

شہیدِ اعظمؑ

حصہ اول
پہلی

حضرت امام حسینؑ کی سوانح عمری

مؤلف

سید ریاض علی ریاض (بنارس)

مؤلف: "الکرار" و "امامت تاریخی حیثیت سے" وغیرہ

باہتمام ضیاء محمد عباد علی ٹیجر و مالکان کے

مطبع اسیر اعظم واقع محلہ مقیم گنج بنارس میں چھپی

ذی الحجہ ۱۳۳۱ھ مطابق نومبر ۱۹۱۳ء

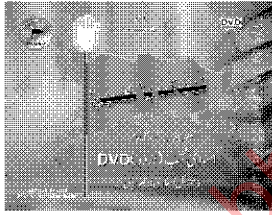
بار اول ایک ہزار

(جملہ حقوق محفوظ بحق مصنف)

تہ: ۸۰/۱

یہ کتاب

اپنے بچوں کے لیے scan کی بیرون ملک مقیم ہیں
مومنین بھی اس سے استفادہ حاصل کرسکتے ہیں۔



منجانب۔

سیل سکینہ

یونٹ نمبر ۸ لطیف آباد حیدر آباد پاکستان



۷۸۶
۹۲-۱۱۰
یا صاحب الزماں اور کئی



لبیک یا حسینؑ

نذر عباس
خصوصی تعاون: رضوان رضوی

اسلامی کتب (اردو) DVD

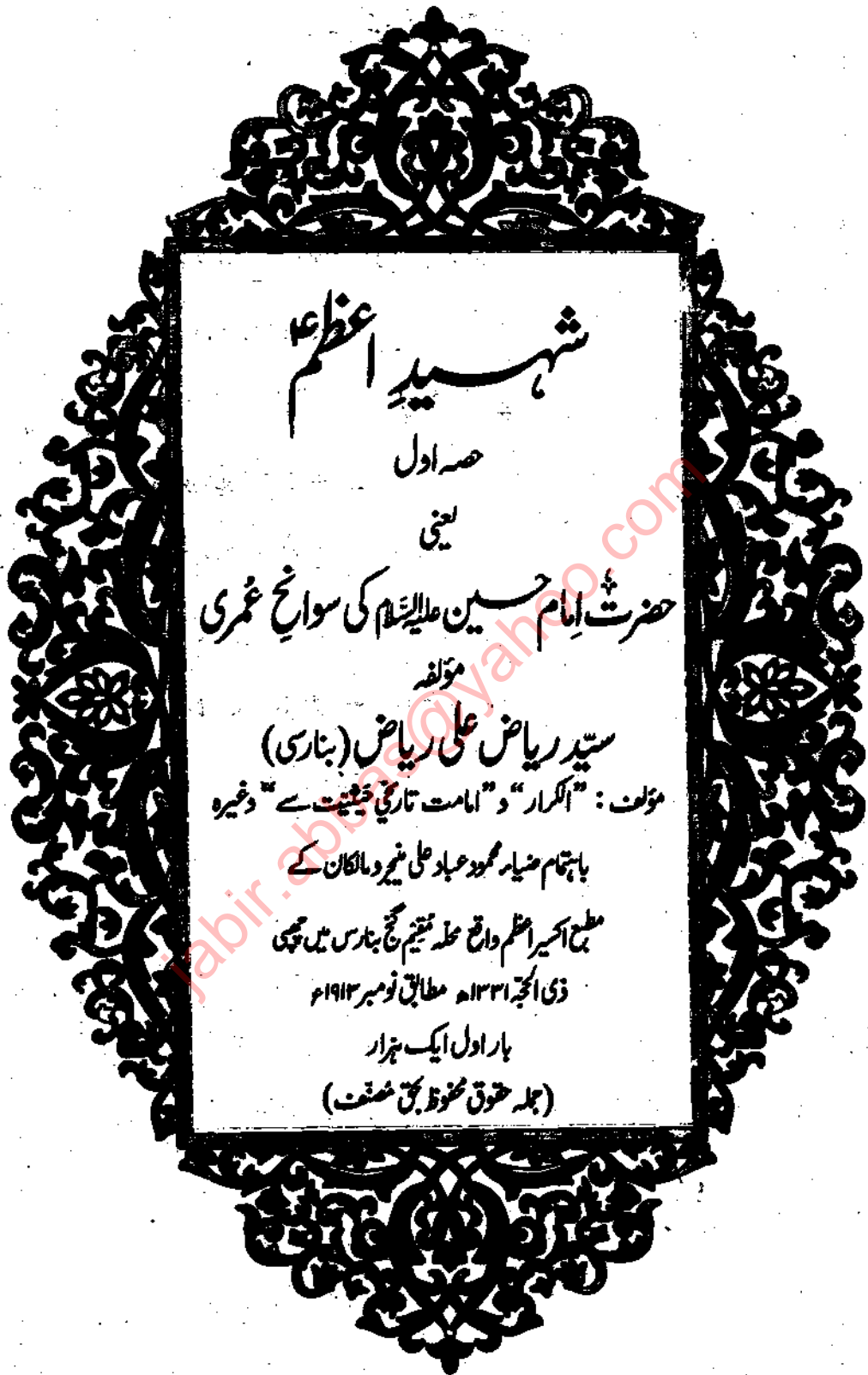
ڈیجیٹل اسلامی لائبریری -

SABIL-E-SAKINA

Unit#8,

Latifabad Hyderabad
Sindh, Pakistan.

www.sabeelesakina.page.tl
sabeelesakina@gmail.com



(جلد حق مخطوطات مصنف)

نام کتب	"شہید اعظم" (حصہ اول)
مؤلف	سید ریاض علی ریاض (بناری)
موضوع	مؤلف: "الکرار" و "امامت تاریخی جہنیت سے" وغیرہ
باجہام	حیدر محمد عباد علی نیو مالکان کے
مطبع	بکیر اعظم واقع محلہ مقیم گج بنارس میں مچی
	تعداد: بار اول ایک ہزار
	تاریخ اشاعت: ذی الحجہ ۱۳۳۱ھ مطابق نومبر ۱۹۱۳ء
	اشاعت ثانی: ۱۳۳۰ھ مطابق ۲۰۰۹ء

قیمت: = ۴۸۰ روپے

ملنے کے پتے:

انڈکس ابواب

مقدمہ از صفحہ ۵ تا ۵۰

کتاب کے ان مختلف حصّوں کے اشارے جنہیں مؤلف اختصاراً یا توضیحاً درج کرنا چاہتا ہے۔
مؤلف کی روش اور علامات۔

باب اول از صفحہ ۵۱ تا ۱۵۷

ولادت حسینؑ کے قبل سے رحلت رسولؐ تک (رسولؐ کی تعمیرانہ مصلحت)

ہادی عالم کی بعثت کے وقت مذاہب کی حالت، نبوت بعض انبیاءؑ اور ان کے اصول کے متعلق اشارے۔ خانہ کعبہ، عرب کی معاشرتی، ملکی، اخلاقی، مذہبی اور علمی حیثیت، نبی عربی کے متعلق اشارے، نصب محمدؐ، وطن فروش عرب، خلف الفضول، حضرت خدیجہؓ کی توجہ، خاندان ہاشم کا متعلق خبر اور عربوں کے ساتھ احسانات، نبی عربی کی طفلی، ابوطالب، قریش کا ابوطالب کے پاس وفد اور سوال کا جواب، حضرت خدیجہؓ کا عقد اور ان کی بدد کا درجہ، علیؑ کی ولادت، فاطمہ زہراءؑ کی ولادت، وراثت مغات، بشیر نذیر انبیاءؑ، مسئلہ شفاعت، ذوالعشرہ، عرب کے بندہ زر ہونے کی مثالیں، ہجرت حبشہ، شعب ابوطالب، دعوت اسلام، مدینہ میں اسلام، ہجرت نبی، جنگ بدر، عقد مواخات، غزوہ تبوک، واقعہ عقبہ، سورہ برات، مباہلہ، اہل بیت، حسینؑ کے متعلق طفلی کے زمانہ کی روایتیں، واقع بنو ضلع، علیؑ یمن بھیجے گئے۔ حیدر الوداع، واقعہ عقبہ کی ملتوی وجہ، دروازوں کے بند کرنے کا حکم، تیارداری کی درخواست، حبش اسامہ، ازواج رسولؐ کا دورہ، لباس مسند کا واقعہ، قتل کا اشارہ، حقیر قرطاس، ہادی کی آخری دستیں۔

باب اول کا خلاصہ (واقعات کا نشو) از صفحہ ۱۵۸ تا ۱۷۳

شرح واقعات اور تبصرہ۔ شہدائے مذاہب اور تاریخی شخصوں کا تذکرہ۔ مثالیں کہ قومیں اپنے مشاہیر کی یادگارت نام کرتی ہیں۔

باب دوم از صفحہ ۱۷۴ تا ۲۰۶

رسولؐ کی تعمیرانہ مصلحت کا اہتمام (مجاہل)

اہلبیتؑ اور ان کے مؤیدین حقوق پر دھاک بیٹھانے کی کوشش

رحلت رسولؐ کے بعد مختلف طبائع کا عمل، عقیدہ بنی سامہ، بیعت ابوبکر، واقعہ متغیر کے متعلق جناب امیرؑ کے الفاظ،

اہل بیت پر بیعت کا ائسد، بیعت سفید کی نیت، بڑی جاعتیں، اور بیعت ابوبکر، واقعہ فک، باحی زکوٰۃ کا قتل، شرکائے دین رسول کے نام۔ جناب امیر رطلت رسول کے بعد حضرت فاطمہ کا اثر خم، طاہرہ کی طالت اور طاہرہ، سیدہ کی وصیتیں اور رطلت، حسین، دین، قبر، علی مرثیہ کہتے ہیں۔ ماکتذیر احمد صاحب کے بعض خیالات۔

باب دوم کا خلاصہ (واقعات کا نشو) از صفحہ ۲۰۷ تا ۲۲۶

شرح و تنقید واقعات۔

باب سیوم

رسول اور اہلبیت کے نام و حقوق وغیرہ کے زائل کرنے کی کوششیں (غفلت) از صفحہ ۲۲ تا ۲۵۹

کامل توجہ عمال، علی کی غیر ماکتذہ روش، خلیفہ کا انتخاب، ایک ظری سوال، علی انتخاب کے متعلق، خلیفہ ثانی اور عمال کی تقرری، عمر کا ظہر اور حسین ترتیب دیوان، مقدمہ زمانہ معلویہ دمشق کا عامل، دور ثانی کے بعض عمال، حضرت شہر بانو، شیریں، تقسیم قیمت اور حسین، غم، بنو ہاشم اور مہدے، عمر اور عباس کا مکالمہ، شہزادہ کی تعظیم، آرائش کعبہ، رسول کا یادگار درخت، روایت حدیث کا ائسد، ایک خلیفہ، اہل حصہ کا قاتل۔

باب چہارم از صفحہ ۲۶۰ تا ۲۹۲

مرکزی خلافت ورزیوں کی ترقی اور اس کا اثر

خلیفہ ثانی کا مقرر کردہ اصول انتخاب، طریقہ انتخاب کے متعلق علی اور عباس، ابن عوف کی کارگزاری، بنی امیہ اور عثمان کا انتخاب، مقداد اور ابن عوف کی گفتگو، انتخاب عثمان کے متعلق علی اور مؤمنین، ابو سفیان اور حسین، عثمان کا پہلا خلیفہ، قتل ہرمزان، عمال کا تقرر و تبدل، مسلمان سپاہیوں میں قیمت کے لیے جنگ حسین اور افریقہ، مال قیمت اور مردان، ابن عباس کا عزل، فتح قبرس، ولید کی شکایت، نندہ ثالث وغیرہ، طبرستان اور حسین، اعراف مصاصت، خلیفہ گمراہ اور خلیفہ، جناب امیر اس زمانہ کے متعلق، اصحاب رسول کا وفد، عمار کے ساتھ بر تلو، ابوذر کا شام اور مدینہ سے افراف، رطلت ابوذر، مسیح کا طرز عمل، مالک اشتر کی بلا وطنی، شکایتی وفد، مشورہ، اہل کوفہ کی صلاح، اہل کوفہ کے نام خلیفہ کا خط اور اس کا جواب، رسول کی انگوٹھی، عام شکایات اور جناب امیر کی وسالت، خلیفہ کی تقریر، صلاح اور معلویہ، مصر کا وفد خلیفہ کا محاصرہ، فتح ابن ابی بکر کی تقرری اور قتل کا فغان، اصحاب پر اس کا اثر، مقدمہ، جماعت کو عزل کا اختیار نہ دینے کے لیے ابن عمر کی صلاح، علی کی سفارت کا اثر اور پھر خلیفہ اور مردان کا طرز عمل، علی گنارہ کشی کا جہد کرتے ہیں۔ وفد کے تصفیہ کن شرائط، خلیفہ اور مامورین کا مکالمہ، علی نے پانی بھیجہ حضرت عائشہ حج کے لیے روانہ ہوئیں۔ طلحہ اور عثمان، حسین، ماکتذہ، فتح ابن ابی بکر اور عثمان، رطلت، انتقام، اس وقت کے عمال۔

باب چہارم کانشواور واقعات کا خلاصہ از صفحہ ۲۹۳ تا ۳۲۲

شرح و تنقید واقعات

باب پنجم از صفحہ ۳۲۳ تا ۳۶۴

رسول کے بعد کے نظام کا سکون اور دوبارہ حرکت

علی کی خلافت کے لیے بلا فصل خواہش کی مثال، خلافت کی پیش کش اور علی، حنفیہ بیعت، علی کی بیعت کے واقعات، تقسیم بیت المال اور مسلمات برتنے جانے کی حکایت، تحلف اور اس کی وجہ، معاویہ اور دریافت حالات، بنی امیہ شام جانے لگے، طلحہ و زبیر بصرہ اور کوفہ کی حکومت طلب کرتے ہیں، مالکہ رحلت عثمان اور خلافت علی بن عمر کے قاصد کا بیان، شوش کی خبریں اور علی بنی امیہ اور اصحابِ جل میں اختلاف، اصحابِ جل اور بصرہ جناب امیر کی روانگی، علی کے قاصد اور ابو موسیٰ، مخیر بن علی کوئی مدکار اور علی اصحابِ جل کی آمد کی جنگ، اخف کا سوال، جناب امیر کا خطبہ اور اصحابِ جل کے نام خط، جواب اور سفارت۔ علی کا جنگی خطبہ، تعبیر جنگ، زبیر اور علی، جنگِ جل، امیر المومنین کا اعلان اور اسرائل نے جنگ کے ساتھ بر تلوز حضرت عائشہ کے بعض خیالات اور کوششیں، فتح کا اثر، کوفہ۔ معاویہ کی حیثیت، صفین کی تیاری۔ ابن عباس اور معاویہ کا مجبور۔ شرمیل ابن سبط۔ ابن عمر معاویہ کے پاس۔ فوجوں کی روانگی۔ صفین میں جناب امیر کا خواب۔ کنڈرات جنگ۔ سفارت، سلطان عثمان کا سوال اور جواب۔ مخیر بن حنفیہ کی جنگ، معاویہ کی کوششیں، سخت جنگ اور لشکر شام کی حالت۔ علی فیصلہ کن جنگ کے لیے آمادہ ہوئے۔ حلیہ قرآن۔ جناب امیر فریب سے آگاہ کرتے ہیں۔ لشکر کی مخالفت۔ حکیمان کا تقرر۔ فیصلہ اور نوبت جنگ۔ جناب امیر کی وصیت۔ حکیمان کا فیصلہ اور جناب امیر کا اعلان۔ خارجہ شام کی طرف بڑھنے کا حلیہ اور لشکر کا عذر۔ ولادت امام زین العابدین۔ مالک اشتر کی شہادت۔ مخیر ابن ابی بکر کی شہادت۔ معاویہ کی سرحد کی کوششیں۔ جناب امیر تساہل کے نتائج سے مطلع کرتے ہیں۔ معاویہ سے جنگ کی آخری تیاری۔ امیر المومنین کی شہادت۔ آل عبد المطلب اور حسنین کو ہدایت۔ ایک قاتل معاویہ کو خبر دیتا ہے۔

باب پنجم کانشواور صفحہ ۳۶۵ تا ۳۹۹

واقعات کی شرح

باب ششم از صفحہ ۴۰۰ تا ۴۴۰

بنی ہاشم کا دائمی زوال

حسن کی بیعت، معاویہ بیعت لیتا ہے۔ جاسوس، مراسلات۔ معاویہ کی جنگ کے لیے تیاری۔ حضرت امام حسن کی فوج اور اس کی حالت۔ حسن اور قیس کا کوچ۔ حسن زخمی ہوئے۔ لشکر کی نافرمانی۔ حریم صلح۔ حسن کا خطبہ۔ قیس ابن سعد۔ شرائط صلح۔ معاویہ حسن سے خطبہ کی خواہش کرتا ہے۔ خطبہ۔ عمرو بن عاص اور معاویہ کی تقریر۔ قیس اور معاویہ۔ حسین سے طلب بیعت۔ صلح اور حسین۔ حسن سے صلح کے متعلق سوال و جواب۔ ابن بشر اور حسین۔ اہل بصرہ صلح کے متعلق حسن کا مزید جواب۔ بنی امیہ حضرت امام حسن کو توہین کرنے کے لیے بلاتے ہیں۔ شہادت حسن۔ حسین زہر دینے والے کا نام پوچھتے ہیں۔ دفن حسن۔ معاویہ کو اطلاع اور اس کی حالت۔ حسن کا مرثیہ۔ علی کے دوست اور معاویہ۔ زیاد، زیاد اور شیعان علی۔ حبر ابن عدی۔ عمرو ابن امق۔ دیگر شہداء۔ حجر کے خلاف مقدمہ۔ شہادت حجر۔ حسین اور معاویہ کی خط و کتابت۔ شہداء اہل مدینہ کی قبریں۔ دلی عہدی زید کی کوشش۔ مکہ میں حسین کا خطبہ۔ حسین اور قسطنطنیہ۔ معاویہ اور حسین میں سختی سے گفتگو۔ معاویہ کے اعلان بیعت کے متعلق لوگوں کو حسین کا جواب۔ ابن خالد اور حاکم کی رحلت۔ معاویہ کی رحلت زید کو اختیارات کی حوالگی اور وصیت۔ زید کی تقریر۔ حسین کے متعلق روایتیں اور حضرت کے اقوال۔ کنیت، ولایت، نقش خاتم۔ مدد اولاد و زوجات۔

باب ششم نشواز صفحہ ۴۴۱ تا ۴۷۱

شرح واقعات۔ معاویہ قیام یا اجرائے احکام شریعت کے لیے نہیں لڑتا تھا۔ علامہ سید رشید رضا کی تقریر کا اقتباس۔ صلح حسن کی بحث۔

باب ہفتم از صفحہ ۴۷۲ تا ۵۶۴

حسین رجب شدہ تک

تبصرہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

شہید اعظم

یعنی

حضرت امام حسینؑ علیہ السلام کی سوانح عمری

(پہلا حصہ)

مقدمہ

واقعہ، سبب اور نتیجہ کے بعد اس کے نتائج ایک زمانہ تک اثر دکھاتے رہتے ہیں۔ اگر کسی بڑے واقعہ کے بعد دیکھنے کے بعد اس کے نتائج پر غور نہ کرنا غفلت اور کم نظری ہے، اسی طرح اس کی نسبت اس صفت تصور سے کام لینا کہ وہ بڑے اسباب کا نتیجہ نہ تھا، نتیجہ کو بغیر سبب کے شہتا کر دینا جو کہ پیش نظر حرر مقدمہ صدر خیال کا نتیجہ ہے۔

شہادتِ حسینؑ کی عظمت بمقابل ملل ماضیہ ہے کہ حسینؑ کی شہادت ایک ایسا واقعہ عظیم ہے جیسا نہ کبھی کہیں ہوا اور نہ خود تاریخ اسلام اس کا مقابل لاسکد ملل ماضیہ اور ان کی تاریخ اگر اسی طرح قبول کر لی جائے جس طرح اس وقت ہمارے سامنے موجود ہے جب بھی ان کا کوئی شہید یا سلسلہ شہداء مشکل سے ہمارے شہید کی عظمت و شرافت اعمال کے مقابلہ کا حوصلہ کر سکے گا۔ اولیاء مذہب اور ان کی تخلصیں حسینؑ کے انہو مصائب پر جھجھکتی ہوئی نظریں بھی تھرا جائیں گی اور کسی یسعیہ کا چہرے نے دلا تہا آ رہے ان بے شمار حروں کے سامنے گونگا ہو جائے گا۔ جس پر ہمارے شہید کا خون ہے یا کسی صلیب رسیدہ جسم کی چند کلیں حسینؑ کے جسم اقدس میں چھپنے والے بے شمار تیر اور نیزے کی انیوں کے سامنے بے حقیقت ہوں گی۔

حسینؑ کی شہادت کے واقعات کیونکر ملے ہمارے شہید کی تاریخ ہے۔ اس حیثیت کی تاریخ جو دشمنوں کے قلم اور زبان نے ہمارے حوالہ کی۔ حسینؑ کا

دوست واقعہ نگار کوئی زندہ نہ چھوڑا گیا۔ اگر کوئی واقعہ نگار کی سکتا تھا تو علی بن الحسینؑ اور محمد راست عصمت امام زین العابدین علیہ السلام اپنی قید سے بہت پہلے بستر علالت پر مختصر تھے اور پردہ نشین بیسیاں حسینؑ کی زندگی تک بیرونی ممالک بہت کچھ بے خبر تھیں۔ لیکن حسینؑ کی شہادت کے بعد نہ صرف علی بن الحسینؑ اپنے بستر بیماری سے کھینچے گئے کہ وہ اس کے بعد کے واقعات دیکھیں بلکہ محمد راست عصمت نے بھی یہ دیکھا کہ میں اپنے قاتلانے غیر کے خلاف عام نکالیں دیکھنی ہوں گی۔

افراد اور ان کے خصائل پر اجتہاد کی آسانی کوئی وقت ہو اس کے متعلق سمجھنے کی ضرورت کے موافق ان مقلوموں کی تاریخ ہی فن تاریخ کا ترقی کیا ہوا زمانہ تھا اور آٹھ لکھ ان کے پیشتر کے اولیاء اور شہداء کا زمانہ اس حیثیت کا نہ تھا جس سے واقعات اور افراد کے خصائل پر اجتہاد تاریخی کی ایسی آسانیاں ہوں جیسی ان کے زمانہ میں تھیں۔ خود اسلام جو اس واقعہ سے ۳۲ برس قبل سے شروع ہوا تھا اس کے متعلق ایک فرانسیسی مورخ بہت کچھ ریما رک کرتا ہے کہ: یہ ایک مذہب کا قیام خیز مظہر پیش نظر کرتا ہے جس کا دن کی صاف روشنی میں وجود ہو رہا ہے۔ یہ سب تاریخی زمانہ کی آنکھوں کا دیکھا واقعہ ہے۔

شہادت حسینؑ سے بہت واقعات کا اصلی رنگ معلوم ہو گیا حسینؑ کی شہادت کے تاریخ وہ گزشتہ ہوا آئندہ ایسی تیز روشنی ڈالی جس سے بہت سے ایسے واقعات کا اصلی رنگ معلوم ہو گیا جو بغیر اس قوی اشارہ کے بے قوی سے گزر جاتے۔ بلکہ ان کی غرض اور حقیقت بالکل چھپانے چھپ سکتی ہے۔

مؤلف کا کام جو کچھ مجھے اپنے اس سبب سے بڑھ کر فرض کے متعلق کرنا ہے وہ یہ ہے کہ میں اس دعویٰ پر قیامت نہ کروں کہ شہادت حسینؑ ایک واقعہ عظیم ہے بلکہ یہ دکھائوں گی کہ حیثیت یہ نہ صرف اسلام بلکہ عالم کی تاریخ کے مشہور واقعات میں ایک سرمایہ حیرت اور عظیم ساتھ ہے۔ جس حد تک حسینؑ کی تاریخ عمری بلکہ عروج و غروب متعلق اثر کے قبول کر سکے میرا فرض اسی پر تمام نہ ہو جانے کا کہ میں سامع کو بحیثیت اس کے سامع ہونے کے بیان کردوں اور بس۔ نہیں یہ روش تو بہت کچھ زمانہ حال کے اس جائز مورخانہ اعتراض کی تبلیغ رہے گی کہ واقعہ کو صرف بیان کر دینا قصہ خوانی سے زیادہ مفید نہیں ہے۔ بلکہ اس کتاب کی یہ غرض بھی ہوگی کہ واقعہ نہ صرف من حیث الواقعہ بیان کیا جائے بلکہ اس کے پس منظر پر بے جذبہ احتیاط سے نظر ڈالی جائے۔ اس سے امید کی جاتی ہے کہ جب مجاہد دور کر دیے جائیں گے تو واقعہ اپنی تجویزی حیثیت سے اس سے زیادہ سمجھ میں آنے کا جس قدر صرف بحیثیت واقعہ پڑ جائے کہ میں آئندہ کیونکہ اس نہ صرف اسباب بلکہ نتائج نے بھی اس کے سمجھنے میں مدد دی ہوگی۔

اسباب شہادت کا خاصہ ظہری ہے اس خیال کا پید ہونا کہ ”انا قاتل العبدۃ“ کہنے والے کے اسباب شہادت جس کی بے گناہی پر ایک عالم شاہد اور مظلومیت پر ایک زمانہ اشک حسرت بہا رہا ہے، نہایت مسلسل، خلاف انسانیت، بے رحمانہ اور ایسی مصلحت کے تابع ہوں گے جس میں شخصی اور قومی شرائط سے جاہل کیا جاسکتا ہو گا اور خود غرضیوں کی حفاظت کیے ہی کر رہے اور ظالمانہ فعل کے کرنے سے رخصت نہ پیدا کرتی ہوگی۔ بلکہ مدبرین کسی تحریک کے پیدا ہونے کو نتیجہ حاصل کرنے کے جوش میں کمزوری سمجھتے ہوں گے اور اپنی عدم ہمدردانہ ضد کو استقلال سمجھ کر اپنے فعل کا جواز اور اپنا اطمینان کر لیتے ہوں گے۔ اگرچہ اس جواز اور ان کے اس اطمینان نے کیسا ہی فساد اور کمی ہی تکلیف ان کی روش کے خلاف شخص یا اشخاص کے لیے کیوں نہ پیدا کر دی ہو۔ یادہ زمانہ کے لیے کسی ہی بری مثال کیوں نہ ہو۔ انوس ایسا ہی تھا۔ مثالیں شاذ نہیں ہیں۔ اور اگر کسی دانست میں شاذ ہوں بھی تو وہ انداز اور اسباب جن سے مثالوں کی سی صورت تیار ہوتی ہے کسی طرح شاذ نہیں ہیں۔

حسینؑ کے پہلے اور حسینؑ کے زمانہ کی مصلحت کا فرق وہ اسباب جن کا نتیجہ شہادت حسینؑ تھی اپنی ساخت کے لحاظ سے بھی نرم لیکن

مندی اور مسلسل، اور بھی سخت۔ لیکن رشتے کے قطع کرنے والے نہ تھے۔ ایسا نہ ہونا سہی ہوئی مصلحت بلکہ ناقبولیت پیدا نہ کرنے کا خیال تھا۔ ورنہ حسینؑ یا ان کی مصلحت کے عموک یا دوسرے لفظوں میں وہ جن کی مصلحت کے حسینؑ عامل تھے بہت پیشتر قتل ہو گئے ہوتے۔ اس سے ظاہر ہو گا کہ حسینؑ مصلحت میں فرق نہ تھا اگر تھا تو سختی کے درجہ کا اختیار اور حکومت کے ساتھ رشتہ کے قطع کر دینے کی سی سختی نہ کرنے کی وجہ سے گزشتہ مدبرین کامیاب ہوئے۔ اس وجہ سے کہ ظاہری بے عنوانیوں کے نہ ہونے کے سبب سے لوگ جہلی میں رہے۔ یا لوگ اس مذہبی اندرونی رفتار نامواخت کی گرفت اور میج اندازہ نہ کر سکے۔ دراصل ایک جس وقت حسینؑ شہید ہوئے رشتے اس قدر چمک گئے تھے کہ یوٹوٹ جانے کے کوئی صورت نہ رہ گئی تھی۔ یہ کھلا اتفاق اور لا اعلان نہ تھا بلکہ اس وقت کے مدبرین گزشتہ روش اور اس کے اثر کو تولنے کے بعد اب اس حد تک سختی کرنے کو اپنے لیے ضروری نہ سمجھتے تھے۔ کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ حسینؑ کی مصلحت ایسی اور اس قدر کمزور ہوتی چلی آئی ہے کہ اس سے کسی قسم کا خوف نہیں ہے اور اس میں اب اطمینان کی قوت باقی نہیں ہے۔ اس لیے اس حالت کو کچھ دنوں اور عالم نزع میں رہنے دینا ایک اپنے لیے غیر ضروری اور ضروری وجود کے بقا کی طرف رجعت کے توہم کیوں نہ تھا۔

بنی امیہ کی تباہی کا سبب ملکی رقابت کے اس لطیف توہم نے دراصل ایک ملکی رقابت کا خوب بھی نہیں دیکھا جاسکتا تھا۔ بنی امیہ کو تباہ کرنے کی حد تک تباہ کیا طلبہ نے تاریخ کے لیے تصور کیا یہ سب سے حیرت خیز خوراک ہوگی کہ اس حالت میں جس کی بے قی کا میج اندازہ کیا گیا تھا کس طرح ایسی بے رکن قوت پیدا ہو گئی جو مرتب فوجوں کے ریلے، فرائض کی پر قوت امداد اور سیاسی موقع شناس نگاہوں کے اندازہ پر غالب آگئی۔ ایک آگ تھی جسے عالم غیب سے نظر نہ آنے والی مقدس رومی دامن سے ہوا سے رہی تھیں۔ آگ بڑھتی تھی اس کی روشنی پس دیش دکھائی تھی۔ اس کی سخت گری دشمنان آل رسالت کی ہڈیوں کے مغز جلا رہی تھی۔ ان کے پیچھے مدت سے جبرے تھے۔

مختلف الاثر پیمانہ لیکن اس کی خوشگوار گری ملحد مسلمین کی رگوں میں تیزی، پھرتی، ہمدردی اور اتفاق پیدا کرتی تھی۔ انھیں گزشتہ غلط فہمیوں پر جوش انابت ہوتا تھا اور اب اس میں مطلق شبہ نہ رہ گیا تھا کہ کم سے کم بنی امیہ اسلام اور رسولؐ کے سخت ترین دشمن ہیں اور اس لیے مطلق اس قابل نہیں ہیں کہ مسلمانوں کے دلی امر ہو سکیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بنی امیہ کی حکومت جتنے دنوں تک شہید کی صاف اور صریح دشمنی کوئی کے موافق آئیں کی عداوتوں سے دم توڑتی رہی اس وقت بھی مشہور باپ کا بیٹا عبدالملک اپنے مشہور عامل حجاج کو لکھتا ہے کہ مجھے آل رسولؐ کے خون سے پھانا۔ بنی امیہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ایسی دزدنی ذلت سے دب گئے کہ انھیں اپنی اظہار قومیت سے بڑھ کر کوئی شرم کی بات نہ تھی۔ اگر عرب میں ان کی ہڈیاں مادر گیتی کے حکم میں دفن کے قابل نہ بھی گئیں بلکہ اس سے زیادہ مناسب مقامات پر تھل کی گئیں تو اندلس کا الزابل اموی اپنے پھٹے ہوئے لباس سے گلیوں میں مسدا لگاتا تھا کہ:

”میں جوں کہ اس کا آخری ہلو شاہ فوج سے عبرت حاصل کرو“

شہید جس کی بے شمار مصیبتوں میں اس کی قابلِ ذمیت پیاس بھی تھی۔ اپنی شہادت کے بعد صرف ایک بات کا پیرا معلوم ہوتا ہے۔ اور وہ یہ کہ اسلام کے یہ سب سے بڑے دشمن دنیا سے ملا دیے جائیں۔ پیاس بھی وہ مٹ گئے۔

حسینؑ کے ساتھ ہمدردی کے جذبات ہی لوگوں میں حسینؑ کے ساتھ جس درجہ کی ہمدردی

اور محبت پیدا ہو گئی وہ نصیح کے شہ سے جس قدر بالا ترقی اسی قدر ہمدردی کرنے والوں میں آپس میں ایسی یک جہتی اور محبت پیدا کرتی تھی جیسا لطف انہیں اپنی پاکت میں حاصل ہونا نا ممکن تھا۔ اس لیے کہ حسینؑ کے ساتھ ہمدردی کے جذبات ان عناصر سے بنے تھے جو اہلِ عالم کے نزدیک ہمیشہ قابلِ وقعت رہا لوگوں میں ایسا ہیون پیدا ہو گیا جو اعلیٰ خصال قوی اور خصوصیات ذاتی کی پرورش قدر شناسی تھی اور جو جہاں ساخت اور تربیت خصال کا پہلا زمین ہے وہاں ترتیب قومیت کے مرکز سے کچھ زیادہ ہے۔ حسینؑ ہمدردی تھے۔ حسینؑ نے دین کو زندہ کیا۔ حسینؑ اپنی فتنے جہانی کے بعد ایک وہ روشن اور بلند مینار بن گئے جس کا سایہ صلح و صفات انسانی کی پرورش کرتا ہے۔

جوشِ ہمدردی جوشِ عداوت پر غالب آ گیا گزشتہ سطروں کے اشارہ کے اعتبار سے یہ خیال ہوتا ہوگا کہ واقعہ شہادت کا نتیجہ نہایت عظیم تھا

جس میں دو متضاد قوتیں تھیں۔ اگر کوئی اس تقسیم کو قبول کرنے میں متردد ہو تو یہ زیادہ واضح ہوگا کہ اس واقعہ نے جیسا جوش ہمدردی پیدا کیا وہ ان قابلیتوں سے پر تھا کہ دشمنانِ حسینؑ کے جوشِ عداوت پر غالب آ جاتا۔

واقعہ شہادت کیونکر دیکھا جاسکتا ہے کیسے کوئی اس انقلابِ عظیم پیدا کرنے والے واقعہ کو کمزور توجہ کی گزرتی ہوئی نگاہ سے دیکھ سکتا ہے بلکہ یہ یقین ہے کہ

اگر کسی قدر زندہ اور اک سے کام لیا جائے تو اس واقعہ کی کل عقلی اور فطری تاریخ اور اس کا پہلو کسی ہی بے قرار گزرتی ہوئی توجہ کو گھڑ دے گا اور حیرت اس وقت تک اسے آگے نہ بڑھنے دے گی جب تک شخص میں پھریدگی کا فطری تغیر نہ پیدا ہو۔ یہ استثنائان صورتوں کے جس میں توجہ نہ ہونے دینا شخص نے قرین مصلحت سمجھ لیا ہو۔

صالح توجہ کے گمراہ کرنے کی مثالیں اور ان کی طینت مثالوں سے گزرتے ہوئے ہم

ایک مسلمان کے اس مشہور فقرہ پر توجہ دلائیں گے کہ: ”حسینؑ اپنے نانا کی تلوار سے قتل ہوئے“ (دیکھیے صواعقِ مرعہ) غور کرنے والے کو اس فقرہ کی دورنگی ایک مسلمان منہ کی زبانی حیرت خیز معلوم ہوگی جس میں اگر رسول کی تلوار کی برش کا واقعہ سے زیادہ سخت اور پر طنز تذکرہ کیا گیا ہے تو اس کے ساتھ ہی اس سے زیادہ تکلیف دہ یہ عکس ہے کہ رسول کی مصلحت نے حسینؑ کو قتل کیا جس کے معنی یہ ہیں کہ جو کچھ سختیں حسینؑ پر گزریں انہیں رسول کی مصلحت میں غوطہ دے کر نری پیدا کی گئی ہے۔ یا الزام کا رخ پھیر دیا گیا ہے۔ ذلیل دنیا پسندی، جوشِ عداوت، اور توہم لے جو مصلحت گزری تھی اسے وہ لباس پہنایا گیا ہے جسے بھی ہوئی نگاہ فوراً دیکھ کر بتا دے گی کہ ناموزونیت کا بہترین نمونہ ہے۔

رسولؐ نے جو عناصر قبیضہ پیدا کر دیے اور جن قوتوں سے مسلح کیا اب وہی کمال نا احسان شناسی سے ان کی اولاد پر صرف کی جارہی تھیں اور یہ دلیل، ہنسی، ہنسی جارہی تھی کہ حسینؑ اپنے نانا کی تلوار سے قتل ہوئے۔ اس فقرہ میں یہ خیال بھی نفوذ کیا ہوا ہے کہ حسینؑ اس کے ہاتھوں سے قتل ہوئے جسے مسلمانوں نے غلیظہ رسولؐ بکھا تھا اور اس لیے کوئی شخص جس کے خیال کو غلیظہ اپنی روش کے خلاف سمجھے قابلِ تہذیب ہے اور یہ سختی اور تعزیر قابلِ الزام نہیں ہے۔

میں کافی یقین سے کہہ رہا ہوں کہ کہنے والے کے اس فقرہ میں مقصود انہ جیرت یا تاسف کے آڑ کی کوئی گنجائش نہیں ہے بلکہ اس فقرہ کی ترکیب بجز اس خیال کے جو ظاہر کیا گیا اور کسی تلویح سے ممکن نہیں، نہ اس سے علیحدہ اس کے الفاظ کوئی دوسری فہم دے رہے ہیں۔

مزید تائید اس خیال سے ہوتی ہے کہ جس زمانہ میں یہ خلاف واقعہ بے رحمانہ اور اسلام آزار فقرہ مسلمان بھی چلانے والی زبان نے ادا کیا اس نے کسی طرح وجہ حسینؑ کی مدد نہیں کی بلکہ وہ ہمیشہ ان لوگوں کے لیے سپہ بنارہا جو یزید کے مظالم اور مصلحت کی مختلف نقطوں میں تائید کرتے رہے۔ وہ زمانہ ایسا نہ تھا جس میں کوئی ظاہر میں حسینؑ کی تائید میں کچھ کہنے کی جرأت کرتا۔ جرأت خود کشی ہوتی۔

اسی طرح گزشتہ فقرہ سے کم مدبرانہ لیکن اس سے زیادہ پر قوت مضر، عملی حیثیت سے یہ فقرہ ہے کہ: ”واعظا پر حسینؑ کا ذکر حرام ہے۔“ نہیں معلوم فتویٰ دیتے وقت مفتی کو یہ یاد تھا یا نہیں کہ وہ شارع اسلام کے نواسے کے ذکر کے متعلق اپنے اسلامی احسان شناسی پر عکس ڈال رہا ہے۔ دین کے اکوں کے بے جا مصروف کی ایسی پختہ مثال شاید ہی کوئی لائی جاسکتی ہو۔ لیکن اس فتویٰ سے زیادہ حیرت خیز ان مسلمانوں کا اقتضائے اسلام ہے جو آج تک اس فقرہ کو دہرا دہراتے ہیں۔ بغیر اس پہلو پر نظر ڈالے جس پر گزشتہ سطروں میں توجہ دلائی گئی یا بلا یہ سوچے ہوئے کہ اس فقرہ کی مصلحت اس کے بانیان مصلحت اور گرد و پیش کے اتفاقات کو فنا ہونے صدیاں گزر گئیں بھی وقت تھا کہ ایسا کہنا کہنے والوں میں امید منفعت پیدا کرتا تھا اور تاویل حکومت کے ماتحتی میں تھی۔ اب یہ اشتہار فروشی سے زیادہ نافع نہیں ہے۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اب وہ زمانہ نہیں ہے بلکہ ایسا کہنا کہنے اور سننے والے دونوں کے لیے مضر ہے۔

نواسۂ رسولؐ کی ہمدردی اتفاق کا ایک مرکز ہے
اس لیے کہ اس سے وہ اکیلی امید کہ ہم سب نبی کے نواسہ کی ہمدردی پر متفق ہو کر اپنے گزشتہ نا اتفاقیوں کے کارناموں کو بھلا دیں گے کمزور ہوتی ہے۔

فتویٰ دینے والے اسباب شہادت حسینؑ کو خوب سمجھتے تھے
مجھے گزشتہ دونوں فقروں کے متعلق اس قدر اور

کہنا ہے کہ ان دونوں جملوں کی مصلحت میں بعینہ وہ فرق ہے جو یزید کے پہلے اور یزید کی مصلحت میں فرق تھا۔ یہ بھی کہنا میں کہنے والے کی دودہ بینی کے ساتھ انصاف سمجھتا ہوں کہ وہ اسباب شہادت حسینؑ کو خوب سمجھتا تھا۔ وہ یزید کی مصلحت کا حامی نہ ہوتا اگر اسے یہ دکھائی نہ دے گیا ہوتا کہ نگاہیں اس سے بہت آگے بڑھ سکتی ہیں۔ جس کے سمجھنے کا راستہ نہایت ہموار ہو گیا ہے۔ میں ہر زمانہ میں ان فقرات کے درجہ مضریت کا مناسب تمیز نہیں کر سکتا لیکن یہ کہہ سکتا ہوں کہ یہ تلوار سے

زیادہ خوفناک کوشش تھی جس سے خاندان رسالت کا نام مٹایا جا رہا تھا۔ ان لوگوں نے اپنے مقتول آکر قتل اور جوش کو ایسی قبر کے حوالہ نہیں کیا جو زندہ کے ساتھ مٹ جاتی ہے۔ بلکہ ان چیزوں کو شیشہ کی قبر میں دفن کیا جس سے اگر مقتول سے ہمدردی کرنے والوں کی نفرت اور عداوت آج تک زندہ ہے تو فحویٰ دینے والوں کی مصلحت کے ساتھ دیشہ واسطے اب تک ان کے کس کو دیکھتے ہیں اور اس کی حفاظت کرتے ہیں۔ میں تصفیہ نہیں کر سکتا کہ کون زیادہ قابل الزام ہے۔ وہ جس نے قتل کیا، یا وہ جس نے مکالمہ مصلحت کی حمایت کی اور اسے کافہ کی ہمیشہ بولنے والی زبان کے حوالہ کر دیا۔

مسلمانوں کے پسند کے مخالف شمال اور طینت
اس سے ظاہر ہو گا کہ متذکرہ صدر
قزاق اپنے شمال اور طینت میں

مسلمانوں کے پسند کے لائق نہیں ہو سکتے

ہماری قوم کے کل جاہل اور عالم افراد پیدائش سے لے کر موت تک سب سے زیادہ اس امر کے متقی معلوم ہوتے ہیں کہ دوسری مجلس میں پہلی مجلس سے زیادہ ماتم کریں۔ حسینؑ کی وہ مظلوم صورت جن پر ان کے عزیز ترین رہتا کاظمؑ اللہ ہے ان کے سامنے آکر گویا کہتی ہے کہ:

من کبتم کہ گریہ بحال مکنی دے
ی شایست ز زکس شہلا گریستن

غیم حسینؑ کا اثر
ہمارے بچے، جوان، بڑے، لڑکیاں، مائیں، بیٹیاں اس طرح اس زندہ گزرنے کے باوجود بڑھتے ہوئے غم میں روتی ہیں جس طرح وہ اپنے عزیز ترین پرندہ روتی تھیں۔ اگر ہم اپنے سرور جہد کر دیتے ہیں تو وہ بھی ہمارے ساتھ اپنے سر کے بال کھول دیتی ہیں اور اپنے اسباب آرائش کو اس طرح بھول جاتی ہیں کہ گویا انھیں ان کی نمائش سے کبھی کوئی اتالی کمزوری یا پر فوق رغبت ہی نہ تھی۔ ہر ایک کا جوش غم اس خیال سے بڑھتا جاتا ہے کہ بقیہ آل رسالت کو کربلا سے دمشق تک نہ رونے کا وقت تھا اور نہ رونے کی اجازت تھی۔ انھیں تجربہ اور یقین تھا کہ میں روتے دیکھ کر کوئی بے رحم ہاتھ ہمدردی کے لیے نیزے کی انی بڑھادے گا۔

جذبات کی یک رنگی
اس طرح ہمارے افراد خاندان اور قوم اس مظلوم کے ماتم میں متفق ہے۔ ایک خیال ایک ہمدردی، غم، غصہ، نفرت، عداوت، محبت پسندیدگی کے جذبات ایک وقت میں قوم کے ادنیٰ سے لے کر اعلیٰ تک تقسیم ہوتے رہتے ہیں۔ ایک دریا بہر ہی لیتا رہتا ہے اور کبھی ہم اپنے قوی غم کی مجلسیں تمام نہیں کرتے۔ جب تک ہم یا لیتنی کُنتُ معہم قافوز قوفا عظیمنا نہ کہہ لیں۔

اسباب شہادت کی عام لاعلمی جو تفریط کی جائے
لیکن قوم کا زیادہ حصہ جاہل ہے۔ اگرچہ
مقتل سے اس کے حسینؑ کی کوئی نصیبت

ہے جسے اس کا ہر فرد نہ جانتا ہو مگر نہ اسے اسباب شہادت حسینؑ معلوم ہیں اور نہ وہ کڑیاں جن کے جوڑ دینے سے یہ خوفناک زنجیر بن جاتی ہے۔ ممنون اس قدر آسان نہیں ہے کہ وہ کند اور بیسطنہ ہو سکنے والے خیال کے اندر آسانی سے سما سکے اور نہ خود قوم کے وہ لوگ جن پر پڑے لکھے کا اطلاق ہوتا ہے عموماً تاریخ اور خصوصاً فلسفہ تاریخ اسلام اور اس کے

الہ ہدیک کلام پر توجہ کرتے ہیں۔ بہت سے ایسے ضرور ہیں جو ان واقعات اور اشارات سے واقف ہیں جن سے اسباب شہادت سمجھے جاتے ہیں لیکن انہیں بھی اس کا قابل تعریف اندازہ نہیں۔ اس کے عکس میں بے اعتدال غلو اور بے ہادہ مبالغہ نے بھی اثر کیا۔

افراط انتخاب الفاظ کی دشواری اور بے احتیاطی

واقعہ خاندان میں سب ایسے نہ تھے جو معاصرین الفاظ اور انداز کے مشکل انتخاب کا شکار نہ رہیں۔ ”کوئی مصیبت ایسی نہ تھی جو امام حسینؑ پر روز عاشورہ نہیں گزری۔“ یا ”جس صورت سے اس امر میں (ردوائے میں) اہتمام کیا جائے اور جس طرح کوشش اس میں صرف ہو وہ سب ایک حد تک مقبول ہے۔“ یا ”مصائب اور فضائل کی روایتوں میں زیادہ تحقیق کے درپے نہ ہوں بشرطیکہ وہ خلاف ضروریات مذہب نہ ہو“ مدد ملی انہیں ”کوئی“ ”جس طرح“ ”جس صورت“ ”تحقیق کے درپے نہ ہوں“ میں پوری اور بے رکاوڈ صحت نظر آئی اور پھر اس کے بعد جولانی طبیعت اور وقت تعینت کا روکنا مشکل ہو گیا۔ انہوں نے ذمہ داروں یا صاحب حس لوگوں کی خاموشی سے قح اضلاع بلکہ بے اعتدال ہوتے گئے۔ ان کی چاشنی سامعین کا مذاق خراب کرتی رہی اور گویا یہ بے مہاری واقعہ خانی کی ایک مستند شان ہو گئی۔ قبول المسید امیر علی صاحب حیدرآباد دکن نے ایک خط میں لکھا ہے کہ: ”اثر کے دائرہ کے وسیع ہونے یا نہ ہونے کے گزرنے سے قحے اور کہانیوں کا پیدا ہونا بالبدی ہے کہ وہ بلا شایوں اور لوگوں کے مزاج اور مذاق کے موافق ہو۔ انسان کی اس فطری خواہش کے اثر سے کہ وہ اپنے مخصوص مذہب کے احکام کو اپنے خاص میلان سے دیکھے کسی مذہب کو مغرب نہیں۔“ مذہب کے عام وسیع مفہوم سے قطع نظر کر کے میں اس وقت اپنی قوم کے سب سے دل پسند شکل کا ذکر کر رہا ہوں۔ ایسے لوگ ہیں جو اب بھی ذکر حسینؑ کی مخالفت کو ایک رکی و رشہ سمجھتے ہیں۔ وہ اکثر پیش پا افتادہ اعتراضات کو اپنی تائید سمجھنے لگے ہیں اور اس بھالنے کو بھی کہ ہم خود تمہارے اعتراض کے مفہوم سے دور ہیں اسے اپنی اصلی وجہ عداوت کے جوش میں جھانپنے کے ساتھ سنتے ہیں۔

غلام حسینؑ کے مختصر ضنین کی غرض اس لیے کہ ان کی تمام غرض یہ ہے کہ وہ غیر صریح پہلوؤں سے اس امر میں کامیاب ہوں کہ ذکر حسینؑ نہ کیا جائے۔ ان کی غرض اپنے تمام تنوع، سارے طنز اور کل پہلوؤں سے اسلحہ نہیں ہے بلکہ محو کر دینا ہے۔

غلام حسینؑ کا نشوونما مجھے اس کے علاوہ صرف یہ کہنا ہے کہ اگر صدیوں کے تجربہ نے اب تک یہ ان کے ذہن نشین نہ کیا ہو کہ حسینؑ کے ساتھ جوش عداوت بران کے ساتھ جوش محبت و ہمدردی ہمیشہ غالب رہا تو وہ پھر سمجھیں گے کہ کس طرح باوجود تمام ہی تراش فراش کی مخالفتوں کے ذکر حسینؑ اس جہاز کی طرح جو سخت طوفان کے بعد نسبتاً کمزور تا طم میں خوشامی سے پانی حیرت آمیز سینہ تانے طلاس کی طرح بڑھتا چلا جاتا ہے۔ روز افزوں ترقی پر ہے۔

مصلحین سے ایک لفظ اس جگہ مجھے ان لوگوں سے بھی یہ کہنا ہے جو خواہاں اصلاح ہیں کہ سر کے بل کسی امر کی اصلاح میں جلدی کرنا اس سے زیادہ مضر ہے کہ تباہی اپنی حالت پر چھوڑ دی جائے۔ تباہی اپنی معمولی روش سے شاید اس قدر جلد اپنی خوفناک حد تک نہ پہنچے گی جس قدر اصلاح کی فوری

کوشش رعناوت پیشین سے چڑا کر ایک بے معنی انقلاب پیدا کرے گی اور اس لیے کچھ زمانہ تک تباہی کو گرم رفتار کر دے گی۔ سوچی ہوئی آہستہ قدم مثال، تدریجی اصلاح جس سے لوگ مصلح کے خیالات کے فوگر ہوتے جائیے۔ غالباً مفید ہو۔ کرنا سوچنے سے کہیں زیادہ مشکل ہے۔ بلکہ نظام مذہبی کی موجودہ عملی عدم ترتیب اور مفلسانہ بے انتظامی میں مصلحتوں کے کسی رسوم مذہبی کے پچھے پڑنا مشکل کے خلاف ہوگا۔ جب تک اصلاح شدہ رسم کا نمونہ پیش نہ کیا جائے یا قائم مقام طرز عمل کی آسانیاں مہیا نہ کر دی جائیں۔

اسباب شہادت۔۔ خلاصہ داتھ شہادت اگر مختصر لفظوں میں بکھایا جائے یا اگر تمام کا خلاصہ کسی مختصر عبارت میں سما کر جتم کیا جائے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ ایک بڑی جامعیت

ہیچہ اس امر کی درپے تھی کہ "نبوت اور خلافت ایک خاندان میں نہ ہو"۔ اور دوسری جامعیت کہ کم التعداد شان سے اگر خلافت نہ ملنے پر متانت نہ تھی تو اس پر ہمہ تن کوشاں تھی کہ وہ مذہب کا اصلی وقار قائم رکھے۔ ایک اپنی کوشش میں اس پر آمادہ تھی کہ اپنی مصلحت پر زور دیتی جائے۔ اگرچہ وہ اسلام کے خلاف اور ہانی اسلام کے ساتھ نا احسان شامی کیوں نہ ہو، اور دوسری اس استقلال سے مسلح تھی کہ اپنے قائم شدہ حق سے انکار نہ کرے اور دوسرے غیر متحق کو جائز ذمہ دار دین نہ کہنے میں اگر تمام قابل شمار تکلیفیں بھی گزر جائیں تو وہ حیرت خیز صبر کے ساتھ برداشت کی جائے۔

اس مشکل جزو دم اور کشاکش کا مقصد اپنے کسی داتھ خاندان کے ہاتھوں کچا ہوا دیکھنا جس نے خود کو حق کے اس وجود کو زوال کی کوشش پر کمزور توجہ بھی نہیں کی ہے جس میں طبع کی مشکل شان اور خاموشانہ رفتار خیال کی گرفت اور عمل کی تنقید کرنی ہے۔ اس عظیم الشان داتھ کو ناقد ری اور بے توجہی سے ایسے خیال اور ایسی زبانوں کے حوالہ مکر دینا ہے جو شایان سے بہت پیچھے لگا۔

روش مصلحت اس سے یہ نہ بھنا چاہیے کہ میں یہ چاہتا ہوں کہ بعض مشہور مثالیں اس انداز اور ان اہم مسائل میں بیان کی جائیں جو عام مجالس میں ہر طبقہ کے سامعین کے لیے موزوں نہ ہوں۔ ایسا کرنا

عام توجہ میں انتخاب پیدا کرے گا اور یہ مفید غرض کہ ذکر حسینؑ عام کیا جائے فوٹ ہو جائے گی۔ یہ ہمیشہ یاد رکھنا چاہیے کہ ایسی روش اختیار کرنے والا کسی طرح مقبولیت نہ حاصل کرے گا بلکہ وجہ حسینؑ کو اپنی ناہمانہ رفتار کے جوش میں قصاص پہنچائے گا۔ زمانہ حال کے کشاکش کی تاریخ نے اگر اس غیر مفید عنصر کو داتھ خاندانی کلاسیک جزو قرار دیا تو کوئی مصلحتانہ روش جس کی اب تک مفید تقلید کی گئی ہے عقل کے سایہ سے دور کر کے بے احتیاط جذبات کے تابع کر دی گئی۔ اور دل پسند لفظوں میں بھلاؤں کہ کسی ہی جوش خیز حالت میں حسینؑ کے صبر کی پیروی سب سے اچھی مصلحت ہوگی۔

ذکر حسینؑ کے شایان ہاتھوں میں دینے کا اثر لیکن ہر حال میں بغیر کہ نہیں رہ سکتا کہ اگر ذکر حسینؑ اس سے زیادہ شایان لوگوں کے ہاتھوں

میں رہتا جیسا اب تک رہا تو خطاب ہم اپنی قوم اور افراد کو عطا زیادہ لطیف انجیل، زیادہ حق پسند، زیادہ مستقل اور زیادہ طا اور جا ہوا پاتے۔ ان کے خصائل قوی اور روح مذہب کی دوبارہ نمود اگر ایسے سنوارنے والوں اور رہنماؤں کے زیر ہدایت رہتی جو مناسب تعمیر کے لائق ہوتے تو ہمارا اس سے زیادہ قوی نہ ہوتا جیسا ہم اپنے کوہاتے ہیں عجب خیز ہوتا جس طرح

ہم اس وقت اپنے عین وجود یافتہ ہو جانے کو سب سے بڑا معجزہ سمجھتے ہیں۔

یہ معجزہ صلاور نہیں ہو سکتا تھا اگر شہادت حسینؑ کا ایسا قوی سبب نہ ہوتا۔ شہادت حسینؑ نہیں ہو سکتی تھی اگر وہ شہادت اس قدر عظیم نہ ہوتی، یا کیسے قیاس کی جرأت کی جاسکتی ہے کہ ایسی عظیم الشان قربانی کسی معمولی یا کمزور وجہ کے لیے گوارا کی جاسکتی تھی۔

قربانی کی عظمت، وجہ کی عظمت ہے

لیکن حسینؑ کا مقدس خون اسلام کے مرجعہ بنے ہوئے پھول کے ساتھ یہ کر سکتا تھا کہ اس میں پھر ایسی زندگی کے آثار پیدا ہو جائیں جس سے مناسب آبیاری کے ساتھ گزشتہ حسن کی حریریں داغ ہوئی جائیں اور ایک زمانہ اسے پھر تازگی کا شہاب گھنے لگے۔ لیکن یہ نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ ہر زمانہ میں اس مناسب آبیاری کے ذمہ دار رہا ہو سکتے۔

بلکہ شخص چاہیے تھا جسے حسینؑ کی روح اقدس اپنے سایہ سے ہدایت کرتی رہتی۔ ایسے اشخاص چاہیے تھے جو

کیسے لوگ ذکر حسینؑ کے شایان تھے

مذہب شیعہ کے پیغمبر اور زندہ واراک کے قابل ہوتے۔

فنانہ ہونا حسینؑ نے روک دیا، اور گویا اگر ہمارے پیچھے ایک فولاد کی دیوار بنادی کہ ہم ایڑیوں کے بل نہ ہٹیں تو آگے بڑھنے کے لیے ایک صلت کیا ہوا میدان دکھادی۔ زوال کا رک جانا ترقی نہیں ہے۔ اگرچہ زوال کے رک جانے پر ترقی کی کوشش ممکن ہے۔ دراصل ایک زوال کے رکنے کے قوی اسباب نہ ہونے پر تمام کوششیں زوال کے روکنے کے لیے صرف کی جاتیں، نہ آگے بڑھنے اور ترقی کے لیے، اس کے بعد اس کی ضرورت تھی کہ ہم ایسی قوی رہنمائی کے تابع رکھے جاتے جو میں چلتی، چلتی رہتی اور چلنے کی قابلیتوں سے مسلح کرتی رہتی۔ یہ ایسی مصلحت کا کام نہ تھا جس میں محنت کی کاہنم بھی کیا جاتا، بلکہ وہ شہادت حسینؑ کے اثر کی طرح مسلسل، پائدار اور قوی ہوتی، مغفات قوی کا بننا، یاروہ زوال ہونے کے بعد سنبھلانا معمولی داغ اور ارادے کا کام ہے اور نہ تھوڑی دیر کا مشغلہ، بلکہ یوں کہا جاسکتا ہے کہ اس بڑے کام کی کوئی حد نہیں ہے۔ اور نہ اس ترقی کی ٹھیل کے لیے کوئی زمانہ اس کی انتہا ہے۔

زیر بحث مضمون اس قدر دلچسپ ہے کہ ناظر کو اس میں تھوڑی دیر اور الجھانے رکھنا شاید مقدمہ کا لحاظ کرنے پر بھی غلط مہر نہ ہو۔ خصوصاً جب کہ ہمیں آخر میں اس کے اشارات کی ضرورت ہوگی۔

صفات قومی کے کمال کا اساس نئی عربی کی تعریف بحیثیت قوم کر کے یہ نہیں ہے کہ انہوں نے قوم میں مغفات قوی کو کمال کر دیا، بلکہ ”دین کو کمال کر دیا“

”وہ دین“ جس کی غیر قویں مقرر ہیں کہ اپنے تعجب خیز اخوت پھیلانے اور تسویہ حقوق بین الاقوام اصول کی قوت سے دنیا میں حیرت خیز اثر ڈال گیا، ڈال رہا ہے اور ڈالے گا۔

اسلام اور شارع کے ساتھ غیر مسلم مؤرخین کا طرز عمل

اس جگہ میں عام مؤرخین کا طرز عمل کو جنہیں اسلام کے بچنے میں دھکی ہے اور جنہیں خواہ مخواہ اس مصلحت کا ساتھ نہیں دینا ہے حتیٰ الوسع بے استیلائی سے بھی اسلام اور شارع اسلام کی تعریف نہ کی جائے، اس بار پر توجہ دلاؤں گا کہ محض اصول اسلام اور اس کے شعور سے ہائی اسلام کو بھٹانا کافی ہے۔ جب تک اس میں ذات رسول شامل نہ کی جائے۔ کیسا ہی عمدہ اصول اثر نہیں کیا کرتا، جب تک کہ اس کے بھٹانے اور سنبالنے والی ذات نہیں ہوتی، اور ایسی ذات جو عمدہ اصول کے ساتھ اثر ڈالتی ہے۔ کبھی یہ عالم نہ پیدا کرتی جب تک اس میں خطایاں قابلیتیں نہ ہوتیں۔ محض غیر قوم مؤرخین نے جہاں اس عقیدہ نکتہ سے اعراض کیا ہے وہاں ہر عقیدہ اور عمدہ صورتوں کو اس روشنی میں دیکھا یا دکھایا ہے جس سے نہ جانتے والا بھی تک ہر وہی خیال جو ان کے کسی ہیرو اور قوم کے لیے مایہ ناز ہوتا ہے ہمارے لیے عیب کی جاتی ہیں اور ایسا کہنے کے لیے ظاہر ایماندارانہ احتیاط سے پیشترے بدلے جاتے ہیں وہی اصول جنہیں وہ ہمارے صدیوں کے بعد اختیار کرتے، ان کے لیے عقل اور انصاف کی حد لیکن ہمارے لیے زمانہ محسوس کی گئی تھی کبھی جاتی ہے۔ ہمارے افعال اور ان کے اچھے نتائج میں خواہ مخواہ بڑی غرض تلاش کی جاتی، بلکہ ضرب دی جاتی ہے۔ بعض اوقات ہمارے ساتھ ہمدردی اور ہمیں صلاح دینے کے جوش سے ان کا اس قدر پیٹ پھول جاتا ہے جس سے انہیں آسانی سے سانس لینا دشوار معلوم ہوتا ہے۔ اب یہ دیکھنے والے کا کام ہوگا کہ وہ سناٹے کے بیرونی جسم کی طرح نہ ہوں۔ یاد دہانے کے لیے مذمت کی جاتی ہے کہ ہم اس پر ثابت اور قائم نہ ہو جائیں، یہ باتیں ہم لوگوں کا عقد س فرس فراموشی ہیں کہ ہم دیکھیں کہ ان مختلف اکیسیت اثرات نے ہمیں اصل مرکز سے کس قدر ہٹا دیا ہے۔ لیکن اسلام ہر وقت ان صلاح کاروں اور ایسے ہی ہذر خواہوں کو تعین دلاتا ہے کہ وہ بغیر ان کی صلاح اور مدد و غماہی کی جنگ زرگری کے بھی شستنی ہے۔ اور اس میں صلاح دینے والوں کی شخصیت پہچاننے کی کافی صلاحیت ہے۔ وہ جانتا ہے کہ شہد کی لکھی کا اغلب وہن شیریں ہے لیکن نیش بھی کافی ایذا رساں ہے۔

قوم کرنے کیا

بہر حال نبی عربی نے اگر افراد میں مجموعہ صفات دکھا دیا تو قوم میں صفات قوی کے آثار روشن کر دیے اور یہ سب حیرت خیز خورے وقت میں۔ قحط سے وقت میں

سانچہ بدلنے کا نظام قومی پر مضر اثر

اے زبردست قوی عناصر حادث اور خیال میں جاری و ساری کر دیے جس نے اور بھی عجب غیر اثر ڈالا ہوتا۔ اگر سانچہ بدل نہ گیا ہوتا، اس وقت بھٹانے کا حائل نہ ہوتا۔ جس نے ساخت قومیت سے شستنی کر دیا، امن اور صلح فساد کی ہر جگہ حرکت ہوتی رہتی۔ یہ دونوں باتیں اپنی شوس جسامت اور قوی روحانیت سے اس ہیبت خیز شان اور عملی مہمت سے بڑھتیں جس کے مقابلہ کی نہ کسی کو قوت ہوتی اور نہ ہی اور نہ انصاف اس کے مخالفت کی وجہ ہوتا۔ یہ صورت بہت کچھ نظر انداز کی گئی اور زیادہ تر اس شہل خانہ شان سے بلا لحاظ اعتدال کام نکالنا مفید سمجھا گیا ہے جسے اصول اور ذات دونوں نے منہ دیکر صفات کے ہاتھ سے۔

میں کہہ رہا ہوں کہ رسولؐ نے ”دین کو کامل کر دیا“ اس سے میں یہ سمجھنا چاہتا ہوں کہ قوتِ یحییٰ میں ہے اور مذہبِ یحییٰ کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ اسلام یا نبی عربی کا دین بطاقتِ مذہبِ جوش اور برادرانہ لحاظ اب بھی دیگر اقوام میں ممتاز ہے۔ اب اس کے بعد پھر سوال کرنا چاہتا ہوں کہ آخر رسولؐ نے اس کی کیا کوشش کی کہ قوم میں صفاتِ قوی کو کامل کر دیتے۔ دراصل یہ معلوم ہے کہ صفاتِ قوی کی تعمیر ایک دن کا کام نہیں ہے۔ لازمی کا ایسا حکم یعنی مصلحِ زمانہ حال کے اس خیال کے موافق معلوم ہوا ہے کہ ”قومیت تبلیغِ نمو ہے تبلیغِ منعت گری نہیں ہے“۔ رسولؐ نے کوئی کوشش اس کے پیشگی کے لیے کی یا نہیں یا محض اپنے زمانہ کی ترقی اور کوشش پر قناعت کر لی؟

سوال کا جواب **مسلمہ حدیث کے عدد میں** یہ کہنا بہت کافی ہو گا کہ ”اشاعرہ نقیبا“ کا یہ صاف مطلب تھا کہ رسولؐ نے اپنے بعد

خاص قوی کی تعمیر کے لیے کچھ لوگ یکے بعد دیگرے مقرر فرمائے تھے حقیقتاً ”نقیب“ کا تہا لفظ بھانے کے لیے کافی نہیں ہے۔ بلکہ مفہوم زیادہ تر ”اشاعرہ“ کی تعداد میں ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ عدد ایک زمانہ کے لیے کافی ہے۔ یعنی اس عدد کے نقبا کے وجود کا بغیر ایک وسیع زمانہ کے جس میں یہ لوگ قناعت کرتے رہتے۔ خیال کرنا خالی از حقل ہے۔

انہ کی دو صورتیں ان کا کیا کام ہوتا؟ بعض کے نزدیک: ”امام کو صاحبِ اخلاق حمیدہ، اپنی زندگی میں ناقابلِ اعتراض یا افضل الناس ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ جب کہ وہ مختار، بالغ، کچھ دار اور خلافت کے معمولی انصرام کار کی قابلیت رکھتا ہے۔ وہ خلافت کا شایان ہے۔“ دوسرے کے نزدیک: ”امام کو اولادِ رسولؐ ہونے کے علاوہ چند معنوں سے شمع ہونا چاہیے۔ وہ معصوم ہو، اس کے علوات و اطوار اعلیٰ ترین ہوں اور سچائی میں سب سے ممتاز ہو۔“

پہلی نوعیت کے امام کی تعریف کا جائزہ بغیر اس کے کہ ان دونوں فقرات اور دعوے کا تنقیدی جائزہ لیا جائے ظاہری نگاہ میں بھی پہلا کسی مذہب کا امام نہیں سمجھا جاسکتا بلکہ اگر کوئی بے حد مصر ہو تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ ایسے مذہب کا امام جس نے اخلاق کو طلاق دے دیا ہو، حقیقت تو یہ ہے کہ یہ تعریف ایک شخصی خود مختار اور مطلق العنان بادشاہ کی ہے۔ جو یہ بھی اپنی شان کے خلاف سمجھتا ہے کہ وہ اصولِ اخلاق کا پابند رہے۔

ہم نے مانا کہ ضرور نہیں کہ وہ وہ علوات و اطوار میں عالمہ ناس سے کم ہو۔ لیکن یہ تعریف ایسے امام کی روحانی اطاعت سے ظہراً ایک طبعی انقلاب پیدا کرتی ہے۔ جب تک اطاعت کرانے کے کچھ اور ذرائع نہ ہوں۔ طبیعت پر کیا ظہری دباؤ ایسے شخص کا ہو سکتا ہے جس کے خاصائص اخلاقی نہ مستند ہیں نہ جن کی تعمیر آئندہ کے لیے کوئی چھوٹا سادہ دعویٰ ہے۔ بلکہ دوسرے پہلو سے یہ سوچنے کی کافی آزادی ہے کہ امام کو اپنے اس منصب کے وسیع ذرائع سے بمقابلہ عالمہ ناس حدودِ اخلاقی پر پوری اور بے پرش دستبرد کا اختیار ہے۔ اس کی مثالیں اموی اور عباسی دور میں کافی سے زیادہ ملتی ہیں اور ایسی تعریف گھڑنے والوں میں شاہزادی، جام شراب، اور کثیر انعام کی امید اور شاعرانہ غلو پیدا کر دیتی ہے۔ سوچنے والا سوچ سکتا ہے کہ کیا کسی نبی اور قوم گر کی امت کے دلی امر ایسے ہی ہوتے ہیں؟

دوسرا مضر پہلو

اختلافِ فقہیت کا دوسرا مضر پہلو یہ تھا کہ اہل رسالت کا جامہ اور مستندِ تقدس اگر امامت کا عنوان گیر ہوتا تو کسی کو عذر کی گنجائش نہ ہوتی، بلکہ ایک قومی مرکز اور تربیتِ خصال کے لیے ایک زبردست سانچہ ہوتا اور نہ کبھی شبہ کیا جاسکتا نہ ضرورت ہوتی کہ سانچہ بدل گیا۔ گزشتہ میلانِ طبعی کی تاریخِ بصیانت نہ کرتی اور کسی ہی خاموشی سے دل یہ سوال نہ کرتا کہ تم کون ہو جس کی روحانی اطاعت کو ہم اپنے ذمہ واجب کر لیں۔ تم کون ہو جسے ہم مسائلِ ناگینِ اہل میں اپنا بیخِ قرار دیں اور تم کس خصوصیت کے حاملے رسول کے بعد فقہیت کا حق رکھتے ہو؟

تیسرا مضر پہلو

تیسرا مضر پہلو یہ تھا کہ اگر خلیفہ اور امام ایک شخص تھا اور وہ اپنی رحلت کے وقت کسی کو امام بنا سکتا تھا یا لوگ اسے پسند اور مقرر کرتے تھے تو اس سے نائب کو نہ اپنے امامِ پیشین کے مصالح ملت معلوم تھے اور نہ اسے مصالحِ ملک و ملت و دعوت کی جاتی تھی۔ اس سے نہ صرف مصلحت کا سلسلہ شکست ہو جاتا تھا بلکہ مرتے ہوئے امام کو خود اس نوعی طریقہ نے اس نہایت مفید نکتہ کی طرف سے لاپرواہ کر رکھا تھا کہ وہ آئندہ کسی کو اس بڑے منصب کے لیے تیار کرے۔ عالمہ ناس کو سنتے چنے ہوئے امام کی طرف سے نہ یہ اطمینان تھا کہ وہ گزشتہ امام کے زیر تربیت رہا ہے اور نہ انھیں یہ اطمینان تھا کہ وہ اس منصب کی خدمت میں نمونہ ان کے تسکین کر لینے کے لائق کر چکا ہے، بلکہ ظراً انھیں ایک زمانہ تک تردد اور شک لاحق رہتا ہوگا۔ حق تو یہ ہے کہ یہ اصولِ انتخاب بجائے نبوت یا امامت روحانی کی تاریخ کے قطعاً شاہی تاریخ کا ایک ورق ہے۔

چوتھا مضر پہلو

اختلاف کا چوتھا مضر پہلو یہ تھا کہ ایک امام کے زمانہ سے دوسرے امام کے زمانہ تک خشکی ہے۔ یعنی امام کی پسند میں ایک امام سے دوسرے امام تک ایسی صلتِ جست کی گئی ہے کہ اگرچہ درمیان میں اکثر لوگ بڑے شد و مد سے حکومت کر چکے لیکن وہ امام نہیں بچے گئے۔ یعنی بہت سا زمانہ بغیر کسی نقیب کے گزرا اور آئندہ اشاعت کی تعداد بھی ابھی پوری نہ ہوئی تھی اور اس طرح اس عدد کا مفید استمرار اور سلسلہ درمیانی بے اثری سے نقصان اٹھاتا تھا۔ سب سے طویل جست کی موٹی مثال عمر بن عبدالعزیز سے خاندانِ بنی عباس تک چلی گئی ہے۔

پانچواں مضر پہلو

اختلاف کا پانچواں مضر پہلو یہ ہے کہ اس حیثیت کی امامت قبول کرنے والے خود اپنے طبقہ میں تجوزِ نقب میں اختلاف کرتے ہیں۔

چھٹا مضر پہلو

چھٹا مضر نتیجہ یہ ہے کہ عالمہ مسلمین مسئلہ ”نقیب“ اور ”فقہیت“ کو مختلف فہم جانتے ہیں۔ اور حقیقتاً بھی مسلمانوں کی ہر طرح کی تباہی کی اصل ہوا تھا اور اب بھی ہے۔ اس اختلاف کے شور نے اور بہت سے ضمنی ککڑے کیے جو آخر میں زمانہ کے ساتھ علیحدگی میں ممتاز ہوتے گئے۔ یہ ایک خوفناک تلوار تھی جو اسلام کے فولادی جسم پر اپنی برش آ رہی تھی۔

مسئلہ امامت کے اختلاف کا اثر

اکثر لوگ مسئلہ امامت کے اختلاف کو ہلکے دل سے غلط اور موزین کا اختلاف کہہ کر خاموش ہو جاتے ہیں۔ اگر ایسا ہی ہوتا تو شاید مجھے بصیانت ہونے کی ضرورت نہ تھی۔ کاش ان اختلافات کا ایسا ہی ہلکا اثر ہوتا۔ لیکن افسوس یہی مسلمانوں کے اختلاف کی جڑ ہے۔ کسی قوم کے پڑے لکھے افراد عالمہ ناس کی عقل، آنکھیں اور زبان ہیں۔ ان کے اختلافات

نسبتہ ان کے قوی اور مہذب دل و زبان سے منظر ہوتے ہوئے جب عامہ ناس کے دل و زبان تک پہنچتے ہیں تو وقت صبر اور تہذیب کی کمی کی وجہ سے ایک عام جھلک کے باعث ہوتے ہیں۔

علماء اور عامہ ناس کا اہم ترین فرض بلوجود اصولی اختلاف کے بھی اختلاف کرنے والے علماء کا اسلامی فرض ہوگا کہ عامہ ناس کے ایسے کسی مندرجہ بالا کی کام کرائی کیے رہیں اور عامہ ناس کا فرض ہوگا کہ دنگل دیکھنے والے علماء سے ان کی مقبولیت سلب کر لیں۔ اختلاف کے کبھی یہ معنی نہ ہونے چاہئیں کہ اہل اسلام پر جڑی اصولی اختلافات سے کوئی قوی اختلاف کا شبہ کرے یا جس سے ہم قدر مشترک کو اس قدر بھول جائیں کہ معاشرتی یک جہتیوں میں کوئی فرق پایا جاسکے۔

ایک سچی بات ہم سب بلاور اسلام کی گود کے پالے ہیں۔ یہی وہ مندرجہ بالا چاہیے اور ہے جو اختلاف کا بھوت بھاگ دیتا ہے۔ ہم لوگ پہلے مسلمان ہیں اس کے بعد شیعہ سنی اور اہل حدیث وغیرہ ہیں۔ واقعات جو گزر گئے وہ نہ شیعہ تھے نہ سنی تھے نہ اہل حدیث بلکہ زمانہ کی ایک سانس تھی جس سے تاریخ ملامت ہوئی۔ مصلحتیں جو اس کی موہد تھیں فنا ہو گئیں۔ معیار اسلامی ہمیشہ باقی رہے گا۔ اب ہمیں تاریخی تجربہ اخلاقی فوائد اور اسلامی اصول کی روشنی میں دیکھنا ہوگا۔

اختلاف کی بے قناعتی گزشتہ سطروں کا اختلاف اگرچہ اسلام کے لیے ہر طرح کے پر مضرت سامانوں سے مسلح تحالین پر بھی کہا جاسکتا تھا کہ یہ یا تو کتابوں کے خاموش اور رازدار سینوں یا لوگوں کے دماغ میں دفن ہے لیکن یہ ہمیں تک نہ رہا، بلکہ اس نے یہ بھی اپنی بے قناعتی کی روش کے شایان بھا کہ ایک ظاہری شکل بھی اختیار کرتا اور خانہ کعبہ ماقی لباس سے اپنے آسپوش کو مصلوں میں تقسیم کیا ہوا دیکھتا رہتا۔ وہ جگہ جو خدائے واحد کی عبادت کے لیے مرکز قرار دی گئی تھی، جہاں مسلمان بلا لحاظ ظہری تقسیم قومیت، نوعیت انسانی، زبان، مراسم اور عادات ایک جگہ جمع ہو کر توحید کا خوشگوار گھونٹ پیتے اور اسلام کی یکساں عمومیت اور علولانہ پر لطف سایہ کی کیفیت کو اپنی یلو میں ہمیشہ قائم رکھتے، وہاں اب اپنی تمام مشقتوں کے برداشت کے بعد اپنے کو اس عبرت خیز نظارہ سے بھی باز نہیں رکھ سکتے۔

قوم گر اس اختلاف کو کیونکر دیکھتا ذرا سوچو اس حالت کو کہ گیارہویں صدی سے دنیا میں بھیجے گئے ہیں اور وہ نہ صرف اسلام کو ٹھٹھکتی فرقوں میں تقسیم کیا ہوا بلکہ خود کعبہ اور طریقہ عبادت کو بھی ٹکڑے ٹکڑے دیکھتے ہیں۔ اس وقت آنحضرت (ﷺ) مکہ کی وہ پہاڑیاں یلو کرتے ہیں جس پر بیعت لے رہے تھے، دامن کوہ اور گھاٹیوں میں آدمیوں کی زندہ ندی بہہ رہی تھی اور یٰذٰلِکُلُوْنِ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ اَقْوَامًا (۲: ۱۸۰) کی پیشین گوئی پوری ہو رہی تھی۔ اسی چوٹی سے اب خانہ کعبہ کی گود کے مصلے دکھائی دیتے تھے رسول یلو کرتے ہیں کہ ہم نے وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا وَلَا تَفَرَّقُوْا (۳: ۱۰۳) بھی کہا تھا اور اسی وقت انھیں ان فرقوں کی فہرست سنائی جاتی ہے جو ان کے بعد سے آج تک مرتب ہوتی ہے۔

وجہ نہ تھی پورے مورخین کو وہ کچھ سوچنے اور صلاح دینے کی جس سلسلہ خیال کو انھوں نے اپنی تحریروں میں ظاہر کرنا

مناسب سمجھا ہے۔ اگر ایسی ظاہری صورتوں نے ان کے آمادہ کرنے میں مدد نہ کی ہوتی، ان کے سیاسی رموز میں ڈوبی ہوتی تحریر کو مسلمان بغیر ان کے شائع اور انکاس کو قبول کیے جاتے بھی اس طرح پڑھ سکتے ہیں کہ اپنی واقعی مضمراتوں کی اصلاح کریں۔

دوسری نوعیت کے ائمہ امامتِ مسلمین کا بھی ایک زبّ نہ تھا جس کا متذکرہ صدر سطروں میں اشارہ کیا گیا، بلکہ اس کے علاوہ بھی تھا جسے اجماع یا مصلح کی ان روش سے کوئی تعلق نہ تھا، جن پر چلنا اور چلانا مذکورہ حیثیت کے ائمہ کے موافق تھا۔ یہ دوسرا سلسلہ علیؑ اور اولادِ رسولؐ کا تھا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اگر پہلا گروہ ائمہ ان کی امامت بے مضرت اور بے اعتراض ہوتی اختیارات اور عامہ ناس پر اس طرح قابض نہ ہو جاتا جو ایک واقعہ تاریخی ہے تو موخر الذکر گروہ ائمہ امتِ رسولؐ کا بے مضرت اور بے اعتراض قائم مقام ہوتا، اس لیے کہ ذیل کی باتیں نہ ہوتیں۔

مضرباتوں کی مثالیں عرب کی ایسی عوامانہ زر قوم جب یہ دیکھتی تھی کہ ایک ہر حیثیت سے بے حق شخص ایک دوسرے حیثیت سے حق دار شخص کے مقابلہ میں رسولؐ کا قائم مقام بن جاسکتا ہے اور اس طرح اختیارات اور حکومت پر قابض ہوتا ہے تو وہ اور اس کے افراد کیوں نہ محض اختیارات اور حکومت کا حوصلہ کریں۔ دراصل انہیں رسولؐ کی قائم مقامی کی نہ صرف قابلیت یا عدم قابلیت کی بحث رسولؐ کی تجیز و تحفین کے ہم وقت متعین بنی سادہ کے مشہور جلسہ میں چاہی پیدا کرنے کی کمی قدر ممتاز قابلیت سے اٹھادی گئی تھی۔ بلکہ آئندہ ایسے ہی سوال پیدا ہونے کو قد ولایت علیکم ولست بنفید حکم کہہ کر انگساری سے روک دیا تھا۔ کیوں نہ یہ حالت اور یہ فقرہ ایسے ہی حوصلہ کرنے والوں کے لیے سند ہوتا۔ لیکن بلاشبہ خلافتِ رسولؐ کے قدس کے لیے یہ مہلک ضرب تھی۔

خصائل کا تغیر نہ صرف اختیارات کے حاصل کرنے کا موقع اور انداز اور مسئلہِ افضلیت کا درمیان سے اٹھا دیا جانا بلکہ اس کے بعد اختیار حاصل کرنے والوں کا اپنے کو اپنی جگہ مضبوط اور قائم کرنے کے لیے خالص ملکی ذرائع استعمال کرنا اور دلوں کو امیدیں دلانا بے لگام حوصلوں کی آگ کو اسی طرح بھڑکانا تھا جس سے لوگ نہ صرف اپنے گزشتہ تغیرِ خصائل کے اعتبار سے پست ہوتے جاتے، بلکہ آئندہ اس نئے قسم کی تعمیر کے خواہر ہوتے جاتے، جو اپنی ساخت کے اعتبار سے کیسا ہی کچھ کیوں نہ ہو، لیکن رسولؐ کی تعمیر سے بہت کچھ الگ تھا۔ بہت درست کہا ہے کسی نے کہ ”جیسا خدا ہو گا ویسے ہی اس کے پرورش کرنے والے ہوں گے“۔ یا ”مجھے آدمی دکھا دو میں ان کے اصول بتا دوں گا“۔ آدمی اس چیمیز کی اخلاقی طینت کے مشابہ ہوتا جاتا ہے جس کی اس کے دل میں وقت ہے۔ یا جس کی کسی طرح پسروی کرتا ہے۔ یہ اس کی طبیعت پر عمل کرتی رہتی ہے اور وقت کرنے والا اپنے کو اس کے مثل بنانے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ اس کے عنایات کا نظارہ رہتا ہے اور اس کے ابرادوں کی مواخت کرتا جاتا ہے۔

مدگاروں کی حرکتوں سے چشم پوشی یہ صورتیں اس کی بھی مقتضی تھیں کہ اپنے مدگاروں کی علمہ ناس پر مضر اثر ڈالنے والی کارروائیوں پر باز پرس نہ کی جاتی۔ جس سے اپنے دائرہ کے لوگ امت پر کسی قدر مطلق العنانی سے دستبرد کا موقع پاتے اور اس دستبرد سے زیادہ نقصان رساں اثر اس کی اس طرح کی حفاظت کا تھا کہ ”وہ نکوار نیام میں نہیں رکھی جاسکتی جسے خدا نے کھینچا ہو“۔ یا کسی حد کے روندنے والے کو ”سیفِ خدا“ کا ایسا مقدس خطاب دے دیا جائے۔

الجھے رکھنے کے ذرائع امیدیں دلانے کا اقتضایہ تھا کہ وہ لوگ جنہیں امیدیں دلائی تھیں امید کے شایان کسی ایسے کام میں الجھے رہتے جو دونوں کے لیے مفید ثابت ہو۔ الجھنے کے ذرائع چاہیے تھے، ذرائع پیدا کیے گئے۔

پہلی نوعیت کے ائمہ دوسری نوعیت کے ائمہ کے مؤیدین حقوق کے ساتھ اور سب سے پہلے اس وضع کے

نقیب نے رسول کی امت کے خون کو اپنے اوپر جاز کر کے اپنی اس قوت کے اجتہاد کا اثر آئندہ ہر زمانہ میں جاری کر دیا۔ یہ سختی اس لیے جاز بھی گئی کہ کچھ لوگوں نے رسول کا نقیب بگھنے اور بیت المال کو ہار و حق بنانے میں دھجکی سے انکار کیا تھا۔ دھری کا فرمانی تھی۔ ایک تو یہ کہ ان کا انکار کرنا ایسے نقیب کے اختیار کی نفی تھی، دوسرے ایسے حوصلوں کے قاضی اہمیات کی زیارت بغیر وہ لوگ جو دار الحکومت میں امیدوں سے ٹھنڈے کیے گئے تھے۔ گرفت کے باہر ہو جاتے۔ خشک امید قناعت کا اچھا نسخہ نہ تھا۔ اور تیسری ایک سخت ناگوار بات تھی، وہ یہ کہ ان انکار کرنے والوں کے نزدیک رسول کا نقیب دوسرا تھا۔ اور ایک تیسرا مسئلہ پیش کر رہا تھا کہ اگر تم ہو سکتے ہو اور حق دار گردہ نہیں ہو سکتا تو ہم کیوں نہ ہوں، حالت نازک تھی۔ کیونکہ یہ ابتداء میں جڑ ہمارے تھے۔ صاحب اختیار گردہ کے لیے ان کی کوئی کوشش وہ حق دار کے لیے ہو یا اپنے لیے دونوں طرح مضر تھی۔ فوجیں سخت احکام اور ہدایتوں کے ساتھ روانہ کی گئیں۔ ملانے کی کوششیں کی گئیں۔ آخر میں ٹھنڈا فواد گرمیوں کے سرد کرنے کے لیے کام میں لایا گیا۔ اور یہ سختی تھی ان کارروائیوں کی کہ اگرچہ انکار کرنے والوں کا ایک افسر جان بچانے کی مصلحت سے ساتھ ہو گیا مگر مل جانا اس خوفناک یادداشت کو دماغ سے نکال سکا۔ اور نہ ٹھنڈی سانس روک سکا۔

غلط اندازی یا اچھے فقرات کا برا مصروف نقیب کے سپاہیوں نے عہد کے بعد ایفا کے وقت حیرت خیز تاویل کی، اور یہ کارروائیاں یا تو ”خدا نے سینہ کھول دیا“ اور یا ”صلاح دین“ کے قدس میں ڈوبنے ہوئے فخریوں میں ظہور کرتی تھیں۔

اختیار بخش جلسہ کی مضرتیں وہ یک طرفہ جلسہ جو پہلے گردہ ائمہ کے لیے اختیار بخش ثابت ہوا اور جس کے باضابطہ ثابت کرنے میں کافی عرق ریزی کی گئی ہے اصول انتخاب کے لحاظ سے قابل تعریف ہو یا نہ ہو لیکن اس سے انکار نہ کیا جاسکے گا کہ انصار کو اوس و فزرج میں تقسیم کرنے اور پرانی کشید گئیں بلکہ عرب کے طینت کے برے عناصر کے زندہ کرنے کا بہترین ثبوت تھا جس کے دہانے اور اصلاح میں

بانی قوم نے بہت سی رحمتیں گوارا فرمائی تھیں۔ بنی اُمیہ کا پرانا مقتدر گروہ اور بنی ہاشم کے ایک دن پہلے حاکم جماعت اس لا معلوم اور گویا پردہ نشین جلسہ کی کارروائیوں سے ناموافق تھی اور اسی طرح اس کے بھی بین ثبوت ہیں کہ مقتدر افراد مہاجرین بھی دوبارہ انتخاب چاہتے تھے جس سے گزشتہ انتخاب پر عکس پڑتا تھا۔ خود یہ انصافانہ خواہش نہ صاحب اختیار گروہ نے قبول کی اور نہ یہ عام ملکی چالوں کے اس کا مسلمانوں کی عام خواہش کے موافق فیصلہ کیا۔ اس سے میں یہ سمجھتا چاہتا ہوں کہ بعض کی اس پر غیل خواہش اور اس خواہش کے جلودار اعمال نے جس کی نیت کے حسن اور فحش سے اس وقت بحث نہیں ہے، یہ افسوس ناک نتیجہ پیدا کیا کہ وہ بڑے بڑے قوی گروہ خیالات میں متحرق ہو گئے جو ایک دن پہلے ایک تھے۔ بعض کو بعض سے شکایتیں پیدا ہو گئیں۔ ایثار، ہمدردی، اور یک جہتی غرض معدوم ہو گئی۔ کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ اس جلسہ کے لوگوں نے رسول کو تو دفن نہ کیا لیکن ان صفات کو دفن کرنے میں بہت جلدی کی جو انھوں نے قوم میں پیدا اور زندہ کی تھیں۔ یقیناً اس نقصان کے اندازہ کرنے میں مبالغہ ممکن نہیں ہے۔

قومی عناصر کی فنا

نقیب کے اس اصول کی مخالفت میں خاندان امیہ کے مشہور ترین شخص کا یہ فقرہ ہمیشہ کے لیے یادگار رہا جو تاریخ کے رازدار سینوں میں محفوظ ہے کہ: ”اگر تم کہو تو مدینہ کو سوار اور پیلاؤں سے بھر دوں۔“

زبردست مخالف کی خریداری اور اس کا آئندہ اثر خود غرضانہ ہوش مندی سے اس کا علاج کیا گیا، اور اس مخالفت اختیار کیے

دو لڑکے یکے بعد دیگرے شام کے ایسے زر خیز ملک اور فوجی اور ملکی افسری کے ایسے بڑے عہدوں پر بحال کیے گئے۔ اس سے یہ بڑا حوصلہ گروہ اگرچہ ایک زمانہ کے لیے قانع اور خاموش ہو گیا۔ لیکن شام بنی اُمیہ کی آبدی کا مرکز اور قلعہ ہو گیا۔ اسی جگہ سے اس منتقم گروہ کی بنیاد مضبوط ہونے لگی۔ مجھے اس سے اس وقت بحث نہیں ہے کہ ایسے قسم کھانے ہوئے دشمنان آکل ہاشم کو حیات کر قوی کرنا کہاں تک نیت اور غرض پر شبہ وارد کر سکتا ہے۔ لیکن اسلام کی تاریخ نے جلی حروف سے لکھا ہے کہ اختیار سپرد کرنے کی اس تجویز نے وہ دانستہ ہویا نادانستہ؟ اپنی دانستہ میں خاندان رسالت کا نام مٹا ہی دیا۔ اور مٹانا کہتے ہیں۔ اگر حرمہ بن کاہل اسدی کے تیر اور چھ مہینہ کے بچے کے خون آلود گلوٹے نازنین کی شرح اس کے علاوہ کچھ اور نہیں ہے۔ بنی ہاشم سے اختیار لے لینا جس کی ابتدا عقی بنی ہاشم پر اسی مصیبت کی پیروی سے اختیار صرف کرنا اس کی انتہا تھی۔

آئندہ زوال کے اسباب کے ذمہ دار پہلی نوعیت کے نقیبات تھے بعض اوقات چھوٹے اسباب بھی بڑے نتائج پیدا کرتے ہیں،

چہ جائے کہ ایسے اسباب جو ابتداء ہی میں بڑی مخالفت کے عناصر سے پر ہوں۔ اس طرح کی حکومتیں جب فتوحات سے دم لیتی تھیں تو اندرون میں عناصر تفرقہ اپنا اثر دکھاتے تھے۔ فوجی جوش، گھر کی ناموافقتیں، حسد، نا تربیت یافتہ حوصلہ، عدم ہمدردی، کمی ایثار، یک جہتی، غرض کی فراموشی کسی اعلیٰ فرض کے زندہ احساس کی کمی اور اس کی طرف سے صاحب اختیار نقیبات کی سرد توجہ بلکہ تجاہل، روحانی مرکز کی بگڑی ہوئی ابتداء اور اس کی طرف سے پیدا کی ہوئی خیالات کی پاشانی، موجودہ نقیب کا

روحانیت کی طرف سے طبی استحضات، انہیں بے کاری میں مشغول بتائی تھی اور وہ دیکھتے تھے کہ ہمارے وہ دشمن جن کو ہم نے اپنی تلواروں سے مرعوب کر لیا، اس اندرونی دشمن کے مقابلہ میں بے حقیقت تھے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ انہیں اپنی اندرونی سخت مخالفتیں اور اس کا پر مضرت اثر ایک زمانہ تک پر مضرت اثر ہی نہ معلوم ہوا۔ اس کے صحیح گرفت کی کمی یا گرفت کے بعد اس کے روکنے کے ذرائع کی کمی قوموں کے زوال کا باعث ہوتی ہیں۔ انہیں اس کے پر مضرت اثر کا احساس کیونکر ہوتا۔ اس لیے کہ وہ تو ان اشغال میں نلکھوت تھے جو انہیں بتائے گئے تھے۔ مسئلہ نقابت سے انہیں اس کے بچنے میں کوئی مدد نہ ملی تھی بلکہ جہاں میں پرورش ہمارے تھے۔

تنگ مصلحتی کی مثالیں جو اخوت اور مساوات کے منافی تھیں ایک وقت تھا کہ ابتدا میں بعض لوگ حکومت پر قابض ہو کر مصالح ملک و ملت کو آپس میں محدود رکھ کر عامہ ناس کو جاہل اور عدم ہمدرد رکھتے تھے۔ پھر یہ نمونہ اسٹیلین عرب کے مقابلہ میں غیر عرب مسلمانوں کو تو یہ حقوق کا دعویٰ نہیں کر سکتے۔ وہ ملکی امور میں ہوں یا مذہبی، اور پھر یہ ترقی تھی کہ بنی امیہ بجائے عام ہمدردی کے صرف بنی امیہ کے ساتھ ہمدردی کرنا، اور اختیارات کا آپس میں رکھنا اسلام کے شایان سمجھتے تھے۔ کون کہتا کہ یہ ترکیبیں قوم گر کی عالمگیر اسلامی مساوات، اخوت، اور معاشرت کا خون ہے۔ کس کے پاس ایک سے زیادہ زبان تھی کہ وہ کسی ایک کے کٹ جانے پر اس کا غم نہ کرتا، اور دوسری سے کام لیتا۔ کس کی آواز اس قدر بلند اور قوی تھی جو یہ سناتا کہ تم ایک عظیم الشان ساخت قومیت کو منہدم کر رہے ہو۔ مگر یہ کہ حسین مظلوم کے گلوئے بیدہ کی خون آلود رنگین نقابت کرتیں۔

مصلحت کی ابتداء اس کے سمجھنے میں ہارج تھی گزشتہ اشاروں کے اعتبار سے یہ ظاہر ہوا کہ جب نقیب کی ضرورتیں اسے بعض

مصلحت کے ایلام پر آمادہ کرتی تھیں تو اگرچہ وہ ابتداء چھوٹی معلوم ہوتی ہوں اور اس وجہ سے عملی تجربہ لوگوں کو نہ ہونے کی وجہ سے باز پرس نہ بھی کی جاتی ہو لیکن جس وقت کچھ ہی دن کے بعد مبالغہ کیا جاتا تھا اور جب لوگ اسے سمجھتے تھے تو اگرچہ وہ مخالفت کرنے کی قوت نہ بھی پاتے ہوں تاہم ذمہ داران نقابت اور ان کے جلو داروں سے مخالفت اور بددلی کا سرمایہ مستقل اور زیادہ ہوتا جاتا تھا۔ بہ استثناء ان لوگوں کے جن کے لیے ایسی کارروائیاں زر خیز ثابت ہوتی ہوں۔

بڑی بڑی تاریخی شہادتوں میں سے اگر کوئی مثال طلب کی جائے تو شاید یہ فقرہ جو ایک ذمہ دار نقیب کے لیے ایک اسی کی جماعت کے نزدیک قابل اعتبار زبان سے ادا ہوا تھا کافی ہوگا کہ: ”ابھی رسول کا کھن پرانا نہیں ہوا لیکن ان کی سنت پرانی ہو گئی۔“ اس جملہ کی واقعیت اور اثر کو ہر ٹھکانا مسلمان جانتا ہے۔

یہ تاریخی مثالیں ممکن ہیں کہ کسی کے نزدیک اب بھی قابل اعتبار نہ ہوں جیسے زمانہ گزشتہ میں نہ ہوں لیکن اسے سوچنا ہوگا کہ بڑی لہریں لینے والے دریا کا سواہ اپنی جگہ ایسا ہوتا ہے جیسے کسی نا کج کھیلنے والے بچے کا ٹیٹا کا گھروندا ابتداء روک سکتا ہے۔ لیکن آخر میں بھی جب دریا ہوتا ہے تو سلطنتوں کے انجینئرس اس کے پرچانے اور تابع کرنے کی اپنے میں قابلیت نہیں دیکھتے۔ مضرت کا درجہ تمیز اس سے ہوگا کہ قابل اعتراض حالتیں صاحب اثر اور صاحب اختیار لوگوں سے

سرزد ہوتی تھیں۔ مصلحتیں یا تواضعیں کی ایجاد کردہ قصیں یا ان کے انداز اور برتنوں سے ان کی پیروی کرنے والوں میں وہ حرک ہو تا تھا جو مفید پہلو اور نتیجہ سے محروم تھا۔

چھوٹی باتوں کا بڑا نتیجہ بڑوں کی باتیں مثالیں ہوتی ہیں۔ اسی طرح ایک زمانہ آتا ہے جس میں قوم کے بڑے اور چھوٹے دونوں میں سے کسی کا کوئی محافظ اخلاق اور قومیت نہیں ہوتا۔ کیونکہ ایک مسلسل پر مضرت اثر اور اس کے بعد اس کی علوت انھیں ان کے جاتے قوی کی صفات سے خالی کر دیتی ہے۔ میں ڈارون کی ذہانت کا اس قدر معترف نہیں ہوں جس قدر اس کے مکس میں آدمی اور قوم کے رخ ہو جانے کا قائل ہوں۔ ہم ڈارون کی تیوری کی کڑیاں کیوں صراوٹ میں ڈھونڈتے پھرے، جب کہ اس سے بدرجہا اچھا کام سامنے ہے کہ آدمی آدمی رکھا جائے اور جانور نہ ہونے دیا جائے۔

دوسرے گروہ ائمہ کا امت رسول پر حاکم ہونا قطعاً بے مضرت ہوتا، متذکرہ صدر اصولی غلطیاں نہ ہوتیں، اس لیے کہ ان غلطیوں کا پیدا ہونا اول الذکر اصول امانت سے تھا جو نہ صرف ہادی الخطر میں بے اصول بلکہ آئندہ بے اصولیوں کے ایجاد کا محرک تھا۔

انہدام اساس اصولی غلطیاں کل دھماکے کے شکست پر گنتی ہوتی ہیں۔ اگرچہ فروعات کی ترتیب کیسی ہی دور بینی اور اعتدال سے کیوں نہ کی گئی ہوں۔ اس اصول سے ملکی معاشرتی اور اخلاقی اعتبار فنا ہو گیا اور اس کے گرد و پیش کے اتفاقات نے مل جل کر نہ اس کے بھانے میں کوئی کسر اٹھا رکھی اور نہ حالات کے پوست کندہ ہونے پر بندہ غرض کے علاوہ کسی بے تعلق شخص کے لیے کوئی دکھائی باقی رہ گئی۔ انھیں پیدا ہوئیں۔ یہ واقعہ ہے نہ ان کو موقع بنی اور بازی جیتنے کے لیے غلات معمول کو کششوں کی ضرورت ہوتی اور نہ انھیں پیدا ہوئیں۔ انھوں نے میرا مطلب وہ طبعی انقلاب ہے جس نے رسول کے تعلیمی اثر اور مقدس ذات کو بھلا کر قطعاً تی روش پر لوگوں کے خیال کو لٹا دیا۔ اور تی روش نے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے وہ کششیں ضروری تھیں جن سے نفس اسلام کے ساتھ مضراثر کیا اور چونکہ یہ کششیں جاتے قومیت کے اغراض سے خالی تھیں، جب تی تعلیم اور روش نے اپنا فخر بتایا تو اسلامی یک جہتی جواب تک ان کی مدد کرتی آتی تھی بہت کچھ کمزور ہو گئی، اور نتیجہ یہ ہوا کہ اس روش کے نقاب خود اسی جاں میں الجھ گئے جو ان کے ہتھکڑیوں نے بچایا تھا اور ابتداء میں اس نے اختیار اور حکومت پر قابض کر لیا تھا۔ تحت ہلا، اور بیٹھ گیا۔ وہ قوم اب نہ تھی جس کی لاعلمی ہائے سلجھائی تھی۔ اب نہ قوم تھی اور نہ تحت۔

نفع اور نقصان کا موازنہ یقیناً میں مبالغہ نہیں کرتا اگر یہ کہتا ہوں کہ فارس اور شام نہیں بلکہ ان تمام فتوحات کو ایک طرف رکھو جو ملکی اسلام کے عروج کے زمانہ میں ہوئی اور ایک طرف ان مضرتوں کو رکھو جو گزشتہ اسباب نے پیدا کیں اور جس کے اس وقت سمجھنے میں زیادہ دشواریاں نہیں ہیں، تو یہ طے کر لینا آسان ہو گا کہ آگ کی طرح پھیلنے والی فتوحات کا ہونا اور اس کا ان اسباب سے تباہ ہو جانا اس قدر مفید نہ تھا جیسا ان اصولی غلطیوں کی وجہ سے دیر پا مضراثر ہوا۔ مسلمان اس لیے بڑھتے تھے کہ اسے خود اپنے ہاتھ سے تباہ کریں۔ بچے اسلام کی تاریخ میں اس سے زیادہ واضح کوئی بات نہیں دکھائی دیتی۔

کامیابی اسلام کی پیدا کی ہوئی بقتیہ صفات کی بدلت تھی اگر عروج اس مفہوم میں تھا کہ مسلمانوں میں بمقابلہ دیگر اقوام کے زیادہ شجاعت، استقلال اور دیگر اقوام کے ساتھ عمدہ برتاؤ کا خیال تھا تو میں بھولا ہوا مرثیہ یاد دلاؤں گا کہ اسی مرحوم اسلام کا مدقہ تھا جس کی عظیم ذمہ داری اور عنانگیری کا مشکل مسئلہ چارے ملک کے ذلیل ترین بچیت اس کے انصاف اور توجہ سے بھی کم وقتی سے دیکھا گیا۔

میرا یہ عرض کرنا مائل نقیش کے لیے شدید بر لطف توجہ کے قابل ہو کہ قوم کی یہ صفات نہ ان نقبانے پیدا کی تھیں اور نہ اس کے قائم رکھنے کی ادنیٰ کوشش کی تھی۔ جس کوشش کو ہم اغراض فتوحات سے مستثنیٰ کر کے تعبیر قوی کے حوالہ کر سکیں۔

مثالیں جن میں اسلام کا شانہ تھا میں ابوالحسن کے ترک شراب، خالد کی کوشش بدر عزل وغیرہ کا ذکر نہیں ہوں، لیکن اگر ابوالحسن کے ترک شراب کے خیال کی وجہ سے اس کے افسر کے انعام سے زیادہ دکھائی ہے تو خالد کی خاموشی کو اس کے افسر کی اندازہ اور موقع شناسی کی کمی یا عدم احتیاط سے زیادہ قابل ستائش سمجھتا ہوں۔

اختیار ائمہ کے خصائل اور تعلیم کا اثر مذہب اگر ایک کے ترک شراب کا باعث تھا تو دوسرے میں وہ اطاعت جو مذہب نے سکھائی تھی فرمانبرداری کی محسوس تھی۔ ان کا ایسے مواقع پر اپنے نفس کے ساتھ اجتہاد کرنا اسلام کے اثر سے عقاب نقیب کے تعلیم اور اثر کے خیال کی اس میں نہ جھلک تھی اور نہ اس کا کوئی سایہ بگھنے کے وجوہات دکھائی دیتے ہیں۔ گزشتہ زمانہ یا ادوات میں عروج کے اسباب وہ تھوڑی سی غریباں تھیں جو عادات اور خیالات میں چھپی چھپائی رہ گئی تھیں۔ نقیب اولیٰ یا اس کے بعد کے ایک آدمہ قائم مقام اس تعزیت کے متقی نہ تھے کہ انھوں نے حفاظت کی کوشش کی تھی۔

قوی حافظہ زمانہ کے گزرنے نے جہاں بقتیہ خوبیوں کو قوی حافظہ سے خارج کر دیا، وہاں برائیوں اور انتشار قوی کا سود بڑھتا گیا۔ عناصر قومیت کسی جلد میں نہیں رہتے بلکہ قوم کی عادت اور خیال میں رہتے ہیں، اور اسی طرح تشکل ہوتے رہتے ہیں۔

دوسری نوعیت کے ائمہ کی بے مضرتی کی مثالیں ثانی الذکر کردہ ائمہ کا امت رسول کا عنانگیر ہونا بے اعتراض ہی ہوتا۔ اس لیے کہ عالم اسلام کے نزدیک رسول کا ہر طرح کا حق ناقابل اعتراض تھا۔ لوگ تسلیم کر چکے تھے اور اس تسلیم کی بنا پر خاندان رسالت میں سے کسی کو چاہتے تھے۔ لوگوں کا ایسا چاہنا بعض کے لیے باعث اضطراب تھا۔ نہ ان کے نقیب ہونے پر کسی کو یہ کہنے کی ضرورت ہوتی کہ: ”ہم مدینہ کو سوار اور پیادوں سے بھر دیں۔“ اور نہ ماضی زکوٰۃ کو قتل کرنا، اور قتل ہونا خواہ بھلا معلوم ہو تا نہ مفور عرب یہ کہہ سکتے کہ ہم کسی کم درجہ نسب اور منزلت شخص کو اپنا افسر قبول نہیں کر سکتے۔ نہ انصار کے ایسے معتد ر کردہ کا افسر ایک زمانہ تک آنداز کنارہ کشی میں اپنی تسکین سمجھتا۔

مفید ہونے کے وجوہات ثانی الذکر کردہ ائمہ کا امام ہونا نہ صرف بے مضرت اور بے اعتراض ہوتا بلکہ مفید بھی ہوتا۔ بے مضرت اور بے اعتراض کے معنی عموماً ضرور یہ نہیں ہیں کہ وہ پر فائدہ اور مقبول بھی ہوتا۔ لیکن اس مخصوص موقع کے لیے یہ سوچنے کے کافی وجوہات ہیں کہ وہ مقبول اور مفید بھی ہوتا۔ یہ کیا کم مفید تھا کہ اس قدر مضرتیں نہ ہوتیں جو زوال قوی کی وجہ اولیٰ ہوتیں۔ اور جب مخالفت میں آوازیں نہ آتیں بلکہ رسول کے تعلیمی اثر اور زیر تربیت طبیعتیں، خاندانی مستند شرافت اور اس کی طبعی جلوگیر غیباں ذمہ دار ہوتیں تو اس کے مقبول نہ سمجھنے میں عالم کے تجربہ اور اخلاقی اعتبار کا ٹکڑا ہونا ہوگا۔ خصوصاً ایسی حالت میں کہ لوگ کسی دوسرے اثر سے متاثر نہ ہوتے۔

مقبولیت مقبول سمجھنے کے لیے متذکرہ صدر فقرات کہ: ”ہم مدینہ کو سوار اور پیادوں سے مبر دیں۔ یا خاندان رسالت میں سے کسی کو چاہنا۔ یا یانہین زکوٰۃ کا ان کے حقوق کی تائید کرنا، یا انصار کا اسی ہی خواہش کرنا، کافی اور اس کا ثبوت ہے کہ ہر شرافۃ ان کے عنانگیر اسلام ہونے کو کسی خیال، تاوانخت سے نہ دیکھ رہا تھا، بلکہ غیر مقدم کے لیے بلا کسی خود غرضانہ سفارش کے تیار تھا۔ ان کے ذمہ دار ہونے پر رسول کے بعد کوئی انقلاب نیابت محسوس نہ کرتا۔ اس سے بری خیال نہ ہوتی۔ حوصلے اور خود غرضی میں حرکت نہ ہوتا اور گویا رسول کی تعلیم اور اثر میں ایک، پیشگی پیدا ہوتی جاتی اور قوم یک جہتی اور ترقی خصلت کی طرف حرکت کرتی رہتی۔

دوسری نوعیت کے امامِ اول کے تعمیرانہ فقرات غور کرو اس وقت کو جب کہ گردہ ثانی کا نقیب اول اپنی معجز غما زبان اور زندہ کرنے والے فقرات کے ساتھ رسول کے ممبر پر ہے (کا کہا ہے کسی نے کہ ممبر کی نکلیاں اسی کی نگوار سے بنی ہیں) کوئی شرتشین یا شام کا گردہ اسے مخالفت کے لیے لٹکا تا نہیں۔ (یہ لٹکا تو اسے بے حق کرنے، حتیٰ جامعہ تیار کر لینے اور قوت حاصل کرنے کے بعد حتیٰ جو ایک زمانہ کی بے قوتی کے بعد اس کی بظاہر تھوڑی دیر کی قوت کے اثر میں کمی پیدا کرتی حتیٰ) اس کے آدمی بنانے والے خلبے پڑھو تو تمہیں کسی زبان کے کھانے سے پہلے خود یقین ہو جائے گا کہ تلہم من اللہ نبی کا شاگرد بول رہا ہے۔

تم اس کا بھی یقین کرو گے کہ اس کے زیر تربیت اور مصلحت کے موافق نقبا کا سلسلہ امت رسول کے لیے مفید ہوتا۔ وہی اپنے بستر احتقار سے کہتا تھا کہ: ”اپنے درمیانی تنازعات کے مصلح بنو۔“ اس حضرت سرماتے تھے کہ: ”اپنی ذات اور اپنے گردہ کی اصلاح تمام روزہ و نماز سے افضل ہے۔“ فرماتا تھا کہ: ”جب تک بنی آدم ایک دوسرے سے مواخت رکھتے ہیں اور بُرائی نہیں کرتے ان کے قبضے سے انتظام اور حکومت نہیں نکلتی۔ جب اس کے خلاف آپس میں نزاع جائز رکھتے ہیں تو کاموں میں خلل پڑتا ہے جس کا نتیجہ تباہی ہے۔“ کبھی اس پر متانت تھا کہ: ”شہر اہل متروک اور ناپسند ہو گئی ہیں۔“ اور کبھی اس پر سرود آہ بھرتا تھا کہ: ”ہر اہل و نااہل دینی اور دنیوی امور میں رائے زنی کرنے لگا۔ نون مزاجیاں دامن گیر ہو گئیں۔“ اور کبھی کبھی مفید امورات میں باوجود بے قوت ہونے کے صاحب اختیار لوگوں سے شرط کرتا تھا کہ: ”اپنے ہوائے نفس کی پسیری نہ کرو گے۔“

اس کے علاوہ اس کی مثالیں آئیں گی کہ اس سلسلہ کے ائمہ نے باوجود بے اختیاری کے اجماع است کس درجہ لحاظ کیا اگرچہ وہ ذاتی طور سے ان کے لیے مفید نہ ہوتا، ان کا نقیب ہونا مفید ہوتا۔

ان کا محض وجود لطافت اسلام کی بقا کا باعث ہوا کہنا قرین انصاف ہوگا کہ اس سلسلہ کو

بے اختیاری یا بے اختیاری کے بعد اختیار حاصل ہونے میں اگرچہ دشواریاں ہر وقت ملتوت رکتی تھیں اور اس سے گویا انہیں کبھی وہ آزادانہ موقع ہی نہیں ملا کہ وہ تربیت اور تعمیر قوی کے فرائض ادا کر سکتے۔ تاہم ان کا محض وجود لطافت اسلام کی قائم رکھنے کا باعث ہوا۔ اور اگرچہ ان کی زبان پر مہر لگادی گئی تھی اور اکثر اس کا موقع نہ تھا کہ اپنے خیالات اور فقرات سے تعلیم کر سکتے۔

خاموشی میں طریقہ تعلیم لیکن ان کا دوسرا طریقہ تعلیم یعنی خود اپنا عمل اس وقت تک فائدہ بخش جو تاراج ہوا جب تک قبر کا گوشہ یا لوی بن نہیک کا سا قید خانہ انہیں لوگوں کی نگاہ سے بالکل مخفی نہ

کر دیتا تھا۔ ان کا عمل لوگوں پر اثر کرتا تھا۔ لوگ دیکھتے تھے درخت خود مختار قید خانہ اپنے مقدس اسیر کا قیدی بن جاتا تھا۔

حسین کے سلسلہ ائمہ پر ان کے پہلے اور بعد کی سختیوں کے مدارج اور وجہ میں جس سلسلہ کو

اس کے لحاظ سے یہ کہہ دینا ضروری ہوگا کہ حسین کے پہلے ان کے سلسلہ ائمہ پر اس قدر ظاہری تشدد و بیزاری بعض فوری گزرتی ہوئی حالتوں کے نہ تھا جس قدر ان کے زمانہ اور ان کے بعد تھا۔ اس کی وجہ ظاہر ہے کہ ان پہلے ائمہ کا زمانہ رسول سے قریب تر تھا۔ کچھ دیکھنے والے لوگ تھے اور اس لیے ان پر زیادہ سختی کرنا مصلحت کے خلاف تھا۔ دراصل ائمہ کے بعد سلسلہ ائمہ کے زمانہ میں کئی پشتیں مخالفت میں بسر کیں تھیں بلکہ ماں کے پیٹ سے مخالفتوں کے ساتھ پیدا ہوئی تھیں۔ سختیاں اس قدر بڑھ گئی تھیں کہ بجائے امام اور نقیب کی زبان کے اس کے پاؤں کی زنجیر اس کی مظلومی کی ثابت کرتی تھی۔ یا کوئی مظلوم امام اپنے کسی پچھلے والے کے مخاطب ہونے پر اسے مختلط اشاروں سے روکتا تھا۔ حقیقی اسلام کے یہ قیامت تک غم کے لیے کافی ہے کہ توہین آمل رسالت میں اس قدر ہمتیں بڑھائیں اور بڑھ گئی تھیں کہ کوئی ان ائمہ کے منہ پر سب کرتا تھا اور جب یہ اپنے کرم اور عنوسے اس کی طرف سے منہ پھیر لیتے تھے تو وہ دوسری طرف بھی آکر کہتا تھا کہ ہم نے تمہاری ہی سب کی ہے اور وہ یادگار رسول جواب میں فرماتا تھا کہ: ”میں نے اس سے بھی اعراض کیا۔“

ان کی روشنی پھر بھی جس طرح حسین کے پہلے ان کے سلسلہ ائمہ نے جان توڑ اصلاح کی کوشش سے یہ بجا دیا کہ ہم بہت کچھ کر سکتے تھے اگر ہمارے ہاتھ کھلے ہوتے اسی طرح بعد کے خاموش ائمہ نے اس

بڑی قربانی کے بعد بھی باوجود اس کے کہ ہر سنگریزہ اور مسلمات فضا میں ”خاموش قتل یا زہر“ نفوذ کیا ہوا تھا۔ اپنے مقدس کوشش کے آثار چھوڑے۔ زبید کا دربار ہوا اموی بادشاہ کو سکھ کی صلاح لینی ہو۔ مامون کا دربار ہوا امت رسول کی کسی عید میں عبادت کے لیے لے جانا ہو، متوکل کے سامنے اپنے خلاف خواہش اشعار پڑھنے ہوں یا ہشام کا ایسا شاگرد چھوڑنا ہو جو بارگاہی کے مشہور مکالمہ کے صدیوں پہلے اس کی ابتدا کرے۔ یہ سب مع اپنے تاریخی آثار انہیں گوشہ نشینوں

کی روشنی تھی۔ یہ لوگ علم اور عقل کو زندہ کرتے تھے اور تھوڑی سختی کی کمی ان کے دائرہ تعلیم اور روشنی کو وسیع دیکھنا شروع کرتی تھی۔ دربار اگر سیاسی مسائل اور فتوحات کی پیچیدگیوں میں الجھتا تھا تو یہ لوگ دماغوں سے الجھنیں دور کرتے تھے۔ خیالات کو ہموار کرتے تھے اور کچھ ایسی روحانی لذت اور علمی چاشنی پیدا کر دیتے تھے کہ لوگ جبراً ادا کر کے ان سے ایک ایک بات پوچھنے آتے تھے۔

ان کے کلام کی سند اور انتہا مخالفت سے بھرپور تھا۔ ان میں پطرس اور پولوس کی ایسی مشہور عداوت اور حسد نہ تھا۔ بلکہ یہ مقدس سلسلہ اپنے کلام کی سند اپنے مقدس پیشرو سے لاتا تھا۔ یہاں تک کہ وہ جناب رسالت مآب پر منتہی ہوتا تھا۔ اس سے نہ صرف صدق کلام اور کلام کے قبول کے لیے یہ سلسلہ ایک ثبوت تھا بلکہ ایک امام نقیب گزشتہ کی تعلیم اور تربیت میں بسر کرتا ہوا اس قابل ہوتا تھا کہ وہ آئندہ کا امام ہو سکے۔

میں حسینؑ سے ہمدردی کرنے والوں کی تعمیر قوی اور ذکر حسینؑ کرنے والوں کی مومنائی قابلیت اور تعمیر کی کمزوری پر غور کروں گا۔ اس کی پاشالی کے اسباب اور وجوہات پر اس لیے متوجہ ہو گیا کہ قوم کی حالت رسولؐ کے بعد کی مصلحت، اس کا اثر، مسئلہ قیامت، حسینؑ سے تعلق اور ان کی کوشش اچھی طرح سمجھ میں آجائے، جو اس قربانی کی عظمت کے سمجھنے میں معین ہو۔ لیکن ہر حیثیت کے ذاکرین حسینؑ کو دوبارہ مخاطب کرنے کے قبل میں حسینؑ کے بعد کے ائمہ کا اس لیے ذکر کرنا چاہتا ہوں کہ خود ان کی کوشش سمجھ میں آجائے جو شہادت کے قرب زمان کے لحاظ سے تھی۔

شہادت حسینؑ کو حسینؑ کے بعد کے ائمہ نے تعمیر قوی کے لیے ضروری سمجھا کے بعد

اس مہم باشان قربانی کو تعمیر قوی کے لیے ضروری اور اصل ذریعہ سمجھا۔ میں آسانی مد نظر رکھ کر اعمال عاشورا اور زیارت کا تذکرہ کر دیتا ہوں۔ لیکن اس شبہ کے ساتھ آگے بڑھنے کو دل نہیں چاہتا کہ مبادا ناظران اشارات، الفاظ اور ان کے توجہ سے بے ہوش گزر جائے جس پر توجہ دلانا میرا مقصود ہے۔

اعمال عاشورا غور کے قابل ہیں یہ محکم جن کے معنی موقع اور حالت میں مخفی ہیں کہ اچھے کپڑے پہننا، پاک صاف رہنا، صرا یا بام خانہ پر رہنا، استینا اٹھنا رہنا، عموں رہنا، عمل عاشورا میں حصہ

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ رَضًا بِقَضَائِہِمْ وَتَسْلِیْمًا لِّاَمْرِہِمْ کہتا ہوں، کبھی آگے بڑھتا ہے کبھی پیچھے ہٹتا ہے۔ اس کا فلسفہ ایک عالم میں ڈال دیا جاتا ہے۔ جس سے وہ اپنے اس انتشارانہ عمل میں حسینؑ کی اس حالت کا زندہ احساس کرتا ہے۔

ایک حالت جب وہ حضرت انبی ناقابل بیان حالتوں میں کبھی سوچتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں کبھی سوچنے کے لیے دم لیتے ہیں، کبھی کوئی درد انگیز صدا یا خیال پیچھے ہٹاتا ہے۔ اور یہی تسلیم و رضا کے الفاظ زبان اقدس پر جاری ہو کر یا تو خیالات اور ارادہ کا تعقیب کر دیتے ہیں، صبر کی ہمت دلاتے ہیں یا الفاظ کی مدد سے بازگشت

مالت یا خیال کے تکلیف دہ احساس سے تھوڑی دیر غافل کر دیتی ہے۔ یا تھوڑی تسکین ہو جاتی ہے۔

اعمالِ عاشور بجالانے والا کہتا ہے کہ لقد عظمت النردية وجلت المصيبة بك علينا وعلى جميع اهل الاسلام (بہ تحقیق کہ آپ کی وجہ سے ماتم اور مصیبت ہم پر اور جمع اہل اسلام پر بزرگ ہوگئی)
 ف: اللہ امة اسست اساس الظلم والجور عليكم اهل البيت۔ (پس خدا۔۔۔ کرے اس گروہ پر جس نے تم اہل بیت کے لیے ظلم و جور کی بنیاد ڈالی)

نزاعی اور دفاعی عہد
 اس کے بعد دشمنوں کے ہر تعلق سے برابرت ظاہر کرتے ہوئے ”انی سلم لمن سالمکم وحرب لمن حاربکم“ (میں اس سے صلح کرتا ہوں جس نے آپ سے صلح کی اور جنگ کرنے والا ہوں اس سے جو آپ سے جنگ کرے)

دُعا جو زبان رکھتی ہے
 اللهم عجل فوج آل محمد واجعل صلواتك عليه وعليهم وستنقدهم من ایدی المنافقین۔۔۔۔۔ وافتح لهم فقهًا يسيرًا واتم لهم روحًا وافرًا جاقربًا واجعل لهم من لدنك على عدوك وعدوهم سلطانًا نصيرًا۔ (خداوند اآل محمد کی کشائش کار میں جلدی کر، اس پر اور ان پر درود بھیج اور انہیں منافقین کے ہاتھوں سے خلاصی دے۔۔۔۔۔ انہیں آسان فتح دے، ان کے لیے کشائش اور راحت جلد بخیتا کر دے۔ اور انہیں اپنی طرف سے اپنے اور ان کے دشمنوں پر قلب ہانے والا کر دے) فانك ضمنت اعزازهم بعد الذلة وتكثيرهم بعد القلة واطهارهم بعد الخمول۔ (پس بدرستیکہ تو ضامن ہوا ان کے اعزاز کا بعد ذلت کے۔ اور ان کی کثرت کا بعد قلت کے اور ظاہر کرنے کا بعد گمنامی کے)

زیارت
 سین کی زیارت پڑھنے والا انہیں مشاہیرِ انبیاء کی صفات کا وارث کہہ کر پکارتا ہے۔ السلام عليك يا وارث آدم صفة الله۔۔۔۔۔ اور نہ صرف ان کے برگزیدہ آباء نے ظاہرین اور ان کی ہدایت یافتہ اور ہدایت کنندہ اولاد پر سلام بھیجتا ہے بلکہ ان پر بھی جو ساتھ شہید ہوئے اور جن کی پاک رو میں ان کی ہم جوار ہلے۔ یہ فقرات سرسری طور پر کہیں کہیں سے زاد المعاد سے چن لیے گئے ہیں۔ ان کل فقرات میں جہاں غم کی گہری لکیر پڑی ہوئی ہے وہاں ذاتِ حسینی سے جو جملہ صفات کی مرکز تھی ہمدردی کرنے، ہمدردی کرنے والوں کی نیچتی دشمنوں سے برابرت تسلیم و رضا کا سبق، عہدات سے تذکیہ اور نیچتی غرض کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ دُعائیں اہل بیت رسول کے ساتھ ایک نزاعی اور دفاعی عہد ہے۔ (دوستوں کے دوست اور دشمنوں کے دشمن)

کوشش اسی پر تمام نہ ہو گئی تھی بلکہ اگر کوئی مظلوم امام مظلوم حسین کا نام سن کر تمام دن متنبہ نہ ہوتا تھا تو شعراء کو مرثیہ کہنے کے صلہ میں انعام سے زیادہ داد دی جاتی تھی۔ ایک جیتی غرض کی کوشش گھر سے شروع ہوتی تھی۔ اگر اہل بیت طہارت پس پردہ خاموش آنسوؤں سے روتے تھے تو امام کے دیکھنے والے شاعر کے دل ہلا دینے والے الفاظ کے علاوہ امام کے اثر سے متاثر ہوتے تھے کیا کوئی اسے غم کا کردار کہہ سکتا ہے کہ حضرت رہاب ایک برس تک چمت کے نیچے نہ بیٹھیں، یا امام مظلوم عید کر بلا کی نگاہوں کے سامنے یہ واقعہ عظیم چالیس برس تک تازہ رہا۔

لیکن ائمہ کی ان کوششوں کو اولیت کا درجہ حاصل نہ تھا بلکہ ابتدا خود حسین ہی نے کی تھی اور جو اہل بیت

کے دمشق تک جانے اور مدینہ کی واپسی تک ہجوان پیدا کرنے والے اسباب مہیا کر چکی تھی۔ ائمہ کی کوششوں کو نہ صرف واقعہ شہادت بلکہ خود ان اسباب سے مدد ملی جو حسینؑ پیدا کر چکے تھے۔ مثلاً:

حسینؑ کے الفاظ جو اسنادہ اساس جماعت ہوئے ”مسیواریین“ کے لفظوں میں حسینؑ کا یہ فرمانا کہ: میرے قتل ہو جانے کے بعد

اور ان جاکاہ مصائب گزر جانے کے بعد خداوند عالم ایک جماعت کو آمادہ کرے گا جو حق کو باطل سے جدا کرے گی۔ اور ہماری قبروں کی زیارت کریں گے اور ہماری مصیبتوں پر روئیں گے اور دشمنانِ آلِ محمدؐ کو اچھی طرح ہلاک کریں گے۔ یہ لوگ خدا کے دین اور میرے ناناکا شریعت کی ترویج کریں گے اور میں اور میرے جد بزرگوار انھیں دوست رکھیں گے اور وہ قیامت کے دن ہمارے ساتھ محشور ہوں گے۔ نہ صرف اندازہ کے باہر ہجوان خم سے آپس میں محبت پیدا کرتا تھا بلکہ انھیں یہ شریفانہ ہمت دلائی تھی کہ وہ اس دین کی حمایت کریں گے جس کی روحانیت قائم رکھنے کے لیے حسینؑ شہید ہو رہے ہیں۔ انھیں عظیم الشان اخلاقی اندازہ پر آمادہ کیا تھا کہ وہ حق و باطل میں امتیاز کریں۔ بلاشبہ یہ بنیاد پرستین کوئی نمود اور تشوئے قومی کی باعث اور مٹتے ہوئے دین کے لطافت قائم رکھنے کی وجہ اعلیٰ ہوئی۔

حسینؑ اور دیگر ائمہ کی ان کوششوں کے بعد ان کوششوں کے واضح اثر کے سمجھنے کے لیے طوک دیلمہ اور فاطمی خلفاء کے زمانہ کے اعمال عاشور اور ان کے دربار کی مجالس دیکھنے سے کوشش کا بلوغ ذہن نشین ہو جائے گا جو اس کے بعد حسینؑ کے مجالس عزا کے عالمگیر ہونے یا ان کے حاضرین کو حق و باطل میں تمیز کرنے والے اسناد اور قوم بنانے کا مقدمہ اور مدرسہ تھا۔

قومی دن انھیں کوششوں کا نتیجہ ہے کہ آج عالم روز عاشور کو حسینؑ سے ہمدردی کرنے والوں کا قومی دن سمجھتا ہے۔ دانے جو ہم پر اگر ہم اسے اس کی خالص فطری شان سے گرا دیں۔ یا خبیثگی اور اثر کے درجہ کو کمزوری، غفلت یا بے تمیز رفتی کے حوالہ کریں۔

مجالس حسینؑ کی مجالس عزا کے اثر کے متعلق ”مسیواریین“ کے یہ فقرات زیادہ واضح ہوں گے کہ: ”حسینؑ تمام روحانیات میں زیادہ تر حضرت یحییٰ سے مشابہ تھے مگر ان (حسینؑ) کے مصائب شدید تر اور سخت تر تھے اور ابتداء پیش رفت تابعان حسینؑ کے بھی پیروان یحییٰ کے مشرور اولیہ کی طرح تھے۔ اگر کسی لوگ بھی پیروان حسینؑ کے اصول اولیہ کی پیروی اختیار کر لیتے یا جو موانع خود مسلمانوں میں پیدا ہو گئے پیروان حسینؑ کو ان کے عمل سے نہ روکتے تو انھیں دو مذہب سے ایک مذہب عالم کے مشرور عدیدہ تک عالمگیر ہو جاتا۔ چنانچہ پیروان حسینؑ کی روک تھام کے موانع جب اٹھ گئے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ مذہب تمام طبقات اسلامی کو اور دیگر مذاہب کو سیل کی طرح احاطہ کیے لیتا ہے۔“

میں یہ اشارے تمام کر چکا کہ حسینؑ کے قبل اور بعد تعمیر قومی کی کیا کوششیں ہوئی تھیں اور کیسے کیسے موانع پیش آئے۔ جس سے اور زیادہ کامیابی کا نہ ہونا تعجب خیز نہ تھا۔ لیکن اس زمانہ اور مقامات میں جب اور جہاں حسینؑ کے نام کے بلند کرنے کی کوشش موانع کے مقابل نہ ہوئی تھیں۔

واقعہ کے فطری اثر میں کونسی چیزیں ہارج تھیں ذکر حسینؑ کا ہلکے خصائل پر اور زیادہ مفید اثر نہ بھی تھا کہ ذکر حسینؑ کرنے والے زیادہ تر اس درجہ کے نہ تھے جو صفات خستینہ اور ان کے اعلیٰ اغراض کا صحیح اندازہ کر سکتے اور ہم میں اس عمدہ صفات پیدا کرنے والے واقعہ کی خوبیوں کو جاری اور قائم کر دیتے۔ واقعہ کا فطری اثر عدم تربیت، بے قاعدگی اور بکھانے والے کی کمی سے سرنگر رہا تھا۔

اسلام مذہبِ اُمید ہے مذہبِ یاس نہیں ہے اس کہنے سے میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں یاس کا اثر ڈال رہا ہوں۔ نہیں میں سب سے آخری شخص ہوں گا جو اس کا مرثیہ کہے کہ وقت گزر گیا، ہم اپنے محبوب سے اس وقت تک خالی اور صفات سے اس وقت تک آراستہ ہو سکتے ہیں جب تک ہم میں کا ایک بھی ہلتی ہے۔ اور وہ اسلام اور حسینؑ پر قائم ہے۔ کم سے کم وہی ایک شخص مثال ہو گا۔

حسینؑ کی شہادت ایک حرکت ہے جس میں سکون نہیں میں اس خیال کے ان قائل، کابل، اور شکستہ خیال مینرافوں میں نہیں ہوں جو یہ سمجھتے ہوں کہ حسینؑ کی شہادت کا خلعت گر اثر تمام ہو چکا، یا حسینؑ کو جو کچھ کرنا تھا کر چکے۔ نہیں۔ واللہ! حسینؑ کا عمل اپنے پیشتر کے جاری قوانین الہی کے لیے جہاں ایک سخت چھوڑ تھی وہاں آئندہ کے لیے ایک ایسی قمریٹ تھی جس میں سکون نہیں ہے۔ قتل ہو، پیاسے رہو، بھوکے رہو، بچوں کو قتل کرادو، جن کے منہ سے دودھ کی بو آتی ہو۔ ان کے خون کو اپنے ہاتھوں سے منہ پر مل کر یہ کہہ دو کہ باریا! میں اب تک صابر ہوں۔ لیکن نہ شہرِ بیلانہ غیرت میں فرق آئے، نہ صبر میں شکنجگی پیدا ہو اور نہ خلاف نفس امارت کی پیروی کے لیے ایک قدم آگے بڑھے۔ بلکہ جوں جوں تکلیفیں بڑھتی جائیں اپنی سچائی کے یقین کے ساتھ تشدد پر صبر کی قوت اور برائی سے نفرت کا اندازہ زیادہ وزنی ہو تا جائے۔

شہادت کی عالمگیر مقبولیت اپنے عناصر کی وجہ سے ہے تاریخِ عالم میں حسینؑ وہ پہلے شخص خدا کا یہ قانون بتایا، علما علم نفس کا یہ قانون بھایا کہ نفس انسانی کی قوت تمام شمار کیے جانے کے قابل مصیبتوں سے زیادہ ہے۔ حسینؑ کی شہادت کا اثر قوانین الہی کی طرح غیر فانی ہو گیا۔ حسینؑ نے مذہب کے اس لازوال ورثہ میں جان پیدا کر دی جو مردہ حیثیت سے گنگ اخلاقی کتبلیشان میں پڑا تھا۔ انجیل کا یہ فقرہ کہ: ”مبارک ہیں وہ لوگ جنہیں راستبازی کے لیے تکلیف دی جاتی ہے آسمانوں کی حکومت ان کے لیے ہے۔“ حسینؑ سے زیادہ کسی سے چسپیدگی نہیں رکھتا بغیر ایسے حسینؑ کے عالم ہمارے لیے ایک غیر مرتب ڈمیر ہے۔

اس اختلاف بین الامم کی تاریخی ابتداء کا ذکر جس نے جماعتیں تیار کیں اور جس کے وسیع معنی اور اثر کی رکاوٹیں طرف توجہ دلائی گئی عام اس سے کہ وہ کمی ہی بخیرہ حیثیت سے کیوں نہ کیا گیا ہو تمام اسلامی فرقوں کا

حفاظ کر کے ساتھ ہی محل سے علیحدہ اور محض اعتقاد کو پیش نظر رکھ کر ایسا نہیں ہے جس کی نسبت یہ کافی الطہین سے سوچا جاسکے کہ وہ ہر ایک کو متوجہ کر سکے گا۔ اس وجہ سے کہ توجہ کی راہ میں ایسی خیال اور ناچکن البیان رکاوٹیں پیدا کی گئی ہیں جو ایک ایسے شخص کے لیے جو عقل اور تاریخ سے کام لینا چاہتا ہے بہت کچھ متعلقہ خبیث ہوں گی۔ لیکن وہ شخص جو اسباب شہادت حسینؑ کو سمجھنا چاہتا ہے وہ یا تو ان واقعات اور اشارات پر ٹھنڈے دل سے نظر کرتا جائے جس میں یقیناً شاعرانہ مضمون آفرینی نہیں کی گئی ہے۔ یا قطعاً اس مصلحت کی پابندی کرے جس نے ذکر حسینؑ کو ذاکر پر حرام کیا ہے۔

واقعہ سمجھنے کے استیقہامی الفاظ اس کلمہ کا بنیاد کر لے پھر کوئی مورخ کیا معنی منسوب اسباب جو لوگ ایسے معاملات میں بھی جس میں مفید حیثیت کا اپنا اختیار تمیزی صرف کر سکتے ہیں ”اسیچہ استوازل گفت ہمان ی گویم“ کے ملوی ہیں ان سے کچھ کہنا محبت ہے۔ لیکن اس شخص کے لیے جو اس عظیم الشان واقعہ کو سمجھنا چاہتا ہے اسے کسی کا ان فطری سوالات سے روکنا مشکل ہے کہ کیا کیوں، کس لیے، کیونکر، کب، کس نے؟

اختلاف بین الامم حسینؑ تک پہنچنے پہنچنے سمجھنے کے قابل ہو گیا تھا یہ اختلاف بین اور ساخت کے اعتبار سے جس طرح قدم بڑھا رہا تھا وہ حسینؑ تک پہنچنے پہنچنے نہ صرف کافی طور سے حسینؑ کے سمجھنے کے لائق ہو گیا تھا اور پہلے کے قابل صورت میں آ گیا تھا بلکہ یہ کہنا اور واضح ہو گا کہ حسینؑ اس خاص سلسلہ کے ایک فرد تھے جس پر مختلف گروہ کے ائمہ یا مختلف ائمہ کے گروہ کا سب سے زیادہ مظاہرہ اثر پڑا تھا۔ اور اس لیے وہ اس کا پورا اندازہ کر سکتے تھے۔

زمانہ کی مقدار اور سمجھنے کی آسانیاں رسولؐ کی رحلت کے وقت حسینؑ سات برس کے تھے اور شہادت کے وقت ۵۷ برس کے۔ یعنی اختلافات اور اس کے اثر کو اپنے سلسلہ پر سمجھنے کے لیے نصف صدی ملتی تھی اور یہ وقت ایسا نہ تھا جو رحلت رسولؐ اور اپنی شہادت کے درمیانی زمانہ میں خاموشی سے گزر گیا ہو۔ بلکہ وہ وقت تھا جس کے واقعات نے آئندہ اسلام کی ہر حیثیت کی قسمت کا فیصلہ کر دیا۔ یہ نکتہ حسینؑ کی روش کے اس خاص پہلو کے سمجھنے میں مدد دے گا کہ ایسا نہ تھا کہ حسینؑ کو اپنے گرد و پیش کے طابع اور واقعات نہ معلوم ہوں جس سے انھیں کسی امر میں فیصلہ کرنے کے مناسب ذرائع نہ ملتے ہوں۔

اس سے مسیری یہ فرض بھی ہے کہ اس سمجھنے میں مدد دوں کہ حسینؑ کا وہ مستقل حیرت خیز ارادہ جس نے سب کچھ کر تمام مصیبتوں کو گوارا کر لیا۔ کس سرمایہ نفرت سے اس قدر معصم تھا کہ انھیں ایسے زمانہ میں زندہ رہنا ناگوار ہو گیا تھا اور آیا ان کی نفرت ایک وجدانی لہر تھی جسے پیشتر کے خیال سے مدد نہ ملی ہو یا جیسا اوپر کہا گیا انھیں اپنے سلسلہ کے ساتھ ایک زمانہ کی مسلسل تلامذہ برتنو دیکھتے دیکھتے اس قدر کوفت ہو گئی تھی کہ وہ آئندہ اس ٹوہن کو گوارا کرنا اپنی اور اپنے ذمہ داری کی ذلت سمجھتے تھے۔ اور اب قبول میسورامین: ”غور و فکر اور علم دارادہ کے ساتھ مقتول ہو جانے پر آمادہ ہو گئے تھے۔“

حسین کی شہرت میدانِ کربلا کے وہ تاجِ خیز حسینؑ جن کے مخصوص واقعات کی زندگی چند مہینہ اور زیادہ خاص کہنے کے لیے چند دنوں یا روزِ عاشورہ کی ہے انہوں نے ایک دن یا چند مہینوں میں کیا کیا کہ وہ خدا کے بعد عالم میں سب سے زیادہ مشہور ہو گئے۔

نمونے صفات کا سلسلہ اب ناظر کو بہترین غور سے یہ دیکھنا ہو گا کہ ان کی یہ شانِ طبیعت ان میں واقعہ کے ساتھ ہی پیدا ہو گئی یا ترقی صفات اور نمونے خصائل کے آثار اور ابتدا کچھ دنوں قبل یا بہت پیشتر سے تھی وہ اسباب کیسے اور کیا تھے وہ کون سے نفوس تھے جن کے زیر تربیت رہنے سے حسینؑ ایسے کمرے حتیٰ رو بن گئے اور ان کے حالات جاننے والے کو یہ یقین ہو گیا کہ ان میں حتیٰ سے بال برابر ہٹ جانے کی قابلیت ہی نہیں رہی۔

وراثت صفات حسینؑ کی اس مخصوص صبرت خیز زندگی کے افعال میں گزشتہ زمانہ کی کونسی مثالوں کے آثار پائے جاتے ہیں۔ اور واضح لفظوں میں حسینؑ کس خاندان کے صفات کے وارث اور مظہر تھے کون سے گرد و پیش کے واقعات اور آثار نے انہیں عظیم المرتبت بنانے میں مدد دی۔ ان کی تربیت اور خیالات کے کون سے نفوس رہنا تھے یا حسینؑ کے افعال اور خصائل کے بھنے کے لیے کن طبائع سے مدد لینی ہو گی۔ میرا خیال ہے کہ شاید یہ سمجھتے وہ ظہری روش ہوں جن سے خاص حسینؑ کے متعلق طبیعتیں کی جرأت کی جاسکے لیکن میں حسینؑ کو وہاں بگولہ لگا چلاں کچھ سکتا ہوں وہاں نہیں جہاں میری کوشش اور الفاظ جواب دیتے ہیں غالباً اکثر مقامات پر ہر قوم کا ناظر میرے اس خیال کا ساتھ دے گا کہ اس جگہ حسینؑ کا بھانا ناچنا ہے۔ اس لیے کہ وہی مثالیں تاریخِ عالم نہ دے سکے گی کہ چہ جانے کہ انسانی جسم پر اس کی تکرار کرتا ہو اور اس لیے ہر انسان اس کے اندازہ کے قابل ہو۔ حسینؑ صرف نوعی مفہوم میں ہمارے قوی ہیرہ نہیں ہیں بلکہ روحانی حیثیت سے بھی انہیں تمام عالمِ اسلام امام بھتا ہے۔

نہ صرف نوعی بلکہ روحانی امام اس جگہ یہ سہیق ملاحظہ طلب ہو گا کہ وہ امام جس کی مذہبی تقلید بطاعت حکومت لوگوں نے کئے میں ڈال لی ہو اس امام سے اپنی روحانی حیثیت میں مختلف اثر ہے۔ جسے اپنے پہلے کے امام سے تقلید اور تعلیم روحانی کا واسطہ ہو۔

پہلی صورت مذہبی حیثیت سے اس قدر مفید نہیں ہے جس قدر سیاسی اغراض کے لحاظ سے جس میں لوگوں پر مفید اثر ڈالنے کے لیے ملک نے مذہب کو ساتھ رکھنا ضروری سمجھا ہے۔ درآئیکہ غرض اولیٰ ملک ہے۔ یعنی مذہب فقیر پسند ضروریات ملکی کے لحاظ سے پیشہ مفید ملکی حیثیت کی تاویلات اور روش کا تابع ہے۔ اور اس لیے وہ ان وسیع تاویلات اور اس کے جلوگیر اغراض اور ان کے اس حیثیت کے اثر اور تاویل کرنے والے کے طبائع اور خیالات کے رنگ میں ڈوبا جاتا رہتا ہے۔ یہ مخلوط صورت قائم نہیں رہتی اور آخر میں یا تو حکومت کی دل چسپیاں مذہبی شلغ سے بے توجہ کر دیتی ہیں یا اس بے توجہی کے عالم میں کوئی دوسرا گروہ مذہب کے سلبانے کو کھڑا ہوتا ہے یا ہلا شاہ اپنی طرف سے کچھ لوگوں کو رنج و ضروریات مذہب کے لیے مقرر کرتا ہے۔ یہ جہاں قوت مذہبی کے ضعف کی صورت ہے، وہاں

مذہب مصلح حکومت کا تابع ہے اور ایک ایسی جماعت تیار کرتا ہے جن کی خود غرضیاں مذہب کی روحانیت کو بہت کچھ مدد پہنچاتی ہیں۔ طلبے یہودی تاریخ جو یا تاریخ دین مسیح کوئی ان آثار سے خالی نہیں ہے اور انھوں نے یہ کہ اسلام جس کی بنا ایسی نہ تھی کہ وہ بھی اس صورت میں نہ ہو تا آخر روش کے تغیر سے اس حالت میں پہنچ گیا۔

دوسری صورت دوسری صورت یہ ہے کہ جس میں غرض اولیٰ مذہب ہے، عام اس سے کہ امامت رومانی کے ساتھ حکومت دنیاوی ہو یا نہ ہو، مثلاً رسول قبل ہجرت بغیر صاحب اختیار ہونے کے بھی ہمارے پیشوائے رومانی تھے جس طرح حکومت کے بعد تھے لیکن رسول کے بعد خلفا کو حکومت سے قطع نظر کر کے امامت رومانی کے کسی خیال سے عامہ الناس کی نگاہ میں وقت نہیں دی گئی اس کے مقابلہ میں۔

ہم وزنی قوت ایسے خلفاء کے مقابلہ میں رسول کی اولاد جو سلسلہ امامت میں تھی باوجود حاکم نہ ہونے کے آج تک بلکہ خود مخالفت زمانہ میں بھی پیشوائے رومانی سمجھے گئے، اگرچہ اسے اختیار نہیں دیا گیا اور اس کی مری کو کششیں ہوئیں کہ اسلام کے لیے ان کے ہوتے ہوئے رقیب علامہ تیار کیے جائیں جس سے اولاد رسول کی مذہبی عزت کو مدد پہنچے۔ اس خاص شلخ میں بھی ہم وزنی قوت کی مصلحت کے آثار رسول کے بعد سے دکھائی دیتے ہیں۔

شناخت کے ذرائع امامت رومانی اور ائمہ رومانی کی صلت صریح اور قوت دار شناخت یقیناً اس سے زیادہ ممکن نہیں ہے کہ تاریخ اسلام میں یہ دیکھو کہ حکومت اور حاکم باوجود تمام اختیارات پر قابض ہونے کے اپنے تمام اختیارات کی قوت اور آنکھوں سے کون سے کمپرس، بے کس، مظلوم اور گوشہ نشینوں کو بغیر ملک جھپکانے دیکھتے رہتے تھے ڈرنے رہتے تھے دانت پیستے رہتے تھے کہ ہمارے گلے گلے یہ کیوں ہیں محسوس کرتے تھے کہ ہم باوجود اپنی نمائشوں اور چیزوں کے ان بے سرو سامانوں کے سامنے کوئی وزن نہیں رکھتے۔

سرق اے عبد الملک، ہشام، سلیمان اور مامون وغیرہ خوب سمجھتے تھے، اور منہ زردق وغیرہ دونوں کو خوب سمجھتے تھے۔ کوئی اگر امام جمہور تھا تو کوئی امام قہر تھا بڑا سرق تھا بہر حال جب ہم ان اسباب

شہادت کی عظمت سمجھنا اسباب کی قوت سمجھنے پر موقوف ہے پر ناظر کو توجہ دلا جائے گی

جن کا نتیجہ قل حسین تھا تو اس کے سمجھنے میں آسانی ہوگی کہ ایسے خوفناک اسلٹ فٹاں کے خاموش کرنے یا اس کی قوت گھٹانے کے لیے کیسے شخص کی ضرورت ہوتی اور تھی جو روش اور خیالات میں ایک انتخاب عظیم پیدا کرنے کی قابلیت رکھتا۔ وہ قابلیت کسی سخت اور اس کامرت کس قدر عبرت ناک ہو تا اگر حسینؑ کی باجری حیثیت سے بھی کامیاب ہونے تو انھوں نے عزیز اسلام پر کوئی احسان کیا یا نہیں۔ عالم کو بے غرضی، ایثار، فسخ، صبر، استقلال، حق رومی، غیرت، محبت، اور حمایت وجہ حق کا ناقابل مقابلہ سبق دیا یا نہیں اور دیا تو اس میں کیا قوت تھی۔

مولف کے فرائض کی مزید تفصیل اور ضرورت اس بات کے سمجھنے کے لیے کہ آیا حسینؑ نے اسلام پر کوئی احسان کیا یا نہیں مجھے کسی حد تک تاریخی واقعات لکھنے ہو گئے۔ وہ واقعات جن میں یہ دکھایا جاسکے کہ رسولؐ نے کیا کہا تھا علیؑ کیا کرتے

رہے تھے حق کیا کرتے اور حسینؑ کے لیے کیا کرنا رہ گیا تھا۔ اس کے لیے تغیرات پر توجہ دلائی ہوگی۔ مسلمانوں کے مختلف طبقات پر نظر ڈالی ہوگی۔ یہ سب اس لیے ہوگا کہ آیا اسلام کے مفہوم میں ایسا انقلاب ہوا تھا یا نہیں جس سے یہ قیاس کیا جاسکے کہ وقت آگیا تھا کہ ایسی عظیم الشان قربانی سے دماغ اور خیالات میں ایک سخت پیمانہ پیدا کیا جاتا تھا۔ حضرت رسولؐ، جناب امیرؓ اور احترام حسینؑ کے حالات صرف اس قدر لکھے جائیں گے جن میں حسینؑ کے حالات کو موافقت یا اثر کا ربط ہے نہ یہ کہ میں ان نفوس قدسی کی پوری سوانح عمریاں لکھوں گا۔ موافق تو خیر مجھے حاضنین کے ساتھ بھی چلنا ہوگا۔

انسانی برداشت کا اندازہ حسینؑ کے ترقی خیز صبر کی قدر کرانے گا حسینؑ کے مصائب اور ان کے مصائب

میں ان کی شان کی وہ شخص قدر کرے گا جو اپنے مصائب اور اپنے اس وقت کے انداز پر غور کرے گا۔ کون نہیں جانتا کہ انسان تھوڑی تھوڑی سی تکلیفوں سے ایسا حواس باختہ ہو جاتا ہے جس کی کہانیاں کہی جاتی ہیں۔ اگرچہ یہ تکلیفیں فطری حیثیت سے اس کے متعلق ہو سکتی ہیں، ایسا بھی ہوا ہے کہ مصائب کی عدم برداشت نے حدود اخلاق سے مطلق العنان بلکہ لحد بنا دیا ہے۔ یہ سب اس لیے کہ واقعات کی رفتار اس کی خواہش کے موافق کیوں نہ ہوتی۔ یا خدا موم کا کیوں نہ ہوا، جو اس کے اندازہ کی گری سے پگھلتا جاتا۔ ان حالتوں کے بعد جس میں مصیبت اور انسانی برداشت کے درجہ اور دماغ کے متاثر ہونے پر غور کیا جا چکا ہوگا۔ جب حسینؑ کے سلسلہ مصائب پر غور اور ان کے ٹھنڈے بخیرہ صبر اور بے لغزش حواس بلکہ اس کی ترقی پر نظر ڈالی جائے گی تو اس وقت حقیقتاً ”صبر“ اور ”حواس“ یہ دونوں لفظ بیشتر سے زیادہ گراں قدر معلوم ہوں گے۔ قطع نظر اس سے کہ آپ اس کے حامل کو کیا سمجھیں گے۔

خدا کے مظہر وجود بندے اور ان کا یقین اور جب ان مشکل وقتوں میں غلوس اور اقرار توحید پائیں گے تو عظمت خداوندی کی عظیم الشان لہریں موج مارتی ہوئی دکھائی دیں گی اور آپ کو اسی کے بچنے میں آسانی ہوگی کہ کیسے لوگ کسی بڑے انعام کے شایان ہیں۔ ایسے لوگ وجود خداوندی کے یقین اور مرکز اخلاق کے مظہر صفات ہیں۔ ان کا دوزنی یقین دوسروں پر اثر ڈالنے کی قابلیت رکھتا ہے۔ میوا گلن ہے کہ بعض لوگ میرے اس کہنے پر غیر متصورانہ حیرت جائز رکھیں گے کہ میں حسینؑ کے واقعات کو روئے کے لیے نہیں لکھ رہا ہوں۔ حسینؑ سے چھوڑی کو تو تمہاری انسانیت کے ریشوں سے مہلکت ہے۔ بلکہ میں اس لیے پیش کروں گا کہ تم خوش ہو۔ اپنی جگہ سے ہل جاؤ اور تمہارے دل کا ہر ریشہ سچ اٹھے کہ : ج

ایسے بندے چاہیں تیری حسدانی کے لیے

ایک مصیبت دوسرے کا پیش خیمہ تھی حسینؑ کی مصیبت کی بھی شان نہیں ہے کہ ان پر کوئی صبر بڑھ کر اور ہر ایک مصیبت دوسرے کا پیش خیمہ تھی۔ اس مصیبت پڑی کوئی نہیں۔ بہت سی ایک سے ایک

حسینؑ نے اپنے بعد مصیبتیں برداشت کرنے کے لیے پس ماندوں کو تیار کیا جو تے وقت حسینؑ کو مختصر فصول میں شہید

یہ تسکین نہ تھی کہ ہم نے جام شہادت نوش کیا اور غلغلیں کم ہو گئیں۔ بلکہ یہ بھی عجیب تھا کہ ابھی سب سے بڑی توہین یعنی اہل بیت کی اسیری ہوتی ہے۔ اس کے لیے حسینؑ نے پس ماندوں کو حیدر کیا۔ حسینؑ کی اس وصیت نے اہل بیت کی وہ حسینؑ پر شرافت قائم رکھی جس نے اس اشرف المشرقاہ کی وجہ کو بڑی مدد دی۔ ان کی توہین کرتے وقت توہین کرنے والے ذلیل ہوتے تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ ان کی عظمت کو گھٹانا ہیاد سے اختیار میں نہیں ہے۔

شہادت حسینؑ کا اطلاق صرف حسینؑ کی شہادت اور اہل بیت کی اسیری پر نہیں ہوتا بلکہ اسلام کے امام اور ماموم بتیہ بہترین نفوس کے غلوس، جانہازی، وجہ حق کی مدد، غلوں کی طرف سے لبروائی کا وہ حکم الملک مدکرہ ہے جس کے طرف لی آئندہ اور ابن مریم الیاذر جوزفس اور جوڈایا ان کے رھمہ کسی مناسبت پیدا کرنے کے خیال سے نظر نہیں کر سکتے۔ ایسے ماموم کے لیے حسینؑ کا ایسا امام اور ایسے امام کے لیے ایسے ہی پیرو ہونے چاہیے تھے جے شاعر بھی نیم مقزوانہ وجہ اور نیم حیرت سے کہتا ہے کہ:

”اللہ اللہ امام ایسا ہو پیرو ایسے“

قربانی حب جاہ یا حصول اختیار کے لیے نہ تھی ان کا شوق شہادت ایک دوسرے پر سبقت کرتا۔ ان کا ایسے وقت غلظ مرہب

کا خیال، ان کا زندگی سے غفر کی حد تک خطر ہو جانا اس لیے کہ اچھے لوگوں کے گرد و پیش کے حالات ان کی برداشت کی حد کے باہر رہے تھے ایسی حالتیں ہیں جو منظور دماغ کو اپنی طرف مٹتی ہیں اور وہ سوچتا ہے کہ کیا اس کا خواب بھی دیکھا جاسکتا تھا کہ انھیں اس غلوس، حق ردی، اور جانہازی کے عوض میں کسی دنیاوی آسائش کی امید محمد اس کی عظمت میں اور زیادتی ہوتی ہے۔ جب اس پر غور کیا جاتا ہے کہ ان میں زیادہ تر ایسے لوگ تھے جو بڑے حلیہ اور زاہد تھے اور جن کے قدس کا غور ذوق مختلف معترف تھا۔ ان میں اسلام کی نمود اور ترقی کا مثالیہ تھا۔

دنیا کی دلفریبیاں پیش کی گئی ہیں اس کے مکن میں حسینؑ کا ساتھ چھوڑ دینے پر دنیا کی دل فریبیاں مال و جاہ کے حوصلے اور زندگی کے اقرار کچے گئے تھے لیکن

ان بندگان حق کے لیے حسینؑ کے لب تشہد اور فلقہ کش ذات سب کچھ تھی۔ انھوں نے فلقہ، پیاس اور شہادت کو ارا کی اور دشمنوں کے دھروں کو ان کے منہ پر گھنچ مارا۔ کبھی حق و باطل کے تفسیر اور پھر کے لیے انسانی ارادہ کو ایسا روکھا وقت نہیں ملا۔

مرقع مرقع جلاوی گے جس میں تھی دامن اپنے شوہر کو حسینؑ پر مدد ہونے کے لیے بھیجا رہی ہے۔ شوہر اپنی پیسوں کو طلاق دے رہے ہیں، اس لیے کہ اپنے شہید ہونے کا یقین ہے۔ عورتیں اپنی اس شرعی میوڑی پر کہ انھیں اجازت جہا نہیں ہے۔ تاسف کرتی ہیں۔ مانیں اپنے بچوں کی محبت بھول گئیں اور اپنے لخت جگر کو آغوش سے بھیج کر حسینؑ پر مدد ہونے کے لیے بھیجا رہی ہیں اور دودھ بچنے کی شرط زخم کھاتا اور شہید ہونا قرار دے رہی ہیں۔ ہاں اپنے بیٹے کو آنکھ کے سامنے دم توڑتے دیکھتا ہے اور اس کے اس پر غم ادا پر مرہا کہتا ہے۔ مگر ٹھکستہ بوڑھے رحمہ دار ہاتھوں سے نکواری اٹھا رہے ہیں۔ بچے قتل ہو رہے ہیں۔ جن کے ادنیٰ ایذا دینے کے خیال پر دنیا کا سب سے بڑا

بے رحم نامرد شرمانے لگا۔

ناگرم سے یہ خواہش کرتا ہے جانہ ہوگا کہ وہ اس پر غور کرے کہ عورتوں بچوں پڑھوں اور دوستوں کا ایسا بکھا ہوا خالص دکھوار نہ جوش کبھی اور بھی ان کی نگاہ سے گزرا ہے اور اگر کوئی ان میں سے کسی خاص شان کو دکھا گیا تو آیا ان اسباب اور اتفاقات میں جن میں حسین اور ان کے رفقا گمرے ہوئے تھے جو قصہ کوئی مقابلہ کے لیے لاتا ہے اس کا ہیرو کس خاص غرض سے اس کا مال ہوا، وہ فوری جوش تھا یا حسین اور نجدہ تصفیہ آیا اس کے لیے کوئی دوسری راہ مصلحت سے بچنے کے لیے دکھائی گئی تھی یا نہیں، یا اسے بیز جان دینے کے چارہ نہ تھا۔ میرے پیراں انتہام، مجھے یقین ہے کہ راستہ ہائی خیریت سے بڑھ کر تھری کی حد تک پہنچ گئے ہیں اور میں اس میں کوئی زری نہیں پیدا کرنا چاہتا۔

حتمًا ہم دو باتوں کا اور تذکرہ کریں گے جن دو اور باتیں جس سے مولف کی غرض تذکرہ سے زیادہ نہیں ہے۔ کے لیے اگرچہ ہمارے پاس زبردست حلی ثبوت نہ بھی ہوں لیکن یقین ہے کہ ان سے اعراض کرنا واقعہ پر اثر ڈالنے والی ایک نمایاں شان سے چشم پوشی ہوگی۔ لیکن میری غرض تاریخی مذاق تحریر کے لحاظ سے یہ نہ ہوگی کہ اس سے خواہ مخواہ ناظرین پر کوئی خاص اثر پڑے بلکہ یہ بہت کچھ انسانی طبائع کے رجحان پر موقوف ہے۔ کیوں ایسا ہوا؟ اس کے لیے نہ میرے پاس دو اور دو چار کی طرح کوئی ہندسہ ہی موجود ہے اور نہ غالباً طبیعت انسانی پر ایسے اتفاقات کے منکر کے پاس کوئی تسکین دلانے والے ثبوت ہیں۔ مگر جہاں یہ سب کچھ ہے وہاں انسانی تجربہ مجھ سے زور سے یہ کہہ رہا ہے کہ اس کا امکان نہ صرف حسین کے ساتھ تھا بلکہ تمام انسانی کے لیے ویسا ہی ممکن الوقوع ہے۔

خواب میری غرض شہادت حسین کے متعلق بہت سے خواب سے ہے۔ خواب جے فراعنہ مصر، ابراہیم اور یوسف دیکھ سکتے تھے اور جس کی تعبیر یوسف اور اکثر انبیائے نبی اسرائیل کو ہلو شاہوں کی نگاہ میں دھت دے سکتی تھی جے خود حسین کے جد امجد دیکھ کر متاسف ہو سکتے تھے اور جے مولانا مہتمم انام علی بن ابی طالب ملاحظہ فرما سکتے تھے اور حسین کو صبر کی نصیحت فرما سکتے تھے۔ وہی۔ خواب۔ حسین بھی دیکھ سکتے تھے۔ میں اپنی روشی قریر سے اعراض کے لیے استثناء نہ کرتا اگر تکلیف زمانہ کے ملاحظات کے الفاظ اور خیالات میں ویسی یک جہتی نہ ہوتی جیسے کہ شہادت حسین کے لیے ہوتی۔

ناظرین میں سے کم و بیش اکثر کو ایسے خواب دیکھنے کا اتفاق ہوا ہوگا جس کی تعبیر قریب قریب ویسی ہی تھی جیسا اس عالم میں دیکھا تھا۔ اگرچہ خواب دیکھنے اور تعبیر پانے کے درمیانی زمانہ میں اس پر مطلق غور نہ کیا ہو، اور تعبیر پانے پر اخص متا خیال آگیا ہو کہ ہم نے ایسا خواب دیکھا تھا۔ یہ یاد آجنا ملاحظہ کی تازگی تھی لیکن یہ کسی طرح خیال میں نہ تھا کہ ہم نے کبھی اس مضمون خواب پر اپنی یاد میں غور کیا ہو یا اپنے سوچنے اور خواب دیکھنے کے درمیانی زمانہ میں متعلق اس مضمون پر مصر رہے ہوں۔ ورنہ یہ طے کر لینا آسان ہوتا کہ ہمارا یہ خواب ایک بہت پیشتر کچھ قبل سوچے ہوئے سلسلہ کی تازگی تھی۔ اگرچہ میں سوچنے کے ارادہ کا احساس نہ ہوا ہو، نہ میں اس سے تسکین ہے کہ تعبیر خیز خواب کی مثال سید اری کے اس بیج غور کی طرح ہے جس کا وہی نتیجہ ہوا ہے وقوع کے قبل ہم طے کر چکے تھے۔ اگرچہ یہ بیانے خود خدا کی بڑی رحمت ہے۔ لیکن

غواب میں ہم تماشا گر نہیں ہوتے بلکہ تماشا شائی ہوتے ہیں۔

نفسِ انسانی کو کسی عظیم الشان اور پر راز قوتوں کا مرکز ہے۔ اس کے اثر ڈالنے اور اثر لینے کا میدان کس قدر وسیع یا کس قدر محدود ہے۔ اس کے کون سے ذرائع ہیں۔ یہ سب میرے تعقیب سے باہر ہے۔ لیکن یہ کہنا شاید کوئی بحث نہ ہو کہ نفس کی تمام عظمت اسی کی تربیت اور بے آکودگی پر موقوف ہے۔ ہم اکثر اس کا حس نہیں کرتے کہ چارے نفس پر کیسی لہری قدرت کے ناقہ نامی خزانہ رحمت سے پلتی رہتی ہیں۔ لیکن انسان ہی اس کا حس کرتا ہے۔ اگرچہ اس کے بعد تمیز کرنے اور معنی سمجھنے کے مدارج باقی رہتے ہیں۔ یہ سب اس کے لیے آسان معلوم ہوتا ہے جو حس اور تمیز کرنے کے بعد قربت سے مطالعہ کرتا ہے اور سمجھنے سے اپنے کو مشغل نہیں کر دیتا۔ یا ایک بے معنی تخیل کج کر اسے اندازہ کے قابل نہیں سمجھتا۔ کون کہہ سکتا ہے کہ یہ اسی قدر قانون قدرت نہیں ہے جس طرح ظرت کے آسانی سے کج میں آنے والے اور قوانین ہیں۔ قدرت کی کوئی زبان اس کے لیے گویا ہو جاتی ہے۔ جو اس کے معنی سمجھنے کی کوشش کرتا ہے اگرچہ اس کے بعد وہ خود گونگا کیوں نہ ہو جاتا ہو۔

کئی شخص کسی غواب کو جو نتیجہ کی طرف لے جانے اقبال کہہ سکتا ہے۔ اس سے اس کی عظمت تنہا اتفاق نہ تھا۔ میں کمزوری پیدا ہوتی ہے۔ لیکن ہم کسی تنہا اتفاق کا ذکر نہیں کر رہے ہیں بلکہ غواب کے وجود تاریخی کی مثالیں اور تجربہ انسانی کے اندر داخل ہونے کے دعویٰ کے بعد یہ بھی کہہ رہے ہیں کہ ہم جس غواب کا ذکر کر رہے ہیں اس کے تکرار و تشکیک پاک دماغوں میں اتفاقِ عدد سے کچھ زیادہ ہوتے۔

اور انہوں نے اسے کوئی بے معنی تخیل یا غواب کو اس کے حکم منہدم میں بے حقیقت نہیں سمجھا بلکہ ان پر وہ اثر ہوا جیسے کسی پر مین واقعہ کے بعد ہوتا۔ یہ ان کی صحیح حس، تمیز اور معنی فہمی تھی۔

پیشین گوئی کی احادیث ہماری دوسری بات شہادتِ حسین کے متعلق پیشین گوئی کی احادیث ہیں۔ جس کے متعلق مسلم حضورؐ دیر میں ذکر کر رہے گئے۔

ہماری دانست میں جو کچھ لکھا جانے والا ہے وہ اس سے بہت کم ہے جو لکھا جاتا ہے۔ چاہیے تھا۔ وہ حیثیت جو اس وقت سوانح عمری کی ہوتی چاہیے، ایک تیرہ صدی قبل گزرے ہوئے بزرگ کے متعلق مرتب ہوتی دشواری ہے۔ آسانی ہوتی اگر ان مشاہیر کے انداز، رفتار، گفتار، شکل، پسندیدگی، معاملت وغیرہ وغیرہ کی حکایتیں پوری حیثیت اور آسانی سے دستیاب ہوتیں اور اگر کوئی واقعہ ہوتا تو اس کے اسباب محنت اور کج داری سے مرتب کیے ہوتے ملتے جس سے ہر شخص کو نتیجہ نکالنا سہل ہوتا۔ دانے بر محل اس بزرگ کے جس کی سوانح عمری لکھے جانے کا وعدہ کیا گیا ہے۔

اس کی دشواریاں سمجھنا مشکل نہیں ہے۔ ایک بات ہو تو کہی جائے۔ وہ شخص جس سے اور جس کے خاندان سے ملکی، مذہبی، معاشرتی مخالفت اور مغایرت پیدا کرنے کے لیے کل کوششیں صرف کی گئیں، اس کی پوری حالت سمجھنے کا تو وہی دعویٰ کرے جس نے مخالفت گروہ کے وہ خفیہ احکامات دیکھے ہوں جو عالموں کو دیے گئے، اور حصّیں زہا ششی سے عربوں کو

اپنا فرائض بنالینے کا طریقہ معلوم تھا اور جوان کل ممکن وسائل کو جوان کی غرض پوری کرنے کے لیے بکار آمد ہو سکیں، صرف کرتے تھے بہت سی دستاویزی جو مکمل حیثیت سے واقعہ کے کھنچے میں معین ہوتیں ایک آدھ فقرہ سے زیادہ نہیں لکھتے۔ اکثر اوقات نہایت مفید واقعات کے اشاروں اور نام لینے کے علاوہ مؤرخین میں نہ تفصیل کا کوئی خیال ہوا، اور نہ انہوں نے آئندہ نسلوں کی اس ناقابل تسکین حالت کا خیال کیا کہ جس واقعہ کو وہ اس کند حیثیت سے ختم کیے دیتے ہیں اس کے متعلق بہت سے فلسفی سوالات سے کسی کو روکنا اس کے ساتھ بے رحمی ہے۔ بہت سے مقامات پر تاریخ اس طرح خاموش ہے کہ مورخ کی تاریخی سے دم گھٹنے لگتا ہے اور پھر اس کے کہ معلومہ حالتوں سے لا معلوم حالات کے لیے قیاس سے مدد لی جائے اور کوئی دوسری صورت راستہ ٹٹولنے اور نتیجہ کھنچنے کی کوششیں نہیں آتی۔ تاریخ کی بدفہمی سے وہ مقامات ایسے نہیں ہیں جن پر بلا کافی غور کے گزر جانا مناسب حال اور واقعہ نگاری کے مستحق مقامات ہو۔

ہم کیونکر بڑھیں گے اس کے ملزم ہم نہیں ہیں کہ کیوں ہماری تاریخ پوری نہیں ہے۔ حکومت ہماری تاریخ پر قابض تھی۔ اس سے ظاہر ہوگا کہ ہم اکثر مقامات پر انگڑے لوٹے واقعات کو تسلیم واقعات کو کر آگے بڑھنے پر مجبور ہوں گے۔

دوسرے مقامات جو حسین کے کھنچے میں مدد دیتے ہیں جہاں متذکرہ صدر دشاویوں کا سامنا ہے وہاں متعصب مؤرخین کی ناانصافی اور غلط انداز سے ہم مقابلہ نہیں ہے، یا اسی طرح کی اور بعض وحسد اور ذلیل فحاش تحقیقی میں ڈھل جاتی کوششیں جن سے اثر زائل کرنے کی آمادگی ظاہر کی گئی۔

قوتِ تخیل کا مصروف اکثر ایسے لوگوں نے جن کے دوستدار حسین ہونے میں ہمیں کوئی شبہ نہیں اپنی بہت درجہ عقل اور معلومات اور ناہمانہ کوشش ترقی کے جوش میں ایسی ایسی کہانیاں بھی کہی ہیں جس سے انہوں نے قصص الانبیاء کی نیم تاریخی حیثیت کو اپنے درجہ سے اور بھی گرا دیا ہے۔ انہوں نے ایک تنہا تامل و بتانی چاہی ہے اور یہ سب غالباً اس لیے کہ ملت چلتے تھے حسین کے واقعات بیان کرنے میں چاشنی پیدا کریں گے۔ ان کی قوتِ تخیل نے حالتِ الہی سے ٹھوکر کھانے کا کہیں ارادہ ہی نہیں کیا ہے اور نہ انہیں اس کا خیال رہا ہے کہ ہم اپنے غلو میں ایسی باتیں تو نہیں کہہ رہے ہیں جو ان نفوسِ قدسی کے خصائل کے مفاتر ہو۔

آئندہ کے لیے قابلِ لحاظ باتیں بہر حال جو کچھ دستیاب ہوا ہے گزشتہ مشکلات کی خیال کر کے بڑی حد تک قابلِ تسکین ہے۔ اگرچہ اکثر واقعات اور اشارات، الفاظ اور

اظہار کی صدا بہت دبی ہے لیکن اس کی صدائے بازگشت نہایت ہی عظیم ہے۔ گو اکثر فقرات اور الفاظ نہایت مختصر ہیں مگر غور میں وہ ایک دفتر معلوم ہوں گے اور اپنی پس منی کی تحریک سے تاریخ کی جلدوں اور ان کے تاریک مقامات کو روشن کر دیں گے۔ یہ پوری طرح کچھ میں آجائے گا کہ یہ چھوٹی سے لڑائی ملی، مذہبی، معاشرتی اور خاندانی تھی یا کل کا مجموعہ تھی۔ حسین سے لڑنے کے لیے یزید کے سپاہی اور انہیں اس معنی میں آئے تھے اور بھیجے گئے تھے کہ ہلا شہ کے حکم کے عام مفہوم میں اطاعت کریں یا اس سے کچھ زیادہ تھا۔ کس خداد کے لوگ بھیجے گئے تھے اور حسین کے حیرت خیز بہتر

کس بارے کے لوگ تھے؟ یہ بتایا نہ تھا کہ حق و باطل کا مجسمہ لڑ رہا تھا۔

واقعات کا جائزہ کیوں نہ لیا گیا میں اب تک بعض دشواریاں بیان کر رہا تھا جن کا تعلق کچھ تو زمانہ سے تھا جن میں یہ واقعات ہوئے۔ کچھ مورخین کی قطع و برید یا تعصب سے

اور کچھ تاریخ نویسی کے مذاق سے۔ اب میں اس پر کسی حد تک غور ڈالتا ہوں کہ واقعات کا یہ حیثیت موجودہ حسین کے ہمدردوں نے ایسا جائزہ کیوں نہ لیا جو ایک زمانہ حال کی اشتہا کے موافق سوانح عمری کی صورت میں ہوتا۔

ان کے سمجھنے کی فطری کوششیں کیوں نہ ہوئیں یہ تو سب جانتے ہیں کہ سید شہید کے

اور یہ کہ حسینؑ والدین کی طرف سے ہائی تھے، اور کوئی مسلمان جس کے قوم کی تعداد اس وقت تک عالم میں تیس اور چالیس کروڑ کے درمیان ہے، یا جو آج سے سید پوری تک ملت اسلام میں پیدا ہونے سے مشرف ہوئے۔ ایسا نہیں ہے جو یہ نہ جانتا ہو کہ اللہ کے پدربزرگوار، ملور گرامی اور جد عالی مقدار کا نام کیا ہے۔ یہ علم ہر مسلمان جاہل اور عالم میں قدر مشترک ہے

اعتقاد کی کفایت نے آگے بڑھنے نہ دیا اور اس کے بعد بغیر کسی کوشش کے غلامانِ نبوت کے زیادہ تر نفسی سلسلہ کے لحاظ سے لوگوں میں ایک

ردِ مانی وقعت پیدا ہوتی ہے جس کے بعد وہ کسی نقیض اور اضافہ معلومات کو اعتقاد کی موجودگی میں غیر ضروری سمجھ کر اس طرح چپ ہو جاتے ہیں کہ حقیقت ان کے سمجھنے اور ان کے متعلق وہ معلومات حاصل کرنے کے خیال کی۔ جس سے ان کے سمجھنے میں مدد ملتی۔ صورت کیا معنی صورت کا معمول سے معمولی خاکہ بھی سمجھنے نہیں پاتا اور جب خیال ہی اپنی جگہ وجود پذیر نہیں ہوتا تو اس کے ترجمان یعنی الفاظ ہی کیوں پیدا ہوتے اور جب الفاظ نہ تھے تو کیونکہ سمجھنے کا کوئی دھڑ ہوتا۔ اور ایک خیال کو دوسرے سے مدد مل سکتی اور جب شرع نفس کے مولف نہ تھے تو فلاح کا وجود کیونکر ہوتا۔ حسینؑ یا ان کے آہانے ظہور کے سمجھنے کی روش زیادہ تر ایسی تھی اور ہے جس طرح وہ بچہ جس کے منہ میں ابھی الفاظ نہیں بنے ہیں کسی مٹھائی کو پھیلان کر دوڑتا تو ضرور ہے لیکن نہ وہ اس کے فائدہ سے واقف ہے اور نہ اس کے عناصر اور ساخت اور بنانے والے اور بازار سے واقف ہے۔ جہاں مل سکتی ہو نہ یہ جانتا ہے کہ اسے کیا کہیں اور اس کے متعلق کیا کہیں۔ ماں باپ کے چاٹ دینے سے اتنا ضرور ہے کہ وہ صورت آشنا ہے اور لذت کا حس اس میں پیدا ہو کر اس کی طرف اس کے تمام احسنہ کو پھیر دیتا ہے۔ اس کا ہلکا ساری گویائی ہے جو اس کی داستانِ شوق کھتی ہے۔

محبت کے فرائض اتفاق ہے کہ ہم حسینؑ کے نام سے درائتہ واقف ہوتے آئے ہیں ادب اور محبت کا ایک درشہ ہے جو ہم تک پہنچا ہے۔ اور ہم میں نالوفے فیصدی تو یہ بھی نہیں جانتے

کہ ان نفوسِ متدی سے اس اتفاقِ واسطی کو کیا کہیں اور یہ گھناوت بہت دور ہے کہ ادب اور محبت لے ہم پر کیا کیا لازم ٹھہرایا ہے اور ہم کہیں کہیں اپنے خیال میں ان کے مناسب ادب اور محبت کے منہ فرائض کی شناخت سے کمی کرتے ہیں۔

اور ہمیں یہ بھی خیال نہیں ہوتا کہ ہم نے کوئی خلاف ورزی بھی کی یا نہیں۔ ہم کو احساس نہیں ہو سکتا تھا جب تک کہ ہم ان کو نہ پہچانتے ان کی صفات سے واقف نہ ہوتے ان کے عمل اور طریقہ عمل کی غریبیاں بھاننے کے لیے مناسب الفاظ نہ ہوتے کہیں سے ہوتے۔

دوسرا درجہ اعلیٰ اور اعلیٰ دیکھو جو حسینؑ اور واقعات سے واقف ہیں یہ اپنے اظہار و افعال میں سرشار ہیں اعلیٰ حسینؑ کے نام کی محبت کا عجیب اثر خیر حالت تک ہے۔ اعلیٰ ان کے واقعات کی تکرار میں ایک غیر فانی طبع ہے اور ان کا تمام اظہار و افعال اس اپنی یہ شرح کر سکتا ہے کہ ہم رسولؐ کی فدیہ امت کے اس گرافر کاٹا اور اس روش کا جس کا ترجمہ لا تُوِيْدُ مِنْكُمْ جَنَّةٌ اَوْ لَا شُكُوْنَا (دھر: ۹) سے ہوتا ہے۔ مفکورہ جوں جوں دے رہے ہیں جو ان کے آخری لحظہ تک اعلیٰ ہمارے متعلق فراموش نہیں ہوا۔ اور اس کے بعد وہ بھی کھو جاتے ہیں۔

بلند تر درجہ حسینؑ سے نہ صرف واقف ہیں بلکہ وہ تاریخ اسلام کی واقعہ دانی میں بھی کسی کی کے مورد الزام نہیں ہیں۔ ان کی تمام تر کوشش اس مصلحت کی پیروی ہے کہ ذکر حسینؑ حوالہ عام کیا جائے اور ان کی غم انگیز حالت سے لوگوں میں ہمدردی پیدا ہو۔ وہ اپنی قابلہ قدر میں فلسفہ اخلاق کے لطیف سے لطیف مضمون کو اٹھا نہیں رکھتے۔ وہ شجاعت، سخاوت، شرافت، ایثار، فطرت، زہد، قوتی غرض کہ کل عمدہ صفات کی روایتیں بیان کر جاتے ہیں۔ یہ سب ممدوح ہے۔ لیکن ان کی مثال اس سائنٹسٹ کی ایسی ہے جو گوشت خون اور ہڈی کے اجزاء طعمہ طعمہ کر سکتا ہو لیکن روح نہ پیدا کر سکتا ہو۔ اور جو روح کے بھاننے کے لیے ایسے خیالات سے بھٹکا ہو کہ ہمارے دلوں کے اجزاء کا انتہائی شور و جوش ہے یا بھگنے کے لیے چھوڑ دیا ہو۔ بلکہ جو اپنے قیامات میں اس حد تک بھی نہ پہنچا ہو کہ ہمارے دلوں کی احترام کی ایک کیفیت کا نام روح ہے۔ سائنٹسٹ اپنے غلط یا صحیح قیامات کے ساتھ مسلسل کوشش کر رہا ہے۔ دراصل یہ کہ وہ جن سے ہم حسینؑ یا ان کے آہانے ظہور کے بھگنے کی امید کرتے ان کی کوششوں کا راستہ تعارف طبعی کے قریب نہیں ہے۔ ان کی سعی مفکورہ ضرور ہے لیکن اس کا غشا اگر فطرت اور اس کی خصوصیات کے صحیح تعارف کی کوشش پر

مبنی نہیں ہے تو اس سے ہاں جو ذکر کی تکرار کے یہ امید دور ہے کہ ہم میں ان کی قریبی معرفت سے وہ کیفیت پیدا ہو سکے گی جسے ہم معنی دار "محبت" کہہ سکیں۔ بلکہ اس کا نتیجہ محض یہ ہوگا کہ ہم ان کے دشمنوں کو پہچانیں اور ان سے نفرت کریں۔ شر سے محض نفرت خیر کی طرف عمل حرکت نہیں ہے۔

کرنابھائی کا پہلا قدم ہے لیکن شر سے محض نفرت خیر کی طرف عمل حرکت نہیں ہے۔ ہم نے اگر برانہ کیا تو اچھا بھی نہ کیا۔ نتیجہ وہ جن سے بہتر امر کی امید کی جاتی انھوں نے ایک امر کے دو پہلوؤں سے پست تر کو قبول اور اپنا طرز عمل قرار دیا ایسا کرنا بھی ہو یا نہ ہو لیکن قابل تعریف نہیں کہا جاسکتا۔ یہ اعرابی حالت زیادہ تر "وقت" کے نام سے چھاری جاسکتی ہے۔

مؤلف کا ایک خیال کسی تنہا شخص کا سوچنا مطلوبہ حد تک شاید مفید نہ ہو لیکن غالباً یہ سوچنا وقت بلکہ وقت کی بہت بھر کی بات ہو کہ آیا میں اپنی روش کو معکوس کر دینا مناسب ہے یا نہیں، یعنی ہماری کوششیں زیادہ حسین اور ان کے آہانے ظاہرین کے سمجھنے اور ان کی صحیح سمجھت پیدا کرنے کی طرف راجح ہوں بہ نسبت اس کے کہ ہماری غرض اولیٰ ان کے دشمنوں سے نفرت پیدا کرنے کی ہو۔ دشمنوں کو تو موت اور نفرت نے ڈھنپ لیا لیکن ہماری غرض اور اصلی کوشش کو اس سے سیر ہو کر حسین اور ان کے آہانے ظاہرین کی صفات کے روشن کرنے سے فائل نہ ہونا چاہیے۔ محض ذکر کرنا اور سننا نیند میں بات کرنے اور سننے سے شاید ہی بہتر ہو۔

ہماری خصوصیات کو ان کی صفات کے ممتاز ہونا چاہیے اگر وہ اعلیٰ صفات ہمارے خصوصیات کا امتیاز نہ ہو سکیں یا نہ کی جا سکیں۔ ”ہونے تو گرفت ہو“ کافی نہیں ہے جب تک ”ہونے تو گرفت“ تک ترقی نہ کی جائے۔ یہ ان کی خواست کے منصب معرفت بغیر ممکن نہیں ہے۔ میں پسند کرتا ہوں کہ آرمیل مسٹر ہوڈور مارکس نے اپنی تازہ تفسیر میں مشرق کے (جس سے ہندی مسلمان مراد ہوں) درستی خصائل کے لیے حسین کا نام لینے کو ترجیح دی ہے۔

غفلت کے اسباب گزشتہ غفلت کے اسباب میں زیادہ واضح قوم کی صفات قوی کے احساس کی پست حالت، کسی ظلم و فحش کی ناموجودگی، تاریخ کا مناسب طریقہ سے مدد مطالعہ سمجھنے اور کہنے والوں کا خیال کی اس حد ترقی پر نہ پہنچنا جو کوئی اعتقاد سے بلند ہوتی اور ایک تالیف حسی کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی۔ ایسے لوگوں کے اظہار خیال میں کئی جرات جو کہنے کے شاہان ہوں لیکن اس طرح کو حوام کے جھلک بولنے یا اختلاوی روش سے عقلی نقیض تک پہنچنے تک محدود رہتے ہیں یا ان میں باوجود خیالات کی پختگی کے اظہار خیال کے لیے مناسب الفاظ کی کمی ہو۔

چند ماموین کے نام جو مرکز کی دلیل تھے میں اس سے کوئی تعرض نہیں کرتا کہ ان نفوس قدسی کی معرفت حق معرفت تک ممکن نہیں ہے میں کہہ رہا ہوں کہ ہم ہاسر، جبر، حبیب بن مظہر، قنبر، ابن سکیت وغیرہ بھی نہیں ہیں چہ جائے کہ اس سے زیادہ بلندی کا حوصلہ کریں۔ لیکن جب میں ان وہ شعاردوں کا نام لے رہا ہوں تو یہ بھانے کی خواہش ہے کہ زمانہ گزشتہ موجودہ کے سمجھنے کا ایک مناسب ذریعہ ہے۔

ان میں کیا تھا جو ہم میں نہیں ہے اس کے بعد یہ سوچا جاسکتا ہے کہ کیوں یہ لوگ ایسے تھے اور ہم کیوں ایسے نہیں ہیں ان میں کیا تھا جس کی ہم میں کمی ہے۔ محض مشاہدہ اگر ان کا اس صفات کے قابل ہو تا تو سب دیکھنے والے ایسے ہی ہوتے۔ یہ ان کی پسندیدگی، میلان اور حالت جذب قوی جس نے انہیں وہ تو نہیں بنایا جس میں جذب ہونے تھے لیکن ایک ایسے نوع کی تخلیق ہوتی جو اپنے مرکز کا نشان بناتی اور جو ہر طرح ایک امام کے سچے ماموم کہے جاسکتے۔ ان میں سے ہر ایک بڑا علم نہ تھا لیکن حمد عمل کا حامل ضرور تھا اور صفات کی پسندیدگی نے اسے آخر میں اس کا خالصہ طبعی قرار دے دیا تھا۔

اصول جذب اور وراثت صفت کی احادیث ہم نہیں جانتے کہ ”مسلمان منی اہل البیت“ کی حدیث اور کونسا اصول کھلتی ہے یا اس روایت میں کہ ”ہمارے دوست اس مٹی سے بنے ہیں جو ہم سے بچ رہی تھی“ طینت کی ایک رنگی کے لیے کیا حوصلہ دلایا گیا ہے۔ بلکہ ان کے صفت کی وراثت اور اس کے داشت کی عظیم ذمہ داری ہمارے حوالہ کی گئی ہے۔

بلند ہونے کے لیے مذاہب کی مثالیں ہم ہندو نہیں ہیں جو یہ کہیں کہ ”اہم برہما“ (میں ہی برہما ہوں) جو ”انا الحق“ کے قریب المعنی ہے۔ نہ بودہ ہیں جو یہ سوچیں کہ ”ہر شخص بودہ ہو سکتا ہے۔“ ہم مسلمان ہیں اور اس پر افتخار ہے کہ ”یا بن آدم اطعنی حق اجعلک مثلی“ تینوں بڑے مذاہب کے طریزیان احتیاط اور انتخاب الفاظ کا موازنہ کرو۔ اگر تمہیں دل چاہی ہو اب کس نے میں حوصلہ کرنے سے منع کیا ہے۔

قانون ارتقاء لیکن ملوہ خوردن را ردی پایید، شیر شاہ بود یا غولین، دونوں میں سے کھاتی ہمدستان اور یورپ کا دفعہ پادشاہ نہیں بن گیا۔ اور نہ کوئی انسان ہوش کے استدا سے نبوت کرنے لگا ہے۔ نئی ہوا اتفاقات کا کھلونا کوئی آدمی، اُسے ضرورت قانون ارتقاء کے پیچھے چلنا ہوگا۔

ہم کیوں نہیں سمجھتے حسین ہوں یا ان کے آبا نے ظاہر ہم احمیں نہیں سمجھتے اس لیے کہ ان نفوس قدسی کی سطح ہم سے بہت بلند ہے اور کوئی غیر مسلسل لنگڑی کوشش جو طبعی حس نقیش کپی جاسکے اپنے لیے دفعہ راستہ تلاش کرنے میں کم ہو کر رجعت فقری میں اپنی تسکین اور بچے راستہ ٹٹولنے کو اپنی نقیش کی کامیابی سمجھتی ہے۔ میں نے ایک مرتبہ نہیں سوچا ہے کہ زندہ قومیں بہ نسبت ہمارے حسین کو بہتر کج سمجھتی ہیں۔ ایسے مؤرخ ہوں یا سوانح نویس جنہوں نے واقعات کے کم و بیش فراہمی پر قناعت کی ہے ان سے بھی یہ امید نہیں کی جاسکتی کہ وہ اپنے فرائض کامل حد تک ادا کر چکے بلکہ ان کا حکم یہ اس حد تک لازم ہے کہ انہوں نے واقعات کو فنا ہونے سے بچالیا اور بس۔

اب اور اس کے بعد کے فرائض یعنی روٹی مچھوڑی کہ موت کا تار اور کپڑا پانا جائے کہ وہ پہننے کے قابل ہو۔ ورنہ محض فطری اگر کبھی منسید تھی تو آج نہیں ہے۔ رٹی ہوئی اور سنی سنائی باتوں کا اگل دینا کافی نہیں ہے، بلکہ خود کرنا اور کھنا ہوگا کہ آئندہ کہنے کے قابل ہو سکے۔ غالباً وہ واقف نہ تھے کہ واقعات کی صفت بندی اور مناسب یک رنگ انتخاب ملتے اور ایک دوسرے کو مدد دیتے ہوئے واقعات کی ترتیب اور ایک سبب کا کئی نتائج پیدا کر سکتا اور کسی طبع کے نتیجے کے کچھنے کے لیے محض تفصیل واقعہ سے سیر نہ ہو جانا، بلکہ فکر کو یہاں تک بڑھاتے جانا کہ آئندہ اس کے متعلق مناسب مدد ملنے کی امید رہتی نہ رہے اور اس مجموعہ کو کسی منفرد واقعہ سے سمجھنے کے لیے زیادہ موزون کھانا ان کے نزدیک وقت کا مناسب مصرف اور کوشش کا قابل تعریف شعار نہ تھا۔ یا کاپلی تھی یا ان کا خیال تاریخ نویسی اس حد تک نشوونما نہ ہوا تھا۔

ترتیب پیش بینی اور پس بینی زبان پیدا کرتی ہے

اور ایسی پیش بینی یا پس بینی سے گوشتے واقعات میں زبان اور مردہ سوانح میں جان پیدا ہو جاتی ہے۔ بے معنی حروف کی ترکیب اگر معنی دار لفظ پیدا کر سکتی ہے تو مناسب خیالات اور فقرات کی ترتیب اور ترکیب سے کیونکر تاریک اور گوشتے واقعات میں روشنی اور گویائی نہ پیدا ہوگی۔ زمانہ نے محض مؤرخ کے قابل تعریف درجہ کو ویسا اعلیٰ نہیں رکھا بلکہ باایلا جٹ (علم روح جانتے والے) مؤرخ کے لیے جگہ خالی کی۔ مؤرخ چاہیے جو کسی واقعہ کے لیے حلت کا شکر کرے اور اس کے شوے ایک نتیجہ بکھاسکے۔

میں یح تعفیہ کی دشواریوں سے واقف ہوں اور اس لیے ہر شخص سے اس کی امید نہیں کرتا، خصوصاً جب کہ غیر محبی بہ عقل اعتقاد اور تعصب تنہا راہنما ہوں۔ وہ کسی طرح کے کیوں نہ ہوں۔

شاعر اور خاصہ نگاری

ایک لفظ شاعر کے لیے اگر شاعر سے مراد وہ ہے جو یح قطع کر سکتا ہو اور مصرع موزون اس پر کہیں ترجیح ہے۔ لیکن اگر اس سے بلند تر مفہوم ہے اور شاعری سے فطرت کے مصوری اور موزون واقعہ خوانی ہے اور شاعر وہ ہے جو چیزوں کے سینہ میں بیٹھ کر وہاں سے توہم کو اس سے خامہ نگاری کی امید کرنی چاہیے۔ یح ہے کہ اس کی محدود زمین اس قدر کشادہ نہیں ہے کہ عرکات طبع کا نقشہ کھینچنے کے لیے لفظوں کا وسیع مصرف اس کے اختیار کی چیز ہو۔ لیکن پھر بھی لفظوں کا مناسب اور مناسب لفظوں کا انتخاب اسے بھی شاعر کی طرح مدد دے سکتا ہے۔ اور وہ کچھ دیکھ سکتا ہے۔ قابل تعریف جذبات کو ابھار کر اس سے زیادہ اثر ڈال سکتا ہے جس قدر شار ویر یا غور کے سامان ٹھہرا کر سکتا ہے۔ میں چاہتا کہ نگار کی ایسی تعریف کی طرح کہ ج: "قروں کی آبدہ ہے سہاگ کی جان ہے"

نفس انسانی کی شرح کے متعلق بھی ایسے بہت سے مصرعے مل سکتے ہیں ایک نفس کی دو صورتیں اور حالتیں دکھانے کے لیے ایسے اشعار بکثرت ملتے کہ روز بروز روشن خواجہ ہر شاعر، شام تارے خاتم جہریر زلف اور پھر میں واقعہ جو اس کے لطف کو پائیداری بخشا جو یح باور گرائی کا ایک ورق ہوتا۔ کیا ہے اس شعر میں مگر یہ کہ کہنے والے نے اپنے مروج کو الٹ پلٹ کر دیکھا ہے۔ اور جو کچھ کہا ہے کہ کر کہا ہے۔ اس طرح نہیں کہا ہے کہ جو کچھ کہا ہے اسے خود نہیں بکھا ہے۔

بے توجہی کا نتیجہ

مسیری عرض ان تمام متذکرہ صدر ریمارک سے یہ ہے کہ اگر ایسے بزرگ استاد عالم جو احسن التوفیق انسان کی ہدایت کے نشان ہیں اپنے حالات میں زمانہ کی بے توجہی، غور کی کمی اور ایسی روش بیان کے حوالہ رہے جو اپنے اعتبار سے بکھانے کے معانی ہے تو ہم نے خداوند تعالیٰ کے ایک عظیم احسان سے فائدہ نہ اٹھایا۔ ہم نے کھڑے ہونے کے مرکز کی حقیر کی، جس سے مرکز کا کوئی نقصان نہیں ہے۔ نقصان تھا رہے ہے ہر گری موم کی طرح پگھلتی رہے گی بغیر اس کے کہ اس میں ریڑھ کی ہڈی ہو۔

میرا تھج اور رنج اس وجہ سے بھی ہے کہ خدا کے یہ ممتاز بندے زمانہ

ان نفوس قدسی اور گزشتہ انبیاء اور مشاہیر کافرق

قدیم کے ان انبیاء کے ایسے نہ تھے جن کے کہنے کے لیے معمولی واقعات بھی نہیں ہیں اور اگر ان کے بچے چائے مظاہرین کو کچھ ورثہ میں ملے ہیں تو وہ نہ تاریخی حیثیت سے پورے اعتبار کے شایان ہیں اور نہ ان سے بڑھ کر کسی خاص طرز عمل کے کسی انسان کے ہر شان طبیعت کی طرح کی مثالیں ملتی ہیں۔ میرے اس کہنے کے لیے تواریخ اور انجیل مثیل میں پیش ہے۔ نہ وہ ان رشیوں کے ایسے تھے جو تاریک اور ناقابل قیاس کہانیوں میں آلودہ ہوں جس حیثیت میں میں رومیوں، یونانیوں اور مصریوں کی کہانیوں کو بھی شامل کرتا ہوں۔ نہ انھوں نے اپنے زمانہ میں اور نہ اپنے بعد کے لیے مخلوقات الہی کو اس توہم میں گرفتار ہونے کی وجہ چھوڑی کہ وہ ان کی جدیدیت میں مشتہ ہو جائیں، نہ وہ پہاڑوں کی چوٹیوں سے بات کرتے تھے اور نہ دوسروں کی کالی کا شور مارتی کھاتے تھے بلکہ وہ سختی سے ایک متمدن انسان کی روزمرہ کے دستور العمل کی خود مثال دیتے تھے شہزادہ زندگی سکھاتے تھے، وہ آسانی قوتوں کو سمجھتے تھے اور اس کے موافق حکم کرتے تھے۔ ایسا حکم جس کے حسن پر عمل کو تسکین ہو۔ وہ صبح اور شام بکھانے اور اس کے فرائض بنانے کے لیے طلق کیے گئے تھے۔

ہمارا خطرناک انتظار اور باوجود ان واضح باتوں کے جو ان کی تعلیم اور ان کے طرز عمل سے ظاہر ہے ہم قائدہ نہیں اٹھاتے چہ جائے کہ ہم اس لحاظ سے ان کی مالگیر تعلیم کو اپنے علاوہ بھی لوگوں کو دکھانے کی کوشش کریں بلکہ اس کا انتظار کرتے ہیں کہ ہمارے مجتہدوں کے حالات، ہمیں غیر مسلمین کے علم زبان سے ملے۔ اور اسے ہمارے بچے اور نوخیز پڑھیں۔ جنہیں زمانہ نے اس قدر وقت نہیں دیا تھا کہ وہ مگر کی بات پہلے مگر سے جانتے۔ اگر یہ یگانہ ہے تو پرانے فاضل ضرور زمانہ کے رنگ کی عدم شناسائی کے لیے مورد الزام ہیں لیکن تے تعلیم یافتہ انھوں نے باوجود زمانہ شناسی کے خود کچھ کیوں نہ کیا۔ قابل افسوس لاہوریانی یا حیرت خیز تدریس

زبان یگانہ ہے کہ وہ جنہیں یورپ کی ترقی یافتہ زبانوں اور اس کے خوبصورت، غماز لطیف، معنی خیز اور وسیع البیان الفاظ اور فقرات کا چکا پڑ گیا ہے انھیں اپنی مادری زبان ایک بے مزہ بڑی معلوم ہوتی ہے اور اس لیے نہ وہ اپنی زبان کو اپنے وسیع خیال کا جیز سمجھتے ہیں اور نہ اس کی کوئی تصنیف کے مطالعہ سے اپنا وقت غراب کرتے ہیں۔ لیکن سوال ہے کہ اسپرٹ آف اسلام ہی کی ایسی کے کتب لکھی گئیں جس سے اردو نہ پڑھنے والوں کو تسکین ہو سکتی۔ اور سوال ہے کہ جب تعلیم اس قدر گراں قیمت ہوتی جاتی ہے تو کیا یہ رویہ اور وقت کے مفید کفایت نہیں ہے کہ ہم اپنی زبان کا علمی ذخیرہ چھپا کر کے واقفیت کا نسبتاً آسان ذریعہ چھوڑیں؟ میں سوچتا ہوں کہ تھی روش سے متاثر لوگوں کو اپنی زبان اور اس کے ذخیرہ کی فراہمی کا زیادہ احساس ہونا چاہیے۔ خصوصاً جب کہ اتفاقات بھی ایسا چاہتے ہوں اور وہ قومی حیثیت کی تعلیم کا ایک اہم ترین مسئلہ ہو گیا ہو۔

متذکرہ صدر بے موقع یا با موقع، متعلق یا غیر متعلق اظہار خیال اور اس کی گری کی مخلصانہ معذرت کرتا ہوں اور مجھے امید معافی ہے لیکن غور کی التجا سے باز نہ آؤں گا۔

حسین کے متعلق بعض اور غور طلب باتیں علاوہ ان باتوں کے جو کبھی گئیں حسین کے اس زمانہ حیل کو جو ہر تہمدینہ سے درود کر بلا تک ہے بعض نہایت غور طلب مسائل سے تعلق ہے۔ مثلاً آیا حسین کی روش نرانی تھی یا دعائی، آہا

حسینؑ نے عقل کو ہذبات کا تابع کر دیا۔ آیا مسلم بن عقیل کی کوئی اطلاع حسینؑ تک پہنچی جس میں وہ حسینؑ کو حکومت کرنے کے لیے طلب کر رہے تھے۔ آیا اس وقت بھی حسینؑ کا روانہ ہونا امید خلافت سے تھا۔ آیا حسینؑ نے جو کچھ کیا ان کا عمل اپنے برادرِ معظم کی مخالفت تھی؟

قضاء و قدر ایک اور پہلو مفید توجہ کا محتاج ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ قضاء و قدر میں غلو کی مصلحت پر قائم گروہ نے کیوں زور دیا۔ آیا یہ موجدینِ مصلحت کے لیے مفید ثابت ہوا۔ اس نے عامہ الناس پر کیا اثر کیا۔

سبب اور نتیجہ کا بعدِ زمان درمیانی شکستگی نہیں ہے میری کتب کا کوئی بے قرار ناظر یہ چاہے گا کہ اسبابِ شہادت

حسینؑ کا نتیجہ و اسباب کیوں نہ ہوا جیسا لکڑی مارنے اور سر چٹھنے میں ہوتا ہے۔ اور وہ سبب اور نتیجہ میں کسی قدر بعدِ زمان کو درمیانی شکستگی سمجھنے لگے گا۔ لیکن اسے غور کرنا ہو گا کہ سر چٹھنا اگرچہ لکڑی سر پڑنے کا نتیجہ تھا لیکن سبب کا نتیجہ پیدا کرنے کے قابل نہ ہوتا کوئی فوری کام نہ تھا بلکہ وہ خود ایک ارادہ، تربیت اور عمل کا تابع تھا یعنی ”لکڑی پڑنے“ کا سبب خود مختلف نوعیت کا سبب ہے لیکن پچ پڑتے ہی چل نہیں نکل آتا بلکہ پچ کے چل جانے تک مختلف تغیرات اور مدارجِ غلو طے ہوتے ہیں جس کے بعد چل کا نتیجہ ہوتا ہے۔

جزئی باتوں کا کافی سمجھنا غلطی کا باعث ہوتا ہے اسی طرح وہ دو فقروں میں خلاصہ سن لینا چاہے گا یا کسی تاریخی اشارے کو پرکار لے کر اس طرح

ناپے گا کہ گویا صرف وہی مطلق ثبوت ہے اور جب وہ ناپ میں کم ہائے گا جیسا کہ ہونا چاہیے تو وہ پیلانے اور چیز دونوں کو دے مارے گا۔ بغیر یہ سوچے ہوئے کہ اس نے قدر اور جسامت کے موافق پیلانے کے انتخاب میں تمیز کا کسی قدر وسیع مصرف گوارا کیا ہے۔ اس نے مطلق یہ تکلیف نہ اٹھائی ہوگی کہ بھانے والے کے اس قدر ساتھ چلنا کہ اسے ایک جس کی چیزیں کچھ میں آجائیں اور اس کے بعد وہ کل کو تولدِ نتیجہ کے سمجھنے میں جزئی باتوں سے مدد لینا اور ان میں کافی سمجھنا اکثر انسانی تجربہ میں غلطی کا باعث بلکہ ضررِ مثبت ہوا ہے۔

دو دھارے میرے لیے یہ آسان نہیں ہے کہ ان عظیم الشان تغیرات کو جس نے بعض کو ایک قوم میں سے اپنے جوشِ مخالفت میں اس قدر پختہ کر دیا کہ وہ اپنے نبی کے نواسہ کو قتل کر سکیں مختصر فظوں میں بیان کر دوں۔ اور نہ کیسے ہی وسیع اور منتخب فظوں میں یہ گنجائش ہے کہ حسینؑ کے اس جوشِ حمیت کو جو ان میں اپنی وجہ کے لیے تھا اس طرح لہا کر دے کہ پھر وہ شرح کے محتاج نہ رہیں، بلکہ وضاحت ممکن نہیں جب تک یہ نہ بھلیا جائے کہ دو ایک دوسرے کے مخالف دھارے بڑے جوش و غروش سے بہ رہے تھے۔

اس کے بعد ان کی ابتداء، ایسے اسباب جن میں کسی دوسرے نتیجہ کے پیدا کرنے کا ارادہ نہ تھا، وسعت کے اسباب ان کے عناصر، ترکیب، نامیت، حرکت اور سرعت پر غور کیا جائے اور پھر اس کے بعد دیکھا جائے کہ اس حالت تک

پہنچنے میں ان ذہنوں و دھاروں کی نمود اور کوئی صورت یز اس نتیجہ کے پیدا کر سکتی تھی یا نہیں۔ آیا اسباب ایسے تھے یا نہ تھے جن سے کسی دوسرے نتیجہ پیدا کرنے کا ارادہ پایا جاتا ہو۔

ہو سکتا ہے کہ حسینؑ کے مخالفت و دھارے کو شخص کی تجویز کا اور اک نہ ہو اور حسینؑ تک پہنچنے پہنچے ہر شخص دیکھنے والا ہو کہ مخالفت کا ہیبت خیز طوفان حسینؑ پر چلا چاہتا ہے لیکن یہ نہیں کہا جاسکتا کہ خاندان معلوم نہ تھا۔ یہ بہت دن پیشتر سے معلوم تھا جس اصول سے نبی اسرائیل کا نبی ان کی ستر برس غلامی اور اسیری کی پیشین گوئی کر سکتا تھا۔

پیشین گوئی اور شخص میرا یہ کہنا ایک مؤرخ کی نظر سے ہے جو صرف واقعات تاریخ کی نمود سے بحث کر رہا ہے۔ لیکن اگر اس میں ان احادیث کا جرم کب کر دیا جائے جو رسولؐ کی زبانی حسینؑ کی شہادت کی پیشین گوئی کے متعلق ملتی ہیں اور جن کا کتب اسلامی میں کافی ذخیرہ ہے (دیکھو سر الشہادتین وغیرہ) تو اس قدر فقہ اور بڑھانے کی ضرورت ہوگی کہ ”لیکن یہ نہ تھا کہ شخص کا کسی کو اور اک نہ ہو“ خواب کے بعد یہ دوسری بات ہے جس کا وعدہ کیا گیا ہے۔

مذہب برانہ پیشین گوئی سے بلند تر پیشین گوئی کے اس حصہ کے کہنے میں دشواری کا خیال نہیں کیا جاسکتا کہ مخالفت کا طوفان خاندان رسالت کے کسی فرد پر چلے گا۔ سیاسی تیر و پھنے والی نگاہوں کی تاریخ میں ایسی پیشین گوئی شاذ نہ ہوگی لیکن شخص کا اس وقت تجویز کیا جانا جس وقت اس کے ساتھ کسی طرح کی مخالفت کا خیال بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ مذہب برانہ پیشین گوئی سے کچھ زیادہ ہے۔

تین صورتیں میرے دانست میں اس کے حل کرنے کی صرف تین صورتیں ہیں۔ ● اول یہ کہ حسینؑ کی تجویز شہادت کی پیشین گوئی کی جس قدر احادیث ہیں وہ قطعی انکار سے ذبح کر دی جائیں۔ ● دوم یہ کہ یہ پیشین گوئی بیجا واقعہ بین صلت سیاسی نگاہ کے ذریعہ سے بھی جائے۔ ● سوم یہ کہ وہ اس سے بالاتر ذریعہ سے بھی جائے۔ وہ الہام ہو، وحی ہو، یا بہ اختلاف نام اسی مفہوم کے کسی وسیلہ سے۔

پیشین گوئیوں کا ذخیرہ تاریخی شہادت کی حیثیت رکھتا ہے پہلی صورت یعنی پیشین گوئی کی احادیث

اس قدر مسلسل اور متواتر اور اس فطری شان اور موقع سے بیان کی گئی ہیں کہ اب وہ ایک تاریخی شہادت ہیں اور یز اس صورت کے کہ جب تک ان کے غلط اور ذمعی ہونے کے قرین عقل اور موید بہ تاریخ و جہات نہ بیان کیے جائیں اس حیثیت سے مانتے والوں کے نزدیک ایک بے انصافانہ اور بے حوصلانہ انکار کجا جائے گا۔ ان کی صحت میں اشتباہ نہ ہونے کے قرائن اس سے قوت پاتے ہیں کہ حسینؑ کے مخالفین نے کبھی ان کے ذمعی ہونے کا الزام نہیں دیا۔ مزید قوت اس سے ہوتی ہے کہ یہ احادیث مختلف مواقع پر مختلف لوگوں کے زبانی بیان کی گئی ہیں اور حسینؑ نے بھی اسے ایک سے زیادہ مواقع پر سننا اس کی تصدیق کی اور تصدیق کرائی۔

دوسری صورت یہ ہے کہ اگر کوئی مؤرخ اسے اعتقادی حیثیت قبول نہ کرے اور اسے رسولؐ کی سیاسی دور بین نگاہ کا نتیجہ سمجھے تو اسے یز اس کے کہ ہاں چھ برس کی عمر میں حسینؑ کے شہادانہ آثار طبیعت اور بعض طبعیتوں کے انقلاب خیز احساس

کو اس پیشین گوئی کا ماتہ قرار دینا پڑے اور کوئی صورت مشکل سے ملے گی۔ لیکن یہ وجہ تشکین کے قابل دراز نہیں ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ یہ پیشین گوئی تاریخی حیثیت سے ناقابل تنقیح ہے۔ جس میں ایک مسلسل بیان ہدایت کا نتیجہ جو دو ذوق میں پیشتر سے چلا آ رہا تھا اور مختلف وجوہات اس میں شدت پیدا کرتے جاتے تھے کسی خاص شخص کے لیے تجویز کیا گیا ہے۔ لیکن یہ پیشین گوئی اس وقت کی تھی ہے جس وقت پیشین گوئی کرنے والے اور خود اس کے ذریعہ سے ملکی حیثیت سے حسین کا موقع بہ نسبت حلف کردہ کے نہایت قوی تھا۔

اور قیاس اس کام مقتضی تھا کہ حسین اس قدر کمزور ہو جائیں
تعمین زمان اور تجویز شخص کا معجزہ
سے تعین زمان اور تجویز شخص کا یہ ایک ایسا معجزہ تھا جو موقع اور طبیعت شناسی سے کسی قدر بالاتر ذرائع سے تھا۔ تجویز شخص اور تعین زمان میں سیاسی حیثیت سے پیشین گوئی کا امتحانہ ہونا اس وجہ سے بھی قیاس کی دشواری ہے کہ یہ پیشین گوئی حسین کے حلف کردہ لے نہیں کی تھی جس سے یہ قیاس

آسان ہوتا کہ دشمنوں نے حسین کو اپنی خلاف انسانیت ہدایت کے لیے مختص کر لیا ہے، بلکہ یہ محض اس کی زبان سے تھی جس کا کاندھا خود حسین کو سب سے زیادہ پہنچا تھا۔ یہ پیشین گوئی اگر رسول کی آخری زمانہ حیات میں حسین کے پیر و بزرگوار کے متعلق ہوتی (جیسی ایک حیثیت کی ہے) تو اس کے متعلق سیاسی نگاہ کے قبول کرنے میں زیادہ دشواری نہ تھی۔ حسین کے متعلق پیشین گوئی جس قدر عجیب انگیز ہے، بنی امیہ کے متعلق آخری کڑیوں میں خود حسین کی پیشین گوئی ویسی ہی حیرت خیز ہے جس میں وہ بنی امیہ کو ان کے عین عروج میں آپس کی جنگ سے تباہی کی خبر دے رہے تھے۔ اگرچہ یہ آخر الذکر پیشین گوئی صاف بین سیاسی نگاہ کے اندازہ کے اندر راست تھی ہے۔

بعض کی نگاہ میں میں نے مقدمہ میں غیر مفید وقت صرف کیا ہوگا اور خواہ مخواہ
اس کتاب کے موضوع
ایسے موضوعات میں ابجا ہوں گا جس کی ضرورت اس کی نگاہ میں نہ ہوگی۔ لیکن میں صاف دیکھ رہا ہوں کہ وہ وقت زیادہ دور نہیں ہے جب اس کا زیادہ احساس کیا جائے گا کہ اگرچہ واقعات کی طبعی اور فطری حیثیت نقیض کی کوشش کی گئی، لیکن کوشش اس سے زیادہ وسیع چاہیے تھی۔ وہ زمانہ ہوگا جس سے حقیقت میرے اس بنیاد ڈالنے کی امید ہی وابستہ ہیں جو اگر ار کے بعد اس سلسلہ میں جس کی ترتیب کی باوجود کی اسباب کے کہہ سکتا ہوں دوسری ہے۔

میں نہیں جانتا کہ میری اس تحریر سے ضروری مقامات اور ان کی شان کے مناسب تاخر کے
جذبات کا مصرف
دل میں، غم، غصہ، نفرت، عداوت، ہمدردی، جوش اور پسندیدگی کا طم پیدا ہوگا یا نہیں۔ لیکن یہ یاد رہے کہ غم، غصہ، نفرت اور عداوت کے جذبات کا پیدا ہونا میری خواہش کے وہیں تک موافق ہوگا جہاں تک یہ اس کام آسکے کہ ان جذبات کے پیدا کرنے والی چیزوں سے شریفانہ کنارہ کشی کی جاسکے جو برائی کی بے وقتی اور اس لیے رفع فساد ہے۔ لیکن اگر یہ جذبات ان ناگوار نتائج کے باعث ہوں جن کا قطعاً پیدا نہ ہونا زیادہ مفید ہوتا تو مجھے شخص کے اس اچھی چیز کے برے مصرف پر ہنسنا ہوگا۔ جذبات اس حد تک قابل تعریف ہیں جب تک ان پر حمل اور احتیال

کی کام چمچی رہے۔ واقعہ تاریخی اور ان پر حتی الوسع قربت سے نظر کرنے کی کوشش حسینؑ کے بچنے کے لیے ہے نہ کہ حسینؑ کے واقعات نامواہقت خیال کا کوئی ذخیرہ فراہم کرنے کے لیے۔

اے کاش! میں ان واقعات کو ترک کر سکتا جن سے خوشگوار بو نہیں آتی۔ ایسا کرنا اپنی غرض کی نفی ہوتی کہ ایک وقت میں کسی کی سوانح نویسی کا دعویٰ کرتا اور پھر ان اسباب سے چشم پوشی بھی کرتا جو اس کے واقعات پر مؤثر تھے۔

مولف کا اعلان برائت کے لیے لاش چیرنی پڑتی ہے۔ میں ان لوگوں سے برائت کا اعلان کرتا ہوں جو اس کتاب کو بجائے بچنے کے ذریعہ کے کج بختیوں کا اکہ بنانے کی کوشش کریں۔

مصلحت سکوت کی صحت غرض سے انکار ہو سکتا ہے کہ عام فرق اسلامیہ میں سے کسی کو یہ حکایت ہو کہ میں بھی حسینؑ کے متعلق ویسے ہی

سکوت آموز مصلحت کیوں نہیں اختیار کرتا جس کا گزشتہ اوراق میں اشارہ کیا گیا۔ مجھے افوس ہے کہ میں اس مصلحت کی صحت غرض کا ٹکڑے ہوں۔ میں اسے حسینؑ کے ساتھ بے رحمی اور ناانصافی اور ظلم کے اس فطری اصول سے اعراض سمجھتا ہوں کہ اچھا اور برا اپنی معلومہ حیثیت کے اعتبار سے دیکھنا نہ سمجھنا جیسادہ ہے۔ میں اس خاموشی پسند مصلحت کو مسلمانوں کے مفات قوی کا سب سے بڑا تباہ کن ذریعہ سمجھتا ہوں اگرچہ کسی کے نزدیک مجھے ایسا بچنے کا کوئی حق نہ ہو۔ میں کیسے خوشی سے ایسا ہواؤں ہے واقعات دیکھنے کی جرأت نہیں ہے۔ واقعات لکھنے سے خوف کرنا نہ واقعات کو چھپا دے گا اور نہ خوف کہ کون اس کا قاتل ہو گا کہ جب پر فساد منڈھنے سے حباب مضبوط ہو جائے گا۔ یا آگ لگی ہوئی دیکھ کر آنکھ بند کر لینا ”آگ لگے ہونے“ کے واقعہ اور اس کے نتائج کو معدوم کر دے گا۔ بلکہ محفوظ تدبیر یہ ہوگی کہ ہم آگ لگنے کے اسباب بھیں۔ جو آئندہ آگ لگنے کے مواقع کو دور کر دے گا، اور گزشتہ اسفل زندگی کے برے نتائج کی مکافات کرے گا۔

نظام تحریر میں واقع ہوں کہ مجھے بعض ایسے واقعات سے سابقہ ہے جن کی طینت ان کے ذکر کے وقت اعتدال سے ہٹا دیتی ہے لیکن میں اس کی ہر حالت میں احتیاط کروں گا کہ گرم کیا معنی شیر گرم الفاظ بھی میرے قلم سے نہ نکلیں۔ مناسب ہے کہ کسی مؤرخ کا قلم ڈھکی کی پڑھی ہوئی چھری نہ ہو۔ میں اس کی کامل احتیاط کروں گا کہ مفید مواقع پر کتاب کا نام اور اس کی عبارت یا لفظی ترجمہ پیش کروں اور واقعات اور رائے کو مخلوط کر کے واقعہ نہ کہوں۔ مفید ابواب میں میں پہلے واقعات ترتیب دے جاؤں گا، اور خود کچھ کہنے کے لیے دوسرا باب تیار کروں گا۔ یا اس طرح کہوں گا کہ واقعات اور میری شرح میں فرق کیا جاسکے۔ اس سے کسی حد تک طوالت ہوگی لیکن واقعہ بچنے اور ہر شخص کو آزادانہ رائے قائم کرنے کی یہ ایماندارانہ ترتیب ہوگی۔ موجودہ روشی تحریر کے لحاظ سے مجھے واقعات کو تفصیل اور ترتیب سے نہ لکھنا چاہیے تھا بلکہ محض شرح اور اشارے کرتے جانا کافی تھا۔ یہ میں نے اس لیے نہیں کیا کہ ہماری عام قوی تعلیمی حالت ایسی نہیں ہے کہ محض اشاروں سے کام چل سکے۔ خصوصاً جس زمانہ میں اپنا مذہبی میلان ظاہر کرنا تدبیر کے خلاف سمجھا جاتا ہو۔ خدا کرے پڑھنا چاہنے والے کے لیے میری تحریر میرے اظہار خیال میں شبہ نہ پیدا کرے۔ اس کے بعد یہ بھی کہہ دوں کہ یہ کتاب ان کے لیے ہے جنہیں اپنے اوپر اس قدر اعتبار

ہے کہ ”یہ دیکھو کہ کیا کہا یہ نہ دیکھو کہ کس نے کہا“ پر عمل کر سکتے ہیں۔ میں تھوڑے صبر اور غور کا پتہ ہوں اور سب کے آخر میں:۔

تاج سد من خاک کف پائے کے است کو چشم مرا بہ عیب من بسینا کرد
خاکسار ریاض



علامات جو ہم کام میں لائے ہیں

! مخاطبہ یا تعجب یا اظہار تاسف۔

? استنبہام۔

یا جملہ ختم ہو گیا، یا آخری لفظ کا سلسلہ دوبارہ اسی لفظ کے پہلے لفظ سے ہو گا۔

— اس کا منشا ہے کہ کچھ عبارت غیر متعلق کچھ کر حذف کی گئی۔

” اس لفظ کے اندر کی عبارت خاص اس شخص کی ہوگی جس کا تذکرہ کیا گیا۔

: ذکر کی جانے والی عبارت کا اس کے بعد آغاز ہوتا ہے۔

() خطوط ہلالی کے اندر کی عبارت اس کے پہلے کے لفظ کی کسی شرح کے لیے ہے۔



باب اول

ولادتِ حسینؑ کے قبل سے رحلتِ رسولؐ تک

(رسولؐ کی تعمیرِ انہ مصلحت)

غیرِ حرا کا طالب علم
مشیتِ ایزدی اس کی مقتضی ہوئی کہ غلامِ حرا کا طالب علم دنیائے گزشتہ کا مصلح اور آئندہ کا رہنما ہو۔ مصلح بنا اور رہنما ہوا۔ اس کے بچنے کے لیے مذاہبِ گزشتہ کی کتبِ مقدسہ ان مذاہب کے بائین کی ذات اس کے اثر ان کی عقل، کامیابی اور افعال پر نظر کرنا اور اس کے بعد بے تضحی سے اسلام اور شارعِ اسلام کی ان کل باتوں کو دیکھنا صحیح فیصلہ سے دور نہ رکھے گا۔

ہادیؑ عالم کی بعثت کے وقت مذاہب کی حالت
اس کتب کا بحث اس غرض سے بہت دور ہے جس میں متذکرہ صدرِ مقابلہ کی گنجائش ہو۔ مجھے اس جگہ جو کچھ کہنا ہے وہ صرف اس قدر ہے کہ اگرچہ اس زمانہ تک جہاں تک تاریخی نگاہ جاسکتی ہے اس کے آثار ہیں کہ قوموں میں ہادی پیدا ہونے اور انھوں نے چاہا، کوششیں کیں، بلکہ اکثر اپنے جوشِ ہدایت میں جانیں دیں لیکن جس وقت نبی عربی مبعوث ہوئے اس وقت مشہور مذاہب کی ایسی قابلِ تاسف حالت تھی جو ایک ہادی کی ضرورت بتا رہی تھی۔ اور ضرورت اس امر کی تھی کہ اس کے اصول ایسے عالم گیر ایسے معتدل اور اس درجہ کمال عقلی کے مظہر ہوں کہ لوگ جو پیشتر کے کسی مذہب کے پیرو ہوں اور وہ اپنی تباہ شدہ حالت پر غور کر کے کسی زبردست نفس اور ہادی کی مدد لینا چاہتے ہوں۔ انھیں اس نقیب کی نقابت قبول کرنے میں کوئی منصفانہ عذر نہ ہو وہ یہ نہ سمجھیں کہ یہ کوئی ایسی بات کہہ رہا ہے جسے پہلے کی عمدہ باتوں سے مغایرت ہے۔ اس کا حکم نہ محض جنتِ نعلیس کے لیے ہو، نہ یہود کے لیے اور نہ وہ کسی ایسے مذہب کا نقیب ہو جس کی تعریف بجانے مذہب کے جبرِ فیائی حدود کا سبق دیتی ہو۔ بلکہ خدا کے پیدا کیے ہوئے تمام انسان اور عالم کے لیے ہو۔

ایک نبی کے بعد دوسرے کی کیوں ضرورت ہوئی
ایک نبی کا دوسرے نبی کے بعد مبعوث ہونا یہ معنی نہیں رکھتا کہ وہ گزشتہ انبیاء کی تعلیم کو قطعاً منسوخ کرنے کے لیے آیا ہے۔ نہ وہ اس لیے آیا ہے کہ اسے کچھ ایسے اصولِ اخلاق اور نیکیاں سکھانی ہیں جو پیشتر نہ سکھائی گئی تھیں۔ نہیں۔ نیکیاں ہر زمانہ میں نیکیاں تھیں اور یہی ان کی نیکی ہونے کا بہترین ثبوت ہے۔ جو کچھ ضرورت ایک نبی کے بعد دوسرے کو ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ جس جس طرح زمانہ گزر جاتا ہے اور جو جہاں پہنچا آدمی میں پیدا ہوتی جاتی ہے اسے مستنبذ کرے۔ بھولی ہوئی باتوں کو یاد دلانے اور انھیں اس طرح سکھانے کہ ان پر اس کے جوش اور اس کی سچائی کا اثر ہو۔ ہدایت پانے ہوئے ہدایت کرنے والے کے پیرو معلوم ہوں اور وہ غرض پوری ہو جو اس کی بعثت سے ہو سکتی تھی۔

ضروری معیار بلاشبہ نبی کی اس وقت بعثت ہوتی ہے جب اس کی خاص ضرورت ہوتی ہے۔ وہ اس وقت کے خیال کے ساتھ پیدا ہوتا ہے۔ وہ اس وقت کی جماعت کی طرح پیدا ہوتا ہے۔ لیکن ایسا کہ اپنے زمانہ کے لوگوں کو اپنی باتیں بکھاسکے۔ ورنہ اگر درجہ عقلی میں ان لوگوں سے کم ہو تو حقیقتاً وہ بکھا سکتا ہے اور نہ لوگ کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ اس لیے معیار نبوت میں بظاہر جو چیز سب سے زیادہ ضروری معلوم ہوتی ہے وہ اپنے زمانہ، اپنے گردہ یا اپنے مخصوص نقطہ ہدایت میں اس کی ترقی عقلی اور اخلاقی عظمت ہے۔

تجدید کی ضرورت اگر خداوند تعالیٰ اس بات کا التزام فرماتا کہ ایک ایسے زمانہ میں جو ابتداء سے آفرینش فرض کر لیا جائے انھیں ایسا کامل دین اور اصول ہدایت سکھایا جائے جس میں اصولاً کوئی ترمیم یا تنسیخ یا تجدید نہ ہو سکے تو یہ ایسے زمانہ کو ایسی باتیں سکھائی ہیں جس وقت کا دماغ اپنی فطری ترقی اور نشوونما میں اس حد تک نہیں پہنچا ہے جس میں وہ ایک اعلیٰ ترقی پانے ہوئے زمانہ کے اصول کا تحمل ہو سکے وہ جس نے نامکمل چیز نہیں دیکھی ہے وہ مکمل کی شایان قدر نہیں کر سکتا اس حالت میں اگرچہ اصول قطعاً مکمل ہے لیکن اس لحاظ سے کہ وہ زمانہ کے موافق نہیں ہے عین نامکمل سمجھا جائے گا اس لیے کہ اس کی تکمیل کس کام کی جب وہ اتنی ہی ہدایت نہ کر سکا جو اس سے کم درجہ تکمیل لیکن زمانہ کے موافق سے ہوتی۔ مثلاً اگر افریقہ کے اس خطہ میں جہاں کوئی طریقہ حکومت نہیں ہے اور طواغیت الملوکی کے بھی فکر نہیں ہیں اگر دفعۃً یورپ کی انتہائی ٹی یا مشروطہ حکومت جاری کی جائے تو یقیناً ایسی حکومت اور رعایا دونوں کی انتہائی بدفہمی ہے۔

انبیاء کی ایک دوسرے پر فضیلت بجائے کسی اور بحث کے ہم مسلمانوں کا ہدایت نامہ اسے علی نقض (۲: ۲۵۳) طے کر دیتا ہے۔ آخر انھیں یزائی ذات، عمل اور اصول کے اور کس چیز سے فضیلت ہو سکتی تھی۔ ضرورت تھی کہ ایک مرتبہ ایک بڑا نبی پیدا ہوتا اپنا اثر ڈالتا اور گزر جاتا کچھ لوگ اس کے اصول کے ساتھ اترتے آتے اور کچھ کم درجہ کے متعلمین اسے سلجھاتے آتے یہاں تک کہ مشیت ایزدی اس کی منتقمی ہوتی کہ کوئی ایسا پیدا ہو جو بعض ذہولت کو منسوخ کرے بعض قائم مقام ذہولت کی تعلیم دے اور کچھ ان نئے خیالات اور افکار کی روش کی اصلاح کرے جو اس درمیان میں پیدا ہو گئی تھیں۔ مثلاً:

حضرت موسیٰ کی مثال نہ صرف اعتقادی بلکہ تاریخی حیثیت سے بھی یہ مسلم ہے کہ حضرت موسیٰ کے قبل انبیاء تھے، لیکن حضرت موسیٰ کو اس کی ضرورت محسوس ہوئی کہ وہ ایک قانون مرتب کرتے اور وہ اپنے زمانہ کے بلکہ اپنے بعد بہت زمانہ تک کے بڑے نبی تھے ان کے بعد ان کا دین بھی پستی کی طرف اس طرح مائل ہوا کہ انھوں نے کی کوئی امید نہ رہی اور کبھی دفعۃً اس طرح امبرا کہ گویا پستی سے مطمئن ہو گیا اور اس جزر و مد میں انبیاء پیدا ہوتے رہے جو اپنے اپنے درجہ نفس اور وقت کے موافق ہدایت کرتے رہے یہاں تک کہ ابن مریم نے دین موسوی سے کبھی برابرت ظاہر نہ کی اور خود ان کی متعلق یہ کہنا دشوار ہے کہ وہ کب یہودی نہ تھے اور کب انھوں نے دین موسوی سے آزاد ایک دین کا اعلان کیا۔ ان کی نہایت مخصوص نظم یہ تھی کہ:

ابن مریمؑ نے بعض امور اٹ میں اصلاح چاہی

شریعت موسیٰ نے کہانت اور رسومات میں جو افراط پیدا کی تھی اور اس کے انہماک نے مذہب کی اصلی خوبیوں سے جس درجہ تغافل پیدا کیا تھا اس سے مٹنے کر یہ شریعت موسیٰ کے اثر یا اس کے متعلق غلط فہمی نے بنی اسرائیل میں دوسری قوموں سے مغایرت پیدا کی اور وہ ناقابل اصلاح حد تک پہنچ گئی۔ ابن مریمؑ کی تعلیم محبت کا عطا کیتی رہا اگرچہ انہوں نے کبھی یہ مخصوص غرض اپنی وجہ بعثت کی ظاہر نہیں کی۔

انبیاء کا درجہ کیونکر سمجھا جائے

نمانہ جزر و مد خیالات، افراط و تفریط، حوادث اور دیگر تغیرات خاص عناصر ہیں جس موقع پر انبیاءؑ کی بعثت و کلماتی دیتی ہے اور وہ کرتا ہے جو کچھ کر سکتا ہے۔ اس کی کامیابی، اس کا درجہ ان باتوں اور اثر سے سمجھا جاتا ہے جو وہ کر گیا اور پھر اس کی بہترین یادگار ہوتی ہے۔

ایک نبی اکثر دوسرے کا شارح تھا

دو جہات بعثت میں جو ایک اور غرض میری کج میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ اگرچہ ایک نبی اس قدر سمجھتا ہے جس قدر سمجھنے کی ضرورت سمجھتا ہے لیکن یہ سمجھنا اور کامل حد تک سمجھنا دشوار ہے کہ وہ لوگ بھی جو سمجھنے گئے تھے اس کی تعلیم کے ہر پہلو کو اس طرح سمجھ گئے جو اس کے بتانے کی غرض تھی۔ بڑے ٹھنڈے والوں نے اکثر اس کا اقرار کیا ہے کہ کسی بات کو اس طرح سمجھنا کہ وہ ہر طرح اور ہر درجہ عقل کے آدمی کی کج میں آجائے دشوار ہے۔ اس لحاظ سے یہ سوچنا غالباً کوئی حدود ٹھنی نہیں ہے کہ اکثر انبیاء دوسرے گزرے ہوئے نبی کے شارح تھے اور انہوں نے وہی کام جاری رکھا تھا جس کی اس وقت کی نسل کو ضرورت تھی اور جس نسل میں گزشتہ نبی کی ذات فرائض اثر اور تعلیم سے مس نہ تھا۔ مشہور آیت فرماتا ہے: مَا تَنصَحُ مِنْ نَبِيٍّ آتَاكَ وَتَنصِيحُهَا نَبِيٌّ قَبْلُهَا (۲: ۱۷۶) (ہم کسی نئی بات کو نہ باطل کرتے ہیں نہ سمجھتے ہیں مگر یہ کہ اس سے بہتر یا اس کے مانند لاتے ہیں)

ہمارے ہادی کی بعثت رقیب مذاہب کے حلقہ میں ہوئی

نبی عربی کی بعثت کا بہترین ثبوت ہدایت خلق کے لیے خدا کی طرف سے بھیجا جانا منجملہ اور بہت سے ثبوت کے یہ ہے کہ وہ ایک ایسے مقام پر پیدا ہوئے جہاں کے لوگوں کو نہ صرف یہودیت، مسیحیت، زردشتیت، مہاتیت (صابین) اور ہندویت کا علم تھا بلکہ ان مذاہب کے لوگ بہ اشتیاق نے ہندو عرب کے کسی نہ کسی غلط رجحانیت حاکم گروہ کے بھی تابع تھے اور ان میں سے ہر ایک کے علم اور فہم اپنی اپنی حکومت کے اسخوش میں بغایت بسر کرتے تھے۔ دور کیوں جائیے تعجب خیز برداشت نے اسخوش خانہ کعبہ کو عرب کے ہر مذہب کی غماش کا بنیاد بنا دیا تھا مثلاً:

خانہ کعبہ قبل اسلام

نہ صرف خانہ کعبہ کی چار دیواری میں اس کی تعمیر کرنے والے کی اس طرح تصویر رکھی تھی کہ ایک طرف حضرت ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ کا بت تھا اور اس کے سامنے ایک میٹر اکڑا تھا تو مسیحیوں کے لیے یہ ناگہن تھا کہ حضرت یحییٰ کو حضرت مریمؑ کی گود میں بیٹھا ہوا نہ دیکھتے۔ لات و منات کی تمام عرب پرستش کرتے تھے دراصل ایک لات نہایت قدیم زمانہ سے اہل بابل کی بلکہ تحت الارض تھی اور چونکہ

اہل بابل نے علم الاثر میں بہت سی کتابیں لکھی تھیں اور وہ سیاروں سے خاص قائل اور اثر کے امیدوار رہا کرتے تھے۔ اس لیے جب نہیں ہے کہ صائین اہل بابل کی یادگار ہوں اور یہ بت دونوں قوموں کی مذہبی خیال کا مجسمہ ہو۔ زمانہ اسلام کی تاریخ عرب بتاتی ہے کہ ہبل قریش کا خدائے جنگ تھا۔ کیونکہ جب احد میں حضرت رسول کی شہادت کی خبر مشہور ہوئی تو ابو سفیان نے خصوصیت سے اس بت کی تعریف کی تھی اور کس فوجی ہم کے روانگی کے قبل اسی سے طلب استیغانت بھی کی جاتی تھی۔ اور بلطاط اس کے کہ قدیم الایام سے انسان بتوں کے سامنے اپنا اظہار غلوس و عقیدت کیا کرتا تھا اس لیے عرب میں بہت سے بتوں کا زمانہ کے اختلاف نام کے لحاظ سے موجود ہونا اس مفہوم سے کسی طرح الگ نہیں ہے کہ مذہب بت پرستی کی بھی معمول سے زیادہ وکالت ہوتی تھی۔

خانہ کعبہ مذاہب کا وکالت خانہ تھا اور اس لحاظ سے کہ کچھ موجدین بھی اس حیثیت کے تھے جو ان عقائد سے اس قدر متاثر نہ ہوں جس قدر توحید سے رغبت ہو اور وہ روایات یا فطری روش خیال سے اس نتیجہ پر پہنچے ہوں کہ ابراہیم نے اسے خدائے واحد کی پرستش کے لیے بنایا تھا اور ان کی وقعت اور اپنے اعتقاد کو اس گھر سے وابستہ رکھتے ہوں لیکن یہ ان کے امکان کے باہر تھا کہ اس مشہور مذاہب عالم کے خانہ ٹی سے ہر ایک وکیل کو کمال دیتے اور محض خدائے واحد کی پرستش کے لیے مقدس کرتے شایہ ہی دنیا کے کسی معبد کو اس قدر مشہور مذاہب کے مرکز ہونے کا موقع ملا ہو۔

ہم وزنی اثر خانہ کعبہ کے اس حیثیت کے مجموعہ معبد ہونے سے گمان غالب ہوتا ہے کہ اس کی وقعت کسی طرح کسی زمانہ میں کم نہیں ہوئی۔ روایتیں ہوں شہرت ہو، یا لوگوں کا عام رجحان ہو، ان میں سے ہر شے اس کی تائید کرتی تھی ہم وزنی اثر تھی اور اس طرح ایک مذاہب دوسرے پر اپنا اثر ڈالتا تھا۔ اور کچھ ایسا ہم وزن اثر تھا کہ ایک ذوق دوسرے کی شے پرستش کا غلبہ نہیں کر سکتا تھا۔ چہ جائے کہ کوئی ایک اس امر کی کوشش کرتا کہ وہ ہتھیہ کو اس معبد سے نکال کر اپنے لیے بخش کرے۔

ملکہ کی مرکزیت اور اسی وجہ سے کہ یہ بہت سے اقوام کا مرکز پرستش تھا۔ لوگوں کا مجمع ہونا اور مجمع ہوتے رہنا اس امر کی ضرورت پیدا کرتا تھا کہ ان کی آسائش کی چیزیں ٹھیکانہ جانیں اور اس طرح عرب کا یہ خطہ قدیم زمانہ میں بھی مرکز تجارت ہوجانے کے لیے موزونیت رکھتا تھا۔

دافع کسل اشغال مذاہب اور تجارت یہ دونوں چیزیں جب مختلف حیثیت کے لوگوں کو دور دور از مقامات سے جمع کر سکتی تھیں تو یہ تعجب خیز نہ تھا کہ لوگ فرائض مذہبی کی سبکدوشی اور ایک حد تک امور تجارت کے انہماک کے بعد اس کے متقی ہوتے ہوں کہ ان کی دافع کسل بھی کوئی شے ہو اور اس کے لیے صبح غلیب اپنی تقریروں اور شیریں بیان شعرا اپنے کلام سے حاضرین کو محفوظ کرتے ہوں۔

ذریعہ تعلیم ایسے زمانہ میں جب کہ کسی ملک میں اشغال علمی اور کتابی علم کی ترقی نہ تھی یہ دونوں چیزیں لوگوں کی واقفیت میں اضافہ اور ان کے خصال کی درستی، حوصلوں کا پیدا کرنا یا قرب و جوار کے رنگ میں رہنے کا زبردست ذریعہ تھیں۔ خصوصاً ایسی حالت میں جب کہ عرب کی شاعری زیادہ تر دافعی نظم ہوتی تھی۔

امارتِ زبان اس نے عکاظ اور ذوالجاز کے میلوں کو جو کعبہ کی بدولت مشہور اور پیدا ہوئے تھے ایک محلِ چٹائی میں درس گاہ بنادیا تھا، جہاں ایک سال کی مختلف خبریں ہر ایک کو پہنچ جاتی تھیں۔ تاہم تھا کہ ایسا مجمع جہاں فصیح غلیب اور شعرا مجمع ہوں وہ زبان کی امارت میں مدد نہ دے۔ عرب کے ایسے ملک میں جہاں اشیائے آرائش اور دیگر اسبابِ باظہری منظر کی اس قدر کمی ہے زبان کے اس درجہ وسیع ہونے کی اور کوئی درجہ بزرگوار اس کے ضمن میں اس کے میلوں کے علاوہ نہیں بتائی جاسکتی ہے۔

ابرہہ کے حملہ کی غرض جو کچھ اغراض ہوں مکی ابرہہ کے حملہ کے لیکن جو کچھ ظاہری باتیں آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہیں وہ بھی چاہتا تھا کہ کعبہ کے ڈھانچے سے لوگوں کا عقیدہ یا اس کا مرکز قائم نہ رہے گا۔ لوگ جمع نہ ہوں گے۔ یہاں کی تجارت جاتی رہے گی اور یہ لوگ اپنی ضروریات کے لیے دوسرے مقامات کے محتاج ہو جائیں گے اور کوئی عجب نہیں ہے کہ اس نے اس غرض سے کوئی تجارتی مرکز اپنے فائدہ کے لحاظ سے قائم کرنا چاہا۔

عرب ہدایت سے بے خبر نہ تھا اس سے قیاس ہو سکے گا کہ عرب میں خبیث القوم اور ملک ایسی قوم اور ملک نہ تھا جو مذہب سے بے خبر ہو۔ وہ خبردار تھا اور دنیا کے مشہور مذاہب ہر وقت اس کی آنکھوں کے سامنے تھے۔ مجھے اس سے بحث نہیں ہے کہ کوئی نبی اس کے قبل ان کی سرزمین میں مبعوث ہوا تھا یا نہیں، لیکن یہ ظاہر ہے کہ نہ صرف حضرت ابراہیمؑ کی تعزیت آوری کے آثار ہیں بلکہ قیاس ہوتا ہے کہ اکثر انبیاء نے بنی اسرائیل کم سے کم اس کے بعض حصوں کی طرف گزرے ہیں۔ اور یہ توہمال کے خطوط صاف صاف کہتے ہیں کہ وہ عرب کی سرزمین میں گئے تھے۔

نئے مذہب کے لیے کیا دشواریاں تھیں چونکہ ہر مذہب کے فقہاء اور واقفان مذہب موجود تھے، جیسا تاریخی آثار صاف بتاتے ہیں اور یہ لحاظ اس کے کہ مذہبی پیشوا اپنی روحانی حکومت سے بہ آسانی دست بردار ہونے کے لیے آمادہ نہیں ہوتے، نہ اکثر اوقات تعصب انہیں دوسرے مذہب کے متعلق آزادی سے کچھ دیکھنے سننے دیتا ہے۔ اس لیے اس حالت نے وہاں کے عقائد کے پلٹنے نہ جاسکنے کے متعلق اور بھی دشواریاں پیدا کی تھیں۔ اور ظاہر ان مشکل حالتوں میں کوئی اور صورت بجز اس کے دکھائی نہ دیتی تھی کہ نہ عرب کا کوئی خاص مذہب ہوتا اور نہ اسے کوئی ایسا صاف قوی مرکز ملتا جس کی تعمیل نہ صرف اعتقادی حیثیت سے مفید ہوتی، بلکہ اس لحاظ سے بھی کہ وہ بہت سے غیر مفید ادھام سے کنارہ کش ہوتا، اور اسے واضح اور فطری راستہ دیکھنے اور چلنے کی توفیق ہوتی۔

عرب کا سیاسی موقع جو کچھ فوج ہو سکتا تھا وہ یہ تھا کہ عرب کے دو جانب دو عظیم الشان سلطنتیں حکومت کر رہی تھیں اور اگرچہ عرب کے زیادہ تر ریگستانی تھے اس کا قیاس قابلِ عمل نہ رکھا تھا کہ یہ دونوں حکومتیں ملکی رقابت پر آمادہ ہو کر دو طرف سے دباؤ ڈالیں گی اور عرب ان دو ہماری جنگی کے پاٹ میں پس کر رہ جائے گا۔ لیکن تاہم عرب کے زرخیز صوبے محفوظ نہ رہے تھے اور آغاز اسلام میں یمن کا ایسا صوبہ

بازان کے ماتحت تھا۔ عرب کے سوشلہ حیات یعنی دجلہ اور فرات کی زمین شمال میں اگر رومی حکمت کی ماتحتی کے قابل ہو سکتی تھیں تو مغرب اور جنوب کیان ایران کے زیر اثر رہ سکتا تھا جو کچھ اہل عرب کے لیے چھوٹا ہوا تھا وہ اس کا صوبہ جاز تھا یا عراق عرب۔

اس کا اثر دوسری وجہ کہ کیوں یہ دونوں سلطنتیں ہر ایک عرب کو اپنے زیر اثر رکھنا چاہتیں، نہ صرف موجودہ زمانہ کے لحاظ سے قابل فہم ہے بلکہ اس زمانہ کی تاریخ بھی بتاتی ہے کہ ان دونوں میں سے ہر ایک عرب کی ہی آزاد اور جگہ جو قوم کو زیر اثر رکھنا چاہتا تھا نہ صرف اس وجہ سے کہ وہ دشمن اور اپنے درمیان ایک زبردست آڑ ہوتی بلکہ اس لیے بھی کہ ان کا اور ان کی جانوں کا میدان جنگ کے لیے غریب لینا بہت آسان تھا۔ اگر اس کے آثار ہیں کہ اکثر شیوخ عرب کسری کے دست نگر تھے تو یہ بھی واضح ہے کہ اہل روم بھی اس منقولہ جائیداد کو اپنی طرف کھینچنے کی فکر سے خالی نہ تھے۔

فرزند صحرا مسیحی یا اسٹش پرست نہ ہوا یہ صورتیں تھیں کہ عرب کا بچا نے یہودی یا عام مفہوم کا بت پرست رہنے کے مسیحی یا اسٹش پرست ہو جانا آسان تھا۔ لیکن باوجود ان دل کش سلمانوں کے حیرت خیز امر یہ ہے کہ یہ دونوں شاہی مذاہب اپنا مذہب بھی اثر ڈالنے میں ناکام رہے اور فرزند صحرا اپنے اس شان خیال میں بھی مطلق العنان رہا۔

سیاحت اور جغرافیائی موقع عرب اس لحاظ سے بھی کوئی بڑی ناواقف قوم نہ تھا کہ اسے اس کی ضرورتیں بخیر کئی تھیں کہ اپنے سے زیادہ زر خیر صوبوں میں بغرض جاریت جایا کرے۔ اسے ہر منزل پر سوچنے اور دیکھنے کا کافی وقت ملتا تھا۔ یہاں تک کہ شام، مصر اور یونان کی زمینیں اس کی آنکھ سے پوشیدہ نہ تھیں اور نہ قیصران روم یا خردان ایران کے دربار اور ان کی عظمت ان کے لیے کوئی خواب کا واقعہ تھا۔ قدیم الایام سے اس کے بندر وہ ذریعہ تھے جہاں سے یورپ اور افریقہ میں تبادلات اجناس ہوا کرتا تھا۔ اس لیے اگرچہ اسے فطرت سے زر خیزی کا کوئی بڑا حصہ نہ ملا تھا مگر اس کا موقع ایسا بنایا گیا تھا جہاں سے وہ ریاست میث اور آرام کی چیزوں کو اپنی نگاہ سے دیکھ سکتا تھا۔

فصاحت کا صرف یہ تمام حیثیتیں مل جل کر ایسے مواقع پیدا کرتی ہوں گی جہاں ایک قوم اپنی انتہائے فصاحت اور جوش ایمانی سے اپنے معتدایان دین کی عمدہ صفات اور محاسن بیان کرتے ہوں اور یہ ذریعہ دوسرے پر اعتقادی فضیلت حاصل کرنے کے لیے موزوں سمجھا جاتا ہو۔ اگرچہ عرب میں خانہ جنگیوں کی مثال اور جانوروں کے لیے لڑائیوں کا ہونا معمول سے زیادہ پایا جاتا ہے۔ لیکن یہ امر شاذ ہے کہ ان میں مذہبی مناظروں نے کبھی آپس میں کوئی فساد قائم کیا ہو۔ اگرچہ بیت المقدس کے وقت اہل عرب رومیوں کے مقابلہ میں جنگ کرنے کے لیے بلائے گئے تھے۔ اسی طرح عرب کی صحیح زبان اور فطری شاعری کے جوش کے لحاظ سے یہ معمول سے زیادہ ممکن تھا کہ تمام مذاہب کے اعتقاد اور روایتیں انتہائی مباہلوں سے ہوا میں اڑ رہی ہوں اور معیار تنقید کی طرف سے کابلان جاہل انھیں ایسی تمام باتوں کو دیرساج سمجھتا ہو جیسا عامہ ناس میں اعتقادی روایتوں کے متعلق عام میلان ہے۔ اور جس میں

رومانے روحانی کی یہ عام روش کہ ان کا قول کبھی تنقید یا شبہ کے حوالہ نہ کیا جائے جس سے ان کی حکومت قلوب میں منصف پیدا ہو اور ترقی پیدا کرتی جاتی ہے جو روز بروز مذہب کے اصول اصلی کا زوال ہے۔

اخلاقی اصول سے نابلد نہ تھا عرب اخلاق کے اصول اولیہ سے بھی بے بہرہ نہ تھا اور نہ صرف ان کی طرف اسے حسن ظن تھا بلکہ اس میں پسندیدگی کا حس بھی تھا اور بہت سی خوبیاں تو گویا اس کے خصلت قوی میں داخل تھیں۔ یہاں نوازی اس کے خاصہ قوی میں داخل تھی۔ ہمسایہ کے حال پر مہمانی اور اس کی خبر گیری نیک آدمیوں کے اوصاف میں شمار ہوتی تھیں، محتاجوں اور بے کسوں کی مدد کرنا تمام شیعوں میں افضل تھا۔ عزت کا لحاظ اور وعدہ کا خیال رہتا تھا اور مینیت عرب اگرچہ نہایت بے مہارت تھی لیکن اسی کی بدولت وہ کبھی کبھی اچھے کام بھی کر جاتا تھا۔ عرب کے اخلاقی حس کے لیے اس سے قوی مثال نہیں دی جاسکتی کہ جاہل اور محدود فکر کی عورتیں بھی اس سے بے بہرہ نہ تھیں جو اس مثال سے ظاہر ہے۔

مثال جب کہ ہمارا ہادی فتح مکہ کے بعد ہر طبقہ کے لوگوں کو ان کے موافق نصیحت فرما رہا تھا اور ابوسفیان کی بی بی حنظلہ حضرت کے متعلق حکم سن کر کہتی ہے کہ: ”مُحَمَّدٌ هِیْنِ لَا یَسْکُنُ مَکْرَ اَخْلَاقِ حَسَنَہ“۔ یا کہتی کہ: ”ہم تم سے غرور اور فریب میں تھے۔“

جعفر بن ابی طالب کے قبل الاسلام خصلت اور رسول کا اعتراف اس میں اخلاقی قوی حس ہوتا اس واقعہ سے بھی ظاہر ہے کہ جعفر بن ابی طالب قبل اسلام سے ان صفات سے تمیز تھے کہ انہوں نے زنا نہیں کی، شراب نہیں پی، بت پرستی نہیں کی اور جھوٹ نہیں بولے۔ اور یہ صفات پروری تھی شارع اسلام کی کہ وہ عالم مع میں بلانے جاتے ہیں، ان کی ان صفات کا اعتراف کیا جاتا ہے اور ان سے ان محبوب سے احتراز کی وجہ پوچھی جاتی ہے۔ جعفر کہتے ہیں میں نے شراب اس لیے نہیں پی کہ اس سے عقل زائل ہو جاتی ہے، جھوٹ نہیں بولا اس لیے کہ دروغ کوئی مردانگی اور مردوت کم کرتی ہے، کسی کی حرمت سے زنا نہیں کی، اس لیے کہ اگر میں زنا کروں گا تو دوسرا میری حرمت سے زنا کرے گا۔ کبھی بت نہیں پوچھا اس لیے کہ اس سے کوئی فتح یا ضرر نہ تھا۔

رسول کے متعلق شکایت کا جواب اور اسی طرح جب حضرت ابی طالب سے لوگ ہادی عالم کی حکایت کرتے ہیں تو وہ جواب دیتے ہیں کہ: ”مُحَمَّدٌ شَیْءٌ غَلِیْظٌ یُّوَلِّیْ تَوْعِیْلَیْمَ کَرْتِیْ ہِیْنِ“۔

عرب کا خاصہ مذکورہ صدر مثالیں بتائیں گی کہ عرب اپنی واقعیت اصول اخلاق میں بے بہرہ نہ تھا بلکہ اس لیے ممتاز تھا کہ اس میں یہ باتیں ایک خاصہ طبعی ہو گئی تھیں، درآنحالیہ وہ مملکت جن میں کتابی علم ترقی پر ہو الفاظ، لغت، تعریف کی کمی یا زیادتی وغیرہ پر داغ سوزی اور وقت صرف کرتے ہوں گے۔ اسی طرح عرب اپنی ترقی عقل میں بھی ایسا نہ تھا کہ اس کا ان اقوام سے مقابلہ کیا جاسکے۔ جنہیں اپنی معاشرت اپنے حقوق اور اپنے پس و پیش کا ادراک نہیں ہے۔

نظام حکومت اگرچہ اس میں قبیلہ بندی تھی مگر اکثر اوقات ایک بڑے قبیلہ کی بہت سی شاخیں ہوجاتی تھیں اور اگرچہ اس طرح ان کی قوت تقسیم ہوتی تھی لیکن یہ قبول کرنے کے قابل نہیں ہے کہ وہ قوی مواقع پر

تمام قبائل کے سرداروں یا شیوخ سے استعصواب نہ کرتے ہوں اور نہ ایسا تھا کہ ہمیشہ ایک شیخ دوسرے سے برسرِ پاش یا زبانی جھگڑی ہی کرتا ہو۔ بلکہ مثالیں ہیں جہاں وہ مل کر بھی کام کرتے تھے۔ شیوخ کو طلب کرتے تھے اور آپس کی مشورت سے ایک بات طے ہوتی تھی۔ ان کی یہ طے شدہ بات عموماً ان کے نقطہ خیال کے لحاظ سے عمدہ تصفیہ ہوتی تھی اور دوسری بے انتہا مفید بات یہ تھی کہ اس کی ناکامی کی صورت میں وہ الزام کے ذمے لے سکتے تھے دراصل انھیں وہ کام جس کے حل میں ناکامی ہوئی ایک قوی تصفیہ تھا، اس لیے اس کے اچھے یا برے نتیجے کی تمام قوم اور اس کے فرد ذمہ دار تھے۔

ایک مفید حالت اور اسی طرح دوسری ایک اور اچھی بات یہ تھی کہ وہ اپنے قوی سرداروں کے حکم پر عمل کرنا جانتا تھا۔ اور اس صورت میں وہ ان قوی جموں سے اچھا تاجرانہ کام قوی مہم ہو۔ لیکن

ہر شخص اختلاف رائے سے مہم کو تراش رہا ہو۔ عرب کے نزدیک ایسے سوسقراط سے جو کسی شے کی کامل تعریف پر مجمع نہ ہو سکیں ایسے تھوڑے سے جاہل اچھے تھے جو بغیر چوں و چرا کے اپنے سردار کا حکم مانیں اور اس کی اطاعت کریں۔

یہ سب باتیں جواب تک کہی تھی ہیں اس بات کے دکھانے کے لیے ہیں کہ اب کسی نئی کی بعثت کے لیے کس قدر دشواریاں پیدا ہو گئی تھیں۔ لوگ بڑی باتوں میں نادانہ نہ تھے۔ مذاہب تھے، اخلاق تھا، مدنیت تھی، اغراض سیاست اور ان کے نتائج سے واقف تھے، تجارت تھی، صنعت اور منہ کا جس تھا۔ اور ان تمام قوموں کے مذاہب کا ایک دوسرے پر ایسا دباؤ تھا کہ جس سے نہ صرف کسی نئے متداخل کے لیے دشواریاں بڑھتی جاتی تھیں بلکہ وہ سب آپس میں بھی ٹسک نہ سکتے تھے۔ کسی کا ہمت کرنا لوگوں کی نگاہ میں اور کس جواب کا مہم ہو سکتا تھا۔ یزاس کے کہ لوگ اس پر، منسین، خاموش ہوجائیں یا اس پر تعجب کریں کہ یہ کون ہے جو ایک جمی ہوئی حالت میں مستحضرانہ بیجاں کا باعث اور اس لیے اپنی مخالفت پر لوگوں کو کمر بستہ کر رہا ہے۔ بات سمجھ میں آجاتی ہے کہ جب ملک اور اس کی دل فریب اشیاء سے جلوبندہ زر عرب یا عرب کی موجودہ گرد و پیش پر کوئی اثر نہ ڈال سکتا تھا تو وہ کون سا ذریعہ تھا جو لوگوں کو اپنی طرف راغب کرتا۔ کام ایسے قصہ خوان مقرر کا نہ تھا جو چند سبکی ہوئی باتوں کو بے اور لوگ بھی جانتے ہوتے لوگوں کے بھرے ہونے کانوں کے حوالہ کرتا یا کہتا جاتا جب تک کہ اسے کہنا ہوتا اور اس کے بعد محکمہ بیٹھ جاتا، اس کے الفاظ اور ان کی ہوجاہاں عرب سے ٹکرا کر چور ہوتی یا ریگستانی ہوا اسے خاک کے نیچے اس طرح دباتی کہ وہ اونٹ کے قدم سے زیادہ گہری دفن ہوجاتی۔ اس کے الفاظ کے پہلے اس کا جوش صرف ہوجاتا اور اب بجائے اس کے کہ وہ دوسرے کو کچھ سکھانے خود سیکھنے اور قبل اس کے کہ وہ دوسروں میں جوش پیدا کرے اپنے میں جوش اور استقلال پیدا کرنے کے لیے تیار ہوتا۔

عرب کا دوسرا رخ اب تک عرب کی تصویر کا ایک رخ تھا جو ناظر نے دیکھا، اس کے علاوہ ایک دوسرا رخ بھی تھا۔ عرب سب سے زیادہ غیر مستقل مزاج شخص تھا۔ اس کی سبب خصلی

ایک مشہور چیز ہے۔ اور اس کی حمیت جو کسی وقت حدس کی عزت کے لیے انتقام پر آمادہ ہو سکتی تھی۔ ایسے حرکات بھی سرزد کر سکتی تھی جیسے رحم، انسانیت اور انصاف سے کوئی تعلق نہ ہو۔

عرب کے لیے کسی مصلح کا کامیاب ہونا نبی عربی کے قبل ناممکن القیاس تھا اس کے جوش کی تربیت کرنا اور اس کا

مقتل صرف نکالنا ایسے نفس شناس اور ایسے تربیت پرور کا کام ہوتا جو آغاز اسلام کے قبل ایسی چیز نہ تھاجس کے متعلق خیال کرنے کی بھی کوئی جرات کرتا اور اگرچہ عرب میں وہ خوبیاں تھیں جن کا ذکر کیا گیا اور وہ طبعی صفات تھیں جن سے کام لیا جاسکتا تھا لیکن اس کا طبعی، اس کا سیلابی جوش اس کی خونخواری اور برائیوں میں انہماک ایسی ظاہری چیزیں تھیں جسے دیکھ کر ”کام لیا جاسکتا“ تیرے تیر عقل والے مدبر، حلیم سے حلیم نبی اور اعلیٰ سے اعلیٰ مدرس اخلاق کے نزدیک حبل کو کوہ اوقیس پر دیدہ و دانستہ چور ہونے کے لیے دے مارتا تھا۔

عرب اچھے سے زیادہ بُرا تھا۔ پڑھو ابن خلدون وغیرہ یا ڈیون پورٹ کا مختصر رسالہ ”مراحم العرب قبل الاسلام“ تو تمہیں معلوم ہو گا کہ عرب اپنی تصویر کے اس رخ میں کیسا مبہم انگ تھا۔ اس سے ہمیں زیادہ جس قدر وہ ایک رخ سے اچھا ہو سکتا تھا۔

دہی جنہیں خسرو پرویز صرائی، سومار خوار، وحشی وغیرہ کہہ سکتا تھا۔ جب کہ اس کے پاس

نبی عربی کا دعوت اسلام کے لیے نوشہ پہنچا حتیٰ تو یہ ہے کہ وہ دفعہ کیسے کج جاتا کہ یہ اس کا

فنان ہے جو نہ صرف عرب کے تمام حیثیتوں سے مجموعہ مفاہک اچھا ہے، بلکہ افضل اور اکمل عقول عالم ہے۔ جب کہ تیرہ سو برس کے بڑے وقت کے لیے بہت سے دماغ نہیں پیدا کیے جاسکتے، اور حقیقت تو یہ ہے کہ ایک شخص میں مبداء فیض سے سمجھنے کے وہ عناصر جمع ہو جانا اس کا خود عالم کے ممتاز نفوس میں بلند ہو جانا ہے۔ مثلاً کسی کا ایسے اسباب میں پرورش پانا کہ وہ ظہیری حیثیت کی اکثر اوقات راہ سے ہٹانے والی روش سے ہٹ کر عالم اور اس کے قوانین کو خود سے سوچے، اور اس میں غلطی نہ کرے۔ مثلاً:

ایسا سوچنا اسے برابر راہ معارف پر اس طرح چلانے کہ اس کی عقل برابر ترقی کرتی رہے اور آئندہ غلطیوں کے خوف سے محفوظ ہونے کی

حد تک پہنچ جائے۔ مثلاً اس کی قابلیتیں اسے خاصہ اور طبائع انسانی کو اسی طرح سمجھائیں جو آخر میں عین واقعہ بھی جائیں اگرچہ اس نے قیافہ اور بشرہ میں کوئی کتب یا علم نفس کے دفتروں میں سے کوئی ورق نہ پڑھا ہو، مگر اس کی آنکھیں اس طرح کج لیتی ہوں جس طرح اس نے انہیں اس وقت سمجھا ہے جس وقت یہ اشیاء عمل کے لیے متحرک تھیں۔ مثلاً اس میں برائیوں کی طرف سے ایک ایسا طبعی تنفر پیدا کیا گیا ہو کہ اسے دوسروں میں برائیوں کی بوجھل معلوم نہ ہوتی ہو چہ جائے کہ اپنے میں یہ میل گوارا کر سکے۔ مثلاً وہ اس درجہ صاف اور نقرے ہوئے خیال کا ہو جو غلطیوں میں الجھتا ہی نہیں بلکہ وہ جاتا ہی ادھر ہے جسے ایک مجمع یا زمانہ کا ایک جزو یا دقت کا کچھ حصہ یا جامعیت انسانی اپنی فطری روش میں عرصہ کے بعد سوچتی ہے یا جسے اس درجہ اعتدال میں ملکہ حاصل ہو گیا ہے کہ وہ اس اساسہ کو جو عالم کے خیال نے الجھا ہوا چھوڑا تھا اپنا کر لے اور اس سے

وہ ممتاز اور روشن نتیجہ نکال لے جس سے پیشتر کی عقل عاجز تھیں یا انھیں اس نتیجہ پر پہنچنے کی جرأت نہ تھی، یا وہ اس طرح اپنے خاصہ طبعی کے نمونے تیار ہو گیا ہو کہ اپنے خیال کا اپنے لفظوں میں مجسمہ بن گیا ہو، اور ان باتوں نے اس میں وہ اثر، وہ وقار، اور وہ شان پیدا کی ہو کہ کیسا ہی نفس ہو مگر اپنے اور پر ذات اور کلام کا اثر دیکھتا ہے، کیسا ہی ناشو ہو مگر وہ اپنے تمام ناشوئی میں اپنے کو اس کی طرف کھینچتا ہوا دیکھتا ہے۔ یہ سب وہ نورانی عقل ہو۔ غلطیوں سے محفوظ ہونا ہو، وزنی ذات ہو یا اس کا حیرت خیز اثر۔ کسی طرح شاعری نہیں ہے۔ بلکہ اس حد تک بھی جن میں مبالغہ ممکن نہ ہو کسی طرح حدود شاعری سے ادنیٰ مس نہیں رکھتا۔

عرب کی فصاحت اگرچہ اپنے عہد مصرف میں قابل تعریف تھی لیکن دولت مندوں کی لڑکیوں اور عورتوں کی عزت ان کی عقل کی بدکاری اور زنا کاری اس کے لیے ندامت کی چیز نہ تھی، اور قدیم اسرائیلیوں کا یہ ورثہ ان تک پہنچا تھا کہ اپنے باپ کی حرم پر محض ہوجائیں۔ یعنی سوتیلی ماں ان پر حرام نہ تھی۔ بے گناہ لڑکیوں کا قتل ان کی جاہلانہ حمیت کے مقابلہ میں کوئی بری چیز نہ تھا بلکہ اگر ان کی اوٹھی یا بیٹھیاں جو مرتبہ مادہ عقلی تو اسے بھی کان کاٹ کر چھوڑ دیتے تھے کسی اجنبی کے گھر میں بغیر اجازت و زمانہ گھس جانا عیب میں داخل نہ تھا اور کعبہ میں برہنہ حج کرتے تھے۔ ان کے نزدیک مردہ جانوروں کا گوشت نہایت لذیذ ہوتا تھا۔ شراب اور منشی چیزوں کا استعمال مدہوشی کے عالم میں اس سے مغلوب ہاتیں سرزد کرتا تھا اور قمار بازی بلا اشتناہر و لغز نہ کھیل تھا۔ لونڈیاں گانا بجانا سکھاتی جاتی تھیں، وہ حرام کاری کی مجاز تھیں اور یہ آمدنی آقا کے تصرف میں آتی تھی۔ رہزنی اور غارت گری انتہائی حد کو پہنچی تھی۔ ٹوٹے اور ٹکڑوں کا اعتماد کرتے تھے اور جانوروں کے اڑنے سے فال لیتے تھے۔ انھیں اعتماد تھا کہ اگر انتقام خون نہ لیا گیا تو مقتول کے سر میں ایک چھوٹا پتھر ڈال کر پھینکا جائے گا کہ آسمان میں چلتا پھرتا ہے۔ کسی کامرانا اس کے اوٹ کی تھا تھی۔ اس لیے کہ وہ قبر میں باندھ دیا جاتا تھا۔ قتل اور گرائی میں اوٹوں کو جرح کر کے اس کا خون پیتے تھے۔ اور گائے کی دم میں سوکھی گھاس اور چھریاں باندھ کر پہاڑوں میں چھوڑ دیتے تھے اور اس کے بعد پانی برسنے کے امیدوار رہتے تھے۔



کیا چاہیے تھا لیکن جو بات نہایت ضروری تھی وہ یہ نہ تھی کہ سب کے پہلے عرب سے ٹوٹے یا ٹکڑوں کا عقیدہ دور کیا جاتا، یا اسے لطافت تہذیب سکھائی جاتی۔ یہ زمانہ کا کام تھا۔ پہلے اسے ایسی تعلیم اور اصول کی ضرورت تھی جو اس کے لیے ایک فطری مرکز ہوتا، اس سے محبت اور خلوص بڑھتا جاتا، وہ شرافت اور صدق و صفا کا قلمہ بکھاتا، اور یہ نمونہ انھیں اپنی فطری روش سے بلند کرتا، اور یہ چڑھائی خود بخود نفس کے باعث ذلت افعال سے اپنے میں متفرق ہو جاتی۔ سب کے پہلے نہ صرف عرب بلکہ عالم کو خدا نے واحد چاہیے تھا۔ ایسا خدا نہیں جو خداؤں میں بڑا خدا ہو۔ یا وہ کئی اور سے مل کر ایک معجون بن گیا ہو، یا گوشت اور خون میں اوتا ہو، یا نیکی اور بدی کے الگ الگ خدا ہوں۔ جو باپ کے گناہ کا عوض بے گناہ پشتوں سے لیا کرتا ہو، یا جس نے مخلوقات کو خود ہی گناہگار پیدا کیا ہو اور پھر انھیں پر اپنے انصاف کی قوت بھی آزمائے۔ یا جس نے شفاعت ناس کے لیے عام اس سے کہ وہ حدود الہی پر چلتے ہوں یا نہ ہوں، درمیانی آدمی رکھا ہو، اور اسے بخوانے کے اسے اختیارات تفویض کر دیے گئے ہوں کہ خود اختیار بخشنے والے

کے اختیارات مداخلت کی کوئی گنجائش نہ ہو۔ ضرورت تھی کہ وہ لَئْسَ بِظَلَامٍ لِّلْعَالَمِينَ (۱۸۲: ۳) (اپنے بندوں پر ظلم نہیں کرتا) ہو۔ اور مَنْ ذَا الَّذِي يَشْفَعُ عِنْدَآلَا بِإِذْنِهِ (۲۵۵: ۲) (کون ہے کہ اس کی اجازت بغیر شفاعت خواہ ہو) کا اختیار اس سے ساقط نہ ہو گیا ہو۔ ضرورت تھی کہ اس کے علاوہ دنیا میں کوئی خدا نہ ہو۔ وہ خالق ہو اور سب مخلوق ہوں۔ یہ نہ ہو کہ وہی خالق بھی ہے وہی مخلوق بھی ہے۔ اور ایک عجب لہو دھون دھون کا رخانہ ہے کہ نہ قاتل قاتل ہے نہ مقتول مقتول۔ نہ حاکم حاکم ہے نہ محکوم محکوم۔ سب ایک ہیں، دراصل ایک ہر ایک اپنے کو ضد حالتوں میں پارہا ہے۔ یہ نہ ہو کہ خدا انسانی صفت کا نمونہ ہو بلکہ خدا کی صفت اور قدرت تمام اشیاء نے عالم میں ظاہر ہوں اور اپنی زبان سے اپنے صانع کی حکمت و قدرت کی شہادت کرتی ہوں۔ ضرورت تھی کہ وہی مرکز صفات ہو، اس کی صفت عین ذات ہو بلکہ کمال الاخلاص لہ نفی الصفات عنہ ہو۔ ترقی اخلاق نے اسے نہ بنایا ہو بلکہ عالم کے تجربہ اخلاق میں وہ ظاہر ہوا ہو۔ وہ اخلاق کا خزانہ ہو نہ یہ کہ اخلاق اس کی زینت ہو۔ اخلاق کو اس کی طرف نسبت دیے جانے سے افتخار ہو، نہ یہ کہ اخلاق سے نسبت دیے جانے سے اس کی کوئی وقعت بڑھ جائے۔

سوچو عالم کے مذاہب کے خدا کو سوچو ہر طرح کے شرک کو سوچو وحدت وجود کو سوچو خود پرستی کو اور پھر اس کے بعد غور کرو اس حیرت خیز مختصر فقرہ کو جسے ہم عالم کے تصفیہ توحید پر ترقی کہتے ہیں کہ "لا الہ الا اللہ"۔ اس "لا" اور "الا" میں نہیں دکھائی دیتی کوئی بات مگر یہ کہ اس کا کہنے والا عالم کے اس وقت کے اصول توحید پر پورا حاوی تھا، اور جس توحید پر زمانہ حال کا فلسفہ اور سائنس کوئی ترقی کی قلعی نہیں کر سکا۔ یہ صاف، شفاف، سیدھا مختصر، شرک کش، شہ شکن جملہ تمام پیشتر کے ادہام اور اکھنوں کو جڑ سے کاٹ رہا تھا۔ یہ دہریت اور مادیت کی خاک کو جو میں اڑا رہا تھا۔ یہ اللہ قبول رسول کے سب سے بڑے شاگرد کے وہ تجاہس کی طرف انسان اس وقت متوجہ ہوتا ہے جس وقت اسے ہر طرف سے مایوسی ہوتی ہے اور تمام امیدیں قطع ہو جاتی ہیں۔ یہی انسان کی آخری پناہ قرار دی گئی تھی۔

لیکن اس جگہ ایک عقدہ ملا نیل یہ پیش ہوتا ہے کہ کیسے :۔

یتیم کہ تا کردہ قساکں درست کتب خانہ چند بلیت بشت
نبی عربی کیونکر ایسے ہوئے

کوئی کہتا ہے کہ جس وقت نبی عربی "محمد بن عبد اللہ" کی حیثیت سے بارہ تیرہ برس کے سن میں شام گئے تھے اور سطورا راہب سے جو کچھ باتیں ابوطالب سے ہوئی تھیں وہی اصل میں وہ بنیاد ہوئیں جنہوں نے آخر میں انہیں اس بڑے منصب کے لیے تیار کیا، اور یہ اس لیے کہا گیا ہے کہ حقیقتاً حضرت عیسیٰ کی بھی ابتداء ہوئی تھیں بیستم دینے والے یوحنا نے بیستم دیا، اور جس کی تقریر اور جوش نے ابن مریم کو متوجہ کیا۔ کوئی مثل سروریم میور رسول کی تعلیم، مذاہب کے لیے قیاسات کی حیرت انگیز قوت سے اس لوگوں کو لاتا ہے جو لوگوں میں قید ہو گئے تھے اور ہوتے ہوئے کسی طرح مکہ مدینہ پہنچ گئے اور مسلمان ہوئے۔ کبھی کسی پادری سے کہیں وعظ کھلوادیا ہے، وہ کسی زمانہ میں کیوں نہ ہو اور رسول نے سنا ہو یا نہ سنا ہو لیکن مسیحی مؤرخین کے موافق رسول کی تعلیم کے لیے ایک ذریعہ ہو گیا اور پھر بھی یہ مذاہب اس قابل ثابت نہ ہو سکے کہ وہ ان پر کوئی اثر کرتے۔ دوسرا خود ہی کہتا ہے کہ سطورا کی زبان دوسری تھی وہ عبرانی ہو یا ارمیک۔ اگر بھی ہے تو تصفیہ کرنا

پڑے گا کہ رسول اس مصومہ سن میں یہ زبانیں سیکھ چکے تھے کس سے سیکھی تھی۔ مکہ میں کیا کوئی مدرسہ الہیات یا مدرسہ اثنہ علم تھا۔ اس کے پروفیسر کون تھے۔ انھیں عبد المطلب یا ابوطالب کیا تجواہ دیتے تھے۔ وہ مدرسہ اب کہاں ہے۔ اس کے کھنڈر کچھ باقی بچا یا بالو سے دب گئے اور پھر یورپ کے تمام اریکولوجیکل سوسائٹی میں سے کسی نے اسے کھود نکالنے کی کوشش نہ کی۔ شاید کوئی کتب نقلی اور عالم کی مطلوبات میں اضافہ کرتا۔

دوسرا کڑا ہوتا ہے اور کہتا ہے کہ: نئی عربی کی مطلوبات شام میں اپنے شباب کے سفر سے ہوئی، اور وہیں انھوں نے تہذیب اور انجیل کا مطالعہ کیا۔ لیکن تعصب کے گہرے پردہ نے یہ سوچنے نہ دیا کہ مذاہب کا مطالعہ وہ کھیل نہ تھا جو اتنے زمانہ میں کھیلا جائے۔ جس میں کوئی شخص اپنی اشیائے تجارت منہ و دھن کرے، در آنحالیکہ وہ اسی ہجرت بحث طلب مفید نکات نوٹ نہ کر سکتا ہو، اس کی مسل مرتب نہ کر سکتا ہو اور پھر یکساں مضمون کو تنقید کے لیے اپنی نگاہ کے سامنے نہ رکھ سکتا ہو۔ مجھے یاد نہیں آتا کہ اس وقت میکسمولر کی کتب ”مشرق کے مقدس مذاہب“ بن گئی تھی یا مسیحی سوسائٹیوں کے چھوٹے چھوٹے رسالے عرب اور شام میں شائع ہو گئے تھے جس سے مدد لی جاسکتی۔ یا دبستان المذاہب وغیرہ ایران سے تصنیف ہو کر آگئی تھی۔ اور ساتھ ہی ساتھ یہ کچھ کا ثبوت بھی ہو کہ اس تینیس چوبیس برس کے سن میں غنمہ عربی کو ایک مذہب کے قائم کرنے کا خیال بھی ہو جو چالیس برس کے سن میں پختہ ہوا اور یہ اس وقت سے اپنی بعثت اور دعویٰ کے وقت تک برابر ایک شخص کی طرح مضامین کے پھول چن چن کر گلہ بستہ بنا رہے تھے اور اس شہد کی مکی کی طرح بے کسل کوشش کر رہے تھے جو اڑے بیٹھے یا جھنجھٹائے مگر اسے صرف یہی خیال ہے کہ کیونکر اپنا چمٹا بنائے۔

نئی عربی کیا کیا تھے
وہ مواد کہاں تھا جس پر رسول عربی سوچتے اور یہ تمام باتیں ان کے دماغ میں جمع رہیں اور بلا سہو۔ کامل حیثیت سے۔ بلا اشتباہ اس وقت نکل آئیں جس وقت ضرورت کہتی کہ یہی بہترین موقع ہے۔ پھر وہ ایک وقت عالم مذاہب ہوتے، دوسرے وقت پطراظم اور نیپولین یا والٹا سر کی تعریف کے قابل مدبر اور مقتدر ہوتے، تیسرے وقت ان کا نفس انبیائے گمشدہ کا انکار ہوتا، اور چوتھے وقت وہ ایسے ضحیٰ دلیغ ہوتے کہ عرب کے اصح الفصحاء سبغہ منخلتہ کو کسبڑوں کے کھانے کے لیے چھوڑ دیتے۔ اور علی ہذا التعلیاس وہ ایک وقت ایسے شجاع ہوتے کہ علی کا ایرامستند شجاع عالم یہ کہہ سکتا کہ انتہائے خطرہ کے وقت ہم لوگ رسول کے پاس پناہ لیتے تھے یا وہ ایسا سپہ سالار ہوتا کہ جو عبد اللہ بن جبر کو پیشتر سے ایسے درہ کی مخالفت کے لیے مقرر کرتا جس سے خوف ہو سکتا تھا، اور آخر میں ماضیوں کی لاپرواہی سے دشمن کا موقع کو غنیمت سمجھنا اس کے اندازہ کرنے والی کج کا ثبوت ہوتا کہ وہ ایسا جامع قوم ہوتا کہ افراد کو قبیلہ، قبیلہ کو ایک قوم اور عالم کی قوموں کو جو بہت سی حیثیتوں سے مختلف تھیں ایسی نسبتاً پرکڑا کرتا جیسے دھوپ، بارش، زمانہ اور اسی طرح کمزور کرنے والی چیزیں کمزور نہیں کر سکتیں۔ اور جس کی مدد بند کی کو مہرائے عرب کا سب سے بڑا طوفان کسی طرح مختا نہیں سکتا۔ ایک لطف، ایک برادرانہ محبت، ایک جذبہ شوق، ایک پر کیفیت تہربت، اہل اسلام کے دلوں میں پیدا کر دیتا جس کے احساس اور شیریں لقمہ پر مخالفتوں کے ٹھیب قرنا اور طبل کی صدا غالب نہیں ہو سکتی۔

قبل بعثت اس کا کوئی اشارہ نہیں ہے کہ انہوں نے آئندہ دعویٰ نبوت کا اعلان کیا کہیں کتب تاریخ میں اس کا ثبوت نہیں ہے کہ نبی عربی نے اپنی بعثت کے ایک دن قبل بھی یہ دعویٰ کیا ہو کہ وہ نبی ہونے والے ہیں۔ چ جائے کہ انہوں نے بارہ برس کے مصومانہ زمانہ، یا چوبیس برس کی عمر میں اس کا کوئی اشارہ کیا ہو۔ لیکن معلوم یہ ہوتا ہے کہ تمام ملک، تمام مرکز جماعت، تمام صحبتیں، اور رضا اس صدا سے رہی ہوئی تھیں کہ ایک نبی پیدا ہونے والا ہے، اور اس ”نبی“ پیدا ہونے والا ہے“ کے فقرہ میں دل کی گہری سے گہری تک یہ خواہش ظاہر ہو رہی تھی کہ ”ایک نبی کی ضرورت ہے۔“

کس پر نگاہیں اٹھتی تھیں اور انہی دو فکروں کے بعد جب نگاہ اس بات کو ٹٹولتی ہے کہ آخر لوگ کس میں اپنے اس خیال کے آثار کو پاتے تھے۔ کہاں ان کی نگاہیں ٹھہرتی تھیں، تو یہ بلا خوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ وہ یتیم عبد اللہ کی ذات تھی جو اکثر حیثیتوں سے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرتی تھی۔ اس کے آثار ہیں کہ عرب اپنی مذکورہ حالت میں سوچ رہا تھا کہ ایک ہادی کی ضرورت ہے اور اگرچہ یہ کہنا موازنہ کے لحاظ سے دشوار ہے کہ آیا عرب کی یہ امید شدت میں ویسی ہی تھی جیسے یہود کا ”زمانہ آمد مسیح“ تھا۔ لیکن بہت کچھ یہ امید ایسی واضح ہو چکی تھی کہ اس کا شخص یتیم عبد اللہ کی ذات میں ہونے لگا تھا۔ عرب کی چہانگرد نظر ہو، یا نسطور اراہب کی ایک صدی پرانی نگاہ۔ یہ دونوں اس خاموش بولتی ہوئی سایہ فگن روح میں کچھ پائی تھیں اور جس جس طرح تجربہ ہوتا جاتا تھا ان کی دھت بڑھتی جاتی تھی۔ نسطور اکا یہ فقرہ اب تک محفوظ ہے کہ ”اے یہود سے بچانا۔“ کیوں کیا اس لیے کہ ایک زمانہ تک مسیحیوں میں یہ خیال تھا کہ یہود دوسری قوموں کے بچوں کو اپنے سینا لوگ میں ذبح کر ڈالتے ہیں؟ لیکن شخص کیا تھی یتیم عبد اللہ سے۔ یہ کوئی موقع نہ تھا جہاں نسطور ایہود اور مسیحیوں کی مشہور عداوت کے لحاظ سے اس کا موقع دیکھتا کہ عربوں میں یہودیوں کی عداوت کا پھیلنا پیدا کیا جائے۔ اسی طرح یوڑے درقہ کا یہ فقرہ ابتدائی زمانہ کا پر غور لحاظ بتاتا جو کہ ”میں کسی کو محمد بن عبد اللہ سے زیادہ نبوت کے قابل نہیں پاتا۔“ اسی طرح ادائل عمر سے طبیعتوں پر گہرے اور دل کش اثر کا یقین اس دفعہ سے ہوتا ہے جب کہ سردار ان قریش انسان کی تین بڑی کمزوری کو ابن عبد اللہ میں تلاش کرنے اور اس کا علاج کرنے آئے تھے اور انہوں نے اپنے جتنی کی عمدہ صفات کا اقرار کیا تھا اور اسی طرح بہت کچھ سمجھتی ہے یہ حالت کہ جو ”دیکھتا تھا ذرا فیتہ ہو جاتا تھا۔“

ہر وقت کے دیکھنے والے زیادہ متاثر تھے ہر وقت کے دیکھنے والوں میں بجائے اس کے کہ اپنے اس مرکز نگاہ اہل وطن کی دھت کے متعلق جاہل یا کمی پیدا ہو روز بروز بڑھتی جاتی تھی۔ وہ دیکھتے تھے کہ اس میں سے خوش غفلتی اور محبت چمکی پڑتی ہے۔ وہ اس میں تربیت کے اعلیٰ آثار پاتے تھے۔ وہ اپنی عقل کو اس کی تبعیت پر بخور دیکھتے تھے۔ وہ اس میں ایک عظمت پاتے تھے جس کے سامنے ادب سے دبے جاتے تھے۔ اگرچہ وہ سن میں کتنے ہی بڑے کیوں نہ ہوں۔ وہ اسے ایک ابر دیکھتے تھے جس کی خوشگوار بوندیں عالمگیر ہوتی جاتی ہیں۔

طفلی میں وجہ خلقت کا اشارہ

جی چاہے گا اس بچہ کی زیادت کو جو بچوں میں کھڑا ہے لیکن یہ کہہ رہا ہے کہ: ”انسان لہو و لعب کے لیے خلق نہیں ہوا ہے بلکہ اس سے بہتر افعال کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔“ جس کی قرآن سے آگے چل کر وضاحت ہوئی کہ: ”وَمَا خَلَقْتُ الذِّقْنَ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ“ (۵۶: ۵۱) یا حضرت امام حسن عسکریؑ غرض خلقت انسانی، علم اور عبادت کے لیے فرماتے۔ غور کرو تو اس کی صورت تمہاری آنکھوں میں پھر جائے گی جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ: ”اندوہش پیوستہ و فکرش دائم“۔

بعض حالتیں اور شغل

دی جس کے دل پسند افعال میں بچوں کو دیکھ کر مسکرا دیتا انہیں سلام کرنا اور غلاموں کے ساتھ کھانا داخل تھا۔ وہ جسے بھلا معلوم ہوتا تھا کہ سال کا ایک مہینہ ایسی جگہ بسر کرے جہاں اہل علم کی نظر اس کے احسان میں نہ چھے۔ اس کے کان دنیا کی صداؤں سے خالی رہیں۔ اس کے خیال پریشان نہ ہوں۔ وہ ادھر متوجہ ہو جہاں وہ چاہے۔ وہ اپنا آپ مالک ہو۔ علم اور اہل علم کی بے شمار چیزیں اسے خواہ مخواہ ہر طرف دورانی نہ پھریں۔ وہ جس نے باب بنی شیبہ کو اپنی یادگار داخلہ اور نصب حجر اسود سے عربوں کا درامد بنا دیا۔ عرب سمجھے کہ ہم من حیث القوم جس امر کو طے نہ کر سکے اسے ایک نوجوان کی عقل نے اس محبت اور خاکساری سے فیصلہ کر دیا کہ گویا اس کے نزدیک یہ کوئی ایسی بڑی بات نہ تھی جس پر افتخار کا خیال بھی کرتا۔ اور اپنی افضلیت کے اظہار سے کوئی ناگوار ہوا کہتا۔ وہ دل کے لیے چھوڑتا تھا۔ وہ مثالوں سے اپنی فضیلت کا احساس کراتا جاتا تھا۔ اس کے لیے کوئی ادا لے بزرگی جو خود ستائی کی کسی ہی لطیف حد میں ہو شریفانہ کنارہ کشی کے لائق تھا۔ وہ ضرور آگے چل کر ”خود“ کے قابل پذیرائی اور اثربخش شان پر لوگوں کو ان کے لیے متوجہ کرتا تھا۔ یہ بلند مفہوم ہر اعتراض سے بالاتر اور سخت سے سخت تنقید کا مقابلہ کرنے کی قابلیت رکھتا ہے۔ یہ اس کا تصور نہ تھا کہ وہ دوسروں کو ایسا نہ پاتا تھا جنہیں نمونہ اور مرکز بنا سکے۔ لیکن وہ ”منی اہل البیت“ کہنے میں کافی سخاوت سے کام لیتا تھا۔ جب اس کا شان پاتا تھا اگرچہ وہ جسے مردم شناس کی نگاہ نے یہ افکار بشتا۔ غمی غلام کے پر مضر فقرات سے کیوں نہ یاد کیا جاتا ہو۔ اور وہ بھی جرأت اور خوش پسندی کی اس حد تک آگیا ہو کہ تمام مضر اور جاہلانہ نسیی افکار کو یہ کہہ کر جھاڑ دے کہ: ”میں فرزند اسلام ہوں۔“

قبل نبوت احسان

نصب حجر اسود کے تصفیہ کا احسان اس قابل تھا کہ عرب ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس دن کو یادگار دن قرار دیتے جب کہ ان کی نیامیں ان کی تلواروں کو اپنی گود میں رکھ سکیں، ورنہ ظاہر ہے کہ ایسی لڑائی کیا کچھ کر سکتی تھی جس میں ایک پر ایک نہیں ہے بلکہ ہر شخص کی تلوار ہر شخص کی گردن پر ہے کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ اگر اس آئندہ کے صلح بنی آدم اور لا تقسید وافی الارض (۲: ۱۱) کے حقیقی قییب نے ان کی مدد نہ کی ہوتی، تو کب تک وہ درندوں کی طرح ایک دوسرے پر حملہ کرتے رہتے۔ کس قدر قتل عام ہوتا۔ اور قتل کے بعد آلے تھے صورت معاملہ کو کس قدر مضییب کر دیتے۔ غالباً اس سے زیادہ مضر اثر پیدا کرنے کے لیے کوئی اور سبب ایسا قوی نہ ہو سکتا تھا۔ اگرچہ سبب مذہبی محض نہ ہوتی لیکن مذہبی جوش اور بھائی محافطت کی باعث ہوتی۔ مشتبہ الاسباب نے واقعات دکھا کر پیشین گوئی کرائی تھی کہ دیکھو بہت جلد ہی تمہارا جامع قوم ہوگا۔ تم اس وقت اس کا کہنا نہ مانو گے۔ محافطیں کر دو گے۔ لیکن اس کی ضرورت تھیں ہوگی، اس کی ہر طرح کی غیباں تھیں اپنی طرف محافطت کی اور آخر میں وہ

تھارے نظام پارینہ کا تار تار الگ کر دے گا اور ایک ایسی بنیاد پر کھڑا کر دے گا جو قصیں اس وقت تک بھرنے نہ دے گی جب تک تم اس کے اصول کو اپنی دینی، دنیوی، عقلی، تمدنی اور معاشرتی بنیاد سمجھو گے۔

دوسرا بڑا احسان قبل بعثت نبی عربی کا دوسرا بڑا احسان یہ تھا کہ انھوں نے اپنی قوم کو ایک عرب کے وطن فوشی سے مطلع کر دیا جو اہل روم سے اس بات کی سازش کرتا تھا کہ انھیں مملکت مجاز پر قابض کر دے۔ یہ نہ صرف اہل عرب بلکہ تمام ممالک اطراف کی دائمی حکمرانی کے قابل ہے جو رومیوں کے زیرِ تدن اور اثر آسکتا۔ اہل روم کی تاریخ ان کے خونی کارناموں سے رنگی ہوئی ہے۔ انھیں ملک کے آباد کرنے کی فکر نہ تھی بلکہ فتوحات اور غنیمت کا جوش اور اپنے ملک کی قدردانی کی آرزو انھیں ویرانی اور بے رمیوں کے لیے آمادہ کرتی تھی اور اس کا اثر مشحونہ ملک کے رہے تھے تمدن اور اخلاق کو بھی غارت کر دیتا تھا۔

تیسرا بڑا احسان تیسرا بڑا احسان یہ تھا کہ انھوں نے عربوں کے ایک قدیم عہد کو جو ”حلف الفضول“ کہلاتا تھا تازہ کیا۔ جس میں غربا کی مدد، مظلوموں کی حفاظت اور عورتوں کی خطا صحت اور حمایت بھی شامل تھی۔ اور یہ شہرت تھی اس سردارانِ عرب کے بادشاہ کی امانت داری کی کہ آخر میں غالباً عمر شریف کے چوبیسویں برس

صورت کی دل کشی اور لہجہ ملکہ عرب حضرت خدیجہؓ نے جن کے ساتھ ہزار سے زیادہ اونٹ عمان، یمن اور شام کی طرف اجناس تجارت کے تبادلہ کے ذریعہ ہوتے تھے۔ اپنا وکیل بنایا۔ یہ مرحلہ شام و کسب معلوم ہوتا ہے، جب اس نوجوان کو شام کی بازار میں دیکھیے، اس کے حسنِ خداداد، اس کی ظہری شیریں کلامی، اس کی متصورانہ شان، اس کی غور میں ڈوبتی ہوئی آنکھیں، اس کے مقوس ہانکت اردوں کے نیچے دیکھنے والوں کو اپنی طرف مہینتی تھیں۔ خبر یہ کہتی ہیں کہ چیزوں کو کوئی نہیں دیکھتا تھا اور سب بیچنے والے کے گرد چوم کرتے تھے۔ غالباً اس آرزو میں ہر شخص قریب آنے کی کوشش کرتا ہو کہ اس کی باتیں سنیں جس کا بقول اس کے شاگرد کے: ”لہجہ سب سے زیادہ درست تھا۔“

چونکہ میں تجارت کا ذکر کرنے لگا اس لیے ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ عربوں کے تعلیم تجارت کے متعلق اس قدر اور کھدوں کہ اتفاق سے یہ افتخار بھی اس گھر کے لیے تھا کہ وہ عربوں کو دور دور از ملکوں سے تجارت کرنا، نفع اٹھانا، تجربہ حاصل کرنا، اور اس سے اپنے خیالات اور ملک کی ترقی میں کوشاں ہونا سکھاتا۔

خاندانی پس منظر پانچویں صدی مکی کے قریب قحی نے جو فہر الملکب بقریش (تاجر) کی اولاد سے تھے اور جن کا خوجہ نسب معد بن عدنان سے ملتا ہے جو حضرت اسماعیلؑ کی نسل سے تھے، مکہ پر اقتدار حاصل کیا اور رفتہ رفتہ تمام حجاز ان کے زیرِ اثر ہو گیا ان کے پہلے مکہ چھوٹی چھوٹی بستیوں میں تقسیم تھا اور انھیں کو کعبہ کے از سر نو تعمیر کی ضرورت ہوئی۔ اپنے قیام کے لیے معبد کے قریب ایک ممتاز عمارت تعمیر کرائی جس کا ایک بڑا کمرہ امورِ سیاسی اور قومی کے انجام دہی کے لیے مختص تھا۔ قحی نے ۳۸۰ھ میں وفات پائی۔ قحی کے بیٹے عبدالدار اور عہد مناف تھے۔ جن کی اولاد میں نزاعات کی ابتداء ہوئی۔ عبدالدار کی رحلت کے بعد اس کے پوتوں اور اس کے بھائی عہد مناف کے بیٹوں میں انتظام اور حکومت کے لیے نزاع ہوئی اور اس کی اس طرح تقسیم ہوئی:

عبد المنان

باشم
عبد الشمس

مطلب

ہاشم کے احسان

ہاشم کے احسان
عبد اللہ نے اپنی حکومت اپنے بھائی ہاشم کے حوالہ کر دی۔ ہاشم نہایت سرور آوردہ تاجر تھے۔ ہاشم کے معنی ریزہ ریزہ کرنے والا۔ اور یہ خطاب انھیں اس لیے ملا تھا کہ یہ مہانوں کو شور بے میں روٹی توڑ توڑ کر کھلایا کرتے تھے اور رفتہ رفتہ حاحیوں کی دعوت اور مہمانی انھیں کے متعلق ہو جی تھی۔ انھوں نے زمانہ قحط میں اپنے اہل وطن کے لیے مملکت شام سے غلہ فراہم کیا اور ان کی بڑی مدد کی۔ ان کو مکہ میں ناقابلِ مثال ہر دلعزیزی حاصل تھی اور تمام حاجی ان کی توجہ کے مشکور واپس جاتے تھے۔ ہاشم نے ۵۱۰ء میں انتقال کیا۔ یہی اپنی قوم میں شام سے حجاز کے محرک بنے۔ ان کے بعد ان کے بھائی مطلب الملقب بہ سخی ان کے جانشین بنے۔ انھوں نے بھی ۵۲۰ء میں انتقال کیا۔ اور ان کے بعد اختیارات ان کے بھتیجے شیبہ کے سپرد ہونے جو زیادہ تر عبد المطلب کے نام سے مشہور تھے۔

عبد المطلب
عبد الشمس
عبد المطلب

عبدالدار کے پوتے مالدار ہوتے گئے لیکن یہ خاندان ہاشم کی عزت اور شہرت دیکھ دیکھ کر حسد کے انکاروں پر لوٹ رہے تھے اور کسی طرح کہ برائے نام چاہتے تھے۔ عبدالمس کا مرض بیٹا امیہ ان کا مددگار تھا۔ لیکن بلا وجود اس کشاکش کے عبدالطلب ۵۹ برس تک حکومت کرتے رہے۔

ابرهہ اور عبدالمطلب

تباہ ہونے کا افکار ہوا۔ اور انھیں کی ہمت اور استقلال نے عربوں کو منتشر ہونے نہ دیا۔ در نہ زیادہ ممکن تھا کہ عرب ہاتھیوں کے ایسے قوی ہیکل جانوروں کے مقابلہ کے لیے کوئی چیز نہ پاتے۔ حیرت اور خوف ان کے حواس پر اثر کرتا اور دشمن کی آمد کے قبل یہ اپنے وطن اور معبد کو چھوڑ کر پہاڑوں اور رگیستانوں میں جا چھپتے۔ یہ عبد المطلب کی مضبوط ذات تھی جس نے انھیں جمع رکھا اور اس کے بعد ”رسیدہ بود بلائے دے بغیر گزشت“۔ حضرت عبد المطلب ہی تھے جنہوں نے زمر کو جو غراب اور بند ہو گیا تھا صاف کرایا۔

عبد المطلب

عبد الله
محمد
فاطمه
الحطاب
علي
حسن
حسين
زينب
أم كلثوم
عباس
الوليد

یہ محبت وطن تھاجس نے اکل افراد عالم کے ایترانی پرورش میں
نبی عربی کی پرورش کا ذمہ دار اٹھاک ظاہر کیا، اس لیے کہ ولادت رسول کے چند ماہ قبل

حضرت آمنہ خاتون بیہ ہونچی تھیں اور بروایت شاذان ابی چار مہینہ کے تھے کہ ماں کا سایہ بھی سر سے اٹھ گیا قبول
 ملا جاہی ”حضرت آمنہ خاتون اپنے عفت و جمال کے لحاظ سے سیدۂ عرب کہلاتی تھیں۔“ کافی ہے کسی معصوم بے زبان بچے
 کے لیے یہ غم کہ ماں کا گرم سینہ اسے چھوٹے چھوٹے ہاتھ مارنے اور چلنے کے لیے نہیں ملتا دودھ پیتے بچے کا دودھ
 پیتے وقت طہنہ دیکھو۔ اس کی معمولی حکومت اور زعم پر غور کرو، اور اس گوارا ہار کے نیچے ماں کے خوشی سے اچھلتے
 ہونے دل کا خیال کرو۔ ماں بچے کی اور بچے ماں کی محبت کا احساس کرتا ہے اور آپس کا قلبی کھجوتا ایک لطف ہے جس پر ماں
 اپنی رات کی نیندیں اور زندگی کا آرام مدفن کرتی ہے۔ اس معصوم کے لیے یہ لطف اور راحت زیادہ زمانہ کے لیے نہ
 تھی۔ ماں نے رعت کی تین دن تک اضطراب رہا۔ ہائی عورتیں یکے بعد دیگرے اپنے سردار کے پاس آتی ہیں لیکن بچے
 کسی طرف رغبت نہیں کرتا۔ ماں کا دل ان میں نہ تھا جو اس بچے کو چھنی سکتا۔ کوئی سینہ چاہیے تھاجس میں فطری مناسبت اور
 عصر محبت کی امتیازی اثر دار شان ہوتی۔ بچے کو چھنی اور وہ میلان ظاہر کرتا۔

یہ حالت تھی اس بچے کی اور ادھر سردار عرب سے اس کا اضطراب دیکھانہ
عبد المطلب کا انتشار گیا۔ جو میدان جنگ میں تلواروں کی جھنکار سے تپور نہ بدلتا۔ نیزوں کی کش
 اور تیروں کے پیکان سے ات نہ کرتا۔ لاشوں کا ٹپنا اس کے شہلاناہ متانت میں فرق نہ ڈالتا۔ نہ آنکھوں کا کوئی ریشہ ڈھیل
 کرتا۔ وہی اس بچے کے چپنے اور تڑپنے سے بے چین ہو کر گر میں نہ رہ سکا۔ خاموش اور تنگین خانہ کعبہ کے پاس بیٹھ گیا۔
 بوڑھا عقیل بن ابی وقاص پاس سے گزرا اور عبد المطلب کو افسردہ رکھ کر کھڑا ہو گیا۔
اضطراب کی وجہ حال پوچھا۔ جواب ملا کہ: ”میرا پوتا بے ماں کا ہو گیا ہے۔ کسی کا دودھ نہیں پیتا“
 اور اس کے اضطراب سے کھانا پینا گوار ہو گیا ہے۔

عقیل نے کہا اے ابو الحارث میں علیمہ دختر عبد اللہ بن حارث کو جانتا ہوں اور
دانی اور اس کی صفت قریش میں اس کی بچہ، فصاحت، صباحت اور شرافت نسب کی ظہیر نہیں ہے۔
 عبد المطلب نے اس کے اوصاف سن کر اپنے غلام شمرول کو ایک تیز ناگہ پر بٹھا کر قبیلہ بنی سعد بن بکر کی طرف بھیجا کہ فوراً
 عبد اللہ بن حارث کو حاضر کرے۔ عبد اللہ لائے گئے۔ حضرت عبد المطلب نے بڑے تپاک سے استہلال کیا۔ اور حال کہا۔
 کہا کہ اگر تم قبول کرو گے تو تمہیں غنی کر دوں گا۔ عبد اللہ نے منظور کیا۔ اپنی لڑکی سے کہا۔ اس نے غسل کیا۔ خوشبو لگائی،
 اچھے کپڑے پہنے اور اپنے شوہر بکر بن سعد اور ہاپ کے ساتھ واپس آئیں۔ حضرت عبد المطلب نے خواہش ظاہر کی کہ اگر
 وہ مکہ میں رہیں تو ان کے لیے ایک قعر خالی کر دیا جائے۔ ہر مہینہ ہزار درہم، ایک جامعہ رومی، ہر روز روٹی اور گوشت دیا
 جائے۔ لیکن ان لوگوں نے اپنے موضع میں رہنے کو ترجیح دی۔

حضرت عبد المطلب نے سہرہ کی کے لیے ویسی محبت آمیز شرطیں کیں جو کی جاسکتی ہیں۔
دانی کے حوالہ کیا علیمہ نے قابل توجہ بات کہی کہ: ”میں نے جب سے اس بچے کو دیکھا ہے اس کی محبت

میرے دل میں پیدا ہو گئی ہے۔ اس کے بعد کعبہ کے قریب سب کو لے گئے۔ طواف کیا۔ خدا کو گواہ کیا۔ تحفے دیے اور بچے کو حوالہ کر کے کعبہ سے کچھ دور تک ساتھ ساتھ گئے۔

طریقہ پرورش کا شرع میں لحاظ اس جگہ مجھے صرف اس امر پر توجہ دلائی ہے کہ اس شریف خاندان نے بچے کی پرورش کے لیے کیسی دایہ تجویز کی، وہ جو اکثر عمدہ مفتوں میں ممتاز تھی۔ آگے چل کر ہم کتب اسلامی میں اس کی کافی وضاحت اور احکام پاؤں گے۔ کہیں کہا گیا ہے کہ وہ دودھ بچے کو نہ پلاؤ جو زنا سے پیدا ہوا ہو۔ کہیں حکم ہے کہ ایسی عورت کا دودھ جس کی آنکھ میں عیب یا آفت ہے نہ پلاؤ۔ کہیں تاکید ہے کہ اچھی صورت اور سیرت کی دایہ چوٹی چاہیے۔ اور یہ سب اس لیے کہا گیا ہے کہ شرع نے دودھ کے اثر کو نہ صرف اعضا بلکہ قوائے ذہنی اور خصائل پر ساری بکھا ہے۔ احساس کیا ہے کہ بچے کی سیرت اور صورت میں دایہ سے مشابہت پیدا ہوتی ہے۔ امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام نے بچوں کے لیے سب سے نافذ دودھ ماں کا تجویز فرمایا ہے، جو حال کے یورپ کی تحقیقات طبی سے مصدق ہے۔

دادا کا آخری لحاظ ۵۷۹ء میں اسس بچے پر سے دادا کا پر شفقت سایہ اٹھ گیا۔ لیکن رحلت کے قبل بستر احتضار پر یہ لحاظ اور شرائط محافظت کا نمونہ بھول نہیں جاتا کہ ایک بچے اس کی حفاظت اور پرورش میں تھا۔ اپنے فرزندوں سے پوچھا کہ کون اس کی پرورش اور پرداخت اپنے ذمہ لیتا ہے۔ ابولہب کی درخواست دلی الطبع ہونے کے لحاظ سے منظور نہ کی گئی۔ عباس کی خواہش اس لیے قبول نہ کی گئی کہ وہ حضور تھے، ابوطالب کی خوبی، سلیم الطبعی، اور غلو صفات ان کی سفارش کی اور دادا اپنے فرائض سے سبکدوش ہو گیا۔ ان کا عزیز بچہ اس وقت آٹھ برس کا تھا۔ دایہ بھی دو برس قبل انتقال کر چکی تھی۔ رحلت کے وقت حضرت عبدالملک کی عمر بیاسی برس کی تھی۔ میں ابن ابی الحدید کے ساتھ سوچتا ہوں کہ حضرت ابوطالب نے رسول کی تربیت محافظت اور پرورش میں جو حصہ لیا وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اہل اسلام کی نمونیت کا متقی ہے جس طرح ان کے مشہور عالم فرزند نے ہوش سلجھانے کے قبل سے آخر عمر تک وجہ رسول کے لیے اپنے کو وقف کر دیا۔ اشاعت اسلام کبھی ان کے بارِ احسان سے سبکدوش نہیں ہو سکتی۔ رسول کو بھی جنھوں نے اپنے ماں باپ کو نہیں دیکھا تھا حضرت ابوطالب اور حضرت فاطمہ بنت اسد سے بڑی محبت تھی۔ گیارہ بارہ برس کے ہیں۔ دیکھتے ہیں کہ مہربان چاکر معاش میں شام جا رہا ہے۔ جدائی گوارا نہیں ہوتی، آنکھوں میں آنسو بھر آتے ہیں۔ حضرت ابوطالب سے پرہیز آکھیں نہیں دیکھی جاتیں۔ ساتھ ساتھ لیے جاتے ہیں۔ لیکن ایک بڑا تغیر پیدا ہونے والا تھا جو آئندہ رسول کے مشن کی سچائی اور حضرت ابوطالب کی محبت پر بے لوث اثر ڈالے۔

نازک موقع قریش کا وفد جاتا اور اپنے سردار عرب سے کہتا کہ تمہارا بھتیجا ہمارے معبودوں کی تحفہ کیا کرتا ہے، اسے باز رکھو۔ یہ ایک نہایت ہی زبردست مصلحت تھی جس نے عربوں کو حضرت ابوطالب کے پاس صحیحہ ظاہر یہ نہایت صلح پسندانہ تھی۔ انھوں نے بیک جسم جا کر اپنی یک جہتی کا بار ڈالنا چاہا تھا جس سے حضرت ابوطالب مرعوب ہو جاتے اور وہ اس تصفیہ پر مجبور ہوتے کہ قوم کی مجموعی مخالفت کے سامنے یزید کو دینے کے اور کیا

کیا جاسکتا ہے۔ حضرت ابوطالب ہی سے اس لیے کہا گیا کہ لوگ جانتے تھے کہ ابن عبد اللہ کا ایسا احسان شناس ہرگز اپنے چچا کی بات کا رد کرنا گوارا نہ کرے گا۔ رسول کے لیے موقع نازک تھا۔ انکار کرنا اپنے کو ایسی زبردست پناہ سے نکال لینا تھا اور اس کے بعد ایسے خطروں کا سامنا کرنا تھا جس میں خود تنہا اور دوسری طرف تمام قوم ہوتی اور اسے ایذا رسانی پر اس لیے جرأت ہوتی کہ وہ اپنے شرائط پیش کر چکے ہیں۔

ایک انداز لیکن ایسے مشکل مسئلہ کا جواب دیر میں نہیں دیا گیا۔ جواب گول گول نہیں دیا گیا۔ جس سے ہاں نہیں کچھ تصفیہ نہ ہو سکے۔ آئینہ کا سامنا تھا اور منور کی طرح سیدھا تھا۔ ”اٹھے“ یہی جواب تھا۔ یہی تصفیہ تھا۔ یہی آئینہ کی کجی تھی۔ یہی ثبوت تھا۔ لیکن آج بھی آنسو ڈھڑا آئے تھے۔ دل بھر آیا تھا۔ محبت تھی اور کیا کیا تھا کون جانے کس قدر خیالات، اس کی کیسی سرعت تصفیہ اور نفس کی کون سی حرکت نے کیا کیا بھانے کے لیے آنسو نکال دیا تھا۔ اس کی کامل شریفانہ شرح کے لیے علم نفس نے کافی الفاظ فراہم نہیں کیے ہیں۔ اٹھے اب محض ابوطالب کی پناہ سے نہیں اٹھے، بلکہ بے شمار دولت، امارت اور بہترین عورت جو قریش خاموشی کا صلہ دیتے اسے لات مار کر اٹھے۔ اٹھنا محض ایک جہانی حرکت کا اظہار تھا۔ اس کی شرح ہونی چاہیے تھی۔ شرح ان یادگار اور عظیم ارادہ کے پہلا نقطوں میں ہونی کہ: ”اگر آفتاب کو میرے داہنے ہاتھ اور ماہتاب کو

ہائیں ہاتھ پر رکھ دی تو بھی میں اپنے پروردگار کی مخالفت نہ کروں گا۔“ پھر فرمایا: ”میں ان سے ایک بات چاہتا ہوں اگر یہ مانیں گے تو عرب اور غم کے بادشاہ ہو جائیں گے۔“ پوچھا وہ کیا بات ہے؟ فرمایا: ”خدا کی وحدانیت اور میری رسالت کا اقرار کریں۔“ جب قریش نے اپنے کو ناکامیاب دیکھا تو دوسری شرط پیش کی کہ تم عمارہ بن ولید کو فرزند یں لو اور تم کو ہمارے حوالہ کر دو۔ اس کا جواب دیا کہ تم کس قدر انصاف سے بعد بات کہتے ہو کہ میں اپنے فرزند کو قتل ہونے کے لیے تمہارے حوالہ کروں اور تمہارے فرزند کی خود تربیت کروں۔ اس کے بعد حضرت ابی طالب نے اصرار فرمایا میں جو اس مسئلہ کے لیے قطعی ثبوت ہیں کہ آیا وہ مسلم تھے یا نہ تھے۔

حضرت ابوطالب کا ایمان اور جوش حمایت مجھے اس مسئلہ کی ضرورت ایچلو اور بعض مؤرخین کے پرستی اصرار پر عجب ہے کہ حضرت ابی طالب نے قبل اقرار اسلام رحلت فرمائی یقیناً ان لوگوں کی نگاہ سے حق کا قصیدہ لامیہ نہیں گزرا۔ دیکھنے کی حالت میں یا تو قصیدہ سے انکار کرتے اور اپنے وجوہات پیش کرتے یا اقرار کرتے لیکن نہ کسی نے انکار کیا ہے اور نہ وجوہات پیش کیے ہیں بلکہ اکثر نے اسی کو ان کے مسلم ہونے کی جتنی ثبوت قرار دیا ہے۔ پورٹھاسر دار اپنی مستند شرافت اور خاندانی عظمت کی زبان اور اپنی شجاعانہ شان سے بول رہا ہے جہاں وہ کہتا ہے کہ: ہم تم کو دشمنوں کے حوالہ کر دی در آنحالیکہ نہ امی نیزے سے چلے ہیں نہ تیروں کا سنا سنا سنا دیا ہے نہ لاشیں تڑپی ہیں۔ رسول کو اپنا کام جاری رکھنے کی ہمت دلائی ہے۔ آخر دم تک مدد کا اعلان کیا ہے اور دین کی تعریفیں کی ہیں۔ حیرت کم نہیں ہوتی جب یہ خیال کیا جاتا ہے کہ حضرت ابوطالب کی باتوں سے مشرکین کو ان کی طرف سے یاس ہو جاتی ہے لیکن مسلمان ان کے کفر یا ایمان کے متعلق سوال کرنا اپنی اسلامیہ شایان سمجھتے ہیں۔ انہیں یہ بھی خیال نہیں کہ ضیف کم سے کم مودعہ کجے جاتے تھے اور خود حق عبد المطلب مجدد توحید خیال کیے گئے ہیں۔ ان استنباطی باتوں سے

درگزر کر کے وہ اس موٹی اور صاف روایت کے بھی آنکھ بند کر لیتے ہیں کہ حضرت ابوطالب علیؑ کو رسول کے ساتھ نماز پڑھتا دیکھ کر اپنے دوسرے فرزند کو بھی شریک کر دیتے ہیں۔ اس کے بعد میں مؤرخین کے دجہ اصرار پر اگر کوئی ہو، کوئی نظر نہیں ڈالتا۔

رسول حضرت فاطمہ بنت اسد کی لاش سے کیونکر مخاطب ہوئے میں حضرت ابوطالب کی محبت کی مثالیں دے رہا تھا

اور میں نے کہا ہے کہ حضرت فاطمہ بنت اسد کو بھی بڑی محبت تھی۔ یہ خود رسول کی زہانی ہے جب کہ علیؑ اپنی ماور گرامی کی رحلت کی خبر دیتے ہیں اور رسول لاش کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں: ”اے میری ماں خدا تجھ پر رحم کرے تو میری ماں کے بعد میری ماں تھی۔ تو آپ جو کی رحمت تھی اور مجھ کو کھلایا کرتی تھی، تو خود نہیں پہنچتی تھی مگر مجھ کو کپڑے پہناتی تھی، تو اپنے نفس کو اپنے کھانے سے باز رکھتی تھی اور مجھے سیر کرتی تھی اور مجھ سے حسن سلوک سے پیش آتی تھی۔“ بے موقع نہ ہو گا اگر میں یہ خواہش ظاہر کروں کہ رسول اور ابن مریمؑ کے اپنے پالنے والی اور حقیقی ماں سے برتاؤ کا موازنہ کیا جائے۔

رسول اور خدیجہ میں نے رسول کو شام کے بازاروں میں دکھایا تھا۔ ابھی امین کہوں، کیونکہ عرب ابھی انھیں اسی خطاب سے یاد کرتا تھا۔ اسے ابھی یہ معلوم نہ تھا کہ یہ آئندہ نہ صرف ہمارا بلکہ عالم کا ہادی ہونے والا ہے۔ میری کتاب کا ناظر جانتا ہو گا کہ خدا نے نبی عربی کو حسن ذاتی بھی معمول سے زیادہ عطا فرمایا تھا۔ میں یہاں آمادہ نہیں ہوں کہ تفصیلاً علیہ مبارک عرض کروں، شام سے تمام مال فروخت کرنے کے بعد واپس آئے، اور ایک آدمہ منزل سے اپنے قافلہ کے لوگوں نے خواہش ظاہر کی کہ حضرت خدیجہ کے پاس جا کر سفر کی کامیابی کی خوشخبری دی جائے۔ رسولؐ گئے۔ حضرت خدیجہ نے ایک سوار کو آتے دیکھا۔ شان معلوم ہوئی۔ سوار انھیں کے گھر ٹھہرا۔ حال کہا۔ مسرت زیادہ ہوئی۔ اور خواہش کی کہ اس مرتبہ پھر قافلہ کے ساتھ اسی طرح آؤ۔ میں حیات القلوب کی عبارت میں حضرت خدیجہ کی مسرت میں جذبہ محبت پاتا ہوں۔ اور تائید اس سے ہوتی ہے کہ وقت عقد اپنے چچا کی وکالت کی پابند نہیں رہتیں، بلکہ وہ اختیارات صرف کرتی ہیں جس کی فطرتاً بالغہ مجاز ہے۔

ابوطالب کا خطبہ حضرت ابوطالب اپنے خطبہ میں بقول ابن خلدون فرماتے ہیں کہ: ”محمدؐ کا جس سے چاہو مقابلہ کرو وہ سب راج نکلے گا۔“ یہ بھی فرمایا کہ: ”ہم کو خدا نے حرم میں عامہ ماس کا امن و امان اور حاکم قرار دیا ہے اور ہم کو مخصوص کیا ہے اس گھر سے جہاں اطراف سے لوگ جمع ہوتے ہیں۔ جانو کہ تم کسی کو قیاس نہ کرو گے مگر یہ کہ میرا بھتیجا اس سے عظیم تر ہو گا۔ اس کے پاس مال کم ہے لیکن مال تغیر پذیر چیز اور سایہ کی طرح ہے، اسے خدیجہ سے رغبت عقد اور خدیجہ کو اس سے خواہش عقد ہے۔“

سن شریف یہ بات مشہور ہے کہ رسولؐ کا سن اقدس اس وقت پچیس برس کا تھا، اور حضرت خدیجہ کبریٰ کی عمر شریف چالیس برس کی تھی۔ روایتیں اس سے کم عمری کی بھی ہیں۔ لیکن تواثر کا زیادہ وزن اول الذکر سن پر ہے۔ میں اس پر کوئی بحث نہیں کر سکتا کہ حضرت خدیجہ کا اس سے پہلے عقد ہوا تھا یا نہیں۔ یا زینب، رقیہ اور اُمّ کلثوم حضرت خدیجہ کے بطن سے تھیں، یا ان کی بہن ہالہ بنت خیلہ کی لڑکیاں تھیں، جن کی وفات کے بعد حضرت خدیجہ نے ان کی پرورش کی۔ یہ بحث ضروری ہو یا نہ ہو کم سے کم میرے لیے غیر متعلق ہے۔

حضرت خدیجہؓ کی ذات کا اسلام میں درجہ مجھے جو کچھ اس تذکرہ سے غرض ہے وہ یہ ہے کہ حضرت خدیجہؓ کی ذات بھی جملہ ان نفوسِ اقدس کے تھی جن سے حضرت رسولؐ کو واقعی تسکین ہوئی اور جن کی وجہ سے رسولؐ کو اپنے کل رسالت کی انجام دہی میں آسانی ہوئی۔ بہت کچھ بھانے کے لیے حیاتِ القلوب میں علامہ مجلسی کا یہ انتخاب کافی ہے کہ:

”در روایت وارد شدہ است کہ خدیجہ نیکو وزیرے و معینی بود برائے رسالت آن حضرت۔ ہر گاہ کہ مردم ازد دوری میکردند اور مونس آن حضرت بود و ہر گاہ کہ اہل مکہ آن حضرت را آزار میکردند او یارے آن حضرت می نمود و آن حضرت را دلداری می نمود و بحسن معاشرت و ملاطفت آن حضرت را از کدورت بیرون می آورد و ببال خود آن حضرت را معاونت می نمود۔“

روایت میں ہے کہ خدیجہؓ اچھی وزیر اور مددگار تھیں حضورؐ کے لیے۔ لوگوں کی دوری کے وقت آپؐ مونس ہوتیں، اہل مکہ ستاتے وہ مدد کرتیں اور حضرتؐ کی دلداری کرتیں اور حسن معاشرت اور نرم روی سے آپؐ خوش کرتیں اور اپنے مال سے مدد کرتیں۔

یہ روایت عام ہیں کہ کس طرح کسی نبیؐ نے رسولؐ سے سوال کیا کہ آپؐ کو فخر سے زیادہ محبت ہے یا خدیجہؓ سے اور رسولؐ نے پریم اسٹھوں سے جواب دیا کہ خدیجہؓ نے میری اس وقت تصدیق کی جب کہ سب انکار کرتے تھے اور اس وقت مونس تھی جب کہ سب تکفین پہنچاتے تھے۔ میں اس سوال کو اس کمزوری کے لحاظ سے قابلِ معافی سمجھتا ہوں کہ محض کم عمری حسنِ مفاہمت کے مقابلہ میں محبت کی حرک بھی گئی تھی یا قیاس کیا گیا تھا کہ رسولؐ وقت کے لحاظ سے مردت میں موجود کو بہ مقابلہ گزشتہ کے ترجیح دیں گے۔ لیکن رسولؐ کی حالت اور الفاظ نے جو کچھ بھلا وہ سوال کے عکس کا زیادہ مؤید ہے، جس کے معنی ہیں کہ: ”تم اس وقت تصدیق کرتی ہو جس وقت اور جس کے پہلے بہت سے تصدیق کر چکے ہیں۔ تم اس وقت مونس ہو جس وقت اظہارِ محبت کے لیے بہت سے آمادہ ہیں۔“

عامِ اکھرن رسولؐ کی محبت کا اندازہ اس سے ہو سکے گا کہ سندہ بشت، جس میں حضرت ابوطالب اور حضرت صدیقہ خدیجہؓ کبریٰ نے چند روز کے عرصہ میں رعلت فرمائی۔ رسولؐ کے نزدیک ”عامِ اکھرن“ تھا۔ یہ مثالیں ہیں جس سے تم رسولؐ کے نفسِ ہدیٰ کی خوشبو سونگھو گے۔ تم گھو گے کہ اس میں محبت اور قدر شناسی کا کیسا کامل ثبوت تھا کہ اپنے ظلم زید بن حارثہ پر روئیں گے۔ اور کہیں گے کہ: ”یہ ایک دوست کا شوق ہے اپنے دوست کے لیے۔“ یا کبھی سلمان کے لیے اپنا تکلیف بڑھا دیں گے یا جب مجلسِ اقدس پر ہوگی تو کسی دُور بیٹھنے والے کے لیے اپنا جامہٴ اقدس بچھا کر بیٹھنے کے لیے پیش کر دیں گے۔ یا جب کوئی شیخِ عرب کسی غریب پاس بیٹھنے والے سے اپنے کپڑے سمیٹے گا تو کہیں گے کہ: ”اے شخص کیا اس کی میل جمہ میں سرایت کر گئی کہ تو کراہت کرتا ہے، یا اس کا افلاس تجہ میں داخل ہو گیا۔“

رسولؐ کے متعلق چند ایشائے دس برس قبل بعثت علیؑ کی ولادت اور تاریخِ اسلام میں ان کی ذاتِ بشت کو ابھی دس برس باقی

تھے کہ علی بن ابی طالب علیہ السلام کی ولادت ہوئی۔ ہونے والا تھا کہ اگر رسول شارع اسلام ہوتے تو علی حامی اسلام ہوتے۔ اسلام کی مشکلات سے رحلت رسول تک کوئی خوف اور ڈرہائی کی جگہ تلاش کرو، کسی مفید امر کی انہام دی دیکھو اور تم وہیں دیکھو گے کہ علی سامنے ہیں، موجود اور مستعد ہیں۔ گردن اور سر آگے بڑھائے ہیں۔ دل پہاڑ کی طرح قائم ہے۔ رسول کی اطاعت کرتی سبھی ہے۔ سوال کرنا نہیں جانتے۔ کام کرنا اور حکم بجالانا جانتے ہیں۔ ہونے والا تھا کہ علی رسول کے حکم اور عمل کے شارع ہوتے۔ ہونے والا تھا کہ رسول کے بعد کے تغیرات میں علی یا مظہر اتم نفس رسول کی عظیم الشان ذات حقیقی اسلام کی روح قائم رکھتی۔ ملکی اسلام فتوحات، نام، شہرت، حوصلہ اور قیمت کے پیچھے دوڑتا، علی اس لیے گوشہ نشین ہو جاتے کہ خاموشی سے اس سب پر نظر ڈال جائیں جو دیکھا یا کیا تھا خود کچھ بچے تھے۔ لوگوں کو بھانا تھا۔ بھانے کے لیے تیار ہو رہے تھے۔ اپنے کو اسلام کا مجسمہ دکھانا تھا۔

علی سے محبت کے وجوہات اور یہ بھی ہونے والا تھا کہ علی اور رسول میں تصور سے بڑھ کر محبت ہوئی۔ محبت کی صرف یہ وجہ نہ تھی کہ رسول ابوطالب اور فاطمہ بنت اسد کے احسانات کا معاملہ کرتے تھے۔ یہی وجہ نہ تھی کہ لوگوں میں پھلا تھا۔ یہی وجہ نہ تھی ایک جدی بھی تھے۔ یہی وجہ نہ تھی کہ ابتدائے سن سے زیر تربیت تھے اور اس نے استاد اور شاگرد کی عزت اور محبت قائم کی تھی، یا وہ علوم اور جانبازیاں ظاہر ہوئی تھیں جو کسی سے ظاہر نہ ہوتیں۔ یا پہلے مسلمان صدیق تھے۔ یا رسول کی تنہا یادگار کے شوہر تھے۔ یا یہ امید تھی کہ آئندہ یہ ماحظ اسلام ہوں گے۔ بلکہ ان میں ایک دوسرے کی محبت اور عزت ان خیالات اور وجوہات سے بلند ہو کر اس لیے تھی کہ دونوں ایک دوسرے کو پہنچاتے تھے۔ دلفس قدسی تھے جس کی ایک دوسرے کو قدر تھی۔ دیرا اتصال قلبی جیسا ایسے نفوس طاہرہ میں ہونا چاہیے۔ دونوں تھیں جو عالم کسبہ تاریکی میں روشن تھیں اور ایک دوسرے کو مدد دے رہی تھیں۔

پانچ برس قبل بعثت فاطمہ زہرا علیہا السلام کی ولادت بعثت کو پانچ برس باقی تھے رسول کا سن اقدس پینتیس برس کا تھا۔ غالباً اسی سنہ میں جب کہ مکہ میں بڑا قحط پڑا تھا اور ہمارے ہاوی نے حضرت ابوطالب کی کثیر الادلادی کی وجہ سے علی کو مستحکم پرورش کے لیے لے لیا کہ تاریخ کا ایک اور ایسا ستارہ طلوع ہوا جس کی نرم روشنی طبقہ انانیت کے لیے خصوصیت سے ہامش ہدایت ہوئی۔ سیدہ طاہرہ، ذکیہ، زہرا، فاطمہ علیہا السلام پیدا ہوئیں۔ خالق عہد نے ان کی وجہ سے ہم لوگوں پر یہ سوچ سکے کا احسان فرمایا کہ عورتیں اس سے کہیں بلند ہو سکتی ہیں جس حد تک سوچنے کے ہم لوگ ملادی ہیں۔ مشکل سے کسی شریف کو اس درجہ حسرت اور تنگ دہی اور تکلیف میں بسر کرنے کی جرأت ہو سکتی ہے مشکل سے کوئی ایسی مائتوں میں شرافت نفس کا ایسا نمونہ رہ سکتا ہے، یا تسلیم درضا اس کا حق کہا جاسکتا ہے۔ ان کے گھر کا یہ فقرہ اور اس کی انتہائی عملی خوبی اخصی کے گھر کے لیے مخصوص ہوئی کہ: ”حفت غریب کی زینت ہے۔“ پڑھوان کی حالت کو اور تم دیکھو گے کہ تمہارا دل تمہارے قبضہ سے نکلا جاتا ہے۔ کبھی تم ان کی پیشکشیں اور اس میں ان کا خاموشانہ حکم دیکھ کر رد دو گے۔ کہیں اس حالت میں دوسروں کی مدد اور ہمدردی کا عملی ارادہ دیکھ کر تم بے چین ہو جاؤ گے۔ کہیں ان کی اور غریبیاں اس طرح اپنی خوشبو

پھیلائیں گی کہ تم اسے اس کے مناسب درجہ عظمت تک بچنے سے اپنے آپ کو کامریاؤ گے کبھی تم پہاؤ گے کہ لبوب کرنے والے گستاخ ہوتے جاتے ہیں، اور ان صبر شکن حالتوں میں جب کہ انھیں اس کے مناسب جواب کا اختیار نہ ہوگا وہ اپنی شریفانہ غیرت کے آفتاب ہوں گے۔ اور تم میں شریف کی میزوری اس کی حمایت کے لیے جذبات پیدا کرے گی اور تم کھو گے کہ یہ حمیت دنیا کی بہترین خوبی ہے۔ تمیں اطمینان ہوگا اور خود اپنی عزت تمہاری آنکھوں میں بڑھ جائے گی۔ آگے چل کر تم اور حالات اسی کتب میں پڑھو گے

حسینؑ کے آبائے طاہرین کے ذکر سے غرض

نیں قس، ہاشم، عبدالمطلب، حضرت آمنہ،
حضرت ابوطالب، حضرت فاطمہ بنت اسد،

حضرت زید، حضرت علی بن ابی طالب اور فاطمہ زہرا علیہا السلام کے مختصر حالات (مناسب تفصیل آگے آئے گی) اس لیے مس کر رہا تھا کہ آئندہ اپنے حیرت انگیز درشت صفات و بچ سکون اور اس میں خصوصیات کے بچنے کی آسانی ہو۔ جس سے آخر میں یہ فقرہ، جو عام تاریخوں میں پایا جاتا ہے، اچھی طرح بچنے میں آنے کے قابل ہو کہ: ”تربیت یافتہ آنکھوں پاکیزہ کبھی حرارت اور مذلت کو شہادت کی سعادت پر اختیار نہ کریں گے“ جس کے ”تربیت“ اور ”آنکھوں پاکیزہ“ کے لفظوں میں ایک معنی دار تاریخ ہے۔ خصوصاً جب کہ بیخ غلیب نے اس کی صفت اور نتیجہ بھی بیان کیا ہے کہ اس کی وجہ سے حرارت اور مذلت گوارا نہیں کی جاسکتی اور اسی طرح حسینؑ کا وہ قصیدہ جس کا اس موقع پر جب کہ فی البدیہہ کہا جاتا ایک بہت سی حیثیتوں کا مجوزہ تھا۔ افتخار فطرت کرتا ہے کہ: ”خیرۃ اللہ من المخلوق ابی بعد جدی وانا بن الخیرین“۔ یعنی منہج زہارت کے ان فقرات سے پیدا ہے کہ: ”اشہد انک کنت نوراً فی الاصلاب الشاعنہ و الارحام المطہرۃ“۔ یہ فقرات درشت صفات کے یقین اور احساس سے پر ہیں۔ خود حسینؑ فرماتے ہیں کہ: ”یا ایہا الرجل المغبون شہدۃ انی ورثت رسول اللہ عن رسل“۔ (اے وہ شخص جس کی طبیعت میں کھوٹ ہے یہ جان لے کی میں رسولان سلط سے سلسلہ بہ سلسلہ رسول کا وارث ہوں)

وراثت صفات
قانون درشت صفات کے متعلق کوئی کہتا ہے: ”وہدان کوئی خیر شے نہیں ہے بلکہ نہ صرف وہ ہمارے انفرادی بلکہ ہمارے تمام اسلاف کے نتیجہ جوارب کالب لباب ہے۔ قوانین ارتقا کے رو سے ہم اپنے اسلاف کے غیر مد رک خصوصیات ہی کے وارث نہیں، بلکہ ان کے تمام مد رکات، محوسات، جذبات وغیرہ بھی توارث کے ذریعہ سے ہم تک منتقل ہوتے ہیں اور اس لحاظ سے ہمارا وہدان ایک رجسٹر ہے جس میں اختصار کے ساتھ گزشتہ نسلوں کے کل جوارب محفوظ ہیں۔“ میرا ذاتی یقین ہے کہ اسلام میں اصول نبویؐ کا نہ ہونا اس دشواری کے باعث اس سے ہے کہ کسی کا گود لینا وراثت صفات کا کوئی سلسلہ نہیں ہے۔ کیونکہ متبقی ظراً نہ ذاتی قائم مقام ہے نہ معالیٰ۔

مجھ ہے کہ محض نبیؐ افتخار اسلام میں شدت سے دور رکھا گیا ہے۔ لیکن نبیؐ افتخار کا چھپا پن اور ہے اور ذلیل انفسی سے محفوظ رہنے کے لیے صفات خاندانی کو سپر بناتا اور ہے۔ تم آگے چل کر غور کرو گے اس خاندان کی مستند شرافت پر جب دشمن ان کی تعریفیں کرے گا، اس کا اندازہ ہر وقت دیرا ٹھکن نہیں جیسا خاص خاص موقع پر یا امتحان کے وقت،

مطلب اس میں کہ دشمن کی حیرت اپنی ذلت اور ان کی شرافت کا ان تقویٰ میں اقرار کرے گی کہ: ”اس کے باپ کا نفس اس کے پہلو میں ہے۔ وہ بھی ذلت گوارا نہ کرے گا۔“

خصوصیات قومی ”متمدن عرب“ کی یہ عبارت بھی مفید ہوگی کہ: ”قوم کے خصائص سے مراد وہ چند محسوسات اور قابلیتیں ہیں جو اس قوم کے اشخاص میں پائی جاتی ہیں اور ان قوتوں کو ایک ہی طرف مصروف کر دیتی ہیں۔ یہ عام مجموعہ خیالات اور محسوسات کا سال دراز میں پیدا ہوتا ہے اس کا نام خصائص قومی ہے۔“ قوم کا لفظ بہ نسبت خاندان کے زیادہ وسیع ہے۔ لیکن جب یہ خیال کیا جائے گا کہ اکثر خاندان مل کر ایک قوم بنتی ہے تو خاندان قوم کا ایک جزو ترکیبی کھاجائے گا۔ اسی طرح خاندان میں کوئی پیدا ہوتا ہے جس کے خصائص ممتاز حیثیت کی قوت رکھتے ہیں، اس کی قوت اپنے گرد و پیش اور اثر پذیر نفوس پر عمل کرتی ہے اور یہ سلسلہ برابر جاری رہتا ہے۔ جب تک بعد کے زمانہ میں ان ممتاز خصوصیات کا ہوش ضائع نہ ہو جائے۔ اثر کن خاندان کے لوگوں کا کسی خاندان یا قوم میں پیدا ہوتے جاتا ترقی اور اس کے عکس میں خصوصیات قومی کی تسخیر ہے۔

وحی اور بعثت نبی عربی کا سن اقدس چالیس برس کا ہوا تھا کہ خداوند تعالیٰ نے یتیم عبد اللہ کو خاتم النبیین تجویز فرمایا۔ ان پر اپنی قدرت کے راز صلات اور قوی زبان سے کھولے۔ قدرت کی زبان ان کے لیے کھلی۔ اس طرح کھلی کہ اب حکم بجالانے اور معنی سمجھنے میں کسی غلط فہمی کی گنجائش نہ تھی۔ صاف اور صریح حکم تھا کہ کیا گیا تھا کہ تم نبی ہو۔ نبوت اور رسالت کا لفظ اس وقت تک اس درجہ عام ہو چکا تھا کہ اس وحی اور بعثت مفہوم کسی کے لیے نیا نہ تھا۔ بلکہ ایسی نہ تھی جہاں بہت سی آوازیں آتی ہوں۔ سناٹا اور خاموشی تھی۔ غالباً خشک اور بے گیہ پھرتی پہاڑی، جہاں پرندوں کے گھن گھن بھی نہیں ہوتے اور نہ چرندوں کے سمون اور چرنے کی آواز سنائی دیتی ہے۔ یہاں کی کھری چٹان تھی اور ہمارا ہلادی۔ یہاں کا عجیبہ سناٹا تھا اور ہمارا ہلادی، جہاں اسے غموشی میں ایک آواز بلند ہوتی ہوئی معلوم ہوتی۔ ہمارا گلی پوش تھا۔ جے غیبیہ کرنے کا حکم دیا گیا۔ حکم دیا گیا کہ اپنے رب کی بڑائی ظاہر کرے۔ ﴿يَا أَيُّهَا الْمَدِينَةُ ۖ ۱﴾ ﴿هُوَ قَائِنٌ ۚ ۲﴾ وَ رَبَّكَ فَتَكْفُرُ ۚ ﴿۳﴾ (۴۷: ۱-۳) ”فَتَحْ“ (اٹھ) فرمایا گیا تھا کسی دیر کی جگہ نہ تھی۔ تسلی کا خیال ناگھن تھا۔

بشیر اور نذیر انبیاء ہمارے نبی کو قَائِنٌ (غیبیہ کر، ڈرا، دھمکا) کا حکم دیا گیا تھا۔ پیشتر نذیر پیدا ہو چکے تھے یسعیاہ، یرمیاہ، حزقیل۔ نذیر تھے کس درجہ اثر کے۔ اس کے بچنے کے لیے توریت پڑھو یا ان کے اثر کو تاریخ یہود میں تلاش کرو۔ یہاں اس پر غور کی ضرورت ہے کہ جب جدید عہدہ کے لیے خداوند تعالیٰ کی مشیت کیوں منقطع ہوئی اور بندوں کا اس میں کیا فائدہ منظور ہوتا مہم لوگوں کے ناقص فہم میں آسکتا ہے۔ یز تاریخ کے اور کوئی ذریعہ جاری مدد کا نہیں ہے۔ یسعیاہ، یرمیاہ اور حزقیل کی بے اثری ان کی قوی تاریخ سے ظاہر ہے۔ بے سود استغفار سے عناصر قوی کی تربیت نہ کر سکے۔ ان کے بعد ابن مریمؑ نے تہدید کو اس درجہ ترک کیا کہ مشتہ اطوار کی عورت کو جس نے انھیں جھٹھکا تھیل ملا تھا۔ بخشش کی بشارت دی۔ اس لیے کہ اس سے محبت ظاہر ہوئی تھی۔ اگرچہ یہود کو ان کے حق بشارت پر اعتراض ہی کیوں نہ ہو۔ وہ صلیب پر چڑھائے جانے کے وقت ایک چور مصلوب کو بہشت کی خوشخبری دے رہے تھے، دراصل ان کے اس سے نہ اثبات ظہر

ہوئی تھی اور نہ اس نے اقرارِ نبوت کیا تھا، بلکہ اس کے فقرات سے ظہرِ قہار اور یہ غالباً اس لیے کہ تہدید ان کے اصول کے خلاف تھی۔ وہ بغیر کسی تہدید یا توہید کرانے ناقابلِ اعتقاد عورتوں کو اپنے زمرہ میں داخل کر لیتے تھے۔ جس سے یہود کو عجب ہوتا تھا۔ یا جس عجب میں بعض یورپین مؤرخین اللہ کے شریک ہیں۔ لیکن اس کے آثار نہیں ہیں کہ کہیں انھوں نے گنہگار انسان میں جوشِ انابت پیدا کرنے کے لیے حسد کی حدالت اور خلاف ورزی کے سزا کا خوف دلایا ہو۔

اس کا اثر انبیاء نے یہود نے دھمکا یا بغیر شکنیں دلانے۔ ابن مریم نے شکنیں دی بغیر خوف دلانے۔ ایک نے اگر یاس پیدا کی تو دوسرے نے محض عنوسے انسان کی قابلیت گناہ پر کوئی رکاوٹ تجویز نہ کی۔ محض بشارت ہو یا محض نذارت، اپنی اپنی جگہ نامکمل تھی۔

نبی عربی بشیر اور نذیر تھے اور ضرورت پیدا ہو گئی تھی کہ خداوند تعالیٰ کسی کے لیے اِنَّا آتِیْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِیْرًا وَّاَوْفِیْیْنَآ (۱۹: ۲) (بہ تحقیق کہ صحیحاً مسم نے تم کو ساتھ حق کے بشارت دینے والا اور خوف دلانے والا) کا اعلان فرماتا۔ یعنی ایک ذات میں دو عہدے تجویز کیے جاتے۔ خوف اور بشارت کا وزن اپنی اپنی ضرورت پر کام دیتا۔ نہ محض بشارتیں بے مہار ہونے دیتیں اور نہ محض خوف انھیں نادمہ کر دیتا۔ یہ ان کے خصائل پر براثر ڈالتیں۔ مایوسی انھیں برائیوں کی آلودگی میں مصمم کر دیتیں۔ محبت اور کشادہ دلی ان سے جاتی رہتی اور محض تاریکی اس کا نتیجہ ہوتی۔ یہ جامعیت کا شیرازہ منتشر کر دیتی اور غالباً مذہب کا یہ گمنام بوحیثیت کا ہم آہنگ ہوتا۔

اس کا اسلامی اصول پر اثر بعض کی مذہبی سیاست نے اسلام کو مذہبِ خوف کہنا قرین مصلحت سمجھا ہے۔ یہ ان کی حسی اور تالیفی فطرت ہے۔ وہ جان سکتے تھے کہ ہمارا پہلنے والا (رب) رحمان اور رحیم ہے اور ہمارا ہادی رحمۃ اللعالمین کہا جاتا ہے۔ اور قرآن شریف رحمت اور امید کے وعدوں سے پر ہے۔ ہم کسی ایسے اعتقاد کے پیرو نہیں ہیں کہ انسان ظہراً گنہگار ہے اور وہ غضبِ خداوندی کا آماج ہے۔ یہ نظریہ محبت کے منافی ہے کہ ہم ایسے پیدا ہی کیے جاویں جس پر خدا اپنے قوتِ غضب کو آزمائے۔ یا پولس کے لفظوں میں جیسادہ گلیشیون کو لکھتے ہیں کہ: ”کتابِ مقدس نے سب کو گنہگار کا ماتحت کر دیا تاکہ وہ وعدہ جو مسیح پر ایمان لانے پر موقوف ہے ایمان داروں کے حق میں پورا کیا جائے۔“ قیاسِ آسان ہے کہ تمام دنیا کی نیکیوں کے بعد بھی اگر خدا اپنے وعدہ کو ملتوی رکھ سکتا ہے اور خود پولس کے لفظوں میں: ”یوحنا مسیح پر ایمان لانے سے گناہ گار راست باز ٹھہرایا جانا“ قرار پاسکتا ہے تو سیردانِ مسیحی کے لیے عملِ خیر کی کوئی رغبت قطعاً فضول ہے۔ جب کہ محض ایمان لانا کافی ہے۔ ہر وہ شخص جس کو حق و باطل کے امتیاز سے محبت ہے علم پر ایسے اصول کے اثر کو کچھ سکتا ہے۔ ہم مسلمان اِنَّمَا شَیْئُکُمْ وَاِنَّمَا کُفْرُوْا (۲: ۷۶) (چاہے شکر کریں چاہے کفران کریں) کے قائل ہیں۔ جس کا میں حس اور اوراک دونوں سے۔ ہم میں اپنی آزادئیِ ابدیہ اور اس لیے اس کے عمل کی ذمہ داری کا مضائقہ اقرار ہے۔ اسلام کو مذہبِ خوف کہنے والے اگر مسلمانوں کے کسی ایسے مذہبی مبع میں شریک ہوئے ہوتے جہاں کوئی داعیِ خدا کی رحمتوں کا ذکر کرتا ہے اور سامعین اپنے مالک کے احسانوں کو سن کر

بے تاب ہو جاتے ہیں تو اسے یہ مذہب خوف مذہب محبت سے بدرجہا زیادہ مذہب محبت کچھ میں آجاتا۔
 مسیحیت میں محض محبت کی تعلیم پر دوسرا مبالغہ شیع مطلق کا اتحاد مشکل سے یہ بات کچھ میں آتی ہے کہ اگر خدا کا آماج غضب
 (انسان) محض ابن مریم کی وساطت سے مغفرت پاسکتا تھا تو کیا ان کے قبل کے لوگ باوجود اپنی تمام نیکیوں اور ارادہ خیر
 کے غلو، رحمت اور مغفرت سے محروم رہے؟ مسئلہ شفاعت اپنی اس شکل میں انسانی اختیارات کے مصلوبیت کی
 دوسری صورت ہے۔ اور سب سے حیرت خیز تو کرتھیوں کے نام یہ عبارت ہے کہ: ”جب سب کچھ بیٹے کے تابع
 ہو جائے گا تو وہ خود اس کے تابع ہو جائے گا جس نے سب چیزیں اس کے تابع کر دیں۔“ انسانی تجربہ اور ضرورتیں خاص
 مواقع پر سفارش یا شفاعت کا خیال دلاتی ہیں لیکن اس کی تعمیم شفاعت کرنے والے کو نہ صرف غیر عادل بلکہ اصل کل خیر کی
 برباد کن قرار دیتی ہیں۔ جو کہ خدا اپنے کسی پیارے بندہ کی سفارش اس لیے قبول کرے کہ اس نے اس کی راہ میں وہ ناگوار
 مصیبتیں اٹھائیں جس کا صلہ نہ صرف اس کا غلو مرتبہ ہو، بلکہ یہ بھی ہو کہ وہ تمام عمر خطا کرنے والے بندہ کو بخش دے لیکن
 آیا ایسا بندہ ایسے غلطی بندہ کی سفارش کا موقع پائے گا؟ یہ ایک دوسری مشکل ہے۔ اور وہ کب اور کتنی مرتبہ اپنی نیکی اور
 خدمت کا واسطہ دیتا رہے گا؟ انبیاء اور ہادیین کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ لوگوں کو اپنے ملحقہ اطاعت میں اس لیے داخل
 کریں کہ داخل ہونے والوں کے اخلاق اور عادات درست کریں، اسے وہ فرائض بتائیں جو اس پر واجب ہونے چاہئیں۔
 اس کی کامیابی ان کی راحت اور اس کی ناکامی ان کا رنج ہے۔ یہ سوچنے کے بعد آیا قیاس اس کا مقتضی ہے کہ ایسا نبی اس
 کی سفارش کرے گا جسے وہ دیکھے کہ اس نے ملحقہ اطاعت میں داخل ہونے کے بعد بہ اشتداد داخلہ کے تمام برائیوں کا
 ارتکاب کیا جن سے بچنے کی ہدایت میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا گیا تھا۔ کچھ کے نزدیک نہ اس لیے داخلہ کا اعلان
 اطمینان بخش ہے اور نہ داخل ہونے والے کی حرکت قابل تسکین جس کی غرض یہ تھی کہ وہ اپنے گناہوں کی گھڑی بھاری
 کرتا جائے۔ اس لیے کہ محض داخلہ اس کی حوالگی اور دھوڑانے کے لیے کافی ہے۔ مشکل سے کسی نبی کی اخلاقی شان ایسی
 شفاعت کی مرتکب ہو سکتی ہے۔ یہ ایسی سستی شفاعت چاہنے والوں کے لیے مزید دشواری ہے۔ وقت آگیا تھا کہ: وَ
 اتَّقُوا يَوْمًا لَا تَجْزِي نَفْسٌ عَنْ نَفْسٍ شَيْئًا وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ (۲: ۱۲۳)
 (ژرور اس روز سے کہ نہ عرض ہو گا کسی کا کسی سے کسی چیز کے ساتھ اور نہیں قبول کیا جائے گا اور نفس سے کوئی عرض اور
 فتح نہ دے گی ان کو کوئی شفاعت اور نہ وہ باری کیے جاویں گے) کا اعلان کیا جاتا۔

خدا کی بزرگی بیان کرنے کا حکم

اس بشیر و نذیر کو وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ کا حکم دیا گیا تھا مشکل سے مکہ کی کوئی
 اونچی یا نیچی جگہ چھوٹی جہاں لوگ کسی درجہ کے دکھائی دیتے ہوں اور ہمارا
 ہادی قولوا لا اله الا الله نہ کہتا ہو۔ کس حالت میں کہتا تھا؟ سوچو اور تائید الہی پر غور کرو۔ یہ بھی ظاہر کرنا مناسب موقع
 ہو گا کہ یہود ہوں، نصاریٰ ہوں یا کفار یہ اس گھر کے جسے وہ معبد قرار دیتے تھے اور کسی جگہ عبادت نہ کرتے تھے۔ یہی
 وجہ ہوئی کہ جب تحویل قبلہ کا حکم نازل ہوا تو یہود طعن کرنے لگے اور ان سے کہا گیا: وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ وَفَاتَيْنَا
 كُتُوبًا فَتَحَّ وَجْهَ اللّٰهِ (۲: ۱۱۵) (اور واسطے خدا کے ہے مشرق و مغرب پس جس طرف کہ متوجہ ہو تم پس وہ جہت ہے
 واسطے اطاعت خدا کے)

اسلام کا ذکر حسینؑ کے قربانگاہ کی تصویر کشی ہے۔ اسلام کے متعلق منفی مختصر اشاروں سے میں اس قربان گاہ کی تصویر کھینچ رہا ہوں جو اس قابل ہو سکتی کہ حسینؑ کا ایسا اثر الشرف اپنے اس پر مرقعاً یہ سوچنا شاعرانہ تخیل نہیں ہے کہ اگر حسینؑ دنیا کے سب سے بڑے شہید تھے تو ان کی وجہ شہادت بھی سب سے ممتاز ہوئی چاہیے تھی۔ اور وہ یہ کہ اسلام جو مذہب عالم پر ایک ترقی ہے، اس کی لطافت اور روح کے باقی رکھنے کے لیے حسینؑ اپنے کو فشرہاں کرتے۔ کیا وقت کہ ابراہیم اور اسحاق کوئی پتر خدا کی قربانی کے لیے مخصوص کرتے یا ابن مریمؑ کے لیے "یہودیوں کے بادشاہ" کا خطاب مصلوبیت کا ذریعہ ہو تا۔ اب وقت تھا کہ حسینؑ کل خیر عالم کے اصول خیر یا حدود الہی یا اسلام کو اپنی قربان گاہ بناتے۔ اور خود قربان ہوتے۔ حسینؑ اس کی شریعت کی لطافت اور رومانیت قائم رکھنے کے ذمہ دار تھے جو "بعثت لانتقم مکارم الاخلاق" (میں اس لیے مبعوث کیا گیا ہوں کہ مکارم اخلاق کی تکمیل کروں) فرما سکتا تھا۔

پہلی صدیقہ اور پہلا صدیق دی کے بعد نہ اب مجھے اس کی تفصیل کرنی ہے کہ کیونکر ہمارا ہادی حضرت خدیج کبریٰ کے پاس پہنچا اور کس عالم میں نہ مجھے یہ کہنا ہے کہ اگر عالم میں کس شخص کو اسلام کا پہلا شرف حاصل ہوا تو وہ ہماری ہی صدیقہ تھی۔ جس کے بعد ہمارے سید اور آقا علی بن ابی طالب کا نمبر تھا۔ رسول تین برس تک دعوت اسلام فرماتے رہے اور اس زمانہ میں مکہ کے **دعوت اسلام کے تین برس** اکثر ممتاز لوگ جن کی تعداد کم و بیش سو کے قریب تھی ایمان لائے۔ **دعوت ذوالعشرہ چوتھے برس** جو تھا برس تھا کہ اسلام کے اعلان کے لیے مخصوص رسمی مجلس قرار دی گئی جو تاریخ اسلامی میں "دعوت ذوالعشرہ" کے نام سے مشہور ہے۔ یہ مجلس اپنے موضوع کے لحاظ سے کیسی بہت شکن تھی۔

اس کے بچنے کے لیے ابلیہب کے یہ الفاظ جیسے میں "اکمیر التواریخ" سے **ابلیہب کے الفاظ** نقل کرتا ہوں، کافی ہوں گے کہ:

"این سبب خواہ شد کہ جمع مردم اطراف بر ما هجوم آرند و قریش را طاقت مقاومت با تمام قبائل عرب نیست"

اس کی وجہ سے اطراف کے لوگ ہم پر حملہ آور ہو جائیں گے اور تمام عرب کے قبائل کا مقابلہ کرنے کی قریش میں طاقت نہیں ہے۔

لیکن ابلیہب کے ایسے ہزار فقرے اسے بٹانہیں سکتے تھے جسے اپنے مالک کی طرف سے "فتح" کا حکم دیا گیا تھا۔ **وصایت اور خلافت کا اعلان نبوت کا اعلان کے سہر کاٹ** اٹھے، اعلان کیا اور قبول الہی تھا اس سہرا کا کہ: "جو شخص

میرے کا ہدایت میں مدد دے گا وہ میرا خلیفہ اور وصی ہوگا۔" پہلور اور عرب کے ممتاز لوگ بیٹھے تھے لیکن اس جرأت نملی نے کسی کو ممتاز نہیں کیا کہ وہ مددگاری کا اعلان کرتا۔ اگرچہ تمام عرب اس کے دشمن ہو جاتے جس وقت من اور

تجربہ کار لوگ اعلان کی اہمیت پر غور کر رہے تھے رسول کی گود کا کھلایا یہ بچہ جو اب قریب سولہ برس کا امیر تاجوانو جوان تھا اٹھ کھڑا ہوا۔ بیعت کی اور حکمرانیت میں مدد کا اعلان کیا۔ رسول کی آنکھیں، چہرہ اور زبان سب قبول ڈیون پورٹ کہہ رہی تھیں کہ: ”میرے بھائی اور وزیر کو دیکھ لو۔“ یا قبول الہی الخدا: ”یہ میرا وصی اور خلیفہ ہے۔“ یا قبول روضۃ الغضا وغیرہ: ”ابن ہریرہ من است وصی من سخن اورا بشنود و از فرمان لا تجاوز منائید۔“ عموماً یورپین مؤرخین جنہوں نے تاریخ اسلام لکھنے کی ضرورت سمجھی ہے اس حامی اسلام کے اس وقت کے اعلان کی عمدہ نقلوں میں تعریف کی ہے۔

متذکرہ صدر سطروں کے سوچنے میں اور زیادہ لطفت آنے لگا۔ جب ابن خلدون کے یہ فقرہ یاد رکھا جائے جو مشرکین شریش رسول ہے کہتے تھے کہ: ”ہم اس شرط پر ایمان لائیں گے کہ ہم کو ملک و حکومت دے دو۔“ اور رسول جواب دیتے تھے کہ: ”یہ کام اللہ جل شانہ کا ہے میں وعدہ نہیں کر سکتا۔“ یا جیسا مترجم ابن خلدون نوٹ میں اپنی تاثیر سے نقل کرتا ہے کہ: جب وقت آپ نے ہوا مگر کہ عمت دی تو کسی نے کہا کہ:

قریش کی خواہش ان کی طبیعت کا آئینہ ہے ”اگر ہم تمہاری متابعت کریں اور اللہ تعالیٰ ہم کو اپنے بھائی خلیفہ بنو گے۔“ آپ نے فرمایا: ”یہ کام اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے، جیسا وہ چاہے گا کرے گا۔“ اس شخص نے کہا: ”یہ بہت درست ہے کہ اس وقت تو ہم تمہارے لیے اپنی گردنیں عرب کے سامنے کر دیں اور پھر جب تم کامیاب ہو تو دوسرے لوگ صاحب حکومت ہو جائیں۔“ یہاں بھی یہ بھانے کی غرض تھی کہ ”ذوالحجۃ“ میں رسول کا احسان حکم خدا سے تھا لہذا اگر آپ اس کی مخصوص غرض اعلان تو حید اور نبوت تھا مگر آپ نے دیکھا کہ وصایت اور خلافت کا اعلان بھی ضروری تھا گیا۔

خلافت کے لیے مذہب فروشی پر تیار تھے دوسری بات جو اس میں دیکھنے کی ہے وہ یہ کہ عرب کسی مذہب کے قبول کرنے کے لیے

ایک ہاتھ ہر ملی مسئلہ پیش کرتا تھا اس کے نزدیک مذہب ایسی چیز تھی جو روپیہ پرست و سخت ہو سکتی اس کی اور مثالیں بھی ہیں، جہاں بندہ زور عرب پر شان و شوکت کا وہ اثر ہوا جو اثر ڈالنے والوں کے کام آسکتا تھا۔ مثلاً:

● دارالحکومت سے دور مقام کے لوگ جب معاویہ کے دربار میں پہنچے تو وہاں کی آرائشیں دیکھ کر اور مثالیں

● کسی نے کہا: ”انعام طلیک یا رسول اللہ۔“ جس پر امیر شام کو مسکرا دینے کی ضرورت ہوئی۔

● یا جیسا طہای شواہد النبوة میں ایک عرب سیح صاری کا ذکر کرتے ہیں جے اپنا اوٹ خدا سے زیادہ پیارا تھا۔

● یا جیسا روضۃ الغضا میں ایک لطیفہ ہے جے میں ناظرین کی دھمکی کے لگے دیتا ہوں: مہدی عباسی ایک روز قمار میں گیا۔

● جو کہ اور پیاس سے بے تاب ہو کر یہ ایک اعرابی کے جھوٹے میں گھس گیا اور اس سے اپنی حالت بیان کی۔ غریب اعرابی نے جو کچھ اس کے پاس موجود تھا حاضر کیا اس میں ایک قند شرباب بھی تھا خلافت آپ نے چھ گھنٹہ نوش فرمانے کے بعد سرور میں اعرابی سے پوچھا: ”مجھے جانتے ہے؟“ جواب دیا: ”نہیں۔“ کہا: ”میں امیر کا خادم ہوں۔“

چند گھنٹ اور ملاحظہ فرمانے کے بعد: ”مجھے پچھانتا ہے؟“ جواب دیا: ”آپ امیر کے خادم ہیں۔“ کہا: ”نہیں میں مصاحب ہوں۔“ چند گھنٹ اور ملاحظہ فرمانے کے بعد: ”مجھے جانتا ہے۔“ جواب دیا: ”حضور نے ابھی فرمایا ہے کہ آپ امیر کے مصاحب ہیں۔“ کہا: ”نہیں میں خود امیر ہوں۔“ یہ سن کر اعرابی نے کلمہ سامنے سے اٹھالیا اور کہا: ”اس کے بعد اب رسالت اور الوہیت کا درجہ باقی ہے۔“ مہدی ہنسا اُتے میں اس کے متلاشی خدام بھی بچھ گئے، اور مہدی نے اعرابی کو انعام دیا۔ انعام پا کر اعرابی نے کہا: ”میں نے جو تمہے اور باغیوں دعویٰ کو بھی قبول کیا۔“

● بعض تھے جو یہ کہتے تھے کہ: ”اگر تمہنی ہوتے تو اس طرح زمین پر پاؤں گھسیٹتے نہ پلٹتے۔“

ان مثالوں کی عرض یہ مثالیں عرب کی اس شاذ طبیعت کو کلام مد تک بھائیں گی۔ ورنہ یہ آسانی سے کچھ میں نہ آئے گا کہ کیونکر سنان بن انس تلقین یہ شعر پڑھ سکتا تھا کہ:

اوفر دکاب فضة و ذہبا اف قتل السید المہجبا

جس کا ذکر آلے والا ہے۔ رسول حیرت ناک طریقہ سے قرآن میں تقویٰ سے استغنا پیدا کر کے حرم اور طمع کو قابو میں رکھنے کی قلم میں بھی کامیاب ہوئے۔ اس کے بچنے کے لیے ان دونوں کی روش پر غور کرو: ● جب تک رسول کی ملاقات مصیبت کے لوگ تاب رہے، اور ● جب امتیاز کے فخر ہو گئے۔

ہجرت حبشہ ”دعوت ذوالعشرہ“ کے بعد یعنی مسلمانوں کے ہجرت حبشہ کے زمانہ تک قریب دو سو کچھ دار لوگوں کے اصول اسلام کے پیرو ہو چکے تھے جو جو زمانہ گزر جاتا تھا رسول کا جوش ہدایت بڑھتا جاتا تھا اور اسی طرح کفار قریش کا جوش مخالفت بسر کر دگی الجلباب اور الوہابیان زیادہ ہوتا جاتا تھا۔ مومنین کفار کی افشیں بہتے تھے اور صبر و رضا کے ساتھ اپنی تسکین روحانی پر قائم تھے یہاں تک کہ ہتھیار باندھنے کے قریب آدمیوں کو حبشہ کی طرف ہجرت کرنے کا حکم ملا۔ اس قافلہ کے سردار حضرت جعفر بن ابی طالب تھے۔ شمشیر اس پر بھی رضامند نہ تھے کہ وہ لوگ جو ایمان لانے ہیں عرب کے باہر بھی آرام سے رہ سکیں اور اس غرض سے کہ غاشی انہیں عرب میں پھر واپس کر دے کہ ان اہل ایمان کے ساتھ یہ لوگ اپنی خواہش کے موافق رہتا کر سکیں۔

عمر بن عاص اور عبد اللہ بن ربیعہ کی قبل الاسلام ایک کوشش قریش نے دو شخصوں کو

اسلام کے پولیٹکل اقتدار کے زمانہ میں نہ صرف نام اور شہرت حاصل کی بلکہ اہل بیت نبوت کے حقوق کو نقصان پہنچانے میں نہایت ممتاز ہوئے۔ ان میں سے ایک عمرو بن عاص تھے جن کی شہر آں اور نیزے کے ربط یا حکم کی کارروائی مشہور ہے۔ اور دوسرے عبد اللہ بن ابی ربیعہ جنہوں نے عثمان کے خلیفہ منتخب ہونے میں عبد اللہ بن سعد بن ابی سرح کی تائید کی تھی۔ ان دونوں نے تحفہ اور تحافت کے ساتھ حاضر ہو کر جعفر اور ان کے گروہ کے تخریب کی خواہش کی۔ غاشی نے حضرت جعفر بن ابی طالب سے حالات پوچھے اور انہوں نے جو کچھ فرمایا وہ نہ صرف اگلی حالت کا موجودہ حالت سے مقابلہ تھا بلکہ دین اسلام کا خلاصہ تھا۔ غاشی نے شمشیر کے تحافت واپس کر دیے اور مہاجرین کو اپنے کی اجازت دی۔ یہ پہلی ہجرت تھی جو اہل اسلام میں اپنے دشمنوں کے خوف سے واقع ہوئی۔

عامہ قریش کا تصفیہ قتل رسول کے لیے قریش کو جب معلوم ہوا کہ حبشہ میں ہماری کوشش بے سود ہوئی تو انہوں نے ایک بڑی صحبت میں ملے کیا کہ جس طرح بنے ہم لوگ محمد بن عبد اللہ کو قتل کریں۔ ان کا یہ تصفیہ ابوجہل کے اس اعلان کے بعد تھا کہ جو شخص محمد کو قتل کرے گا ہم اسے عودٹ اور ہزار اوقیہ سونا دیں گے۔ اور اس کے لیے وہ آمادہ ہوئے تھے۔ تاریخ اسلام کو غلیظ مانی دیکھنا تھا لیکن اسلام ان کے بڑے ارادہ پر غالب آیا۔

اس وقت اسلامی مجتمع جماعت کے لیے کسی ایک فرد کا داخلہ بھی موجب مشر ہوتا ہے

مجموعہ اس قدر مختصر تھا کہ اس میں کسی ایک فرد کا داخل ہونا بھی اس جماعت کے لیے بڑی خوشی کا باعث ہوتا تھا۔ میرے لیے یہ عجب کی بات نہیں ہے کہ اس شخص کے داخل اسلام ہونے پر معمول سے زیادہ خوشی کی گئی ہوگی جس نے شارع کے قتل کا طے کیا تھا یا خود ہادی نے ارادہ قتل رکھنے والے سے اپنے طے جماعت میں داخل ہونے کا اقرار سن کر اللہ اکبر فرمایا ہوگا۔ حضرت ابوطالب قریش کا ارادہ سن کر معلوم ہوئی تو آپ نے بھی مع حضرت نبوی کے طریقہ حفاظت پر غور فرماتا شروع کیا۔ اس مشورت میں حضرت حمزہ، عباس اور دیگر بنی ہاشم اور بنی عبد المطلب بھی تھے۔ جناب رسالت مآب نے فرمایا: ”ہمارے اقربا اور مددکاروں کے مکان مشرکین مکہ کے درمیان پراگندہ ہیں۔ اس صورت میں ہم لوگ اپنی حفاظت نہیں کر سکتے۔ مناسب ہوگا کہ ہم سب لوگ کسی ایک جگہ کو اپنی پناہ قرار دیں۔ جب تک خدام میں اور ہماری قوم میں کوئی تصفیہ نہ کرے۔“ یہ رائے پسند کی گئی۔

سب نے مکہ سے کوچ کیا، اور شعب ابوطالب میں پناہ لی۔ حضرت ابوطالب نے درہ کی حفاظت کی اور تمام کمزور اور حملہ کے قابل مقامات پر پہرہ والے مقرر کیے اور خود اکثر اوقات مع اپنے فرزند علی بن ابی طالب کے مل جل رہتے تھے۔

بنی ہاشم سے معاملات اور معاشرت ترک کی گئی یہ دیکھ کر قریش نے ایک دوسرے جلسہ میں یہ طے کیا کہ بنی ہاشم سے ہر قسم کی معاملات اور معاشرت ترک کی جائے اور کسی طرح آب و آذوقہ ان تک نہ پہنچے۔ اس وقت کی حالت کو مصائب ”سیر الائمہ“ نہایت خوبصورت اور قابل تعریف روش میں ظاہر کرتا ہے۔ جسے بنی ناعمرین کی پسندیدگی کے لیے پیش کرتا ہوں:

نبی کی قوت تصرف:

مدت سے سال کار بدی گونہ رفت و ابوطالب و یاران آن حضرت در خط و حمایت او دقیقہ غفلت نمی نمودند و بہ آن عزت کہ در بزرگان عرب داشتند این ہمہ ذلت و خواری را تحمل نمودند و چنان عشق

و ارامت پیغمبر در دلہائے ایشان جائے گیر شدہ بود کہ باین ہمہ زحمات و عظمت بچ از برائے ایشان کلاست و کسالتی در ہواداری پیغمبر روی نمی داد چون شخص مائل در این امور تامل کند جز قوت تصرف پیغمبر در قلوب آن مردم چسبندے نخواہد دید و چون در قوت تصرف او غور کند خواہد دانست کہ این تصرف از دو جهت است یکے حسن اخلاق و یکی قوت تاثیر کلام کہ ہرچہ می فرمود چنانک منی بر عقل بود کہ در فستوب ہوش مندان کالانش فی الجبر جائے گیر میشد و بچ اغراض شخصہ از فسر مایشات او فہم نمی کردند جز خسیر بندگان خدا و تربیت ایشان و این مردی کہ بر آن حضرت دل نہادہ بودند ہنگی مردم با عقل بودند۔

تین سال کام اسی طرح چلا رہا۔ ابوطالب اور آپ کے مددگار آپ کی حفاظت میں کوئی خللیت نہ کرتے اور باوجودیکہ عربوں کے بڑوں میں بہت معزز شمار ہوتے تھے یہ سب ذلت و خواری برداشت کی اور پیغمبر سے محبت و عقیدت اتنی دلوں میں راسخ تھی کہ ان سختیوں اور تجبیروں کی وجہ سے پیغمبر کے ساتھ محبت میں کوئی کمزوری یا سستی نہیں آتی تھی۔ اگر عقل مند شخص ان باتوں میں غور کرے گا تو دیکھے گا کہ ان لوگوں کے دلوں پر پیغمبر کو قوت تصرف حاصل تھی۔ اس قوت تصرف میں غور کرے گا تو جان لے گا یہ تصرف دو وجہ سے ہے۔ ایک حسن اخلاق اور دوسرا کلام میں قوی اثر کہ جو کچھ بھی فرماتے تھے اس طرح مبنی بر عقل ہوتا تھا کہ صاحب ہوش لوگوں کے دل میں جبر پر گیر کی طرح نقش ہو جاتا تھا۔ اس سے آپ کی کوئی شخصی غرض مفہوم نہیں ہوتی تھی، سوائے اللہ کے بندوں کی بھلائی اور تربیت کے۔ یہ لوگ جو حضور کو دل دیے بیٹھے تھے سب صاحب عقل تھے۔

اس ناگوار حالت میں تین برس گزر گئے علامہ مجلسی فرماتے ہیں کہ اکثر اوقات کہانے سننے کی چیزیں اس قدر ناپاب ہو جاتی تھیں کہ بنی ہاشم کے بچے بے چین ہو جاتے تھے اور اکثر محاصرہ کرنے والے ان کے رونے کی صدا سنتے تھے یہ پہلا محاصرہ اور پہلا موقع تھا جہاں آل ہاشم پر آب و دانہ بند کیا گیا تھا۔

برائی نے اپنے کو برائی ثابت کیا
اس کے بعد روسائے قریش غلام ہونے اور ان میں سے پہنچنے نے جاکر غنہ کعبہ میں اپنے پیشتر کے عہد نامہ سے بیزاری ظاہر کی اور قریب قریب سب نے ان کا ساتھ دیا۔ حضرت ابوطالب کو خبر دی گئی کہ لوگ محاصرہ سے نکلے مہاجرین حبشہ کو جب معلوم ہوا کہ مشریش کا جوش عداوت کم ہو گیا تو یہ لوگ بھی واپس ہونے اور اپنے ہاوی کی زیارت سے نشکین اور مسرت ماسل کی۔

دعوتِ اسلام کا مختلف طبع پر اثر
ہمارا ہاوی پھر کھڑا ہوا۔ ثابت اسلام کے لیے ہر ذمیہ و شریعت اس کے نزدیک مسلولی اور عید خدا تھا۔ یہی سون

عکاظ میں تھے تو کبھی ذوالحجین اور کبھی جمادی الاول کو بلند آواز سے خدا کی طرف پکارتے تھے کچھ سوال کرنے والے، تو میں دھمک کرتے تھے اور باتوں کو بغیر سننے اور جگے جگہ میں اڑانا چاہتے تھے اور کچھ تھے جو خاموش کھڑے رہتے تھے، سننے تھے، دیکھتے تھے کہ الغلادل میں کسے جاتے ہیں اور ان کی بہترین کج تصنیف کر رہی ہے کہ یہ کہنے والا کچھ رہا ہے۔ کچھ اسلام قبول کرتے تھے اور جو اقرار بھی نہ کرتے تھے، وہ رسول کے الفاظ وزن طرز کلام، صفاتی نفس اور ظہیم کی خوبی کا اثر لے کر واپس جاتے تھے اور اطراف و جوانب میں ان کی بزرگی، عقل، فصاحت، خوبی اور سچائی کی شہرت پھیل رہی تھی۔

مدینہ کے چھ متلاشی زمانہ حج آگیا دور دور سے لوگ جمع ہوئے اور نقیب خدا نے اپنے سطلے کے لیے آدمی پائے۔ ایک نہایت مفید امر کی ابتدا ہوئی۔ وہ یہ کہ رسول کی شہرہ سن کر مدینہ کے چھ آدمی دریافت حال کے لیے آئے۔ یہ لوگ قبیلہ قرع کے تھے۔ یہ لوگ کچھ احکام اور آیات قرآنی اپنے ساتھ لیتے گئے۔ مدینہ میں لوگوں کو دکھانا شروع کیا۔ اور اب لوگ متواتر مدینہ سے مکہ آنے لگے۔

اسلام کا مشنری یہاں تک کہ حضرت کو ظہیم اسلام کے لیے مصعب بن عمیر بن ہاشم بن عبد مناف کو بھیجنے کی ضرورت محسوس ہوئی طالب یہ اسلام کے پہلے مشنری تھے حیرت خیز سرعت سے اسلام اہل مدینہ میں پھیلنے لگا اور ہاشم نے چند قریب قریب کل مسلمان ہو گئے۔

ایسی جگہ اسلام کی اشاعت جہاں اسلام کا سوچنے کی بات ہے کہ نہ مدینہ میں کوئی نیکواری تھی تھی اور نہ کوئی ایسی ذات روانہ کی گئی تھی جو خوف دلائی ہو یا جس کی مدد کے لیے عصب میں نیکواریاں اور نیزے ہوں اور لوگ مرعوب ہو کر دین میں داخل ہو گئے ہوں۔ بلکہ اسلام کا سادہ، صاف اور فطری اصول تھا جس نے ہر دلنیزی پیدا کی۔ یہ حالت یقیناً پوش بن لون، اموک اور قسطنطنیہ کے رہنما کے قابل تھی۔

کوہ صفا سے دعوت یہی یا اس کے قریب کچھ میسر کا زمانہ تھا کہ قبول علامہ علی زائرج میں کوہ صفا کے اوپر سے حضرت نے ماتبوں کو دین کی دعوت دی۔ مشرکین قریش پہاڑی کے گرد جمع ہو گئے اور پتھر پھینکنے لگے۔ حضرت اسے چھوڑ کر کوہ مودہ پر گئے اور مشرکین یہاں بھی ساتھ ساتھ پتھر پھینکتے ہوئے آئے۔ کوئی پتھر فرق نظر نہ رہا اور خون مادی ہوا اسے بھی چھوڑ کر حضرت کوہ ابوقیس پر تشریف لے گئے۔ لیکن مشرکین بھی پیچھے رہے اور اپنے ارسالی کی لکریں کرتے رہے۔

علی اور خدیجہ دیکھتے ہیں حضرت خدیجہ اور علی بن ابی طالب علیہ السلام کو یہ خبر معلوم ہوئی، آئے دیکھا کہ کوہ ابوقیس پر آفتاب رسالت چمک رہا ہے۔ دھماکت خدا اور اپنی نبوت کا اعلان ہے اور گرد پہاڑ کے مشرکین ہیں۔ کچھ اوپر چڑھتے جاتے ہیں اور اس فکر میں ہیں کہ قریب کچھ کر اپنے ادا دی۔ شام کی تاریکی پھیلنے لگی اور ہمارا ہادی کسی طرح زلفہ اصلا سے نکل کر گھر تشریف لایا۔ مشرکین یہاں بھی پہنچے اور گھر پر پتھر پھینکنے لگے۔

کفار قریش نے حضرت خدیجہؓ کا احترام کیا یہاں تک کہ رحمتہ اللعالمین نے انہیں مطالبہ کر کے فرمایا کہ: ”اے مشرکین! تمہیں شرم نہیں آتی کہ تم اپنی نجیب ترین عورت کے گھر میں پتھر پھینکتے ہو۔“ یہ سن کر مشرکین کو شرم آئی۔ عنیت اور نہایت کا خیال کیا واپس گئے۔

مشرکین کب زیادہ دلیر ہوئے سوار عرب حضرت ابوطالبؓ اور ملکہ عرب حضرت خدیجہؓ کی رحمت سے مشرکین مشرکین جناب رسالت مآبؐ کو اپنی پٹھانوں میں اور دلیر ہو گئے دوبارہ عہد لے گئے، جن میں ابوسفیان نہایت پیش تھا۔

ہادیؑ کی حالت ان لوگوں نے راستہ میں کانٹے بچانے اور پتھر پھینکنے میں اپنی عورتوں اور بچوں کو بھی شریک کر لیا اور خود استہزاء کے لیے ہر جگہ موجود رہنے لگے۔ یہ بھی ہوا کہ فاسق پسند ہادیؑ پر اوجڑیاں بھینکی گئیں۔ اور بچے بچے سیٹی بھینائی گئی۔ کبھی سراقہ سس سے خون بہا، تو کبھی مکوسے بڑھی ہوئے اور کبھی اڑیاں لہوسے تر ہو گئیں۔

مدینہ کی ہجرت خدا خدا کر کے یہ زمانہ بھی گزرا لیکن نہ مومنین کے ایمان میں دشمنانہ مظالم سے کوئی لغزش ہوئی اور نہ مشرکین کی افشانی ہادیؑ کے جوش کو کم کر سکیں۔ یہاں تک کہ مدینہ میں اسلام شائع ہوا اور اہل مدینہ نے خواہش ظاہر کی کہ نبی خدا اور ان کے مکی پیر مدینہ چلے آئیں۔ وہاں کے مسلمان ان کی ہر طرح کی حفاظت کریں گے۔ کل مسلمانوں کا ایک جسم جانا لیکن نہ قتل نہ زخم نہ زخم نہ لوگ جانے لگے اور اہل یثرب نے ان کی مدارات میں کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہ کیا۔

رسولؐ کے سراقہ س کے لیے دوبارہ انعام مشہور کیا گیا مشرکین کو خبر معلوم ہوئی اور اس مرتبہ وہ اتنے جوش سے بے فکر ہوئے۔ اور دوبارہ رسولؐ کے سراقہ س کے لیے انعام کا اعلان کیا گیا لیکن خداوند تعالیٰ ہمارے سید کو دشمنوں نے درمیان سے محفوظ رکھا لے گیا اور محفوظ مدینہ پہنچا دیا۔

وطن سے ہجرت کے وقت کیا فرمایا مؤثر ہے نتائج النبوۃ کی یہ روایت کہ حضرت مکہ منعم سے وطن سے ہجرت کے وقت فرورہ پر کھڑے ہوئے اور فرمایا کہ واللہ تو زیادہ بخیر میرے نزدیک خدا کی زمینوں میں اگر تیرے اہل خیمہ کو ہمارے نکالے۔

بستر رسولؐ پر قتل ہو جانے کے لیے علیؑ خلیفہ تھے کون نہیں جانتا کہ رسولؐ غلو کے موقع پر اپنا کوئی قائم مقام یزعی کے نہایت تھے کس نہیں سنا کہ علیؑ ان نکواردوں کی چھلوں میں سونے جو رسولؐ کے قتل کے لیے چھنی گئی تھیں۔ بستر رسولؐ پر سونے چھنی رسولؐ کے دم کے میں شہید ہو سکتے تھے۔ دین پورٹ نے بہترین الفاظ میں خاکہ کھینچا ہے اس وقت کا جب کہ مشرکین کچھ تو دیوار کے قریب سے دیکھ رہے تھے کہ رسولؐ سو رہے ہیں اور کچھ گھر میں داخل ہونے کے کام

تمام کر دی: ”لیکن پہلے اپنے نکار کے نوجوان علی کو ملاحت اور تسلیم درخا سے اس موت کا خطر دیکھا جو ان کے سردار کے لیے جوڑ کی گئی تھی۔ اس قدر غلام نے ان غویوں میں ریم پیدا کیا اور علی سے عرض نہ کیا گیا۔“ کچ کہتا ہے صاحب نتائج النبوت کہ: ”جنب ولایت تک اولیٰ ہیں اس شخص کے جس نے خدا کیا اپنی جان کے شہید اور پچا اپنے شہید راہ محبت میں رسول خدا کی یہ آیت اس جنب کی شان میں اس باب میں نازل ہوئی ہے کہ: وَمِنَ النَّاسِ مَن يُشْرِي نَفْسَهُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ وَاللَّهُ رَءُوفٌ بِالْغَافِلِينَ (۲: ۲۰۷) (مردوں سے وہ شخص جو پچا ہے اپنی ذات کو خدا کی طلب خوشنودی میں اور خدا مہربان ہے ان بدوں پر جو اس کی طلب رضا میں اپنی جان فدا کرتے ہیں)

ایک وقت تھا کہ حضرت ابوطالب شہید نے کہ: **باپ اور بیٹے کی ہم معنی شاعری** وَاللّٰهُ لَنْ يَصِلُوْا إِلَيْكَ بِجَهَنَّمَ حَقِّ اَوْسَدِ فِي التُّرَابِ دَفِينًا (تم ہے خدا کی کہ وہ سب مل کر بھی تیرا کچ نہیں کر سکتے جب تک میں زیر خاک مدفون نہ ہوں) اب وقت تھا کہ وہ جوان کے بہر ملاحظہ یہ کہتا تھا کہ:

ارادت به نصر الاله تبتلا و اضمرته حقی اوسد فی قبر
(یہ میں نے ہر چیز سے قطع نظر کر کے محض خدا کے دین کی امداد کی نیت سے کیا اور آئندہ بھی یہی شان لی ہے جب تک کہ قبر میں تکیہ نہ کر نہ لیوں)

● **قتل کرنے والا نیزہ استقبال نشان بن گیا** سرانہ کی روایت مشہور ہے کہ کیونکر وہ انعام کے لالچ میں رسول کا تعاقب کرتا رہا، کس طرح وہ بیٹور ہو گیا اور رسول نے اس کی جان بخشی فرمائی۔ ● اسی طرح بیدہ بن الحسیب اہل شتر آدمیوں کے ساتھ تلاش کرتا رہا تھا۔ لیکن رسول کے کلام نے اسے بھی غلام بنالیا اور اب اس نے یائے اس کے کہ نیزہ کا دار کرتا، نیزہ میں اپنی پگڑی باندھ کر نشان بنایا اور رسول کے آگے آگے مقدمہ لشکر کی طرح ہمراہ چلا۔

رسول کی خبر آمد سن کر اہل مدینہ کا اہل مدینہ ایک زمانہ سے خطر تحریرت آوری تھے ان دنوں زیادہ خبر گرم تھی کوئی دروازہ پر بیٹھا رہتا تھا کچ لوگ بلند یوں سے دور دور نگاہ دوڑاتے تھے کہ ایک روز **اشتقاق اور استقبال کا بے آورد جوش** اہل کچ آمار معلوم ہوئے اور دفعہ سبوں نے ”رسول خدا آتے“ کا نعرہ بلند کیا۔ جوق جوق لوگ گروں سے نکلے عورتیں اور بچے بھی ساتھ ہو لیے۔ ہر شخص ناقہ کی مہار اپنے گھر کی طرف کھینچتا تھا کہ کہ کا جلا وطن میں سرفراز کرے۔ خبر یہ کہتی ہیں کہ سوار خوشی میں نیزے ہانے لگے۔ کوئی گھوڑا دوڑانے لگا اور بنی جبار کی لڑکیاں دف پر یہ شعر گائے گئیں:

نحن جوار من نبی الفجار یا حبلا محسد من جبار
(ہم بنی جبار کے ہمسایہ ہیں، خوشادہ جس کا ہمسایہ محمد ہو)

انصار کی پسینا اپنے حلوں میں بلند یوں پر کوشوں پر کھڑی ہوئی کہہ رہی تھیں کہ:

طلع البدر علینا من ثیاب الوداع وجب الشکر علینا ما دعا للہ داع

(ہم پر بدرطالع ہوا و دایع والی گھاٹیوں سے ہم پر حکم واجب ہو گیا جب تک کوئی ایک بھی اللہ کو
کارنے والا کار تارہے گا۔

جب نہیں ہے کہ اہل یثوب کے اس پر محبت استہلال سے رسول کا دل بھرا آیا ہو۔ کبھی رسول کو قوم کا جذبہ غیظ و زور
کرنا تھا کہ حجر اسود کو ایک چادر میں رکھ کر اس کا گوشہ ہر قبیلہ کے سرداروں کے ہاتھ میں دیدیتے، آج جذبہ شوق اور
محبت کو سدھارنا تھا کہ وہ آنکھوں پر شک اور جسد نہ پیدا کرے۔ ہانے والوں سے ارشاد فرمایا کہ میرا ناکہ جس جگہ
ٹھہرے گا میں وہیں فروکش ہوں گا۔ ناکہ ابوالایب انصاری کے گھر کے قریب ٹھہرا اور کسی کو اس تعفیفیہ پر غور نہ ہوا کہ نبی خدا
ابوالایب کے گھر قرین لے جاتے۔

علی کی ہجرت ادا لے خدمت بھی تھی اس کے بعد کوئی کہتا ہے کہ رسالت مآب نے اپنے آزاد غلام
زید بن حارثہ اور ابورافع کو مکہ بھیجا کہ حضرت فاطمہؑ اور ام کلثومؑ

دوسرے بنو زید وغیرہ کو لے آئے۔ اور کوئی کہتا ہے کہ حضرت نے ابوداؤد کی معرفت اپنے جان نثار کو مدینہ پہلے آنے کا
حکم بھیجا۔ میں آخر اللہ کی روایت کو زیادہ مانجھتا ہوں۔ ظنی ہے یہ امر کہ جس وقت کے عالم میں سرور عالم روانہ ہوئے تھے
یا جس عالم میں مرتضیٰ کو چھوڑ گئے تھے، اس کی ایک دوسرے کو خبر دی جاتی، یا یحییٰ کا موقع تلاش کیا جاتے۔ جناب
سرور کائنات اپنی دختر فاطمہؑ کو بھیجے بھیجے گئے تھے۔ حضرت فاطمہؑ بنت اسد بھی بھیجے گئے تھے۔ ان کے
کل فرزند مدینہ روانہ ہو چکے تھے۔ فاطمہؑ بنت زید اور ام ایمن بھی بھیجے گئے تھیں، جن میں آخر اللہ کی ہجرت اس کے کہ ماں تھیں
اسامہ بن زید کی، ان کی کنیت اسی گھر سے مشتق تھی۔ یہ حالت مقتضی تھی کہ کوئی خبر شخص ان لوگوں کی حفاظت کے لیے
مکے رہتا اور پھر مدینہ اپنے ہمراہ لے جاتا اور انھیں جناب رسالت مآب کے پاس پہنچا دیتا۔ علیؑ عذر رات کی حفاظت اور
امانتوں کی داپسی کے لیے پہلے چھوڑے گئے تھے۔ جیسا سوانحی محدث کی اس حدیث سے واضح ہو گا کہ :

”روایت کرد احمد و ترمذی و نسائی و ابن ماجہ از عیسیٰ بن حیان کہ گفت پیغمبر ﷺ
”علی منی و انامن علی و لا یودی عفی الا علی“۔

علیؑ از من است و من از علیؑ و ادای امانات تکلف از جانب من مگر علیؑ۔

علیؑ مجھ سے ہیں اور میں علیؑ سے ہوں۔ میری طرف سے امانت کوئی نہیں ادا کرے گا مگر علیؑ۔

اور اس فرض کی انجام دہی کے بعد مکہ میں انھیں قیام کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ اس صورت میں ابوعبیدہ بن جراحؓ
ہو یا ابورافعؓ ان میں کسی کا بھیجا جاتا تھی تھا محفوظ پہنچنے کی اطلاع پر۔ ظاہر ہے کہ اگر اہل یثوب رسول کا خیر مقدم و روانہ کرتے
جیسا تھا یا رسول ان کے اعظام میں مشتہد ہوتے تو ہرگز عورتوں کو نہ بلاتے۔ ان آدمیوں کا دوسرا کام یہ تھا کہ یہ دو آدمی
اور ہائی خود رہ لائے تھے۔

کفار نے راستہ روکا علیؑ نے مسلمان سفر درست کیا اور تمام آدمیوں کو ہمراہ لے کر مدینہ طیبہ
روانہ ہوئے۔ راستہ اس لحاظ سے محدود تھا کہ دشمن کا کسی شرارت پر
آلودہ ہونا بہت ممکن تھا۔ اسی لیے ابوداؤد اوشوں کو تیرے جا رہا تھا۔ اس جگہ حضرت علیؑ مرتضیٰ کا یہ قول ہم تک پہنچا ہے کہ :

”اے ابوداؤد غزنویوں کے ساتھ مارا کر اور ان کے اوشوں کو آہستہ لے چل کہ وہ کمزور ہوتی ہیں“ یہ بھی خبر ہے کہ آنحضرتؐ نے راستہ روکا اور علیؑ نے حارث بن امیہ کے غلام کا شانہ زخمی کیا اور اس کے بعد کفار جنگ گئے۔

اس کے بعد قبول صاحب منہاج النبوة: ”روضۃ الاحباب والا کہتا ہے کہ علیؑ مرتضیٰ علیؑ کی آبلیہ پائی اور رسولؐ کے دست اقدس

مکہ سے پیلاہ راہ چلی کر مدینہ میں حضرتؐ کے پاس آنے اور اس جانب کے دونوں پاؤں میں پیلاہ پٹنے سے چھالے پڑ گئے تھے حضرتؐ نے اپنا دست مبارک ان کے پاؤں پر ملا۔“

قبل الاسلام مدینہ کا نظام حکومت رسولؐ کی تعزیت آوری کے قبل مدینہ میں کوئی ہاکمہ نظام نہ تھا۔ قبیلہ اور فرقہ بندی کی حکومت تھی اور وہ اس وقت سے

کبھی خالی نہ تھے کہ مہلدا ایک قبیلہ کو دوسرے قبیلہ سے کوئی وجہ پر غاش پیدا ہو جائے اور آپس میں کشت و خون پھاری ہو اور ایک دوسرے کے طبعیت فرقتے ایک دوسرے کی مدد کر کے ابھی خاصی طاقت جاعتیں تیار کر دیں۔ دو بڑے قبیلے جو کاتام لوس اور قریظ تھا ایک دوسرے کے دشمن چلے آتے تھے اور کوئی صورت آپس میں اتحاد اور اتفاق کی نظر نہ آتی تھی۔ جنب رسالتؐ آپ کی قوی ذات اور علوانہ اصول نے وہ تمام امتیاز جو سرداران قبیلہ کو حاصل تھے شکست کر دیے اور جس قدر مدنی مسلمان تھے سب کو انصار کا خطاب عطا فرمایا۔ وہ لوگ جو مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ پہنچے تھے مہاجرین کے نام سے یاد کیے جاتے تھے۔ حضرتؐ کی ذات کو مہاجرین ہوں یا انصار ہر حالت میں اپنا رہنا سمجھتے تھے اور قبول سید امیر علی صاحب: ”اب انجذاب صرف ایک واسطی کی حیثیت میں نہ تھے بلکہ لوگوں کے ہجرت ہجرت بھی تھے جو اپنے محبوبوں میں اصحاب کبار کو مدعو کرتے تھے اور شہر کی حفاظت انجذاب کے ذمہ کر دی تھی۔ انجذاب کا فرض فتنہ زد کرنا، اور سازش سے بچنا تھا۔“ (تاریخ الاسلام ترجمہ بریت ہشری آف سارا سنس)

ذات اقدسؐ نہیں کالیہ اثر ہوا کہ کشت و خون، فتنہ و فساد سب رفع ہو گیا۔ اور تمام لوگ صرف ایک دامن میں تھے کہ کس طرح اسلام سکھیں اور کس طرح اس پر عمل کریں۔ اور اس اثر اور یکساں جوش کا نتیجہ تھا کہ ایک روش اور ایک خیال کے لوگوں میں ایک جذبہ محبت اور برادرانہ اعلاص پیدا ہو گیا تھا۔

مکہ اور مدینہ میں جنگ کے اسباب جمع ہو رہے تھے مدینہ جدت کے لحاظ سے مکہ کا رقیب شہر تھا اور قبول

سید امیر علی صاحب جیناؤہ تاریخ اسلام میں فرماتے ہیں: ”اہل مکہ اہل مدینہ کے برخلاف سخت برا فتنہ تھے کہ انھوں نے کیوں آنحضرتؐ اور اصحاب کبار کو تھیں وہ باغی خیال کرتے تھے پناہ دے رکھی ہے۔ ان کے اور اہل مدینہ کے درمیان لڑائی اٹل تھی۔“

اس کے علاوہ مشرکین مکہ نے ان مسلمانوں کو اذیتیں پہنچانے میں کوئی دقیقہ اٹھانہ رکھا تھا جو مکہ میں رہ گئے تھے اور بوجہ مدینہ کی طرف کوچ نہ کر سکے تھے نہ صرف یہ بلکہ مشرکین نے یہ بھی روش اختیار کر لی تھی کہ وہ جہاں جاتے تھے غلام افواہیں مشہر کرتے تھے جس سے ہدایت کی راہ کے مسدود ہونے کا اندیشہ تھا اور سب سے زیادہ علیؑ کی مخالفت

یہ معنی تھی کہ مشرکین قریش کے قافلہ نے مہاجرین کے اوتھوں کو لوٹ لیا۔

اسلام کی اشاعت کے خلاف وصیت اور ضمانت ان کی عداوت کا درجہ اس مثال سے کچھ میں آئے گا کہ ولید بن مغیرہ (خالد کا باپ)

پر حالت نزع میں بے قراری طاری تھی اور وہ رہا قتلہ ابوجہل نے اس سے بے قراری کی وجہ دریافت کی تو اس نے جواب دیا کہ مجھے خوف ہے کہ کبشہ کا دین مکہ میں ظہور کرے۔ اس پر ابوشیان نے اسے تسکین دی اور کہا کہ میں ضمانت ہوں کہ اس کا دین ظہور نہ کر سکے گا۔

اسلام کے لیے موت اور زندگی کا مسئلہ تھا یہ باتیں بھانسنے کے لیے کافی ہیں کہ اسلام

کے لیے موت اور زندگی کا مسئلہ تھا کئی مرتبہ رسول کے قتل پر عہد کیا گیا اور انہیں کون کون سی تکلیفیں نہ دی گئیں۔ اسلامی تاریخ کے تناظر سے حضرت ہامزہ، عمار، اور ان کی ملازمت گرامی کے واقعات چھپ نہیں سکتے اور نہ بغیر اپنا اثر ڈالنے گزر سکتے ہیں۔ سوچ عرب کی گرم رنگ کسی کے رہنے، جسم اور سینہ پر چھادی پتھر کو، اور ان کی قدر کرو۔ لڑائی کا ہونا لہدیٰ تھا۔ جب پہلی رسول اور ان کا گروہ کم اور کمزور تھا کئی شکست ان کے دین کے ساتھ جس قدر برا اثر کرتی اس کے بچنے کے لیے زیادہ دماغ سوزی کی ضرورت نہیں ہے۔ اور کئی طرح کی غفلت اس برے نتیجہ کو ان کے سامنے موجود نہ دیتی۔ خبریں گرم ہو سکتی تھیں کہ مشرکین نے جس طرح مہاجرین کے اوتھ لے لیے یا جس طرح ان سے اور ایسی ہی نزاعیں مرتکب سرزد ہوئیں وہ ایک دن اہل یشرب کے سر پر موجود ہو جاتے۔ اور موقع ایسا نازک پیدا ہوتا کہ انہیں پر مغلوب اور شکستہ اور کچھ نہ آئندہ اور پھر نہیں معلوم یہ انسانیت سے معرا دشمن رسول اور اس کے دین کا نام کس کس طرح مٹانے کی کوشش کرتے۔

رسول نے کن حالتوں میں جنگ کا تصفیہ کیا ایسی حالت میں یہ غمی کے دیکھنے کا موقع تھا کہ وہ کب اور کہاں دشمن کو ٹھیک۔

اور کون سا موقع تلاش کریں جہاں دشمن کی شکست اسے آئندہ شرارتوں سے باز رکھے اور ان کی دھماک آئندہ امن اور صلح میں معین ہو۔ یہ سوچنا بھی اس وقت تھا جب کہ دشمن سے اذیت رسائی کی انتہائی کوششیں سرزد ہو چکی تھیں۔ جو رہی تھیں اور کئی امید اس کی نہ تھی کہ وہ کچھ اپنی شرارتوں سے ہلا آئیں گے۔ جب تک ان پر متواتر کاری ضروری نہ لگائی جائے۔

جنگ بدر یہ وقت تھا جبکہ سنا گیا کہ کاروان قریش شام کے سفر سے آ رہا ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ تجارت کر کے آ رہا ہے اور اب اس کے پاس ہاں بھی ہے جسے وہ نزاعی روش میں صرف کر سکے

یا اس کے اسلحہ فراہم کرے۔ اس وقت اگر یہ خبر غلط بھی ہو کہ وہ حملہ کرنے کا موقع دیکھتے ہیں تاہم احتیاط اس کی مقتضی ہوتی پاس ہے تھی کہ رسول آمادہ رہتے۔ اور یہ سمجھتے کہ مہلادہ میں تیار نہ پا کر حملہ کر بیٹھیں۔ یہ خبر سن کر کہ رسول بھی غافل نہیں ہیں ابوشیان نے مکہ میں خبر گیری اور وہاں سے امدادی فوج بھیجی۔

۱۰ مشرکین حضرت کو ان اہل کبشہ کہتے تھے۔

مسلمانوں اور دشمنوں کی تعداد اور موضع بدر میں دشمن کے لاسکنے والے سپاہیوں کی تعداد نو سو پچاس تھی اور رسول کے اصحاب صرف تین سو چودہ تھے یعنی ایک مسلمان کا تین کفار سے مقابلہ تھا ذرا لشکر اسلام کے ساز و سامان پر بھی نظر کرو۔ تمام لشکر میں صرف تین گھوڑے تھے۔ چہ زرہ پوش تھے آٹھ گھوڑا ہی نہیں اور ستر اونٹ تھے دو دو تین تین شخص تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد اونٹ پر سوار ہوتے تھے۔

رسول اور علی کی سواری جہول صاحب منافع الثبوة: "شریک حضرت رسول کی سواری میں علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ تھے جب حضرت کے پیلاہ چلنے کی نیت پہنچی تب حضرت علی کرم اللہ وجہہ کہتے کہ: "یا رسول اللہ تم سوار ہو میں تماری رکاب میں پیلاہ چلا ہوں۔" حضرت فرماتے: "یا علی تم فجر سے زیادہ قوی نہیں ہو، اور میں مستثنیٰ زیادہ تم سے نہیں ہوں اجر میں۔"

دشمن کی ثروت کفار کے پاس نہ صرف بہت سامان تھا اور امراء نے لشکر میں سے ہر ایک ایک ایک ہونہ تمام لشکر کی حیثیت کرتا تھا بلکہ انھوں نے یہ بھی قیاس کیا تھا کہ ہم ایسے کروڑوں کے ساتھ رہیں کہ نبی عربی اور ان کے رفقاء عرب جو جائیں اور ہمارا شہرہ دور تک پہنچے۔ ایک اور مخصوص ہدف جو ذکر کے قابل ہے وہ یہ ہے کہ لشکر اسلام جس جگہ ٹھہرا تھا وہاں ہی رسول اور آدمی ران تک دشمن جلتے تھے۔ پانی کی کمی تھی اور ہر ایک کو پیاس کی صلیت تھی۔ دراصل ایک دشمن کی فوج دیکھ کر ان میں پانی بہا ہوا تھا۔

اس جنگ میں سعد بن عبادہ، مقداد بن عمرو اور سعد بن معاذ نے محنت اور مدد کے مستقل اظہار ارادہ سے رسول کو سکین دی۔ رسول کو خدا نے فتح دی۔

علی نے کون سے لوگوں کو میدان میں قتل کیا اور بے جس خاص ہمت کی طرف اشارہ کرنا ہے وہ یہ ہے کہ اس جنگ میں علی بن ابی طالب نے میدان جنگ میں علاوہ اور مشاہیر کے ان لوگوں کو قتل کیا: ● ولید، معاویہ کا خالو ● حنظلہ بن ابوشخیان، معاویہ کا بھائی ● عمر بن عثمان عم طلحہ بن عبد اللہ ● عثمان د ● مالک بن ابراہیم طلحہ۔

اسلام کا ایک دشمن کم ہوا اور دوسرا زخمی ہو کر بھاگا صاحب "تہذیب اسلام" واقعہ خوانی کرتا ہے، چہاں وہ یہ کہتا ہے کہ:

"اس جنگ میں سب سے زیادہ پر جوش اور کوشش کرنے والے صرف دو تھے ● ایک علی بن ابی طالب، رسول اللہ کے چھیرے بھائی، اور ● دوسرے حمزہ بن عبد المطلب۔" مشرکین پر ان باغی ولیوں کی شجاعت سے ہیبت طاری ہوئی اور وہ بھاگے لیکن اسلام کا سب سے بڑا دشمن ابو جہل مارا گیا اور ابوشخیان زخمی ہو کر قتل بھاگا۔

حالت اسیری میں عباس کے کر اپنے سے رسول بے خواب رہے امیران جنگ میں عباس بن عبد المطلب بھی تھے،

جنھیں کفار بہ جبر لائے تھے۔ یہ بیشتر سے مسلمان ہو چکے تھے اور مشرکین کے احوال کی خبر دینے مکہ میں رہ گئے تھے۔ اور ان کے متعلق قبل ابترائے جنگ رسول نے بھی فرمایا تھا کہ جو ان تک پہنچ کر فراق کر لائے۔ شب کے وقت عباس کے کر اپنے

سے رسول کو نیند نہ آئی محمد اسلب نے وجہ دریافت کی اور معلوم ہونے پر لوگوں نے ان کی زنجیریں ڈھیلی کر دی۔
قیدیوں کے ساتھ رحم اب رسول نے دریافت کیا کہ کیوں عباس کے کراہنے کی صدا نہیں آئی؟ اور جب معلوم ہوا کہ اہل اسلام نے رسول کے لحاظ سے ان کی زنجیریں ڈھیلی کر دی ہیں تو آپ نے دوسرے قیدیوں کے متعلق بھی اس نرمی کا حکم دیا۔

پڑھنا لکھنا جانتے والے قیدی معلم مقرر کیے گئے دوسری بات جس کا میں ذکر کر دینا مناسب سمجھتا ہوں وہ یہ ہے کہ اسیرین جنگ جوئی کتب جانتے تھے ان سے یہ کام لیا گیا کہ ان میں ہر ایک انصار کے دو دو لاکوں کو لکھنا سکھائے۔ ہجرت کے پہلے سال کا ایک مفید واقعہ عقد مواخات تھا جس میں رسول نے مسلمانوں کو ایک دوسرے کا بھائی بنایا۔ اس کا سیاسی اور معاشرتی مفید اثر ہر شخص کچھ سکتا ہے۔ جب وہ اس پر غور کرے گا کہ لوگ ”بھائی“ بنائے گئے تھے جو کچھ بھے اور کہنا ہے وہ یہ ہے کہ: ”عقد مواخات باندہ حاضر کے نے درمیان ابیکر کے اور عمر بن الخطاب کے، اور درمیان طلحہ اور زبیر کے اور درمیان عثمان بن عفان اور عبدالرحمن بن عوف کے“۔ تب علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ نے کہا: ”یا رسول اللہ اپنے پیاروں کے درمیان عقد باندہی باندہ حاتم نے اور نجم کو بھول گئے اور کسی کے ساتھ بھے بلزاری نہ دیکھ میرا بھائی کیوں ہے“۔ حضرت نے فرمایا: ”بھائی تیرا میں ہوں“۔ اور فرمایا:

”یا علی انت اخي في الدنيا والاخرة“۔ اے علی تو دنیا و آخرت میں میرا بھائی ہے۔ (مشائخ النبوة)

تمام مومنین اس پر متفق نظر آتے ہیں۔ مشکل سے میں صحیح سمجھتا ہوں کہ کسی نے اس وقت جس وقت سلسلہ مواخات قائم ہوا یا اس کے بعد آج تک جب کہ اس واقعہ کے بعد صدیوں ڈھلک گئی ہیں سوچا کہ رسول نے جو جو چیزیں اس کے کوئی معنی تھے یا ایک بے کما ہوا فعل تھا۔ مشکل سے بھے تمام دنیا کھا سکتی ہے کہ یہ ایک انفرادی فعل تھا بھے رسول کا یہ فعل صحت بنا رہا ہے کہ حضور نبوی نے مٹی ہوئی طبیعتوں کو جن کراٹک الٹ کر دیا تھا۔ میں اس سے بہتر الفاظ نہیں پاتا۔ یہ اس کے جو کچھ میں نے الکرار میں کہا ہے کہ:

”آگے چل کر ایک زمانہ آنے والا ہے جس میں طبائع کے میلان کی یج گرفت کا اندازہ کیا جاسکے گا۔ اور اس وقت یہ تصفیہ آسان ہوگا۔ جب رحلت رسول کے بعد مٹی تنہا دکھائی دی گے کہ رسول نے طبیعت شناسی اور نسبت دینے میں ایک ایک رنگ طبیعت کو علیحدہ علیحدہ کر دیا تھا۔ یہ کوئی انفرادی فعل نہ تھا جو رسول سے مل میں آیا، بلکہ کما ہوا ارادی“۔

ابو حباب کا خطاب اور ایک حدیث: اور ہجرت کے اسی سلسلہ کا واقعہ غزوہ عسیرہ ہے۔ ان غزوں اور مشائخ النبوة کے نزدیک حضرت کاندہ سے صلح کر کے واپس آئے، مومنین کے نزدیک اسی واقعہ کے اشن میں علی بن ابی طالب کو ”الہر اب“ کا خطاب عنایت ہوا۔ یہ روایت حضرت عماد یاسر کی زبانی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم اور علی

ایک گجر کے درخت کے نیچے سو رہے تھے زمین ریتی تھی اور ہم لوگ گرد آلود ہو گئے تھے کہ حضرت سرہا میں کھڑے ہو گئے اور بیدار کیا اور علی کو "قم یا ایا حباب" فرمایا پھر کیا۔۔۔ تمام جہان کے لوگوں سے زیادہ بد بخت وہ ہے جو حباب سے عاصی کو تھلائے خون سے لگیں کرے مگر یہ فرماتے تھے اور دوست مبارک علی کے سر اور چہرہ پر پھیرنے جاتے تھے علی بن ابی طالب کو اپنا یہ خطاب سب سے زیادہ پسند تھا اس واقعہ کے لکھنے سے نہ صرف مجھے صاحب منابع النبوة کے افظالوں میں یہ کہنا سچ کہ "عائنین اور معاندین حضرت علی کی اس کنیت سے بھارتے تھے اور قہر کرتے تھے اس ہفت سے قصاص اور حدیث کے شیعہ ممالک اس کنیت میں اس علی حباب کی کمال عقیم و محرم ہے۔" بلکہ ایک سے زیادہ مورخ آئے گا جہاں ہماری اس کتب کے پیر کو دشمن "یا بن ابی حباب" کہہ کر پکار رہے گے۔

علی اور قاطمہ کا عقد اور اس کے وجوہات قاطمہ زہرا کا عقد علی بن ابی طالب علیہ السلام سے ہوا۔

کوئی کہتا ہے رمضان کے مہینہ میں، کوئی مفر میں اور کوئی رجب میں۔ کوئی وجہ نہیں ہے کہ جب ۳۱ اور ۳۲ رجب ولادت علی اور بخت رسول کے لیے ہم میں مستند ہے تو ایک تیسری خوشی اسی مہینہ سے مخصوص نہ کی جائے۔ اسی طرح کسی کے نزدیک یہ عقد قبل جنگ احد اور کسی کے نزدیک بعد جنگ ہوا۔ بلافاصلہ اس کے کہ حضرت رسول خدا پانچ برس قبل بخت پیدا ہوئی تھیں سن شریعت اس وقت ۱۹ برس کا تھا اور یہ کلام اس کے کہ بیوتا علی بن ابی طالب دس برس قبل بخت خلق ہوئے تھے سن شریعت چوبیس برس کا تھا۔ (میں نے مبینہ حساب میں نہیں کیے)

وہ تاریخیں جو اس عقد کا ذکر کرتی ہیں صاحب منابع النبوة کی اس عبارت کے مفہوم کو ادا کرتی ہیں کہ: "خواستگاری کی قاطمہ زہرا کی ابوبکر مدنی نے کی تھیں کیا حضرت نے اس کا رد کیا تو انہوں نے کہا کہ میں نے اس کا رد کیا اور اسے اپنے گھر میں رکھا۔" بعد اس کے عمر خطاب نے خواستگاری کی حضرت نے جواب اسی طرح سے دیا جو مدنی کو فرمایا تھا۔ اور مشکوٰۃ میں آیا ہے کہ جب خطبہ کیا مبنی خواستگاری کی حضرت خاتون کے شیعہ دشمن نے تب حضرت نے فرمایا کہ وہ مضبوط ہے۔ اس کے بعد صاحب سیر الائمہ کے موافق ابوبکر، عمر اور سعد بن معاذ میں باہمی ہوتے ہوئے عقد کا ذکر ہے چڑا اور کسی نے کہا کہ: "علی کی بیعت انہیں اس امر کی خواہش سے روکتی ہے۔" مالا کہ:

"ایہا امر روشن اسعد کہ رسول خدا قاطمہ را از برائے علی مجوس داشت۔"

اس کے بعد صلاح ہوئی کہ علی کی خواہش دیانت کی جائے۔

تحریک عقد نے علی سے کیا کہلوایا علی کسی انصاری کے باغ میں پائے گئے خوف نے اپنا فرض ادا کیا اور سوال سن کر: "علی آج دو چشم بگڑھینا و قوموداے"

ابوبکر جنبش دہوی چیز سے ماکہ دو میں ساکن ہوا۔ از غلب بر انداختہ ہوا کہ در میں چشم بگڑھینا (سیر الائمہ) بعینہ ہی الفاظ علامہ مجلسی نے ادا کیے ہیں۔ جے میں مجالس الابراہیم ہا تا ہوں۔ بہر حال عسلی بن ابی طالب علیہ السلام شریعت نے گئے۔ رسول حضرت ام المومنین ام سلمہ کے دولت خانہ پر شریعت رکھتے تھے۔ علی سامنے پہنچے۔ سر جھکا لیا اور زمین کی طرف دیکھتے رہے۔ رسول نے بات کرنے کی اجازت دی اور منسلک کیا کہ: "تم اس طرح آئے ہو کہ

کہا تمہیں کئی حاجت کہنی ہے۔

علی خواہش عقد کے وقت اور درخواست کی خوبصورتی اب علی نے عرض کرنا شروع کیا۔ اوسب، تہذیب اور خوبصورتی توجہ کے قابل ہے کہ :

”بالی انت وای تو خود دانائی کہ مراہنگام میں از پدرم ابو طالب و مادرم ماغوذہ بنتی و بہ ادب خود مودب فرمودی وایک تو ذخیرہ دنیا و آخرت میں لا جرم دوست دارم چنانکہ خداوند بازوے مرا بہ وقت تو ہم کردہ از برائے من دختر تو زوجہ باشد ایلتک بر رغبت تمام بھرتے تو شافقم باشد کہ ماطمہ دختر خود را ہا میں تزویج فرمائے۔“

میرے ماں باپ آپ پر قربان۔ آپ خود جانتے ہیں مجھے کچھ میں آپ نے میرے ماں باپ سے لے لیا تھا اور اپنے آداب سے مودب فرمایا۔ آپ میرے لیے دنیا و آخرت کا ذخیرہ ہیں۔ یقیناً میری خواہش ہے کہ جس طرح اللہ نے میرے بازو کو آپ کی قوت سے ہم فرمایا آپ کی دختر میرے گھر کی مالک ہو۔ میں پوری رغبت سے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں کہ آپ اپنی دختر کا عقد طالع مجھ سے فرماویں۔

یہ سن کر رسول کا چہرہ خوشی سے چمکنے لگا منبر پر تشریف لے گئے۔ غلبہ چڑھا اور اس کے بعد علی کو اظہار مطلب کی اجازت دی۔ محمد اور پاس کے بعد علی نے کہا کہ رسول نے اپنی دختر نیک اختر کا عقد میرے ساتھ منظور فرمایا اور میری زرہ مہر قرار دی گئی، موجود اصحاب نے رسول سے تصدیق چاہی، رسول نے اقرار کیا۔

رسول کا طالعہ کا استمراج لیتے ہیں اس قدر مجھے اور کہنا ہائی ہے کہ جب اللہ قریش اظہار عقد کرتے تھے اور جناب رسالت مآب حضرت زکیہ کو اطلاع دیتے تھے تو

آپ کے چہرہ سے اظہار کراہت ظاہر ہوتا۔ علی کے اظہار پر بھی جب حضرت رسول نے اطلاع دی اور بقول علامہ مجلسی فرمایا: ”علی نے تمہاری خواستگاری کے بارے میں کچھ کہاہے تمہاری اس میں کیا مصلحت ہے۔“ جناب سپردہ یہ سن کر چپ ہو گئیں۔ لیکن منہ اپنا نہیں پھیرا اور اظہار کراہت نہیں فرمایا۔ جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم اٹھے اور فرمایا کہ: ”اللہ اکبر سکوت کرنا طالعہ کا اس کے رضا کی علامت ہے۔“ (مجلس المصابرا)

انتظام عقد، ولیمہ اور شرکائے دعوت اس کے بعد مجھے یہ سب کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ اگر آدائش عروس حضرت ام سلمہ کے سپرد ہوئی تو کچھ غریب نا حضرت ابوبکر کے حوالہ کیا گیا، ولیمہ کے لیے لوگ بلائے گئے اور خبری کہتی ہیں کہ اس میں قریب قریب چار ہزار کے اہل مدینہ شریک تھے۔

رخصتی رخصتی ہوئی۔ دختران عبد المطلب اور مہاجرہ انصار کی عورتیں رجز پڑھتی ہوئی عروس کے ناکہ کے آگے آگے تھیں۔ تمام ہاشمی برہنہ شمشیر کے ساتھ چمکے چمکے تھے۔ اور جناب رسول ان کے ساتھ تھے۔

حضرت اُمّ سلمہؓ کا رجز قحطکہ: ”اے میری ہمسایہ کی عورت تو خدا کی تائید کے ساتھ چلو اور ہر حال میں اس کا حکم کرو۔ ریت غلّی کے انعام کو یاد کرو جس نے مکروہات اور آفات ذلیل کیے۔ ہدایت کی ہم کو ساتھ ایمان کے قبل اس کے کہ کافر تھے اور رب التعلوات نے ہمیں اُٹھایا۔ چلو بہترین نسل غلّی کے ساتھ ہمارے عملات اور حالات اس پر خدا ہوں۔ اے بیٹی اس کی کہ خدا نے فضیلت دی ہے اسے دی اور رسالت کے سبب ہے۔“ اسی طرح ام سعد اور دیگر عورتیں رجزِ رحقی قصیں اودان کے مطلع دہرائی جاتی تھیں۔

رسول پاکیزگی نسل کی دعا دیتے ہیں

رسولؐ نے علیؑ کو فاطمہؑ کو دعا دی اور فرمایا: ”ہاں الہامیہ دونوں بچے دوست

ہیں میرے نزدیک، پس تو بھی انہیں دوست رکھ، ان کی ذریت میں

برکت ہے اور ان پر اپنی جانب سے حافظ مقرر کر اور میں ان کو اور ان کی ذریت کو تیری پتہ میں دیتا ہوں شیطانِ رحیم سے۔“

یا قبول شولہا النہد و شب عروسی کی صبح کو رسولؐ نے طویل سہرہ کیا اور دعا میں فرمایا کہ: ”اے فاطمہؑ بلا تباہ

پاکیزگی نسل۔“ یا فرمایا کہ: ”ان کی پناہ گدگی کو جمع کر اور ان کے دلوں میں الفت دے۔“ یا ایک دوسرے کو محبت اور

کافک کی تاکید کہ دونوں کے متعلق دونوں سے سوال کیا اور ہر ایک نے دوسرے کو اچھا کہا۔ رسولؐ کا یہ فرمانا اب تک

کتابِ اسلامی میں محفوظ ہے کہ: ”اگر نہ پیدا کرتا خدا فاطمہؑ تو کوئی علیؑ کا کھونہ ہوتا۔“

علیؑ فاطمہؑ کے متعلق اور فاطمہؑ علیؑ کے متعلق اس حدیث کا نتیجہ علیؑ کے فصول میں یہ تھا کہ:

”جب تک فاطمہؑ دنیا میں رہیں میں نے انہیں کوئی

رنج نہیں پہنچایا۔ کسی امر میں اور ہرگز میں نے وہ امر نہیں کیا جو ان کے ناگوار طرح ہو اور وہ ہرگز بے غصہ نہ لائیں اور کبھی امر

میں نافرمانی میری نہیں کی اور جب میں انہیں دیکھتا تھا تمام غم و الم میرے سینہ سے دور ہو جاتے تھے۔“ (مجلس الامار)

حضرت فاطمہؑ کے لیے ”اموت مع یاسین عم و طاعتہ“ پڑھنا سنہ ض تھا اور مہمانی جنگ کا

رجز علیؑ سے کہلواتا تھا کہ:

”ولی الفخر علی الناس بعروسی و بنیہا ثم غفوی برسول اللہ اذ زوجنیہا“

(اور مجھ کو فر ہے آدمیوں پر بہ سبب اپنی زوجہ اور اس کے فرزندوں کے۔ پھر غفر میرے سبب

رسول اللہ کے ہے جب کہ اپنی دختر کو میری عروسی میں دیا)

ابھی تک میں عقد کے متعلق ہر پہلو کے واقعات لکھ رہا تھا۔ چھوٹے چھوٹے کھڑے کھڑے۔ جانے اور ہوا رکھے

تھے لیکن موٹے موٹے واقعات محض کافی نہیں ہوا کرتے۔ جب تک واقعات غور کی نہاں سے نہ لیں۔ میرے لیے ابتدا

اس سوال سے ہوتی ہے کہ آیا یہ عقد اپنے اس عام مفہوم میں تھا کہ بالغہ کا ولی اسے شوہر کے سپرد کرنے کے بعد کہتا

ہے کہ وہ اپنا اس وقت تک کا فرض ادا کر چکا اور اسے اب اس کے بعد کی زندگی کی ذمہ داری کے لیے کوئی جواب دہی

نہ رہی، بلکہ آئندہ کے لیے تمام ذمہ داریاں اس شخص نے اپنے اوپر لے لیں جس نے خدا کے سامنے عہد (عقد) کیا اور

زن و شو نے اپنے اپنے نفس کا ایثار کیا اور رنج و راحت کی شرکت میں یک دل اور ہم زبان ہو گئے۔

رسولؐ کے متعلق ذکر کیے جانے والے سوال سے میری یہ غرض نہیں ہے کہ میں نفس عقد پر بحث کروں یا زن و شو کے

تعلقات پر کوئی مضمون لکھوں، یہاں مجھے یہ کہنا ہے کہ عقد کا عام مفہوم بھی ایک غرض تھی کسی شوہر کا اپنی بی بی کے متعلق یہ کہنا کہ: ”جب میں اُمیں دیکھتا تھا تمام غم دالم میرے سینہ سے دور ہو جاتے تھے۔“ اس بی بی کے لیے وہ سب کچھ کہہ دیتا ہے جو شارح کو کہنے کی ضرورت ہو۔ ہمارا تو یہ بھی لکھنے کو یہاں بی چاہتا ہے کہ ”خصوصاً جب کہنے والا علی ہو۔“ میں علی کی راحت اور علی کے رنج و غم کی قدر ہے۔ میں یہ بھی چاہتا ہوں کہ ساتھ ساتھ اس پر غور کیا جائے کہ: ”اگر تم امی اولاد چاہتے ہو تو مجھے ناں ہاپ بنو۔“ رسول کی یہ تنہا یادگار عالم کے مثل فرد کی مثل بی بی تھی۔ جن کی اولاد کے ذکر کے لیے ہم راتہ رات صلیت کر رہے ہیں۔

والدین کی تبلیغ خصوصیات سمجھنے میں مدد ملی گئی ہے

بعض کے لیے شاید یہ غور کا دلچسپ مضمون ہو کہ اسلامی تاریخ میں اس مسئلہ پر سوچنے میں مدد دیتی ہے کہ زن و شو کی محبت امی اولاد ہونے میں معین ہوتی ہے۔ غور کرو کہ حضرت آمنہ اور حضرت عبداللہ کا فرزند کون تھا سوچو کہ حضرت ابوطالب اور فاطمہ بنت اسد کا مشہور یادگار عالم کا کیسا ضروری فرد تھا۔ اسی طرح حضرت رسول اور حضرت خدیجہ نے کسے اور کیسا چھوڑا۔ تم آگے بڑھو گے کہ علی اور فاطمہ کے کیسے یادگار تھے۔ یہ مثالیں میرے لیے سوچنے میں محرک اور معین ہوئیں اور مجھے اس میں بھی اپنی روش تصور کی غلطی کا گمان نہیں ہوا۔

عرب اور شرافت نسب

اب یہ سوچنا آسان ہو گا کہ عرب جسے شرافت نسب اور اس لیے خاندانی صفات کے متعلق ہوتے رہنے کا اعتراف تھا وہ اپنے نازک رشتوں کے لیے کس قدر چھان بین کرتا ہو گا اور چونکہ وہ صفات خاندانی کا بڑا داع تھا وہ دوسروں کی ایسی ہی صفات کا اقرار کیجے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ ہمارا ہادی عرب تھا۔ عرب کے شریف ترین قبیلہ بلکہ سرچشمہ شرافت افراد کا یادگار تھا اسے ضرورت لاحق ہوتی تھی کہ اپنی ہمارے بھگ کو کسی کے سپرد کرے۔

عقد کی نسبی وجہ

اپنا خاندان کجا ہوا خاندان تھا۔ اس کے ایک بچے کو لڑکین سے بگودوں میں کھلایا تھا۔ زبان چوساتی تھی۔ یہ بھی کہنا تھا یا کہہ چکے تھے جیسا تم موافق عرقہ میں پاؤ گے کہ:

”لما وعلی من شہرۃ واحدة“۔ (ہم اور علی ایک درخت سے ہیں)

ابوطالب نام کے باپ تھے دراصل ان کی تمام ذمہ داریاں جو پرداخت یا تربیت کے متعلق ہو سکتی تھیں رسول کے متعلق ہو گئی تھیں۔ اب رسول کا کام تھا کہ وہ اپنی خواہش اور روش کے موافق پالے۔ اپنا نظیر اتم بنا دیا۔ یہ سوچنا مشکل کر دیا کہ آیا ایسے بچے کی کوئی اور بھی مثال ہے۔ اس سے نہ صرف رسول کو اس کا موقع تھا کہ وہ صفات خاندانی جانتے ہوئے، بلکہ عین شخص اور اس کی صفات اور اس کی شہام قوتوں اور خیالات و عمل سے واقف تھے۔ عقد فاطمہ کے متعلق باوجود شرفائے شریف کی خواہش کے رسول کا معین اور طویل سکوت کہتا ہے کہ رسول طبیعت اور اطلاق و حلاوت شناسی کا ایک بڑا مسخر ادا کر رہے تھے۔ اور اس کے متعلق تھے کہ فاطمہ کا کھو (ہمسرا) وہ جو جو علم اور تجربہ کے معیار سے اپنا ثانی نہ رکھتا ہو۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ رسول کے نزدیک اور ان کے علم و تجربہ میں اگر علی وہ شخص تھے جنہیں یہ شرف بخشا جاسکتا تھا جو موافق عرقہ کی اس حدیث سے کچھ میں آنے کا کہ:

”مرویت از ابوہریرہ کہ پیغامبر صلی اللہ علیہ وسلم فرمود علیؑ را کہ فاطمہؑ دوست ترست نزد من از تو و تو اعزای بر من از وی۔“

تو پھر خود سے اس امر کی تحریک کیوں نہ کی۔ اسے ایسا کام شریف سمجھتا ہے۔ مگر دنیا نے اس کی ذمہ داری اپنی ہاتھ لڑکی کے حوالہ کر دی ہے۔ رسولؐ ”ظفر“ تھے قوی قرآن تھے کہ علیؑ خواہش کرتے جیسا ہوا۔ نیز یہ حالت کہ جب علیؑ اس خواہش کے ساتھ آئے اور رسولؐ نے دیکھا تو مستہم ہو کر فرمایا کہ: ”جو کچھ کہنے آئے ہو کہو کہ تمہاری خواہشیں قبول ہیں۔“ یہ ظاہر کرتا ہے کہ علیؑ کے منہ سے وہ کہلوانا چاہتے تھے جو خواہش تھی۔ ذاتی طور سے مجھے خیال ہوتا ہے کہ ام ایمن کا علیؑ سے یہ کہنا کہ تم کیوں نہیں کہتے، رسولؐ کے ایما سے اگر نہ تھا تو امتزاج کے بعد تھا۔

مختصر یہ کہ سید عالمؑ کی پارہ بھر جس کا شاہانِ مہم

خاندان کی فطری تقسیم اور امتزاج

”سیدہ نساء العالمین“ ہے۔ اسے دی جاسکتی تھی جو

”سید عرب“ ہو اور امیر المؤمنین (تمام حیثیتوں سے ہو) ہونے کی قابلیت رکھتا ہو۔ حضرت فاطمہؑ وہ ذریعہ ضعیف جنہوں نے حضرت عبداللہ اور حضرت ابوطالب کے خاندان کو مل کر ایک کردیا اور ان کی بالخصوصیات اور استحقاق اولاد فاطمہؑ میں ہائی رہے۔

وہ وقت جس وقت کہ خاندان حضرت عبداللہ اور ابوطالب عقد کی معاشرتی سیاست کا آئندہ پراثر

حضرت علیؑ اور فاطمہؑ کے لحاظ سے ایک ہو گیا۔ ایسا تھا جس میں رسولؐ کو مکلفہ و قار ماسل تھا۔ وہ حاکم تھے۔ ان کے اختیارات میں نہ صرف اضافہ کی قابلیت تھی بلکہ اضافہ ہو رہا تھا جو آپ ہمارے لیے ایک مستند واقعہ ہے۔ اب سوچو کہ رسولؐ اپنی بلا کار کو ان گروہ پوش کی حالت میں کسی کو سپرد کیا چاہتے ہیں۔

بجز علیؑ کے فاطمہؑ کا کفو نہ ہونے کے عناصر

یہ بھی مل کر سوچو کہ اثرات قریشی خواہش کرتے ہیں لیکن جواب انہیں ہمیشہ کے لیے ٹھنڈا کر دیتا ہے۔

علیؑ خواہش ظاہر کرتے ہیں اور رسولؐ کے انداز جواب دیتے ہیں کہ یز اس کے ان کی اور کوئی خواہش بھی نہ تھی۔ اس لیے کہ ان کے نزدیک ”کوئی نہ تھا جو فاطمہؑ کا کفو ہو سکتا ہو علیؑ کے۔“ کیوں نہ ہو سکتا اسے سوچو اور دیکھو کہ حقیقتاً اس پر معنی کفو کے عنصر کسی اور میں یز علیؑ کے مع جمع تھے؟

اس وقت تک کی خدمت اسلام بھی ایک بڑی وجہ تھی جس بات پر میں اب توجہ دلائے

دلا ہوں وہ رسولؐ کے نزدیک

بقول صاحب قرۃ العیون: ”چادر حضرت کی اوڑھ کر آپ کے بستر پر سو رہا ہوں اپنے نفس کو خدائے ذابہ مقدس کیا۔“ (وکیومنا فی التوبۃ ونشرۃ العیون شرح سہروردی المحمودی)

ایک مشہور مثل ہے دعوتِ نفاہیثہ میں مدخل کی احمدیہ دوسہ ہی قصیں، ان کے اعلان کی صداقت ہوتی جاتی تھی جس وقت نوجوان مائی اسلام نے ظہرِ مسجد دل اور بے لکنت نہان سے مدد کا دھبہ کیا۔ سہارا ہوا سکین ہو گئی۔ ”اقتضایہ“ اس لیے خطاب ہوا کہ ظہر میں کھڑے کے سکلے ہوئے بچوں کی تنگ آنکھی روکنے کے لیے اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں کو مستحضر رکھتے تھے لیکن جاننے کے باوجود ان ہاتھوں میں آئندہ اسلام کا علم دیکھتے ہوں اور انھیں ہاتھوں کو اسلام اور اس کے اعلان کے دفاع کا مکمل خیال کرتے ہوں۔

کیا اس میں کہیں سے مبالغہ ہے کہ :
خدمت کی مصویٰ علی کے لفظوں میں
 (اور جب از وقت کیا آتشِ حرب کو احمد نے قدم کیا فخر کو اور جب ندا دی رسول اللہ نے میری جانب تو میں نے کہا: کیا ارشاد ہے)

(دلیان جناب امیر)
 اور کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ: ”وہنا افتام دعائم الاسلام“
 (اور بسبب ہمارے قائم کیا ارکانِ اسلام کو)
 جے مثلِ غلیہ مٹی کی مجلس میں کہتے ہیں۔

اور کیا دلیان میں حضرت ابوطالب کا مکالمہ علی سے کوئی خیالی امر ہے جس کا علی جواب دیتے ہیں کہ: اسے پد بزرگوار! آپ مجھے حضرت احمد میں صبر و استقامت کا حکم کرتے ہیں، واللہ میں نے کوئی بات بے صبری میں نہیں کہی۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ میری صبرت دیکھتے اور جانتے کہ میں آپ کا ہمیشہ کا سہارا ہوں اور حضرت احمد میں میری کوششِ خدا کی خوشنودی کے لیے ہے جو نبی ہادی اور مسعود ہے مطلق اور نوجوانی میں۔

ناظر کو اخذِ نتائج کا اختیار ہے
 میں کہ چاکہ رسول نے اپنی نبوت کے ساتھ امامت کا اعلان اور امام کی شہادت ضروری تھی میں دیکھا چاکہ علی کو رسول اپنا جانی منتخب کر سکتے تھے میں محمد کے خاندانی، روحانی اور ملکی وجوہات دیکھا چاکہ اس کے بعد اخذِ نتائج کا ہر شخص کو اپنی جگہ اختیار ہے۔

رسول کی اس صلاحیتِ اذی کا حق جو علی کو نبیائی کئی بمقابلہ رسولی
 ایک امر اور ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر رقیہ اور
 کی اور کسی صلاحیتِ اذی کے جو کسی دوسرے سے کو نبیائی کئی ہو
 ام کلثوم و خیران حضرت خدیجہ تھیں اور ساتھ ہی
 و خیران رسول بھی تھیں: تو ان کی اولاد کو بھی وہی حق ہونا چاہیے تھا جو اولادِ حضرت فاطمہ کو قطع نظر دیگر مسائل کے پھر بھی

اولادِ طاہرہ کو حق مرثعہ حاصل تھا اس لیے کہ طاہرہ اور علی کے خمد نے آلِ عبد اللہ اور آلِ ابوطالب کے حقوق کو اولادِ طاہرہ میں جمع کر دیا تھا جس کا عبد المطلب کے بعد تقسیم ہو جانا خیال کیا جاسکتا تھا اور یہ حقوق رسول کی اور کسی صاحبزادی کو حاصل نہیں ہو سکتے تھے بجز اس کے جو علی یا ان کے کسی جانی سے بیہی گئی ہو۔

ایک سوال اس پر سوچنا کہ صورتِ مسئلہ کیا ہوئی اگر رسول کی اولادِ ذکور میں کوئی باقی ہوتا، اسی امر پر غور کرنا ہے جس کا وجود نہ تھا اس لیے کہ حضرت کے دو فرزند ابراہیم اور قاسم خود حضرت کے سامنے رحلت کر گئے تھے اور ان کا کوئی حق پیدانہ ہونے پایا تھا جس طرح رقیہ اور ام کلثوم نے رسول کے سامنے رحلت کر کے ایک روایتِ طاہرہ کی شواہد النبوة کے علاوہ کتابوں میں بھی باقی رہی ہے کہ ایک روز رسول حسین کو ایک زانو اور اپنے منہ زند ابراہیم کو دوسرے زانو پر بٹھانے ہوئے تھے کہ حیران نازل ہوئے اور کہا کہ: ”خدا ان دونوں کو ایک وقت میں جمع نہ رکھے گا ان میں سے ایک کو اختیار کرو۔“

رسول کا روحانی اضطراب اور تصفیہ رسول نے فرمایا کہ اگر حسین نے انتقال کیا تو مجھے علی اور طاہرہ کو مدہم ہوگا اور ابراہیم نے انتقال کیا تو مجھے زیادہ مدہم ہوگا اس لیے میں نے ان کے مدہم پر اپنا مدہم گوارا کیا اور ایسا ہوا کہ تین روز کے بعد ابراہیم نے رحلت کر کے اس کے بعد جب حسین رسول کے سامنے آئے تو منہ چوم کر فرماتے: ”اہلا و مرحبا بمن فدیته بابی ابراہیم۔“ اس سے کچھ میں آتا ہے کہ رسول ایسے وقت جب کہ وہ ان دونوں بچوں کو دیکھتے پیار کرتے اور غمخس ہوتے ہوں گے کسی ایسے ہولناک خیال کا تصفیہ کہ اگر ان دونوں وجہ محبت پر کوئی آفت ہو تو کس کی مصیبت پر صبر کیا جائے۔ یہ کہاتے تھے کہ ابراہیم کی رحلت پر صبر کیا جاسکتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ حسین باقی رہیں۔ یہ کہتے تھے کہ فرزند سے زیادہ محبت کا ہونا دوسرے فرزند کے حقوق کو کم پانڈا نہیں کرتا۔ جب تک محبت کرنے والا کسی خاص وصیت کی ضرورت نہ لگے یہاں صرف واقعات اور ان کے آثار سے بحث ہے جس کے طبعی تصفیہ کا ہر شخص کا اختیار ہے نہ یہ کہ کسی حدائق میں مقدمہ لڑنے کے لیے تہاری کی جا رہی ہے۔

صورتِ مسئلہ کی دھجی اور بڑھ جاتی ہے جب صوائقِ عرقہ میں یہ دیکھا جائے کہ:

”و طبرانی روایت کرد کہ رسول اللہ ﷺ فرمود کہ خدائے تعالیٰ ذریعہ ہر پیغمبر سے مادر

صلب و سہ نہادہ و ذریعہ ہر مادر صلب علی بن ابی طالب نہادہ۔“

اسی کتب میں اہلِ انجیل اور صاحبِ کنوزِ المطالب سے ایسی ہی حدیث نقل کی گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس جگہ اصولِ تنبیت کی وہ دشواری نہیں ہے جس سے متنبی ذہنی اور عقلی قائم مقام نہ ہو سکتے اس لیے کہ رسول اور علی کے پہلے صرف ایک پشتِ حضرت عبد المطلب کو تقسیم کرتی تھی اور خود حسین رسول کی صاحبزادی کے فرزند تھے۔

اگرچہ بدر کے بعد بہت سے چھوٹے چھوٹے غزوات اور سلیا ہوئے لیکن کوئی اس درجہ مفید نہیں ہے جس کا تفصیلی تذکرہ ضروری ہو۔ لیکن اس قدر کہہ دینا ضروری ہے کہ جب اہلِ انجیل و ایہی آیا بدر سے تو قریش کو اظہارِ مصیبت اور رونے سے اس لیے روکنا تھا کہ دشمن شامت نہ کرے۔ اسے نہ صرف اپنے ایک لڑکے حطلہ کے مارے جانے کا غم تھا

بلکہ دوسرا کاجس کا نام عرقہ اسیر ہو گیا تھا۔ اسی طرح چندہ الوسفیان کی بی بی کا باپ قتبہ مارا گیا تھا۔

الوسفیان اور ہندہ کی قسمیں الوسفیان نے قسم کھائی تھی کہ جب تک اس کا انتقام نہ لے گا وہ سر میں تیل لٹائے گا اور نہ عورتوں سے طاعت کرے گا۔ اسی طرح اس کی بی بی

نے بھی قسم کھائی تھی۔ رسول کے لیے اس جنگ کی فتح نے یہ مفید اثر کیا کہ جس قدر لوگ آپ کے ساتھ نہ بھی آئے تھے وہ مدینہ میں رسول کی دایہی کی خبر سن کر حرام روم میں چھپیں میل آگے استقبال کے لیے آئے۔

الوسفیان قسم پوری کرتا ہے الوسفیان نے اپنی قسم کے متعلق عملی کارروائی اس طرح شروع کی کہ دو سو سواردوں کے ساتھ موضع حرض میں جو مدینہ سے تین میل کے فاصلہ پر ہے پتھ کے ایک درخت جلا دیا اور ایک انصاری کو قتل کر کے بھاگ اس نے اپنی قسم پوری کی۔ جب رسول کو معلوم ہوا اور تعاقب میں پتے تو دشمن نے اپنے کو ہٹا کرنے کے لیے سواقی (ستو) پھینک دیا۔ مسلمانوں کے لیے یہ قیمت ہوا اور جنگ نہیں ہوئی۔

یہودان بنی قینقاع یہودان بنی قینقاع نے کریمہ حبیب اور کلیف وہ طغر شروع کیا۔ کھانے گئے، نہ ناظر بخیراً مصلحہ کیا گیا، اور اب انھوں نے شرائط پیش کیے کہ ہم لوگ اپنے اہل و عیال پر قابض ہوں اور یہ مسلمانوں کے حوالہ کر دیں۔ بنی قینقاع انھیں شام کی طرف جانے دیے گئے۔

حسن کی ولادت واصلت کی یہ روش تھی کہ ہمارے منسلک شدہ کو علی اور فاطمہ کے گھر تاریخ اسلام کا ایک بڑا محسن پیدا ہوا۔ جس نے دوست دشمن دونوں کی نگاہوں میں حیرت خیز کام کیا۔

جس پر آئندہ بحث ہوگی یہ بزرگ ”سید جوانان اہل بہشت“ میں کا ایک تھا۔ جس میں رسول اپنی شان ”ہیبت اور سرداری“ پاتے تھے۔

رسول کے دونوں سوں کے دو بڑے فرض یہ وہ بزرگ تھے جن کے مشہور سواہر حیرت فعل کے بعد بھی دشمنوں کے برتاؤ نے ہماری اس کتب

کے ہیرہ کے پر استقلال ارادہ کے جواز میں قوت پیدا کر دی۔ حسن کی وجہ سے اگر زمانہ کو یہ تجربہ ہوا کہ اہل بیت رسالت امت کے رفیع فساد کے خیال سے دولت اور امارت سے دست بردار ہو سکتے ہیں تو ہماری کتب کے ہیرہ نے یہ دکھایا کہ ہمارے ہونے کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ دین اسلام پر بلائیں آتی رہیں اور کسی نے اپنے کو مشہ بان نہ کیا۔

کتاب کے آئندہ حصہ کے لیے بعض غور طلب باتیں یہ مقامات کتب کے آئندہ حصہ میں نہایت غور سے دیکھنے کی باتیں

ہوں گی۔ جس میں صلح جنگ کا اپنے اپنے زمانہ اور اتفاقات میں تعین کرنا ہوگا کہ آیا ان دو صلح اور جنگ کر لے والوں میں صلح اور جنگ کی قوت تھی یا نہ تھی۔ یہ میں اس لیے کہتا ہوں کہ لوگ یہ سوچنے میں اکثر غلطی کرتے ہیں کہ صلح اور جنگ کا ہر وقت

اعتماد ہوتا ہے۔ یا قوت رہتی ہے۔ اگر کہیں صلح کی قوت دیکھ کر جنگ کر لے کی قوت کوئی گئی ہے تو کہیں جنگ کی قوت نہ دیکھ کر یہ بھولیا گیا ہے کہ تو صلح ہو سکتی تھی۔ اور اگر کہیں یہ قیصری صورت پیدا ہو گئی کہ صلح اور جنگ دونوں کی قوت نہ

ہونے کی حالت میں ایسی صلاحیتیں تھیں جن کا موقع اور مکمل اختیار حاصل تھا تو یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ پہلے تو صلح نہ کی گئی آفریں بخیر ہو کہ اس وقت صلح کی خواہش کی جب موقع نہ ملا تا کہ موقع ہی بھگنے میں مقررین نے غلطی کی ہے۔

غزوہٴ احد، بدر کا انتقام اور اُن کے سامان میں بھی غزوہٴ بدر، سوتی، اور سریرہ قزوہ کا نتیجہ تھا۔ دارالندوہ میں مشرکین شمشیر نے جن کے سرغنہ صفوان بن امیہ اور عکرمہ بن ابوجہل تھے، ابوسفیان سے کہا کہ تم مال جمع کرو کہ لشکر آراستہ ہو اور ہم لوگ اپنے مقتولین کا انتقام لیں۔ چنانچہ جس قدر اسلحہ جمع ہوئی ان کا وزن ایک ہزار اوشوں پر بار ہوا۔ عمرو بن عاص منتخب کیے گئے کہ یہ قبائل عرب کو جمع کریں۔ اس لیے کہ یہ بہت ”عرب زبان“ تھے اور ایک پڑا طبقہ ہندو کی ماتحتی میں پندرہ ہجرتوں پر روانہ ہوا کہ وہ مقتولین بدر پر نوحہ کرے اور لوگوں میں انتقام کا جوش پیدا کرے۔

جوشِ عداوت کی ایک وحشیانہ حرکت اور اُس کی غرض دشمنوں کا درجہ عداوت اس سے معلوم ہوا کہ جب یہ لوگ موضعِ ابوا میں پہنچے جہاں حضرت آمنہ خاتون کی قبر تھی تو انھوں نے قبر کھودنے اور ہڈیاں نکال لینے کا قصد کیا۔ اس خیال سے کہ اگر مشرکین کی عورتیں گرفتار ہوئیں تو ہڈیاں دے کر واپس کی جائیں اور در صورتِ ایسا نہ ہونے کے رشتوں بہت سا مال دے کر واپس لیتے لیکن پھر یہ صلاح اس لیے مسترد کی گئی کہ قبیلہ بنو بکر اور خزاعہ رشتوں کے حلیف تھے وہ یادشمنوں کی اس حرکت پر انھیں روکتے اور جنگ کرتے یا خود دشمنوں کی قبریں جو اب میں کھود ڈالتے۔

نگہباناں اصحاب اور مشورہٴ جنگ جس روز سے اصحاب کو دشمنوں کی تیاری کی خبر ملی وہ صلح ہو کر حضرت کی نگہبانی میں مشغول ہوئے۔ ان میں سے مشہور سعد بن معاذ، سعد بن عبادہ اور اسید بن خنیس تھے۔ دیر تک اس کی بحث تھی کہ مدینہ میں رہ کر جنگ کی جائے یا بیرون مدینہ۔ حضرت عمرؓ کے اس فقرہ نے کہ: ”اس وقت تک روزہ نہ کھولوں گا جب تک دشمنوں سے اپنی نگواری سے جنگ نہ کروں۔“ تصفیہ میں مدد دی اور پھر طے پایا کہ خارج از مدینہ جنگ کی جائے۔

علمدارانِ لشکرِ اسلام مہاجرین کے علمدار حضرت علی بن ابی طالب، اسید بن خنیس اوس کے اور سعد بن عبادہ اور حباب بن منذر قبیلہ خزرج کے علمدار تیار دیے گئے۔ بعض کمسن نوجوانوں کے نام جنھیں زمانہ آئندہ سے تعلق ہوگا کس نوجوانوں کو مدینہ کی طرف واپس جانے کی اجازت دی۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھیں ہماری کتب کے آئندہ واقعات سے بھی تعلق ہوگا ”مناجی النبوة“ میں ان کے نام: ● عبداللہ بن عمر بن خطاب ● زید بن ثابت ● اسامہ بن زید ● زید بن ارقم ● برام بن عازب ● ابوسعید خدری ● عمرو بن جندب، اور ● رافع بن خدیج ملے۔

رسول نے محمد بن مسلمہ کو پچاس چھدرین سے لشکر کی ہاسپانی کے لیے، اور کفار نے عکرمہ بن ابی جہل کو اپنے لیے مقرر کیا۔ حضرت نے کوہ احد کو پشت پر لیا اور مدینہ کو سامنے رکھا۔ سلسلہ کو میں ایک پہاڑ جس کا نام عینین تھا، دو ٹکٹ دار تھا جس میں دشمن نہیں کر سکتا تھا۔ حضرت نے عبداللہ بن جیسر کو سخت تاکید کی کہ وہ مستحق شکست کی صورتوں میں کسی طرح اپنی جگہ نہ چھوڑے۔

ابودجانہ کی سپاہیانہ شان
جنگ ہونے لگی۔ ابودجانہ کا بھتیجا کیا گیا۔ اور اگرچہ یہ ہندو یا بھول جموں کا کل ترجمہ تاریخ واقدی عمرہ بنتہ احمارث کے پاس پہنچا اور خیال اولیٰ یہ ہوا کہ اس اجمار نے والی کو قتل کرے۔ لیکن پھر بقول مناج النبوة تعفیت یہ کیا کہ: ”یہ تلوار اس سے برتر اور گرامی ہے کہ اس عورت کے خون سے آلودہ ہو۔“

رنجی کے ساتھ علی کا شجاعانہ رحم
قریش کا صاحب لواء طلحہ بن ابی طلحہ میدان میں آیا اور اسے شیریشہ بیٹا علی مرتضیٰ نے، جس کا بقول واقدی: ”سریند پشیمہ سفید تھا“ وار کیا۔ اور اس کا سر ٹکٹا ہوا، علی میدان جنگ سے چلے آئے، اور لوگوں نے پوچھا کہ آپ نے اسے قتل کیوں نہ کیا؟ فرمایا کہ ”جب وہ گرا اس نے مجھے قہقہہ دیا کہ میں اسے چھوڑ دوں۔ مجھے شرم آئی کہ پھر اس سے متعرض ہوں۔“

علی کی شجاعت نمائی کارسوں اور لشکر اسلام پر اثر
اسی مورخ کے موافق: ”جب طلحہ قتل ہو گیا اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو سرور ہوا، اور اظہار تکبیر کا فرمایا، پھر سارے مسلمان نے تکبیر کہی۔“ اس کے بعد ابوشیبہ عثمان ابی طلحہ میدان میں آیا، اسے ہاشمی شیر اور رسول کے زمانہ کے سید الشہداء حضرت حمزہؓ نے جو خود میں شرم رخ کے پر لگائے ہوئے تھے قتل کیا۔ اور یہ کہتے ہوئے چہرے کہ: ”انا ابن ساقی العجاج“ (میں مامیوں کے پانی پلانے والے) (حضرت عبدالطلبؓ) کا فرزند ہوں) علیؓ نے ارطاب بن عبد شریل اور مواب غلام بنی عبدالدار دوسرے علمدار کفار کو بھی قتل کیا۔ بعض اور سردار سعد بن ابی وقاص اور زبیر بن العوام اور قتبان کے ہاتھوں سے بھی قتل ہوئے۔

لشکر اسلام کی فتح و شکست
مسلمان یہاں تک غالب آئے کہ دشمنوں کے خیوں پر قابض ہو گئے۔ لیکن فتح و شکست میں تھوڑا فرق تھا۔ شکست کی وجہ عرب کی جلی کمزوری یعنی لاچ بونی عبداللہ بن جیسر اپنے محافظین دورہ کو اس سے باز نہ رکھ سکا کہ وہ شریک غارت نہ ہوں اور رسول کا حکم مامیں، وہ لڑتے لڑتے مارا گیا۔ اپنی زندگی میں دشمن کو گزرنے نہ دیا۔ دشمن غالب اس کی لاش پر سے گیا۔

مسلمانوں کا اضطراب
اب حالت یہ تھی کہ بقول جموں کامل: ”مسلمان ساتھ مشرکین کے قتل ہو گئے تو باہم مشتبه ہو کر مقابلہ کرنے لگے اور باخود ایک دوسرے کو مارتے تھے مگر عجلت اور حالت اضطراب میں جس کو مارتے تھے کسی کو پہچانتے نہ تھے کہ وہ کون ہے۔“ چنانچہ ● اسید بن خنیر کو ابوردہ نے

زخمی کیا اور ۱۰ بوردہ کو ابو زمہ نے زخمی کیا اور جب پہچانا تو ”علیؑ“ کی وجہ سے یہ زخم ”فی سبیل اللہ“ سمجھے گئے اسی طرح ۱۰ حذیفہ کے ہاتھ پیاں قتل ہو گئے اور ۱۰ حباب بن منذر جو دلا شجاعت دے رہے تھے جبار بن مضر کی ایسی ہی نادانستہ شہرت سے زخمی ہوئے۔

”سیف اللہ“ کی زبانی ایک روایت ان بزرگ کے متعلق جن کی شہرت، وجاہت اور جسامت بعض مؤرخین کے ادعا کے موافق مکہ میں علامہ نماز پڑھا سکی، انھیں مؤرخین کے نزدیک ”سیف اللہ“ کہتے ہیں کہ: ”روزِ آمد جس وقت مسلمان روگردان ہو گریز ان ہوئے تو میں نے عمر بن الخطابؓ کو دیکھا کہ وہ سچے جانتے تھے اور ان کے ساتھ کوئی نہ تھا۔۔۔ کسی نے میرے ہوا ان کو نہیں پہچانا۔۔۔ آخر میں نے دیکھا کہ وہ شعب جیل کی جانب متوجہ تھے۔ اسی کتب میں ہے کہ جب ”عمرؓ قتل ہوئے“ کی صدا بلند ہوئی تو عمرؓ لفظ کہتے ہیں کہ میں اس وقت آگے بڑھا اور جیل پر مثل بز کو ہی چڑھ گیا۔ حالت اگر ایسی ہی تھی تو عجب نہیں ہے کہ وہ لوگ جو ان کے جنگ سے متاثر ہوں انھیں ”شعب“ کی طرف جاتا ہوا دیکھ کر خود بھی میدان میں کھڑا رہنا غلط سمجھتے تھے۔ وقت تھروش تھا اور قرینہ غالب تھا کہ رسولؐ کو ان سے صلاح کی ضرورت ہوتی تھیں مؤرخین نے ”وزارت“ کا عہدہ حوالہ کر دیا ہے۔ اس کی ایک مثال موافق مجموعہ کامل ظاہر ہے جو کہ عبدالرحمن بن ابی بکرؓ نے جب مقابل طلب کیا اور حضرت ابوبکرؓ نے مقابلہ کا قصد کیا تو رسولؐ نے فرمایا: ”تکوار میان میں کر اور اپنی جگہ پھر جا اور اپنی ذات سے ہم کو منفعت پہنچا۔“ اپنی ذات سے ہم کو کچھ پہنچا۔ یہ اس قدر پر معنی لفظ ہے جس کے انتخاب کی داد دی جاسکتی ہے۔ لیکن ذات اور فتح کے معنی ہم کو موقع جنگ کے لحاظ سے معلوم ہوں گے۔ یہ ظاہر ہے کہ وہ لڑائی سے باز رکھے گئے اور نہ یہ اُن آٹھ آدمیوں میں تھے جنہوں نے سرنے کی بیعت کی تھی اور نہ کہیں صلاح مشورہ کا موقع تھا اس لیے اگر اس کے کوئی معنی ہو سکتے ہیں تو یہ کہ تمہاری موجودگی زیادہ تعداد و مکملے میں مفید ہوگی ہو سکتا ہے کہ وزیر کے لفظ سے مؤرخین کی غرض وزیر جنگ نہ ہو۔ یہ حالت اس دوسری حالت کے معنی بتاتی ہے کہ محمد بن عمر الواقفیؒ نے کہا کہ مدوز احمد رسول خدا ﷺ لفظی و ظہری فرمایا کہ: ”تم میں سے کون شخص اس تکوار کو لیتا ہے جیسا کہ حق تکوار پکڑنے کا ہے۔“ لوگوں نے عرض کی: ”وما حقہ؟“ یعنی حق تکوار پکڑنے کا کیا ہے؟ فرمایا: ”دشمنوں کو قتل کرنا۔“ عمرؓ نے کہا: ”یا رسول اللہ! اس تکوار کو میں لوں گا۔“ حضرت نے ان کی طرف سے منہ پھیر لیا اور اس تکوار کو اس شرط پر پھر پیش کیا۔

مرنے پر بیعت کرنے والوں کے نام قبولِ واقفی: ”اس روز آٹھ آدمیوں نے حضرت کے ہاتھ پر بیعت کرنے کی تھی۔ تین نے مہاجرین میں سے: ۱۔ علیؑ ۲۔ زبیرؑ ۳۔ طلحہؑ اور پانچ نے انصار میں سے: ۴۔ ابو دجانہؑ ۵۔ حارث بن صہؑ ۶۔ حباب بن منذرؑ ۷۔ عامر بن ثابتؑ اور ۸۔ اسمیل بن ضیمؑ۔“

اسلام کے شہداء اسلام کے لیے خوفناک تاریخی کا وقت تھا اور ہم بھی حامی مسلمان کے ساتھ چلیں گے کہ وہ جنہیں مولوی شبلی صاحب الغبار دوق میں ”آسمانِ اسلام کے مہر و ماہ“ فرماتے ہیں میدان

جنگ کو روشن کرتے۔ عمارہ بن زیاد زخمیوں سے چور چور رسول کے قریب بکھڑا تھا اس کو حضرت نے اپنے قریب بلایا اور جسم اطہر کا حکم لکھ دیا اور اسی حالت میں وہ پہلور اپنا فرض ادا کر گیا انھیں دھتوں میں کوئی ہراس بن عمارہ بن نضله کا ایسا فانی بھی تھا جس نے اپنی زرہ اور خود اتار ڈالا دشمن کے لشکر میں مارتے ہوئے گھس گئے اور شہید ہوئے۔

رسول اور اسلام کے لیے خوفناک وقت میں

علاء کاشات اور اس کا اثر

حضرت علی پہلو میں کھڑے ہوئے ہیں۔ حضرت نے فرمایا کہ: ”یا علی کس طرح کی بہت ہے کہ تم یاروں میں محلی نہ ہونے۔“
 یحییٰ نہ بھاگے ان کے ہمراہ علی مرتضیٰ نے کہا: ”اے انھو بعض الایمان ان لی ہک اسوۃ“ آپا کافروں میں ایمان لانے کے بعد تحقیق کہ مجھے حق سے اقتدا ہے یاروں سے اور بھائیوں سے کیا کام جو بھاگے۔ اسی وقت میں ایک گروہ کفار کا متوجہ طرف اس جناب کے ہوا۔ حضرت نے فرمایا:

”یا علی مجھے اس گروہ سے بھاد حق خدمت دیاری بجاؤ کہ وقت دیاری ہے۔“

علی مرتضیٰ متوجہ طرف اس گروہ کے ہوئے۔ اور ان کو براگندہ کیا اور ایک مجمع کثیر کو طرف جہنم کے روانہ کیا۔ پھر یہی مقرر ہو گیا ہے: ”اس وقت ایک آواز سننے میں آئی کہ کویدۃ طہی کہتا تھا کہ:
 ”لا فقی الا علی لا سیف الا ذو الفقار“

اور اس مبارک غلظی نے علی کرم اللہ وجہہ نے حق مبارزت اور محاربت اور جلالت اور شجاعت وہ بھالایا کہ فوق اس سے مشہور نہ ہو سکے۔ علی کو اس جنگ میں سولہ زخم لگے تھے اور چار مرتبہ سنبھل نہ سکے اور گر گئے۔ لیکن پھر اٹھے اور اس وقت تک میدان جنگ سے نہ ہٹے جب تک کہ دشمن واپس نہ گیا۔ حضرت کے دیوان کا یہ شعر در کی سرخی میں لکھا گیا ہے۔ لیکن میرے خیال میں یہ امد کی واقعہ غنائی کرتا ہے کہ:

فصرنا رسول اللہ لما تدابدو و تاب الیہ المسلمون ذوا الجحی
 (مدد کی ہم نے رسول خدا کی جب پھر گئے لوگ اور پھر سے طرف حضرت کے مسلمان حقل والے)

روایتیں ہیں کہ اکشر نہاد مسلمین نے اس حالت میں جنگ کی جب کہ لشکر اسلام میدان جنگ میں مخترق ہو گیا چنانچہ ام عمارہ نسیمیہ اور صفیہ بنت عبد المطلب نے مشرکین کو قتل کیا۔

حالت زخم میں رسول کاشات

اگرچہ موقع جنگ رسول کے لیے اس حد تک محدود ہو گیا تھا کہ عتبہ بن ابی وقاص لب و دندان رسول زخمی کرتا، ابن شہاب مرفی اقدس کو مدد پہنچاتا اور اسی طرح ابن قتیہ کی ضرب مدد پہنچاتی اور جناب رسالت تک ایک گڑھے میں گر پڑتے لیکن سردار اسلام ایسا ہی ہونا چاہیے تھا کہ وہ اس تمام یورش میں اپنی جگہ سے ایک ہلشت نہ ہٹتا اور کسی وقت دشمن چوم کرتے اور زخمی کرنا شروع کرتے اور کوئی تباہی نہ ہتیہروں کا ایک وقت میں جواب نہ دے سکتا۔

مسلمان عورتیں اور لشکر کی خدمت اس جنگ کی ایک صورت یہ بھی تھی کہ اکثر مسلمان عورتیں اپنے ساتھ کھانا اور پانی لاتی تھیں اور زخمی مسلمانوں کو پانی پلاتی تھیں۔ مگر بعض عورتیں اپنے کاندھے پر دھری جھینگیں لے کر تھیں، اور ام ایمن بھی پانی پلا رہی تھیں۔ یہ لوگ زخمیوں کی تیمارداری بھی کرتی تھیں۔ یہ سبیاں غالباً اس وقت میدان جنگ میں پہنچیں جس وقت مدینہ میں یہ خبر عام ہو گئی کہ جناب رسالت مآب شہید ہوئے۔

فاطمہ رضوان اور علی میں نہیں جانتا کہ کس طرح حضرت زکیہ طہرۃ میدان میں پہنچی ہوں گی۔ مگر کس طرح اپنے پدر بزرگوار کے چہرہ اقدس کو خون آلودہ دیکھا ہوگا۔ جس حالت میں آنجناب قبول تمام مؤمنین کے یہ فرما رہے تھے کہ: ”کیسے کھن پانے کی وہ قوم جو اپنے نبی کے چہرہ کو خون سے رنگین کرتی ہے۔ دراصل ایک وہ انھیں خدا کی طرف بلاتا ہے۔“

رضوان کو جناب امیر بظلوں میں ہاتھ دے کر گڑے سے نکال چکے تھے۔ پیاس کی شدت تھی اور خون کسی طرح بند نہ ہوا تھا۔ حضرت اسد اللہ غالب مہر اس کی محیل سے پانی لانے اور زخم جنب نبوی کو دھونا شروع کیا۔ لیکن خون کسی طرح بند نہ ہوا تھا۔ جنب فاطمہ زہراءؑ نے ریشمی یا کچی قم کا مونگا کپڑا جلا کر اس کی راکھ جسم میں بھری اور اس سے خون بند ہوا۔ قبول مجتہد کامل واقفی علی زخم سر کے دھونے کے وقت حضرت فاطمہؑ کو اپنی نلکار لیے رہنے کو حوالہ کرتے ہیں۔ دیوان جنب امیر و حسبات القلوب وغیرہ کے موافق منسما تے ہیں: ”اے فاطمہؑ تو اس نلکار کو جو بری نہیں ہے اور میں خوف زدہ لیم اور ناکس نہیں ہوں، اے فاطمہؑ میں نے سخت کارزار کی نصرت احمد اور خوشنودی پروردگار میں جو بندوں پر رحیم ہے، میں یزید جزائے خدا کے اور کسی شے کی خواہش نہیں رکھتا، اور خدا کی رضا جنت اور بہشت کی آسائش ہے اور میں وہ مرد ہوں کہ بلندی و صوبہ تاجوں جب لڑائی دامن چڑھانے اور دشوار کام بڑھا، بغیر اس کے کہ مزاردار ملامت ہو، میں نے قہد کیا پھر عبدالدار کا یہاں تک کہ مارا میں لے اس کو اپنی نلکار آبدار سے جو مقوم اصناف استخوان کو کاٹی ہے۔۔۔ اور میری ششیر میرے ہاتھ میں مانند شہاب درخشاں کے تھی، جسے میں چلاتا تھا۔۔۔ میں جیشہ تاک میں رہا یہاں تک کہ میرے پروردگار نے ان کی جہاتوں کو پراگندہ کیا اور شقاوت شکنیں دی میں نے ان سے ہر صبر کرنے والے کے سینہ کو۔“ واقفی نے کوئی سختی نہیں کی ہے جہاں علیؑ کے منطبق رضوان سے یہ کہلوا یا ہے کہ تم نے ”بہت خوب جنگ کی۔“

لشکر اسلام کے بعض مجاہد اور مثالی دل کی عورتیں اس جنگ میں حضرت عروہؓ مصعب بن عمیرؓ ابو دجانہؓ جہاد بن منذرؓ اہل بن ضیف خصوصیت سے قابل تعریف ہیں جنہوں نے اس طرح جنگ کی جو شجاعت کا حق تھا اسی طرح میں ان عورتوں کی تعریف کیے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتا جن میں سے کوئی اپنے جوان بیٹوں کی لاش اپنے اوٹ پر لیے جا رہی ہے لیکن کسی نوچنے والے سے ان کی فہم کی ہوا بھی نہیں دیتی اور رضوان کی سلامتی کی خوشخبری سناتی ہے اور کوئی اپنے فرزند اور شوہر کی لاش دیکھ کر رضوان کی خبر سلامتی دریافت کرنے کے جوش میں ان کی طرف سے منہ پھیر کر آگے بڑھ جاتی ہے۔

یہ باتیں تھیں جن پر اسلام کی خصلت شجاعت پروری کو افکار ہوتا چاہیے۔

حضرت حمزہؓ کی شہادت خانہ جنگ کے بعد کادرد انگیز منظر اب شروع ہوا اور رسولؐ نے اسلام کے ایک بڑے مددگار شیر یعنی حمزہؓ کو دریافت فرمایا جس نے دشمنوں کی صفیں

چھری اور روغنی قہیدہ کسی کے دل میں یہ طاقت نہ تھی کہ وہ رسولؐ سے کہتا کہ وحشی نے چھپ کر اس پہلور کے پہلو میں نیزہ مارا اور ہندہ نے نہ صرف سیدہ شگفتہؓ کر کے ان کا دل چھایا بلکہ مثلہ بھی کیا۔ زنی سپاہیوں پر عبرت خیز عالم طاری ہوا۔ جب علیؓ بن ابی طالب علیہ السلام اپنے سہارے سے رسولؐ کو اپنے عم بزرگوار کی لاش پر لے سٹے واقعی اور مناج النبوة کے علاوہ مؤمنین قائل ہیں کہ رسولؐ چشم پر آب ہو گئے۔ لیکن اس وقت اور بھی بے قراری بڑھ گئی جس وقت حضرت صفیہ بنت عبد المطلب نے لاش کے قریب جانا چاہا اس وقت تمام مسلمان بھی رو رہے تھے۔

فاطمہ بنت حمزہؓ کا سوال اور رسولؐ کی شفقت اور کسی کا دل ایسا سخت نہ تھا کہ فاطمہ بنت حمزہؓ کو یہ پوچھتے سنا کہ:

”میرا باپ کہاں ہے۔“ اور کوئی اپنی آنکھوں سے آنسو نہ ٹپکنے دیتا۔ دیر تک یہ سر راہ کھڑی رہیں، اور دیکھا کہ جوق جوق لوگ ایک طرف سٹے جا رہے ہیں۔ اس منظر نے جانے تسکین کے اور متاثر کیا ہوگا۔ جب اس گروہ میں کسی سپاہی کو خود میں شرمسار کے پر لٹانے نہ دیکھا ہوگا۔ اس کے بعد یہ بھی رسولؐ کے پاس پہنچائی گئیں۔ یہاں بھی نہ پایا۔ اب بے چینی سے ہم سندس پر ہاتھ ڈال دیا اور وہی دل بلا دینے والا سوال کیا کہ: ”میرا باپ کہاں ہے؟“ رسولؐ نے مندرمایا: ”میں تیرا باپ ہوں گا۔“ ذکی الطبع لوگ نے کہا کہ ”یا رسول اللہ! اس سے خون کی بوساقتی ہے۔“ رسولؐ اور اصحابؓ کی آنکھوں کے آنسو نے اس سوال کا جواب دیا۔

حمزہؓ کی تعزیت کے لیے رسولؐ کا حکم اور انصار حضرت پر شہادت حمزہؓ کا بیسا دیر پا اثر ہوا وہ اس واقعہ سے معلوم ہو گا کہ:

جب آنجناب مدینہ واپس تشریف لائے اور انصار کے گھروں سے اپنے اپنے مقولین پر رونے کی صدا سنی تو فرمایا کہ: ”حمزہؓ پر کوئی رونے والا نہیں ہے۔“ انصار نے یہ سن کر اپنی عورتوں کو ہدایت کی کہ تم پہلے حمزہؓ کے گھر جا کر رود۔ حضرتؓ نے جب حمزہؓ کے گھر سے آواز گریہ سنی اور حالات پر مطلع ہوئے تو قبول مناج النبوة فرمایا کہ: ”راضی ہوں خدا ان عورتوں سے اور ان کی اولاد سے اور اولاد کی اولاد سے۔“

زخم اور عبادت حضرتؓ اس قدر زخم دار تھے کہ بیٹھے بیٹھے نماز پڑھائی اور قبول جھومتہ کامل واقعی جب شہداء پر رسولؐ نماز پڑھاتے تھے تو مندرمایا کہ: ”میں ان لوگوں پر شاہد ہوں۔“

رسولؐ کی حدیث زمانہ مستقبل کے لیے تب ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ: ”یا رسول اللہ! کیا یہ لوگ ہمارے برادر تھے کہ اسلام لانے لگے؟“

مندرمایا: ”ہاں جی ہے لیکن انھوں نے اپنے اجور دکائی میں سے کچھ نہیں کھایا۔ اور میں نہیں جانتا کہ تم میرے بعد کیا کیا احداث و بدعت کرو گے۔“

غزوہ اُحد میں میں نے ترتیب واقعات میں ناظم کا زیادہ وقت لیا، اس سے زیادہ جس قدر میں اکبرہ غزوات اور سلیما میں ضرورت کجوں گا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ذکر کیے ہوئے واقعات کو ہمارے پیردے کے بعض اکبرہ واقعات سے مسدود وغیرہ مناسبت ہوگی۔

اسلام کے اور شہد امر
 اس کے بعد اگرچہ بعض سلیما وقوع میں آنے لیکن ان میں سے زیادہ توجہ کے متعلق واقعہ جیح تھا یہ اس وجہ سے ہوا کہ سلاطین بنت محمد بن جو طلحہ بن ابی طلحہ کی بی بی تھی، عام اعلان کیا کہ: ”جو شخص میرے دو بیٹوں کے قاتل حام بن ثابت کا سر لائے گا اسے نو اؤنٹ دیے جائیں گے۔“ اس پر ایک شخص شعیان بن خالد آیا ہوا اور اپنے قبیلہ کے چند شخصوں کو لے کر خدمت رسول میں حاضر ہوا اور بہ مکر مسلمان ہونا ظاہر کیا اور اس کے بعد خاشس کی کہ اگر کچھ لوگ اس کے قبیلہ کی طرف ہدایت دین کے لیے روانہ کیے جائیں تو سب اسلام لائیں گے۔ رسول نے سات آٹھ آدمی منتخب فرمائے۔ جب یہ لوگ تخیم میں پہنچے تو شعیان بن خالد نے اپنے قبیلہ کو خبر دی اور اس نے اگر ان کو گھیر لیا یہ سات آدمی بہاروں کی طرح لڑے، اور سب نے بہ اشتداد آدمیوں کے شہادت پائی۔ ان کے نام غیب اور زید بن دثہ ہیں۔ یہ مکہ میں لاکر فروخت کیے گئے۔ غیب کو حارث بن عامر کے بھائی نے خریدا، اس لیے کہ غیب نے حادثہ کو بدتر میں قتل کیا تھا اور زید کو صفوان بن امیہ نے خریدا۔ اس لیے کہ اس کے باپ کو انھوں نے قتل کیا تھا۔ یہ لوگ دہر پر پہنچے گئے اور ان سے اسلام سے پھر جانے کی خواہش کی گئی۔ یہ وصال دار اسلام کو اپنی جان سے زیادہ عزیز سمجھتے تھے۔ اس وقت چالیس نسیزہ دار جن کے اعز ابدر میں مارے گئے تھے جمع ہوئے، اور انھیں انیاں چھانے لگے اور اس طرح یہ دو مسلمان جاں بحق تسلیم ہوئے۔

رسول کو دو مسلمانوں کی لاش کا دار پر رہنہ گوارا نہ ہوا
 رسول کو اس خبر نے متصع کیا اور زید اور حارث لے کر یہ وعدہ کیا کہ یہ لوگ ان کی لاشوں کو دار پر سے اتار دیں گے۔ یہ لوگ گئے اور بہت ہوشیاری سے لاشیں اتار لیا، اور اپنی وفادارانہ کارروائیوں کے اختتام کے بعد رسول کو اس کی خبر دی۔ (شواہد النبوة، مناقب وغیرہ)

اسلام کے وقتاری حفاظت
 اس کے قبل صفوان بن امیہ اور حکرمہ بن ابی جہل اس پر متصع تھے کہ اُحد کی جنگ کے بعد کبھی مدینہ کو نہ لوٹا۔ بعض ان میں سے اس کے مخالف تھے۔ تمام ذاتی تکلیف کے لحاظ سے مقدم تھی۔ یہ خبر رسول کو پہنچی اور اگرچہ آپ مع اکثر ممتاز جانداروں کے زخمی تھے لیکن سب وقار اسلام کے محفوظ رکھنے کے لیے حرم آہ الامد میں جمع ہوئے، در آنحالیکہ ان کے زخموں پر پٹیاں بندھی تھیں۔ علامہ مجلسی حیات القلوب میں لکھتے ہیں کہ اگرچہ علی ایسے زخمی تھے کہ بستر سے اٹھ نہ سکتے تھے مگر جس وقت رسول نے فرمایا کہ مشرکین حرم آہ الامد میں جمع ہوئے کا قصد رکھتے ہیں تو علی میں جنبش پیدا ہو گئی اور ساتھ جانے کا قصد ظاہر فرمایا، اور رسول کی اشک آلود نگاہوں نے حکریہ ادا کیا۔ مسلمانوں کی اس دلیری نے کفار کی ہمت پست کر دی اور جنگ نہ ہوئی۔

وہ لوگ بھی ہونے لگے جو دعوے کرتے تھے کہ یہ نبی خدا کا ہے۔ اسی طرح نجد میں ان مسلمانوں کو جو دعوت اسلام کرنے گئے تھے، ہمارے قریبی نے منع انہیں کشمیر کے گھیرا اور شہید کیا۔ غزوہ بنی نضیر میں مجھے صرف یہ کہنا ہے کہ یہود کا یہ موقع نہیں گزرا کہ اگرچہ پیشتر ہندو مذہب کے لوگ بھی یہودیوں سے مل گئے تھے اور انہیں رسول کو دعوت دے کر اپنے خیموں میں پھیرنا چاہا، تو بھی ان کے سپاہی غرور انے اسلام کے سپاہیوں کو کہیں سے قتل کرنے کا قصد کیا۔ اس پر بھی ان کی غاشمیں صلح منظور کی گئی تو قبول نتائج انہوں نے:

”اپنے تئیں سنوارا، دین پھلتے اور گیت گاتے مدینہ کے بازار سے نکلے۔“

نہ اس کے قبل کہ اپنے گمروں اور پس ماندہ چیزوں کو اپنے ہاتھ سے غراب نہ کیا ہو۔

ماہ شعبان تک تاریخ اسلام کا اس حد تک ثواب و شہادت کا اس درجہ و درجہ کا نام ہو چکا تھا کہ

جناب رسالت مآب اپنی پارہ بھر کے مجرموں کے باہر کھڑے تھے یہ نہ تھا کہ جناب اقدس نبوی نے اپنی عداوت کے موافق سلام کیا ہو اور اس کے فتنے ہوں کہ جواب ملے تو ہم اندر داخل ہو رہے اور نہ یہ تھا کہ جناب رسالت مآب کہیں سے تشریف لائے ہو اور اپنی لڑائی جیتی ہو مگر ان کے موافق پہلے دیکھنا چاہتے ہوں۔

رسول کی حالت انتظار آج رسول کا والد ابراہیم پر وہ دن خانہ تشریف رکھتے تھے اور ایک بچے کی ولادت کے انتظار تھے یہ سب ہوا اور قبول خاص شہینہ: ”حضرت نے حالت سہمہ میں آواز دی کہ میرے فرزند کو لا۔۔۔۔۔۔ میں لائی اسامام حسین کو ایک پارچہ ریشم میں لپیٹ کر پس حضرت نے امام حسین کو گود میں لیا۔

بعض احادیث اور ہادی نے اپنے اس فرزند کے کانوں میں اذان کہی۔ یہ پھر میرے جوائن بہشت کا دوسرا تھا۔ اور یہ سید العرب کا دوسرا فرزند تھا۔ یہ دو ریحان رسول میں کا ایک تھا جس کے متعلق رسول نے قبول موافق فرمایا کہ: ”حسین از من است و من از دے ام“۔ حسین مجھ سے ہے اور میں اس سے ہوں۔ خدا آن را دوست داشته است ہر کس کہ حسین را دوست داشته است خدا اس سے محبت کرتا ہے جو حسین سے محبت کرے۔ اس کتاب میں یہ بھی حدیث ہے کہ: ”ہارون وہ پسران خود را شیر و شیریں نام کرد و من دو پسران خود را حسن و حسین نام کردم“۔ ہارون نے وہ بیٹوں کے نام شیر اور شیریں رکھے تھے، لاوی نے اپنے دو بیٹوں کے نام حسن و حسین رکھے ہیں۔

رسول نے حسین نام رکھا ہے یہ روایت سر الشہادتین میں بھی مذکور ہے اور اس میں اس قدر اضافہ ہے کہ جب حضرت امام حسین علیہ السلام پیدا ہوئے تو جناب رسالت مآب نے حضرت علی سے دریافت فرمایا کہ تم نے کیا نام رکھا ہے۔ آپ نے جواب دیا کہ ”عرب“۔ فرمایا حضرت نے بلکہ اس کا نام ”حسین“ ہے۔

عقیدہ ساتویں دن ایک سفید کپڑے میں لپیٹے گئے، عقیدہ ہوا اور بالوں کے وزن کے موافق چاندی تصدیق کی گئی اور بحشد کے موافق کان چھیدے اور بندے ڈالے گئے۔

حسینؑ میں رسولؐ کی سخاوت اور جرات بعض کے موافق اس وقت جناب کاظمؑ زہرا (علیہا السلام) نے اپنے مسخرہ زند کے لیے رسولؐ سے کچھ مانگا اور رسولؐ نے مسخرہ پایا: ”میں نے اسے اپنا جود اور اپنی شجاعت عطا کی“۔ موافق عرقہ کے لفظوں میں:

”طبرانی از کاظمؑ روایت کرد کہ پیغمبر فرمود صلی اللہ علیہ وسلم کہ اما حسن پس مراد راست ہیبت من و سرداری من و اما حسین پس برائے لاجت جرات من و جود من“۔ حضورؐ نے فرمایا: حسنؑ کے لیے میری ہیبت اور سرداری ہے، حسینؑ کے لیے میری شجاعت اور سخاوت ہے۔

رسولؐ کے مشابہت کو ماٹا لوریاں دیتی ہے روایتیں ہیں کہ جناب امام حسینؑ رسول اکرمؐ سے مشابہت تھے جس کی تائید اس شعر سے بھی ہوتی ہے جو جناب کاظمؑ حسینؑ کو لوریاں دیتے وقت فرمائی تھیں کہ:

انت شبیه بابی لست شبیها بعلی

حسینؑ اور رسولؐ اس کے بعد باقرؑ کا کہنا کہ میری کبھی رسولؐ کے وصف اقدس پر ہے۔ کبھی سینہ پر ہے۔ کبھی ہاتھ پر ہے۔ کبھی رسولؐ چوم رہے ہیں اور کبھی ام ایمن یا ام الفضلؑ کی اس لیے چشم نمائی کرتے ہیں کہ کیوں حسینؑ کو اس طرح کو سے ٹھنکا کہ وہ بورنے لگے۔ حسینؑ جو سچے ہائیں گے اور قبول سرالشاہدین نبی اللہؐ کے ہاتھ پر رجوعیں گے اور کبھی صحن کپڑے پہنے ہوئے چھوٹے چھوٹے پاؤں سے ڈگ ڈگ کرتے اور لڑکھاتے ہوئے مہر میں چلے آئیں گے۔ رسولؐ منبر پر سے انھیں گے دل بے چین ہو جانے کا کہ کہیں گر نہ پڑیں۔ چوٹ نہ لگے اور روتہ دیں۔ منبر سے اتر آئیں گے۔ گود میں لے کر پیار کرنے لگیں گے اور قبول موافق عرقہ فرمائیں گے کہ:

”خدا نے قتال راست گفتہ کہ جو ابن نیست کہ اموات و اولاد شما فتنہ ایست من نظر کردم باین جود صبیان یعنی حسنؑ حسینؑ کہ ی آئید و پائے ایشان ی لغز ہیں جبر توانستم کرد تا این کہ حدیث خود را خلق نمودہ برداشتم ایشان را“۔

اللہ تعالیٰ نے کچھ فرمایا ہے: مال و اولاد تمہارے لیے آزمائش ہے۔ میں نے دیکھا ان دو بچوں حسنؑ اور حسینؑ کو کہ آرہے ہیں اور ان کے پاؤں لڑکھارہے ہیں۔ پس میں صبر نہ کر سکا۔ انچ بات چھوڑی اور ان کو اٹھا لیا۔

ہم پھر بخوریں کہ اس مولود مسعود کے حالات سے اس وقت تک رک رہیں جب تک یہ تاریخ اسلام میں عملی شرکت کے قابل نہ ہو جائے۔ اس درمیان میں ہم پھر ان عظیم الشان واقعات کا خلاصہ پیش کرتے ہیں جن سے حسینؑ کی سوانح عمری متاثر ہے۔

حضرت فاطمہ بنت اسد کی رحلت اور رسول اس سال میں حضرت فاطمہ بنت اسد نے قبر تیار کی گئی۔ خبر سن کر رسول نے اپنے اصحاب سے فرمایا کہ: ”چلو اپنی ماں کے پاس چلو۔“ اصحاب اس طرح رسول کے ساتھ چلے گئے۔ ان کے سروں پر طائر بیٹھے ہوئے تھے۔ حضرت نے اپنا پیرا ہن ان کے کفن کے لیے عطا فرمایا۔

رسول کا نہ دیتے ہیں اور جب جنازہ باہر آیا تو قول مناجات النہود اس جناب نے اس جنازہ کا پایہ اپنے کفن مبارک پر اٹھایا اور تمای راہ میں بھی اٹھ پایہ جنازے کا اور کبھی پچھلا کاندھے پر اٹھائے تھے کاندھا دیے ہوئے چلے جاتے تھے۔

رسول کا سپہا مخاطبہ انس بن مالک کہتے ہیں کہ رسول لاش کے سرہانے بیٹھے تھے اور فرماتے تھے: ”يَا أَيُّهَا بَعْدَ أَيُّهَا“ (اے میری ماں کے بعد میری ماں) اور ”اسلمہ بن زید“ اباباٹھ انصاری اور عمر بن الخطاب نے قبر کھودی۔ اور کھدان کی اس جناب نے اپنے دست مبارک سے کھودی اور اپنے ہاتھوں سے خاک اس کی باہر نکالی۔

سعد بن معاذ کی تجہیز و تکفین حضرت فاطمہ بنت اسد کا تو کیا ذکر سعد بن معاذ کی تجہیز و تکفین میں رسول نے مخصوص شرکت فرمائی اور وقت نزع ان کا سر زانو سے مبارک پر رکھا۔ یہ اسلامی خدمت کا احترام تھا۔ لیکن رسول غیر مسلمین کے جنازہ کا بھی احترام فرماتے تھے اور کھڑے ہو جاتے تھے۔

غزوہ نبی مصطلق شہد میں ایک واقعہ ہوا جس بعض مؤرخین نے یہ بھی کہتے ہیں جس نے ہماری تاریخ کے آئندہ اوراق پر گہرا اثر ڈالا۔ واقعہ کو بغیر کسی تنقید یا اجتہاد تاریخی کے مختصر فقرات میں پیش کرتا ہوں۔ مجھے اس واقعہ کے متعلق کاف اور امید ہے کہ کم سے کم میرے ہم خیال مؤرخین کما اے کسی تنقید یا اجتہاد کے تابع نہ کریں گے۔ مجھے ذاتی طور سے یہ یقین ہے کہ یہ مصطلح جناب امیر کی پیروی ہوگی۔ واقعہ یہ ہے کہ حادثہ بن مزار نے جو بنی خزاعہ کا سوار تھا قبائل عرب کو رسول کی جنگ پر متوجہ کرنا شروع کیا۔ رسول مع اپنے جبار کے روانہ ہوئے۔ حادثہ بن مزار مع اپنے بیٹے کے علی کے ہاتھ سے مارا گیا۔ لشکر بے سردار ہو چکا تھا۔ مسلمانوں نے یک یارگی حملہ کیا اور دشمن کے دس آدمی اور قتل ہوئے تھے کہ مسلمان فتح یاب ہوئے۔

حدیث افک رسول واپس آ رہے تھے اور قریب مدینہ پہنچ رہے تھے کہ ایک شب کوچ کا اعلان کیا گیا۔ کوچ کے اعلان کے وقت حضرت عائشہ قتائے حاجت کے لیے لشکر سے باہر تشریف لے گئیں۔ اور جب واپس آئیں تو دیکھا کہ گردن بند نہیں ہے۔ پھر واپس گئیں اور ڈھونڈنے میں دیر ہوئی۔ جب لشکر گاہ میں آئیں تو دیکھا کہ یہاں کوئی نہیں ہے۔ یہ بیٹہ گئیں اور بنید آگئی۔ صفوان بن مطلق سلمی اس لیے عقب لشکر رہتا تھا کہ لوگوں کی چھوٹی ہوئی چیزیں دیکھ لیا کرے۔ بقول مناجات النہود عائشہ مدنیہ کہتی ہیں کہ بس ریح کی صفوان نے میری منزل کے نزدیک اور دیکھا اس نے ایک سیاہی آدمی کی کمر بچا خواب کے سوتا ہے۔ پس پوچھا اس نے مجھے جس وقت اس نے

مجھے دیکھا اور اس نے مجھے پیش از مجلس دیکھا تھا۔ کہا اس نے انا للہ وانا الیہ راجعون۔۔۔۔۔۔ پس جنگی میں اس کے استر میں کی آواز سے اور دُعا میں نے اپنے منہ کو اپنی چادر سے۔۔۔۔۔۔ پس اس صفوان اپنے اوٹ سے اور بٹھایا اس نے اپنے اوٹ کو پس رکھا اس نے پاؤں اوٹ پر اور یہ اس واسطے کیا تاکہ آسمان ہو جائے کو سوار ہوتا۔۔۔۔۔۔ پس کھڑی ہوئی میں الاز گئی طرف اوٹ کے اور سوار ہوئی اس پر۔۔۔۔۔۔ یہاں تک کہ آئے ہم اور دیکھیں ہم لکڑی کے میں کرم مکہ روز میں۔۔۔۔۔۔ پس دراز کی اہل ایک نے زبان۔۔۔۔۔۔ اور سر انہم کرنے والا بڑا عبد اللہ بن ابی سلول ہوا۔۔۔۔۔۔ اور عقبہ یہ ہے کہ اہل اسلام سے بھی کئی شخص اہل ایک کے ساتھ شریک ہوئے۔۔۔۔۔۔ حسان بن ثابت اور بن اثامہ ابو بکر صدیق کی خالہ کی بیٹی کا بیٹا تھا اور حمزہ بنت حمز، زینب بنت حمز کی ہمشیرہ و عاصمات مومنین سے ہے۔

حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ مدینہ پہنچ کر میں بیمار ہو گئی اور اہل انکب کے ہاتوں کی مجھے کوئی خبر نہ تھی۔ لیکن رسول کا مزاج اپنے طرف سے بخیر ہلتی تھی۔ یہاں تک کہ کچھ دنوں کے بعد ام سلمہؓ نے قصہ سنایا۔ اس کے بعد حضرت عائشہؓ رسولؐ سے اجازت لے کر اپنے باپ کے گھر تشریف لائیں۔ یہاں معلوم ہوا کہ حضرت ابوبکرؓ نے بھی یہ روایت سنی ہے۔

مشورہ اور علی کا جواب: کچھ دن گزرے تھے کہ حضرت رسولؐ نے اسامہ بن زید اور جناب امیر علیؓ کے سامنے مشورہ طلب کیا۔ جناب امیرؓ نے قبول مناجات اللہ سے دعا کی:

”یا رسول اللہ شگ نہیں کیا ہے حق تعالیٰ نے واسطے تیرے عورتوں کے جنہیں اور عورتیں اس کے
سوا بہت ہیں۔ پوچھیے آپ جاریہ سے یعنی بریرہ سے۔“ ---- پس بلایا حضرت کی نے بریرہ کے جنہیں
---- بریرہ نے عرض کی: ”یا رسول اللہ قسم خدا کی میں دیکھا میں نے ماحضہ سے ایسا کوئی کام جو
عیب دار کرے ماحضہ کو زیادہ اس سے کہ لڑکی ہے۔ ہر سال خالص اس سے کہ بکری اتلی ہے
اور حواست میں نے گوند کا کھا جاتی ہے۔“

طبری اور روضۃ الصفا وغیرہ میں بی بی ۷

جانب امیر نے جو کچھ فرمایا اس کے متعلق مولف کتب مولوی عبدالحق صاحب دہلوی فرماتے ہیں کہ نا۔۔۔
 ”جب دیگھا علی مرتضیٰ نے کہ حضرت نعلی غریج اور حیدرت اور تنگ دلی میں پڑے ہیں اور اس
 غم و اندوہ کی کشادگی کار کی کوئی راہ نہیں ہے۔ تب یہ کہا، اور یہ بات برادری میں مجھوں میں اور
 غیر خواہوں میں ہوئی ہے۔۔۔ ظاہر یہ ہے کہ جتنی محنت اور غیر خواہی کہ علی مرتضیٰ حضرت سے رکھتے
 تھے ملاحظہ سے نہیں رکھتے تھے۔ پس اس نے اپنی حضرت علی نے حضرت کی رعایت کر کے
 ایک بات کی۔“

اسی کتب میں میچ بخاری سے نقل کی گئی ہے کہ زہری روایت کرتا ہے ابوسعلمہ بن عبد الرحمن بن عوف اور ابوبکر بن عبد الرحمن بن مارث سے کہ حاکم نے ان سے کہا کہ: "علی میرے قصہ میں خاموش (ساکت) تھے۔"

جامع ترمذی، قرۃ العیون اور منہاج میں یہ اختلاف الفاظ حضرت حاکم نے رسول کو یہ جواب دیا کہ:

”اگر میں کہوں کہ میں اس سے پاک ہوں تو صدق نہ کرو گے اور یقین نہ کرو گے میرے کہنے پر۔ اور اگر اقرار کروں میں ایک امر پر جس کا انھوں نے ٹحہ پر بہتان باندھا ہے تو صدق نہ کرو گے۔“

شرآن کا تصفیہ کیا ہے کہ: **لَوْ لَا جَاءَ وَعَلَيْهِ بِأَرْبَعَةِ شَهَدَاءَ ۚ فَإِذَا لَمْ يَأْتُوا بِالشَّهَادَةِ** **قَالُوا لَيْتَ عِنْدَ اللَّهِ هَمُّ الْكَافِرِينَ** (۱۳: ۷۲) (کس واسطے نہیں لائے اور اس کے چار گواہوں کو میں دیکھ نہ لائے وہ گواہوں کے پس وہ گروہ ہیں نزدیک خدا کے دروغ گوئیں سے) اور اس کے بعد نہایت جائز ہدایت کی گئی ہے: **يَعْلَمُكُمُ اللَّهُ أَنْ تَعْلَمُوا إِلَهِكُمْ أَبَدًا إِنَّ كُنتُمْ مَوْفِقِينَ** (۱۴: ۷۲) (مخبر کرتا ہے تم کو خدا یہ کہ پھر ذکر کرو تم مابعد اس ذکر کے بھی اگر تم ایمان لائے والوں سے)

علی کی رہائے اس جگہ میں یہ کہنا علی کے ساتھ افعال گھٹا ہوں کہ رسول کے صلح لینے پر علی کا جواب نہ صرف **وہات** کا مظہر ہے بلکہ کوئی صریح رائے نہ دے کر لینے کو اس الزام سے دور رکھا ہے کہ عائشہ کے متعلق انھوں نے کوئی بے رحمانہ تصفیہ کیا ہے بلکہ معاملہ ظلم رسول کی رائے پر موقوف رکھا اس کے بعد اس لیے علی سے کوئی مخالفت پیدا ہو نہ صرف ان کے فیصلہ اور موقع کے ساتھ تاہضانی ہے بلکہ ان کے لطیف احساس کی ناقدری ہے۔ یہ سولے سولے واقعات تھے جن میں نے پیش کیا۔ **مواقف کیوں یہ واقعہ نقل کیا** حقیقتاً مجھے ان واقعات کا لگنا ہے سود مند اگر آئندہ اس کا کوئی اثر نہ ہوتا بلکہ مجھے اس کے لکھنے کی اس لیے ضرورت محسوس ہوئی کہ اس واقعہ نے آئندہ علی کے متعلق واقعات پر حضرت عائشہ کی بدولت بڑا اثر ڈالا۔ میں نہیں کہتا کہ یہی ایک وجہ تھی جس نے آئندہ واقعات کو متاثر کیا بلکہ اکثر واقعات میں جس نے علی کی تاریخ پر اثر کیا واقعہ بنی مضطرب ممتاز ہوا۔

غزوہ خندق

شہد کا مشہور واقعہ غزوہ خندق ہے۔

اس کی ابتداء اس طرح ہوئی کہ جلاوطن بنی نضیر نے اسب قریش سے کہا کہ ہم چاہتے ہیں کہ: ”تم سے

یہود اور کفار کا اتحاد اسلام کے خلاف

خمسند صلی اللہ علیہ وسلم کی عداوت اور استعمال پر عہد کریں۔“ اس پر ابوسفیان نے جواب دیا کہ: ”بہترین اشخاص ہمارے نزدیک وہ ہیں جو ہماری مدد کریں“۔ اس کے بعد کعب بن جعد و یحییٰ مضبوط کیا گیا۔ بنی نضیر نے قبیلہ غطفان کو بھی خیبر کے ایک سال کے غم سے اپنے ساتھ کر لیا اس کے بعد ابوسفیان قبائل اسلم، ایح، ابھرہ، کسنہ، خزاعہ اور غطفان کو لے کر آگے آگے چلا۔

دشمن کی تعداد

اس لشکر کی تعداد دس ہزار تھی۔ دشمن کا بیڑہ زیادہ تھا۔

سلمان کی صلاح سے حفاظت کے لیے خندق کھودی گئی رسول نے استشارہ فرمایا اور طے یہ کیا گیا کہ مدینہ کا وہ سمت جہم میدان ہے اور کوئی فطری یا عارضی آڑ نہیں ہے اس طرف خندق کھودی جائے۔ خندق کی صلاح حضرت سلمان کی فطرت سے دی

حضرت سلاطین خندق کی میں ایسا اہناک ظہر کرتے تھے کہ مہاجر اور انصار دونوں انہیں اپنی طرف لینا چاہتے تھے۔ رسول نے تعقیب فرمایا کہ ”سلمان منا اهل البيت“

مسلمین کی بے سراسر سامانی اور کوشش
اس فصل میں ہوا نہایت سرد تھی۔ اصحاب بھوکے تھے۔ خاک ان کے سر اور کندھوں پر پڑی تھی۔ مگر ہر جی کہتے تھے کہ: ”ہم نے بیت کی محراب سے چلا کر جب تک زندہ ہیں۔“ اور حضرت فرماتے تھے کہ: ”خدا خدا کوئی عیش آخرت سے بہتر نہیں ہے۔ تو مہاجر اور انصار کو بخش دے۔“ خود جناب رسالت اکبرؐ اس قدر بھوکے تھے کہ حکم اقدس پر پھر بڑا حایا تھا۔ حیات القلوب میں کہا ہے کہ جناب فاطمہؑ زہرا ایک کھڑا روٹی کالائیں اور رسولؐ نے فرمایا کہ: ”یہ کھڑا ہے جو تین دن میں تیرے باپ کو میرا ہوا ہے۔“

گھر کے دشمن
لشکر اسلام کو نہ صرف کبھی اتنے بڑے لشکر سے ساتھ نہ ہوا تھا بلکہ دشواری میں اس سے بڑا اور اضافہ ہو گیا تھا کہ نجی بن اخطب اور ابو سفیان نے صلح کی کہ بنی قریظہ کو جو رسولؐ کے حلیت ہیں، ظالمیہ اصول نے بیان شکی کی اور اب لشکر اسلام کو حجب اور سامنے دونوں طرف سے فوج ہو گیا۔ اگرچہ رسولؐ نے بنی شہر قریظہ کے پاس زہراؑ، سعد بن معاذ یا سعد بن عبادہ کو بھجوانے کے لیے بھیجا، مگر یہ لوگست راہ پر نہ آئے۔ مسلمانوں کی حالت اس سے معلوم ہوگی کہ: ”اشد اذہایا مسلمانوں کے کمزور دل مسلمانوں کی حالت“

خوف نے اور حلیم ہوئی بلا ان کی۔“ حضرت نے فرمایا: ”حسبنا اللہ ونعم الوکیل“۔ لیکن منصفانے اسلام کے دل بھاری کی شوکت اور کثرت سے اڑنے لگے اور انہیں نہایت رعب سے غیر ہو گئے۔ یعنی کھلی رہ گئے۔ (منابع) بہترین مصوری خداوند تعالیٰ نے سورۃ احزاب میں فرمائی ہے۔ مصالحت مدینہ کی حفاظت کا انتظام

عسلی کی یادگار مسجد
اور یہ مدینہ کے محلات کی محافظ کرتے تھے، اور قبول صاحب حیات القلوب: حضرت اسد اللہ الغالب تمام شب گرو لشکر گشت کرتے تھے اور دشمن کے طالیہ سے اکثر جنگ ہو جاتی تھی۔ حضرت نے جس جگہ نماز پڑھی اس جگہ مسجد امیر المومنین ہے۔

جو مسجد فتح سے ایک تیر کے پر تاب پڑا ہے۔“

اس جنگ کی حالت کو مولانا علی بن ابی طالب علیہ السلام اپنے دیوان میں نظم فرماتے ہیں:

و کنا نوا علی الاسلام البنا ثلاثة
فقد خر من تلك الثلاثة واحد

(اور تھے یہ لوگ اسلام میں تین گروہ پس منہ کے بل گرا ان تینوں میں سے ایک)

علیؑ کی خدمت کا وزن
اس کے بعد قبول صاحب مناج النبوة: ”مبارہ اور مقابلہ میان دونوں لشکروں کے واقع ہوا۔ خصوصاً حیدر کرار صاحب ذوالقار علی مرتضیٰ سے اس غزوہ

میں وہ مبارزت اور مخالفت واقع ہوئیں کہ حد قیاس اور عقل کے احاطہ سے باہر ہے۔ جیسا کہ اخبار میں واقع ہوا ہے۔ لبأرذہ علی بن ابی طالب یوم الخندق افضل من اعمال اسحق الی یوم القیامة (جنگ کرنا علی بن ابی طالب کا

داؤدؑ اور علیؑ کی مماثلت

اثبت لحاك الله ان لم تسلم
(قدم ثابت کہ خدا تجھے جی کرے اگر تو اسلام نہ لائے۔ واسطے ضرب شمشیر آبدار کے)
یہ کہنے لار کرنے والا تھا کہ:

“قد جدت لله بلحمي ودمي”

(یہ تحقیق جو امرودی کی میں نے واسطے خدا کے اپنے گوشت اور خون سے)
 علی اس جنگ میں اپنے مشہور بہادر دشمن سے نہایت توجید نہ مجولے جنگ ہوئی۔ ایک کاری زخم لگا مگر اپنے دشمن
 کو قتل کبید میدان جنگ سے واپس آنے کے قبل ان کی صدائے تکبیر نے رسول کو ان کی سلامتی اور فتح کی خوشخبری
 سنائی تھی۔ علی واپس آئے، اور قبولِ روضۃ الغنائین نے پیشانی چوم لی۔
 اسی جنگ کا ایک اور قابلِ الثقات واقعہ یہ تھا کہ عمرو بن عہد د کی بہن اپنے بھائی کے میدان جنگ میں مارے

جانے کی خبر سن کر روئی ہوئی آئی۔ لیکن لاش کے پاس پہنچ کر جانے اس کے کہ وہ قاتل کے جوشِ خداداد میں غمِ وحشی جوشِ ندامت میں یہ شعر پڑھنے لگی کہ:

تو کان قاتل عمر غیو قاتله لکن ابکی علیہ و آخر الابد

لکن قاتله من لا یعاب به من کان یدعی قدیماً بیضۃ البلد

(اگر عمر کا قاتل ہوا اس کے قاتل کئے جوتا تو میں ہمیشہ اس پر رونا کرتی۔ لیکن اس کا قاتل وہ ہے

جس کے نسب میں کوئی عیب نہیں ہے۔ اور وہ ہمیشہ سے شہر کا سردار پکارا گیا ہے)

اس کی تعریف کی یہ وجہ تھی کہ باوجود عرب کے اس دستور کے کہ قاتل مقتول کا اسلحہ لے لیتا تھا، علیؑ نے اس کی قیمتی زمرہ لے کر اسے برہنہ نہیں کیا اور یہ دیکھ کر اس نے پہلے کہا کہ ماقبلہ الا کفو کریم۔

اسلام کا دھارِ قائم رہا کچھ تو اس سبب سے کہ علیؑ نے دشمن کے سب سے پہلے سپاہیوں کو قتل کیا تھا کچھ اس سبب سے کہ ”خدا کے لشکر“ نے مدد کی کچھ اس وجہ سے کہ قریش اور بنو قریظہ آپس میں مشتبہ ہو گئے۔ اسلام پر سے بلائی اور ان کا نام ہمیشہ کے لیے بحیثیتِ سرِ فوجِ اسلام کے ممتاز ہوا جنہوں نے ایسے وقت جان بازی کی اور رسولؐ نے ان کی خدمتوں کا احترام کیا۔

بنو شریظہ غنہ کی واپسی کے بعد ہی بنو شریظہ کو ان کی بد عہدی کی سزا دی گئی۔ سزا پاش کے قبل نہ غنہ نہ بنو شریظہ نے اپنے آپ پر دم کیے جانے کا کوئی پہلو اٹھا رکھا تھا۔ یہاں بھی غسلِ ممتاز تھے اسلام کی خدمتوں میں۔

فدک اور علیؑ کچھ دنوں کے بعد قبیلہ بنی سعد کی کوشش کی ضرورت محسوس ہوئی۔ علیؑ سو سپاہیوں کے ساتھ فدک پہنچے۔ دشمن بھاگ گیا۔ علیؑ شہیت لائے اور مسلمان حصہ میں شریک ہوئے۔

صلح حدیبیہ ہجرت کے چھ برس بعد مدینہ واقع ہوئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ نبی کریمؐ نے ارادہ منج فرمایا اور مسلمانوں کو رسولؐ کے ارادہ سے آگاہی دی گئی۔ مشرکین کو افسوس ہوا اور انہوں نے روکنے کا قصد کیا۔ رسولؐ نے اپنی عرض بجانے کے لیے آدی بھیجا۔ لیکن وہ گرفتار کر لیا گیا۔

مدینہ میں پہنچ کر رسولؐ نے قبولِ دھاری: ”حضرت عمرؓ عمر بن خطابؓ کو حکم کیا کہ اہل مکہ کے پاس جا کر ان سے اذن و اجازت حاصل کریں کہ وہ لوگ حضرت کے لیے تین دن تک کے واسطے مکہ کو خالی کر دیں، تاکہ آنحضرت ﷺ کو اہل مکہ کے مناسک و ارکان منج آوا کر لوں، بعد ازاں واپس چلے جا دیں گے۔ تب عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کی:

”یا رسول اللہ! میں مکہ میں کتر قبیلہ والا ہوں۔ یعنی وہاں میرے عزیز و اقارب بہت کم ہیں، میں اس قوم سے ڈرتا ہوں کہ وہ مجھے قتل کریں گے۔“ مدینہ میں رسولؐ نے اس شرط پر حجت کی کہ اگر قاتل واقع ہو تو فوراً نہ کریں۔ اہل مکہ نے صلح کے لیے دو آدی بھیجے، اور جناب رسالتؐ آپ نے فرمایا کہ: ”مجھے سب باتوں سے سزا زیادہ پسند ہے۔“ مہاجرین و انصار میں صلح کا عمل ہو گیا اور کچھ مہاجرین (۲) اپنے عزیزوں و قریبیوں کی ملاقات کے لیے مکہ میں چلے گئے۔ انہیں قریش نے گرفتار

کر لیا۔ مسلمانوں کو جب اس کی خبر ملی تو یہ لوگ مکہ میں گھس گئے اور کعبہ کے پاس بیت سے آدمیوں کو پا کر گرفتار کر لیا۔ رات کو مشرکین تیر مارنے لگے۔ اور قبولِ واہی: ”اس وقت تو مسلمان پریشان ہوئے۔“ صبح کو مسلمانوں نے جنگ شروع کی، اور مشرکین کو بگاڑ دیا، اور اس وقت آیت نازل ہوئی کہ:

”هُوَ الَّذِي كَفَّ أَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ وَ أَيْدِيَكُمْ عَنْهُمْ بِبَطْنِ مَكَّةَ مِنْ بَعْدِ أَنْ أَظْفَرَكُمْ عَلَيْهِمْ
”وہ خدا وہ ہے جس نے روک دیے ان کے ہاتھ تم سے اور تمہارے ہاتھ ان سے درمیان مکہ کے بعد ازاں کہ تم کو ان پر ظفر حاصل ہو چکی۔“ (۲۸: ۲۴)

اس کے بعد اہل بن عمرو مشرکین کی طرف سے یہ شرائط لایا کہ رسول واپس چلے جائیں اور کسی شخص کو مشرکین سے جو ان کے پاس جائے دو برس تک قبول نہ کریں۔ اور اس کے عوض میں سالِ آئندہ مشرکین تین دن کے لیے مکہ کو غالی کر دیں گے اور رسول کسی قسم کا اسلحہ یا تلوار کے جو نیاں میں رہے گی اپنے ہمراہ نہ لاسکیں گے۔ دس برس تک آپس میں صلح رہے گا۔ تمام بلاد میں لوگ بے امن ہاسکیں گے اور ہم سو گندوں سے کوئی تعرض نہ کیا جائے گا۔

حضرت عمر اور صلح
حضرت عمر کو عہد نامہ کے اکثر دفعات پر اعتراض تھا۔ واہی کے نزدیک حضرت عمر کہیں یقیناً لہجہ سے کہتے ہیں کہ: ”آیا آپ ان کے لیے یہ بات مقرر کریں گے؟“۔ اور کہیں کہہ دیتے ہیں کہ: ”ایسا نہ کیجیے۔“ اور رسول کہیں کہتے ہیں کہ: ”اے عمر سکوت کر۔“ اور کہیں: ”عمر کی بات پر ہنس دیتے ہیں۔“ صاحب سیرۃ النبی صوفی کے موافق شرائط کے طے ہونے کے وقت حضرت عمر حضرت ابوبکر کے پاس جا کر پوچھتے ہیں کہ: ”کیا آنحضرتؐ رسول اللہؐ اور مہم مسلمان نہیں ہیں؟“۔ اسی مؤرخ کے نزدیک: ”آنحضرتؐ کے منشا کے خلاف چاہنے پر اپنی غلطی کا اقرار کیا اور اس کے کفارہ میں غلام آزاد کرنے کا عہد کیا۔“ صاحب مناقب النبوة صرف اس قدر کہلواتا ہے کہ: ”یا رسول اللہؐ! اس بات پر راضی مت ہو۔“ صاحب شریۃ العیون لکھتا ہے: ”عمر بن خطاب سے مروی ہے کہ کہا انھوں نے کہ: ”اس دن میرے دل میں ایک امر عظیم پیدا ہوا اور مراجعت کی میں نے ساتھ حضرت ﷺ کے ایسی مراجعت کہ مثل اس کے ہرگز نہ کی تھی میں نے۔“ اور ایک روایت میں ہے کہ: ”کہا انھوں نے کہ: ”کیا میں حضرت ﷺ کے پاس اور عرض کی کہ تم رسول اللہؐ کے برحق ہو؟“۔ آپ نے فرمایا کہ: ”ہاں برحق ہوں۔“۔ پھر میں نے عرض کی کہ: ”کس لیے ہم اس نقصان اور ذلت کو قبول کریں، اور اس طرح سے صبح کر کے لوٹیں؟“۔ آپ نے فرمایا: ”بے شک میں رسول خدا کا ہوں۔ اور اللہ تعالیٰ مجھ کو صلاح نہ کرے گا۔“

حضرت عمر کہتے ہیں کہ کہا میں نے کہ: ”کیا آپ نے یہ نہیں فرمایا تھا کہ متربیب ہے کہ ہم زیارت بیت اللہ کو جاویں گے اور طواف کریں گے۔“ آپ نے فرمایا کہ: ”ہاں! لیکن کیا یہ بھی کہا تھا کہ اسی سال؟“۔ میں نے عرض کی کہ: ”نہیں۔“ آپ نے فرمایا تھا کہ: ”غم مت کھا کہ تو زیارت بیت اللہ کو جائے گا۔“ حضرت عمر فرماتے ہیں کہ: ”اسی طرح ملول و غزون میں آپ کی مجلس سے اٹھا اور ابوبکر کے پاس گیا اور تمام حکایت ان سے کہی۔“۔

مصلحت اسی میں ہے

مصلحت اسی میں ہے

فرمایا حضرت صدیق نے کہ: ”اے عمرؓ! اور ہاتھ حضرت سلی اللہ علیہ وسلم کی رکاب میں مار اور کچھ اعتراض مت کر کہ وہ خدا کے رسول ہیں۔ جو کچھ وہ کرتے ہیں وحی سے کرتے ہیں اور مصلحت اسی میں ہے۔“ اور منقول ہے حضرت عمرؓ سے کہ فرمایا انھوں نے کہ: ”بہت اعمال صالحہ مثل نماز، روزہ و تصدق و اعتقاد کفارہ میں اس گستاخی کے کیے میں نے۔“ مترجم قرۃ العیون یہ بھی کہتا ہے کہ: بعض محققین نے اسے موضوعات میں شمار کیا ہے اور پھر یہ بھی کہہ دیتا ہے کہ: ”حضرت عمرؓ کا جو چھٹا بطور استکشاف و استفسار کے تھا، نہ بطریق شک اور انکار کے، حاشا وکلاً۔“ مؤلف تاریخ الاسلام مولوی عتاسی صاحب کے نزدیک ”حضرت عمرؓ کے زیادہ خلاف تھے اور نادم بھی تھے۔“ ابو الفدا کے نزدیک کہا کہ: ”یا رسول اللہ! یا تو آپ خدا کے رسول نہیں ہیں، یا ہم لوگ مسلمان نہیں۔“ کبھی کہا: ”صلح سے عزت کھوتے ہیں۔“ اس مورخ نے ایسا کہنا اگر عموماً اسلام پر معمول کیا ہے۔ ہم کو اس کوشش کا بھی اقرار ہے جو ”الفاروق“ میں کی گئی ہے۔ جو کچھ ہوا اکثر مؤرخین اس پر متفق ہیں کہ آئیں اِنَّا قَتَلْنَا لَكَ قَتَلْنَا مَسْلَمًا (۱: ۲۸) صلح حدیبیہ سے متعلق ہے۔ صلح کونج میں کھنے کا مذہب عالم میں اسلام کو افکار ہے۔

مشرکین علیٰ سے عہد نامہ لکھوانا چاہتے ہیں

منہاج النبوة اور قرۃ العیون کے موافق حضرت نے اوس بن خولی انصاری کو عہد نامہ لکھنے کا حکم دیا۔ لیکن مشرکین کے وکیل ہسبل نے کہا کہ: ”اے محمدؐ یہ نامہ علیؑ کو لکھنا چاہیے جو تمہارے چچا کا بیٹا ہے۔“ (قرۃ العیون) اسی مؤرخ کے موافق:

”یہ کہنا ہسبل کا اس لیے تھا کہ ظاہراً حق اور اولیٰ معاملہ میں اور مصالحوں اور معاہدہ اور قرض عہد میں آدمی کے اس کے عصبات اور اس کے اہل جوتے ہیں، اور سبب بھی تھا کہ حضرت نے سورہ برائت پڑھنے کو۔۔۔ بعد بھیجئے حضرت ابوبکر کے حج ادا کرنے کے لیے کہ امیر حاج ان کو کیا تھا، حضرت علیؑ کو کچھ سے بھیجا تھا۔ بہ اختلاف الفاظ

”منہاج النبوة“ کا مفہوم بھی یہی ہے۔

قلم سے تلوار

دوسرا عجب خیز واقعہ یہ تھا کہ جب رسول کے حشم سے حضرت علی بن ابی طالب نے

..... علیہ محمد رسول اللہ لکھا تو مشرکین کو ”رسول اللہ“ کے لفظ پر اعتراض ہوا۔

اس وقت قبول قرۃ العیون: ”حضرت علی نے وہ کلمہ رکھ دیا اور ہاتھ تلوار کے قبضہ پر رکھا۔“ علی کے لیے میں یہ کہنا ہی

بے کار سمجھتا ہوں کہ یہ ”گرجوئی اسلام“ سے تھا۔ رسول نے خود دست مبارک سے محو فرمایا اور عام مؤرخین کے موافق

جیسا صاحب ”شواہد النبوة“ بھی لکھتے ہیں: حضرت نے فرمایا کہ: ”یا علی! حتمہ کو بھی ایسا ہی واقعہ پیش آئے گا۔“

یہ آئندہ کا واقعہ تاریخ ہے، جس کا ذکر کچھ دیر میں آئے گا۔

فتح خدیجہ ۱۷
 مشرۃ العیون: "ایک دن ابوبکر نشان لے کر قلعہ قومس کے نیچے آنے اور خوب لڑے اور سخت مقابلہ کیا۔ فتح یاب نہ ہوئے، دوسرے روز حضرت عمر گئے اور خوب لڑے اور بہت مقابلہ کیا۔ بہ نسبت پہلے دن کے، مگر قلعہ فتح نہ ہوا۔

اور روایت ہے کہ حضرت عمر دو بار لڑے۔ "واہی کہتا ہے کہ: "ایک روز مرحب یہود کے لشکر کا سالار تھا اور سردار مہاجرین حضرت عمر تھے اور حال مسلمانوں کا یہ تھا کہ جب مرحب لڑنے کو نکلتا تھا تو اس کے مقابلہ میں کئی کرتے تھے پھر جس وقت مسلمان قریب دروازہ خیر پہنچے اس وقت مرحب اپنا غول مہرا لیے ہوئے مسلمانوں پر نکل پڑا اور ان کو بھاگایا۔ یہاں تک کہ ان کو صف بزرگ تک یعنی لشکر گاہ تک بھاگایا۔"

خیبر میں اسلام کا علم اور علمداری کی شریں صاحب شواہد النبوة بھی ہم زبان ہے۔ اس میں یہ زیادہ ہے کہ رسالت مآب اس روز درود شقیہ میں مبتلا تھے یہ حالت پہنچ گئی تھی کہ جناب رسالت مآب نے عامہ مؤمنین کے موافق فرمایا کہ: "لا عطین السرایة غدا رجلاً کراراً غیر فدا یرحب اللہ و رسولہ و یحبہ اللہ و رسولہ لا یرجع حق یفتح اللہ علی یدہ۔" (کل اے علم عطا کروں گا جو نہ بھاگنے والا بہا رہے اور جو خدا اور رسول کو دوست رکھتا ہے، اور جسے خدا اور رسول دوست رکھتے ہیں نہ پھرے گا جب تک اس کے ہاتھ خدا فتح نہ دے)

حضرت عمر کا حوصلہ بے شک رسول نے ایسا ہی کچھ فرمایا تھا کہ حضرت عمر قبول منافع فرماتے کہ "ہرگز امارت کو میں نے دوست نہیں رکھا مگر اس روز۔" یا فتح عم رسول کی توجہ مبذول کرنے کے لیے کھڑے کھڑے دم سے گفتگوں کے بل گر پڑا۔

شریش کی قابل توجہ باتیں قریش میں یہ باتیں بھی ہونے لگیں کہ: "علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ اس مراد سے فائز نہ ہوں گے، کیونکہ ان کی آنکھیں آبی ہیں، اور درد کرتی ہیں اس درجہ میں کہ اپنے پاؤں کے اٹھری نہیں دیکھ سکتے۔"

علی نے بھی رسول کا دلولہ خیر اور پچھوانے والا کلام سنا تھا اور کچھ کہا بھی تو یہ کہ "اللہم لا مانع لیسا أعطیت ولا مغطی لیسا منعت۔" (اے پروردگار کوئی مانع نہیں ہو سکتا ہے تو عطا کرے اور کوئی عطا نہیں کر سکتا ہے تو منع کرے) رسول علی کو پوچھتے ہیں: "معاہدہ، اسلام کی عزت کا نشان رسول گئے دستِ اقدس میں لہرا رہا تھا۔ سب لوگ در دولت پر کھڑے تھے سناٹے کے عالم میں رسول کی آواز سنائی دی۔ دریافت فرمایا کہ: "علی کہاں ہیں؟" اور قبول منافع: سب لوگ چاروں طرف سے نکلا اٹھے کہ: "یہاں ہی ہیں، لیکن آنکھیں ان کی ایسی دکھتی ہیں کہ اپنے سامنے نہیں دیکھ سکتے۔" سنایا: "ان کو میرے پاس لاؤ۔" سلمہ بن الاکوع نے جا کر حضرت علی کا ہاتھ تھامے ہوئے لاکر حضرت کے خیمہ میں پہنچایا۔ سرورِ عالم نے اس جناب کا سراپے زانوئے مبارک پر رکھا اور آپ دہان مبارک اپنا حضرت علی کی آنکھوں میں لگایا۔ فی الحال درد چشم زائل ہوا۔ تب سرورِ عالم نے اپنی خاص زرہ ان کے بدنِ مظہر پر چھائی اور ذوالفقار کمر سے لٹائی اور رایت اپنا اس شیر پیہر کے ہاتھ میں دیا اور فرمایا: "بلوا الثقلت مت کرو، جب تک مفتوح کرے اللہ تعالیٰ قلعہ تمہارے ہاتھ سے۔"

جب علی مرتضیٰ علم ہاتھ میں لے کر چلنے لگے تب کہا: "یا رسول اللہ! قتال کرتا ہوں میں جب تک کہ وہ مانع

ہمارے ہوں۔ یعنی اسلام لادو۔“ فرمایا: ”یا علی! تحلیل مت کرو جب تک ان کی ساحت میں اترو اس وقت ان کو طرف اسلام کے دعوت کرو، اور خدائے عزوجل کے حقوق پر جو کچھ اس نے اپنے بندوں پر واجب گردانا ہے واقف کرو اور تم خدا کی اگر ہدایت کرے خدائے تعالیٰ تمہارے ہاتھ سے ایک مرد کو بہتر ہے وہ تمہارے اس بات سے جو تمہارے کو یہودی اشتراک سرخ موکہ راہ خدا میں تصدیق کرد تم۔“

کل اور آج کا مشرق علیؑ علیہ السلام کا دل ساتھ ساتھ چلا۔ اسلام کا وقار ساتھ ساتھ رہا۔ مسلمانوں کی نگاہیں نقش قدم پر ساتھ ساتھ رہیں۔ ایک وقت تھا کہ لشکر اسلام پسپا ہوتے ہوتے لشکر کھٹک بچھ جاتا۔ آج شواہد النبوة پڑھو کہ لشکر اسلام لشکر گاہ کے قریب (پچھے) جھوٹ گیا اور سردار قلعہ کے پاس بچھ گیا۔ یہیں تک کہ علیؑ نے لشکر فوج ایک ٹیلہ پر کھڑا کیا۔

دید بان کی چیخ قرۃ العیون اور مناجیج کے موافق دید بان نے پوچھا کہ: ”اے صاحب علم تو کون ہے؟“ کہا: ”تیں علی بن ابی طالب ہوں۔“ یہ سن کر دید بان چلا اٹھا کہ: ”اے اہل قلعہ تم ہے تو ریت کی کہ اب تم معسلب ہو گئے۔“ یہودی کا یہ فقرہ اور کیا بھاتا ہے یزاس کے کہ علیؑ کے چہرہ پر غلری منانت، غیر آلودہ تصنیع تعصیم اور شجاعت کی حریریں ایسی بچی تھیں کہ دیکھنے والا ایسے زبردست ارادہ کے نفس سے مرعوب ہو جاتا یا اور کیا کچھ میں آتا ہے یزاس کے کہ قیافہ اور شہرت نے ایک دوسرے کو مدد دی تھی۔

تم کو اگر رجز خانوں میں دل چسپی ہے تو جناب امیر کا دیوان یا دیگر تواریح پڑھو۔ یہیں صرف یہ کہنا ہے کہ جب مارٹ اور مرتبے ایسے پشت و پناہ یہودی ذوالفقار کے وزن سے جھک گئے تو قبول قرۃ العیون و مناجیج وغیرہ:

”جب حصار والوں نے قوت بازو علیؑ کرم اللہ وجہہ کی دیکھی امان طلب کی۔ حضرت علیؑ نے جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت سے ان کو امان دی اور اس شرط پر کہ قلعہ اور سلاح مسلمانوں کو دی اور کچھ چھپانہ رکھیں۔۔۔ اور اس شرط پر بھی کہ ہر مرد ان میں سے ایک آؤٹ بھر کر کھانے کو لے اور اس شہر سے نکل جائے۔“

رسول نے علیؑ کا استقبال کیا جب خیبر کے فتح کی خبر حضرت سرور عالم کو پہنچی حکمرانہ اس نعمت کا بھالنے کہ یہ فتح سبب ظہور عزت اسلام کی ہوئی اور جب

حضرت امیر۔۔۔ فتح و فیروزی سے متوجہ طرف سید ابرار کے ہونے حرکت اس حالی جناب کی تہنیت کے واسطے استقبال اور استبشار کے لیے خیمہ سے باہر آئے اور حضرت امیر سے بظاہر گہرے اور ان کی دونوں آنکھوں کے درمیان بوسہ دیا، اور فرمایا: ”قد بلغنی ہباتک المشکور و صنیعک المذکور قد رضی اللہ و رضیت انا عنک۔“ (مجھے تمہاری تعریف مشکور کارگزاری اور سچی کی خبر پہنچی میں اور خدا تم سے راضی ہوئے) پس حضرت امیر رونے حرکت نے فرمایا: ”یا علی! یہ رونا خوشی کا ہے یا اندوہ کا۔“ کہا: ”بلکہ خوشی کا اور کیونکر خوش نہ ہوں کہ آپ اور خدا راضی ہیں۔“ صاحب مناجیج کے موافق: ”غزوۂ خیبر میں بہت کام تھے علیؑ مرتضیٰ کے حوالے“ جن کی کوئی فہرست نہیں ہے۔ خیبر میں علیؑ کی خدمت اسلام کچھ ایسی ہی تھی کہ مولف ”الغاروق“ اپنے یہودی کی تعریف ملتوی کر کے علیؑ کی تعریف کر اٹھا۔

علی کے لیے ایسے مواقع نہیں ہیں، جہاں احتیاط کے بے اعتباری کا مجوزہ ملادے ہو۔
غنیمت اس جنگ میں علاوہ مال و متاع کے ایک سوزرہ چار سو تلواریں اور ہزار نیزے ملے۔ کیا اچھا ہوتا کہ یہ عربی علی اور اولادِ رسول کی مخالفت میں صرف نہ ہوتے ہوتے اور یہ یا آگے پیچھے جو کچھ وصول ہوا وہ ان کی ایذا دہی کا صلہ نہ مسترد دیا جاتا۔

رسول کا رحم آخر میں مجھے یہ کہنا ہے کہ بلالؓ حضرت صفیہؓ دخترِ خنی بنی اخطب کو لاشوں کی طرف سے لائے۔ اس وقت قبولِ واقعہ: ”حضرت علیؓ نے لوگوں سے فرمایا: کیا بلالؓ کو نہیں دیکھتے ہو کہ اس نے کیا کام کیا۔“ آخر جب بلالؓ صفیہؓ کو خیمہ میں پہنچا کر خدمتِ نبوی ﷺ میں پھر آئے تو آپؐ نے فرمایا: ”اے بلالؓ کیا تو نے اپنے دل سے رحم کو دور کر دیا۔ تجھ کو کون اسرا بھٹ ہوا اس بات پر کہ تو اس کمن لڑکی کو مقتولوں کی طرف سے لے گیا۔“ بلالؓ نے معذرت کی اور نبی اللہؐ نے عفو فرمایا۔

رسولؐ نے عزت کی صفیہ کو اسلام اور بیہودیت میں مختار کیا۔ لیکن انھوں نے اسلام قبول کیا۔ اور شرفِ زوجیت کی اتھا کہ لشکر کی روانگی کے وقت حضرت نے زانوئے مبارک کے سہارے سے ناقہ پر سوار کرایا۔ اور چادر ان کے سر پر درست کرتے تھے۔

مسلمانوں کو رسولؐ کے احترام کا خیال ان کی غیرت سے مسلمان آپس میں کہہ رہے تھے کہ: ”رسول خدا ﷺ“ اگر صفیہ کو حکم فرماوی کہ وہ اپنا منہ ڈھانپ لیں تو جان لو کہ وہ امہاتِ مومنین سے ہیں، اس صورت میں آپ کے ساتھ ساتھ نہ چلو۔ کیونکہ رسول خدا ﷺ بڑے غیور ہیں۔“

خمس سے بنو ہاشم اور بنو عبد المطلب کا حصہ صاحبِ منافع کے پاس ایک مفید واقعہ اور ہے کہ: ”رسولؐ نے خمس سے بنو ہاشم اور بنو عبد المطلب کو ایک حصہ ارزانی فرمایا۔ اور یہ جو حدیث میں آیا ہے کہ عثمان بن عفان اور جیسر بن مطعم سرورِ عالم کے حضور میں گئے کہ ہم بنی ہاشم کی غنیمت کا انکار نہیں کرتے۔ کیونکہ آپ انھوں سے ہیں لیکن قرابتِ ہماری اور بنو مطلب کی آپ سے ایک مرتبہ میں ہے۔ یہ کیونکر ہوا کہ انھوں کو بنو عبد مطلب کا ہم آپ نے عطا کیا اور ہم کو عرم کیا۔ جواب میں فرمایا حضرت نے کہ بنو ہاشم اور بنو مطلب نہیں ہیں مگر ایسے ہی جس طرح بیان کیا۔ اور اپنی انگلیوں کو کھولا اور فرمایا: ہم اور بنی مطلب آپس سے جدا نہیں ہوتے، نہ جاہلیت میں نہ اسلام میں۔ جیسر کہتا ہے میں نے دیا اس حضرت نے بنو عبد خمس کے تئیں۔“ ہم آگے ذکر کریں گے کہ جیسر بن مطعم سے کیا کام نکالا گیا۔

قبضہ فدک فتح خیبر کا نتیجہ تھا فتح خیبر کا دوسرا نتیجہ یہ ہوا کہ بقول ابنِ خالدون: ”جب ابلی فک کو خیبر کے حکمت کی اطلاع ہوئی تو انھوں نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں یہ پیام بھیجا کہ: ”ہم کو صرف ہماری جانوں کی امان دی جائے مال و اسباب سے ہم کو سروکار نہیں۔“ رسول اللہ ﷺ نے ان کی یہ درخواست قبول فرمائی۔ چونکہ فدک پر حملہ نہیں کیا گیا تھا اور نہ اس پر کسی سوار و پیادہ

کو نیزہ تلوار چلانے کا موقع ملا تھا اس وجہ سے بلا تقسیم جیسا کہ جناب ہاری عزامہ نے حکم دیا آپ کے قبضہ میں رہا۔
 ابوہریرہ کہتا ہے: ”ایسا ہی اہل فک سے معاملہ ہوا تھا کہ اتنا فرق ہے کہ فک خالص رسول اللہ کی ملک میں تھا اور خیر تمام
 مسلمانوں کا تھا کیونکہ بدون حاجت سواروں اور فوج کشی کے پیلوہ پامسلمانوں نے فتح کیا تھا۔ اسی مورخ نے زمانہ عثمان
 میں کہا ہے: ”ایک سبب یہ بھی تھا کہ باغ فک جو میراث بی بی فاطمہ کے تھا وہ مروان نے چھین لیا تھا یہ ایک باغ
 رسول اللہ کا تھا اس کو جناب فاطمہ نے رسول اللہ سے میراث میں پلایا تھا۔ رومنہ القضا کی عبارت ہے کہ:

”جبرئیل نازل شد کہ خدا ای فخر ماید کہ حق خوشیان بدہ رسول فخر مود خوشیان کیا بندہ گفت
 فاطمہ۔ پیغمبر فاطمہ را خواند و حقے نوشت و آن و شیتہ بود کہ بعد از وفات رسول اللہ پیش ابوبکر آورد و
 گفت این کتاب رسول خداست کہ برائے من و حق و حسین نوشیتہ است۔“

جبرائیل نازل ہوئے کہ خدا فرماتا ہے کہ قریبوں کا حق دے دو۔ رسول نے فرمایا قریبی کون ہیں۔ کہا
 فاطمہ ہے۔ پیغمبر نے فاطمہ کو بلوایا اور ان کے لیے دلیل تجت لکھی، اور یہ وہ و شیتہ تھا جو وفات
 رسول خدا کے بعد ابوبکر کے پاس لائیں اور فرمایا یہ رسول خدا کی تحریر ہے کہ جو آپ نے میرے
 لیے اور حق و حسین کے لیے لکھی ہے۔

نہیر امیر علی صاحب اپنی ”تاریخ اسلام“ میں فرماتے ہیں: ”فک کا باغ جو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی ملکیت تھا اور مروان
 نے غصب کر لیا تھا آنجناب کی اولاد کو واپس کر دیا۔“

فتح مکہ شہ کا مشہور ترین واقعہ فتح مکہ ہے۔ اگرچہ صلح حدیبیہ کا زمانہ ابھی منقضی نہ ہوا تھا لیکن
 قریش نے رسول کے حلیف بنی قریظہ کو سخت اذیتیں دیں اور ان کے اکثر آدمیوں کو حرم میں
 قتل کیا۔ بنو قریظہ نے رسول سے فریاد کی، اور رسول نے ان کی اعانت کا وعدہ کیا۔

مکہ کا جلاوطن بنی اب کس طرح مکہ میں داخل ہوا وہ ابونخیل کی حالت
 اور الفاظ سے معلوم ہوگا جو دادی کے کنارہ سے عباس کے ساتھ

لشکر اسلام کا جلال دیکھ کر پوچھتا ہے: ”من ہولاء؟“ جس کا عباس جواب دیتے ہیں کہ: ”ہذا رسول اللہ فی
 المهاجرین والانصار۔“ اور ابونخیل یہ سن کر تعجب سے کہتا ہے کہ: ”تمہارے لڑکے کا جاہ و جلال بہت بڑھ گیا۔“

رسول نے داخلہ کے قبل یہ اعلان فرمایا تھا کہ: ”جو شخص مسجد میں یا ابونخیل کے گھر میں داخل ہوا
 اعلان دروازہ بند کر لے وہ امان میں ہے۔“ حضرت عباس کے نزدیک ابونخیل ”امتیاز پسند“ تھا۔
 اس لیے رسول نے اس کے گھر کو یہ امتیاز عطا فرمایا۔ لشکر اسلام کا جاہ و جلال دیکھ کر ابونخیل نے ذرا فتح امان کا تذکرہ کیا۔

بقول ابن خلدون و حیات القلوب لشکر اسلام کا
 سعد بن عبادہ کی علمداری اور حضرت عثمان

جب یہ ابونخیل کے قریب سے گزے تو جوش میں کہہ اٹھے: ”اليوم يوم المحصه۔ اليوم تغل الحرمه۔“ اسے گردہ
 اوس و فرج آج ابونخیل سے احد کا کینہ نکالو۔ ابونخیل ڈر گیا اور رسول سے فریاد کی اور بقول مناج: ”عثمان بن عفان

کے شہر مہرقابت کی اور رعایت ان کی دامن گیر حال ہوئی اور بولے: یا رسول اللہ! ہم سعد بن عبلہ سے بے فکر نہیں، اور دہشت میں ہیں کہ ایسا نہ ہو کہ قریش کو آسیب پہنچائے۔ اس کے بعد بقول ابن خلدون: ”رسول اللہ (ﷺ) نے یہ سن کر رایت سعد بن عبلہ کے ہاتھ سے لے کر علی بن ابی طالب کو نہر حمت فرمایا۔ اور بقول حیات القلوب و منافع: ”تری سے داخل ہونے کا حکم دیا۔“

خانہ کعبہ اور علی رسول خانہ کعبہ میں داخل ہوئے اس کے بعد صاحب منافع النبوة نے یا ملا جابی نے شواہد النبوة میں جو واقعہ بیان کیا ہے اسے فیضی کی حیرت میں کہنا ہے کہ: **زہر نقش پائے کہ بر دوش احمد**

زہر نقش پائے کہ بر دوش احمد زہر نبوت مستدم لشیدہ مکہ میں خون ریزی کی ممانعت ایک خطبہ میں بقول ابن خلدون رسول نے یہ بھی فرمایا کہ: ”کسی شخص کے لیے جو اللہ اور روز قیامت پر ایمان لائے یہ جائز نہیں

ہے کہ وہ اس (مکہ) میں خون ریزی کرے اور نہ اس میں کوئی سرسبز درخت کو کاٹے۔“ وہ قریش جنہوں نے رسول کو ناقابل برداشت افشیں دی تھیں اب رسول ان سے سوال کر رہے تھے: ”اے گروہ قریش کیا تم مجھے جو کہ ہم تمہارے ساتھ کیا کرنے والے ہیں۔“ قریش نے کہا: ”جلائی، جلائی اور جلائی کہیم کے بیٹے ہو۔“ رسول اللہ (ﷺ) نے کہا: ”بے شک میں کہتا ہوں جو کہا تھا یوسف نے اپنے بھائیوں سے تم پر کوئی برائی نہیں ہے آج کے دن۔ جلاؤ تم سب لوگ آزاد ہو۔“ اس کے بعد بقول منافع: ”معاویہ ابوسفیان کا بیٹا بھی اس گج مکہ میں مسلمان ہوا اور مؤلفہ القلوب میں ہے۔“ اس کے بعد آفتاب رسالت کوہ صفا پر چمک رہا تھا۔ قابلِ جوق جوق بیعت کے لیے آ رہے تھے اور خدا کے دین میں لوگ فوج فوج داخل ہو رہے تھے۔

حضرت عثمان کی دوسری سفارش عبد اللہ بن سعد بن ابی سرح عثمان بن عفان کا برادر رضاعی جو مرتد ہو گیا تھا پناہ لینے انہیں کے گھر آیا۔ اس کے واجبِ قتل

ہونے کا اعلان کیا جا چکا تھا۔ عثمان اسے بیعت اور معاف کرانے رسول کے پاس لائے۔ رسول نے ان کی التجا کا بقول منافع تین مرتبہ کوئی جواب نہ دیا اور جب یہ اٹھ کر باہر چلے گئے تو رسول نے اصحاب سے فرمایا کہ تم نے اس مرتد کو قتل کیوں نہ کیا۔ اصحاب نے کہا کہ نبی خدا نے کوئی اشارہ نہیں فرمایا۔ کہا کہ انبیاء اشارہ نہیں کرتے۔ مدبرِ واقعی نے واقعات بیان کیے ہیں لیکن حضرت عثمان کا نام لینے سے احتیاط کی ہے۔ ناظرِ آئندہ دیکھئے گا کہ ابن ابی سرح عثمان کے لیے کام کا آدمی ثابت ہوا۔ ابن ابی سرح کو نہ صرف یہ غرہ تھا کہ میں جو چاہتا ہوں لکھ دیتا ہوں بلکہ اپنے آپ اور وحی نازل ہونے کا دعویٰ بھی تھا۔ اس کے بعد جیسا سید امیر علی صاحب فرماتے ہیں کہ: ”فتح کے وقت کوئی داخلہ کسی مٹھوہ

انصار اور رسول شہر میں ایسا با امن نہیں ہوا۔ انصار نے جو اس امید میں تھے کہ رسول قریش سے

اتحاق لیں گے، جب دیکھا کہ رسول نے اپنے برائے دشمنوں کے ساتھ خلافتِ امیرِ رعایت کی تو وہ بکے کہ اب رسول مدینہ کو ترک کر کے ہر مکہ میں اقامت فرمائیں گے، حضرت کو جب ان کے خیالات معلوم ہوئے تو ان سے فرمایا کہ: ”میں نے ہجرت کی تمہاری طرف حیاتِ میری تمہارے ساتھ ہے اور موتِ میری تمہارے درمیان ہوگی۔“ پس انصار

رونے لگے اور بولے: ”واللہ یارسول اللہ! یہ بات بدگمانی کی جہت سے نہ حق بلکہ کمال محبت اور دل بستگی سے آپ کی جانب میں ہم نے یہ باتیں کیں کہ آپ اوروں کے واسطے ہوں اور ہم کو چھوڑ دوں۔“

شہدہ کا ایک دوسرا واقعہ جس میں لشکر اسلام کو احد کی مصیبت کا سامنا ہوا غزوہ حنینؓ اور جس میں بنی ہاشم نے اپنی شجاعت اور استقلال سے رسول کی حفاظت کی

اور اسلام کا دثار قائم رکھا، غزوہ حنین تھا۔

مشکل وقت کے جان باز ابو القحاک کے موافق: ”مسلمان دشمنوں کے اچانک حملہ سے اس طرح محترق ہو گئے کہ ان میں ایک دوسرے کی خبر نہ تھی۔“ تاریخ الاسلام اور روحۃ القفا کے نزدیک

”اس وقت صرف یہ لوگ تھے: ● جناب امیر ● عباس ● ابوسفیان بن حارث ● ابن عم رسول جعفر ● ربیعہ ●

● قثم ● فضل بن عباس ● اسامہ بن زید ● اور ● اس کی ماں کا بھائی تھا صاحب منہاج نے ان کے علاوہ لکھا ہے کہ ●

● عبداللہ بن زبیر بن عبدالمطلب اور ● عقیل بن ابوطالب اور کئی شخص اور بھی جو اہل بیت ہی سے تھے اس کے بعد لگتا

ہے: اور ● ابوبکر صدیق اور ● عمر خطاب اور ● مسعود بھی درمیان انھوں کے تھے۔ بعض انھوں کے منہ کی طرف اور

بعضے یمن شمال۔ یہ تفسیر ان تین صاحبوں کی ہے جو آخر سب کے نام لے گئے۔ اور تعجب تو یہ ہے کہ یمن جو اول میں سب

کے بعد ان کے نام اس جنگ میں لکھے گئے۔ ”صاحب قرۃ العیون نے یہ حضرت ابوبکر اور عمر کے سب کے نام دیے

ہیں۔ اس میں جب کہ کوئی پہلا آگے آگے شمشیر زنی کرتا تھا کوئی رکاب اور کوئی جانب رسالت مآب کے مرکب کی لگام

تھامے تھا۔ عباس کو جو بہت ہی بلند اور قوی آواز تھی حکم دیا گیا کہ اصحاب کو یہ کہہ کر آواز دو کہ یا اصحاب سمرہ یا

اصحاب سورہ بقرہ۔ خود رسول فرما رہے تھے کہ: ”انا النبی لا کذب انا ابن عبدالمطلب۔“ عباس کی صدا پر

نواہار ”لبیک لبیک“ کہتے ہوئے آئے۔

بڑی غنیمتؓ تو یہ جنگ گرم ہوا دشمن بھاگا اور اس جنگ میں جس قدر مال قیمت حاصل ہوا کبھی اس قدر نہ ملا

تھا۔ مجھے یقین ہے کہ تقسیم کے وقت نہ صرف اس قدر لوگ ہوں گے جو روانگی کے وقت تھے،

بلکہ یہ بھی چاہا ہوگا کہ حضرت رسول اگر اپنے وفور سخاوت سے اپنا حصہ بھی پیش دی تو بھی نگاہ کر کے لے لیں۔

اس جنگ میں یہ واضح اعلان کیا گیا کہ: بچے اور اجیڑوں کے قتل کی ممانعت

کفار کا ایک گروہ طائف کی طرف بھاگا۔ صاحب مشرۃ العیون کے

تفظوں میں: ”ایام معاہدہ میں طائف کے علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ کو حضرت

رسالت پناہ ملا اللہ علیہ وسلم نے اطراف میں اس دیار کے واسطے مغالی مشرکین کے بھیجا۔ انھوں نے جا کر خوب جدال و قتال

کی اور ہوازن اور ثقیف کے اطراف کے بتوں کو توڑا اور سب آثار اور دیار مشرکین بے دین کے خراب اور تباہ کیے اور

پھر حضرت کی خدمت فیض درجت میں آکر حاضر ہوئے۔ جب آپ کی نظر برکت اثر حضرت علیؓ کے چہرہ سعادت بہرہ پر

پڑی تو آپ نے متکبیرہ کبی، اور ان سے غلوت کی اور خفیہ کچھ ان سے باتیں کیں۔ جب بہت دیر ہوئی، تب صحابہ

رضوان اللہ علیہم نے کہا کہ: ”آج جب رازِ دُور درِ رازِ آپ نے اپنے چچا کے بیٹے سے کہا کہ اس طرح آپ اوروں سے نہیں کہتے۔“ آپ نے فرمایا: ”مَا اَنْتَ جِيْتَهُ وَلَكِنْ اَللّٰهُ اَنْتَ جَاہُ“۔ (تیں نے خود سے اس سے راز نہیں کہا لیکن خدا نے ایسا کرنے کا مجھے حکم دیا) مظہرِ حق ترجمہ مشکوٰۃ المصابیح میں بھی یہی ہے۔ بعض کے نزدیک اظہارِ عجب کرنے والے حضرت مہر تھے اور رسول کا جواب سن کر فرمایا تھا کہ: ”مجھے خوف ہے کہ یہ اعتراض مثلِ حدیبیہ کے نہ ہو۔“ یہ الفاظ کہ: ”اس طرح آپ اوروں سے نہیں کہتے۔“ وہ کسی نے کیوں نہ کہے ہوں، صاف ظاہر کرتے ہیں کہ رسول کے راز دار بہت سے نہ تھے، بلکہ خود حضرت عمر اپنی نسبت ان مؤرخین کے اس ضمنِ ظن کی تردید کرتے ہیں کہ وہ وزیر اور صلاح کار تھے۔ جب ابوسفیان فتح مکہ کے زمانہ میں عباس کے ساتھ آتا ہے اور حضرت عمر سے خواہشِ سفارش پر بقول ابنِ خالدون آپ فرماتے ہیں کہ: ”اگر خجہ کو یہ معلوم ہو گیا ہو تا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا قصد ہے تو میں خجہ سے آج نہٹ لیتا۔“ ابوسفیان اس کلام کو سن کر چپکا علی بن ابی طالب کے پاس چلا آیا۔ علی نے کہا: ”میں اس ہایت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ نہ کہہ سکتا۔“

انصار اور رسول کا خطبہ
جس وقت جناب رسالت مآب طائف کے بعد مقامِ جعرانہ میں پہنچے جہاں حنین کی قیمت رکھی تھی اور آپ نے مؤلفۃ القلوب کو زیادہ حصہ دیا، تو انصار نے جو صلحت نہ بچتے تھے شکوہ کیا۔ بعض نے ان میں سے یہ بھی کہا کہ: ”رسول تمام قبائل کو جنھوں نے راہِ خدا میں کوئی محنت نہیں اٹھائی انعام دیتے ہیں اور میں محروم کیا ہے، جن کی تلواروں سے ابھی کفار کا خون خشک نہیں ہوا۔“ رسول کو معلوم ہوا، اور پوچھنے پر لوگوں نے جواب دیا کہ: ”ہمارے اکابرین نے ایسا نہیں کہا، لیکن نوجوانوں کے ہم ضامن نہیں۔“ اس کے بعد نبی خدا نے جو خطبہ فرمایا، وہ بہت اثر خیز تھا۔ جس کے بعض فقرات درج کیے جاتے ہیں۔ فرمایا: ”آیا میں نے تم کو گمراہ نہیں پایا؟ خدا نے میرے سبب سے تمہیں ہدایت بخشی۔ جب میں تم میں آیا تو تم ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ خدا نے تمہیں محبت عطا کی۔ اور تمہارے مال اور اولاد میں برکت دی۔ کیوں مجھے اس کا جواب نہیں دیتے؟“ انصار نے جواب دیا کہ: ”یا رسول اللہ! ہمارے ماں باپ آپ پر فدا ہوں۔ ہم کیا جواب دیں۔ بے شک آپ کا ہم پر احسان ہے۔“ یہ سن کر اسخضرت نے پھر فرمانا شروع کیا کہ: ”اگر تم چاہو تو کہو کہ تم حج کہو گے اور اس کی تصدیق کی جائے گی کہ: تو ہماری طرف آیا، درِ اسخالیکہ قوم نے تیری تکذیب کی، اور ہم تیری تصدیق کرتے تھے۔ اور کوئی تجھے نصرت نہیں دیتا تھا، اور ہم نے تیری مدد کی۔ تو اپنے وطن سے باہر نکلا، جو تھا، ہم نے تجھے جگہ دی۔ تو قیصر اور درویش تھا، ہم نے تیری خدمت کی۔ تو خائف تھا، ہم نے بے خوف کیا۔“ حضرت سے یہ مفکورانہ فقرات سن کر انصار ہولے کہ: ”احسان خدا اور اس کے رسول کا ہے۔ اگر آپ کا وجود ہم میں نہ ہوتا تو ہم میں اور دوسروں میں کوئی فرق نہ ہوتا۔ ہم آپ کی وجہ سے معزز اور سرفراز ہوئے۔ ہماری خویاں آپ کے سبب سے ہیں۔ ہم راضی ہیں خدا سے اور اس کے رسول سے، ہماری نظر آپ کی متابعت پر ہے۔ متاعِ دنیا پر نہیں ہے۔“ یہ کہتے جاتے تھے اور کہن سالِ سردارانِ قوم روتے جاتے تھے۔ اس کے بعد رسول نے انھیں بھی عطا فرمایا، اور اپنی صلحت ظاہر کی کہ تازہ اسلام یا متوجہین کے دل میں عطایا سے رسولِ اسلام اور محبت پیدا کی جاتی تھی۔ اور فرمایا: ”اے گروہ انصار! کیا تم اس پر راضی نہیں ہو کہ لوگ

اؤٹ اور بکریوں کے ساتھ اپنے گھروں کو پھری اور تم خدا اور رسول کے ساتھ اپنے گھروں کو واپس جاؤ تم غصہ کرتے ہو کہ میں مؤلفہ القلوب کو مال دیتا ہوں اور تم کو تمہارے ایمان پر چھوڑتا ہوں اور تمہارے کمال انظام پر اعتماد کرتا ہوں۔ اگر لوگ کسی وادی اور شعب میں چلیں میں انصار کی وادی اور شعب کی طرف چلوں گا۔ لوگ دہرا (بیرونی پوشاک) میں اور انصار میرے شمار (اندرونی پوشاک) ہیں۔ میں حیات اور مامت میں تمہارے ساتھ ہوں۔ اس کے بعد رسول نے ہجرین کو انصار سے مخصوص کر کے ان کے نام و شیعہ لکھا۔ انصار روتے جاتے تھے اور کہتے تھے کہ: ”آپ کے بعد میں اس کی احتیاج نہیں، وہ دن نہ ہو جس میں آپ نہ ہوں۔“

خالد کا جوش انتقام اسلام نے فرو نہیں کیا
اس زمانہ میں یا اس کے کچھ قبل رسول نے خالد بن ولید کو جواب یہ سوچ بچ کر قریش کی شوکت اور قوت تمام ہوگئی ”مسلمان“ ہو گیا تھا۔ بنی غرمیہ کی طرف ایک گمشدہ جماعت کے ساتھ روانہ کیا۔ خالد دعوت اسلام کے لیے بھیجے گئے تھے۔ قتل کا حکم نہ تھا۔ بدقسمتی سے کسی زمانہ میں غرمیہ نے خالد کے چچا انفاس یا فاکہ کو قتل کیا تھا۔ بنی غرمیہ یہ سن کر کہ خالد آیا ہے اشتیاعاً مسلح آئے اور بقول قرۃ العیون جب خالد نے پوچھا کہ: ”تم کون لوگ ہو۔“ انھوں نے کہا: ”ہم مسلمان ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی شریعت اور ان کے دین پر ایمان لائے ہیں اور منسلک پڑھتے ہیں اور ہم نے مسجد بنائی ہے۔ اس میں اذان و اقامت کہتے ہیں اور جمعہ و جماعت ادا کرتے ہیں۔“ خالد نے مسلح آنے کی وجہ پوچھی۔ انھوں نے کہا کہ: ”ہمیں ایک جماعت عرب سے بوجہ عداوت کے خوف تھا۔“ خالد نے ہتھیار رکھنے کو کہا۔ انھوں نے حکم کی تعمیل کی۔ اب خالد نے انھیں بقول مناج و قرۃ العیون وغیرہ بے گناہ قتل کرنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ نو آدمی قتل ہوئے۔ صرف بنو سلیم نے قتل کیا تھا۔ مہاجر و انصار نے اپنے اسیروں کو قتل نہ کیا۔ کسی نے جاکر رسول کو خبر دی۔ حضرت یہ سن کر غصہ ہوئے اور دو یا تین مرتبہ کہا: ”اللہم انی ابرأ الیک عما صنع خالد۔“ (خداوند! میں بیزار ہوں اس سے جو کچھ خالد نے کیا)

علی نقصان کی تلافی کے لیے بھیجے گئے
اس کے بعد عام مؤرخین کے موافق رسول نے علی بن ابی طالب علیہ السلام کو روانہ فرمایا اور دیت کا رویہ دیا۔ جناب امیر نے رویہ تقسیم کیا۔ (خالد کی غلطی اور رسول کی براہت کا تذکرہ کیا اور غالباً خالد کی کافی چشم نمائی کہ (جے مؤرخین نے اس لیے نہیں لکھا کہ آئندہ خالد کو ایسا ہی کچھ پھر کر کے ”سیف اللہ“ ہو جاتا تھا) اور جو کچھ رہا اتحادہ بھی مزید تالیف کے لیے تقسیم کر دیا۔ سپہ امیر علی صاحب کے لفظوں میں جیسا وہ اپنی تاریخ الاسلام میں فرماتے ہیں کہ: ”حضرت علی کے اخلاق و جود و سخا سے ہر شخص کا دل خوش ہوا اور سب نے ان کو دعائے خیر دی، اور جب حضرت علیؑ وہاں سے پھر کر رسول اللہ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آنحضرت نے بھی نہایت مدح و ثنا کی اور بہت شکر یہ ادا کیا۔“ اس کے بعد بقول مناج: ”حضرت ایک مدت تک خالد پر برسر غضب تھے۔“ ----- ”حضرت بعضے (۹) اصحاب کی شفاعت کے وسیلہ سے خالد سے درگزر سے۔“

عمرو بن عاص اور اسلام

میں یہ کہنا بھی فراموش نہ کروں گا کہ فتح مکہ کے بعد عمرو بن عاص مسلمان نہیں ہو گئے بلکہ انھوں نے بادشاہ حبشہ کے پاس سکونت کا ارادہ کیا۔ اس خیال سے کہ اگر قوم غالب ہوئی تو آجائیں گے، نہیں تو محفوظ رہیں گے۔ ناشی نے بھی ان کا خیر مقدم اچھا نہ کیا۔ اب اس کے بعد سوچنا آسان ہے کہ یہ بے خانماں ہو کر جو کچھ سوچے اور کیا وہ خود کس حد تک ان کے مفید تھا۔ ان کے دلچسپ واقعات ابھی تاریخ اسلام میں بہت سے ملیں گے، جس کا دواۓ اثر ہوا۔ کس حیثیت کا اسے ناظر خود سمجھے گا یہ سوچنا بعض نتائج پر پہنچنے میں مفید ہو گا کہ یہ کس کس کے مددگار رہے۔

شہدے میں ایک واقعہ ہوا جو خصوصاً اس لیے قابل ذکر ہے کہ اس میں اسلام کا ایک ذی فہم واعظ اور اخلاق کا اخلاقی اندازے سے پابند بزرگ کم ہو گیا۔ یہ بنی ہاشم کے ممتاز شہدا کا تیسرا تھا۔ میری غرض سہیہ موت سے ہے۔ جس میں اسلام کے علم کے ایک ممتاز محافظ حضرت جعفر بن ابی طالبؓ تھے۔

ان کے متعلق جناب رسالت مآبؐ کا یہ فرمانا ان کے لیے

بہت کچھ کہتا ہے جب یہ غزوہ خیبر کے بعد رسولؐ کے پاس ہجرت حبشہ سے واپس آئے ہیں کہ: ”مجھے نہیں معلوم کہ میں خیبر کی فتح سے زیادہ مسرور ہوں یا جعفرؓ کی واپسی پر۔“ انھیں کے متعلق قبول منافع فرمایا تھا کہ: ”اشبہت خلقی و خلقی۔“ لشکر اسلام کے تین ہزار سپاہیوں کو ہر قل کے دو لاکھ سپاہیوں کا سامنا تھا پھر بھی زید بن حارثہؓ کی شہادت

یہ تباہی گئے اور شہید ہوئے۔ ان کے بعد حضرت جعفرؓ نے قبول ابن خلدون:

”دور کر رایت اسلام سنبھالا اور لانے لگے تا آنکہ ان کا گھوڑا زخمی ہو کر گر پڑا اور یہ پامیلہ لانے لگے۔ دشمنان اسلام نے ہر چار طرف سے ان پر وار شروع کر دیے۔ جب ان کا دایاں ہاتھ کٹ کر گرا تو انھوں نے رایت اسلام کو بائیں ہاتھ میں لیا۔ یہ بھی ان کے جسم پر باقی نہ رہا، اور ابوطالبؓ کا فرزند اسے بازوؤں کے سہارے سنبھالے رہا۔ یہاں تک کہ دشمن نے کمربدار کیا اور یہ شیر دل جھولے پچاس، جھولے ستر اور جھولے نوے زخم کھا کر اسلام پر نثار ہو گیا۔“

اساتذت عیسٰی زوجہ حضرت جعفر بن ابی طالبؓ کہتی ہیں کہ جب جعفرؓ کی شہادت کی خبر حضرت کو پہنچی تو

میرے گھر میں تعزیت لائے اور دریافت کیا کہ جعفرؓ کے لڑکے کہاں ہیں۔ میرے پاس لاد۔ میں لڑکوں کو حضورؐ میں لے گئی۔ حضرت نے گود میں لیا، چہا، اور سوچھا اور آنکھوں میں آنسو بھر لائے۔ میں نے عرض کی کہ یا رسول اللہؐ گویا جعفرؓ کی سنائی آئی ہے۔ فرمایا: ہاں وہ شہید ہوئے۔ (منابع)

رسولؐ نے کھانا بھجوا دیا اس کے بعد چشم بچ آب اٹھے اور حضرت فاطمہؑ کے گھر تشریف لائے۔ یہاں بھی حضرت زہراءؑ کو ”یا عافہ یا عافہ“ کہہ کر روتے سنا دیا: چاہیے کہ جگر کے ایسے شخص پر رونے والی رونے۔ حضور اقدسؐ نے جگر کے گھر کھانا بھجوانے کا بھی حکم فرمایا۔

عدی بن حاتم کا اسلام اپنی بہن کے ساتھ اچھے برتاؤ کو دیکھ کر شہد میں جناب رسالت ﷺ نے امیر المومنین علیؑ بن ابی طالب کو قبیلہ طے کے مشہور بت خانہ فلس کی طرف بھیجا۔ اس سریر میں مشہور حاتم طائی کی بیٹی اور عدی بن حاتم کی بہن لشکر اسلام کے قبضہ میں آئی۔ اولاد حاتم پر دارالحرب کا اصول تقسیم قیمت موثر نہ کیا گیا بلکہ اسے مدینہ کے ایک گھر میں محفوظ رکھا۔ رسولؐ نے آزاد کیا۔ اور عدی بن حاتم شام سے آکر مسلمان ہوا۔

رسولؐ عدی کا احترام کرتے تھے آئندہ زمانہ میں دیکھا جائے گا کہ عدی بن حاتم یا اس کا فرزند عمر بن عدی علیؑ کے خالص جان شادوں میں تھا۔ اس کی ابتدائی وجہ یہ اس کے اور کچھ نہیں ہو سکتی کہ اس شریف قوم پر احسان اور حفظ عزت نے اثر کیا تھا۔ عدی بڑا شکاری تھا۔ اور مولوی عبدالحق صاحب مناجات میں فرماتے ہیں کہ: ”حضرتؐ کو اس پر عنایت بہت تھی۔ یہاں تک کہ جب عدی واسطے شکار کے سوار ہوتا تو حضرتؐ اس کے ساتھ دواہی عقیق تک مشالیت فرماتے۔“

عمر بن عاص اور ابو عبیدہ میں امامت نماز کا جھگڑا میں ایک واقعہ اور اس لیے بیان کرتا ہوں کہ آئندہ بعض کے میلان طبیعت کی نلک چٹنی کی جاسکے۔ واقعہ یہ تھا کہ رسولؐ کو بنی قریظہ کے مدینہ پر شب خون مارنے کی خبر پہنچی۔ رسولؐ نے ابن عاص کو ان کی طرف روانہ کیا۔ انھوں نے اپنی قلت اور دشمن کی کثرت دیکھ کر مدد طلب کی اور اب رسولؐ نے ابو عبیدہ کی ماتحتی میں ایک جماعت مسلحین کو جس میں ابن ابوقحافہ اور ابن الخطابؓ بھی تھے، روانہ کیا۔ نماز کا وقت تھا۔ مسئلہ یہ تھا کہ امیر سابق پیش نمازی کرے یا امیر لاحق۔ عمرو بن عاص دونوں کا امام بننا چاہتا تھا۔ اور ابو عبیدہ اس پر تعفیہ کر رہے تھے کہ تم اپنی جماعت کے امیر ہو اور ہم اپنی جماعت کے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ابو عبیدہ دس گئے اور ابن عاص ہازی لے گیا۔ لیکن قصہ یہیں ختم نہیں ہو گیا۔ بلکہ بقول فرقۃ العیون و مناجات یہ بھی ہوا کہ: ”حضرتؐ عمر فاروقؓ نے اس میں (آگ جلانے یا نہ جلانے میں) ان سے بہت گفتگو کی اور سخت کلام کیے۔ عمرو بن عاص نے کہا کہ: ”تم ہامور ہوئے ہو کہ میری بات سنو اور میرا حکم مانو۔“ حضرت فاروقؓ نے کہا کہ: ”ہاں ہم ہامور ہیں۔“ انھوں نے کہا: ”تو پھر ہامور بنے رہو۔“

سرمیر عصابہ باندھنا دشوار پیش آمد کا اشارہ تھا روضۃ الصفا اور حیات القلوب کو اس کے علاوہ کچھ کہنا ہے اور وہ یہ کہ ابن عاص، ان کے بعد ابن خطاب اور پھر ابن ابی قحافہ کو شکست ہوئی اور اب رسولؐ نے علیؑ کو بھیجا اور علیؑ اپنی غلط فہمی و حرکت سے دشمن کے سرمیر پانچ گئے۔ صاحب حیات القلوب کو اس قدر اور کہنا ہے کہ سخت لڑائیوں میں جناب امیر علیؑ السلام

سر پر ایک عصابہ باندھ لیتے تھے

فرض جسے مناظمہ کے آنسو نہ مثال سے

نہ آنسو فرض کے ٹالنے کے لیے تھے

نیزہ غلی ہاتھ میں لیے اپنے سرخ گھوڑے کو بھیڑ کرتے ہوئے روانہ ہو گئے۔

علاء کا استقبال اور ایک حدیث

علاء کو فتح ہوئی۔ رسول نے اصحاب کو استقبال کے لیے بھیجا، اور خود آگے آگے تشریف لے چلے۔ علاؤ کو گھوڑے سے اترنے نہ دیا، اور فرمایا: ”اگر مجھے خوف نہ ہوتا اپنی امت سے کہ جو کچھ مسیح ابن مریم کے لیے کہا جاتا ہے ایسا ہی کچھ وہ تیسری شان میں بھی کہے گی، تو میں تیرے لیے کچھ کہتا کہ تو جس طرف سے گزرے گا لوگ تیرے قدم کی خاک اٹھاتے۔“ سیر الائمہ، روضۃ الشفاء وغیرہ کے علاوہ مشابہت صبیحی کی حدیث علامہ جلال الدین سیوطی نے البازاز، ابوالصلی اور المحکم سے نقل کی ہے۔ مشکل سے میں سوچ سکتا ہوں کہ جو کچھ جناب رسالت مآب فرمانا چاہتے تھے وہ نہیں فرمایا، بلکہ اس طرح فرمایا جس سے زیادہ پرقت انداز سے کہنا مشکل تھا۔

غزوہ تبوک ۹ اور بعض خصوصیات

یہ ہیں کہ رسالت مآب ﷺ کا یہ اصول تھا کہ کسی جنگ کے لیے کیوں نہ تشریف لے جائیں لیکن کبھی اپنا ارادہ ظاہر نہیں فرماتے تھے۔ لیکن اس غزوہ کی روانگی کے قبل ظاہر فرمادیا، دوسرا امر یہ تھا کہ اس غزوہ کے لیے سرحد شام تک جانا تھا اور درمیان میں بہت سی تکلیفیں تھیں۔ تیسری بات یہ تھی کہ بنی اسد، غطفان اور رقیقہ نے حاضر بن گئے اور ابن ابی سلول ان میں سے کچھ مقرر کر کے چلے گئے اور کچھ راستہ سے پلٹ آئے اور وہ قابل ذکر بات یہ تھی کہ اس مرتبہ جناب امیر کو بیانے اس کے کہ ہر غزوہ کی طرح پشت دینا لشکر رکھتے، مدینہ میں اپنا قائم مقام چھوڑا۔

دیوانی یا فوجی عہد میں علاء کسی کے ماتحت نہیں رکھے گئے

یہ واقعہ ہے کہ جب حضرت رسالت مآب اور جناب امیر غزوات کے لیے باہر جاتے تھے تو مدینہ کی حفاظت کے لیے کوئی شخص ذمہ دار بنایا جاتا تھا۔ لیکن یہ مقام بھی تبوک کی مثال سے صاف ہو گیا کہ اگر مصلحت اس کی تقضی تھی کہ جناب امیرؓ ہمراہ نہ رکھے جائیں تو مدینہ میں وہ اور کسی حیثیت سے چھوڑا قائم مقام کے نہ چھوڑے جاسکتے تھے۔ جس طرح غزوات میں کسی کے ماتحت نہ بنائے جاسکتے تھے اس لیے کسی کا یہ کہنا کہ علاؤ کا غلیفہ چھوڑنا اس لحاظ سے کہ رسول نے اور مواقع پر دوسرے لوگوں کو غلیفہ چھوڑا تھا کوئی وزن نہیں رکھتا بلکہ ایک صریح مغالطہ ہے۔ اس لیے کہ ہم تو یہ کہہ رہے ہیں کہ کوئی ایسا کام جو فوجی ہو یا ملکی اور وہ ایسی اہمیت رکھتا ہو کہ اسے جناب رسالت مآب ہی کو ادا کرنا ہو تو ایسے مواقع پر کوئی رسول کے نزدیک چھوڑنے کے اپنے کو اعتبار کا شایان نہیں ٹھہراتا

تھا۔ مساوات منزلت تو اس وقت ہوتی جب علیؑ اور کسی کے ہوتے ہوئے ایک مرتبہ یہ اور ایک مرتبہ وہ ہوتا، بلکہ ہم یہ کہہ رہے ہیں کہ علیؑ کے ہونے کے معنی دوسرے کا نہ ہونا تھا۔ علیؑ اور رسولؐ کی ناموجودگی میں کسی کا ہونا رائج ضرورت تھی اور علیؑ کے ہوتے ہوئے دوسرے کا نہ ہونا علیؑ کی قدر و منزلت۔

رسولؐ اور علیؑ میں موسیٰؑ اور ہارونؑ کی مناسبت کا اشارہ غزوہ تبوک کی اس مستند
بین الصنفین حدیث:

”اما حدیثی ان تکون منی بمنزلۃ ہارون من موسیٰ الا انہ لانی بعدی“۔ یہاں جو مستند ہونے کے دفتر کے دفتر سیلہ کیے گئے ہیں۔ کوئی صاحب قرۃ العیون کا ایسا مولف ان الفاظ کو روک نہیں سکتا کہ: ”یہ حدیث دلیل اہل سنت کی ہے قیامت کرنے فضیلت حضرت امیر رضی اللہ عنہ اور صحت امامت ان کی کے اپنے وقت میں، اس واسطے کہ اس حدیث سے استحقاق حضرت امیرؑ کا واسطے امامت کے مستند ہوتا ہے۔“

سوال کیا جاسکتا ہے کہ: ”جب یہ حدیث رسولؐ کی حیثیت میں اور پھر ایک زمانہ کے بعد کسی خاص وقت کے جناب امیرؑ کے لیے بمنزلہ سفارش اور فضیلت کے ہو سکتی ہے تو مختصاً رسولؐ کے بعد کیوں نہیں ہو سکتی؟“

ولی عہدی کے متعلق اگر کسی بادشاہ کا ولی عہد مر جائے، اور اس صورت میں وہ بادشاہ کے بعد قائم مقام نہ ہو سکے، تاہم عالمہ ناس ہی سمجھتے ہیں کہ: ”اگر وہ زندہ رہتا تو قائم مقام ہوتا۔“ موت نے اس واقعہ کو کہ وہ ولی عہد تھا فنا یا نیست نہیں کر دیا، اگرچہ شخص فنا ہو گیا۔ اسلام و وصایت ہارونؑ اور علیؑ میں عام تھا۔ ہارونؑ رحلت کر گئے، علیؑ زندہ رہے۔ اور اس لیے ولی عہد کرنے والے کی خواہش کے موافق انھیں خلیفہ ہونا چاہیے تھا۔

ہارونؑ کا توریت میں موقع دوسری بات جو اس ضرورت کے لیے توریت پر چھنے والوں نے عہد آیا سہواً منہر و گزاشت کی ہے وہ یہ ہے کہ ہارونؑ کی کہانت کے لیے مقدس کیے جانے کے وقت خدا نے ان کے لیے جو رعایتیں اور حقوق مقرر کیے وہ دیگر بنی اسرائیل کے لیے نہ تھے۔ بنی اسرائیل اولاد ہارونؑ کی موجودگی میں کسی دوسرے کو اپنے دشمنات مذہبی کا پیشوا نہیں سمجھتے تھے اور بیت المقدس کی کہانت یا ریاست روحانی اولاد ہارونؑ میں تھی۔ برخلاف مسلمانوں کے جنھوں نے ایک خاص وقت اور اس کے اثر سے اپنا یہ اصول قرار دے لیا کہ جو بادشاہ ہے وہی پیشوائے روحانی بھی ہے۔ وہ کوئی، اور کیسا ہی کیوں نہ ہو۔

فسق ہر مورخ اسے مانتا ہے کہ رسولؐ نے پہلے علیؑ کو اپنا قائم مقام کیا۔ اس کے بعد جناب امیرؑ کے ہمراہ نہ جانے کے اظہار تاسف پر یا منافقین کے اس کہنے پر کہ: ”اس لیے یہاں چھوڑ گئے کہ کچھ کہدورت خاطر مبارک میں رکھتے تھے۔“ فرمایا کہ: ”ایسا کہنے والے مجھوتے ہیں۔ کیا تو اس پر راضی نہیں ہے کہ تیری نسبت مجھ سے وہ جو ہارونؑ کو موسیٰؑ سے تھی۔ صرف فرق یہ ہے کہ میرے بعد کوئی نبی نہ ہوگا۔“ اس سے ظاہر ہوگا کہ اگر علیؑ کا پیچھے چھوڑنا محض اہل و عیال کی حفاظت تھی تو موسیٰؑ اور ہارونؑ کی مثال کے کوئی معنی نہیں ہیں۔

بلکہ مؤٹی اور ہارون کی مثال اس لیے ہے کہ جس طرح حضرت مؤٹی نے اپنے زمانہ نصیبت میں قوم کے خیالات کا محاذ اور رہنما اپنے اعتبار کے ایک آدمی کو چھوڑا تھا اسی طرح جناب رسالت مآب نے اسے اس سے زیادہ سخت اتفاقات میں جن کا مؤٹی کو سامنا تھا اپنا قائم مقام چھوڑا تھا جس پر رسول کے اعتبار کے متعلق راز گوئی کا طرز سب سے زیادہ واضح اور زبردست دلیل ہے۔

متشکل سے وہ شخص ”نبوت“ کے خطاب سے ممتاز کیا جاسکتا ہے جو اپنے اہل و عیال کی حفاظت کے لیے تو محاذ چھوڑے اور قوم کی حفاظت کا کسی کو ذمہ دار نہ بنائے۔

لیکن یہ عجیب خیز نظریہ ہمارا نہیں ہے کہ نبی نے کسی کو قوم کا مستند ذمہ دار نہیں چھوڑا، بلکہ واقعی تو کہ ان لوگوں کے قول کی نفی ہے جو یہ کہتے ہیں کہ رسول نے اپنے بعد کوئی قائم مقام نہیں چھوڑا۔ جب سرور عالم تو کہ کے زمانہ نصیبت میں اپنا قائم مقام چھوڑ سکتے تھے تو اپنے بعد انھوں نے بہ مراتب زیادہ اس کا محاذ کیا ہو گا کہ امت کا کوئی محاذ چھوڑے۔ ایسے قائم مقام کا انتخاب رسول کا فرض تھا نہ کہ بھیڑیاد ہسان خلقت کا۔

ایک حدیث جو وقتی یا غیر وقتی وصایت کا تصفیہ کرتی ہے ان مورخین کو جو اس پر مصر ہیں کہ جبکہ کی قائم مقامی میں مؤٹی و ہارون کی

حدیث کا فرمایا جانا آئندہ پر کوئی اثر نہیں رکھتا میں روئے الاحباب کی یہ حدیث یاد دلاؤں گا کہ: ”علی خلیفہ علیکم فی حیاتی و فی مماتی فمن عصا فقد عصانی“ (تم پر میری زندگی میں بھی اور میرے مرنے کے بعد بھی خلیفہ ہے اس کا نافرمان میرا نافرمان ہو گا) جے ام المومنین ام سلمہ ام المومنین عائشہ کو یاد دلاتی ہیں اور وہ تصدیق کرتی ہیں جس میں حیات اور ممات کا قصہ طے ہو جاتا ہے۔ لیکن شاید یہ حدیث بھی بحث کے موقع پر اس لیے قبول نہ کی جائے کہ یہ اس کے زبانی ہے جس نے نہ صرف حضرت عائشہ کی سپہ سالاری میں شرکت نہ کی بلکہ اس پارٹی میں بھی نہ تھیں جن کی ایک فرد حضرت عائشہ تھیں۔ مزید تائید کے لیے موافق عہد سے یہ حدیث نقل کرتا ہوں کہ:

”ما تروون من علی ان علیاً منی وانا منہ وھو ولی کل مؤمن بعدی“ (چہ میخواید از علی۔ سہ نوبت تکرار ایں لفظ کردہ گفت۔ بدرستیکہ علی از من و من از دے ام و دلاولی ہر مومن است بعد از من)۔ (تم علی سے کیا چاہتے ہو۔ یہ تین بار کہہ کر فرمایا: علی مجھ سے ہے اور میں اس سے چوں۔ علی میرے بعد ہر مومن کا دلاوی ہے)

یہ تمام باتیں اس میں مطلق شبہ کی گنجائش نہیں رکھتیں کہ وصایت یا خلافت یا امامت علی بن ابی طالب علیہ السلام کے لیے جناب رسالت مآب نے حتمی اعلان فرمایا، اور سب کی تصدیق عہد الوداع میں کی۔ مؤرخین کا یہ کہنا کہ اس سے مقصود امامت حقیقی ”اپنے وقت میں“ اس لیے ہے کہ کچھ وقت دوسروں نے اپنا کر لیا تھا اور مؤرخین نے اور محاذ کے ساتھ رسول کے اس فرمانے کے معیار سے بھی ان کے وقت پر غور نہیں کیا کہ رسول کی قائم مقامی وہ کرتا ہے جو ”رسول میں سے ہو“۔ کم سے کم رسول نے اپنے زمانہ میں ہر مفید موقع پر یہی کھلایا۔ اور خود یہ اصول اس قدر فطری تھا کہ ہیل بن عسر نے اس کی خاموشی کی۔

رسول کو ہلاک کرنے کا ارادہ جو کچھ غزوہ تبوک کے متعلق مجھے اور کہنا ہے وہ یہ ہے کہ جناب رسالت مآب کی داہنی کے وقت کچھ لوگوں نے اسٹھنٹ کے ہلاک کرنے کا قصد کیا جو واقعہ عقبہ کے نام سے مشہور ہے۔

واقعہ عقبہ مؤرخین کو اس واقعہ کے زمانہ کے متعلق تھوڑا سا اختلاف ہے اور وہ یہ کہ واقعہ عقبہ بعد تبوک ہوا یا بعد حجۃ الوداع۔ اس اختلاف سے ہمارے خیال پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ وہ کبھی کیوں نہ ہوا ہو۔ ہم کہہ چکے ہیں کہ مشہور منافقین یا تو مدینہ رہ گئے یا راہ سے مذر کر کے واپس آئے۔ لیکن پھر بھی لشکر اسلام کے ساتھ کچھ لوگ تھے جنہیں لوگ عام طور سے نہ جانتے تھے کہ یہ دشمن رسول ہیں۔

واقعہ عقبہ اس کا ثبوت ہے کہ رسول جس وقت عقبہ کے پاس پہنچے، مہاجر مشر عمار بن یاسر ظاہر منافقین کے ملاوہ کچھ غیر ظاہری تھے۔ بکڑے تھے، اور حذیفہ پہلے پہلے آ رہے تھے کہ کچھ لوگ پس پشت کی طرف سے پیدا ہوئے جو چہروں پر قلاب ڈالے ہوئے تھے۔ رسول کو آہٹ ملی اور آپ نے حذیفہ سے سہرا لیا کہ انہیں واپس پلٹا دو۔ حذیفہ ان کے ناقوں کے منہ پر مار کر کہتے تھے کہ: دُور ہو دُور ہو اے دشمنانِ خدا۔ دشمن جن کی تعداد زیادہ سے زیادہ پندرہ تھی، یہ کچھ کر کہ رسول کو ان کے ارادہ کی اطلاع ہو گئی، پلٹ گئے۔ اس کے بعد قبول شہادۃ النبوة: رسول اللہ ﷺ از حذیفہ پرسید کہ کچھ کس را سواریاں پہچانی گئیں۔ ان میں گروہ شامی؟ گفت یا رسول اللہ ﷺ راحلہ کلان و کلان (۹) را

شامی۔ اما ہمہ رویہا نے خود بستہ بودند و شب تاریک بود ایشان را نہ شامی چوں از عقبہ گزشتہ و بح مدید رسول اللہ ﷺ اسید بن ضمر را گفت یا اباجی ی دانی کہ شب منافقان چہ اندیشہ کردند۔۔۔

رسول اللہ نے حذیفہ سے پوچھا کہ اس گروہ میں سے کسی کو تو نے پہچانا۔ حذیفہ نے کہا اے رسول خدا! کلان کلان کی سواری کو پہچان لیا ہے۔ لیکن مجھے منہ لپیٹے ہوئے تھے۔ اور رات تاریک تھی۔ ان کو پہچان نہیں سکا۔ جب اس گمائی سے گزر گئے اور برج نمودار ہوئی تو رسول خدا نے اسید بن خنیس سے فرمایا اے ابوجی جانتے ہو منافقوں نے آج رات کیا منصوبہ بنایا تھا۔۔۔

کیوں رسول نے منافقین کو سزا نہ دی اسید گفت بفرمائی یا رسول اللہ۔۔۔ تا فی الحال سہرانے منافقان را بجزرت تو رسام۔ گفت اے اسید مکروہ میدارم کہ مردم گویند چوں حرب منتفی شد پیغمبر ﷺ قتل اصحاب خود آغاز کرد۔ اسید گفت ایشان از اصحاب تو نیستند نہ مود کہ اظہار شہادت ی کنند و خدائے تعالیٰ مرا از قتل اہل شہادت نفی کردہ است۔ بعد ازاں رسول ﷺ نامہائے آن جماعت با مدنیہ گفت۔۔۔ و بغیر دے از اصحاب کچھ کس آں را نمی دانست۔

یعنی اسید نے کہا: اے رسول خدا! فرمائیے کہ ابھی منافقوں کے سر کاٹ کر آپ کی خدمت میں پیش کروں۔ فرمایا: اے اسید میں نا پسند کرتا ہوں کہ لوگ کہیں کہ جب جنگ ختم

ہو گئی تو پیغمبر نے اپنے اصحاب کو قتل کرنا شروع کر دیا۔ اسید نے کہا وہ آپ کے اصحاب سے نہیں بلکہ فرمایا کہ اظہار شہادت کرتے ہیں اور خدا نے مجھے شہادت دینے والوں کے قتل سے منع فرمایا ہے۔ اس کے بعد رسول خدا نے اس گروہ کے نام حذیفہ کو بتلائے۔ اور حذیفہ کے سوا اور کسی کو معلوم نہ تھے۔

رسول نے عمار اور حذیفہ کو منافقین کے نام بتا دیے ہر ایک کا راصلہ پھٹا گیا بلکہ رسول

نے حذیفہ کو اور جنول ثرقۃ العیون عمار بن یاسر کو بھی سب کے نام بتا دیے۔ اب ایک منہجہ ہزارا زیہ ہے کہ اگر رسول نے اپنے زمانہ میں خود عام طور سے ظاہر کرنا بعض مصالح کے لحاظ سے پسند نہ بھی فرمایا ہو تو کیا وجہ ہو سکتی تھی کہ رسول کے بعد ان ناموں کا اعلان نہ ہو جاتا۔ اس لیے کہ اس کے بعد مشہور ہونے سے دین اور دنیا کی کوئی قربانی نہیں ضروری تھی۔

ایک شخص حذیفہ سے سوال کرتا ہے ثرقۃ العیون میں اس امر کا محسوس تذکرہ ہے کہ: کسی مجلس میں اہل عقبہ میں سے ایک نے (۲) حذیفہ کو قسم دی کہ

وہ حملہ آور منافقین کی تعداد بتا دے۔ حذیفہ نے کہا کہ: ”مجھے خبر دی گئی ہے کہ وہ چھوڑ آ دی تھے اور اگر تو بھی اس میں سے ایک ہے تو چہرہ دہ تھے۔“ یہ بھی تذکرہ ہے کہ ان منافقین میں سے تین نے حضرت کی، اور ان کا قصور معاف کیا گیا۔ یہ کل باتیں بتاتی ہیں کہ اس کے بعد منافقین کا نام مخفی رہنا محال تھا۔

نام چھپ نہیں سکتے تھے کیے ممکن تھا کہ جب لوگوں کو معلوم ہوا کہ ان کے ہادی پر حملہ کرنے کا ارادہ کرنے والے چھو چہرہ آدی تھے اور ان میں سے عام طور سے چند نے معافی مانگی اور پھر ان لوگوں سے بقیہ کا معاملہ نہ معلوم ہو گیا ہو۔ دراصل حذیفہ نے ان سے اخفا کی کوئی تاکید نہ فرمائی تھی۔

حضرت عمر حذیفہ سے اپنے قلبی حالت کی گفتش فرماتے ہیں حیرت پر حیرت احیاء العلوم غزالی جلد چہارم کی حسب ذیل

عبارت سے ہوتی ہے کہ ”عمر بہت مبالغہ کرتے تھے اپنے قلبی حالت کی گفتش میں، یہاں تک کہ پوچھا کرتے تھے حذیفہ سے کہ آیا وہ ان میں کچھ لفاق کا اثر ہاتے ہیں؟“ اور اس طرح حضرت عمر کی کے متعلق کہا گیا ہے کہ رحلت رسول کے بعد اس شخص کی نماز جنازہ پڑھتے تھے جس پر حذیفہ کو پڑھتے ہوئے دیکھتے تھے اور حذیفہ کا ہاتھ پکڑ لیتے تھے۔

مولف کی حیرت جس بہت پر میں نے مزید عجب سے غور کیا ہے وہ یہ کہ اگرچہ تاریخ اسلام میں اکثر مواقع پر یہ نظر آتا ہے کہ حضرت عمر کی تلوار کے نیام سے باہر نکل آئے اور کسی گرفتار دشمن رسول کے

مار پی ڈالنے میں کئی دیر نہیں ہے۔ لیکن اس موقع پر حضرت عمر کی کسی ایسی کوشش کا تذکرہ نہیں ہے جس میں انھوں نے جناب رسالت تک یا حذیفہ سے منافقین کے نام دریافت کرنے کی بات چیت اور انھیں قتل کرنے کا ارادہ ظاہر کیا ہو۔ جیسا اسید بن حضیر نے عرض کیا تھا۔ میں اس تصدیق سے دور نہیں ہوں کہ رسول ہی کے زمانہ میں منافقین کے نام معلوم ہو گئے تھے۔ لیکن بلاط اس جواب کے جو اسید بن حضیر کو دیا گیا وہ منہیں خاموش تھے۔ اب رہا یہ کہ رسول کے بعد ان کا نام کیوں ظاہر نہ ہو گیا؟ اس کا

جواب رسول کے بعد ہی حیرت خیز انقلاب میں ہے اور کہ۔

ایک سوال جو تیغ کے آئندہ مناسب موقع کے لیے ملتوی کیا گیا میں نے اب تک یہ

کی کہ مجھ ان وجوہات کے جن سے یہ لوگ (مناہقین) ایسے فعل کے ارتکاب پر آمادہ ہونے جن سے جرم کر کسی مسلمان کے نزدیک برا کام نہیں ہو سکتا میری تحریر کے قطع خیال کے لحاظ سے کوئی وجہ ہو سکتی ہے۔ میں اسے کتاب میں مناسب موقع کے لیے اٹھا رکھتا ہوں۔ غالباً اہل تاریخ ہی اس کے حوالے کرنے کے لیے کافی گویا ہوں گے۔

ادائے رسالت کے متعلق ایک مفید حکم اور علی اسی سلسلہ کا ایک اور قابل توجہ واقعہ یہ ہے کہ جناب رسالت مآب نے قبول

صاحب قرۃ العین ابوبکر صدیق کو تین سو آدمیوں کے ساتھ سوار کر کے حج کے واسطے بھیجا کہ مناسک حج کی لوگوں کو تعلیم کریں اور اول سورہ بقرہ سے تیس چالیس آیتیں لوگوں کو پڑھ کر سنائیں۔ بعد اس کے حضرت علیؓ کو حکم پر دی نازل ہوئی کہ اگلے رسالت و پیغام نہ کرے کوئی مگر قیادہ شخص کہ حجر میں سے ہو۔ سو حضرت نے علی کرم اللہ وجہہ کو بلایا اور فرمایا کہ تم ابوبکر صدیق کے چچے جاؤ اور اول سورہ براسہ کی آیتوں کو ان سے لے کر حج کے بعد ورم سب کو سنا دینا۔ یہ ارشاد فرما کر اپنی آؤٹی پر کہ نام اس کا ضبط تھا، حضرت علیؓ کو ان کاموں کے سچے سوار کہہ کر روانہ کیا۔

حضرت علیؓ تشریف لے گئے اور ہر ایک خیمہ میں رو برو لوگوں کے وہ آیات بینات پڑھنے لگے اور وہ چاروں احکام مذکورہ (●) بہشت میں یزموں کے کوئی داخل نہ ہوگا ● کوئی برہنہ طواف بیت اللہ نہ کرے ● اس ساری کے بعد کوئی مشرک حج نہ کرے اور بیت اللہ کے قریب نہ رہے ● یہ کہ جو کوئی عہد موقت رکھتا ہو ساتھ خدا و رسول کے تو چاہیے کہ اس مدت کے گزرنے تک اپنے عہد پر ثابت رہے۔ اور اگر کوئی عہد نہ رکھتا ہو یا عہد غیر موقت ہو تو وہ چار عہدینہ کی مدت تک (لن میں ہے) پہنچانے لگے۔ پھر جب اس کام سے فراغت کر کے مع الخیر مدینہ میں آئے تب حضرت صدیق نے جناب رسالت مآب ﷺ سے عرض کی کہ: "یا رسول اللہ! مجھ سے کوئی ایسی غلطی ہوئی جو آپ نے مجھ سے وہ خدمت آیات پڑھنے اور احکام ارشاد کے پہنچانے کی موقت رکھی۔ آپ نے فرمایا: "مسبب یہ ہے کہ جبریل علیہ السلام میرے پاس آئے اور یہ حکم لائے کہ تبلیغ اس امر کی کوئی نہ کرے مگر تم آپ یادہ جو تم میں سے ہو اس لیے میں نے یہ کیا۔"

قبول ابوالخیر (جب حضرت علیؓ نے ابن ابوقحافہ سے سورہ براسہ لے لیا) "یہ بات سن کر حضرت ابوبکر صدیق راوی میں سے مراجعت کر کے پیغمبر خدا کی خدمت میں حاضر ہوئے۔"

علی آج فرستادہ خدا ہیں سورہ براسہ کو علیؓ تھا اس جگہ لے جاتے ہیں جہاں کفار کا جہم اور انہوہ ہے۔ مجمع کو خطاب کر کے فرماتے ہیں کہ: ایہا الناس! الی رسول اللہ للہکم

(اے لوگو! میں تمہاری طرف فرستادہ خدا ہیں) لوگ پوچھتے ہیں کہ کس جہیز کے ساتھ؟ اور آپ جواب میں فرمانا شروع کرتے ہیں کہ: بَوَّاءٌ قَاتِلٌ لِلَّهِ وَرَسُولِهِ۔ (بہناری ہے خدا اور اس کے رسول کی طرف سے۔۔۔)

سورۃ برات کی اہمیت سورۃ برات کے تذکرہ سے میری یہ غرض تھی کہ میں اس پر توجہ دلاؤں کہ عہد ناموں کی جدید تفسیر یا تفسیر کس پایہ کی ہوتی ہے اور اس وکیل کو کس درجہ معتد بین الفرقین ہونے کی ضرورت ہے۔ ایسے سیاسی عناصر میں وکیل کی ذلت مخصوص اثر پیدا کیا کرتی ہے بغیر کسی اور طویل توجیہ کے میں یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ اس میں نہ صرف سیاسی شان تھی بلکہ اس لحاظ سے کہ یہ عہد کے متعلق صلوات اور مزاج اطلاق تھا اور دشمنی کی طرف سے تھا۔ اس میں اخلاق اور مذہبی عناصر بھی پہلو بہ پہلو تھے۔ ظاہر ہے کہ ایسے موقع پر جب کہ جناب امیر مکرر مصلحت کے اٹھانے اور مصلحت کے قائم کرنے کے لیے تعزیرات لے گئے تھے موقع کا غرض ہوتا تھا۔ نیز نہ تھا چنانچہ جناب امیر کی واپس تشریف آوری کی خبر جب ابور نے ہادی برقی کو پہنچادی تو رسول اکرمؐ نے استقبال کیا اور نکل گیا۔

حسینؑ رسول کے ایک فرض میں شریک کیے قابل ہوئے دیر تک میں نے غور کیا کہ یہ کچھ کے لیے غور رکھا کہ اب وہ وقت آیا جس میں حسینؑ رسالت مآب کے سدا نشین میں شریک کے قابل ہوئے۔ اور شرکت بھی جس امر میں ہوتی وہ اس درجہ ہمت بالشان تھا جس کا ذکر نہ صرف چارے چارے علماء (مفسرین شریعت) میں ہے بلکہ جس واقعہ سے علمہ ناس کی نگاہوں میں اسلام کا وقار خدائی فیصلہ کے بسبب اور قائم رہا بلکہ اس میں اضافہ ہوا۔ واقعہ یہ ہے کہ سید ویر عالم نے سلسلہ میں نصاریٰ نمران کو دعوت اسلام کا مکتوب روانہ کیا اور ان میں سے چودہ شخص بغرض تفتیش مدینہ میں آئے۔ رسول نے دعوت اسلام فائدہ ان لوگوں نے اٹھا کر کیا اور پوچھا کہ حضرت عیسیٰ کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے۔ اس کے جواب میں حضور انورؐ پر یہ آیت عیسیٰ کی مثال خلقت میں مثل آدمؑ کے ہے۔

إِنَّ مَثَلَ عِيسَىٰ عِندَ اللَّهِ كَمَثَلِ آدَمَ ۖ خَلَقَهُ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ ۚ (الْحَقُّ مِنْ رَبِّكَ فَلَا تَكُن مِّنَ الْمُنْكَرِينَ) ۝ فَمَنْ حَاكَمَكَ فَبِئْسَ مَا جَاءَكَ مِنَ الظُّلُمِ ۚ قَالَ لَقَدْ جَاءَنِي آتَاءُ وَآهَاءُ كَرِهَ نِسَاءُ تَا وَنِسَاءُ كَرِهَ وَانْفُسًا وَانْفُسًا ۚ ثُمَّ تَبَيَّلَ ۚ لَعْنَتُ اللَّهُ عَلَى الْكَاذِبِينَ ۝ (۳: ۵۹-۶۱)

(تحقیق کہ مثل عیسیٰؑ خدا کے نزدیک مثل آدمؑ کے ہے۔ بنایا اس کو مٹی سے پھر کہا اس کو چودہ ہو گیا۔ حق بات ہے تیرے رب کی طرف سے پھر تو شک میں نہ پڑ پھر کوئی بعد اس کے کہ تجھے علم ہو چکا اس بات پر جھگڑا کرے تو کہہ کہ آؤ بلاؤں مسم اپنے بیٹے اور تمہارے بیٹے اور اپنی عورتیں اور تمہاری عورتیں اور اپنی جائیں اور تمہاری جائیں پھر دعا اور لعنت کریں جموؤں پر) نصیحت دینے نے یہ سن کر خجلت مائیگی۔

مباہلہ کی صورت اور حسینؑ کی شرکت دوسرے روز جناب رسالت مآب مباہلہ پر اس طرح مشغول تھے کہ حسینؑ کو گود میں لیے ہوئے اور حسنؑ کا ہاتھ پکڑے تھے پشت اقدس پر، زکیہ طاہرہؑ حضیں اور علی مرتضیٰؑ سب کے آخر میں دکھ گئے تھے اور

مردمِ عالم نے سب کو ہدایت فرمائی تھی کہ جب میں دعا کروں تو تم آمین کہنا۔
مصدق ثانی رسول کا یہ اہتمام دیکھتا تھا اور اس کا یہ قول ہم تک پہنچا ہے کہ: ”اے قوم میں چند آدمیوں کے
چہرے دیکھتا ہوں کہ اگر وہ خدا سے پیڑ کے ٹل جانے کی دعا کریں تو پیڑ اپنی جگہ سے ہٹ جائے گا۔ خسر و مہملہ
نہ کرنا، ورنہ ہاک ہو گے۔“ (فرقۃ العیون)

نصاریٰ نجران سے معاہدہ اور اس کے دفعات صلح کی کہ: ”ہم ایک ہزار عہدہ ماہ مفرور
ایک ہزار عہدہ ماہ وجب میں دیا کریں گے۔ تمہارے دکان کی مہلت ادا کریں گے۔ اس شرط پر کہ ہم اپنے دین پر قائم رہیں
اور تم ہمیں اپنی پسند میں لو۔“ صلح بنی آدم نے یہ عہد نامہ منظور فرمایا۔

آیہ مہملہ کا ترجمہ مشکل سے مجھے یہ کہنے کی ضرورت باقی رہ گئی ہے کہ جناب رسالت مآب نے
آیہ مہملہ کا جو عملی ترجمہ فرمایا اس سے علم پر ثابت ہو گیا کہ ابنائنا میں حسینؑ، حسنؑ، سنانؑ
میں جناب فاطمہؑ زہراؑ اور انفسنا میں علیؑ مرتضیٰؑ، رسولؑ کے نزدیک وہ لوگ تھے جو خدائی فیصلہ کے پر عظمت اور جلالت
کے موقع پر لائے جاتے تھے تو اس وقت اس سے بحث ہے کہ حسینؑ اس قابل ہو گئے تھے کہ ان کے چھوٹے چھوٹے ہاتھ
رسولؑ کی گود سے آئیں کہنے کے لیے بلند جھٹکتے اور کہتی عجب نہ تھا کہ رسولؑ ان ہاتھوں کو اسی وقت چوم لیتے۔ میں ابوالہدیٰ
کے قول کو جو اس مہملہ چاہنے والی جامعیت کے چہروں کی شان کے متعلق ہے پر غور و توجہ کے حوالہ کرتا ہوں۔
آیہ تطہیر اور حسینؑ صاحب موافق آیہ تطہیر کو لکھتے ہوئے کہتا ہے: ”اکثر مفسرین بریں رفتہ اند کہ
اس کے بعد صلاح پیش کرتا ہے کہ روایتیں بعض مؤید ہیں اس کی کہ یہ پانچ تن کی شان میں نازل ہوئیں اور بعض انولج
رسولؑ کے متعلق اور اس ضمن میں روایت کرتا ہے:

مرویت بروایت احمد از ابو سعید خدری کہ ابن آیت در شان پانچ کس نازل شد بخیر علیؑ و علیؑ
و فاطمہ و حسن و حسین (رضی اللہ عنہم) و ابن جریر مرفوعاً باین لفظ روایت کردہ است قولت ہذہ لآیت فی
نفسہ فی النبی صلی اللہ علیہ وسلم و فاطمہ و حسن و حسین۔ و طبرانی نیز روایت کردہ۔۔۔۔۔

یعنی: بروایت احمد بن حنبل ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ یہ آیت تطہیر پانچ تن کی شان میں
اتری ہے۔ پیغمبرؐ، علیؑ، فاطمہؑ، حسنؑ، حسینؑ۔ اور ابن جریر نے مرفوعاً ان ائمتوں سے روایت کی ہے کہ
یہ آیت پانچ افراد کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ حتیٰ کے بارے میں، علیؑ اور فاطمہؑ اور حسنؑ اور
حسینؑ کے بارے میں۔ اور طبرانی نے بھی روایت کیا ہے۔

رسول اہل بیتؑ کو پہنچواتے ہیں و سلم باین طریق روایت کردہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایشان را
در کسائی یعنی مہمانی کے بروئے ہمدرد آورد و این آیت
بر خواند و بصحت رسیدہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عبا را بریں چہار کس پوشانید و فرمود اللہم ھولاً و اھلاً

یعنی: ”مسلّم نے اس سہ سے روایت کیا ہے کہ رسولِ خدا نے ان کو اپنی چادر یعنی عباء میں جو اوڑھے ہوئے تھے، لیا اور یہ آیت پڑھی۔ اور صحیح حدیث سے ثابت ہے کہ: ”رسولِ خدا نے ان چادر ہستیں کو چادر اوڑھائی اور فرمایا: ”اے اللہ! یہ میرے اہلِ نبیّت ہیں اور میرے قریب ہیں۔ ان سے رخص کو دور رکھ اور انہیں پاک رکھ جیسا پاک رکھنے کا حق ہے۔“ دوسری روایت میں تعظیماً کہنے کے بعد فرمایا: ”میری جنگ ہے ان لوگوں سے جو ان سے لڑیں، اور میری صلح ہے ان سے جو صلح رکھیں، میں ان سے سلامتی کے ساتھ ہوں جو ان کے ساتھ سلامتی سے رہیں، اور میں ان کا دشمن ہوں جو ان سے دشمنی کریں۔“ ایک اور روایت میں ہے تین بار فرمایا: ”اے اللہ میرے اہلِ نبیّت ہیں۔“

امیر المؤمنین، حضرت زکیہ طاہرہ اور حسین علیہم السلام پر اطلاق الہی بیٹ کا ہو تا تھا یا حنی کے نسبت جناب رسالت مآب نے

اہل بیت کی تخصیص کیوں شبہ کے حوالہ کی جاتی ہے

نفوی دلیل سے زور دیا جاتا ہے اور کبھی جب یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ اس میں غلام اور کنیز بھی داخل ہو جائیں گی۔ کیونکہ گھر میں رہنے والوں میں ان کا بھی شمار ہوگا۔ (جب کہ بہت سے اور شامل ہو سکتے ہیں) تو محسوس شروع ہوتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ یہ ازواج رسول اور تمام اہل باشم اور بنو عبدالمطلب کے لیے کہا گیا اور پھر جب واقعہ خیراں پر نظر جا پڑتی ہے تو مؤرخین کو پیراس کے چارہ نہیں ہوتا کہ اہل بیت سے مراد متذکرہ صدر حضرات ہیں۔ تاریخ اسلام کا جانتے والا مشکل سے اس میں مشتبہ رہ سکتا ہے کہ کیوں اسن صریح آیت اور واقعہ تاریخی کے لیے لغت کی ضرورت ہوتی۔

حسینؑ کے متعلق روایتیں اب وقت آگیا ہے کہ حسینؑ کے متعلق میں ان تمام روایتوں کو بیان کر دوں جن کے متعلق کسی زمانہ کا صحیح اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔

راکب اور مرکب
 ایک روز جناب رسالت مآب ﷺ کو اپنے دو شاہ مبارک پر چلے جانے لگے تھے کہ کسی نے کہا: ”کیا اچھا مرکب ہے۔“ رسول نے جواب دیا:

”دیکھو راکب بھی کیسا اچھا ہے۔“

حسینؑ کو سنبھالنے کا حکم اس کے علاوہ روایتیں ہیں کہ حسینؑ کو جناب رسالتؐ کی حکم قدس پر لٹائے رہتے تھے اور حسینؑ چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے ریش اترتے تھے کھیتے تھے کئی روز حسینؑ اس میں کشتی لڑ رہے تھے جناب رسالتؐ نے حضرت فاطمہؑ سے مندرمایا کہ: "حسینؑ کو سنبھالو۔"

حسینؑ کے رونے سے رسولؐ متاثر ہوئے جناب رسالتؐ حسینؑ کے رونے کی آواز سن کر جناب فاطمہؑ زحما سے مندرماتے تھے: "کیا تم نہیں جانتی کہ حسینؑ کے رونے سے مجھے طغیث ہوتا ہے۔"

رسولؐ حسینؑ کو راستہ میں پاتے ہیں لیلیٰ بن امیہ کہتے ہیں کہ ایک روز ہم جناب رسالتؐ کی سہرا کشی جگہ حیفانہ میں جا رہے تھے حسینؑ راستہ میں کھڑے تھے انہیں دیکھ کر رسولؐ نے پکڑنا چاہا حسینؑ دوڑے لیکن گرفتار ہو گئے رسولؐ نے ایک ہاتھ پشت پر اور ایک ٹھوکی پر رکھ کر پیادہ کر لیا ضرور ہر حسینؑ بھولا قبضہ لگا کر بھاگے ہوں گے

مجمع اصحاب میں حسینؑ کو پھنچواتے ہیں فخر بن ابیہ کی سند سے ابیہ میں حدیث سے نقل کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ ایک دن رسولؐ نے مندرمایا: "ایہا الناس! یہ حسینؑ پسر علی بن ابی طالبؑ ہے اسے پھانسی دے اس کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے کہ حسینؑ کے دوست پشت میں رہیں گے۔" اس واقعہ کو شاعر نے نظم کیا ہے:

اخل النبی ید الحسین و صنواہ یوما و قال و صعبہ فی مجمع

من و علی یا قوم او ہذین او ابوجہا فی الخلد مسکنہ معی

یعنی: "ایک دن مجھے حسینؑ اور اس کے چچا جی کا ہاتھ پکڑا اور صعبہ سے بڑے اجتماع میں

فرمایا: اے لوگو میں تم سے ان دونوں سے ان کے ماں باپ سے صعبہ رکھے گا اس کا ٹھکانہ

میرے ساتھ جنت میں ہوگا۔"

اس روایت میں ایک عام اعلان اور رسولؐ کا پھنچوانا توجہ کے قابل ہے۔

رسولؐ کا سجدہ اور حسینؑ ایک دن جناب رسالتؐ نے حسینؑ کو سنبھالنے کا حکم قدس پر لٹائے رہتے تھے اور حسینؑ چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے ریش اترتے تھے کھیتے تھے کئی روز حسینؑ اس میں کشتی لڑ رہے تھے جناب رسالتؐ نے حضرت فاطمہؑ سے مندرمایا کہ: "حسینؑ کو سنبھالو۔"

لیکھ یهودی کا اعتراض ایک مرتبہ ابورافع اور حسینؑ (ایک کھیل جس میں لڑکے گڑھا کھودتے ہیں اور اس میں چھوٹے چھوٹے پتھر یکے بعد دیگرے رہا کرتے ہیں) اگر دو سوا پتھر پہلے سے لگ جاتا

ہے تو جس کا پتہ لگا ہے وہ بچے پر سوار ہوتا ہے (کھیلے تھے جب ابو رافع جیتے تھے تو حسین کہتے تھے: تو چاہتا ہے کہ اس کی پشت پر سوار ہو جے رسول اپنی پشت پر سوار کرتے ہیں۔ اور جب حسین بازی لے جاتے اور ابو رافع کی پشت پر سوار ہونے کا قصد کرتے تو ابو رافع کہتے تھے: یا ابا عبد اللہ تم نے میں سوار ہونے نہ دیا۔ ہم بھی نہ سوار ہونے دیں گے۔ اب حسین کہتے تھے: کیا اس پر راضی نہیں ہے کہ اسے اپنی پشت پر سوار کرے جسے رسول اپنی پشت پر اٹھاتے ہیں۔ بے چارہ ابو رافع معقول ہو کر چڑھی دیا کہ تاحدا

کشتی یا دلی ایک دن حسینؑ نے رسولؐ کی خدمت میں کشتی لٹنی چاہی اور رسولؐ کو بچ بتانا چاہا۔ مگر رسولؐ نے فرمایا: کشتی نہ لڑو بلکہ دسلیاں لکھ کر لادو۔ جس کا خط اچھا ہو گا وہی جیتا۔ بھولے بھولے بچے اپنی اپنی تعریف کے حوصلہ میں دسلیاں لکھ کر لائے۔ اور رسولؐ نے دونوں کی سسر گری دیکھ کر اس خیال سے کہ کسی کی دل شکنی نہ ہو فرمایا: ”میں اُسی ہوں بہتر ہو گا کہ دسلیاں اپنے ہلپ کو دکھاؤ۔“ بچے دسلیاں لیے ہوئے علی بن ابی طالب کے پاس آئے اور قصہ معلوم ہونے انھوں نے منسلما: ”بہتر ہو گا کہ تم اپنی ماں کو دکھاؤ۔“ بچے اب اپنی ماں کے پاس آئے، اور جب زکیہؓ کو معلوم ہوا کہ ٹٹا اور ہلپ نے فیصلہ سے کسی کو رنجیدہ نہیں کیا۔ تو نہایت خوب ترکیب نکالی اور منسلما: ”میرے گلے میں ہار ہے، میں اس کے دانے زمین پر پھینکتی ہوں جو زیادہ والے چھوڑا۔ اس نے ہفتی دیا۔“ مٹی بھرانے گئے اور شہنشاہ اسحاقؒ سے دونوں صاحبزادوں نے برابر دانے چنے اور مٹی کو نافی کا مہرغ نہ ملے۔

حسینؑ کا تسلانا اور تکبیر کا زبان پر جاری کرایا جانا رسولؐ ایک مرتبہ نماز کے لیے کھڑے ہوئے اور تکبیر کہی حسینؑ بھی کھڑے ہو گئے مگر پوچھ کر ہی تکبیر زبان سے صاف نہ ادا ہوئی تھی۔ رسولؐ نے سات مرتبہ اہلادہ فرمایا اور اب حسینؑ کی زبان پر رواں ہو گئی۔ ایک مرتبہ جناب رسالتؐ نے یہاں تک کہ جناب قاضی زہراؑ کے دولت مہر پر تشریف لائے۔ یہاں حسینؑ کو نہ پالنا۔ دریافت سے معلوم ہوا کہ بھوک کی وجہ سے باہر کھینے چلے گئے ہیں۔ اس وقت ابو رافع آگئے اور ان سے معلوم ہوا کہ علی بنی جذعان میں ہیں۔ رسولؐ تشریف لے گئے اور لے آئے۔

حسینؑ کو نانا کا کندہا زیادہ محبوب تھا ایسا ہی ایک موقع صحیفہ بنی بھار میں ہوا تھا اس وقت حضورؐ اقدس نبویؐ کے ہمراہ جناب امیر المومنینؑ اور اصحاب تھے رسولؐ نے کندہے پر بخالیدؓ علیؓ اور اصحاب نے اپنی اپنی گود میں لینا چاہا مگر صاحبزادوں نے کہا: ”نانا میں آپؐ کا کندہا اور لوگوں سے زیادہ محبوب ہے۔“

حسینؑ و حبیبہؓ کی بے تکلف تھی حسینؑ و حبیبہؓ کی بے بہت بے تکلف تھی اور جب یہ اپنے جاری سفر سے واپس آتے تھے تو حسینؑ کے لیے حنف لیتے آتے تھے اور حسینؑ ان کی گود میں بچے کر سب کا طریقہ کر لیتے تھے۔

گھوڑے کی سواری سکھائی جاتی ہے ایک مرتبہ حسینؑ گھوڑے پر سوار ہو رہے تھے کہ اپنی

عہد میں نے رکاب چھو۔ کسی نے اعتراض کیا احترام حسینؑ کی عہد میں اس کے احترام کی بنا پر تھا۔ ابن عباسؓ نے جواب دیا: ”یہ فرزند ان رسولؐ ہیں اور جو نعمت خدا نے مجھے عطا فرمائی ہے اس کی شایان ہے کہ میں رکاب پر ہاتھ رکھوں اور ان میں اچھی طرح گھوڑے پر بیٹھا جاؤں۔“

اس بچے سے رسولؐ کی محبت جسے حسینؑ سے محبت تھی روایتوں میں اس سے زیادہ

کوئی روایت تلاش کی جاسکتی ہے جو ذرا عین ترجمہ خاص باتیں میں ملتی ہے کہ: ”ایک دن ایک لڑکے کو حضرتؐ نے بازار میں دیکھا، پس بچہ گئے اور اسے اٹھایا اور اس بچے سے ملافت فرماتے تھے ایک شخص نے سبب اس کا دریافت کیا فرمایا کہ: ”یہ بچہ میرے فرزند حسینؑ کو دوست رکھتا ہے۔ کیونکہ میں نے دیکھا ہے کہ خاک و دم حسینؑ کو اپنے منہ پر ملاتا تھا۔“

حسینؑ کی علالت، نذر اور بل اتی ایک مرتبہ حسینؑ کچھ علیل ہو گئے اور تندرستی گئی کہ اگر خداوند تعالیٰ

نے صحت عطا فرمائی تو تین روزے رکھ دیتے۔ حسینؑ صحت یاب ہوئے اور روزے رکھنے کے علاوہ تین صاع جو قرآن لیا گیا، روزہ رکھا گیا اور اظہار کے وقت ایک مسکین آگیا، جناب امیرؑ نے سنا اور حضرت فاطمہؑ کو مخاطب فرما کر ارشاد کیا کہ: ”ایک سختی رسیدہ اندوگین ہے، اور ہم سے گرسنگی کا شکار کرتا ہے۔“ (دیوان جناب امیرؑ)

اہل بیتؑ اور مسکین و یتیم و اسیر ظاہر ہے جواب دیا کہ: ”میں اسے کھانا دوں گی۔“

تنگی کی پرورہ نہیں ہے اور بھوکے کو سیر کرنے کی آرزو رکھتی ہوں۔“ آج کا حصہ کھانا دے دیا گیا اور بچہ تک بھوکے رہے۔ دو سیرادوں ہوا، پھر روزہ رکھا گیا۔ اظہار کا وقت آیا اور آج یتیم نے دروازہ پر صدادی اور آج پھر جناب امیرؑ نے فرمایا: ”میرے سید کرم کی دختر! اللہ ہمارے پاس یتیم کو لایا ہے، جو شخص آج رجم کرے گا وہ رحیم ہے۔“ سید نے فرمایا کہ: ”میں یتیم کو کھانا دوں گی ملاحظہ میرے بچوں نے بھوکے شام کی ہے۔“ تیسرا دن ہوا۔ یہ نذر کرنے والے جو استقلال کا خزانہ تھے، آج بھی روزہ سے تھے کس طرح شام کی ہوگی، اور کس قدر ضرورت ہوگی کہ یہ کچھ کھاتے لیکن ہونے والا یہ تھا کہ ان کا مخلوق الہی کے ساتھ رجم ذاتی تکلیف پر غالب آئے۔ آج بقیہ تیسرے حصہ کی روٹیاں اظہار کے لیے تیار کی گئی تھیں۔ لیکن آج ایک اسیر کو آواز دی تھی۔ تیسرے دن کے بھوکوں نے سنا اور رحمہ لکھا لیکن کے دمی نے کہا: ”اے فاطمہؑ اے پیغمبر ستودہ کی بیٹی بے شک آراستہ کیا ہے خدا نے اس (قیدی) کو گردن نازک سے۔ زنجیر میں بندھا ہوا اور طوق میں مقید، ہم سے اٹھ بڑھی ہوئی بھوک کا شکار کرتا ہے۔ اے بغیر احسان شوم کے کھلاؤ۔ یہاں تک کہ تم جزادی جلاؤ اس چیز سے جس کی نہایت نہ ہو۔“ جناب فاطمہؑ نے جواب دیا: ”جو کچھ آپؑ نے تھے اس سے بڑا ایک صاع کے کچھ باقی نہیں ہے اور میری ناقص ذرا ان کی نوک سے کھس گئی ہے۔ خدا کی قسم میرے دونوں بچے بھوکے ہیں۔ ان کا ہاں خیرات سے ٹکی کر لے والا ہے۔“

اس کے بعد اہل بیت نبوتؑ بلکہ ان کی مشہور خادمہ حضرت زینبؑ نے بھی اپنا حصہ رونا خدا میں بخش دیا۔
بالاختیار تین دن بھوکے رہے
 غالباً یہ پہلا تاریخی دن تھا جس میں اہل بیتؑ خصوصاً حسینؑ تین دن تک بھوکے رہے۔ اگرچہ یہ بالاختیار تھا ہم لوگوں کے لیے یہ اس قدر واقعہ ہے جس قدر کائنات اور ظلم کی زبان اندازہ کرا سکتی ہے لیکن ان نفوسِ مقدسہ کے لیے یہ ایک ایسا واقعہ تھا جس کا یہ خود اندازہ کر رہے تھے بلکہ واقعہ ان کا اور یہ واقعہ کا اندازہ کر رہے تھے ہم کو واقعہ سے ان کا اندازہ کرنا چاہیے۔ سن لینا اور ذرا سال کے اس عالمِ برداشت پر متاسف ہو جانا اور یہ اور ایسا دل رکھنا جو دوسروں کو اپنے اوپر ایسی سخت حالتوں میں مقدم رکھے اور یہ جو کو ان پر نازل تھا رحم و کرم کا ان سے انتظار تھا یہ اس قابل تھے کہ سورہ ہل اتی سے متاثر کیے جاتے۔

اسی سنہ میں رسولؐ نے قبیلہ بنو منلیح کی گوشمالی کے لیے جنھوں نے وجیہ کبی کا مال لوٹ لیا تھا زید بن حارثہ (واقعہ بنو منلیح ششہ کے قبل کا ہے) یا اگر ششہ کا ہے تو یحییٰ زید بن حارثہ کے کوئی دوسرا انصر بھی گیا) کو روانہ کیا نہچ کے سپاہیوں نے کچھ بنو منلیح کو بھی قتل کیا جو مسلمان تھے بنو منلیح نے رسولؐ کو خبر دی اور غائبی کی کہ ہمارے امیر رہا کیے جاویں۔ جناب رسالتؐ آپ نے قبول ابن خلدون: ”علی بن ابی طالب کو اوٹ پر سوار کر کے مل کے پہلے روانہ کیا اور صدیقی کے لیے انہی تلوار مرمت فرمائی۔“ (ابن خلدون)

اسی سال جناب رسالتؐ آپ نے حضرت امیر المومنین کو تین سو حوازیوں کے ساتھ یمن کی طرف روانہ کیا۔ ان کے لیے ایک لشکر مرتب فرمایا۔
رسولؐ اپنے ہاتھ سے آراستہ کرتے ہیں
 سر پہ اپنے دست مبارک سے عمامہ باندھ کر اس کا ایک سرا موڈ سے کی طرف اور دوسرا پشت کی جانب رکھا گیا۔

اور فرمایا: ”اے علیؑ میں تمھیں بھیجتا ہوں مگر تمھاری جدائی پر افسوس کرتا ہوں۔“
اظہارِ تاسف جدائی پر
 علیؑ پر رسولؐ کی ایسی ہی توجہ کی حدیث مشکوٰۃ المصابیح سے ملے گی کہ: روایت ہے ام حلیہ سے کہ کہا: بھیجا رسولؐ خدا علیؑ علیہ وسلم نے ایک لشکر کہ ان میں عسلی تھے رسولؐ کی ایک دعا: کہا ام حلیہ نے: پس میں نے آنحضرتؐ سے اس حالت میں کہ اٹھائے والے تھے دلوں ہاتھ اپنے دعا کے لیے دافرتے تھے یعنی دقت پہنچنے ان کے کے یا نزدیک توقع آئے ان کے کے یا الٹی ہندار فوج کو یہاں تک کہ دکھلائے تو فوج کو علیؑ کو سلامتی سے پھر کر آویں۔ قتل کی یہ تمذی نے۔ یہ بھی کہہ دیا چاہتا ہوں کہ علیؑ اس پر ختم سے قبول ابن خلدون خالد بن ولید کے بھیجے جانے کے بعد روانہ کیے جا رہے تھے۔

یمن میں علیؑ کی دعوتِ اسلام کی کامیابی کی اطلاع پر رسولؐ نے سب سے شکر کیا اور تین مرتبہ ”السلام علیٰ محمدؐ“ فرمایا۔ یمن کا قیام اور انکلام اس کا مقدمہ ہوا کہ جناب رسالتؐ آپ اقتضاکم علیؑ فرماتے۔
علیؑ کی دعوت کے قبیلہ ہمدان اسلام قبول کرتا ہے

علی رسول کے اخلاق و شمائل کی شرح کرتے ہیں

شولہ النبوة ص ۱۰۰ ج ۱ کی یہ روایت کسب خور کے قابل ہے کہ :

”چون حضرت امیر مہر جرح اخلاق و شمائل رسول ﷺ مشغول شد بحسب الاحادیث تقسیم کردہ حضرت امیر سبب تقسیم پر سید۔ کتب گفت : بسبب این صفات کہ ما در کتب یہود و نصاریٰ خود چنان یافتہ ایم پس تصدیق کرد و ایمان آورد۔“ (فرقا الیون وغیرہ)

یعنی : جب حضرت امیر نے رسول خدا کے اخلاق و صفات کی شہود کرنی شروع کی تو کتب الاحادیث مسکراتے۔ حضرت نے مسکراتے کی وجہ پوچھی۔ کتب بولے : ان اوصاف کی وجہ سے کہ ہم نے خود اپنی پرانی کتابوں میں ان کو پایا ہے۔ پھر تصدیق کی اور ایمان لے آئے۔

بریدہ رسول سے علی کی شکایت کرتے ہیں

واقعہ یمن کے متعلق ایک ہات اور فکر کی گئی ہے جس سے مؤرخین نے بعض مفید موقوع پر پناہ لی ہے

اور وہ یہ ہے کہ محمد اسباب فتن کے ایک کنیز تھی جسے جناب امیر نے اپنے ذمہ رکھ لیا۔ بریدہ مقرر فرمایا اور اس نے خالد بن ولید سے بھی کہا کہ اگرچہ جناب امیر نے اسے جواب دیا کہ وہ مال فتن میں تھی لیکن بریدہ کو شک کیا نہ پہلی اور جناب رسالت اکہ کی خدمت میں شکایت کی۔

شکایت سن کر شکایت کرنے والے پر رسول کا غصہ

پہول مؤرخین رسول نے مندرمایا :

”توان کو دشمن نہ رکھ۔ اگر تو ان سے دوستی رکھتا ہے تو ان کی دوستی میں زیادہ کہ اسے بریدہ اس کا حصہ فتن میں سے زیادہ اسے کنسب دے گا۔“
بریدہ کی زبانی یہ بھی روایت ہے کہ : ”صلی علیہ وسلم پر حضرت کے رسولوں کا رنگ چمک اٹھا یعنی غضب سے اور مندرمایا : ”علی کی شان میں بدگمانی نہ کر، اس لیے کہ میں اُن سے ہوں اور وہ مجھ سے ہیں اور وہی تمہارے مولا یعنی معظم و مکرم اور رفیق ہیں۔ جس کسی کا میں غولی ہوں، اُس کے علی غولی ہیں۔“ یہ سن کر بریدہ کے نزدیک کوئی صلہ میں سے نہ تھا کہ حضرت علی سے زیادہ دوست ہو۔“

حجۃ الوداع کی جماعت علی کو خبر نہ بھی گئی

زمانہ حج قریب پہنچ گیا تھا رسول نے اپنے ارادہ حج کا اعلان فرمایا اور علی کو جو یمن میں تھے خبر دی۔

جہاں تک روایتیں بتا سکتی ہیں وہ یہ ہے کہ اس مرتبہ رسول کے ہمراہ حج کو جانے والی جماعت ایک لاکھ سے زیادہ تھی۔ علی پہنچ گئے، اور رسول کے پوچھنے پر کہ تم نے کیا نیت کی ہے، مندرمایا : جو آپ نے نیت کی ہے۔ ارکان حج بجالانے گئے۔ اوشٹ نم رکھے گئے، اور شورا اُس کا پیغمبر خدا نے علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ تسلول فرمایا اور عزت و شرف میں ایک طویل خطبہ پڑھا جس میں مندرمایا :

عرفات کا خطبہ

ایہا الناس ! سنو ! بلا خطبہ میں آئندہ اس سال کے بعد تم سے اس مقام پر ملنے کا حق نہیں کر سکتا ہوں۔ اس کے بعد قتل و غارت سے منع کیا۔ امن و امان داری میں ایمان داری کی تاکید کی۔

جاہلیت کا خون وضع کیا۔ سود کی ممانعت کی اور خود سے عباس بن عبد المطلب کا سود اور ربیعہ بن العوف بن عبد المطلب کا خون ممانعت کیا۔ عورت اور مرد کے حقوق کو واضح فرمایا۔ کسی کا مال لینے اور فیسوں پر ظلم کرنے سے ممانعت فرمائی اور ارشاد کیا کہ مسلمان ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔ (ابن طلحہ و غیرہ)

غدير خم میں قیام اشد مراجعت میں غدير خم پہنچے۔ موقع تھا کہ لوگ اپنے گھروں کو واپس جاتے۔ لیکن رسول نے سب کو ٹھہرنے کا حکم دیا۔ میدان صاف ہونے لگا۔ پالانٹل کا میٹر بننے لگا۔ اور ہر شخص جو مناسک حج اور دیگر امور میں جنب رسالت مآب کا ظہر اور وضو سن چکا تھا غدير ہوا کہ اب یہاں کیا ہونے والا ہے۔ رسول اس مقامی میٹر پر تشریف لے گئے۔ وہ تمام جمع جو ساتھ ساتھ آیا تھا افسوس کا شوق زیارت رسول کے تھیں۔ ظہار سے اور بڑھ گیا تھا کہ: ”اس سال کے بعد تم سے اس مقام پر ملنے کا یقین نہیں کر سکتا۔“ دھڑکتے ہوئے دل، اٹھی ہوئی لڑھکیاں اور کھلے ہوئے کانوں سے ایک ایک لفظ کو جو رسول کی زبان اقدس پر جاری ہوتا تھا بڑی پیاس کے عالم میں پیتا جاتا تھا۔ بچے عین ہے کہ اگرچہ عربوں کا بیچ بہت خاموش جمع نہیں ہوا کرتا لیکن اس موقع پر جو خاموشی کے کوئی زبان نہ بولتی ہوگی اور رسول خدا کے الفاظ ہوں گے جو میدان میں پھیلتے اور گونجتے ہوں گے اور لوگ اپنے مناظر میں ذخیرہ کرتے جاتے ہوں گے (دیکھئے: مشکوٰۃ الصالح)

رسول اولی بالمؤمنین ہونے کا اقرار لیتے ہیں رسول کے پہلے ہی استقبال پر لوگوں کو عجب ہوا ہوگا۔ وہ اپنے دلوں میں کہہ رہے ہوں گے کہ رسول کو

ہماری طرف سے شہر کی کیا وجہ ہوئی جو ہم سے بچتے ہیں کہ: ”السمتعلمون الی اولی بالمؤمنین من القسم۔“ (کیا تم نہیں جانتے کہ میں بہ نسبت مومنین کے اللہ کے ان پر اولی ہوں)

اثبات میں جواب اور تاکید یہ ہے کہ اس سوال کی تین مرتبہ حجاز کی اور بیحجاز نے جواب دیا کہ: ”ہاں آپ اولی بالمؤمنین من القسم ہیں۔“

رسول کے سوال کی غرض اس کی بلندی تھی سوال کا مطلب اب کھلا۔ جب رسول علی کی طرف پرچہ۔

جو لوگوں سے انھیں ہاتھوں پر تھا ان کی بظوں میں ہاتھ دیا اور اٹھایا۔ یہاں تک کہ کل آنکھوں

ملنے وہ دیکھنا چاہتیں یا نہ چاہتیں یہ دیکھا کہ وہ بچے جو روز ولادت

انھیں ہاتھوں پر تھا آج پھر دست اقدس پر بلند ہوا ہے، اور ان گل کاٹوں نے وہ سننا چاہتے یا نہ چاہتے۔ مسئلہ:

ہو معنی دعاء: اللہم من کنت مولاه فعلی مولاه (خداوندنا جس کا میں مولا ہوں میں اس کا علی بھی مولا ہے)

اللہم وال من والاه و ما دہ و انصر من نصرہ و اخلل من اخللہ (خداوند اوروں سے رکھ لے جو ایسے دوست رکھے اور دشمنوں سے رکھ لے جو ایسے دشمن رکھے، مدد کر اُس کی جو ایسے مدد فرمے جو مدد فرمیں جو اُس کو چھوڑ دے)

و ادر الحق حیث ما دار علی (اور میری حق کو ساتھ لے کے جس طرف وہ پھرے)

موسیٰ کی وداعی تقریر اور خاتم النبیین تبلیغ اپنے کو دہوارہ کی تھ۔ مٹنے نے اپنی آخری وقت میں ختم

سیتم کو دداعی تقریر اور اپنی ہدایت کی تصدیق وغیرہ کے لیے چنا تھا

جس کے ایک طرف کوہ اکمل اور دوسری طرف کوہ گریزیم تھا۔ اسرائیل کے ہر چھ قبیلہ ایک ایک پہر کھڑے تھے اور اپنے ہاتھ کے قتل کے جواب میں آئین کہتے تھے۔ ہلوسے ہاتھ لے کر اور اذنیہا کہ اپنی زندگی میں مسلمانوں کے بیچ کو دو حصوں میں تقسیم کرتے جو گویا جوڑا اور اسرائیل کی حکومتوں کی پیشین گوئی ہوئے۔ صرف تہار رسول تھے جو فارہ تھے اور تم کی گمانوں میں مسلمانوں کا ایک جسم تھا جو سخت و محبت میں اپنے ہاتھ کے اولیٰ ہونے کا استدار کر رہا تھا۔ اور اپنے رسول، متین اور جان قوم کی زبان سے نہ صرف یہ سن رہا تھا کہ: ”جس کام میں مولیٰ ہوں اس کے علیٰ سوا میں“ بلکہ:

مرکز سے ہلا شیلہ کر رہے تھے اس کے علاوہ دوسرے نقطوں میں ایک مرکز بیان رہا تھا کہ:

میں تم میں دو امر عظیم چھوڑے جاتا ہوں، ایک قرآن (مجموعہ قوانین) دوسرے میرے اہل بیت (مائل) اور یہ دونوں ہر گز ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں گے (یاد رہے کہ اگر تم ان سے منک کر دو گے تو گمراہ نہ ہو گے) تورات مگنی باب ۲ کی ۲۲ آیت میں تم پڑھو گے کہ جس وقت محمد خدا سے حضرت موسیٰ نے وضع بن نون کو اپنی امت کا پیشوا مقرر کیا (ہارون کی رحلت کے بعد) تو صرف یہ کیا تھا کہ یسوع کو لے کے البعز رکابن اور ساری جماعت کے سامنے کھڑا رکھا اور اپنے ہاتھ اس پر رکھے اور اسے جیسا خداوند نے اس کو فرمایا تھا وصیت کی۔ تاریخ اسلام رسول کے وصی کی تقرری کے وقت حالات کی تفصیل بیان کرتی ہے، مگر پھر بھی مسلمانوں کو واقعہ اور تفصیل کے سامنے غور کی ضرورت ہے۔

ایک زمانہ کے بعد لوگوں نے شہادت دی یہ واقعہ ایسا صاف اور صریح تھا کہ تاریخ انصاف اور مواحق عرق کے موافق آئندہ زمانہ میں علی کے سوال کرنے پر حاضر الوقت تیسرا صحابہ بنے گواہی دی، یا شاہد النبوة کے موافق دس انصار نے تائید کی۔

خیمہ نصب کیا گیا، مبارکبادیں دی گئیں صاحب روئے انصاف کوئی حجب غیر بات نہیں کہہ رہا ہے کہ اس واقعہ کے بعد خیمہ نصب کیا گیا لوگوں نے مبارکبادیں دینا شروع کیا۔ جس میں سب سے ممتاز اور یادگار تہنیت حضرت عسکر کی تھی۔ قبول صاحب منافع:

”ملاقات کی حضرت امیر المومنین علیؑ سے ”امیر المومنین“ عمر نے بعد کجایت کی اور کہا گوارا ہوا اور شاد ہو اے ابو طالب کے فرزند کہ بیچ کی تم نے ابو زخام کی اور ہونے تم مولد تمام مومنین کے کیا ہو کیا نور ہے۔ روایت کیا ہے اس حدیث کے شیعہ احمد نے براہ بن عازب سے اور زید بن ارقم سے کذا فی مشکوٰۃ۔

آیہ اَکْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ اِی وَنْ نَّازِلٌ هُوَا یہی دن تھا جس میں مؤرخین مثل طبری و تاریخ الاسلام مولوی عباسی صاحب قاتل

ہیں کہ آیہ: الْيَوْمَ اكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ (۵: ۳) نازل ہوا۔ کیونکہ: يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ وَإِنْ لَمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ وَاللَّهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ (۵: ۶۷) کی ایسے سخت موقع پر تمیل کی گئی تھی۔

آیت کی تسکین دی وَاللّٰهُ يَتَصَدَّقُ بِكَ مِنَ الْمَالِ (اللہ تجھے لوگوں سے بھانے کا نہایت لوجہ کے قابل قرار دے گا جس سے اس پر ہائی روشنی پڑتی ہے کہ رسول نے جو کچھ آج کسب اس کا کرنا بہت محفوظ نہ تھا۔

واقعہ غدير پر ہم کوئی مزید بحث نہیں کرتے جیسے ہم ”الکرار“ اور ”الماست تاریخی حقیقت سے“ میں کافی حد تک کر چکے ہیں۔ وہ جو واقعہ غدیر میں رسول کے حلف اور صریح طرز علی اور لوگوں کے سرورانہ مبارکبادوں کو اہم واقعہ نہیں سمجھتا جسے علم میں تاریخ اپنی ضرورتوں کے وقت دہرایا کرتی یا جو اس موقع پر رسول کے ایسے بالاعلان نمائش کو علی کے متعلق رسول کے اقوال اور افعال کا ثبوت نہیں دے سکتا۔ اس کے لیے کوئی بحث اور عقل بکار آمد نہیں ہو سکتی۔ میں اپنا خیال رائٹ آریل سید امیر علی صاحب کی ”امپریٹ آف اسلام“ سے پیش کرتا ہوں اور بس۔ مدوح منسخت ہیں: ”یہ عموماً خیال کیا جاتا ہے کہ رسول نے ولید بن مغیرہ کیسے یہ واقعات کا ایک غلط توہم ہے۔ کیونکہ اس کی کافی شہادت ہے کہ رسول نے اکسہ ولید کی لیے علی کی طرف اشارہ کیا۔ خصوصاً حاجہ الوداع کی دایہ کے موقع پر اس جگہ ہے ”غم“ کہتے ہیں شہر گئے اور مع میں جو انکار فرماتے اس سے ان کے ارادہ ولید کی شہادت میں شہر کی گواہی نہیں رہتی۔“

تاریخ اسلام کے تاسف کا موقع۔ تاریخ اسلام کو اس کا افسوس ہونا چاہیے کہ ایک ایسے مسند کے متعلق ہے ہمارے عقیدے نے واضح سے زیادہ صاف کر دیا تھا اور نہ صرف قول بلکہ فعل سے اس کا ترجمہ فراہم تھا۔ زندہ کو اس کی ضرورت ہوتی کہ احتکات کیا جاتے تھوٹ اور غدیر میں اعلان اور ادا لے رسم کا تھوڑا فرق تھا۔ یہ ہم پیشتر کہہ چکے ہیں کہ واقعہ حاجہ الوداع کے بعد ہوا اگر واقعہ تبوک میں جناب امیر حقوٹے دنوں کے لیے قائم مقام بنائے گئے تھے اور مشہور حدیث سے اکسہ کی ولید کی روشنی ڈالی تھی تو واقعہ غدیر میں ولید کی روایت عطا کرتے گئے تھے۔ یہ باتیں ان لوگوں کے لیے خوش آمد نہ ہو سکتی تھیں جو اسلام لائے کو اس شرط سے مشروط کرنا چاہتے تھے کہ ”تو پھر میں اپنے بعد اپنا خلیفہ بنو گے؟“ واقعہ عقبہ کی ملتوی وجہ بیان کی گئی۔ یادہ جنہوں نے موٹے موٹے نظروں میں یہ ظاہر تو نہیں کیا لیکن امارت کے لیے سرور آئیں، سینہ میں رہ نہ سکیں۔ اب ان کے لیے اس سے زیادہ کوئی بڑی چوٹ ہو سکتی تھی کہ وہ ذوالعشرہ کے بالاعلان خلیفہ کی رگی ولید کی دیکھتے اور خواہ مخواہ چہرے پر بے صاف اور خوشی بوقت کے آثار ظاہر کرنے پڑتے۔ اگرچہ ولی انیشتا اور بیٹا جاتے تھے۔

واقعہ عقبہ میں رسول پر حملہ کی غرض بہت غور سے اس کا اندازہ کرو کہ واقعہ عقبہ ظہری دشمنوں کا کام نہ تھا کیونکہ وہ تو خود سے پیچھے رہ گئے تھے اور تبوک یا حاجہ الوداع ہی کے بعد ان کا یہ محکم ارادہ کہ رسول کو شہید کریں اور کیا وجہ عداوت کہا سکتا ہے۔ یہ اس کے کہ جب ہماری امیدیں خاک میں مل گئیں تو ہم اپنی حسرت کا انتقام کیوں نہ لیں۔ اور پھر اکسہ کی ٹکری کریں۔

آئندہ کے متعلق انعکاس تم یہ بھی گویا کہ جو کہ منافقین کا نام چسپاں ہوتا تھا۔ اب اس کے بعد جو واقعات بیان ہوں گے ان کی طبیعت نہیں مخالفت کے اور روشنی شدید بہتے ہوئے دھاروں کا حال بتائیں گے اور تمہیں بہت سے اگلے پچھلے واقعات کیسے ہی چھپائے ہوئے یا کیسے ہی غفلتوں میں کیوں نہ بیان کیے گئے ہوں یا کسی روشنی میں کیوں نہ بخدش بنے مٹا دیے ہوں گویا آجائیں گے تم آدمی بچاؤ گے۔ تم لوگوں کے متعلق رسول کا خیال کج ہو گے اور تمہیں اس وقت ان کا درجہ اور مقدار سمجھنے کا ترانہ مل جائے گا۔ واقعات گزشتہ تمہارے مددگار ہوں گے۔ تمہارے سامنے ہیں موافق مقررہ کی یہ روایت بھی ممکن ہوگی جو ابو حنیفہ غیری سے مذکور ہے کہ:

”مناظر را بہ این شاکم کہ امیر المومنین علی را دشمن میدانست۔“

یعنی: میں منافق کو اس سے بچاتا کہ وہ امیر المومنین علی سے دشمنی رکھتا تھا۔

حجۃ الوداع کے بعد ہادی کی حیات ہادی ملام باقرہ غیری کے بعد بہت دنوں تک اہل علم کے لیے زندہ نہ رہا۔ زیادہ سے زیادہ مدت تراسی دن اور کم سے کم تین دن۔

دروازوں کے بند کرنے کا حکم علی کو مستثنیٰ کر کے انہیں دنوں میں جناب رسالت مآب ﷺ نے حکم دیا کہ جن لوگوں کے

دروازے مسجد کی طرف ہیں وہ بند کر لیں۔ اس کے بعد قبولِ روضۃ الشفا:

”إلا خاد علی، فشد مودک: ما از مسجد او گریز نیست و او را از مسجد من۔“

”سوائے علی کے گھر کے۔ فرمایا کہ میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتا اور وہ مجھے بغیر نہیں رہ سکتا۔“

قبولِ مناقب حضرت علی: ”یہ امر صحابہ کو مشاقی گزرا۔ اگرچہ جناب رسالت مآب نے مستثنیٰ کیا تھا کہ: ”تمہارے گھر خدا کا ہے۔“

حضر عمر کی درخواست شریعت نامنظور کی گئی مظاہر حق ترجمہ مشکوٰۃ الصالحین میں ہے کہ: ”عمر نے درخواست کی کہ اپنی دیوار میں ایک روزن چھڑ دی تاکہ دیکھ لیا کریں اس شخص کو جس وقت کہ آویں مسجد میں۔“ لیکن فرمایا نہ حضرت نے کہ: ”نہ چھڑیں اگرچہ مقدار تک پہنچ سکے۔“

اسی کتب میں ہے کہ: ”پوچھے گئے ہیں عمر کہ کیا کہتے ہو پچھتی عثمان اور علی کے؟ کہیں بیان کیا ہے کہ صرف بعد اس کے کہامت پر چھ سال علی کا اور قیاس نہ کرو کسی کو ان پر بند کیے دروازے سب کے سوا دروازہ ان کے۔“

بعض احادیث علی کے لیے اس امتیاز کا بھی ہونا تاریخ اسلام کے ہاتے والے کے لیے جب غیر نہ ہوا اور اگر فی حدیث میں دل چاہی ہے تو یہ احادیث مدد دیں گی کہ: ”انا صدیقہ العظمیٰ وعلی بابہا۔“ یا ”انا دار الحکمة وعلی بابہا۔“ (میں شہر ہوں علم کا یا گھر ہوں حکمت کا اور علی اس کے دروازہ ہیں)

یا "لا یجل لاحد ان یجنب فی هذا المسجد خیری و غیری" (جملہ نہیں ہے کہ کوئی خاصہ جنب میں ہو اس مسجد میں جو اُنے میرے اور تیرے) یا "علی باب حطه من دخل منه کان موحدنا و من خرج منه کان کافرا" (علی باب مغفرت اور حطہ ذنوب ہیں جو کوئی اس دروازہ سے داخل ہوا اور اس کی متابعت کی وہ مومن ہے اور جو شخص کہ اس سے باہر نکل گیا اور پیچھے پھری وہ کافر ہے) (مواہق فرقہ)

اس سے معلوم ہو گا کہ اس کے لیے مسجد کا دروازہ بند نہیں کیا جاسکتا تھا جو پرستی استغفاروں پر معنی استغفارہ میں دروازہ کہا گیا ہے۔ اب دوسرا سوال یہ ہوتا ہے کہ پھر کیوں لوگ ایسے دروازے سے جہان سے دور نکل کی نقل و حرکت دیکھ سکتے تھے اور ہاں پہنچ جاتے تھے اسی سختی سے روکے گئے درازنہ ایک سوراخ کی ابتداء مانگتے والے بعض مؤرخین کے نزدیک اتنا بگڑا ہوا ہے کہ نہ تھے۔

بہت سی رائے بہت سے قرآن مہیا کرے
 کم سے کم ایسے شخص کو جس کے متعلق مفسرین میں
 اپنی عمارت سے علی کی نہانی کہلایا گیا ہے کہ:
 "مشرکان ایک رائے عمر کی رائے میں سے ہے۔" یہ امتیاز دینا چاہیے تھا کہ ان کا مسجد کی طرف والا دروازہ کھلا رہنے
 دیا جاتا۔ خصوصاً ایسی حالت میں جبکہ انہوں نے ایسی بات کی تھی کہ اس کے برخلاف بغیر کسی ایسی بات کے اس کا دروازہ
 کھلا نہ ہوتا۔ کیا جے پیشتر امتیاز دینے گئے تھے۔

رسول پوچھیں گے کہ تم نے علی کے ساتھ کیسا سلوک کیا
 اور جس کے متعلق مرض
 موت میں ایک مجمع کے
 سامنے ہاتھ پکڑ کر قبول موافق فرقہ فرمایا تھا کہ:

"هذا علی مع القرآن و القرآن مع علی لا یفترقان حتی یردنا علی الحوض فاستلھما
 کیف خلفتم فیما۔"

(یہ علی مشرکان کے ساتھ اور مشرکان علی کے ساتھ ہے۔ یہ دونوں آپس میں جہاد نہ ہوں گے
 جب تک میرے پاس وحش کوثر پر وارد نہ ہوں میں پوچھوں گا کہ میرے بعد تم نے
 اللہ سے کیسا سلوک کیا)

میں اس دوسرے سوال کا جواب مناسب وقت کے لیے اٹھا رکھا ہوں۔

ہادی کی علالت
 جناب رسالت مآب ﷺ تپ اور درد میں مبتلا ہو گئے۔ اب موقع تھا کہ دوسرے
 وزیر اعظم جنہوں نے ہجرت میں مشہور اونٹ مشہور قیمت پر پیش کش کیے تھے جن پر فارکی
 مصابحت میں مشہور کیفیت طاری ہوئی اور انہیں رات کو سانپ لے گاٹا اور سانپ کے زہر کا اثر ہوتا درد
 بڑھتا رہا جنہوں نے سہرا کا تھول سے زیادہ بیبت سے خیر مقدم کیا۔ رسول سے ہادی کی التجا کرتے۔
 لیکن حجت یہ ہے کہ قبول روضۃ القضا اس زمانہ تک کے
حضرت ابوبکر کی درخواست رد کی گئی
 مشہور حکیم کی درخواست بھی منظور نہ ہو سکی اور

مناجی الخیر کے ہیں خواہے جوئے کن اور مسلح طاقت میں جواب دیا: "اے ابوبکر اگر میں قہر داری بغیر اہل بیت کے کبھی کو فرماؤں تو نصیب بدان کی فریاد ہوگی۔" لیکن حیرتوں کی حیرت اس سے بڑھ جاتی ہے کہ عام مؤرخین نے اس پر ہر طرح سے زور دیا ہے کہ رسول زمانہ طاعت کو بڑھتے ہوئے اور کسی نہ کسی گھر صرف نہ فرمانا چاہتے تھے۔

استنباطی حیرت اور مؤرخین یہ بھی کہتے ہیں کہ اہل بیت میں ازواج بھی شامل ہیں۔ پس اگر رسول حضرت عائشہ کے گھر اپنی بیوی ہیں تو قرینہ فرماتے اور وہ اہل بیت میں داخل ہیں تو حضرت ابوبکر کو حضرت عائشہ کے گھر میں داخل ہونے سے روکنا کیا معنی جن سے شوقا کوئی پردہ نہ قلم سب جانتے ہیں کہ صدیق اور صدیقہ باپ بیٹی ہیں۔ اس سے کیا کچھ معلوم ہوتا ہے، بالفضل مجھے کہنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن اس سے اہل بیت کے معنی معلوم ہوتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسی درخواست جس کے قبول کرنے میں ظاہر کوئی حذر نہیں کر سکتا منظور نہ کی گئی۔ اب انکار معنی پیدا کرتا ہے۔

ایک معترض کے نزدیک انکار کے معنی معنی تلاش کرنا غور کرنے والے اور پس و پیش کے واقعات میں ڈوبنے والے کا کام ہے۔ یہ منظور کرنے کے بعد بھی کہ چنانچہ رسالت مآب حضرت عائشہ کی کے گھر قرینہ رکھتے تھے چھپ چھپ کی کم نہیں ہوتی بلکہ کیوں سرکاری طور سے باپ کو اس کی اجازت نہ دی گئی کہ وہ بیٹی کے گھر میں داخل ہوتا ہے جب کہ یہ انکار اشتراک اور اجتماع کا مدبب بکھا جاسکتا تھا۔

تاریخ علالت علالت چنانچہ رسالت مآب کی تاریخ ۸ مفر اور رحلت کی تاریخ ۱۲ ربیع الاول جاتی گئی ہے۔ مجھے مؤرخین کے قول کے موافق متذکرہ صدر بیخ کے لحاظ سے واقعات کا اندازہ کرنا ہوگا۔ گزشتہ اوراق میں اس کا اشارہ کیا گیا کہ شہید بنی غزوہ موت واقع ہوا اور زید بن حارثہ شہید ہوئے۔ ۳۶ مفر ۱۱ء میں دوبارہ خائفین کے شورش کی خبر ملی۔ رسول نے اسلحہ بن زید کو بلا لیا اور انہیں ایک لشکر کا امیر کو کے حکم جنگ دیا۔ لڑائی مقام ابی پر ہونے والی تھی جو اہل روم کے قبضہ میں تھا اور جہاں زید مارے گئے تھے موضع جرف مرکز لشکر قرار دیا گیا۔

بہ استثنائے علی مشاہیر اصحاب کو زید کی سہرا کی حکم دیا اور "حکم حالی بین صلور ہوا کہ احسب ان جہلہ و انصار مثل

صدیق اکبر اور عمر فاروق اور عثمان و ذوالنورین اور سعد بن ابی وقاص اور ابو عبیدہ بن جراح وغیرہم سب (اسامہ بن) زید بن حارثہ کے ہمراہ جہاں بھی گئے علی مرتضیٰ کے تنگ سہرا نہ کیا۔" (متفق)

تمام مؤرخین یہ اشتداد مترجم ابن طلحہ دن کے قاتل ہیں چنانچہ رسالت مآب نے جناب امیر کو ہمراہ نہ کیا بلکہ چار داری کے لیے رکھ لیا خود مترجم اپنے نوٹ میں قاتل ہوا ہے کہ: لیکن طالت کی وجہ سے آپ نے ہا جازت اسامہ علی و عباس رضی اللہ عنہما کو چار داری کی غرض سے مدینہ میں رکھ لیا تھا۔ باقی اور اجلہ اصحاب اسامہ کے ہمراہ مدینہ سے روانہ ہوئے۔ اسامہ مدینہ سے ایک کوس چلی کر جرف میں ٹھہر گئے اور وہاں سے ابوبکر و عمر وغیرہ رضی اللہ عنہم اسامہ سے اجازت

لے کر رسول اللہ کو دیکھنے آتے تھے اور پھر چلے جاتے تھے۔ اس منزل سے اُسامہ کوچ کرنا چاہتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ کا انتقال ہو گیا۔

یہ بات لوگوں کی خاطر پر گراں گزری کہ پیغمبر خدا نے

اس امور پر اعتراض جیسا ہو

ایک غلام کو اکابر مہاجرین و انصار پر امیر گردانا۔۔۔

جب یہ اخبار صحیح مبارک میں پہنچے خاطر مبارک سخت

فنائی الدین حضرت جعفر نے کوئی عذر نہ کیا

رنجیدہ ہوئی اور غضب میں آئے اور باوجود تپ اور درد سر گھر سے سر مبارک اپنا حصبہ سے بلند کر باہر آئے اور منبر پر رونق افروز ہونے اور خطبہ پڑھا اور منسلما:

”اے معشر الناس! میں نے اُسامہ کو جو امیر بنایا تم اس سے انحراف کرتے ہو، اور اس کے انحراف پر تنبیہ باپ کی امارت میں بھی غزوہ موتہ کے درمیان نچن کرتے تھے تم یہ کیا بات ہے۔ تم خدا کی کہ وہ سزاوار ہے امارت کا اور اس کا باپ بھی سزاوار امارت تھا۔“

حضرت عمر کا سلام اور پُر معنی جواب

اُسامہ جواب دیتے تھے: غفر الله لك يا اُمير المؤمنين۔ بقول ابن خلدون جب اُسامہ کے متعلق رسول نے فرمایا کہ: اگر اس کا باپ لائق امارت تھا تو یہ بھی قابل امیر ہونے کے ہے۔ جاتے جاتے اُسامہ نے یہ سنتے ہی کوچ کا حکم دیا اور جرت میں پہنچ کر پُلو کیا۔ کہا گیا ہے کہ سرورِ عالم کا خطبہ دسویں تاریخ رجب الاول کو ہوا۔ (قرۃ العیون) ص ۱۷۲ کو دو شنبہ کے روز (اُسامہ) پھر آیا اور حضرت کو تھوڑی تخفیف حاصل ہوئی تھی۔ اُسامہ کو حضرت نے وداع کیا اور فرمایا: ”اعن علی بركة الله“۔ (جنگ کر خدا کی برکت پر) اور اُسامہ حضرت کے فرمان کے مطابق لشکر گاہ کو پھرا اور اس نے حکم کیا کہ لشکر کوچ کرے اور جب چاہا کہ اب سوار ہووے اس کی ماں ام ایمن نے پیغام بھیجا کہ رسول خدا نزع میں ہیں۔ اُسامہ پھر پھرا اور ایمان اسحاب بھی پھر آئے اور ابوبکر صدیق اور عمر فاروق اور امثال انھوں کے خود مدینہ ہی میں تھے۔ اور جب ابن خلدون پُرحوگے تو معلوم ہوا کہ دو شنبہ کے دن بعد نماز صبح ابوبکر ”اپنے اہل کے پاس پہنچے گئے۔“ بعض تاریخیں یہ بھی کہتی ہیں کہ جناب رسالت مآب نے سحر بن عبادہ کو اس پر مقرر فرمایا کہ لوگوں کو گھروں سے بلا کر اُسامہ کے ہمراہ لے کر۔

عدم روانگی کی وجہ تجنیز لشکر نہیں ہو سکتی اس واقعہ کے ذکر سے میں خود بخوبی کے لیے سوال کرتا ہوں کہ کیا وجہ ہوئی جو باوجود اس کے کہ

جناب رسالت مآب نے ۲۶ صفر کو حکم دیا تھا مگر گیارہ رجب الاول تک فوج روانہ نہ ہوئی۔ دراصل ایک اس کے قبل نبی قولہ وغیرہ کی جنگ بتاتی ہے کہ صرف حکم دینے کی دیر ہوئی تھی اور کچھ دیر کے بعد لشکر روانہ ہونے کے لیے مستعد ہو جاتا تھا۔ اس واقعہ میں دیر کی یہ وجہ نہیں بتائی گئی ہے کہ تجنیز لشکر کی وجہ سے دیر ہوئی۔ اگر کوئی یہ مذر بھی کرے تو یہ مذر اس خیال سے قابل پذیرائی نہیں ہے کہ رسول کے خطبہ کے بعد اُسامہ نے کوچ کیا اور جرت میں پُلو ڈالا۔ اگر مسلمان کی کمی دیر کی

وجہ ہوتی تو درنگی کے قبل اسامہ کا کوچ کرنا اور پڑاؤ ڈالنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اب روانہ نہ جانے کے اعتراض حل طلب ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا اسامہ یعنی اس لشکر کے سردار کی وجہ سے دیر ہوئی تھی؟ نہیں بلکہ وہ ایک وفادار سپاہی کی طرح

لشکر کا امیر دیر کا سبب نہ تھا

حکم ہاتے ہی روانہ ہو گیا۔ اور جنت میں پڑاؤ ڈالنے کی یہ وجہ ہوئی کہ جب بقیہ لوگوں کو حنین کچہر دیر ہوئی ہے لشکر کے روانگی کی خبر معلوم ہوگی تو جلدی کریں گے اور اس کے بعد یہاں سے لشکر روانہ ہو سکے گا۔ پھر تو کیا عام سپاہیوں کی تساہلی کی وجہ سے سردار لشکر روانہ نہ ہو سکتا تھا۔ اسے بھی اسامہ کی روانگی اور پڑاؤ لگانا کٹ دیتا ہے۔

اور تاخیر کی پہلی تاریخی وجہ جو کچھ میں آتی ہے وہ ان لوگوں کا اعتراض ہے جو

تاخیر کی ایک وجہ

خیال امتیاز کو رسول کے حکم پر معتمد رکھتے تھے۔ مؤرخین نے سہراہی کے حکم میں جن مخصوص اصحاب کا نام بتانا مناسب کہا ہے ان میں پانچ نام ہم لکھ چکے، بقیہ نام یہ ہیں: سعد بن زید، قتادہ بن نمان اور سلمہ بن اسلم بن حرث۔

مشکل سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ سعد بن ابی وقاص یا قتادہ بن نمان کا ایسا سپاہی فوجی کارنامے کی شرکت میں کوئی تامل کرے اور نہ آئندہ وقت جس کا ذکر کئے والا

کوئی تساہلی کر سکتا تھا

ہے، ان سے اس طرح متعلق ہے کہ ان پر کسی خاص وجہ سے روانہ نہ ہو سکنے کا شبہ کیا جاسکے۔ ہم سعید بن زید اور سلمہ بن اسلم کے متعلق بھی کچھ نہیں کہہ سکتے اس لیے کہ نہ پیشتر نہ بعد ان کے واقعات کسی کو متروک کیا ہے اور نہ یہ کوئی مخصوص حالت میں پائے گئے ہیں۔ زیادہ جو ان پر الزام لگایا جاسکتا ہے وہ یہ ہو کہ ممکن ہے کہ یہ بھی اس اعتراض میں شریک ہوں کہ ہم پر ایک ظلم کو امیر کیا ہے اور اس کے بعد تاکید حکم نے انھیں مسترد کر دیا ہو۔ حضرت عثمان جب مومنا میدان جنگ کے مواقع پر امتیاز سے نہیں دیکھے گئے ہیں تو ہمیں البتہ ان کی عدم روانگی پر زور دینے یا اعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔

لیکن سوال یہیں ختم نہیں ہو جاتا، بلکہ اب ایک دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا رسول اپنے اصحاب کے قابلیت شناس تھے؟

رسول قابلیت شناس تھے

کوئی باحواس آدمی یہ نہیں کہہ سکتا کہ بغیر طبیعت شناسی اور اندازہ قابلیت کے کوئی بڑا ہو سکتا ہے، نہ کہ چار اہادی۔ جس کی انہو صفات میں یہ صفت نہایت مخصوص تھی۔ پھر جب رسول جانتے تھے کہ حضرت عثمان میں صفت شجاعت تلاش کرنا بہت کچھ چاہتا ہے تو پھر بھی انھیں کیوں روانگی کا حکم دیا۔ کیا یہ ایک بے معنی حکم تھا؟ یہی سوال حضرت عمر اور ابوبکر کے متعلق اپنے کو دہراتا ہے۔ مؤرخین نے اپنے طرز عمل سے ہمیں یہ سوال کرنے کا موقع دیا ہے کہ کیوں دونوں کے دونوں حضرات ایسے دور کے معتمد پر بھیجے جا رہے تھے۔ دراصل ایک امیر نہ تھے، بلکہ مامور تھے۔ اور رسول کو مطلق اس کا کوئی تاثر نہ تھا کہ راتے اور مشورہ لینے کے وقت ان میں سے کوئی نہ جو جن میں سے ایک کے متعلق مولوی شبلی صاحب "افراد حق" میں فرماتے ہیں کہ: "انظامِ اشاعتِ اسلام میں ایک واقعہ بھی ایسا نہیں جو حضرت عمر کی شرکت بغیر انجام پایا ہو۔" سوچا جاسکتا ہے کہ شدید طالت اور آخری اوقات میں مختبر لوگوں کو تشریب رکھنے کی سخت ضرورت ہوتی ہے اور اس وقت کا ہر لفظ مفید اور ان کی بحال آوری ایک خدمت ہوتی ہے۔ ایسے وقت

ایک نبی، مصالح مطلق اور قوم گر کو کس قدر دسلایا کی ضرورت ہو سکتی ہے۔ لیکن ایسے وقت خصوصیت کے ساتھ ان کی ردائی کے حکم اور ماموریت سے ان کی رائے کا وزن اس سے بالکل الگ معلوم ہوتا ہے، جیسا کہ مؤرخین نے بھانے کی کوشش کی ہے۔ اور نہ ان کی ردائی اس بیخوری سے تھی کہ ان سے زیادہ باعتبار فوجی افسر کاملنا دشوار تھا۔ اب خواہ خواہ گزشتہ واقعات سامنے آجاتے ہیں کہ ایک بزرگ کو اتنی اعزاز ملتی کہ وہ رسول کے دولت سرا کی طرف ایک سوراخ رہنے دی تو دوسرے کو یہ رخصت نہیں ہے کہ وہ تیار داری کر سکے۔ اگرچہ ان کی بیٹی ہی کے گھر کیوں نہ ہو۔ کیا اس کے معنی یہ ہو سکتے ہیں کہ رسول نے ایک کو اگر اس سے رد کا تھا کہ وہ ہر وقت نقل و حرکت کا نگران نہ ہو تو دوسرے کو نہ صرف اس خیال سے بلکہ اس سے بھی رد کا تھا کہ وہ اپنی بیٹی کے پاس جا کر کسی ایسے خیال میں مشترک نہ ہو جائے جو موقع بیٹی بھی جاسکے۔ بلحاظ اس کے کہ حضرت حفصہ اور عائشہ داخل ازواج تھیں۔ حضرت عمر اور ابوبکر کا موقع ایسے ناقد کے سامنے نہایت ہی نازک ہے جو کسی ایسے اجتماع اور اشتراک کو جو کسی صاحب اختیار کی رحلت یا حالات کے وقت ہوسای نگاہ سے دیکھنا چاہتا ہے۔

علاء کے متعلق روئے الشفا کا یہ فقرہ کہ: ”مراد صحبت اور گریز نیست۔“ اگر صحیح ہے تو یہ فقرہ بھنے کے عصر میں اپنے عکس سے

مدد دیتا ہے کہ کچھ لوگ جن کے دروازے مسجد کی طرف تھے ایسے تھے جن کی صحبت سے رسول کو گریز تھا۔ یہ کوئی راز نہیں ہے کہ جناب رسالت مآب کے ازواج کی دوہارٹیاں تھیں اور ان میں بعض ایسی تھیں جن سے سرورِ عالم کو کچھ بہت راحت نہ تھی۔

ان میں سے ایک پارٹی کی طرف حضرت ام سلمہ تھیں اور دوسری طرف حضرت عائشہ اور حفصہ وغیرہ۔ مشکوٰۃ المصابیح سے معلوم ہوا کہ حضرت زینبؓ نے ایک مرتبہ جناب رسالت مآب کے لیے شہد غنیمت کیا اور جناب سرورِ عالم دیر تک ان کے گھر قسرت فرما رہے اور حضرت عائشہ کو رشک ہوا اور اتفاق کیا حفصہ سے کہ آنحضرتؐ جس کے پاس ہم میں سے آوی تو کہے کہ آپؐ میں سے ہواغیر (بدبودار گوند) کی آتی ہے۔ سورۃ تحریم اس کے بھنے میں اور مدد دے گا۔ (منابع)

اسی طرح زمانہ طالت میں یہ واقعہ بھی غور کے قابل ہے کہ: ”عائشہ سے آیا ہے کہ پیغمبر میرے گھر سے باہر نکلے اور میں حضرت کے چھپے نکل غیرت

کی جہت سے کہ ہمیں ایسا نہ ہو کہ حضرتؐ اپنے قبیلوں سے کسی لہی کے یہاں جاویں۔ یہاں تک کہ حضرت ﷺ قبیح کو پہنچے اور بہت دیر کھڑے رہے اور تین بار اپنے دست مبارک اٹھانے اور دعا کی اور وہاں سے پھرے میں بھی پھری اور حضرت کے پہنچنے سے آگے گھر میں چلی اور سوچی۔ متعاقب میرے حضرتؐ بھی آئے اور جب رسول خداؐ نے اثر اضطراب اور شگفتگی کے تئیں میرے دریافت کیا، پوچھا: اے عائشہ کیا حال ہے اور کیا ہوا جو مضطرب معلوم ہوتی ہے۔ صورت حال میں نے عرض کی: فرمایا: وہ سیاهی جو میں نے اپنے آگے آگے بھی تھی مگر تو تھی؟ میں نے کہا: ہاں، یا رسول اللہ! پس رسول خداؐ نے ایک ہاتھ عصف (درشتی) سے میرے سینہ پر مارا اور کہا: تو نے گمان کیا تھا کہ خدا اور

رسولؐ غنائیہ سے حق میں ظلم کرتے ہیں۔ ایک روایت میں یہاں آیا ہے کہ: حضرت نے عائشہ سے فرمایا کہ: ”شیطان نے تجھے اس بات پر گماشتہ کیا ہے۔“ یہ بتائیں اس گھنے کے لیے دی گئی ہیں کہ حضرت عائشہ کی ایک پارٹی تھی اور کیسے ہی سبھی ظلم سے گھبرائیں نہ ہو لیکن رسولؐ کے قتل و حرکت پر غور سے غور رہتی تھی اور یہ کوشش تھی کہ رسولؐ ان کے ارادہ سے مطلع نہ ہو جائیں۔ ایسے ہاوسلئے فعل کے علم پر اگر رسولؐ نے اپنے شہادت کو واقعہ سے زیادہ وزن دیا بھی ہو تاہم اس کا الزام کسی طرح رسولؐ پر نہیں ہے۔ غرض اور ارادہ پر مطلع ہونا یا تو اس پر منحصر تھا کہ اس سے دریافت کرتے جس پر کسی قسم کا شبہ ہوا اور اس جواب پر قناعت کر لیتے جو دیا گیا، یا ان اسباب پر نظر ڈال کر جن سے موجودہ واقعہ کا گھنا آسان ہواخذ نتائج کرتے۔ روایتیں ہیں کہ جناب رسالتؐ اس سے کشیدہ ہونے کہ بعض ازدواج نے بعض باتوں کو ظاہر کر دیا جو راز کے طور پر حوالہ کی گئی تھیں۔

کیا ان حالتوں نے رسولؐ کو اس حکم پر آمادہ کیا تھا کہ حضرت ابوبکر اور حضرت عمرؓ اپنی اظہار قابل قبول خواہش میں مایوس کیے جاویں اور رسولؐ حضرت عائشہ اور حضرت حفصہ کو ہر وقت کا نگران کچھ کر اس کی احتیاط کرتے ہوں کہ انہیں یہ لوگ اپنے اپنے باپ سے مل کر کسی ایسی کارروائی پر آمادہ نہ ہوں جو رسولؐ کی خواہش اور منشا کے خلاف ہو اور انہیں ان کے محض فتنوں پر اطلاع نہ ہو۔

رسولؐ کا حضرت حفصہ سے عورتوں کے متعلق مخاطبہ حیرت خیز تائید منافع النبوۃ کے اس فقرہ سے ہوتی ہے جب

عائشہ حفصہ سے عمر کے نسل پڑ جانے کی سفارش کرتی ہیں اور رسولؐ منہ راتے ہیں کہ: ”تم اسے گردہ مکتورات مواحب یوسف ہو۔ یعنی اپنی بات پر پائیداری کرتی ہو اور دل میں کچھ نہ رکھتی ہو اور باہر کچھ کہتی ہو“

مجھے کوئی شبہ نہیں کہ عجب نہیں ہے کہ مقررین امارت اسامہ میں حضرت عمر اور ابوبکر اس افتخار کے جوش میں مخصوص نمود رکھتے ہوں کہ وہ رسولؐ کے خسر ہیں، اور اس لیے محض اس رشتہ کی بنا پر امید و امتیاز ہوں۔ لیکن رسولؐ کی سخت رنجیدگی، غضب اور دردِ سر کے باوجود پر قصیم ارادہ نے امید امتیاز کو قائم نہ رکھا ہوگا اور کھادیا ہوگا کہ محض رشتہ اور ایسا کمزور رشتہ رسولؐ کے ہاتھوں ممتاز نہیں ہو سکتا جب تک مخصوص اسلامی خدمات سے منحرف نہ ہو۔

کیا روانہ نہ ہونا محبت سے تھا اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ رسولؐ انہیں کیوں دینہ طیبہ سے دُور بھیجتے تھے اور یہ کیوں روانہ نہ ہونے کو اولیٰ

کہتے تھے؟ اور باوجود حکمِ روانگی یہ لوگ کیوں بقول مترجم ابن خلدون: ”رسول اللہؐ کو دیکھنے آتے تھے اور پسہ چلے جاتے تھے۔“ آیا یہ آنا اور دیکھ جانا محبت سے تھا؟

ایک بدیہی تضاد ان تنبیہات کے جواب چند روز بعد کے واقعات نہایت مغربی سے دے سکیں گے مافصل مجھے جس امر کی طرف توجہ دلانا ہے اس کا بدیہی تضاد کسی طرح قابل تسکین نہیں ہے اور وہ

یہ ہے کہ اگر حضرت ابوبکر و عمر وغیرہ جوف سے آتے اور دیکھ جاتے تھے اور انہیں صریح حکمِ روانگی دیا جا چکا تھا جس کی بنا پر یہ پڑاؤ میں مقیم تھے تو ساتھ ہی ساتھ یہ امامتِ مسجد میں رسولؐ کی قائم مقامی کیسے کر سکتے تھے اور یہ بھی فرست تھی کہ

نہج بھی جو آیا کرتے۔ اور ایک صریح حکم کے سامنے آیا یہ امامت مسجد اگر واقعہ بھی ہو رسول کے حکم اور خواہش سے بھی جاسکتی ہے اور کیسے قبول ابن خلدون تیرہ نمازیں اور قبول مجموعہ کامل آٹھ دن اور قبول مناجات تین دن قبل رحلت و نیز تیرہ تک ابوبکر نے نماز پڑھائی۔ اور ابوبکر کی امامت مسجد کا حکم مجموعہ کامل کی اس روایت سے کیونکر ہم آہنگ ہو سکتا ہے جس میں ہلال سے رسول فرماتے ہیں کہ ”ابن خطاب سے کوکہ دے کہ لوگوں کو نماز پڑھاوے“۔ اور خود اس روایت کو اس سے کیسے مخالفت ہو سکتی ہے جیسا مناجات میں ہے کہ جب رسول نے عبداللہ بن ربیعہ (وہی جس نے عثمان کے انتخاب کے لیے ابن مسرج کی تائید کی) کو ابوبکر کے نماز پڑھانے کا حکم دیا، اور اس نے انھیں نہ پا کر عمر سے کہا، اور عمر کی بلند آوازی جب رسول کے مع مبارک میں پہنچی تو فرمایا: ”اے (الکافر) رکھتا ہے خدا تعالیٰ اور ابار رکھتے ہیں مسلمان مگر ابوبکر کو“۔ اور ابن خلدون دیکھی میں یہاں تک اضافہ کرتا ہے کہ: ”دسویں روز جب درد کے خیف ہو جانے سے حضرت باہر تشریف لے گئے تھے جب کہ ابوبکر نماز پڑھا رہے تھے اور وہ پیچھے بیٹھے کاٹھنہ کرتے ہیں تو رسول نے مونڈھا پلکے جہاں پر پہنچ گئے وہاں پر کھڑا تھا“۔ جسے صاحب مناجات یہ کہتا ہے کہ: ”پس طلب کیا حضرت نے علی مرتضیٰ اور عباس کے شیں اور تکیہ کیا انھوں نے اوپر اور باہر آئے مسجد کی طرف اور نماز ادا کی“۔ طبری کو یہ کہنا ہے کہ جب رسول باہر تشریف لے گئے تو لوگوں نے نہ صرف امامت ابوبکر کی تائید توڑی بلکہ خود حضرت ابوبکر نے بھی نماز شکستہ کر دی۔ جی چاہے تو اعظم کوئی اور مناقب مرتضیٰ کا یہ خیال بھی سن لیں کہ امامت مسجد کا حکم رسول خدا کی طرف سے نہ تھا بلکہ حضرت عائشہ کی طرف سے تھا۔ جو بعینہ خیال حیات القلوب کا ہے۔

فصل بن عباس کا فطری متعجبانہ استقیام علامہ علی لوگوں سے یہ فطری سوال بھی کرتے ہیں کہ تمہیں کس نے بھیجا ہے اور لوگ دریافت کرنے دولت سرا کی طرف جب آتے ہیں تو فضل بن عباس سے ملاقات ہوتی ہے اور وہ پوچھتے ہیں کہ: ”کیا ابوبکر عیش اسامہ کے ساتھ نہیں گئے؟“ میں اس بے رحمانہ اقامت سے باز رہوں گا کہ امامت مسجد کے مسئلہ پر جس کے ایک لفظ کو دوسرے سے ایسا ہیبت ناک اختلاف ہے تحیدی نگاہ سے دیکھوں۔ روایت کا خاصہ بگھنے کے لیے اس سے بھی مدد ملے گی کہ اگر رسول عبداللہ بن ربیعہ کے زبانی پیغام بھیجتے ہیں تو روایت کرنے والی حضرت عائشہ ہیں۔ مجھے حضرت ابوبکر کی نہی طبیعت سے کافی ہمدردی ہے جس کی بنا پر حضرت عائشہ ابا حصہ کی بھی سلاش کر دیتی ہیں یا حضرت عمر کا حال ایسا ہے کہ وہ حضرت ابوبکر کو اپنے اوپر مقدم کر دیتے ہیں۔ اور باوجود ان تمام باتوں کے رسول یہ بھی فرماتے ہیں کہ: ”دل میں کچھ رکتی ہو اور باہر کچھ کہتی ہو“۔

شور غل اور غش کے سچے لوگ کہتے ہیں کہ رسول مسجد میں درد کی تخفیف سے باہر آئے۔ یہ بھی وجہ ہوئی کہ رسول کو مسجد میں نہ دیکھ کر حضرت ابوبکر مارے افسوس کے غش کھا گئے اور لوگ رونے لگے۔ رسول نے یہ عداوتی اور تشریف لے گئے۔ شور و غل کی صدا میں ہو سکتا ہے کہ غم محرک ہو اور لیکن واقعات کے بگھنے کے لیے اس پہلو پر غور کرو کہ جب حضرت ابوبکر امامت کے لیے مسجد میں پیش قدمی کرتے ہیں تو کچھ لوگ جو یہ جانتے ہیں کہ انھیں اسامہ کے لشکر کے ساتھ روانہ ہونے کا حکم ہے پوچھتے ہیں کہ آپ یہاں کیسے تشریف رکھتے ہیں کچھ بلند آواز لوگ ان کی تائید کرتے ہوں گے۔ کچھ کہتے ہوں گے کہ چلو دریافت کرائیں اس میں

شور و غل بجا ہو گا ہم نہیں کہہ سکتے کہ وادی الرمل والے عمرو بن عاص بھی اس مجمع میں موجود تھے یا نہ تھے۔ یہ شور غل سن کر رسول عباس اور علیؑ کے کاندھے پر تکیہ کر کے باہر تشریف لائے ہوں گے اور انھوں نے ایسے لوگوں کو پایا ہو گا جنہوں نے ایک مربع حکم سے انحراف کیا تھا اور ایسے لوگ رسول کو دیکھ کر ہچکے پٹے ہوں گے۔

ہم تک نہ پہنچنا رسولؐ نے اس وقت کیا فرمایا ہو گا کسی طرح معجزہ نہیں ہے۔ لیکن یہ سوچنا کہ کب فرمایا ہو گا کچھ بہت مشکل محسوس نہیں ہے۔

جہاں استنباط آسان ہے

فتنہ کالی رات کی طرح چوم کر آئے ہیں (منہاج)

اسی زمانہ طالع کے واقعہ میں ایک یہ بھی ہے کہ نعت شب کو جناب سرور عالمؐ

اپنے مقامِ مہربانہ کو اپنے ہمراہ لے کر گورستانِ نبیؐ میں تشریف لے چلے گئے ہیں اور فرماتے ہیں: ”اے اہل قبور گوارا جو جمع تم کو وہ نعمتیں کہ صبح کی تم نے اور۔۔۔ دور ہو تم ان قتلوں سے کہ میں جن قتلوں میں لوگ اور تم کو نہایت دی ہے ان قتلوں سے اور غمی دی ہے خدا تعالیٰ نے ان قتلوں سے تحقیق کہ چوم لائے ہیں لوگوں پر فتنہ مانند کالی رات کے قتلوں کے منسلک ہے آخر ان قتلوں کا دل سے ان قتلوں کے۔۔۔ بعد اس کے حضرت صاحب کی طرف رونق افروز ہونے اور فرمانے لگے کہ دے۔

اصحاب کا سوال اور رسولؐ کا جواب

(اہل قبور) تم سے بہتر ہیں۔۔۔ صاحب نے عرض کی کہ یا رسول اللہؐ دے ہمارے بھائی ہیں، جس طرح دے ایمان لائے ہیں

ہم بھی لائے، انھوں نے اتفاق کیا ہم نے بھی کیا دے گئے ہم بھی جانیں گے۔ ہم پر ان کی زیادتی کس چیز کی ہے۔ فرمایا کہ: ”وے گزرے اور اپنے اجر سے انھوں نے دنیا میں کچھ نہیں کھایا اور میں نہیں جانتا کہ تم میرے بھائی ہو کرو گے، اور کیا کیا فتنے تمہارے درمیان تم سے سرزد ہوں گے۔“

حضرت عائشہ نام نہیں لیتیں

اسی کتب میں زمانہ طالع کے متعلق صحیح بخاری کی حاشیہ سے ایک روایت نقل کی گئی ہے جو تعلقات کے بھنے میں مدد دے گی کہ وہ ذکر طالع

کرتی ہوئی کہتی ہیں کہ: ”باہر آئے حضرت ایک روز گھر سے مسجد کی طرف اور حال یہ کہ حضرت درمیان دو مردوں کے ہیں اور اوپر ان کے اٹھو کیے ہوئے یعنی تکیہ کیے ہوئے اور غلطی سے تھے دونوں پاؤں اس جانب کے زمین میں نہایت صحت و ثبات سے اور وہ دونوں ایک عہد تھے چچا حضرت کے اور دوسرا ایک مرد اس جانب کے اہل بیت سے۔“

ابن عباس نام بتاتے ہیں

عبید اللہ بن عبد اللہ اس حدیث کے راوی نے ابن عباسؓ سے یہ روایت بیان کی اور ابن عباسؓ نے پوچھا کہ آیا تو قیاس کرتا ہے کہ وہ دوسرا مرد

کون تھا اور انکار پر جواب دیا کہ: ”وہ مرد علی بن ابی طالبؑ تھے۔“ مؤرخین نے حضرت عائشہ کے نام نہ لینے کی جو تاویل کی ہیں وہ مشکل سے موافق واقعہ ہیں۔ جب کہ یہ طرزِ عمل اور مصلحتِ عالمگیر ہوتی جاتی ہے کہ اپنے ناموافق فریق کے کسی کارنامے یا خدمت کے ذکر یا حتی الوسع نام لینے سے پرہیز کیا جائے۔

پنج شنبہ، قصہِ ستر طاس

ایک اور واقعہ جو بقول ابن خلدون اور منائی پنج شنبہ کو ہوا اسے ہم نے اب تک نہیں لکھا۔ قصہ قراطس ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ

قول منافع وابن خلدون: ”آپ نے فرمایا کہ میرے پاس دوام و کثرت لازم میں تم کو کچھ لکھ دوں، تاکہ بعد اس کے گمراہ نہ ہو۔“ لوگ بحث و مباحثہ کرنے لگے۔ تھوڑی دیر کے بعد جب پھر اس کلام کا احوالہ کرانا چاہا تو آپ نے ارشاد کیا کہ: ”تم لوگ مجھے چھوڑ دو، میں جس حالت میں ہوں اچھا ہوں اس سے جس کی طرف تم مجھے بلاتے ہو۔“ مترجم ابن خلدون بخاری و مسلم سے نوٹ کرتا ہوا کہتا ہے کہ: ”عمر نے کہا کہ ہمارے لیے قرآن مجید کافی ہے جو ہمارے پاس ہے۔“ اور بے شک اس وقت آپ کے درد زیادہ ہو رہا تھا۔ اس اثنا میں کسی نے یہ بھی کہہ دیا کہ: ”ان کو احتکام کلام ہو گیا ہے۔“

رسولؐ نے شور و شغب کرنے والوں کو چلے جانے کا حکم دیا ”آپ نے فرمایا کہ پیغمبروں کے پاس شور و شغب کا کام نہیں ہے۔“

حضرت عمر کا کھن خطاب صاحب منافع کہتے ہیں: ”عمر خطاب رضی اللہ عنہ نے کہا کہ یہ مرد یعنی پیغمبر خدا شدت مرض کے وقت ایسی باتیں کرتا ہے کہ اختیار کے دائرے سے باہر ہیں۔ شاید کہ یہ باتیں بھی مانند ان باتوں کے ہوں۔ یعنی مبادا لوگوں کے شیں راہ سخن پیدا ہو اور کہیں اور خیال کریں اور طعن کریں کہ رسول خدا ہڈیاں کرتا ہے۔ یعنی بڑبڑاتا ہے۔ جس طرح بیمار بیماری کی سختی کے وقت کہتے ہیں۔“ مولوی شبلی صاحب فرماتے ہیں: ”یہ واقعہ ظاہر تعجب انگیز ہے۔ ایک مقرر کہہ سکتا ہے کہ اس سے زیادہ اور کیا گستاخی اور سرکشی ہوگی کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بستر مرگ پر ہیں اور اُمت کے درد و غم خواری کے لحاظ سے فرماتے ہیں کہ ایک ہدایت نامہ لکھ دوں جو تم کو گمراہی سے محفوظ رکھے۔ یہ ظاہر ہے کہ گمراہی سے بچانے کے لیے جو ہدایت ہوگی وہ منصب نبوت کے لحاظ سے ہوگی اس لیے اس میں خلا و سہو کا احتمال نہیں ہو سکتا باوجود اس کے حضرت عمر بے پروائی ظاہر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ کچھ ضرورت نہیں ہم کو قرآن کافی ہے۔“

بعض روایتیں کہ حضرت عمرؓ نے رسولؐ کے ارشاد کو ہڈیاں سے تعبیر کیا طرہ یہ کہ بعض روایتوں میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے اسخفرنگ کے اس ارشاد کو ہڈیاں سے تعبیر کیا۔ نعوذ باللہ۔ صاحب مظهر حق کہتا ہے: ”ابن عباس کہتے ہیں کہ: ”تحقیق مصیبت کامل وہ حال ہے کہ ہوا مائل اور مانع درمیان پیغمبر خدا کے اور درمیان اس کے کہ لگتیں ان کے لیے یہ نوشتہ بہ سبب اختلاف ان کے کے اور شور و شغب ان کے کے۔ کاش کہ وہ اختلاف اور غل نہ کرتے تا حضرت کچھ فہمتے کہ سبب ہدایت کا ہوتا۔“

ابن عباس کا تأسف ”پس تھے ابن عباس مائل طرف خلافت اس چیز کے کہ کبھی عمرؓ نے اور انھوں نے کہ تلاح تھے ان کے اصحاب میں سے۔۔۔ پھر رونے ابن عباس اتار دئے کہ ترک دیا ان کے آنسوؤں نے سنگ ریزوں کو کہ وہاں پڑے تھے۔“

یہ منہج منہج میں ہے۔ یہ دونوں کتابیں بعض کا یہ خیال بھی نکلتی ہیں کہ چاہا تھا کہ معین کردی ایک کو اصحاب میں سے واسطے خلافت کے تا واقعہ جو مذاہب ان میں۔

بعض کا خیال شک و ترادف سے ہو جانے لپے
خلیفہ کا تعین چاہا تھا

رسولؐ نے اسباب تحریر کب طلب فرمایا۔ اس کتب میں جو خاص مفید نکلت کے میں زیادہ طول مناسب نہ کہوں گا۔ تم کو یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ جناب رسالتؐ نے قلم و دوات یا اسباب تحریر اس وقت طلب کیے جب کہ لوگ دیر سے آنجناب کے وصلیا کو سنبھال رہے تھے اور ہر شخص کج رہا ہے کہ حضرت اس کچھ میں تقرر فرما رہے ہیں جو صاف طریقہ سے ددائی تقرر بھی جائے۔

طلب قرطاس کے پہلے عذر نہ ہوا۔ کسی کو کوئی اعتراض نہیں ہوتا۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ حاضرین اور محکم میں اُمت اور نبی کا واسطہ قائم ہے۔ نہ کوئی یہ کہتا ہے کہ یہادی میں زیادہ شکوک کرنے سے آپ کو تکلیف ہوگی، اور نہ اب تک کسی کو یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ چونکہ آیہ ”اکملت لکم دینکم“ نازل ہوا ہے۔ اب میں یہ کہنے کا موقع ہے کہ محمد بن عبد اللہ ﷺ کی ذات منصب و نبوت سے غافل ہو گئی۔

دو شنبہ تک گفتگو فرمائی۔ پنج شنبہ کی صبح دو شنبہ تک جناب سرورِ کائنات نے تقریر فرمائی اور کسی نے اس عذر بے جا کو اپنے اسلامیت کے شایان نہ کہا کہ حضرت مریض نے رسالت کا حق سنبھال کر دیا ہے۔ بلکہ فوری تغیر اور انقلاب طبیعت کے آثار رسولؐ کے اس فرمانے کے ساتھ ہی پیدا ہو گئے کہ: ”دوات کا لڑاؤ میں تم کو کچھ لگے دوں تاکہ بعد اس کے گمراہ نہ ہو۔“ دراصل یہ کہ یہ الفاظ صاف صاف کہہ رہے تھے کہ یہ فرمانا غلط منصب ہدایت کے لحاظ سے تھا۔

آیا حضرت عمرؓ کو کچھ ایسا لگے جانے کا۔ سوال یہ ہے کہ آیا حضرت عمرؓ کو یا کچھ ایسے لوگوں کو جو ان کے خوف تھا جو ان کے لیے مضر ہوتا۔ زیر اثر ہوں یہ خوف یا شبہ تھا کہ جناب رسالتؐ کچھ ایسا تحریر فرمائیں گے جو ان کے حقوق کے لیے مضر ہوگا۔ اور کیا کھنے کا ستر نہ تھا آیا اس کے کچھ آثار ہیں جو حضرت عمرؓ کے خوف کی وجہ بھی ہاسکے۔

مرا سم دینیہ کے متعلق ہدایت مضر نہ ہوتی۔ ایسے مخالفت اور موافق ہر شخص تسلیم کرے گا کہ نماز روزہ حج اور زکوٰۃ وغیرہ کے متعلق رسولؐ کا کچھ فرمانا کسی حیثیت سے کسی کے مضر نہیں ہو سکتا تھا اس لیے کہ اس میں کوئی ایسی بات نہ تھی جو ذاتی منفعت کے مخالفت اور رد حقوق کا سبب ہو سکتی یہ یقینی امر ہے کہ حضرت عمرؓ کا ایسا کچھ کہنا جو رسولؐ کی خواہش میں رکاوٹ پیدا کرے اس خیال سے نہیں ہو سکتا تھا کہ رسولؐ نماز و روزہ کے احکام کو کلامِ قلم کے حوالہ نہ کریں۔ اور نہ اس میں کسی صاحبِ حواس کو شبہ ہو سکتا ہے کہ جو کچھ کہا گیا اور جس طرح کہا وہ کسی طرح اس خیال سے تھا کہ رسولؐ کو تکلیف نہ ہو۔

کونسی تکلیف زیادہ ہے اس لیے کہ رخصت ہوتے ہوئے بزرگ کی کوئی ایسی تکلیف ہے وہ اپنے آخری عالم میں گوارا کرتا ہے وہ اس کے مقابلہ میں بہت کم ہے کہ وہ اپنے بعد آخری وصیتیں کرنا چاہے اور نہ کر سکے۔ جاہل سے جاہل اور وحشی سے وحشی قوم آخری وصیت کو توجہ سے سنتی ہے اور حتی الوسع اسے پورا کرنے کی کوشش کرتی ہے۔

صاحبِ خلقِ عظیم ہمدردی کا ایسا جواب نہیں دے سکتا تھا اگر ابا حنفہ نے رسول کے ساتھ ہمدردی کے لحاظ سے کہا ہوتا تو کبھی اس کا جواب رسول کے ایسے صاحبِ خلقِ عظیم سے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ یہ فرماتے کہ: ”میرے پاس سے ملے جانے پیغمبروں کے سامنے ایسے شور و شغب کا کام نہیں ہے۔“

مؤرخین نے کسے چھوڑا اور کس کی حفاظت کی مؤرخین کا تمام ”عجب“ اور ”نفوذ باللہ“ اور تحریف پیرایوں میں ان الفاظ کو دکھانا اور دھمکانا اور اس کے بعد قیامت تک ایسی ہی یا اس سے ہزار ڈیڑھ عمدہ لفظوں اور پیرایوں میں اس کے اصلی ہیئت کو بدلنے کی کوشش صرف ایک اور اکیلے ایک بات بھادے کی لاور وہ یہ ہوگی کہ:

نہ صرف عصائیت کا اسد باب ہوا بلکہ ان مؤرخین نے اس کی مخالفت کی جس نے نبی عربی مسلمانوں کو متفرق ہونے کا ذریعہ حوالہ کیا کی نہ صرف صریح ترین انداز اور لفظوں میں تحریف کی بلکہ مسلمانوں کو جو اس وقت سے قیامت تک پیدا ہوتے رسول کی ایک ایسے واضح اور مستند ارادہ ہدایت سے باز رکھا اور آئندہ مسلمانوں کو متفرق ہونے کا راستہ بتایا۔ معاملہ صرف رسول اور ابا حنفہ میں نہیں ہے بلکہ ابا حنفہ اور عام مسلمانوں میں بھی ہے۔ محافظ مسلمان یقین لگاتے ہیں کہ قرآن پر اکتفا کرنا بہت درست تھا اس سے شاید وہ ہمیں یہ بھگانا چاہتے ہوں کہ رسول کا مشن ایک یہ تھا کہ وہ قرآن کی چند جلدیں شائع کر جائیں اور بس۔ یاد دوسرے لفظوں میں ہمیں یہ بتانا ہو کہ رسول کو اس کا مطلق خیال نہ تھا کہ وہ قرآن حوالہ کر چکے ہیں۔ اور سب سے زیادہ معکب یہ دلیل ہے کہ اس اعراف کا جواب اس دوسرے اعراف سے دیا گیا ہے کہ ایک مرتبہ رسول نے ابوہریرہ کو اس اعلان کا حکم دیا کہ جو شخص صدق دل سے لا الہ الا اللہ کہے اس پر آٹھ دوزخ حرام ہے۔ اس سے بھی ابا حنفہ نے رد کا اور رسول خاموش رہے۔

ایک پہلا انسداد وہ لوگ جو اس پر غور نہ کریں کہ حکم دینے کے بعد رسول کی خاموشی نے باوجود اعراف کے ان کے مخالفت کے باوجود رسول کا حکم پہنچ گیا اس فرمانے کو آج بھی ہم تک پہنچا دیا۔

خاموشی سے اصرارِ مخالفت کا انسداد منظور تھا در آنحالیکہ اگر اس وقت اعراف کا لحاظ نہ سہاتے اور حکم دیتے جاتے تو جہاں ہمیں یہ خبر ملتی کہ رسول کے حکم کا اعلان کیا گیا وہاں یہ خبر بھی پہنچتی کہ ایک شخص اسی طرح ممانعت بھی کرتا جاتا تھا اور

اگر حضورِ عمر کو آپے متعلق کچھ اُمید تھی تو وہ لکھنے دیتے

اپنا خلیفہ جویز کریں گے اور اسے مصدق بہ تحریر کر دیں گے۔ حضرت عمرؓ یا ان کی جماعت کی مخالفت کبھی تھی کہ انھیں اپنی نسبت رسولؐ سے کوئی امید نہ تھی، ورنہ لکھنے دینا ان کے مفید تھا اور اپنے مفید امر سے مخالفت کا خیال نہیں ہو سکتا۔

حضرت ابوبکر کے موافق کچھ لکھا جانا حضرت عمر کے خلاف نہ ہوتا اور نہ یہ روایت کہ میں ابوبکر کے ہوتے ہوئے پیش نمازی

نہیں کر سکتا یا اس کے کچھ روزہ کا واقعہ کہ خود حضرت عمرؓ سے پہلے حضرت ابوبکرؓ کی بیعت کرتے ہیں، اس کی جگہ معیوضا ہے جس سے یہ قیاس کیا جاسکے کہ حضرت ابوبکرؓ کے لیے رسولؐ کا کچھ تحریر فرمانا حضرت عمرؓ کے ناگوار طبع ہوتا۔

رسول اسے امت کا والی امر نہیں قرار دے سکتے تھے نہ اس کا قرینہ ہے کہ حضرت ابوبکر جو عمرو بن عباس جیسے ان کی حیات میں کوئی مفید خدمت نہیں دی گئی یا اسامہ بن زید کے ماتحت رکھے جاسکیں، یا سورۃ برات اس لیے تلاوت کے لیے نہ ملے کہ اس کام کو رسول کری یا جو رسول کے اہل بیت سے ہو تو عقل اور انصاف کے نزدیک بہت بعید ہے کہ رسول ایک ایسے بڑے کام کو جس میں کئی ہر لحاظ سے مسلمانوں کا والی امر ہو، ایک ایسے شخص کے سپرد کر دیں جسے پیشتر نسبتاً کم درجہ کے کام بھی نہ دیے گئے ہوں یا دیے گئے ہوں تو ایسے وجوہات پیدا ہو گئے ہوں کہ اس منصب کو لے لینے کی ضرورت محسوس ہوتی ہو۔

کس کے متعلق رسولؐ کچھ لکھ سکتے تھے

خلیقہ، وحی، مجزئۃ السراس من بدنی (جسم میں بمنزلہ سر) مولیٰ اور کیا کچھ نہ فرماتا مسلمانوں کی کتابوں میں محفوظ ہے۔ اسی بزرگ کے لیے لکھتے۔

آخری وقت علی کو قریب رکھا تھا

اور حضرت عمر اور ابوبکر اور عثمان کو
دور بھیج رہے تھے، رسول کاٹنے چن رہے تھے

موت نہ آئے جب تک علی کو بیچ نہ لیں۔ یا فرماتے تھے کہ باغ و درت تمہیں عیبت تو ہوں لیکن جدائی پر افسوس کرتا ہوں۔ کون اس سوچنے سے باز رکھا جاسکتا ہے کہ رشواں ان تمام لوگوں کو جو ذاتی وجوہات سے علی کے حقوق کی مخالفت کرتے

مدد مقام سے دُور ہمارے تھے کہ کوئی جناب امیر کے راہ میں حائل نہ رہتا۔

حلیش اُسامہ کے ساتھ روانہ نہ ہونے کی وجہ تھا کہ کہیں اسی کو رسول اپنا جانشین چھوڑ کر

رحلت نہ فرمائیں جس کے جانشین ہونے اور یکے جانے کا دلوں کو یقین ہے اور ہم لوگ ذوری کی وجہ سے کوئی کوشش نہ کر سکیں۔ ظاہر ہے کہ ایک مرتبہ ہلکی شورش اور مخالفت کے علی کا جانشین ہو جانا دوسروں کی امیدوں کو خاک میں ملا دیتا۔ یہ بھی کہہ دوں کہ اگر ایسا ہو تا تو آج اسلام اور مسلمان دوسرے ہوتے۔ اس لیے کہ علمبر فقرہ نہ اس قدر

جلد پیدا ہوتے اور نہ ایسا موقع ملے علی کے مخالفین حقوق اپنی کوشش سے باز نہیں آئے جس کا ذکر تھوڑی دیر میں کیا جائے گا اور وہیں اس احتجاج کا جواب ہو سکے گا کہ آیا بعض لوگوں کا لشکر اُسامہ کے ساتھ روانہ نہ ہونا رسول کی محبت سے تھا؟

سوچو کہ اگر حضرت عمر کا یہ باغزوختہ فقرہ غم غماری کے لحاظ سے ہو تا تو کیا ضرورت تھی کہ درہمیانے علم ابن عباس روتے اور پہلی نکت روتے کہ ان کی آنکھوں کے آنسو سنگریزوں کو تر کر دیتے۔ اس لیے روتے کہ لوگ رسول کو ایسی چیز کے کھنسنے سے مانع ہوئے جو مسلمانوں کی ابدی آہلک کے لیے ہدایت کرتا، اور وہ قوم کش احتمالات نہ ہوتے جو مسئلہ امامت سے ہوتے۔ یہ اسلام کی پہلی ہمدردی تھی۔

رسول کا ایک فقرہ جسے مؤلف نہیں سمجھا میں رسول کے اس فقرہ کے نتیجہ نصرت کو مطلق نہیں سمجھا کہ: ”مجھے چھوڑ دو میں جس حالت میں ہوں اٹھا ہوں۔ اس سے جس کی طرف تم مجھے بلاتے ہو۔“ پہلے نصرت فقرہ کا مطلب صحت ہے کہ رسول شور غل کرنے والوں کو مجلس اقدس سے دور کر رہے تھے اور ان کا قریب رہنا ناگوار تھا۔ لیکن دوسرا نصرت کہ: ”اس سے جس کی طرف تم مجھے بلاتے ہو۔“ واقعات کی کمی سے کچھ میں نہیں آتا۔ جو کچھ خیال ہے وہ یہ ہے کہ شور و شب کرنے والوں نے کوئی رائے پیش کی ہوگی جو رسول نے قبول نہ فرمائی۔

ایک نہایت مفید بات تاریخ میں معدوم ہے لیکن چونکہ مؤرخین نے یہ نہیں لکھا کہ لوگوں نے رسول کو کس طرف بلایا تھا

اس لیے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ لیکن سوچتا ہوں کہ اگر یہ کوئی مخالفت تجویز پیش کی گئی تھی تو اس کا تاریخ میں ہونا حالت کو صاف بگاڑ دیتا۔ جو اب اس لیے حذف کیا گیا کہ رسول نے نامعلوم فرمایا اور لکھا بہت سے حالتوں کو پوست کبہہ کر دیتا۔ رسول نے زیارت کی استدعا نا منظور کی البتہ کہ یہ کہنا ہے کہ بیماری میں اور نہادنی ہوئی اور لوگوں نے یہ خواہش ظاہر کی کہ زیارت کے لیے آنے کی اجازت دی جائے تو سرور عالم نے فرمایا کہ: ”میری بیماری کی تکلیف کم ہے بہ نسبت تمہاری موجودگی کے۔“

افسوس دورانِ علالت کی آخری باتوں میں صاحب حیات القلوب اور مناقب مرتضیٰ نے پُرورد تصویر رسول کا اسبابِ خاصہ علی کے حوالہ ہوا

گئی جبکہ رسول علی کو اپنی تلوار، زرہ، تاج اور کپڑے عطا فرما رہے ہیں۔ ان کپڑوں میں ایک وہ چادر بھی ہے جسے آنحضرتؐ کو سگی کے وقت شکم اطراف پر باندھ لیتے تھے اور علیؑ روتے روتے بے خود ہو گئے ہیں۔

علیؑ عکاشہ کے تازیانہ کے لیے سند درحکم نے اپنے آخری وقت یہ بھی امتنان فرمایا کہ اگر میں نے کسی کو تکلیف پہنچائی ہو تو مجھ سے اقامت لے لے۔

عکاشہ بن صحن نے دعویٰ پیش کیا کہ مجھے رسولؐ کا تازیانہ ملا ہے۔ رسولؐ آمادہ ہوئے۔ پور طبری کے مولف عکاشہ کے تازیانہ کے تلے خصوصاً علیؑ نے اپنے کو پیش کیا۔ عکاشہ نے پشت مبارک پر بوسہ دیا اور درگزر کیا۔ اسے کاشحہ آئندہ خانہ میں بھی اہل بیت نبویؑ کا ویسا ہی احترام باقی رہے جیسا عکاشہ سے سرزد ہوا۔

رسولؐ کا سر مبارک علیؑ کے زانو پر اس کے بعد قبول منافع سرزد حکم نے فرمایا کہ میرے جانی علیؑ مرتضیٰ کو بلاؤ۔ علیؑ مرتضیٰ آئے اور حضرت کی ہالیں پر بیٹھے۔ اور

سر مبارک اس حضرت کا اپنے زانو پر اس جانب نے رکھا۔ امیر المومنین سے اور وصلیا فرماتے۔ کچھ ایسے قرض کے متعلق تھے جو ذاتی تھے۔ کچھ اس قرض کے متعلق حاجو اُسلانہ کے لشکر کی آراستگی کے لیے لیا تھا۔ اور سب سے مخصوص وصیت یہ تھی کہ:

آئندہ کے متعلق ایک یادگار وصیت ”میرے بعد مجھے بہت سے محدث پہنچیں گے۔ مجھے چاہیے کہ گھبرانے والے اور سر ہلکانا شروع کرے۔ جب تو

یہ دیکھے کہ لوگ دنیا کی طرف مشغول ہو گئے تو آخرت اختیار کرنا۔“

رسولؐ طاہرہؑ کے آنسو پونچھتے ہیں ہادی عالم کی حالت خراب ہوئی تھی، اور یہ نصیحت سچی تھی کہ ان کی لادھیستی منجانب سے نہ ہو سکتی۔ رسولؐ نے آنکھیں کھولیں اور

اپنے دستِ اقدس سے آنسو پونچھے۔

حسینؑ کی طلبی اور اُن کا اضطراب اور قبول روضۃ الشہداء اپنے فرزندوں کو طلب کیا۔ طلبا لوگ بچوں کو بلانے تیزی سے دوڑے۔ بچوں کے اور جب نہیں جاکے

لوگوں کی گھبراہٹ اور اُشروہ صورتوں نے بچوں کے اثر پذیر دل کو متاثر کیا۔ اگرچہ وہ حالت کا ایچ اندازہ نہ کر سکے۔ ہوں۔ حسنینؑ کے اضطراب نے اصحاب کو ڈکا دیا۔

رسولؐ بچوں کے متعلق وصیت کرتے ہیں سات آٹھ برس کے بچے اس طرح جلد جلد قدم اٹھاتے ہوئے جا رہے تھے کہ چھوٹے چھوٹے علمائے سرور سے

گرسے جاتے تھے۔ وہ اصحاب جو رہداریت سربراہ کھڑے تھے حسنینؑ کو بسورتے اور اس طرح جاتے ہوئے دیکھ کر بے اختیار ہو گئے۔ قبول منافع: ”حضرتؐ نے ان کو بوسہ دیا۔“

اور سوچا۔ اور لوگوں کی تعظیم احترام اور محبت کے باب میں اصحاب کو اور تمامی اُمت کو وصیت کی۔ ”اور شاید بھی وقت ہو جس کے متعلق علامہ مجلسی مدیث نقل فرماتے ہیں کہ جناب رسولؐ چشم پر آب ہو کر علیؑ سے فرماتے ہیں: ”میں جانتا ہوں کہ تمہارے لیے میری اُمت کے بہت سے لوگوں کے دلوں میں کینے ہیں کہ وہ لوگ ان کینوں کو ظاہر نہ کریں گے۔“

یہاں تک کہ میں باغی ہو کر (مجلس ابراہار)

اس وقت کی حالت واقعات بتائیں گے کہ کوئی چشم دید واقعہ خوانی اس پیشین گوئی سے بڑھ نہیں سکتی تھی۔ اس وقت کی حالت نہایت لکھے جانے کے سہی خوب جاسکتی ہے۔

علیؑ: ہمیں رسولؐ نے فرزندوں کی طرح گود میں پالا تھا۔ فرزندوں میں قبول کیا تھا۔ ہدایت پائی۔ سایہ میں جوان ہونے اور اثر حاصل کیا۔ اپنے کو تنہا دیکھ رہے ہیں۔ حضرت فاطمہؑ کہہ رہی تھیں کہ بابا اب حسینؑ کس پر مچیں گے۔ اور کون ناز اٹھائے گا۔ اصحاب اہل بیتؑ کی مصیبت پر سرپیٹ رہے تھے۔ اور دیکھنے کی یہ بات تھی کہ وہ تنہا جیسے مکہ سے جلا وطن کیا۔ طائف میں نہ رہنے دیا، مدینہ میں تھیں سے بچھاننا ملا، اب اس پر مکی اور مدنی اس طرح رو رہے ہیں کہ کبھی کوئی بیٹا اس طرح باپ پر اور کوئی باپ اس طرح اپنے بیٹے پر نہ رویا ہو گا۔ مدینہ کے ہر کوچہ و بازار سے رونے کی صدا بلند تھی اور یہ آوازیں درود دیوار سے اپنا سر ٹکرا رہی ہیں۔ اسلام میں کبھی ایسا نوحہ و ماتم نہیں ہوا۔ یہ پہلا غم تھا۔

فتح خدیجہؑ سے مبارک نہ اٹھا سکا در خیبر اٹھانے والے علیؑ سے سراقہ س نہ اٹھ سکا کہ لٹا دیتے اور عباسؑ کو آواز دی:

”میں بے خود ہو رہا ہوں میری خبر لے۔“ اس لیے کہ ہادیؑ جو اس دنیلے کافی میں اپنا کام پورا کر چکا تھا عالم فساد کی طرف بلا لیا گیا۔

— (۱۵۷) —

باب اول کا خلاصہ

واجبات کا ثبوت

کسی حد تک سر زمین عرب کی حالت دکھائی گئی اور یہ بتایا گیا کہ اگرچہ سرزمین جزیرہ عرب میں ہدایت کا مجموعہ تھا لیکن وہ اپنے مذہبی خیال میں اس درجہ پست تھے کہ ان کے عین اصول منہج ہو گئے تھے۔

منہج ہونے کے اسباب وہ اس وجہ سے ہو کہ بائبل مذہب نے اپنی اصول کو غلط فہموں ظاہر نہ کیا ہو۔ یا خود اصول ہی تغیر پذیر ہوں یا استدلال زمانہ کی وجہ سے مقلدین میں مبالغہ کی خواہش اور مقلدین کی کئی احتیال یا اصول کی گرفت کے قابلیت کی کمی نے انہیں اس حد تک منہج ہانے دیا ہو۔

مذہبی جزر و مد بہت غور کے قابل ہے کسی کا یہ فقرہ کہ مذہب ایک دریا ہے۔ جس میں جزر و مد ہوتا رہتا ہے۔ اس میں ترقی ہوتی ہے اگر اس کے عین گیر ترقی کی طرف پہنچانے کے قابل ہونے اور تسخیر ہوتی ہے اگر ذمہ دار لوگ اپنی عقل اور معلومات میں ضروریات سے پست درجہ کے ہونے۔

کیسے لوگ گزر چکے تھے مشاہیر انبیاء مثل حضرت موسیٰ اور عیسیٰ گزر چکے تھے اور ایسے قوت دار اور عقل والے لوگ مثل داؤد اور سلیمان کے صفحہ تاریخ پر اپنی ہستی کا نقش ڈال چکے تھے۔ مشرق میں بودہ اپنے گوشہ نشین فلسفہ کے ساتھ نمودار ہوا اور بہت جلد اس کے خیالات گوشہ نشینوں کے ذہن میں رہ گئے یا لوگ اپنے خیالات اولیٰ میں اپنی جگہ رہے اور بودہ کی نصیحتوں کو بھی دماغ میں اسی طرح رہنے دیا جس طرح اور بہت سی اچھی باتیں سنائی دیتی ہیں۔

مذہب کی غرض انفرادی اور قومی خصائل کی درستی ہے لیکن وہ کوئی ایسا وزن نہیں رکھتیں جو خصائل پر گہرا اثر اور عواقب الہی سے اجماد واسطہ قائم کرنے میں معین ہوں یا روزانہ معاشرت میں بودہ کے خیالات کسی طرح نمودار ہو سکے ہوں۔ یا کوئی خدا دکھایا جو جس نے دل کی گہری سے گہری نہ میں ایسی جڑ پکڑ لی ہو کہ پھر کسی ہی بودہ کے تعلیمی نقائص ہوں اس کا اکثر ناگہم ہو گیا ہو۔ اچھا تھا کہ کنگفوزی نے ملکی انطوق کی تعلیم کی

اور میرے خیال میں چینی قوم کے لیے بودہ کے بہ نسبت زیادہ اچھی اور بکار آمد باتیں کہہ گیا اور بعض عملی مثالیں بھی بتا گیا۔ لیکن وہ بودہ ہو، کنگفوزی ہو یا لاوژی یا تینوں کا مجموعہ اپنی تعلیمی حیثیت سے قوم کے حالات و خصائل کو کوئی ایسا مرکز نہ بتا گیا جس سے وہ تنہا یا مجمع میں یہ سوچ سکتی کہ ہم یہاں ایک ہیں۔ یہ ہمارا نقطہ خیال اور یہ ہمارے مجمع ہونے کی جگہ ہے۔ بے حقیقی کے فلسفہ میں شہیدانہ منزلت کا احساس ممکن نہ تھا

ترجمہ موجودات کی بے حقیقی کا حقیقی اعتقاد ہو سکتا ہے وہ کسی اصول پر مشرمان ہونے کو شہیدانہ منزلت بخشتی۔
نظام موسوی موجودہ توریت میں حضرت موسیٰ کی زندگی اور عمل سے عزرات کا حصہ نکال دو، پھر اس کے بعد کہو کہ ہم بحیثیت ایک قوم گر کے انھیں کس نگاہ سے دیکھیں، تو قصیں غالباً صرف اس سے تشکیل دی گئی کہ انھوں نے رسومات مذہبی کے بارے میں قوم کو اس طرح دبا دیا تھا کہ وہ اس سے علیحدہ ہونے کی فرصت اور سوچنے کا وقت نہ پائی، اور مزید اعتیاد کے لیے کابھوں کو مسلماً کر دیا تھا۔ اگرچہ کوئی اس کی ذمہ داری نہ تھی کہ سب ہارون کے ایسے ہو سکتے یا علی کے بیٹوں کے ایسی دست برد سے متعذرین محفوظ رہتے۔ اور جب تم استقلال تلاش کرنا چاہو گے تو قصیں محض یہود کے قوم گر کی ذات تشکیل نہ دے گی بلکہ اس کے قریب کوئی بڑا پتر اور سی یا قسم بھی تلاش کرنا ہو گا۔ اور اگر تم کوئی قابلِ وقعت خداوند ناچاہو گے تو قصیں دیرانہ دکھائی دے گا جیسے یہود کی تاریخ ان کے خصائل بھائی ہے۔ اور اگر تم اعتدال یا رحمت خداوندی تلاش کرو گے تو ضرور قصیں اپنی تمام کوشش میں شک کر بیٹھنا ہو گا یا زیادہ سے زیادہ یہ ہو گا کہ خدا نے اپنی خاص قوم یہود کو اس لیے اپنی رحمت کے لیے کچھ دنوں تک مختص کر لیا کہ اُسے غیر قوموں کے ساتھ اعتدال حرام تھا۔

عیسوی انتہا پسندی اور مسیحی نظام حضرت مسیحی ایک زمانہ تک یہودی تھے۔ جیسا خود ہائے لیٹ بھی خیال کرتا تھا۔ (یوحنا باب ۱۸: آیت ۳۵) انھوں نے یہ بھی ظاہر نہ کیا کہ وہ کس نئے مذہب کی بنا ڈال رہے ہیں۔ اگر ان کی تعلیم میں کوئی مخصوص شان تھی تو یہ کہ وہ تمام رسومات کو خفت سے دیکھتے تھے۔ یہ دوسرے دین کی انتہا پسندی تھی یا فقہانے یہود کی تصنیع اور ان کے پتی صفات پر طنز کر رہے تھے۔ یہ پال تھے جنھوں نے یہودیت اور مسیحیت کی جڑ نے دانی زخمیر کو کاٹ دیا۔ چالیس سے زیادہ انجیلوں میں چارہ گئیں اور وہ بھی مختلف نقطہ خیال سے بیان ہوئیں جو بدیہی تناقض سے پر ہیں جس سے اس کا یہ اثر کہ وہ الہامی حیثیت رکھتی تھیں ہاتا رہا۔ اگرچہ خود اسی میں کلام ہے کہ کسی نے حضرت مسیح کے اقوال کو جمع کیا۔ خود اس مباحثے نے کہ آیا انجیل غیر یہود اقوام پر پڑی جانے یہ شبہ پیدا کیا کہ حضرت مسیح کا مشن نہایت محدود تھا۔ اور موعودین کے لحاظ سے مذہب عیسوی کی تسلیط پر پتی نے اسے درجہ توحید سے گرا دیا۔ (دیکھو میس کرانسٹ صفحہ ۱۸۸ کیلی ڈی ریمی)

یہودیت میں درجہ شہادت موجودہ یہودیت لویا مسیحیت اپنے شہدا کا تذکرہ کرتی ہے۔ شہدائے یہود مدد لیتا ہوں۔ مجھے ان دونوں کتابوں سے درجہ شہادت کا ممتاز احساس نہیں جو تہ جس سے یہود کے اپنے شہدا کے افکار میں نہیں بھی شریک ہو سکوں۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ ان شہدا کی ابتدائی تاریخ اور ان کے حالات و خصائل کے متعلق حالات کی کمی ہے۔ دوسرے یہ کہ محض قتل ہو جانا دراصل ایک امتحان خیز حالتوں کی کمی ہے اور جس میں علم و ارادہ سے مقتول ہونے کے آثار نہیں ہیں، ان کے کسی ایسی صفت یا صفات کا معترف نہیں بناتا جس سے ان کا استقلال حق ردی ایثار اور باطل سے کنارہ کشی یا حق پر قتل ہو جانے کی قسم پائی جاتی ہو۔ بجائے کسی اور لفظی موازنہ کے میں سفارش کروں گا کہ ان مدارج کے سمجھنے کے لیے ناظرانِ واقعات کا انتظار کرے جو میں اپنے شہداء کے متعلق پیش کرنے والا ہوں۔

مصلوبیت مسیح کے اسباب و حالت اور نتیجہ مسیحیت کی سب سے بڑی شہادت پر بالفعل میں قناعت کرتا ہوں جو درجہ شہادت اور اس کی بلوگیر مغات کے کھنے میں مدد دے گی۔ واقعہ مصلوبیت ابن مریم ہے جس صورت سے وہ موجودہ انجیل میں پہلایا جاتا ہے۔

فتح کی عید کی وجہ سے ابن مریم کی گرفتاری ملتوی رکھی گئی ابن مریم سے یہود بد دل ہوتے جاتے تھے یہاں تک کہ ان کے اس فقرہ نے کہ میں اس معبد (بیت المقدس) کو چاہتا ہوں سے بنایا گیا ہے توڑ کر تین دن میں ایسا بنا دوں گا جو ہاتھوں کا بنا ہوا نہیں ہے۔ مخالفت کو دشمنی کی حد تک پہنچا دیا۔ لیکن ان دنوں فتح کی عید تھی۔ یروشلم میں لوگ جمع ہو رہے تھے، اس لیے عید ہونے اور لوگوں کے مشتعل ہوجانے تک یہود نے ان کی گرفتاری ملتوی رکھی۔

مسیح کی افسردہ حالت اور دعا مخالفت کی خبریں ابن مریم کو پہنچی تھیں اور یہ افسردہ دکھائی دیتے تھے۔ متی کے باب ۲۶ آیت ۳۹ میں ہے کہ: ”موت کی کسی حالت بخوشی اور مژدہ کے بل کر کر دعا مانگی کہ اے میرے باپ اگر ہو سکے تو یہ پیلا (موت) غم سے گزر جائے۔“ اور وہ جاگتی میں پھنس کے اور بہت گڑبڑا کے دعا مانگا تھا۔ اور اس کا پسینہ لہو کی بوند کے مانند ہو کر زمین پر گرتا تھا۔ (لوقا باب ۲۲: آیت ۴۴) دو یا تین مرتبہ یہ دعا مانگی۔

پوشاک مضحکہ اور الفاظ جوڈا استریوٹ نے ساٹھ روپیہ کی لالچ میں انھیں گرفتار کر دیا۔ ابن مریم کو قمری رنگ کا کپڑا پہنا دیا گیا۔ کاشوں کا تاج سر پر رکھا اور ہاتھ میں ایک سرکٹا دے کے لوگوں نے اپنے گھٹنے ٹیکے اور مضحکہ کیا کہ: اے یہودیوں کے ہلاک شاہ سلام۔ صلیب دیے جانے کے نوبت گھٹنے مسیح زور سے چلانے کہ: ”اے میرے خدا میرے خدا کیوں تولے مجھے اکیلا چھوڑا۔“ اور اس کے بعد ”یہووا نے پھر بڑے شور سے چاکا جان دی۔“ مرقس میں بھی ہے۔ لوقا میں جرز و ذرع کے الفاظ اگرچہ موجود نہیں ہیں لیکن چلانا لکھا گیا ہے۔

یہ واقعہ بتاتے ہیں کہ نہ صرف حضرت مسیح کے ذہن میں کوئی ایسی بڑی وجہ نہ تھی جس کے لیے انھوں نے پیشتر سے یہ معصم ارادہ کر لیا ہو کہ ہم اس کے لیے جان دیں گے لیکن پچھنے نہیں گئے۔ اور نہ انھیں یزاس کے مفرقا کہ یہود کی عام آواز اور فتوے کو قبول کرتے۔

الزام یہود کچھ تو اس وجہ سے مخالفت کرتے تھے کہ وہ انھیں مذہب یہود کی تحفیت کرتے ہوئے دیکھتے تھے اور کچھ اس لیے مخالفت تھے کہ انھوں نے انھیں ان کے مذہبی دستار سے گرا دینا چاہا تھا۔ اور ان دونوں نے مل کر رومی گورنر پائے لیٹ پر اس کا زور دیا کہ اپنے کو ”یہودیوں کا ہلاک شاہ“ کہنے والا باغی ہے۔ اس لیے کہ یہودیوں کا ہلاک شاہ قیصر روم ہے۔

جب پائے لیٹ نے ابن مریم سے پوچھا کہ: ”کیا تو یہودیوں کا بادشاہ ہے۔“ تو اس کا جواب دیا گیا اس سے کہ میں

ابن مریم سے پائے لیٹ کا سوال

آتا ہے کہ ابن مریم نے نہ اقرار کیا اور نہ انکار کیا۔

مٹی میں ہے کہ: ”تو کہتا ہے۔“ مرقس میں ہے: ”میں ہوں۔“ لوقا میں ہے:

مفید موقع پر اناجیل کا اختلاف اور گول جواب

”اگر میں تم سے کہوں تم یقین نہ کرو گے۔“ یوحنا میں ہے کہ: ”یہ بات تو کہتا ہے یا لوگوں نے تجھ سے کہی ہے۔“ ایسے گول جواب کی ضرورت یزاس کے اور کچھ کچھ میں نہیں آتی کہ اقرار ملزم ٹھہراتا اور انکار متعین پر سے اثر زائل کر دیتا۔ موت کے آثار دیکھ کر نہ صرف ابن مریم میں افسردگی پیدا ہوئی بلکہ موت کی سی حالت طاری ہوئی، اور انھوں نے اس کے ٹل جانے کی بھی دعا مانگی۔ ہم نہیں سوچ سکتے کہ

تسلیم و رضا کی لغزش

یہودی آزادی حکومت ان کے مشن کے متعلق اگر کچھ شرائط پیش کرتی تو یہ کس حد تک منظور کرتے اور کس حد تک اپنی روش پر مصر رہتے۔ عین مصلوبیت کی حالت نے ان میں اس درجہ لغزش پیدا کی کہ یہ سوال کر سکتے کہ: ”میرے خدا تو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا۔“ یا جبر و ذریع کی حالت طاری ہوئی۔

یہ حالتیں قصیں جس سے میحیت کے اس پہلے شہید کے درجہ استقلال کا قابل تعریف اندازہ نہیں ہوتا اور نہ یہودیوں کے

مصلوبیت مسیح بڑی بات نہ سمجھی گئی

بادشاہ کے خطاب کے کوئی وجہ شہادت کچھ میں آتی ہے۔ انھوں نے شہادت کا ارادہ نہیں کیا۔ شہادت ان کی طرف دوڑائی گئی۔ اس وقت کے مؤرخین مثل جوزیفوس وغیرہ کے کہتے ہیں کہ حضرت مسیح کے واقعہ نے لوگوں پر کوئی اثر نہ کیا۔ حضرت موسیٰ کے استقلال کی جنبش

دودھ میں مشتہ ہو جاتے جس کی پاداش میں انھیں چالیس برس بیابان میں سرگردانی ہوئی اور پھر بھی وہ ہار رکھے جاتے کہ دودھ اور شہد کے ملک میں وہ خود داخل نہ ہوں بلکہ ایک بلند پہاڑ سے اس جگہ کا نظارہ کر لیں۔

شہدائے عالم اور شہدائے کربلا کا فسق

شجاعت پر آمادہ کرتی میدان جنگ کسی کاڑھا قتل عام دیکھے۔ کوئی قتل کرے اور کوئی مقتول ہو، اس میں کوئی بہ نسبت دوسرے کے ممتاز ہو اور شجاع بکھا جائے۔ لیکن ان تاریخی شجاعوں کے کارنامے جو ان دشواریوں کے سامنے کام نہیں کر رہے تھے جن کے تذکرے آنے والے ہیں کوئی غیر معمولی فکر کے تحت نہیں ہیں اور یہ تو بہت دور ہے کہ ان کی شجاعت اور متعلق مسافت بااعلام اس وقت ظاہر ہوئی ہوں جس وقت نہ صرف طائف دنیا سے بیزاری کے آثار ملتے ہوں بلکہ فسق کے بعد بھی آسائش کی کوئی امید نہ ہو۔ یہ اس وقت بھی جان دینے پر آمادہ ہوں جس وقت انھیں جان بخشی اور انعام کا یقین دلایا جاتا ہو۔

تاریخ عالم کے مشہور کارنامہ شجاعت

تاریخ قدیم میں شجاعت کا سب سے مشہور کارنامہ لی آیلز کا ہے۔ جس وقت ژرکونین (کھنرو) نے یونان پر سس لاکھ سپاہیوں سے حملہ کیا۔ مغرور شہنشاہ کی فوج ایسے تنگ راستہ سے گزرتی جاتی ہے جس کی ایک طرف پہاڑ اور دوسری طرف سمندر تھا۔ شاہ اسپارٹانے اس ملک انگن فوج کا استقبال کیا۔ یہاں تک کہ تھراپولی کے درہ میں اس کے ساتھ صرف تین سو آدمی بچے۔ اور ایرانی فوج ان کی زندگی تک آگے نہ بڑھ سکی۔ بلکہ یہ فوج ان ٹھہن وطن کی لاشوں پر سے ہو کر گزری۔ تاریخ روم میں شجاعت کی مثال جو ریش کوکس کی ہے جس نے ہٹبر کے پل پر پوسنیا کی فوج کو تیار دیا وہاں تک کہ پل توڑ دیا گیا۔ یہ بھی دریا میں گرا لیکن تیرتا ہوا کنارہ پہنچ گیا۔ قوم نے قدر کی۔

موسیٰ اور عیسیٰ کے مخلصین

تمام توریت کا ملاحظہ یہ نہیں بتاتا کہ حضرت موسیٰ کی تمام قوم گری نے ان کے لیے کچھ ایسے مخلصین تیار کیے ہوں جن کی ذہن میں ان کی اطاعت حکم جان سے زیادہ عزیز ہو، بلکہ ان کی قوم نہ صرف ذرا ذرا سی بات پر بغاوت پر آمادہ رہتی ہے بلکہ بار بار خود حضرت موسیٰ خدا سے بھی شکایت کرتے ہیں اور اپنے منصب سے استعفا پیش کرتے ہیں اور اسی طرح حضرت عیسیٰ اپنے ظاہر اضطراب کے وقت پطرس کے لیے مشہور حواری کی وفاداری کے متعلق اس کے منہ پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ: ”میں تجھ سے کچھ کہتا ہوں کہ تو اسی رات کو مرع کی ہانگ دینے کے پہلے تین بار میرا انکار کرے گا۔“ (متی ۲۶: ۳۴)

زندگی میں معتقدین کے انکسار کی یہ حالت آئندہ زمانہ کے ایسے واقعات سے کہ یہودیوں کی کسی ظالم بادشاہ کے حکم کے حکار ہونے اور دفعہ قتل ہو گئے یا یہ ذکر بھی کہ انھوں نے جنھیں گوارا کیں (جو بہ نسبت یہی تاریخ کے تاریخ یہود میں زیادہ ممتاز ہے) لیکن تبدیل مذہب نہ کیا۔ اس لحاظ سے قابل موازنہ نہیں ہے جس طرح تمام فوج میں چند سپاہیوں کا میدان جنگ میں قتل ہو جانا کوئی مخصوص ہیئت نہیں ہے۔ یہ حالت محض اس تعریف کی مستحق ہے کہ وہ میدان جنگ میں تھے اور ان کا موقع بھی ویسا ہی تھا جیسا دشمن کا وہ بھی اپنے مقابل دشمن سے جو ملے نکال سکتے تھے۔ اور دشمن بھی اسی تعداد میں مارا جاسکتا تھا جس قدر ان کے آدمی مقتول ہوئے۔ اس سے ظاہر ہوگا کہ محض فوج میں قتل ہو جانا یا کسی ظالم بادشاہ کے حکم سے زندگی سے سبکدوش کر دیا جانا باوجود اس کے کہ اس حالت میں ان سے قابل تعریف امور ات سرزد ہوتے ہوں۔ ان واقعات کے سامنے بے حقیقت ہیں جن کا ذکر حسین کی سوانح عمری سے متعلق ہے۔ یہ حالتیں انھیں مخصوص افراد عالم کے لیے تھیں اور ان کی تعریف یہ تھی کہ ان مخصوص مواقع پر انھوں نے بہترین صفات کو بڑی پختہ حد تک دکھایا جن حالتوں میں ان صفات کا دکھایا جانا اگر ہو بھی تو نہایت شاذ ہوگا۔

مذہب زردشتی میں شہادت کی معدومیت

مذہب زردشتیت نے نہ صرف شہادت کے اعلیٰ مفہوم کو کبھی نہ دکھایا بلکہ ایسے زمانہ میں بھی جب کہ عربوں یا کبھی کی حکومت یا غیر مذہب قوم نے حملہ کیا۔ ایرانیوں میں بڑھاکم قوم کی کوشش کے جو اپنے اختیار کے لیے لڑ رہی تھی، مذہبی قوت کے کوئی آثار معلوم نہ ہوئے اور نہ کسی نے اپنے کو مذہب پر قربان کیا۔ یہ بھٹا معجزہ ہوگا کہ اسٹش پرست اور سب کچھ پرست بغیر اس کے کہ فائین کے مذہب کو اپنے مذہب سے زیادہ صاف قوت دار اور قابل عمل سمجھتے

ہوں، ملک کے ساتھ اپنے گزشتہ مذہب کو بھی بلاوجہ چھوڑ بیٹھے ہوں۔ زردشتیت اس کے آثار پیشتر سے ظہر کر لے گئی تھی کہ اسے بجائے اس انیزد اور اہرمین کے محبت اور خوف کے جسے سیموتل لیٹنگ کا ایسا کوئی زمانہ حال کا حامی اصول غیرد شر کا فلسفہ بتاتا ہے، ایک صاف صاف مرکز اعتقاد کی ضرورت ہے۔ اس کا ثبوت اس وقت ملے گا جب ایرانی بیت المقدس پر قبضہ کرتے ہیں اور اس میں کسی دیوتا کو نہیں دیکھتے اور آخر میں نہ صرف لوٹی ہوئی چیزیں واپس کراتے ہیں بلکہ اس کے قیام کے لیے بھی مدد کرتے ہیں۔

اور جب اس کا وقت آیا کہ ”خدا“ یا بیسٹ کل یا عالمگیر ذات کی پیش کسی خاص گھر میں اسلام کا خدا اور معبود مختص نہ رکھی جاتی بلکہ اس کی عبادت کا بہترین مندر قلب انسانی ہوتا اور رسالہ ہر جگہ اپنا مجد انکسار ظہر کر سکتا تو عالم نے خدا اور اس کی عبادت کو نہ صرف مندر اور پوجاریوں سے آزاد دیکھا بلکہ آزادی سے اس کے ظہار کا خلوص پیدا ہوا اور اس کے بعد خدا کے دین میں لوگ فوج فوج داخل ہونے لگے۔ ہر اشتہار ان صورتوں کے جب کہ اس فطری عالمگیر مذہب کی راہ میں مندر اور پوجاریوں کی ذاتی منفعت حاصل ہوگی ہو یا زمانہ حال میں نوعی اصول نے اپنی تمام ایلیاں اس کے روکنے میں صرف کردی ہوں۔

حضرت موسیٰ اور عیسیٰ کی ابتدائی کوشش کا درجہ حضرت موسیٰ کو ایک بڑی اور بے کوش استقامت یہ ملی تھی کہ انھیں

ایک ایک اینٹ جوڑنی نہ پڑی تھی۔ بلکہ ان کا فرض یہ تھا کہ وہ قوم جو کبھی حضرت یسٹ کے زمانہ میں عمن مصر کی قوم بھی جاتی تھی اور جس پر کچھ زمانہ کے بعد حاکم قوم نے مظالم اور تشدد کیے تھے انھیں سرزمین مصر سے نکال لائے اور ایک ایسی جگہ انھیں دیتے جہاں وہ اپنے رعویت ادا کر سکتی۔ اسی طرح حضرت موسیٰ کو کچھ تو اس وجہ سے زیادہ خوف اور دشواری نہ تھی کہ وہ کوئی خاص اصول مذہب نہ قرار دے رہے تھے اور نہ کسی تعریف کا اعلان کرتے تھے بلکہ مبہم نصیحتیں تھیں جس کے کہنے اور سننے کا ہر شخص کو حق حاصل تھا۔ اگر انھوں نے فقہ یا کاہن فرقہ کو اپنا محافظ نہ بنایا ہوتا یا بیت المقدس کے متعلق وہ کچھ نہ کہا ہوتا جو کہا یا خدا کی حکومت کا دیا ترجمہ کیا ہوتا یا عیسائیت کے کسی مؤرخین کرتے ہیں اور حتمًا اپنے متعلق ”یہودیوں کے بادشاہ“ کا حوصلہ خیز اور ملکی حیثیت سے مشتبه فقرہ قبول یا ظہر نہ کیا ہوتا تو انھیں کوئی دشواری کا سامنا نہ ہوتا۔ یہود کو اس سے کوئی مخالفت نہ ہوتی کہ انھوں نے مشتبه اطوار کی عورتوں کو بخش دیا۔ یا انھیں اس درجہ رعویت عطا کیا کہ وہ تیل یا عطریات اور ان کی زلفیں ان کے ہاتھوں پر لہرائی رہیں۔ جب کہ خود یہود زہرہ کی دل فریب پیش اور عنسارت کی رفاص کنیزوں کے گردیدہ ہو گئے تھے۔ اسی طرح انھیں فلسفہ محبت سے کوئی مخالفت نہ ہوتی۔ اچھا تھا کہ کوئی شخص کم سے کم بنی نوع انسان کے سامنے ہر روز ہزار مرتبہ محبت محبت کہا کرتا۔ عام اس سے کہ وہ اپنے حلقہ متخلفین میں محبت پیدا کر سکتا۔ یا خود اپنی ذات سے انعام میں کسی کو راج کر سکتا یا نہ کر سکتا۔ حضرت مسیح کو ایک اور آسانی یہ تھی کہ وہ رومیوں کے حکومت کے زیر سایہ اپنی عقلم پھیلاتے تھے۔ جو ملکی حیثیتوں سے یہود کے سخت دشمن تھے اور خود یا قیصر روم کا بت پوجتے تھے یا اپنے اور بتوں کی پیش کرتے تھے۔ رومیوں کے لیے برابر تھا کہ یہودی مذہب کی تعین کی جاتی، یا دین مسیح کی، دراصل ایک دین یہود سے علیحدہ ہو کر دین مسیح میں آنا ایک قوی جامعیت کا شکستہ ہونا تھا اور اس لیے

رومیوں کے مفید قتلہ

قوموں میں اپنے مشاہیر کی عزت
واقعات عالم یہ بھی دیکھ چکے تھے کہ اہل مصر اپنے محسن یوسف اور ان کے باپ یعقوب پر بھی ستر دن تک روتے اور لاش میں خوشبو بھرتے ان کی فطری موت پر غم کرتے۔ اہل چین آج تک کنفوری کی یادگار یہ قائم کرتے اور اس کی اولاد کی عزت کرتے۔ اسی طرح اہل روم اور ان کی عورتیں اپنے کونسل برٹس پر ایک سال تک اس لیے غم کرتیں کہ اس نے لکڑیا کی قص خوردہ صحت کا انتقام لیا تھا۔ فرانسیسیوں نے ایک زمانہ کے بعد نپولین کے باقیات کو سینٹ ہیلیا سے منگا کر خاک وطن میں دفن کیا اور ایک عالی شان یادگار قائم کی۔ انگلستان اپنے مشاہیر کو ویسٹ منسٹر اے میں دفن کرتا ہے۔ بنی اسرائیل موٹی اور ہارون کا ایک مہینہ تک غم کرتے۔

نبی عربی کی ابتدائی مشکل
اب اسلام کی باری تھی۔ نبی عربی کو حضرت موٹی اور عیسیٰ کی سی آسانیاں نہ تھیں بلکہ خود ایک ایک اینٹ جانی تھی۔ اسی جگہ جہاں مسیحین، کابین، دین مکی کے علمہ اور کفار تھے۔ اور ان کے پادریوں کاہنوں اور پوجاریوں کی مرتب فرج مخالفت کے لیے آمادہ تھی۔ کسی ایسی قوم کے سامنے اسلام پیش کرنا نہ تھا جیسا اسرائیلیا، پولینیشیا یا امریکہ کے قدیم اقوام کی حالت تھی جہاں کسی مستند مذہب کے گزر کے آثار نہ تھے۔ اور نہ حکومت کے مذہب کی حیثیت سے سامنے لایا گیا تھا۔ لیکن مشیت ایزدی کا اقتضا یہی تھا کہ اسلام ان بڑے اور مستند مذاہب کے دانتوں کی پچ سے نکلتا ان کی آنکھوں کے سامنے اس کا آغاز ہوتا، اور بے پردہ اپنے لیے قدم اٹھاتا۔ غالباً اس لیے کہ اگر ہندوستان میں ابتداء ہوتی تو ایک زمانہ تک محض اہل ہند سنتے اور دیکھتے۔ اگر چین میں ہوتا تو صرف بدعہوں کے لیے مفید ہوتا یا فلسطین میں فطرت اسلام محض یہود کے لیے ذریعہ ہدایت ہوتی یا کسی ایسی جگہ جہاں محض میحیت تھی اسلام کا اعلان صرف میحیت کے لیے ہدایت بھی جاتی بلکہ اسلام کا مشن یہ تھا کہ ایک وقت میں البتہ ان میں کے قریب کل مذاہب فطرت اسلام سنتے اور اپنی قومیں اس کے گھنے یا مخالفت میں صرف کرتے۔

اسباب عروج اسلام
اسلام کے موافق کیا تھا؟ عرب کی اچھی خصوصیات قوی، اسلام کی فطری سادگی، گزشتہ انبیاء ہادیین اور صاحبین کی ہدایت کا استمرار، اہام سے کنارہ کشی، علم اور اس کے جذبات کو اپنی دونوں جسمانی اور عقلی آنکھوں سے دیکھنا کہ خیالی جالوں سے آزاد کرنا۔ مساوات اپنی ہر شاخ میں جو اخوت اسلامی کی زبردست بنیاد ہوئی، امتیاز درجہ ترقی صفات میں جس سے خدمات اور تذکیہ نفس میں ناقابل الزام رقابت پیدا ہوئی اور حیرت خیز سرعت سے صفات نے ترقی کی۔

سرچشمہ
خدا اور اس کے رسول پر ”مجدوسا“ ”کثرت ظن“ سے پرہیز زبردست برادرانہ معاشرت اور درگزر، سادگی، انصاف، بے شمار نہروں سے یہ چند نام لیے گئے جو اس سرچشمہ سے جاری ہوئیں۔ جے ہم ”رحمۃ للعالمین“ کہتے ہیں۔ یہ نہری اسی کی زبان اور عمل سے جاری ہوتی تھیں۔ ان باتوں نے نہ صرف رائٹ ازریل سید امیر علی صاحب کے ان بہترین لفظوں میں کہ ”اوس اور خرزج اپنی کہنہ خوریز لڑائیوں کو اسلام کے برادرانہ لطف و محبت

کے جذبہ میں بھول گئے۔ ”اثر کیا، بلکہ قوم کی قوم ایک تھکے ہو گئی ایک محسوس جسم بن گئی جس میں اخلاق اور اخلاص اور محبت کی حقیقی بڑھتی ہوئی سرسروش جان شاری غلوس محبت ایثار نفس ان سے ظاہر تھا۔ وہ کہہ رہے تھے کہ: ”من جان ز برانے دوست می دارم دوست“۔ اُستاد کی عظیم الشان ذات ہر شخص کی ذاتی قابلیت کے لحاظ سے کم و بیش ہر ایک سے جھلک رہی تھی۔ ایک معجزہ جلوہ تھا جو عالمگیر ہوتا جاتا تھا۔

ذات رسالت اور اس کے عناصر اس نے کام شروع کیا جو عروں کے شریف ترین اور ممتاز قبیلہ کا ایک فرد تھا جس نے امین کا امتیاز حاصل کیا۔ جس نے نصب ہجر اسود سے قبائل عرب کو ایک رکھا اور اختلاف نہ ہونے دیا اور جو ملکہ عرب کا شوہر ہوا۔ اس نے کام شروع کیا جس کا خاندان عروں کا پیشتر سے روحانی پیشوا تھا جو ان کے اگلے عمنوں اور حاکموں کا فرزند تھا۔ کام اس وقت تک نہ شروع ہوا جب تک اس کے انداز، رفتار، گفتار اور ذات میں وزن اور کشش نہ پیدا ہو گئی۔ اس وقت تک کچھ ایک لفظ آئندہ کے متعلق زبان سے نہ نکلا جب تک حرم کی چٹانوں نے اسے خاموشی میں یہ مدائے بازگشت نہ سنائی کہ اٹھ اور ہدایت کر۔ اب نہ مکہ اور اس کے مشرک روک سکتے تھے اور نہ طائف کی سیلیں اس کی آواز پر بلند ہو سکتی تھی، عورتوں کی ہوا پختہ مغز بڑھموں کی ملا جلی، جوانوں کی ہیبت، بچوں کے پتر، قرنیوں کا قفس اس کے ارادہ اور مسلسل استقلال کے سامنے خشک پتیاں تھیں جو اس وقت کھڑکڑاتی ہیں جب ہوا چلتی ہے۔

مسلمان اور ان میں شجاعت کے اسباب شجاعت کا مرکز دنیا کچھ جی ہے کہ مسلمان ایک شجاع قوم ہے۔ اس لیے کہ اس میں

اس کے خیال میں۔ اس کی ترکیب میں وہ عناصر ساری ہو گئے ہیں جو کسی قوم کو شجاع بنا سکتے ہیں۔ لیکن یہ تمام صفات بغیر نبی عربی کی حیرت خیز اور مجتہدہ صفات بلکہ مظہر صفات ذات کے ایک وہ بے روح کہانی ہوتی جیسے کتب کے کیڑے ستنے اور کھاتے رہتے انھیں اس کا احساس نہ ہوتا اور نہ مسلمانوں کو اس جائز افتخار میں شرکت کا موقع ہوتا کہ ہم میں ہمارے خون میں ان آباء و اجداد کا اثر ہے جنہوں نے رسول کے ذات اقدس کی استقلال اور شجاعت کو محسوس کیا تھا اور اثر لیا تھا۔ تم نے پڑھا ہے کہ جس وقت لشکر اسلام میدان جنگ میں نہ رہ سکتا تھا زندہ اسلام (رسول) اس وقت بھی اپنی جگہ نہ چھوڑتا تھا اور کسی تباہ سر فروش کی جان شاری کا ان الفاظ سے اعتراف کرتا تھا کہ: ”لا فقی الا علی لا سیف الا ذوالفقار“ اسی جگہ نہ چھوڑنے کا یہ نتیجہ ہوتا تھا کہ وہ جو دشمن کے دباؤ سے ہیبت زدہ ہو کر جگہ چھوڑ دیتے تھے پھر اس عظیم الشان ذات کے استقلال کو دیکھ کر کھچتے تھے اور استقلال فتح پاتا تھا۔ خصوصاً جب کہ استقلال کے عناصر خدا پر مبروسا، بچائی اور ہدایت تھی۔

مسلمانوں کے شجاعت کی تاریخ سوچو اسلام کی حالت اور اس کے سپاہیوں کے سامان کو کبھی دشمن کی تعداد کے آدھے بھی نہیں ہیں۔ کبھی چند تلواریں ہیں اور چند مدافعہ جو تمام لشکر کے خوراک کا سامان ہیں۔ دشمن دزدی خود اور زربوں سے اپنے جسم کو بچا رہا ہے، یہ پیتھڑوں میں لپٹے ہوئے اس کے سامنے جاتے ہیں۔ اس صورت سے جاتے ہیں کہ نہ زہر پوش کو اپنے فولاد میں ڈوبے رہنے کا

خیال آتا ہے اور نہ یہ دکھائی دیتا ہے کہ ہمارے حروں کو دشمن کا بہنہ جسم دکھائی دے رہا ہے۔ نہ انھیں خوف اور اندیشہ ہے کہ ہم اپنے کونیزوں کی انی اور تلواروں کے بڑے منہ چڑھانے جا رہے ہیں۔ مرنے کی خوشی تھی۔ مرنے کی دعا میں مانگتے تھے نہ مرنے پر افسوس کرتے تھے۔ بقول ان میں سے کسی کے کہ: ”ہم موت کو اس سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں جس قدر تم زندگی کو عزیز رکھتے ہو۔“ موت سے شریفانہ نفرت تھی۔ ایسی زندگی حیرت مانی جو ان کی بڑی وجہ کی راہ میں حاصل ہو کہ کوئی خوف یا اپنی محبت پیدا کرے۔ شراب کا غنا انھیں میدان میں نہ لے جاتا تھا اور نہ کوئی تنخواہ والے افسر تھے جو سپاہیوں کو ٹپنچوں کے خوف سے میدان میں قائم رکھتے ہوں۔ ہم لوگ جو دہریت اور ملاہیت کی لہروں کے طمانچے کھاتے رہتے ہیں مگر ان کے اس جوش اور اخلاص پر اپنے دانتوں کو ہوا کھلا دی لیکن سوچنا ہو گا کہ جان دینا آسان نہیں ہے۔ وہ لوگ دیکھتے تھے اندازہ کرتے تھے احساس کرتے تھے اور پھر بھی اپنے جوش پر قائم رہتے تھے ان کا جوش پلک جھپکانے کے ترانہ پر تولنے کا نہ تھا ایسا جوش تھا جس میں شکستگی نہ تھی۔ جوش لذتوں کے حصول کے لیے نہ تھا اس لیے تھا کہ شارع کے حکم کی اطاعت اور اسلام پر قربان ہو رہے ہیں۔ اس نتیجہ کے لیے کہ خدا کی خوشنودی حاصل ہوگی۔ نام و شہرت دنیاوی قدر دانی اور اصول منفعیت کا گزر نہ تھا۔ کوئی رومی قاتلانہ محسراب کی صورت نہ جانتا تھا۔

رسولؐ کی ذات سے محبت یہ ذات اقدس تھی جو باہر کو اس وقت بھی پیاری تھی جس وقت پشت گرم ریت پر مجلس رہی تھی اور سینہ پر بھاری پتھر رکھا تھا سمیٹے زوجہ باہر ہزاروں تعریفوں کی منتہی تھی کہ ان کے صبر اور استقلال میں ناقابل برداشت اذیتوں سے لغزش نہ پیدا ہوئی، عمارہ بن زیاد، عباس بن عبدالمطلب، خلیل الملائکہ، ابن جبر، نسیم، قیس، زید بن دثمہ، زید بن حارثہ، اور جعفر بن ابی طالب ہیں جو اسلام کے بڑے دل والے سرفروشن کی فہرست میں سے لکھ دیے گئے ہیں۔ لوگ تھے عورتیں تھیں۔ انھیں اپنے اعزاک لاش پر کھڑی ہونے کی اس لیے ٹھہرتی تھی کہ انھیں رسولؐ کو پہلے دیکھنا سب سے زیادہ عزیز تھا۔

اُمت پر رسولؐ کی پیدائش توجہ وہ پدرانہ توجہ جو رسولؐ کو اپنی اُمت سے تھی اس نے اُمت کے افراد میں اس کا اثر کیا اور اگرچہ فوج سے بھاگنے والے یا رانہ ظاہر کر دینے والے کے لیے کوئی کورٹ مارشل نہ تھا۔ لیکن واقعہ ہونے پر بیٹا، بیٹی، بی بی، عزیز اور دوست سب کے سب اسے جماعت سے ملحق کر دیتے تھے جب تک اس کے دل میں توبہ کا ایسا کامل جوش نہ پیدا ہوتا تھا کہ خدا اور اس کا رسولؐ اسے معاف کرے۔ معافی کے بعد اس کی خلاف ورزیاں عموماً وہ پھر جماعت کا ویسا ہی فرد ترکیبی ہو جاتا تھا جیسا پہلے تھا۔ توبہ اس کے لیے شوب ہو جاتی تھی۔ وہ ماں کے پیٹ سے دوبارہ پیدا ہوتا تھا اور مسلمان لذت معافی کو محسوس کرتے تھے۔

غُربت اور امارت اس طرح خدا کی حکومت اپنے سفیر کے ذریعہ سے جڑ پکڑتی جاتی تھی۔ نہ غربت ذلت کی چیز تھی اور نہ امارت مایہ ناز بھی جاتی تھی۔ اگر غریب کو صبر اور قناعت کی تعلیم دی گئی تھی تو امیر کو کبر و نخوت سے روکا تھا۔ غریب کو اگر سوال کی ذلت سے منع کیا تو امیر کو اپنے غریب بھائیوں کے حقوق یاد دلانے تھے۔ روم اور شرفانے قوم کا اگر لحاظ کیا جاتا تھا تو انھیں یہ اجازت نہ تھی کہ کسی ہی ذلیل حالت کے مسلمان کا دل دکھائیں۔

قوت جذب پیدا ہوئی ان باتوں نے دوسری جماعتوں کو کھینچا۔ انہیں ساخت قوی کی ایسی حیرت خیز کل پلٹی ہوئی معلوم دی جو ان کی کج سے بہت بالاتر تھی۔ وہ سب کچھ سمجھ جاتے لیکن اس نور کے دھونے ہوئے دل کے اثر کو بغیر حلقہ اطاعت میں داخل ہونے کیونکر محسوس کرتے جو ان مسلمانوں پر سایہ فگن تھا اور جس فراور اتر کر لوگ وہ کسی جماعت اور آب و ہوا کے کیوں نہ ہوں دفعۃً رسومات پیشین کی پہلی اتار کر نئے دین کی روح سے گرا کر معلوم ہوتے تھے۔

فطری ولولہ تم بڑے بچے کہ دشمن اس قدر اذیتیں نہ صرف ہادی برحق کو پہنچا چکے تھے جس قدر عداوت کا قیاس اور کوشش ممکن تھی بلکہ مختصر سی اسلامی جماعت کے ساتھ چھیڑ بھی نہ حبشہ میں اٹھارہ مئی اور نہ مدینہ میں۔ بعض اوقات تو موقع اس قدر نازک ہو گیا کہ یہود اور مشرکین میں پس جانے کا کوئی شبہ نہ رہ گیا تھا۔ پھر بھی تم نے دیکھا کہ حتی الوح در گزر سے کام لیا گیا اور وہ رعایتیں کی گئیں جس نے خود دشمن کو حیرت میں ڈالا۔ اور اسی سلسلہ میں آدمی نے ہر مومنوں میں عورتوں مریموں اور اجیروں سے تعرض نہ کرنے کا پہلا اعلان کیا۔ تم سوچ سکتے ہو کہ شیر دل حضرت حمزہ جنہوں نے وجہ اسلام کو اپنی شجاعت سے کسی مدد دی ان کی عبرت خیز شہادت رسول کو انتقام پر آمادہ کر سکتی تھی۔ لیکن ہمارا رسول شیوع اسلام کے لیے آیا تھا (نکوار کرنے) یا ساس کو بھوسے چھڑانے نہیں آیا تھا۔ ظلمہ کرنا یا آگ سے جلادینا شدت سے رد کا گیا۔ اگرچہ وہ کیسا ہی دشمن کیوں نہ ہو۔ اسلام کا کیسا ہی دشمن اقرار اسلام پر امن میں تھا۔ اگرچہ اسلام کی آغوش میں بہت سے ایسے داخل ہو گئے تھے جو آئندہ اس کے سخت ترین دشمن ثابت ہوئے۔ انہوں نے اس کے امن کو اس کے خلاف فساد قائم کرنے کا وسیلہ بنا دیا۔ یہاں تک کہ مندرجہ کے مختلف دفعوں نے یہ ثابت کر دیا کہ خداوند تعالیٰ نے حجاز اور عرب میں عام اشاعت اسلام کے لیے ہر شخص میں ایک فطری ولولہ پیدا کر دیا ہے۔ اسلام لانے والے فکر کر رہے تھے کہ خدا نے اسلام سے ہمیں عزت دی۔ دیر کرنے والے دوڑ رہے تھے کہ ہم نے وقت ضائع کیا۔ ہمارے ہادی کی ساخت قوی اور درستی خصال کے اس معجزے کی تحقیر کرنا فطرت کے معجزے اور قانون کا انکار ہو گا۔ ایسا معجزہ جسے دنیا کے تمام مدبر قوم گراور فلسفی سر جوڑ کر بھی نہیں دیکھا سکتے۔

رسول کے بعد اُمت کی عنان گیری کا سوال اور اس کی وجہ لیکن ہمیشہ ہمیشہ ذہن میں آنے والا یہ سوال باقی

تھا کہ رسول نے اپنے بعد کے لیے کیا انتظام کیا۔ اور اُمت کو جو ایسی سرکش قوم سے مرکب تھی جسے قتل فارت شراب، زنا اور انتقام سے کام تھا اس کے جذبات کو کلام دینے اور اس قدر تعلیم اور درجہ تہذیب کی مخالفت جو اسے حاصل ہو چکی تھی کس ذات کے سپرد کی۔ اور کسے ان کا آئندہ رہنما مقرر کیا۔ یا یہ کیا کہ مہاجر اپنے میں سے اور ان میں کا ہر قبیلہ اپنا اپنا سردار اور انصار اپنے میں سے اور اپنا اپنا سردار مقرر کریں۔ اور اسلام کی ایک جیتی قبل الاسلام اختلاف پر مبنی ہو۔

ہارون الرشید اور اس کا عمل موافق عرقہ میں ابوبکر بن عباس کی زبانی ہارون الرشید بجا دیا گیا ہے کہ خدا اور رسول نے سکوت کیا لیکن اس حیرت خیز سکوت نے شاید کچھ دیر

کے لیے اس پر محکم سکوت طاری کیا ہو لیکن اس سے خود رشید کو کوئی نصیحت نہ ہوئی بلکہ اس نے کمال اہتمام سے اپنے بعد امین اور مامون کے متعلق وصیت جائز اور ضروری بھی۔

رسول کے الفاظ جو اپنے بعد کا لحاظ سمجھاتے ہیں

رسول کے یہ خیال ہم تک پہنچے ہیں کہ کبھی اُحد میں اور کبھی قبیع میں اصحاب سے کہتے ہیں کہ: ”نہیں معلوم میرے بعد کیا کر دو گے۔“ فرماتے ہیں کہ: ”میرے بعد قتلے ہوں گے۔“ یا قبول منائی کہتے ہیں کہ: ”میں نہیں ڈرتا ہوں تمہارے پر کفر کے شیں اور شرک کے شیں یعنی یہ کہ تم میرے بعد کافر اور مشرک ہو گے۔ لیکن ڈرتا ہوں اس بات سے کہ دنیا کی رغبت کر دو گے اور آپس میں لڑو گے۔“ جب کہ یہ کہنا ضروری سمجھتے ہیں کہ: **وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا (۲: ۱۵۷)** جو ہدایت سے بڑھ کر متعلق رہنے اور متفرق نہ ہونے کے استقامت تک پہنچ گیا ہے اور علی سے اس ہدایت اور وصیت نے کہ:

”میرے بعد تجھے ہوتے سے جد سے بھیجیں گے۔ تجھے چاہیے کہ گھبرا نہ جائے اور صبر اپنا شعار کرے اور جب تو دیکھے کہ لوگ دنیا کی طرف مشغول ہوئے تو تو آخرت اختیار کرنا۔“

یہ بھادیا کہ رسول کا سارا خوف یہ تھا کہ لوگ دنیا میں مشغول ہو جائیں گے۔

رسول نے ایک مرکز قائم کیا اپنا قائم مقام چھوڑا اس لیے کی عناصر تفرقہ خود سری کے ہاتھوں قوت نہ پڑی اور قیام امن کی کوششیں ذاتی اغراض کے ہاتھوں پائمال نہ ہوں۔

جناب امیر کے ذکر سے ایک غرض یہ قی کہ میں نے جناب امیر کے واقعات کو بھی ساتھ ساتھ بیان کرتے ہانا اس لیے ضروری سمجھا تھا کہ اس موقع پر یہ کہہ سکوں کہ یہ وہ مرکز تھا جسے رسول نے مسلمانوں کے لیے چھوڑا تھا۔

رسول کے بعد کامرز پہنچوایا جائے

نہ اس لیے کہ ستر اہل کا زور خیال تھا بلکہ اس لیے کہ علی کو ان مختلف حیثیتوں سے پہچان چکے تھے جن حیثیتوں سے پہچانا ضروری تھا ان کے اخلاص اور خدمات کی خبریں مجاز و عرب میں شائع ہو چکی تھیں۔ ان کا نفس وہ شیشہ تھا جس پر رسول نے قلعی کی تھی۔ لیکن نہ تھا کہ اس میں کوئی عکس آتا اور رسول اس سے مطلع نہ ہوتے۔

واقعہ غدیر کے رشوات اس طرح ختم ہوئے کہ چونکہ رسول دنیوی اور دینی حاکم تھے اس لیے جانشین کرنے اور دعا دینے کی خدمتیں بھی انہیں کو بیلانی تھیں جو ”مولیٰ“ اور ”وال“ کے الفاظ سے ظاہر ہیں۔

دُعا کی دُنوی اور رُحانی حیثیت

لوگوں نے اس کا اس طرح استقبال کیا جس طرح ظفر کوئی جانشین کے

اسے وجوہات کہ کیوں رسول نے غدیری ایسی رسم آخری وقت کے لیے اٹھار کی

موقع کا استقبال کرتا ہے۔ لوگوں میں نظمیانہ مسرت پائی جاتی تھی۔ لیکن اس کے کوئی معنی ہیں کہ رسول نے علی کے متعلق اگرچہ پہلے قوی اشارے جانشین کے لیے لیکن کبھی ایسے واضح

عمل سے تائید نہ کی بلکہ اسے آخر کے لیے اٹھا رکھا کیوں؟

اس لیے کہ جماعت اسلامی اب تک دوسروں کے مقابل آزمائی گئی تھی اب تک جامع قوم سر پر موجود تھا ابھی وہ

آپس کے احمقانہ خیز مواقع سے نہ گزرے تھے۔ ابھی انھیں آپس کا معتدلانہ برتاؤ اگر آیا بھی تھا تو اس کے یقین کی کوئی وجہ نہ تھی کہ ان میں جاہلیت کی خصوصیات مردہ ہو گئی ہیں۔ جو اعتدال کو جوش اور زیادتی سے نہ بدل دیں گی۔ یا جو ذاتی فوائد اور حوصلہ کے مقابلہ میں اطاعت اور حق شناسی پر عمل کریں گے۔

اس لیے کہ اسے اصول اسلامی بر قائم ہونے زیادہ زمانہ گزرا تھا۔ اگرچہ وہ حلقہ اسلام میں داخل ہو گئے تھے لیکن یہ سمجھنے کی گنجائش نہ تھی کہ وہ شارع اسلام کی خواہش کے موافق مدارج ایمان بھی طے کر چکے ہیں۔ اگرچہ زمانہ کے گزرنے اور عمل کی ترقی کے ساتھ ان کا پختہ یقین اور ایمان ہو جانا بہت ممکن تھا۔

اس لیے کہ اکثر عرب داخل اسلام ہو گئے تھے لیکن ان کے اعزہ حالت کفر میں تھے اور اسلام اور رسول کے خلاف ٹکڑیاں اٹھاتے تھے اور قتل ہوتے تھے۔ پس اگرچہ اسلام میں داخل ہونے والے اسلام کے اپنے خیال پر غالب آجانے سے کفر کی طرف رجعت نہیں کر سکتے تھے لیکن ان میں سب کے سب ایسے نہ ہو گئے تھے جو اپنے مشرک بھائیوں کے قتل پر متاسف نہ ہوتے یا کسی ہی مشکل پڑتی لیکن خوف کے موقع پر جان دیتے اور رسول کو چھوڑ کر نہ بھاگتے۔ اس لیے کہ ایک جماعت تھی جو یہ دیکھ رہی تھی کہ ہم بہت سے داغ اٹھا چکے ہیں اور نہ ہم اب انتقام لینے کے قابل ہیں اور نہ اب پہلی حالت پر قائم رہ سکتے ہیں۔ پس اختلاف مصلحت یہ تھا کہ جماعت اسلامی میں اپنا نام لکھوائیں، جس کے اقبال میں شرکت کی قوی شرکت کی قوی امید ہے۔ اس لیے کہ ایک جماعت تھی جسے حالت کفر میں اپنی قوم پر ایک وقار اور اثر تھا جسے اسلامی جماعت کے نشوونما کر دیا۔ شخصی اثر جاتا رہا اور حلقہ اسلام میں کل داخل ہونے والوں کا ایک دینی اور دنیوی رہنا تھا۔ ان کا اپنی پرانی حالت پر اڑے رہنا بے سود ٹھنڈی سانس بھرنا تھا۔ لہذا اس کے نزدیک بھی قیمت آسانی کا میدان مسلمانوں کے ہاتھ تھا۔ اقبال اور قیمت کی گنجی پر مسلمان قابض تھے۔

زیر دامن آگ اور اس کا اثر لیکن ان تمام واقعات کا تعلق دو ذات سے تھا جس میں اگر حکم رسول کے متعلق تھا تو بجا بلانا علی سے متعلق تھا۔ اور جس قدر سردار ان عرب کے سر

کچلے گئے اور ان کے جس قدر افسر قتل ہوئے وہ زیادہ تر علی کی ٹکڑیوں سے اس لیے اگر کفار کو علی سے دشمنی اور انتقام کا جوش تھا تو وہ لوگ جو متذکرہ صدر لحاظ سے مسلمان ہو گئے تھے لیکن اپنے پہلوؤں میں عداوت کو رینگتا ہوا دیکھتے تھے اور دشمنی کی یاد کو کسی طرح فراموش نہ کر سکتے تھے۔ وہ بھی دشمنی اور انتقام کے لیے موقع ڈھونڈتے تھے۔ اور سب سے زیادہ خوفناک امر یہ تھا کہ جب ایسے دھڑکتے ہوئے آگ کے لوگ اسلام میں داخل ہوئے تو اگرچہ انھیں اپنے لوگ اپنی پرانی بنیاد پر تو نہ ملے لیکن طبیعت کے بہت سی روش اور خیال کی بے چینی میں یکساں نظر آئے۔ خصوصاً انھیں موقع بینی اور انتقام میں اکثر ہم خیال لوگ ملے۔ اسلام کا خالص گروہ انھیں کل حیثیتوں میں مسلمان سمجھتا تھا اور اسے علم نہ تھا کہ ہم میں وہ گروہ داخل ہے جس کے سینہ میں آگ دہی ہوئی ہے۔ اور بڑک اٹھنے کے لیے وقت تلاش کر رہی ہے اس لیے اگرچہ خالص گروہ عداوت کم تھا لیکن دوست نما دشمنوں سے ناواقف تھا اور اپنے کو اپنی جگہ مضبوط کرنے کی کوئی فکر نہ کی تھی۔ دراصل ایک یہ دوست نما دشمن اگر انھوں نے اسلام میں اپنے ہم خیالوں کی باضابطہ جھانبدی نہ بھی کی ہو تاہم فطریاً یہ لوگ اپنے حوصلوں امیدوں اور موقع بینیوں میں ایک تھے اور ان کی اس ہم خیالی نے اگرچہ وہ باطل ہی کیوں نہ ہو ان میں ایک قوت پیدا

کردی تھی۔ اور بے ترتیب خالص گروہ ان کی اس اجماع کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ اس گروہ کو ایک دوسری آسانی یہ تھی کہ جہاں لوگ ان کے دلی حالتوں سے واقف نہ تھے وہاں اسلام میں جم غفیر داخل ہوتا جاتا تھا اور یہ لوگوں کی رفتار اور خیال میں رسوم حاصل کرتے جاتے تھے اور اپنے موافق موڑنے جاتے تھے۔ دراصل ایک بے خیال اور بے شہ داخل ہونے والے مطلق ناواقف تھے۔ انہیں ان دوست نمادشمنوں سے پتے سے کھڑے ہونے کا کوئی خیال نہ تھا۔ وہ اگرچہ جانتے تھے کہ ہم اسلامی جماعت میں حرکت کر رہے ہیں لیکن حقیقت میں وہ لوگ اپنے آئندہ خیال میں جس طرح تربیت پا رہے تھے وہ انہیں خود پسند نہ آتا۔ اگر اس عصر سے واقف ہوتے۔

آئندہ پراثر ڈالنے والے انداز رسول سے پوشیدہ نہ تھے لوگ واقف ہوں یا نہ ہوں لیکن رسول واقف تھے یہاں بھی

ان کی طبیعت شناسی، خیالوں کا وزن کرنا، نفس کا تولد، حرکات و سکنات سے بیچ اشارہ بگنا، الفاظ کی بوا انہیں دل کی چھٹی ہوتی باتیں بتا دیتی تھیں۔ رسول کچھ تو لوگوں کے اغلاص کا درجہ اُحد میں سمجھتے تھے اور بہت کچھ خندق میں سمجھ گئے۔ عربیہ نے تصدیق شروع کی اور مخالفت کی سرکوشی کے طفرے وہ ذات بتادی جس کا رسول پیدا کر سکتا تھا۔ واقعہ عقبہ نے عملی مخالفت کے لوگ یا سرخند پہنچا دیے اور بیماری میں حکم کی نافرمانیوں سے یہ یقین دلا دیا کہ طاعت کی کمزوری سے قائدہ اٹھایا جا رہا ہے۔ ورنہ آئندہ کے متعلق رسول کو کچھ خوف ظاہر کرنے اور علی کو آئندہ طرز عمل کی ہدایتیں کرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ ابن خلدون نے کہا ہے کہ: دو شنبہ یعنی روز و قات کی بیچ کو نماز ادا فرمانے کے بعد آپ نے وعظ فرمایا، جسے قابلِ مہترم نے ماشیہ میں نقل کیا ہے۔ اس کی یہ عبارت غور کے قابل ہے کہ: ”اے لوگو! آگ بھڑک اٹھی اور آگ نے آگیا مثل اندھیری رات کے ٹکڑے کے“۔ ہدایت یہ نہ تھی کہ اپنا ساتھ چھوڑنے اور ردِ حقوق کرنے والوں سے بزورِ شمشیر معاملہ کرنا نہیں۔ ”جب وہ دنیا کی طرف مشغول ہوں تو تم دین اختیار کرنا“۔

مخالفت کا گمان، علم یا یقین ادا نہ واجبے روک نہیں سکتا تھا یہ خیالات اور ان کا یقین تھا کہ رسول نے علی بن ابی

طالب کی وصایت کا اعلان نہیں کیا بلکہ اسے آخر کے لیے اس وقت تک اٹھا رکھا جس کے بعد ملتوی کرنا ممکن نہ تھا۔ اس لیے کہ مخالفت کا گمان علم یا یقین ادا نہ واجب سے روک نہیں سکتا تھا۔ اور جب تک وَاللّٰهُ بِعَيْصِمِكَ مِنْ التَّائِبِينَ (۵: ۶۷) (خدا تجھے لوگوں سے محفوظ رکھے گا) بھی تسکین اور تائید کے لیے نہیں نازل ہوا۔ آخر کیا ضرورت تھی خدا کو دعوۂ مخالفت کی اگر کچھ لوگوں کے مخالفانہ ارادوں سے خوف نہ تھا؟۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر: بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ وَإِنْ لَمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَغْتَ رِسَالَتَهُ (۵: ۶۷) (پہنچا دے اس بات کو جو تیرے رب کی طرف سے تجھ پر نازل کی گئی اور اگر تو نے نہ پہنچائی تو گویا تو نے ادا نہ رسالت نہیں کی) یہ مطلب تھا کہ رسول یہ فرماتے کہ: ”تم جاہلیت کا خون معاف کر دو، یا امانت داری کرو یا عورتوں کے حقوق کا لحاظ کرو“۔ وغیرہ وغیرہ۔ تو یہ باتیں تھیں، جسے رسول اکثر فرما چکے تھے پس یہ حکم ضرور کسی امرِ خاص کے متعلق تھا۔ اور وہ امر یہ تھا کہ اپنے بعد کے لیے دین اور خدا کی حکومت کے نمونہ کو جس کے یہ افسر تھے ایک متقی اور شایانِ شخص کے سپرد کرتے۔

صاحبِ صواعق کے نزدیک علیؑ کے متعلق کچھ باتیں
 شایانِ شخص وہی تھا جس کے واقعات اور خدمات کو میں نے داغ اور طویل مد تک دکھایا ہے۔ اور جسے قبولِ صواعق عرق: ”ابوبکر و عمر خود یہ علی مولائے المومنین کہتے تھے۔“ (ابوبکر اور عمر نے خود علیؑ کو مومنین کا مولا کہا ہے۔)

اور جو اس عورخ کے نزدیک نبیِ واقعہ سقیفہ کے اثباتِ ابوبکر وغیرہ سے شوکت، مذر، اجتہاد، اور سماعت میں قوی تر تھا۔ اس لیے سپرد کرتے کہ عامہ ناس کی خود سری اور خود رانی اس ڈھانچے کے شکست کا باعث نہ ہو جو صورت پذیر ہو گیا تھا۔ لیکن جس کے کافی مد تک مضبوط ہونے کے لیے زمانہ کی ضرورت تھی اور جب اس دین کا ایک ہر لمحے مناسب شخص کو محافظ بنادیا اور اس کے متعلق اپنا سند فرض ادا کر کے تو اب لوگوں کو مزید اطمینان کے لیے یہ بھی سننا تھا کہ ”الیوم اکملت لکم دینکم۔“

رسول کے زمانہ میں اسلام کا نقشہ کچا تھا عمارت نہ بنی تھی ہم سب اس سے واقف ہیں کہ رسول کے زمانہ میں

نہ قرآن کی تدوین ہوئی تھی اور نہ احادیث ایک جگہ جمع کی گئی تھیں اور ان دو اصل ذریعہ اسلام کا ہر سانچہ اور زبان کے متعلق کیا جاتا مسلمانوں میں کس اختلاف انگیزی کا محرک ہو سکتا تھا اور جس کا ایک نتیجہ تو یہ تھا کہ قرآن شریف تین چار آدمیوں کی کمی کے متعلق کیا جاتا کہ وہ مشتبه مقامات کو تفسیر کی بولی میں منتقل کر سکیں اور پھر باوجود اس علم کے کہ علیؑ نے (وہی علیؑ جن کے متعلق یہ مستند بنی الفریقین حدیث موجود ہے کہ علیؑ قرآن کے ساتھ اور قرآن علیؑ کے ساتھ ہیں) رسول کے بعد بھی یہ خدمت اپنے ذمہ لی ہے کہ وہ قرآن مدون کیے بغیر عہدِ کاندھ سے پر نہ ڈالیں۔ یہ تک گوارا نہ کیا جائے کہ کم سے کم ان کے جمع کیے ہوئے قرآن سے مقابلہ ہی کر لیا جائے۔ اور ابتداء ہی میں یہ ہو کہ غریب ابن مسعود دیکھے جو کچھ اسے دیکھنا تھا پھر احادیث جس کی تصنیف کے تھوڑے آثار نہیں ہیں، کس قدر اس خیال میں مشتبه کرتے ہیں کہ رسول کے الفاظ کیا تھے سوچو کہ ان تمام حالتوں نے کیا طبی اور قوی لحاظ سے افسوسناک اثر کیا اور کر رہا ہے خدا نہ کرے کہ ابد الابد تک کرے۔ اس کے لیے کوئی چارہ نہ تھا یوں اس کے کہ رسول خود لکھا ہوا چھوڑتے اور یا اسلام کی تحریری صورت کا کسی کو ذمہ دار کرتے۔ اگر اس لحاظ سے کہ رسول کو بہت کم وقت ملا کہ جس میں کسی سے ایک لفظ، کسی سے ایک اشارہ اور کسی کو خاص تالیف کرتے اور ہر چیز کی تشریح اور تدوین نہ کر سکتے تو یوں اس دوسری صورت کے چارہ نہ تھا کہ وہ دوسرے کو ذمہ دار کرتے۔ وہ ذمہ داری پوری ہو جاتی ہے۔ اگر کوئی امام مقرر کیا جاتا ہے جو تعمیری حیثیت سے اسلام کو کامل کرے۔ رسول نے نقشہ کھینچا تھا اس کی عمارت بنانا ابھی باقی تھا۔ لیکن چونکہ وہ نقشہ بنا سکے، نقشہ بھاسکے اور تعمیر کا ایک ایسے شخص کو ذمہ دار بنا سکے جس کے مدارجِ تعلیم پر انھیں اعتبار تھا تو اب اس کہنے سے کوئی امر مان نہ تھا کہ اکملت لکم دینکم یعنی ان صورتوں میں اکملت لکم دینکم نہیں کہا جاسکتا اگر تعین امام نہ کیا گیا ہوتا۔ اب اس کے بعد یہ سوچنا آسان ہے کہ ایسے کسی شخص کے معرفت قرآن اور احادیث کا ملنا کس درجہ مفید اور قابلِ اعتبار ہو تا۔ افسوس آج مسلمان دوسرے ہوتے اس لیے کہ ان اصلی چیزوں کے متعلق اختلاف نہ ہوتا۔

مسئلہ امامت سیاسی حوصلہ مندوں کا اس سے ظاہر ہوگا کہ مسئلہ امامت محض مال یحمانہ قافلہ اس کے علاوہ بہت کچھ تھا۔ سیاسی حوصلہ مندوں کا مال یحمانہ تھا بلکہ حقیقتاً تعمیر اسلامی کی ذمہ داری تھی۔ یہ ہمارے لیے کم مقدس نہیں ہے۔ یہ اگرچہ توریث نبوت نہ ہو لیکن توریث مندرجہ نبوت ضرور ہے۔ اور یہ امر فحوائے حکم "تبلیغ رسالت تم (رسول) کرو یا جو تم میں سے ہو" ممکن تھا۔

مؤلف بعض باتوں کی طرف توجہ دلاتا ہے میں پھر یاد دلاؤں گا کہ واقعہ عقبہ سے رحلت رسول تک جو واقعات گزرے ہیں ان کے سلسلہ پر خیال کرو۔ دیکھو کہ بعض لوگوں کا برتن رسول کے ساتھ کیسا ہو گیا تھا اور خود رسول انہیں کس طرح سمجھ گئے تھے۔ اکثر باتوں کی تصدیق اس آئندہ باب سے ہوگی جسے میں شروع کرتا ہوں۔ کیونکہ اب میں اس جماعت کی عملی کارروائی کے لکھنے کے موقع پر پہنچ گیا ہوں جس کے پیشتر اس کے الفاظ اور انداز سے حسن ظن اور طبیعت بچنے کی کوشش تھی۔

حسینؑ کی عمر کا سا آواں برس اب باب میں ہم اپنے ہیرو کی اس عمر تک پہنچے ہیں جس میں وہ واقعات کے یاد رکھنے کی حالت تک پہنچ گیا ہے اور بہت سی جذبات کا مالک ہے۔

اب تک وہ یہ دیکھ رہا ہے کہ میرے پدر بزرگوار کی شان اور وقار عامہ ناس اور رسول کی نگاہوں میں کیسی ہے۔ اور یہ بچنے کی عقل ہے کہ ہماری تعظیم اور محبت کی اُمت سے وصیت کی گئی ہے۔

— ﴿﴾ —

باب دوم

رسول کی تعمیرانہ مصلحت کا انہدام (جہاں)

(اہل بیت اور ان کے مؤیدین حقوق پر دھاک بٹھانے کی کوشش)

کوٹ اٹھ گیا تھا کوئی عجب نہیں ہے کہ رسول کے رحلت کی خبر سے مدینہ میں ایک عام افسردہ تاریکی پھیل گئی ہو اور لوگ یہ سوچنے لگے ہوں کہ دیکھیے اس نفس عظیم کے سایہ کے بعد جو ابھی چارے سروں سے اٹھ گیا اب ہی حالت کوئی شکل اختیار کرتی ہے اور اس کا قیام کیونکر ہوتا ہے۔ بہت سے ہوں گے جنہیں عالم سود مہر دکھائی دیتا ہوگا۔ اس لیے کہ اس دل کا دھڑکنا موقوف ہو گیا جس کی محبت کی گرمی کا وہ احساس کرتے تھے اور اسے تمام لطف اور راحتوں سے زیادہ عزیز سمجھتے تھے۔ کچھ ہوں گے جنہیں اب باتوں میں عقل کی وہ روشنی نہ دکھائی دیتی ہوگی جو نہ صرف انہیں بلکہ اکثر یہود اور نصاریٰ کو بھی اپنے تصفیہ سے تسکین دیتی تھی۔ کسی کے لیے وہ خبر گیر آسمیں جہاں کے لیے کمی نہ چھپکتی تھیں پتھر اگئیں۔ اب کوئی اس تیز اور لپٹنے والی لطف سے توجہ کرنے والا نہ رہا جو اہل صفہ کے لحاظ سے اس کا بھی روادار نہ تھا کہ اس کی گاڑی بیٹی ایک کڑا اپنے ہاتھوں میں پہن سکتی یا کوئی پردہ اپنے دروازہ پر لٹکا سکتی۔ محلہ کے بچے اب وہ چہرہ نہ دیکھتے تھے جو انہیں دیکھ کر بے ہوش نہ رہ سکتا تھا۔ حاجت والے اس گھر میں شور مارتے سنتے تھے۔ جہاں انہیں اپنی ضرورتوں کی پورے ہونے کی امید تھی۔ لوگوں کی آنکھیں تھیں اور روتے تھے منہ تھے لیکن بات نہ تھی۔ غموں کی خبر گئی تھی اور اس غموں کی لوگوں کے پہلے ہیجان غم کے فرو ہونے کے بعد پھر کوئی بے چین چیخ یا سرد آہ آنسوؤں کا رخ آنکھوں کی طرف پھیر دیتی ہوگی۔ تھکتے تھکتے آنسو تھے ہوں گے اور اس سکون کے عالم میں ہوش کی باتیں اور آئندہ کا خیال پھر سامنے موجود ہو جاتا ہوگا۔

طباع کا عمل اور اس میں دیکھنے کی باتیں جس وقت رد نے دلے رو رہے تھے اور سیر نہ ہوتے تھے بلکہ ان کے دلوں نے تسکین پانے سے انکار کر دیا تھا۔

اکثر طباع تھے جو اپنا عمل کر رہے تھے لیکن ان کا عمل اپنی ساخت نتیجہ کے لحاظ سے نوعیت میں مختلف تھا۔ یہ وہ تھے جو دیکھنا چاہتے تھے کہ امارت اسلام کا تصفیہ کیونکر ہوتا ہے۔ آیا مسلمانوں کا دل، مولا، اور رسول کا خلیفہ وہی ہوتا ہے جسے رسول کہہ گئے تھے یا اور بھی موقع ہے۔ اس میں دیکھنے کی بات ہوگی کہ ان خیالات کی بنیاد حب قومی، حب وطنی اور حب دینی کی وجہ سے تھی۔ جس میں کوئی اپنی غرض شامل نہ تھی۔ یا ان چیزوں کے پردہ میں خود غرضی بھی چھپی ہوئی تھی۔ یا ان اعلیٰ احساسات کا کوئی اثر نہ تھا بلکہ تمام کوششیں خود غرضی اور اصول منفعت یا حصول اختیار پر مبنی تھیں۔ یہ نتیجہات ہیں جنہیں یہ باب غالباً بکھانے کے لیے کافی ہوگا۔ اور یہ اچھی طرح بکھا جاسکے گا کہ رسول کے بعد جو کچھ واقعات ہوئے اس میں وہ کوششیں ہوئیں جو اس اصول اسلامی کو ہر حیثیت سے اپنی جگہ قائم رکھیں جو سکھایا گیا تھا اور خیال اور عمل میں جاری

کیا گیا تھا۔ یا کوششوں کی خاصیت اور نتیجہ یہ بتاتا ہے کہ یہی امور اس آئندہ جماعتِ اسلامی کے انتشار کے باعث ہوئے۔ اگرچہ کچھ وقت تک جنگی باجوں کے شور اور جوش نے دیکھنے نہ دیا ہو۔ یا آگے چل کر ثروت کی اور امارت کی ترقی اور حسین کنیزوں کی بغل گیری نے رات اور دن میں اصلی حالت کے سوچنے کے لیے کوئی وقت نہ چھوڑا ہو۔

اقدام کس نے کیا اور بنی ہاشم اور بنی امیہ کی اُس وقت کی حالت سب سے حیرت خیز امر یہ ہے کہ ان امور سے

خلافت کا اقدام ان دو جماعتوں سے۔ حمیں بنی ہاشم اور بنی امیہ کہتے ہیں شروع نہ ہوا۔ اگرچہ اول الذکر جماعت وہ جماعت تھی جو رسول کے سانس لینے تک حاکم تھی اور دوسری جماعت وہ تھی جو اپنی بلندی کی کوشش میں ایک زمانہ تک اسلام کو موت اور زندگی میں متردد رکھتی تھی اور بالآخر اس سرِ غور ہوئی کہ خوشی یا ناخوشی سے حکومت کے حوصلوں کو اپنے سینہ میں زور سے دہلاوے۔ اس آخر الذکر جماعت سے خوف کیا جانا، یا اول الذکر جماعت سے اپنے حقوق کے نفاذ کی کوشش دیکھنا امید کے باہر نہ تھا۔ لیکن ان دونوں جماعتوں کے طرزِ عمل نے یہ بھگایا کہ اگر اول الذکر اپنے سردار اور ہادی کی لاش کا دفن کرنا پہلا فرض تھا تو دوسری جماعت اپنے دعوای کو پس پشت ڈال کر مطمئن ہو گئی تھی۔ جب تک کوئی مثال اس کے سینہ کے دبے ہوئے حوصلوں کو پھر سے کمود کرنے کا تھی اور حقیقت تو یہ ہے کہ اول الذکر جماعت کو اس کا یقین ہی نہ تھا کہ ہمارے حقوق کے درمیان کوئی جماعت حیرت خیز سرعت سے حال ہو جائی گی۔ اور ثانی الذکر گروہ نے اس کا خواب بھی نہ دیکھا تھا کہ بنی ہاشم کا حاکم گروہ دفعتاً بے اختیار اور بے وقت ہو جائے گا۔ لیکن یہی ہونے والا تھا ایک تیسرے گروہ کے ہاتھوں۔

رحلت کے دن اور قریب وقت حضرت ابوبکر کہاں تھے ہماری موجودہ ضرورت کے موافق واقعات یہ تھے کہ جناب رسالت مآب نے بقول

ابن خلدون دو شنبہ کے روز دوپہر کو اور بقول مجتہد کامل داہدی (مغازی الرسول) دن چڑھے انتقال فرمایا۔ اسی صبح کو جناب رسالت مآب ایسے اچھے تھے کہ مسجد میں نماز ادا کی اور خطبہ پڑھا اور بقول ابن خلدون ابوبکر نے یہ کہہ کر کہ: ”ہم دیکھتے ہیں کہ آپ اللہ کی عنایت سے بہت خوش و غم ہیں، جیسا کہ ہم چاہتے تھے اپنے اہل کے پاس رخ میں چلے گئے۔“ مناج میں بھی یہی ہے۔ باوجود اس قدر رخ ہو جانے کے جس سے ابوبکر کو اس قدر اطمینان ہو گیا کہ وہ اپنے عیال کے پاس موضع یا محلہ رخ میں چلے جاتے در آنحالیکہ محض علالت کی خبر نے روک رکھا تھا کہ وہ لشکر کے ساتھ کوچ نہ کرتے۔ یہ ہماری کج کے باہر ہے کہ کیونکر مرض میں دفعۃً اس قدر زیادتی ہو گئی کہ آنحضرت نے تھوڑی دیر کے بعد انتقال فرمایا۔ حالانکہ مرض اور خصوصیات مرض ایسا نہ تھیں جس سے وقوعِ موت اس قدر سریع ہوتا۔ مؤرخین نے کہا ہے کہ سبب مرض وہ زہر تھا جو خیر کی یہودیہ نے بزغالہ بریان میں دیا تھا۔ لیکن کوئی نوالہ حلق سے نیچے نہ اترتا تھا۔ صرف لعابِ دہن سے جو کچھ ہوا ہودہ غالباً ایسا نہ تھا کہ اس وقت اپنا کوئی اثر کر سکتا، چہ جائے کہ اس قدر بعدِ زمان کے بعد ہو۔

رحلتِ رسول کے بعد لوگوں کی حالت پر غور کی بعض مشکلیں بہر حال رحلتِ رسول کے بعد کیا ہوا جس سے انصار ایک جگہ اور ابواہشیم وغیرہ دوسری جگہ اپنی حالتوں پر غور کرنے لگے در آنحالیکہ بنی ہاشم رسول کی لاش اقدس کے قریب

تھے کتنی دیر لوگ دولت سرا کے قریب رہے۔ اور اس کے بعد اپنے اپنے گھر جا کر فرقہ بندی کی۔ آیا خبریں سن کر لوگ جمع بھی ہوئے یا محض اپنی اپنی جگہ پر اظہار غم کر لیا۔ اس کے خارج آثار نہیں ہیں۔ دوسری بات جو اور زیادہ غور کے قابل ہے وہ یہ ہے کہ یہ سب ٹھیک کہ لوگوں کو یہ معلوم تھا کہ جناب رسالت مآب نے تجیز و تکفین کی بنی ہاشم کو وصیت کی ہے لیکن پھر بھی کسی کو شرکت سے منع نہ کیا تھا۔ پس وہ کونسا امر اس کا محرک ہوا کہ وہ نماز اور دفن پر اپنے غور کو مقدم کر دیتے۔

کیا کسی گروہ کو دوسرے کی سبقت کا اندیشہ تھا

میں کہہ رہا ہوں کہ ہر ایک میں حوصلہ حکومت بھی لیکن اختیار حاصل کرنا اور اس کے لیے اس قدر جلد مشغول ہونا کسی ایسی وجہ سے تھا جس میں ایک گروہ کو دوسرے گروہ کے سبقت کا خوف ہو۔ اور اس نے پیشتر سے یہ طے کر لیا ہو کہ ہم رسول کے انتقال کے ساتھ ہی پہلا کام جو کریں گے وہ اس امر کا تصفیہ ہو گا کہ ہم کس طرح صاحب اختیار ہو جائیں۔ میں اس کی جڑ یا آغاز پر اپنی نگاہ دوڑانا چاہتا ہوں کہ ان کے اس تصفیہ کے لیے کونسی شے محرک ہوئی۔

انصار اور مہاجرین کو ایک دوسرے کے متعلق وصیت

احم کوئی ابوالہشیم بن تیہان اور ابوبکر وغیرہ ایک جگہ جمع ہوئے اور انصار دوسری جگہ دکھائی دیے۔ دراصل ایک بنی ہاشم ایک ضروری فرض ادا کر رہے تھے کوئی بات معین نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ منافع کی اس روایت سے مدد ملتی ہے کہ انصار رسول کی زیادتی طاعت سے متردد ہوئے تو آپ نے انصار اور مہاجرین کی ایک دوسرے کو وصیت کی اور سورہ العصر کو تلاوت فرمایا۔ انصار کے متردد ہونے کی وجہ یا تو یہ تھی کہ وہ رسول کے بعد اپنے حقوق کو ادراج کرنا چاہتے تھے اور یا انھیں رخ دریا کے نیچے کچھ اور دھکے پہننے ہوئے دکھائی دیتے تھے جس نے انھیں اپنے لیے خوف زدہ کر دیا تھا۔ اور وہ بھی رسول کے نظروں میں سوچ اور دیکھ رہے تھے کہ ”آگ بھڑک اٹھی اور مثل اندھیری رات کے کھڑے کے ہند آگیا۔“

دفن رسول پر معرکہ آرائیوں کو مقدم کرنے کا کوئی جواب نہیں ہے

لیکن جو کچھ بھی ہو ان لوگوں کی فرقہ بندی نے جنول مولوی شبلی صاحب اس کا جواز کیے کر لیا کہ: ”اس بات کا بھی اظہار نہ کیا گیا کہ پہلے تجیز و تکفین سے فراغت کر لی جائے۔“ یا اس مورخ کے موافق کہ: ”انھوں نے سقیفہ میں پہنچ کر خلافت کے بارہ میں انصار سے معرکہ آرائی کی اور اس طرح کوششوں میں مصروف رہے کہ گویا ان پر کوئی حلاوت ہی نہیں پیش آیا تھا۔“ حالت شاعر کے ان نظموں کی سی ہو گئی تھی کہ:

گر نہ در غایت غلی و پڑ غول عقل بلور نکتہ کز رمضان اندیشہ

اب نہیں یزید سوچے مغرب نہیں ہے کہ رسول کے انتقال کے ساتھ ہی کوئی فوری وجہ اس کی فکر نہ ہوئی تھی کہ لوگ رسول کی لاش سے بے خبر ہو کر معرکہ آرائیوں پر تل جاتے۔ بلکہ جو کچھ اسباب تلاش کیے جاسکتے ہیں وہ رسول کی رحلت کے قبل ہیں جس نے سقیفہ بنی ساعدہ کے دو گروہ کو دفعہ غم ٹھونکنے پر اس طرح آمادہ کر دیا کہ گویا یہ دیر سے وقت کے منتظر تھے۔

اس کا جواب کہ اُسامہ کے لشکر کے ابن خلدون کا یہ فقرہ ہم بعض لوگوں کے متعلق نوٹ کر چکے ہیں ساقیہ روانہ نہ ہونا محبت سے نہ تھا کہ اُسامہ کے لشکر سے رسول کی ملاقات کی خبر سن کر آتے اور دیکھ جاتے تھے۔ کیا اس لیے کہ انھیں رسول کی رحلت اور اس لیے کارروائی کے آغاز میں کتنی دیر ہے جو تم کہہ سکتے ہو کہ محبت عیادت کی حرکت ہوئی تھی۔ لیکن ایسا کہنے کے قبل رسول کے جنازہ کے پاس ان محبت کرنے والوں کو ڈھونڈ لو۔ اس کے بعد ظہر تھیں بجلائے گی کہ غرض محبت پر غالب تھی۔ ہم نفس غرض پر آگے بحث کریں گے۔

حضرت ابوبکر کی بیعت رحلت رسول کے دن ہوئی اس کے بعد آگے چلنے کے لیے ہیں موافق عرقہ کی یہ روایت ملتی ہے کہ: ”روایت کرد وادی از چند طریق اسناد کہ بیعت ابوبکر رضی اللہ عنہ روزے شد کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم رحلت فرمود۔“ ترجمہ: ”ابوبکر کی بیعت وصال رسول کے دن ہوئی۔“

بیعت عام دوسرے دن ہوئی اسی کتاب میں ہے کہ: ”چوں بیعت ابوبکر رضی اللہ عنہ شد در سقیفہ روز دیگر بر منبر نشست پس مردمان بیعت کردند بیعت عام بعد از بیعت سقیفہ۔“ ترجمہ: ”سقیفہ میں بیعت ابوبکر ہو چکی تو دوسرے روز منبر پر بیعت عام کی۔“ یہ دونوں روایتیں ہم نے اس لیے پیش کی ہیں کہ رحلت رسول کے پہلے اور دوسرے دن ان اصحاب کی مشغولیت معلوم ہو جائے جو رسول کے وفور محبت کی وجہ سے ان کی ملاقات میں ان کے ایک حکم کو ملتوی کر سکتے تھے۔

اس کے بعد مولوی عبداللہ صاحب امرتسری کی یہ عبارت بھی ملاحظہ ہو کہ: ”جب حضرت ابوبکر وہاں (سقیفہ بنی ساعدہ) سے لوٹے تو سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم دفن ہو چکے تھے، اس لیے شرکت جنازہ سے محروم رہے جس کا حق ان کو تادم عمر رہا۔“

کیونکر ”چل گئی“ اور اس کے عناصر کیا مضائقہ ہے اگر ہم ناظر کو تھوڑی دیر کے لیے اس جلسہ میں لے چلیں جس نے اسلام کے آئندہ کا ضیاع لے لیا تھا نہ سہ سہامد خان کی اس مصیحت اور ارادہ کے ساتھ کہ: ”جس کی چل گئی وہی غلیف ہو گیا۔“ بلکہ یہ سمجھنے کے لیے کہ کس طرح ”چل گئی“ اور یہ ”چل گئی“ طبعیتوں اور واقعات پر کیا اثر ڈالتی ہے۔ اور اس کے پس و پیش سے کیا کچھ میں آسکتا ہے۔ جس سے اگلے زمانہ کا دور بین مدبر شاعر کہے گا کہ: ”مکشتہ شد حسین اندر سقیفہ۔“ یعنی ”حسین سقیفہ میں قتل ہوئے۔“

مؤلف کو سقیفہ بنی ساعدہ کا راستہ کیونکر معلوم ہوا مشکل سے مجھے راستہ معلوم ہوتا اگر روزنہ الغفانے راستہ دکھانے والے کا نام نہ بتایا ہوتا۔ یہ فقیر بن شعبہ تھا جس کے واقعات ہم کسی حد لکھتے آئے ہیں۔ اور ابھی نہایت مفید حالات باقی ہیں۔ لیکن رسول کے بعد آج یہ پہلا موقع ہے کہ کسی عام مفید موقع پر دکھائی دیا ہو۔ اہل عرب میں ابن شعبہ مدبر اور صاحب رائے مشہور تھا۔ اس کا نام آنا تمام راستہ روشن کر دیتا ہے۔ اگرچہ یہ نہیں معلوم کہ اس نے ابن الخطاب سے اس کے علاوہ کیا گفتگو کی۔ جب وہ انصار کے ارادوں کی اطلاع دینے آیا۔ ابن الخطاب نے اس کی خبر ابوبکر کو دی اور روزنہ الغفانے کے موافق:

”ہمدرد بالحق آں سرور آفاق راتنا گزاشہ رہ بجانب ستیفہ بنی ساعدہ آوردند و ابو عبیدہ جراح در عقبہ ایشان رواند۔“
 یعنی ”دونوں نے مل کر سرور کائنات کو تہا چھوڑا اور ستیفہ بنی ساعدہ کی راہ لے لی۔ ابو عبیدہ جراح ان کے پیچھے پیچھے روانہ ہوا۔“
حضرت عمرؓ کی واقعہ خوانی
 صاحب موائع کسی غیر کی بھی ضرورت نہیں سمجھتا، بلکہ ابوبکرؓ خود عمرؓ سے انصاری کی طرف چلنے کی خواہش کرتے ہیں۔ اس لیے کہ: ”مرویت از عمر در زمانے کہ رسول اللہ ﷺ رحلت فرمود حضرت علیؓ وزیر فی اللہ معاویہؓ دیکر کہ بالایشان بودند در خانہ فاطمہ نشستہ تھلٹ کردہ وہم چشیں انصار از ما تھلٹ کردہ در ستیفہ بنی ساعدہ گرد آمدند و مہاجرین بجانب ابوبکرؓ شتافتند۔“ ترجمہ: ”مروی ہے حضرت عمرؓ سے کہ اس وقت سے کہ رسول خداؐ نے رحلت فرمائی حضرت علیؓ، زبیرؓ اور ایک گروہ اور نے جو کہ ان کے ساتھ تھا فاطمہؓ کے گھر میں بیٹھ کر تھلٹ کیا اور اسی طرح انصار نے ہم سے تھلٹ کیا اور ستیفہ بنی ساعدہ میں آگئے اور مہاجر ابوبکرؓ کی طرف دوڑے۔“ اور ابن خلدون بھی کہتا ہے کہ: ”رفتہ رفتہ اس امر کی اطلاع ابوبکرؓ و عمرؓ کو ہوئی یہ دونوں بزرگ صحابہؓ جراح کے ستیفہ کو روانہ ہوئے۔ ماسم بن عدی اور عویم بن ساعدہ سے ملاقات ہو گئی۔ ماسم نے ان کو روکنے کا قصد کیا لیکن وہ لوگ ان کے روکنے سے نہ رکے جس قدر جلد ممکن ہوا ستیفہ میں چلے پر انصار مجمع تھے چاہیے اور باہم مباحثہ ہونے لگا۔“

حضرت ابوبکرؓ اپنا استحقاق خلافت پیش کرتے ہیں
 اس مؤرخ کے نزدیک ابوبکرؓ نے اپنے حقوق کے متعلق جو کچھ کہا وہ یہ تھا کہ: ہم لوگ رسول اللہ ﷺ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اطہار اور ان کی مشیریت سے ہیں

اور انصار حکومت کے حق زیادہ ہم ہیں اور اس میں ظاہر کوئی نزاع کا موقع نہیں معلوم ہوتا بلکہ ہم کوئی ضرورت اور نیز سابق الاسلام ہونے کا حاصل ہے ہاں کھانا ہم لوگ امر ہیں اور تم دوزرا ہو۔“

انصاری کی کمزوری
 انصار کے مجمع میں ایک کمزوری یہ تھی کہ وہ خود اوس اور خزرج میں تقسیم تھے۔ سعد بن عبادہ قبیلہ خزرج کے پیشوا تھے اور اسید بن حضیر قبیلہ اوس کے۔ حبیب بن مضر اور ثابت بن قیس وغیرہ انصاری کے لیے سعد بن عبادہ کو تجویز کرتے تھے اور بشر بن سعد وغیرہ اس رائے کے موافق نہ تھے اس لیے کہ قبول ابن خلدون: ”اوس۔۔۔ خزرج کی انصاریت سے کشیدہ خاطر تھے۔“

ایک انصاری کی موقع بینی
 اور قبول اعظم کوئی بشر بن سعد نے کہا کہ: ”امروز خلافت بہ قریش مسلم دارید کہ بہ اہل شام باشد و اگر بر خلاف ابن ہود مثل شما باشد۔“
 ترجمہ: آج خلافت کو قریش کے لیے رہنے دو۔

جس وقت اوس، خزرج اور ابوبکرؓ اپنے اپنے حقوق میں رہنے دو
عویم بن ساعدہ کہتا ہے کہ خلافت خاندان نبوتؐ میں رہنے دو
 پیش کر رہے تھے اعظم کوئی کے مواقع عویم بن ساعدہ نے کہا: ”اول قوی کہ بادشمن محمدؐ طلحہ شمشیر کشیدند شما ہدید اول کسیکہ بادوستان و خویشان او خلاف کند شما باشد خلافت بہ خاندان نبوتؐ بلا گزاید و دست ازین نزاع و تعلق بداید۔“

یعنی: ”سب سے پہلے لوگ جنہوں نے محمدؐ کے دشمنوں کے خلاف تلوار اٹھائی وہ تم تھے۔ اب ان کے دوستان اور رشتہ داروں کی سب سے پہلے مخالفت کرنے والے نہ بنو۔ خلافت خاندان نبوت کے پاس رہنے دو۔ اور اس جھگڑے سے دست بردار ہو جاؤ۔“

حضرت ابوبکر کا خیال کہ عرب خاندان نبوت میں کسی کو چاہیں گے

جواب بن منذر کی تقریر میں حضرت ابوبکر کا یہ جواب بھی نہایت توجہ کے قابل ہے جو انہیں کافی سے ملتا ہے کہ: ”عرب بہ امداد شمار منانہ دہند چون از شما نیست و کسی را خواهند کہ از خاندان نبوت باشد۔“ ”عرب تمہاری حکومت پر راضی نہیں ہوں گے کیونکہ حضور تم سے نہیں ہیں اور کسی ایسے کو چاہیں گے جو خاندان نبوت سے ہو۔“

انصار کا ابوبکر کو الزامی جواب اور طبری سے ایک نہایت مفید امر معلوم ہوتا ہے کہ جب ابوبکر نے بمقابلہ شہریش کے حقوق کا تذکرہ کیا تو انصار نے جواب دیا کہ: ”پھر علی سے بیعت کر لو کہ وہ پیریم رسول ہیں۔“

حضرت عمر کی جلدی اس کے بعد عمرؓ نے کہ اختلاف ہو گا اور ابوبکر سے کہا کہ: ”ہاتھ بڑھاؤ تم سے بیعت کریں۔“ ابن عمرؓ کی کو یہ بھی کہنا ہے کہ: انصار مکروہ دانستند بیعت لا ابوبکر ایشان را علوم بساخت بجز الامت من قریش بنا بر این اطاعت و انقیاد کردند و حضرت علیؓ از رونے شوکت و عذر و استدعا و سماعت قوی تر بود از ایشان۔“ یعنی: ”انصار اس کی بیعت کو ناپسند کرتے تھے۔ ابوبکر نے ان کو اس حدیث سے جواب دیا کہ امام قریش سے ہیں۔ اس وجہ سے انہوں نے اطاعت و فرمانبرداری کی جب کہ حضرت علیؓ شوکت و عذر و لیاقت و سماعت میں ان سے قوی تر تھے۔“

ابوبکر، عمر اور ابو عبیدہ کی آپس کی نہایت مفید باتیں مورخین نے یہ بھی کہا ہے کہ اختلاف میں زیادتی ہونے لگی تو ابوبکر نے عمر

اور ابو عبیدہؓ کے ساتھ کانٹا پیش کیا اور اس وقت عمرؓ نے ابوبکر کو اپنے اوپر مقدم رکھ کر بیعت کر لی۔ لیکن اس کے مقابلہ میں میں موافق عقد کی اس روایت کو جو مسعود نے ابراہیم قمی سے نقل کیا ہے زیادہ قبولیت سے دیکھتا ہوں کہ: عمرؓ نے پیشتر ابو عبیدہ کی طرف توجہ کی جس کی تائید ابن سعد کی اس روایت سے بھی کی گئی ہے کہ: ”چون ابوبکر شنید کہ عمر بہ طرف ابو عبیدہ میل دلد و ابوبکر بہ عمر گفت رضی اللہ عنہما دست خود بکشا تا با تو بیعت کنم عمر گفت تو افضل از منی پس ابوبکر جواب دلا قوت تو از من زیادہ است و این سخن را مکرر گردانید بعد از ان عمر گفت قوت من تراہست باز زیادتی فضل پس از ان بیعت بہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کرد۔“ یعنی: ”جب ابوبکر نے سنا کہ عمر ابو عبیدہ کی طرف مائل ہیں تو ابوبکر نے عمر سے کہا کہ اپنا ہاتھ بڑھاتا کہ تیری بیعت کروں۔ عمر نے کہا تو افضل ہے اس کے بعد ابوبکر نے جواب دیا تیری طاقت مجھ سے زیادہ ہے اور یہ بات دہرائی اس کے بعد عمر نے کہا کہ میری قوت تیری فضیلت کے ساتھ تیرے لیے ہی ہے۔ اس کے بعد ابوبکر کی بیعت کر لی۔“

قبیلہ اوس نے ابوبکر کا ساتھ دیا۔ یعنی ”اس روز غصہ نے بیعت کی۔“ اسی کتب میں ہے کہ: ”قبیلہ اوس برہنہ تمام ہا صدیق بیعت کردند و خراج را غلامی تمام روی زد۔“ یعنی: ”قبیلہ اوس نے پوری رغبت سے صدیق کی بیعت کر لی اور خراج شرمندہ رہ گئے۔“

اعظم کوئی میں ہے کہ حبش لے بھر بن سعد کی آمادگی دیکھ کر اس سے پوچھا کہ: اوس و خراج کا حسد ”مجھے کیا ہوا کہ تو نے اپنے اہل عم سعد بن عجلہ سے حسد کیا۔“ صورت مطالعہ یہاں تک پہنچی کہ گوارا نہ گئی اور لوگوں نے حسب کور وکلا

ابن عوف انصار اور ابوبکر اعظم کوئی کے موافق یہ روایت بھی دلچسپ ہے کہ بیعت کے بعد عبدالرحمن بن عوف کی چند انصار سے ملاقات ہوئی اور انہوں نے کہا کہ تم نے کیوں ابوبکر اور عمر کے مقابلہ میں اپنے کو پیش کیا۔ انصار نے اپنے افراد کے متعلق احادیث رسول بیان کرنے کے بعد آخر میں جواب دیا کہ: ”اے ہنس عوف اگر علی بن ابی طالب اور نبی ہاشم سرور عالم کی تجیز و تھن میں مشغول اور کثرت غم میں مبتلا نہ ہوتے تو دوسروں کا کھانا نہ کھا ہوتا۔ اور ان کا کام ناقص رہتا۔ اب جلا اور ایسی باتیں نہ کرو۔ جس سے تمہارے معتد پر مشکل آجائے۔“ ابن عوف نے یہ باتیں ابوبکر سے کہیں اور انہوں نے جواب دیا کہ: ”جب ہماری مراد کے موافق کام پورا ہو گیا تو تم اس بازخواست سے مستثنیٰ تھے۔“

حضرت عمر کا فقرہ سعد بن عجلہ کے متعلق بیعت کے وقت سٹہ بن عجلہ کو دھکا لگا۔ یہ طیل تھے اور اوڑھے لپٹے بیٹھے ہوئے تھے۔ کسی نے یہ بھی کہا کہ دیکھو سعد کھل نہ جائے۔ اس پر قبول ابن غلدون عسرنے جواب دیا کہ: ”اللہ تعالیٰ ہی نے مارا ہے۔“ سعد یہ سن کر دست و گریبان ہو گئے۔ اور عسرنے کو بھی خستہ آگیا۔ لیکن ابوبکر کے روکنے سے رک گئے۔

سعد کا بیعت انکار اور ان سے درگزر اسی مورخ کے موافق جب سب لوگ بیعت کر چکے تو سعد سے بیعت کرنے کو کہا۔ سعد نے انکار کیا۔ بشرنے کہا: ”یہ تو تنہا آدمی ہے، اس سے درگزر کرو۔ اس کو اپنی حالت پر رہنے دو۔“ پس سعد بن عجلہ اس واقعہ کے بعد نہ تو ان کے ساتھ نماز میں شریک ہوتے تھے اور نہ ان سے باتیں کرتے تھے، تا آنکہ ابوبکر کا انتقال ہو گیا۔ بعضوں نے یہ کہا ہے کہ: ”بعد اس واقعہ کے سعد بن عجلہ سعد کی موت کیونکر واقع ہوئی شام کی طرف چلے گئے تھے اور وہیں ٹھہرے رہے، تا آنکہ مر گئے۔“ مشہور یہ ہے کہ ان کو جن (۹) نے مارا ہے۔

اختلاف کے خوف سے ابوبکر نے دو آدمیوں پر بیعت کا زور نہیں ڈالا۔ موافق عسرنے کی یہ روایت بھی دیکھنے کی

ہے: بروایت ابی اسحاق وغیرہ اس کے سامنے گفت اے ابوبکر چہ چیز تر ابرائے داشت کہ والی مردمان شوی و مال آتکے فی میکردی مارا ازان کہ بردو کس (۲) امیر ہاشم ابوبکر گفت مارا ازین چارہ نیست تر سیدم کہ امت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم متفرق گردند و خلل افتد در دین۔ یعنی: ”ابو اسحاق وغیرہ کی روایت کے مطابق ایک سائل نے کہا اے ابوبکر تجھے کس چیز نے آمادہ کیا کہ لوگوں کا حکمران بن بیٹھے، جب کہ میں تو دو دہائیوں پر بھی امیر بننے سے منع کرتا تھا۔ ابوبکر نے کہا میں اس کے سوا چارہ نہ تھا میں ڈرا کہ امت محمدیہ منتشر ہو جائے گی اور دین میں خلل پڑے گا۔“

حضرت عمر کے لفظوں میں ابوبکر کی بیعت کیونکر ہوئی ان حالات میں جب کہ کوئی کہہ رہا ہے کہ: ”فوری طور پر اتفاق عام ہو گیا۔“ اور کوئی

کثرت اڑدھام سے سہ کو کچلے ڈالتا ہے۔ دیکھنے کی یہ بات ہے کہ حضرت عمر اس کے متعلق کیا کہتے ہیں۔ ابن ابی الحدید یہ کہتے ہوئے کہ عمر نے بیعت ابوبکر کو ناگہانی ہونا اور اس کے شر سے خدا کا محفوظ رکھنا کہا ہے۔ آگے بڑھ کر کہتے ہیں کہ: ”یہ صرف ان کی عیسیٰ زبان اور درویشی طبعیت تھی ورنہ وہ ادب کرتے تھے۔“ صواعق عرقہ کا یہ خطاط طرز بیان توجہ کے قابل ہے کہ: ”عمر رضی اللہ عنہ در زمانے رواج از ج غلبہ گفت کہ بن چنین رسیدہ کہ فکرنے از شما گفتہ است کہ عمر چوں بمیرد بہ فکرنے بیعت خواہم نمود پس مغرور نشود یکے از شما بہ آتکے بگوید بیعت ابوبکر فاجہ واقع شد و آگاہ ہاشم کہ اس چنین نمود ہا آتکے بعدائے تہلک و قتل از شر آن نگہداشت و ہر روز در میان شما کسی نیست کہ قطع از جانب او شود۔“ یعنی: ”عمر رضی اللہ عنہ نے حج سے واپسی کے وقت غلبہ دیا کہ مجھے یہ بات چینی ہے کہ تم میں سے فکرنے نے کہا ہے کہ عمر جب مرنے کا میں فکرنے کی بیعت کر لوں گا پس تم میں سے کوئی اس دھوکے میں نہ پڑے کہ کہے ابوبکر کی بیعت اپنا تک ہو گئی تھی۔ آگاہ ہو جاؤ کہ اس طرح نہ تھا مگر یہ کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے اس کے شر سے بچا لیا تھا اور آج تم میں کوئی نہیں ہے کہ اس کی طرف سے قطع ہو سکے۔“

بیعت کا طرز عمل اب ذرا طریقہ بیعت پر غور کیجیے جسے ابن ابی الحدید برادر بن حازب کی زبانی بیان کرتے ہیں: ”تھوڑی دیر کے بعد ہم نے سنا کہ قوم ستیفہ بنی ساعدہ میں ہے۔ اس کے بعد دوسرے لکھنے والے کو سنا کہ ابوبکر کی بیعت کر لی گئی۔ تھوڑی دیر نہ گزری کہ دیکھا ابوبکر و عمر ابو عبیدہ مع ایک جماعت اصحاب ستیفہ کے چلے آتے ہیں۔ وہ کسی کی طرف سے نہیں گزرتے مگر یہ کہ اس کو دہا دیتے ہیں اور ہاتھ اس کا بڑھا کر ابوبکر کے ہاتھ سے مس کر دیتے ہیں وہ چاہتا ہوا نہ چاہتا ہوا پس میرے ہوش گم ہو گئے۔“

ابو قحافہ اور ابوبکر اب یہ ملاحظہ طلب ہے کہ خود اپنے بیٹے کی اس بیعت کے متعلق ابو قحافہ کی آمد کیا تھی۔ صواعق عرقہ میں ہے کہ: ”گفت ابوبکر را کہ ہوشیار ہاش دریں امر کہ ابن امر عمل است آیا راضی شدند بنو عبد مناف و بنو مغیرہ (۲) گفت بلے۔۔۔۔۔۔“ یعنی: ”ابوبکر کو کہا کہ اس امر کے بارے میں ہوش کرو کہ یہ ناگہان بات ہے۔ کیا بنو عبد مناف اور بنو مغیرہ راضی ہو گئے ہیں۔ ابوبکر نے کہا: ہاں۔“

پوست کش لطیفہ اور ابدار دعا ابن ابی الحدید میں اس قدر لطیفہ زیادہ ہے کہ جب ابو قحافہ کو معلوم ہوا کہ ابوبکر سے اس لیے بیعت کی گئی کہ وہ سب میں زیادہ سن کے تھے

تو کہا: ”میں ان سے زیادہ سن کا ہوں۔“ ان دونوں مؤرخین نے ان کی یہ دعا بھی لکھی ہے کہ: ”کوئی اسے پست نہیں کر سکتا ہے تو بلند کرے اور کوئی اسے بلند نہیں کر سکتا ہے تو پست کرے۔“

بیعت کے وقت بمقابلہ علیؑ ابوبکر کی شوکت اور استیقاد

لوگوں کی نگاہ میں کم مائی یعنی: ”ابوبکر امامت کے بارے میں جھگڑے، حلاوت علیؑ سے شوکت میں کمزور تھے اور لوگوں کے نزدیک ابوبکر کی لیافت اس وقت کمتر تھی۔“ اب اس امر کے بچنے کی کوشش کی جانے لگی کہ آیا جناب امیر علیؑ کے الفاظ اس واقعہ کے بچنے میں کوئی مدد دیتے ہیں۔ اس کے لیے نبی البلاغہ کے متعلق خطبوں کا متعلق غلامہ پیش کیا جاتا ہے۔

نبی البلاغہ سے کیا سمجھ میں آتا ہے

عرض کی گئی کہ وہ کہتے ہیں: ”منا امیر و منکم امیر۔“

انصار اور مہاجرین کی دلیل میں علیؑ کی دلیل

فرمایا: ”مہاجرین نے کیوں یہ دلیل پیش نہ کی کہ رسول خداؐ نے وصیت فرمائی ہے کہ ان کے اچھوں سے نیکی کی جائے اور ان کے برے سے درگزر کیا جائے۔“ اصحاب نے عرض کیا کہ: ”اس میں ان کے عدم لمارت کی کوئی دلیل ہے؟“ مندرمایا: ”اگر ان میں لمارت ہوتی اور ان میں بھی کوئی امیر اور حلیف ہوتا تو یہ دوسروں کے سپرد کیوں کیے جاتے؟“

قریش نے پھل کو ضائع کیا

پھر فرمایا: ”اچھا قریش نے کیا دلیل پیش کی؟“ اصحاب نے عرض کی کہ وہ یہ دلیل لائے کہ: ”ہم رسول اللہ ﷺ کے خبرے سے ہیں۔“

قریش نے پھل کو ضائع کیا

پھر فرمایا: ”وہ اس خبرے کے ساتھ تو متمسک تھے مگر اس کے ثمر کو ضائع کر دیا۔“

علیؑ کی پیشین گوئی نظام قومی کی برسی کے متعلق

جلس شوریٰ میں فرمایا: ”کہیں ایسا نہ ہو کہ آج کے دن کے بعد تم اس امر خلافت کو ایسی حالت میں دیکھو کہ اس میں تلواریں چنی جائیں، عہد شکنیاں ظہور میں آئیں، حتیٰ کہ تم میں سے بعض لوگ اہل ضلالت و گمراہی کے امام اور اہل جہالت و نادانی کے پیرو ہو جائیں۔“

ذمہ داری کے زمانہ میں محتاط جواب

زمانہ خلافت میں جب کہ معاویہ معلقوں پر آمادہ تھا کسی نے پوچھا کہ خلافت کے سزاوار تو آپ ہی تھے پھر کیوں قوم نے آپ کو اس سے علیحدہ کر دیا۔ فرمایا: ”بے شک تیرے مرکب کا تنگ ڈھیلہ ہے۔ تو صواب و سداد کے برخلاف رستوں کی طرف مہار اٹھا رہا ہے اور وہ سوال کر رہا ہے جس کا موقع اور مصلحت نہیں (لیکن) تجھے سوال کرنے کا حق بھی

حاصل ہے اور تو علم کا طالب بھی ہو رہا ہے۔ لہذا اب معلوم کر حالانکہ از روئے نسب میں سب سے اعلیٰ ہوں اور از روئے رشتہ کے رسول خدا سے نہایت ہی قریب بلکہ پھست ہوں پھر بھی غر پر بلند ہونے کی آرزو کرنا ظاہر ہے کہ اس قوم کے نفوس نے بخل اختیار کیا۔ حق بہ حقدار نہ پہنچایا اور ایک دوسرے گروہ نے اپنے نفوس پر سخاوت اختیار کی کہ حق و باطل میں حکم کرنے والا خداوند عالم ہے۔ تو اس غارت کے حالت کو چھوڑ دے جس کے اطراف میں بہت سی فریادیں بلند ہو چکی ہیں۔ اب اس ابن ابوشیان کی شان بزرگ کو دیکھو مجھے رلانے کے بعد اس زمانہ نے ہنسنا دیا اور اگر دیکھا جائے تو قسم خدا کی یہ کوئی تعجب کا مقام بھی نہیں۔۔۔ اگر ہم سے اور ان سے ان بلاؤں کے رنج و الم دور ہو جاتے تو میں اضمیں خالص حق پر قائم کر دیتا اور اگر ان سے برخلاف ملتا ہوتا پھر تو ایسے لوگوں کی مگرابیوں پر حسرت و افسوس کر کے اپنے نفس کو ہلاک نہ کر۔ کیونکہ جو کچھ یہ لوگ عمل کرتے ہیں پروردگار اس سے واقف ہے۔

علی قریش کے متعلق ”ہاں الہا! میں تجھ سے اس گروہ قریش کے لیے انتقام طلب کرتا ہوں۔ کیونکہ ان لوگوں نے میرے رم کو قطع کیا اور اس حق پر مجھے نزع کرنے کے لیے جمع ہو گئے جس کا میں ان سے زیادہ متحق تھا اور مجھ سے کہنے لگے کہ بے شک یہ خلافت تیرا حق ہے اگر تو اسے لے لے مگر اب تو حق یہی ہے کہ تجھے اس سے روک دیا جائے۔ اب تو نہایت ہی رنج و الم کی حالت میں صبر کر اور نہایت متاسفانہ طریقہ سے مر جہ۔ اب میں نے نگاہ دوڑائی تو اہل بیت کے سوا کسی کو اپنا معین و مددگار اور دشمن کو دور کرنے والا نہ پایا۔“

علی نے اہل بیت کی موت سے بخل کیا ”میں نے ان کی موت سے بخل کیا۔ اب میں نے کدورت آمیز آنسو بہانے کے لیے آنکھوں کو بند کر لیا۔ دلی سوزش بھیلنے کے واسطے لعل دہن پی کر رہ گیا اور خشم و غضب کے فدو کرنے کے خاطر ایسے ناگوار طریقہ سے صبر کیا جو درخت حُلّ سے بھی زیادہ تلخ اور تیر چھریوں کی برش سے زیادہ قلب کو ازیت پہنچانے والا ہے۔“

شوری کی تردید اور مصاحبت کی دلیل میں قربت ”نہایت تعجب ہے کہ مصاحبت پیغمبر شخص مصاحب بھی ہو اور خویش بھی وہ خلافت سے محروم رہے۔ اگر تو شوری و اجماع کے سبب سے امور مردم کا مالک ہو گیا تو یہ شوری و اجماع متحق کیونکر ہوا۔ کیونکہ صاحبان شوری تو غائب ہی ہیں۔“

خاموشی اغیار کے استحقاق کا اقرار اور اپنا انکار نہ تھا اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ اغیار اس کے متحق تھے اور ہیں وہ حق نہیں پہنچتا تھا۔

علی نے صبر کا تصفیہ کیا ”اے سننے والے خبردار ہو جا کہ ظالم شخص نے پیر بن خلافت کو زیب تن کر لیا۔ حالانکہ وہ خوب جانتا تھا اور اسے اچھی طرح یقین تھا کہ خلافت کے لیے میرا وہ مقام ہے اور مجھے اس سے وہی نسبت ہے جو آسیا کو قلب آسیا سے۔۔۔ جب ابن ابوقحافہ نے اس پیر بن کو ناحق اپنے زینت بنالیا تو میں نے اپنے اور اس خلافت کے درمیان پردہ ڈال دیا اور اس معاملہ میں غور کرنا شروع کیا کہ اپنے

بریدہ اور شکستہ ہاتھ سے اس پر حملہ کروں یا اس خلعت تاریکی پر صبر کروں۔ اس وقت میں نے دیکھا کہ اس واقعہ پر میرا صبر کرنا بیعت ہی بہتر اور نہایت ہی عظیمی ہے۔ میں دیکھ رہا تھا کہ میری میراث کس طرح تاراج و غارت ہو رہی ہے۔ ”جب آپ کا انتقال ہو گیا تو آپ (رسول) کے بعد مسلمانوں نے امر خلافت میں نزاع کی کہ تم خدا کی ہرگز میرے دل میں یہ بات نہ تھی، مجھے اس کا گمان بھی نہ تھا کہ اہل عرب اس امر خلافت کو رسول اللہ کے بعد آپ کے اہل بیت سے زائل کر دیں گے نہ مجھے یہ خیال تھا کہ حضرت کے بعد مجھے اس خلافت سے دور کر دیں گے۔“

حصول اختیار کا نتیجہ آگ اور تخلیہ اب جو واقعات مسم بیان کریں گے وہ حصول اختیار کا نتیجہ بکھا جانے کا اعلان دیتا ہے:

ابوبکر نے اب عمر کو علی کے پاس ہاں اراہہ بھیجا کہ: ”جو لوگ اہل بیت میں سے ہمراہ ہیں انھیں مع علی کے حضرت فاطمہ کے گھر سے نکال دو، اور اگر نکلنے سے انکار کریں تو لڑنا۔“ یہ تھوڑے لوگ لے کر بہ اراہہ گھر چھوٹنے کے گئے۔

حضرت فاطمہ کا سوال اور عمر کا جواب حضرت فاطمہ سے ملاقات پر آپ نے پوچھا: ”کیا ہمارا گھر چھوٹنے جاتا ہے؟“ البتہ

گھر چھوٹک ڈالوں گا، نہیں تو تم بھی ابوبکر صدیق سے بیعت کر لو۔ جس بیعت میں تمام امت داخل ہوئی تم بھی داخل چھو لو۔

مہلت نہ دینے کی صلاح کتب الامامة والسیاسة میں بھی ہے کہ پہلے ابن خطاب لکڑیاں لے کر گئے اور واپس آئے۔ اس کے بعد صلاح ہوئی کہ مہلت نہ دینی چاہیے۔

اور اس مرتبہ ایک شخص بھیجا گیا جس کا نام قنفذ تھا۔

طاہرہ کی فریاد نے قنفذ کو رلا دیا اس وقت حضرت زکیہ طاہرہ نے بلند آواز سے منہ مایا کہ:

”یا رسول اللہ! آپ کے بعد اپنی ابو قنفذہ اور عسر سے کیا کیا نہیں دیکھا۔“ اس پر قنفذہ اور اس کے ہمراہی رونے لگے۔

علی صاحبان اختیار کی روش سمجھاتے ہیں اس مؤرخ کے موافق جس وقت حضرت علی دربار خلافت میں موجود تھے آپ نے فرمایا کہ:

”اس طرح دودھ دو دو کہ تمہیں بھی اس کا ایک حصہ ملے اور ان کے لیے مضبوط کرو کہ وہ کل تمہیں لوٹا دیں گے۔“

حضرت علی کا سوال اور عمر کا جواب حضرت نے یہ سوال کیا کہ: ”اگر ہم بیعت نہ کریں تو کیا کر دیں گے؟“ عمر نے کہا: ”گردن مار دیں گے۔“

ابوبکر کا جواب اور اس کے بعد ابوبکر سے مخاطب ہو کر کہا کہ: ”تم کچھ حکم کیوں نہیں دیتے۔“ جس کا انھوں نے جواب دیا کہ: ”جب تک فاطمہ ان کے پہلو میں ہیں ہم کبھی بیعت نہ کریں گے۔“

بشر بن سعد اور علی کی گفتگو اعظم کوئی کے موافق بشر بن سعد اور علی میں یہ گفتگو ہوئی: بشر نے کہا: ”یا علی صدیق کی بیعت کے پہلے اگر تم اپنا حق ظاہر کرتے تو دو آدمیوں سے

زیادہ کوئی تمہاری مخالفت نہ کرتا۔ لیکن چونکہ تم گھر بیٹھے رہے۔ سب کو خیال ہوا کہ تمہیں رغبت خلافت نہیں ہے۔“

اب یہ باتیں لوگوں کے عقیدہ کے خلاف ہوں گی۔ لوگوں نے اس خوف سے کہ مبادا دین رسول میں خلل پڑے ابوبکر کی بیعت کر لی۔ علی نے جواب میں فرمایا: ”اے بشر! کیا تو اسے پسند کرے گا کہ میں رسول کی لاش بے غسل و کفن چھوڑ کر ریاست کی فکر میں دوڑتا؟“

جوش کے وقت حضرت ابوبکرؓ کی لاعلمانہ سادگی اور علیؓ سے بیعت کی تکلیف ساقط
 اب ابوبکرؓ جواب میں کہتے ہیں کہ: ”اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تم مخالفت کرو گے تو میں ہرگز قبول نہ کرتا۔ اب اگر بیعت کرو تو مناسب ہے۔ نہیں تو تم پر کوئی تکلیف نہیں ہے۔“ صاحب صواعق عرقہ نے بھی اس اعلان کو لکھا ہے۔ اگرچہ اس کی شکل اس طرح کی ہے کہ حضرت علیؓ نے تعزیمیں کرنے کے بعد بیعت کر لی۔

ابوبکرؓ رو رہے ہیں
 اس مؤرخ نے یہ بھی لکھا ہے کہ: جب ابن ابوقحظہ حضرت علیؓ کے پاس گئے تو جناب امیر نے حکایت کی کہ: ”مقرر شدی باہر یعنی مشورت راتھا کمدی و مارا داخل نہ دادی و بواسطہ قرابتے بر رسول ﷺ مارا درین نصیبہ بود مثل این نوع سخن رفتی امیزی گفت تا آنکہ ابوبکر صدیق بگریہ آمد و احک از چشم ہائے بارید۔“ یعنی: ”بغیر مشورہ کے تو نے آمریت اختیار کی اور میں اس میں دخل کا موقع نہ دیا۔ رسولؐ کی قرابت کے واسطہ سے ہمارا حصہ تھا اس طرح کی نرم باتیں کہیں، یہاں تک کہ ابوبکرؓ رونے لگے اور آنکھوں سے آنسو چھیننے لگے۔“

آیا بیعت لینا حسن نیت اور اسلام پر احسان کے خیال سے تھا
 اب ہم اس امر کے بیعت کرانے والوں نے حسن نیت سے مسلمانوں کی ذمہ داری قبول کر کے اسلام پر احسان کیا تھا یا اس کے خلاف تھا ابن ابی الحدید سے مدد لیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جس روز ابوبکرؓ خلیفہ ہوئے اسی شب کو ابوذرؓ، سلمان اور ابن ہشیم وغیرہ نے ایک کھیتی کی کہ مہاجرین میں خلافت کے متعلق دوبارہ شوری ہو۔

دوبارہ شوریٰ کی خبر سن کر ابوبکرؓ مغیرہ کے پاس گئے
 یہ خبر ابوبکرؓ وغیرہ کو معلوم ہوئی اور یہ لوگ سید سے مغیرہ بن شعبہ کے پاس گئے۔

بقول کتب الامامة والسياسة مغیرہ نے کہا:

صلاح کہ علیؓ اور بنی ہاشم پر نجات قاشم کرنے کے لیے نسلا بعد نسل وظیفہ مقرر کردو
 کیا تمہاری صلاح ہے کہ عباسی کے پاس چلو اور اس امر میں ان کا اور ان کی اولاد کا بھی حصہ قرار دو۔ یہ نجات ہوگی علیؓ اور بنی ہاشم پر جب کہ عباسی تمہارے ساتھ ہوں گے۔

جماعت خلافت کا عباسیؓ سے مخاطبہ
 پس گئے ابوبکرؓ، عمر اور ابوہریرہؓ یہاں تک کہ عباسی کے پاس پہنچے۔ (ابوبکرؓ نے کہا) ”ہم کو خبر پہنچی ہے ان طعنوں کی جو طعن کرنے والے اجماع فاسقین کے خلاف کرتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگ اور طرف مائل تھے اور تم کو آڑ قرار دیتے ہیں۔ یا تم خود اس میں داخل ہو جس میں عام لوگ داخل ہوئے ہیں۔ یا رد کو ان لوگوں کو جس طرف وہ

مائل ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ تمہارے لیے اس امر میں ایک حصہ قرار دیں جو تمہارے اور تمہارے بعد کے لیے ہو۔ اس واسطے کہ تم ہم رسول ہو۔ اگرچہ لوگوں نے تمہاری اور تمہارے اصحاب کی منزلت سمجھ لیکن اس امر خلافت کو تم سے پھیر دیا۔ اے بنی عبد المطلب اپنی جگہ پر قرار لو، اس واسطے کہ رسول تم سے بھی ہیں اور ہم سے بھی۔“

اب عمر نے شروع کیا: ”ہاں واللہ یہ مناسب ہے۔ ہم اس واسطے نہیں آئے ہیں کہ ہم کو تم سے کئی حاجت ہے۔ لیکن ہم نے اس بات کو ناپسند کیا کہ تمہاری وجہ سے اس امر پر کوئی طعن ہو جس پر عام لوگوں نے اجماع کر لیا ہو۔ پس گھبرائیں گے مشکلات تم کو اور ان کو۔ پس اپنے اور لوگوں کے لیے غور کرو۔“

عباسؓ نے جواب دیا: ”رسولؐ نے لوگوں پر ان کے امر کو چھوڑ دیا کہ وہ اپنے لیے انتخاب کریں اس طور سے کہ حق کو لیے ہوں، نہ حق سے علیحدہ ہوں، سبب خواہش نفس کے۔ اگر سبب رسولؐ کے تم نے اس کو طلب کیا ہے تو تم نے ہمارا حق اٹھ لیا، اور اگر مومنین کے ذریعہ سے لیا ہے تو ہم بھی مومنین میں سے ہیں، اور سب میں ہدم ہیں۔ اور اگر یہ تمہارے لیے ثابت ہوا ہے مومنین کے ذریعہ سے تو وہ تمہارے لیے کیونکر ہو سکتا ہے در آنحالیکہ ہم کارہ تھے۔ جو کچھ ہم کو دینا چاہتے ہو اگر وہ تمہارا حق ہے تو ہم کو اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے، اور مومنین کا حق ہے تو تم کو اس کے متعلق فیصلہ کا کوئی اختیار نہیں ہے۔ اور اگر ہمارا حق ہے تو ہم بعض کو چھوڑ کر بعض پر اکتفا نہیں کر سکتے۔ یہ جو تم نے کہا کہ رسولؐ ہم میں اور تم میں دونوں سے ہیں تو رسولؐ وہ درخت ہیں جس کی ہم ٹہنیاں ہیں اور تم ہمسایہ ہو۔“

حضرت عباسؓ کا یہ جواب ابن ابی الحدید نے لکھا ہے۔ جے ابن قتیبہ نے نہیں لکھا کہ: ”تمہارا

یہ قول کہ تمہیں خوف ہے لوگوں کا ہمارے باب میں پس اس کا تو تم نے پہلے ہی سامان کر لیا ہے اور خدا ہمارا مددگار ہے۔“

اب میں جو مثال دینا چاہتا ہوں وہ انھیں بیعت ابوبکر سے کراہت کی مثال اور بنی امیہ

انصار بیعت ابوبکر کو مکروہ جانتے تھے یا سلف بن عبادہ نے بیعت نہ کی۔ ابن خلدون کے مترجم کی زبانی ہم اس حکایت کو قبول کرتے ہیں جے اور مؤرخین نے بھی نقل کیا ہے کہ: ”ایک روز ابوسفیان مدینہ میں علیؓ کے پاس یہ کہتے ہوئے آئے کہ میں مدینہ میں ایک عجب شورش دیکھتا ہوں جس کو سوائے کشت و خون کے اور کوئی چیز فرو نہیں کر سکتی۔ اے اکی عبد مناف ابوبکر تمہارے ہوتے ہوئے سرداری کا کیسے مستحق ہو سکتا ہے۔ کہاں ہیں وہ دونوں ضعیف و ذلیل علیؓ و عباسؓ؟ یہ عجب بات ہے کہ حکومت و سلطنت قریش کی نہایت چھوٹے اور خیر قبیلہ میں چلی جائے۔“ یہ کہہ کر علیؓ سے مخاطب ہو کر کہا: ”ہاتھ بڑھاؤ! میں تم سے بیعت کرتا ہوں۔ واللہ اگر تم چاہو تو میں ابوبکر پر اس میدان کو تنگ کر دوں، اور دم زدن میں اس کو سوار و پیادہ سے بھر دوں۔“

علیؓ نے یہ سن کر نہایت سختی سے جواب دیا، اور یہ کہا کہ واللہ تو نے اس سے ابوسفیانؓ کو علیؓ کا جواب آتش فتنہ روشن کرنے کی کوشش کی ہے۔ جا مجھے تیری نصیحت کی ضرورت نہیں ہے۔

علیؑ نے قبول نہ کیا

موافق میں ہے کہ: ”حضرت عباس اراوت بیعت باعلیٰ کرم اللہ وجہہ کردہ و علیؑ قبول این معنی نہ کرو۔ زبیر صاحب شہامت بنو ہاشم وغیر ایشان بہ لا بودند و تقویت او میکردند۔“

یعنی: حضرت عباسؑ نے علیؑ کی بیعت کا ارادہ کیا۔ علیؑ نے قبول نہ فرمایا۔ زبیر پہلور بنو ہاشم وغیرہ ان کے ساتھ تھے اور ان کی تقویت کر رہے تھے۔“

ابوالفضلؑ کہتا ہے کہ بنی ہاشم، عتبہ بن ابی لہب، خالد بن

ابوبکرؓ کی بیعت سے تخلف کرنے والوں کے نام

سعد بن العاص، مقداد، ابن عمر، سلمان فارسی، ابوذر،

عمار بن یاسر، برادر بن مالک اور ابن کعب علیؑ کے ہمراہ رہے اور ان لوگوں نے ابوبکرؓ کی بیعت نہ کی۔ ابوشیمان بھی جو بنی امیہ تھا الگ رہا۔ ابن خلدون میں متخلفین بیعت میں طلحہ کا نام بھی ہے۔

ابن خلدون سے معلوم ہوتا ہے کہ ابوبکرؓ نے خالد بن سعید کو جو شام کے عامل تھے اور جنہوں نے بعد وفات آنحضرتؐ چند روز بیعت ابوبکرؓ سے تخلف کیا تھا اور علیؑ و عثمانؓ رو سائے بنی عبدمناف کے پاس گئے تھے، معزول کر دیا۔

ابوالفضلؑ کے موافق عتبہ بن ابی لہب نے چند شعرا اس مضمون کے کہے کہ: ”میں نہ جانتا تھا کہ خلافت اور حکم اولاد ہاشم سے جاتا رہے گا اور ابی حسن

کو بھی جو سب سے پہلے ایمان لائے تھے اور سب سے پہلے مسلمان ہوئے قرآن و سنت کو خوب جانتے تھے اور جس نے آخر وقت میں رسولؐ خدا کو غسل دیا اسے خلافت نہ ملے گی، کہ ایک اور ہی شخص کو مل جائے گی۔“

ابن ہاشم کی مالی مشکل قصہ فذک بھی ہم جو کچھ کہیں گے وہ صاحب اختیار لوگوں کی یہ کوشش بھی جانے گی کہ وہ خاندان رسالت کو مالی حیثیت سے

اپنا دست نگر بنانا چاہتے ہیں۔ یا قبضہ خلافت کے ساتھ رسولؐ کی جائیداد خالصہ کو بھی اسی حق سے حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ہم واقعہ فذک کو زمانہ رسولؐ میں کسی حد تک تعارف کے لیے پیش کر چکے ہیں۔

ظاہرہ کا سوال اور خلیفہ کا اقرار کہ ان کے یہاں اب اس قدر کہنا ہے کہ قبول نتائج النہوہ صریح کے بعد ان کی اولاد ان کی وارث ہوگی۔ ”آئیں بنت رسولؐ اللہ فاطمہؑ زہرا ابوبکرؓ کے نزدیک

اور میراث طلب کیلئے میراث نہ دی ابوبکرؓ نے۔ پس کہا فاطمہؑ زہرا نے: ”اے ابوبکرؓ! اگر تو مر جائے، کون وارث ہوگا تیرا؟“ کہا صدیقؓ نے کہ: ”میرے اہل اور اولاد وارث ہوں گے۔“ فاطمہؑ نے کہا: ”پھر کیا سبب ہے جو میں وارث نہ ہوں اپنے باپ کی؟“ کہا ابوبکرؓ نے کہ: ”سنا ہے میں نے رسولؐ خدا سے کہ نہیں ہوئی ہم کو میراث۔“

فاطمہؑ زہرا کو غضب ناک کرنے کے بعد معذرت کتب الامانہ والسیاتہ میں ہے: کہا عمرؓ نے فاطمہؑ نے اجازت نہ دی، فاطمہؑ نے منہ پھیر لیا۔ ابوبکرؓ سے چلو ہم لوگوں کے ساتھ فاطمہؑ

کے یہاں، اس لیے کہ ہم نے ان کو غضب ناک کیا ہے۔ پس دونوں شخص گئے اور اجازت چاہی فاطمہؑ سے ان کے پاس حاضر ہونے کی لیکن انہوں نے اذن نہ دیا تو دونوں صاحب علیؑ کے پاس گئے اور ان سے گفتگو کی اور وہ ان دونوں شخصوں کو

فاطمہؑ کے پاس لے گئے۔ اور جب یہ دونوں بیٹھے ان کے پاس تو انہوں نے ان لوگوں کی طرف سے مٹہ پھیر کر دیوار کی

خلافت کے بعد پہلی حدیث جو ابوبکر نے بیان کی
 لا تدرث ما توركناه صدقہ یعنی: ”ہم وارث نہیں بناتے ہمارے کہ صدقہ ہے۔“ پس فاطمہؓ نے کہا: ”اگر میں تم دونوں سے رسول خدا کی حدیث بیان کروں تو اس کا اقرار کرو گے اور اس پر عمل کرو گے۔ دونوں صاحبوں نے کہا کہ ”ہاں۔“

طاہرہ ایک حدیث بیان فرماتی ہیں

وَسَخَطَ فَاطِمَةُ مِنْ سَخَطِي لَمَّا احْبَبَ فَاطِمَةَ ابْنَتِي فَقَدْ احْبَبَنِي وَمِنْ اَرْضَا فَاطِمَةَ فَقَدْ اَرْضَانِي وَمِنْ اسْخَطَ فَاطِمَةَ فَقَدْ اسْخَطَنِي۔ یعنی: ”فاطمہ کی رضا میری رضا ہے، فاطمہ کی ناراضگی میری ناراضگی ہے۔ جس نے میری بیٹی فاطمہ سے پیار کیا مجھ سے پیار کیا، جس نے فاطمہ کو راضی رکھا اس نے مجھے راضی رکھا، جس نے فاطمہ کا ناراضی کی اس مجھے ناراض کیا۔“ دونوں صاحبوں نے کہا ہاں سنا ہے ہم نے رسول خدا سے۔ پس کہا فاطمہ نے پس میں گواہ کرتی ہوں اللہ اور ملائکہ کو کہ تم دونوں نے مجھے ناراض کیا، اور مجھ کو راضی نہیں کیا، اور اگر رسول سے ملوں گی تو تمہاری امن سے شکایت کہوں گی۔ پس کہا ابو بکر نے ہم ساتھ سمجھتے ہیں خدا کی اس کی ناراضی اور تمہاری ناراضی سے اسے فاطمہ۔

دوبارہ ابوبکر کو رونا آگیا

اپنی حیات تک بائیں کی

و باقی فہم خیر کہ ازاں حضرت رضی اللہ تعالیٰ عنہ سلم منادہ بود کرد۔۔۔۔۔ چون ابابکر ابا کرد ازاں کہ چیزے ازاں اموال بہ فاطمہ دید فاطمہ رضی اللہ عنہا غضب کرد بر ابابکر صدیق رضی اللہ عنہ ہجرت کرد و تکلم نہ کرد تا زمانیکہ حضرت فاطمہ زہرا حیات بود۔ یعنی:

”بخاری نے عائشہ سے روایت کی ہے کہ حضرت فاطمہؑ نے کسی کو ابوبکر کے پاس بھیجا اور مدینہ کے اموال اور خدک نیز حضورؐ کے خیر کے بچے پختے فہم کو مانگا۔۔۔۔۔ جب ابوبکر نے انکار کیا اس سے کہ اہل اموال میں سے کچھ بھی فاطمہؑ کو نہ دے تو فاطمہؑ ابوبکرؓ پر غضبناک ہوئیں اور پلٹا چھوڑ دیا۔ اور جب تک حضرت فاطمہؑ زہراؑ زندہ رہیں اس سے نہ بولیں۔“

قوت و معیشت کے لینے کی شکایت

باغ کو اور میرے فسر زندوں کے قوت و معیشت کو لے لیا ہے۔“

ناعین زکوٰۃ کا قتل

اب میں حصول اختیار کے آخری نتیجہ کی طرف توجہ دلاتا ہوں یہ درو انگیز داستان ہے جسے بفضل کا پر جوش لہجہ اور آسنو خوب بیان کر سکتے تھے مجھے اس جگہ اہل رذت کی تقسیم کردہ بی ہوگی جس سے مطلب سمجھنے میں آسانی ہو۔

مؤرخین نے اہل رذت اور ناعین زکوٰۃ کو مخلوط کر دیا ہے

مؤرخین نے جہاں مسئلہ کتاب، سراج، اور طلحہ بن خلیلہ کو جائز حیثیت سے مہدین کے خطاب سے یاد کیا ہے وہاں ان لوگوں کو بھی جنہوں نے ابابکر کو رسول کا جائز خلیفہ نہ سمجھا کر زکوٰۃ اور صدقات دینا روک رکھا تھا یا انکار کیا تھا انہیں بھی اہل رذت کے ناجائز لقب، غلط الزام اور غلط مفہوم کھانے والے فرقہ سے یاد کیا ہے۔ مجھے اوّل الذکر گروہ سے کوئی غرض نہیں ہے۔ صرف یہ کہنا ہے کہ یہ فتوحات اگرچہ کیسے ہی قیمت معاوضہ میں کیوں نہ پیش کرتے ہوں لیکن میری دانست میں یہ فتوحات بڑی قیمت سے خریدی گئی تھیں جن میں صرف جنگ ہمارے میں سات سو حلقہ شہر آں کٹوا دیے گئے۔ میں کسی حد تک اسی دوسرے گروہ کا حالات پر اکتفا کرتا ہوں۔ لیکن اس کے قبل بغیر یہ کہہ نہیں رہ سکتا کہ بعد رسول جو کچھ ہوا اس پر سلیم الطبعی سے رائے قائم کرنے میں ایسی وحشت خیز مغربی اذنانہ دل جانیں کہ: ”قبائل کے قبائل اسلام سے پھر گئے تھے کم ایسے قبیلہ تھے جن کے بعض مرتد ہونے تھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کی وجہ سے نفاق کی تاریکی چھا گئی تھی۔ ہوائے مخالفت کے جھونکے چل رہے تھے۔ امتداد کی سیاہ گھٹائیں اٹھتی چلی آتی تھیں۔ مسلمان غریب ایسی شب تاریک میں اپنی قلت جماعت و کثرت اعدا سے حیران و پریشان ہو رہے تھے۔“ میں قائل ہوں کہ باہر کی حالت دیکھنے کے لیے کل حردت تھی مدد کے لیے صرف کر دیے گئے ہیں لیکن اندر کی حالت دیکھنے کی طرف سے منہ موڑ لیا گیا ہے۔ اس لیے کہ جو کچھ ہم دکھا رہے ہوں اسے دیکھو، اور اسے دسایا ہی سمجھو۔ جیسا ہم دکھا رہے ہیں۔ اس سے دو غرض پوری ہوتی ہے۔ ایک تو یہ کہ ہمارا حق قبول کرو، دوسرے یہ کہ اس کے بعد اسی حق کے رو سے ہم جو کچھ کریں اسے بھی قبول کرو، اور ہمارا احسان مانو کہ ہم نے یہ کیا حال تک حصول حق اور حق کا نفاذ دونوں نہایت گہرے الزام کے سایہ میں ہیں۔ مرتد جس مفہوم میں بھا گیا ہے اس کی ابن غلدون سے مثال دیتا ہوں: ”عمر بن معاویہ نے باوجود واجب ہونے کے صدقات کے دینے سے انکار کیا۔ زیاد نے ان پر حملہ کر کے انہیں ہلکتی دی۔ کل بنی عمر بن معاویہ اسی واقعہ سے برہم ہو کر منع صدقات پر آمادہ اور مرتد ہو گئے۔“

ان حالتوں میں جو کسی ایسے صریح اور صاف واقعہ کے جس میں یہ لکھا ہو کہ فلاں شخص یا قبیلہ اسلام سے پھر گیا اور اس نے اپنا دوسرا خدا اور رسول جن لیلہ ہم تمام دیگر واقعات کو اسی سرفی میں لائیں گے کہ ساری دوزخیں اور سرگرمی اپنے اختیارات تسلیم کرانے کے لیے تھی۔ ان لوگوں سے جو یہ سوال کرتے تھے کہ تم کون ہو جو رسول کے بعد ہمارے درمیان مائل ہو گئے ہو اور تمہیں کیا حق حاصل ہے۔ ہم کیوں تمہیں زکوٰۃ اور صدقات کا محافظ قرار دیں۔

مؤرخین کے لیے اس سے زیادہ کوئی آسان بات ہو سکتی تھی کہ ان کو جن کے سر جھکانے کے لیے فہمیں بھیجی جا رہی تھیں اس لیے کہ میں خلیفہ تسلیم کرو اور زکوٰۃ دو انہیں اسلام سے پھرنا ہو کہہ دیتے اور ان کے قتل و غارت کو صلاح دین کہتے۔ ایسے مواقع دکھائی دیتے ہیں جہاں یہ کہا گیا ہے کہ چونکہ ایک قبیلہ نے دوسرے مسلمان قبیلہ پر حملہ کیا تھا

وہ مرتد ہو گیا یا چونکہ بعض قبائل سہل اور حسیلہ کے ساتھ ہو کر خالد کے لشکر سے لڑے اس لیے وہ کاڑ ہو گئے۔ لیکن میرے خیال میں یہ واقعات کاغذ پیرایہ ہے۔ اگر ایسا ہے تو ہماری کج میں نہیں آتا کہ ہم مدنی فوج کے سپاہیوں کو کیا کہیں، جو ان سے لڑنے گئے جو ابقادہ کے نزدیک مسلمان تھے، بلکہ واقعہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ قبائل میں جنگ ہو جانا اپنے گزشتہ عداوتوں کی بنیاد پر تھا۔ اربداد کو اس میں کوئی دخل نہ تھا۔ اسی طرح وہ قبائل جو حسیلہ کے ساتھ ہو کر لڑے۔ چونکہ وہ خود مرکزی حکومت کے استحقاق تحصیل زکوٰۃ کو قبول نہ کرتے تھے انھوں نے حکومت کے دوسرے دشمن کو قدر مشترک بھائی جنگ میں ساتھ لے لیا۔ زیادہ سے زیادہ ان پر یہ الزام ملید ہو سکتا ہے کہ انھوں نے باوجود اختلاف کے غیر مسلم کے شریک ہو کر مسلمانوں سے کیوں جنگ کی۔ اس کے لیے شاید حضرت ابوبکر کو ایسے لوگوں کو بھی مزادینے اور مرتد کہنے کی ضرورت ہوتی ہے نہ وہ خود پسند کرتے اور نہ مسلمان۔ بلکہ حسیلہ ان میں بعض کا پیرایہ بھی تھا۔ جیسا بنی حنیفہ کا ایک گرفتار عربین شمر کہتا ہے کہ حسیلہ نے دھوکا دیا اور قوت پکڑی۔ ”مثل خلافت شما کہ از خاندان نبوت بخرج گرفتہ“۔ یعنی: ”تمہاری خلافت کی طرح کہ جسے تم نے خاندان نبوت سے دھوکے کے ذریعے لے لیا“۔ (اعثم کوئی)

ان واقعات کا مفہوم بھاننے کے لیے میں اعثم کوئی کو منتخب کرتا ہوں جس نے مورخانہ سادگی اور صراحت سے یہ واقعات لکھے ہیں۔ جس کی فطری حیثیت میں مجھے کوئی شبہ نہیں ہے۔ لیکن مورخانہ کور سے مدد لینے کے قبل میں چاہتا ہوں کہ مشافہہ روایتیں بھی بیان کر دوں جو اور مؤرخین سے بھی ملتی ہیں جس سے یہ کج میں آ جانے کہ خوددار اختلاف کے اکثر نمیزن اس کے خلاف تھے۔ بقول صاحب مظهر حق: حضرت عمر اور حضرت علیؓ ماضین زکوٰۃ کی کلمہ کوئی پر نظر کر کے سفارش کو اٹھے اور کہا کیونکر قاتل کریں ہم ان سے ایسی حالت میں کہ فلانیا آنحضرت نے: ”امرت ان اقاتل الناس حقاً یقولوا لا الہ الا اللہ“۔ یعنی: ”مجھے حکم دیا گیا ہے کہ لوگوں سے جنگ کروں یہاں تک کہ ”لا الہ الا اللہ“ کہنے لگیں۔“ کہا ابوبکر نے کہ قاتل کروں گا ان سے کہ جو فرق کریں گے درمیان زکوٰۃ اور نماز کے۔ حضرت عمر نے کہا کہ دیکھا میں نے کہ کھول دیا اللہ نے سینہ ابوبکر کا قاتل کے لیے۔ پس جہاں میں نے کہ بھی حق ہے۔

صاحب صواعق عرق کہتے ہیں: ”چون وقت پیغامبر ﷺ مشہور شد و در نای مدینہ طہرہ بسیار محبوب و محترم شد و منع زکوٰۃ کردند ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بقتل ایشان برخاستہ عمر و بعض دیگر از اصحاب گفتند صلاح و راست کہ دست از قتل ایشانی باز داری۔ ابوبکر گفت بہ سوگند کہ تقصیر نہ کنم در قتال و عتاقے کہ آنچہ در زمان رسول اللہ ﷺ میدانم از من منع ی کنند و ازلے آن نمی کنند ہر آئینہ مقاتلہ با ایشان خواہم کرد در منع آن۔ بعد از ای عمر گفت چگونہ ہر ایشان قاتل میکنی و ملائکہ رسول اللہ ﷺ فرمود اموت ان اقاتل الناس حقاً یقولوا لا الہ الا اللہ وان یقتلوا رسول اللہ فمن قاتلہا عصم منی مائتہ و دممہ الا بحقہا و حسابہا علی اللہ۔ ماور شد بقتل مردمان تازمانیکہ بگوید لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ و ہر کس کہ این کلمہ گفت منع کرد و حمایت کرد از من مال خود را و خون خود را ابر حق این قول بابر حق ملایم و صاحب او بر خدا متعلق است۔ ابوبکر گفت بگوئند کہ مقاتلہ خواہم کرد بکیسکہ در میان صلوة و زکوٰۃ فرق کنند چرا کہ زکوٰۃ حق ماست و مال آنکہ رسول فرمود ﷺ لا یجہدہ عمر گفت بعد ازے سوگند کہ نیافتم کسے دیگر را آنکہ خدا نے قتلی مقرر ساخت صدر ابوبکر را بقتل آن جماعت و معلوم من شد کہ حق بجانب ابوبکر و آنچہ او ی گفت راست بود“۔ یعنی: ”جب پیغمبر کی

وفات مشہور ہوگئی اور مدینہ کے اطراف میں بہت سے گروہ عرب مرتد ہو گئے اور زکوٰۃ دینی روک وی تو ابوبکر صدیق ان سے جنگ کو اٹھے۔ عمر اور بعض دیگر اصحاب بولے کہ بہتری اس میں ہے کہ لڑائی سے ہاتھ روکے رکھیں۔ ابوبکر نے قسم اٹھا کر کہا کہ ایک رسی اور ایک بکری کے بچے کے ہارے میں بھی کمی نہ کروں گا، جو وہ زمانہ رسول میں دیتے تھے۔ مجھے دینے سے ملنے ہیں اور ادا نہیں کرتے میں ہر حال ان سے اس رکاوٹ میں محتاط کہوں گا۔ اس کے بعد عمر نے کہا آپ ان سے کس طرح لڑ سکتے ہیں جب کہ رسول خدا نے فرمایا کہ مجھے یا گیا ہے کہ لوگوں سے لڑوں یہاں تک کہ لاکھ قاتل ہو جائیں، اور اس کے کہ محمد اللہ کے رسول ہیں۔ پس جو اس کا قاتل ہو جائے اس کا مال اور خون غم سے محفوظ ہے، سوائے حق کے اور اس کا حساب اللہ پر ہے۔ ابوبکر نے قسم اٹھا کر کہا کہ میں اس سے لڑوں گا جو نماز اور زکوٰۃ میں فرق کرے۔ کیونکہ زکوٰۃ ہمارا حق ہے اور رسول نے فرمایا ہے کہ: الا بحقہا۔ عمر نے کہا اللہ کی قسم جس طرح ابوبکر کا سینہ اللہ نے ان لوگوں کے قتال کے لیے کھول دیا کسی اور کو میں نے نہیں دیکھا اور مجھے معلوم ہو گیا ابوبکر حق بجانب ہیں اور جو کچھ وہ کہتے تھے حق تھا۔

ابن خلدون کے نزدیک ابوبکر کی بعض قابل شمار خد متین ہیں کہ کو ابن خلدون کے کسی ایسے معارفہ انتقام سے کوئی بحث نہیں ہے کہ اگر ابوبکر ایسے ہنگامہ میں جس وقت کہ کسی کے ہوش و اس بیانہ تھے پیش نہ ہو گئے ہوتے تو عمر کو ان کے ہر جوش کلام سے کون روکتا۔ عائد کے سینہ سے سر مبارک کون اٹھاتا۔ سقیفہ میں انصار و مہاجرین کے چھٹڑے کو کون ختم کرتا۔ مرتدین کا کون قلع قمع کرتا۔ باوہ اخصی ایسے ”اہم امور“ بتائیں۔ تحصیل ”دین کے ساتھ نہایت قوی تعلق تھا۔“ نہ میں ابوبکر سے کوئی شکایت ہے کہ ہم ان سے اس کی باز پرس کریں کہ: ”اگر ابوبکر خلیفہ بنو دی مردم بندگی خدا اعلیٰ را بجائی آوردند باز مرتدہ سیوم ابن سخن را مکر ساخت۔“ یعنی: ”اگر ابوبکر خلیفہ نہ ہوتے تو لوگ اللہ کی عبادت بیانہ لاتے۔ تین بار یہ بات دہرائی۔“ یا ان لوگوں کا ساتھ دی جنہوں نے یہ سن کر کہا کہ: ”ساکن شام ابوبکر سے۔“ یعنی: ”چپ ہو جاوے ابوبکر۔“ لیکن ہم کو ابن حجر مکی سے کہنا ہے کہ علی کی زبان تمہارے قلم کی طرح اپنی خواہش سے پھرنے والی نہ تھی کہ وہ زیر بحث امر پر جس سے ان کی مخالفت ظاہر ہوگئی تھی اپنے اوپر یہ بوجہ گزارا کرتے کہ: ”روایت از علی کرم اللہ وجہہ کہ از جملہ شجاعت ابوبکر قتال ہودبا جماعتی کہ منع زکوٰۃ کردند و عزیمت بران کسے را بنشد۔“ علی سے روایت ہے کہ ابوبکر کی شجاعت میں سے ایک ناہنیں زکوٰۃ سے لڑائی تھی۔ اس پر کمی اور کو عزیمت نہیں۔

حضرت موت کا عامل زکوٰۃ مانگتا ہے (اعثم کوئی) زیاد بن لبید اس وقت حضر موت کا عامل تھا اس نے ایک روز منادی کرائی اور جب لوگ

مجمع ہوئے تو ان سے کہا کہ: ”اے مسلمانان صدقت درہم آوری کہ نزدیک صدیقی میفرستم کہ آئینا لشکر انبہ است و اخراجات بسیار۔“ یعنی: ”اے مسلمانو! صدقات (زکوٰۃ) اکٹھا کر کے لے آؤ تاکہ صدیقی کے پاس بیجوں کہ وہاں بہت بڑا لشکر ہے اور اخراجات بہت ہیں۔“ مال کے جمع کرنے میں زیاد نے ایک شخص کے اوٹ کو لے لیا اور اس پر نشان کر دیا اس شخص نے

صاحب شریعت کے بعد اس کے اہل بیت کی اطاعت کر سکتے ہیں ابوبکر کو ہم سے کیا بحث
 حارث بن سراقہ سے سفارش چاہی کہ زیاد کوئی دوسرا
 اؤٹ لے لے اور وہ دیدے لیکن زیاد نے باوجود
 سفارش اسے منظور نہ کیا۔ اس پر حارث کو غصہ آیا اور اؤٹ کے مالک سے کہا کہ جا اپنا اؤٹ لے لے اور اگر کوئی
 مزاحمت کرے تو تلوار سے جواب دینا۔ ”ما بفرمان خدا پیغامبر اور ا مطیع بودیم تا صاحب شریعت بجائے بود چون اورا
 فرمان حق رسید اگر اہل بیت او کسی بجائے او نشیند اسکس را اطاعت داریم پس ابو قتادہ را ہرچہ فرماں رسد و بامانچہ کار
 دارد۔“ یعنی: ”ہم خدا کے حکم سے اس کے رسول کے فرمانبردار تھے جب تک خود صاحب شریعت موجود تھے چونکہ
 انھیں حق کا بلاد آگیا۔ اگر ان کے خاندان سے کوئی ان کا جانشین ہو تو ہم اس کی اطاعت کریں گے ابو قتادہ کے بیٹے کا جو
 بھی حکم ہو ہمارے ساتھ اس کا کیا تعلق۔“

اشعث بن قیس کا یہ جواب جس وقت اشعث بن قیس
 کندی کو معلوم ہوا جو ملک عرب میں سے تھا

عرب نے نبی ہاشم کے مقابلہ میں بنی تسیم کو خلیفہ کیا اور ادعا کہ اگر بنی ہاشم کے علاوہ کوئی خلیفہ ہو تو ہم کیوں نہ ہوں
 تو اس نے کہا: ”مرا مین حاصل است کہ عرب
 بحدی قبیلہ ابوبکر یعنی بنی تیم تن در بندہ و ترک
 بہترین بطاعت یعنی از بنی ہاشم گیرند کہ معدن رسالت

و نبوت ایشانند و اگر رواست کہ خلافت بیرون بنی ہاشم کسی را باشد بچ کس بدان منصب نرود و تراز مانیت کہ ما و پدران
 ما ملوک زمین بودہ اند۔“ یعنی: ”مجھے یقین ہے کہ عرب ابوبکر کے قبیلہ یعنی بنی تیم کو مقدم ہونا قبول نہ کریں گے اور اہل
 کے سرداروں یعنی بنی ہاشم کو نہیں چھوڑیں گے۔ کیونکہ وہ معدن نبوت و رسالت ہیں۔ اگر خلافت بنی ہاشم سے باہر جالی روا
 ہے تو پھر کوئی بھی اس منصب کے لیے ہم سے زیادہ حق نہیں رکھتا۔ کیونکہ ہم اور ہمارے آباء و اجداد زمین کے بلاشاہ
 رہے ہیں۔“ زیاد بن لبید نے اب چاہا کہ حضرموت کے دیگر قبائل ملانے جائیں اور اگر قنویت حاصل ہو تو قبائل کندہ اس
 کے بعد عبور کیے جائیں یہ سوچ کر زیاد اب بنی ذیل کے پاس گیا۔ بنی کندہ کی حکایت کی اور ابوبکر کی بطاعت چاہی۔

قطع جماعت کی کوشش اور ناکام جواب
 ان میں سے ایک شخص جس کا نام حارث بن علوہ تھا
 کہنے لگا: ”تو مرا بطاعت مردی میخانی کہ بچ کس

مارا بطاعت او وصیت نہ کردہ است۔“ یعنی: ”تو میں اس مرد کی اطاعت کی دعوت دیتا ہے کہ جس کی فرمانبرداری کی نہیں
 کسی نے وصیت نہیں کی۔“ زیاد نے کہا: ”راست می گوئی لیکن ماسلمان با تفاق اور اعتقاد کر دیں۔“ یعنی: ”تو بچ کہتا
 ہے لیکن ہم مسلمانوں نے مل کر اسے نہ لیا ہے۔“

کیوں اہل بیت رسول کو الگ کر دیا
 حارث نے کہا: ”چوں اجتہاد میکردید چراہل بیت رسول
 را علیہ السلام از میان ما بیرون نہادید و این کار حق ایشانست۔“

بقول خدا نے جل شانہ کہ سر مود: وَأُولَٰئِكَ هُمَا أُولَىٰ بِبَعْضِهِمَا فِي كِتَابِ اللَّهِ (۸: ۷۵) یعنی: اگر تم نے
 اجتہاد کیا ہے تو اہل بیت رسول کو کیوں تم نے ہم سے باہر رکھا جب کہ یہ کام ان کا حق ہے، بدلیل فرمان خدا کہ:

خونی رشتہ دار ایک دوسرے کے زیادہ حق دار ہیں، اللہ کی کتب میں۔ زیادہ نے کہا: ”مہاجر و انصار در کادر مسلمانان از تو دانا ترند۔“ یعنی: ”مہاجر و انصار مسلمانوں کے کام کو تجھ سے بہتر جانتے ہیں۔“ حارث نے کہا:

”بخدا نے کہ حسد کردند و حق از حق
بیردند و ما را حقین است کہ رسول

زکوٰۃ نہ دینے والا تیغ بیان کرتا ہے اور دلیل لاتا ہے

علیہ السلام از دنیا بیرون گرفت تا بہتیم را مختار نے از اہل بیت خویش بموجب حکم حق قتالی غضب نہ کر در روز غدیر غم وقت معلومت از حجۃ الوداع کہ یک لک و چند ہزار عرب اشراف از ہر قبائل جمع ہو علی علیہ السلام را خلیفہ و جانشین خود گردانید بلانے خبر کھلا ہائے شہر و غلبہ درین باب فصیح فرمود کہ ابن علی بعد من مولا و مختار نے شہادت ابن را کہ شہاد خلیفہ مقرر نموده ابیہ این صدیق و عمر بن الخطاب اول آمدہ بیعت کردند و تیغ لک یا امیر المومنین بہ علی علیہ السلام گفتند۔ آن کد ام بیعت ہو دو این کد ام است۔ اے زیادہ از میان ما کنوں بیرون شو کہ دعوت توبہ قرار نیست۔ یعنی: ”اللہ کی قسم انھوں نے حسد کیا اور حق کا حق حصب کیا۔ ہمیں یقین ہے کہ رسول خدا اس وقت تک دنیا سے نہیں گئے جب تک کہ امت کے لیے رہنما و مختار اپنے اہل بیت سے خدا کے حکم کے مطابق مقرر نہیں کر دیا۔“ غدیر غم کے روز حجۃ الوداع سے واپسی پر جب کہ ایک لاکھ چند ہزار شرفائے عرب ہر قبیلہ سے جمع تھے، علی کو اپنا خلیفہ اور جانشین بنادیا۔ اُنٹوں کے کھلوں کے میسر پر اور اس بارے میں صحیح غلبہ دیا اور فرمایا کہ یہ علی میرے بعد تمہارا مولا اور مختار ہے۔ یہ صدیق و عمر حمصی تم نے خلیفہ مقرر کیا ہے سب سے پہلے اگر انھوں نے علی کی بیعت کی اور ”بیع لک یا امیر المومنین“ کہہ کر مبارک ہلا دی۔ وہ کونسی بیعت تھی اور یہ کونسی ہے؟ اے زیادہ اب ہمارے ہاں سے باہر چلے جاؤ کہ تمہارے دعویٰ کی کوئی بنیاد نہیں ہے۔“ اس کی تقریر سن کر عرفہ عبد اللہ نے صدیق کی اور کہا: ”آخر پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم بر امت خویش مہربان تر از مہاجر و انصار بنود کہ صلح ایشان بدین جماعت ہازی گزاشت؟“ یعنی: ”آخر پیغمبر خدا اپنی امت پر مہاجر و انصار سے زیادہ مہربان نہیں تھے کہ امت کی صلحتوں کو اس جماعت کے سپرد کر جاتے۔“ اس کے بعد ”زیادہ مرد شاخت و جائے دید و از اں قبیلہ بہ پرداخت و قبیلہ دیگر شد ہمیں چاشنی یافت و بہر جا کہ قبول فرمود ہم ازین گو نہ ابای نمودند۔“ یعنی: ”زیادہ نے لوگوں اور مقام کو کھلایا اور اس قبیلہ سے دوسرے قبیلہ کی راہ لی۔ لیکن یہی کچھ پہلا اور جہاں بھی گیا اسی طرح کالوگوں نے اٹکار کیا۔“

قبائل کی کمزوری نے اطاعت کرائی نہ طبعاً
بھنے جس وقت سنتے تھے کہ ہمارے لیے فوج بھیجی

بعض کہتے تھے کہ اطاعت قبول کر لیتے ہیں۔ لیکن ادائے زکوٰۃ کی قوت نہیں ہے۔ ان قبائل کی یہ دل شکنی ظری قوی کچھ تو اس وجہ سے کہ عالمہ ناس کا در آسمانیکہ وہ اپنے امور است خاگی اور اہل و عیال کے اٹکار میں مشغول ہیں، کسی ایسی فوج کے مقابلہ میں جنگ کرنا ہمیشہ دشوار ثابت ہوا ہے جو محض ارادہ جنگ سے آئی ہے اور اسے کوئی دوسری فکر نہیں ہوتی اور مرکزی حکومت برابر اس کی مدد اور فکر کرتی رہتی ہے۔ کچھ اس سبب سے بھی کہ قبائل میں آپس میں کونہ عداوتیں تھیں اور انھیں خوف تھا کہ اگر ہم مدینہ کی فوجوں سے لڑنے پر تیار ہوں تو ہمیں ایسا نہ ہو کہ ہمارے دشمن بھی ہم پر ٹوٹ پڑیں۔ بکر بن وائل اور قبیلہ کنندہ ایسے ہی خوف میں مبتلا تھے جس میں آخر اللہ کر قبیلہ بنی مذحج سے ہر وقت ہوشیار رہتا تھا۔

زیاد بن ابید جس کے پاس مرکزی حکومت سے چار ہزار فوج ساتھ کی گئی تھی ایک قبیلہ کے بعد دوسرے سے جنگ کرنے لگا اور تاخت و تاراج میں کامیابی ہوئی خلیفہ نے جو خط اشعث بن قیس وغیرہ کو لکھا اس کا مضمون دیکھ کر یہ ”تمہارے اعتقاد میں جو ظلم آگیا ہے وہ زیاد پر غصہ کی وجہ سے ہے۔ ہم خلیفہ کا خط اشعث کے نام سے معزول کر کے کسی دوسرے کو تمہاری ملالت کے لیے بھیجیں گے کہ تمہیں ملامت بر کر سکے۔ ہم نے قاصد سے کہہ دیا ہے کہ جب فرمان تمہیں دیدے تو تم زیاد کو دایم کرد و اور گزشتہ سے توبہ کرو۔“

اشعث کہتا ہے کہ بیعت کے توقع سے ہم کفر کے نامہ بر یعنی مسلم بن قیس سے مخاطب ہو کر ملزم ہوئے لیکن مسلمانوں کا قاتل ہوا نہ بسمجھا گیا۔ اشعث بن قیس نے کہا: ”تمہارے مقصد نے اس وجہ سے میں کفر سے نسبت دی کہ ہم نے اس کی بیعت میں وقت کیا اور زیاد کو جس نے اتنے مسلمان ہمارے قبیلہ کے قتل کیے برا نہ کہا۔“

قاصد کا جواب قاصد نے جواب دیا: ”وقت کی وجہ سے تمہیں نسبت نہیں دی گئی بلکہ اس وجہ سے کہ تم نے مہاجر و انصار کے اجماع کے خلاف کیا۔“ قاصد کے افسانہ ابھی منہ میں تھے کہ نئی مرہ کے ایک شخص نے جوش و غصہ میں اسے تلوار ماری اور یہ مرکز گر پڑا۔

اشعث کا جواب اُس کی قلبی حالت کا ائینہ یہ دیکھ کر اشعث نے کہا: ”خدا تیرے ہلپ کو بخش دے کہ اس سے اچھا جواب نہیں دیا جاسکتا تھا۔“

زیاد کو اسپس کی پھوٹ سے مدد ملی بعض لوگ قاصد کے قتل سے ناراض ہوئے اور ان میں سے پانچ ہزار آدمی زیاد بن ابید سے مل گئے زیاد اور اشعث میں لڑائی ہوئی اور زیاد کا لشکر سپا اور قلعہ بند ہوا۔ انہوں نے مرکز خلافت میں اطلاع بھیجی۔

عمر سے علی کے بھیجے جانے کی صلاح اور نہایت مفید جواب غلیفہ نے اپنے دوست سے صلاح کی کہ

ایسے وقت علی سے جنگ کے لیے روانہ ہونے کی استدعا کی جائے۔ ابن الخطاب کا جواب سب کچھ بجا دیتا ہے انہوں نے کہا: ”آپ درست فرماتے ہیں، لیکن مجھے ایک بات کا خوف ہے وہ یہ کہ علی آج کل کال استیلا کرتے ہیں۔ اگر خدا نخواستہ وہ نہ گئے یا ان لوگوں کے کفر و اسلام میں توقف کیا تو پھر کوئی لڑنے نہ جانتے مگر میثوری سے مصالحت یہ ہے کہ انہیں مشورہ کے لیے مدینہ میں رکھو اور عکرمہ بن ابی جہل کو بھیجو۔“

عکرمہ بن ابی جہل نے کیا کیا عکرمہ روانہ ہوا، پہلے مارب پہنچا جہاں کے لوگوں نے ابوبکر کے حامل کو نکال دیا تھا اہل مارب نے چونکہ پیشتر سے قلعہ بندی کا

کوئی سامان نہ کیا تھا محصور ہونے پر بے سرو سامانی کی وجہ سے صلح کی خواہش پر مجبور ہوئے۔ عکرمہ نے اس حیثیت خیز شرط پر صلح منظور کی کہ اہل قلعہ اپنے کفر اور ہمارے حقیقت کا اقرار کریں، اور کہیں کہ ان کے مقتول جہنم میں اور ہمارے بہشت میں جاویں گے۔ عکرمہ کے پیاسے محصورین کو کوئی دوسرا چارہ نہ تھا اس کی منظوری پر انہیں بے اختیار باہر آنے کا

حکم دیا گیا اور جب وہ باہر آئے تو فواد نے ان کا استقبال کیا۔ مال اور اسیر دار الخلافہ روانہ کیے گئے۔

دوسری بد عہدی اشعث بن قیس عکرمہ اور زیادہ کے لشکر سے اس طرح لڑا جس طرح بہادر کو لڑنا چاہیے لیکن آخر میں فوج کی کمی، اپنی زخم داری اور مددگاروں کی لاعلمی سے صلح کی خواہش پر مجبور ہوا۔ میرے لیے یہ کہنا مشکل ہے کہ کن شرائط پر صلح ہوئی۔ آپ تمام محصورین کی جان محفوظ رکھنے کی استدعا تھی، یا اشعث نے محض اپنے غنموصلین کے لیے آزادی چاہی، اور دوسروں کو دشمن اور غنم کے حوالہ کر دیا۔ لیکن اہل قلعہ نے جس اطمینان سے دروازہ کھولا وہ ظاہر کرتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک کو اپنی جان کی طرف سے اطمینان تھا۔ لیکن جب تلوار اپنا کام کرنے لگی تو ان میں سے ایک نے سوال کیا کہ: ”اے امیر کیا تو نے میں امان نہیں دی ہے۔“ تو جواب دیا گیا کہ: ”اشعث نے اپنے اور اپنے متعلقین کے لیے امان مانگی۔ تمہارے لیے کچھ نہیں کہا۔“ یزید محدود سے چند سب قتل ہوئے اور اشعث دار الخلافہ صیحا گیا۔

بنی کندہ کے قیدی عورتیں ابن خلدون کو کہنا ہے کہ: ”اس واقعہ میں قیدیوں کی تعداد کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ایک ہزار مرسف عورتیں قید ہو کر آئی تھیں۔“

دین سے بے بندہ ہونے کا مکرر اعلان اور فساد کے الزام اور دربار خلافت میں اشعث کے پہنچنے پر عمر سے قتل کی دھمکی سے کہیں کب تک مفید نہ ہوا؟

دیکھ دیتے ہیں۔ اور اشعث کہتا رہا کہ میں دین سے نہیں ہجرا۔ یہ وہی بتائی کہ نہاد قتل اور اہل بیت کے ساتھ ہے میری غیرت قبول نہ کیا اس کے بعد اشعث نے وعدہ کرنے کے بعد غلبہ کی بہن ام فہد سے عقد کی خواہش کی۔ خلیفہ نے تھوڑی دیر سر جھکا کر کہا: ”مصلحت میں است۔“ یعنی: ”بہتر یہی ہے۔“ بعض خرافات پسندوں نے کہنا شروع کیا کہ: ”اٹان ثواب الکفر و پیہ البکم۔“ (اس کے کفر کا ثواب یہ تھا کہ اپنی کنواری بہن کے ساتھ شادی کر دی؟)

اشعث کی نئی سوانح عمری شروع ہوئی اور اس کی اولاد اس کے بعد ہماری تاریخ میں اشعث بن قیس نہ مرسف تغیر

نفس کی چہرہ خیز مثال پیش کرے گا۔ بلکہ ام فہد اور اشعث کی اولاد وہ ذریعہ ہوں گے جن سے مدبرین خاندان رسالت کا نام مٹانے کے لیے کافی استعمال سے مدد لے سکیں۔ ان کے نام: ۱۔ محمد ۲۔ اسحاق ۳۔ اسماعیل اور ۴۔ جدہ بن۔

دوسرا افسوس ناک واقعہ جس میں قناعت کرتا ہوں وہ سرزمین بطلح کی غارت اور

مالک بن نویرہ کا واقعہ مالک بن نویرہ اور اس کے متعلقین کا قتل ہے اور بقول ابو القحطاف: ”مالک بن نویرہ کو رسول نے اپنی قوم پر سردار کیا تھا۔“ اسی کا خوشی میں ڈوبا ہوا یہ فقرہ ہے کہ: ”تعلمت الایمان برب الکعبۃ۔“ جس وقت رسول نے اسے اسلام کی تعلیم فرمائی بقول ابن خلدون مالک ابن نویرہ بوقت وفات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بنی حنظلہ پر حامل تھا۔ بنو حنظلہ کے کچھ لوگ اپنے صدقات لے کر مدینہ گئے اور کچھ لوگ تھکے تھے۔ اتنے میں بھولنے غروب کیا۔ ”مالک بن نویرہ نے اس سے مصاحبت کر لی اور اس کو مدینہ پر فوج کشی کرنے سے روک کر بطون بن تمیم پر حملہ کرنے کی تحریک کی۔“ آپس میں جنگ ہوئی اور جب مصاحبت ہو گئی تو مالک بن نویرہ مدینہ بن مالک اس سے علیحدہ ہو کر

اپنی قوم میں چلے آئے۔ ”مالک بن نویرہ اس حیس میں جٹا ہی تھا کہ قبیلہ تمیم سے بنو حنظلہ اس کے پاس آکر بھلائی میں جمع ہوئے لیکن مالک بن نویرہ چونکہ خود اپنی بابت متروکہ تھا اس نے بنی حنظلہ کے مال و اسباب کو مقام محفوظ میں رکھوا دیا اور ان کو لڑائی کرنے سے منع کر کے اپنے مکان پر لوٹ آیا۔ خالد بن ولید اس خبر سے مطلع ہو کر لشکر اسلام لے کر ان کی سرکوبی کو بڑھے۔ اگرچہ انصار نے ابتداء خالد بن ولید سے مخالفت کی اور یہ کہا کہ جب تک خلیفہ کا کوئی حکم نہ آئے گا نہ بڑھیں گے۔ لیکن پھر یہ سوچ کر کہ اگر مجاہدین ان مرتدوں پر فتح یاب ہو گئے تو ہم اس نیکی سے محروم رہ جائیں گے اور اگر اللہ نہ کرے یہ ناکام ہوئے تو ہم پر ان کے حملت نہ کرنے کا الزام عائد ہوگا، ہمراہ ہو گئے۔ مالک مع دیگر اہل قبیلہ کے گرفتار ہوا۔ سب کے سب قتل کیے گئے۔ اور ”ابوقحافہ و خالد میں اس بابت پر اس قدر جھگڑا ہوا کہ ابوقحافہ تداریکی ہو کر ابوبکر صدیق کے پاس چلے آئے۔“

جہاں اللہ تعالیٰ حضرت ابوبکر کا مراد واقع ہوا ہے ”پھر جب خالد بن ولید ——— مدینہ میں آئے تو عمر بن الخطاب نے مالک بن نویرہ

کے مقدمہ میں ابوبکر صدیق سے خالد بن ولید سے قصاص لینے اور ان کے معزول کرنے کو کہا۔ ابوبکر صدیق نے اس سے انکار کیا اور جواب دیا کہ: ”میں اس نکوار کو نیام میں نہیں کیا پامتا جس کو اللہ تعالیٰ نے کافروں کے لیے مہل چھوڑا۔ بعد ازاں مالک اور اس کے ہمراہیوں کا غنہ پادیدیا اور خالد کو پھر ان کے محبوبہ بلد کی طرف لوٹا دیا۔“

ایک اصول جسے مؤلف اسی موقع پر صرف مترجم ابن خلدون لیلی زوجہ مالک سے اس کے شوہر کے قتل کی رات کو اس کی رضامندی کے خلاف خالد کے

کرنے کو اس لیے معتبر نہیں سمجھتا کہ ابن خلدون نے نہیں لکھا اور اس کے بعد کچھ باتیں تسلیم نہ کرنے اور کچھ فرض کرانے کے بعد ایک نہایت شہتیر دلیل یہ لاتا ہے کہ: ”یہ امر مسلم ہے کہ مالک بن نویرہ نے ایک مدت سے اپنی بیوی کو طلاق دیدیا تھا لیکن رسم جاہلیت کے موافق اس کو اپنے گھر میں قید رکھا تھا پس ایسی صورت میں انتظار عدت کی کوئی حاجت نہیں ہے۔“ اور مالک کے کفر کی دلیل میں یہ خبر لائی گئی ہے کہ: ”اس نے رسول اللہ ﷺ کے انتقال کی خبر سن کر بڑی خوشی منائی تھی۔“ میں اس موقع پر مترجم ابن خلدون کی تمام دلیل اور تاریخ نویسی کو اس لیے صحت سے دور سمجھتا ہوں کہ اسے ابن خلدون نے نہیں لکھا۔ اگر ایسا ہی ہوتا تو ابن خلدون اسے ضرور لکھتا۔

احتم کئی کو کہنا قبل الاسلام خلافت انسانیت فعل کی طرف سیف الخلیفہ کی رجعت ہے کہ بھلا ک

ایک شخص جس کا نام چول تھا وہ لوگوں سے کہتا تھا کہ اپنا مال کسی کو نہ دو۔ تم خود اپنے مال کے بمقابلہ دوسروں کے زیادہ متفق ہو۔ مالک بن نویرہ بھی اسی خیال کا تھا۔ ان کے خیالات سے مطلع ہو کر خالد نے قسم کھائی تھی کہ فتح یابی پر اسے قتل کرے گا اور اس کے سر کو دیگ کی ٹھیک بنائے گا۔

ایک سریہ روانہ ہوا۔ سب گرفتار ہوئے۔ سیاست ہونے لگی اور سب نے صلاح دین خالد کا فتویٰ کہنا شروع کیا: ”ما مسلمیم کشتن مالا چہ وجہ روای داری؟ خالد گفت

زیرا کہ کشتن شما صلاح دین است۔ یعنی: ”ہم مسلمان ہیں تو ہمارا قتل کس وجہ سے جائز سمجھتا ہے۔ خالد نے کہا اس لیے کہ تمہیں قتل کرنے میں دین کی بھلائی ہے۔“ اس کے بعد ابو قتادہ نے کہا کہ: ”ہم سے ان لوگوں نے قبل جنگ مسلمان ہونے کا اقرار کیا تھا اور ہم سب لوگوں نے ساتھ نماز پڑھی۔“ خالد گفت فرقہ نیست میان ارکان دین اگر ایک رکن ظہداشت و یک رکن بگزاشت یعنی زکوٰۃ و چلہ نیست از کشتن ایشان۔ یعنی: ”خالد نے کہا ارکان دین میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اگر ایک رکن کی حفاظت کریں اور ایک رکن چھوڑ دیں۔ یعنی زکوٰۃ اور ان کے قتل بغیر کوئی چارہ نہیں ہے۔“ اس کے بعد مالک بن نویرہ کی باری آئی اور اس نے پوچھا: ”مرا خواہی کشت و من مسلم و رو بیوئے کعبہ نماز میکنم۔“ یعنی: ”مجھے تو قتل کرے گا مالا نکہ میں مسلمان ہوں اور کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتا ہوں۔“ خالد گفت: ”اگر مسلمان بیوی حق مسلمان بڑ گزشتی و زکوٰۃ اصال میدادی۔“ یعنی: خالد نے کہا: ”تو اگر مسلمان ہو تا تو مسلمانوں کا حق نہرو کیا اور اموال کی زکوٰۃ دیتا۔“ مالک گفت: ”واجب فوت نہ شدہ سست اگر شکت فوت شد تدارک آن سهل برائے فوت شکت مسلمان کشتن کدام دین و جواب این عمل نزد خدا و رسول او و ہر کس کہ مثل تو خدا ناسپاس را تسلط اقتدار دادہ چہ خواہند گفت۔“ یعنی: مالک نے کہا: ”واجب نہیں چھوٹا ہے اگر سنت چھوٹی ہے تو اس کا تدارک آسان ہے۔ سنت چھوٹنے پر مسلمان کو قتل کرنا کون سادین ہے تیرے اس عمل کا جواب اللہ اور اس کے رسول کے پاس تو اور ہر وہ کہ حق نے تمہیں جیسے خدا کے نام لکھے کو تسلط دیا ہے کیا جواب دیں گے۔“ خالد گفت: ”مسئلہ تو از بول حق نہ شود تا شخص تو را کلمہ سرخانی نگوید۔“ یعنی: خالد نے کہا تو پیشاب کرنے سے پہلے قتل کر دیا جائے گا۔

مالک بن نویرہ ایک اسیر گھونگھٹ کی طرف دیکھتا ہے
 مالک بیوی سر پوشیدہ مگریت گفت: ”اے خالد مرا این ی کشد۔“ یعنی: مالک نے پوشیدہ سریوی کی طرف دیکھ کر کہا: ”اے خالد مجھے یہ مردانے دیتی ہے۔“ اس کے بعد ”بیشتر از اصحاب تاریخ برانید کہ خالد ہما نشپ کہ روز آن مالک را کشت زنش خواست و زنا کرد و او را مانی نمود شعرا درین باب شعرا گفتند مبنی از ظلم خالد و مظلوی مالک۔“ یعنی: ”اکثر مؤرخین کا نظریہ ہے کہ خالد نے جس روز مالک کو قتل کیا اسی رات اس کی بیوی کے ساتھ زبردستی زنا کیا۔ شعراء نے اس کے بارے اشعار کہے ہیں جو خالد کے ظلم اور مالک کی مظلومی پر مبنی ہیں۔“

مؤرخ کا قلم گرفتار عورت کی ملامت کے لیے منتخب کرتا ہے
 صاحب سیرۃ الفاروق اگرچہ لکھتا ہے کہ: ”مالک بن نویرہ کے مسلمان ہونے اور بے گناہ قتل ہونے کا واقعہ حضرت عمر کے نزدیک ثابت تھا“ مگر پھر بھی اس کے نزدیک واقعہ بیان کرنے کا یہ بیس حقیقت سے نزدیک ہے کہ: ”موائے اس کے کہ مالک کی عورت کو میدان جنگ ہی میں قتل کر لینے پر طاعت کی اور کچھ کہنا پسند نہ کیا۔“

جذبات کی برائیگی جو مشکل سے مسطح کیے گئے تھے
 عصمت کی قہر دانی انصاف اور تاریخ نویسی کے فرائض خدا نہ کہے کہ

اس پیرایہ کے مائل بھی ہوں۔ ابن خلدون مالک اور اس کے ہمراہیوں کا خونبھا دلا دیتا ہے۔ رسولؐ کے بعد ہی یہ عظیم الشان واقعات تھے جنہوں نے اپنی خلافت امیر نوعیت کے لحاظ سے لوگوں کو دفعۃً چٹکا دیا اور ہر شخص اپنے ان جہالت کے ساتھ کٹا ہو گیا جن کے مدحار نے اور مسخ کرنے میں ہادی عالم نے مشقت گوارا کی تھی۔ اس لیے کہ مومن لوگوں کو سوچنے کا وقت نہ ملے ان واقعات نے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اکھڑ پر اپنا اثر ڈالا اور دفعۃً پرانے تعلیمی خصوصیات کو بھلا کر ایک نئے مابہ تہا لے لیا۔ یہ تھا جسے میں نے سانچہ بدلتا کہا ہے۔

ایسی یہ کہنا ہالی ہے کہ دفن رسولؐ میں جو لوگ شریک تھے ان کے نام کیا ہیں۔ ابو الخداع کے نزدیک یہ حضرات تھے:

● جناب امیر ● عباش ● فضل بن عباش ● قثم بن عباش ● انس بن زید ● شقران ● ابو طلحہ انصاری ● حضرت علیؑ نے غسل دیا ابو طلحہ نے قبر کھودی اور حضرت علیؑ اور قثم نے لاش قبر میں اتاری۔ بعض کے نزدیک ایک انصاری نے جناب امیر سے خواہش کی کہ اسے قبر میں اترنے دیں اور جناب امیر نے اسے اجازت دی۔ مترجم ابن خلدون اس کا نام غیل انصاری بتاتا ہے۔

ابن خلدون یا اس کے مترجم کی یہ اہل نبوی عبارت ہے عدم شرکت کی دلیل بھنا چاہیے تو جب کے قابل ہے کہ: ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو جو اب سوال نہ دیا تھا کہ مجھ کو میرے خاندان والے بھلائیں۔ پھر کون موقع تھا کہ ابوبکر دخل در مقولات کر لے شامل ہو جائے۔ وہ لوگ تجیز و مخفین میں مصروف ہی ہو گئے تھے وہاں چپکے کھڑے ہونا مناسب تھا یا ان جھگڑوں کا رخ کرنا؟“

محض؟ پھر آگے چل کر جب حضرت علیؑ ابوبکر سے مشورہ میں شریک نہ کرنے کی ہدایت کرتے ہیں تو بھول مترجم ابوبکر جواب دیتے ہیں کہ: ”تم جب کہ تجیز و مخفین میں مصروف تھے تو میں تم کو کیسے محض“ اس کام کے لیے وہاں سے بلواتا اور اس بابت مشورہ کرتا۔

علیؑ کا رسولؐ کی لاش مطہر سے مخاطبہ

دفن کے وقت جناب امیر نے فرمایا: ”میرے ماں باپ آپ پر فرما ہوں، آپ کی وفات نبوت، وحی، آسمان کی خبریں قطع ہو گئیں۔ آپ مصیبت پہنچانے کے لیے مغموم ہوئے، جیسے کہ آپ نے غم کی مصیبت سے ہیں مطمئن کر دیا۔ اگر آپ صبر کا حکم نہ دیتے عزت و فخر سے مخ نہ فرماتے تو غم اس مصیبت پر مجھائے اشک کا پانی اتسا کو پہنچا دیتے۔“

قبر سے مخاطبہ

دفن کے بعد قبر کے پاس کھڑے ہو کر فرمایا: ”صبر کرنا اچھی بات ہے مگر حضرت سے صبر کرنا مدوح نہیں ہے۔ جزع و ذزع بے شک صحیح ہے مگر آپ کے بچنے کی مصیبت پر نہیں۔ آپ کی مصیبت سے جو رنج و اندوہ ہے وہ نہایت ہی بزرگ ہے اور رنج و اندوہ آپ کی مصیبت سے پہلے حقیر تھا اور آپ کی مصیبت کے بعد بھی حقیر ہی بھجا جائے گا۔“

جناب امیر اپنے دیوان میں رحلت رسول کے متعلق جناب امیر کا دیوان رحلت رسول کے نتیجہ پر اکثر مفید عکس

ڈالے۔ جس سے ہم کسی حد تک اقتباس کرتے ہیں۔ ”وہ حضرت اپنے گھر والوں کے علاوہ ہمارے لیے مثل قلند کے تھے اور ان کا طہانہایت مضبوط ہے دشمنوں سے بے شک چھا گئی ہم پر تاریکی ان کے ایشال کے بعد گویا کہ تیرے بعد لوگوں کے کام مہج کی کشی میں رکھے گئے جس وقت وہ دریا میں بلند ہوئی اور ماگھی ہیں تو میں در نہ مردے کا در اٹھالیکہ ہمارے پاس ہدایت اور نبوت کا ورثہ ہے۔“

فقراور علیؑ میں نے ہر شخص پر غلبہ چاہا اور میں اس پر غالب ہوا اور جب فقر نے فخر پر غلبہ کیا تو فخر پر غالب ہو گیا۔ اگر ظہر کرتا ہوں تو رسوائی ہے اور اگر نہیں ظہر کرتا تو مارے ڈالتا ہے۔ ”ہمارے لیے ہے وہ امر جس کا تم بغیر حق حق کے متعلق اپنے غمیر سے مخاطبہ کے دعویٰ کرتے ہو۔“

”پہانا ہے تم نے ہمارا حق پھر اس سے اٹھ کر کیا۔“

نافرمانی کا زمانہ ہے نہ کہ حق رسائی کا خاک بر سر زمانہ کہ وہ وقت نافرمانی کا ہے نہ کہ حق رسائی کا۔“

الوبکر سے مخاطبہ ”سیکھ لے اوبکر اور جاہل نہ رہ اس بات سے کہ تحقیق علیؑ بہترین ہے با برہنہ اور جو تا پہنچنے والوں کا۔ رسول اللہ نے اس کے حق میں وصیت کی ہے اور تلک نہ کر حق اس کا اور پھر خلق کو اس کی طرف۔“

امامتؑ میں ضد طلب کرتا ہوں اپنی قوم سے ملاکہ وہ فرض کتب سے جاہل ہیں اور پہنچے ہر اس چیز کو جو حرام ہے۔ امامت کی رسی ہمارے اسجد کے بعد ہمارے لیے ہے نہ زمانہ نبوت میں استخفاف کے وہ صاحب پر ہیز گاری تھے اور نہ رعایت رکھی ان لوگوں نے عہد و میثاق کی بھرنی کے۔ اگر مسیرے لیے ان کے امر کا چھوڑنا جائز ہو تا تو چھوڑتا میں اپنی قوم کو ملاکہ وہ ایک امت ہے امتوں میں سے۔“

حضرت فاطمہؑ پر رحلت رسول کا اثر اب میں اپنی غزوی حضرت فاطمہؑ زہرا زکیہ طاہرہ کے اثر غم کو دیکھتا ہوں۔ صاحب منائے کہتا ہے کہ: ”حضرت کی رحلت کے بعد فاطمہؑ زہرا کو کسی نے سنبٹے نہ دیکھا۔ پھر کہتا ہے: ”فاطمہؑ زہرا اور علیؑ رضی اللہ عنہما سب سے زیادہ مصیبت زدہ، یکس اور ذار و نالاں تھے امام حسن امام حسین کے منہ کی طرف نگاہ کرتے تھے اپنی بیٹی اور ان کی نامرادی پر نالاں و گریاں تھیں۔“

حالت اور نوحہ افسوس کرنے والے جب اپنے اندر دہناک فرض سے فارغ ہوئے اور رسول کی لاڈلی نے افسوس دیکھا تو پر درد سوال کیا کہ: ”کیونکر تھا رہے دل نے گوارا کیا کہ رسول خدا پر خاک ڈال دی۔“ اس کے بعد قبر شریف پر آئیں۔ قبر کی خاک اٹھائی اور اپنے چہرہ پر ڈال کر فوسہ فرماتے تھیں کہ:

”فجر پر ایسی صبحیں دورہ کرتی ہیں کہ اگر وہ زمانہ پر پڑی تو تاریک رات ہو جائے۔“ فرماتی ہیں کہ: ”جب شوق

زیادتی کرتا ہے تو تیرے قبر کی زیارت کرتی ہوں اور جب تو جواب نہیں دیتا تو نوحہ کرتی ہوں۔ اسے خاک کے آرام پالنے والے اکٹھ جو میرے رونے سے مجھے تیرا یاد کرنا تمام مصیبتوں سے محبوب ہے۔ اگرچہ تو خاک میں میری نگاہ سے غائب ہے مگر میرے دل غزلوں سے غائب نہیں ہے۔“ (مجلس الامبار)

طاہرہؑ کی حالت فتنہ کی زبانی اب میں ایک سرگزشت بیان کرتا ہوں جسے طاہرہؑ کی وہ کنیز بیان کرتی ہے جس کے مشتاق مشہور ہے کہ اس نے برسوں پر آیاتِ حکمِ الہی کے

اور کسی لفظ سے کلام نہیں کیا یا جواب نہیں دیا۔ ورقہ بن عبد اللہ زمانہ حج میں فتنہ سے ملاقات کرتا ہے اور امتداد کرتا ہے کہ میری خدمت فاطمہؑ زہراؑ صلوٰۃ اللہ علیہا کا مالِ وقت و نیت بعدِ رحلت رسولِ بیان کر دے۔ نام آنا فتنہ کی آنکھوں کے لیے وہ چھپر تھی جس سے آنسو پلکنے لگتے۔ جواب دیا کہ: ”تو اس غم کو جہان میں لایا جو ساکن ہو گیا تھا اور اس آگ کو بڑھا دیا جو سینہ میں پوشیدہ تھی۔ میں نے دیکھا ہے ان خدمت کو اور سانحہ پر غم یہ ہے کہ جب جناب رسالتؐ آتے ہیں رحلت فرماتی ہیں تو کسی کو نہ دیکھا کہ وہ نالہ دے کر تائب ہو، مگر نالہ و زاری میرے قانون کی اور غم ان خدمت کا ہر روز زیادہ ہوتا تھا۔ سات دن تک گھر میں بیٹھی رہیں۔ جب آسمانوں روز ہوا طاقت صبر چلتی رہی اور وقت شب گھر سے باہر آئیں اور ہالے ہالے کے نعرے مار کر روئیں۔ اس وقت تمام غم و کلاں عورتیں اور بچے اپنے گھروں سے باہر نکل کر ان مصومہ کے پاس جمع ہوئے اور رونے لگے۔ ہر طرف سے لوگ جمع ہوئے اور راہوں کے چراغ گل کر دیے کہ تا عروص کی نگاہ عورتوں کے چہروں پر نہ پڑے، اور حضرت فاطمہؑ فریاد کرتی تھیں کہ اسے پدر بزرگوار! اسے برگزیدہ خداوند عالم کے اسے محمد مصطفیٰؐ، اسے ہالے والے یہ عورتوں کے، اسے ہاپ تیبوں کے کون ہے قبلہ اور مصلیٰ کے لیے کہ آپ سے بہتر نماز گزار ہو۔ اور کون ہے دل داری کر لے والا آپ کی مائش بیٹی کا کہ وہ آپ پر مثل زنِ پسر مردہ کے رو رہی ہے۔ اس کے بعد رونہ منور کی جانب متوجہ ہوئیں، اور غایت اضطراب سے ہالے مبارک ان مصومہ کے دامن میں اچھے جاتے تھے اور کثرتِ اہکباری سے کوئی چیز نظر نہ آتی تھی۔ یہاں تک کہ اس حال سے قبر منور کے پاس پہنچیں۔ جب نظر جسور رسالتؐ پر پڑی اور گلدستہ اذان کو دیکھا آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا شروع کیے اور اس قدر روئیں کہ

فاطمہؑ زہراؑ زمانہ کی شکایت کرتی ہیں غش طاری ہوا۔ عورتوں نے پانی کا کچھڑکا۔ اکٹھ ہوا۔ انھیں اور فرمایا کہ طاقت اور قوت میری زائل ہو گئی اور اس حال سے دشمن خوش ہوئے اور شہادت کہ آپ کی مفارقت سے میری زندگی خراب ہو گئی۔ اسے بابا فخر سے آپ کے خوشی و اقربا بھر گئے اور خوشی کا دردانہ فخر پر بند ہو گیا۔ میں آپ کے بعد دنیا سے جیزا ہوں۔ برابر آپ کی مفارقت پر تاسف کروں گی، یہاں تک کہ آپ سے ملاقات کروں۔ آپ کے بعد ہم سعیت و خیر ہو گئے۔ لوگوں نے منہ پھیر لیا۔ آپ کی زندگی میں ہم غلامی کے نزدیک معظّم و مکرم تھے۔ وہ منبر جس پر آپ تشریف رکھتے تھے تاریکی نے اسے ڈھانپ لیا۔

رحلت کے دسویں دن علیؑ اور سلمانؑ متذکرہ صدر عبارت میں جہاں سرد مہری کا تذکرہ ہے وہاں رحلت کے دسویں روز نہ صرف حضرت بتولؑ مقرر بلکہ خود مرتضیٰؑ بھی ایسے پختہ عقیدے جیسے کہ سلمانؑ تھے شکایت کرتے ہیں کہ بعدِ رسولؐ تو نے جفا کی اور ترکِ ملاقات کی۔

فساد کا ناقہ حاملہ ہوا

تمہارے فسلا اور فتنہ کا ناقہ بار در اور حاملہ ہوا۔۔۔۔۔ "اُسی کتب میں اکثر مضموم سے ملتی ہوئی روایت احجاج سے نقل کی گئی ہے جس کا راوی سید ابن غفلہ ہے۔"

مہاجر و انصار معذرت کے لیے آئے

سب حاضر ہو کر کہنے لگے کہ ”اے سیدۃ النساء اگر ابوالحسن ہم سے ذکر کرتے ہیں اس امر کے قیل استواء کے ساتھ جو حکم کرنے ہمارے عہد و عقد کے توہر آئینہ ہم ان جناب سے عدول نہ کرتے اور دوسرے سے رجوع نہ کرتے حضرت فاطمہ علیہا السلام نے فرمایا کہ مجھ سے دست بردار ہو اور اپنے کو مجھ سے باز رکھو کہ تمہارا عذر قبول نہیں ہے۔“ اس جگہ یہ کہنا مفید ہو گا کہ صاحب السیاسة والامامة نے اس کا تذکرہ کیا ہے کہ بعد واقعہ سقیفہ جناب امیر موع حضرت فاطمہ انصار کے پاس گئے تھے اور انہوں نے متذکرہ صدر جواب دیا تھا۔

رسول اور طاہرہؑ کی رحلت کا وقفہ

دو دھلی، تین مہینے سے چھ مہینے تک جاتا ہے۔ جو زائرین جو ایک دن جناب امیر غلام محمد علی صاحب نے مدد فرمائی وہاں آ رہے تھے کہ راستہ میں چند کنبیوں کو روتے ہوئے آتے دیکھا پوچھا کہ تم کیوں اس قدر مختصر ہو۔ بھولنے جواب دیا کہ امیر المومنین جلد خبر لیجئے فاطمہ زہرا کی قبریں گمان نہیں ہے کہ کس آسپاں میں زندہ رہا ہیں۔

جناب امیر جلد جلد گھر میں داخل ہوئے یہاں دیکھا کہ سیدہ مصری سفید کپڑا پہنے ہیں اور سکرانٹ کے عالم میں کھجی داہنا ہاتھ منحنی لیتی ہیں اور کھجی ہاواں

پتہ پھیلا دیتی ہیں اور کروٹیں بدلتی ہیں۔ علیؑ نے عبادوش مبارک سے چھینک دی۔ علامہ سرسے اتار ڈالا اور گھنٹیاں قبا کی کھول کر سرہانے بیٹھ گئے۔ زکیہؑ کا سہ مبارک گود میں لیا۔ جھکے اور پکارا ”زہرا“ جواب نہیں ملا۔ پھر کیا ”اسے بیٹی غنیمت مفتاحی کی“ جواب نہیں۔ اسے بیٹی اس کی جو گوشہ چادر میں زکوٰۃ باندھ کر غرا و مساکین کے گھر پہنچا تھا۔ خاموشی پھار (ظلمت) دھستی ہوئی ہے۔ مینی اور کسی قدر بلند آواز سے (فاطمہؑ میں ہوں علیؑ آکھ کے ڈھیلیں میں سے حرکت ہوئی۔ آہستہ آہستہ کھلیں۔ علیؑ کو دیکھا اور آستو نکل پڑے۔ پوچھا کیوں روتی ہو اسے سیدہ؟ فرمایا: روتی ہوں ان ظلموں پر جو میرے بعد تم پر ہوں گے۔ کافی تھا کسی شوہر کے دل کے بھر جانے کے لیے یہ خیال کہ وہ بی بی جو اپنی زندگی میں محبت کرتی تھی اسے احترام میں اپنے بعد بھی محبت کا ویسا ہی خیال ہے۔ علیؑ جواب دے سکے منسرحلایا: ”خدا رو کہ مجھ پر راہ خدا میں کل افیشیں آسکن ہیں۔“

طاہرہ کی وصیتیں طاہرہ کی مخصوص وصیتیں یہ تھیں کہ ● جناب امیر امامہ بنت الحارث سے عقد کریں۔ اس لیے کہ وہ ”میرے بچوں کی دوست اور ان پر مہربان ہے۔“ ● دوسرے تابوت میں شب کو لاش لے جانا۔ ● تیسرے جن لوگوں نے ظلم کیا ہے انہیں اجازت نہ دینا کہ وہ میرے جنازہ پر آئیں اور نماز پڑھیں۔ قریب کے اعزا پہلے اور اس کے بعد ہر اہل بیت اور احباب ہوں۔

بچوں کے متعلق سیدہؓ نے اپنے بچوں کے بارہ میں وصیت میں مبالغہ کیا ہے فرمایا ہے کہ: ”اے ابواکھنؓ میرے بعد حسنینؓ سے بلند آواز سے نہ بولنا کیونکہ وہ شکستہ خاطر اور غریب ہو جائیں گے۔“ ”ابھی کل کے دن ان کے جد امجد کا سایہ ان کے سروں سے اٹھ گیا ہے۔ آج وہ ماں کے سر سے اور تمہیں ہوں گے۔“ اس کے بعد آپؓ نے چند اشعار فرمائے جن کا مفہوم یہ تھا کہ: ”اگر روتے ہو تو رو کہ آج فراق کا دن ہے۔ میرے بچے میرے بعد میری ملاقات کے مشتاق اور بے قرار ہو جائیں گے۔ انہیں تسلی دینا کہ مجھ سے جدا ہوتے ہیں۔“

فاطمہؓ اور اہتمام رحلت میں نہیں کہہ سکتا کہ اس کے کچھ قبل یا کچھ بعد کی یہ حالت ہے، جیسے اس اجتماع عظیم بیان کرتی ہے کہ جب وقت وفات قریب پہنچا سیدہؓ نے دعو کے لیے پانی پالاکہ وضو کیا خوشبو ملنگ کر کپڑے منظر کیے تھیں زیب جسم فرما کر نماز پڑھا کئی تھیں۔ اس کے بعد سر منظر بستر پر رکھ کر اس سے سرہانے بیٹھنے کی ہدایت کی اور فرمایا کہ جب وقت نماز آئے تو مجھے اٹھانا اور اگر نہ اٹھوں تو علیؓ ابن ابی طالبؓ کو بلا لینا۔ کافور سرہانے رکھو الیہ اور چادر اوڑھ لی۔

اسما پر لپکارتی ہے مگر جواب نہیں ملتا وقت نماز آیا اسما نے الصلوٰۃ یا بنت رسول اللہ کہا لیکن خاموشی نے جواب دیا۔ اسما نے پھر آواز دی۔ جواب نہ ملا۔ چادر ہٹائی دیکھا کہ مصوٰۃ عالم اعلیٰ کی طرف انتقال فرما گئیں۔ اساتج اٹھی بچے قریب دوڑے ہوئے آئے۔ حسنؓ پوچھنے لگے کہ اسما اس وقت والدہ ماجدہ کیوں آرام کرتی ہیں۔ جواب ملا پچھڑاں کھانے لگے۔

حسینؓ اور ماں کی لاش حسنینؓ ماں کے پاؤں چوم رہے تھے اور کہتے تھے اماں ہم تمہارے فرزند حسنینؓ ہیں کچھ بولو۔ اس کے بعد دونوں بچے نہیں معلوم کس طرح مسجد میں باپ کو خبر دینے گئے۔ صاحب دوڑے کسی نے کہا کہ اے فرزند ابن رسول خدا تمہاری آنکھوں کو نہ رُلانے کیا رسول کی باپ کو خبر دینے گئے۔ مگر خالی دیکھ کر تم پر رقت طاری ہوئی ہے۔ جواب دیا کہ ہماری ماں نے رحلت کی۔ علیؓ نے سر زمین پر رکھ دیا اور کہا اے دختر رسولؓ رسول کے بعد تم سے تسکین حتیٰ اب تمہارے بعد تمہاری مصیبت میں کس سے تسکین پاؤں گا۔

بچے ماں کی وداعی زیارت کرتے ہیں جس وقت امیر المومنینؓ نے چاہا کہ چادر میں لپیٹ دیا اس وقت تمام بچوں کو وداعی زیارت کے لیے بلایا اور بچوں نے اس موقع کو قیمت بھانک کر ایک مرتبہ اور ماں کے سینہ پر لوٹ لیں۔ بچوں کی مصوٰنہ صدائیں ایک یہ پر دروہم آہنگی بھی تھی کہ اے ماں

جب آپ ہمارے جد بزرگوار کی خدمت میں پہنچیں تو ہماری جانب سے سلام پہنچایا گیا۔ جناب امیر نے آہستہ بچوں کو لاش سے علیحدہ کیا۔ اولاد بند کھن بلند حدیث سے۔

شرکت جنازہ کرنے والوں کو عباس کی اطلاع خبر مہذبہ میں پھیل گئی کہ دختر رسول نے انتقال فرمایا۔ مرد اور عورتیں رونے لگیں اور عورت بنی ہاشم

ان مہذبہ کی گھر جمع ہوئیں۔ لوگ پر سہ کے لیے جمع ہو رہے تھے اور انتظار میں تھے کہ مشائعت جنازہ کریں، اس وقت قبولہ بالوزر اور قبولہ عباس باہر آنے اور لوگوں سے کہا: اس وقت واپس جاؤ کہ دختر رسول کا جنازہ زیادہ رات گئے اٹھایا جائے گا۔ لوگ منتظر ہو گئے اور شب آگئے۔

شریک دفن لوگ جناب امیر حسنین عقیل اور گروہ بنی ہاشم کے علاوہ زبیر، ابوذر، سلمان اور بربدہ جنازہ لے کر پہلے نماز پڑھی اور قہج میں دفن کر کے قبر زمین سے برابر کر دی۔ لاش اطہر کو قبر میں رکھتے وقت جناب امیر نے فرمانا شروع کیا۔

فاطمہ کی قبر اور علی سلام ہو آپ پر اے رسول خدا میری طرف سے اور آپ کی اس دختر کی طرف سے جو آپ کے پیلوں میں وارد ہونے والی ہے اور آپ سے ملنے والے کے لیے جلائی کر رہی ہے۔ یا رسول اللہ آپ کی برگزیدہ دختر کے انتقال سے میرا صبر کم ہو گیا۔ اس کی مصیبت کی وجہ سے میری جنتی دچلائی جاتی رہی۔ ایک لعل واپس لے لی گئی۔ ایک یلہ کار نشانی اٹھائی گئی۔ اب میرا حزن و ملال دائمی ہے۔ اب میری آنکھوں میں بینہ کہاں۔ جب تک کہ پروردگار عالم میرے لیے اس مقام کا ارادہ کرے جس میں آپ مقیم ہیں محرم آپ کی دختر آپ کو آگاہ کرے گی۔ میری موجودہ حالت کو ان سے دریافت فرمائیے حالانکہ ابھی آپ کے انتقال کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔

لوگ بنت رسول کے دفن کی خبر سن کر جب لوگوں نے سنا کہ بتول خدا خاک کے سپرد کر ڈالی گئیں تو ایک دوسرے کو ملامت کرنے لگے کہ

رسول نے صرف ایک دختر چھوڑی تھی حیف ہے کہ وہ رحلت کرے اور دفن ہو اور ہم لوگ نہ وقت و مکان حاضر ہوں۔ نہ نماز پڑھیں اور نہ دفن میں شریک ہوں۔

قبر کب معلوم ہوئی اور غالباً لوگوں کو صحیح نشان قبر اس وقت تک نہ معلوم ہوا جب تک زکیہ کا فرزند اکبر اس جگہ دفن کے لیے نہ لایا گیا۔ اور قبول تاریخ نہیں ایک لوح برآئید ہوئی

جس میں لکھا تھا: ”ہذا قبر فاطمہ بنت رسول اللہ“ اور کونسا زمانہ تھا جس کے متعلق جناب امیر فرماتے ہیں کہ ”ہم مثل کبوتر کے جوڑے کے

علی مرثیہ کہتے ہیں ایک مرغزار میں جوانی اور عمر رقی سے برخوردار تھے کہ زلزلہ ہم پر داخل ہوا اور ہم میں جدائی ڈالی۔ زمانہ دوستوں کا جدا کرنے والا ہے۔ ”کیا ہمارے کو میں قبروں پر سلام کرتا ہوں یا کھڑا ہوں۔ قبر دوست کے اور

اس نے میرے سلام کا جواب نہ دیا۔“ ”ایسا ہی مجھے تیرے نزدیک ڈالتی ہے۔ میں تیرے لیے روتا ہوں (حلالک) مردوں میں میرا ہمسرا نہیں ہے۔“ ”دوستوں کے درمیان ہر اجتماع میں تفرقہ ہے اور ہر وہ شے جو فراق سے سوا ہے قلیل

بعد احمد کے میرا فاطمہ کو کھودینا اس کی دلیل ہے کہ کوئی دوست ہمیشہ نہیں رہتا۔

مولوی نذیر احمد صاحب کچھ فرماتے ہیں شمس الظلمہ مولوی حافظ محمد نذیر احمد خان صاحب اہل اہل دی اپنے تصنیف رویائے صلوٰۃ میں فرماتے ہیں :

”جو شخص سب سے زیادہ پیغمبر صاحب کی وفات سے متاثر ہوا وہ فاطمہ تھیں۔ والدہ پہلے انتقال فرما گئی تھیں۔ اب ماں اور باپ دونوں کی جگہ پیغمبر صاحب تھے اور باپ بھی کیسے باپ دین و دنیا کے بادشاہ ایسے باپ کا سر سے اٹھ جانا اس پر حسرت علی کا خلافت سے محروم رہنا اور ملک بر جرات ترکہ پداری باغ فدک کا دعویٰ کرنا اور مقدمہ کا ہار جانا کسی دوسرے کو ایسے ستم صدمات پہنچے تو وہ زہر کھا کر مر رہتا۔ مگر ان کے صبر و ضبط انہیں کے ساتھ تھے۔ پھر بھی انہیں رنجوں میں کھل کھل کر چھ مہینہ کے اندر اندر انتقال فرما گئیں اور جتنے دن زندہ رہیں ان لوگوں سے جنہوں نے ان کو رنج دیے تھے نہ بولیں اور نہ بات کی یہاں تک کہ ان لوگوں کو اپنے جنازہ پر آنے کی بھی ممانعت کر دی۔ اور شیعہ کے وقت مدفون ہوئیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مانا کہ ان کا غصہ کسی قدر بے جا بھی ہوتا تاہم ان کے باپ کے حقوق کیا چاہتے تھے فاطمہ کے دل غمزہ کو خوش کرنے کے لیے علی کو اگر وہ اہل بھی نہ تھے برائے نام خلافت دی ہوئی اور آپ انتظام کیا ہوتا۔ خیر خلافت تو کون دیے دیتا تھا مگر باغ فدک کے دیدینے میں ایسی کوئی قیامت تھی۔ غایۃ مافی الیاب حدیث : ”نحن معاشر الانبیاء لا نرث ولا نورث ما ترکنا صدقہ“ کے خلاف ہو تو ہو گناہ اگر ہو تو فاطمہ کو ہوتا کہ وہ سیدانی ہو کر صدقہ کھاتیں۔ سخت افسوس کی بات ہے کہ اہل بیت نبوی کو پیغمبر صاحب کی وفات کے بعد ہی سے ایسے ناظم اتفاقات پیش آئے کہ ان کا وہ ادب اور لحاظ جو ہونا چاہتا تھا اس میں ضعف آگیا اور شدہ شدہ غم ہوا اس ناقابل برداشت واقعہ کربلا کی طرف جس کی نظیر تاریخ میں ملتی مشکل ہے۔“

صاحب بلا المین نہایت متین عبارت میں فرماتے ہیں کہ : ”اگرچہ شہادت حسین کا تیرہ و تار سانچہ سلسلہ میں واقع ہوا لیکن اس دیور قیامت کی شام ظلمت اس وقت سے شروع ہو چکی تھی جب کہ خورشید رسالت غروب ہوا اور جناب رسالت مآب نے اس دایرہ فانی سے عالم جاوداتی کو انتقال فرمایا۔“

رحلت فاطمہ کے بعد اہلبیت کے دوستوں کی یاس اس باب میں مجھے کچھ اور کہنا نہیں ہے بلکہ مشرکین کی یہ عبارت پیش کرنی ہے کہ : ”دختر رسول کے انتقال کے بعد وہ دوست جو کچھ دنوں تک ماتمہ رہے تھے، دہان میں آتے جاتے ہیں، اور اپنے کو تبہ ہوتا ہوا دیکھ کر بیعت کر لیتے ہیں۔“

فاطمہ کے بعد علی کی گوشہ نشینی اور لوگ اسی کے قریب صواعق عرقہ کی یہ عبارت ہے کہ : ”امیر المومنین علی کرم اللہ وجہہ در مدت حیات فاطمہ الزہرا بیعت نہ کر دے ہو لیکن اور اعز و جاہے بواسطہ حیات حضرت خیر النساء نزد مردمان ہوجوں حضرت فاطمہ وقت وفات حضرت علی اذروئے مردمان انکار نمود و عزلت اختیار کر دو کسے ہوا آمد و شد نہ کرد۔“

یعنی: ”امیر المومنین علی کرم اللہ وجہہ نے زندگانی حضرت فاطمہؑ میں بیعت نہ کی تھی، لیکن حضرت خیر النساءؑ کے زندہ ہونے کی وجہ سے لوگوں کے نزدیک عزت اور مرتبہ ماسل تھا جب حضرت فاطمہؑ وفات پانگئیں تو حضرت علیؑ لوگوں سے منہ پھیر کر گوشہ نشین ہو گئے اور کسی کے ساتھ آمد و رفت نہ رکھی۔



jabir.abbas@yahoo.com

باب دوم کا خلاصہ

واقعات کا شو

باب اول کے خلاصہ نے ہمیں پہلی تک پہنچایا تھا کہ ہادی عالم کی ذات اور اصول وہ مرکز تھا جس کے گرد حجاز اور عرب کے سرگشتہ جمع ہوتے جاتے تھے اور دیکھتے تھے کہ نہ صرف رسول نے ہمیں جن امور کی تبعیت کے لیے بلایا ہے وہ روحانی حیثیت سے لیکن وہ ہے بلکہ جو محبت مسلمات اور علولانہ روش قائم کی ہے وہ دنیوی حیثیت سے بھی ایک ایسی نعمت ہے جس کی قیمت کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔

حوصلہ مند طبعیتوں کا نصب العین لیکن ہاں جو ان دل پسند صورتوں کے دوسرا رخ بھی تھا کل طبعیتیں ایسی نہ تھیں جو محض تعلیم اور پیروی پر قناعت کرتیں اور ایسے موقع نہ ہوتا جس میں رسول اور امتیاز کی امید ہوتی۔ خصوصاً ایسی حالت میں جب کہ اسلام بھی ایک حیثیت سے دنیوی حکومت کی صورت بھی اختیار کرتا جاتا تھا۔ لیکن رسول کی مصنوعی کوششیں رسول ایسے قدر شناس کو دھوکا نہیں دے سکتی تھیں۔

رسول کے نزدیک کیسے امتیاز ہو سکتا تھا ان کے نزدیک اسی کو رسول اور امتیاز ہو سکتا تھا جو دین کے لیے ایشاد نفس اور نصیحت یا ترقی نفس کے لیے مدارج قوی طے کر سکتا تھا۔ چھٹی، کوئی ہوتی، نمائشی کاروائیوں کی قیمت رسول کو معلوم تھی۔

رسول نے مختلف رنگ و بو کے پھولوں کا گلدستہ بنایا تھا یہ بھی ہم کہہ چکے کہ اگرچہ رسول کی جامعیت اسلامی دکھاوتی تھی لیکن جو جامعیت مختلف حالتوں میں داخل ہوتی تھی وہ ذرا سی شخص سے مختص ہو سکتی تھیں۔ موقع یا اسکا نا چاہیے تھا اور بس بڑھا ہوا گلدستہ ٹوٹ کر یہ دکھانے کے لیے تیار تھا کہ ہمارے پھول مختلف رنگ کے ہیں۔ یہ واقعہ تھا کہ پھول مختلف رنگ کے تھے باغبان کی یہ تعریف تھی کہ اس نے مختلف رنگ اور خوشبو کے پھولوں کو ایک جگہ جمع کر دیا تھا جس سے ان کے رنگ و بو کا اختلاف بجائے علیحدگی کے خوشنہی کا نمونہ تھا۔ رسول وہ حلقہ تھے جس نے انہیں الگ نہ ہونے دیا۔ وہ باتے تھے کہ پھول مختلف رنگ و بو کے ہیں۔ انہیں خیال ہو سکتا تھا کہ ہماری یہ محنت رائیگاں نہ ہو ان سے زیادہ کون تھا جسے اپنی محنت کی قدر ہوئی۔ اور کسے پڑی تھی کہ ان کی حفاظت کے ایک ایک پھلو پر غور کرتا اور حفاظتیں کرتا۔

جس رسول صفاں کی صورت دے سکتے تھے حفاظتیں کیں۔ دیکھنے والا مقرر کیا بدرجہ اسے پہنچایا۔ لیکن

اس کے متعلق اسے فرد یا افراد کو حسد دیکھتے تھے کہ جس جس طرح وہ اپنے کو آئینہ حفاظت اور ہو سکتا تھا جو خود اس امید میں ہوں ذمہ داری کے قابل بناتا جاتا ہے اور جس میں طرح ہم اس کی خدمات اور نفس کا احترام کرتے جاتے ہیں۔ لوگوں کی آنکھیں بدلتی جاتی ہیں اور ان کے چہروں پر اس انخوس کی لکیر پائی جاتی ہے کہ رسول کے بعد ہمیں کچھ امید نہیں ہے۔ غور کرنے والے کے لیے یہ سوچنے کی جگہ ہے کہ اس کی کوشش کی جاتی ہو کہ ہم کس طرح کامیاب ہوں اور رسول کا نامزد کس طرح لوگوں کی آنکھوں سے اوجھل ہو جائے۔ اور اس کے بعد قبول مولوی نذیر احمد خان صاحب: ”لے اڑے وہ جو اس کے لے اڑنے کی تدبیر کر سکتے تھے“۔

حوصلہ مند جماعت کیونکہ خالص جماعت پر غالب آتی ہم یہ بھی دکھا چکے ہیں کہ جماعت اسلامی کی کوئی تقسیم ہو سکتی تھی اور اگرچہ خالص جماعت کی طرح حوصلہ مند یا متمم جماعت بھی جدا کچھ ایسی زائد متصور نہیں ہو سکتی لیکن جس وقت خالص جماعت خاموش تھی اور اس کی فینک نہ کرتی تھی کہ علامہ ماس پر رسول و اقتدار حاصل کرے اور اس کی تمام کوشش ہلوی برحق کی خوشنودی اور بجا آوری احکام پر ختم ہو جاتی تھی۔ دوسری کو اس بہت کاموں تھا کہ اس ”عام حق“ کو جو تمام ائمہ اسلام کرنے والوں کو رسول کی خدمت کی شرف پائی کا حاصل تھا اپنے سے کم حاضر باش اور دور کے نازین کی نگاہ میں رسول کے نزدیک اپنے رسول کی دلیل مسترد دے اور بعض ہوں جو بعض کی تصدیق کرتے ہوں۔ دراصل ایک اتفاقاً سننے والے جو رسول کے متعلق تمام باتوں کو کمال اعظام اور شوق سے سننے کے لیے حاضر ہوتے تھے، وہ بغیر واقعات کی جانچ کیے ہوئے ان باتوں کو قبول کر لیتے ہوں جو ان کے کانوں میں ڈالی جاتی ہوں۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ کیا تھا لیکن کچھ تھا جو رسول کے اقربا سے چھپایا جاسکتا اور رسول کا جواب کہتا کہ انھیں مشریش کی طرف سے اپنے اہلیت کی دوستی کے متعلق کچھ شبہ ہے۔ صاحب موافق فرقہ لکھتے ہیں: ”ابن ماجہ از ابن عباس بن مطلب روایت کردہ کہ رسول اللہ ﷺ منہ مودہ پیست قوی را کہ چوں یکے از اہل بیعت من با ایشان ی شیعہ قطع حدیث خودی کنند بہ آن خدا نے کہ جان من بہ یہ قدرت دوست کہ ایمان در دل یچ مومن داخل نمی شود تا وہیکہ اہل بیعت مرا دوست دارد از چہت خدا نے و از چہت مستراہت من“۔ یعنی: ”ابن ماجہ نے ابن عباس سے روایت کی ہے کہ رسول خدا نے فرمایا کچھ لوگوں کو کیا ہوا ہے کہ جب میرے اہل بیت میں سے کوئی ان کے پاس بیٹھتا ہے تو اپنی بات قطع کر دیتے ہیں۔ اس خدا کی قسم جس کے دست قدرت میں میری جان ہے کہ کسی مومن کے دل میں ایمان داخل نہیں ہو تا جب تک کہ وہ میرے اہل بیت سے خدا کے لیے اور میری قربت کی وجہ سے محبت نہ کرے“۔

فقہانہ بے چینی کے وجوہات سب سے بڑی وجہ متعلقانہ بے چینی کی یہ بھی تھی کہ وہ لوگ جنہیں اپنی قوم میں ایک گونہ اقتدار حاصل تھا وہ اسلام کی بڑھتی ہوئی قوت سے مغلوب ہو گئے تھے اور دیکھتے تھے کہ مقابلہ سے ہیں اپنے بہت سے اعزاز کو کھوٹا پڑا۔ ہو سکتا تھا کہ فتح کی حالت میں وہ وقتی انتقام کے بعد بھول جاتے لیکن شکست اور مغلوبیت نے انھیں بد آستین بنا دیا جو اب سامنے آکر لڑنے کی جرات نہیں کر سکتے تھے لیکن دیکھنا چاہتے تھے کہ ہمارے قاتل کس وقت غافل ٹھہرے لیکن بلا جود ان عناصر کے رسول کی فطرت

اقدس کاحیرت خیر بلکہ معجزہ نما اثر یہ تھا کہ وہ جماعتیں جو کسی ہی موقع بیٹی یا بیٹوں سے داخل اسلام ہوتی ہوں یا کیسے ہی جو ملے اور امید نے انہیں نے دین کے سایہ میں کیوں نہ ٹھنچا ہو سب کے سب ایک سکون کے عالم میں تھے۔

اس سکون کو نامطلوب حرکت کر بد لنا قومی اور دینی گناہ تھا حقیقت یہ ہے کہ ان داخل ہونے والی جماعتوں کے یہ قابلِ حکایت

عنصر اس قدر قابلِ الزام نہیں تھے جس قدر وہ لوگ جنہوں نے ان عناصر کو زندہ کرنے کی مثال دی یا تحریک کی۔

عداوت کا انتہائی فعل اس کا شہوت ہے کہ واقعات اپنی فطری روش پر چل رہے تھے کہ دفعۃً

علیٰ میں امامت کی قابلیت کا پورا انشووہو چکا تھا واقعہ عقبہ نے پچھلے سکون میں ایک جیہان پیدا کیا اور

یہ سوال پیدا کیا کہ اگر جہانبندی اور رسول کے ارادوں کے خلاف بغاوت پر ایک جماعت آمادہ نہ تھی تو یہ کیا تھا تو دشمنوں

کا یہ غصہ ظہر ظہر اس لیے تھا کہ اس ذات کو فنا کر دیں جس نے آئینہ کے لیے اپنا قائم مقام ہمارے علاوہ اس کو چنا

ہے جے ہم نہیں چاہتے نہ اس لیے کہ وہ وجہ اسلام کا سب سے بڑا حامی نہیں ہے۔ نہ اس لیے کہ وہ ان صفات سے

مفت نہیں ہے جو ایک نبی کے دوسری میں ہونی چاہیے بلکہ اس لیے کہ اس کا دوسرا ہونا آئینہ ان کی امید پر خاک ڈال

سجک ہم کچھ نہیں رہتے۔ یہ خیال اس وقت کی تمام مخالفت جہانبندی کی اصل تھا۔

نیا دور شروع ہوتا ہے ذاتی طور پر مجھے اس کا یقین ہے کہ وہ چند افراد تھے کسی طرح رسول کے بعد صاحب اختیار ہونے کا حوصلہ پیدا ہو گیا ہو اس وقت اس خاص شلغ کے متعلق رسول کے

احکام یا انداز کو نہایت غور سے دیکھنے لگے جس وقت رسول نے اپنی پارہ ہجر حضرت فاطمہ زہرا کو علی کے حقد میں دیا۔ لیکن

اس وقت بڑی خفیت کشیدگی کے سڑی ہوئی دشمنی اور معصم مخالفت کا خیال نہیں کیا جاسکتا تھا اس لیے کہ ابھی قرابت پیدا کرنے

کے ذرائع ختم نہیں ہوئے تھے اور اس کے بعد اولاد کی امید ہو سکتی تھی جس سے آئندہ کوششوں کا جواز ہوتا کشیدگی معصم

مد تک نہیں پہنچی جب تک یہ امید باقی رہی زمانہ گزرنے کے ساتھ جس طرح اس امید میں ضعف پیدا ہوتا گیا وہاں زوج

بتول نے رسول کی آنکھوں میں روز افزوں وقت حاصل کی جو عامہ ماس کی آنکھوں کے سامنے کا واقعہ تھا اس نے دیگر

امید داران میں ماس کی زیادتی شروع کی اور ماس کے ساتھ دل میں حقوق کی مخالفت کا ذخیرہ زیادہ ہوتا گیا۔

مؤلف کے نزدیک حدیث اُسامہ کے حکم و انگلی کی اصلی غرض انتظام تھے جو رسول اپنی آنکھ کے مستقبل کے لیے

کر رہے تھے ان لوگوں کو انتظام کے لیے آمادہ ہونا چاہیے تھا جو اپنے لیے امید ہی کرتے ہوں۔ ان سوچتا ہوں کہ

اسامہ ابن زید کو اس لحاظ سے کہ دشمن کو اس سے شرارت کی مزادنی جانے شدت بیماری میں روانہ کرنے کے لیے تیار

کرنا بلاط مزادینے کے ایک ایسا امر تھا جو ملوثی رکھا جاسکتا تھا اور اگر رسول رحلت بھی فرماتے تو ایک لشکر کے روانگی کی

دمیت فرما سکتے تھے یا آئندہ والی امر کا کام ہوتا کہ وہ ضرورت دیکھتا اسی سرے کا آراستہ کرنا زیادہ تر اس مصلحت پر مبنی تھا

کہ بے قرار طبیعتوں سے مدینہ دور رکھا جائے۔ لوگ کج گئے اور جہاں مناسب نہ تھا۔ رسول ان کے اس بچنے کو کج گئے۔

رسولؐ نے کب کاغذ طلب کیا
اور اس کے بعد مزید قوت لینے کے لیے یہ امر تھا کہ اس اپنا ارادہ اور خیال حمزہؓ اور وصیت کی صورت میں بھی اس کے حوالہ کر جائیں۔
واقعات کا سلسلہ اس طرح تھا کہ وہ طبعاً جو ایک خیال میں آلودہ تھیں ان کا مشتبه رہنا اور یہ سوچنا کہ اس کی غرض کیا ہے کچھ زیادہ مشکل نہ تھا۔

کاغذ طلب کرنے کی غرض کا سمجھنا واقعات کے سلسلہ کی محض گرفت تھی

کاغذ کے طلب کرنے کے ساتھ ہی شبہ کا بڑک اٹھنا کوئی عجب خیز نہ تھا کیونکہ نہ اباحضہ اور ابن ابوقحافہ نے دم لیا جب حضرت عائشہ سے یہ روایتیں موجود ہیں کہ رسولؐ عبدالمعین ابن ابوبکر کو پکار رہے تھے کہ ابوبکر کی خلافت کا وسیعہ لکھ ہی دید۔ شاید یہی ہوتا لیکن حضرت عمرؓ کی شدت نے یہ ظاہر کر دیا کہ تم سے کم وہ ایک تنہا شخص تھے جس میں اس کا یقین تھا کہ رسولؐ ان کے متعلق کچھ تحریر نہ فرمائیں گے اور نہ ان میں اپنے دوست اور بیعت رضوان کے بھائی کے متعلق کوئی امید تھی ورنہ لکھنے نہ دینا کیا معنی رکھتا ہے۔

تحریر کے روکنے سے علیؓ کا دعویٰ کمزور نہیں

ہوا بلکہ حضرت عمرؓ نے اپنے اور ابوبکرؓ کے

دعوے کا ہمیشہ کے لیے فیصلہ کر دیا

یہ ہے کہ اس وقت تک کسی کو ظاہر دعویٰ کی جرات ہی نہیں ہوتی تھی۔ ڈول والی حدیث۔ اینٹ والی حدیث اور طلاق سے

کٹ جانے والی قرابت کا حق اور ان کا وزن بگھنایا وزن دینا "مریدان می پرانہ" والے زمانہ کا ہے۔ اور ظاہر یہ ہے کہ

رسولؐ کے زمانہ میں علیؓ کے وقار اور دجاہت کے مقابلہ میں کسی کا وقار نہ تھا اور نہ ہو سکتا تھا۔

گبن نے گھر کے اندر ہی ایک بات کہنا چاہی

ہے حدیث افک کے متعلق علیؓ کے صاف

تصفیہ کی حدیث اور ابوبکرؓ کے لیے ہم اشری

اس کی خبر پہنچتی ہے اور مشرکین کے خیالات کے موافق رسولؐ کے بستر خلعت کو "عائشہ نے جو علیؓ کی دشمنی اور ابوبکرؓ کی بیٹی

تھیں حضورؐ کر لیا تھا" وہی جن کے عرض کے موافق نہ ہو سکتا تھا کہ علیؓ رسولؐ سے یہ کہتے کہ آپؐ کو اس غم سے خلاص

ہونے کے لیے بہت سی عورتیں تنگیں ہیں۔ نہ میں یہ سوچ سکتا ہوں کہ حضرت ابوبکرؓ نے طبعاً علیؓ کے اس جواب کو اس

روش سے علیحدہ دیکھا ہو گا جس سے ان کی بیٹی نے دیکھا جس کے آثار ایک زمانہ تک دکھائی دیے۔

ان حالتوں میں رسولؐ کے الفاظ اور ان کا عکس

ان حالتوں میں رسولؐ نے فرمایا کہ: "میں ڈرتا ہوں کہ دنیا کی رغبت کرو گے"

اور آپؐ میں لڑو گے۔" کبھی فرمایا کہ: "میں معلوم میرے بعد کیا فتنے تمہارے درمیان کھڑے ہو گئے۔" اور جب

سازشوں کی شدت بڑھی تو فرمایا کہ: "آگ بھڑک اٹھی اور فتنہ آگیا مثل امیر میری رات کے کھڑے کے۔" کبھی انصار

سے کہا کہ: "فل عسیق۔۔۔۔۔۔" (آیا تم سے امید ہے کہ اگر تم والی امر ہو تو فساد اور قلع رجم نہ کرو گے)

ایک طرف لوگوں سے یہ فرما رہے تھے، لیکن تنہا اس سے جس کی روانگی پر بیچ و سلم واپس آنے کی دعائیں مانگتے تھے اور جدائی پر افسوس کرتے تھے یہ فرماتے ہیں کہ: ”میرے بعد تجھے بہت سے مددے پہنچیں گے۔ لیکن جب لوگ دنیا کی طرف مشغول ہوں تو تو دین اختیار کرنا۔“ کیسے میں ان واقعات کی ترتیب میں اپنے کو اس قیمت سے باز رکھ سکتا ہوں کہ ان تمام افکار میں رسول کی یہ حالت ہے جیسے کوئی کسی بڑے کام کو انجام دے اور جب یہ دکھائی دینے لگے کہ اس کے آئندہ اجراء میں کوئی غلطی یا تساہلی نہیں ہوئی اور اب وہ بغیر رکاوٹ کے چلے گا تو دفعتاً اسے یہ دکھائی دینے لگے کہ نہیں کچھ طبیعتیں اس پر آمادہ ہیں جو یہ چاہتی ہیں کہ اس کے چلنے کی صورت ہم درست کر لیں۔ غم کی اس گرانی میں معاملات کی روش نے یہ صورت اختیار کی کہ کچھ لوگ اس سے بھی پھلانے جاتے کہ رسول ان کے دروازے بند کر دیتے۔ تیار داری کی اجازت نہ دیتے اور اپنے پاس سے انکار دیتے۔

رسول کی آخری ناراضی آدمی اور گزہ پھینواتی ہے
رسول کے ایسے علم نے یہ نرم کشیدگی بھی اس وقت تک اختیار نہیں کی جب تک یہ یقین نہ ہو گیا کہ اظہار ناراضی میں خاموش رہنا واقعات اور امر حق کے کھنچنے میں ہارج ہو گا کیونکہ اس کے بعد رسول کی کلمۂ ناراضی کو پھیلنا اور وجوہات بگڑنا آسان ہو جاتا۔

موقع مبنی کی جلدی کا مطلب ۴ وہ افسوس ناک وقت آیا کہ ہلوی عالم سے زمانہ خالی ہو گیا۔ وہ اور اس کے متعلقین جس کے سینہ اور گردن کے درمیان رسول کی روح اقدس عالم راحت کی طرف بردانہ ہوئی جسم الطہر کے آخری فرض ادا کرنے کے فکر میں رہی۔ کون بوجھ سکتا تھا کہ کوئی مسلمان جسے رسول سے محبت ہوگی وہ تجیز و تحنین کے قبل موقع اور وقت کو ضیعت کج کر اور فطری حق دار کو اس ناقابل تسکین غم میں مشغول دیکھ کر یہ بھلے گا کہ اگر اس وقت کچھ نہ کیا تو پھر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے وصلے خاک کے سپرد ہو جائیں گے۔ کیونکہ اس کے بعد دفن کرنے والوں کو کوئی ایسی مفید آخری خدمت کا ادا کرنا اپنے ذمہ نہ ہو گا اور وہ بھی ہماری طرح آزاد ہو گا کہ ہر طرف دیکھ سکے اور ہماری ہر کوشش کو رد کر دے۔

صورت یہ پیدا ہوئی کہ یا خلافت لویا رسول کو دفن کرو
بلکہ اس کا موجود رہنا اور محض اس کی ذات بمقابلہ تمام

دعویٰ داروں اور ان کی دلیلوں کے زیادہ دینی ہو گا۔ مسئلہ نے یہ صورت اختیار کی تھی کہ یافون میں شریک ہو یا خلافت حاصل کرو۔ لوگوں نے دوسری صورت اختیار کی جس سے یہ امر صاف ہو گیا کہ ان کے نزدیک کونسا فرض زیادہ توجہ کے قابل تھا۔ میں بذات خود اس امر کے مان لینے پر آمادہ نہیں ہوں کہ انصار کے متعلق مولف کا خیال

مجھے اس کے متعلق دو شبہ ہیں ایک تو یہ کہ جس طرح اور لوگ رحلت کی خبر سن کر اپنی اپنی جگہ باتیں کرنے لگے ہوں اسی طرح یہ بھی باتیں کر رہے ہوں اور یمن کے غمر نے انھیں یہ غلط خبر دی ہو کہ لوگ امارت کا تصفیہ چاہتے ہیں اور یہ لوگ دوڑے گئے ہوں، اور اپنی دلیل پیش کی ہو اور انھیں اپنے کو آگے بڑھاتا ہوا دیکھ کر انصار نے اپنے حقوق

بھی پیش کیے ہوں اور یا حضرت ابوبکر کا بیٹا حقیقت میں کہیں ایک جلسہ منعقد کرنے کے لیے ہو، جو آئندہ امور اہل بیت پر بحث کرے، یا قبیلہ اوس کو اپنا کرنے کے لیے جن کا ذکر آتا ہے۔ انصار بھی اس مجمع میں داخل ہو گئے ہوں اور صورت سب معاملہ وہ چینی ہو جڑ کر رہے۔

مخبر نے کیوں دو ہی آدمیوں کو خود دی اور
ان دونوں آدمیوں نے مسلمانوں کو شریک نہ
کیا نہ انصار کو جلسہ ملتوی کر کے صلح دی
 اور مؤرخین نے اختلاف جلسہ کی مصلحت کو انصار کے سر توڑا ہوا اس کے کوئی معنی نہیں ہیں کہ غیر آئے اور صرف انہیں دو آدمیوں کو مطلع کرے اور یہ صرف اپنے امین ابو سعیدہ جراح کو ہمراہ لیں اور مطلق اس کی فکر نہ کریں کہ بغیر قوم ڈھیلے کیے ہوئے ایک ہی آواز دیدی کہ مسلمانو ستیفہ بنی ساعدہ میں اپنی قسمت کا فیصلہ کرنے چلا انصار بے عنوانی کیا چاہتے ہیں۔ یاد میں پہنچ کر بھی انصار سے کہیں کہ تفتیہ اس وقت تک ملتوی رکھو جب تک کہ مہاجرین و انصار کے سربراہ اور وہ لوگوں کا مجمع نہ ہو لے اور کسی کو یہ نصیحت نہ ہو کہ میں ہماری امور اہل بیت کے مشورہ میں شریک نہ کیا صوابی عرقہ کی روایت خبر کی بھی ضرورت نہیں تھی بلکہ اباحضہ خود سے ابو قحافہ سے خواہش کرتے ہیں کہ انصار کے پاس چلا اور کہتے ہیں کہ انصار ستیفہ میں جمع ہوئے ہیں۔ وہ جمع ہوئے یا نہ ہوئے لیکن لطف اس میں ہے کہ ”حضرت علیؓ وزیر رضی اللہ عنہما و جمیع دیگر کہ ہاشمیان بعد از در غلام و طاہرہ ششہ تعلق کردہ“۔ یعنی: ”جب حضرت علیؓ وزیر رضی اللہ عنہما اور چند اور لوگ جو ان کے ساتھ تھے نے قافلہ کے گھر میں بیٹھ کر تعلق کیا۔ ہماری کجی میں نہیں آتا کہ تعلق کس بات سے کیا۔ اس لیے کہ وہ لوگ تو تہیز و تکفین کی فکر میں تھے، اب تک سوال بیت پیدا ہی نہیں ہوا تھا اور اگر تعلق کرنا ہی تھا تو اس مجمع نے آپس میں کسی کو اسی طرح غلیظہ بنایا جو تاجس طرح ستیفہ بنی ساعدہ میں بنایا گیا۔ اور نہیں معلوم وہ مہاجرین کا مجمع کو نسا تھا جو ابوبکر کے گرد جمع ہوا۔ کیونکہ اور کسی کا نام جانے والوں میں یزداد اور شخصوں کے نہیں ہے۔ بلکہ واقعہ یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ امیر المومنینؓ اور ان کے رہا کو چھوڑ کر انصار کو بلانے کی فکر سے روانہ ہوئے جس کے ساتھ طالب متغیرہ ابن شعبہ کی بھی صلح تھی کہ تم قبیلہ اوس اور خزرج کو علیہ کر کے ایک کو اپنی طرف کر لینا اور جب ایک امر طے ہو جائے گا تو پھر کوئی عمل مخالفت کے لیے نہ کھڑا ہو گا اور لوگ غموشی اختیار کریں گے۔ ہم غموش رہنے کو رضامندی ظاہر کریں گے ان کا اس مجمع کے پاس کھڑا نہ ہو سکتا جہاں علیؓ موجود تھے اور دوسرا امید ان تلاش کرنا موقع کو صاف دلیل سے بگاڑتا ہے۔

جلسہ کی دُوری
 سب سے پہلی بات اس جلسہ سے مشتبه کرنے کی یہ ہے کہ جلسہ تفتیہ امور اہل بیت کے لیے ایک ایسی جگہ قرار دیا گیا جو شہر سے کئی میل پر واقع تھا جہاں کی خبر پہنچنے پہنچنے کئی گھنٹہ ہو جاتا یا لوگوں کے پہنچنے تک ایک بات طے ہو جاتی اور پھر ”قول دے چکے“ کی آڑ ہو جاتی۔

انصار زیادہ قابل الزام ہیں یا وہ مہاجر جو وہاں تھے
 ہم نے مانا کہ انصار قابل الزام ہی لیکن وہ مہاجر جنہیں خبر ملی اور انہوں نے جامعہ اسلامی کے مقتدر افراد کو مطلع کرنے کی کوشش نہ کی وہ ان سے زیادہ قابل الزام ہیں۔

ستیفہ کے واقعہ میں ایک بات جو نہایت غور کے قابل ہے وہ یہ ہے کہ کچھ ہوا جس سے اوس قرزع کے

دو گروہ ایک دوسرے کی مخالفت پر تل گئے۔ تم زمانہ رسول کے گزشتہ اوراق میں پڑھ آئے ہو کہ کس طرح رسول نے ایسے ہی ایک موقع کو بلامنت طے کر دیا، اور خزع کی رانی رقابت سے صرف اس قدر کام لگا کہ وہ آئندہ اسلامی وجہ کی مدد میں ایک دوسرے پر سبقت کرنے کی کوشش کرتے اور یہ جدوجہد قوی اور مذہبی حیثیت سے مفید ہوئی۔ آج کیا ہوا؟

کشیدگی کی تفصیل اور خاص باتیں بشرابن سعد کہا جاتا ہے کہ وہ سعد بن عبادہ کی مخالفت کرتا تھا یعنی قبیلہ اوس خزع کو صاحب اختیار نہیں ہونے دیا چاہتا تھا اور کہہ رہا تھا کہ قریش کی حکومت کو مان لو کہ اس کے بعد تمہاری ہوگی یا اس کے مثل ہوگی یعنی اگر کچھ تم صاحب اختیار نام سے نہ بھی پکارے جاؤ تو قریش کا اس طرح ساتھ دینے سے تمہارا جو موقع ہو گا وہ کسی طرح صاحب اختیار ہونے سے کم نہ ہو گا جس کی ابوبکر نے حریک یا تصدیق کی تھی کہ: ”ہم امرا ہیں اور تم دوزرا ہو“۔ صورت مسئلہ اس قدر ظاہر ہو گئی تھی کہ حبیب بن مضر بشر بن سعد سے پوچھ سکتا کہ تو نے کیوں اپنے ابن عم سے ”حسد“ کیا۔ اور آپس میں تلوار کھینچا۔ حبیب اس کا استغناء کرتا کہ اے انصار میں دیچ رہا ہوں کہ تمہارے بچے ایک کوزہ آب طلب کرتے ہیں اور نہیں ملتا اور حضرت ابوبکر کہتے ہیں کہ بھلا ہم سے تم کو ایسی امید ہے؟ اور مؤرخین یہ لکھتے ہیں کہ: ”خدمتِ مغلطہ تمام روی دلا“۔ یعنی: ”خزع کو بہت شرمساری ہوئی“۔

حضرت عمر اور ابوبکر میں سیاسی رد و بدل اور سب سے زیادہ بڑی لطف داستان تو یہ ہے کہ حضرت ابوبکر اور عمر میں بھی سیاسی چالوں کی رد و بدل ہوئی ہے کہ ابوبکر عمر کو ابوسفیہ کی بیعت پر آمادہ دیجے کر نہایت غصانہ اقام یہ کرتے ہیں کہ تم اپنا ہاتھ بڑھاؤ ہم تمہاری بیعت کر لیں۔ اور اس اصرار میں اس قدر طول دیتے ہیں کہ اباحصہ بغیر یہ کہ نہیں رہ سکتے کہ تم فوج سے اغفل ہو اور اس کے بعد ابوبکر اصرار بھول کر بیعت کر لینے میں مضر نہیں کرتے۔ ”چل گئی“۔ نتیجتاً اس میں ابوبکر کی مصلحت قوی تھی وہ دیجے رہے تھے کہ اگر بیعت ابوسفیہ اور عمر میں رہ گئی تو ہمارا نمبر تیسرا ہو جائے گا۔ اس لیے انہوں نے ابوسفیہ کو درمیان سے اٹھا دیا، اور خود اور اباحصہ پہلے اور دوسرے ہو گئے۔ اباحصہ اگرچہ اپنی پہلی مصلحت سے پیچھے نہ رہے لیکن وہ پہلے ہونے میں چوک گئے اور ابوسفیہ تو نتیجتاً ”چل گئی“ کے موقع کو ہاتھ سے کھو بیٹھے۔ اگرچہ اباحصہ نے اپنے زمانہ کو ختم دیجے کرا نہیں پھر بلا کیا لیکن یہ اس وقت تمام ہو چکے تھے۔

کیا یہ دور اندیشانہ رقابت تھی؟ کون جانے کہ سرور عالم کے خسر ہونے کا افکار اس امر خاص میں دور اندیشانہ رقابت سے قبل ان مواقع کو اس وقت کے دیکھنے والے کی نگاہ سے اگر بھنا چاہتے ہو تو تمہیں یہ فقرہ مدد دے گا کہ: ”اس طرح دودھ دو جو کہ تمہیں بھی ایک حصہ ملے اور ان کے لیے مضبوط کر دو کہ کل وہ تمہیں لوٹا دیں گے“۔

ظہری اور باطنی مناظرہ ہم کو اس پر بھی اب کچھ کہنا نہیں ہے کہ ابوبکر کی بیعت ناگہانی تھی اور ہم اسے بالکل یحیح سمجھتے ہیں کہ پہلے ان کے چند مخصوصین نے بیعت کی اور یہ لوگ

اس کام میں لانے گئے کہ ابوبکر کو یمنی لنگی بند ہوا کر ساتھ ساتھ طہیں اور جو دکھائی دے اسے دیکھیں کہ اس میں ہاتھ ہے یا نہیں اور ہاتھ کھینچ کر اپنے غلیفہ کے ہاتھ سے مس کر لوید۔ اگرچہ اس حیرت خیز بیعت کو دیکھ کر برابر بن عازب کے ”جوش کیوں نہ اڑ جائیں“۔ برابر بن عازب کے جوش کا کاخستہ اڑ جانا اس قدر عجب کی چیز نہیں ہے جس قدر ابو قحافہ کا یہ فطری سوال اپنی منصفانہ واقعہ خوانی ہے کہ کیا بنو عہد مناف اس پر راضی ہو گئے؟ اور پھر لطف میں اس سے اور زیادتی ہو گئی کہ ”کوئی اسے پست نہیں کر سکتا ہے تو بلند کرے“۔ مجھے یہ کہنا ہے کہ ابو قحافہ کی قدرت گزشتہ مثالوں کی طرح ایذا رسان نہیں ہے۔ ایسا کہنے کے وقت کہنے والے کی طبیعت کے کون سے عناصر آشکھوں کے سامنے موجود ہو جاتے ہیں اور ان سے ان کی طبعی تاریخ پر کیسا عکس پڑتا ہے۔ اس کی وضاحت سے میں اپنے کو باز رکھتا ہوں۔ لیکن یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ہاپ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے شکر اور موقع کو قبول کرنے کے لیے نفس کا آلودہ نہ ہونا فلسفہ ساری تہذیب سوال ان کے لیے دلچسپ ہو گا جو سطح طبیعت سے خاندانی درجہ خصوصیات بگھنا چاہیں، اس انداز طبیعت کا کسی قدر سخت پہلو یہ تھا کہ: ”نفسا مکروہ داشتند بیعت او“۔ اور اس کا تیسرا درجہ یہ تھا کہ: ”ابن ابو قحافہ کون ہے جس کی ہم بیعت کریں؟“۔

کہاں کہاں اور کس نے علی کی ناموجودگی میں ان کی وکالت کی

ضرورت نہیں ہے کہ انصار نے علی کو بغیر کسی سٹارش کے خلافت کے لیے پیش کیا اور آسمانیکہ ان کی کوئی مرتبہ مددگار جامع نہ تھی لیکن نام آنے کے ساتھ ہی حضرت عمر کو ضرورت محسوس ہوئی کہ وہ بیعت کی کاروائی شروع کر کے سوچنے کا موقع نہ دید۔ جو سکتا ہے کہ کچھ لوگ پیشتر سے تیار رکھے گئے ہوں کہ اپنا مل دھا کر لوگوں کو قہر پر آمادہ کریں۔ نبی امیر کے مستند سردار نے بھی ویسا ہی چاہا۔ جو انصار نے چاہا تھا ان کے علاوہ حضرموت جہاں دور کی وجہ سے علی کی کسی کوشش اور اثر کا موقع نہ تھا وہاں بھی نہ صرف عام لوگوں نے بلکہ معارف نے بھی ایسی ہی خواہش کی اس لیے کہ ملوک کی اولاد امیروں کے سامنے بھگنے کو اپنی توہین سمجھتی تھی۔

علی کی شہرت نے آئندہ کے لیے اس کا راستہ صاف کر دیا تھا

مقاتلہ بر علی شریعت لے گئے ہوں یا نہ لے گئے ہوں لیکن ان کے خدمات اسلامی اور رسول کے نزدیک ان کے درجہ کی شہرت ہر جگہ پہنچ گئی تھی اور جو لوگ واقف نہ تھے انھیں حجۃ الوداع نے بتا دیا انھوں نے اپنے گھروں پر پہنچ کر اس بڑی رسم کا ذکر کیا اور وہ ہر وقت اس کی امید کرتے تھے کہ ہم رسول کے بعد علی کو اپنا امام سمجھیں گے۔ یہاں میں یہ بھانا چاہتا ہوں کہ ان امور ات نے لوگوں کے دلوں کو اس امر کے لیے آمادہ کر دیا تھا کہ وہ علی کو غلیفہ رسول سن کر نہ چھوڑیں بلکہ ایک طے شدہ امر سمجھیں جس کا اعتبار خود رسول نے قائم کیا تھا۔

ائمہ کے طرز عمل کا بڑا فرق

اب فرق دیکھو کہ کچھ لوگ ہیں جو ایسے موقع پیدا کرتے ہیں جو افتراق اور اختلاف پر ختم ہوں۔ نزاع اور قتل کا بازار گرم ہو جائے۔ اور اگر خوش قسمتی سے عطا ایسا نہ ہو تو کہا جائے کہ ”خدا نے اس کے (بیعت کے ناگہانی واقعہ ہو جانے سے) شر سے محفوظ رکھا“۔ لیکن

علی اگرچہ ہر طرح کا مرجح حق رکھتے ہیں اور فوجی مدد کی امید دلائی جاتی ہے لیکن آمادہ نہیں ہوتے اس خیال سے کہ یہ ملنا کہ ہم صاحب حق ہی لیکن نتیجہ قتل و غارت اور ایک ساکن حالت کو فساد سے بدلنا ہے۔

جناب امیر اپنی کشمکش کا نقشہ پیش کرتے ہیں ہم کیوں اس کے محرک ہوں جناب امیر ہی کے لفظوں میں حالت یہ تھی کہ ”اگر میں اپنا حق طلب

کرتا ہوں تو (لوگ) یہ کہتے ہیں کہ یہ شخص ملک و مال پر کتنا حرص ہے اور اگر غموشی اختیار کرتا ہوں تو سرگوشیاں ہوتی ہیں کہ موت سے ڈر گیا سوچ لینا آسان ہے لیکن ایسے جوش خیز مواقع پر یہ تعفیہ کرنا اور اس پر قائم رہنا آسان نہیں ہے۔ خصوصاً جب کہ یہ تعفیہ ان علی کو کرنا پڑے جن کی عمر طعن و ضرب میں کئی قہر اپنے اس جوش کو دہا دینا تھا اگرچہ یہ صبر درخت حقل سے بھی زیادہ تلخ اور تیز چھریوں کی برش سے زیادہ قلب کو اذیت پہنچانے والا ہو۔ اس لیے کہ رسول کی قبر سے یہ صدا آرہی تھی کہ اے علی ”جس وقت لوگ دنیا میں مشغول ہوں تو تم دین اختیار کرنا“۔ حیرت خیز پیشین گوئی تھی جس کے لیے حیرت خیز ذات جی جی محمد اس پر عمل کرنا اپنے حقوق اور جائز حوصلوں کی جوی شہرہائی تھی۔

علی کی خاموشی کا احسان اسلام پر بزورِ شمشیر معاملہ نہ کرنے میں رسول کے بعد علی نے مسلمانوں اور لطافت اسلام کے قائم رکھنے میں پہلا اور سب سے بڑا احسان کیا

جس سے ابدی ہلاکت اسی شکر یہ کے مستحق ہونے کہ انہوں نے باوجود اشتعل انگیز حالتوں کے ذاتی حقوق کو اسلامی لحاظ پر شہرہاں کر دیا صرف علی کا یہ طرز عمل رسول کے بعد انہیں محافظ اسلام بکھا دینے کے لیے کافی ہے۔ حالانکہ اس زمانہ میں بھی بھی ایک مثال نہیں ہے۔

علی نے فوجی قوت کا نفاذ اعلیٰ احساسات کے تابع رکھا یہاں میں اس سے بحث نہیں کر رہا ہوں کہ علی کی جنگی قوت

کہاں تک تھی اور کامیابی یا کس حد تک کامیابی کی امید کی جاسکتی تھی بلکہ میں اس امر کو تسلیم کرنے کے بعد کہ وہ فوجی قوت کا اظہار کر سکتے تھے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ باوجود ایسی حالت کے جس میں فوجی کارروائی ممکن تھی علی نے اسے مضطرب رکھا اور یہ بھلانا چاہتا ہوں کہ ضرور نہیں کہ فوجی قوت کا نفاذ فوجی قوت کی موجودگی پر جتنی ہو جائے بلکہ وہ اعلیٰ احساسات کا تابع کیا جاسکتا ہے ایسی اشتعل انگیز حالتوں میں علی کا کام تھا جس کی انہوں نے مثال دی۔ آج اس صورت سے اسلام پر احسان کرنا تھا اس قدر مثالیں آئیں گی جو اس سے کم حیرت خیز نہ ہوں گی جن کے بیان کرنے کے لیے ہم طبعیتوں کو تیار کر رہے ہیں۔

موقع جو نیت کو پوشیدہ نہیں رکھتا متغیر پیر سامنے آتا ہے جب ابوالہیثم، سلمان اور ابوذر کے ایسے مہاجرین یہ منعقدانہ روش اختیار کرتے ہیں کہ انھیں

خلیفہ شوریٰ سے ہو تو ایک ایسا جلسہ ہونا چاہیے جس میں کسی کو ناواقفیت کی حکایت نہ ہو اور ہر طبقہ کے لوگ شامل ہوں۔ انصاف کے نزدیک یہ صلاح کہی ہی مقبول کیوں نہ ہو لیکن ان کے نزدیک دل پسند نہ تھی جو صاحب اختیار ہو گئے تھے۔ یہ کہہ چکنے کے بعد کہ چپ چپ ”عرب خاندان رسالت میں سے کسی کو چاہیں گے“۔ دوبارہ انقلاب شوریٰ سے کہیں یہ موقع پھر نہ آجائے اور ہم اس موقع کو کھو بیٹھیں جو اتفاقات نے ہمیں حوالہ کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس تعفیہ پر آمادہ نہ ہونا

کم سے کم اپنے کامیابی کی بے اعتباری ضرور تھی۔ اور اب متغیر کے صلاح سے اس پر آمادہ ہونے کے علی بن ابی طالب کے مقابلہ میں ایک دوسرے حق دار کو کھڑا کر کے امیر المومنین علی کے حقوق کو کمزور کر دیں یا لوگ اور علی کے درمیان ایک زبردست آڑ کر دیں۔ عہد سے اپنا اٹھالی حق ظہر کیا دمکلیا عزز داری ظہر کی، لالچ دی، لیکن جواب یہ ملا کہ:

- مومنین کے ذریعہ سے قتادے سے علی کیونکر ثابت ہو سکتا ہے۔ دراصل ایک ہم کارہ تھے (موجود نہ تھے)
- خدا ہمارا مددگار ہے۔ اگر ہمارا حق ہے تو ہم بعض کو چھوڑ کر بعض پر اکتفا نہیں کر سکتے
- رسول وہ درخت ہیں جس کی ہم ٹہنیاں ہیں اور تم ہمسایہ ہو۔ (یعنی کے امر قربت پر مومنین نے وقت قائم کرنے کے لیے اکثر زور دیا ہے حالانکہ اسے نہ صرف رسول نے کوئی وقت نہ دی نہ بنی ہاشم نے اسے رسول کے بعد کچھ اور نہ خود مشرکین نے صلح حدیبیہ میں اس پر کوئی توجہ کی)

مدینہ کی خاموشی مفید نہ ہوتی اگر باہر شور ہوتا رہتا جس طرح سے کیوں نہ ہوا بعد مدینہ میں اسلام خلافت کے بعد اس کی

ضرورت تھی کہ بیرونی موبہ ہات بھی خلیفہ تسلیم کریں۔ ورنہ ایک دن ان مقامات کی مخالفت سے ہاتھ بدل سکتا تھا۔ مخالفت ہوئی مخالفت کی پکی روش نہ تھی کہ ہم تمہیں خلیفہ رسول نہ کچھ کر صدقات نہیں دیتے بلکہ صورت مسئلہ میں وہ خوفناک عنصر بھی مل گیا تھا جسے ابن ابوقحافہ نے انصار سے کہا تھا کہ: ”عرب خاندان رسالت میں سے کسی کو چاہیں گے۔“

سقیفہ بنی ساعدہ کے خلیفہ کا ”کسی“ ہم سب جانتے ہیں کہ خاندان رسالت کا ”کسی“ کون تھا اور انصار نے یہ ہیبت ناک نام بھی لے لیا تھا یعنی

یہ اندیشہ تھا کہ علی ہم سے بزورِ شمشیر معاملہ کریں یا نہ کریں، بیرونی مقامات پر نہ صرف ہمارا اثر نہیں ہے بلکہ وہ علی کے حقوق کے حامی ہیں۔ کسی ایک کا ایسا ہونا محسوس تھا کہ نہ کہ صاحبِ وقت قبائل کا حالانکہ ان میں سے چند ایسے تھے جنہوں نے محض خاندان رسالت کا نام لیا تھا یا یہ کہا تھا کہ بنی عیم کی تو قبائل میں کوئی وقت نہیں ہے جسے ہم اپنا امیر قرار دیں۔ اگر ایسے ہوسکتا نہ بھی ہوں تاہم صلح اس کی متعنی تھی کہ اس کا جلد مذاکرہ کیا جائے کہ اور لوگ بھی اس دلیل کے حامی نہ ہو جائیں۔

کچھ ایسے بھی تھے جو سبیل اور مشیلہ کا ساتھ دیتے تھے۔ نہ اس لیے کہ اسے بنی یا کچھ ایسا ہی سمجھتے تھے بلکہ دو محلے میں ان کا آئینہ تھا۔ وہ ڈرتے تھے کہ اگر ہم نے مرتدین کا ساتھ نہ دیا تو یہ ہم پر

غارت گری ثابت ہو گے اور اگر ابن ابوقحافہ کا ساتھ نہ دیا تو وہ مخالفت پر آمادہ ہوں گے۔ اس بنا پر معمولی تصفیہ کی بہت یہ تھی کہ وہ قریب کے دشمن کو دوست بنا کر دور کے دشمن سے لڑتے۔ دشمنی دونوں میں قدر مشترک تھی۔ کسی طرح جان بچانی تھی۔

ابوبکر کے لیے موقع اس قدر نازک تھا کہ وہ کیسے فوج ذرا سی بکنی بہت سا پانی رنگین کر دیتی ہے کشی کرتے اور کیسے علمہ مسلمین میں جنگ کا جوش

پیدا کر دیتے۔ اس لیے کہ اکثر قبائل کے مسلمان ہونے کے خود اپنے آدمیوں نے اعلان کیا تھا کہ وہ علی الاعلان یہ کہہ سکتے تھے کہ چونکہ ان لوگوں نے علی کے حقوق کی تائید کی ہے اس لیے ہمیں ان پر فوج کشی ضروری ہے۔ اس کے لیے موقع کی باتیں موجود تھیں۔ ایک تو یہ کہ مشیلہ اور سبیل کی شورش کی خبر تھی۔ ایک پڑا بکنی ایک بوتل پانی کے رخصتے

کے لیے کافی پڑھائی ہے۔ اب مشکل نہ تھا کہ شورشوں اور ارتداد کا حصول بجا دیا جاتا اور بھانے کے لیے ایسے القائل جاتے کہ گناہیں آ رہی ہیں، طوفان اٹھ رہے ہیں، بجلی چمک رہی ہے، شیطے بلند ہو رہے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

مسلمانوں کی آزاد عورتیں کنیز بنائی گئیں

دے سکتے وہ عورتیں جنہیں اسلام نے آزادی عطا کی تھی وہ رسول کے بعد کے اسلام کی کنیز ہوئیں۔ یعنی منفیت کا راستہ دکھا دیا وہ دوسرا اصول تھا جس نے فوج کشی میں مدد دی، اس نے ساتھ رہنے والوں کو اپنی جگہ قائم رکھا ورنہ دوسروں کا دوسرا بھتا تو درکنار خود قول دینے والے غلبہ خلافت کے مسترب نہ رہ سکتے تھے۔ یہی کرنا ہوتا تو کسی کو ہلا دینی کی کیا ضرورت تھی۔ اور دوسرا سب سے بڑا فائدہ یہ تھا کہ ملے کے حقوق کی تائید آج اگر نہ ہوتی تو کل پھر وقعت نہ رہے گا اور اس کی قوت بڑھتی جائے گی۔ یعنی پہلی اور حق کے مقلدین کے قتل سے ابتدا کی گئی۔

کون قتل کے گئے اور کیوں

یہ واقعات کیسے ہی میرا یہ اور الفاظ میں کیوں نہ ہوں اللہ سید کھول دے یا اصلاح امت کبھی جائے۔ تھا یہ کہ اہل بیت رسالت کے حقوق اور وقعت کے ملانے کی یہ پہلی بڑے پیمانہ پر عملی کارروائی تھی۔ جس میں وہ گلے گلے گئے جن سے اہل بیت رسالت کے حقوق کی تائید کی صدا نکلتی تھی۔ اس مصلحت سے کہ اگر یہ کمزور نہ کیے گئے تو عداوت اجنا مشکل ہے۔ ایسا فتویٰ دینا کہ ”جو شخص زکوٰۃ اور صلوٰۃ میں فرق کرے گا میں اسے مسلمان نہیں سمجھتا۔“ آسان تھا۔

رسولؐ نے کیا کہا تھا

اگرچہ رسولؐ فرما چکے ہوں کہ: ”میں اہل شہادت کے قتل سے خدا نے منع کیا ہے۔“ اور اس سے زیادہ آسان ایسے لوگوں کا مل جانا تھا جنہیں یہ سوچنے کی پرواہ نہ تھی کہ وہ زکوٰۃ اور صلوٰۃ میں فرق نہیں کرتے، بلکہ تم کو خلیفہ رسولؐ نہ بھر کر تمہیں زکوٰۃ نہیں دیتے اور کہتے کہ اگر ہمیں زکوٰۃ نہیں دیتے تو تمہارے مسلمان ہونے اور نماز پڑھنے سے ہمیں کیا فائدہ۔ ہم بزور تم سے وصول کریں گے اور کہہ دیں گے کہ سب مرتد ہو گئے تھے۔ انصاف، یک جہتی اور محبت کی حکومت مٹ گئی۔ خون، اظہار قوت اور گردہ بندی کا دور شروع ہوا۔ ایسی فضا قائم ہو گئی جو آئندہ قوی شیرازہ کے منتشر کرنے کے لیے مذہبی روح، دینی قدس اور امتیاز، خود غرضانہ سیاسی ضرورتوں کے نیچے کھل ڈالے۔ یہ قوی اور دینی نقطہ کے وسیع مفہوم کی اعلیٰ سیاست نہ تھی بلکہ اپنا موقع اور چہرہ محفوظ رکھنا تھا۔ یہی موقع تھا جہاں اسلام اپنے خون میں نہا رہا تھا۔

یہ نہ ہوتا اگر علیؑ خلیفہ ہوتے

یہ نہ ہوتا اگر علیؑ بن ابی طالب خلیفہ ہوتے۔ اس لیے کہ نہ لوگوں کو مخالفت ہوتی اور نہ علیؑ ایسے راستہ اختیار کرتے اور لوگوں کی طبیعتوں کو اس آب و ہوا سے آئندہ کے لیے تیار کرتے۔ جس سے رفتہ رفتہ وہ تمام خصوصیات فنا ہو جاتیں جو رسولؐ نے پیدا کی تھیں بلکہ انہیں قائم رکھتے اور ترقی دیتے۔ قوی ساخت کا کارخانہ انہدام پذیر نہ ہوتا۔

سٹیٹس کا نہایت درست ریلدک ہے کہ: ”اگر قربت کی وجہ سے محبت کھینی کا اصول علیؑ کے موافق ابتدا سے مانا جاتا تو وہ ریلدک کی جگہ نہ ہوتے جس نے اسلام کو مسلمانوں کے خون میں غوطہ دیا۔“ (اسپرٹ آف اسلام)

یا قبول دانشگاہ اردیگ کہ: ”سب سے زیادہ ممتاز امیدوار علی تھے جن کا سب سے زیادہ فطری حق تھا کہ چونکہ یہ رسول کے ابن عم اور داماد تھے اور فاطمہ سے ان کی جو اولاد تھی صرف وہی رسول کی پادگار رہ گئی تھی۔“ سید امیر علی صاحب اپنی تاریخ اسلام میں فرماتے ہیں کہ ”انجمن نے اکثر دفعہ حضرت علیؑ کو خلیفہ کرنے کا اشارہ کیا تھا مگر کوئی ضابطہ مقرر نہیں فرمایا تھا۔ (موت کے پاس شارٹ ہسٹری آف سارا سنس نہیں ہے بلکہ ”وطن“ کا ترجمہ ہے۔ میں اس عبارت کو انگریزی میں دیکھنا چاہتا ہوں) اس بات سے ذلتی طبع، اسلامی فلسفہ کے خوف پر غالب آ گئی اور بعد کے زمانہ میں اس کا یہ نتیجہ نکلا کہ خانہ جنگیاں شروع ہو گئیں اور مذہب میں رخنہ پڑ گیا۔ اگر اس وقت حضرت علیؑ خلیفہ بنا دیے جاتے تو مسلمانوں میں تباہی بخش خون ریزیاں ظہور میں نہ آتیں۔“ یہ مؤرخین امیوی، یسوی، صدی عیسوی کے سیاسی مصلحت کے سایہ میں بول رہے ہیں۔ لیکن ہمارا امام اسلامی تباہی کے وقوع میں آنے کے صدیوں پیشتر عین دن کے دن کہتا ہے کہ: ”کہیں ایسا نہ ہو کہ آج کے دن کے بعد تم اس امر خلافت کو ایسی حالت میں دیکھو کہ اس میں تلواریں گھنٹی جاں ہیں۔ عہد شکنیاں ظہور میں آئیں۔ حتیٰ کہ تم میں سے بعض لوگ اہل خلافت و گمراہی کے امام اور اہل جہالت و نادانی کے پیرو ہو جائیں۔“ اس وقت اور اس وقت میں عناصر کافرق نہیں ہے تفصیل کافرق ہے۔

اگر طبع پیشتر سے تیار نہ تھیں تو یہ کیسے ممکن تھا کہ سرور عالم کی رحلت کے ساتھ ہی کوئی ایسا ارادہ نہ پختہ ہو جاتا جس کی غرض یہ ہو کہ ہم اپنے امور امت کی انجام دہی کے لیے رسول کے گھر جلا دینے تک باز نہ رہیں۔ مجھے اس میں کوئی حذر نہیں ہے کہ یہ خالص اور کمرانگی اقدام نہ تھا ایسا اقدام جو اس حد تک پہنچ گیا جو جس میں کسی مذہبی وقت سے چشم پوشی کی جائے یا اس کا لحاظ کرنا، ملکی فطرت یا کمزوری سمجھی جائے۔ بڑا ارادہ اور بڑی تعظیم تھی یہ بڑا ارادہ اور اس کی پختگی خصوصاً اسی وقت کی طرف سے جاہل جو ایک زمانہ سے قائم تھی کوئی ایسی سانس نہ تھی جس سے پتنگا اڑ گیا ہو، بلکہ جھگڑیں آگ لگنے اور قلعہ گیری کا سامان تھا۔ رسول کے گھر پر قبضہ کرنا، اور دھاک بٹھانا نہ تھا اسلام کے دل کو ناخون سے دہانا تھا سوچا اگر تم سوچ سکو کہ یہ بھی عقیدہ کی ایسی کوئی فوری کارروائی تھی؟ اپنے کو پہلاؤ اگر پہلا سکو کہ قلوب پیشتر سے نامواخت اور حفاظت پر تیار نہ تھے جو اپنی پختگی میں یہاں تک پہنچی۔

انسان کی ایک چال جسے وہ اکثر خود نہیں سمجھتا یہ غیر فطری نہیں ہے کہ اگرچہ انسان ایک گناہ کا ایک وقت ارادہ نہیں کرتا یا اس ارادہ کو محسوس نہیں کرتا لیکن اسباب گناہ کے جمع ہوتے ہی وہ اس طرح دوڑتا ہے کہ گویا وہ دیر سے پیدا ہوا گناہ کو تلاش ہے اس لیے کہ اس میں قابلیتیں نشوونما پاتی چلی جاتی ہیں۔ ان کے توڑنے کی کوئی فکر نہ کی تھی۔ فعل تو خیال کا نتیجہ ہے جس ایک مثال سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ کس طرح تیار ہو رہا تھا۔

آگ لگنے میں دیر نہیں ہوتی بلکہ شلگنے میں ہوتی سچ ہے کہ ایران اور روم کے مملوکوں کے پتروں سے مسلمانوں کے بڑے بڑے قسرن گئے لیکن یہ مل اس چٹاری پر بنے تھے جو رسول کے گھر کے لیے مخصوص کی گئی تھی۔ یہ سب قسرن مل گئے اور اس کی راکھ ہوا میں اڑ گئی۔ اس لیے کہ جو اصول رسول کے گھر کو آگ دکھا سکتا تھا وہ مسلمانوں کے گھر کو کیسے بچا سکتا تھا ایران اور

روم کی فتح اس لیے ہوئی تھی کہ اللہ کے لیے اور بہت سی لکڑی جمع ہو جائے۔ یہ صحیح نہیں ہے کہ آگ لگنے میں دیر ہوئی۔ نہیں لگنے میں دیر ہوئی۔ اس لیے کہ لکڑیوں میں گزشتہ یاد اور اس کے خصوصیات کی کچھ نی باقی تھی۔ اور فتوحات کی دیوانگی اور جوش منفیت نے یہ دیکھنے نہ دیا کہ خود ہمارے گھر میں سے دھواں اٹھ رہا ہے اور گھنے اور لہراتے ہوئے دھوئیں میں شعلے لپک رہے ہیں۔ دیکھا تو اس وقت جب کہ چارہ کار باقی نہ تھا اور اب یہ کچھ بھی باقی نہ تھی کہ آگ لگنے کے اسباب پر غور کریں۔ کیونکہ اسباب ایک طویل زمانہ کے نشوونما اپنا منہ چھپاتے تھے۔ ایک کھن تھا جو لاش کے گرد لپٹا تھا۔ ہر حیثیت کی آتش افروزی کے تذکرہ سے نہ صرف مجھے متذکرہ صدر باتوں پر غور کرنا منظور ہے بلکہ زکیہ کا فقرہ

طاہرہؑ کے فقرہ کی صدائے بازگشت

جی پیش کرنا ہے کہ: ”کیا ہمارا گھر چھو لگنے جاتا ہے؟“ پوچھنے والی رسولؐ کی بیٹی ہے۔ اس کی سوانح عمری پر غور کرو۔ شریف ترین خاندان عرب کی بیٹی جس میں ہمیشہ سے دنیاوی اور روحانی حکومت تھی۔ جس نے آنکھ کوئی تو دیکھا کہ باپ کے سامنے دل اور سر جھک رہے ہیں۔ وقت آتا ہے کہ وہ دنیاوی حاکم بھی ہے۔ لیکن اپنے باپ کی اس زیادہ اندر روش میں شریک ہے کہ ہم دنیاوی لذتوں کے لیے پیدا نہیں ہوتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ہم بہ فراغت بسر کر سکیں۔ لیکن کرنا یہ ہے کہ نہ ہو کہ کوئی ہموکا ہو اور ہم سیر ہوں۔ حاجت مند گرد تھے۔ ان کے خیال نے اپنے کو عبلا دیا تھا۔ یہاں تک کہ اس خرد و انگلے کو گھبرا کیا جس سے بڑھ کر مثال نہیں دی جاسکتی۔ اور نہ اس سے بڑھ کر کبھی کو اس کا اندازہ اور تجربہ ہو سکتا تھا۔ اس نے انھیں غرا کا پھر رد بنایا۔ غرا کو غربت میں انتہائی شریفانہ وقار پر قائم رہنے کا سبق دیا۔ انھیں تسکین دی کہ غربت یا امارت فی نفسہ ذلت یا عزت کی چیز نہیں ہے بلکہ دونوں سے جو محبوب پیدا ہوتے ہیں وہ قابل لحاظ ہیں۔ دونوں میں عزت و ذلت ہو سکتی ہے۔ امیر بننے اور امیرانہ عزت دکھانے کے لیے ہر تنفس تیار ہو جائے گا۔ لیکن ایسے جری کم نکلیں گے جو غربت کے امتحان کا دعویٰ کریں بلکہ اسے پسند کریں۔ حالانکہ امیر ہو سکتے ہوں اور ہوں اور دعویٰ کے بعد اپنے کو ایسا دکھائیں کہ غمزدہ ان کے پاس دوڑتے تھے کہ ہمیں تسکین دی جائے گی۔ کیونکہ ان کی تسکین قابل قدر تھی۔ وزن اور اثر رکھتی تھی۔ انھیں جمع کرنا نہ تھا ہانٹنا تھا۔ یہاں تک کہ ایسی ضروری اور یادگار چیزیں بھی فقر کی راحت کے لیے صرف کر دی ہیں جسے رسولؐ نے عطا کی ہوں۔ حقہ کی یادگار ہوں جس پر خود اور بچے آرام کرتے ہوں۔ ہم خاک پر سو رہیں گے لیکن یہ نہ کریں گے کہ خدا کے بندہ کا دل توڑا جائے۔

ان کے ایسے پختہ اور حاکمانہ وقار کے باوجود ان میں ایسی محبت، ہمدردی اور رحم کہتا ہے کہ ان کی حکومت نے ایسا جلوہ دکھایا۔ ان کی ذات اور عمل میں دکھایا اگر کبھی دکھایا۔ قاتنی مبالغہ نہیں کرتا جہاں وہ کہتا ہے کہ: ”روز روشن خواجہ ہر شیر مرد شام تاڑے غلام ہر سیر زن۔“ واقعہ ہے شاعری نہیں ہے۔ یہ اس بی بی کے شوہر کی تعریف تھی۔ علی کو اپنی آنکھوں سے مسلح ہوتے دیکھا تھا۔ رخصت کیا تھا اور غم نہ پھیر کر آنسو ٹپکادیے تھے۔ صبر کیا تھا۔ خطروں میں جانے دیا۔ اس لیے کہ وہ امر جو اس کا باپ اور شوہر کرے بغیر سوال کے ان کے لیے قابل پیروی تھا۔ محبت تھیں کہ بڑی وجہ ہے۔ اور پھر اپنے کانوں سے علیؑ کو کامیابی اور ادائے فرض کے بعد یہ کہتے بھی سنا تھا کہ: ”لو اسے فاطمہؑ یہ تلوار جو جس سے میں نے خدا و رسولؐ کی نصرت میں جنگ کی ہے۔“

کیسے حاکم تھے؟

اور باپ نے اس کی تصدیق کی تھی۔

مختصر یہ کہ وہ جس کی شان اور آن بغیر کسی ٹھیس کے ترقی پذیر تھی جس نے کسی مظلوم، غریب، یتیم اور اسیر کی تسکین میں کوتاہی نہیں کی آج اسے دیکھنا ہے کہ وہ لوگ جو ہمارے آستانہ کی خاک کو بہ فرس پر لگاتے تھے یہ کہہ سکتے ہیں کہ: ”ہاں گھسہ چوٹک ڈالیں گے، نہیں تو تم بھی بیعت کرو جس طرح اور مسلمانوں نے بیعت کی ہے۔“ رسول کی لاڈلی مسلمانوں سے فریاد کر سکتی تھی لیکن موقع یہ پیدا ہو چکا تھا کہ بہت سے مسلمان قول میں گرفتار ہو چکے تھے خانہ عرب فطری مددگار تھا لیکن دیکھتی ہیں کہ شیر کو اپنے گرفتاری کی اس وقت خبر ہوئی جب کہ ہر طرف سے مضبوط سلاخوں میں گھر گیا تھا اس کے بعد زور دینے کے معنی یہ تھے کہ ہم اس امکان پر بھی راضی ہیں کہ قتل ہو جائے اور غافل بے گجے ہوئے بہت سے مسلمانوں کو قتل کرو، یا قتل کرو اور اس کے بعد انتقام اور صداوت کا سو بڑھتا جائے۔

مسلم نمائش کی غرض مسلمانوں کو جو نئی مصلحت کے متبذ ہو گئے دیکھا کہ وہ حملہ آوروں کے جوش سے آ رہے ہیں۔ مگر کاغذیہ کرانا ہو یا اپنے قوت کی نمائش ہو۔ اور یہ سب اس لیے کہ علی بھی ہماری اطاعت اور پیروی کو واجب جانیں۔

شرفائے عالم کے غور کے قابل یہ مسلمانوں ہی کی تاریخ کا ایک سیاہ ورق نہیں ہے، بلکہ موقع وہ ہے جہاں ہر قوم کا شریعت اس عبرت خیز واقعہ سے متاثر ہو گا۔ جس میں دم کی ہونے آن والے دیکھتے ہیں کہ ہمیں صدمہ پہنچایا جا رہا ہے۔ اور ہمیں برداشت کیے بغیر چارہ نہیں ہے۔ توہین میں اور زیادہ تلخی اس سے پیدا ہو گئی ہے کہ یہ ان کے ہاتھوں نہیں ہے جن پر ہمارا احسان نہ ہو بلکہ ان کے بدولت جن کے سر کے بال قبول انہیں کے ہمارے ہاتھوں اُگے ہیں۔ حالت میں کچھ ایسا ہی درد مبر تھا کہ قطعہ جو ایک حملہ آور سپاہی کی حیثیت سے کیا تھا اس پر رو دیا کہ بیٹی باپ کو پیلا کر رہی ہے۔

واقعات جن سے وہ نہ رُسکے جتھیں رونے کا سب سے زیادہ حق تھا تم سوچ گے کہ رحلت و واقعات نے ان کو اطمینان سے رونے نہ دیا ہو گا۔ جتھیں رونے کا سب سے زیادہ حق تھا۔ بلکہ اور بہت سے غم اصلی غم میں شامل ہو گئے ہوں گے۔ ہم لوگ جن کی آنکھوں پر تیرہ لمبی اور تاریک صدیوں کا پردہ پڑا ہے۔ ان حالات کا صحیح اندازہ نہیں کر سکتے اور نہ یہ ہمارے امکانی طور میں ہے کہ اس سے کس درجہ نفرت اور خستہ پیدا ہو گا۔

اس وقت علی کا شغل یہ سوچنے پھرنے میں سانس رکھتی ہے کہ علی کیا کرتے ہوں گے ابھی تک سینہ اور گردن کے قریب رسول کی آخری سانس کا احساس باقی تھا۔ کھلتی ہوئی صورت بھول نہ تھی۔ دفن کرنے کا عالم یاد تھا کہ ہر طرف سے نئے دور دورہ کے آئینہ دکھائی دینے لگے۔ یہ کیا کم تھا کہ اس کا سایہ اٹھ گیا جس کی گود میں آنکھ کھول۔ جس کی زبان چوں کر بڑے پھلے۔ جس نے فطری جوش کی زیادتی کے ساتھ ان باتوں کا جوش پیدا کرنا شروع کیا جو علی کی زندگی کی خصوصیات میں ہیں۔ جس نے اپنا شیل اور شارح بنایا جس نے آئینہ کے لیے معاملات کا تجربہ کر لیا اور فس کے لیے راستے صاف کر لے اور پہنچا دیے۔ آج اس کی منہ اس کے قدم کے نیچے ہے ”جس کی چل جائے!“

اور جناب فاطمہؓ کے اس عظمت ریزیٰ فخر میں دیکھنا تھا کہ: ”رسولؐ کے میٹر کو تاریکی نے ڈھانپ لیا۔“

زوال کی ایک لازمی بے رحم شان لیکن صورت یہ تھی کہ محض روحانی حیثیت سے امت کی عدم مرکزیت دیکھنی نہ تھی یا یہی نہ تھا کہ ہماری گود کا پالا دین ہر زبان کی

گویائی اور ہر عقل کی تاویل کا تابع ہو گیا ہے بلکہ ان کے لیے بھی یہ عالم تھا کہ ایک بڑے گھر کی تباہی اس وقت تک برابر زوال کی تابع رہتی ہے جب تک وہ اپنے کو اس کی روش کا خور اور اپنے کو اس کا دست نگر نہ بنائے جس کا عروج اس کی تباہی کا باعث ہوا۔ اور عروج پانے والا مطمئن ہو کر اسے بغایت بسر کرنے کے سامان فراہم کر دے۔ زوال پذیر کے لیے یہ فطری ہے کہ کچھ دنوں یا دو ایک پشتوں تک اپنی آن کو اپنے سر میں رکھے اور دست گیری یا صاحب اختیار کی خوشامد کے مقابلہ میں اپنی خاموشانہ غیرت کو زیادہ پسند کرے اور گرتے گرتے تباہی کی انتہائی حد تک پہنچ جائے اور اس درمیان میں صاحب اختیار کی مصلحت نہ صرف جم جائے بلکہ تسلیں بناد ہو جائیں جنہوں نے اس روش کے سایہ میں بسر کرنا سیکھا ہے۔ اس وقت تازہ حادثہ تھا اور دیکھنا یہ تھا کہ نہ صرف ہم کو اختیار سے دست بردار ہونا پڑا ہے بلکہ کوشش یہ بھی ہو رہی ہے کہ بقول حضرت سیدہ فرزندوں کا وقت و معیشت بھی لے لی جائے۔ اہل بیت رسالت کے لیے تغیر حکومت اس لیے اور ظلیف وہ تھا کہ انہوں نے اپنے زمانہ حکومت میں اپنا گھر نہ بھرا تھا اب وقت تھا کہ علیؑ دیکھیں کہ سیدہؓ کی گواہی جھٹلائی گئی اور ظاہر دیکھیں کہ علیؑ کی گواہی کو دھت نہ دی گئی۔ اس لیے کہ رسولؐ کی جلداد پر ہمارا حق قبول کرنا امارت کے لیے فطری حق دار کا سوال سامنے کھڑا کر دیتا ہے۔ یہی نہ تھا کہ ہم میں ہفتہ، افسوس اور نفرت پیدا ہو اور ہم صبر کریں بلکہ یہ بھی دیکھیں کہ دختر رسولؐ کا نسب نازک دل لڑ رہا ہے۔ یہی جذبات ان میں بھی پیدا ہو رہے ہیں وہ کھل رہی ہیں اور ہم دیکھ رہے ہیں اور اس سے کسی طرح کم یہ احساس نہ تھا کہ چھوٹے چھوٹے بچے ہر طرف دیکھتے ہیں کہ آج ہم سے ہمارے نانا کی امت اس پیار سے کیوں متوجہ نہیں ہوتی جو پہلے تھی۔ رسولؐ کے بعد تو ہمیں اور لشکین کی ضرورت تھی۔ ہم نے کیا کیا ہے۔ بچے کیا جاتے تھے کہ زمانہ ہمیں اب شانزادہ نہیں سمجھتا بلکہ ہمارے اس خطاب پر، ہنس رہا ہے۔ حاضر باشوں کو اب دوسرے کام ہیں، وہ اپنی ماضیاتی سے کام نکال چکے۔

علیؑ تھے اور یہ روح فرساعم تھے۔ سوچو اس ظلیف وہ کوشش کو کہ جناب امیر بیحیثیت امیر خاندان کے اس امر کی کوشش کرتے ہوں گے کہ ہمارے چہرے سے غم کے آثار ظاہر نہ ہوں۔ جس سے ہمارے متعلقین افسردہ نہ ہوں۔ ہم بغیر سامانوں کے لشکین دینے کی کوشش کریں۔ علیؑ کا رد اس قدر دردا انگیز نہ ہوتا جس درجہ ان کا صبر غم آلود ہے۔ میں مولوی عباسی صاحب کے ساتھ سوچتا ہوں جہاں وہ فرماتے ہیں کہ جناب امیرؑ کا غم حسینؑ کے غم سے کسی طرح کم نہ تھا۔ افسوس ہاں۔ علیؑ تھے جنہیں غم کا دھکا پہلے لگا اور بقیہ عمر اس طرح بسر ہوئی کہ ایک سے ایک بڑھا ہوا صدمہ پہنچتا اور دیکھتے۔ جناب امیرؑ سے بیعت کرانے کی کوشش ان کی طبیعت شناسی سے اس قدر جاہل نہ تھا جس قدر نئے نئے صاحب اختیار ہونے کے دلولہ سے

کوشش اور اس کا تجربہ

تھا یا اس وجہ سے ہو کہ ان کے دشمنوں کو اپنی ماتحتی میں جمع اور انہیں توہین پر آمادہ دیکھ کر انہیں رد کرنے کی جرأت نہ ہو سکی۔ لیکن گرفتار شیر سے بھی آنکھیں ملانا آسان نہیں ہے۔ جس میں اس سے بھی مدد ملی کہ علیؑ نے مجمع میں اپنے حقوق کا

اعلان کیا۔ اب تک یہ ہو سکا تھا کہ بنی ہاشم کی طرف سے جاہلی پیدا ہو جاتا اور لوگوں کو قول دیدیتے لیکن ابھی اس کا تجربہ نہ ہوا تھا کہ لوگ اس پر بھی آمادہ ہو جائیں گے کہ اگر وہ بیعت نہ کریں تو ان سے بزورِ شمشیر معاملہ کیا جائے۔

دھمکی کو عمل میں لانا مصلحت کے خلاف تھا ایسے محدود تجربہ کے لیے آمادہ ہونا تین مصلحت نہ تھا اور اگرچہ یہ دھمکی دی گئی تھی کہ بیعت نہ کرو گے تو

گردن مار دیں گے۔ لیکن یہ فقرہ بہت سی حالتیں اور اس تصفیہ کی مجبوری بکھارتا ہے کہ: ”ساتھ گفت اے ابوبکر چہ چیز ترابر این داشت کہ والی مردمان شوی و ملائکہ نمی میکردی ملا از انکہ بر دو کس امیر ہاشم گفت مارا ازین چارہ نیست ترسیدم کہ امت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم متفرق گردند و خلل افتد در دین“۔ یعنی: ”کسی نے پوچھا اے ابوبکر تجھے کس چیز نے آمادہ کیا کہ لوگوں کا حکمران بن بیٹھے۔ حالانکہ تو ہمیں دو بندوں پر حاکم بننے سے روکتا تھا انہوں نے کہا میں مجبوری تھی میں ڈرا امت محمد رسول اللہ کے متفرق ہونے اور دین میں خلل پڑنے سے“۔ بہتر ہے کہ راوی نے ہمیں سائل کا نام نہیں بتایا نہ ہمیں کوئی ایسی ضرورت ہے کہ ہم خالد کے ایسے ہمسایہ بن جائیں۔ لیکن اس کے کوئی معنی ہیں کہ لوگ تجھے جو اس خیال سے آسانی سے سانس نہیں لے سکتے تھے کہ ہم دو آدمیوں پر امیر نہیں ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ دو آدمی جناب امیر اور ستر تھے۔ دین کے ساتھ ہمدردی کے لحاظ سے ظل نہ پڑنے دینا حکم یہ کا حق شہرہ آفاق اگر عمل اس کے خلاف کچھ نہ کہتے۔

بیعت کا تشدد بنی ہاشم کے لیے حفاظت کا بلکہ بہت ظاہرات یہ تھی کہ مبادا ایسی سختی حفاظت کے

مسئلہ ہو جاتا جو حکومت کے لیے رسول کی خیال سے انہیں بھی بزورِ شمشیر مقابلہ پر آمادہ نہ کر دے

رحلت کے قریب زمان سے غمزدوش تھا اور یہ تلوار علی کے ہاتھ میں ہو اور اس وقت بنی ہاشم

خلافت حاصل کرنے یا نہ کرنے کو چھوڑ کر عرب کے عام دستور کے لحاظ سے اپنے خاص فرد کی حمایت اور حفاظت کے لیے

کھڑے ہو جائیں۔ اور انہیں آمادہ جنگ دیکھ کر عامہ مسلمان کارٹ بدلتے لگے اور مغرور ابو سفیان اپنے سوار پیادہ لے آئے۔

جے جناب امیر کے حقوق کی بچی تائید ہو یا نہ ہو لیکن وہ ایک مستند خاندان کو بنی تم پر ترجیح دے۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ سعد

اگرچہ عامہ مسلمان کے نزدیک کسی طرح اس وقار اور وقعت کے درجہ پر نہیں ہو سکتے تھے جیسے جناب امیر تھے لیکن تاہم یہ

ایک بڑے قبیلہ کے رئیس تھے۔ اب یہ گھنا آسان تھا کہ حکومت کے ساتھ تلی بجانے والے کسی شخص خاص کے ٹکر نہیں ہوا

کرتے۔ وہ اختیار اور ہوا کے غلام ہیں۔ در اخالیکہ وہ جو قبیلہ کے عہد اور قرابت کے پاس سے لڑنے کو آمادہ ہوتے ان کا

جوش اور اغلاص بدرجہا زائد ہوتا۔ اب ہر شخص کو تصفیہ کا اختیار ہے کہ یہ احتیاط دین میں ظل نہ پڑنے دینے کی وجہ سے حتی یا

محدود تجربہ سے گریز تھی کہ ان کے اقرار بیعت کے لیے اپنے اختیار میں رحمہ نہ پیدا کرو جس سے لوگوں کے خیال بدلنا

شروع ہوں۔ در اخالیکہ ہم سے اختیار چھین لینے کے لیے کوئی عملی کوشش نہیں کرتے بلکہ صرف پر وقار کنارہ کشی

چاہتے ہیں۔ مصلحت یہی ہے کہ انہیں ان کے حال پر چھوڑ دو، اور کہہ دو کہ اگر تم بیعت نہ کرو تو تم پر کوئی تکلیف نہیں ہے۔

سعدی شہر کا قاتل جن تم نے غالباً غور کیا ہو گا کہ سعد بن عبادہ کو کونسا جن اور کیوں

قتل کر سکا تھا یقیناً کوئی جن خلافت کا رقیب نہ تھا قتل کر سکا تھا یقیناً کوئی جن خلافت کا رقیب نہ تھا

علی کے بیعت نہ کرنے کا اثر علی کے بیعت نہ کرنے کا اثر سوچنا مشکل نہیں ہے۔ سرورِ عالم کی رحلت کے بعد فوری جوش یا جھل نے کچھ ہی کیوں نہ کر لیا ہو لیکن ایک مضبوط لہر ہر شخص اپنے دماغ سے ٹکراتی ہوئی محسوس کرتا ہو گا جس وقت سنا اور دیکھا ہو گا کہ زوجِ بتول مرعوب نہیں ہوا۔ علی اس سے نہ صرف اپنی جگہ قائم رہے بلکہ اپنے تمام گزشتہ وقار کو اپنی پہلی شان سے لوگوں کی نظروں میں قائم رکھا، بلکہ اس استقبال اور حیرت نے اس میں اور اضافہ کیا کہ ایسے امتحان خیز وقت میں بھی ان پر کوئی اثر نہ ہوا۔ اس سے علی لوگوں کے دل اور دماغ پر بیٹھ گئے۔ کیا ہوا اگر لوگ حکومت پر بیٹھے اس سے علی بیانے خود ایک مرکز ہو گئے۔ ہر دم لوگوں کی نگاہیں اٹھ سکتیں اور ان کی ذاتی قابلیتیں سمجھنے میں مدد دیتے۔ واقعات ہیں جن کے منہ میں یہ زبان ہے کہ حکومت بھی کبھی کبھی مشتبہ نکالیں ہٹا کر ان کی طرف اس نگاہ سے دیکھتی تھی کہ اس وقت ہماری ضرورت ہے۔ لوگ بھی اسے دیکھتے تھے اور اب علی کے وقار میں روحانی زیادتی ہوتی جاتی تھی۔ یہ واقعہ تھا کہ لوگ پیٹ بھرنے حکومت کے پاس جاتے تھے اور تمام وقتوں میں ان کے حلقہ میں اس احساس کی گد گدی ہوتی ہو یا نہ ہو کہ علی ہمارے دماغ میں بیٹھے ہیں۔ لیکن موقع کی چھیڑا نہیں بغیر یاد دلانے نہ رہ سکتی تھی۔

کفر اور اسلام کے متعلق علی کے تصفیہ کا عامہ ناس پر اثر صحابی بات نہ تھی کہ لوگ یہ جانتے کہ علی کو حصول خلافت کا حق اور قابلیت ہے لیکن وہ خاموش ہیں اس لیے کہ امت جموں کے بیٹریوں کی طرح ایک دوسرے کی جان پر حملہ نہ کرے اور امن فساد سے مبدل نہ ہو جائے۔ ہم کوئی ایسی بات اپنی طرف سے نہ کریں جو اسلام کے حق میں مضر ہو اور نقص امن کہا جاسکے۔ وہ جانتے اور حیرت اٹھیں گھر نہ لے کہ علی کسی ایسی فوج کشی کے مخالف ہیں جس میں مسلمان ایک دوسرے پر جرات نثالی کریں۔ جیسے حکومت ان لفظوں میں ظاہر کرے کہ: ”علی آج کل کالِ استیلا کرتے ہیں اگر خدا غواستہ وہ نہ گئے یا ان لوگوں کے کفر و اسلام میں توقف کیا تو پھر کوئی لڑنے نہ جانے گا مگر بخوری سے۔“ علی اپنی بے اختیاری میں بھی صاحب اختیار دکھائی دیتے ہیں، جہاں ایک فعل کے لیے ان کا اقام نہ کرنا لوگوں پر یہ اثر کرتا ہے کہ کوئی اس فعل کے لیے بخوری کے اور کسی طرح آمادہ نہ ہوگا۔ یہ واقعہ آزادی اور بخوری کا فرق بھی دکھاتا ہے۔ جناب امیر کو ماضین زکوٰۃ پر نہ بھیجے کی اس مصلحت کا بھنا بھی مشکل نہیں ہے کہ وہ ان لوگوں پر نہیں بھیجے جاسکتے تھے جو ان کے حقوق کی تائید کرتے ہیں۔ یا لوگ ہیں جو موجودہ حکومت کے مخالف ہیں، ہو سکتا ہے کہ وہ علی کے طرف نہیں تیرے یہ کہ علی کی ماتحتی میں ایسے وقت ایک فوج دینا محموش ہے۔

یہ واقعات میں نے اس امر کے بھانے کے لیے لکھے ہیں کہ اہل بیت پر دھاک بھالنے کی کوشش کی گئی اور ان کے مؤیدین حقوق سختی سے کچلے گئے۔ یہ بھی میری غرض تھی کہ باوجود تغیر حکومت کے ایسی مثالیں دی جاسکتی تھیں کہ بیعت نہ کی جانے اور نہ کرانی جانے اور اس سے یہ کہنے کی غرض تھی کہ ان واقعات کو حسین نے دیکھا یا سنا تھا، جیسے آگے چل کر ان کی بڑھتی ہوئی عمر نے بھلا اور حالات سے طبعی مسس ہوا۔ اور باب دوم کے واقعات اور اس کے ثبوت سے یہ دکھانا اور بھانا مقصود تھا کہ کس طرح حسین سات برس کے سن میں اپنے حق سے محروم ہونے جو ان تک پہنچا۔

مباح ”سیرۃ الفاروق“ مسئلہ خلافت کا ذکر کرتے ہوئے حسینؑ اور ان کی اولاد کو

مؤلف ”سیرۃ الفاروق“ کا ایک اصول

دارسؑ تیار دے کر کہتا ہے کہ: ”بلاشبہ عرب کے واسطے یہ سب سے بہتر اصول ہوتا۔“

اس باب کی آخری بات پر اب

انصار نے رسولؐ کے احسان کا فائدہ اٹھایا تو کیا جواب دیا

توجہ دلاتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ

ہماری قرابہ نے جو پہلو اختیار کیا اس نے لوگوں میں طبعی بیگانہ پیدا کرنے میں کہاں تک اثر کیا۔ انصار ہماری قرابہ کے پدر عالی مقام کا یہ مشہور مطالبہ بھولے نہ ہوں گے کہ: ”اگر لوگ ایک طرف جائیں تو ہم اور ہمیں گے ہر امر اسے انصار تم جاؤ گے۔“ آج یہ دیکھنا تھا کہ قرادی ہاپ کے سوگ میں ان سے انتہائی کرنے کے لیے آنے پر مجبور ہو۔ انصار نے کسی ہی مفرد کیوں نہ ظاہر کی ہو لیکن ان کی پیشانیوں پر شرم کی نمی پیدا ہوئے بغیر نہ رہ سکتی تھی۔ اور تم سے کم وہ یہ سوچتے ہوں گے کہ غفلت میں ہم نے یہ خیال نہ کیا تھا کہ بنو رسولؐ ہمارے سامنے اس طرح کھڑی ہو جائیں گی اور گویا پوچھیں گی کہ: کیا تمہیں پھر کرنا چاہیے تھا۔ کیا ہم نے تمہارے ساتھ کوئی برائی کی تھی؟۔ میں کیوں ضعیف و حقیر کر دیا؟۔ تم نے کیوں منہ پھیر لیا؟۔

کیا مورخین کو بنت رسولؐ کا یہ فرمانا معلوم ہوتا بغیر ان لوگوں کے سننے ہوئے جو اس وقت موجود تھے کہ: ”بابا ہم نے آپ کے بعد کیا کچھ نہ دیکھا؟“۔ لوگوں نے نہ اس کھوں پر پی ہاندھی تھی اور نہ کانوں میں ردی رکھ لی تھی جو انہیں نہ معلوم ہوا کہ جناب فاطمہؑ زہراؑ کو ان کے پدر بزرگوار کی میراث نہ ملے۔

ہو سکتا ہے کہ ہمارا زادہ زکیہ کے اس فرمانے کے اثر کا اور اندازہ نہ کر سکے کہ میں ہمیشہ بد و مادیوں کی لیکن ان پر اثر کا خیال کرو جنہوں نے رسولؐ کے نہان سے سنا تھا کہ: ”فاطمہؑ کی خوشی میری خوشی اور اس کی ناخوشی میری ناخوشی ہے جس نے اسے رنجیدہ کیا اس نے مجھے رنجیدہ کیا۔“ جواب یہ سنتے ہوں گے کہ بنت رسولؐ کو ناخوش کرنے کے بعد لفظوں سے تسکین دینے کی کوشش کی گئی اور انہوں نے نہ جواب سلام دیا اور نہ دیوار کی طرف سے منہ پھیرا۔

تاکید جس سے متفرکچ میں آتا ہے

لوگوں سے متفرکچ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے خبر غلط چھپانے کی تاکید کہ ہم تمہاری ہمدردی اور عیادت نہیں چاہتے ہیں غم کرنے دو۔ ہمیں مرنے دو۔ ہماری لاش کے قریب نہ آؤ۔

عیادت کرنے والی عورتیں کیانتی ہیں اور اس کا اثر

یہ سننے کے لیے کہ: ”بہزار ہوں تمہارے مردوں سے میں نے ترک کیا انہیں قبل اس کے کہ ان کی آتماں کروں اور بہزار ہوں میں ان سے بعد امتحان کے اور دریافت اور مشاہدہ کرنے ان کی خصلتوں کے۔“ اس لیے آئیں کہ عیادت کے رمی اہل منہ میں گم ہو جائیں اور اپنے مردوں کے ”بہڑا سب رانے“ کی ملامت سنیں۔ اور اس پر غور کریں کہ

خلافت ان لوگوں سے دور ڈال دی گئی جو کہہ پائے استوار رسالت اور اساس نبوت ہیں، اور یہ موقع ضائع کیا کہ سہولت سے راہ حق میں لے جائے جاتے اور یہ سب دشمنی اس لیے کہ علی سے جہاد کا انتقام لیا گیا۔

مردوں میں شرم کا بیج شرم اور غیرت میں ڈوبی ہوئی عورتیں اپنے مردوں کے پاس پہنچیں اور وہ سب ہاتھ بیلان کیں۔ مجھے یہ کہہ دینا ہے کہ سننے اور بیان کرنے والیوں میں سبب خصال عرب کی مائیں تھیں جس کی حقیقت اور غیرت مشہور ہے۔ جنہوں نے اپنی آنکھ اور کان سے گزرتی ہوئی یادگار رسول کو یہ خم انگیز ہاتھ بیان کرتے سنا تھا جسے اب انہوں نے اپنے گھروں میں دہرایا۔ اثر کو سوچو اور فوری نتیجہ یہ دیکھو کہ لوگ جنس رسول کے در دولت پر کھڑے ہوئے ہذر کر رہے ہیں کہ: ”اے سیدۃ النساء! اگر ابوالحسن ہم سے ذکر کرتے اس امر کو قبل استوار کرنے ہمارے عہد کے تو ہم عدول نہ کرتے۔“ اور جواب یہ سننے کہ: ”مجھ سے دست بردار ہو اور اپنے کو مجھ سے باز رکھو کہ تمہارا ہذر قبول نہیں ہے۔“ یہاں تک کہ چند ہی روز کے بعد سننے کہ بتول ہذر ا خاک میں چھادی گئیں۔ اور ہر شخص یہ کہتا اور ایک دوسرے پر تاسف کرتا کہ: ”رسول نے صرف ایک دختر چھوڑی تھی۔ حیف ہے کہ وہ رحلت کرے اور دفن ہو اور ہم لوگ نہ وقت وفات حاضر ہوں نہ نماز پڑھیں اور نہ دفن میں شریک ہوں!“

جناب امیر کس موقع کو کام میں نہیں لائے اور کیوں قیاس نہیں کیا جاسکتا کہ یہ ہاتھ بغیر گہری لکیر ڈالے ہوئے گزر گئی ہوں۔

علی کی ذات نے اپنی روش سے اگر اہل بیت رسول کی ذات، قابلیت، خدمت اور حق کی طرف ہلکی ہوئی توجہ کو کھینچا تو جناب فاطمہ سنی رسول کے خون نے لوگوں میں رم، ہمدردی اور جوش پیدا کیا۔ کیا ہوتا اگر جناب امیر اس وقت تلوار سے استفادہ کرتے۔ لیکن جناب امیر اس سے ہلاتے تھے کہ وہ ان چیزوں کو حصول اختیار کے لیے مدد کو بلاتے۔ کافی تھا ان کے لیے کہ وہ اپنی جگہ چھوڑ دیے جائیں اور کسی کے فعل کے ذمہ دار نہ ہوں۔ انہیں ترتیب مشرکان کی فرصت ملے۔ اگرچہ عالم کی بددینی سے ایسے موقع پیش ہوں کہ باوجود اس علم کے کہ جناب امیر نے قرآن جمع کیا ہے، لوگ اس سے اپنے کو مستثنیٰ سمجھیں۔ اور آئندہ کوئی معرض یہ کہہ سکے کہ قرآن من حیث الترتیب قابل اعتراض ہے۔ بغیر یہ جانے ہوئے کہ موجودہ قرآن کی ترتیب کا کون ذمہ دار تھا۔

فاطمہ کی رحلت اس تسکین کا عدم تھا جس سے ہجوم غم میں راحت تھی علی کا وہ یادگار موقع تم بولے نہ ہو گے کہ

وہ ایک دفعہ کے مقرر سے کسی انصار کے ہاٹھ میں فرماتے ہیں کہ تو نے اس چیز میں حرکت لے دی جو ساکن تھی۔ اور سوتے ہوئے خیال کو بگاڑ دیا۔ آج وہ خوشگوار اور درندہ تھا کہ جناب رسالت مآب زوجیت کا افتخار عطا فرمائیں آج یہ دھڑکن تھی کہ رسول کی یادگار لاشانی خاک کے سپرد ہوا چاہتی ہے۔ ان تمام روح فرسادموں میں جس تہاذاات سے تسکین ہے وہ بھی رخصت ہو رہی ہے۔ یہ علی کی حالت ہے کہ عہد چھینک دی، عمامہ اتار دیا، اور بند قبا کھولنے لگے! سرہانے بیڑ کر رخصت چلے والی کی آنکھ میں آنسو دیکھے۔ وجہ پوچھی اور جواب ملا کہ: ”ان ظلموں پر روتی ہوں جو تم پر میرے بعد ہوں گے۔“ مسیحا تصفیہ ہے کہ اس صبر شکن فقرہ کے سننے کے بعد علی میں ضبط اور صبر نہیں رہ سکتا تھا۔ محبت کرنے والا اس وقت

کے لیے رو لیتا ہے جب وہ نہ ہوگا محبت دم توڑتی تھی محبت کی تصویر آنکھوں کے سامنے مسٹ رہی تھی۔
 کوئی گھر آج کے دن دارالنبوت سے زیادہ عزیز نہ تھا جہاں سات آنکھ
 برس کے دو بچے جو ابھی ابھی دو ڈھائی مہینہ قبل تانا کو روچکے ہیں، آج
 ماں کو رو رہے تھے رخصت ہوتی ہوئی ماں کو اس سے شکین نہیں ہے کہ کون میرے بچوں کی خبر گیری کرے گا جس میں
 چھوٹی چھوٹی لڑکیاں، زینب اور ام کلثوم بھی تھیں وہ افسوسناک وقت آیا کہ جناب امیر سرخاک پر رکھ دیتے بچے آخری
 مرتبہ ماں کو چومتے اور سینہ پر لٹتے اور اس جنت میں آخری مرتبہ ”الصلوة یا بخت رسول اللہ“ کہتے ”لو اقمہ خالی کر
 رہے تھے جہاں فرماتے تھے کہ: یا رسول اللہ! آپ کی دختر اکسینہ گہر کے انتقال سے میرا صبر کم ہو گیا
 علی فرار ہے تھے اور یہ ان کا صبر تھا جو کم ہو رہا تھا!۔

قصہ یہ فقرہ یاد ہو گا جو حکومت کی زبان
 سے ادا ہوا تھا کہ: ”جب تک قلم“

ان کے پہلو میں ہیں ہم بھی احمیں (علی کو) مجبور نہ کریں گے۔ یعنی گزشتہ تمام صدیوں کے علاوہ جناب امیر کو اب اس
 تردد کا سامنا تھا کہ قبول صواعق: ”عز و جانے کہ بواسطہ حیات حضرت خیر النساء فرد مردمان بود۔“ اب اس
 منزلت کا وسیلہ نہ رہا جس کا علی کے پاس نہ رہنا یہ سچی رکھتا تھا کہ حکومت کو اب وہ ”وقت نما“ کہ اپنے طریق سے
 علی کے دقار کو علاوہ اس کے دلوں سے زائل کرنے کی کوشش کر سکے

—

باب سوم

رسول اور اہل بیت کے نام و حقوق وغیرہ کے زائل کرنے کی کوششیں (غفلت)

رسول کے بعد دورِ حکومت میں توجہ کے قابل نام
میں نے ابھی اس امر پر توجہ نہیں دلائی کہ حکومت کے تھے دور میں کون سے اعمال توجہ کے قابل ہیں۔ مجھے صرف انھیں سے تعلق ہے جو گزشتہ زمانہ میں اپنے کسی خاص میلان یا آئندہ زمانہ میں ایسی ہی حالت کے لیے مخصوص ہونے والے ہیں۔ یہ کہا گیا ہے کہ زیادہ بن لیبہ وہ شخص تھا جس نے نہ صرف ابن ابوقحافہ کی تائید کی بلکہ حضرت عیسیٰ میں شورش کی تحریک کا بھی باعث ہوا اور آئندہ جو لوگ قبیلہ کننہ سے لڑنے کے لیے بھیجے گئے وہ حکمران بن ابی جہل اور مہاجر بن امیہ تھے۔ عموماً انھیں زکوٰۃ کی قسمت خالد بن ولید کے سپرد کی گئی۔ عمرو بن العاص قنصلہ سے لڑنے بھیجے گئے اور کچھ دنوں کے بعد قسطنطین ان کا مرکز ہو گیا۔

آگے چل کر شام کی فوج کشی میں نہ صرف متذکرہ صدر لوگ دکھائی دیے بلکہ ابوسفیانہ بن جراح، زبیر بن ابوسفیان، خود ابوسفیان، شریک، فداکلاخ اور ولید بن عقبہ بھی دکھائی دیے اور معاویہ بن ابوسفیان اپنے بھائی زبیر کی مدد کو بھیجا جانے لگا۔ دیوانی کے عہدوں میں ابوسفیانہ بیت المال پر، ابن الخطاب قنصلہ پر مامور دکھائی دیے گئے۔ اور خولان پر یثیل بن امیہ، زبیر اور زعمہ پر ابوموسیٰ اشعری مامور ہوئے گئے۔

پہلی خلافت میں حضرت عمر کا رسوخ
پہلے دورِ خلافت سے ابن الخطاب کے تعلقات بگنے میں اس سے لطف حاصل ہو گا کہ زبیر قحان اور امتداع جس وقت بحرین کے لیے غلیفہ سے ایک عہد نامہ لکھا کہ ابن الخطاب کی دستخط سے تصدیق چاہتے تھے انھوں نے اس عہد نامہ کو چاک کر ڈالا اس معاملہ میں طلحہ بن عبد اللہ درمیانی آدمی تھے بقول ابن خلدون: ”طلحہ کو بے حد برا فحشت کی پیدا ہوئی ابوبکر کے پاس آئے اور کہا: ”انت الامیر ام عمر؟“ یعنی: ”تو امیر ہے یا عمر؟“ ابوبکر نے جواب دیا: ”عمرو غیوان الطاعة لی“ یعنی: ”عمر امیر ہے، مگر فرمانبرداری میری ہے۔“

نام لینے سے مولف کی غرض
عمالوں اور عہدہ داروں کے نام لینے سے میری غرض یہ نہیں ہے کہ غلیفہ نے ان لوگوں کو ذمہ دار عہدوں پر مقرر کیا جنہوں نے انھیں مدد دی تھی۔ اور آئندہ سنبھالنے کی امید ہو سکتی تھی، بلکہ میں ان لوگوں کے نام کے ان عناصر کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں جو ایک زمانہ تک رسول خدا سے مسلسل جنگ کے لیے اجماع سے رہے۔ نہ میں اس کہنے سے یہ سمجھنا چاہتا ہوں کہ مجھے ان کے مسلمان ہوجانے سے کوئی شکایت ہے اور میں ان کے اس گزشتہ کافرانہ تعدی پر طنز کر رہا ہوں، یا انھیں اس جرم کا

مستوجب قرار دے رہا ہوں۔ جے اقرار اسلام نے دھو دیا۔ بلکہ میں اس سے یہ بھگنا چاہتا ہوں کہ آیا یہ سوچنے کی گنجائش ہے یا نہیں کہ اگرچہ یہ لوگ بادی النظر میں اصولاً مسلمان ہو گئے مگر ان میں عرب کا انتقامی عنصر بھی بچ گیا یا نہیں، جس کی واضح مثالیں آئیں گی۔

انتقامی خاصیت کس پر برا نکجنتہ ہو سکتی تھی صورتِ معاملہ اس سے اور پُر پچ ہو جاتی ہے کہ یہ انتقام یا رسول کی ذات سے مخصوص ہو سکتا تھا یا

اس سے جس نے سردارانِ قریش کو معرکہ ہانے جنگ میں قتل کیا۔ رسول سے کوئی متعلقہ اہم اور علی سے رسول کے زمانہ میں ایسا ہی اہم قریب قریب نامکین تھا لیکن اب حالت یہ پہنچی تھی کہ وہ خلافت کے لحاظ سے خلیفہ کا قریب تھا وہی ان کے انتقام کا مرکز تھا جو اگرچہ خلیفہ نہ تھے مگر خلیفہ کے مویدین تھے یا ہو گئے تھے، یا بنائے گئے تھے۔

انتقامی عداوت میں ایک مدد کہا جاسکتا ہے کہ ان عمال کی تقرری اس لیے نہ تھی کہ وہ کوئی تھی تحریکِ مخالفت کریں یا پرانی عداوتوں کو زندہ کریں۔ ہو گا۔ جے تو

صرف اس فطری میلانِ طبیعت سے بحث ہے جو ایسے مواقع پر ظاہر ہوتا ہے۔ اور قدرِ مشترک پر جمع ہونا قرینِ مصلحت سمجھا جاتا ہے۔ امید نہیں کی جاسکتی تھی کہ آپس کی ہمدرد جماعتیں اس کے علاوہ کوئی اور ترتیب صورتِ اختیار کریں جو دکھائی دے۔ جس طرح یہ عقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ اگر علی خلیفہ ہوتے تو ترتیبِ جماعت کے عنصر دوسرے ہوتے یا جماعتِ مختلف افراد سے مرکب ہوتی۔ اور نہ اس ترتیبِ جماعت کے بعد جو ہوئی اس کے علاوہ کوئی نتیجہ سوچا جاسکتا تھا جو نہ صرف اس وقت بلکہ اس کے کچھ پہلے سے ایک صورتِ اختیار کرنا جاتا تھا اور اس میں پھانسنے کے قابلِ نقد و نما ہوتا تھا۔ اگر اغفال سے غرض بھی جاسکتی ہے تو غالباً ابوشنفیان کی مثال کافی ہے کہ وہ شخص جو دوسرے فریق کو قوت دار مدد دینے پر آمادہ تھا وہ اور اس کے لڑکے اس لیے خرید لیے گئے کہ نہ انہیں مخالفتِ امویات

بنی ہاشم کے مخالف خادمان کے

خریدنے، بلکہ قوت دیے جانے کے معنی

کے سوچنے کی شہادت ہو اور نہ وہ آئندہ ہمارے خلاف ہمارے رقیب سے سلسلہ کلام جاری رکھیں۔ اس طرح امیہ کے خاندان کو جو بنی ہاشم کا مخالفت تھا وہ بنیادوں پر ہی تھی جس پر آئندہ اپنے کو مضبوط کرے۔

بنی امیہ حکومت کے مشکور خادم نہ ہو سکتے تھے

یعنی بنی امیہ کا موقع اس وقت یا اس کے بعد بنی ہاشم سے تو بالکل ہی آزاد اور دنیوی حیثیت سے زیادہ قوت دار ہو گیا بلکہ اس خیال نے کہ حکومت نے بھی میں اپنا مددگار سمجھا یا بنایا انہیں حکومت کا کوئی مشکور خادم نہ بنایا اور انہوں نے آئندہ اپنے لیے میدانِ صاف دیکھا۔

علی کی غیر مخالفانہ روش نے کس درجہ مفید اثر کیا اب ہم یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ علی کی غیر مخالفانہ مصلحت کس درجہ مفید تھی علی نے

اپنے روش سے نہ صرف حکومت کے جوشِ مخالفت کو فرو کر دیا بلکہ اسے اطمینان ہو گیا کہ وہ بڑا اس کے کچھ نہیں چاہتے کہ

ہم سے بیعت کرا کے ہیں اس امر کا طبع نہ قرار دو کہ ہم تمہارے افعال کے ذمہ دار اور شریک ہوں۔ بیعت نہ کرنے کے اعلان کا جو اخلاقی فائدہ تھا غیر مخالفانہ روش اس کا دوسرا اقدام تھا۔ یعنی وہ لوگ بھی جو حکومت کے خون سے ملے سے قطع تعلق کر دیتے اب حکومت کا جوش مخالفت نہ دیکھ کر سلسلہ ارتباط قائم کرنے میں متوجش نہ ہو سکتے تھے۔ یہ حالت ملے کے موافق جماعت تیار کرنے میں ایک بڑی وجہ ہوئی جو آئندہ موقع پر مفاد کھائی دے گی۔

جمادی الثانی ۱۳ ان واقعات کے تذکرہ میں اب ہم سلسلہ کے ماہ جمادی الثانی تک پہنچ جاتے ہیں۔ جس میں ہمارے ہیرو کی عمر دو مہینہ کم نو برس کی ہوئی ہے۔ وقت یہ ہے کہ خلیفہ طویل ہے، اور اپنا پناہ نشین مقرر کیا پاہست ہے۔ اور مؤرخین تالیفیں بجا رہے ہیں کہ کیا انتظام کیا ہے۔

خلیفہ ثانی کے طریقہ انتخاب کے متعلق ایک سوال اور کوئی مولوی شبلی صاحب کا ایسا ہی جوش تھا۔ **بہا خلیفہ سازی کی دوسری صورت تصنیف ہوئی** مولف ان فرائض کو خیر مقدم کرتا ہے کہ :

”حضرت ابوبکر صدیق کے بعد شاید بنو ہاشم کے دعوے سے دعوے سے پیش ہوتے لیکن حضرت عمر کی ہامنا بلہ و لیچہدی نے اس کا موقع نہ دیا۔“ (الغاروق) کون ہے جس میں ملاحظہ اپنی بیچ حالت میں ہے اور جس نے گزشتہ جمہوریت کی جھنڈی سخی ہے وہ اس ”ہامنا بلہ“ کے شخص اور تائید کرنے والے مؤرخ دونوں کے طرز عمل سے حیرت میں ڈوب نہ جاتے۔ مگر اور سوال کرے گا کہ جمہوریت کی وہ فریضی کہاں گئی جس نے اپنی طرز عمل کو رسول کے انتخاب پر مقدم رکھا۔ ابھی کے دن ہوئے ہیں کہ سفید کامیدان جمہوریت کے ادما کا اعلان بنا ہوا تھا۔

جمہوریت کی صورت کیا تھی زیر بحث نہانہ اس اصول کے اندر ہی نہیں آسکتا کہ جمہور نے کسی خلیفہ کا انتخاب چاہا تھا اور جمہور نے واقعی جمہوری انصاف اور طریقہ

سے منتخب کیا تھا۔ دویم یہ کہ اسی نہانہ میں اس سے روشن تر کوئی امر نہیں دکھائی دیتا کہ بعض لوگ تھے جنہوں نے کچھ لوگوں کے خیال اور عمل پر قبضہ کر لیا۔ جس کی غرض اور اخلاقی شان سے کافی بحث کی جائیگی۔ اور جب کچھ جماعت تیار ہو گئی تھی دیکھ کر جمہور مخالفت کرنا خلاف مصلحت سمجھتے تھے تو اسے عام اہم قرار دے لیا گیا۔ یہ صورت حقیقت میں خاموش رہنے والوں کی تعریف ہے نہ ان کی جنہوں نے جماعت سازی سے امن شکنی کا سامان نہیں کیا۔

اصول میں ترمیم ہو گئی مجھے تو اس وقت صرف ان مؤرخین اور حضرات کی خاموشی سے شکایت ہے جنہوں نے یہ اصول مسترد کر دے لیا تھا کہ حالت مرض میں مرض کو وصیت کرنے دینا

اے ”بنگ“ کرنا تھا یا ”کلیف دہی تھی“۔ لیکن اب تو یہ اصول قابل عمل تھا کہ : ”مشتقی ہدی ازین باز خواست چون کد بمرلا مست“۔ یعنی : ”اس کی حاجت نہ تھی مگر چونکہ ہماری مراد کے مطابق کام تھا پسند کر لیا۔“

بیماری میں تفویض اختیار واقعات یہ ہیں کہ جب خلیفہ طویل ہو گئے تو بقول ابوالقدا انہوں نے : ”حضرت عمر کو حکم دیا کہ وہ نسل پڑھا دیا کریں اور خلافت بھی ان کے سپرد کی تھی۔“

طبری میں ہے کہ : اندران بیماری ابوبکر رضی اللہ عنہ ہمہ روز در غم کد مسلمان بود کہ از پس خویش کرا خلیفہ کند پس دلش بر عمر رضی اللہ عنہ مستدار یافت۔ یعنی : ”اس بیماری کے اندر ابوبکر ہر روز مسلمانوں کے کام کے غم میں تھے کہ اپنے بعد کے

خلیفہ بنیہ پھر ان کا دل عمر پر قرار پڑ گیا۔

عمر کے متعلق رائے لی جاتی ہے

اسی مورخ کے موافق: ”خلیفہ نے عبدالرحمن بن عوف اور عثمان بن عفان سے ابن الخطاب کے متعلق صلاح کی اپنی عوف

نے ابن الخطاب کو ”درشت اور تنگ دل“ کہا۔ خلیفہ نے ان لوگوں سے یہ بھی تائید کی کہ کسی سے کہنا نہیں۔ ترجمہ ابن خلدون کے نوٹ میں اپنی اثر سے نقل کیا ہے کہ: ”خلیفہ نے عبدالرحمن بن عوف سے صلاح لی اور ابن عفان سے پوچھا جس میں آخر ادا کرنے لگا کہ:

لبصیغہ راز صلاح

”عمر کا باطن ظلم سے بچا ہے۔“ ابوبکر نے یہ سن کر دونوں آدمیوں سے انتقام راز کو کہا۔ اس مسئلہ میں طلحہ بن عبد اللہ آگئے۔ ابوبکر نے ان سے کہا کہ میں نے لوگوں پر عسر کو بٹا خلیفہ کید طلحہ نے جواب دیا کہ: ”محبوب تم اللہ تعالیٰ سے طاعت کرنے والے ہو تم سے اللہ پوچھنا کہ تم نے رعیت کے ساتھ کیا معاملہ کیا ہے ابوبکر نے کہا: ”مجھ کو اٹھا کر بٹھاؤ جب لوگوں نے ان کو اٹھا کر بٹھا تو یہ جواب دیا کہ: ”میں جب اپنے رب کے سامنے جاؤں گا اور وہ مجھ سے دریافت کرے گا تو میں کہہ دوں گا کہ تیرے مخلوق پر میں نے تیری بہترین مخلوق کو مقرر کیا ہے۔ طلحہ یہ سن کر خاموش ہو رہا ہے۔“

خلافت کے متعلق لوگوں کی رائے لینے کے قبل اپنا اظہار رائے

بعد ازاں عثمان کو عہد نامہ لکھنے کا حکم دیا۔ ابوبکر شدت طاعت کی وجہ سے رک رک کر بولتے جاتے تھے اور عثمان لکھتے جاتے تھے جب عہد نامہ لکھا گیا تو اس کو لوگوں میں پڑھے جانے کا حکم دیا اور خوبہر اگر لوگوں سے طالب ہو کر کہا: کیا تم لوگ راضی ہو تے ہو اس شخص پر جس کو میں نے اپنا خلیفہ بنایا ہے بے شک میں نے خلیفہ نہیں بنایا اپنے کسی عزیز و قریب کو میں نے اپنا خلیفہ بنایا ہے تم پر عمر کو پس اس کا کہنا سنو اور اس کی طاعت کرو۔“

ابوبکر عمر سے خلوت میں چند وصیتیں کرتے ہیں

”از مال کیسے لامن سوال میکنی تو مالی جمل دے از من۔“ اسی کتب میں ہے کہ: ”بعد ازاں امر فرمود تا عہد نامہ راسخ کردہ بیرون بروند و مردم بیعت کنند و بدان راضی شدند و ابوبکر عمر رادر خلوت طلب کرد و وصیتیں چند فرمود۔“ یعنی: ”اس کے بعد حکم دیا کہ عہد نامہ کو پھر لگا کر باہر جائیں اور لوگوں نے بیعت کر لی اور اس پر راضی ہو گئے اور ابوبکر نے عمر کو تنہائی میں بلا کر چند وصیتیں کیں۔“

لطیفہ

اسی کتب میں نہایت خوش مزہ یہ مثنوی ہے کہ جس وقت ابوبکر لوگوں سے پوچھ رہے تھے کہ: ”آیا میں سے عہد پر راضی ہو؟“ یہ سن کر حضرت علی بن ابی طالب نے فرمایا کہ: ”راضی نیستم مگر اس کے عہد تو در حق عمر بڑھ باشد۔“ اس لطیفہ کو اسی دوسری صورت سے ہم نے کہیں دیکھا ہے کہ جس وقت سر مہر لفظ سامنے آیا تو جناب امیر نے فرمایا کہ: ”میں راضی ہوں اگرچہ وہ عمر ہوں۔“

ابن حجر کے موافق حضرت عمر اور ابوبکر کے وجوہات فضیلت
 موافق عمرہ میں مجملہ ان وجوہات کو جن سے ابن الخطاب کو لوگوں پر فضیلت دی گئی ہے ایک یہ ہے کہ: "انہوں نے بیعت ابوبکر میں اجتہاد کیا اور وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے ابوبکر سے بیعت کی۔" جس طرح حضرت ابوبکر کی سائرس پر فضیلت شہادت کے لیے حضرت علیؑ سے یہ روایت ملتی گئی ہے کہ: "از جملہ شہادت ابوبکر قتل بود با جماعتی کہ منع ز کوفہ کردند۔" یعنی: "ابوبکر کی پہلاری میں سے یہ تھا کہ انہوں مانع ز کوفہ سے جنگ کی۔"

حضرت ابوبکر اور عمر کی معاملت
 یہ سوچنا کہ ابن ابوقحافہ نے ابن الخطاب کو خلیفہ کیا میرے نزدیک کسی حد تک آخر اللہ کر کے ساتھ نا انصافی ہے۔ جن وجوہات سے کیوں نہ جو میرے اثر کے موافق ابن الخطاب نے خلیفہ کی مرضی یا عدم مرضی سے اپنا موقع ایسا بنایا تھا جو جانے خود اگر ایک وقت میں دوسرا خلیفہ نہ کہا جاسکے تو غشی بگھنے میں کچھ خلوت کا زیادہ صرف نہیں ہے۔ اور بغیر ایک دوسرے کے درگزر کے چارہ بھی نہ تھا۔

خلیفہ اول سے جو کچھ خلیفہ ثانی کے متعلق
 کیا اس کی پیشین گوئی نہایت آسان تھی اختیار اس مثال سے مفید ہے کہ انہوں نے ایک ایسے عہد نامہ کو جس کی حکومت کی زبان نے تصدیق کی تھی بے وقتی کے تابع کر دیا۔ جس نے یہ سوال پیدا کر دیا کہ ابوبکر خلیفہ ہیں یا عمر اور حکومت کو یہ اس تادیل کے کوئی چارہ نہ ہوا کہ اسے اپنے سر اور نہ لے اگرچہ وعدہ کا اعتبار ختم خوردہ کیوں نہ ہوتا ہو۔ حضرت ابوبکر نے جو کچھ ابن الخطاب کے ساتھ کیا وہ ایسا نہ تھا جو امید کے باہر ہو۔ جب کہ عالمہ انصار کو وزارت کی حکمیں دینی جاسکتی تھی تو اس کے متعلق تو امید کہیں ٹھوکر کھائی نہیں سکتی تھی جس نے میدان حیات دیا ہو۔ پھر بھی میں اٹھیں ابوبکر کے سب سے بڑے بے غرض دوستوں میں شمار کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہوں۔ میرے نزدیک یہ اشتراک متعین تھی یا ہمزنی قوت۔ نہ مجھے یقین ہے کہ اگر بنی ہاشم کا علیحدہ رکھنا قدر مشترک نہ ہو تا تو صورت معاملہ آپس میں اس کے علاوہ نہ ہوتی۔

مولف کچھ ڈھونڈتا ہے
 یہ جانتیں اداسے فکر گزاری اور جزئی احسان میں یہ کرا سکتی تھیں کہ کسی مقرر کے جواب دینے کے لیے بستر بیماری سے اٹھ بیٹھتے۔ لیکن صرف یہی نہیں تھا۔ جاہد دینے کی یہ بے حسنی اور آملگی کی شواہد کسی ایسے امر میں محسوس ہے جس میں نہیں جانتا۔ میں غالباً غلطی نہیں کرتا جہاں میں بے تابانہ انداز کے پچھے کچھ ڈھونڈتا ہوں۔

تدبیری جواب کیوں تھا
 نہ میرے لیے اس کا تعین ممکن ہے کہ ابن ابوقحافہ کے نزدیک ابن الخطاب بہترین خلق تھے یا کیا معیار تھا۔ شاید یہ ہو کہ وہ ان کی خلافت کے پہلے مدتی تھے۔ دوسری بات اس تقریر کے متعلق یہ ہے کہ اگر ابن ابوقحافہ کو اپنے انتخاب کر لینے پر ایسا ہی وثوق تھا اور وہ اس پر بھی

آلودہ تھے کہ اگر خدا پوچھے گا تو ہم جواب دے لیں گے تو پھر انھیں اس مذہبی جلب کی کیا ضرورت تھی کہ انھوں نے اپنی ذات اور اس کے منصب کی مدد سے لوگوں کا اقرار حاصل کیا۔ انھیں کیا خوف تھا جو انھوں نے لوگوں کے اقرار پر اپنے منتخب کے نام کو مقدم نہ رکھا اور کیوں اہل مل و متحد کی رائے کی ایسی بے وقعتی کی کہ انھیں آزادی سے بحث کرنے کا موقع نہ دیا، بلکہ اپنے انتخاب کو قبول کر لینے کے لیے پیش کیا۔

طلحہ کا تنہا چپ کرانا بمقابلہ عامہ ناس کے آسان تھا شہ کے راستے صحت ہیں کہ کہیں عامہ ناس بھی طلحہ کی

زبان میں نہ کہیں کہ: ”مترقب تم اللہ تعالیٰ سے ملاقات کرنے والے ہو تم سے اللہ پوچھے گا کہ تم نے رعیت کے ساتھ کیا معاملہ کیا۔“ اکیلے طلحہ چپ کرانے جاسکتے تھے، عامہ ناس کو چپ کرانا مشکل ہو جاتا۔ اور یہی وجہ تھی کہ ابن عوف اور ابن عوفان کو راز کے افحاش کی تاکید کی تھی کہ کہیں اختتام اقرار کی راہ میں حامل نہ ہو جائے۔ خود ان لوگوں کا جواب بے غفلت نہ تھا بلکہ یہ بتاتے اپنے خود خلیفہ کو ذمہ دار بنا رہے تھے۔ ایک صاحب اختیار کے سامنے ان کی یہ احتیاط ویسی ہی تھی جیسی عامہ ناس میں پائی جاتی ہے، تاہم ان کا یہ کہنا کہ ”ان کا باطن ظاہر سے اچھا ہے۔“ باطن کی تعریف ہو یا نہ ہو لیکن ظاہر کی کوئی دلفریب نمائش نہیں ہے۔

ایک فطری سوال اور اس کا حل ان واقعات کے پڑھنے کے بعد فطری سوال جو ہر شخص کے دل میں پیدا ہو گا وہ یہ ہے کہ ابن ابوقحافہ کو دو برس کی حکومت سے

مسلمانوں کی اس درجہ ہنس کر ہو کہ وہ بغیر اس کے کہ ایک شخص کو حکومت کا عہدہ سپرد قرار دیں اور اس کے لیے تمام چنگی کر جائیں دنیا سے نہ گزریں اور رسول جنھوں نے بہت سے ایسے لوگ بنادیے وہ اپنے بعد کے لیے امت کی عین گیری کو پھیرے کی ہوا کے سپرد کر جائیں۔ ابوبکر ایسے شخص کو اپنا جانشین بنائیں جس نے ان کے حق کا بھول مورخین امامت مسجد یا ستیفہ میں لحاظ کیا۔ اور رسول باوجود ایسے شخص کے جوتے ہوئے جو اپنی شہ رگ کو رسول کی حیات کا پیش خیمہ نیکے رہا اسے بھول جائیں؟۔

مؤلف نبی بدلنے کے لیے تیار ہے اگر ایسا تھا کہ نبی عربی سے ابن ابوقحافہ میں یہودی عامہ اور فکر گزاری یا احسان شناسی کا زیادہ تھا تو ہم اپنا نبی

بدل دینے کے لیے تیار ہیں۔ خلافت کیا چیز ہے ہم صفت کے قدر دان ہیں محض ذات کوئی چیز نہیں ہے۔ مجھے کمال عقین ہے کہ یہ حالت قصہ قرطاس کو مل کر دیتی ہے۔

جناب امیر انتخاب اور منتخب کے زمانہ کے متعلق خطیبہ شمس شہید اس سے احتساب کے متعلق حسب ذیل مکتبہ نکالتا ہے۔

”یہاں تک کہ اول تو اپنے راستہ پر گزر گیا مگر اپنے بعد خلافت کے ڈول کو ابن الخطاب کے کنوئ کی طرف پھینک گیا۔ مگر مجھے تو تعجب اور سخت تعجب ہے کہ وہ جانے والا اپنی حیات میں بیعت خلافت کے توڑ دینے کا حکم دیتا تھا وہ اٹالہ طلب کیا کرتا تھا مگر باوجود اس قول کے اپنے مرنے کے بعد دوسرے کے ساتھ خلافت کو منھ کر دیا اور واقعی امر یہ

ہے کہ پہتان ناقہ خلافت کو دونوں نے آپس میں خوب ہاٹ لیا۔ افسوس خلافت کو ایک درشت مزاج اور تند خو کے حوالہ کر دیا۔ جس کی زبان کے زخم نہایت سخت اور کاری تھے اور جس کا چھوٹا بھی ناگوار تھا۔ جس کی گھٹارو کردار دونوں ناہموار تھیں۔ اس کی طبیعت میں سخت لغزشیں تھیں۔ وہ قدم قدم پر ٹھوکر کھاتا تھا اور پھر اپنی لغزشوں پر عذر خواہ بھی ہوتا تھا۔ ایسی طبیعت والے کی مثال بالکل اس شخص کی ہے جو کبھی بوجھ نہ اٹھانے والے اوٹ پر سوار ہو، اگر یہ سوار اس کی مہار کھینچتا ہے تو اس کی ناک پارہ پارہ ہوتی ہے اور اگر چھوڑتا ہے تو خود گرنے کا خوف ہے۔ حیات خداوندی کی قسم ہے کہ لوگ اس کی سبب سے خط میں مبتلا ہو گئے۔ ہر اہل دنیا اہل دینی و دنیوی امور میں رائے زنی کرنے لگے۔ متلون مزاجیاں دامن گیر ہو گئیں، اعتراضوں کی بوچھاڑ ہونے لگی۔

خالد کا عزل اور ابو عبیدہ کا نصب
 خلیفہ اول کے زمانہ میں چونکہ امورات انتظامی کی ابتدا پر یا انتہا کچھ ایسی بڑی نہ تھی اس لیے اس وقت تک اس اصول پر عمل ہو سکتا تھا کہ ملکی اور فوجی چھدے اپنے خاص خاص لوگوں کے سپرد کیے جائیں۔ خلیفہ ثانی کے زمانہ میں فتوحات کی وسعت نے اس اصول کو سالم رہنے نہ دیا۔ بلکہ اس کی عیوری ہوئی کہ وہ بہت سے لوگوں کو اپنے اعتبار میں داخل کریں۔ تاہم انہوں نے تغیر عمل میں سب سے زیادہ جو مشہور بات کی وہ یہ تھی کہ خالد بن ولید کو معزول کر کے ابو عبیدہ بن جراح کو حکام کے لشکر کا سردار بنایا۔ بقول ابن خلدون حضرت عمر کا یہ فقرہ توجہ کے قابل ہے کہ: ”اللہ ابوبکر پر رحم کرے، انہوں نے خالد کے امارت کی پردہ پوشی کر دی۔“ اور پھر آگے آئے والے زمانہ میں جب کہ خالد کی سپاہیانہ کارگزاریاں سنیں تو یہ بھی کہا کہ: ”میں خالد کو اس کے نفس کا سردار مقرر کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ ابوبکر پر رحم کرے وہ فجر سے زیادہ لوگوں کو بھارتے تھے۔“ خلیفہ ثانی کے ان دونوں فقرات کے تضاد پر خیال کرنے کے بعد ان کی طینت کے متعلق جناب امیر کا یہ ریمارک کج میں آتا ہے، جہاں آپ فرماتے ہیں کہ: ”وہ اپنی لغزشوں پر عذر خواہ بھی ہوتا ہے۔“ حضرت عمر کا اس شخص سے ناخوش ہونا جس نے احد میں انہیں پہاڑ کی طرف جاتے دیکھا تھا اگر محض اخلاقی وجوہات سے تھا تو پھر باوجود اس کے خالد یعنی مسلمانوں کے سپہ سالار کو ”اپنے نفس کا سردار“ بنالینا اخلاقی پسند کو ضروریات ملکی کا ناچ کر دینا تھا۔ نتیجہ سوچنے کا ہر شخص کو اختیار ہے۔ ان کا دور حکومت بمقابلہ پیشتر کے اگرچہ اعتبار کی وسعت کے لحاظ سے ممتاز تھا مگر ان کے زمانہ میں ایک نئی مصلحت کی بھی ابتدا ہوئی اور وہ یہ تھی کہ عربوں کو بمقابلہ دیگر ملک کے مسلمانوں کے زیادہ حقوق حاصل تھے یہ نہ صرف اصول جمہوریت کے منافی تھا بلکہ اخوت اور مساوات اسلامی کے قوت دار بڑے اصول کو شکست کر دینا تھا جو رنگ اور قوم کا امتیاز درمیان سے اٹھا دیتا تھا۔

صاحب سیرۃ الفاروق کے موافق انہوں نے خلافت کے خطبہ میں کہا کہ: ”قوم عرب چھدے ہونے ناک والے اوٹوں کی قطار کے مانند ہے۔ جس کی نکیل میرے ہاتھ میں دی گئی ہے۔“ یا عمرو بن عاص سے کہا کہ: اگر قریش کی جماعت تنہا ایک غار میں گھسے گی تو اعرابی وہاں بھی ان کی پیروی کریں گے اور پیچھے چلیں گے۔ وہ ایک کم حیثیت بھڑے۔“ حضرت عمر کا یہ فقرہ شاید بھائے میری کتب کے ناظر کے صفت صوافق عرقہ کی زیادہ توجہ کے قابل ہوگا، جنہوں نے جمہور کی رائے میں جماعت پیدا ہونے پر شدید زور دیا ہے۔

خلیفہ ثانی کا خطبہ اور حسینؑ صاحب تاریخ الفتنہ نے ایک واقعہ لکھا ہے جو اگرچہ زمانہ غلیظہ مانی کا ہے لیکن اس کا ٹھیک سنہ نہیں بتایا۔ واقعہ یہ ہے جبہ ابن صحر ابابختری اور وہب بن وہب مدنی سے قتل کرتے ہیں کہ ایک روز غلیظہ مانی دھڑکھڑ رہے تھے اور حسینؑ اپنے پرہیزگاروں کے لشکر میں رکھتے تھے کہ آپ نے واقعہ کو مطالبہ کر کے فرمایا: "اترو میرے باپ کے منبر سے"۔ واقعہ یہ سن کر جواب دیا: "ہاں یہ تمہارے باپ کا منبر ہے میرا نہیں ہے"۔ علیؑ نے چشم نمائی کہ

خان پہلور شیخ احمد حسین صاحب اپنے قابل قدر رسالہ "البلار المبین" میں ابن صحر کو وغیرہ کے مسئلے سے تحریر فرماتے ہیں کہ: "امام حسینؑ سے روایت ہے کہ عمر بن خطابؓ منبر پر تھے، میں بھی چڑھ گیا اور ان سے کہا کہ: "میرے باپ کے منبر سے اترو، اور اپنے باپ کے منبر پر جاؤ"۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ: "میرے باپ کا تو کوئی منبر بھی نہ تھا"۔ پھر مجھے اپنے ساتھ شمالیہ اور جب اپنی قیام گاہ کی طرف گئے تو مجھ سے دریافت کیا کہ: "یہ تم کو کس نے سکھایا تھا؟"۔ میں کہا کہ: "میں نے نہیں سکھایا"۔

۱۵۔ ترتیب دیوانؑ بیروت کا پندرہواں سال شروع ہوا اور اب چونکہ غلام اور حاصل کی آمدنی اس قدر ہو گئی تھی کہ وظائف مقرر کیے جاسکتے۔ لہذا ترتیب دیوان کی بنیاد ڈالی گئی۔ اس محکمہ میں جو بات سب سے پہلے کیے متوجہ کرتی ہے وہ جیسرین مطعم کا نام ہے۔

جیسرین مطعم، مہتمم دیوانؑ تم واقعات خیبر میں پڑھ آئے ہو کہ عثمان بن عفان اور جیسرین مطعم یہ دو شخص تھے جنہوں نے سرورِ عالمؐ سے عذر کیا تھا کہ تمس بنو ہاشم کو دیا گیا وہاں جیسرین اب محکمہ مال کا ایک افسر ہے۔ اگرچہ عوف بن نوفل اور عقیل بن ابی طالبؓ کے نام بھی ماہرین حساب میں آئے تھے مگر ہم ابھی اس پر توجہ دلائیں گے کہ اس دورِ حکومت میں قاعدہ تمس قابلِ فلاح سمجھا گیا یا نہیں۔

رجسٹر میں عباسؑ کا نام پہلے لکھا گیا کہا گیا ہے کہ رجسٹر میں نام کی ترتیب اس طرح ہوتی کہ پہلے بنو ہاشم، پھر ابوبکرؓ اور پھر عسر کا قبیلہ تھا۔ بقول ابن خلدون: "عمر فاروقؓ نے اس کو ناپسند فرمایا اور ارشاد کیا: "یوں نہیں، پہلے آنحضرتؐ کے چھائے شروع کرو۔ کیونکہ وہ رسولؐ سے زیادہ قریب ہیں، بعد ان کے درجہ بدرجہ قرب و بعد قربت کے لحاظ سے ہر قبیلہ کو لکھتے پہلے آؤ، اور جب میرے قبیلہ کی نوبت آئے تو مجھ کو بھی لکھو"۔ ابوالفضلؓ بھی عم رسولؐ کو مقدم کرنے کے بعد لکھا ہے: "پھر جو قریب تر رشتہ کار رسولؐ سے تھا اس کے لیے بہت عطا مقرر کی"۔ بقول ابن خلدون یا مترجم: "عمر فاروقؓ کی یہ تجویز نہایت قابلِ قدر و لحاظ ہے۔ کیونکہ اگر ترتیب سابق قائم رہ جاتی تو خلافت خود غرضی کا وسیلہ بن جاتی"۔ اور اس کے بعد "ازولہٰی مظہرات کی تحواہیں دس دس ہزار مقرر کی گئیں اور مائتہ مدتیہ کو علاوہ مقررہ تحواہ کے دو ہزار زائد دیے گئے"۔

حسنینؑ اور وظیفہ نوٹ میں یہ بھی لکھا ہے کہ "امام حسنؑ و حسینؑ والوزر و سلطان فارسی (نصرت اللہ) کو ہاشمیانہ اپنے اہل کے اہل بدر میں شریک کر کے پانچ پانچ ہزار درہم تحواہیں دی تھیں"۔

مغیرہ بن شعبہ کی مصلحت دوسری صورت میں کامیاب ہوئی مجھے نہ ترتیب دیوان کی کسی تفصیل سے بحث ہے نہ

اس کے عام اصول سے، بلکہ مجھے صرف اس قدر کہنا ہے کہ مغیرہ بن شعبہ کی مصلحت دہرائی گئی جو ایک زمانہ میں ناکامیاب ہوئی۔ اس وقت عباس نے کوئی وظیفہ اس لیے منظور نہ کیا کہ وہ اظہار حق کی قیمت قرار دیا گیا تھا جسے غالباً اب اس لیے منظور کیا کہ مسلمانوں نے اپنی فتوحات میں یہیں مسلمان کچر حصہ دیا ہے اور اس کے عوض میں ہم سے کوئی عہد نہیں لیا گیا ہے۔ لیکن بلاشبہ حکومت کا سیاسی قدم آگے بڑھا جہاں اسے اب اس کا موقع ملا کہ:

بنی عباس کا سنگ بنیاد وہ بنی ہاشم میں سے ایک کو پسند کر کے اسے علی اور مسلمانوں کے بیچ میں کھڑا کر دے۔ اور اس طرح گویا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے علی اور آلِ فاطمہ کی طرف سے چشم پوشی سے ایک مستقل دفتر اور عملی اصول قرار دیا جائے۔ اور کون جانتا تھا کہ یہ اقدام آئندہ بنی امیہ کی بنی عباس کے ہاتھوں تباہی کا سنگ بنیاد ہوگا۔

حضرت عائشہ کا ممتاز وظیفہ اگر عدم مسلات کی ضرورتیں تسلیم کی جاسکتی ہیں تو پھر یہ بھی کسی طرح قابلِ مذہر نہیں ہے کہ بنت ابوبکر کو تنخواہ میں حسنین پر ممتاز کیا۔ مجھے جس قدر کہنا ہے وہ یہی ہے کہ میں صرف نام کی طرف توجہ دلاؤں۔ اس کی بیٹی جس نے وصیت کی تھی اور کیا نہیں معلوم۔ مجھے اس شخص سے بھی کوئی بحث نہیں ہے جو اسے خلیفہ کی انکساری سمجھتا ہو کہ انھوں نے اپنا نام سب کے آخر میں لکھوایا۔ لیکن یہ یہ بھول سکتا ہوں کہ وہ خلیفہ ہے، نہ یہ نظر انداز کر سکتا ہوں کہ اسے محمد مال پر تسلط حاصل ہے۔

عقبر عمر اپنے لیے "امیر المؤمنین" کا خطاب تجویز کرتے ہیں ایک دوسرا مفید قدم یہ اٹھایا گیا کہ لوگوں نے ابن الخطاب کو "خلیفہ رسول" کہنا شروع کیا۔ اس پر بقول ابن خلدون: "عمر فاروق نے کہا اس طور سے رفتہ رفتہ کلام طول ہوا۔ کیونکہ جب کوئی خلیفہ ہوگا اس کو خلیفہ خلیفہ رسول اللہ کہو گے، مناسب یہ ہے کہ تم لوگ مومنین ہو اور میں تمہارا امیر ہوں۔ تم لوگ مجھے آج سے "امیر المؤمنین" کہا کرو۔" ابن عمر کے پاس ایک روایت یہ ہے کہ: "بھنے گفتہ اند اول سیکہ عمر ابنتا بن ریم کردہ مغیرہ بن شعبہ بود۔" یعنی: "بعض نے کہا کہ عمر کو اس رسم میں مبتلا کرنے والا پہلا شخص مغیرہ بن شعبہ ہے۔"

ایک مقدمہ جس میں پیشتر کے حقوق ادا کیے گئے ہیں خلافت میں ام حائل اور مغیرہ بن شعبہ کے اور جو اس کے بعد دوستی یا دشمنی کا مقدمہ ہوا مقدمہ کی غرافت خیز شہادت کے مجھے بحث نہیں ہے، بلکہ اس واقعہ سے کہ جب تین گولہ گزر گئے اور خاتمہ کی خوشی شہادت رہ گئی جس کے بعد مغیرہ کو حکم دیا جاتا تو خلیفہ نے جو تھے گولہ یعنی زیادہ کو دیکھ کر اس کے شہادت دینے کے قبل کہا کہ: "ایک آدمی سے فخر کو امید ہے کہ بسبب اس کے ایک محبِ رسول اللہ کا جان سے شاید بچ جائے۔" اس لیے زیادہ نے گواہی دی کہ۔۔۔ (ابوالفدا)

خلیفہ کے اشارہ پر عمل کرنے سے زیادہ کو جگہ ملی اور پھر میرنشی ہوا

ابن خلدون سے معلوم ہوا کہ زیادہ فتح میں رہا اور خلیفہ نے اسے ”ایک خدمت سپرد کی جس کو زیادہ نے نہایت کفایت شعاری اور امانت و دیانت سے انجام دیا۔“ اور ”ابومویٰ اشعری نے اپنے زمانہ حکومت بصرہ میں اس کو میرنشی کا عہدہ دیا۔“ مشکل سے مجھے یہ کہنے کی ضرورت ہے کہ اگر خلیفہ اول خالد بن ولید کو اس لیے پچا سکتے تھے کہ وہ اچھا عامل تھا تو مغیرہ کو پھالینے کی اس سے زیادہ فکر ہونی چاہیے تھی جو ان کے لیے مفید مصالح کا موجب تھا۔ اپنے قتلے اس کے بعد بھی ملیں گے۔

۱۸ھ میں شام میں تقرری

عام حالت سید امیر علی صاحب کی تاریخ اسلام سے معلوم ہوگی، جہاں وہ فرماتے ہیں کہ: ”دمشق کا دستہ فوج یزید بن ابوشیان کے ماتحت بھیجا گیا، جو پہلے دکن اسلام تھا اور اب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے جھنڈے کے تلے لڑنے مرنے پر تیار تھا۔ یزید کی فوج مکہ اور تہامہ کے عربوں پر زیادہ تر مشتمل تھی اور ان میں سے ہسٹک لوگ فتح مکہ سے پہلے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ لڑائی کر چکے تھے۔ لوٹ مار کی لالچ سے اب وہ یزید کی فوج میں بطور دلائیہ شامل ہو سکتے مکہ اور تہامہ کے عربوں اور مدینہ کے لوگوں میں سخت دشمنی تھی، جس کا نتیجہ بد نظار سو نکلا۔۔۔ ابوشیان کا دوسرا بیٹا معاویہ جس نے آخر خلافت کو غصب کر لیا، یزید و فوج کا کانڈر مقرر ہوا۔“ یزید بن ابوشیان کے مرنے کے بعد اس کی جگہ معاویہ کو دی گئی۔ اس کے علاوہ اس دور حکومت میں ابوالاعور آملی، حصین بن نمیر،

معاویہ بن مذہج اسکوئی، شرجیلی، ولید بن عقبہ وغیرہ بحیثیت افسران فوج دکھائی دیں گے۔ عمرو بن العاص مصر کا افسر بھی تھا جس کی ماتحتی میں عبداللہ بن سعد بن ابی سرح دیا گیا۔ ابومویٰ اشعری مکہ متحکم کا عامل تھا۔ ابی بن امیہ یمن کا اور عمر بن سعد عجم کا حاکم تھا۔ اور سرہ بن جندب سوق الاہواز پر حکومت کر رہا تھا۔

بعض نام جو موافق ثابت ہوئے

اسی دور میں عبداللہ بن بدیل درقہ الاعوامی، جریر بن عبداللہ اہلی، اخف بن قیس، مالک اشتر، برار بن عازب، ہاشم بن عقبہ، قحطاع بن عمر وغیرہ بھی اکثر نہایت مفید فوجی عہدوں پر دکھائی دیں گے۔ یہ لوگ جناب امیر کے بڑے حامی تھے اور ان میں کسی کی دوقی بہ استثنائے جریر مشتبه نہیں ہوئی۔ یہ لوگ سپاہی تھے اور انھیں اپنے لیے کوئی کام اور راستہ ٹھکانا چاہیے تھا۔ ان کے سپاہیانہ وصلوں کے لیے بلاد مختلفہ میں کام مل رہے تھے۔

۱۶ھ فتح مدائن اور حضرت شہر باؤ

فتح مدائن جو طبری کے موافق ۱۶ھ میں ہوئی، ہمارے لیے خاص دلچسپی رکھتی ہے۔ اس لیے کہ مؤرخین کے موافق فتح میں مسلمانوں کو جو چیزیں ہاتھ لگیں ان میں شہر باؤ دختر یزدجرد بھی تھیں۔ بقول مؤلف تاریخ الاسلام: ”اس کے بدن کے زیورات تقسیم کرنے کے لیے عربوں نے اُتارنا چاہے۔ وہ بے بسی میں تھی، لیکن پھر بھی بلا شہ کی لڑائی تھی۔“

عربوں کا یہ نذیرہ پن اس نے نہایت کردہ کھلا اس کے چہرہ کی رنگت غصہ سے متغیر ہو گئی۔۔۔ عمر نے اس کی مکافات یوں کی کہ حج زیور است کے اسے حضرت امام حسنؑ (غالباً کاتب کی غلطی سے بیانے حسینؑ کے حسنؑ لکھا گیا) ابن فاطمہ کے حوالہ کیا۔ اور اس طرح وہ جوان حسین شہزادی شاہہ دارین کے نواسہ کی زوجیت میں آئی۔ حضرت عسمر نے کہا بھی کہ: ”شہزادی شہزادہ ہی کو مناسب ہے۔“

قتلع بن عمر اور قصر ابیض کا محاصرہ
واقدی کے فتوح عم کے ترجمہ میں ہے کہ فتح مدائن کے بعد جب مسلمان آگے بڑھے تو کچھ مرزبان قصر ابیض میں داخل ہوئے اور اسے اپنا قلعہ بنایا تو پھر مسلمانوں نے قتلعل بن عمر کی ماتحتی میں اس کا محاصرہ کیا۔ تیروں سے لڑائی ہوتی رہی۔ اور جب غالباً عرصہ ہوا تو سعد بن ابی وقاص نے سلمان فارسی کو قصر ابیض کی طرف اس لیے بھیجا کہ وہ مصابح المسلمین کے لیے کوئی تدبیر سوچے۔ یہ گئے اور انھوں نے اہل قلعہ کو مخاطب کر کے کہا کہ: ”تم لوگ کیوں جان دیتے ہو۔“ اور جب ایرانیوں نے انھیں دیکھا تو ان پر یہ اثر پڑا کہ یہ اکابر اہل اسلام سے ہیں۔ اور ان لوگوں نے کہا کہ: ”ہمارے لڑنے کا یہ سبب ہے کہ ہمارا بادشاہ کسریٰ نہلاند کی طرف چلا گیا۔“

کسریٰ کی بیمار لڑکی قصر میں تھی
اور چونکہ اپنی بیمار لڑکی کو اپنے ساتھ لے جانے سے منع فرما رہا ہے ہمارے سپرد کر گیا۔ ہم نے اس کی حفاظت اپنے ذمہ واجب کی ہے۔ اگر تم ہم کو اس کے لیے امان دو تو ہم اسے تمہارے سپرد کر دیں۔ سلمان نے سعد سے مشورہ کیا، اور مرزبانوں سے کہا گیا کہ مسلمانوں کا لشکر اطراف میں پھیلا ہوا ہے۔ ہم پر کوئی قبضہ کر لے گا۔ اگر ہماری امان میں نہ آ جاؤ گے اس پر ان میں سے بعض نے غصہ راستہ سے ان لوگوں کو بلالید

ہاشم بن عتبہ اور کسریٰ کا تعاقب
اسی کتب میں موی بن عبداللہ سے اس نے عمر سے اس نے اپنے دادا بچائی سے روایت کی ہے کہ جب کسریٰ پسپا ہوا تو ہاشم بن عتبہ نے علوان تک تعاقب کیا۔

ہودج اور محل
اور ایک جگہ دیکھا کہ کچھ ایرانی مسلح سپاہی بہت سی ہودج اور محل کی محافظت کرتے ہیں۔ ان میں زنانی سواریاں تھیں۔ بہت سے خدام اور کینز بھی تھیں اور وہ سب محفل کے گرد تھے۔ محفل چوب رطب کا بنا تھا۔ رنگ برنگ کی پوششیں پڑی تھیں۔ اس کا تالو تار زرین تھا اور اس کے بیل بوئے طلانی اور مریخ بجا رہے تھے۔ ہاشم نے اپنے گروہ کے ساتھ اس پر حملہ کیا۔ ایرانی بڑے استقلال سے اپنی ملکہ کی محافظت میں لڑے۔ مسلمانوں نے آخر میں ان محافوں پر قبضہ کر لیا۔

شاہی اسرا مدینہ بھیجے گئے
سعد بن وقاص نے جب فتح مدائن کی خبر خلیفہ کو بھیجی تو ان شاہی اسیروں کو بھی اسی کے ساتھ بشر کی نگہداشت میں روانہ کیا۔ بہت کسریٰ کے خدام اور رستار ساتھ ساتھ تھے۔ بشریہ چیزیں لے کر مدینہ پہنچا، اور خلیفہ جب تقسیم غنائم سے فارغ ہو چکے تو دوبارہ بہت کسریٰ حکم کیا کہ اس کو سامنے لاؤ۔

خلیفہ نے شہر بالو کے جسم سے زیورات اُتار لینے کا حکم دیا چنانچہ وہ شاہزادی روبرو جو

پیشاک نفیس اور زرد و جاہر سے بہت کچھ تھا۔ تب ایک شخص کو حکم کیا کہ متاع زیور وغیرہ اس کے بدن سے اٹالے، تا اس کی قیمت میں لوگوں کے لیے اضافہ کیا جائے۔ آخر وہ شخص شاہزادی کی طرف آگے بڑھا تا کہ وہ سب اسباب اٹالے۔

شہر بالو کی غیرت اور خلیفہ کا غصہ مارا کہ وہ باز رہے۔ یہ دیکھ کر عمر رضی اللہ عنہ غیظ و غضب میں آئے اور لوگ اس ملکہ مکرمہ پر تازیانہ بلند کیے ہوئے تھڑھم کے تھے اور وہ روتی تھی۔

اس وقت علی علیہ السلام بولے اے امیر المومنین جناب امیر کی وساطت نے رنگ بدل دیا مہلا سنی غصہ نہ کرو اور افروختہ خاطر نہ ہو۔

یہ تحقیق کہ میں نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ فرماتے تھے: "ارحموا عنیز قوم ذل وغف قوم افتقر"۔ یعنی جو عزیز دریس قوم کہ ذلیل و خوار ہو جائے اور جو غنی و توکر کسی قوم کا محتج و نادار ہو جائے تو ان پر رسم کرد یہ کلام سن کر طیش عمر رضی اللہ عنہ کا سند ہو گیا۔

اور پھر جو اس شاہزادی کی طرف نگاہ کی تو دیکھا وہی تھقی شہر بالو حسین کی طرف دیکھ رہی تھیں بالنظر الی الحسین بن علی رضی اللہ عنہ یعنی وہ خزادی گوشہ چشم سے یا لہ تیرے حسین بن علی علیہا السلام کو دیکھ رہی ہے۔

اب حضرت عمر ایک قابل قدر حدیث بیان کرتے ہیں اور شہر بانو کے حسین کی طرف میلان کی وجہ بتاتے ہیں

سے سنا ہے کہ فرماتے تھے: "اتقوا فراسة المؤمن فانه ينظر بنور الله"۔ یعنی فرہست و ظلمات مومن سے ڈرتے رہو اور لحوظ خاطر رکھو کہ وہ یہ قوت نور خدا مشاہدہ کرتا ہے۔ چنانچہ میں جو دیکھتا ہوں تو یہ لوکی حسین بن علی کی کھم انگشت اور تیر نگاہ سے نکلتی ہے۔ سو مجھ پر یہ بات ثابت ہوئی کہ یہ دختر ساز مردم میں سے طرف حسین کے ارادت و عقیدت رکھتی ہے۔ اس لیے کہ لوگوں میں از روئے مہارت و دجاہت کے حسین سے کوئی بہتر نہیں ہے۔ بعد ازاں کہا: "اے ابا عبد اللہ اس لڑکی کو لو۔ یہ میری طرف سے تمہارے لیے ہدیہ و تحفہ ہے۔" چنانچہ علی علیہ السلام اور جو لوگ مسلمان میں سے حاضر وقت تھے وہ سب اس امر میں شکر گزار و منت پذیر عمر رضی اللہ عنہ کے ہوئے۔ عمر بن محمد الوافقی کے سامنے مسجد اقصیٰ میں منشد میں یہ روایت پڑھی گئی۔

شریف قوم کے ساتھ برتاؤ کے متعلق باوجود تحالف مذہب صاحب بجا تحریر فرماتے ہیں کہ: "عمر نے چاہا کہ:

عورتوں کو بیچ ڈالیں اور مردوں کو غلامی میں دیں کہ بڑے حاجی ان کی بیٹے پر طواف خانہ کعبہ کریں۔" جناب امیر نے فرمایا کہ: "جناب رسالت مآب نے فرمایا کہ جو شخص اپنی قوم کا بزرگ ہو اس کی بزرگی کرنا چاہیے اور عزیز رکھنا چاہیے۔"

اگرچہ تمہارے دین کے مخالفت ہو یہ قیدی صاحب ریاست و شرافت ہیں۔ انہوں نے تمہاری اطاعت کی اور اسلام کی طرف رغبت ہے۔ میں نے اپنا حق اور بنی ہاشم کا ان کی گردنوں سے ساقط کیا۔ اکثر مہاجر و انصار نے بھی بخشا۔

جناب امیر عورتوں کی آزادی رائے قائم رکھتے ہیں

اب اکثر لوگوں نے عورتوں سے

شہر ہاتھ زبان سے بھی حسین کو پسند کرتی ہیں

اس کی بنی۔ جناب امیر نے کہا: ”اس کی خاموشی عین اقرار ہے۔“ پوچھا کہ چاہتی ہو؟ کہا: ”اگر مجھے اختیار ہے تو میں نے حسین کو اختیار کیا۔“ جناب امیر نے مذنیہ بن الیمان کو خط لکھنے کا حکم دیا اور نکاح کر دیا۔

بحار کی ایک روایت و نیز جامع التواریخ کے موافق یہ خبر ہے کہ جناب امیر نے اپنے دور حکومت میں حریت بن جابر حتیٰ کو بلاد مشرق کی طرف بھیجا اور یزید جو کہ تین لڑکیاں ان کے ہاتھ لگیں۔ جن میں سے ایک عبداللہ بن عمر، دوسری محمد بن ابی بکر اور تیسری حسین کی زوجیت میں دی گئیں۔

اس واقعہ کے زمانہ کے متعلق مجھے شبہ ہے۔ ایسی صورت میں کہ سنہ قائم ہونے کے قرآن اس کے بعد کے زمانہ کے ہیں۔ جیسا ابن خلدون سے پایا جاتا ہے کہ تعیین سنہ کی ضرورت سنہ میں ہوئی اور بلحاظ اس کے کہ مختلف تواریخ میں واقعات مختلف ترتیب اور سنہ کے اختلاف سے لکھے گئے ہیں، میں سوچتا ہوں کہ فتح مدائن یا دو تین برس قبل لکھی گئی ہے یا شہر ہاتھ کی اسپی کا واقعہ فتح مدائن سے متعلق نہیں ہے۔ جیسا ابن خلدون سے پایا جاتا ہے کہ: ”یزید جو کہ اپنے حرم اور خاندان شاہی کو اس سے پہلے جس قدر مال و اسباب اٹھا سکتا تھا اٹھا کر روانہ کر دیا تھا۔“ بلکہ میں سوچتا ہوں کہ یہ واقعہ سنہ یا سنہ کا ہے، جب کہ مرو شاہجہان میں خود یزید جو کہ ابراہان نے یزید جو کی مخالفت کر کے اس کا مال و اسباب چھین لیا اور یزید جو بھاگ اور ابراہان نے لشکر لے کر تمام چیزیں اخف بن قیس کو دے کے صلح کر لی۔“ فتح مدائن اگر سنہ میں ہوئی تو اس وقت حضرت امام حسین علیہ السلام کا سن اقدس زیادہ سے زیادہ ۱۲ برس کا تھا اور یہ سن غالباً عقد کے انتخاب کے لیے موزوں نہ تھا۔ اس امر پر لحاظ کرنے کے بعد بھی کہ بنی ہاشم کی آراد و آمدار اور کچھ دن قبل کی حاکم قوم کا شو نما جلد ہوتا تھا سرزمین عرب بھی معین ہوتی ہے اور جناب امیر جہانی قوت میں نہایت ممتاز تھے پھر بھی مجھے حسین کے ہار حوی یا ہار تیر حوی پر برس محمد کا ہدایت ممکن التواریخ نہیں معلوم ہوتا۔ خصوصاً جب کہ عورت نے خود اپنی پسند کا اعلان کیا۔

عرب۔ قیدی۔ اور جناب امیر کی حالتیں

کون جانتا ہے کہ شہر ہاتھ کو روپیہ کے شکل میں بھنا کر سے جناب امیر وہاں موجود تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ ہزاروں برس کے شخصی اصول سے متاثر ہلاشاہ کی بیٹی میوڑ ہے کہ وہ فتح عرواں کی مغترانہ بے لچاٹی برداشت کرے۔ شہر ہاتھ کی حالت کا قیاس کرنا نا ممکن نہیں ہے۔ اور اسی طرح اس کی شرم کے ساتھ اس کی غیرت اور نفرت کا قیاس بھی خیال کے اندر ہے کہ وہ عرب جو اس کے ذہن میں کبھی اس کے دست نگر

تھے۔ آج اتفاقات سے اس پر قابو پا کر اس کی گزشتہ عظمت اور شرافت کی طرف سے لاپرواہ ہو گئے ہیں اور اس کے ساتھ وہی اصول برتنا چاہتے ہیں جو عام اسرائیل نے جنگ کے لیے قتلہ میں کچھ نہیں سوچ سکتا مگر یہ کہ جس وقت عام عرب تقسیم قیمیت میں ایک دوسرے سے لڑ رہے ہوں گے یا قاتلانہ شان میں ڈوبے ہوں گے جناب امیر اس شریف قیدی کی حالت کا غور سے مطالعہ کر رہے ہوں گے اور ان میں ہمدردی کے وہ جذبات پیدا ہو رہے ہوں گے جو شریفیت کی نصیبت دیکھ کر ہر شریفیت میں ہونی چاہیے۔

قیدی جمع میں ہمدردی کا مرکز پالیتا ہے

یہ بھی عجب خیر نہیں ہے کہ عبور قیدی نے جس وقت وہ جمع میں ہر طرف کسی ہمدرد کو ڈھونڈنا چاہی ہو جناب امیر کے بھروسہ اور آنکھوں میں امید کے آثار پائے ہوں اور حسین کو پہلو میں بیٹھا ہوا دیکھ کر وہ مرکز پالیا ہو جہاں اس انتشار کے عالم میں اپنے کو ٹھہرا سکے۔ (میں یہ پیرا گراف و نیربہ کالکچر چاکا کہ محمد الوائلی کی روایت دیکھی جس نے میرے خیال کی تصدیق کی اور میں نے اسے واقعات کے سلسلہ میں پیش درج کر دیا)

شانہزادی کی خصوصیات عمل کرتی ہیں

اب ایک شانہزادی کی خصوصیات اور احساسات کے عل کا وقت تھا۔ اس کی آنکھیں جن میں اور امتیاز تھا اسے جمع میں چہروں پر وہ لکیریں اور خصوصیات کی وہ اعلیٰ تحریری تلاش کرنی تھیں جو پہلے دنوں سے بھی نہیں رہیں۔ خصوصاً شاہی خاندان کے کسی فرد کی منجی ہوتی نگاہ کے لیے جس کے سامنے ملک اور مختلف اقوام کے شرفا کا نگہ ستہ بندھا ہوا رہتا ہے۔ نہ یہ سوچنا ممکن ہے کہ شہر بانو کو یہ معلوم نہ ہو گیا ہو کہ یہ دونوں بزرگ کون ہیں۔ اس نے انتخاب اور پسند میں ہمدردی۔ جناب امیر کے صلاح سے مردوں نے پہلے اپنے قیدیوں کی شرافت کی طرف توجہ کی اور دوبارہ جناب امیر کی صلاح سے ان عبور قیدیوں کی آزادی انتخاب اور عقد کی خواہش کسی کے نزدیک قابلِ مذر نہ ٹھہری۔ ایسے نازک وقت میں ان کے غرور اور آن کی اس سے اچھی اور کسی طرح حفاظت ممکن نہ تھی۔ قیدیوں کی طرح ڈالنا ان کا کوئی قابلِ وقت کاٹنا نہ ہوتا۔

مردوں کا پسند کرنا عورتوں کی اسیری سے بہتر نہ ہوتا

مردوں کا ایسے وقت خواہش عقد کرنا اور پھر کرلیٹا اسیری سے کسی طرح بہتر نہ ہوتا، جو اس کے کہ عورتیں عقد کرنے میں مختار قرار دی جاتیں۔ اور ان کا انتخاب کرنے والا زفر نہ ادا کر کے بیت المال کے ساتھ کوئی نا انصافی نہ کرتا۔ یا حکومت مصلحت کے اعلیٰ احساس سے اس کی کوئی قیمت نہ لیتی۔ جب کہ وہ لوگ جو بیت المال کے اس ایک جزو سے تقاضا کرتے انھوں نے عامہ ناس کی خوشنودی

حوالگی نہ کہ اسیری

اور حق تو یہ ہے کہ شہر بانو کو اسیر جنگ کہنا ہی غلط ہے جب کہ ان کے محافظین نے ان کے جان و آبرو کی حفاظت کا عہد لے کر حوالہ کیا تھا۔ جے انھوں نے اس وقت ظہر بھی کیا جس وقت اس اصول کے خلاف خلیفہ کے حکم سے کسی عرب نے ان کے زیورات لینا چاہے۔ اور چونکہ حکومت کے ایک حکم پر مواقع نے انھیں فتح دی ان کی آزادی میں کسی وقت شکستگی نہیں پیدا ہوئی۔ جناب امیر کی صلاح حکومت اور

جمہور کی رضامندی اور خود شہرہاٹو کی آزادانہ لغت خواہش یہ سب موجودہ نظام سے ان کے متاثر نہ ہونے اور اپنی حالت پر قائم رہنے کی مزید تائید ہے۔

سو میریگ

مجھے یقین ہے کہ شہرہاٹو نے جناب امیر کی صلاح کے لطافت لحاظ کا اندازہ کیا۔ یہ اندازہ ان کے جواب سے ظاہر ہے جس نے سو میریگ (ہندو راجاؤں میں کبھی کبھی یہ رسم برتی جاتی تھی کہ ان کی وہ لڑکی جس کی شادی ہونے کو ہوتی تھی وہ اس راجا کے گلے میں ہار ڈال دیتی تھی جیسے وہ پسند کرتی تھی) برآمدہ کر دیا۔ اور پسندیدگی کا ہار فتح عرب اور شاہ کونین کے نواسے کے گلے میں ڈالا گیا۔ مظلوم عورت کی حمایت اصول شجاعت میں داخل ہے۔ جس کی بنیاد پر جناب امیر اس کے عزت کے وکیل بنے تھے۔ شہرہاٹو نے اپنی پسند میں غلطی نہ کی تھی۔ اور نہ وکالت کے بعد جناب امیر اور حسین سے یہ ممکن تھا کہ شہرہاٹو کے اس پر امید یا ایسے ہی فقرہ کو کہ: ”اگر مجھے اختیار ہے تو میں نے حسین کو اختیار کیا۔“ یا اس سے بدل دیتے یا ایسی بیان خیز اور پر معنی نظر کو جو وظیفہ کو یہ بھادیتی کہ: ”یہ دختر سار مردم میں سے طرف حسین کے ارادت و عقیدت رفتی ہے۔“ قبولیت کی پناہ سے علیحدہ رکھتے۔

شہرہاٹو کی تباہ شدہ عظمت کی تلافی

قدزدانی اور حمایت کا اقتضاء یہ تھا کہ اگر جناب امیر بہو بتانا منظور کرتے تو حسین انہیں زوجیت میں قبول کرتے۔ شہرہاٹو کی تباہ شدہ عظمت نے اگرچہ دنیاوی حکومت پر قبضہ نہ کیا لیکن اس سے کہیں زیادہ پراثر عظمت مسلمانوں کی نگاہ میں ماسئل کی کہ وہ بادشاہ و ملوک کے مندر زند کی بی بی ہوئیں۔

کیا قلبی میلان کا تصادم ہو رہا تھا

کوئی عجب نہیں ہے کہ اس عقد کے لیے دونوں طرف سے قلبی میلان پیدا ہو گیا ہو۔ شہرہاٹو کی مسرت کا اندازہ روضۃ الشہداء کی اس روایت سے ہو سکتا ہے کہ ان کے پاس سو کنیزی تھیں، اور بعد زفاف انہوں نے راہ خدا میں پچاس کنیزی آزاد کیں۔

شہرہاٹو کی عفت کے بعد خوشی

شہرہاٹو کے ذکی اہل نے اشارے کے اشارے اس روایت سے بھی مفید ہیں جو روضۃ الشہداء سے ملتی ہے کہ شہرہاٹو کی ایک نہایت حسین کنیز تھی جس کا نام شیریں تھا۔ ایک روز حضرت سبط اصغر شہرہاٹو کے پاس تشریف رکھتے تھے کہ شیریں سامنے آئی۔ حسین نے شہرہاٹو سے مخاطب ہو کر فرمایا: ”شہرہاٹو! شیریں کی آنکھیں کیسی برا مندرختہ ہیں؟“

شہرہاٹو نے سنا اور تھوڑی دیر کے بعد شیریں کو پر کلفت لباس سے آراستہ کر کے سبط اصغر کی خدمت میں بٹھا دیا۔ اور جب حسین نے تعجب سے اس طرح آنے کا سبب پوچھا تو شہرہاٹو نے جواب دیا: ”زن و شو کا ایک دوسرے کی خاطر کا لحاظ“

گد میں نے اسے آپ کو بخش دیا۔“ حسین نے ہنسے اور فرمایا: ”اگر تمہارا یہ خیال ہے تو میں نے اسے راہ خدا میں آزاد کر دیا۔“

تھوڑی دیر کے بعد شیریں عمدہ لباس اور زیورات میں نظر آئی تو حسین نے پھر پوچھا: ”شہرہاٹو! تم نے بہت سی کنیزی آزاد کیں، لیکن کسی کو اس کلفت سے آراستہ نہیں کیا تھا۔“ شاہ زنان نے جواب دیا: ”اس وجہ سے کہ وہ

میری آزاد کی جہتی تھیں اور شیریں کو آپ نے آزاد کیا ہے۔ نجم میں اور آپ میں امتیاز ہونا چاہیے۔

شیریں کنیزی کو آزادی پر ترجیح دیتی ہے اگرچہ شیریں کو آزادی کا خوشگوار حکم سنا دیا گیا لیکن اس نے خاندان رسالت کی کنیزی کو آزادی پر ترجیح دی

اور اس گھر سے اس وقت تک اپنا تعلق قطع نہیں کیا جب تک کہ ہم ایک اندوہناک واقعہ کے قریب نہ پہنچیں۔ خلیفہ ثانی کے زمانہ کے واقعات میں صاحب سیرۃ الفاروقؓ ازالۃ الخطاب گشت سے نقل کرتا ہے کہ: "ایک دن

خلیفہ ثانی اور حسین کی نسب عظمیٰ

مال قیمت تقسیم کرنے لگے تو امام حسنؓ سے شروع کیا اور ان کو ہزار درہم دیے۔ پھر امام حسینؓ کو بھی ہزار درہم دیے۔ جب ان کے بیٹے عبداللہ کی باری آئی تو پہلی سودرہم ان کو کھلا انھوں نے کہا: یا امیر المؤمنین میں قوی آدمی ہوں جس نے رسول اللہ کے سامنے تلواریں ماری ہیں امام حسنؓ اور امام حسینؓ دو لڑکے ہیں جو مدینہ کی گلیوں میں کھیلے پھرتے تھے، ان کو ہزار ہزار درہم دیا گیا اور نجم کو پہلی سود یہ میرے حق سے کم تھا۔ حضرت عمرؓ جو شہر میں آئے اور منہ سنانے لگے کہ: جاتو بھی ان کے باپ جیسا باپ، ان کی ماں جیسی ماں، اور ان کے نانا جیسے نانا، اور ان کی نانی جیسی نانی، ان کے چچا جیسا چچا، ان کے ماموں جیسے ماموں اور ان کی خالہ جیسی خالہ لے آ۔ جس کو نہیں لاسکے گا تجھے معلوم نہیں کہ ان کا باپ علیؓ رضی اللہ عنہ کی ماں فاطمہؓ زہراؓ ان کے نانا محمد مصطفیٰؐ، ان کی نانی خدیجہؓ کبریٰؓ، ان کا چچا جعفرؓ بن ابی طالبؓ طیار، ان کا ماموں ابراہیمؓ بن رسول اللہؐ اور ان کی خالہ اُمّ کلثومؓ اور رضیہؓ رسول اللہؐ کی بیٹیاں ہیں۔ عبداللہؓ یہ سن کر خاموش ہو گئے۔

خلیفہ ثانی اور خاندان رسالت کے احسانات کا اعتراف اسی طرح ایک دن امام حسنؓ یا امام حسینؓ گئے اور دیکھا کہ عبداللہؓ

اپنے بیٹے کو اس وقت اندر نہیں بلایا تو وہ لوٹ گئے۔ حضرت عمرؓ کو جب معلوم ہوا تو آدمی بھیج کر ان کو بلایا اور کہا کہ: لے میرے بھائی کے بیٹے! تم کیوں لوٹ گئے۔ کیا میرے سر کے بال تمہارے ہی اگائے ہوئے نہیں ہیں؟ اور ایسے ہی ایک موقع پر یہ کہہا ہے کہ "ہماری بزرگی تو خدا کے بعد تمہیں سے ہے۔"

خلیفہ ثانی نے کبھی اہل بیت کو خمس نہیں دیا ابن الخطاب کے زمانہ کے واقعات میں سے ایک یہ ہے جے مولوی شبلی صاحب "الفاروق" میں

بیان کرتے ہیں: "حضرت عمرؓ کے نسبت لوگوں کا بیان ہے کہ وہ قرابت داران پیغمبر کو مطلقاً خمس کا حق دار نہیں سمجھتے تھے چنانچہ انھوں نے اہل بیت کو کبھی خمس میں سے حصہ نہیں دیا۔ ذوالقرنی کے حق کے لحاظ سے یہ کہتے ہوئے کہ ساتھ دینے کی وجہ سے مصلحت تھی کہ حصہ مقرر کیا جائے آگے بڑھ کر لکھتے ہیں کہ: "ملک یہ قرار دینا کہ قیامت تک آپ کے قرابت داروں کے لیے پانچواں حصہ مقرر کر دیا ہے اور گوان کی نسل میں کسی قدر ترقی ہو اور گوہ کتنی ہی دولت مند اور غنی ہو جائیں، تاہم یہ رقم ہمیشہ ملتی رہے گی۔ ایسا قاعدہ ہے جو اصولِ تمدن کے بالکل خلاف ہے۔ اگر کوئی بانی شریعت ایسا کئے گا تو اس میں اور خود غرض برہمنوں میں کیا فرق ہوگا۔ اور اس کے بعد اگرچہ یہ آیت لکھی ہے کہ: وَاعْلَمُوا أَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِنْ قَوْلٍ قَاتٍ لِلَّهِ خُمُسُهُ وَلِلرَّسُولِ وَلِذِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسْكِينِ وَابْنِ السَّبِيلِ (۸: ۴۱) لیکن پھر انھیں یہ اجتہاد

بھی کرنا پڑا ہے کہ یہ تمام احکام فقہ و اسباب سے متعلق تھے زمین اور جائیداد کے لیے کوئی قاعدہ نہیں قرار پایا تھا۔
خمس میں ذوی القربی کا حصہ صاحب منافع نے یمن میں قبیلہ ہمدان کے اسلام لانے اور جناب امیر کی ایک کنیز اپنے حق میں لینے اور بریدہ کے اعتراض پر جناب امیر سے جواب دلایا ہے کہ: ”نہیں دیکھتا تو اس جاریہ کے خنیں کہ سبایا سے خمس میں آتی ہے اس واسطے میں نے اس سے نزدیکی کی گویا حضرت علیؑ نے حضرت سے اذن پایا ہی تھا خمس کی قسمت کا اور ذوی القربی کو اس میں حصہ ہے۔“ بریدہ کو اس سے غلابا تسکین نہ ہوئی اور انھوں نے جناب رسالتؐ کے سامنے واقعہ بیان کیا اور آپؐ نے فرمایا کہ: ”اے بریدہ حصہ علیؑ کا اس خمس سے زیادہ اس سے تھا۔“

مسئلہ خمس کا سابق اور سیاق اصول خمس کے متعلق سوال یہ نہیں ہے کہ ابن الخطاب بنی ہاشم کو حق دار سمجھتے یا نہ تھے یا یہ کہ ایسے توہمت کی گنجائش ہو کہ: ”گو ان کی نسل میں کسی قدر ترقی ہو اور گودہ کھتی ہی دولت مند اور غنی ہو جائیں تاہم یہ رقم ہمیشہ ملتی رہے گی۔“ بلکہ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ ہدایت نامہ مسلمان نے کیا حکم دیا تھا اور رسولؐ کا طرز عمل کیا تھا اس کے بعد یہ سمجھنا ہوگا کہ ابن الخطاب کا طریقہ کیا تھا اور اس کی کیا وجہ ہو سکتی تھی۔ آیہ قرآنی متذکرہ خمس سے جواز خمس میں کوئی شہ باقی نہیں رہتا۔ رسولؐ کا طرز عمل کہ آنحضرتؐ نے بنی ہاشم کو خمس خیر سے عطا فرمایا مزید تائید ہے جسے حیدر بن مطعم اور ابن عثمان کے اعتراض نے اور صاف کر دیا اور پھر جناب امیر کا یمن میں طرز عمل مسئلہ خمس کی ایک طے شدہ شان رکھتا ہے جسے بریدہ کے اعتراض پر رسولؐ کا جواب ہمیشہ کے لیے صاف کر دیتا ہے۔ بعد طلعت رسولؐ حضرت سیدہ کا بقیہ خمس خیر میں سے اپنا حصہ طلب کرنا قائم شدہ حق کا اظہار یقین تھا کوئی عجب نہیں ہے اگر ابو بکرؓ نے دینے سے انکار کیا اور کوئی حیرت نہیں ہے اگر ابو بکرؓ کے جانشین نے بھی اپنے پیشرو کی مصلحت پر عمل کیا۔

فدک اور خمس مسئلہ خلافت کی دو چھوٹی شکلیں ہیں حقیقت میں فدک اور خمس مسئلہ خلافت کی دو چھوٹی شکلیں ہیں۔ قابل

مؤلف ”الفاروق“ نے بنی ہاشم کی عودیت اور ابن الخطاب کی مصلحت کی حمایت میں مبالغہ نہ کیا ہوتا۔ اگر انھیں یاد رہتا کہ اگرچہ وہ ”قیامت تک“ اور ”نسل کی ترقی“ کی بنیاد پر اصول خمس کی مخالفت کر رہے ہیں۔ لیکن حقیقت میں وہ لوگ جن کی مصلحت کی حمایت کی جا رہی ہے۔ خود سے ایسی مصلحت کی بنیاد ڈالنے عباس کے پاس گئے تھے کہ: ”ان کی اولاد کا بھی حصہ قرار دید۔ اس لیے کہ یہ محنت ہوگی علیؑ اور بنی ہاشم پر جب کہ عباس ساتھ ہوں گے۔“

مؤلف الفاروق ایسے اصول کی ترمیم چاہتا ہے جسے عمر اور ابو بکرؓ نے بھی جاری رکھا مجھے اس پر بھی حیرت نہ ہوگی اگر اس کے بعد بھی خلفائے

مؤلف ”الفاروق“ کے نزدیک قابل اعتراض اصول جاری کرنے گئے تھے بحث تو اس سے ہے کہ بنی ہاشم کے حقوق کی طرف سے کسی طرح آنکھ جھپک جانے اس کے بعد یہ سوچنے کی بھی ضرورت نہیں ہے کہ ابو بکرؓ اور عمرؓ تو اس لیے بیت المال کو رقیق بنادیں کہ ایک شخص کی زبردست آڑ سے یہ خلافت پر قائم رہتے ہیں۔

رسول کو وہ حق حاصل نہ تھا جو خلفا کو تھا

اور رسول کو یہ حق حاصل نہ ہو کہ وہ ان کے لیے

ذلیفہ مقرر کر دیں جنہوں نے شیوع اسلام، وقار اسلام کی مصلحت اور رسول پر جان نشاری میں کوئی دقیقہ منہ و گزاشت نہیں کیا۔ اور جو اس وقت ملاحظہ رہتے تھے اور اپنے خون بہاتے تھے جس وقت دلیل لانے والوں کے دوست ”جان ہے تو جہان ہے“ پر عمل کرتے تھے۔ میں اسے اصول تمدن کہوں، یا تمدن کش اصول، کہ اگر کوئی

تمدن کا ایک ہیبت ناک اصول

دولت مند اور غنی ہو جانے تو اسے اس کا حق نہ ملے۔ ملائکہ خدا نہ کردہ بنی ہاشم میں کوئی اسلامی تاریخ کے مفہوم میں ”غنی“ نہ تھا۔ یہ بھی صاف امر ہے کہ کسی دولت مند کے ذرائع آمدنی کا بھاری رہنا اسے مالی اغلاط یا زوال سے بچاتا ہے اور حکومت کا فرض ہوتا ہے کہ وہ لوگوں کے قبول کو بھاری رکھے بلکہ اس میں ترقی دی جائے جس سے نہ صرف حکومت بلکہ جماعت کے کچھ افراد کو بھی مدد ملتی ہے۔ زیادہ سے زیادہ کسی ہمدرد حکومت کا یہ فرض ہوتا ہے کہ کسی جگہ مالی مرکزیت سے ایسی حالتیں نہ پیدا ہوجائیں جس سے اوسط یا پست درجہ کی حالت کو اور پست ہوتے جانے کا خوف ہو۔ تصفیہ کو اس وقت سے تعلق تھا قیامت سے نہ تھا۔ کوئی مدبر قیامت کا ذمہ دار نہیں ہے، بلکہ اپنی وقت کی مصلحت اور اس کے اثر کا اصول غم سے انکار کرنے کے وقت بنی ہاشم کے قبول کی حالت ایسی نہ تھی جس سے یہ اندیشہ ہو کہ ان کے کچھ ذرائع بند کیے جائیں، ورنہ انہیں حلقہ ناس پر غیر مفید مالی تقویٰ حاصل ہو جائے گی۔ بلکہ بنی ہاشم کی یہ حالت ظاہر تھی کہ انہوں نے حیات رسول میں اپنے ہلوی کی تقلید سے زندگی کی نہایت ضروری چیزوں کے تلف سے بھی کمال ایثار سے اپنے کو محروم رکھا تھا۔ اختلاف اختیار نے اب ان کی حالت ایسی پہنچا دی تھی کہ جناب امیر اپنے دواں میں یہ فرما سکتے کہ: ”میں نے ہر شے پر غلبہ چاہا اور میں اس پر غالب ہوا اور جب فقر نے غلبہ کیا تو غالب ہو گیا اگر ظاہر کرتا ہوں تو رسوائی ہے اور اگر نہیں ظاہر کرتا تو مائے ڈالتا ہے۔“ عجیب ہے کہ اس شعر کا وقت نہیں معلوم ہے لیکن یہ سوچنا سہل ترین امر ہے کہ کوئی دوسرا زمانہ رحلت رسول کے بعد کے سوانح میں ہو سکتا تھا اور حقیر سیدۃ النساء کے اس فقرہ کا تو وقت بھی معلوم ہے کہ: ”میرے فرزندوں کے وقت و معیشت کو لے لیا ہے۔“

بنی ہاشم کو خمس کا حقدار نہ سمجھنے کی غرض

اب میں کیا سوچ سکتا ہوں بجز اس کے کہ بنی ہاشم کا ایک مخصوص حق جو ان کے مخلصانہ جانبازی کا

احترام یا تائیدی صلہ تھا وہ ان سے نہ صرف اس لیے لے لیا گیا کہ ان کا یہ جائز امتیاز چھین لیا جائے اور انہیں اس صورت میں ہر درجہ کے مسلمان کے برابر کر دیں، عام اس سے کہ اس سے برائے نام خدمت بھی اسلام کے متعلق سرزد نہ ہوئی جو بلکہ اس لیے بھی کہ یا بنی ہاشم چاہے دست نگر رہیں اور یا اللہ اس کے لازمی تنگی کا دور ہے اثری میں بسر کریں۔ اصول غم کو بنی ہاشم پر ناقہ نہ بھنا رسول کے شہنشاہانہ حقوق کا انکار تھا۔ رسول کی پسند کا انکار تھا۔ اور بنی ہاشم کے ان حقوق کا انکار تھا۔ انہوں نے اپنے خون اور اعتبار اور خدمت سے حاصل کیا تھا کیا عجب ہے کہ اس سے انکار نہ کیا جاتا۔ اگر غم کا تعلق بنی ہاشم یا خلافت کے فطری حق دار سے نہ ہوتا۔ حکومت کی تبدیل ہیئت نے اس مسئلہ کی صورت بھی اس طرح بدلتی چاہی تھی جو تغیر کے موافق ہو سکے۔ پیشتر کے اسلامی جانبدار اپنے حق کی عرومیت سے یہ

کہلاتے ہیں کہ اب اسکوہ کے لیے تم اپنے کو بے تعلق سمجھو ہم اپنے مخلص بنائیں گے۔ ایک دوسری ضمنی بات کو بھی مولوی شبلی صاحب نے ظاہر کیا ہے جس میں واقع ذاتی رائے کے ساتھ پھینٹ دیا گیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

واقعہ رائے اور دلیل کا اختلاط

بنو ہاشم کو جو عہدے نہیں دیے اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ ان کو خوف تھا کہ بنو ہاشم چونکہ قس میں اپنا حصہ ایک شرعی حق سمجھتے ہیں اس لیے باوجود دولت مند ہو جانے کے قس میں سے حصہ لے لیں گے۔ حالانکہ عمر کے نزدیک قس کے مصارف امام وقت کی رائے پر منحصر ہیں۔ اس میں واقعہ صرف اس قدر ہے کہ عمر نے بنو ہاشم کو عہدے نہیں دیے۔ اس کے بعد یہ فقرات کہ باوجود دولت مند ہو جانے کے، اور ”امام وقت کی رائے پر منحصر ہیں۔“ یہ اپنی صورت میں دیسی ہی بالغ دلیلیں نہیں ہیں جیسی واقعہ قس میں پیش کی گئی تھیں۔

کیوں بنی ہاشم کو عہدے نہیں دیے گئے

بنی ہاشم کو عہدے دینا یا نہ دینا بھی حضرت عمر کے زمانہ کی کوئی مخصوص مصلحت نہ تھی بلکہ اس کی ابتدا ابوبکر کے زمانہ سے ہو چکی تھی اور جو وجوہات ان کے زمانہ میں انھیں علیحدہ رکھنے کے تھے اس وقت اگرچہ اس میں ویسی قوت باقی نہ تھی اور کسی قدر اسباب بھی مختلف تھے تاہم اصل مصلحت میں فرق نہ تھا کہ بنی ہاشم کو کسی گروہ نہ کہ سب گروہ سے ملنے نہ دو جس سے انھیں اپنا اثر ڈالنے کا موقع ملے اور خلافت ان کی تلوار کے سایہ میں تھرائی رہے۔ حالانکہ یہ بات ہی دوسری ہے کہ بنی ہاشم کوئی ایسی شورش پسند کرتے یا نہ کرتے اور ایسے عہدے قبول کرتے یا نہ کرتے جس میں انھیں ابوبکر اور عمر کی تلواریں کا حکوم رہنا پڑتا۔

حکومت کا یہ خوف اور دلیل کس قدر محکم ہوگی کہ چونکہ کوئی اپنے کو قس کا شرعی حق دار سمجھتا ہے اور وہ اپنا یہ حق لے لے گا اس لیے حکومت اسے کوئی عہدہ نہیں دیتی۔ عہدہ دار کا یہ فعل حکومانہ کا ہے کوہوتا اسے آزادانہ اختیار کا فائدہ ہوتا اور کسی ایک یا چند کے ایسا کرنے کو حکومت منع کر سکتی۔ بڑا اس صورت کے جس میں حکومت کو اس کا تعین ہوتا کہ ہمارا روکنا ایک قائم شدہ قانون کی خلاف ورزی ہوگی اور مجبور کی رائے ہمارے خلاف ہو جائے گی۔ بہتر ہوگا کہ اس کا موقع ہی نہ آنے دو۔

مکالمہ جس سے گزشتہ اور موجودہ مصلحت سمجھ میں آتی ہے

اب میں ایک خوش مزہ مکالمہ کے تشریب پہنچ گیا ہوں۔

جس سے یہ امر اچھی طرح واضح ہو جائے گا کہ بنی ہاشم کی عرویت کے لیے کوئی قلیل معجزہ کھیں۔ اس میں یہ بھی دیکھنے کی بات ہوگی کہ ابن الخطاب اپنے پیشرو کی مصلحت کی تائید کرتے ہیں جو کسی طرح حیرت خیز نہیں ہے۔ قریش کی ان کارروائیوں کا خلیفہ کی زبان سے اعلان ایک مفید دستاویز ہے جس کی نوعیت کہتی ہے کہ راز اس وقت ظاہر کیا گیا جب کہ وہ تجویز کے درجہ سے نکل کر پوری طرح عملی صورت میں آگیا اور صاحب اختیار کو ان خیالات کے ظاہر کر دینے میں اب کوئی تردد نہ ہوا۔ مکالمہ شروع اس طرح ہوا کہ کسی شاعر نے کچھ اشعار پڑھے۔ انھیں سن کر عمر نے کہا: ”خدا کی قسم میں جہاں تک جانتا ہوں اس اشعار کا مصداق اولیٰ یزیدی ہاشم کے کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا۔“ ابن عباس موجود تھے، انھوں نے یہ سن کر

کہا کہ: ”تم نے اس کج میں توفیق پائی۔“ اس کے بعد مکالمہ یہ ہے:

عمر: ابن عباس کچھ جانتے ہو کہ تمہاری قوم نے تم لوگوں کو کیوں عہد رکھا؟

ابن عباس: اگر ہم نہیں جانتے تو امیر المومنین بتائیں گے۔

عمر: تمہاری قوم نے نہ چاہا کہ: نبوت و خلافت دونوں تمہارے خاندان میں رہیں۔ جس سے تم اپنی قوم پر فرد

مہمات کرو۔ لہذا مشریش نے خلافت کو اپنے ہاتھ میں لیا اور اپنی طرف سے خلیفہ بنایا۔

اس کارروائی میں مشریش صواب پر ہیں اور نیک توفیق پائی۔

ابن عباس: اے امیر المومنین اگر آپ اجازت دیں اور غصہ نہ فرمائیں تو میں کچھ کہوں؟

عمر: کہو!

ابن عباس:

امیر المومنین کا یہ کہنا کہ قریش نے خلافت اپنے ہاتھ میں لی ہے اور بہ اختیار خود خلیفہ مقرر کر لینے میں

نیک توفیق پائی ہے۔ اور اچھا کیا اگر مطابق حکم و اختیار خدا ایسا کرتے تو بے شک ثواب پاتے۔

اور کوئی ان پر رد نہ کرتا۔ ہاں یہ کہ مشریش نے ہم میں نبوت و خلافت کے جمع ہونے سے

کراہت کی تو خدا ایک قوم کی کراہت کے بارہ میں کہتا ہے: ”اور بہ سبب اس کے ہے کہ

انہوں نے کراہت کی اس چیز سے جس کو نازل کیا خدا نے۔ پس جہاں خدا نے ان کے

اعمال کو۔“

عمر: بیہات بیہات! افسوس افسوس! اے ابن عباس! ضرور مجھ کو تمہاری بہت سی باتوں کی خبر پہنچی

تھیں جن کو اس وجہ سے تم سے نہ دہرایا کہ اس کے اقرار سے تمہارا مرتبہ میرے نزدیک زائل

ہو جائے گا۔

ابن عباس: اے امیر المومنین بتائیے وہ کونسی باتیں ہیں؟ اگر حق ہیں تو ضرور میری منزلت گھٹتی چاہیے۔ اگر باطل

خبر پہنچی ہیں تو میں اپنی برادرت ثابت کروں گا۔

عمر: میں نے سنا ہے کہ تم کہتے ہو کہ خلافت ہم لوگوں سے ازراہ بغاوت و حسد و قلم چینی گئی؟

ابن عباس: قلم کا حال تو جاہل و عالم سب کو معلوم ہے۔ باقی رہا حسد۔ پس حضرت آدمؑ سے حسد کیا گیا اور ہم

لوگ انہیں کی اولاد ہیں اور ہم سے لوگ حسد کرتے ہیں۔

عمر: بیہات بیہات! اے ابن عباس تم لوگ بنی ہاشم کے دل نے یہ حسد کے سب باتوں سے انکار کیا۔

ابن عباس: بس بس! اے امیر المومنین جس قوم کے دلوں کی تعریف خدا نے لیں کھج عَنكُمْ اَلَّذِي جَسَّ اَهْلَ

الْبَيْتِ وَيَطْفُرُ كَهْ تَطْفُرُ اَنْبَا (۲۲: ۲۲) سے فرمائی ہے حسد اور کھوٹے پن سے ان کی طرف حسد اور

غش کی نسبت نہ کرو۔ حضرت رسولؐ کا دل بھی انہیں بنی ہاشم سے ہے۔

عمر: تم میرے سامنے سے ہٹ جاؤ۔

ابن عباس: بہت خوب! جب اٹھنے لگے

عمر: اے ابن عباس! خدا کی قسم میں تمہارے حقوق کی رعایت کرتا ہوں اور تمہاری خوشی کو دوست رکھتا ہوں۔

ابن عباس: اے امیر المومنین ضرور میرا حق تم پر ہے اور ہر مسلمان پر جس نے اس کی حفاظت کی وہ نصیب کو پہنچا اور جس نے ضائع کیا اس نے اپنا نصیب کھو دیا۔

مولوی شبلی صاحب نے ”الفاروق“ میں جو مکالمہ لکھا ہے اس میں عمر کی زبانی جواب کا اس قدر کلڑا زیادہ ہے کہ: ”شاید تم کہو گے کہ حضرت ابوبکر نے تم کو خلافت سے محروم کیا لیکن خدا کی قسم یہ بات نہیں۔ ابوبکر نے وہ کیا جس سے زیادہ مناسب نہیں ہو سکتا تھا۔ اگر وہ تم کو خلافت دینا بھی چاہتے تو ان کا ایسا کرنا تمہارے لیے کچھ مفید نہ ہوتا۔“

مکالمہ کے متعلق مولف الفاروق کا استنباط اور ریمارک
اس مکالمہ سے زیادہ کٹ مٹا مولف الفاروق کا یہ ریمارک

ہے کہ: ”ان مکالمات کا عطلہ اصل واقعہ کے تم اس کا بھی اندازہ کر سکو گے کہ حضرت عمر کے مبارک عہد میں لوگ کس دلیری اور بیباکی سے اپنے خیالات ظاہر کرتے تھے اور زیادہ اس وجہ سے کہ حضرت عمر آزادی اور حق گوئی کو قوم میں پھیلانا چاہتے تھے۔“ اگر امیر شام کو ایسے لوگ فخر کے لیے مل سکتے تھے جو جل اور ناقہ میں تمیز نہ کر سکتے تو مولفین کو ایسے پڑھنے والوں کا مل جانا عجب خیز نہیں ہے جو مکالمہ پر فخر کرنے کے بعد بھی اس نتیجہ اور ریمارک کو قبول کر لیں جو پیش کیا گیا ہے۔

قوم کو بنی ہاشم کے فرد مباہات کیوں عداوت تھی
مکالمہ، اس کا مفہوم، انداز اور اس کی پیکار تلخی اس قدر واضح ہے جس کی شرح کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اس سے زیادہ اور کیا صاف بات ہوگی کہ: ”تمہاری قوم نے نہ چاہا کہ نبوت و خلافت دونوں تمہارے خاندان میں رہیں۔ جس سے تم اپنے قوم پر فرد مباہات کرو۔“ اس میں سوال کی جس قدر بات ہے وہ یہی ہے کہ قوم کو ان کے فرد مباہات سے عداوت کی کیا وجہ تھی اور وہ کیوں ان کے احسانات کے معاملہ میں ایسی اٹلی بات پر آمادہ ہو گئی کہ دوسرا فرد مباہات کے موقع پر ہو تو ہو لیکن یہ نہ رہیں۔

خلیفہ کی رائے۔ تدبر کی مقدار
اور خلیفہ خود ان لفظوں میں رائے دی کہ: ”اس کارروائی میں قریش صواب پر ہیں اور نیک توفیق پائی۔“ اس میں تھوڑا یا بہت جس مقدار میں جو تدبر صرف اس قدر ہے کہ خلیفہ ”قوم“ کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ صاف ترین امر ہے کہ وہ کون لوگ تھے جو ”اس کارروائی“ (بنی ہاشم کو فرد مباہات کے درجہ پر رہنے نہ دینے) کے محرک تھے۔ جنہوں نے ”چھیدی ہوئی ناک دالے قریش کو“ اپنے ہاتھ میں لے لینے کا موقع پایا۔

ابن عباس کی شرح
ان کارروائیوں میں ابن عباس مشیرش کے نفس کی مسح شرح کرتے ہیں، جہاں کہتے ہیں کہ: ”مسم سے لوگ حسد کرتے ہیں۔“

بنی ہاشم میں یاسٹ پیدا کی گئی تھی اگرچہ یہ مکملہ انتقال شروع ہو گیا لیکن میرے خیال میں ابن عباس کے لیے نیا ہو تو ہو لیکن کسی طرح ابن الخطاب کے لیے نیا نہ تھا۔

اس لیے کہ اس کے اکثر ممنون وہی تھے جسے کہنے کے لیے عباس کے پاس گئے تھے۔ اور ایک حد تک تعفیہ کی بحث ہو چکی تھی۔ آج اگر یہ کہا گیا تھا کہ تمہاری قوم نے نہ چاہا کہ خلافت اور نبوت دونوں تمہارے خاندان میں رہیں اور وجہ یہ بتائی تھی کہ جس سے تم اپنی قوم پر فرد مہابت نہ کرو تو پہلے یہ کہہ چکے تھے کہ: ”اگرچہ لوگوں نے تمہاری اور تمہارے اصحاب کی منزلت بھی لیکن اس امر خلافت کو تم سے پھیر دیا۔“ اور غرض یہ تھی کہ تم ہمارا ساتھ دو اور ہمارا پیش کش قبول کر لو۔ عباس کے پاس جو سیاسی دھڑ گیا تھا اسے کوئی تقرری کامیابی نہ ہوئی، ابن عباس سے جو مکالمہ ہوا، اس میں حد، ظلم، بغاوت اور جہل اعمال وغیرہ کے ایسے گہرے الزامات کا یہ جواب تھا کہ: ”خدا کی قسم میں تمہارے حقوق کی رعایت کرتا ہوں اور تمہاری خوشی کو دوست رکھتا ہوں۔“ اور ابن عباس اس محبت نبی اللہ کو بھی اپنے حق کے دستار سے ہٹا دیتے ہیں۔ میں فخر انداز نہیں کر سکتا کہ حضرت عمر کا رخت لہجہ اس وقت طین ہو جاتا ہے جب ابن عباس اٹھنے لگتے ہیں!

چند واقعات چند واقعات نے اور لکھنے ہیں، جن کے من حیث الواقعہ ہونے سے کسی کو انکار نہیں ہے۔ لیکن حکمین اور مؤرخین دونوں کو ان میں ایسا عمل معلوم ہوا ہے جس کی غرض بھالنے کے لیے انھوں نے کوششیں کی ہیں۔ وہ یہ ہیں:

شعائر اللہ کی تعظیم مولوی شبلی صاحب فرماتے ہیں: ”اسلام کا ایک اصول شعائر اللہ کی تعظیم ہے۔ اسی بنیاد پر کعبہ اور حجر اسود وغیرہ کے احترام کا حکم ہے۔ لیکن اس کی صورت منم پرستی سے بہت کچھ ملتی جلتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ تمام مذاہب میں اس اصول سے رفتہ رفتہ منم پرستی قائم ہو گئی۔“

خلیفہ ثانی اور حجر اسود ”حضرت عمر نے مختلف موقعوں پر لوگوں کو اس غلطی میں پڑنے سے باز رکھا۔ ایک بار حجر اسود کے سامنے کھڑے ہو کر ملائیہ کہا: ”میں جانتا ہوں کہ تو ایک پتھر ہے، نہ فائدہ پہنچا سکتا ہے نہ نقصان۔“

ابن خلدون کہتا ہے: ”ایک دفعہ حج کرنے کو آئے طواف کیا، اور حجر اسود کو بوسہ دے کر سامنے کھڑے ہو کر کہہ دیا: ”میں جانتا ہوں کہ تو ایک پتھر ہے، نہ فائدہ پہنچا سکتا ہے نہ نقصان، لیکن چونکہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کو میں نے اسلام کرتے ہوئے دیکھا ہے، اس وجہ سے میں بھی کرتا ہوں۔“

محدثین نے اس خیال سے کہ عمر فاروق کے دامن عزت پر اس قول سے یہ بدنامی لگ جائے گا کہ انھوں نے شعائر اللہ کی اہانت کی، جہاں عمر فاروق کا قول نقل کیا ہے وہاں اس قدر اور اضافہ کر دیا ہے کہ علی بن ابی طالب نے ان کو اس کہنے سے روکا تھا اور ثابت کر دیا تھا کہ حجر اسود فتح و نصیب پہنچا سکتا ہے کیونکہ قیامت میں وہ شہادت دے گا۔ لیکن ناقرین فن حدیث نے اس اضافہ کو غلط اور بے بنیاد تسلیم کیا ہے۔

کیا شعائر اللہ کی یہی صورت صنم پرستی سے ملتی جلتی ہے؟
مؤلف الفاروق نے غالباً بہت احتیاط کی ہے کہ: "مطلق جلتی"

کا لفظ استعمال کر دیا ہے۔ ملاحظہ اس کی افتاداً "صنم پرستی" کھانے میں تقیہ نہیں کرتی۔ خصوصاً ایسی حالت میں کہ کسی مؤلف کی کتاب کا ہیرو اس کے تمام دلائل کا مرکز اور پہلو ہو۔ مجھے سوچنے کی ضرورت نہیں ہے کہ کس نے اپنے ہیرو کے انتخاب میں غلطی کی ہے۔ لیکن غالباً فردوسی نے اپنے:۔

صنم کردہ ام رستم داستان دے رستے بود در سیستان
و اے شعر کو اپنے ہی لیے پیٹنٹ نہیں کر لیا تھا۔ میں جو کچھ سوچ رہا ہوں وہ کہنے والے اور شرح کرنے والے کے متعلق یہ خیال ہے کہ: "صنم پرستی" سے وہ کیا بچے ہیں۔ میں حقیقتاً یہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ سقراط کی طرح اشیاء کی تعریفیں گھڑنے بیٹھیں۔ لیکن میں ایسے تعریف اشیاء کے قرآنہ کے لیے ایک رقم کا اضافہ بھتا اگر قابل منہاج نے حضرت عمر کی زبانی کسی شرح کی ناموجودگی میں غلطی کو "صنم پرستی سے ملتی جلتی صورت" کے کھانے کی کوئی کوشش کی ہوئی۔

موحدین اور صنم پرستی
موحدین صنم پرستی سے کیا مراد لیتے ہیں؟ یہ کہ صنم پرست اپنی صنعتوں کو وہ قوتیں حوالہ کرتے ہیں جو موحدین خدا کے لیے بکھتے ہیں اور اس طرح ان صورتوں کی پرستش سے بچانے خالق کے مخلوقات کی پرستش ہونے لگتی ہے۔ یہی حالت اس زمانہ کی بھی تھی جس میں دریا، پہاڑ، آگ، اور طوفان وغیرہ کی پرستش ہوتی تھی۔ جس میں لوگ اگرچہ ان میں سے کسی شے کو قادر مطلق نہیں سمجھتے تھے لیکن خدا کی کسی نہ کسی قوت کا اتار بکھتے تھے۔ اب کیا مسلمان کہہ یا قرآن اس وقت سے آج تک کوئی خدائی اختیار حوالہ کرتے ہیں؟ نہیں۔

بت پرستی کی ایک یہ شاعری حقیقتاً متذکرہ صدر مفہوم میں نہ ہوتی اگر یہ کہا جاتا کہ چونکہ ہم نے خدا کو کبھی نہیں دیکھا ہے اور ہم ایک ایسی چیز کے مرکز پرستش بنانے کو دشوار سمجھتے ہیں جسے ہم نے دیکھا نہیں ہے، اگرچہ ہم اس کے وجود کا انکار نہیں کر سکتے لہذا ہم نے مرکزیت کے لیے ایک صورت بنائی ہے جسے ہم خدا سمجھتے ہیں، عام اس سے کہ وہ جسم یا جہانی ہو یا نہ ہو، خیالی حیثیت سے، ہم مادے اور صورت کو منفرداً یا مجموعاً بھی خدا نہیں سمجھتے، بلکہ ہم اسے خدا فرض کرتے ہیں، یہ صورت خیالی حیثیت سے خداوند تعالیٰ کے سوا چیزوں کے قائم مقام نہ ہوتی۔ ہم نے نہ خدا کی قوتیں گوشت اور خون کو حوالہ کی ہوتیں، نہ عناصر کی اور نہ کوئی ایک خدائی قوت کسی ایک کو یہ پہلے برے مفہوم میں بت پرستی نہ ہوتی بلکہ اس مفہوم میں کہ تم نے خدا کا خیالی بت بنایا۔ لیکن چونکہ موحدین، مسلمان اور فیلسوفین کے نزدیک خدا اس سے بالاتر ہے کہ کسی خیال اور صورت کے اندر آسکے، اس لیے اس دوسری صورت کی "خدا کی بت پرستی" "فرضی" صورت گری کے لحاظ سے قابل اعتراض ہوتی، نہ اس لحاظ سے کہ تم نے شرک کیا یا دوسری چیزوں کو خدا کی عہدات میں شریک کیا، پھر بھی یہ دوسری صورت لطافت توحید کے اندر نہ آسکتی جس میں صورت گری تو دور از حال یہ بھی دور ہے کہ اس کی صفت زائد از ذات بھی جائے اور مزید غلطی یہ ہے کہ بلا وجود اس ادعا کے کہ ہم مادہ اور اس کی صورت کو مجموعاً یا منفرداً خدا نہیں سمجھتے بلکہ فرض کرتے ہیں، پھر بھی اس خیال کی غیر مرئی یا ظاہر صورت یہ ہے کہ ہم خدا کی پیدا کی ہوئی کسی شے یا اپنی صنعت کے نمونہ کو خدا کی عہدات کا مرکز قرار دیتے ہیں۔ اور بلا وجود ادعا کرتے ہیں کہ تقیہ وہ شے عہدات کے خیال کے اندر شامل ہو جاتی

ہے۔ پس اگرچہ ہمارا ارادہ غیر خدا کی پرستش کا نہ بھی ہو، تاہم عطا ایسی چیز کی پرستش ہوتی ہے جو خدا نہیں ہے۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا مسلمان کعبہ و حجر اسود کو اس دوسری صورت کے کسی مفہوم میں سمجھتے تھے یا سمجھتے ہیں؟ نہیں۔

تاریخی صورت اب تاریخی اور مذہبی صورت کی طرف توجہ کرو۔ ”جب خداوند نے ابراہیم (ابراہیم) کو دکھائی دے کے کہا کہ اے ابراہیم! میں تیری نسل کو دوں گا، اور اس نے وہاں خداوند کے لیے جو اس پر ظاہر ہوا

ایک قربان گاہ بنائی اور وہاں سے روانہ ہو کے اس نے بیت ایل کے پورب کے ایک پہاڑ کے پاس اپنا ڈیرا کھڑا کیا۔ بیت ایل اس کے کچھ اور جہتی ان کے پورب تھا اور وہاں اس نے خدا کے لیے ایک قربان گاہ بنائی اور خداوند کا نام لیا۔“ (توریت کتب سیدائش باب ۱۲ آیت ۵-۸) اور اگر تو (موسیٰ) میرے لیے پتھر کی قربان گاہ بنائے تو تراشے ہوئے

پتھر کی مت بنائیو کیونکہ اگر تو اُسے اوزار لگانے کا تو اُسے ناپاک کرے گا۔“ (توریت کتب خروج باب ۲۰ آیت ۲۵) کون نہیں جانتا جس نے توریت پڑھی ہے کہ حضرت ابراہیم، یعقوب اور اسحاق کسی پتھر کو قربانی کے لیے مخصوص کرتے تھے

اور چونکہ اس پتھر سے خدا کی قربانی اور خدا کا نام منسوب رہتا تھا لوگوں کو نہ صرف خدا بلکہ مقدس قربانی کرنے والا بھی یاد آجاتا تھا یہاں تک کہ حضرت موسیٰ کی کسی حد تک مطمئن حالت نے قوم اسرائیل کے مخصوص قربان گاہ بنائی جس کے علاوہ

بنائے کی اجازت نہ ہوتی نہ اس لیے کہ قربان گاہ بنانا کسی عقیدہ شرک کے لحاظ سے برا تھا بلکہ قومی، معاشرتی اور سیاسی اغراض سے کہ عدم مرکزیت نہ ہو۔ بعد کے زمانہ میں اسرائیل اور یہود کی حکومتوں کی جنگ کے اسباب میں ایک یہ بھی تھا کہ

انہوں نے الگ الگ قربان گاہ بھی بنائی تھی۔ اس سے الگ جو موسیٰ اور شلیمان نے بنادی تھی۔ توریت سے بت پڑتی کا جو مفہوم مجھ میں آتا ہے وہ یہ ہے کہ پتھر کو لوہا لاکر کوئی صورت نہ بنائی جائے جو پرستش کے کام یا منتقلات میں لائی جاسکے نہ یہ

کہ بیت المقدس کا سا کوئی گھر نہ بنایا جائے جس میں تعمیری حیثیت سے پتھروں کے گھرنے کی ضرورت ہو۔ آگے چل کر گوسالہ پرتی کی تردید بتائی ہے کہ کسی ایک یا چند دھاتوں سے کسی جانور کی صورت بھی پرستش کے لیے نہ بنائی جائے۔ اور

اس کے بعد بعل، زہرہ اور اشروت کے بتوں سے بنی اسرائیل کا بازار کھا جاتا ہے بتاتا ہے کہ سیاروں اور ایسے ہی قدرت کے نمونوں کے بت بنا کر ان کی پرستش نہ کی جائے۔ کیا حجر اسود کی بھی صورت توریت کے کسی اعتراض کے اندر تھی؟ نہیں۔

ہمارا اہدایت نامہ بھی یہ تین باتیں پیش کرتا ہے کہ: **قرآن شریف اور بت پرستی کی قسمیں**

قَدْ دُفِنَ اللَّهُ (۳: ۷۳) (سواللہ کے کسی کی مہلات نہ کریں۔ کسی چیز کو اس کی طاعت میں شریک نہ کریں۔ اور سوائے خدا کے اپنے میں سے کسی کو اپنا خدا نہ بنالیں) ظاہر ہے کہ قرآن پاک کو اپنی تیسری صورت کی جو ضرورت محسوس ہوتی تھی وہ اس غلو کے لحاظ سے جو میچوں میں حضرت عیسیٰ کے اپنے متعلق بعض کی اعتیاد کے فحشوں سے پیدا ہوگئی۔ حضرت موسیٰ

جانتے تھے کہ فراعنہ مصر اپنے کو سجدہ کراتے ہیں جس کا متاخرن انبیائے بنی اسرائیل کو اپنے دو فاتحین یعنی اہل بابل اور اہل روم سے بھی تجربہ ہوا۔ قطع نظر اس خیال کے کہ قوموں نے جو کم ترقی ملی اور عقلی زمانہ میں ضمیمہ انہوں نے اپنے بعض

مشاہیر کی بت سازی میں جو پیشتر ان کی یاد اور وقت کے لحاظ سے ہوا آئندہ یہ ترقی کی کہ انہیں خدا کا کوئی اوتار سمجھنے لگے۔ بنا برآں اس ضروری امر کو بھی جس کے طرف یہودیت اور مسیحیت میں خاص توجہ نہیں دلائی گئی تھی اسے اسلام نے پورا کیا۔

جو مل ماننیہ کا متم قہد

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا ہم مسلمان کعبہ یا حجر اسود کی عہدوت کرتے ہیں؟ آیا ہم اسے خدا کی عہدوت میں شریک کرتے ہیں؟ نہیں۔ اور تیسری صورت یعنی ”اپنے میں سے خدا بنالینے کی“ محض انسان کے لیے مختص ہے جو کعبہ اور حجر اسود کے لیے صلاقی نہیں اسکتی۔ بیت المقدس میں تو یہ بھی جائز رکھا گیا تھا کہ ایک صندوق قانون کی لومیں رکھنے کے لیے بنایا جاتا اور دو فرشتوں کی صورتیں ہوتیں جو اپنے پروں سے صندوق پر سایہ کیجے ہوتے۔

”جس میں نہ کہ“ جس کی“ کعبہ تو وہ گھر ہے جس میں عہدوت کی جاتی ہے نہ کہ جس کی عہدوت کی جاتی ہو، اور اس میں حجر اسود ہے جس کا تمام قابل اعتراض احترام

مس کرنے اور بوسہ دینے تک محدود رہا اور ہے۔

کعبہ کی قدیم تاریخ کارلائل کہتا ہے کہ ڈیوڈ اور سیکولس سہیگی سے نصف صدی قبل کا ذکر کرتا ہے کہ وہ اس کے زمانہ کا نہایت ہی قدیم اور محترم معبد ہے۔ ”بے شمار عہدوت کرلے والوں کی آنکھیں آج بلکہ ہمیشہ دن میں ہاتھ اس کی طرف پھرتی ہیں۔ انسانی مسکن میں مشہور ترین مرکز ہے۔“

کعبہ اور حجر اسود کی تعظیم کے متعلق ابتدائے حضرت سرور عالم نے کیا کیا اور تیرہ صدیوں کے ابتدا اسلام سے آج تک مسلمانوں کا کیا طرز عمل رہا۔

دیکھو کہ حضرت نے حج مکہ کے بعد ”جب حجر اسود کے بارہ بیچے اسلام کیا اسے یعنی ہاتھ سے مس کیا اور بوسہ دیا اس کے نشیں۔ اور بعد اسلام حجر سرور عالم نے شروع کیا طواف کرنا۔“ اس کتب میں حجہ الوداع کے زمانہ میں ہے کہ: ”اور حالت اسلام یہ کہتے تھے: بسم اللہ اللہ اکبر اور کھمبی پیشانی اس پر رکھتے تھے اور اس جگہ سجدہ کرتے اس وقت بوسہ دیتے اس کے بعد ”جب صفا کے نزدیک آئے یہ آہ پڑھا: اِنَّ الْمَقْفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعْبِئِ اللّٰہِ۔۔۔ (۲: ۱۵۸)

پس صفا کے اوپر چڑھے ایسے کہ کعبہ کو دیچہ سکے۔۔۔ اور تکبیر کی اور کہا: لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ لَہٗ الْمُلْکُ وَلَہٗ الْحَمْدُ وَہُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْمٌ۔۔۔ مسلمانوں نے اس وقت سے آج تک کعبہ اور حجر اسود کو کیا

کھل نہ ان میں سے کسی کو خدا کھل نہ خدا کا اوتار کھا، اور نہ ان میں سے کسی کو خدا کی کوئی قوت یا قوتیں حوالہ کیں۔ کعبہ کو اگر بیت اللہ کھا یا بیت اہرام کہا تو حجر اسود کو حجر اسود کہل نہ اس طرح کیا جس طرح اپنے ہاوی کو دیچا تھا یا جس طرح حکم ملا تھا۔

مولانا امیر المومنین اپنے خطبہ جامعہ میں تعصب اور تکبر سے پرہیز کرنے اور تواضع اور فروتنی اختیار کرنے کی مثالیں دیتے ہوئے فرماتے ہیں: ”کیا تم نہیں دیکھتے ہو کہ پروردگار عالم

نے اپنے بندگان اولین کو ابتدائے حضرت آدم صلوٰۃ اللہ وسلم علیہ سے لے کر اس عالم موجودہ کے آخرین تک پتھروں کے ساتھ آزمایا، ایسے پتھر جو نہ ضرر پہنچا سکتے تھے نہ قح، نہ دیکھتے سنتے تھے۔ ان پتھروں کو اپنا ایسا بیت اہرام بنایا جسے لوگوں کے مصلحت کے لیے قرار گاہ اور تکیہ گاہ قرار دیا۔ اور یہ کھاپ پتھر کے قطعات زمین میں سے نہایت ہی سخت قطعہ۔

برونے کھونڈ و زمین خشک دنیا کے شہر، سخت پہاڑوں، ریگ کے ٹیلوں، کم آب چشموں اور مستغرق قریات کے درمیان اسے ایک نہایت ہی تنگ وادی قرار دیا۔ نہ شر اس میں پرورش پا کر تروتازہ اور فرہ ہو سکتے ہیں نہ سمدار حیوان

نہ کھروں والے۔ پھر آدم اور اس کی اولاد کو حکم دیا کہ قصہ اور توجہ کو اس کی طرف مائل کریں۔ پس وہ (بیت اہرام) ان لوگوں کے مناخِ معرکہ کا مرجح۔ ان کے بوجھ اتار دینے کے مکان کی انتہا ہو گیا۔ قطع ہو جانے والے سمندر روں کے جزروں، عقیق فاروں میں واقع ہونے والے مکاؤں، بے آب و گیاہ اور دور دور از زیباہوں سے سفر کرتے ہوئے دلوں کے میوے اس کی خواہش کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ نہایت شوق کے ساتھ اطاعت کی حالت میں اپنے شانوں کو حرکت دیتے ہیں۔ اس کے اطراف میں خوشنودی خدا کے لیے صدائے لیلیک بلند کرتے ہیں۔ خداوند تعالیٰ کے لیے بالوں کو پریشان اور غبار آلود کئے ہوئے ایسی حالت میں اپنے پاؤں پر دوڑتے ہیں کہ اپنے پیراہنوں اور لباسوں کو پشت پر لاد رکھا ہے۔ اپنے بدن کے حسین مقامات کو ہل نہ ترشوانے کے سبب سے زشت اور بد روپ کر لیا ہے اور یہ حکم، احسانِ عظیم، آسمانِ شہید، ایک بین جانچ پڑتال اور انتہائی رستگاری کے لیے منتخبین فرمایا اور اس امتحان و آسائش کو اپنی رحمت کے سبب سے جنت تک پہنچ جانے کا سبب اور وسیلہ قرار دیدیا۔ اگر پروردگار عالم اپنے بیت اہرام اور اپنی عبادت کے بزرگ مقامات کو باہفت، نہروں، نرم اور ہوار زمینوں، میوے کے قریب پہنچتے ہوئے درختوں کے جھنڈ، گندم کے دانوں، سرسبز مرغزاروں، باہفت والے کشت زاروں، پانی سے سیراب رہنے والے اطراف، تروتازہ زراعتوں، اور آب و رستوں کے درمیان واقع ہونے والے قریات میں قائم کر تہ تو بے شک اس امتحان کی غری کی بنا پر جزا اور ثواب کی مقدار بھی بالکل قلیل کر دیتا وہ بنیادی جن پر بیت اہرام محمول ہے۔ وہ پھر جن کے سبب سے بیت اللہ بلند اور رفیع ہے اگر سرسبز زمر، سرخ یا قوت اور نور و روشنی کے درمیان واقع ہوتے تو بیشک اس کے سبب سے سینوں میں شہادت کے ظلمے کو خفیت اور ضعیف، ابلیس کی کوششوں کو قلوب سے الگ اور شک و شبہ کے مقامات کو لوگوں سے دور کر دیتا لیکن پروردگار عالم اپنے بندوں کو طرح طرح کی سختیوں سے آساناتا ہے۔ قسم قسم کی مشقتوں سے ان کی عبادت کی تحقیق کرتا ہے انواع انواع کے مکر و مہات میں مبتلا کرتا ہے۔ کیوں؟ ان کے دلوں سے تکبر کو خارج کرنے کے لیے، فروغی، ذلت اور انکساری کو ان کے نفوس میں جگہ دینے کے لیے اور اس لیے کہ اس امتحان و آسائش کو اپنے فضل و کرم کے طرف کھلے ہوئے دروازے، اپنی بخشش اور مطلق کے لیے آسان سبب مقرر فرمائے۔

حج تقویت دین کے لیے ہے ایک دوسرے ظلمہ میں ذمیت حج "تقویت دین کے لیے"۔

ان تمام باتوں کے لکھنے سے مین خلیفہ کے تجربہ بت پرستی کا فکری نہیں ہوں لیکن میری غرض یہ ہے کہ نافع خلیفہ نے عمر اسود کو پتہ کرنے کی تکلیف گوارا کی۔ اس کا نام ہی عمر ہے اور اندھا بھی اسے ٹٹول کہ پتہ کرہ سکتا ہے۔

بے کار ریمارک کا اثر ایسی صورت میں کہ خلیفہ نے اپنے اس برہنہ ریمارک کی تاویل کسی وجہ سے نہیں کی۔ ہوں کوئی مؤرخ یا حکم وہ کوئی نہیں دیکھا سکتا جس میں

اس کی دلیل لگائی جاسکتی ہو لیکن خلیفہ نے جس خیال سے کیوں نہ کہا جو جس میں اہانت شاعر اللہ ایک ایسی ذمہ بات ہے جسے ہر شخص دیکھتا ہے۔ محکمین اور مؤرخین نے اپنی تاویل میں اس قدر حمایت نہیں کی جس قدر پر وہ جہادیا، اور ابلیس وہ لائے جو نہ صرف خدا کے حکم، رشول کے طرز عمل، مسلمانوں کی بیا آوری حکم اور عمل کے مخالف ہے۔ بلکہ کسی طرف

عقل کے نزدیک ادنیٰ توجہ کی چیز نہیں ہے۔ فلسفیانہ نقطہ خیال، اور توحید مذہب دونوں ”منہ پرستی“ کے الزام کو مفردانہ نفرت سے ٹال دیتی ہے۔ مسلمان جانتے ہیں کہ ان کے ہاوی کی تعلیم اور مسلمانوں کے عمل سے توحید کامل ہوئی۔ اسلام اور اعمال حج کی اس شان نے بھی مفسرین کو ہانپ نہیں رکھا کہ مفس کرتے وقت مس کرنے والا خدا کے نام سے شروع کرتا ہے اور خدا کے بزرگ ہونے کا اقرار کرتا ہے۔ مفا اور مردہ کو شاعر اللہ کہتا ہے۔ کہتا ہے کہ سوا خدا کے کوئی خدا نہیں ہے، وہ اکیلا ہے اور اس کا شریک نہیں ہے، اسی کا ملک ہے اسی کے لیے تمام حد ہے اور وہی تمام چیزوں پر قادر ہے۔

کعبہ اور حجر اسود کے احترام کی وجہ یہ واقعہ ہے کہ اوائل اسلام سے آج تک نہ صرف ہاوی اسلام نے حجر اسود اور کعبہ کا احترام کیا بلکہ مسلمان بھی

کرتے رہے۔ نہ اس وجہ سے کہ ڈیوڈورس نے اسے قدیم کہا ہے یا پولوس یعنی ابن مریم کا حواری اپنے سفر عرب کے زمانہ میں یہاں گیا ہو کہ نہ اس وجہ سے کہ سالوسٹوڈی ساسی کہتا ہے کہ قرینہ ہے کہ اجماع سلاوی میں سے کسی جرم کا کوئی شکستہ ٹکڑا ہے۔ نہ اس وجہ سے کہ حضرت ابراہیم نے اس پتھر پر خدا کے نام کے لیے قربانی کی ہوگی، یا یہ ٹکڑا بہشت سے آیا ہوگا یا اس لیے کہ یہود، نصاریٰ، مومنین، اور صابین نے منفرداً اور مجتمعاً اسے اپنا معبود قرار دیا اور ایک معلوم زمانہ سے اس جگہ کو عبادت گاہ بننے کی خصوصیت حاصل ہوئی۔ اور اس وجہ سے اسے خدا کی خالص عبادت گاہ بنانا اس مفہوم میں مفید ہوا کہ اس مرکز سے خیالِ قدس کا سلسلہ شکست نہ ہونے پائے۔ بلکہ اس وجہ سے کہ عالم کے سب سے بڑے نقیب توحید نے اس مقام کو عبادت الہی کے لیے مخصوص کیا اور اس وجہ سے کہ ہمارے ہاوی کے دستِ اقدس اس سے مس ہوئے۔ ہم کو اپنے ہاوی کا عمل اور حکم معلوم ہے۔ اگرچہ شخص کے وجوہات معلوم نہ ہوں۔

انسان بہت سی چیزوں کی تعظیم کرتا ہے ہم کس کس چیز کی فہرست دی جن کی انسان تعظیم اور احترام کرتا ہے۔ کیا انسان اپنے والدین کی تعظیم اور احترام نہیں

لیکن کوئی اسے بت پرستی نہیں سمجھتا کرتا ہے۔ یہاں تو نہ صرف تصویر ہے بلکہ گوشت اور خون بھی ہے اور ہماری تخلیق کی ایک بڑی وجہ ہے انسان جھکتا ہے۔ وہ سب جھکتا ہے جو انسان میں اچھا ہے اور اپنے اس اطاعت احترام اور تعظیم کو سعادت سمجھتا ہے۔ سوچو ایک ایسے وقت کو جب کہ انسان ایک بڑے پہاڑ کے نیچے کھڑا ہے، غوس، سیاہ مارے کا ڈھیر جو ہمارے قدم سے ہزار ہزار درجہ بلند اور عریض ہے۔ کیا معلوم ہوتا ہے۔ غوس خون، ہماری کیا حالت ہوتی ہے۔ اگر ہم پہتے ہوئے صاف، عین اور چوڑے دریا کے قریب کھڑے ہوتے ہیں، دیکھتے ہیں کہ ایک چوڑا سیال جسم لہریں لیتا اور ٹکراتا ہوا بڑھتا چلا جاتا ہے، ایک کیفیت لطف اور محویت طاری ہوتی ہے۔ ہم اس کی عظمت سے مرعوب ہوتے ہیں۔ سب نہ ہوتے ہوں گے، جو مارے کی ان عظمت اور جسمِ مشکوں کو دیکھ کر قتیلاً اللہ احسن الخلقین (۳۳: ۱۳) کہہ دیتے ہوں۔ لیکن ان احساس کے فکر نہیں ہو سکتے۔ کیا ہم لوگ اپنے اس احساس سے عناصر پرستی کے حد کے اندر آتے ہیں؟ بے شک بغیر ارادہ بھی ہمارا تمام خالص جسمانی اور روحانی قوت اور عظمت سے مستحیر اور متغلب ہو گیا ہماری ظہرت ہیجان میں آگئے۔ کیا یہ احساسات فلسفہ توحید کی اعلیٰ ترین ترقی میں کبھی شرک اور بت پرستی کے حد کے اندر آئے۔ نہیں لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ:

”ملتے جلتے“ کے وسیع المعنی لفظ کے باہر ہے۔

حج کا منظر حج کا فلسفہ اور اس کی صورت جن روشن نقطوں میں دکھائی گئی ہے وہ جناب امیر کا حق تھا بندہ عزیز فدوی اور انگاری سے اپنے معبود کی عہدیت کے لیے دل و جان سے آمادہ ہوتا ہے۔ اس کی سراپائی اور حیرانی، اس کا عین ہوش ہے۔ وہ لیبیک کہتا ہے۔ گویا مالک کی صدا پر خادم صدادے رہا ہے۔ یہ عہدیت کا سب سے عظیم اور اظہار عبودیت، اخلاص اور محبت کا وہ کلڑا ہے جس کے بے شمار عنصروں کی تشریح نہیں ہو سکتی اور ہو سکتی ہے تو اس کا لطفت اور خوبصورتی قائم نہیں رہ سکتی۔ ایک نہیں ہزاروں ہزاروں نہیں لاکھوں بندے اس طرح خدا کی عہدیت میں مشغول ہیں۔ اس کا تماشا نہیں ہے کہ لوگ کیا کر رہے ہیں، بلکہ توحید کا تماشا ہے کہ کس طرح مختلف صداؤں، لہجوں، زبانوں ترتیب اور چاتھوں سے وحدانیت اپنے کو بلند کر رہی ہے۔ کون نہیں جانتا کہ کعبہ، حجر اسود، صفا اور مردہ ان میں سے کوئی یا سب مل کر توحید کا کوئی جزو نہیں ہے۔ نہ توحید بغیر اس کے ناقابل ہے۔ ہم اپنے کمرہ کے تمام دروازے اور سوراخ بند کر کے اقرار توحید کر سکتے ہیں۔ اسلام نے عہدیت کے لیے کسی مخصوص مقام کی قید نہیں کی ہے۔ خدا محیط کل ہے۔ اس کی عہدیت ہر جگہ ہو سکتی ہے۔ نہ فرضیت حج اس کے منافی ہے، بلکہ اس کے فرض ہونے کے وجوہات میں اصل وہی وجہ ہے کہ ”قنوت دین“ کے لیے ہے۔ قوت خیالی ہو یا عملی، تنہائی میں نہیں ہے بلکہ مجموعہ میں ہے۔ عمر بھر گوشہ میں عہدیت کرنے والا ایک مرتبہ دیکھتا ہے کہ ہم ہی نہیں، بلکہ ہماری طرح اور بندے بھی اسی طریقہ سے عہدیت کر رہے ہیں۔ جس طرح ہم کرتے ہیں۔ وہی خیال جو ہماری روح کی تسکین ہے دوسروں کا بھی رہنا ہے۔ نوعیت انسانی، رسم و رواج، زبان، لہجہ، آب و ہوا، کوئی چیز ایسی نہ تھی جو اس خیال سے مغلوب نہ ہو جاتی۔ یہ اعتقاد کی بلندی اور قنوت کا باعث ہوتا ہے اور اس کے بعد ان ہم خیالوں میں جو محبت پیدا ہوتی ہے وہ کسی تعارف کی محتاج نہیں رہتی۔ یہ حالت ساخت قومیت کے اس نظریہ کی تابع نہیں رہتی کہ مذہب، زبان، نوعیت اور رسم و رواج اور آب و ہوا ایک ہو، بلکہ محض مذہب وہ حکومت ہو جاتی ہے جس کی ماتحتی دیگر عنصروں کی ناموجودگی میں بھی پائشان جسم اور اعضا کو ایک رکھ سکتی ہے۔ یہ قوت ہے بلکہ وہ قوت ہے جو کسی اور کو حاصل نہیں ہے۔ کیونکہ کسی اور کا ایسا جلتا ر خالص مرکز نہیں ہے۔ اس کا مرکز قرار دینا اپنی ملت و مذہب کی مفید من اللہ عقل کا کام تھا۔ جس سے مسلمان ابد الابد ایک اصول معاشرت کی ہر قسم کی ترقی کے باوجود مذہبی، معاشرتی، سیاسی فتح اٹھا سکتے تھے اور اٹھا سکتے ہیں۔ اس مرکز کی تختیر کرنا یا اس کے ساتھ عدم مرکزیت کے باعث خیالات کو ملا دینا نہ صرف اس کے قدس پر حملہ ہے بلکہ اس کل کے پرزے علیحدہ علیحدہ کر دینا ہے جو نہ صرف قوم بنتی ہے بلکہ جنگی دور کرتی ہے۔

کعبہ کے اسباب آرائش کے فروخت کرنے کی تجویز اب جو روایت میں بیان کرتا ہوں وہ متذکرہ صدر واقعہ کا

ایک ضمن بکھا جاسکتا ہے میں نے اسے تہذیب المتین فی سیرۃ امیر المومنین اور نیزنگ فصاحت ترجمہ فتح البلاغہ میں دیکھا ہے جسے میں آخر الذکر سے نقل کرتا ہوں: ”زمانہ عمر خطاب میں لوگوں نے کعبہ کی آرائشوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ کعبہ کو ان آرائشوں کی کیا ضرورت ہے۔ اگر آپ اخصیں وہاں سے اٹھا کر کسی لشکر کی تیاری میں صرف کریں تو یقیناً باعث ثواب ہوگا۔ خلیفہ صاحب نے بھی یہ رائے پسند کی اور ارادہ کر لیا کہ کعبہ کی تمام آرائشوں کو برطرف کر دیا جائے۔ اور حضرت

امیر المومنین علیہ السلام سے بھی اس بارہ میں رائے دریافت کی حضرت نے فرمایا: بے شک قرآن ہی پر نازل کیا گیا ہے اور مال کی چار قسمیں تھیں (مسلمانوں کا مال فی، غنم، زکوٰۃ) اور کعبہ کی آرائشیں اس روز (نزول قرآن کے وقت) بھی ایسی ہی تھیں جیسے آج ہیں۔ مگر خداوند عالم نے انھیں ان کے حال پر چھوڑ دیا۔ اب سوچنا چاہیے کہ خداوند عالم سے یہودیسیان کے باعث یہ فروگراشت نہیں ہوئی۔ نہ اس کامکان اس کی نگاہوں سے پوشیدہ تھا۔ پس تو بھی ان آرائشوں کو وہیں قائم رکھ جہاں خداوند عالم اور اس کے رسول نے انھیں قائم رکھا ہے۔

وہ درخت کٹوا دیا گیا جس کے سایہ دوسرے ایک واقعہ کو ابن خلدون بیان کرتا ہے کہ ”فتح مکہ سے پیشتر میں رسول نے جہاد کی بیعت لی تھی جس درخت کے نیچے بیٹھ کر اسحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے لوگوں سے جہاد پر بیعت لی تھی۔ اور زمانہ عمر فاروق میں لوگ اس کو تبرک کج کر زیارت کرنے کو آنے لگے تھے۔ انھوں نے یہ دیکھ کر اس کو کٹوا دیا کہ آئندہ مبادا اس کی پشش ہونے لگے۔ اور رفتہ رفتہ اس کے ذریعہ اسلام میں شرک نہ ہو جائے۔ اصل یہ ہے کہ اسلام انھیں غلیظوں کے مٹانے اور لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی خالص عہدوت سکھانے کو آیا ہے۔ آج کل کا زمانہ جو تا تو بے چارے عمر فاروق پر خدا جانے کس چیز کو فتویٰ دیدیا جاتا ہے۔“

متذکرہ عبارت میں مترجم اور مؤرخ کی دلیل اور کوشش کو دور کرنے کے بعد واقعہ صرف اس قدر رہ جاتا ہے کہ ”فتح مکہ سے پیشتر جس درخت کے نیچے اسحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے لوگوں سے جہاد پر بیعت لی تھی اسے انھوں (عمر) نے کٹوا دیا۔“

تاریخی حیثیت ہو گئی تھی اس میں بات کوئی غیر معمولی نہیں ہے جس پر توجہ دلائی ضرور ہو۔ بجز اس کے کہ یہ درخت وہ نشان تھا جہاں ایک سخت وقت میں ہمارے ہادی کو تجدید عہد کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اور وہ عہد جہاد کے لیے تھا۔ اس لحاظ سے اب اس مقام کو نہ صرف ایک تاریخی واقعہ کی یاد سے تعلق تھا بلکہ نئی عربی کی ذات اقدس نے اس میں اور بھی محبت کا جز شامل کر دیا تھا۔ کوئی عجب نہیں ہے کہ لوگ اس مقام کو دیکھنے آتے ہوں اور دم لیتے ہوں اور ایک ہتم باشندان واقعہ کی تمام کارروائی ان کے نگاہ کے سامنے گزر جاتی ہو۔ خبر یہ کہتی ہیں کہ غلیظ نے پہلے لوگوں کو اس کے قریب جانے سے دھمکایا اور پھر کٹوا دیا۔ یہاں تک کہ مناجات النبوة اور قرۃ العیون میں باختلاف الفاظ یہ خیال پایا جاتا ہے کہ: ”حدیبیہ نام ایک کنویں یا درخت کا ہے کہ اس مکان (جگہ) میں تھا۔ اور وہ مکان حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ ہدایت نشان میں متعین اور معلوم تھا اور صحابہ کے عہد مبارک میں وہ مبہم اور مجہول ہو گیا۔ اب آدمی زیارت اس کی سے محروم ہیں۔ اس کی جہت مسافت کی معلوم ہے مگر مخصوص اور متعین نہیں ہوتا۔“

اور اگرچہ حضورؐ نے ہی زمانہ کے بعد لوگوں نے موضع خمرہ میں ایک مسجد بنالی لیکن سعید بن مسیب کو خمرہ کے بیچ مقام کا تعین نہ ہوا اور انھوں نے اپنے باپ کا قول نقل کیا جو بیعت رضوان میں شریک تھے کہ: ”جب باہر آئے ہم سال آئندہ فراموش کیے گئے ہم اس موضع کے نشیں جو خمرہ تھا پس قدرت نہ پائی ہم نے اس کے دریافت پر اور مشتہبہ ہوا وہ مکان اور ہمارے۔“

لشکارے جو آثار رسول کے ساتھ ہم مسلمان اس واقعہ پر ہر وجود صدیوں گزر جانے کے اس محبت بے نیازی کی وجہ سے بڑے ہو جاتے ہیں اور حدیث کے لحاظ سے مناسبت ہو سکتے ہیں جو ہمیں دراستہ اور علمی حیثیت سے ملے ہیں اور سوچ سکتے ہیں کہ آثار رسول کے ساتھ یہ بے رحمی بھی جانے کہ اگر وہ چیزیں نیست و نابود کر دی جائیں جو ان کے یاد آنے کا ایک وسیلہ تھیں۔ لیکن حقیقت ہم پر ویسا اثر نہیں پڑ سکتا جیسا ان لوگوں پر جنہوں نے جناب اقدس نبوی کی زیارت کی تھی۔

قرآن میں ذکر کیے جانے کے قابل درخت اور اس قرآن میں ذکر کیے جانے کے قابل درخت ﴿إِذْ يَبَايِعُكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ﴾ (۱۸: ۳۸) کے بیعت کی تھی۔ اور تھیں وہ تمام حالتیں یاد آجاتی ہوں گی۔ جن میں اس عہد کی ضرورت ہوتی تھی۔

تاریخی مماثلتیں ہم لوگ جو میوزیم اور اسٹیج کے زمانہ میں ہیں ہر روز دیکھتے اور سنتے رہتے ہیں کہ قومیں کس طرح اپنے افراد کی یاد قائم رکھنے کے لیے ایسے مسلمان ضروری سمجھتی ہیں اور اہتمام کرتی ہیں، غلیف کا یہ فعل ہماری کج میں نہیں آتا کہ وہ عبدالوہاب غیری کے لیے مسلمان کے علاوہ مسلمانوں کو بھلے معلوم ہوں جن کے مزید واقعات تاریخ دوم (ترک) میں مل سکتے ہیں۔ حقیقتاً عبدالوہاب کا نہایت مشہور فعل مسلم بن عقبہ کی بٹا گردی تھی اور اس کے بعد باقرین اور طلبانے تاریخ کے کھنڈے کی بات ہے کہ ابن عقبہ اور ابن نمیر وغیرہ نے یہ اور اس کے بعد خانہ کعبہ کے ساتھ جو کچھ کیا وہ کس مصلحت کا شوق تھا!

ایسی الزام دہی جس کے مسلمان کبھی مرتکب نہ تھے وہ مشکلم جو نبی عربی کی تعلیم توحید اہد قلع شرک کے بعد ہم پر اس کے عہد کرنے کا

خوف طاری کرتے ہیں غالباً انہوں نے یہ خیال کیا کہ عقیدہ توحید کے کامل لشو کی ابتدا اس زمانہ میں ہوئی، نہ انہوں نے اس پر غور کیا کہ ایک عقیدہ باطل کا ترک طبقاً اس کی طرف عہد کرنے سے روکتا ہے۔ نہ انہوں نے یہ سوچا کہ نفرت شرک جس درجہ کی مسلمانوں کی پہلی نسل کے خیال میں ذخیرہ کر دی تھی وہ کئی قیامت تک صرف اور ختم ہوئی۔ مسلمانوں کی خدا پرستی کا وہ سب سے کم بین مورخ ہو گا جو اس سے خوف کہے کہ وہ غریب پستی میں مبتلا ہو جائیں گے۔ غالباً حفاظت مذہب اور ترقی کی یہ حیرت خیز کوشش ہو گی کہ مسلمانوں کو اس گناہ کا الزام لگانے جس کے وہ مرتکب نہ تھے اس خوف سے کہ آئندہ زمانہ میں وہ مبتلا نہ ہو جائیں اور یہ اس لیے کہ انہیں کسی کے فعل کی حفاظت کے لیے کوئی اور دھرمی دلیل نہیں ملتی تھی۔

خلیفہ ثانی اور احادیث رسول اس کے بعد مجھے جو کچھ کہنا ہے وہ شاعر اللہ یا آثار رسول کے متعلق نہیں ہے بلکہ عین جناب رسالت مآب کی احادیث کے متعلق ہے۔ اور جس طرح متذکرہ صدر امور کے متعلق جو کچھ خیالات غلیف کے ظاہر کیے گئے ہیں ان کی کوئی وہ وجہ اور غرض خلیفہ کی زبانی نہیں ہے جو مشکلم اور مؤرخین نے بیان کی ہے۔ اسی طرح پیش نظر امر کے متعلق بھی خلیفہ نے ریمارک کرنے میں اپنی غرض کو ظاہر نہیں کیا ہے، بلکہ صرف مؤرخین نے ریمارک کے ساتھ کوئی غرض لگا دی ہے۔

صاحب سیرۃ الفاروق فرماتے ہیں: ”املائی کے نسبت حضرت عمر کا ایک ممتاز اصول جو دکھائی دیتا ہے وہ یہ ہے کہ حدیثوں کی کثرت روایت کر سکتے تھے۔“ پھر فرماتے ہیں: ”حضرت عمر کی روایت حدیث کی حفاظت صرف ان کی کثرت روایت ہی سے نہیں ظاہر ہوتی بلکہ وہ اس کی علانیہ طور پر حفاظت کرتے تھے اور دانستہ حدیثوں کی کثرت کر سکتے تھے۔“ کوفہ اور عراق جانے والوں کو احادیث کم بیان کرنے کی وصیت کرتے ہوئے کہا کہ: ”ان کو حدیثوں میں نہ پھنسا لینا۔“

قرآن کی تفسیر کم کرنے کا حکم اسی مؤرخ نے آگے چل کر ان کے اقوال میں لکھا ہے کہ: ”قرآن کی تفسیر اور رسول اللہ سے روایت تھوڑی کیا کرو، اس میں میں بھی تھلا شریک ہوں۔“

مؤلف الفاروق حکم کی غرض بتاتے ہیں مولوی شبلی صاحب الفاروق میں خلیفہ کے حکم کو معوجہ کے بیان فرماتے ہیں کہ: ”حضرت عمر اس ڈر سے کہ صحابہ آنحضرت سے روایت کرنے میں غلطی نہ کریں صحابہ کو حکم دیتے تھے کہ رسول اللہ سے کم روایت کریں۔“ اس میں غور طلب امر یہ ہے کہ آپ اکم روایت کرنا غلطی کے خوف کو مرتفع کر دیتا ہے؟ نہیں اس لیے کہ یہ بہت ممکن ہے کہ کسی کی کم گوئی اسے غلط بیانی سے محفوظ نہ رکھ سکے جو صرف اس قدر کہ اگر اس کم گو لیکن غلط بیان شخص سے کم گوئی کی حالت میں تھوڑی غلطیاں ہوں تو زیادہ گوئی کی حقدار کے لحاظ سے غلطیاں وزن میں زیادہ ہوتی جاتیں۔ یعنی اس حکم نے کسی طرح غلط بیانی کا انسداد نہیں کیا۔ یہ حکم کم بیان کرنے کے متعلق ہے۔ قابل سوچنے کی بات یہ حکم نہیں سمجھتے کہ صحیح روایات بیان کر دیا اگرچہ ان میں زیادہ یاد بولے اور اس سے مقدار بڑھ جائے۔ اس کم گوئی کے حکم میں اگرچہ صحیح گوئی کے لیے کوئی رعایت ملحوظ نہیں رکھی گئی ہے لیکن میں بحث کے لیے اسے قبول کر لیتا ہوں کہ غیبہ صریح منشا ہی تھا مگر اس کا معیار کیا تھا کہ اس کے بعد جو کچھ گاہہ صحیح کہے گا۔ اور یہ کیوں نہ کہا جائے کہ اگر جسے کوئی کیسا ہی صحیح کیوں نہ کہے لیکن جہاں کچھ زیادہ کہا وہ غلط بیانی کے میدان میں آگیا۔ یہ ایک حکم تھا جس نے کسی طرح صحیح گوئی کی مدد نہ کی، بلکہ اپنے ہیئت سے جس کی غرض مقصود ہے صحیح گوئی پر حکم چڑھا دی۔

اس کا اثر غلط بیانی کا رد کتنا کسی طرح دکھائی دیتا ہے نہ حتیٰ جو کچھ انسداد ممکن تھا وہ یا تو کسی حد تک تقریر و تحریر سے یا خلاف ورزی کا شوق ملنے پر سزا کرنے سے بلکہ جو طرز عمل کہ نہایت منصفانہ اور ناقابل اعتراض معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ یہ وہ زمانہ تھا جس میں زیادہ تر اصحاب رسول زندہ تھے اور یہ تمام لوگ اگرچہ کل احادیث کی تصدیق نہ بھی کر سکتے ہوں اور باوجود اس کے کہ رسول کے بعض اصحاب کو معلوم ہوں لیکن یہ ممکن نہ تھا کہ وہ امور اہل شرع اور عامہ مسلمین سے متعلق ہوں اس کے متعلق وہ لوگ رسول کے احکام اور اصول نہ سن چکے ہوں۔ اس لحاظ سے یہ بہت آسان تھا کہ کوئی حدیث جو کسی صحابی کے نہانی غیر معمولی معلوم ہوتی وہ جاننے کے لیے ان اصحاب کے حوالہ کی جاتی اور وہ انکار یا تصدیق کرتے۔ نہ کہ ایک ایسا حکم ملاد کر دیا جاتا جس سے لوگ احادیث بیان کرنا حکومت کے حکم کے خلاف کہہ کر خوف زدہ ہوتے۔ حضرت عمر کے لیے کافی تھا کہ وہ ایک ایسی تحریک کے باعث ہوتے جس سے آخری وقت کے

ایسے مفید موقع پر رسول مسلمانوں کے لیے ہدایت کی غنیمتیں نہ لکھوا سکتے نہ کہ انہوں نے اپنے دور خلافت کو اس سے بھی غنیمت کیا کہ کچھ لوگ ہوں جنہیں مفید شائع کے متعلق احادیث یاد ہوں اور وہ بیان نہ کر سکے ہوں بلکہ زبان کھٹنے کے قبل دنیا سے گزر گئے ہوں۔ یہ اسناد و شہادت کے جواز کے ساتھ یہ خیال بھی دلاتا ہے کہ کیا خلیفہ نے کسی یا چند مخصوص امور امت کے متعلق رسول کی احادیث کو بیان کرنے سے روکا تھا؟

ان مذکوروں کے بعد جس میں خلیفہ ثانی کا خود رسول کی احادیث کے متعلق طرز عمل واضح ہو جاتا ہے ہمیں انفرادی کی اس عبارت پر کوئی توجہ نہیں ہوتا کہ: ”حضرت علیؑ کے ہم صحبت اکثر وہ لوگ تھے جو علیؑ حدیث میں بلند پایہ نہ تھے۔ حضرت علیؑ سے جن لوگوں نے روایتیں کیں ان پر اعتبار نہیں کیا جاتا تھا۔“ نہ ہمیں اس پر سوال کرنے کی ضرورت ہے کہ آیا یہ ممکن ہے کہ بنو ہاشم کا کوئی معمولی دلال یا غمخوار کے کسی کارخانہ کے غیر سے اصول تجارت کو بہتر سمجھتا ہو۔ ہمارے خیال کہ آیا کسی یا چند مخصوص امور امت کے متعلق رسول کی احادیث کو بیان کرنے سے روکا تھا انفرادی کی عبارت سے یہ بات کچھ صاف ہو جاتا ہے۔

خلیفہ ثانی کا مخاطبہ اور علیؑ

مؤلف تہذیب المتین صاحب کشف سے نقل کرتے ہیں کہ علی بن موسیٰ اردبیلی اور ابوالوید خوارزمی نے محمد بن خالد الجہنی سے روایت کی ہے کہ ایک دروز عمر بن الخطابؓ نے منبر پر غلبہ کہا کہ: ”اے امت محمد! اگر ہم تم کو اس چیز سے جس کو تم پہچانتے ہو (یعنی اسلام) اس شے کی طرف پھیریں جس کے تم شکر ہو (یعنی کفر) تو تم کیا کرو گے؟ راوی کہتا ہے کہ لوگ خاموش ہو گئے۔ عمر نے تین مرتبہ اعلاہ کہہ کر علیؑ اس وقت گوشہ مسجد میں غائب رہے تھے یہ سن کر بیتاب ہو گئے، اور کہا: ایسا ہو تو ہم تجھ سے توبہ کر انہیں گے۔ اگر توبہ کرے تو تیری توبہ قبول کریں گے۔ عمر نے کہا اگر نہ مانیں؟ مسخرایا: اس وقت گردن مار رہے گے۔ اب کہا عمر نے: حکم خدا کا کہ اس نے اس امت میں ایسے شخص کو مقرر کیا ہے کہ جب ہم راہ راست سے منحرف ہوں تو وہ ہماری تہمتوں کو درست کرے اور ہم کو سیدھے راستہ پر لے دے۔“

میں نہیں جانتا کہ مؤرخین اس واقعہ کے متعلق کیا کہنا پسند کرتے ہیں۔ غالباً کم لوگ ہوں گے جو یہ تصدیق کریں کہ حضرت عمرؓ کے مزاج کے اس میلان کے لحاظ سے جو مذکورہ صدر مثالوں سے ظاہر ہوا، اسی روایت کے خیالات بھی ”بعید نہیں ہیں۔“ حضرت عمرؓ جہاں خدا جانے یا اشارہ میں جہاں کہ دوست کے اس پراسرار سوال میں کیا کہ تھا لیکن غالباً اس وقت نہ تو امتداد کی بجلی کڑکڑا رہی تھی، نہ ہلال گرگڑا رہا تھا نہ طوفان اٹھ رہا تھا نہ سیلابی نور پر غالب آئی جالیہ جس سے کہا جاسکے کہ لوگوں کے غلط میلان کو دھکی سے روک رہے تھے۔

خلیفہ ثانی کا قاتل مغیرہ بن شعبہ کا غلام ہوا۔ یہ باب اس حیرت خیز اتفاق پر ختم ہوتا ہے کہ اباحہ کا قاتل مغیرہ بن شعبہ ہی کا غلام تھا۔

صاحب صواعق عرقہ ابولولو کو جو سی بتاتے ہیں۔ دراصل ایک ابن خلدون کے نزدیک ضررانی تھا اسی نے خلیفہ سے شکایت کی کہ میرا مالک مجھ سے زیادہ محمول لیتا ہے، اسے کم کر دیجیے۔ محمول ابن عمرؓ کے نزدیک چار درہم روزانہ اور ابن خلدون کے حساب سے صرف دو درہم (سات آنہ) تھا۔ ابولولو ہماری، فاشی اور بڑھتی کا کام جانتا تھا۔ خلیفہ نے فیصلہ کیا کہ:

”ان منہوں کے مقابلہ میں یہ محمول زیادہ نہیں ہے۔“
 فیروز اس رقم کو گران محسوس کرتا تھا جو فیصلہ سننے کے بعد اس کے اس
 ابولولو گھورتا ہے حالت اور قول سے ظاہر ہے۔ جو ابن حجر کی نقل کرتے ہیں کہ: ”آٹھ غلام
 ختم گرفت و رفت و گفت عدل ابوبہرہ کس رسیدہ است غیر از من۔“ یعنی: ”اس وقت غلام غصہ میں آکا اور چلا گیا اور
 کہا کہ اس کا عدل میرے سوا سب کو پہنچا ہے۔“

یاد دہانی بنانے کے حکم پر: ”ابولولو رونے ترش کردہ خصلتہ بجانب عمر نظر کرد و گفت آسیا سمیت تو سلازم کہ مردم سلاہا
 از ان ہاڑی گفتہ باشہ۔“ یعنی: ”ابولولو نے ترش و بدکردگی کی طرح عمر کی طرف دیکھا اور کہا تیرے لیے ایسی جگہ بندوں کا کہ
 لوگ سالوں تک اس کی باتیں کرتے رہیں گے۔“ اس نے ایک روز موقع پا کر دار کچلہ زخم ٹھک تھا۔

نہیز مفید نہ ہوئی زخم کھانے کے وقت خلیفہ کی حالت
 قول ابن خلدون: ”ایک طیب بلایا گیا
 اس نے عسر و آردق کو نہیز پلائی۔ لیکن زخم کی راہ سے باہر نکل گئی۔ اور جوں جوں بخشتاری سے ابن حزمہ کی
 روایت نقل کرتے ہیں کہ: ”چون عمر از زخم خنجر زدند۔ متالم بہ و جزعی کرد و ابن عباس گفت اے امیرالمومنین
 مبالغہ مکن در جمع۔“ یعنی: ”جب عمر کو خنجر کا زخم مارا گیا در و محسوس کر رہے تھے اور جزع کر رہے تھے اور ابن عباس
 نے کہا اے امیرالمومنین جزع میں مبالغہ نہ کرو۔“

مرکزی خلافت ورزویوں کی ترقی اور اس کا اثر

<http://fb.com/ranajabirabbas>

انہوں نے کہا کہ مقررہ وقت میں اگر وہ آجائیں تو خیر ورنہ تم اپنا کام کرنا۔ اور جب لوگوں نے کہا کہ تم خود ہی کسی کو خلیفہ بنا دو جس طرح ابوبکر نے کیا تو کہا کہ: ”اگر ابوصبیہ بن جریج زندہ ہلاک نہ ہو مگر وہ لاوی۔“ یعنی: ”اگر ابوصبیہ بن جریج زندہ ہوئے تو خلافت ان کو دے دیتا۔“

بعض نے سالم کا نام بھی لیا ہے اور بعض نے ابن عوف ہی کو منتخب کیا ہے لیکن انہوں نے انکار کیا۔ طبری ہی کے موافق یہ حکم بھی ضروری تھا کہ اگر پہنچ آدمی موافق اور ایک ناموافق ہو تو اسے قتل کر ڈالنا اور اگر دو شخص ناموافق ہوں تو اسے اور ہر دو عمر عبدالرحمن بن عوف سے روئے الفتاح میں بھی ابن عوف کا موقع مستند اور نصف خلافت کے لیے قتل کا حکم لکھا ہے۔ ابو القحطاف کے نزدیک عبدالرحمن بن عمر اس طریقہ رکھے گئے ہر عمر عبدالرحمن بن عوف ہوں جس کی وضاحت ابن خلدون سے ہوتی ہے کہ:

خلیفہ ابن عوف سے کچھ عہد کیا چاہتے ہیں ”آپ (عمر) نے عبدالرحمن کو بلا کر فرمایا: میں تم سے کچھ عہد کیا چاہتا ہوں۔ عبدالرحمن نے کہا:

کیا آپ مجھ سے کچھ عہد کریں گے؟ فرمایا: نہیں بھائی ایسا نہ کروں گا۔ بلکہ میں ان لوگوں سے عہد لوں گا جن سے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) راضی و خوش تشریف لے گئے ہیں۔ یہ کہہ کر آپ نے علی و عثمان و زبیر و سعد اور خود عبدالرحمن بن عوف کو بلا کر اور ان لوگوں سے مخاطب ہو کر کہا: تین روز تک تم لوگ طلبہ کا انگارہ کرنا، اگر وہ آجائیں تو فیہا ورنہ تم لوگ مشورہ کر کے کسی کو اپنے میں سے امیر بنالینا۔ اور ابوطالب انصاری و مقداد بن الاسود کو طلب کر کے حکم دیا کہ ان لوگوں کے دروازہ پر جا کر کھڑے رہنا اور کسی کو ان کے پاس جانے نہ دینا جب تک وہ ہام مشورہ نہ کر لیں۔ اور عبداللہ سے مخاطب ہو کر فرمایا: اگر لوگ انتخاب خلیفہ میں تمکنت ہوں تو کمزرت رائے سے مواختہ کرنا، اور اگر ظالمین برابر ہوں تو تم اس گروہ کے رائے سے اتفاق کرنا جس میں عبدالرحمن بن عوف ہوں۔

خلیفہ ولیعہد منتخب کر چکے چنانچہ لوگوں نے عمر فاروق سے کہا: آپ اپنا دلی عہد منتخب کر جائیے۔ جواب دیا: میں کر چکا۔ ابن خلدون میں ہے کہ: ”در صورت مصلوات

عبداللہ بن عمر حکم ہائے جائید اور عبداللہ بن عمر اس فریق سے اتفاق رائے کریں جس میں عبدالرحمن بن عوف ہوں۔“

صلی اور عباس نے نتیجہ انتخاب اب مجھے یہ کہنا ہے کہ اس انتخاب کے متعلق علی و عباس کا کیا خیال ظاہر ہوئے؟ قبل کیا کیا اور کیوں

فج سے گئی۔ کیونکہ سعد عبدالرحمن سے خلافت نہ کرے گا اس لیے کہ وہ چچا کا بیٹا ہے اور عبدالرحمن خسر ہے۔ یہ لوگ آپس میں ایک دوسرے کو خلیفہ بنالیں گے۔ اس گروہ کو چھین نہ آوے گا جب تک ابیر خلافت مسم سے دفع نہ کر لیں۔ ”یہی معنوں روئے الفتاح میں بھی ہے کہ: ”عبداللہ عثمان کا داماد ہے اور سعد بن ابی وقاص ابن عوف کا ابن عم ہے۔ اگر طلحہ و زبیر عمار اساتذہ ہی دیں تو بے کار ہے۔“ اور ابن عباس کہتے ہیں کہ: ”لا مکر ابن طلحہ ابن عباس کہ بہت ہر دفع مامقصد دلدند تا دیگر برابر مسند حکومت نشانہ۔“ یعنی: ”اس گروہ کے مکر سے بے خوف نہ رہ جو کہ انہیں دوہر رکھنے پر ہمت مکر کوڑے دے دے ہیں تاکہ ہماری مسند پر کسی اور کو بٹھائیں۔“

طبری کہتے ہیں کہ: ”علی با عباس گفت مارا ہی خواہد عباس گفت مظلوم گفت چرا گفت بیا کہ عمر یہ نبی ہاشم نہ وہد مگر کہ ہمہ گمراہید و یک تن را خلیفہ کنند تو مباحث چگونہ کہ کسی از نبی ہاشم آسمانہود“ یعنی: علی نے عباس سے کہا کہ میں بلا رہا ہوں عباس نے کہا نہ جا کہا کیوں کہا جان لے کہ عمر بنی ہاشم کو نہ دیں گے جب تک کہ سب لوگ مجمع لا جہنم اور ایک کو خلیفہ بنادیں تو نہ جاکہ کہہ سکوں کہ نبی ہاشم سے وہاں کوئی نہ تھا۔

—

صاحب تہذیب المتین نے ابن الحدید کی زباناً ایک دلچسپ موقع دکھایا ہے۔ جس میں گذرتے ہوئے خلیفہ نے طلحہ زہیر ابن عوف، جناب امیر اور عثمان کے متعلق کچھ ریمارک کیے تھے صرف آخر لڑکوں کے متعلق ریمارک سے صرف ہے۔ عثمان کو مخاطب کر کے کہا:

عثمان کے متعلق ریمارک انتخاب کی پیشین گوئی کرتا ہے۔ (ایک کلمہ جس سے اوتھ بھٹکتے ہیں) میں دیکھتا

ہوں کہ قریش نے بسبب محبت کے تیرے ساتھ تجھ کو فرار وافر کیا اور تو نے نبی امیر اور پیران معیط کو ظالمی گردنوں پر سوار کیا اور امویں کو ان کے لیے مخصوص کر لیا یعنی ایک گروہ گرہن حرب نے انگریزوں کے خلاف ہر قوم کو قتل کیا تم بھڑاکہ اگر تجھ کو خلافت ملی تو بغیر ایسا کیسے نہ چھوڑے گا اور تو نے یہ کیا تو وہاں تجھے قتل کیے بغیر نہ چھوڑینگے۔ پھر ان کی پیشانی کو ہاتھ سے پکڑ کر فرمایا جب یہ باتیں ہوں اور ضرور ہوئی تو اس وقت مجھے یاد کرنا۔

۲۳۔ امیدواروں کے متعلق اظہار رائے

ابن عوف، علی اور عثمان

”بعد از فراغ از دفن جماعت مذکورہ یعنی اصحاب شوری اور یک جا جمع شدند۔ عبدالرحمن بن عوف گفت امر خود را بکس بلا گزارید زہیر گفت من امر خود را باہمالو معین امام برحق علی گزاشتم۔ وسعد گفت من امر خود را بعد الرحمن بن عوف گزاشتم و طلحہ گفت رجوع امر خود را بعثمان کردم۔ چون این سہ کس بیرون شدند عبدالرحمن بہ عثمان و علی گفت من از اوہ این امر خلافت نذارم ہر یک از شما کہ تیرا کند ازین امر خلافت بدست او میزدیم۔ وعہد خدائی خواہم بود کہ در نفس خود ملاحظہ افعلی کند و حرمی باشد بر اصلاح حال امت آگاہ عثمان و امیر المومنین علی رضی اللہ عنہما ہر دو سکوت ورزید امر ہتھیار فرمودند۔ باز عبدالرحمن گفت اگر شما درین امر سکوت اختیار میکنید رجوع بمن کنید وعہد ایستاد بر من کہ تقصیر نمی کنم الا فضل و عثمان ہر یک گفتند بلے بتور رجوع کردیم۔ بعد از ان عبدالرحمن و امیر المومنین حضرت علی خلافت کردہ گفت عہد و میثاقی خدا نے تعالیٰ از تو میگیرم اگر ترا امیر سلاطین طریقہ عدل مرئی داری۔ و اگر دیگرست بر تو امیر گردام اطاعت و انقیاد پیش آوری علی فرمود بلے قبول دارم۔ بعد با عثمان رضی اللہ عنہ خلافت کردہ ہمیں طریق گفت بعد از عہد و میثاق بیعت کرد عثمان۔ یعنی: ”دفن سے فراغت کے بعد مذکورہ گروہ یعنی اصحاب شوری ایک جگہ جمع ہوئے۔ عبدالرحمن نے کہا اپنے معاملہ کو تین شخصوں کے حوالے کر دو۔ زہیر بولے میں نے اپنے امر عبدالرحمن بن عوف کے حوالہ کیا۔ طلحہ نے کہا میں نے اپنا معاملہ

عثمان کی جانب مڑا۔ جب یہ تین شخص (اس امر سے) باہر ہو گئے عبدالرحمن نے عثمان و علی سے کہا میں اس خلافت کا ارادہ نہیں رکھتا جو کوئی تم میں سے اس امر خلافت سے اپنی جیڑاری کرے اس کو خلافت اسلامی خدائی عہد اس پر ہونا چاہیے جو نفس میں افضل کا لحاظ کرے اور امت کے حال کی اصلاح پر عرصہ ہو۔ عثمان اور علی دونوں اس وقت خاموش رہے۔ پھر عبدالرحمن بولے اگر تو اس امر میں خاموشی اختیار کرتے ہو تو میری طرف رجوع کرو۔ میرے اوپر یہ اللہ کا حق ہے کہ کوئی اس نہ کرے۔ ہر ایک نے کہا ہم نے رجوع کیا۔ اس کے بعد عبدالرحمن نے امیر المومنین حضرت علی سے تنہائی میں بات کی کہ تم سے خدائی عہد و میثاق لیتا ہوں کہ اگر تجھے امیر بننا تو عدل کا طریقہ ملحوظ رکھو گے۔ اور اگر دوسرے کو تجھ پر امیر بننا تو اطاعت و امتلا سے پیش آئیں گے۔ علی نے فیما باقول ہے۔ پھر عثمان سے خلوت کی اور اسی طرح کی بات کی اور عہد و میثاق کے بعد عثمان کی بیعت کر لی۔

غالباً جہاں ”ذی رائے“ قریش کا مرادف ہے اسی موقع کے موافق: ”ابن عساکر روایت کر دے کہ مردم درین ایام نزد عبدالرحمن

مجمع شدہ درین باب مشورت می کردند و پچ مرد ذی رائے (۹) بیعت کہ مقابل بہ خلافت عثمان نباشد۔ یعنی: ”ابن عساکر نے روایت کیا کہ لوگ ان دنوں عبدالرحمن کے پاس مجمع ہو کر اس بارے مشورہ کرتے تھے اور کوئی صاحب رائے مرد نہیں بلکہ کہ عثمان کی خلافت کی طرف مائل نہ ہوتا۔“

علی سنت خلافت پیروی سے انکار کرتے ہیں عثمان کی خلافت گزشتہ کی نوع فی

کہید و حضرت علیؓ کا گزشتہ عبدالرحمن گفت گناہ من نیست۔ ابتداء حضرت علیؓ خلوت کردہ گفتیم یا تو بیعت میکنم بشرط کتب اللہ قتل و شلیت رسول صلی اللہ علیہ وسلم اگر سیرت ابوبکر و عمر مددی و بطریق ایشان عمل میکنم گفت کہ نہ دلام پس عثمان گفت عمل ابوبکر و عمر بروے خود قبل داری گفت قبل دلام۔ یعنی: مسند امام احمد میں ابوداؤد سے مروی ہے کہ میں عبدالرحمن بن عوف سے کہا تم نے عثمان سے کس طرح بیعت کی اور علیؓ کو چھوڑ دیا۔ عبدالرحمن نے کہا یہ میرا گناہ نہیں ہے میں نے پہلے علیؓ سے خلوت کی اور کہا کہ میں تیری بیعت کتب اللہ اور سنت رسول اللہ پر کرتا ہوں اگر تو ابوبکر و عمر کی سیرت رکھنے اور ان کے طریق پر عمل کرے۔ بولے نہیں کروں مگر پھر میں نے عثمان سے کہا کہ علیؓ ابوبکر و عمر کو اپنے اوپر لازم رکھنا قبول کرتے ہو اس نے کہا قبول کرتا ہوں۔“

اچھا کیا کہ ابن جریر نے یہ بھی کہہ دیا: ”واضح شد کہ خلافت عثمان فرع خلافت عمر است کہ آن فرع خلافت صدیق است۔“ واضح ہے کہ خلافت عثمان خلافت عمر کی فرع ہے اور وہ خلافت صدیق کی فرع ہے۔

ابن خلدون کے نزدیک: انتخاب گاہ یا دار الثوریٰ مسور بن حزمہ یا امام المومنین عائشہ کا گھر تھا۔ یہاں ابی عوف نے اہل ثوریٰ سے کہا: ”تم میں سے ایسا کوئی شخص ہے جو اپنے کو ان لوگوں میں سے نکالے جو خلافت کے لیے نامزد کیے گئے ہیں تاکہ وہ اس امر کا منہم مقرر کیا جائے کہ تم میں سے جو افضل و لائق ہو اس کو خلیفہ بنائے۔ کسی نے اس کا جواب نہ دیا۔“

خود ساختہ متصمم اس کے بعد ابن عوف نے اپنے کو خطا اور اپنے کو متصمم بنانا سب اس پر راضی ہو گئے اور علی نے کچھ نہ کہا اس پر ابن عوف نے پوچھا: ”یا ابا الحسن آپ کیا کہتے ہیں؟“ میں بھی راضی ہوں بشرطیکہ تم اقرار کرو کہ حق کرو گے۔ اپنے بوائے نفس کی پیروی نہ کرو گے نہ کسی کے رشتہ داری کا پاس دیکھا کرو گے حتیٰ کہنے میں کسی کی طاقت و نصیحت کا خیال نہ کرو گے۔“

علی کے حقوق کا اقرار مہدی دیکھان کے بعد ابن عوف نے علی کو ”علیہ“ لے جا کر کہا: ”تم قرابت داری رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) اور سابق الاسلام اور حسن مسامی دین کی وجہ سے خلافت کے زیادہ مستحق ہو اور تم سے زیادہ موزوں کوئی اور شخص خلافت کے لیے نہیں ہے۔ لیکن یہ تو بھلا کہ ابن لوگوں میں جو خلافت کے لیے تائید کیے گئے ہیں تمہارے بعد کون زیادہ مستحق ہے۔ جواب دیا عثمان ابن عفان۔ پھر عثمان کو خطبہ میں لے جا کر ان سے بھی ایسا ہی کہا انہوں نے کہا: ”علی“۔ اس قدر باتیں ہونے کے بعد جلسہ ختم کر دیا گیا اور ان سے خلافت کے بابت جو تھے دروز کی برائیاں نکال دی گئیں۔

زبیر اور سعد علی کو منتخب کرتے ہیں پھر مسور بن عزمہ کے مکان پر آئے اور زبیر و سعد کو بلا کر کہا: لوگوں کا اتفاق علی و عثمان کی خلافت پر ہوتا ہے تم لوگ کیا کہتے ہو۔ ان دونوں بزرگوں نے علی پر اتفاق کیا۔“

عمار یا سر علی کی طرف ”تمناز فجر کے بعد مہاجرین اور سابقین اسلام انصار و اہل مکہ کو طلب کیا ایک ساعت میں ساری مسجد پر ہو گئی تہل رکنے کی جگہ باقی نہ رہی عبدالرحمن نے حاضرین سے کہا جس کو تم لوگ خلافت کے لیے منتخب کیا چاہتے ہو اس کی طرف اشارہ کرو۔ عمار نے علی کی طرف اشارہ کیا ابن ابی سرح نے کہا اگر قریش کے اختلاف کا اندیشہ نہ ہو تو عثمان کے خلافت پر بیعت کی جائے۔ عبداللہ ابن ربیعہ نے اس رائے سے اتفاق کیا۔ عمار و ابن ابی سرح میں گفتگو بڑھ گئی سخت گلائی کی نوبت آ گئی۔

ابن عوف نے اپنے ذہن میں خلیفہ چن لیا سعد نے اٹھ کر کہا: اے عبدالرحمن اس سے پیشتر کہ لوگوں میں ہفتہ بھا جو جانے تم جس کو چاہو غلیفہ منتخب کرو۔ عبدالرحمن نے جواب دیا میں نے اپنے ذہن میں خلیفہ منتخب کر لیا اور رائے قائم کر لی۔ اے لوگو ذرا دم بھر کو خاموش ہو جاؤ پھر علی کی طرف مخاطب ہو کر اور اٹھا ہاتھ پکڑ کر کہا تم کو اس شرط پر خلافت دی جاتی ہے کہ تم کتاب اللہ و سنت رسول اللہ کی تعلیم دینا اور خلیفہ بنیں (جو ان کے بعد ہونے ہیں ان کی اتباع کرنا۔ علی نے جواب دیا کہ میں امید کرتا ہوں کہ میں اپنے مبلغ علم و طاقت کے موافق عمل کروں گا۔ یہ جواب پا کر انہوں نے عثمان سے مخاطب ہو کر یہی کلمات کہے۔ عثمان نے کہا ہاں میں اقرار کرتا ہوں کہ میں ایسا ہی کروں گا اللہ اللہ تعالیٰ

ابن صوف عثمان کا ہاتھ اپنے ہاتھ عبدالرحمن نے یہ سنتے ہی سفت مسجد کی طرف سر اٹھایا اور ان کا ہاتھ عثمان میں لے کر چست کی طرف دیکھتے ہیں کے ہاتھ میں تھا۔ اسی مورخ کے موافق متفیرہ ابن شعبہ اور عمرو

باب چہارم

عاص دار الثورنی کے پاس آکر بیٹھے مگر سحر نے یہ کہہ کر اٹھا دیا کہ تم کہو گے کہ ہم بھی اراکین شوریٰ میں تھے۔ ابوالفدا میں سنت وغیرہ کے سوال پر ابن خلدون کے نقل التلخیص ”میلغ“ کے علاوہ سب وہی جواب ہے۔ روضۃ القفا میں اس قدر زیادہ ہے کہ مقدار الاسود نے عمار یاسر کی تائید کی۔

عثمانؓ کے دل میں علیؓ کے متعلق رائے دینے والوں سے کینہ طبری کے موافق بھی سحر دوست دیا اور اس وجہ سے ”عثمانؓ را از سحر کینہ در دل بلند“۔

بنی امیہ کی کوششیں اسی مورخ کے موافق: ”ابو سفیانؓ مرد عمرو بن عاصؓ شد و گفت عبدالرحمنؓ مرد من شد و گفت کرا غبابی گفت عثمانؓ را عمرو گفت من نیز عثمانؓ را خواستم۔ ابو سفیانؓ گفت انھوں نے کہہ کر کہ لا مرد نرم است و ابن کار بگفت و علیؓ بر بلیدؓ عمرو گفت اندیشہ مدار کہ اشبہ ہر دو را بہ بنیم و چنان کہم کہ سحر بٹھن“۔ یعنی: ”ابو سفیانؓ عمرو بن عاصؓ کے قریب ہوا اور کہا کہ عبدالرحمنؓ میرے قریب ہوا اور بولا کہے چاہتے ہو؟ میں نے کہا عثمانؓ کو عمروؓ نے کہا میں بھی عثمانؓ کو چاہتا ہوں۔ ابو سفیانؓ بولا اب کیا کروں کہ وہ نرم آئی ہے اور یہ کام کرنا بیٹھے گا اور علیؓ حسینؓ لے جانے گا۔ عمروؓ نے کہا لکن نہ کر آج رات دونوں سے ملوں گا اور ایسا کروں گا کہ عثمانؓ کا کام بن جائے گا“۔

اس کے بعد وہی روایت بھی ہے کہ ابن عاصؓ نے علیؓ سے کہا کہ تم سے اتباع سنت خلفاء کے لیے کہا جائے گا تم قبول نہ کرنا، اور عثمانؓ سے جا کر کہا کہ تم سے جو کچھ کہنا ہاں کریں گے۔ اور جب ابن عوفؓ نے سوال کیا اور علیؓ نے جواب دیا تو ابن عوفؓ نے ”دست علیؓ را رہا کر دو گفت بدی“ یعنی نہ خواہم۔ یعنی: ”علیؓ کے ہاتھ کو چھوڑ دیا اور کہا میں اس کی کوری کے ساتھ نہیں چاہتا“۔ اور عثمانؓ نے کہا: ”پذیرم“۔ یعنی: ”میں نے قبول کیا“۔

کیوں علیؓ کو سنت خلفاء منظور نہ تھی صاحب نظام عثمانی فرماتے ہیں کہ علیؓ کو رغبت خلافت تھی۔ لیکن یہ شرط کہ سنت خلفاء کی پیروی کریں، منظور نہ تھی۔ ”اس وجہ سے کہ انھیں بہت سی باتیں پسند نہ تھیں“۔

رائٹ آرمیل مولوی سید امیر علی صاحب باقلم ”اسپرٹ آف اسلام“ میں فرماتے ہیں: ”علیؓ بن ابی طالب کو خلافت تہذیب کی تھی لیکن ختم خدا و رسول کے علاوہ سنت نبیین کی چرخ لکھی تھی حتیٰ وہ بنی امیہ کو معلوم تھا کہ علیؓ منظور نہ کریں گے۔ علیؓ نے اپنی مخصوص جلی آزادی سے اپنی تجویز کو اختیار کرنے سے انکار کیا“۔ واشنگٹن آرکیولوج اپنی کتب مسکسیرس آف قحط میں بھی یہی کہتے ہیں۔

ابن عوفؓ اور مستراد کی گفتگو ابوالفدا کے موافق مستراد بن الاسود اور عبدالرحمن بن عوفؓ میں بیعت کے بعد یہ گفتگو ہوئی۔ مقدار: تو نے قسم خدا کی علیؓ کا حق ان کو نہ دیا، حالانکہ یہ شخص ان لوگوں میں ہے کہ اس کا حق پورا دینا چاہیے

اور انصاف کرنا چاہیے۔

ابن حوف: اے مقداد میں نے بہت کوشش کی عثمان نہ مٹیں تو کیا کروں؟
مقداد: تعجب ہے قریش سے کہ ایسے شخص کو پسند نہ کیا میں تو سمجھتا ہوں گا میرے نزدیک علم اور عمل میں کوئی شخص اس سے بہتر نہیں ہے۔

عبدالرحمن: اے مقداد خدا سے ڈر کہیں تو کبھی شک میں گرفتار نہ ہو جائے۔

عثمان کی بیعت کے بعد علی نے کیا کہا
اب میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ بیعت کی اس کارروائی کا علی پر کیا اثر ہوا۔ ابوالہرا کے موافق: ”علی نے کہا کہ یہ وہی روزِ اول ہے کہ دکھانے کو تخت کی ہے تو نے اس لیے بیعت کی کہ خلافت تیری طرف حائل ہو۔“
روایتِ اشعاع کے موافق: ”اے پھر حوف غرض تو اہل حرکت آگاہ ہو کہ مرج غلق کو دی این نہ اول بعد از بیعت کہ شہاب من علیہ کردہ ہاشمید۔“ یعنی: ”اے حوف کے بیٹے اس حرکت سے تیری غرض یہ تھی کہ جو سب لوگ جانتے ہیں یہ پہلا دن نہیں ہے کہ جس میں تم نے فوج پر زیادتی کی۔“

ابن عمر نے حکمِ قتل یاد دلایا
طبری کے موافق: ”علی برہانے ملند و گفتند خداوندی خداوند است عبدالرحمن گفت عمر گفت کہ ہر کس مخالفت عبداللہ کند بکشد۔“
یعنی: ”علی پر تسمار ہے اور تسمار یا یہ دھوکا ہے کل دھوکا۔“ عبدالرحمن نے کہا کہ: ”عسر کافران ہے کہ: جو بی مخالفت کرے قتل کر دیتا۔“

تسلیم و رضا کی مفید شرط
نسخ البلاغۃ میں ہے کہ: ”تم خوب جانتے ہو کہ میں اپنے غیر سے زیادہ حکومت اور بیعت کے لیے قابل اور مستحق ہوں۔ میں تسلیم کرتا ہوں جب تک اس اور مسلمان سلامت رہیں اور اس کے ایامِ خلافت میں کلمہ کا ظلم و جور نہ ہو۔ گو خاص فخر پر ظلم و تم ہوئے رہیں۔ میں اس تسلیم و رضا کو اس لیے اختیار کرتا ہوں کہ مجھے خداوند تعالیٰ کی جانب سے اس کا اجر و ثواب عطا ہو، اور تقرب خداوندی نصیب ہو۔ کیونکہ جس چیز کے سبب سے تم اس کے طالب ہو اور اس پر راضی ہو، میں اس سے پرہیز کرتا ہوں۔“

شیش اور عثمان
صاحبِ موافق عقد زہری سے روایت کرتے ہیں کہ: ”عزود قریش دوستِ تر عثمان بود از عمر رضی اللہ عنہ زینا کہ عمر شد عدو قلقت بہ ایشان میکند چون عثمان والی شد بہ ایشان بہ لینت و نرمی سلوک ی نمود و طریق مواصلت و موافقت پیش گرفتہ بود۔“ یعنی: ”قریش و عمر کی بیعت عثمان کو زیادہ پسند کرتے تھے کیونکہ عمر ان کے ساتھ شدت و سختی سے پیش آتے تھے جب عثمان دہلی ہوئے تو ان کے ساتھ نرمی کا سلوک کیا اور ان کے ساتھ بنا کر رکھتے تھے۔“

عثمان کا انتخابِ اسلام کی تباہی کا باعث ہوا
رائٹ ازبیل سید امیر علی صاحبِ ہاتھ اپنی تاریخِ اسلام میں فرماتے ہیں: ”اس متعلق (جانشین کی تقرری) اپنے پیش رو کے نقش قدم پر نہ چلنے میں ان سے ایسی غلطی سرزد ہوئی جس نے بنی امیہ کی سازشوں

کے لیے راجہ صلت کو علی بن امیہ اب مدینہ میں نہایت زبردست ہو گئے تھے اور رسول اللہ ﷺ کے مخالفان ہاشمیوں کے بدلت سے رقیب تھے اور ان سے سخت نفرت رکھتے تھے۔ چھ دنوں کے محنت مباہلہ کے بعد بنی امیہ خاندان کے ممبر حضرت عثمان بن عفان کو منتخب کیا گیا ان کا انتخاب آخر میں اسلام کی تباہی کا باعث ہوا۔

عثمان کی بیعت کے بعد ابوسفیانؑ اور حسینؑ اس وقت کے متعلق علامہ مجلسی بخاری میں ایک مفید روایت نقل کرتے ہیں جسے میں ماحسن الابرار

ہے لکھتے ہیں کہ: ”ابوسفیان نے امام حسین علیہ السلام کا ہاتھ پکڑ لیا جب کہ عثمان کی بیعت کی گئی اور ان سے کہنے لگا کہ اسے سچے میز سے پھانسی کے تم میرے ساتھ میں غرقہ کو چلو وہ نکلیں یہاں تک کہ جب وہ قبروں کے پچ میں آتے آتے آواز بلند سے چنا یہ کہہ کر کہ اسے اہل قبور وہ ملک کہ جس پر تم ہم سے مقابلہ کرتے تھے وہ ہمارے ہاتھ میں ہو گیا اور تم خاک میں ہوسیدہ ہو گئے پس حسین بن علی علیہ السلام نے فرمایا کہ خدا تیرے بڑھاپے کا برا کرے اور تیرے فتنہ کو برا کرے پھر حسین علیہ السلام نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ سے چڑھایا اور اسے وہیں چھوڑ دیا پس اگر عثمان بن اشیر نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا ہوتا اور انھیں مدینہ میں نہ پھیر لائے ہوتے تو ابوسفیان اسی روز ہلاک ہوتا۔“

پہلا خطیبہ ابوالفدا کو ایک مفرح واقعہ لکھنا ہے کہ: ”جب کہ بیعت ان سے لوگوں نے کی اس وقت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ منبر پر چڑھے اور خطبہ پڑھا پہلے حمد اللہ کی کی اور کچھ شہادت ادا کیا بعد میں چڑھ گئے اور چہرہ کہا کہ اول ہر شے کا سخت ہوتا ہے اور اگر میں جیسا رہوں گا تویرت سے خطبہ سنو گے۔ بعد ازاں منبر سے نیچے اترے۔“ اس پر آف اسلام میں ڈوڑی کی زبانی ایسے ہی خیالات کا اظہار ہے۔

قتل ہرمزان خلافت عثمان کا پہلا واقعہ جو ابن خلدون میں ملتا ہے وہ قتل ہرمزان ہے جسے مولوی شبلی صاحب اپنے رسائل میں ان نقضوں میں بیان کرنے کا موقع پاتے ہیں۔ ”محمد اللہ (ابن عمر) نکو اور ہاتھ میں

لے کر لنگہ فیروز کے بیٹے اور جینا اور ہرمزان کو جن پر سلاش کا شہ تھا قتل کر دیا۔ ان میں سے ہرمزان مسلمان ہو گیا تھا۔ تمام مہاجرین نے ان بزرگواروں نے جو رسول اللہ ﷺ کے ساتھ وطن چھوڑ کر چلے آئے تھے

اور تمام صحابہ کے نسبت افضل سمجھے جاتے تھے ایک زبان ہو کر کہا کہ عبد اللہ کو قتل کر دینا چاہیے۔ حضرت علی علیہ السلام بھی اس گج میں موجود تھے، اور انھوں نے بھی پکی رائے دی۔

فیصلہ کی عدم تعمیل اور بیت المال اگرچہ حضرت عثمان بعض مصلحتوں کی وجہ سے اس فیصلہ کی تعمیل نہ کر سکے۔ تاہم انھوں نے تینوں مقتولوں کے بدلے

بیت المال سے خون بہا دلا لیا۔“

بقول ابن خلدون قتل کی رائے کے بعد عمرو بن عاص کے اس جواب پر کہ: ”ایسا نہ ہو کہ کل اس کا پاپ مارا گیا ہے اور آج لڑکا مارا جائے۔“ عثمان نے کہا: میں اس کا ولی ہوں اور اس کا خون بہا ادا کرنا ہوں۔“

غیر معمولی حد واقعات جن کے قریب اب ہم اپنے کو دوچار رہے ہیں اور اس سے زیادہ مشکل ہے کہ بیعت بھی

ان کے ہر وقت اپنے ہاتھوں کی تیزی کا مظاہرہ کرتا تھا کہ کہاں تک ہم انہیں اس طرح چھو سکتے ہیں جس سے ہماری بصری راہ کی روشنی قائم رہے۔ جس کے دکھانے بغیر ہم گویا اسباب شہادت حسین سے جو سوانح عمری کے حصہ اول کی سب سے ضروری چیز ہے عملاً مرہض کر دی گئے۔

یہ باب اس کا خاکہ ہے کہ اس زمانہ کے واقعات مگر شہید بارہ برس پر کیا عکس ڈالتے ہیں؟

بنی امیہ کی تقرری شروع ہوئی قتل ہر خزان کی واقعہ نگاری کے بعد ابن خلدون معیرہ بن شعبہ کو حسب وصیت عمرؓ معزول کر کے سعد بن ابی وقاص کو کوفہ کا گورنر مقرر کرنا ہے۔

چونکہ خلیفہ ثانی کے انتقال کا واقعہ آخر ماہ ذی الحجہ ۶۳۴ء کا ہے غالب قریباً چھ سالہ کے کسی عہدہ میں مقرر کیے گئے ہوں۔ لیکن ۶۳۴ء میں وہ معزول بھی کر دیے گئے اور اس کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ سعد نے ابن مسعود سے کچھ روپیہ قرض لیا تھا جسے وہ بلا وجود قرضے کے ادا نہ کر سکے۔ اور ان کی جگہ ولید بن عقبہ بن ابی معیط مقرر کیا گیا۔ اسی سال میں عقبہ بن ابی وقاص کو گورنر بنایا گیا۔ پہلے کے ساتھ ہی بغاوت ہوئی اور فوج کشی کرنی پڑی۔ اعظم کوئی کے موافق عثمان نے ”عمر بن الخطاب کے مالوں کی جگہ دوسرے مال بھیجے۔“ اور اسی ضمن میں بولنے ابوحنبلہ کے عہد اللہ بن حار کر نے کو جو خالد زاہد جانی تھا بصرہ کا حامل مقرر کیا۔

مال غنیمت کے لیے مسلمان سپاہی آپس میں لڑے ابن سراہا میں جو دور دور کے ملک فتح کرنے کے لیے

روانہ کیے گئے تھے ارمینہ کی ہم قابل ذکر ہے جس میں خلیفہ نے مال شام یعنی معاویہ کو اس کی فتح کا فائدہ بھیجا۔ معاویہ نے حبیب بن مسلمہ فہری کو روانہ کیا۔ قریب پانچ لاکھ سپاہیوں کے ساتھ روانہ ہوا کہ روہیوں نے ایک لاکھ سپاہیوں کو کیا ہے جس کے مقابلہ کے لیے اسلامی لشکر روانہ کیا نہیں ہے۔ حبیب نے معاویہ کو خبر دی۔ امیر شام نے خلیفہ کو لکھا اور خلیفہ نے ولید بن عقبہ کو مدد بھیجنے کا حکم روانہ کیا۔ ولید نے سلطان بن ربیعہ کی ماتحتی میں ایک لشکر بھیجا۔ مدد پہنچنے کے قبل حبیب نے روہیوں پر حملہ کیا اور فتح ہوئی۔ مال غنیمت لیا اور تقسیم ہوا۔ مددگار لشکر پہنچا اور اس نے اس زبردست ادعا سے اپنا حصہ طلب کیا کہ تم نے ہماری مدد کی خبر سن کر ہمت کی۔ فتح لشکر نے کہا کہ ہم نے محنت آؤر خون سے جو چیز حاصل کی ہے وہ تمہیں کوئی نفع نہیں ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جنگ ہوئی اور جہول اعظم کوئی: ”یہ پہلی جنگ تھی جس سے اہل شام اور عراق میں دشمنی پہلے ہوئی۔“

بنی امیہ اور خلیفہ اعظم کوئی زمانہ خلافت عثمانی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ: عثمان نے کچھ دنوں تک تو عمر کے عمال کو رکھا۔ اس کے بعد اس ولایت کو بنی امیہ کو سپرد کیا اور مثال میں

عبداللہ بن حار حامل بصرہ ولید بن عقبہ حامل کوفہ، معاویہ بن ابی سفیان حامل شام، عمرو بن حار اور ابن ابی اسیر کو حیرہ کو پیش کرتا ہے اور لکھتا ہے کہ تقسیم غنائم میں ایک مرتبہ عبداللہ بن خالد بن اسد بن ابی العاص بن امیہ جو موجود تھا اسے حاضر ہونے پر تین لاکھ درہم دیے اور حکم بن العاص جے دخول نے مدینہ سے نکال دیا تھا عثمان نے اسے بلایا اور ایک لاکھ درہم انعام دیا اور خمس افزا اسے غنیمت کیا اور اس کے لڑکے حارث بن حکم کو بھی بہت کچھ دیا۔ اصحاب کو یہ امور اتنا گوارا ہوئے اور انہوں نے ابن حوف سے شکایت کی اور کہا کہ یہ سب بڑی تھوڑی دولت دیکھنا پڑا ہے۔

تمہارے عثمان کو خلافت دیتے وقت ہم لوگوں سے ان امورات کا اقرار نہیں لیا تھا۔ ابن عوف نے لاعلمی اور عدم رضامندی ظاہر کی اور علی نے فرمایا کہ: ”موصورت معللہ یہ نہ ہوئی چاہیے بلکہ واجب نہیں ہے۔“ ابن عوف نے کہا: ”یہاں تک کہ اگر ایسا ہے جیسا یہ لوگ کہہ رہے ہیں تو ہم اور تم دونوں آدمی ہمارے نہیں۔“ ابن عوف کی یہ باتیں خلیفہ کے کانوں تک پہنچیں۔

خلیفہ گر اور خلیفہ اور انہوں نے ابن عوف کو ”منافق“ کہا۔ خلیفہ کے اس ریلوے کو ابن عوف نے بھی سنا اور کہا: ”مجھے کان نہ تھا کہ میں ایسے زمانہ تک پہنچوں گا کہ عثمان میں منافق کہیں۔“ اور اس کے بعد قسم کھائی کہ: ”پھر بھی عثمان سے ہاتھ نہ کریں گے۔“ ابوالفضل بھی کہتا ہے کہ: ”جب لوگوں نے عبدالرحمن بن عوف سے عمال کی تقرری کے نسبت شکایت کی تو ابن عوف نے بات کرنا عثمان سے چھوڑ دیا۔“ طبری کہتا ہے کہ: ”ہم شہر عمال عثمان بن امیہ بود چون یکے را از ایشان باز کردی دیگرے را ہم از ایشان فترار کردی۔“ یعنی: ”قسام شہرہاں میں عثمان کے گورنر بنو امیہ میں سے تھے اگر کسی کو ہٹاتے تو انہیں میں سے کسی کو مقرر کر دیتے تھے۔“

جناب امیر اس وقت کی مصوری کرتے ہیں اس وقت کی عام حالت مختصر لفظوں میں جناب امیر کے ظلم و ستم کے موافق چہاں خلیفہ ثابت کے زمانہ کے ذکر کیا گیا ہے یہ سچی کہ: ”اس کی یہ حالت تھی کہ اس نے اپنے معرے اور اصول کو حق تک دنیا کے مال سے بھر لیا تو پروری اختیار کی ملوگوں کے مال کھانا شروع کیے اور پھر اس کے ساتھ ہی اس کے باپ کے بیٹے بھی اکڑے ہوئے اور خدا کے مال کو اس طرح کھا گئے جیسے اوٹ فصل بہار کی گھاس کو چر جاتا ہے۔“

موصورت معللہ یہ ہوتی جاتی تھی کہ اصحاب رسول نے اپنی شکایتیں انہیں جس میں یہ فقرہ بھی تھا کہ: ”اگر یہ بے قاعدگی نہ رکھ نہ کی گئیں تو ہم تمہیں معزول کر کے دوسرے کو خلیفہ بنائیں گے۔“ پہلے یہ صلاح ہوئی کہ سب لوگ طویلہ آخر میں طے یہ ہوا کہ عمار بن یاسر نے جائیداد عمار لے گئے۔ خط دریا اور جواب مالک خلیفہ نے چند سطریں پڑھ کر کافہ پھینک دیا۔ عمار نے کہا: اسے اصحاب رسول نے لکھا ہے۔ چھینکا مناسب نہیں ہے۔ بلکہ جو لکھا ہے اس پر غور اور ملاحظہ لازم ہے۔ ہم تمہارے خیر خواہ ہیں۔ یہ باتیں تم سے مصطلحت اور نصیحت کے لیے کہی جاتی ہیں۔ اس پر عمار جھوٹے بنائے گئے اور غلاموں کو مارنے کا حکم دیا گیا۔ عمار گر پڑے اور اس خلیفہ نے بھی تبرکاً چاند لائیں پیٹ اور حلق پر مارا۔ عمار بے جوش ہو گئے اور عارضہ فتن میں مبتلا ہو گئے۔ بنی عزم آکر اٹھالے گئے اور قسم کھائی کہ اگر عمار جان برونے تو عثمان کو قتل کر ڈالیں گے۔

ابوذر شام میں کیا دیکھتے ہیں یہ خبر ایسی تھی کہ مدینہ میں سب نہ رہ سکتی اور ابوذر غفاری کے پاس شام چلی۔ بات ایسی نہ تھی کہ ابوذر چپ رہ سکتے جب وہ ایسی باتیں بھی دیکھتے رہتے تھے کہ شام کے بیت المال کو بیت المال کہا جاتا ہے۔ اس لیے کہ امیر کو اس کے تصرف پر پورا اختیار ہوا اور مومنین کو باز پرس کا کوئی حق نہ رہا۔

امیر شام ابوذر کے اخراج کے لیے لکھتا ہے اور خلیفہ کا حکم معاویہ نے اس کی مات غلیفہ کو بھی

جن میں اس کا تذکرہ مناسب تھا کہ ابوذر کا شام میں رہنا مناسب نہیں ہے، وہ لوگوں کو تم سے پھیرتے ہیں۔ مبادا کوئی فتنہ کھڑا ہو جائے۔ عثمان نے حکم بھیجا کہ فوراً ایک سخت اونٹ پر بٹھاؤ، ساربان شب دروز بٹھاتا ہوا آئے کہ ابوذر پر غیر غالب ہو جائے، جس سے چار اور تیرا ذکر بھول جائے۔ معاویہ نے ایک درخت خوشنہان کے حوالہ کید اس نے برہنہ کوہاں پر سوار کر کے مدینہ کا رخ کیا۔ مدینہ پہنچتے پہنچتے ابوذر کا گوشت ہڈیوں سے علیحدہ ہو گیا تھا۔

اس کے بعد ابوذر اور خلیفہ میں گرم گفتگو رہی۔ اور نتیجہ یہ ہوا کہ ابوذر کو ربذہ میں جلا وطنی کا رہنما میں جلا وطنی حکم دیا گیا۔ مردان کو ہدایت کی گئی کہ ابوذر کو اونٹ پر بٹھا کر مدینہ کے باہر لے جاؤ، اور کوئی شخص ان کے رخصت کرنے کو نہ جائے۔

صحاب کو یہ امر بھی ناگوار گزرا اور ابوذر کی مشاعت کے لیے علی، ابن عباس، حسنین، مقداد اور عمار یا سر وغیرہ گئے۔ مردان نے خلیفہ سے ان لوگوں کی مشاعت کا ذکر کیا۔

ابوذر کے ساتھ خلیفہ کے برتاؤ نے علی کو بہت متاثر کیا تھا اور مشاعت کے وقت یہ الفاظ فرمائے جو صحیح البلاغہ میں ملتے ہیں:

”اے ابوذر تو محض خدا کی وجہ سے خشم ناک ہوا تھا اب اسی سے امیدوار رہ جس کی خاطر تو نے خشم اختیار کیا۔ اس قوم نے تیری طرف سے اپنی دنیا کا خون کھلیا اور تو نے ان کی طرف سے اپنے دین کا خون کید اب تو اس چیز کو انہیں کے ہاتھوں میں چھوڑ دے جس کے ذوالی سے یہ ظالم ہو رہے ہیں اور تو اس چیز (دین) کو ان سے بچا کر لے جا جس کے بارے میں تجھے ان کا ڈر ہے۔“

رحلت ابوذر اور ان کی تجہیز و تکفین

مقدس صحابی اس دوران جگہ رہتے تھے مددگار حضرت ابی بنی حمی اور مالک کی تحفہ یہاں تک کہ غربت میں موسیٰ کی تحفہ ابی بنی سرورہ بیٹے کر دے گی۔ اتفاقاً کچھ لوگ حج سے خارج ہو کر واپس آ رہے تھے جن میں غنوص لوگ ضیف بن قیس، ابی عبد اللہ بن مسلمہ، علقمہ بن قیس، مصعب بن موصان اور ہلال بن مالک، جریر بن عبد اللہ، ابی، ابو بن زید وغیرہ تھے جن کے میر کاروان مالک اشتر تھے۔ جب یہ قریب پہنچے تو منعید کھڑے ہو گئی اور کہنے لگی کہ: ”اے مسلمانو! ابوذر نے جو رسول کے صحابی تھے یہاں رحلت کی۔ میں ان کی بی بی ہوں اور اس جگہ غربت میں کوئی میرا مددگار نہیں ہے جو دفن کرے۔ اگر تم لوگ اس کام کو انجام دیدو تو خدا تمہیں اجر دے گا۔“ یہ سن کر لوگ رو دیے، غنوص کھڑے ہو گئے، گھر سے اور طلب آمرزش کی۔ ابوذر ہر شخص نے خواہش کی کہ اس کے مال سے کفن دیا جائے۔ نماز اور دفن کے بعد مالک اشتر قبر پر کھڑے ہوئے اور بقول اعظم کوئی یہ یادگار دھاک:

مالک اشتر کی یادگار دعا: خداوند! ابوذر غفاری تیرے رسول کے ساتھ رہا۔ تیری کتاب اور تیرے رسولوں پر ایمان لایا۔ تیری راہ میں لڑا اور جاہد اسلام پر ثابت قدم تھا۔ اس نے شرع میں کوئی کھیر نہیں کیا۔ اس نے کچھ باتیں

دیکھیں جو سنت رسول کے موافق نہ تھیں اس نے ان سے انکار کیا۔ اس وجہ سے اسے لوگوں نے حقیر کہا اور اسے روضہ رسول کے طواف کی وجہات سے عرم کر کے نکال دیا، اور اسے ضائع چھوڑ دیا۔ یہاں تک کہ غربت میں مر گیا۔ خداوند ا سے بیشت عطا کر جس کا تو نے مؤمنین سے وعدہ کیا ہے۔ اور اسے بھی سزا و جزا دے جس کا وہ مقتدی ہو جس نے اسے عرم رسول سے نکال دیا۔ لوگوں نے آئینہ کی۔

بعض اور زیادتیاں جن پر اعتراض ہوا۔
قبول ابن خلدون محمد بن احمد کے جن سے مخالفین کو موقع
اختصاص ملا یہ بھی تھا کہ امیر المومنین عثمان نے ندرہ ثالث
ٹیمہ میں نزادہ کردی تھی اور منی و عرفہ میں پوری نماز پڑھی تھی۔ حالانکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک مہد اور شہین
کے دور خلافت میں نماز قصر کی جاتی تھی۔ اس کے بعد مکالمہ چونکہ اور آخر میں ”امیر المومنین عثمان نے کہا یہ میری رائے ہے
اور میرے نزدیک بھی مناسب ہے۔“

سعید بن العاص کی تقرری اور اس کے آئندہ نتائج
دلید معزول کیا گیا اور سعید بن
العاص اموی جو فتح شام میں معاویہ کے
ساتھ تھا اور جس نے عثمان کے گود میں پرورش پائی تھی اور جسے مدینہ بلا کر عقد کر دیا تھا جانے اس کے گورنر مقرر ہوا۔
ہونے والا تھا کہ عثمان کے ایسے معتد سے انھیں بے ارادہ وہ سب دیکھنا پڑتا جو آئندہ بیان کیا جائے والا ہے اور جس کا
دور حکومت عثمان کے اسباب ظلم اور قتل میں بڑا سبب ہوا۔

طبرستان اور حسین
ابن خلدون ہی کے پاس یہ روایت بھی ہے کہ سعید بن العاص نے جب طبرستان پر
حملہ کیا تو اس لشکر کے ساتھ حسین علیہ السلام بھی تھے۔ میرے وجہات وہی ہیں
جو افیہ کے مستحق تھے گئے ہیں۔

اسی مورخ کے موافق: ”امیر المومنین عثمان ج کو گئے اور مقام مناس میں خیمہ نصب کر لیا۔ یہ پہلا خیمہ ہے جو اسلام میں
ہتمام مناسپ نصب کیا گیا۔ اسی واقعہ سے لوگوں نے کلمہ کلا امیر المومنین عثمان پر حرمت گیری کرنی شروع کی۔“

شہر آن کے ساتھ معاملہ
شہر کا ایک دوسرا نازک معاملہ قرآن کے نصوص کا پارہ پارہ کرنا،
اور جلوا دینا تھا۔ ابن خلدون ایسے حذیفہ سے شروع کرتا ہے جنہیں

اس کا نتیجہ ہوا تھا کہ قرأت قرآن میں اختلاف ہے۔ ان کے نزدیک ہمیں کے لوگوں نے مقداد سے قرأت سیکھی تھی۔
اہل دمشق اس کے خلاف کہتے تھے بھری کہتے تھے کہ ہم نے ابوہریرہ سے سیکھا ہے اور کوئی ابن مسعود کو اپنا معلم بتاتے
تھے۔ حذیفہ نے قرآن مجید کو ایک قرأت و صورت پر جمع کرنے کی خواہش کی اور ابن مسعود سے بھی کہا لیکن انھوں نے
منظور نہ کیا۔ حذیفہ نے مدینہ میں آکر خلیفہ سے کہا۔ خلیفہ نے وہ قرآن جو خلیفہ اول کے حکم سے زید بن ثابت نے جمع کیا
تھا اور جو حصہ کے پاس امانت تھا منگوایا۔

قرآن کی نقل و ترتیب کے ذمہ دار اور ایک حکم
اور زید بن ثابت، عبد اللہ بن زبیر،
سعید بن العاص، عبد الرحمن بن امیر

بن ہشام کو اس کی نقل و ترتیب پر مہور کیا اور یہ اصرار کیا کہ اگر تم کو کسی لحاظ میں اعتکاف واقع ہو تو علوۃ مشرق کے مطابق کعبہ کیونکہ مشرکین مجید انصاری کی زبان میں غزل بخا ہے۔ پس ان بزرگواروں نے ایسا ہی کیا اور محفوظ کئے مشرکین مجید کے لئے۔

خلافت کے مرتبہ قرآن کے علاوہ اور نسخے جلوائے گئے

امیر المومنین عثمان نے اسی قرآن کے نسخے تمام بلاد اسلامیہ میں

بیچ دیے اور یہ حکم دیا کہ اسی پر احمد و مبرورہ کیا جائے۔ اس کے سوا اور جو نسخے تھے ان کو صحابہ نے جلادیا۔

ابن مسعود حکومت کا شہر ان نہیں لیتے

کوفہ میں جب یہ قرآن پہنچا تو صحابہ رضی اللہ عنہم بہت محفوظ ہوئے لیکن عبداللہ بن مسعود نے اس قرآن کے نسخے کے لینے سے انکار کیا اور لوگوں کو اپنی ہی قرأت پر رکھا۔ ابن غلدون غلیفہ کی مختلا خلافت لیکن مدین کی قابل افوس بے کالفی سے ان نسخوں کو صحابہ کے ہاتھوں جلواتا ہے۔ حالانکہ خود احبار علوم و جمع قرآن کی سرخی میں بخاری کی روایت بھی نقل کرتا ہے جس کی آخری عبارت یہ ہے کہ: ”تا آئنگہ مصحف کے متفقہ مصاحف میں نقل ہو گئے عثمان نے اس مصحف کو حصہ کے پاس دایس کدیا اور منقول کو اطراف و جانب میں بیچ دیا اور سوا اس قرآن کے اور مصحف اور مصحف کے جلادینے کا حکم دیا۔“

ابن مسعود کے ساتھ خلیفہ کا برتاؤ

ابو القاسم بھی قرآن کے جلاتے جاتے اور ”قریش کی بولی“ میں تذکرہ نہیں کرتا۔ جو اعظم کوئی میں اس طرح ہے، جب کہ طلحہ و زبیر لوگوں کی حکایت لے کر غلیفہ کے پاس گئے تھے: ”گفتند ترا با عبداللہ بن مسعود چہ کار بود کہ فرمودی کہ قرأت او مجبور است و او قرأت الیہ صلی اللہ علیہ وسلم آموختہ است و چندان بر شکم بوزی کہ ابن مسعود در خانہ غلیفہ است و حق ندانہ ہمنا کہ بر خیر“۔ یعنی: ”بولے تھے عبداللہ بن مسعود کے ساتھ کیا تھا کہ تم نے کہا کہ اس کی قرأت متروک ہے۔ حالانکہ اس نے قرأت منطوقی سے بیگی ہے اور تم نے اس کے پیٹ پر اتارا کہ اس گڑی گھریں گرا پڑا ہے اور اٹھنے کی بھی سکت نہیں رکھتا۔“

صاحب صواعق عرقہ صرف اشارہ دیتے ہیں یہ لکھتے لکھتے کہ جب عثمان کا غلام مصر جانے وقت پکڑا گیا: ”پچاس ازاہل مدینہ نماز مگر آنگہ بر عثمان دل تنگی و غم نمود و هیچ کہ بواسطہ ابن مسعود ابوہریرہ و عمار در غضب بودند غیظ و غضب بیش از زیادہ گشت۔“ یعنی: ”اہل مدینہ کے ہر شخص عثمان پر دل تنگ اور غصہ ہوا اور تمام لوگ جو کہ ابن مسعود ابوہریرہ و عمار کی وجہ سے غضب ناک تھے ان کا غیظ غضب اور زیادہ ہو گیا۔“

اس کے کچھ پہلے ہی اسی کتاب میں ابن جریر نے لکھا ہے: ”وقبل ازہی میان عثمان و عبداللہ بن مسعود ابوہریرہ و عمار ہر نزاع واقع شدہ بود۔“ یعنی: ”اس سے پہلے ہی عثمان اور عبداللہ بن مسعود ابوہریرہ و عمار میں جھگڑا واقع ہوا تھا۔“

حسینؑ اور افریقہ

ابن غلدون کہتا ہے کہ شہر مدینہ میں فتح افریقہ کے لیے جو لشکر عبداللہ بن مسعود بن ابی سرح کی ماتحتی میں روانہ کیا گیا تھا اس میں حسین علیہ السلام بھی تھے۔

اعظم کوئی میں ہے کہ خلیفہ نے اہل محل حضرت علیؑ، طلحہ، زبیر، سعدؓ اور سعد بن زید وغیرہ سے صلاح لی، لیکن ان میں سے ”زیادہ تر کی رائے تھی کہ اہل انصاریہ سے کوئی تعرض نہ کیا جائے۔“ یہ مؤرخ بھی نہیں کہتا کہ حضرت علیؑ کی کیا صلاح تھی۔ اگر حضرت بھی کثرت کی طرف تھے تو بہت کم قریب ہے کہ حسنین افریقہ کی طرف روانہ ہوئے ہوں۔ یہ ایک ایسا واقعہ ہے جسے عموماً مؤرخین نے نقل نہیں کیا ہے۔ علاوہ بریں اس کے آثار بھی ہیں کہ جناب امیر حسنینؑ کو صفین میں لے جانے سے متردد تھے۔ جس کی وجہ ظاہر ہے کہ وہ فرزندان رسولؐ کو خطرہ میں گرفتار نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اور دوسرے مسند زید محمد حنفیہ کو جنگ کے لیے روانہ کرتے تھے۔ نظریں بچے رواں گی کے بہ نسبت عدم رواں گی کے قرائن زیادہ قوی معلوم ہوتے ہیں۔

قبول ابن خلدون عثمان نے ابن ابی سرح کو اس شرط پر فتح افریقہ پر مقرر کیا کہ اگر اللہ تعالیٰ کامیابی و فتح پائی عنایت فرمائے گا تو مال قیمت کے خمس کا خمس خیر خدمت کے صلہ میں دیا جائے گا۔ اسی کتب میں ہے کہ ”ابن زبیر فتح کی خبر اور خمس لے کر مدینہ کو آئے۔ جس کو مروان بن حکم نے پانچ لاکھ کو خرید لیا۔ جسے کہتے ہیں کہ افریقہ کا خمس اس کو دیا گیا۔ لیکن یہ صحیح نہیں ہے۔ بلکہ ابن ابی سرح کو افریقہ کی پہلی لڑائی کا خمس افس دیا گیا۔“

ابن عباس اور مغیرہ خلیفہ کے مخالف ہو گئے
سلسلہ شروع ہوا، اور اس میں مصر کا فتح مشہور عمرو بن عباس معزول کیا گیا۔ اور قبول روضۃ النقا: ابن عباس نے اس طرح انتقام لیا کہ عثمان کی بہن کو جو اس کی زوجیت میں تھیں ”طلاق دیدیا۔“ اسی مؤرخ کے موافق: مغیرہ اور ابن عباس یہ دونوں خلیفہ پر طعن کرنے لگے۔

جزیرہ قبرس کی فتح اور ابوذر کا تأسف
جزیرہ قبرس معاویہ کے اہتمام میں فتح ہوا۔ جس وقت سپاہی مال قیمت اس میں تقسیم کر رہے تھے ابوذر غفاریؓ اذہیں دیکھ کر مغموم تھے۔ کسی نے اسے مبارک وقت ان سے ان کے بے موقع تأسف کی وجہ پوچھی اور ابوذر نے جواب دیا: ”تم جو کچھ کہہ رہے ہو صحیح ہے۔ لیکن میں جس وقت ان عورتوں اور بچوں (اسیر) کو دیکھتا ہوں، مجھے خیال آتا ہے کہ یہ امت کے گناہگاروں کی بدولت اس ظلمیت میں مبتلا ہوئے ہیں۔ یہ لوگ نعمت اور فراغت میں بسر کر رہے تھے اور جب گناہ کیا اور حکم خدا کو عزیز نہ رکھا اس ذلت میں گرفتار ہوئے۔ جسے خدا اپنے بندوں کا بندہ قرار دیتا ہے، وہ ایسی ہی محذول و متہور ہوتے ہیں۔“

تقسیم غنیمت کے وقت خصوصیتیں
اعظم کوئی کے موافق تقسیم غنیمت دیانت داری سے نہ ہوئی اور اس میں خصوصیتیں پیدا ہوئیں، وہ وقت اور اس کے تقسیم کی فسادور ہو گئی تھی کہ کوئی سپاہی کوئی سونے کیڑا پسینے کے لیے سین کی قیمت سے بغیر حکم رسولؐ لے لیتا اور رسولؐ اسے دم مسلات کے لحاظ سے واپس کر لیتے۔

ابوذر کے علاوہ معاویہ بن الحارث، سدا، وائلہ بن الاشعث اور ابوامامہ وغیرہ نے دیکھا کہ ایک شخص دو دراز گوش بھانے لگے جاتا ہے۔ دریافت سے معلوم ہوا کہ معاویہ نے دیا ہے۔ ان لوگوں نے کہا کہ نہ معاویہ کو دینا اور نہ انھیں

لینا ہائز ہے۔ یہ واقعہ بھی معاویہ سے کیا گیا یہ لوگ بلانے گئے اور انھوں نے صلاح دی کہ سفارت مہربانیت اور حسن سیرت سے شخص کوئی شخص تقسیم قیمت کے لیے مقرر کیا جائے۔

غنیمت کی ایک کنیز اور اہلیہ عثمان
معاویہ نے غم میں غلیفہ کے لیے جہاں بہت کچھ نقد بھیجا بلکہ اس کے ایک نہایت ہی حسین اور خوش ادا کنیز بھی تھی لیکن اہلیہ عثمان نے اہتمام کیا کہ وہ دار الخلافہ میں نہ رہ سکے اور شام روانہ کر دی جائے۔ پھر حال معاویہ کی اہلیہ کوئی بغاوت نہ کر سکی۔
زمانہ عثمان میں معاویہ کے اقتدار کی وسعت
معاویہ اس وقت نہ صرف اشعار شام بلکہ فلسطین، قبرس اور مغلیہ کا بھی حاکم تھا اور

شام کے علاوہ مقامات بھی زمانہ عثمان میں اس کی حکومت میں شامل کیے گئے تھے۔

ولید کی شکایت کا وفد
ولید بن عقبہ کی شکایت کے لیے کوفہ سے ایک وفد آیا اور اس نے ولید پر شراب خوری، بدمستی اور غفلت کا الزام لگایا۔ شکایت کے وقت دربار میں ایک شخص ابوزناب حاضر تھا۔ اس نے ایک انگوٹھی پیش کی اور کہا کہ میں ایک دن کوفہ تھا اور ولید اس درجہ بدست تھا کہ میں نے انگوٹھی اتار لی اور اسے خبر نہ ہوئی اور لوگوں نے بھی تصدیق کی اور جناب امیر کی صلاح سے ملے یہ پایا کہ ولید اپنی صفائی کے لیے طلب کیا جائے۔ ولید حاضر ہوا اور صفائی نہ دے سکا۔ بعض جنوں نے شراب پیچے نہ دیکھا تھا انھوں نے شراب کی ترقی کرنے کی شہادت دی۔ عثمان نے سعید بن العاص (آئندہ گورنر کوفہ) کو درہ لگانے کا حکم دیا۔ بعض کے نزدیک حسن یا عبداللہ بن جعفر نے درہ لگایا۔

علی شرع کے موافق حد جاری کرتے ہیں
اور قبول ابن خلدون: ”جب چالیس درہ پر پہنچے تو علی بن ابی طالب نے کہا: بس اب درہ نہ لکھو۔“
اسخضر اور ابوبکر نے چالیس چالیس درہ مارنے کا حکم دیا۔ اور عمر نے اسی درہ شراب خوار کو مارے تھے اور یہ سب سنت ہے۔

شکل سے سوچا جاسکتا ہے کہ کسی ایک شارع کے متعلق مؤرخین کے پاس کے درجہ سنت ہے جب کہ یہ ظاہر کر دیا گیا کہ رسول کا کیا حکم تھا اور جناب امیر بھی اسے پسند فرماتے تھے۔ ولید کا حالت نشہ میں صبح کی نماز کے بعد خواہش کرتا کہ کہو تو دو چار رکعت اور پڑھا دوں۔ کوئی اذیلا نہ تھی جب کہ حضرت عمر نے مزاحمت دہائی کر دی تھی۔

سعید بن العاص کی سیاسی بے تمیزی
کوفہ میں یہ ہو رہا تھا کہ قبول ابن خلدون: ”سعید بن العاص نے کوفہ میں پچھ کر روسائے شہر اور اہل کاوسیہ سے ایسے مراسم بڑھانے کہ مثل ملک ابن کعب، اسود بن زید، طلحہ بن قیس نخعی، ثبیت بن قیس ہمدانی، جندب بن زہیر، جندب بن کعب ازدی، عروہ بن الجعد، عمرو بن الحق غزالی، مصعب و زید پسران موہان، ابن الکوا، کسلی بن زید، حمیر بن ضبابی، طلحہ بن خویلد وغیرہم راتوں کو لوگوں کے انساب اور سرب و اسلام کے امام و اخبار کے تذکرے اور باہم ہنسی مذاق کرنے کو سعید کی صحبت میں حاضر ہوا کرتے تھے۔ اکثر ہنسی مذاق ہوتے ہوتے نوبت طعن و تشنیع و سخت کلامی کی پہنچ جاتی تھی۔“

ایک روز اشتر بن سحید نے اشتر کلام میں کہا: ”ہذا اسواد بستان قدیش“۔ اشتر نے جواب دیا: جس سواد کو اللہ تعالیٰ نے ہماری تلواروں کے زور سے عنایت فرمایا ہے تم اس کو اپنا اور اپنی قوم کا بستان خیال کرتے ہو۔ اشتر کے اس جواب سے اور حاضرین نے بھی کچھ کہنا شروع کیا۔ عبدالرحمن اسدی (سحید بن الحارث کے پوتے کے امیر) نے ان لوگوں کو شور و غل مچانے اور لامحالہ قتل کرنے سے بہ تشدد منع کیا۔ لوگ اس پر ٹوٹ پڑے اور اس قدر مارا کہ وہ بے ہوش ہو گیا۔

ابن خلدون نے اس کے پہلے کا ایک واقعہ نہیں لکھا ہے جس طرح اس نے عمار، ابوذر اور ابن مسعود کے اصل واقعات کو اپنے لیے بلا ضرورت کج کر ترک کیا ہے ہم اسے اعظم کوئی سے نقل کرتے ہیں۔

سحید اور ہاشم بن عتبہ سحید بن الحارث اور ہاشم بن عتبہ بن ابی وقاص میں کچھ گفتگو ہوئی اور سحید نے اسے ”کھانا“ کہا۔ اور بات یہاں تک بڑھ گئی کہ سحید نے اپنے آدمیوں سے مارنے کا حکم دیا اور گھر جلا دیا۔ جب یہ خبر سحید بن ابی وقاص کو ہوئی تو بہت برا فروختہ ہوئے اور عثمان سے شکایت کی اور انہوں نے بھی سحید بن الحارث کے گھر میں آگ لگا دی۔ اس کے بعد کا واقعہ ہے کہ ایک روز زمینوں اور ان کی سپہ سالار کا ذکر ہو رہا تھا کہ مالک اشتر نے کوفہ کی تعزیت کی، اس پر عبدالرحمن بن خنیس الاسدی نے کہا کہ: ”عراق اور اس کا اسواد قریش کے لیے بمنزلہ بستان ہے جس قدر ہم چاہیں لے لیں اور جس قدر نہ چاہیں چھوڑ دیں۔“

قوم نے اشتر کے جواب کو پسند کیا اس واقعہ کے بعد سے بد مزگیوں بڑھنے لگیں۔ اشتر کی ان کے ہم خیالوں نے تعزیت کی کہ اگر تم نے ایمان نہ کیا ہو تا تو یہ گروہ اس کے بعد ہمارے گھر ہمارے گھر میں تصرف شروع کرتا اور ہمیں ہمارے آباد اجداد کی میراث سے محروم کر دیتا۔ سحید نے عثمان کو حالات کھئے اور ان لوگوں کے جلا وطنی کی خواہش کی۔

مالک اشتر کی جلا وطنی سحید اور خلیفہ دونوں آدمیوں نے اشتر وغیرہ کے متعلق اچھے الفاظ استعمال نہ کیے اور انہیں شام روانہ کر دیا۔

طنز اور اس کا جواب روانگی کے وقت سحید نے کہا کہ: ”جاتے ہو تو ان سفہا اور اوباشوں کو بھی لیتے جاؤ جو تمہیں برا سمجھتے کرتے ہیں۔“ اشتر نے اس کا نہایت ہی مدبرانہ جواب دیا کہ: ”کوفہ میں جتنے لوگ ہیں سب میرے ہوا خواہ ہیں اور کوئی اس پر راضی نہ ہو گا کہ تو ان کے شہر اور گھروں کو اپنا بستان قرار دے۔“

معاویہ اور جلا وطن یہ لوگ معاویہ کے پاس پہنچے معاویہ نے مدبرانہ پہلو سے قریش کی تعزیت شروع کی کہ اگر جلا وطن لوگ خاموش رہیں تو گویا اپنا کام کیا اور غدر کریں تو رسول کا نام بھی قریش میں شامل کر دیا۔ ان لوگوں نے بھی جنتی ہوئی تقریریں کیں۔ معاویہ نے دمکھایا اور جب دیکھا کہ یہ لوگ رعب میں آنے والے نہیں ہیں تو خلیفہ کو لکھ بھیجا کہ: ”ان سے نیکی کی کم امید اور برائی کا زیادہ اندیشہ ہے۔“

شام سے بھی نکالے گئے یہ لوگ محض میں عبدالرحمن بن خالد بن ولید کے پاس بھیجے گئے اور قبول ابن خالد بن عبدالرحمن نے ”ان کے ساتھ ایسا سختی کا برتاؤ کیا کہ یہ لوگ مرعوب ہو کر کہنے لگے ہم اپنے اقوال سے رجوع کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے سامنے توبہ کرتے ہیں۔“

دوسرا شکایتی وفد زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ کچھ مشاہیر کوفہ نے اگر اشتد وغیرہ کے جلاوطنی اور سعید بن العاص کے نسبت شکایت کی۔ اتفاقاً کچھ بصری بھی آنے لگے اور ان لوگوں نے عبداللہ بن عامر کریم کی شکایت کی۔ اعظم کوفی کے موافق عثمان نے اپنے حاکموں کو طلب کیا اور انھیں نصیحتیں کر کے واپس کیا۔ لیکن یہ لوگ اپنے پرانے رنگ پر رہے۔ اہل کوفہ نے پھر خط لکھا اور اس کے ساتھ ساتھ قبول ابن خالد بن عامر بن عبداللہ تھی کو روانہ کیا اس نے پتھ کر عام جمع میں کہا:

لوگوں نے خلیفہ کی باتوں پر نظر شروع کی اے عثمان لوگوں نے حماد سے اٹھ کر پھر کر شروع کیا ہے۔ تم نے بڑے بڑے ناروا کام کیے ہیں۔ پس اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور توبہ کرو۔

خلیفہ کا اللہ تعالیٰ امیر المومنین عثمان نے فرمایا: ”تم لوگ سنتے ہو یہ کیا کہہ رہا ہے؟ لوگ اس کو زہر دے متورع بگتے ہیں اور یہ فجر سے ہالو اجا ایسی ایسی باتیں مانا تم کہہ رہا ہے۔ واللہ یہ اللہ تعالیٰ کو نہیں جانتا کہ کیا ہے۔“ عامر نے جواب دیا: ”میں اللہ تعالیٰ کو نہیں جانتا؟ بیشک اللہ تعالیٰ حاکموں پر قابو پانے والا ہے۔“ اعظم کوفی کے موافق جو شخص کہ اہل کوفہ کا خط لایا تھا اس کی خوب مرمت کرانی گئی اور قید کا حکم دیا گیا۔ جن لوگوں نے عرضداشت بھیجی تھی وہ سفہا، اہل بنی اور حد کہے گئے۔ کعب بن عبیدہ جنھوں نے اہل کوفہ کے ساتھ خط بھیجا تھا بلانے گئے انھیں کوڑے مارے گئے اور کہیں پہاڑ پر قید کیے گئے۔

معتد کی صلاح ابن خالد بن عامر، عمرو بن العاص کو مشورہ کی غرض سے طلب کر کے ارشاد کیا: تم لوگ میرے وزیر، میرے ناظم، میرے معتد علیہ ہو۔ تم پر مجھے اطمینان ہے کہ تم لوگ نیک نیتی سے رائے دو گے۔ تم لوگ اور لوگوں کا برتاؤ دیکھتے ہو۔ طرح طرح کے الزامات فجر پر قائم کرتے ہیں۔ میرے عمل کی معزولیاں پہنتے ہیں اور جس کو وہ دوست رکھتے ہیں مجھے اس کا پابند اور اس کی طرف لوٹنا چاہتے ہیں۔ اس امر میں غور کر کے بتلاؤ کیا کیا جاتا ہے۔ جس سے یہ یورش فرو ہو جاتا ہے۔ ابن عامر نے کہا: میرے نزدیک ان لوگوں کو جہاد میں مصروف کر دیجیے۔ کیونکہ جب فارغ بنیں گے تو طرح طرح کے خیالات پیدا کر کے آئے دن ایک نہ ایک فتنہ اٹھاتے رہیں گے۔ سعید نے کہا: مناسب یہ ہے کہ ان کے سرداروں کی معقول گرفت کی جائے۔ جب ان کے سردار ہلاک ہو جائیں گے تو یہ لوگ خود بخود متفرق ہو جائیں گے۔ امیر المومنین عثمان نے فرمایا: یہ رائے ضرور مناسب ہے لیکن اس پر عمل کرنا کسی قدر مشکل ہے۔ معاویہ بولے: امیر المومنین اس کام کو اہل لکھ کے سپرد کیجیے۔ میں شام کو ان لوگوں سے

صاف کردوں گا آپ مدینہ کو سنبھالیے اور امرا اپنے مومنہ صوبہ کو صاف کریں۔ عبد اللہ نے کہا: یہ لوگ طمع ہی ہیں ان کو مال و زر دے کے اپنا بنا لیجئے۔ اس سے زیادہ تالیف قلوب اور کسی صورت سے ممکن نہیں ہے۔ امیر المومنین عثمان نے ان لوگوں سے رائے لینے کے بعد تصفیہ جو گزشتہ مصالح کی تقلید تھی ان کے صوبہ کی طرف واپس کیا اور یہ حکم دیا کہ: ”لوگوں کو چھاپہ روانہ کرو، تاکہ اس کی مصروفیت ان کو اور خیالات سے روک دے۔“ بعض کے موافق معاویہ نے صلاح دی کہ علی اور طلحہ وزیر قتل کر دیے جائیں۔

اہل کوفہ کی صلاحین جس وقت مدینہ میں خلیفہ اپنے متعین سے اپنے قیام اختیارات کے متعلق مشورہ کر رہے تھے اہل کوفہ انھیں معزول کرنے کی صلاحوں میں سرگرم تھے چنانچہ سعید امی کوفہ واپس بھی نہ آیا تھا کہ زید بن قیس نے فروج کیا اور ان لوگوں کو بھی ہذریہ خط کے طلب کیا جو محس میں عبدالرحمن بن خالد کے پاس نظر بند تھے۔

مالک اشتر اور فوجی انتظام اعظم کئی کے موافق مالک اشتر ولایت شام سے کوفہ تیر حویں دن پہنچ گئے انھوں نے موضع جرمہ کو اپنا فوجی مرکز بنایا اور ثقیفہ کار آزمودہ لوگوں کو سپاہوں کے ساتھ بصرہ، عین التمر، طوان، مدائن وغیرہ اس حکم کے ساتھ روانہ کیا کہ اگر سعید بن العاص کوفہ کا قصد کرے تو اسے مدینہ لوٹا دیں۔ عمر بن حصین السکونی نے جے سعید اپنا قائم مقام کر گیا تھا قریروں سے روکنا چاہا۔ لیکن قنقلع نے جوفی امر قہایہ کہہ کر اسے روکا کہ: ”تم سیلاب کا حالت جوش میں روکا چاہتے ہو، صبر کرو، یہ لوگ بغیر فساد کیے جانے نہ رکیں گے۔ (ابن خلدون) خلیفہ کو یہ خبر پہنچی اور انھوں نے سعید بن العاص کو روانہ کیا۔

سوادستان شیش کا جواب اعظم کئی کے موافق حذیب کے قریب عبد اللہ کاندہ نے تین سو سواروں سے روک کر کہا: ”اے دشمن خدا کہیں جاتا ہے لوٹ جا جہاں سے آیا ہے۔ اب دوسری چیزوں کا کیا ذکر ہے تو منہات کا ایک قطرہ نہ پانی کے گا۔“

خلیفہ نے کب عامل بدلا قبول ابن خلدون: سعید کے نوکر نے کچھ تکرار کی اشتر نے اس کی ٹانگ گھسیٹ کر ایک ہاتھ مارا اور کہا: ”جاؤ عثمان سے کہہ دو کہ ابوموسیٰ کو بھیج دے۔“ خلیفہ نے ابوموسیٰ کو بھیج دیا اور یہ ظاہر اس وقت تک کوفہ کا برابر عامل رہا جب تک مالک اشتر نے امارت سے نہ ہٹایا۔ جس کا ذکر آئے والا ہے۔

اہل کوفہ کے نام خلیفہ کا خط اعظم کئی نے سعید بن العاص کی روانگی کے وقت اہل کوفہ کے نام عبدالرحمن بن ابی بکر معرفت عثمان کا ایک خط بھیجا ہے اور اشتر نے اس کا جواب دیا ہے۔ جے دلچسپ کچھ کہ ہم اس کا نقلی ترجمہ پیش کرتے ہیں:

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ عبد اللہ عثمان امیر المومنین۔ یہ خط مالک اشتر اور اس جماعت مسلمین کو لکھتے ہیں جو اس کے موافق ہیں۔ تمہیں جانتا چاہیے کہ خلیفہ وقت پر طعن کرنا ایک بڑا وبال ہے۔ اور ظاہری

قصان۔ جو شخص ایسے گناہ پر اقدام کرتا ہے اس کا نتیجہ بڑا، سخت، عذاب اور مشقت کے کچے نہیں ہوتا۔ تم نے میرے نائب کی جو بے حرمتی کی وہ مجھے معلوم ہوئی۔ تم کو جاننا چاہیے کہ تم نے جو قلم کیا وہ خود اپنے اوپر کیا، اور اس وجہ سے تم نے خدا کے غضب کے دروازہ کو اپنے اوپر کھول دیا۔ تم نے عوام کو فتنہ میں مبتلا اور اپنے کو عیب و نقص کا غر کر دیا ہے۔ رحمت میں سے پہلا فرقہ جس نے مخالفت شروع کی اور اپنا طریقہ علیحدہ مقرر کیا، وہ تم ہو۔ صورت یہ ہے کہ امت کا کوئی گروہ تمہارے اس مناقشہ اور مخالفت میں تمہارا ساتھ نہ دے گا۔ اور اس ناپسندیدہ کام میں تمہاری موافقت نہ کرے گا، اور اس کا دہال تمہارے اوپر رہے گا۔ اسے بندگان خدا سے ڈرو اور حق کی طرف پھرو۔ اعمال ناپسندیدہ سے توبہ کرو کہ رستگار ہو۔ تمہاری جو غرض اور حکایت ہو مجھے لکھو۔ اگر تم اس امیر کو نہیں چاہتے جیسے میں نے مقرر کیا ہے تو اسے معزول کر دو، ہم اسے معزول کریں گے جسے تم چاہتے ہو۔“

اہل کوفہ نے مالک اشتر کو جواب کا ذمہ دار کیا
عبدالرحمن بن ابی بکر نے یہ خط دیا، اہل کوفہ کے سامنے پڑھا گیا، اور لوگوں نے اشتر سے جواب دینے کو کہلدا، اشتر نے یہ جواب دیا۔

یادگار جواب
یہ خط مالک بن حارث اور مسلمانوں کی جماعت کی طرف سے خلیفہ کے نام ہے جو سنت محمد مصطفیٰ ﷺ سے پھر گیا ہے۔ مابعد خط پہنچا اس میں لکھا تھا کہ خلیفہ اور ایک جماعت کی مخالفت اور ائمہ پر طعن کرنا دہال ظلم اور ظلم خسران ہے۔ یہ بات سچی ہے، بشرطیکہ خلیفہ عادل ہو، اور امور اس کو طریقہ حق پر انجام دے اور اگر ایسا نہ کرے اور راہ صلاح پر نہ چلے تو اس کے خلاف کرنا، اور اس سے مفارقت کرنا خدا کے نزدیک ایک بڑا وسیلہ اور قربت ہے۔ اپنے حال کی جو بات تو نے ذکر کی ہے اور کہا ہے کہ ہم نے ظلم کیا اور احترام نہ کیا۔ ہم نے تیرے حال پر ظلم نہیں کیا، بلکہ اپنے اور بندگان خدا پر سے اس کا ظلم دفع کیا۔ تجھے چاہیے کہ تو اپنے اور اپنے مالوں کو ظلم سے منع کرے کہ ہم تیرے مطیع اور فرمانبردار رہیں اور امر حق میں تیری مدد کریں۔ اور یہ جو لکھا تھا کہ تیرے حال پر جو کچھ ہوا اس سے ہم نے اپنے اور ظلم کیا۔ یہ ایک گمان ہے جو تیرے قصان کا باعث ہو گا کہ انصاف اور طلب انصاف کو ظلم کہتا ہے۔ ہم لوگ خدا کے فضل سے راہ راست پر ہیں اور اچھے آدمیوں کے ساتھ سلوک کرتے ہیں اور اس میں کوئی شک اور شبہ نہیں کرتے۔ ہم لوگ اپنے اس شیوہ تمیل میں کوئی تغیر اور تبدل نہ کریں گے۔ جو شخص ہماری اقتدا کرے گا راہ راست پر رہے گا، اور سعادت حاصل کرے گا، دنیا اور آخرت میں عزت اور کرم ہو گا، اور ان لوگوں میں ہو گا جو ظالموں کو مدد نہیں دیتے اور قیام سنت اور فرائض میں مداہنت نہیں کرتا۔ یہ جو لکھا تھا کہ ہم توبہ کریں، اور راہ حق کی طرف لوٹ آئیں۔ ہماری تیری طاعت کی طرف لوٹنا مخالفت ہے اور تقویٰ سے دور ہو جانا ہے۔ تو نے کہا ہے کہ جو ہماری مراد ہو اور جسے ہم امیر چاہتے ہوں مقرر کیا جائے تو پہلی خواہش ہماری یہ ہے کہ تو خدا سے طلب امر و نہی کرے۔ اپنے جرم و گناہ اور تعدی اور ظلم سے جو ہم پر کیا ہے۔ ہمیں اپنے گھر بار، بچوں اور اعزاء سے چمڑا کر دو۔

پہنک دیا اور جو فاقی نائب اور حامل ہم پر مقرر کیے ان سے توبہ کرے۔ اگر اس طریقہ پر چلے جو ہم نے کہا ہے تو ہم تیرے اس وقت تک مطیع رہیں گے جب تک تو خدا درخشاں کا مطیع رہے گا۔ ورنہ تیرے مخالف ہوں گے اور اس پر اصرار کریں گے، جب تک خدا ہم میں اور تم میں فیصلہ نہ کرے۔ اگر ہماری یہ نصیحتیں قبول ہوں اور ناپسندیدہ کاموں سے توبہ کرے تو عبداللہ بن قیس کو ہمارے شہر میں بھیج کہ ہم میں مساوات جاری رکھے اور شرائع اسلام کو قائم کرے۔ حذیفہ بن الیمان کو افسر مال مقرر کر کہ وہ رعیت سے اپنا معاملہ کرے۔ سعید بن العاص اور ولید بن عقبہ کے ایسے لوگوں کو جو تیرے عزیز ہیں اور رعیت پر اپنے خواہشات نفس کی پیروی سے قلم اور مخالفت شروع کرتے ہیں اپنے پاس رکھ کہ ہم ان کی امارت کے خواہش مند نہیں ہیں۔“

کسیل بن زیاد کا زبانی جواب جو لوگ یہ خط عثمان کے پاس لائے ان میں کسیل بن زیاد بھی تھے اور جب پوچھا گیا کہ تم لوگ کیا چاہتے ہو تو انھوں نے کہا کہ:

ہمیں وطن بلاؤٹ سے باہر نہ کرو کہ ہم اپنے اعزاء اور اولاد سے جدا ہو جائیں۔ ہمارے وطن دو۔ اپنے نوجوان عزیزوں کو جو ہوائے نفس اور شہوات کی تبلیغ کرتے ہیں ہمارا امیر نہ بنائے۔ اور اچھے لوگوں کے ہوتے ہوئے برے کو منتخب نہ کرو۔

خلیفہ کے ہاتھوں سے رسول کی انگوٹھی گر گئی ابن خلدون کہتا ہے کہ: ”منجملہ ان امور کے جن سے لوگوں کے قلوب پر غاش پر

ماں ہوئے آنحضرت ﷺ کی انگشتی کا امیر المومنین عثمان کے ہاتھ سے چاہ ارس میں گر جانا تھا۔ جو مدینہ سے دو میل کے فاصلہ پر تھا۔ بہت تلاش کرائی لیکن نہ ملی۔“

عام مخالفت قبول اسی موردخ کے جب ”چاروں طرف طعن و تشنیع کا بازار گرم ہو گیا۔ روزانہ اس کی متواتر خبریں مدینہ میں پہنچنے لگیں۔ مدینہ میں بھی لوگوں میں سرگوشیاں شروع ہو گئیں۔ امیر المومنین عثمان اور ان کے عمال پر زبان طعن و دراز ہو گئی۔“

ایک گروہ علی کے پاس خلیفہ کی شکایت کے لیے گیا تو ایک گروہ عوام کا مجتمع ہو کر علی بن ابی طالب کے پاس گیا۔

اور امیر المومنین عثمان کی شکایت اور بنا۔ مخالفت بیان کی۔

علی نے خلیفہ کو متنبہ کیا علی بن ابی طالب ان لوگوں کے کہنے سے امیر المومنین عثمان کے پاس گئے اور لوگوں کے خیالات اور ان کی شکایات و اسباب مخالفت بیان کر کے

۔۔۔ اور امیر المومنین عثمان کا انہام کار اور جن خطرات کا اندیشہ ہوتا تھا اس سے مطلع کیا۔

جناب امیر کی تقریر اسی کتب کے نوٹ میں جناب امیر کی جو تقریر تھی ہے اس کے بعض عبارت توجہ کے قابل ہے کہ: ”تم اپنے بہت خود کرو۔ بخدا تم بے بصیرتی سے نہیں دیکھتے

اور نہ تم جہالت سے کچھ نہیں جانتے۔ اور بے شک راستہ واضح ظاہر ہے اور بے شک اعلام دین قائم ہیں۔ گھوڑے عثمان بے شک اللہ تعالیٰ کے بندوں میں افضل امام حلال ہے۔ خود ہدایت پایا (ہوا) اور (جس نے) دوسروں کو ہدایت دی۔

پس اس نے سنت معلومہ کو قائم اور بدعت متروکہ کو مردہ کیا۔ بخراہیہ دونوں امور کھلے ہوئے ہیں اور بے شک مستقیم قائم ہیں ان کے لیے احکام ہیں اور بے شک بدعتیں بھی قائم ہیں اور اس کے لیے بھی احکام ہیں اور بے شک اللہ تعالیٰ کے نزدیک شرر آدمیوں سے امام ظالم ہے (جو) گمراہ ہوا اور (جس نے) گمراہ کیا۔ پس مردہ کیا اس نے سنت معلومہ کو اور زندہ کیا بدعت متروکہ (کو) اور میں تم کو اللہ تعالیٰ کی سطوت اور اتمام سے ڈراتا ہوں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا خطاب نہایت شدید و دروناک ہے۔ اور میں تم کو اس سے ڈراتا ہوں کہ تم اس امت کے امام مقتول ہو کہ تمہارے قتل سے اس پر قتل و قتل کا دروازہ قیامت تک کے لیے کھل جائے اور اس پر اس کے واقعات ملتبس ہو اور مشتبه ہو جائیں گے اور ایک گردہ چھوڑ دیے جائیں گے جو حق کو بوجہ طلوع ہاٹل نہ دیکھ سکیں گے۔ اور اس مباحثہ میں غلط ملط بے حد ہوگا۔ اضطراب و احتمال اس میں پیدا ہوں گے۔

عثمان مینبر پر عثمان اس کے بعد مینبر پر گئے اور کہا کہ: ”تم لوگ میری نرمی اور لطافت کی وجہ سے جری ہو گئے ہو۔ ایسی جرات تم کو ابن خطاب کے زندہ خلافت میں نہیں ہوتی۔ تم کو مناسب ہے کہ تم لوگ اپنے خیالات تبدیل کر دو، اپنی رائے سے رجوع کرو، اور اپنے کاموں کو اپنے امرا پر چھوڑ دو، جن کو میں نے مامور کیا ہے۔“ مٹا سے کہا: ”بخدا اگر تم میری جگہ پر ہوتے تو تم کو میں قربت داروں کے پاس دیکھا کرتے نہ کچھ بھی نہ کہتا۔“

اہل مصر کا وفد اعظم کوئی کے موافق اہل مصر آئے اور انھوں نے بھی وہی شکایتیں کیں جو اور صوبیات کے لوگ کر چکے تھے اور عثمان نے ایک حکم جاری کیا کہ جہاں جہاں کے لوگوں کو حکایت ہو وہ میرے پاس حاضر ہو کر اپنے مذہب پیش کریں۔ ابن خلدون کے موافق غلیفہ نے ایام حج میں اپنے عمال کو طلب کیا اور سمجھوں کو فحاشی کی۔

علی طلحہ اور زبیر سے معاویہ کی پر معنی تقریر اور جب یہ لوگ مدینہ آئے تو معاویہ نے کہا: (علی، طلحہ و زبیر بلوائے گئے تھے) ”تم لوگ

ارباب حل و عقد ہو، اور اس امت کے سرپرست و والی ہو۔ تم نے اپنے دوست (عثمان) کو بلار و رعایت اس کام کے لیے منتخب کیا اور اب وہ بڑھا ہوا گیا اور اس کے حق میں طرح طرح کی باتیں مشہور ہو رہی ہیں۔ تم لوگوں نے اس امر میں اگر کچھ فیصلہ کیا ہے تو میں موجود ہوں۔ باقی رہا یہ امر کہ اگر کوئی شخص خلافت و امامت کی طرح کرے تو واللہ تم لوگ سوائے بیٹے پھیر کر بھاگنے کے اس سے اور کچھ نہ دیکھو گے۔“ عثمان نے بھی ایشانے ٹھگو میں کہا کہ: ”میرے اعزہ و اقارب غریب اور کم مایہ والے ہیں۔ میں نے اپنا ہاتھ ان کے لیے کھول دیا۔ پس اگر اس میں تم لوگ میری غلطی دیکھو تو اس کو واپس لے لو۔“

معاویہ کی آخری صلاح جلسہ برخاست ہونے پر معاویہ نے کہا: امیر المؤمنین! اس سے پہلے کہ آپ پر حملہ ہو جس کا آپ تحمل نہ کر سکیں مناسب ہوگا کہ آپ میرے ساتھ شام چلے جائیں۔ کیونکہ کل اہل شام میرے مطیع ہیں۔“ اس کے بعد معاویہ شام رخصت ہو گیا۔

اعظم کوئی کے موافق عثمان کے طلب کرنے پر کوفہ، بصرہ اور مصر سے لوگ آنے لگے اور وہ لوگ ان کے ساتھ چل گئے جو مہاجر و انصار میں سے تھے اور جنھیں عثمان سے حکایت پیدا ہو گئی تھی۔ اور ان میں مشورہ ہوا کہ غلیفہ سے کہو کہ

وہ عزل گوارا کریں یا ہم قتل کر ڈالیں گے۔

ابن خلدون کے تین گروہ ابن خلدون کے موافق: ”مصر میں کی تعداد ایک ہزار تھی۔“ اسی مورخ کے موافق: ”اہل بصرہ کی طبیعت طموح کی طرف مائل تھیں، اور کچھ لوگ بلوایان کوئہ

کے اپنے گروہ سے نکل کر اعراس میں آکر جمع ہوتے۔ ان لوگوں کا رجحان زیر بن العوام کی جانب تھا۔ اس گروہ کے ساتھ کچھ لوگ اہل مصر کے بھی تھے اور عام بلوای ذوالمرودہ میں ٹھہرے رہے۔ مصریوں کی طبیعت علی بن ابی طالب کی جانب تھی۔“

دارالامارت کا محاصرہ اس کے بعد ابن خلدون کے موافق ”خالفین عثمان نے علی، طلحہ اور زبیر کو خلیفہ منتخب کیا لیکن ان لوگوں نے جزاک دیا اور یہ لوگ اپنے اپنے کیمپ میں واپس

گئے۔ صبح ہوتے دیکھا تو امیر المومنین عثمان کا مکان محاصرہ میں تھا۔ بلوایتوں نے اس کو چاروں طرف سے گھیر لیا تھا اور یہ منادی کرانی تھی کہ جو شخص اپنا ہاتھ مقابلہ سے روک لے گا وہ مایون ہے۔ چند ایام تک امیر المومنین لوگوں کو نماز پڑھاتے رہے اور اہل مدینہ اپنے اپنے مکانوں میں گوشہ گزین رہے۔“

صاحب صواعق عرقہ ابن عساکر سے زائد عثمان کے وجوہات انقلاب بیان کرتے ہوئے جس میں ابن کی خلافت در زیاں بنی امیہ کی تقرری، ابوذر، عمار اور ابن مسعود اور ان کے قوم کی ناخوشی کا ذکر کیا ہے، کہتے ہیں: ”چون اہل مصر شکوہ عبداللہ بن ابی سرح کی دوند عثمان کتبائے نوشت اور اتہدید دخی از ان اعمال فسر مودر عبداللہ مذکور ہا کرد از انکہ سن عثمان بشنود در باب آن جماعت و آن کس کہ کتبت از جانب عثمان آمدہ بود اور ابھل رسانید اہل مصر چون مشاہدہ ابن حال نمودند ہفت صد کس متفق شدہ بمدینہ آمدند و در مسجد نزول کردند و نزد اصحاب پیغمبر شکوہ آفاذ کردند در مواقیت صلوة از اصغر عبداللہ بن ابی سرح باشان کردہ بود۔“ یعنی: ”جب اہل مصر نے عبداللہ بن ابی سرح کی شکایت کی تو عثمان نے اس کی طرف تحریر بھیجی اور اسے تہدید اور ان کا سوں سے بھی فرمائی۔ عبداللہ مذکور نے اس جماعت کے بارے میں عثمان کی بات مانتے سے انکار کر دیا اور جو شخص عثمان کی جانب سے تحریر لایا تھا اسے قتل کر دیا۔ اہل مصر نے یہ صورت حال دیکھی تو سات سو آدمی اکٹھے ہو کر مدینہ میں آئے اور مسجد میں اتر پڑے۔ اصحاب پیغمبر کے پاس اوقات نماز میں اس کی شکایت کا آفاذ کیا جو کچھ عبداللہ بن ابی سرح نے ان کے ساتھ کیا تھا۔“

طلحہ عثمان کو سخت باتیں کہتے ہیں آنگاہ طلحہ بن عبد اللہ برخاستہ متکلم شد و سخن سخت عثمان گفت۔

یعنی: ”اس وقت طلحہ بن عبداللہ اٹھ کر بولنے لگا اور عثمان کے ساتھ سخت باتیں کیں۔“

عائشہ اور علی بھی نصیحت کرتے ہیں باز عائشہ کے رازد عثمان فرستاد و گفت اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم نزد شما آمدہ اند و التماس ی کنند کہ ابن مال را عزل

کنید و این معنی را ابای نمازید و حال آنکہ آنی مردھے لاییشان را کشتہ است باید ایشان را طریق عدل و انصاف مرعی دارند و دیگر آنکہ علی کرم اللہ وجہہ آمدہ گفت این جماعت ارادہ نہ دارند مگر آنکہ شے را بچانے شے نصب کنی و حال آنکہ قبل ازین دعوی خون خودی کردند۔ ابن مال را عزل کن و میان ایشان حکم کن اگر حقے بر او نیست کند طریق عدالت مرعی دار۔“

یعنی: پھر عائشہ نے کسی کو عثمان کے پاس بھیجا اور کہا اصحاب رسول تمہارے پاس آئے ہیں اور درخواست کرتے ہیں کہ اس حامل کو بھادو اور تم اس بات سے انکار کرتے ہو۔ حالانکہ اس مرد نے ان میں سے ایک شخص کو قتل کیا ہے۔ چاہیے کہ ان کے ساتھ عدل و انصاف کا لحاظ رکھیں۔ دیگر حضرت علیؓ آئے اور کہا کہ یہ لوگ صرف ایک شخص کی جگہ کسی دوسرے کو نصب کرنے کو چاہتے ہیں، حالانکہ اس سے پہلے اپنے قہاس کے مدعی تھے۔ اس گورنر کو معزول کر دو اور ان کے درمیان فیصلہ کرو۔ اگر اس پر ان کا حق ثابت ہو جائے تو عدل کی راہ کا لحاظ رکھو۔

عثمان گفت ہر کس را کہ ایشان اختیار کنند بجائے او نصب کنم آن جماعت محمد بن ابی بکر را اختیار کردند۔ عثمان اور والی گردانید۔ فرمان جیت او نوشہ بجانب

محمد بن ابی بکر کی تقرری

مصر متوجہ شد و پہنچے از مہاجران و انصاریان با اتفاق ایشان بیرون آمدند تا ملاحظہ نمایند کہ محبت میان ایشان و عبداللہ بن ابی سرح بکجا خیر خواہ شد۔ یعنی: عثمان نے کہا کہ یہ لوگ جیسے پسند کریں میں اسے اس کی جگہ نصب کر دوں گا۔ ان لوگوں نے محمد بن ابی بکر کو پسند کیا۔ عثمان نے اسے گورنر بنا دیا۔ اس کے بارے میں فرمان تحریر کر دیا۔ وہ مصر کی طرف چلے۔ کچھ مہاجرین و انصار ان کے ساتھ باہر نکلے تاکہ دیکھیں عبداللہ بن ابی سرح اور ان کے درمیان بات کا نتیجہ کیا ہوتا ہے۔

چون محمد بن ابی بکر بار فتح ہاں روز را از مدینہ دور شدند در اثناء راہ غلامی سیاہ دیدند کہ بچہ شتر سے سوار است و شتر را بر صحت تمام می راند گویا کسی را میجوید یا از کسے میگریزد۔ آنگاہ اصحاب رسول اللہ

شتر سوار

صلی اللہ علیہ وسلم باو گفتند حال قصہ تو چیست بیان مانند کہ از کسے می گریزی یا کسے را میجوئی گفت من غلام امیر المومنین علیؓ ام کہ مرا نزد حامل مصر فرستادہ است گفتند او در این مقام حاضر است یا نزد او رویم گفت مرا باین حامل کد نیست بلکہ نزد حامل اول میروم۔ آنگاہ محمد بن ابی بکر را خبردار گردانیدند۔ او قصے را طلب غلام فرستاد اورا گرفتہ آوردند چون انہو پر رسیدند کہ غلام کہتی گاہی گفت کہ غلام حضرت امیر المومنین عثمانؓ ام و گاہے می گفت غلام مروا۔ یعنی: جب محمد بن ابی بکر ساتھیوں سمیت مدینہ سے تین روز کی مسافت دور ہو چکے تھے کہ دیکھا کہ ایک سیاہ قام غلام اونٹ پر سوار ہے اور اونٹ کو پوری تیزی سے بھاگنے جا رہا ہے، گویا وہ کسی کی تلاش میں ہے یا کسی سے بھاگا جا رہا ہے۔ اصحاب رسول خداؐ نے اس سے پوچھا کہ تیرا کیا قصہ ہے کہ یا کسی سے بھاگ رہا ہے یا ڈھونڈ رہا ہے۔ اس نے کہا میں امیر المومنین علیؓ کا غلام ہوں۔ آپؐ نے مجھے مصر کے گورنر کے پاس بھیجا ہے۔ انہوں نے کہا اس مقام پر موجود ہے۔ آ اس کے پاس چلیں۔ اس نے کہا مجھے اس گورنر سے کام نہیں، بلکہ پہلے گورنر کے پاس جا رہا ہوں۔ اس وقت انہوں نے محمد بن ابی بکر کو آگاہ کیا۔ اس نے اسے بلوایا۔ اسے پکڑ کر لائے۔ جب اس سے انہوں نے پوچھا کہ کس کے غلام ہو تو کہی کہتا حضرت امیر المومنین عثمان کا غلام ہوں، کبھی کہتا مرواں کا غلام ہوں۔

إتفاقا مردے در آنجا حاضر بود و آن غلام را می شنخت گفت غلام مروا است پرسیدند بچہ ہم بصر میروی و کتابتے میداری یا نہ گفت برساتے میروم و کتابتے ندارم چون

عثمان کا غلام اور خط

تفتیش کردند غمیر از ادوہ (کودہ) خشک شدہ باو چسبنے دیگر نہ بود۔ چون ادوہ را متحرک ساختند چسبنے دران بود و بیرون نمی آمد آنگاہ آن ادوہ را شکافتند و کتابتے از اجابہ بیرون آمد۔ یعنی: اتفاق سے ایک مرد وہاں موجود تھا

جو غلام کو پہچانتا تھا اس نے کہا یہ مردان کا غلام ہے۔ انھوں نے پوچھا کس غرض سے مصر جا رہے ہو اور کوئی خط تمہارے پاس ہے یا نہیں۔ اس نے کہا ایک پیغام لے جا رہا ہوں اور خط کوئی نہیں ہے۔ جب تاشی لی تو بغیر خشک چھوٹے مشکیزے کے اس کے پاس کچھ نہ تھا۔ جب مشکیزے کو ہلایا تو اس میں کوئی چیز تھی جو نکل نہیں رہی تھی۔ تب انھوں نے اسے چیرا اور ایک خط اس سے باہر نکلا۔

خط کا مضمون

خط کا مضمون

محمد بن ابی بکر جمعی کہ از مہاجر و انصار در اخلاص حاضر بودند ایشانرا طلب نموده آن کتابت را خواندند و مضمون آن کتابت این بود کہ : " از عثمان نوشتہ شد بجانب ابی سرح کہ محمد بن ابی بکر و فلان فلان کہ باین جانب ی آید در قتل ایشان حیلہ کن و کتابت ایشان را باطل سازی و بر عمل خود باقی مانی و بر فساد باشی تا وہتیکہ پیغلے و پانامہ من بتورسد و اگر کہے بہ قلم تو و حکایت بہ طرف من آید۔۔۔۔۔۔ پس کن تا وہتیکہ خبر بتورسد انشاء اللہ تعالیٰ "۔ یعنی : محمد بن ابی بکر نے مہاجر و انصار کی جو جماعت وہاں موجود تھی اسے بلایا اور اس خط کو انھوں نے پڑھا اس خط کا مضمون یہ تھا : " عثمان کی طرف سے ابن ابی سرح کی جانب لکھا گیا کہ محمد بن ابی بکر اور فلان فلان کہ جو ادمہ آرہے ہیں ان کے قتل کا حیلہ کر اور ان کے پاس جو تحریر ہے اس کو باطل کر اور اپنی گورنری پر ہائی و برقرار رہ۔ جب تک کہ میرا کوئی پیغام یا خط تجھ تک نہ پہنچے۔ اگر کوئی تیری طرف سے قلم کا لکھ یا حکایت لے کر میرے پاس آنے کا تو۔۔۔۔۔۔

محمد بن ابی بکر مدینہ واپس ہوئے

محمد بن ابی بکر مدینہ واپس ہوئے ”آنگاہ محمد بن ابی بکر و اصحاب فارغ شدند از خواندن کتابت آنرا بہ مہر جمع کہ ہمراہ بودند رسانیدند و بہ کہے این سپردند و بجانب مدینہ مراجعت نمودند۔“ یعنی: ”اس وقت محمد بن ابی بکر اور اصحاب نے اس خط کے پڑھنے سے فارغ ہو کر ساتھ میں موجود جماعت کی مہر لگوائی اور کسی کے سپرد کر دیا اور مدینہ کی طرف لوٹے۔“

کوئی نہ رہا جو عثمان سے خفانہ ہوا

کوئی نہ رہا جو عثمان سے خفا نہ ہوا

جب اصحاب کو یہ حال معلوم ہوا تو ”کیج کس از اہل مدینہ نماند
مگر آئندہ بر عثمان دل چسپی و خشم نمودند۔ و اصحاب محمد مصطفیٰ
صلی اللہ علیہ وسلم جیسا غم ناک شدہ بمنزلہ اپنے خود رفتہ و جماعت مذکور عثمان را محاصرہ کردند و محمد بن ابی بکر جماعت نبی تیم وغیرہ
ایشان بروے لشکر کشیدند۔“ یعنی: ”اہل مدینہ میں سے کوئی نہ رہا مگر عثمان پر غصہ اور دل چسپی کا اظہار کیا۔ اور اصحاب
محمد مصطفیٰ تمام غم ناک ہو کر اپنے گھروں میں گئے اور مذکورہ جماعت نے عثمان کا محاصرہ کر لیا۔ اور محمد بن ابی نے تیم اور
دوسرے لوگوں کی جماعت سے عثمان کے خلاف لشکر کشی کی۔“

مقدمہ

چون علی مشاهدہ این امر نمود طلحہ وزیر و سعد و عمار را و جمعی دیگر از اصحاب را کہ جمع ایشان از اہل بدر بودند طلب نمود و نزد عثمان رفت و شتر و کتابت مذکورہ آنگاہ بجانب عثمان التفات نمود گفت این غلام ملک شماست گفت بلہ باز گفت این شتر شماست عثمان گفت بلہ باز گفت این کتاب شما نوشتہ شد عثمان قسم یاد کرد بخدا کہ این کتابت من نہ نوشتہ ام و کہس را امر نہ کردہ ام نوشتن آن و بہ این علم نہ دارم علی گفت مہر یکہ بر این کاغذ است مہر شماست عثمان گفت بلہ مہر من است باز علی گفت چگونه غلام شما با شتر و کتابت و مہر و سکہ

شماست بیرون میں دو دشمن خبر نہ دلائی۔ یعنی: ”جب علیؑ نے یہ ہانت کی کہ طلحہ، زبیر، سعد، عمار اور جھلجی ایک اور جاحص کے کہ جواہلی بدر سے تھے بلوایا اور عثمان کے پاس گئے اور اوٹ اور مذکورہ خط بھی لے گئے۔ اس وقت عثمان کی طرف تفتیت ہو کر کہا یہ غلام تمہاری ملک ہے؟ وہ بولے جی ہاں۔ پھر کہا یہ اوٹ تمہارا ہے؟ عثمان نے کہا ہاں۔ پھر کہا یہ خط تم نے لکھا ہے۔ عثمان نے خدا کی قسم اٹھا کر کہا کہ یہ خط میں نے نہیں لکھا ہے۔ اور نہ اس کے لکھنے کا کسی کو حکم دیا ہے۔ اور نہ مجھے اس کا علم ہے۔ علیؑ نے کہا اس کاغذ پر جو مہر ہے تمہاری مہر ہے؟ عثمان بولے ہاں میری مہر ہے۔ پھر علیؑ نے کہا کس طرح تمہارا غلام تمہارے اوٹ، خط مہر اور سکے کو لے کر باہر جاسکتا ہے۔ جب کہ تمہیں اس کی خبر ہی نہ ہو۔

مردان کے دینے سے انکار اور اصحاب پر اثر
گفتند مردان را بما تسلیم کن و مردان چون در خانہ عثمان بود از تسلیم نمودن او امتناع نمود و اصحاب بواسطہ امتناع از تسلیم شاکل و غضب ناک از منزل عثمان بیرون آمدند۔ و مرد ایشان ظاہر و واضح بود کہ عثمان سوگند دروغ یاد نمی کند و ازین معنی خبر نہ دارد۔ و لیکن قوی گفتند کہ ابراہم ذمہ عثمان نمی شود مگر آنکہ مردان را بما تسلیم نماید و بلا مباحثہ کنیم و بدایم کہ چون امر نموده است بہ قتل دو مرد از اصحاب مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم بغیر حق۔ از دو حال بیرون نیست۔ اگر عثمان نوشہ باشد او را عزل می کنیم۔ و اگر مردان از زبان عثمان نوشہ در امر مردان نظر خواہم کرد۔ و بعد ازین حکایت اصحاب از خانہ خود بیرون نیامدند و عثمان مردان را نزد ایشان نہ فرستاد از قتل او اندیشید بنا براین آن گروه محاصرہ عثمان کردند و آب از فے منع نمودند۔ یعنی: ”انہوں نے کہا مردان کو ہمارے حوالے کرو۔ مردان چونکہ عثمان کے گھر میں تھے انہوں نے اس کو حوالہ کرنے سے انکار کیا اور اصحاب اس انکار سے شاکل اور غضب ناک ہو کر عثمان کے گھر سے نکل آئے اور ان کے نزدیک واضح حاکہ عثمان جھوٹی قسم نہیں اٹھا سکتے اور انہیں اس ہانت کی کوئی خبر نہیں ہے۔ لیکن ایک گروہ نے کہا کہ عثمان جیجی برقی الذمہ ہو سکتے ہیں کہ مردان کو ہمارے حوالے کریں اور ہم اس سے مباحثہ کریں اور جان لیں کہ چونکہ محمد مصطفیٰ کے دو اصحاب کو ناحق قتل کرنے کا حکم دیا گیا ہے یہ دو حال سے خالی نہیں۔ اگر عثمان نے لکھا ہو تو اسے معزول کر دیں، اور اگر مردان نے لکھا ہو تو مردان کے بارے میں غور کریں گے۔ اس حکایت کے بعد اصحاب اپنے گھروں سے باہر نہ آئے اور عثمان نے مردان کو ان کے پاس نہ بھیجا۔ اس کے قتل کیے جانے کا اندیشہ کیا۔ اس وجہ سے اس گروہ نے عثمان کا محاصرہ کر لیا اور اس سے پہلی کو روک دیا۔“

محاصرہ کرنے والوں نے عثمان کے پیچھے نماز پڑھنا ترک کر دی
اس واقعہ کا اثر اس سے بگھا جاسکتا ہے کہ بقول ابن خلدون: ”اس وقت تک بلوایاں مصر و کوفہ و بصرہ امیر المومنین عثمان کے پیچھے نماز پڑھتے تھے۔ لیکن اس واقعہ کے بعد انہوں نے لوگوں کو امیر المومنین عثمان کے پاس جانے اور ان کے پیچھے نماز پڑھنے سے روکنا شروع کیا۔“

عثمان اپنے عاملوں کو مطلع کرتے ہیں
”امیر المومنین عثمان نے والیان ممالک اسلامیہ کے نام مقتدر سندھ میں بھیجے اور ان کو ان واقعات سے مطلع کیا۔“

ابن عمر کی صلاح کہ جماعت کو عزل کا اختیار نہ دو
اعظم کوئی کے موافق زندہ معاصرہ میں
عثمان نے عبد اللہ بن عمر سے کہا:
”تم دیکھتے ہو کہ مخالفین مسیسی عزل کی نسبت کہتے ہیں۔“ اس پر عبد اللہ نے کہا: ”یہ طریقہ جاری نہ کرو کہ جس وقت جماعت خلیفہ سے راضی نہ ہو، اسے معزول کر دے، اور دوسرے کو اس کی جگہ بٹھائے۔ جس لباس کو خدا نے تعالیٰ نے تمہیں پہنایا ہے اسے محفوظ رکھو، اور جدا نہ کرو۔ اس قوم سے کہو کہ: مسم کتاب خدا اور سنت محمد ﷺ پر عمل کریں گے۔ اگر مائیں تو دونوں کے لیے بہتر ہے اور اگر انکار کریں تو تمہارے لیے اچھا اور ان کے لیے بُرا ہوگا۔“

عمرو بن عاص اور مغیرہ کی سفارت بے کار ہوئی
عثمان نے مغیرہ بن شعبہ کو بلایا اور
انہیں سفارت پر روانہ کیا لیکن
ان کے استقبال کو کاخانہ کلابی مطلق نصیب نہ ہوئی۔ عمرو بن حاص بھیجے گئے اور یہ بھی ”شرمندہ“ واپس ہوئے۔ اب
ابن عمر کی صلاح سے علی کو صیغہ پلایا اور جناب امیر نے اس شرط پر سفارت منظور کی کہ: ”مجھ سے عہد کرو کہ جو کچھ تم کہتے ہو اس پر وفا کرو گے۔“

جناب امیر کی وساطت لوگوں کا صاف جواب اور رضامندی
جناب امیر تحریر لے
گئے اور لوگوں نے کہا:
”اے ابوالحسن! آپ بہ سعادت واپس چلے جانیے اور اس میں شکایت نہ اٹھائیے۔ ہم جانتے ہیں کہ یہ معاملہ طے نہ ہوگا۔ اس قوم کا ارادہ دوسرا ہے۔ ہم لوگوں کو آپ کی عزت ہے۔ آپ کی عزت واجب ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہماری طرف سے آپ کی حرمت میں کوئی قصیر نہ ہو۔“

جناب امیر کی ذات نے انہیں راضی کیا۔ عثمان پاس آئے صلح نامہ ہوا اور اس کے بعد غلام اور خط کا قصہ تھا۔ اس کے بعد عثمان نے خطبہ پڑھا اور برامت ظاہر کہ مجمع کی حالت بہت جوش کی فتح اٹھانے پر عثمان پر ڈھیلے پڑے اور یہ منبر پر نہ رہ سکے۔ ابن خلدون نے بھی یہ کہا ہے کہ جب علی کے کھانے سے لوگ واپس ہوئے تھے تو مروان نے خلیفہ سے کہا کہ: آپ منبر پر تقریر کیجیے کہ اہل مصر اس وجہ سے واپس ہوئے کہ انہیں جھوٹ خبر ملی تھی۔
واقعات کے خلاف تقریر پر لوگوں کی صدا
جوں ہی عثمان نے تقریر شروع کی:
”چاروں طرف سے آواز آئے گی:
”اتق اللہ یا عثمٰن و تب الی اللہ۔“ سب سے پہلے اس فقرہ کو عمرو بن العاص نے کہا تھا۔“

لوگوں سے سختی کرنے کا حکم
اسی مورخ نے یہ بھی کہا ہے کہ جب قبہ والی تقریر کر چکے تو نبی امیہ نے
عثمان کو ملامت کی اور جب اس کے بعد چند آدمی رخصت ہوئے یا اور کسی
غرض سے دروانہ پر جمع ہوئے تو عثمان نے مروان سے فرمایا کہ تو جا کر ان لوگوں سے ہم کلام ہو اور گفتگو کرنے میں درستی
سے کام لے۔ چنانچہ مروان نے نکل کر کہا:

بنی امیہ اپنے ذاتی اختیارات کے لیے تم لوگوں کو کیا ہو گیا ہے تمہاری کیا حالت ہے۔ تم لوگ ہمارے قبضہ لوگوں کی صورت میں لاہور آئے۔ ہمارے ملک کو چھیننے کو آئے ہو۔ بھرا اگر تم نے کسی قسم کا قصد کیا تو ہم تم پر ایسا بوجھ ڈالیں گے کہ جس کو تم اٹھانہ سکو گے۔ جاؤ اپنے اپنے مکانات کی طرف لوٹ جاؤ۔ بھرا جو ہمارے قبضہ میں ہے اس میں ہم تم سے مطلوب نہیں ہیں۔

یہ تقریر سن کر علی پراثر اسی مؤرخ کے موافق جب جناب امیر نے یہ تقریر سنی تو فرمایا: ”تم نے عثمان کا خطبہ کل اور مروان کا کلام آج سنا ہے۔ میں جب گھر میں بیٹھ رہا تو عثمان نے مجھے کہا کہ تم نے مجھے چھوڑ دیا، تم نے میری قربت و حق کا پاس نہ کیا، اور جب میں نے دخل دیا، اور لوگوں کو بھاڑا اور دور کیا تو مروان کے کہنے سے لوگوں کے کھیل کی طرح اس کو الٹ دیا۔ تعجب ہے کہ عثمان باوجود من ہونے اور اس حضرت علیؑ کے محبت سے مشرف ہونے کے مروان کے قبضہ میں ہے جس طرح وہ چاہتا ہے اس طرف پھیر دیتا ہے۔“

علی عثمان کے پاس نہ جانے کا عہد کرتے ہیں اس کے بعد جناب امیر نے عثمان کو مروان کے تسلط پر غصہ کی اور کہا کہ: ”آج سے اب میں پھر تمہارے پاس نہ آؤں گا۔“

نانکھ کی صلاح نانکھ زوجہ عثمان یہ تقریر سن رہی تھیں۔ انھوں نے بھی ”مروان کی کھابندی پر نصیحت اور علی بن ابی طالب سے صلاح و مشورے لینے کی رائے دی۔“

اس روایت کے موافق کہ وقت حاضرہ جناب امیر خیر میں تھے جب واپس آئے اور عثمان ملاقات کو گئے تو کہنے لگے: ”اے علی! میرے حقوق تم پر بہت ہیں۔ جملی ہونے کا حق ہے۔ قربت داری کا حق ہے۔ ہجرت ہونے کا حق ہے اور بغرض تھیرا اگر جاہلیت ہی کا زمانہ ہو تا تو بھی بنی عبدمنان کے لیے یہ امر باعث ننگ تھا کہ بنو تم ان کے قبضہ سے حکومت چھینے۔“

طلحہ اور علی علی بن ابی طالب یہ سن کر طلحہ کے پاس گئے دریافت کیا کہ یہ کیا مسئلہ ہے۔ جواب دیا: کیا بعد اس کے کہ تنگ لے کر کیا چھاتیوں کو اے ابوالحسن (کسی کام کے حد سے تجاوز ہونے کا محاورہ۔ یہ ظاہر ہے کہ جب تنگ چھاتیوں تک پہنچ جانے کا تو زین پشت پر نہیں ٹھہر سکتا) علی بن ابی طالب لوٹ کر بیت المال کی طرف آئے۔ لوگوں کو جو کچھ مناسب تھا دیا۔ لوگ طلحہ کے پاس سے اٹھ کر چلے گئے۔ اکیلے طلحہ رہ گئے۔ امیر المومنین عثمان کو اس سے مسرت ہوئی۔ بعد اس کے طلحہ امیر المومنین عثمان کے پاس آئے۔ آپ نے فرمایا میں متاثر نہیں ہوا، لیکن مغلوب ہوا ہوں۔ پس اللہ تعالیٰ اسے طلحہ تم کو کافی ہو۔“

اہل مصر جس وقت غلام کو گرفتار کر کے واپس آنے تو انھوں نے حکامین پیش کیں اور کہا: ”تعجب کا مقام ہے کہ اس قسم کے غلو تمہاری مہر سے لگے جائیں اور تمہارا غلام لے کر جائے اور تم کو اس کی اطلاع نہ ہو؟۔ پس تم جھوٹے ہوا بچے ہو، اور پھر دو تھیر تم سے خلافت لے لینا مناسب ہے۔ کیونکہ جھوٹے کو مسلمانوں کا والی بنانا جائز نہیں ہے،“

اور اگر سچے ہو تو تمہارا منصب اس حد تک بچ گیا ہے کہ تمہارے بغیر اجازت و اطلاع جس کا جو بی چاہتا ہے کرتا ہے۔ لہذا بہتر یہ ہے کہ تم خلافت چھوڑ دو۔“

جہاں عثمان کی خلافت بنانے والے اللہ تعالیٰ کے مراد ہیں امیر المومنین عثمان نے فرمایا: ”میں اس لباس کو نہیں اتارا چاہتا جس کو اللہ تعالیٰ نے مجھے پہنایا ہے۔ یعنی میں خود منصب خلافت ترک نہیں کروں گا۔ ہاں یہ ہو گا کہ اگر مجھ سے غلطی ہوگی تو میں توبہ کروں گا اور اپنی غلط رائے سے رجوع کروں گا۔“ ابن مسریس نے کہا: ”ہم بارہا دیکھ چکے ہیں کہ تم توبہ کرتے ہو اور پھر وہی کام کرتے ہو۔ اب ہم پر مندرجہ ہے کہ ہم تم سے خلافت چھین لیں۔ یا تم کو قتل کر ڈالیں اور اگر تمہارے دوستوں میں سے کوئی مزاحمت کرے تو اس سے بھی لڑیں گے اور جب تک ہم زندہ ہیں لڑتے جائیں گے۔ پس یا تم تک پہنچنا یا مر جائیں گے۔“ علی بن ابی طالب اٹھے اور بلوائیوں کو امیر المومنین عثمان کے پاس سے نکال کر اپنے مکان پر چلے آئے۔

معاویہ وغیرہ سے عثمان کی مدد طلب کرتے ہیں اور مصریوں نے امیر المومنین عثمان کے مکان کا دوبارہ محاصرہ کر لیا۔ دوبارہ محاصرہ کرنے کے بعد معاویہ و ابن عامر کو امداد کے لکھا۔

معاویہ کا جواب اعظم کوئی کے موافق معاویہ نے جواب دیا کہ خدا نے جس سے کوئی نعمت چھین لی ہو میں اسے واپس نہیں کر سکتا۔ اگر میں یہاں سے جاؤں گا تو دشمنان اسلام اس صوبہ پر حملہ کر دیں گے۔ عبداللہ بن عامر کریم نے بصرہ میں لوگوں کو آمادہ کرنا چاہا، لیکن کوئی نہ گیا۔

پھر علی کی وساطت اور تین دن کی بے کار مہلت پھر امیر المومنین عثمان کے مشیروں نے رائے دی کہ علی بن ابی طالب کو ان لوگوں کے روکنے کے لیے بھیجو کہ وہ ان کو بجا بوجھا کر واپس کر دیں اور ان سے وعدہ کر دیں کہ ان کی مرضی کے موافق عمل کی بجالی و معزولی کی جائے گی۔ چنانچہ علی بن ابی طالب بلوائیوں کے پاس گئے۔ دھڑ دھڑ کر کے ان کی درخواستوں کے موافق عمل درآمد کرنے کا وعدہ کیا۔ بلوائیوں نے کہا: آپ ایک میلو مقرر کیجیے۔ علی بن ابی طالب لوٹ کر امیر المومنین عثمان کے پاس آئے۔ امیر المومنین عثمان نے تین دن کی مدت مقرر فرمائی۔ علی بن ابی طالب نے ایک عہد نامہ لکھ کر بلوائیوں کو دیا۔ جس میں اقرار تھا کہ تین یوم کے اندر ان کی مرضی کے موافق عمل کی تقرری و معزولی اور ان کی شکایت رفع کر دی جائے گی۔ بلوائی اس اقرار نامہ سے بلا جنگ و جدل رکے رہے۔ لیکن امیر المومنین عثمان نے کسی وجہ سے کسی قسم کا تغیر و تبدل نہ کیا۔ بعد اقصاء میلو بلوائیان مصری خشب سے مدینہ میں ایضاً عہد کی غرض سے آئے۔ امیر المومنین عثمان نے انکار کیا۔ بلوائیوں نے برہم ہو کر چاروں طرف سے محاصرہ کر لیا۔“

عثمان کا لوگوں سے خطاب اس کے بعد ابن خلدون ہی کے موافق عثمان نے سب لوگوں کو بلوایا جس میں بلوائی اور غیر بلوائی سب تھے اس کے بعد کہنا شروع کیا:

”اے ابلی مدینہ! میں تم کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کرتا ہوں اور اس سے دعا کرتا ہوں کہ میرے بعد تم پر کسی اچھے کو خلیفہ بنائے۔“ یہ کہہ کر حضورؐ دیر تک خاموش رہے، پھر سر اٹھا کر بولے: ”تم کو میں اللہ تعالیٰ کی قسم دلاتا ہوں کیا تم جانتے ہو کہ عمر کے زخمی ہونے کے وقت تم نے اللہ تعالیٰ سے دعا کیا تھا کہ اللہ تعالیٰ تمہارے لیے کسی کو منتخب کر دے اور تمہارے بہترین شخص پر تم کو متعین کر دے۔ کیا تم کہو گے کہ یہ نہیں قبول کیا یا کہو گے کہ اللہ تعالیٰ نے جس کو اس دین کا ولی کیا ہے اس کو ابتلا میں نہیں ڈالا۔ یا کہو گے کہ امت نے مکابرہ سے یا بغیر مشورہ کے ولی کیا ہے۔ پس اپنے کام کو اس کے سپرد کر دیا بغیر میرے انجام پنی کے۔ پھر میں تم کو اللہ کے قسم دلاتا ہوں تم لوگ میرے سوا حق کو جانتے ہو جس کا حق واجب ہے پس درگزر کرو۔ کیونکہ تین آدمیوں کے سوا اور کسی کا قتل کرنا جائز نہیں ہے، زانی مصنن اور مرتد اور قاتل بغیر حق کا۔“

لوگوں کا جواب
 بلوائیوں نے جواب دیا کہ جو تم نے بعد عمر فاروق کے استخارہ کے نسبت کہا ہے تو اصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ اس میں کیا اچھا کیا۔ لیکن درحقیقت اللہ تعالیٰ نے تم کو ایک بلا بنایا ہے جس میں اس نے اپنے بندوں کو مبتلا کیا ہے۔ اور حق اور ساقبیت اسلام کو جو تم کہتے ہو تو وہ میٹھ ہے اور تم ضرور اس کے متقی تھے لیکن تم نے بہت سی باتیں ایسی کی ہیں جس سے تم کو ہم حق قائم کرنے کے لیے بھی نہیں چھوڑ سکتے۔ اس خیال سے کہ مبادا سال آئندہ اور فتنہ و فساد برپا نہ ہو، اور باقی رہا یہ کہنا کہ تین ہی آدمیوں کو قتل کرنا چاہیے، اس کے نسبت ہم یہ کہتے ہیں کہ ہم اللہ تعالیٰ کی کتب میں سوائے ان تینوں آدمیوں کے اور لوگوں کا قتل کرنا بھی جائز دیکھتے ہیں۔ از انجملہ ان آدمیوں کا قتل کرنا روا ہے، جو دنیا میں باعث فساد ہوں، یا بغاوت پر جو شخص لڑے یا حق و راستی کو متع اور اس پر مکابرہ کرے۔ اور تم نے بے شک بغاوت کی اور حق پر مکابرہ کیا، اور جو لوگ فساد کے باعث ہیں ان کے طرفدار ہونے اور بلاشبہ تم نے امارت کا زور و دہلاؤ ہم پر ڈالا، اور بے شک جو لوگ ہم سے لڑے اور لڑنے کو آتے ہیں وہ تمہاری امارت کی وجہ سے لڑتے ہیں۔ پس اگر تم خلافت چھوڑ دو تو وہ لوگ برسرِ مقابلہ نہ آئیں گے۔

کھانا پانی بند کرنے پر علی لوگوں کو ملامت کرتے ہیں
 اس کے بعد خلیفہ کے پاس پانی پھنچنا مشکل ہو گیا۔ اور بقول ابن خلدون: ”عثمان نے علیؓ و ظہیر و امیات المومنین کے پاس کہلا بھیجا کہ بلوائیوں نے میرا پانی بند کر دیا ہے۔ اگر تم لوگ مجھ کو پانی پھنچا سکتے ہو تو مجھے پانی بھیج دو۔ علیؓ بن ابی طالب اس دردناک خبر کے سنتے ہی علیؓ اصباح سوار ہو کر بلوائیوں کے پاس گئے اور ان کو مخاطب کر کے فرمایا: ”اے لوگو! تمہارا یہ فعل نہ مسلمانوں سے مشابہ ہے نہ کافروں سے۔ تم لوگ اس شخص (عثمان) کا پانی و کھانا بند کرو۔ بلاشبہ رومی اور ایرانی اپنے قیدیوں کو کھلاتے پلاتے ہیں۔“

حضرت عائشہؓ حج کو چلیں
 واقعات کی یہ صورت تھی کہ بقول ابن خلدون: ”ام المومنین عائشہ صدیقہؓ بقصد حج نکلیں اور اپنے بھائی محمد کو ہمراہی کی غرض سے بلایا۔ محمدؐ نے ساتھ جانے سے انکار کیا۔ حنظلہ کاتب وحی بولے: تم کو ام المومنین اپنی ہمراہی کے لیے بلاتی ہیں۔ تم ان کے ساتھ نہیں جاتے ہو اور صفہ عرب کی اتباع کرتے ہو، جو تمہارے شایان شان نہیں ہے۔“

بنو عبد مناف کے تسلط کا خوف

بعض علما اگر اس کا آخری نتیجہ یہ ہوا کہ امیر المومنین عثمان
مظلوم ہوں تو تم پر بنو عبد مناف مسلط ہو جائیں گے

یہ واقعہ اہم کئی تھا جس وضاحت سے موجود ہے اس سے اس وقت حج کی روانگی اور اس کے بعد حیرت خیز جذبہ
ہمدردی کا پیدا ہونا دونوں اہم طرح کچھ میں آنے کا وہ لگتا ہے :

حضرت عائشہ اور عثمان میں کشیدگی تھی

”پیش ازین در میان عائشہ و عثمان گفتگوئے رفتہ بود و
عائشہ از ناراضی دل گشتہ غم گرفتہ سبب آنکہ مکرر

روزے چند در وظیفہ ارزاق کہ عائشہ را معین بود تاخیرے افتادہ و بمعتقدان او واصل نہ شدہ۔ عائشہ اور اگت اے
عثمان اسانت بخوردی و رعیت را مصلح گزاشی و بجاتے بہ مردمان را از خویشاوندان خویشین بر سر نیک مردان و ضعیفان
مسلط گردانی خدا نے قتال ترا از آسمان آب بند ہوا و لا بر کلت زمین عوم بگردانہ۔ اگر حرمت بخ نما نیستی کہ ی گزاری
والا ترا چنان کشندے کہ شریان را کشند۔ یعنی : ”اس سے پہلے عائشہ و عثمان کے درمیان گفتگو ہوئی تھی۔ عائشہ اس
سے ناراض اور غضب ناک تھیں۔ کیونکہ عائشہ کا جو وظیفہ ملی مقرر تھا اس میں کئی بار چند روز کی تاخیر کی گئی اور
آپ کے متعلقین تک نہ پہنچا۔ عائشہ نے فرمایا : اے عثمان ! تو نے امانت کھائی اور مصلح کردی اور اپنے رشتہ داروں
میں سے بہ لوگوں کے ایک گروہ کو نیک اور کزور لوگوں پر مسلط کر دیا۔ اللہ تعالیٰ تجھے آسمان سے پانی نہ دے اور
زمین کی برکتوں سے عوم کر دے، اگر نہ لڑکی حرمت نہ ہوئی جو کہ توڑتا ہے تو تجھے اس طرح قتل کر دیتے
جیسے اونٹوں کو کاٹ ڈالتے ہیں۔“

حضرت عائشہ کا فتویٰ

عثمان ابن آیت از قرآن مجید در جواب عثمان اور غلام : ضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا لِّلَّذِينَ
كُفَرُوا امْرَأَتِ طُحَيِّقَ وَامْرَأَتِ لُوطَ ۚ كَانَتَا تَحْتَ عَبْدَيْنِ مِنْ عِبَادِنَا صَالِحَيْنِ

فَخَالَفَتْهُمَا فَلَمَّ بِطُلُوحِهَا مِنْهُمَا فَمِنْ الْكُفَرَاءِ وَقِيلَ اَدْخُلَا النَّارَ مَعَ الْكَاذِبِينَ (۲۶ : ۱۰) یعنی : ”عثمان نے آپ کے جواب
میں قرآن مجید سے یہ آیت پڑھی : (ترمذی) ”اللہ نے نوح کی بیوی اور لوط کی بیوی کو ان لوگوں کے لیے بطور مثل بیان فرمایا
جو کافر تھے۔ دونوں ہمکے دو بندوں کے تحت تھیں۔ ہمکے صالح بندوں میں سے پس ان دونوں نے ان سے خیانت کی تو یہ
دونوں ان میں اللہ سے نہ پاسکے اور کہا گیا کہ دونوں داخل ہو جاؤ جہنم میں داخل کئے والوں کے ساتھ۔“

”ازین معنی خاطر اندیشہ مردمان بر عثمان بنایت (۹) و میگفت بکشد این سچ گفتہ را کہ بنو سیدہا بن حضرت مصطفیٰ
صلی اللہ علیہ وسلم کہنے نہ شدہ است کہ شکست او را کہنے کردند۔ بکشد این سچ گفتہ را و زندہ مگر اید۔ در جملہ چون مردمان
بمنازعت عثمان بر خواستند و برادر سمرانے او گرد آمدند و او را سمرانے نیافتند عائشہ کا ساختہ کرد و راحلہ مرتب گرد آمدند
و جانب مکہ بر عزیمت حج گزاردن و بکشد۔ یعنی : ”اس سوچ سے لوگوں کو عثمان پر برا چھینے کرتی اور کہتیں کہ اس
بڑے بچہ کو مار ڈالو کہ ابھی حضرت مصطفیٰ کا قمیص پرانا نہیں ہوا ہے کہ آپ کی سنت کو پرانا کر دیا۔ اس بوڑھے بچہ کو قتل کر دو
اور زندہ نہ چھوڑو۔ جب لوگ عثمان سے جھگڑنے کو اٹھ کھڑے کئے اور آپ کی سمرانے کے آس پاس اکٹھے کئے آپ کو گھر پر
نہلایا، عائشہ نے ایک کام کیا تھا سواری تیار کروالی اور مکہ کی طرف حج کرنے کے قصد سے روانہ ہو گئیں۔“

مروان اور عائشہ مروان حکم بخیریت اور رفت و گشت اے ملار مومنان اگر عزیمت حج در وقت داری و در معنی این واقعہ کہ عثمان را شکوہ است ہاں قوم کلمہ گوئی تا قرآن قوم از دودخ شود ہمانا اولی تر باشد و ثواب آن از حج زیادتر۔ عائشہ گفت آن ساعت این سخن ہا من حکوی کہ حج بر من فرض شدہ است واللہ کہ مقام تمام کرد۔ یعنی: ”مروان آپ کی خدمت میں گیا اور بولا اے مومنوں کی مل! اگر قصد حج موقوف کرد اور عثمان کو جو کچھ پیش آگیا ہے اس واقعہ کے بارے میں ان لوگوں کو کوئی بات کہو تا کہ اس قوم کے شر کو عثمان سے دور کرد تو یقیناً بہتر ہوگا اور اس کا ثواب حج سے زیادہ ہوگا۔ عائشہ نے کہا: اس وقت یہ بات فحش سے نہ کرد کہ حج فحش پر واجب ہوگا ہے اللہ کی قسم میں غمہ نہیں سکتی۔“

مروان جہلا کر شعر پڑھتا ہے مروان حسب مال ابن بیت بخاندہ: ضروب قیس علی البلاد اذا اضطرب اججھا یعنی قیس اسٹش قند در شہرا زد چن آتش در گرفت و شطوط قند بلند گشتہ قیس سرخوش گرفت و بر فعد عائشہ گفت میدام کہ ابن چہ مثل است کہ میزند مرادر دفع عائشہ از اسیمہ المومنین عثمان مقصر دانی و راست پنداری کہ من در عثمان بشکم و اورا امین نمی شام ابن بگفت و بجانب مکہ منظرہ زادہ اللہ شرفا روانہ شد۔ یعنی: مروان نے حسب مال یہ شعر پڑھا: (ترجمہ) ”قیس نے قند کی آگ شہرہ کو لگائی جب آگ لگ گئی اور قند کے شطے بلند ہوئے تو قیس خود کو چاکر چاکر کیا۔“ عائشہ نے کہا کہ میں جانتی ہوں کہ یہ کونسی کہلات ہے جو تو کہہ رہا ہے۔ تو کہتا ہے کہ میں عثمان سے اس کردہ کو دور کرنے میں کوتاہی کرنے والی ہوں اور اسے امین نہیں سمجھتی۔ یہ کہا اور مکہ (زادہ اللہ شرفا) کی طرف چلی گئیں۔

توبہ یا خلع طبری کہتا ہے: ”حضرت عائشہ بیگم ہر چن اورا (عثمان) حصار گرفتہ ابو جحی رفت و بی گفت عثمان رضی اللہ عنہ را کہ توبہ ہائیتہ کردن و یا غیشتن را خلع کردن۔“ یعنی: حضرت عائشہ جب پر قین اور جب عثمان کا محاصرہ ہوا اور وہ حج پر جاری قین تو کہہ رہی قین عثمان کو کہ تجھے توبہ کرنی چاہیے یا خلافت سے خود کو الگ کر لینا چاہیے۔

رسول کے کپڑے پرانے نہیں ہونے سنت کہنہ ہو گئی صاحب روضۃ القفا کہتا ہے کہ: عائشہ آزرہ قین اور

”مروان را بر مخالفت ی گماشت و میگفت ہنوز جامہ رسول نواست کہ شئت لو کہنہ و محروک شد۔“ یعنی: لوگوں کو مخالفت پر ابھارتی اور کہتی قین کہ ابھی رسول کا لباس نیا ہے کہ ان کی سنت کہنہ ہو گئی اور چھوڑ دی گئی۔

مدد کی خبر سن کر محاصرہ کی سختی قبول طبری: جس وقت محاصرہ کرنے والوں کو معلوم ہوا کہ عثمان نے اپنے مالوں سے مدد طلب کی ہے تو انھوں نے محاصرہ میں سختی

شروع کی۔ طلحہ نے بیت المال پر قبضہ کر لیا اور کہا کہ: ”عثمان راحت گیرید کہ فوج عذیبک او آمد۔“ یعنی: عثمان پر سختی کرو کہ فوج اس کے نزدیک آگئی۔ اور عثمان نے یہ سن کر کہا کہ: ”یہ سب طلحہ کا کیا ہوا ہے کہ خود غلیف ہو جائے۔“ قبول روضۃ القفا: ”عثمان گفت کہ طلحہ ابن قندہ اچھتہ است۔“ عثمان نے کہا کہ طلحہ نے یہ قند اٹھایا ہے۔

طلحہ، زبیر اور سعد محاصرہ سے عثمانؓ کے پاس آئے

عثمانؓ کو طے پر آنے اور سلام کیا اور پوچھا کہ تم میں طلحہ، زبیر اور سعد ہیں؟ اور جب یہ لوگ سامنے آئے تو حکایت کی کہ ہمیں گمان نہ تھا کہ تم کسی مجمع میں ہو۔ ہم سلام کر رہے تھے اور تم جواب نہ دو۔ اس کے بعد غلیفہ نے علیؓ کو پیغام بھجوایا کہ ہمارے پاس ہانی نہیں ہے اور قبول صاحب موافق و اعظمؓ کوئی وغیرہ علیؓ نے تین مشکیں بھیج دیں۔

حسینؓ زخمی ہوئے

حسینؓ، قنبر اور اکشمہ بنی ہاشم کو حکم دیا کہ مخالفین میں سے کسی کو گھر میں داخل نہ ہونے دو۔ اور روایتیں یہ بھی کہتی ہیں کہ اس کشمکش میں حسینؓ زخمی بھی ہوئے۔ اعظمؓ کوئی نے یہ بھی کہا ہے کہ جس وقت محاصرہ کی شدت ہوئی، عثمانؓ نے چند شعر علیؓ کو لکھ بھیجے۔ جس کا مفہوم تھا کہ کیا تم اسے گوارا کر دو گے کہ تمہارا ابن عم قتل ہو جائے۔ جب علیؓ نے یہ شعر حرم مسجد میں آئے۔ بنی ہاشم اور خدام جمع ہوئے اور جب یہ خبر مشہور ہوئی کہ علیؓ مدد کے لیے آتے ہیں، تو لوگوں نے طلحہ کا ساتھ چھوڑ دیا۔ طلحہ نے اپنے کو تنہا دیکھ کر عثمانؓ کے پاس جا کر عذر کرنا مناسب سمجھا۔ عثمانؓ نے عذر قبول نہ کیا اور جواب دیا کہ ”تمہاری معذرت اس وقت شروع ہوئی جس وقت تم نے دیکھا کہ لوگ نہیں چھوڑ کر علیؓ کے پاس چلے گئے اور وہ مدد کے قصد سے آتے ہیں۔“

اس درمیان میں محاصرہ کرنے والوں نے دروازہ میں آگ لگادی اور کچھ لوگ پشت سے گھر میں داخل ہو گئے۔ موافق عرقہ بن ابی خلدون ہو، یا اعظمؓ کوئی ہر شخص اس کا تذکرہ کرتا ہے کہ محمد بن ابی بکرؓ گئے اور عثمانؓ سے گفتگو ہوئی۔ ”اگر عثمانؓ نے کہا کہ تمہارے باپ جوتے تو میرے بڑھاپے کی قدر کرتے۔“ تو محمد بن ابی بکرؓ نے کہا کہ: ”میرا باپ تم کو یہ کام کرتے دیکھتا تو وہ ان کاموں کو پسند نہ کرتا اور مجھ سے زیادہ سختی سے تمہاری ڈاڑھی پکڑتا۔“ اور اس کے بعد چلے گئے۔

۱۸ ذی الحجہ ۳۵ھ کوئی قاتل عثمانؓ کا نام نہ جانتا تھا

اب کچھ لوگ داخل ہوئے اور انہوں نے قتل کر ڈالا۔ قاتل کا نام نہ مؤرخین کو معلوم ہے اور نہ علیؓ کے سوال پر نائلہ بنت الفرہان بتا سکیں۔ اور اس کی بھی تصدیق کی کہ محمد بن ابی بکر قاتل عثمانؓ نہیں ہیں۔

باب کا انتقام ابن خلدونؒ کہتا ہے کہ: ”بیان کیا جاتا ہے کہ۔۔۔ عمر بن خطابؓ نے ٹھوکر مارا جس سے چند پسلیاں ٹوٹ گئیں۔ ٹھوکر مارنے کے وقت یہ کہتا جاتا تھا: ”تم نے میرے باپ کو قید کیا تھا جو بے چارہ حالت قیدی میں مر گیا۔“

قتل عثمانؓ کے وقت عمال

اسی مؤرخ کے موافق بوقت شہادت مملکت اسلامیہ میں عمال اس تفصیل سے تھے: مکہ میں عبداللہ ابن الحضری، طاقت میں قاسم بن ربیعہ ہفتی، منعم بن لعل بن منبہ، جد میں عبداللہ بن ربیعہ، بصرے میں عبداللہ بن عامر، شام میں معاویہ بن سفیان، اور حمص میں عبدالرحمن بن خالد، قسطنطنیہ میں حبیب بن مسلمہ، اردن میں ابوالاحور اسلمی، فلسطین میں علقمہ بن حکیم کندی معاویہ کی طرف سے، اور بحرین میں عبداللہ بن قیس فرازی حامل تھے، قضا ابوالدرداء کے سپرد تھی، کوفہ میں امامت ابو موسیٰ اشعری کرتے تھے،

جنگی افسری قطعاً بن عمر کے قبضہ میں تھی، خراج سوا پر جابر مزی اور ساک انصاری مامور تھے، اور ققیسا میں جابر بن عبد اللہ، آذر بایجان میں اشعث بن قیس، طوان میں عتبہ بن نہاش، اسفہان میں صائب بن ارج، سیدان میں خنیس گورز تھے، مدینہ منورہ میں بیت المال کے افسر عتبہ بن عمر اور قنبار بن ثابت تھے۔



jabir.abbas@yahoo.com

باب چہارم کا نشو

اور واقعات کا خلاصہ

گزشتہ اسوئاک حالت کے لکھنے اور اس پر تنقیدی نظر ڈالنے میں ذلتی طور سے مجھے کیسے ہی کراہت کیوں نہ ہو لیکن ایک مورخ کی دیانت اس کی متقنی ہے کہ وہ واقعات لکھے۔ واقعات کسی نصیحت کے کیوں نہ ہوں، اور دیکھے اور دکھائے کہ ان واقعات اور شخص سے کیا نسبت ہے، جس کا دکھانا اصل مقصود ہے۔

مشغولیت نے اپنے ہاتھ خالی رکھے رسول کے بعد سے ہم نے اس کا ضروری اہتمام کیا ہے کہ ہم یہ اور دوسروں کو غور کا موقع نہ دیا دکھائے آئیں کہ کون کون سے لوگ کن کے مددگار اور ہم خیال تھے اور ان لوگوں کا ضروری تعارف بھی کسی حد تک کرایا جا چکا ہے۔ ان لوگوں میں جس حد تک آپس کی مشورت اور یکس جہتی فرض کیوں نہ ہو چونکہ ان کا واقعہ حکومت ایک انتظامی شکل کا تھا اور بلحاظ اس کے کہ فوراً ہی حاکم ہاں کو اپنی ردت اور ماضین زکوٰۃ کی طرف مہیا کر دیا اس لیے صاحب اختیار لوگوں کو اس کا کافی موقع ملا کہ وہ نہ صرف اپنے کو اپنی جگہ مضبوط کرتے بلکہ لوگوں کو جو ان کے قریب یا دور تھے امید و بیم میں مبتلا کر کے اور باتوں کی طرف غور کا موقع نہ دیتے۔ خلیفہ اول کا وہ برس یا کچھ زیادہ زمانہ ایسا نہ تھا جس میں لوگوں کی یہ مشغولیت تمام ہو گئی ہوئی، بلکہ یہ زمانہ وہ تھا جس میں انہیں ایسی مشغولیت کی چاہ پڑ گئی اور ان کے ذہن میں یہ بات سما گئی کہ حیضہ جو کچھ ہے وہ تو باہر ہے مدینہ میں کیا دھرا ہوا ہے۔ اس نے مدینہ کی پکی پچائی پرانی فضا سے علیحدہ کر دیا۔

نبی امیہ کو شام کا صوبہ دکھایا گیا۔ ظاہر ان سے کام لایا گیا اس لیے کہ وہ علی کی طرف رخ نہ کر سکیں۔ اور صدر مقام سے حتیٰ الوسع دور بھی رہیں۔ ان کی ماتحتی میں لوگ تھے فتح، نام آوری، اور قیمت تھی خالد دیکھ رہا تھا کہ ہم نے جس تعفیہ سے اسلام قبول کیا تھا وہ کسی طرح غلط نہ تھا آج حکومت ہمارے سمیت اللہ جلنے کا اعلان کر رہی ہے۔ ہمارے ہاتھ اور تلوار کی آزادی میں کوئی شے حاصل نہیں ہے۔

ابن حارثہ اور خالد کے معزولی کی سرکاری وجہ ابوبکر اور عمر کی پسند کے عناصر میں کوئی فرق نہ ہو سکتا تھا۔ حیثیت یہ دونوں آدمی ایک

اتفاق میں بسر کر رہے تھے اور ایک دوسرے کے معاون تھے۔ تعین عمل میں ابوبکر کی پسند اور عمر کی قبولیت میں جس قدر اختلاف دکھائی دیا وہ صرف خالد کے متعلق تھا کچھ دنوں تک تو عمر اور خالد کا معاملہ ذاتی حیثیت کا رہا۔ لیکن اس کے بعد خالد یا شعی بن حارثہ کی معزولی قبول خلیفہ اس حد کے اندر بھی آئی کہ ان میں خودمختاری کی وجہ سے غرور پیدا ہو گیا تھا۔ یا متیرہ بن شعبہ اس وجہ سے ہٹایا گیا کہ وہ بنو ایاد میں بہت صاحب اثر ہو گیا تھا۔ کون کہہ سکتا ہے کہ ان جوابوں میں

ان لوگوں کے صاحبِ قوت ہونے کا خوف چھپا ہوا نہیں تھا۔

عموماً شرکتِ جنگ سے کوئی امر مانع نہ تھا خلیفہ ثانی کے زمانہ میں نئے لوگ بھی آئے گئے تھے سے میرا مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ جنہوں نے

بنی ہاشم کے حقوق سے کوئی مخالفت نہ ظاہر کی تھی اور جنہوں نے ابتدائی یورش یا مائین زکوٰۃ کے قتل میں کوئی شرکت نہ کی تھی اور جو آخر میں بنی ہاشم کے بڑے مفید اور دوست ثابت ہوئے۔ جنہیں میں نے خلیفہ ثانی کے مخصوص عمالوں کے علاوہ دکھایا ہے۔ مثلاً عبداللہ بن بدیل، جریر، اشتر، برام وغیرہ۔ میں سوچتا ہوں کہ اب حالت یہ پہنچ گئی تھی کہ نہ حکومت کو بغیر دائرہ اعتبار بڑھانے مفر تھا اور نہ ان لوگوں کو پیش قدمی بغیر چارہ تھا جو کچھ زمانہ تک خاموشی اور بے کاری سے سوچتے رہے تھے اور موقع تو اس لیے تھا کہ ضرور اور قیصر سے جنگ کی جانے جن میں سے اول الذکر مقام اگر اس الزام سے بری نہ تھا کہ اس نے رسول کے نامہ کی خفت کی تو آخر الذکر نے مسلمانوں کے سفیر اور مسلمانوں کو قتل کیا تھا۔ یہ حاشیہ ایسی نہ تھیں جن میں کام لینے میں حکومت کو کسی غیر ضروری شہ پاندی کی ضرورت تھی۔ تاہم یہ تھا کہ یہ لوگ کسی بڑی فوجی لشکر یا ملکی نگہداشت کے لیے کام میں نہیں لئے گئے جس سے میں یہ نتیجہ اخذ کرتا ہوں کہ شاید حکومت کے نزدیک ان کی تقرری تجربہ کی ابتدائی حالت میں ہو۔

خلیفہ ثانی اپنے کو ستر احتضار پر بنی امیہ میں گھرا ہوا پاتے ہیں اس کا موقع اسی گیا تھا کہ

بنی امیہ کا درخ شام کی طرف چھیرا دیا جاتا تو حضرت عمر کے نزدیک عیٰی بن ابی سفیان، زید بن ابی سفیان اور معاویہ کی کوششوں کے بعد اب اور کوئی چارہ نہ تھا کہ معاویہ شام کے صوبہ میں مستقل کر دیا جاتا اور اگر شرمیل، ذوالکلاع، معاویہ، عمرو بن حاتم، ولید بن عقبہ، عیٰی بن امیہ اور ابی سفیان زمانہ خلافت اول میں دکھائی دیتے تو خلیفہ ثانی کے زمانہ میں ان میں سے زیادہ تر لوگ شام کے صوبہ میں سکونت پذیر ہوتے جس سے شام ایسے لوگوں کی ایک نو آہلی ہو جاتا جن کے اور متعلق نہ کرے ہمارے اصل تذکرہ سے بہت تعلق رکھتے ہیں، بلکہ حضرت عمر کی عمالوں کی فہرست میں ایسے ہی اور لوگوں کا اضافہ ہو تا جن کے نام ابوالاعور، سلمیٰ بن حصین بن نمیر، معاویہ بن خدیج اور عمر بن سعد ملے۔ مجب نہیں ہے کہ خلیفہ ثانی نے اپنے کو ستر موت پر دیکھ کر جب تین میں کے تیسرے (ابی سفید بن جراح) کو نہ پا کر آہ سو گھنچی ہو اور خلیفہ منتخب کرنے کے لیے نظر دوڑائی ہو تو اپنے کو بنی امیہ میں گھرا ہوا دیکھا ہو۔ اب نہ چارہ تھا اور نہ غم تھا۔

اپنے افعال کے نتائج کی لاعلمی نہ تھی مجھے یقین ہے کہ وہ بنی امیہ کے صاحب اختیار ہونے کو کسی خوف سے نہ دیکھتے تھے اور یہ امور ان کے ذہن میں تھے

کہ بنی امیہ کا صاحب اختیار ہونا ان کا صاحب اختیار ہونا ہے جو ایک زمانہ تک اسلام اور مسلمان کے سخت ترین دشمن تھے اور انہیں صاحب اختیار بنانا گویا ان کی بھولی ہوئی انتہائی خاموشیوں میں گدگدی پیدا کرنا ہے۔ کسی وقت تک شاید یہ امر نظر پڑنے کی قابل نہ ہوتا کہ ابی سفیان، زید بن ابی سفیان اور معاویہ کی تقرری ہوش کے اندر تھی یا بے جگے ہوئے اتفاق کارروائی تھی۔ خاندان کے ایک فرد کے بعد دوسرے کی تقرری اور اکثر بنی امیہ پر ایسی ہی توجہ ایسے اتفاقِ خفیت میں

زیادہ درجہ تک نہیں رہ سکتی تھی لیکن آخری وقت ان کی عثمان سے وہ تقرر جو ہم نے ابن ابی العاصیہ سے نقل کی ہے خصوصاً اس کا یہ فقرہ کہ: ”جب یہ ہاتھیں ہوں اور ضرور ہوں گی“ کوئی شبہ نہیں رہنے دیتا کہ رسولؐ کے بعد جس طرز حکومت کا قیام ہوا تھا اس نے قریش (بہ استثناء بنی ہاشم) کو اس درجہ مضبوط کر دیا تھا کہ اب ان کے علاوہ دوسرے کے نام قلعہ قائل نہ کرنے کی پیشین گوئی کی جاسکتی تھی۔ اور اگر یہ تمام ہاتھیں نظر انداز بھی کر دی جائیں تو حضرت عمرؓ نے مرتے مرتے خلیفہ نامزد کرنے کے لیے جو طریقہ اور لوگ مقرر کیے تھے اس نے یہ اچھی طرح سمجھا دیا کہ ان کی مرضی بھی یہ تھی کہ بنی امیہ ہی صاحب اختیار ہوں۔

آخر کیا وجہ ہو سکتی تھی علیؓ کو انتخاب کے قبل یہ کہنے کی کہ ہم منتخب نہیں ہوں گے اس لیے کہ سعد، عبدالرحمن، عبداللہ اور

گورنمنٹ پارٹی حال میں قوی تھی

عثمان میں ایسی قربابت ہے کہ وہ آپس میں ابن عم، اور داماد تھے۔ اب ان روایات کے موافق کہ طلحہ نہ تھے، علیؓ کی طرف صرف زیر رہ جاتے ہیں اور چونکہ طلحہ نے آخر میں عثمان کے لیے رائے دی اور سعد نے ابن عوف کے بعد علیؓ کے متعلق رائے دی۔ پھر بھی گورنمنٹ پارٹی نہ صرف مدد زیادہ تھی بلکہ جناب صدر انجمن صاحب بھی اسی اضافہ کے طرف تھے۔ لیکن اس کے بعد بھی ابن عوف کا پس و پیش صاف صاف کہہ رہا ہے کہ وہ صورت معلوم کو کچھ رسبہ تھے۔ اگرچہ انھیں یہ معلوم

ابن عوف کے پس و پیش کے معنی

تھا کہ عبداللہ یا عثمان کا داماد میری رائے کا متعلق بنا دیا گیا ہے اور کچھ ہی دن کے بعد تاریخ کے سینہ پر یہ واقعہ بھی ثبت ہونے والا تھا کہ ان منتخب لوگوں میں سعد، طلحہ، زبیر اور ابن عمرؓ کی بیعت سے اکراہ کرتے۔ اگرچہ ابن عمرؓ کی بیعت نہ کرنے کو اہل غنم کے خلاف گناہ تصور کر سکے، حقیقت یہ ہے کہ ابن عوف کا پس و پیش ہی اس امر کی تھی ہے کہ وہ علیؓ کو خلیفہ نہیں بنانا چاہتے تھے۔ اور ایک ایسے پہلو کی فکر میں تھے جس سے یہ نہ کہا جاسکے کہ انھوں نے خسر ہونے کی وجہ سے عثمان کی جنبہ داری کہ در نہ زبیر اور سعد کے علیؓ کے لیے رائے دینے پر صرف طلحہ عثمان کے حامی رہ جاتے تھے اور اب ابن عوف کو اپنا میلان ظاہر کرنا رہ گیا تھا۔ لیکن ابن عوف نے اب کیا کیا۔ قبول ابن عمرؓ ”ذی رائے“ لوگوں سے صلاح لی اور یہ سب عثمان کے لیے کہتے تھے۔ طبری ان ذی رائے حضرات کے نام بتاتا ہے اور وہ ابوسفیان اور عمرو بن حاص ہیں۔ یہ بھی بمقابلہ علیؓ عثمان کی کمزوریوں کے قائل ہیں۔ اور یہ تینوں مدبر یہ طے کرتے ہیں کہ علیؓ سے نامزدگی کی شرط سنت خلفاء کی پیروی قرار دو، جسے وہ منظور نہ کریں گے اور اس طرح عثمان خلیفہ ہو جائیں گے۔ بلاشبہ عامہ تاس کو اپنی معذوری دکھانے کے لیے انھوں نے ایک بات سامنے کھڑی کر دی اور اسی طرح اس میں بھی کوئی شبہ نہیں ہے کہ علیؓ نے اس شرط پر خلافت قبول نہ کرنے سے عام مجمع میں یہ بھی ظاہر کر دیا کہ سنت خلفاء کی پیروی ہمارے نزدیک قائل علیؓ نہیں ہے۔

عمار کی صدا مرتب مخالفت کے سامنے بے اثر ہوئی وہ وقت آیا کہ اب مشورہ تمام ہوتا، اور عام مجمع میں انتخاب کا

اعلان کیا جاتا۔ مہاجرین، انصار، اور امرائے لشکر جمع تھے ابن عوف نے ”حاضرین“ سے کہا جس کو تم لوگ خلیفہ منتخب کیا چاہتے ہو اس کی طرف اشارہ کرو۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ ابن غلدون کے ”حاضرین“ سے عام مجمع مراد ہے یا وہ لوگ

جو از باب خودی قرار دیے گئے تھے۔ اس لیے کہ علانہ ناس کو القاب میں کوئی اختیار نہیں دیا گیا تھا۔ غالباً ابن عوف کا یہ خطاب عام نہ ہو لیکن کوئی عجب نہیں ہے اگر اس سے عام دکھاوا مقصود ہو۔ غالباً ابن عوف کی امید کے خلاف جس وقت اس کا تجزیہ اور نمائش اس باطن میں پر تھی کہ ایک بڑی جماعت میں سلجھائے گی، مجمع میں سے محمد بن ہاشم کے ایسے مشہور صحابی کی آواز ملے گی جسے بلند ہوئی۔ کون جانتا ہے کہ اس صدا سے بنی امیہ کو سردی معلوم ہونے لگی ہو اور بسوں نے ہنسنے اور بے چینی سے ابن عوف کی طرف دیکھا ہو۔ کون جانتا ہے کہ محمد اڈ کے تائید کرنے سے مجمع کا رنگ بدلنے لگا ہو۔ لیکن یہ صدا بھی دیکھی ہی تھی جیسی متغیر بنی ساعدہ میں انصار میں سے کسی نے بلند کی تھی اور اس پر مرتب مخالفت غالب آگئی۔ اس لیے کہ نہ اس نے اپنے لیے کوئی پختہ پن کی تھی جس کے لیے یہ صدا بلند ہوئی تھی اور نہ آواز دینے والے نے اپنے کو وقت دینے کے لیے اہتمام کیا تھا بلکہ یہ بات تھی جو بغیر غور اور اہتمام کے منہ سے نکل پڑی تھی۔

علیٰ نے حصول اختیار کے لیے ترتیب جماعت نہ کی تھی سب نے دیکھا کہ مرتب مخالفت اور جاہل اس پر

غالب آگیا۔ محمد اڈ کی صدا دیکھی ہی تھی اور اس وقت بھی علیٰ نے کوئی نظام اپنے صاحب اختیار ہونے کے لیے درست نہ کیا تھا۔ کیونکہ علیٰ کے نزدیک یہ فریب اور چال کا امام ہونا جو تاہم بلکہ ابن عباس کا ایسا اثر دار ہونے لگا کہ کفارہ بخشی کی طرح دے رہا تھا جس سے یہ کہنے کا موقع ملے کہ کوئی بنی ہاشم محمد سے مشورہ میں شریک نہ تھا جو دلیل وہ متغیر بنی ساعدہ کے بعد پیش کر رہے تھے۔ پھر بھی علیٰ گئے۔ نہ اس امید سے کہ وہ کامیاب ہوں گے۔ اس کی تو وہ پیشین گوئی کر چکے تھے۔ بلکہ متغیر بنی ساعدہ اور انصار کی اس صدا کا جواب دینے کے لیے اگر علیٰ ہوتے تو محمد اکرام ناقص رہ جاتا یا یہ کہ اگر نہیں پہلے محمد ان خیال معلوم ہوتا تو ہم دوسرے کی بیعت نہ کرتے۔ وہ دکھا رہے تھے کہ ہمارے خلاف ایک مرتب مخالفت ہے۔ علیٰ خاموش بیٹھ کر اب یہ نہیں دکھا سکتے تھے۔ اس کے برخلاف دن اور راتیں گزری تھیں کہ بنی امیہ اور وہ جوان کے امید دار اور منتظرین تھے اس امر میں سرگردان تھے کہ ہم کس مکر یا کس فریب سے صاحب اختیار ہو جائیں۔ اور گویا اس قطعی تصفیہ کے میدان میں آنے کے قبل وہ طے کر چکے تھے کہ ہم کیا کریں گے۔

کس نے عثمان کی تائید کی تھی اور کیوں؟ اگرچہ علانہ مہاجرین اور انصار کا مجمع تھا جس میں مدینہ، سپاہی، روم اور ہر طبقہ کے لوگ موجود تھے، لیکن

قناہ قدر لے کر اس شخص کے کسی کے حق میں آواز نہ پیدا کی ہے خیانت و بی کے لحاظ سے بلاد میں اور عثمان کے ہاتھوں امیر مصر جو ناقصہ محمد کو بچانی کی حمایت کا غصہ آیا اور انہوں نے حدارت کے طرز سے کہا کہ: "چپ رہ اور مدت ہے مسلمانوں کے امور میں دخل کا کیا حق ہے۔" لیکن آج کا دن وہ زمانہ اور وقت ظاہر کر رہا تھا جس میں ابن ابی سرح کو جرأت ہوئی اور رسول کے مقدس صحابی منہ دیکھتے رہتے۔ کیونکہ ہر شخص کے منہ کے الفاظ وہ کوئی اور کیسا ہی کیوں نہ ہو قوی کردہ بندی کے مقابلہ میں سننے کے قابل نہ تھے فقط اقدام ہی تھا۔

ابن ابی سرح کی جرأت آزادانہ نہ تھی ابن ابی سرح کی جرأت آزادانہ نہ تھی۔ وہ دیکھتا تھا کہ مجمع زیادہ تر کون سے افراد سے مرکب ہے اور اُسے

عثمان کے نزدیک جیسی قربت حاصل تھی اس سے یہ خیال کرنا کہ ابن عوف، ابوشیمان اور عمرو بن حاص وغیرہ کے مفوروں سے وہ ناداشت تھا۔ معمول سے زیادہ بھولا پن ہو گا۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ ارباب رائے کون ہیں اور وہ حدوائے قوی ہیں۔ اب اسے مجھ پر اپنی رائے پیش کرنے میں کسی پس دیش کی وجہ باقی نہ رہ گئی تھی اور نہ عبداللہ بن ربیعہ کو تاکید کرنے میں کسی تردد کی ضرورت تھی۔

علی موقع کے عناصر کا نام گنوار ہے تھے صورت معلومہ پر مزید روشنی علی کے ان فقرات سے پڑتی ہے جس سے وہ اس کو مخاطب کرتے ہیں جو ظاہر ایثار فہم دکھا رہا ہے اور اپنے کوان لوگوں کی فہرست میں سے باہر نکال رہا ہے جس سے خلیفہ منتخب کیا جاسکتا تھا کہ: "اقرار کرو کہ حق کرو گے۔ اپنے بوائے فہم کی پیروی نہ کرو گے نہ کسی کے رشتہ داری کا پاس دیکھا کرو گے۔ حق کے کہنے میں کسی کی ملامت و نصیحت کا خیال نہ کرو گے۔" ہادی النظر میں یہ ایک اقرار ہے لیکن حقیقتاً موقع کے عناصر کا نام گنوار اور واقعہ خانی ہے۔

علی کے فقرات کا ترجمہ ہو سکتا ہے کہ ابتداء "بوائے فہم" کہنے میں علی نے اس میں جتنا نہ ہونے سے صرف ہوشیار کیا ہو اور ان کی نگاہ میں مریا ایسا کہنے کے وجوہات ہوں یا نہ ہوں، لیکن یہ فقرہ کچھ ہمدیر کے بعد شرح کی صورت میں سامنے آیا جب عثمان کے انتخاب پر علی نے کہا کہ: "تو نے اس لیے بیعت کی کہ ملامت تیری طرف ملے جو۔" علی کا یہ کہنا گزشتہ واقعات کا ترجمہ تھا۔ تجربہ کھلوار ہاتھ یا تاریخ اپنے کو دہرا رہی تھی۔ "رشتہ داری" ظاہرات تھی۔ "سلامت" سے ان کی طرف اشارہ کر رہے تھے جو یہ کہتے کہ گزشتہ حکومت کے اصول کے مفید بن اور بنی امیہ کے ہوتے ہوئے تم نے کیوں دوسرے کو چنا اور "نصیحت" سے یہ مراد ہو کہ "خلافت اور نبوت ایک خاندان میں نہ ہونی چاہیے!"۔

ضرر کی دھمکی تھی اس جماعت کی قوت بلکہ ضرر رسان روش بھی معلوم ہو گئی، جس وقت مقداد نے ابن عوف سے علی کو منتخب نہ کرنے کی شکایت کی اور انھوں نے جواب دیا کہ: "خدا سے ڈر نہیں تو کسی فتنہ میں گرفتار نہ ہو جائے۔" مشکل سے سمجھ میں آئے گا کہ جب خدا کے اختیارات ایسے پر معنی شوریٰ میں منتقل ہو گئے تھے تو پھر اس سے ڈرنے کی غیر ضروری دھمکی کیوں دی جاتی تھی یا اس کے کہ ان لوگوں سے ڈرار ہے ہوں جو اپنے کو اختیارات کا حامل اور اس کے مددگار سمجھ رہے تھے اور اپنے فوائد کے کسی حافع سے انتقام لینے کے لیے آمادہ ہو سکتے تھے۔

نشو و جماعت کیونکر ہوا تھا کون امید کر سکتا تھا کہ رسول کے انتقال کے بارہ برس کے بعد حالت یہ ہو جائے گی کہ علی کے لیے کچھ کہنا "خدا سے ڈر لے اور فتنہ میں گرفتار نہ ہونے" کا مستوجب ٹھہرائے!۔

عملی مثالیں ہونے والا یہ تھا کہ یہ دھمکی بغیر مثال دیے نہ ہے۔ اگر سعد بن ابی وقاص کے علی کے لیے رائے دینے پر طبری کو لکھنا ہے کہ: "عثمان را از سعد کہنے در دل مانند۔" اور ہم لوگوں نے دیکھا کہ دھمکی طرح منزل کیا گیا اور ہاشم ابن عتبہ بن ابی وقاص آج تو بین قرار دیا گیا تو پھر حاکم علی کی گماگم حمایت کرنے کی بدولت

دربار خلافت میں اس استقبال کا شایان قرار دیا گیا جو عثمان کے خلاف بد مزگی کا ایک بڑا سبب ہوا۔ اس میں بھی کوئی تفریق نہ تھی۔ جب پھر سعد ابن عبادہ کو مجمع میں کھل جاتے اور ابن الخطاب کو یہ کہتے سن چکے ہیں کہ: ”اس کو اللہ تعالیٰ ہی نے مارا ہے۔“ اور یہ بھی دکھا چکے ہیں کہ خالد بن سعید معزول کیا گیا اور اس وقت تک مورد الطائف نہ ہوا جب تک اس نے موجودہ حالت پر رضامندی ظاہر نہ کی اور بنی ہاشم خصوصاً علی بن ابی طالب کا تو ذکر ہی بے کلام ہے۔

کیوں عثمان ہی کے زمانہ میں انقلاب ہوا پیشتر کیوں نہ ہوا سوال ہوا کہ پھر اس وقت بد مزگیوں کیوں پیدا

نہ ہوئیں اور کیوں عثمان کا زمانہ ہی طبعیتوں میں ایک انقلاب عظیم کا باعث ہوا۔ ● اس لیے کہ کام اور کام کرنے والوں اور اس کے دیکھنے والوں کی ابتداء تھی۔ ● اس لیے کہ انھیں دیکھنے اور رائے پختہ کرنے کا مشغولیت کی وجہ سے وقت نہ ملا۔ ● اس لیے کہ رطب رسول کے ساتھ عظیم اور اس کے بعد فوری انقلاب نے نہ کسی کے منہ میں نظر رکھے تھے اور نہ ہاتھوں میں حرکت تھی۔ ● اس لیے کہ ابتدائی اختیار حاصل کرنے والوں کی جماعت جن افراد سے مرکب تھی ان میں کسی ایک جتنی غرض اور عمل کیوں نہ پائی جاتی ہو لیکن وہ قریب قریب اور ایک قبیلہ کے افراد کی حیثیت سے نامزد نہیں کی جاسکتی تھی۔ جو نسبت عثمان کو بنی امیہ سے تھی۔ اور جب لوگوں نے یہ دیکھا کہ ہر وہ شخص جو حکومت کے افعال میں اس کی مدد کرے تو قائدہ اور اعتبار کا شایان ہو تا ہے تو فوری منافع کی امید نے حرکت طبعی اور اخلاقی پر غلبہ حاصل کیا، برخلاف اس کے عثمان کے زمانہ میں ہر شخص بنی امیہ کے قوی ہونے اور انھیں کو زیادہ تر مورد الطائف دیکھ کر اپنے موقع اور فتح کے لیے خوف زدہ ہوا۔ اور صورت حال :۔

کس نیا موخت علم تیر از من کہ مرا عاقبت نشانہ کرد

کی ایسی ہوئی۔ ● علاوہ اس کے عثمان اپنے پیش روؤں کے ایسے مشتہ اور ہوشیار نہ تھے۔ اور سب کے آخر میں اس وقت اس لیے بد مزگی پیدا نہ ہوئی کہ وہ جسے عملی طاقت کا حق ہو سکتا تھا اسے یہ عزیز و منیع یاد تھی کہ: ”جس وقت لوگ دنیا میں مشغول ہوں تم دن اختیار کرنا۔“ اس وقت خاموش رہنا، دین تھا اور شروع ہی شروع میں مسلمانوں پر تلوار اُترنا انھیں باسحق دینا تھا۔ بلکہ کسی مددگار کے پیش کش کو بھی رد کر دیا۔ اور وجہ بھی ظاہر کر دی۔ عثمان کے خلیفہ ہونے کے وقت بھی باختلاف اظہار لیکن اسی معنی میں یہ فقرہ ارشاد فرمایا کہ: ”میں تسلیم کرتا ہوں جب تک امور مسلمان سلامت رہیں، اور اس کے ایام خلافت میں کھلم کھلا ظلم و جور نہ ہو، گو خاص فوج پر ظلم و ستم ہوتے رہیں۔“ افسوس تاریخ کے سینہ میں مدعا یہی کہ کھلم کھلا ظلم و جور بھی ہوا اور علی پر ظلم و ستم بھی ہوتے رہے۔ اور زمانہ نے جناب امیر کے ان فقرات کے بگھنے میں بھی مدد دی کہ: ”جس چیز کے سبب سے تم اس کے طالب اور راغب ہو میں اس سے پرہیز کرتا ہوں۔“

عبارت کی زد میں میں خود ساختہ منصرم یا حکومت کے بنائے جانے پانچ کے خود ساختہ منصرم کا پتیرہ ایک خاص پتیرے اور اس کے متحرک انتشار سے دور ہو گیا۔ علی کے شرائط

کہتے ہیں کہ انھوں نے ابن عوف کو غیر مشروط طاقت کا شایان نہ سمجھا اور یہ تو یلدا دلاتا ہی ہے کار ہے کہ عثمان کو کیا ضرر ہو سکتا تھا۔ پھر بھی ابن عوف نے بقول ابن خلدون علی کو ”علیہ“ لے جا کر ان کی ان تمام صفات اور دہلوی کو جو

اپنی خلافت کے لیے پیش کر سکتے قبول کر لیا۔ جس طرح سقیفہ بنی ساعدہ کے بعد عمر ابوبکر اور عبیدہ بن جراح نے عام مجمع میں علیؑ کے تمام دعوای کو قبول کر لیا تھا۔

بے پردہ اور پس پردہ اقبال کی وجہ
مدبرین اولین کو ”عام مجمع“ میں قبول کرنے میں اب کوئی خوف نہ تھا۔ اس لیے کہ مسئلہ خلافت اب عامہ الناس کی نگاہ میں ایک مشکل اختیار کر چکا تھا۔ اس وقت ابن عوف نے ”علیہ“ یعنی مجمع کے کان اور آنکھ سے دور اقرار کیا۔ اس لیے کہ ابھی انتخاب خلیفہ باقی تھا میں نہیں سمجھتا کہ علیؑ کے حقوق کی سچائی اور اثر کے لیے اس سے زیادہ کوئی قوی دلیل اور ان کے خوف زدہ نفس کی حالت بھانے کے لیے جو عامہ الناس کے خیال پر پردہ ڈالنے کے لیے آمادہ تھے، اس سے اچھی کوئی مثال پیش کی جاسکتی ہے۔

اول اور آخر کی مناسبت
ابن عوف کو جرأت نہ تھی کہ قبل اعلان انتخاب وہ علیؑ کی صفات کے ساتھ مجمع میں یاد کرتا۔ جس طرح سقیفہ بنی ساعدہ میں نام آتے ہی علیؑ کے علاوہ کسی شخص سے فوراً بیعت کی ضرورت سمجھ لی گئی۔ اسی طرح اس مجمع میں علیؑ کا نام آتے ہی خصوصاً عامہ کے وکالت کرنے سے کچھ کیفیت پیدا ہوئی کہ سعد کو جلد تصفیہ کرنے کے لیے ابن عوف سے کہنا پڑا اور ابن عوف نے جواب دیا کہ: ”میں نے اپنے ذہن میں خلیفہ منتخب کر لیا۔“ کیا ابن عوف کے ”ذہن“ میں علیؑ تھے؟ نہیں۔ ”سنت خلفاء کی شرط“ کہتی ہے کہ نہ تھے۔ وہی امر جس پر اراکین بنی امیہ غور اور بحث کر چکے تھے کہ علیؑ قبول نہ کریں گے۔

اگر علیؑ اقرار ہی کر لیتے تو عثمان سے
پوچھنا اور پہنچ کا تصفیہ باقی تھا
تم کہو گے کہ سب کچھ غور اور بحث ہی لیکن ابن عوف کو یقین کیا تھا کہ علیؑ اقرار ہی کریں گے مناسب لیکن سوچو کہ علیؑ اقرار ہی کر لیتے تو عثمان کو ابھی اقرار کرنے کا موقع باقی تھا۔ اس لیے کہ علیؑ سے پہلے سوال کیا گیا تھا اور پھر اس کے بعد ہی تصفیہ کا اختیار ابن عوف کو حاصل تھا۔ اور اس کا تصفیہ قطعی تھا۔ سوال پہلے عثمان سے نہ کیا گیا۔ اس لیے کہ اقرار کے بعد ابھی تصفیہ نہ کر سکتے۔ کیونکہ علیؑ باقی رہ جاتے اور ان سے نہ پوچھنے کی ایک ظاہر حکایت رہ جاتی۔ اس لیے ”منتخب کر لیا“ کے یقین سے علیؑ سے پہلے سوال کیا کہ ان کے انکار کرتے ہی عثمان کا آخری اقرار اخصی خلیفہ منتخب کرنے کے اعلان کو بے مذر معذرت اعلان بھانے کا سب کچھ تھا اگر اسی وقت علیؑ کو بھی کہہ دیتا تھا کہ ”خدا“۔

حکم قتل کس کے لیے ہو سکتا تھا
معاذ اللہ! انتخاب جس شکل میں تھا اس کی آخری ٹھیس بات ابھی باقی ہے، اور وہ یہ ہے کہ: ”اگر پہنچ آدمی موافق اور ایک ناموافق ہو تو اسے قتل کر ڈالنا۔“ یہ ناموافق کون ہوتا؟ کیا سعد، عبداللہ، عثمان اور ابن عوف میں سے جو ایک دوسرے کے عزیز تھے کوئی قتل کیا جاتا؟ اور طلحہ تو عثمان کے لیے راتے دے ہی چکے تھے۔ کون رہ جاتا ہے۔ زبیر اور علیؑ۔ یعنی ایک وہ جو ہمیشہ سے صاحب حق تھا اور دوسرا وہ جس نے اس کی اول معرکہ کے بعد بھی تائید کی قہم میں شدت کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ اصول انتخاب کا تعزیری دفعہ زبیر پر سختی سے نافذ کیا جاتا۔ شاید یہ محض دھمکی اور شاید انتہائی ضرورت کے لیے رکھا گیا ہو۔ اب کون رہ جاتا ہے مجھے نام لینے کی جرأت نہیں ہے۔ لیکن وہ جس کے متعلق ایک مرتبہ پہلے بھی

کہا جا چکا ہے کہ اگر بیت نہ کر دے تو گردن ماری گئے ہمارے یہ خیالات واقعات سے کیسا ہی قریبی عکس کیوں نہ لے لے
ہوں پھر بھی ہم سب کو متوجہ شاعری بے جا قریب خیال اور بے اعتبارانہ الزام سے متاثر قبول کر لیں گے۔ مگر ہم واقعہ
کے اس ٹکڑے کا کیا جواب دیں گے جو عبدالرحمن بن عمر کا خوشی ہے کہ: ”ہر کس خلافت عبداللہ کند بشید“۔ یعنی: ”جو
عبداللہ کی خلافت کرے اسے قتل کر دو“۔ اپنی عمر کو بھی ہم لینے کی جرأت نہ ہوئی۔ ہم سب جانتے ہیں کہ وہ ”کس“
کون تھا! کیا اتفاقاً ابن عمر کا ریمارک متعلق ہوا گیا تھا کیا خداوند کو بھی اس عہد سے حالات تھے کہ اس کے اظہار پر یہ
کہا جاسکتا۔ یقیناً نہیں۔ ایک جماعت کی مرتب خلافت اور سوچے ہوئے نظام کی موافقت یہ سب کچھ کر رہی تھی۔

انتخاب اس کے اصول اور طرز عمل کے متعلق مجھے کچھ اور کہنا نہیں ہے۔ نہ مشریش کے نزدیک عثمان کے
”دوست ترا ز عمر“ ہونے میں مجھے شبہ ہے۔ جب کہ ایسے زمانہ میں بھی کہ مسلمان اور مشرکین میں جنگ ہو رہی تھی۔ ان
کے کہہ بھی جانے پر انھیں قریش کے ساتھ گھوڑے پر چڑھے چڑھے پھرنے کا موقع مل سکا۔ اور حضرت عمر حضرت
نہ کر سکے نہ ہم اپنی کتاب میں مقررین کی فصاحت بلاغت یا عرافت کا موازنہ کر لے چکے ہیں کہ حضرت عثمان کی حیثیت
خلیفہ پہلے مختصر تقریر کے متعلق یہ کہیں کہ سب کچھ آج ہی پر موقوف تھا۔ اس کے طعنے میں کوئی آدرود نہ تھی۔ کون کہہ سکتا
تھا کہ آج کا ناقابلِ تعریف حالت میں ممبر سے اتنا آئندہ نعمت سے اترنے کی پیش گوئی تھی۔

کیوں ابتدائی چھ برس شورش نہ ہوئی

جسے جو کچھ کہنا ہے وہ یہ ہے کہ خلیفہ ثالث کے
چھ برس نسبتاً امن سے گزرے اور ان میں نظام حکومت
کے متعلق کوئی شورش پیدا نہ ہونے پائی۔ کیا اس لیے کہ اس زمانہ تک ان کا طرز حکومت اجماعی اور آخر میں قسطنطین
ہو گیا؟ نہیں۔ بلکہ ہم شدت کے ساتھ ابن عمر کے اس فقرہ کے موافق ہیں کہ: ”عثمان کی خلافت عمر کے خلافت کی اور
عمر کی خلافت ابوبکر کے خلافت کی فرع ہے۔“ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ یہ ہے کہ عثمان کو جو کچھ دیکھنا پڑا وہ پہلی دو خلافتوں میں
بھی ہوتا۔ اگر ان کا موقع بھی عثمان کا ایسا ہوتا۔ اور وہ موقع کیا تھا؟ وہ یہ تھا کہ عثمان کی خلافت کا چھ برس یعنی وہ زمانہ جس میں
قوم اور سپاہی اسکندریہ، ارمینہ، آذربائیجان، افریقہ، قبرس، خراسان، کابل، زابلستان، طبرستان وغیرہ کی فتح یا شورش فرو
کرنے اور دوبارہ فتح کرنے میں مشغول رہے۔ (جس طرح ابوبکر اور عمر کا زمانہ گزرا تھا) اس وقت نظام حکومت پر کسی کو
نظر اٹھانے کا موقع نہ ملا۔ لیکن اس کے بعد اس کے آسان مواقع نہ رہے، اس لیے کہ مرکز سے بہت دور دور کے
مقامات پر فوجیں بھیجی تھیں۔ میں اور آگے بڑھنا ناگہن نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ یہ کہہ رہا ہوں کہ اب ان دور دور کے
مقامات پر فوج کشی کرنے یا انتظام درست رکھنے میں دیسی آسانیاں نہ تھیں جیسی ان مقامات پر جواب تک فتح کیے جانے
تھے۔ کچھ تو عمر کے زمانہ میں فتوحات کا دائرہ اس قدر وسیع ہو چکا تھا کہ اغلاط کی امید کی جاسکتی تھی لیکن خداوند کے
نزدیک عثمان کا زمانہ ہونے والے واقعات کے لیے مخصوص ہوا تھا۔ نتیجہ کیا ہوا۔ قوم کی قوم جس کا مشغلہ صرف جنگی
کارگزاری پر موقوف تھا مصروفیت کے ذرائع ڈھونڈنے لگی۔ کچھ یہ تصور قوم کا نہ تھا بلکہ ان کا جنھوں نے اس شغل میں
جبتا کرنے کی تو کوشش کی لیکن انھیں اپنی مصالت قوی میں نہ ترقی کا کوئی ذریعہ حوالہ کیا۔ نہ اس جوش کو آپس کے لیے
معتدل رکھنے کی کوئی کوشش کی۔ نہ مصروفیت کے لیے کچھ مسلمان یکے دوسروں سے لڑنے میں وہ قدر مشترک پر جمع

تھے لیکن آپس میں صلح اور اتحاد سے رکھنے کے لیے انھیں کسی قدر مشترک بر توجہ نہ دلائی گئی۔ اب شاید حکومت کرنے والوں کی مصیبت یہ ہو کہ جماعت کو حصوں میں تقسیم کرنے سے حکومت کرنا ممکن ہوگا۔ اور نہ کوئی ذمہ دار ذات تھی جس کے طرز عمل کا لوگوں پر کوئی وزن ہو۔ فطری ہے یہ امر کہ جس وقت قوم کو جنگی نام آدریوں کے لیے ایک وسیع حلقہ ملتا ہو تو اس نے تجارت اور صنعت و معرفت یا ذراعت کی طرف سے آنکھ بند کر لی ہو، بلکہ انھیں بے قدر سمجھنے لگی ہو۔ لیکن قوم کے عنان گیر نے اشغال صلح کی قدر کے لیے کیا سامان کیے تھے؟

فتوحات کب تک چلتیں اور ان کے پلوں کس قدر لمبے ہو جاتے کہ وہ طی الارض میں مشغول رہتے۔ حاصلہ انھیں تھکاتا، جوش کم ہوتا، متوجہ ملک کی غنیمت اور حاصل امارت کے سامان نہیں کرتی، آرائش اور لاتوں کا طعنت اٹھا کر پیدا کرتا، اور رفتہ رفتہ تلوار کی جھنکار اور طبل کی جگہ دغریب صدائیں لے لیتیں۔ یہ بھی بعد کی باتیں تھیں، ابھی تو سپاہی جنگی کیفیت محسوس کر رہے تھے کہ رُکے رُکے اور پُرانی مصیبتیں عود کرنے لگیں۔ اب قوم کی مہار رشول کے ایسے کسی مخلوق انہی کے ہاتھ میں نہ تھی، بلکہ ایسے لوگوں کے ہاتھ میں جن کے زمانہ نے مسلمانوں کو قتل حق دار کو عروم، فرقہ بندیوں کو تازہ اور بغض و حسد کو زندہ اور خود غرضیوں کو پیدا ہوتے دیکھا تھا۔ یقیناً مسلمانوں نے غیر اقوام کے مقابلہ میں اپنے کو بڑا پہلور ثابت کیا۔ لیکن انھوں نے کہ آپس میں شجاعت آزمائی نے انھیں ایسا تباہ کیا کہ وہ دوسرے کے مقابلہ سے قائل ہو گئے۔ فتح کرنے باہر گئے تھے، اب تو گہری میں افتخار سے خالی جنگی مشغلہ حاصل ہو رہا تھا!

قوم کے خیال کی شارح مثال اس کے آثار عثمان کے ابتدائی زمانہ میں بھی دکھائی دیے۔ مثلاً ارمینہ کی فتح میں جو حبیب بن مسلمہ فہرہ نے قبول اپنے ”حمت اور خون سے“ حاصل کی تھی شلیان بن ربیعہ اور اس کے لشکر نے اس دلیل سے حصہ طلب کیا کہ ”تم نے ہماری آمد کی خبر سن کر ہمت کی“۔ ظاہر ہے کہ فوجی امداد سے دشمن پر جو اثر پڑ سکتا تھا اور لازماً اپنے لوگوں میں مدد سے جو ہمت افزائی ہو سکتی تھی وہ بغیر خود غرضانہ اصول منفعت کے ناگزیر ہے بلکہ اس کا دام لینے کے لیے آپس کے بہت سے سپاہی لڑے اور مارے گئے۔ ایک نے اس غرض سے پیش قدمی کی کہ غنیمت میں حصہ دینا نہ پڑے تو دوسرے نے اپنے رشتہ کے فوجی کارناموں کی اس وقت تک داد دینی مناسب نہ لگی جب تک غنیمت میں شرکت حاصل نہ ہو۔ آپس کی فتح اور نام آدری قوی افکار کا سرمایہ نہ رہی تھی جب تک کہ اپنا فتح، نام اور شہرت اس میں داخل نہ ہو۔ کیوں ہوتا جب قطعاً اہام یہ تھا کہ: ”ہم کیوں نہ ہوں“۔ ذمہ دار مدبرین ایثار نفس اور حب قوی کی کیسے امید کرتے اور لوگ کس کے نمونہ پر چلتے؟ جب کہ انفرادی شخص کا قوم شکن ہمت سر پر سوار تھا۔

اس وقت کی باتوں میں بھی ایک واقعہ نہ تھا جس میں خود غرضیوں سے آپس میں جنگ ہوتی ہو تھیں ملکی ضرورتوں نے کوفہ اور شام میں رکھا تھا بلکہ جزیرہ قبرس کی غنیمت بھی اس طرح تقسیم نہ ہوتی جس کی حکایت آج تک ہائی نہ رہ گئی ہو۔ میرا حذر نہ کبھی دراز گوش پر سوار ہے اور نہ میں کسی شیر یا ادا اور دل فریب کنیز کے پیچھے دوڑ رہا ہوں، نہ میں اس کی حکایت کر رہا ہوں کہ امیر شام نے کیوں کسی کو اپنی عنایات کے صرف میں ممتاز کیا بلکہ میں یہ موقع دکھا رہا ہوں کہ یہ ماسک ظاہر ہونے لگی تھی کہ مال لڑائی کی ہڈی اور حوصلوں کا مرکز ہو سکتا لیکن یہ بھی خفیہ ہی بمقابلہ اس کے کہ سپاہوں

اور عامہ ناس کو اپنے افسوں کی تقسیم پر اعتبار نہ رہا تھا۔

۱۔ عثم کئی کا ایک واقعہ نہایت پر معنی ہے کہ جب امیر شام جزیرہ سقلیہ پر حملہ کرتا ہے تو یہاں کا یہی بادشاہ قناریہ کے

حکومت خوزدہ بادشاہ کے ساتھ عربوں کی آمد دیکھ کر متحجب ہوتا ہے کہ عربوں کے پاس عمدہ عمدہ اسلحہ اور آرائش و زیبائش کی چیزیں جو نمود اور نمائش کے کام آتی ہیں کہاں سے آئیں گی۔ اور ملک قناریہ اپنا واقعہ یہاں کرتا ہے کہ ہم سے جو جماعت جنگ کرنے آئی تھی وہ ”غریب، صاحب نیت، صادق، صلح اور یقین والی“ تھی جو اپنے قیوت دین کے لیے جنگ کرتی تھی اور اسباب دنیاوی کی زیادہ گرویدہ نہ تھی اور یہ جماعت جو آج آئی ہے معلوم ہوتا ہے کہ اسباب دنیاوی اور مال کی جمع رکھتی ہے۔ اگر یہ ملک دمال سے دفع کیے جاسکیں تو اس سے اچھا ہے کہ جنگ کی جائے۔ یہ تئیر تھا جو مسلمان کی روش مذاق میں ایک غیر مسلم نے دیکھا تھا۔

ابوزر کی آہ سرد کے معنی نظام قومی کی درستی اور حفاظت تھی مجھے ایک مسلمان کی حالت تھی ہے جس کے

نہ اور درع کے سب قائل تھے اور جیسے رسول نے ”اصدق“ فرمایا تھا۔ میں ابوزر کو کہہ رہا ہوں۔ فتح لشکر قبرس کی قیمت تقسیم کر رہا ہے۔ خوش ہے۔ مال اور اسرا نے جنگ سانسے ہیں لیکن ابوزر کا چہرہ مہر بھرا ہوا اور آنکھیں پر نم ہیں۔ اور کسی کے غالب پر طنز غصہ سے ٹوکنے پر کہتے ہیں کہ: ”جس وقت ان عورتوں اور بچوں کو دیکھتا ہوں تو مجھے خیال آتا ہے کہ یہ امت کے گناہگاروں کی بدولت اس تکلیف میں مبتلا ہوئے ہیں۔ یہ لوگ نعمت اور فراغت میں خبر کر رہے تھے اور جب گناہ کیا اور حکم خدا کو عزیز نہ رکھا تو اس ذلت میں گرفتار ہوئے جسے خدا اپنے بندوں کا بندہ قرار دیتا ہے وہ ایسے ہی مخدول و مقہور ہوتے ہیں۔“ کوئی قوم تباہ ہوتی ہے مگر یہ کہ اس میں وہ مفات جو قوی یک جہتی کے باعث ہوتے ہیں ضیعت اور معدوم ہو جاتے ہیں۔ ہوتا ہے کہ قوین جو فلسفہ اخلاق کے لحاظ سے پست درجہ ہوتی ہیں ملکی یا سیاسی اخلاق میں ایسی ذکی اگس ہوتی ہیں کہ وہ اعلیٰ اخلاقی مقاصد کے چہل پر بھی اپنے قوی حیات کو نوعی طریقوں سے قائم رکھتی ہیں اس کی مثالیں ہمارے زمانہ کو اس قدر حاصل ہیں جس پر میں کچھ کہنے کی اس شخص کے لیے کوئی ضرورت نہیں ہے جو واقعات عالم کو ہوش سے دیکھتا ہے۔ بلکہ زمانہ کو تو اس حد تک تجربہ ہو رہا ہے کہ ماہرین فلسفہ سیاست و دسروں کو اس لیے فلسفہ اخلاق کا سبق پڑھاتے ہیں کہ وہ بے شککے ہماری تدبیر کا فکار ہو سکیں۔

ابوزر کی اس حالت کا مجھ پر جو اثر پڑ رہا ہے وہ محض یہ نہیں ہے کہ وہ انسانی ہمدردی سے بے قرار ہو گئے۔ یا محض بحیثیت ایک نامح کے انھوں نے قبل از وقت اپنی قوم کو ان نتائج سے آگاہ رکھنا چاہا جو غفلت، کاہل، حب الوطنی اور حب قوی کی ناموجودگی یا انحلال کی بدولت دیکھنا پڑتا ہے یا بغض و حسد سے جو کچھ عدم مرکزیت پیدا ہو جاتی ہے بلکہ باوجود اس کے وہ اس وقت کے غالب فائض میں وہ آثار دیکھ رہے تھے جو ان کے نزدیک ایسے نہ تھے جو ایسی خوشی کے موقع پر بھی انھیں خوش اور شریک کر سکتے انھوں نے قوم کو ایسے وقت مطلع کیا ہے جس وقت مغلوب قوم مع اپنے مال کے سامنے کھڑی ہے اور دوسری حصول دولت میں نہ صرف انھماک ظاہر کر رہی ہے بلکہ عدم سوچت خود غرضی، بغض و حسد

سے بھی پاک نہیں کہی جاسکتی تھی جو کچھ دنوں کے بعد اس حالت پر تھی ہو سکتی تھیں جو منشور قوم کی دہائی دے رہی تھی ابوذر نے جو باتیں صاف صاف عرض قوی درد سے کہی تھیں مجھے ان سب پر نظر ڈالنے کی ضرورت نہیں ہے لیکن یہ کہنا ہے کہ ان کی ایسی قوت دار اور گہرے لہجہ کی نصیحت نہ صرف بے توجہی کے حوالہ کی گئی بلکہ مسلمانوں کی بدقسمتی سے ذمہ دار مدبرین نے درستی اور حفاظت قومیت کی اس آہ سرد کو اپنے اغراض ذاتی اور نفاذ اختیار کے حق میں منہ بجا اور دشمن ہو گئے اور مصلح اپنی نصیحتوں کے ساتھ ایسی جگہ جلا وطن کیا گیا جس سے قید تہائی مقصود تھی کہ کوئی اس کی بات سننے کے لیے موجود نہ رہے! اس کے معنی اور کیا ہیں کہ کسی مصلح کا قوم کو اپنی مرکز پر لانا بھی قوم اور حکومت کے نزدیک قابلِ لحاظ نہ رہا تھا قوی حس فتنہ ہو گیا تھا۔

حکومت کا پہلا فیصلہ نہ صرف غیر منصفانہ عثمان کے زمانہ کو ”سالے کہ محسوس از بہارش ہوا بلکہ بہت المال میں بے جا دخل دیا گیا“ یہاں پہلا اسٹاکسٹ کا موقع نہ ملا بلکہ غالباً ان کے ہجر فتنہ کو عام راتے اور انصاف کے خلاف بہت المال سے مدد لینی پڑی اگرچہ یہ جزو تاریخ نہیں ہے کہ عامہ ناس نے اس فیصلہ کا کس خبیثیت استعمال کیا لیکن سوچنا آسان ہے کہ جب انھوں نے دیکھا ہوگا کہ خلیفہ کے عزیز کے لیے نہ صرف جنایت خون صاف ہے بلکہ ایسے قابلِ مذر مالت کی دفعیہ کے لیے پبلک فنڈ کام میں لایا جا رہا ہو تو اس زمانہ کے انصاف کی طرف سے اعتبار اٹھ گیا ہوگا اور سب تو سب خود ان مہاجرین و انصار نے کیا کہا ہوگا جنھوں نے ”یک زبان ہو کر کہا کہ عبد اللہ کو قتل کر دینا چاہیے“ کیا انھوں نے سوچا ہوگا کہ خلیفہ ہو جانے کے بعد خلیفہ کو ”اجماع“ کی پابندی لازمی نہیں ہے؟ میرے نزدیک خالد بن ولید یا مغیرہ بن شعبہ کا بچا لیا جانا اس سے کم قابلِ اعتراض نہیں ہے۔ پچالے کے اغراض ایک جہت اس لیے کہ یہ مددگار اور حکومت کے نزدیک قابلِ اعتبار تھے۔

مغیرہ اور عمر عاص کی معزولی ان کے اثر میں ٹکمی نہ کرتی تھی عثمان کے پہلے چہ برس کے زمانہ میں یہ بھی ہوا کہ پہلے زمانہ کے اکثر گورنر معزول کیے گئے اس لیے کہ خلیفہ اپنے قابلِ اعتبار بنی امیہ کو ان کی جگہ مقرر کر سکیں ان واقعات میں اگرچہ عمرو بن عاص اور مغیرہ بن شعبہ بھی داخل ہیں لیکن ان کا معزول ہونا ان کے اختیار اور اثر میں میرے نزدیک کوئی ٹکمی نہ کرتا تھا اس لیے کہ یہ لوگ اگرچہ کسی خاص صوبہ کے حاکم نہ رہے ہوں لیکن یہ وزارت کے رکن رہے جیسا اکثر مفید مواقع پر ان کی کارگزاری اور کار براری سے معلوم ہوتا ہے۔

عثمان سے مخالفت کے ذاتی وجوہات سعد بن وقاص جن کی سپاہیہ قابلیت سب کو معلوم ہے ان لوگوں میں پہلے شخص تھے جن کو اتفاقات نے خلیفہ کے ساتھ ہمدردی نہ رکھنے پر مجبور کیا اس کی وجہ یہی نہ تھی کہ خلیفہ کو ان کی طرف سے خیال پیدا ہو گیا تھا کہ انھوں نے میں اپنی رائے انتخاب کے متعلق نہ دیکھا بلکہ یہ بھی کہ مخالفت فارس کے وہ مقامات جو ان کی کوششوں سے فتح ہوئے تھے ایک سال کے اندر ہی قبضہ سے نکال لیے گئے لیکن یہ ذاتی قصص بھی جس کے ساتھ شہرت کو قصص پچتا ہو گوارا کیے بغیر چارہ نہ تھا یہاں تک کہ سعد بن عاص کی ناقابلِ برداشت

انانیت نے ہاشم بن عقبہ کے ایسے بہادر سپاہی کو جس نے لڑائیوں میں بڑے بڑے کام کیے تھے اور نکوار سے شیر کو قتل کر سکتا تھا اپنے آدمیوں سے ذلیل کر دیا۔ بہادر بھیجے کی ایسی ذلت سحر کے نزدیک قابل برداشت نہ تھی اور اس کے بعد ان کی حالت بھیجی سبکہ وہ کل غیظ میں آ گئے تھے یہ سب اس کے ہاتھوں (سید بن العاص) جو جوان (سید بن ابی وقاص) کی جگہ قائم کیا گیا تھا۔ ہم نہیں جانتے کہ سید بن العاص نے ”عثمان را از سحر کینہ در دل بلند“ کا بیخیت ایک وفادار خادم کے کچھ صلوحہ کرنا چاہا تھا یا نہیں۔

سحر صرف سپاہی تھے عثمان نے ایک سپاہی مدبر، بیسویں صدی کے معیار کے مدبر، عمرو بن عاص کو جس نے ان کے خلیفہ بنادینے میں بہت کچھ کیا تھا ناخوش کر دیا۔ اس نے بھی اپنے بے اختیار ہو جانے کو اسی طرح محسوس کیا جو کاجس طرح سحر نے اس لیے کہ مصر اس کے ہاتھوں فتح ہوا تھا اس نے مفتوحہ کا انتظام محکمہ سے لیا لیکن پھر بھی کچھ نڈا رنگ لگتا رہا جب تک وہ یوکار موقع نہ آیا کہ خلیفہ بنائے اپنے قول کی پابندی کے ان کو دھمکاتے جنہیں زبان دلی محمد اور ابی عاص ہی وہ شخص جو تاج و تخت سے بول اٹھتا کہ: ”خدا سے ڈرو اور توبہ کرو“۔ اس وقت تک ابن عاص میں اتنا حس باقی تھا کہ حرم انیسائے دھڑ پر ٹوٹا اور خدا سے ڈراتا۔ لیکن آئندہ زمانہ اس کے سیاسی حلقہ اور روش میں اسے طہرانہ حد تک پختہ کرنے والا تھا۔ مغیرہ ابن عاص سے کسی طرح کم درجہ کا نہ تھا بلکہ گزشتہ خلافتوں پر اس کے بڑے پلیس کے تعلیم کردہ سیاسی اصول کی مدد کا احسان تھا۔ یہ بھی تحفیت میں آیا اور یہ بھی باوجود تحفیت کے جو میرے ذہن میں حلقہ تاس کے مخالفت کی قوت اور انہیں خوش کرنے کی نیت سے عمل میں آئی تھی حکومت کی کل کا ایک پرزہ رہا۔ لیکن اس کے ایسے موقع بین شخص کی ذات سے یہ ناگہن نہ تھا کہ تحفیت اور دوبارہ امورات عکلت کی شرکت کے درمیانی زمانہ میں رومنہ القفا کے خیال کے موافق خلیفہ کے خلاف اپنی طعن کسی قدر بلند کر دی ہو۔ اس کا ایک یہ پہلو بھی غور کے قابل ہے کہ مغیرہ ”جب وصیت عمر“ معزول کیا گیا تھا یعنی خلیفہ دوم کے مصالح اس کے مقتضی نہ تھے کہ وہ معزول کرتے، بلکہ دوسرے کو وصیت کی تھی۔

شاید ان امورات نے بھی لوگوں کی نگاہ میں غور اور انقلاب کی کئی وجہ پیش نہ کی ہو۔
مردان کی رعایت لیکن یہ بھی ہوئے والا تھا کہ مردان کی ذات اور غیر معمولی رعایت یا انعام لوگوں میں مذہبی جوش اور حسد دونوں پیدا کر تے۔ مذہبی جوش اس لیے کہ خلیفہ نے نزدیک مورد عنایت وہ ٹھہرا تھا جسے رسول جلاوطن کر سکتے تھے حسد اس لیے کہ عرب کو یہ گوارا نہ تھا کہ عثمان کا عزیز تو اپنی آسمان شہریت کے لحاظ سے بڑے انعام کا مستحق ٹھہرے اور ہم باوجود ملک گردی کے خشکی کی حکایت میں مبتلا رہیں۔ یہ کل باتیں اس کا آئینہ ہیں کہ ہم اس وقت تک دوست ہیں جب تک فتح میں شرکت ہے۔

خمس الفریقہ خریدنے کے لیے باوجود عام مؤرخین کے اس لفظ کے کہ عثمان نے ابن حکم کو افریقہ مروان کے پاس روپیہ کہاں سے آیا کافس دیدیا۔ ہم ابن خلدون کے اس کہنے کو ماننے کے لیے آمادہ ہیں کہ جب ابن زبیر کس افریقہ لائے تو مروان نے اسے پانچ لاکھ کو خرید لیا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ابن حکم کب کا فاروق تھا کہ اس کے پاس اتنا روپیہ رہتا جب کہ خود خلیفہ کا یہ فقرہ موجود ہے کہ میں نے اپنے کم مایہ اعزاء کے لیے لہنا ہاتھ کھول دیے۔

اس مورخ کے مروان کے پاس بیت المال کے نام کوئی چیک نہ تھی۔ جس دیدینا یا اس کا دام ادا کر دینا دونوں برابر تھا۔
ولید بن عقبہ غلیفہ کا کوڑا کا غلیفہ ولید بن عقبہ مورخ الزام ٹھہرایا گیا۔ الزام مسلمانوں کی نگاہ سے نہ صرف سخت بلکہ قابل نفرت تھا۔ اس لیے کہ اسلام نے شراب کی طرف سے جو نفرت دلائی تھی اور جس پر سختی سے عمل ہو رہا تھا اس کی خلاف ورزی جماعت کے ایک مفید اصول سے اعراض تھا۔ شراب پینا، پلانا، بچنا، شراب بنانے کی چیزوں کا شراب بنانے کی ٹیکہ کاشت کرنا وغیرہ وغیرہ سب منشوع تھا۔ ہم مسلمان اس کے (ممانعت) کی پورے منافع حاصل کرتے اگر ولید بن عقبہ کے ایسے گورنر اور اکثر غیر مختلط لذت پسند مسلمان بلو شاہوں نے سبق نہ دیا ہوتا۔

زمانہ عثمان میں جماعت کی اخلاقی حالت
 ولید بن عقبہ تو صرف انگلی سے دکھانے کے قابل ہو گیا تھا حالانکہ مولوی سید امیر علی صاحب ہاتھ کے موافق جیسا وہ اپنی تاریخ اسلام میں فرماتے ہیں: ”حضر عثمان کے تحت خلافت پر جلوہ افروز ہوتے ہی نوجوانوں اور خاص کر بنی امیہ کے نوجوانوں نے وہی عیثانہ زندگی اختیار کر لی۔ ان کے اپنے جیتے نے ایک قار خانہ جاری کیا اور عورتوں کا عاشقی معشوقی کرنا ایک فیشن ہو گیا۔ مکہ کی حبشی بنی امیہ کے عہد میں دمشق میں بدترین صورت میں نمودار ہوئی۔“

یہ واقعات تھے جن کے متعلق
مثالیں جن کا خلیفہ کی ذات سے غیر صریح تعلق کہا جاسکتا ہے
 کہا جاسکتا ہے کہ انہیں خلیفہ کی ذات سے غیر صریح تعلق تھا۔ یعنی عمال کی بے عنوانیاں صرف اس قدر قابل اعتراض تھیں کہ کیوں انہوں نے حاتمہ ناس کے مقابلہ میں بنی امیہ ہی کو اعتبار کا شایان سمجھا۔ کیوں ایسے لوگ مقرر کیے جنہوں نے لوگوں کو خوش نہ رکھا اور پھر حکایت پر یا تو توجہ نہ کی اور یا ویسا ہی دوسرا شخص مقرر کیا۔

لیکن بدقسمتی سے زیادہ تر واقعات ایسے ہوئے جن کی ایکلا مصلحت بھی خلیفہ کی ذات سے ہوئی جس کاغذا ان کے حکم سے ہوا۔ اور بعض اوقات خلیفہ کے غور اور لحاظ کی کمی نے ان کے خلاف سخت براؤختگی پیدا کر دی۔

رسومات کی خلاف ورزی
 اگرچہ خلیفہ ہونا ایک موقع پیدا کرتا تھا کیونکہ منجملہ اور وجوہات کے کسی نہ کسی طرح تمدن اور مذہب کا نظام ابھی ایک ہی شخص میں مجتمع تھا اور ابھی حکومت نے اپنے کو اس قدر مذہب کے ذمہ داری سے مطلق العنان نہیں کیا تھا کہ وہ اس شاع کو علیحدہ کر دیتی۔ اور امام سازی کی طرف متوجہ ہو کر مذہب کو حکومت کا ماتحت کر لیتی۔ پھر بھی رسومات کی خلاف ورزی نے خلیفہ کو اندراج اعتراض بنا دیا۔

ابھی کچھ ایسا زیادہ زمانہ نہ گزرا تھا کہ لوگ رسومات مذہبی کو بھول گئے ہوں جس طرح وہ رسول کے ساتھ یا ان کی تعلیم سے بچا لانے تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ ندائے ثلاث جعبہ میں زیادہ کر دی گئی۔ منی اور عرفہ میں نماز قصر نہ کی گئی۔ منی میں شان و شوکت سے نیچے نصب کیے گئے۔ لوگوں نے خلیفہ کے رسم و رواج کی اور اسے کہنا پڑا کہ: ”میں نے تمہیں اس لیے خلیفہ بنایا ہے کہ سنت کے موافق کرو گے، نہ کہ اس کے خلاف کرو۔“

کہا جاسکتا ہے کہ یہ بہت بڑے درجہ کی

قرآن کے ساتھ طرز عمل لوگوں کی خواہش کے موافق نہ تھا

خلافت درزی نہ تھی بلکہ تھوڑا سا فرمی ڈھیلا پن تھا۔ لیکن خدا قدر کو یہ بھی منظور تھا کہ غلیفہ نے ترتیب قرآن کیسی ہی عمدہ غرض سے کیوں نہ کی ہو اور کسی کو لفظی اختلاف کے لحاظ سے قریش کی بولی میں لکھنے کا آسان حکم دیدیا ہو مگر پھر بھی حکومت کے اس مرتبہ نسخہ کے علاوہ نسخوں کے جلا دینے کا حکم برا فرزند خستگی پیدا کرے۔ مسلمانوں کو گوارا نہ تھا کہ وہ اپنے مذہبی، اخلاقی، تمدنی اور معاشرتی ہدایت نامے کے ساتھ کسی نوعی توہین کو دیکھ سکیں۔ ایک طبعی انقلاب ہوا۔ یہاں تک کہ ام المومنین عائشہ نے قرآن جلانے والے کے قتل کا فتویٰ بھی دیدیا۔

ابن مسعود کی مخالفت کچھ معنی تھے اس علم کے بعد بھی کہ موجودہ ترتیب قرآن میں کم و بیش گزشتہ

خلافتوں نے اہستہ اہستہ کیا تھا، یہ حالت توجہ کے قابل ہے کہ ”ابن مسعود نے اس قرآن کے نسخہ کے لینے سے انکار کیا اور لوگوں کو اپنی ہی قرأت پر رکھا۔“ اور لوگوں نے اقرار کیا کہ انھوں نے خود رسول سے قرأت سیکھی ہے۔ یقیناً کچھ اختلاف تھا کہ ان پر مرتبہ حکومت قرآن کے لینے کا زور ڈالا گیا اور یقیناً کچھ اختلاف تھا کہ انھوں نے نہ لیا، اور انھیں اپنے اوپر باوجود دباؤ کے اعتبار رہا۔ ورنہ اگر ایک صورت ہوتی تو نہ دباؤ کی ضرورت تھی نہ انکار کہ اور یہ تو کہنا ہی نہیں ہے کہ گزشتہ دو خلافتوں نے باوجود علم کے علی کا مرتبہ قرآن نہ لیا، اور نہ تیسری خلافت کی قرآن مرتب کرنے والی جماعت میں علی کا نام ہے۔

احراق مصاحف کے حکم میں علی کا مرتبہ قرآن بھی اصولاً داخل تھا اور چونکہ تمام دیکر

حکم دیدیا گیا تھا علی کا مرتبہ نسخہ اس حکم کے اندر آگیا وہ حقیقتاً جلا ہوا نہ جلا ہوا۔

کیوں دو گزشتہ خلافتوں میں اشاعت نہ کی گئی میں خود اس امر پر بھی بغیر رکے آگے نہیں

بڑھ سکتا کہ اگر گزشتہ دو خلافتوں میں ترتیب قرآن کا کام پورا ہو چکا تھا تو کیوں نہ اس کی نقل اور اشاعت کی گئی۔ کیا انھیں رسول سے قریب تر زمانہ میں ہونے کے لحاظ سے اپنی ترتیب کے خلاف یورش پیدا ہونے کا اندیشہ تھا اگرچہ جنگ یمامہ میں سات سو محافظ قرآن شہید ہو چکے تھے۔

لیکن واقعہ قرآن تنہا نہیں گزرا بلکہ اس میں رسول کے مقتدر صحابی کی توہین بھی ضم ہو گئی، ہم

اصحاب کی توہین نہیں جانتے کہ غریب ابن مسعود سے پیشتر سے ہونے کی کئی اور وجہ تھی یا

نہ تھی، ہمیں اس وقت کا کلام بھی نہیں معلوم جس کے بعد ان کے پیٹ پر غالباً بے کرانے کے لیے لاتیں ماری گئیں۔ یقیناً اس وقت کا مکالمہ معاملہ کے سمجھنے میں بہت معین ہو گا۔ بہر حال یہ پہلا موقع تھا جس میں اختلاف رائے (جس کے علاوہ میں

کچھ نہیں معلوم) رسول کے صحابی کو سزا کا مستوجب ٹھہراتا۔ اب سید امیر علی صاحب کی تاریخ اسلام کے اس فقرہ کا وقت گزر چکا تھا کہ: ”ان کے عہد وقت بدلا کے پہلے چار سال میں اگرچہ نئے گورنروں کے قلم سے ناک میں دم آ گیا تھا (مگر) لوگ

چپ چاپ رہے۔ بلکہ اب وہ وقت آیا جیسادہ آگے چل کر فرماتے ہیں کہ: ”اس اثنا میں خلیفہ کی کمزوری اور ان کے منہ گلوں کی شرارتیں لوگوں میں سخت غیظ و غضب پیدا کر رہی تھیں۔ ان کے گورنروں کے ظلم و تعدی کی پرزور شکایتیں ڈھڑا ڈھڑا اختلاف میں موصول ہونے لگیں۔ آخر قیامت بہ ایجا رسید کہ صوبوں سے انصاف کا تقاضا کرنے کے لیے وفد آنے شروع ہوئے، وعدہ وعید پر ٹال کر ان کو واپس کیا گیا۔“

اصحاب کی لطافت
انہیں مواقع میں سے ایک تھا جس میں اصحاب رسول نے غالباً تقرر کی گری کی احتیاط سے شکایتیں کاغذ کے حوالہ کیں اور مزید لحاظ سے بے یک جسم جانا بھی نمود وقت کی دھجی سمجھ کر ترک کیا، بلکہ ایک شخص کو اپنا وکیل کیا۔ وہ شخص وہی تھا جس کے متعلق رسول کی یہ حدیث کہ: ”اے عمار تجھ کو ایک فرقہ باغی قتل کرے گا۔“ اور مورخین کی طرح ملا جالی بھی ”شواہد النبوة“ میں نقل کرتے۔ نہ صرف رسول کے ساتھ عمار کی محبت اور وجہ اسلام کی حمایت ہر شخص کو معلوم تھی، بلکہ ان کے پدر بزرگوار اور مادر گرامی اوائل مسلمین اور مسلمات میں کفار کی تعدی کے شکار اور حیرت خیز اسلامی استقلال کے نمونے تھے۔

کس کے ساتھ ناملائم برتاؤ ہوا
کون کہہ سکتا ہے کہ مستغنیوں نے انہیں بیز صلح اور داد رسی کے اور کئی نیت سے اپنا وکیل بنایا تھا۔ لیکن ایسے وزنی استیغاثہ اور متدس وکیل کی اس طرح توہین کی گئی کہ چند سطریں پڑھ کر کاغذ پھینک دیا گیا۔ عمار سنجیدگی سے اصحاب کی وکالت کر رہے تھے۔ ایک فرض ادا کرنا تھا۔ وہ اور اصحاب رسول کے وقار کا بھی وکیل تھا۔ کہا کہ: ”اے اصحاب رسول نے کہا ہے۔ پھینکنا مناسب نہیں ہے۔“ لیکن اس کے علاوہ بھی ایک اور نازک فرض تھا، اور وہ نازک پھر درد اور مسلمان کی حیثیت سے کہنا تھا کہ: ”اس پر غور اور تامل لازم ہے۔ ہم تمہارے خیر خواہ ہیں۔ یہ باتیں (جو کچھ لکھی ہیں) تم سے مصطحت اور ضحیت کے لیے کہی جاتی ہیں۔“ کون کہے گا کہ ان الفاظ میں کوئی گری یا سختی ہے یا آداب شاہی کی خلاف ورزی کی گئی ہے۔

یہ سب کچھ نہ تھا بلکہ صورت معاملہ یہ پہنچ گئی تھی کہ یہ کہنا بھی کی ہم مذر یا داد خواہ ہیں حکومت کے خوشگوار سر میں ایک تکلیف دہ پیچ مخلوط کر دینی تھی۔ عمار کے سابق میں ایک اور ناگوار بات تھی، جسے خلیفہ کا معاملہ دماغ سے خارج نہ کر سکا ہوگا۔ یہی تھے جنہوں نے خلیفہ سازی کے مجمع میں علی کی وکالت کی تھی۔ کسی کا بڑا صاحب اخلاق حمیدہ اور مذہبنا متدس ہونا اسے سیاسی جرم سے محفوظ نہیں کر سکتا۔ نہ کہ سیاسی حیثیت کے رقیب کا وکیل ہونا۔ اگرچہ اس کے بعد ان کے دل میں اس واقعہ کی کوئی یاد باقی نہ رہی ہو۔ آج قبضہ میں تھے۔

عمار کے ساتھ برتاؤ، اثر اور اس کی وجہ
اس کے بعد خلیفہ کی حرکت کی قدر دانی کے لیے میں ابن خلدون یا مترجم ابن خلدون کے لیے دوٹ دیتا ہوں۔ نتیجہ کیا ہوا۔ بنی عزم نے قسم کھائی کہ اگر عمار جابر نہ بھٹے تو عثمان کو قتل کر ڈالیں گے۔ تم کہو گے کہ یہ ان کی گستاخی تھی کہ انہوں نے خود انتقام کا قصد کیا، اور عدالت میں نہ گئے۔ عدالت کہاں تھی؟ جب داماد کے لیے بیت المال تھا

تو اپنے لیے مملکت عروسہ فروخت کیے جاسکتے تھے کیا عدالت کی طرف سے یہ بے اعتباری انصاف کو اپنے ہاتھ میں لینے کی کافی وجہ نہ تھی؟ یہ موقع تو خیر گزر گیا۔ محمد بن ابی بکر کو ابھی ایسا ہی موقع باقی ہے۔ صرف برغانگی کا جوش بڑھتا جا رہا ہے۔

ابوزر غفاریؓ کسی طرح ابن مسعود اور عمار بن یاسر کے واقعہ سے کم جوش خیز ابوزر غفاریؓ کا واقعہ نہ تھا۔ ابوسفیان کا بیٹا کب خوش ہو سکتا تھا کہ حکومت اور فتوحات کا تلذذ تو یہ، انصاف اور احتیلا کی تکی میں ڈھبایا جائے۔ اور تصرف کے وقت کھٹکاٹار ہے کہ کوئی دیکھنے والا آگاہی کی مسدالکھایا جاتا ہے۔

نازکؓ موقع معاویہ کو اس صورت میں کہ وہ اپنے لوگوں کو مخصوص توجہ سے نہ دیکھ سکے، ایک مضبوط تائید سے مستحکم ہونا پڑتا۔ اور اس صورت میں کہ معاویہ ناس پر ابوزر غفاریؓ کی تقریر اور فقرات کا اثر پڑتا۔ کیونکہ وہ حقوق مسلمان اور عامہ ناس کی وکالت کرتے تھے۔ اسے لوگوں کی طرف سے بھی اطمینان کی امید نہ تھی۔ یہ بھی وکالت کی قوت تھی کہ تنہا آدمی نے حکومت کے خود غرضانہ نفاذ اختیار کا موقع اس قدر نازک کر دیا تھا۔ کیا کیا جاتا۔ معاویہ کے حوصلے اس سے کہیں بڑے تھے کہ وہ اپنے کو مسلات اور احتیلا کا پابند کرتا۔ صرف اب یہ رہ گیا تھا کہ وہ خلیفہ کو مدد کے لیے پکارتا، اور کہتا کہ ابوزر کو اس قدر جرأت ہو گئی ہے کہ وہ نہ صرف میرے اغفال پر متعرض ہے بلکہ وہ خلیفہ وقت سے بھی جواب طلب کرنے کا اپنے کو متفق سمجھتا ہے۔ وہ حکومت کا رفیق نہیں ہے، بلکہ قانون اور عامہ ناس کا اپنے کو وکیل سمجھتا ہے۔ خلیفہ نے نہ صرف ابوزر کے قول کی صدق یا کذب کے سمجھنے کی مطلق کوشش نہ کی بلکہ قطعاً اپنے عامل کی مصلحت کے پسند ہو گئے اور سختی شروع کر دی۔ ابوزر کی اسلامی منزلت بھی حکومت کی روش کے لحاظ سے کسی سفارش کے قابل نہ ہوئی۔ حکومت کا درشت مذاق تھا کہ مسلسل دوڑتے غولے اوٹ پر اپنے ملزم کو قلابازیاں کھلائے۔ اس لیے کہ: ”ہمارا (حکومت) اور تیرا (عامل) ذکر بھول جائے۔“ لیکن درد انگیز بھی تھا کہ کچ کہنے میں اپنے جسم کا گوشت بھی ساتھ چھوڑ دیتا ہے۔ بوڑھا مقدس صحابی اس طرح آدمہ مواد اور اختلاف پہنچا کہ حکومت تختیر اور طرے استقبال کرے۔

نیکی اپنا آپ انعام ہے نہ سفر کی مخمور اور نالاعلم برتاؤ اور نہ خلیفہ کا رعب اور سختی ابوزر کو یہ کہنے سے روک سکے کہ: ”مجھے جہاں چاہے بھیجو جہاں رہوں گا کچ کہوں گا۔“ ابوزر نے اس اعتبار کی وقعت قائم رکھی جس کی بنا پر رسول نے انھیں ”امدق“ فرمایا تھا۔ طبیعت شناس رسول نے فرمایا تھا۔

سزا کے بعد عداوت ختم نہ ہوئی چند میٹر اور ایک آدمہ اوٹ کے ساتھ جوان کی بقیہ زندگی تک کے گزارہ کے لیے دیا گیا تھا۔ ان کی خاص یلکیت تھی۔

بوڑھا صحابی ربذہ کی طرف جلا وطن ہوا۔ جو مقام اسے نہایت ناپسند تھا۔ جلا وطنی کے حکم کے بعد بھی حکومت کے دل میں خشکی نہ پیدا ہوئی، اور وہ وقت بھی کہ جس میں کوئی، یا چند آدمی قہری دور مشاعت کرتے، ابوزر کی سہراہی کے لیے مخدوش بھا گیا کہ مبادا وہ لوگوں کے کان میں ایسے لفظ پھوکی جو برا اثر کریں۔ اور حکم دیا گیا کہ کوئی مشاعت نہ کرے۔ یہی مصلحت تھی کہ ایک غیر آبلو مقام ان کی سکونت کے لیے مخصوص کیا گیا۔

ابوذرؓ سے علیؓ کے مخاطبہ کی شرح

نہ اس لیے کہ علیؓ نے فرمایا ہے، بلکہ حالات پر غور کے بعد ان فقرات پر نظر کرو جو علیؓ نے ابوذر سے اس وقت کہے تھے جس وقت وہ مدینہ نبی کو دداعی نگاہ سے دیکھ رہے تھے کہ اس سے زیادہ مناسب لفظوں میں اس وقت کی صحیح حالت نہیں بیان کی جاسکتی۔ ابوذر کو خواہش اصلاح میں کوئی خود غرضانہ وجہ مرک نہ ہوئی تھی، بلکہ وہ ”خدا کی وجہ سے خشم ناک“ ہوئے تھے لیکن چونکہ ایسا چاہنا نبی امیہ کی بے مہار خواہش حکومت کے نزدیک دلپذیر نہ تھا، اس لیے ”اس قوم نے ان کی طرف سے اپنی دنیا کا خوف کھایا۔“ آسان تھا کہ وہ بھی حکومت کے ساتھ تالیاں بجاتے لیکن یہ ابوذر کے ضمیر کے خلاف تھا۔ اور اپنے ”دین کا خوف کیا“ ورنہ ”اگر یہ ان کی دنیا کو قبول کر لیتے تو البتہ نبی امیہ ان کے ساتھ دوستی سے پیش آتے، اور اگر دنیا کو ان سے (نبی امیہ سے) قرض لیتے تو ابوذر کو اپنی مضرتوں سے پناہ دیتے۔“ اب جب کہ ابوذر پہلے جا رہے ہیں تو انہیں اس سے بہتر کیا تسکین ہو سکتی کہ ”اب تو اس چیز کو ان کے ہاتھوں میں چھوڑ دے جس کے زوال سے یہ نفع ہو رہے ہیں۔“ انہیں فصل بہار کی گھاس اطمینان سے چرنے دے کہ ان کی انتڑیاں حلق تک بھر جائیں، اور ”تو اس چیز (دین) کو لے کر فرار کر جا جس کے زائل ہوجانے کا تجھے ان کی طرف سے خوف تھا۔“

روزِ جزا کے آثار

روزِ جزا کی آمد کے آثار دکھائی دے رہے تھے۔ سازبنا ہوا تیار تھا۔ چھپڑنے کی دیر تھی۔ غریب ابوذر باوجود مظلوم ہونے کے نہیں معلوم ملامتیں حکومت اور اس کے مداخلوں کے نزدیک کس قدر موردِ اہتمام ہوتا اگر اس کی زندگی میں ان کا کوئی لفظ کسی پر یہ اثر کرتا، جو حکومت کی طرف سے نفرت آمیز غصہ پیدا کر دیتا، اور کہا جاتا کہ بغاوت ایک زمانہ سے یہی جاری تھی۔ زندگی نے کچھ نہیں کہا موت نے کہا۔ اتفاق تھا جس نے جریر بن عبد اللہ اہلبی، مصعبہ اور مالک اشتر کے بلادہ کے لوگوں کو اس وقت پہنچا دیا جس وقت حالت یہ تھی کہ ایک کمزور عورت گویا لاش سے

پوچھ رہی تھی کہ ہم کیا کریں۔ نہ ہم تنہا مراسم دفن ادا کر سکتے ہیں اور نہ رسمی کفن ہے جو تمہارا آخری لباس ہو۔ یہ محض دمیّت نہ تھی کہ ضعیفہ سر راہ بیٹھ گئی، بلکہ موقع کا بڑھتا ہوا انتشار تھا جس نے اس جگہ کھینچا جہاں سے لوگوں کے گزرنے کی امید تھی۔ یہ پرسہ کی معمولی رسم نہ تھی کہ جریر، اشتر اور مصعبہ کے ایسے سپاہی ادا کرتے بلکہ گزری ہوئی باتوں کی یاد۔ موجودہ موقع اور ایک غریب عورت کی صدا نے استیغاثہ تھی جس نے پتھر پھلادیا۔ سپاہی ایشٹھ گئے۔ اور بے چینی سے روئے۔ لیکن صرف ہمدردی سے رو دینا عورتوں کے کمزور رونے سے کسی طرح اچھا نہیں ہے۔ نہ یہ اس طرح رونے تھے۔ آئندہ قربت سے مطالعہ اور خیالات کی تشریح بکھلنے لگی۔ ان کی دداعی دعا کو غور سے دیکھو؟

دُعا پر نظر

میں اس کا کوئی لفظ ایسا نہیں دیکھتا جو نظر انداز کیے جانے کے قابل ہو، اور عین واقعہ ہوا واقعہ کے متعلق بے تکلف خیال نہ ہو۔ ابوذر کے ایمان لانے، رسول کے ساتھ رہنے، مشرکین سے جنگ، اسلام پر ثابت قدم رہنے کے حقوق یاد کیے گئے ہیں۔ کہا گیا ہے کہ انہوں نے ”شرع میں کوئی تغیر نہیں کیا۔“ یہ ابوذر کے مخالفین پر عکس تھا جس کی شرح آئندہ فقرات سے ہوتی ہے جہاں زمانہ کے واقعات بیان کی جاتے ہیں کہ: ”اس نے کچھ باتیں دیکھیں جو سنت رسول کے موافق نہ تھیں۔ اس نے ان سے انکار کیا۔“ اس کے بعد وہ فقرہ ہے

جسے ہم آئندہ کی گنجی کہہ سکتے ہیں کہ: ”اس وجہ سے اسے لوگوں نے خیر کہا اور اسے روضہ رسول کے طوائف کی دولت سے محروم کر کے نکال دیا“ اور اسے ضائع چھوڑ دیا یہاں تک کہ غربت میں مر گیا۔ اور آخر میں دعا تھی کہ: ”اے مجی سزا جزا دے جس کا وہ مفتی ہو، جس نے اسے حرم رسول سے نکال دیا“۔

اتفاقات قسمت کی حیرت خیز مخالفت تھی کہ یہ لوگ کوفہ کے بھٹے جہاں ہاشم بن عتبہ کی توہین ہوتی اور سعید بن العاص سے وہ معاملات پیش آتے تھیں ہم بیان کرتے ہیں۔ سعید بن العاص اموی عثمان کی گود کا کھلایا، جس کا عقد بھی عثمان نے کرایا، جو گویا معاویہ کی فوجی شاگردی میں تھا۔ کوفہ کے ایسے مفید مقام کا اپنے کو حاکم و بچہ رہا تھا۔ اس سے زیادہ کون اپنا موقع قوی کچھ سکتا تھا جس کا ایک استاد شام کے صوبہ میں حاکم اور دلی مدینہ میں خلیفہ ہو۔ اس نے اس میں ناگوار رعونت اور حاکمانہ تجتر پیدا کیا۔ یہاں تک کہ اس کے منہ سے نہ صرف موجودہ بلکہ گزشتہ مصلحت کے بھی بالکل خلاف یہ فقرہ نکل گیا کہ: ”عراق اور اس کا سواد قریش کے لیے بمنزلہ بوستان ہے۔ جس قدر ہم چاہیں لے لیں اور جس قدر نہ چاہیں چھوڑ دیں۔ یہ خود غرضانہ فقرہ نہ صرف ان کے رد و بد تھا جو اب گزشتہ اور موجودہ حکومت کے زمانہ کے فتوحات میں حصہ لینے والے سپاہی تھے لیکن قریش نہ تھے بلکہ وہ جن کا وطن عراق تھا۔ انھوں نے کیا سوچا یہ کہ کوشش ہماری لیکن نام آوری بنی امیہ یا حاکم گردہ کے چند تنفس کی جو ہمیں دمکی دے رہے ہیں کہ ہمیں مغر کھاتے دیکھتے رہو، اور اس کی دعائیں مانگو اور منہ دیکھتے رہو کہ ہم ہڈی بھی تمھاری طرف پھینکتے ہیں یا نہیں! سعید کو سننا پڑا کہ: ”جس سواد کو اللہ تعالیٰ نے ہماری تلواروں کے زور سے عنایت فرمایا ہے تم اس کو اپنا اور اپنی قوم کا بستان خیال کرتے ہو؟“۔ بات یہیں تک ختم نہ ہوئی بلکہ واقعہ کا اثر اس سے کچھ میں آنے لگا کہ سعید بن العاص کا پولیس کا افسر مجرد ہوا۔ اور لوگوں نے اشتراکی تعریف کی اس لیے کہ: ”اگر ایسا نہ کیا ہوتا تو یہ گردہ اس کے بعد ہمارے گھر ہار میں تصرف شروع کرتا اور ہمیں ہمارے آبلہ و اجداد کی میراث سے محروم کر دیتا۔“

معاویہ اور سعید کے طرز عمل کی موافقت سعید بن العاص نے وہی مصلحت اختیار کی جو معاویہ نے کی تھی۔ اگرچہ دونوں کے شکاروں

کی حالت میں فرق تھا۔ اور ایک گردہ پر مخصوص الطاف غالباً قدر مشترک تھی۔ لیکن ابوزر محض بیعت ایک مسلمان اور مصلح کے نصیحت کرتے تھے انھیں اپنی کسی جانتا دہر پر حکومت کی دستبرد کا اندیشہ نہ تھا، درآسمانیکہ اہل کوفہ کو سعید بن العاص کے فقرات نے ذاتی قصبان کا خطرہ دلایا تھا۔ یعنی صورت معاملہ کسی خاص گردہ کے مورد عنایت ہونے سے بڑھ کر اب اس دہرے خوف کی بھی محرک ہو گئی تھی کہ ہمارا مال اور معاملہ عمال کے رحم اور مزاج کے اعتدال یا عدم اعتدال پر موقوف ہے۔ جب ایک عامل دوسرے عامل کے عمل کی تقلید کر رہا تھا تو کوئی وجہ نہ تھی کہ خلیفہ اپنے پیشتر کے دستور العمل سے انحراف کرتے۔ اس مرتبہ انھوں نے طرہوں کو مدینہ نہ بلایا۔ کون جانے کہ اس لیے کہ اصحاب رسول محض ان کے عمال کا بیان کیا ہوا الزام نہ سنیں گے بلکہ خود طرہ میں سے بھی کچھ پوچھیں گے اور اگر ان کے نزدیک الزام درست نہ نکلا تو پھر ان میں ویسی ہی بددلی پیدا ہوگی جیسی ابوزر کے متعلق پیدا ہو چکی تھی۔ اس لیے مناسب تھا کہ ان لوگوں کو شام یعنی وہاں کے بیدار مغر عامل کے نگاہ کے نیچے بیچ دیں۔ سعید نے ان لوگوں کو جلا وطنی کا حکم سنایا، اور براہ فرستگاری میں جو کچھ کسربانی

رہ گئی تھی اُسے یہ کہہ کر پورا کر دیا کہ: ”جاتے ہو تو ان غنہا اور ادبائوں کو بھی لیتے جاؤ جو تمہیں برا سمجھتے کرتے ہیں۔“ لیکن کچھ حکومت نے جن لوگوں کو جائز نکتہ چینی پر خاموش اور ذلیل کرنے کا ارادہ کیا تھا اس کی غرض کسی ہی کیوں نہ ہو کسی طرح کچھ کی چمک اس میں نہ پائی جاتی تھی۔

اشتر محض کند سپاہی نہ تھا، سردار قبیلہ، مقرر، مدبر، اور نہایت ذکی اکس تھا۔ اپنے ان قریبوں میں جو امور اس کی سیاست کے متعلق تھیں نہایت غمناک تھا۔

سید کے فقرہ کے بعد اس کا کہنا کہ: ”کوفہ میں جتنے لوگ ہیں سب میرے ہوا خواہ ہیں اور کوئی اس پر راضی نہ ہو گا کہ تو ان کے شہر اور گھروں کو اپنا بستان قرار دے۔“ اسی قدر کچھ تھا جیسا مدبرانہ تھا۔ اس نے ایسے موقع پر نہ صرف اہل کوفہ کو اپنا ہوا خواہ بنایا بلکہ یہ بھی ذکر کے قابل سمجھا کہ حکومت کی بے مہار اور غیر محتاط تقریر پر اہل کوفہ راضی نہیں ہو سکتے اور سب میرے ہم خیال ہیں۔ مسئلہ جوش خیز تھا۔ اشتر نے ساز کے اس تار پر انگلی رکھی تھی جو حکومت کو بھلائے معلوم ہوتا۔ لیکن عام رائے جس کا طبعی اقرار کرتی۔

دستر خوان کی مخدوش زینت دور کی گئی

مدبر معلویہ نے مالک اشتر وغیرہ کو اپنا کرنے کے لیے دسترخوان کو مدد کے لیے بلایا۔ تقریری مغالطے دیے۔ دمکی اور لالچ سے کام نکالنا چاہا۔ لیکن اس کے تمام تدبیر کو کامیابی نہ ہوئی۔ جب ابوذر کا ایسا بے غرض مصلح شام میں رکھے جانے کے قابل نہ ہو سکتا تھا اس لیے کہ وہ خدا کے لیے خاموش جم غفیر کے حقوق کی آزادانہ وکالت کرتا تھا تو ایسے واصلوں میں بسر کیے ہوئے لوگ جنہیں آئندہ کا حوصلہ ہو سکتا تھا اب ایسے مہان ہو سکتے تھے جو زور دسترخوان کی مخدوش زینت ہوتے۔ دوبارہ امیر شام کو تم بدھ سے زیادہ متین الصلوٰۃ فلسفی اور دین کی حمایت کا محمد بن کر خلیفہ کو صدا دیتا ہے اور ان لوگوں کی موجودگی سے انصاف، حق، دین اور نیکی سب کو معرض خطر میں مبتلا دیکھتا ہے اور یہ چند جری صاف گو، دمشق سے اس لیے نکالے جاتے ہیں محض روانہ کیے جائیں۔

شخص نہ کہ مقام

لیکن یہ جگہ نہیں تھی جہاں ان کا سمجھا جانا کوئی خصوصیت رکھتا ہے، بلکہ حقیقتاً اس کا تعلق شخص سے تھا۔ وہ شخص دور اول کے دست راست اور شمشیر کا سرزند تھا۔ میری غرض خالد بن ولید کے فرزند عبدالرحمن سے ہے۔

عبدالرحمن بن خالد بن ولید کے برتاؤ نے آگ بھڑکائی

یہ اپنے باپ کا بیٹا کر یہہ الفاظ سے اس گروہ کا استقبال کرتا ہے، اور ”ایسی سختی“ کا برتاؤ کرتا ہے جس سے کوئی عجب نہیں ہے اگر ان لوگوں نے اپنا موجودہ موقع دیکھ کر بخوری سے ”توبہ“ کی بھڑکانے بتایا کہ یہ توبہ ایک آگ تھی، جو وقت پر بھڑکنے کے لیے دہادی گئی۔

وجہ کی یک جہتی

ہم نہیں جانتے کہ اہل کوفہ اس سے واقف تھے یا نہ تھے کہ مالک اشتر اور مصدغ وغیرہ شام اور محض میں ہر طرح کی دلتوں میں بسر کر رہے ہیں اور ان کا مدینہ میں آکر خلیفہ سے عامل اور اپنے لوگوں کی بلا وطنی کی شکایت محض فریادری کی حیثیت سے تھی۔ اور وہ اور جوش میں آتے اگر انہیں صحیح حالات

معلوم ہوتے۔ جو کچھ بھی ہوا اہل کوفہ کے دفتر نے اپنے کو تہانہ دیکھا بلکہ اہل بصرہ کو بھی موجود پایا۔ ان وفد کا اس قدر نتیجہ ہوا کہ عاملوں کو ”نصیحت“ کی گئی۔ عمال نے یا تو نصیحت کو اس قابل نہ سمجھا جسے وہ اپنے اپنے عمل میں لے جاتے، یا غلیفہ نے دریافت پر ان عاملوں کی روش کو حکومت کے نقطہ نگاہ سے قابل چشم غمازی نہ سمجھا اور واپس کیا۔ اہل کوفہ کو غلطی نہ ہوئی اور انہوں نے دوبارہ ایک متنی آدمی کو اپنا سفیر بنایا اور دوسرے ایک مقدس بزرگ نے غلیفہ سے بھی ایک خط بھیجا۔ مجھے سفیر کے اس فقرہ سے بحث ہے کہ: ”اے عثمان لوگوں نے تمہارے افعال پر نظر کرنا شروع کیا ہے۔“

کسی ہوشیار حکومت کے لیے لوگوں کا امورات حکومت پر نظر کرنا حکومت کی مصلحت کا باعث ہوتا۔ لیکن افوس ناک مند نے غلیفہ کے منہ سے

خلافت مصلحت الفاظ

یہ خیالات ظاہر کیے کہ ”ایسی باتیں ناپائیدار“ ہیں اور ایسا کہنا کہنے والے کے ”زاہد اور متورع“ ہونے کو مستحبہ کر دیتا ہے۔

ساتھ ہی ساتھ حکومت کے خوفناک ”اللہ تعالیٰ“ کو بھی پہنچوانا چاہتے ہیں۔ اور جواب ملتا ہے کہ: ”میں اللہ تعالیٰ کو نہیں جانتا، پر بے شک اللہ تعالیٰ

اللہ تعالیٰ کا تعارف کرایا گیا

ظالموں پر قابو پانے والا ہے!“۔ اس کے بعد غلیفہ نے تصفیہ کیا کہ: ”سنو! خواہ ”شفا“ اہل بنی اور حد“ ہیں۔ سفیر ”اللہ تعالیٰ“ نے توجہ کی بلکہ اس طرح پہنچایا گیا کہ بغیر کسی ایسی ہولناک مزاح کے ایسا کہے ہوئے جو ابوذر کے لیے اختیار کیا گیا تھا کسی طرح نہ بھولنا۔ کعب بن عقیلہ کوفہ گرفتار کر کے بلوائے گئے۔ اور کورے کی سائیں یا خون آلود نشان کے مٹانے کے لیے پہلا تجویز ہوا۔

حالت ضرور نازک تھی کہ غلیفہ نے معاویہ، ابن ابی سرح، سعید، ابن جابر نازک حالت اور معتدل لوگ اور ابن عباس کو طلب کیا۔ اس لیے کہ یہ لوگ وزیر، ناظم، معتدلیہ تھے۔

نازک حالت اور معتدل لوگ

ان پر ”اطمینان“ تھا کہ یہ لوگ ”نیک نیتی“ سے رائے دیں گے۔ رائے زنی کا مضمون یہ تھا کہ لوگ ”طرح طرح کے الزامات غم پر قائم کرتے ہیں۔ میرے عمال کی معزولی چاہتے ہیں اور جس کو وہ دوست رکھتے ہیں مجھے اس (امر) کا پابند اور اس کی طرف لوٹنا چاہتے ہیں۔“ چونکہ ابن ابی سرح کی لالچ دینے والی رائے قبول نہ ہوئی۔ میں اس سے کوئی واسطہ نہیں، نہ سعید کی اس رائے سے کہ ”سرदारوں کی ہلاکت“ سے لوگ خود بخود متفرق ہو جائیں گے۔ باوجود اس کے کہ غلیفہ نے ”ضرور مناسب“ بھی۔ میں کوئی بحث ہے۔ اس لیے کہ مورخ نے یہ بھی بتایا ہے کہ ”اس پر عمل کرنا مشکل“ تھا۔

تاریخ اپنا حل آپ ہی کر رہی تھی اور ہم اپنے کو اسی صلاح پر متوجہ کرتے ہیں جو عبد اللہ بن جابر کر رہے دی کہ: ”ان کو جہاد میں مصروف کر دیجیے۔ کیونکہ

تاریخ اپنا حل آپ ہی کر رہی تھی

جب یہ تاریخ نویس کے تو طرح طرح کے خیالات پیدا کر کے آئے دن ایک نہ ایک ہتھ اٹھاتے رہیں گے۔ غلیفہ نے یہ رائے منظور کی اور حکم دیا کہ: ”لوگوں کو جہاد پر روانہ کرو، تاکہ اس کی مصروفیت ان کو اور خیالات سے روک دے۔“

یہ دکھانے کے لیے مشکل سے میں کوئی اور دلیل لا سکتا ہوں کہ رسول کے بعد کامیابی کا یہی ایک بڑا راز تھا جس کے تجربہ پر اب پھر توجہ ہوئی تھی۔ لیکن جہاد کی آسانیاں اب دور ہو چکی

اب وقت نہ تھا

تھیں، اس لیے کہ فتوحات کا دائرہ وسیع سے بھی کچھ زیادہ ہو چکا تھا۔ دور دور از مقامات پر فوجیں بھیجنا آسان نہ تھا بلکہ خود

مفتوحہ مملکت میں ذرا سی غفلت بغاوتیں کھڑی کر دیتی تھی اور عمال پر نظر رکھنا ایک اور مشکل کام ہو گیا تھا۔
اہل کوفہ کی کوشش
 خلیفہ اور ان کے نیک نیت تابع جس وقت آئندہ کا دستور العمل درست کر کے انہیں مشورت برخواست کر چکے تھے اور ہلکے دل سے اپنے اپنے عمل کی طرف واپس جا رہے تھے کہ اب یزید بن قیس نے اپنا موقع پایا، اور ملک اشتر وغیرہ کو ولایت شام سے طلب کیا، اور یہ لوگ رات دن مسافت طے کرتے ہوئے کوفہ میں داخل ہو گئے۔ کوفہ کی عام برائیگی اس سے کچھ میں آئے گی کہ بہت سے کار آزمودہ سپاہیوں کی ماتحتی میں فوراً بہت سے سپاہی مفید فوجی مقامات پر بھیجے جانے لگے اور جرہ فوجی مرکز قرار دیا گیا۔ یہ اشتر کی فوجی قابلیت، ہوشیاری، مستعدی اور کار آزمودگی تھی، عام حالت اس سے بھی کچھ میں آئے گی کہ اگرچہ کوفہ میں حکومت کی طرف سے قحط بن عمر کا ایسا تجربہ کار اور پہلور سپاہی موجود تھا، لیکن اس نے بھی حکومت کے موجودہ قائم مقام عامل عمر بن حریس اسکوئی کو صلاح دی کہ ”سیلاب کو حالت جوش میں“ نہ روکے۔ سعید جس وقت سرداروں کی ”معتول گرفت“ کی صلاح صادر کر کے کوفہ واپس آ رہا تھا، اور عذیب پہنچا اسے عبداللہ بن کثنہ کے تین سواروں کی فلولی صفت سامنے دکھائی دی، جو یہ کہہ رہی تھی کہ: ”اے دشمن خدا کیل جاتا ہے، لوٹ جا چاہی سے آیا ہے۔ اب دوسری چیزوں کا کیا ذکر ہے تو فرات کا ایک قطرہ نہ رہی سکے گا۔“ اور درود انگیز مظر تھا کہ لمبی شان والا سعید جھینکتا ہوا چلا کہ خلیفہ سے فیلا کرے کہ جس کی ”معتول گرفت“ اور ”ہلاکت“ کی ہم صلاح دے رہے تھے انہوں نے ہماری ”معتول گرفت“ کی اور ہمارے وقار کو ”ہلاک کیا“ اور اگر ہم اپنے کو ظلم کا محسوس جسم نہ دکھاتے تو ہلاکت دور نہ تھی۔ یہی نہ تھا۔ مسرید کرنے اور عرضداشتیں بھیجنے کا وقت گزر چکا تھا۔ دلیل مٹنے سے اب دہانے ہاتھ میں آگئی تھی، نہ بانی گفتگو کا موقع نہ رہا تھا۔ تلوار کے بولنے کا وقت تھا، اور اشتر کو اب حشک دینا تھا کہ: ”جاد عثمان سے کہہ دو کہ ابو موسیٰ کو صبح دے۔“ اور خلیفہ کو تعلق قائم رکھنے کے لیے راضی ہو جانا تھا۔ نہ اس کے قبل کہ وقار کو صدمہ پہنچ چکا اور اس سے زیادہ قابل افسوس یہ ہے کہ یہ تہمت نہ تھی۔

اب جو خط خلیفہ نے اہل کوفہ کو بھیجا اگر اس کا مفہوم یہ تھا کہ وہ لوگوں کی جرأت باز پرس پر شان دار حیرت صرف کر رہے تھے بغیر لوگوں کا حق قبول کیے ہوئے اور اس کی تصحیث کر رہے تھے کہ پس تم اطاعت کے سوا کوئی خیال ہی دل میں نہ لاؤ تو اہل کوفہ اپنے جواب میں خلیفہ کی بے رعایت نکتہ چینی کر رہے تھے اور اپنی پسند کے قابل امام کی تعریف کر رہے تھے اور اس امر کو وقت سے ظاہر کر رہے تھے کہ ہم اپنے خیال پر قائم ہیں، اگرچہ اس سے ہم میں اور تمہارے روابط میں کھینچائی ہی کیوں نہ ہو جائے۔ وہ ایسے خود غرض، بے لحاظ اور ناشنو عامل نہیں چاہتے تھے جو حکومت کو اپنی خواہش کا پر تو دیکھنا چاہتے ہیں۔ وہ حکومت کی روش سے مشتبه ہو گئے تھے کہ وہ ایسے لوگ سمجھتی ہے۔ تمہیں اس نے ہمارے ساتھ سب کچھ کرنے کا اختیار دیا ہے، لیکن میں کسی اعتراض کرنے کا حق نہیں دیا ہے، بلکہ ہمارا اعتراض وہ کسی ہی فریاد رسی اور داد خواہی کے لہجہ میں کیوں نہ ہو اس لیے ناگوار گزر تا ہے کہ ہم نے کیوں داد خواہی کے لیے اپنی صدا بلند کی۔ اور حکومت کو اپنے مصلحتوں پر یہ اعتبار تو ہے کہ وہ حکومت کے ساتھ فائدہ کے اشتراک کے لحاظ سے کوئی بد معاملی نہ کریں گے۔ لیکن اسے مطلق اس کی فکر نہیں ہے کہ وہ عام رعایا کے ساتھ کس طرح کا برتاؤ کریں گے اور ان کا برتاؤ قابل ہاز پرس

یہی ہے یا نہیں۔ بلکہ انہیں خیال تھا کہ خلیفہ اپنے ماملوں سے اس لیے باز پرس نہیں کرتے کہ مبادا وہ حکومت سے برا فرد خستہ ہو کر اپنے کو اپنی جگہ آزاد اور خود مختار دیکھنا نہ چاہیں اور اس لیے عمال کی ناخوشی پر انہوں نے رعایا کی ناخوشی کو گوارا کر لیا ہے۔ پھر بھی اہل کوفہ نے اپنی آواز سنانے کے بعد خاموشی سے حکومت کے ہر حکم کو اپنے اوپر گوارا کیا اور اس وقت تک مصمم عملی مخالفت کا ارادہ نہ کیا جب تک وجوہات میں اختلاف نہ ہوتا گیا اور انہیں یہ یقین نہ آ گیا کہ موجود نظام حکومت سے کسی اصلاح کی امید کرنا اپنے کو تباہ کرتے جاتا ہے۔

کیا یہ ممکن تھا کہ ایسا نہ ہوتا جیسا ہوا۔ نہیں ضرور ہوتا۔ وہ حوصلہ خیز مصلحت جو وہ ضرور ہوتا جو کچھ ہوا۔ رسول کے بعد ایسا ہوتی تھی اس کا اور کوئی نتیجہ نہ ہوتا نیز اس کے جو کچھ ہوا۔

کچھ عثمان ہی کے ساتھ موقوف نہ تھا۔ کوئی دوسرا ان کی جگہ ہوتا یا خلیفہ ثانی کو کچھ اور زمانہ ملا جس میں انہیں دم لینا پڑتا تھا۔ کچھ عثمانوں کے خلیفہ ثانی کے زمانہ میں ایرانی سلسلہ کوہ کے سرحد قرار دیے جانے اور صلح کے بعد فارس پر دوبارہ فوج کشی کی گئی۔ یہی وجوہات پر کیوں نہ مبنی ہو لیکن سپاہوں کو مشغول رکھنے کی ضرورت نے دوبارہ فوج کشی کے تصفیہ پر قوی اثر ڈالا ہوگا۔ اس ناگوار نتیجہ کے جلد واقع ہونے میں ضرور حضرت عثمان کی کئی احتیاط لے جلدی کی۔ جو کچھ ممکن تھا وہ بھی تھا کہ نتیجہ آئندہ کے لیے مالا جاتا۔ اس کے لیے ابن ابوقحافہ یا ابن الخطاب چاہیے تھے۔

بنی ہاشم کی پامالی کے بعد بنی امیہ کا صاحب اختیار نہ ہونا ممکن نہ تھا۔

تھا کہ بنی ہاشم کے حقوق اور تقدس کی طرف سے تجاہل اور ان کے اختیارات کی پامالی کے بعد بنی امیہ صاحب اختیار نہ ہوتے۔ اس لیے کہ اگر عرب کی جماعت سے بنی ہاشم نکال دیے جاتے تو بنی امیہ کو ثروت اور حد کی جو مدد ملتی اور ان کے جاہلیت کے اثر کی بنا جس قدر معین ہوتی وہ دوسرے کو حاصل نہ تھی۔ ابوبکر یا عمر اپنے اپنے لڑکوں کو خلیفہ منتخب نہیں کر سکتے تھے۔ نہ کر سکتا ان کے اس ہوش پر مبنی تھا کہ بنو تمیم اور بنی عدی کی وقعت ایسی نہیں ہے کہ ہمارے لڑکوں کے مدد کے لیے صرف خلیفہ کا لڑکا ہونا کافی ہو۔ اور لوگ اور بہت سے احتراض لے کر کھڑے ہو جائیں، دوزخ کا حکم ان لڑکوں کے پاس نہ خلیفہ ہو جانے کے وہ اتفاقات ہوں اور نہ دلائل ہوں جو ہمارے لیے لائے جاسکتے تھے۔ جیسا خود سعید کے ایک سوال پر کہ ابن عثمان کو خلیفہ بننا زہر نے اپنے حوصلوں کے زمانہ میں قبول ابن خلدون جواب دیا کہ: ”یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اکابر و شیوخ مہاجرین کو چھوڑ کر ان لڑکوں کو حاکم بنائیں۔“ نہ حضرت ابوبکر حضرت عمر کی موجودگی سے چشم پوشی کر سکتے تھے اور نہ علیؓ یا القیاس حضرت عمرؓ اپنے گرد و پیش کے واقعات سے غافل تھے۔ اس لیے انہیں (اولاد کو) نہ صرف ان قیاسات کے حوالہ کرنا تھا کہ ان کی مخالفت ہو بلکہ انہیں اس لحاظ سے بھی عروم کر دینا تھا جو اس سے پیدا ہوتا کہ خلفائے اپنے اعزاء کو اپنا جانشین نہیں کیا، اگرچہ کسی کی دانست میں محض ”ممکن ہو“۔ بہت سی باتیں ممکن ہیں لیکن سب قابل عمل نہیں ہیں۔ اور نہ خلفائے کے لیے یہ ممکن تھا کہ وہ بنی امیہ کو علیحدہ رکھتے جس طرح بنی ہاشم کو علیحدہ رکھا تھا۔ ایسا کرنا ان دوز بردست گردہ کو ایک کر دینا ہوتا۔ بلکہ دیکھا یہ گیا کہ علیؓ ایسا موقع آتے ہی ایک جو قبضہ میں کیا جاسکتا تھا اپنی بنی امیہ کا گردہ خرید لیا اور خواہی خواہی قوی ہوتا گیا۔

انگوٹھی کا گرنا تخت سے گرنا تھا

جہاں یہ سب ہو رہا تھا عقیدت کے لحاظ سے علمہ ناس میں غلبہ کی طرف سے ایک اور توحش پیدا ہوا۔ اور وہ یہ تھا کہ کہا

جاتا ہے کہ جس انگوٹھی سے جناب رسالت مآب اپنے فرامین پر مہر فرماتے تھے اور جو غالباً اپنے اعلان نیابت کے لیے خلفا نے اپنے قبضہ میں رکھنا مذہبی پہلو سے مفید سمجھا تھا عثمان کے ہاتھ سے گر گئی۔ انگوٹھی کا گرنا ان کا تخت سے گرنا، یا لوگوں کے قلب سے گرنا تصور کیا گیا۔ چاہ عریض نہ کچھ زیادہ گہرا تھا اور نہ پانی تھا خاک چھانی گئی لیکن انگوٹھی کہیں نہ تھی۔

ان واقعات میں کسی قدر حیرت خیز صورت ایک یہ بھی تھی کہ لوگوں کی توجہ جناب امیر کی طرف مائل ہوئی اور اکثر موقع پر صرف انھیں کو مدخلت یا وساطت کا شاہانہ بھتے۔

ان واقعات میں یہ دیکھنا ہے کہ ایسے موقع پر جب کہ لوگوں کو حکومت سے کوئی اذیت پہنچتی تھی وہ کیوں علی کو

لوگ کیوں علی کے پاس جاتے تھے

دھونڈتے تھے کیا اس لیے کہ ایک غم زدہ دوسرے درد رسیدہ کو ہمدردی کے لیے تلاش کرتا ہے۔ کیا لوگوں کی توجہ اس کی تھی ہے کہ سیاسی بے چینیوں سے قطع نظر کر کے علی کی وقعت علمہ ناس کی نگاہوں میں کبھی کم نہیں ہوتی تھی، اور وہ ایک مشکل وقت جب انھیں کسی اور سے تسکین نہ ہو علی کو تلاش کرتے تھے کیا اس لیے کہ زمانہ گزرا تھا جس میں پیش پیش لوگ اپنے خیالات اور معاملات کے لحاظ سے اس طرح کچھ میں آگئے تھے کہ وہ اخلاقی اعتبار کے مرکز نہ ہو سکتے اور ان شور انگیز وقتوں نے علی کو موقع دیا تھا کہ وہ اپنے کو اپنی حقیقی شان سے دکھاتے اور ان کی غریبیاں دلوں میں گہری جڑ پکڑتیں اور وہ لوگوں کی آخری امید ہوتے۔ اور ہم لوگ یہ دیکھتے کہ ایسے نازک وقتوں میں جب کہ اعتبار ایک نہایت مفید ہوتی ہے اور جس کے بغیر کسی بڑے معاملہ کی ابتدا ہی نہیں ہو سکتی، بغیر کسی سفارش یا نمائش کے لوگوں کو کوئی ذات ہی نہیں دکھائی دیتی۔ علی کی ذات کے سوا جو اعتبار اور اطمینان دلا سکے۔

خلق اللہ کے میلان سے حکومت بھی علی کی وساطت چاہتی تھی

معاملت کی یہ صورت اسی طرح تمام نہیں ہو جاتی بلکہ اس کے عکس میں ایک اور پر تو اختیار کرتی ہے۔ یعنی پہلی صورت تو یہ تھی کہ لوگوں کو حکومت سے معاملہ تھا اور وہ لوگوں کی کم قوتی ہو، انصاف پسندانہ خواہش اصلاح ہو، یا محض خاموشی سے شکایت ہو کہ انھیں ایک پہنچ کی ضرورت تھی لیکن واقعات کا نشانہ اس طرح بھی ہونے والا تھا کہ حکومت بھی علی کی وساطت پر مجبور ہوتی۔ وہ حکومت کی کمزوری ہو، یہ کچھ کہہ کر جو کہ اصولاً حکومت اس قدر مرفوع الاعتبار ہو گئے ہیں کہ اب ان سے کوئی کام لینا لوگوں کو اور جوش دلاتا ہے۔ یا اس لیے ہو کہ علی (یا وہ ذات جس پر لوگوں کو اطمینان تھا) کو درمیان میں لا کر وقت حاصل کیا جائے۔ اور لوگ علی کی وساطت کو بھی غیر مفید سمجھ کر حکومت کے ساتھ علی سے بھی ناخوش ہوں۔

علیق نے کب تک اس نازک دھڑے دکھایا جائے گا کہ آخری موقع کو علی کچھ بچے تھے اور اس اخلاقی منصب سے براءت کا اعلان نہیں کیا

تھی۔ اور جب یہ امید منتقل ہو گئی تو اپنے پہنچ کے منصب سے استعفا دیدیا۔

غالب پہلا موقع وہ تھا کہ بنی مخزوم نے عمار کے ساتھ تشدد کی علی سے شکایت کی اور انھوں نے جا کر بھجایا۔ اس کے بعد اگرچہ کسی نہ کسی طرح عمار اور عثمان میں التوائے جنگ کی حالت پیدا ہو گئی۔ لیکن ابوذر کی رحلت کی خبر سن کر جب خلیفہ نے ”رحمہ اللہ“ کہا اور عمار نے پوچھا کہ کیا یہ دل سے کہا ہے؟ تو اس پر عثمان نے جواب دیا کہ: ”کیا تجھے شک ہے کہ میں نے جو نکال دیا تو اب شرمندہ ہوں۔“ عمار نے جواب دیا: ”واللہ نہیں!“ اس پر عثمان نے انھیں بھی نکال دینے کا حکم دیا تو پھر بنی مخزوم علی کے پاس شکایت لائے اور جناب امیر نے دوبارہ عثمان سے فرمایا کہ: ”ابوذر کے واقعہ سے لوگ ناخوش ہیں اور عمار کے لیے بھی جو حکم دیا گیا ہے وہ ”مناسب نہیں ہے۔“ اس پر جواب ملا کہ: ”پہلے تمہیں شہر بدر کرنا چاہیے۔“ یہی مجمع تھا جن میں متیرہ بن انفس لفظوں میں علی کی تائید کرتا کہ: ”رسول کی خدمت میں جو تیرا مرتبہ ہے وہ کسی کا نہیں ہے۔“ اور متیرہ بن شعبہ کہتا کہ: ”تم چاہو یا نہ چاہو تمہیں حکوم رہنا ہوگا۔“

آگ اس قوت سے نہیں لگی تھی کہ دو ایک چھینٹے اے بچا سکتے یا بچتی در اخیالیکہ بچانے کی مناسب کوشش ہی نہ کی جاتی۔ اس وقت تک ”چاروں طرف طمانیہ طعن و تشنیع کا بازار گرم ہو گیا۔ روزانہ اس کی متواتر خبریں مدینہ میں پہنچنے لگیں اور مدینہ میں بھی لوگوں میں سرگوشیاں شروع ہو گئیں۔“ اب پھر علی تھے اور لوگ تھے جو علی سے کہتے تھے کہ ہماری شکایتیں خلیفہ سے کہہ دیجیے اور اصلاح کرا دیجیے۔

علی کی حسرتیں موقع کی صریح صورت یہ ہے کہ جناب امیر کی آنکھ واقعات کو دیکھ رہی ہے اور عثمان کو بھاری ہے۔ علی کے کھن اور الفاظ پر غور کرو کہ آیا اس سے زیادہ شریفانہ متانت ایک ایسے شخص سے ممکن ہے جس کا حکومت کے نزدیک اپنے حق کے لحاظ سے نہایت ہی نازک موقع رہا۔ پھر بھی وہ اس وقت جماعت کے ایک فسر، ایک گروہ کی زبان، اپنے علم اور اپنے عقیدے کے لحاظ سے ناصح کی حیثیت سے آیا ہے۔ اور معلوم نہیں ہوتا کہ سطح سے کوئی چھوٹی سے چھوٹی لہر بلند ہو رہی ہے جس میں ناگوار لغم ہو، بلکہ وہ اس وقت انسانی ”حق“ کے وکیل تھے اور اپنا ”فسر“ ادا کر رہے تھے۔

شاید جناب امیر کے یہ الفاظ کہ: ”اپنے بابت غور کرو“ یا یہ جھتی ہوئی جھجک کہ: ”تم بے بصیرتی سے نہیں دیکھتے اور نہ تم جہالت سے کچھ نہیں جانتے۔“ یا فرمانا کہ: ”راستہ واضح ظاہر اور احاطہ دین قائم ہیں۔“ بعض کے نزدیک محض استغفارہ ہو۔ اگر کسی کی دانست میں یہ صورت ہو تو آگے چل کر یہ فقرہ استغفارہ کی سرحد سے نکل کر صراحت کی صورت اختیار کرتا ہے کہ: ”میں تم کو اس سے ڈراتا ہوں کہ تم اس امت کے امام مقتول ہو۔“ اور اس کا ایک نتیجہ یہ ہو کہ: ”قتل و قتل کا دروازہ قیامت تک کھل جائے۔“ جس سے ”واقعات ملتبس اور مشتبه ہو جائیں گے۔“ اور لوگ ”حق کو بوجہ علوے باطل نہ دیکھ سکیں گے۔“ اور اضطراب و احتکال اس میں پیدا ہوں گے۔“ امت کی بدھشی سے جناب امیر کے یہ الفاظ ایسے بچ ہوئے کہ گویا وہ جناب آئندہ کو اس طرح دیکھ رہے تھے کہ اس نے صورت اختیار کر لی تھی جس کا تذکرہ ہمارے آئندہ باب میں کیا جائے گا۔

کسی وقت بھی خلیفہ نے اپنے افعال پر نظر ثانی نہ کی اگر کوئی اور دلیل نہیں بھی ملتی جاسکتی تھی تو غالباً امت رسول میں

”واقعات کے ملتبس اور مشتبه ہو جانے سے“ قتل و قتال اور اضطراب و اختلال پیدا ہونے کا واسطہ ایسا تھا جس کے لحاظ سے خلیفہ کو اپنے روش پر نظر ثانی کی ضرورت تھی۔ لیکن ایسا ہونے والا نہ تھا۔ سوچا اگر تم سوچ سکتے ہو کہ خلیفہ کو اپنی روش پر اصرار کے علاوہ کچھ اور سمجھنا تھا جب کہ علی کی وکالت کے تمام ہونے پر وہ میسر ہو گئے۔ آج فصاحت ان کا ساتھ دے رہی تھی اور وہ داد خواہوں سے کہہ رہے تھے کہ: ”تم لوگ میری نری اور الطاف کی وجہ سے جری ہو گئے ہو۔“ ”تم لوگ اپنے خیالات تبدیل کر دو۔۔۔۔۔ ار اپنے کاموں کو اپنے امرا پر چھوڑ دو۔ جن کو میں نے مامور کیا ہے۔“

پہلا موقع جس سے معاویہ کا حوصلہ خلافت ظاہر ہوا

جن میں سے ایک تو یہ تھا جو علی، طلحہ اور زبیر کے سامنے آ رہا تھا گیا کہ: ”تم لوگوں نے اس امر میں کچھ فیصلہ کیا ہے تو میں موجود ہوں۔“ اس سے یا تو یہ غرض تھی کہ یہ لوگ ٹٹولے جائیں کہ آیا ان میں عثمان کو معزول کرنے کا کوئی تصفیہ ہوا ہے یا نہیں، اور اگر ہوا ہو، اور یہ لوگ آئندہ کے لیے کوئی دستور العمل مرتب کر چکے ہوں تو اپنی رضامندی ظاہر کر کے اس کے ایک مقتدر حصہ دار بن جائیں۔ اس میں کامیاب نہیں ہوا۔ ایسا ہی خیال کعب الاحبار کے سامنے معاویہ نے ظاہر کیا تھا کہ: ”اگر مجھے معلوم ہو تا کہ عثمان کے بعد کون خلیفہ ہو گا تو میں اس کی بیعت کرتا۔“ چلتے چلتے عثمان سے بھی ایک بات کہہ لی کہ: ”اس سے پہلے کہ آپ پر حملہ ہو جس کا آپ تحمل نہ کر سکیں، مناسب ہو گا کہ آپ میرے ساتھ شام چلے جائیں۔ کیونکہ کل اہل شام میرے مطیع ہیں۔“ اس فقرہ میں خوش خلقی اور محبت یا احسان کی حریر داغ سے بھی زیادہ ہے۔ لیکن میرے خیال میں آج پہلا موقع تھا جس میں معاویہ کا آئندہ خلیفہ بن جانے کا حوصلہ ظاہر ہوا۔ وہ خلیفہ کونہ صرف بجلے یا برے ہوا خواہوں نے اثر سے نکال رہا تھا بلکہ انھیں شام میں خلیفہ دکھا کر تمام اختیارات اور اثر پر خود قابض ہو جانا چاہتا تھا۔ اور اس کے بعد خلیفہ کے رحلت پر مطیع اہل شام کے سامنے اپنے کو خلیفہ کہنا کچھ مشکل نہ تھا۔

یہ مصلحت حضرت عمرؓ اور ابن عوفؓ کی مصلحت سے قطعاً مشابہ تھی صرف اتفاقات کی قوت کا فرق تھا۔ یعنی معاویہ وہاں خلیفہ کو قائم رکھنا چاہتا تھا جہاں وہ حاکم بھی تھا۔ اور اسے اسلحہ کے لیے نہ صرف احسان بلکہ اپنی قوت سے بھی امید تھی۔ لیکن یہ آخر موقع تھا کہ معاویہ عثمانؓ کی حیات میں مدد کا وعدہ کرتا۔ اس لیے کہ خلیفہ کے آخری وقت ان کے استیغاثہ مدد کو یہ جواب پانا تھا کہ: ”خدا نے جس سے کوئی نعمت چھین لی ہو میں اسے واپس نہیں کر سکتا!“۔ اور بقول جناب امیر کے معاویہ وہاں ابن عفانؓ کی مدد کرتا تھا جہاں اسے اپنے قلعہ کی امید تھی۔

آخری وقت قریب آتا جا رہا تھا اور اہل مصر کے ابن سراج کی شکایت پر جب عامل کے نام خلیفہ نے تہدید کی خط روانہ کیا تو عامل مصر نے بجائے اس کے کہ کوئی اصلاح کرتا اس شخص پی کو رفع کر دیا جو خط لایا تھا اور جس جماعت کی طرف سے شکایت کی گئی تھی اس کی باز پرس شروع کی۔ اب بقول ابن عمر مصر سے سات سو آدمی آئے اور اوقات نمازیں صلیب رسول سے مسجد میں جا کر شکایت کی۔ طلحہ نے عثمان کو ”سخت“ باتیں کہیں۔ خود حضرت عائشہ نے بھی ابن ابی سراج کو معزول کرنے کے لیے کہلویا اور جناب امیر نے بھی ایسا ہی فرمایا۔

اب غلیفہ نے لوگوں کی خواہش سے محمد بن ابی بکر کو مصر کا عامل مقرر کرنا منظور کیا۔ لوگ روانہ ہوئے اور کچھ مہاجر و انصار بھی صورت معاملہ دیکھنے کے لیے ساتھ چلے۔ مدینہ سے ابھی تین دن کا راستہ طے کیا تھا کہ ایک حبشی غلام دکھائی دیا جو ”کسی کو ڈھونڈتا تھا، یا کسی سے بھاگتا تھا“۔ اسے روکا تو اس نے اپنے کو کبھی عثمان اور کبھی مروان کا غلام بتایا۔ لیکن جو بات اس نے لوگوں کے توجہ کے قابل کی وہ یہ تھی کہ ہم ”مصر کے عامل کے پاس جاتے ہیں“۔ لوگوں کا استیجاب اس سے اور بڑھ گیا اور انہوں نے کہا کہ چلو عامل مصر کے پاس لے چلیں، وہ تو یہیں ہیں۔ تو اس نے کہا کہ ہمیں ”عامل اول“ سے کام ہے۔ شبہ ہوا، تلاشی لی گئی اور ٹھہلک خط برآمد ہوا۔ جو عامہ ناس کے سامنے پڑھا گیا۔

آسان تھا کہ یہ خط غلیفہ کے سامنے پیش ہوتا، اور حکومت اس سے انکار کر جاتی، اس لیے اس پر حاضرین کی دستخط یا مہر

خط گرفتار کرنے والوں کی احتیاط

کر لائی گئی، اور ایک معتد کے پاس حفاظت سے رکھا گیا۔ یہ لوگ اگلے پاؤں مدینہ واپس گئے۔ ابھی بعض مخالفت کے داو خواہ و فو واپس بھی نہ گئے تھے کہ انہیں یہ حقیقت معلوم ہوئی اور نتیجہ یہ ہوا کہ: ”اہل مدینہ میں کوئی نہ رہا جو عثمان سے دل تنگ اور خضہ نہ ہوا ہو۔“

پھر بھی غلیفہ کے خلاف کوئی سخت کارروائی اختیار نہ کی گئی۔ بلکہ اس کے

لوگ رفع نزاع چاہتے تھے

پہلے لوگوں نے تصدیق اور رفع حجت چاہی۔ اور عثمان نے اس کا اقرار کیا کہ: ”اوٹ، مہر اور غلام ہمارا ہے۔“ لیکن مضمون خط سے انکار کیا۔ اس کے بعد بھی لوگ مان لینے پر آمادہ تھے، بشرطیکہ عثمان اپنے سیکرٹری کو حوالہ کر دیں جس کے علاوہ کوئی تیسرا یہ مضمون نہیں لکھ سکتا تھا۔ لیکن عثمان نے مروان کو حوالہ کرنے سے انکار کیا۔ مشکل سے یہ موقع بچنے کے قابل ہے۔

ابے موقع پر یا تو عثمان اس لیے حوالہ کرنے سے انکار کر سکتے تھے کہ

مروان کی حفاظت کے معنی

مروان نے جو کچھ لکھا تھا وہ ان کے ایما سے لکھا تھا اور اگر اپنے موقع کے بچانے کے لیے غلیفہ نے انکار کر کے مروان پر عکس ڈالا تھا تو اس کا بچا لینا بھی ان کا فرض تھا۔ اور یا اس لیے بچا سکتے تھے کہ اگرچہ انہیں علم نہ تھا کہ کیا لکھا گیا ہے لیکن معلوم ہونے پر اس کے بچا لینے کی کوشش سے یہ بکھایا کہ جو کچھ اس نے کیا، اسے ہم پسند کرتے ہیں۔ جس کی مثال پیشتر گزر چکی تھی کہ غلیفہ اول کے عہد کو جب ابن اخطاب چاک کر ڈالتے تو ابوبکر ان کے اس فعل سے کوئی اظہار ناراضی نہیں کرتے، بلکہ اسے اپنی طاعت کے شایان سمجھتے ہیں۔

کسی فرد قوی کی حفاظت کے لحاظ سے حضرت عثمان نے مروان کا بچا لینا کیسا ہی ضروری کیوں نہ سمجھا ہو۔ لیکن اگر وہ اس پر راضی تھے کہ ان کا مکار سیکرٹری بے گناہوں کو قتل اور جس کرا دیتا۔ اگر اس کی چل جاتی تو انہیں لب اس پر راضی ہو جاتا تھا کہ سلطنت کا اعتبار قائم رکھنے کے لیے ان کا یہ مخدوش دوست شہربان کرا دیا جائے۔ ایسے پر جو شخص موقع پر اسے بچا کر اپنا اعتبار کموتا تھا۔ اور ایسا کرنا اپنے نظام سیاست کو شکنجی اور ملتی ہوئی آگ کے حوالہ کرنا تھا۔ ان اس پر نظر ڈالنے کی ضرورت نہیں سمجھتا کہ بحیثیت غلیفہ رسول کے ان کا یہ فعل کس نگاہ سے دیکھے جانے کے قابل تھا۔ ابن خلدون احتیاط کرتا ہے کہ ان طرز عمل کے تذکرہ کے وقت بھی نام کے ساتھ ”امیر المومنین“ کا لفظ چھوٹنے نہ پائے اگرچہ وہ یہ جو

دیکھ رہا ہو کہ مہاجر و انصار گھر سے باہر نہیں نکلتے اور اہل مصر کوفہ اور بصرہ نہ خود خلیفہ کے پیچھے نماز پڑھتے ہیں نہ دوسرے کو پڑھنے دیتے ہیں!۔

جنگی تیاری کوئی حیرت کی بات نہیں ہے اگر ایسے وقت میں خلیفہ نے بقول ابن خلدون: ”والیمان مملک اسلامیہ کے نام متفقہ فرامین بھیجے اور انھیں واقعات سے مطلع کیا۔“ کیا غرض ہو سکتی تھی ان فرامین کی بجز اس کے کہ اپنے کو اپنی جگہ قائم رکھنے کے لیے فوجی امداد طلب کی جاتی کہ شکایت کرنے والوں کا نہ کار ہے نہ آواز رسے۔ اور حقیقتاً فوجیں روانہ بھی ہوئیں لیکن قضا و قدر نے انھیں وقت پر نہ پہنچایا اور اسی زمانہ میں خلیفہ نے عبداللہ بن عمر کی یہ یادگار صلاح بھی پسند کی کہ ”یہ طریقہ جاری نہ کرو کہ جس وقت جماعت خلیفہ سے راضی نہ ہو اسے معزول کر دے۔“ اور اس کا یقین دلا دیا کہ جماعت کی ضرورت اور عصمت محض نصب تک تھی۔ میں نہیں جانتا کہ علامہ ابن حجر اس موقع پر کیا منسرماتے۔ اور اس فقرہ میں عصمت دیکھتے یا نہ دیکھتے کہ: ”تم جھوٹے ہو یا سچے ہو اور ہر تقدیر تم سے خلافت لے لینا مناسب ہے۔ کیونکہ جھوٹے کو مسلمانوں کا والی بنانا جائز نہیں اور اگر سچے ہو تو تمہارا نصبت اس حد تک پہنچ گیا ہے کہ تمہارے بغیر اجازت و اطلاع جس کا جو بی چاہتا ہے کرتا ہے۔“ اور اس کے بعد نہیں معلوم مولوی شبلی صاحب اپنے ”حاکمانہ لیاقت“ والے فقرہ میں عدد کے لحاظ سے کوئی ترمیم مناسب تصور فرمائیں گے یا نہیں جس کو انھوں نے (حضرت عمر کے سچے منتخب لوگوں میں جن میں عثمان بھی تھے) حضرت عثمان کے لیے بھی استعمال فرمایا ہے۔ اگر ”جس کی چل گئی“ کا فلسفہ سیاست درست ہے تو کیسے اس سیاسی اخلاق کے بنا پر ان لوگوں پر کوئی اعتراض کرے گا جنھوں نے خلیفہ کو محصور کر لیا، در انحالیکہ ان کے افسروں کو اس کا اندیشہ تھا کہ اگر خلیفہ یا ان کے مویدین کی چل گئی ہو تو ہم کو یا تو ملک الموت کے جلد آنے کی دعا مانگنی ہوتی اور یا بن بلانے میں مجبور ان کا استقبال کرنا ہوتا۔ اور اب بھی وہ اندیشہ رفع نہ ہوا تھا، جیسا طلحہ کی زبان نے بتایا کہ: ”عثمان راسخت گیرید کہ فوجی او نزدیک آمد۔“

ان تمام امور ات کے برداشت کے بعد بھی جو علی پر گزر چکے تھے اور اس فرمانے کے بعد بھی کہ: ”قسم خدا کی میں نے معاشرہ کو اس سے دفع کیا حتیٰ کہ اب مجھے گنہگار ہونے کا خوف ہے۔“ وہ فریقین کی اصلاح کے لیے آمادہ تھے صرف اس کی ضرورت ان کی نگاہ میں تھی کہ: ”مجھے عہد کر دو کہ جو کچھ تم کہتے ہو اس پر وفا کرو گے؟“۔ کیونکہ بغیر کسی ایسے اطمینان کے ان کے پاس جانا بے سود تھا۔ جو اس لیے ”نہیں چھوڑ سکتے“ تھے کہ: ”مبادا سال آئندہ اور فقہ و فساد بڑھا نہ ہو۔“ اور جو ان تینوں باتوں میں سے کسی ایک پر ارادے مصمم کر چکے تھے کہ: ”خلع، موقوفی عمال، یا قتل۔“ عثمان جب خلیفہ ہو جانے کے لیے تمام شرائط قبول کر سکتے تھے جو عائد کی جاتی تو لذت حکومت حاصل ہونے کے بعد کیا کچھ اقرار نہیں کر سکتے تھے۔ اگر اس کا شدید تزلزل مائل بہ سکون ہو جائے لیکن وہ مداخلت جس کے لیے علی بغیر اکراہ آمادہ نہ ہوئے تھے اور جس کے بغیر ایسا بڑا نتیجہ حاصل نہیں ہو سکتا تھا کہ ایسے مصمم لوگ جو گویا اپنے قتل کے فریب کا انتقام لینا چاہتے تھے ہتھیار روک رکھتے۔ ان کا اپنے جوش کو حکومت کے بار بار عہد شکنی کے بعد بھی اصلاح کی امید پر روک لینا بے انتہا تعریف کا مستحق تھا۔ اب اس تمام کوشش کا یہ ناسف خیز مذاق تھا کہ ”امیر المومنین عثمان نے کسی وجہ سے کسی قسم کا تقیرو تبدیل نہ کیا۔“ یا ایک مرتبہ معذرت اور اصلاح کا وعدہ کرنے کے بعد پھر ممبر پر بیٹھ کر انکار کرتے اور لوگ پکاراٹھتے کہ:

”خدا سے ڈرو اور توبہ کرو“۔ یا جب کسی دھدھہ کے بعد لوگ خوش خوش رخصت ہونے کے لیے آتے تو سیکرٹری کو ”درستی“ کی ہدایت ہوتی اور وہ لوگوں سے کہتا کہ: ”تم لوگ ہمارے قبضہ سے ہمارے ملک کو چھیننے آئے ہو“۔ اس طرز پر بھی تشکیں نہ ہوتی اور رجسٹرار بن سلیمان بن داؤد کے لہجہ میں جس کی ”چھٹکلیا اپنی باپ کی کمر سے زیادہ دلدار تھی“ مروان جواب دیتا کہ: ”اگر تم نے کسی قسم کا قصد کیا تو ہم تم پر ایسا بوجھ ڈالیں گے کہ جس کو تم اٹھانہ سکو گے“۔ اور غرہ یہ ہوتا کہ: ”جو ہمارے قبضہ میں ہے اس میں ہم تم سے مغلوب نہیں ہیں“۔

حالت اب ایسی پچھ گچی تھی کہ جناب امیر خلیفہ کے پاس جا کر کہہ دیتے کہ: ”آج سے اب میں پھر تمہارے پاس نہ آؤں گا“۔ کب تک علی مداخلت کرتے رہے اور اپنے کو اس عہدوش شبہ میں مبتلا کرتے کہ وہ تنہا شخص جس کا اب تک تمام ذوق اعتبار کرتے رہتے کہیں حکومت کے امور میں شریک تو نہیں ہے اور ان افعال کو پسندیدگی سے تو نہیں دیکھتا ہے۔ اس سے بھی زیادہ ”اب گنہگار ہونے کا خوف تھا“۔ یعنی حکومت کے افعال بہ تکرار صراطِ مستقیم سے ہٹے ہوئے ثابت ہو چکے تھے اور اب مسلمانانہ مداخلت کے معنی یہ تھے کہ ایسے ہی افعال کے صدور کے لیے دوبارہ وقت اور موقع دیا جائے۔

خلیفہ کا سیاسی مجموعہ کیا قہین تھا کہ آئندہ ایسے ہی امور پھر سرزد نہ ہوں گے اس لیے کہ خلیفہ کے سیاسی مجموعہ میں لوگوں کے حقوق کا کہیں موقع نہ تھا بلکہ اگر ارضیں علی سے بھی کچھ کہنا تھا تو یہ کہ: ”اگر جاہلیت ہی کا زمانہ ہوتا تو بھی نبی عہد منات کے لیے یہ امر باعثِ تنگ تھا کہ نبی قہیم ان کے قبضہ سے حکومت چھینے“۔ میں ان تمام لوگوں کو جو حقیقہ بنی ساعدہ کے بیچ کو اسلام کے جمہوریت کی شرح سمجھتے ہوں، اس سمجھنے کے لیے اپنی مدد کو بلاتا ہوں کہ وہ اس میں جمہوریت تلاش کریں۔ افسوس میں کہاں کہاں دکھائوں کہ جمہوریت شعبہ باز کا وہ کلونا تھا جو دیکھتے دیکھتے اپنی صورت بدل دیتا ہے۔ ابن الرقاعہ کو بمقابلہ انصار نہ قریش یا مہاجرین کی افضلیت کے ادعا کا حق تھا نہ ابن الخطاب یہ کہہ سکتے تھے کہ: ”قبیلہ زہرہ کو خلافت و محکمائی سے کوئی نسبت نہیں“۔ نہ عثمان کے پاس بڑا اس کے کوئی دوسری وجہ بمقابلہ نبی قہیم بنی عہد منات کے ”تنگ“ کی ہو سکتی تھی کہ وہ خود نبی عہد منات میں داخل ہوتے تھے نہ یہ نبی عہد منات کی ماکانہ قابلیت کی تعریف کا موقع تھا جس کی غرض استغاثہ مدد یا خود ستائی بھی جاتی حیثیت نبی عہد منات کی تعریف نہ ہوتی۔

اور وہ تمام لوگ جو نفس انسانی کے اس نادمانہ انقلاب کو جسے توبہ کہتے ہیں اصلاح کا پہلا زینہ سمجھتے ہیں ان تمام توبہ ہاتھوں کے بعد جو اب تک ہو چکی تھیں خلیفہ کے اس فقرہ کو غور سے پڑھیں جو طلحہ کے سامنے کہا گیا کہ: ”میں تائب نہیں ہوا لیکن مغلوب ہوا ہوں“ کہ آیا اس پر اصلاح کا کوئی ثوب پڑا ہے بلکہ اپنے فعل پر اصرار کے لیے اس سے زیادہ قوت سے کچھ کہنا ممکن نہ تھا۔

یہ سب کچھ تھا لیکن ابی انسانیت کا حق باقی تھا۔ انصاف اور فیصلہ دوسری چیز ہے اور ایسا رم جو فیصلہ راز نہ ڈال سکے دوسری چیز ہے۔ یہ کہنا ہمارا کام نہیں ہے کہ اگر مصلحتیں ایک طرف اور خلیفہ دوسرے ذوق ہو کر علی سے ان کے مقدمہ کے فیصلہ کی خواہش کرتے تو وہ کیا تجویز سناتے۔ اس وقت خلیفہ نے پانی طلب کیا تھا۔

علیؑ نے اپنے آدمیوں سے مجھا دیا، بلکہ محاصرہ کرنے والوں کو بھی اس "حق بھری" سے منع نہ کرنے کی نصیحت کی۔
نانکہ نے غلطی نہ کی تھی اگر اپنے خلیفہ شوہر کو علیؑ کے مشورہ پر عمل کرنے کی صلاح دی تھی۔ خلیفہ اگر مردوں کے سیاسی حقوق
قبول نہ کرتے تھے تو عورتوں کے ایسے حقوق کا تسلیم کرنا ان سے صدیوں دور تھا۔

بہ استنشا علیؑ کے عثمانؓ کی کوئی مدد نہیں کرتا تھا ان چھ آدمیوں میں جو خلافت کے لیے نامزد
کیے گئے تھے چار آدمی خلیفہ کے مخالف

ہو گئے تھے۔ ابن عوف کی ناخوشی زیادہ تر اپنی انتخاب کی ذمہ داری پر مبنی تھی۔ سعد بن ابی وقاص کے ساتھ بھی ذاتی وجہ تھی
اور طلحہ و زبیر نے عام حوش و غروش دیکھ کر تیار چیز میں شرکت نہ کرنا موقع بینی کی مصلحت کے خلاف سمجھا جس میں طلحہ کو
خلیفہ بھی اچھی طرح سمجھ گئے۔ کبھی کہا کہ: "اللہ تعالیٰ تم کو اسے طلحہ کافی ہو"۔ اور کبھی کہا کہ: "یہ سب تمہارا کیا ہوا ہے۔"
اور کبھی افسوس ظاہر کیا کہ "طلحہ، زبیر اور سعد جمع میں ہوں اور ہمارے سلام کا جواب نہ دیں۔"

اس وقت علیؑ کی ذات نے کیا کیا عبد اللہ بن عمر کا قری نازک رشتہ کی وجہ سے کسی مخالفت پر آمادہ
نہ ہونا زیادہ قابل تعریف نہ تھا۔ اگرچہ ہم اس میں متردد ہیں کہ
انہوں نے خلیفہ کو عزل منظور کرنے کی صلاح دے کر کہاں تک شدنی امر کے واقع ہونے میں مدد دی اور کہاں تک
صلاح دینے کی ذمہ داری محسوس کی۔ اب علیؑ رہ جاتے ہیں اور اپنے اس تمام زمانہ کے افعال میں سخت سے سخت جارح کو
چینا دیتے ہیں کہ وہ امور مسلمین میں کسی بے عنوانی کے باعث ہونے کے اشارہ بھی تلاش کر سکے۔ کیا ان کی یہ روش اس
لیجے تھی کہ حکومت نے ان کے ساتھ احسان اور نرمی کا برتاؤ جائز رکھا تھا۔

افسوس زمانہ جانتا ہے کہ رشول کے بعد سے اس وقت تک وہ کس طرح کے برتاؤ کے شکار تھے۔ لیکن وہ اس سے
نہایت بلند تھے کہ ذاتیات انہیں احسان کرنے سے باز رکھ سکتی، بلکہ اس لیے کہ جب آئندہ زمانہ کی سلیں ان تمام
حالتوں پر نظر ثانی کریں اور سوال کریں کہ آیا اس وقت کوئی محب قوم، محب وطن اور محب مذہب تھا تو انہیں وہ
ذات دکھائی دے جس نے اپنے ہادی کے اعتبار کے ساتھ خیانت نہیں کی کہ "جب لوگ دنیا میں مشغول ہوں تو تم دین اختیار
کرنا۔" دین کو بہت محدود کر دے گا وہ شخص جو اس سے محض چند رشولت مراد لے۔

حضرت عائشہؓ کی مخالفت کا اثر بلاشبہ حضرت عائشہؓ کی مخالفت عورت کی مخالفت تھی اور ابھی
مخالفت کی ترتیب میں انہوں نے وہ انتظامی قابلیت نہیں دکھائی تھی

جو چند مہینوں کے بعد دکھالے والی تھیں اور ابھی وہ زمانہ بھی کچھ دنوں بعد آنے والا تھا جن میں وہ ردا میں نمودار ہوتیں جو اثر
کی زیادتی میں مصیبت ہو سکتیں۔ لیکن یہ امر کم قابل کاغذ نہ تھا کہ وہ ایک گزرے ہوئے خلیفہ کی صاحبزادی تھیں اور رشول کا
شرٹ زوجیت بھی حاصل ہو چکا تھا۔ سوچو صدیقہ کے اس سچے ریمارک کے اثر کو کہ: "ابھی رشول کا کپڑا پرانا نہیں ہوا
ہے کہ ان کی سنت کھنہ ہو گئی۔" اس فقرہ کا طعن نہایت پر حرارت عنصر سے مرکب تھا۔ ان کا فحش اگرچہ عثمانؓ کے عبرت
ناک نتیجہ کا تمام تر سبب نہ تھا لیکن ایک قوی سبب ضرور تھا۔ میں مروان بن حکم کے اس مثل کہنے پر غور کرتا ہوں جب
وہ ام المومنین سے ظہر نے اور کلہ خیر کی استدعا سے مایوس ہو جاتا ہے کہ: "میں نے آگ لگائی اور جب دیکھا کہ شعلے

بلند ہو گئے تو اپنی راہ لی " حضرت عائشہ نے مروان کو مثل کہنے کے معنی بکھلا دیے اور بغیر معذرت یا انکار کیے اپنی راہ لی۔
عثمانؓ کے خلاف انقلاب کی نوعیت ایک آخری لفظ اور بس میں یہ باب تمام کر چکا اور وہ یہ ہے کہ اکثر انقلاب اس کے باعث ہوئے ہیں کہ وہ اپنے

زمانہ کے تمام بھلائی اور برائیوں کو اپنی جگہ سے اکھڑ دی اور جب انقلاب تمام ہو تو چاروں طرف ایک غبار سی حالت دکھائی دے۔ لیکن پیش نظر انقلاب کی اٹھان ہی اس لیے تھی کہ وہ ان تمام برائیوں کے دور کرنے کی وکالت کرے اور اچھی حالت کو اپنی جگہ قائم کرے۔ اس کے طرز عمل کی کوئی بڑی فہرست نہ تھی جس نے موجودہ حالت کا تار تار علیحدہ کر دیا ہو، بلکہ وہ چند آدمیوں کی برطرفی اور اسی نتیجہ کے حاصل کرنے پر مصر اور کوشاں تھی۔ انقلاب اپنی اس کوشش میں کامیاب ہوا۔ کامیابی کے لیے جو ذرائع اختیار کیے وہ پس پردہ نہ رکھے گئے بلکہ اعلان کردہ ضرورتوں سے کسی قسم کی خلاف ورزی نہ کی۔ ان کا طرز عمل کس قدر انصاف سے دیکھے جانے کے قابل ہے اب اس قدر واقعات لکھنے اور ان کی شرح کے بعد مجھے خود کچھ کہنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

انقلاب اور پس بینی اسی طرح یہ بھی ناظر کے تصنیف کی چیز ہوگی کہ کہاں تک یہ انقلاب اس گزشتہ نظام کے خلاف بدرکندہ یا بے ہوشانہ انقلاب تھا جس کی عثمان کا زمانہ حکومت ایک فدا تھا۔ عثمان کو اس اصول نے قتل کیا جس کے معتدل مصرف نے ان کے پیٹروں کو اپنی جگہ قائم رکھا اور اس مصلحت کے سانچے میں ڈھلے ہوئے لوگوں میں اپنے خود غرضانہ حوصلوں کے آزمائے کی اس وقت تک جرأت نہ ہوئی جب تک خلق اللہ کی ہم آہنگی انہیں شرکت کے لیے دکھائی نہ دی۔ اس طرح عثمان کے خلاف دو قوتیں مختلف نقطہ خیال سے منہج تھیں۔ ان دقتوں میں حسینؓ کی قابلیتوں کا فطری نشو و نما تک ہو چکا تھا کہ وہ بغیر کسی کی مدد کے واقعات کو دیکھتے اور سمجھتے۔



میں نے ان واقعات میں زیادہ دقت صرف کیہ

مجھے اس کے سوا چارہ نہ تھا۔

اس سے بھی کمی کرنا گزشتہ

اور آئندہ واقعات کی

زبان کاٹ لینا

ہوتا

○

باب پنجم

رسول کے بعد کے نظام کا سکون اور دوبارہ حرکت

اس باب کا آہنگ اس باب کے شروع کرنے کے ارادہ کے ساتھ ہی مجھے خیال ہوتا ہے کہ میری کتب کا ناظر جس نے عثمان کے اختتامی واقعات پڑھے وہ سوچتا ہوگا کہ میں اب جناب امیر کی حیات کے اس زمانہ کے واقعات بیان کرنے کے لیے یہ آہنگ اختیار کروں گا جس سے جناب امیر علیہ السلام مجھے جاسکیں۔ نہیں، بلکہ صرف اس محدود حیثیت تک کہ انہوں نے نظام قوی اور روح دینی کے قائم رکھنے کے لیے اپنے زمانہ میں کون سے وسائل اختیار کیے۔ خصوصاً اس زمانہ میں جب کہ اس کی مخالفانہ کوششیں تھیں کہ یہ کچھ نہ کر سکیں۔ گزشتہ ابواب میں جس حد تک کوئی واقعہ یا سلسلہ واقعات پیش کیے گئے ہیں وہ محض اس نقطہ خیال سے کہ وہ کون سے اسباب اور آثار تھے جو بالارادہ یا سبب ارادہ شہادت حسینؑ کے باعث اور موجب ہو سکتے اور اگر میں نے جناب رسالتؐ، جناب فاطمہؑ زہرا اور جناب امیر علیہ السلام یا ثنودنمائیے اسلام کا ذکر کیا تو اس کی غرض تھی کہ میں آئندہ حسینؑ کی روش اور تعلق دکھا سکوں اور حسینؑ کے افعال میں جو عکس دکھائی دیتے اس کی ابتدا تلاش کرنے میں شاعرانہ تخیل سے کام نہ لینا پڑے۔

دو متضاد جماعتوں کا اثر ان نفوس قدسی کے حالات اس لیے لکھے گئے کہ یہ بھلایا جاسکے کہ حسینؑ کس روح اور مادے سے بنے تھے۔ لیکن یہ باب اس کے سمجھنے میں مدد دے گا کہ حسینؑ کو اپنے مشہور دنوں میں اپنے پدر بزرگوار کے کون سے افعال اور روش سے اپنے روش کے اختیار کرنے میں مدد ملے۔ اس کے مقابل میں میں یہ بھی دکھاتا آ رہا ہوں کہ ان کی روش کے خلاف بھی کچھ افراد یا جماعتیں کچھ کر رہی تھیں یا نہیں؟ اور ان دونوں کوششوں کی جو اپنی نوعیت میں متضاد تھیں، کیا صورت ہوتی جاتی تھی، اور کیا نتیجہ دکھائی دیتا تھا۔ حسینؑ کی سوانح عمری نہیں ہے مگر یہ کہ افراد اور ایک جماعت کا فروج اور مخالفت ہے۔

رسول کے بعد کے نظام کے سکون کا نتیجہ نبی ہاشم کے حقوق سے یہ واقعات تھے جن کے نتیجے میں حیرت خیز کہنے میں مجھے کوئی ظلم نہیں ہے، اور ان کا نتیجہ یہ تھا کہ رسول کے بعد جو نظام دکھائی دیتا تھا اس میں دفعتاً سکون پیدا ہو گیا۔ اگر اس وقت تک کے ابواب یہ بھانسنے کے لیے کافی ہوتے ہوں کہ ان کی غرض یہ تھی کہ: ”نبوت اور خلافت ایک خاندان میں نہ ہونی چاہیے۔“ تاہم اس کے سکون سے بھی نتیجہ نکالنا کہ لوگوں کی فطری خواہش سے خلافت اور نبوت ایک خاندان میں ہو ہی جاتی۔ اعتقادی عقین کی حد کے اندر آتا۔ لیکن یہ ایک ایسا معاملہ تھا جو محض تخیل کے آئینہ میں اپنی صورت نہیں دیکھتا رہا۔

بلکہ دن اور رات نے بھی ایسا ہی دیکھا۔ گویا زمانہ کو اس کا انتظار تھا کہ طبعیتوں کی روش اپنی فلسفی شان میں دکھائی دے اور کچھ دخل دینے والے اور درمیان میں آ جانے والے خود ساختہ منصرم نہ دکھائی دیں تو ہم اپنی خواہش ظاہر کریں۔ یہ حالت اس سوال کو پیش نظر کرتی ہے کہ اگر منصرمین کا زمانہ مدخلت کا زمانہ کچھ کرکھال دیا جائے تو لوگوں کی خواہش کے بلا فصل کہنے میں کسی مبالغہ کی کوشش نہ کرنی پڑے گی۔ باوجود اس حالت کے علی کو خلیفہ دیج کر اس زمانہ کو علی کا زمانہ حکومت بھنا واقعہ فہمی کی غلطی ہوگی یا واقعہ کی مقدار سمجھنے میں مبالغہ کرنا ہوگا۔

عامہ ناس کی بلا فصل خواہش

واقعہ اس قدر تھا اور بس کہ علی کا زمانہ حکومت تمام تر ان کی حکومت کا زمانہ نہ تھا۔ گزشتہ نظام کے خلاف ایک انقلاب ہوا اور انقلاب کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس نظام میں سکون پیدا ہو گیا اور علی سامنے دکھائی دیے۔ لیکن علی کے سامنے دکھائی دیتے ہی گزشتہ نظام میں ایک منتقلانہ جوش سے حرکت پیدا ہو گئی۔ اور اس نے علی کو اس کے علاوہ کوئی موقع نہ دیا کہ وہ اسے ساکن کرنے کے لیے اپنے ممکن ذرائع سے کوشش کرتے۔ یہ حقیقت اس قدر جناب امیر کی خلافت کا زمانہ نہ تھا جس قدر رشول کے بعد کا نظام اپنی کچھ دیر کی کسوٹی ہوئی قوت کے حامل کرنے کے لیے جہن توڑ کوشش کر رہا تھا۔ علی اس کے ساکن کرنے میں پورے کامیاب نہیں ہوئے۔

علی کو ترتیب جماعت کا موقع نہ ملا

نہ اس وجہ سے کہ انھوں نے جو طریقے اختیار کیے تھے وہ غلط تھے۔ بلکہ سالان اور زمانہ کا فرق تھا۔ ہمیں برس تک جو حالت ان کے خلاف پیدا ہوئی تھی اور اس نے جو صورت قائم کر لی تھی اس کے مقابل ان کے موافق ایک فوری انقلاب سے یہ امید کرنا کہ وہ اس طرح کامیاب ہو جاتا کہ گزشتہ کوششوں کے زمانہ پر غالب آجاتا ایک غیر معمولی امید ہوگی۔ دونوں کی قوت کا اندازہ تو اس وقت ہو سکتا جب کہ علی کو بھی لوگوں کو اپنے رنگ میں رہنے کا موقع ملتا۔

علی کا اختیار بے اختیاری سے صرف ظاہری صورت میں خشک تھا لیکن وہ اختیار ہوا ہے چند مفید تنقیحات

انتخابی، علی کو لوگوں کے کانوں تک یہ صدا پہنچانی تھی کہ خلافت ملے یا نہ ملے ہم شکتی خلفا کی پیروی نہیں منظور کریں گے۔ کیا یہ انکار سیاسی خشیت علی کے مفید تھا نہیں۔ اب تو نسبتاً بڑی بھاری سلطنت ملتی۔ بہر حال میرا یہ باب بھی پھر دکھانے کا کہ علی کے موافق انقلاب پر غالب آنے کے لیے گزشتہ نظام نے کیا طریقے اختیار کیے اور یہ سکون کیونکر حرکت سے بدلا۔ اور یہ حرکت آیا صورت اور غرض میں اس سے خشیت کبھی جاسکتی ہے جو رشول کے بعد سے علی کے خلیفہ دکھائی دینے تک جاری رہی۔ اور جب یہ کچھ میں آجائے گا تو میرے بھنے کا موقع ہوگا کہ علی کے دور حکومت سے حفاظت آیا اس اصول کے رُوح اور طرز عمل سے حفاظت تھی یا نہ تھی جو گزشتہ تین خلافتوں کے پہلے تھا۔ اور جب علی نے سنت خلفا کا اتباع منظور نہ کیا اور قرآن اور سنت رشول کی شرائط کو منظور کیا اور بدعتوں کے مستحکم کرنے کی حسرت ظاہر کی تو آیا علی کے طرز عمل کے کوئی اور معنی یزید اس کے ہو سکتے تھے کہ وہ اس راہ کو روشن کرنے کی کوشش میں تھے جو تین خلافتوں کے پہلے تھی؟ علی کے حفاظت جو قوتیں حرکت میں تھیں آیا ان کے عناصر کے بھنے

کے لیے علیؑ کے پہلے کا زمانہ اور ان کا طرز عمل کوئی مدد دیتا ہے؟

اسی طرح یہ بھی کہہ دوں کہ جس طرح علیؑ نے از ابتدائے بعثت تا رحلت رسول بے کسل ایثار سے کام کیا اور اس کے بعد رحلت رسول سے آج تک جب کہ جامعہ اسلامی کی موت اور زندگی اکثر موقع پر علیؑ کے طرز عمل پر موقوف ہوتی تھی اور مسلمانوں کا شیرازہ منتشر ہو سکتا تھا، علیؑ نے اپنے حق کو جاہل میں دفن ہو جانے دیا۔ جس سے کوئی مشکوک ان کی وجہ سے نہ پیدا ہوئی۔ اسی طرح اب بھی آپ دیکھیں گے کہ ایسے وقت میں بھی جب کہ عناصر تفرقہ اپنے پورے جوش و غروش کے عالم میں تھے علیؑ نے کس احتیاط سے قدم اٹھایا، بلکہ ناشنودشمنوں کو اتنی بار بکھایا جسے ایک ایسا حاکم جو اپنے موقع کو محض ماکھنہ سمجھتا ایسی بار بار استیغاث امن کو کسر شان سمجھتا۔

دشمنوں کا کوئی فریب علیؑ پر کارگر نہ ہوا یہ باب دکھانے والا ہے کہ دشمنوں کا کوئی فریب علیؑ پر غالب بلکہ ان کے منافق ہمراہیوں پر نہ آیا لیکن ان کے ناظم ہمراہی فریب یا لالچ میں آگئے جس سے انھوں نے وجہ اسلام کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تباہ کر دیا۔ ہم ”ناظم ہمراہی“ کا لفظ عبور استعمال کرتے ہیں۔ اس لیے کہ ایسے لوگ جو ظاہر علیؑ کے ساتھ ہو گئے تھے لیکن ان کی ترتیب خصال قطعاً دوسری باتوں میں ہوتی تھی اور وہ نہ خود بگھنے کی قابلیت رکھتے تھے نہ بکھانے پر عمل کرتے تھے۔ ان کے لیے ہم یزاس خرقہ کے اور کیا کہیں۔ لیکن کسی طرح وہ ”ہمراہی“ کے وسیع اور پورے مفہوم میں نہیں آسکتے تھے۔ اگرچہ کچھ وقت ملنے اور علیؑ کی تعلیم کے زیر اثر رہنے پر ان کا ویسا ہو جانا ممکن تھا جیسے علیؑ کے پیچھے والے دوست اور پیرو تھے۔

لوگ بیعت کے لیے علیؑ کے پاس گئے اب ہم واقعات کی طرف اپنا ہاتھ بڑھاتے ہیں۔ ابن خلدون کہتا ہے: ”بعد شہادت عثمان بن عفان طلحہ وزیر اور مہاجر بن انصار (رضی اللہ عنہما) کا ایک گروہ علیؑ بن ابی طالبؑ کے پاس بیعت کے واسطے گیا۔ علیؑ نے کہا میں تمھارا وزیر ہوں گا۔ اس سے بہتر جگہ میں امیر ہوں۔ تم جس کو منتخب کر دو گے میں اس سے راضی ہو جاؤں گا۔ ان لوگوں نے منت و ساجت سے کہا ہم تم سے زیادہ کسی کو اس کا متحق نہیں پاتے اور نہ تمھارے سوا کسی کو منتخب کر سکتے ہیں۔ علیؑ بن ابی طالبؑ ان لوگوں کے اصرار سے عبور ہو کر مسجد کی طرف تشریف لائے اور صحابہ کرام کے مواجہہ میں طلحہ وزیر سے کہا: میں تمھیں اختیار دیتا ہوں اگر تم پسند کرتے ہو تو میں تمھارے ہاتھ پر بیعت کروں دیا راضی ہو تو تم میرے ہاتھ پر بیعت کرو۔ انھوں نے کہا: نہیں ہم تمھارے ہاتھ پر بیعت کریں گے۔ یہ کہہ کر طلحہ وزیر نے بیعت کی۔۔۔۔۔ بعد طلحہ وزیر کے اور لوگوں نے بیعت کی۔

سعد بن ابی وقاص اور ابن عمر کا توقف پھر لوگ سعد بن ابی وقاص کو لائے اور بیعت کرنے کو کہا۔ سعد نے جواب دیا لوگوں کو بیعت کر لینے دو تو میں بیعت کروں۔ علیؑ نے کہا رہنے دو۔ پھر ابن عمر لائے گئے۔ ابن عمر نے بھی ایسا ہی کہا۔ لوگوں نے کہا کوئی ضامن لاؤ۔ ابن عمر نے کہ میں ضامن نہیں دے سکتا۔ اشر نے کہا مجھے اجازت دیجیے، میں اس کو قتل کر ڈالوں۔ علیؑ بن ابی طالبؑ

نے فرمایا: "مہوڑو، میں اس کا ضامن ہوں۔ بعد اس کے اعلان نے بیعت کی۔ مگر چند لوگوں نے بیعت سے تعلق کیا۔ انصار متخلفین بیعت کے نام" ازاں جملہ انصار سے: حسان بن ثابت، کعب بن مالک، مسلمہ بن عجلہ، ابوسعید خدری، محمد بن مسلمہ، نعان بن بشیر، زید بن ثابت، رافع بن خدیج، فضلہ بن عبید، کعب بن عجرہ، سلمہ بن سلمہ بن دقش۔

مہاجرین متخلفین بیعت کے نام عثمان کا کرتہ شام گیا لے کر شام چلے گئے۔

یہی مورخ لکھتا ہے کہ جب علی، طلحہ، زبیر، سعد اور ابن عمر نے بیعت لینے سے انکار کیا تو بلویاتوں نے اہل مدینہ کو جمع کر کے کہا کہ اگر تم امام نصب نہ کرو گے تو ہم فلاں فلاں کو قتل کر ڈالیں گے۔ ابن اشیر نے بجائے فلاں فلاں کے علی، طلحہ، اور زبیر کا نام لیا ہے۔ تو "اہل مدینہ یہ سن کر علی بن ابی طالب کے پاس گئے۔ انھوں نے خلافت سے انکار کیا۔ ان لوگوں نے اسلام کے انجام سے ڈرایا۔ تب علی نے بخیر ہو کر اگلے دن کا دودھ کید جمع ہوتے ہی وہ لوگ پھر آہٹچے۔ اور حکم بن جبیلہ مصریوں کے ساتھ اور اشتر کوفیوں کے ہمراہ حاضر ہوا۔ حکم بن جبیلہ نے زبیر کو اور اشتر نے طلحہ کو بہ اکراہ لاکر پیش کیا۔ چنانچہ لوگوں نے علی بن ابی طالب کے ہاتھ پر بیعت کی۔

علی بن ابی طالب مسجد میں آنے اور منبر پر چڑھ کر فرمایا: "اے لوگو! ہماری بابت کسی کو کوئی حق سوائے اس کے نہیں ہے کہ تم نے امارت کے لیے منتخب کیا۔ کل تم لوگ میرے پاس پریشان ہو کر آئے تھے اور میں خلافت و امارت سے گریز کر رہا تھا۔ لیکن تم لوگ اس پر مصر ہوئے کہ میں تمہارا امیر ہوں اور تمہاری فوج میرے ہاتھ میں ہو۔" حاضرین نے کہا: "ہاں ہم لوگ اپنے اسی کل کے خیال پر ہیں۔" علی بن ابی طالب بولے: "اللہم اشہد"۔ بعد اس کے وہ لائے گئے جنھوں نے بیعت سے تعلق کیا تھا۔ پس انھوں نے بھی کتب اللہ و سنت رسول اللہ و اقامۃ الحمد و پر بیعت کی۔ پھر عوام کی بیعت کرنے کے بعد علی بن ابی طالب نے خطبہ دیا۔

ان خبر نے مواعق عرقہ میں لکھا ہے: آنگاہ آن جماعت بجانب علی شائقند و گفت دست بکشا تا با تو بیعت کنیم۔ علی گفت شمارا این رجوع نیست یعنی: اس وقت وہ جماعت علی کی طرف دوڑی اور بولی کہ ہاتھ پھیلاؤ تاکہ آپ کی بیعت کریں۔ علی نے فرمایا تمہارے لیے یہ رجوع نہیں ہے۔

بلکہ ابن امیر لائے اہل بدر منوط است۔ بہر کس کہ ایشان با و راضی شوند آن کس خلیفہ باشد۔ آنگاہ از اہل بدر پچاس کس باقی ماند مگر آنکہ نزد علی آمدند گفتند ما حق و اولی از شما نمیدانم۔ دست بکشا تا بیعت کنیم۔ علی قبول کرد

و باو بیعت کردند۔ یعنی: بلکہ یہ امر ابلی بدڑ کی رائے کے ساتھ تعلق رکھتا ہے جس پر وہ راضی ہوں وہ غلیف ہو گا۔ اس وقت ابلی بدڑ میں سے کوئی بھی باقی نہ رہا مگر علیؑ کے پاس آئے اور کہا کہ ہم آپ سے زیادہ کسی کو حق دار اور اولیٰ نہیں جانتے۔ ہاتھ پیلا نہیں تاکہ آپ کی بیعت کریں۔ علیؑ نے قبول کر لیا اور سب نے آپ کی بیعت کر لی۔

مروان ہاکا: مروان و ولد مروان فسرار رابر فسرار اختیار نمودند۔ یعنی: مروان اور اس کے بیٹوں نے ٹھہرنے پر جانے کو ترجیح دی۔

بیعت کا وقت: ابن سعد گوید: ”بیعت علیؑ وقت صبح روز دوم از قتل عثمان بود در مدینہ و مجمع اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم در مدینہ بودند باو بیعت کردند۔“ گفتہ اند کہ طلحہ و زبیر بیعت حضرت اسد اللہ الغالب علیؑ را کمرہ بودند و بعد از آنکہ بہ کرہ بیعت کردند از مدینہ بیرون رفتند و بمکہ آمدند و چون حاشہ در مکہ بود اورا برداشتہ بجانب بصرہ توجہ نمودند و طلب خون عثمان کردند۔“ یعنی: ابن سعد کہتا ہے کہ علیؑ کی بیعت عثمان کے قتل کے دوسرے روز مدینہ میں ہوئی اور تمام اصحاب رسول خدا مدینہ میں تھے۔ انھوں نے آپ کی بیعت کر لی۔ کہا گیا ہے کہ طلحہ اور زبیر حضرت اسد اللہ الغالب علیؑ کی بیعت ناپسند کرنے والے تھے اور ناپسندیدگی کے باوجود بیعت کرنے کے بعد مدینہ سے باہر چلے گئے اور مکہ آ گئے۔ چونکہ حاشہ مکہ میں تھیں انھیں اٹھا کر بصرہ کی طرف چلے اور عثمان کے خون کا مطالبہ کرنے لگے۔

علیؑ نانکہ سے عثمان کے قاتل کا نام پوچھتے ہیں اور نانکہ کی لاعلمی

عثمان کہہ بود گفت نمی دادم دومرد آمدند کہ ایشانہ شافتم و محمد بن ابی بکر بآن دومرد میراہ بودند بیان آن واقعہ بہ تفصیل نزد علیؑ نمود۔ یعنی: علیؑ عثمان کی زوجہ کے پاس آئے اور اس سے پوچھا کہ عثمان کا قاتل کون تھا۔ اس نے کہا میں نہیں جانتی۔ دو مرد آئے جن میں میں نہیں پہچانتی اور محمد بن ابی بکر ان دو مردوں کے ساتھ تھا اور اس واقعہ کو تفصیل علیؑ سے بیان کیا۔

محمد بن ابی بکر کی طلبی آن گاہ علیؑ کس را بہ طلب محمد بن ابی بکر فرستاد چون حاضر شد ازو سوال کرد از آن چہ زوجہ عثمان گفتہ بود گفت آن چہ او می گوید راست است واللہ کہ من داخل بر عثمان شدم و ارادہ قتل او داشتم لیکن نام پدر من بر زبان راند و اورا گزاشتم و تائب شدم بسوئے خدا واللہ کہ اورا کشتم و نگاہ نہ داشتم کہ کدام کس کشتہ یعنی: اس وقت علیؑ نے محمد بن ابی بکر کو بلوایا۔ جب وہ آیا تو اس سے پوچھا اس کے بارے میں جو زوجہ عثمان نے کہا تھا۔ وہ بلا جودہ کہتی ہے کچھ ہے۔ میں عثمان پر داخل ہوا اور اس کے قتل کا ارادہ رکھتا تھا لیکن وہ میرے باپ کا نام زبان پر لایا۔ میں نے اسے چھوڑ دیا اور اللہ کی بارگاہ میں تائب ہو گیا۔ اللہ کی قسم میں نے اسے قتل نہیں کیا اور نہیں دیکھا کہ کس نے انھیں قتل کیا۔

نانکہ محمد بن ابی بکر کے قول کی تصدیق کرتی ہیں زوجہ عثمان گفت محمد بن ابی بکر راست میگوید و لیکن او آن دو مرد را بہ اندرون خانہ آورد باین تشیع ترغیب فسر مودہ۔ یعنی: عثمان کی بیوی نے کہا محمد بن ابی بکر کچھ کہہ رہا ہے لیکن وہ ان دو مردوں کو گھر میں لایا اور اس کام کی ترغیب دی۔

صاحبِ روضۃ الاحباب کہتا ہے کہ بیعت سے ”علیؑ علیہ السلام“ کی داشتِ زیرِ اکہ اختلافِ مشاہدہ ہی فرمود۔ یعنی: علیؑ خود کو علیؑ نہ رکھ رہے تھے۔ کیونکہ وہ اختلافِ دیکھ رہے تھے۔ اس مورخ نے بھی علیؑ، نائلہ اور محمد بن ابی بکر کی روایت کو ابنِ عمر کی طرح لکھا ہے۔

علیؑ بیعت لینے کے شرائط پیش کرتے ہیں اور بیعت کے ”الحاج“ پر علیؑ نے فرمایا ہے کہ: ”از حد شرع تجاوز نہ کنم میل و مہل از من واقع نہ شود“

فصلِ امورِ بشاوتِ جمہور۔۔۔ ایک درم از بیتِ المال برائے خود تصرف نہ کنم و میانِ شما ترجیح نہ خم۔ یعنی: شریعت کی حد سے تجاوز نہ کروں گا۔ کسی کی طرف جھکنا یا لحاظِ نجم سے نہ ہو گا۔ امور کے فیصلے جمہور کے مشورہ سے کروں گا۔ بیتِ المال سے ایک درہم بھی نہ لوں گا۔ تمہارے درمیان کسی کو کسی پر ترجیح نہ دوں گا۔

اس کے بعد خلافت کا قیودہ پڑھا گیا اور علیؑ نے طلحہ و زبیر کے طلبِ قہاس کے جواب میں فرمایا ہے کہ: خونِ عثمان میں بہت سے منہم ہیں، جب کسی کی نسبت گواہی سے تصدیق ہو تو ہم حکم دیں۔

بنی اُمیہ شام چلے گئے عثمان کا مال اُن کے ورثا پر تقسیم ہوا اسی مورخ کے موافق بنی اُمیہ کچھ عرصہ کے پاس چلے گئے کچھ

شام کی طرف چلے اور کچھ مغنی ہو گئے۔ دوسرے دن بیتِ المال تقسیم کر دیا گیا عثمان کی ذاتی جائیداد ان کے دربار پر تقسیم کی گئی اور حکومت کا مال علیؑ پر دیا گیا۔

طلحہ کا علیؑ سے قبولِ خلافت کا اظہار اعظم کوئی زیادہ بیان خیر ہے اور امور خانہ تیر نکاحی سے واقعات دیکھتا ہے۔ اس کے نزدیک جب لوگ بیعت

کی استدعا سے جنابِ امیر کے پاس آتے ہیں تو آپ انہیں طلحہ و زبیر کے پاس لے جاتے ہیں اور وہ کہتے ہیں کہ: ”اے ابو الحسن تو بدینِ کلاہِ اولی تری و خلافت حق تست بحکمِ سواقی جمیل و فضائل بسیار کہ تراست و شرفِ قرابت کہ بارئولِ خدا علیؑ علیہ السلام داری۔“ یعنی: اے ابوالحسن! آپ اس کام کے لیے سب سے اولیٰ ہیں اور خلافت آپ کا حق ہے۔ آپ کے جمیل کارناموں اور بہت سے فضائل اور رسولِ خدا کے ساتھ قرابت کی وجہ سے۔

علیؑ کو خدشہ اور یہ سن کر جنابِ امیر نے فرمایا کہ: ازلہٰی اندیشم کہ اگر این کلاہِ قبولِ کتم و دران شروع نمایم مضائقے و منازحتے ظاہر شود۔ یعنی: میں اس سے ڈرتا ہوں کہ اگر اس کام کو قبول کر لوں اور

شروع کر دوں کوئی جھگڑا اور جنگی ظاہر ہو۔

یہ سن کر طلحہ نے بڑی زبردست ”استغفر اللہ“ کہی، اور عہد کے بعد زبیر سے بھی یہی معاملہ پیش آیا۔ اب جنابِ امیر مسجدِ رسول میں تشریف لائے۔ یہاں علاوہ اور لوگوں کے ابوالہشیم، رافع بن رافع، مالک بن عجلان، ابوالیوب، خالد بن زید اور خرمیہ بن ثابت تھے۔ ان لوگوں نے لوگوں کو مخاطب کر کے کہا:

بعض اصحاب کا عامہ ناسخ سے مخاطبہ تم لوگ جانتے ہو کہ تمہارے ساتھ عثمان کا کیا طریقہ برتاؤ تھا۔ اب وہ گزر گیا۔ علیؑ کی فضیلت، کرامت،

اور قربت آفتاب سے زیادہ ظاہر ہے۔ جن علوم، محاسن اخلاق اور خوش خلقی بران کی ذات شریف حاوی ہے وہ شرح اور بیان سے مستثنیٰ ہے۔ انھیں دقائق حلال و حرام پر جیسا وقت ہے اور ہیں اور تھیں ہر روز بلکہ ہر لمحہ ان سے جو احتیاج پڑتی ہے اسے جانتے ہو۔ اگر امور خلافت کی انجام دہی کے لیے ہم علی سے زیادہ کسی کو فاضل، پرہیزگار اور خدا ترس جانتے تو ہم اس کی طرف اشارہ کرتے۔ لیکن آج تمام روئے زمین پر ان خصال خیر کے لیے ہم علی سے زیادہ معتبر کسی کو نہیں پاتے۔ اب تم اس معاملہ میں کیا کہتے اور سوچتے ہو۔

اس کے بعد ”جملہ متفق اللفظ والمعنی گفتند کہ علیؑ علیہ السلام راضی و مطیع و فرمانبردار بطور و رغبت نہ باکراہ و اجبار این سخن میگوئیم۔ از سرائقان و بصیرت نہ زوجہ تردد و تحیر۔“

یعنی: سب نے بیک زبان و دل کہا کہ علی سے ہم خوش ہیں اور اس کے مطیع و فرمانبردار ہیں۔ یہ بات ہم بخوشی و رغبت کہہ رہے ہیں جیرا کراہ سے نہیں۔ یقین و بصیرت سے کہہ رہے ہیں تردد و تحیر سے نہیں۔

اور علیؑ یہ سن کر پوچھتے ہیں کہ: ”یہ جو کچھ تم کہتے ہو محض اپنی حسن رائے کی وجہ سے یا خدا نے تعالیٰ کی جانب سے میرا حق واجب جانتے ہو؟“۔ جواب دیا: ”بلکہ ہم اس حق کو خدا نے تعالیٰ کے حکم سے اپنے اوپر واجب جانتے ہیں۔“ یہ سن کر منہ مانتے ہیں:

”ابھا آج جاؤ اور اس پر سوچ کر کل پھر آؤ اور تم جو کچھ طے کرو گے اس طرح اس کا انجام ہوگا۔“ دوسرے دن پھر لوگ جمع ہوئے اور

آج پھر حکومت اور اختیار پر مسکرانے والا بے ارادہ اپنے نفس پر اپنا اختیار دکھاتا ہے۔ جب کہ وہ کہتا ہے کہ:

”ابھی کام کا آغاز ہے اور اس کا رشتہ تمہارے ہاتھوں میں ہے۔ قبل اس کے کہ کام تمہارے ہاتھ سے چھوٹ جائے۔ خوب غور کرو۔ تم جسے چاہو اور لائق گھو اسے اختیار کرو۔ میں تمہارے موافق ہوں اور مجھے کوئی جھگڑا اور مناقشہ نہیں کرنا ہے۔“ لیکن

”از ہر گوشہ مسجد آواز ہا برآمد کہ ماہروز ہم برائیم کہ دیروز بودہ ایم و در اہتمام مہم خلافت بر تو حیدے نہ داریم بسلطت دست بیرون کن تا با تو بیعت کنیم۔“ یعنی: مسبح کے ہر گوشہ سے آوازیں

آئیں کہ ہم آج بھی اسی رائے پر ہیں جس پر کل تھے اور آپ کی خلافت کے لیے کسی اور اہتمام کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ سلطت کے ساتھ ہاتھ باہر نکالے کہ آپ کی بیعت کر لیں۔

امیر المومنین علیؑ علیہ السلام چون حال بران جملہ دید و سخن مہاجر و انصار برین سوال شنید۔ خاموش ایستاد۔ یعنی: حضرت علیؑ نے جب

سب کا یہ حال دیکھا اور مہاجرین و انصار کا اس سوال پر جواب سنا تو خاموش کھڑے ہو گئے۔

اب اس مجمع میں کوئی نفس ایسا دوزنی نہ تھا جو علیؑ کو اتمام محبت کے بعد اس کیفیت میں دیکھتا اور نہ کچھنا۔ دنیا کے تمام فیوض کی خوش بیاں اس ”چپ کھڑے ہو جانے کی“ ادا پر صدقہ تھی۔ میں بیعت کی حالت کو علیؑ کے لفظوں میں بیان کر کے ہنستا ہوں اور روتا ہوں۔ منہ مانتے ہیں:

علیؑ اور بیعت کے وقت کی مصوری

”تم نے بیعت کے لیے میرا ہاتھ پھیلا دیا۔ میں نے اسے کھینچ لیا۔ تم نے میرا ہاتھ کھینچا۔ میں نے اس پر قبضہ کر لیا۔“

پھر تم میرے گرد ہو کر اس طرح ایک دوسرے کے مزام ہونے لگے جیسے کہ پیلا سے اوٹ اپنی اکباہوں پر وارد ہو کر ایک دوسرے کی مزاحمت کیا کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ میری نعلین کے تسمے ٹوٹ گئے۔ ردا میرے کانڈے سے گر پڑی۔ ضعیف آدمی اس پلچل میں پس گیا، اور لوگوں کی خوشی کی اس بیعت میں یہ فست پختی کہ چھوٹے تو خوش ہوئے، کبیر السن بے چارے بیعت کے لیے آتے آتے راہ میں گر پڑے۔ بیادوں نے اس بیعت کے مقام تک پہنچ کر رنج اٹھایا، اور اس بیعت کے لیے لڑکیوں تک نے اپنے گھونگٹ الٹ دیے۔“

مساوات کی تلخ تفریح
اعظم کوئی کے موافق: تقسیم بیت المال میں ہر شخص کو تین دینار ملے۔ جب میں کہہ رہا ہوں کہ ہر شخص کو تین دینار ملے تو میں یہ بکھا رہا ہوں کہ امتیاز اٹھا دیا گیا اور مساوات قائم کی گئی۔ نہ کسی کو ٹیس یا ٹیس دیا گیا اور نہ حکومت کی جائداد کسی کو جاگیر میں عطا ہوئی۔ میں ان چروں کے دیکھنے کے لیے جو امتیاز کے حامی اور بڑی بڑی رقبہ پا کر روغنی نگاہ کے ہو گئے تھے کیا کچھ قربان نہ کرتا جو کچھ کر سکتا انھوں نے کس طرح تین دینار چنگی میں دہانے ہوں گے۔ مشکل سے میں امید کر سکتا ہوں کہ میرے زمانہ کا سب سے بڑا مفرا ایکٹر اس کو قطری شان سے نہا سکتا ہوگا۔

مساوات پر اعتراض اور علیؑ کا جواب
اور زمانہ یہ پہنچ گیا تھا کہ مساوات کا پرانا جانا قابل شکیت تھا اور وہ شکیت کرنے والے طلحہ وزیر ہوتے تھے علیؑ جواب دیتے کہ: ”یہ مساوات کے بارہ میں جو تم ذکر کر رہے ہو تو یہ ایک ایسا امر ہے جس میں میں نے اپنی رائے سے حکم نہیں کیا۔ نہ اپنی خواہش نفس سے اس کا مرتکب ہوا ہوں، بلکہ میں نے اور تم دونوں نے اس حکم کو پایا ہے جسے رسول اللہ ﷺ نے تم سے جس سے آپ فارغ کر دیے گئے۔۔۔۔۔ جس کی تقسیم سے خداوند عالم فارغ ہو چکا ہے اور اس بارہ میں اس کا حکم نافذ ہو چکا ہے۔ اب تمہارا اور تمہارے اغیار کا کوئی حق نہیں کہ مجھے اس معاملہ میں مشوب کریں۔“

زوطۃ الاحباب
ولید بن عقبہ بن ہاشم کی بچو کرتا ہے اور فضل بن عباس جواب دیتے ہیں موافق ولید بن

عقبہ نے اکی ہاشم کی مذمت میں اشعار کہے اور فضل بن عباس نے اس کا جواب دیا کہ:

وکان ولی الامر بعد محمد علی و فی کل موطن صاحبہ

وصی رسول اللہ حقاً و صہرہ و اول من صلی و ما دام جانبہ

یعنی: محمدؐ کے بعد امر کا ولی علیؑ اور ہر مقام پر آپؐ کے ساتھی تھے۔ آپؐ رسول خدا کے برحق وصی ہیں۔ آپؐ کے داماد ہیں اور آپؐ نے سب سے پہلے نماز پڑھی اور ہمیشہ حضورؐ کے پہلو میں رہے۔

عمارؓ یا سمر کی ایک صلاح اور علیؓ کا جواب

اتھم کئی کے موافق عمارؓ یا سمر اور اشتر نے امیر المومنین کی خدمت میں عرض کی کہ اگر اجازت ہو تو وہ لوگ جواب تک شریک بیعت نہیں ہونے ہیں وہ بھی لانے جائیں کہ انھیں عذر نہ ہو۔ لوگ اپنی صلاح کار کے لیے آپ سے بیعت کرتے ہیں۔ آپ بھی اپنے صلاح کار محفوظ رکھیے۔ جناب امیرؓ نے فرمایا کہ اے عمار اور مالک جس کو ہماری رغبت نہیں ہے ہمیں بھی اس کی احتیاج نہیں ہے۔ ہم آدمیوں کو تم سے اچھا پہچانتے ہیں۔ رہنے دو یا مجھے اپنی رائے پر چلنے دو۔ زہرا بن حنظلہ تمہی نے جناب امیرؓ کی تائید اور شرح میں کہا کہ ایسے لوگ جن سے بکراہ بیعت لی جائے گی اس کا کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ اگر وہ بہ رغبت بیعت کریں تو مناسب ہے ورنہ ان سے ہاتھ اٹھا لو۔

علیؓ اور سعد بن ابی وقاصؓ

سعد بن ابی وقاصؓ نے کہا کہ مجھے کوئی شک نہیں ہے کہ آپ کی خلافت برحق ہے۔ مگر یہ بھی ہے کہ ہم میں سے ایک جماعت اس معاملہ میں آپ سے لڑے گی اگر آپ چاہتے ہیں کہ ہم بیعت کریں تو ہمیں ایک تلوار دیجیے کہ اسے زبان اور دو ہونٹ ہوں اور بات کر سکے اور حق و باطل میں فرق کر سکے۔ جناب امیرؓ نے جواب دیا کہ مہاجر و انصار اور کافہ مسلمانین سے کتاب اور سنت پر عمل کرنے کی شرط ہے اگر تمہیں خواہش ہے تو بیعت کرو ورنہ گھر میں بیٹھو کہ ہم تمہیں کسی امر پر مجبور نہ کریں گے۔

علیؓ بنی امیہ سے وجہ مخالفت پوچھتے ہیں

جناب امیرؓ نے مردان بن حکم، سعید بن العاص اور ولید بن عقبہ کو طلب کیا اور ان سے تحفہ کی وجہ دریافت کی، ولید نے کہا: ”اے ابواکمن! ہم آپ سے کس امید پر بیعت کریں اور کس آنکھ سے دیکھیں آپ نے ہمارے پردہ بال کو نوجا اور ہمارے سینہ کو کینہ سے جھریا۔ ہمارے ہاپ کو بدر میں قتل کیا اور عثمان کو جو خلیفہ اسلام تھے غوغا میں چھوڑ دیا اور مدینہ کی یہاں تک کہ وہ قتل ہو گئے۔ سعید بن العاص کے ہاپ کو بھی جو بنی امیہ کا سردار قتادہ بدر میں قتل کیا اور مردان بن حکم کے ہاپ کو جب عثمان مدینہ میں لانے تو آپ نے کہا جو کچھ کھل عثمان کی رائے کو ضیعت اور غلط کھل ہم نے تینوں آدمیوں کے حال کو بتا دیا۔ اب ہم کس طرح بیعت کریں، اور کس دل سے آپ کو دوست رکھیں۔ اور اگر بیعت کرنی ہی ہوگی تو اس شرط سے بیعت کریں گے کہ کھلان عثمان کو قتل کیجیے اور اگر ہم سے کوئی سہو اور غلط ہو تو اسے معاف کیجیے۔ اور اگر آپ سے ہم اپنے ابن عم معلویہ کے پاس شام جانے کی اجازت طلب کریں تو اجازت دیجیے اور منع نہ کیجیے۔“

علیؓ کا جواب

جناب امیرؓ نے منبرمایا کہ تمہارا غم سے کینہ رکھنا بھی نہیں ہے۔ وہ حکم خدا تھا اور مردان کے ہاپ کے حق میں بھی میں نے کوئی ناحق بات نہیں کہی۔ اور کشندگان عثمان کو اگر آج قتل کر سکوں تو کل پر نہ اٹھا رکھوں گا۔ میں تمہارے خوف کو دور کرتا ہوں۔ ان لوگوں نے بیعت کی اور چلے گئے۔ لیکن جناب امیرؓ کو ان کے بے اطمینانی کی خبریں پہنچتی رہیں۔ یہاں تک کہ ایک دن مردان بن حکم کے چند شعر پڑھے گئے جو اس نے بیعت کی عدم رضامندی اور اپنے تردد کی حالت کے متعلق کہے تھے۔ جناب امیرؓ نے ان لوگوں کو پھر طلب کیا اور فرمایا کہ اگر تم لوگ یہاں

ڈرتے ہو تو تمہیں اجازت ہے کہ جہاں چاہو سچے جاؤ۔ یہ لوگ یہ کہہ کر واپس ہونے کہ میں اطمینان ہو گیا۔ ہم اب مدینہ ہی میں رہیں گے۔ چند روز نہ گزرے تھے کہ مروان نے پھر شعر کہے۔ جن کا مفہوم یہ تھا کہ ماکان عثمان مدینہ میں بغایت بھر کر رہے ہیں۔ علی دیکھتے ہیں اور خاموش ہیں۔ مسلمانوں نے مروان سے باز پرس چاہی لیکن جناب امیر نے منع فرمایا۔

اس زمانہ میں امیر شام بنی امیہ کا حال دریافت کرتا تھا۔ یہاں تک کہ مدینہ کا ایک شخص جس کا نام حجاج بن غزیمہ تھا، شام گیا اور اس نے

یہ کہنے کے بعد کہ: ”علی سے اشراہب حجاز، اعیان یمن اور اکابر و معارف مصر بیعت کر چکے اور اب تک اہل بصرہ نے بھی بیعت کر لی ہوگی۔ کہا: اس وقت شام میں تیرے پاس جس قدر لشکر اور سلمان ہے وہ علی سے بہت زیادہ ہے ابھی ان کا انتظام جا نہیں ہے کہ وہ مدینہ سے جنبش کر سکیں۔ لشکر تیرے موافق ہے۔ تنویرا سا ایک دل اور موافق لشکر اس فوج پر غالب آجاتا ہے جو موافق نہ ہو۔ اگرچہ عدد میں زیادہ ہو، مالا نکہ تیرا لشکر خود علی کے لشکر سے زیادہ ہے۔ اگر تو علی سے مخالفت کرنا چاہتا ہے تو اس کے قبل جنگ کر کہ ان میں قوت پیدا ہو جائے۔ جب وہ اپنا انتظام کر لیں گے تو میں یقین ہے کہ وہ عراق و حجاز پر بغیر شام کے راضی نہ ہوں گے۔

مغیرہ بن شعبہ کو معاویہ کے اشعار سے ان کا خیال معلوم ہوا
مغیرہ بن شعبہ کی تقریر سن کر جو گیا معاویہ کے دل کی باتیں کہہ رہا تھا اور یہ اشعار مدینہ میں پہنچے اور مغیرہ بن شعبہ کو معلوم ہوئے۔

مغیرہ علی کو صلاح دیتا ہے اور علی قبول کرنے سے انکار کرتے ہیں
اور اس نے جناب امیر کے پاس حاضر

ہو کر قبول ابن خلدون کہا کہ: ”جب تک حکومت و خلافت کو استقلال حاصل نہ ہو اس وقت تک عمال عثمان کو برقرار رکھو بعد استقلال و استقرار حکومت جس کو چاہنا معزول و تبدیل کرنا۔ علی بن ابی طالب نے اس سے انکار کیا۔“ اور اس کے بعد اسی مورخ کے موافق: ”چونکہ مغیرہ بن شعبہ نے نصیحت کی تھی اور علی بن ابی طالب نے اس کو قبول نہ کیا تھا اس وجہ سے ناراض ہو کر مکہ چلا آیا۔“ مورخین نے اہتمام کیا ہے کہ ابن عباس کو بھی مغیرہ ابن شعبہ کا ہم خیال بنادیا اور ابن خلدون نے ایک جملہ چٹکا مکالمہ درج کر دیا ہے جس میں ابن عباس علی کو یہ صلاح دیتے ہیں کہ: ”واللہ اگر تم میرے کہنے پر عمل کرو تو میں تم کو ایسے راستہ پر چلا دوں کہ وہ انجام کار پر غور ہی کرتے رہ جائیں اور پیش افتادہ امور ان کو نہ سوجھ پڑیں۔“ ہم نہیں جانتے کہ یہ بھی کہا یا نہیں کہ جب تک وہ تمہیں ہم پھر ایسا ہی ایک امر اور پیش کردی علی کا یہ جواب خوش ذائقہ ہے کہ: ”مجھ میں نہ تمہاری صلتیں ہیں نہ معاویہ کی۔“

ابن خلدون کو یہ بھی کہنا ہے کہ: ”مروان اور بنی امیہ شام کی طرف بھاگ کر چلے گئے۔ علی بن ابی طالب قریش کو فروج سے نہ روک سکے۔ تیرے دن اعراب کو ان کے بلاد کی طرف واپس جانے کا حکم دیا۔ ان لوگوں نے اس سے انکار کیا اور اس کے ساتھ سیبہ نے فتنہ و فساد کی آمادگی ظاہر کی۔“

طلحہ وزبیر بصرہ اور کوفہ جانے کی اجازت مانگتے ہیں
 ”اس اثنا میں طلحہ وزبیر آئے اور کہا ہم کو
 آپ کوفہ و بصرہ جانے کی اجازت دیجیے
 تاکہ لوگوں کے منتشر خیالات کو ہم جمع کریں۔ علی بن ابی طالب نے کسی مصلحت سے ان کو روک لیا۔“

علی حصول اجازت کی غرض بتا دیتے ہیں
 اعثم کوئی کے موافق جب طلحہ وزبیر نے جناب
 امیر سے عہدہ کے لیے مکہ جانے کی اجازت
 طلب کی تو امیر المومنین نے ان کے تمام دلی ارادے بتا دیے اور: ”ایشان سررازیہ انگلندہ بودند۔“ اور اس کے بعد
 واشنگٹن آرویگ کے قتلوں میں: ”ایسی حالت میں کہ لب پر قوی اور دل میں مکر تھا۔ یہ عائشہ سے جا ملے جو مخالفت
 کے لیے تیار تھیں۔“

زینب بنت ابوسفیانؓ کے اشعار
 اسی مورخ کے موافق شب کو یہ واقعہ گزر چکا تھا کہ جناب امیر
 کسی رات سے تشریف لا رہے تھے اور جب زینب بنت
 ابوسفیان کے گھر کے قریب پہنچے تو سنا کہ کوئی دن پر شرکار رہا ہے۔ جس کا مفہوم یہ ہے کہ: ”طلحہ وزبیر نے عثمان کے
 قتل میں کوشش کی اور فتنہ مٹا دیا۔ اگر آج علی کی بیعت کی ہے تو اس کی کوئی اصل نہیں ہے۔ آخر میں مخالفت کر پی
 گئے۔ ظاہر میں دوست ہیں اور باطن میں دشمن ہیں۔“

کوئی حضرت عائشہ کے تغیر پر اعتراض کرتا ہے
 ابن خلدون: ایک شخص عبید بن ابی سلمہ سے ملاقات ہوئی۔ دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ عثمان شہید ہو گئے اور لوگوں نے
 علی کی خلافت کی بیعت کی ہے۔ ام المومنین عائشہ نے ارشاد کیا: ”واللہ عثمان مظلوم مارے گئے ہیں، میں ان کے خون کا
 معائنہ لوں گی۔“ حاضرین میں سے کسی نے کہا: ”آپ یہ کیا کہہ رہی ہیں، اور اس سے پیشتر آپ کیا کہتی تھیں؟“
 جواب دیا: ”بے شک ان لوگوں نے پہلے عثمان سے توبہ کرانی پھر ان کو شہید کیا۔“ غرض ام المومنین عائشہ صدیقہ اس
 مقام سے لوٹ کر مکہ واپس آئیں۔ لوگوں کا ایک مجمع ہو گیا۔۔۔ عبد اللہ بن عامر حضری (عثمان کی طرف سے مکہ کا عامل تھا)
 بولے: ”میں سب کے پہلے خون عثمان کا بدلہ لینے والا ہوں۔“ اس کلام کے تمام ہوتے ہی بنی امیہ نے (جو بعد شہادت
 عثمان مکہ کی طرف ہجرت گئے تھے) سمعہ و طاعت آمادگی ظاہر کی ازاں جملہ سعید بن العاص، ولید بن عقبہ وغیرہ تھے۔
 اس عرصہ میں عبد اللہ بن عامر بصرہ سے اور یحییٰ بن مسلمہ یمن سے چھ نوادرات
 اور چھ لاکھ دینار لے کر مکہ میں آئے۔ بعد ازاں طلحہ وزبیر مدینہ سے
 وارد مکہ ہوئے۔۔۔ ام المومنین عائشہ نے کہا: ”ہمارے ساتھ ان کی طرف خروج کرو۔“ حاضرین میں سے بعضوں نے
 رائے دی کہ: ”شام کی طرف چلنا چاہیے۔“ اس پر ابن عامر بولے: ”شام میں معلویہ ہیں، وہ اس کے لیے کافی ہیں،
 بصرہ کی طرف چلو۔ میری وہاں بات بنی ہوئی ہے اور لوگوں کا رجحان طلحہ کی جانب ہے۔ لوگوں نے بصرہ سے ابن عامر کے
 چلے آنے کو غیر محسن سمجھا کہ بصرہ کے طرف جانے پر اتفاق کر لیا۔“

دُکدُگی سپٹ دی گئی ام المؤمنین حضرت نے سہراہی کا قصد کیا لیکن اپنے بھائی عبداللہ بن عمر کے کہنے سے رک گئیں۔ غرض ابن عامر اور یحییٰ بن نبیہ نے اپنے مال و اسباب سے قافلہ کی روانگی کا ساز و سامان درست کیا۔ اور یہ ندا کرادی کہ: ”ام المؤمنین عائشہ اور طلحہ و زبیر بصرہ کی طرف جا رہے ہیں۔ میں جو شخص اسلام کی ہمدردی کرنا اور خونِ عثمان کا بدلہ لینا چاہتا ہو اور اس کے پاس سواری نہ ہو وہ آئے اس کو سواری دی جائے گی۔“

ایامتِ نماز کا جھگڑا، حضرت عائشہ کا کام جب نماز کا وقت آیا تو مردان نے اذان دی اور طلحہ و زبیر کے پاس آکر کہا: ”تم دونوں میں سے ایامت کس کے سپرد کی جائے۔“ ابن زبیر نے کہا: ”میرے ہاپ کو۔“ ابن طلحہ بولے: ”میرے ہاپ کو۔“ ام المؤمنین عائشہ نے یہ سن کر مردان کے پاس کہلا بھیجا کہ: ”کیا تم ہمارے کام کو درہم و برہم کیا چاہتے ہو، ایامت میرا بھائی عبداللہ بن زبیر کئے گا۔“

علی کی بیعت کی خبر اور حضرت عائشہ پر اثر اعظم کوئی کو کہنا ہے کہ جب عائشہ نے سنا کہ: ”عثمان قتل ہو گئے۔“ تو پوچھا کہ: ”پھر اس کے بعد کیا ہوا؟“ کہا: ”علی سے بیعت کی گئی۔“ عائشہ نے کہا: ”کاش آسمان پھٹ پڑتا کہ یہ برادری نہ دیکھتے۔“ اور غیبی لے کہا کہ: ”اے ام المؤمنین اچھا نہیں کرتی ہو کہ لوگوں میں شورش پیدا کر رہی ہو۔“

غیبیہ نے حضرت عائشہ کو ان کا فتویٰ یاد دلایا روضۃ الاحباب میں ہے کہ جب غیبیہ بن سلمہ نے عائشہ سے خونِ عثمان کا دعویٰ سنا تو کہا کہ: ”کیا تمہیں ان کی

شان میں ”اقتلوا و اغتسل فانہ قد صفر“ (یعنی: قتل کو قتل کر دو، کیونکہ یہ کاڑھو گیا ہے) نہیں کہتی تھیں۔“ اور جب عائشہ نے حضرت ام سلمہ کو بھی اپنے موافق بتانا چاہا تو ان کے ”تعب کی آواز گھر کے ہر شخص نے سنی۔“ اور انہوں نے کہا کہ: ”اے دخترِ ابوبکر کیا تو نے رسول کی یہ حدیث نہیں سنی کہ: ”علی خلیفہ علیکم فی حیاتی و فی مماتی فمن عصاہ فقد عصانی۔“ یعنی: ”علی تم پر میری زندگی میں ظیفہ ہے اور موت کے بعد مجھ جو اس کی نافرمانی کرے گا وہ میرا نافرمان ہوگا۔“ اور عائشہ نے تصدیق کی۔

لیکن عبداللہ بن زبیر کی محبت سے پھر اپنا خیال بدل دیا۔

طلحہ و زبیر کب علی کے مُنکر ہوئے اسی مؤرخ کے موافق: طلحہ و زبیر نے بیعت سے اس وقت انکار کیا جب کہ ریاست بصرہ و کوفہ نہ دی گئی۔ اور

عبداللہ بن عامر کرز نے یہ بھوک کر کہ علی اے کھال دیں گے بصرہ میں براؤختگی پیدا کرنے کا قصد کیا۔ اس پر جاریہ بن قدامہ سعدی نے جواب دیا کہ تو بہ اکراہ حاکم ہوا ہے، اس لیے کہ عثمان نے تجھے یہاں بھیجا تھا۔ اب اگر علی تجھے کھال دیں گے تو ماخوذ ہوگا یہ سن کر بصرہ سے بھاگا اور طلحہ سے ملا۔

اعظم کوئی نے بھی بالکل بھی لکھا ہے اور جب ابن عامر طلحہ کے پاس آیا تو آخر لڑ کرنے کہا کہ: ”تو کیوں آیا کہ بصرہ کا مال ہاتھ سے جاتا رہا۔“ تجھے اس قدر صبر کرنا چاہیے تھا کہ ہم پہنچ جاتے۔“ اور ولید بن معیط نے بھی ایسا ہی کہا۔

معاویہ کے اشعار اور عائشہ اسی مورخ کے موافق جب معاویہ نے سنا کہ عائشہ اور ان کے رفقاء شام کا قصد رکھتے ہیں تو اس نے چند شعر لکھ کر مکہ میں بھجوا دیے کہ وہ لوگ

اور آنے کا ارادہ نہ کر دیں۔ اگرچہ اپنا نام ظاہر نہیں کیا۔ عائشہ اور ام سلمہ سے گفتگو ہو چکنے کے بعد ابن زبیر اور حضرت ام سلمہ

حضرت ام سلمہ نے جواب دیا: ”اے ابن زبیر! آیا تیرے نزدیک یہ مصلحت ہے کہ مہاجر و انصار اور اشراف صحابہ علی کو جو مسلمانوں کے والی ہیں چھوڑ کر تیرے باپ سے بیعت کر دیں گے۔ تجھے اور تیرے باپ کو جو یہ فتنہ کھڑا کر رہا ہے یقین کرنا چاہیے کہ اس سے کوئی مطلب نہ نکلے گا۔“ ابن زبیر نے کہا: ”ہم نے کبھی رسول سے یہ نہیں سنا کہ علی مسلمانوں کے والی ہیں۔“ حضرت ام سلمہ نے فرمایا: ”اگر تو نے نہیں سنا تو تیری والدہ نے جو یہاں بیٹھی ہے سنا ہوگا اس سے پوچھ لے۔ میں بالمشافہ کہہ رہی ہوں کہ آیا رسول نے یہ نہیں کہا ہے کہ: ”علی میرا خلیفہ ہے، میری زندگی میں اور میری وفات کے بعد۔“ اے عائشہ تم نے رسول سے یہ سنا ہے یا نہیں؟ اور گواہی دو گی یا نہیں؟“ عائشہ نے گواہی دی اور تصدیق کی۔

حضرت عائشہ کے متعلق ایک مشہور حدیث اس کے بعد حضرت عائشہ سے حضرت ام سلمہ نے وہ مشہور حدیث بیان فرمائی جسے عامہ مؤرخین نے نقل کیا ہے کہ: ”اے عائشہ! ہرگز وہ عورت نہ ہونا جسے دیکھ کر آب و تاب کے کتے بھونکیں۔“

مؤرخ تاریخ الاسلام اور حضرت عائشہ کی روش مؤلف تاریخ الاسلام مولوی عباسی صاحب گورکھ پوری کو اقرار ہے کہ: ”ایک بڑی فساد کی بنیاد عائشہ کی ذات سے قائم ہوئی۔“

اہل کوفہ اور ابو موسیٰ کوفہ کا یہ حال تھا کہ جناب امیر کے خلیفہ ہونے کی خبر پہنچی تو لوگ ابو موسیٰ کے پاس آئے اور اس سے پوچھا کہ: ”تو کیوں علی کی بیعت نہیں لیتا؟“ اس نے جواب دیا کہ: ”ہم ابھی توقع کرتے ہیں۔ دیکھیں اس کے بعد کیا ہوتا ہے۔“ ہاشم بن عقبہ بن ابی وقاص نے یہ سن کر کہا: ”اب تجھے کیا خبر ملے گی۔ عثمان قتل کیے گئے اور مہاجر و انصار خاص و عام نے علی سے بیعت کی۔ اس سے نہ ڈر کہ اگر تو علی سے بیعت کرے گا تو عثمان اس جہان سے واپس چلے آئیں گے۔“ یہ کہہ کر اس نے اپنے داہنے ہاتھ میں ہالیاں ہاتھ لیا اور کہا: ”ہالیاں ہاتھ میرا ہے اور داہنا علی کا ہے۔ میں نے علی سے بیعت کی، اور ان کی خلافت پر راضی ہوا۔“ اب ابو موسیٰ کوئی عذر نہ کر سکا، اور اس نے اور اس کے بعد تمام اہل کوفہ نے بیعت کی۔

اہل یمن اور بیعت اہل یمن نے جناب امیر کی خلافت کا ذکر سن کر برہم تہنیت مدینہ کا قصد کیا اور ان کا استقبال کیا گیا۔ جناب امیر نے اپنے جو عمال روانہ کیے اس کا حسب ذیل نتیجہ ہوا: ● عثمان بن حنیف بصرہ بھیجے گئے۔ اور حکومت اپنے ہاتھ میں لی۔ ● عمارہ بن شہاب کوفہ بھیجے گئے۔ راہ میں طلحہ بن خویلد نے کہا کہ ہم یزید ابو موسیٰ کے کسی کو نہیں چاہتے۔ تم جاؤ نہیں تو قتل کر ڈالیں گے۔ یہ واپس ہوئے۔ ● عبید اللہ بن عباس

باب

میں گئے اور اختیار اپنے ہاتھ میں لیا۔ ● قیس بن سعد مصر گئے اور جناب امیر کا فرمان پڑھا کچھ نے ساتھ دیا۔ کچھ نیوٹرل رہے۔ کچھ نے عثمان کا قصاص طلب کیا۔ ● اسمیل بن ضیف شام جا رہے تھے انھیں توجک میں چند سوار ملے، اور کہا کہ اگر تمہیں عثمان کے علاوہ کسی نے بھیجا ہو تو دایمیں چلے جاؤ۔

جناب امیر کا خط معاویہ کے نام

ابن خلدون کے موافق: علی نے مسرہ جہنی کے ہاتھ معاویہ کے پاس خط بھیجا۔ اس نے تین مہینہ تک کوئی جواب نہ دیا۔ اس کے بعد قیصر صبی کے ہاتھ ایک سربراہ خط روانہ کیا جس کا عنوان تھا: ”من معاویۃ الی علی“۔ اور جب غلغلا چاک کیا گیا تو اس میں کوئی خط نہ تھا۔ علی نے قاصد کی طرف دیکھا اور اس نے کہنا شروع کیا: ”میں شام میں ایسے لوگوں کو چھوڑ آیا ہوں جو سوائے روکنے کے کسی طرح راضی نہ ہوں گے۔ میں نے ساٹھ ہزار

سچ کو دیکھا ہے کہ وہ عثمان کے قیس خون آلودہ پر رو رہے ہیں، جو اسی غرض سے جامع دمشق کے منبر پر رکھا ہے۔“ اعظم کوئی میں اس قدر زیادہ ہے کہ: ”پہلے وہ شیطان پر لعنت کرتے تھے، اب قاتلان عثمان پر لعنت کرتے ہیں۔“ جناب امیر نے پوچھا کہ: ”اور وہ لوگ قتل عثمان سے کسے مٹھم کرتے ہیں؟“۔ قاصد نے کہا: ”تمہیں۔“

یہ سن کر علیہ بن زبیر العصبی نے کہا: ”تو جب بے شرم ہے کہ امیر المومنین اور مہاجر و انصار کو اس جرم میں مٹھم کرتا ہے، جو انھوں نے

نہیں کیا۔ اگر جہاں کی کوئی جماعت عثمان کے کرتے پر روتی ہے تو نہ وہ کہہ ”پیرا ہمن یوسف“ ہے اور نہ وہ رونا ”گریہ یعقوب“ ہے۔ اگر قتل عثمان پر رونا تھا تو اس وقت مدد کیوں نہ کی جب وہ مدد طلب کرتے تھے؟“۔

ابن خلدون کے موافق: اب جناب امیر نے شام کی طرف روانگی کے لیے تیار ہوجانے کا حکم دیا۔ اعظم کوئی کے موافق: ابواب انصاری کی صلاح نہ ہوئی

اور جناب امیر نے فرمایا کہ: ”قرآنہ اور لشکر کے لحاظ سے ہم کو عراق میں رہنا چاہیے۔ اس سے ہم شام کی طرف سے مطمئن رہیں گے۔“ تاہم جناب امیر نے کچھ دنوں کے لیے یہ ارادہ ملتوی کر دیا۔

دیگر عمال کی روانگی

اور مختلف مقامات پر عمال روانہ کیے۔ اس کے بعد جب ہر طرف سے شورشوں کی خبر آنے لگی تو فرمایا:

”جس امر کا مجھے اندیشہ تھا وہ ظاہر ہوا“ اور لوگ مخالفت کرنے لگے۔ فتنہ کی مثال آگ کی ایسی ہے کہ بڑک اٹھنے کے بعد شعلے زیادہ ہوتے جاتے ہیں۔ جہاں تک میرے امکان میں ہے میں اس فتنہ کے فرو کرنے اور اس آگ کے بجھانے میں کوشش کروں گا۔ اگر حالت درست ہوگی تو خیر ورنہ مجسز جنگ کے چارہ نہ ہوگا۔“

جناب امیر ان افکار میں مبتلا تھے کہ انھیں حضرت ام سلمہ کا خط ملے جس میں مکہ کے حالات کی خبر اپنے

حضرت ام سلمہ کا خط جناب امیر کے پاس آیا

فرزند عسیر بن سلمہ کے ہاتھ روانہ کی تھی اور لکھا تھا کہ: ”اگر جناب رسالت مآب نے عورتوں کو گھسے باہر نکلنے کو منع نہ کیا ہوتا تو میں بھی تمہارے لشکر کے ساتھ اس طرف حرکت کرتی جاہر تم جاتے میں اپنے منہ زند کو بھیجتی ہوں، یہ آپ کا تابع منہ رہے گا۔“

ام الفضل کی اطلاع اسی طرح ام فضل بنت ام عبد اللہ بن عباس نے قبیلہ جہینہ کے قفر بنی ایک شخص کی زبانی ماحد کے خروج کی خبر امیر المومنین کے پاس بھیجی۔

طلحہ وزبیر کی مخالفت سن کر آئندہ کی مصلحت ظاہر کرتے ہیں قبول ابن خلدون: جب اس خروج کی خبر معلوم ہوئی تو جناب

امیر نے غلبہ میں فرمایا کہ: ”بلشبہ طلحہ وزبیر و ماحد نے میری خلافت و امامت کے درہم و برہم کرنے پر درپردہ اتفاق کر لیا ہے اور ظاہر لوگوں کو اطلاع کی طرف بلایا ہے اور میں قتل کروں گا جب تک تمہاری جماعت پر مجھے کسی امر کا اندیشہ نہ ہوگا اور میں رکاوٹوں کا اگر وہ لوگ رکے رہے۔“ اعثم کوفی کے موافق: مہملہ اور اسرار کے جناب امیر نے محمد بن ابی بکر سے فرمایا کہ: ”سنئے جو تمہاری بہن نے کیا ارادہ کیا ہے؟“ اور انھوں نے کہا: ”اے امیر المومنین! مسلمان آپ کے موافق ہیں۔ خدا آپ کو فتح دے گا۔“

ابن عثمان کو خلیفہ بنانے کے متعلق طلحہ وزبیر سے سوال اور اس کا جواب ایک اور پچھپ پچھ یہ تھا کہ قبول ابن خلدون: سعید بن الحارث طلحہ وزبیر کے پاس آئے اور کہا: ”اگر تم فتح مند ہو گے تو کس کو صاحب الامر بنو گے۔“ جواب دیا: ”ہم دونوں میں سے جس کو لوگ منتخب کریں گے۔“ سعید نے کہا: ”نہیں بلکہ عثمان کے لڑکے کو حکومت دینا کیونکہ تم لوگ خون عثمان کا ملامت لینے کو نکلے ہو۔“ جواب دیا کہ: ”یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اکبر و شیوخ مہاجرین کو چھوڑ کر ان لوگوں کو حاکم بنائیں۔“ سعید بولے: ”نیں گان کرتا ہوں کہ ایسی حالت میں میں کوشش نہ کر سکوں گا مگر یہ کہ بنی عبد مناف سے حکومت نکالنے کی کوشش کی جائے۔“ طلحہ وزبیر نے اس کا کچھ جواب نہ دیا۔ سعید لوٹ کھڑے ہوئے۔ ان کے لڑتے ہی عبد اللہ بن خالد بن سعید اور متیرہ بن شعبہ اور جو لوگ اس کے ہمراہ قبیلہ ثقیف کے تھے، واپس ہوئے، اور طلحہ وزبیر بقیہ لوگوں کو ہمراہ لیے ہوئے آگے بڑھے۔ ان کے ہمراہ ابان و ولید پسران عثمان تھے۔

حضرت عائشہ کا خط بعض روسائے بصرہ کے نام اور اس کا جواب حضرت عائشہ اپنی ”اصلاح“ کے لشکر کے ساتھ قبول

ابن خلدون: آپ حاسب پر ایک چہانہ روز ٹھہری تھیں کہ لشکر میں ”علی پہنچ گئے“ کاغل اٹھا اور سبوں نے ”نہایت تیزی سے بصرہ کا رخ کیا۔“ اور روسائے بصرہ کو جن کے نام اخف بن قیس اور صبرہ بن یثیمن وغیرہ ہیں مدد کے لیے خط لکھا۔ اخف وغیرہ نے اسلئے انھیں کو الزام دیا اور ان کی شرکت نہ کی۔

علی کا عامل عثمان بن عفیف کو جب خبر معلوم ہوئی تو اس نے ابلاسود وغیرہ کو ماحد اور طلحہ وزبیر کے پاس دریافت حال کے لیے بھیجا اور اگر کسی نے اپنے آئے کی غرض ”اصلاح“ پہنچی تو کسی نے

”انتقام خون عثمان“ بتایا۔ اور اگرچہ انہیں بیعت شکنی کا الزام دیا گیا لیکن یہ ان کے لیے کافی نہ تھا۔ عثمان بن حنیف نے سن کر کہا: ”بہت کلمہ اسلام کی جچی مٹی“۔ دنیسیذ یہ کہ: ”میں ان کو روکوں گا تا آنکہ امیر المومنین علی آئیں“۔

حضرت عائشہؓ مرد تک آ پہنچیں۔ عثمان بن حنیف مقابلہ کو پہنچ گیا۔
جاریہ بن قدامہ اور حضرت عائشہؓ اور طلحہ وزیر نے اپنی اپنی صف سے نکل کر خون عثمان کے

انتقام کے لیے اجماع نے میں فصاحت کا کوئی کونہ بے چھوٹے نہ چھوڑا۔ اور حضرت عائشہؓ نے بھی ایسا ہی کوشش کی۔ جاریہ ابن قدامہ سعدی نے قبول عامہ مؤرخین کہا: ”اے ام المومنین! واللہ عثمان کا قتل جو ناز زیادہ پسندیدہ تھا اس ہے کہ تم اس تلخون لوٹ پر سوار ہو کر لڑائی کے لیے مکہ سے نکلتیں۔ تمہارے لیے اللہ تعالیٰ کی جانب سے پردہ و حرمت تھی۔ تم نے پردہ کی ہنگ کی اور حرمت کو مباح کیا۔ اور بے شک جو شخص تم سے لڑا چاہتا ہو اس کا قتل کرنا مناسب ہے۔ پس اگر تم اپنی طبیعت سے آتی ہو تو بہتر ہے کہ اپنے مکان پر واپس جاؤ۔ اور اگر یہ جبر و اکراہ آتی ہو تو اللہ تعالیٰ سے استغنا مت چاہو اور لوگوں سے واپس چلنے کو کہو“۔

فریقین میں خوب جنگ آزمائی ہوئی۔ آخر میں شک کر صلح کی اور ہتھیار روک رکھنے کا معاہدہ ہوا۔
جنگ اور التوا طلحہ وزیر نے عثمان سے شہر خالی کرنے کو کہا۔ مگر اس نے انکار کیا۔ اور قبولی اپنی غلطیوں: ”طلحہ وزیر نے لوگوں کو جمع کیا اور شب تاریک میں بعد نماز عشاء مسجد کی طرف آئے۔

عہد کے بعد مسجد پر شجوں اور ابن حنیف کے ساتھ برتاؤ عبدالرحمن بن حنبل نے بڑھ کر حملہ کیا۔ تلواروں کی جھنکار سے

مسجد گونج اٹھی۔ تقریباً چالیس آدمی اس وقت مسجد میں موجود تھے۔ لڑائی ہوئی، مارے گئے۔ بالآخر عثمان بن حنیف کے گھر میں گھس کر اس کو قتل کر طلحہ وزیر کے پاس لائے۔ اس حالت میں کہ اس کے چہرے کے کل ہال نوج ڈالے گئے تھے۔ اسی مورخ کے موافق بعض کے نزدیک عثمان بن حنیف کی گرفتاری نماز پڑھانے کی حالت میں عمل میں آئی۔ اور عائشہؓ نے انہیں مارنے اور شہر بدر کرنے کا حکم دیا۔ مباح بن مسعود اس کے لیے مامور کیا گیا۔

طلحہ اپنے خطبہ میں جھٹلائے گئے بصرہ میں داخل ہو کر طلحہ نے کہا: ”اے اہل بصرہ تو بہ گناہ کے لیے ہم چاہتے تھے کہ امیر المومنین عثمان کو راضی کر لیں۔

اس اثنا میں کینوں بلوائیوں نے بلوہ کر کے ان کو شہید کر ڈالا۔ حاضرین نے طلحہ کو مخاطب کر کے کہا: ”ہمارے پاس تو تمہارے خطوط اس کے خلاف آتے تھے۔“ وزیر بولے: ”ہم نے یقیناً ایسے خطوط نہ لکھے ہوں گے۔“

امیر المومنین نے مدینہ پر ابن عباس یا اسمیل بن جناب امیرؓ نے کوچ کیا حسینؓ سردار میسرہ

کر کے کوچ فرمایا۔ اس وقت کی ترتیب لشکر کے موافق حسینؓ امیر میسرہ تھے۔ ربذہ میں قبیلے طے اور اسد نے شرف قدم بوسی حاصل کیا۔ اور رکاب میں چلنے کو عرض کیا۔ آپ نے فرمایا: اپنے ازار پر تم لوگ ثابت وقائم رہو۔ مہاجرین کافی ہیں۔ اسی مقام پر ایک شخص شیبانی کوفہ سے آیا۔ آپ نے اس سے ابوحنیفہ کو دریافت فرمایا۔ اس نے جواب دیا: اگر صلح کا

قصر رکھتے ہو تو وہ تمہارا سہارا ہی ہے اور اگر قصد جنگ ہے تو وہ تمہارا شریک نہیں ہے۔ آپ نے فرمایا: واللہ ہمارا قصد سوانے صلح کے اور کسی امر کا نہیں ہے۔ جب تک ہم پر کوئی موقع نہ ہو۔ راہ میں عثمان بن حنیف وغیرہ کے واقعہ کی خبر معلوم ہوئے ذی قار میں قبیلہ بکر بن وائل نے حاضر ہو کر ہماری کے لیے گزارش کی اور آپ نے متذکرہ صدر جواب دیا۔

ابومویٰ کا خیال امیر المومنین نے محمد بن ابی بکر اور محمد بن جعفر کو کوفہ روانہ کیا تھا۔ ابومویٰ نے انھیں جواب دیا کہ: ”لڑائی کے لیے غرض کرنا دنیا کی راہ ہے۔ اور بیٹھ رہنا آخرت کی۔۔۔ واللہ عثمان کی بیعت میری گردن میں ہے اور علیؑ کے گردن میں بھی ہے۔ اگر لڑائی ضروری امر ہے تو قاتلین عثمان سے جہاں کہیں ہوں لڑنا چاہیے۔“ یہ دلائل گئے جناب امیرؑ نے ملک اشتر اور ابن عباس کو روانہ کیا۔ یہ بھی واپس آئے اور اب جناب امیرؑ نے حسن اور عمار کو روانہ کیا۔ ابومویٰ نے عمار سے کہا: ”اے ابوالیقظان! تم نے امیر المومنین کی مخالفت مخالفین کے ساتھ ہو کر کی اور اپنی سہماری کو فجار کے ساتھ جاڑ رکھا۔“

حضرت عائشہ کے خطوط پھر زید بن صوحان مسجد میں ام المومنین عائشہ کا ایک خط اپنے نام کا اور ایک بنام اہل کوفہ لیے ہوئے آئے۔ اور ان کو بمواچہ حاضر بن علی سبیل انکار پڑھا (نوٹ میں لکھا ہے: ”ہردو خطوط کا مضمون یہ تھا کہ: ”اس زمانہ میں تم لوگ کسی کی مدد نہ کرو، اپنے اپنے مکان میں بیٹھ رہو، یا ہماری نصرت پر آمادہ ہو۔ ہم خون عثمان کا معاوضہ لینے کو آئے ہیں۔“) ابومویٰ یہ کہتے جاتے تھے کہ: ”میری اطاعت کرو اور عرب کے ٹیلوں میں سے ایک ٹیلہ بن جاؤ تاکہ مظلوم تمہارے سایہ میں آکر پناہ گزین ہو۔“

زید بن صوحان اہل کوفہ کو علیؑ کی مدد کے لیے اُجھالتے ہیں زید بن صوحان نے کڑے ہو کر کہا: ”اے عبداللہ بن

قیس! فرات کو لوٹا دو جس طرف سے بڑھ کر آتا ہے اور امیر المومنین و سید المسلمین علیؑ کی مدد کو چلو۔“ قحط بن عمر نے کڑے ہو کر اس کلام کی تائید کرتے ہوئے بیان کیا: ”امیرؑ نے جو کچھ بیان کیا ہے وہ سب درست دینگے۔ لیکن میں تم لوگوں کو نصیحت نہ کہتا ہوں اور سوانے حق کے اور کچھ نہیں کہتا ہوں کہ امیر المومنین علیؑ کی مدد کرو۔ حق تک پہنچ جاؤ گے۔“ عبدغیر نے بھی اسی قسم کی تقریر کی اور ابومویٰ سے مخاطب ہو کر کہا: ”تم جانتے ہو کہ طلحہ و زبیر نے علیؑ کی بیعت کی تھی؟“ جواب دیا: ”ہاں۔“ پھر دریافت کیا: ”کیا علیؑ نے کوئی ایسا کام کیا ہے جس سے ان کی بیعت توڑ دی جائے؟“ جواب دیا: ”میں نہیں جانتا۔“ اس پر عبدغیر نے خشوت سے کہا: ”تم یہ نہیں جانتے ہو تو ہم تم کو چھوڑ دیتے ہیں۔ تا آنکہ تم جان جاؤ۔“ ”اے لوگو! تم کو امیر المومنین نے بلایا ہے، تاکہ جو معاملات ان میں اور ان کے دونوں رفیقوں (طلحہ و زبیر) میں ہیں ان کو دیکھو اور وہ (علیؑ) امت پر فقیہ دین میں مامون ہیں۔ پس جو شخص ان کی مدد کو جائے گا اس کے ہمراہ چلنے کو تیار ہوں۔“ عمار بولے: ”علیؑ نے تم لوگوں کو حق کے دیکھنے کو بلایا ہے۔ چلو اور ان کے ہمراہ ہو کر لڑو۔“

حسنؑ کا مخاطبہ حسن بن علیؑ نے کہا: ”تم لوگ ہماری دعوت قبول کرو اور ہماری اطاعت کرو اور جس بلا میں تم اور ہم بھی مبتلا ہو گئے ہیں اس میں ہماری مدد کرو اور بے شک امیر المومنین کہتے ہیں کہ: ہم اگر مظلوم ہیں تو ہماری امداد کرو اور اگر ہم ظالم ہیں تو ہم سے حق لو۔ واللہ طلحہ و زبیر نے سب سے پہلے میری بیعت کی

اور سب کے پہلے مجھ سے بے وفائی کی۔

نوبہار سپاہی تیار ہوئے لوگوں کے دلوں پر اس تقریر سے ایک فوری اثر پیدا ہو گیا۔ سبوں نے آمادگی ظاہر کی۔ ہدی بن حاتم نے اپنی قوم کو اور عمر بن ہدی نے اسی طرح تحریک کی۔

چنانچہ حسن بن علی کوفہ سے نوبہار کی جمعیت سے روانہ ہوئے۔

احثم کوفی میں اس قدر زیادہ ہے کہ ابو موسیٰ نے کہا کہ مجھے کامیاب ہے پاس خط آیا ہے اور اس میں ہدایت ہے کہ ہم اہل کوفہ سے گمروں میں خاموش بیٹھنے کو کہیں۔ اس پر ہمارے کہا کہ اگر مجھے نے تجھے یہ کہا ہے تو میرا لومین نے ہیں حکم دیا ہے کہ لوگوں کو جمع کر کے ان کی خدمت میں لے جائیں۔

جناب امیر نے امدادی لشکر کا استقبال کیا اسی اثنا میں مالک اشتر پیر کوفہ پہنچ گئے اور دارالامارت سے ابو موسیٰ کا معین قلیل قبل کے

کابل استقل ہو گیا اور جب رومانی کوفہ اور سرداران لشکر ذی قار میں آئے۔ آپ (امیر المومنین) ان کے استقبال کو سوار ہو کر گئے۔ ان پر مرحبا کہا اور یہ ارشاد فرمایا: اے اہل کوفہ ہم نے تم کو اس غرض سے بلایا ہے کہ ہمارے ساتھ اپنے جانوں اہل بصرہ سے مقابل ہو۔ اگر وہ لوگ اپنی رائے سے رجوع کر لیں تو فوج الراء اور اگر اپنے خیال پر اصرار کریں گے تو ان کا علاج ہم نری کے ساتھ کریں گے۔ تاکہ ہماری طرف سے ظلم کی ابتداء نہ ہو، اور ہم کسی کام کو جس میں ذرہ بفرسلا ہو گائیں اصلاح کیے نہ چھوڑیں گے۔ ان اثنا اللہ تعالیٰ پس اہل کوفہ نے امیر المومنین کے پاس ذی قار میں قیام کیا اور عبد اقیس بن کثیر ہزاروں سے مجوز قحی بصرہ اور امیر المومنین کے درمیان فہرے ہونے ان کا اختلاف کر رہے تھے پھر امیر المومنین علی نے قحط بن عمر کو اہل بصرہ کی طرف طلحہ و زہیر کے پاس بھانے اور اتفاق کرنے روانہ کیا۔

حضرت عائشہ کے لشکر کی تعداد قبول احثم کوفی ذی قار میں انیس ہزار لشکر جمع ہو گیا اور اب جناب امیر بصرہ کی طرف روانہ ہوئے۔ ان کے آنے کی خبر

سن کر طلحہ، زبیر، عبد اللہ بن زبیر، مروان بن الحکم، عبد الرحمن بن عتب بن اسید، بلال بن ریح، عبد الرحمن بن حارث، عبد اللہ بن عامر کرز، حاتم بن بکر الباہلی، عمر بن طلحہ اور حاش بن مسعود نے ہتھیار لنگر درست کیا۔ لشکر کی تعداد بیس ہزار تھی۔ امیر المومنین نے سنا اور اپنے لشکر سے خبر کی، اور اہل لشکر نے بھی درستی کی صلاح دی۔

احنف کی وکالت اور علی کا جواب اس اثنا میں احنف بن قیس نے حاضر ہو کر عرض کیا کہ:

”اہل بصرہ میں افواہ ہے کہ اگر علی کو فتح ہوئی تو وہ ہمارے مردوں کو قتل کر کے ہمارے بچوں اور عورتوں کو غلام بنائیں گے۔“ جناب امیر نے جواب میں فرمایا کہ: ”میں ہرگز یہ نہ کروں گا۔ اہل بصرہ مسلمان ہیں۔“ (احثم کوفی) اس کے بعد دریافت کیا کہ: ”میں نہیں جانتا کہ تو نے کیا سوچا ہے۔ تو ہمارے موافق ہے یا نہیں؟“ احنف نے موافقت کا یقین دلا کر کہا کہ: اگر آپ فرمائیں تو دو سو پہلاروں سے ہم آپ کے ہمراہ رہیں، یا چار ہزار جو سپاہیوں کو آپ سے دفع کریں۔ امیر المومنین نے حق مانی کو پسند فرمایا۔ اس کے بعد خطبہ فرمایا کہ:

مخالفیت کے عناصر کا اندازہ

”مجھے اپنے بھائیوں سے قطع عہد، بغاوت اور قلم و حد سے سامنا تھا ہے۔ میرے بھائی اور دوست مجھے غلیظ رسول نہیں دیکھ سکتے۔ مامد محمود فیہ کے زوال کے علاوہ کچھ نہیں چاہتا۔ یہ لوگ چاہتے ہیں کہ لباس خلافت کو جو خدا نے مجھے پہنایا ہے مجھ سے اتار کر خوش ہوں۔۔۔ اس لیے مختلف چیلے اختیار کیے ہیں۔۔۔ اور سخت تر اہم یہ ہے کہ چار شخص جو چار باتوں میں بے ہمتا ہیں، میرے مخالف ہیں۔ رسول کے بعد ایسے چار آدمیوں سے کسی کو سامنا نہیں ہوا۔ ان میں سے پہلا زبیر بن عوام ہے، جس سے زیادہ کسی پہلو نے رکاب میں ہاتھ نہیں رکھا۔ دوسرے طلحہ بن عبد اللہ جس سے بڑھ کر کوئی مکار نہیں ہے۔ تیسرے عاصم بن جہل سے زیادہ کسی کے فساد پر دار نہیں ہیں۔ چوتھے یحییٰ بن نہبہ کہ جس سے زیادہ اس زمانہ میں کسی نے مال دنیا جمع نہیں کیا۔ اول اللہ کرتین شخص میری مخالفت میں صرف کرنے کے لیے جس قدر روپیہ اس سے طلب کریں گے دے گا۔“

فرخ بن ثابت نے یہ سن کر علی کی پہلی، شجاعت اور علم کی تعریف کہ لوگوں کی اطاعت کا ذکر کیا اور کہا کہ: ”میں لوگوں نے قلم سے جو مال جمع کیا ہے اس سے جہل اور فساد کی حکم پری کریں گے۔“

جناب امیر کا خط جس میں اہل مدینہ کو حکم بنانے کا خیال ظاہر کرتے ہیں اس کے بعد جناب امیر نے طلحہ و زبیر کو

خط لکھا جس میں واقعات بیان کیے تھے۔ فرمایا کہ: ”اہل مدینہ کو حکم بننا جو اس وقت کسی کے ساتھ نہیں ہیں۔ تم نے ہمسک مسلمانوں کو قتل کیا، اور عاصم کو لے آئے۔ تمہیں عثمان سے کوئی قربت نہیں کہ تم خون کا دعویٰ کر سکو۔ عثمان کے لڑکوں کو پہلے میری بیعت کرنی چاہیے، اس کے بعد جس پر انہیں دعویٰ ہو پیش کریں کہ موافق انصاف شریعت کا حکم نافذ کیا جائے۔“

اسی طرح عاصم کو بھی خط لکھا کہ: ”تم کہتی ہو کہ ہم اسلام کے لیے آئے۔ عورتوں کو لشکر کشی اور مردوں کے درمیان اسلام سے کیا کام۔ تم میں اور عثمان میں کوئی قربت نہیں ہے۔ عثمان بنی امیہ سے تھے اور تم بنی قیم بن مرہ بن کننہ سے۔ تم کھرے باہر نکلیں اور خلق کو معرض ہلاکت ڈالو۔“

طلحہ و زبیر نے جواب دیا کہ تم نے شہرت کی غرض سے لشکر کشی کی ہے۔ ہم تمہاری اطاعت نہ کریں گے اور ابن زبیر نے قرقر کی کہ: ”اپنے زن و منہ زند اور حسب و نسب کی حفاظت کے لیے لڑو۔“

حسن کا لشکر سے خطبہ کسی نے حسن سے یہ قرقر قتل کی اور انہوں نے جواب میں اپنے لشکر کے سامنے قرقر کی جس کا مخصوص مضمون یہ تھا کہ: ”تم لوگ جانتے ہو کہ زبیر نے عثمان کو کیا کچھ نہیں کہا، اور طلحہ نے بیت المال پر کیا تصرف نہیں کیا۔ ہیں انصار عثمان سے کوئی غرض نہیں ہے۔ بلکہ ہم شترشیں کے رکھائے آملہ جنگ ہیں۔ ہر شخص نے اس خطبہ کو پسند کیا۔“

علی اور صلح کی کوشش دونوں لشکر ایک دوسرے کے مقابل پہنچے اور سپاہیوں میں جنگی کیفیت پیدا ہونے لگی تھی کہ کعب بن سواد نے عاصم سے کہا: ”بہت خون بہا چاہتا ہے اے مادر مومن! کچھ فکر کرو ورنہ ہر شکنجہ ممکن نہ ہوگی۔“ یہ سن کر عروج میں بیٹھ کر آئیں اور دیکھا کہ علی اپنے

سپاہیوں کو جنگ سے روک رہے ہیں۔ یہ دیکھ کر واپس آئیں۔ جناب امیر نے دوبارہ ابن موحان اور ابن عباس کو کھانے کے لیے بھیجا لیکن حاکم نے جواب دیا کہ: ”ہم کوئی جواب نہیں دیں گے۔ اس لیے کہ ہم محبت میں علیؑ پر غالب نہیں آسکتے۔“ یہ سن کر جناب امیر نے سردار ابن لشکر کو طلب فرمایا اور جب حاضر ہوئے تو فرمایا:

”جہاں تک میرے امکان میں تھا میں نے نری اور تسلیٰ کی جنگ کی تختیوں سے ڈرایا۔ قسم دی۔ کسی کا نتیجہ نہ ہوا۔

جناب امیر کا لشکر سے جنگی خطبہ

بلکہ غم سے کہا ہے کہ ”لڑائی کے لیے آمادہ ہو“ اور مردوں کے سامنے آؤ۔“ ہم سے یہ کہا ہے جس کا غم و غنا میدان جنگ میں ہوا ہے۔ میں وہی علیؑ ہوں جس نے ان کی صفیں توڑی ہیں، ان کے آہد و اچھاؤ کو قتل کیا ہے اور ان کی صفت کو پریشان کیا ہے۔ وہی تلوار میرے قبضہ میں ہے۔ میرا دل اور ہازد متین ہیں۔ جو قتل نہ ہوگا مرے کا ضرور۔ مرنے سے قتل ہونا بہتر ہے۔ غم پر تلوار کے ہزار زخم عورتوں کی طرح مسراش پر مرنے سے زیادہ آسان ہیں۔“ اس کے بعد علیؑ نے مناجات کی۔ مسلمانوں کے درمیان جنگ کرانے والوں کی شکایت کی۔ نقص عہد اور بے وفائی کا شکوہ کیا۔ اور اپنے کو لڑائی چھڑنے سے معذور کر کے تعبیر کا حکم دیا۔ عمار، یاسر، شریح بن ہانی، سعید بن قیس، رفیع بن شداد، الجہاد، محمد بن ابی بکر، صدق بن حاتم، زیاد بن کعب، عمر بن عدی، عمر بن اخط اور جناب بن زبیر کو انہیں لشکر معزز کر کے حکم دیا کہ ہر قبیلہ اپنے انصر کے حکم پر توجہ رکھے۔ لیکن خواہش اسلام سے علیؑ سیر نہیں ہوئے۔

صلح کے لیے علیؑ غیر مسلح میدان میں آئے اور زبیر کو حدیث یاد دلانی

رسول کا کردہ پہنہ رسول کی ردا اور حمی

سیاہ عمامہ سر پر رکھا اور رسول کے مرکب دلدل پر سوار ہو کر، غیر مسلح میدان جنگ میں آئے اور آواز دی: ”زبیر کہاں ہے میرے سامنے آئے۔“ زبیر آگے بڑھے اور حاکم نے فریاد کی کہ: ”کیا اسلام کو سیو کر ڈالے گا؟“ زبیر نے جواب دیا: ”مظنن رہو۔ علیؑ مسلح نہیں ہیں۔ وہ بہ قہد جنگ نہیں آئے ہیں۔ شاید غم سے کچھ کہنا ہے۔“ جب زبیر پہنچے تو علیؑ نے فرمایا: ”اے ابا عبد اللہ! یہ کس بات کے لیے تم آمادہ ہوئے ہو؟“ جواب دیا: ”طلب خون عثمان کے لیے۔“ فرمایا: ”بھان اللہ! تم نے اور تمہارے دوستوں نے عثمان کو قتل کیا تھا۔ کس سے طلب کرتے ہو؟“ اس کے بعد جناب امیر نے جناب رسالتؐ کے اقوال یاد دلانے۔ زبیر پر اثر پڑا اور یہ واپسی کا عہد کر کے چلے۔ حاکم نے مضمون ٹھگھو دریافت کیا۔ بتلایا اور کہا کہ ”لڑائیوں میں مجھے بصیرت اور قوت رہتی تھی۔ لیکن

آج علیؑ کے مقابلہ میں گویا تردد اور تحیر سے اپنے قدم اپنی جگہ نہیں دیکھتا۔ حاکم نے جواب دیا کہ تم علیؑ کی تلوار سے ڈر گئے۔ یہ کوئی عیب کی بات نہیں ہے۔ تم سے پہلے بڑے بڑے ڈر چکے ہیں۔

ابن خلدون بھی حدیث بیان کرنے کے بعد عبد اللہ بن زبیر سے کہلاتا ہے کہ: ”ہاں جب دونوں فریق کو متح کر لیا اور ایک کو دوسرے کی عداوت پر ابھار دیا تو اب مجھ کو کہانے کا قہد کرتے ہو۔“ زبیر نے کہا: ”میں نے قسم کھالی ہے۔“ جواب دیا کہ: ”اپنی قسم کا کفارہ دیدو۔ اپنے ظلم منکول کو آزاد کر دو۔“

لڑائی شروع ہوئی

جنگ شروع ہوئی۔ اصحابِ جل نے تیر مارنا شروع کیا۔ علیؑ کے سپاہی خاموش کھڑے تھے۔ یہاں تک کہ انھوں نے کہا: امیر المومنین! اب ان کی شوفی حد سے گزر گئی اور ہمارے آدمی زخمی ہو گئے۔ اب کیا انتظار ہے؟ فرمایا: میں اپنی معذوریّت چاہتا تھا۔ اب علیؑ نے اسلحہ جنگ زیبِ جسم فرمایا۔ اور ایک جوان کو قرآن دے کر فرمایا کہ جلاؤ اور اس کے اوامر و نواہی یاد دلاؤ۔ قرآن بردار سپاہی گیا۔ اور پہلدار کی طرح اس نے ہاتھ کٹوائے اور جان بوی۔ جناب امیرؑ نے اپنے فرزند محمد بن حنفیہ کو علم دیا۔ اور حملہ کرنے کا حکم دیا۔

مردان اور طلحہ

اٹلنے لگی جنگ میں قبولِ اعثم کئی: مردان بن حکم نے طلحہ کو ترغیب جنگ دیتے ہوئے دیکھ کر غلام سے کہا کہ: ”مجھے عجب ہے کہ قتل عثمان میں طلحہ سے زیادہ کوئی قرص نہیں کرتا تھا۔ آج کہتا ہے کہ میں خون عثمان کا انتقام لیتا ہوں۔ میں مسلمانوں کو اس سے خلاص کرتا ہوں۔ تو میرے سامنے کھڑا ہو جا کہ کوئی نہ دیکھے۔ میں اسے تہہ مارتا ہوں۔“ یہ کہہ کر زمہ آؤد تیر مارا۔ تیر طلحہ کو لگا۔ اور اس کے مذمہ سے بے پوش ہو کر گرے اور کچھ دیر کے بعد مر گئے۔ طلحہ کو صدمہ ہوا۔ مولوی عباسی صاحب گورکھ پوری اور روضۃ المتفاد جامع التواریخ وغیرہ نے بھی اس کا تذکرہ فرمایا ہے۔

مقتولین جنگ کی تعداد، منادی

جناب امیرؑ اور ان کے سرداران لشکر نے تصفیہ کیا کہ جب تک طلحہ کا آؤٹ زندہ رہے گا عثمان قتل ہوتے رہیں گے۔ اس لیے آؤٹ کے پاؤں کاٹنے پر سپاہیوں کو مشغول کیا۔ آؤٹ گرا۔ لڑائی ختم ہوئی، نہ اس کے قبل کی حالت کے نو ہزار اور علیؑ کے ایک ہزار ستر سپاہی قتل ہو چکے ہوتے۔ جناب امیرؑ نے قبل آغاز جنگ منادی کرا دی تھی کہ: ”کوئی شخص اس معرکہ میں بھاگنے والے کا تعاقب کر کے اس سے نہ لڑے اور نہ کسی زخمی پر حملہ کرے اور نہ کسی کا مال و اسباب چھینے۔“ بعد ختم جنگ بھی یہی منادی کرائی۔ جس میں اس قدر زیادہ تھا کہ کوئی ”کسی کے گھر میں نہ گھسے۔“ قبولِ روضۃ الاحباب اپنی فوج سے فرمایا کہ: ”ہماری نیت دفاعی ہے نہ کہ قتل کی۔ تم ابتدا بہ جنگ نہ کرو اور بروج یا مریض کو قتل نہ کرو۔“ بعد ختم جنگ جناب امیرؑ نے قبول ابنِ غلدون: مقتولین کے درمیان عائشہ بھائی کی حفاظت میں سے عمادی اٹھالینے اور محمد بن ابی بکر کو اس پر قبضہ کرنے کا حکم دیا۔ اور یہ ارشاد کیا کہ: ”دیکھو ائمہ المومنین کو کہیں زخم تو نہیں لگا؟“

عائشہ کی حسرت

جب لوگ حالت کے پاس گئے تو کہا: ”مجھے عجب و منظور تھا کہ آج کے واقعہ سے میں برس پہلے میں مر جاتی۔“

زیرِ بھی اس جنگ کے بعد زندہ نہ رہے۔ حضرت عائشہ ابنِ غطف کے مکان پر ٹھہرائی گئی تھیں۔ امیر المومنینؑ یہاں تشریف لے گئے۔ اور قبول ابنِ غلدون: ”چونکہ اس واقعہ میں عبداللہ بن غطف کام آئے تھے، ان کی ماں اور نیز بعض اور عورتوں نے امیر المومنینؑ کو سخت دست کہا۔ آپ نے غفلت توجہ نہ کی۔ بعض مصاحبین نے آپ کو بر غلات ان کے اہمارنا چاہا۔ آپ نے فرمایا: ”چونکہ عورتیں ناقص العقل ضعیف البینان ہوتی ہیں، اس وجہ سے ہم ہمیشہ عورت

مشکلات سے تعرض کرنے کو منع کرتے ہیں چہ جائے کہ مسلمان عورتوں سے ہم متعرض ہوں۔“
حضرت عائشہ سے مدینہ جانے کو کہا گیا جب امیر نے منسلما کہ: ”ہم نے تمام عالم کو پناہ دی ہے۔“ اس کے بعد جناب امیر نے ابن عباس کو عائشہ کے پاس اس پیغام کے ساتھ بھیجا کہ: ”تم اب مدینہ جاؤ۔ بسرہ میں زیادہ قیام کی ضرورت نہیں ہے۔“ کچھ دیر تک آپس میں گرم کلام ہونے اور ”امیر المومنین“ کے خطاب سے انکار کرتی رہیں۔ آخر میں کہا:

حضرت عائشہ کا بنی ہاشم کے متعلق خیال ”اچھا۔ اس شہر سے ملی جاؤں گی۔ مجھے کوئی گھر اس سے زیادہ دشمن نہیں ہے، جہاں اسے بنی ہاشم تم ہو۔“
 بقول روضۃ الاحباب کہا: ”سب وہاں جاتیں گے جہاں اسے بنی ہاشم تم نہ ہو۔“ اور یہ سن کر ابن عباس اس کو قہقہے کہتے رہے کہ تمہیں تمام شرف بنی ہاشم سے حاصل ہونے ہیں۔ اور آخر میں یہ سن کر عائشہ نے کہا کہ: ”تم اطمینان رکھو کہ علی تمہاری ان باتوں پر توجہ نہ کریں گے اور تمہیں اس پر مسلم نہ رکھیں گے۔“ ابن عباس نے جواب دیا کہ ”ہم علی سے ان امور میں کوئی مداخلت نہ کریں گے اور انہیں مسلم رکھیں گے کہ وہ بہ نسبت میرے قریب تر ہیں۔“

حسن بھیجے گئے اور ان کے ایک اشارہ نے اثر کیا ابن عباس نے واپس آکر تمام مسئلہ علی سے عرض کیا۔ علی نے جواب دیا کہ: ”امیر المومنین سوگند یاد کی کندہاں خدا نے کہ خلق آسمانیہ اوست کہ اگر ابنی ساحت بر نہ شیری و یحباب مدینہ ہلا نہ کردی تھے کہ میدان دور حق تو بگوئی و عائشہ دران ساحت سر داشتہ ی کرد و کیسوںے راست ہالہ بود و چپ ماندہ۔“ جن حسن رضی اللہ عنہ ابن بگفت کیسوںے چپ ناہالہ بگذاشت و برہائے جست و گفت بشاید و راحلہ من یارید تا بجناب مدینہ روم۔“ یعنی: ”امیر المومنین قسم اٹھاتے ہیں اس خدا کی جس نے کائنات کو پیدا کیا ہے کہ اگر اس گھڑی تو نہ اٹھی اور مدینہ کی طرف واپس نہ ہوتی تو وہ بات جو تو جانتی ہے تیسہ سہ بارے میں کہہ دوں گا۔ عائشہ اس وقت سر کو کھنکھی کر رہی تھیں اور دائیں کیسو کو گوندہ چکی تھیں اور بائیں کیسو رہتا تھا۔ جب حسن نے یہ کہا تو بائیں کیسو کو گوندہ سے بغیر چھوڑ دیا اور ہاتھوں پر اچھل پڑی اور بولیں جلدی کرو میری سواری لاؤ تاکہ مدینہ کی طرف چلوں۔“

صاحب روضۃ الاحباب نے بھی اس کا تذکرہ کیا ہے۔ ایک عورت اس وقت موجود تھی اس نے کہا کہ آپ نے ابن عباس اور خود امیر المومنین کو سخت جواب دیے اس لئے کہ کہنے سے اس قدر مضطرب ہونے کی کیا وجہ ہے اور قسم دی۔ حضرت عائشہ نے فرمایا: ”جس رمز کا علی نے اشارہ کیا ہے اس کا واقعہ یہ ہے کہ ایک دن تقسیم قیمت میں ہم لوگ زیادتی کی درخواست کر رہے تھے کہ علی نے منع کیا اور ہم نے سختی سے جواب دیا۔ علی نے یہ آیت پڑھی کہ: عَسَىٰ رَبُّهُ اَنْ يُّفْلِحَ الْاٰنَ اَمْ يَكُنَّ اَزْوَاجًا خٰیَرًا وَشٰكٍ (۵: ۶۶) پھر ہم نے سختی کی اور رسول نے منسلما کہ: ”ابن زبائن رابد ست تو کردیم ہر کرا الا ایشان طلاق دی چکے کس از من نباشد و از حلالہ من بر طرف گرد و دواہن طلاق رادقتے“

معین نہ کر دے کہ در حالت حیات میں یا بعد از وفات میں دی ازان کی ترسم کہ اگر اس وقت اشارت علی گوش نہ دارم علی طلاق گوید آن گاہ کہ کس مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم رانا شام و از دولت ابدی عروم ہاشم۔ یعنی: میں نے ان عورتوں کو تیرے ہاتھ میں دے دیا ہے۔ جس کو بھی تو نے ان میں سے طلاق دے دی وہ میری بیوی نہ رہے گی اور میرے جہلہ عقد سے نکل جائے گی۔ اور اس طلاق کا کوئی وقت مقرر نہ کیا تھا کہ میری زندگی میں دے یا میری وفات کے بعد دے۔ اس وجہ سے میں ڈرتی ہوں کہ اگر اس گھڑی علی کے اشارہ کو نہ سنا تو علی طلاق دے دیں گے۔ اس وقت مصطفیٰ سے میرا کوئی تعلق نہ رہے گا اور ہمیشہ کی دولت سے عروم ہو جائوں گی۔

فتح جمل کا فائدہ

جمل کی فتح نے جناب امیر کو اس قدر موقع دیا کہ وہ گرد و پیش کے دشمنوں سے ایک گونہ مطمئن ہو جائیں اور انہیں اچھی طرح پہچان لیں۔ یہ بھی ہوا کہ عطائے امان سے بہت سے زخمی دشمنوں، دشمنوں اور متوجہین نے بیعت کی اور کہا جاسکتا تھا کہ یوشام کے تمام تمام صوبیات پر جناب امیر کو اختیار حاصل ہو گیا۔ جناب امیر نے بقیہ مقامات پر اپنے عامل روانہ بھی کیے۔

رجب ۳۶ کو فہ اور استقبال

امرا اور سرداران لشکر نے بعد ختم جنگ سوال کیا کہ: ”امیر المومنین اب کس طرف توجہ فرمائیں گے کہ ہم بھی مستعد رہیں اور جہلہ ملکہ اس وقت کو فہ چلنے کی صلاح ہے۔ اس کے بعد جو مصلحت ہوگی ویسا کیا جائے گا۔ اور نہ صرف وہ روسہ شرقا اور امرائے لشکر جو کو فہ کے تھے اور اس وقت شریک فوج تھے خوش ہوئے۔ بلکہ خود جو کو فہ میں تھے انہوں نے نہایت مسرت اور خوشی سے استقبال کیا۔ جناب امیر قہر امارت میں فوکش نہ ہوئے، بلکہ جعدہ بن ہبیرہ کے مکان کو پسند فرمایا اور یہاں عملدین سلام کے لیے حاضر ہوئے اور جناب امیر نے اکشر سے فرمایا کہ: ”اگرچہ تو بھی ہمارے حاکمین میں سے تھا مگر آج غلبہ ہے۔“

جنگ صفین کا مقدمہ جزیرہ کی چھیڑ چھاڑ

جناب امیر کو معلوم ہوا کہ ولایت جزیرہ کے لوگوں نے عثمان کی ہوا خواہی کے لحاظ سے یہ مناسب سمجھا کہ معاویہ سے بیعت کر لیں۔ امیر المومنین نے مالک اشتر کو اس کا حامل مقرر فرما کر روانہ کیا۔ حاکم بن قیس القہری معاویہ کا منقہ سردار اس وقت حیران میں تھا۔ اس نے اہل رقبہ سے مدد طلب کی اور لکھا کہ مالک اشتر کو داخل نہ چھلنے دو۔ رقبہ اور حیران کے لشکروں نے مل کر مالک اشتر پر حملہ کیا لیکن اشتر نے شکست دی اور حاکم کو امیر شام سے کمک طلب کرنی پڑی۔ اشتر کے پرانے ”دوست“ عبدالرحمن بن خالد بن ولید فوج شام کی مدد کے لیے آئے لیکن شام کے مجموعی لشکر کو آج وہ موقع نہ ملا جو اشتر کے ساتھ محسوس میں ملا تھا۔ شام سے پھر مدد آئی اور پھر اشتر کی تلوار نے سب کو شام کی مڑک دکھادی۔ جزیرہ قبضہ میں آ گیا اور اشتر نے واقعات کی باضابطہ اطلاع بھیجی۔ حالات کا غلط پر امیر المومنین نے حسب ذیل خطبہ فرمایا:

فتح جزیرہ کی اطلاع پر جناب امیر کا خطبہ

خداوند عالم اپنے بندوں سے یز اس کے راضی نہیں ہوتا کہ وہ راہ حق کے مسلک ہوں اور جب تک آپس میں دفتی اور موافقت رہتی ہے اور ایک دوسرے پر طعن و تشنیع نہیں کرتے اس وقت تک ان کے قبضہ سے انتظام

اور حکومت نہیں نکلتی۔ جب اس کے خلاف کرتے ہیں اور ایک دوسرے کو اٹھالنا پسندیدہ اور اقوالناستودہ نہ سمجھتے۔ نسبت دیتے ہیں کاموں میں ظل واقع ہوتا ہے جس کا نتیجہ تباہی ہے۔ ضرورت خطاب یہ ہے کہ معاویہ نے اہل شام کو شک میں ڈال رکھا ہے۔ اور ان کے دلوں کو میری اطاعت اور بیعت پھیر دیا ہے۔ اور کہا ہے کہ علی بن ابی طالب نے عثمان کو قتل کیا۔ یہ بڑا کام میرے سپرد کیا ہے۔ اس بنیاد پر میری مخالفت میں اس نے مالک اشتر سے لڑنے کے لیے فوج بھیجی۔ جو جزیرہ کا حامل ہو کر گیا تھا اور لشکر جمع کر کے فوج سے لڑنے کا قصد کر رہا ہے۔ یہ صلاح معلوم ہوتی ہے کہ اسے نصیحت کروں اور خط لکھوں۔ شاید اس پر اثر ہو اور لڑائی کے خیال کو فسخ کر دے۔ اس میں تمہاری کیا صلاح ہے؟۔ حاضرین نے جواب دیا کہ: ”امیر المومنین کی رائے نہایت مناسب ہے۔ ہم لوگ آپ کے دیے ہی مطیع ہیں جیسے رسول کے تھے۔“

معاویہ سے خط و کتابت
جناب امیر اور معاویہ میں جس قدر خط و کتابت ہوئی وہ بہت زیادہ ہے۔ جو نہ صرف عام تاریخوں میں ملتی ہے بلکہ وہ فتح البلاغہ میں بھی موجود ہے۔ اس کا کوئی نتیجہ نہ ہوا، اور فریقین تلوار سے فیصلہ کے لیے آمادہ ہوئے۔

جناب امیر نے اپنے حاکموں کو اپنی فوج کے ساتھ حاضر ہونے کا حکم بھیج دیا اور

علی کا فرمان اور اشعث بن قیس
انہیں میں اشعث بن قیس کنہی کے نام بھی تھا جو ان دنوں

آذربائیجان کا عامل تھا اسے عبداللہ بن حاتم کرز نے اس وقت مقرر کیا تھا جب کہ ابن حاتم عثمان کے پاس مشورہ کے لیے آیا تھا۔ یہ اس وقت سے برابر آذربائیجان میں رہا۔ جب امیر المومنین کا فرمان پہنچا تو بقول امثم کوئی وہ سوچنے لگا کہ امیر المومنین کے پاس جانے یا معاویہ سے مل جانے کہ حساب فہمی سے محفوظ رہے۔ اس نے اپنے اعزاء اور مقررین سے اپنا تردد بیان کیا اور سب نے اسے امیر المومنین کی خدمت میں حاضر ہونے کی تساہل پر ملامت کی اور یہ شرا کر مع سلمان روانہ ہوا۔ اور شرف قدم بوسی حاصل کیا۔ جریر بن عبداللہ ابی حاتم ہمدان بھی حاضر ہوا، اور یہ معاویہ کے پاس بغرض لہائش روانہ کیا گیا۔

عمر بن عاص پر علی کی بیعت کا اثر
اس اثنا میں عمرو بن حاص بھی انتظار کا جو اکمیل رہا تھا، اور بقول ابن خلدون جبہ ”علی کی بیعت کا مال ساخت ریغہ ہونے۔“

اور جب مالکہ کے غروج کی خبر لگی تو ”اس سے ایک گونہ ان کی طبیعت کو شکستگی ہوئی۔“ اور جب مالکہ کو شکست ہوئی تو ”ان کے حالات میں تذبذب واقع ہوا۔“ اور ”جب اہل شام اور معاویہ کو خون عثمان کا ماحولہ طلب کرتے ہوئے پایا، دل ہی دل میں خوش ہوئے۔“ اس کے بعد عمرو بن حاص کا بیٹوں سے صلہ لینا، ان کی رائے، غلام کا غزوہ، عمرو حاص کا جناب امیر کی مدد کرنا، معاویہ کے پاس جانا، محاکمہ اور شرکت کے صلہ میں مصر کی دستاویز کا لکھا جانا، قریب قریب تمام تاریخوں میں پایا جاتا ہے۔

معاویہ اور عمرو بن حاص کے تصفیہ کے بعد ابن حاص کے ایک چچا زاد بھائی نے اسے ملامت کی کہ تو نے دین کو دنیا کے ہاتھ بیچ ڈالا۔ اس پر ابن حاص نے ہنس کر جواب دیا: ”اے برادر کلہ دنیا حکم تقدیر سے وابستہ ہیں، نہ یہ معاویہ

اور نہ علیؑ کے ہاتھ میں ہلہ میں نے کوشش کی ہے۔ شاید موافق ہو جائے اور نام و نصیب حاصل ہو۔“
ابن حاص کا ابن عم شام سے روانہ ہو کر کوفہ میں آیا، اور امیر المومنین کی خدمت میں حاضر ہو کر صورتِ معللہ عرض کیا۔ اگرچہ خود جناب امیرؑ نے کرچکے تھے کہ معاویہ کی فوراً خبر لینی ضرور ہے لیکن صلاح لینے پر معلوم ہوا کہ کچھ لوگ عجلت اور اکثر لوگ توقف چاہتے تھے۔ بنا بر اس کے جناب امیرؑ نے فرمایا:

”اہل شام سے لڑائی کے لیے میرا مستعد ہو جانا حالانکہ میرا قاصد
جبران کے پاس موجود ہے۔ گویا ان لوگوں کے لیے درخت
بند کر دیتا ہے اور گویا میں اہل شام کو اگر وہ اطاعت کا ارادہ بھی رکھتے ہوں روک رہا ہوں۔۔۔۔۔ ہاں میں تمہاری تیاری
جنگ کو برا اور مکروہ نہیں سمجھتا۔“

جبر کو تاکیدِ حکم اس کے بعد جناب امیرؑ نے جبر کے نام حکم بھیجا کہ معاویہ سے گفتگو ختم کی جائے اور
جبر نے معاویہ کو امیر المومنین کے حکم کی اطلاع دی۔ معاویہ نے عمرو بن حاص سے
صلاح کہ سوچا گیا کہ علیؑ سے بیعت نہ کرنے میں غلطی ہے۔ لیکن

شرحبیل کے لیے گواہوں کی تیاری طے یہ کیا گیا کہ شرحبیل بن سبط الکندی جو روسائے شام میں
سے اس وقت محض میں سکونت پذیر تھا بلایا جائے اور چند
مقبول القول گواہ تیار رکھے جائیں جو یہ کہیں کہ علیؑ نے عثمان کو قتل کیا۔ بشر بن ارقطہ، حمزہ بن مالک،
حابس بن سعد الطائی، ابوالاعور اکی، یزید بن انس وغیرہ شہادت دینے پر راضی کیے گئے۔ شرحبیل بلایا گیا اور تیار شدہ قتل
بغیر غلطی کے کی گئی۔ اور شرحبیل نے جواب دیا کہ: ”اب ہم میں اور علیؑ میں یزید بن ابی سہل کے اور کسی چیز سے معللہ نہیں
ہو سکتا۔“ جبر نے اس کی تقریر سنی اور اسے کھلایا لیکن اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ اب معاویہ نے جبر سے کہا: ”تو نے
اہل شام کی رائے سنی اور اب تو نے جو کچھ دیکھا یا سنا ہے اسے جا کر علیؑ سے بیان کر۔“

علیؑ کے خلاف براہِ جنگی کے لیے الزامات کا اعلان اس کے بعد شرحبیل نے صلاح دی کہ اس
امر میں بغیر موافقتِ عوام کام نہ چلے گا۔ اور

اپنے زیر اثر شہروں میں تقریریں کیں، اور منادی کر دی کہ: ”علیؑ بن ابی طالب نے عثمان کو قتل کیا۔ امت رسولؐ میں تفرقہ
ڈالا۔ بصرہ میں قتل عام کیا۔ اب تمہاری طرف رخ کیا ہے کہ تمہیں گمراہوں سے نکال دے اور رنج و غضب میں گرفتار
کرے۔ کوئی یزید معاویہ کے مقابلہ کی طاقت نہیں رکھتا۔ اس لیے تم سب لوگ ایسے دشمن کے دفع کرنے کے لیے معاویہ
کی مدد کرو۔“ اسی زمانہ میں عبداللہ بن عمر خطاب بھی شام تشریف لائے اور امیر شام نے کمال اظہارِ مسرت سے عمرو بن
حاص سے کہا: ”مجھے معلوم ہوا کہ عمر بن خطاب پھر سے زندہ ہو گئے (لوگوں سے مخاطب ہو کر) اگر یہ علیؑ سے کشیدہ نہ
ہوتے تو ہرگز میرے پاس نہ آتے۔ اب ہمارے پاس ان کی موجودگی سے لوگوں کا اعتقاد بڑھے گا۔“ عمرو بن حاص نے
کہا: ”یہ تیری موافقت سے نہیں بلکہ علیؑ سے بھاگ کر آئے ہیں۔“ اس کے بعد ابن عمر کے لیے تقریر میں مٹھاس
اور دھندلہ دھندلہ کا اہتمام کی حد تک اہتمام کیا گیا اور ان سے چلایا گیا کہ تم میسر پر علیؑ کی مذمت کرو، اور کہو کہ انھوں نے

عثمان کو قتل کیا۔ ابن عمر نے شق مٹی کو قبول کیا۔ لیکن منبر پر جا کر ہکا بکا ہو گئے اور اتر آئے۔ جب پوچھا گیا تو کہا کہ: ”میں نے نہ چاہا کہ منبر پر جھوٹ بولوں۔“

کس نے معاویہ کی دعوت قبول کی اور کس نے نہ کی

امیر شام نے عبداللہ بن عمر، سعد بن ابی وقاص، محمد بن مسلمہ انصاری وغیرہ کو

اپنا ساتھ دینے کے لیے بلایا۔ لیکن ان سب لوگوں نے اسے سخت جواب دیے۔ بقول روضۃ الغضا مشہور البہرہ: ”ابو بردہ“ ابواسامہ اور نعمان بن بشیر انصاری نے معاویہ کی دعوت قبول کی اور اب معاویہ نے ابی شام کے سامنے خطبہ دیا اور کہا: ”تم لوگ بیان کرو کہ علیؑ کو فوج معاویہ علیؑ کے مقابلہ میں اپنی فضیلتوں کا جریڑھتا ہے۔ پر کس بات سے فضیلت ہے۔“

میں رسول کا منشی تھا میری بہن ان کے گھر میں تھی، میں عثمان کا نائب اور عامل تھا میری ماں چندہ دختر عقبہ بن ربیعہ ہے۔ اگر ابی حجاز و عراق نے علیؑ سے بیعت کی ہے تو ابی شام نے میری بیعت کی ہے۔ ہم میں اور علیؑ میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اگر دو شخص کسی چیز کے بارے میں جنگ کریں تو وہ چیز اس کی ہے جو غالب ہو۔“ اور پھر علیؑ کو خط لکھا کہ: ”پہلے ابی حجاز اہل احکام حق کے ماتم تھے، اب وہ اختیارات شام میں منتقل ہو گئے۔“ اور بہت سی خط و کتابت کے بعد علیؑ نے جواب دیا کہ ”تو اپنے باپ کا بیٹا نہ ہوتا اگر اس کے افعال کی تقلید نہ کرتا۔“ اگر معاویہ نے لکھا کہ ہم اتنے عساکر اور پیادے طاہرے ہیں، لڑنے کو تیار رہو، تو علیؑ نے جواب دیا کہ: ”وہ ہاتھ جس نے تیرے نانا عقبہ، ماں کے چچا شیبہ، ماموں ولید اور بھائی حطلہ کو قتل کیا ہے ابھی ویسا ہی سالم ہے۔“ یا کبھی فرمایا کہ: ”حقیقت یہ ہے کہ تو نے عثمان کی وہاں مدد کی جہاں تھے اس کی مدد سے فائدہ پہنچا اور اس مقام پر اس کی لہ اوسے ہاتھ اٹھالیا جہاں اسے تیری لہ اوسے فائدہ پہنچ سکتا تھا۔“

مردان بن حکم عثمان کی تلوار لگائے تھا

فوجیں روانہ ہوئیں، معاویہ کے احکام فوج میں لکھا

کچھ جوئے فوج کے آگے آگے رکھا گیا تھا۔ جناب امیر نے فوجی احکام کے ساتھ اپنے سردار ان لشکر کو روانہ کرنا شروع کیا۔ اپنے مقدمہ لشکر کے امیر زیاد بن نضر اور شرح بن ہانی سے فرمایا کہ ”دیکھنا قبل اس کے کہ دشمن تمہیں لڑائی کے لیے میدان میں طلب کریں قبل اس سے کہ ان کے عذر تمام ہوں کہیں ان کے سینوں میں جوش کھلنے والی دشمنیاں تمہیں ان کے ساتھ قتل و قتل پر آمادہ نہ کریں۔“ اور یہ اعتیلا حتی افسروں میں کہ مالک اشتر نے ابلا عور کا انکاری خط ثبوت کے لیے امیر المومنین کے دکھانے کو اپنے پاس رکھ لیا۔

صفین میں جناب امیر کا خواب

جناب امیر کا خواب جسے میں نے مقدمہ کتب میں ذکر کیا ہے

صفین کی روانگی کے زمانہ میں تھا جسے ملا جاہی ان فکلوں میں بیان فرماتے ہیں: بکر بلا رسید براست و چپ نگریت و گریبان گریبان لڑا غبار گزشت۔ پس گفت واللہ ابن سبت عمل خواہندین شتران ایشان و موضع مردن ایشان۔ اصحاب گفتند اے امیر المومنین ابن چہ موضع است؟ فرمود کہ ابن کربلا است۔ ابن جاقوے را بکشید کہ بے حساب در بہشت درانید بعد از ان برفت و پیچ کس تاویل سخن دے ندانست تا آن روز کہ

واقعہ امیرالمومنین حسین رضی اللہ عنہ واقع شد۔ یعنی: کربلا پہنچے، دائیں بائیں دیکھا اور روتے روتے وہاں سے گزر گئے۔ پھر فرمایا اللہ کی قسم یہ مقام ہے ان کے لوشوں کو بٹلانے کا اور ان کے قتل ہونے کا ساتھیوں نے کہا اے امیرالمومنین یہ کونسا مقام ہے۔ فرمایا یہ کربلا ہے۔ اس جگہ ایک ایسے گردہ کو قتل کر رہے تھے کہ جو بلا حساب جنت میں داخل ہوں گے۔ اس کے بعد چلے گئے اور کسی کو اس بات کی تاویل معلوم نہ ہوئی، اس دن تک کہ امیرالمومنین حسین کا واقعہ پیش آیا۔ صاحب السہولتین فرماتے ہیں کہ: ”اور بربلا ذکر کیا امیرالمومنین کرم اللہ وجہہ نے صفین کے سفر میں۔“ اعظم کوئی یہ ذکر کرتے ہوئے کہ فرات کے کنارہ تشریف رکھتے تھے اور نیند آگئی تھی۔ ”ہمدان زمین بیدار گشت چنانکہ کسی از چیزے ترسیدہ باشد ہمدان حالت ابن عباس را بخاند و فرمود اے عبد اللہ عجب خواب دیدہ ام دیدم کہ جماعتی از مردان سپید رونے از آسمانی آمدند۔۔۔ پس این درختان خرما را دیدم کہ شاخہائے خوشیت بر زمین میندند و جوئے دیدم کہ پر از خون تیزی رفت و حسین پر من اور ا دیدم در میان جوئے خون افتادہ و فریادی خواست و اور اس بفریاد غمی رسید و مددی جست و کسے اور ا مدد غمی کہ دپس آن مردان سپید رونے را دیدم کہ متلاوی کردند و ی گفتند صبر کنید اے فرزندان رسول خدا و بدانید کہ بر دست بدترین خلق کشتہ ی شوید۔“ یعنی: اسی وقت بیدار ہو گئے جیسے کوئی کچی چیز سے ڈرا ہو، اسی حالت میں عبد اللہ بن عباس کو بلایا اور فرمایا اے عبد اللہ عجب خواب دیکھا ہے۔ دیکھا کہ سفید رومرد آسمان سے آئے۔ پھر ان کجور کے درختوں کو دیکھا کہ اپنی شاخیں زمین پر مار رہے ہیں۔ اور ایک نہر تھی کہ تازہ خون سے پر بہہ رہی ہے۔ اپنے بیٹے حسین کو دیکھا کہ خون کی نہر میں گرا فریاد کر رہا ہے اور کوئی بھی اس کی فریاد کو نہیں پہنچتا اور مدد طلب کرتا ہے مگر کوئی اس کی مدد نہیں کرتا۔ پس اس سفید رومردوں کو دیکھا کہ منادی کر رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں اے رسول خدا کی اولاد صبر کرو اور جان لو کہ بدترین مخلوق کے ہاتھ سے شہید ہو گئے۔

حسینؑ کو صبر اور مصیبت آنے کے پہلے تیار ہونے کی نصیحت

اس کے بعد حسینؑ کو قریب بلایا اور فرمایا: ”اے

فرزند صبر کرو اور صبر میں ثابت قدم رہ کہ دنیا محنت و بلا کی جگہ ہے۔“ میں نہیں جانتا کہ جناب امیرؑ کے دیوان کا یہ شعر کہ:

حسین اذا كنت في بلدة غریبا فعاشر بأدایہا

یعنی: اے حسینؑ کسی شہر میں مسافر ہو تو اس کے آداب کے مطابق معاشرت کرو۔

اور اس کے بعد کے اشعار اسی موقع کے لیے یا اس کے بعد کے لیے تھے جن کا مفہوم یہ ہے کہ: ”خوشی نہ کر دنیا کے اسباب پر اور پریشان نہ ہو اس کے رنج و غم سے۔ قیاس کر آنے والے کل کو گوشہ کل پر تاکہ تو راحت پائے۔ اور عربوں کی طرح تلاش نہ کرے گویا کہ میں بذات خود اپنی اولاد کے کربلا اور کربلا کے مقام جنگ میں ہوں۔ رگیں ہیں ہماری ڈاڑھیاں خون سے مثل رگیں ہونے عروس کے اپنے لباس میں۔ چند مصیبتیں ہیں کہ آمادہ کر رہی گی تجھ کو پھر جانے پر۔ پس آمادہ ہو ان کے آنے سے پہلے۔۔۔ اے حسینؑ پریشان نہ ہو فراق احباب سے کہ دنیا تیری بربادی کے لیے پیدا ہے۔“

اہل شام نے فرات کا پانی روکا

معاویہ کا لشکر فرات سے قریب اتر آیا جب امیرالمومنینؑ کے سپاہی پانی لینے گئے تو انہیں شامیوں نے روکا یہ خبر جناب امیرؑ کو ہوئی۔

آپ نے مثبت ریتی اور مصعب بن مومنان کو بلا کر منسلک کیا کہ تم لوگ مہلویہ کے پاس جاؤ اور کہو کہ: تیرے لشکر نے ہمارے خدمت گار اور چار ہاپوں کو پانی سے روک دیا ہے۔ لشکر کے ساتھ ضعیف، کمزور اور بوڑھے بھی ہیں۔ یہ مناسب نہ ہوگا مسلمانوں سے پانی بازار کھا جائے۔ اگر ہم تیرے

جناب امیر پانی کو وجہ جنگ نہیں قرار دینا چاہتے تھے

پہلے وارد ہوتے تو ہرگز متح نہ کرتے۔ اس وقت دو ہاتوں میں سے ایک کرنی ہوگی یا تو ہمارے خدو میں کو پانی لینے دے اور تیرا لشکر بھی جہد ضرورت سیراب ہو۔ دونوں طرف سے ایک دوسرے کو پانی کی روک نہ ہو۔ اور اگر محاصرہ ہے تو جس وجہ سے جنگ کی تیاری ہے اسے ترک کر کے پیشتر پانی کے واسطے جنگ کر پیا جسے فتح ہو اس پر قبضہ کرے۔ یہ لوگ گئے اور مہلویہ سے کہا: لیکن ولید بن عقبہ کی یہ صلاح پسند کی گئی۔

مصعبہ اور ولید کی گرم گفتگو

کہ: ”اے مہلویہ! یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے چالیس روز تک عثمان کو پانی نہ دیا۔ یہ لوگ متقی خدا ہیں۔ خدا انہیں اس عالم میں بھی پانی نہ دے گا۔“ یہ سن کر مصعبہ نے کہا: ”اے پسر عقبہ خدا تیرے ایسے کلاڑوں کو جس نے گناہ کیے اور بدکار ہیں، پانی نہ دے گا۔ تو نے شراب پی۔ مہربان کوفہ میں بحالت مستی پیش نمازی کی اور صبح کی نماز چار رکعت پڑھی، اور سلام پھیرنے کے بعد کہا کہ آج بہت خوش ہوں کہ تو دو چار رکعت اور اضافہ کر دو۔ عثمان نے تجھے جدماری۔ تو نے علیؑ سے مناظرہ کیا جس پر تیرے لیے کفر اور علیؑ کے لیے مومنیت کی آیت نازل ہوئی اور تو مہاجر و انصار کے سامنے ذلیل ہوا۔“ اس پر ابن ابی سرح نے ولید کی حمایت کی اور تلوار چھنی لیکن یہ بھلا کر دیا گیا۔ ان لوگوں نے امیر المومنین سے حالت بیان کی اور اجازت جنگ طلب کی۔ اجازت دی گئی۔ ابوالاعور نے رو کیا لیکن آخر میں قبول ابن خلدون:

ابوالاعور گھاٹ کا محافظ تھا

”مہربان امیر المومنین نے اس تیاری سے حلقہ شروع کیے کہ لشکر شام کے پاؤں اکٹرا گئے۔ دریائے فرات سے ان کا قبضہ اٹھ گیا۔ اشتراک ان کے ہمراہی پانی پر قابض ہو گئے۔“

فتح کے بعد علیؑ نے دشمن کے ساتھ حق بشری کا لحاظ کیا

ان لوگوں کا بھی بھی قصہ تھا کہ مہربان مہلویہ کو پانی نہ دی۔

لیکن امیر المومنین علیؑ نے اس سے منع کیا۔

امیر المومنین گویا ہمیشہ اس فکر میں رہتے تھے کہ ہم کب موقع پائیں اور نصیحت کریں، نہ صرف اس واقعہ کے بعد آپ نے اپنے بعض نامی انہروں کو مہلویہ کے پاس روانہ کیا بلکہ عوم تک لائے کو سختی سے جاری نہ کرنے کی وجہ بیان فرمائی کہ: ”شاید مہلویہ سوچے اور مخالفت سے باز آئے۔“ اور پھر صدی بن حاتم وغیرہ کو بھیجا اور انہوں نے کہا: ”اے مہلویہ امیر المومنین علیؑ کی اطاعت قبول کرو۔ شاید اللہ تعالیٰ تمہارے بیعت کرنے سے مسلمانوں میں اتفاق پیدا کر دے، اور واقعی تمہارے سوا کسی اور شخص نے بیعت سے تعلق نہیں کیا۔“ زید بن قیس نے کہا: ”ہم تم کو نصیحت نہیں کرتے آئے ہیں لیکن اس امر کی ضرورت کو شش کریں گے کہ تفریق جماعت نہ ہونے پائے اور آپس میں ربط و اتصال بڑھے۔“ اس کے بعد آپس میں سختی سے کام ہوئی۔

باسمِ

معاویہ کی پس پردہ کارروائی اور معاویہ نے قبول ابن خلدون: ”زیاد بن حصہ کو تنہائی میں لے جا کر امیر المومنین کی شکایت کی اور ان کے قبیلہ سے مدد طلب کی اور یہ کہا کہ: ”دونوں شہروں میں جس کو پسند کرو گے اس کا میں تم کو والی کر دوں گا۔“ زیاد نے اس سے انکار کر کے کہا: ”میں موید من اللہ ہوں گناہگاروں کا معین نہیں ہو سکتا۔“

اس وقت علیؑ کے رفقا کی ہم آہنگی اس کے بعد ”معاویہ نے عمرو بن العاص سے کہا میں ان میں سے جس سے کچھ بات کہتا ہوں وہ ایک ہی جواب دیتا ہے۔ گویا ان سبوں کے دل ایک ہی ہیں۔“

قتلان عثمان کی فہرست معاویہ نے بھی امیر المومنین کے پاس شرمیل وغیرہ کو بھیجا۔ اعثم کوئی نے قاتلان عثمان کی حوالگی کا سوال ابھر رہا اور ابودرداء کی معرفت کرایا ہے۔ جناب امیرؓ نے ان کے ناموں سے لاطی ظہر فرما کر کہا کہ: ”اگر تجھے یقین ہو تو جس نے قتل کیا ہو اسے گرفتار کر کے لے جا۔“ رومۃ العفانے ابودرداء وغیرہ کی فہرست میں قریب قریب ان تمام لوگوں کو داخل کیا ہے جو جناب امیرؓ کے بٹے جان ثار تھے۔ دس ہزار نے اپنے کو قاتل عثمان کہا، اور قتل کی وجہ بتائی اور صورت معاملہ بیان کی۔

لشکر میں شور مچا اور قریب دس ہزار سپاہی آمادہ جنگ ہو کر کہنے لگے: ”ہم سب نے عثمان کو قتل کیا ہے۔ وہ جب تک قاعدہ پر تھے اور حکم خدا اور شوال کی اطاعت کرتے تھے ہم سب مطیع تھے جب اس سے جھوڑ کیا اور مسلمانوں کو رنج دینا شروع کیا اور بنو امیہ کو مسلمانوں پر مسلط کر دیا تو ہم سب نے بالاتفاق قتل کیا اور سب شریک ہیں۔“ عرم کے بعد کے اعلان جنگ پر جو فوجی انتظام ہوا ان میں حسینؑ سواران یمینہ کی افری میں اپنے برابر معظم کے شریک تھے۔

محرم ۳ صفین اعلان ابن خلدون نے بھی منہزمین صفا اور عورتوں کے متعلق صفین میں جناب امیرؓ کے حکم کو قتل کیا ہے۔ جس میں یہ زیادہ ہے کہ: ”کسی کا ستر نہ کھولنا اور نہ ملکہ کرنا اور نہ کسی عورت پر غصہ سے دست اندازی کرنا، اگرچہ وہ تم کو کاہلیں دیں۔ کیونکہ وہ ضعیف النفس و القویٰ ہیں۔“

محمد بن حنفیہ کو ابن عمر کے مقابلہ سے روکا ابن خلدون اور اعثم کوئی نے اس روز کی جنگ میں جس میں معاویہ نے عبید اللہ بن عمر کو میدان جنگ میں بھیجا ہے اور امیر المومنین نے محمد بن الحنفیہ کو حملہ اور لشکر کا افر مقرر کیا تھا لکھا ہے کہ: ”عبید اللہ بن عمر نے صفت لشکر سے علیحدہ ہو کر محمد بن الحنفیہ کو مقابلہ کے لیے لکارا۔ محمد بن الحنفیہ جوش مردانگی میں آکر نکلے لیکن امیر المومنین علیؑ نے گھوڑا دوڑا کر واپس کر لیا۔“

حسن کو نہ روکا اعثم کوئی کو ایک دوسرا واقعہ لکھا ہے کہ: عبید اللہ بن عمر نے حسن کو طلب کیا۔ حسن مسلمان میں تشریف لے گئے اور انھیں مسلح دیکھ کر ابن عمر نے کہا:

”تم نے اسلحہ کیوں پہنڈ معاذ اللہ مجھے تم سے مخالفت نہ تھی، بلکہ صرف ملاقات کرنی تھی اور اس کے ضمن میں کچھ نصیحت کرنا چاہتا تھا۔“

حسنؑ اور ابن عمر کا مفید مکالمہ

حسنؑ نے کہا: تمہیں جو کچھ کہنا ہو کہو۔

کہا: تمہارے باپ نے قریش کے ساتھ اچھی زندگی بسر نہیں کی۔ اس لیے لوگ ان کے دشمن ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ عثمان کو قتل کیا مصلحت یہ ہے کہ تم علیؑ کا ساتھ چھوڑ کر ہمارے پاس چلے آؤ کہ ہم لوگ اتفاق کر کے خلافت تمہارے سپرد کریں۔ سب مطیع ہو جائیں اور خصوصیت برطرف ہو جائے۔

سنرایا: تو چاہتا ہے کہ میں خلافت حکم رسولؐ کروں اور خلیفہ دومی رسولؐ کا مخالفت بنوں۔ تیری آنکھوں میں بصیرت نہیں رہی۔ تو دین سے نکل کر ظلم، بدکردار، فاسق و مکار کے پاس گیا۔ مثلیہ تو بھول گیا کہ وہ اور اس کا باپ ہمیشہ مسلمانوں کا دشمن رہا۔ یہ سب خدا و رسولؐ پر ایمان نہیں لائے۔ صرف مصلحت وقت پر فخر ڈال کر اپنی مخالفت کے لیے ان لوگوں نے کلمہ پڑھ لیا۔ تو اب واپس جاؤ اور تمہارے جہاں تک ہو سکے کوشش کرو کہ ہم خدا پر محروسہ رکھتے ہیں اور جب تک ممکن ہو تا ہے کسی کو نہیں ستاتے۔

اور سپاہیوں کو ملانے کی کوشش

معاویہ اب نہ صرف علیؑ کے اکثر سپاہیوں کے گلے کی کوشش میں رہا۔ مثلاً خالد بن عمر الدوسی کو مارا۔ غراسان کی لڑائی دی۔ جس وقت وہ شام کی فوجوں کو معاویہ کے خیمہ تک پہنچایا تھا اور اس کے بعد تباہی کرنے لگا۔ بلکہ اس امیر شام نے یہ دیکھ کر کہ ہمارے سپاہی اور افسر علیؑ کے سپاہی اور افسروں کے ایسے شجاع اور پر جوش نہیں ہیں اور ترکیبیں اختیار کریں۔ مثلاً

معاویہ آخری حیلے کر رہا تھا

نہان بن جبلة فضاہی کو جس کا میان علیؑ کی طرف تھا اور امیر شام سے صاف نہ تھا بلایا۔ انتہاکہ کیا۔ بیٹا بنایا اور چاہا کہ تو اپنے بڑے قبیلہ سے

ہماری مدد کر نہان مارا گیا۔

ابن عمر قتل ہوئے

اور کئی ابن الخطاب سے کہا کہ آج تمہیں کچھ کہو کہ اہل شام خوش ہوں۔ یہ بھی مارے گئے نہ اس کے قبل کہ بقول ابن خلدون یہ کہہ چکے ہوتے کہ: ”اے اہل شام

یہی لوگ امیر المومنین عثمان کے قاتلین ہیں، ذرا خدا کا خیال کرو۔ اسی مردانگی پر امیر المومنین عثمان کے خون کا بدلہ لینے کو آتے تھے۔“

ان کے مارے جانے سے وہ موقع ملا جس کے حاصل کرنے کے لیے انہیں قتل کروانا مفید تھا۔ معاویہ نے اظہار غم میں مبالغہ کیا اور سردار ابن لکھڑے متاثر ہو کر انتقام پر آمادگی ظاہر کی۔ اسی نشان فوج کے نیچے فہیں مچ ہوئیں، اور ایک بڑا نشان آگے چلا۔ عبرت ناک جنگ ہوئی۔ جن میں تلواریں، نیزے اور چمچیاں ٹوٹیں اور بے کار ہوئیں۔ یہاں تک کہ سپاہوں نے دانتوں سے بوٹیاں کاٹیں۔

قوی تمیز عمار یاسر بلند آواز سے کہہ رہے تھے کہ: ”جو شخص اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش کرے اسے چاہیے کہ وہ مال و اولاد کی طرف واپس جانے کی امید نہ رکھے۔“ اور امیر المومنین کے سپاہی جواب دیتے تھے کہ: ”ہمارے ساتھ ہو کر ان لوگوں پر حملہ کرو جو خون عثمان کے طالب ہیں اور اس ذریعہ سے اپنے دلی باطل خواہشات کے مکر کو پھیلاتے ہیں۔“ ان کے ساتھ اصحاب رسول کی سیل جلی ابن حاص دکھائی دیا اور اس سے کہا: ”اے عمرو! قت ہو تجھ پر تو نے اپنے دین کو مصر کے عوض فروخت کر ڈالا۔“

رسول کی پیشین گوئی پوری ہوئی جنگ ہوئی رہی یہاں تک کہ رسول کی یہ پیشین گوئی پوری ہوئی کہ: ”محمد کو گردہ ہاٹی مارے گا۔“

جناب امیر کا شغل امیر المومنین کا یہ شغل تھا کہ: کبھی ان کی تلوار گرد و پیش موت برسائی تھی۔ کبھی گھوڑے سے اتر کر کسی مقدس جگہ کو دم لٹھیلنے کے لیے اپنا زانو عنایت سماتے تھے اور کبھی کسی مرنے والے سپاہی کا آخری سلام لیتے تھے۔

لشکر شام کی حالت لشکر شام کی ہمتوں کے پرزے جدا ہو گئے تھے اور ان پر عام یاس اور خوف طاری تھا۔ یہاں تک کہ معاویہ کو ان لفظوں سے شکین کی ضرورت ہوئی کہ: ”اگر خدا (حمیری) ہمارے لشکر سے مارا گیا تو علی کے لشکر سے عمار یاسر قتل ہوا۔ اگر حوشب (ذوالکلیم) کا حادثہ ہوا تو ہاشم بن عقبہ بھی زندہ نہیں ہے۔ اگر عبید اللہ بن عمر بن الخطاب قتل ہوئے تو عبداللہ بن مغزل بھی مارے گئے۔“

معاویہ کو علی کے لشکر میں کن کی فکر تھی ”اولیٰ یہ ہے کہ ہم لوگ دل تنگ نہ ہوں بلکہ خوش ہوں کہ تین آدمی سے جن کا عرب میں نظیر نہ تھا ظالم ہوتے اب تین آدمی اور رہ گئے ہیں: اشتر غنمی، اشعث بن قیس و عدی بن حاتم۔ کوشش کرو کہ یہ بھی تمام ہوجائیں۔“

مالک اشتر اور علی میدان جنگ میں اب شام کا تعبہ اور ظالم فوج بھی قائم نہ رہتا تھا اور غالباً اشتر کی مصلحتانہ رقابت گوارا نہ کرتی تھی کہ اس کی شیر زنی جناب امیر کے ناقابل مقابلہ قوی نفس کی موجودگی سے اپنے درجہ سے دھندلی پڑ جائے۔ اور وہ طبعاً نہ حاجت سے کہہ اٹھتا تھا کہ: ”یا امیر المومنین خوش ہو جیے کہ میدان ہمارے ہاتھ ہے۔ نزدیک ہے کہ ہم بغایت ازیدی فتح یاب ہوں۔ آپ بہ سلطنت واپس ہوں کہ سرداران لشکر آپ کو دھوڑتے رہے ہیں۔“

حسین شریک جنگ ہیں پہلور اشتر دیکھتا ہے کہ حسن، حسین، محمد حنفیہ، محمد بن ابوبکر اور عبداللہ بن جعفر کی تلواریں سرخ ہو رہی ہیں اور اب اپنے رجز میں ان کی مدح بھی شامل کر لیتا ہے۔

اعظم کوئی کے موافق معاویہ اب امیر المومنین کو غلط لکھتا ہے جس میں قتل عام کے تذکرہ کے بعد گزارش کرتا ہے کہ ہم اپنے صوبہ پر رہنے دیے جائیں اور ہم سے بیعت طلب نہ کی جائے تو لڑائی موقوف ہوجائے۔ اور جناب امیر فرماتے ہیں کہ ابھی یہ معرکہ تمام نہیں ہوا۔ تو نے کونسا نیا حق قائم کر لیا ہے کہ دوبارہ یہ استدعا کرتا ہے۔ شام پر تیرے قائم رہنے کی درخواست بغیر میری بیعت کیے ممکن نہیں ہے۔

معاویہ علی سے دست بدست جنگ سے دور رہا

جناب امیر نے علاوہ خطوط اور متواتر سفارت کے یہ بھی چاہا کہ خود اور معاویہ میں دست بدست جنگ سے فیصلہ ہو جائے اور عمر بن عاص نے بھی جو اپنے مشہور غیبت دارانہ تقن سے علی کے ہاتھ سے جاگ نکلا تھا، امیر شام کو غیرت دلائی۔ لیکن معاویہ نے، ہنس کے ٹال دیا۔

علی مجموعی حملہ کے لیے لشکر کو آمادہ کرتے ہیں

امیر المومنین فیصلہ کی جنگ کے لیے آمادہ ہوئے اور اپنے سپاہیوں سے مستحیلا:

”یہ قوم اگر دین کے حدود کو مشکل نہ چھوڑتی، باطل کی سعی اور دوسرے شیطانی سے خدا کی نعمتوں کا کفران نہ کرتی تو میں کبھی میدان میں قدم نہ رکھتا۔ لیکن میں بخیر ہوں کہ بہ ضرورت اس قوم کی ہدایت کرنی ہوگی اور طریقہ دین کی طرف بلانا ہوگا۔ حالت یہ چنی ہے کہ بغیر جنگ کیے چارہ نہیں۔ صبر نہایت اچھی چیز ہے۔ علی انخصوص جنگ میں عزا اور کالی سے کبھی کام نہیں ہوا۔ ان دو خصلتوں سے ادبار اور رنج ہوتا ہے۔ فحیب اور اقبال کا کئی اور نعمت کئی سے حاصل ہوتا ہے۔ صبر اور صبر کو ایک دوسرے سے قوی تعلق ہے۔ ثابت اور وقار سے مشکل کام سہل ہو جاتے ہیں۔“

اس وقت اٹھارہ ہزار سپاہی جان دینے اور جنگ کرنے کے لیے مستعد ہوئے۔ اشتر آکل مذبح کو بڑھاتا ہوا، ابن عباس بصرہ

کے سپاہیوں کے ساتھ، قیس بن سعد اپنی قوم اور علی مجاہدین کی فوج کے ساتھ بڑے۔ عدی بن حاتم ر کلب میں حاضر رہا، اور اس حکم نے فوج میں گشت کی کہ جوں ہی میں حملہ کروں یہ اٹھارہ ہزار آدمی اس طرح حملہ کریں کہ سب کا حملہ ایک کا حملہ بکھا جائے۔ یہ خاموش لیکن معم لشکر بڑھا۔ ذوالفقار کی نرم خمیدگی نے کسی طرح اس کی ہیبت میں کمی نہ کی تھی۔ اٹھارہ ہزار تلواریں چمچے چمک رہی تھیں، جن پر سپاہیوں کے ہاتھ کی گرمی اور جوش نے مقل کیا تھا۔ اس انفوس سے کام نہیں چلے گا کہ کسی ٹھوکر تصویر کے فن کی ایجاد کیوں نہ ہوئی تھی کہ یہ جلالت غیر منظر دکھائی دیتا سوچو کہ لشکر شام دل کی کس حالت سے اس امیڈ نے ہونے دریا کا انتظار کرتا ہوگا؟

شاعرانہ تصویر کشی کی ضرورت نہیں ہے۔ جس وقت اس لشکر نے پہلا حملہ کیا تو عمرو بن عاص کی چیخ

ان لڑائیوں میں کوئی لڑائی ایسی تھی جس میں فریقین کے پچیس ہزار مارے گئے اور غالباً وہ کوئی دوسری لڑائی لینے الہر کی آخری لڑائیوں کے علاوہ نہیں ہو سکتی تھی۔

ایک دن کے مقتول

ایک اشتر نے شام کے طہار کو قتل کیا۔ شامی نشان سرنگوں ہو گیا۔ اور امیر المومنین نے ”سیم مدیجینی شروع کی۔“ اہل شام کی آوازیں رم کے لیے بلند ہوئیں۔ اور جوں جوں اہل خلدون: ”عمرو بن عاص اشتر کے حملہ سے گھبرا گئے اور اپنے ہمراہیوں کے کشت و خون سے ڈر کر معاویہ سے کہا:

”کیا دیکھتے ہو، تمہارے ہاتھ میدان نہ آنے گا۔ لوگوں کو حکم دو کہ مشہد آن شریف کو تیروں پر حلیہ قرآن اٹھائیں اور آواز بلند سے کہیں ہمارے تمہارے درمیان یہ مشہد آن شریف ہے اگر اس کو

وہ لوگ منظور کریں گے تو سو سو لڑائی بند ہو جائے گی۔ کشت و خون سے نجاست مل جائے گی اور اگر ان میں سے بعض لوگوں نے اس سے اختلاف کیا تو ان کے اختلاف سے بھی ہم کو فائدہ پہنچے گا۔ چنانچہ مصافحہ نیندوں پر اٹھائے گئے۔ لوگوں نے کہنا شروع کر دیا: ”ہم کتب اللہ کے فیسدہ کو منظور کرتے ہیں۔“

امیر المومنین علیؑ نے

علی دشمن کے فریب آگاہ اور حصول حق کے لیے آمادہ کرتے ہیں

لکھارا: اے اللہ کے

بند اپنے حق کے حاصل کرنے کو بڑھو اور دشمنوں سے جنگ کرنے میں تاہل نہ کرو۔ کیونکہ معاویہؓ، ابن ابی معیطؓ، حبیبؓ، ابن ابی سرحؓ، ضحاکؓ نہ صاحب دین و قرآن ہیں اور نہ صاحب ایمان ہیں۔ ہم ان کی حالت بخوبی واقف ہیں۔ ہم ان کے لوہین اور بڑے ہونے کے بعد بھی صحبت میں رہے ہیں۔ لوہین میں وہ نہایت شریر لڑکوں میں سے تھا اور سن شعور میں پہنچ کر بھی بے حد شریر آدمیوں سے ہوا۔ افسوس ہے تم کو کچھ نہیں پڑتا۔ ان لوگوں نے قرآن شریف کو براہِ مکرو فریب اٹھایا ہے۔ لوگوں نے کہا: ”ہم سے یہ نہیں ہو سکتا کہ ہم کتب اللہ کی طرف ہٹنے جائیں اور اس لشکر کی مخالفت کو منظور نہ کریں۔“ امیر المومنین نے ارشاد کیا: ”ہم لوگوں سے اس لیے لڑتے ہیں کہ کتب اللہ پر عمل کریں۔ کیونکہ انھوں نے اس کو پس پشت ڈال دیا ہے۔“

مصر بن مذک تھی اور زید بن جحشین اٹھائی مع ان لوگوں کے جو بعد کو خوارج ہو گئے تھے بولے: ”اے علیؑ کتب اللہ کو منظور و قبول کرو ورنہ ہم تم کو چھوڑ دیں گے اور تمہارے ساتھ وہی برتاؤ کریں گے جو ابن صفان کے ساتھ ہم نے کیا تھا۔“ امیر المومنین علیؑ نے فرمایا: ”اگر تم میرے مطیع ہو تو برابر لڑتے رہو اور اگر باغی ہو چاہتے ہو تو جو تمہاری کجی میں آئے وہ کرو۔“

خوارج نے اب اشتر کو میدانِ جنگ سے واپس بلانے پر زور دیا اور اشتر نے جس پر اب تک واقعات واضح نہ ہونے تھے نہایت یحج کہا کہ: ”یہ وقت میری طلبی کا نہیں ہے اور نہ یہ مناسب ہے کہ میں موقعِ جنگ سے ہٹایا جاؤں۔ مجھے قوی امید ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے فتح و نصرت عنایت فرمائے گا۔“ خوارج نے پھر زور دیا۔ پھر قصدِ گید اور جناب امیرؑ نے کہلایا کہ: ”جہاں تک جلد ممکن ہو میرے پاس آجائے۔ کیونکہ فساد کا دروازہ کھل گیا۔“ اشتر نے دریافت کیا:

آخری پیغام اور اشتر کا جواب

”کیا قرآن شریف کے اٹھانے سے؟“ زید (حاضر) نے جواب دیا: ”ہاں۔“ اشتر بولے: ”مجھے اس کا خیال پہلے ہی ہوا تھا کہ لوگوں میں اختلاف پڑ جائے گا اور مجموعی حالتِ جامعہ کی باقی نہ رہ جائے گی۔ میں کیسے ان لوگوں کو چھوڑ کر واپس چلوں اللہ تعالیٰ کی عنایت سے فتح ہو ابی چاہتی ہے۔“ زید نے کہا: ”کیا تم اسے ددست رکھتے ہو کہ تم کو شیعہ باب ہو اور امیر المومنین دشمنوں کے حوالہ ہو جائیں یا شہید کر ڈالے جائیں؟“ اشتر یہ سنتے ہی مصر وغیرہ کے پاس چلے آئے اور ان سے مخاطب ہو کر کہا: ”اے ابی سراق! بڑے افسوس کا مقام ہے کہ جس وقت اللہ تعالیٰ نے تم کو ان لوگوں پر غالب کیا اس وقت تم لوگ اہل شام کے مندریب میں آ گئے۔“

عجب نہ تھا کہ باہم جنگ چھڑ جائی۔ لیکن امیر المومنین علیؑ کے ڈانٹنے سے وہ شور و فل منسوخ ہو گیا۔

کس نے پہلے مخالفت کی اعظم کئی کے موافق: پہلا شخص اشعث بن قیس کنزی تھا جس نے لڑائی روک دینے کا زور ڈالا اور اس شور انگیز گھگھو کو سن کر

علاء کل اور آج کا فرق بتاتے ہیں جناب امیر نے جواب دیا کہ: ”اے قوم کیا وہ پہلا شخص جس نے قرآن کو قبول کیا میں نہیں ہوں، اور کیا میں شروع ہی سے

یہ نہیں کہتا تھا لیکن فرق یہ ہے کہ کل ختم دینا تھا لیکن آج ہمارے ہوں۔ کل مسخ کرتا تھا، آج مسخ کیا جاتا ہوں۔ میں کیا کہوں کہ تم میں اختلاف دیکھ رہا ہوں کہ یہ معاویہ کا فریب ہے اور وہ اپنے کو اس حیلہ سے غلام کیا چاہتا ہے۔ میں نے تم سے اصل بات کہہ دی، آئندہ تمہیں اختیار ہے۔“

مالک اشتر اور علی کیا دیکھتے ہیں یہی مورخ اشتر کو یہ خبر بتا کر کہ ”اگر جلدی نہ سہے تو علی کو زندہ نہ پاؤ گے“ تصویر پیش کیا ہے کہ ”اشتر نے تلوار پیچک دی،

اور فتنہ میں ہرا ہوا لوٹا سر ہلاتا جاتا تھا اور کہتا جاتا تھا کہ: ”اے گردو حلق اور اے اہل فتناء! یہ کیا بیوہ حرکت ہے جس وقت دوستوں کی مراد بر آئے اس وقت تم نے فتنہ کھڑا کر دیا۔“ امیر المومنین نے اشتر کو اور اشتر نے امیر المومنین کو دیکھا اور یہ بھی دیکھا کہ میں ہزار مسلح سپاہی جن کے مشہور امرا اشعث اور غطفان بن ثوری ہلکے ہوئے گویا آئندہ طرز عمل کے متعلق احکام صادر کر رہے ہیں۔ اشتر نے قاتل معقول کرنا چاہا۔ میدان جنگ میں جانے کی خواہش کی جو حاجت کے قریب بھی جانے لگا۔ گرم الفاظ کہہ کر اڑے سڑے اور حالت عذر پیش کرنے لگی حتیٰ کہ امیر المومنین نے مداخلت کی۔

حکم کے انتخاب میں بھی علی کی مخالفت کی گئی اور ابو موسیٰ چنا گیا حکمین کے قیام کے قیام کی صورت میں معاویہ نے عمرو بن

حماص کو منتخب کیا اور اشعث اور اس کی جماعت نے ابو موسیٰ اشعری کو اپنا حکم جوڑ لیا اور ابن غلدون کے موافق امیر المومنین علی نے ارشاد کیا: ”میں اس انتخاب سے راضی نہیں ہوں۔“ اور وجہ بتائی کہ ”میں اس کو فتنہ نہیں کہتا۔ اس نے میری رفاقت ترک کی، لوگوں کو میرے ساتھ مل میں جانے سے روکا، مجھ سے شتر ہو کر بھاگ پھر رہی ہیں۔ ایک مہینہ کے بعد اسے امن دیا۔ میں اس کو حکم ہرگز نہ بنائوں گا۔ البتہ ابن عباس کو میں اپنی طرف سے حکم منتخب کر سکتا ہوں۔“

تحقیق نے کہا: ”ابن عباس تمہارے عزیز ہیں۔ ہم ان کو حکم نہ بنائیں گے۔“

جناب امیر: ”اچھا اشتر تو میرا عزیز نہیں ہے۔“

تحقیق: ”کیا اشتر کے سواروں نے زمین پر کوئی اور شخص نہیں ملا؟“

جناب امیر: ”پھر کیا تم لوگ سوائے ابو موسیٰ کے اور کسی کو حکم نہ بنائے گے؟“

اور اس کے بعد بقول ابن غلدون: ”امیر المومنین علی ان مباحث سے تنگ ہو گئے اور میزور ہو کر ارشاد کیا: ”اچھا جو چاہو اور جو تمہاری کجی میں آئے وہ کرو۔“ اب ”عمرو بن العاص امیر المومنین علی کے پاس اقرار نامہ لکھنے کو حاضر ہوئے۔ کاتب نے بسم اللہ الرحمن الرحیم کے بعد لکھا:

۱۳ صفر ۳۵

علی کا وہ موقع جو رسول کے لیے صلح حدیبیہ میں تھا

ہذا ما تقاضی علیہ امید المومنین
عمرو بن العاص نے جنت فسلم پکڑ لیا۔

بولے : یہ ہمارے امیر نہیں ہیں۔ تمہارے امیر ہوں تو ہوں۔

اخف : اس لفظ کو محضہ کر دو۔ مجھے اس کے محو کرنے سے بد فکلی کا خیال ہوتا ہے۔

اشعث : امیر المومنین کا لفظ ضرور محو کر دو۔

امیر المومنین : اللہ اکبر۔ صلح حدیبیہ میں بھی ایسا ہی واقعہ پیش آیا تھا۔ کفار نے آنحضرت ﷺ کے اسم مبارک کے ساتھ ”رسول اللہ“ کو نہیں لکھنے دیا تھا۔ کیوں عمرو بن العاص اس واقعہ میں تم بھی ایسا ہی جانتے ہو؟

عمرو بن العاص : سبحان اللہ ! آپ کفار سے ہماری تشبیہ دیتے ہیں؟ حالانکہ ہم لوگ مومن ہیں۔

امیر المومنین : اسے ابن النبیغہ ! تو کب فاسقین کا ولی اور مومنین کا دشمن نہ تھا؟

اشتر نے عہد نامہ پر دستخط نہ کی

عہد نامہ لکھا گید و تھیں بولتے۔ لیکن اشتر نے دستخط کرنے سے انکار کیا۔ اشعث مصر ہوئے۔ اسی مؤرخ کے موافق اخف بن قیس نے

امیر المومنین سے یہ خواہش ظہر کی کہ نجم کو بھی ابو موسیٰ کے ساتھ حکم بنائے۔ لیکن لوگوں نے اس سے مخالفت کی۔

اشعث کے موانع کئی تھے اور شریح بن ہانی کچھ دور ابو موسیٰ کو پہنچانے گئے۔

لیکن شریح بن سلم الکندی نے ابو موسیٰ سے کہلوا دیا کہ جو لوگ تیرے ودار کرنے کو آتے ہیں انہیں رخصت کر دے۔ اس کے بعد امیر المومنین کوفہ کی طرف اور معاویہ شام کی جانب روانہ ہو گئے۔

مجھے جلتب امیر نے عمل کو اپنے عمل پر واپس کر دیا۔

حکیمین کے فیصلہ کے وقت حاضرین کے نام

فیصلہ کا دن آیا۔ اور بقول ابن خلدون حکیمین کے ساتھ مجلس حکم میں عبداللہ بن عمر، عبدالرحمن بن ابی بکر، عبداللہ بن زبیر، عبدالرحمن بن امیر بن ہشام، عبدالرحمن بن عبد یحییٰ بن عمر، ابو جہم بن حذیفہ مدنی،

مقیہ بن سعد، سعد بن ابی وقاص موجود تھے۔ عمرو بن العاص نے کہا : اے ابو موسیٰ ! تم جانتے ہو کہ عثمان براہِ قلم مارے گئے ہیں، اور معاویہ اور ان کی قوم اولیاء اور نثار عثمان ہیں۔

ابو موسیٰ نے کہا : ہاں۔

عمرو بن العاص بولے : پس کون امر تم کو ان کی خلافت قبول کرنے سے روکتا ہے۔ حالانکہ وہ قبیلہ قریش سے ہیں۔

جیسا کہ تم جانتے ہو، اگرچہ سابق الاسلام نہیں ہیں، لیکن انہیں سیاست و ملک داری کا علاوہ بہت بڑا

ہے اور وہ ام المومنین ام حبیبہ زوجہ رسول اللہ ﷺ کے بھائی ہیں، اس سے زیادہ قریب

قربت اور کیا ہو سکتی ہے۔ اور مدتوں آنحضرت ﷺ کے کاتب رہے ہیں اور شرفِ صحبت

سے بھی مستز ہوئے ہیں۔

ابوموسیٰ کے لیے حکومت کی پیشکش اس قدر کہنے کے بعد کہا: ”اگر تم مسیری رائے سے مہلت کرو گے تو تم کو جس شہر کی حکومت پہنچ کر دے گا وہی رہے گی۔“

ابن عاص اپنے لڑکے کو خلیفہ بنایا چاہتا ہے اسی مورخ کے موافق ابوموسیٰ نے عبداللہ بن عمر کو دالی و حکم بنانے کا خیال ظاہر کیا اور

ابن عاص نے کہا: ”تم کو میرے لڑکے کے دالی مقرر کرنے میں کیا عذر ہے۔ تم اس کی حالت و صلاحیت و غیبت سے بخوبی واقف ہو۔“ اور یہ بھی کہا کہ: ”یہ کام تو ایسے شخص کو سپرد کرنا چاہیے کہ جس کے دانت ہوں۔ جس سے وہ کھاتا پیتا ہو۔“ آخر طے یہ پایا کہ علی اور معاویہ دونوں معزول کر دیے جائیں اور مسلمان جس کو چاہیں شور مچا کر کے مقرر کریں۔

اعلان کا وقت آیا اور صحبت رسول کے شرف اور بزرگی سن کے لحاظ سے عمرو بن عاص نے ابوموسیٰ کا اعلان پایا کہ ابوموسیٰ پہلے اعلان کرے اور ابوموسیٰ نے کہا: ”ہم لوگوں نے بہت کچھ غور و فکر کیا۔

لیکن سوائے اس کے جس پر ہم نے اتفاق کیا ہے اور کچھ کچھ میں نہ آیا کہ ہم اور عمرو بن العاص دونوں با اتفاق رائے علی و معاویہ کو معزول کریں اور مسلمانوں کو اختیار دیں جن کو وہ چاہیں با اتفاق رائے خلیفہ بنائیں۔ چنانچہ میں نے علی اور معاویہ دونوں کو معزول کر دیا۔ پس تم جس کو لائق سمجھو اس کو خلیفہ بناؤ۔“

ابن عاص نے کہا: ”تم لوگ گواہ رہنا (ابوموسیٰ کی طرف اشارہ کر کے) کہ اس شخص نے اپنے رفیق (علی) کو معزول کر دیا ہے۔ اور بے شک میں بھی

اس کو معزول کرتا ہوں۔ جیسا کہ اس نے معزول کیا ہے اور معاویہ کو بحال رکھتا ہوں کیونکہ وہ عثمان بن عفان مظلوم خلیفہ کا دلی ہے اور اس کے قائم مقام ہونے کا مستحق ہے۔“

اس کے بعد ابوموسیٰ اور ابن عاص میں جنگ زرگری ہوئی۔ اور حکمین کی گرم گفتگو اور تصفیہ کا اثر

جواب ترکی بہ ترکی دیا۔ لوگ درمیان میں پڑ گئے۔ اعظم کوئی کے موافق بھی: ”تو دیک بود کہ اصحاب امیر المومنین علی علیہ السلام و لشکر معاویہ با یک دگر جنگ کنند۔“ اہل شام خوش تھے اور عراقیوں پر طنز کرتے تھے اور سعید بن قیس ہمدانی کہتا تھا کہ: ”اگر ہم لوگ راہ راست پر رہتے اور اس قوم سے جنگ کرتے تو یہ شہادت سننے میں نہ آئی۔ اب بھی کچھ نہیں گیا ہے اور نہ ہم میں سنی آئی ہے۔“

صفین سے واپس تشریف لا کر جناب امیر نے اپنے جانداد خاصہ کے متعلق وقف علی الاولاد اور حسین

ایک دستاویز تحریر فرمائی کہ: ”اس حکم کے ساتھ حسن بن علی قائم ہو۔ موافق شرع اس مال میں تصرف کرے اور حسب شرع اس مال کو فقراء مسکین میں تقسیم کرے۔ اگر حسن کو کوئی حادثہ پیش آئے اور حسین زندہ ہو تو اس کے بعد وہ اس حکم کے ساتھ قیام کرے۔ اور اس وصیت کو اس کے مصدر

اور موقع کے منتظر جاری کرے۔ بے شک علی کے اس مال میں فاطمہ کے بیٹوں کا وہی حق ہے جو تمام اولاد علی کا ہے۔“ منسلک ہوا ہے کہ بوجہ قربت رسول اور ان کے احترام کے (تولیت) اولاد فاطمہ کے منتظر رکھی گئی ہے۔ اصل کی حفاظت اور منافع کے تقسیم کا حکم دیا گیا ہے۔

ایک دوسری وصیت ہے جس میں جناب امیر نے حسن کی تعلیم کا تذکرہ کیا ہے۔ انھیں مضر تعلیم کے اثر سے محفوظ رکھنے اور ایک شفیق باپ کی طرح ہر کام میں توجہ لازم سمجھنے کا تذکرہ فرمایا ہے۔ کتاب خدا کی تعلیم اس کی تاویل پر عبور اور اسلام کے طریقے اور اس کے سواں و حرام کا اہتمام فرمایا ہے۔ اور بہت سے مسائل فلسفہ پر مفید حکمتیں کی ہیں۔

جناب امیر حکمین کے فیصلہ سے بیزاری

اور تیاری جنگ کا حکم دیتے ہیں

پس اس حکم و فیصلہ سے اللہ اور اس کا رسول اور صلوات مست بری ہیں۔ لہذا تم لوگ شام پر حملہ کرنے کی تیاری کرو۔“

خطبہ کی نقل خوارج کونہی

ترجہ فرمایا کہ: ”ہم اسی پہلے رائے پر ہیں جس پر اس سے پیشتر تھے۔ یعنی اہل شام سے جنگ کر دیں گے۔“ اس کا بھی کوئی نتیجہ نہ ہوا اور جناب امیر نے مدائن کے گورنر کو ان کے روکنے کا حکم بھیجا اور اس نے نہروان کے قریب انھیں روکا۔

بصرہ کے خوارج مسعر بن مذکرم کی ماتحتی میں پہلے (جو قبضہ تقرر حکم اور مشرکان کے بلند کرنے کے وقت اشعث کا ہم آواز تھا)

اور عبد اللہ بن عباس نے رد کا اور یہ بھی نہروان چلا آیا۔ اس زمانہ میں جناب امیر کے حکم سے شام کی طرف روانگی کی تیاری میں بصرہ سے اخف بن قیس اور عمار بن قحاصہ کی ماتحتی میں تین ہزار ایک سو سپاہی آئے اور کوثر کی فہرست کے رو سے چالیس ہزار ترجمہ کار سپاہی، ستر ہزار نو عمر اور آٹھ ہزار غلام میدان جنگ میں جانے کے قابل پائے گئے۔

ابن غلدون کے موافق باوجود لوگوں کی اس خواہش کے کہ پہلے خوارج سے جنگ کی جائے، فرمایا: ”اہل شام پر فوج کشی کرنا زیادہ ضروری ہے۔ کیونکہ انھوں نے تم سے مقابلہ کیا، برابر لڑتے رہے اور اس کا مقصود یہ ہے کہ وہ بذور و جبر بادشاہ بن جائیں اور بندگان خدا کو اپنا غلام بنائیں۔“ لیکن اس کے بعد خبر یہ آئی کہ خوارج نے عبد اللہ بن خباب کو

ذبح کر ڈالا اور ان کی بی بی کا پیٹ پھاڑ ڈالا اور قبیلہ طی کی تین عورتوں کو قتل کیا۔ جناب امیر نے حرث بن مرہ کو دریافت حال کے لیے بھیجا اور یہ بھی مارے گئے۔ اب یزید طے کئے ہوئے چارہ نہ تھا کہ پہلے ان کی فکر کی جائے۔ مقابلہ پہنچے

ہمارے بھائیوں کے قاتلین کو ہمارے حوالہ کر دو۔ ہم ان کے عوض میں ان کو قتل کر دیں گے۔ تاکہ ہم تم کو چھوڑ کر اہل مغرب کی طرف جائیں اور تم سے اس وقت تک جنگ نہ کریں گے جب تک ہم جنگ اہل شام سے واپس نہ آئیں گے۔

شاید اللہ تعالیٰ اس اٹھ میں تم کو راہ راست کی ہدایت کرے۔ خوارج نے جواب دیا ہم سب نے مل کر

ان کو مارا ہے اور ہم سب تمہارے خون اور ان کے خون کو مباح سمجھتے ہیں۔“

امان کا علم اب جناب امیر نے محمد بن حذی مشبک ربیع، مقتل بن قیس، ابوالایوب انصاری، ابو قتادہ اور قیس بن سعد کو اقرار مقرر کیا۔ اور ایک امان کا علم ابوالایوب انصاری کے حوالہ کیا گیا۔ اور یہ اعلان کیا گیا کہ: ”جو شخص بلا جنگ کیے ہوئے آئے گا اس کو امن دیا جائے گا، اور جو شخص مقرر نہ ہوگا اس کو بھی امن دیا جائے گا۔ اور جو شخص کو ذیادہ ان کی طرف لوٹ جائے گا اس کو بھی امن دیا جائے گا۔“

اس کا نتیجہ فخریزی سے بچنے کے اس اعلان کا یہ نتیجہ ہوا کہ: ”فردہ بن نوفل انجی پانچ سو سواروں کو لے کر خوارج سے ملیدہ ہو کر دوسرہ میں جا کر قیام پذیر ہوا۔ کچھ لوگ کوفہ کی طرف بڑھے، کچھ لوگ امیر المومنین علیؑ کے لشکر میں آئے۔ ان سبوں کی تعداد تقریباً چار ہزار تھی۔“ اب امیر المومنین کے فوجی نظام نے خوارج کو بچانے کے لیے لید سواروں نے دو طرف سے دہلیا اور پیادوں نے تلواروں سے حملہ شروع کیا۔ اور خوارج کے کل نای سردار مارے گئے۔ بلکہ خوارج کے عوام بھی اگر بچے ہوں تو صرف معدودے چند۔ صرف اسباب حرب اور مویشیاں لشکر پر تقسیم کیے گئے۔ قلعوں اور عورتوں کو واپس کر دیا۔ امیر المومنین کے مقتولین کی تعداد صرف سٹ سپاہی تھی۔

شام کی طرف کوچ کا حکم لشکر کا تساہل جناب امیر نے اب شام کی طرف بڑھنے کا فیصلہ فرمایا۔ لیکن اہل لشکر نے کسل اور زخم کا مذر پیش کیا۔ اور قبول ابن خلدون: ”اس مشکوک کرنے پر اشعث بن قیس مامور کیے گئے تھے۔“ امیر المومنین نے اسے منظور نہ کیا۔ لیکن کوفہ واپس ہونے خیلہ میں قیام کیا۔ اور ”عام حکم دیدیا کہ کوئی شخص اپنے مکان پر نہ جائے جب تک دشمنوں کی طرف خروج نہ کرے فتح یاب ہو آئے۔“ باوجود اس حکم کے اکثر لوگ چھانوی سے گمراہ کو واپس گئے۔ اور جب جناب امیر نے تاخیر کی وجہ دریافت فرمائی تو ان لوگوں میں سے نہایت کم آدمیوں نے شام پر فوج کشی کی خوشی ظاہر کی۔“

۱۵ جمادی الاولیٰ ۳۸ھ امام زین العابدینؑ کی ولادت پندرہ جمادی الاولیٰ ۳۸ھ میں حضرت امیر المومنین کی ولادت ہوئی اور بعض مؤرخین کے موافق حضرت شہر بانو نے اسی زمانہ میں رحلت کی۔ حکمین کے فیصلہ کے بعد معاویہ نے مصر کی طرف دیکھا۔ محمد بن ابی بکر یہاں کے مالک اشتر کی شہادت دہلی تھے معاویہ ابن خدیج اور عثمان کے خوخواہ شورش کر رہے تھے۔

اور محمد بن ابی بکر کے ایک اشرافین معاصم کو شکست بھی دی تھی۔ معاویہ نے ابن خدیج وغیرہ کو خط لکھ کر بلایا۔ اور ”امیر المومنین علیؑ کی مخالفت کرنے پر حکم گزاری ظاہر کی“ اور عمرو بن حاس کی ماتحتی میں چھ ہزار آدمی روانہ کیے۔ عمرو بن حاس نے محمد بن ابی بکر کو خط لکھا اور انھوں نے وہ خط مدد کی عرضداشت کے امیر المومنین کے پاس پہنچا دیا۔ جناب امیر نے جزیرہ سے مالک کو بڑھنے کا حکم دیا۔ اور قبول ابن خلدون جب ”معاویہ کو اس کی اطلاع ہوئی تو اس نے یہ کچھ لیا کہ اب مصر پر قبضہ کرنا کارے دارد کا مضمون ہے۔ کیونکہ اس کا محافظ جدید (اشتر) اس کو بیرونی حملہ سے بچالے گا۔ لیکن اتفاق یہ پیش آیا کہ اشتر جون ہی حاکم عراق قلم کے پاس آکر اتر اقبال کر گیا۔ کہا جاتا ہے کہ معاویہ کی سازش سے حاکم

باب

خراج قلم نے اشتر کو زہر دیدیا تھا۔ اس طرح سے کہ اس سے خراج معاف کر دیا جائے گا۔ اس کے بعد عورن کا اموی میلان بغیر کسی دلیل کے اس سے یہ بھی کہلوا دیتا ہے کہ ”میکن یہ دور از قیاس اور غلط واقعہ ہے۔“ دانشمن آردینگ اور ادسورن، ابن غلدون کی طرح معاویہ کے معاملہ نہیں ہیں، اور نہ طبری اور روضۃ الصفا یا جامع التواریخ نے یہ لکھنے میں کئی کی ہے کہ معاویہ کے ایماء سے زہر دیا گیا۔ اعثم کوئی اشتر کی محض شہادت اور ابوالفدا زہر دیے جانے کا تذکرہ کرتا ہے۔

مالک کی خبر شہادت سن کر جناب امیر کے الفاظ اپنے اس دفا دار خدام اور بہادر دوست کی اس افسوس ناک موت کی

خبر سن کر بھلائی لے کہ ”عورتیں مثل اس کے دوسرے نہ ہوں گی، اور اس کی مثال دوسرا موجود نہیں ہے۔“ علی کا دہنا ہاتھ کٹ گیا، اور ہایاں ہاتھ بھی ہائی نہ رہا۔ کوشش کی، ترغیب دی کہ سپاہی مصر کی طرف مدد کے لیے روانہ ہوں۔

محمد بن ابی بکر کی عبرت ناک شہادت دو ہزار آدمی ویر میں تیار ہوئے۔ لیکن اس درمیان میں محمد بن ابی بکر کو دشمن کی کثیر تعداد نے گھیر لیا تھا۔ گرفتار چلے۔

بقول ابن غلدون: ”دشمنوں نے پیاس کی حالت میں انھیں ایک مرد اور گدھے کی کھال میں بھر کر جلا دیا۔“

اس کے بعد عبداللہ بن حنظلہ بصرہ بھیجا گیا کہ وہاں کے لوگوں کو جناب امیر سے براہِ رخصت کرے۔ حامل نے خسر دی جناب امیر امین بن عصبہ کی ماتحتی میں

کچھ سپاہی بچ گئے۔ ابن الحنظلہ کو شکست ہوئی اور مارا گیا۔

زیا د نے فارس کا انتظام کیا ایرانیوں نے کچھ شورش کی، جناب امیر نے زہرا کو بھیجا اور اس نے ہاتھوں کو سزا دی اور حالت اپنی جگہ قائم رہی۔ معاویہ نے عین التمر میں

اس کے بعد قمت آسمانی کی گورنر حضور ہوا۔

شامی عین التمر سے بھاگے اور اگرچہ مدد بھیجنے میں علی کی کوششیں بے کار ہوئیں لیکن اتفاق سے عبدالرحمن بن عوف پیاس آدمیوں کے ساتھ مالک بن کعب (گورنر) کی

مدد کے لیے پہنچا۔ شامی بچے کہ کوفہ سے بڑی مدد آئی اور خوف سے بھاگ گئے۔

اہل شام کے ہتھکڑی لوٹنے کی خبر سن کر جناب امیر کا خطبہ اس کے بعد اہل شام نے ہتھکڑی اور اتار کو لوٹا۔

علی کا حامل حسان البکری مارا گیا۔ جناب امیر نے خبر سن کر خطبہ دیا: ”قتل اور غارت تم پر گرجا نہیں۔ تمہارے مال تاراج ہوں گے۔ تمہارے گھروں پر قبضہ کر لیا جائے گا۔“ سوار ولایت اتار میں داخل ہو رہے ہیں۔ وہاں کے حامل

حسان البکری کو قتل کر ڈالا ہے۔ تمہارے سواروں کو تمہارے اسلحہ خانوں سے ہٹا دیا ہے۔ مجھے ان حملہ آوروں کے قلم و جوہر کی یہاں تک خبر پہنچی ہے کہ ان میں سے ایک شخص کسی مسلمہ یا ذمیہ عورت کے گھر میں داخل ہوتا، اس کے پازرب،

اس کے کڑے، اس کا گھونڈ، اس کے گوشوارے یہ سب زیورات نہایت بے رحمی کے ساتھ چھین لیتا تھا۔ وہ عورت اس مرد کو نہ روک سکتی۔ مگر ہاں وہ برابر مدد آنے گریہ بلند کر رہی تھی اور قبیلہ والوں کو بلارہی تھی اور یہ لشکر ایک کثیر

اور وہ فرماں قیامت لے کر واپس گیا نہ تو ان میں سے کسی کو زخم پہنچانہ کسی کے خون کا ایک قطرہ زمین پر گرا۔
دشمن باطل پر متفق لیکن تم حق سے پراگندہ

اب اگر کوئی مسلمان اس سانحہ دل غراش پر افسوس کرتا کرتا مہرجانے تو اسے ملامت نہیں کی جاسکتی، بلکہ وہ اس مرگ کا ملول وار ہے۔ آہ! تعجب اور سخت تعجب ہے۔۔۔ کہ وہ مخالفت تو سب کے سب اپنے فعل باطل پر اس قدر اجماع کر رہے ہیں اور تم امر حق سے یوں متفرق و پراگندہ ہو۔ وہ تم سے لڑائی کرتے ہیں اور تم لڑائی سے جان چراتے ہو۔ خدا کی نافرمانیوں اور مصیبتیں کی جا رہی ہیں اور تم راضی ہو بیٹھے۔۔۔ اے مرد موصوفہ مالا کہ مرد تم میں کئی نہیں ہے۔ اے خواہاں اے اطفال۔ اے حقوق زنان جملہ نشیمن! میں اس بات کو دوست رکھتا تھا کہ تمہیں نہ دیکھوں اور تمہیں نہ پہچانوں۔ تم نے اپنے صلیان و نافرمانی کی وجہ سے میری رائے اور تدبیر کو بھی فاسد کر دیا۔۔۔ حقیقت یہ ہے کہ رائے اور تدبیر اس شخص کے لیے سود مند نہیں جو اس پر عمل کرنے والا نہیں۔

جناب امیر تنہا روانہ ہونے کا قصد کرتے ہیں
 اب جناب امیر نے اپنی ذمہ داری کے لحاظ سے تنہا روانہ ہونے کا قصد فرمایا۔ قیس بن سعد نے روکا اور کچھ سپاہوں کو لے کر روانہ ہوئے۔ لیکن دشمن ان کے آنے کے پہلے روانہ ہو چکا تھا۔

شامی تیار سے بھاگے
 معاویہ نے ایک فوج تیار کی۔ امیر المومنین شعیب فزاری کی ماتحتی میں دو ہزار سپاہی روانہ کر سکے۔ شامی حضور ہوئے اور آخر میں بھاگے۔

حاجی بہکائے گئے اور ان کے محافظ سپاہی قتل کیے گئے
 غالباً شامی قریب تھا کہ معاویہ نے خاک بن قیس کو چار ہزار

سپاہوں کے ساتھ مکہ کی طرف روانہ کیا۔ اس نے حاجیوں کو یہ کہہ کر واپس کرنا شروع کیا کہ کوئی امام نہیں ہے، کس کے ساتھ حج کرو گے۔ اور شرط کے ان سپاہوں کو قتل کر ڈالا۔ جنہیں امیر المومنین نے حاجیوں کی حفاظت کے لیے ریگستانی راہوں میں تعینات فرمایا تھا۔ اب جناب امیر نے عمر کندہ کی ماتحتی میں چار ہزار سپاہی بھیجے۔ خاک کو شکست ہوئی اور یہ شام بھاگے۔ بشر بن ارطاة مدینہ آیا اور قبضہ کر لیا اور ابوبہرہ کو بھی عامل بن جانے کا موقع ملا۔ امیر المومنین نے دہب بن مسعود کو روانہ کیا اور انہوں نے دوبارہ قبضہ کر لیا۔

ابن عباس کے دو بچے دشمن نے ذبح کر ڈالے
 بشر بن ارطاة یمن گیا اور یہاں عبداللہ بن عباس کے دو صغیر السن بچوں کو ذبح کر ڈالا۔

یہ خبر سن کر جناب امیر نے فرمایا: ”بچے بشر بن ارطاة کی خبر ملی ہے کہ اس نے یمن پر قبضہ کر لیا۔ تم اپنے برحق امام سے مخالفتیں کر رہے ہو۔ تم میں فتنے ظاہر ہو رہے ہیں۔ مجھے اس قوم کی طرف سے یہ گمان ہے کہ وہ تمہاری بدعنوانیوں سے فائدہ اٹھا کر تمہیں اپنی رعایا بنالے گی اور تم اس کے فرمانبردار ہو جاؤ گے۔“

جناب امیر پیشین گوئی کرتے ہیں

بنی امیہ کے متعلق کہیں اور فرماتے ہیں: ”وہ تمہیں برابر ازیت پہناتے رہیں گے، یہاں تک کہ ایک شخص کو بھی تم میں سے

ایسا نہ چھوڑیں گے جو اُن میں سے نہ پہناتے یا اس کے نزدیک اس کا نفس بے ضررت ثابت نہ ہو۔ ان کی باتیں تم پر مسلط رہیں گی جب تک کہ تم میں سے ایک ایک شخص ان کا ظلام اور خدمت گار نہ بن جائے۔

سجستان کی شورش فرو کی گئی

سجستان میں شورش ہوئی اور وہ فرو کی گئی۔ بنی ناعیہ کے نصرانی فرقہ نے خارج سے مل کر جنگ کی اور وہ بھی اپنی حالت پر لائے گئے۔

شام پر فوج کشی کے لیے علی کی آخری کوشش اور شہادت

باوجود ان تمام شورشوں کے جناب

امیر اپنے اس پہلے خیال پر قائم رہے کہ جب تک امیر شام اپنی جگہ قائم رہے گا شورشوں کا سورج بند نہ ہوگا اور علی کی آخری کوشش دکھائی دیتی ہے کہ وہ لوگوں کو آمادہ کر کے دس ہزار سپاہی اپنے فرزند حسین کی ماتحتی میں دیتے ہیں۔ قیس بن سعد اور ابوالایب انصاری بھی دس دس ہزار سپاہوں کے افسر ہوتے ہیں اور دیگر سرداران لشکر کو اور سپاہی سپرد کیے جاتے ہیں۔ تیاری قریب بہ تمام اور کوچ کا وقت نزدیک آ گیا تھا کہ اسلام کی امید ہمیشہ کے لیے زہر الودھنوار سے ذبح ہو گئی۔

۳۰؎ حالت نماز میں زخم کھا کر علی نے کیا فرمایا

کون مسلمان نہیں جانتا کہ انیسویں رمضان کی نامبارک تاریخ کو جس وقت یہ

رضائے الہی کا شہیدانہ کو مسجد میں نماز پڑھنے اور پڑھانے جا رہا تھا کوئی محافظ سپاہی نہ تھا کسی چھپے ہوئے قاتل کا اندیشہ نہ تھا کہ عین حالت نماز میں جب کہ سر مبارک سجدہ سے اٹھا بھی نہ تھا کہ تین قاتلوں نے یکے بعد دیگرے اپنی زہر کی بھیجی ہوئی تلوار سے وار چکے۔ ایک تلوار اسی جگہ لگی جہاں اعزاس میں عمرو بن عبدود کے ہاتھ سے لگی تھی۔ قاتل نے ابی سر مبارک سے تلوار چھینی بھی نہ تھی کہ علی نے فزرت بوب الکعبہ (عدائے کعبہ کی قسم خیاں ہوا) فرمایا۔

شور ہوا، لوگ دوڑے، قاتل گرفتار ہوا، حسین آئے۔ دیکھا کہ درد لیار پر ہاپ جراح نے زخم دیکھا

کے خون کے چھینٹے پڑے ہیں۔ خود خون میں نہانے اور درد سے پہلو بدل رہے ہیں۔ عمر بن نعمان جراح نے زخم دیکھا، اور کہا: ”زخم علاج پذیر نہیں ہے۔ تلوار زہر آلود معلوم ہوتی ہے۔“

یہ سن کر لوگوں پر یاس اور تاریکی چھا گئی۔ اپنے زخمی ہونے اور رحلت کے درمیانی زمانہ میں جناب امیر نے فرمایا:

اپنے درمیشانی تن زحمت کے مصلح بنو آئمنہ سمراتے تھے کہ اپنی ذات اور گروہ کی اصلاح تمام روزہ و نماز سے افضل ہے۔

بنی عبد المطلب کو نصیحت

بنی عبد المطلب سے فرمایا: ”اے اولاد عبد المطلب! میں تمہیں ایسی حالت میں نہ پاؤں کہ تم مسلمانوں کے خون میں سر سے پاؤں تک رگیں

ہوتے پھرو، اور کہتے جاؤ کہ امیر المومنین قتل ہو گئے۔ امیر المومنین قتل ہو گئے۔ آگاہ رہو کہ میرے قاتل کے سوا کوئی دوسرا شخص قتل نہ ہونا چاہیے۔

اس کے بعد جناب امیرؒ نے اپنے دونوں فرزندوں حسنؒ و حسینؒ کو جو مخصوص نصیحت فرمائی وہ یہ تھی کہ: ”تم دنیا کو طلب نہ کرنا، اگرچہ وہ تمہیں طلب کرے اور تمہاری طرف مائل ہو اور کبھی اس چیز پر حسرت و افسوس ظاہر نہ کرنا جو از غم ماں دنیاوی تم تک پہنچنے سے روک دی جائے۔ یہی باتوں پر زبان کھلے ابجد و ثواب کے لیے غن کرنا۔ ظالم کے دشمن رہنا اور مظلوم کے مددگار۔“

یہ نصیحتیں فیج البلاغہ میں ملتی ہیں۔ جن کا خلاصہ ابن خلدون نے بھی دیا ہے۔ آخر اللہ کر مورش کے موافق حسینؒ اور محمد تقیؑ کو ایک دوسرے کے لحاظ کی وصیت فرمائی۔ اور پھر حسنؒ کو تھوڑی دیر تک بچاتے رہے۔

اسی مورش کے موافق برک بن عبد اللہ جب معاویہ کے ارادہ سے گیا اور گرفتار ہوا تو اس نے کہا: ”میں تم کو ایک خوشخبری سنایا چاہتا ہوں، اگر تم اس سے مجھے مستحید کر دو اور وہ یہ ہے کہ آج ہی شب کو میرے ایک بھائی نے علیؑ کو مار ڈالا۔“ معاویہ نے استعجاب سے کہا: ”شاید وہ اس امر پر نہ فکور ہوا ہوگا۔“ برک نے جواب دیا: ”یہ غیر ممکن ہے۔ کیونکہ اس کے ساتھ کوئی محافظ نہیں رہتا۔“

معاویہ کی ایک غور طلب کوشش اور جناب امیرؒ کے الفاظ صاحب شواہد النبوة نے ایک روایت

لکھی ہے جو میں ناظر کے غور کے لیے پیش کرتا ہوں، اور وہ یہ ہے کہ: معاویہ نے اپنے ”عاقبت کار“ کے معلوم کرنے کے لیے اپنے مصاحبین سے صلاح لی، اور پھر خود ہی تصفیہ کیا کہ اسے ”علیؑ سے معلوم کر لیں گے۔“ اور تین آدمیوں کو کوفہ بھیجا اور ان تینوں نے یکے بعد دیگرے کہنا شروع کیا کہ معاویہ نے انتقال کیا۔ یہ خبر جناب امیرؒ کو پہنچی مگر لیکن ”ہاں انتکات نہ نمود۔“ یعنی: اس طرح توجہ نہ کی۔ اور لوگوں کے اصرار پر کہا: ”کلا کہ فے نمیر و مادام کہ این (واشارات بحاسن خود کرد از این و اشارات بسر خود کرد) خطاب کردہ نہ خود و رنگین نہ گردد و این اکلمہ الا کہ ہاں ملاعبہ نکند۔ و آن سہ تن این خبر را بمعویہ بردند۔“ یعنی: ہرگز نہیں، وہ نہیں مرے گا جب تک کہ یہ (اس سے) اپنے ریش مبارک کی طرف اشارہ کیا اور اس سے اپنے سر مبارک کی طرف اشارہ کیا (خطاب نہ کی جائے اور رنگین نہ ہو جائے اور جگر چبانے والی کا بیٹا اس سے خوش نہ ہو اور وہ تینوں یہ خبر معاویہ کے پاس لے گئے۔

اب مجھے اور یہ کیا کہنا ہے بڑا اس کے جو میں انگڑائی میں کہہ چکا ہوں کہ: رمضان کی اکیسوی کو تجھیز و تکھیز متفقین کا ”ولایت نامہ“ شیعوں کا ”ایام اوتل“ دنیا کا ”بہارِ دہلی“ رضائے الہی کا شہداء، مہد کوفہ کا عابد، دشمن پر دم کرنے والا، دنیا سے گزر گیا۔ حسینؒ نے غسل دیا اور وصیت کے موافق دفن کیا۔ بغیر کسی نمائش اور شان کے غالباً جئے ہوئے تھوڑے سے لوگ اس مقدس اور متبرک بوجہ کو اپنے کاندھوں پر لے گئے۔ اسلام کے علانیہ مدد کرنے والے کو دشمنانِ اسلام کے خوف سے (پوشیدگی سے) زمین میں دفن کر دیا۔ کئی نشان قبر، کوئی لوح، کوئی کتبہ نہ رکھا گیا۔ بلکہ زمین برابر کر دی گئی۔ لوگوں کو دفن کی خبر اس وقت ہوئی جب یہ لوگ گھر واپس آ رہے تھے۔ علمہ ناس کو یہ بھی معلوم نہ ہوا کہ مشتاقِ رضائے الہی کو کس جگہ زمین میں چھپایا ہے!۔

باب پنجم کا شروع

(جس کی بہاریہ ہو پھر اس کی خزاں نہ لوچھ)

کس کے خلاف انقلاب ہوا

کیا سمجھا کہ گزشتہ باب میں نہ کہیں بالادستی دکھائی دی نہ کہیں اپنا پہلو منہ میں مضبوط دبا کر بحث کی گئی۔ نہ ٹانگ جھپکنے کا موقع غنیمت سمجھا گیا۔ نہ زبان کاٹنے کے لیے اقرار لیا گیا، اور نہ اس کا موقع دیا گیا کہ ایک حکم کے سامنے کوئی عذر کی ضرورت سمجھتا اور نہ کچھ لوگ تصفیہ خلاف کے لیے مقرر کیے گئے، جن کی مجموعی صورت کسی سمجھنے والے کو دھوکا نہیں دے سکتی تھی۔ انقلاب ہوا کس کے خلاف۔ رسول کے بعد جو نظام دکھائی دینے لگا تھا اس کے خلاف۔ اس کی فرع کے خلاف۔ ہم کہہ چکے ہیں کہ اس پہلے نظام کے قائم ہونے ہی یا اس کے بعد کیوں انقلاب نہیں ہوا۔ اور یہ بھی کہہ چکے ہیں کہ جون جون دن گزرتا جاتا تھا انقلاب کا ذخیرہ زیادہ اور انقلاب کا وقوع قریب ہوتا جاتا تھا۔

بنی امیہ بغیر کوشش کے باز نہ رہتے

میں نے یہ بھی کہا ہے کہ رسول کے بعد جو روش تھی وہ کسی صورت پر منتہی نہیں ہو سکتی تھی مگر یہ کہ بنی امیہ صاحب اختیار ہو جاتے لیکن اب میں تذکرہ اور واقعات کے اس حد تک شر کے قریب آ گیا ہوں جہاں بے تردد یہ کہہ سکوں کہ اگر ایسے ذرائع نہ بھی اختیار کیے جاتے جس سے بنی امیہ کو حصول اختیار میں سہولت ملتی تاہم وہ بغیر کوشش کے باز نہ رہتے۔ سہولت پیدا کرنا تو دفع الوقتی تھی اگر میں رشوت کا لفظ استعمال نہ کرتا چاہوں۔

کیونکر نظام الٹ گیا

میں انقلاب کا ذکر کر رہا ہوں۔ حیرت کی جاسکتی ہے کہ جس وقت عناصر قوی کے منتشر کر دینے والی کل چلتے چلتے اس حد تک شدید دیباچی تھی کہ بے نام جذبات کے پچھے نہ دوڑنا ناکامی بھی جاتی اور محض فوجی جوش۔ حوصلہ مال اور شہرت کی نہ بچنے والی پیاس اور کالاج ہوئی اور وہ اس پر مطلق غور نہ کرتے کہ اس کے منہ۔ احتیاط اور احتیال پر رکنے کی بھی کوئی کل ہے یا نہیں جو آئندہ انتشار قوی اور بے مسئلہ بے کاری کے خطرات سے محفوظ رکھے۔ جس وقت بغیر ترجیحی سلوک کے حکومت اپنی بنیاد مضبوط نہیں کر سکتی تھی اور اپنے اغراض قیام اور استحکام کے لیے متعین کی زیادتیوں سے چشم پوشی کر سکتی تھی اور جس وقت حکومت کا افراد اور جماعت کی موافقت حاصل کرنے کا کس یہ تھا کہ ایسی جماعت اور افراد رسول اور اقتدار کی امید کرتے اور اپنے کو عامہ ناس سے اس اعتبار سے بلند رتبہ سمجھتے ان حالتوں میں قوی عناصر میں سے کونسا عنصر نیست ہونے سے بچ رہا تھا۔ جسے مدبرین کی نگاہ نہ دیج سکی اور چھپا چھپا رہ گیا، اور جو لڑکھڑاتا ہوا اٹھا اور اس میں یہ قوت پیدا ہو گئی کہ وہ ایک نظام کو الٹ دیتا۔

کیا علیؑ کے سوا مدینہ میں کوئی نہ تھا

لیکن میری حیرت اس غور اور استفہام پر ختم نہیں ہو سکتی۔ میں آگے بڑھتا ہوں اور اب سوال کرتا ہوں کہ کیا تمام

مدینہ میں یزیدؑ کے اور کوئی نہ تھا جس کی طرف لوگوں کی فطرت سکتی، جسے بنو امیہ بھی اپنی دقتوں میں اپنا مشکل کشا سمجھتے جس سے عثمان استفادہ کرتے تھے۔ تاہم اپنے شوہر کے موٹے آزادی دہندہ گتیں اور جو عثمان کو مردانہ قربان ہونے سے بچا لیتا۔ ایسے جوش کے عالم میں جب کہ قتلع بن عمرو کا ایسا ملک ایران پہلور نسبتاً لوگوں کے کم تعداد کے جوش میں بھی ان سے باز پرس کرنا موقع کے خلاف سمجھا ہوا، قتلع سپاہی مدبر تھا۔ رسول کا مدد و رسول کا مرکز امید نہ تھا۔

اصحاب تھے۔ کوئی شخص جو اسلام لایا ہو، کسی عقل، کبھی قوتی، کسی نفس اور کسی علم کا کیوں نہ ہو لیکن رسول کی خدمت میں حاضری کا شرف اسے حاصل نہ کھا سکتا تھا لیکن خدا کا

ان میں کوئی علیؑ نہ تھا

بزرگ نام کر دڑ مہرہ رو، یا تمام عمر کا قدر لکھا ہوا دیکھتے رہو۔ عبادتِ رضی عنہ کی ایک چیز کو کر بھالنے رہو۔ لیکن تم نہ ایک ایسی بڑھو گے نہ بلند ہو گے۔ گریو فون کا متواتر مدد دینا اس میں کوئی شور نہیں پیدا کرتا۔ ان مقدس چیزوں کے خصلت گراؤ کے استقبال کی نوعیت اور انداز وہ حالت ہے جس سے ”جہاں ہم نشین در من اثر کرد“ یحییٰ ہو سکتا ہے۔ یہ تھادی قبولیت کی قابلیت پر موقوف ہے ورنہ ”من ہماں نام کہ، ستم“۔ صاحبِ بہت سے تھے۔ بہت سے ایسے تھے جو کسی مذہب اور مجموعہ مذاہب صفات کے ناز تھے لیکن ان میں کوئی علیؑ نہ تھا۔ اور لوگوں میں اس کا جوش تھا۔

ان میں استدار تھا کہ ہم علیؑ کوئی علیؑ کا منکر صفات ہو کر ان کا مخالف نہیں ہوا۔

علیؑ کے خلاف جو گئے لیکن یہ ان کی انکار صفات کی بنیاد پر نہ تھا بلکہ جیسا صاحبِ موافق عرقہ فرماتے ہیں: ”امام المؤمنین گفتہ کہ اتحاد و اعتباری نیست بر قول کسی کہ گفتہ است اجماع بر امامت علیؑ متفقہ شدہ زیر آ کہ چاکس انکار امامت و ارث الانبیاء علیؑ نہ کرد۔ این فتوہ و فتویٰ کہ در میان ایشان واقع شدہ بواسطہ دیگر امور بود نہ بسبب امامت او“۔ یعنی: امام المؤمنین نے کہا ہے کہ اس شخص کی بات قابلِ ملاحظہ اعتبار نہیں ہے کہ جس نے کہا ہے کہ علیؑ کی امامت پر اجماع متفقہ نہیں ہوا۔ کیونکہ کسی شخص نے بھی وارثِ انبیاء علیؑ کی امامت کا انکار نہیں کیا۔ یہ فتوہ و فتوہ کہ جو درمیان میں آپؑ پر یہ دیگر باتوں کی وجہ سے تھا نہ کہ امامت کی وجہ سے۔

اس وقت امام دھونڈنے کی نکلنی در آن حال پیکہ کہیں گئے لوگ جس وقت ظلم امور کے لیے اس کے قبل امام اپنی امت ڈھونڈ رہے تھے۔ کوئی نہ دیکھائی دیا۔ عصری، بھری، کوئی، مدنی

کہاں جا رہے تھے مدینہ دار الخلافہ تھا۔ یعنی ایک مرکز تھا جہاں ممالکِ عروسہ کے لوگ اکٹھے حیثیتوں سے موجود رہتے ہوں گے۔ ان لوگوں کا بار بار اس گھر کی طرف جانا جو کبھی مہذب جب مدینہ میں لیکن رسولؐ کے دفن کے قبل سو قتی ہو گیا تھا۔ سوال پیدا کرتا ہے کہ آیا اب رسولؐ کے بعد پچیس برس تک صاحبِ خانہ کی اکثر امور سے ناواقف اور علیؑ کی اسے مزید شہد کا مستوجب فہرہ ریزی تھی اور یہ لوگ گئے تھے کہ اب اس مکان اور لیکن کا نام و نشان باقی نہ رکھیں؟ نہیں اس مجمع کا جاننا نہ اپنے حصول اختیار کے لیے تھا اور نہ اپنے اختیار است کے طوعاً یا کراً

معاہدے کی غرض سے قتل یہ امام دعوینڈ نے لکھے تھے دارالخلیفہ اس کے قبل امام اپنی رعایا دعوینڈ نے لکھے تھے۔
آج کا خلیفہ شرائط لکھوار ہاتھا
 بھی نہیں بلکہ آج کامرکز نگاہ ”سب قبول ہے“ والا خلیفہ نہیں بنتا تھا بلکہ خود شرائط لکھوار ہاتھا شرائط قائم کرتے وقت علی کے چہرہ پر غم کا سایہ دکھائی دیتا ہے۔

کب نہ ہوتے اور کب ہوتے
 وقت آیا کہ علی اس وقت خلیفہ نہ ہوتے جس وقت نہ ہونے کا گمان بھی نہ ہوتا زمانہ ڈھلکا اور اس طسرح کہ گویا اس کا سارا وزن

بنی ہاشم اور ان کے معتمدین حقوق کو پیسے ڈالنے کے لیے ہے۔ یہ بھی گزرتا اور اب پھر زمانہ اس وقت علی کو خلیفہ بتایا کرتا جس وقت علی کو خلیفہ ہونے کا ادنیٰ گمان باقی نہ رہ سکتا لیکن یہ کئی عالم خیال کی تصویریں نہ تھیں، نہ غلبہ کے تمدن تھے بلکہ عقلی لوگوں کو اور لوگ علی کو دیکھ رہے تھے علی کا وقت اس خلافت پر قتل کے بل گرا نہیں پڑتا تھا اور اب میں علی کی آنکھوں میں لوگوں کی اسستہ عابر طرز دیکھتا ہوں اور ان کا ہار بار رو کر ناگھاتا ہے کہ کج خلافت خلافت کی مشہور حیثیت سے علی کی نظر میں ”بکری کی چھینک“ سے زیادہ وقت نہیں دیتی تھی۔

علی کا عہد ایک اظہارِ تاسف تھا
 غم اس خیال سے شروع ہوتا ہے کہ سفیر الہی کی نہایت کامستہ اب کس صورت سے لوگوں کے خیال میں قائم ہو گیا ہے۔ اور اس نے کیا کچھ اثر کر لیا ہے۔ نہ ہو کہ لوگ یہ سمجھتے ہوں کہ گزشتہ طرز عمل کو ہم بھی طے شدہ امر سمجھتے ہیں اور آئندہ اپنے طرز عمل کو رسول کے بعد کے کسی نظام سے متاثر نہ ثابت کرنے کے لیے اپنے روش کے آئندہ کھنے کا عہد لیتے ہیں اور لوگ بھی محض کتب اور سنت پر عہد لیتے ہیں۔ ”سنت غلط“ کا نام بھی نہیں لیتے۔ یہ حالت تھی جو ہم سے پہلوی ہے کہ نہ صرف لوگ یہ سمجھتے تھے کہ علی کیا پسند کریں گے اور کیا پسند نہ کریں گے بلکہ ہم اسے رسول کے بعد کے کل نظام کے خلاف ایک انتخاب کہتے ہیں۔

جائز نوعی طریقہ کے بعد روحانی اثر کی طرف عود کرتے ہیں
 جناب امیر اس پر قیامت کرنے کے لیے آلودہ نہ تھے بلکہ انھیں

یہ بھی کہہ دیتا تھا کہ: ”تم مجھے خلیفہ ہالوی اور بالحق اور وزیر از جانب خدا تسلیم کرو۔ یہ اس سے بہتر ہے کہ تم اپنی بیعت کے سبب مجھے خلیفہ مانو۔“ کیا اس کے بعد بھی اس شبہ کی جگہ رہتی ہے کہ جناب امیر گزشتہ طرز انتخاب کو دلوں سے دھو نہیں رہے تھے؟ کیونکر ایسا نہ کہتے جب انھیں فرمانا تھا کہ ”اب جہالت آگاہی پر چلنا ہوا ہے اور مشہور اہل متروک اور ناپید ہو گئیں۔“ اور بغیر ایسی باتوں کے جو نے کیسے یہ حسرت ظہر کی جا سکتی تھی کہ: ”اگر میری خلافت اور امارت کے پاؤں لائیں گے انھیں کے فخرش کرنے والے مقلات سے قرار پا گئے تو بیشک بدعتوں کو مستحکم کر دوں گا۔“

عالم کا تجربہ
 کیا یہ نہ تھا کہ قوم عرب کی درستی اس وقت شروع ہوتی تھی جب کہ علی بالغ اور کجدار ہو چکے تھے اور کوئی کام ایسا نہ ہوتا تھا جو علی سے پوشیدہ ہو یا ان کا اس میں عملی حصہ نہ ہو۔ فوجی، اعلیٰ مقامی، سیاسی، اور مذہبی امور ملت تھے جنھیں رسول نے انھیں کے ساتھ علی کے سپرد کیا اور کبھی رسول کو

شکایت نہ ہوتی بلکہ علی کے انہام وہی امورات پر رسولؐ نے حکم یہ لدا تھا کہ رسولؐ کی تعلیم ایک ایسی قوم کو بتا رہی تھی جو ہلو کے ذرات سے زیادہ پیچیدہ تھی۔ بلاشبہ قوم اور افراد کے اختیارات سوخت ہو کر رسولؐ کی تہا ذات میں جمع ہو گئے تھے اور علیؑ نے رسولؐ کی اس ذات کو اپنا سرخس انہام دیتے دیکھا تھا۔ یہ ذات اور اس کا طرز عمل وہ محور تھا جس پر قوم گومتی تھی اور یہی قوی حرکت کی روح تھی۔ اس نے قوی جسم کو جن انداز سے بنایا تھا وہ علیؑ کی آنکھوں کے سامنے کا تماشا تھا اس کے اصول نہ صرف دیکھے تھے بلکہ رسولؐ نے کھانے بھی تھے۔ رازدار تھے۔ اب تیسری حالت پیدا ہوئی یعنی سانچہ بدل دیا اور اب قوم کے خصال جو صورت اختیار کرتے جاتے تھے وہ بھی علیؑ سے پوشیدہ نہ تھے۔ علیؑ کا تجربہ رسولؐ کی ساخت قوی اور موجودہ روش کے قابل سے یہ تصدیق کر رہا تھا کہ شاہرہاں یعنی خصال سازی کے بڑے اصول متروک اور ناپید ہو گئے۔ اور اب یہ حالت افکار پر چھا گیا۔ یعنی وہ روشی کی روح جو دکھائی دیتی تھی غفلت یا جاہلی سے متاثر ہو گئی۔ ان مختلف حالتوں کا تھیر کر سنا بیانے خود تھیر کر سکنے والے کی طرف امید کی نکالیں اٹھا سکتا تھا خصوصاً جب کہ وہ کہہ بھی رہا تھا کہ: ”خوب جان لو۔ اگر میں تمہاری التماس کو قبول کروں اور تم سے بیعت لوں تو تمہیں احکام خداوندی کا تحمل پنا دوں گا۔ حصہ میں ابھی طرح سے جانتا ہوں۔“ اگر ایسا تھا کہ علیؑ یہ بھروسہ تھے کہ لوگ اپنی ترقی کے اصل گر کو بھول کر ظہر فریب چیزوں کے طرف دوڑ رہے ہیں جس سے وہ گہری تباہی کی طرف جارہے ہیں تو اس میں بلا خوف ہوا فہم اس یقین کی جگہ ہے کہ اگر کوئی تھا جو قبول ابن خلدون: ”علی منہاج المعبودہ“ چاہ سکتا تو وہ علیؑ تھے۔ اور علیؑ نے قوی ساخت کو دوبارہ شروع کیا بغیر اس کے کہ وہ ”لوم لائم“ کی پرواہ کرتے۔ لیکن ایک مرتب مخالفت ابتدا ہی سے پے در پے سامنے آنے لگی مخالفت دفعہ نہ پیدا ہو گئی تھی بلکہ اس کی ابتدا اس وقت سے برابر جاری تھی جس کے دکھانے کے لیے میں نے طوالت کو اراکی۔

۲ صفحہ میں نے کتب میں ابتدا ہی سے اس کا اہتمام کیا ہے کہ ان لوگوں کے نام احتیلا سے لکھتا آؤں جن کا دو میلان کسی خاص امر کی طرف دکھائی دیا ہے اور اس سے مسیری غرض ظاہر ہے کہ شخص واقعتاً سمجھنے میں معین ہو۔ اب اس باب میں یہ غور سے پڑھو کہ وہ کون لوگ یا کس کے قائم مقام یا اوتار تھے جنہوں نے اپنے میلان کو عملی مخالفت کی صورت میں دکھایا۔ زمانہ نے اس واقعہ میں رنگ طبیعت کی دو مشین سامنے کھڑی کر دی ہیں جو اپنی روش اور خیال کی عظمت کر رہے ہیں۔

عینک جو گزری اور اگر جنب امیر کو یہ واقعہ پیش نہ آئے اگر ان کی خلافت کے پہلے اس نوعیت کی حکومتیں نہ گزری ہوتیں جامع تھی جو ان کے حقوق کی مخالفت کا بیج اس وقت سے اپنے دل میں بونگی تھی جس وقت تیر سے تیر آکر جو مخالفت یا مخالفت کے تمیز میں مہارت رکھتی ہے پھلتے کا کوئی اقدام نہ کرے۔ حیثیت یہ باب وہ عینک ہے جس سے دور کی چیزیں اور وہ فرد ہیں جس سے اپنی ذرات مخالفت دکھائی دے جاتے ہیں۔

ماہرین اصول اکتب سے مجھے صرف یہ کہنا ہے کہ رسولؐ کے بعد باوجود اوطانے اکتب آیا اس پہلے یا تیر سے اکتب میں

کس نے حقوق بشری کا لحاظ کیا

باقاعدگی، دیانت، اور اس کی فطرت پائی جاتی تھی یا اس وقت جب کہ وہ منتخب کیا گیا جس نے اصول انتخاب کو تسلیم نہ کیا تھا نہ مجھے اس کی تفصیل کی ضرورت ہے کہ یہ فقرہ کہ خدا کے بندوں کو اپنا بندہ نہ بنو اعلان کنندگان جمہوریت کا قول نہ تھا بلکہ اس کا جس نے اپنے استلو کی طرح انسان کی پیدائش حقوق کا لحاظ اور اس کی ہمیشہ کوشش کی تھی۔

پس و پیش کے معنی کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ جناب امیرؒ نے کئی دن تک خلافت قبول نہ فرمائی اور جب ”لوگوں نے اسلام کے انجم سے ڈرایا“ تو کبھی اہل بدر کو بلایا، کبھی لوگوں سے مسجد میں اپنی خواہش ظاہر کرنے کو کہا۔ کبھی وزارت قبول کر لینے پر قناعت کی اور کبھی طلحہ وزیر کے خلیفہ بن جانے کا استعراج لیا۔ کیا یہ علیؑ کا بر مذاق طغر تھا۔ اس پر کہ ہم کسی بڑے ہونے ہاتھ کو دبچ کر بیعت نہیں کروا لیتے۔ کہیں شہر سے کوسوں دور نہیں بیعت کراتے بلکہ مسجد میں طلب کرتے ہیں۔ کئی دن انکار یا تاہل سے لوگوں کو غور کا موقع دیتے ہیں۔ اور اس امر کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے صاف کر دیتے ہیں کہ ہم نے موقع دیا کہ ہر قسم کے لوگ استشارہ اور اظہار خیال میں شریک ہو سکیں۔ اور امر بیعت بلائے ناگہانی کا مراءوت نہ ہو جائے۔

کیا پس و پیش تھا؟ کوئی مورخ مثل صاحب ”سیرۃ الخاروق“ کہہ دے گا کہ خلافت کی عظیم الشان ذمہ داری کے لحاظ سے کوئی قبول نہیں کرتا تھا اور ابوبکرؓ نے قبول کر کے اسلام اور مسلمانوں پر احسان کیا۔ ایسا خیال ”پس و پیش“ کے لفظ کی مولفانہ قیادہ بھی جانے گی۔ کیونکہ رسولؐ کے بعد نہ علیؑ کو خلافت قبول کرنے کا موقع دیا گیا، اور نہ انھوں نے کوئی پس و پیش ظاہر کیا۔ پس و پیش انھوں نے اپنے انتخاب کے وقت یعنی رسولؐ کے رحلت کے چوبیس برس بعد ظاہر کیا جب کہ لوگ اس نظام سے متاثر ہو چکے تھے جس کا ذکر کیا جاتا رہا۔ اور اب اس نظام سے نہ صرف پرانی قوم متاثر ہو چکی تھی بلکہ ایک پشت سموی اس میں نشوونما پا چکی تھی۔ بلکہ دوسری تیار ہو رہی تھی۔ اور مزید کمی یہ تھی کہ اس زمانہ میں جو مملکت فتح ہوئے تھے اور ان میں جس قدر لوگ اسلام لائے تھے وہ جناب امیرؒ کے متعلق نہ حضرت رسولؐ کے خیالات اور تعلق قلبی سے واقف تھے، نہ انھیں علیؑ کے درجہ اور ان کے اسلامی خدمات کے واقفیت کے آسان ذرائع حاصل تھے۔ انھیں جو کچھ تعلق تھا موجودہ سیاسی نظام سے تھا اور جس طرح کا اسلام انھوں نے سیکھا تھا۔ اسی نظام کے سایہ میں سیکھا تھا یہ تھا کہ علیؑ رسولؐ کے بعد خلافت نہ ملنے پر متاسف ہوتے اگرچہ انھیں تھوڑی رعایا اور ریگستانی خطوں پر حکومت کرنی پڑتی۔ انھیں تو اس درجہ خصائل پر لوگ چاہیں تھے جس پر رسولؐ چھوڑ گئے تھے لیکن اس خلافت کے قبول کرنے میں پس و پیش کرتے جس میں کسریٰ اور قیصر کے ملک جوڑے جا چکے ہوتے اور جے عمرو بن ماس و معاویہ اور خالد بن ولید کے ایسے لوگوں نے اضافہ کیا جو تار اور صرف عدداً مسلمان بڑھ گئے ہوتے بغیر اس کے کہ ان پر اسلامیت کا قابل اعتبار سایہ پڑا ہوتا۔

متخالفین کے لیے علیؑ اور ان کے اصحاب کی مصلحت زوج بتول نے جو قبول سید امیر علیؑ صاحب جیسا وہ

تاریخ اسلام میں فرماتے ہیں ”انتخاب حق کے پہلو بہ پہلو موروثی حق بھی رکھتا تھا“ خلافت کے قبول کرنے کا اعلان کیا ”کئی“ اپنے ہاتھ میں لی۔ معلوم ہوا کہ کچھ لوگ بیعت سے آٹھیں چرارہے ہیں۔ خاموش رہے۔ پر جوش محضین نے غلبہ گزشتہ مثال کے لحاظ سے گزارش کی کہ میں مفکرین کے ساتھ سخت برتاؤ کی اجازت دیجیے۔ دلیل یہ لائے کہ

”لوگ اپنے صلاح کار کے لیے اپنی بیعت کرتے ہیں آپ بھی اپنے صلاح کار محفوظ رکھیں۔“ اس جوڑ توڑ کی صلاح کے معنی اور کیا تھے کہ اقرار کے بوجھ سے دھادکچے کہ آخر میں وہ انکار نہ کر سکیں لیکن اجازت نہ دی کیونکہ علیؑ کے نزدیک یہ رسی بیعت بے سود تھی جب تک ”رغبت“ نہ ہو۔ فرماتے ہیں کہ ”ہم آدمیوں کو تم سے اچھا سمجھتے ہیں۔“

یہ بھی فرماتے ہیں کہ: ”مجھے اپنی رائے پر چلنے دو۔“ اس سے کچھ میں آتا ہے کہ جناب امیرؑ نے ان لوگوں کے متعلق کسی برتاؤ اور معاملت کو اپنے ذہن میں طے کر لیا تھا۔ ابھی کے دن گزرے تھے کہ اس کا اثر محسوس ہوتا یا وہ کوئی مصلحت جاری کر چکے ہوتے۔ یہ ایک امر تھا جسے زمانہ اور وقت طے کرتا۔ لیکن ہے کہ جناب امیرؑ وقت اور اپنی حکومت کے جم جانے کے منتظر ہوں جس کے بعد نظام کا وزن انھیں دہا دیتا لیکن ہے کہ جناب امیرؑ وقت دے رہے ہوں اور امید ہو کہ ہمارا برتاؤ دیکھ کر دوبارہ ہو جائیں گے۔ لیکن ہے کہ جناب امیرؑ سوچتے ہوں کہ ان پر تشدد انہیں بگاڑ دینے کا سبب نہ ہو جس سے دور دراز مقامات پر جا کر یہ غلط فہمیاں پھیلائیں۔ لیکن ہے کہ ان لوگوں کے ساتھ ان لحاظ کے اس لیے ضرورت محسوس ہوتی ہو کہ وہ دیکھنا چاہتے ہوں کہ مکہ اور دمشق کدھر کر ڈھلے لیتا ہے۔

کچھ لوگ جو بڑے واصلوں والے تھے لیکن فی الجملہ متانت پسندی ظاہر کیا چاہتے تھے اگرچہ انھیں یقین نہ تھا کہ ہم امیر المومنینؑ پر پھیل جائیں گے لیکن تاہم بغیر تجربہ کیے وہ کوئی اور داغ راہ اپنے لیے اختیار نہ کیا چاہتے تھے۔ وہ لوگ سوچتے تھے کہ اگر ہم ایسے ظاہر ہو سکے جس سے یہ سمجھا جاسکے کہ ہم خلافت کے رسمی یا غیر رسمی مشیر ہیں تو یہ بھی کچھ زیادہ ذیلی بات نہ ہوگی، اور اس طرح ہم غفلت کی نگاہ میں دھرمے قدامت کے دکھائی دیں گے، اور خود خلافت بھی اصرار کے ساتھ ہیں شریک دیجہ کر ہمارے غلبہ کی کوشش نہ کرے گی بلکہ ٹارگٹے گی۔ اور اگر ایک دفعہ امتیاز کا کس ہم پر پڑ گیا اور تو اب سے کہاں تک ہم زیادہ فتح میں نہ رہیں گے۔ اس ذیل ڈول کے ساتھ لوگ جناب امیرؑ کے قریب گئے۔ مصلحوں کی ٹھٹھری بند می تیار تھی لیکن یہاں کی فضا سخت ردھی دکھائی دی۔

علیؑ کی اسکیم
علیؑ کے پاس کوئی ایسی اسکیم نہ تھی جس سے ایسے لوگوں کو لٹانے رکھنے کی ضرورت محسوس ہوتی اس کے وقت گئے گزرے۔ علیؑ کی اسکیم یہ تھی کہ وہ قوی اندرونی اصلاح کریں جو بدلتوں سے خفاکے حوالہ تھی خصال قوی کی عدم مرکزیت کو دور کریں اور مرکز پر قائم کریں۔ علیؑ چاہتے تھے کہ انفرادی جائزہ وصلے اس طرح نکلیں کہ قوی خصال اس میں جذب یا معدوم نہ ہو جائیں۔ مختصر نظموں میں علیؑ چاہتے تھے کہ لوگوں کو رشوت کی طرف پھیر لائیں۔ بہر حال اور کسی کو کوئی امتیاز حاصل ہوا ہو یا نہ ہو ظلمہ و زیر کو یہ امتیاز ضرور حاصل ہوا کہ بیخ البرافہ کا ایک غلبہ اس معنوں پر ہے جس میں امیر المومنینؑ صلاح نہ لینے یا مسلات برستے کا جواب دیتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے لیے تو بہتر یہ ہوتا کہ ایک غلبہ ہوتا جو ان کی رائے اور رہنمائی کا محتاج ہوتا۔ اور انھیں مسلات کی خفت نہ برداشت کرنی ہوتی۔ عجب نہ تھا کہ اگر جناب امیرؑ کو خاموشی سے حکومت اور اندرونی اصلاح کا موقع ملتا تو اکثر لوگوں کے سنگ مرمر کے عمل رہن مایاں ہو جاتے اور اکثر جو مال حکومت سے خواہ خواہ کے زمیندار بن گئے تھے اب اپنے ہاتھوں میں آبلے دیکھتے۔ اور کچھ تو یہ ہے کہ جناب امیرؑ سے مخالفت کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ ایسے لوگ کچھ چکے تھے کہ اب ہمارے ہاتھ میں فور پیدا ہو جانے گا۔ جناب امیرؑ سے یہ لیکن نہ تھا کہ انفرادی مالی مرکزیت کے مقابلہ میں قوی نقصان اور نا انصافی کو ارا کر سکتے

یہی لوگ اکیلی مثال نہ تھے بڑے بقرابطہ بن شعبہ بھی ایک عدد مشورہ کے ساتھ تشریف لائے اور صلاح اس سے کم نہ تھی کہ معاویہ بن ابی سفیان اپنی جگہ رہنے دیا جائے۔ ان کے اسلام لانے کا موقع تاریخوں میں مذکور ہے اس کے سابق کا ہم تذکرہ کر چکے ہیں۔ ہم نہیں جانتے کہ گزشتہ حکومتوں کو انھوں نے جو صلاحیں دی تھیں وہ محض اپنے فتح اور سلطنت کی وقاری کے لحاظ سے تھیں یا ذاتی طور پر انھیں بھی بنی ہاشم سے کوئی حکایت تھی۔ اگرچہ آگے چل کر ایسے مواقع پیش ہو گئے جن سے ذاتیات کا معاملہ درپیش ہو جاتا۔ یہ کیسے کہہ سکتا ہوں کہ بنی ہاشم ان کی حرکات کو امتحان کی نظر سے دیکھتے تھے۔ نہ متغیرہ کو بنی ہاشم کی اس حالت میں اس کی بڑی کوئی فکر تھی کہ ہمیں یہ کن نگاہوں سے دیکھتے ہیں جب کہ ایسے زبردست مددگار موجود تھے جو اس کے خلاف سخت شہادت کو مجروح کر دیتے اور سنگسار ہونے سے بچا لیتے۔ اگرچہ ممکن سے دور نہیں ہے کہ اس وضع کا مدبر اب اس صلاح کے ساتھ آنے کے وقت اس فکر سے خالی نہ ہو کہ اگر امیر المومنین نے ہمیں امید دلائی تو ہم اپنے پہلے دوستوں کے خلاف چہری چلانے لگیں۔ لیکن علی کا دور حکومت وہ دور نہ تھا جس میں ایسے خصال کے مدبرین کی قدر کی جاسکتی۔

متغیرہ کی صلاح ممکن العمل نہ تھی قطع نظر اس کے دنیاز اس کے کہ علی اور بنی ہاشم کو اس سے کسی نیک صلاح کی امید نہ ہو سکتی تھی ہم دیکھتے ہیں کہ اس کی صلاح نہ صرف قابل عمل نہ تھی بلکہ معاویہ کی تحریک تھی جسے وہ بحیثیت ایجنٹ کے ادا کر رہا تھا۔

میں کہہ چکا ہوں کہ کیونکر حجاج بن خرمہ شام پہنچا اور اس نے معاویہ سے ظہر کیا اور صلاح دی کہ: ”شام میں تیرے پاس جس قدر لشکر اور سامان ہے وہ علی سے بہت زیادہ ہے۔ ابھی ان کا انتظام جا نہیں ہے کہ وہ مدینہ سے جنبش کر سکیں۔ لشکر تیرے موافق ہے اگر تو علی سے مخالفت کرنا چاہتا ہے تو اس کے قبل جنگ کر کہ ان میں قوت پیدا ہو جائے۔ جب وہ اپنا انتظام کر لیں گے تو یقین ہے کہ وہ عراق و حجاز پر بغیر شام کے راضی نہ ہوں گے۔“ معاویہ کے خیالات متغیرہ کو معلوم ہوئے اور اب یہ اس ”نیک نیتی“ کی صلاح سے لدے ہوئے امیر المومنین کے پاس پہنچے۔ کیا جناب امیر کے لیے بنی امیہ کے حالات سے پوری واقفیت ہونے کے بعد دنیاز اس علم پر کہ بنی امیہ کے افراد مدینہ میں موجود تھے وہ انھیں غلیفہ دیکھ کر پیچ تاب کھا رہے تھے۔ یہ ممکن تھا کہ وہ معاویہ یعنی اصل مخالفت اور بنی امیہ کے مرکز امین کو اپنی جگہ قائم رہنے دیتے نہیں۔ یہ علی کی حکومت اور اختیار کے لیے ہمیشہ ایک دھمکی ہوئی۔ وہ کبھی معاویہ کی طرف سے مطمئن نہ ہو سکتے تھے۔ اور ہر وقت انھیں اندیشہ ہو سکتا تھا کہ وہ اپنی قوت کے آزمائے کو مستعد ہو جائے گا۔ علی کا غلیفہ ہونا، اور ایک زبردست صوبہ کا مخالفت پر تلے رہنا، یا اطاعت کی آملاگی ظاہر نہ کرنا، بلکہ حکومت کے بھیجے ہوئے نائب کو واپس کر دینا، اعلان جنگ تھا۔ اور اب حکومت کا فرض تھا کہ باغی عامل کو سبق دے۔ معاویہ سے ایسی حالت میں چشم پوشی کرنا، اور اسے اپنی مخالفتوں پر آمادہ ہوتے دیکھتے رہنا، دوسرے عاملوں کو ایک تحریک ہوتی کہ تم بغاوت پر کیوں آمادہ نہیں ہوتے۔ اور جب ایسا سبق دے چکے تو خود دار السلطنت کی کون ذمہ داری کرتا، اور کیوں نہ ہر شخص ہر روز حکومت کا امیدوار بن کر آتا، اور وہ کامیاب ہوتا۔ جس کے ساتھ زیادہ ہتھیار اور آدمی ہوتے۔ پھر ایک صوبہ کا عامل دوسرے سے جنگ کرتا۔ تمام ملک میں بے امنی اور قتل و غارت کا بازار گرم ہو جاتا۔ یہاں تک کہ ان میں سب سے زیادہ قوی

اپنی حکومت منوالیتا۔ یادوتین چار برابر کے اپنی اپنی حکومتیں اور سرحدیں قائم کرا لیتے۔ اس کے معنی یہ ہوتے کہ وہ ہے اپنے اختیارات کو اکیدہ اور موجودہ بھلائی کے لیے صرف کرنے کا موقع تھا۔ وہ اس لیے خاموش ہوتا کہ تیس چالیس برس کی متواتر خونی جنگیں قائم ہوں اور مخالفتوں کا ذخیرہ برابر تقسیم ہو کر ابدالاباد تک جاری رہے۔ نہ رسول کے خلیفہ کا نظام یہ چاہ سکتا تھا کہ ایک ایسا عامل حکومت کا نائب بھجا جائے جو خلافت حق اور خلافت راستی ذرائع اپنے کو اپنی جگہ مضبوط کرنے کے لیے بے تکلفی سے وہ ذرائع اختیار کرے اخلاق اور مذہب پس پشت ڈال کر محض حکومت سامنے ہو اور اس کی حفاظت کے لیے بے تکلفی سے وہ ذرائع اختیار کیے جائیں جس سے اسلام کے بڑے اصول اخوت، مساوات، راستی، اعتبار اور محبت پر مکارانہ تدبیر کی فتنی چلتی رہی۔ لوگوں کو بے عنوانیوں کے باز پرس کی آزادی نہ رہے، اور حکومت اپنے اختیار سے ان کے منہ بند کر دے، ان پر تشدد کرے، اور مخالفت قسم کے مصیبتوں میں گرفتار کر دے۔ اس لیے کہ کسی نے حکومت کو شخصی مال نہ سمجھا کر اپنے اور حکومت کے حق اور فرائض بھنا چاہے ہوں۔ وقت تھا کہ مسلمان کسریٰ اور قحیر کے نظام سیاسی کو طنز اور نفرت کے اظہار کے لیے مثال میں لاتے تھے۔ آج اس رپور اعلیٰ ہو رہا تھا۔

لیکن محض حکومت اور اخلاق ہی کے نقطہ خیال سے ضروری نہ تھا کہ وہ لوگ شخصیں حامل نہ رہنا چاہیے تھا عامل رہ سکتے بلکہ انقلاب کی اصل غرض یہ تھی کہ جن کے خلاف شکایتیں ہیں وہ اپنی جگہ قائم نہ رہیں اور خلیفہ ثالث کو قتل یا معزول کی شرط اس لیے پیش کی گئی تھی کہ وہ قابل شکایت عمال کی کارروائیوں سے چشم پوشی کرنا چاہتے تھے۔ جناب امیر کا خاموش رہنا گویا اس کا اعلان ہوتا کہ ہم بھی اسی مصلحت کے حامل ہیں جس مصلحت کے خلاف انقلاب ہوا جو خلیفہ کے قتل پر تفتہ ہو۔ دوسرے نقطوں میں اس کے معنی یہ تھے کہ اصلاح کے خواہش مند اپنی نیکو اس وقت تک نیاں نہیں دیکھتے جب تک علی سے بھی تعفیہ نہ کر چکے ہوتے۔ اب ہر شخص کو فیصلہ کا اختیار ہے کہ جناب امیر کے لیے یہ ممکن تھا کہ وہ معاویہ، ابن ابی سرح، ولید اور سعید بن العاص وغیرہ کو اپنے ساتھ لیتے یا ان لوگوں کو جن کی تمام شکایتیں اب ملک اور قوم کی زبان پر تھیں اول الذکر کردہ کے ساتھ اخلاقی سیاسی مذہبی اور خاندانی تجربہ کے اعتبار سے کوئی امید نہ تھی۔ آخر اللہ کر گروہ نے جو کچھ کیا تھا یا جو کچھ چاہا تھا اسے یا تو لوگوں نے پسند کیا اور ساتھ دیا یا متوقف رہے۔ صحیح ہے کہ جناب امیر نے یزید کتاب اور سنت کے کوئی شرط اپنے ذمہ نہ لی تھی بلکہ یہ ایک شرط تھی جو خود ان کا عین منشا تھا اور لوگوں سے صاف صاف کہہ بھی دیا تھا کہ: ”ہمارے بابت کسی کو کوئی حق سوا اس کے نہیں ہے کہ فخر کو تم نے امارت کے لیے منتخب کیا ہے۔“ جس کے معنی یہ ہیں کہ یہ تم نہیں ہو جو مجھے مصطفیٰ مقرر کر دیا کرو گے بلکہ یہ میں ہوں جو تمہیں کسی امر کا حکم دوں گا اور تمہیں بجالانا ہو گا۔“ اور اس خیال کے ظاہر کرنے کے بعد بھی وہ یہی تعفیہ کر سکے کہ ہم ان عمال کو معزول کریں۔ بغیر اس کے کوئی دوسری مصلحت علی کی مصلحت نہیں ہو سکتی تھی۔ کسی نے اس کی مخالفت نہ کی یزید بن شعبہ کے اگرچہ بعض مؤرخین نے یہ بھی مصلحت سمجھی کہ اس کی فرہ تائید کے لیے ابن عباس کا نام بھی لیوں۔ کیا مشکل تھا ان مؤرخین کے لیے جب انھوں نے خود حسن کی زبانی اپنے مقدس باپ کو نصیحت کرا دی ہے!

مجھے اس کے بعد کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ یزید بن شعبہ نے اپنے صلاح کا بھانڈا خود چھوڑ دیا۔ کیا یہ صلاح کا پسند نہ آتا تھا کہ وہ دفعہ مکہ چلا جاتا اور پھر شام سے صفین میں آتا؟ اس سے زیادہ کوئی امر صاف نہیں ہے کہ وہ معاویہ کی

وکالت کر رہا تھا، یا بذات خود بنی امیہ کی قوت اور میمنت کا کوشاں تھا اور امید کرتا تھا کہ اگر صلاح کار گر ہو گئی تو ہم معلویہ کی فوجوں کو مدینہ کے قریب دیکھیں گے۔ اور جب دیکھا کہ علی اس دام میں گرفتار نہ ہوئے جس کے معنی معلویہ کی طرف سے ہوشیاری اور آگے حرکت کرنے کا ارادہ ہے تو اب مصیبت نہ تھی کہ وہ علی کی نگاہ کے نیچے رہتا۔

یہ حالتیں کہتی ہیں کہ کچھ لوگ باوجود اس کے کہ جناب امیر سے اچھی طرح واقف تھے اور جانتے تھے کہ ہر صلاح اور صلاح دینے والا ایسا نہ ہوگا جو ان کے خیال میں دخیل ہو سکے لیکن پھر بھی کچھ تھے جو گئے اس امید پر کہ شاید حکومت کے ترددات اور ضرورتیں علی کو اس قدر دھیلا کر دیں کہ وہ بعض ایسی روش کو گوارا کر لیں جو عدم حکومت کی حالت میں ان کے نزدیک قابل اعتراض ہوتیں اور جب دوبارہ تجربہ ہوا کہ علی کی حکومت اور نظام سیاسی اخلاق کی حدود شکن نہیں ہیں، اور انھیں اپنے نام و نمود سے پاس ہو گئی تو انھوں نے اپنے حوصلے پورا کرنے والا گمراہی و موٹہ لیا اور ڈھونڈتے رہے۔ تاریخ اپنے کو دہرا رہی تھی کہ اگر ایک مرتبہ باپ ہوتے جو لوگوں کے ان جذبات کے سہارے سے اختیار حاصل کر سکتے تو دوسری مرتبہ بیٹی ہوتی جو ایسے لوگوں کی مرکز امید ہو سکتی۔ حضرت ابوبکر کے علم کے متعریفین کے لیے حضرت عائشہ کا فوجی میلان حیرت خیز ہوگا لیکن ان کی تمام حیرت، صفات کا اثر دیکھنے والوں کی حیرت سے بڑھ نہ جائے گی جب وہ غور کریں گے کہ حضرت ابوبکر کے علم نے بنی ہاشم کے حقوق کے ساتھ جو کچھ کیا وہی حضرت عائشہ کے آج کی فوجی جوش کا باعث ہوا۔ مختلف صفات ایک نتیجہ کے لیے تھیں۔ بنی ہاشم کی بے اختیاری۔

حضرت عائشہ نے کیوں دار الخلافہ علیہ مرکز قرار دیا

میں اس لیے نہیں کہتا ہوں کہ اس پر کوئی اصرار کروں لیکن سوچتا ہوں کہ حضرت عائشہ مروان بن حکم کے استیغاثہ کے باوجود اس وقت مکہ تشریف لے گئیں جس کے چند ہی روز بعد حضرت عثمان کو سانحہ درپیش ہوا۔ یا عین اس وقت کے قریب جب سے معاشرہ کر کے والوں کا تشدد بڑھ گیا، یا معاشرہ کرنے والوں کا مہم ارادہ معلوم ہو گیا۔ اور کوئی شبہ کی گنجائش نہ رہی کہ وہ کیا چاہتے ہیں۔ طلحہ وزیر بغاوت کی کسی نہ کسی شاخ کے سالار یا ایک جڑو تھے۔ یہ حضرت عثمان کو بھی معلوم تھا۔ حضرت عائشہ اور حضرت عثمان کی آپس کی ناموافقت نہ اب بصیغہ راز تھی اور نہ صدیقہ کے فتوے نے اس کی سچائی میں کوئی شبہ باقی رکھا تھا۔ ان حالتوں میں یہ سوال آسانی سے چھینک دینے کا نہ ہوگا کہ کیا حضرت عائشہ اپنی ہی تجویز یا طلحہ وزیر کی صلاح سے ایسی جگہ گئی تھیں جہاں انھیں عثمان کے بعد اپنے آئندہ ارادوں کے نفاذ کی پوری آزادی حاصل رہے، اور انھیں مناسب قرینہ معلوم ہوا جو، یا امید ہی نہ ہو کہ لوگ علی کی طرف میلان ظاہر کریں گے اور اگر ایسا نہ ہوا تو ظاہر لوگوں میں کوئی ایسا اثر دار نہ ہوگا جیسا طلحہ وزیر اور عائشہ کی تثلیث سے متصور ہو سکتا تھا۔ اور نتیجہ یہ ہوگا کہ اس طرح اختیار ہاتھ میں آجائے گا۔ انھیں اس کے کامیابی کی اس لیے بھی امید ہوگی کہ جو کچھ انقلاب ہے وہ بنی امیہ کے خلاف ہے۔ اس لیے بنی امیہ کا کوئی ذی اثر سامنے آنے کی جرأت نہ کرے گا۔ نظر بریں جو کچھ پیش بندی کی ضرورت محسوس ہوئی ہو انھیں اپنی کامیابی کے لیے بنی ہاشم اور بنی امیہ سے کوئی بڑا خون نہ تھا۔ اور گویا وہ اپنی کامیابی کو جتنی بچتے تھے۔ در اسی قدر تھی جس قدر وقت عثمان کے قتل میں صرف ہو۔ طلحہ اور وزیر اگرچہ خود کوشاں تھے اور انھیں امید ہو سکتی تھی لیکن انھیں عائشہ کی ایسی ذی اثر ذات کے سایہ میں پناہ لینا مفید تھا، اور اس لیے

بھی ضروری تھا کہ وہ ان دونوں آدمیوں میں ہموزنی قوت قائم رکھ سکتیں۔

طلحہ اور زبیر کی اسپس کی دشواریاں تم کہو گے کہ اگر طلحہ و زبیر اور خلافت کے درمیان ٹھنڈی سانوں کا جزر و مد تھا تو انھوں نے اس وقت خلافت کیوں نہ

قبول کر لی جس وقت جناب امیرؓ نے ان کا استمراج لیا لیکن اس کی ذمہ داری کون کرتا ہے کہ طلحہ یا زبیر ایک دوسرے سے بھی یہ تعفیہ کر چکے تھے کہ ہم میں سے کوئی غلیف ہو جائے بلکہ میں یہ کہہ رہا ہوں کہ طلحہ و زبیر عائشہ کے زیر اثر ایک نظام درست کرتے جو نظام ثنوی (ڈولسٹک) کہا جاسکتا۔ آپس میں کسی کو کوئی ترجیح نہ ہوتی اور انھیں مد پر رکھنا عائشہ کا کام ہوتا۔ اس کے علاوہ کچھ اور نہ ہو سکتا۔ اس لیے کہ ان دو حضرات کے دو فرزند تھے جن میں گرم خون اور بلند حوصلہ تھا جس سے ہر تعفیہ کی موقت امید کر لی جاسکتی۔ لیکن اس پر اعتبار کر لینے کا کوئی اعتبار نہ تھا۔

جناب امیرؓ کے فرمانے کے وقت کیوں دوسرا امر یہ تھا کہ جناب امیرؓ کا بفرض حال یہ فرمانا کہ: ”اگر تم پسند کرتے ہو تو میں تمہارے ہاتھ پر

بیعت کروں۔“ ان کا ایک ذاتی اعلان تھا اس کے بعد یہ لوگوں کی خواہش ہوتی کہ وہ بھی ان میں سے کسی کو پسند

کرتے یا نہ کرتے، یا باوجود ان کی پسند کے علیٰ ہی سے خلافت قبول کرنے کی استدعا کرتے۔ طلحہ و زبیر نے علیؓ کے ایسا فرمانے پر اپنے اعلان پسند کی سبقت نہ کہ اس لیے کہ وہ لوگوں کے موج خیز میلان کو علیؓ کی طرف دیکھ رہے تھے اور یہ محض بشرہ اور دل میں نہ تھا بلکہ صداقتی جو ایک بڑے دور میں سنائی دیکھا جاتی تھی۔ مجھے کوئی شبہ نہیں کہ ان کی بیعت خوشی سے نہ تھی لیکن میں حسن کے خیال کو دہراتا چاہتا ہوں کہ حکم شرع ظاہر پر ہے۔ وہ اپنے اقرار بیعت کے ذمہ دار تھے اور یہ تو کہنا ہی نہیں ہے کہ اگر طلحہ و زبیر کو علیؓ کی بیعت سے اکراہ تھا تو کس وجہ اور کس کی طرف رغبت کے لحاظ سے۔

ان اتفاقات میں انھیں بجز اس فوری حل کے کوئی چارہ نہ تھا کہ یہ دیکھتے کہ ہم امور خلافت میں کس درجہ دخل ہو سکتے ہیں دراصل انھیں اپنی اندرونی فکروں سے کوئی روک نہیں سکتا تھا۔

کچھ تجا جس سے زینب بنت ابونہیان یہ کہہ سکتی کہ: ”طلحہ و زبیر نے عثمان کے قتل میں کوشش کی اور فتنہ مکڑا کیا۔ اگر آج علیؓ کی بیعت کی ہے تو اس کی کوئی اصل نہیں ہے۔ آخر میں مخالفت کریں گے۔ ظہر میں دوست اور باطن میں دشمن ہیں۔“ یہ لطیفہ نہیں ہے کہ ان کا دل اپنے کو اس درجہ ظاہر کر چکا تھا کہ بے شعور دلت بھی فتنہ چڑھانے کی کوشش کرتا۔ تجربہ ہوا۔ دیکھا کہ علیؓ کو ان کے اس اعلان سے کہ: ”میل و محاباز من واقع نہ شود۔“ اور ”میان شما ترجیح نہ نم۔“ ہٹا نہیں سکتے ہیں تو اب اپنی دل کی دہلی ہوئی آگ کو فرو کرنا ممکن معلوم نہ ہوا۔ نہ اس کے قبل کہ طلحہ و زبیر کو فہ کی حکومت کے خواستگار ہو چکے ہوتے۔ عالم سیاسیات کا اقتضایہ نہیں ہے کہ چیزیں اپنی ظاہری صورت میں قبول کر لی جائیں۔ یا اعلان اپنے الفاظ کے اعتبار اور شکل سے قابل وثوق ہو جائیں۔ اس میں اعتبار سب سے آخر چیز ہوا کرتی ہے۔ بلکہ ظاہری صورت کی جگہ اس کی نہ اعلان کی جگہ غرض اور نیت الفاظ کی جگہ عمل اور اس کا اثر دیکھا جاتا ہے اور گزشتہ یا آئندہ قرآن کا وزن کیا جاتا ہے۔ سیاق اور سباق پر متلاشی۔ چھاتی ہوئی نظر چھوٹی جاتی ہے۔ اور اس کے بعد حکومت کی

کشتی کھینچنے والے کا دم اسے اس طرف لے جاتا ہے۔ ہر امر اسے طوفان کا سب سے کم قرینہ اور اپنے تجویز کے محفوظ اور مفید مقام پر اتار دینے کا یقین ہوتا ہے۔

حکومت کو اس کا مشکور ہونا چاہیے تھا کہ طلحہ وزیر نے اس لیے بصرہ اور کوفہ جانے کی خواہش کی کہ: ”لوگوں کے منتشر خیالات کو جمع کریں۔“ اور جناب امیر نے بعض مؤرخین کے موافق یہ فرمایا کہ: ”تمہارا میرے پاس رہنا مناسب ہے۔“ کیا اس لیے کہ انھیں تسکین ہوئی اور مشکل امور میں ان کی صلاح لیتے۔ نہیں۔ صلاح قبول کی جانے کے لیے بھی ضروری نہیں ہے کہ صلاح دینے والا بڑا کچھ دار ہو، بلکہ کوئی صلاح قابل عمل نہیں ہے، جب تک کسی مخصوص صلاح کے متعلق صلاح لینے والے کو اعتبار نہ ہو۔ کیا یہ موقع تھا کہ جناب امیر اس صلاح کو قبول کرتے؟ کیا جناب امیر نے کوئی صلاح طلب کی تھی؟ نہیں۔ بلکہ بصرہ اور کوفہ کے ”منتشر خیالات“ ہی قابل سوال تھے۔ بصرہ پر جناب امیر کا جاہل قابض ہو چکا تھا اور اسے کوئی حکایت نہ تھی۔ کوفہ میں ابو موسیٰ بیعت کر چکا تھا اور اگرچہ جناب امیر کو اس کی طرف سے اطمینان نہ تھا لیکن ساتھ ہی یہ بھی معلوم تھا کہ اہل کوفہ زیادہ تر ہمارے مفید حقوق ہیں۔ یہ جناب امیر کے سمجھنے اور دیکھنے کی بات تھی کہ وہ کوفہ کے ساتھ کیا کریں گے۔ اور کس طرح اپنا اطمینان کریں گے۔ اور یہ بھی ذکر کیا گیا کہ جب بغیر اطمینان کیے ہوئے آگے بڑھنا قرین مصلحت نہ نظر آیا تو جناب امیر نے مسلسل کوشش سے اس وقت تک ہاتھ نہ اٹھایا جب تک انھیں کامیابی نہ ہوئی۔ یہ کامیابی فوجی ذرائع سے نہ تھی، بلکہ خالص سیاسی تھی۔ پھر کیا تھا کہ اب طلحہ وزیر ان دونوں مقامات پر جا رہے تھے۔ اس لیے کہ انھیں امید تھی۔ ایک جگہ ابو موسیٰ تھا جسے اپنا ہم خیال اور ہم عمل بنا سکتے تھے اور اس کے علاوہ بہتے ہوئے دریا میں پرند جانوروں کے بیٹھ جانے کے لیے بہت سی لاشیں مل جاتی ہیں۔ عبداللہ بن عامر ابھی چند روز ہوئے تھے کہ بصرہ سے بھاگا تھا۔ وہاں بھی۔۔۔۔۔ تھا اور راز تو یہاں تک ظاہر تھا کہ یہ حضرات ابن عامر کے بھاگ آنے پر یہ کہہ سکتے کہ تو نے جلد چلے آنے میں غلطی کی۔ تھے ہمارے آنے تک انتظار کرنا چاہیے تھا! اب یہ سوچنے کی بات ہے کہ کیا علی یا ان کے موقع پر کسی دوسرے مدبر کا یہ موقع تھا کہ وہ انھیں ان کے امن اور صلح کے الفاظ کا شکر یہ ادا کر کے روانہ کر دیتا اور اس کا انتظار رہتا کہ قصص امن یا حکومت کے خلاف فساد کی خبر آتی اور اس کے بعد نہ صرف معلوم کی فکر ہوتی بلکہ بصرہ اور کوفہ کے ایسے دو مفید مقامات بھی قبضہ سے نکل جاتے۔ بفرض حال طلحہ وزیر نہایت نیک نیتی سے صلاح دے رہے تھے۔ اور یہ سب غلط کہ جناب امیر ان کے دلی راز سے واقف تھے اور جب انھوں نے مکہ جانے کی اجازت چاہی اور جناب امیر نے ساری باتیں کھول کر رکھ دی تو انھوں نے سر جھکا لیا لیکن سوال تو یہ ہے کہ صلاح کے قبول نہ کیے جانے پر انھیں مدینہ رہنا کیوں ناگوار ہو گیا۔ یہی نہیں بلکہ آئندہ کے الزامات گھڑنے کے لیے آمادہ ہوئے۔ اگر پہلی غرض یہ تھی کہ علی کو راہ سے ہٹا دی اور جب اس میں کامیابی نہ ہوئی تو اس کے عکس یعنی لوگوں پر ہاتھ صاف کرنے کا ارادہ کیا اور دنیا کو اس کا کافی تجربہ ہے کہ جم غفیر پر قبضہ کر لینا خصوصاً ایسے ذرائع سے کوئی مشکل بات نہیں ہے۔ دونوں کا نتیجہ ایک تھا۔ یادوؤں چالیں ایک ہی نتیجہ کے لیے تھیں۔

مدبرین کے نزدیک یہ ہمیشہ ناقابل معافی گناہ رہا ہے کہ ان کی مصلحت اور اس کی غرض کو وہ کیوں سمجھے جن پر رہا کی گئی تھی اور اس کے اہر انک سخت اعتیلا کرتے ہیں اور اس کے بعد طرح طرح کے عذرات سے جوابل پیدا کرتے ہیں،

یہاں تک کہ ان کی مصلحت اپنے مرکز پر پختہ جاتی ہے اور ڈھانک لیتی ہے۔ کیسے جملہ معلوم ہوتا طلحہ وزیر کو جب وہ نہ مرنے دیکھتے بلکہ جناب امیر کو فرماتے ہوئے بھی سنتے کہ: ”میں وہ کھنڈار (ایک جانور) نہیں ہوں جو دیر تک مٹیاد کے آہستہ آہستہ زمین پر لکڑی مارنے سے سو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کا طالب اس تک پہنچ جاتا ہے اور اس کا منتظر اسے دھوکا دیتا ہے۔

شاید ہم میں سے بعض یہ خیال کریں کہ اصحابِ عمل میں دفعہ کیسے یہ ہم آہنگی پیدا ہو گئی کہ وہ سب کے سب مکہ میں جمع ہو جاتے اور وہ کرتے جو کچھ کیا۔ ضرور ان میں آگے بچھے جمع ہو جانے کی ہم آہنگی پیدا ہوئی۔ لیکن ان کی یہ ہم آہنگی کہ وہ اس غرض کے لیے جمع ہو جاتے جس کے لیے جمع ہونے کوئی فوری انقلاب طبیعت نہ تھا۔ جس کی تاریخ نہ صرف ہم واضح کرتے رہے بلکہ واقعات کے قریب قریب یکساں نوعیت کی تکرار نے اسے اچھی طرح ذہن نشین کر دیا۔ یہ کچھ نہ تھا مگر یہ کہ واقعات کا نشو و نما بچے اس وقت ان لوگوں کا جمع ہونا حیرت میں نہیں ڈال سکتا جب کہ بچے رسول کی رحلت کے بعد ہی ماکنہ اختیار سے لدی ہوئی صورتیں رسول کے گھر کا معاشرہ کیے ہوئے دکھائی دیتی ہیں۔ اور جب یہ لوگ اس طرح مریکا دن کو رات کہنے پر آمادہ تھے تو کیا غم تھا کہ کوئی یہ کہتا کہ ”رسول کو یہ زیادہ گوارا ہوتا کہ عثمان قتل ہو جاتے بہ نسبت اس کے کہ تم اس طرح باہر آہیں۔“ یا یہ کہ ”تم نے اپنی بیسیوں کو پس پردہ بٹھایا ہے اور زوجہ رسول کو اس طرح لیے پھرتے ہو۔“ اس وقت تک نوانی بے حجابی غیرت سے اس درجہ بلند نہ ہو گئی تھی کہ اس کے بہت سے حامی ہوتے۔ شاید یہ بے حجابی موقت ہو اور منافع ایسے واضح ہوں جس پر غیرت قربان کی جاسکتی ہو۔

حضرت حفصہ کو ابن عمر کے روکنے کے اسباب کوئی حیرت کی جگہ نہیں ہے اگر حضرت حفصہ نے حضرت عائشہ کی ہمراہی گوارا کی

اور اسی طرح اس میں بھی کوئی عجب کی بات نہیں ہے کہ حشام سلمہ نے حشامی کا ساتھ دیا۔ کیسے صاف ہوتا کہ حیات رسول میں بعض ازواج کا ایک گروہ تھا اور بعض کا دوسرا۔ جس میں یہ کہا جا چکا کہ حشام سلمہ اور حفصہ ایک طرف تھیں اور حشام سلمہ دوسری طرف۔ اور صورتِ معاملہ جو ہو رہی تھی اس سے حشام سلمہ اور حفصہ کا اپنے اپنے باپ کو مفید حال کا مطلع کرنا اور اپنے موقع کے لحاظ سے ان کی کامیابی پر اثر ڈالنا بعید نہ تھا۔ یہ واقعہ ہے کہ عبداللہ بن عمر نے انہی بہن کو روکا۔ اس کا تصفیہ کر سنا کہ اس سے ان کی کیا غرض تھی کسی قدر مشکل ہے۔ لیکن یہ امر واضح ہے کہ کسی طرح ابن عمر کو مساوی یا اولیٰ نصیب کی امید نہیں ہو سکتی تھی۔ اس لیے کہ خون عثمان کے بہانہ سے انتقام لینے کی صلاح میں ابن عمر کا کوئی ہاتھ نہ تھا بلکہ مصلحت گزرنے والا گردہ جنسِ موقع کے تقدس کے اضافہ کے لیے حشام سلمہ کو بھی ساتھ لے لینا چاہتا تھا۔ انہیں معلوم تھا کہ یہ کون کون لوگ ہیں اور انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ طلحہ وزیر اور عائشہ میں جو ایک دوسرے کا لحاظ ہے اس میں ہمیں یا ہماری بہن کی شرکت کو کوئی امتیاز نہیں دیا جاسکتا۔ انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ طلحہ وہ شخص ہیں جنہوں نے میرے باپ کی نامزدگی پر ہذرہ کیا اور انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ ہمارے باپ قریش میں ایسے مقبول نہ تھے کہ اب کسی سہلے کی امید کی جائے۔ وہ اس سے بھی واقف تھے کہ اپنے دورانِ خلافت میں میرے باپ کی سخت دیکھ بچال یا بے اعتباری نے اکثر صاحب اثر لوگوں کو جو ان کے وقت میں معزول ہونے ان کی طرف سے کبیدہ کیا۔ ان خیالات کے باوجود میں اسے بھول نہیں جاتا کہ ابن عمر گوشہ نشین اور طلبہ

مشہور تھے اور ممکن ہے کہ انہوں نے ایسی شور انگیزی میں اپنی بہن کی شرکت سے احتیاط کی ہو۔ میں یہ بھی کہہ سکتا ہوں کہ انہیں اصحابِ جل کی اس کوشش کے عدم حقیقت کا یقین تھا جو ان کے بعد کے اس خیال سے ظاہر ہے، جسے میں ”سیرۃ الفاروق“ میں پاتا ہوں کہ: ”اپنے مرنے کے قریب کہا کرتے تھے کہ میں اپنی زندگی میں کوئی چیز ایسی نہیں پاتا جس پر افسوس کروں، اور اب اس کے کھنکے کا موقع نہ رہا ہو یزاس کے کہ حضرت علیؑ کے ساتھ مل کر باغی گروہ سے لڑائی نہ کی۔“

صور حال کے متعلق جناب امیر کے خطبہ کا حوالہ تمام تاریخوں اور روایات و حدیث کی کتابوں میں جناب امیرؑ کے وہ جواب لکھے

ہیں جو انہوں نے اپنے متعلق الزام پر دیے ہیں۔ میں نے اسے انکار میں کافی حد تک نفع البلاغہ سے نوٹ کیا ہے۔ جناب امیرؑ کہیں اہل مدینہ کو بچ بناتے ہیں۔ ہمیں طلحہ و زبیر کے حوصلہ حکومت کا ذکر فرماتے ہیں۔ کہیں طالبانِ خون عثمان سے اس مسئلہ کے متعلق مختلف جماعتوں کے خیال بتاتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ ایسے کام نہ کرنا جس سے قوت متزلزل ہو جائے۔ امید دلاتے ہیں کہ میں محرابِ امر خلافت سے اس طرح متنک کروں گا جس سے یہ عجم و استوار ہو جائے اور جب کوئی چارہ کار نظر نہ آئے گا تو پھر آخرش درد کی دوا داغ ہے۔

مخالفین کی حرکات پر صبر کا وعدہ فرمایا ہے جب تک موافق جماعت کے ضرر کا اندیشہ نہ ہو۔ کہتے ہیں کہ اس جماعت نے احکامِ اسلام کو اس کے پشت سر کی طرف لوٹانے کا ارادہ کیا ہے۔ اب تمہیں لازم ہے کہ کتابِ خدا و سنت رسولؐ کے ساتھ ہمارے طریقہ پر عمل کرو۔ رسولؐ کے حق کو قائم کرو۔ اس کی شریعت کو بلند و برتر بنو۔ فرماتے ہیں کہ طلحہ طلب خون عثمان سے لوگوں کو مغلطہ میں ڈال رہے ہیں کہ بلحاظ اس سرگرمی کے جو ان سے مخالفت عثمان میں ظاہر ہو چکی ان سے مطالبہ خون عثمان نہ کیا جائے۔

کون خلیفہ ہوتا اگر حضرت عائشہ کو فتح ہوتی باوجود اس کے کہ جناب امیرؑ نے منصفانہ طریقہ سے ان لوگوں کو فکلمانِ عثمان کا تصفیہ کرنے کے لیے

مقرر کیا جو کسی طرف شریک نہ تھے لیکن اگر ایسا ہی ہوتا اور مدینہ کے لوگ حکم بن کر تصفیہ کر دیتے تو آئندہ طلحہ و زبیر کے لیے آگے بڑھنے اور ہاتھ پاؤں مارنے کی کوئی سبیل رہ جاتی۔ جناب امیرؑ جانتے تھے لیکن چونکہ غلط فہمیوں کے جواب کی ضرورت تھی اس لیے کہ بقول مؤلف ”تاریخ الاسلام“: ”لوگ واقعات سے واقف نہ تھے اس (معاویہ) کا یہ کہنا کہ علیؑ فکلمانِ عثمان کے سردار ہیں اثر کر جاتا تھا۔“ جناب امیرؑ بھی اس زہریلے الزام کو حتی الوسع صاف کر دیتے تھے۔ جناب امیرؑ کا یہ فرمانا کہ: ”ان دونوں میں سے ہر ایک اپنی امارت کی امید رکھتا ہے۔“ یہ بھی ایسا صاف نہیں ہوا جیسا اس وقت جب کہ امامتِ نماز کا سوال درمیان میں آیا اور صورتِ معاملہ یہاں تک پہنچی کہ حضرت عائشہ کی ذات کو یہ کہہ کر دخل کی ضرورت محسوس ہوئی کہ کیا: ”ہمارے کام کو درہم برہم کیا چاہتے ہو۔“ اور یقیناً یہ کہنا بھی لفظِ لفظ پورا ہوتا اگر خدا نخواستہ اس کا موقع آتا کہ: ”اگر یہ اس چیز تک پہنچ جائیں جس کا یہ ارادہ کر رہے ہیں تو بے شک ان میں سے ہر ایک دوسرے کی جان لے لے۔“ واقعات نے صاف کر دیا کہ حضرت عائشہ کو ابنِ زبیر کی زیادہ محبت تھی اور اس سے بشرطِ کامیابی یہ نتیجہ اُمید کرنا مشکل نہ تھا کہ کون خلیفہ بنایا جاتا۔ اگرچہ بعض مؤرخین نے یہ بھی لکھا ہے کہ امامتِ نماز کے لیے

ایک دن طلحہ اور دوسرے دن زبیر کو مقرر کیا گیا میں سوچ سکتا ہوں کہ یہ محض امامت نماز تھی جس کے سلیے یہ اہتمام جائز رکھا گیا؟ اور کیا کسی کا یہ نماز پڑھنا تھا جس سے ”کام در ہم و بر ہم“ ہو سکتا نہیں۔ بلکہ اپنے پیشرو کے ایک خود ساختہ اصول کے اثر سے فائدہ اٹھایا جاتا تھا کہ غلیفہ وہ ہو گا جو امامت نماز کرے۔ میں نہیں تصفیہ کر سکتا کہ ”اگر یہ مسلمہ اصول تھا تو آگے چل کر ولید ثانی کی بی بی کیونکر غلیفہ نہیں ہو سکتی تھی؟“

کیا قاتلین عثمان سے انتقام لینا ممکن تھا

متعلق صاحب سیرۃ الفاروق تصانیف احمدیہ جلد اول سے یہ عبارت نقل فرماتے ہیں کہ: ”حضرت علی رضی اللہ عنہ ایک جب خلافت پہنچی تو ایسی ابرو و غراب ہو گئی تھی جس کا درست ہونا اگر ناممکن نہ تھا تو قریب قریب ناممکن تھا۔“ آپا کسی طرح یہ قرین حقل تھا کہ جناب امیرؓ کسی بڑے پیمانہ پر قاتلان عثمان کی نقیش کر سکتے؟ جب کہ یہ ہر ایک کو معلوم تھا کہ صوبے، قبیلے، شہر وں اور خود مدینہ کے لوگ عثمان کے قتل کے عرک اور مقید تھے۔ کیا یہ ممکن تھا کہ جناب امیرؓ ایسی مشتہر حالت میں طلحہ زبیر اور عائشہ سے قاتلین عثمان کی فہرست طلب کرتے اور ان لوگوں کو جن کے نام لکھے ہوں ایک ایک کر کے قتل کرنا شروع کرتے؟ دراصل ایک اس فہرست میں طلحہ و زبیر کا نام نہ ہوتا۔ کیا یہ ممکن تھا کہ طلحہ و زبیر جو جناب امیرؓ کے نزدیک شریک شورش تھے جناب امیرؓ کی طلب پر کہ تم بھی ان لوگوں میں ہو جو سختی سزا ہیں اپنے کو امیر المومنینؓ کے حوالہ کر دیتے کہ قانون اور انصاف ہم پر جاری کیا جائے؟ کیا کسی حاکم کی مصلحت اس کی مقتضی ہے کہ وہ ایسے شہم حقل کے لیے آلاہ ہو جائے دراصل ایک اس کی رعایا میں سے چند اس سے انصاف نہیں چاہتے نہ استغاثہ کرتے ہیں، بلکہ بہ لوگوں شمشیر اپنے شرائط کھواتے ہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہو کہ ان کی خواہش پوری کرنے پر بھی ان کی اطاعت کی کوئی امید نہ ہو اور دوسرے طرف وہ جو بغیر تحقیقات کے مستوجب سزا ٹھہرے اپنے حق میں یہ نا انصافی دیکھ کر خود بھی انصاف کو اپنے ہاتھ میں لے لیں اور اس طرح حکومت دو بظاہر کے درمیان کر دیں بدلے؟ بلکہ حقل، انصاف اور مصلحت کا تقاضا اس سے بہتر نہیں ہو سکتا جیسا جناب امیرؓ نے فرمایا کہ: ”عثمان کے لڑکوں کو پہلے میری بیعت کرنی چاہیے اس کے بعد جس پر انھیں دعویٰ ہو پیش کریں کہ موافق انصاف شریعت کا حکم نافذ کیا جائے۔“

کون پیش کیا جاسکتا جب کہ خود نائلہ کو کوئی معلوم نہ تھا۔ انھیں تو انتقام چاہیے تھا۔ اس سے کیا بحث تھی کہ علیؓ اسے ”زمانہ جاہلیت کے جاہلوں کا کام“ سمجھتے، اور چاہتے کہ لوگ مطلق العنانی چھوڑ کر حکومت سے تصفیہ کی خواہش کریں۔ نہ ان لوگوں کو اس معاملہ کو اس وسعت سے دیکھنے کی ضرورت تھی جس ذمہ دارانہ حیثیت کے لحاظ سے امیر المومنینؓ کا عہدہ قرار ہے تھے کہ تم انتقام کا حل چارہ ہے ہو۔ دوسرا فرقہ انھیں واجب القتل سمجھتا تھا۔ تیسرا متوقف ہے اور انتقام کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ نہ انھیں اس انتظار میں کوئی فائدہ نظر آتا تھا کہ: ”دل اور رائیں اپنے مقام پر قائم ہو جائیں پھر حقوق آسانی سے لیے جاسکیں گے۔“ کیا نتیجہ ہوتا اس کا بجز اس کے کہ قاتلان عثمان قتل کیے جاتے۔ بس۔ اور پھر؟ علیؓ غلیفہ ہو جائیں؟۔۔۔ قتل ہونے کے لیے بہت سے مسلمان ملتے ہیں!

کس نے علیؓ کو وقت دیا۔ کس نے ان کی تائید کی اور کون اس تلخ صبر کے قابل ٹھہرا جو بیعت کر لینے کے شوق اور

جوش کے بعد اس ہوش کو اپنے سامنے رکھتا کہ بیعت کے معنی یہ بھی ہیں کہ ہم اس راہ پر چلیں جس پر ہم چلنے جاتے ہیں۔ راہ خشک تھی۔ لیکن انھیں پتہ کی طرح سخت بنانے والی تھی۔ عادتیں جس طرح بگڑ گئی تھی ان کے بعد اس پر چلنا اور بھی دشوار ہو گیا تھا۔ لوگ تھرا گئے، قدم ثابت نہ رہے۔ یعنی یہ لوگ تھے جنہوں نے اپنے کو ناکامیاب کیا۔ نہ وہ جو انھیں کامیابی کی طرف لے جا رہا تھا۔ وہ تو اپنی مصلحت کی ناکامی کا اس وقت ذمہ دار ہو تا جس وقت لوگ اس کی خواہش پر چلتے اور ناکامیاب ہوتے۔ واقعات کہتے ہیں کہ یہ علی کی مصلحت نہ تھی جو ناکامیاب ہوئی، بلکہ لوگوں کی عدم اطاعت اور سہلی تھی جو ناکامی پر مصر ہوئی۔ انھیں ابتدا کی تھوڑی سی تکلیف جو آزادی اور اختیار کی طرف لے جاتی تھی معلوم نہ ہوئی اور وہ غلامی پر غم کے بل گرے۔

نتیجہ کی تنبیہ جناب امیر نے انھیں قبل اس کے کہ کوئی واقعہ ہو تا پیشتر سے تمام نتائج سے مطلع کر دیا، اور اس طرح وہ اپنے تمام منہ انصاف سے سبکدوش ہو گئے جیسے ہم آگے ذکر کر رہے ہیں۔ بیان کیے جانے والے واقعات جناب امیر کے اس فرمانے اور طرز عمل کا ثبوت ہوں گے کہ: ”جب کوئی چارہ نہ ہو گا تو پھر آغوش درد کی دوا داغ ہے۔“ یا ”میں ابھی ان لوگوں کی حرکت پر صبر کرتا ہوں جب تک تمہاری جمعیت کو ضرر پہنچنے کا خوف مجھے لاحق نہ ہو۔“ اور یہ بھی بغیر منہ سامنے نہ رہ سکتے تھے کہ مخالفین کے منہ عقل اور بے جا نہ سے مسلمانوں کے کاموں کا انتظام بگڑ جائے گا۔ اور ان لوگوں کے طرز عمل کے لحاظ سے اور کیا نتیجہ نکلا جاسکتا تھا اگر یہ کہ: ”اس جماعت نے احکام اسلام کو اس کے پشت سر کی طرف لوٹانے کا ارادہ کیا ہے۔“

چونک اٹھنے میں ایک طویل زمانہ کی تاریخ مضمر ہے چونک اٹھے جو اسے خلافت امید امر بھٹا جو کہ حضرت ام المومنین لے قتل عثمان کی خبر بغیر کسی جذبہ کے سنی اور جب معلومات میں اس سے اضافہ ہوا کہ ”اور علی خلیفہ ہوئے۔“ تو زبان نے یہ الفاظ اور فقرہ مرتب کر لیا کہ ”کاش آسمان پھٹ پڑتا کہ یہ برادری نہ دیکھتے۔“ طبعاً حضرت عائشہ کا چونک اٹھنا فطری تھا لیکن ان کا چونک اٹھنا واقعات کی شرح بھی تھی کہ اب جناب امیر کا خلیفہ رشول ہو تا اس قدر بعید از قیاس ہو گیا تھا کہ حیرت اور عجب کے اسناد کے لیے کوئی ارادہ احتیاطاً بھی پیشتر سے موجود نہ ہوتا کہ کاموں کا مددگار ہو گیا۔ مکہ بنی امیہ کا مرکز ہو گیا اور سامان کی درستی کے لیے یحییٰ بن نبیہ چھ لاکھ دینار لے آیا۔

مخالفت کے عناصر کا اندازہ جناب امیر نے اصحاب غل کی اصلی قوت کا نہایت صحیح اندازہ کیا تھا جہاں وہ خمار ہے تھے کہ محل کے حقیقی عنصر طلحہ زہرہ عائشہ اور یحییٰ بن نبیہ ہیں جس میں ایک پر تشنہ مدبر، دوسرا بہادر سپاہی، تیسرا مرکز قہر اس اور چوتھا مالی تائید ہے۔ اور جب یہ باتیں جو فوجی آراستگی کے لیے مفید اور ضروری ہو سکتی تھیں موجود تھیں تو کون امر اس اعلان سے مانع تھا کہ: ”جو شخص اسلام کی ہمدردی کرنا اور خون عثمان کا بدلہ لینا چاہتا ہو اور اس کے پاس سواری نہ ہو وہ آئے اس کو سواری دی جائے گی۔“

ہم نہیں کہہ سکتے کہ کوئی مدبر ایسی ”اسلام کی ہمدردی“ کا اور کیا عملی ترجمہ کر سکتا ہے یہ اس کے کہ ہمیں صاحب اختیار بنانے کے لیے اپنی جائیں دور اور علی بن ابی طالب کو اختیار سے ہٹا دو سواری دینے کے لیے ہم تیار ہیں اور پھر

ہم کا سب ہوئے تو کبھی تمہاری گردن کو یہ شکایت نہ ہوگی کہ اس پر بوجھ نہیں ہے۔ اسے کون دکھاتا؟

اصحابِ حمل اور بنی امیہ میں رد و بدل **عمر بن جل کے لیے تھوڑی دیر سوچنے کی بات پیدا ہو گئی تھی جس وقت سعید بن العاص نے ان سے سوال کیا کہ:**

”اگر تم فتح مند ہو گئے تو کس کو صاحب الامر بناؤ گے۔“ اب تک طلحہ و زبیر جو سوال کا مطلب نہ سمجھے تھے اطمینان سے کہنے لگے کہ: ”ہم دونوں میں سے جس کو لوگ منتخب کریں گے۔“ اور یہ سن کر سعید نے ایک بد مزہ تجویز پیش کی کہ ”نہیں۔ بلکہ عثمان کے لڑکے کو حکومت دینا۔“ اور تائید اس سے کی کہ: ”کیونکہ تم خون عثمان کا معاملہ لینے کو نکلے ہو۔“ طلحہ و زبیر نے جواب دیا کہ: ”یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اکابر و شیوخ مہاجرین کو چھوڑ کر ان لڑکوں کو حاکم بنائیں۔“ ہم نہیں جانتے کہ ان کا یہ جواب سن کر کسی بوڑھے بدری صحابی نے ابو قحافہ کے لفظوں میں یہ خیال ظاہر کیا تھا یا نہیں کہ: ”اگر بزرگی سن سے کوئی غلیف ہو سکتا ہے تو ہم کیوں نہ ہوں۔“ اور سعید نے جواب دیا کہ: ”ایسی حالت میں میں کوشش نہ کر سکوں گا۔“ اور یہ کہہ کر مع عبد اللہ بن خالد اور مغیرہ بن شعبہ کے الگ ہو گئے۔ اور پھر شام۔ کیا یہ اس کی ایک مثال نہ تھی کہ ہر مضبوط گردہ اور اس کے افراد میں یہ خود غرضانہ خیال مضمحل تھا کہ: ”ہم کیوں نہ ہوں“ بنی امیہ اب وہ بنی امیہ نہ تھے جنہیں تھوڑی سی لالچ موافق بنائے رہتی۔ اب معاویہ اپنے اختیار سے شام کا معاملہ تھا۔ بنو امیہ کی نوآبادی اس کی معین تھی اور سلطنت اور اس کے اختیارات کو قوی حیثیت سے بچانے پر مستعد تھی۔

اصحابِ حمل کی فتح بنو امیہ سے جنگ کا مقدمہ ہوتی **یہ واقعہ ہے کہ اصحابِ حمل نے شام کو اپنا مرکز نہیں بنایا، بلکہ**

اپنے لیے ایک دوسرا میدان تلاش کیا، اور کچھ تھا کہ ان لوگوں نے یا تو معاویہ سے مدد طلب نہ کی یا معاویہ نے ان کی طلب پر انہیں کھرا جواب دیا، اور یہ خاموش ہو رہے۔ اب کیا یہ سوچا جاسکتا ہے کہ اگر طلحہ و زبیر کو فتح ہوئی تو یہ ابن سفلان کو اپنے ماتحت بنانے کی کوشش نہ کرتے یا اسے معزول نہ کرتے، یا مدد نہ کرنے کی سزا نہ دیتے۔ بنی امیہ اور ان کے حوصلے اب اس سے کہیں بڑھ گئے تھے کہ وہ حضرت عائشہ یا طلحہ و زبیر کی صاحب الامری گوارا کرتے وہ علی سے اپنے اختیارات کے لیے لڑے، وہ طلحہ و زبیر سے لڑتے اگر یہ صاحب اختیار ہوتے۔

سامانوں کی درستی کے بعد اڈنٹ اپنے عالم پسند خوش رفتاری سے آگے بصرہ کی جانب بڑھا

جناب امیر کے آمد کی خبر نے اس اصلاح پسند لشکر کو تھوڑی دیر کے لیے انتقام خون عثمان بھلا دیا، اور بصرہ پہنچنے کی جلدی کی گئی۔ اخف بن قیس کے ایسے بہادر کچہ دار اور تجربہ کار افسر کو ملانے کی کوشش کی گئی لیکن اگلے تھن عہد کا الزام سنا پڑا۔

اصحابِ حمل نے وہ طریقہ اختیار کیا جو رومی یہود کے ساتھ کرتے تھے **عثمان بن ضیف کا ایسا مقدس**

صحابی جو عائشہ کے لشکر کشی کی خبر سن کر ایسا موافق واقعہ پر مغرور کہہ سکتا تھا کہ اب ”اسلام کی چٹی چٹی“ اس سے امید نہیں کی جاسکتی تھی کہ وہ کوئی ایسی روش اختیار کرے جس میں قوی مضرت کا شائبہ پایا جائے اور اس نے نہایت صحیح تصفیہ

کیا کہ: ”میں ان کو روکوں گا، تا آنکہ امیر المومنین آئیں۔“ لیکن اس لشکر کے فاتحانہ حوصلوں کو اس میں کامیابی کی صورت زیادہ نظر آئی کہ کسی مقامی عامل اور اس کی موجودہ فوج سے لڑنا آسان ہے بہ نسبت اس کے کہ انتظار کے بعد فوجیں اس کی مدد کو آجائیں۔ جنگ ہوئی عثمان بن حنیف نے شہر کی حفاظت اور اپنی ذمہ داری کے فرض کو خوب ادا کیا۔ یہاں تک کہ فتح لشکر نے بھی امیر المومنین کے آنے تک ہتھیار روک رکھنا گوارا کیا۔ لیکن یہ عہد صرف دھوکا دینے کے لیے تھا۔ اور جس وقت کہ بوڑھا صاحبی عشرہ بنو قریظہ کے دواصلب اور ایک ام المومنین کے قتل پر ایک مسلمان کے یقین کے ساتھ مطمئن ہو کر مسجد میں خدا کی عبادت کر رہا تھا یہ لوگ روم کے سپاہیوں کے طرز عمل کو اختیار کر رہے تھے۔ جو اس کے منتظر رہتے تھے کہ یہودیوں کی عبادت میں مشغول ہوں تو ہم حملہ کریں۔ شاید یہ پہلا موقع تھا کہ خانہ خدا میں مسلمانوں نے مسلمانوں کا خون بہایا۔ مسجد میں خدا کا بزرگ نام بلند نہیں کیا گیا بلکہ ”تکواروں کی جھنکار سے مسجد گونج اٹھی۔“ کیا عجب ہے کہ قتل کے جوش اور خوشی میں ”اللہ اکبر“ فتح سے نکل گیا جو کون تھا جو عبرت سے کہتا: آئندہ ذکر کیا جائے گا جس سے بڑھ کر کسی بڑے موقع پر تکبیر نہیں کہی گئی۔ اور سب جانتے ہیں کہ عثمان بن حنیف کس کے حکم سے کس سزا کا مستوجب ٹھہرا۔ اور پھر فاتحانہ داخلہ کے بعد طلحہ نے خطبہ کہا اور معاملہ عثمان میں اپنی برامت کی کوشش کرنی چاہی تو کسی نے صاف منہ پر کہہ دیا کہ: ”ہمارے پاس تو تمہارے خطوط اس کے خلاف آتے تھے۔“ کیا مشکل تھا کہ یہ حق کر زہر جواب دیتے کہ: ”ہم نے یقیناً ایسے خطوط نہ لکھے ہوں گے۔“ اقرار کرنا موجودہ موقع کے خلاف بلکہ مضر ہو تا۔ یہ مذہب کے سایہ میں اس وقت نہ تھے مدبر تھے۔ اس وقت سیاسی اخلاق پر عمل کرنا پڑ گیا تھا۔

جناب امیر حلقہ جنگ کو وسعت نہ دینا چاہتے تھے میں نہیں کہہ سکتا کہ کیوں لیکن غالباً جنگ اور اس کے نتائج کو وسعت نہ دینے کا

خیال تھا کہ امیر المومنین نے قبیلہ طے، اسد اور بکر بن وائل کی شرکت جنگ کی خواہش کو منظور نہ فرمایا۔ اور اسی طرح اخف بن قیس کے متوقف رہنے اور لوگوں کو کسی طرف شریک ہونے سے علیحدہ رہنے کو پسند کیا۔ اہل کوفہ کو بھی یہ پیغام نہیں دیا کہ تم میرے شریک ہو کر لڑو بلکہ: ”جس بلا میں تم اور ہم بھی مبتلا ہو گئے ہیں اس میں ہماری مدد کرو۔۔۔ اگر ہم مظلوم ہیں تو ہماری امداد کرو اگر ہم ظالم ہیں تو ہم سے حق لو۔“ اور روسائے کوفہ کی حاضری پر خود فرمایا کہ: ”اگر وہ لوگ اپنی رائے سے رجوع کر لیں تو فوج المراء، اور اگر اپنے خیال پر اصرار کریں گے تو اس کا علاج ہم نرمی کے ساتھ کریں گے تاکہ ہماری طرف سے ظلم کی ابتداء نہ ہو۔“ اور یہ بھی فرمایا کہ: ”ہم کسی کام کو جس میں ذرہ بھر فساد ہو گا بغیر اصلاح کیے نہ چھوڑیں گے۔“

احنف کا سوال پہلے خلیفہ کے طرز عمل سے پیدا ہوا تھا ان واقعات میں ایک نہایت

مفسد عکس ڈالنے والا سوال اخف بن قیس کا تھا جس نے امیر المومنین کی خدمت میں حاضر ہو کر اہل بصرہ کا یہ خوف بیان کیا کہ: ”اگر علی کو فتح ہوئی تو وہ ہمارے مردوں کو قتل کر کے ہمارے بچوں اور عورتوں کو غلام بنائیں گے۔“ مجھے اس سوال کی وجہ کے لیے اور کوئی مانتہ ہو اس برتنہ کے نہیں دکھائی دیتا جس میں مائنین زکوٰۃ مبتلا ہوئے تھے۔ لوگ سوچتے تھے کہ جب ایک خلیفہ مسلمان کینیزوں کی کھپ کو پسندیدگی سے دیکھ سکتا ہے تو دوسرے کو کونسا امر مانع ہے۔ شاید ان کو معلوم یا یاد نہ تھا کہ نہ صرف علیؑ نے

ابتدائی میں ان سے اس جنگ کو پسند نہ فرمایا تھا بلکہ ایک مرتبہ سنت نظام کو منظور نہ کرنے پر خلافت سے عہدہ ہونے کے بعد اس مرتبہ بغیر اس شرط کے خلیفہ ہوئے تھے۔ اہل بصرہ بھی ان لوگوں میں تھے جنہیں علیؑ کے متعلق زمانہ رسول کے واقعات معلوم نہ ہو سکتے۔ انہیں کیا ذریعہ تھا نیز ان چند لوگوں کے جو یہاں قیام پذیر ہو گئے ہوں یا جنہوں نے کچھ اور ہم خیال بنائے ہوں اور جن کے ذہن میں دیکھے اور سنے ہوئے واقعات رہ گئے ہوں۔ بہر حال جناب امیرؑ نے یہ فدا کر اس وقت بھی اپنے پہلے خیال کی تصدیق کر دی کہ: ”میں ہرگز ایسا نہ کروں گا، اہل بصرہ مسلمان ہیں۔“

ابومویٰ ہر شخص جس نے کوفہ میں ابومویٰ کے بیعت اور مدد کرنے کے تردد اور انکار پر غور کیا ہے وہ اس میں ذرا شبہ نہیں کر سکتا کہ وہ کسی طرح وجہ علیؑ کا حامی نہ تھا۔ محض اس کی خاموشی بھی علیؑ کے لیے عہد دش تھی۔ وہ نہ جانتے کہ ہم کیا کریں اور آئندہ اپنے طرز عمل کو کس طرح درست کریں جب کہ ایک خوفناک بغاوت تمام مسلمانوں سے سامنے کھڑی ہے۔ ابومویٰ حیرت خیز نظریہ پیش کر رہا تھا کہ میری گردن میں عثمان اور علیؑ دونوں کی بیعت ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس کی عثمان والی بیعت علیؑ کے مخالف نہ ہوئی لیکن اس کی ذمہ داری کون کر رہا تھا کہ اسے ان لوگوں سے ہمدردی نہ تھی جو انتقام خون عثمان چاہتے تھے اور علیؑ کے مخالف تھے۔ یہ صورت اس قدر علیؑ کی اطاعت نہ تھی (اگرچہ علیؑ کی بیعت کا زبانی اقرار تھا) جس قدر علیؑ کے مخالفین کی تسکین تھی۔ حشر عائشہ سے جو خط و کتابت جاری تھی اس سے یہ قیاس کرنا کہ ابومویٰ امیر المومنینؑ کے دیکھ کو بغاوت اٹھیل اس وقت روک رہا تھا جب تک حشر عائشہ کوفہ میں داخل نہ ہو جائیں۔ ایک ظاہر بات تھی۔ ابومویٰ نے ایک لفظ منہ سے ایسا نہیں نکالا جو امیر المومنینؑ کے لیے امید خیز ہوتا۔ ایسی صورت میں اصحابِ جل سے ابومویٰ کی اخلاقی ہمدردی ہو یا علیؑ، علیؑ کے لیے خوشگوار نہ تھی کہ وہ اگر بڑھتے تو ایک بگلی دشمن سے مشتبیہ رہتے اور اگر فتح پاتے تو خوف تھا کہ کہیں کوفہ ہمارے بھاگے ہوئے دشمنوں کا ٹھکانہ نہ ہو۔ جس سے انہیں جنگ اور خونریزی کی دوبارہ قوت حاصل ہو جائے۔ اب اس تمام گھٹگو کے لکھنے کے بعد جو جناب امیرؑ کے پیچھے ہوئے لوگوں یا ان کے مؤیدین نے کی ابومویٰ کے پہنچانے کے لیے اس قدر اور کہتا ہوں کہ وہی جو علیؑ اور اسلام کے فائدہ کی پامالی چہرے کے مرتب ریٹوں سے دیکھ سکتا تھا، عجز اور انکار کا پتلا بن گیا جب اسے یقین ہو گیا کہ سرانے سلطانی ہیں اپنے سایہ میں قبول نہ کرے گی۔ اور مالک اشتر سے اپنے مال و اسباب کے مل جانے کی استدعا کی۔ یہی ابومویٰ آئندہ علیؑ اور اسلام کا وکیل بنایا گیا!

باپ اور بیٹے کی گفتگو نفس اور واقعات کی شرح تھی باوجود اس کے کہ جناب امیرؑ نے مقابل بیچ کر خطوط، دیکھ،

ملاقات اور ہر طریقہ سے اصلاح چاہی جس سے کشت و خون کی نوبت نہ پہنچے لیکن ان لوگوں سے صلح کرنے کی امید بہت دور تھی جو جان بوجھ کر تلبیس حق سے اپنے حوصلے پورے کرنا چاہتے تھے۔ یا جو اپنے ساتھ دینے والوں کو ان الفاظ سے آمادہ کرتے تھے کہ: ”اپنے زن و فرزند اور حسب و نسب کی حفاظت کے لیے لڑو۔“ اگر زہیر پر دبدو گھٹگو کا اثر پڑا بھی تو اس لیے کہ تجویزی ہی دیر میں غلامِ قسم کی قربانی قرار دیا جائے۔ اور یہ تلخ سچائی اپنے بیٹے کے منہ سے سننی پڑی کہ: ”جب دونوں فریق کو جمع کر لیا اور ایک کو دوسرے کی عداوت پر ابھار دیا تو اب چھوڑ کر جانے کا قصد کرتے ہو۔“ بہادر زہیر کے لیے یہ آسان امر نہ تھا کہ وہ اپنے ہی فرزند سے سنتا کہ: ”تم میں نامردی آگئی ہے۔“

جناب امیر نے بے وقت کو کب تک دور رکھا وہ براقت آگیا کہ یز جنگ کیے چارہ نہ ہوتا۔ جناب امیر نے اس قدر صبر کیا تھا کہ دوست یا دشمن کوئی اس الزام کا خیال بھی نہیں کر سکتا تھا کہ ہم تو معاملہ کے بچنے اور صلح پر آمادہ تھے علی کے فاتحانہ جوش نے ہمیں موقع ہی نہ دیا۔ دشمن کے تیروں کے منہ سے سپاہی گرے اور زخمی ہوئے۔ سپاہی دیکھتے رہے اور اب اپنے افسر کے حکم کے قبل تیار اور جوش جنگ سے بے چین ہو گئے اور خود بھی دشمن کے زیادتی کو روکنے کی اجازت چاہی اور علی کا قرآن بردار سفیر قتل کیا گیا۔ رکتے ہوئے لفظوں میں جناب امیر نے جنگ کی ضرورت کا اقرار کیا۔ اور جب یہ تصفیہ کر چکے تو اب علی کا تمام خاتمہ جنگ ہی سے فیصلہ کرنے پر تیار ہو گیا۔ اور وہ جو برسوں سے علی کی تلوار سے بے خوف ہو گئے تھے حیرت سے دیکھنے لگے کہ ذوالفقار میں کوئی دندانہ نہیں پڑا ہے اور نہ علی کے نفس کی اس قوت میں کوئی فرق آیا ہے جس سے مقابل ہو کر دشمن اپنے کو حواس سے معراپا تا تھا۔ وہی ام المومنین جن کے ساتھ رسول کا غلوے محبت ظاہر کرنے کے لیے کسی کے پاس اس وضع کی ردا تیں ہیں کہ رسول نے اپنے کندھے پر انھیں حبشیوں کا بیج دکھایا اور دھنسنے دیا، جل میں مسلمان بسلوں کا عبرتناک رقص اور دل شکستہ کراہ سن رہی تھیں۔ جس وقت زخمی ایٹھتے تھے تڑپتے تھے اور کرب میں اپنی تھیلیاں رگڑتے تھے۔ یقیناً یہ استہلالی تالیں نہ تھیں!

مردان کا تیرا ایک قلم تھا جو اصحابِ حمل کے دلائل کو کاٹ رہا تھا جناب امیر، قلعاع بن عمر یا عمار یا سر تھے جنھوں نے اوٹ کی ٹنگڑی کو مسلمانوں کا قاتل بھا اور اگرچہ حضرت عائشہ کے تشریف فرما ہونے سے کیسا ہی قہر س کیوں نہ آگیا ہو لیکن ان کے ذہن میں وہ مسلمانوں کے خون سے زیادہ مقدس نہ تھا جس کا بہنا روکا جانا ضروری تھا۔ لڑائی ختم ہوئی لیکن نہ اس کے قبل کہ مردان بن حکم طلحہ کو اپنے زہر آلود تیر کا شکار کر چکا ہوتا۔ کون انکار کرے گا کہ یہ تیر وہ قلم تھا جو اصحابِ حمل کے دلائل کو کاٹ رہا تھا۔ وہ زبان حق جو بھی واقعہ خوانی کر رہی تھی۔ افسوسناک تھا یہ امر کہ طلحہ کا ایسا شخص مردان کی اس مکاری کا شکار ہوتا۔ لیکن کسی گناہ گار قاتل نے اپنے مقتول کے داہمت کو قتل سے اس صفائی سے نہیں دکھایا۔ کون جانتا تھا کہ یہ (خل قتل) طلحہ کے خلاف قطعی دلیل ہو جائے گا، اور خود قبول طلحہ اس خون سے ضائع نہ ہو جائے۔

دشمنوں کے ساتھ جناب امیر کا برتاؤ لڑائی ختم ہوئی، بجائے ہوئے دشمنوں کے ساتھ جناب امیر نے جو رحم کیا شاید ہی کوئی قوم اس کا جواب لا سکتی ہو۔ امیر المومنین اس کے بعد میدان جنگ میں تشریف لے گئے۔ کیوں اور کس نیت سے۔ نہیں معلوم۔ نہ کسی مؤرخ نے جناب امیر کی اس وقت تصویر کشی کی ہے اور نہ واقعات لکھے ہیں۔ جو غنیف اشارہ مل سکتا ہے وہ محض اس فقرہ سے کہ: ”افسوس لوگ یہ سمجھے تھے کہ ہم پر عوام الناس نے صرف غرور کیا تھا، حالانکہ ان میں یہ لوگ موجود تھے۔“ تشریف لے گئے تھے کہ جنگ کے نتیجے کے تالیف حسی کریں اور اس عبرت ناک عالم پر غور کریں جہاں گیارہ ہزار سے زیادہ زخمی و مقتول سپاہی جنگ آزمائی کر کے پڑے ہیں اور اس افسوسناک وجہ کے لیے جسے ہر شخص جانتا تھا۔

حضرت عائشہ کے فقرات

میں حضرت عائشہ کا اس وقت کا فقرہ نہیں بھلا کہ: مجھے محبوب و منظور تھا کہ آج کے واقعہ سے میں برس پہلے میں مر جاتی۔ کیا اس لیے کہ اس

خونناک قتل اور اس کے ضمنی نتائج سے متاثر ہوئی تھیں۔ کیا اس لیے کہ طلحہ و زبیر کے قتل نے ایسے مفید مددگاروں سے محروم کر دیا تھا۔ کیا اس لیے کہ باوجود تمام کوششوں کے یہ ناکم ہوا کہ علیؑ اپنے اختیارات سے جٹا دیے جاتے۔ اور یہ فقرہ اس کی شرح تھا کہ مجھے کوئی گمراہی سے زیادہ دشمن نہیں ہے جہاں اسے بنی ہاشم تم ہو۔ اور اس جوش نے یہ کہلوایا کہ: ”اب وہاں جاؤ گی جہاں اسے بنی ہاشم تم نہ ہو۔“ کونسی جگہ تھی جہاں اب بنی ہاشم صاحب اختیار نہ ہوتے بزم صوبہ شام کے۔ جس سے قیاس ہوتا ہے کہ اس فقرہ میں دھمکی تھی کہ اب ہم معاویہ کی شرکت سے تم سے بھگتیں گے۔ معاویہ کو اب انہیں ساتھ لے لینے میں کیا عذر ہو سکتا تھا۔ بلکہ یہ اس کے اغراض پورے کرنے کے کام آ سکتی تھیں اور اصحابِ جل کی شکست سے پر پرزے ٹوٹ چکے تھے جو کسی خوف کے باعث ہو سکتے۔ یہ معنی اور دھمکی تھی ورنہ کیا تھا کہ حضرت عائشہ باوجود متواتر فحاشی کے مدینہ کی طرف واپس ہونے کے لیے مستعد نہ تھیں۔ لیکن حضرت عائشہ کے ان تمام اظہار خیال میں سب سے زیادہ خطرناک یہ کوشش تھی کہ انہوں نے اس فقرہ میں کہ: ”تم اطمینان رکھو کہ علیؑ تمہاری ان باتوں پر توجہ نہ کریں گے اور تمہیں اس پر مسلم نہ رکھیں گے۔“ ابن عباس کو بمقابلہ علیؑ اپنا موقع درست کرنے اور اختیار حاصل کرنے کے لیے ابھارا تھا۔ یا علیؑ کی وفادارانہ و کالت ادا کرنے پر فتنہ کیا تھا۔ ابن عباس نے صاحبزادی کو دہی جواب دیا جو قریب قریب عباس نے باپ کو دیا تھا۔

جنگِ جمل کے بعد کیا پیشین گوئی کی جا سکتی تھی

اصحابِ جمل کی شکست اس ہمت اور جوش کی شکست تھی جو علیؑ کو صاحب اختیار

نہ دیکھ سکتا تھا۔ اور اس شکست سے بنی ہاشم کے ہم خیال مددگاروں کو امید ہو سکتی تھی کہ آئندہ ہماری روش بغیر کسی ایسی مزاحمت کے کامیابی سے اپنے مقصد پر پہنچے گی۔ جس قدر ظاہر خطرہ تھا وہ معاویہ کا تھا۔ یعنی برگد کے درخت کا اصل تناگر چکا تھا لیکن اس کی دوسری شاخ بڑھتے بڑھتے زمین گیر ہو کر اصل سے زیادہ قوی ہو گئی تھی باوجود اس خطرہ کے علیؑ کو لوگوں کی اس وقت تک کی اطاعت اور لوگوں کو علیؑ کی رہنمائی کا جو یقین تھا اس سے یہ امید ہو سکتی تھی کہ آئندہ کسی مخالفت کا آسانی سے مقابلہ کیا جاسکے گا اور جب بزم شام کے تمام صوبجات ہماری اطاعت کریں گے تو ہم مالی اور شخصی مدد کے لحاظ سے نسبتاً زیادہ قوی ہوں گے۔ یا دوسرے لفظوں میں جب ہم نے تھوڑے سالان اور ابتدائی حالت سے ایسے خوفناک بغاوت کو فرو کر دیا اور اس آہستہ قدمی اطمینان اور رحم کے ساتھ تو مزید سالان اور جی جوتی حالت میں ہم اس سے کہیں بڑے پیمانے کی سرکشی کو بھی دبا سکتے ہیں۔

تقسیم غنیمت

طبری نے کہا ہے کہ جناب امیرؑ نے مالِ محلولہ کو فوج کی قیمت نہ قرار دیا اور اعلان کیا کہ جو جس کا مال ہو بچان کر لے جائے۔ روضۃ الصفائے بھی قیمت کی واپسی کا ذکر کیا ہے۔

ابن خلدون کہتا ہے: ”امیر المومنین علیؑ نے بیت المال کو کھولا، چھ ہزار سے زائد نقد موجود تھا۔ آپ نے اس کو حاضرینِ معرکہ پر تقسیم کر دیا۔ ہر شخص کو پانچ پانچ سو ملے۔ وقت تقسیم آپ نے حاضرین سے مخاطب ہو کر کہا: اگر تم لوگ ملک شام پر

فتح یاب ہونے تو تھارے وظائف کے علاوہ اسی قدر اور دیا جائے گا۔ یہ سن کر فرقہ سپیٹھ لے آپ پر بھی درپردہ طعن و تشنیع شروع کر دیا، اور اس سے پیشتر بھی آپ پر ان لوگوں نے طعن زنی کی تھی جس وقت آپ نے مال و اسباب کے لوٹنے سے متوجہ نہ کیا تھا۔ ابن غلدون کے ”چہ ہزار“ سے ہم نہیں کہے کہ وہ دینار تھا یا اور ہم تھا یا ابن غلدون کی چہ ہزار جلدیں تھیں۔ اور یہ تو میری ہندوستانی معلومات سے کہیں زیادہ ہے کہ کیسے یہ چہ ہزار اٹھارہ ہزار سپاہوں پر اس طرح تقسیم ہوتے کہ ہر ایک کو پانچ پانچ سولتے مجھے درہم و دینار سے بحث نہیں ہے۔ بلکہ میں صرف یہ بگھنا چاہتا ہوں کہ آیا کچھ سیٹ المال کی رقم وصول ہوئی اور وہ تقسیم ہوئی اور تقسیم کو سپاہوں اور افسروں نے کس طرح قبول کیا یا لوٹ سے روکے جانے کو انہوں نے کس نظر سے دیکھ میں جو کچھ سمجھ سکتا ہوں وہ یہ ہے کہ یحییٰ بن منبہ کی پس ماندہ رقم یا بصرہ کا بیت المال ملا اور وہ تقسیم ہوا۔ لیکن اس تقسیم کو جس طرح جناب امیر نے جائز رکھا آیا اس طریقہ کو ہر ایک نے امتحان سے دیکھ ابن غلدون کہتا ہے کہ کچھ بدگو لوگوں نے طعن و تشنیع کیا کیوں؟ نہیں معلوم۔ اور یہ بھی اسی مورخ سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسی ہی لوگوں نے لوٹے نہ کرنے کے حکم پر طعن و تشنیع کی۔ اگر یہ واقعہ ہے کہ ایک گروہ نے لوٹنے کی اجازت نہ پا کر طعن و تشنیع کی اور جناب امیر کے طریقہ تقسیم پر راضی نہ ہوا تو ہم صلت صلت وہ سراپا تے ہیں جس سے صفین کے آخری واقعات سمجھیں کہ کیونکر کچھ لوگ مل گئے یا اس کے بعد کے واقعات میں ان لوگوں کے کاہلانہ طرز عمل کی حقیقت اور وجہ سمجھیں آئے۔ یہ طرز عمل اس کا ایک ثبوت ہو گا کہ لوگ اگرچہ ظلم جناب امیر کی بیعت میں تھے لیکن من حیث الواقعہ وہ ابھی اس غنا سے علیحدہ نہ ہوئے تھے جو انہیں ایسی روش کا ذخیرہ بنائی یا باز پرس نہ کرتے۔ یہ ایک انگارہ تھا کہ ہم ذاتی فوائد کے معاملات میں جناب امیر کے اس بے رحایت انصاف پر راضی نہیں ہیں۔ اور ہم اس طرح چلیں گے کہ ہم ادھر جائیں گے جہاں ہمیں امتیاز زیادہ فائدہ اور خصوصیت نصیب ہو۔ ہم دوسروں پر فخر کریں، حسد، بغض، قطع و بید، ہر وقت ہمارے مددگار آتے ہوں۔ اور اس طرح ہم میں کے تھوڑے سے مخلوقات الہی کے بڑی تعداد کو اپنے ناخوئیوں میں رکھیں۔ انہیں بیزہاری اطاعت ہم سے خوف کرنے اور مرعوب رہنے کے کوئی کام نہ ہو۔

اس جگہ یہ نہایت مفید روایت بیان کی جاتی ہے جو ابن ابی الحدید نے فضل بن جعد سے نقل کی ہے کہ: ”بہت بڑا سبب نصرت جناب امیر میں عرب کے بیٹے رہنے کا امر مال ہے۔ کیونکہ نہ وہ حضرت شریعت کو مشرقت پر اور عربی کو گمی پر فضیلت دیتے تھے اور نہ بھی روماء اور امرائے قبائل کو رشوت دیتے تھے جیسا کہ بلوک دیا کرتے ہیں اور نہ کبھی کسی کو اپنی طرف مائل کرتے تھے اور معلویہ اس کے برخلاف تھا۔“

جناب امیر کا کوفہ کو دار الخلافہ قرار دینا ان کے اس پہلے خیال کو قوت کے ساتھ پیش کر رہا تھا کہ وہ امیر شام سے بغیر معاملہ طے کیے ہوئے خاموش نہ رہیں گے اور اگر درمیان میں اصحاب محل اپنے خصال اور شوخیالات کے مقلد نہ بن جاتے تو کوئی شبہ نہ تھا کہ امیر شام سے معرکہ آرا ہوا شروع ہو گئی ہوتی۔

کس نے چھیڑ کی ابتدا کی

متیرہ بن شعبہ کے مصالحت اور صلاح پر وعدہ کرنے والے خود کریں گے کہ یہ علی نہ تھے جنہوں نے عطا چھیڑ چھڑ شروع کی، بلکہ یہ امیر شام ہی تھے جنہوں نے ولایت جزیرہ کو اپنے قبضہ میں لانا چاہا اور خفاک بن قیس نے ان لوگوں کو مٹانے اور میدان جنگ میں

اپنا شریک کرنے کے لیے کوئی کوشش اٹھانہ رکھی۔ یہ واقعات جب اس عل کے ساتھ ملا کر غور کیے جاتے ہیں کہ ابتدا ہی سے عثمان کا خون آلود کرتہ اور انگلیاں جامع مسجد میں رکھی گئی تھیں۔ صبح مقرر اپنی تمام طاقت لوگوں کے جوش دہانے میں صرف کر رہے تھے اور معاویہ نہ صرف بنی امیہ بلکہ مدینہ کے اکثر لوگوں کے خیال دریافت کر رہا تھا۔ اور خبر لے رہا تھا کہ کہاں کہاں کے لوگوں نے علی کی بیعت کی ہے تو کون اس صلاح کو بشرف اطمینان کہہ سکتا تھا کہ جب تم کچھ دنوں کے بعد صاحب اختیار ہو جاؤ گے تو معاویہ کو آسانی سے نکال سکو گے اور وہ تسلیم و رضا سے تھادی بڑھتی ہوئی قوت کو دیکھے گا اور فوش ہو گا۔ یز اس کے کہ علی کو دھوکا دیا جا رہا تھا کہ وہ غافل رہیں اور معاویہ ہاتھ پاؤں پلا کر دروازہ کھٹکھٹانے اور اس وقت کوئی چارہ نہ ہو۔ بلکہ جناب امیر نے اعظم کوئی کے موافق اپنے خطبہ میں یہ بھی فرمایا کہ: ”معاویہ قیصر سے دوستی کر کے آیا ہے اگر اسے شکست ہوئی تو قیصر سے مدد لے گا۔“ جیسا روئے اتفاقی میں بھی اس کا تذکرہ ہے کہ: ”جس وقت عمرو بن حاص اور معاویہ میں پیش نظر واقعات کی گفتگو ہوئی تو قیصر سے دوستی رکھنے کے لیے یہ طے کیا گیا کہ اس کے قیدی قابیس سکے جائیں۔“ میں آخری شخص ہوں گا جو اس میں شہ کرے گا کہ معاویہ کی فراد کا مدبر اس میں ذرا پس و پیش کرتا کہ وہ مسلمانوں پر فتح پانے کے لیے غیر مسلم کو اپنا شریک نہ کرتا۔ اوسورن نے کئی رعایت یا مبالغہ نہیں کیا ہے چاہے وہ کہتا ہے کہ: ”بنی امیہ کا یہ پہلا غلطی بے رحم اور بے لحاظ خلیفہ کسی ایسے گناہ سے نہ بچتا تھا جو اسے اس کی جگہ پر مضبوط کر دے۔“ (اسپرٹ آف اسلام) اور کیا آخر میں اس نے یہ نہیں کہا کہ: ”اگر اہل ہمد و عراق نے علی سے بیعت کی ہے تو اہل شام نے میری بیعت کی ہے۔ ہم میں اور علی میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اگر دو شخص کسی چیز کے بارہ میں جگ کر رہے ہیں تو وہ چیز اس کی ہے جو غالب ہو۔“ اور نہ صرف یہ کہا کہ: ”میری بہن رضول کے عقد میں تھی بلکہ یہ بھی کہا کہ ارباب حل و عقد کے اختیار است مدینہ سے شام میں منتقل ہو گئے۔ وہ سر عام یہ فقرہ شہ سے نہیں نکال سکتا تھا اگر اسے یہ یقین ہوتا کہ زیادہ تر اصحاب رضول کو اپنے ملاحظہ کا پاس ہے۔ اور کیا اس سب کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ ان تمام نکات پر غور کر رہا تھا جو علی کا استدلال کی حیرت زان بازی سے توڑ مروڑ کر لوگوں کو اس کی طرف متوجہ کر دے۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ جب ایک بی بی اپنے حق زوجیت سے کہیں بڑا حوصلہ کرتی ہے اور سامان چھٹا کر لیتی ہے بغیر اس کے کہ اس کا ایک پیسہ اپنے خاں سے فروغ ہو یا اپنا کوئی آدمی ضائع ہو تو پھر وہ اپنی بہن کا وکیل کیوں نہ ہوتا، دراصل ایک صوبہ پر اختیار تھا اور در صورت ہر گن تباہی کی بھی نہ اس کی ذاتی جائداد کا کوئی تل بھر نکلا ضائع ہوتا تھا اور نہ لاکھوں کے قتل عام پر غصہ کی سانس کی کوئی لہر اس کے دل پر سے گزرتی۔

یہ سب پھر ہوا کہ محل اپنی محل کی طرف کھینچنے لگا۔ تمام بنی امیہ شام چلے گئے اور عمرو بن حاص کو بھی فلسطین بلا معلوم نہ ہوا۔ فوج کشی کی مکمل کارروائی شریبل بن سوط الکندی کی مذکورہ پڑ فرب کارروائی سے شروع ہوئی اور شام کا یہ رئیس اپنی دجاہت اور اعتبار کو ناواقف مخلوقات کی جہالت پر صرف کئے لگا۔ وہ تمام الفاظ صرف کیے گئے جس سے کسی بے رحم حملہ آور کی تصویر چھنی جاسکتی ہے اور کوئی ترکیب اثر ڈالنے کے لیے اٹھانہ رکھی گئی جس سے عثمان کی مظلومیت ثابت ہو۔ اور لوگ ایک خلیفہ رضول کے بے گناہی سے ملے جانے کا قاتلوں سے بدلہ لیں۔ اور جب یہ عمل جاری ہو گیا تو پڑ اطمینان نہر خندہ سے جبر سے کہا کہ: ”ٹوٹے اہل شام کی رائے رکھی اور سنی اب تو نے جو کچھ دیکھا یا سنا ہے اُسے جا کر علی سے بیان کر۔“

سادے کافور کے معنی بھی یہ تھے کہ ہم تمہارا کوئی جواب نہیں دینا چاہتے۔ تم جو کر سکتے ہو کرو اور سفید کافور جو کچھ نہ بکھاسکتا تھا اسے قاصد کی زبان نے پورا کر دیا۔

جناب امیر جنگی انتظام شروع کرتے ہیں جزیرہ نسبتاً کم مسلمان سے اکثر کے قبضہ میں آ گیا اور اس طرح ابتدا امید خیز ثابت ہوئی۔ جناب امیر نے اپنے

پرجوش انداز سے سے خاموشانہ عمل شروع کیا اور آہستہ آہستہ پلے در پلے ایک ایک افسر کو روانہ کرنا شروع کیا۔ مقدمہ لشکر میں زیادہ بن ضر، شریح بن ہانی، ہاشم بن عقبہ ایسے لوگ تھے جن کی افسری ہر سپاہی کے لیے مایہ ناز تھی اور یہ اس پر خوش تھے کہ ہم سب مالک اشتر کے ماتحت ہیں اب تک جناب امیر کے حکم کا اس درجہ لحاظ تھا کہ نزامی ردش اختیار نہ کرنے کے ثبوت میں شام کے افسر کا انکاری خط رکھ لیا جاتا کہ امیر المومنین کو دکھایا جائے۔ ابوالاعور کو جو ایک تجربہ کار افسر اور مغلویہ کامیہ ناز تھا خاک بن قیس کی طرح شکست ہوئی اور یہ جھاکہ شام کے اصل لشکر میں مل جائے قبل اس کے کہ مالک اشتر سے ملنا ہو جائے۔ مالک اشتر کا تو کیا ذکر ابھی تک سپاہوں میں یہ جوش تھا کہ وہ کہہ رہے تھے کہ ہم تنہا پہاڑ پر حملہ کر دیں ابوالاعور کیا چیز ہے۔ اسی طرح شامیوں کی چیخ بھڑائی میں یہ دوسری فتح تھی جو امیر المومنین کو حاصل ہوئی۔ امیر المومنین کی یہ بھی دور اندیشی تھی کہ انہوں نے خود کوچ فرما کر نہ صرف سپاہیوں کی ہمت بڑھائی بلکہ قریب پنج کر دھن کو مروجہ کید صفیں شام سے زیادہ قریب تھا اور تیسری نمایاں فتح فرات کے کنارہ حاصل ہوئی جب کہ شامیوں نے پہلی مرتبہ فرات کا پانی بند کیا۔ بنی ہاشم کو آج اختیار تھا کہ وہ بنو کثیمہ شامیوں کو کھٹ سے ہٹا دیتے اور اختیار رکھتے تھے کہ شامیوں کو پانی نہ دینے کا جواب دیتے لیکن رحمتہ للعالمین کے اس جانشین سے امید نہیں کی جاسکتی تھی کہ وہ انسان کو اس کے حق بشری سے باز رکھے۔ علی کا یہ احسان رسول اور علی کے عام احسانوں کے طرح آگے ذکر کیے جانے والے زمانہ میں بالکل بھلا دیا گیا۔

علی فتح سے کیا کام لیتے تھے کوئی فتح فوج جس وقت فتح کے جوش میں کمزور سے ناقابل برداشت رعونت کا برتاؤ کرتی ہے اور آئندہ کمزور کرتے رہنے کے لیے دم اور

ایمان کے غلات کا ردائیاں کرتی رہتی ہے۔ علی اپنی قوت اور فتح کو حصول صلح کے لیے صرف کرتے ہیں۔ فتح کرتے ہیں اور رکھتے ہیں۔ اس لیے کہ: ”شاید دشمن سوچے اور مخالفت سے باز آئے۔“ ہار ہار سفیر بھیجتے ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ ”شاید اللہ تعالیٰ تمہارے بیعت کرنے سے مسلمانوں میں اتفاق پیدا کر دے۔“ یا ”تفریقِ جماعت نہ ہونے پائے اور آپس میں رعب و احتمال بڑھے۔“ صحیح ہے کہ رعب و احتمال کا مفہوم وہ اعلیٰ المذاج ہے جس پر پہنچنے کے لیے قوی حکومتیں جان توڑ کوششیں کرتی ہیں۔ لیکن اتفاق اور احتمال اس کے لیے زہر سے زیادہ کڑوا ہے جو تفریقِ جماعت میں اپنی کامیابی دیکھتا ہو۔ امیر المومنین اور ان کے رفقاء اور احتمال کی کوششیں کر رہے ہیں اور ابھی ان کے فتنہ کے الفاظ تمام نہیں ہوئے ہیں کہ مغلویہ زیادہ بن حصہ کو علی کے خلاف ابھارتا ہے۔ مدد مانگتا ہے اور کسی شہر کے حکومت کی لالچ دیتا ہے اور جب اس وقت مایوس ہوتا ہے تو کہتا ہے کہ ”جس سے بات کرتا ہوں وہ ایک ہی جواب دیتا ہے گویا ان سبوں کے دل ایک ہی ہیں۔“ کاش سبوں کے دل ایک ہی رہنے پاتے!

الوہرہ اور فہرست

اسی زمانہ کی یہ روایت بھی ہے کہ الوہرہ نے وہی الوہرہ جو بلا جود کئی ہزار احادیث یاد رکھنے کے معنویہ کے بلانے پر اس کے شریک ہو گئے تھے اور انکھ وہ ابواب میں بھی دکھائی دی گئے۔ تجویز کیا کہ اگر قاتلان عثمان مل جائیں تو آپس میں تصفیہ ہو جائے۔ مشکل سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ ان کی یہ تجویز معنویہ کی صلاح یا علم کے باہر تھی لیکن جو کچھ بھی ہو الوہرہ اگر اپنے حکار پھیلاتے تھے تو انھیں کیا ہوا تھا کہ وہ امیر المومنین کو اس وقت ان قاتلوں کی فہرست نہ دیتے جس وقت تک انھوں نے معنویہ کی دعوت قبول نہ کی تھی۔ درمیان میں نہ صرف کئی مہینہ تک علی کی خلافت بغیر کسی جنگ کے گزری بلکہ جل کی جنگ ہوئی اور ختم ہوئی لیکن کئی انھوں نے پہنوائے اور نام لینے کی جرات نہ کی، نہ کہیں عثمان کے معاشرہ کے وقت اس کا تذکرہ ہے کہ وہ قتل عثمان کے زمانہ میں قمر امارت میں تشریف رکھتے تھے اور انھیں پھیلاتے کا کوئی موقع حاصل تھا لیکن کیا تم حاکم یہ کسی کو پھیلاتے یا پھیلاتے اور اس تجویز میں عثمان کا قاتل قتل ہوتا یا وہ مکان سے دور رہتا، انھیں تو ایک فہرست پیش کرنی تھی کہ اگر یہ لوگ ہمارے حوالہ کو دیے جائیں تو صلح ہو سکتی ہے۔ اور فہرست اس سے کیا کم ہوئی کہ ہر وہ ذی اثر شخص جس پر علی کی محبت کا شبہ بھی ہو حوالہ کر دیا جائے۔ بے شک یہ صلح کی سب سے اچھی ترکیب تھی۔ علی کس طرح قبائل کو اپنا شریک کر سکتے تھے جب ان کے سرداروں کو دشمن کے حوالہ کر دیتے اور قاتلان لوگوں کے قصور معاف ہونے کی بھی ایک ہی ترکیب تھی اور یہ کہ معنویہ کے شریک ہو کر علی سے جنگ کرتے۔ جس شرط پر آخر زمانہ میں عمر بن الحق اور عمار بن ہدی وغیرہ کی جان بخشی کی جاتی تھی۔ مختصر یہ کہ اس سے کہیں زیادہ لوگوں نے اپنے کو قاتل عثمان کہا۔ جس حد میں الوہرہ کو پیش یا دتیں۔ ان لوگوں نے قتل کرنے کے وجوہات میں ایک یہ وجہ بیان کی تھی کہ عثمان نے ”بنو امیہ کو مسلمانوں پر مسلط کر دیا تھا“۔ خوفناک وجہ تھی جس سے معنویہ قبر میں بھی پھٹنے لگتا۔

دشمن کی ترکیبیں اور جناب امیر کی ذکاوت حس

اگر یہ واقعہ ہے گو اس میں ذکاوت حس غور طلب ہے کہ جناب امیر نے کس طرح اپنے فرزند محمد بن حنفیہ کو عبید اللہ بن عمر کے مقابلہ میں جانے سے روکا۔ حالانکہ اس کے بعد یا پہلے اپنے فرزند حسن کو نہ روکا۔ کیا اس جگہ موازنہ جرات تھا کہ ایک فرزند کو جانے دیا اور ایک کو نہ جانے دیا۔ نہیں۔ کیا محمد بن حنفیہ سے بہ نسبت حسن کے زیادہ محبت تھی کہ روکا۔ نہیں۔ قیاس کے باہر ہے۔ بلکہ جب دشمن لاکھ چاکھاتو اب مارا جانا سوچنے سے بعد ہو گیا تھا۔ بلکہ یہ عبید اللہ بن عمر کی ذات تھی جس کے متعلق سوچنا تھا کہ اگر وہ قتل ہوں تو کس کے ہاتھ سے۔ محمد بن حنفیہ اور حسن کے وفادار ہیں بڑا فرق تھا۔ ایک محض علی کے فرزند تھے، دوسرا علی و فاطمہ کا فرزند تھا جسے رسول اللہ کا فرزند کہتے تھے۔ اگر ابن عمر محمد بن حنفیہ کے ہاتھ سے قتل ہوتے تو معنویہ کو جناب امیر کے خلاف جوش مخالفت پیدا کرنے کا ایک نیا وسیلہ ہاتھ آتا۔ لیکن اگر وہ حسن کے ہاتھ سے قتل ہوتے تو معنویہ کو فرزند رسول کے خلاف لوگوں کو بھڑکانے کی آسانی متصور نہ تھی۔ ابھی تک لوگ فرزند ان رسول کی مخالفت پر صریحاً آمادہ نہیں ہوتے تھے۔ حالانکہ یہ تمام واقعات غیر مربع طریقہ سے اس طرح روشن اختیار کرتے جاتے تھے جو ان کی خلاف ایک ہند سوی اندازہ کھا جائے۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ جس طرح یقیناً جناب امیر نے ابن عمر کو محمد بن حنفیہ کے ایسے شجاع فرزند کے ہاتھ سے قتل ہونے سے بچایا معنویہ نے

انھیں قتل ہونے کے لیے محمد بن حنفیہ سے جنگ کرنے کی صلاح دی تھی یا نہیں، جیسا آخر میں ان سے کار نمایاں کرنے کا
استنباط کر کے انھیں لڑایا اور یہ قتل ہونے اور کچھ دیر کے لیے اس ترکیب سے بچی فوج میں ایک مجموعی حیثیت کا پیمان
پیدا کر دیا۔ ابن عمر حنّ کے مقابلہ میں نہ صرف یہ حیثیت سپاہی کے آئے تھے بلکہ حقیقت میں وہ ایک بڑی تدبیر کے
ایجنٹ بن کر آئے تھے۔ ان کا مشن بمقابلہ امیر سرہ اور ابوذر انزلیہ مدبرانہ اور لطیف ہونا بھی چاہیے تھا۔ پہلی ترکیب اگر
فوجی حیثیت سے سے علی کو کمزور کرنے کی ہو سکتی تھی تو اس کا اظہار انھیں اس سے حنّ کو خلافت حوالہ کی جاری تھی مگر یہ
اس وقت جبکہ حنّ اپنے پدر بزرگوار کا ساتھ چھوڑ کر امیر شام کے لشکر میں چلے جاتے اور اس طرح علی کے لشکر میں یا تو
چھوٹ ڈالی جاتی اور یا لوگ اس شبہ میں مبتلا کر کے ہٹا دیتے کہ ہم فاسر رسول کا ساتھ دیے یا امیر المومنین کا۔ اور جب ایک
مرتبہ علی کا موقع کمزور ہو جائے تو پھر حنّ کا خلیفہ بننا یا نہ بننا تو ہمارے اختیار میں ہے۔ حضورؐ سا وظیفہ یاد ر صورت انکار
حضورؐ سا مذہر فیصلہ کر دے گا۔ مگر ان لوگوں نے فوجی طیبہ کے خصال کا نہایت ہی غلط اندازہ کیا تھا کہ وہ ایسی چالوں سے
فریب دینا چاہتے تھے جو قبول امیر المومنین ایسی تھیں جیسا بچوں کو دودھ چھڑانے کے لیے دیا جاتا ہے۔ موقع تھا کہ حنّ
نفرت اور حقارت سے بچھڑ چلا کر کہتے۔ اور جس وقت معاویہ نے کبھی ثمان بن جبلة، کبھی عبید اللہ بن عمر سے استنباط
اور ان کے قتل ہونے کے جوش سے وقت ٹھل رہا تھا اور کبھی اپنے لشکر کو اس سے شکین دیتا تھا کہ علی کے نامی امیر
بھی قتل ہوئے اور ہر ممکن ذرائع سے اپنے سپاہیوں کو تلوار کی بازہ پر مجبور کیا تھا کہ کسی طرح جنگ کی صورت موافق
ہو جائے کبھی علی کے کسی امیر کو جب وہ اس کے خیمہ تک ملے کر تا ہوا پہنچ جاتا تھا تو اسے اور رشتہ دیتا تھا۔ جناب امیرؑ اس
قتل عام سے متاثر ہو رہے تھے اور چاہتے تھے کہ فوج میں اور معاویہ میں تصفیہ ہو جائے۔ معاویہ کے لیے اس سے اور
کو سا عمدہ موقع ہو سکتا تھا کہ وہ علی سے نہ صرف دشمن بلکہ اپنے اولین کی فہرست سامنے رکھ کر انتقام لیتا لیکن پھر آگے
چل کر فریب کے جال کوں بچاتا۔ وہ اب اس سے بڑا مدبر تھا کہ عمرو بن عاص کے غیرت دلانے سے ذوالفقار کی چمک
میں اپنی صورت دیکھنے جاتا۔ اسے وقت اپنی جان بچانا بھی اس کی ناست تھی۔ اور دوسرے عمرو بن عاص کا غیرت دلانا بھی
اس قدر پر مبنی ہو سکتا تھا کہ مسکرا دیتا۔ وہ کیوں عمرو بن عاص کے لیے میدان خالی کرتا۔ اور ان تمام باتوں کے ساتھ یہ
کوشش بھی کی کہ علی سے اپنے کو شام میں رہنے دے جانے کی گزارش کرے۔ علی اس درخواست کو منظور کر کے
اپنی آپ ہی تردید کرتے۔

جناب امیرؑ نے جس عنوان سے جنگ شروع کی اس سے ظاہر ہے کہ وہ ابتدا ہی سے یہ فیصلہ نہیں کر چکے تھے کہ
تصفیہ محض جنگ سے ہوگا بلکہ معین اور پر ہوش تساہل اور آسپستگی کی غرض کو جناب امیرؑ نے خود بھی اپنی زبان مبارک اور
افہام سے ظاہر فرما دیا۔ اس آسپستگی کی دوسری غرض یہ ہو سکتی تھی کہ شامیوں کی طریقہ جنگ کا مطالعہ کیا جائے، جو ایک
ایک دود و دستہ کی جنگ اور متواتر چھوٹی چھوٹی لڑائیاں کھا سکتی تھیں، جن میں اکثر کچھ زیادتی بھی ہو جاتی تھی۔

نصیب اور اقبال کیونکر حاصل ہوتا ہے اور واقعت بتاتے ہیں کہ علیؑ کی آنکھ اپنے اور دشمن
کے سپاہیوں اور موقع کو دیکھنے سے میر نہ ہوتی تھی۔
اور جب نصیحت اور مطالعہ اتمام تحت تک پہنچ گیا تو جناب امیرؑ نے اپنے فوج سے مخاطب فرمایا کہ ہم اب پورے ارادے

سے جنگ شروع کریں گے سپاہوں کو عز اور کامیابی کی ضرورتیں بتائیں۔ کارکنی اور محنت کشی سے نصیب اور اقبال کے حصول کا خیال دیا۔ صبر اور فتح کے قریبی تعلق کو دکھایا اور مشکل کاموں کا صبر اور وقار سے آسان ہو جانا اور شلو فرمایا اور اب اپنے نای سر فروش افسروں کو اس گرمی سلسلہ اور موقع سے روانہ فرمانا شروع کیا کہ دشمن اپنی جگہ بیٹھنا بھول گیا اور سب سے بڑا مرتب حملہ وہ تھا جو خود جناب امیر کے افسری میں اٹھارہ ہزار سپاہوں نے کیا اس نے شام کے لشکر پر کاری ضرب لگائی۔ جنگ دیر تک جاری رہی اور اب معاویہ کا خیمہ نہ اپنی جگہ تھا اور نہ خود اسے اپنے خیمہ کے لیے محفوظ جگہ معلوم تھی۔ کیونکہ علی کے افسر کسی سپاہی یا افسر پر معاویہ کے شہ سے بھی حملہ کر دیتے تھے اور ہٹاتے ہٹاتے ٹیلوں پر لٹے تھے اور ٹیلوں سے پستیوں کی طرف دھکیل دیا تھا۔ شام کا لشکر ڈھلک رہا تھا زمین اس کے پاؤں کے نیچے سے نکل چکی تھی اور ظلمات اس میں مبالغہ نہیں ہے کہ شام کے زیادہ تر سپاہی رجم کے لیے فریاد کر رہے تھے۔ عمرو بن عاص کا گھبراہٹ اور یہ کہنا کہ اگر ایک حملہ اور ایسا ہی ہوا تو ہمارا لشکر نہ ملے گا یا معاویہ سے کہنا کہ کیا دیکھتے ہو میدان تمہارے ہاتھ نہ آئے گا یا حیلہ قرآن یہ سب بچانے خود لشکر شام کے واقعہ خوان ثبوت ہیں۔

اب میں کہنا چاہتا ہوں کہ ذی الحجہ ۳۲ھ سے ہجرت ۳۳ھ تک کا وہ زمانہ ہے

علی کے زمانہ حکومت کی مقدار اور اس کی کامیابی

جس میں علی حکم دیتے تھے اور لوگ سنتے تھے اور اس پر عمل کرتے تھے یہی زمانہ ایک برس کئی مہینہ کا تھا جس میں ایسے منتقیر و قتل میں علی غلیظ ہوئے۔ ہر جگہ عمل بھیجے، انھیں مختلف قسم کی مفید ہدایتیں کرتے رہے اور دو ایسی بنیادوں پر کامیاب ہوئے۔ علی نے جو کچھ کیا اس کی کامیابی اور ناکامی محض اسی زمانہ سے بھیجی جاسکتی ہے جس میں ان کے کامیابی پر شہ کرنا بھی ملتی باتوں کے کہنے سے انکار ہو گا اس زمانہ میں علی کے تمام اعمال کی کامیابی نہ معاملہ کی کسی کونسل کی صلاح تھی اور نہ محض غلیظ ہونے کے لحاظ سے تمام کامیابیوں کا سہرا انھیں کے سر چڑھتا، اگرچہ مسلمان سپاہی، ان کا اسلامی مزاج، خالد بن ولید، سعید بن ابی وقاص، نہان بن مقرن اور قتیبہ بن عمر کے ایسے قابل فوجی افسر فتح کرتے۔ کوئی صاحب شور انسان اس زمانہ کو کسی حاکم کا زمانہ نہیں کہہ سکتا جن میں اس کی اطاعت نہ کی گئی ہو۔ اور نہ اسے کسی ایسے فعل کا ذمہ دار ٹھہرا سکتا ہے جو اس کی صلاح سے نہ ہوا ہو بلکہ اس کا انکار اور اس کے خلاف صلاح موجود ہو۔ اور نہ یہ واقعات اور حالات ہوں کہ چونکہ ہمارے افسر نے ہمیں غلط حکم دیا تھا اور وہ اس درجہ ناقابل عمل اور غلط تھا کہ ہم اس کی اطاعت نہیں کر سکتے تھے۔

فہم قرآن سے ایک نئی صورت پیدا ہو گئی اور اب ایک دور شروع ہوا جس میں کبھی علی کی اطاعت کی گئی اور کبھی خلاف ورزی یا تساہل یا لاپرواہی

کی گئی۔ جب اطاعت کی گئی تو انھوں نے اپنے مقابل دشمنوں کو جلا گئے اور ذلیل ہوتے دیکھا اور جب حکم نہ سنا تو سرحدی مقامات یا بعض اندرونی شہروں پر دشمنوں کی غارت گری فوج کو حملہ آور دیکھا لوگ قتل ہوئے، وقار قوی کو ٹھیس پہنچی اور بے امنی مع اپنے بے مہار افواجوں کے جو امیں اڑتی رہی۔ ہمیں اور پست ہوتی رہیں۔ یہاں تک کہ وہ زمانہ آگیا جو اپنے قوی وقار کے محفوظ نہ رکھنے اور لاپرواہی یا غطرہ سے خوف زدہ ہونے کا لازمی نتیجہ تھا اور جس سے الٹا ناخدا بار بار ان کے منہ پر انھیں مختلف کر چکا تھا۔ ان کا ناخدا اس اکیلے ذریعہ کو کچھ چکا تھا جو انھیں دشمن کی شور آگیاؤں سے محفوظ اور آئندہ

کے لیے گرم و سرخ چمڑہ قوم بنادیتا۔ لیکن اب تو وہ یہ فرما رہا تھا کہ رائے اور تدبیر بے کار ہے۔ جب اس پر عمل کرنے والا نہیں پایہ فرمانے کے بعد کہ جنگ کی رائے نہایت غم تھی کہتا: ”مگر میں کس طرح ایسا حکم دیتا کس کے مجبور ہونے پر یہ فرمان نافذ کرتا میرا ارادہ تھا کہ امت کی مخالفت کے آگام کا قہار سے ساتھ علاج کروں مگر تم خود میری نافرمانی کے درد میں گرفتار ہو۔ پھر نوک خار سے خار کیونکر نکلے۔ حالانکہ خار نکالنے والا چاہتا ہے کہ یہ نیش خلیش کے بغیر نہ رہے گا۔ اور گمان غالب ہے کہ اس کی نوک بھی ٹوٹ کر بدن میں پھوست ہو جائے۔“

قرآن بلند کیا گیا اس مصلحت سے کہ منظور کرنا اور اختلافت کرنا دونوں معاویہ کی نازک حالت کے لیے مفید ہو گا۔ اسے وقت مل جائے گا علی، مالک اشتر اور ابن عباس سب نے دیکھا۔ آخر اللہ کرنے کا کہا کہ جنگ ختم ہوئی اور فریب شروع ہوا۔ اشتر فوجی چارج میں تھا مگر کو کچھ اگر رکنا تو گویا دشمن کا فریب کھا گیا۔ سہ سالار نے دیکھا اور فرمایا کہ: ”اے اللہ کے بند اپنے حق حاصل کرنے کے لیے بڑھو اور دشمن سے جنگ کرنے میں تاہل نہ کرو۔ معاویہ، ابن ابی معیط، حبیب، ابن ابی سرح، ضحاک نہ صاحب دین و قرآن ہیں نہ صاحب ایمان۔ حیرت خیز ہے کہ لادھر مگر شروع ہوا“ اور لادھر جنب امیر کے سپاہوں نے کہنا شروع کیا کہ ”ہم کتب اللہ کے فیصلہ کو منظور کرتے ہیں۔“ اور جنب امیر نے فرمایا: ”افس ہے تم کو کچھ نہیں پڑتا ان لوگوں نے قرآن شریف کو براہ کرد فریب اٹھایا ہے۔“ یا ”یہ ایسا امر ہے جو ظاہر آواہل ان معلوم ہوتا ہے مگر اس کے باطن میں ظلم اور حیلہ فریب ہے اس کا اول تو یہ ہے کہ ان پر رحم کرو، اور آخر یہ ہے کہ تمہیں پشیمانی اور ندامت نصیب ہو۔“ اور اب علی کے مار آئین یہ کہہ رہے تھے کہ: ”کتب اللہ کو منظور کرو، ورنہ ہم تم کو چھوڑ دیں گے۔ اور قہار سے ساتھ وہی برتاؤ کریں گے جو ابن عباس کے ساتھ ہم نے کیا تھا۔“ اور علی فرماتے ہیں کہ: ”اگر تم میرے مطیع ہو تو برابر لڑتے رہو اور اگر باغی ہو چاہتے ہو تو جو قہاری کھینچ آئے کرو۔“

مالک اشتر کوئی فتح سپاہی اپنی فتح کے علم میں اس الموناسک استنبال کا مستوجب نہیں ٹھہرایا گیا جو اشتر کو اپنی قوم اور اکثر اپنے ماتحت سپاہوں کے ہاتھوں نصیب ہوا۔ اس کا انتقام ورد انگیز حیرت کا نمونہ تھا جو وہ میدان جنگ سے اسے وقت طلبی کے منتقل کر رہا تھا۔ بے چین قہار اس کے تمام الفاظ اور انداز میں پانی جلتی تھی۔ موت کا کرب اسے اس وقت کی بے کاری سے زیادہ آرام دہ تھا۔ افسوس ہاں۔ ایسے موقع قوم کی تاریخوں اور تجربہ میں ہیں جب کہ وہ اپنی قوم یا فرد کے حق مغال کی طرف سے بہری ہو جاتی ہے۔ اس کی ترقی کو بھول جاتی ہے۔ ترقی کی کوشش کو اپنی بے معنی یا پست جتنی سے بے کار یا مصلحت کے ظان سمجھتی ہے یا اس قوم فروشی کی قیمت پانچ ہوئی ہے کہ تم تنہی کیا معنی، ترقی میں یا اس اور جڑ میں آ رہا تو وہ مفلوج ہو جاتی ہے اور مرض اس کے رگ و پے میں اس طرح سرایت کر تا جاتے ہے کہ آخر میں اس کی زبان بھی حرکت سے ہلاکتی ہے اور غویوں کے اعتراف کی جرأت نہیں رہتی۔ اور اپنی اس مفلوجانہ خاموشی کو انتہائی حلقہ کی مانند برکتی ہے۔ وہ مرنے لگتی ہے بغیر اس عوش اور درک کے کہ ہم مر رہے ہیں۔ بلکہ کسی میں زندگی کے آثار یا زندہ ہونے کے لیے ہاتھ پیر مارنے کی کوشش کو آخر میں اس متحک نگاہ اور اہلہ انداز سے دیکھتی ہے کہ گویا کوئی ایسی کوشش ناقابل معافی گناہ ہے۔

کہتا اشتر جس قدر کہہ سکتا کہ: ”اے اہل اتفاق یہ کیا یہودہ حرکت ہے کہ جس وقت دوستوں کی مراد برآئی اس وقت

تم نے فتنہ مٹا کر دیا۔ کجاست کرتا جس قدر چاہتا کہ میں تھوڑی دیر اور کوشش کی جہالت دو لیکن قوم فروش و دام پاپ کے تحے اور اپنے زیر اثر لوگوں کو اپنے روش سے ہندہ بچے تھے وہ کیوں کوشش کرتے یا کرتے رہتے وہ در کے فتح کو تھوڑی سے موجودہ فتح پر کیوں ترجیح دیتے۔ اگرچہ بعد کے شائع خود ان کے یا ان کی اولاد کے لیے کیے ہی افسوسناک کیوں نہ ہوتے۔ ایسے انتشار اور جوش کے وقت میں یہ سن کر کہ ”کیا تم اسے دوست رکھتے ہو کہ تم تو فتح یاب ہو اور امیر المومنین دشمنوں کے حوالہ ہو جائیں یا شہید کر ڈالے جائیں۔“ اب اشتراک فوارک جانا اظہار اور دلائل کی ایک مثال تھی جس کی نظیر نہیں ملتی جاسکتی۔ اشتراک یہ چشم زدن کا معاملہ عالم کے ایک زندہ کے علی کی محبت سے کہیں زیادہ وزنی تھا اور یہ فعل اس امر کے بھنے کی بھی ہے کہ اشتراک یہ کوشش، جوش اور توجہ کس لیے تھی؟ رکھنا کس کے لیے کرتا؟ جب علیؑ نہ سنے! فتح و علیؑ کی خوشی کے لیے تھی علیؑ فتح کے ضمن میں نہ تھے اب تلوار کیا کرتا؟ اشتراک چاہتا کہ میں زندہ واپس جا کر علیؑ کی صورت نہ دیکھتا لیکن اسے پسند کرتا کہ علیؑ کو زندہ دیکھ لیتا۔ اس وقت علیؑ کی ایک نگاہ اس کے لیے تسکین ہو سکتی تھی۔ علیؑ کی ایک سانس اس کا نایہ حیات اور علیؑ کی ایک نظر اس کے روح کی گری تھی۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اپنے کثیر التسم (جانب امیر کا غلبہ) کا چہرہ افسردہ دیکھ کر اشتراک جوش کھاتا ہوا خون رگوں میں سرد نہ ہو گیا ہو گا۔ اپنے بھول کو بس ہزار کاٹوں میں گھرا دیکھ رہا تھا اور وقت نہ تھا کہ کسی فوجی قتل و حرکت سے اپنے بہت کو اپنے سپاہیوں کے ہلقہ میں لے لیتا۔

نازک موقع

سراغ تم نہیں ہوتا کہ کس جگہ سے ایسی قوم فرد شانہ کا دروئی شرع ہوتی جب کہ اشعث بن قیس مع اپنی گستاخانہ مند اور اپنے پیشتر کے واقعات کے سامنے کھڑا ہے۔ وہی اشعث جو کبھی دجہ علیؑ کا حامی تھا جس نے پھر اپنے کو فروخت کر دیا۔ جو پھر علیؑ کے زیر نگین آئے۔ اس کے قبل کہ علیؑ کی شرکت کرنے پانہ کرنے میں متردد ہوتا۔ اسے بیت المال کے متعلق بھی دی تھی تھی۔ پھر شریک ہوا اور اب پھر وہ گیا جس سے بڑھ کر کسی نے نقصان نہیں پہنچایا۔ اس کے انداز میں کہیں سے بھنے اور محض استدعا کرنے کا میلان نہیں پایا جاتا بلکہ اس کی اس امر پر مستعدی کہ جو کچھ ہم کہہ رہے ہیں وہی کرو۔ صاف ظہر کرتی ہے کہ اسے اسی امر کا دام ملتا تھا کہ تم جس طرح ہو سکے جنگ کو موقوف کرو۔ اس وقت کے متعلق اکثر ایسے آثار ملتے ہیں جس سے یہ سمجھا جاسکے کہ کچھ لوگ تھے جنہیں ایک جگہ چکا روزگار مل گیا تھا کہ وہ معالیہ سے اس دھکی سے روپیہ وصول کریں کہ علیؑ سے نہ مل جائیں اور علیؑ کے لشکر میں رہ کر معالیہ کے روپیہ سے ملک حرام بنے رہیں۔ اشعث کی بے جا بند بہت صبر آتا تھی۔ عجب نہ تھا کہ اشتراک سے سخت کھڑی ہوئی اور دور نہ تھا کہ آپس میں تلوار چل جاتی۔ اور پھر ایک افسردہ سرے سے جنگ کرتا۔ یہاں تک کہ امیر المومنینؑ کے لشکر میں دو صفیں ہو جاتیں، اور ایک خوفناک جنگ شروع ہو جاتی۔ وقت تھا کہ جانب امیرؑ کی ذات اقدس اور اس کا وزن کام آتا۔ اور کوشش فرماتے کہ باوجود اس صاف بگڑی ہوئی صورت اور باغیوں سے رشتہ کی قطع کھننے کی مانت کی یہاں تک بہت بنی رہ سکتی ہے اور کام ہاتھ میں رکھی جاسکتی ہے کہ اس نقصان میں یہ مزید خطرہ شامل نہ ہو جائے کہ معالیہ باغیوں کو اس طرح ملے کہ وہ فوراً جنگ پر مستعد ہو جائیں۔ علیؑ کا خیال ہوئے اور اس جوش خیز حالت کو سرد کیا۔ اور اب باغیوں نے اپنے چہرہ سے علیؑ کی مخالفت اور ان کے ساتھ بے ایمانی کا رہا سا ہار پرہ بھی ہٹا دیا جب کہ انھوں نے مسلمانوں کے امن کے تصفیہ اور جانب امیرؑ کے دلائل کے لیے ابو موسیٰ کو نہ صرف منتخب کیا بلکہ اصرار کیا۔ اور پھر جانب امیرؑ نے فرمایا کہ: ”جو چاہو اور جو تمہاری

کچھ میں آئے وہ کرو۔ یہ بھی ہونے والا تھا کہ عہد نامہ سے ”امیر المومنین“ کے لفظ کے محو کرنے پر اشعث ہی اصرار کرتا کیسے ہو سکتا تھا کہ اشعث اس عہد نامہ پر اپنے دستخط کرتا

سوچا اگر تم سوچ سکو کہ یہ عہد نامہ جناب امیر کی طرف سے تھا اور اس کے بدلے کے ذمہ دار جناب امیر ہیں یا ان پر اس عہد نامہ کی پابندی لازمی تھی۔ پھر بھی جناب امیر نے رشتہ کو اپنے ہاتھ سے جانے نہ دیا، جب تک کہ قاتل کے خیز نے اسے کاٹ نہ دیا۔

ناقابل بیان حالت جناب امیر اس طرح واپس ہونے کے صفیں کے میدان میں اپنی فتح کو چھوڑ آئے۔ جناب امیر کا لشکر اس طرح واپس ہوا کہ پہلے تو وہ اپنے خون بہاتا کہ فتح کرسے اور جب فتح پر ہاتھ رکھنے کا موقع ہوتا تو ہاتھ اور فتح کے درمیان اپنی تلوار رکھ دیا، اور منہ پھیر لیتا کیسے کہوں کہ جناب امیر میں اس سے دل شکستگی نہ پیدا ہوتی ہوگی اور ان کے ہی خواہوں کو یا اس اپنی صورت نہ دکھائی ہوگی۔ کیونکہ نہ کہوں کہ فتح امامت کے پر والے اپنے مرکز قربانی کی اداسی سے سر ٹکرا رہے ہوں گے، جھلاہٹ، غصہ اور افسوس پیدا ہو رہا ہوگا۔ اور وہ گم ہو گئے ہوں گے کہ اب ہم کیا کریں۔ چوٹ لگی تھی بغیر اس کے کہ اس چوٹ کھانے کے نیچے چار ہوں۔ سادہ مزاج سپاہی بہادروں کی طرح جنگ کرنے گئے تھے۔ مکاروں کی طرح فریب دینے اور فریب کھانے نہ گئے تھے۔ ان کے گلان سے دور تھا کھد ہلار سے، ہلاری چلاری، ہلاری فتح، ہماری آکھہ بیہودی، اور اسلام کی امید کو اپنی ضد اور ناشنوی سے فتح کر دی گئے۔

کامیابی اور ناکامی معاویہ یہ کہتا ہوا واپس ہوا کہ ”جنگ گئے“۔ علی کے سپاہیوں کی تلوار اپنے گردن سے دور ویچ کر اطمینان سے سانس لیتا ہوگا۔ چند گھنٹے تھے کہ شام اور اس کی حکومت پیشہ کے لیے اس سے رخصت ہوئی۔ اس وقت کو اس نے بھلا بھی اس کی کامیابی تھی۔ علی کو اپنی فتح ملی تھی ان کی ناکامی تھی۔ معاویہ اس مفید تجربہ کے ساتھ واپس جا رہا تھا کہ علی اور ان کے لشکر پر تلوار سے فتح نہیں حاصل کی جاسکتی، بلکہ اب اسے دوسرے ذرائع معلوم ہو گئے تھے۔ یہ نسبتاً کم خدوش اور زیادہ مفید تھے اور اس میں ذرا شبہ نہیں کہ صفیں کے بعد بھی مصلحت اپنا مل کر رہی تھی۔

مجھے حکم کی کارروائی کی کوئی شرح نہیں کرنی ہے۔ نہ اس کی ابتدا پوشیدہ ہے نہ اس کے کارکن پوشیدہ ہیں۔ مجھے اس وقت صرف حضرت عمرو بن حاص کی چوٹی کی کوششوں سے بحث ہے کہ معاویہ کی دکان کچھ غدوی بندہ زلادہ کی سفارش سے نہیں چمکتے۔ اپنے اس اظہار مصلحت کی موافقت سے کہ کل دنیا حکم قدیر سے وابستہ ہیں۔ کوشش کی ہے شاہد کارگر ہو جائے۔ لیکن بہت کچھ اس سیلان کے پھرری سے جس کے آثار دکھانے جاتے رہے ہم کہوں نہ ہوں چل گئی تو خیر در نہ ایک ٹھکانا تو ہے ہی۔ اور اس سے کم منہک یہ کوشش نہ تھی کہ: ”یہ کام تو ایسے شخص کو سپرد کرنا چاہیے کہ جس کے دانت ہوں جس سے وہ کھانا پیتا ہو“۔ اپنے موقع کے لحاظ سے ابن حاص یا اس کے ہم خیالوں کا یہ کہنا کسی طرح غلط نہ تھا۔ جب کوئی خود کھانے سے احتیلا کرے گا تو اس کا کب روادار ہوگا کہ دوسرا کھاسکے ضرورت تھی کہ دانت والا تلاش کیا جائے۔ شکستہ دند ان پوچھ متی ان کے لیے کمی خوش ادا نہیں ہو سکتا تھا۔ ایسے لوگوں کے ہوتے ہونے یہ سوچنا کہ علی

دلی امر ہوئے والی امر ہوتے ہوئے ان کو راحت چلاتے ہوئے دیکھنا ان اور رات کو ایک وقت دیکھنا ہوگا۔
حکیم کی کارروائی کا نتیجہ معاویہ کے لیے مفید نہ تھا
 حکیم کی کارروائی سے زیادہ اہل شام اس پر خوش
 ہو گئے کہ ہمارے دیکھل کو ایک سیاسی فتح حاصل ہوئی۔ لیکن یہ ایک فتح تھی جس سے اہل شام کو کوئی مزید فتح نہیں حاصل
 ہو سکتا تھا۔ وہ معاویہ کو اس کے پیشتر ہی اپنا مرکز امید اور امیر سمجھتے تھے۔ علی کے لشکر کو اس فریب سے جھٹکا نہیں دیا
 اور یہ لوگ اسی جگہ بنوک شمشیر تعفیت پر آمادہ ہوئے۔ ان میں اور تمام لوگوں میں اہل شام کی مکارانہ کارروائیوں کا جو اثر پڑا
 وہ اضافی حیثیت سے معاویہ کے طاقت تھا۔ اس کے عکس میں یہ جناب امیر کے لیے مفید تھا جن کی رائے اور روش کی
 صحت اس عام لوگوں پر ظاہر ہوتی جاتی تھی۔ اور وہ تاسف کر رہے تھے کہ کیوں ہم نے امیر المومنین کے حکم کو نہ سنا اور
 تساہل جائز رکھ کر جناب امیر نے اعلان فرمایا کہ: ”اس حکم و فیصلہ سے اللہ اور اس کا رسول اور صلوات اللہ علیہ اجمعین بری ہیں، لہذا
 تم لوگ شام پر حملہ کرنے کی تیاری کرو۔“

نئے جوش سے علی نے تیار شروع کی۔ صرف بصرہ اور کوفہ کے فوجی مقامات نے جس قدر جنگ دیدہ اور ردین
 دیکھا کر دیے اور وہ اس کے لیے بہت کافی تھے کہ معاویہ کی اس قدر فوج کا جو وقت ملنے کے قبل میدان میں لانی پاسکے،
 کامیابی سے مقابلہ کرے۔ ملاحظہ نہ ابھی ان دونوں مقامات کے ذرائع ختم ہونے تھے اور نہ دیگر مہمات سے مدد طلب کی
 گئی تھی۔ اس زمانہ میں خوارج کی سرگرمی زیادہ ہونے لگی۔ جناب امیر کی نگاہ ان کے ساتھ ساتھ تھی اور جو مقامات فوجی
 حیثیت سے اہم ہیں روک سکتے تھے خبردار کر دیے گئے تھے۔ یہاں تک کہ خوارج گھیر کر نہروان میں لائے گئے۔ معانی اور
 پناہ کا نشان قائم کیا گیا جس نے ہزاروں جاہل پائندہ اور جب یزید کے چارہ نہ ہوا تو دشمن کو دو طرف سے ہزاروں
 نے دبا دیا اور پیلاے جنگ کی عملی صفت میں ہے۔ یہاں تک کہ خوارج کو ان کی ناشنوی نے تباہ کیا۔ اور خوارج کی ان
 سختیوں اور انحراف کے باوجود جناب امیر نے ان کے زعمیوں کو اپنے جراح کے حوالہ کیا۔ قیمت میں صرف اسلحہ جنگ اور
 مویشیات تقسیم کی گئیں۔ گرفتار مرد اور عورتیں رہا کر دی گئیں۔ ظاہر ہے کہ یہ گروہ نہ بڑا ہوتا اگر قصہ قرآن نہ ہوتا۔

سپاہیوں کے عذر کے معنی
 خوارج کی جنگ کے بعد جو فوجی کارگزاری کی حیثیت سے ایک بڑی
 شاندار فتح تھی، جب جناب امیر نے شام کی روانگی کا قصد فرمایا تو کس اور

زخم کا عذر کیا گیا اور آج بھی گویا فوج کا مقرر اشعث بن قیس تھا۔ جناب امیر نے وقت کے حذر کو منظور نہ فرمایا۔ لیکن پھر
 بھی فوج کے عذر کا کاغذ کر کے کوفہ تشریف لائے اور غلیلہ کو مرکز قرار دینے کے بعد عام حکم دیدیا کہ ”کوئی شخص اپنے مکان
 پر نہ جائے جب تک دشمنوں کے طرف خروج نہ کر کے فتح پایا ہو۔“ لیکن ملاحظہ کیا کہ اکثر لوگ اپنے گھروں کو داخل
 گئے تھے اور ”نہایت کم آدمیوں نے شام پر فوج کشی کی خوشی ظاہر کی۔“ ان واقعات سے کچھ میں آتا ہے کہ اگر جناب امیر
 نہروان ہی سے شام کی طرف روانگی کا اصرار کرتے تو جس طرح غلیلہ سے لوگ خلاف ورزی پر آمادہ ہو گئے اسی طرح اشلانے
 راہ یا شام پہنچ کر کنارہ کشی کرتے۔ جناب امیر نے انہیں ہانپنے کے لیے غلیلہ تک اپنے حکم پر اصرار کیا اور یہاں فوج کی
 سرتابی سے انہیں وہ قصاص نہ ہونے پایا جو دشمن کے مقابلہ میں منظور ہو سکتا تھا۔ کیا یہ واقعات کہیں سے اس میں شبہ

رکھتے ہیں کہ علی کے اکثر افسران فوج اس کی تجاویز پر عمل آوری کے لیے بھی آمادگی ظاہر نہ کرتے بلکہ آگے بڑھ کر تو یہ بھی طے پا گیا کہ اور شام کے لشکر سے بھی نہیں چکند نہ کرنا یعنی یہ شام کے لشکر کی شیرزنی کا خوف نہ تھا جس کا علی کے سپاہوں پر سکھ جاوے۔ جنہیں یہ ایک دودھ نہیں بلکہ اکثر روند کر آ رہے تھے۔

جناب امیر کے واسطے اور بائیں بازو

محمد بن ابی بکر پر محمد اشعث بن قیس کے حالات دین اور قوم فدوی کا علی نمونہ ہیں۔ یعنی اس نے معاویہ کو اپنی طرف سے مطلق کر دیا۔ بقیہ دو مشاہیر میں سے ایک دور کے مصر میں خفیہ سازشوں کا اس طرح بھڑکا ہوا کہ مصری باغی اور شاہی فوجوں میں گھر جاتا اور سیاسی حالت میں ”مردار گدے کی کھال میں بھر کر جلادیا“۔

جناب امیر مصر کے واقعات سے واقف تھے اور بہترین انتظام یہ کر سکتے تھے کہ اپنے بہترین عامل کو اس کے انتظام کے لیے روانہ کرتے۔ لیکن افسوس وہ پہلے درجے کے حکمرانوں کے سلیب میں مرنے کی عید ہوئی جو اس طرح مرنے پر تاحقا اس کی موت کو نامرد اور مکار دشمن زہر کے چند خاموش قطروں سے غریب تاکہ اس کی تلواریں محفوظ رہے اور پہلے اور اس طرح دم توڑتا کہ اس کا سر جناب امیر کے زانو پر نہ ہوتا اور جس وقت اس لاشنی شجاع مدبر اور عامل کی خبر موت سن کی علی چونک اٹھے اور یہ فکا کر اشر کے گھنے میں مدد دیتے کہ: ”عورتیں مثل اس کے دوسرے نہیں گی۔“ امیر شام کہتا کہ: ”خدا کا لشکر شہد کی کھینچوں میں ہے!“ ان دونوں دھندلے دوست اور غلاموں کی موت نے علی کا موجد کردہ ایسے فی الحال میں اس سے کم شکین نہ ہوگی کہ ہمارے واسطے اور بائیں بازو چونکہ اور مصر کے ایسے زرغین اور مفید مقام پر ہمارے محل اور دوست علی اور ضرورت کے وقت ہم انہیں اپنی مدد اور تسکین کے لیے طلب کر سکتے ہیں۔ امیر المومنین ایک کو ”مہیاں مانج“ اور دوسرے کو ”پھر مہیاں“ فرماتے تھے۔ لیکن افسوس کہ یہ ایسا ہمیشہ کے لیے منقطع ہو گئی۔ یہ دونوں دل جو علی کی محبت کی گری سے دھڑکتے تھے سرد ہو گئے بغیر اس کے کہ انہیں ایک دوسرے پر لسنے والی فخر ڈالتیں۔ اور جبر سے جدا ہوتیں۔ کھچتیں مگر پھر لپٹ جاتیں۔ ان دونوں شریف النفس حق پسندوں کی خبر موت سن کر جو کچھ جناب امیر نے فرمایا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جناب امیر کا ایسا فاقی النفس ہمدرد کس طرح ہوتا ہے۔ میں تصدیق نہیں کر سکتا کہ اسے مرثیہ کہوں یا مدح کہوں، یا خصال نگاری کہوں یا سب کہوں۔ اور سب میں متین درد کا آہنگ محسوس کروں۔ تاسف اور زیادہ شدید ہوتا ہے جب امیر کی یہ حکایت بھی ملتی ہے جو جناب نے ابن عباس کو تحریر فرمائی تھی کہ: ”میں لوگوں کو اس سے ملنے ہونے کی حرص اور اس واقعہ شہادت سے پہلے اس کی فیاداری کے لیے حکم کرتا تھا بعض تو ان میں سے کراہت اور بے رفتی کے ساتھ اس حکم کو قبول کرتے تھے۔ بعض جھوٹے ہذر کے ساتھ اعتبار سے کام لیتے تھے۔ بعض تارک چلا ہو کر اپنے گھر سے بھی نہ اٹھتے تھے۔“

جناب امیر کام کرنے والے نہیں پاتے

ان مثالی دوستوں کو تلاش کرتے اور ان کی ناموجودگی کو سختی سے محسوس کرتے۔ اب لوگ جوتے جنہیں فرماتے کہ:

”اے مرد صورت تو حاکم تم میں کوئی مرد نہیں ہے۔ اے خواہجہ نے اطفال، اے حقول زمان جملہ نشیمن میں اس بات کو دوست رکھتا تھا کہ تمہیں نہ دیکھوں اور تمہیں نہ پہچانوں۔ تمہاری اس جان پہچان نے پیشانی کے دروازے کو کھل دیا ہے۔ تم نے اپنے صہبان اور نافرمانی کی وجہ سے میری رائے اور تدبیر کو بھی قلمبند کر دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ رائے اور تدبیر اس شخص کے لیے سودمند نہیں جو اس پر عمل کرنے والا نہیں۔“ کیسے نہ فرماتے جب یہ ملاحظہ کرتے تھے کہ دشمن کے چھوٹے چھوٹے دستہ شہروں اور سرحدی مقامات پر نقص امن کے لیے حملہ کرتے رہتے ہیں۔ ہم آدمی کاٹش کرتے ہیں اور نہیں ملتے۔ خصوصاً جب کہ دشمن کی جرات اور شجاعت محض حملہ تک رہتی ہے اور اس وقت شکست کھا کر بجائے کہ جب مجرب بن ہدی اور قیس بن سعد وغیرہ کے ایسے بچے ہونے و فکار فوج لے کر سر پہنچ جاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ دشمن کی جرات اس علم پر تھی کہ ہم نے اکثر سرداران لشکر کو غرور لیا ہے۔

ادائے فرض کی مثال

علیؑ ادائے فرائض کی تہا اطفال و بچاؤ دیتے ہیں۔ جب وہ جیت کے تاراج کی خبر سن کر ایک شعلہ یازمیر کی فیلا سے متاثر ہوتے ہیں اور خود روانہ ہونے کا ارادہ ظاہر فرماتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ ان خبروں کو سن کر اگر ”کوئی مسلمان افسوس کرتا کہ تاراج ہانے تو اسے ملامت نہیں کی جاسکتی بلکہ وہ اسی مرگ کا سردار ہے۔“ فرماتے ہیں کہ: ”مجھے اس قوم (بنی امیہ) کی طرف سے یہ گلہ ہے کہ وہ تمہاری بد مختاریوں سے فائدہ اٹھا کر تمہیں اپنی رعایا بنائے گی اور تم اس کے فرائض دار ہو جاؤ گے۔“ ارشاد کرتے ہیں کہ: ”تم میرے بہتر بنی امیہ کو بہت برے حاکم اور خداوند بناؤ گے اس کاٹنے والی اڈنی کی طرح جو اپنے ٹھ سے کاٹی ہو اپنے ہاتھوں سے زمین کو کوٹی ہو اپنے پاؤں سے لائیں مارتی ہو اور اپنے دودھ سے شیش کرتی ہو۔ وہ تمہیں برابر ازیت پہنچاتے رہیں گے یہاں تک کہ ایک شخص کو بھی تم میں سے ایسا نہ چھوڑیں گے جو انھیں تیغ نہ پہنچائے یا ان کے نزدیک اس کا نفس بے حضرت نہ سمجھت ہو۔ ان کی باتیں تم پر مسلط رہیں گی۔ جب تک کہ تم میں سے ایک ایک شخص اس کا ظلم نہ بن جائے۔ اس وقت تمہیں میری قدر معلوم ہوگی۔ اور اس وقت قتل کرو گے کہ تم سے اس چیز کو بالکل قبول کر دو جس کے بعض حصوں کو طلب کر رہا ہوں اور یہ بھی مجھے دینے سے انکار کرتے ہو۔“ افسوس کہ اس کا ایک ایک مصلحت سمجھتا ہوا بد شہادت امیر المومنینؑ لوگوں کے یہ اقوال ملتے ہیں کہ: ”اس وقت ہم بعینہ ان بکریوں کے گلہ کی طرح تھے جس کا کوئی گلہ مان نہ ہو اور جیسے ہر طرف سے تلچہ جارہے ہوں۔“ دیکھو کہ اب وہ نہ تھا جس کے لیے تاریخ المظاہر میں یہ روایت مل سکتی کہ: ”آپؑ نے خلافت کو نہ صرف دی خلافت نے آپ کو زینت نہیں دی، اسے آپ کی بڑی ضرورت تھی بہ نسبت اس کے کہ آپ کو اس کی ضرورت ہوئی۔“ علیؑ ملامت کرنے سے چپ نہیں ہونے جب تک اپنے سفینے والوں سے یہ بھی نہ کہہ لیا کہ: ”میں اس چیز سے خوب واقف ہوں جو تمہارے فتنہ و فساد کی اصلاح کر سکتی ہے۔ تمہاری کمی کو سپردھا کر سکتی ہے۔ جابر اور ظالم بادشاہوں کی میاستوں کا تمہارے ساتھ مل در آمد ہو سکتا ہے۔ مگر میں اپنے نفس کو قلمبند کرنے کے تمہاری اصلاح نہیں چاہتا!“

علیؑ کی حالت کس قدر مثالی رہی

اس بلند اظہار خیال کو یہ غرض حاصل ہے کہ اہل عالم کی زبانوں میں علیؑ ہی کی زبان لدا کرتی۔ نافرمانی کی ان حالتوں میں وہ کچھ دار

دوستوں کی کئی یا کم چھپانے سے جو لوگوں کے قریب کھاجانے سے جو اس خیال سے جو کہ ہم میں مساوات بنی جاتی ہے۔ یا اس وجہ سے جو کہ جب ہم فتح کرتے ہیں تو امیر المومنین میں دشمنوں سے پورا فتح نہیں اٹھانے دیتے بلکہ خلافت امیر رحم فرماتے ہیں۔ پھر بھی ایسا کان نہیں کیا جاسکتا تھا کہ ایسا ہی کہیں ہو گا کہ دشمن بیز معز کے تمام مقامات سے قتل باہر کیا جاسکے۔ اس لیے کہ جناب امیر خاموش نہ ہوں گے جب تک اعظام نہ کر لیں۔ انھیں ہر مقامات سے متواتر خبریں ملتی رہیں گی اور براہ راست ہاری رکھیں گے غریب سے غریب کس سپر س عورت اور بڑے سے بڑے صوبہ کا حامل دونوں ان کی نگاہ کے سامنے رہیں گے۔ ایک کی دلاوری کر لینے کے بعد اگر نماز شروع کی جائے گی تو دوسرے کو صاف بے لوث ملامت کی جائے گی اگرچہ وہ ابن عباس یا عقیل بن ابی طالب کیوں نہ ہوں۔ ہمیں کوئی خبر نہیں معلوم کہ جناب امیر نے مصر پر دوبارہ اختیار حاصل کرنے کے متعلق کیا ارادہ فرمایا تھا لیکن جو باہت واضح ہے وہ یہ ہے کہ جناب امیر بکھرے ہوئے تھے کہ چھوٹا ایک امیر شام قائم رہے گا ہر روز اسی طرح کی ایک نئی شورش بھا کرے گا اس پر کاری ضرب لگتا ان چھوٹی چھوٹی لڑائیوں کا انداد ہو گا۔ جناب امیر اس کوشش سے کبھی باز نہیں آنے تھے یہاں تک کہ وہ وقت آیا کہ قیس بن سعد اور ابوالایب انصاری دس دس ہزار سپاہوں پر افسر مقرر کیے جاتے اور اب حسین بھی مصر کے جنگ میں اس درجہ اور اس حیثیت سے شریک ہو چکے تھے کہ ان کی تہاذیب داری پر دس ہزار سپاہی ماتحت کیے جاتے۔ جناب امیر کے پاس اب تک ان کے علاوہ بھی ایسے سردار تھے جن پر اعتبار کیا جاتا۔ کوئی شبہ رواں نہیں نہ تھا بلکہ چند ہی روز غالباً دس روز بھائی رہ گئے تھے۔ غالباً اختتام ہمارے محاصرے کا انتظار ہو کہ ابن عجم اپنا کام کر لیا۔

ہیں ابن عجم کی عشق بازی کی داستانوں کو یا ان روایتوں کو کہ ایک ہی دن قاتلوں نے جناب امیر، معاویہ، اور ابن عباس کو قتل کرنا چاہا۔ وہ داستانیں بھتا ہوں جو واقعہ کے چھپانے کے لیے سننے کے قابل بنائی گئی ہیں۔ بلکہ میرا قطعی تصدیق ہے کہ یہ تینوں شخص معاویہ کے بھیجے ہوئے تھے کہ وہ جناب امیر پر پوشیدگی سے وار کریں۔ اور ان لوگوں نے ایسی جگہ رہنا پسند کیا تھا جہاں نہ صرف ان قاتلوں کی موجودگی کی خبر جناب امیر کو نہ پہنچ سکتی بلکہ وہ خارجیہ بھی ہوئی۔ قاتل رئیس قبیلہ نہ تھا کہ وہ ایک ہزار کی گوارہ رکھتا اور اگر رکھ بھی سکتا تو ہوتا بھی تو سپاہوں کا یہ قاعدہ نہیں ہے کہ وہ اپنی گوارہ کو زہر آلود کیا کریں۔ اور اس پر زہر چھوٹانے کے لیے ایک ہزار اور صرف کریں، ایسا بھی ہو گا لیکن قلعہ کے اختیار اختتام کے وقت ابن عجم کا جواب کہتا ہے کہ اس میں جناب امیر پر حملہ کرنے کا خلیق خیال ہی نہ تھا۔ ایسی صورت میں یہ ممکن نہ تھا کہ وہ پیشتر سے ایسی گوارہ رکھتا اور اگر نہ تھی تو کہیں سے دفعہ پیدا ہو گئی۔ اور اگر یہ بھی فرض کیا جائے تو صرف ابن عجم میں اشتہار دیوانگی ایسی پیدا ہو سکتی تھی کہ وہ جان پر عمل کر شہد ہو تاکہ یہ ممکن تھا کہ دو اور عاشق بھی دفعہ تیار ہو جاتے اور پھر لڑی رقابت کے باوجود سبوں میں حملہ کی ہم آہنگی پیدا ہو جاتی۔ اور اگر دوسرے دونوں عاشق نہ تھے تو بلا وجہ ان میں ایسی ہم کاپیہ امتدادیابی بعد از قتل ہے۔

اب سوچئے کہ جو شخص عبد اللہ بن بدیل، ہاشم بن عقبہ اور عمار یا سر کی شہادت سے اس لیے خوش ہوتا کہ وہ علی کے سے دوست ٹھہرے اور یہ سن کر کہ اشتر کے مصر میں پہنچ جانے پر کوئی افسوں کا رگ نہ ہو کہ اہتمام کرتا ہے کہ سردار کے رفیقہ کو ہلاک کرے اور زہر آلود شہد خیار رکھے کہ یہ غیر متوہم مہاں سانس تک نہ لے۔ جو وجہ علی کے کمزور کرنے

کے لیے ہر اس شخص کو جس کی مدد علی کے حق میں مفید سمجھتا ہے روپیہ اور حکومت کی لالچ دیتا ہے وہ خود اس شخص کے معرودہ کرنے کے لیے کس سرگردانی میں مبتلا ہو گا جو مرکز تھا اور جس کے گرد تمام ایسے لوگ جمع ہوئے تھے جن کی موجودگی معاویہ میں تزلزل پیدا کرتی تھی۔ حقیقت میں یہ خبریں کہ معاویہ نے تین آدمی بھیجے کہ وہ کوفہ جا کر دریافت کریں کہ معاویہ پہلے مرے گا یا علی، اور اس کے لیے کوفہ جا کر معاویہ کی موت کی افواہ مشہور کریں۔ ہو سکتا ہے کہ اسی طرح مشہور کی گئی ہوں جس کا لاطینی منشا علی کا قتل ہو، اور جناب امیر کو اس وقت بھی یہ فرمانا ہو کہ: "معاویہ نہیں مرے گا جب تک میرا سر خون سے رنگین نہ ہو لے اور وہ اس سے طمع نہ کرے"۔ اور کس قدر عام ہوگی یہ خبر کہ معاویہ کو علی کے انتقال یا قتل سے خوشی ہوگی جس سے یہ روایت ہو سکتی کہ برک معاویہ کو شہادت علی کی "خوشخبری" دیتا ہے اور معاویہ اس درجہ اپنے اوپر حملہ کرنے والے کو مزادینا بھول جاتا ہے کہ فوراً غم سے یہ فقرہ نکلتا ہے کہ: "شاید وہ اس امر پر قادر نہ ہوا ہوگا۔" جس کا کہن اس ترجمہ کا مخدج نہیں ہے کہ اسے کاش وہ اس امر پر قادر ہوا ہو۔ اور قاتل اس امکان سے تسکین دیتا ہے کہ: "ان کے ساتھ کوئی مصلحت نہیں رہتا"۔ کیا اس جواب میں جناب امیر کی قتل و حرکت کا مطالعہ مخفی نہیں ہے۔ میرے نزدیک اس سے صاف کئی امر نہیں ہے کہ جو تین قاتل امیر المومنین کے لیے جوڑے ہوئے تھے ان میں سے ابن ظلم گرفتار ہوا اور جتنے جہاگے جن میں سے برک نے امیر المومنین کی شہادت کی خبر دی۔ یہ محض باہتمام ہے کہ: "آپ کا بھائی شب" کا فقرہ کہا گیا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ معاویہ نے اس خبر دینے والے کو مصلحت کی شدید احتیلا سے قتل کر ڈالا ہو۔ اس لیے کہ کہیں اس کے زبان سے راز ظاہر نہ ہو جائے اور آخر میں اس خبر کی شہرت سے پیروان امیر المومنین انتقام پر آمادہ ہو جائیں۔ قاتلوں کی شلیٹ صاف صاف مدبرانہ احتیلا اور اپنے ارادے پر اصرار ہے کہ اگر ایک ناکام ہو تو دوسرا اور دوسرا نہ ہو تو تیسرا اپنا ناکام کر جائے۔ اور کیا یہ دنیا کا اہم ترین حادثہ اس وقت نہیں ہوا جس وقت امیر المومنین شام کی طرف فوج کشی کی کوششوں میں مشغول تھے؟

قبول ابن خلدون "شہادت سے چند دنوں پیشتر امیر المومنین علی نے ہجرت شام ایک لشکر مسلمانوں کا مرتب کیا تھا اور چالیس ہزار آدمیوں سے موت کی بیعت لی تھی لیکن اتفاق وقت سے لشکر کشی کی نیت نہ آنے پائی تھی کہ شہید ہو گئے"۔ معاویہ لشکر کشی اور جنگ آزمائی ابھی طرح دیچ چکا تھا کہ علی کے دوستوں میں جس درجہ صفین کے التو سے جھلپٹ پیدا ہو گئی ہے اور جس درجہ مکاریوں کی خبر مشہور ہو گئی ہے اس سے کسی نئے فریب کا کارگر ہونا دشوار ہے اور اس پر اختیار سے دست بردار ہونے یا مارے جانے کے کوئی چارہ نہ ہوگا، اگر اس مرتبہ علی مصلحت شام تک اپنا لشکر لے آئے، زہر کا موقع نہ تھا اس لیے کہ ان دونوں جناب امیر ایک روز اپنے فرزند حسن اور دوسرے روز اپنے فرزند حسین کے گھر اظہار فرماتے تھے پھر ایسے آدمی کیوں نہ تلاش کرتا جو کعبہ کے مولود اور کعبہ کے پاک کرنے والے کو قتل کر سکتا خانہ خدا میں شہید کرتا، آئندہ باب میں معاویہ کی ایسے ہی کوششوں کی اور مثالیں دی جائیں گی۔

مصلحت بنی آدم کے جانشین کے آخری وصایا
لیکن اس بندہ مافوق انسان کو اس کے قبل گزرنا نہ تھا جب تک وہ اپنے فرمانے کے قابل اپنے استلا کی ایک صحت کو حاضرین سے نہ کہہ لیتا کہ: "اپنے درمیانی تنازعات کے مصلحت بنو"۔ آنحضرت فرماتے

تھے کہ: ”اپنی ذات اور اپنے گروہ کی اصلاح تمام روزہ و نماز سے افضل ہے۔“ علی کا تمام ایام جوش اسلام اور مسلمانوں کی فکر بہبودی میں صرف ہوا تھا کیسے علی گوارا کرتے کہ جس قدر دیر موت کا عالم طاری ہونے میں ہاتی ہے اسے ایسی بڑی نصیحت میں صرف نہ کریں جس کے بغیر نہ کوئی قوم قوم ہے، نہ کوئی اخلاق اخلاق ہے، نہ کوئی مذہب مذہب ہے، نہ کوئی فرد انسان کہے جانے کے قابل ہے۔ کاش ہم میسوی مدی کے مسلمان اسے سنتے۔ آج سنتے۔ کل سنتے۔ یہ کچھ کراب اپنی حیات کے لیے سنتے کہ جس قدر دیر کریں گے اسلامی اتحاد و اتفاق کو ہنسوائیں گے اور اپنے پرزے زیادہ کرتے جائیں گے۔ لیکن اس محسن اسلام کو ایک اور بڑی نصیحت اور آخری احسان کرنا تھا اور جس کا تعلق محض اپنی ذات سے تھا۔ اور وہ یہ موقع تھا کہ کہیں بنی ہاشم ہماری شہادت کو دوسرا ہی ذریعہ نہ بنالیں جو بنی امیہ اور بنی تمیم وغیرہ نے پسند کیا تھا۔ قوت دی ہے اپنے لہجہ میں جہاں سنسنا یا ہے کہ:

”اے اولاد عبد المطلب! میں تمہیں ایسی حالت میں نہ پاؤں کہ تم مسلمانوں کے خون میں سرے پاؤں تک رہیں ہوتے پھر، اور کہتے جاؤ کہ امیر المومنین قتل ہو گئے امیر المومنین قتل ہو گئے۔“

میرے قیاس سے باہر ہے کہ خوشنواہن عثمان کی کارروائیوں پر اس سے زیادہ کسی واقعہ تاریخی سے روشنی پڑ سکتی ہے۔ کیا موقع ہے۔ کیا فیصلہ ہے۔ کس طرح فرمایا ہے۔ طعنے، افوس ہے، عداوت ہے اور نصیحت ہے۔ ہادی النظر میں اس قدر فرمایا کافی تھا۔ مگر نہیں، جناب امیر نے شرح بھی کر دی۔ اور سنسنا دیا کہ:

”آگاہ رہو کہ میرے قاتل کے سوا کوئی دوسرا شخص قتل نہ ہونا چاہیے۔“

یہ سب اس لیے کہ میرے بعد بھی مسلمان قتل نہ ہوں۔ آپس میں نہ لڑیں، ان کا رحم و کرم اپنے قاتل کو بھی نہ بھولا۔

کہاں سے اپنے احساظ میں یہ درد لاؤں جو یہ اثر پیدا کر سکے کہ زمانہ

اس مسلمان سے خالی ہو گیا جس کی عظیم الشان منزلت پر

تیرہ صدیوں کے گہرے پرے پڑے اور بڑے بڑے

تمیزات کے بعد آج بھی عالم کے تیس کروڑ

سے زیادہ مسلمان ادب، اخلاص،

اور احسان شناسی سے

متفق ہیں

باب ششم

بنی ہاشم کا دائمی زوال

شہ رمضان المبارک

اس باب میں اب ہم ان تذکروں تک پہنچے ہیں جہاں یہ کوشش اپنے کمال کو پہنچ گئی کہ صاحب اثر لوگ خالد بن بنی ہاشم کی کوئی ایسی مدد نہ کر سکیں جس سے ان میں اپنے اختیارات پر قابض رہنے کی قوت باقی رہے۔ پیشتر اگر وقت تھا کہ بنی ہاشم سے جھگڑا پیدا کیا جاتا اور لوگ اس طرح مشغول کیے جاتے کہ وہ بنی ہاشم سے اپنی ضرورتوں میں مستثنیٰ ہو جائیں اور مشغولیت ان کی طرف مائل نہ ہونے دے تو اب وقت آیا ایسی مصلحت کا شو ہوا کہ بنی ہاشم کے قلعہ ضعیف اور بے اثر کرنے کے لیے ان کے سب دشمن کا حکم اعلان ہوا اور ان کا ذکر احماد اور سیاسی جرائم سے بھی زیادہ سنگین بکھا جانے لگا۔ پھر اس کے بعد ان کے دوستوں سے متواتر اور مسلسل وہ برتاؤ کیا جانے لگا جو ان کی مصدومیت کا باعث ہو۔ بلکہ قتل اور زہر اس وقت تک مخفی یا علانیہ طور سے استعمال کیا جاتا رہا۔ جب تک علی اور فاطمہ کی اولاد میں سے کوئی امام باقی نہ رہے۔

امیر المومنین کے دشمن سے فارغ ہو کر آپ کے فرزند اکبر حضرت امام حسن مجتبیٰ کی سوانح عمری نے غلبہ فرمایا جس میں نہایت میج اور توجہ کے قابل یہ بات کہی گئی کہ :

”تم میں سے وہ شخص اللہ گیا جس کے مثل محققین نے نہ دیکھا تھا اور متاخرین اس جیسے نہ دیکھیں گے۔“ اس کتب میں کسی حد تک حسن کا تعارف کرایا گیا ہے جس قدر ہماری کتب کو ضرورت تھی اور وہ اس بکھانے کے لیے کافی ہے کہ حسن نے اپنے سینیویوں برس تک عالم کے اس قدر تغیرات دیکھنے تھے جیسے کم دیکھنے کا اتفاق ہوتا ہے۔ کم سنی میں اپنا اختیار پرفوری بے اختیاری اور پھر اس میں قیام اور سختیں اور اس کے بعد پھر اختیار اور ترقی اور پھر نیکایک انحطاط اور زوال دیکھا تھا۔ زوال کی رکی ہوئی حالت تھی کہ اپنے کو اپنے پدر بزرگوار کا جانشین دیکھا۔ اس حالت میں کہ لوگوں کو تمام تر اپنی اطاعت پر آمادہ دیکھا ہو اور خطرات گرد و پیش نہ دکھائی دیتے ہو۔ بلکہ اپنی قوت کے زوال کے اسباب کو اپنی آنکھوں سے لوگوں کی نافرمانی کر بدولت دیکھا تھا۔

ان امور سے میری یہ غرض ہے کہ حسن کے متعلق کوئی فیصلہ ان کے اس لیے واقعات پر نظر ڈالے بغیر ممکن نہیں ہے جن میں کبھی وہ کوفہ کے لوگوں کو ایسی حدود و حالت میں اپنے موافق کر لیتے ہیں جہاں جنگ جمل میں تقریر کرتے ہیں اور لوگ جن میں بوڑھے صحابی، مدبر اور تجربہ کار سپاہی ہیں، جن کے وقت رسول اور جناب امیر کی تقریریں، کلام اور انداز دیکھنے اور سننے میں صرف ہوتے تھے۔ ان کی تقریروں کو پسند کرتے ہیں۔ مزید براں میدان جنگ کا تجربہ بھی عملاً حاصل تھا۔ جس طرح جناب امیر نے اہتمام کیا تھا کہ انھیں ایام ہوش سے قرار کرنا سکھائیں جس سے زبان اور خیال رواں ہو جائے

اسی طرح اپنی نگاہ کے سامنے انھیں میدان جنگ میں شریک ہونا جنگ کرنا اور فوجی افسری بھی سکھانی تھی۔ جس طرح تاویل قرآن اور علوم اخلاق کو اپنی زبان سے تعلیم فرمایا تھا۔ یہ تھے حسن۔ یعنی علی اور رسول کے دلی عہد اور جانشین۔ اور وہ ان تمام قابلیتوں میں ممتاز و مستکمل رکھتے تھے جس کی کسی ولیعہد کو اپنے موقع پر ضرورت ہوا کرتی ہے۔

بیعت کے وقت کی مخصوص حالت
بیعت شروع ہوتی اور سب کے پہلے اس نے بیعت کی جس نے صفین میں معاویہ کے خیمہ کو گھوڑ دوڑ کا میدان بنادیا تھا۔ جس پر امیر المومنینؑ کو اعتبار تھا اور جو ایک دستہ کا افسر تھا۔ میری غرض بلند بالا اور قوی، سیکل قیس بن سعد بن عبادہ انصاری سے ہے۔ کہا گیا ہے کہ قیس نے بیعت کرتے وقت کہا کہ: ”اپنے ہاتھ کو کتب خدا، سنت رسول اور قتال ظہرین کے لیے بڑھاؤ۔“ اس پر حضرت سبط اکبر نے فرمایا کہ: ”کتب خدا اور سنت رسول میں دیگر شرائط بھی شامل ہیں۔ تفصیل کی ضرورت نہ تھی۔“ اس پر بقول ابن خلدون لوگوں کو شبہ سا پیدا ہو گیا۔ آپس میں سرگوشیاں کرنے اور کہنے لگے: ”یہ تو تمہارا امیر نہیں ہے اور نہ یہ جنگ کا قصد رکھتے ہیں۔“

امیر المومنین حسنؑ، معاویہ کو اپنے بیعت کے لیے لکھتے ہیں
بیعت کے بعد حضرت نے معاویہ کو اطلاع دی کہ لوگوں نے میری بیعت کی ہے اور معاویہ کے عدم استحقاق کو ظاہر کرنے کے بعد خواہش کی کہ وہ بھی بیعت میں داخل ہو جائے۔ لیکن بقول ابن خلدون: ”امیر المومنین علیؑ کی شہادت کا حال معاویہ کو معلوم ہوا تو انھوں نے اپنی خلافت کی بیعت اہل شام سے لے لی، اور اسی روز امیر المومنینؑ کے مبارک لقب سے نپکے جانے لگے لیکن اصل یہ ہے کہ معاویہ نے بعد اجتماع حکمین بیعت خلافت لی تھی۔“ اور بقول علامہ مجلسیؒ حسنؑ کے جواب میں معاویہ کا یہ فقرہ توجہ کے قابل ہے کہ: ”میرا اور آپ کا امر مشابہ ہے امر ابوبکر اور آپ حضرت کچھ امر سے بعد وفات رسول خدا ﷺ کے۔“

جہاد پر آمادہ کرنے کا خطبہ اور لوگ
اس کے بعد حضرت نے خطبہ فرمایا اور لوگوں سے جہاد کی فضیلت بیان کی اور انھیں آمادہ کرنے کی کوشش کی اور حکم دیا کہ لوگ لشکر گاہ کی طرف نکلیں۔ لیکن لوگوں میں یوزناوشی کے تعمیل حکم نہ دکھائی دی۔ جس پر ہدی بن حاتم نے کہا: ”بحان اللہ! تم لوگ اپنے امام کو کیوں نہیں جواب دیتے۔ خطبہ مصر کہاں ہیں؟“ اس پر کچھ لوگ تیار ہوئے۔

معاویہ کی خفیہ کارروائی
بقول علامہ مجلسیؒ ارشاد شیخ مفید علیہ الرحمہ میں ہے کہ معاویہ نے ”ایک شخص کو قبیلہ حمیر سے کوفہ کی طرف اور ایک شخص کو ابن قیس سے بصرہ کی

طرف خفیہ طور سے بھیجا تاکہ یہ دونوں وہاں کی خبریں اسے لکھ بھیجیں اور امور حکومت امام حسنؑ علیہ السلام میں خلل انداز ہوں۔“ بصرہ اور کوفہ کے یہ دونوں شخص گرفتار ہوئے اور حضرت نے معاویہ کو تحریر فرمایا کہ: ”تو نے پوشیدہ طور سے قتل کرنے اور فریب کے لیے لوگوں کو بھیجا ہے تو نے جاسوس بھیجے ہیں گویا تو لڑائی چاہتا ہے اور اس میں میں شک نہیں کرتا پس تو جنگ کے لیے مستعد رہ۔“

علامہ مجلسی کے نزدیک حضرت امام حسنؑ کے لشکر کے عناصر

معاویہ نے شام سے ساٹھ ہزار فوج کے ساتھ حرکت کی اور حضرت نے بھی عربین صدی کو منظم فوج مقرر کیا۔ خود حضرت لوگوں کو چہاد پر آمادہ کرتے تھے۔ مگر لوگوں میں نامستعدی ایک ظاہر شان تھی۔ لشکر جن لوگوں سے مرتب ہوا اس کے بیچ عناصر قبول علامہ مجلسی یہ تھے کہ: "بعض تو ان جناب کے اور ان کے پدر بزرگوار کے شیعہ تھے اور بعض خارجی تھے اور بعض ان میں کے بڑے فتنہ پرداز اور لکھی تھے غنیمتوں میں۔ اور بعض ان میں کے بڑے فکری تھے اور بعض ان میں سے اصحاب تہذب تھے کہ انہوں نے اپنے قبیلہ کے رئیسوں کی متابعت کی وہ دین کی جانب رجوع نہیں کرتے تھے۔"

حضرت کو جب معاویہ کی حرکت کی خبر ہوئی تو آپ نے قیس بن سعد کو بارہ ہزار سپاہیوں کے ساتھ

۳۱۔ مقابلہ کے لیے قیس کی روانگی

انبار کی طرف روانہ فرمایا اور خود کوچ کرتے ہوئے مدائن پہنچے۔

اس کے بعد موقع کے لحاظ سے روایتیں اس قدر مختلف ہیں کہ ابتدا کے لیے کسی کی اولیت پر اطمینان نہیں کیا جاسکتا۔ مثلاً صاحب صواعق عرقہ حسنؑ بصری سے روایت کرتے ہیں (جنہوں نے یحییٰ بخاری سے نقل کی ہے) کہ جب امام حسنؑ کا لشکر معاویہ کے مقابلہ میں پہنچا تو عمرو بن عاص نے کہا کہ میں لشکر دیکھ رہا ہوں جو کبھی بیٹھ نہ پھیرے گا تاؤ دھیکہ اپنے مقابل کو قتل نہ کرے اور پھر اس کے بعد اس میں اس درجہ انسانیت حب قوی اور وطن پرستی بھی پیدا ہوئی جس سے یہ کہہ سکتا کہ پھر: "امور مسلمین کے لیے کوئی نہ رہے گا جو ان کی عورتوں اور ان کی زمینوں کی مصلحت کرے۔" اور اس ہتھیار پر دو شخصوں کو مصالحت کے لیے بھیجا۔ اس کے علاوہ اسی موقع نے یہ بھی ذکر کیا ہے کہ لشکروں کے مقابلہ ہونے پر خود سے حسنؑ نے تحریک صلح کی۔ ابن خلدون کہتا ہے کہ: "یہ مشہور ہو گیا کہ قیس بن سعد مارے گئے۔ اس خبر کے مشہور ہوتے ہی لوگ بھاگ کر ایک دوسرے سے الگ ہو گئے۔ چند لوگ امام حسنؑ کے خیمہ کی طرف چھپے، جو کچھ ہالیا لوٹ لیا۔ اندر گئے تو اس ہمسلا اور چادر کو بھی چھین لیا جس پر آپ بیٹھے اور جس کو آپ اوڑھے ہوئے تھے۔ بعضوں نے متابعت ملندہ شی سے آپ کی ران میں نیزہ بھی مارا۔ رعبہ دہقان آپ کی حمایت پر اٹھ کھڑے ہوئے۔ اوباشوں کا مجمع منتشر کیا۔ آپ کو ایک سر پر اٹھا کر مدائن میں لائے۔ چنانچہ آپ قصر ابیہ میں داخل ہوئے۔"

معاویہ کا مقدمہ لشکر اور حسن کے سپاہیوں کا انتشار

روضة الصفا کو کہنا ہے کہ معاویہ نے قیس بن سعد کو انبار میں محصور کیا اور عبد اللہ بن عامر کی ماتحتی میں ایک فوج مدائن کی طرف روانہ کی۔ امام اس لشکر کے مقابل ہونے ار یہ دیکھ کر ابن عامر نے آواز دی کہ: "اے اہل عراق! میں معاویہ کا مقدمہ ہو میری غرض جنگ نہیں ہے۔ معاویہ کثیر فوج کے ساتھ انبار میں ہے۔ ابو محمد (کنیت حسن) کو میری طرف سے سلام کہو کہ عبد اللہ آپ کو قسم دیتا ہے کہ آپ اپنے نفس اور اس جماعت کی ہلاکت کے لیے کوشش نہ کیجیے۔" یہ سن کر حسنؑ کے لشکر پر خوف طاری ہوا اور وہ بے کار ہو گئے۔ حسنؑ نے مدائن کی طرف مراجعت کی اور ابن عامر نے محاصرہ کیا۔

معاویہ کی کوششیں

اعظم کوئی کو کہنا ہے کہ: ”معاویہ، امیر المومنینؓ کے وفات کی خبر سن کر بہت خوش ہوا اور لشکر جمع کر کے اطراف ولایت میں بھیجا اور ولایت جزیرہ، عراق،

بین اور بصرہ کے کچھ حصہ پر قبضہ کر لیا۔ معاویہ لوگوں کو عطیہ دیتا تھا۔ اس وجہ سے سب نے اس کے طرف رجوع کیا اور موافق ہو گئے۔ اس کے بعد وہ بصرہ آیا اور لوگوں سے بیعت لی۔ امیر المومنینؓ نے یہ دیکھ کر خطبہ کہا، اور معاویہ کے ساتھ جنگ کرنے کی تحریک کی اور جب دیکھا کہ لوگ سستی اور تقصیر کرتے ہیں تو عبداللہ بن حارث بن نوفل معاویہ کے بجائے کو اس کے پاس شرائط صلح کے ساتھ بھیجا۔

حسنؑ کے خالص دستِ عدلاً اتنے نہ تھے جو دشمن کا مقابلہ کر سکتے

علامہ مجلسی کہتے ہیں کہ
مدائن کے لوگ معاویہ

سے مل گئے تھے۔ حضرتؑ کے ساتھ کوئی ایسا شخص کہ جس کے فریبوں سے حشر مامون ہوں باقی نہ رہا۔ مگر مخصوص شیعہ ان کے پدر بزرگوار کے اور خود احتجاج کے اور وہ اپنے قلیل تھے کہ مقاومت لشکر ان شام کی نہ کر سکتے تھے۔ پس احتجاج کو معاویہ نے صلح کرنے کے بارہ میں لکھا، اور وہ خطوط حضرتؑ کے دوستوں کے (۹) جو انھوں نے معاویہ کو حضرتؑ کی غفلت سے قتل کر ڈالنے اور حضرتؑ کو معاویہ کے سپرد کرنے کے بارے میں لکھے تھے معاویہ نے حضرتؑ کو یوں دے دیے۔

حسنؑ کا خطبہ جو عزت کی موت یا ذلت کی زندگی کا تصفیہ تھا

اس کے بعد مؤرخین کے
موافق حضرت امام حسنؑ نے

بعض شرائط صلح لکھ کر معاویہ کے پاس بھیجے، جسے اس نے تمام قبول کیا، بلکہ ایک سادہ کاغذ پر اپنی مہر وغیرہ کر کے حسنؑ کے پاس بھیج دیا کہ تم اپنے شرائط اس پر لکھ دو۔ اور جب ایسا کا وقت آیا تو اس نے پہلے خط کو قابل عمل کہا۔ اب قبول ابن خلدون: ”آپ نے اہل عراق کو جمع کر کے خطبہ دیا جس میں بعد حمد و درود کے بیان فرمایا کہ

اے اہل عراق! میں نے تین بار تم سے درگزر کیا۔ تم نے میرے باپ کو مارا، مجھے نیزہ مارا، میرا گھر لوٹا، آگاہ رہو کہ تم نے دو مقتولوں کے درمیان بیچ کیا۔ ایک مقتول مسلمان کے جس کے لیے تم رو رہے ہو اور ایک مقتول نہروان کے جس کا معاوضہ طلب کر رہے ہو، اور جو باقی ہیں وہ خاذل ہیں اور روئے والے بدلہ لینے والے ہیں اور معاویہ نے ایک امر پیش کیا ہے جس میں نہ تو عزت ہے اور نہ انصاف۔ پس اگر تم موت پر راضی ہو تو ہم اس امر کو قبول نہ کریں اور ان سے اللہ تعالیٰ کے مجروسہ تیر تلواروں سے محاکمہ کریں اور اگر زندگی دوست رکھتے ہو تو ہم اس کو قبول کر لیں اور تمہارے لیے خوشنودی حاصل کریں۔ لوگوں نے یہ سن کر ہر طرف سے چلا کر کہا صلح قائم رکھیے صلح قائم رکھیے۔“

لوگ ذلت کی زندگی پر راضی ہو گئے

اسی مؤرخ کے موافق: ”امام حسنؑ نے قیس بن سعد کو جو

مقدمہ پیش کے افسر تھے امیر معاویہ کی اطاعت قبول کرنے اور ان کی بیعت کرنے کو لکھ بھیجا۔ قیس نے اپنے ہمراہیوں کو جمع کر کے اس خط کو پڑھا اور بغیر مشورہ ان کو مخاطب

کر کے کہا: ہم لوگوں کا بغیر امام کے لڑنا مناسب ہے یا کہ امام مگر ان کی اطاعت کرنا۔ لوگوں نے پچھل حق کو اختیار کیا۔ لشکر سے قیس کا مخاطبہ اور جواب

”قیس بن سعد بوجہ امیر معاویہ کی بیعت سے رکے ہوئے تھے اور عبید اللہ بن عباس بھی اس رائے سے متفق تھے لیکن جب امیر معاویہ نے عبد اللہ بن عامر کو بسرگردی ایک لشکر جہاد عبید اللہ بن عباس کی طرف روانہ کیا، اور عبید اللہ بن عباس نے خط و کتابت کر کے امان حاصل کر لی اور شب کے وقت تنہا اپنے لشکر سے نکل کر عبد اللہ بن عامر کے خیمہ میں اور پھر ان کے ہمراہ امیر معاویہ کے پاس چلے آئے اور روانگی کے بعد قیس بن سعد امیر لشکر ہونے تو انہوں نے از سر نوکل لشکریوں سے امیر معاویہ سے ہاں شرط جنگ کرنے کا عہد و پیمان لیا کہ جب تک امیر معاویہ امیر المومنین علیؑ کے گردہ کو ان کے جان و مال کا امن نہ دیں اور جو کچھ پچھلے واقعات میں ان سے سرزد ہوا ہے اس سے درگزر نہ کریں۔ قیس کے شرائط کو معاویہ نے منظور کیا

امیر معاویہ نے کہا اس میں بہتری نہیں ہے۔ جنگ کرنے میں انہیں لوگوں کے برابر اہل شام بھی کام آئیں گے۔ پھر ایک قاصد کو بلا کر سادہ کافت پر مہر و دستخط کر کے قیس بن سعد کے پاس بھیج دیا کہ: ”جو شرط تم کو منظور ہو لکھ دو۔“ قیس نے اپنے اور کل ہمراہیوں کے لیے امان طلب کیا مال وغیرہ کچھ نہیں مانگا۔ امیر معاویہ نے ان کو امان دیدیا۔ اور قیس نے مع اپنے کل ہمراہیوں کے بیعت کر لی۔ اسی صفحہ میں مؤرخ اس حصہ کتب کو ختم کرتا ہوا یہ عبارت لکھتا ہے کہ: ”میں نے بعض جزئی حالات سوائے طبری کے اور لوگوں کی کتابوں سے بھی قدر طاقت یکجہ کر کے اقتد کیا ہے۔“ اور ”حق یہ ہے کہ معاویہ کا شمار خلفاء میں ہے۔“

روختہ الخفائے قیس بن سعد کو خبر پہنچانے کے بعد اس سے لوگوں سے کہلوا دیا ہے کہ: ”یابغیر امام کے جنگ کرو“ یا بیعت باضالہ پر اقام کرو۔ اور لوگوں نے کہا کہ: ”ہم بیعت باضالہ کو اس سے زیادہ پسند کرتے ہیں کہ ہم قتل ہوں۔ ہمارے اموال تلف اور اہل و عیال ضائع ہوں۔“

جہاں ایک دوست عزیز سے بلند تر ہے علامہ مجلسی نے بھی بحار میں روایتیں نقل کی ہیں کہ کس طرح معاویہ نے ابن عباس کو دس لاکھ درہم کا وعدہ کر کے بلایا اور قیس بن سعد نے جو عبید اللہ بن عباس کے بعد امیر لشکر ہوئے تھے امام حسنؑ کو خبر دی اور پھر معاویہ نے قیس کو ملانا چاہا، مگر انہوں نے لکھا کہ: ”تو مجھے کبھی ملاقات نہ کئے گا مگر یہ کہ میرے اور تیرے درمیان میں نیزہ ہوگا۔“ اور جب قیس کو صلح کی خبر پہنچی تو انہوں نے اشعار پڑھے جن کا ترجمہ یہ ہے کہ: ”مجھے مسکن کی زمین سے مقام حال میں صلح کی خبر اور قیس کی حالت یہ خبر پہنچی کہ امام حسنؑ نے صلح فرمادی جب سے مجھے یہ خبر معلوم ہوئی ہے میں متحیر ہوں اور چپکا مگھین قلب کی

عاجزی کی حالت میں بیٹھا تھا تدرے گھٹ کر تاجوں۔

شرائط صلح
اب میں تمام معاملات میں سب سے زیادہ مفید امر کی طرف آتا ہوں اور وہ شرائط صلح ہے۔ اور یہ جگہ ہے جہاں حیرت اور غصہ کا نورشیں سے دور رکھنا معمول سے کہیں زیادہ دشوار ہے۔ بعض ان میں سے دھلت شرائط تک کا ذکر نہیں کرتے۔ بعض چند پر قناعت کرتے ہیں اور کبھی کبھی دور ان تذکرہ میں کہہ دیتے ہیں کہ یہ شرط بھی تھی۔

قبول ابن خلدون: ”امام حسنؑ نے لوگوں کی خود رانی اور نفاق کی وجہ سے امیر معاویہ کو لکھ بھیجا کہ میں خلافت و حکومت سے دست کش ہوا چاہتا ہوں۔ بشرطیکہ فوج کو کچھ مال بیت المال کو فہ میں ہے دیدو۔ (اس وقت بیت المال میں پانچ لاکھ موجود تھا) اور داراب جود (مقامات فارس) کا خرانج مجھے معاف کر دو اور علیؑ کو میرے سامنے سخت و ناعلاہم کلمت سے نہ یلا کرو۔ خطر روانہ کرنے کے بعد اپنے بھائی حسینؑ و عبد اللہ بن جعفر سے اس کا تذکرہ کیا۔ ان لوگوں نے بھلیا بھلیا، لیکن وہ اپنی رائے سے نہ پھرے۔ جب یہ خط امیر معاویہ کے پاس پہنچا تو انھوں نے اس خط کو لے لیا اور اس سے پیشتر ایک سادہ کافہ پر دستخط دہر کر کے عبد اللہ بن عامر اور عبد اللہ بن عمرو کی معرفت امام حسنؑ کی خدمت میں بھیج چکے تھے، اور علیحدہ یہ تحریر کیا تھا کہ آپ کو جو شرط منظور ہو اس سادہ کافہ پر لکھ دیجیے۔ ہم اس کو منظور کر لیں گے۔“ امام حسنؑ نے اس سادہ کافہ پر جس کے نیچے امیر معاویہ کا دستخط دہر تھی ان شرائط سے دو چند شرائط لکھے جو اس کے پہلے اپنے خط میں لکھ چکے تھے۔ پس جب امام حسنؑ بعد تقویٰ امارت ان شرائط کے ایفا کے خواستگار ہوئے تو امیر معاویہ نے پہلے خط کے شرائط پر عمل کیا اور یہ کہا کہ یہ وہی تو ہے جو تم طلب کرتے تھے۔“

صاحب صواعق عرقہ عہد نامہ لکھے جانے کے پہلے یہ شرائط لکھتا ہے کہ معاویہ حسنؑ کے تمام دلیوں کو ادا کرے اور اہل عراق و حجاز سے کوئی مطالبہ نہ کرے۔ معاویہ نے کہا کہ ہم صرف عشر لیں گے۔ حسنؑ نے اصرار کیا اور معاویہ نے سادہ کافہ بھیج دیا کہ اپنے مدعا کو صلح نامہ میں لکھ دو ہم قبول کریں گے۔ اس کے بعد حسب ذیل صلح نامہ لکھا گیا:

”یہ صلح نامہ ہے حسنؑ بن علیؑ اور معاویہ بن ابی سفیان میں۔ ان لوگوں نے مصالحت کی ہے اس بات پر کہ مسلمانوں کے امورات کی دلایت اس شرط سے معاویہ کو تسلیم کی جائے کہ وہ کتاب اللہ، سنت رسولؐ اور میرت خلفائے راشدین پر عمل کرے۔ اور دوسری شرط یہ ہے کہ معاویہ کو یہ اختیار نہیں ہے کہ وہ اپنے بعد کسی کو اپنا ولیعہد بنائے بلکہ یہ امر مسلمانوں کے مشورہ پر رہے۔ وہ جسے چاہیں اپنا امیر بنائیں۔ اور شرط یہ ہے کہ خدا کی زمین میں لوگ اس سے بے خوف ہوں۔ شام، عراق و حجاز ہو یا یمن اور اصحاب و شیعہ علیؑ اپنے نفس مال اور اولاد سے بے خوف رہیں۔ اور معاویہ بن ابی سفیان پر خدا کی طرف سے یہ عہد ہے کہ وہ حسنؑ بن علیؑ اور ان کے بھائی حسینؑ بن علیؑ یا اہل بیت رسولؐ میں کسی سے ظاہر و باطن میں کوئی کدورت نہ رکھے۔ وہ کہیں ہوں۔ شہادت ظن ظن، اور کافی ہے شہادت حق سبحانہ تعالیٰ کی۔“

اعظم کوئی کو کہتا ہے کہ حسنؑ نے پیشتر خط میں تحریر فرمایا کہ: ”اگر بندگان خدا کے ساتھ اچھی زندگی بسر کرے اور انھیں

مال اور زن و فرزند کی طرف سے بے خوف کر دے اور خدا کے اوامر و نواہی اور آداب رسول پر عمل کرے تو ملامت تجھے سپرد کر دوں۔ اور اگر تو مسلمانوں سے رعونت اور تکبر کرے گا اور انصرام امورات موافق شرع نہ کرے گا بلکہ اپنے مذاق کے موافق جاری رکھے گا تو میں جہاں تک ممکن ہو گا کوشش کروں گا جب تک خدا ہم میں اور تمہیں فیصلہ نہ کرے۔“

اس کے بعد حسنؓ کے وکیل عبداللہ بن حارث نے معاویہ سے کہا کہ: ”امیر المومنین“ برآن قرار خلافت تسلیم میکنند کہ اگر ترا پیش ازوے وفات رسد خلافت ازان او باشد و بعد از تو کار بدست گیرد و در مدتی کہ تو بخلافت قیام نمائی ہر سال پانصد ہزار درہم از بیت المال بدو دی و خراج دارالجمہود و مدارس ازان او باشد تا ہر سال خراج آن را بر حقو نے کہ ہست ی ستند معاویہ جلب دلا کہ برین جملہ رمنا دلام۔“ اس کے بعد مہر اور دستخط والا کاغذ صحیحہ عبداللہ بن حارث اور عبداللہ بن سمرہ بھی ساتھ آئے ان لوگوں نے معاویہ کی منظوری بیان کی اور حسنؓ نے کہا کہ: ”معاویہ سے جو کہا گیا ہے کہ اس کے بعد خلافت ہماری طرف آئے گی بہتر نہیں ہے، میں اسے نہیں چاہتا، اگر مجھے اس کی خواہش ہوتی تو میں حوالہ نہ کرتا۔ اب میں خراج دارالجمہود اور دیگر مال بھی نہیں چاہتا۔ اور اس سے بیعت کرتا ہوں۔“ یہ کہہ کر صلح نامہ لکھا کہ:

”یہ صلح نامہ ہے حسنؓ بن علیؓ اور معاویہ بن ابی سفیان میں اس سے امر پر صلح کی گئی ہے اور خلافت سپرد کی ہے کہ: ● جب وہ وفات کرے اور نزدیک بہ ار حال ہو تو خود کسی کو ولیعہد نہ بنائے بلکہ مسلمان شورے سے اس کا تصفیہ کر لیں۔ ● دوسری شرط یہ ہے کہ عامہ فسطیں اس کے ہاتھ اور اس کی زبان سے بے خوف ہوں۔ اور علیؓ اللہ کے ساتھ اچھی زندگی بسر کرے۔ ● تیسری شرط یہ ہے کہ علیؓ بن ابی طالب کے شیعہ ان کے متعلقین اور ان کے زن و فرزند ہر جگہ محفوظ اور بے خوف رہیں، اور ان سے کم و زیادہ کسی طرح کا تعرض نہ کیا جائے۔“

اس پر معاویہ نے عہد کیا، اور اسے قبول کیا کہ: ”اس اقرار پر وفا کرے گا اور شرائط بھی بجالائے گا اور کسی طرح کا مکروہ نہ کرے گا اور حسنؓ بن علیؓ اور ان کے بھائی حسینؓ بن علیؓ اور ان کے زن و فرزند اعزا اور اقبا اور اہل بیت حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ سے ظاہر و باطن بدی نہ کرے گا اور ایسا کرنے کا حکم نہ دے گا۔ یہ لوگ جہاں رہیں محفوظ رہیں۔ انہیں کسی طرح کی دھمکی نہ دی جائے گی۔ گواہ ہوئے عبداللہ بن حارث بن نوفل، عمر بن ابی سلمہ وغیرہ۔“

روضۃ الفتا کے موافق حضرت امام حسنؓ نے علاوہ اور شرط کے ابن حارث سے جو مخصوص شرط لکھوائی وہ یہ تھی کہ: ”در عطایا و صلوات بنی ہاشم را بر اہل بیت خویش تفصیل و ترجیح کند۔“ عطیوں اور صلوں میں اپنے خاندان والوں پر بنی ہاشم کو ترجیح دے۔

اسی مؤرخ کے موافق معاویہ نے یزیدؓ ”سب علیؓ“ کے تمام شرائط منظور کیے اور کہا کہ جس جگہ حسنؓ موجود ہوں وہاں سب نہ کی جاوے۔ اور پھر یہ بھی لکھا ہے کہ: ”یکے از شرائط صلح آنکہ تعین خلیفہ بعد از معاویہ بے مشورت امیر المومنین حسنؓ نباشد۔“ یعنی: ”معاویہ کے بعد حسنؓ کے مشورہ کے بغیر خلیفہ معین نہ ہو۔“

علامہ مجلسی کے موافق ایک شرط یہ تھی کہ معاویہ اپنے کو امیر المومنین کے خطاب سے یاد نہ کرے۔ راسٹ انریل مولوی سید امیر علی ہاشمی اپنی تاریخ الاسلام میں فرماتے ہیں کہ: ”صلح کے شرائط میں جو معاویہ اور حضرت حسنؓ کے مابین

ہوئی تھیں حضرت حسینؑ کا حق خلافت بین طور پر محفوظ رکھا گیا تھا۔

کابل ابن ابیہر میں علاوہ عام حالات کے مخصوص باتیں بھی ہیں کہ معاویہ نے ایٹانے شرائط سے انکار کرتے وقت کہا کہ: ”ہم پہلے خط کے موافق عمل کریں گے نہ کہ سفید مہر والے کاغذ کے موافق۔“

اسی مورخ کے موافق معاویہ نے ”سب وشم علیؑ نہ کرنے سے انکار کیا۔“ اور اب حنؑ نے یہ شرط پیش کی کہ میرے سامنے سب نہ کرنا۔ معاویہ نے ”اس کا اقرار کیا لیکن وفانہ کی۔“ اور ”خراج بھی نہیں دیا۔“

تاریخ قمی کے موافق حنؑ کی شرط تھی کہ معاویہ ”نہ طلب کرے اہل مدینہ مجاز و عراق سے کوئی ایسی چیز کہ ان کے باپ کے زمانہ میں تھی، اور یہ کہ اس کے بعد ولیعہد ہم میں سے ہو، اور یہ کہ اختیار دے کہ ہم بیت المال میں سے ہدر ضرورت لے لیں۔ اس پر معاویہ خوش ہوا۔“ نیز اسی میں ہے کہ معاویہ نے ”دس آدمیوں کو امان دینے سے انکار کیا اور حنؑ نے اس بارہ میں مراجعت کی۔ پھر معاویہ نے لکھا کہ: ”قیس بن سعد کو ہاؤں کا تو قتل کروں گا۔“ اس پر بھی حنؑ نے مراجعت کی کہ بیعت نہ کروں گا۔ اور اب معاویہ نے سفید کاغذ پیش دیا کہ: ”جو لکھو گے اسے قبول کروں گا۔“ اور ”لکھا حنؑ نے کل ان باتوں کو جو پہلے لکھا تھا۔“ اور معاویہ نے ”سب کو قبول کیا۔“ اب حنؑ نے طلع کیا اپنی نفس کو اور امارت معاویہ کو تسلیم کیا۔“

ابو اسحاق اسفرائینی اپنے رسالہ نور العین فی مشہد الحسنینؑ میں معاویہ کی رحلت کے وقت زبید کے اس سوال پر کہ: ”آپ کے بعد کون خلیفہ ہوگا۔“ جواب دلاتے ہیں کہ: ”خلیفہ تو ہی ہوگا۔“ لیکن پھر آگے یہ وصیت بھی کراتے ہیں کہ: ”رعیت کے متعلق کوئی کام حسینؑ رضی اللہ عنہ کے مشورہ بغیر نہ کرنا۔“ اس لیے کہ اسے بیٹا خلافت ہمارا حق نہیں ہے۔ یہ حق ان کا ہے اور ان سے پہلے ان کے باپ اور ان کے نانا کا تھا۔ اور ان کے بعد ان کے اہل بیت کا حق ہوگا۔ بیٹا! تم تھوڑے ہی مدت تک خلافت کرنا، یہاں تک کہ حسینؑ رضی اللہ عنہ بالغ ہو جائیں، اور اچھی حالت میں مکہ جائیں۔ پھر وہ خود خلیفہ ہوں، یا جس کو چاہیں اہل بیت میں سے خلیفہ بنائیں۔ اور خلافت اپنے حق دار کے پاس جا پہنچے۔“

انسائیکلو پیڈیا (حنؑ و حسین) میں یہ عبارت ہے کہ: ”علیؑ کی رحلت پر ان کے فرزند اکبر حنؑ خلیفہ منتخب ہوئے لیکن وہ اس شرط پر معاویہ کے حق میں مستعفی ہوئے کہ وہ اس کے بعد پھر خلیفہ ہوں گے۔“

مولوی حنؑ میاں پھلوری صاحب اپنے قابل مطالعہ رسالہ ”حم حسین“ میں فرماتے ہیں: ”تمام کتب تاریخ و سیر وغیرہ سے ثابت ہے اور تمام محققین علمائے اہل سنت کا اس پر اتفاق ہے کہ سیدنا امام حنؑ علیہ السلام نے امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو خلافت صرف ان کے حیات تک کے لیے سپرد کی تھی اور اسی شرط پر ان کو خلافت سونپ دی تھی کہ تمہارے بعد خلافت ہماری ہی طرف لوٹے گی۔ تم کو ہر گز یہ حق نہ ہوگا کہ کسی کو اپنا ولیعہد بنو۔ یا اس کو میراث مجھو۔“

اس کے بعد ابن عبدالبر اندلسی کی استیعاب جلد اول صفحہ ۱۴۴ سے فرماتے ہیں: ”باتفاق عام علمائے اہل سنت کے نزدیک یہ امر مسلم ہے کہ امام حنؑ نے امیر معاویہ کو صرف ان کی حیات تک کے لیے خلافت سپرد کی تھی۔ نہ ما بعد کے لیے بھی، اور اسی پر ان دونوں کے مابین صلح ہوئی تھی۔“

کتب الامامت و السیاست ابن قتیبہ دینوری سے نقل فرماتے ہیں: ”امام حنؑ نے امیر معاویہ صاحب سے

اس بات پر صلح کی کہ امامت (خلافت) امیر معاویہ کے لیے ہے جب تک وہ زندہ رہیں۔ پھر جب وہ مر جائیں تو ان کے بعد خلافت و امامت حسن کی ہوگی۔

صاحب شواہد النبوة فرماتے ہیں: ”معاویہ با امیر المومنین حسن رضی اللہ عنہ در سر مصالحہ کرد و عہد بست بر آنکہ اگر دیرا ملاشہ پیش آید خلیفہ امیر المومنین حسن باشد۔“ یعنی: ”معاویہ نے امیر المومنین حسن سے اس پر معاہدہ کیا تھا اور عہد کیا تھا کہ اگر اسے کوہ ملاشہ پیش آجائے تو خلیفہ امیر المومنین حسن ہوں گے۔“

صلح کے بعد کی گفتگو اور حسنؑ سے خطبہ کی خواہش مصاحبت کے بعد قیس بن سعد کوفہ چلے آئے اور معاویہ بھی آیا حسنؑ اور

معاویہ کی گفتگو میں مخصوص بات یہ تھی کہ معاویہ نے قبول شواہد النبوة و اعثم کوئی حضرت امام حسنؑ سے کہا کہ: ابراہانے آفرینش سے کسی نے ایسی شجاعت نہیں کہ یہ جود و سخاوت خاندان بنی ہاشم کے لحاظ سے حیرت خیز نہیں ہے۔ اور آزادوں کی طرح امر خلافت مجھے حوالہ کر دیا ہے۔ اس کے بعد کہا: ”جب آپ یہ احسان کر چکے۔ لیکن ہے کہ ابھی لوگوں کو یہ معلوم نہ ہو اور جگتے ہوں کہ آپ کو رغبت خلافت ہے۔ اگر مصالحت بھیجیے تو کچھ فرما دیجیے کہ لوگ میرے بارہ میں آپ کے احسان سے واقف ہو جائیں۔“

تاریخ غیس کے موافق حسنؑ کے خطبہ کہنے کے لیے عمرو بن عاص نے معاویہ کو اس لیے صلاح دی تھی کہ ”دخل نہ ہونے کی وجہ سے نقص ظاہر ہوگا۔“ معاویہ نے اسے مکروہ سمجھا۔ لیکن آخر میں حسنؑ سے خواہش ظاہر کی۔ اور جب حسنؑ اپنے خطبہ میں معاویہ کو مخاطب کر کے اس جگہ پہنچے کہ: ”تیرے وجہ سے فساد اور خون ہوا۔“ تو معاویہ نے کہا کہ: ”میں نہیں خیال کرتا تھا مگر اسی بات کا۔“

قبول ابن خلدون: ”امیر معاویہ نے آپ کو بٹالیا کیونکہ انھوں نے ان کے خلاف خیال بیان فرمایا تھا۔

ابن حجر مکی صاحب موانع عرقہ کے موافق فرمایا: ”تم لوگ جانتے ہو کہ خدا نے تمہیں گمراہی اور جہالت سے میرے نانا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بدولت آزاد کیا، اور ذلت و خواری کے بعد تمہیں عزیز کیا، اور قلت کے بعد تمہیں کثرت عطا کی۔ جانو کہ معاویہ نے مجھ سے ایک ایسے امر میں نزاع کی جو میرا حق تھا۔ اس کا نہ تھا۔ میں نے صلاح امت پر غور کیا، اور فتنہ کو منقطع کیا۔ حالانکہ تم نے مجھ سے بیعت کی تھی کہ تم اس سے صلح کرو گے جس سے میں صلح کروں گا، اور جنگ کرو گے جس سے میں جنگ کروں گا۔ لیکن میری رائے یہ قرار پائی ہے کہ معاویہ سے صلح کر لوں اور جو جنگ کہ واقع ہے اسے برطرف کروں۔ اس لیے کہ لوگ قتل سے محفوظ رہیں۔ ان کے خون کی ممانعت اس سے بہتر ہے کہ ان کا خون بہایا جائے۔ میں نے اس صلح کا ارادہ نہیں کیا مگر تمہاری صلاح اور جفا کے لیے۔“ بعض مؤرخین کے موافق حضرت نے اپنی تقریر میں شرائط بھی بیان کر دیے تھے۔

عمرو بن عاص کی صلح شکن تقریر اعثم کوئی کے موافق عمرو بن عاص کھڑا ہوا اور کہنے لگا: ”اے اہل عراق! ہم اور تم راہ راست پر تھے کہ

مختلف ہواؤں نے ہم لوگوں کو جدا کر دیا۔ لڑائیاں ہوئیں۔ آخر میں حکمین نصب ہوئے اور سب لوگ ان کے ایسے حکم پر

جو موافق کتب خداوند سنت رسول ہو راضی ہوئے۔ حکمین نے اس پر یہ طے کیا کہ تم لوگ مسم پر ظلم اور تریج کا دعویٰ کرتے تھے آج حق اپنے مرکز میں قائم ہوا اور جنگ سے فارغ ہوئے۔ تم کو گزشتہ کاغذ اور گزشتہ نامہ سربانی اور عصیان کا موافقت اور اطاعت سے متدارک کرنا چاہیے کہ دین اور دنیا کے امور اور مصلح کا انتظام ہو اور پراگندگی رفع ہو۔

معاویہ کی ویسی ہی تقریر
اس کے بعد معاویہ نے کہا: ”۔۔۔ اب تک جو کچھ لڑائیاں اور کوششیں ہوئیں اور جس قدر خون بہا اور مسلمانوں کے امورات میں جو کچھ غل و غلاخ ہوا یہ سب باتیں گزر گئیں۔ نظم ظاہر ہوا اور پریشانی و تفرقہ دور ہوا۔ بڑے غزل کے بعد حق اپنے مرکز میں ہوا اور فتنہ کی آگ بجھ دی۔ ہماری دعوت عزیز ہوئی۔ میں نے جو شرطیں کی ہیں اس کا سرا میرے ہاتھ میں ہے۔ چاہوں وفا کروں خواہ نہ کروں۔ تمہیں اس سے کوئی مطلب نہیں۔ تم کو اطاعت سے کام رکھنا چاہیے۔“

یہ تقریر سن کر قبول اعثم کوئی: ”تمام آدمی برہم اور غضب ناک ہو گئے اور معاویہ کو گالیاں دینے لگے اور قہر کیا کہ اسے مار ڈالیں۔ قریب تھا کہ بہت بڑا فساد اور خونریزی واقع ہو، معاویہ ڈر گیا اور اپنی گنگو سے پشیمان ہوا۔ اس کے بعد ایک نہایت پر جوش روایت یہ ہے کہ قیس بن سعد جب معاویہ کے دربار میں گئے تو اس نے کہا کہ: ”اے قیس میں نہیں چاہتا تھا کہ میں امیر ہوں اور تو زندہ رہے۔“ قیس نے جواب دیا: ”میں بھی نہیں چاہتا تھا کہ میں زندہ رہوں اور تو حکومت کرے۔“ قبول علامہ مجلسی: قیس کے قول کے موافق جب یہ معاویہ کے پاس آئے تو درمیان میں نیزہ اور تلوار رکھ دی گئی تھی اور معاویہ نے خود اپنا ہاتھ بڑھا کر ان کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

حسین سے بیعت کی خواہش اور ان کا انکار
قبول ردیفہ الصفا: معاویہ نے حسین کے پاس طلب بیعت کے لیے آدمی بھیجا حسین نے

انکار کیا۔ امام حسنؑ نے معاویہ سے کہا کہ: ”اے معاویہ حسین کو بیعت کے لیے مجبور نہ کر، اس لیے کہ ان کے نزدیک قتل ہو جانا تیری بیعت کرنے سے بہتر ہے۔ تو انہیں نہیں قتل کر سکتا جب تک ان کے اہل بیت کو قتل نہ کرے، اور اہل بیت قتل نہیں ہو سکتے جب تک ان کے شیعہ قتل نہ ہوں۔“ معاملہ طویل کھینچے گا۔ یہ سن کر معاویہ نے خاموشی اختیار کر لی۔

صلح اور حسین
قبول کامل ابن اثیر حضرت امام حسینؑ نے اپنے بھائی سے کہا: ”اپنے باپ کی تکذیب اور معاویہ کی تصدیق نہ کیجیے۔“ حسنؑ نے کہا: ”چپ رہو، میں تم سے زیادہ جانتا ہوں۔“

قبول اعثم کوئی: حسینؑ نے حسنؑ کی طرف دیجھا اور کہا: ”اب کوئی متدارک نہیں ہو سکتا اور نہ کوئی اصلاح ہو سکتی ہے۔ جو کچھ آپ نے کیا، مجھے اس سے بہت کراہت تھی۔ لیکن میں نے نہ چاہا کہ آپ کے خلاف کروں۔ آپ کی خوشنودی کے لیے خاموش رہا۔“ قبول علامہ مجلسی: ”امام حسینؑ علیہ السلام اپنے برادر علیؑ و قار کی خدمت میں روتے ہوئے حاضر ہوئے۔ پھر حضرت کی خدمت سے منہ پٹے ہوئے باہر آئے۔ امام حسینؑ علیہ السلام کے دوستوں نے حضرت سے پوچھا کہ یہ کیا امر ہے۔ حضرت نے فرمایا کہ عجب ہے میرے جانے سے ایسے امام کی خدمت میں کہ ان کو میں سکھانا چاہتا

تھا۔ پس میں نے ان سے عرض کیا کہ آپ نے کس وجہ سے حکومت سہرہ کر دی؟ انھوں نے فرمایا کہ جو وجہ تھا اسے پدر بزرگوار کو داعی ہوئی تھی اس زمانہ سے پیشتر کے زمانہ میں۔

صلح کے متعلق محسنؑ سے مستی کا سوال و جواب کے بعد منیب بن ثنابہ الفزاری اعظم کوئی کے موافق معاویہ کی تقریر

کھڑے ہو گئے اور حسنؑ کے قریب جا کر کہا کہ: ”جہاں تک غور کرتا ہوں یہ مشکل حل اور میری حیرت تمام نہیں ہوتی کہ آپ نے کیوں معاویہ سے بیعت کی اور چالیس ہزار مردان شمشیر زن کو ٹہل چھوڑ دیا۔ نیز آپ نے اپنے زنی و فرزند اور دوستوں کے لیے کوئی مضبوط عہد نہیں لیا اور ایسا صلح نامہ لکھا جو آپ اور اس کے درمیان ہے لوگوں کو اس کی کوئی خبر نہیں ہے۔ اس وجہ سے معاویہ مبہر رہ جاتا ہے اور کہتا ہے کہ میں نے جو عہد کیا ہے اس کا سرامیر سے ہاتھ میں ہے چاہوں وفا کروں یا نہ کروں۔ یہ آپ کی موجودگی میں کہتا ہے۔ یہ وہ آپ ہی سے کہہ رہا تھا اس کا مطلب کوئی دوسرا نہ تھا یہ امر عظیم آپ سے سرزد ہوا۔ اس کی طاقت بخیر ہو۔“ حسنؑ نے جواب دیا: ”اے منیب یہ چالیس ہزار مردان شمشیر زن جو بظاہر ہمارے ساتھ تھے جیسے معلوم ہے کہ مطلق حکم نہیں مانتے تھے اور جسے معاویہ کے مقابلہ میں جنگ کے لیے بھیجا جاتا تھا اس سے مل جاتے تھے یا اس کے پاس چلے جاتے تھے۔ یہ حال دیکھ کر صبح کی تھی۔ اگر ایسا نہ کرتا تو کیا کرتا۔ اب میں اس کا بہتر تدارک کیا معلوم ہوتا ہے؟“ منیب نے جواب دیا: ”اے امیر المومنین اگر آپ کی خواہش ہو تو میں یہ ہے کہ اس بیعت سے باز آئے اور اپنی پہلی حالت پر عود کیجیے اور اس سے کہیے کہ تو نے میرے سامنے یہ کہہ کر کہ چاہے اپنے عہد پر وفا کروں چاہے نہ کروں عہد کو توڑ ڈالا۔“

عبیدہ کنڈی اور حسنؑ یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ بصرہ کا ایک شخص جس کا نام عبیدہ بن عمر الکندی تھا قریب آیا۔ اس کے چہرہ پر ایک گہرا زخم تھا۔ امیر المومنین حسنؑ اسے پچاتے تھے پوچھا کہ: ”تجھے یہ زخم کب لگا تھا۔“ کہا: ”قیس بن سعد کی موافقت میں جب معاویہ سے جنگ کی تھی۔“

حجر اور عبیدہ کا تاسف یہ سن کر حجر بن عدی الکندی نے کہا: ”کاش تو اور ہم اس روز ہلاک ہو جاتے کہ یہ برا دن نہ دیکھتے کہ دشمن کی مراد برآئی اور ہم لوگ دل تنگ اور غضب ناک ہوئے۔ موت اس زندگی سے کہیں بہتر تھی۔“

حسنؑ تسکین دیتے ہیں یہ سن کر حسنؑ کا چہرہ منتخیر ہو گیا اور اڑھ کر اپنے گھر چلے گئے۔ یہاں سے حجر بن عدی کو بلوایا اور فرمایا: ”حجر مجھے تمہاری شفقت اور اپنے بارہ میں تمہارا

اعتقاد معلوم ہے۔ تم نے معاویہ کے مجلس میں جو باتیں کہیں اس کا وہاں موقع نہ تھا۔ میں چاہتا تھا کہ تمہیں وہیں تسکین دوں۔ لیکن اغیار وہاں موجود تھے۔ تم اپنے کو خوش کرو اور رنجیدہ نہ ہو کہ میں نے تمہاری بہتری کے لیے صلح کی۔ اس لیے کہ تم آرام پاؤ۔ اور مسلمانوں کا خون نہ بچے۔ مجھے طبع جاہ اور زیادتی مال کی خواہش نہیں ہے۔ میں نے اپنے کو اس کام سے سبکدوش کیا کہ عہدت خدا میں بسر کروں۔ تم کو میری رضا پر توجہ کرنی چاہیے اور ایسی باتیں نہ کرنی چاہئیں۔“

سفیان بن ابی لیلیٰ اور حسنؑ اس وقت سفیان بن ابی لیلیٰ اُمّی داخل ہوا اور کہنے لگا: ”سلام جو تم پر اے ذلیل کرنے والے مومنین کے۔ یہ تم نے کیا کیا۔ کاش ہم اور تم مر جاتے کہ یہ کاٹنا نہ چھتا۔“

اس کے بعد حق کی تذکرہ صدر تقرر تھی جس سن کر شیب بن خبہ نے قبول روضۃ الشفا کہا: ”ہمارے لیے مشکل نہیں ہے اس لیے کہ معاویہ کو ہم لوگوں کی ضرورت ہے اور ہمارے ساتھ رعایت کرے گا۔ لیکن ہمارا دل تمہاری طرف لگا ہوا ہے کہ مبادا معاویہ تم سے فضل عہد کرے اور کوئی کاٹنا نہ کرے۔“

تذکرہ صدر واقعات بہ اختلاف وقت و مقام عام تواریخ میں پائے جاتے ہیں۔

علی بن بشر اور حسینؑ علی بن بشر حضرت امام حسنؑ کی وجہ مصاحبت سننے کے بعد حضرت امام حسینؑ کے پاس گیا اور جو کچھ سنا تھا بیان کیا۔ اس پر سبط اصغر نے فرمایا: ”ابو محمد نے جو کچھ فرمایا وہ حق اور مطابق صدق ہے۔ جب تک معاویہ زندہ ہے اب بیز اس کے کوئی چارہ نہیں ہے کہ ہر شخص اپنے گھر میں بیٹھا ہے۔“

اہل بصرہ کی استقامت کا درجہ اہم کوئی کے موافق جس وقت اہل بصرہ نے سنا کہ حق نے امارت معاویہ کو تقویٰ کر دی، ان لوگوں کو بہت رنج ہوا اور بہت سے لوگوں نے جمع ہو کر کہا کہ ہم اس پر راضی نہ ہوں گے کہ فرزند ان علیؑ و رسولؐ کے ہوتے ہوئے ہم معاویہ کی خلافت کو قبول کر لیں۔ حمران بن آبان نے جو دوسرا کوفہ میں سے ایک تھا لوگوں کو تسکین دی اور شہر پر حق کے نام سے قبضہ کیا (ابن خلدون بھی قبضہ کا ذکر کرتا ہے) معاویہ کو یہ خبر معلوم ہوئی اس نے عمر بن ارطاة کو لشکر کثیر کے ساتھ بھیجا جس قدر لوگ حمران کے ساتھ جمع ہوئے تھے مخترق ہو گئے۔

عمر بن ارطاة اور ابوبکرہ دوسرے روز عمر بن ارطاة قبر الامارۃ سے مسجد میں آیا اور جس قدر نامعلوم الفاظ علیؑ اور اولاد علیؑ کے لیے استعمال کر سکتا تھا کیے۔ اس وقت ابوبکرہ کھڑے ہو گئے اور کہا: ”جھوٹ کہتا ہے اے دشمن خدا۔“ ابن ارطاة نے ان کی گرفتاری کا حکم دیا لیکن بن ضبہ بیچ میں پڑے اور انہیں اٹھالے گئے۔ ابن ارطاة چھ مہینہ تک حاکم رہا۔ اس کے بعد عبد اللہ بن عامر کرنے اور اس کے بعد زیاد بن ابیہ عامل مقرر کیا گیا۔

مصلحت صلح پر مزید عکس علامہ مجلسی احتجاج طبری سے زید بن وہب جہنی کے زبانی ایک روایت نقل کرتے ہیں جس سے مصلح صلح پر کچھ اور عکس پڑتا ہے اور وہ یہ ہے کہ:

جب حسنؑ بن علیؑ علیہ السلام مدائن میں مجروح ہوئے تو میں ان جناب کی خدمت میں حاضر ہوا اور وہ جناب درد میں مبتلا تھے۔ میں نے عرض کیا کہ یا بن رسول اللہؐ کیا رائے ہے آپ کی کیونکہ لوگ تمہیں ہیں۔ حضرت نے فرمایا کہ میں دیکھتا ہوں قسم بخدا معاویہ ان لوگوں سے میرے لیے بہتر ہے۔ یہ لوگ کھان کھتے ہیں کہ یہ میرے شیعوں میں سے ہیں۔ میرے قتل کے درپے ہوئے۔ میرا سہا ب لوٹا، میرا مال لے لیا واللہ اگر میں معاویہ سے ایک عہد لے لوں کہ میں اس کے سبب اپنی خونریزی کو روکوں اور اس کے سبب میں اپنے اہل میں امن سے رہوں تو یہ امر بہتر ہے اس سے کہ یہ لوگ مجھے قتل کریں اور میرے اہل بیت

اور اہل صلح ہوں۔ تم بخدا کہ اگر میں معاویہ سے مقابلہ کروں تو یہ لوگ میری گردن پکڑ کر مجھے معاویہ کے سپرد کر دیں گے صلح کی راہ سے۔ پس واللہ اگر میں اس سے صلح کروں اس حال میں کہ میری عزت قائم ہے یہ میرے نزدیک بہتر ہے اس امر سے کہ وہ مجھے قتل کئے اس حال میں کہ میں اس کا اسیر ہوں یا وہ منت رکھ کر چھوڑے اور یہ امر باعث عار ہو۔ بنی ہاشم کے لیے قیامت تک اور معاویہ اور اس کی اولاد ہمیشہ احسان جتانے اس کا ہمارے ہر زندہ اور مرنے پر۔ آگے بڑھ کر حضرت امام محمد باقر سے ایک روایت ابن ابی الحدید کی شرح فیج البلاغہ سے نقل فرماتے ہیں کہ۔۔۔ پھر ان کے فرزند امام حسن علیہ السلام سے بیعت کی گئی اور عہد کیے گئے استجواب سے۔ پھر استجواب سے مذر کیا گیا اور ان کا ساتھ چھوڑ دیا۔ پھر ان حضرت پر اہل عراق نے حملہ کیا۔ یہاں تک کہ ان جناب کے پہلو پر زخم خیز لایا گیا اور استجواب کے لشکر کو لوٹ لیا اور استجواب کے کنیزوں کی غنائیں بہ ظلم حصین لی گئیں۔ پس حضرت نے معاویہ سے مصالحہ کر لیا اور استجواب نے اپنے اور اپنے اہل بیت کی خون ریزی کو روکا اور وہ انتہا درجہ قلیل تھے۔۔۔ بخاری میں حضرت امام حسن ابو سعید خضیص سے ہم کلام ہیں اور فرماتے ہیں: اے ابو سعید خضیص میرے مصالحہ کی معاویہ سے وہ طلت ہے کہ جس طلت سے رسول خدا ﷺ نے بنی ضمرہ اور بنی ابیج سے صلح کی تھی اور اہل مکہ سے صلح کی تھی۔ جب وہ جناب مدینہ سے پھرے۔ وہ لوگ کفار تھے، بہ تسنیل اور معاویہ اور اس کے اصحاب۔۔۔ ہیں بتاؤ۔۔۔ نہیں واجب ہے یہ امر کہ میری رائے پر سفاهت کا الزام لایا جاوے اس امر میں کہ جس کو میں بجلاؤں صلح کر لینے یا عمار بہ کرنے سے اگرچہ وجہ جھگڑا اس امر کی جس کو میں نے کیا ہے مظلوم نہ ہوتی ہو۔

علامہ مجلسی نے کتاب

نواسۂ رسولؐ کی توہین کے لیے بنی امیہ کی بے چینی اور اس کی وجہ احتجاج سے ایک واقعہ

بیان کیا ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک دن معاویہ کے پاس عمر بن عثمان، عمرو بن عاص، عتبہ بن ابی سفیان، ولید بن عقبہ اور مغیرہ بن شعبہ بیٹھے تھے، ان میں سے ابن عاص نے معاویہ سے کہا کہ حسنؑ نے اپنے باپ کی سیرت کو زندہ کیا ہے۔ لوگ ان کے پیچھے ادب و اطاعت سے چلتے ہیں اور ان کی تصدیق کرتے ہیں اور یہ باتیں انھیں اس چیز کی طرف لے جاتی ہیں گی جو ان سب سے زیادہ بلند ہے تو انھیں یہاں بلا اور ہم لوگ کہیں کہ تم دونوں اس مرتبہ کمال پر پہنچنے سے قاصر ہو اور ان کی ذلت کریں۔ حسنؑ بلائے گئے۔ سلامتی اور بے خوفی کا اقرار ہوا اور معاویہ نے کہا کہ ان لوگوں نے آپ کو بلایا ہے کہ یہ کہیں کہ عثمان مظلوم قتل کیے گئے اور آپ کے پدر بزرگوار نے انھیں قتل کیا۔ آپ انھیں جواب دیجئے جیسا یہ کلام کریں اور میری موجودگی جواب دینے سے باز نہ رکھئے۔

گھگھو شروع ہوئی۔ جس میں ابن عاص نے کہا کہ ہم نے آپ کو اس لیے بلایا ہے کہ آپ اور آپ کے باپ کے بارہ میں بے ادبی کریں اور آپ اتنی طاقت نہیں رکھتے کہ ہم پر عتاب کر سکیں اور نہ اس قدر استیلاعت رکھتے ہیں کہ ہماری تکذیب کر سکیں۔ اس کے بعد حاضرین نے بد گوئی اور برائے قے یاد کر کے جس طرح انتقام لے سکتے تھے لیا اور حسنؑ نے ہر ایک کی حقیقت جواب اور نسب کو جس طرح ظاہر کر دیا اس نے سبوں کی گردنیں جھکا دیں۔ اور حسنؑ وہاں سے اٹھ کر چلے آئے۔ اس جلسہ میں مروان نہ تھا۔ جب اسے معلوم ہوا کہ بنی امیہ کو حسنؑ نے ذلیل کیا تو اب یہ آیا اور یہ دعویٰ

کیا کہ میں انھیں اس قدر ذلیل کر دوں گا کہ قریش کے لوٹہڑی اور غلام اسے گالتے رہیں گے۔ پھر حق بلائے گئے اور اب کی مردان نے پھپھوٹے توڑے اور حق نے اس کے متعلق بھی جو کچھ کہا اس سے مردان کو بھی سیری حاصل ہو گئی۔

حضرت امام حسنؑ کا آخری زمانہ
اب میں اس فصیح بنی آدم کے آخری زمانہ پر آتا ہوں اور ان واقعات کو ترک کرتا ہوں کہ عہد نامہ کے موافق جو رقم ہر سال ملنی چاہیے تھی وہ برسوں نہ ملی۔ سختی اور تنگی برداشت کریں اور غالباً متعلقین کی ضروریات سے بیخبر ہو کر قبول صواعقِ عودہ: معاویہ کو لکھنے کے لیے کبھی قلم و دوات طلب کریں لیکن پھر غالباً بغیرت سے واپس کریں اور خاموش رہ جائیں۔

شہادتِ حسنؑ
جامع التواریخ ابوالقدا، روضۃ الصفاء طبری، رسالہ نجات، شواہد النبوة، روضۃ الشہداء، انسابکلبیہ، اوسبورن، صواعقِ عودہ اور اعظم کوئی۔ یہ سب مؤرخین ان میں سے کسی امر پر متفق ہیں کہ جعدہ بنت اشعث کو ملا کر معاویہ نے حسنؑ کو زہر دلوا یا کہ زہید کو دلچہد کرے۔ یا یہ کہ زہید نے جعدہ کو ملا کر زہر دلوا یا اور کسی نے اگر بہت احتیاط کی ہے تو کہا ہے کہ ”مشہور“ یہ ہے کہ معاویہ کے ایما سے زہر دیا گیا صواعق کی ایک روایت کے موافق تین مرتبہ اور روضۃ الشہداء کے موافق سات مرتبہ زہر دیا گیا لیکن پیشتر یا تو استقرار کی وجہ سے اثر نہ ہوا یا علاج سے صحت ہو گئی۔ صاحب روضۃ الشہداء کے موافق مردان بن حکم نے جو اس وقت مدینہ میں تھا جعدہ بنت اشعث کے پاس ایک روی کنیز کے معرفت جس کا نام البسونیہ تھا پیغام بھجوایا کہ اگر تو حسنؑ کو زہر دیدے تو مجھے نہ صرف اس قدر روپیہ ملے گا بلکہ زہید بن معاویہ جو اس وقت ایسا صاحب اثر ہے تجھے اپنے عقد میں لے لے گا۔

بھائی کا آخری وقت اور حسینؑ
مشہور ہلپ اور ماں کی بیٹی پر فریب کار گرا ہوا اور اس نے سوزہ الماس پانی میں ملا دیا۔ امام نے شب کو یہ پانی پیہ اور ملحق سے نیچے اترنا تھا کہ فرمایا: ”آہ کیسا پانی تھا کہ حلق سے ناک تک ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔“ اس کے بعد حسینؑ کو طلب کیا اور سینہ سے نکال دیا۔ حال کہ حسینؑ اپنے لب اقدس تک جامِ آب لے گئے تھے کہ امام نے جلدی سے چھین لیا اور زمین پر پھینک دیا۔ اس کے بعد دردِ شکم سے زمین پر لوٹنے لگے۔ آفتاب طلوع ہو رہا تھا کہ طشت جگر کے ٹکڑوں سے بھر گیا اور رنگ میں مہزی آنے لگی۔ دوبارہ قاطرہ کے پارہ جگر ایک دوسرے سے لپٹے اور رخسارِ آنسوؤں سے تر ہو گئے۔ حسینؑ نے اپنے برادرِ معظم سے پوچھا کہ: ”آپ کو کس پر زہر دینے کا گمان ہے؟“ اس پر امام نے سوال کیا کہ: ”کیا اسے قتل کرو گے؟“ اور جب اثبات میں جواب سنا تو قبولِ عام مؤرخین کے فرمایا کہ: ”اگر وہی ہے جس پر میرا گمان ہے تو خدا کا غضب سب سے زیادہ سخت ہے۔ اور اگر وہ نہیں ہے تو مجھے پسند نہیں ہے کہ کوئی بے گناہ میرے لیے قتل ہو۔“ قبول روضۃ الشہداء اس کے بعد بنت اشعث کو غلوت میں طلب کر کے طامت کی اور اس کے بعد منہ پھیر لیا۔ اور زمانہ رسول کے بڑے نواسہ سے خالی ہو گیا۔

قبول اعظم کوئی: ”لقد راویوں سے سنا گیا ہے کہ جس وقت معاویہ نے مصمم ارادہ کر لیا کہ اپنے بیٹے کو اپنا دلچہد مقرر کرے تو اس نے خیال کیا کہ امام حسنؑ کی زندگی میں یہ بات وقوع میں نہ آسکے گی۔ اس لیے اس نے ہمہ تن کوشش کی کہ اس مسد ثنیں اہمیت کو دنیا سے رخصت کر دے۔“ اس کے بعد مردان کی کوشش اور جعدہ کو فریب دینے کی تفصیل ہے۔

طبری کہتا ہے: ”چون حسنؑ علیہ السلام برفت معلویہ درندہ ہر ہلاک او ایستہ تا او را بہ چہ رونے ہلاک کند تا مردان ندانند کہ او را ہلاک کردہ است۔“ یعنی: ”جب حسنؑ گئے تو معلویہ ان کو اس طرح مار دینے کی تدبیر میں لگ گیا کہ لوگوں کو پتہ نہ چلے کہ اس نے مار ڈالا ہے۔“ (حاشیہ پر غالباً مترجم نے اسے ”مقتربات شیعہ“ کہہ کر تنقید تاریخ کا حق ادا کر دیا ہے اور زید و مردان کو بل بکرا بتایا ہے)

دفن کے متعلق وصیت حضرت نے قبول تاریخ نہیں وغیرہ یہ بھی وصیت فرمائی کہ: ”میں نے عائشہ سے کہا تھا کہ اگر میں شہید ہو جاؤں تو خانہ رسولؐ میں دفن کرنا، اور اس نے اقرار

کیا تھا میں نہیں جانتا کہ یہ بات ہو بہ میرے۔ اگر وہ خوشی سے کہہ دے تو دفن کرنا میں جانتا ہوں کہ لوگ تم سے مزاحمت کریں گے۔ اگر ایسا ہو تو بیعت میں دفن کر دینا۔“ قبول علامہ مجلسی فرمایا: ”دیکھو میرے لیے ایک چلو خوں نہ گرے۔“

دفن کے واقعات حسینؑ مع بنی ہاشم کے جنازہ کو قیر رسولؐ پر لانے لیکن کہا گیا ہے کہ بنی امیہ نے ہتھیار بندی کی اور قبول روضہ الشقا: قبل از دفن عائشہ ازیں معنی و قوت پالتہ بر استرے سوار

شدہ بہ آن موضع رفت وہ منع مشغول گشت۔ شیعہ امیر المومنین علیؑ بنیلا غوغا کردہ گفتند اے عائشہ روزے بر شتر نشستہ عادت کئی روزے بر استر سوار شدہ بر سر جنازہ نبیہؑ پیغمبر منازعت آفاذ فی ونگہاری کہ او را دفن کنند و چندان کہ سہی نمودند مفید نیتھا چہ مردم بہ دو فرقہ متفرق شدند وہ جانب یک دگر تیر انداختند چہ تیر بہ جنازہ رسید۔“ یعنی: دفن سے پہلے حضرت عائشہؓ اس ہلکے مطلع ہو کر ایک فخر پر سوار ہو کر اس جگہ گئیں اور روکنے میں مشغول ہو گئیں۔ امیر المومنینؑ کے شیعوں نے شور مچا کر کہا اے عائشہ! کسی دن آپ اوٹ پر سوار ہو کر جنگ کرتی ہو، کسی دن فخر پر سوار ہو کر پیغمبر کے نواسے کے جنازہ پر جنازہ پر جھگڑا شروع کرتی ہو اور اہل دفن ہونے نہیں دیتے۔ جتنی کوشش کی جتنی بے فائدہ رہی۔ کیونکہ لوگ دوحہ میں بٹ گئے تھے اور ایک دوسرے کی طرف تیر چلاتے تھے، چہ تیر جنازہ کو بھی لگے۔

قبول اعظم کوئی: ”جب امام حسنؑ کی روح اقدس جوار رحمت الہی میں چلی گئی تو غسل اور کفن کے بعد آپ کا جنازہ اٹھایا گیا، اور حضرت رسولؐ خدا کے روضہ مقدس کی طرف لے چلے تاکہ اپنے بھائی کو عالی مرتبہ نانا کے پہلو میں دفن کریں۔ سعید بن العاص مدینہ کے حاکم نے عائشہ کے پاس پہنچ کر اطلاع کی کہ جنازہ کو وہاں دفن نہ ہونے دے۔ ام المومنینؑ عائشہ مدنیہ اوٹ پر سوار ہو کر اور کسی قدر عثمانی گروہ کے آدمی ہمراہ لے کر روکنے میں مشغول ہوئیں۔“ امام حسینؑ نے حسب وصیت اپنے مقدس بھائی کا لاشہ نانی (دادی) فاطمہ بنت اسد بن ہاشم کے پاس دفن کر دیا۔“

طبری کہتا ہے: ”چون حسنؑ رضی اللہ عنہ برد چہل و شمش سادہ بود پس او را گورے کنند نہ ہم پہلوئے گور پیغمبر ﷺ و بر جنازہ اش نہادند کہ او را گور کنند حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا آگاہ شد بیامد و بر استرے نشستہ و را ہانکد و ش کہ آن جاش در گور کنند مردمان مدینہ بر عائشہ شوریدند کہ نیکو مسکنی یک روز بر اشتری جنگ کئی و دیگر روز بر استراذ بہر جنازہ منازعت ہی کئی۔ و را نہ میدی کہ نبیرہ پیغمبر ﷺ را گور کنند و ہر چند کہ بغفتند عائشہ رضی اللہ عنہا ہانہ کرد کہ او را گور کنند و مردمان بدو گروہ شدند گروہی کہ شیعہ عائشہ بودند تیر انداختن گرفتند تا جنازہ امیر المومنینؑ حسنؑ پر تیر گشت۔“ یعنی: جب حسنؑ نے وفات پائی آپ چھالیس سال کی عمر کے تھے۔ آپ کی قبر پیغمبر کے پہلو میں بنایا چاہی اور

آپ کو چارہائی پر رکھا گیا کہ دفن نہ کرنے دیا۔ مدینہ کے لوگوں نے عائشہ پر شور کیا کہ خوب کرتی ہو، ایک دن اونٹ پر لڑتی ہو اور دوسرے روز فجر پر چڑھ کر جنازہ کے لیے جھگڑتی ہو اور پیغمبر کے نواسے کو دفن نہیں ہونے دیتی ہو۔ جتنا کچھ بھی کہا گیا عائشہ رضی اللہ عنہا نے نہ چھوڑا کہ انہیں دفن کر یہ۔ لوگوں کے دو گروہ ہو گئے۔ جو لوگ عائشہ کے طرفدار تھے تیرہ سالے لگے، یہاں تک کہ حسنؓ کا جنازہ تیروں سے بھر گیا۔

قبول علامہ مجلسی مردان نے حضرت عائشہ سے کہا کہ: ”اگر امام حسنؓ علیہ السلام رسول خدا ﷺ کے ساتھ دفن ہوئے تو تیرے باپ کا خسر اور اس کے ساتھ ہی عمر کا فخر بالکل روز قیامت تک محو ہو جائے گا۔“ اور اس کے بعد حضرت عائشہ نے اپنے کو قبر پر فجر سے گرا دیا، اور کہنے لگیں: ”واللہ امام حسنؓ یہاں پر ہر گز دفن نہ کیے جائیں گے۔ یہاں تک کہ یہ تراش ڈالی جائیں۔“ اور اپنے ہاتھ سے اپنے بالوں کی طرف اشارہ کیا۔ پس بنی ہاشم نے لڑنے کا ارادہ کیا۔ پس امام حسینؓ علیہ السلام نے فرمایا کہ ڈرو خدا سے میرے بھائی کی وصیت کو ضائع نہ کرو اور ان کا جنازہ یقین کی طرف پھیر لے چلو۔“ قبول تاریخ غمیں: بنی امیہ کی مسلح شورش دیکھ کر باہر رہنے لگا کہ: ”یہ قلم ہے کہ ابن رسولؐ دفن نہ کیا جائے۔“ اور انھوں نے مقابلہ کا ارادہ دیکھ کر وصیت حسنؓ یاد دلائی۔

یہی مؤرخ ابن خلکان سے نقل کرتا ہے کہ جب امام علیل ہوئے تو خبر علالت و شہادت اور معاویہ مردان نے معاویہ کو اطلاع دی اور اس نے جواب بھیجا کہ مجھے برابر خبر بھیجتے رہنا۔ اور جب شہادت کی اطلاع ہوئی تو اس کے تکبیر کی صدا غصہ سے سنی گئی۔ اور یہ صدا سن کر اہل شام نے تکبیر کی۔ اس پر فاختہ بنت بنت قرظہ نے پوچھا: تیری آنکھ ٹھنڈی ہو کیوں تکبیر کی؟ کہا: مر گیا حسن۔ کہا: کیا ابن فاطمہ کی موت پر؟ کہا: نہیں۔ نہ بطاطا شمت، بلکہ میرا دل ٹھنڈا ہو گیا۔ اس وقت ابن عباس معاویہ کے پاس گئے اور اس نے کہا: جانتا ہے کہ تیرے اہل بیت میں کیا ہوا؟ جواب دیا نہیں لیکن تو خوش معلوم ہوتا ہے۔ کہا: ”حسنؓ مر گئے۔“ اسی مؤرخ کے موافق خبر شہادت سن کر معاویہ نے کہا: ”حسنؓ سے تعجب ہے کہ ایک گھوٹ شہدا اور چارہائی پیا، اور مر گئے۔“

اسی مؤرخ و نیز رحمۃ اللہ علیہ کے موافق معاویہ کی شہادت پر ابن عباس نے جواب دیا کہ: ”جو گڑھ تیرے لیے مقدر ہوا ہے وہ حسنؓ کی رحلت سے مسدود نہ ہو جائے گا۔“ اور یہ کہہ کر اٹھ گئے۔ علامہ مجلسی نے یہ واقعات ریح الابرار و مختصری اور کتاب التحدیث ابن عبد ربہ سے نقل کئے ہیں۔

قبول اعظم کنی: ایک دن عبداللہ بن عباس معاویہ کی محفل میں موجود تھا۔ معاویہ نے ملامت کی راہ سے کہا: ”اے عباس تو نے سنا کہ حسنؓ بن علیؓ نے ملک پر مرگ کو ترجیح دی۔“

امیر شام عبداللہ بن جعفر یل ابن عباس کو بمقابلہ حسینؓ افسر بنی ہاشم بنانا چاہتا ہے۔ امیر شام اس کے قبل قبول علامہ جیسا احتجاج طبری سے نقل کیا ہے: عبداللہ بن جعفر بن عباس پر آسانی اور کہا کہ اب تو تم سردار قوم قریش ہو گئے۔ جس پر ابن عباس نے کہا کہ ابو عبداللہ الحسینؓ علیہ السلام باقی ہیں۔

حسن کا مرثیہ فضل بن عباس نے حضرت امام حسنؑ کا جو مرثیہ کہا اس کا ترجمہ یہ ہے کہ: ”آج کے دن ابن ہند حسنؑ کی رحلت سے اظہارِ غمت میں بے خوف ہو گیا۔ ان کے بعد معاویہ کو راحت ہوئی اور وہ جنابِ حوادثِ زمانہ سے قبر میں مقیم ہوئے۔ اسے ابن ہند تو بے خوف چراگاہ میں چر رہا۔ وحشی کا مونا ہو جانا اس کے اچکنے کا سبب ہو جاتا ہے۔“

حسینؑ کا مرثیہ کہتے ہیں اپنے بھائی کی لاش کو کھدیں رکھنے کے وقت حضرت امام حسینؑ نے جو مرثیہ فرمایا اس کے بعض اشعار کا ترجمہ یہ ہے: ”کیا میں اپنے سر میں تیل ڈالوں یا میری مجلسیں غم سے خالی ہوں درِ آسمانیکہ سر مبارک آپ کا خاک آلودہ اور آپ کے جسم کا لباس اتارا ہوا ہو۔ دنیا کی کسی محبوب شے سے کیا فائدہ اٹھاؤں۔ مجھے وہ چیز محبوب ہے جو آپ کے قریب کرے۔ میں آپ پر برابر روتا رہوں گا جب تک کہ کبوتری گونجنے اور جب تک صبا اور ہلا جنوب چلے۔ جب تک میری آنکھ سے ایک قطرہ اشک نکلے اور جب تک کہ عجز کے بڑے بڑے درختوں میں کوئی ڈالی سر سبز ہو۔ لٹا ہوا وہ شخص نہیں ہے جس کا مال لوٹ لیا جائے، بلکہ وہ ہے جو اپنے بھائی کو زیرِ خاک کرے۔“

علیؑ کے دوست اور معاویہ مجھے بالتفصیل یہ کہنا نہیں ہے کہ معاویہ نے علیؑ کے دوستوں کو ذمہ سے علیؑ کرنے کا اعلان کیا اور وہ ٹھٹھکان اور شہ پر قتل کیے گئے۔ ہاتھ پاؤں کاٹے اور آنکھیں نکلوائی گئیں نہ مجھے اس پر کسی بسط کی ضرورت ہے کہ معاویہ نے کس طرح فضائلِ علیؑ کو رد کا اور اس کے مقابل کون سے لوگوں کے لیے عیش گھر ڈالیں، اور آخر میں یہ نتیجہ ہوا کہ دوستانِ علیؑ کا قتل کرنا اور کرنا حصولِ تقرب کا ذریعہ بن گیا یا حدیث سازی کا حکم بڑی شد و مد سے جاری رہا۔ اور کچھ دنوں کے بعد یہ نیت پہنچی کہ ایک مردود بقول ابن ابی الحدید حجاج سے یہ کہہ سکتا کہ: ”ہم میں سے کوئی ایسا نہیں ہے جس سے ابتراب پر سب دشمن کرنے کو کہا جائے اور وہ ان کے ساتھ ان کے فرزند حسنؑ و حسینؑ اور ان کی ماں فاطمہؑ زہراؑ کو زندہ نہ کرے۔“ میں نہایت مخصوص لوگوں اور حالتوں کے تذکرہ پر قناعت کروں گا۔

۴۱۔ عہدِ بنی حاتم ابن غلدون اگرچہ اس قصہ کا کوئی زمانہ نہیں لکھتا لیکن قیاس آسان ہے کہ وہ عامِ اجماع کے قریب کا ہو کہ: ”ایک روز عہدِ بنی حاتم امیر معاویہ کی صحبت میں بیٹھے ہوئے تھے امیر معاویہ نے ازراہ مذاق امیر المومنین علیؑ کی مصاحبت کی چنگلی (ہم) ”مصاحبت کی چنگلی“ کا بیج غری فقرہ دیکھنا چاہتے ہیں) عہد نے ترش رو ہو کر کہا: واللہ وہ قلوب جن سے ہم نے تم سے عداوت کی تھی ہمارے سینوں میں ہیں اور بے شک وہ تلواریں جن سے ہم تم سے لڑے تھے ہمارے قبضہ میں ہیں، اگر تم ایک ہاشت بھی بد عہدی سے ہماری طرف بڑھو گے تو ہم برائی سے تمہاری طرف پہنچ پاتے پڑیں گے۔ بلاشبہ موت کا غرہ اور حالتِ نزاع کا گمرہ ہمارے لیے آسان ہے بہ نسبت اس کے کہ ہم علی بن ابی طالب کے حق میں کوئی کلمہ ناطع سنیں۔ اے معاویہ تلوار کی بو سے تلوار اٹھاتی جاتی ہے۔ معاویہ نے یہ سن کر حاضرین سے خطاب کر کے کہا: یہ باتیں نہایت بیگ ہیں۔ ان کو کلمہ لو۔ پھر عہد کی طرف متوجہ ہوئے اور نہایت نرمی و مہاشفت سے گفتگو کرتے رہے۔“

۵۰

لیکن مشرک کے قریب جب کہ زیاد بن ابیہ بصرہ اور کوفہ کا حاکم تھا اس نے ”عدی بن حاتم کو (جو مسجد میں تھے) گرفتار کر لیا اور یہ دہلاؤ ڈالا کہ عبداللہ بن خلیفہ (رفیق حبرین عدی) کو حاضر کرو، یا اس کا پتا بتاؤ۔ عدی بن حاتم نے جواب دیا: کیا میں اپنے چچا کے لڑکے کو حاضر کروں کہ تو اسے قتل کر ڈالے۔ واللہ اگر وہ میرے قدموں کے نیچے ہوتا تو میں ان کو ہرگز نہ اٹھاتا۔ زیاد نے جھلا کر ان کو بھی قید کر دیا۔ لوگوں کو اس سے ناراضی پیدا ہوئی۔ آپس میں صلاح مشورہ کر کے زیاد کے پاس پہنچے اور اس سے کہا کہ بڑے غضب کی بات ہے کہ تو یہ فعل اصحاب رسول ﷺ اور سردار طے کے ساتھ کرتا ہے۔ زیاد نے بخیر اشتغال طع حوام یہ کہہ کر چھوڑ دیا کہ اچھا میں عدی کو چھوڑے دیتا ہوں۔ لیکن اس شرط پر کہ یہ اپنے چچا زاد بھائی کو کوفہ سے نکال دے۔“

عمرو بن عاص اور مغیرہ بن شعبہ کی سیاسی جنگ

معاویہ نے حصول اختیار کے بعد عبداللہ بن عمرو بن عاص کو کوفہ کی حکومت دی۔ یہ دیکھ کر مغیرہ بن شعبہ نے کہا: مصر میں ابن عاص اور کوفہ میں اس کا لڑکا ہے۔ ”گویا اب شیر کے دو دانتوں کے درمیان میں ہیں۔“ امیر معاویہ نے عبداللہ کو معزول کر کے بجائے ان کے مغیرہ کو مقرر کیا۔ اس کی خبر عمرو بن عاص کو پہنچی تو انھوں نے امیر معاویہ سے عرض کیا تم نے ایسے شخص کو کوفہ کا حاکم بنایا ہے جو مال کو ٹھپ کر جانے گا اور تم اس سے کچھ وصول نہ کر سکو گے۔ مناسب یہ ہے کہ ایسے شخص کو تم اس کے ساتھ مامور کرو جس سے یہ ڈرے۔ چنانچہ امیر معاویہ نے مغیرہ کو نماز پڑھانے پر متعین کیا۔“

زیاد زیاد کو جس کو اس کی قبول النسی کی وجہ سے ”ابن ابیہ“ یا ”ابن سمیہ“ (زیاد کی ماں کا نام) کہتے تھے۔ عبداللہ بن عباس نے فارس کا گورنر مقرر کیا تھا۔ اس نے برابر حمزہ انصاری کی انتظامی قابلیت دیکھ کر معاویہ نے اسے اپنی طرف ملنا چاہا۔ اور زیاد کو جو خط لکھا اس میں ظاہر کیا کہ تو ابوسفیان کے نطفہ سے ہے۔ (ابن خلدون نے ابن اثیر اور عقد الفرید سے لکھا ہے کہ سمیہ کسی ایرانی دستان کی کنیز تھی جو حرث بن کعدہ طبیب کو دی گئی اور کیونکر سمیہ کی آوارگی کی خبر سن کر اس نے اپنے غلام ضبید کو دیدیا اور پھر کیونکر ابوسفیان ایک غار کے پاس پہنچا اور سمیہ سے تعلق ہوا۔ جن صورتوں کے بعد تصفیہ آسان نہیں ہے کہ یہ کس کے نطفہ سے تھا) زیاد نے خط پڑھ کر لوگوں کو جمع کر کے غلبہ دیا۔ جس میں امیر معاویہ کی دھمکی سے تعجب ظاہر کرتے ہوئے کہا تھا کہ معاویہ مجھے ڈرانا چاہتا ہے۔ حالانکہ میرے اور اس کے درمیان میں ابن عمر رسول اللہ ﷺ مع مہاجرین و انصار کے ہیں۔ امیر المومنین علی بن ابی طالب کو جب اس سے آگاہی ہوئی تو لکھ بھیجا کہ میں نے تم کو والی مقرر کیا ہے اور میرے نزدیک تم اس کے سزاوار ہو اور ابوسفیان میں خباثت نفس اور ایک جہالت تھی جس کی میراث تم کو نہ ملنا چاہیے اور نہ تمہارا نسب اس سے ملتی ہو نامناسب ہے۔ اور معاویہ انسان کے آگے کچھ دائیں بائیں سے آتا ہے۔ پس اس سے احتراز کرو۔ پھر احتراز کرو۔“ (ابن خلدون)

عُبَید اللہ بن زیاد کیونکر قتل سے بچا

امیر المومنین کی شہادت کے بعد معاویہ نے کبھی زیاد کو بیت المال بھیجے، کبھی حساب فی کے لیے اور کبھی یزیدی طلب کیا۔ لیکن زیاد برابر انکار کرتا رہا۔ یہاں تک کہ بشر بن ارطاة نے بصرہ میں اس کی اولاد پر قبضہ کر لیا۔ جن میں عبدالرحمن،

عبداللہ اور عبید اللہ کا نام ہے۔ اور سبوں کے قتل کا قصد کیا ابوبکرہ زیاد کے ماوری بھائی نے (جس کے بھرن ارطاة کے ساتھ سب علی کے معاملہ کو ہم لکھ چکے) بھرے کہا: ”تو نے ان کو بغیر کسی جرم کے گرفتار کر لیا ہے حالانکہ امام حسن بن علی نے معاویہ سے مع میرا ہیمن علی کے جس حیثیت سے تم صلح کر لیا ہے۔ تم کو نہ ان کے اور نہ ان کے باپ کے گرفتار کرنے کا کوئی حق حاصل ہے۔“ بھرن نے ٹھٹھ دی۔ ابوبکرہ معاویہ کے پاس گئے۔ رہائی کا پروانہ لیا اور قتل میں ایک گھنٹہ باقی تھا کہ ابوبکرہ پہنچے اور رہا کر لیا۔ میں نہیں جانتا کہ ابوبکرہ کیا کرتے۔ اگر انھیں معلوم ہوتا کہ جس عبید اللہ کو انھوں نے امیر المومنین کا دوست کچھ کر صلح حسن کے ایک دفعہ سے رہا کر لیا وہ کچھ دن کے بعد کیا کرنے والا تھا۔

زیاد نے کچھ مال عبدالرحمن ابوبکرہ کے پاس لائٹا رکھا تھا اور انھوں نے اسے بصرہ کے قریب رکھا۔ معاویہ کو خبر ملی اور اس نے متغیر بن شعبہ کو قبضہ کرنے کے لیے لکھا۔ متغیر نے عبدالرحمن سے کہا: اگرچہ تمھارے باپ نے میرے ساتھ برائی کی تھی لیکن تمھارے چھانے میرے ساتھ سلوک کیا ہے۔ یہ کہہ کر عبدالرحمن کو لوٹا دیا اور امیر معاویہ کے پاس ایک خط معذرت کا لکھ بھیجا۔ بعد اس کے خود حاضر ہو کر کھانے اور معذرت کرنے لگے۔ امیر معاویہ نے کہا جبکہ فارس میں زیاد نے قیام کیا ہے اور میری طلبی پر نہیں آیا ہے اس وقت شب کو مجھے نیند نہیں آتی۔ متغیر نے عرض کیا: زیاد کی حقیقت کیا ہے؟۔ امیر معاویہ بولے: ”یہ نہ کہو وہ عرب کا ایک بڑا شخص ہے۔ اس کے پاس فارس کا مال ہے۔ حیلہ سازی اور چال بازی میں اس کو بڑی مہارت ہے۔ ایسا نہ ہو کہ اہل بیت میں سے کسی شخص کی وہ بیعت کر لے اور لڑائی پھر از سر نو چھڑ جائے۔“ متغیر نے زیاد کے لانے کا وعدہ کیا۔ زیاد کے پاس گیا اور کہا: ”تم کو معلوم ہے کہ حسن بن علی نے ان کی بیعت کر لی ہے۔ حالانکہ بھی ایک شخص ایسے تمھے کہ جو امیر معاویہ کی مخالفت کر سکتے تھے۔ میں میرے نزدیک تم اپنی فکر کرو اس سے پیشتر کہ معاویہ کو تمھاری پرواہ نہ باقی رہ جائے۔“ زیاد بولا: ”تم کچھ مجھے رائے دو۔“ متغیر نے جواب دیا: ”میرے نزدیک تم امیر معاویہ کے پاس چلے چلو اور مناسب یہ ہے کہ تم اپنے کو ان کی ذات سے وابستہ کر کے واپس آ جاؤ۔“ زیاد نے اس کو قبول کر لیا۔ معاویہ کے پاس گیا۔ ایک لاکھ درہم پر مصاحبت کر لی اور اجازت حاصل کر کے کوفہ میں آٹھرا۔ متغیر بن شعبہ زیاد کی کمال عزت و احترام کرتا تھا۔ پھر امیر معاویہ نے متغیر کو لکھ بھیجا کہ: ”زیاد، عمر بن عدی، سلیمان بن صرد، شہب بن ربعی، ابن الکوا، ابن الحنفی کو بلا التزام نماز جامعہ میں شریک کیا کرو۔“

۳۵۔ میں زیاد بصرہ کا گورنر مقرر ہوا۔ اور شہر کے قریب کوفہ بھی اس

علی کے دوست اور زیاد

کے عمل میں شامل کیا گیا اور اس نے قاعدہ مقرر کیا کہ چھ مہینہ بصرہ اور

چھ مہینہ کوفہ میں رہتا تھا۔ اعثم کوفی کے موافق کوفہ میں: ”دوستان علی کو گرفتار کرتا تھا قتل کرتا تھا ہاتھ پاؤں کٹواتا تھا اور آٹھیں لٹکواتا تھا۔“ بقول ابن خلدون ادنی بن حصن کی گرفتاری اور قتل کے بعد عمارہ بن عتبہ بن ابی معیط نے عمرو بن الحنفی کی چٹائی کی کہ اس کے پاس شیعان علی کا بیچ ہوتا ہے۔ زیاد نے عمرو بن الحنفی کو اس بیچ کرنے سے منع کر دیا۔

اور سمرہ بن جندب جس کو بصرہ میں اس نے اپنا نائب بنایا تھا اس کی غیر

بصرہ میں آٹھ ہزار کا قتل

ماضی میں خوزنی پر کمر بستہ ہو گیا۔ بے شمار عورتوں کو سیوہ اور بے حد

لوگوں کو قتل کر دیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ آٹھ ہزار آدمی اس کے ظلم کے ہاتھوں موت کے گھاٹ اتارے گئے۔

اسی مؤرخ کے موافق: ”مغیرہ بن شعبہ نے یہ عادت اختیار کر لی تھی کہ اپنے زمانہ گورنری میں اکثر مجالس اور خطبوں میں امیر المومنین علیؑ پر تعریضیں کرتا تھا اور امیر المومنین عثمانؓ کی تعریف۔ حبر بن عدی

یہ امر شاق گزرتا تھا۔ بسا اوقات کھڑے ہو کر کہہ اٹھتے تھے: خدا تم سے مجھے تمہاری ہی ذات سے یہ سب کچھ ہوا۔ میں شہادت دیتا ہوں کہ جس کی تم مذمت کر رہے ہو وہ فضیلت کا مستحق ہے اور جس کی تم بڑائیاں بیان کرتے ہو وہ مذمت کا مستحق ہے۔۔۔ اتفاق سے مغیرہ اپنے آخر زمانہ حکومت میں حسب عادت قدم بٹھیر پڑے ہوئے وہی کلمت کہہ رہے تھے حبر نے ایسا ڈانٹ کر کہا کہ کل مسجد والوں نے سنا۔ اسے شخص ہمارے روزیہ دیدے تو نے اس کو کیوں روک رکھا ہے۔ اس سے تجھ کو کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ بڑے افسوس کی بات ہے کہ تو نے امیر المومنین کی سختی سے مذمت کرتے ہوئے صبح کی۔۔۔ الغرض مغیرہ بعد چندے مر گئے اور زیاد بچانے ان کے گورنر مقرر ہو کر کوفہ میں آیا۔ اثنائے خطبہ میں امیر المومنین عثمانؓ کی تعریف بیان کی اور ان کے قاتلین پر طعن کیا۔ حبر نے حسب عادت قدم جو کہتے تھے کہا۔ زیاد خاموش ہو گیا اور بچانے اپنے عمر بن حریث کو مقرر کر کے بصرہ واپس آیا۔ بعد چندے یہ خبر پہنچی کہ حبر کے پاس شعیان علیؑ کا مجمع ہوتا ہے اور وہ لوگ امیر معاویہ پر لعن کرتے ہیں اور نیز ان لوگوں نے عمر بن حریث کو کنکریاں ماری تھیں۔ زیاد یہ سنتے ہی کوفہ کو روانہ ہوا۔ مسجد میں خطبہ دیا۔ حبر بھی موجود تھے۔ زیاد نے نہایت سختی سے ان کو مخاطب کر کے کہا: لست بشئ ان لم اصنع الکوفۃ من حجر وادعہ نکال لمن بعدہ۔ بعد اس کے حبر کو بلا بھیجا۔ حبر نے آنے سے انکار کر دیا۔ تب زیاد نے شداد بن الہیثم ہلالی صاحب شرطہ کو چند لوگوں کے ہمراہ حبر کے لانے کو بھیجا۔ حبر اور ان کے ہم نشینوں نے ان کو گالیاں دیں۔ زیاد نے اہل کوفہ کو ایک جاکر کے دمکھایا اور ایسا ہی لوگوں نے حبر سے علیحدگی و برائت ظاہر کی۔ زیاد نے کہا میں نہیں تم لوگوں کے جو اعزہ و اقربا حبر کے پاس ہوں ان کو تم لوگ بلالو۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ حبر کے پاس سوائے اس کی قوم کے اور کوئی نہ رہ گیا۔ اس وقت زیاد نے شداد بن الہیثم کو حکم دیا کہ حبر کے پاس جاؤ اور اس کو طوقاد کہاجس طرح ممکن ہو حاضر لاؤ۔ شدا گیا، حبر نے چلنے سے انکار کیا۔ بحث بڑھی۔ حبر نے بڑھ کر اس پر حملہ کر دیا۔ ابوالحر کندی نے حبر سے کہا: تمہاری حمایت کو سوائے میری تلوار کے اور کوئی نہیں ہے اور میری تلوار تم کو ان لوگوں سے نہ بچا سکے گی۔ بہتر یہ ہے کہ تم کندہ میں جا کر پناہ گزین ہو جاؤ۔ اس وقت عمرو بن الحق زخمی ہوئے اور سنبھل کر ازد میں پناہ لی اور حبر جرح ابوالحر کے سوار ہو کر کندہ آئے۔ زیاد نے مذبح و ہدان کے قبیلوں کو ان کی گرفتاری کے لیے بھیجا اور یہ ازد ربیعہ وغیرہ قبائل میں پناہ لیتے رہے۔

محمد بن اشعث بن قیس کندی حبر کو زیاد کے پاس لایا اور آخر میں محمد بن اشعث کے ذریعہ سے یہ طے پایا کہ زیاد حبر کو معاویہ

کے پاس بیٹھا دے۔ اور جب حبر آئے تو زیاد نے اس کو قید کر کے اس کے ہمراہیوں کی جستجو شروع کر دی۔ عمرو بن الحق مع رفاعہ بن شداد کے ساحل کی طرف بھاگ گیا اور ایک پہاڑ میں جا کر چھپ رہا، ان دونوں کا مقدمہ حامل موصل عبدالرحمن بن عثمان لکھتی ہمشیرہ زادہ امیر معاویہ معروف بہ ابن ام الحکم کے پاس پہنچ دیا گیا۔

عمرو بن الحق عبدالرحمن ان کی تلاش میں نکلا۔ رفاعہ تو ہاتھ نہ آیا لیکن عمرو بن الحق کو گرفتار کر کے امیر معاویہ کی خدمت میں ایک اطلاعی عرضداشت بھیج دی۔ امیر معاویہ نے کہا کہ چونکہ اس نے امیر المومنین عثمان کو

سات نیرے مارے تھے پس اس کے بھی اسی قدر نیرے مارے جائیں۔ غرض اول یاد دوسرے ہی میں عمرو بن اُمّیہ مر گیا۔ بعض کے موافق عمرو بن اُمّیہ جس غار میں چھپے تھے اس میں انھیں سانپ نے کاٹا، اور جب سوار انھیں باہر کھینچنا چاہتے تھے تو گوشت کا ٹکڑا ہاتھ میں آجاتا تھا۔ ان کا بند بندا کیا گیا اور سران کی سیوہ کے پاس بھیج دیا گیا۔ سردیجہ کریم کے معاویہ کو پیغام بھجوایا کہ: ”تو نے اے قتل کیا جو نہ کسی کا دشمن تھا نہ جس سے کسی کو دشمنی تھی وہ بہت دن تک تیرے خوف سے پسیدہ رہا۔ تو نے ایک پرہیزگار کا مارا اور اس کا سر میرے پاس ہی رہ گیا۔“

معاویہ نے انھیں بلوایا، اور پوچھا: ”تو نے یہ پیغام بھجوایا تھا؟“ جواب دیا: ”ہاں ہم نے۔ نہ ہم انکار کریں گے اور نہ کوئی عذر کرنا چاہتے ہیں۔ معاویہ نے کہا: ”ہمارے ملک سے چلی جا۔“ کریم نے کہا: ”اچھا۔ قسم خدا کی جلاوطن ہوتی ہوں اور اب اسے اپنا وطن نہ بناؤں گی اور نہ وہاں بات کروں گی۔ کیونکہ میری بے خوابی کو طول ہو گیا۔ میری عزت معرض خطر میں ہے۔ میرا تشریف زیادہ ہو گیا۔ بلا اس کے کہ کبھی خوشی کا منہ دیکھوں۔“ یہ سن کر ابن ابی سرح نے کہا: ”اس منافع کو اس کے شوہر کے پاس بھیج دو۔“ حنیفہ نے اس کی طرف دیکھا اور جواب دیا: ”وہ منافق ہے جو جھوٹ بولتا ہے اور بندہ گن خدا کو اذیت دیتا ہے۔ اور اس کا ہنہ کتاب خدا میں مذکور ہے۔“ اس کے بعد حنیفہ دربار سے نکلوا دی گئی۔ (ناخ التواریخ)

اور شہداء امینؒ نے ہر ایمان جو کہی سے شروع کر دی۔ چنانچہ قیس بن ضبہ عسبی کو امن حاصل کر کے حاضر کیا۔ زیاد نے اس کو بھی قید کر دیا، اور قیس بن عبد الشیبانی اپنے قوم کے ایک شخص کے ہمراہ آیا۔ زیاد نے اس سے امیر المومنین علیؑ کی بابت دریافت کیا۔ قیس نے تعریف و توصیف کی۔ زیاد نے اس کو مار کر قید کر لیا۔ پھر حجر کے ہمراہیوں میں سے کریم بن حنیفہ خشعی پیش کیے گئے۔ (ابن خلدون)

حجر کے خلاف مقدمہ تیار کر لیا جا رہا ہے قسہ مختصر جب زیاد نے رفتہ رفتہ حجر کے ہمراہیوں میں سے بارہ آدمیوں کو قید کر لیا تو سرداران ارباع عمر بن حریث، خالد بن عرظہ، قیس بن ابوفید، البردہ بن ابو موسیٰ کو بلایا، اور ہمراہیوں میں خود بخود جمع ہو گئے۔ ان لوگوں نے شہادت دی کہ حجر نے لشکر جمع کیا، اور امیر المومنین معاویہ کو گالیاں دیں اور لوگوں کو برا بھلا کہنے پر ابھارا، اور یہ زعم کیا کہ خلافت اہل ابی طالب میں جونی چاہیے اور نیز شہر میں بلوہ کیا، اور امیر المومنین کے حامل کا قتل دیا، اور علی بن ابی طالب کی ہوا خواہی اور محبت ظاہر کرتے ہوئے ان کے مخالفین سے استبرا کیا اور یہ لوگ جو اس کے ساتھ ہیں اس کے لشکر کے سردار اور اس کے مشیر ہیں۔ زیاد نے ان شہادتوں کے لینے کے بعد اور شہادتیں طلب کیں۔ چنانچہ احمہ و موئی پسران طلحہ بن عبد اللہ، منذر بن الزبیر، عمارہ بن عقبہ بن ابی معیط، عمرو بن سعد بن ابی وقاص وغیرہم نے شہادتیں دیں۔ انھیں شہادتوں میں شریح بن احرث و شریح بن ہانی کے نام بھی تھے۔ زیاد نے ایک عرضداشت میں ان کو انھوں کے نام سے

اور وائل بن حجر الحضری وکثیر بن شہاب کو ملا کر حجاز اور اس کے ہمراہیوں کو مع عرضداشت امیر معاویہ کی خدمت میں لے جانے کے لیے سپرد کیا۔

رفقائے حجر کے نام
حجر بن عدی کے ہمراہیوں کے نام تھے: ① ارقم بن عبد اللہ کنذی، ② شریک بن شداد حضری، ③ مصعب بن فضل شیبانی، ④ قیس بن ضبعہ عسبی، ⑤ کریم بن عقیف خشعی، ⑥ عامر بن عوف البلی، ⑦ ورقان بن ابی، ⑧ کرام بن حسان العنبری، ⑨ عبد الرحمن بن حسان العنبری، ⑩ حرز بن شہاب النبی، ⑪ عبد اللہ بن حوہ السحری۔ پھر زیاد نے ان گیارہ آدمیوں کے بعد سعد بن بکر سے عقبہ بن الاقرس اور سعد بن عوات ہمدانی کو گرفتار کر کے امیر معاویہ کے پاس روانہ کیا۔

شرح بن ہانی گواہوں کی مرتبہ فہرست کی حقیقت کھولتے ہیں
تھوڑی مسافت طے کی ہوگی کہ شرح بن ہانی آپہنچے

اور ایک بند لفظ میں امیر معاویہ کے نام کا خط وائل بن حجر کو لے کر واپس آئے۔ جس وقت یہ لوگ مرج عذرا (قریب دمشق) پہنچے وائل وکثیر نے آگے بڑھ کر امیر معاویہ سے ملاقات کی۔ واقعات بتلائے اور شرح کا خط دیا۔ امیر معاویہ نے کھولا۔ لکھا ہوا تھا کہ مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ زیاد نے میری شہادت حجر کے مقدمہ میں لکھ دی ہے۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ حمران لوگوں میں سے ہے جو نماز پڑھتے ہیں، زکوٰۃ دیتے ہیں، عمرہ و حج ہمیشہ کرتے ہیں، امر بالمعروف و نہی عن المنکر کرتے ہیں اور خون حرام و مال حرام سے احتراز کرتے ہیں۔ پس اگر آپ چاہیں تو ان کو قتل کر ڈالیں اور اگر مناسب سمجھیں تو رہا کر دیں۔۔۔۔۔ بعد اس کے امیر معاویہ نے ہدیہ بن فیاض قضاعی، حسین بن عبد اللہ کلابی، ابو شریب بدری کو حجاز اور اس کے ہمراہیوں کے قتل پر مامور کیا۔

علیٰ سے بیزاری قتل سے رہائی کی قیمت قرار دی جاتی ہے
پس یہ لوگ حجر کے پاس شام کے وقت آئے اور

کہا تم لوگ اگر علیٰ سے بیزاری ظاہر کرو اور ان کو طعن و تشنیع سے بھا کر دو تو ہم تم کو رہا کر دیں گے ورنہ قتل کر ڈالیں گے۔ حجر اور ان کے ہمراہیوں نے اس سے انکار کیا۔ تمام رات نمازیں پڑھتے، مغفرت کی دعائیں مانگتے رہے۔ صبح ہوتے ہی فیاض وغیرہ قتل کے لیے آگے بڑھے۔ حجر نے وضو کیا،

نماز پڑھی، حمران لوگوں سے مخاطب ہو کر کہا: واللہ میں نے اس سے زیادہ چھوٹی نماز کوئی نہیں پڑھی۔ اگر مجھے یہ شبہ نہ ہوتا کہ تم لوگ یہ سمجھو گے کہ میں موت سے ڈر رہا ہوں تو میں دیر تک نماز پڑھتا رہتا۔۔۔۔۔ فیاض نے لپک کر حجر پر تلوار چلائی اور اس کے ہمراہیوں نے اوروں پر وار کیا۔ حجر کے ساتھ جو اس واقعہ میں راہی ملک بچا ہوئے ان کے نام یہ تھے:

شہداء
شریک بن شداد، مصعب بن فضیل، قیس بن ضبعہ، حرز بن شہاب، کرام بن حسان، قتل کرنے کے بعد فیاض نے ان لوگوں کو دفن کر دیا۔ اور عبد الرحمن بن حسان عنبری اور کریم بن عقیف خشعی

کو امیر معاویہ کے پاس لائے۔ پہلے کریم پیش کیے گئے۔ ان سے کہا گیا کہ تم امیر المومنین علیٰ سے استبرار کرو۔ کریم نے اس کا کچھ جواب نہ دیا۔ سرہ بن عبد اللہ خشعی نے کھڑے ہو کر ان کی سفارش کی۔ امیر معاویہ نے اس شرط پر منظور کر لیا کہ آئندہ یہ کوغہ نہ جائیں۔ غرض کریم رہا جو کہ موصل میں مقیم ہوئے۔ باقی رہے عبد الرحمن بن حسان، ان سے دریافت کیا

گیا: تم علی کے بابت کیا کہتے ہو۔ جواب دیا میں ان کو بہت اچھا اور نہایت افضل سمجھتا ہوں۔ پھر استفسار کیا: عثمان کیسے تھے؟ جواب دیا: سب کے پہلے جس نے ظلم کا دروازہ کھولا اور حق کا دروازہ بند کیا وہ بھی تھے امیر معاویہ نے اس کو زیادہ کے پاس لوٹا دیا اور یہ کہلا بھیجا کہ اس کو نہایت اذیت سے قتل کرنا۔ پس زیادہ نے اس کو زندہ دفن کر دیا۔

حجریوں شہید کیسے گئے

مالک بن ہبیرہ سکونی نے حجر کی سفارش کی تھی لیکن امیر معاویہ نے جواب دیا: ”وہ سردار ہے۔ اگر میں اس کو چھوڑ دوں گا تو آئندہ خونِ فساد کا ہے۔“ عبد الرحمن بن حرث نے جنھیں حضرت عائشہ نے حجر کی گرفتاری کی خبر سن کر سفارش کے لیے بھیجا تھا اور بعد قتل حجر بیچنے، معاویہ سے کہا: کیوں معاویہ! حجر کے قتل کے وقت ابوسفیان کا علم کہاں غائب ہو گیا تھا۔ امیر معاویہ نے جواب دیا: ”جہاں تم جیسے قوم کے طیم غائب ہو گئے تھے۔ اور مجھ کو تو اس امر پر ابنِ سمیہ نے آمادہ کیا تھا۔ اس وجہ سے میں حجر کے قتل پر تل گیا۔“

شہادتِ حجر کے متعلق ایک سچا قول رجب بن حرث جو ولایتِ فرسان کے عامل تھے حجر کی شہادت کی خبر سن کر کہنے لگے: ”عرب ہمیشہ حجر کے بعد سے یوں ہی قتل کیا جائے گا اگر وہ لوگ حجر کے قتل سے رک جاتے تو اپنے کو اس قتلِ عام سے بچا لیتے لیکن انھوں نے ایسا نہ کیا اور ذلیل ہو گئے۔“

شہادتِ حجر اور اہلِ کوفہ صاحبِ روضۃ الصفا کہتا ہے: ”جس وقت اہلِ کوفہ نے سنا کہ حجر اور ان کے رفقاء مارے گئے تو بہت ہی مضطرب ہوئے اور ان کے اکثر مشاہیر

مدینہ میں حاضر ہوئے اور حسینؑ کی مہلت اختیار کی۔ والی مدینہ نے یہ خبر پا کر معاویہ کو اطلاع دی کہ ”کچھ اہلِ عراق مدینہ میں آنے ہیں اور حسینؑ کے پاس جایا کرتے ہیں۔ مجھے ان لوگوں کے فتنہ کا اندیشہ ہے۔“ معاویہ نے اس کا جواب دیا کہ: ”حسینؑ سے کوئی تعرض نہ کرو کہ انھوں نے ہم سے بیعت کی ہے۔ اور ظنِ غالب ہے کہ وہ فتنہ عہد نہ کریں گے۔“ اس کے بعد حسینؑ کو بھی خط لکھا کہ: ”تمہارے متعلق مجھے کچھ خبر ملی ہے کہ جو آپ کے لائقِ حامل نہیں ہے۔ جس نے کسی سے بیعت کی اسے مناسب ہے کہ وہاں سے ہمیں امید ہے کہ جب تک ہماری جانب سے تمھیں کوئی برائی نہ پہنچے مجھے بھی تمھاری طرف سے کوئی مکروہ امر واقع نہ ہو۔ مناسب یہ ہے کہ ان سفہاء کے کہنے پر عمل نہ کرو جو طالبِ فتنہ ہیں۔“

حسینؑ نے جواب دیا کہ: ”میں کسی طرح تیری مخالفت اور جنگ کی رغبت نہیں رکھتا تو مظہرِ رہ۔“

مروان، معاویہ اور حسینؑ اسی مؤرخ کے موافق: حجر کے خلاف گواہی دینے والوں میں ابو موسیٰ، اور ابوہریرہ کے نام بھی ہیں۔ و نیز یہ کہ زیادہ نے محمد بن اشعث کی معرفت حجر کو بلوایا۔ حجر اور ابنِ اشعث میں مستراحت تھی لیکن ان دنوں گفتگو قطع تھی۔ نایخ التواریخ کو کچھ اور کہنا ہے کہ: معاویہ نے ابنِ حکم کو مخموم ہدایت کی کہ: ”جب تک حسینؑ مصلحت سے متعرض نہ ہوں گے ہم ان سے متعرض

نہ ہوں گے۔ اور جب تک ان سے خطرہ ہو اپنے راز ان پر ظاہر نہ کر۔“ حسینؑ کو لکھا کہ: ”اگر تم مجھ سے انکار کرو گے تو میں بھی انکار کروں گا، اور نزدیکی اختیار کرو گے تو میں قربت چاہوں گا۔ اس سے پرہیز کرو کہ شق امت یافتہ کے باعث ہو۔ تم نے لوگوں کو اچھی طرح سمجھ لیا ہے اور امتحان کر لیا ہے۔ اپنی جگہ قائم رہو۔“ حسینؑ نے جواب لکھا: ”خط پہنچا۔ لکھا تھا کہ میں نے تیری مخالفت میں کچھ کیا ہے۔ جس کے علاوہ تجھے امید تھی۔۔۔ یہ خوشامدی اور جھوٹے لوگوں نے اختیار کیا ہے۔ میں نہ تیری مخالفت پر آمادہ ہوں اور نہ جنگ کا قصد رکھتا ہوں۔۔۔ آیا تو وہ شخص نہیں ہے جس نے ہجرت کندی کو قتل کیا جو نماز گزار اور پرہیزگار تھا، اور جو ظلم و بدعت کو پسند نہیں کرتا تھا اور جسے دین میں کسی کے سرزنش کی پروا نہ تھی۔ تو نے اسے ظلم سے تباہ کیا۔ بعد اس کے کہ قسموں سے عہد کو پختہ کیا تھا اور بغیر اس کے کہ اس نے تیرے ملک میں کوئی فتنہ برپا کیا ہو۔ کیا تو وہ نہیں ہے کہ جس نے عمرو بن امق کو جو بڑا عادل اور پرہیزگار تھا خط امان دینے کے بعد قتل کیا۔۔۔ آیا تو وہ نہیں ہے کہ زیاد ابن سمیہ کو جو ایک عبد ثقیف تھا بھائی کہا۔ اگرچہ حکم رسولؐ اس کے خلاف تھا تو نے اپنی مصلحت کے لحاظ سے سنت رسولؐ کو دور پھینک دیا، اور اسے عراق میں پر بھیجا۔ اس نے مسلمانوں کے پاؤں کاٹے اور درختوں میں لٹکایا۔ گویا تو اس امت سے نہ تھا۔ آیا تو وہ نہیں ہے کہ زیاد ابن سمیہ نے تجھے لکھا کہ حضرت عیسیٰؑ کے دین پر ہیں اور تو نے اسے حکم بھیجا کہ ان میں سے ایک کو زندہ نہ چھوڑے۔ اس نے سب کو قتل کیا۔ حالانکہ اسی دین کے لیے علیؑ نے تجھے اور تیرے باپ کو دستوش شمشیر بنایا تھا۔ آج تو نے خلافت کو غصب کیا ہے۔ در نہ تیری اور تیرے باپ کی منزلت سوا تلوار کے دوسری نہ تھی۔ اور یہ جو تو نے لکھا ہے کہ اپنے دین اور امت کی فکر میں رہوں اور فتنہ مٹانے کروں تو میں اس امت میں کسی فتنہ کو تیری حکومت اور خلافت سے زیادہ تصور نہیں کر سکتا۔ اپنے نفس اور امت محمدی کے خیال سے اس سے اچھی کوئی بات مجھے معلوم نہیں ہوتی کہ تجھ سے جنگ کروں۔ اگر تجھے شکست دی تو درگاہ خدا میں مجھے تقرب حاصل ہو گا۔ سستی کرنے میں مجھے خدا سے طلب استغفار کرنا پڑے گی۔ یہ جو تو نے لکھا ہے کہ اگر میں تجھ سے انکار کروں گا تو تو بھی مجھ سے انکار کرے گا، اور اگر میں تجھ سے صداقت کروں گا تو تو بھی مجھ سے صداقت کرے گا۔ افسوس ہے تجھ پر یہ تیرا کیا خیال ہے۔ مجھے امید ہے کہ مگر کسی مخلوق کو نقصان نہیں پہنچاتا مگر یہ کہ اسی کے نفس کی طرف بازگشت کرتا ہے۔ تو جیل پر سوار اور نقص عہد پر عرص ہوا۔ خدا کی قسم تو نے کسی عہد کو وفا نہ کیا۔ مسلمانوں کو قتل کیا، بعد اس کے کہ ان سے دھدے کیے تھے، اور بغیر اس کے کہ انھوں نے تجھ سے کوئی مناقشت کی ہو۔ ان کا تصور بجز عار سے فضائل اور تعظیم حقوق کے کچھ نہ تھا۔ انھیں تو نے اس خوف سے قتل کیا کہ اگر یہ زندہ رہیں تو تو خود نہ تباہ ہو جائے۔ جان اسے معاویہ کہ قیامت ہوگی اور قصاص کا وقت قریب آرہا ہے۔ جان کہ کوئی گناہ مغیرہ و کبیرہ ایسا نہیں ہے کہ جو کتاب خدا میں نہ لکھا ہو۔ خدا دیکھتا ہے کہ تو نے لوگوں پر بہتان کیا۔ دوستانہ خدا کو ٹھٹھٹ لگائی۔ بہتیروں کو قتل اور جلاوطن کیا، اور لوگوں سے بیعت کرائی۔ تو نے اپنا دین خراب اور رعیت کو پریشان کیا، ہارساؤں کو ڈرایا، اس لیے کہ آرزو کی گردن پر سوار ہو۔“

۵۷ شروع شروع ہوا تھا کہ زیاد کی انگلی میں ایک چھوڑا لٹکا اور زہر پھیلنے لگا۔ اور ہاتھ کٹانے کی صلاح ہوئی۔ لیکن وہ دشمن انسانیت جو ہزاروں بندگان خدا کو معاویہ کے خوش کرنے اور اپنے کو اپنی جگہ قائم رکھنے کے لیے بغیر کسی شکن کے قتل کر سکتا تھا خود ”جس وقت آگ اور آتش قطع پر نظر پڑی ڈر کر ہاتھ کٹانے سے رک گیا۔“ اسی مرض نے زمانہ کو اس کے

باب

وجود سے پاک کیا اور خماک بن قیس کو ذہ کا گورنر ہوا۔ اور مسجد میں عبید اللہ بن زیاد بصرہ کا گورنر مقرر کیا گیا۔
معاویہ اور شہداء اُحد کی قبریں معاویہ کے دوران حکومت کا یہ واقعہ ہے کہ شہداء اُحد کی قبریں مکشوف ہوئیں جسے میں منافع النبیوت سے قتل کرتا ہوں:
 ”اکثر قبور شہیدوں کی اس جہت سے مکشوف ہوئیں کہ معاویہ ابوسفیان کے بیٹے نے اپنی امارت کے وقت میں ایک نہر کھدوائی اس مشہد مقدس کی راہ میں۔ یعنی اس نہر کو ان شہیدوں کی قبروں کی راہ سے روانہ کیا اور اکثر قبریں اس سبب سے مکشوف ہوئیں اور شہیدوں کو قبروں سے باہر نکالتی تھیں اور مدینہ کی تاریخ میں امام تلح الدین سکی سے شکار السقام سے لاتا ہے کہ جب معاویہ نے نہر نکالی اور حکم کیا شہیدوں کے نکالنے کا ان کی قبروں سے تب مسامی سید الشہداء حمزہ بن عبد المطلب کے قدم کو پہنچے اور خون اس سے جاری ہوا اور روایت کرتے ہیں کہ اس کے حامل نے اس نہر کے گڑھا کھدوانے کے روز مدینہ میں منادی کی کہ نہر امیر المومنین کی آتی ہے جس کا مردہ اُحد میں ہو سو آوے اور اسے وہاں سے اٹھا کر دوسری جگہ لے جانے۔“

ولیعہدی زبیدی کی کوششوں کی ابتدا مغیرہ یا عمر عاص کے دماغ سے ۳۹

بڑے تغیر کی ابتدا ہو رہی تھی۔ روضۃ الصفا اور ابن خلدون کے موافق یہ مغیرہ بن شعبہ اور اعثم کوئی کے موافق عمرو بن عاص تھا جس نے اس معاملہ کو شروع کیا اور ان دونوں کا اس قصہ کو اٹھانا کچھ تو معاویہ کی خوشنودی اور میلان اور کچھ اموی خاندان کے اقتدار کے لحاظ سے اپنی قدر دانی اور اقتدار کو محفوظ کرنا تھا۔

ہوا یہ کہ مغیرہ نے صنعت کی وجہ سے استغناء دیا اور جب اس کے دوستوں نے سنا تو کہا کہ: ”تم کو امیر معاویہ نے نکال دیا ہے۔“

اس سے مغیرہ کے دل پر ایک چوٹ سی لگی اور اسی وقت سے بحالی کی فکر ہو گئی۔ (ابن خلدون) اسی غور میں ایک روز زبیدی کے پاس جا پہنچے اور اس سے کہنے لگے: ”تم امیر معاویہ سے اپنی ولیعہدی کی بیعت لینے کو کیوں نہیں کہتے۔ کیونکہ اہل صحابہ اور سرداران و بزرگان قریش انتقال کر چکے ہیں اب ان کی اولادیں باقی ہیں اور تم ان لوگوں سے رائے، سیاست میں افضل ہو۔ میرے نزدیک امیر المومنین کو تمہاری ولیعہدی کی بیعت لینے سے کوئی امر مانع نہ ہوگا۔“ زبیدی نے مغیرہ کی تقریر کا معاویہ سے اعلاہ کیا۔ معاویہ نے مغیرہ کو طلب کیا اور مغیرہ نے کہا: ”آپ اس کی ولیعہدی کی بیعت لوگوں سے پیچھے آپ کے بعد مسلمانوں کا یہ ماوا اور مٹا ہوگا اور اس میں نہ کوئی فتنہ ہوگا اور نہ فساد۔ میں اس کام کی انجام دہی کو کوفہ میں کافی ہوں گا اور زیاد بصرہ میں۔ اور ان دونوں شہروں کے بعد پھر کوئی ایسا شہر نہیں ہے جو آپ کے حکم سے مخالفت کرے۔“ امیر معاویہ نے اس تقریر کو غور سے سن کر مغیرہ کو بحالی کی سند دی اور دوبارہ کوفہ کی طرف واپس کیا اور زبیدی کی ولیعہدی کی بیعت کی کارروائی کرنے کا حکم دیا۔

مغیرہ وفد تیار کرتا ہے مغیرہ نے کوفہ میں پہنچ کر ہوا خواہان دولت بنی امیہ سے اس کا ذکر کیا۔ ان لوگوں نے بہ کمال خوشی منظور کر لیا۔ مغیرہ نے ان لوگوں میں ایک گروہ کو

بطور وفد اپنے لڑکے موئی کے ساتھ دار الخلافہ دمشق کو روانہ کیا۔ اہل وفد نے حاضر ہو کر ولیعہدی یزید کی بیعت کی درخواست پیش کی۔۔۔ بعد اس کے یزید کو یہ کل حالات لکھ بھیجے اور اس سے مشورہ طلب کیا۔

یزید کے متعلق زیاد کے خیالات یزید نے عبید بن کعب عمیری کو بلا کر کہا: ”۔۔۔ امیر المومنین نے مجھے یہ خط لکھا ہے اور ولیعہدی یزید کے بابت مشورہ

طلب کیا ہے۔ اس وجہ سے کہ لوگوں کے متفر سے وہ خائف ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ لوگ اس امر میں ان کی اطاعت کریں۔ لیکن مسلمانوں کا اس امر پر راضی ہونا ایک امر اہم ہے۔ یزید میں آوارگی، بے خودگی، نااہلی ہے۔ میرے نزدیک تم امیر المومنین سے جا کر ملو اور یزید کے افعال سے مطلع کرو اور صاف صاف کہہ دو کہ یہ کام ہونا دشوار ہے۔“

لیکن جو کچھ زیاد کے نزدیک ناگہن تھا دوسرے ہوا خواہ کے نزدیک ایسا کہنا خلاف مصلحت تھا۔ اس لیے کہ ”معاویہ کی رائے سے مخالفت“ اور ”یزید کو بد خواہ بنانا“ ہوتا، اور تجویز کیا کہ یزید سے کہا جائے کہ ”اگر تم مناسب کھو تو تم ان افعال و حرکات کو چھوڑ دو تا کہ لوگوں کو قاتل معقول کرنے کا موقع مل جائے اور جو تم چاہتے ہو وہ امر حاصل ہو جائے۔“ یہ رائے پاس ہوئی اور معاویہ کو توقف کی صلاح دی گئی۔

”جب زیاد مر گیا تو امیر معاویہ نے یزید کی ولیعہدی کی بیعت لینے کا معصم قصد کر کے کارروائی شروع کر دی۔ پہلے عبداللہ بن عمر کے پاس ایک ہزار درہم بطور تذر کے بھیجا عبداللہ بن عمر نے اس کو قبول کر لیا، بعد اس کے ولیعہدی یزید کی بیعت کا تذکرہ کیا گیا عبداللہ بن عمر نے ارشاد کیا: ”میں اپنے دین کو بعض دنیا نہ فروخت کروں گا۔“ یہ کہہ کر در اہم واپس کر دیے اور ولیعہدی یزید کی بیعت سے انکار کر دیا۔“

مردان بن حکم اہل مدینہ سے ولیعہدی یزید کا مشورہ لیتا ہے اس کے بعد معاویہ نے مردان

لکھا، اور کہا کہ اہل مدینہ کا خیال معلوم کرو۔ جواب گیا کہ: بہتر ہے امیر المومنین محمی کو بلائے لیے منتخب کریں۔ اب جواب بھیجا گیا کہ: ”یزید کو میں اپنے بعد ولیعہد کرتا ہوں۔“ مردان نے اسے اہل مدینہ سے کہا: یہ سن کر عبدالرحمن بن ابی بکر نے کہا: ”واللہ! اے مردان تو جھوٹا ہے اور معاویہ بھی جھوٹ بولتا ہے۔ تم دونوں نے امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے کیا بہتری ڈھونڈی ہے۔ بلکہ تم خلافت کو حکومت ہر قلیہ بنانا چاہتے ہو کہ ایک ہر قل جب مر جائے تو اس کی جگہ پر دو سرا ہر قل قائم ہو۔“ حسین بن علی، عبداللہ بن عمر، ابن زبیر نے اس کلام کی تائید کی۔ مردان نے معاویہ کو صورت حال کی خبر دی۔

حکومت عام خواہش دکھانے کے لیے وفد تیار کراتی ہے اس وقت امیر معاویہ نے اپنے

”تم لوگ یزید کی شاد صفت لوگوں میں بیان کرو اور اطراف و جوانب بلاد اسلامیہ سے یزید کی ولیعہدی کی درخواست پیش کرنے کی غرض سے وفد بھیجو۔“ وفد جمع ہوئے اور اب معاویہ نے ضحاک بن قیس القہری سے کہا کہ: ”میں تمہیں کچھ بیان کروں گا جس وقت میں تقرر کر کے خاموش ہو جاؤں اس وقت تم اٹھ کر ولیعہدی یزید کے بیعت کی تقریر کرنا، اور لوگوں کو اس امر پر ابھارتا۔“ ضحاک، عمر بن سعید الاشجق وغیرہ نے دھواں دھارہ سجھیں دی۔

حکومت کے نزدیک خطیبوں کا سردار اور یزید بن مثنیٰ خدری نے کھڑے ہو کر کہا: (امیر المومنین کی طرف اشارہ کر کے) یہ امیر المومنین ہیں۔ اگر یہ مرجائیں تو (یزید کی طرف اشارہ کر کے) یہ امیر المومنین ہیں۔ اور جو شخص اس سے اختلاف کئے گا تو (تلوار کی طرف اشارہ کر کے) یہ ہے۔“

امیر معاویہ نے یزید بن مثنیٰ سے کہا: ”بیٹہ جاؤ تم خطیبوں کے سردار ہو۔“

احنف بن قیس کی تقریر سے رنگ بدل گیا

احنف بن قیس خاموش بیٹھے ہوئے تھے۔ امیر معاویہ نے کہا: ”تمہاری کیا رائے ہے؟“ عرض کیا: ”مجھے خوف ہے کہ میں جو کہوں گا اس کی تم تصدیق کرو گے اور اللہ تعالیٰ کا خوف یہ ہے کہ وہ تکذیب کرے گا۔ اے امیر المومنین تم یزید کے شبانہ روزی حالات سے بخوبی واقف ہو۔ اس کے ظاہر و باطن، اند و رفت سے کما حقہ آگاہ ہو۔ اگر تم جانتے ہو کہ اس میں اللہ تعالیٰ اور امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بہتری ہے تو کسی سے مشورہ نہ کرو، اور اگر تم اس کے خلاف جانتے ہو تو دنیا کی زیادہ فکر نہ کرو۔ سفر آخرت قریب ہے۔ باقی رہے ہم۔ ہمارا فرض یہ ہے کہ آپ جو کچھ کہیں اس کو بسر و چشم منظور کر لیں۔۔۔۔۔“

احنف کی تقریر لوگوں میں پھیل گئی اور بظاہر یہ معلوم ہوا کہ اب یہ کام نہ ہوگا۔ لیکن امیر معاویہ برابر اپنی کوشش میں لگے رہے۔ ہر شخص سے مدارات و سلوک کرتے رہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑے ہی دنوں کے بعد اہل عراق و شام کے اکثر آدمیوں سے ولیعہدی یزید کی بیعت لے لی۔

معاویہ مدینہ میں

اہل عراق و شام سے ولیعہدی یزید کی بیعت لینے کے بعد امیر معاویہ ایک ہزار سواروں کی جمعیت سے مدینہ منورہ پہنچے۔ حسین بن علی، عبد اللہ بن زبیر، عبد الرحمن بن ابی بکر، عبد اللہ بن عمر (رضی اللہ عنہم) اس خیال سے کہ امیر معاویہ کا ہمارے کہنے پر غلہ رآمد نہ ہوگا، مکہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ امیر معاویہ نے لوگوں کو جمع کر کے خطبہ دیا۔ یزید کی تعریف کی اور یہ بیان کیا کہ کوئی شخص اس سے زیادہ سچی خلافت نہیں ہے۔۔۔۔۔ کسی نے اس تقریر کا کچھ جواب نہ دیا۔ امیر معاویہ منبر سے اتر کر ام المومنین عائشہ کی خدمت میں گئے اور اس سے پیشتر ان کو یہ معلوم ہو چکا تھا کہ حسین بن علی اور ابن عمر (رضی اللہ عنہم) وغیرہ بخوف بیعت ولیعہدی یزید مکہ چلے گئے ہیں۔ آپ نے ارشاد کیا میں نے سنا ہے کہ تم نے ان لوگوں کو قتل کی دھمکی دی ہے۔ جواب دیا:

ایک چھوٹا سا ”لیکن“

اے ام المومنین وہ لوگ مجھے یزید سے زیادہ عزیز ہیں۔ لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں اس بیعت کو ناقص کر دوں جو ولیعہدی یزید پر میں نے لی ہے اور پوری ہو گئی ہے۔ اس پر ام المومنین عائشہ خاموش ہو رہیں۔

۵۶ معاویہ مکہ میں

امیر معاویہ تھوڑے دن مدینہ میں ٹھہر کر مکہ روانہ ہوئے۔ امیر معاویہ کی خبر آمد سن کر اہل مکہ ملنے کو آئے۔ حسین اور ابن عمر (رضی اللہ عنہم) وغیرہ بھی یہ خیال کر کے کہ شاید معاویہ اپنے فعل سے نادم ہو کر آتے ہیں، ملنے کو گئے۔ معاویہ نے اپنی رعایتوں کے ذکر کے بعد یزید کی ولیعہدی پیش کی۔ اور ابن زبیر نے خلیفہ ثالث تک کے اصول انتخاب یا خلافت کا تذکرہ کر دیا۔

حق گوئی تلوار کی بارگاہ کے نیچے

امیر معاویہ نے کہا: ”تم لوگ بھی کہتے ہو جاذب لیکن میں زید کو ولیعہد ضرورت بتاؤں گا۔ خدا کی قسم اگر کسی نے میری ہاست رد کی تو

خیر نہ ہوگی۔ یہ کہہ کر اپنے صاحب شرط کو بلا کر کہا کہ جو شخص میرے بیان کی تکذیب کرے اس کی گردن فوراً اڑا دینا۔ ابن علی، ابن عمر، ابن زبیر، ابن ابی بکر رضی اللہ عنہم اٹھ کر باہر آئے۔ امیر معاویہ بھی اندر سے نکل کر منبر پر چڑھ گئے اور حمد و ثناء کے بعد کہا: ”ما جو! ابن علی، ابن ابی بکر، ابن زبیر وغیرہم مسلمانوں کے رومی پیشوا اور بہترین امت ہیں۔ کوئی کام ان کے بغیر مشورہ انجام کو نہیں پہنچ سکتا۔ یہ لوگ ولیعہدی زید پر راضی ہو گئے ہیں اور بیعت کر لی ہے۔ آؤ تم لوگ بھی اللہ تعالیٰ کا نام لے کر بیعت کر لو۔“ اہل مکہ چونکہ انھیں لوگوں کی بیعت کا انتظار کر رہے تھے۔ یہ سنتے ہیں بیعت پر آمادہ ہو گئے۔

اہل مکہ سے بیعت لے کر امیر معاویہ مع ان بزرگوں کے مدینہ پہنچے۔ اہل مدینہ ان لوگوں سے ملنے کو آئے۔ برسیل تذکرہ کہا: ”تم لوگ تو بیعت ہی کے خوف سے مکہ بھاگ گئے تھے، یہ کیا معاملہ پیش آیا کہ زید کی بیعت پر راضی ہو گئے؟“ ان لوگوں نے کہا: ”واللہ ہم نے بیعت کی ہی نہیں۔“ پھر اہل مدینہ نے کہا: ”تم نے معاویہ کو اس سے کیوں نہ روکا؟“۔ سمجھوں نے جواب دیا: ”مسلمانوں کی خونریزی کے خیال سے۔“

بعد اس کے امیر معاویہ اہل مدینہ سے بھی یہ حکمت عملی بیعت لے کر شام کو روانہ ہو گئے۔ صاحب تاریخ التواریخ نے عشرہ کے واقعات میں لکھا ہے کہ حضرت امام حسینؑ نے ایام حج میں ایک خیمہ نصب فرمایا اور قریب ایک ہزار بنی ہاشم اور اصحاب

مکہ میں حسین کا خطبہ

مجمع ہوئے۔ حضرت نے خطبہ فرمایا۔ جس میں حمد و ثناء کے بعد ارشاد کیا کہ معاویہ نے ہمارے اور ہمارے دوستوں کے ساتھ جو کچھ کیا اسے تم لوگوں نے سنا اور دیکھا۔ میں تم سے کچھ پوچھتا ہوں۔ اگرچہ ہو تو اس کی تصدیق و رد نہ تکذیب کرنا۔ اور اسے اپنے ذہن میں محفوظ رکھ کر اپنے وطن میں بیان کرنا اور سننے والوں سے کہنا کہ وہ دوسروں سے بیان کریں۔ میں خوف ہے کہ دین خدا ضائع ہوگا۔ اس کے بعد رسول کا جناب امیر کو اپنا بھائی فرماتا، مسجد کا دروازہ ان کے لیے کھلا رکھنا، بعض کا حسد کرنا، غدیر کی حدیث، ہارون فرماتا، نصاریٰ خیران کے مبالغہ میں علیؑ کو اپنا نفس فرماتا، خبیر میں کرار کہنا، سورۃ برات حوالہ کرنا، یا علی انت صفی وانا منک فرماتا۔ بیان کرنے کے بعد پوچھا کہ کیا رسولؐ نے یہ حدیثیں نہیں فرمائیں؟ کیا حضرت فاطمہؑ سے نہیں کہا کہ تیرا شوہر ”خیر اہل بیت اقدمہم سلما واعظمہم حتما واکثرہم علما“ سے شفقت ہے۔ کیا رسولؐ نے اپنے کو سید عالم اور علیؑ کو سید عرب نہیں فرمایا۔ فاطمہؑ کو سیدۃ النساء اہل الجنۃ اور ہم لوگوں کو سیدۃ شباب اہل الجنۃ نہیں کہا۔ کیا تم لوگوں کو حدیث ظہیرین یاد نہیں ہے۔ سب نے تصدیق کی اور یہ احادیث اور موقعہ سن کر مٹی سے متفرق ہوئے۔

روضۃ الشفا کے موافق سعید بن عثمان نے خراسان کی امارت چاہی، معاویہ نے عذر کیا کہ عبید اللہ بن زیاد وہاں کا حاکم ہے۔ اس پر ابن عثمان کچھ گرم ہوئے، اپنے باپ کے حقوق یاد دلانے۔ آخر گورنری لے کے ہی چھوڑی۔

گبن نے دکانین ایڈر فال آف رومن امپائر میں لکھا ہے کہ: ”حسینؑ نے جنھیں اپنے باپ کے قتل کے طرح شجاعت کا درس بھی ملا تھا، مسیحوں کے خلاف قسطنطنیہ کے محاصرہ میں قابل تعریف خدمت ادا کی۔“ اور مؤلف

بریت ہٹری آف سار سینس کہتا ہے کہ: ”حسینؑ غلیفہ کی فوج کے ساتھ میچوں سے برابر جنگ کرتے رہے۔“
اعثم کوئی اور روضۃ العفا کے موافق صلاح کی ابتدائی مدارج میں نیریدج کرنے آیا، اور لوگوں کو اپنی طرف مائل کرنے کے لیے بہت داد و دہش کی۔ لیکن جب معلوم ہوا کہ معاویہ نیرید کو ولیعہد کرنا چاہتا ہے تو لوگوں نے جو کچھ جی میں آیا کہا اور شرعاً لے چو لگی۔

اور جب مدینہ میں ابن حکم مثنیٰ سے نیرید کی تعریف کر رہا تھا۔ عبدالرحمن بن ابی بکر نے
ابن ابی بکر اور مروان اسے جھٹلایا اور اور ٹانگ پکڑ کے اتار لیا۔ بنی امیہ غصہ میں آنے اور اس وقت
حضرت عائشہؓ آگئیں۔ اور مروان کو سخت ست کہا۔ جس سے وہ خاموش ہو گیا۔

روضۃ العفا کے موافق مدینہ پہنچ کر معاویہ نے حسینؑ سے کہا کہ: ”تمہاری مثال اس شخص کی ہے جس کا خون جوش
میں آ گیا ہو۔ خدا تمہارا خون پہائے گا۔“ اعثم کوئی کے موافق کہا کہ: ”ہم تمہارے حسد اور عداوت کو جانتے ہیں۔“
اور حسینؑ نے جواب دیا: ”چپ رہ اے معاویہ کہ ہم اس کے اہل نہیں ہیں۔“ معاویہ نے کہا: ”تم اسے کے اور
اس سے بدتر کے اہل ہو۔“ تم لوگ ایسی بات چاہتے تھے خدا جس کے خلاف چاہتا تھا۔“

انہیں مؤرخین کے موافق معاویہ نے اپنی عام تقریر میں بیعت نہ کرنے والے لوگوں کو ہر طرح کی دھمکیاں دیں۔ اور یہ
سن کر کہ عبداللہ بن عمرو غیر تاکہ سٹے گئے ”منکسر ہوا۔“ اس کے بعد کچھ دیر تک ابن عباس سے گرم و سرد گفتگو ہوئی اور
بنی ہاشم کے وظائف جاری کرنے پر اس وقت تک آمادہ نہیں ہوا جب تک ابن عباس نے یہ دھمکی نہ دی کہ پھر ہم جو کچھ
تمہارے متعلق جانتے ہیں اس سے لوگوں کو مطلع کرنا شروع کریں گے۔ معاویہ اس کے بعد مکہ روانہ ہوا۔ اور حضرت
عائشہؓ نے اپنے بھائی کے مظلومانہ موت کے عوض میں معاویہ کو قتل کرنے کی دھمکی دی۔ مکہ میں پہنچ کر ان لوگوں سے
خوش اخلاقی کا برتاؤ کیا اور کہا کہ: ”دل من چننا میخواست کہ شمام خلافت براؤ (نیرید) نہید و کلد بدست شما باشد
آنچه خواہید و مرا دل داشتہ میکنید۔“ یعنی: میرا دل چاہتا تھا کہ تم نام کی خلافت نیرید کو دو اور کام تمہارے ہاتھ
میں ہو جو چاہو کرو۔

تحفہ بھیجے لیکن حسینؑ نے اسے قبول نہ فرمایا۔ چند روز کے بعد حسینؑ کو طلب کیا۔ زیر بحث گفتگو شروع کی۔ اور
اعثم کوئی کے موافق کہا: ”میں نے مدینہ کی بیعت کو ملتوی رکھا تھا۔ اس لیے کہ میں جانتا تھا کہ یہ نیرید کا گھر ہے، اور اس
کے اعزا بہت ہیں۔ اگر میں نیرید سے کسی کو اچھا دیکھتا تو اسی کو منتخب کرتا۔“ حسینؑ نے جواب دیا کہ: ”اے معاویہ نیرید سے
کسی بہتر شخص کو امورات خلافت کے لیے منتخب کر۔ جو اے انجام دے سکے اور جو اپنی ذات اور اپنے ماں باپ کی طرف سے
بہتر ہو۔“ معاویہ نے کہا: ”کیا اس ”کسی“ سے تم اپنے کو مراد لیتے ہو۔“ فرمایا: ”اگر میں مراد لوں تو بعید نہیں ہے۔“
معاویہ نے کہا: ”اس میں شبہ نہیں کہ تم نیرید سے اچھے ہو لیکن امورات خلافت کے لیے وہ تم سے اچھا ہے۔“
حسینؑ نے فرمایا: ”انصاف سے
حسینؑ کو نانا کی امت اپنے نفس سے زیادہ عزیز تھی
بات کر اے معاویہ۔ وہ کون ہے جو
میرے نانا کی امت کے لیے خج سے بہتر ہو۔ کیونکہ مجھے اپنے نانا کی امت اپنی ذات سے زیادہ عزیز ہے۔“

معاویہ نے کہا: ”اے حسینؑ واپس جاؤ۔ اپنی جان کو ڈرتے رہو اور اہل شام سے پرہیز رہو۔“

اس کے بعد ان دونوں مؤرخین نے لکھا ہے کہ: ”دوسرے دن معاویہ نے ان چاروں آدمیوں کو بلایا اور خود مشیر پر چڑھ کر کہا: ”میں بہت سی باتیں سنتا ہوں لیکن اے معتبر نہیں سمجھتا۔ میں نے سنا ہے کہ یہ چاروں بزرگ یزید کی بیعت پر راضی نہیں ہیں اور بیعت نہیں کی۔ مجھے تعجب ہوا اور ان بزرگ زادگان عرب کو جو اخیر مسلمان ہیں طلب کیا اور ان سے بیعت یزید کی گفتگو پھیری۔ انھوں نے لطف اور طوع و رغبت سے یزید سے بیعت کی ہے۔ یہ باتیں میں ان کے سامنے کہہ رہا ہوں کہ کسی کو شبہ ہو تو تحقیق کر لے کہ انھوں نے یزید کی بیعت کی ہے یا نہیں۔ اس کے بعد امر اور معارف شام کو اشارہ کیا۔ یہ تلواریں اٹھ کر کھڑے ہوئے اور کہا: ”کب تک تو ان چار شخصوں کی تعریف اور عزت کرے گا۔ ان کا موقع ایسا عظیم نہیں ہے کہ تو ان سے خوف کرے۔ حکم دے کہ ابھی ان کی گردنیں ماریں اور تجھے اس دفعہ سے فراغت حاصل ہو جائے۔ یا یہ لوگ سب کے سامنے بیعت کریں۔ یزید کے غلبہ کے لیے ان چار شخصوں کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔“ معاویہ نے خاموش کر لیا۔ اور جب مجلس برخاست ہوئی تو لوگوں نے تردد اور حیرت ظاہر کی۔ اس پر حسینؑ نے فرمایا: ”واللہ ہم نے سر آغا علانیاً کسی طرح یزید کی بیعت نہیں کی ہے۔ لیکن معاویہ نے ہم سب کو فریب دیا اور جو کچھ تم نے دیکھا اور سنا اس نے کیا اور اہل شام نے اس کے کہنے سے اس قدر غلو کیا اور تلواریں اٹھیں، البتہ ہم خاموش تھے۔ نہ تم نے کچھ پوچھا نہ ہم نے جواب دیا اور ہم تم دونوں حیرت میں رہ گئے۔ اصل واقعہ یہ ہے۔ لوگوں کو اس مکر سے تعجب ہوا۔“

چونکہ ہم معاویہ کے زمانہ امارت کے اختتام تک پہنچے

عبدالرحمن بن خالد اور حضرت عائشہ کی موت کیونکر واقع ہوئی

گئے ہیں۔ ہم دو واقعات کو اور لکھنا چاہتے ہیں، جو روضۃ الصفا اور ابن خلدون میں ہیں۔ پہلا یہ ہے کہ عبدالرحمن بن خالد بن ولید جنھوں نے معاویہ کے حکم سے فوج روم میں قیام کیا تھا، حمص میں واپس آئے۔ عبدالرحمن بہادر اور باتدبیر تھے۔ یہاں کے لوگ خالد بن ولید کی کارگزاریوں کے لحاظ سے ان کی تعظیم کرتے تھے۔ اس سے معاویہ خوف زدہ ہوا اور ابن اسمٰئل نصرانی سے کہا کہ اگر تو عبدالرحمن کو ہلاک کر ڈالے تو تجھ سے خراج نہ لیا جائے گا اور حمص کے خراج کا دالی قرار دیا جائے گا۔ ابن اسمٰئل نے منوم شربت سے ہلاک کیا۔ معاویہ نے وعدہ وفا کی نہ کی، اور آخر میں عروہ بن زبیر کے طعنہ سے خالد بن عبدالرحمن نے ابن اسمٰئل کو قتل کیا اور معاویہ نے انھیں کچھ دنوں قید میں رکھا۔ دوسرا واقعہ حضرت عائشہ کی رحلت کا ہے۔ ابن خلدون کہتا ہے: ”آپ کو مردان اور اس کے خاندان والوں نے شہید کیا تھا۔ اس وجہ سے کہ اس کی مخالفت کرتی تھیں۔ اس نے دعوت کے بہانہ سے اپنے گھر بلایا اور پہلے ایک گڑھا عمیق کھود کر نیزے، تلواریں، چمچاں وغیرہ رکھ دی تھیں، اوپر سے ایک فرش بچا دیا تھا۔ ام المومنین جب تشریف لائیں تو ان کو وہیں بٹھلایا۔ بیٹھا تھا کہ نیچے گر پڑیں۔ عمر اور کمزور تھیں۔ ایسی چوٹ آئی کہ پھر اس سے جانبر نہ ہو سکیں۔“

معاویہ شام کی طرف واپس جا رہا تھا کہ مقام ابوا کے ایک کنویں کے برے پانی سے بیمار ہو گیا۔ اور شام پہنچتے پہنچتے زہری کی پیچھے لگے۔ پریشان خوئی اور غشی سے چونک کر اکثر کہہ اٹھا تھا کہ: ”کیا کیا میں نے اے عمر بن عدی اور عمرو بن لُحی اور کیوں اختلاف کیا میں نے تجھ سے اے ابن ابوطالب۔“ اس حالت میں یزید اس کے پاس آیا اور کہا کہ:

”میرے تجرید بیعت کے لیے کوشش کرو، ورنہ خوف ہے کہ اگر لوگوں نے مجدد اُبیعت نہ کی تو اکی ابتراب سے بچے رنج پہنچے۔“ دوسرے روز خماک بن قیس اور مسلم بن عقبہ نے زبید کی سفارش کر کے کہا: ”ہم راضی نہیں ہیں کہ حکومت البسفیان کے خاندان سے اکی ابتراب میں منتقل ہو۔“ اس کے بعد بہت سے لوگوں کو بلوایا، اور سبوں نے پی خواہش کی۔ معاویہ نے علامات شاہی حوالہ کیں اور عثمان کا خون آلود کرتا پہنایا، خماک اور مسلم سے بیعت کرائی۔ اس کے بعد زبید مسجد میں آیا اور خطبہ پڑھا، اور پھر معاویہ کے پاس واپس گیا۔ اس وقت معاویہ نے زبید کو اپنے وصیاً حوالہ کیے۔

اعظم کوئی کے موافق اس میں یہ معنوں بھی تھا کہ: ”خلیفہ مقتول کے دریا کو اکی ابتراب پر مقدم رکھنا“ اور بنی امیہ اور بنی عہد اُٹس کو بنی ہاشم اور دوسرے لوگوں پر حاکم مقرر کرنا۔ اپنے دوستوں کے قاتلوں کو اپنے پاس سے دور رکھنا۔ جس شخص پر یہ عہد نامہ پڑھا جائے وہ اپنے امیر زبید کی اطاعت کرے اور جو شخص کچے یا انگار کرے زبید کو اختیار ہے کہ اس پر تلوار سیپنے اور اُڑھیں قتل کرے جب تک کہ وہ اس کی خلافت اور امارت کا اقرار نہ کریں اور مطیع نہ ہو جائیں۔“ خماک اور مسلم نے مجمع کو وصیت نامہ سنا دیا۔



بعض مورخین اور ابن خلدون نے بھی کہا ہے کہ: طبری نے ہاشم ہی سے روایت کی ہے کہ جب ۶۰ھ میں امیر معاویہ کا زمانہ وفات قریب آ گیا، اور اس وقت زبید موجود نہ تھا تو امیر معاویہ نے خماک بن قیس فہری اور مسلم بن عقبہ الخزرجی کو بلا کر کہا: ”میری وصیت زبید تک پہنچا دینا۔“ اور روضۃ الصفا کی ایک روایت کے موافق زبید ”شکار چھوڑ کر ملک کے شکار کو چلا۔“ اسی مؤرخ کے موافق زبید نے اپنی تخت نشینی کی تقریر میں اہلین فوج سے کہا کہ: ”عقرب ہم میں اور ہمارے دشمنوں میں جنگ ہوگی۔“ اور فوج نے خدمت گزاری کا یقین دلایا۔

معاویہ کی موت کے وقت سر جان رومی میرٹھی تھا۔ مدینہ میں ولید بن عقبہ بن ابی سفیان، مکہ میں عمرو بن سعید بن الحارث، بصرہ میں عبید اللہ بن زیاد، کوفہ میں نعمان بن بشیر گورنر تھا۔



اس باب کے متعلق سیاسی واقعات ہم لکھ چکے، لیکن اپنے ہیرو کے متعلق ہمیں بعض روایتیں ابھی لکھنی ہیں، جن کا کوئی صحیح زمانہ معلوم نہیں ہے۔ لیکن جو اب کے بعد نہیں ہو سکتی تھیں۔ اس لیے ہم اس باب کو اس کے لیے مختص کرتے ہیں۔

ہیں۔

حسین کے متعلق روایتیں

صحیح طریقہ وضو کی تعلیم ایک روز حسنین ایک بوڑھے کے پاس سے گزرے جو غلط وضو کر رہا تھا یہ دیکھ کر حسنین نے آپس میں گفتگو شروع کی اور ایک نے دوسرے سے کہا کہ تم اچھی طرح وضو کرنا نہیں جانتے اور یہ کہتے ہوئے بوڑھے کے پاس آئے اور کہا:

ایہا الشیخ! تو ہم دونوں کے درمیان حکم ہو جا۔ ہم میں سے ہر ایک وضو کرتا ہے تو دیکھ کہ کون اچھا وضو کرتا ہے۔ اس کے بعد دونوں صاحبوں نے وضو کیا۔ بوڑھے نے جواب دیا: آپ دونوں حضرات اچھا وضو کرتے ہیں۔ صرف میں نادان ہوں اور اس وقت آپ دونوں بزرگواروں سے سیکھ گیا۔ اور توبہ کی آپ کے ہاتھ پر بوجہ آپ کی برکت اور شفقت کے جو آپ حضرات کو اپنے نانا کی امت پر ہے۔

عبداللہ بن عمرو بن عاص اور حسین ایک دن عبداللہ بن عمرو بن عاص اور ابوسعید خدری چلے جاتے تھے کہ حسنین سے ملاقات ہو گئی۔ ابن عمرو بن عاص نے کہا: جو شخص کہ اہل آسمان وزمین کے نزدیک محبوب ترین زمانہ کو دیکھنا چاہتا ہے وہ اس جانے والے کو دیکھے۔ ابوسعید نے ابن عاص کو حسنین کی خدمت میں پیش کیا۔ حسنین نے فرمایا: تیرا خیال ہے کہ میں فاضل ترین زمانہ ہوں۔ میرے پدر بزرگوار محمد سے افضل تھے۔ لیکن صفین میں تو ہم دونوں سے لڑا۔ ابن عمرو بن عاص نے کہا: یا ابن رسول اللہ! معذرت چاہتا ہوں۔ رسول اللہ نے اطاعت والدین کا حکم فرمایا ہے۔ فرمایا: عبداللہ! کیا تو نے حکم خدا نہیں سنا کہ اگر تیرے والدین تجھے میرا شریک اختیار کرنے کو کہیں جسے تو نہیں جانتا، تو ان کی اطاعت سے منہ پھیر لے۔ خود رسول کا حکم ہے: "انما الطاعة طاعة المعروف لا طاعة لمخلوق في معصية المخلوق"۔ (اطاعت کا رہانے معروف و پسندیدہ میں چاہیے نہ کہ خدا کی معصیت کرنے کے لیے کسی مخلوق کی اطاعت کرے)

حسین کی میزبان بڑھیا ایک مرتبہ حسین اور عبداللہ بن جعفر حج کو تشریف لے جا رہے تھے۔ اسباب پہنچے آ رہا تھا کہ آنحضرت پر گرسنگی اور کھنگنی طاری ہوئی۔ قریب کی گھاٹی میں انھیں ایک خیمہ دکھائی دیا۔ اس میں ایک بڑھیا تھی۔ ان حضرات نے پانی مانگا۔ بڑھیا نے بکری کی طرف اشارہ کیا، اور ان لوگوں نے دودھ دہ کر پیا۔ اب کچھ کھانے کو مانگا اور بڑھیا نے کہا کہ میرے پاس بکری کے کچھ نہیں ہے۔ بکری ذبح کی گئی۔ بڑھیا نے پکایا۔ یہ لوگ سیر ہونے اور چلنے وقت کہا کہ ہم قریش سے ہیں اور حج کرنے جا رہے ہیں۔ واپسی کے وقت ہم سے ملنا کہ تجھ سے نیکی کریں گے۔ کچھ دنوں کے بعد یہ عورت انکس سے بیٹور ہو کر مدینہ آئی۔ حسنین نے اسے دیکھا اور ایک ہزار بکریاں اور ایک ہزار دینار عطا فرما کر حسنین کے پاس بھیج دیا۔ حسنین کا عطیہ بھی اس کے برابر تھا، اور انھوں نے بھی عبداللہ بن جعفر کے پاس بڑھا دیا۔ یہاں بھی وہ ایسے ہی عطیہ سے مسرور ہوئی۔

کنیز سے حسین پر کاسہ طعام گر پڑا حسنین ایک روز کھانا نوش فرما رہے تھے کہ ایک کنیز کے ہاتھ سے گرم کاسہ طعام حسنین کے چہرہ پر گر پڑا، اور حسنین نے

اس کی طرف دیکھا اس کے منہ سے نکلا: وَالْكَاظِمِينَ الْغَيْظَ

فرمایا: كَظَمْتَ غَيْظِي

لوٹڑی نے کہا: وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ

فرمایا: عَفَوْتُ عَنْكَ

لوٹڑی نے کہا: وَاللّٰهُ يَعْزِبُ الْمُحْسِنِينَ

فرمایا: اَنْتَ حَرَّةٌ لَّوْجَهُ اللّٰهُ سَبَّحَانَهُ

محمد حنفیہ اور حسینؑ حضرت محمد حنفیہ اور حضرت امام حسینؑ میں کسی وجہ سے کشیدگی ہوگئی۔ محمد حنفیہ نے حسینؑ کو لکھا: اے بھائی! میرے اور تمہارے پدر بزرگوار علی بن ابی طالب ہیں۔ اس امر

میں نہ تو میں تم سے افضل ہوں نہ تم مجھ سے۔ تمہاری ماور گرامی فاطمہ زہرا رسول خدا کی بیٹی ہیں۔ اگر تمام روئے زمین کے موافق سونا میری ماں کی ملک ہو تب بھی وہ تمہاری ماں کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔ پس جب تم یہ خط پڑھو تو میرے پاس آؤ اور مجھے راضی کرو۔ کیونکہ تم بہ نسبت میرے احق بالفضل ہو۔ تم پر سلام ہو اور خدا کی رحمت اور اس کی برکتیں نازل ہوں۔

حسینؑ نے جو فی خط ملاحظہ فرمایا محمد حنفیہ کی شیریں شکایت اور ان کے فردانہ ناز و محکم کے موافق تشریفات لے گئے اور منالید کسی کنیز نے ایک مرتبہ شاعر ریحان کا گلدستہ پیش کیا۔ حسینؑ نے اسے آڑا کر دیا۔ کسی نے تحفہ کی بے حقیقی اور آڑائی

کے بڑے غم البدل پر اعتراض کیا۔ فرمایا: خدا فرماتا ہے: إِذَا خُتِمَتْ بِمَنْحَةٍ فَخُتِّمُوا بِأَحْسَنِ مِنْهَا أَوْ رَدُّوْهَا۔ (۸۶:۴) (جب تمہیں کوئی تحفہ دے تو یا تو اسے اس سے اچھا تحفہ دو یا رد کرو)

اشائے نماز میں سائل آیا ایک روز حضرت امام حسینؑ نماز پڑھتے تھے کہ کسی سائل نے آواز دی: جس نے تم سے امید رکھی اور کئی کھٹکھٹائی وہ عروم نہیں ہوا۔

تم بخشش کرنے والے ہو۔ تم پر بھروسہ کیا جاتا ہے اور تمہارے ہاں ہاتھوں کے قتل کرنے والے تھے اگر وہ امر (اجرائے سلام) نہ ہوتا جو تمہارے اسلاف کر گئے تو جہنم ہمارے محیط ہوتی۔ حسینؑ نے نماز ختم کی۔ کچھ عطا فرماتے وقت کہا: ان درہموں کو لے اور صلوات کرو اور جان لے کہ میں تجھ پر شفیق ہوں۔ اگر مجھے قدرت حاصل ہوتی تو میرا آسمان بخشش تجھ پر منطبق ہوتا۔ لیکن حوادث زمانہ تغیرات پیدا کرنے والے ہیں۔ ابنائے زمان نے ہمارے حق کی رعایت نہ کی اور حقوق ہمارے تلف کیے اس لیے ہاتھ ہمارا مال دنیا سے جڑی ہے۔

محتاجوں کے متعلق قول آپ کا قول تھا کہ محتاج نے جب تم سے سوال کیا تو اس نے تمہیں اپنی آبرو والہ کر دی اور کچھ اکرام اپنی آبرو کا نہ کیا۔ لیکن تم اسے عروم واپس کر کے

اپنی آبرو زائل نہ کرو اور اپنے چہرہ کی تکریم کرو۔

سائل کا روپیہ پر کھنا اور حسینؑ کی تصدیق حضرت نے ایک شخص کو ہزار دینار یا درہم عطا فرمائے۔ وہ شخص روپیہ کو پرکھنے لگا۔ حضرت کے

غازن نے اس کہا کہ کیا تو نے کوئی شے فروخت کی ہے کہ روپیہ پر کم رہا ہے۔ حاضر جواب سائل نے کہا کہ ہاں آبرونہی ہے۔ حضرت نے فرمایا کہ تو نے کچھ کہا اور ارشاد فرمایا کہ اسے تین ہزار درہم یا دینار دو۔ ایک سوال کے لیے ایک آبرو کے لیے، ایک اس لیے کہ ہمارے یہ پاس سوال کے لیے آیا ہے۔

عرضی پڑھنے کے قبل حاجت روائی ایک مرتبہ کسی شخص نے حضرت کو عرضی دی۔ حضرت نے فرمایا کہ قبل اس کے کہ تیرا رقعہ پڑھا جائے تیری حاجت ردا ہے۔ کسی نے کہا کہ کیوں آپ نے رقعہ نہ پڑھا اور ایسا فرمایا۔ ارشاد کیا کہ حق تعالیٰ مجھ سے سوال کرے گا کہ کیوں غلط پڑھنے تک اسے انتظار میں رکھا۔

حسینؑ کی تعدادِ حج کہا گیا ہے کہ حضرت نے پیادہ چھبیس حج کیے تھے۔ ایک مرتبہ پیادہ حج کو تشریف لے لیے جارہے تھے کہ راستہ میں حاحیوں کا اور قافلہ ملا۔ لوگ بوجہ احترام اپنی سواریوں سے اتر گئے۔ لیکن پیدل چلنے میں تکلیف محسوس ہوئی۔ سعد بن وقاص نے سوار ہوجانے کی گزارش کی کہ ہم لوگ آپ کے ادب کی وجہ سے سوار نہیں ہوتے۔ یہ سن کر حسینؑ نے وہ راہ ترک کر دی۔

ایک بدگو اور حسینؑ ایک روز حسینؑ مدینہ کے باہر کہیں تشریف لے جارہے تھے کہ ایک شخص نے کسی سے ان کے نسبت سوال کیا۔ جواب دیا گیا کہ یہ نواسہ رسول ہیں۔ اس نے کہا کہ یہ پسر علی ہیں۔ جواب دیا گیا ہاں۔ اب اس نے سب علی شروع کر دی۔ حسینؑ نے سنا مسکرایے اور فرمایا: اے عزیز کیا محاورہ دی سے تیرے دماغ میں خشکی آگئی ہے۔ اگر ایسا ہے تو میں تیرا علاج کردوں اور اگر تیری بی بی نے تجھے ستایا ہے تو یہ روپیہ لے اور جا۔ کسی نے اس کی گستاخی پر اسے قتل کرنے کا ارادہ کیا۔ آپ نے رد کیا اور فرمایا ہم بڑے علم ہیں۔ کوئی چیز ہمیں طیش نہیں دے سکتی۔

بے ادب کے ساتھ حلم کسی مجلس میں حسینؑ تشریف رکھتے تھے کہ کسی شخص نے آپ کی شان میں بے ادبی کی۔ حاضرین نے مزادینا چاہی لیکن دیکھا کہ حسینؑ کے چہرہ پر شکن تک نہیں ہے اور فارہے ہیں: فرشتے اس گھر میں نہیں جاتے جہاں کتا جوتا ہے۔ (آپ نے غصہ کو کتے سے تشبیہ دی ہے)

ام کلثوم بنت عبد اللہ بن جعفر کی زیند کے لیے خواستگاری اور حسینؑ مروان بن حکم کو معصوبہ نے

عبد اللہ بن جعفر کے پاس اس لیے بھیجا کہ وہ ام کلثوم بنت عبد اللہ کی زیند کے لیے خواستگاری کرے۔ عبد اللہ نے حسینؑ پر مالا۔ مروان حسینؑ کے پاس آیا اور کہا کہ اگر ام کلثوم کا زیند سے عقد ہو جائے تو بہتر ہے اور معصوبہ نے کہا ہے کہ جس قدر مہر ہو گا میں ادا کروں گا۔ آج کل ان دونوں خاندانوں میں صلہ ہے۔ اس عقد کی وجہ سے یہ بات قائم رہے گی اور میں لکھوں گا کہ عبد اللہ پر جس قدر قرض ہے وہ بھی ادا کیا جائے۔ اسے حسینؑ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ یہ نسبت زیند کے آپ کو اچھا بگھنے والے کم ہیں اور زیند کو یہ نسبت آپ کے اچھا بگھنے والے زیادہ ہیں اور بڑے قہر کی بات ہوگی کہ زیند سے مہر طلب کیا جائے حالانکہ وہ ایسا شخص ہے جس کا صلہ ہمیں نہیں۔

حسینؑ نے فرمایا: حکم ہے اس خدا کا جس نے مجھے اپنے نفس پر اختیار دیا۔ اپنے دین کے لیے پسند کیا اور اپنی مخلوقات میں ہمیں بزرگی دی۔ تو نے کہا ہے کہ ام کلثوم کا باپ جس قدر مہر مانگے دوں گا۔ میرا مشا تو یہ ہے کہ میں وہی طریقہ جاری رکھوں جو رسول اللہ کی بیٹی بی بی اور دیگر اہل بیت کی عورتوں کا مہر ہوا ہے۔ یعنی بارہ اوقیہ (چار سو اسی درہم) یہ جو کہا ہے کہ اس کے باپ کا قرض بھی ادا کیا جائے گا۔ یہ بتا کہ کب ہمارے خاندان کے بیویوں نے ہمارا قرض ادا کیا ہے۔ صبح کے بہت پہلے کہ ہم جو تم لوگوں سے مخالفت کرتے ہیں تو یہ محض خوشنودی خدا کے لیے ہے۔ دنیا کے لیے ہم کبھی صلہ نہیں کریں گے۔ جب نبی قرابت سے کچھ فائدہ نہ ہوا تو بیسی قرابت اور شادی بیاہ کب مصالحت کر سکتے ہیں۔ تو نے یہ جو کہا کہ تعجب ہو گا۔ اگر زید سے مہر طلب کیا جائے تو اس کی کیا ہستی ہے۔ اس سے اور اس کے باپ دادا سے جو لوگ افضل تھے ان لوگوں نے تو دیا ہی ہے اور ان سے مہر لیا گیا ہے۔ تو نے کہا ہے کہ زید کا کوئی ہمسرہ نہیں تو کچھ لے کہ اس کا وہ ہمسرہ جو آج سے پہلے تھا۔ اس کی امارت نے اس کی ہمسری میں کچھ زیادتی نہیں کی ہے۔ یہ جو کہا کہ آپ کو اچھا بھنے والے کم ہیں تو کچھ پردہ نہیں۔ جاہل اسے اور مائل مجھے اچھا سمجھتے ہیں۔ (اپنے مختار کی طرف متوجہ ہو کر) سب لوگ گواہ رہیں کہ میں نے ام کلثوم بنت عبد اللہ کا عقد اس کے چچا زاد بھائی قثم بن محمد بن جعفر سے چار سو اسی درہم پر کیا اور انھیں اپنی مدینہ دلی زمین دی جس کی آٹھ ہزار اشرفیاں سالانہ حاصل ہیں۔ یہ ان کی بسر اوقات کے لیے کافی ہوگی۔ مروان نے خفا ہو کر کہا: بنی ہاشم اپنی عداوت نہیں چھوڑتے۔ آپ نے فرمایا: وہ واقعہ یاد نہیں ہے کہ جب بھائی حسنؑ نے عائشہ بنت عثمان سے عقد کی خواہش کی تو تم نے کہا کہ عائشہ کا عقد عبد اللہ بن زبیر سے ہو گا۔

علاء الحسنیؑ کی روضۃ الشہداء میں ایک واقعہ ملتا ہے جسے ناموں کے اختلاف کے ساتھ ابن قتیبہ نے

ارینب بنت اسحق کا قصہ معہ تنقید مؤلف

کتاب الامامۃ والسیاہ میں تفصیل سے لکھا ہے۔ جو اصلاح نمبر ۱۵ میں بھی شائع ہوا۔ میں خلاصہ پیش کروں گا۔ روضۃ الشہداء میں میرے غور کے قابل صرف یہ عبارت ہے کہ: ”عداوت فرعی بن زید بہ دو سبب ہو چکے آئندہ امام حسینؑ از بیعت اوبالاکرد۔۔۔ دوم آئندہ عبد اللہ زبیر نے داشت کہ دران صبر حسن و جمال او نشان نمی دادند و خبر غلبہ او بہ زبیر رسید۔ انواع جہلہا ساختند و تدبیر ہا پر داختند۔ ابن زبیر آن زن را بے جہت طلاق داد و از شام و کالت نامہ بہ ابی موسیٰ اشعری رسید کہ مطلقہ ابن زبیر را برائے دے بخلند۔“ یعنی: زید کی فرعی عداوت دو وجہ سے تھی۔ ایک یہ کہ امام حسینؑ نے اس کی بیعت سے انکار کیا تھا۔ دوسرا یہ کہ عبد اللہ بن زبیر کی ایک بیوی تھی کہ اس کے حسن و جمال کی اس زمانے میں مثال نہ تھی۔ اس کی خوبصورتی کی خبر زید کو پہنچ۔ طرح طرح کے چیلے اور تدبیریں کی گئیں۔ ابن زبیر نے بلا وجہ اس عورت کو طلاق دے دی اور شام سے ابوموسیٰ اشعری کے نام و کالت نامہ آیا کہ ابن زبیر کی مطلقہ کو اس کے لیے دعوت دے۔

ابوموسیٰ نے اسے اپنا زید، ابن عمر اور حسینؑ کا پیغام دیا۔ اور جب مطلقہ ابن زبیر نے حسینؑ کو پسند کیا تو ”عداوت امام حسینؑ در دل زبیر زیادہ شد۔“ یعنی: امام حسینؑ سے دشمنی زبیر کے دل میں زیادہ ہو گئی۔

کتاب الامامۃ میں ہے کہ زید ارینب بنت اسحق کی یاد میں بہت بے قرار تھا آخر اسی حالت میں معاویہ کے پاس گیا۔ بہت سے شکوے شکایت آپس میں ہوئے۔ آخر میں باپ نے بیٹے کو صبر اور راز کے مخفی رکھنے کی تاکید کی

اور اس کے بعد عبداللہ بن سلام یعنی اربنب کے شوہر کو جسے بصرہ کا حکم مقرر کیا تھا دمشق میں طلب کیا، اور ابہرہ اور ابورداء کو اس پیغام کے ساتھ عبداللہ کے پاس بھیجا کہ میں اس سے اپنی لڑکی کا عقد کرنا چاہتا ہوں اور ادھر اپنی لڑکی سے کہہ دیا کہ جب ابورداء وغیرہ عبداللہ بن سلام کا پیغام لائیں تو اس کی شرافت و نجابت کا اقرار کرنا، اور اربنب کی طلاق اپنے عقد کی شرط قرار دینا۔ ابہرہ وغیرہ نے جب عبداللہ بن سلام سے معاویہ کی خواہش بیان کی تو اس نے بڑی خوشی سے ان لوگوں کو نکاح کر دینے کا وکیل بنایا۔ یہ لوگ بہت معاویہ کے پاس گئے۔ اس نے سکھائی ہوئی باتیں کہیں۔ یہ لوگ پھر عبداللہ کے پاس آنے میں کھلے اور انھوں نے فوراً طلاق دیدیا۔ ابہرہ اور ابورداء گولہ ہوئے۔ اور جب ابن دو معزز گواہوں نے معاویہ کو طلاق ہو جانے کی اطلاع دی تو اب وہ بہت خفا ہوا اور کہا کہ اگر وہ جلدی نہ کرتا تو بہتر تھا۔ جاؤ پھر کھا جانے لڑکی کو بھی ایسا ہی کھا دیا اور کھلوا بھی دیا کہ تحقیق کی جانے گی، جلدی مناسب نہیں ہے۔ اب معاویہ نے مزید کو صورتوں میں خبر دی اور شام میں معاویہ کے حیلہ کی خبر مشہور ہو گئی۔ اور جب پھر ابن سلام نے اپنے مذکر مشاغل کو بھیجا تو جواب ملا کہ مشورہ میں کچھ لوگ موافق ہیں اور کچھ نا موافق۔ یہ ہماری طبیعت کے موافق نہیں ہے۔ یہ خبر بھی مشہور ہوئی اور لوگوں نے کہا کہ کس قدر برا ہے وہ شخص جسے خدا بلا شلہ بنائے اور اپنی رعایا کو اس کے سپرد کرے وہ ایسا فریب اور دھوکا دے۔ جب عدۃ کا زمانہ تمام ہوا تو معاویہ نے ابورداء کو عراق بھیجا کہ مزید کے لیے اربنب کی خواستگاری کرے۔ ابورداء سے عراق میں پہلے امام حسینؑ سے ملاقات ہوئی اور جب ان کے درود کی وجہ ظہر ہوئی تو حسینؑ نے بھی انھیں اپنا وکیل بنایا۔ ابورداء اربنب کے پاس پہنچے اور دونوں پیغام دیے۔ اربنب نے بھی اپنے کو ان کے بھائی کی بیٹی کہہ کر انھیں اپنا وکیل بنایا۔ اور صلح پوچھی اور انھوں نے میزور کہا کہ اے بیٹی فرزند رسولؐ ہم کو زیادہ احب ہے کہ خود رسول اللہؐ کو دیکھا ہے کہ ان کے لبوں کو چومتے تھے۔ لہذا تو بھی اپنا لب وہیں رکھ جہاں رسول اللہؐ لب رکھتے تھے۔ اربنب نے منظور کیا۔ نکاح ہوا۔ معاویہ کو خبر ہوئی اور مجلسِ ہٹ میں اپنے وکیل کو جو کچھ کہہ سکتا تھا کہا۔ عبداللہ بن سلام نے اپنے زمانہ عقد میں اربنب کو کچھ مونی دیے تھے۔ جب معاویہ کو اپنی کارروائیوں میں ناکامی ہوئی تو ابن سلام کی طرف سے توجہ کم ہو گئی، جس کا نتیجہ ان کا ہوا۔ ابن سلام عراق آیا۔ حسینؑ سے ملاقات کی۔ سارا قصہ بیان کیا۔ حضرت نے سکوت فرمایا، اور اس کے بعد اربنب سے قصہ بیان کیا۔ اور فرمایا کہ وہ تمہارا مداح ہے۔ اگر اس کی امانت ہو تو اسے واپس کر دو۔ اربنب نے تصدیق کی۔ حضرت نے ابن سلام کو خبر دی، اور ساتھ ہی اجازت دی کہ وہ اپنے ہاتھ سے اپنا مال لے لے۔ ابن سلام گیدا اربنب نے مونی سامنے رکھ دیے۔ حسینؑ باہر قعرین لے گئے۔ ابن سلام نے چند موتی معاوضہ میں پیش کیے، اور بیچ کر روئے لگے۔ حسینؑ دونوں کے رونے کی صدا سن کر اندر قعرین لائے اور فرمایا: ”ہم خدا کو گواہ کرتے ہیں ہم نے اس عورت کو طلاق دیا، اور وہ خوب جانتا ہے کہ ہم نے بہ خیال حسن و جاہل عقد نہیں کیا تھا بلکہ اس خیال سے کہ وہ اصلی شوہر پر طلاق ہو جائے۔ خداوند اتو نہیں اس کا اجر عطا کر۔“ حضرت نے جو کچھ مہر دیا تھا اس میں سے باوجود ابن سلام کے اصرار کے کچھ واپس نہ لیا۔ عدۃ تمام ہونے پر ابن سلام نے پھر عقد کبیدہ دونوں نہایت خوشی و آرام سے رہنے لگے اور مزید عودم رہا۔

بلاشبہ میں سوچتا ہوں کہ یہ نیکی سیر کے قابل کیڑی ہے اور اس قدر قانون طلاق کا لحاظ ہے جس قدر ہے قصہ ہر طرح چھانی کا رنگ لیے ہوئے ہے اور حقیقت یہ ہے کہ یہ بھی ایک امر ہے جس سے اس کی چھانی میں اشتباہ ہوتا ہے۔

دوسری زبردست بات یہ ہے کہ محلوہ کے دور ان حکومت میں جو لوگ بصرہ کے حامل مقرر کیے گئے ان کے نام مجھے یہ ملتے ہیں۔ بشر بن ارطاة، عبد اللہ بن حار، حارث بن عبد اللہ ازدی، زیاد بن سمیہ، عبد اللہ بن عمر خیطان اور عبد اللہ بن زیاد۔ عبد اللہ بن سلام کا کہیں نام نہیں ہے۔ ابن خلدون کے موافق ایک عبد اللہ بن سلام کاتب وفات سکندر ہے۔ یعنی اگر یہ وہی ابن سلام تھے تو زیر بحث قصہ تک زندہ نہ رہے تھے۔ تیسرے دو مؤرخین کا مفید اختلاف۔ لیکن یہ سب باتیں اس خیال کے سامنے بے حقیقت ہیں کہ یہ زید کے دل میں دشمنی پیدا ہونے کی ایک وجہ بتائی گئی ہے اور اس کی غرض یہ ہے کہ ابن فطری اور مسلسل اسباب کو آنکھ سے اوجھل کر دے۔ جو شہادت حسینؑ پر تھی جو سکتے تھے زید کے گتہ کو اگر دھونڈ سکے تو کم سے کم مستحکم رقابت کا خیال دلا کر اس کے جرم کو ہلکا کر دے۔ اور اس طرح حسینؑ کے عظیم کارناموں کو خفیہ یا دوسرے رنگ میں دکھانے کے لیے اگر کلی نہیں تو جزئی کامیابی ہو اور معاملہ صرف عورت کا رہ جائے جیسا کہ حقیقت میں ایک عیسانی نے ٹم سے کہہ دیا ہے کہ ایک کجدار کے لیے جسے واقعت سے واقفیت ہے یہ واقعہ باوجود گج ہونے کے بھی کسی طرح ان وجوہات کے مقابل ہونے کا جثہ نہیں رکھتا جو شہادت حسینؑ پر تھی ہوتے۔ لیکن کسی زمانہ میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں تھی جن کے کانوں کی گہرائی کبھی قہقہے کرنے سے سیری ظاہر کرے۔ زید کی عداوت کی وجہ واقعہ کی صحت کی حالت میں بھی اپنے کو ”وجہ“ ہونے کی منزلت سے گرا دیتی ہے۔ جبکہ پیچہ کی مقام کارروائیاں اور خیالات حسینؑ کی حیات میں اور بعد کبھی اسے صداوت کی وجہ ظاہر نہیں کرتے نہ کوئی ہم صدر دیکھنے والا کہتا ہے اور ایسی صورت میں کہ کچھ دنوں کے بعد حسینؑ نے اپنی کیم انفسی سے شوہراوئی کی طرف واپس کر دیا۔ کوئی وجہ نہیں ہے کہ حسینؑ کے لیے تو وجہ ہو جائے اور ابن سلام انتہائی سلسلہ میں نہ آئے۔ حالانکہ زید نسبتاً کم وقت اور اندیشہ سے اسے قتل کر کے اپنی خواہش پوری کر سکتا تھا۔ حالانکہ زید کے دور ان حکومت میں کہیں اس کا ذکر نہیں ہے۔ شاید اس مٹلاشی کی محنت بے کار نہ جانے جو یہ بگھنے کی کوشش کرے کہ اس روایت کے راوی کس زمانہ تک پہنچے ہیں اور ابن قتیبہ نے خود کو کسی کتابوں سے یہ روایت پائی ہے۔ اور روایت کا ہموار سلسلہ کم سے کم واقعہ کا اس قدر وزن قائم رکھے گا جس کا وہ شایان ہے۔

اسحاق بن عمار نے روایت کی ہے ابو عبد اللہ علیہ السلام سے پوچھا میں نے یا ابن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں ملاحظہ قرآن ہوں تلاوت اس کی از روئے قرآن کروں یا از ظہر قلب فرمایا: ”از روئے صحت کے (کیا) نہیں سنا تو نے کہ قرآن میں فقر کہا جاتا ہے۔“

تلاوت قرآن کا طریقہ

(توینح مجیدی بیچ کلام اللہ امجد)

کسی نے حضرت امام حسینؑ سے پوچھا کہ روزہ کیوں واجب کیا گیا فرمایا: اس لیے کہ امیروں کو بھوک کا مزہ معلوم ہو کہ غریبوں پر رحم کرے۔

وجوب روزہ کی وجہ

کتاب توحید ابن بابویہ میں ہے کہ راوی نے ابی عبد اللہ علیہ السلام سے سوال کیا کہ: آیا خدا ہمیشہ مرید (ارادہ کرنے والا) ہے؟

خدا مرید ہے یا عالم و تادور

حضرت نے فرمایا کہ: ”مرید نہیں ہوتا ہے مگر یہ کہ مراد اس کے ساتھ ہو۔ بلکہ وہ ہمیشہ عالم اور قادر ہے۔“ (توینح۔)

حسینؑ کے خطبہ کے بعض الفاظ میں اثبات وجود باری کے متعلق طریقہ استدلال
 سید الشہداء نے اپنے ایک خطبہ میں فرمایا کہ :
 ”سب تعریفیں اس خدا کے لیے زیبا ہیں جو کسی شے سے موجود نہیں ہوا، مدد و اشیاء اس کے انہی ہونے پر گواہی دینے والی ہیں۔ منعت کی مضبوطی اس کے نشان کے لیے کافی ہے۔“ دعائے عرفہ میں فرمایا : یا اللہ میں تیری ہی طرف متوجہ ہوتا ہوں اور تیرے رب ہونے کی گواہی دیتا ہوں اور اقرار کرتا ہوں تیرے ہی طرف ہماری بازگشت ہے۔ تو نے ابتدا کی اپنے بخشش کی قبل اس کے کہ میں موجود تھا۔ (کفایۃ المودین)

ہر خیر کی اصل
 فضل بن شاذان سے روایت ہے کہ ابی عبد اللہ علیہ السلام نے فرمایا کہ ہم اصل ہیں ہر خیر کی اور ہر نیک باری فرع ہے۔ ازاں جملہ توحید، صلوة، صیام، ختمہ کا فرد کرنا، حقو، قیصر پر رحم، ہمسایہ کی مدد راست، اور فضیلت کا اقرار فضیلت ہے اور ہمارا ہمد اصل ہر شر ہے اور اس کی فروع کل باعیاں ہیں ازاں جملہ جھوٹ، بدگوئی، جمل، قلع رحم، سود کھانا، بغیر حق کے یتیم کا مال لینا، خدا کے مقرر کردہ حدود سے تجاوز کرنا، ظلم اور باطن فواحش کا مرتکب ہونا۔ ازاں جملہ سرقت، زنا، اور جو چیزیں کہ اس قسم کی ہوں، وہ شخص جھوٹا ہے جو کہے کہ ہمارے ساتھ ہے در آنحالیکہ وہ ہمارے غیر کی فرع سے تعلق رکھتا ہو۔ (توضیح۔۔۔)

خدا اور خیر و شر
 ابوبصیر نے حضرت ابو عبد اللہ سے روایت کی ہے کہ جو شخص یہ کہتا ہے کہ خدا برائی کا حکم دیتا ہے اس نے خدا کی تکذیب کی اور جو شخص کہتا ہے کہ خیر و شر خدا کی طرف سے ہے اس نے خدا کی تکذیب کی۔ (توضیح۔۔۔)

فقراء و عمو کرتے ہیں
 ایک مرتبہ حسینؑ کہیں تشریف لے جا رہے تھے، راستہ میں دیکھا کہ بہت سے فقیر راستہ میں بیٹھے ہوئے کچھ کھا رہے ہیں۔ ان لوگوں نے حسینؑ کو بلایا۔ حسینؑ کمال خلق سے ان کے پاس بیٹھ گئے۔ اور فرمایا : ان الله لا یحب المتکبرین ثم قال قد اجبتکم فأجیبونی۔ اس کے بعد آپ سب کو اپنے دولت سرا لے گئے اور سبھوں کے ساتھ رعایت کی۔

حسینؑ کا ایک لقب
 صاحب جنات الخلود کے موافق حضرت کی کنیت میں ایک ”ابوالساکین“ بھی تھی۔ اس لیے کہ حضرت مسکین اور غریب پر بے حد لطف فرماتے تھے اور وظائف عطا کرتے تھے۔

پشت اقدس کے نشان کی واقعہ خوانی
 بعد شہادت حضرت کی پشت اقدس پر نشان پائے گئے۔ حضرت امام زین العابدین علیہ السلام سے دریافت کیا گیا، اور آپ نے فرمایا کہ یہ نشان اس بار کے ہیں جسے پوشیدہ پشت پر رکھ کر شیعوں اور پیادوں کے گھروں پر پہناتے تھے شاعر کہتا ہے۔

و ان ظہرہا غذا للبر ینقلہ
 سرا الی اہلہ مکسورا
 (وہ پشت اقدس جو فراق کے لیے راتوں کو صدقات اٹھاتی تھی ایک دن پامال سم اسپان تھی)

اسامہ کا قرض ادا کرتے ہیں

اسامہ بن زید بیمار ہو گئے حسینؑ ان کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے۔ اسامہ کی باتوں سے ان کی پریشانی ظاہر ہوئی اور وجہ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ ان پر ساٹھ ہزار درہم قرض ہیں۔ فرمایا: ”ہم ادا کر دیں گے۔“ اسامہ نے کہا: ”میں خوف ہے کہ آپ ہمارے مرنے کے بعد ادا کریں۔“ یہ سن کر حسینؑ نے اسے فوراً ادا کر دیا اور فرمایا: ”بادشاہوں کی خصلت میں سے سب سے زیادہ بری اور ناقابلِ تفریط بات یہ ہے کہ وہ دشمن سے ڈریں، غریبوں پر سخت دلی سے رحم نہ کریں اور بخل کریں۔“

ایک اعرابی کا اثر حسینؑ کی سخاوت سے

کسی اعرابی نے حسینؑ کے سخاوت کی شہرت سنی اور حاضر خدمت ہوا۔ حسینؑ نے قبر سے دریافت کیا کہ کچھ موجود ہے۔ کہا چار ہزار دینار موجود ہیں۔ فرمایا اسے دیدہ جو ہم سے زیادہ سچی ہے۔ حضرت نے اپنے کو چھپا کر اپنے دست مبارک سے دیا اور غرر کیا۔ اعرابی رونے لگا۔ حضرت نے سبب پوچھا تو کہا: میں تمہارے ایسے شخص پر روتا ہوں کہ تمہارے زیرِ خاک چھپنے پر یہ دست جو ناپید ہو جائے گا۔

معلم کی قدردانی

عبدالرحمن بن سلمیٰ حسینؑ کے بعض بچوں کے استاد تھے۔ ایک روز جب بچوں نے گھر آکر سبق سنایا تو حسینؑ نے استاد کو ایک ہزار دینار اور حلہ عطا فرمایا۔ کسی نے زیادتی سخاوت پر اعتراض کیا تو فرمایا: ”میری مختصر بخشش اس کی کثیر عطا کے ہم پلہ نہیں ہے۔“

حسینؑ اور خوفِ خدا

ایک مرتبہ حسینؑ پیادہ حج کرنے تشریف لے جا رہے تھے اور سواری ساتھ تھی۔ کسی شخص نے کہا: ”یا ابنِ رسولِ اللہ! آپ بہت خوفِ خدا کرتے ہیں۔“ فرمایا: ”قیامت میں وہ بے خوف نہیں ہے جو دنیا میں نہیں ڈرتا۔“

قلبتِ اولاد مشغولیتِ عبادت سے

کسی شخص نے حضرت امام زین العابدین علیہ السلام سے حضرت امام حسینؑ علیہ السلام کی قلبتِ اولاد کے بارہ میں سوال کیا۔ آپ نے فرمایا کہ: ”مجھے تعجب ہے کہ میں کیونکر پیدا ہوا اس لیے کہ وہ جنابِ توحب کو ہزار رکعت نماز ادا فرماتے تھے۔“

ایک غلام کیونکر حسینؑ کی وساطت سے آزاد ہوا

حسینؑ فرماتے ہیں کہ: میں نے ایک مرتبہ ایک غلام کو کتے کے ساتھ کچھ کھاتے دیکھا۔

میں نے اس سے سبب پوچھا۔ اس نے کہا: یا ابنِ رسولِ اللہ! میں ایک دردِ رسیدہ ہوں۔ دل خوش کرنے کو اس کتے کے ساتھ کھیل رہا ہوں۔ حسینؑ اسے لیے ہوئے اس کے آقا کے پاس گئے جو یہودی تھا اور دو سو دینار زرِ ربانی پیش کیا۔ یہودی نے کہا: آپ کی تشریف آوری کے ضمن میں میں نے اسے آزاد کیا۔ اپنا ایک ہالغ اسے دیا اور آپ کا روپیہ واپس کر تا ہوں۔ حسینؑ نے فرمایا: میں روپیہ تجھے ہبہ کرتا ہوں۔ یہودی نے قبول کیا۔ لیکن روپیہ بھی غلام کو دیدیا۔ یہودی کی بی بی پر حسینؑ کے رحم و عطا کا یہ اثر ہوا کہ اس نے اپنے شوہر کا سر معاف کر دیا۔ یہودی اور اس کی بی بی مسلمان ہوئی اور شوہر نے اپنا مکان عورت کے نام ہبہ کر دیا۔

بخشش موافق معرفت

ایک اعرابی حسینؑ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا یا ابن رسول اللہ میں دیت کا ضامن ہوا ہوں۔ مجھے اس قدر مرحمت فرمائیے۔ فرمایا: اسے برادر اعرابی میں تجھ سے تین سوال کروں گا اگر ۱/ بتایا تو ۲/ زر دیت اور ۳/ بتایا تو کل ادا کر دوں گا۔ اس نے عرض کی: یا ابن رسول اللہ آپ کا ایسا صاحب علم و شرف مجھ سے پوچھے! فرمایا: نانا رسولؐ نے فرمایا ہے کہ بخشش معرفت کے موافق ہونی چاہیے۔ اس کے بعد پوچھا: فاضل ترین اعمال کیا ہے؟ جواب دیا: اقرار توحید۔ پوچھا: کونسی چیز انسان کو ہلاکت سے بچاتی ہے؟ جواب دیا: خدا پر بھروسہ۔ پوچھا: کس چیز سے انسان کی زینت ہے؟ جواب دیا: علم سے۔ جس میں علم ملا ہو۔ فرمایا: اگر یہ نہ ہو تو؟ کہا: پھر مال اور مروت ہو۔ پوچھا: اگر یہ بھی نہ ہو تو؟ کہا: تو فقر میں صبر ہونا چاہیے۔ فرمایا: اگر اس پر بھی قدرت نہ ہو؟ کہا: تو ایسا شخص متقی ہے کہ اس پر بجلی گرے۔ حضرت ہنسے اور اعرابی کو ایک ہزار دینار اور ایک انگوٹھی عنایت کر کے فرمایا: ایک سے دیت ادا کر اور دوسرے کو نقد میں صرف کر۔

حسن کا ادب اور ایک فقرہ

حسینؑ حق کے سامنے ادب سے بات نہ کرتے تھے۔ ایک مرتبہ فرمایا (کاش) اے بھائی آپ کی زبان میری اور میرا قلب آپ کا ہوتا۔

رسالہ البرہان ہایت ماہ مارچ
۱۳۳۱ء میں غلیہ مبارک اسٹور

نانا کے انداز اور نقل و حرکت سے حسینؑ کی دلچسپی اور واقفیت

کے فاضل مضمون نگار مولوی خواجہ غلام حسینؑ صاحب ہائی جی نے تحریر فرمایا ہے کہ ”نہد بن ابی ہالہ یعنی حضرت امام حسن علیہ السلام کے ماموں غلیہ مبارک بیان کر رہے ہیں۔ اور حضرت سن رہے ہیں۔“ جب یہ حدیث سن چکے تو آپ فرماتے ہیں چند روز تک میں نے اس کا ذکر اپنے بھائی امام حسینؑ سے نہ کیا۔ پھر جب میں نے ان سے یہ حدیث بیان کی تو معلوم ہوا کہ وہ پہلے ہی اس کی تحقیق کر چکے تھے، اور جو بات میں نے دریافت کی تھی وہ خود اس کو دریافت کر چکے تھے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ اپنے والد بزرگوار سے آنحضرت کے مدخل (گھر میں تشریف لائے) اور خروج (گھر سے باہر تشریف لاجائے) اور مشکل (طرز روش) کا کل مال دریافت کر لیا تھا۔ کوئی بات باقی نہ چھوڑی تھی۔ اس کے بعد فاضل مضمون نگار نے خود حضرت امام حسینؑ سے روایت فرمائی ہے کہ وہ حضرت اپنے پدر بزرگوار سے آنحضرت کے مدخل خروج اور مجلس کا حال دریافت فرماتے ہیں اور جناب امیرؑ ہر جگہ کی حالت کو بہ تفصیل ارشاد فرماتے ہیں۔

کسی نے حضرت کو کبر سے نسبت دی۔ فرمایا: کبر خدا کے لیے ہے جس کا کوئی شریک نہیں۔ لیکن خدا فرماتا ہے کہ: ”عزت مومنین اور رسولؐ کے لیے ہے۔“

کبیر یا عزت

ایک دن مردان نے حضرت سے کہا کہ اگر فاطمہ (علیہا السلام) تمہارے لیے باعث غرہ ہوتیں تو پھر تم کس سے غر کرتے۔

مردان کو عملی دلیل دکھائی گئی

حضرت نے ہاتھ بڑھا کر مردان کا ٹیٹو اکیڑا اور زمین دکھا کر فرمایا: اگر جواب ہو گیا ہو تو صدق کر۔ معاویہ کے دورہ کے زمانہ میں ایک سائل آیا اور اس نے سوال کیا۔ معاویہ نے حسینؑ سے صلاح کی اور آپ نے سفارش کی۔ معاویہ نے کچھ دیا، اس پر اعرابی نے شعر پڑھے جو ان کے آہانے طاہرین اور ان کی مدح پر مشکل تھے۔

مردان بن حکم نے اپنے دور حکومت میں فرزدق شاعر کو نکلوا دیا۔ جب یہ حسینؑ کے پاس آیا تو آپ نے اسے چار ہزار دینار عطا فرمائے۔ جب مردان کو معلوم ہوا تو اس نے آپ سے کہا: یا ابن رسول اللہ! ایک درود گو شاعر کو اس قدر عطا کی ضرورت نہ تھی۔ فرمایا: بہترین مال وہ ہے جس کی عطا سے عزت محفوظ رہے۔ رسولؐ نے بھی عباس بن مرداس کو اس کی زبان سے محفوظ رہنے کے لیے کچھ عطا فرمایا تھا۔

حضرت کا قول ہے کہ: ”دنیا کے لوگ مال کے بندے ہیں، اور دین ان کی زبان پر ایک مہل لفظ ہے۔ جب تک دین سے ان کی معاش حاصل ہے، اس وقت تک اس کے گرد رہتے ہیں، مگر جب آزمائش کے لیے خالص کیے جاتے ہیں اس وقت دین دار کم رہ جاتے ہی۔“ (اخلاق حسنی)

روایت ہے کہ حضرت کے زمانہ میں مدینہ میں کوئی ایسا مسکین نہ تھا جسے حضرت سے وظیفہ نہ ملتا ہو۔ (جنات الخلود)

جناب امیر اور طاہرہ کے اوقاف اور حسین

حضرت امام حسنؑ کی شہادت کے بعد حضرت امام حسینؑ از روئے وصیت ان اوقاف کے

متولی ہونے جو جناب امیہؑ اور حضرت عالمؑ نے اسی لیے کیے تھے۔
حضرت کی انگوٹھی پر نقش تھا کہ: "ان اللہ بالغ امرہ"۔ (خدا اپنے حکم کا خود بجالانے والا ہے)
یا "تقتی باللہ" (میرا بھروسہ خدا پر ہے)

عدد اولاد
 بقولے چار لڑکے اور دو لڑکیاں۔ بقولے چھ لڑکے اور چار لڑکیاں۔
 علی اکبر، لیلۂ بنت ابی مرہ سے، علی اوسط ملقب بہ امام زین العابدین شاہ زنان سے، علی اصغر ماں کا نام
 معلوم نہیں۔ محمد صالح معلوم نہیں۔ جعفر اور عبداللہ رہاب بنت امرا نقیس سے تھے۔ فاطمہ ام اتقی سے۔ زینب ماں کا نام
 معلوم نہیں۔ ایک اور لڑکی ماں کا نام معلوم نہیں۔ (جنات المخلوٰد)

تاریخ غیس کے موافق حضرت کی اولاد کے نام : علی اکبر، علی اصغر، جعفر، فاطمہ اور سکینہؑ ہیں۔ یہی مورخ ذوالحجۃ سے چھ بیٹے تین بیٹیاں لکھتا ہے۔ علی اکبر، علی اصغر، علی زین العابدین، محمدؐ، عبداللہ، جعفر، زینب، سکینہؑ، فاطمہؑ۔

زوجات سوائے کنیزانِ خاصہ کے تمام عمر میں پہنچ عقد کیے شہر بانو بنت زید و جد، لیل بنت ابی مرہ بن عروہ بن مسعود ثقفیہ، رہاب بنت امرا القیس بن عدی کلبیہ، ام اکث بنت عبد اللہ ثمیمیہ، قناعیہ (باپ کا نام معلوم نہیں) (جنات الخلود)



باب ششم کا نشو

امیر شام جنگ کرنے کی غرض ظاہر کرتا ہے

ان باتوں کے کہنے کے بعد جن کا گزشتہ ابواب سے تعلق تھا ہم اب اس کے

ایسے نشو پر پہنچے ہیں جس کی صورت حال ابن ابی الحدید کی اس روایت سے بہت اچھی طرح کچھ میں آتی ہے جسے میں ہمارے نقل کرتا ہوں کہ معاویہ نے خلیلہ میں خطبہ دیا اور اس میں کہا: ”خدا کی قسم میں نے تم سے اس امیر پر مقابلہ نہیں کیا کہ تم نماز پڑھو اور نہ اس لیے کہ روزہ رکھو اور نہ اس لیے کہ تم حج کرو اور نہ اس لیے کہ زکوٰۃ دو۔ کیونکہ یہ امور سب تم بجالاتے ہو۔ بلکہ میں نے تم سے اس لیے مقابلہ کیا کہ تم پر امیر ہو جاؤ۔“ ابن خلدون سلمہ میں بنی امیہ کے متعلق لکھتا ہے کہ: ”یہ وہ زمانہ تھا کہ لوگ شاہن نبوت اور اور خوارق کو بھلا کر قوی معیت اور غلبہ پر آرہے تھے اور یہ بات کل عرب اور مصر پر بنو امیہ کو حاصل تھی۔“

معاویہ کے پیشتر مصلحت کی مماثلت

کیا اگر بنی امیہ کی جنگ اپنے امانت کے قبول کرانے کے لیے تھی اور رشوات دین کی بجا آوری کے لیے نہ تھی

تو میں غور کرتا ہوں کہ معاویہ کے پیشرو لوگوں کے بعض افعال امورات شریعت کے قیام کے لیے تھے؟ کیا وہ لوگ قتل نہیں کیے گئے تھے جنہیں اصحاب رسول نے قتل ہونے کے قبل نماز پڑھتے دیکھا اور اذان دیتے سنا تھا۔ کیا مانعین زکوٰۃ اصولاً ادا نہ زکوٰۃ کے مخالفت تھے اور شریعت میں ترمیم کرنا چاہتے تھے؟ نہیں وہ خود ساختہ امتیاز کی مخالفت کر رہے تھے جسے نہ مجبور نے کسی کو عطا کیا تھا اور نہ ان کے مستند رہ جانے اسے آئندہ کا امام قرار دیا تھا جس نے اس علم پر ان کے قتل کرنے کے لیے فوجیں روانہ کی تھیں کہ وہ ”ہیں“ غلیظ تسلیم نہیں کرتے ہیں۔

علامہ سید رشید رضا کی متعلق تقریر

اسی موقع پر علامہ سید رشید رضا ایڈیٹر ”المنار“ کی تقریر کے ایک جزو کا پیوند لگانا چاہتا ہوں جو انھوں نے

ندوہ سلمہ کے جلسہ میں فرمائی تھی۔ مجھے ان کی تقریر کے موقع کا لحاظ ہے اور ان کی اعتیلا کا عقربت ہوں، جہاں وہ فرماتے ہیں: ”اگر“ ہم اس موقع پر خلفاء راشدین کی حکومت سے قطع نظر کریں تو یہ کہ وہ تنمیر اسلام (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کے جانشین تھے اور ان پر ہم دیگر حکومتوں کو قیاس نہیں کر سکتے تو ”کم سے کم“ بنی امیہ اور عباسیوں کی حکومتوں کو تو پیش نظر لا سکتے ہیں۔ بلاشبہ یہ دونوں حکومتیں قانون اور انتظام کے لحاظ سے رحلیا پرست و زیادہ مہربان اور فیاض تھیں مگر دیکھو کہ انھوں نے ان اشخاص کے ساتھ کیا جابرانہ برتاؤ کیا جو ان کے اقتدار کے مخالفت تھے۔ یہاں تک کہ انھوں نے اہل رسول (علیہ السلام) کو ذبح کرنے میں بھی دریغ نہیں کیا۔ اور ”آل نبی“ میں سے جس کو جہاں پاتے تھے اس ”دہم“ سے کہ ”مہدا“ وہ ان کی حکومت میں خلل انداز ہوں ”بے تکلف“ قتل کر ڈالتے تھے۔ اس تقریر کے الفاظ ”اگر“

”کم سے کم“ ”آلِ نبی“ ”دہم“ ”مبادا“ ”بے ظلفت“ اپنی آپ ہی شرح ہیں۔

حضرت امام حسن علیہ السلام نے مغیرہ بن شعبہ کے متعلق یہ فرمانے کا موقع پایا وہ کڑی جو بنی تیم اور بنی امیہ کی مصلحت کو جوڑتی ہے

تھا کہ وہ ”اسلام کو ہلاک کرتا رہا“۔ ہم نے احتیاط کی ہے کہ مغیرہ بن شعبہ کے اساس مصلحت کو لکھتے ہیں اور یہ دکھاتے آتیں کہ وہ کون سے لوگ تھے جنہیں ان ذات شریف سے مصلحت لینے کی ضرورت محسوس ہوئی اور پہلی کو اپنی صورت دکھانی تھی کہ اس کی بھی مثال ملتی کہ اور وہ کون تھا جس نے اسلام کے اس ہلاک کرنے والے کی مصلحت قبول نہ کی۔ اگر ایک جیتی مصلحت اور احتمال غرض سے چشم پوشی بھی کی جائے تو یہ امر خیال کرنے کے قابل ہوگا کہ گزشتہ تین دور اور بنی امیہ کے حصول اختیار میں مغیرہ بن شعبہ کی ذات نہ صرف جوڑنے والی کڑی تھی بلکہ اس کی دونوں میں شرکت ایک چیز تھی جو ان دونوں حکومتوں میں قوی مماثلت کے قرائن سے پر تھی اور یہ تو صاف ظاہر ہے کہ قرون ثلاثہ کی مصلحت بنی امیہ کو دراشت میں ملی تھی۔

بنی امیہ کو قرون ثلاثہ کی مصلحت ورثہ میں ملی تھی میں نے کہا ہے کہ قرون ثلاثہ کی مصلحت بنی امیہ کو دراشت میں ملی تھی۔ یہ اس خیال سے ہے کہ اس زمانہ میں جب کہ بنی ہاشم صاحب اختیار ہو جاسکتے بنی امیہ خاموش تھے اور بنی ہمدانی یا تیم اس کے خلاف ایک مصلحت کے موجد ہوئے اور جب سے انھوں نے بنی امیہ کو اپنے لیے خرید اپنی امیہ اپنے اس اظہار خیال سے باز آنے کہ بنی ہمدانی اور تیم قریش میں کوئی ذی اثر قبیلہ نہیں ہے۔ بلکہ وہ اب بنی ہاشم کے خلاف انھیں (ہمدانی و تیم کو) اپنی جگہ مضبوط کرنے لگے اور انھیں (بنی امیہ کو) خود اپنے لیے کھڑے ہونے کی جگہ مل گئی اور آئندہ تجربہ نے بتایا کہ ہم بنی ہاشم کے دل نشین قدس اور عظمت کے مقابل اگر ٹھہر سکتے ہیں تو اس مصلحت کی پیروی سے جو ہمارے بحال کرنے والے کر گئے، لازماً بنی امیہ جب تک بنی ہمدانی اور تیم کے ماتحت رہے نہ انھیں شہنشاہی کے بڑے مصلح خود مقرر نہ ہئے اور نہ وہ بنی ہاشم کے متعلق مصلحت کی اس صورت میں زیادہ پر جوش ہو سکے جس قدر موقع کی مصلحت کے لحاظ سے بنی ہمدانی اور تیم نے سختی جائز رکھی تھی بلکہ بنی ہاشم کی دفعۃً بے دست دہائی اور ہمدانی و تیم کی قوت کے باوجود ناقبولیت کے خوف نے غیر مختلط سختی سے آپس میں ایک یہ گھجوتا کر دیا کہ نہ تم ہمارے اختیار کے خلاف کوشش کرو اور نہ ہم تمہیں آئندہ کسی مزید آزمائش کی تکلیف دیں۔ یہ مصلحت مصلوبہ کے زمانہ تک قائم رہی، اگرچہ دور ثالث یعنی بنی امیہ کے عود اختیار سے جو حرکت حرک ہو سکتا تھا اس کا تذکرہ کیا گیا۔

قرون ثلاثہ کی مصلحت بھی بنی امیہ کے جوشِ عداوت کا ورثہ تھی لیکن یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ قرون ثلاثہ کی مصلحت ورثہ

تھی بنی امیہ کے اس جوشِ عداوت کا جو حصول اختیار کے لیے تھا۔ لیکن ہے کہ بنی امیہ کی عداوت میں جو انھیں بنی ہمدانی سے جتنی مذہبی عنصر کا بھی کوئی جزو ہو لیکن بنی امیہ اور بنی ہاشم کی عداوت بنی عربی کی بعثت سے بہت قبل کی تھی جس میں مذہب کا کوئی جزو نہ تھا۔ بلکہ اگر تھا تو نام اور نمود کا جس نے امیہ کی اولاد میں حسد پیدا کیا اور وہ برابر بنی ہاشم کی پیچ تکی میں مبتلا

رہے نہ بنی امیہ اسلام کے لیے اسلام لائے اور نہ کبھی اسلام کے سیاسی اقتدار کی ذرا سی لغزش دیکھ کر انھیں طنز کرنے میں خلعت ہو اور عثمان کے خلیفہ ہوتے ہی ابولخیان قیص میں چپہ جو اسے کہنا تھا یہ اس کی تمام ساخت تمام خلعت اور تمام خیال کا آئینہ تھا۔

عداوت اور بے کاظمی کی انتہا اور ہم ایک موقع پر پہنچنے والے ہیں جہاں یہ کہا جائے گا کہ:

”بنی ہاشم نے ملک کے ساتھ کھیل کھیلا نہ کوئی خبر آئی تھی نہ وہی نازل ہوئی تھی۔“ ہم میں سے بعض سوچ سکتے ہیں کہ یہ ایک اظہار خیال ہے جس سے مذہب کی بوجھت ترین احتیلا بلکہ دشمنی کے طنز سے دور کی گئی ہے۔ لیکن کوئی کہہ سکتا ہے کہ سیاسی حیثیت سے اس کی بے تمیزی ظاہر ہے۔ جس میں اس کا کاظم نہیں کیا گیا کہ سننے والے کون تھے لیکن میں ان دونوں باتوں سے الگ سوچتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ موقع آیا تھا جس میں لوگ اس درجہ دینی حرارت سے خالی ہو گئے تھے کہ وہ اپنے قوی مذہب کی ایسی سخت چھوڑ پر بھی اپنے کو بے حس پاتے۔ یہ خلی ہونا ایک دن کا کام نہ تھا ان کا یہ حس اس وقت ضائع نہیں ہوا تھا جس وقت اس کے نشور پر نظر یہ انتہا پسند فقرہ کہا گیا بلکہ ان کے حس کا صنعت اس وقت سے شروع ہوا تھا جس وقت سے انھوں نے یا ان کے آباد اجداد نے اسے گوارا کر لیا تھا کہ اپنے ہر طرح کے محسن کے آخری فرض کے ادا کرنے کے قبل ہم اپنا موقع طے کر لیں نہ جو کہ اس کے دفن کے ساتھ ہماری آرزوئیں دفن ہو جائیں اور کیا یہ اس کے قبل ہو سکتا تھا جب تک وہ اپنے محسن کے ان تمام اقوال کو جو عدم خود غرضی اور عدم موقع بینی کا سبق سکھاتے ہوں اپنی توجہ اور اطاعت کے شایان نہ سمجھتے ہوں؟ جماعت انسانی کا کوئی عاجز اور دنی الطبع انسان ذلت کا پہلا بت نہیں ہے، بلکہ وہ ایسے اتفاقات میں بسر کر چکا ہے کہ زمانہ نے اسے اپنی قوتوں کو اس طرح صرف نہ کرنے دیا جس طرح وہ پیدا ہوا تھا۔ اور جس طرح اس کے شو کا فطری اقتضا تھا بلکہ وہ ایسے بوجھ سے دبا تھا کہ ہل نہ سکتا اور اگر چلنے کی راہ بھی پاتا تو ایسے راستوں سے جو اس سے بہتر موقع کے کسی نفس کے لیے ذلت کی انتہا ہوتی۔ تم چاہتے ہو کہ گھناؤنا بیچ اچھا درخت اگلے۔ اور شدید یہ بھی تمہارے مشاہدہ یا سمی تجربہ میں ہو کہ ضعیف البصر ہاپ کا فرزند بھی ضعیف البصر اور ہرے ہاپ کا بیٹا بھی اکثر ہرا ہوا ہے۔ یا بسا اوقات بیٹا اپنے ماں ہاپ کے امراض و درائش پاتا ہے۔ تم نے کب خدا کا قانون یہ دیکھا ہے کہ لومڑی نے شیر کا بچہ جتا جو۔ میں اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ اگر کسی شجاع قوم سے جرأت کا احساس دور کیا جاسکتا ہے تو بلودی قوم، یا وہ جو جرأت کھو چکی ہے، کیوں نہ شجاع بنائی جاسکتی ہو۔

اور کیا یہ انسانی تجربہ میں ہے کہ کوئی شخص کسی امر میں فوراً انتہا پسند ہو جائے، جب تک کچھ وقت اُسے ہٹکا تا ہوا ایک جگہ قائم نہ کر دے۔ وہ شخص جو یہ کہہ سکتا تھا کہ بنی ہاشم نے ملک کے ساتھ کھیل کیا، وہ تحت شامی پر تھا اس نے اپنے پہلے بلو شاہ کے طرز عمل کو دیکھا تھا اور وہ روایتیں اور ترکیبیں سنی اور دیکھی تھیں جو اس کے پیشروؤں نے اپنے کو اپنی جگہ مضبوط کرنے کے لیے کی تھیں اسے یہ بھی معلوم تھا کہ ذاتی منفعت یا احتیلا کی مصلحت نے لوگوں کو بھی اپنی جگہ پر رکھا اور اب نسبت اس آب و ہوا میں پرورش پاتے ہوئے اس قدر زیادہ زمانہ گزرا ہے کہ کسی مخالف احساس کے پیدا ہونے کی امید نہیں ہے۔ یعنی اس کی جرأت لوگوں کے مردہ احساس پر مبنی تھی۔

اور کیا یہ انسانی تجربہ میں ہے کہ کوئی شخص کسی امر میں فوراً انتہا پسند ہو جائے، جب تک کچھ وقت اُسے ہٹکا تا ہوا ایک جگہ قائم نہ کر دے۔ وہ شخص جو یہ کہہ سکتا تھا کہ بنی ہاشم نے ملک کے ساتھ کھیل کیا، وہ تحت شامی پر تھا اس نے اپنے پہلے بلو شاہ کے طرز عمل کو دیکھا تھا اور وہ روایتیں اور ترکیبیں سنی اور دیکھی تھیں جو اس کے پیشروؤں نے اپنے کو اپنی جگہ مضبوط کرنے کے لیے کی تھیں اسے یہ بھی معلوم تھا کہ ذاتی منفعت یا احتیلا کی مصلحت نے لوگوں کو بھی اپنی جگہ پر رکھا اور اب نسبت اس آب و ہوا میں پرورش پاتے ہوئے اس قدر زیادہ زمانہ گزرا ہے کہ کسی مخالف احساس کے پیدا ہونے کی امید نہیں ہے۔ یعنی اس کی جرأت لوگوں کے مردہ احساس پر مبنی تھی۔

اور اگر یہ انتہا پسندانہ بے تمیزی تھی تو اس کے قبل اعتدال کے زمانہ میں کیا ایسی باتیں نہ گزری تھیں جو ایک ذکی الحس کے لیے ایٹھنے کو ناگہانی ہوتیں؟ نام اور غرض بھول جاؤ اگر چاہو لیکن کون سے مراحل باقی تھے جو طے پھٹنے سے بچا ہے تھے آج سے کچھ ہی قبل تک ایسی صدا آسکتی تھی کہ رسول، سیدۃ النساء اور ولایت مآب کے دفن میں شرکت نہ ہونے سے شرم اور اتابیت کی دلیل سنائی دے۔ اور لوگ بھیجیں کہ علی اور فاطمہؑ نے، ہیں شرکت تجیز و تکفین کے قابل نہ بگھا وہ اس لیے ہو کہ ہم نے ان کے ساتھ قباہل ہائز رکھا تھا یا اس لیے کہ ہم ان کی کارگردگی کے دیکھنے میں اسلجے ہوئے تھے جنہوں نے دفن رسول پر بعض سرگرمیوں کو مقدم رکھا لیکن ہمارے زیر تبصرہ باب میں واقعات کا ٹکڑا اس طرح جو رہا تھا کہ نبی کے نواسہ کا دفن ایک عبرت ناک تاریخی واقعہ ہو جاتا۔ اور اس سے کہیں بڑھ کر واقعات تو ایسی باقی ہیں۔ صرف مدارج اور مراتب کو زیر نظر رکھو۔

علی و فاطمہؑ کا مسند زندقہ (جو انکے لعلی خلقی عظیمیہ (۶۸: ۴) کے مصداق کافر زندقہ تسلیم کیا جاتا، مگر لڑکے سے مراد ذات و صفات کے فطری اشتغال کا سلسلہ ہے، جو خود بھی اپنے خلق کے لیے مشہور ہوتا) اس کا قائم مقام ہوا جس نے فرمایا تھا کہ: ”مجھے سلج سب سے زیادہ محبوب ہے۔“ اس سرچشمہ شرافت و تہذیب (حسنؑ) نے اپنی عمر میں ایک مرتبہ جو سب سے سخت جملہ استعمال کیا وہ یہ تھا کہ: ”تیرے لیے میرے پاس بزدلتی کے کچھ نہیں خبہ۔“ لیکن رسول کا قائم مقام اس قوم کا امام ہوا جس سے اسے حکایت تھی۔ ”جس کے مثل

حسنؑ اور ان کا موقع

تھکدین نے نہ دیکھا تھا اور متاخرین جیسانہ دیکھیں گے۔“ حسنؑ نے اپنی آنکھوں سے اس قوم کے بہت سے انداز دیکھے تھے اور دیکھ رہے تھے کہ اسے اگر کچھ پسند ہے تو روپیہ اور احتیلا اسے کچھ غم نہیں ہے کہ تم بہ حیثیت رہنا ہونے کے اپنی روش میں حق کی پیروی کر دیا حق کا خلاف جاو لیکن ہمارا حکم تمہاری آنکھوں سے اوجھل نہ ہو۔ حسنؑ کو توجہ تھا کہ کس طرح عین فتح کے وقت یہ لوگ پھر جاسکتے ہیں بلکہ دشمن کے حوالہ کر دینے کی دھمکیاں دے سکتے ہیں۔ خوفناک ہو گا وہ وقت جب ان کے ساتھ شکست ہوا پھر بھی یہ تو دور پہنچے ہوئے زمانہ کا تھا۔ حق اپنے کو اس وقت کو نے عناصر میں گمراہ ہوا دیکھتے تھے اور وہ کس درجہ امید افزا یا بہت شکن تھا۔ پرانے دشمن نے قصہ حکم کے بعد ”بیعت خلافت“ لی تھی یا کم سے کم جناب امیر کی شہادت کی خبر سن کر اپنے کو ”امیر المومنین“ مشہور کیا اپنی بیعت خلافت ہو رہی ہے۔ قیس بن سعد جوش و فدا داری میں بیعت کرتے وقت ”قتال طہرین“ کی شرط کا عام مجمع میں نام لیتے ہیں۔ امام تقصیل کو احتیلا سے دور کچھ کر روک دیتے ہیں کہ ”کتاب خدا و سنت رسول میں دیگر شرائط بھی شامل ہیں“۔ نتیجتاً اس خیال سے کہ جب تک قیس کے علاوہ اور لوگوں کا میلان اور آہوگی ظاہر نہ ہو لے اس وقت تک ایسی کسی شرط کا اعلان مصطحت کے خلاف ہے۔ اس سے ہم تیار دشمن کو اور تیاری کا موقع دیں گے بلکہ وہ ہماری تیاری کے قبل پیش قدمی کر سکتا ہے، دراصل ایک ہم اس کے دفاع تک کے لیے اپنے پاس سامان نہ دیکھیں۔ اور قوم کے غیر قائم متانت اور ہلکے فیصلہ پر غور کر دو کہ اسے یہ احتیلا اچھی معلوم نہیں ہوتی۔ کیا اس لیے کہ وہ جوش جنگ سے بھری ہوئی تھی؟ پھر تو نہ تھا۔ ایسے نہ صرف مغن کے بعد کی تاریخ، قوم کے موجودہ افراد کی ترکیب، حسنؑ کے ساتھ معاملت، ان کا سوال، اس کا جواب، حسنؑ کا تصفیہ یہ بھانے بغیر نہیں رہتا کہ قوم کے قوی حس میں گمن لگ گیا تھا۔ غیرت اور حمیت کی جگہ روپیہ اس کی نگاہوں کے

سامنے تھا اور ذلیل زندگی انھیں میدان جنگ کی برافراں موت سے زیادہ پسند آئے گی تھی۔ حیات کا یہ نسخہ قوی ہوش اور خصوصیات سے خارج ہو گیا تھا کہ: ”جنت تلواروں کے سایہ میں ہے۔“ قوی خیال اور اعلیٰ حوصلوں کا کوئی مرکز نہ رہا تھا۔ اور اپنے قوی وقار اور غرور کی قیمت بھول گئے تھے۔ کوئی نکتی ہوئی چیز دکھا دہ اس کے پیچھے ہیں۔ ہمیں ظاہری شان کا ذخیرہ ہو اور ان کی عرصہ زبان چاٹ لینے کو لگی ہے اور غلامانہ ذلیل انداز دور سے بلاتیں لے رہی ہیں۔ کوئی اس قوم سے پوچھتا کہ آخر وہ چاہتی کیا تھی کہ جب اسے جنگ کے لیے بلایا جاتا تھا تو موت کا ایسا سکوت اس کی ہر سانس سے پیدا ہوتا تھا اور جب سلامت کے طائر سے کہا جاتا تھا کہ اگر تم جنگ کے لیے آلودہ نہیں ہو تو میں تمہیں ایسی بات پر مجبور نہیں کرتا جس سے تمہیں کراہت ہے تو وہ اس بھولنے تک کو لوٹ لیتے تھے جس پر ان کا امام بیٹھا ہوا تھوڑے دو دنوں کو معلوم تھا کہ جنگ کے وقت جنگ نہ کرنا کیا معنی رکھتا ہے اور اس جواب کو سنو جو انھوں نے دیا۔ کوئی تسکین نہیں دیتا۔ کوئی جلتے دینے والا دکھائی نہیں دیتا۔ کوئی لفظ ایسا نہیں سنائی دیتا جس میں ہمت کی گری ہو۔ جواب یہ ہے کہ ان کی آنکھیں چیز پر تلاش کرتی ہیں جو وہ لے جاسکتے ہوں۔ انھیں یہ خیال نہیں ہوا کہ وہ یہ دیکھتے کہ ایسے وقت اپنے اقتدار کی حفاظت اور ذلت سے بچنے کے لیے ہمارے پاس تلوار ہے یا نہیں۔ انھیں اقتدار اور ذلت سے کیا بحث تھی۔ انھیں مال اور چیز کی ضرورت تھی۔ انھوں نے وہ بسلا نہیں چنی تھی جس پر دخول کا نواسہ بیٹھا تھا۔ وہ بھارے تھے کہ دین کا اقتدار ہم الٹ رہے ہیں۔ کیوں۔ اس لیے کہ کچھ پامائیں۔

حق ایسے بھر رہے تھے۔ ان کے لیے ذلت تھی کہ وہ اپنے کو ایسی قوم کا امام کہتے۔ کہاں ہے وہ سپہ سالار جو اس ذلیل مواد کو سپاہیوں کی فوج کہتا۔ کون ہے وہ جارج جو یہ سوال کرتا ہے کہ حق نے جنگ کیوں نہ کی۔ مانا کہ قیس بن سعد کے ماتحت میں بارہ ہزار سپاہی تھے اور دشمن کی فوج جو روانہ ہوئی؟ ساتھ ہزار تھی۔ اور خبر یہ ہیں کہ قیس محاصرہ میں آگئے تھے۔ ان کا محاصرہ میں آجانا ان کی فوجی غلطی تھی اور نہ دشمن کی کوئی تعریف۔ پھر بھی شجاعت اور وفاداری کے اس روشن چراغ نے اپنے گردہ اور اپنے وقار کو محفوظ رکھا جو کسی کمزور دل یا عرصے سے ہر طرح ممکن تھا کہ یادہ دشمن کی کثرت اور یا دولت سے مرعوب اور مغلوب ہو جاتا۔ کمزور طبیعت موقع بین مدبر ابن عباس اپنے کو اپنے قوی استقلال کے درجہ سے گرا دیتا ہے لیکن مشہور انصاری اپنے عہد اور غلوں کو نہیں بھولتا۔ یہ قیس کی ذات تھی جس نے محلوہ پر اس درجہ اثر کیا کہ اس نے باوجود اس کے کہ اس کی فوج پانچ گنی زیادہ تھی اور مزید ملک کی امید کر سکتا تھا۔ لیکن پھر بھی جنگ چھیڑنے کی جرأت نہ کی۔ بلکہ ایک دوسری فوج حق کی طرف روانہ کی۔ امید کی جاسکتی تھی کہ اگر بارہ ہزار سپاہی شام کے ساتھ ہزار سپاہیوں کو مستعد جنگ نہ کر سکتے تھے تو امام کا اصل فوجی مرکز شام کی تمام فوجی قوت کا آسانی سے مقابلہ کر سکتا تھا اور چونکہ اس وقت تک ایسے پر زعم طہرانہ خیال نہ پیدا ہوئے تھے کہ ”خدا سب سے بڑے دستہ فوج کی طرف ہے“ بلکہ کہ ”مَنْ قَاتَلَ قَلِيلًا فَلَيْتَ قَلِيلًا قَاتَلَ قَلِيلًا قَاتَلَ قَلِيلًا“ (۲۵۰:۲) کو جانتے تھے۔ غالب قرینہ تھا کہ امیر شام اپنے گھر کا راستہ آسانی سے لیتا۔ یہ سب کچھ تجلیا میج لیکن لوگ کہاں تھے جنہیں یہ یاد ہوتا۔ وہ تو ان خبروں کے سننے کے ملوے ہو گئے تھے کہ امیر شام نے بغیر نکیر پھولے یمن، عراق، بصرہ، اور جزیرہ پر قبضہ کر لیا۔ نہ انھیں کر دھ لینے کی ضرورت تھی کہ ہم اپنے ان حملات کو محفوظ اور واپس کریں، نہ اس کا ہم تھا کہ ہم بغیر کی فکر کریں، وہ ابن ماعر کی تقریر سنتے ہیں اور منتشر

ہونا شروع ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ امام بدائے کی واپسی پر پھوڑ ہوتے ہیں۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ ران میں نیزہ کا زخم کھالے کے بعد اگر رعبہ اور ہمدان حفاظت کے لیے کڑے نہ ہو جائیں تو آج ہی ہماری شہادت میں کوئی شبہ نہیں۔ اور جب امیر شام امیر کے معتقد دوستوں کو پھلجری چھوٹنے کا تماشہ دکھا سکتا تھا جس سے سفید اور زرد رنگ کے پھول گرتے وہ دیکھتے یا نہ دیکھتے تو اب تو معاویہ کو اپنی اس مصلحت میں کافی تجربہ ہو چکا تھا اور بقول علامہ مجلسی: ”حضرت (حسن) کے ساتھ کوئی ایسا شخص کہ جس کے فریبوں سے حضرت مامون ہوں ہائی نہ رہا۔ مگر مخصوص شیعہ ان کے پھر بزرگوار کے اور خود آجانب کے اور وہ ایسے قلیل تھے کہ ملامت لشکر ان شام کی نہ کر سکتے تھے۔“ اور اطمینان دیکھو امیر شام کا کہ اب اسے ایسے میضہ راز کے کلافات کو چھپانے کی بھی ضرورت نہیں ہے جس میں لوگ حسن کو غفلت سے قتل کر ڈالنے یا سپرد کردینے کو کہتے ہیں۔ اس لیے کہ چھپانے کی تو اس وقت ضرورت ہوتی ہے جس وقت یہ اندیشہ ہو کہ نہ چھپانے سے ہماری غرض میں کامیابی نہ ہوگی۔ اس کے برعکس وہ لوگ معلوم نہ تھے جو حسن کی حفاظت کر سکتے اب اس کے بعد ان بے وفائی کے اسناد کا حسن کے پاس بھیجانے کی طرح معاویہ کی سیاسی غلطی نہ تھی۔ بلکہ بھانے خود ایک سیاسی اقدام تھا جس سے حسن میں یاس اور شبہ پیدا کر سکتا۔

صلح حسن پر نظر اب حسن کیا کر سکتے تھے؟ جہاں تک واقعات کی بنا پر رائے قائم کی جاسکتی ہے حسن کے لیے دو راستے تھے۔ ایک یہ کہ اپنے لا معلوم یا معلوم چند دوستوں کے مجبور سے پر نکوار ہاتھ میں لیتے اور برابر جنگ کرتے رہتے۔ یہاں تک کہ یا تو ان کا مختصر گروہ نیست و نابود ہو جاتا اور یا یہ معاویہ کو متواتر شکستیں دے کر ملک کا کوئی حصہ اپنے لیے مخصوص کر لیتے اور یا لڑتے لڑتے ایک لا معلوم طویل زمانہ کے بعد جب کہ حسن اور معاویہ ہوتے یا نہ ہوتے حسن کے قائم مقام اپنے کو دہلی امر دیکھتے۔ لیکن ان تمام باتوں کا جواب کیا حسن کے اس مطالبہ میں نہیں ہے جو اہل عراق سے فرماتے ہیں جس سے مات فظوں کا مات بیان کرنے کے لیے تلاش کرنا غیر ضروری ہے کہ: ”معاویہ نے ایک امر پیش کیا ہے جس میں نہ تو عزت ہے اور نہ انصاف۔ پس اگر تم موت پر راضی ہو تو ہم اس امر کو قبول نہ کریں اور ان سے اللہ تعالیٰ کے مجبور سے پرہیز نکو اردوں سے محکمہ کریں اور اگر زندگی کو دوست رکھتے ہو تو ہم اس کو قبول کر لیں اور تمہارے لیے خوشنودی حاصل کریں۔“

صلح اور جنگ کا تصفیہ قیاس نہیں کیا جاسکتا کہ یہ ایک ایسا مجمع ہو جس میں تمام دوست یا تمام دشمن ہوں۔ بلکہ کم ہی یہی لیکن کچھ ایسے ہوں گے جنہیں ان کے حقوق کی حمایت پسند ہوگی لیکن وہ اس خیال سے کیوں نہ ہو کہ زیادہ تر کو خاموش دیکھ کر بولنے کی جرأت نہ کر سکے کم سے کم اپنی خاموشی کے صلح اور جنگ کے مسئلہ کا فیصلہ کر رہے تھے اور جو بولے بھی وہ یہ کہ ”صلح قائم رکھی جا۔“

آزادی اور غلامی کا تصفیہ آگے بڑھو اور اس شجاع انہر قیس بن سعد کے مطالبہ پر غور کرو جس کا جواب بھی یہ نہیں دیا گیا کہ ہم لڑیں گے، بلکہ امام گمراہ کی اطاعت کریں گے۔ اس لیے کہ بھانے قتل ہونے کے اپنے مال اور عیال کی محبت تھی۔ یہاں قوم اپنی آزادی اور غلامی کا تصفیہ کر رہی تھی۔

بے سود کوشش یہاں اب سوال کیا جاسکتا ہے کہ اگر حق تلوار ہاتھ میں لیتے تو کس قوم کے لیے؟
 قسح کرتے کہ پھر یہ قوم حکومت کرے یا اس کی ذلیل اولاد اپنے کو حکومت کا
 شایان قرار دے۔ جب کہ اولاد کے بزرگوں سے غنیمتوں کے مقابلہ کرنے کی قوت جاتی رہی تھی۔

دُشراپٹلو اب میں اس کو دوسرے پہلو سے دیکھتا ہوں اور وہ یہ تھا کہ کیوں نہ حق نے اپنے
 ممکن آدمیوں سے اختیار پر قائم رہنے کی کوشش کی۔ لوگ اس قابل ہوتے
 یا نہ ہوتے۔ اور رفتہ رفتہ وہ کوئی صورت ایسی پیدا کر دیتے جس سے دوران عمل کی کمی اکثردہ پوری ہو جاتی۔ یہ طرز عمل بجانے
 اس کے کہ رسول علی اور ان کی اولاد سے چاہا جائے، دور احکام کا طرز عمل ہو تا۔ یا زیر ذکر زمانہ میں معاویہ نے اپنے کو اس
 قابل ثابت کیا۔ اس کا پہلا قدم یہ ہوتا کہ اپنے حصول اختیار کے لیے مخلوقات الہی بزرگبانی بٹنی جاتی۔ سپاہیوں کو قائم
 رکھنے کے لیے صریح یا غیر صریح طریقوں سے رعایا پر ہر طرح کا تشدد ہوتا۔ اور حاصل کے لیے ایسا اپنی خوفناک تراش غراش
 سے ان کے سر پر سوار کی جاتی یا حصول زندگی کے لیے عام اس سے کہ کوئی اپنے کو رعایا کہتا یا نہ کہتا اپنے تلوار کا خوفناک
 وزنی سایہ منوایا جاتا۔ اور دھاک قائم رکھنے کے لیے طریقے اختیار کیے جاتے جسے دیکھ کر انسانیت الامان کی پروردگار
 بے سود مدائیں دیتی رہتی۔ اپنے خلقت کش سپاہیوں کو متاثر نہ ہونے دینے کے لیے کہانیاں گھڑی جاتیں۔ دود از راہ
 جواب دیے جاتے۔ چاہیے آفرینی، ناحق کوشی، غلط اندازی اور حق کشی کا چہرہ چلنا رہتا۔ اور مدبرین کو تسکین اس سے ہوتی کہ
 کم سے کم ہمارے ساتھ دینے والے صاحب اختیار ہیں جو بجائے خدا ایک بڑی نعمت ہے۔ اور ان برائیوں سے محفوظ ہیں
 جو حکومت کا لازمی نتیجہ ہیں۔ مختصر لفظوں میں شارع اسلام اور اس کے ذمہ دار شارحین کا یہ طرز عمل نہ تھا کہ برائیوں کو
 قبول اور ان پر عمل کر کے اس سے بھلائیوں کے پیدا ہونے کی امید کی جائے۔ نشو و نما کے لیے نظریہ دہریت کے دور کا
 ہے۔ وہ ایسے کسی نظریہ سے متاثر ہو یا نہ ہو کہ انسان بالطبع گناہگار ہے، یا خدا کا آماج غضب ہے۔ یا پیدا نشی ثور ہے۔
 حق ”کل مولود یولد علی فطرۃ الاسلام“ کے قائل اور عامل تھے۔ زیر بحث مصلح فلسفۃ اسلامی کے
 پانڈا نہیں ہو سکتے تھے۔ اسلام انسان کے احساس شرافت کے لیے ایک تحریک تھا۔ دنیاطبع بنانے نہیں آیا تھا۔
 بغیر نظام سازی کے وہ اپنا ایک عصر کھوتا تھا۔ لیکن اپنی اسپرٹ کے خلاف نظام سیاسی اختیار کر کے مذہب اور
 سیاست دونوں کے لیے مضر تھا۔

کیا خالص تخم کافنا کر دینا قرین مصلحت تھا اب میں اسے قبول کیے لیتا ہوں کہ حق کو کچھ آدمی
 ملتے۔ لیکن جو واقعات کہ بیان کیے گئے اور جس قدر
 زمانہ سے کہ معاویہ کی زہا شانہ ترکیبیں چل رہی تھیں اس سے یہ قریب بہت کم ہے کہ زیادہ آدمی دستیاب ہو سکتے۔ یعنی
 دشمن کے مقابلہ کے لیے جس قدر لوگ حق کے ساتھ ہوتے ان سے کسی طرح زیادہ دیر تک مقابومت کرنے اور فتح کی امید
 نہیں کی جاسکتی تھی۔ اور اگر یہ قیاس نہ بھی کیا جائے کہ غلوں کے انتہائے جوش سے یہ مختصر گروہ ساتھ نہ بھی چھوڑتا تاہم
 اس خالص تخم کافنا کر دینا کسی طرح ایک اصول انسانیت کے پیرو اور صاحب شعور سپہ سالار کے نزدیک مناسب نہ تھا۔
 جب کہ آخری فحش ہوتی تھی۔ وہ فحش عزت سے مصلحت تھی۔

لیکن صلح پر غور کرنے کے قبل ابھی زیر بحث مضمون پر کچھ اور کہنا ہے اور وہ صلح کے خلاف ہے لیکن ہونے والوں کی تعداد ہے۔ ان کا شمار انگلیوں سے زیادہ نہ تھا۔ کیا حق ان چند نفوس کے اعتبار پر صلح نہ کرتے۔ ان کے جسم کے ٹکوار اور نیروں کے لیے کافی ہوتے اور ان کے قہوڑے سے اور رختا شام کے ریلوں کو کتنی دیر تک روکتے یہ بھولنا نہ ہوگا کہ قوم کے غرور اور آکن کی یہ زندہ تصویر جس قدر افسوس اور طنز پر بیٹھ رہی تھیں ان میں سے ہر ایک کا جوش اپنی ذات کے اعتبار پر تھا۔ یہ اپنا فرض ادا کر رہے تھے۔ بڑا ناقدر شمس ہوگا جو ان کے جوش کو گستاخی کہے۔ یہ موقع کی گرمی کا جنون تھا۔ کاش ایسا جنون چند ہزار آدمیوں میں ہوتا؛ اور جہاں تک میں سوچ سکتا ہوں حق کو بھی ان کی وفاداری میں کتنی شبہ نہ تھا۔ ایسے جوش کے وقت جب کہ ایک وفادار سپاہی فہید بن عمر الکندی کے ایک زخم کے متعلق سوال پیدا ہو جاتا ہے اور حیر کا یہ فقرہ کہ: ”کاش تو اور ہم اس روز ہلاک ہو جاتے کہ یہ برا دن نہ دیکھتے کہ دشمن کی مراد برآئی اور ہم لوگ دل تنگ اور غضب ناک ہوتے۔ موت اس زندگی سے کہیں بہتر تھی۔“ گزرتے ہوئے اختیار اور آزادی کا موشہ پڑھتا ہے۔ کیا اس وقت حق یہ نہیں فرماتے کہ: ”میرے تمہاری شجقت اور اپنے بارہ میں تمہارا اعتقاد معلوم ہے۔“ اور کہتے ہیں کہ: ”میں نے تمہاری بہتری کے لیے صلح کی۔“ ان میں سے ایک شہید بن غلبہ اس کا ذکر بھی زبان پر لاتا ہے کہ آپ نے چالیس ہزار سپاہیوں کو بے کار کیا اور جب جواب سنا ہے کہ: ”جسے معاویہ کے مقابلہ کے لیے بھیجا جاتا تھا اس سے مل جاتے تھے۔۔۔۔۔ اگر ایسا نہ کرتا تو کیا کرتا۔“ تو کوئی قابل اطمینان جواب نہیں دے سکتا اور قیس جو معاویہ سے کہہ سکتا کہ: ”میں نہیں چاہتا تھا کہ میں زندہ رہوں اور تو حکومت کرے۔“ کیا اپنے جوش اور شجاعت کے باوجود اس کا موقع دیکھ رہا تھا کہ وہ حق سے ان کے تصفیہ کے خلاف جنگ کرنے کا اصرار کر سکتا کیا ہوا عمر ان بن ابان کے بصرہ پر حق کے نام سے قبضہ کر لینے کا نتیجہ جنگ اور اس کا کامیابی سے جاری رکھنا محض تنہا یا چند کام نہیں ہے۔ اگر سپاہی بغیر سپہ سالار کے بے کار ہے تو سپہ سالار بغیر سپاہیوں کے کیا کر سکتا ہے؟

اب جب کہ حق نے دیکھا تھا کہ زیادہ تر ایسے لوگ میرے گرد ہیں جنہوں نے میرے باپ کو مارا ہے نیزہ مارا، میرا گھر لوٹا، اور مقتولین نہروان کا مظلوم

کس حالت میں صلح کی

طلب کر رہے ہیں اور جو باقی ہیں وہ خاذل ہیں اور بدلہ لینے والے ہیں۔ اور اگر میں معاویہ سے ہٹاؤں تو یہ لوگ میری گردن پکڑ کر مجھے معاویہ کے سپرد کر دیں گے۔ تو آپ نے اپنے دوست غلامیوں کو ترک کر کے اپنے دشمن سے عہد کیا۔ اس لیے کہ: ”اگر میں معاویہ سے ایک عہد لے لوں کہ میں اس کے سبب سے اپنی خون ریزی کو روکوں اور اس کے سبب سے اپنے اہل میں امن سے رہوں تو یہ امر بہتر ہے اس سے کہ یہ لوگ مجھے قتل کریں۔“ دیکھ اس لیے کہ: ”اگر میں اس صلح کروں اس حال میں کہ میری عزت قائم رہے۔ یہ میرے نزدیک بہتر ہے اس امر سے کہ وہ مجھے قتل کرے اس حال میں کہ میں اس کا امیر ہوں یا وہ منت رکھ کر چھوڑ دے اور یہ امر باعث عار ہو۔ بنی ہاشم کے لیے قیمت تک اور معاویہ اور اس کی اولاد ہمیشہ احسان جنگ لے اس کا ہمارے ہر زندہ اور مردہ پر۔“

متذکرہ صدر فقرات میں حق اپنی حالت کا اندازہ کر رہے ہیں۔ اور دیکھ رہے ہیں کہ یا تو میرے ہمراہی مجھے معاویہ کی خوشامد میں دشمن کے حوالہ کر دیں گے اور یا میں کئی اسباب کے وجہ سے گرفتار ہو جاؤں گا۔ وہ مجھے گرفتاری کی حالت میں

قتل کرے، یا گرفتاری کی حالت سے رہا کر دے گا۔ آخر الذکر صورت بنی ہاشم کی دائمی ذلت اور بنی امیہ کے دائمی افتخار کا ایک سبب ہو جائے گا۔ اس لیے صلح کر کے کیوں نہ عزت قائم رکھی جائے۔ ظاہر ہے کہ جو شخص کے معاملے سے اس سے بہتر کوئی تفریق نہیں ہو سکتا تھا۔ معاویہ ضرور تمام مملکت اسلامی پر حاوی ہو جاتا۔ اور اس وقت جب کہ اپنی کوششوں سے حاکم ہو جاتا بغیر اس کے کہ حق نے کوئی رعایت کی ہوئی تو اس وقت حق کے پاس نہ کوئی رعایت ہوتی اور نہ قطعی بخوری میں ان کا صلح بھی جاتی بلکہ وہ سیاسی مغلوبیت بھی جاتی۔ اس وقت کی صلح کو معاویہ بھی یہی کہہ سکا کہ: ”آزادوں کی طرح اہر خلافت کے حوالہ کر دیا ہے“۔ نظر میں اپنے اور قوم کے حقوق کو مد نظر رکھ کر اس سے اچھی کوئی تدبیر نہیں ہو سکتی تھی کہ شیشہ صاف سے تمام ہلوں کے گر جانے کے قبل وہ سب سبھذرات سے وقت کا اندازہ کیا جاتا۔ باعزت اور مخالفت کے لیے ممکن ہو تو خیر اٹھ کھڑے جاتے۔

اس وقت جنگ اختیار میں نہ تھی لیکن صلح تھی اب تک اگر جنگ کی وقت نہ تھی تو صلح کا اختیار تھا۔ ایک حکمت کا ہو جانا جس کا موجودہ حالات کے

مقابلے سے ہر طرح قریب تھا۔ کو بھی اختیار کے باہر کر دیتا۔ چونکہ اب تک لوگ جانتے تھے کہ قیس، عمر، ابن جحش، مدی، وغیرہ چہرے لیتے لوگ ہیں جو قتل اور زہر سے بچ گئے ہیں اور چونکہ یہ سرداران قبیلہ ہیں جو کچھ نہ کچھ وہیں حق کے لیے میدان میں لے آئیں گے اور بنی ہاشم کے افراد جن کی حق چاہتے ہیں وہی ہے جو شش شہادت میں اس فوج کی روح اور استقامت ہونے کے اس لیے یہ قیاس نہیں کیا جاسکتا تھا کہ تباہ و تاراجی تمام کوششوں اور اس کے اثر کے علم کے بھی معاویہ ہول سے ڈر رہا تھا کہ وہ اور اس کے ہزار ہوں اور عساکر مالکیر پوشاہ کسی گوشہ نشین امام کے تباہ و تاراج کو بھی اپنے لیے مدد و شجاعت تھے یہ حق کے لیے مفید تھا اور اس سے اگر جنگ ممکن نہ تھی تو عزت سے صلح ممکن تھی۔

نامساوی قوت اور اخلاقی ہتھیار سوالات کیا جاسکتا ہے کہ فریقین میں جب نامساوی قوت تھی تو صلح قبول کرنے والے کمزور فریق کو کیا اختیار تھا کہ زبردست

مضامین و فائدے عہد کرے گا۔ کوئی اعتبار اور ذمہ داری نہ تھی نیز اس کے کہ اس صورت میں عہد کے اخلاقی اعتبار پر مجبور کیا جاسکتا ہے نسبت اس حالت کے جب کہ ظاہر بہ ظاہر مغلوب جو شرائط قبول کیے جاتے۔ اب تک شرائط اٹھوا بھی سکتے تھے۔ اس وقت محض شرائط قبول کرتے۔ یہ بھی یگانہ کہ کوئی عہد حوالہ سیاست میں وزن نہیں رکھتا جب تک قوت اس کی مخالفت ہو لیکن کیا تھاری دانست میں اس طرح کا عہد ہونا قطعاً نہ ہونے کے برابر ہے۔

حسن کے انداز ان تمام چشم کشا سالانوں کی موجودگی میں شرائط صلح کو حق اور اپنے موافق کرنے میں حق نے ایسے ممکن انداز اختیار کیے جس کی امید نہیں کی جا سکتی تھی انہوں نے نہ صرف اپنے

پدر بزرگوار کے اور اپنے دوستوں کے لیے جو اطراف مملکت اسلام میں ہوں عہد لیا۔ بلکہ دس آدمیوں کے متعلق بھی اس عہد کے غیر جوڑ ہونے کو قبول نہ کیا۔ یہاں تک کہ ایک آدمی کو بھی جس سے اتمام لینے کے لیے معاویہ کا بیہنہ کھول رہا تھا اور نے عہد معاویہ کے لیے نہ چھوڑا اور بنی امیہ کے صاحب اختیار ہوتے ہوئے یہ امید کرنا کہ وہ جب امیر کے اہم حق سے انتقام نہ لیتے تا نگین تھا۔ پھر بھی یہ عہد میں داخل تھا اور اگر یہ قبول نہ بھی کیا گیا تھا تاہم یہ اشتناک کو

معلوم تھی کہ وہاں احتیلا کی ہائے چہاں فرزند رسول موجود ہوا۔ ایک سید انتہائی غریب و فقیر جسے "واشنگٹن آرہنگٹ" نامی سید صاحب جسٹس کی وجہ قرار دیتے ہیں۔

لیکن ہماری کتاب کی اصل غرض کے لحاظ سے سب سے

مفید شرط یہ تھی کہ معاویہ کے بعد حسن یا حسین کا

حق خلافت محفوظ کیا گیا تھا۔ سوچو اس شرط کے مفید گہرے اثر کو کہ وہ دشمنانِ اہلِ باطمینان کے حقوق سے نہ صرف

اعراض بلکہ چاہیل پیدا کرتے رہے اور پیشہ احتیلا کی کہ کسی عام مجمع میں ایسا کوئی قرار نہ کیا جس سے لوگوں کی ان کی

طرف توجہ ہو، وہ آج ان کے حق کو مہر اور دھتلا اور گواہی کے حوالہ کرتے ہیں اور اس وقت جبکہ ملک پیچھے پیچھے ہوا

لیجئے کہ یہ سب شرط قبول لیکن پہلے ہم حاکم ہوئیں اس سے جتنی مقبولیت اور نامقبولیت کا اندازہ کرو۔ سیاسی لحاظ تو

ایک موقت اور گزرتے ہوئے لحاظ ہیں نہ صرف یہ بلکہ گویا معاویہ کے طرز عمل کو اس کی جہالت تک کے لیے اس شرط

سے گھارا کر لیا آئندہ اس کی مصلحت کے کسی سلسلہ کو متعلق نہ کر دیتا تھا۔ اس کا اثر یہ تھا کہ معاویہ باوجود اپنے اقتدار اور

تقریبوں کے مبہولوں کے لیے کمال کوشش خود متاثر رہا شی سے اس قابل ہو سکا کہ وہ یزید کو اپنا ولی مہر قبول کر دیا اور پھر

بھی لوگ بہ اشتیاق بنی امیہ اس اقدام سے بیباک نہ رہتے۔ اور معاویہ کی دور انداز مانی کارروائیوں کو سمجھتے ہائے۔

باتوں سے گزرتے ہوئے اختیار کے اس زمانہ میں حسن کو اسامہ سے اطلاق اور

احکام اسلامی بھی یاد دلانے تھے اور مثالیہ حکومت بھی بتانے تھے

جہاں فہماتے ہیں کہ: "اگر بندگانِ خدا کے ساتھ اچھی زندگی بسر کرے" تو امارت سپرد کروں اور اگر تو "مسلمانوں سے

رحمت اور تکبر کرے گا اور احرام امور ات موافق شرع نہ کرے گا بلکہ اپنے مذاق کے موافق جاری کرے گا تو میں جہاں

تک ممکن ہو گا کوشش کروں گا جب تک خدائے تم میں اور تم میں جہل نہ کرے۔" اہلِ حق و عین کو کچھ سے کم اس سے

محفوظ کر لیا کہ ان پر نئے معاملے قائم نہ کیے جاسکتے۔ یہ اصول تھے جو ایک مصلحتی آدم اور اس کے چاشین کے دیکھنے

کے تھے۔ جب تک لوگ اسے اپنے امور ات کے احرام کا دالی قرار دیتے اور اسی مالت میں بھی جب کہ لوگ اچھی

حکوتوں سے اپنے کو اس قابل نہیں قرار دے رہے تھے کہ وہ ایسی ذمہ داری قبول کرتے وہ اپنی جتنی ذمہ داری کا لحاظ

کر کے ان اصول پر عمل کا عہد لیتا ہے اور اپنے کو حکومت سے اس لیے ملے کر لیتا ہے کہ دشمن اپنی جوش غلو کے ظہر

کرنے کے لیے جب کوئی مرکز نہ ہائے گا تو اسے رعایا سے کوئی بحث نہ ہوگی اور کشت و خون رخ ہو جانے کا درکار نہ ہوگا

لوگوں کی موجودہ حالت سے قہور سا کشت و خون گوارا کرنا بھی کوئی ایسی امید نہیں ہے کہ تاکہ وہ اپنے ہاتھوں کو بے عمل

کی اس وقت یا کچھ یہ صلاحیت دیکھتے ہیں یا نہیں دیکھتے۔

آخر میں یہ بھی کہہ دوں کہ مؤرخین کے الفاظ "مصلح" "تقویٰ امارت" اور "مصلح" ہیں کہیں "جیلٹ" نہیں ہے۔

اور جن لوگوں نے اپنے روش کی احتیلا سے اسے ممن قرار دیا ہے یا ایک شرط پر قرار دی ہے کہ معاویہ سنتِ خلفاء پر عمل

کرے انہوں نے اپنے مالک کی قوت کی تعریف کرانی نہیں چاہی ہے۔ جب کہ بیشتر بیعت نہ کرنے اور صلح رہنے کی

مثالیں گزری ہیں اور جب کہ اس وقت اس کا بھی ذکر ہے کہ حسین نے بیعت نہیں کی کہ معاویہ کرے جس کا بھی چاہے کہ

جب جناب امیر اس شرط پر خلافت قبول نہیں کر سکتے تھے تو کیا ان کا فرزند سبکدوش یا ترک امارت کے وقت دوسرے

سے یہ شرط کرا سکتا تھا۔ بغیر شرط کے بھی معاویہ کو اس سنت کی پیروی بغیر چارہ نہ تھا۔

یہ دوسری بات بھی فراہوشی کے قابل نہیں ہے کہ یہ ایک عہد تھا جو دو آدمیوں میں ہوا تھا۔ یعنی اس وقت

عہد ناموں کا اخلاقی اثر کب تک ہے

یہ عہد نہیں ہے جس وقت فریقین میں سے کوئی خلاف ورزی کرے اور کسی شرط یا شرائط سے اعراض کرے۔ دھات مشروط تھی۔ عہد کی ادنی خلاف ورزی اس کی اخلاقی حالت کو سخت کمزور تھی۔ یہ دوسری بات ہے کہ وقت کی عدم مصلحت ہے مضبوط اخلاقی خلاف ورزی کے بعد بھی کمزور کے لیے یہ عہد قائم رکھنا اپنے لیے مفید ہے یہ حالت عہد کی پابندی لازم نہیں ٹھہرائی بلکہ سیاسی بخوری کے لحاظ سے اپنی آئندہ روش قائم کرتی ہے۔

لن تنزکوں سے کہ یہ دیکھنا مقصود تھا کہ کس طرح نئی ہاشم کی قوت کا زوال ہوا۔ جہاں میں نئی ہاشم کا نظریہ استعمال کرتا تھا اس سے یہی غرض رسول کے بعد دوسرا دور سے ہے جو علی اور فاطمہ سے ہوں ورنہ غیر ذمہ داری نئی ہاشم کا خاتمہ سیاسی عہد صدیقین قائم رہا اور لوگ فاطمہ (مصر) نے صفحہ تاریخ پر اپنا نئی نقش چھوڑا۔

مجھے اس کے وسیع مفہوم سے کوئی بحث نہیں ہے۔ میں تاویر الامت شائع سے بحث نہیں کر رہا ہوں بلکہ وجود اس کے کہ پہلے چھ مہینے کی برادری نام حکومت کسی حاکم کی سوانح اور زمانہ حکومت کے لحاظ سے قریب وقت بھی نہیں ہے تاہم خیال کیا جاسکتا ہے کہ جس نے اپنے اختیار کو قربان کر کے ان چٹاریوں کو بجا دیا جی میں آتش افروزی کی پوری قوت تھی سب سے سود کو آتش کا نتیجہ غریب کے پردہ میں چھپا تھا۔ لیکن اگر ظہر اسباب سے شگاف اٹھ گئے جاسکتے ہیں تو شاید اسلام کو سیاسی شہرت کی مدد لیے بغیر یہ کہنا ممکن ہے کہ بیزانسی خلیفہ اور گوشت کی ارزانی کے اور کچھ نہ ہوتا۔ وقت نہ تھا کہ قربانی کسی نتیجہ کی امید دلائی اس لیے کہ معاویہ کی طرف سے لوگوں میں کسی ہی سبب اٹھادی کیوں نہ ہو لیکن کچھ تو فائدہ تھا اور کچھ ایسی لوگوں کو اس کا تجربہ نہ تھا کہ کسی عہد نامہ کا کیا نتیجہ ہوتا ہے۔ جس سے نفاذ عہد کی امید نہ رہتی۔ کچھ اس لیے کہ معاویہ پس پردہ مصالح سے کام لیتا تھا اور سرد مزاج متین بے رحم تھا۔ اس وقت کسی خفیہ کوشش کے معنی یہ ہوتے کہ دشمن اپنے جذبات و نظام کو رہا کر دیتا اور شاید پھر اس کے بعد اولاد رسول کا کوئی غیر مشروط دوست دنیا میں دکھائی نہ دیتا۔ یہی ہے زیادہ اور اس کے نائب نے جو قتل عام کیا اس کی مثال زمانہ معتمد میں کرغی کی لائی جاسکتی ہو لیکن ظاہر اس وقت کا اکثر زیادہ تر مشاہیر کے خلاف تھا اور اگرچہ معاویہ کی غرض اپنے احکام سے یہ کہیں نہ ہو کہ علی اور فاطمہ کی اولاد کے دوست و حامی نہ دکھائی دیے۔ تاہم یہ بات محض انکار کے ذریعہ سے حل میں نہیں لائی گئی بلکہ لوگوں کے خیال غریب نے یا انہیں موجود نظام کے قبول کرانے کی بھی بڑی کوشش ہوئی اور اس وقت نتیجہ کے زریں بلکہ فطری اصول نے لوگوں کو ایک آواز کی یہ سوراخ بھی نہ ملتا اگر جنگ سے لوگوں میں عام مخالفت پیدا کر دی جاتی اس وقت کا جوش و نظام اس وقت سے کہیں زیادہ ہوتا۔

اس بات میں اپنا خیال بکھاسا ہوں گا کہ وقت ہوتا ہے جب کہ حکومت اور اختیار سے بہت سے کام ہوتے ہیں۔ یہ وقت تھا کہ برائے نام اختیار سے اس لیے دست برداری کی جائے کہ دشمن کے جوش و ادب اور انتقام کا مزاج بدل دیا جائے۔ وہ کسی خلاف ورزی پر مستعد ہونے کے قبل ایک برائے نام رکھنے لگی دیکھے۔ یہی اس کا کوئی خیال مسلم خلیفہ

سے نہیں بلکہ فطری شکوک کے بعد عمل کرے۔

اب جو شخص کو چاہیے خود تصفیہ کا موقع ہے کہ حق کی ذات کا اس ناجیز وقت میں محض سامنے آجائے تاہم متر مفید ہوایا نہیں۔

اب میں ملے کے پہلو کے متعلق معلویہ کے طرز عمل صلح حسن کا تصفیہ معلویہ کی روش سے

ہو چاہیے گا کہ اگر حق نے اس وقت صلح قبول کرنے کا تصفیہ کیا ہو تاہم اس میں موقع نہ رہتا اور وہ یہ ہے کہ معلویہ نے خود سے صلح کی پیش قدمی کی ہو چاہیے کہ اس امر کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ معلویہ تمام شرائط کو قبول کر لیتا ہے بلکہ ایک سالہ کانڈ پر مہر اور دستخط کر کے بیٹھا ہے کہ اپنے شرائط تحریر کر دو۔ کسی کے نزدیک اس کی اس وجہ آگاہی اور مجلس جہد کے عدم دعا کا فیصلہ شریعت ہو سکتی ہے ایسا ہی ہو لیکن مجلس اور آوازی میں محض عدم دعا کا حصر منحصر نہیں ہو سکتا تھا بلکہ اس میں خوف کا جز بھی شامل تھا۔ اس لیے کہ اگر ایسا نہ ہوتا اور معلویہ کو تمام تر اپنی حق اور کامیابی کی امید بھٹی تو اس کی کوئی ایسی مجلس اس کے لیے غیر ضروری اور غیر مفید بے تمیزی ہوتی جس میں وہ خواہ مخواہ عدم دعا کا شبہ پیدا کر کے فلاح مافی کی طرف سے انتہا میں کا خوف کرتا۔ دوسرے لفظوں میں کون ایسا ہوگا کہ فتح کی بے خوف حالت میں چاہے اس کے کہ اپنی مرضی اور خواہشات قبول کرانے لے اپنے کو ایسے شرائط میں پھنسانے جس کی طرف سے کوئی بد عملی عرف نامقبولیت کی حرکت ہو بلکہ اس کا مل کچھ تو معلویہ کے اٹلے مدبر کے غیر قائم عقین یا فکری طبیعت میں ہے اور کچھ حق یعنی فوریہ و رجحان اور مل کے مقابل شخصیت میں ہے جس کی طرف سے معلویہ کو ہمیشہ خوف ہو سکتا تھا کہ مہلک الوکول کی غلطی اور لہر دانی پر اعتماد اور عقین غالب آجائے اور پھر وہ ایک مرکز پر جمع ہو کر ہماری طرف الہ تیروں سے نہ دکھائی دے جن طرح صفین کے میدانوں میں دکھائی دیتے تھے۔ دنیا بھر کے شرائط منظور اگر ہم صاحب اختیار قبول کر لیں ہائیں، یا شرائط کیسے ہی کیوں نہ ہوں اس کے مقابل کم عدد دش ہیں کہ ہمارے خلاف یہاں کا کوئی موقع پیدا ہو جائے اور امید میں اتھو یا زوال کے آثار دکھائی دینے لگیں۔

ایسا ہی ہو کہ بنی امیہ حتمی اصول لادارت کا خواب دیکھتے ہوئے زمانہ گزرا تھا اور کوا کی اپنی کوششوں سے پڑ اس کے کہ باز آتے اور کوئی چارہ نہ تھا اور پھر اتفاقات کی موافقت سے یہ دن نصیب ہوا تاکہ اپنے بل کڑے ہو کر جنگ آرمیوں کے ساتھ آجائے لڑے بڑے حکومت کو اپنے طرف اکٹھا ہوا دیکھ کر تم کے بل گر رہے تھے اور ان کے ایسے طرز اور بندہ راہ کے لیے یہ قیاس کے باہر تھا کہ کوئی ایسا ہی ہو سکتا ہے جو غیر تکبیر بھولے حکومت والہ کر دے سکتا ہے اور انہی خیالات سے امیر شام حق سے کہتا ہے کہ: "ابتداءً آؤ ہمیں سے کسی نے ایسی شجاعت نہیں کی کہ یہ جود صلاحیت خلف ان بنی ہاشم کے کمال سے حیثیت خیر نہیں ہے۔" غلطی ہوگی اگر اس موقع پر یہ کہا جائے کہ امیر شام یہ فقرات کہہ رہا تھا یا غلیہ رسول سے کہہ رہا تھا۔ نہیں، بلکہ بنی امیہ کی پستی طبیعت بنی ہاشم کے علو کے نفس کے سامنے فخریہ غلطی ہوگی اگر معلویہ کے ان فقرات کو متغزل طرز کہا جائے۔ اس لیے کہ معلویہ کے لیے افکار کا کوئی موقع نہیں تھا بلکہ افکار تو ایثار اور تقویٰ میں ہے۔ معلویہ بھی خود اسے "اسلان" کہتا ہے۔ اب ہم ان حالتوں کی طرف آتے ہیں جس میں کوئی غیر شجاع دشمن اپنے شجاع دشمن کو قہر میں دیکھ کر ہزمت نمایاں کرتا ہے۔ یا جسے اختیار انتہا کے مورہم سے یہ عرض

ہو جاتا ہے کہ سوتے جاگتے اپنی حکومت مواتا رہے اور شریف دشمن کی شکستہ عظمت اس کی المیہ دولت ہو۔
حقیت کے بعد مبشر
 مشکل سے ابھی عہد نامہ کی پہلی شکست ہوئی تھی کہ مشہور ملی کے بیٹے نے اپنی لپے چلے شرارت سے مجبور ہو کر ابن ابی عقیل کو صلیبیوں کی وہ حق سے برسرِ منہ رکھوائے کہ: ”مجھے رنجیت خلافت نہیں ہے۔“ اس سے کچھ تو لوگ اپنی امیدوں کو حق کی طرف توڑ دیں گے اور کچھ اس غرض سے کہ چونکہ حق بہت صاحب حیا ہیں اقرار میں لکھت ہو یا اعلان کر سنا موجب قفس ہو گا اور اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ لوگوں کی نگاہ میں حق کی منزلت، خفیت ہو جائے گی۔ پھر بھی یہی اس سے دیکھ رہا تھا کہ لوگوں کی خاص کوجہ کو افسانہ و خول کے ہاتھ میں دیر ہے۔ لیکن اس کلاس سے کہ شاید موقع کی مہمیت اور محتاطی مروت کی کمزوریوں سے حق میرے خواہش کے موافق ہی کہیں ہی سٹے کیا کہ حق کچھ کہیں۔ لیکن واقعت اپنی حیرت بغیر راز رفتار اس لیے اختیار کر رہے تھے کہ انہی رسول خلافت کے تحت سے اس لیے ایک ہاتھ اٹارے کہ دوسرا ہاتھ مبشر پر ہمارے جو اس کا اصل مرکز حکومت ہو، موقع کی محدودیت کے باوجود رسول کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ ان کا جانشین اس وقت ان کے مبشر جاتا جس وقت اختیار ان کے قبضہ میں نہ ہوتا لیکن کسی نے اندازہ کیا تھا کہ یہ ائمہ دنیا کے تمام اختیار اور تحت مبشر جابٹے ان کے لیے صدر بن کر تھے وہ اپنے لیے تحت پر نہیں جاتے تھے ان کا اصل شعبہ انسانی دل اور داغ تھا لیکن اس لیے تحت پر گئے کہ وہ یہ بھی دکھا دیں کہ حقوق بشری کی اس کمر سے بدل کے ساتھ حفاظت پاس ہے۔ لوگ پیدا ہونے جو اس سے بغاوت کرتے۔ یہاں تک کہ دیہاتی شخص ان کے قابل نہ رہ جاتا جس طرح کہ لوگ بدل گئے تھے اس کی مثال پانچ گے جہاں امام رابع بن نمیر کی صلاح کو رد کرتے گئے۔ یا ابوسلمہ کا خلافت پیش کش کرنے والا خط بغیر ملاحظہ میں بلا دیا جائے گا مدینہ کے ایسا موقع ہی نہ آنے دیا تھا آج اس لیے موقع دیا گیا ہے کہ وہ ”لوگوں کو اپنے احسان سے واقف کریں۔“ معاویہ بنی امیہ دہشت گرد ہوا تھا اور حصول اختیار کے بعد ایک سیاسی فتح کے بخلاف میں تھا لیکن گزشتہ کی طرح اس موقع نے بھی ظاہر کر دیا کہ رسول کے بعد کسی مدبر نے ائمہ میں سے کسی پر سیاسی فتح حاصل نہیں کی، جہاں تک ان کی تنہا قیادت کو تعلق تھا۔ مبشر یا احسان سے کوئی بحث نہیں ہے۔

گئے حق مبشر بہشتی لوگوں کو مخاطب کیا۔ واقعات اور ان کی چٹائیوں کے ذکر سے مخاطب کیا۔ لوگوں کا جو گزرے ہوئے زمانہ کی باتوں کا انکار کرتا اور کسی کی گردن کے ریشے اس قدر سخت تھے کہ بار احسان سے اپنے کو جھکا ہوا نہ دیکھتے۔ جس وقت رسول کا افسانہ کہہ رہا تھا کہ: ”تم لوگ جانتے ہو کہ خدا نے تمہیں نگرانی اور جہالت سے میرے مانا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بدولت آزاد کیا اور ذلت و خواری کے بعد تمہیں عزیز کیا اور قلت کے بعد تمہیں کثرت عطا کی۔“ کوئی انتہا نہ تھا لہجہ کے کوئی رفتار جو اس کے نہیں ہو سکتی کہ اقرار کرو کہ ایسا ہی ہے۔ شریعت اس مرکز سے کیا جس میں کسی کو مخالفت نہ ہو سکتی اور گویا موافق اور مخالفت چند لحوں کے لیے تھی کہ ایک نقطہ پر بغیر سوچے پہنچ جاتے۔ کوئی طبی رفتار جو اس کے غیر فطری ہوتا۔ لیکن اقرار کی اس ابتداء اور ان باتوں کے ذکر میں کیا یہ غم انگیز نظر تھا جسے امام کی غیرت نے لفظوں میں ظاہر کرنا پسند نہ کیا کہ: ”تم اس لیے آزاد ہوئے کہ میں گرفتار کرو اور ذلت و خواری سے عزیز ہو کر تم نے اپنے بلکہ کرنے والوں کی اولاد کے لیے ذلت و خواری مہیا کرنا مناسب سمجھا اور جب تمہاری حالت

قلت سے کثرت میں بدل گئی تو تم نے یہ روش اختیار کی کہ رسول کی اولاد کی اور بنی ہاشم کی کثرت کو قتل سے بدلنے کی کوشش کرتے رہو۔ یا تم اپنے قلمی، ظاہری اور اخلاقی ترقی کا سلسلہ دیکھ کر دے رہے ہو کہ ان قوتوں کو چارے خلاف صرف کر دو۔ (خانوشی بلکہ پر جانب سکوت جمع ہو ظاہری رہا) اس خطبہ: ”جانو کہ معاویہ نے مجھے ایک ایسے امر میں نزاع کی جو میرا حق تھا۔ اس کا نہ تھا۔“ اس کے ساتھ یہ فقرہ بھی ختم کر لو کہ معاویہ کی طرف مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ: ”تیری وجہ سے خدا اور خون ہوا۔“ اور اس وقت معاویہ کے موقع پر غور کرو۔ مدبرین، سپاہی، محدثین ٹھہرتے ہوئے غریبہ سلام کرنے والے خوشامدی۔ کون تھا جو نہ ہوگا۔ خصوصاً جب کہ مجمع صاحب اختیار کا مرکب کیا ہوا ہو لیکن نہ غریبے و نادان سے خطر رہا۔ سنائو اس وقت تک قائم رہا جب تک حق نے سلسلہ کلام جاری نہ کیا۔ کیا اس وقت ایسا ہوا ہوگا کہ علی و فاطمہ علیہ السلام کے حقوق کا دشمن سے دشمن یہ سن کر دل میں کہہ اٹھا ہو کہ: ”برا کیا۔“ بظاہر حق نے ہی کہا تھا بلکہ میرے خیال میں اختیار کی حق کہ ”حق“ اور ”نزع“ میں اپنا اور معاویہ کا نام لیتے۔ لیکن کیا حق کی تقریر کا یہ ایک گوشہ تباریخ پر تبصرہ نہ تھا اور کیا یہ سنا نہ تھا یعنی رسول کو رحلت کچھ ہوئے صرف تیس برس ہوئے تھے یہ زمانہ تو ایسا نہ تھا جس میں دشمنیں زمانہ میں دفن ہوا تھیں اور پہلے کے واقعات حاکم کی تازگی کے زیادہ فاصلے ہوتے، یا سہاں یہی اس درجہ غالب ہو تاکہ اشارہ کی ادنیٰ ٹھوکر سے کام نہ چلے نہ نہیں زمانہ کا چہرہ ایسا گہرا نہ تھا جس میں نگاہیں نہیں نہ سکتیں اور خیال آتا کہ یہ تہا معاویہ تو نہ تھا جسے حق کے نزاع میں اولیت کا امتیاز حاصل ہو!

مجھ نے اور زیادہ دینے والی غیر ظاہر نکات پر جس کی مسامتہ نے تقریر کو اور زیادہ صبر شکن بنادیا تھا تیسرا درجہ پر احسان کا تھا۔ فرماتے ہیں: ”میں نے صلاح امت پر غور کیا اور فقہ کو منقطع کیا۔“ اس کی شرح اس طرح کی جا سکتی ہے کہ گویا فار ہے تھے کہ جس وقت کوئی اس اوجیز میں مبتلا تھا کہ کس طرح میرا حق ہے اپنے حق کے لیے مجھ سے نزاع کرے، میں سوچ رہا تھا کہ صلاح امت اس میں ہے کہ میں اپنے حق پر قائم رہوں یا اپنے حق کو منقطع کر دوں۔ اور اگر کسی وقت خدا کہ خلافت قبول کرنا تو اب وقت ہے کہ اسے ترک کر دوں۔ اسد بھی ممکن تھا کہ لوگوں کا کچھ ہی میلان کہیں نہ ہو لیکن ہم اپنے اختیار کے لیے کوشش کریں اور اگر ہمارے لوگ قتل ہوں اور حکومت ہو جب بھی ہمارا کوئی ذاتی نقصان نہیں ہے اور اگر حق ہو تو یہ عین غماش کے موافق ہوگا لیکن ہم سے فتنہ کی پرورش ممکن نہیں ہے۔ اور ہم اپنے حق اور حوصلوں کی قربانی سے فقہ کو منقطع کرتے ہیں۔ صلاح امت ہمارے لیے مقدم ہے۔ ہم دنیاوی اختیار کے مالک نہیں ہوتے۔

آگے بڑھتے ہیں۔ اپنے ساتھ لوگوں کے نزاعی اور دفاعی عہد کا ذکر کر کے لوگوں کے متعلق کچھ اور نہیں فرماتے۔ اگرچہ ایسے ذلیل النفس لوگ جو ایسے اطاعت پر آمادہ نہ ہوتے تھے جو خود ان کے لیے مفید ہوتی اور حکومت کے امور اس میں ہندرجہ اولیٰ ان کا حق قائم رکھتی اور وہ اس پر آمادہ ہو گئے تھے کہ ہم بنی امیہ کے دست نگر ہو کے رہیں۔ اس قابل نہ تھے کہ ان کا کوئی وقار قائم رکھنے کے لیے اہتمام کیا جاتا لیکن اس معاملہ میں خانوشی کا لحاظ لوگوں ہی تک محدود نہ تھا بلکہ علاوہ اس امر کے کہ ان کے امام کچھ دن کچھ گئے ہیں مصیبت کی نہایت کامل دور بینی اس میں تھی کہ دشمن کے مجمع میں اپنی نام نہاد جماعت کی تفریق اور پاشانی خیال کی جو ایک زبان پر نہ آنے دی۔ جس سے کچھ تو خود اپنی جماعت سوچے اور اس میں اس شان سے پسیدگی کا پیدہ ہو اور قوی تر مفید امر یہ تھا کہ ہم اپنی کمزوری ظاہر کر کے دشمن کے سامنے اپنی زبان

سے اقرار نہ کریں جس سے دشمن کی جہاد زیادہ پہلے مکمل نہ ہو جائے اور اب تک جتنا مجرم بنا ہوا ہے اور جس قدر بھی اسے نکار سے مکمل پڑ جائے کافور ہے جاتا رہے۔ ضرورت تھی کہ یہ اثر نہ صرف اس وقت قائم رکھا جائے جس سے شرائط صلح طے ہو جائیں بلکہ جی الاصلاح جاری رہے۔ اور اگر کچھ وجہ ظاہر فرمانا مناسب سمجھتے ہیں تو صرف یہ قطع کن تصدیق کہ: ”میری رائے یہ قرار پائی ہے کہ معاویہ سے صلح کر لوں اور جو جنگ کہ داغ ہے اسے قطع کر دوں۔ اس لیے کہ لوگ غلی سے محفوظ رہیں۔“ اسے قوی تر الفاظ میں ظاہر کرتے ہیں اور گویا ایک اصول تسلیم یا قائم کرتے ہیں کہ: ”اس کے خون کی حفاظت اس سے بہتر ہے کہ ان کا خون پیلا جائے۔“ اور یہ سب ”تحدی صلح اور جاس کے علیہ۔“ اس تقریر میں یہ دیکھنے کی بات بھی ہے کہ امام غصنی اپنی جماعت کی یہودی کا ذکر نہیں کرتے بلکہ خون کی حفاظت اور صلح دہشت کی تعمیر فرماتے ہیں۔ ذرا سلسلہ دیکھو کبھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدینہ میں کہ نہایت ہی جنگ نہ آئے۔ کبھی جناب امیر قصبہ حنین کی ظہر انجوت اور اس کے لیے اپنے انکار کے باوجود کہتے ہیں کہ: ”شاید ہم بقیہ دین و شریعت پر متفق ہو جائیں۔“ آج حق تعالیٰ امارت کرتے ہیں، اس لیے کہ اس وقت صلح اور جاس کے امت اس میں ہے۔

معاویہ کا اضطرابِ تقریر کا اثر سمجھاتا ہے
امام ابنِ قریہ میں یہاں تک پہنچے تھے کہ عام مؤرخین کے موافق معاویہ نے حضرت کو بھالایا۔ قبول روحیہ الغضا ”ہذا عاقل“ ہو گیا۔ اور عمرو بن عاص کی طرف سے ذل میں گینہ پڑ گیا۔ لیکن مؤرخین میں سے کسی نے اس مفید امر کے متعلق کوئی معلومات یا وجہ ظاہر نہ کی کہ سامعین پر کیا اثر پڑا۔ اس کے گھنے کے ذرائع مقصود ہیں، یزاس کے کہ معاویہ کی سب سے مٹی اور ابنِ عاص کی غیبت سے بھا جانے کہ کچھ اور کہنا اس کے لیے مفید نہ تھا۔ یا ان تقریروں سے بھا جانے جو ابنِ عاص اور معاویہ کے کیم اور دھمکیوں سے کام لیتا تھا۔ اور چونکہ اپنی از خود رفتہ امید میں اس درجہ ناکامی ہوئی جس درجہ کامیابی کی امید نہ کی جا سکتی تھی۔ مقلد نے قادی سے کھڑے ہو کر اپنے اختیارات کی تعلیم کرنا کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔ خصوصاً وہ ایک زمانہ کی چہرے کے یہ آج اپنے کو تنہا صاحبِ حکومت دیکھتا ہے۔

عمرو بن عاص کی تقریر
کڑا جو ابنِ عاص اور حنین کے متعلق اپنی کارروائیاں بیان کیں اور جناب امیر کا فقرہ حق کے جواب کے لیے تجویز کیا کہ: ”حق اپنے مرکز میں قائم ہوا۔“ اور حکومت کے مفاد ان غلام کی طبعاً بزرگانہ نصیحت بھی کر دی کہ: ”تم کو گزشتہ ہفتہ پانچ ماہی اور عصیان کا موافقت اور اطاعت سے متارک کرنا چاہیے۔“

معاویہ کی تقریر
آیا معاویہ اور اس نے ابنِ عاص کا تعاقب کیا۔ مخصوص بات یہ بھی کہ: ”ہماری دعوت عزیز ہوئی۔“ دعوت کے معنی اس وقت بھی اگر بلاؤ و قور نہ تھے تو اس میں کوئی شبہ نہیں۔ لیکن نہ یہاں معاویہ اپنے دستِ رخاں کی تعریف کر رہا تھا اور نہ اپنی دستِ رخاں کی تعریف کو چھپا رہا تھا بلکہ حنیہ آسمانوں میں چھائی ہوئی دھول جھونک رہا تھا۔ وہ وقت پار رہا تھا کہ اپنی اور اپنی خاندانی کارروائیوں کو ”دعوت“ اور آج کے موقع کے لحاظ سے اسے ”عزیز“ کہے۔ یہ اس کی اطمینان کی سانس تھی۔ وہ کسی قلِ حاکم کو بھی قیام امن اور تہذیب و شائستگی کا نام حوالہ کر سکتا تھا یا کسی انتہائی تشدد کو احسان سے موسوم کر سکتا تھا۔ بلکہ یہ بھی کر سکتا تھا کہ ظلم پہنچنے

والے اسے احسان کا داتا درم و کرم کا پکا اور انسانیہ کا مجسمہ کہتے ہیں تو صرف امتیازی ہوا کہ جبکہ سب سے پہلے لیکن قبول حق کے کوئی دعوہوں کا علم ہی کیا۔

لیکن ابھی اس سے بھی زیادہ کچھ کہنا تھا اور وہ یہ تھا کہ: ”میں نے مذہب معاویہ کا غیر مدبرانہ فقرہ جو شرطیں کی ہیں اس کا سرا میرے ہاتھ میں ہے چاہوں وفا کروں خواہ نہ کروں۔ میں اس سے کوئی مطلب نہیں۔ تم کو اطاعت سے کام رکھنا چاہیے۔“ اس فقرہ کا اثر اس سے کہنا ہے کہ یہ حق کی تقریر اور اس کے اثر کے بعد تھا۔ مشکل سے میری دانست میں مذہب معاویہ نے بھی ایسا غیر مدبرانہ فقرہ کہا ہوگا۔ اس لیے کہ اگر وہ شرط کی خلاف ورزی ہی پر آمادہ تھا تو اسے بغیر کچھ کے بھی اقتدار حاصل تھا لیکن حق اور باطل روشنی کس طرح کھ نہیں آتی۔ اس سے معاویہ نے اپنا اقتدار کمزور کیا اور مشکل سے کوئی عہد نامہ اس قدر قلیل الحیاض ہوا۔ معاویہ کی اس گفتگو کے معنی یہ تھے کہ اس عہد کے دوسرے فریق پر وہ حق ہوں حسین ہوں ان کے دوسروں پر وہ تمام لوگ جو خلافت اسلامی میں تھے اور جن کے حقوق کے بارہ میں عہد کیا گیا تھا اب اپنے کسی طرز عمل میں کسی عہد کے پابند نہ تھے۔ اگر انھیں ایسا کرنے کی قوت تھی۔

معاویہ کی صلح کش تقریر کے بعد بھی حسن کے لیے کیا مناسب تھا۔ تاہم اپنی حالت کے اعتبار سے حق اور

ان کی جماعت کے لیے یہی مناسب تھا کہ وہ خاموشی اختیار کرتے۔ اس لیے کہ معاویہ کی تقریر میں یہی فقرہ نہ تھا کہ: ”چاہے نہ کروں“ بلکہ ”چاہے کروں“ بھی تھا اور یہ ”چاہے کروں“ حسن اور ان کی جماعت کے لیے مفید تھا اور اسی نتیجہ کے پیدا کرنے کے لیے انھیں اپنی روش اختیار کرنی تھی۔ اسے مستبہ بن غبہ کے سوا کسی اور بھی حسین کی لڑائی سے ظاہر کر دیا۔ گفتگو کے بعد درمیانی وقفہ نہ لے کر ابھی اسی اندیز خیز مالت پیدا کی تھی کہ حق اپنے تصفیہ پر قائم نہ رہتے۔

ان تمام باتوں میں جو اس وقت تک توہین یا تحقیر کے لیے کی گئی ہوں، وہ صورت ہی تھی جو اجلیج سے قتل کی تھی ہے۔ جو بد مصیبت معاویہ نہ تھا بلکہ اجرائے حکومت نے اختراع کی تھی۔ تاہم ان کی فہرست پر نگاہ ڈالنا صورت معاملہ کے سمجھنے کے لیے کافی ہوگا۔ چونکہ ان لوگوں کی دانست میں معاویہ کی اطلاع اور شرکت بغیر کچھ کرنا مناسب نہ تھا لہذا اس سے کہا گیا کہ: ”حق نے اپنے باپ کی سیرت کو زندہ کیا ہے۔ لوگ ان کے پیچھے ادب و اطاعت سے چلتے ہیں اور ان کی تصدیق کرتے ہیں، اور یہ باتیں انھیں اس چیز کی طرف لے جائیں گی جو ان سب سے زیادہ بلند حد تو انھیں پہنچا جا اور ہم لوگ کہیں کہ تم دونوں اس مرحلہ پر پہنچنے سے قاصر ہو اور اس کی ذلت کریں۔“

وہ مجمع جس میں عمرو بن ماس، مغیرہ بن شعبہ، ولید اور قتیبہ بن النضیر ہوں اور جس میں حسین مظلوم جمع کی نوعیت کیوں عمر بن عثمان نے بھی شرکت پسند کی ہو وہ کوئی بات کریں جو معاویہ کے دکھانے والے

اور شرکت کے قابل ہو، اور وہ لولہ رشوق کے بھی فہم کی اذیت پر تھی نہ بعد عجب غیز ہوگا۔ اس مجمع کا عمل بہت سے عہد دن پر مشتمل تھا۔ کچھ تو یہ تمیز پارٹی تھی۔ کچھ حکومت کی خوشامد تھی کہ ہم سوتے جاگتے اس کے فوائد سے غافل نہیں ہیں۔ کچھ یہ قوم کی بے قوی یا عدم مرکزیت کا خود ساختہ کمیشن تھا۔ اس مجمع کے لیے یہ ہزد کی بات تھی کہ حق اپنے پدر بزرگوار

کی سیرت کو زندہ کرتے ہیں۔ قیاس نہیں کیا جاسکتا کہ: ”سیرت“ کا محض اخلاقی مفہوم مدبرین کے لیے زیادہ غور کی بات تھی۔ لیکن اوصیائے رسول کی سیرت کا وہ حصہ جو قوم گری کے بہترین عناصر کا سامعہ تھا مدبرین کے احتیاط کے قابل سمجھا گیا۔ انہیں کبھی معلوم ہو سکتا تھا کہ کوئی ان کے اختیار اور ثروت کے ذیل اطمینان یا محکمت نمائش سے مرعوب نہ ہوتا۔ انہیں گوشہ چشم عاریت بھی نہ دیتا۔ اور اگر دیکھتا تو بیز نفرت اور کسی چیز کا قہقہہ نہ ہوتا۔ ایک کے لیے اختیار اور ثروت دنیا کا خدا تھا تو دوسرے کے نزدیک شیطان کا بہترین آلہ تھا۔ اگر اس میں شریعتانہ اعتدال یا احتیاط کے ساتھ خدا کی قادر مطلقیت کا حس شامل نہ ہو، اس مجمع کے افراد اپنے کو صاحب اختیار دیکھ کر حضرت پہنچانے اور توہین کرنے میں کسی چیز کو مانع نہ دیکھتے تھے اور اس پر خوش تھے۔ لیکن ان کے لئے غضب ان کی اس بڑھتی ہوئی خوشی سے زیادہ مخلوقات کے بدلے کے لیے کوئی چیز نہیں دیکھتے تھے۔ اور جس وقت حضرت پہنچانے والے اپنے ایذا رسانی کی فہرست دیکھ کر جھلاتے تھے اور گویا کہتے تھے کہ: ”یہ لوگ اب بھی سیدھے نہیں جوتے؟“۔ یہ لوگ ایسی تسلیم و رضا کے اس ذہنیت کو برداشت کرتے تھے نہ انہیں ان کے ٹکڑوں کی طرف کھینچتا تھا، اور نہ کوئی مہربان شرارت انہیں اپنی جگہ سے ہٹا دیتا تھی۔ اس لیے کہ لالچ اور خوف کے تمام ثمرات سے ان کے خصال زیادہ دزنی تھے۔ یہ ان چیزوں کی طرف تو اس وقت لڑنے پھرتے جن وقت غور ہو جاتے اور جب مدبرین دیکھتے تھے کہ ہم اس قوم کے خصال کو اس کے مرکز سے ہٹا کر اپنی خواہش کے موافق نہیں لاسکے تو آخری ذرائع سے انہیں نیست و نابود کر دینے پر آمادہ ہوتے تھے۔ یہ قتل اور زہر کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے۔ اگرچہ انہیں بھی جو ان مانتوں کا نتیجہ ہے اپنے خوفناک اثر سے انہیں بدلنے نام سے زیادہ زندگی کے قابل نہیں رکھتا۔

کیا معنی ہیں حسن کی اس حالت کے کہ کبھی ظلم اظہار پر مجبور ہوتے اور غیرت پھر ہتھ روک دیتی ہے۔ اور نہ صرف اس قوم کی اس کی صلیبت تھی کہ کسی طرح حسن کا میلان جاری طرف نہیں ہے اور ہماری خوب سے متاثر نہیں ہیں اور وہ روش اختیار کی ہے جو ان کے محسن اسلام پر مدالی مقدار نے رحمت رسول کے بعد سے ایک زمانہ تک اختیار کی۔ بلکہ ان کے لیے اور زیادہ لیٹھنے کی بات یہ تھی کہ: ”لوگ ان کے پیچھے ادب و اطاعت سے پہلے ہیں اور ان کی تصدیق کرتے ہیں۔“ یعنی جتنے مضامین کا رد جاری ہے۔ بغیر اس کے کہ حکومت نے اپنی روش کا کوئی استلزام مطلق کیا ہو۔

یہ سوچنے کے بعد قیاس آسان ہے کہ ان کے دشمن وہ کسی زمانہ میں کیوں نہ ہوں جب دیکھتے تھے کہ حضرت پہنچانے کی کوششیں اس مفہوم میں بے کار گئیں کہ وہ ہمارے سامنے نہ صرف نہیں جھکے بلکہ اور زیادہ سیدھے ہو گئے اور لوگوں کی نگاہ میں اور زیادہ بلند و ماحصل کی تو انہیں یہ تسکین نہیں حاصل ہوتی تھی کہ ہم نے ایک بے ثروت اور بے اختیار کی گردن جھکادی، بلکہ بچ و تلب بڑھتا جاتا تھا۔

کیوں خوف تھا ظاہر ہے کہ سیرت کا زندہ کرنا، لوگوں کا ادب و اطاعت یا اس کے بعد تصدیق یہ سب تہید تھی اس دہم کی کہ: ”یہ باتیں انہیں اس چیز کی طرف لے جائیں گی جو ان سب سے زیادہ بلند ہے۔“ مشکل سے بچے کہنے کی ضرورت ہے کہ وہ ”چیز“ کیا تھی۔ کیا غم خانی امیہ کو اگر ائمہ میں تمام خویاں ہوتیں اور ساتھ ہی بنی امیہ کو قہقہہ بھی ہوتا کہ وہ کبھی خلیفہ ہونا پسند نہ کریں گے۔ ظاہر جس قدر باطن کا تجزیہ کیا جاسکتا ہے

جناح امیر کی خاموشی اور حسن کی مٹو ماند حالی، تپتی بنی امیہ کو یہ بکھا دینے کے لیے کافی ہوئی چاہیے تھی کہ ان نفوس قدسی کو خود کوئی خواہش حکومت نہیں سہہ لیکن کیا تجرہ بخاری یہ نہیں بتاتا کہ حکومت کے ساتھ رکھتے کا وہم ایک جزو ایکٹک ہے۔ یہ وہم کبھی سلطنت کو محفوظ رکھتا ہے اور کبھی یہ وہم نہ صرف دوسروں کو دبا دھرتا ہے بلکہ ذمہ داروں کا ظلم اکثر ایسی ناگوار حالتیں پیدا کرتا ہے جس کے مقابل اعتبار انتظار کہیں زیادہ نافع ہوتا ہے۔ میں مدبرین کے اختیار تیزی کو بخیر نہیں کر سکتا کہ کہاں وہ اعتبار اور کہاں وہم کا موقع دیکھیں گے۔ یہی تاریخ میں مجھے عام مانتا ہے کہ کوئی بحث ہے بلکہ مجھے تو یہ دکھانا ہے کہ یہ نفوس قدسی ایسے تمام تہافت کے انداز ہونے سے جلاتر تھے گو خود تجرہ بتا رہا تھا کہ امیر المومنین علی بن ابی طالب کی صلاح ابن الخطاب کے قاتلانہ یا انتحاری دور میں کہاں تک موجود تھی۔ یاد اور کالمف کے ویسے ہی مازک موقع پر ان کی نیک نیتانہ صلاحوں کا کیسا اثر تھا۔ یہ صلاحیں علی کے ایسے قدسی ذات سے نہیں لی جاسکتی تھیں جب تک ان کی حیرت خیز دیانت کا یقین نہ ہوتا۔

موتلف کے نزدیک صحیح قیاس بنی امیہ کا کوئی دلیل کہہ سکتا ہے کہ مدبر کے لیے یہ حفاظت لازمی تھی کہ گواہی رسول کو اس کی رغبت نہ تھی کہ منصب خلافت کے حصول کے لیے خود سے کوئی حریج کوشش کرتے لیکن لوگوں کی خواہش انھیں بخیر کہہ سکتی تھی۔ میری تئیم اس قیاس کو پیچھتا ہوں۔ اور بنی امیہ کو اس خیال کی ذلت میں مجبور دیتا ہوں کہ وہ لوگوں کو ان کی ظہری خواہش سے روک کر اپنے کو مسلط کرنا چاہتے تھے۔ ہالینہ اختیار اطاعت ظلم کے لیے قبل طوع و اذعہ مستعد ہوجاتے تھے، بلکہ اس کے قبل کہ کسی ایسی فرض یا اثر کا شائبہ پایا جائے، یا اس کا قرینہ ہو۔ اور تاریخ کے لیے عبرت ہے کہ یہ احتیاط بھی بنی امیہ کو سیاسی یا انتظامی حیثیت سے زندہ ہلا دینا نہ بنا سکے۔ بنی امیہ اپنی ظالمانہ روش کے ظہری اقتضا میں زندہ ہلا دیتے تھے۔

بلانے گئے حسن اور اس سے زیادہ عبرت ناک سلامتی اور بے غنی کا اطمینان دلانا تھا اور یہ جانتے ہوئے پادری تھی کہ یہ کہہ سکتی کہ بلانے سے ہماری غرضی ہی یہ ہے کہ ”آپ اور آپ کے باپ کے بارہ میں بے ادبی کر لیا۔“ اور اپنے اعتبار جرات کی وجہ بھی بتا دی کہ آپ ”اتنی طاقت نہیں رکھتے کہ ہم پر عتاب کر سکیں اور نہ اس قدر انتقام صحت رکھتے ہیں کہ ہماری تکذیب کر سکیں۔“ یقین کو اپنی چیز سے شرم آتی ہے کہ اس حد تک کوئی ایسا خیالی سانسکے کہ ایک وقت تھا جس میں لوگ اکل رسالت پر اس لیے پیش پیش تھے کہ ان کی ایسی تامل کی جانب سے کہ کوئی غم نہ گاتے رہیں۔ اور توین وہ لوگ کری جن کے واقعات اور نام و نسب بیحد راز میں نہیں ہیں۔

مصلحت کہاں ختم ہوتی لیکن اسی شرمناک کارروائی سے بھی دشمنوں کو تشکیں نہ تھی، کیونکہ وہ دیکھتے تھے کہ ابی ذات فنا نہیں ہوتی۔ اور اس لیے صاف تھی کہ فرید اللہ بن حطار کا

ہم حسن و ہم خلق و ہم علم و ہم لطیف و ہم جود و ہم علم کبھی موصل جلتا ہے اور تین تین بار زہر دیا جاتا ہے لیکن نہ ہلاکت ثابت نہیں ہوتا۔ پریشان اور بخیر جو کرنا کے مدینہ آتے ہیں کہ یہاں زہر آلود رطب کھلایا جائے۔ بیمار اور چھر پریشان جو کر تبدیل آب و ہوا کے لیے موصل جلتے ہیں اس لیے کہ پاؤں میں حصا کا زہر آلود لپٹا چھو دیا جائے۔ آخری مرتبہ مدینہ آتے ہیں اس لیے کہ اس مرتبہ ایسے زہر کو نوش فرمائیں جو ہلاک کرنے میں کبھی خلا نہیں کرتا۔ اور احتیاط یہ ہے کہ اگر

ابن خالد غیر مسلم کے ہاتھ قتل کر دیا جاتا ہے اس لیے کہ شیعہ مسلمان کو مسلمان کے زہر دینے میں تردد ہو اور راز قاش ہو جائے تو رومی ایسویہ کی معرفت فاسہ رسول کو جام زہر پلانے کی راز و نیاز نہ لگے۔ شروع کی جاتی ہے۔ اور اگر باپ سے یہ کام لے سکتا ہے کہ شکست کو فتح سے بدل دینے میں مدد دے جس سے حکومت پر قائم ہو جائے تو بیٹی سے یہ کام انجام دلا دیا جاتا ہے کہ لکھہ کی ایسے توہم کی گنجائش نہ رہے کہ ہم حکومت پر قائم نہ رہیں گے اور پھر مزید اہتمام یہ ہے کہ جہدہ بھی خطری کوئی جاتی ہے اس لیے کہ راز حلی الموحظ ظاہر نہ ہو۔

ان کا بستر احتضار گہوارہ امن تھا کرب لار نزہ کے بستر پر اس کے فاسہ کو دیکھو جو ناقصین کے نام کو بتا دیتا اس خیال سے گوارا نہیں فرماتا کہ لوگ نہیں گے کہ

رسول نے اپنے اصحاب کو قتل کرنا شروع کیا۔ اس کے فرزند کو دیکھو جو ضعیف کرتا ہے کہ دیکھو تم مسلمانوں کے خون میں آلودہ نہ ہونا۔ کروٹیں بدلتا جاتا ہے اور اپنے چھوٹے بھائی سے جواب میں کہہ رہا ہے کہ اسے حسین میرے بزرگ غلام نہ تھے، دیکھو میرے لیے ایک پلا خون نہ کرے۔

تینوں خیالات کی اہمیت اور حسن کا ہوش اس محظوظ امن اور انسانیت کی یہ آخری وصیت ہے۔ معتد کہ مدور دونوں وصیتوں کے موقع اور

اہمیت کے درجہ کے لحاظ سے صداقت پری تھی۔ ہر ایک کو اپنے آخری وقت رخ فرما اور قیام امن کی وصیت ضروری تھی۔ لیکن حضرت امام حسن علیہ السلام کا نام نہ بتلایا اس لیے بے اشار شمس لار دور بینی کا ثبوت ہے جس کے مقابلہ میں ان کے چار بزرگوار اور جہد ملی مقدر کے اور کوئی مثال نہیں ملتی جاسکتی۔ حضرت کو یہ معلوم تھا کہ جہدہ ہفت اشعث نے ہمیں زہر دیا۔ حضرت کا یہ قیاس فرمایا کہ جہدہ کی یہ حرکت اپنی تجویز نہیں ہے، بلکہ اس کی صلاح ہے جس کے خیال میں مجھے زہر دیا جاتا ہے۔ کوئی عجب غیظ راف نہیں ہے۔ اس کے بعد یہ سوچنا کہ مجھے جو صل میں کس کی تحریک سے زہر دیا گیا جو مراسلت (بقول روئے الشہدا) حضرت کے ہاتھ لگی، کوئی بڑے غور کی چیز نہ تھی۔ حضرت کو یہ معلوم تھا کہ مدینہ میں یزید مروان بن حکم کے اور کسی کو ابن ابی سفیان کی بیٹی کا فر نہیں ہو سکتا۔ یہ سلسلہ اور اس کی قوت ایک طرف تھی اور دوسری طرف حسین اور ان کے چہرہ تھا۔ اس وقت اگر جہدہ کا نام بتایا جاتا اور یہ سلسلہ عام طور سے ظاہر ہو جاتا تو محمد بن اشعث اور اس کے اہل قبیلہ، حاکم مدینہ بنی امیہ اور سب سے زیادہ معاویہ جعفر کے لیے تیار ہو جاتا۔ فاسہ رسول کے انتقام لینے کا جوش پیدا ہوتا، یا نہ ہو تا لیکن یہ سب سے زیادہ واضح تھا کہ اس وقت ہم نام بتا کر اپنی اس چھوٹی سے رازح الامتلا جہد کو قتل کرانے کے حرکت ہو جائیں گے جسے ہم نے صلح کر کے چلایا۔

توریت کتاب پیدائش کے ۲۳۔۲۵۔۳۵۔۳۹ اور باب کے مطالعہ سے معلوم ہو گا کہ ابراہیم اور آل ابراہیم کو اپنے خاندانی معروہ میں دفن ہونے کا خاص لحاظ تھا۔ تقریباً یہ قیاس کرنا آسان ہے کہ سرزمین عرب جو دیگر بنی اسرائیل کے عروج و زوال سے زیادہ متاثر نہ ہوتی تھی لار جہاں ابراہیم اسماعیل لار ہاجرہ کے عیالیت کی حفاظت کی گئی تھی لار جہاں ان کی اولاد اپنے اولین رسالت و عیالیت پر زیادہ قائم تھی اسے ابراہیم اور آل ابراہیم کے دفن کا یہ پسندیدہ طرز فراموش نہیں ہو سکتا تھا۔ اب مجھے حسن کی وصیت کا یہ کلزا لکھنا ہے کہ: ”اگر میں شہید ہو جاؤں تو خانہ رسول میں دفن کرنا“۔

اور اگرچہ صوفیوں کو بھلائی کے لئے کی ضرورت تھی اور انہوں نے ”قدر کیا تھا“ لیکن پھر حضرت نے یہ ایسا کہہ رہے تھے کہ: ”تم نہیں جانتے کہ یہ ایک عظیم میر ہے۔ اگر ایسا ہی ہوتا تو کیوں نہ حضرت کاظمؑ اپنے پدر عالیٰ مقدار کے پہلو میں دفن ہوئے۔ غلام رسولؑ بنی ہاشم کے قبضہ میں نہ تھا۔ اور دفن کا حکم وہی سے لگایا تھا کہ خیال مانع نہ تھا بلکہ جیسا جگہ سے زندہ کے ایک قادیانی رسالہ خلافت راشدہ اور خود بخود اور فضل بن حسن کے ایک مکالمہ سے ظاہر ہے (دیکھو تہذیب المتین) کہ جب محض دفن کر دیا جاتا افضلیت کا ایک بڑا حوالہ دیا جاسکتا تھا تو ہماری تاریخ کے زندہ میں کیا کچھ ممکن نہ تھا۔ جبکہ خود ماضی کا اپنے تمام ماضی کے ذخیرہ کے موجود تھیں اور جس وقت حکومت ہر طرح کی کارروائیاں اکیں رسولؑ یا ولادہ موثیٰ اور شجیت حضرت بلکہ رسولؑ سے ان کی بلکہ تلقینی ظاہر کرنے کے لیے اختیار کرتی تھی۔

نواسہ رسولؑ کا جنازہ
اب علم خیال میں ایک مظلوم کے جنازہ کے ساتھ ساتھ رسولؑ کے حرم و مظلومیت کا چلو جو مظلوم رسولؑ کا نواسہ تھا۔ تم کیوں چاہتے ہو کہ اس جنازہ کے ساتھ دفن کے لیے ہسٹ آدی ہوتے جب کہ رسولؑ علیؑ اور کاظمؑ زہرا کے دفن کی تاریخ بھی جانتے۔ یا اس کے کہ جس قدر بنی ہاشم کی تعداد بڑھ گئی ہو یا جس قدر دوست اس قدر بے خوف ہو گئے ہوں کہ انہیں اپنا پیچھونا اور اس کے نتائج سمجھنا زیادہ گوارا ہو بہ نسبت اس کے کہ اس کا رسولؑ کے آخری فرض میں شریک نہ ہوں، اس مقدس بلوہر اٹھانے والوں کے لیے افریقہ کے علاوہ ان کی افسردہ صورتیں صاف اس فکر اور خوف کو ظاہر کر رہی ہیں گی جن کا انہیں سب سامنا تھا۔ جب کہ سب سامنے کے ایک فرقے سے زیادہ خلی ہو گیا اور جس کے محض وجود نے ظلم کی انتہا کو رک رکھا تھا۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ جنازہ نے پہلے خاتمہ رسولؑ کی نزالت کی یا پہلے مسیحؑ کے گروہ سے طاقت ہوئی۔ ہر شخص کو اختیار ہے اپنے تعینے کا کہ کبھی لوٹ کا ہوا اور آج پھر سوار ہو سکتا تھا یا نہیں اور بعد ہنگو ہو سکتی تھی یا نہیں۔ لیکن اس سے کبھی کو انکار ممکن نہیں کہ مولیٰ بن حکم کو خاتمہ رسولؑ کے متعلق کسی کوشش تعینے اور ارادہ کا حق نہیں ہو سکتا تھا۔ بنی امیہ کی سرگرمی مردان موجودگی بلکہ اغوا تو ظاہر ترین بات ہے۔ اس وقت بنی ہاشم کے خلی غیظ کا قیاس آسان ہے۔ اور اگر یہ رویہ نہ گئے ہوتے تو دفن کے لیے کبھی شہیدوں کی قبریں مد میں زیادہ ہوجاتیں۔ لیکن غالباً بنی امیہ ایک بے کار ضد پر زیادہ حیرت اور ثابت قدم کی تعمیر نہ دیتے سکتے۔ بنی ہاشم نے تعینے کیا کہ اگر کبھی تلوار چھیننے کا وقت ہے تو آج ہے لیکن ذمہ دار کے حسن کا اصل مرثیہ

کلان میں جنازہ ہے صدا آدی تھی کہ: ”میرے لیے ایک چلو خان نہ گرسے۔“ حسنؑ نے خون کی سہ کی تھی۔ اس وقت امن قائم نہ تھے کا ذمہ دار خان کے گوشہ پی کر بنی ہاشم سے کچھ نہ ملتا تھا: ”میرے بھائی کی وصیت کو مانع نہ کرو۔ اور ان کا جنازہ قیام کی طرف پھیر لے چلو۔“ اس وقت حسنؑ کی مظلومیت کا اظہار میں حسینؑ کے صبر اور حکم کا گروہ خدا سے زیادہ درد مند کیونچہ نہیں کہا جاسکتا تھا۔ حسینؑ نے نہ تیروں کے چلنے کو جنازہ کی آرائش کا کوئی جزو قرار دیا تھا اور نہ سفید کفن پر سرخ و دھبہ ڈالنا مسلمانوں کا اصول ہے۔ قیام کی طرف واپسی کے وقت تیروں کے پر مندوق کو دھانکے تھے۔ اور شیر کاظمؑ سے بنے ہوئے (اس وقت کے سرد خون کے) ہلکے گلابی دھبے کفن پر پڑے تھے۔ چاکا ابھر رہا تھا کہ: ”یہ ظلم ہے کہ ابن رسولؑ (رسولؑ کے پہلو میں) دفن نہ کیا جائے۔“ آج انہیں بھی یاد نہ تھا کہ حسنؑ کے ہاتھوں کی فہرست بناتے لیکن وہ ختمی ولادہ رسولؑ کو رحلت کے بعد بھی انہیں لوگوں کے خیال میں

رسول سے علیحدہ رکھنا تھا وہ دیکھنا چاہتے تھے کہ کوئی قبیح بین کوئی زینوا میں کوئی مشہد میں دفن ہو۔

عبرت خیر تکبیر امام کا طویل ہوا ایک غیر حق جو امیر شام کو دی جاتی اور وہ اس قدر وحشی ظاہر کرتا کہ برابر خبر بھیجنے کی تاکید کرتا۔ اسے اور کیا سننے کی بے چینی تھی جو اس کے کہ زمانہ حق سے

خالی ہو گیا خبر سنی۔ تکبیر کہ اصطلاح بلکہ حق اصطلاح اس طرح کہ اہل شام سمجھتے اور فسادات بلکہ تکبیر کی غرضی اور مفہوم سے اعادہ کرتے۔ فسادات نے تکبیر سے پہلے سکھائی تھی کہ فسادات کو زہر دے کہ ظہر سے تکبیر کی جائے۔ اور اب کوئی سبب پوچھتا اور وہ اس لیے ظہر سے کہتا کہ "مرگئے حسن" اس سے اس کا "دل غصہ ہو گیا" اور پھر اس کے بعد ابھی اس طویل و مشابہ قسم اور طرز کی بھونک باتی تھی کہ "حسن سے تعجب ہے کہ ملکیت گھوٹ عہد اور پانی پیا اور مر گئے؟" فضل بن عباس نے مرثیہ میں معاویہ کی طبیعت کا عجیب نقشہ کھینچا ہے۔

جب معاویہ حسن کی حیات ہی میں عبد اللہ بن جعفر میں صہبن کی تعلیم کے طعنے سے خیال و محبت پیدا کرنا چاہتا تھا جو ظلم الی اعتکاف پر تھی جو بلا کر یہ دہم میں آجائیں تو کم سے کم بنی ہاشم کی سرداری ظہر و آدمیوں میں تقسیم ہو جانے تو پھر حق کے بعد کیوں عدیہ پر فریب خیز گئی ابن عباس پر صرف کرتا کہ: "اب تو تم سوار قوم قرار پانے لگے۔" غالباً یہ جو حق کوشش تھی جس میں حکومت بنی ہاشم کے کسی فرد کو قوم کا سوار قبول کر کے کمالی طلاق کو پست کرنا چاہتی تھی۔ غیور اب تک نندہ تھا اور اسے اپنی ابتداء کی آخری کوشش میں بھی ناکامیابی دیکھنی تھی۔

کتے دو بارہ پڑے چڑا کیسے جالے لگے اگرچہ حضرت امام حسن کی حیات ہی میں جناب امیر پر سب دشمن کی جاتی تھی لیکن حق کی موجودگی ابھی اس سے

روکتی تھی کہ ایک ایک پرزہ جدا کیا جائے۔ یعنی ان کے صاحب اثر مؤیدین حقوق قتل کیے جائیں جو بنی امیہ کی اطاعت پر خوشی سے آمادہ نہیں تھے۔ جب زکوٰۃ نہ دیا جائے قبول نہ کرنے کے ہم معنی اور جناب امیر کی تاکید کا عارف اور اس لیے قتل کا مستوجب ہو سکتا تھا تو اس وقت تو ان لوگوں کو ہٹانا تھا جو ایک عہد کے رو سے دغاغف پاتے تھے۔ اور یہ دغاغف حکومت کے نزدیک ان پر بہتر مؤلفہ کیے جاسکتے تھے جو حمایت پر آمادہ ہوں۔ یہ عناصر تھے جنہیں معاویہ اپنے آزادانہ فلاح اختیار کی دوا میں مائل دیکھتا تھا۔ شاخص شاخص تھی شاخوں کے لٹکنے کا معنی نہ ہوتا۔ اگرچہ اپنی جگہ رکھی جاتی۔ دوست چہرہ نہ ہو سکتے تھے لیکن کسی جیٹ کا پیرا عداوت کا معاملہ اس لیے جرموں کی مسلسل کوشش کی گئی کہ کسی طرح فساد رسواں تمام ہو جائے۔ یہ سب برآں۔

نیا پرزہ بھی کافی تھ تھا کہ عروش لوگ کم کیے جاتے بلکہ جتنے دوست بھی پہلا یکے جاتے اس لیے زیادہ کے ملنے کی کوشش کی گئی۔ اس کی حیرانی اور انتظامی قابلیت کام لینے کی چیز تھی۔ جس طرح

اشعث بن قیس کی پہلا پیرا کلا گزاریاں اور اس کا انفرقیلہ جو اسے دور اول میں قربات کی قیمت سے خرید سکتا تھا اور آئندہ اسے خود ابن ابوسفیان لاکھوں روپیہ دے سکتا تھا۔ زیادہ کی طرف توجہ کی وجہ صحیحہ کی تاریخ تھی۔ امیر شام تو بہت کچھ کر سکتا تھا اگر موقع ملتا اس وقت تو صرف جانی ہی بنانا تھا۔ ان کوششوں کے دور ان میں معاویہ اللہ اور عبید اللہ بن زیاد کو بشر بن اسحاق نے گرفتار کر لیا۔ اور قتل کا قصد کیا۔ لیکن ابوبکر نے صلح کا دفعہ بلا دلا۔ مزید کوشش یہ کہ

معاویہ سے رہائی کا پروانہ لانے اور رہا کر دیا کبھی کسی ایسی غرض نے اس معاملہ سے زیادہ برا چلا نہیں دیا اور نہ کبھی احسان کا بدلہ بدرجہا زیادہ ناشکری سے دیا گیا۔ کون وہ کورنگ ابن ملک حرام تھا جس نے اہل رسالت کے نام شادی کا پر اصرار ذمہ لیا یا اسی ابن زیاد کے۔

اسی زمانہ میں متغیر بن شعبہ کو زیاد کا ایک احسان اتارنے کا موقع مل گیا اور اس نے اس مال پر قبضہ نہیں کیا جو عبدالرحمن بن ابوبکر کے پاس زیاد نے رکھ دیا تھا اور کہہ بھی دیا کہ: ”تھارے ہاتھ نے میرے ساتھ رہائی (شہادت) کی تھی لیکن تھارے چچا نے میرے ساتھ سلوک (غلیظہ کے اشارہ پر جرم ثابت نہ کرنے والی شہادت دی تھی) کیا تھا۔“ اور اس کے بعد جب متغیر سے ابن ابیہن نے زیاد کے ملالے کی وجہ بھی ظاہر کر دی کہ: ”ایمان نہ ہو کہ وہ اہل بیت میں سے کسی شخص کی بیعت کر لے اور لڑائی پھر از سر نو چڑھ جائے۔“ (مؤلف کے نزدیک امیر شام اس وقت غلیظہ اول کی زبان سے بول رہا تھا) اس لیے اسے ”شب کو نیند نہیں آتی تھی“۔ متغیر نے لانے کا وعدہ کیا اس سے زیادہ کبھی کوئی بھی نہ ہو سکتا تھا۔ زیاد سے کہا یہ کہ: ”اپنی فکر کرو، اس سے پیشتر کہ معاویہ کو تھاری پروانہ نہ ملتی رہے۔“ متغیر اس سے کہہ رہا تھا جو اوموی اور حضرت عمر کی گورنٹ کا سیکرٹری رہ چکا تھا۔ مزید اہتمام یہ تھا کہ وہ ”ایک لاکھ درہم پر مصالحت کے بعد چھوڑ دیا گیا تھا، بلکہ ”عزت و احرام“ ہوتا تھا اور ”ہاتھ پر مصالحت میں شریک“ کیا جاتا تھا۔ یاد دوسرے نظموں میں متغیر کے دربار کا شاعر دہلیا گیا تھا اور جناب امیر کے اس فقرہ کو بھلا دینے کے لیے تیار ہو رہا تھا کہ: ”ابوہنیاں میں خواستہ نفس اور ایک جہات تھی جس کی میراث تم کو نہ ملنی چاہیے۔“ معاویہ جو کچھ کر رہا تھا یہ رومیوں کی اس مصیبت کی شاگردی تھی جو وہ یہود کے ساتھ کرتے تھے۔ جب یہود کا کوئی فدا اپنی بے قوی میں اس درجہ ترستی کر جاتا تھا کہ اسے اپنی قوم کی خوب سے مغفرت ہو جاتی تھی۔

اس درمیان میں بشر بن ارطاة بصیرہ میں اور متغیر کو فہم میں ملتا اور اس کی علی کے مشتعل اپنی دل کے بجز اس غفلت رہا تھا۔ اور خود معاویہ نے عدی بن ماتہ سے اس لیے علی کی مصیبت پر مخکے شروع کیا کہ کوئی میدان نہ تھا جہاں عدی کی تلوار جو سپہ دہی پھر بھی عدی کی زبان تلوار سے زیادہ گہرا زخم لگانے کے قابل نہیں تھی۔ معاویہ ان کی تقریر سے ہم گئے تقریر لکھوالی ”عدی اور ملاطفت“ سے گفتگو شروع کی۔ ہم اس دھت کا قیاس نہیں کر سکتے جو یہ سن کر لاشی ہوئی ہوگی کہ ”بلاشبہ موت کا غرغره اور مات نزع کا گھرہ ہمارے لیے آسمان ہے بہ نسبت اس کے کہ ہم علی بن ابی طالب کے حق میں کوئی کلمہ ناطق نہیں“۔ حق ہے کہ کسی چیز کے نسبت غلوں محبت اور اعتقاد کی بہترین کوئی موشگرم علی کی محبت اس پہلوری سے زیادہ تھی۔

یہود اور سپردان علی ہو سکتا ہے کہ یہود کو اپنی تھانے قوی کے جدوجہد میں ان کے اقوام پر انکار کا موقع ہو لیکن یہود ان علی کے مقابلہ میں یہ ادعا کوئی ترجیحی حق قائم نہ کر سکے گا۔ انہیں اپنے لیے کہ یہود مدین کے بننے کے بعد بگڑے اور اس کے بعد انہیں اپنے زوال کے روکنے کی کوششیں آسان تھیں برخلاف یہود ان علی کے جو اس وقت سے بگڑی کہ ان کے بننے کا زمانہ قابل شمار نہ تھا۔

یہود اور سپردان علی میں سب سے پہلے اکر نے رعلت فرمائی اور اس وقت تک زیادہ ان ایسے زیادہ گورنر مقرر کیا گیا جس درجہ تک پہنچا تھا وہ معاویہ کے اس درجہ توجہ کے قابل تھا کہ اسے

بصرہ اور کوفہ کے دو مفید صوبے حوالہ کرتا ہے۔ امیر شام کی یہ عزتیں زیادہ کے اجمال کی قدر دانی اور مزید ایسی ہی کارروائیوں کے لیے ایک اشارہ تھا۔ اور خود اس کی آڑ کھینکتا تھا۔

شعبہ میں اس نے بڑے مہمال (مدی) کو اس لیے زیر حراست لے لیا کہ وہ عبداللہ بن علیہ طائی کو حاضر کریں۔ عبداللہ حجر کے رفیق تھے اور مجرب نہ صرف سہارا قیصر تھے بلکہ حضرت امام حسنؑ کے طرف سے فوجی مہمیں اور انتظام کے افسر تھے۔ اور مہمانیت کے محتاج تھے۔ مدی نے اس کی ذمہ داری نہیں لے لی کہ انہیں خوف تھا کہ عبداللہ قتل کر دیے جائیں گے۔ زیادہ نے کوئی اٹکار نہیں کیا۔ یہ ان کے قید کرنے کا ایک سبب ہو سکتا تھا۔ لیکن جب دیکھا کہ لوگوں میں ان کی مصیبت اور سردار بے ہوشی کی وجہ سے پراثر خوشی ہے تو انہیں ایک شرط سے رہا کر دیا۔ لیکن کیا سبب مصلحتی اور سردار بے ہوشی تھے؟ نہ تھے اور اس لیے ان کے ہاتھ پاؤں، گردن، نریمان، اور آنکھیں، ٹیلو، نیزے اور رسیوں کی خدا کی قسم، سولیاں، درخت اور قید خانے ان کی شہادت کے تہلکانی تھے۔

فوج کشی کا بے بنیاد الزام برہنہ ہو گیا۔ کوئی شخص علی کے کسی دوست کے متعلق کہتا کہ

اس کے گھر ”مجمع“ ہوتا ہے اور یہ لفظ اس قدر بھیانک صورت اختیار کرتا جو قتل کا حق دلا سکتا۔ اسی بنیاد پر قتل اور قتل کی حکمت عمود بنی۔ مقتول اور ایک روز جب زیاد کہہ رہا تھا جو کچھ بنی امیہ کا وظیفہ تھا تو حجر نے رد کیا۔ زیاد خاموش رہا۔ بصرہ گیا اور عمرو بن عریف کو کوفہ میں ڈھانسیا۔ ابن عریف جس نے اکثر ہزار آدمیوں کو بصرہ میں قتل کر ڈالا تھا۔ معظم ہوتا ہے کہ ایسے ہی حجر کے گرفتار کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔ زیاد پھر کوفہ آیا اور ایک دن اپنے صاحب شرط کو کچھ سپاہیوں کے ساتھ عمری گرفتاری کو سچا لیکن وارنٹ عدم تعمیل واپس آیا۔ اب زیاد نے ”اہل کوفہ کو ایک جا کر کے دھمکایا ڈرایا“۔ اور جب لوگوں نے بے لگتی کا اقرار کیا، جس کے سوا چارہ نہ تھا تو اب زیاد نے صاحب شرط میں ہمت کے کچھ اور قطرے پھانکے۔ لیکن ہمت کا صرف کہاں تھا جب کہ دوسری جانب مقابلہ کا سامان ہی نہ تھا۔ یہ تمام الزام برہنہ ہو گئے کہ مجمع ہوتا ہے اور لشکر کشی کا سامان ہے وغیرہ وغیرہ۔ جب صاحب شرط حجر کی تنہا تلوار سے زخمی ہو کر گرا، اور ابو العزندی نے حجر سے کہا کہ: ”تمہاری حمایت کو سوامیری تلوار کے اور کوئی تلوار نہیں ہے اور میری تلوار تم کو ان لوگوں سے نہ بچا سکے گی“۔ ظاہر ہے کہ ابو العز کا یہ کہنا یا عمرو بن اُمّی کا حجر کی حفاظت میں زخمی ہونا، جو کہ اس مسلحہ قانون کی بنا پر تھا کہ اہل قتل اپنے کسی فرد قتل کی حفاظت کرتے تھے۔ مگر اس وقت ان کا قیصر بھی حفاظت کے لیے مجمع نہ تھا۔ غالباً گرفتاری کے حکم کے لیے الہامی وقت مناسب تھا گیا ہے۔ عمرو بن شاد اور عمرو بن اُمّی شکیف قبائل میں پناہ لیتے رہے اور زیاد نے چند قبائل کو ان کی گرفتاری کے لیے غنموں کیلئے ایک قبیلہ کو دوسرے پر چڑھ دیا۔ پھر بھی یہ لوگ گرفتار نہ ہو سکے۔ لیکن جو کچھ قوت نہیں ہو سکتا، مگر یہ آسان ہو جاتا ہے۔ اگرچہ حجر کدہ کے رئیس تھے لیکن حکومت نے بھی کدہ میں ایک رئیس اپنا بنالیا تھا اور یہ کون تمناؤں مشورہ ہائیکے بیٹے کے۔ حجر نے اپنے کو محمد بن اشعث کے حوالہ کر دیا۔ بارہ سردار لہر قید کیے گئے۔ محمد بن شاد اور یہ کون تمناؤں مشورہ ہائیکے بیٹے کے۔ حجر نے اپنے کو محمد بن اشعث کے حوالہ کر دیا۔ بارہ کے فلسفہ تاریخ کے تجر کا نتیجہ ہے، یا اس کے مترجم کی میسوں صدی تک کی معلومات کا بھی کچھ حاشیہ ہے۔

کس دل کے لوگ علیؑ پر قربان ہونے کے شایان تھے

لیکن بغیر کسی اپنی کوشش کے
خدمہ کائن سے زیادہ کج بین

آجائے گا جب اس کے دو عصر پر نظر ڈالی جائے گی۔ اول یہ کہ گواہی دینے والے طلحہ مزین، ابن ابی مطیہ اور ابن ابی وقاص کے لڑکے تھے۔ اور ابو موسیٰ اور ابو ہریرہ کے نام سے خبر ست پر قہر س لیا گیا تھا۔ دوسرے شریح بن ہانی کا نام گواہوں میں بغیر ان کے علم و اطلاع کے لکھا گیا تھا جس کی اہمیت مزید کرنی پڑی لیکن فوج کشی ہو یا مصلوبی کی خدمت سب کچھ قابل معافی تھی مگر یہ لوگ ”علیؑ سے بیزاری ظاہر کریں“۔ شہل اور وقادار حجر اور ان کے رفقاء نے جس نے ”انکار کھٹا“ حجر کی سپاہیانہ فہمیت ہی کا جس یہ کہنے کا شایان تھا کہ: ”اگر مجھے یہ شبہ نہ ہو تا کہ تم لوگ یہ کہو گے کہ میں موت سے ڈر رہا ہوں تو میں دیر تک نسل پڑھتا رہتا“۔ اور اس کے بعد عمرؓ کے وقادار کا نام کی طرح علیؑ کے نام پر شہر بان ہو گیا۔ شریح، مسنی، قیس، عوز، کرام زندہ جاوید ہوئے۔ اور عبدالرحمن بن حسان جنہوں نے عہد و شمع کی صلاحت کئی کی جرأت کر کے مصلحہ کے گھنے کے لیے روشن تاریخ چھوڑ دی ”زندہ دفن“ کو بے گئے۔ عمرو بن اکت کو پانیر سے مار کر شہید کیا۔ یا دشمنوں کے تعاقب میں ہلاک ہوئے۔ پھر بھی ان کا سر مصلوبہ کے لیے اس قدر قیمتی تھا کہ اسے دیکھ کر تسکین ہوتی۔

اس طرح وہ جڑ اور شاخیں نیست و نابود کر دی گئیں جن کا سر بنز رہنا مصلوبہ کو سواہی روح قتلہ اور جن کے ہوتے یہ جھوٹا اپنے کو بلا شہ نہیں کہہ سکتا تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جن میں سے ہر ایک مصلوبہ کو اپنی تلوار سے قتل کرنا تلوار کی زلت بھتا لیکن شاید اس لیے قتل کر ڈالا کہ خلق کو اس کے سایہ سے محفوظ کر دے۔ لیکن ابن ابی سفیان نے اپنے موقع پر اعلان کیا کہ ان کی تلوار کے سایہ کا ادب کرتا رہا اور آج جب کہ وہ عہد اور ان کے کلا سے بے تعلقی کی زندگی بسر کر رہے تھے اور اپنی تلوار پر اپنے ہاتھ سے دم کا پیکر تھے وہ فتنہ عہد کے قتلہ اور انتقام کے مورد ہوئے۔ یہی مرتبہ مکر غیر عظم قیروں پر غالب آ گیا۔

ربیع بن عرث کے فقرہ کے معنی

”عرب ہمیشہ جبر کے بعد سے یوں ہی قتل کیا جائے گا۔ اگر وہ لوگ جبر کے قتل سے رُک جاتے تو اپنے کو اس قتل عام سے بچا لیتے لیکن انھوں نے ایمانہ کیا اور ذلیل ہو گئے۔“ یہ طلحہ یا مشیر بھانپا ہے یا ایک مصلحہ یا تلوار کی کیفیت ہو۔ لیکن یہی بس نہیں تھا۔ بلکہ قوی خصال کی تاریخ بیان کی جا رہی تھی۔ جہاں کئی گروہ اس درجہ ذلیل ہو گیا تھا کہ اپنے ظری سردار کے قتل کو ششہ سے دلوں سے دیکھ رہا تھا بلکہ اپنی بے تعلقات خاموشی اور فوشلہ سے آسمانیں پہن کر رہا تھا اس سے اگر کسی المرقوم کے ساتھ ایسی بے اعتنائی بے رحمی کی جاسکتی تھی تو غیر متاد حاکم کی حالت کا قیاس آسان ہے۔ قتل نہ تھا بلکہ قوم کے خناس کی زندگی یا موت کی کوئی تھی۔ آنکھوں میں زلت اور نامردی یا فوشلہ کی قدر نہیں ہو سکتی۔ ایسا بھانا قانون قدرت کا انکار ہو گا۔ اگرچہ عربین کی زبان الزار سے انھری جڑی حشر و فقر و افیاض کی قوت میں ہے اور جب کہ قوم کی قوم ایسے ہی افراد کا مجموعہ ہو۔

عمر دین الحق کی بی بی کے ساتھ برتلاؤ کے معنی اور جب یہ ممکن ثابت ہوا تھا کہ نواسہ رسول سے

تمیز کیا جاتا، اور المران قوم قتل کیے جاسکتے تھے۔ اس سے کوئی اندازہ نہ تھا کہ عمرو بن الحق کی بیگم کے ساتھ سخت کٹائی نہ کی جائے اس غیور بی بی نے اپنے کو عمرو بن الحق کی بی بی ثابت کیا۔ یہ خاتون نہ جبر و ذریعہ کرتی تھی نہ اس میں خوف اور خوشامد کے آثار تھے، بلکہ اپنے شہید شوہر کی تعریفیں کرتی ہے اور کہتی ہے کہ تو نے ”اس کا سر میرے پاس دیا یہ بھیجا“۔ عرب ہمیشہ اپنی عورتوں کے احساسات کی عزت کرتا تھا اور اس کی بیعت کچھ شہادت اپنی عورتوں کی وجہ سے عقد عورت کی زیادہ جان دینے کے لیے مستعد ہو جاتا، اور اس کی مدد کرنا بیعت میں داخل تھا اور اس کا تو ذکر ہی عبت ہے کہ اسلام نے کیا سکھایا تھا ایک شریف بی بی کو اس کے بڑے شوہر کا سر تحفہ بھیجا گیا ہے اور وہ اصول کی خلاف ورزی پر اظہار حیرت سے جس سے غم غمہ نہیں ہو سکتا تھا شہادت کر رہی ہے اسے جلا وطنی کا حکم ہوتا ہے وہ گویا پیشتر سے مستعد تھی اس لیے کہ بے خوابی کو طول ہو گیا تھا عزت معرضی خطر میں تھی قرض زیادہ ہو گیا تھا اور خوشی کا ٹھنڈکھٹکھٹا دور اندھاں تھا لیکن جلا وطنی کے قبل ایسی بی بی تھا کہ خانہ دہی بھی کچھ لیتا۔

حزیر کی شہادت کا بیجاں محمد کی شہادت نے اس قدر پیمان پیدا کیا کہ ملک بن ہبیرہ سکونی نے

اس کو چھوڑ ڈالا کہ تو اگر وہ فوت فلاں ہے۔ (ابن خلدون) ملک نے گھر نکلی کر اپنی قوم کو ایک جا کیا اور جو کچھ چڑا لے چلا۔ جب قاتل جو قتل کر کے آ رہا تھا تو ملک سے ملاقات ہوئی اور انھوں نے خبر کامل پوچھا اس نے واقعہ بیان کیا۔ ”ملک کو اس کا تعین نہ ہوا“۔ میرے ہذرہ راگتہ وہاں تھیں ہزاروں کو قاتلوں کی گرفتاری کے لیے بھیجا لیکن وہ ہاتھ نہ آئے اور معاویہ کو معلوم ہوا تو اس نے کہا: ”یہ جوش تھا جو اس کے دل میں میرا تھا۔ مجھے امید تھی کہ وہ اب فرو ہو رہا ہوگا۔ رات ہوئی تو ایک ہزار و ہجہ ملک کے پاس بھیجے۔“ حضرت عائشہ نے بھی سطرش کے لیے آدمی بھیجا لیکن یہ بھی شہادت کے بعد پہنچا کچھ طویہ کلام ہوئے۔ آخر میں معاویہ نے کہا کہ: ”مجھ کو اس امر پر ایمان سمیٹنے کے آثار ہو گئے۔“ اہل کوفہ میں بھی کچھ پیمان ہوا۔ اور اکثر مشاہیر ترک وطن کر کے مدینہ آئے اور حضرت سیدہ امیر کے پاس حاضر ہوئے لگے۔ جب مروان کو معلوم ہوا کہ کچھ اہل کوفہ مدینہ آئے ہیں اور حضرت امام حسین علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوتے رہتے ہیں تو اس نے معاویہ کو خبر دی۔

معاویہ کے خط کے معنی

معاویہ نے یہ خبر سنا کہ جو خط حضرت کو لکھا اس سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ مروان نے اپنے داماد پر کس قدر زور دیا تھا اس میں سے زیادہ توجہ کے قابل یہ فقرہ ہے کہ: ”مجھے امید ہے کہ جب تک ہمارے ہاتھ میں کوئی برائی نہ پہنچے۔ تمہاری طرف سے بھی کوئی نکرہ اور واقعہ نہ ہو۔“ اس فقرہ میں معاویہ اپنی غرور کے اس موقع کو دہرا رہا تھا جو مصالحت کے بعد کی تھی کہ: ”جو شرطیں میں نے کی ہیں ان کا سرا میرے ہاتھ میں ہے چاہوں وہاں نہ کروں خواہ نہ کروں تمہیں اس سے کوئی مطلب نہیں تم کو اطاعت کا کام رکھنا چاہیے۔“ یعنی معاویہ لوگوں کے ساتھ اپنے کیے ہی عمل کو قابل باز پرس نہ ٹھہرا رہا تھا بلکہ وہ مردوں کو اجلا علی سے روکتا تھا اور انھیں انفرادی مصالحت کا نظریہ رکھتا تھا۔ دو بے نظموں میں معاویہ کو اختیار تھا کہ وہ ایک ایک کو

قتلِ لادن زہر کے لیے چننا جائے لیکن دوسرا اس میں کوئی دخل نہ دے۔ دوسرے کے قتل کے وقت وہ اس سے مظنون نہ ہو سکتا۔ یہاں تک کہ معلوم ہو کہ وہ بھی اور میان سے جی لے کر ظاہر ہے کہ کوئی تنہا شخص سلطنت کے انتظام اور سامان کے تقاضا میں کچھ نہیں کر سکتا۔ نہ کہ جب اسے غوراً اپنے کو بچر خضب میں گرفتار دیکھ کر اپنی فکر کرنی پڑی حسین کے حوالہ جواب ملتے ہوں اس میں مخصوص اور مشترک یہ ہے کہ: ”میں نہ تیری مخالفت پر آمادہ ہوں اور نہ جنگ کی رغبت یا قصد رکھتا ہوں۔“ حسینؑ نہ دوسرا اور نہ اس سے اپنا جواب دے سکتے تھے۔

خود غرضیوں کی جنگ اور ناز اور جس نسل میں بنی امیہ اور ان کے جواخلا اہل پر مستعرج تھے کہ کس طرح صریح یا غیر صریح طریقہ سے ایک دھم کو نقصان پہنچائیں ابن عباس اور خیرہ کے واقعات بھی کم درجہ پر نہیں ہیں کہ کبھی متغیرہ ابن عباس کے لڑکے کو کوفہ کا حاکم نہیں دیکھ سکتا اور بھی ابن عباس متغیرہ سے انتقام لے کر اسے بھی معزول کر دیتا ہے۔ برابر کی چٹ اور برابر کی جوت تھیں ان کے طریق کی کو واقعہ خولانی کے لیے ان کے افعال کی مثالوں سے زیادہ قوی زبان نہیں ہے۔ لیکن اس موقع پر جہاں تک شخصی فوائد کا تعلق ہے دونوں اچھے رہے بری صرف نڈر رہی۔

ولیعہدی زبید کے اہتمام پر نظر

اگرچہ بنی ہاشم اور ان کے پر پوزوں کے چرا کرنے کی یہ ضروری معنی نہیں ہو سکتے کہ یہ ولیعہدی زبید کے نتیجے کے لیے سبب قرار دیا گیا تھا لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب از روئے عہد نامہ معاویہ کو اپنی حیات تک اپنے مام رہنے کا تقبیل تھا تو پھر ان لوگوں کے فنا کر دینے کا کیوں اس قدر اہتمام تھا جو طبقہ اس کی حکومت پر راضی نہ ہو سکتے تھے۔ عام حکومتوں کا یہ اصول ہو یا نہ ہو لیکن کم سے کم معاویہ کا نہ تھا کہ سب میری حکومت پر فوشی سے راضی ہو اور جبری میں اسے کیا کراہت تھی۔ برسوں پہلے خلیفہ بن شعبہ عثمان کے سامنے علی سے کہہ چکا تھا کہ: ”تم چاہو یا نہ چاہو تمہیں حکوم رہنا ہو گا۔“ اب رہا یہ دم کہ باوجود پیرانہ سال کے اسے امید نہ تھی کہ وہ لوگ میری بقیہ عمر تک بھی مجھے حکومت کرنے دیں گے۔ یہ قیاس معاویہ کے ایسے اندازہ کے آدمی کے لیے محال تھا جو قوتوں کی یہ تحریک کر سکتا تھا۔ اسے اپنی قوت معلوم تھی اسے ان لوگوں کی قوت بھی معلوم تھی جو اس کے مخالفت ہو سکتے تھے وہ مہینوں جناب امیر کے مقابل لشکر آرائی کر چکا تھا اور اسے بنی امیہ کی تائید کی آخر دم تک اس لیے امید تھی کہ ان کا اور کہیں گزرنہ تھا اور اس لیے اب اس خوف کی گنجائش نہ تھی کہ ایک آدمی شکست کے بعد محنت اٹ جانے کا ایسی صورتوں میں بنی ہاشم کے دوستوں کا کوئی خفیہ بیوانہی امیر شام کی طرف سے ایسی نصرت کا رو روائیوں کا متقاضی نہیں ہو سکتا تھا جس میں دشمن کی معدومیت کے سوا چلہ نہ ہو۔ انتقام کا جوش بھی یہی لیکن جو کچھ کیا گیا وہ یوں ”الطاعت یا قتل“ کے اور کوئی اصول نہیں بگاڑتا تھا اور اس کے ایک مستقل مصلحت کا سوا تھا اور ایسا ہونا یا پیشتر سے اپنے اور اپنے خاندان کو محفوظ کرنے کے خیال سے تھا یا میدان صاف کر دینے کے خیال شدید ہو گیا۔

لیکن بات ایسی تھی جسے پہلے پہل خود غم سے نکالتے اور تاقتاً معاویہ کی خود ترکیب ہو یا متغیرہ کے دل پر طعنے سے حکومت کی لہرا گئی ہو کہ اس نے اپنے دوبارہ بحالی کے لیے یہ ترکیب نکالی کہ نزیہ کی ولیعهدی کا مسئلہ چھیڑ دے۔ بہر حال

مسئلہ پھڑا اس بنا پر کہ: ”اجلِ صلہ اور سرداران و بزرگانِ قریشِ اشعل کر چکے ہیں۔“ اور اس لیے کہ ولیعہدی زبید کی بیعت لینے میں ”نہ کوئی فتنہ ہوگا اور نہ فساد۔“ یہ آخری فقرہ قوم کی اخلاقی حالت کا آئینہ تھا کہ: ”مسلطہ کرو جسے پاہو میں دیکھنے کا کوئی حق نہیں ہے!“ اب رہ گیا کوشش کرنے والا آدمی تو یہ بھی کہہ دیا کہ میں کوفہ میں اور زیادہ بصرہ میں کام کرے گا اور اس کے بعد یہ بات بھی بہت غور کی کہ ”ان دونوں شہروں کے بعد پھر کوئی ایسا شہر نہیں ہے جو آپ کے حکم کی مخالفت کرے۔“ اس لیے کہ خلیفہ ثانی کے وقت سے کوفہ اور بصرہ کی حیثیت نہ صرف بہ لحاظ شہریت کے بڑھ گئی تھی بلکہ فوجی عنصر کی زیادتی نے اسے ایسا موقع دے رکھا تھا کہ مصلحت کے کسی اساس کے قبل اس پر نظر ڈالنا نہایت ضروری تھا۔ کوشش شروع ہوئی اور ”ہوا خولہاں دولتِ بنی امیہ“ سے ابتر کی گئی لیکن زیادہ زبید کی حرکتوں سے اس کی ولیعہدی کی امید نہ کر سکتا تھا اور اگرچہ اس کا مصلح کار عبید بن کعب غیری بھی نامقبولیت میں اس کا ہم خیال تھا لیکن حالتِ جواب دینے کی جرأت ”معاویہ کی رائے کی مخالفت“ اور ”زبید کو بد خواہ بنانے“ کے خوف سے نہ کی بلکہ مسئلہ کو سردست ملتوی رکھنے کی صلاح دی گئی۔ اور اس طرح گویا پہلی کوشش کا زور ٹوٹ گیا۔ یہاں تک کہ زیادہ سے زیادہ پاک ہوا۔

زیادہ کے بعد کوشش کا دوسرا دور شروع ہوا۔ ابن عمر کے پاس ایک ہزار درہم بھیجے گئے جسے انھوں نے قبول کر لیا لیکن ولیعہدی زبید کا نہ کر سکا اور اسی کو زیادہ مروان کو لکھا گیا، مروان نے لوگوں کے سامنے تقریر کی اور جب زبید کا نام آیا تو عبید الرحمن بن ابی بکر نے مروان اور معاویہ دونوں پر گری ظاہر کی۔ بعض کے نزدیک ابن ابی بکر کا بچہ مروان کی ٹانگ تک پہنچ گیا۔ بنی امیہ گرم ہوتے یہاں تک کہ حضرت عائشہ کو قیام امن کے لیے تقریر لانا پڑا۔ مروان نے معاویہ کو حالت کی اطلاع دی اور ابن ابی بکر کی وراثتی عمر ان کی ملاحظہ ہوئی۔

اس سے زیادہ مشروطیت نما کارروائیاں گئیں و فوج بھیجنے کے حکم نے گشت کی اور ہر سویرہ دار نے وفد تیار کیے اور وہ امیر شام کی دلی خواہش اپنی زبان سے بیان کرنے لگے۔ معاویہ کے خاص مقرنین نے حاضرین اطراف کے سامنے اظہارِ اطمینان و وفائی کی تقریریں کیں اور سب سے زیادہ رگوش کو خلیفوں کے سردار کا خطاب دیا گیا۔ لیکن جس وقت یہ ہو رہا تھا تجزیہ کار اخص بن قیس جس کا پیشہ تصادف کرایا گیا ہے اور جس سے ایک صلح کی حالت تھی۔ خاموش مستحضر رہا۔ یہاں تک کہ معاویہ نے اسے چپ نہ رہنے دیا۔ طلبا اس امید سے کہ اس کا کہنا بلحاظ اس کی وجاہت، منجیدگی اور نیوٹرل حالت کے زیادہ اثر کرے گا لیکن جو کچھ اس نے کہا اپنے موقع کا بہ نسبت معاویہ کے زیادہ لحاظ کیا۔ جو گویا معاویہ کی تمام کارروائیوں کے ایک مرتبہ اور شکست کا باعث ہوا۔ یہاں تک کہ زمانہ نے پھر ایسی مثال میں حد کا اضافہ کیا کہ کیسا ہی مکروہ کام بھی مسلسل کوشش سے خواہش کے موافق پورا ہو جاتا ہے۔

مکہ معظمہ اور مدینہ طیبہ میں معاویہ کے داخلہ کی وجہ شریں گویا، مدارات، سلوک، و مکی کام لاتی جاتی رہی اور آخر میں ایک ہزار سواروں سے مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں پرامن داخلہ کی تیاری کہ وقت تھا کہ دخول مکہ معظمہ سے اس لیے بتوں کا نظیہ کرتے کہ اگر کعبہ میں ان کا وجود رہا تو عقیدہ مشرک کا مرکز مشرکین عرب کا خیال میں قائم رہے گا۔ اب وقت تھا کہ

حصولِ مدعا کے لیے اہلِ عربانِ شریفین پر اپنے شان و شوکت سے مرعوب کر کے اثر ڈالا جاتا۔ یعنی جس قدر بھی ان میں مذہبی لطافت کے لحاظ سے تنید کے ایسے شخص کو دلچسپ قبول کرنے میں تردد ہوتا، یہ بھی ان سامانوں کی وجہ سے دور کر دیا جاتا اور یہ سب اس لیے کہ یہ دونوں مرکزِ اسلام اگر اپنی روشِ انکار اور کراہت پر مصر رہے تو خواہش کا نفاذ آسان نہ ہوگا اور یہ دونوں مقدس مقامات، خلافتِ عظمیٰ پر اپنا اثر ڈالتے رہیں گے۔ غالباً یہ مثالیں ان مقدس مقامات کے متعلق پیشہ کے لیے ہماری چشم کشا ہو سکتی ہیں۔

مدینہ منورہ کے معاویہ نے حضرت اموم حسینؑ سے مخاطب ہو کر جو کچھ کہا وہ ایک صریح مذہبی تھی اور یہ فقرہ نہیں کہا جاسکتا تھا مگر اس کے بعد کہ وہ حکمِ مدینہ کی نگی ہوئی خبروں سے خوب بھر جاتا کہ: ”تھوڑی مثال اس شخص کی ہے جس کا خون جوش میں آگیا ہو“۔ اور پھر یہ جملہ پیشتر کی مثال دی ہوئی مانتوں کی طرح اس خوفناک اندازِ بیان سے تمام کیا گیا جس میں اپنے ارادوں کے نفاذ کے لیے خدا کے نام کو کارکنِ قرار دے لیا جاتا تھا۔ یقیناً یہ کوستانہ تھا کہ: ”خدا تمہارے خون کو پہلانے کا“۔ کوستا کو زور ہے۔ اور ”حدودِ حدیث“ کا اتمام اس لیے دینے کی ضرورت تھی کہ کیوں نہ تم نے ولیعہدیٰ تنید کا تذکرہ سنتے ہی قبول کر لیا۔ سخی سے حسینؑ نے جبر کا لیکن اسے پھر یہ کہنے کا موقع تھا کہ: ”تم اس کے اور اس سے بدتر کے اہل ہو“۔ اور اتفاقاً کی موافقت اس کہنے سے بدتر نہ تھی کہ: ”تم لوگ ایسی ہمت چاہتے تھے نہ ان کے خلاف چاہتا تھا!“۔ پھر مدینہ کی تمام تقریر اور مذہبی تنید کی خلافتِ دخیولے کچھ نہ کیا بلکہ اگلے شعرانے چوکی۔

امیرِ شام کیوں عائشہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان کی رحلت کی وجہ

پیش بندی اور احتیال کا آدمی مدینہ آتا اور حضرت عائشہ کی زیارت نہ کرتا۔ خصوصاً ان کی ان قابلیتوں کے علم پر جو ان سے ظاہر ہو چکی تھیں۔ اشلے گفتگو میں حضرت عائشہ نے معاویہ کو اس کی دھمکیوں پر ملامت کی اور اس نے جواب دیا کہ: ”یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں اس بیعت کو ناقص کر دوں جو ولیعہدیٰ تنید پر میں نے لی ہے“۔ معاویہ نے ام المومنین کی زبان سے مروج محمد بن ابی بکر کے قصاص کا ذکر بھی سنا۔ یہ گزشتہ تاریخ تھی کہ حضرت ام المومنین نے ابنِ زبیر کی محبت کا اظہار کیا اور یہ ابنِ زبیر بہت جلد خلافت کے قریب پہنچ جاتے اگر جل میں فتح نصیب ہوتی ہوئی۔ مگر انی اور خلافت کی سرور آہ ان کے دل میں تھی اور خود معاویہ نے تنید کے نسلخ میں خاص طور سے ابنِ زبیر پر نگاہ رکھنے کی وصیت کی، بلکہ قتل کر ڈالنے تک کی اہانت دی۔ ایسی صورت میں کہ وہی ابنِ زبیر اور وہی حضرت عائشہ زمرہ تھیں۔ اور وہ کچھ کہہ چکی تھیں جو کہنا تھا یقین کر لے جس کا جی چاہتا ہے کہ حضرت عائشہ کا عبرت ناک حوالہ عرضِ مردان کا جوشِ انتقام تھا جس نے طلحہ کے بعد ام المومنین کو بھی فنا کر دیا اور پھر امیرِ شام اس کی کوئی باز پرس تک گوارا نہ کرے۔ ذاتی طور سے اگر میری آنکھ سے زمانہ اور اس وقت کا سیاہی پر وہ اٹھ بھی جائے تو میرا یقین بڑھ نہ جائے گا کہ حضرت عائشہ کی موت معاویہ کے حکم سے تھی۔ یہ ہو یا خالد اور مغیرہ کا عزل، عبدالرحمن بن خالد کا زہر دیا جاتا۔ یہ سب اس روح کی حرکت تھی کہ: ”ہمارے حوصلہ اور اختیار میں کوئی دخل دیتا ہے“ جو دوسری شکل میں کم ذمہ داروں سے اس طرح ظاہر ہوتی تھی جیسے مغیرہ اور ابنِ ماس کی آپس کی جنگ تھی۔ بہر حال حضرت عائشہ کا درمیان سے اس طرح اٹھا دیا جاتا۔ امیر کی ہمد گہریت اور بے حیثیت حالت کی

مثال تھی اور وہ اب اس قابل ہو گئے تھے کہ اس صلت کے شخص کو فنا کر سکتے جو آج انہیں تخت پر لانے کے سبب ہوئی یہ بنی تم کا بڑا سبق تھا جو انہوں نے رعول کی احسان شناسی اور اہل بیت کے ساتھ طرز عمل سے حاصل کیا۔

معاویہ کی فکر اور اس کی وجہ مدینہ کے سنائے اور اس خبر نے کہ حضرت امام حسینؑ، ابن زبیر، ابن عمرؓ کے گئے ہیں معاویہ کو ”منظور“ کہہ دیا۔ فکر کی وجہ ظاہر تھی کہ ایک مرتبہ ایک زبردست فوجی تیاری کام کر چکا تھا اور ان افراد میں جو کہ گئے تھے ہر فرد کم بیش اس درجہ اثر رکھتا تھا کہ کچھ جمعیت فراہم کر لے سکتا۔ لیکن معاویہ کا یہ فکر وہم ہی وہم تھا کسی نے سرا و ملایا کوئی ایسا خیال ظاہر نہیں کیا اور نہ کوئی ادنیٰ کوشش ان کے کسی ایسے خیال کی ترجمانی ہو سکی۔ لیکن اگر ”موقع بیانی“ کے مشہور مفہوم کا لحاظ کیا جائے تو یقیناً کسی ایسی کارروائی کے لیے جو معاویہ کی مخالفت میں کی جاسکتی اس سے بہتر موقع ملتا دھواں تھا جب کہ معاویہ کے پاس صرف ایک ہزار سوار تھے اور جب کہ مکہ کا عامل صرف خوزے سے پہاڑی غنیمت کر سکتا ابن زبیر نے یہ کیا لیکن اس سے کم مناسب وقت کو منتخب کیا۔ حسینؑ نے نہ اس وقت کوئی ایسی کارروائی کی اور نہ اس کے بعد کسی ایسی کارروائی کو پسند کیا جس کا ذکر آئے گا۔

امیر شام کی کارروائی جو مکہ کے لحاظ سے اور زیادہ افسوسناک تھی پہنچ گیا امیر شام مکہ میں اور ان لوگوں

سے ملاقات کر کے کوئی تذکرہ مانگی گزشتہ خواہش بیان کیا لیکن کچھ وقت کے بعد تذکرہ آیا اور اب گزشتہ صلت کی جس کی مثالیں دی جا چکی۔ پھر قلعہ کی گئی اور کہا گیا کہ ”تم لوگ صرف برائے نام غلیہ تو زبیر کو قرار دے لو ہوائی تمام کام اپنی خواہش کے مطابق کرو۔“ میں تصدیق نہیں کر سکتا کہ معاویہ اس شرط سے بیعت کر کے ان لوگوں کی زبانیں کھٹ رہا تھا یا کچھ ایک مشکل کارروائی کو آسان بنانے کے لیے دب رہا تھا۔ نہ میں یہ سوچ سکتا ہوں کہ معاویہ اس کہنے کے بعد یہ امید کر سکتا تھا کہ حسینؑ ہمارا کہنا مان لیں گے بلکہ اگر میرا استدلال غلط نہیں ہے تو یہاں انتخاب عثمان میں حکم کی کارروائی کا مکمل تھا جو دوبارہ کھینچا گیا تھا جس کی اصلی غرض یہ تھی کہ سب نہیں تو نصف نصف بائیں اور ایک بھی موافق اور مخالفت ہو گئے تو وہی جنگی فوجی حائلین کے قتل یا قتل و کے لیے کام میں لایا جاسکے گا حسینؑ نے تو رد ہی کیا۔ لیکن جتنی لوگ بھی راضی نہ ہوئے صرف غلیہ مقتول کے ایک صاحبزادے صوبہ داری میں مکن تھے اور اس طرح وہ موقع ہاتھ نہ آیا کہ ان ذی اثر لوگوں میں سے چند کو خرید کر آئندہ مخالفت کے توہم کو کم کر دیا۔

آخری ترکیب لیکن اگر زمانہ میں ایسے لوگوں کی مثالیں ہیں جن سے قوی کسی علیحدہ اور جن کی شیعوں کا ذخیرہ کبھی کم نہیں ہوتا تو ایسی مثالیں کیوں نہ ہوں جو نہ فقط انہیں فریب کے برم ہوں،

خصوصاً جب کہ دنیاوی اقتدار ان کا دھنا ہاتھ ہو۔ تم جان ہی کر کیا کرو گے کہ تمہارے ساتھ فریب جو دہا ہے۔ جب کہ تمہیں نشانہ بنے بغیر چارہ نہیں۔ لیکن فریب جتنا بڑھتا جائے گا جتنی نیکی اتنی ہی گراں قدر ہوتی جائے گی۔ اس مرتبہ یہ آخری ترکیب اپنے اظہار مطلب کے لیے نکالی گئی کہ ان کے سروں پر ننگی تلوار پڑی رہی جن کے انکار کرنے کا شہہ ہو۔ اور پھر اس کے بعد جس قدر دروغ بیانی مفید ہو، اس میں کسی طرح بھل سے کام نہ کیا جائے۔

کیا کہنا ہے اس زبان کی روانی کا جس پردہ خدا کے خوف کا کئی کئی گنا ہو، نہ لپٹا نفس طاعت کرتا ہو، نہ کوئی دنیاوی سزا کا خوف ہو اور نہ جسے مخلوقات کے واقف ہو جانے سے کوئی شرم آتی ہو۔ جلی زبان، کہا گیا کہ چاروں حضرات کے متعلق خبریں مشہور ہیں کہ وہ بیعت سے گارہ ہیں لیکن دریافت اور طلب کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ لطیف، اطاعت اور رغبت سب کو بیعت نیکہ کے لیے صرف کرنا چاہتے ہیں اور شبہ ہو تو یہ لوگ بیٹھے تو بی بی بیچہ لوہ یہ فرقہ سروں پر تلواروں کے پچلے کا اشارہ تھا اور مہابی کہہ رہے تھے کہ: ”ان کا موقع ایسا عظیم نہیں ہے کہ ان سے خوف کیسے“۔
 ہو سکتا ہے کہ یہ محض شہکار ہو لیکن کلٹے سے کونسا رمانع تھا جب کہ وہ ان کے موقع کو عظیم نہیں سمجھ رہے تھے، اور جہاں کے نزدیک زید کے ظہر کے لیے ان چار شخصوں کی کوئی ضرورت تھی۔

کتنا ہی وقت اس تماشہ میں کیوں نہ صرف ہوا لیکن اس آنکھوں میں خاک ڈالنے سے ضرور کچھ لوگوں میں یہ خیال پیدا ہوا ہو گا کہ امیر شام کی گھر رہا ہے، بلکہ کم ہونے والے اس درجہ کا فریب کچھتے ہوں، اور اظہار اطاعت کیا ہو گا اور کئی جانتا ہے کہ معاویہ کے دوبارہ مدینہ پہنچنے کے قبل یہ خبر پہنچ گئی ہو کہ ان چاروں آدمیوں نے بیعت کر لی اور جو لوگ ان کی وجہ سے رکے ہوں وہ معاویہ کے پیچھے ہی اب انکار بے سود کچھ کر راضی ہو گئے ہوں۔

اور جب گزشتہ مظلوم کی مثالیں دی جا چکی تھیں تو یہ کیوں ہائی
شہدائے احد کی لاشوں سے انتقام

احد میں اپنا خون چھاکر اسلام کے فہرست شہدائیں ہمیشہ قائم رہنے والا کارنامہ ثبت کیا تھا انہی مظلوم سے بچ جانے اگر وہ نہ تھے تو ان کی مقدس بوسیدہ ہڈیاں ابھی انتقام کے لیے کام میں لائی جاسکتی تھیں۔ قصور یہ تھا کہ یہ لوگ بنی امیہ کے ظہری کفر کی حالت میں ان سے بیلور سپاہی کی طرح لڑے تھے بنی امیہ کا آج ظہری اسلام انہیں اپنی شہادت کے وقت کے بوسیدہ لباس میں جمع نہیں دیکھ سکتا تھا اس کے لیے اہتمام یہ کیا گیا تھا کہ میں اسی رات سے ہر کھلی جاتی جہاں یہ شہدا زندہ جاوید ہونے تھے اور منادی کرانی جاتی کہ: ”جس کا سر وہ احد میں ہو سو آدے اور اسے وہاں سے اٹھا کر دوسری جگہ لے جائے!“۔ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ کیا کچھ بے ادبی نہ کی جاتی اگر زونا بتول نے اپنی قبر کے چھپانے کی دینیت نہ فضائی ہوئی!۔ حضرت حمزہ نے تو صرف ایک آدمی اعزائے معاویہ کو قتل کیا تھا زیادہ تر تو شیر خدا کے ہاتھوں قتل ہوئے تھے لیکن بے سود توبہ کا دن نزدیک آچکا تھا یار ہوا اور دماغ یا ایلیو منسریب کا کارخانہ متاثر ہوا۔ سرمای مالت میں کہہ اٹھا تھا کہ: ”کیا کیا میں نے“

امیر شام کی موت

اسے عمر بن عدی اور عمرو بن اکث اور کیوں اختلاف کیا میں نے تم سے اسے ابن ابوطالب۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر مزید اور بنی امیہ کا سرگرم موید ضحاک بن قیس آئندہ موقع کے لیے متردد ہوا۔ اور چاہا کہ معاویہ کا دوبارہ اظہار وسیعہ دے بلکہ خلافت کی بیعت آئندہ کے لیے مفید ہوگی اور اس طرح نہ صرف اس کی موجودگی جو اسباب ”غلبہ“ کا مالک ہے بلکہ ایک گز سے ہونے والے ماکم کا فاضل لوگوں کو اپنی جگہ رکھنے کا باعث ہو گا۔ خلافت شاہی حوالہ کیے گئے تحت نشینی کی ضرر ہوئی اور آئندہ کے لیے پیشتر کے تیار کردہ دھماکا حوالہ کیے گئے۔

یہاں میری کتاب کا پہلا حصہ ختم ہوتا ہے۔ جس میں میں متعلق
چیزوں کے قلم سے متاثر ہونے کے واقعات کو دکھا رہا تھا۔

شہید اعظم حصہ اول کی غرض

یہ اگرچہ مختصراً ناموں اور مختصراً اغراض اور مختصراً زمانہ کی کارروائیاں ہوں لیکن غالباً میں دکھاسکا ہوں گا کہ یہ سب ایک
غرض کے لیے تھا کہ: "خلافت اور نبوت دونوں ایک خاندان میں نہ ہوں"۔ اور اس لیے بنی ہاشم ان کے دوست ان
کے یاد دلانے والی چیزیں ان کے حقوق، ان کے کارنامے، غرض کہ ایک جسم کے مشترک اعضاء مختصراً تشدد کے
تابع تھے اور کمزور کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ کبھی اس تشدد کا مزاج معتدل تھا اور کبھی اعتدال سے بڑھا ہوا تھا۔
اس نے ہمارے اس حصہ کتاب تک جو کچھ کیا اس سے سوچا جاسکتا ہے کہ اب کیا باقی تھا جو کیا جاتا! ہماری کتاب کا
دوسرا حصہ وہ باتیں دکھانے والا ہے جو اب تک باقی تھیں۔ یہ دوسرا حصہ نہیں لکھا جاسکتا تھا اگر پہلا حصہ نہ لکھا گیا ہوتا۔
کیسے بغیر ایام طغویات گزرتے ہوئے کوئی انسان جوانی کی حد تک پہنچ سکتا ہے یا کیسے کوئی واقعہ بغیر اسباب پہنچا ہونے ہو
جاسکتا ہے۔ دوسرے نظروں میں وہ اسباب ختم ہوئے جو شہادت حسینؑ پر منتہی ہوتے اور اب شہادت حسینؑ کے واقعات
لکھے جائیں گے۔ میں نے تمام شعار مصلحت کو اس حصہ میں اس لیے ختم کرنے کا اہتمام کیا کہ یہ باتیں آنکھ کے تذکروں
کے کہنے میں جاری نہ ہوں۔ میرے نزدیک حسینؑ کی حیات کی فطری تقسیم ایک ولادت سے سنہ تک ہے۔ اور دوسری
بقیہ کی جلالت یعنی شہادت تک اور اسی بنیاد پر میں نے اپنی کتاب کے دو حصے کیے۔

۶۰ سنہ تک حسین کے واقعات پر تبصرہ اسی حصہ کتاب کا جز ہے

اب تک میں نے
حسینؑ کے متعلق کچھ
کہنے سے حراست رکھی اب موقع دیکھتا ہوں کہ اس وقت تک اس حصہ کتاب میں حسینؑ کے متعلق جو کچھ واقعات لکھے
گئے اور ان میں دیگر متعلق واقعات سے جو ربط تھا اس کا نظامہ ایک باب میں پیش کروں گا کہ ایک مرتب صورت آگے
کے واقعات کے کہنے میں معین ہو۔



باب ہفتم

سین رجب سنہ تک

زمانہ ولادت کا گرد و پیش محض یہ کہنا کہ حسینؑ سنہ ۶ میں پیدا ہوئے سنہ ۶ کا کوئی تعارف نہیں ہے بلکہ ایک گولڈیاں ہے اس سے یہ تو کچھ میں آتا ہے کہ یہ کئی زمانہ تھا لیکن یہ زمانہ اور وقت کا مختصر حصہ حسینؑ کے خاندان کے لحاظ سے کیسی اہمیت رکھتا تھا اور اس خاندان کے گرد و پیش واقعات سے اس کو کیا ربط تھا یہ سب کچھ معلوم نہیں ہو تا جس طرح یہ کہنا کہ حسینؑ نبی عربی کے نواسہ تھے، نبی سلسلہ کے علاوہ کوئی تعارف نہیں ہے۔

شرح زمانہ کے لحاظ سے وہ زمانہ جس میں کچھ دن پہلے ایک نبی کی بعثت ہوئی اور یہ زمانہ جو کچھ اب اس سے ایک دین جو عالمگیر ہونے والا تھا پہلے عربی دنیا میں پڑنے اور پکے دلائل میں پھینکا اور جس وقت مدینہ کے علاوہ مقلات جاہلیت کے اشغال میں مصروف اور اخلاق کے ادنیٰ ترین احساسات سے متاثر تھے اور خدا کی زمین اور اس کے قانون کو فحشاء و منکر میں دکھا رہے تھے مدینہ امن اور محبت کا گھر تھا اور جس وقت یہ وہی مقلات اپنے قدیم معبودوں کی ہیبت اور شیعوں قبل کی متکبرانہ زیادتیوں سے اپنے نفس کو کھوپچے تھے عہد اخوت، مساوات اور آزادی کا سچا دوسرا تھا نہ اس فلسفہ اخلاق کے استوار کی طرح جس کا دلی اور زبان اور عمل ایک دوسرے سے بے ربط ہے بلکہ آسان مختصر ظہیم اور متوازن عمل سے۔

قوت استقامت اس فضا میں بسر کرتے ہوئے مدینہ کو پورے چار برس گزرنے کے لیے چار ماہی مہینہ باقی تھے اس کی قوت استقامت کا اندازہ اس سے کافی حد تک ہو سکے گا کہ اسے بدر، قینقار اور نصیر میں بڑی فتح حاصل ہوئی تھی اور کچھ سرایا کے لیے کامیابی کے ساتھ پیش قدمی کی جا سکی تھی بلکہ امد کے فتح نہ ہونے یا فتح کے ناکامی بہ شکست ہو جانے نے بھی اس کے نظام کے نئے دور پر کوئی اثر نہ کیا تھا نہ اس کا نظام معاشرت شکست ہوا نہ آپس کے اعتبار اور محبت میں کھینچ لی گئی ہوئی اور نہ اپنے رہنما پر ہمدردی میں کوئی جنبش پیدا ہوئی، بلکہ ایسے وقت میں کہ ان میں کے اکثر زعمی اور کسل مند تھے وہ پھر اپنے ہادی کے مخلص اور مخلصانہ حکم پر خوشی سے مسلح ہو گئے۔ اس لیے کہ دشمن کے دوبارہ حملہ کی افواہ تھی بہت ممکن ہے کہ ان کی مستعدی کو اس خیال سے اور مدد ملی ہو کہ امد کی فتح کو ہاتھ سے کھودینا اپنے ہادی کے ایک حکم کی جہل سے تھا۔

کیونکر متمدن بن رہے تھے اس زمانہ میں وہ متمدن بنے تھے اور اس کی مافیتوں کے لطفت لے رہے تھے نہ اس طرح کہ کسی نے ان کے امور استقامت کا خود

ٹھیکہ لے کر اخصیہ اعلیٰ سے علیحدہ کرکے اور ان پر غفلت کی سی نیند طاری ہو۔ اور اس غفلت میں ان کی حاملانہ قوتیں سلب ہوتی جا رہی ہوں، بلکہ ایک نگاہ کے نیچے جو ان سے کام لیتی تھی اور اخصیہ اپنے امورات پر اپنے ہاتھ سے کچے دھڑے کا اطمینان تھا اور وہ اس نگاہ میں کہیں سے حاکمانہ روکھٹان نہ پاتے تھے بلکہ پرانہ رنج شقیت سے کہیں زیادہ عزیز تھی۔ نہ ان میں تمدن کی حالت نے ایک دوسرے سے بے حدود دانہ لاہوتی اور اصول شخصیت کی غور خزانہ روش پیدا کی تھی بلکہ اخصیہ تو اگر کوئی سبق معلوم تھا تو آپس کے بھائی چارہ، محبت، محاظ، حسن ظن، درگزر اور احتمال کا اور اس میں ہر لحاظ سے جو رہی تھی اس لیے کہ ہادی ان کی ان امورات کی درنگی ہی کو اپنا فرض جانتا تھا۔ وہ نقل اللہ کے لیے پیدا کیا گیا تھا۔ انصار نہیں بلکہ اہل مدینہ شہری میں تو کہہ رہے تھے کہ:

”اگر آپ کا وجود ہم میں نہ ہوتا تو ہم میں اور دوسروں میں مسرت نہ ہوتا۔ ہم آپ کی وجہ سے معزز اور سرفراز ہوئے۔ ہماری غصیاں آپ کے سبب سے ہیں۔“

کیوں اہل مکہ دشمن ہو گئے یہ عظیم الشان ذات جس کے احسانات کی داستان انصاریان کرتے تھے اور جو ان کے نزدیک تمام اسباب ثروت سے زیادہ عزیز تھی

ہر جگہ طاعت آگاہی کاغونہ اور صفیہ کی تصویر تھی۔ اہل مکہ نے اس کے احسانات کو اس لیے فراموش کیا کہ یہ ان کے خیال کی پامالی کو بھرا کر ان کی غلطی اخصیہ بتا رہا تھا اور ایک اصول پر لے چلنا چاہتا تھا جو ان تمام ضروریات پر حاوی ہوتا جس کی انسان کو دنیا میں ضرورت ہوتی ہے۔ یہ اس کے دشمنوں کو اس لیے گوارا نہ تھا کہ ان کے شخصی اختیارات ضائع ہو جاتے اور وہ اس کو اپنا رہنما قرار دیتے۔ جس کے بزرگوں سے سربراہی کی رفاقت میں ان کے بزرگ مشہور ہو چکے تھے آریا جس طرح آریا لیکن انھوں نے ہاشم، عبدالملک اور عبداللہ کے فرزند کو ہر روز زیادہ ہر دلعزیز اور

تصلو اس کی قابلیتوں کو آرائش کے بعد زیادہ روشن دیکھا۔ اس کی منہ میں اللہ ضد دشمنوں کی سختیوں سے جو سختی تھی اور اپنے لئے دعوت سے مسرت تک یعنی تیرہ برس میں نہ صرف انھوں نے یہ دیکھا کہ مکہ میں وہ اپنی صداقت کا تمام دلوں میں مضبوط ہو گیا، بلکہ اسی زمانہ نے مدینہ کے زیادہ تر حصہ کو اس کا بیٹا اگرچہ اس کے جہاں جہاں آرا کی زیارت بھی محدود ہے چہرے کے مواکیب نے نہ کی تھی لیکن جس حالت میں کہ نبی برحق کو اس تیرہ برس کے بعد اور چار برس ملے تھے کہ اپنے مشن کو پورا کر رہا تھا۔ اس سترہ برس میں دوسرے رخ سے یہ خصوصیت تھی کہ اس کے دشمن اس کی پیچ تکی کے لیے مسلسل کوشاں تھے اور جس وقت ہرج و مرج و شام اس قولہ کا ثبوت اور اس کے جزم و استقلال کی مثال پائی جاتی تھی کہ:

”اگر مشریش میرے ایک ہاتھ پر آکھ اور دوسرے پر ہاتھ رکھ دیں تب بھی میں اپنے فرض سے باز نہ آؤں گا۔“

بزرگ قریش اپنے گھر اور سنگ افگنی سے بڑھ کر بھی قتل کے لیے صلاحیں کرتے تھے۔ کبھی غیر ملکی بادشاہوں کے لیے سفارت مینا کرتے تھے کبھی حملہ کے لیے چھوٹی چھوٹی جاعتیں تیار کرتے تھے۔ کبھی بڑے بیانہ پر سلمان کرتے تھے اور کبھی کوئی بزرگ قوم اپنے زیر اثر لوگوں کو اس سے دین کے پھیلنے نہ دینے کے لیے مرتے وقت دیتیں کرتا تھا۔ بدر کی شکست چونکہ پہلی بڑی شکست تھی اس کے ساتھ ہی دشمنوں کا ڈھیل پڑ جانا لیکن نہ تھا وہ لڑتے رہے۔ یہاں تک کہ احد کے موقع نے ان کی ٹوٹی ہوئی ہمتیں پھر جوڑ دیں اور وہ نہ صرف رنج و غیہ میں زنا می روش کی مثال دے گئے

کہاں دو تھے اور کہاں دو ایک تھے۔ بلکہ انہوں نے گھبراہٹ کو اجہرنے پر مجبم کر دیا۔ اور جی وقت ”ازید“ و ”اہرمین“ اپنے اپنے کام میں مذکور

زمانہ تک خود فروشانہ استقلال ظاہر کر رہے تھے۔ نئی عربی کا کوئی واقعہ نگار فردوس کا اہتمام قبول کیے بغیر ان کی مدح و عری نہیں کر سکتا تھا جب تک ان کے نوجوان چاراد بھائی کے غلوں، جہان بازی، وجہ حق کی مدد کے نقطہ نہایت اور اس طرح گویا معلوم ہوتا تھا کہ عبدالمطلب یعنی محافظ کعبہ کو حضرت عبداللہ اور حضرت ابوطالب اس لیے حلائیے ملے تھے کہ ان دونوں بزرگواروں کے مشہور علم فرزند ایک دوسرے کی قیوت کے لیے دو رہیں لیکن طریقہ حق کی اشاعت اور شہادت کی کوششوں میں ایک ہوں۔ کوئی اگر حکم دینے والا ہو تو دوسرا حکم کے ہر لفظ اور شاہد کی اطاعت کی کمال مثال ہے۔ اور رسول کے شہور ایذا رساں اور تکلیف دینے والوں کے مشہور مددگاروں کا اس حامی دین کے ہاتھوں سے سرکھلا جانے۔

عرب کے خاصہ انتقام کے علم کے بعد علی کی کوشش کا درجہ
علی عربوں کے مزاج، رسم و رواج اور خیالات واقف

تھے وہ کہہ سکتے تھے کہ سرداران قریش کا ہمارے ہاتھوں آج یا کل قتل ہونا کیا کچھ چارے اور چارے خاندان کے لیے کر سکتا ہے۔ وہ جانتے تھے کہ عرب کے انتقام کا اثر بوسیدہ ہڈیوں تک پہنچتا ہے جو خیال حضرت آمنہ رضی اللہ عنہا کی قبر کے متعلق دشمنوں نے ظاہر بھی کیا تھا۔ لیکن اس تمام علم کے ساتھ علی کو اپنے وجہ کی قیمت بھی معلوم تھی۔

علی اور ان کی اولاد بلاد میں جتنا بھائی جس میں گرفتار ہوئی اگر ایک تیسری جماعت دفعہ سامنے آکر نبی امیہ کے بچے ہونے کی وجہ سے اور گئی ہوئی قوت کو زندہ نہ کر دیتی بلکہ اپنا مددگار قرار دے لیتی۔ لیکن علی اس علم پر بھی کوشش کرتے کہ ہماری کوشش ہماری اور ہماری اولاد کی یقینی تباہی ہے۔ اس لیے کہ وجہ بہت عظیم تھی۔ ان کی کوشش کے اکثر مواقع ایسے تھے جس میں اس علم بغیر چارہ نہ تھا۔

آلِ ہاشم کی خاندانی محبت کی تاریخ
بے شک مثال ہے کہ حضرت ابوطالب کو اپنے بھائی حضرت عبداللہ سے بڑی محبت تھی۔ لیکن میرے عقیدے میں

ان دونوں بھائیوں کی محبت ان اسباب محبت کے سامنے مثال میں نہیں لائی جاسکتی جو علی اور رسول میں واقع تھے۔ میری فرض قابل نہیں ہے بلکہ سلسلہ ہے۔ اور جس طرح حضرت عبداللہ اور حضرت آمنہ کی محبت مؤید بہ تاریخ ہے حضرت ابوطالب اور حضرت فاطمہ بنت اسد کی لہجہ کی محبت اور خوش وقتی کی مثال ملتی ہے یہاں تک کہ حضرت خدیجہ اور جی برحق کے واقعات ایک دوسرے کی محبت اور مشکوٰۃ اللہ کاٹھ کی ظاہر تصویر ہوتی ہیں۔

محبت کاٹھ اور پاکیزگی کی یہ فضا تھی جس میں نبی عربی کی دختر نیک اختر پرورش پاری تھی۔ بڑے بڑوں میں حضرت ابوطالب زندہ تھے حضرت فاطمہ بنت اسد موجود تھیں۔ ماہر گرامی تھیں۔ جنہوں نے اپنی تمام ثروت امر حق کی اشاعت میں صرف کر دی تھی۔ اور سلسلہ بعثت یعنی حضرت ابوطالب اور حضرت خدیجہ کی رحلت تک سن شریف پندرہ برس کا جو چکا تھا۔ اپنے پدر عالی مقام کے سرمایہ حیرت افحال دیچہ اور سن رہی تھیں۔ خود اپنی تربیت میں اس درجہ کمال حاصل کر چکی تھیں کہ ہادی عالم عظیم کیا کرتا۔ یہ بھی جانتی تھیں کہ علی نے میرے باپ کی خدمت اور جہان بازی میں کیا کرنا چاہیے تھا جو نہیں کیا۔

بلکہ بسترِ فراہ کی مشہور سرفروشی کے بعد منہ لے جانے میں حضرت ذکیہ کی حفاظت کے لیے بھی علی کو تیار سے مدد لینے کی ضرورت پڑتی تھی۔ یہاں تک کہ مسجد میں موقع نے طاہرہؓ سے عقد کے متعلق علی کا بے چین خیال ظاہر کر دیا۔ جس کے سننے کے خود رسولِ مشرق تھے اس لیے کہ علی کے سوا فاطمہؓ کا کوئی کفونہ تھا۔ ہاشم کی نسل کی یہ دو شاخیں پھر مل گئیں۔ چار ہزار مہاجر و انصار نے دعوتِ ولیمہ نوش کی اور رسولؐ نے پاکیزگی نسل کی دعا دی۔ علیؓ کا ہر شے اور خود علیؓ و فاطمہؓ کے واقعات آپس کی محبت اور حفاظت کی زندہ تاریخ ہیں۔ سمجھ کر اٹھا کہ سہوار عرب کے فرزند اور ملکہ عرب کی یادگار کے گھر عقد کا نتیجہ ظاہر ہوا۔ جس میں نبی کی نگاہیں ”اپنا علم و وقار“ پائی تھیں۔ اب تک حضرت فاطمہؓ جنتِ اسدِ حیات قصیں کہ گود میں کھلائیں۔

۳۔ شعبانِ شہ کے زمانہ نے

ایک حیرت خیز مولود کا استقبال کیا

واقعات اور جذبات کا یہ جزو و مد تھا کہ زمانہ ۳ شعبان ۱۰ شہ تک بڑھا، اور مخلوقاتِ عالمی میں سے ایک حیرت خیز وجود کا استقبال کیا۔ مبارک ہے وہ مولود جس کے انتظار میں رحمتِ لقا میں پس در کھڑا تھا۔ اضطراب اور بے چین اشتیاق کی ایک حالت تھی۔ بے چینی رخ ہوئی۔ رسولؐ نے سہرہ کیا۔ لیکن اشتیاق اس قدر بڑھ گیا کہ ابھی سہ سے سر نہیں اٹھا تھا کہ اسلام کو گارہ دکھایا کہ: ”میرے فرزند کو!“۔ غالباً اس وقت وہ منظرِ حیات نہ تھیں۔ تھیں رسولؐ ”ای بعد اسی“ فرماتے تھے، ”ورنہ وہ خوشی خوشی اپنے فرزند کے فرزند کو رسولؐ کی گود میں دستہ۔ جس طرح اپنے فرزند کو پہلے امین کی پر محنت آنکھوں اور زبان کے حوالہ کیا تھا۔

لالی اچھا چھوٹا چھوٹا ایک بچہ ریشمی کپڑے میں لپیٹا ہوا۔ آنکھیں اس چھٹی می سیکل کے گرد پھریں۔ خلیل اس کے کہ پسینہ مس کرتا۔ نگاہوں نے بڑھ کر اپنے میں اُتار لیا۔ اس سے پہلے کہ پہلو اپنی پُر لطف گرمی کی قلب کو خبر دیتا۔ رسولؐ کے ہاتھ بڑھے اور گود میں لے لیا۔ لبِ اقدس ننھے ننھے کانوں کے قریب لے گئے اور خدا کا بزرگ نام اپنی صفتِ عظمت کے ساتھ بچے کی قوتِ سماعت کے حوالہ کیا گیا۔ تکبیر، دی تکبیر جو حسینؑ کو شہید کرنے کے بعد بھی گئی تھی۔ صرف کہنے کا مسروق تھا۔

اس بچے نے جس کا نام رسولؐ نے حسینؑ رکھا۔ رسولؐ کی تصویر کو پورا کیا۔ ہوا میں رہا۔ اس نے کہا کہ حسینؑ رسولؐ کے نصف ہلائی حصہ سے اور حسینؑ نصف زیرِ پا سے مشابہ تھے۔ اگرچہ دیکھنے والوں کو شہادتِ قریب ہونے سے رسولؐ یاد آجاتے تھے۔ اور خود طاہرہؓ کے شعر سے کہ:

لنت شہید بآبی لست شہیداً بعلی

ظاہر ہوتا ہے کہ حسینؑ شہیدِ رسولؐ تھے۔

عطا کے لفظ میں قیافہ پسند انتخاب اور تحریک مضمحل ہے۔ حقیقہ اور چاندی تصدیق کرنا اظہارِ مسرت تھا لیکن خدا سے بندے کا اظہارِ غلوس نہ صرف قربانی کے پیش کش سے ظاہر تھا بلکہ خیالات کرنے کے اصول سے جس میں کئی عناصر کو

کچھ دیباچاتی المصنعت ادا کرنا بھی خدا ماں کی خوشنودی اپنے پدر بزرگوار سے اپنے بچے کے لیے کچھ طلب کرتی ہے اور رسول اسے اپنا جود و شہادت عطا کرتے ہیں۔ ”علاقہ“ کے لفظ کا استعمال زیادہ جرح کا محتاج نہیں ہے، بلکہ اس موقع پر رسول کے فرمانے سے کہ میری شہادت اور جود صیغہ میں ہے۔ بھائی گھیا کہ رسول نے یہ صفات اسے عطا کیے۔ حالانکہ صفت ایسی چیز نہیں ہیں جو زبان اور الفاظ سے نقل کی جا سکیں۔ لیکن میں اس لفظ کو بھی قبول کرتا ہوں۔ اس لیے کہ اگر جڑی صفت اپنے نشو و نما اور ترقی کے لیے خارجی حرکت کے محتاج ہیں تو رسول کے فرمانے سے زیادہ صیغہ کے لیے کوئی قوی تر حرکت نہیں ہو سکتی تھی۔ اور اس طرح کسی صفت کی پرورش کی ایسی قوی زبان سے حرکت کسی طرح عطا سے کم نہ تھی۔

رسول کا یہ فرمانا اس زمانہ میں تھا جسے ہم ہندوستانوں کا مذاق چھٹی چلا کرتا ہے۔
حسینؑ کا قیافہ اور رسولؐ علم قیادہ جانتے والوں اور قیادہ شناسوں کے لیے یہ حیرت اور دلچسپ غور کی

بابت ہوگی کہ اس مختصر عمر میں بچے کے چہرہ پر جود و سخا کی تحریر کی کس قدر قابل شناسائی مدنگ واضح ہو سکتی تھی۔ دراصل ایک نہ ابھی اس کی آنکھیں اپنے علم میں قائم ہوئی ہیں۔ ابھی گردن میں ایسی سختی آئی ہے کہ وہ دونوں شانوں پر تسلسل کے اور نہ گرم و سرد جھانے چہرہ پر کوئی نقش ڈالا ہے۔ ہارنگت میں بچی آئی ہے، نہ کاسہ سر ابھی اس حد تک سخت ہوا ہے کہ اس کے ٹکڑے آنکھ اپنی صورت میں بیکر ہو سکے اور کسی طرح کی تغیر کی محتاج نہ رہے ہوں۔ یہ کچھ ہے کہ بچے اپنے تمام سامانوں میں دم مار رہے ہیں۔ ہونے کے بعد وہی ہے جیسا اس وقت جب کہ وہ سو برس کا ہو کر آغوشِ مادر میں واپس جاتا ہے۔ لیکن اس تمام زمانہ میں اس کے عکس صفت صفت اس کے محتاج ہوتے ہیں کہ شناسائی کے قابل صورت اختیار کریں اور قیادہ میں اپنی تصویر کھینچیں۔ حسینؑ کا قیادہ عجیب و غریب تھا کہ وہ چند دنوں کی عمر میں اپنے خصوصیات کے پہچاننے کے قابل ہو گیا۔ اسی طرح رسولؐ کی قیادہ شاہی حیرت خیز ہے کہ انھوں نے ایک نوزائیدہ بچے کی غیر محکم آنکھ اور قیادہ میں جس میں سادگی کی گہرائی کے علاوہ کچھ نہ ہونا چاہیے، وہ جگہ دریافت کر لی جہاں جود و شہادت کے آثار تھے۔ گویا وہ احسانے جہانی کی طرح صفات صفت دیکھ لینے کی کوئی چیز تھی۔ رسولؐ کا یہ فرمانا محض خاص قوی کے علم سے نہ تھا، ورنہ اگر ایسا ہی ہوتا تو وہی الفاظ جو حسینؑ کے لیے فرمانے تھے اپنے فرزندِ حسنؑ کے لیے بھی کہتے۔

حسینؑ کو ہارونؑ کے فرزندوں سے موسوم کرنے کا عکس ہم پچھلے اوراق میں اس پر نظر ڈال چکے ہیں کہ سعد بن ابی

وقاص کی زبانی بیان کی ہوئی اس سلسلہ میں افریقین حدیث کا کیا کس ہو سکتا ہے جس میں رسولؐ نے علیؑ کو ہارونؑ سے نسبت دی۔ اس کے بعد اب میں کہنا ہے کہ رسولؐ کا حسینؑ کے نام کو ہارونؑ کے فرزندوں سے نسبت دینا جو سلسلہ کے تعارف کے اور کوئی امر نہیں ہے۔ یہ دونوں شخص ایک دوسرے کی مود ہیں اور زمانہ آنکھ پر کافی روشنی ڈالتی ہیں کہ اس سے یزید و صلیت کے کوئی اور نتیجہ اخذ کرنا مناسبت کے ساتھ ایک غیر متعلق کھیل ہے۔ ان میں سے کسی حدیث کا پہلے یا پچھے بیان کیا جانا اصل خیال کی موجودگی پر کوئی اثر نہیں ڈالتا۔

رسولؐ اور حسینؑ کی روایات صحبت آبیاب و گاندہ خیال کیا جا سکتا ہے کہ کسی بچے کے والدین یا اولیاء کا صحبت کے علاوہ کوئی تاریخی حیثیت رکھتے ہیں۔

ایک بے سودیاں ہے۔ اس لیے کہ ہر شخص جسے خدا نے اولاد عطا کی ہے وہ جانتا ہے کہ وہ بچے سے کیونکر کھیلے اور بچے کیونکر کھیلتے ہیں اور کیسا سہاواں ہے بلاتر لطف ہے جو بزرگوں کو ان طفلانہ حرکتوں اور غلطیوں میں حاصل ہوتا ہے۔ لیکن حسینؑ کی طفلانہ ادائیں اس نگاہ سے دیکھی جائیں تو انہیں ان کے اس زمانہ کی روایتوں کو اس کاٹھ سے امتیاز حاصل ہے کہ ان کا بچپن اور کھیلنے والہ مرحلہ تھا بلکہ حقیقتاً حسینؑ نے ان بچوں کے وہ رسومات بھی ادا کیے جو دوسرے کمروں میں والدین ادا کرتے اور موقع کے لحاظ سے رسولؐ کی عنایات اور توجہ ایک ملکی اور مذہبی اثر رکھتی تھیں جسے اصحاب دیکھتے تھے۔ اور اس طرح یہ واقعات اپنی بعض پیشگوئیوں سے ایک تاریخی صورت رکھتے ہیں۔ آئندہ واقعات نے اس کا ثبوت دیا کہ رسولؐ کی محبت کے افضل لوگوں کے لحاظ سے اس طرح خارج نہیں ہو گئے تھے جس طرح ان بچوں کے ساتھ طفلی میں بزرگوں کی مہمانیابی ایک وقت کی باتیں تھیں کہ آئندہ یاد رکھنے کی چیزیں نہیں تھیں بلکہ لوگوں نے اسے اہل عزیزیت سے یاد کیا اور یاد کر لیا۔ حسینؑ کی یہ بات ان کو اتنا تھکاتے تھے کہ ان کی رکتی تھی۔ اور اس کے بعد سے آج تک وہ حسینؑ کے واقعہ غوان ہوں۔ قصیدہ گوہوں یا حشر کہنے والے ان میں سے کوئی بھی اسے بے ضرورت نہ کہ سدا حقیقت یہ ہے کہ یہ واقعات حسینؑ کی سوانح عمری کے جزو لاینفک ہیں۔

حسینؑ کے متعلق اس کے اہل شرافت پر اگر عبوری سی غور کی ضرورت ڈالی جائے

حسینؑ کے متعلق رسولؐ کا ارشاد اور اس کا عکس

جس کا ایک خطاب شافع روز جزا بھی ہے تو باوجود محبت کے اکثر فقرات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس سے کچھ اور غرض بھی تھی۔ مثلاً میں فرماتے ہیں کہ حسینؑ کے دوست اہل بہشت ہیں۔ حسینؑ کو یہ شہاب اہل بہشت فرماتے ہیں۔ ارشاد کرتے ہیں کہ جس نے انھیں ازیت دی اس نے مجھے ازیت دی کہتے ہیں کہ حسینؑ مجھ سے ہے اور میں حسینؑ سے ہوں۔ اصحاب موجود ہیں اور چھوٹی چھوٹی بغلوں میں ہاتھ ڈال کر اٹھا لیتے ہیں۔ کھلی ہوئی کلیوں کو جوش سے چوم لیتے ہیں۔ اور پچھتاتے ہیں۔ شعرا رسولؐ کے ارشاد کو نظم کر دیتے ہیں، اور لوگ اس سے واقف ہوتے ہیں۔ ان تمام فقرات اور اس کی ادائیں محبت کی گہری لکیر ہے۔ لیکن دوستی و مائیں اور دشمنی کے اجماعی فقرات، عجیب شگفتگی یہ اشارے ہیں جو اسے واضح کرتے ہیں کہ ان بچوں کے لیے رسولؐ لوگوں کے دل و دماغ میں کوئی جگہ قائم کر رہے تھے۔

اس موقع میں خصوصیت یہ ہے کہ ایک قوم کا ہر ضروری خلیفہ کا ہادی جو تمام اخلاقی مذہبی، سیاسی اور فنی اختیارات کا مرکز ہے ایک بچے کے متعلق محبت چاہتا ہے۔ اب مجھ کو متنی صاف ہو جاتے ہیں۔ وہ لوگوں میں ایک قلمی داہنگی پیدا کرتا ہے۔ محبت کر کے یہ متنی ہیں کہ کم سے کم دشمن نہ کرو لیکن وہ دشمنی سے باز رہنے کی بھی ہدایت کر کے محبت کی طرف بڑھاتا ہے۔ ایسے شخص کی محبت کے متعلق یہ کوششیں اپنی آپ ترخان ہیں۔ محبت کی سفارش اس کے لیے کی جاتی ہے جو مجھ کے قابل ہے۔ یہاں ہرگز سفارش وہ ہے جس کی مصلحت کا شوق نہ لگتا ہو۔ اور اس لیے ہادی انھوں نے ”قابل“ کلمے سے پہلے سفارش ہے۔ اس پر اعتراض کا موقع ان کو حاصل تھا جو سفارش کے وقت موجود تھے نہ کہ ہم کو جو حسینؑ کے مددوں بعد زندہ ہیں۔ لیکن وہ جن کی آنکھوں اور جن کے کانوں سے رسولؐ سفارش کر رہے تھے انھیں اپنے تمام ظہری اور باطنی حواس سے زیادہ رسولؐ کے ارشاد پر اعتبار تھا۔ انھیں اس سفارش اور اس کے علاوہ اکثر غیر وقتی ہدایتوں کے متعلق تجربہ

ہوا کہ ان کے ہائی کا اندازہ کبھی غلط نہیں ہوا۔ اور نہ واقعات کا تاریخی مجموعہ حسین کے بعد لوگوں سے یہ کہلو سکتا تھا کہ رسول نے اپنی سفارش میں جلدی کی۔ عظیم الشان قحطی وہ ذات جس کی تعریف اس کے قاتل کریں اور احسان خاص اس عالم مہربان انسانی کا جس نے ایک امام کی امامت کے زمانہ کے قبل اسے پہچا کر حکومت کے لیے آسانی پیدا کی تھی۔

”اننا من الحسین“ کا زمانہ اور اس کے معنی میں سوچنا ہوں کہ رسول کا یہ منہ دینا کہ: ”میں حسین سے ہوں“ حسین کے اجداد ہی زمانہ

میں نہ تھا بلکہ رسول کے آخری زمانہ میں کہنا مناسب ہو گا جس وقت رسول کی کوئی اولاد باقی نہ تھی یہ حضرت فاطمہ زہرا کے اور اس لیے اس کے ظہر معنی یہ تھے کہ میرا (یعنی محمد عربیؐ) کا جلا وطنی (نام حسین سے باقی رہے گا لیکن اگر ”میں“ یعنی امامت میں منصب ہدایت کا خیال بھی ضمیر تھا تو حسینؑ اپنی تربیت اور تعلیم اور علم کے علاوہ ہدایت خلق کے قابل ٹھہرانے لگے تھے اور اس طرح رسول کے منصب ہدایت نے حسینؑ کی ذات سے اپنا شخص قائم رکھا۔ آگے چل کر حسینؑ کے آخری واقعات نے رسول کے اس ارشاد میں جو معنی پیدا کیے اگرچہ وہ ایک مؤرخ کی نگاہ سے شواہدات تھے لیکن حسینؑ کے طرز عمل کی قوت نے اس مفہوم ثانوی کو معنی اصلی قرار دیدیا۔ یعنی اپنے فناء کے دین کی اصلی صورت کو اپنے علم و حق روی اور جزم و استقلال سے دکھا کر اس بھڑی ہوئی صورت کو پہچا دیا۔ جسے لوگ اس علیٰ اصل صورت سمجھ گئے تھے کہ وہ صاحب اختیار لوگوں کی بنائی ہوئی تھی اور اس لیے وہ وقت نہ آئے دیا جس میں کوئی نکتہ مذہب کی حقیقی روح کی کمال فکاہا جاتا اور صورت مسئلہ جیسی ہو گئی تھی اس کے علاوہ جو بڑی اور اکیلی قربانی برسرِ شوق سے گوارا کی گئی اس کے علاوہ کسی اور طرح ہمیشہ کی حد بندی ممکن نہ تھی۔ دین کی لطافت کو اس طرح قائم رکھنا رسولؐ کے نام کے سبب داغ روشنی کو قائم رکھنا خدا یہ حسینؑ نے قائم رکھی۔ کیسے قتل ہو جاتے زین العابدین جب رسول کا نام رہنے والا تھا اور کیونکر دین کی لطافت ضائع ہو جاتی جب رسول کی شہادت سے ممتاز ایک نفس دنیا میں موجود تھا۔

حسینؑ کا گہوارہ اور ماں ابھی جم گہوارہ کی عمر سے آگے نہیں بڑھے۔ کون جانے کہ ان نفوسِ قدسی کی ضرورتوں کی کمی کے باوجود طاہرہ خانہ داری کی مشغلوں میں مشغول رہتی ہوں اور

حسینؑ ماں کی گود میں پہنچنے کے قبل چھپے رہتے ہوں۔ روایت ہے کہ جب امیر نے حضرت زکریاؑ سے خواہش کی تھی کہ وہ رسولؐ سے ایک کثیر طلب کریں لیکن طلب کا وہ وقت چلانے کیلئے حلا کے وسیع فاطمہؑ کی تعلیم کے لیے مشہور ہے۔ غالباً یہ عقد کے اجداد ہی زمانہ کا واقعہ ہے۔ اور اگرچہ حضرت خضر ہادی خاتون کی مشہور کنیزوں لیکن ولادت حسینؑ کے وقت ان کا کہیں تذکرہ نہیں ہے۔ یہ بھی تذکرہ ہے کہ رسولؐ حسینؑ کے رونے کی صدا سن کر بے چین ہو جاتے تھے اور ان کے اس سوال کے معنی کہ کیا تم نہیں جانتیں کہ حسینؑ کے رونے سے مجھے طبیعت ہوتی ہے۔ یہ ہیں کہ حسینؑ کو بھلانے رہا کرو۔ صورت دوسری ہوتی ہوگی جس وقت زمانہ بھی ہاتھ بٹانے کے لیے موجود رہتی ہوں گی۔ یا امام امین اور اس کا بچہ مدد دہی ہوں گے۔ بے چاری ام امین کی تو ایک مرتبہ اس لیے تلویب بھی کی گئی کہ انھوں نے حسینؑ کو رسولؐ کی گود سے کسی قدر بے احتیاطی سے کھینچا تھا۔

کون اندازہ کر سکتا ہے سیدہ کی اس شکین اور خوشی کا جب وہ غم غلا کھینے کے لیے جمونے کے پاس کھڑی ہو جاتی

ہوں گی، ماں اور اس کی سہیلیاں کسل شوق سے تازہ بچے پر گڑی رہتی ہوں گی اور دیکھنے سے میری نہ ہوں گی۔ نہ پیار کی تکرار
 ذائقہ میں کوئی کمی کرتی ہوگی۔ بچے متین آنکھوں اور خندہ چہرہ سے ماں کی طرف دیکھتا ہوگا۔ یہاں تک کہ ماں کا ہنسنے سے
 چہرہ میں منتہی ہو کر وہ عالم پیدا کرے گا جو بچے کی بھول، ہنسی، کھی جانے، ع: "بسم تھا کہ جنت کی فضا کا ایک نمونہ تھا۔" محرم
 ہو گئی تھی یا بہارِ عالمِ قائم اور ماں دنیا کے تمام خوشیاں اس ایک ادوار پر صدقہ کرتی ہوگی۔ راتوں کا جاگنا اور تمام نکلینوں کا
 طالع اس ایک لمحہ سے ہو جاتا ہوگا اور لوریاں دینے میں نظر کے ساتھ دل بڑھتا ہوگا اور حسین کے دل کے لیے پکی زبان
 ہوگا جب کہ وہ ماں کے رحم و کرم، نرمی، علم اور پاکیزگی سے اثر لیتا ہوگا۔

ایک اندوہناک عکس یہ وقت تھا جب کہ بتول حذرا کے ہاتھ حسین کی نرم گردن کو شانوں پر استوار
 کرتے تھے کون جانتا تھا کہ اس لیے کہ ایک دن اس کے خون سے بے حس
 اور بے ادبیاں فواد رکھا جائے لیکن نہ اس کے قلبی کہ وہی نرم گردن جو گوارے میں زکریہ کے دستِ اقدس کے
 سہارے چھوٹی تھی۔ ایک دن ایسی سخت ہو جاتی کہ تیس ہزار شاہی تلواروں کا وزن اسے جھکانے سے روکتا تھا۔ فاطمہ کو اپنے مکتوں کی
 داد ملی۔ چار اہم دستاویزی شاعر بھی خون کے ذریعہ سے توارثِ صفات کا قائل ہے۔ جہاں وہ کہتا ہے کہ: ۷۷

غیر خیر بھی نہ تھا پھر شیر خدا یہ ظلم تو فقط فاطمہ کے شیر میں ہے
 گود اور جھولے کی عمر اس طرح ختم ہوئی کہ حسین بھی رسول کے دستِ اقدس پر اور بھی
جھولے کے بعد شائے سے لگے ہیں۔ گھٹنوں چلنے کڑے ہونے اور چلنے کی کوشش کے متعلق
 خبریں ہیں کہ لڑکھائیاں گے اور رسول پکار اٹھیں گے کہ اسے فاطمہ سنبھال لو حسین کہ لڑکھاتے ہوئے آہستہ آہستہ مسجد
 میں پہنچ جائیں گے رسول دھکا دھکاتے ہیں گے دیکھیں گے اور اس خوف سے کہ مبادا اگر کر سورتے نہ لگیں، منبر سے اتر
 آئیں گے گود میں لیں گے حسین نہ ہتھ پڑے ہوئے کھول دیں گے۔ رسول پکار کر کہیں گے اور ساتھ ہی اپنے دُورِ محبت کا
 احساس کہ کے لوگوں سے کہیں گے بلکہ اقرار کریں گے کہ ہم سے میری ہو سکتا اور ہم نے اپنی تقریر ختم کر دی۔ رسول کے
 ازبلا محبت پر کبھی کسی یہودی نے طعنہ بھی دیا اور آپ نے فرمایا کہ: "اگر تم خدا اور رسول پر ایمان لاتے تو مجھ کو
 موجبِ رحمت و راجت سمجھتے۔"

ہاں میں کچھ اور قوت آتی: اب کڑے ہو سکتے ہیں۔ ماں کی محبت نے سرخ کپڑا پہنا دیا ہے۔ نانا کے پاس چلے
 کاندھا اٹھلا میں تھا۔ جھومنے لگے۔ رسول سو گھٹتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ یہ میرا بچا ہے۔ ابھی حسین کو کیا فکر ہے کہ نانا
 کی محبتِ عبادت میں دخل نہ دیں۔ لیکن نہ تھا کہ یہ قریب پہنچیں اور گود پہلو شائے اور پشت کو جولا نگاہ نہ بنادیں۔ کوئی
 مرکب کی تعریف کرے لیکن رسول فوراً راکب کی تعریف پر آملا ہو جائیں۔

کم عمری کے واقعات کا اثر ابھی برس ڈھب برس کے ہوئے تھے اور اس وقت تک قیام
 نے کچھ الفاظ زبان پر جاری بھی کر دیے تھے کہ غزوہ بنی مطلق میں
 لشکرِ اسلام کو فتح حاصل ہوئی اور منہ تمام نہ ہوا تھا کہ حدیث کی بڑی جنگ میں لشکرِ اسلام کی نازک حالت کو خدائے اس
 درجہ فتح اور قوت سے بدل دیا کہ آئندہ کے لیے رسول یہ اعلان فرما سکتے کہ مشرکین اب پیش قدمی نہ کریں گے۔

یہ ان (وٹس اور بیورو) کی مجموعی کوشش کی ناکامی تھی اور اس کا اثر پاس ان سب پر طاری ہوا تھا۔ حسین ابھی اس قابل نہ تھے کہ اس جنگ کے بڑے نتائج کو سمجھ سکتے یا اس لڑائی کے مفید نکات کے احساس کے قابل ہوتے۔ لیکن جوش کا سن آنے والا تھا۔ اس وقت بھی یہ جنگ بغیر اس کے کہ حسین کے بھولے دل پر اثر ڈالتی یوں ہی نہ گزری۔ بچے میں باپ اور کھلانے والوں کو چند مہینہ کے بعد سے پہچانتے لگتے ہیں جو ان کے چہرے، ان کے ہنسنے اور گد میں اظہار میں سے ظاہر ہے۔ درحالیکہ نئے آدمیوں یا بچوں نے ہوش کی صورت کے ذرا سے تغیر کو دیکھ کر نہ صرف ہلکا ہونے میں بلکہ پاس تک نہیں جاتے۔

جنگ خندق میں باپ کا زخم سر اور حسین حسین اپنے پدر بزرگوار کے بیچ و سلام چہرہ کے دیکھنے کے حوالی تھے۔ ابھی زخمی، خون آلود یا پانی بند مانتا چہرہ

ان کے تجربہ کے باہر تھا۔ دروسر چہرہ کی زردی، اور بے مٹی سے چہرہ کے عالم اور تغیر کے فکر نہ تھے۔ غالباً میں یوں کے مطالعہ حرکات میں غلطی نہیں کرتا کہ جناب امیر کے گہرے زخم اور چہرہ کے تغیر کو دیکھ کر جناب امیر کے ہاتھ پھیلانے اور خود گود میں جانے کی خواہش کے باوجود حسین گود میں نہ گئے ہوں، بھانپ کر ”اب“ (بابا) کہا اور پھر رونے لگے۔ چہرہ تک کئی مرتبہ کی کوشش یا چند دنوں کی عادت نے بے خوف نہ کر دیا۔ حسین کو ابھی معلوم نہ تھا کہ باپ کا یہ زخم کھانا کسی مہلک تھی اور اس نے جو نتیجہ حاصل کیا اس کے لیے وہ ایک سے زیادہ زخم خوشی سے کھا سکتے اور کھاتے۔ نہ انھیں یہ معلوم تھا کہ یہ پاس کے علاوہ زخم نے علی کی ہمت، استقلال اور وجہ حق کی مدد میں کئی صحت نہیں پیدا کیا تھا نہ ان کے چہرہ کے غیر فانی منتہی نے ان سے دوری اختیار کی تھی۔ لیکن علی کی طبیعت کے سکون اور چہرہ کا اطمینان حسین کے اثر پذیر نفس کے لیے ایک غیر ضائع نقش تھا۔ اور بہت اثر آفرین کا وہاں طبیعت کو بلند کیے بغیر نہ رہ سکتا تھا۔ اور اسلام کے یہ اداکار اپنی بلندی اور فز کو انگھاری اور تسلیم و رضامندی خرقی کر دیتے تھے۔ ان کے لیے یہ ان کا خاصہ تھا۔ ہمارے لیے ان کا عمل بے احتیالی اور تہی غری سے بچنے کا نسخہ تھا اور ابد الہا تک کا نگہ نگار کی نصیحت تھی۔ بلندی کا امتیاز قانون الہی کے امتیاز سے کیوں بے ہوش کر دے جس میں غفلت کے ساتھ خود بخود قدم چمکنے لگتے ہیں۔ یہ سنہ تمام نہ ہوا تھا کہ نبی قرظہ اور نبی سعد کی موقع بینی کو سزا دی گئی اور اس سے حسین کے پدر بزرگوار کی بدولت مسلمانوں کی مالی حالت میں کچھ اضافہ ہوا۔ سترہ یا حسین کی عمر کا دوسرا برس شروع ہوا تھا کہ ہر وقت آنسو ضرر مشرکین کو حدیبیہ کی چوٹی سی شکست کے بعد عہد کرنا پڑا جو اگرچہ رسول کی صلح پسندی کی بدولت برابر کا عہد تھا لیکن یہ اسلام کے لیے ”فتح مبین“ تھی۔ اس لیے کہ اب مشرکین اپنے چہرے بھارے تھے و نیز اس لیے کہ اب ہمت سے لوگ اسلام میں داخل ہو رہے تھے۔ اس عہد میں دوسری خصوصیت اس لیے تھی کہ مشرکین کو کسی ایسے عہد پر اعتبار نہ تھا جو علی کے ہاتھ سے نہ لکھا جائے۔ وہ پاس قربت ہو۔ علی کی ذات کا اعتبار ہوا یا رسول کے فوجی حصر کا اقرار شریک کرنا ہو۔

دیکھنے چلنے اور تنہا کی عمر اور جنگ خیبر حسین اب پورے دھمکی برس اور حق سڑے تین برس کے تھے کہ غیبہ کے لیے فوج کشی کی گئی۔ اب تک یہ عمر بہت کچھ گئے اور کھانے کی نہ تھی لیکن پاؤں پاؤں چلنے تنہا کی اور دیکھنے کی

مرد تھی۔ قوی الجذہ اور میج ان کو اس والدین کے بچے نہ صرف جلد بڑھتے ہیں بلکہ ان کا شوہوش بھی نسبتاً ناموافق حالتوں کے بچوں سے جلد جوتا ہے۔ علیٰ اور فاطمہ کے یہ بچے دیکھتے ہیں کہ آئینس مزاج گھوڑوں کے پیچھے گھوڑے اور سواروں کے پیچھے دیسے ہی پر دلولہ سوار بیٹھے ہیں۔ پیارے اور ان کی گھنی صفیں دور تک پھیلی ہیں۔ نیزوں کا جھگل، سواروں کی زین اور پیادوں کے ہاتھوں میں آگ آیا ہے۔ قفل و حرکت سے نکواریوں کی جوش خیز مدانیوں سے بلند ہے۔ چہروں پر آگ کا غازہ ہے۔ پدر بزرگوار کامل سکون و وقار سے اسلام کا علم لیے ہیں۔ اگرچہ ہوا پھرہ سے کھیل رہی ہے اور یہ ہاتھیں مل جل کر ایک عالم پیدا کرتی ہیں جو اثر کی ممتاز حیثیت رکھتی ہیں۔ حسنین حیرت آلود چہرہ سے یہ دیکھ کر نانا کے پاس دریافت حاصل کے لیے دوڑے ہوں گے اور اس وقت انھیں اس خند سے مشکل پڑ گئی ہوگی کہ ہمیں کاندھے پر بٹھالو۔ اور رسول اس طرح فوجی تیاری اور روانگی کا مصلحت کر رہے ہوں کہ یہ لوگ آویزہ دوش ہوں اور فوج نے اپنے ہاوی اور قوم گر کو اس صورت سے دیکھ کر خوشی کے نعرہ بلند کیے ہوں یا نعرہ نکسیر گونج اٹھا ہو۔ اور حسنین اپنی اس راحت جاں نشست کی بلندی سے کبھی طفلانہ حجب انگساری اور کمی حیرت کی پیش قدمی سے اسلام کے اس بڑھتی ہوئی فوجی قوت کو دیکھ رہے ہوں۔

حسین کے سوالات اور ماں کا جواب بڑھ گیا لشکر اسلام یہاں تک کہ مشتاق دیکھنے والوں کی نگاہ سے آخری صف کی سیاہی اور بلند سے بلند نشان فوج اوجھل

جو گیدہ چسپ ہوتی وہ قرر اگر موجود ہوتی جس سے حضرت فاطمہ زہرا اپنے ان بچوں کو پہناتی ہوں گی جس وقت وہ نانا کے لیے چلتے ہوں گے یا کہتے ہوں گے کہ ہمیں بھی پہنچا دو۔ یا جب آپس میں بات کرتے ہوں گے! طفلی کے بھولے سوال اور سادگی کی زیادتی آئندہ کے لیے بچوں کی تیزی عقل اور نیک نفسی کے آثار میں ہے۔ یہ وقت ہے کہ اگر بری طبیعتوں سے دور رکھے جائیں اور اچھے صفت نفس سے مس ہوتے رہیں تو آئندہ ان کی اچھالی کے لیے پیشین گوئی کی جاسکتی ہے۔ ان کے بھولے سوال کا محلول جواب مفید جوتا ہے اور ان میں جانتے کی سرگرمی پیدا ہوتی رہتی ہے۔ کسی طریقہ کی، پسند یا عدم پسند کا یہ بہترین وقت ہے اگر انھیں راستہ بتایا جاتا رہے۔

حسین کیا بوجھ سکتے ہیں اس کے کہ باپ اور نانا کہاں گئے ہیں۔ اور زکیہ کیا فرائض ہوں گی۔ یا اس کے کہ اسلام اور قوم کے عزت کی حفاظت کے لیے دشمنوں کو دفع کرنے گئے ہیں۔ فتح کی دعا کے لیے فرا کر انھیں وہ مرکز بتائی ہوں گی جو وہاں سے شروع جوتا ہے۔ جہاں سے انسان کے تمام ذرائع ختم ہو جاتے ہیں۔ اور طریقہ بتانے کے لیے چھوٹے چھوٹے ہاتھ آسمان کی طرف بلند کر دیتی ہوں گی اور کیا یہ بھی فرائض ہوں گی کہ جب تم بڑے ہو گے اور ایسا ہی وقت آنے کا تو تم بھی ہتھیار سلجھال کے حفاظت اسلام کے لیے لڑنے جاؤ گے اور بچے بے سوچے خوش خوش کہتے ہوں گے کہ ہاں جائیں گے اور ماں کا دل یہ سن کر آپ سے آپ ہر آتا ہوگا!

نتیجہ نہ سمجھتے تھے لیکن کیا دیکھتے تھے حسنین کی عمر ابھی فتح و شکست کے نتائج سمجھنے کی نہ تھی نہ ابھی یہ جانتے تھے کہ محدوش موقع رہتہا ہجرت کس درجہ دشوار چیز ہے۔ نہ اس کا اندازہ تھا کہ پدر بزرگوار کی کارگزاریوں کے صلہ میں رسول کے استقبال، بغل گیر ہونا اور پیشانی پر بوسہ دینے کا طبعی ترجمہ کیا تھا لیکن یہ دیکھ سکتے تھے کہ لوگ اب کس طرح ان کی تعظیم کرتے ہیں اور یہ بھی دیکھتے ہوں گے کہ یہ لوگ کیسے

خوش خوش دلیس آئے ہیں۔ یہ سننے کے دن تو آنے والے تھے کہ اس واقعہ نے اسلام کو کس درجہ قوت دی۔

خمس اور ذک کا نام سنتے ہیں اور مثالی چچا کو پہچانتے ہیں
ان کی اس عمر کا واقعہ تھا کہ بنی ہاشم خمس سے مخصوص کیے جاتے

اور حضرت عثمان باوجود طلب اس میں شریک نہ کیے جاتے، اور ابی حسین پورے تین برس کے نہ بچے ہائے تھے کہ ذک کا واقعہ ان کی مادر گرامی کے نام لکھا گیا جس کے لیے ساتویں برس انھیں بحیثیت مدعی کے مدعا علیہ ابن ابوقحافہ کی عدالت میں جانا پڑے۔ اس جنگ نے بھی نہ صرف مسلمانوں کے مالی حالت میں اضافہ کیا جو ان کا مالیہ حیات ہو سکتا تھا بلکہ مسلمانوں کو اکابر عرب بھی بہت سے ملے۔ حسینؑ نے اسی زمانہ میں اپنے چچا حضرت جعفرؑ ابن ابی طالب کو دیکھا جن کی صفات اور ان کے اسیرہ شجاعانہ کارروائیوں کے بچنے کا زمانہ آنے والا تھا اگرچہ حالات اسی وقت بہت کچھ سنے ہوں گے۔ اس طرح ہم حسینؑ کی سترہ تین برس کی عمر تک پہنچ گئے اور عجب نہیں ہے کہ حسینؑ کے مضبوط کھڑے ہونے، چلنے اور دوڑنے کی عمر

اُس میں کبھی لڑنے کی روایت اسی زمانہ سے متعلق ہو۔ یہ روایت اس وقت کی ہے جس وقت حسینؑ اپنے بچوں پر مضبوط کھڑے ہو سکتے تھے اور اس کے بعد یہ روایت ہوگی کہ رسولؐ کہیں تصریح لے جاتے ہیں اور حسینؑ کو گھر کے باہر بچوں کے ساتھ کھیلا دیکھتے ہیں۔ یعنی اب وہ گھر کے قریب قریب مقامات کے پہنچنے کے قابل ہو گئے تھے۔ رسولؐ کا پیار سے دوڑنا کہتا ہے کہ انھوں نے جس طرح کے مشغلہ میں حسینؑ کو دیکھا تھا وہ قابل چشم نمائی نہ تھا۔ اس وقت کی صورت یہ تھی کہ رسولؐ نے ایک ہاتھ پشت اور ایک ٹھڈی پر رکھ کر سیدھا کر دیا تھا کہ طفلانہ ناز انھیں بھاگنے نہ دیے۔ جس سے پیار کرنے میں ہرج و مرج واقع نہ ہو۔ اور یہ روایت اس سے سن کی ترقی ہے کہ اب گھر باگھر کے تفصیل نہ تھے بلکہ بنی ہاشم میں چلے گئے۔ ہم نہیں جانتے کہ اس عہد میں کون سے لوگ

مضطربانہ تلاش

آباد تھے جس سے یہ معلوم ہو سکتا کہ ابوذرؓ اسے ٹھکانا معلوم کر کے لانے کے لیے رسولؐ کا روانہ ہونا محض ماں کی تسکین اور بچے کے مضطرب نہ ہونے کے لیے تھا یا خود بھی اس اضطراب سے تھا کہ مہارادہ کسی دشمن خصوصاً کسی پہنچے ہوئے یہودی کے ہاتھ میں نہ پڑ جائیں جن کے متعلق وہ صحیح ہو یا غلط یہ الزام ہے کہ وہ غیر قوم بچوں کو قربانی کے لیے گرفتار کر لیتے تھے، اور روح فرسا ہے یہ خیال کہ یہ چار برس کے قریب کا بچہ اس لیے گھر سے باہر نکل گیا تھا کہ بھوک نے رہنے نہ دیا تھا۔ اس لیے کہ ان کے گھرنے، حکومت اختیار مال اور رخ کو ذاتی آرام سے نسبت نہ دی تھی اور اس بلند ترین درجہ پر تھے کہ اس سے دوسروں کو راحت دی۔ ان کے سوا تاریخ عالم میں کوئی دنیاوی یا روحانی رئیس نہ تھا جس کی خدا سے یہ دعا ہوتی کہ: ”ایک دن دے کہ تیرا شکر کریں اور ایک دن بھوکا رہے کہ تم سے طلب کریں!“

ان کا خود پسند فقر مذہب عالم کے روسائے روحانی سے اس لیے ممتاز تھا کہ یہ تارک الدنیا اس مفہوم میں نہ ہوتے تھے کہ انھیں مقلدین کا اعتقاد نوالے دیا کرے۔ انھوں نے عالم اور اہل عالم کو اپنا ہاوری خانہ اور ہاوری نہ بنایا تھا۔ یہ سخت کراہت اور نفرت سے ان کی طرف دیکھتے تھے جو جائز طریقہ سے حصول معاش سے قسائی کرتے تھے بلکہ حصول معاش کی خود مثال دیتے تھے۔ اسی طرح وہ ان کو بھی نفرت سے دیکھتے تھے جو اپنی ثروت کو نسبتاً کم موقع مخلوق کے املاج

رعونت بننے کا ذریعہ سمجھتے تھے

حدیقہ بنی نجار کا مفید موقع
دوسرا موقع آیا اور اس مرتبہ حسینؑ حدیقہ بنی نجار میں پہنچے۔ وہی محلہ جس نے سب سے پہلے مدینہ میں رسولؐ کا استقبال کیا۔ نبی اللہ کے ساتھ نہ صرف اصحاب تھے بلکہ جناب امیرؓ بھی تھے۔ کون جانے کہ اس مرتبہ گھر سے اسی دیر غائب رہے ہوں کہ جناب فاطمہؑ زہرا کو گم ہو جانے کا اضطراب پیدا ہو گیا اور ان کے رنج و انتکار کے لیے جس قدر خود اپنی محبت سے رسولؐ تشریف لے گئے ہوں اور اس حالت نے نہ صرف جناب امیرؓ بلکہ اصحاب کو بھی ساتھ کر دیا ہو۔ اس حالت کے معنی یہ ہیں کہ حسینؑ کے ساتھ رسولؐ کے قلمی میلان کو اصحاب اس قدر جانتے تھے کہ مروت ہی سے بھی لیکن ساتھ رہنا ان کی خوشنودی کا سبب سمجھتے تھے اور حسینؑ کے متعلق رسولؐ کے کسی اضطراب میں شرکت کرتے تھے۔ مل گئے حسینؑ اور سب سے پہلے جس نے گود میں اٹھالیا رسولؐ تھے اور دونوں کاندھوں پر دونوں صاحبزادوں کو بٹھا کر چلے۔

حسینؑ کا احساس اور امتیاز
اصحابؓ یہ تمکین نہ تھا کہ وہ اس کی خواہش نہ کرتے کہ رسولؐ کو سبکدوش کر دیں۔ حسینؑ نہ اترے۔ اب علیؑ نے خواہش کی۔ لیکن حسینؑ نے رسولؐ کو نہ چھوڑا اور جو جواب ملا ہے وہ یہ ہے کہ: ”میں مٹا کا کاندھ حازرہ محبوب ہے۔“ ہو سکتا ہے کہ ”محبوب“ کا لفظ کسی راہی کا ترجمہ جذبات ہو۔ لیکن یہ صحیح ہے۔ حسینؑ کا محض یہ کہنا کہ: ”ہم مٹا کے کاندھے پر رہیں گے۔“ یا کچھ نہ کہنا اور رسولؐ کے کاندھے سے نہ اترنا، یزیدؓ کا مدد کرنا خیال کے اور کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اس روایت کی دیکھی اپنے موجودہ درجہ پر نہ پہنچتی اگر علیؑ نہ ہوتے، یا ہوتے مگر ان کی گود میں لے لینے کی خواہش نہ ہوتی یہاں ایک قانون قدرت ظاہر ہے اور وہ یہ ہے کہ یہ نسبت علیؑ کے رسولؐ میں محبت کا عنصر زیادہ ہے۔ اس کا معیار چھوٹے بچوں کا قلمی میلان ہے۔ وقت ہوتا ہے کہ علم نفس کے جاننے والے اور تجربہ کار جذبات شناس معاملات میں حکم قرار دیے جاتے ہیں لیکن ایسا بھی وقت ہوتا ہے جہاں ایسے بچے جن کے دل پر جذبات کے بہت سے نقوش نہیں ہیں کسی خاص جذبہ کے لیے اپنی فطری میلان سے بچ کوئی ہو سکیں۔ یہی قانون تھا کہ ہمارا اہلوی اپنے گہوارہ میں حضرت علیمہؑ کو منتخب کرتا اور یہ ہر اس گھر میں کہا جاسکتا ہے جسے خداوند تعالیٰ نے بچوں سے مورد رحمت قرار دیا ہو۔ اکثر توبہ دیکھا گیا ہے کہ باپ میں ماں سے زیادہ محبت ہے۔ اس لحاظ سے کہ بچوں کے تعلق کے ساتھ عام عموما تین چار برس تک ہوتا ہے مسم اس روایت کے لیے بھی یہی زمانہ تجویز کرتے ہیں کہ رسولؐ کو نماز کے لیے مستعد دیکھ کر حسینؑ بھی کھڑے ہو گئے اور محکمبیر کا اعلاہ کرنا چاہا۔ لیکن زبان سے صاف نہیں نکلتی۔ رسولؐ دھراتے جاتے ہیں، یہاں تک کہ ساتویں مرتبہ صاف اور صریح ادا ہوئی۔ بڑا ہے وہ خدا جس کی بڑائی رسولؐ نے حسینؑ کو سکھائی ہو۔ اور بڑا تھا وہ خدا جس کے سوا حسینؑ نے اپنے وقتوں میں کسی کی بڑائی کا استہوار نہ کیا۔ اس وقت کی سکھائی ہوئی نماز حسینؑ کو زیرِ خبر بھی ملا تھی۔

۲۰ رمضان ۸ شہر فتح مکہ اور حسینؑ
حسینؑ نے پانچویں برس میں قدم رکھا تھا کہ اسلام کے داعی قیام کا واقعہ ظہور میں آیا۔ رسولؐ مکہ میں داخل ہو رہے ہیں جو کہ رسولؐ کو خدا کی زمینوں میں سب سے زیادہ پیاری تھی اور جہاں سے بہ جبر جلا وطن ہوئے تھے۔

بنی امیہ کے ساتھ رسول کا احسانؑ ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کے باوجود رسول سے کہتا ہے اور سعد ابن حبلہ کے گرم لفظ سے قرا جاتا ہے۔ رسول نے علیؑ کو "نزی سے

داخل ہونے کا حکم دیا" اور مزید تالیف کے لیے ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کے باپ اور زید کے دادا کے گھر کو اماں دی۔ شہریش آج مشہور شہرہ شکستہ خاوری اور یاس سے رسول کے ختم کو دیکھ رہے تھے اور باوجود اپنی گزشتہ کارروائیوں کے اپنے کرم کرنے والے بھائی کے بیٹے سے بھائی چارہ ہے تھے۔ رسول انھیں بھائی کہنے سے منع نہیں کرتے۔ لیکن برادرانِ یوسف کا استعمار استعمال فرماتے ہیں، اور اعلیٰ ترین کرم انہی سے فرماتے ہیں کہ: "جو سب لوگ آزاد ہو۔" اور یہ حیرت خیز اتفاق بھی اس کے بعد تھا کہ وہ بلادِ طین جے کو صفا کی چٹیاں اپنے اہلِ ہدایت میں پناہ نہ دے سکتیں، آج انھیں پر جلوہ افروز ہوتا۔ انسانوں کی بیتی ہوئی ندی پستی سے بلندی کی طرف جاتی، اس لیے کہ نبی اللہ کے ہاتھوں کو ہوسہ دے لے۔ کو صفا کا یہ دوسرا نظارہ تھا۔ مسم ایک تیرے حیرت انگیز نظارہ پر بھی توجہ دلائیں گے۔

اگرچہ یہ کہیں مذکورہ نہیں ہے کہ حسینؑ کہاں تھے لیکن یہ یقینی امر ہے کہ وہ بھی اس وقت اپنے نانا اور دادا کے قدمِ وطن کو دیکھنے آئے تھے۔ ان کی موجودگی اس خیال سے نہیں ہے کہ رسول اور جناب امیرؑ تھے، بلکہ اس وجہ سے کہ جنابِ فاطمہؑ زہرا بھی تشریف لائی تھیں۔ جن کی تشریف آوری اس روایت سے صدیق ہے جب کہ حضرت ام ہانی اپنے برابرِ معکم کی بر لطف شکایت کرنے گئی تھیں اور بھلاؤ نے انھیں شکایت پر ٹوکا، جو نظمیں انداز کی نرم تنبیہ بھی جاتے۔ غالباً پہلا موقع تھا کہ حسینؑ کسی فرج کے ساتھ روانہ ہوئے تھے ایک آدمی صوفی لڑائی کا عالم اور گرم شور دیکھا یا قریب سے سنا تھا اور کیا عجب ہے کہ اطاعت اور اظہارِ عقیدت کے عام پیمان کو اس طرح دیکھا ہو کہ وہ اپنی مستند نشست پر ہوں یا پہلوؤں میں کھڑے ہوں۔ حسینؑ کے ہم انگیز مستقبل کے لیے یہ واقعات ناقابلِ سوچ تھے خصوصاً جب کہ یہ مکہ سے متعلق ہوں۔

حسینؑ کی عمر میں چند دنوں کا اضافہ ہوا تھا کہ حنین کا حشد و شومخ آیا۔ جس کی غمخس صورت یہ تھی کہ مسلمانوں کا غلوس سخت کھٹی پر کسا گیا۔ مولاۃ القلوب میں سے

ابوحنیفہ مسلمانوں کو منہزم دیکھ کر وحش ہو رہا تھا کہ "مسجد کا خاتمہ ہو گیا۔" اور شبیب بن عثمان بن ابی طلحہ جس کا باپ احد میں مارا گیا تھا آج باوجود رسول کے ہمراہ جانے کے رسول سے انتقام لینے کے لیے بے چین ہو گیا تھا۔

حسینؑ اور طائف کی صدائے بازگشت اور ان لوگوں کی یہ حرکتیں دیکھ کر صفوان بن امیہ یہ اصول تسلیم کر رہا تھا کہ: "میرے نزدیک یہ

زیادہ عزیز ہے کہ میرا ربی کوئی قرشی ہو اس سے کہ ہوازن کے کسی شخص کے ہالے پڑوں۔" لیکن اولادِ عبدالمطلب موجود تھی، ان کی حیات میں رسول کے نزدیک کسی کو پہنچنے کی جرات نہیں ہو سکتی تھی علی، جعفر، عقیل، عباس، قثم اور فضل بن عباس، ربیعہ، ابوحنیفہ بن حارث، عبد اللہ بن زبیر بن عبدالمطلب موجود تھے۔ پیش دہیں راست و چپ لگام اور رکاب تھامنے والے پروانے کی طرح شمعِ رسالت کے گرد پھر رہے تھے۔ اسامہ بن زید اور امین بن ام ایمن بھی حق تک ادا کر رہے تھے۔ ان لوگوں نے میدانِ جنگ کے حشد و شومخ کو چہلچہ کے لیے اپنی آنکھوں اور ہاتھوں میں لے لیا تھا کہ عباس کی بلند آواز کی گرج سنائی دی، اور "ایک نواہد" پر اظلاس اطاعت سے "لیک لیک" کہتے ہوئے

دور پڑے۔ اب میدان جنگ کا رنگ بدل گیا یہاں تک کہ تقسیم قیمت کے وقت تو ہاشمیانے چند مقتولین کے وہ پوری بارہ ہزار کی جماعت تھی جو روانگی کے وقت تھی۔ اس کے بعد رسولؐ نے مشرکین کے اس گردہ کی طرف توجہ فرمائی جو غلامانہ سب سے قوی اور حدودش تھا اور طاقت کی طرف بھاگا تھا۔ یہاں کی تمام مفید خدمتیں علیؑ کے حوالہ تھیں۔ اور کارگزاری کے بعد واپسی اس حیثیت کی تھی کہ رسولؐ علیؑ کو بیچ کر تکبیر کہہ اٹھتے اور دیر تک بصیغہ راز گھنگھوڑتے۔

ان تمام واقعات کے بعد رسولؐ کا واپس تشریف لانا چاہتا ہے کہ رسولؐ اپنی اس بیٹی کو جسے سفر سے واپس آکر پہلے دیکھنے جاتے تھے دیر تک دیکھتے رہے ہوں۔ نگاہ میں سب کچھ ہوگا۔ لیکن کون تھا جو پہلی نگاہ کے تمام جذبات کی شرح کر سکتا۔ اشتیاق تھا، محبت تھی، خوفناک یلدا دھت کا گزرتا ہوا کس تھا خدا کے اوائے فکر کی آہستہ حرکت تھی۔ نتیجہ کی خوشی تھی اور اب ان سب کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ رہے تھے۔ جس کی سب سے زیادہ محبت تھی لیکن سوچو اس وقت کو جب کہ حسینؑ ہمتوں کے چھوٹے ہوئے ناز بردار کے گزریے ہونے خوف کی حالت کو سنتے ہوں گے ان کے چھوٹے چھوٹے دل دھڑکتے ہوں گے۔ خوف کی تاریکی اور سامنے موجود دیکھنے کی خوشی عالم پیدا کرتی ہوگی کہ کبھی چاند پر ہلال آگیا ہے اور کبھی ہٹ گیا ہے۔ رسولؐ کی نگاہیں دیکھتی ہوں گی اور یا تو ذکر سے احتیاط کی ہوگی یا بھلانے اور خوش کرنے کی فکر کی ہوگی۔ اور بچے اس ذات کو نا شکستہ نظر اور مسلسل ہوش سے دیکھتے ہوں گے جس کے لیے کوئی خوف نہ تھا۔ اور جو ایسی حدودش مانتوں میں اپنے عظیم الشان وجود کی طرف سے اپنی وجہ کے لیے بے پرواہ ہو جاتا تھا۔ اور پھر یہ بھی سنتے ہوں گے کہ ہمارے پدر بزرگوار نے ایسے وقت کیا کیا اور ساتھ ساتھ اپنے اور عزیزوں کی وفادارانہ بے بھری سے بھی خوش اور متاثر ہوں گے۔ اور ان خبروں میں حسینؑ نے اپنی کھلائی ام ایمن کو اپنے بھائی کے غم میں افسردہ دیکھ کر اڑ لیا ہوگا۔

جمادی الاولیٰ شہرہ

یہ زمانہ خاندان رسالت کے لیے سخت غم کا تھا۔ اس لیے کہ امین کے ولی اور محافظ کا فرزند اسلام

حضرت جعفر بن ابی طالب کی شہادت اور آئندہ کا ایک اشارہ

کے بچے مددگاروں کی فہرست سے کم ہو گیا۔ میری غرض حضرت جعفر بن ابی طالب سے ہے۔ ہم ان کے قبل الاسلام خیالات کا کہیں تذکرہ کر چکے ہیں۔ جس سے معلوم ہوگا کہ یہ اپنے خیالات اور خصال میں کس درجہ قابلِ تعریف تھے۔ یہ پہلے نصیب تھے جس نے اصولِ اسلامی کی ماوراء الوطن فطرت کی اور اثر ڈالا۔ اور ایک زمانہ تک ہجرت اور جلا وطنی کی تکلیفیں اٹھاتے رہے۔ خیر کی فتح کے بعد ان کی واپسی رسولؐ سے کہلوا سکے کہ: ”مجھے نہیں معلوم کہ میں خیر کی فتح سے زیادہ مسرور ہوں یا جعفرؑ کی واپسی پر۔“ لیکن انھیں دنیا میں زیادہ رہنا نہ تھا۔ بالو کے تودوں اور گرم رگستانوں کی ہوا میں جسے اس لیے راحت تھی کہ وہ ایک اعلیٰ اصول کا سالک ہے اور سیکڑوں منزلیں طے کر سکتا تھا بغیر اس کے کہ کہیں راحت کی بگڑی ہوئی صورت بھی مشکین کے لیے ہو، وہ اب اس لیے بے چین تھا کہ اس کی روح راحتِ ابدی کی وسیع فضا (جنت) میں طیران کرتی پھرے۔ جعفرؑ سے زیادہ اس کا کون ممتحن تھا خصوصاً جب اس سیکڑوں اصلا ب شامخ اور ارمام مظہرہ کے نایاب موتی نے اپنی حیات دنیوی اس طرح ختم کی جو جس پر شجاعت اور استقلال کو دائمی ناز ہو۔ تاریخ شجاعت میں اسلام کے لیے یہ واقعہ مایہ افکار تھا۔ جب اس کا ایک فرد اس کی روح کا ایسا مجسمہ ہو سکتا تھا ایک ہاتھ لکنا دوسرا بھی قلع ہو جانا، اور ان دونوں سے خون کا

پر نامہ پہنچا اسلام کی مخالفت میں صحت نہیں پیدا کر سکتا تھا۔ اے کاش حضرت فاطمہ بنت اسد جوتیں، اور کرے جھڑے ہاتھ، اور کٹے جھڑے ٹکڑے کو چوم لیتیں۔ یہ حضرت جعفر کی بہترین داد اور حضرت فاطمہ بنت اسد کے شیر کا بہترین صلہ ہوتا۔ گھوڑا دشمنوں کی سیکڑوں تلواروں سے قہر ہو کر گر گیا۔ بے شمار تلواریں اس شیر پر اپنی برش آزار رہی ہیں۔ سر سے ہاتھوں تک بہتے ہوئے خون نے اعضا کو چھپا لیا ہے۔ لیکن شارع اسلام کے محافظ کا فرزند اس طرح کھڑا ہے کہ اس کے جسم کا ٹکڑے ہونا اس کی روح پر کوئی صدمہ نہیں پہنچا رہا ہے۔ جعفر کے خون سے رنجے ہوئے علم کا پھر راسب تک وجہ کر رہا ہے کہ ہم ایسے ہاتھوں اور ایسے شانوں اور ایسے سینے سے لپٹے ہیں۔ ہم تصفیہ نہیں کر سکتے کہ یہ حالت دیکھ کر حضرت فاطمہ بنت اسد پہلے روتیں یا چیخ کر تعزیت کر اٹھتیں۔ اگرچہ اس تعزیت سے زیادہ پرورد مرثیہ نہ ہو سکتا۔ علم شجاعت کا یہ نظارہ اور ارادہ کا یہ معجزہ اس وقت تک دکھائی دیا جب تک تلوار نے کمر سے دو ٹکڑے نہ کر دیا۔ کسی خاندان کسی قوم اور کسی ملت کے لیے یہ کارنامہ ایسی جائداد نہیں ہے جو تباہ ہو جائے۔ اسلام کی تاریخ اسی خاندان کی تاریخ نے اس واقعہ کو دہرایا، ایسے وقت میں جب کہ ~~مظہر بدر چہاڑہ~~ گئی تھیں۔

جعفر کی شہادت کا تعلیمی اثر
 بنی ہاشم کو جعفر کی شہادت کی خبر اس طرح معلوم ہوئی کہ رسول نے اولاد جعفر کو طلب کیا، اور سب کو یہاں کرنا شروع کیا۔ اس طرح کہ اسٹھوں میں آنسو ڈھنڈھا آئے تھے۔ اب حضرت فاطمہ زہرا بھی چیخ کر رو رہی تھیں۔ یہ وقت تھا کہ حسینؑ بورتے ہوئے ماں کو لپٹ جاتے اور ماں پوچھتے اور اس وقت انھیں معلوم ہوتا کہ میرے چچا نے کس طرح شہادت پائی۔ حسینؑ نے اپنے چچا کا کارنامہ شجاعت اپنی اسٹھوں سے نہ دیکھا تھا لیکن کیا سننے کے بھی قابل نہ تھے؟ زمانہ آنے والا تھا۔ حسینؑ جعفرؑ کی جیسی حضرت عباس بن علیؑ نے اسے دہرا دیا۔ یہ حسینؑ بھی دیکھ رہے تھے اس وقت تک کہ نہ تھا کہ حسینؑ اپنے چچا کو یاد نہ کرتے اور حسرت ہوئی کہ کاش اس وقت چچا اپنے اس بھوکے پیلے بچے کا حواس اور استقلال دیکھتے۔

بنی خرمیہ
 یہی زمانہ تھا جس میں حسینؑ رسول کو اس لیے غم و افسوس میں دیکھتے کہ ان کے ایک آدمی نے ان کے حکم کی خلاف ورزی کر کے بدنام کرنا چاہا۔ جس کا ہر طرح برا اثر پڑتا تھا اس لیے خلاف ورزی کی کہ اس وقت کچھ اختیار حاصل تھا کہ ایام جاہلیت کا انتقام لے سکتا اور پھر حسینؑ نے یہ بھی دیکھا کہ ان کے پدھر عالی حقدار بھیجے گئے اور وہ اپنے طرز عمل سے رسول کی خوشنودی اور شکریہ کے مستحق ہو سکے اس لیے کہ نری اور پھر ردی سے مظلوم جماعت کی اشک شونی کی تھی۔

متضاد باتیں اور ان کا اثر حسینؑ کی سماعت
 یہ موقع تھا کہ بچے متضاد افعال سنتے اور خیال کرتے کہ انسان میں یہ جذبات بھی ہو سکتے ہیں اور اگر ایک سے انسانوں کو یہ مصیبتیں اٹھنا پڑتی ہیں تو دوسرے سے تلافی ہوتی ہے۔

سند
 حسینؑ پورے پانچ برس کے ہو چکے تھے کہ قید طے پڑ مسلمانوں کو تسلط حاصل ہوا۔ علیؑ کی بدولت ہوا، اور اس میں رسولؐ نے دختر حاتم کے ساتھ جو برتاؤ کیا وہ حاتم کے شکاری بیٹے مدی کی مثال جو شریفانہ برتاؤ کی تعلیم تھی

اس درجہ پسندیدگی کے قابل تھا کہ وہ شام سے آتا اور مسلمان ہوتا۔ حسینؑ تعذیب کرتے ہوں گے کہ شریف قوم عورتوں کے ساتھ اگرچہ وہ مفتوح ہوں اور غیر مذہب کے کس طہر کا برتو کیا جاتا ہے۔

وادئ المل کا عصابہ اور کر بلا کا کرتہ یہی زمانہ سریرہ وادی المل کا تھا جس کی اہمیت بعض تہذیب کار انہروں کی ناکامی سے ظاہر تھی۔ جناب امیرؑ کا عصابہ

طلب کرنا بھی ایک نشانی تھی کہ صورتِ معاملہ کسی قدر سخت ہے۔ جناب امیرؑ کو اپنی آنکھوں کے سامنے عصابہ ہاتھ دھتے اور سب میدان جنگ کی طرف روانہ ہتھ دھتے دیکھ کر ظاہرہؑ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ کون جانے کہ حسینؑ کس طرح دیکھ رہے تھے اور ماں کو چشم بے آب دیکھ کر شہر گھوڑے کے اگلے سوں سے لپٹ گئے تھے یا نہیں جو روکنے کی مطلقانہ کوشش بھی جانے۔ لیکن یہ بھی دیکھ رہے تھے کہ پد بزرگوار کو فاطمہؑ زہرا کے آنسو اور ہم لوگوں کی بھولی صورتیں اور باتیں نہ روک سکیں۔ کیا معلوم تھا علیؑ اور فاطمہؑ کو کہ ایک دن آنے والا ہے کہ ان کا حسینؑ زخموں سے چور اس طرح لپٹے اہل و عیال کے سامنے آنے کا کہ پچھانا نہ جائے۔ اس وقت ایک جامہ لہد طلب کرے گا اور اسے اور چاک کر ڈالے گا۔

تبوک اور حسنینؑ اس وقت سے جب سے حسینؑ باپ اور نانا کو پھلتے لگے ہوں، اب تک صورتِ حال یہ تھی کہ کسی موقع پر جب کہ ان بزرگواروں میں کوئی گھر سے باہر جاتا تھا دوسرے کا جانا

و یا باقی جینی قتلہ لیکن تبوک میں ان کو تشکین تھی کہ اگر نانا نہیں ہیں تو باپ ہیں۔ نانا کے فرائض کے ساتھ ہیں۔ اور عجب نہیں ہے کہ لوگ بھی علیؑ کی خوشنودی کے لیے ان کے ساتھ زیادہ اظہارِ ارادت جاتے دیکھتے ہوں۔ اور پھر انہوں نے یہ بھی دیکھا کہ دفعہ پد بزرگوار کچھ خاموش اور کبیرہ سے بھاگنے اور مدینہ سے چلے گئے۔ لیکن پھر آئے اور اب وہ پیشتر سے زیادہ مطمئن اور خوش تھے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ جناب امیرؑ نے اپنے فرزندوں کو اس زمانہ میں اس درجہ ذی ہوش خیال کیا یا نہیں کہ وہ بتا سکتے کہ انہیں لوگوں میں جو ہمارے اظہارِ اطاعت اور غلوں میں مبالغہ کرتے ہیں کچھ منافقین بھی ہیں۔ جو ظاہر دشمنوں سے زیادہ مخدوش ہیں اور ہمارے یہاں رہنے کی اغراض میں ایک یہ بھی ہے کہ ہم ان کے حرکات و سکنات کو دیکھتے رہیں۔

رسولؐ کا تشریف لانا مسلمانوں اور خصوصاً اہل بیت کے لیے سب سے زیادہ ہامشہ و مہمورت تھا لیکن اس خوف سے مطلقاً خالی نہ تھا کہ دشمن ہر وقت تاک میں رہتے ہیں کہ کسی طرح ان کی ہلاکت کے باعث ہوں۔ اس نے مخلصین کے دل پر اظہارِ عقیدت اور یگانہ سلامت واپسی پر خاموش خشکی کی عید کی اور بڑھادی ہوگی۔ اور رسولؐ نے حسینؑ کو پھر ایک مرتبہ اس طرح بھیج کر سینے سے لٹایا اور پیار کیا جو کس طرح کوئی خطرہ کے بعد اپنے کو محفوظ دیکھ کر فطرتاً ان کی طرف اپنا قلبی میلان ظاہر کرتا ہے جو سب سے زیادہ محبوب ہوتے ہیں۔ رسولؐ ان سے زیادہ اور کسی پر توجہ نہیں فرما سکتے تھے، جن پر نصیحت کی کوئی چھینٹ نہیں پڑی ہو۔ کیا حذیفہ کے علاوہ رسولؐ نے ان بچوں کو منافقین کے نام بھی بتا کر انہیں ہوشیار رہنے کی تاکید کی ہوگی؟

ابتدائی تعلیم کے آغاز کے اشار میں سوچتا ہوں کہ غالباً یہی زمانہ ہو گا جس میں حسینؑ کی تعلیم کا آغاز کیا گیا ہو۔ اگرچہ اس کے ہامشہ و مہمورت آثار اور خبریں نہیں ہیں کہ

کسی خاص وقت، کس اللہ کی گنجی لیکن اس غیر صریح اطلاع سے ہم کام لیتے ہیں کہ رسولؐ ان کے فطانیہ حوصلہ تریخ کا تعذیب جانے کبھی لانے کے و صلیاں لکھوا کر کرنا چاہتے ہیں۔ و صلیاں لکھنے یعنی کتابت کی ابتدائی حالت تھی ابتدا کا اندازہ کیا

ہاں سکتا ہے۔ رسول کی احادیث حصول علم کے متعلق جس قدر ہیں اور خود جو کچھ ان کے اس علم سے ظاہر ہے کہ وہ اسیران اُحد میں سے پڑے ٹھوں کو انصار کے بچوں کی تعلیم کے لیے مقرر فرماتے ہیں۔ اس سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ آنحضرت نے اپنے محبوب نواسوں کی تعلیم کو ضروری وقت سے زیادہ ملتوی نہ کیا ہو گا۔ اور چونکہ اس کا کہیں اشارہ نہیں ہے کہ کوئی شخص حسنین کا معلم مقرر تھا، میں یوں اس کے تصفیہ نہیں کر سکتا کہ خود جناب امیر نے ان کی تعلیم ابتدا سے اپنے ذمہ لی تھی۔ جیسا اس کے بعد حسنین کے زمانہ شہدائے کربلا میں کہ جناب امیر نے تالیف مشرکین خود تعلیم فرمائی۔ حسنین کی تعلیم کا خیال لوگوں میں کس درجہ ہو گا اس کا اندازہ اس روایت سے کیا جاسکے گا کہ حسنین گھوڑے پر

سوار ہونا عباس سے سیکھتے ہیں اور وہ رکاب تمام کر سوار کرنے کو اپنے لیے باعثِ افتخار سمجھتے ہیں، اگرچہ وہ خود ہاشمی ہیں۔ حسنین کے زمانہ طفلی کی ذہانت کے آثار میں جو روایت ملتی ہے وہ غالباً اسی پانچ چھ برس کے سن کی ہے اور وہ اپنی طفلی کی مطلق میں اپنے کھیل کے ذوق پر غالب تھے۔ ابورافع و حسنین کی دلیل سے لوگوں میں مطلوب ہو جاتے ہیں آئندہ زمانہ میں حسنین کے نام نہ بنا کر لے گئے ہیں۔ جس پر ہم نظر کریں گے۔

حسینؑ کی روشن ہیئت
حسینؑ نے چھٹے برس میں قدم رکھا تھا کہ رسولؐ نے انھیں رومی طور پر مہلبہ میں شریک کیا۔ دیکھنے سے ظنی رکھتا ہو گا یہ عالم جس وقت یہ پانچ نفوس قدسی خدائی فیصلہ کے لیے تیار ہو کر گئے ہوں گے۔ ان کا خدا پر محروم ہونا اپنی سچائی کا تقین، اپنی فتح کی امید، ایک شانِ رکتی تھی جو ذوقِ محبت سے یہ کہلوا سکے کہ: ”میں چند آدمیوں کے چہرے دیکھتا ہوں کہ اگر وہ خدا سے پہلے کے ٹل جانے کی دعا کریں تو پہلڑ اپنی جگہ سے ہٹ جائے گا۔“

میں سوچتا ہوں کہ نصاریٰ خیران پر سب سے زیادہ دو بھولے بھولے، چاند سے متین مصوم بچوں کی موجودگی سے اثر پڑا۔ میرے لیے یہ سوچنا ممکن نہیں ہے کہ اساتذہ جن کے طرزِ عمل کی تاریخ آج ریشیل برس کی امام ہے، وہ ان مصوموں کے سامنے کھڑے ہو سکتے تھے۔ اس کے بعد واقف مہلبہ جو تائیانہ جو تا پانچ تن پاک فتح یاب ہو گئے۔ ذوقِ محبت کا اظہار اس کی طبعی خلست تھی۔ وہ ان نفوس قدسی کی عظمت اور جلالت کے مقابل کھڑے ہونے کا اپنے میں استقلال اور ارادہ نہ پاتے تھے۔ یہ موقع اسی قدر قانونِ الہی کا اظہار تھا جس قدر اور صلتِ مواقع ہوتے ہیں۔ کس میں ذرا احساس ہے اور وہ نہیں جانتا کہ ہم اپنے سے پست نفس کے سامنے اپنی نفس کی بلندی اور قوی کے سامنے اپنے نفس کی پستی کا احساس کرتے ہیں اور بغیر اس کے کہ ان میں سے کوئی کچھ کہے ایک قلبی تصفیہ ہو جایا کرتا ہے۔ اس حالت کو خود جناب امیرؑ نے ظاہر فرمایا ہے۔ جب کہ کسی نے آپ سے سوال کیا کہ آپ اپنے ہمسروں پر کیسے غالب ہوئے۔ اور فرمایا کہ: ”میں کسی شخص سے ملتی نہیں جو اگر یہ کہ اس نے اپنے نفس پر قبضہ دینے کے لیے میری اجازت کی۔“

حسینؑ کاندھے پر ہے اور وہ موقع نہ آیا کہ اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھ بلند کرتے۔ آسمان کی طرف اٹھتے اور بے گناہ لبِ زبان سے آمین کی صدا بلند ہوتی۔ خدا کے بلند کیے جاتے یہ بندے واپس نہیں ہو سکتے تھے مگر یہ کہ اپنے فتح یابی

سے پاکیزگی کی عظمت اور اس کی بلند کرنے والی لہریں محسوس کرتے۔ کون روکنے والا تھا حسینؑ کو کہ ذرا سا کندھے پر تھن نہ جلاتے اس کے بعد یہ کہنا ہے کہ ضرانیوں نے حسینؑ کی شرکت کے اس موقع پر جو صلح کی وہ مسلمانوں کے لیے مایہ ناپسند تھی۔
لڑکپن میں دُوسروں کے لیے بھوک کا سخت اندازہ کب؟ نہیں معلوم لیکن غالباً اسی سے کچھ قبل یا بعد کے زمانہ میں

وہ واقعہ ہوا جو محلِ اقی سے ممتاز کیا جاتا۔ اس لیے کہ نزولِ قرآن کا زمانہ تھا۔ معاملہ یہ حسینؑ کی سات برس کی عمر تک کا ہوگا جس کی تصدیق حضرت فاطمہؑ کے اس لفظ سے بھی ہوتی ہے جہاں آپ فرماتی ہیں کہ: ”میرے بچے بھوکے ہیں۔“
 چھ یا سات برس کا سن اگرچہ اس پورے اندازہ کا نہ ہو کہ دوسروں کی تکلیف کو اپنی ضرورت پر مقدم رکھنا کس قدر بلند خیالی اور انسانیت کا اعلیٰ درجہ ہے۔ لیکن بھوک ایسی چیز ہے جو اپنی حالت سے بار بار اندازہ پر مصر ہوتی ہے اور اس لیے بچے ایسے موقع پر جس میں خود اپنے تجربہ سے اندازہ کرنا ہو بغیر حسی علم کے نہ رہ سکتے تھے۔ موقع کی خصوصیت یہ تھی کہ اپنی تکلیف سے ان کی لاپرواہی اس درجہ تھی کہ جوں جوں ان کا امتحان بڑھتا جاتا تھا یہ امتحان دینے پر مصر ہوتے جاتے تھے۔ ان مرحلوں کے ہوتے پھولوں کو دیکھ کر رسولِ چشم پر آب ہو گئے اور زبان مبارک پر جاری ہوا: ”واغوثاہ اهل بیت محمد یومنون جو ما۔“ (اے پروردگار تیرے نبی کے اہل بیت بھوک سے مر رہے ہیں)

آیہ تطہیر اور حسینؑ کی شہادت اور حسینؑ یہ بندے تھے جنہیں تطہیر کا یقین دلایا جاتا اور ان کی آئینہ امتحان خیز تاریخ بھی ان کی تطہیر پر مشتبہ نہ ہوتی۔ اس موقع کی خصوصیت یہ بھی تھی کہ رسولؐ یہ دعا بھی فرماتے کہ: ”میں اس سے جنگ کروں گا جو ان سے جنگ کرے گا اور صلح کروں گا جو ان سے صلح کرے گا اور دشمن ہوں گا جو ان کا دشمن ہوگا۔“ ہم نہیں جانتے کہ اس تمام موقع پر حسینؑ کچھ بٹھے ہوں گے یا نہیں لیکن میرا طبعی تصفیہ یہ ہے کہ موقع کے نئے پن اور عظمت حیرت اور سفیرانی کے نفس کی اس خیرہ حالت نے جو دعا اور استقبال احکام کے وقت ہوئی تھی سب کو بے جنبش رکھا ہوگا۔

سورۃٔ برات کے پڑھنے کے لیے جس کی مختلف حیثیتوں پر توجہ دلائی گئی جناب امیرِ مکتبہ نے جانا حسینؑ کے لیے اس محاذ سے باطل نہ ہوا کہ ایک تودہ خود کہہ آئے تھے دوسرے یہ بھی دیکھ چکے تھے کہ پدرِ بزرگوار اکثر باہر بھیجے جاتے ہیں اور ان کی اس ناموجودگی میں یہ بھی دیکھتے تھے کہ کبھی رسولؐ دعا فرماتے ہیں کہ علیؑ کی دوا بھی تک مجھے نہ اٹھانا۔ کبھی خود استقبال کر کے لاتے ہیں اور کبھی بھیجتے ہیں لیکن فرماتے ہیں کہ میں تمہیں ہوں اور اس طرح مفارقت پر صبر کرنے کی لڑکپن سے عادت ہوئی جاتی تھی۔ اگرچہ یہ وقتی کیوں نہ ہو۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ حسینؑ کے نزدیک بھی یہ کوئی مخصوص بات تھی یا نہ تھی کہ ان کے پدرِ بزرگوار کے قبل ایک بزرگ بھیجے گئے اور وہ بلا لیے گئے اور ان کے بعد جناب امیرؑ بھیجے گئے۔ لیکن ہے کہ مغربی نے اس کا زیادہ لحاظ نہ کیا ہو لیکن رسولؐ کے کچھ ہی دن بعد حسینؑ کو ان سے جو معاملت لاحق ہوئی تھی اس کے اعتبار سے انہیں پہلی حالتوں کا یاد آ جانا بہت ممکن تھا اور یہ پس پنی مزید بچ و تاب کی باعث ہو سکتی تھی۔

مین کی روانگی کا نظارہ اور حسینؑ وہ وقت آیا کہ حسینؑ اپنے پدرِ بزرگوار کو آخر بڑی سفارت کے لیے رسولؐ کے حکم سے مستعد دیکھتے اور اس کے لیے مستعد

رسپتے کہ وہ ایک لامعلوم زمانہ تک مدینہ واپس تشریف نہ لائیں گے۔ موقع یہ تھا کہ اس وقت جناب امیر کی ذات کئی منصب کامرکز تھی۔ وہ مدینہ سے یمن بھیجے جا رہے تھے۔ درمیانی مقامات کا معاملہ پیشتر بھیجے ہوئے افسر یعنی خالد بن ولید سے ملاقات و دریافت کرنا، اور اسے ہمراہ لے لیتا یا واپس کرنا۔ در صورت اہل یمن کی مخالفت کی آخری چارہ کے لیے مستعد رہنا۔ تبلیغ اسلام دینی امورات کی تعلیم ان پر حکومت یہ خدمتیں جو علی کے سپرد تھیں۔ بنو حنیبلہ کے تصفیہ کے لیے علی کو اپنی تلوار دے کر رخصت کیا تھا۔ بڑھتے ہوئے تعلق نے یمن بھیجتے وقت مزید نشانات اختیار کو ضروری تھا۔ ضرورت بھی قحی ایک بڑے اور زر خیز صوبہ پر حکومت کے لیے بھیجتے تھے غالباً علی کے پہنچنے کے قبل ان پر اپنی توجہ اور محبت کی خیر پیشتر بھیجی ہو اور ان تین سو سواروں کو جو ہمراہ رکاب جانے کے لیے کڑے قحاطاعت اور لحاظ کا اشارہ ہو کہ نشان مرتب کرنے کے علاوہ اپنے دست اقدس سے عمامہ باندھتے ہیں اور دیکھ کر کہتے ہیں کہ: ”اے علی میں تمہیں بھیجتا ہوں مگر تمہاری ہدائی پر افسوس کرتا ہوں۔“ باوجود اس کے بھیجتے ہیں۔ جس سے معاملہ کی اہمیت ظاہر ہے۔ روایت دیکھنے کے لیے کون نہ ہوگا جسے جناب امیر سے محبت ہوگی۔ خاموشی اور اس میں جذبات محبت کا تصادم۔ بے مینی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنا اور پھر اس میں کھینچ کر لینا کچھ کہنے کا ارادہ اور پھر دفر جذبات سے گویائی کی کمی۔ سنائے میں وزنی سانس کی پر خم خیرگی۔ یہاں تک کہ وہ صبر شکن موقع آ گیا کہ ددائی نظر پر نمی سے پردہ پڑ جاتا۔ گھونٹوں کی صدا خاموش دیکھنے والوں کو چوکائی۔ یہ شاندار دستہ کچھ دیر کے لیے خم کا ایک جلوس ہو جاتا اور چاہنے والے اس وقت تک کڑے رہتے۔ جب تک کہ اس جلوس کا آخری نشان یا صدا کی غنیمت آہٹ بھی ملتی۔ جلوس روانہ ہوتا اور قبی تعلق رکھنے والے خاموش دیکھتے رہ جاتے۔ غرض!

حجۃ الوداع اور حسین چند ماہ اس طرح گزرے تھے کہ رسول کا حکم نامہ یمن پہنچا۔ رسول مدینہ سے اور علی یمن سے پہلے مرکز ملاقات کہ قحط ظاہر بھی تشریف لے گئی تھیں، اور اس سے تعین کیا جاسکتا ہے کہ حسین بھی گئے تھے اور اگر اس کے قبل شان سے روانہ ہوتے دیکھا تھا تو کہ میں اسی شان سے داخلہ دیکھا ہوگا۔ اسلام کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ اس قدر مسلمان حج کرنے منع ہوئے اور اس وجہ سے آخری بھی تھا کہ نبی اللہ نہ اس کے بعد تشریف لے گئے اور نہ اب تک اجتماع کے لیے اس قدر اہتمام کیا گیا تھا۔ یہ موقع تھا جسے زمانہ اب نہ دیکھے گا۔ اگرچہ اس سے بدرجہا زیادہ تعداد میں مسلمان حج کرنے ہر سال جاتے رہتے ہیں اور باوجود بعض دقتوں کے آمد و رفت کی سہولتیں تعداد میں اور اضافہ کرتی رہیں گی۔ حسین نے یہ اثر خیز منظر دیکھا اور کیا عجیب ہے کہ مسکرا کر پوچھا ہو کہ: ”ننانا یہ سب تمہاری امت ہے؟“

حج خستہ ہوا، لوگ سٹپے، اور متفرق ہونے کے قبل دوسرا منظر بھی ان مسلمانوں کو دیکھنا تھا۔ اس لیے کہ رسول خدا نے نقطہ تفرق کو اپنی نگاہ کے تابع رکھنا چاہا۔ وہ کسی ایسی جگہ سے جہاں بہت سے راستے ہوں۔ لوگوں کو اپنی خوشی سے منتشر نہیں ہونے دیتے۔ بلکہ اس کا لحاظ فرماتے ہیں کہ ان میں ایک مرکز پر جمع کر کے کسی بلادی اور خیالی اختراق کا موقع نہ دیں اور آج حسین ایک تماشہ دیکھتے ہیں، جو اگر غلط سے بڑھ گیا ہو تو نقصانے سن کے لحاظ سے اور زیادہ دل پسند ہو جاتا ہے۔ یہ علی کے لیے نیا نہ تھا۔ اس لیے کہ ان میں بھی رسول نے اپنے ”کنارہ بخل“ میں پالا تھا اور زبان چوسانی تھی۔

لیکن حسینؑ کی حیرت تبسم اور پر مسرت ہے یعنی مصور کے اندازہ کے باہر ہے جب وہ دیکھتے ہوں گے کہ منبر ہے، نانا ہیں اور لوگ ہیں۔ لیکن آج ہم نہیں بلکہ پدر بزرگوار رسولؐ کے ہاتھوں پر بلند ہیں۔

ہم نہیں کہہ سکتے کہ حسینؑ اس وقت یا اس کے بعد کی مبارک بلاؤں کو دیکھ کر خوش ہی ہو رہے تھے یا کبھی کسی کے پڑھنے تبسم اور اس کی فحی کو بھی محسوس کرتے تھے۔ بچوں کو خیال ہی کیوں ہونے لگا کہ آدمی کا ظہر و باطن ایک نہیں ہو کرتا اور ہنسی کے نیچے زہر بھی جھرا رہتا ہے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ اگر ایسی ہنسی حسینؑ کی نگاہ کے نیچے آگئی ہوگی تو وہ بغیر جھکنے نہ رہے ہوں گے۔

وداعی حالت کا حسینؑ پر اثر نبی عربی کا عجز الوداع کے قبل اہتمام کرنا کہ ایک وداعی مجمع ہو۔ مجمع سے کہہ بھی دینا اور اس کے بعد بقیہ اسی نوے دن کا طرز عمل اسی پر راز قانون کے

اندرا آتا ہے جس کا نام الہام یا دوی یا سادہ باطنی ہے کوئی بعید از قیاس امر نہیں ہے کہ رسولؐ کی اس قلبی حالت نے بچوں پر اثر کیا ہو۔ وہ چپ اور مخموم رہتے ہوں، بغیر اس کے کہ انھیں وجہ معلوم ہو، وہ والدین کی تنگی خاموشی سے احتیلا کے باوجود اشارہ ہاتے ہوں اور دل بھرا آتا ہو اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہو کہ والدین ان بچوں پر نظر گرا دیتے ہوں اور منہ کی کوشش کے قبل آنکھوں میں آنسو ڈھلک آتے ہوں، بچے دیکھتے ہوں۔ دل میں کڑھ جاتے ہوں۔ ان کی آنکھ میں بھی آنسو آجاتا ہو اور اب ماں باپ انھیں زور سے پٹالیتے ہوں۔

ہادیؑ کا آخری وقت اور حسینؑ کچھ دنوں تو خوف کا وہم تھا لیکن سلسلہ کا یہ صغریٰ ختم نہیں ہونے پایا تھا اور نہ حسینؑ ابھی پورے ساٹھ برس کے چھوٹے تھے کہ

وہ دن آیا جس کا خوف تھا۔ ہادیؑ عالم کو مرض الموت لاحق ہوا۔ محض علالت حیات کی امید قطع نہیں کر دیتی۔ لیکن علالت میں دنوں کا گزرنا اور مرحل میں اضافہ اہل بیت رسالت کی افسردگی کو بڑھاتا جاتا ہوا اور حسینؑ اپنے اوپر نانا کے ہر وقت منہ سے ہونے چہرہ اور لطفت آمیز نگاہوں کو افسردہ اور ساکت ہاتے ہوں گے۔

ہادیؑ عالم کے آخری دنوں کے متعلق ہم کافی سے زیادہ اشارے کر چکے کہ وہ انتظار آمیز ساعت سے خالی نہ تھے۔ سیاسی پیش بدلیوں کے بچنے کے لیے حسینؑ کی عمر بہت کم تھی۔ ان کے سن کا تقاضا یہ نہیں تھا کہ اس کے اسباب ثواب و شادی کو کچھ سکتے اور اس لیے ہم محض یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اگر حسینؑ کی سماعت تک کسی یا چند کی خلافت درزی کی خبر پہنچی ہوگی تو وہ محض ایک انفرادی حیثیت کی بے طاعتی سمجھتے ہوں گے اور اس سے اس قدر روٹھے ہوں گے جس قدر توجہ لڑکچن کا بے قرار خیال حوالہ کر سکتا ہے۔ اور کچھ عجب نہیں ہے کہ اپنے اور اپنے والدین کے ساتھ رسولؐ کی بڑھتی ہوئی توجہ کو دیکھ کر ان بے طاعتی کی مثالوں کو مطلق کسی توہم سے نہ دیکھتے ہوں۔

ہادیؑ برحق کی علالت بڑھتی گئی اور غم کی موجیں اس قدر قوی ہو گئیں کہ پہلے ظاہرہ کے صبر کو پہلوئیں۔ ظہری تھا کہ حق تھا کہ رسولؐ کا ظہرہ کے پہلے کوئی روتا۔ کس کے گرم آنسو اس قابل تھے کہ ہادیؑ برحق کے رخساروں پر پڑتے، اور آنکھیں کھلوا سکتے۔ صبر شکن نگاہ لاڈلی بیٹی کی طرف اٹھی اور ساتھ ہی شدت، صفت اور جذبہ محبت سے تھر تھراتے ہوئے ہاتھ آخری مرتبہ اٹھے کہ ظاہرہ کے آنسو پونچھتے اور تسکین دلانے کی یہ کوشش سیلاب اشک کو اور تیز کر دیتی۔

لیکن محبت کا یہ غم انگیز منظر آخری نہ تھا بلکہ اس میں بچوں کا بھولا پن کچھ اور اضافہ کرنے والا تھا۔ ہوائی نے آنکھیں کھولتے ہی اپنے فرزندوں کو طلب کیا۔ کئی روز کی شدید بیماری نے جس قدر خاموش کر دیا تھا اب اس وقت کی طلبی نے حسنین کو یہ خیال دلایا جو کہ رسول کی ناشکستہ توجہ صحت سے پھر عود کر آئی۔ یا بلانے کے لیے جانے والوں کی افسردہ صورتیں دیکھ کر پہلا اثر خوف کا ہوا اور اس نے دوڑا دیا جو۔ میرے نزدیک دوسری صورت زیادہ قریب الامکان ہے۔ آئے حسنین۔ اس لیے کہ رحمتہ للعالمین کی محبت سے مجھ سے جوئے سینہ کی گری آخری مرتبہ محسوس کریں۔ رسول کی آنکھیں کھلی تھیں۔ ہاتھ پھیلے تھے اور سینہ پٹا لینے کے لیے بے چین تھا۔ لپٹ گئے۔ رسول نے ان کے بھولے رخساروں پر لب اقدس سے محبت کی مہر کی، ریحانیتین کو سونگھا اور اس وقت بھی تعظیم احترام اور محبت کے باب میں اصحاب اور تمامی امت کو دھمکتے کہ حسنین کی عمر اس کی کافی صلاحیت رکھتی تھی کہ رسول کی ان دھمکتوں کو جو اپنے متعلق تھی یاد رکھتے اور اس وقت لوگوں میں اپنا جو احترام تھا اس کا امتیاز کر سکتے۔

وہ تمام نفوس جنہیں رسول سے محبت تھی قریب تھے، خوف اور اضطراب سے ناگزیر نتیجہ کے منتظر تھے۔ جناب امیر کے سینہ مبارک یا زانوئے اقدس کو اس کا افتخار تھا کہ سر منظر اس پر رکھا تھا۔ علی چاہتے کہ ہمیشہ میں یہ فراور راحت نصیب ہو۔ لیکن مشیت ازوی جاری ہونے والی تھی۔ رسول کے لب اطہر میں آخری جنبش ہوئی۔ ”الرفیق الاعلیٰ“ کی مخلص روحانی قربت کا شوق تھا جو ان کے آخری سانس سے ظاہر تھا۔ اوہر اظہار شوق تمام ہوا اور کائنات عرب کا صبر ختم ہوا۔ سر اقدس کا وزن اٹھانے کی اب قوت نہ رہی۔ بیخ اٹھے۔ عباس کو بھارا کہ ”میں بے خود ہو رہا ہوں میری خبر لے۔“ قیاس آسان جبکہ اس وقت نسبتاً کمزور دل کی طاہرہ اور بچے کیا کر رہے ہوں گے اور کیا کہہ رہے ہوں گے۔ لیکن انہیں کیا معلوم رحلت رسول کے بعد واقعات کے لحاظ سے اہل بیت کی طبعی حالت تھا کہ ابھی رسول دفن

نہ ہونے پائیں گے اور نہ ہم رونے سے سیر ہوں گے کہ ہم ایک مرتب جامعیت کے قبضہ میں اس طرح آجائیں گے کہ ہمارے حقوق، ہماری تعظیم اور جلال احترام ایک خواب کی بات ہو جائے گی۔ اور دفعۃً یہ باتیں اس طرح جلا دی جائیں گی کہ گویا ہمارے لیے کبھی نہ تھی، بلکہ ہم سے چاہا یہ جانے گا کہ ہم اس طرح ان کی تعظیم و احترام کریں۔ جنہیں ہماری تعظیم و احترام کا حکم دیا گیا تھا۔ بچے بے خبر تھے۔ طاہرہ بے خبر تھیں، جناب امیر بے خبر تھے کہ طوکان کی جڑی آواز کان میں آئے گی۔ میرے خیال میں تمام اس مجمع نے جو اس وقت علی کے پاس دفن رسول کی فکر میں ہو کسی تھی متوجہ خبر کے قبول کرنے سے انکار کر دیا ہو گا۔ حقیقت یہ ہے کہ قبول کیا جانا عجیب خیز اعتقاد ہو تا۔ لیکن زیادہ دیر نہ ہوئی تھی کہ ان لوگوں کو یقین بغیر چارہ نہ ہوا۔ اور اب سوچا جاسکتا ہے کہ ان کے غم غصہ اور نفرت کا کیا درجہ ہو گا۔ خصوصاً جب کہ انہیں دفعۃً اپنے خیالات کا راستہ بدلنا تھا۔ ابھی جوش غم میں کمی نہ ہوئی تھی، آنسو تھے اور خشک نہ ہونے تھے کہ وہ خبر ہی سنتے ہیں کہ منہ رسول کا انتظام رسول کے گھر سے کوسوں دور کر لیا گیا، بغیر اس کے کہ بنی ہاشم یا اہل بیت رسول میں سے کوئی وہاں موجود ہو تا۔ کوئی عجب نہیں ہے اگر اہل تنقید کی کارروائیوں کی خبر نے اہل بیت اور ہوا خواہان اہل بیت کے آنسو خشک کر دیے ہوں اور وہ اپنے دماغوں پر چوٹ کھانے کی گنجمنہٹ محسوس کرتے ہوں اور کچھ دیر کے لیے گم ہو گئے ہوں کہ ہم کیا کریں۔

نئی ہاشم انسانیت کے حقوق ادا کر رہے تھے کہ انھیں عالم سیاست نے مجبوراً یہاں عالم سیاست سے میری غرض اس کی نرم اور معمولی روش نہیں ہے بلکہ وہ عالم جس میں رحم اور دل نہیں ہوتا۔ جو جذبات اور احساسات کو وہ کیسے ہی اعلیٰ کیوں نہ ہوں اپنی بعض ضروریات کے لیے اپنا دشمن کچھ کر چکے سے بھی زیادہ کھلتا ہے۔ کون سوچ سکتا ہے اس غفلت کو جو جناب امیرؒ کو ہوتی ہوگی۔ کون کہہ سکتا ہے کہ جناب امیرؒ ایک ہاتھ سے رشوا کی لاش تھلے ہوں اور دوسرا ہاتھ دفعہ سر تک پہنچ گیا ہو۔ میرے آخری فقرہ کی غرض یہ نہیں ہے کہ جناب امیرؒ کا اس وقت بھی انداز تھا، بلکہ میں کچھ انسانی دماغ کی اضطراب، پتھر اور گرتی ہوئی حالت کھا رہا ہوں۔ جناب امیرؒ اس سے بہت بلند تھے کہ ان سے اضطراب کی کوئی ظاہر حالت ایسے وقتوں میں طاری ہوتی جس میں وہ ایک فریق اور دوسرا انسان دوسرا فریق ہو جب کہ ان جناب کے اس احساس کے متعلق ان کا کسی موقع پر یہ اظہار خیال پایا جاتا ہے کہ ”یہ امر عجیب پر نہایت ہی دشوار ہے کہ کسی قسم کے اندوہ و ملال کی جھلک غم میں نظر آنے تاکہ دشمن کو شہادت کا موقع ملے یا دوست اس کی حالت دیکھ کر غمزدن ہو۔“ یا چہرہ پر دیگر جذبات کے اثر کو اس فقرہ میں ظاہر فرماتے ہیں کہ: ”کسی شخص نے محبت و عداوت کو دل میں پوشیدہ نہیں کیا مگر یہ کہ وہ اس کی زبان، غفلتوں اور چہرہ کے صفحات میں ظاہر ہو گئی۔“ اس سے ظاہر ہوگا کہ جناب امیرؒ کس طرح کوشش کرتے ہوں گے کہ میرے اثر غم سے میرے متعلقین غمزدن نہ ہوں۔ یہ کوشش بجائے خود ایک مرثیہ تھی۔ دراصل ایک یہ بات ابھی باقی ہے کہ محض چہرہ سے ظاہر نہ ہو سکتا کیا اس کے لیے کافی ہے کہ قلب کی کسی کیفیت کا اثر دوسرے قلب پر نہ ہو۔ خصوصاً ایسی حالت میں جب کہ ایک یا چند ایک ہی جذبہ سے متاثر ہوں۔ اور پھر کے گھڑی جناب امیرؒ اپنے اس ہوش پر مصر رہتے کہ ہمارے چہرے سے آثار غم نہ تو ظاہر نہیں ہیں۔ قلب کی ذرا سی نرمی، چہرے کے ریشوں کا خفیف سا ڈھیلپن اور اس کا وہ عالم جو غم سے متاثر ہونا کہا جائے کافی تھا کہ دیکھنے والوں کی آنکھوں سے آنسوؤں کا مینہ برساتا۔ اور جناب امیرؒ یا تو لگاؤں فچی کر لیتے یا اپنے چہرہ کو مد پر لانے کے لیے غم پھیر لیتے۔ آخر کون تھا جس کی طرف زکریہ دیکھتیں اور ہمارے خزانے اور خزانوں کے اپنا تسکین دینے والا بھتیں۔

لیکن جناب امیرؒ کا ضبط کرنا تو اس خال سے تھا کہ میری افسردگی میرے متعلقین کو اور بے چین نہ کر دے۔ اس کی غرض یہ نہ تھی کہ وہ لوگ بھی میری ہی طرح ضبط کریں۔ جناب فاطمہؒ زہراؑ کی یہ مشہور حالت سب کچھ کہتی ہے کہ ان مصومہ کو رشوا کے بعد اپنی رحلت تک کسی نے ہنسنے نہ دیکھا۔ ہنسنے نہ دیکھنے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ کوئی انھیں روتے دیکھتا لیکن یہ واقعہ ہے کہ وہ مظہر اس وقت تک سیر نہ ہوئیں جب تک ان کی روح اقدس نے اس عالم کی طرف ہجرت نہ کی جہاں وہ اپنے پدر عالیٰ مدار کی روح مظہر سے قربت حاصل کرتی۔ ایک دریا تھا جو امیرؒ رہا تھا۔ ایک جوش تھا جس نے سکون پالنے سے انکار کر دیا تھا۔ اور ایک متغی درد تھا جس نے سنے والوں کو اس درجہ بے چین کیا کہ وہ جناب امیرؒ سے درخواست کرتے کہ رونے کا وقت مقرر کیا جائے اور ظہم من اللہ کی صاحبزادی انھیں جواب دیتی کہ مجھے تم میں بہت دنوں نہیں رہنا ہے۔

پھر بھی جناب امیرؒ نے عموماً کیسا ہی ضبط کیوں نہ کیا ہو انھوں نے نظم و نثر میں وقت و فن اور بعد و فن جو کچھ فرمایا اس کی خوبصورت شاعری (جذبات کی مصوری) اس لیے بہت مؤثر ہے کہ وہ ایک ضابطہ کا اظہار خیال ہے۔ علیٰ قبر کے پاس

کھڑے ہلکے صبر اور رونے کی مختلف حالتوں پر ان کا دل مغرور کر رہا ہے اور کہہ رہے ہیں: ”صبر کرنا بھی بات ہے مگر حضرت سے صبر کر لینا مدوح نہیں ہے۔ جزع و ذراع بے شک قبیح ہے مگر آپ کے پھرنے کی نصیبت پر نہیں۔ آپ کی نصیبت سے جو رنج و اندوہ ہے وہ نہایت ہی بزرگ ہے۔ یہ رنج و اندوہ آپ کی نصیبت سے پہلے حیر تھا اور آپ کی نصیبت کے بعد بھی حیر کھا جانے کا۔“ یا فرماتے ہیں کہ: ”آپ نے غیر کی نصیبت سے ہیں مطمئن کر دیا۔“

حسینؑ کی نامرادی اور بلو جو ان باتوں کے اس اندوہناک اشتیاق کی بھی خبر ہے کہ جب جناب امیر اور طاہرہؑ ”امام حسنؑ اور امام حسینؑ کے فتنہ کی طرف نگاہ کرتے تھے تو اپنی بیٹی اور ان کی نامرادی پر“ روتے تھے۔ حالت یہ تھی کہ بچوں کا رونا صبر شکن تھا نہ رونا، اور کراہنا، پاسائے اور بھولے چہرے سے دیکھنا اور زیادہ غم اڑا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ ایک پیاری چیز کھو گئی ہے بغیر اس کے کہ اس کے اظہار کے لیے غم میں لفظ پاتے ہوں۔ ان کا دل کچھ ڈھونڈتا تھا مگر پاتے نہ تھے۔

خطرہ اور اس کا احساس اب ذرا اس تاریکی پر توجہ کی جائے جسے علی فرماتے ہیں کہ: ”جھانکی تاریکی ان (رسول) کے انتقال کے بعد“۔ یا جیسا حضرت طاہرہؑ فرماتی ہیں کہ: ”وہ میٹر جس پر آپ (رسول) تشریف رکھتے تھے تاریکی نے اُسے ڈھانپ لیا۔“ اور دیکھیں کہ حسینؑ کی ”نامرادی“ یا ان کی مادر گرامی کے اس خیال کو کہ: ”آپ کے بعد ہم ضعیف و خیر ہو گئے۔ لوگوں نے فتنہ پھیر لیے۔ آپ کی زندگی میں ہم خلائق کے نزدیک معظم و مکرم تھے۔“ کس درجہ تعلق ہے۔ سوچے کوئی اگر سوچ سکے کہ کبھی کے بچے یہ دیکھتے ہوں کہ سیکڑوں آدمی حملہ آوروں کے جوش سے ہمارے گھر کی طرف آرہے ہیں۔ اپنی ماں سے کسی کی یہ دھمکی سنی ہو کہ ہم گھر چھوٹک ڈالیں گے۔ اس وقت بھی دیکھا ہو کہ آگ اور لکڑی موجود ہے۔ محاصرہ اور اطاعت کرنے کا شور مچا ہو اور پھر وہ یہ نہ سمجھتے ہوں کہ ہم خطرہ میں ہیں اور سب سے زیادہ افسوسناک یہ امر ہو کہ آج ان کے یہ انداز دیکھتے ہوں جو کل دست لگے تھے اور انھیں آسمانیں چار کرنے کی جرات نہ تھی اور جن سے نانا نے عظیم و احترام کی وصیت کی تھی۔ حالت ایسی ہوتی کہ فتنہ یعنی حملہ آوروں میں کا ایک سپاہی رو دیتا اور بچے ہم نہ جانتے اور ماں کے سینہ میں اپنے فتنہ نہ چھپاتے؟ یہ سن تو ایسا نہیں ہے جن میں بچے محبت اور غصہ کی نگاہیں نہ پہچان سکتے ہوں۔ انھوں نے اطاعت کرنے والی صورتیں بھی نہیں اور یہ حالت اس وقت کی صورت خوب سمجھا سکتی تھی۔ وہ یہ بھی دیکھ رہے تھے کہ اس وقت والدین کے بٹھے دیے بٹاش نہیں ہیں جیسے اصحاب کی ماضی کے وقت رہا کرتے تھے اور یہ ان کے خوف زدہ کرنے کے لیے بہت کافی تھا۔ کچھ بعید نہیں ہے کہ حیرت اور خوف سے اس وقت پوچھا ہو کہ: اماں! کیا یہ میرے نانا کی امت نہیں ہیں؟ ان سے پوچھو تو کہ کیا ہمارے ہی احترام کے لیے کل وصیت نہیں کی گئی ہے۔ ام الفضل سے پوچھتے ہوں گے کہ داوی تم ہیں یہ شعر پڑھ کر کھلاتی تھیں کہ:

”یا ابن رسول اللہ یا ابن کعبہ الجاہ“

آج ہمارا جاہ کہاں ہے؟ تمہاری یہ دعا کہ: ”خدا تمہیں مصیبتوں سے پناہ میں رکھے۔“ قبول نہیں ہوئی۔ اور یہ سن کر ماں اور دانی کے لب جواب نہ دیتے، بلکہ آنکھوں میں آنسو ڈھلکاتا ہوا دکھائی دیتا ہو۔

بچوں کا پہلا اندوہناک اتفاق

علم آدروں اور دھمکانے والوں کا واپس جانا کوئی تسکین نہ تھی بلکہ حسنین دہجہ رہے تھے کہ اب وہ ہمارے سامنے نہیں ہے جو نانا کے بعد ہماری پتہ ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ اگر رشوں کے بعد کبھی جناب فاطمہ زہرا کے آہنہ تھے تو اس وقت اور ظالم اس سے زیادہ ان کے روحانی تکلیف کا دوسرا وقت نہیں تھا جب وہ دہکتی تھیں کہ علی مرتضیٰ ان لوگوں کے پاس گئے ہیں جو ہیں اپنے حاصل کردہ اختیار سے مرعوب کرنا چاہتے ہیں۔ ان سے یہ بات چھی نہ رہ سکتی تھی کہ بیعت نہ کرنے سے قتل کی دھمکی دی گئی اور خود یہ بھی خبر ہے کہ حسنین کو کوئی درشت خوش راسخ راستہ میں ملتا اور انھیں الزام دیتا کہ تم جاسوسی کرنے گئے تھے۔ بچے کرخت انداز اور درشت چہرہ کو پہلی مرتبہ دیکھتے اور غالباً گھر آکر شکایت کرنے اور جناب امیر کچھ نہ کر سکتے اس لیے کہ انھیں تنہا اس تنہا شخص سے جواب طلب کرنے کا اختیار نہ ہوتا کیونکہ وہ حکومت کی حمایت کے لحاظ سے حکومت کو اپنی مدد کے لیے بلا سکتا۔

تنگی معیشت بچے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جناب امیر کے دیوان کے وہ اشعار جن میں آپ انھیں اور تنگی معیشت کا تذکرہ کرتے ہیں وہ مثلاً بعد رشوں زمانہ سے تعلق رکھتا ہے۔ جیسا ظاہر کا یہ فرق کہ: ”میرے فرزندوں کا وقت و معیشت بھی لے لی گئی۔“ کون قیاس کر سکتا ہے ان سرچشمہ شرافت غوس کی دشواریوں کا جنھوں نے اپنے حکومت و اختیار کو خلق اللہ کے راحت و آرام کے لیے اس طرح صرف کیا کہ اپنے کو مطلق ترین فرد عالم کی حیثیت میں ڈالا جس سے وہ غریب کی حالت کے اندازہ اور پیچھے ہٹنے کے قابل ہوں۔ انھوں نے اپنے شرعی حصہ قیمت یا حاصل کو تو کیا معنی خود اپنی کسی جائداد کی آمدنی کو بھی زیادہ تر غریب کے لیے صرف کر دیا۔ اب وہ دیکھتے ہیں کہ ہم بے اختیار ہیں اور قبل اس کے کہ ہم نے زمانہ اختیار میں اپنے بے اوقات کا بے اختیاری کی حالت میں خیال کیا ہو بے اختیاری نے ہمیں بغیر کسی ذریعہ کے چھوڑ دیا اور زمین کا وہ ٹکڑا جو ہمارے کام آتا اسے حکومت نے اپنے ”اختیار“ کی دلیل سے ہم سے چھین لیا۔ اب ظاہر اگر کوئی صورت تھی تو یہ کہ علی اپنے اور فاطمہ اپنے حقوق سے دست بردار ہوتیں اور حکومت کی ہر روش کو تسلیم کر کے رفاقت کا اعلان کیا ہوتا۔ لیکن علی و فاطمہ سے یہ ممکن ہوا نہ ہو خود حکومت کی سیاسی بے اعتباری فوری اعتبار کی تقصیر نہ ہوتی۔ ان باتوں کے لحاظ سے ہم کوئی تفسیر نہیں کر سکتے کہ اس وقت ان کے بسر اوقات کا کیا خالص ذریعہ رہ گیا تھا جب کہ فکر ان سے لے لیا گیا ایسا ہے کہ جناب زکیہ نے وزیر جناب امیر نے اپنی زمینداری اور باغ کو اپنے بعد وقت کیا جس سے کچھ میں آتا ہے کہ جناب امیر اور زکیہ کو حضرت ابوطالب اور رسالت مآب کی خاندانی جائداد سے کچھ حصہ ملا۔ اس صورت میں اگرچہ فائدہ اور اس سے بچنے کے لیے شدید محنت کا غالباً موقع نہ ہو لیکن مقدار نہیں معلوم اور گزشتہ فقرات کے بنا پر خیال ہوتا ہے کہ ان کی آمدنی اس قدر کافی نہ تھی کہ وہ بغیر فکر کے حاصل کے بسر اوقات کے لیے کافی ہوتی۔

انصاف یا سیاست اللہ کی شان تھی کہ جناب امیر اور ظاہر مع حسنین اور ام ایمن کے ابن ابوقحافہ کے پاس بحیثیت مدعی کے جلتے اور اتفاقات کا نام نہ لیا تھا کہ یہ دیکھتے کہ ضرور نہیں ہے کہ انصاف اور سیاست ساتھ ساتھ چلے یہ واپس آتے اور حسنین کے چھوٹے چھوٹے دلوں پر چٹ لگتے وہ دیکھتے

یاد دیکھتے ہیں کا داغ جو اطاعت اور اظہارِ انعام کا ملوی تھا گزرے ہوئے دو تین دنوں سے دیکھتا کہ ہماری آن چٹ کما رہی ہے اور زمانہ میں پست مالتی کی طرف گھنچ رہا ہے۔ ہم نہیں جانتے کہ جناب امیر اور زکیہ نے حسنینؑ کو کس طرح کھلایا اور چپ کر لیا ہوگا جب بچے اپنی گزشتہ شان اور وقار کے فطری اثر سے ان کو جو آج چہرہ پر ماکانہ رو دکھاپن اوڑھے تھے دیکھ کر کہتے ہوں گے کہ یہ تو وہی ہیں جن کے جیڑے ہر وقت اظہارِ عجز و انکسار میں جکے رہتے تھے، آج آپ انہیں کچھ کیوں نہیں کہتے۔

ایک حالت جسے ہماری خرا دیاں بھولی نہ ہوں گی
رسولؐ کے رحلت کے ساتویں دن یعنی بیعت کی پورش کے بعد طاہرہؑ کا

اشتیاق زیارت میں گھر سے شب کو باہر نکلتا اب تک لوگوں میں اس آزادانہ فوری لحاظ کا سبب ہو سکا کہ اہل مدینہ راستوں کے چراغ گل کر دیتے اور انصار و مہاجرین کی عورتیں اپنے حلقہ میں لے لیتیں۔ یہ حسنینؑ کے دیکھنے اور یاد رکھنے کی چیز اس قدر تھی جس قدر ہماری دونوں خرا دیاں حضرت زینب اور کلثوم کے نہ بھولنے کی چیز تھی۔

حسینؑ کے لیے اب تک دو ذات باقی تھیں
باوجود اس بڑے نقصان کے جو حسنینؑ کو ہادی عالم کی رحلت سے ہوا تھا اب تک

وہ عظیم الشان ذات باقی تھی جو نبی برحقؐ کی پوری شرح کہی جائے۔ عرب کا ہادی اول اب نہ تھا لیکن فتح عرب کی ذات میں وہ میچ چہرہ تھا جو رسولؐ کو یاد دلانے اور محبت کا دوسرا مجسمہ طاہرہؑ کی ذات میں موجود تھا۔ لیکن افسوس رسولؐ کی رحلت کے بعد کوئی دن نہ گزر تا تھا جو اس خوف اور یقین میں اضافہ نہ کرے کہ ”ماں“ بھی ہم کو چھوڑا چاتی ہیں۔ شاید بچے نہ بگھتے ہوں لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ اس پر خم خوف کے آثار جناب امیرؑ کے دل اور فکر میں نہ تھے اور کون کہہ سکتا ہے کہ جناب فاطمہؑ زہراؑ کی مایوس قسم کشی نے بچوں کے چہرہ پر اندوہناک غم نقش نہ کر دیا ہو۔

ماں کی وہی حالت جو نانا کی تھی
اس طرح دن گزر رہے تھے اس کی رحلت کو جس کی فکر اور سایہ میں سات آٹھ برس کی عمر ہوئی تھی ساتیس دن پورے

نہ ہوئے تھے کہ ماں کو اسی حالت میں دیکھا جس میں نانا کو مفارقت کے بارہ دن قبل دیکھا تھا۔ بچوں کے لیے طالت اب کوئی تھی بات نہ تھی اور اس کا جو خوف طاری تھا کیا عجب ہے کہ اندیشہ خیز یقین کی صورت ابتداء ہی میں اختیار کرتا جاتا ہو خصوصاً جب کہ وہ ماں کی بے کسل محبت اور توجہ میں طالت کو ہار چ دیکھتے ہوں۔ برے وقت طالت کا آغاز ہوا تھا کہ اس میں کوئی کمی نہ ہوئی۔ کیونکہ کئی ہوتی جب کہ درمیان میں اور اس کے قبل ایسے اسباب پیدا ہوئے تھے کہ اس کی شدید ضرب گراہی اور حیات معرض خطر میں گرفتار ہو جاتی۔

بنتِ رسولؐ کے مکالمات کا لہجہ اور مضمون اور حسنینؑ
یہ حالت تھی بلکہ ہیں کہنا ہوگا کہ وہ دن بہت قریب تھا کہ طاہرہؑ

بھی اپنے پدر بزرگوار سے جا ملتیں کہ بچوں نے آج پھر دیکھا کہ دو آدمی اس طرح مادر گرامی سے عذر خواہی کر رہے ہیں جس طرح وہ حیاتِ رسولؐ میں اظہارِ انعام و ادب کو ہائز رکھتے تھے میں امید نہیں کرتا کہ حسنینؑ ان کی عذر خواہی کے درجہ پر

غور کی ضرورت سمجھتے ہوں گے یا انہوں نے خیال کیا ہوگا کہ وہ اپنی گزشتہ قابلیت کا علاج کرنے آئے ہیں بلکہ بچے تو اس پر خوش ہو رہے ہوں گے کہ اس وقت کا صاحبہ اختیار اپنی مشغولیت کے باوجود ہمارے در پر پھر آیا اور یہ بھی دیکھتے ہوں گے کہ مادر گرامی کے لہجہ اور شان خطاب میں کوئی انحراف نہیں میں نہیں سوچ سکتا کہ بچے اس وقت کے مشہور مکالمہ کو کبھی بھول سکتے تھے۔ اور نہ چند روز کے بعد وہ اس گفتگو کو بھول سکتے تھے جو حضرت فاطمہؑ نے انصار و مہاجرین کی عورتوں سے کہ نہ یہ ملاحظہ سے خارج ہونے والی ہست تھی کہ اس کے بعد مہاجرین و انصار و اشراف پر حاضر ہو کر مضر خواہی کر سکتے ہیں۔ یہ وقت تھے جس میں ان مرحلے ہونے والی کی طبیعت اپنے دکار کی طبیعت بھرے ذرا سی شکین پائی۔

ماں اپنے بچوں کا آخری لحاظ کرتی ہے اپنی رحلت کے ایک آدھ دن یا چند ساعت قبل سیدہ

لیسپنے کو اس سے شکین دی تھی کہ بچوں کے لیے کھانا تیار کرواؤ۔ یہ نپلاوی اور سرسبب تھی کہ وہ آخری وقت میں ان افعال محبت کا محرک ایک خطاب تھا جس سے جناب فاطمہؑ کو یقین تھا کہ وقت قریب ہے کہ ہم اپنے پدر بزرگوار سے طافا کر یہ غم کا طوفان اس سے زیادہ بے رحم تھا کہ وہ بچوں کی بھول سورت اور جناب امیرؑ کی سہیلی سے سفاک ہوتا۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ سیدہ نے اپنی آخری وقت اس کا لحاظ رکھا تھا کہ بچے زیادہ تر ان کی آخری شکین یعنی روضہ رشک پر رہیں سیدہ کے صنعت اور قلبت کی انتہا ہو گئی اور جناب امیرؑ پر وہ مات طاری ہوئی کہ بند قبا کھینچتے اور علامہ سر مبارک سے اتار دیتے ہونے لگے مہالے ٹپے جاتے۔ لیکن باوجود بولنے کی طاقت نہ ہونے کے زکیہ کی آنکھ میں آنسو کا ایک قطرہ اس فقرہ کے ترجمہ کے لیے تھا کہ: ”دوئی ہوں ان غلوں پر جو میرے بعد تم پر ہوں گے۔“ اور دوسری یہ بھول نہ جانے والی وصیت تھی کہ: ”حسینؑ سے بلند آواز سے نہ بولنا کہ وہ شکستہ خاطر اور غریب ہو جاوے گا۔“ یا ”میرے بچے میرے بعد میری ملاقات کے شائق اور بے قرار ہوں گے انہیں تسلی دینا کہ تم سے جدا ہوتے ہیں۔“

اس کے بعد علامہ جناب امیرؑ مسجد میں اور بچے کھینچے اور تھے کہ اسامہ کو ”العلوہ یا حب رسول اللہؐ“ کا جواب نہ ملے حسینؑ بچے کے ماں پر رہی ہے۔ پچھا اور لکھا لیکن جواب نے رشک کے ان خوبصورت کھلونوں کو زمین پر لوٹتے دیکھ کر ترپنے اور چنے سے شکین نہ ہونے چھوٹے بچوں کو یقین نہ تھا کہ مسجد میں کو بولنے نہ دے گا۔ چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے ان قدموں کو تھام لیا، حسینؑ موت نے سو اور خاکستری بنا دیا قطع چھینے لگے کہ یہ ہے تھے: ”ماں! ہم تمہارے فرزند حسینؑ کو کچھ بولو۔“ لیکن انہوں نے موت میں یہ قوت نہ تھی کہ وہ اس طفلانہ ناز محبت کا جواب دلا سکتی ماں کی خاموشی ویسی ہی شکستہ رہی۔ چہرہ اور تمام اجزاء کے رنگ و ریشہ نے پھیلنے سے انکار کیا۔ جو زندگی میں اس کا اشارہ ہوتا کہ آؤ گود میں آ جاؤ بچے ماں کی اس خلافت امیرؑ سو میری پر اور کراہے اور اب شاید انہیں اس کا یقین آئے لگا کہ ماں اب نہ بولے گی۔ اس نے بیک کی طرح تھر تھراوا اور ناقابل بیان خوف نے اپنی آخری امیرؑ کی طرف دوڑا دیا۔ سر کے بال جس میں کچھ دیر پہلے ماں کے کھینچنے کی تھی گرد آلود تھے آنکھیں ابلی اور اشک آلود چہرہ تمنا یا حواطلہ آواز میں غم کا بے تسخ آہنگ تھا کہ مسجد کے قریب پہنچے کچھ ضرور نہ تھا کہ حسینؑ اس دل شکن خبر کو اپنی زبان سے لدا کرتے۔ انہیں روٹنے اور اس صورت

میں گھبراتے اور دوڑتے ہوئے آتے دیکھتا کافی تھا کہ جناب امیر کو سب کچھ بجا دیتا اور حقیقت ہمارے ہاں دینی چٹ
تھی کئی صاحب پوچھتا کہ: ”اے فرزند اللہ! روٹی لٹا دینا تمہاری آنکھوں کو نہ نہ لگے کیا روشنی کی جگہ خالی دیکھ کر تم پر رقت
طاری ہوئی؟“ اور حسنینؑ لبورتے اور ہاپ کود پکھتے ہوئے کہتے کہ: ”ہماری ماں نے رحلت کی“ اور یہ سن کر وہ سر
ہے ابن جبرود کی گوار کاؤ نم نہ جھکا سکتا جھکتا جیسا تک کہ زمین اسے سلجھاتی!

ماں کی وداعی زیارت
اگرچہ ماں کی محبت آلودہ آنکھیں پھرا گئی تھیں اور تسکین دہ الفاظ محدود ہو گئے
تھے تاہم اب تک بچے ماں کو دیکھ رہے تھے لپکی وداعی زیارت کا وقت

قریب آیا جس کے بعد حضرت فاطمہؑ زہراؑ کا روتے مبارک چادر سے چھپا دیا جاتا۔ کون اس بے نصنع اور بھولے جوش گریہ کا
نقشہ کھینچ سکتا ہے جس میں یہ بچے مشغول تھے جی میں کوئی سبینہ اور سرد اسخوش پر لوٹ رہا تھا اور کوئی ہاتھ پاؤں اور پیشانی
کو چوم رہا تھا دردِ اگیر خج تھی اور اس میں یہ الفاظ کج میں آتے تھے کہ: ”اے ماں جب آپ ہٹے جو بزرگوار کی
خدمت میں پہنچیں تو ہماوی جانے کے سلام پہنچائیے گا۔“ جناب امیرؑ زیادہ دیر تک اس روح فرسا نظارہ کی تاب نہ لاسکے
بڑھے اور بغیر اس بے رحمی کے چارہ نہ ہوا کہ چھوٹے چھوٹے رونے والوں کو لاش سے ہٹاتے کہ فشن نہ کھا جائیں۔
بم یہ خورہ کسی موقع پر لگا چکے ہیں کہ: ”جب تک فاطمہؑ (علیؑ) کے
پہلو میں ہیں ہم میوز نہ کریں گے۔“ اب اس کے بعد جناب امیرؑ میوز

کینے گئے ہوں یا نہ کیے گئے ہوں کم سے کم ان کا موقع اس درجہ کمزور تھا کہ میوز کیے جاسکتے۔ ظاہر ہے کہ موقع کی یہ کمزوری
اس وجہ سے تھی کہ دختر رسولؑ کی قوی لا اثر ذات اب نہ تھی۔

جناب امیرؑ کی روش اور حسنینؑ کا مطالعہ
اس غم کے متعلق جناب امیرؑ کے خیالات اور

مورخین کے اشارہ جو مناسب موقع ملتے ہیں گئے
گئے۔ حالت یہ تھی کہ جناب امیرؑ گوشہ نشین تھے اور کسی سے ملاقات نہ کرتے تھے میرا خیال ہے کہ حسنینؑ نے موقع کی
روش کا احساس اس سے زیادہ نہیں کیا ہوگا اس لیے کہ بچے تو سادگی، صاف دلی محبت اور سیدھی سیدھی باتیں جانتے
تھے کشیدگی، دورنگی، منقلب و زبان کی نامانفقت کیا جانی یا کیسے کجا جانی کہ دنیا میں ایسے ہی ہوتے ہیں جو اس وقت تک
سلام فروش ہیں جب تک انہیں امید اور فتح ہے ورنہ ان سے زیادہ ظلیت وہ ظلیتہ کوئی نہیں ہے وہ کیسے کہتے کہ
کمی کے جھکنے والے اس وقت کیوں ہاتھیں چراتے ہیں اور اپنے چہرہ پاتے ہیں اور جب نہیں کہ اب گستاخانہ اور پر
توہین انداز اختیار کرتے ہوں۔ بچے انہیں شامسا لہجہ میں پکارتے ہوں اور وہ غم بنا کر ہنستے جاتے ہوں۔
اس کے بعد کارنامہ ظاہر خلافت کی طرف سے جناب امیرؑ کے لیے نرانی نہ تھا بلکہ ایک متوقعہ حالت تھی۔ ظاہر اپنے
کو اپنی جگہ اپنے نقطہ نگاہ سے مضبوط کر رہی تھی۔ یہاں تک کہ اگرچہ جناب امیرؑ کے موقع کو اس معنی میں کمزور کر دیا تھا کہ ان
کے پاس کوئی ویسی چاشنی نہ تھی جیسی خلافت کے پاس لوگوں کی دلچسپی کے لیے تھی یا ہو سکتی تھی اور جناب امیرؑ متاسف
ہو سکتے تھے۔ جیسا کہ ہونے کے قریب اپنے خصائص کا پوست اتار کر آہستہ آہستہ ایک لباس پہن رہی ہے جس سے کچھ زیادہ
کے بعد پچالے نہ جاسکی لیکن اس لحاظ سے کہ اس وقت وہ قوم کی درستی اور حفظ خصال کے ذمہ دار نہ تھے انہیں بڑ

ذاتی تاسوت کے دخل کا کوئی حق حاصل نہ تھا۔ ان کی یہ بڑی خاموشی کبھی کبھی اس طرح ڈھنکی تھی کہ وہ بعض مواقع پر اپنے کو ایسے اہل بیت کے لیے حکومت کو قرض دیدیتے تھے جہاں وہ جتھے تھے کہ ایسا کرنا پھرے خیال اور دین کی روح کے متانی نہیں ہے بلکہ نظام قوی کے لیے مفید ہے۔ وہ تا صاف ظاہر کرتے تھے جہاں انھیں ایسا کرنا دشمن معلوم ہوتا تھا۔ مثلاً قتل مانعین، زکوٰۃ، جنب امیر کی یہ روش حسنین کے مطالعہ بغیر نہ کر سکتی تھی۔ انھیں انفرادی رائے کے ووثوق، اپنے وقار کے اعتبار اور حقیقی لواب اور اطاعت کا راز، بحج میں آتا تھا۔ وہ اپنے پدر بزرگوار کے طرز عمل کو دیکھتے تھے اور چونکہ ان کا موقع ایسا نہ تھا کہ وہ متضاد اثر سے متاثر ہوتے۔ جنب امیر کی یہ روش ہر خیال، ہر ادا حسنین کی جزو عادت ہوتی جاتی تھی۔

بچوں کی حیرت، مشہور اور خیرہ کی عام چیز ہے۔ یہ سن کر کہ لشکر روانہ ہو رہے ہیں۔ وہ دیکھتے ہوں گے اور اگر پوچھتے ہوں گے کہ یہ لوگ کہاں جا رہے ہیں اور آپ کیوں نہیں جاتے۔ اور اکثر جواب پاتے ہوں گے کہ یہ لشکر ان سے جنگ کے لیے جاتا ہے جو ہمارے مای حقوق ہیں اور صاحب اختیار لوگوں کی اطاعت اور جیب گرم کرنے سے انکار کرتے ہیں۔ فرماتے ہوں گے کہ ہم اس لیے نہیں جاتے کہ اپنے ہم خیالوں سے لڑنا لینا اور حکومت ایسے موقع پر ہمیں فوج کیوں دینے لگی جس سے اس کا موقع محدود ہو جائے۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ حسنین نے یہ سوال کیا ہو گا یا نہیں کہ پھر آپ مانعین زکوٰۃ کی مدد کیجیے اور اس وقت بڑا اس کے اور کیا جواب دیا ہو گا کہ ہم حتی الوبح است رسول کے قتال میں شریک نہیں ہونا چاہتے۔ اس طرح زمانہ گزرا اور قیدیوں کا آئینہ میں مشہور ہوا ہو گا اور حسنین ان گرفتاروں کو روم اور ہمدون کی نگاہ سے دیکھتے ہوں گے جو ظلمات کے تسلیم نہ کرنے اور اہل بیت رسول کی پیروی کے لوازم گرفتار ہونے ہوں گے۔

عناصر و حسنین کے ہوش کو مد دیتے ہیں

یہ ہے کہ اب تک حسنین بہت کم سن تھے اور ہم اس اتمام صریح کا موقع نہیں دیکھتے جس سے یہ کہہ سکیں کہ ان تمام واقعات پہلو کے متعلق حسنین استنبلا اور استخراج کی نووری انتقاد کرتے تھے۔ لیکن یہ بغیر کہہ نہیں رہ سکتے کہ آسمان برس ایسا بھی نہ تھا جس کے امتحان کے اعتبار سے یہ کہنے کی گنجائش ہو کہ واقعات کا ظاہر کسی طرح شخص کا تابع تھا بلکہ کائناتوں کے حسنین نے جس غما میں پوروش پائی تھی وہ اس درجہ ہوش پور تھی جس سے یہ امید کی جاسکتی کہ جو کچھ دیکھتے تھے وہ سالم خفا چھٹکان کے مطالعہ میں محفوظ ہوتا تھا تا حال اور ان سے جو کچھ نتیجہ نکالتے تھے اس کا طویل و عرض کشائی کم کیوں نہ ہو لیکن وہ یحییٰ ہوتا تھا اس کے لیے یہ باتیں مصیبتیں۔ معائنہ طحانہ حیرت کا استنبہام اور جنب امیر کی موجودگی۔ یعنی اگر حسنین نے واقعات کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور جنب امیر سے سوال نہ کیا تو کم سے کم اصل واقعہ یاد رہا اور اگر سوال کیا تو واقعہ کے اس قدر نتیجہ یا پیش کے گھنے میں مدد ملی جس قدر شیخ جنب امیر نے مناسب بھی۔

یہ امورات مؤرخین کے یحییٰ استنبلا میں ہمدون شہوت کی طرح مصیبت ہونے اگر بچوں کے سوالات موجود ہوتے۔ یا اس کے متعلق جنب امیر کے جواب ملتے۔ اس سے حسنین کی اس

تلیخ کی خاموشی

وقت کی روش خیال اور اس کے درجہ کے گھنے میں مدد ملتی۔ لیکن ظاہر ہے کہ رسول کے بعد حسنین جو واقعات دیکھ رہے تھے اور اس کے متعلق ظرائفان کے سوالات یا جواب ہو سکتے تھے وہ ایسے تھے جو عام موقع پر ہوتے یا جنب امیر اسے ہر ایک سے کہتے پھرتے اور چونکہ زمانہ ایسا تھا جس میں اہل بیت بہت کم لوگوں پر اپنے راز کے متعلق اعتبار

کہہ سکتے تھے اس سلسلہ میں امید کرنا کہ اور لوگوں سے کہیں معلوم نہ ہو سکتا ہے۔

حسینؑ کے نوں برس خلافت کا دوسرا دور اس طبعیت پر غور کرنا اور حسینؑ کو برسوں کے جوئے

کی بنا پر جو حسینؑ کو معلوم ہوں یا جن کی دھندلی یاد بانی ہو حسینؑ کو بھی یہ امید ہو کہ ہمارے پدر بزرگوار مٹا کی امت کے عثمان گیر ہوں اور اس خبر کے مشہور ہونے کے ساتھ کہ کوئی دوسرا حاکم ہو، جانب امیر اور نبی ہاشم کے بشمول حسینؑ کو اپنے موقع کی ایسی گہادی ہو۔

اس دوسرے دور نے بھی جانب امیر کی متوطنانہ حالت میں کوئی زیادہ نازک موقع نہ پیدا کیا، اگرچہ اس وقت کے مرکز خلافت کی گڑھ گری طبیعت سے اس کا خوف ہوتا لیکن تھا، بلکہ اس کے برخلاف اس لحاظ سے کہ ابوداؤد مکی اور انصاری کا اہمیت پرستی جاتی تھی خلافت کو نازک مٹی موقع پر جانب امیر کی صلاح پر عمل کیے بغیر چارہ نہ ہوا۔ خلافت کے موقع کے اعتبار سے جانب امیر کا ایثار ان کے خدائی اقوام ہونے کی بہترین دلیل ہے، اور فرقہ اسلامی کے لیے پیش کی ایک قیمت ہے کہ کہاں وہ بلا جو اختلاف کے دخی اور ملی موقع پر اپنے کو فخر دکھا سکتے ہیں اور مل کر کام کر سکتے ہیں۔

ابن عمر کا ایک فقرہ اس زمانہ کے واقعات میں اس خیال کے شور و غما کا شہرت نکلا کہ وہ مسلمان جو اسلام

مقابلہ میں اس اصول کی کوئی باز پرس نہ کی جاتی یہ حالت غلیفہ زاد سے ظاہر ہوتی اور غالباً انھیں سے اس لیے ظاہر ہوتی کہ وہ اپنے باپ کو غلیفہ دیکھتے تھے اور تقسیم قیمت کے وقت کہہ رہے تھے کہ: ”حسنؑ و حسینؑ دو لڑکے تھے جو زمین کی گلیوں میں کھیلنے پھرتے تھے۔“ میرا غلبہ یہ نہیں ہے کہ میں مسلمانوں کی مخالفت کر رہا ہوں، بلکہ مجھے ملاقات مسلمانوں کے نہ برتنے جانے کی شکایت ہے کہ کیوں حضرت علیؑ کے بڑے وقتے اور پھر گھلوے پر اعتراض نہیں ہوا۔ ہاں میں یہ بھی کہہ رہا ہوں کہ مسلمانوں پر ہندی کے معنی احسان فراموشی نہیں ہے، ابوداؤد مکی تو میرے نزدیک خودیہ لڑکھٹے مسلمانوں کا موقع تھا نہ غلبہ احسان شامی کا۔ بلکہ اس موقع کی وہ بھی ہے کہ غلبہ احسان رسالت کے ساتھ کوئی لڑکھٹا آکر سے دیکھنے کی چیز ہوتی اور اعتراض کیا جاتا یہ میرے قیاس کے باہر ہے کہ حسینؑ نے اسے محسوس نہ کیا ہو۔

حسینؑ کا خلیفہ ثانی سے منبر پر خطاب قبل بلوغ تھا کس حد اور موقع پر یا کس سن میں حسینؑ نے خلیفہ دوم کو

مناظرب کیا جس وقت وہ منبر پر تھے نہیں معلوم۔ میں اس روایت میں علامہ سوطی کے اجتہاد کی بنا پر آگے جاتا ہوں۔ اس کے بچنے کے لیے موقع اور الفاظ کی بوسے علاوہ اور کسی چیز سے مدد نہیں مل سکتی۔ الفاظ کہتے ہیں کہ وہ دعوے کو پھالتے ہیں۔ منبر کو پھالتے ہیں۔ اپنے باپ کے منصب اور حقوق سے واقف ہو سکے ہیں۔ کوئی جانے کہ حسینؑ نے کتنے دیر سنا سننے کے بعد انھیں اہل بیٹم دینے میں کتنی دیر لگی اور کہنے یا نہ کہنے کا تفسیر ارادہ کی کس قدر جنگ کے بعد ہوا۔ لہجہ اور الفاظ کہتے ہیں کہ حسینؑ کو اپنے الفاظ کے تیرہ لاکھ احساس نہ تھا لیکن اگر مجھے حسینؑ کی اس وقت کی حالت سے تفسیر کرنا چاہو تو کہوں گا کہ ایسے واقعات حسینؑ کی کئی خوش نہ بے جوشی میں گزرے تھے جس سے امید کی جاتی کہ وہ جانتے ہوں اور

بلوچوں اس کے ان کا جو شہنشاہ کے اس وقت کے مندر سے بڑھ گیا ہو یہ موقع بھی تصفیہ میں آسانی پیدا کرتا اگر یہ معلوم ہوتا کہ الفاظ کا بحث کیا تھا اور مقرر کے کس حاشی موقع پر حسین سے لڑنے کے بغیر نہ رہا گیا لیکن مؤرخین نے واقعہ کی اس مفید کڑی کو محدود یا غالباً اس لیے کہ حسین کی غلط فہمیاں اور ابن الخطاب کی بزدلانہ بردباری کے علاوہ اور کسی پہلو کا دکھانا ان کے نزدیک غیر مفید تھا حکومت کا یہ سوال توجہ کے قابل ہے کہ: "یہ تمہیں کس نے سکھایا ہے؟" جو کچھ بھی ہو الفاظ آمد جناب کی بدولت سے رہے ہیں اور بادجو دیکھ سہرزمین عرب خط استوا کے قریب ہے، جہاں معتدل یا سرد ملکوں سے بہ نسبت جلد بلوغ ہوتا ہے، میں گیارہ یا بارہ برس سے زیادہ عمر کا تصفیہ نہیں کر سکتا۔

سن کے سمجھنے میں ترتیب دیوان کے واقعہ سے مدد۔ عمر کا یہ تصفیہ اس لحاظ سے بھی ہے کہ ترتیب دیوان کا قصہ

خلیفہ میں بتلایا گیا ہے جس کے اعتبار سے حسین اس وقت ساڑھے گیارہ برس کے تھے اور چونکہ خلیفہ نے حسین کے خلیفہ میں لحاظ کیا تھا طبعی لحاظ یہ چاہتا ہے کہ حسین اس کے بعد روکھیاں جائز نہ دیکھتے لیکن میرزا یہ طبعی تصفیہ نہیں ہے۔ حالت اس کے بالکل عکس بھی ہو سکتی تھی اس لیے کہ ترتیب دیوان میں حسین کا حصہ کوئی اس کی رشوت نہ تھی کہ وہ کچھ نہ دیکھتے لیکن اگر طبعی لحاظ حسین کے اکندہ خاموشی کا باعث ہو سکتا تھا تو میرے خیال میں یہ روایت بھی قصہ منبر کے بعد کی ہے کہ: "میرے سسر کے ہاں تھوڑے ہی اگلے ہوئے ہیں۔" لیکن ایسی سیاسی غلطی لگا ہی ہے جو اس کا مفید ہے کہ قصہ منبر ترتیب دیوان اور مذکورہ بالا روایت کے پہلے کا ہے اور وہ یہ ہے کہ: اگرچہ حسین بہت کم سن تھے اور انہیں نہ خود کوئی اختیار تھا

خلیفہ کی خاموشی الفاظ کے بے پردہ سیاسی موقع سے

نہ ان کے پدر بزرگوار کا ایسا موقع تھا کہ لوگ فحشہ میں ساتھ دیتے تاہم ایک کم سن بچہ کا جو رشوت کا نواسہ بھی ہو بھری محل میں یہ کڑوا حق تھا کہ: "میرے ہاں کے منبر سے اتر آؤ۔" ایک ایسی بڑی حرکت قلوب میں پیدا کر سکتا تھا جو خلافت کے مفہوم نہ ہوتی۔ خلافت کی طرف سے کوئی چشم نمائی یا مقبولیت کی حرکت نہ تھی۔ کیونکہ کوئی دلیل حسین کے قول کے رد میں نہ ملتی جا سکتی اس لیے جو اس کے کوئی مطلب نہ تھی کہ منبر سے چہرہ سے انصاف پسندانہ اقرار کیا جاتا کہ: "ہاں تمہارے ہاں کا منبر ہے۔" جس سے لوگوں میں تردید کے لیے مستعد ہوجانے کی حرکت نہ ہوتی، بلکہ خلافت کی انصاف پسندی انہیں اپنی جگہ رکھتی اور چونکہ اس فقرہ نے یہ بگاڑا تھا کہ یہ بچہ کس طرح کا بے خوف صفت گو ہے اس لیے ضرور متنبہ ہوتی کہ اس کی دیکھنی اور خاموشی کے لیے ہمیشہ توجہ اور لحاظ سے کام لیا جائے۔ جس سے لوگوں میں مقبولیت بھی پیدا ہوتی جائے، اور کبھی انہیں حقیقت امر کا بے غلبہ احساس نہ ہو۔

حسین کے الفاظ اور جناب امیر۔ حسین کے اس کہنے سے جناب امیر کا موقع نازک ہو گیا تھا۔ خیالات اور الفاظ بے لگام ہو جاسکتے تھے۔ اس لیے کہ

سننے والوں میں ہر شخص خلیفہ کا ایسا مختلط بردہ تھا کہ یہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ ہر شخص حسین کا ساتھ دیتا وہ کیسا ہی جاکریں نہ کہتے ہوتے بلکہ کم ہی بھی لیکن حکومت کے ساتھی بے کجے ہونے حمایت میں اپنی آواز بلند کر سکتے تھے موقع کی

سلطانی کو جناب امیر کی چشم نمائی نے دفع کیا ہوگا اور شاید اس کے بعد حسین کو اس کی نصیحت کی گئی ہو کہ اگرچہ یہی ہفت کہنا تعریف کا مستحق ہے لیکن ایسا بھی موقع ہوتا ہے کہ قطعاً ناموشی قویں مصلحت ہوتی ہے اور پھر اس کے بعد حسین کی سبے مختلف حالت گئی پراخیں پیار بھی کر لیا ہو۔ خدا ہی جانتا ہے کہ مکہ میں معاویہ کی اس تقریر پر کہ حسینؑ نے مجھ سے بیعت کی حسینؑ کا ناموش رہنا اس وقت کی حکیم سے متاثر تھا یا نہ تھا۔

حسینؑ اور شہر بانو زمانہ گزر تا گیا یہاں تک کہ حسینؑ کی عمر کے اس مشہور حصہ تک پہنچا جس میں اتفاقات نے انھیں اور یزید جو کی لڑکی کو یکا یکاً کتب خیز ہوا اور حیرت انگیز پند کا

حسن اتفاق تھا۔ شہر بانو خاندان کسریٰ کی یادگار نہ ہوتی اگر بنی ہاشم کے علاوہ کسی کو چنتی۔ اس وقت اسیری تھی، لیکن اسیری نے شاہانہ پسند میں فرق نہ کیا تھا۔ بلند نظری اسیر نہ ہوتی تھی۔ مغرور آں دار دل سینہ میں تھا۔ اور نگاہ میں وہ ملک تھا جو بہترین حق کے علاوہ کسی پر شہرتی نہ تھی۔ یہ اختلاک دوسرے میں مقابل خصوصیت کا امتیاز اور انتخاب کر سکتی تھی۔ بلند شاندار بشرے کا پھانسا جس پر شرف اور نجابت کی حریریں ہوں چھپ جانے کی چیز نہیں ہیں، ان کے شے کے لیے مدلیں کی کھلم، انھیں اور لازمی ہستی میں رہنے اور یہاں تک ذلیل ہو جانے کی ضرورت ہے کہ اسے طبعا قبول ہی کر لے یہاں تک کہ ذات کو ذلت نہ بچے کے دن ہونے تھے کہ شہر بانو ملک فارس نہ رہی تھی اور نئے دن ہونے تھے کہ حسینؑ شاہانہ پسند تھے۔

شہر بانو کا دربار میں داخلہ موقع کا خیال کر دو کہ ایک قوم فتح کی خوشخبری اور منشور اسباب کی نادر چیزیں دیکھنے کی مشتاق ہے جن میں مغرور کسریٰ کی ایک شاہزادی بھی ہے۔

داخل ہوتی ہے اس کی نگاہیں میوڑ ہیں کہ موجودہ مظہر بحیں شاہانہ نامر غوبیت اور ناشکستہ چھپے مجمع کو دیکھتی ہے۔ لیکن فطرت نے اس کے ساتھ اتالی خرمی اور حسن کی لطافت عطا کی ہے۔ جسے ویرات اور لباس نے اور زیورہ دل کش بنایا ہے۔ اور ان سب کے باوجود وہ موقع بھی عین حقیقت ہے۔ جس سے ہاوی اور دل کشنگی کے نقش کا چہرہ پر نہ ہوتا لیکن نہ تھا۔ شہر بانو کے داخل ہوتے ہیں مجمع میں ایک فلی حرکت کا ہونا نظری تھا لیکن اس عجب حیرت خیز مظہر سے متاثر ہونا بھی وہاں ہی غری تھا۔ اس نے کچھ کو ناموش کر دیا ہوگا کچھ نے اپنے افکار کے خدای جو شمس کو روکا ہوگا اور کچھ علی ہمدردی کے اظہار پر آمادہ ہو گئے ہوں گے۔ ہم نہیں جانتے کہ کسی کی ہمدردی کی لہر یا بلندی قیامہ اس وقت ان ہذبات کا اس وقت سے مظہر تھا یا نہ تھا جو شہر بانو کو متوجہ کر سکتا اور وہ اس کی گرفت کر لیں۔ ہم نہیں جانتے کہ ہاشم بن عقبہ ہوں یا اخف بن قیس انھوں نے ان شاہی اسرار سے اہل بیت نبوت کے حسن صفات اور تمام کائنات کو اپنا کر لیا تھا، جو اس وقت بددیتا لیکن وقت آ رہا تھا کہ داغی حرکات کا مسئلہ حل ہوتا اور آئندہ اشارے اس کی شرح ہوتے۔

خلیفہ کا حکم اور شہر بانو وہ منہلک حکم صادر ہوا جس سے دربار کے کسی غلام کو یہ آراوی حاصل ہوئی کہ وہ شہر بانو کے جسم سے آخری عطیات شاہی کو

دور کر دیتا۔ اور ہر جمع اسے دیکھتا۔ شہر بانو کی گردن جھکی لیکن تعمیل حکم کرنے والے کو مسترب دیج کر چڑا تھی اور بلند ہوئی۔ شریفانہ آں خود کو آئی اور اپنے گرفتار ہاتھوں کی کمزور قوت یا کمزور ہاتھوں کی گرفتار قوت سے سینہ پر ”دو ہتھ“ مارا۔ ایران کی شرافت یہ آخری لڑائی لڑ رہی تھی۔ کسی شریعت اور شجاعت سے متاثر دل کے لیے اس سے زیادہ اندوہناک

متکبر تھیں نہ تھا لیکن افسوس ہے موقع کی حکمت نہ بری اور افتخار کے عدم اعتدال پر جس نے شریعت قیدی کے جس کا احساس نہ کیا اور ”عمر بنی النضر غیظ و غضب میں آنے اور لوگ اس کا مکہ مکرمہ پر تازیانہ بلند کیے ہوئے متکبر حکم کے تھے اور وہ روتی تھی“ :-

اندھینا کٹ خاموشی اور جناب امیر کی صدا اس منٹے اور قیدی کی پچی کے کسی دھند میں ایک آواز بلند ہوئی جو کہہ رہی تھی کہ ٹھہرو!

”غصہ نہ کرو“۔ لوگ غائب ہوئے اور ہر ایک کے دل سے تسکین کی صفی سانس نکلی۔ جب نقیب حجت سے رجوع کی یہ حدیث بنی کہ: ”جو عزیز و ریس قوم کہ ذلیل و خوار ہو جائے اور خوشی و توکیر بھی قوم کا احتجاج و تدارک ہو جائے تو ان پر رحم کرو“۔ ہم نہیں جانتے کہ بھولے ہوئے رحمتہ للعالمین کے صدائے بلاغت اور موقع کی اندوگی نے ”رحم“ کے لفظ کو یاد دل کر کتھوں کو چشم بر آب کر دیا ہوگا۔ لیکن ہم سوچتے ہیں کہ شہر بانو کے لیے الشہداء ان محمد رسول اللہ کہنے کا دوسرا وقت نہیں ہو سکتا، ڈوبتے کو تنکے کا سہارا ملے ہوش آگیا اور شہر بانو نے جناب امیر کو دیکھا اب مخصوص توجہ کے بعد اس وقت کے ہذبات کا صفت پڑھ لینا آسان سے بھی زیادہ سہل تھا۔ پہلی نظر کے بعد اپنے شرافت اور عزت کے وکیل کو پھر دیکھنا ہی تھا۔

دوسرا رنگ جناب امیر کی فکر سننے میں کاب رنگ دیکھنے اور شہر بانو پر نگاہ جانے میں جس قدر عرصہ ہوا جو لیکن خلافت کی نگاہ اب موقع کوئی کی فکر سے متاثر ہو کر دیکھ رہی تھی، اور اب یہ تماشہ دیکھا کہ قاریس کی شاہزادی شاہ کوہن کے نواسہ کی طرف دیکھ رہی ہے۔ اس فراست سے جس کے معنی سمجھنے میں کوئی غور کی مشقت نہ ہو۔ خلیفہ بھی اس کے معنی ”انکشافات“ ہی سمجھ رہا تھا جس وقت شہر بانو کی نگاہ نے اس سبزہ آغا کو دیکھا، وہی وقت ان کی حقیقی اسیری کا تھا۔ اس لیے کہ ”لوگوں میں از روئے مباحث و وہابیت کے حسین سے کوئی بہتر نہ تھا“۔ ایک کھٹا ہوا بھول، اچھی فطری تازگی اور اپنے قائدانی خصوصیات کی روشن حریر دل کے ساتھ نرمی سے اپنی اصل کے سایہ میں اگا ہوا تھا۔ سن کی بے خبری شہب کی لطافت اور آبی ہوئی جوانی کی گوارا سختی کے ساتھ غزالانہ حیرت لے شہر بانو سے کہا کہ میں دیکھو اور شرفانہ بلند بصرہ کی ہمدردی نے شاہزادی کو اسیری کا آزادانہ جوش دلایا۔ وہ کچھ دیر کے لیے بھول گئی کہ ہم کہاں ہیں۔ کھوئی ہوئی چیز مل گئی تھی۔ لبوں میں حرکت نہ تھی۔ دل تھا جو کہہ رہا تھا کہ کیا میں اپنی کنیزی میں قبول کرو گے؟ آسمان ہذبات کی ترہاں قہم۔ اور دل ہی تھا جو مستی خیز حرکت کا احساس کر رہا تھا۔

متذکرہ صدر طبعی حالت کے استنباط کے عناصر یوحسین کی موجودگی کے ان کے قیام کی کھی شان، انداز کی کوئی صورت اور الفاظ کی

کسی بھی صدا کا بھی ہیں علم نہیں۔ اس لیے ہم کسی استنباط کی جرات نہیں کرتے۔ ہم اب تک جو کچھ دیکھ رہے تھے وہ جناب امیر کی موجودگی اور اظہار خیال، خلیفہ کے فقرات، شہر بانو کے انداز، موقع کی مناسبت اور اس کی فطری شان تھی جن کی تاملی حیثیت باب سیوم میں دکھائی گئی ہے۔

مصلحت حال اب بغیر اس کے کہ موقع کی نزاکت اس کی سیاسی شان، جناب امیر کے فرائض کی قوت اور شہر بانو کے میلان وغیرہ زیادہ دروسوں کی بجائے یہ کہنا چاہیے کہ ساتھ انصاف ہو گا کہ انھوں نے

چونکہ پیشتر کی روش کو ایسے طرز عمل سے بدلا جو مقبولیت کا باعث ہو گا۔ اگر حاضر الوقت "مظنی" فکر نگار اور محنت پذیر ہو سکتے تھے تو جناب امیر خوشی تھے کہ کسریٰ کی لڑائی میری وکالت موجودہ اسیری ہے اس درجہ بلند ہوئی کہ اب میری بہو ہے۔ کیا اس وقت طاہر بلا آئی ہوں گی کہ جو میں تو اپنی بہو تھیں؟ اور حسین تو اب علیہ کا "ہدیہ اور تحفہ" لیے گئے تھے۔

پس ماندہ اسباب شاہی حضرت شہر بانو کے حاکمین نے اس شرط پر اپنے کو ہاشم کے والد کیا تھا کہ انھیں امان دی جائے گی۔ اس شاہی گروہ کے پاس اب تک پیسے ہمارے ہیں

امارت اور خدام اور کئی قیمتی انصاف یہ چاہتا ہے کہ ان کے ساتھ اسیران جنگ کلبو تاون کیا جاتا ہے اور ان کے جان مال اور عزت و آبرو دار اور ہمسایہ کے اصول کے ماتحت نہ ہوتے۔ ان واقعات کے بنا پر ان کے فائدہ و مفاد میں جس قدر بے مروتی اختیار ہوئی ہو، آخر میں ایسا ہونا چاہیے تھا کہ یہ اپنی رائے اور موقع میں آزاد رکھے جاتے۔ اگرچہ اس کے لیے جناب امیر کو وکالت کی ضرورت ہوتی اور ایسا ہونے کے بعد کوئی وجہ نہ تھی کہ وہ تمام اسباب جو شہر بانو سے متعلق تھا وہ ان کے والد نہ کیا جاتا، اس لیے کہ یہ قیمت میں داخل نہ تھا۔ میں سوچتا ہوں کہ کیا یہ ممکن تھا؟

کنیزوں کی آزادی کے معنی اور روضۃ الشہداء کی یہ روایت تھی بہ واقعات ہے کہ حضرت شہر بانو نے اپنی نو کنیزوں میں سے پچاس کنیزیں اپنی کھڑی کے

دو کمرے دن آزاد کر دیں۔ پچاس کنیزوں کی آزادی بچانے خود ایک شاہانہ بلند ہو چکی ہے۔ لیکن یہ محض شاہانہ بلند ہو چکی نہ تھی جس سے شہر بانو نے ایسا کیا، بلکہ ایک "لوگ" جو اپنے شاہانہ شوک و اختتام کے آئندہ خواب دیکھنے کی بھی امید نہیں کر سکتی اپنے بچلے دنوں کی خوش آئند عطاات کو خود سے دور کر رہی ہے۔ وہ اپنے کو اپنی موجودہ حالت کے موافق بنا رہی ہے۔ ایسا کرنا قیاس کے اندر نہ تھا جب تک اس میں وہ کیفیت نہ پیدا ہوئی ہے "خوشی" اور اطمینان کہتے ہیں۔ اور اسلام کی تاریخ میں غلام یا کنیز کی آزادی اعظمی شکر اور امتنان کے علاوہ کوئی محی نہیں رکھتی۔ حضرت شہر بانو کی پسند جس امید کی ابتدا محی کنیزوں کی آزادی عملی سرشت کا ضمیر تھا۔ ان کی اسیری کے اتفاقات اور گزشتہ کی افوس ناک یاد کے لحاظ سے ان کی موجودہ حالت کے علاوہ ان کی تسکین کا اس سے زیادہ کوئی حل نہیں ہو سکتا تھا۔ حسین ان کی تسکین، حسین ان کے دکار، اور حسین ان کی راحت تھے۔ وہ پست نہ ہوتی تھیں، بلند ہوتی تھیں۔ کم مثالیں ہوں گی جس میں کسی افوس ناک ابتدا کی ایسی ہوتا ہو۔

خوشگوار تعلقات کی کافی مثال اگرچہ میں اس کے بعد حضرت شہر بانو اور حضرت امام حسین علیہ السلام کے آپس کے تعلقات کی خبر یہ نہیں معلوم تھا لیکن شہر بانو کی روایت

اس تصنیف کے لیے بہت کافی ہے کہ یہ تعلقات نہایت خوشگوار تھے۔ یہ روایت بتاتی ہے کہ یہ لوگ کس درجہ ذکی انھیں تھے کس درجہ ایک دو کمرے کی خاطر کاملاً قضاہ اور کس درجہ حقیر شہر بانو حسین کی خاطر اور ملاحظہ اپنے خیال کی حد تک بڑھاتی تھیں۔

دنیاوی اور روحانی شہنشاہی کا فرزند حضرت شہر بانو کے واقعات ہمارے لیے اس وجہ سے اور توجہ کے قابل ہیں کہ انھیں کو یہ فخر حاصل ہو کہ

ان کے بطن سے ۳۸ برس میں امام چہارم کی ولادت ہوئی وہ امام جن کے سولیہ حیرت صبر نے حسینؑ کے مبارکہ فضل کو کرنا سے کوفہ، کوفہ سے دمشق اور دمشق سے مدینہ تک پورا کیا وہ تمام عمر صبر اور برداشت کی زندہ تصویر بنے رہے۔ امام چہارم کو نہ صرف اپنے پورے بزرگوار کی مخالفت بلکہ اپنی اور گرامی کی امیری کے واقعات کا بھی دورہ ملے۔

انیسواں برس خلافت کے اس دور کے انتظام یعنی ذی الحجہ ۳۸ تک حسینؑ کا سن اقدس انیس برس کی عینہ کا تھا۔ اس میں جس قدر واقعات گزرے وہ نہ صرف حسینؑ کے ہوش کے زمانہ کے تھے بلکہ وہ احب ان تمام قوتوں کے مالک تھے جس سے کوئی واقعات کو دیکھتا اور اس سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ اور یہ زمانہ صرف حسینؑ کا وہ زمانہ تھا جس میں انھیں گزرے ہوئے واقعات جو کئی ہوش کے زمانہ کے تھے جلتے جلتے اور وہ موجودہ کے قابل سے ہر ایک کو کچھ لیتے۔

دور ثانی کی خصوصیات اور حسینؑ یہ زمانہ مسلمانوں کی ملکی فتوحات اور اس کی لازمی مشغولیتوں کا وقت تھا اگرچہ خود اس میں بھی ایسے واقعات نہیں معلوم جس میں حسینؑ کی کوئی عکاسی ہو لیکن چونکہ یہ خبریں ہیں کہ جناب امیرؑ سے شام اور فارس کی فوجی صلاحیتیں، زمینوں کی پیمائش، حاصل کی تقرری، زمین سہ، مناسب تعلیم کے آدمیوں کا انتخاب، فتوحات کا فیصلہ، مشتعل ہو گیا تھا۔ تاہم تاکہ یہ امور اس کے اصول حسینؑ کے لیے سچے ہوتے۔ حسینؑ اس وقت کے جنگی شوق میں شریک نہ تھے لیکن تاہم تاکہ فوج عرب کی جنگی خصوصیات نے حسینؑ میں ایک سخت ہانکا ہوا جوش نہ پیدا کیا ہو تا۔

اور گو کہ زمانہ تھا جس میں خلافت کی کوئی توجہ ان کے ساتھ رعایت کی جاتی لیکن کیسے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ وہ جو اپنے باپ کا میراث لیتے، علاوہ منصب اور حقوق نہ پہنچتا ہوتا، یا یہ نہ جانتا کہ یہ میرے نانا کی امت ہے جو کجوری ہے کہ وہ اس وقت ہماری نگرانی سے مستثنیٰ ہے۔ کیسے ہو سکتا تھا کہ وہ اور مسلمانوں کی طرح فہرست میں ہو تا اور یہ نہ سمجھتا کہ رسولؐ نے جو کچھ تلازمہ قرار دیا تھا وہ اس سے الگ تھا جو اس وقت حکومت نے مناسب سمجھا ہے۔

حسینؑ کے ملاحظہ کی چیزیں فتوحات کے شور کے پیچھے تھیں لیکن حسینؑ کے دیکھنے اور سمجھنے کے لیے

اس سے بڑے مسائل تھے کہ انھیں کوئی فوجی عہدہ ملا یا نہیں یا وہ فوج کے حق دار تھے یا نہیں۔ اور بچے تین ہے کہ وہ بغیر حسینؑ کی توجہ کے نہیں گزرے۔ اس لیے کہ اس کے متعلق ان کے پورے بزرگوار کے خیالات ہیں کہ وہ کیا سوچے رہے تھے۔ حیرتی غرض فتوحات کے شور کے پیچھے ہے۔ قوم اپنے بعض خیالات اور احساسات سے اس قابل ہوتی تھی کہ بڑھ سکتی۔ بڑھنے کی یہ قابلیت اس تعلیم کا دور تھا جو انھیں ہادی برحق سے ملا تھا۔ اس نے انھیں اس قدر ممالک نہیں دیے تھے جس قدر فوجی مخالفت کے عناصر مل گئے تھے۔ اب قوم ملک میں ڈوب گئی تھی اور یہ دیکھنے والا نہ تھا کہ تم مخالفت فوجی کو زیادہ کرتے جاتے ہو یا کم کرتے جاتے ہو۔ بدترین زیادہ سے زیادہ منشور ممالک کے سنبھالنے کی فکر میں تھے لیکن فوجی ڈانچہ؟ اس کا کوئی محافظ نہ تھا، اور جس جس طرح مشغولیتیں بڑھتی جاتی تھیں، اگرچہ مخالفت قومیت کی ضرورتیں بڑھتی جاتی تھیں لیکن نئے اسباب اسے کھٹاتے جاتے تھے۔

حصولِ علم کے ذرائع

مجھے اس کا بھی لحاظ ہے کہ ممکن ہے کہ شہاب نے ہارنیک سیاسی مسائل میں الجھنا گھبرانہ کیا ہو، اور اس سے واقعات کا تمام تر گنا اور اتنے نتائج اپنی کوشش سے نہ ہو، بلکہ صرف اسی قدر جو جس قدر جالب اسیر کے اشاروں سے ممکن تھا یا جس تک دور دور سے نظر پڑی تھی لیکن بہت جلد زمانہ آنے والا تھا جو بڑی قوت سے ترجمہ کرتا اور اس وقت لوگوں کے واقعات گویا ہوئے بغیر نہ رہتے۔ اس واقعہ کے بارے میں لکھ کے ختم اسباب تھے تو اس وقت ظاہر ہو گئے تھے۔ اکثر مواقع کے متعلق حسین کے خیالات کا موجود نہ ہونا کچھ تو اس وجہ سے ہو کہ کوئی ان کے ہر اشارے، الفاظ اور خیالات کا ضبط کرنے والا نہ تھا اور کچھ اس لیے کہ اس اصول کی بنا پر کہ انہر خاندان کے ہوتے ہوئے ماتحت متعلقین معاملات میں فساد دار نہ کبھی جاتے تھے حسین کا یہ موقع ان کی عمر کے چھالیس برس تک رہا۔ لیکن اس عالم اسباب میں اپنے گرد و پیش کے واقعات جاننے کا ہمیشہ ہی ذریعہ نہ تھا کہ کوئی ہر امر میں دخل بھی ہوتا رہے، بلکہ کچھ تو بزرگوں کی تعلیم، کچھ ان کی نگرانی کے اثر، کچھ ان کی پیروی، کچھ مستند بگدادوں کے طرز عمل اور گرد و پیش کی فضا کی نوعیت، اور پھر اس کے بھائی موجد قالیبتوں سے اس کا دیکھنا اور سنا تھا۔

میں اس پر کوئی بحث نہیں کرنا چاہتا کہ آیا زبردستی سادہ میں رہنا زیادہ مفید ہے یا ہر امر کا خود فیصلہ کرنا اور دخل ہوتے رہنا۔ میرا تصنیف ہے کہ وہ لوگ جنہیں فطرت نے یہ صحیح قابلیتیں عطا کی ہیں کہ وہ حتی الوسع خود پیش آئیں اور اپنے اپنے واقعات کا تصنیف کرتے رہیں انہیں بھی ہاتھوں سے اپنے فیصلہ پر زیادہ اعتبار ہوتا ہے، اور ان میں رفتہ رفتہ ایک استیلا کا شوق ہوتا ہے جو آئندہ صحیح تصنیف میں مدد دیتی ہے۔ لیکن بے چارہ انسان اپنے فخر کے دفتوں میں بھی کیوں نہ سوچے کہ اس کی سانس کے اشارہ پر زمانہ چل رہا ہے۔ لیکن اکثر وقت آتا ہے جس میں اسے ہوش آتا ہے کہ ہماری سانس میں جھٹکا ہو سکتی ہے اور ہم سانس لینا چاہتے ہیں اور نہیں لے سکتے اور جس وقت ہم دہانہ ہاتھ دیکھ رہے ہیں یہ ہوش نہ تھا کہ ہاتھ ہاتھ بھی ہے۔ اس کا درد ہوش ابے اس سے زیادہ گرا دیتا ہے جس حد وہ غور میں جھٹکا ہو سکتا تھا کتنی باتیں وہ خود سے سوچ سکے گا اور کہاں تک وہ گزشتہ کے تجربہ سے اپنے کو مستثنیٰ سمجھے گا کہ آئندہ ہر قدم پر ٹھوکر کھانے کا خطرہ زمانہ کی مثالیں بکھاتی ہیں کہ وہ جو پرانی تعلیم کے اثر کے بھانپتہ زمانہ کی روش سے واقف ہوئے وہ ان سے اچھے رہے جو زمانہ گزشتہ کی سہولت میں گرفتار رہے اور وہ ان سے بھی عقلی اعتبار سے کہ وہ ان میں رہے جنہوں نے ہر قسم کے اثر سے خارج ہو کر ہر جگہ اپنے اجتہاد سے کام لینے کو بہتر سمجھا۔ نتیجہ یہ ہے کہ ابتدائی عمر کے بڑا حصہ تک مناسب اور مختار تعلیم کے زیر اثر ہونا اگرچہ اس میں کسی طرح کی آزادانہ جھٹکا نہ ہو آئندہ کے لیے آگے بڑھنے کا ایک مرکز قائم کرنا ہے جس کے بعد ہم ہر معاملہ کے ساتھ لڑتے نہ پھر رہے اور خیالات اور ان کے اثر کے حدود سے واقف ہو جائیں۔ اس سے ہمارے قابلِ عقار انسان ہونے میں کوئی صحت لاحق نہیں ہوتا۔ تو اگرچہ حسین کی عمر کے بڑے حصہ تک میں معلوم نہ ہو سکا ہو کہ حسین کے خیالات کی رفتار کیا تھی۔ لیکن یہ معلوم ہے کہ ان کے آپس نے ظاہر کے خیالات اور عمل کیا تھے۔ اور اس فضا سے جو اثر حسین کے خیالات اور عمل پر پڑ سکتا تھا وہ اس قدر اطمینان خیز ہے کہ اس کی موجودگی میں ہر موقع پر حسین کے خیالات کا موجود نہ ہونا کوئی کمی نہیں ہے۔

نانا کی یاد دلانے والی چیزوں کے ساتھ بے کاظمی اور حسینؑ

یہ واقعہ حسینؑ کے لیے کم افسوس کا نہ ہو گا جب انہیں معلوم ہو گا کہ میرے نانا کا یلو کار درخت کٹا دیا گیا۔ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ مردہ چیز جو نانا کی یاد دلاتی تھی، کو عزیز ہو گئی۔ اس کے علاوہ املویہ کے متعلق انہوں نے غلیظہ کا خیال سنا ہو گا اور بہت کم قہر ہے کہ انہوں نے اس مصلحت کو پسندیدگی سے دیکھا ہو، جسے غلیظہ نے ظاہر کیا تھا۔ انہیں کعبہ کے متعلق خصوصاً عمر کا خیال معلوم ہو گا اور پھر اپنے پدر بزرگوار کا جواب سنا ہو گا۔ اور یہ بھی ان سے چھپا نہ ہو گا کہ غلیظہ کعبہ کے مال کا کچھ معرفت چاہتے ہیں، جسے علی مرتضیٰ نے اپنی حیثیت سے قائم رکھنے کی صلاح دی۔ اور حسینؑ نے یہ بھی سنا ہو گا کہ غلیظہ نے کسی غرض سے کیوں نہ کہا ہو کہ: ”اگر ہم تم کو اس چیز سے جس کو تم بچاتے ہو اس شے کی طرف پھیرا جس کے تم فکر ہو تو تم کیا کرو گے۔“ اور ان کے پدر بزرگوار نے یہ وقت دار پر جوش اور صریح جواب دیا کہ: ”اگر تو توبہ کرے تو تیری توبہ قبول کر رہا ہوں۔“ اور اس سوال پر کہ: ”اگر نہ مائیں؟“ تو فرمایا کہ ”گردن مار رہا ہوں۔“ ظاہر ہے کہ اس کہنے کی جرأت اس وقت صرف مولانا امیر المومنین میں تھی وہ اپنے جواب کے وقت سوال کرنے والے کی قوت جانتے تھے اور وہ اپنے جواب اور مسلمانوں کی تائید کی بھی قوت جانتے تھے۔ لیکن یہ ایسی بات نہ تھی جسے اور مسلمان نہ سمجھتے ہوئے، صرف وہ اختلافی جرأت اور لوگوں میں نہ تھی جو سید العرب میں تھی۔ باپ کی طبیعت کی یہ چمک بیٹے کے پسند کی چیز تھی اور وہ سوچ سکتے تھے کہ اگر ہم دوسرے کو ایسی غلطی سے روکنے کے لیے قتل کی دنگی دے سکتے ہیں تو یہیں بھی اس حکم کے لیے جان دینا ہو سکتا ہے۔

اور بلا جہد غلیظہ کی ان تمام شہیدوں کی توجہ کے جن کی مثالیں حسینؑ کے متعلق ملتی ہیں، ایسے خلافت نبویہ کی مدد بنی کرنے کے لیے کافی تھے جو ان عباس سے مکالمہ میں حضرت عمرؓ سے ظاہر ہوئے۔ اس کے بعد قریش اور ان کے گزشتہ اور موجودہ سرگرمیوں کی روش گھنے میں یا یہ گھنے میں حسینؑ کی عمر کو دشواری نہ ہونا چاہیے کہ ہمارے ساتھ کہاں تک بے غرض اور حقوق شہسائہ رعایت ہے۔ اسی طرح کسی ہاتھی سے یہ امید کرنا کہ وہ بنی امیہ کی ان کارروائیوں کو بھول گیا جو اسلام کے انسداد اور ہادی کی اپنا ادبی کے متعلق ان سے سرزد ہوئیں، ان کے سیاسی اور قوی حس کو قبل از وقت مردہ تصور کرنا ہو گا۔ قوی حافظہ انفرادی حافظہ سے زیادہ دیر پا ہوا کرتا ہے۔ دراصل ایک متواتر محسوس نے زخم کو ہمارا کھاتہ اور نہ وہ حیرت خیز انقلاب ان سے پوشیدہ رہ سکتے تھے جس سے شام کا صوبہ بنی امیہ کی نوآبادی اور ایک خود مختار صوبہ کی حیثیت اختیار کر جاتا تھا۔ یا جس حیثیت سے وہ رسول کے بعد سے گزشتہ ظلم میں داخل دکھائی دیتے تھے اور جب بنی امیہ کے ایسے گروہ کی شرکت اور ان کا اقتدار حکومت نے گوارا کر لیا تھا تو ایسی ہی روش کے وہ عمل بھی

لوگ جنہیں بغیر بیچانے چارہ نہ تھا

اس دور کی فہرست میں کیوں دکھائی نہ دیتے جو آئندہ بنی ہاشم کے سخت ترین دشمن ثابت ہوئے۔ انہیں نہ صرف حسینؑ نے اس وقت دیکھا بلکہ اس کے بعد بھی اور پھر انہیں اپنے نانہ اقتدار میں برسرِ جنگ پایا اور ان میں سے اکثر کو اپنے آخری نانہ میں اپنے قتل پر اس طرح مستعد دیکھا کہ یادہ اس پر ایک نانہ سے مستعد تھے اور یا ان کے نزدیک کوئی لونی

کھاؤ کی بات نہ تھی۔ ان کی مثال اس گورنر کی تھی جو قبر کھودنے وقت گاتا ہے، یا اس جلائی ایسی تھی جو فوش فوش اپنے مکرر کام میں اپنے جلدی کرتا ہے کہ کچھ انعام کی امید رہتی ہے۔

اس دور حکومت کا آخری تنازعہ قریب آگیا جس نے خواہی نہ خواہی خلافت بنی امیہ کو سپرد کر دی۔

خلیفہ ثانی کا ہنا کردہ اصول انتخاب اور حسین

اس کا ذکر کیا گیا کہ بنی امیہ کی جھڑپ اور ان کے افراد جو معاملات میں خود کی قابلیت رکھتے تھے حصول اختیار کے لیے بے کسل کوششوں میں مصروف تھے۔ وہ اپنی جھڑپ کو تعلیم دے دے تھے اور ذمہ دار و بزرگ اپنی مصلحت کے لیے رہے تھے کہ میں کیا کرنا چاہتا ہوں؟ ان میں اپنی آنکھوں کا سامنا اور طرز عمل کے درست کرنے میں خلیفہ کے انتخاب سے بڑی مدد ملتی تھی بلکہ میں کہتا چاہیے کہ حصول اختیار کے جزو اعظم کا تقاضا ان کے موافق ہو چکا تھا صرف وہ طریقہ اور موقع ہائی تھا جن سے یہ بغیر کسی شوش کے حاکم دکھائی دینے لگیں۔ اس کے مقابل کہیں یہ تذکرہ نہیں ہے کہ بنی ہاشم جو کھانا منگوا کر اپنے لیے کوئی کوشش کر رہے تھے۔ بلکہ اگر کچھ تذکرہ ہے تو صرف اس تفسیر کا جو بنی ہاشم کے دو بزرگ یعنی عباس اور جندب ابیہ نے طریقہ انتخاب کو سنا کر اپنی جگہ کیا تھا اور یہ حالت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ اس کا تفسیر ہے کہ آنکھوں کے موافق کوئی امید کرنا ان کے نزدیک بے سود تھا۔ اس سے حسین کی روش کو بھی آجلی ہے۔ بہت ممکن تھا کہ بنی ہاشم کے اہل بیت جو سارے نوجوان "امید" کے فریب و مصلحت کو تہیہ ظاہر ہونے تک شوق سے دیکھ رہے ہوں۔ اور ایک مرتبہ امید کا پیرا ہو جانا اس خواب کی بادی تعبیر کا تھا کہ کھینچے بغیر نہ رہا ہو جو یہ دیکھتے ہوں، ان کی قبول ہونی نہیں عموماً آتی ہوں، ان کا سینہ ٹگی کرنے کا ہو، اور رگیں گرم خون کے غیر معمولی سرخ ہوں سے پٹی جاتی ہوں۔ ہو سکتا تھا کہ ان کا سینا کوئی جوش عہدش ہو تا لیکن علی اور عباس کے سکھانے انہیں غیر متحرک رکھا اور یہ مشروطیت کے پیچ لپٹا اور اس سے صورت مصلحت کو دیکھتے رہے۔ موقع کا علم اور تجربہ حسین کے توجہ کی چیز تھی۔

تجربہ سامنے آجائے تو میں نے کہ بنی ہاشم کو اس وجہ سے اس کی بوری چوٹ نہ لگی ہوگی کہ وہ ایسے دو اور دو چار کی طرح جاتے تھے۔ لیکن اب انہیں اپنا ہی موقع اس وجہ سے اور زیادہ بڑا لگ

دواکتہ نظام

معلوم ہوتا ہوگا کہ اب وہ صاحب اختیار ہیں جن کی مصلحت دواکتہ ہو جائے گی وجہ سے یہ صورت اختیار کرے گی کہ ان کے ہوتے ہوئے ہم قلعہ بند ہوں۔ پہلی حکومتیں محض سیاسی موقع کے لحاظ سے منقسم تھیں۔ اب نہ صرف سیاسی موقع ہے بلکہ گوشہ دراندوزی کا پر جوش انتقام بھی ہے۔ آخری صورت بنی ہاشم کے لیے عثمان کے زمانہ میں المظاہر اور لہذا کی دیکھیں اور تو میں سے بڑھ کر خون کی حد تک نہ پہنچی جس نے معاویہ کے زمانہ میں اس کی احتیاط کی وجہ سے زہر کا گھس بڑا اور آخر میں احتیاط کو اختیار کی موجودگی میں کمزوری کو کرکھار چکی تھی۔ اس نے شورش پیدا کی اور پھر آنکھ کے صاحب اختیار لوگوں نے زہر کی مصلحت کی طرف مڑ کیا۔

بنی حکومت شروع ہوئی۔ جب ایک شخص کے حکم پانے کے قبل لوگ اس لیے اس کا ساتھ دے سکتے

ابوسفیان کی بے اختیار چنچ کا حسین پر اثر

تھے کہ وہ ہمارے حقوق کا کھانا کرے گا تو قیاس آسان ہے کہ اس کے بعد ان لوگوں کے انداز کس درجہ برداشت کے

بہر جو گئے ہوں گے۔ مثال خلافت کے اعلان کے بعد ہی ملے اور تعجب غیر اتفاق یہ تھا کہ حسینؑ اس کی تلخی کو پہلے محسوس کرتے اور وہ بھی ابوشنایان کی زبان سے۔ اسی ابوشنایان کا وحش شاعرانہ حسن بیان اختیار کرتا ہے جو متوازن تلخی کو اور بڑھا دیتا ہے۔ جب وہ حسینؑ کو بنی ہاشم کے مقبرہ میں ملے جا کر مردوں کو دوازدیسا ہے۔ ابوشنایان رجز بڑھ رہا تھا بنی امیہ کی فتح کے گیت گا رہا تھا اور مردوں پر طنز کر رہا تھا۔ بڑھاپے نے اسے تقاضا کی دوا ہو گئی ہے۔ مستی نہ کیا تھا حسینؑ ابھی پورے بیس برس کے نہ ہوئے تھے۔ انھیں ساتھ لانا ایسی باتیں سننا جو بنی امیہ کا صین خواہ اور بنی ہاشم کے لیے لائقِ روش کا غلط مفہوم تھا کہ وہ ملک کے لیے مقابلہ کرتے تھے۔ حسینؑ کے لیے بیچ تھا۔ عجب نہیں ہے کہ اس نے ایک نوجوان کے خون میں اس درجہ جوش پیدا کر دیا جو کہ اس نے اپنے اسی قاتل کو مارنے والے کے ان الفاظ کو اس کے زندگی کے دماغی الفاظ قرار دے دینے کی آمادگی کی تھی۔ خیریت یہی کہ انھیں بد بشیر موجود تھا اور اس نے نازک موقع کو دُور رکھ لیا۔ کیسے جو سکتا تھا کہ ابوشنایان یہ سوچ کر نہ علیحدہ ہوتا کہ کل بنی ہاشم اس مقبرہ میں نہیں ہیں اور کیسے حسینؑ واپس جاسکتے تھے بغیر اس کا تعلیم وہ ہزارہ کیسے بچنے کے بنی امیہ اپنی علاقوں کو نہ صرف نہیں بھولے ہیں بلکہ اب موقع نے انھیں ایذا و صافی پر مستعد کیا ہے۔ دبا سنا کیسے ہم میں پہلی سی علامت کی قوت نہیں ہے۔ لیکن موقع کی عبرت تاک بیش بہی ہے۔ بے شک آج اگر ابوشنایان حسینؑ سے یہ فریاد کہہ سکتا تھا کہ دن آئے والے تھے کہ ابوشنایان کا پوتا حسینؑ کے سر مبارک سے قریب قریب ہی الفاظ کہتا ہے۔

حسین کی سیاسی تعلیم

میں کی سیاسی مہم کے اندر نہ تھے تو اب انہیں ان کی جی طرفانہ بڑا اس بغیر اس کا کچھ و تابیہ پیدا کیے گئے نہ رہ سکتی تھی جو حسین کو موجودہ مواقع کے دیکھنے کے لیے ہمدن ہوش نہ بنا دیتا۔ عالم سیاست بھائی الطرزی نے دیکھا غیر ظاہر اور بے لطف ہے لیکن سلیم توجہ کے ہو جانے کے بعد یہ دیرسا بے غرہ نہیں رہتا بلکہ مسئلہ کی وسعت کے لحاظ سے دیکھی بڑھتی جاتی ہے۔ عام اس سے کہ یہ توجہ غریبیت سے بڑھ کر تعلیمات میں داخل ہونے کا موقع پانے یا دہانے یا پھر زور و روش جو علم کے اعتدال پر پھرنے کی سے تعلق نہ رکھتی ہو یا نہ ہو۔ مثالیں گزریں جو اس کا تصفیہ کر سکیں کہ حسین کی ہمت سرخ انہم اور ذکی انہم تھے اور ان مثالوں کی ناموجودگی بھی اس امر کے گھنے میں پارسی نہ ہوتی کہ ان کا خاصہ مسائل سیاسی سے دیکھی لینے کی قابلیت رکھتا تھا یا نہ تھا جب ان کے خاندان اور ان لوگوں کی کافی سے زیادہ مثالیں ملنا جن کی اصل اور عمل کی فضا حسین کے گرد محیط تھی اور جب اس کی مثالیں نہیں ملتی کہ وہ اپنے خاندانی درجہ عالی سے علیحدہ ہو گئے تھے بلکہ اس کے خارج اشارے ملے کہ وہ گمشدہ تجربہ سے پورے واقف تھے اور اسی طرح اس پر عمل کر سکتے تھے جو کہا جوا عمل کہا جاسکے یہ باتیں اس امر کے گھنے میں ممکن ہیں کہ حسین کی فکری سیاسی تعلیم کی ابتدا بہترین لوازمات کے ساتھ ہوتی اور ان کا اکوہ بھی اس لیے خوش نصیب تھا کہ وہ ہمیشہ تجربہ کار نگاہ مکے سایہ میں تھے جس نے قوم کی درستی اور اس کی ضروریات میں اس قدر حوصلہ تھا جس قدر اس وقت تک ممکن تھا اس لیے یہ اندیشہ بھی نہ تھا کہ حسین اپنے کسی غور اور نتیجہ میں کسی سے اصلاح کی امید نہ کر سکتے تھے۔ آگے وقت آنے والا ہے کہ حسین اپنے پدر بزرگوار کے خالص سیاسی تعلیمات سنتے اور عملی شرکت کرتے۔ اس کے علاوہ حسین کی سیاسی تعلیم کے دوسرے رفیق صفت تھے جن کی سلیم الطبعی کی مثال دی جاتی ہے۔ لیکن نہ تھا کہ حسین اپنے برادر بزرگوار کے تصفیہ کے اثر سے متاثر نہ ہوتے اور اس کی مثالیں ملے کہ وہ ان کے آخری دم تک

متاثر ہے اور ان کے بعد بھی ان کے احکام کی بجا آوری سے اعراض نہیں کیا۔

ابن عوف سے علی کے الفاظ اور حسین یہ الفاظ حسینؑ کی حد سماعت کے باہر نہ تھے جو جناب امیر نے ابن عوف سے ان کی دشمنی کے وقت کہے تھے، یا

جس سے عثمان کے انتخاب کے بعد خطاب کیا تھا۔ اس میں عثمان کے انتخاب کرنے کی غرض اور وجہ بتائی تھی۔ اس سے پہلے انتخاب کی وقت اور مصیبت بھی نہ رہ سکتی تھی نہ یہ غیر ظاہر تھا کہ ہم پر ایک جامع مسئلہ ہے جو ہمارے لحاظ کو پیشہ دور ہٹانے کا خاص اہتمام کرتی رہتی ہے۔ لیکن حسینؑ نے اپنے پدر بگوار سے یہ بھی سنا تھا کہ: ”میں تسلیم کرتا ہوں کہ جب تک امور مسلمین سلامت رہیں اور اس کے ایام خلافت میں حکم کلام و جور نہ ہو گو مجھ پر ظلم و ستم ہوتے رہیں۔“ کون جانتا تھا کہ جناب امیرؓ کا اپنے موقع کے لحاظ سے یہ فرمانا اسیرہ کے لیے حسینؑ کے حل کرنے کا ایک اصول ہو جائے گا۔ کہ حق تھا کہ وہ حسینؑ سے زیادہ جناب امیرؓ کی مصیبت کا اعجاز اور پیرو ہو سکتا۔

بنی امیہ کی بڑھتی ہوئی قوت اور بنی ہاشم وہ تمام باتیں ہونے لگیں جنہوں نے ابن عثمان کو داخل اور خارجی نا مقبولیت میں مبتلا کیا۔ نتیجہ بنی ہاشم

بنی امیہ کی بڑھتی ہوئی قوت کو ٹھنڈے دل سے نہ دیکھ رہے ہوں گے اور ان کا خوف بڑھتا جاتا ہے۔ اس اموی حاکم کی سے یہ نتیجہ نکلتا کہ ہمارا اثر ضائع اور دور ہو جاتا ہے اور اس کی جگہ ہم سے ان لوگوں کی عداوت بڑھتی جاتی ہے جنہوں نے ہمیں بنی امیہ کی زبان سے سنا ہے۔ بنی ہاشم کے لیے کوئی غور طلب بات نہ تھی۔ اور یہ گل ان تمام ممالک میں جاری تھا جو فتح ہوتے جاتے تھے اور جنہیں اسلام کی واقفیت اس وقت سے شروع ہوئی جب بنی ہاشم اور اہل بیت عداوت اسلامی کی ذمہ دار نگرانی سے دست بردار کر دیے گئے تھے۔

دیکھنے کے علاوہ اور کیا کر سکتے تھے کہ کوئی شخص مستوجب مزاحمت یا کسی بعض حیثیت کی رعایتیں نافذ حکم شرع سے زیادہ مفید بھی ثابت نہ دیکھتے کہ وہ لوگ امت رسولؐ کے مخالف ہیں جن کا کسی جامعہ انسانی میں ہونا انگشت کشی کے لیے کافی ہے۔ لیکن دم نہ مار سکتے۔ دیکھتے کہ خلافت در زمانہ ہیں اور اس پر طویہ یہ ہے کہ حکم اور غرض کے علاوہ اور کئی دلیلیں اس کے اثر کو کم نہیں کیا ہے اور اس کے بعد یہ بھی دیکھتے کہ دنیا میں ایسے لوگ بھی ہیں جن کی غرض حیات ہے اس کے اور کچھ میں نہیں آتی کہ وہ اختیار کی کر یہ عزائم ہاتھ پر آتا اور صدقہ کے علاوہ کچھ کہتا نہ جانتے اور اس لمحہ نہ صرف اپنے کو ذلیل کرتے رہیں بلکہ ذلت اور کج روی کو آنکھ کے لیے قوم کا شعار قرار دے دے وہ سب کچھ جو صاحب اختیار کے علاوہ سب کچھ غلط جو بے اختیار سے سرزد ہو۔ کوئی جگہ جہاں وہ کسی ہی جگہ اور کسی ہی جگہ اور غصہ سے کیوں نہ کی گئی ہو جو قوم کو مستبد کرے۔ ان خوشدلیوں کے پڑ حیرت اور دنگی دینے والی نفرت اللہ تعالیٰ کی آماج اور کسی ہی رکیز اور جامعہ انسانی کے لیے ضرر دہ جو مرکز اختیار سے سرزد ہوتی ہو تو تفریقوں سے زمین اور آسمان سر پہ اٹھانے کی مثالیں قرار دی جاتی رہی۔

ہو تا رہا جو کچھ ہوتا تھا یہاں تک کہ اس کی باری آتی کہ مصیبت کے اس پہلو پر قیامت نہ کی جاتی کہ اپنی قوت دینے والی اور موافق چیزوں کو بلند کرنے جانا۔ اپنے نا موافق چیزوں کو جہاں اور پستی کی طرف خود بخود ہٹانا ہے بلکہ اس کا بھی موقع دیکھا کہ اپنی چیزوں کو بلند کرنے کے ساتھ اپنے نا موافق چیزوں کو سختی سے دھانسنے کا بھی دینا ہی اہتمام کیا جائے۔

کئی خلافت جو کچھ چاہتی لیکن افسوسناک یہ ہے کہ وہ اسے اپنے احکام کی سب پرش روش کے منافی سمجھنے لگی کہ کوئی عمار ابو زریا ابن مسعود اپنے عہد میں جرات پاتا کہ وہ سوال کرنے اور ملی حقوق کی حفاظت کا اپنے فطرتوں میں اوطا پیدا کرتا اور وہ بے مہار غصہ سے مسلح کر دیا جاتا۔ کون سوچ سکتا ہے کہ حسینؑ اپنے نانا کے ان ممتاز خلوصوں کو ذلت و توہین میں مبتلا دیکھتے اور اللہ کے تمام خلصہ میں ایک سخت پیمانہ نہ پیدا ہوتا۔ لیکن جو کچھ بھی ہوتا انہیں یہ دیکھنا تھا کہ ایسا بھی ممکن ہے کہ خلافت اگر خالد، متیرہ اور ابن عمر کو رہا کر دے اس لیے کہ یہ لوگ خلافت کے مفید تھے تو ان پورسوں کو وہ رسول کے لیے ہی منحصر رکھنا کیوں نہ ہوں کہ سخت ہلن چلن کا مستوجب قرار دیتے۔ کیونکہ یہ خالصہ اصول اسلامی اور خلق اللہ کے مفید تھے یہ مثالیں ایسی نہ تھیں کہ جو حسینؑ کے مستقبل روش پر بغیر کچھ ہتھیان ڈالے گرد ہاتھ نہ

خلق اللہ کی بلند ہوتی ہوئی صدا اور حسینؑ اور جب ان تمام باتوں کے دیکھے اور سمجھے بغیر چارہ خلق اللہ کی صدا کے مدارج دیکھتے جو رچی، پست، معتدل اور بلند ہوتی جاتی کبھی منتقیر اور ناقابل فہم رہتی لیکن رفتہ رفتہ عقیدہ محسوس اور پر عظمت ہو جاتی اور آخر میں اس کا پر اسرار استکمال انتہائی ہو گیا ہے کہ نہ ہوتا وہ سنتے کہ دُف دُف آ رہا ہے بلکہ اصطلاح کی اس سند طرک رہا ہے۔ وہ ان دُف دُف کے ساتھ برتاؤ ان کے ممتاز افراد کے ساتھ نہ صرف اجزائے حکومت بلکہ مرکز حکومت کا سلوک دیکھتے اور سمجھتے کہ عالم سیاسی ایک حالت پیدا کرنا ہے جس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اعتبار اور اطمینان دلاتا صرف دستِ دلِ اوقی کا نام ہے۔ اور طے کرنے کہ نظام حکومت خالصہ اسے گوارا نہیں کرتا کہ وہ حاملہ ناس کے کسی اختیار کو تسلیم کرے۔ اگرچہ وہ کسی ایسے کے نزدیک ہے اس نظام سے تعلق نہ ہو کیسا ہی حق پرست نہ ادا کیوں نہ ہو۔ اور اگرچہ حکومت کے لیے اپنے اختیار کی اس دلی دوست برداری سے انکار کا بھی نتیجہ کیوں نہ ہو کہ وہ بہت سے اختیار سے بہ حیرت بردار کی جاتے۔ حقیقتاً زمانہ آنکھ نے اس مسئلہ کو حل کیا کہ حکومت کی اس روش کو حسینؑ کس درجہ ناچھ کر رہے تھے۔

علیؑ کی وکالت اور حسینؑ یہ حالتیں اگرچہ اس کی غمت نہ تھیں کہ کوئی اور زیادہ تجربہ کار اپنے خیال اور انداز سے حسینؑ کے اقتدارِ تابع میں سہولت پیدا کرنا لیکن جناب امیرؑ کے خیالات اور روش حسینؑ کے اسٹیموں کے سامنے قوی اور یہ عجب نیز ظاہر تھا کہ کبھی ان کی اصطلاح پر حکومت ایستھتی ہے اور اسے گوارا نہیں کرتی کہ کوئی بے غرض مسلح ایسی بہت کچھ جو ہماری روش کے علاوہ ہوا اگرچہ وہ مفید ہی کیوں نہ ہو۔ کبھی پھر امتِ رسولؐ کی صدا کی قوت سے دیتی ہے اور جناب امیرؑ کو دوسرے لیے پکارتی ہے اور پھر دم لینے کے بعد بے پردا ہو جاتی ہے۔ غرض کہ ایک حالت سامنے آتی ہے جس میں کبھی امتِ رسولؐ انہیں اپنی طرف متوجہ نہیں ہے اور کبھی خلافت ان کے سامنے میں پہنچتی ہے۔ یہ سب کو معلوم ہے کہ امتِ رسولؐ کیوں نہیں تھی اور خلافت کیوں مدد کے لیے پکارتی تھی۔ کسی تنہا شخص پر دو مضبوط جانتوں کے اعتبار کا اس سے بڑا مزید تلاش کرنا بیکار ہے۔ کیا تب ہی علیؑ کی بے نفسی، بے غرضی، حق روی اور اصلاح کی ہی خواہش کے جو لوگوں کو ایک قوی عہدِ روشِ خورشید پر ان کے قریب پہنچتی تھی۔ ان کے پاس دونوں کی اصلاح اور خالصہ جگہ کے مدد کرنے کے لیے لفظ تھے۔ وہ نہ خلافت اور نہ نتیجہ ان اصلاح کے کیمپ میں تھے بلکہ خدا کے اس حصہ زمین پر

کڑے تھے پہلی ان کے ہاؤں تھے ایک شمع تھی جو نہ صرف خود روشنی بلکہ تاریکی دور کر رہی تھی۔ مشکل حالت تھا آگ ہاشم کے لیے جسی سخت امتحان میں انھوں نے اپنے بہترین قوی خصوصیات کو جس پر نبوت کا گہرا عکس تھا موافق اور جھٹک دونوں کے نزدیک حاصل دکھایا۔

اور پھر اکی نہایت میں ان کے لیے یہ بھی کہا جاتا کہ تم کو بلا وطن کرنا چاہیے اور یہ صاف بے خوف جواب دیتے تھے کہی معاویہ بن ابی سفیان ان کے قتل کی صلاح دیتا اور کئی یہ دیکھتے کہ حکومت جاری مدد اور وسالت کو اپنے محفوظ کر لینے کے لیے استعفیٰ کرتا ہے جس کے بعد حکومت کا اپنے وعدوں کو پورا نہ کرنا پھری وسالت کی وجہ سے لوگوں کو بدعنوان کر سکتا ہے۔ اور اس سے علیحدگی اختیار کرتے لیکن جس میں حکومت اور غلامی کو وسالت کے اعتبار کی ضرورت پڑتی ہے اسی قدر زیادہ بچنے پھرتے۔ یہ حالت تکلف کی ضرورت تھی لیکن اپنے پیٹنے اور اس تسکین کی ضرورت تھی کہ پھری ہوش کئی کے نزدیک قابل اعتراض نہیں ہے بلکہ ہر ایک کو ہم پر عبور نہ ہے۔ اس لیے کہ ہم نے ”حق“ اور ”عدل“ کو اپنے سامنے رکھا ہے۔ کون کہتا کہ اس معاملے سے شریفانہ تعبیر کا ہونا قابل اعتراض ہوتا۔ ہونا فطری قتل۔

خلق اللہ کے میلان سے نبی ہاشم کا نازک ترین موقع بہت جگہں ہے کہ نبی ہاشم کے نوجوانوں کے لیے یہ وقت

اس لیے اور نازک ہو کہ وہ خلق اللہ میں اپنی طرف فطری میلان دیکھ رہے تھے۔ ان کے حوصلوں کا جوش اس قدر بھٹ ہو سکتا تھا کہ اس کے روکنے کے لیے اعتدال کو دشواری ہوتی۔ وہ اپنی موقع بینی کو اپنی جائز سیاسی حق طلبی کہتے۔ لیکن ان کے لیے بڑی دشواری یہ تھی کہ وہ جسے منب سے زیادہ سیاسی اور روحانی حق تھا وہ علیحدگی کی مثالیں دیتا آتا تھا اور اپنے مثال احساسات سے کسی ہی جائز حق طلبی کو اٹھانے کے قابل نہ سمجھتا تھا۔ جب تک خلق اللہ خود اس کی خواہش نہ کرے کہ تم ہمارے عنانگیر ہو۔ ہم اس سے بھی انکار نہیں کر سکتے کہ غیر ذمہ دار نبی ہاشم کے لیے یہ جابرانہ روش شیریں نہ ہو سکتی ہو۔ لیکن حسین کے فرائض انھیں بجز اس کے اور کسی خیال کی جرأت نہ دلا سکتے تھے کہ اپنے پدر چرگوار کو فحش سے بچتے جس میں اپنا لام بھیں۔ اور میں کوئی شبہ نہیں کہ حسین کی عقل اور تربیت کے ساتھ ان کا پاکیزہ نفس اس روش کو بجز امتحان کے اور کسی فکر سے نہ دیکھ سکتا تھا۔

خلیفہ کے آخری دستخط پر اپنے اس پدر روانہ جس سے جوہر بخود کی مدد کے لیے آگاہ کر دیتا تھا۔ حسب امیر نے اس وقت بھی جس طرح کی مدد دی وہ اس کا شہوت ہے کہ ہر موقع کے لیے حسب امیر کی تیز فکر کیسا بہترین مل تلاش کر لیتی تھی۔ مل یہ تھا کہ ریشمال کے فاسوں کو حفاظت کے لیے بھیجتے۔ ظاہر ہے کہ یہ مدد کسی دست فوج سے زیادہ موثر تھی اگرچہ بڑی حدوش بھی تھی۔ جس کا اثر ظاہر ہوا کہ باوجود اس جوش کے جو لوگوں میں تھا اور باوجود اس کے کہ اسی حالت میں لوگوں نے یہ نہ دیکھا ہو کہ کلین دار اللہ رعب کی حفاظت کر رہا ہے اور اس سے یورش میں کسی طرح انھیں کوئی زخم لگا ہو یا کسی دور کے رہنے والے کی نادانستہ اور ناشائستہ حرکت ہو، تاہم کوئی شخص یا شخص اصل دروازہ سے دار اللہ رعب میں داخل نہ ہو سکے۔ لیکن ایک وقت میں ان نوجوانوں کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ ایسی حالت میں چاروں طرف کی حفاظت کر سکتے، جب کہ ہر طرف سے محاصرہ کرنے والوں کا دباؤ رہا تھا۔ ہوا جو کچھ ہونا تھا اور کچھ نہیں ہے کہ حسین نے

اپنے اس فرض کو جس میں غلہ پہلے پہل نکوار اٹھائی تھی ابھی طرح انجام دیا۔ اور وہ ایک برافروختہ کردہ مکے ہلے کو ثابت قدمی سے برداشت کر گئے۔ مجھے یہ بھی یقین ہے کہ حسین کا فرض محض حفاظت اور دفاع تھا، خود حملہ کرنا نہ تھا ایسا کرنا موجودہ موقع کے لحاظ سے فوجی بے فائدگی ہوتی۔

عثمان کے بعد پھر بھی ابھی یہ اصل سوال طے نہ ہوا تھا کہ اسکرہ کے لیے امت رضوی کا انتخاب کون ہو؟ اس غمیب سنائے میں میئر کاغلیہ ساز گردہ سانس لینے سے ڈر رہا تھا۔

عثمان کی رحلت کے بعد بھی اسل ہاشم کی خاموشی بنی ہاشم خاموش تھے۔ اس لیے کہ علی اپنی پُر وقار کنارہ کشی کو حرکت سے

بدلنا نہیں چاہتے تھے۔ بنی ہاشم کے لیے اپنے رہنمائی یہ روش بے معنی خیز ہو سکتی تھی۔ بہت ممکن ہے کہ نوجوان یہ سوچ رہے ہوں کہ جناب امیر کو کیا ہوا ہے کہ ایسے وقت جب کہ ان کے خلیفہ تسلیم کرنے میں ہڈی کی خیف صدا بھی نہیں ہے وہ اس طرح خاموش ہیں، اور اس وقت تو ان کی بے صبری کی انتہا نہ ہوگی جب وہ پورے وفد کو خلافت کے پیش کش کے ساتھ آتے دیکھتے ہوں گے اور انکار سن کر واپس جاتے ہوں گے۔ پہلا گڑباز گزر رہی تھی، دن گزرا، رات گزری، کچھ دن اور راتیں گزریں۔ مگر علی ہیں کہ اپنے انکار میں کوئی نرمی نہیں کرتے۔ بہت سے نہ ہوں گے جو یہ سوچتے ہوں گے کہ علی نے ہماری پیش کش کو اتفاقاً پیش کش نہ رہنے دیا۔ بعض کی پیش کش نہ رکھنا پیش کش کی حیثیت نہ رہی۔ بلکہ وہ حیثیت قبولیت پر منتقل ہو گئی۔ بعض نہ رہے۔ اکثر نہ رہے، بلکہ تمام افراد کے مسلسل وفد نے اصرار کو سٹیک بلکہ ایک سیال جسم بنا دیا جو جتنی مجہوریت اور قوی خواہش بھی چاہنے۔ قوی ہم آہنگی دیکھ رہی تھی کہ محض ہمارا جسم وہ پوری سیکل نہیں ہے جس سے ظلم قوی درست کہا جائے بلکہ وہ ایک ذات کو اب اس کی پوری شان سے دیکھ رہی تھی جو اپنی رائے پر اعتبار کی تہا مثال دے رہی تھی اور پیروی کے شرائط لے کر رہی تھی اور کئے آدمی تھے جو اس کا طعن اٹھاتے کہ علی نے ذمہ داری کے استہار کے پہلے قوی سلنے کے درستی کی ابتدا کی۔ حقیقت یہ ہے کہ اختلاف کی ناموجودگی کے ساتھ قوی ہم آہنگی کے علاوہ اب اور کوئی بات علی کو ذمہ داری کے مواقع پر نہ دیکھ سکتی تھی۔

امیر المومنین کی بیعت کے وقت بنی ہاشم کی بنی ہاشم کی اس وقت کیا حالت تھی جس وقت جناب امیر مسجد میں اظہار قبولیت کے لیے تشریف

طبعی کیفیت اور حسین کے دیکھنے کا تماشا لے جا رہے تھے؟ گرفتار افراد جو رہے تھے۔

مظلوم قوم صاحب اختیار ہو رہی تھی۔ مظلوم اعضا میں حرکت پیدا ہو رہی تھی۔ تمام وہ قوائے لطیف جن کا حسن عالم خواب کی باتیں نہیں سیدار ہو رہے تھے خلق اللہ بھر رہی تھی کہ ”منہاج النبوة“ کا دوسرا دور شروع ہوا۔ راستوں میں بچوں، بوڑھوں، لڑکیوں اور جوانوں کا دریا بہہ رہا تھا۔ ایک دوسرے پر پیرایا پڑتا تھا کہ کبھی طرح امیر المومنین کے دست اقدس کو چوم لیں۔ بے اصول حوصلہ مند سوچ رہے تھے کہ ہم کس طرح علی کے خیالات میں دخیل ہو جائیں۔ دشمن حفاظت کا مرکز نکاش کر رہے تھے اور علی سوچ رہے تھے کہ کس طرح ”بدھوں کو مختیر“ اور ان ”شاہراہوں کو جو متروک اور ناپید ہو گئی ہیں“ روشن کر دیں۔ یہ نمائش تھا جو حسین کے

ہوش اور آنکھوں کے سامنے گزر رہا تھا۔ حسینؑ اس وقت اکتیس برس چار مہینہ کے تھے اور پھر اب شانہ زادے تھے اگرچہ انھیں اس کے دنیوی منہوم سے کراہت ہو۔

پرانے مخالفین کے پہچاننے کا وقت

نہ صرف یہ وقت تھا کہ وہ لوگ جو طبعاً جنب امیرؑ کی ولایت کے قائل تھا بڑا بڑا ہوش مانہ ہوئے اور اطمینان سے سانس لیتے بلکہ وہ بھی جنھیں کسی دور حکومت سے کوئی خاص تعلق نہ تھا اس وقت کچھ ایسے بھی تھے جنھوں نے نہ صرف بیعت سے انکار کیا بلکہ ان کو ایسی جگہ رہنا بھی گوارا نہ ہوا جہاں علیؑ کی حکومت ہو۔ یہ کوئی آسمان سے ٹپکے ہوئے لوگ نہ تھے بلکہ وہ جو ایک زمانہ سے اپنی روش اپنا خیال اور میلان صاف صاف ظاہر کرتے آتے تھے ان میں کے اکثر وہ تھے جن کے دل میں زمانہ رسولؐ میں علیؑ کے روضہ کا حسد اور دشمنی سڑ رہی تھی، بلکہ ایک زمانہ تک وہ علیؑ کو بے دست و پا بھی دیکھ چکے تھے اور اسی کل کے پرزے تھے جس نے علیؑ کو اختیار سے علیحدہ رکھا اب پھر وہ سخت کجی کے عالم میں دیکھ رہے تھے ہم وہ کچھ دیکھ رہے ہیں جن کے دیکھنے کی اب کوئی امید نہ تھی اور جن میں کے اکثر اس کے بعد اس پر آملاہ ہونے کہ ہم اس عالم کے نہ دیکھنے کے لیے بڑا دشمنیہ معاملہ کرنے میں دریغ نہ کریں۔

اگر یہ قیاس کیا جاسکے کہ حسینؑ اس کے لیے بے چین تھے کہ کسی طرح ان کے پیر بزرگوار ان کے جہر علیؑ مقرر کی مسند پر جلوس فرمائیں تو ان حالتوں کی موجودگی سے جنب امیرؑ کے تردد کا کچھ لینا جن کے اشارے کیے گئے ان کے لیے کوئی بڑی بات نہ تھی۔ لیکن موقع ایسا نہ تھا جس طرح غامبی غامبی بہت سے ہاتھیں انسان کے آنکھ اور کان کے سامنے سے گزر جاتی ہیں۔ بلکہ ان واقعات کا شمار خصلت گری اور تصفیہ سازی کے ان آکام میں تھا جنھیں گہرا اثر ڈالنے میں نظری مہارت ہے۔ میرا تصفیہ ہے کہ امید خیز ابتدا اور گئی ہوئی چیز کے حاصل ہوجانے سے جو کچھ وقتی چہاں ہوا وہ نہ صرف ان کی وقت دار اعلیٰ قرنی سے پست ہوا بلکہ پیش نظر مخالفت عناصر نے بھی دیکھا اور ان دونوں مضبوطیوں نے انھیں اپنی جگہ اس طرح رکھا کہ گویا کوئی نئی بات ہی نہ تھی اور یہ اپنی موجودہ ذمہ داریوں کو بے جذبہ احتیاط سے ادا کرنے لگے۔

حسینؑ پر ان کا اثر جو جنب امیرؑ کے وفادار

دوست یا علیؑ کی پسند کے قابل تھے

بچے دوست اور ان کا خاص بچپن کی چیز نہیں ہوا کرتی اور اس لیے ہم امید کرتے ہیں کہ وہ تمام لوگ جنھیں ہم گزشتہ واقعات کے ضمن میں دکھا آئے ہیں حسینؑ سے شرف تعارف حاصل کر چکے تھے،

میں بھول نہیں سکتا ہوں کہ مثال ہے کہ حسینؑ کسی یا چند اصحابؓ کو ”مچھا“ کہتے تھے اور یہ بھی صاف ہے کہ حسینؑ جنھیں ”مم“ فرماتے تھے وہ قریش کے بڑے (دنیوی منہوم ہیں) لوگوں میں نہ تھے۔ انھیں ایسا کہنا یا نیا ہاشم میں سے کسی کو اس طرح پکارنا قبیلہ یا خاندان کے مراسم کے لحاظ سے جواز نہ تھا بلکہ وہ عرب بھی نہ ہوتا مثلاً سلطان یا کوئی غیر ممتاز ابتدا کا بیٹا تھا۔ اس لیے کہ یہ فرقہ ان اسلام تھے اور اس لیے کہ یہ اسلام کے اوتار میں اس طرح جذب ہو گئے تھے جس سے انھیں اس کے مظہر ہونے کا امتیاز حاصل ہوتا اور نہ ہیئت ایسے مؤرخ کے جسے زیادہ تر شومخات کے آثار اور گرد و پیش کی حالتوں سے بحث ہے۔ میں اسے فرو گزاشت کر سکتا ہوں کہ حسینؑ کے خیالات اور حالات ان تمام بڑے پڑوسیوں کی پاکیزگی خیال،

پاکیزگی، صلح، صدق، توکل، بھرا، استقلال، شجاعت، ایثار، نفس و غیرہ سے متاثر نہ ہوتے۔ یا ان کی موجودگی اور انہیں حسینؑ کو اپنی احتیلا، حفاظت اور ارتقا کا خیال نہ دلاتیں۔ ظاہر ہے کہ میرے آخری ریمارک کا زیادہ موقع حسینؑ کے لیے اپنے پدر بزرگوار کے زمانہ خلافت سے شروع ہوتا تھا۔ اس لیے کہ خلافت ان ممتاز افراد عالم کو اپنے گرد جمع کر سکتی تھی۔ ”توریت صفات“ اور ”فنا“ دونوں حسینؑ کے لیے ایسی تھی جس حد تک پاکیزگی، خیال کا ہمارے عالم میں قیاس ممکن ہے۔

شورشوں میں جناب امیرؑ کی متانت کا حسینؑ پر اثر

اس زمانہ کے واقعات میں جناب امیرؑ کا علوانہ برتاؤ اور مستند دشمنوں

سے درگزر منجملہ ان باتوں کے تھی جسے حسینؑ دیکھتے اور خصوصاً تردد و غیر مالتوں میں جناب امیرؑ کا اپنی جگہ قائم رہنا اور اس طرح قدم اٹھانا کہ گویا ان تمام شورشوں میں اسی وقت نہ تھی کہ جناب امیرؑ کے افعال، خیال اور انکشاف میں کوئی ادنیٰ لغزش پیدا کر سکیں۔ دیکھنے والے کے لیے پوری خصلت ساز تھیں۔ اسی طرح معاملات کا ان کے سامنے آنا اور اس کے متعلق حکم جو عین حقیقت امر کی وضاحت ہوتی تھی حسینؑ کے لیے ان کے فوائے عقلی اور طول نظر کی ترقی کی بہترین تحریک تھی کہ اس طرح معاملات پر غور اور تفتیش کیا جاسکتا ہے۔

جنگِ جمل میں حضرت عائشہ کا موقع

واقعہ جمل میں کچھ ذاتوں کا سامنے آجہا جس کا شخص نہانہ تھا نہ جلتے والے میں بھی مستقیمانہ حالت پیدا کر سکتا تھا اور اگر ہم یہ قیاس کر سکیں کہ انھیں

قرب سے دیکھنے کا وقت حسینؑ کے لیے سات برس کی عمر تک تھا تو کچھ گزشتہ کی یاد کچھ حاضرانی حیثیت کی اطلاع دینی کچھ درمیانی کسی موقع پر کوئی مفید خبر اور پھر اس وقت کی پر جوش تیاری اور پراسرار نزاع، کئی ہوش کی ان باتوں کو بھی روشن کر دے سکتی تھیں جو حدیثی ہوں۔ ظاہر ہے کہ اس موقع کا علم جس میں مخصوص ذات حضرت عائشہ کی ہو ان تمام مواقع اور ضمنی حالات کی اکٹھی بغیر نہیں کر سکتی تھی جس کا موجودہ حالت ایک فطری نتیجہ تھی۔

اور ہاں جو ان باتوں کے جوابی روش خیال اور جماعت کے لیے پریشان کن نظر آتیں حسینؑ کو واقعات کے اس مذاق کا بھی علم ہوتا کہ ہماری ناخلاق جماعتیں کئی مال کے لیے آپس میں جنگ کرتی ہیں، کئی آپس میں عدم امتیاز کی بنا پر کشیدگی ہوتی ہے اور کئی شرکت جنگ کے لیے ہر جماعت اپنا آدمی پیش کرتی ہے جو فتح کے بعد دلی امر قرار دیا جائے۔ اسی دور میں عترتِ عائشہ کا کئی امتیاز اس کی ظاہر پیشین گوئی تھی کہ امیرِ شام انھیں صوبہ اختیار کی کوشش میں مدد نہ دیتا انھیں صاف امتیاز کر دینا اپنے کو اپنی جگہ کمزور کر دینا تھا۔ ان کی شرکت جتنی دیر کے لیے نافع تھی اس کا وقت گزر چکا تھا۔ اور اس خیال میں اسی گروہ کو اس سے اور مدد ملی کہ ابھی دشمن کا فتح کے بعد دلی امر قرار دیا جاتا تھا۔ جمل کے نزدیک مناسب نہ تھا۔

جناب امیرؑ کی صلح پسندانہ روش اور حسینؑ

نہ یہ حسینؑ کے نہ دیکھنے کی چیز تھی کہ کس طرح جناب امیرؑ اطمینان شکن خبروں کو اطمینان سے سنتے ہیں، لوگوں کو اطلاع دیتے ہیں۔ گرد و پیش پر نظر ڈالتے ہیں۔ اہل کوفہ کی روش سمجھنے اور انھیں پہلے اپنے قبضہ میں لانے کی

کوشش کرتے ہیں اور باوجود قابل اعتبار فوج اور افسروں کی موجودگی کے اس کا محکمہ ہر ادہ ظاہر کرتے ہیں کہ مصنفانہ دلائل سے پہلے گواہ فیصلہ نہ کرے۔ اس کوشش کے تمام اقدام حسین کی نگاہ میں نئے تھے اور وہ نہ صرف جانتے تھے کہ مخالف گروہ باوجود عہد کے مسلمانوں کے ساتھ کیا کر سکتا ہے بلکہ وہ اس یقین سے باز نہ رہ سکتے تھے کہ اسے کوئی دلیل نہیں بھا سکتی جب تک وہ یمن صاحب اختیار دیکھ رہا ہے۔

اور ہم ساتھ ہی ساتھ آج یہ دُھندلی یاد نہ
 تھی کہ کس طرح رسول کا لشکر محمد بن دین

اپنا اختیار گزشتہ کی دُھندلی یاد کو روشن کر رہا تھا

سے چلا کر لے جاتا تھا۔ اور ہم ان کے کاندھے پر بیٹھ کر دیکھتے تھے کہ پدربزرگوار اسلام کا نشان لے لے جا رہے ہیں۔ آج دیکھ رہے ہیں کہ محمد ابن حنفیہ یا خود امیر المومنین علیہ السلام لشکر ہیں۔ ہم افریقہ میں ہیں اور آج نظام اسلام کو اپنی حد پر قائم رکھنے کے لیے کوشش کرنے والوں کے ایک ہیں۔ ہر فوجی پٹاؤ پر فلاح کے لوگ اظہارِ اطاعت اور شرکت کے لیے حاضر ہوتے ہیں اور امیر المومنین انہیں جنگ اور اس کے خوفناک نتائج سے حتی الوسع دور رکھتے ہیں۔

جناب امیر کے فوجی نصاب اور حسین

میں صفت سے باہر نکلے اس لیے کہ دشمن کے سب سے پہلور سپاہی سے بات کریں۔ پھر بھی خون بہہ نہ رکھا دشمن نے ابتدا کی۔ اپنے سپاہی زخمی ہوئے اور وہ دشمن سے جنگ کرنے کی اجازت طلب کرنے لگے اور اب امیر المومنین نے ان کے چھوٹے بھائی میں بائیس برس کے امیرتے ہوئے نوجوان فتح ابن حنیہ کو حائل کرنے کا حکم دیا اور یہ ہدایت کی کہ "میںنا پہاڑ انہی جگہ سے ٹل جائیں سر رہ فلک چشیاں سرک جائیں مگر تو اپنے مقام سے نہ ہٹنا اپنے سر کو عاریۃ خدا کے حائلہ کر۔ اپنے قدموں کو زمین پر رکھ دے۔ اس قوم کے قہقہے پر فخر کر۔ بیشک فتح و نصرت خدا کی جانب سے ہے۔" حسینؑ اپنے پدر بزرگوار کے پہلو سے یہ الفاظ سن رہے تھے۔

محمد ابن حنفیہ کی جنگ کا منظر اور حسین

جس وقت شیر کا فرزند اپنے اور دشمن کی فوج کے درمیانی میدان کو طے کر رہا تھا۔ یا جس وقت اس کی تلوار کسی اہل رسیدہ پر پہلے پڑی۔ حسین کے متعلق تو یہ خبریں بھی ہیں کہ وہ افریقہ اور طبرستان کی مہات میں شریک ہوئے، محمد ابن حنفیہ کا طالب کیہ پہلا موقع تھا۔ پھر بھی انہوں نے نہایت بے بھگری اور حواس سے اپنے پہلے مشغلہ کو انجام دیا اور اس سے زیادہ دشوار ہے میرے لیے یہ بیان کرنا کہ حسین کس طرح اس کا احساس کر رہے تھے کہ کوئی باپ اپنے بیٹے کو میدان جنگ میں جاتے ہوئے کس آنکھ اور دل سے دیکھتا ہے اور اس کے جذبات کی کیا کیفیت ہوتی ہے اور آیا کچھ ایسے دل بھی ہوتے ہیں جو کسی اعلیٰ خیال اور وجہ کے لیے ان جذبات سے بے پردہ ہوتے جاتے ہیں۔ اور پھر محمد ابن حنفیہ کی دایہ پر جناب امیر کی آنکھوں نے کس طرح ان کا استقبال کیا۔ نہیں معلوم جناب امیر کی فوجی ترتیب کی لحاظ سے یہ ممکن تھا یا نہ تھا کہ حسین انہیں بغل گیر کر سکتے۔

شیر خدا کی جنگ کا منظر اور حسینؑ اور پھر اس کے بعد اگر اب تک اپنے پدر بزرگوار کو جنگ کرتے نہ دیکھا تھا تو اس وقت دیکھ گس کے منہ میں زبان

جسکے جناب امیرؑ کے انداز بشرہ اور نفس کی اس قوت کا قصہ سننے کے جو دشمن کو مرعوب کر دیتا تھا لیکن آنکھ دیکھ سکتی تھی اور بیان نہ ہو سکنے والی حالت کچھ میں آسکتی تھی۔ حسینؑ اب کچھ سیکھتے تھے کہ جد بزرگوار کے سامنے کی لڑائیوں میں میرا ہلپ کس طرح لڑا تھا جس وقت ان کا تمام فرض یہ تھا کہ لڑتے اس وقت تو خود حکم دیتا اور حکم کی ذمہ داریاں بھی قصیدہ تور جنگ گرم اور شہدا ہوا۔ ترتیب لشکر، تعبیه، لڑانا، لڑنا، فتح جنگ کی مختلف حالتیں اور حسینؑ دھکست، فتح اور مفتوح کی حالت فرض کہ جنگ کے تمام

تو محاذ آکھ کے سامنے سے گزرے، دوست، دشمن، بچے ہوئے اور نا بچے جوش کو دیکھا اور پھر دنیا کی وہ شریف ترین شہنشاہی سانس نبی جو مقتولین کے لحاظ کے وقت جناب امیرؑ کے منہ سے برآمد ہوئی اور آخر میں یہ بھی دیکھا کہ رحمتہ للعالمین کا ہاشمین اسرا لے جنگ کے علاوہ غمخوش عالمین کے ساتھ کیا برتاؤ کرتا ہے۔

جمل کی فتح کے بعد حسینؑ کی اُمید میں بے تردد سوچتا ہوں کہ جنگ جمل کے اختتام پر حسینؑ اس عام خیال میں شریک ہوں گے کہ خدا کی حکومت اب پائیدار ہوگی اور خدا کے

سفیر کا ہاشمین حدودِ خداوندی کے قائم کرنے میں کامیاب ہوگا۔ اس لیے کہ یہ ایک زبردست مخالفت تھی جو صاحب اثر لوگوں کے ذریعہ سے ہوئی تھی اور جناب امیرؑ نے اسے نہایت کم وقت اور عدم تیاری کے عالم میں رو براہ کید نہ تھا یہ سوچ سکتا ہوں کہ جناب امیرؑ کو ایسی ہی اُمید نہ ہوگی۔ لیکن جناب امیرؑ اپنی اُمید میں غمناک تھے۔ اس لیے کہ جناب امیرؑ نے بہت کچھ دیکھا تھا جو حسینؑ نے نہ دیکھا تھا۔ نیز اس وجہ سے کہ حسینؑ اس وقت ذمہ دار نہ تھے علی بن ابی طالبؑ ذمہ دار تھے۔

کوفہ میں حسینؑ شانہزادہ کی حیثیت سے داخل ہوتے ہیں جناب امیرؑ کے لشکر میں کوفہ کے اکثر علماء ہیں تھے۔ جمل کی فتح کے بعد

کوفہ میں جناب امیرؑ کی تعریف آوری سے اہل لشکر اور اہل کوفہ خوش ہوئے اور غلبے سے جناب امیرؑ کا "استقبال" کید اس طرح حسینؑ اپنے پدر بزرگوار کے ساتھ اس شہر میں بحیثیت شانہزادے کے داخل ہوئے جسے ان کی آنکھ حیات یا حیات کے بعد سے عبرت خیز تلقین ہے۔ اور چونکہ کوفہ میں ایک غیر محدود وقت کے لیے قیام تھا۔ میں تصدیق کرتا ہوں کہ حضرت زینبؑ اور ام کلثومؑ ہاتھوں اور دیگر نبی ہاشم نے ہاتھوں اسے اپنا گھر بنایا۔ جن میں تین خصوصیت سے اولاد جعفر و عقیل کا نام لیتا ہوں۔ جنہیں جناب امیرؑ کی دلدلی کا شرف حاصل تھا۔

کوفہ کا قصر امارت اور حسینؑ یہ معلوم ہے کہ جناب امیرؑ نے قصر امارت میں سکونت اختیار نہ کی۔ ظاہر ہے کہ یہ فعل جناب امیرؑ کے اس عمل قوی کی بنا پر تھا جس سے

وہ جناب دنیاوی تلذذ کے کسی مفہوم سے اپنے کو آلودہ نہیں کرتے تھے لیکن دواعیات کی فطری روش قہیم میں کچھ ذرات مروت مترہ سے الگ شامل کرنے ہوں گے۔ اگر یہ کہا جائے کہ زمانہ آنکھ کے پردہ واقعات کے علم نے انہیں اس کے انقباض سے باز رکھا۔ اور ایک گونگو کی حالت ہوگی۔ جو غیر فطری نہیں کہی جاسکتی۔ اگر یہ سوچا جائے کہ علی کا قلب مصفا

زمانہ آئندہ کے متعلق بعض لہری محسوس کرتا تھا جس کے معنی صاف ہوں یا نہ ہوں لیکن افسردگی سے یہ تصفیہ کر رہا تھا کہ نہ رہا یہاں کیا ضرور ہے کہ کوئی خیال آج ہی گویا میں آجائے۔ زمانہ بہترین شارح ہے۔

قصر ماریات میں نہ رہنے کی احتیاط لوگوں اور خصوصاً نبی ہاشم کے لیے جن کے دن امید اور حوصلے کے تھے ایک تنبیہ تھی کہ اپنی جگہ بچاؤ اس نے اگر نبی ہاشم کے طرز عمل کو درمیانی زمانہ نے فہم بھی کر دیا ہو تو اب اپنے افسرانہ انداز اور اہم کی بین روش نے انہیں پھر سنبھال دیا۔ لیکن رہنا یا نہ رہنا اس کا مانع نہ تھا کہ تصفیہ امور اس دہائی نہ ہوا کرتا۔ قصر ماریات خلافت کی ضرورتوں میں آیا علی بن ابی طالب کے لیے نہ تھا۔ اس طرح حسینؑ نے اپنی حیات میں نہ صرف اس جگہ کو بچا بلکہ حکم کے تابع پایا۔ جسے آئندہ زمانہ میں محض ان کا سر مبارک دیکھنے والا تھا۔

خطبات نبی البلاغہ اور حسینؑ اس طرح ہم حسینؑ کی حیات کے اس زمانہ تک پہنچ گئے جس میں ان حیرت خیز خیالات کا اظہار ہوا جو اب اسلام کی خوش فہمی سے خطبات نبی البلاغہ

کے نام سے ہمارے پاس موجود ہے۔ جس کی تدوین شرح اور مطالعہ سے علامہ سید رضی، علامہ ابن ابی الحدید، اور علامہ ابن عبد ربہ کو شکین ہوئے۔ اور جو کتب خدا کے بعد دوسری بھی جاتی۔ لیکن اسلام کے ان مشہور محسن علامہ نے کافور پر ان عروفت کو پلایا تھا جن کے خاموش معنی کا بھناہر ایک کی تمیز، درجہ معلومات اور بلندی خیالات پر موقوف حلاوت عقلمن کے ساتھ اکثر یہ طے نہیں کر سکتے تھے کہ حکیم اسلام کے انداز کسی مخصوص لفظ یا فقرہ کے کیا معنی بکھار ہے تھے۔ انہیں یہ فرض نصیب نہ تھا کہ آواز کی گری اور لہجہ کی راستی سے کہتے اور روح مبارک کا قریبی عکس خیالات کو روشن کرتا تھا۔ بہت سے اشارہ ایسے ہیں جن کے متعلق داخ تاریخ نہیں لکھی گئی۔ جس کا اس وقت جاننا آسان تھا۔ لیکن حسینؑ اس زمانہ میں تھے علیؑ کے زیر تعلیم جو نے کافر تھلا، انطا اور فترات کو اپنے کانوں سے سنا اور انداز بیان کو اپنی اسٹھوں سے دیکھا تھا۔ اور تقریر کا وہ اثر یا لہجہ کی وہ ادا جو کبھی سننے والے کے دماغ سے نہیں نکلتی حسینؑ کا غیر فانی قرآن تھی۔

لیکن محض یہ کہنا کہ حسینؑ نے خطبات نبی البلاغہ کو سنا تھا یہ بھانے کے لیے کافی نہیں ہے کہ حسینؑ نے کیا سنا تھا۔ یہ ایک بہت بڑا مضمون نظر ہے جس کی میں یہاں جراثیم نہیں کر سکتا۔ بلکہ ملاحظہ سے چند مضامین کے نام لیتا ہوں جس سے یہ بکھاجائے کہ کس حیثیت کے مضامین حسینؑ کے اس دور تعلیمی پر مؤثر تھے۔ مقولے، توحید، رسالت، اسلام، حیات بعد الموت، عہدوت، انسانی ذمہ داری، حقوق اور فرائض دنیا اپنے ہر پہلو سے، امید اور عقل، سچائی اور نجات، حسد اور صحت، وجہ عقبت، عورت، مرد، انسان کی کمزوریوں پر نظر، رحم اور اور در گزرتا مذہب کی حالت حدیث و قدم، نگوین عقبت، غنی رویت قوی ترقی اور زوال کے اشارے مثالیہ حکومت، جاہلہ شاہوں کا طرز عمل، یہودی عام، رعایا اور ہلا جہ طریقہ طرز عملان زکوٰۃ کو حکم، دیوانی، اور فوجی عہدوں کے متعلق ہدائیں، ذی، جاہلہ نفس، فرشتہ، قرآن، غرض کہ اسی باتیں جس کی صحیح فہم اس وقت دی جاسکتی ہے جب محض مضامین کی فہم سے بنانے کے لیے کتب لکھی جائے اور کوئی غیب نہیں ہے کہ کثرت کار کی وجہ سے باوجود ایراف کی موجودگی اور خود توقیعات تحریر فرمانے کے اس کا موقع آتا ہو کہ مفید احکام خود حسینؑ سے بھی لکھوائے جاتے ہوں۔ نہ حسینؑ اس مختلط خط و کتابت سے ناواقف تھے جو جناب امیرؑ اور مولا یہ میں ایک زمانہ تک جاری رہیں۔ اس کے علاوہ نبی البلاغہ بجائے خود اس زمانہ کا فلسفہ تاریخ ہے جس سے نہ صرف بہت سی

باتوں کے اسباب و نتائج کچھ میں آتے ہیں بلکہ اکثر واقعات اس وضاحت سے معلوم ہوتے ہیں جس کے بعد تسکین کی کمی نہیں رہتی۔ معلوم ہوتا ہے کہ زیر ذکر واقعہ کانٹس چاک کر کے سامنے رکھ دیا گیا ہے۔ تو اگر اب تک بھی اس قیاس کی گنجائش ہو کہ کچھ واقعات تھے جو اپنی پوری حیثیت سے حسینؑ کے علم کے باہر تھے تو ان قیاسوں کے بعد ان کے علم کے اندر تھے۔ اور جن استعارات کو ہم اس وقت تاریخی شرح کے نہ ہونے یا اس طرح زمانہ کے گزر جانے سے نہیں کھینچ سکتے۔ قرب زمانہ نے اسے حسینؑ کو پوری طرح بھایا ہوگا۔

جناب امیرؑ کی چند سال حکومت کا اثر
اس زمانہ میں جناب امیرؑ کو اس قدر ٹھٹھٹلی کہ وہ بہ اشتغال شام ان تمام صوبوں پر عامل روانہ

فرما سکتے جہاں اب تک خانگی سخت مشغولیت کی وجہ سے نہ جھٹک سکے تھے۔ یہ استحکام کا ایک فطری اقدام تھا۔ اور انھیں وقتوں کی تھوڑی سی ٹھٹھٹلی میں بغیر کسی داغ و گزاشت کے جس قدر کام ہو سکے اس نے جناب امیرؑ کی روش خیال کے اس قدر لوگ پھونک دیے جن کا فائدہ دینا اموی اور عباسی حکومتوں کے لیے ناممکن ہوا۔ اور پھر کچھ زمانہ کے بعد ملوک دیلمہ اور خلفاء فاطمی کے زمانہ نے پھر اس میں ایک حیات کی سی کیفیت پیدا کر دی۔ یقیناً ہم ان باتوں کے متعلق جن میں سے چند کے اوپر نام لیے گئے انھیں بیان کر سکتے تھے کہ ”نفس رسولؐ“ کا کیا خیال تھا؟ اگر ایسا وقت نہ آتا جس میں انھیں بغیر کسی سیاسی اعتبار کا دباؤ محسوس کیے ہوئے کچھ کہنا نہ ملتا۔ علیؑ کی روش نے جیسے سخت امتحان دیے وہ اپنی قوی نفسی کا بہترین ثبوت ہے۔ ایک نظام جو تین چار برس قائم رہا، ایک ذات کی بدولت رہا، وہ حیات کے اپنے قوی عناصر سے مرکب تھا جسے صدیاں منتظر نہ کر سکتیں! اس وقت کی وجہ اولیٰ بلاشبہ رسولؐ کی حیات کے اس زمانہ میں قائم ہو چکی تھی۔ جس میں علیؑ کو حصول تعلیم اور اظہار صفات کا موقع ملا تھا۔

معاویہ کا تدبر اور علیؑ
عمل اپنے اپنے عمل پر جا رہے تھے۔ اور اگر جناب امیرؑ خبریں بھی سن رہے تھے کہ ابن ابی سفیان کس تاک میں ہے۔ معاویہ کیسا ہی تدبر اور لوگوں کی نگاہ میں اپنی فائزانی قیامت کے لحاظ سے کیسا ہی اثر کیوں نہ رکھتا ہو لیکن وہ اپنے تمام تدبر اور وقار میں علیؑ کے سامنے بے پردہ کھڑا رہتا۔ علیؑ اسے ابتدائی زمانہ سے اس وقت تک ہر صورت اور خیال میں دیکھ چکے تھے۔ ان کے نزدیک اس کی تمام سیاسی چالیں یا سیاسی فیسبکس جو بچوں کے دودھ چھڑاتے وقت کیا جاتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس کا کوئی فیسبک ٹیپ سے پوشیدہ نہیں ہے۔ یا کہتے ہیں کہ ”اگر مکاری اور دھوکا نہ پلے نہ ہو تا تو میں مدبر ترین مردم ہوتا“ تو کیسی ہی خیر کا آنا کہ معاویہ مخالفت، ہماری اور جنگ کے لیے سامان کر رہا ہے۔ علیؑ کے نزدیک کوئی ایسی خبر نہ تھی جو ان کے تحیر کی باعث ہوتی۔ معاویہ وہی تھا جسے آج سے تیس برس قبل لاتے دیکھا تھا۔ علیؑ وہی تھے جس نے اس کے گھر کو صاف کر دیا تھا۔ بنی امیہ اس وقت کفر کی مخالفت اور اپنے اظہار اقتدار کے لیے لڑ رہے تھے۔ آج مخالفت کفر کا اعلان ممکن نہ تھا۔ تدبر بالحد نہیں ہو سکتی تھی، تدبر بالمثل ہو سکتی تھی۔ لیکن اصل وجہ یعنی اپنے اقتدار کی مخالفت اور بنی ہاشم کو صاحب اقتدار نہ دیکھ سکتا دیکھی ہی تھی۔ علیؑ آج بھی مخالفت اسلام کر رہے تھے لیکن کفر کے مقابلہ میں نہیں بلکہ اس سے معز تر دشمن سے جو علیؑ اعلان اصول اسلامی کی مخالفت نہیں کر سکتا تھا بلکہ جو اپنے طرز عمل کو جو ایک معاملہ تاریخی ہے بطحا ایک بڑی

جماعت کے سیاسی حاکم ہونے کے سرگرم یا غیر سرگرم اسلام کا قاعہ حاکم بھاتا تھا۔ اور اتفاقات نے عوام الناس کو بھی ایسا ہی بھلایا تھا۔ اس کا مذہب چارے زمانہ کے دور احوال کی سیاست تھی اس کا ایمان اختیار تھا اور اس کے اصول وہ تھے جن سے وہ کسی طرح اپنی جگہ مضبوط رہ سکے اور چونکہ اس کی مثالیں گزر چکی تھیں کہ کوئی راستہ کو نکتہ چین صاف گولی کی جرات پر اپنا قلعہ سلاہوا دیتا اور چونکہ زمانہ حق پسندی کی قوت کو اپنی روش اور مدت کے لحاظ و نیز ان نسلوں کی کمی معلومات کی وجہ سے کمزور کرتا جاتا تھا جنہوں نے تغیرات نہ دیکھے تھے اور بچے ہوئے لوگ خوف سے اصل واقعات و دلیلیات نہ کرتے تھے یہ امید مودوم ہوتی جاتی تھی کہ اس منہ تاریکی میں کسی طرح کسی خفیہ روشنی سے کوئی حکمت ہو سکے کسی کا شریعت اسلامی کا پابند ہونا اس کی تلوار سے محفوظ ہونے کا پر دانہ نہ تھا جب تک وہ اظہار اطاعت میں بھی سرگرم نہ ہو جس طرح شریعت اسلامی کا پابند ہونا اور زکوٰۃ نہ دینا یہ سیاسی فتوے شائع کر سکتا تھا کہ ان سے قتال جائز ہے۔ اس کے نزدیک لوگوں کا حق یہ نہ تھا کہ کچھ دخل دے سکیں بلکہ دیکھیں کہ کیا کیا گیا ہے اور بس۔ اس کے عمل اور اہل شوریٰ کی فہرست دی گئی جس سے بھا جاسکے کہ یہ لوگ کس قوم کے تھے اور ان کی مصلحت کا شمار کیا ہو سکتا تھا اور اگر کبھی آئندہ جمہور نما کارروائی بھی کی گئی تو ایسی جس پر استدعا کو ناز ہو۔ جس سے بڑھ کر خلق اللہ کو غیر ظریٰ خدا سے چھٹا نہیں سکھایا جاسکتا اور نہ کبھی وہ جس پر لوگوں کو بھروسہ ہو کہ ہمارا حاکم ہونے کی وجہ سے ہمیں اچھی راہ چلانے کا۔ اس سے بڑھ کر اپنی ذاتی راحت کے لحاظ سے لوگوں کو غلط راہ لے جاسکتا ہے۔ نہ اس سے زیادہ خلق اللہ کے اعتبار اور بول نہ سکے والے ناکجوں کے ساتھ ٹھیسب کھیل کھیل جاسکتا ہے۔

تو مولویہ کے دور حکومت سے امید کرنا کہ وہ ارسطو کی مثالیہ حکومت کا نمائندہ ہو تا امید کو تسریب دینا ہے۔ جس میں اگلے زمانہ کا وہ فلسفی اسٹیٹ کو وہ مرکز بھاتا ہے جہاں انسان کی غرض خلقت تکمیل کو پہنچتی ہے اور اسٹیٹ جو کچھ ہے ان تمام حرک کا جس میں انسان کو اپنے قوانین و ذہنی اور خارجی کے استعمال کا موقع ملتا ہے اور اسٹیٹ ذمہ دار ہوتی ہے کہ وہ عامہ الناس کی یہودی کی فکر کرے۔

ہم نہیں جانتے کہ علامہ ابن خلدون جن سے بڑھ کر ابن ابوشیخان کا بھلائی تلاش کرنا ان کے ساتھ نا انصافی ہے اپنے اس دعویٰ کو مولویہ کے لیے کوئی مستندار دیں گے یا نہیں کہ: ”امام ایسا شخص ہونا چاہیے جو جمہور کے حقوق کا تحفظ کرے اور سب کے لیے نیکی کی راہیں آسان کر دے، خواہ وہ ذی ہو یا مسلمان۔“ میں کیسے اٹھ کر دوں کہ مسلمانوں کے لیے نیکی کی راہیں آسان کی ہوں یا نہ کی ہوں کم سے کم ذمیوں کے لیے اس قدر آسان کر دی تھیں کہ وہ کسی مسلمان کو زہر دے کر اپنے عقائد سے آفرست کی بڑی نیکی اور دنیا میں حاکم اسلام کے مردم شناس خزانہ سے ناشناس نہ ہوتا۔ اور اس طرح امام اپنے لیے ایک ہمدردش اثر دار شخص کو دور کرنے کے لیے ذی کو بھی اپنے مشورہ میں شریک کرتا ہے۔ بلکہ آگے چل کر وہ عورتوں کے حقوق کو بھی بیسویں صدی سے اس قدر نمایاں حیثیت سے تسلیم کرتا ہے کہ ذمیہ کو بھی شریک کر کے اس کے نواسے کو زہر دینے کے لیے کام میں لاتا ہے جس نے عطا ارسطو اور افلاطون کے نظریات کو اس طرح دکھایا جس پر یورپ کا بہترین قوم گر حیرت کیے بغیر نہیں رہ سکتا جس وقت وہ اپنی سیاسی استیلا اور تعصب سے پاک ہوتا ہے۔

جناب امیر غنی امیہ کی روش اور اس کے ممتاز افراد کو نہ صرف ان کے قبل الاسلام کارروائیوں سے جانتے تھے بلکہ اپنی خلافت کے قبل انھیں پورا موقع ملا تھا کہ اختیار کی حالت میں بنی امیہ کا ہاتھ پاؤں مارنا بھی دیکھتے اور ان کے طریقہ حکومت سے خلق اللہ کی بے اختیار حق بھی سنتے اور اپنے حاکم ہونے پر یہ دیکھتا تھا کہ اب شام ان کا مرکز ہوتا ہے۔ جناب امیر کا پہلے یہ موقع تھا کہ وہ خاموش دیکھتے لیکن اب خلق اللہ کی مدائے انھیں اپنا امام تجویز کیا تھا اور اب انھیں احساس تھا کہ ہم غلامہ دار ہیں۔ اور اس لیے کہ ہم مثالیہ حکومت کا تذکرہ کر رہے ہیں۔ ہمارا یہ چاہنا کہ ہم جناب امیر کی مثالیہ حکومت کو کچھ پیش کریں، یہ بھانے کا ایک ذریعہ ہوتا کہ جناب امیر اس دور سیاسی کو گوارا نہیں کر سکتے تھے جس کا خوف تھا۔ اور خود بھی ایک نظام حکومت کو نافذ کرنا چاہتے تھے جو اپنی اسپرٹ اور عمل میں قطعاً دوسرے مرکز پر قیادت طوالت کا خوف نہیں فہرست مضامین اور مقابلہ یا شرح کی اجازت نہیں دیتا۔

حاکم مصر قرار دینے کے وقت مالک اشتر کو جناب امیر کی ہدایات

محض نام پیش کرتا ہوں اور بیسویں صدی کے سخت ترین بے رحم سیاسی قتلہ کو مدعو کرتا ہوں کہ وہ امام اول کے مظہر ہدایت پر حملہ کا کوئی جوت تلاش کرے۔ اے کاش کہ مسلمان ہمیشہ اس پر عمل کرتے اور اے کاش کہ دنیا کی وہ قومیں جنہیں اختیارات و ولایت کیے گئے ہیں اس کی اسپرٹ سے فائدہ اٹھائیں اے کاش کوئی مسلمان ایسا نہ ہو جو اس ظلیہ کا اصل یا ترجمہ نہ ہو اور نہ پڑھے۔ اگر وہ تمام خطبات نہیں پڑھ سکتا میری غرض ان وصایا سے ہے جو جناب امیر نے مالک اشتر کو حاکم مصر مقرر کرتے وقت کیے تھے۔ اس وصیت کا وقت بعد جنگ صفین ہے جب بظاہر یہ امید تھی کہ اب اندرونی اسلامیات میں مشغول ہو سکیں گے اور وصیت اس شخص کو کی گئی ہے جس کے سیاسی خیالات ہم گزشتہ ابواب میں لکھ چکے اور جس کی جنگی کارروائیوں کے متعلق بھی ہم بہت کچھ کہہ چکے ہیں۔

کوئی کہے گا کہ حسینؑ کے سوانح نویس کو مثالیہ حکومت کے ذکر اور کسی نظام حکومت کی تفصیلی مثالوں سے یا اس کے مختلف شعبوں کی کارروائیوں سے کیا بحث ہے دراصل مالک اشتر کو مثالیہ حکومت حسینؑ کا شائع کردہ نہ تھا۔ ہاں حسینؑ کا شائع کردہ نہ تھا لیکن ان کے پدر بزرگوار کے خود، تجربہ اور مخلوقات الہی کے ساتھ ہمدردی اور ان کے حقوق کی نگرانی کا اظہار تھا جس میں چند اہل جاہ اور ثروت منظور نظر قرار نہیں دیے گئے تھے اور عامہ ناس کی وزنی لاش اپنی جگہ نہیں چھوڑی تھی جی جس کا نقل قوی اصنام التیام نہ پیدا کر سکے بلکہ دہتا جانے اور معاشرتی طبقات پیدا ہونے جاتیں بلکہ یہ سننا تھا کہ: ”عوام الناس کا غضب خواص کی خوشنودی کو باطل کرتا ہے اور خاص لوگوں کا ختم عوام کی خوشنودی کے ساتھ بخشا جاسکتا ہے۔“ یا سن رہے تھے کہ ”قوت اور طاقت عامہ ناس ہی میں ہے۔“ بظاہر ایک ناہموار قومی زمین کے ہموار کرنے کے لیے پاپست بلند کیے جاسکتے ہیں یا بلند پست کیے جاسکتے ہیں۔ شق اول جہاں دھلیا کے قابل ہمدردی طبقہ کی دستگیری ہے وہاں شق ثانی مصالح کے لحاظ سے کسی ہی مفید کیوں نہ ہو نا انصافی سے خالی نہیں ہے۔ بنی امیہ اور وہ جن سے انھوں نے امور ات سیاسی میں سبق لیا تھا بلند کو بلند کرتے تھے اور پست کو اپنی جگہ چھوڑ دیتے تھے جس کا نتیجہ قوی معاشرت کے لحاظ سے ایک بدناما اختراق تھا۔ نتیجہ یہ تھا کہ صاحب اثر و طاقت اور شریک تھے عامہ ناس جاہل اور بے اثر رہتے تھے۔

یہ قومی جھنڈے کے قوی کرنے کے اصول نہ تھا بلکہ قومی مابھواری بڑھتی جاتی تھی۔ فطری انفرادی عروج و زوال سے اجزا علیحدہ ہوتے جاتے تھے جس سے ایک قوم سیاسی عدم مساوات کی بدولت اپنے ٹکڑے کرتی جاتی تھی۔ حکومت ایک مطالب حق الٹو اٹھانے لگی تھی اس کے برخلاف اسلام پست کو بلند کرتا تھا اور بلند کی بلندی سے کوئی تعرض نہ کرتا تھا۔ جس سے کسی کو کوئی منصفانہ اعتراض کی گنجائش نہ تھی۔ حسین کا موقع چاہتا تھا کہ وہ اس سے واقف ہوتے کہ چرواہا بیٹیوں کے کھالے کے لیے نہیں ہے بلکہ ان کی ہر طرح کی حفاظت کے لیے ہے۔ اس لیے نہیں ہے کہ ان کا رزق کھا جائے بلکہ ان کی آسودگی کی فکر کرے۔ حسین کو رومی اور ایرانی نظام حکومت اور ایک ایسے نظام کو بھنا اور فرق کرنا تھا جو ظہم میں ملے گا جاری کردہ قانون یا اس کے احکام کی روح سے متاثر تھا جسے جناب امیر نے فرصت پاتے ہی جاری کیا ہے اور جس سے منظر نظام کے نفاذ سے اس کے پیشتر وہ خوش نہ تھے۔ پڑھو اور تم پر اثر ہو گا کہ خدا کے سفیر کا شاگرد بول رہا ہے۔ اسلام بول رہا ہے۔ خدا کا نمائندہ حکومت، حکومت اور مخلوقات کے فرائض بیان کر رہا ہے۔ جناب امیر کا یہ نظام تھا جس کے علاوہ حسین کی پسند کے لیے کوئی موجود نہ تھا۔ مبالغہ کی سب سے عمدی کوشش ہوگی۔ یہ نہ صرف حسین کے گھر کا شائع کردہ اصول تھا بلکہ انھیں ایسے نظام حکومت میں بسر کرنے کا بھی موقع ملا۔

آئندہ کے سیاسی موقع کا انعکاس

حسین کو جناب امیر کے بعد بہت کچھ دیکھنا تھا جس سے بڑے کراہی کے لیے کوئی روح فرسا اور نفرت خیز منظر تلاش کرنا بے سود ہو گا۔ بلکہ حسین کے انقلابی بار ادبی نظام تربیت سے عدم تالیف کی مثال ہوگی۔ آگے موقع آنے والا ہے جہاں شاید بعض کے موافق حسین پر سلطنت طیبی کا خیال مائد کیا جاسکے۔ اور بحث کے لیے اسے منظور کر لینے پر یہ سوال پر لطیف ہو گا کہ تو پھر حسین کی نگاہ میں کونسا مثالیہ حکومت ہو سکتا تھا؟ اور اس صورت میں بھی یہ کوشش مدوح قومی یا نہ تھی۔ حالانکہ یہ زبردست سوال اس کے پیچھے رہے گا کہ آیا اپنے موجودہ مسلمان کے لحاظ سے حسین کے لیے یزائی قربانی کے یہ سوچنا ممکن تھا یا نہ تھا کہ اس سے میں کوئی فتح ہو گا یا نہیں بلکہ اس کے بعد بھی یہ قربانی رہے گی۔ قربانی کے حقیقی مفہوم یہ ہے تو ناظر کے بطور خود تصفیہ کی چیز ہوگی کہ حسین اپنے غیر کے نظام حکومت سے کب سے غور ہونے لگے اور کون کونسی حالتوں نے نفرت کے مدارج میں ترقی دی۔ اس وقت تو مثالیہ حکومت کے ضمن میں نہیں یہ کہنا ہے کہ یہ ہونے والا نہ تھا کہ علی کا عامل اپنے امام کے دمایا کے ساتھ اپنے عمل پر پہنچے ہی پاتاچہ جائے کہ وہ اس مرکز سے حکومت شروع کرتا اور اس کی باضابطہ اطلاع ان محاسبین کے متعلق پلائی جاتی۔ زہر کے ایک قطرے نے عالم سیاست کے اس پر احمید تجربہ کا موقع نہ آنے دیا اور لازماً اس کے اقتصادی نتائج نہ دکھائی دیے۔ حسین اس سے واقف ہوئے۔ حسین زہر دینے والے اس کی غرض اور خیال کو جانتے تھے بلکہ اس کے ہاپ کے بے اعتیلا جوش کو دیکھ چکے تھے۔

لیکن ایسے تو ابھی دیر تھی کہ حسین اپنے علم اور ارادہ کے ساتھ کھڑے ہوتے ابھی تو انھیں یہ دیکھنا تھا کہ میرے پدر بزرگوار اپنی ذمہ داری کے فرض کے ادا کرنے کے لیے مستعد ہو رہے ہیں۔ اور اپنے ایسے دشمنوں کے مقابلہ میں جس کی روش نصف صدی کے تجربہ پر اتر چکی ہے۔ نہ صرف بے جذبہ اعتیلا سے کام لے رہے ہیں بلکہ ان کے کسی فعل کی نیت یز اصلاح عدم تفرقہ اور پابندی احکام الہی کے کچھ اور نہ تھی۔

حسینؑ اپنی قوت کا معائنہ کرتے ہیں

رقہ اور حران میں ملک اشتر کی کارروائیاں اپنے دشمن کے مقابلہ میں سنیں، جو گویا علیؑ تہجد تھی صفین کی نبرد آسمانی کی اپنے پدر بزرگوار کو اپنے مختلف عمل کے پاس فرامین ارسال فرماتے دیکھا اور یہ سلسلہ دیکھتے رہے کہ مختلف حالات کے حکام فوج اور سالانوں کے ساتھ پہنچنے لگے۔ پر جوش فوج کا جہلو، اغلام پسند افسروں کا شاندار معائنہ، تجربہ کار سپہ سالاروں کی مشغولیت اور انتظام اور پھر سب کا امیر المومنین کے سامنے اس طرح جھکنا اور اطاعت کی وہ ناقابلِ سوچیں شایع جو غوث اور تحواہ سے ممتاز ہو ایک ایسا منظر تھا جسے دنیا نے بہت نہیں دیکھا ہے۔ میرے پاس اس استہلال کی وجہ نہیں ہے کہ مویٰ، یوش اور داؤد کو ایسا پر اغلام منظر بھی دکھائی دیا۔ اگرچہ وہ فوجوں کے افسر رہے۔

مقدمہ فوج کو تجربہ کار افسروں کی ماتحتی میں روانہ ہوتے دیکھا اور دشمن کے مقدمہ کے شکست کی خبر سنی، راستہ میں فوج فوج لوگوں کو استہلال کے لیے حاضر ہوتے دیکھ دیے یہاں تک کہ کہانی کے اسی جسم بسیل کے پاس پہنچے جس کا نام فرات تھا اور جس کی نرم اور صاف لہری نیوا کے رنگینی ساحل کو ٹھکراتی اور مٹنی صدا پیدا کرتے ہوئے اس وقت کے ٹھکے ہوئے سپاہیوں کا آرام وہ استہلال کر رہی تھیں۔ فوجی افسر جاکھ کوچ اور کسل مند سفر کے بعد ایسے موقع پر اپنے بچوں پر سے ظاہری تربیت کی نگاہ اٹھا لیتے تھے دم لینے دیا جاتا ہے اور پیاسے سپاہیوں میں ٹھٹھے پانی کا ایک گھونٹ پھر سے حواس پیدا کر دیتا ہے۔ سپاہیوں کے بے قاعدہ جھنڈ لب ساحل پر پہنچتے ہیں اور اطمینان سے فطرت کی فیاضی کا لطف اٹھاتے تھے ٹھٹھی، لطیف، کھلتی ہوئی ہوا جان ڈالتی ہے اور خود بخود ایک سکون کا سناٹا مچا جاتا ہے۔

فرات کے دو منظر اور حسینؑ

کون جانتا ہے کہ اس وقت کہیں ساحل پر پہنچ کر جناب امیرؑ نے گھوڑے کی کلام روک لی تھی حسینؑ بغل میں موجود ہوں اور ٹھٹھی ہوا کے ایک تھوچ کے لیے بند قباکھول دیے ہوں۔ خاموش کچہر گرد و پیش کے منظر دیکھتے رہے ہوں اور گھوڑے کو تھیں بدل رہے ہوں۔ کون جانتا ہے کہ یہ وہی جگہ جو جس سے حسینؑ کے آخری وقت کو تلقین تھا اور وہ ایک ہم غیر سے جنگ کر کے پڑھتی ہوئی پیاس میں یہاں پہنچے۔ اسی گھوڑے کی کلام ڈھیلی کردی اور بند قباکھول دیے۔

کنارِ فرات کے ذبیحہ کے متعلق مختلف

زمانوں کے مماثل خواب اور ملنے ہوئے الفاظ

میں خون جوش مار رہا ہے۔ اور حسینؑ اس میں غوطے کھا رہے ہیں۔ اور پھر نائب رسولؑ اس یقین کی حد تک متاثر ہے کہ حسینؑ کو طلب فرمایا ہے۔ صبر اور ثابت قدمی کی نصیحت کرتا ہے اور مصیبتوں کے پہلے تیار رہنے کی ہدایت فرماتا ہے۔ ہم کیوں حیرت زدہ ہوں اور غمگین کی جولانگاہ میں کھو جائیں جب یرمیاہ ۳۱ باب کی دوسری آیت کہتی ہے کہ: "خداوند ربّ الافواج کے لیے اتر کی سرزمین میں دریائے فرات کے کنارہ ذبیحہ مقرر ہے۔"

یا مکاشفات یوحنا میں "برہ" اور اس کی مصوری اس کی صفات اور حقوق کا تذکرہ ہے۔ کیا حق تھا اوریت اور

انجیل کے اوصیا کو جو قرآن کے نبی کے دسی کو نہ ہو سکتا اور ایسے ہی ملاحظات اسے نہ ہوتے۔ اگر یہ تینوں باتیں کسی کے لیے حیرت خیز مناسب تاریخی رکتی ہیں اور تین پیشین گوئی کے اکثر الفاظ ملتے ہیں تو وہ محض حسین کی شہادت ہے۔ یرمیاہ کا زمانہ دور قحہ یوحنا کا زمانہ دور قحہ اگر ان سے سوال بھی کیا جاتا تو وہ صریح جواب نہ دے سکتے تھے۔ لیکن زیر ذکر زمانہ تھا کہ یرمیاہ کے ”ذبیح“ اور یوحنا کے ”برہ“ کو ”ید اللہ“ اپنی تمثیل کی سلیب میں لے لیتا اور فرما سکتا کہ دیکھو خدا کے حقیقی تخت کا مالک میرا یہ منور زندہ ہے۔

يَبْقَىٰ اِنِّیْ اَرٰی فِی الْمَنَامِ وَتَرٰکُنَا عَلَیْهِ فِی الْاٰخِرِیْنَ

ہم بعض سلسلہ خیال کی وضاحت کے لیے ابراہیم اور اسماعیل کے قصہ کا اپنے ”ہدایت نامہ“ سے ترجمہ پیش کرتے ہیں کہ: ”اے فرزند میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ میں حجر کو ذبح کر رہا ہوں۔ پس تو سوچ کہ تیرا دل کیا کہتا ہے۔ کہا: اے باپ! جو کچھ تم کو حکم دیا جاتا ہے کرو۔ تم دیکھو گے کہ اللہ اللہ میں اس کو برداشت کروں گا۔ پس جب دونوں راضی ہو گئے اور (ابراہیم نے اسماعیل کو) مانگے کے بل لٹایا تو ہم نے اسے پھرا کہ اے ابراہیم تو نے اپنے خواب کو کچھ کر دکھایا۔ بے شک ہم ایسا ہی بدلہ دیتے ہیں احسان کرنے والوں کو بلاشبہ یہ تو بہت ہی سخت امتحان ہے۔ اور ہم نے اسے ایک جی قربانی کے بدلے پھلایا اور اس کو کچھ آنے والوں میں چھوڑا۔“ (والصافات ۲۷: ۸۷-۸۶)

کون جانتا تھا کہ ابراہیم کا روحانے صلوات ایک آگ ہوگی جس کی چھاریں مختلف نفوس مذکی سے نکلیں گی۔ شواہد النبوة میں حضرت ام سلمہ سے روایت ہے کہ انہوں نے جناب رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کو تختی اور پریشان دیکھا اور حضرت ام سلمہ کے سوال پر فرمایا کہ: ”امشب مرا بہ مومنے بردند از عراق کہ آن را کہ بلا کینہ و جانے قل حسین رضی اللہ عنہ و جہنم لا فسد زندان من نمود۔“

یعنی: آج رات مجھے عراق میں ایک مقام پر لے گئے جہے کہ بلا کہتے ہیں اور حسین اور میرے بچوں کی ایک جماعت کی قل گاہ دکھائی۔

رسول اس کے اس رؤی کو بھی دیکھیں گے کہ ان کے منبر پر بدر چڑھ آئے ہیں۔ ملاحظات ہوں گے اور حسین کی رسول کے زمانہ کی مختصر حیات کئی مرتبہ شہادت کی پیشین گوئی کا مرکز ہونے کی۔ جناب امیر طہیک اسی جگہ فطرت کے لا معلوم ذرائع سے ایسے اشارے پائیں گے جس سے کچھ زمانہ بعد کا آنے والا واقعہ ان کی نگاہوں کے سامنے پھر جانے لگا۔ اور وہ ابراہیم کے فرزند کو اسکاہ ذبح عظیم کے لیے تیار کریں گے، جو آخر حق کے لیے اٹھار کھا گیا تھا۔ طبعا جناب امیر اور ابراہیم کے جذبات محبت اور اثر میں یک جہتی تھی۔ ضرور حضرت ابراہیم نے سخت امتحان دیا۔ لیکن آخر میں خوش ہوئے۔ مولانا علی بن ابی طالب کی بے یقینی ایسی نہ تھی جو زائل ہو جاتی۔ کیونکہ شخص، زمانہ اور مقام معلوم تھا۔ باپ اسگوں سے بچ رہا تھا اور ذبیح کے سرائس پر دست شفقت پھیر رہا تھا۔

یہ بھی اتفاق تھا کہ شام کا لشکر فرات پر قبضہ کر لیتا اور جناب امیر کے اشراف لشکر پہلی مرتبہ یہ سن کر کہ ”جنوں نے چالیس روز تک عثمان کو ہانی نہ دیا یہ لوگ متقی مضارب ہیں۔“

بنی اُمیہ سے نہر فرات کا چھینا جانا اور حسینؑ
آج بزورِ شمشیر مانی کو اپنے قبضہ میں لاتے اور
پھر جناب امیرؑ کے جبری حق شناسی اور رم سے
دشمن کو عس و دم نہ رکھتے ہم نہیں کہہ سکتے کہ مسلمات پر قبضہ کرنے کی جنگ میں حسینؑ شریک تھے یا نہ تھے۔
صاحبِ ماکہ کے نزدیک گھاٹ چھیننے والی فوج کے اشر حسینؑ تھے لیکن شریک جنگ نہ بھی تھے تو یہ کیسے
ہو سکتا تھا کہ وہ غور سے دیکھتے نہ ہوں۔

میدانِ جنگ میں باپ اور بھائی کی بعض مثالیں اور حسینؑ
یہ بھی ہونے والا تھا کہ جناب
امیرؑ عرب کے رم اور حکمِ قرآن
کے لحاظ سے عوم میں جنگ ہلتی رکھتے اور اس زمانہ کے ختم ہونے کے بعد حسینؑ سوارانِ یمدہ کی اغری میں اپنے برادر
عظم کے شریک رکھے جاتے۔ کسی موقع پر دیکھتے کہ ان کے برادر عظم سے کسی سیاسی فریب کی باتیں کی گئی ہیں اور ان
کے جواب سے قوت حاصل کرتے۔ ملاحظہ فرماتے کہ امیر شام ابن عمر اور ان کے خاتمہ کو کسی کام میں لایا۔ لیکن سب سے
دکھپا مطالعہ کی چیز جناب امیرؑ تھے، جن کی ایک شان یہ بھی تھی کہ مرنے اور مرنے کے بعد کی کس درجہ دل دہی اور
سرفرازی فرماتے ہیں۔ حسینؑ کو سخت ترین موقع پر یہ مسندِ ادا کرنا تھا۔

صفین میں حسینؑ کے جنگ کی شان
باوجودیکہ اس کی تفصیل خبر نہیں ہے کہ حسینؑ صفین میں کیونکر
لائے اور ان کی شرکت جنگی حیثیت سے کوئی نمایاں شان
رکھتی تھی یا نہیں لیکن مالک اشتر کی تعریف کا موجود ہونا اس کی بہترین سند ہے کہ حسینؑ کی جنگ بھی ایسی تھی جس کا تذکرہ یہ
وجید عصر شہل اپنے رجز میں شامل کر لیتا۔

صفین کا تغیر اور حسینؑ
کس نے خواب دیکھا تھا کہ بنی ہاشم اور ان کے بھائیوں کے بڑے ہونے دل،
ان کی فاتحانہ شان اور آئندہ کے درستی ظلم کی امیدیں دفعہ پاس کی سخت اور غلاب
امید چٹ کھائیں گے۔ ایسی چٹ جس کے بعد پھر نہ سنبھل سکتے اس کے بعد حسینؑ تھے ان کی آنکھیں تھیں۔
تھہ مشرکانِ غلبہ حکیم تھے اور ان کی مغنی کارروائیاں تھیں۔ کچھ دیر قبل کے مطیع سپاہی اور لوگ تھے جو سخت دشمن
سے زیادہ مضرت ثابت ہوئے اس کے بعد قہاس آسان ہے کہ سسریب میں آنے والے اور فریب دینے والوں سے
حسینؑ کا غر کس درجہ کا ہوگا۔

باپ کے بعد کی ذمہ داریوں کا احساس
جناب امیرؑ کو ذہنی تعریف ملے۔ اس کا فکر
کرتے ہوئے کہ وہ گزشتہ امتحانوں میں حق سے نہیں
بٹھے اور اب وقت تھا کہ علی کی اولاد جناب امیرؑ کے دواع کا پہلا جگہ از پیغام سنتے اس لیے کہ وہ جناب اپنی اولاد کے
لیے آئندہ کا انتظام فرما رہے تھے اور دیتیں کر رہے تھے۔ اور پہلی مرتبہ وصیت نامہ کے اس فقرہ سے کہ: ”اگر حق کو
کوئی حادثہ پیش آئے اور حسینؑ زندہ ہو تو اس کے بعد وہ اس حکم کے ساتھ قیام کرے۔“ حسینؑ آئندہ بعض ذمہ داریوں کو
اپنی آنکھوں کے سامنے صورتِ پذیر ہوتے دیکھ رہے تھے۔

جناب امیر کی اپنے فرزندوں کی تعلیم پر توجہ اور حسین

اور اگرچہ جناب امیر اپنی دصلا میں خاندان کے اسکول ذمہ دار

کو مخاطب فرما رہے تھے لیکن یہ قیاس نہیں ہو سکتا کہ انھوں نے اپنی اور اولاد خصوصاً حسین کو اس سے علیحدہ رکھا ہو۔ کیونکہ حسین کی عمر میں کوئی زیادہ فرق نہ تھا جس سے قیاس کیا جاسکتا کہ حسین اس قدر چھوٹے تھے کہ اپنے بڑے بھائی کی تعلیم سے فائدہ نہ اٹھا سکے۔ روایتیں توچہ سات مہینہ کا فرق بتاتی ہیں، مگر برس ڈیڑھ برس کا فرق بھی کوئی فرق نہ ہوتا۔ اس بنا پر یہ صاف ہے کہ جناب امیر حسن کی طرح تمام اولاد خصوصاً حسین کے لیے فرماتے ہیں کہ ”تیرے ہر کام میں ہر جگہ میں نے اپنی توجہ کو لازم کیا جیسا ایک شفیق باپ کا فرض ہے۔ میں نے تیرے کام کے موافق تیرے ادب سکھانے کا عزم باہم کر لیا تھا کہ جب تو جوان ہو، صاحب نیت سلیم ہو اور ایک صاف و شفاف نفس کا مالک ہو تو تجھے کتب اللہ عزوجل کی تعلیم دلاؤں۔ اس کی تائید پر عبور کرادوں۔ اسلام کے طریقے اور اس کے حلال و حرام تجھے سکھا دوں اور اس تعلیم کے غیر کی طرف تجھے چھوڑ نہ کرنے دوں۔ پھر مجھے خوف ہوا کہ مہلّا تاجر پر وہ علوم و معارف مشتہ ہو جائیں جن میں لوگوں نے اپنی نفسانی خواہشوں اور فاسد راہوں کے سبب سے اختلاف کیا ہے اور وہ ان پر مشتہ ہو گئے ہیں۔ پس میں نے اس کو مضبوط و محکم کر دیا۔ اس لیے کہ تجھے آگاہ کر دینا میرے نزدیک اس سے محبوب تر تھا کہ میں تجھے ایسے امر کے حوالہ کر دوں جس میں تیری ہلاکت سے بے خوف نہیں ہوں۔“

حکیم کی کارروائی کے بعد جناب امیر کو یہ فرماتے سنا کہ:

جماعت کی ابتری کا نظارہ اور حسین

”دونوں راہ راست سے علیحدہ رہے۔ پس اس حکم و فصلہ سے اللہ اور اس کا رسول اور علماء امت بری ہیں لہذا تم لوگ شام پر حملہ کرنے کی تیاری کرو۔“ خواجہ کا خطاب طبیعت اور ناشدنی اور اپنی فوج اور نظام کی دوبارہ فتح دیکھی اور پھر یہ حیرت خیز قتل و کمانی دیا کہ شام پر کوچ کرنے کے لیے مقرر ہو گئے۔ اور مقرر بیان کرنے کا مکمل اشتعال بن گئے۔

اس کے بعد تساہل گویا قوم کا ایک مستند مرض ہو گیا۔ جو ان خبروں سے بڑھتا گیا کہ امیر شام نے سعدی مقامات اور اندرونی شہروں پر چھاپے مارے لیکن کوئی

جناب امیر کی ملاحتوں، نصیحتوں اور انہام نمانی سے اس طرح متاثر نہ ہوا کہ شام کے ایسے محلے ہمیشہ کے لیے روک دیے جاتے جن میں سب سے زیادہ افسوسناک نتیجہ یہ تھا کہ محمد بن ابی بکر شہید ہو گئے اور انھیں واقعات میں یہ بھی دیکھا کہ جناب امیر نے ہیت یا اہلدار کی طرف تنہا روانہ ہونے کا عزم ظاہر فرمایا۔ یہ صورت اس طبیعتی قابلیت سے پر تھی کہ انسان اپنے فرائض کے انجام کے لیے اپنا انفرادی عزم ظاہر کر سکتا ہے۔ اگرچہ وہ اس حیثیت سے زیادہ حید نہ ہو کہ تنہا کے عزم سے زیادہ کاربہاری نہیں ہو سکتی۔ لیکن کسی نتیجہ کا موافق ہونا یا نہ ہونا اپنی ذمہ داری سے بری نہیں کر سکتا۔ جناب امیر کا یہ عظیم الشان عزم حسین کے ناقابل مثال ارادے کا پیشرو تھا۔

اگر اپنی روش کی پختگی تجربہ سے ثابت ہوتی تھی تو لوگوں کے دم دشمن کی بعض حرکتوں کا معائنہ اطاعت کے نتائج بھی دیکھے تھے۔ دشمنی کے ذریعہ جو رعونت،

سازش اور زہر کی شکل میں ظاہر ہوتے تھے کوئی پوشیدہ خبر نہ تھی لیکن یہ واقعات بھی تجربہ میں آنے والے تھے کہ دشمن باوجود اظہار اسلام نہ کر سکنے کے ماحیوں کے محافظ سپاہیوں کو قتل کر سکتا ہے اور لوگوں کو فریضہ حج سے اس لیے مانع ہو سکتا ہے کہ اس کی سیاسی شہرت کے لیے مفید ہے۔

اور سب پر طرہ یہ تھا کہ ایسے وقتوں میں مدینہ کی وقتی گورنری کے موقع کو ابھر رہے ضائع نہ جانے دے سکتے تھے اگرچہ وہ ابن ابی شیبہ کے ہاتھ سے ملا ہو۔ جس کی قبضہ کی دلیل یہ تھی کہ اب تک وہاب بن مسعود فوج لے کر جناب امیر کی طرف سے نہ پہنچے تھے۔

ہوتا جو کچھ ہوتا لیکن جناب امیر اپنی جگہ پر موجود تھے
شورشیں اور ان کا مجموعہ ایسا نہ تھا جو جناب امیر کے

ارادہ کا استقلال اور حسینؑ کا فوجی عہدہ

سکون اور اطمینان پر اس قدر اثر کر سکتا کہ وہ اپنے حزم سے باز آتے۔ نہروان کی جمع کی ہوئی فوج ہذر گنہی تھی تو کیا درمیانی خلاف درزیاں اور تساہلی ظاہر ہو چکی تھی۔ ہوئی لیکن انھیں وقتوں میں جناب امیر نے بھی کیا کہ سنہ ۳۵ میں ابوالویس اور قیس بن سعد کے ایسے معتبر افراد کے علاوہ دس ہزار فوج اپنے فرزند حسینؑ کی ماتحتی میں نامزد کر سکتے۔ نہ اس کے قبل کہ حسینؑ جل، صفین اور نہروان کے معرکہ دیکھ چکے ہوتے اور ان میں شرکت کی ہوئی۔ اسے کاش یہ فوج روانہ ہو جاتی کہ اسلام بعد کے برسے دن نہ دیکھتا۔

رواگی کا دن نہ آیا زہر آلود تلوار مائل
ہو گئی جو ملک اور عورت نے تیار کی

جناب امیرؑ کی حالت زخم داری، الفاظ، عمل اور حسینؑ

تھی حسینؑ کے علم میں یہ بھی آتا تھا کہ انسان اپنے نفلوں پر ارادے کے اجرا کے لیے نماز کی مشغولیت سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ اور وہ غفلت میں شہید کیا جاسکتا ہے جس کے میدان جنگ میں شہید نہ ہونے پر شامع روتی۔ حسینؑ اس وقت پہنچے جب کہ مشغول، محن مسجد اور عراب شہید کے خون سے مقدس ہو چکے تھے۔ اور باپ کے سر سے خون کی چادر نے چہرہ اقدس کو پھاتے کے قابل نہ رکھا لباس رنگین ہو چکا تھا۔ لیکن حسینؑ کے سننے کی بات یہ تھی کہ ادھر تلوار مفرس رہ چکی اور ادھر زبان نے "فزع بوب للکعبۃ" کہا اور مراسم دین کے اجرا کا یہ لحاظ دیکھنا تھا کہ کسی کو نماز تمام کرنے کا حکم دیا جاتا۔

شدید ضرب اور اس کا معنی کرب ہوتا ہوتا لیکن علیؑ ہوتے اور وہ اپنے فرض کو دوسرے وقت کے لیے اٹھا رکھے، یہ ناگن قتل آتا ہے اور خدا کے رحم و کرم کا مجسمہ اس کے ساتھ برتنوں سے غلج خدا کو حیرت زدہ کرتا ہے۔ وہی جو محل میں حالت جنگ میں پیاس کے وقت شہد کا شربت پی رہا تھا اور اس پر مصافحہ تھا کہ دشمن بھی پیاسا ہوگا۔ وقت تھا کہ "اپنی ذات اور اپنے گروہ کی اصلاح تمام روزہ و نماز سے اغفل" بتائی جاتی۔ اور کہا جاتا کہ: "اے اولاد عبد المطلب! میں تمہیں ایسی حالت میں نہ پاؤں کہ تم مسلمانوں کے خون میں سر سے پاؤں تک رنگین ہوتے چرو۔۔۔۔۔" فرماتے کہ: "میری باتوں پر زبان کھلے۔" یا "ظالم کے دشمن رہنا اور مظلوم کے مددگار۔"

وہ نہ رہا جس نے حسینؑ کو حسینؑ بنایا تھا
سین کے لیے اپنے پدر بزرگوار کی شہادت
قرب قریب دیکھی تھی جیسے جناب امیر کے لیے

رسول کی ولایت محمد حسینؑ پر اپنے ہر بزرگوار اور مالور علیٰ حق دار کا جیسا اور جس درجہ اثر پڑا وہ ہوش کی کیسی ہی کمی کے زمانہ کا کیوں نہ ہو لیکن کسی طرح تصور نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن ابتدا سے آج تک جب کہ حسینؑ چھٹیس برس کے بچے تھے ان کی خصال سازی زیادہ تر علیؑ کی آنکھ، علیؑ کی زبان اور علیؑ کی موجودگی اور ان کے واقعات سے تعلق رکھتی تھی۔ وہ نہ رہا جس نے حسینؑ کو حسینؑ بنا لیا تھا۔

جناب امیرؑ اور حسینؑ کی مائتوں میں ایک فرق یہ تھا کہ رسولؐ کے بعد جناب امیرؑ کو امید تھی اور دفعہ پاس دکھائی دی۔ پھر بھی لشکر کا مسلسل نظام درست نہ ہوا تھا۔ لیکن حسینؑ تک پہنچتے پہنچتے زمانہ نے تجربہ سے مدد کی تھی اور اب دشمن ”رہنے دو“ پر عمل کے لیے آمادہ نہ تھا، بلکہ رہنے دینا اپنی سیاسی حیات کے لیے عہد و ش بکھا تھا۔ منازعت کا سلسلہ جاری تھا اور صفات قوی کے وہ تغیرات دیکھ چکے تھے اور دیکھ رہے تھے جو کسی طرح امید افزا نہ تھے۔ قوم اب حیات سے ہر طرح جینے کی دلتوں پر آمادہ تھی موت سے پر عزت حیات خریدنے پر آمادہ نہ تھی۔ اس کی کارکنی کی قابلیت پر تسلی کا قافیہ گرا تھا اور دوا پینے سے انکار کر رہی تھی۔

مجھ سے کہ شیب بن خنہ، محمد بن صدی اور قیس بن سعد کے ایسے چند بے مثال دوستوں کی نگاہ میں چالیس ہزار ہلکے اس سے زیادہ مسلح سپاہی دکھائی دے رہے تھے لیکن ان کی غیرت اور انخلا کا جوش حالت کے کھنچنے میں مبالغہ کر رہا تھا۔ وہ بے کار غول کو ہا کار بھگنے کی امید کر رہے تھے۔

ترغیب جہاد پر آمادہ نہ ہونا، اٹلے طرز و موڈ نہ رہنا، اور بات بات پر بگڑنا قوم کی حالت کو اچھی طرح بکھارا تھا۔ اور وہ جو قوی حیل کے سر پر تھا اسے ایسے مولد سے بہتری کی امید اور دشمن سے مقابلہ کرنے کا عزم کرنا خود کشی سے بہتر نہ معلوم ہوتا تھا۔ جو قوم اپنے رہنا کو لوٹ سکتی تھی اور اسے زخمی کر سکتی تھی کہ آئندہ وہ نہ رہے جو ہمیں کچھ حکم دے سکے وہ اس قابل نہ تھی کہ اس کے مجروحے پر قوی دشمن کے مقابلہ میں تلواریں سے فیصلہ کیا جاسکتا۔ غمگین کہ حسنؑ کا زمانہ اور اس کے تمام اتفاقات جن کی ضروری حیثیتوں سے کافی بحث کی جا چکی، اس کا بہترین نمونہ تھا کہ کیونکر کوئی قوم اپنے ہاتھ سے اپنے اختصار اور آراوی اور صفات قوی کو تباہ کرنے کے لیے آخری ضرب لگاتی ہے۔ اور قبولِ تاریخ نہیں اس کا حقین تھا کہ یہ ”لشکر غالب نہ آئے گا“۔ جس نے حسنؑ کو ایسی آخری سے دست بردار ہونے پر معمم کر دیا، اس لحاظ سے کہ امیر المومنین نے قوم کی امامت اس کی امید ادا نہ کی تھی۔ اس کے خیال سے اپنے ذمہ لی تھی۔ جب کہ وہ خود ہم آوازی سے ایسا کہہ رہے تھے۔ اس کا حقین ہے کہ مسلسل ظلمت در زیاں رہنے کی صورت میں امیر المومنین بھی دست بردار ہو جاتے بلکہ انھوں نے ان نظموں سے ہمت دا بھی کر دی تھی کہ ”تیں اس بات کو دوست رکھتا تھا کہ تمہیں نہ دیکھوں اور تمہیں نہ پہچانوں“۔ یہ حالتیں حسینؑ کے لیے پُر غور تجربہ کی چیز تھیں۔ آئندہ حالتیں بتائیں گی کہ اس کا حسینؑ پر بڑا اثر تھا۔

صلح کے متعلق حسنؑ اور حسینؑ کے خیال میں
لیکن صلح کے وقت حسینؑ کے بعض الفاظ اور انداز
ہیں جس سے قیاس کیا جاسکے کہ ان کا

تناقض نہ تھا بلکہ موقع کا فترق تھا

تصفیہ متذکرہ صدر خیال سے الگ تھا یا مختصر
 فکلوں میں وہ اس سے الگ سوچتے تھے جو کچھ
 ظاہر حق نے تصفیہ کیا تھا۔ بلاوجود ایسی مختصر خبروں کے جن حقیقی تصفیہ نہ کیا جاسکے مجھے اس کے قبول کرنے میں کوئی عذر
 نہیں ہے کہ حسین وہی کچھ سوچتے تھے جیسا قیس بن سعد، شیب، عبید بن عمر، حمزہ بن ابی سفیان بن لیل کا خیال تھا۔ مجھے عجب ہوتا
 اگر حسین یا معاویہ دسے چند لوگوں کا ایسا خیال موجود نہ ہوتا اور اس وقت میں یہ تصفیہ کرتا کہ قوم میں ایک شخص بھی باقی نہ رہا
 تھا ہے اپنے قوی وقار کی حفاظت کا خیال ہوتا اور گزرتی ہوئی سیاسی حیات پر ٹھنڈی سانس لیتا۔ لیکن کسی ایسے مقرر کی
 فطرتی وہاں ہے جہاں وہ حق اور حسین کی تصفیہ میں تناقض خیال کرتا ہے۔ وہ تناقض کے نہ صرف درجہ مفہوم میں مبالغہ کرتا
 ہے بلکہ وہ انفرادی فرائض کو بھی بھول جاتا ہے۔ حسین ہوں یا یہ چند مخلصین یہ عامہ مسلمین کی طرح ایک حیثیت رکھتے تھے۔
 جنہیں اپنے اخلاص، اروے اور جوش کے ظاہر کرنے سے کوئی امر مانع نہ تھا۔ لیکن حق کی حیثیت یہ کماؤ ذمہ دار امام
 ہونے کے دوسری تھی۔ انہیں زیر نظر امورات کا تصفیہ چند بے خوف مخلصین کے اظہار ارادت پر کرنا نا ممکن تھا۔ اور نا ممکن
 تھا کہ وہ بقیہ قوم کی تساہلی اور بے کاری کا کماؤ نہ کرتے۔ کون سوچ سکتا ہے کہ حق کے تمام خیال اور امید میں یہ نہ تھا کہ
 اسے کاش تمام قوم اس وقت ان چند مخلصین کی غیرت قوی کی مظہر ہوتی۔ اب یہ تصفیہ آسان ہے کہ چند آدمیوں کے اعتبار
 اور مجرورے پر وہ صبح نہ کرتے یا اپنی اس حالت پر قیام کرنا قطعاً بے سود سمجھ کر چند مفید شرائط کی اخلاقی قوت پر اعتبار کر کے
 صلح کرتے۔ سیاسی اقتدار کا قائم رکھنا چند آدمیوں اور فوج کی بے قوتی سے ممکن نہیں ہے۔ خصوصاً جب کہ قوم سے اپنے
 سیاسی حیات کا حسن جاتا رہا ہو۔

ان صورتوں کے کماؤ سے جن میں حق نے صلح کی کون کہہ سکتا ہے کہ خود حق کو اس صلح سے ویسی ہی ”کراہت“ نہ
 تھی جیسی حسین کو تھی۔ لیکن جس وقت موقع یہ تھا کہ حسین بی حیثیت جماعت قوی کے ایک فرد ہونے کے اپنی کراہت اور صلح
 سے نا فوٹی ظاہر کر سکتے تھے۔ حق کی مصلحت کی روح یہ تھی کہ ہم اس ناگزیر موقع سے اظہار کراہت کر کے اس صلح کے
 اس قدر اثر کو بھی کمونہ دیں جو چند روز کے بعد دشمن کے جبر سے حاصل نہ ہو اور پھر زبانی باتوں کا بھی موقع نہ رہے۔ حق کا
 کوئی اظہار کراہت اقدام صلح کی آپ ہی تردید تھی دراصل ایک دم صلح میں قوی حقوق کی حفاظت کا کوئی سلمان نہ تھا۔ اس
 قدر بھی نہ تھا جیسا اس صلح کے بعد ہو۔ یہاں وہی کراہت جس کا ظاہر کرنا حسین کا فرض تھا۔ حق کے لیے ظاہر نہ کرنا فرض
 تھا۔ کراہت دونوں میں قدر مشترک تھی۔

کوئی اور آگے بڑھ سکتا ہے کہ یہ کماؤ اس کے کہ حق نے ایک امر کیا تھا کسی طرح مناسب نہ تھا کہ حسین اظہار
 کراہت بھی جائز رکھتے۔ ایسا سوچنے والے نے اس پر غور نہیں کیا کہ صلح کا اخلاقی اثر صلح کے اعلان تک رہا، اور بس، اور
 اس کے ساتھ ختم ہو گیا۔ جب معاویہ نے صلح کا ”سرا میرے ہاتھ میں ہے اس پر وفا کرو یا نہ کرو“ حسین کی کراہت
 اس اعلان کے یقیناً بعد تھی۔ اس کے بعد نہ صرف حسین بلکہ کسی کو اظہار کراہت کا حق تھا۔ حق بھی اظہار کراہت کرتے
 اگر کر سکتے صلح حدیبیہ اس وقت تک تھی جب تک شرائط پر عمل درآمد تھا۔ صفین اور حکین کا گھوٹا اس وقت تک نافذ
 رہتا جب کوئی تصفیہ ہوتا جس پر فوجیں عمل کر سکتے۔ اگر نقص عہد پر رضوٰل فتح مکہ اور جناب امیر دوبارہ فوج کشی کے

سامان کر سکتے تھے تو حق بھی نقص عہد کے بعد فوج کشی کرتے اگر کر سکتے۔

نہ کسی کا آمادہ ہو کر جنگ کرنا انفرادی حیثیت سے امام کے خلاف ہو سکتا اس لیے کہ انہوں نے وجہ ظاہر کر کے کہ ہم تمہاری جانوں کی حفاظت کے لیے صلح کرتے ہیں ہر شخص کو اپنی جگہ سوچنے کا موقع دیا تھا کہ اگر تم جان کی حفاظت ضروری نہیں سمجھتے تو تمہیں اختیار ہے۔ اس طرح کسی کا کسی اہتمام سے جنگ کرنا عموماً صلح کی اس وقت تک نفی نہ کرنا جب تک خود حق شریعت جنگ نہ کرتے۔ اور اس طرح اس کے بعد بھی وہ شرائط صلح کی نفاذ پر زور دے سکتے تھے بلکہ وہ ایسی صورت کے وہ حق کی خوشنودی کے لحاظ سے ہو یا اپنی کراہت کے بلکہ خود حق کے تصفیہ کی جگہ کے طبعی اقرار پر بعد حسینؑ کسی ایسے امر پر آمادہ نہ ہونے جو حق کے تصفیہ کے خلاف روش کبی جاسکتی۔

ابن اثیر کے اس فقرہ میں کہ ”اپنے باپ کی تکذیب اور معاویہ کی تصدیق نہ کیجیے“ اگر ”تکذیب“ اور ”تصدیق“ کے الفاظ حسینؑ کے استعمال کردہ الفاظ نہیں ہیں، بلکہ کسی قریب المفہوم لیکن کم کرخت الفاظ کے اس لیے قائم مقام قرار دیے گئے ہیں کہ حسینؑ کی مخالفت ظاہر کریں تو زیادہ بحث کی چیز نہیں ہے لیکن اگر بغرض حال ہی الفاظ استعمال کیے گئے تو یہ فقرہ غالباً جوش کی پہلی لہر کا تھا جس میں سختی سے یہ کہہ رہے تھے کہ اپنے پدر بزرگوار کی اس روش کے خلاف نہ کیجیے کہ وہ برابر معاویہ سے جنگ کرتے رہے اور انہوں نے اس کی امارت کی تصدیق نہیں کی۔ جو آپ کر رہے ہیں۔ لیکن اس کے بعد ہی موقع کی حقیقت سامنے آگئی اور اب حسینؑ کا تصفیہ ان کی خاموشی سے ظاہر تھا اگرچہ حسینؑ کے اس فقرہ کا جواب بھی دیا گیا کہ ہم نے اس مصلحت سے معاویہ کو حکومت سپرد کر دی ”جو وجہ تمہارے پدر بزرگوار کو داعی تھی۔ اس سے پیشتر کے زمانہ میں“۔ حسینؑ روتے ہوئے حق کے پاس گئے تھے لیکن ہنستے ہوئے باہر آئے۔

اب تک جو کچھ میں کہہ رہا تھا اس امر کے تسلیم کرنے پر تھا کہ حضرت امام حسینؑ اپنے برابر حالی مقدار کے تصفیہ پر اس قدر نافوش تھے کہ صلح نامہ کو اپنے اوپر نافذ نہ سمجھتے۔ لیکن اگر روحہ الشفا پر اعتبار کیا جائے جس کے موقع اور لہجہ کو میں زیادہ تر مطابق واقعہ سمجھتا ہوں تو حسینؑ کی روش میں حق کے تصفیہ سے کوئی ادنیٰ اشکات نہیں دکھائی دیتا کہ علی بن بشر درجہ مصالحت یا شرائط سننے کے بعد حسینؑ کے پاس جاتا ہے اور انہیں بیان کرتا ہے اور حسینؑ مدبرانہ خشک مزاجی سے فرماتے ہیں کہ ”ابو محمد (حق) نے جو کچھ فرمایا وہ حق اور مطابق مدق ہے“ جب تک معاویہ زندہ ہے اب یزاس کے کوئی چارہ نہیں ہے کہ ہر شخص اپنے گھر میں بیٹھا رہے۔ اس جگہ مجھے ان فقرات میں کوئی ایسے انداز نہیں معلوم ہوتا جیسے کوئی عزو اپنے کسی بزرگ کے ہر فعل کو تسلیم و رضا سے دیکھتا ہے۔ بلکہ حضرت امام حسینؑ کی تقریر پوری آنکھ سے دیکھی گئی ہے۔ اور تقریر کے برائے حوالے ”حق“ اور جن وجوہات پر صلح کی ضرورت محسوس ہوئی وہ ”مطابق مدق“ کہے گئے ہیں۔ اور چونکہ شرائط کے بموجب معاویہ کے بعد خلافت حق یا حسینؑ کی طرف عود کرتی تھی۔ و نیز اس وجہ سے کہ اس کے بعد لوگ پھر ایسا کچھ سوچ سکتے تھے جو بنی ہاشم کی طرف میلان کہا جائے اس صورت میں زیادہ مناسب یہ سمجھا گیا کہ اس وقت اپنی بے قوتی اس فقرہ میں چھپائی جائے کہ ”جب تک معاویہ زندہ ہے۔۔۔۔“ یعنی معاویہ کے ایسے صاحب اثر اور سیاسی فتن کے آدمی کے برسر حکومت نہ ہونے کے بعد اگر خلافت ورزی ہوئی تو اس کے بعد دیکھا جائے گا۔ یہ بیانے خود جس قدر پابندی عہد تھی اسی قدر مدبرانہ انتظار تھا اور چونکہ اپنے صلح کے اہام اور اپنے بے مثل اظہار اشار سے لوگوں کی توجہ اپنی طرف

مائل کر چکے تھے اور اپنی روش بکھل چکے تھے۔ زیادہ قریب تھا کہ زمانہ انتظار ان کے لیے مفید ہوتا، اور یہ زمانہ احراف ان کے دوست تیار کرتا۔ معاویہ بھی اسے سمجھتا تھا اور پوری سیاسی بے اعتباری سے آنکھ اپنے خیال کے لیے برسوں راستہ تیار کرتا رہا۔ لیکن اس وقت تک پہلا قدم نہیں اٹھا سکتا تھا جب تک حسن دنیا میں موجود تھے۔

حسینؑ سے معاویہ کی طلب بیعت اور بھائی کے متعلق بھائی کا بیان دار امام تو کا

حسینؑ نے بھی بیعت نہ کی۔ معاویہ نے حسینؑ سے بیعت کرانی چاہی۔ انکار عجب خیر نہ تھا اور نہ معاویہ نے اصرار مناسب کیا، جیسا کہ معاویہ کے بیشتر جناب امیر اور اکثر لوگوں سے بیعت کا اصرار ضروری نہ سمجھا گیا تھا۔ اور اگرچہ یہ کوئی ایسی بات نہ تھی جو لوگوں کو معلوم نہ ہوتی لیکن کسی ذمہ دار زبان سے اس کی وجہ اس وقت سے نہ بیان ہوتی تھی کسی اس وقت ہوتی اس لیے کہ موقع آ گیا تھا کہ وجہ ظاہر کی جلتی۔ حسنؑ نے فرمایا: ”اے معاویہ حسینؑ کو بیعت کے لیے بخور نہ کہ اس لیے کہ ان کے نزدیک قتل ہو جاتا تیری بیعت کرنے سے بہتر ہے۔ تو انھیں قتل نہیں کر سکتا جب تک ان کے اہل بیت کو قتل نہ کرے، اور اہل بیت قتل نہیں ہو سکتے جب تک ان کے دوست قتل نہ ہوں۔ معاملہ طویل کھینے کا۔ یہ نہ صرف اس وجہ سے قابل اعتبار ہے کہ ایک بھائی اپنے بھائی کا خاصہ بیان کر رہا ہے بلکہ اس وجہ سے بھی کہ یہ اس قدر مطابق واقعہ تھا کہ معاویہ اسی پر عمل کرنے کو بیعت کے تشدد سے زیادہ محفوظ مصلحت سمجھتا۔

مؤرخین اور لوگوں کی عام غلطی

یہ باتیں بھائی ہیں کہ حسینؑ معاویہ کی بیعت کو کیا سمجھتے تھے ان کا یہ ”کیا سمجھنا“ سوال پیدا کرتا ہے کہ کیوں ایسا سمجھتے تھے؟ اور جواب ہے کہ اس لیے کہ وہ اپنے کو اس سے بالاتر سمجھتے تھے کہ ایسے لوگوں سے بیعت یا اطاعت اور موافقت کا عہد کریں جس میں وہ اچھی طرح سے پہچانتے تھے۔ دین اس لیے کہ انھیں اپنے پدر بزرگوار کے طرز عمل اور تعلیم سے اس کے علاوہ اور کچھ نہ کرنا چاہیے تھا جو کیا حسن یا حسینؑ کا بیعت کرنا اپنے پدر بزرگوار کی تکذیب اور معاویہ کی تصدیق ہوتی۔ وہ لوگ اپنی اس ظاہر غلطی پر پھر غور کریں گے جو یہ سمجھتے ہیں کہ بیعت نہ کر سکنے کے معنی یہ ہیں کہ تو پھر خود بیعت کی ہوگی۔ یا ترک امارت کے معنی یہ ہیں کہ جب وہ ایک ایسی چیز پر اختیار نہ رکھ سکے جس پر قابض رہنے کے لیے ایک جماعت کی پیروی اور اطاعت ضروری ہے تو وہ اپنے نفس پر قابو اور امتیاز حق و باطل بھی نہ کر سکے جس کے لیے اپنے سوا کسی خارجی مدد کی ضرورت نہ تھی۔ نہ بیعت نہ کرنے کے معنی یہ تھے کہ وہ مخالفت پر آمادہ تھے۔ مخالفت پر آمادہ ہونے کے لیے جن باتوں کی ضرورت ہوتی ہے اگر وہ موجود ہوتی تو آج تقویٰ امارت کا موقع نہ آتا۔ اور اس کے بعد بھی اگر ان کے لیے ایسے مواقع پیدا ہوتے جس سے کامیاب مقابلہ کی امید کی جاسکتی تاہم محض مسلمانوں کی موجودگی انھیں مقابلہ پر آمادہ نہ کرتی جب تک یہ نہ سمجھتے کہ خلق اللہ کے فائدہ کے لحاظ سے قتل اور خون کے لیے آمادہ ہونا مناسب ہے یا نہیں اور اس کے بعد لوگوں میں امر حق پر قائم رہنے کی صلاحیت ہے یا نہیں۔ یہ امور اس لیے تھے کہ حسینؑ اپنے پدر بزرگوار کے طرز عمل سے کافی مثال مل چکی تھی۔ اس لیے ان کی موجودہ روش یہ تھی کہ تم حکومت کرتے ہو کرو۔ لیکن اپنی روش کی ہم سے موافقت اور تصدیق نہ چاہو۔ ہم الگ شعلہ رہیں گے اور اگر ہم پر کچھ لازم ہے تو یہ کہ ہم مخالفت نہ کریں۔ یہ صورت

اس وقت تک ہٹی جس کی طرف ہم رفتہ رفتہ بڑھ رہے ہیں۔
اہل بیت رسالت کے چند پر جوش دوست جو اپنے موقع کی حقیقت کو اب تک نہ سمجھے ہوں ان کے لیے اہل بصرہ کی روش ایک آئینہ تھی۔ آسانی سے ان لوگوں نے معاویہ کی حکومت سے انکار کیا اور آسانی سے اپنے دھڑے بھول گئے۔ گویا وہ سمجھ نہ تھے کہ معاویہ اس لیے مستول ہے کہ ایک قوم اس کا ساتھ دے رہی ہے، اسے اختیار سے دست بردار کرنے اور آلِ رسول کو صاحب اختیار کرنے کے لیے ایک قوم کی حمایت اور ضمنی قربانیوں کی ضرورت ہے۔ وہ سمجھ نہ تھے کہ دھڑہ اور عمل کی مطابقت بغیر نتیجہ کی امید کرنا قطعی ہے۔

چند نام اور ان کے کاموں کا اثر

ترک امارت کے بعد ایسے لوگوں کو حاکم پاتے ہوئے جن کے نام بشر بن ارمطہ، عبداللہ بن حاتم، کرزیا ابن زیاد، مردان بن حکم، مغیرہ، ابن حاص وغیرہ ہوں۔ یہ امید کرنا کہ وہ جناب امیر اور بنی ہاشم کو اچھے ناموں سے یاد کرتے۔ ان افراد کے ساتھ بے تعارفی ہوگی جن کے سابق کے تذکرے ہم کرتے آئے ہیں کہ اتفاقات کون سے سایہ میں ان کی پرورش کرتے رہے اور پھر اس وقت کس قلب آسیا کے گرد یہ مدتے ہو رہے تھے۔ ایسا آدمی ایسے وقت کیونکر کسی صوبہ اور مشہور شہر کی حکومت کے لیے منتخب ہو سکتا تھا جو آلِ ہاشم کی عداوت اور اسبابِ عداوت میں ممتاز نہ ہوتا کہ اس کے ذریعہ سے دہانے اور مٹانے والے اصول جاری کیے جائیں۔ حقیقت ایک زمانہ تک بنی امیہ اور بنی عباس کی سیاست کا اصل اصول ہی یہ تھا کہ وہ کس کس طرح آلِ ہاشم کا نام مٹا سکتے ہیں۔ کہیں مسلمان مؤرخین اور مدبرین جو چاہیں لیکن مسلمانوں کے صفات قوی کے مٹانے والے اسباب ایسے ہی دور تھے جنہوں نے ذاتی اقتدار کی حفاظت میں ان نفوس کو مٹا دیا جو اسلام اور تعلیم اسلامی کی زندہ تصویریں تھیں اور جو تمام اخلاقی نظریات کے مقابلہ میں جو دنیا میں ہوں محض اپنی ذات اور عمل سے بہترین تعلیم دے سکتے تھے۔ ان کا ضائع جانا ان ستونوں کا گرنا تھا جو قوم گر تھے۔ ان کے بعد قوی لامرکزیت کا دکھائی دینا یا جتنی قوم میں مخالفت اسلامی کا نہ پایا جاسکتا مطلق حیرت خیز نہیں ہے۔ اور پھر رجزہ کی ہڈی تلاش کرنا اس سے زیادہ بے سود۔

حسن تھے اور انھیں یہ سب سننا تھا حسینؑ تھے اور وہ اپنے برادرِ عالی قدر سے ذکر کرتے تھے ان بے حقانوں کا جو دشمنوں کے ہاتھوں، ان کے نام ان کے ذکر اور ان کی فضیلت اور حقوق کے خلاف جاری تھیں۔ ان حالتوں کے متعلق خیال کیا جاسکتا ہے کہ حسینؑ کا موقع اپنے پدر بزرگوار سے زیادہ نازک تھا۔ یہ دونوں یلوکار رسولؐ تھے اور دورِ اموی اور اس کے پیشتر کے سرور آور وہ لوگ تھے جو اپنے محبتوں میں انھیں اس لیے طلب کرتے تھے کہ ان کی توہین کریں۔ اس لیے کہ ان کے خلاف انھیں کچھ کہنے کی قوت نہیں اور کوئی یہ دعویٰ کرے گا کہ ہم ایسی خفیک کریں گے کہ لوٹریاں اور غلام گاہیں گے۔ اور کبھی مدینہ نبی سے تاریخ اسلامی کا مستند مردود جو آخر اللہ کر دعوئی کرتا تھا حسینؑ سے پوچھنے کی جرأت کرے گا کہ اگر ”فاطمہ (علیہا السلام) تمہارے لیے باعثِ فخر نہ ہوتیں تو پھر تم کس سے فخر کرتے۔“ حسینؑ کا ہاتھ آہستہ سے بڑھ کر مروان کی گردن پر قبضہ کر لے گا۔ اس کا دھڑکنے میں مجھلا مجھولے گا اور ابھی پیٹنگ مارنے سے فرصت نہ ہوتی ہوگی کہ اسے تقدیری بغیر چارہ نہ ہوگا۔

رفتہ رفتہ یہ کوششیں شروع ہوئیں کہ حضرت سبط اکبر درمیان سے ہٹا دیے جائیں۔ یہ ظاہر معاویہ کو حصولِ اختیار

اور حسنؑ کی بے اختیاری پر تشکین ہو جانی چاہیے تھی کہ وہ اپنی گزشتہ بے عنوانیوں میں ایک ایسے اور اسلامی نگاہ سے ناقابل معافی گناہ کا اضافہ نہ کرتا۔ ایسا سوچنا اس حد بندی کا دعویٰ ہو گا کہ انسان کہاں تک گناہ کر سکتا ہے۔ یا سیاسی بے مہار فوج کو حسنؑ کی لگام دینی ہوگی۔ یا کہنا ہو گا کہ ہندہ اور ابوسفیان کے بیٹے کے دل سے انتقام کی گدگدی جاتی رہی تھی۔ کس پر دنیا میں حسنؑ اس درجہ بار ہو سکتے تھے کہ وہ چہرہ مرتبہ نہر دینے کی مسلسل کوشش کرتا۔ اور کس کے اختیار میں مدینہ اور موصل وغیرہ تھے کہ نواسہ رضول ایک جگہ سے دوسری جگہ اس لیے تشریف لے جاتا کہ دوسری جگہ بھی زہر کی ٹنگی محسوس کرتا۔ کیوں زہر کو حسنؑ سے ایسی محبت ہو گئی تھی کہ وہ ساتھ ساتھ پھرتا تھا۔ کیا حسینؑ ان تمام دگرگراش واقعات سے بے خبر رہ سکتے تھے۔ کیا وہ اس کی غرض سے ناواقف رہ سکتے تھے۔ خصوصاً ایسی حالت میں کہ جس کو زہر دینے کے مسلسل کوششیں کی جاتی ہوں وہ حسنؑ ہوں!۔

بفرض محال یہ مروان ہی تھا جس نے حضرت عائشہؓ کی موت کا سامان نہیں کیا۔ بفرض محال یہ مروان ہی تھا جو ہر جگہ ایسا آدی ڈھونڈتا پھرا جو چند روپیہ کے لیے نواسہ رضول کو زہر دینے کے لیے آمادہ ہوتا، اگرچہ حسنؑ اس کی گورنری کے رقیب نہ تھے۔ لیکن پھر معاویہ نے اس سے کہیں کوئی باز پرس کی؟ یا ہم اس کی اس وقت تک امید نہ کر ہی جب تک کہ کوئی شخص یا مترجم کسی کتب میں اس قدر اضافہ کا اہتمام نہ کرے کہ امیر معاویہ کے حکم سے مروان بن حکم کو انی دڑے ملائے گئے۔ یا چمک گئے۔ مدبر معاویہ کہ کسی ایسے آدی کو جو مستوجب قتل ہوتا اس الزام سے قتل نہ کیا کہ اس نے زہر دینے میں سازش کی تھی۔ تو مدبر مؤرخین تالیاں پالنے میں کوئی کسر اٹھانہ رکھتے۔ اور اس وقت ایک صحیح نتیجہ مشتتبہ ضرور ہو جاتا۔

ایسا نہ ہونے کی صورت میں مروان کا اطلاع دی کا اہتمام، خبر بھیجتے رہنے کی ہدایت اور ایسی لمبی تکبیر جو دور دور سنائی دیتی بلادی النظر میں بھی سیاسی تنگ ظرفی ہے۔ اور پھر استنبلا کے لیے تو جگہ ہی باقی نہیں ہے جب کہ اس کے ظاہر الفاظ ہیں کہ ”دل ٹھنڈا ہو گیا“۔ ابن عباس کی نگاہوں کو معاویہ ”خوش معلوم ہوتا ہے“۔ اور آپس میں طنز کی باتیں ہوتی ہیں۔ میں تو اس سے عجب ہے کہ ایسے مفید سیاسی امور اس آج بھی معلوم ہو گئے۔ یقیناً اس غرہ کے بدولت کہ کوئی ہمارا کر لے گا۔ جہد، الیسنویہ اور مروان کی آپس کی مشاورت، جہد کا مروان کے پاس بھاگ جانا، اور پھر شام روانہ کیا جانا۔ اس کے لیے کافی تھی کہ ہر زمانہ میں بغیر کسی ظاہری اقرار کے بھی صحیح استنبلا کیا جاسکتا۔ جیسا کہ ہوانہ کہ جب معاویہ کے انداز نے اپنے ہاتھ سے پردہ ہٹا دیا ہو۔

حسینؑ کا اندوہناک موقع

بنی ہاشم اور خصوصاً حسینؑ کے اس جانکاہ غم کا خیال کرو کہ انھوں نے فوراً مجرم افراد کو جان لیا ہو یا واقعات کے مقطر ہونے میں کچھ دیر لگی ہو لیکن اگلی نہ اٹھا سکتے ہوں۔ ایسے وقت میں محض زبان سے کچھ کہنا نہ صرف بے سود بلکہ نہلک تھا۔ حسنؑ سے بہتر موجودہ حالت کا جاننے والا دوسرا نہ تھا اور انھوں نے وہی کیا جو انھیں بحیثیت ایک خیر اندیش کے کرنا چاہیے تھا۔

حسینؑ کے صبر اور صحیح تصفیہ کی پہلی بڑی مثال

میں سوچتا ہوں کہ صبر کی پہلی سخت
تجربہ حسینؑ کو اس وقت اٹھانی پڑی

جب انھوں نے لوگوں کو مانع دفن دیکھا اور ساتھ ہی بھائی کی وصیت یاد آئی۔ اس تصفیہ کی دشواری کا احساس آسان ہے کہ

دمینٹ کی موجودگی میں حسین کیا کرتے۔

وقت کی خوش خیز حالت اس جواب کا جواز چاہتی ہے کہ حسین جنگ کرتے۔ لیکن اب حسین کی ذمہ داری یہ بھی چاہتی ہے کہ وہ یہ سوچے کہ اس کا وقت آیا ہے یا نہیں کہ اپنی قوزلی سے راسخ الاعتقاد جماعت موقع پر قربان کر دی جاتی۔ شہبانی نہیں کی گئی۔ غالباً دمینٹ نے بھی اسے روکا اور جب تانکوں سے جنگ نہیں کر سکتے تھے تو دفن نہ کرنے دینے والوں کا تو نسبتاً کم قصور تھا۔ اور بنی امیہ اور بنی کندیہ کے علاوہ بنی قیم کو پھر مخالفت کے لیے لٹکارنا تھا۔ حسین کی ذمہ داری کی ابتداء اپنی جوش خیز نوعیت کے لحاظ سے جیسی صبر شکن تھی حسین کا صبر اور ان کے تعصیب کی پگھل دینے ہی حیرت خیز تھی!۔

ہم پیشتر صلح حسن پر بحث کرتے ہوئے کہیں یہ خیال ظاہر کر چکے ہیں کہ معاویہ کی صلح کے لیے پیش قدمی اس خوف سے خلیفہ تھی کہ مہلدا ایسا نہ ہونے کی صورت میں ایک سخت جنگ کے اتفاقات جمع ہو جائیں۔ ظاہر ہے کہ یہ خوف حسن کی ذات کی وجہ سے تھا۔ فضل بن عباس نہایت بگے ہوئے اور موقع پر روشنی ڈالنے والے خیالات ظاہر کرتے ہیں، جہاں وہ مرثیہ کہتے ہیں کہ: ”آج کے دن ابن ہند حسن کی رحلت سے اظہارِ تحوت میں بے خوف ہو گیا۔“ اب بے خوفی کی وجہ ظاہر ہے۔ اس لیے کہ وہ ذات جو ہر حیثیت سے چند روز پیشتر منصب امامت کی مرکز تھی طبعاً خلق اللہ کی نگاہ میں بے عنوانیوں کے متعلق سوال اور کسی انداز کے اختیار کرنے کا حق رکھتی تھی اور اس میں قابلیت تھی کہ وہ منتشر قوت کو ”تنگ آمد بیجا آمد“ کے لحاظ سے جمع کرنے کی کوشش کرتی۔ ایسی کوئی کوشش اس کے لیے بہ محال کسی دوسرے کے زیادہ آسان تھی۔ یہ طبعی اثر حسین کو حسن کے برابر رسول کے بعد کی سیاسی دستور العمل کے لحاظ سے اس لیے حاصل نہ تھا کہ حسن غلیفہ ہو چکے تھے۔ حسین کو محض حق تھا اور یہ بعد خیال ایک ایسا عصر تھا جس سے بمقابلہ حسین کے معاویہ کو مفید استحصال کا زیادہ موقع تھا۔

حسین اور فطری شاعری
حسین طرۃ شاعر تھے۔ جنہیں اپنے اظہارِ خیال کے لیے آورد اور خوبصورتی ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ صاف اور غیر آلودہ فصیح تصویر کھینچتے تھے۔ جذبات کی مصوری ایسی فطری اور بے لوث ہوتی تھی جس کے کہنے میں شبہ نہ ہو۔ الفاظ کے ساتھ دماغ وہ کیفیت محسوس کرتا ہے اور وہ صورت سامنے موجود ہو جاتی ہے جس کے دکھانے کا ارادہ کیا گیا ہے۔ مرثیہ ہے، قبر میں لاش اتار رہے ہیں اور کہتے جاتے ہیں۔ شروع کرتے ہیں کہ: ”کیا میں اپنے سر میں تیل ڈالوں یا میری مجلسیں خوشگوار ہوں در آسمانیکہ سر مبارک آپ کا خاک آلودہ اور آپ کے جسم کا لباس اتارا ہوا ہو۔“ حسرت، دل برداشتگی، اور یاس کا اظہار اس استغہام سے زیادہ نہیں ہو سکتا تھا جیسا ”کیا“ سے ابتداء کرنے سے ہوا۔ اس کی افلاک اس تمام سلمانِ راحت کو ڈھلکے ہے جو ایک انسان کو اپنی حیات میں میسر ہوتے ہیں اور اسے غم آلود کر دیا ہے۔ طرزِ ادا نے غم کی چوٹ کا اثر دور دور تک پہنچایا ہے۔ حیات کی آرائشوں اور موجودہ حالت کا مقابلہ کیا ہے جو عبرت خیز ہے اور ساتھ ہی ساتھ اظہارِ ادب اور محبت کی لپک نے اسے اور درد انگیز کر دیا ہے اور متانت میں کشتگی کی ہوا لگنے نہیں پاتی ہے۔ فرماتے ہیں: ”دنیا کی کسی محبوب سے کیا فائدہ اٹھاؤں، مجھے وہ چیز محبوب ہے جو آپ سے قریب کھے۔“ چیزوں کی عنایت پر بے شبہی کا سایہ پڑ گیا۔

تجھ ہو گئیں۔ جب تم سامعِ محبوب نہ رہا۔ تم دُور ہو گئے دل کہتا ہے کہ تم سے قریب ہو جائیں۔ دُور محبت یہ ہے کہ وہ تمام چیزیں جو تم سے نزدیک کریں محبوب ہیں۔ مرتبہ یہ ہے کہ یہ قربت زمانہ خیالت کی نہیں ہے بلکہ محسوس قربت کی آرزو ہے۔ فرماتے ہیں: ”تم آپ پر برابر دو تار ہوں گا جب تک کہ کبوتری گوشت نہ خجے۔ جب تک صبا اور بادِ جنوب چلے۔ جب تک کہ مجاز کے بڑے بڑے درختوں میں کوئی ڈالی سرسبز ہو۔ یہاں حسینِ طہرت کے شاعر ہیں۔ وہ طہرت کی ان چیزوں کو اپنے غم کا گواہ قرار دیتے ہیں۔ ان چیزوں کو اپنے سلسلہ غم کے تازہ کرنے کی علامت قرار دیتے ہیں۔ کبوتری کا گوشت اس کی بے آزار اور طبعِ خوش وقتی کا بیان ہے۔ اس کی مفردانہ ادا اس کی حرکتِ طبعی بکھار رہی ہے کہ وہ خوش ہے۔ اس کی لاپرواہی و مسرت نے اسے اور قابلِ رحم قرار دیا ہے۔ اس کا چھوٹا ناچس سے وہ اپنے غافلانہ مشغولیت سے باز آئے۔ کسی ذی رُوح سے اس کے خوشی کے عالم کو حسین لینا ہے جو طبعی احساس کے لحاظ سے مکر وہ ہے۔ طہرت کا یہ پُر لطفت تماشہ۔ یہ غم غلط کرنے والا منظر۔ یہ خوشی کی تصویر حسین کے لیے اپنے غم کے یاد دلانے کا ایک ذریعہ ہے۔ اسی طرح ہر معتدل اور گرم ملک کے لیے صبا اور بادِ جنوب کے چلنے کا موسم اور اس کا ایک جموٹا رُوح افزا ہوتا ہے۔ خصوصاً عرب جہاں زیادہ تر وقتوں میں موسمِ طبعی ہو۔ اور جہاں ٹاپالی آبِ سبزہ کی کمی کی وجہ ہو۔ غالباً حسینؑ بادِ صبا اور بادِ جنوب کے چلنے یا ڈالیوں کے سرسبز ہونے سے زمانہ بہار کی ثروت یاد دلاتے ہیں۔ ٹھنڈی ہوا کی متین نازک غرای سے سبز ڈالیاں جھوم رہی ہیں۔ پتیوں کی سنسانہٹ عالمِ وقتوں میں دماغ کو تھپکیاں دیتی ہے۔ سرسبز شاخیں آسمانوں کو خشکی اور فرحت دیتی ہیں لیکن ان سب کو حسینؑ محروک غم قرار دیتے ہیں۔ اس لیے کہ یہ چیزیں ان کی حقیقی بہار پر غزاق کے چما جانے کی یاد دلانے والی ٹھنسی ہیں۔ اور پھر ان سب کے بعد سخت ترین مرثیہ یہ ہے جہاں دو صورتیں دکھائی ہیں۔ قوت اس سے آگئی ہے کہ استعارہ سے کام نہیں لیا ہے بلکہ صاف صاف کہا ہے کہ: ”لنا عوادہ شخص نہیں ہے جس کا مال لوٹ لیا جائے بلکہ وہ ہے جو اپنے بھائی کو زیرِ خاک کرے۔“ کوئی لفظ ان الفاظ سے زیادہ اس عالمِ غم میں نہیں ڈبو سکتا جو ”لنا عوادہ“ مال سے نہیں بلکہ ”جو اپنے بھائی کو زیرِ خاک کرے“ سے مترشح ہے۔

حسینؑ نے اکثر اشعار فرمائے ہیں خصوصاً ان وقتوں میں جس وقت لطافتِ خیال کی موزونیت کے لیے انسان میں حواس نہ ہونا چاہیے۔ نہیں معلوم ایسے وقتوں میں حسینؑ کے خیالات کی تعریف کی جائے یا ان کے ہوش کی ہم اس مضمون کو اس پر ختم کرتے ہیں کہ حسینؑ میں ایسی قابلیتِ شاعری کا ہونا اس وجہ سے بھی عجب خیز نہیں ہے کہ ان کی مادرِ عالیِ مستدار اور پدرِ گزرگوار کے اشعار اور ان کے خیالات کی نفاست ایک مستند اور مشہور امر ہے۔ حسینؑ کے افسردہ چہرے اور ان کے غم و غصہ کا نقشہ کھینچنا غفلتوں کے

رحلتِ حسنؑ سے حسینؑ کا انقضاء

امکان سے باہر ہے۔ وہ ان حسنؑ کو دفن کر رہے تھے جو بنی و فاطمہؑ علی کے فرزند تھے۔ وہ ان حسنؑ کو دفن کر رہے تھے جو ایک ذمہ دار امام تھے۔ وہ اپنے بھائی کو دفن کر رہے تھے، وہ لوگوں سے اس وقت تک کے رفیق اور دوست کو دفن کر رہے تھے۔ اور سب کے آخر میں وہ اپنی سیاسی پناہ کو دفن کر رہے تھے۔

حسینؑ کی تنہائی کی قوتِ شہرت اور تعارفِ تنہائی کے کسی بے اختیار اور مظلومیت تھی اس کے عکس میں کچھ نہ تھا لیکن کچھ عجب بھی

اور وہ یہ تھا کہ بچے بچائے دوست پنج تن میں اب صرف حسینؑ کو دیکھ رہے تھے یہ بقیہ تھے اس سب کچھ کے جو ان نفوس

مدی میں تھا۔ اس لحاظ سے حسینؑ کی ذات کوئی ایسا مرکز نہ ہو سکتی تھی جو عدم شناسی اور عدم شہرت کی وجہ سے کم موثر ہوتی۔ چاقو یہ ہے کہ رسولؐ نے اہل مدینہ اور مدینہ آنے والوں کو حسینؑ سے اس طرح شناسا کر دیا تھا کہ عدم شناسی کا کوئی عذر مستوجبِ سماعت نہیں ہو سکتا۔ یہ ہوا کہ اس وقت تک ایک پشت کجہ دار اور ایک قریب بلوغ تیار ہو گئی ہو اور اتفاقات کا جو رنگ تھا اس نے ان کے متعلق روایات کو ملاحظہ کے قریب نہ رکھا بلکہ دوسرے کے چار پانچ برس اس طرح کے نہ گزرے تھے کہ حسینؑ ایسے موقع پر نہ ہوتے کہ کوئی نہ دیکھ سکتا۔ جناب امیرؑ کے غلیفہ ہوتے ہوئے کون تھا جو ان شاہزادوں کو نہ پھانسا اور پھر جل کے مشہور میدان میں اور مدینہ سے صفین تک کے کوچ اور اس کے مشہور میدانوں میں کونسی جگہ تھی جہاں حسینؑ نہ تھے اور جہاں ہزار ہزار آدمی اٹھیں نہ دیکھ رہے تھے۔ ممکن ہے کہ ان لاکھوں دیکھنے والوں میں سے ہر ایک کو حسینؑ سے شرفِ تعارف حاصل نہ ہو، اور یہ لوگ ذات کے اثر کی کیفیت محسوس نہ کرتے ہوں جو تعارف اور قربت سے حاصل ہوتا ہے لیکن ان کا سب سے بڑا تعارف یہ تھا کہ یہ فرزندِ رسولؐ تھے اور بس اس کے بعد ان کا شرف و فضیلت پوشیدہ رہنے کی چیز نہ تھی۔ کون جانتا ہے کہ حسینؑ کی اس شناسی اور آنے والے سفر سے خدا کو کچھ کام لینا تھا۔ بعد خیال بھی لیکن ہر جہانے والے شخص میں یہ خیال موجود تھا کہ حسینؑ کا حقِ معاویہ کے مرہانے کے بعد ان کی طرف عود کرے گا نہ صلحِ حنّ کے بعد حسینؑ کے بیعت نہ کرنے کی شہرت ایسی تھی جس سے ان کی طرف نگاہیں نہ اٹھیں۔ دراصل ایک اس کے آثار ہیں کہ اکثر مشاہیر حسینؑ کی خدمت میں اس کے بعد حاضر ہوئے اور کچھ عجب نہیں ہے کہ انہوں نے حسینؑ کو اپنی آخری امید قرار دیا ہو۔ اور سب کے آخر میں حسن کے دفن کی مطلوبانہ شان اور حسینؑ کا پڑپوش صابرانہ تصفیہ بغیر اس کے کہ لوگوں کی ہمدردی ان کی طرف منتقل کر تا اور وہ حسینؑ میں اپنا ذمہ دار رہنا چاہتے۔ بے اثر نہیں گزر سکتا تھا۔

کونسی مصلحت قوت کے ساتھ ظاہر ہوتی جاتی تھی

حسنؑ کے زمانہ حیات کی بات تھی اور اگرچہ زیادہ شہرہ سے شہرہ تک بصرہ اور کوفہ کا گورنر رہا جس دوران میں بصرہ کوفہ اور حضر موت میں شیعہ اہل کا ہزاروں کی حد میں قتل عام ہوا لیکن غالب قریب ہے کہ گو بعض غیر مشہور اشخاص یا جماعت حسنؑ کی حیات تک (شہرہ) میں قتل کی گئی ہو لیکن قتل عام اور مشاہیر کی شہادت زیادہ تر امامِ دویم علیہ السلام کی شہادت کے بعد وقوع میں آئی۔ اس لیے کہ ان آخر الذکر امور کے متعلق حضرت امام حسین علیہ السلام اور معاویہ کی خط و کتابت کا نشان ہے۔ یہ مراسلت بجائے حسینؑ کے حسنؑ کے نام سے ہوئی، اگر وہ جنسِ حیات ہوتے۔

یہ زمانہ اور اس کی مصلحت اس بات کا آئینہ تھی کہ حکومت کے لیے اہل بیت کے دوستوں کا زندہ رہنا برداشت کے باہر تھا۔ عہد اور

حسینؑ عزمِ شہادت کا گہوارہ

دعہ وفا کے قابل نہ رہا تھا۔ ایک سردار قوم درمیان سے چن لیا جاتا تھا اور بقیہ اس کے خطر رہتے تھے کہ دیکھیں موت اب کس کے نام قرعہ ڈالتی ہے۔ یہ حالت ہر ایسے شخص کے لیے لانے اور مارے جانے کو جائز کیے دیے رہی تھی عام اس سے کہ کوئی لڑتا یا نہ لڑتا۔ ظاہر ہے کہ یہ حالت نہ ہوئی اگر قوم اس سے پہلے موت کی وقت کی حیات غریبی۔ اس وقت لوگوں میں مارے جانے کے قبل مرجانے کا ارادہ نہ پایا جاتا کچھ جب خیز نہ تھا عزم کی قابلیت فنا ہو گئی تھی۔ مظالم کا یہ سلسلہ

حسینؑ کے نہ بدلنے والے ارادہ کے بچنے میں معین ہو گا اور تمام حالتیں حسینؑ کے عزم شہادت کا گہوارہ کبھی جائیں گی۔
بے قوت ہیجان پھر بھی نام لینے کو ایسی حالتیں تھیں کہ عدی کے ساتھ برے بر تو پر لوگ اظہار خاموشی کرتے۔ حجر کو گرفتار دیکھ کر چڑانے کی کوشش اور شہادت کے بعد لوگ حسینؑ سے شکایت کرتے اور بقیہ مشاہیر حسینؑ کے پاس آتے۔ یہ تمام اٹھان استننا سے زیادہ وقت نہیں رکتی تھی کیونکہ اگر اس میں اجماعی قوت اور ناقابل تغیر ارادہ ہو تا تو یہ حالت اپنی تاریخ کچھ اور نکھواتی۔ کر دھ بدلتا خواب کی مشتبہ حالت سے زیادہ کچھ نہیں ہے چہ جائے کہ وہ جوش اور کھڑے ہونے کا عالم کہا جائے۔

ذمہ دار ائمہ کے چپ رہنے اور بولنے کا مطالعہ حسینؑ خاموش تھے، ذمہ دار ائمہ کی خاموشی اور عمل کی حالتیں پر غور مطالعہ کی چیز ہیں کہ کب تک وہ چپ رہتے تھے اور کب اپنی آواز بلند کرتے تھے یا حرکت کرتے تھے۔ جناب امیر اگر صداؤں کی ہم آہنگی اور پُر استقلال عزم دیکھے بغیر خلافت منظور نہ کر سکتے تھے تو حسنؑ کب بغیر ایسی حالت کے خلیفہ رہنا پسند کر سکتے تھے۔ یا پھر ایسی حالت کی ناموجودگی میں حسینؑ کیونکر کوئی ایسا ارادہ کر سکتے تھے جس میں حسینؑ اور عامہ ناس کے اشتراک کی ضرورت ہو۔ اگر ایسا ہی تھا کہ انفرادی اظہار عزم کا وقت آگیا تھا تو اس کا اختیار تیزی اس شخص کے لیے تھا جو تیار ہو تا اور ہمارے دیکھنے کی یہ بات ہے کہ اختیار تیزی کے صرف کا یہ وقت تھا یا وہ ہے حسینؑ نے چنا جس کا تذکرہ آدے گا۔

حسینؑ چپ نہیں رہنے دیے جاتے حسینؑ میں قلعہ خاموشی کا کیسا ہی ارادہ کیوں نہ ہوتا، لیکن وہ خاموش نہ رہنے دیے گئے۔ حکومت کی وہ آنکھ جو مدینہ میں تھی اس کے بمیانک کرنے کے لیے یہ تماشہ کافی تھا کہ لوگ اور مشاہیر حسینؑ کے پاس آرہے ہیں۔ اپنے شرفا اور فطری سرداروں پر ظلم کی شکایت کر رہے ہیں۔ مروان نے معاویہ کو "قتلہ کے اندیشہ" سے مطلع کیا۔ معاویہ نے حسینؑ کو لکھا اور ان خبروں کو ان کے "لائق حال" نہ بگاڑ دینے عہد (۱) کی امید اور نصیحت کی۔ اور گویا ایک نیا گھوڑہ یہ پیش کیا کہ: "جب تک ہماری جانب سے تمہیں کوئی برائی نہ پہنچے مجھے بھی تمہاری طرف سے کوئی امر مکروہ واقع نہ ہو"۔ یہ عہد اس لیے قابل لحاظ نہ رہ گیا تھا کہ معاویہ اور حسینؑ کی قابلیت دفع برابر نہ تھی۔ اس کا فائدہ عدم مساوات قوت کے لحاظ سے تمام تر معاویہ کے لیے تھا۔ وہ ہر وقت اختیار رکھتا تھا کہ کوئی نزاعی روش اختیار کرتا اور حسینؑ دفعۃً ایک قوت دار مخالفت دیکھ کر مقابلہ کی قوت نہ پاتے۔ معاویہ کی مسلسل روش نے اس کے ایسے کسی وعدہ کو قابل اعتبار نہ رکھا تھا نیز اس کے کہ کمزور یہ کہے بغیر چارہ نہ دیکھتا کہ مجھے تم پر اعتبار ہے۔ کیونکہ ایسا نہ کہنے کی صورت میں قوی دشمن کا نہانی اقرار بھی نہ رہ جاتا۔ مقتولین کے میزور، ہمدردوں کے متعلق معاویہ کے "عنفا" اور "طالب قتلہ" کہنے میں مجھے اختیار کے ہاتھوں الفاظ کے رخ ہونے اور خیال کے ناجائز ولادت کے علاوہ کچھ نہیں دکھائی دیتا۔

حسینؑ کے الفاظ اور ان کا عکس حسینؑ کا جواب مختصر اور صاف ہے کہ: "میں کسی طرح تیری مخالفت اور جنگ کی رغبت نہیں رکھتا، تو مطمئن رہ"۔ اس میں

جس نے ”مخالفت“ ”رغبت“ اور ”مظنن“ کے الفاظ ہی نہیں ہیں، جو غور طلب ہوں۔ مخالفت نہ ہونے کے معنی موافق ہونا نہیں ہے۔ ”رغبت“ کا استعمال مظہر اختیار ہے جو اپنی بے قوتی کا عکس نہ ڈالے۔ اور ”مظنن“ کرنے سے مخالفت کے عملی حرکت کو سلا دینے کی کوشش کی ہے۔

اب میں حسینؑ کے اس مختصر جواب کے علاوہ ناخ التواریخ کے طویل جواب پر نظر ڈالتا ہوں۔ یہ خط ایک تنقیدی حیثیت کا جواب ہے۔ شروع ہی میں حسینؑ نے

مفصل جواب پر نظر

فرمایا ہے کہ اس خبر کو ”جھوٹے اور خوشامدی لوگوں نے افتر کیا ہے“۔ ”من لا تودر مخالفت نیست و نہ در عاربت“۔ جس کے معنی یہ ہوں گے کہ میں تجھ سے حالت مخالفت یا جنگ میں نہیں ہوں۔ اس کے بعد صاف لفظوں میں حرار اور ابن ابی عمیر پر ظلم کا تذکرہ کیا جس کی مخصوص بات یہ تھی کہ: ”بغیر اس کے کہ انھوں نے تیرے ملک میں کوئی فتنہ بھایا ہو“۔ مجھے اس میں شبہ نہیں ہے کہ وعدہ امن کے بعد بے وفائی یا دلا کر غیر صریح طور سے حسینؑ یہ کہہ رہے تھے کہ میرے ساتھ بھی تیرے کسی عہد پر کیا اعتبار ہے۔ اس کے بعد زیادہ کے مظالم اور خلافت اسلام کا رد و انکسار یا دلا دینے کے بعد فرمایا: ”گویا تو اس امت میں نہ تھا“۔ اس کا صحیح پرتو غالباً یہ ہے کہ تو بحیثیت حاکم ہونے کے ایسے حکم دے رہا تھا کہ گویا تو مسلمان نہ تھا۔ اور نہ تجھے اس کی فکر تھی کہ مسلمان خلافت انسانیت طریقوں سے شہید کیے جا رہے ہیں۔ یہ تیس آگے کی اس عبارت سے صاف ہو جاتا ہے کہ ”حالانکہ اسی دین کے لیے علیؑ نے تجھے اور تیرے باپ کو دستخوش شمشیر بنایا“۔ جماعت اسلامی اس بے دردی سے تباہ کی جا رہی ہے کہ گویا اس جماعت کے مہینا کرنے کے لیے کوئی کوشش ہی نہ کرنی پڑی تھی۔ اور موقع کا طعنا اس ظری واقعہ خوانی میں ادا ہو گیا کہ تو ادھر تیرا باپ جو جماعت اسلامی کی ترتیب میں ہارچ تھا اور اس لیے علیؑ تجھے دستخوش شمشیر بنا رہے تھے۔ آج پھر تو اس بنی ہوئی حالت کو بکھڑا رہا ہے۔ کیونکہ تو نے ”فصل خلافت کیا ہے“۔ کون کہہ سکتا ہے کہ ان تمام خیالات میں اظہار تاسف کا حسینؑ سے زیادہ کسی کو حق تھا وہ دیکھ رہے تھے کہ ان کے جد بزرگوار کے تیار کیے ہوئے بہترین نمونے برباد کیے جا رہے تھے۔ اور پھر سیاسی تقن کا دہان سے ایسا جواب چاہتا تھا جو حالت کی سلامت روی کا اقرار ہو۔ حسینؑ اپنی غیر نزاعی روش کا اطمینان دلا سکتے تھے لیکن ان کی حق گوئی سے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ ایک قابل اعتراض حالت کو سیاسی دہان کی وجہ سے ناقابل اعتراض کہہ سکتے۔ خصوصاً جب کہ وہ کچھ کہنے کے لیے مجبور کیے جا رہے تھے۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ جماعت کی جماعت ظلم کی ان ایملوں سے تباہ کر دی تھی جسے اسلام نے مشروع قرار دیا تھا اور پھر انھیں اس کی اٹل دھمکیاں دی جا رہی تھیں کہ تم چپ اور بے حرکت نہیں ہو۔

باوجود اس کے کہ ان الفاظ اور خیالات کے لیے اس وقت ناخ التواریخ کے علاوہ مجھے اور کوئی سند نہیں معلوم لیکن ذاتی طور سے مجھے اس کے ماننے میں کوئی عذر نہیں ہے۔ اگر موجودہ حالت اور واقعات کا ظہر کرنے والا کوئی خیال اور الفاظ، طرز بیان، انکسار، بوجہ اور اس کا خاصہ کہنے والے کے خیالات کا تحارف، کوئی معیار قرار دیا جاسکتا ہے تو نہ صرف متذکرہ صدر صاف کوئی بلکہ یہ الفاظ بھی کہ ”تو نے لکھا ہے کہ اپنے دین کی فکر میں رہوں اور فتنہ کھڑا نہ کروں تو میں اس امت میں کسی فتنہ کو تیری حکومت اور خلافت سے زیادہ تصور نہیں کر سکتا۔ اپنے نفس اور امت محمدی کے خیال سے اس سے اچھی کوئی بات مجھے نہیں معلوم ہوتی کہ تجھ سے جنگ کروں“۔ حسینؑ نے کہے اس وقت مجبور کیے جانے پر ایسا

نہ کہنا معاویہ کی مصلحت کی کامیابی ہوتی اور گویا خاموشی کے اصرار سے اس کی تہری کے سلسلہ میں ترقی دینا ہوتا۔ میں سوچتا ہوں کہ اس جواب کا یہ اثر ہوا کہ معاویہ کو اپنی تمام کارروائیوں میں اب یہ پیش نظر رہتا ہوگا کہ کوئی دیکھ رہا ہے۔ اگرچہ وہ کیسا ہی بے قوت ہو۔

اور اس قدر تنگ آگئے تھے کہ یہ بغیر فرمانے نہ رہ سکتے کہ جنگ سے ”سستی کرنے میں مجھے خدا سے طلبِ استغفار کرنا پڑے گا۔“ کب تک دیکھتے اور خاموش رہتے کہ شریعتِ اسلامی جس نے مسئلہ کرنے اور آگ سے جلانے سے کفار تک کو منع کیا تھا۔ اسلام کے ہمیشہ کے دشمنوں کے ہاتھوں جاہلیت کی طرف لوٹائی جا رہی ہے اور مسلمان ان ظلماتِ انسانیت اذیتوں کے شکار ہوتے رہتے ہیں۔ اور عداوت کے اٹل الزام کے جواب میں نہایت طبعِ فخرہ اور شلا فرماتے ہیں کہ: ”مگر کسی مخلوق کو نقصان نہیں پہنچاتا مگر یہ کہ اسی کے نفس کی طرف ہار گشت کرتا ہے۔“ یہاں حسینؑ اس عارضی نقصان کو نقصان نہیں سمجھتے جو کسی کے مکارانہ اختراع سے کسی کو پہنچا ہو۔ بلکہ حقیقی نقصان اسی مکار کے نفس کو پہنچا جس نے مکر کیا تھا۔ مطابق واقعہ میر فخرہ حر فرماتے ہیں کہ: ”تو جہل ر سوار تھا اور نقص عہد پر عرص ہوا۔“ بے وفائی کی مثالیں اور مقتولین کا ذکر کر کے ”ان کا قصور ہیں ہمارے فضائل اور تعظیمِ حقوق کے کچھ نہ تھا۔ انھیں تو نے اس خوف سے قتل کیا کہ اگر یہ زندہ ہیں تو خود تباہ نہ ہو جائے۔“ شدید ہی واقعت کا غلام اس سے بہتر کیا جاسکتا ہو یا ان کی حقیقت اور ظالمانہ غرض اس سے بہتر نقطوں میں بھائی جاسکتی ہو۔ اس کے بعد حسینؑ اپنے حقیقی منصب کے لحاظ سے عذابِ خدا سے ڈراتے ہیں۔ رعیت کی پریشانی کا تذکرہ کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ تو نے ”پارساؤں کو ڈرایا کہ آڑ کی گردن پر سوار ہو۔“ کیسے ممکن تھا کہ وہ جو اپنے کو خلیفۃ المسلمین کہتا ہے بلا کسی جھجک کے خلافتِ حقِ امورات میں مصروف ہو سکتا جب تک ان کی زبانیں خوف سے بند نہ کرادیتا جو اعتراض کر سکتے۔

زہر اور تلوار سے مرنے والے مرچکے تھے۔ اب گڑ سے مارے جانے کے قابل لوگ رہ گئے تھے کہ مدبرین یہ کہہ سکے کہ چونکہ اکابرین قریش مرچکے ہیں، ولیعہدیٰ یزید کا اہتمام کیا جائے، اس لیے کہ اب کوئی فتنہ یا فساد نہ ہوگا۔ شام موافق تھا، عراق مقررین سے پاک کر دیا گیا تھا۔ حجاز یعنی اسلامیت کا گہوارہ اور دینی روایات کا مولد کیوں زیر اثر نہ لایا جاتا۔ خصوصاً جب کہ چار صاحب اثر لوگوں کی ناموافقیت کا اندیشہ پیدا ہو گیا تھا۔

بعض کے موافق مدینہ میں معاویہ کے آمد کی خبر سننے ہی چاروں حضرات مکہ چلے گئے لیکن میں ان مؤرخین کے قول کو زیادہ ہاور کرتا ہوں جن کے نزدیک یہ لوگ مدینہ میں تھے اور معاویہ سے گفتگو کے بعد مکہ روانہ ہوئے۔ ان کا روانہ ہونا ایسی دھمکیاں اور فقرات سننے کے بعد تھا کہ: ”خدا تمہارا خون پہلے گا۔“ پھر بھی حسینؑ نے معاویہ سے ”حسد اور عداوت“ کے الفاظ سن کر اس کی امید کے خلاف ڈانٹ بتائی تھی کہ: ”چپ رہ ہم اس کے اہل نہیں ہیں۔“ اور اس نے کہا کہ: ”تم اس کے اور اس سے بدتر کے اہل ہو۔ تم لوگ ایسی بات چاہتے تھے خدا جس کے خلاف چاہتا تھا۔“ ہم اس کے پیشتر مثالیں دے چکے ہیں کہ مدبرین کو اس کی عداوت ہو گئی تھی کہ ہر ایسی سختی کو جو وہ اور ان کی جماعت کسی فرد یا جماعت سے جائز رکھے وہ خدا کے عمل کے حوالہ کر دی جائے۔ اس کی غرض کچھ تو یہ ہو سکتی تھی کہ اپنے طرزِ عمل کو لوگوں کا آماجِ عقیدہ نہ بنائیں اور کچھ ملوم نفس کی تسکین مقصود تھی۔ اس کے عکس میں ادنیٰ سے ادنیٰ بات جو ان کے خلاف کی

یا کچی جانے کہ میں ہاندہ لی جاتی تھی اور کسی طرح اس میں قدریت سے تسلیم و رضا کا سبق نہ پڑھا جاتا تھا۔ ان تمام مشکوک کے بعد جس سے خون کی بو آتی تھی یہ زیادہ قرین قیاس ہے کہ منکرین بیعت حضرات اب مدینہ سے روانہ ہوئے ہوں۔ جسے سن کر امیر شام ”منظکر“ ہو سکتا تھا۔ فلک کی وجہ ظاہر تھی۔ اس لیے کہ حضرت عائشہ نے بھی یہی ظاہر کیا کہ: ”تم نے ان لوگوں کو قتل کی دھمکی دی ہے۔“ اور جب یہ دھمکی دی جا چکی تھی تو دھمکیاں پہنے والے ہمارے تھے کہ در صورت موافقت نہ کرنے کے یا قتل ہونا گوارا کرتے اور یا کوئی ایسی فکر کرتے جس سے وہ ان دھمکیوں سے محفوظ ہو جاتے۔ کوئی تنہا نہ تھا۔ چار تھے اور سب صاحب اثر تھے۔

مکہ کی روانگی سے منکرین بیعتِ زید کی کیا غرض تھی

میرے نزدیک عبداللہ بن زبیر کا بغرض حفاظت مکہ تشریف لے جانا مدینہ رہنے سے بہتر مصلحت نہ تھی نہ محض اس لحاظ سے کہ حضرت عائشہ مدینہ میں موجود تھیں بلکہ اس وجہ سے بھی کہ وہ عامہ ناس پر اپنے وقار کو اب اس قدر مسلم الثبوت سمجھتی تھیں جس سے وہ معاویہ کو محمد بن ابی بکر کے طلب قہاص میں قتل کی دھمکی دے سکتیں۔ ان کی یہ روش بھی ہر طرح مناسب تھی کہ انھوں نے ان چاروں حضرات کے متعلق معاویہ سے اس کے الفاظ کی باز پرس کی۔ اور معاویہ کا جواب کہتا ہے کہ اسے اپنی غرض کی تکمیل کے لیے کسی ہی بات کرنے سے کوئی تردد نہ تھا۔ لیکن اگر ابن زبیر اور ابن ابوبکر کا مکہ جانا دشمن کے خیال کے دو جگہ تقسیم کرنے کے لیے تھا کہ اگر وہ مدینہ میں حضرت عائشہ سے پیش آمد میں قابل اعتراض ثابت ہو تو ہم مکہ میں فکر کر سکیں اور اگر وہ مکہ پہنچ کر ہمارے ساتھ کوئی ناملائم برتاؤ کرے تو حضرت عائشہ مدینہ میں رہیں تو ہم پہلے خیال کو واپس لیں گے۔ ابن عمر اور حسین کا موقع ایسا نہ تھا جیسا ان دونوں حضرات کا۔ اس لیے کہ ان کا حضرت عائشہ کا ایسا کوئی زبردست مددگار نہ تھا۔ موقع نہ ہونے کے علاوہ ہم یقین کر لیتے ہیں کہ ابن عمر خلافت کے حوصلوں سے پاک اور جی آدمی نہ تھے۔ حسین ایسی کسی کوشش میں جو حضرت عائشہ کی مرکزیت سے شروع ہوتی۔ غالباً کوئی حسد نہ لیتے کہ انھیں سب سے بہتر تجربہ تھا کہ حضرت عائشہ کو ابن زبیر کے خلیفہ بنانے کا کس قدر حوصلہ ہے۔ ہر صورت میں ایسی کسی کوشش اور کامیابی کا نتیجہ ابن زبیر کا خلیفہ ہونا ہوتا۔ حسین اور ان کے پدر بزرگوار جب اپنے لیے بزورِ شمشیر معاملہ نہیں کر سکتے تھے تو استنباط کے لیے جگہ خالی نہیں ہے کہ وہ اوروں کا حوصلہ پورا کرنے کے لیے مخلوقات کے خون سے اپنا ہاتھ مہرتے۔ نظمِ بریں میرا تصفیہ ہے کہ حسین کا مکہ تشریف لے جانا محض رعبِ شر اور حفاظت کی غرض سے تھا۔ جیسا اس کے بعد بھی انھوں نے ایسا ہی کیا۔ لیکن غالباً ان کا آئندہ موقع اسی وقت آجاتا۔ اگر اس وقت بھی اس پر بیعت یا قتل کا زور ڈالا جاتا جیسا اس کے بعد ہوا۔

معاویہ کے فلک کے لیے اور کوئی چارہ نہ تھا بجز اس کے کہ وہ مکہ جاتا۔ یقیناً نہ اس لیے کہ وہ یلو کرتا کہ جو شخص خانہِ اہلسنیان میں داخل ہوگا اسے امن ہوگا، نہ اس جگہ کی زیارت کرنے جا رہا تھا جہاں حیوانی اور نباتی قتل جائز نہیں ہے۔ بلکہ ان لوگوں کی آزادی نفس کو قتل کرنے جا رہا تھا جو ایسے کو خلیفہ تسلیم نہیں کر رہے تھے جس کے عادات نے خود اس کے باپ بیعت یا قتل کا زور ڈالا جاتا جیسا اس کے بعد ہوا۔

معاویہ اور مکہ کی یادداشت

معاویہ کے فلک کے لیے اور کوئی چارہ نہ تھا بجز اس کے کہ وہ مکہ جاتا۔ یقیناً نہ اس لیے کہ وہ یلو کرتا کہ جو شخص خانہِ اہلسنیان میں داخل ہوگا اسے امن ہوگا، نہ اس جگہ کی زیارت کرنے جا رہا تھا جہاں حیوانی اور نباتی قتل جائز نہیں ہے۔ بلکہ ان لوگوں کی آزادی نفس کو قتل کرنے جا رہا تھا جو ایسے کو خلیفہ تسلیم نہیں کر رہے تھے جس کے عادات نے خود اس کے باپ

اور جانوں کو متروک کر رکھا تھا اور اصولاً خلافت تھا۔ اور اس کیفیت لطف کے محسوس کرنے کے لیے جو ایک اموی کو اس خیال میں حاصل تھا کہ پشتوں کی جدوجہد کے بعد آج ہم بے مداخلت غیرے وطن میں شاہی داخلہ دیکھ اور دکھا سکے۔ داخل ہوا۔ منکرین بیعت سے ملاقات ہوئی۔ ایک طرف سے اصرار دوسری طرف سے انکار ہوا۔ اور معاویہ نے کہا: ”خدا کی قسم اگر کسی نے میری بات رد کی تو خیر نہ ہوگی۔“ باغ سبز بھی دکھالیا۔ حماقت بھیجی۔ لیکن حسینؑ سے دور تھا کہ وہ اس رشوت پر نظر ڈالتے۔ بلکہ گفتگو میں جب حسینؑ نے امور خلافت کے لیے کسی ”بہتر شخص“ کو منتخب کرنے کی صلاح دی اور معاویہ نے پوچھا کہ کیا تم اس سے اپنے کو مروا لیتے ہو تو فرمایا کہ: اگر ”میں مراد لو تو بعید نہیں ہے۔“ اور پھر فرمایا کہ: ”وہ کون ہے جو میری نانا کی امت کے لیے مجھ سے بہتر ہو۔“ یا فرمایا کہ: ”مجھے اپنے نانا کی امت اپنی ذات سے زیادہ عزیز ہے۔“ پہلا فقرہ عین صدق ہے، دوسرے کو آئندہ زمانہ نے ثابت کیا کہ امت رسولؐ کا دینی وقار اور خصائل کی عظمت قائم رکھنے کے لیے حسینؑ نے اپنی عزیز جان اور ان کی جانوں کی جن کی جانیں حسینؑ کو عزیز تھیں کوئی پرواہ نہ کی۔ پہلے جواب میں حسینؑ نہ صرف اس تعلیمی استیلا کے خلاف اشارہ کر رہے تھے جو مہات خلافت کی انجام دہی کے متعلق انھیں باسلسلہ حاصل تھا بلکہ اپنے فطری حق کو بھی ظاہر کرتے تھے۔ اور یہ باتیں اس لیے کہانی ہوئی چاہیے تھیں کہ امت محمدیہ ان کی خلافت پر راضی ہو جاتی۔ لیکن اب جواب یہ تھا کہ جلاؤ اور اہل شام سے اپنی جان کو ڈراتے رہو! سرورِ عالم میور اپنی لافٹ آف محمدؐ کے دوسرے حصہ میں اس کا ذکر کرتے ہیں کہ حضرت امام حسینؑ نے معاویہ کے افعال کے منتقل طعن الفضول کا واسطہ دیا۔

ملکہ کی سیاسی محفل

معاویہ کے لیے یہ مایوسانہ حالتیں کم پریشان کن نہ تھیں۔ نہ اس کی جھولی خالی ہو چکی تھی۔ مدینہ کی طرح لوگوں کو جمع کر کے منبر پر چڑھ جانا بے سود تھا۔ اس لیے کہ لوگوں نے تقریر کا کچھ جواب نہ دیا تھا۔ اب محض اختیار کی نمائش ہی مقصود نہ تھی بلکہ اپنے صاحب شرطہ کو بلا کر کہا کہ: ”جو شخص میرے بیان کی تکذیب کرے اس کی گردن فوراً اڑا دینا۔“ مکارانہ فعل اس کے بعد شروع ہوئی۔ جس میں خون کا عمل تھا کمال ہوش مندی سے ان چاروں آدمیوں کے بیعت نہ کرنے کے واقعہ کو ناقابل اعتبار افواہ کہا۔ انھیں بزرگ زادگان عرب، اخیار مسلمین، مسلمانوں کے رومی پیشوا وغیرہ کہا: ”جس کے مشورہ بغیر کوئی کام انجام کو نہیں پہنچ سکتا۔“ اور اب شاہی اطمینان سے انکے بیعت کرنے کا اعلان کیا۔ اور سب پر طرہ یہ تھا کہ: ”یہ باتیں میں ان کے سامنے کہہ رہا ہوں کہ اگر کسی کو شبہ ہو تو تحقیق کر لے کہ انھوں نے مزید کی بیعت کی ہے یا نہیں۔“ کوئی عجب نہیں ہے کہ لوگ حیرت میں ڈوب گئے ہوں اور ایک دوسرے کا منہ دیکھ رہے ہوں۔ وہ اپنے میں ”یابہ آکن شور اشوری یابہ این بے نمکی“ کا عالم محسوس کرتے ہوں۔ ان کی نگاہ میں ان لوگوں کے انکار کی وقعت گھٹ گئی ہو اور سوچنے کے لیے آملاہ ہو گئے ہوں کہ تو پھر ہم شاہی غضب کے آماج کیوں ہوں۔ مجھے شک نہیں ہے کہ لوگوں نے معاویہ کے کہنے کو بھلا بھلا موقع کی بے لگنت دروغ گوئی نے ہر لفظ کو سچا دکھایا۔ ایسے افسوس ناک موقع پر جب کہ بچائی ذبح ہو رہی تھی میرے دانست میں مذاق کا عنصر غیر موجود نہ تھا۔ حسینؑ کی جملہ ہٹ اور تنفر، لوگوں کی حیرت اور خفت سے دیکھنا مقرر کے اعتبار انڈیلنے والے انداز اور اعتبار کے ڈھیلے پڑنے کے لیے قتل پر تیار رہنا۔ ان تمام باتوں میں تلخ ہنسی کی جگہ تھی۔ لیکن لفظوں میں بیان کرنا جس قدر

وقت کا محتاج ہے سرعت خیال اور نظر سے اس کا اندازہ نہیں ہو سکتا یہ کل حالتیں اس قدر جلد گزریں جو وقفہ نہ کہا جاسکے، بلکہ حقیقت وہ کہانہ ہونا ہی معاویہ کے لیے مفید تھا اس کی تقریر کے بعد لوگ حیرت سے چونکے نہ تھے کہ تنظر حکم و فائدہ ار جلا اشارہ پا گئے اور تلواریں کھینچ کر ان کے سروں پر کھڑے ہو گئے جن سے انکار کا اندیشہ تھا۔

معاویہ کی تقریر کے عجب خیز معنوں کے بعد اس سے کسی طرح کم موثر سپاہیوں کا اندازہ نہ تھا کون تھا جو اپنے پہلے سلسلہ خیال کو قائم رکھتا، اور اس نئے تماشا کو دیکھنے نہ لگتا۔ معاویہ کی تقریر اگر ایک ”طے شدہ“ امر پر لوگوں کو راضی کر رہی تھی تو یہی سہی آؤ اس وقت تلواریں اور خوف نے دور کر دیا تھا۔ سپاہیوں کی آمد انداز کے اعتبار سے کسی طرح بری نہ تھی نہ ان کے الفاظ بے کار تھے۔ الفاظ سپاہیوں کے نہ تھے۔ وہ قتل تھے۔ اس کے ضعف نہ تھے۔ ان سے ایسے انعکاس سے کیا بحث جو احساسات کے جزو و بد کے لیے تیار اور پیش کیا گیا ہو۔ ان الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ سپاہی معاویہ کی تقریر کے ایک ایک لفظ کو ایک مدبر کی طرح تول رہے ہیں اور گھر رہے ہیں کہ معاویہ اس لیے تعریف کر رہا ہے کہ ان چاروں آدمیوں کے موقع کو عظیم سمجھتا ہے۔ عظیم بھنا خوف پیدا کرتا ہے اور وہ خوف قتل یا ”سب کے سامنے“ بیعت کرنے سے دور ہو سکتا ہے۔ اور گویا تنگ آ کر کہہ اٹھتے ہیں کہ: ”کب تک تو ان چار شخصوں کی تعریف اور عزت کرے گا۔ ان کا موقع ایسا عظیم نہیں ہے کہ تو ان سے خوف کرے۔“ بظاہر یہ ایک مخلصانہ تنقید تھی یا شاید مؤلف الفاروق کے لفظوں میں ہاشمیانے نام حالت بیان کی جاسکے کہ: ”تم اس کا بھی اندازہ کر سکو گے کہ حضرت۔۔۔ کے عہد میں لوگ کس دلیری اور بے باکی سے اپنے خیالات ظاہر کرتے تھے اور زیادہ تر اس وجہ سے کہ حضرت۔۔۔ آزادی اور حق گوئی کو قوم میں پھیلاتا چاہتے تھے!“۔

(ناظر کا جی چاہے تو غلطوں کی جگہ معاویہ کا نام لکھ دے)

معاویہ کے لحاظ سے تدبیر یہ تھا کہ ”بوسہ چند بیامیز بہ دشنامے چند“ کے اصول پر مصلحت تیار کی گئی تھی اور ”اخیار مسلمین“ کے اعتبار سے مرثیہ یہ تھا کہ حکومت خود بخود ختم ہو جاتی ہے ہاتھ کر کے اپنے دست و بازو سے ایسا کچھ پہلوانی تھی جو ان کی شان کے خلاف تھا اور اس سے یہ بھائی تھی کہ دیکھو یا تم میرے قدر شناسی پر مائل ہو اور یا اس پر راضی ہو جو میرے خیر خواہ چاہتے ہیں۔ حالانکہ یہ نرم گرم باتیں ایک ہی نتیجہ کے لیے تھیں۔

اس کے بعد طے شد تدبیر میں یہ بھی داخل تھا کہ معاویہ ان اہل شرطہ کو ”خاموش“ کراتا۔ یہ کڑا بھی نہایت خوب تھا۔ اس لیے کہ سر حکومت نہ صرف عام حاضرین بلکہ مفکرین بیعت پر بھی اپنی ختم نہ ہونے والی عنایت کا اثر ڈال رہا تھا۔ اور پھر کیا ان دمگیوں کے علاوہ قتل کر دینے سے کوئی مزید فائدہ متصور تھا؟ نہیں۔ بلکہ مضر ہو سکتا تھا۔ اور یہ غرض حاصل ہوئی تھی کہ ”لوگ بیعت پر آمادہ ہو گئے۔“ پھر کیوں اس وقت تک کی مفید مصلحت سے اعراض کیا جاتا کہ بہ حیرت بیعت لی جاتی یا بیعت اور قتل کے علاوہ تیسری صورت نہ ہوئی۔

یہ حقیقت کش قتل حسینؑ سے معاویہ کے اعلان کے متعلق سوال اور ان کا جواب

ابن خلدون ”حکمت عملی“ کہتا ہے، ختم ہوئی۔ اب وہ فطری موقع آیا کہ عام لوگ ان چاروں حضرات خصوصاً حسینؑ سے

باب

ان کی روش اور معاویہ کے اعلان کے متعلق سوال کرتے۔ حسینؑ نے اس کا جواب دیا: ”واللہ ہم نے سرِ اعلان کی طرح زبید کی بیعت نہیں کی ہے۔ لیکن معاویہ نے ہم سب کو فریب دیا اور جو کچھ تم نے دیکھا اور سنا اس نے کیا اور اہل شام نے اس کے کہنے سے اس قدر غلو کیا اور تلواریں کھینچیں البتہ ہم خاموش تھے نہ تم نے کچھ پوچھا نہ ہم نے جواب دیا۔“ اور اب لوگوں نے کہا کہ پھر آپؑ نے معاویہ کو اس سے کیوں نہ روکا؟۔ جواب دیا: ”مسلمانوں کی خونریزی کے خیال سے۔“ ”لوگوں کو اس کمرے سے قحب ہوا۔“

حسینؑ کی روش کے متعلق سوال اور جواب

سوال یہ ہے کہ ایسے موقع پر حسینؑ کو خاموش رہنا مناسب تھا یا نہیں۔ خاموش رہنے کے خلاف جو کچھ کہا جاسکتا ہے وہ یہ ہے کہ باوجود اس قدرت کے کہ وہ لوگوں کو فریب میں نہ آنے دیتے اس وجہ سے فریب میں آنے دیا کہ وہ خاموش نہ رہنے کی صورت میں قتل کر ڈالے جلتے۔ یہاں سوال یہ ہوتا ہے کہ آیا ایک شخص کے لیے یہ زیبا ہے کہ وہ اپنے کو معرضِ ہلاکت میں گرفتار کرے یا فریب میں آنے دے۔ میں اس سے انکار نہ کروں گا کہ یہ درجہ اعلیٰ ہے کہ فریب میں نہ آنے دینے کے لیے کوشش کرے۔ اگرچہ ایسا کرنا اپنے کو ہلاکت ہی میں گرفتار کر دیتا کیوں نہ ہو۔ نہ ایسا تھا کہ حسینؑ نے فریب میں نہ آنے دینے کی کوشش نہ کہ ضرور عین موقع پر نہ کہ لیکن کچھ ضرور نہ تھا کہ اسی وقت مطلع کرتے۔ جب کہ اس وقت خاموش رہ کر نہ صرف اپنی جان بچا رہے تھے بلکہ اس کا بھی فہم تھا کہ تھوڑی دیر کے بعد ہم لوگوں کو اصل حقیقت سے مطلع کر سکیں گے اور اس وقت اس کا اس سے زیادہ اثر ہوگا جیسا اس وقت ہوتا اس لیے کہ اس وقت تو یہ بھی مشتبہ تھا کہ ہم انکار اور اس کے وجوہات بیان کر سکیں گے اور بہت ممکن تھا کہ جنش کرتے ہی تلوار اپنا کام کر چکی ہوتی اور وہ مفید اطلاع بھی ختم ہو جاتی جو در صورتِ حیات لوگوں کے حوالہ کی جاسکتی تھی اور لوگ ایسے موبانہ فریب سے متفر ہو سکتے تھے جیسا اطلاع کے بعد ہوئے۔ اس وقت ظاہر کر دینے کی صورت میں دوسرا نقصان یہ تھا کہ شاید کچھ لوگ اور انکار کرتے اور وہ بھی تلوار کے نذر ہوتے بلکہ گہروں کے ساتھ گہن بھی پس جاتا۔ آخر یہ سب کیوں کیا جاتا جب کچھ دیر کے بعد بغیر کسی خونریزی کے یہ نتیجہ حاصل ہو سکتا تھا۔

دوسرے پہلو سے جواب کے لیے حسینؑ کو نہ معاویہ نے ذمہ دار بنایا تھا اور نہ لوگوں نے، بلکہ لوگ تھے جنہیں در صورتِ اشتباہ حسینؑ سے پوچھنے کا حق تھا۔ حسینؑ خود سے جواب دینے کے ذمہ دار نہ تھے۔ حسینؑ کا موقع ابنِ مریم کا ایسا نہ تھا کہ ہائی لیٹ کے اس سوال کے جواب کے وہ ذمہ دار تھے کہ تو ہی وہ ہے جو اپنے کو یہود کا بادشاہ کہتا ہے؟ اور یہ جواب دیتے ہیں ”تو کہتا ہے“۔ اگر سننے والے ایسے ہی خوش اعتماد تھے کہ ہر چھپنے والے کے چھپے دوڑ جاتے تھے دراصل ایک کوئی اسٹھوں کے سامنے تھی تو کیا امید تھی کہ ان کا انکار ایسے لوگوں پر کچھ اثر کرتا جو محض پوچھنے کی تکلیف گوارا نہیں کرتے بلکہ دوسرے کو اپنے قتل کے اہتمام پر آمادہ کرتے ہیں۔

نیز یہ کہ کیا وہ تمام لوگ جو یہاں موجود تھے حسینؑ کی بیعت میں تھے؟ بلکہ بہ اشتباہ نے چند سب تھے جو معاویہ کی بیعت میں تھے۔ یعنی ایسے لوگ جو فاسق رسول کے ہوتے ہوئے ایسے شخص کی حکومت پر راضی تھے جن سے اور جس کے اکثر حالات کو وہ جانتے تھے تو حسینؑ کو کیا امید تھی کہ وہ بمقابلہ معاویہ میری بات کی طرف زیادہ مائل ہوں گے۔ اور کیا فہم

تھا حسینؑ کو کہ میرا ایسے عہد و شوق تھا اپنی زبان کو قابو میں نہ رکھنا اس قدر مفید ہو گا کہ لوگ ایک برے کام سے رک جائیں گے۔ کچھ نہ تھا۔

پھر بھی حسینؑ کا جواب کہ: ”نہ تم نے کچھ پوچھا نہ میں نے جواب دیا“ بھاتا ہے کہ اگر لوگ پوچھتے تو حسینؑ اپنے اس اعلیٰ احساس سے جو ان میں تھا جواب دینا اپنے اوپر فرض کر لیتے اگرچہ وہ مخلوقات الہی کو فریب سے بچانے کی کوشش میں اسی وقت شہید ہی کیوں نہ ہو جاتے۔ مجھے کوئی شبہ نہیں ہے کہ یہ فقرات حسینؑ کے معصوم ارادہ کو بھاد پتے ہیں۔ میں سوچتا ہوں کہ ایسے موقع پر حسینؑ کا خاموشی کا تصفیہ کسی طرح اس پر آسائش تصفیہ سے کم نہ تھا کہ بھائی کو بذورِ شمشیر روضہ رسولؐ میں دفن کریں یا دادیں جائیں۔ حسینؑ نے یہاں بھی دکھایا کہ انھیں اپنے اوپر کس درجہ قابو حاصل تھا اور بھی موقع تھا کہ حسینؑ نے اپنے پیٹرو بزرگوں کی طرح مسلمانوں کے خون کو بچایا۔

تقتیہ کا مسلمہ بین الفرقین موقع میں مثنویہ بھی سوچتا ہوں کہ حسینؑ کے ساتھ ابن ابوبکر، ابن عمر، ابن زبیر کی خاموشی سے تقتیہ کی غالبیہ بہتہ بنی مثال مسلمہ بین الفرقین سدا رہائی۔ (تقتیہ موقت ہے، نہ کہ غیبیہ موقت)

بعض باتیں جو حسینؑ کے تجربہ میں آئیں یہ بھی حسینؑ کے علم میں آنے والا تھا کہ حضرت عائشہؓ کی منیعت الغری انھیں دشمنوں کے خلاف انسانیت پر ادا دل سے باز نہ رکھتی اور کیوں۔ وہ جانتے کہ شہدائے اہل اپنے افکار کے اس خواب گاہ میں آرام نہ کر سکتے جے انھوں نے اپنی زندگی کی قیمت اور سرفروشی کے حق سے حاصل کیا تھا۔

مکہ میں حسینؑ کا ایک کام لیکن ہے کہ مکہ تشریف لانے کا بھی زمانہ جو جس میں مصلوبہ کے آنے کے قبل حسینؑ نے ان کوششوں اور اس کے اثر کو دیکھ کر جو حکومت کی طرف سے جاری تھیں اس کی ضرورت دیکھی ہو کہ وہ ایک مرتبہ اس مجمع کو جو ان کے پاس ہواہ احادیث رسولؐ یاد دلادی جو ان کے پدر بزرگوار، مادر گرامی، خود اپنے اور اپنے برابر مالی مقدار کے لیے تھیں۔ مجمع کی تعداد ایک ہزار بھی تھی ہے۔ جس میں حسینؑ نے خطبہ فرمایا اور ان باتوں کو یاد دلایا جو مصلوبہ کی طرف سے ان کے اور ان کے دوستوں کے متعلق سرزد ہوئی تھیں۔ حالت کا بیچ اندازہ اس فقرہ سے کیا جاسکے گا کہ: ”ہمیں دین خدا کے ضائع ہونے کا خوف ہے۔“ اس کی تاکید فرمائی کہ جو کچھ میں کہتا ہوں اسے اپنے وطنوں میں جا کر لوگوں سے کہنا اور اسے محفوظ کر لینا ظاہر ہے کہ یہ کوشش اس لیے تھی کہ اصل باتیں بھی لوگوں کے ذہن میں رہیں اور ان مسلسل شہرتوں سے متاثر نہ ہو جائیں جو حکومت کے قوی ہاتھ اور زبان سے ہو رہی تھیں۔ نہایت ضروری تھا کہ جس وقت مملکت اسلامیہ کے تمام مشیروں سے مای اسلام پر سب دھم ہو رہی تھی وہ باتیں یاد دلانی جائیں جو اس مظلوم کے متعلق شاربِ اسلام فرما گیا تھا:

ان کل باتوں کے یاد دلانے پر جس میں سے ایک بھی کسی مسلمان کے لیے مایہ ناز ہوئی حاضرین نے ایشیائی نبوی کی تصدیق کی اور سب لوگ منی سے متفرق ہو گئے۔ یہ جامعیت اگرچہ ہمد آگم بہت زیادہ نہ تھی جس کا دشمنوں سے مقابلہ کیا جاسکتا لیکن اگر حسینؑ ان میں اپنی سرگرمی چھونک سکے اور وہ لوگ بھی موقع کے لحاظ سے اپنی ذمہ داری

محسوس کر سکے ہوں تو کوئی شبہ نہیں کہ ان میں آلِ نبی کے بظاہر عزت کا محکم ابرادہ پیدا ہو گیا ہو، اور دینِ خدا کے خلاف نہ ہونے پر ہر شخص بجائے خود آمادہ ہو گیا ہو۔ جہاں تک اس کے ملکہ اثر میں ممکن ہو۔ حسینؑ کا یہ ہوش اور جوش مسلمانوں کے لیے ابد الابد تک کے لیے نصیحت ہے۔

اموی لشکر کے ساتھ حسینؑ کے تشریف لے جانے کا عدم امکان دونوں یگی موزنین نے جنہوں نے یہ لکھا

ہے کہ حسینؑ معاویہ کی فوج کے ساتھ رہے یا قسطنطنیہ کے محاصرہ میں شرکت کی، کوئی سہ نہیں دی۔ یہ ایک واقعہ ہے جس کا بطلان اس سب سے بہتر طریقہ سے ہو سکتا ہے کہ معاویہ کی جو روش حسینؑ کے ساتھ تھی وہ ہر گز اس کی حقیقت نہ تھی کہ وہ معاویہ کی معرفت ایسے کسی کام کو طبعاً قبول کرتے۔ جب کہ خود حسینؑ کے متعلق اس کا پتا چلتا ہے کہ معاویہ نے خارج کے فروغ پر اس کی خواہش کی کہ وہ ان سے جنگ کریں اور انہوں نے اسے منظور نہ کیا۔ قسطنطنیہ کی فوج کشی شہر کا واقعہ ہے یعنی جب کہ چند روز ہونے تھے کہ حضرت امام حسنؑ کا واقعہ پیش آیا تھا اور جس زمانہ سے بیعتِ یزید کا مسئلہ چڑھا تھا اسی زمانہ میں نہ معاویہ کی مصلحت متفق ہو سکتی تھی کہ وہ کوئی فوج حسینؑ کے حوالہ کرتا۔ اور نہ حسینؑ پر فراووشی اس قدر غالب آسکتی تھی کہ وہ شاہی لشکر اور خصوصاً اس کے افسروں کے ساتھ ساتھ جاتے۔ موزنین خصوصاً ابن خلدون نے ابن عباسؓ، ابن زبیرؓ، ابوالعباس انصاریؓ اور ابن عامرؓ کا نام لیا ہے۔ لیکن کہیں حسینؑ کا نام نہیں ہے۔ کم قیاس ہے کہ موزنین ان لوگوں اور اکثر افسرانِ فوج کا نام لیتے اور حسینؑ کے نام کو فراووش کر سکتے اگر وہ شریک ہوتے۔

اس وقت تک کے مذکورہ واقعات اور حسینؑ اب تک ہم جن واقعات پر نظر کر رہے تھے وہ اس درجہ مختصراً خاصیت اور

دھوکے تھے جن میں سے اگر ہر ایک پر خصوصیت سے توجہ دلائی جاتی تو یقیناً سلسلہ بیان سبب لطیف ہو جاتا اور اکثر ملاحظہ مدد نہ کرتا کہ بڑے بڑے معانی اور بعض غیر صریح اشاروں سے کہیں تک متعلق اثر ڈالنا ہماری غرض کے اندر ہے۔ واقعات میں کچھ ایسے تھے جو حسینؑ کے علم و تجربہ میں قبول کیا گئے اور کچھ ایسے جو ناقابلِ قبول اور ان سے دور رہنے کا اہتمام کیا جاتا۔ طبیعتیں تھیں جن میں سے بعض ایسی تھیں جن میں اصولِ خیر کا بہترین پرتو تھا اور ایسے نفس بھی تھے جن کا سایہ کانپ جانے کے لیے کافی ہوتا۔ اصول تھے مختلف مفہوم کے جو اپنے محور پر دورہ کر رہے تھے۔ اس میں ایک نتیجہ کے لیے ٹھوکر رہا تھا اور ہر ایک کا کھار اپنے حلیہ پر صورتیں تیار کر رہا تھا۔ ان کے ضمنی اثر تھے اور وہ واقعات کی صورت اور جماعت انسانی کے اظہارِ حال کی زبان میں ظاہر ہو رہے تھے۔ کئی اخلاقی قوت تھی جس نے معاشرت اور سیاست کو اپنے زیرِ سایہ رکھا تھا اور کئی سیاست تھی جو اپنی قوت کا جھنڈ بڑھ رہی تھی اور اپنے لیے تمام اصول کو اپنا ہار کش بنا لیا تھا۔ حکومِ اصول تیر دھار کے نیچے رقصِ بکری میں جلتے اور زبان نہ تھی۔ دل تھے لیکن قوت نہ تھی۔ آنکھیں تھیں لیکن تیزیِ مدخل ہو گئی تھی۔ قمرانی تھیں اور برابر نہ دیکھ سکتی تھیں۔

یہ تمام حاشیوں نے اگر وضاحت سے نہیں تو مختصر اشاروں سے اس لیے دکھائی تھیں کہ اس کے نزدیک حسینؑ کے واقعات اور سوانح سے انہیں کسی طرح کا تعلق تھا۔ ان میں اب تک زیادہ تر اسی نوعیت کی تھیں۔ حسین صریح یا غیر صریح

مکس ڈالنا تھا اور کم باتیں ایسی تھیں جو خود حسینؑ کی ذات سے ظاہر ہوتی تھیں۔ کم ظاہر ہونا اس وجہ سے تھا کہ سید
نیک حسینؑ کا موقع خود مختار نہ تھا اور نہ واقعات کی روش ان کے ساتھ ویسی تھی جس زیادتی کے ساتھ جناب امیرؑ کے
لیے تھی۔ یہ باب جو محض اس لیے تھا کہ حسینؑ اور ان کی حیات پر مکس اور ان کی حیات پر مکس ڈالنے والے واقعات
اس طرح دکھانے جائیں جس سے حسینؑ کا نفس، ان کی تربیت اور علم و تجربہ سے ان کی ساخت بھی جاسکے ختم ہوا۔ اور یہ
اہتمام اس لیے کیا گیا کہ سید کے بعد چند روز کے واقعات کا حقیقیہ بغیر اس کا خیال کیے نہ کیا جاسکے کہ اتفاقاً نے
اپنے اور اس قدر مختلف نوعیت کے واقعات کی حسینؑ کو تعلیم دی تھی جس سے بڑھ کر شاید ہی کسی کو موقع مل سکتا ہو۔ اور
چونکہ یہ سمجھنے کی ضرورت کے موافق کہا جاسکا کہ حسینؑ کس قدر سیریل انہم اور ذکی الحس تھے۔ یہ قیاس کرنے کی گنجائش نہ
رہی کہ واقعات تو ان کی حیات میں بہت ہوئے لیکن وہ ان کے ہوش کے اندر نہ آئے بلکہ اس طرح آئے کہ ہوش کو
بوجھل کیے چارہ تھا۔ مختصر لفظوں میں یہ تھے حسینؑ جو اس دن کے لیے ان قوتوں اور علم و تجربہ کے ساتھ تیار اور کھڑے
ہوئے جس کا ذکر کیا جانے والا ہے۔

حسینؑ کے متعلق روایات کی شرح
اس باب میں جو کچھ باقی ہے وہ حسینؑ کے دم و دم و کم و نیک نفس،
عزت، علم، بخشش، تہذیب، شائستگی، خود داری اور استقلال

ظلمت کی چمک ہے۔ اس کی مثال ہے کہ وہ کسی طرح مخلوقات الہی کے لطیف احسانات کا لحاظ کرتے تھے اور انہیں
دکھانا نہیں چاہتے تھے۔ ان کی قدر دانی علم اور اعلیٰ خیالی کی داد ہے اور اس کی کوشش ہے کہ وہ کس طرح اچھی باتوں پر
اگلی رکھ کر ان میں ترقی دیا چاہتے تھے۔ دوسرے لفظوں میں یہ وہ باتیں ہیں جنہیں حسینؑ اپنی جگہ کرتے ہیں اور جسے کوئی
خارجی اثر سے نسبت نہیں ہے۔ یہ بجائے خود ضروری اشارہ ہیں جن سے حسینؑ کی طبیعت کے فطرتی پہلو معانی اور
سادگی سے سمجھ میں آجائیں۔ بغیر اس کے کہ اس پر کوئی سیاسی ملح ہو۔

لطف کاظ اور حسن تعلیم
میں نہیں کہہ سکتا کہ اس روایت کو کون سے دقیق نسبت دوں جس میں
ایک بڑے وضو کرنے والے کی غلطی بتانے کے لیے لطف کاظ کا اہتمام
کیا گیا اس سے یہ نہیں کہا کہ تم غلطی کرتے ہو بلکہ صحیح طریقہ اسے دکھانا بڑے نے ان کے حسن تعلیم کی داد دی۔
حسینؑ اور عمرو بن عاص کے فرزند میں الفاظ کا پر لطف رد و بدل
جو غرض بھی ہو جس
سے ابن عمرو بن عاص

نے حسینؑ کے لیے محبوب اور فاضل ترین زمانہ کے الفاظ استعمال کیے لیکن حسینؑ کو موقع مل گیا کہ وہ اس کے الفاظ اور خیال و
عمل کی صدمہ مطابقت پر اسے ٹوکتے ہیں سوچتا ہوں کہ اگر عبد اللہ کے الفاظ میں طوطا تو خود حسینؑ نہایت گوارا لگی سے اس
کے تیر کو اس کی طرف اس جتنی ہوتی حیرت سے دیکھ کر رہے تھے کہ بڑا قدر دان فضلی ہے کہ تو مجھ سے افضل سے لاگید
اور اگر عبد اللہ بھی بات اقراری لہجہ میں ادا کر رہا تھا تو یقیناً اسے اس بے خیالی کی سزا ملی کہ وہ پیشتر کیا کر چکا تھا اور گویا حسینؑ
اسے انابت کی طرف لا رہے تھے۔ چوتھ کھانے اور جست کرنے کے بعد عبد اللہ نے معذرت کی لیکن پھر سنبھلا اور گزشتہ
لغزش کے دُعا کئے کے لیے اسے اس دلیل میں ایک پردہ مل گیا کہ رسولؐ نے اطاعت والدین کا حکم دیا ہے۔ مگر میں نہیں

جانتا کہ اسے گھبراہٹ نے اس دلیل کو صحیح سمجھ لیا تھا بلکہ اراکہ مخالفہ کی کوشش کر رہا تھا یہ ایک جواب تھا جس میں پہلی غلطی تھی۔ لیکن عبداللہ کا مقابل کوئی ایسا نہ تھا جسے اپنے کسی ممتاز بزرگ سے محض نبی سلسلہ کا ادعا ہو اور بس۔ حسینؑ اپنے جد بزرگوار کے صفات اور خیالات کے نواسہ بلکہ فرزند تھے۔ حسینؑ نے اپنے جواب میں پہلے قرآن شریف سے ایک وسیع اصول پیش کیا جس میں اس کی مثال تھی کہ والدین کی پیروی سے انحراف ہو سکتا ہے مثلاً شرک میں۔ اور پھر اور قریب آئے کہ اطلاع سے امر معروف میں ہوتی ہے نہ کہ ایسے امر میں جو خدا کی اطاعت سے محفوظ کرے۔

یہ مکالمہ علوہ حسینؑ کی زندہ دماغی اور فکری کے کھاتا ہے کہ حسینؑ کو قرآن شریف اور اقوال رسولؐ پر کس درجہ تبحر تھا۔ تجربہ ایسا کہ ہر کالے کالے حرف اور صدا کی سبے ہوشانہ تقلید بھی جانتے بلکہ جہاں غور اور عقل کو مذہب نے طلاق نہیں دیا ہے۔ عبداللہ نے اپنی ذمہ داری دوسرے کے سر دھکیلنے میں اپنی پناہ بھی تھی۔ لیکن حسینؑ اسے چھوڑتے ہیں کہ خدا اور رسولؐ نے تجھے اپنی ذمہ داری سے معذور نہیں کر دیا تھا۔ یہ اشارے حسینؑ کے گزشتہ کو روشن کرتے ہیں کہ وہ اپنے زمانہ بوش سے گرد و پیش کے اثرات میں محض مقلد نہ تھے بلکہ موافقت یا مخالفت کرتے تھے اپنی ذمہ داری کے احساس سے اور اس مکالمہ کا دوسرا مذاق یہ ہے کہ اگر عمرو بن عاص کا نقشہ علیؑ پر غالب نہ آیا تو بیٹے کی دلیل کب حسینؑ پر کوئی اثر کر سکتی تھی۔

اس روایت میں اس زمانہ کی سادی اور بے عظمت زندگی کا نقشہ سادی زندگی اور احسان کا صلہ ہے کہ حج کرنے چلے جا رہے ہیں مسلمان سے آگے بڑھ آئے ہیں کہ

بھوک پیاس معلوم ہوئی۔ ایک جھوٹا دکھائی دیا۔ چلے گئے سہالی مالک۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ جگہ عرب کے ان مقامات میں تھی جہاں کوئی چشمہ یا کنواں قریب نہ تھا۔ دودھ دوہنے کی اجازت ملی اور ان لوگوں نے دودھ کر لیا جس بھائی اور سیرچہ شتم بڑھیا نے یہ بھی گوارا کر لیا کہ اس کی بکری اس انقلابی ضیافت میں صرف ہو جائے۔ ان لوگوں نے اپنا نام و نشان نہ بتایا نیز اس کے کہ ہم لوگ قریش سے ہیں۔ ہم سے مدینہ میں طاقت نہ رکھنا غالباً اس لیے کہ ہمیں پہچان کر بڑھیا کو ہماری ضیافت اور خاطر داری میں اپنی بے ملامت زیادہ اہتمام کرنا پڑے اور کئی اسباب اسے اندر ہٹا کر بڑھیا کو تنگی معیشت نے کچھ دنوں کے بعد بخیر کیا کہ وہ اپنی موجودہ پناہ سے نکل پڑی۔ اس کالمک میں باہم ٹکنا افلاس کی دوری کا سبب ہو گیا۔ اور حسن نے بڑھیا کو پہچان کر اس قدر مزاحم کا وہ خواب نہ دیکھ سکتی تھی۔ حسینؑ اور عبداللہ بن جعفرؑ نے سہا اکبر کی تقلید کی اور شاید اس کے بعد بقیہ عمر بڑھیا آل ہاشم کے سخی اور خدمت شناس ہاتھوں کی مدد سے فکر رزق کی مشقت سے بے پروا ہو گئی۔ ہر شخص جانتا ہے کہ اگلے زمانہ میں آقاؐ کو اپنے غلام اور کنیز پر کس درجہ خدمت حاصلی تھی اور نہ وہ برتنوں کا معلوم ہیں جو

معانی اور وقت کی طبعی کیفیت

روم، یمن، ایران، مصر، ہمالی وغیرہ میں ان بخیر روزی رعوں کے ساتھ ہوتا تھا۔ اسلام نے ان کی حالت کا مطالعہ کیا اور ان کے ساتھ جس رحم و انسانیہ کے برتنوں کو اصول قرار دیا اس سے انکار کرنا اس کو بھول جانا ہوگا کہ اس وقت کے غلام اپنی فطری کو آزادی پر ترجیح دیتے تھے۔ میرے خیال میں ابھی دنیا نے حقیقی تہذیب اور شائستگی میں اتنی ترقی نہیں کی ہے کہ وہ اس پر اعتراض کر سکے کہ اسلام نے غلام کو قلمنا مشغول کیوں مسترد نہیں دیا۔ تہذیب اور شائستگی کی حقیقی ترقی اسلام کی

ایک صورت ہوگی اور اس وقت اسلئے اور متعینہ روشنی کے الزام خود ساقط ہو جائیں گے۔ کون سے حقوق تھے جو اہلین نہ دیے گئے تھے اور کون سا انعام اور احسان تھا جو ان سے انکار کیا جاتا تھا۔ اسلام کے ذمہ دار ہادیوں کی نہ صرف مثالیں ہیں بلکہ اس کی بھی کہ طبعاً اس نے بھی اس سے سبق حاصل کیا۔ یہ بات دوسری سبب کہ اسلام پر اعتراض کرتے وقت اس کے برتاؤ فراموش کر کے اپنے برتاؤ جو ظالموں کے ساتھ تھے پیش نظر رکھ کر اسلام پر اعتراض کیا جائے۔ ہمارے زمانہ کے متفکرمین اسلام نے اس پر بحث کی ہے اور میں اسی وقت اس سے زیادہ کہنا نہیں چاہتا بلکہ ذمہ دار ہادی کے علم اور آزاد کرنے کا پہلا دھوڑنے کی مثال دیتا ہوں کہ ایسے موقع پر جب کہ اپنی اور اپنے کپڑوں کی مثال سے خود ہی مرعوب ہو جانے والے نہیں معلوم۔ غیظ و غضب کا کیا اہتمام کرتے تھے جو حسینؑ کیا کرتے ہیں۔ کھانا کھا رہے ہیں یا کھانے کا تہیہ ہے کیز لائی ہے کہ کسی وجہ سے کلمہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ پڑا۔ حسینؑ کی نگاہ اس پر اٹھ گئی۔ اور کینو کے الفاظ کہتے ہیں کہ وہ تمام بدوح و جسم سے تھوڑی لیکن اس نے ریگ اور حسینؑ کے دل پسند الفاظ میں (آج قرآنی) اعلان کا استغفار کیا اور اسی مناسبت پر سے نکلا تھا کہ: ”وہ لوگ جو غصہ فرو کرتے ہیں“ کہ غالباً حسینؑ نے اس کی خوف زدہ حالت دیکھ کر اس کا اظہار کیا کہ وہ غزوہ تمام کرتی اور جلدی سے کہہ دیا کہ: ”میں نے اپنا غصہ فرو کیا“۔ اب اس کی جان میں جان آئی اور اس نے بعد کا غزوہ کہا کہ: ”اور جو لوگوں کو مصائب کرتے ہیں“۔ فرمایا: ”میں نے تجھے مصائب کیا“۔ محافی کی خوشخبری سن کر اس نے تیسرا کڑا بھی ادا کر دیا کہ: ”خدا احسان کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے“۔ اور اب حسینؑ نے اسی بے جنبش حالت بلکہ بڑھتے ہوئے دم و کرم سے فرمایا کہ: ”میں نے تجھے خداوند تعالیٰ کی راہ میں آزاد کیا“۔ بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ چار سو درہم بھی عطا کیے۔

مارکس ڈاؤڈا کثرت آف ڈیویٹی فی ثلث صفت ”محمد بدھ ایڈ کرانٹ“ زیر نظر روایت کے ذکر کے قبل کہتے ہیں: ”مذہب کا اثر سمجھنے کے لیے مغربی مزاج کا بھی ضرور لحاظ کرنا ہوگا ہم خوشخوار خالد کو اسلامی اثر کا نمونہ اسی طرح کم قبول کریں گے جس طرح شریعت انفس حسینؑ کو“۔ اس کتاب کے قابل صفت کی روش اسلام اور شارع کے سمجھنے کے لیے ویسی ہی دور افتادہ اور دور آنگن ہے جیسے کسی رقیب مذہب کے رومانی سے امید کجا سکتی ہے اور جو خصوصاً بالعموم مسیحی متفکرمین نے اختیار کی ہے۔ مسیحیت کے طریقہ اشاعت کی تاریخ جیسے والوں کے لیے یہ روش عجب غیر نہیں ہے۔ قابل صفت ان کے سامنے لیکچر دے رہا ہے جن میں جیسا خود اس نے حوالہ دیا ہے کہ ”خود تعلیم یافتہ“ اسلام کے متعلق ”اس سے زیادہ نہیں جانتے کہ ترک تعدد ازدواج کے مرتکب ہوتے ہیں“۔ یا بہت سے اس علم پر فاض ہیں کہ اس کی (اسلام کی) ماہرہ احمد سے ہوتی یہ اپنے عقلمند کو تعدد ازدواج پر برا سمجھتے کرتا اور قدریہ بنا دیتا ہے اور مہلمان شراب سے نفرت کرتے ہیں“۔ مسیحیت کا لیکچر دیتے وقت ڈاکٹر آف ڈیویٹی ٹی سے امید کرنا کہ اسلامی خوبی کے ذکر کے وقت وہ ایسا ڈھیلا ہوگا کہ ایسی جامع کو یہ سمجھنے دے کہ اسلام نے ایسی خصائل سازی کی دور از حال تھا۔ بلکہ وہ قابل تعریف صفت سے توڑ مروڑ کر دو مختلف حالتیں ایک ہی سانس میں پیش کرتا ہے۔ جن میں ایک نیک فہم ہے تو دوسری ”خوشخواری“ کے لحاظ سے ویسی ہی درجہ کی کریہ ہے۔ یہ ویسی ہی متناقض مثالیں ہیں جیسے ایک کلمہ سے کل اور دوسرے سے سانس بھریں کے لڑوانے کا اعلان ہو۔ حالانکہ اسلام خوشخواری کو منع اور حق کی تعلیم دیتا ہے۔ لیکن قابل لیکچر

انفرادی مزاج کے حوالہ کر کے دونوں کو اسلام مجاز دیتا ہے۔ نہ صاف صاف یہ سمجھنے دیتا ہے کہ انفرادی مزاج کی تربیت کے لیے مذہب کی ضرورت اس کے نزدیک ہے یا نہیں۔ یا وہ مذہب کو اس کے خالص اصول سے کجا چاہتا ہے اسے حقیقت کراہیت کے ذکر سے بچت نہ ہوئی، مگر نیک نفسی کو اسلامی اثر سے دور رکھنے کا اہتمام مد نظر نہ ہوتا وہ بہانی کے ساتھ بھٹائی کو بھی معیار سے خارج کر کے اپنی مضافانہ روش کا اقرار لیا چاہتا ہے۔

مجھے کوئی شبہ نہیں کہ وہ اس موقع پر دو کئی علما نہ اور عقلی روش پسند کرتا ہے چہاں وہ ”انفرادی مزاج“ کو مذہب کے اثر کے سمجھنے میں کمال خود بخاری عطا کرتا ہے۔ نہ میں غلامی کا محک ہوں لیکن یہ سوال لطف سے خالی نہ ہوگا کہ اگر ابن مریم کا رحم و کرم اور محبت جس کی روایتیں ہم تک ان کی مذہبی چٹنی ہیں جن میں سے اکثر نے انہیں دیکھا نہ تھا نہ کوئی سلسلہ روایات تھا اور سب پر طرہ یہ ہے کہ واقعات کے لیے الہام کی مدد لینے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر ان کے اصول سے خارج کر کے انفرادی مزاج کے حوالہ کر دیا جائے تو یحییت کہاں رہتی ہے۔ نہ یحییت کے لیے میرے نزدیک یہ انصاف ہوگا اگر یہ پسند حتی مثال میں پیش کی جائے کہ اس نے جوڑا استعراض بنائے، یا جیسا خود مصنف نے کہا ہے کہ: ”بدنام اور عیاش مزاج قطبی راہبوں سے یحییت کا اندازہ کرنا ہے انصاف ہوگی“ نہ مجھے کوئی غم ہوگا اگر یحییت مذہب کو انفرادی خصائل کی دیتی کے لیے نمونہ اور آلہ نہ قرار دے۔ انفرادی خصائل کی آزادی سوخت نہیں ہوتی اگر وہ مذہب کے کسی اصول کو پسند کرتا ہے اور نہ مذہب انفرادی مزاج کی قابلِ تعریف غنی کے اعتراض سے باز رہتا ہے اگرچہ وہ خوبی یا ظاہر کسی مذہب کے اثر سے پیدا نہ ہوئی ہو۔ اور یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ یہ مزاج کس سایہ سے متاثر ہوا۔ اور اگر انفرادی مزاج قابلِ تعریف ہے اور مذہب کے اصول کو پسند کرتا ہے تو گویا ایک دوسرے کے مداح ہیں۔ جامعیت انسانی میں باقاعدہ مذہب بھی لپچے لور بڑے خصائل کے لوگ پائے جاسکتے ہیں۔ اگرچہ اس حالت میں پابندی اخلاق اس کے لیے محض پسند کرنے یا نہ کرنے کی چیز ہوگی اور اس کا حکم مذہب کی پابندی نہ صرف انفرادی مزاج درست کر سکتی ہے جس سے وہ پابند اخلاق ہو بلکہ اس کے علاوہ پابندی اخلاق کو پیروی مذہب سے اور زیادہ روحانی سند عطا کرتی ہے۔ یہ عام حالت ان سے مقابلہ نہیں کی جاسکتی جو ذمہ دار ان مذہب ہوں۔ اور جن کی ہر روش میں یہ قوت ہو کہ قوم اسے اپنے لیے نمونہ قرار دے۔ حسین اسلام کے اس سلسلہ میں تھے جو اسلام کے ذمہ دار رہنا تھے اور ان کا ہر فعل اسلامی روشی سے دیکھا جاتا تھا اس لیے انہیں بھی اپنے صفات میں اسلامی اثر سے علیحدہ کر کے محض انفرادی مزاج کے حوالہ کر دینا ان کے واقعات سے منفرد و اعلیٰ ہوگی۔ اس کے علاوہ حسین کے انفرادی مزاج کا اس وقت سے جب سے کہ وہ رم مار میں تھے اور اس وقت تک جب کہ ان سے رم و عنو کی یہ مثال ظاہر ہوئی اسلام اور شارع کے زیر اثر نہ ہوا تھا۔ خالد اپنی حیات کے زیادہ حصہ تک اس اثر میں نہ تھے اور اگرچہ وہ مسلمان ہوئے مگر انہوں نے اس اختیار سے تعلیم اسلامی کی پیروی نہ کی جس سے ان کا انفرادی مزاج اسلامی تعلیم کا نمونہ کہا جاسکتا، بلکہ وہ اپنی پہلی روش پر قائم رہا۔ بلکہ واقعہ بنی قریظہ میں رسول نے یہ کہہ کر ”خالد نے جو کچھ کیا میں اس سے راضی نہ تھا“ اس جگہ اعلیٰ رکھ دی جہاں کوئی انفرادی مزاج پیروی اسلام سے علیحدہ رہا۔

اس سب کا نتیجہ یہ ہے کہ انفرادی مزاج جو کچھ کرتا ہے مذہب ان تمام حرکات کے متعلق کچھ حکم دیتا ہے اگر وہ انفرادی مزاج حلقہ مذہب میں بھی داخل ہے تو اس کے افعال اس مذہب کے معیار حکم سے دیکھے جائیں گے یا مذہب

اپنے اصول سے دیکھا جائے گا اور علی سے کہا جائے گا۔ اور چونکہ حسینؑ سے جو غم و رم ظاہر ہوا وہ تعلیم اسلامی کے اندر ہے اور چونکہ غم حسینؑ ان لوگوں میں کے ایک تھے جو تعلیم اسلامی کے نمونے تھے اور چونکہ وہ خود ہمیشہ اسلامی اثر میں رہے اس لیے انہیں اسلامی اثر کے بچنے میں نہ قبول کرنا کسی مذہب کی خوبیوں سے مار فائدہ قابل ہوگا، اور یہ موقع تو وہ تھا جہاں حسینؑ آیہ شہدائی سے متاثر ہوتے تھے۔ ایک انفرادی مزاج مذہب کی ایک اعلیٰ پیش کش کو قبول کر رہا تھا۔

نہیں معلوم کیا وجہ ہوتی جس سے یہ روایت تیار ہوئی کہ حسینؑ اور محمد ابن حنفیہؑ میں کشیدگی ہو گئی ہوئی جاتا ہے۔ خصوصاً اعراض اور چھیڑ چھاڑ کا تذکرہ تار

رہ لطف کشیدگی اور صلح

اس وقت تک بڑھتا جاتا ہے جب تک درگزر اور صاف دلی سے اس کے دور کر دینے کا ارادہ اور پیش قدمی نہ کی جائے۔ زیر ذکر حالت کچھ ایسی معلوم نہیں ہوئی جس میں کشیدگی زیادہ ہوتی جاتی اور موافقت کا کوئی راستہ نہ ہوتا۔ اس روایت میں لطف یہ ہے کہ تحریک صلح محمد ابن حنفیہ کرتے ہیں اور تحریک موافقت حسینؑ سے چاہتے ہیں۔ اس میں فصاحت تھا اور دونوں حضرات کی بات برابر ہونے سے کسی کی آن کو ٹھیس پہنچنے کا بھی موقع نہ تھا۔ لیکن چونکہ منانے کی ذمہ داری حسینؑ کے حوالہ کی گئی تھی اس کے لیے ایک نہایت خوبصورت وجہ بھی لگی تھی کہ ”تم اہل باطن ہو“۔ اور یہ اس وجہ سے کہ اگرچہ پدری سلسلہ سے ہم تم برابر ہیں لیکن مادری سلسلہ سے تم اشرف ہو۔ آپس کا یہ شیریں لحاظ حسینؑ کے لیے بڑی اہمیت سے چاہتا تھا کہ وہ اس فردانہ ناز و محکم کی قدر کریں۔ کشیدگی جاتی رہی۔ مبارک۔

ایک کنیز اپنے مالک کو تحفہ دیتی ہے۔ یہ حالت میرے نزدیک بے حد قابلِ رحم اور غم آلود ہے۔ ایک دست نگر اسے کچھ پیش کش کر رہا ہے

کنیز کا تحفہ اور طبائع کا عمل

جو اس کا سہارا ہے۔ غالباً ہی یا اس کی کوئی دوسری صورت تحفہ میں دیتا ہے جو اسے مل بھی تھی۔ اپنے لاد اپنے تحفہ کے خیر موقع کو دیکھتا ہے لیکن پھر چاہتا ہے کہ پیش کرے۔ اس موقع میں مساوات کی ایک جھجک ہوتی صورت ہے۔ اب امید ہے کہ یہ ہے۔ چہرے کے کسے ہونے پریشانی غم ہے دل ہے جو ٹوٹ جانے والا لڑائی ہو چکی ہے۔ یہاں نہیں معلوم مالک ہمارا دل دیکھے یا نہ دیکھے۔ ظاہر کہ حسی لحاظ سے مالک کی ہر اداس کے لیے یہ ایک نازک سا اور محتاط موقع ہے۔ حسینؑ فقر فز کے فرزند تھے۔ جس نے اپنے خاندان سمیت بالارادہ اس حالت کا مطالعہ اور اندازہ کیا تھا۔ حسینؑ اس کے فرزند تھے جس کے احکام طبائع انسانی کے کامل ملاحظہ اور گہرے مطالعہ پر مبنی تھے۔ حسینؑ کی سرخ آہنی احساس شناسی اور رم کے بچنے کے لیے اس کے بعد کسی مثال کی ضرورت نہیں ہے کہ ہاتھ گدستہ کی طرف بڑھ رہا تھا اور غیباں مبارک آزادی کا حکم سن رہی تھی۔ کنیز کی خوشی تو جانے دو۔ موقع ایسا تھا کہ دیکھنے والا چونک پڑا اور کہہ اٹھا کہ تحفہ اور جواب میں کوئی نسبت نہیں ہے۔ ایک بے حقیقت تھے ایسے انعام کی مستوجب نہیں ہے۔ یہاں حسینؑ اور ان کا غیر سامنے ہے۔ دونوں نے ایک حالت کو ایک وقت دیکھا تھا۔ ایک محض ریحان کا ڈھنسل اور چند پتیاں دیکھتا ہے۔ حسینؑ اس کے پیچھے ایک گچلا ہوا دل دیکھتے ہیں۔ جس کا مرجھانا اور ہرا ہونا حسینؑ کے انداز اور جواب پر موقوف تھا۔ خوش کرنے کے لیے کافی تھا کہ قبول کر لیتے۔ اور بس متعرض خوش ہو جاتا، اور شاید ایک آدم مرتبہ خود بھی گدستہ پرانی ناک رگڑ لیتا، اور اظہارِ اطمینان و خوش وقتی کے لیے بشتا جیسا وہ بن سکتا، اور غالباً اور اُدھر دیکھتا کہ کوئی قدر دان ہے یا نہیں۔ حسینؑ کا علوی نفس

یہ تھا کہ جیسا انھوں نے مشہر آن حید کی آیت میں ظہر فرمایا۔ حکم عام تھا یہاں اگر رد کرتے تو دل صحتگی ہوتی۔ رد نہ کرتے تو قتل ارشاد مشہر آن کی حسین کے نزدیک اس سے بہتر صورت نہ تھی جو کہ مثال میں آئی وہ پیش کیا جس میں عہدیت یا غیر عہدیت کی کوئی قید نہیں ہے۔

بخشش اور عذر ہو سکتا ہے کہ سائل اپنے لیے مہربان کرنے کو تعریفیں کر رہا ہو۔ لیکن اس کا کہنا کہ جس نے تم سے امید رکھی وہ عہد نہیں ہوا۔ یا تم پر اعتماد کیا جاتا ہے یا تمہارے پدر بزرگوار نے فاسقوں کو قتل اور اجرائے احکام میں جوش و سرگرمی ظاہر کی۔ یہ سب گزری ہوئی باتوں کو یاد کرنا تھا۔ جس نے خلق کو ان بد اعمالیوں سے محفوظ رکھنے کی کوشش کی جس کا نتیجہ مغفرت کی دشواریاں ہیں۔ ابھی ایک طرح کی عہدیت (نماز) ختم کی تھی کہ حاجت براری کی دوسری عہدیت میں مشغول ہو گئے۔ اظہار انگساری کے ساتھ معافی کی خواہش بھی ضم کردی اور چونکہ سائل کی پس بینی خیال دلا سکتی تھی کہ اسے حسین کی دنیاوی حالت کے کہنے میں واقعہ سے زیادہ مبالغہ ہو سکتا ہے اس لیے یہ بھی فرمایا کہ میری شفقت میں کمی نہیں ہے لیکن تغیرات زمانہ کی وجہ سے مال کی کمی ہے۔ میں اور زیادہ بخشش کرتا اگر مجھے قدرت ہوتی۔

سوال اور عطا کا نفس سوال اور عطا کی حالتوں کو چہرہ کر حسین نے دکھا دیا جس وقت سوال کی حالت کو آبرو والہ کرنا یا دوسرے تقصیروں میں آبرو کا اکرانہ نہ کرنا فرمایا ہے۔ اور یہ فرما کر کہ سائل کو ”مسرورم واپس کر کے اپنی آبرو زائل نہ کرو“۔ ایک نہایت لطیف جزوہ کا نقشہ کھینچا ہے۔ عہد واپس کرنا دوسرے کی اس حالت کے ساتھ ہمدردی نہیں ہے جس میں وہ اس پر بخیر ہوا کہ وہ سوال سے اپنے کو تمہارے سامنے بے عزت کرتا۔ اسے تم سے امید تھی تمہارا انکار اس اعتماد کا بطلان ہے جو کسی کو تم سے تھا۔ در آخر خلیفہ ہمدردی کرنا اپنے ”چہرہ کی تکریم“ بھی ہوتی۔ لطیف خیال ہے جو لطیف تقصیروں میں ادا کیا گیا ہے۔ جس کی پشت پر ہدایت ہے۔

دوسروں کے لحاظ کو اپنی تکلیف سے راحت دی آپ نے نہ صرف بہت سے جگہ کیے بلکہ پیدل تشریف لے گئے۔

حاجیوں کا قافلہ مل گیا۔ اس میں پھلنے والے لوگ بھی تھے جس میں سب سے مشہور سعد بن ابی وقاص تھے۔ (یہ واقعہ مشہر کے قبل کا ہے اس لیے کہ سعد نے اسی سنہ میں انتقال کیا) یہ تعظیماً اپنی سواری سے اتر پڑے اس لیے کہ معلم حج کا فرزند سواری پر نہ تھا لیکن ہے کہ جاتے والوں کو دیکھ کر نہ پھلنے والے بھی پھلان گئے ہوں اور تھوڑی دیر میں قافلہ کا قافلہ اپنی سواریوں سے اتر گیا ہو لیکن ہے کہ قافلہ کے ساتھ مریض اور ضعیف ہوں یا لوگ ہوں جنہیں اگرچہ کسی قسم کا منفع لا حق نہ ہو مگر ثروت اور آرام طلبی کا مرض لاحق ہو گیا ہو اور اب ان سے دھوپ میں تھوڑی دیر پیدل نہ چلا جاتا ہو۔ سعد ضعیف آدمی تھے۔ جناب امیر سے بھی ایک آدمہ برس عمر میں زیادہ تھے۔ انھوں نے نواسہ رشول سے سوار ہو جانے کی گزارش کی۔ یہ درخواست حسین کو کھادینے کے لیے کافی تھی کہ یہ یا اور چند لوگ پیادہ چلنے سے متاثر ہو رہے ہیں۔ حسین کو کب گوارا تھا کہ کسی کو ان کی وجہ سے کوئی تکلیف ہوتی لیکن چونکہ حسین پیدل تشریف لے جا رہے تھے اور اس حالت میں لوگوں کو سوار ہونے میں تکلف ہوتا آپ نے وہ راہ ترک کردی اور دوسرے راستہ سے تشریف لے گئے۔

حسینؑ کے اثر کا اثر ایسا ہی موقع ایک مرتبہ آیا کہ سواری آگے آگے جا رہی تھی اور خود پہلے صغیرؑ لے جاتے تھے کہ کسی نے کہا کہ آپؑ خدا کا بہت خوف کرتے ہیں اور آپؑ کا جواب جاتا ہے کہ سزا دہرا کا کس درجہ اثر تھا۔ ایسے خاصان خدا کا مالک پیم الدین کی درگاہ میں عجز و انکسار مذہب کے غلوں اور قوت و اثر کی نعت کہلاتا ہے۔

قدرت کے وقت اپنے اوپر اختیار اور درگزر مجھے ایسی نصیحتیں سن لینے میں کوئی حذر نہیں ہے کہ اگر کوئی تمہارے ایک نکل پر قہر مارے تو دوسرا بھی سامنے کر دو۔ نہ مجھے دینی گوتم کی کسی ایسی تعلیم سے چمکتا ہے کہ تمام جذبات کو فنا کر دو۔ کیونکہ بہت سی بری مثالوں میں چند خوشا اگرچہ ناقابل عمل نصیحتوں کا ہونا فتح اور ضرر کی درمیانی حالت میں ہے۔ کم سے کم انھیں جذبات کے ظلم دینے کے لیے کام میں لانا مفید ہو سکتا ہے۔ میرے لیے یقین کے اسباب نہیں ہیں کہ اپنی مرض اپنے کو اپنی نصیحت کا مثالیہ ثابت کر سکے اور نہ مثالیں ہیں کہ دینی گوتم کے لیے ایسا موقع آیا اور ان میں جذبات کی کوئی حرکت محسوس نہ ہوئی۔ دوسروں کو قربانی اور قتل سے منع کرنا اور خود گوشت کھانا کچھ عطا بہت حوصلہ افزا نہیں ہے۔ یہ خبر تو ہے کہ تمول پور ناگوتم بدھ کے سامنے اقرار کرتا ہے کہ وہ سروں پر اتھ کے دشمنوں کے ظلم اور سختی کو محبت اور درگزر سے دیکھ لے لیکن اس سکھ بدھ محبت اور درگزر کے واقعات نہیں ہیں جن سے خیال اور عمل کی تطبیق بھی جاسکے۔ اس کے علاوہ محبت اور درگزر کا بیج اندازہ اس وقت کیا جاسکے گا جب یہ سمجھا جاسکے کہ اس کے خلاف بھی کچھ کرنے کی قوت تھی ورنہ گرفتار بندوں کے ظلم کی تعزیت سے بہتر نہ ہوگی۔ قبول حضرت امام حسینؑ: ”سب سے بڑھ کر معاف کرنے والا وہ ہے جو اپنے قابو کے وقت معاف کرے“۔ یہ باتیں علاوہ اس لحاظ کے ہوں گی کہ کیوں جذبات بیشہ بری ہی فکر سے دیکھے جائیں، بلکہ عظیمہ جذبات کا غمنا اور مناسب صرف ہماری عملی تہ کہ خیالی دنیا کے لیے زیادہ تر قابل قبول ہے۔ میرے نزدیک گفتگوئی کا خیال بہ نسبت میٹھ اور بدھ کے زیادہ تر اس دنیا کا خیال ہے اور اسلام کے تصفیہ اور طرز عمل سے قریب مناسبت ہے۔ ان چھ تمہیدی سطروں سے ہماری غرض اس روایت کی شرح ہے کہ ایسی حالت میں جب کہ حسینؑ اس کے لیے مطلق تیار نہ تھے کہ کوئی ان کی شان میں پُر اصرار اور دل آزار گستاخی کیا جاہتا ہے، دفعہ ایک شخص سامنے آتا ہے اور انھیں پھیلاتے کے بعد انھیں اور ان کے پدر بزرگوار کو برا بھلا کہنا شروع کرتا ہے۔ حسینؑ سنتے رہے۔ اندازہ آواز اور الفاظ میں کوئی تغیر دکھائی نہ دیا۔ یہاں تک کہ بدگو کا منہ ٹھکا اور چپ ہوا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس تمام دوران میں حسینؑ کی نگاہیں اس پر تھیں۔ ”مسکرا رہے تھے“۔ نظر اور تنہم کے نیچے وہ چمک تھی جو حیثیت مال کے بھگنے کے لیے متحرک ہوتی ہے اور اپنے سایہ سے چیزوں کو روشن کر دیتی ہے۔ مجھے یہ بھی یقین ہے کہ بھرا ہوا بدگو اپنے جوش میں اس وقت تک بکتا رہا جب تک اس نے غور سے حسینؑ کا چہرہ اقدس نہ دیکھا اور اس کے بعد اسے اپنے الفاظ کی کراہت سے زیادہ حسینؑ کے انداز لے شرمندہ کر کے چپ کر دیا۔ کب اسے امید ہوگی کہ کوئی برے الفاظ اس اچھے انداز سے سنے گا، اور خیال بھی نہ ہوگا کہ اگر اس کے بعد جواب دے گا تو اس سے رحم، درگزر اور محبت کے قطرے ٹپکتے ہوں گے۔ بلکہ احسان اور انعام کا امیدوار کرتا ہوگا۔ اسے ”عزیز“ کے لفظ سے مخاطب فرماتے ہیں۔ دماغ کے علاج کر دینے کا امیدوار کرتے ہیں۔ یا

نقد روپیہ دیتے ہیں۔ اگر مزاج کا عدم اعتدال لبی لبی کے مسئلے سے پیدا ہو گیا ہو۔ حسینؑ کے جواب میں مزاج ہے اور یہ ان کے مزاج کی اس وقت کی بیچ صورت دکھا دیتا ہے۔ بدگوئی گستاخی رکھ کو برا فروختہ کرتی ہے۔ سزا دینے پر آمادہ ہوتے ہیں لیکن حسینؑ اپنا علم یا دلاتے اور تسکین دیتے ہیں کہ: ”کوئی چیز میں جنش نہیں دے سکتی۔“ اللہ اکبر!۔

(ازام کرشن پرم، ہنس نے اپنے امریکا کے سلسلہ لیکچر میں اس حالت کا ذکر کیا ہے جس کی سلسلہ اسطرلاب میرے ملاحظہ کے لیے ثقیل تھی۔ قابل لیکچر نے بھی وہ طرف نہیں دکھایا جس میں یہ حالت پائی گئی ہو)

ایسے زمانہ میں جب کہ آل عبا کی توہین کے علاوہ حکومت اور اس کے روشناسوں کو دین و دنیا میں کوئی دوسرا کام ہی نہ رہ گیا تھا کچھ عجب نہیں ہے۔ اگر ایسے موقع آجایا کرتے ہوں کہ کوئی اسلام فراموش ان کے غصہ پر اٹھیں کچھ کہہ کر اپنی جرات آزمائی چاہتا ہو۔ یہ دوسری مثال بھی متذکرہ صدر ریمارک کے تابع ہے کہ سب دشمن کے دوسرے موقع پر حسینؑ کے چہرہ مبارک پر کوئی شکن نہیں دکھائی دیتی۔ اور آپ ان کو جو سزا دینا چاہتے تھے ان الفاظ سے منع فرماتے ہیں کہ: ”فرشتے اس گھر میں نہیں جاتے جہاں کتا ہوتا ہے۔“ اس سے اور کیا کچھ میں آتا ہے بجز اس کے کہ غصہ وہ ذریعہ ہے جو اعتدال طبیعت کو جو بجانے خود رحمت خدا ہے اور جو حالت مزید رحمتوں کی مستوجب ہو سکتی ہے، دور کر کے غیر مفید رجعت کا باعث ہوتا ہے۔ اور اتنی دیر تک خدا کی مزید رحمتوں سے محروم رکھتا ہے۔

خواہش عقد کے معنی پیشتر اس کے اشارے کیے جا چکے ہیں کہ کس طرح عبد اللہ بن عباس اور عبد اللہ بن جعفر کو اپنا کر کے بنی ہاشم کی معاشرتی سیاست یا سیاست منزل میں رخنہ اندازی کی کوشش کی جا چکی تھی۔ اس مرتبہ اس اہام سے کہ ام کلثوم بنت عبد اللہ کی خواہش کی جانے کسی قدر زیادہ جرات سے ایک صلح پسندانہ صورت اختیار کی گئی تھی۔ معنوں سفارت ختمی گنگو، لہجہ اور انداز سب پر شیرینی کی دہیز نہ جانے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ مردان و خیل تھا۔ عبد اللہ بن جعفر نے پوری وفاداری کا ثبوت دیا اور اس معاملہ کو حسینؑ پر محمول کر دیا۔ مردان نے کل باتیں سوچ سوچ کر اگل دیں۔ عقد ہو جانے کو بہتر کہا۔ معاویہ کو ادا دے مہر کا (جس قدر ہو) ذمہ دار قرار دیا۔ خاندانوں کی موجودہ صلح اور آئندہ امیدیں کا تقین دلایا۔ عبد اللہ کے قرض ادا کرنے کی امید دلائی اور کسی قدر تنبیہ کی مثال سے کہا کہ: ”اے حسینؑ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ بد نسبت زید کے آپ کو اچھا بگھنے والے کم ہیں اور بد نسبت آپ کے زید کو اچھا بگھنے والے زیادہ ہیں۔“ کہہ چکا طرید رسول اور اس کے انتظار جواب کی صورت مجھ سے پوشیدہ نہیں ہے۔ نواسہ رسول ستا رہا۔ حسینؑ کس طرح سنتے رہے اور اس وقت ان کی طبیعت کی صورت کیا تھی۔ یہ میرے نزدیک ان کے ابتدائی فقرہ کی جھوٹ سے صاف ظاہر ہے۔ جہاں وہ جناب شروع فرماتے ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ جواب کے لیے بے چین ہیں کہ وہ جلد گنگو ختم کرے۔ ابتدا تھی کہ: ”شکر ہے اس خدا کا جس نے میں اپنے لیے اختیار کیا ہے اور اپنی مخلوقات میں میں بزرگی دی۔“ زید بادشاہ تھا۔ وہ یہ بگھتا تھا کہ اگر ہم بنی ہاشم سے شادی بیاہ کے مراسم قائم کرنے کی خواہش کریں گے تو وہ خوش ہوں گے اور اپنی بڑائی بگھیں گے۔ حسینؑ کے جواب کی ابتدا ظاہر کرتی ہے کہ وہ جس کے خاندان کو خدا نے اپنا وکیل قرار دیا ہو جو مخلوقات پر فضیلت کی ایک دلیل ہو وہ کسی صاحب اختیار کے اظہار و تسلط کی کو اپنے لیے کوئی منزلت نہیں کچھ سکتا۔ اسی مفکورہ سلسلہ میں اپنی دوسری ذاتی اور خاندانی وجاہت کا نام

لیتے ہیں کہ: ”خدا نے ہمیں اپنے دین کے لیے پہنچ فرمایا۔“ وہی بات جس کے مٹانے کے لیے حکومت کے تمام سامان صرف ہوئے تھے۔ ایک آگ جس کے بجھانے کے لیے بھی اس کے آثار پر ہر کاٹ کر لائی جاتی تھی اور کبھی ٹھنڈا فواد استعمال کیا جاتا تھا اور کبھی شکت مزارجی سے تدبیریں سوئی جاتی تھیں۔ اور یہ فقرہ تھا جس کا عالمہ مسلمان تو انکار کر ہی نہیں سکتے تھے لیکن معاذیہ بھی مع اپنی حکومت کے ان کے زیر سایہ آجاتا تھا اور اگر احسان شناسی سے نہیں تو کم سے کم مسلمانوں میں نامقبولیت کے خوف سے انکار نہ کر سکتا اسی طرح یہ فقرہ تھا جس میں حسینؑ اظہارِ فکر فرما رہے تھے کہ خدا نے ان کو اور ان کے آبائے کرام کو خلق میں جن لیا۔ ظاہر ہے کہ یہ فقرے اظہارِ فکر میں کہتے تھے۔ سچے اور عین واقعہ کی زبان تھے۔ لیکن دوسرے پر تو سے حسینؑ ایسی شان پر کھڑے ہو کر بول رہے تھے جو بڑی سے بڑی بادشاہی کو نصیب نہیں جوتی اور بادشاہوں نے اسی میں اپنی لشکریں پائی کہ وہ اپنے کو مذہب کا بھی رکن اعلیٰ قرار دیں۔ حسینؑ کا لہذا ازبیاں بھی ملوکانہ نہ تھا۔ جس کی مناسبت میں اونچے و درجہ کا نہیں سے کوئی جھکا نہیں ہے۔ ساتھ ہی ساتھ دنیوی سامان ایک طرف تھے۔ جس کے مقابلہ میں حسینؑ اپنے تنہا نفس کے اختیار اور پسند کا شخص قائم کر رہے تھے۔ بھے یقین ہے کہ ابتدائی فقرات کی آمد ہی سے مروان کے کانوں میں جھگی پیدا ہو گئی ہوگی۔ لیکن تفصیل جواب ابھی باقی تھا اور جواب کو ایک خاص مضمون سے تعلق تھا۔

مروان نے کسی قدر بخینہ شان سے کہا کہ: ”جس قدر میرا ہوگا“ معاذیہ ادا کرے گا حسینؑ نے فرمایا: ”میرا بادشاہ ہے کہ میں وہی طریقہ جاری رکھوں جو رسول اللہ کی بیٹی، نبیؐ اور دیگر اہل بیت کی عورتوں کا سر ہوا ہے۔“ یہاں بھی شاہانہ عنایات کے مقابلہ میں حسینؑ نے اصول اسلامی اور سنت رسولؐ کا وقار قائم کیا ہے۔ ادا نے قرض کے متعلق فرمایا: ”یہ بتا کہ کب ہمارے خاندان کی سیپیوں نے ہمارا قرض ادا کیا ہے؟“ اس فقرہ میں مجھے طرہ معلوم ہوتا ہے لیکن مثال معلوم نہ ہونے کی وجہ سے ہم تصدیق نہیں کر سکتے صلح کے جواب میں حسینؑ وہی فرماتے ہیں جو ان کے پدربزرگوار فرماتے تھے۔ ”کہو بے کہ ہم جو تم لوگوں سے مخالفت کرتے ہیں تو محض خوشنودی خدا کے لیے ہے۔ دنیا کے لیے ہم کبھی صلح نہ کریں گے۔“ اس جواب میں حسینؑ نہ صرف حقیقت امر کو واضح فرما رہے ہیں بلکہ بنی امیہ کے اس جوش انتقام پر پانی ڈالنے کی کوشش کر رہے ہیں جو انھیں اپنے مقتولین بدر و احد وغیرہ کے متعلق تھا۔ یہ لڑائیاں جو وجہ اسلام کے لیے ہوئیں اور جن میں محمؐ اور خوشنودی خدا کے لیے جناب امیرؑ نے کوشش فرمائی کسی انتہائی جذبہ سے نہ تھی اور اب چونکہ بنی امیہ کو نہ صرف ادا ملے اسلام بلکہ خلافت اسلامی کی عنایت کی کا دعویٰ تھا انھیں اس معاملہ کو کوئی قوی مدد نہ ملنا چاہیے تھا۔ اسی فقرہ میں حسینؑ ایسے کسی خیال کی بھی تردید کر رہے ہیں جو قحطی نسلوں یا خود فراموشی پر مبنی پیدا ہو گئی ہو کہ حسینؑ یا ان کے مقدس پیشرو بنی امیہ سے حصول اختیار کی رقابت سے جنگ کر رہے تھے یا اس وقت ان کی کنارہ کشی گزشتہ اسباب مخالفت سے تھی۔ وجہ مخالفت اگر پہلے یہ تھی کہ بنی امیہ محاذ کفر تھے تو اس وقت اپنی روش اور خصائل کے اعتبار سے ایسے نہ تھے جو مسلمانوں کے امام کہے جاسکتے، یا جو ہر اسلام ان کے ہاتھوں میں اپنی ہیبت سے محفوظ رہ سکتا اور چونکہ بنی امیہ میں اپنی گزشتہ خاصیت کے لحاظ سے کوئی تغیر نہ ہوا تھا بلکہ حصول اختیار کے حوصلے اور نفاذ اختیار کے مظالم نے انھیں اور نہیں دکھانا شروع کیا تھا یہ کسی طرح ممکن نہ تھا کہ ہادی برحق کا سلسلہ اس صلح کی کسی پیش آمد کا خیر مقدم کر سکتا جس کی موجودہ صورت یہ جوتی کہ ہمارے انعام و اکرام پر شکریہ ادا کرتے رہو اور ہماری کسی ہی

روشن برآئکہ نہ اضلاع ہوتا کہ حسینؑ یا ان کے مقدس پیشرو عام مالتوں میں خاموش رہتے لیکن یہ نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ اپنے کو موافق دکھا کر بنی امیہ یا ان کے پیشروں کو سہہ عطا کرتے۔

یہ فرمایا حسینؑ نے کہ: ”جب بنی قریب سے کچھ فائدہ نہ ہوا تو یہی قریب اور شادی بیلا کب مصاحت کر سکتے ہیں۔“ اس میں حسینؑ مروان اور معاویہ کی دلیل گزشتہ تجربہ سے کاٹ رہے تھے اور اسے آئندہ کے لیے طریقہ روشن قرار دے رہے تھے۔ بنی سلسلہ کے باوجود یہ ہوا کہ ایک کو دوسرے کا طرز عمل مختلف اغراض اور نقطہ خیال سے پسند نہ آیا اور جب گزشتہ سلسلہ غیر مفید ہوا تو ماضی سبب صلح کی قوی امید نہیں دلا سکتا تھا۔ اس کے علاوہ تاریخ سیاست میں بھی یہ کوئی مفید نسخہ ثابت نہیں ہوا۔ بلکہ اکثر کہ ناموافقیت ہوا ہے۔ مزید برآں بنی امیہ اور بنی ہاشم کی تاریخ ایسی واقع ہوئی تھی کہ بنی امیہ کو بنی ہاشم کی صداقت کا یقین تھا۔ اگرچہ ان کے عمل کو اپنے لیے پسند نہ کرتے ہوئے اس لیے کہ اس میں امتیاز اور فتح نہ تھا۔ لیکن بنی ہاشم کو بنی امیہ کی صداقت اور عمل دونوں پر اعتماد نہ تھا۔ اس لیے کہ طبعا انھیں کسی ایسے شخص سے نفرت تھی جو خلافت راستی کا روناٹیوں سے حاصل ہو۔ نظر براں گزشتہ تجربہ کچھ بھی کہیں نہ کہتا بنی ہاشم کو اس کا کیا اعتبار تھا کہ بنی امیہ کا یہ اقدام صلح ایماں دارانہ اقدام صلح ہے اور اپنی کسی غرض کے پورا کرنے کے لیے نہیں ہے۔ کچھ نہ تھا بلکہ اس کے بر خلاف موجودہ صورت واقعات یہ کہہ رہی تھی کہ بنی امیہ اس قربت کی سلسلہ جینانی سے سیاسی تقویت حاصل کر رہے ہیں جو آئندہ اس کام میں مددگار ہو سکتی کہ کوئی ناموافق باہمی اور آسانی سے زہر یا تلوار کے حوالہ کیا جاسکے۔ حضرت عبداللہ بن جعفر سے قطع نظر کر کے حضرت جعفر بن ابی طالب کا درجہ اسلام میں غیر معمولی تھا۔ اور اس لیے ایسے صاحب اثر کے حاصل کرنے کے لیے اہتمام کی طرح اہتمام کیا جا رہا تھا۔ کیوں؟ اس لیے کہ بنی ہاشم میں کامیابیوں کا پتہ چلا جاسکے۔

اور جس طرح تعین مہر کے متعلق حسینؑ شارع طلیہ السلام کے صاف اور قابل عمل (بلکہ اس وقت تک کے مبالغہ خیز رقم کے لحاظ سے غیر معطر) طریقہ کو اپنی پسند سے وقت دے رہے تھے اسی طرح اس کے نسبت ”طلب مہر“ کے دوسرے فائدہ کو بھی امارت یا غربت کے لحاظ سے کوئی امتیاز نہیں دے رہے تھے۔ بلکہ بنی ہاشم پر امارت و استغلب کو اس فقرہ سے جڑ رک رہے تھے کہ ”اس کی کیا ہستی ہے اس سے اور اس کے باپ دادا سے جو لوگ افضل تھے ان لوگوں نے جو دیا ہی ہے اور ان سے مہر لیا گیا ہے۔“ حسینؑ نے یہاں مسلمات شرع قائم رکھ کر غربت اور امارت کے لیے دو حالت پسند نہیں فرمائی نہ امارت کو شرع پر غالب آنے دیا یا شرع کو امارت کے ہاتھ میں نہیں کر دیا۔

مروان کا تمام لہجہ تقریر کی اس شان کا نمونہ تھا جس طرح عموماً شادی بیاہ کی گفتگو میں ایک فریق دوسرے پر اپنی وجاہت قائم کرنے کی مبالغہ آمیز کوشش کیا کرتا ہے۔ اور اس وقت اہتمام میں اور زیادہ جدوجہد اس لیے تھی کہ گفتگو ”بڑی ناک والے بنی ہاشم“ سے تھی۔ جنہوں نے قبل الاسلام بھی کسی کو اپنی نسب، شرافت اور وجاہت کے مقابل نہیں بھلا اسی لحاظ سے مروان نے کہا تھا کہ ”وہ (مزید) ایسا شخص ہے جس کا مثل دہمسر نہیں ہے۔“ حسینؑ نے غالباً اس طرح کہ گویا انھیں زبان سے ادا کرنا بھی خفیہ معلوم ہوتا ہے۔ قاطع لہجہ میں جواب دیا کہ ”اس کا وہ ہمسر ہے جو آج سے پہلے تھا۔ اس کی امارت نے اس کی ہمسری میں کچھ زیادتی نہیں کی۔“ زیادتی نہ کرنا کئی نہیں ہے لیکن وہ بھی ہمسر نہ بھاجاتا تھا۔ اس موقع پر لفظ کا جواب اسی لفظ سے دیا گیا ہے اس لیے حسینؑ کے فرمانے کے معنی یہ تھے کہ کب مقابل بچے تھے

جولادت کی وجہ سے آج ہمسو نہیں گے تو وہی ہے جو کبھی تھا۔ شخص قوی نہیں ملتا ہے۔

غالباً مردان کی تمام تقریریں سب سے زیادہ مدبرانہ فقرہ یہ تھا کہ نذیر کو بہ نسبت آپ کے اچھا بھنے والے زیادہ ہیں۔ اس فطرت کے ہونے کے فطرت اب تک جبر و تنہید کے حوالہ دے چکے ہیں جس میں ایسی غیر واضح دھمکیاں دی گئی ہیں کہ صورت حال کے خلاف کیوں کسی خیال پر ہے ہو در اس حالیکہ اتحاد اقلیت دینے والے عدوانیت کم ہیں۔ اور جب ہم ایسی کوششوں میں کامیاب ہو سکتے کہ اتحاد سے نسبی ذاتی اور مغربی لحاظ کے باوجود ہم ایسی جامعیت دیا کر سکیں جو نذیر کو بہتر سمجھنے لگے تو ہمارا ناگہن ہمارے لیے ممکن اور اتحاد ممکن ہمارے لیے ناگہن ہو گیا ہے اور اب ہمارے لیے مجسمہ غیر مفید پاس کے اور کیا رہ گیا ہے۔ اب اگر ہمارے لیے کوئی امید ہے تو یہ کہ ہمارا ساتھ دو اور ہمارے اعمال کی رفتار کرو۔

قیاس کے قابل ہے کہ یہ تمام انکاس حیلوں کے لیے دل غراش تھے۔ موش کی حقیقت

تفحص کی دو صورتیں

تھی جس میں سو میں سو آدمی ناموافقیت بے سود سمجھتے۔ اگرچہ انہیں طلبہ کو اور نہ ہوتا اور اگرچہ ایسا کرنے میں وہ اپنا تفحص کو بیٹھتے اور یہ اس موٹی سی ظاہری وجہ سے کہ جب لوگوں کو بھاری دھت فحاشی ہو جاتی تو اس ہم اپنے تفحص کے معاملہ تک نہیں گئے اور یہ ہمارا تفحص ہی کس کام کا۔ یعنی ہمارا تفحص اور عامہ فاس کی قدر دانی دو مداخلت مانتیں ہیں۔

لیکن اگر دو جہاں ہو سکتے ہیں جس سے عامہ فاس نذیر کی بہتری کے مقصد کے اور ایسی کوئی حالت تفحص کے محتاج کی شکایت ہو تو بہتر ہوگا کہ تفحص کا لفظ ایسے برے مفہوم میں استعمال نہ ہو۔ درندہ مثالوں کی کمی نہ ہوگی جس میں ایسے لوگ جن کا پیشہ ہی اخلاقی غلات و رزق ہے اپنی جامعیت بلکہ ہر جگہ کی ایسی ہی طاقت کے نزدیک اپنے تفحص کے لحاظ سے بڑے بڑے مسلم اخلاق اور عالم کے مقابلہ میں زیادہ قوی ہیں۔ تفحص کوئی شخص ہی نہیں ہے اگر وہ اپنی حقیقی صفات کے علم پر مبنی نہ ہو۔ اور جسے اپنی ذات و صفات پر اعتبار ہو وہ اس کا محتاج نہیں ہے کہ لوگ بھاری قدر کریں تو بھاری مصیبت مسیبت ہے درندہ کوئی چیز ہی نہیں ہے۔ ہر زمانے میں ایسے لوگ ہوتے ہیں جو شخص کی وجہ سے حکومت کے انداز نظر میں دیکھتے رہتے ہیں۔ حالانکہ حکومت کے انداز نظر کچھ ضرور نہیں ہے کہ اخلاقی اسسٹس پر مبنی ہوں اور وہ شخص جو اپنے تفحص کا اندازہ لوگوں کے اس معیار سے دیکھتا ہے وہ حقیقتاً اپنے کو ان سے بہتر ثابت نہیں کر رہا ہے۔ ایک اگر مصیبت شناسی کے لیے ایسے کا محتاج ہے جس کے مصالح کے نزدیک اکثر عیب مفید ہیں تو دوسرا خود اپنے کو نہیں پہچانتا اور اپنی حقیقت کو ان سے پوچھتا ہے جو حقیقت بھنے کے اہل نہیں ہیں۔

حسینؑ اس سے بالاتر تھے کہ وہ کسی ایسے فقرہ سے کہ: ”نذیر کو بہ نسبت آپ کے اچھا بھنے والے زیادہ ہیں۔“ مایوس ہوتے۔ یا انہیں اس کی زیادہ فکر ہوتی کہ چونکہ میں اچھا بھنے والے کم ہیں ہم بھی اپنے اچھا بھنے والے کے لیے دیے ہی کوششیں کریں جیسے نذیر کے لیے کی گئی ہیں۔ حسینؑ دونوں طرح کے بھنے والوں کو خوب سمجھتے تھے۔ اور وہ اپنے کو بھی سمجھتے تھے۔ اس سے مردان کے تمام مدبرانہ فقرات نے حسینؑ کی نگاہ میں اپنے شخص کو سب نہیں کیا تھا کہ وہ مردان کی پیش کش کو شوق کی نگاہ سے دیکھتے اور اپنے وفادار کی زیادتی بنی امید کی موافقت میں تلاش کرتے۔ حسینؑ کا تفحص ان کی مصیبت ان کے علم اور اس کے اعتبار پر تھا۔ وہ اسے ذلت سمجھتے تھے کہ ہم بنی امید کے ہاتھ سے کوئی عزت چاہیں جسے لوگ بھی عزت سمجھیں۔

اے حسینؑ نے اپنے وقار کے اطمینان سے بہترین واقعہ خواں الفاظ میں ادا کیا کہ ”جاہل اُسے اور عاقل مجھے اچھا سمجھتے ہیں۔“
 بلاوجود ان تمام جواب کے عبداللہ بن جعفر اور حسینؑ کے کچھ کلایک موقع یہ بھی تھا کہ مروان کی وکالت کا قبول کرنا
 عبداللہ بن جعفر کے لیے امید افزا تھا جسے حسینؑ نے اس وقت سے رد کر دیا اور چونکہ ابی جعفر نے معاملہ کو حسینؑ ہی کے
 والدہ کردہ تھا ان کی ذمہ داری بڑھ گئی تھی۔ اس لیے حسینؑ نے اپنی اس تجویز کے ساتھ کہ ام کلثوم کا عقد قثم بن محمد بن جعفر
 سے جو مسلمان ہی اپنے عقائد کو حکم دیا کہ ان کے بسر اوقات کے لیے حسینؑ کی حکومت زمین دیدی جائے جس کی آمدنی کافی سے
 زیادہ تھی۔ اگرچہ اپنی آن کی ہائز مخالفت اور مخالفت ناقابل اعتراض ہے لیکن ہمارے اوپر کے دیما رک کی مثال ابھی موجود
 ہے کہ مروان یمن گیا اور کہنے لگا کہ ”میں ہاشم اپنی عداوت نہیں چھوڑتے۔“ دوستی تو اس کے نزدیک یہ ہوتی کہ بنی ہاشم
 ہر بات پر سر تسلیم خم کیے رہتے۔ لیکن مروان کی سفارت کی ناکامی کے لیے میں غالب (بہت بے آبرو ہو کر تیرے کوچہ
 سے ہم نکلے) یا معنی (ہم شوق آئندہ بدم ہم مروان رفتہ) کے مصرعہ میں پسند کا تصفیہ نہیں کر سکتا اگر یہ خالص سیاسی اقدام
 تھا تو میں غالب کے مصرعہ کو مناسب سمجھوں گا۔

کبر سے حسینؑ کو نسبت دیا جانا

طبیعت کے اعلیٰ شان کی ناشناسی سے تھا

حسینؑ کے اس شخص کو کچھ جب نہیں ہے کہ نہ
 کچھنے والے۔ جنہیں کبر اور خود داری میں تمیز نہ تھا
 کبر سے منسوب کرتے ہوں اور حضرت
 اخص بجاتے ہوں کہ: ”کبر خدا کے لیے

ہے۔ جو کہ کوئی شریک نہیں ہے۔ لیکن ”عزت“ مومنین کے لیے ہے۔“ اور یہ تو یہ ہے کہ وہ جس کا خطاب ابوالساکین ہو
 جس کا غربا کے ساتھ رحم و کرم اور متعین کے ساتھ عناد اور درگزر لا جواب مثالوں کا ذخیرہ ہے اس کی نسبت کبر کا خیال کرنا
 احساس شناسی سے دور افتادگی ہے۔ مثالیں جو کچھ بجاتی ہیں وہ یہ ہے کہ حسینؑ غربا اور غیور لوگوں پر بے حد شفیق تھے لیکن وہ
 جو خود بینی کو اپنی شان سمجھتے تھے اور حسینؑ سے اس کی قدر دانی چاہتے تھے وہ حسینؑ کو سوا کا سید حادر بے لوج پاتے
 تھے اور جس جس طرح خود ہیں ایٹھتے جاتے تھے حسینؑ کا پر وقار سکون بڑھتا جاتا تھا بلکہ شاید نظر اور چہرہ کے عکس میں
 عظمت کا جزو مثال جو تھا جاتا تھا یہ سب اس لیے کہ بھولے چلے اوپے طبیعت کے لوگ اعتدال کی طرف مود کریں۔
 اس کے بعد عود کرنے والے تھے حسینؑ کو نرم و تا جود دیکھ کر مطمئن ہو جاتے تھے یا جو بے اعتدالی طبیعت کو اپنی شان
 سمجھتے تھے اپنے کو اپنی شان پر نہ پا کر کچھ میں مبتلا ہو جاتے تھے اور انتقام کے لیے حسینؑ کو کبر سے نسبت دیتے تھے یا وہ جو اپنے
 جانے کے علاوہ اور کسی خوش دلائی کے مرتکب نہ ہو سکتے تھے وہ اپنے کو بھول کر حسینؑ کی خود داری میں قابل اعتراض کبر
 دیکھ لیتے تھے۔

جو کچھ میں اوپر کہہ رہا تھا اس کے کچھنے کے
 لیے حسینؑ کے خیالات اور بھی ہیں مثلاً
 جو کچھ آپ اسامہ بن زید کے اوائے قرض
 کے وقت فرماتے ہیں کہ: ”ہلا شاہوں کی

اسامہ کے وہی انداز جو رسولؐ کے سامنے تھے

اور حسینؑ کی وہی عنایت جو رسولؐ کی تھی

خصالت میں سب سے زیادہ بری اور ناقابلِ تعریف بات یہ ہے کہ وہ دشمن سے ڈریں اور غریبوں پر بھت دہلی سے رحم نہ کریں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ”دشمن سے ڈریں“ وہ مقابل کسی طرح کے مقابل سے کسی طرح کا دینا ہے۔ حسینؑ ذیِ اقتدار لوگوں کی شان سے اثر پذیر ہو کر بھگتے تھے لیکن اس بے اثری کو اگر وہ غرباء کے ساتھ بے رحمی جو تو اسے سخت دلی سے تعبیر فرماتے تھے۔ ہر شخص جسے اسلامی تاریخ سے رغبت ہے جانتا ہے کہ زید اور اسماء بن زید کو خاندانِ رسالت سے کیا نسبت تھی پھر بھی مباحثات کی یہ صورت ہونے والی تھی کہ جناب امیرؑ کے استقرارِ خلافت کے وقت اسلام مخالفین بیعت میں ان کے ایک سے ملے۔ غالباً ان کا مختلف نیوٹرل رہنے سے زیادہ نہ تھا۔ اس لیے کہ اصحابِ جمل و صفین میں ان کا نام نہیں دکھائی دیتا۔ پھر بھی ان کے موقع کے آدمی سے خاندانِ رسالت کے اقتدار کے وقت کوئی دشمنی کی بھی حیرت خیز تھی۔ اس کی وجہ غالباً اسلام کا وہ بر تلو تھا جس نے عطائے حقوق میں انسان اور انسان میں کوئی فرق نہیں کیا تھا اور چونکہ زید اور اسماء پر رسولؐ کی توجہ اس سے بھی آگے بڑھی ہوئی تھی اس لیے اسماء ”ایا زدر خود بشناس“ سے آگے بڑھ گئے تھے۔ اس پر وہ مائتیں اور تازیانہ ہو گئی تھیں جس نے ”ہم کیوں نہ ہوں“ ایک زندہ اصول قرار دے رکھا تھا۔ میں نہیں جانتا کہ کب انہوں نے صورتِ حالی کو تسلیم کیا اور کب ان کے تعلقات تجوہ کی حد تک قائم ہوئے۔ لیکن بلا جود اس گرہ کے حسینؑ کا عیادت کے لیے تشریف لے جانا اور زندگی ہی میں اسماء کے بار کو ہلکا کر دینا کہتا ہے کہ حسینؑ اس سلسلہ عملیات کو فراموش نہیں کرنا چاہتے تھے جو کسی وابستہ خاندان کے ساتھ تھی۔

حسینؑ کا خلع جو انہیں ہر پیش قدمی کے لیے پہنچانے پر آمادہ کر دیتا تھا اور ان کی وہ پھر وہی جو خلق اللہ خصوصاً غرباء کے لیے تھی۔ غالباً اس وقت رحم اور غیر متنازعہ نگاہوں سے ان قیروں کو

فقرا کا حسینؑ کو دعوت دینا، غرباء کے ساتھ

حسینؑ کے نرم بشرہ کی وجہ سے تھا

دیکھنے لگے جو بیٹے ہونے اپنی بھوک دور کر رہے تھے اور حسینؑ کے ان انداز نے غالباً بے سرو سامانوں کو یہ جرأت دلائی کہ وہ قریب بلا لیتے۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ سوسائٹی، فیشن، غربت کا نام لینا ذلت اور غربت کا اندازہ اور ذکر یہی تھی شان کے خلاف وغیرہ کا فروغ بے سامان مفہوم پیدا ہوا تھا یا نہیں۔ اگر تھا تو اس کا اثر حسینؑ پر نہ تھا اور وہ جناب اپنے جد بزرگوار کی اسی نصیحت سے متاثر تھے کہ غربت سراپت نہیں کر جائے ان کے نزدیک غربت اور ملامت ایک انتہائی چیز تھی جو درجہ انسانی پر اثر نہیں کرتی۔ نہ اسے جامعیت کا دور کردہ قرار دیتی ہے۔ جیڑ گیا ایک نفسِ رحم اور رحمہ اللہ کے فرزند اور غالباً اس کا بھی کر کے کہ اب فقرا کو سکین ہو گئی اور وہ ہمارا اللہ چلنا چلنے کے ساتھ محسوس ہو کر رہ گئے، اس طرح اٹھے کہ انہیں بھی اپنے ساتھ اپنے گھر لے گئے اور احسان فرمایا۔ میرے خیال میں ساتھ لے جانا بھی کسی احسان کرنے کی آکن سے نہ تھا بلکہ قیروں کے خوشگوار وقت کی یاد کو رفاقت سے دیر پا کرنا تھا۔

حسینؑ کو پچانو کہ کہاں تھے اور کس طرح تھے جب وہ اعرابی کو اس کی امید سے بدرجہا زیادہ عطا فرماتے ہیں۔ اس طرح کہ سامنے نہیں آتے ہیں بلکہ

حسینؑ کی روحانی زیارت

صرف ہاتھ بڑھا دیا ہے جس میں قہقہہ ہے۔ خود پس پردہ ہیں اور مدد کر رہے ہیں۔ دقت ہوتا ہے کہ پردہ چھپاتا ہے۔

یہ وقت تھا کہ پردہ حسینؑ کو ظاہر کر رہا تھا حسینؑ کی یہ غیرت شرع سے بالاتر ہے جہاں وہ اپنا چہرہ اور آنکھیں مسائل کے سامنے نہیں کرتے۔ کیا اس لیے کہ وہ سوال کرنے والے کی غفلت نہ دیکھیں۔ یا اس لیے کہ وہ امید رکھنے کے بعد اظہار شکمہ میں معبر نہ آئے۔ حسینؑ کسی کے ایک درد انگیز عالم اور اپنی ذاتی تسکین کے نظارہ سے اپنے کو کھینچ رہے تھے۔ ہلای النظر میں یہ ایک روایت ہے لیکن حسینؑ کے نفس کے شاعر اور ان کے مصور مؤرخ کے لیے یہ چھوٹی سی روایت گونگے واقعات کی تمام سوانح عمری سے زیادہ روشن تاریخ ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ حسینؑ آج ہمارے سامنے اس وقت اس طرح نہیں ہیں جیسے اپنے اس انداز سفاکے وقت تھے۔ لیکن کون ایسی بے ہوش اور تاریک نظر ہوگی جو ایسے واقعات کو پڑھے گی اور حسینؑ کا اس وقت کا نقشہ اس کے سامنے نہ پھر جائے گا۔ یہ نقشہ ایسے جسم اور روح سے کھنچا ہے جسے نہاد اور اس کے تغیرات متناہیں سکتے۔ اس وقت تک نہیں جب تک کہ صوف کاغذ کے کسی ٹکڑے پر پولیس گے۔ یا یہ واقعہ انسانی ماحول سے تھقل ہو تاہوا آخری انسان تک پہنچے گا۔ اور برابر اس وقت تک حسینؑ اپنی صورت اور اس کے ضمنی اثر سے مخلوقات الہی کو دکھائی دے گے۔ روایت یہیں ختم نہیں ہو سکتی بلکہ مسائل اعرابی کے ریمارک نے اس میں خود اساد و دلور شامل کر دیا۔ اسے حسینؑ کی بے نقصان عنایت نے رلا دیا۔ مشکور حاجت مند ”ایسے شخص“ کے ”ذیر خاک چھینٹا“ اور ”دست جو کے ناہید ہو جائے“ کا پیشتر سے مرقیہ کہہ رہا تھا۔ اس کے نزدیک اپنے احساس کے کمالے کا یہ بہترین طریقہ تھا۔ اور شاید بہترین فطری تعریف بھی تھی۔

دور کردہ جماعت پر حسینؑ کی نظر

یہ دوسری روایت بھی کم موثر نہیں ہے کہ حسینؑ ایک انسان کو کتے کے ساتھ اس طرح کچھ کھاتے اور کھیلتے دیکھتے ہیں کہ گویا وہ کبھی آدمی یا کسی بچے کے ساتھ خوش فطری کر رہا تھا۔ فوراً حسینؑ کو خیال ہوا ہوا کہ کیا اسے آدمیوں سے نفرت ہے۔ کیا کوئی آدمی اسے جی بھلانے کو نہیں ملتا۔ اس کے چہرہ پر اندوگی اور مایوسی دیکھ کر اس کی حالت اور موقع سمجھیں گے۔ اس کے لیے غفلت کے برے لفظ استعمال نہ کیے۔ دور نہ ہٹے۔ اس کی حالت خود اسی سے پوچھی۔ جواب یہ تھا کہ ”میں ایک درد رسیدہ ہوں۔ دل خوش کرنے کو اس کتے کے ساتھ کھیل رہا ہوں“۔ مواقع ہوتے ہیں کہ انسان کو انسانوں سے نفرت ہو جاتی ہے۔ لیکن یہ موقع تھا کہ انسانوں نے ایک انسان کو جماعت کے میل جول سے دور ڈال دیا تھا۔ اس لیے کہ اس کا موقع اچھا نہ تھا۔ لیکن غفلت نے اسے اپنے رحمت کی مسلمات سے دور نہیں کیا تھا۔ اس میں میل جول کی خواہش تھی اور دکھ سکھ کا احساس تھا۔ اگر آدمی اس کے غم غلط کرنے کے قابل نہ تھا تو جانور تھا اس کے نگاہ میں آدمیوں سے جانور اس وقت بہتر ہو گا۔ حسینؑ کی ایک نگاہ کبھی گئی۔ دل نے اثر لیا۔ رک گئے۔ ہمدردی کی۔ اپنے باپ اور نانا کے بچے فرزند کی طرح سٹارش اور آنکھوں دھانے کے لیے اس کے آٹاکے پاس پہلے۔ ان کی بے غرض عنایت اور حقوق عباد کے لحاظ نے جواڑ کیا وہ کسی شرح کا محتاج نہیں ہے۔

طریقہ سخا کی جدت اور تفریح

اس روایت میں طریقہ سخا کی جدت ہے کہ مسائل سے چند سوالات کیے جاتے ہیں۔ یہاں بھی مجھے خود اسامزاح معلوم ہوتا ہے۔ ہلای ریحی بھی اپنی اندوگی کے وقت ایک بے وقوف کر یہ مظر اعرابی کو تلاش فرمایا کرتا تھا۔ جس کی منکھ صورت، انداز اور شکل

سے فتویٰ کی تصریح ہو جاتی تھی۔ حسین اعرابی کی معنک گھبراہٹ دیکھنا چاہتے ہیں یا اسے اپنے سوالات کے جواب بتا کر اس کا مشنری بنانا چاہتے ہیں۔ چند سوالات ہیں لیکن نہایت مفید خصوصاً ایسی حالت میں جب کہ حصول علم کی آسانیاں نہ تھیں اور جب کہ ریگستانی اور پہاڑی مقاموں میں کوئی استاد نہ پایا کرتا تھا۔ ایسے موقع کو حسین کیوں ضائع کرتے۔ پہلے ہی فرمایا کہ ”خشیش موافق معرفت ہونی چاہیے۔“ پہلے کچھ سیکھو اس کے بعد انعام چاہو۔ تعلیمی سوال شروع کیجئے اور فاضل ترین اعمال پوچھا۔ جواب ملا کہ اقرار توحید۔ توحید جو بہت کچھ پرستی اور ادھام باطلہ سے بچاتی ہے خصوصاً محروانوں میں جہاں سادہ مزاج مخلوق کو شاعرانہ وحشت اعتقاد کی بہت گنجائش ہے ایک خدا جو نہ اوجھتا ہے نہ سوتا ہے جو ہر جگہ ہے جو تمام بدوین کے افعال دیکھتا ہے اور جو اعرابی کے صحرائی جموں پڑے اور اس کے اونٹ کے گلہ سے دور نہیں ہے۔ اور جو اصل اعتقاد ہے۔ خدا ہی جانے کہ برادر اعرابی کو توحید کے فاضل ترین اعمال ہونے کی شرح بھی معلوم تھی یا نہ تھی لیکن حسین کیوں اس کے معرے سے زیادہ خوراک دیتے جب اصل بات پیٹ میں اتر پڑی تھی۔ اور اس طرح بے خوف تھی کہ وہ کسی طرح کا مشرک نہ ہو گا یعنی اسلامیت کی پہلی زبردست اصلیت اس میں موجود ہے۔ کہہ دیا کہ جی تم ۱۰ جواب دے چکے یعنی تصدیق سے اسے اپنے خیال میں راضی کر دیا۔ غریب ڈر رہا ہو گا کہ پاس بھی جوتے ہیں یا نہیں اور پاس فیملی جاتا جنم میں غم تو اسے انعام کا ہوتا۔ اب تو ذرا مانٹھا ہو کر جواب کے لیے مستعد ہوا ہو گا۔ اب پوچھا: ”کوئی چیز انسان کو ہلاکت سے بچاتی ہے؟“ پہلی بیڑی تھی۔ لیکن برادر اعرابی نے سوچ سناج کر بڑی بکی بات کہدی کہ: ”خدا پر بھروسا۔“ دہریت اور لا ادریت کی بے اعتدالی بے قاضی اور ان بے لگام کوششوں کا خیال کر دو جس میں خدا پر بھروسہ نہ کرنے سے انسان مبتلا ہوتا ہے۔ خدا پر بھروسا کے معنی ”جگہ ناتھ جی“ (ہندوؤں کے اوتار کا ایک بت جس کے ہاتھ پاؤں کٹے ہوتے ہیں) بن جانا نہیں ہے۔ بھروسا کے معنی قوائے فکریہ اور اعضائے جسمانی کا قفل نہیں نہ کوشش سے باز آنا مقصود ہے بلکہ بھروسا خدا کی شان ربوبیت کا ایک طبعی اطمینان ہے اور قناعت کے موافق ہونے یا نہ ہونے میں تسلیم و رضا کا اظہار ہے۔ اور ساتھ ہی اس کی تائید کی امید ہے۔ ذرا سی دعا اور اس کی کامیابی یا ناکامی خدا کے وجود یا عدم وجود کا معیار نہیں قرار دی جاتی۔ اگلی میٹھ نہیں دیا جاتا کہ اگر میرے موافق مزاج بات نہ ہوتی تو ہم قیرا انکار کریں گے بلکہ غم و اندوہ آسکے اور دیکھتا ہے کہ ہم ایسے مخلوق کے پاس آئے ہیں جو اپنی ہستی ہم سے موانع چاہتا ہے جانے اس کے کہ ہم اس پر غلبہ آجائیں۔ اس لیے کہ وہ مخلوق، خدا کے انصاف پر راضی اور اس کے ارادے پر شاکر ہے۔ خشیش اس سے ساقط ہو گئی ہے وہ اب اپنی تخیل سے اوڑا اوڑا نہیں پھرتا بلکہ ایک زبردست مرکز سے بندھا ہے یہ اس کی طبیعت اور خیال کا اعتدال ہے اور یہ حالت ہلاکت سے بچانے والی ہے۔ برادر اعرابی وہ صہا لگئے۔

تیسرا سوال ہوا کہ ”کس چیز سے انسان کی زینت ہے؟“ ہم جوتے تو بے ساختہ سنت زمانہ کے لحاظ سے عمامہ، ٹٹنی کار، کت مظر وغیرہ وغیرہ کہہ دیتے۔ پسند کرنا دوسرے کے اختیار کی چیز تھی۔ لیکن جاہلی عرب نے بھی ہم سے اختلاف رائے کیا۔ غالباً اس کے نزدیک مستند بین الفرقین تھا کہ آدمی نے پیٹھ سے بنائے ہیں پیٹھروں نے آدمی نہیں بنایا۔ جواب دیا کہ: ”علم سے جس میں جلم ملا ہو۔“ ہم کو ذرا سی وجہ شبہ کی ہو تو ہم انکار کر جائیں کہ جاہلی بدوی یہ نہیں کہہ سکتا تھا اسے عالمانہ مذاق ہی نہیں بلکہ جلم سے علم کا مزاج درست کرنے سے کیا بحث۔ ہر حال اس کا ذلتی عقین ہو

نئی ہوئی بات ہو یا کسی نے شاید حسینؑ ہی نے بتادیا ہو بات ایسی تھی۔ لیکن حالت اشتنا چاہتی تھی اس لیے کہ علم بغیر علم اور علم بغیر علم ہو سکتا ہے۔ یہ ناقص صورت تھی یا یہ دونوں حالتیں عموماً نہیں پائی جاسکتی تھیں اور اس طرح یہ مخصوص لوگوں کے زینت کا ایک ذریعہ ہوتا۔ یہ کمزوری ایسی تھی جو فوراً حسینؑ کے سامنے آجاتی اور وہ سوال کر بیٹھے کہ اگر یہ نہ ہو تو؟۔ اعرابی دوسری مرکب صفت مالدار کے ساتھ مردت کو پیش کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ صورت بھی پیشتر کے اعتراض سے خالی نہ تھی۔ پھر وہی سوال کیا گیا اور اب اعرابی نے فقر کے ساتھ صبر کی قید لگائی۔ انسانی حیات کی تین واضح صورتوں کی مثالیں دی جا چکی تھیں جن سے انسان کی زینت ہو سکتی ہے۔ اعرابی کا ہر جواب اچھا تھا لیکن پہلی حالت پر اگر حسینؑ قناعت کرتے تو دو اور حالتیں ظاہر نہ ہوتیں اور بغیر ٹوکے خاموشی بھی غیر مفید تھی۔ کون جانے کہ حسینؑ اسے چھیڑ رہے ہوں۔ اور آخر مرتبہ وہ جھل بھی گیا لیکن آخری جواب بھی کم قوت دار نہ تھا کہ اگر یہ صورتیں نہ ہوں تو کسی کے زندہ رہنے کی کیا ضرورت ہے۔ حسینؑ ہنس دیے اور نہ صرف زردیت ادا کیا بلکہ اس کے نقشہ کا بھی کھانا فرمایا۔ اب برادر اعرابی غالباً قاتلانہ شان سے رخصت ہوئے۔

حسینؑ ایک قوت دار زبان خریدتے ہیں اس روایت میں کہ حسینؑ نے فرزوق کو کچھ عطا فرمایا در آنحالیکہ مردان نے اسے ٹکوا دیا تھا

عطا فرمایا خالصتاً سخا سے نہ تھا بلکہ ایک قوت دار زبان کا خریدنا تھا۔ زیر ذکر زمانہ میں کوئی مشہور شاعر عمار سے زمانہ کے کسی مشہور اخبار کے ایڈیٹر سے غالباً اثر میں کم نہ تھا بلکہ خصوصیات زمانہ زیادتی کا حکم لگا سکتی تھی۔ حسینؑ اسے ”عزت محفوظ“ رکھنے کے لحاظ سے خرید رہے تھے۔ اور اس کے لیے ان کے پاس اپنے جد بزرگوار کی مثال تھی۔ عزت محفوظ رکھنے کا خیال نہ صرف شعرائے عرب کی چھا گوئی کے لحاظ سے تھا بلکہ اس لحاظ سے بھی کہ اگر کوئی آئندہ شاعر بنی امیہ کا بندہ ہو جاتا تو غلط خیالی پھیلنے میں اور زیادہ اثر کرتا۔ اب چونکہ وہ بنی امیہ سے برا فرودخت ہو کر آیا تھا۔ قرین مصلحت تھا کہ وہ سنبھالا جاتا۔ آئندہ ذکر آنے کا کہ فرزوق خبر دینے کے کام آیا بلکہ ہشام بن عبد الملک کے چاچا کرلے کے زمانہ میں اس نے حضرت امام زین العابدین علیہ السلام کی شان میں جس موقع پر بنی امیہ یہ قصیدہ:

هذا الذي يعرف البطحاء وطائفة
و البيت يعرفه و الحل و الحرم

کہا اس نے بڑا اثر کیا۔

وجوب صوم کی وجہ اور اس کا طائر وجوب صوم کی وجہ بیان فرماتا کہ: ”امیروں کو بھوک کا مزہ

معلوم ہو کہ غریبوں پر رحم کریں۔“ اپنے دین کے ایک حکم کی مام فہم تفسیر تھی۔ یہ شرح خود حسینؑ کے رحم پسند اور غریب پرور نفس کی شریح ہے۔ حسینؑ اس سے زیادہ شرع فرما سکتے تھے شاید اسی وقت کی ہو لیکن ہم تک صرف اسی قدر پہنچد ظاہر ہے کہ اس میں حسینؑ وجوب صوم کی وجہ بیان فرماتے ہیں جس کا فائدہ خود سامع کے لیے ہو صواب عطا کے اور کچھ نہیں ہے۔ بلکہ فائدہ اور وکالت زیادہ تر غریب کی ہے۔ اس سے خیال ہوتا ہے کہ سوال کرنے والا ذی قدرت لیکن غلیل تھا جسے غریب پر رحم کے تعلیم کی ضرورت تھی۔ یہ نکتہ صحت ہو جاتا اگر مسائل کا نام اور خلعت معلوم ہو سکتی ہیں اس خیال سے خالی نہیں ہوں کہ اس میں نظمیں حیثیت کا طائر بھی ہو۔

حسینؑ کی قدر دانی علم نہ صرف اس سے معلوم ہوتی ہے کہ اپنے بچوں کے معلم کو بہت کچھ عطا کیا بلکہ اس سے زیادہ اس سے کہ اپنی کثیر عطا کو معلم کی کثیر عطا (ظہیم) کے ہم پلہ نہ بھلا اس کے نواسہ سے جو پڑے لکھے اسیران جنگ کو آراو معلم بنا دیتا تھا یا اس کے منہ زند سے جو ”پیر لو قبل اس کے کہ بچے نہ پلو“ منہ ماسکتا تھا ایسا خیال ظاہر ہونا مطلق حیرت خیز نہ تھا۔

مشکلیں میں اس پر تھوڑی درد سری نہیں ہوتی ہے کہ ارادہ خدا حادث ہے یا قدیم ہے۔ اشاعرہ قدامت کے قائل ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ اگر ارادہ خدا علم خدا ہے تو اس کی صفت ذات ہے اور یہ قدیم ہے لیکن عموماً بلکہ اہملاً پیروان آکل رسالت اس کے قائل ہیں کہ ارادہ خدا حادث ہے۔ وہ ہمیشہ اور تمام باتوں کے متعلق ارادہ نہیں کیا کرتا۔ کیونکہ اگر خدا ہر امر میں مرید (ارادہ کرنے والا) ہوتا تو تمام برائیاں یا کافراں کافر بھی ارادہ خدا سے ہوتا اور اس طرح کفر مراد خدا ہوتا۔ پیروان آکل رسالت حسن اور قبح عقلی کے قائل ہیں۔ ظاہر میں بھی ارادہ ایک صفت فعلی ہے۔ حسینؑ نہایت فلسفیانہ احتیلا سے اسے ”علم اور قادر“ فرماتے ہیں۔ یعنی وہ چیزوں کو جانتا ہے اور ارادہ کی قدرت رکھتا ہے۔ علم شے ارادہ شے نہیں ہے۔ اب وہ کس امر کا ارادہ کرتا ہے یا کس کا ارادہ نہیں کرتا، اسی کا تفسیہ ہر چیز کی موجودہ صورت پر کیا جانے گا۔ باوجود اس کے کہ اسحاق بن عمار حافظ قرآن تھے لیکن حضرت ابو عبد اللہ علیہ السلام نے انھیں اپنے حافظہ سے پڑھنے کی اجازت نہ دی بلکہ لکھے ہوئے

ناظرہ پر زور دینے کی وجہ

کے پڑھنے کا حکم دیا اور یہ حدیث یاد دلانی کہ: ”قرآن کا دیکھنا عبادت ہے“۔ یہ حدیث یا حدیث کا یاد دلانا دونوں کا مفہوم ایک تھا اور وہ یہ کہ حافظہ اصل کتاب سے بے پرواہ نہ کر دے۔ دوسرے لفظوں میں کتب کی مرکزیت کو نقص کاٹنے سے بچنا تھا۔ اگر جناب امیر مولا کا نہ شان کے باوجود قرآن کی اظہار عظمت کے لیے اسے حکم بنانے کے لیے جنگی صفت کے پکا میں لانے تھے تو حسینؑ کیوں کر اس کے احترام کے لحاظ کو محسوس نہ بناتے۔ یہ تھے جنہوں نے ہر طرح قرآن، نفس شہ آں کی ہر حفاظت اور شرح کی اور اس پر عمل کیا۔

خطبہ کی مختصر شرح

حسینؑ اس خدا کی تعریف کرتے ہیں جو ”کسی شے سے موجود نہیں ہوا“۔ جو قائم بالذات ہے جو طبع البطل ہے۔ چیز اور صورتیں نمودار اور فنا ہوتی ہیں اور یہ سب گویا اپنے منسوب کے ازلی ہونے کی گواہی دیتی جاتی ہیں۔ خلق شدہ چیزوں میں صنعت کا نمونہ دکھائی دیتا ہے اور یہ سب اپنے صانع کا نشان دے رہے ہیں۔ حسینؑ اپنے خدا کو صنعت ربوبیت سے بنا کرتے ہیں۔ اور اسی خدا کی طرف دایمی کا اقرار بھی کرتے ہیں اور دعا اور اظہار شکر کو نہایت خوب صورت اور تصور خیز فقرہ میں ادا کرتے ہیں کہ: ”تو نے ابتداء کی اپنی شمشعش کی قبل اس کے کہ میں موجود تھا“۔ یہ الفاظ اگرچہ بہت مختصر تھے لیکن ماہرین فلسفہ جانتے ہیں کہ اس میں وجود باری تعالیٰ کے استہلال کے کئی طریقوں کا ذکر ہے۔ مجھے اس کی تفصیل غیر ضروری ہے۔ مجھے تو یہ کہنا ہے کہ ایک نگاہ ہے جو عالم اور اس کے تغیرات و تحولات پر غور کر رہی ہے ایک ذات جو فطرت قوانین میں بے ہوش نہیں کھڑی ہے بلکہ کچھ دیکھ رہی ہے اور جو کچھ دیکھتی ہے اس سے کچھ استدلال کر رہی ہے۔ طبع دیکھ رہی ہے۔ معلول دیکھ رہی ہے۔ صنعت ہے اس میں مضبوطی کی شان ہے جو بغیر شور نہیں ہو سکتی۔ کچھ غیر مد رک آکات ہیں جن میں کوئی چیز کام کر رہی ہے۔ دو نوعیت کی چیزیں حیرت خیز

احترام کا نمونہ ہیں۔ ایک وقت تھا کہ یہ احترام نہ تھا۔ اس وقت ہے اور پھر نہ ہوگا۔ لیکن یہ قانون برابر عمل کرتا رہے گا۔ تماشا کا ختم ہونا تماشا کر کا ختم ہونا نہیں ہے بلکہ اس قدر تماشے ہیں جس کی ایک کنہ دریافت کرنا مزید کنہ کے دریافت کھلنے کا مقدمہ ہے۔ جس طرح کا بھی ہو ان چیزوں میں حدوث ظاہر ہے۔ ان چیزوں کی علت قاعلیٰ ایسی حدوث پسند نہیں ہو سکتی وہ ان سے الگ ہے وہ کسی چیز سے موجود نہیں ہوئی۔ اب یہ نگاہ اپنی علت قاعلیٰ کو پہچان کر اس کی طرف متوجہ ہو جاتی ہے۔ اور دیکھتی ہے کہ وہ ہمارا پالنے والا ہی ہے۔ محبت کا پہچان ہوتا ہے۔ اور ساتھ ہی ابتداء کے بعد انتہا بھی دکھائی دیتی ہے۔ ابتداء کی پرورش بازگشت کے اقرار سے اپنے کو آئندہ رحمت کا امیدوار بناتی ہے۔ اس لیے کہ ہم نے اپنے وجود کے لیے کوئی حق قائم نہ کیا تھا۔ اور پھر بھی تو نے ہمارے موجود ہونے کے قبل اپنی رحمت کو غنیمت کر دیا۔ تو بڑا عظیم ہے۔ تو جانتا ہے کہ ہم کو اپنے موجود ہونے پر کونسی چیزوں کی ضرورت ہوگی۔ تیرے شعور نے ہمیں ہماری بے ہوشی میں تنہا نہ چھوڑا۔ اس کا انتظار کیا کہ میں ملنے کے قابل ہو تا تو دیتا۔ تو ہم تیری طرف اپنی بازگشت کے اقرار سے کیوں مطمئن نہ ہوں۔

خدا کو خیر و شر سے نسبت نہ دیے جانے کی شرح

میری دانست میں شر کو خدا سے منسوب کرنا
اہرمٰن کے قاتل ہونے سے کسی طرح بہتر

نہیں ہے۔ یا الیک ہی خدا کو شر کے ساتھ خسر کا خالق قرار دینا "انزہ" اور "اہرمٰن" کو مخلوق کر دینا ہے۔ خدا خسر نہیں ہے اس نے خیر اور شر کا کہیں دو ذخیر نہیں لٹکا دیا ہے۔ خدا کے قانون کی موافقت خیر اور اس کی مخالفت شر ہے۔ خیر اور شر دو حالتیں ہیں، جن کی شُخْش اور بُخْش کے سمجھنے کا معیار عقل ہے۔ نہ خیر اور شر یا شُخْش اور بُخْش کا بھنا محض مذہب پر موقوف ہے بلکہ خیر اور شر یا شُخْش اور بُخْش کے وہ بھی قائل ہیں جو مذہب کی پیروی نہیں کرتے۔ انسان کا خاصہ اخلاقی اسے بری باتوں سے منتظر کرتا ہے اور اچلی باتوں سے مطمئن کرتا ہے۔ وہ جو برائی کا مرتکب ہوتا ہے اسے اچھائی کچ کر نہیں بلکہ برائی کو برائی ہی کہتا ہے۔ اگرچہ وہ مرتکب ہوا ہو۔ اور اگرچہ وہ کسی ایسی حالت میں ہو جس کی کوئی برائی سوسائٹی کے نزدیک "خود مرض و جملہ مرض رادواست" ہی کیوں نہ ہو۔ تاہم انفرادی ضمیر بغیر جنگلے لیے نہیں رہتا۔ اگر جس فنا نہیں ہو گیا ہے۔ یہ صورتیں ہمیں خیال کی رو سے جو اس وقت اس وقت کے پہلے اور اس وقت کے بعد رہیں گی۔ جس کی نسبت حسین سے سوال کیا گیا حسین کے زمانہ کو خصوصیت یہ تھی کہ اس وقت تک حکومت کا فیشن ہو گیا تھا کہ وہ جو کچھ کرے اور لوگوں پر اس کا کیسا ہی اثر کیوں نہ پڑا ہو لیکن آسانی سے یہ کہہ دیا جائے کہ آدمی کیا کرتا ہے۔ خدا ہی کے نزدیک تم اس برائی کے متقی تھے اگر خدا کو منظور نہ ہوتا تو جلاوطن کیا جاتا۔ تم اس بلا میں رہتے اور کوئی تمہارے ساتھ کچھ کر سکتا کیا کرتا کوئی مغالطہ کچھ کر جب کہ مغالطہ کی حفاظت کے لیے تلواریں تھیں۔ ہوتا جو کچھ بھی ہوتا لیکن جب حسین سے پوچھا جاپکا تھا تو وہ اس وقت دار و دروازے میں جواب دینے کے لیے اپنے منصب کے کام سے عبور تھے کہ جو شخص یہ کہتا ہے کہ خدا برائی کا حکم دیتا ہے اس نے خدا کی تکذیب کی۔ یہ ذات خداوندی سے بعید ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ: "جو شخص کہتا ہے کہ خیر و شر خدا کی طرف سے ہے اس نے خدا کی تکذیب کی۔" چنانچہ خدا کی تکذیب ہے۔ اس لیے کہ کیا خداوند تعالیٰ نے اپنے بندوں کو ایک صاحب ارادہ نفس اور حق و باطل کا تمیز نہیں عطا کیا ہے کہ وہ اپنے لیے اپنی راہ اختیار کر لے؟

یہ تھے جنہیں اس کا ادعا ہو سکتا تھا کہ ہم اصل (جڑ) ہیں ہر غیر کی اور ہر اور نئی ہماری فرع ہے۔ اور جب یہ کہہ سکتے تھے تو یہ دوسرا

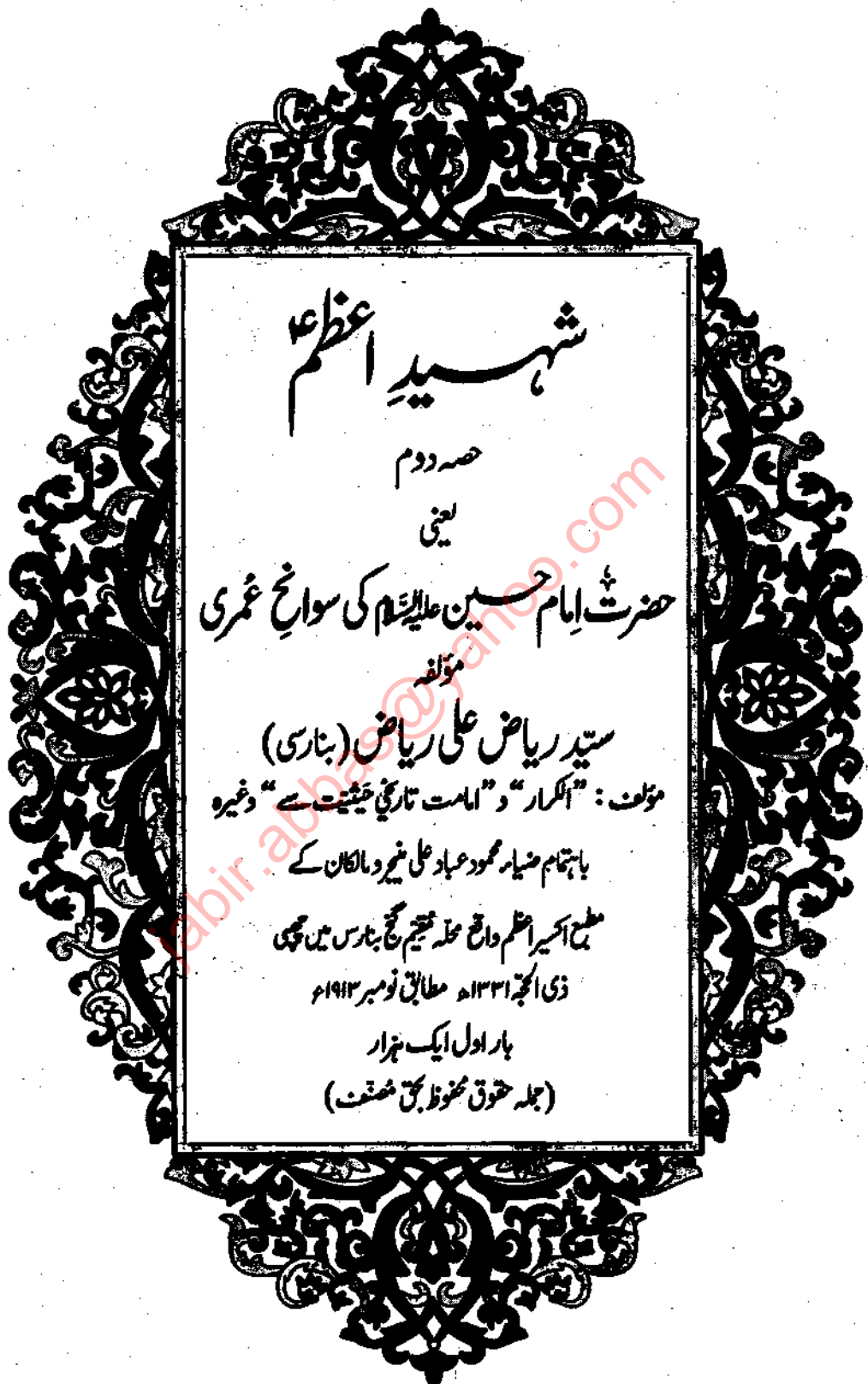
بلند ادعا جو مؤید بہ تاریخ ہے

فقہ اس کا دوسرا پہلو ہے کہ ”ہمارا دشمن اصل ہر شر ہے اور اس کی فروع کل برائیاں ہیں۔“ ان کی تاریخ یہ کہتی ہے کہ یہ یزید واقعہ کے اور کچھ نہیں کہہ رہے تھے حسین ہی تو تھے جو معلویہ کو چیلنج دے رہے تھے کہ اگر یزید کو میری برائیاں معلوم ہوں تو وہ بلا تردد بیان کرے۔ ایسے پاک، ایسے خالص، ایسے ظہر اگر مصوم میں الخطا کچھ جاتے ہیں تو یہ کوئی اور مانگے احتلاوی نہیں ہے بلکہ ان کے روزمرہ کی کہانی ہے۔ ان کا روزمرہ ایک دن، ایک مہینہ، ایک برس ایک صدی نہیں بلکہ صدیوں اس طرح گزرا کہ انہیں اپنی نیک نائی کے قائم رہنے کی امید نہ ہوتی چاہے محمدؐ کیا یہ حالت اس خیال کی گنجائش رکھتی ہے کہ ”ممنوع کیا بھیجے جسے روشن خدا کرے۔“ بچانے کی توانی کوشش ہوتی جس قدر ہو سکتی ہے لیکن نہیں بچا اور اس کا نور اب تک ہے جس میں زردی نہیں آئی زندہ ہے اور حیات بخشی کی قابلیت رکھتی ہے صرف شرط یہ ہے کہ ”غیر کی فرع سے تعلق نہ رکھتا ہو۔“ میں نہیں سوچتا کہ مذہب کے کسی پیرو کو اپنے امام کی علویت اور محمدؐ خیر ہونے سے بہتر کیا آماج ہو سکتا ہے۔ ہانپاں مذہب گزرے اور ایک اصول کی بنیاد ڈال گئے۔ وہ گزر گئے، ان کی ذات فراموش ہو گئی۔ اصول رہ گیا جو زمانہ کے ہاتھوں مستحیر ہو تا رہا۔ لیکن اس دین پر جس کے متعلق مشیت ایزدی متعین ہوئی تھی کہ وہ فارحہ کے طالب علم اور اس کی اولاد املا کے ہاتھوں شائع ہوتا، ان نفوس قدسی کا وہ گہرا نقش ہے کہ اصول ذات سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ اور یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں میں اپنے اصول مذہب کے مرکز اشاعت سے جو ذاتی محبت کا جوش ہے اس کا دوسرے مذہب میں تلاش کرنا تاریخ کو بھرے کھنا ہے۔

اپنی کتاب کے اس حصہ میں ہم وہ سب کہہ چکے ہیں کہ ہماری دانست میں کہنا ضروری تھا۔ اگرچہ طوائف کے لحاظ سے ہم نے بہت کچھ قلمزد کر دیا جو لکھا تھا۔ اے کاش کہ یہ طویل داستانیں اور ان کا ضمنی عکس یہ کام نہ لے سکا جو کہ ان تمام کی روشنی کار حسینؑ کی ذات اقدس کا تعارف کروا رہا ہو۔ داستانیں داستان فہمی کے لیے نہ تھیں بلکہ حسینؑ فہمی کے لیے۔ پہلی آخری چھوٹی چھوٹی روایتیں وہ تھیں جو حسینؑ سے درجہ ثانی کا تعلق نہ رکھتی تھیں۔ کسی بزرگ کے موجود اثر یا اور کسی طرح کے اثر کا اظہار نہ تھا بلکہ جو کچھ تھا اس سے حسینؑ اس طرح ظاہر ہوئے تھے جیسے وہ اس وقت تھے۔ اور وہ اپنے شو مغلت میں اس حد تک پختہ ہو چکے تھے کہ اپنے کو ہر غیر کی اصل اور ہر نئی کو اپنی فرع فرما سکتے۔ یعنی نیکیاں ان کے لیے اب تقلیدی اور نقلی حیثیت سے بڑھ کر عین ان کا خاصہ ہو گئی تھیں۔ ہمارا دوسرا حصہ جن واقعات دکھانے والا ہے وہ حسینؑ کے اس ادعا کا ثبوت ہو گا کہ حیدر برائی کے محل بھی کسی خیال کی طرف ان کا قدم اٹھانے کے لیے عمل تھا۔ اور ان صبر شکن اور باجواد ہاتھوں میں جو حسینؑ کے پہلے اور حسینؑ کے بعد کسی کے لیے نہیں ہوئیں اور جو واقعات سامنے آئے وہ لیے نہ تھے جن کے متعلق حسینؑ کا علم جسمہ اور خاصہ تصفیہ کی غلطی کر سکتا۔

(حصہ اول تمام شد)





(جلد حقوق محفوظ حق مصنف)

- نام کتب: ”شہید اعظم“ (حصہ دوم)
- یعنی حضرت امام حسین علیہ السلام کی سوانح عمری
- مؤلف: سید ریاض علی ریاض (بناری)
- مؤلف: ”الکرار“ و ”امامت تاریخی حیثیت سے“ وغیرہ
- باہتمام: ضیاء محمود جہا علی نیو دہلی کے
- مطبع: اکبر اعظم واقع محلہ منجم گنج بنارس میں مچی
- تعداد: بار اول ایک ہزار
- تاریخ اشاعت: ذی الحجہ ۱۴۳۱ھ مطابق نومبر ۱۹۱۲ء
- اشاعت ثانی: ۱۴۳۰ھ مطابق ۲۰۰۹ء
- کمپوزنگ: سید حسن علی
- الخطاط کمپیوٹر ۲۸۲۔ جہر کالونی سرگودھا
- فون: 048-3764705
- قیمت: روپے
- ملنے کے پتے:

شہید اعظم (حصہ دوم)

انڈکس ابواب

باب، ششم (رجب سنہ ۶ کے بعد) از صفحہ ۵۶۹ تا ۶۰۴

حاکم مدینہ کے نام زید کی اطلاع اور حکم مروان سے مشورہ بیعت زید کے لیے حضرت امام حسینؑ اور ابن زبیر کی طلبی حسینؑ کا اہتمام اور گفتگو ابن زبیر کے گھر کا دورہ حسینؑ روضہ رسول پر محمد بن حنفیہ سے گفتگو اور وصیت ابن عباس اور ابن عمر سے گفتگو زید کے مسائل مدینہ سے ہجرت مکہ میں داخلہ عمر بن زبیر اور عبداللہ بن زبیر کوفہ کے خطوط حضرت مسلم بن عقیلؑ کی روانگی زید کو مسلم کے کوفہ پہنچنے کی اطلاع حسینؑ کا خط اہل بصرہ کے نام اور ابن زیاد کو آگاہی ابن زیاد کوفہ کا عامل مقرر ہوا ابن زیاد کوفہ میں مسلم کا کردہ محترق ہو گیا مسلم ہانی بن عروہ کے گھر دوبارہ بیعت ابن زیاد ہانی کے گھر حسینؑ کے نام مسلم کے خط کی گرفتاری باسوی ہانی کی گرفتاری مسلم کا خروج اور لوگوں کی پاشلی مسلم طوع کے گھر جنگ اور گرفتاری گفتگو اور شہادت

باب، ششم (واقعات کاشو) از صفحہ ۶۰۵ تا ۶۳۹

آیا حضرت کی روش نزاعی تھی یا دفاعی

باب نہم (مکہ سے ہجرت) از صفحہ ۶۴۰ تا ۶۵۹

ہشام مخزومی کا اہل کوفہ کے منتقل ریمارک اور حسینؑ کا جواب ابن عباس دوبارہ آئے عبداللہ بن جعفر اور عمر بن سعید کا خط اور جواب زید کے اشعار اور جواب مکہ میں حضرت کا خطبہ اور روانگی امیر مکہ حسینؑ کو روکنے کی کوشش کرتا ہے حضرت محمد بن حنفیہ دوبارہ آئے مکہ سے کوفہ تک کی منزلیں اور واقعات

باب دہم (مشہد اعظم) از صفحہ ۶۶۰ تا ۷۲۳

کربلا میں قیام اور حضرت کے اشعار اور الفاظ ابن زیاد کا خط اور جواب ابن زیاد اور ابن سعد ابن سعد کربلا میں حسینؑ کے پاس قاصد بھیجتا ہے ابن سعد کا ابن زیاد کے پاس صلح کا خط اور جواب ابن زیاد کی کوفہ میں تقریر اور مکہ کی فوجیں ابن سعد کے نام سخت احکام گھاٹوں کی سخت مخالفت حضرت کا لشکر ابن سعد کے خطاب حضرت عباسؑ ہانی لائے شب کی گفتگو ابن زیاد کے سخت ترین احکام حضرت عباسؑ کے لیے امان اور جواب حضرت کا اہتمام مخالفت بریر اور ابن سعد دشمن کا کردہ طنز لشکر شام کی آلودگی جنگ اور شب کی شہادت حضرت کا اصحاب سے خطاب اور جواب روز عاشور جنگ اور شہادت اصحاب و حضرت

باب یازدہم (بعد شہادت اہل بیت کوفہ میں) از صفحہ ۷۳۳ تا ۷۵۱

شہادت اور تکبیر سوید بن مطعر حضرت کا گھوڑا اور اہل بیت کا مرثیہ۔ تاراجی خیام۔ کبر بن وائل کی ایک عورت۔ ہامی لاشہائے شہداء۔ قاتل کافراور انعام۔ لشکر شام کی کوفہ روانگی۔ دُش لاشہائے شہداء۔ مقتل حضرت سجاد اور زینب خاتون۔ ابن زیاد حضرت کا سر مبارک اور زید بن ارقم۔ کوفہ کی حفاظت۔ کوفہ میں اہل بیت کا قافلہ۔ حضرت زینب۔ اُمّ کلثوم۔ فاطمہ مغزی اور سیدہ سجاد کے خطبے۔ دربار ابن زیاد اور مکالمے۔ ابن عقیف۔

باب دوازدہم (اہل بیت دمشق) از صفحہ ۷۵۲ تا ۷۸۱

کوفہ سے دمشق تک کی منزلیں اور واقعات۔ دمشق کی حالت۔ ایک بڑھا اور امام۔ داخلہ دربار۔ زحر بن قیس کا بیان۔ زید کی دورگی۔ زید کے اشعار۔ حضرت زینب کا خطبہ۔ ہند۔ راس اہلوت۔ جاثق۔ حضرت اُمّ کلثوم۔ حضرت سکینہ اور زید۔ ایک شامی کا سوال۔ حضرت امام زین العابدین اور زید۔ حکم قتل اور واپسی۔ شامی خلیفہ۔ امام منبر پر خطبہ کا اثر اور زید کی کوششیں۔ شہادت کے متعلق زید کا جاہل اور انگشت حقیقت۔ رہائی اور دمشق کا ماتم۔

باب سیزدہم (اہل بیت مدینہ) از صفحہ ۷۶۹ تا ۷۷۳

دمشق سے روانگی۔ کربلا۔ مدینہ میں بشیر کے اشعار۔ مدینہ کا عالم۔ امام زین العابدین علیہ السلام کا داخلہ۔ حضرت محمد ابن حنفیہ۔ حضرت اُمّ کلثوم کے اشعار۔ امام کے اشعار۔

باب چہار دہم (شہادت حسین کے بعد متعلق باتیں) از صفحہ ۷۷۳ تا ۸۰۳

سر مبارک۔ غم حسین کا شوق نما۔ بعد شہادت قلم کی مثالیں۔ شہادت بلندی مرتبہ کے لیے۔ قرآن سے سند کہ حسین فرزند رسول ہیں۔ مکہ اور مدینہ کی تاراجی۔ زید کی موت۔ زید کے خلاف فروعی قاتلان حسین نیست و نابود ہوئے۔ نبی امیہ کی تباہی۔ سوال کہ آیا حضرت آسمان پر اٹھالیے گئے۔ سوال کہ خدا دشمن کو دوست پر کیوں مسلط کرتا ہے۔ حسین کا مرثیہ۔ مجالس حسین۔ رم تاجی شی دہلی عزم اور شاہانہ لطف۔

باب پانزدہم (تبصرہ) اصحاب از صفحہ ۸۰۵ تا ۸۵۲

باب شانزدہم (تبصرہ) اہل بیت از صفحہ ۸۵۳ تا ۸۷۹

باب ہفت دہم (تبصرہ) حسین از صفحہ ۸۸۰ تا ۹۰۳

مولف کے عذرات اور مسئلہ زبان



باب ششم رجب شہ کے بعد

پہلے حصہ کتاب کو اسباب شہادت حسینؑ سے تعلق تھا یہ حصہ شہادت حسینؑ کا ہے

رجب شہ معاویہ کے وداعی انتظامات
اب ہم جو کچھ لکھیں گے وہ نتیجہ ہوگا ہماری گزشتہ تحریر کا اور اسے زیادہ تر معاویہ کے وداعی انتظامات سے تعلق ہوگا جس کا باب ششم میں مذکور کیا گیا۔ اس وقت کے بعض الفاظ وہ معاویہ کی وصیت کے ہوں، مزید کے ہوں، یا خماک بن قیس کے ظاہر کرتے ہیں کہ اموی حکومت کے یہ اراکین باوجود ان تمام باتوں کے جو آل ہاشم کے کمزور بلکہ نیست و نابود کرنے کے لیے ہو چکی تھیں بنی ہاشم کے عود اختیار سے خوف زدہ تھے۔ اس سے زیادہ صاف اور غیر مشتبہ لفظ کیا ہوں گے جو مزید معاویہ سے کہتا ہے کہ: ”میری تجدید بیعت کے لیے کوشش کرو ورنہ خون ہے کہ اگر لوگوں نے عہد اُبیعت نہ کی تو آل ابوتراب سے مجھے رنج پہنچے۔“ یا خماک کی پر رنوخ ہو خواہی اور سفاک کہ: ”ہم راضی نہیں ہیں کہ حکومت ابوسفیان کے خاندان سے آل ابوتراب میں منتقل ہو۔“ کیا رہ گیا تھا اب بنی ہاشم کے پاس جس کا خون تھا فوج، روپیہ یا حکومت کچھ تو نہ تھی۔ لیکن ایک حکومت تھی۔ حکومت قلبد اور اسلام پر ان کی ذات کا ایسا گہرا نقش تھا جو کسی جگہ سے مٹایا نہیں جاسکتا تھا نہ مٹا لیکن مدبرین اپنی اس بے خواب کوشش سے کیوں باز آتے کہ علانیہ ناس اور اس اثر کے درمیان پردہ ڈالتے اور حتی الوح اس میں ربط نہ ہونے دیتے۔

ایک اصول کا استقرار
تجزیہ پیش کرنا یا توجہ دلانا ہوا خواہوں کا کام اور اساس مصلحت سر حکومت کا فرض تھا۔ معاویہ نے واقعہ کو تسلیم کیا اور چلتے چلتے تاکید کردی کہ: ”خلیفہ مقتول کے ورثہ کو آل ابوتراب پر مقدم رکھنا اور بنی امیہ اور بنی عبدالمطلب کو بنی ہاشم اور دوسرے لوگوں پر حاکم مقرر کرنا۔“ معاویہ کوئی نئی بات نہ کہہ رہا تھا بلکہ اس مصلحت کی تجدید کر رہا تھا کہ بنی ہاشم اختیارات میں شرکت سے دور رکھے جائیں اور اسے معاویہ سے بہتر کون کچھ سکتا تھا کہ یہی شرکت تھی جس نے اسے آج ممالک اسلامی کا فرمانروا بنا دیا اور دوسری مصلحت بھی وہی مصلحت تھی جس کی مثالیں دی جا چکیں کہ کوئی رقیب بنایا جاوے اور وہ کسی طرح اس کام آئے کہ علی اور اولاد رسول کو فراموش کرا سکے۔ لیکن معاویہ محض اسی پر قانع نہ تھا کہ بنی ہاشم بے اختیار رہیں، بلکہ اس کا بھی اہتمام کیا کہ ان کے دشمن ان پر حاکم رہیں، اور ان کے علاوہ اور لوگوں پر بھی یعنی حکومت کے لیے بنی امیہ کو چن لیا تھا۔ ہم اسے گزشتہ صفحات میں دکھانے کے ہیں کہ کس طرح رسول کے بعد سے اصول مساوات منسوخ ہوتا جاتا تھا اور اختیار و حکومت میں وہ لوگ شریک کیے جاتے تھے جنہوں نے حصول اختیار میں مدد دی ہو۔ عثمان کے زمانہ میں بنی امیہ ہر اعلیٰ عہدہ پر دکھائی

دینے لگے تھے لیکن حکومت نے اور لوگوں کے غلبہ کی کوئی نوٹس نہیں دی تھی۔ اگرچہ طرز عمل اس سے الگ نہ تھا لیکن معاویہ کے لیے رفتہ رفتہ زمانہ آگیا تھا کہ اب نہ کوئی اعتراض کر سکتا اور نہ اسے اس وصیت میں ادنیٰ تردد ہوتا کہ بنی امیہ حاکم قوم قرار دی جائے۔ مجھے کچھ نہیں کہنا ہے کہ یہ مصلحت کبھی تھی، اس لیے کہ اس کے ماضی کا بیز اس کے کوئی دوسرا حال نہیں ہو سکتا تھا۔ لیکن مجھے یہ کہنا ہے کہ حکومت اسلامی کی یہ صورت ہو گئی تھی کہ بیز اس گروہ کے جو برسر حکومت تھا اور اسلامی گروہ اس کے نفاذ اختیار میں شریک ہونے کے قابل نہ تھا۔

اس اصول کی وجہ، بے اعتباری

بے اعتباری کی یہ ترجیحی مصلحت اس لیے تھی کہ انھیں اور مسلمانوں سے اس کی امید نہ ہو سکتی تھی کہ وہ ہر امر میں موافقت کریں گے۔ موافقت نہ کرنا نظام کی اموی روح میں ابتری کسے جا جس کا نتیجہ یہ ہو سکتا ہے کہ بنی امیہ کے ہاتھ سے اختیار جاتا ہے اور یہ تو بحث کے میدان سے بہت دور ہے کہ وہ بنی ہاشم سے کہاں تک اپنی روش میں موافقت کی امید کر سکتے تھے۔ لیکن آل رسول کی بیخ کنی کی کوششیں کچھ اس بنا پر نہ تھیں کہ وہ موافقت نہ کریں گے یا ان کی مخالفت کا اندیشہ تھا، بلکہ تجربہ تھا کہ

وہ مخالفت نہ کریں گے اور خاموش رہیں گے۔ خوف ان کے کسی عملی مخالفت سے نہ تھا بلکہ ان کا دماغ میں لوگوں کے سامنے رہنا ہی افراد حکومت کے نزدیک خطرہ کی چیز تھی۔ آل رسول کے پاس اس کا کوئی علاج نہ تھا کہ وہ کیوں ایسے ہیں۔ اس کے لیے وہ اپنی روش سے اطمینان دلا سکتے تھے۔ حکومت کا اندیشہ دور کرنے کے لیے قوی خود کشی نہ کر سکتے تھے۔

اور جب معاویہ اپنے کو اپنی جگہ مضبوط دیکھ رہا تھا اور ہر شاخ حکومت بنی امیہ کے لیے مسلم کر دی تھی تو اس کے نزدیک اب یہ حکم دیا جاسکتا تھا کہ: ”جس شخص پر یہ عہد نامہ پڑھا جائے وہ اپنے امیر زید کی اطاعت کرے اور جو شخص کلمے یا انکار کرے زید کو اختیار ہے کہ اس پر تلوار چھینے اور اسے قتل کرے جب تک کہ اس کی خلافت اور امارت کا اقرار نہ کرے اور مطیع نہ ہو جائے۔“ یعنی حکومت کو اپنی قوت پر اب اس درجہ اطمینان تھا کہ ناموافق اور نیوٹرل لوگوں کو مخالفت کچھ سکتی اور بغیر اقرار لیے نہ چھوڑتی۔ یہاں یہ دیکھنے کی بات ہے کہ یہ ایک ایسا تجربہ تھا جس سے معاویہ نے اپنی حیات تک پرہیز کیا۔ یعنی اسے عملی سیاست قرار نہ دیا تھا۔

ایک حکم

کوئے لوگوں سے ناموافقت کا خوف تھا

یہ کہا جا چکا ہے کہ معاویہ کو کون سے لوگوں سے ناموافقت کا خوف ہو سکتا تھا۔ گزشتہ زمانہ میں چار آدمی اس کے لیے مخضوم تھے۔ لیکن زید کے دور حکومت تک عبدالرحمن بن ابی بکر نہ رہے تھے۔ ابن عمر نے نہ صرف بیعت کر لی تھی بلکہ وہ حسین سے بھی ایسا ہی چاہتے تھے۔ اب بطلہ یہ وصیت یزید عبداللہ ابن زبیر اور حسین بن علی کے کسی دوسرے کے لیے نہ ہو سکتی تھی۔

زید کی حکومت کے اسباب

زید سے بڑھ کر کسی اپنی حکومت کا یقین اور اطمینان ہو سکتا تھا جس کے پہلے ایک سیاسی جوش کا آدمی حکومت کر چکا تھا اور ان سامانوں کو ٹھپا کر تاراج اپنے کو مضبوط اور کسی مخالفت کو کمزور کرتا رہا۔ اور سب سے مفید بات یہ تھی کہ بنی امیہ میں نہ صرف حکومت کی

لذت پیدا ہو گئی تھی بلکہ وہ دیگر بنی امنیہ میں اپنی قوی اور سیاسی قوت دیکھتے تھے اور ہر ایک کو اس کی فکر تھی کہ اختیار ہمارے ملقہ سے نکل کر باہر نہ جانے پائے۔ سیاست ان کا مذہب، سیاست ان کا اخلاق اور سیاست ان کی فہمائیں۔ اب جس فہمائیں ان کے اختیارات کا نشو و نما تھا اس کے لحاظ سے ان کی سیاست کی نوعیت بجز اس کے نہ ہو سکتی تھی جس سے زیادہ ظاہر شاید ہی اسلامی تاریخ میں کوئی اور بات کہی جاسکے۔

یزید کا ایک اعلان جس سے آئندہ پر روشنی پڑتی ہے سلمانوں کا غرہ اور معاویہ کی وصیتوں کی رہنمائی تھی جس سے

اس نے اپنی آئندہ روش بے کھٹکے ظہر کر دی کہ: ”عتریب ہم میں اور ہم سے دشمنوں میں جنگ ہوگی۔“ آئندہ واقعات بتائیں گے کہ یزید کے دشمن کون تھے۔ میں یہ کہہ چکا کہ میرا پہلا حصہ اسباب شہادت حسینؑ کا تھا۔ اب پیش نظر حصہ شہادت حسینؑ کا ہے۔ اور حقیقتاً یہ حصہ میرے پہلے حصہ کا نہ صرف لازمی نتیجہ بلکہ طبعیتوں اور ان کے عناصر کا آئینہ بھی ہے۔

مؤلف اب واقعات لکھتا ہے اب میں واقعات کی طرف بڑھتا ہوں۔ ابن خلدون کہتا ہے:

یزید کا حکم امیر معاویہ کے مرنے کے بعد بیعت خلافت یزید کے ہاتھ پر کی گئی۔۔۔ اس کی توجہ پوری اس طرف تھی کہ ان لوگوں سے بیعت لینی چاہیے جنہوں نے اس کی ولیعهدی کی بیعت سے امیر معاویہ کے زمانہ میں انکار کیا تھا۔ چنانچہ اس نے ولید بن عقبہ کو امیر معاویہ کے انتقال کا حامل لکھا۔ اور نسیبہ تحریر کیا کہ: ”بلا تاخیر حسین بن علی، عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن زبیر سے بیعت لے لو۔“

کامل ابن اثیر کے موافق اطلاعی خطوط کے علاوہ اک دوسرا نوشتہ تھا جس میں حاکم مدینہ کو تاکید کی گئی تھی کہ: ”نہ چھوڑنا یہاں تک کہ بیعت کریں۔“ اعثم کوئی کہتا ہے کہ: ”اگر وہ بخوشی بیعت کر لیں تو اچھا ہے ورنہ ان سے بھیر بیعت لے اور ان میں سے جو شخص بیعت نہ کرے اسے قتل کر کے سر میرے پاس روانہ کر۔“

بعض مؤرخین کی ایک روش ابو اسحاق اسفرائینی نے عام مؤرخین سے الگ واقعہ خوانی کی ہے۔ جہاں وہ دو صفحوں میں معاویہ سے وصیتیں کراتا ہے جو زیادہ رحیمیت کے ساتھ

حسن سلوک کی نصیحتیں ہیں اور غالباً یزید تائید کے لیے حسینؑ کو معاویہ کے ہمراہ دمشق میں رکھتا ہے۔ اور معاویہ کے انتقال کے بعد دمشق ہی میں یزید اور ابام حسین علیہ السلام سے غلط کتابت ہوتی ہے۔ قابل واقعہ نویس کی روش ان لوگوں کی سی ہے جن کے نزدیک قاتل و مقتول برابر ہیں یا جیسا صاحب صواعق عرقہ نے اذاکر اصحابی فامسکوا کی شرح میں ایک رات دکھایا ہے۔ یا جو ان روایات کے قائل ہیں کہ معاویہ حدیث سن کر شادی ہی نہیں کرتے تھے کہ مبادا یزید پیدا ہو اور اس کے بعد تقدیر کا پھیر کہ پیدا ہی ہو گیا۔ اب چارہ ہی کیا تھا۔

تفریق سے حکومت کا اصول۔ ولید اور مروان میں مشورہ کامل کے موافق ولید بن عقبہ معاویہ کی خبر موت سن کر گھبرا یا

اور اس نے مروان بن حکم کو طلب کیا، جو ان دنوں اس کی ماتحتی میں کام کرتا تھا۔ ان دونوں میں کچھ بے لطفی بھی تھی۔ جے

ابن غلدون نے لکھا ہے کہ: کس طرح معلویہ ایک گامگرد دوسرے کے ہاتھوں کھدوانا چاہتا تھا۔ لیکن چونکہ معلویہ کی موت اور حسینؑ سے انذبیعت دونوں بڑی باتیں تھیں ولید نے مناسب سمجھا کہ اس وقت گزشتہ کشیدگیوں کا کھانا نہ کیا جائے۔
تاریخ غیس کے موافق آج شب یکشنبہ قحی اور
شب یکشنبہ ۲۸ رجب ۶۰ھ

مروان آیا، ولید نے خط دیا۔ پڑھا اور اب قبول ابن غلدون: ”ولید نے ان لوگوں سے بیعت لینے کی بابت اس سے مشورہ طلب کیا۔ مروان نے رائے دی کہ: ”اسی وقت وہ لوگ بلوائے جائیں۔ اگر زید کی بیعت کر لیں تو بہتر ورنہ اس سے پیشتر کہ وہ امیر معلویہ کے انتقال سے واقف ہوں قتل کر ڈالے جائیں۔ کیونکہ انتقال امیر معلویہ سے واقف ہو جانے پر ہر شخص ان میں کادھی خلافت ہو جائے گا۔ ہاں ابن عمر ایک ایسے شخص ہیں جو طرائی جھگڑے سے بھاگتے ہیں اور خلافت کو پسند نہیں کرتے۔ مگر یہ کہ کل مسلمان شیخ ہو کر ان کو خلیفہ بنائیں۔“

حسینؑ کے متعلق خیال
اعظم کوئی اس کے بعد آگے بڑھتا ہے کہ ”اس لیے بالفعل اسے (ابن عمر کو) تو رہنے دے اور کچھ نہ کہہ حسینؑ اور عبدالرحمن اور عبداللہ بن زبیر کو بلا کر بیعت لینے کی تدبیر کر۔ اور خوب کہے کہ حسینؑ ہرگز زید کی بیعت اختیار نہ کرے گا۔ خدا کی قسم اگر میں تیری جگہ ہوتا تو حسینؑ سے کچھ بھی نہ کہتا اسے قتل ہی کر ڈالتا اور ذرا نہ ڈرتا۔“ ولید کو متردود بھیج کر: ”اے امیر تو غمگین نہ ہو اپنے کام کی طرف متوجہ ہو۔ آل ابوتراب ہمیشہ کی ہماری دشمن ہے۔ انھوں نے عثمان کو مارا ہے۔ معلویہ کے ساتھ جو معرکہ آرائیاں کی ہیں وہ تو نے بھی دیکھی اور ملاحظہ کی ہیں۔ اگر جلدی نہ کرے گا اور حسینؑ کو معلویہ کی وفات کی خبر ہو جائے گی تو وہ تیرے ہاتھ نہ آنے گا۔ زید کی طرف سے تیری حرمت اور مرتبہ کو نقصان پہنچے گا۔“

آخر بلانا طے پایا۔ روضۃ الشفا اور ناخ التواریخ کے موافق جس کو بلانے کے لیے بھیجا اس کا نام

ولید کے قاصد کا نام بلانے کا وقت
عمر بن عثمان تھا۔ طبری کے موافق بنیرہ عثمان تھا۔ تاریخ غیس کے موافق ”رات کو بلایا۔“ کمال کہتا ہے کہ: ”جس وقت حسینؑ وغیرہ کو طلب کیا وہ وقت ولید کے دربار کا نہ تھا۔“ ابن غلدون کہتا ہے کہ: ”ولید نے اسی وقت عبداللہ بن عمر ابن عثمان ایک نو عمر لونڈے کو ان لوگوں کے بلانے کو بھیجا۔ پس حسینؑ و ابن زبیر کے پاس مسجد میں یہ اس وقت پہنچا جس وقت کہ ولید اجلاس عام نہ کرتا تھا۔ اور ان دونوں بزرگوں سے کہا کہ: ”چلیے آپ کو امیر بلاتے ہیں۔“ حسینؑ و عبداللہ بن زبیر نے کہا: ”تم جاؤ ہم آتے ہیں۔“

حسینؑ کہاں تھے، جواب
اعظم کوئی کے موافق یہ لوگ قبر عثمان کے پاس بیٹھے تھے اور حسینؑ نے قاصد کو جواب دیا کہ: ”جب ہم گھر جائیں گے تو وہاں بھی جتے جائیں گے۔“

حسینؑ اور ابن زبیر میں مضمون طلب پر
گفتگو، حسینؑ کا صحیح استنباط اور تصفیہ
اس کے بعد عبداللہ بن زبیر نے امام حسینؑ سے کہا کہ اے ابا عبداللہ یہ وقت تو امیر کے اجلاس کرنے اور

امورات سلطنت میں مشورہ لینے کا نہیں نہ معلوم اس نے اس وقت میں کیوں بلایا ہے۔ میرے دل میں گھبراہٹ پیدا ہو گئی ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے۔ امام حسینؑ نے کہا کہ میرا دل گواہی دیتا ہے کہ معلویہ مرگیا۔ عبد اللہ بن زبیر نے کہا: تو میں اس لیے بلاتا ہوں کہ زبیر کے واسطے ہم سے بیعت لے۔ تم اس معاملہ میں کیا کرو گے؟ امام حسینؑ نے کہا: ”میں زبیر کی بیعت اختیار نہ کروں گا۔ کیونکہ معلویہ نے میرے بھائی کے ساتھ اس شرط پر عہد کر لیا تھا اور قسم کھائی تھی کہ اس کے مرنے کے بعد خلافت مجھے ملے گی اور وہ ہر گز اپنی اولاد میں سے کسی کو خلیفہ مقرر نہ کرے گا۔ اگر معلویہ مر گیا ہے اور اس نے اپنے قول و اقرار کو پورا نہیں کیا ہے تو بڑا اہم کام واقع ہوا ہے۔ کیا تیرا خیال ہے کہ میں زبیر کی بیعت اختیار کر لوں۔ زبیر شرابی، جھوٹا اور علانیہ فسادی شخص ہے۔ وہ کتوں اور چیتوں سے کھیلا ہے ہم رسول خدا کے اہل بیت ہیں ہم سے ایسی بات وقوع میں نہیں آسکتی۔“

قاصد کی دوبارہ مداخلت اور حسینؑ کا جواب
ابھی یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ دوسرا قاصد آیا اور کہا: ”امیر تمہارا منتظر ہے۔“ امام حسینؑ نے کہا: ”تجربہ رفت ہے کب تک بلانے جانے گا۔“ اگر کوئی نہ آئے تو نہ آئے میں ابھی آتا ہوں۔“ ولید کا قاصد الٹا چلا گیا اور (جا کر) کہا کہ: ”حسینؑ نے تیرے کہنے کو منظور کر لیا ہے۔ ابھی میرے پیچھے آتا ہے۔“ مروان نے کہا: ”وہ نہ آئے گا تجھے دھوکا دیا ہے۔“

حسینؑ کی خصلت اور ولید
ولید نے کہا کہ: ”ایسی بات نہ کہہ کہ حسینؑ بے وفا نہیں۔ جو کہتا ہے اسے پورا کرتا ہے۔“ رومنہ العفا کے موافق ولید نے کہا کہ: ”حسینؑ خدا نہیں ہیں۔“

حسینؑ اور ولید کے پاس جانے کا انتظام
اب امام حسینؑ نے مہراہیوں سے کہا: ”تم چلے جاؤ میں بھی اپنے گھر جاتا ہوں۔ پھر ولید کے پاس جاؤں گا۔“ عبد اللہ بن زبیر نے کہا: ”میری جان تم پر سے خدا ہو مجھے اندیشہ ہے کہ مہراہیوں سے تم اس کے پاس جاؤ (وہ) تمہیں قید کر لے۔ یا خدا نخواستہ مار ڈالے۔“ امام حسینؑ نے کہا: ”میں اس کے پاس تنہا نہ جاؤں گا۔ اپنے دوستوں میں سے کچھ لوگ ہمراہ لوں گا۔ اور کہہ دوں گا کہ ہتھیار لے لیں اور زیر دامن چھپا لیں۔ پھر اگر کسی نے میری طرف بری نگاہ سے دیکھا تو میں اسے فنا کر دوں گا۔ تو جس قدر آسان بات کہتا ہے اس قدر آسانی سے کوئی فخر پر قابو نہیں پاسکتا بلکہ سخت مشکل کام ہے۔ اور جو لکھا جا چکا ہے وہ ہو کر رہے گا۔“

”پھر سب رسول خدا کی قبر پر آئے اور ایک دوسرے کو رخصت کر کے اپنے اپنے گھر گئے۔ امام حسینؑ نے غسل فرمایا۔ عمدہ لباس پہنا۔ دو رکعت نماز ادا کی پھر کسی شخص کو بھیج کر اپنے دوستوں اور عزیزوں کو بلایا۔ سب حال سنا کر کہا کہ اپنے اپنے اسلحہ زیر دامن چھپا کر میرے ساتھ چلو۔ ولید کے دروازہ پر ٹھہرے رہنا۔ اگر سنو کہ میں بلند آواز سے بول رہا ہوں اور تمہیں طلب کرتا ہوں تو بلا روک ٹوک تم اندر چلے آنا۔ جے میرے درپے دیکھنا اسے ہٹا دینا اور اگر کسی کو میرے قتل پر آمادہ پاؤ تو اسے مار ڈالنا۔ جب تک تمہیں یہ امر معلوم نہ ہو کہ کوئی میرے قتل کا ارادہ رکھتا ہے تو خاموش بیٹھے۔“

رہتا ذرا اہل ہوتا اس کے بعد رسول خدا کی حصالے کر گھر سے باہر تشریف لائے۔ تیس یکتا پہلور ساتھ تھے۔

مردان اور ولید کی صلح پر حسینؑ خوشی ظاہر کرتے ہیں

رہا کو دروائے پر بٹھا کر تاکید کر دی۔ خود اندر تشریف لے گئے ولید نے مناسب خیر مقدم کیا اور حسینؑ نے مردان اور ولید کو ایک جگہ دیکھ کر قبول کامل فرمایا: ”مسلحہ رحم کرنا قطع رحم سے اور صلح فلا سے بہتر ہے۔“ ولید اور مردان خاموش رہے۔ اس کے بعد حسینؑ نے وجہ طلبی دریافت کی اور معاویہ کا حال پوچھا۔ ولید نے معاویہ کی موت کی خبر دی اور آپ نے قبول اعظم کوئی سوال بیعت اور حسینؑ کا جواب فرمایا: ”اللہ تعالیٰ اس کی موت سے تمہیں ثواب عظیم عطا کرے۔“

سوال بیعت زید کے متعلق قبول ابن خلدون فرمایا: ”میرے نزدیک یہ مناسب نہیں ہے کہ فخر ایسا شخص غیہ طور سے بیعت کرے اور یہ کچھ موزوں اور کافی بھی نہ ہوگا، بلکہ جب میں یہاں سے اٹھ کر لوگوں میں جاؤں اور تم ان سبوں کو بیعت کے لیے بلاؤ گے اور میں بھی ان لوگوں میں ہوں گا تو سب کے پہلے میں ہی جواب دینے والا ہوں گا۔“

ولید نے حسینؑ کے اس جواب کو پسند کیا۔ مجھے بھی ولید کے الفاظ اور انداز کے لحاظ سے مؤرخین کے اس ریمارک سے اتفاق ہے کہ ولید ”عالمیت پسند تھا۔“ لیکن مردان کا تعارف اب تک جس حد تک چھپکا ہے اس سے اس کا طبی علیہ صیغہ راز کی چیز نہیں ہے۔

مردان کو ولید سے اختلاف ہوا اور اس نے کہا: ”ان کو بغیر بیعت کیے نہ جانے دو ورنہ ان ایسے شخص سے بیعت نہ لے سکو گے جب تک تم میں اور ان میں

فون کا دریا نہ رواں ہوگا اور اگر تم ایسا نہیں کرو گے تو میں لپک کر ان کی گردن اڑا دوں گا۔“ (ابن خلدون) حسینؑ قبول اعظم کوئی: ”امام حسینؑ غصہ ہو کر اس کی طرف چلے۔“ قبول کامل: ”اچھل پڑے۔“ اور قبول ابن خلدون: ”ڈانٹ کر کہا: ”تو یادہ مجھے قتل کرے گا؟۔ واللہ تو جھوٹا ہے۔“ مردان یہ سن کر دب گیا۔“

حسینؑ کی آواز اور رفقار قبول اعظم کوئی: ”آپ کی زبان سے یہ الفاظ بلند آواز سے نکلے اور آپ کے دوستوں نے جو آواز کے منظر تھے سنتے ہی تلواریں نکال لیں اور چاہا کہ ولید

کے گھر میں گھس جائیں کہ اتنے میں امام حسینؑ باہر چلے آئے اور کہا بس غمہ جاؤ۔“ اب امام حسینؑ اپنے گھر تشریف لائے۔ قبول ابن اثیر مردان کی صلح قتل پر جب ولید نے کہا کہ: ”حسینؑ کو قتل کر کے جو حساب دینا ہوگا وہ بہت ہی خفیف المیزان ہوگا۔“ تو مردان نے طنزاً کہا کہ: ”کچھ کہتے ہو۔“

ولید اور مردان راستہ کا مکالمہ

اعظم کوئی دوسرے دن پھر حسینؑ اور مردان کا ایک مکالمہ لکھتا ہے جس کے بعض خوبصورت خیالات میں درج کرتا ہوں: ”امام حسینؑ دوسرے دن اپنے مکان سے باہر تشریف لائے کہ دیکھیں کیا کیفیت ہے۔ مردان کوچہ میں ملا۔ کہا اے ابابعد اللہ میں تجھے نصیحت کرتا ہوں اور تیری بھلائی کی بات کہتا ہوں کہ زید کی بیعت منظور کر لے تاکہ مجھے کچھ صدمہ اور رنج نہ پہنچے اور یہ فساد مٹ جائے۔ زید بھی یہ خبر سن کر تمہارے

ساتھ بہت اچھے سلوک کرے گا۔ اگر میری بات مان لو گے تو دین اور دنیا دونوں جگہ تمہارا بھلا ہوگا۔ امام حسینؑ نے فرمایا: **إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ**۔ آج اسلام کمزور ہو گیا اور آدمی مصیبت میں پھنس گئے۔ اے مردان! زبیر کون شخص ہوتا ہے جس کی بیعت کے واسطے تو مجھے نصیحت کرتا ہے تو اسے خوب جانتا ہے کہ وہ شراب خور اور جھوٹا ہے۔ تو نے یہ بات بہت ہی بے وقوفی اور نادانی کی کہی۔ میں تجھے اس نصیحت کے واسطے جو ہزار ہا ملاحوں سے زیادہ ہے، برا نہیں کہتا۔ کیونکہ حجر سے اسی قسم کے امور سرزد ہوں گے۔۔۔۔۔ اے دشمن خدا تجھے معلوم نہیں کہ ہم رسول خدا کے اہل بیت ہیں۔ ہم ہمیشہ کاہلے ہوتے ہیں۔ میں نے اپنے نانا محمد رسول اللہ سے سنا ہے کہ آل ابوسفیان اور طلاق کے لیے خلافت حرام ہے۔ جب معاویہ کو میرے منبر پر بیٹھے دیکھو اس کا پیٹ پھاڑ ڈالنا۔ خدا کی قسم مدینہ والوں نے اسے میرے نانا کے منبر پر بیٹھے دیکھا اور کچھ نہ کہا۔ اس لیے خدا نے انھیں زبیر کے بچہ میں ڈالا۔ اس کے بعد کچھ دیر اور اور طہر کی باتیں جوتی رہیں اور آخر میں حسینؑ نے فرمایا: ”میرے سامنے سے دور ہو جا۔“ اور مردان نے ولید کو اس مسئلہ کی خبر دی۔

عبداللہ بن زبیر اور ولید
مجھے عبداللہ بن زبیر کے متعلق انکس مصلحت بھانے کے لیے اس قدر کہنا ہوگا کہ مؤرخین کے موافق ابن زبیر اپنے اعزہ کو ایک جامع کر کے کھریں چھپ رہے اور ولید کے پاس نہ گئے۔ ولید نے اپنے غلاموں کو گرفتاری کے لیے بھیجا۔ ابن زبیر کے گھر کا محاصرہ ہوا اور انھیں سخت دست کھلا۔ آخر میں ابن زبیر نے اپنے بھائی جعفر کی زبانی کہا بھیجا کہ ہم گھبرا گئے ہیں کل ضرور آئیں گے۔ اپنے غلاموں کو بلوالو۔ ولید نے منظور کیا اور اب ابن زبیر نے متعین کو شاہ راہ سے مکہ جانے کی ہدایت کی اور خود دوسرے راستے سے مکہ روانہ ہوئے۔ صبح کو ولید کو خبر ہوئی تو اس نے تیس اموی سائڈنی سواروں کو تعاقب میں بھیجا۔ لیکن گرفتار نہ ہوئے۔ ولید نے اب ابن زبیر کے تمام رشتہ داروں کو قید کر لیا۔ (احتم کوئی) زبیر کو حالات کی اطلاع دی گئی اور جواب یہ آیا کہ ”عبداللہ بن زبیر کو اس کے حال پر چھوڑ دو وہ جہاں عالمگیر کند کہیں جائے گا ہماری کند اس کے گلوگیر ہے۔ گدہ بولٹری چاند سے بھاگ کر کہاں جا سکتی ہے۔“ اسی خط میں تھا کہ: ”اس خط کے جواب کے ساتھ حسین بن علی کا سر میرے پاس میں دے۔“

عمال کا تباہی و تباہی
آخر میں ولید معزول ہوا اور عمر بن سعید الاشقر اس کی جگہ مائل مدینہ مقرر کیا گیا۔ جو ابن زبیر کے مکہ پہنچنے کے وقت وہاں کا حامل تھا اور جس سے انھوں نے کہا تھا کہ: ہم ”خانہ کعبہ کی پناہ لینے آئے ہیں۔“ بقول کامل عمال کا تباہی و تباہی کے مہینہ میں ہوا۔ بقول ابن خلدون: ”ان دنوں مکہ کا حامل عمر بن سعید تھا۔ اس کے ساتھ نہ تو وہ نماز پڑھتے تھے اور نہ اس کے ساتھ طواف کرتے۔ یہ اور ان کے ہمراہی علیحدہ کھڑے رہتے۔“

ابن حجر مکی صواعق عرقہ میں لکھتے ہیں کہ: ”سبب خروج حسینؑ آن بود کہ زبیر پلید چون در سنہ ۶۰ بمسند حکومت نشست رسول خود را نزد حامل خود کہ در مدینہ بود فرستاد کہ بیعت دے از حسینؑ بگیرد۔ حسینؑ براہین معنی اطلاع یافتہ بر نفس خود ترسید و بجانب مکہ توجہ نمود۔“ یعنی: امام حسینؑ کے مدینہ سے نکلنے کی وجہ یہ تھی کہ زبیر پلید جب سنہ ۶۰ میں مسند حکومت پر بیٹھا تو اپنے قاصد کو اپنے گورنر مدینہ کے پاس بھیجا کہ حسینؑ سے بیعت لے۔ حسینؑ اس بات سے انکار ہو کر

جان کے ڈر سے مکہ روانہ ہو گئے۔ اس کی تفصیل یہ ہے: کابل اور اعظم کے موافق بن زبیر کی شب روانگی کو حسینؑ سے کوئی تعرض نہ ہوا۔ حسینؑ اس رات کو روضہ رسولؐ پر تشریف لے گئے اور قبول اعظم کوئی فرمایا:

حسینؑ کا روضہ رسولؐ سے مخاطبہ

السلام علیک یا رسول اللہ! میں آپ کی فاطمہ کا بیٹا اور تمہارا
فرزند ہوں۔ جس کو دنیا سے رطبت فرماتے وقت آپ نے
امت کے حوالہ کیا۔ اور ان کو میری عزت اور حرمت کرتے رہنے کے لیے وصیت فرمائی تھی۔ واضح ہو کہ انھوں نے
آپ کی وصیت کو بھلا دیا۔ مجھے تنہا چھوڑ دیا۔ میں آج کی رات آپ سے آپ کی امت کی شکایت کرتا ہوں۔ اور جب
آپ کے پاس آ کر ملوں گا تو درد دل کا مفصل حال عرض کر دوں گا۔

یہی مورخ کہتا ہے: ”ولید نے اس دن بوقت شب آدمی بھیج کر امام حسینؑ کا حال معلوم کرنا چاہا۔ اور یہ
سن کر کہ آپ گھر میں موجود نہیں ہیں ولید نے کہا: ”شکر خدا کہ آپ اس شہر سے تشریف لے گئے اور
مجھے نیکوئی کے حکم کی تعمیل نہ کرنی پڑے گی۔“ (اعظم)

دوسری رات کو حسینؑ پھر روضہ مظہر پر تشریف لے گئے۔ نماز پڑھی اور مناجات کی کہ: ”اے خدا! یہ تیرے پیغمبر محمدؐ
کی خاک ہے۔ اور میں اس کی بیٹی کا بیٹا ہوں۔ مجھے ایسا کچھ معاملہ درپیش ہے جس سے تو ہی آگاہ ہے۔ اور میرے حالات اور
دلی کیفیتوں سے بخوبی واقف ہے کہ میں نیکی کو عزیز رکھتا ہوں اور برائی سے بیزار ہوں۔ اے ذوالجلال والا کرام اس خاک پاک
کے طفیل اور اس شخص کے واسطے جو اس تربت میں مدفون ہے مجھے اپنی اور اپنے رسولؐ کی رضامندی کرامت فرما۔“

اس کے بعد آپ بہت رونے اور قبر مظہر پر سر رکھ کے سو
رہے۔ خواب میں اپنے نانا محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ

حسینؑ کا خواب رسولؐ پر
(بہت سے فشتوں کے ساتھ جو آپ کے دائیں بائیں اور آگے پیچھے موجود ہیں) تشریف لائے امام حسینؑ کو اپنے سینہ سے
ٹکالیا۔ پھر پیشانی پر بوسہ دے کر فرمایا کہ: ”تو عترتِ ایسے شخصوں کے ہاتھ سے جو اسلام کا دعویٰ کرتے ہوں گے زمین کرلا
میں شہید ہوگا۔ اس وقت تو یہاں سا ہوگا اور وہ تجھے ایک قہر پانی نہ دیا گے۔ میرے پیارے حسینؑ تمہارے ماں باپ
میرے پاس ہیں اور تیرے دیدار کے مشتاق ہیں اور بہشت میں تیرے واسطے حالی شان در ہے مگر میں جو بغیر شہادت
حاصل نہیں ہو سکتے۔“ اب امام حسینؑ خواب ہی میں جواب دیتے ہیں کہ: ”اے نانا مجھے اپنے پاس ہی رکھ لیجئے۔ مجھے دنیا
میں واپس جانے کی ضرورت نہیں ہے۔“ آپ نے فرمایا: ”تجھے شہادت کی سعادت حاصل کرنی ضرور ہے۔“

حسینؑ بیدار ہوئے اور اہل بیت سے یہ خواب بیان کیا روضہ مطرہ سے پھر رخصت
ہوئے اور اب فاطمہ حضرت محمد بن حنفیہ سے باتیں ہوئیں۔ یہ صبح کا وقت تھا۔

نصف شب

محمد بن حنفیہ اور حسینؑ کی گفتگو
قبول ابن غلدون محمد ابن حنفیہ نے کہا: ”نیکوئی کی بیعت سے اعراض
کر کے کسی دوسرے شہر میں چلے جاؤ اور وہاں سے اپنے دعا کو

اطراف و جوانب بلاد اسلامیہ میں روانہ کرو۔ اگر وہ لوگ تمہاری بیعت منظور کر لیں تو اللہ تعالیٰ کا حکم یہ ادا کرنا اور اگر
تمہارے سوا انھوں نے مشتق ہو کر کسی دوسرے کو امیر بنالیا تو تم کو اس سے کوئی نقصان نہ ہوگا۔ نہ تمہارے دین کو مضرت

بچے کی اور نہ تھاری محل کو نہ اس میں تھاری آبروریزی ہوگی۔ مجھے اندیشہ اس کا ہے کہ کہیں تم ایسے شہر یا ایسی قوم میں نہ چلے جاؤ جس میں سے کچھ لوگ تمہارے ساتھ اور کچھ تمہارے مخالف ہوں اور جس سے بدی کی ابتدا تم ہی سے ہو۔ امام حسینؑ نے دریافت کیا: ”اچھا ہم کہاں جائیں؟“۔ جواب دیا: ”مکہ جلاؤ۔ اگر تم کو اطمینان کے ساتھ یہ باتیں حاصل ہو جائیں تو فیما در نہ ریگستان اور پہاڑوں کی گھاٹیوں میں چلے جانا اور ایک شہر سے دوسرے شہر کا رخ کرنا۔ یہاں تک کہ کوئی امر لوگوں کے اجتماع و اتفاق سے طے ہو جائے۔“۔ قبول کمال: محمد ابن حنفیہ نے کہا: ”جب تک محکم جو زید سے بیعت نہ کیجیے۔“۔ اعثم کوفی کے موافق کہا: ”آپ اپنے کو زید اور اس کے شہروں سے جس قدر محکم ہو دو رکھیں۔“۔ اور اگر لوگ بیعت کر لیں تو ”رسول خدا کی سنت اور علی مرتضیٰ کی سیرت کے ساتھ زندگانی کیجیے۔“۔ امام حسینؑ نے فرمایا: ”خدا کی قسم اگر دنیا بھر میں میرا ایک دوست بھی نہ ہوگا، اور کسی جگہ بھی امن و امان نہ ہاؤں گا تب بھی زید کی بیعت اختیار نہ کروں گا۔“۔ پھر فرمایا: ”میں اس وقت مکہ جانے پر کمر بستہ ہوں۔ بھائی بھائیوں اور دوستوں کو اپنے ہمراہ لے جاتا ہوں۔ وہ سب اس امر میں فخر سے متفق ہیں اور مخالفت نہ کریں گے۔ اگر تم مدینہ میں رہنا چاہو گے تو کچھ وقت کی بات نہیں تمہیں کوئی نہ ستائے گا۔ مگر لازم ہے کہ ان لوگوں کے قول و فعل اور حالات سے خبردار رہ کر جو کچھ واقعات پیدا ہوں ان سے برابر مجھے مطلع کرتے رہو۔ زید اور اس کے دوستوں کی کوئی بات فخر سے پوشیدہ نہ رکھو۔“۔ اس کے بعد وصیت نامہ لکھا: ”بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ یہ وصیت حسین بن علیؑ نے اپنے بھائی محمد ابن حنفیہ کے واسطے لکھی ہے۔ اور گواہی دیتا ہوں کہ اللہ ایک ہے اس کا کوئی شریک نہیں ہے اور محمدؐ اس کا بھیجا ہوا پیغمبر ہے جو آنحضرتؐ نے فرمایا سب صحیح ہے۔ بہشت اور دوزخ برحق ہے۔ قیامت آنے والی ہے۔ اس کے واقع ہونے میں ذرا شک نہیں۔ اللہ تعالیٰ تمام آدمیوں کو قبروں سے زندہ کر کے اٹھائے گا۔ میں حسینؑ ہوں۔ کسی ظلم یا فساد یا غارتگری یا دوری حق کے اندیشہ کے سبب سے مدینہ سے باہر نہیں جاتا ہوں۔ بلکہ محض امت محمدیؑ کی درستی کے واسطے جاتا اور چاہتا ہوں کہ نیکی کی ہدایت اور بدی کی ممانعت کے شرائط لوگوں پر ظاہر کروں۔ میں نے جب مصطفیٰ ﷺ سے اس امر کو سنا ہے کہ حسینؑ کی عمر کا ناتمہ قتل سے ہوگا۔“۔

ابن عباس اور حسینؑ کا مکالمہ
اس قد حرر فرمایا تھا کہ ابن عباس نے کہا: ”میری یہ رائے ہے کہ آپ زید کی بیعت اختیار کر لیں اور جس طرح معاویہ کے زمانہ میں صبر کیا ہے زید کے عہد میں بھی صبر کرتے رہیں۔ یہاں تک کہ کوئی ایسا عہدہ موقع پیدا ہو جائے جس سے آپ کو فائدہ پہنچے۔“۔

منہ فرمایا: ”یہ کیا کہتے ہو! میں وہ شخص نہیں ہوں جو زید کی بیعت اختیار کر لوں اور اس کے کہنے پر چلوں۔“۔
کہا: ”اے ابا عبد اللہ! آپ نے جو کچھ فرمایا وہ صحیح ہے۔ میں نے بھی آنحضرتؐ سے سنا ہے۔ اے حسینؑ میں دنیا میں کسی شخص کو رسول خدا کی بیٹی کا فرزند آپ کی ذات کے سوا نہیں پاتا اور اس امت پر حضور کی امداد ایسی فرض ہے کہ اس بغیر اللہ تعالیٰ اپنے مومن بندوں کی نجات اور زکوٰۃ کو بھی قبول نہ فرمائے گا۔“۔
منہ فرمایا: ”اے ابن عباس تو اس گروہ کو کیسا بگڑتا ہے جو رسول خدا کے فرزند کو اس کے گھر، وطن اور جائے پیدائش سے نکال دے اور حرم میں رہنے اور تربت رسولؐ کی زیارت کرنے سے محروم کر دے اور

اس قدر ڈرائے کہ وہ کسی جگہوں اور جگہ میں نہ ٹھہر سکے پھر اس کے قتل کا ارادہ کر لے۔ حالانکہ اس کی کچھ خطا اور قصور نہ ہو نہ وہ مشرک ہو۔

کہا: ”اس کے سوا اور کیا کہیں کہ وہ لوگ کافر اور خدا و رسول کے دشمن ہیں۔ اے فرزند رسول تم امیر اور سردار اور بزرگ شخص ہو۔ رسول خدا کے بیٹے اور رسول کی بیٹی کے نور نظر اور علی مرتضیٰ کے بھتر گوشہ ہو۔ یہ خیال نہیں ہو سکتا کہ اللہ تعالیٰ ظالموں کے اہل سے بے خبر رہے گا۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ جو شخص تیرے نانا کے راستہ اور طریقہ سے پھرے گا اے عاقبت میں کچھ نصیب نہ ہوگا۔“

”اے خدا میں بھی گواہی دیتا ہوں۔“

کہا: ”میری جان آپ پر خدا جو معلوم ہوتا ہے کہ آپ اپنی وفات سے مطلع کرتے اور مجھے اپنے واقعات کی خبر دیتے ہو۔ اور اللہ اور انبیاء کی خواستگار ہو۔ اسی خدا کی قسم جس کے سوا کوئی اور خدا نہیں کہ میں آپ سے آگے بڑھ کر اس قدر شفیق زنی کروں گا کہ میرے دونوں ہاتھ کٹ کر گرجا میں اور پھر بھی آپ کے حق مجھ سے ادا نہ ہوں گے۔“

اب ابن عمرو بن ابی اسلمی: ”اے ابی عباس اس بات سے باز آ۔ پھر امام حسینؑ کی طرف مخاطب ہو کر بولا۔ اے ابا عبد اللہ! تم اس ارادہ کو جو پیش نظر ہے

ترک کر دو اور ہمارے ساتھ مدینہ کو پھر چلو اور جس طرح اور لوگوں نے زید کی بیعت کر لی ہے تم بھی اس سے بیعت کر لو۔ اور اپنے مکان اور اپنے نانا کی تربیت سے آپ علیحدہ نہ ہوں۔ اور اپنے اوپر اس گروہ کی محبت قائم نہ ہونے دو جس کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے۔ اگر تم یہ چاہتے ہو کہ زید سے بیعت نہ کرو تو تمہیں اس کے لیے ضرور مجبور کریں گے۔ اور وطن میں اطمینان سے بیٹھنے نہ دیں گے تا وقتیکہ آپ اس کی بیعت اختیار نہ کریں اور ممکن ہے کہ زید کی عمر بہت تھوڑی ہو اور ہم اس کی طرف سے غنیمت ہو جائیں۔“ فرمایا: ”ایسی باتوں پر وقت ہے جب تک آسمان وزمین قائم ہیں۔ کیا تو کہہ سکتا ہے کہ میں غلطی پر ہوں اسے بیان کر کہ میں باز آ جاؤں۔“ کہا: ”آپ غلطی پر نہیں ہیں۔ نہ آپ سے ایسا ہونا ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسولؐ کی دختر کے فرزند کو غلطی یا سہو میں مبتلا کرے۔ مگر آپ نے بھی سنا ہوگا کہ زمانہ کارنگ بدلا ہوا ہے مبادا آپ کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں اور کوئی ایسی حرکت کر بیٹھیں جس کے مقابلہ کی طاقت آپ میں نہ ہو۔ اس لیے مناسب ہے ہمارے ساتھ مدینہ کو دایم چلے چلو۔“ فرمایا: ”میں ہرگز زید کی بیعت نہ کروں گا بلکہ اپنے نانا رسول خداؐ کی سنت اور اپنے باپ علی مرتضیٰ کی خصلت پر چلوں گا۔ جو شخص میری اطاعت کرے گا اور حق بات کو سننے کا لگیں اور سلاحتی حاصل کرے گا۔ اور جو شخص انکار کرے دائرہ اطاعت سے باہر ہو گا تو میں اس پر صبر کروں گا۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ مجھ میں اور اس میں فیصلہ کر دے گا۔ اور وہی سب سے اچھا حاکم ہے۔ میری بچی دمنیت ہے۔ پھر اپنے بھائی محمدؐ کی طرف متوجہ ہو کر کہا: اللہ تعالیٰ تم کو توفیق نیک عطا کرے۔ اے بھائی اب میں تم سے رخصت ہوتا ہوں۔ اس پر سلام ہے جس نے ہدایت پائی اور خدا نے بزرگ اور برتر کے سوا اور کسی میں کچھ قدرت و طاقت نہیں ہے۔ اب دمنیت نامہ لپیٹ کر اپنے بھائی کو دے دیا۔“ ابن خلدون کے موافق: جب ولید نے ابن عمر کو بیعت کے لیے طلب کیا تو انھوں نے کہا:

جلدی کیا ہے جس کے ہاتھ پر سب مسلمان بیعت کر لیں گے گو وہ جی کیوں نہ ہو میں بھی بیعت کر لوں گا۔ بعض کے موافق یہ روایت لکھتے ہوئے کہ ابن عمر سے حسینؑ سے مکہ کی راہ میں ملاقات ہوئی ابن عمرؓ نے کہا: ”مسلمانوں کی جماعت کو متفرق نہ کرتے جاؤ۔“ اور ”بیعت عامہ کے بعد ان دونوں بزرگوں (ابن عباس اور ابن عمر) نے بیعت بھی کر لی۔“

حضرت ام سلمہؓ اور حسینؑ صاحب خاص خنیفہ فرماتے ہیں: جب کہ حضرت نے ارادہ مدینہ منورہ سے سفر کا فرمایا پس حضرت اُمّ سلمہؓ خدمت میں حضرتؑ حاضر ہوئیں اور عرض کی: اے فرزند مجھے بخون و مغموم نہ کرو عراق کے جانے سے۔ کیونکہ میں نے تمہارے جد امجد سے سنا ہے کہ فرزند میرا عراق میں شہید ہوگا۔ فرمایا: اے مادر میں بھی جانتا ہوں اس امر کو اور ضرور مجھے قتل کریں گے اور کوئی چارہ و علاج نہیں ہے۔ پس جناب اُمّ سلمہؓ بہت قہقہہ کر روئیں اور آخر الامر سپرد خدا کیا پس فرمایا: اے مادر خدا کو منظور ہوا کہ مجھے کشتہ اور آغوش بھاک و خون دیکھے اور میرے عیال کو اسیر و در بدر اور اطفال کو میرے مذہب و بچے اور مظلوم اس وقت کہ استغاثہ کریں اور کہیں ان کی فریاد کو نہ پہنچے۔ اسی مولف کے موافق: ”مجلس امام حضرت کی بیرون مدینہ تھی جب کہ اہل مدینہ خدمت میں حضرت کے حاضر ہوئے اور مشغول نوہ و بکا ہوئے۔ حضرت نے فرمایا کہ تم کو قسم دیتا ہوں خدا نے عزد مل کی کہ اس راز کو کاش نہ کرو کہ مصیبت خدا ہے۔ کیا انہوں نے کہ آج اگر ہم نہ روئیں تو پھر کس دن کے واسطے رونا اٹھا کہ آج محل اس روز کے ہے کہ پیغمبر خدا اور علی مرتضیٰ اور فاطمہؓ زہراؓ اور امام حسنؓ مجتبیٰؑ نے دنیا سے رحلت کی۔ آپ کو قسم دیتے ہیں کہ آپ اپنے شہنشاہ قتل سے بچائے۔“

عمر بن علیؓ اور حسینؑ صاحب تاریخ اتوار و پنج اور بیعت کے موافق: ”محمد بن عمر راوی ہیں کہ میرے باپ عمر بن علیؓ بن ابی طالب میرے ماموں و آل عقیل سے یہ بیان فرماتے تھے کہ جب میرے بھائی حسینؑ بن علیؓ نے مدینہ میں یزید کی بیعت سے انکار کیا تو میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا وہ تہا تھے میں نے ان سے عرض کیا یا ابا عبد اللہ میں آپؑ پر خدا ہوں آپ کے بھائی ابو محمد حسنؑ نے اپنے باپ سے روایت کی ہے (اتنا میں کہنے پہنچا تھا کہ دل بھر آیا اور میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور دھڑلے مار کر رونے لگا) حضرت نے غم کو پٹا لیا اور فرمایا کہ: ”مقتول؟“ پھر حضرت نے پوچھا کہ تم سے حدیث بیان کی ہے کہ میں مقتول ہوں؟ تب میں نے عرض کی یا رسول اللہ یا ابن رسول اللہ۔ پھر حضرت نے کہا کہ: ”میں تم کو تمہارے باپ کا واسطہ دے کر پوچھتا ہوں کہ میرے قتل کی تم کو خبر دی ہے۔“ میں نے جواب دیا کہ ”ہاں۔“ پھر میں نے کہا کہ: ”کاش آپ بیعت کر لیتے!“

دنانٹ نفس حسینؑ کو پسند نہ تھی حضرت نے فرمایا کہ: ”غجو سے میرے باپ نے حدیث بیان فرمائی ہے کہ جناب رسول خدا نے ان کو میرے اور ان کے قتل کی خبر دی ہے اور یہ بھی خبر دی ہے کہ میری اور میرے باپ کی قبر قریب قریب ہوگی۔ پس کیا تم کو گمان ہے کہ تم اس امر کو جانتے ہو جس کو میں نہیں جانتا ہوں۔ بخدا میں نے دنانت نفس کو نہیں پسند کیا ہے۔“

یزید کے متعلق خیالات صاحب سر الشہادتین یزید کی طرف سے ولید کی طلب بیعت کے ذکر کے بعد فرماتے ہیں: ”انکار کیا حسینؑ علیہ السلام نے اس کی بیعت سے اس واسطے کہ

تھانید موداق شرابی، ظالم۔ اور کوچ کیا امام حسینؑ نے مکہ کی طرف۔

رائٹ آرمیل سپر امیر علی صاحب ہاتھ اپنی ”تاریخ اسلام“ میں فرماتے ہیں: ”زید ظالم اور وقاباز تھا۔ رحم و انصاف نے تو اس کو شس سے مس تک بھی نہ کیا تھا۔ اس کی دل لگی کے سامان اس کے مصاحبوں کی طرح کینہ اور ٹوٹنے تھے۔ وہ علانے دین کی توہین و ہتک اس طرح کرتا کہ جہاں جاتا ایک بھانے بھانے شای گدے پر ایک بندر کو طلا کے سے کپڑے پہنا کر ساتھ لیے پھرتا۔ سارا دربار میخاری و میٹھ میں ڈوب گیا۔ اور دار الخلافہ کے لگی کوچوں میں قدراً اس کی تھلید ہونے لگی۔ حضرت علیؑ کے دوسرے فرزند حضرت حسینؑ اپنے ہاپ کے اوصاف حمیدہ اور خصائل پسندیدہ سے مفلو تھے۔

اور قبول سیڑی لٹ صاحب ان میں صرف ایک صفت کی کمی تھی کہ امیہ کی اولاد کی طمع سازش کے جاہل بھٹانا نہیں جانتے تھے۔

سیڑی لٹ حسینؑ کے متعلق

ان کو خلافت کا حق رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت علیؑ دونوں کی طرف سے پہنچا تھا۔ صلح کے شرائط میں جو مصلوبہ اور حضرت حسنؑ کے باہین ہوئی تھیں۔ حضرت حسینؑ کا حق خلافت بین طور پر محفوظ رکھا گیا تھا۔ حضرت حسینؑ نے دمشق کے ظالم کی خلافت کو کبھی تسلیم نہیں کیا تھا اس کی برائیوں سے وہ نفرت رکھتے تھے اور اس کی بددلتی سے سخت ہزار تھے۔

مشرکین اپنی کتب و بیانات میں یہ کہتے ہیں کہ امام حسینؑ کی برائیوں سے وہ نفرت رکھتے تھے اور اس کی بددلتی سے سخت ہزار تھے۔ صاحب تاریخ الخلفاء کے موافق واقعی روایت کرتے ہیں کہ عبداللہ بن حنظلہ فرزند خلیل الملائکہ کہتے ہیں کہ ہم لوگوں نے زید کی اس وقت تک مخالفت نہیں کی جب تک ہم یہ خوف نہ ہوا کہ ہم لوگوں پر آسمان سے پتھر برس گئے۔ اس لیے کہ وہ سوتلی ماؤں سے متہ کرنا تھا اور جے لڑکیوں اور بیٹوں سے پرہیز نہ تھا جو شریعت بتاتا تھا اور تادک الصلوۃ تھا۔ صاحب موافق نے بھی متذکرہ صدر روایت نقل کی ہے اور اس کے قبل یہ بھی لکھا ہے کہ: ”بہرہ طلاء کفرو اسلام زید احتکاف کردہ اند اما محتقین امر اور ابغضائے قتال موقوف نمودہ اند و لیکن در فسخ و شرد و ظلم و تکبر مخفی نیست۔“

بہر حال صاحب روضۃ الشہداء کے موافق: حسینؑ۔ ”زہدات ماں کی قبر سے رخصت ہوتے ہیں“

تربت ملار بزرگوار خود آمد و گفت اسلام طیک یا امام حسینؑ این جازمانے بگریست و دعا فرمود۔

صاحب نایخ التواریخ کے نزدیک حضرت نے قبر حضرت خدیجہؑ پر نماز پڑھ کر یہ مناجات کی۔ (مؤلف کا فوٹو مدد نہیں

حضرت خدیجہؑ کبریٰ کی قبر پر مناجات

دیتا کہ یہ مناجات ہجرت مدینہ کے وقت تھی یا اس کے پہلے)

فارم عیہدا الیک طہاء
طوبی لمن کمت انت مولاء
یشکو الی ذی الجلال بلواء
اکثر من حہ مولاء

یا رب یا رب انت مولاء
یا ذا المعالی الیک معتمدی
طوبی لمن کان خانقاً ارقاً
و ما بہ علہ و لا سقم

اذا اشتكى منه و خصته اجابته الله ثم لباه
اذا ابتلا بالظلام مبتلا احكمه الله ثم ادناه

اے پروردگار اے پروردگار تو اس کا موا ہے۔ ہم کر اس بندے پر جس کی پختہ تیری طرف ہے۔ اے صاحب عظمت (خداوند) تجھی پر میرا
اجھڑی خوشامدل اس کا جس کا موا ہو۔ خوشامدل اس کا جو خدا کے خوشے شب بیدار ہے۔ اور صاحب جلال خداوندی و اپنی بلا کی
صلابت کے۔ اے کوئی دکھ اور بیماری نہیں ہو۔ اے تو اپنے موا سے سب زیادہ مجھکے جب وہ اپنے غم و غصہ کی صلابت کا تاہ تو اللہ
اس کو قبول فرماتا اور لیکھ کہتا ہے۔ جب وہ رات کی تاریکی میں نزع و نزاری کے تو اللہ اس کو عزت اور اپنے قرب میں جگہ دیتا ہے۔

۴ شعبان ۶۰ھ

تعب خیز اتفاق یہ تھا کہ اپنی پیدائش کی تاریخ اور مہینہ میں جب کہ غلبہ جو قحی تاریخ
کے چاند کی روشنی کے آثار کچھ کچھ افق غریبی پر پائی تھے کہ مدینہ کی شاہراہ سے قبول
تاریخ غمیں اہل بیت یا غیر اہل بیت کے "عشر سوار" مکہ کی طرف چلے جا رہے تھے اور حسینؑ کی زبان مبارک پر جاری تھا کہ :
فخرج منها خائفاً تترقب وقال رب اغفر الذلّين (۲۸: ۲۱) (پس نکلے شہر سے خائف دشمنوں کی آمد
نے اس وقت کہا پروردگار مجھے قوم ظالمین سے غفرت دے) اس وقت قبول صاحب روختہ الشہداء: "محبی از موالیان و
ہمدادان گفتند یا ابن رسول الله از سرتربت جد خود کہا میدوی — جواب دلا کہ من بہ اقتدار میروم"۔ قبول صاحب
تاریخ التواریخ روایتی کے وقت یہ اشعار حضرت کے ورد زبان تھے : ۵

اذا الموء لا يصح بنيه و عرسه و عترة كان اللثيم المسببا
و من دون ما يبغي يزيد بنا ضدا غنوص بعلو الموت شر قأوغربا
و لضرب ضرباً كالحريق مقدماً اذا ما راه ضيقهم فدماربا

راستہ کے متعلق مسلم کی صلاح اور حسینؑ کا تصفیہ قبول اعظم کوئی: "آپ کے چچا زاد
جالی مسلم بن حقیل نے کہا اگر ہم

شارع عام سے ملید ہو کر غیر معین راستہ سے عبد اللہ بن زبیر کی طرح چلیں تو بہتر ہے کہ لوگ کہے اندیشہ ہے کہ ولید کچھ آدمیوں
کو ہمارے پیچھے نہ منگدے۔ ہم شارع عام پر چوں گے تو ہمسائی احمیل مل جائیں گے اور مشکل واقع ہوگی۔ امام حسینؑ نے
فرمایا شارع عام اور سید سے راستہ پر ہی چلنا اچھا ہے۔ ہم اسی راستہ سے چلیں گے اور مکہ کے مکانات پر نظر جائیں گے۔"

عبد اللہ بن مطیع کی صلاح اس کے بعد حضرت قبول اعظم کوئی چند فرما آگے تشریف لے گئے تھے کہ
عبد اللہ بن مطیع عدی حاضر ہوا۔ اور کہا: میری جان آپ پر خدا ہو

اسہ فرزند رسول خدا! کہیں کا ارادہ ہے۔ اور کس غرض سے؟ آپ نے فرمایا: فی الحال تو مکہ جانے کا قصد ہے اور وہاں
پہنچنے کے بعد اپنے مصالحت پر غور کر کے جیسا کچھ مناسب معلوم ہوگا اس کے مطابق عمل درآمد کروں گا۔ عبد اللہ نے
کہا: سلامتی اور پیروی خدا کرے آپ کے ارادہ اور جوئے کے شامل حال رہے۔ اگر حکم ہو تو جو کچھ میرے دل میں ہے
وہ بھی عرض کر دوں۔ امام حسینؑ نے کہا: ہاں کیا کہنا چاہتا ہے، بیان کر۔ عبد اللہ نے کہا: مکہ میں پہنچ کر آپ اسی جگہ قیام
رکھنا اور اہل کوفہ پر ذار بھروسہ نہ کرنا۔ آج آپ سوار اور عرب کے سربراہ آوردہ شخص ہیں خدا کے گھر میں قیام رکھیں۔

کوفیوں کا کچھ اعتبار نہیں اور نہ ان کے کسی قول و قرار کا بھروسہ۔ اگر خدا خواستہ آپ کو کوئی حادثہ پیش آنے کا تو تمام اہل بیت ہلاک ہو جائیں گے۔ حضرت اسے دھانے خیر دے کر آگے روانہ ہو گئے۔

ابن خلدون متذکرہ صدر ہاتوں کے علاوہ اس قدر اور لکھتا ہے کہ: ”جن کو آپ کی بواغیظی منظور ہوگی وہ یہیں رہیں گے۔ جب تک مجاز کے لوگ آپ کے استدعا نہ کریں اس وقت تک بیت اللہ کو نہ چھوڑیے گا۔“ کمال ابن ابیہر ان کا نام عبداللہ بن مطلق کہتا ہے اور اس سے یہ مخصوص بات کہلاتا ہے کہ: ”ہر طرف سے لوگ بلائیں گے مگر حرم کو پکڑے رہیے گا۔ آپ سید عرب ہیں۔ اگر آپ ہلاک ہوں گے تو ہم بھر آپ کے غلام ہو جائیں گے۔“ اس کے بعد لوگ آتے اور لٹے جاتے تھے۔

صاحب روضۃ الشہداء کہتا ہے: من (ابن مطیع) میدام کہ ایشی (کوفی) ترا خواہد خواند مگر بزودی ترا عطا خواہد گزاشت از طریقہ وفادور اند۔ عہد نگاہ خواہد داشت۔ یعنی: ”میں جانتا ہوں وہ کوئی آپ کو بلائیں گے مگر جلد چھوڑ جائیں گے وہاں سے دور ہیں، عہد کی پاسداری نہ کریں گے۔“

مکہ کی پہاڑیاں
آیت پڑھی: وَلَئِنَّا تَوَجَّهْ وَلِقَاءَ مَدِّیْنٍ قَالَ عَسَىٰ رِقَّتْ اَنْ یَّهْدِیْنِی سَوَاءَ الشَّیْئِلِ (۲۸: ۲۷) (جب حضرت مثنیٰ) شہر مدین کی طرف متوجہ ہوئے تو کہا: امیدوار ہوں کہ پھر درگاہ میری ہدایت کرے اور منزل مقصود تک پہنچائے۔

مکہ کا استقبال
امام حسین علیہ السلام کے مکہ میں داخل ہونے کے وقت لوگوں نے استقبال کیا۔ جن میں عبد اللہ بن زبیر بھی تھے۔

قبول روضۃ الشہداء: ”مؤذن امام حسین پنج دقیقہ قبل در غایت بلندی (اذان) کی گفت و قوم عظیم ہر دے نماز

آخر ماہ شعبان سنہ
ی گوارا دندہ سعید (ابن العاص حاکم مکہ) تبرید در موسم حج بر مردم (کہ) از اطراف و جانب جمع شدند (جو) ہواداری شاہزادہ اور ہلاک کنند بگریخت و بمید رفت و بہ زید مکتوبے نوشت از آمدن حسین بکہ و میل مردم ہرے در آغوش آکر د۔“

یعنی: ”مؤذن امام حسین بہت اونچی اذان دیتا اس پر عظیم جماعت نماز پڑھتی۔ سعید موسم حج میں اطراف و جانب کے لوگوں کے اجتماع اور شاہزادہ کی طرف ان کے میلان سے ڈر کر مدینہ بھاگ گیا اور زید کو حسین کی آمد کے اور لوگوں کا ان کی طرف جھکاؤ ذکر کیا۔“

قبول اعم کوفی: شعبان کے مہینہ کے چند روز باقی تھے کہ امام حسین مکہ میں تشریف لے کر تھیں اور رمضان دشوال و ذیقعدہ کا مہینہ آپ نے مکہ میں گزارا۔

ابن زبیر کا موقع بمقابلہ حسین
قبول کمال: ”بہ نسبت اور مخلوقات خدا کے حسین کاملہ میں رہنا ابن زبیر کو گراں گزرتا تھا کیونکہ جب تک حسین تھے اہل حجاز (ابن زبیر کی) بیت نہیں کرتے تھے۔“ لیکن قبول اعم کوفی وغیرہ: ”لیکن اس مطلب کو ظاہر نہ بخئے دیتا تھا خود بھی ہر روز آپ کی

خدمت میں آئے جانے لگا اور آپ کے چھ نماز پڑھتا تھا اور سہ ماہہ رکھتا تھا۔ قبول ابن خلدون "اور ابن الزبیر خانہ کعبہ کے ایک گوشہ میں شب روز نماز پڑھتے تھے طواف کرتے تھے حسین بن علی اکثر لوگوں کے حالات ظہر کر کے ان سے مشورہ لیا کرتے تھے اور ان کو یہ معلوم تھا کہ ابی حجاز حسین بن علی کے بھوتے میرے ہاتھ پر بیعت نہ کریں گے۔"

قبول ابن خلدون : ان واقعات کی اطلاع زید کو ہوئی تو اس نے ولید بن عقبہ کو مدینہ کی دالی گری سے معزول کر کے

عمر بن سعید الاشجق کو مامور کیا چنانچہ عمر بن سعید ماہ رمضان المبارک سنہ ۱۷ میں داخل مدینہ منورہ ہوا اور

ابن زبیر کے خلاف فوجی روانگی اور

ان کے ہوا خواہوں کے ساتھ برتاؤ

اس کے پولیس کی افری عمر بن زبیر کو دی گئی کیوں کہ ان میں اور ان کے بھائی عبداللہ بن زبیر میں کسی وقت سے ناچاقی و کشیدگی تھی اس بنا پر اس نے مدینہ کے چند لوگوں کو جو خواہ عبداللہ بن زبیر تھے گرفتار کر کے چالیس پچاس ساٹھ درے تک پٹائے۔ بعد اس کے عمر بن سعید نے سات سو آدمیوں یا اس سے کسی قدر زیادہ کو مکہ کی طرف روانہ کرنے کو سلا و مرتب کر کے عمر بن زبیر سے ان کی افری کے بابت دریافت کیا۔ عمر بن زبیر نے جواب دیا مجھ سے زیادہ کوئی شخص موزوں اس کام کے لیے نہ ہو گا پس عمر بن سعید نے عمر بن زبیر کو بھر افری سات سو جنگ آوروں کے جن میں انیس بن عمر الاشجی بھی تھا مکہ منظمہ کی طرف روانہ کیا۔ استے میں مردان بن اکرم آگیا مکہ منظمہ پر فوج کشی کرنے پر ملامت کر کے کہنے لگا اللہ تعالیٰ سے ڈرو۔ بیت اللہ کی حرمت کو حلال نہ کرو۔ عبداللہ بن زبیر سے درگزر کرو۔ ساٹھ برس کی اس کی عمر ہو گئی وہ کیا مخالفت کرے گا۔ عمر بن الزبیر بولا واللہ میں اس سے عین خانہ کعبہ میں لڑوں گا یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ ابوشریح قزاعی آگئے اور عمر بن سعید کو مخاطب کر کے کہل میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے آپ فرماتے تھے مجھے ایک ساعت کے لیے مکہ منظمہ میں جنگ کرنے کی اجازت ہوئی تھی بعد ازاں اس کی حرمت و سیاہی ہو گئی جیسا کہ کل تھی۔ عمر بن زبیر نے ترش رو ہو کر کہا : "اے بڑے ہم تجھ سے زیادہ مکہ کی حرمت کو جانتے ہیں۔" اور بعضوں کا یہ بیان سنا کہ زید نے عمر بن سعید کو لکھا تھا کہ عمر بن زبیر کو ایک لشکر جہاد کے ساتھ اس کے بھائی کی طرف روانہ کرو۔

زید کی قسم میں اس نے بسروری دو ہزار جنگ آوروں کے روانہ کیا مقدمۃ البیث پر انیس بن عمرو الاشجی تھا مکہ منظمہ کے قریب پہنچ کر انیس نے ذی طوی میں عمر بن زبیر نے اہل میں ڈیرے ڈال دیے۔ اور اپنے بھائی سے کہا میاں : "زید نے تم کھائی ہے کہ تمہاری بیعت نہ قبول کی جائے گی جب تک تم حاضر نہ آؤ گے۔" کمال کا بھی پھی مضمون ہے۔ لیکن دونوں موزین نے اس جنگ آزمائی کی تاریخ اور مہینہ نہیں لکھا ہے جن میں ابن زبیر نے گرفتار کرنے والوں کو بھگا دیا۔

صاحب روضۃ الصفا لکھتا ہے : تاہمیر المؤمنین حسین در مکہ بود ابن زبیر ملازمت آئیناب می نمود و از خلافت و ریاست دم نمیزد و بر غے گفته اند

ابن زبیر کو حسینؑ کی صلاح

دراں آواہن کہ ہر دور در مکہ بودند ابن زبیر را داعیہ آن شد کہ خروج کند و مکہ را در حیطہ منہ و تصرف خویش آورد درین باب با امام حسینؑ مشورت نمود گفت کہ وقت این کار نیست چہ در مکہ مردے کہ متابعت تو نمایند و شائستہ حرب

ہاشمہ نیست۔ عبداللہ را این سخی موافق شیکوہ خروج کرد و حامل یزید از شہر بیرون رفت و باہر گوشہ مختفی گشتہ و غیبتکند
 اور داینین و باین قول کہ عبداللہ مخالفت یزید کردہ مکہ را تصرف نمود امیر المومنین حسینؑ در خانہ خویش نشستہ بیرون نمی
 آمد و گماشتہ یزید لا کمائی حالات مکہ یزید را اعلام دلا و یزید غمہ بمرورین مسجد نوشتہ کہ لشکرے بکہ فسرستہ۔۔۔
 یعنی: جب تک امیر المومنین حسینؑ مکہ میں تھے ابن زبیر آپکے ساتھ کارہتاتھا اور خلافت و ریاست کا دعویٰ نہیں کرتا تھا
 اور کچھ لوگوں نے کہا ہے کہ ان دنوں جب دونوں مکہ میں تھے ابن زبیر کو یہ سوچی کہ خروج کئے اور مکہ پر قبضہ کر کے اپنے
 تصرف میں لائے۔ اس بارے امام حسینؑ سے مشورہ کیا آپ نے فرمایا کہ اس کام کا وقت نہیں ہے کیونکہ مکہ میں تیری
 متابعت کرنے والے اتنے لوگ نہیں ہیں جو لڑائی کے قابل ہوں۔ عبداللہ کو یہ بات پسند نہ آئی اور خروج کر دیا۔ یزید کا
 گورنر شہر سے باہر چلا گیا اور کسی گوشہ میں پوشیدہ ہو رہا۔ دونوں روایتوں میں اختلاف کی بنا پر اس قول کے مطابق کہ
 عبداللہ نے یزید کی مخالفت کی اور مکہ پر محض عرف بنو کید امیر المومنین حسینؑ گھر میں بیٹھے رہے اور باہر نہیں آئے تھے اور یزید
 کے کارندے نے مکہ کے حالات جیسے تھے یزید کو اطلاع دی اور یزید نے عمرو بن سعید کو خط لکھا کہ ایک لشکر مکہ بھیجے

طبری کے موافق بھی یہی حالت تھی یہ کہتا ہے کہ مکہ کا حامل حارث بن عرقا تھا اور ابن زبیر نے ذی الحجہ سنہ ۶۰ میں
 قبضہ کیا اس کے بعد عبداللہ بن زبیر کے سلسلہ حالات میں لکھتا ہے: ”یزید عمر بن سعید الحارثی را بکہ اسیری دادہ و ہرو
 ولید بن عقبہ بن ابی سفیان را بمدینہ۔ چون عبداللہ بن زبیر لا مدینہ بکہ آمد عرب (۹) باو حرب کرد یزید اور احمیت کرد و لا
 حکو متش باز کرد و مکہ و مدینہ ہر دو بہ ولید (۹) دلا ولید بمدینہ نشست و بکہ خلیفہ فرستاد و عبداللہ بن زبیر خلیفہ اور از مکہ
 بیرون کرد و او بجاغابی بود۔ مردمان مکہ گروہ با عبداللہ بن زبیر بیعت کردہ بودند و ہوا غلہ یزید بودند و نزد عبداللہ بن زبیر
 نیامدند و عبداللہ بمسجد نماز جدا کرد و مصلح یزید جدا چوں وقت چاہے یزید ولید را فرمودے تا بکہ شدے و با
 مردمان چاہے کردے و بمدینہ ہلا شدے و عبداللہ بن زبیر بکہ می ہوسے تا حسینؑ رضی اللہ عنہ بکہ می ہوسے اور احرمت بھی
 داشت بظاہر و کس را بہ بیعت نخواستے از بہر خویش و چون حسینؑ رضی اللہ عنہ از مکہ بیرون رفت عبداللہ ہی کرد تا بہ بیہر کہ
 کار او بجا میرسد چوں خبر کشتن حسینؑ رضی اللہ عنہ بشنید دانست کہ کسے نماند کہ بالو متلاحت کند آنکہ مردمان مکہ را بظاہر
 بہ بیعت خواند۔ یعنی: ”یزید نے عمرو بن سعید الحارثی کو مکہ کی گورنری دی ہوئی تھی اور ولید بن عقبہ بن ابی سفیان کو مدینہ
 میں۔ جب عبداللہ بن زبیر مدینہ سے مکہ آیا عرب اس کے ساتھ ہو کر لڑے۔ یزید نے عمرو کو منہم جانا اور اس کو حکومت
 سے ہٹا دیا اور مکہ و مدینہ دونوں ولید کو دے دیے۔ ولید خود مدینہ میں بیٹھا اور مکہ میں اپنا نائب مقرر کیا۔ عبداللہ بن زبیر نے
 اس کے نائب کو مکہ سے نکال دیا۔ وہ وہیں کہیں رہ گیا۔ مکہ کے لوگوں میں ایک گروہ نے عبداللہ بن زبیر کی بیعت کر لی
 تھی۔ اور دوسرے یزید کے خیر خواہ تھے اور عبداللہ بن زبیر کے پاس آتے نہیں تھے۔ عبداللہ مسجد میں ٹھکرتے تھے۔ حاکم
 اور یزید پسند الگ۔ چونکہ چاہے کا وقت تھا یزید نے ولید کو حکم دیا کہ مکہ جانے اور لوگوں کو چاہے کروانے اور مدینہ واپس
 آجائے۔ عبداللہ بن زبیر مکہ میں ہی تھے اور جب تک حسینؑ مکہ میں رہے اس نے مکہ کی حرمت بظاہر برقرار رکھی اور کسی
 کو بھی اپنی بیعت کی دعوت نہیں دی اور جب حسینؑ مکہ سے باہر چلے گئے تو عبداللہ یہ دیکھ رہا تھا کہ ان کا انجام کار کیا ہوتا
 ہے جب حسینؑ کے قتل ہونے کی خبر سنی تو جان لیا کہ اب اس کے ساتھ منازعت کرنے والا کوئی

ہیں رہا تو اس وقت مکہ کے لوگوں کو ظہر ظہرائی بیعت کی دعوت دی۔

ابن خلدون کے موافق: ”مکہ سے حسین کی روانگی کے وقت عمر بن سعید الحارثی ماک تھا۔“

اہل کوفہ کی استدعا کی ابتدا ابن خلدون کے موافق: ”جب کوفیوں کو بیعت خلافت یزید اور حسین بن علی کے مکہ پہلے جانے کا حال معلوم ہوا تو شیعان امیر المومنین علی شلیان

بن صود کے مکان پر جمع ہوئے اور چند لوگوں کی طرف سے جن میں شلیان و شیب بن محمد و رکن بن شداد و حبیب بن مظاہر وغیرہ تھے حسین بن علی کو خط لکھا اس مضمون کا کہ آپ یہاں تشریف لائیے ہم لوگوں نے نعمان کے ہاتھ پر یزید کی بیعت نہیں کی نہ تو جمعہ میں اس کے ساتھ شریک ہوتے ہیں اور نہ عید میں۔ اگر آپ آجائیں گے تو ہم اس کو کھال دیں گے۔“ خط کی عبارت یہ تھی:

”بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ خدا کی رحمت تم پر ہو۔ ہم اللہ تعالیٰ کی مدد کرتے ہیں جس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ بعدہ اللہ تعالیٰ کا احسان ہے کہ اس نے تمہارے دشمن جبار و سرکش کو خواب مرگ میں سلا دیا۔ جس نے اس امت پر حیران حکومت بٹھائی تھی اور اس پر بلا استحقاق ماک بن گیا تھا اس کے مال کو غصب کر لیا تھا اور بغیر رضامندی امت اس پر مارت کرتا تھا ہاں ہم اس میں جو اچھے تھے، ان کو اس نے مار ڈالا اور اشرار کو ہائی رکھا اب ہم پر کوئی امام نہیں ہے۔ آپ آئیے شاید آپ کے ذریعہ سے ہم کو اللہ تعالیٰ حق پر جمع کر دے۔ اگرچہ نعمان بن بشیر ہمارا دشمن تھا لیکن ہم اس کے ساتھ نہ تو شریک جہ ہوتے ہیں اور نہ عید میں۔ اگر ہم کو یہ معلوم ہو جائے کہ آپ تشریف لائیں گے تو ہم اس کو ایسا کھال دیں کہ شام ہی میں جا کر دم لے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ والسلام علیک ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔“

مار یہ بنت سعد کا مکان ابن خلدون یا غالباً اس کا مترجم یہ روایت بھی کمال ابن ابیہ سے لوٹ کرتا ہے کہ: ”اسی زمانہ میں شیعان بصرہ بھی ایک عورت مار یہ بنت سعد (قبیلہ عبد شمس) (اسی کتب کا میرا نوٹ ہے کہ یہ امراء القیس کی بی بی تھی) کے مکان پر جمع ہوئے تھے لیکن خط لکھنے کی نیت نہ آئی البتہ ان میں یزید بن شیط نے حسین بن علی کی خدمت میں حاضر ہونے کی غرض سے اٹھ کر کہا تم میں سے کون شخص میرے ساتھ چلے گا۔ اس کے دس لڑکے تھے۔ منجملہ ان کے دو عبد اللہ و عبید اللہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ پس یہ تینوں شخص مکہ پہنچے پھر وہاں سے امام حسین کے ساتھ کر بلا گئے اور انھیں کے ساتھ شہید ہوئے۔“

کوفہ کا دوسرا وفد دور آؤں کے بعد ابن خلدون لکھتا ہے: پھر دور آؤں کے بعد دوبارہ اخط تقریباً ڈیڑھ سو آدمیوں کی جانب سے بعض مضمون بالا لکھا گیا۔ پھر

سہارا اس مضمون کا روانہ کیا سب کو شبت بن ربیع، حمار بن امر، یزید بن امر، یزید بن ردم، عروہ بن قیس، عمر بن حجاج الزبیدی، محمد بن عمیر ایسی وغیرہم نے بڑے شد و مد سے لکھا تھا۔

دوسرے وفد کو بھی جواب نہ دیا روضۃ الشہداء کے موافق: نہ حسین نے ہاں نہ نہیں فرمایا نہ جواب لکھا۔ دوسرے وفد کا بھی جواب نہ دیا۔ اعظم کوفی کے موافق: امام حسین انھیں پڑھ کر اور مال درمالت کر کے خاموش ہو رہے نہ قاصدوں سے کچھ فرمایا نہ خطوں کا جواب لکھا۔

صرف ان کو خوش کر کے واپس کر دیا۔ انھوں نے کوفہ میں پہنچ کر تمام مال عرض کیا۔

اب کوفہ کے بڑے بڑے سردار بھانسیہ مکہ روانہ تھے۔ امام حسین نے کوفہ جانے میں تامل کیا اور انھیں بھی کچھ جواب نہ دیا۔

تیسرے وفد کو بھی جواب نہ دیا

اب دو قاصد اور آئے اور کوفیوں کے خط لائے۔ یہ آخری خط تھے جن میں امام کو بلایا تھا اور ہانی بن ہانی سمعی، سعد بن عبداللہ حنفی نے اس مضمون کے خط لکھے کہ امیر المومنین علی کے دوستوں کی طرف سے امیر المومنین حسین کو معلوم ہو کہ تمام کوفہ والے آپ کی تعریف آدری کے منتظر ہیں۔ سب کے سب آپ کی خلافت اور امامت پر متفق ہیں۔ اب ذرا تامل نہ کرنا چاہیے۔ بہت جلد تشریف لائے۔ یہاں پہنچنے اور فوج کشی کرنے کا یہی وقت ہے۔ مرا سر سبز ہیں۔ میوے پک رہے ہیں۔ دیہات میں چارہ بکثرت ہے۔ فی انھور آنا چاہیے۔ کسی قسم کا پس و پیش نہ فرمائیں۔ جس وقت آپ کوفہ میں داخل ہو جائیں گے تو وہ تمام فوجیں جو آپ کے لیے فراہم کی گئی ہیں آپ کے پاس حاضر ہو جائیں گی۔ اور خدمت گزاری اور جاں نثاری کے لیے کمر بستہ ہوں گی۔ والسلام علیک ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

صاحب لہوت کے موافق: اہل کوفہ کو جب حسین کا بیعت زبید سے انکار اور مکہ کی تعریف آدری معلوم ہوئی تو وہ لوگ شیلیان بن سعد کے مکان پر جمع ہوئے، اور شیلیان نے مخصوص باتیں یہ کہیں: ”اس وقت وہ (حسین) تمہاری مدد کے تحت لاج لائے۔ اگر تم جانو کہ تم ان کی مدد کر سکو گے، اور ان کے دشمنوں سے چلو کر سکو گے، تو ان کو خط لکھو، اور اگر تم کو کابلی دستی و نامردی کا خوف ہو تو ان کو نصیب نہ دو۔“ اس کتاب کے موافق حضرت کے پاس بارہ ہزار خط جمع ہو گئے۔ اس کے بعد آخری خط آیا۔

ابو اسحاق اسفہانی کے موافق اہل کوفہ کی مشاورت میں زبید کی بے احتیالی اور

اہل کوفہ کے نزدیک حسین کے انتخاب کی وجہ

مظالم کا ذکر ہوا۔ کہا گیا کہ حسین کو خلافت کے لیے لکھا جائے۔ ”کیونکہ یہ انھیں کا حق ہے۔“ وہ اللہ کے پیچھے والے ہیں اور رسول اللہ ﷺ کی نسل سے ہیں اور عدل و ایمان والے ہیں۔ ظلم و جور اور پستیاں کو پسند کرنے والے نہیں۔ زبید اور کسی دوسرے کی نسبت وہ ہم پر زیادہ مہربان ہیں۔“ اس پر اتفاق کے بعد خط لکھا گیا۔

حسین نے قدرے تامل کے بعد خط پیش کر دیا۔ قاصد کو فرمایا چلے جاؤ۔ اور کوئی جواب نہ دیا۔ نہ کسی قسم کی اور کوئی بات کہ قاصد ناکام واپس گیا اور

حسین کا زبانی جواب

اہل کوفہ کے پاس آکر تمام واقعہ بیان کیا۔ خطوط کے اصرار پر ہر مرتبہ یہی کہا کہ: ”میں مکہ سے باہر نہ نکلوں گا یہاں تک کہ میری زندگی ختم ہو جائے، اور میں اسی جگہ مردوں۔ مجھے خلافت کی اور لوگوں پر جبر و تعدی کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔“

اسی مؤرخ کے موافق: ایک دن امام حسین رضی اللہ عنہ اپنے گھر میں تشریف فرما تھے۔ ایک سوار آیا اور آپ کا دروازہ کھٹکھٹانے لگا۔ آپ نے پوچھا کون ہے۔ عرض کیا یا ابا عبد اللہ میں ایک قاصد ہوں۔ آپ نے اندر آنے کی اجازت بخشی۔ وہ اندر آیا۔ سلام کیا اور ہاتھوں کو

بوسہ دیا۔ پھر ایک خط لکھ کر آپ کو دیا۔ جو اہل کوفہ نے بھیجا تھا۔ آپ نے کھول کر پڑھا تو اس میں یہ عبارت درج تھی:

یا حسین یا ابن بنت رسول اللہ!

”زید بن معاویہ سخت ظلم و ستم کر رہا ہے۔ لوگوں کو قتل کر ڈالتا ہے۔ ان کے مال لوٹ لیتا ہے۔ غیب اللہ بن زیاد بن مرجمہ نای ایک شخص کو اس نے ہم پر حاکم مقرر کیا ہے جو ایک جبار و ستم گار اور خدا دشمن شخص ہے۔ اس کا ظلم تمام ملک میں پھیل گیا ہے۔ وہ نیک باتوں سے منع کرتا ہے اور بری باتوں کا حکم دیتا ہے۔ شراب پیتا ہے۔ خدا سے نہیں ڈرتا۔ سرعام فحش و فجور کرتا ہے۔ رعایا کو تیرہ کا ہفت مصائب بتا رہا ہے۔ لوگوں کو ناحق قتل کرتا ہے اور بلا وجہ ان کے مال ضبط کر لیتا ہے۔ کسی امر میں خدا کا لحاظ نہیں کرتا۔ رعایا سے مدد و انصاف اس نے روپوش کر رکھا ہے اور ظلم و طغیان عام کر دیا ہے۔ اے ابو عبد اللہ! ہم قبل از یہ ایک ہزار کے قریب عرصیاں آپ کی خدمت میں بیٹھ چکے ہیں۔ جن میں ہم نے التجا کی ہے کہ آپ تشریف لائیں۔ ہم آپ کی امداد و اعانت کو آمادہ ہیں۔ زید کو قتل کر کے آپ کے باپ اور نانا کی خلافت آپ کو دلا دیں گے۔ پھر خواہ آپ خود غلبہ میں یا اپنے اہل بیت میں سے کسی اور کو بنائیں۔ ہم آپ کے نانا مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا واسطہ دے کر آپ سے ملتی ہیں کہ آپ ضرور تشریف لائیں اور خلافت پر قبضہ فرمائیں۔ اگر آپ نہ آئے تو کل بروز قیامت اللہ تعالیٰ کے حضور میں ہم آپ پر دعویٰ کریں گے اور کہیں گے: الہی حسین نے ہم پر ظلم کیا تھا۔ کیونکہ ہم پر ظلم و ستم کیا کر رہے ہیں۔ اور تمام لوگ فریاد کریں گے کہ ہمارے پروردگار حسین سے بیمار بدلہ دلا تو اس وقت آپ کیا جواب دیں گے؟ اور خلق اللہ کے حقوق سے کس طرح سرگردنی حاصل کریں گے۔“

جب امام حسین رضی اللہ عنہ نے یہ خط پڑھا تو خدا کے خوف سے ان کے رونگھے کھڑے ہو گئے اور خلق اللہ کی مظلومی پر اور ان کے نانا کا واسطہ ڈالنے سے ان کا دل پانی پانی ہو گیا۔ فوراً اٹھے۔ بلکہ ان کے آنسو رخساروں پر بہ رہے تھے اور دوات و قلم و کاغذ لے کر اہل کوفہ و عراق کی طرف یہ جواب لکھا:

”بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ حسین بن علی بن ابی طالب کی طرف سے

اہل کوفہ و عراق کی طرف۔ آپ لوگوں کو معلوم ہو کہ آپ کے

بھیجے ہوئے ایک ہزار خطوط ہمارے پاس پہنچے۔ مگر ہم نے ان پر توجہ نہیں کی۔ میری مراد یہی تھی کہ ہمیشہ بیت اللہ کے پاس رہوں اور مرتے دم تک وہیں بسر کروں۔ اب زید و غیرہ کے ظلم کی آپ لوگوں نے شکایت کی ہے۔ میں ان شاء اللہ معریب تمہاری طرف آنے والا ہوں۔ مسلم بن عقیل میرا یہ خط لے کر تمہارے پاس آتا ہے۔ وہ کوفہ کی مسجد میں تمہاری امامت کرانے کا اور شرعی فیصلہ کیا کرے گا۔ ننان میرے آنے تک تم میں احکام جاری کرے گا۔“

ابن خلدون کے موافق: متواتر خطوط آنے سے حسین بن علی کے خیالات کچھ کے کچھ ہو گئے۔ جواب میں لکھا: جو تم لوگوں نے لکھا ہے میں اسے کب گید ہا فعل میں اپنے بھائی حجاز اور اپنے معتد ترین اہل بیت مسلم بن عقیل کو بھیجتا ہوں۔ یہ تمہارے رنگ و رنگ دیجے کر بچے اطلاع دیں گے۔ پس اگر تمہارے رؤساء ملت نے جیسا کہ اس کے پیشتر تم نے لکھا ہے اس پر اتفاق کیا ہے اور اس پر منتج ہو گئے تو میں معریب آ جاؤں گا۔ اپنی قسم امام دی ہے جو کتب اللہ پر عمل کرتا ہے اور عدل پر قائم ہے اور حق پر چلتا ہے۔ والسلام۔

دسویں رمضان ۶۰ھ کو کوفیوں کا پہلا خط آیا تھا علامہ مجلسی کے موافق اہل کوفہ کا پہلا قاصد دسویں رمضان کو حسینؑ کے پاس آیا

مُسلم بن عقیلؑ کی روانگی اور وصیت

اب جبول اعظم کوئی مسلم بن عقیلؑ سے فرمایا: میں تجھے کوفہ بھیجتا ہوں۔ وہاں جا کر دریافت کرنا کہ ان لوگوں کی زبانیں اپنی ان قیروں کے مطابق ہیں یا نہیں۔ وہاں پہنچنے کے بعد ایسے شخص کے گھر پر اتنا جو سب سے زیادہ احمق کے لائق اور ہماری دوستی میں پورا اہمیت قدم معلوم ہو۔ وہاں کے باشندوں کو میری بیعت اور فرمانبرداری کی ہدایت کرنا۔ ان کے دلوں کو آل انبیاء کی طرف سے پھیر دینا اگر یہ بات معلوم ہو کہ ان کے ازار پچے ہیں اور جو کچھ کہتے اور لکھتے ہیں اس کو پورا کر ہی گئے تو بہت جلدی مجھے لکھ بھیجنا اور جو امور مشاہدہ سے گزر رہی انھیں مفصل درج کر دینا میں امید کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ مجھے اور تجھے شہادت کا درجہ عطا فرمائے گا اس کے بعد آپس میں بخل گیر ہو کر ملے اور روتے ہوئے ایک دوسرے کو رخصت کیا۔

۱۲ ذیقعدہ ۶۰ھ کو مسلم روانہ ہوئے تھے

ابو احق اسفرائینی فرماتے ہیں: ابوہریرہؓ اور امام حسینؑ رضی اللہ عنہما مسلمؑ اور قاصد کے روانہ ہونے کے بعد فوراً اپنی بہن سکینہ کے پاس گئے اور ان کو اہل کوفہ و عراق کی مظلومی، یزید اور ضیاء اللہ بن زیاد کے ظلم اور اہل کوفہ و عراق کے خط و کتابت وغیرہ تمام حالات سنائے اور ان کی آخری چٹھی اور اپنے جواب کا بھی ذکر کیا۔ اور مسلمؑ کو ان کا نام و فاضی ضرر کرنے اور اپنے تشریف لے جانے تک کو ان کا حکم بنانے کا مال بھی بتایا۔ پھر فرمایا: اسے یحییٰ اللہ تعالیٰ ہو اور سفر کا سامان کر۔ جب بہن نے یہ بات سنی تو اہل عراق و کوفہ کے حالات سن کر سخت متکاثر ہوئیں اور آجیدہ ہو کر کہا: بھائی! یہ سفر کا وقت نہیں ہے۔ یوں تو ہم تیار ہیں مگر احرار عجم احرام کا مہینہ آ رہا ہے۔ ہم چاہتے ہیں ماثورا کے روز بیت احرام میں ہوں۔ اس روز بارہ ذیقعدہ کی تاریخ تھی۔

حضرت مسلم سفر کی دشواری کی اطلاع دیتے ہیں

اس کے بعد جبول اعظم کوئی: مسلمؑ نے کوفہ کا راستہ لیا۔ پوشیدہ سفر کیا کہ غی امیر میں سے کسی کو اس حال کی خبر نہ ہو جائے۔ مہلادہ یزید کو خط لکھ کر تمام حالات سے مطلع کر دے۔ جس وقت مسلم مدینہ میں داخل ہوئے تو مسجد رسولؐ میں آکر دو رکعت نماز پڑھی آدمی رات کے وقت اپنے عزیزوں اور دوستوں سے رخصت ہو کر سفر کوفہ اختیار کیا اور قیس بن غیلان کے قبیلہ کے دور ہبر ساتھ لیے کہ غیر معروف راستہ سے کوفہ پہنچا دیں۔ کچھ دور چل کر دونوں راہبر راستہ بھول گئے اور غلطی سے ایسے میدان میں جا پہنچے جہاں پانی کا نام و نشان نہ تھا۔ انہما کار دونوں راہبر پیاس کی شدت سے مر گئے۔ اب مسلمؑ بہت ہراساں ہو کر احرار عجم پانی کی تلاش میں دوڑے مگر کسی جگہ پانی نہ پایا۔ آخر کار ایک گاؤں مضیق نام میں پہنچ کر پانی پیدا ساتھیوں اور مویشیوں اور گھوڑوں کو بھی پانی دیا۔ پھر کچھ دیر آرام لے کر امیر المومنین حسینؑ کے نام خط لکھا۔ تمام کیفیت درج کر کے یہ بھی تحریر کیا کہ یہ سفر مجھے مبارک نہیں ہوا۔ قل بد معلوم ہوئی ہے۔ آپ مجھے اس سفر سے معاف رکھیں۔ والسلام

جس وقت مسلم کا یہ غلام حسینؑ کے پاس پہنچا، احوال مندرجہ سے واقف ہو کر یہ جواب تحریر فرمایا: بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ حسینؑ بن علیؑ امیر المومنین کی طرف سے مسلم بن عقیلؑ

معلوم ہوا کہ تھار اخط آیا۔ معنوں معلوم ہوا۔ تھار یہ لکھنا کہ مجھے اس سفر سے معاف رکھو بڑے تعجب کی بات ہے۔ معلوم ہوتا ہے سستی اور شکستہ دلی کی وجہ سے یہ خط لکھا گیا ہے۔ تم اپنے دل کو مضبوط رکھو۔ کسی امر کا خوف نہ کرو۔ اور جس کام کا حکم ہے اسے انجام دو۔ والسلام علیک ورحمۃ اللہ۔

کامل ابن اثیر کے موافق حسینؑ نے جواب دیا: ”ڈرنا ہوں کہ تمہیں بددلی نے اس خط کے بھیجنے پر آمادہ کیا ہے۔ پس بہتر ہے کہ تم روانہ ہو۔“

یکم ذی الحجۃ ۶۰ھ

ابن خلدون کے موافق: ”مسلم بن عقیلؓ بہ تعمیل ارشاد پہلی ذی الحجہ ۷۱۷ء کو کوفہ میں داخل ہوئے۔ شیعوں کے دل میں کھلبلی پڑ گئی۔ بیٹھ میں جیسے

بعض الفاظ جس میں ابن خلدون یا

بعض الفاظ جس میں ابن خلدون یا اس کے مروجہ ابوہریرہ کا لحاظ کیا ہے دوڑنے لگے۔ جب ان میں سے چند لوگ جمع ہو جاتے تو مسلم بن عقیلؓ ان کو امام حسینؑ کا خط پڑھ کر سناتے تھے اور وہ لوگ دھاڑیں مار مار کر روتے تھے۔

اور امداد کا وعدہ کرتے تھے۔ "بقول مؤرخین: "حضرت مسلم بن الحجاج بن ابی بکر بن ابی قحطافہ کے گھمبہ فروکش ہوئے۔" بقول اعظم کوفی: امیر المؤمنین علی کے دوست مطلع ہو کر آپ کے پاس حاضر ہوئے۔

م ۱۸ استقبال
مسلم نے امام حسینؑ کا خط پڑھ کر سنا۔ جب انہوں نے حسینؑ کا خط اور علیؑ کا نام سنا
غیبِ زبور سے رونے اور ”واشوقاً الی لقاء“ زبانوں سے ادا کیا۔

عابس بن ابی سلیم

عابس بن ابی سلیب پھر ایک شخص عابس بن ابی سلیب نے مسلم کے پاس آکر کہا: میں اور لوگوں کے دلوں اور مجروحہ سے بے خبر ہوں جو کچھ مجھے کہنا ہے عرض اپنی طرف سے کہتا ہوں کہ

میرا دل اور جان فرزند رسول کی دوستی کے لیے وقف ہیں۔ خدا کی قسم یہی بات ہے میں تمہارے آگے کھڑے ہو کر شمشیر زنی کروں گا۔ تمہارے دشمنوں کو مار دوں گا۔ یہاں تک کہ میری تلوار کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں اور صرف قبضہ ہاتھ میں رہ جائے اور اس خدمت گزاری اور دوستی سے صرف خوشنودی خدا نے تعالیٰ مطلوب ہوگی۔

علیہ بن مظاہر

عصیب بن مظاہر پھر حبیب بن مظاہر اسدی نے اٹھ کر کہا: خدا کی قسم میں بھی تمہاری دوستی میں ایسا ہی تھلوں گا جیسا عابس نے بیان کیا ہے۔ اب لوگوں کی ٹولیاں آگنی شروع ہو گئیں۔ اور

قبول ابن خلدون: اس کی خبر نھان بن بشیر گورنر کوفہ تک پہنچی۔ چونکہ طبیعت میں علم و صلح پسندی تھی، لوگوں کو منع

میں اس سے نہ لڑوں گا اور نہ کسی کو محض شبہ ویدگانہ سے گرفتار کروں گا۔ ہاں اگر تم نے اتنے اکی اور نقص سبب کا اور

[illegible]

وہ کمزوروں کی رائے پر دشمنوں کے ساتھ سختی کا برتاؤ کرنا چاہیے۔ اس میں دشمنوں کو جرات ہوگی۔ لیکن انہوں نے جواب دیا: مجھے کمزور ہو کر اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں رہنا زیادہ محبوب ہے۔ اس سے کہ میں اللہ تعالیٰ کا گناہ گار ہو کر عزت والا بنوں۔ یہ کہہ کر لیکن میسر سے اتر آئے۔

نزید کو اطلاع عبد اللہ بن مسلم، عمارہ بن ولید بن عقبہ، عمرو بن سعد بن ابی وقاص نے مسلم بن حذیل کے آنے، لوگوں کی بیعت کرنے اور لیکن بن بشر کے خطبہ دینے کا حال نزید کو لکھ بھیجا اور یہ بھی تحریر کیا کہ اگر تم کو کوفہ کی ضرورت ہو تو کسی زوردار شخص کو مامور کرو جو تمہارے احکام کو استیصال اور وقت کے ساتھ جاری اور تمہارے ملک کی حفاظت اور تمہارے دشمنوں کو زیر کرے۔

حضرت ایام حسینؑ کا خط اہل بصرہ کے نام اسی زمانہ میں حسین بن علیؑ نے رسالہ اہل بصرہ ملک بن مسیح بکری، اخف بن قیس، منذر بن جارد، مسعود بن عمر، قیس بن ابیہثم، عمر بن عبید اللہ بن عمر وغیرہم کے پاس ایک خط روانہ کیا تھا جس میں ان لوگوں کو کتب اللہ و سنت رسول اللہ کی دعوت دی تھی۔ جسوں نے اس خط کو چھپالیا لیکن منذر بن جارد نے یہ کچھ کر کہ شاید ابن زیاد کا کر نہ ہو نامہ بر اور خط کو ابن زیاد کے روبرو پیش کر دیا۔

اعظم کوئی کے موافق: منذر بن جارد کی بیٹی عبید اللہ کے صلح میں تھی۔ صاحب لہوت کے موافق: اس کا نام بحسب یہ بنت منذر تھا۔

نزید ابن زیاد کو کوفہ کا عامل مقرر کرتا ہے اپنے کوئی نامہ نگاروں کے مضمون خط سے مطلع ہو کر نزید نے اپنے باپ کے وزیر سعد بن روی سے مشورہ کیا اور اس نے عبید اللہ بن زیاد کے لیے بصرہ کے ساتھ کوفہ کی گورنری کی صلاح دی۔ بعض مؤرخین کے نزدیک نزید ان دنوں ابن زیاد سے کچھ ناخوش تھا۔ میر بھی یہ صلاح اسے پہنچ آئی اور قبول اعظم کوئی اس نے ابن زیاد کو خط لکھا کہ: ”مسلم بن حذیل کو اس طرح تلاش کر کہ جس طرح غیل آدمی گرے ہوئے روپیہ کو ڈھونڈتا ہے۔ جس وقت اسے گرفتار کر لے تو فوراً قتل کر کے سر میرے پاس بھیج دے۔ خوب یاد رکھ کہ میں اس معاملہ کی نسبت تیرے کسی پدر اور حیلہ کو نہ سنوں گا۔“ یہ خط مسلم بن عمر البہالی کو دے کر کہا کہ ”بہت جلدی یہ خط بصرہ لے جا کر عبید اللہ کے حوالہ کر اور راستہ میں کسی جگہ نہ ٹھہرنا۔“

بصرہ میں فرزند رسولؐ کے قاصد کی شہادت ابن زیاد نے حسینؑ کے قاصد ظہیر کو قتل کیا اور ظہیر اسی روز نزید کا حکم پہنچا جیسا اعظم کوئی کے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن زیاد میسر پر گیا اور کہا: ”آج نزید کا ایک فرمان آیا ہے اس نے ولایت کوفہ بھی مجھے عطا کر دی ہے۔ میں کل کوفہ کو جاں گا۔ اپنے بھائی عثمان کو تمہارا امیر مقرر کرتا ہوں۔ لازم ہے کہ تم سب اس کو عزت اور حرمت سے رکھنا۔ ہر امر میں اس کی رضا مندی اور اطاعت کو اختیار کرنا۔ خدا نے واحد کی قسم اگر میں نے سنا کہ تم میں سے کسی نے خلافت ورزی کی اور فرمانبرداری سے غمہ پھیرا تو اسے مع اس شخص کے جو اس کا شریک مال ہوگا قتل

کر ڈالوں گا اور جب تک انتظام ٹھیک نہ ہو گا دشمن کو دوست کے حوض گرفتار کروں گا۔

شریک بن اعور

ابن زیاد دوسرے ہی دن کوفہ کی طرف روانہ ہوا۔ مسلم بن عمر الباہلی، منذر بن جارد اور شریک بن اعور ہمدانی کو اپنے ہمراہ لے لیا۔ کوفہ کے قریب پنج کرا ایک جگہ ٹھہر گیا اور اتنا انتظار کیا کہ آفتاب غروب ہو جائے۔ دو گھنٹہ رات گزری تھی کہ اس نے سیاہ عمامہ سر پر رکھا اور یہاں کی راہ سے داخل کوفہ ہونے کے لیے کوچ کیا۔ بقول ابن خلدون شریک اٹھانے راہ سے علیحدہ ہو گئے۔ بقول کامل شریک ابن اعور ابن زیاد کے لشکر سے جدا ہونے اور یہ خیال کیا کہ اسے کوفہ جانے میں کچھ توفیق ہو کہ حسینؑ پنج جاہیں لیکن ابن زیاد پنج گیا۔

اہل کوفہ کو دھوکا ہوا

بقول اعظم کوئی: اب چاند پوری روشنی ڈال رہا تھا لوگوں کو خیال تھا کہ امام حسینؑ تشریف لائیں گے۔ عبید اللہ کے ترک و اعتشام کو دیکھ کر خیال کیا کہ امام حسینؑ تشریف لائے ہیں۔ گروہ در گروہ لوگ آنے شروع ہو گئے اور عبید اللہ کو سلام کرتے تھے اور کہتے تھے کہ: اسے فرزند رسول مبارک ہو مبارک ہو۔ آپ کی تشریف آوری مبارک ہو۔ عبید اللہ ان کے سلام کا جواب دیتا تھا۔ آخر کار مسلم بن عمر الباہلی نے ایک شخص سے کہا: یہ عبید اللہ بن زیاد ہے، حسینؑ بن علی نہیں۔ تم کو محض دھوکا ہوا ہے۔ کوفہ والے اس حال سے مطلع ہو کر بھاگے اور منتشر ہو گئے۔

بقول صاحب سر الشہادتین: پس پیشوائی کی (ابن زیاد کی) لوگوں نے اندھیری رات میں۔

کوفہ میں ابن زیاد کی تقریر

عبید اللہ بن زیاد قصر امارت میں داخل ہوا۔ دوسرے روز منادی کر لئی کہ سب لوگ مسجد جامع میں حاضر ہوں۔ لوگ آنے اور ابن زیاد نے ”بوسہ چسپند بہ دشتاے چسپند“ کی ایسی بھاری رفاقت کرنے والوں کو انعام اور احسان اور مخالفت کرنے والوں کی گردن اور پیٹھ کو تلوار اور درہ کا امیدوار بنایا۔ بقول مترجم ابن خلدون جیسادہ (کامل ابن بشر، تاریخ الخلفاء، مطبوعات ابن قتیبہ اور عقد الفرید سے) نوٹ کرتا ہے: ”ان لوگوں کی تعداد بیچ بیچ ظاہر کرو جن کے دلوں میں احتکاف و بغاوت کا مادہ بھرا ہو۔ جس جو شخص صاف صاف کہہ دے گا وہ بری ہے اور جو شخص نہ کہے گا تو اس کا مذمہ وار کہا جائے گا۔ اگر اتفاق سے اس کے دوستوں آشتیوں میں سے کسی نے ہماری مخالفت کی یا ہم سے باغی ہوا تو ہم اس سے بری الذمہ ہیں۔ اس کا خون و مال ہم کو مباح ہو گا اور جس کے علم میں امیر المومنین کا باغی و مخالفت ہو اور اس نے نہ ظاہر کیا ہو تو ہم اس کو سولی دیدیں گے اور اس کا وظیفہ منہد کر لیں گے۔“

عصر کی نماز کے وقت حضرت مسلم کے رفقاء

صاحب نور العین فی مشہد الحسینؑ لکھتے ہیں کہ: ”جب عصر کا وقت آیا تو مسلم اپنے

گھر سے نکلے اور عصر کی نماز کے لیے جامع مسجد میں آنے اور جماعت کے ساتھ نماز پڑھانے کے لیے کھڑے ہوئے تو کوئی شخص ان کے پیچھے کھڑا نہ ہوا اور جس نے ان کو دیکھا لادھر ادر ٹل گیا۔ جب وہ نماز سے فارغ ہوئے اور مسجد سے نکلے لگے دیکھا تو ایک غلام کھڑا ہے۔ اس سے پوچھا اہل کوفہ کا کیا حال ہے۔ اس نے کہا: حضرت اہل کوفہ نے امام حسینؑ رضی اللہ عنہ کی بیعت توڑ ڈالی ہے اور سب یزید کی بیعت میں داخل ہو گئے ہیں اور ابن زیاد کے خطبہ کے حال منہا مسلم نے

دایاں ہاتھ بائیں ہاتھ پر بار کر کہا: "لا حول ولا قوۃ الا باللہ العلیٰ العظیم"۔ اور کسی ایسے شخص کی تلاش میں مصروف تھے جو ان کو پناہ دے۔ کوفہ میں ایک شخص مسی ہانی بن عروہ تھا جس کی عمر رسول اللہ ﷺ کے اہل بیت کی محبت میں گزر گئی تھی۔ وہ کوفہ کے سربراہ آئندہ لوگوں میں تھا اور سلاطین وقت کے نزدیک اس کی بڑی عزت تھی۔ مسلم اس کو جانتے تھے اس کا گھر پوچھتے پوچھتے گئے اور دروازہ کھٹکھٹایا۔ ایک لونڈی باہر آئی اور پوچھا کیا کہتے ہو؟ انہوں نے کہا اپنے آقا سے کہو کہ بنی ہاشم میں سے ایک شخص مسلم بن عقیل نام آپ سے ملنا چاہتا ہے۔ لونڈی نے اندر جا کر اپنے آقا سے کہا تو اس نے ان کو اندر بلا لیا۔ انہوں نے اندر جا کر سلام کیا وہ اس وقت بیمار تھے۔ مسلم ایک طرف بیٹھ گئے اور تمام حال بیان کیا اور کہا کہ ابن زیاد میرے قتل کے درپے ہے۔ ہانی نے کہا: "کوئی خوف کی بات نہیں ہے۔ یہ آپ کا گھر ہے۔ میں ان شاء اللہ آپ کے بچاؤ کی کوئی صورت نکالوں گا۔"

تجدید بیعت شروع ہوئی بعض موزنین کے نزدیک جس وقت حضرت مسلم پہنچے تو ہانی بن عروہ کو تردد ہوا لیکن آخر میں انہوں نے پناہ دی۔ اور اب بقول اعظم کوئی: لوگ پوشیدہ طور پر مسلم کے پاس حاضر ہوئے اور اس سر بیعت کرتے تھے۔ مسلم ان پر سخت قائم کرتے تھے کہ تم اپنے اقراروں پر مثبت قدم رہنا۔ بے وفائی نہ کرنا۔ وہ قسمیں کھاتے اور عہد دیکھان کرتے تھے۔ یہاں تک کہ بیس ہزار سے زیادہ آدمی بیعت کے حلقہ میں آگئے۔

شریک بن اعور کی علالت اعظم کوئی اور روضۃ الصفا کے موافق: شریک بن اعور ہمدانی ہانی بن عروہ کے گریہاں ہو کر غمیرے اور یہ مسلم کی درست امورات میں بہت سرگرم تھے۔ ابواسحاق اسمرائی کے موافق: ہانی بن عروہ بیمار کہے گئے ہیں۔ ابن زیاد نے شریک کا حال پوچھا اور جب معلوم ہوا کہ وہ بیمار ہیں تو اس نے عیادت کے لیے جانے کی اطلاع دی۔

شریک بن اعور مسلم کو ابن زیاد کے قتل کی صلاح دیتے ہیں شریک نے مسلم سے کہا کہ تمہیں اس سے بہتر موقع نہ ملے گا۔ میں اسے باتوں میں مشغول کروں گا تم اسے قتل کر ڈالنا۔ کوفہ تمہارے قبضہ میں آجائے گا۔ اور اگر میں جیتا رہا تو بصرہ بھی تمہارے تصرف میں آجائے گا۔

شریک کی بے چینی ابن زیاد آیا۔ شریک بے چینی سے اس کا انتظار کرتے رہے کہ مسلم نکلیں اور قتل کریں لیکن مسلم نہ آئے۔ شریک اس وقت بعض اشعار پڑھنے لگے جس کا مفہوم ہے کہ: "اے میری روح مشوقہ سلی کو سلام کر اور اس کے سلام کرنے والوں کو سلام کر۔ سلی کے سلام کرنے کا بچے کیوں انتظار کرنا پڑتا ہے۔ کیا کوئی شیریں پانی کا گھونٹ ہے جو میں پیاس کی حالت میں پی لوں، اگرچہ میں ہلاک ہو جاؤں۔ اور اس میں میری بد بختی ہو۔ پس اس کی طرف آؤ اور فیصلہ میں دیر نہ کر۔ اگر یہاں میں کچھ پانی ہو تو بلا دو۔"

بعض کے موافق: ابن زیاد کو شبہ ہوا اور چلا گیا۔ اور بعض کے موافق اس نے ہانی سے کہا کہ یہ ہمدانی کبک ہے اور ہانی نے جواب دیا کہ یہی اشعار مجھ سے اس کی زبان پر جاری ہیں۔ ابن زیاد کے جانے کے بعد شریک نے مسلم سے

وجہ یہی کہ تم نے کیوں ایسے نادر موقع کو ضائع کیا جس کے بعد تمہیں کوفہ پر قبضہ کرنے میں کوئی تردد نہ ہوتا۔
مسلم قتل نہ کرنے کی وجہ بتاتے ہیں
 میں کہا کہ: دو وجہ سے میں نے قتل نہیں کیا۔
 ایک یہ کہ ہانی کو ناگوار تھا کہ اس کے مکان پر وہ قتل کیا جائے۔ دوسرے یہ کہ امیر المومنین علیؑ نے رسول اللہ ﷺ سے روایت کی ہے کہ: **لن الايمان قيد الفتك فلا يفتك مومن بمومن**۔ (ایمان دھوکے کی خوریزی سے ملتا ہے اس لیے ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا اس طرح خون نہیں پھینکتا) شریک کی رائے اس سے مختلف تھی۔
 اور وہ ابن زیاد کے قتل کو موجب قرب خدا سمجھتے تھے۔

حسینؑ کے نام مسلمان کے خط کی گرفتاری
 اعظم کوئی کہتا ہے: ابھی یہ باتیں سو رہی تھیں کہ
 عبداللہ کا ایک خدمت گار ملک بن یبرقع تمی آیا
 اور کہا: اللہ تعالیٰ امیر کو محفوظ رکھے۔ ایک خوفناک ملاشہ کی خبر ہے۔ اس نے کہا: بیان کر۔ ملک نے کہا: میں سیر کے
 ارادہ سے شہر کے باہر گیا ہوا تھا اس کے گرد پھر رہا تھا ایک شخص کو دیکھا کہ گرد سے لٹل کر نہایت تیز روی سے مدینہ کی
 طرف جا رہا ہے۔ میں نے اس کے پیچھے گھوڑا ڈالا اور جا لیا پوچھا تو کون شخص ہے، اور کہاں جا رہا ہے۔ اس نے کہا: میں
 مدینہ کا رہنے والا ہوں۔ پھر میں نے گھوڑے سے اتر کر دریافت کیا: تیرے پاس کوئی خط ہے۔ اس نے اقرار نہ کیا۔ تو
 میں نے اس کے کپڑوں کی تلاش کی۔ ایک سر بند خط ملا۔ وہ یہ ہے، اور اس شخص کو امیر کے دروازہ پر پہرہ کے اندر دیدیا
 ہے۔ ضیاء اللہ نے خط لے کر کھولا۔ مضمون یہ تھا۔

”مسلم بن عقیل کی طرف سے حسینؑ بن علیؑ بن ابی طالب کو معلوم ہو کہ میں کوفہ
 پہنچا۔ تمام شیعہ لوگوں سے ملا۔ ان سے آپ کے لیے بیعت لی۔ میں ہزار شخصوں نے دلی
 رضا و رغبت سے آپ کی بیعت اختیار کر لی ہے۔ میں نے ان کے نام لکھ لیے ہیں۔ آپ
 اس خط کے مضمون سے مطلع ہوتے ہی فوراً چلے آئیں۔ کسی وجہ سے دیر نہ کریں۔ کیونکہ
 کوفہ والے دل سے آپ کے خیر خواہ اور دوست ہیں اور یزید سے متنفر۔“

ابن زیاد نے خط دینے والے کا نام دریافت کیا۔ لیکن عبداللہ بن قطین (یا قطیر) نے بتانے سے انکار کیا۔ صرف یہ
 کہا کہ میں بنی ہاشم کا ہوا خواہ ہوں اور مجھے ایک بڑھیا نے یہ خط دیا ہے۔ اور باوجود اس دھمکی کے کہ نام نہ بتانے کی
 صورت میں قتل کیے جانگے، قتل ہونا گوارا کیا۔
 علامہ مجلسی نے بھی بکار میں اس خط کی گرفتاری کا ذکر کیا ہے۔

شریک نے تین دن کے بعد اشتغال کیا۔ قبول اعظم کوئی: یہ شخص بصرہ کے بزرگوں اور اراکین میں سے تھا۔
 امیر المومنین علیؑ کا مداح شاعر تھا۔ اپنے کلام کو پوشیدہ رکھتا تھا۔ متعدد اشخاص کے سوا کسی غیر کو نہ سنا تھا۔ قبول ابن خلدون
 جنگ صفین میں جناب امیرؑ کے ہمراہ رکن تھے۔

ابن زیاد مسلم کی تلاش میں مشغول تھا اور آخر اس نے اپنے ظلم مقل کو تین ہزار درہم کی جاسوسی خلی دے کر کہا کہ تو جا کر علی کے دوستوں سے میل جول پیدا کر اور کہہ کہ

میں حسینؑ کا دوست ہوں اور مسلم کے لیے کچھ روپیہ لایا ہوں۔ مجھے ان کے پاس پہنچا دو کہ داخل ثواب ہوں۔ مقل روپیہ لے کر مسجد اعظم میں گیا اور متردد تھا کہ کس سے بات کرے کہ مسلم بن عوفہ اسدی سے ملاقات ہوئی اور اس سے یہ باتیں کہیں مسلم نے تمہیں لینے کے بعد اس سے دوسرے دن لے چلنے کا اقرار کیا۔ مقل نے ابن زیاد کو خبر دی اور اس نے تاکید کی کہ مردوں کی طرح اس کام کو انجام دینا۔ دوسرے دن پھر مسلم بن عوفہ سے ملاقات ہوئی اور یہ اسے ہانی کے گھر لے گئے مسلم سے بیعت ہوئی اور یہ دن بھر باتیں کرتا رہا۔ اور شام کو ابن زیاد کو خبر دی۔

ابن زیاد نے محمد بن اشعث بن قیس کنذی، اسلم بن خارجہ قناری اور عمر بن حجاج الزبیری کو بلایا۔

(صاحب لہوت کے موافق عمر بن حجاج الزبیری کی بیٹی روپیہ ہانی کی لہابی تھی) اور ہانی کے نہ آنے کا سبب بوجھ ان لوگوں نے طاعت کی وجہ بتائی اور اصرار پر لانے کا وعدہ کیا۔ دار الامارت سے نکل کر اب یہ لوگ سیدے ہانی کے گھر آئے اور ابن زیاد سے جو باتیں ہوئی تھیں بیان کیں۔ اس کے بعد یہ اصرار سوار کر کے لے سٹلے قصر کے قریب پہنچ کر ہانی نے کہا مجھے ابن زیاد سے فتویش پیدا ہو گئی ہے۔ لیکن محمد بن اشعث اور اسلم بن خارجہ نے تسکین دلائی کہ یہ محض وہم ہے اور اس کے بعد یہ لوگ دار الامارت میں داخل ہوئے۔ ابن زیاد نے ہانی کو دیکھ کر کہا کہ میں تیری حیات چاہتا ہوں اور تو میرے قتل کی فکر میں ہے؟

ابن زیاد صورت معاملہ ظاہر کر دیتا ہے۔ ہانی نے بوجھ کہ امیر نے کیا کہا اور ابن زیاد نے کہا شروع کیا کہ: معاملہ اس سے زیادہ کیا ہوگا کہ تو نے مسلم بن حقیلؑ کو اپنے گھر پناہ دی ہے۔ لوگ اور ہتھیار جمع کیے ہیں۔ تو بھتا ہے کہ میں تیرے کاموں سے ناواقف ہوں۔ (مقل کی طرف اشارہ کر کے) اس کو پہچانتا ہے؟

ہانی اب مجھے کہ مقل جاسوس تھا اور کہا کہ اسے امیر میں نے مسلم بن حقیلؑ کو خود طلب نہیں کیا بلکہ رات کی تاریکی میں وہ میرے گھر میں داخل ہو گئے اور میری پناہ چاہی۔ حیا کے خلاف تھا کہ میں ان کو قتل دیتا۔ اب وعدہ کرتا ہوں کہ اپنے گھر جا کر قاتل دوں گا اور پھر امیر کے پاس حاضر ہوں گا۔

ابن زیاد نے مسلم کی گرفتاری ہانی کی رہائی کی شرط قرار دی۔ وقت تک باہر نہ

جاسکو گے جب تک مسلم کو حاضر نہ کرو۔ ہانی نے کہا کہ ہر گز غم سے یہ نہ ہوگا۔ مردت میں یہ جائز نہیں ہے کہ پناہ گیر اور مہمان دشمن کے حوالہ کر دیا جائے کہ وہ قتل کر ڈالا جائے۔ یہ عرب کی سیرت نہیں ہے۔ اگر میں ایسا کروں گا تو یہ شرم خجہ سے کچھ دور نہ ہوگی اور ہمیشہ میں برے نام سے یاد کیا جاؤں گا۔

اس وقت مسلم بن عمر الباہلی نے ہانی سے کچھ بات کرنے کی اجازت مانگی اور ابن زیاد نے اس شرط پر اجازت دی کہ

قصر کے باہر نہ لے جانے۔ مسلم بن عمر الباہلہ ہانی کو کنارہ لے گیا اور کہہ دیا ہانی! انوس ہے تم پر کہ تم اپنی جان سے سیر ہو گئے ہو اور مسلم کے لیے اپنے اہل و عیال اور قبیلہ کو موردِ بلاء کرتے ہو۔ ہم میں سے اگر کوئی مسلم کو طلب کرتا تو تمہارا حوالہ کرنا عیب میں داخل تھا لیکن جس وقت ایک زبردست دشمن تم سے طلب کر رہا ہے مسلم کا حوالہ کرنا شرم کی بات نہیں ہے۔ ہانی نے جواب دیا کہ مسلم کے حوالہ کر دینے میں ہزار عیب ہے میں فرزند رسول اور اپنے مہان کو بھی دشمن کے حوالہ کرنے کی رسوائی گوارا نہ کروں گا۔ مسلم بن عمر نے مایوس ہو کر ابن زیاد سے گفتگو دہرائی اور اب ابن زیاد نے غصہ میں ہانی سے کہا:

گرم گفتگو ”اے ہانی اگر تم مسلم کو حاضر نہ کرو گے تو تمہیں قتل کروں گا۔“ ہانی نے جواب دیا: ”کس کی جہل ہے کہ میرے ساتھ ایسی حرکت کر سکے اگر تو اپنے اس خیال پر عمل کرے گا تو لوگوں کا ہنرہ کثیر ہے۔“

قصر کا محاصرہ کر لے گا۔“ ابن زیاد نے کہا: ”تو مجھے اپنے قبیلہ اور دوستوں سے ڈراتا ہے۔“

ہانی کے ساتھ برتاؤ اور برا فروختگی ابن زیاد کے ہاتھ میں ایک آہنی لکڑی تھی اس نے ہانی کے ہاتھ پر چھین مار دی جس سے ناک سے خون جاری ہوا۔ ہانی نے ایک سپاہی کے قبضہ پر ہاتھ ڈالا جو قریب کھڑا تھا لیکن اس نے ہاتھ پکڑ لیا اور اب ابن زیاد نے کہا کہ اے ہانی اب تیرا خون ہم پر مہلج ہو گیا اور اس کے بعد اخص قید کرنے کا حکم دیا۔ اسلم بن خارجہ جو ہانی کو چھپا رہا تھا ابن زیاد کا یہ برتاؤ دیکھ کر برا فروختہ ہوا اور کہنے لگا کہ اے امیر! ہانی کے آنے کے قبل تو اچھی اچھی باتیں کرتا تھا اور وعدہ و وعید کرتا تھا لیکن جب ہانی آیا تو تو نے نہ صرف غلات امید ہاتھیں کیں بلکہ اس کی ناک بھی توڑی جس سے اس کی داڑھی خون سے سرخ ہو گئی اور اب اس کے قتل کی دھمکی دے رہا ہے۔ یہ مناسب نہیں ہے۔ ابن زیاد کو یہ بھی برا معلوم ہوا اور اس نے اسلم کو مارنے کا حکم دیا کہ یہ قریب المرگ ہو گئے تو ہانی کی طرف دیکھ کر کہا: انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اے ہانی اب ہم تجھے موت کا پیغام دیتے ہیں اب یہ معاملہ ہاتھ سے نکل چکا۔“

مددگاروں کی نوعیت اور ہیئت اس وقت بقول ابن خلدون: ”رفتہ رفتہ عمرو بن العجلان تک یہ خبر پہنچی کہ ہانی مار ڈالا گیا۔ جوش میں آکر مذبح کو لے کر دارالامارت کا محاصرہ کر لیا اور بلند آواز سے کہا: ہم عمرو بن العجلان ہیں اور یہ سوارانِ مذبح اور ان کے سردار۔ ہم نہ تو اطاعت امیر المؤمنین سے نفرت ہوتے ہیں اور نہ تفریقِ جماعت کی ہے۔ ابن زیاد نے گھبرا کر قاضی شریح سے کہا: آپ ذرا ان کے دوست (ہانی) کے پاس تشریف لے جائیے اور اس کو دیکھ کر ان لوگوں سے کہہ دیجیے کہ وہ زندہ ہے۔ چنانچہ شریح قاضی نے ایسا ہی کیا اور وہ لوگ یہ سن کر کہ ہانی زندہ ہے لوٹ گئے۔“

طبری کہتا ہے کہ قتل ہانی کی خبر سن کر جو لوگ مسلم کے پاس آئے وہ: ”مردمانِ درویش بے سلاح (بودن) و ازاں مہتران کے بیرون نیامد۔“ مسلم ایشان را گفت بروں آئید بیعت دریں روز بلید کردن۔ ہر کے بگفت ما بیعت با حسین بن علی کردہ ایم۔ یا اور بیلید ما پیش او حرب کنیم ترا مہربلید کردن تا بیلید۔ یعنی: ”غریب لوگ بغیر ہتھیار کے تھے بڑے لوگوں میں سے کوئی نہ تھا مسلم نے ان سے کہا باہر آؤ آج بیعت کرنی چاہیے۔ سب نے کہا ہم نے حسین کی

بیعت کی ہے وہ انہیں گے تو ہم ان کے سامنے جنگ کریں گے قصیدہ ان کے آنے تک صبر کرنا چاہیے۔

مسلم بن حذیفہ کی یہ واقعات سن کر اپنے اصحاب میں
یا منصور امت کی صدا کرتے ہیں

ہاتھ پر اٹھارہ ہزار آدمی بیعت کر چکے تھے جس میں چار ہزار مکان میں موجود تھے قزوئی دیر میں ایک انبوہ کثیر جمع ہو گیا آپ نے عبداللہ بن عزیٰز کندی کو کندہ پر مامور فرما کر آگے بڑھنے کا حکم دیا اور مسلم بن حو سجہ اسدی کو مدح و اسد پر ابی ثمامہ صاندی کو تمیم و ہمدان پر عباس بن جعدہ حرانی کو مدینہ پر منتھین کر کے قسرات کا قہد کیا ابن زیاد نے دروازے بند کر لیے۔ قسرات کا کل صحن اور مسجد و بازار آدمیوں سے بھرا ہوا تھا۔۔۔۔۔ ابن زیاد کے ساتھ اس وقت قسرات میں تیس آدمی پولیس کے اور تیس آدمی اور تھے جن میں چند شرفاء کوفہ اور کچھ اس کے خود غلام و خاندان والے تھے۔ شام تک بھی کیفیت رہی۔۔۔۔۔

مسلم کے رفقاء منتشر ہو گئے
تب ابن زیاد نے ان کے منتشر کرنے کی یہ تدبیر نکالی کہ کثیر بن

شہاب حارثی کو مدح کی طرف محمد بن الاشعث کو کندہ و حضرموت کی جانب قتلع بن ثور الذہلی و شبث بن ریحی تھمی و حذر بن امر علی کو دشمنین دی ابوشن صہابی وغیرہم کو حکم دیا کہ قسرات کی کھڑکیوں اور ہالا خانہ سے کھڑے ہو کر لوگوں کو بھانجا کر مسلم بن حذیفہ سے علیحدہ ہونے کو کہو، اور اعلان کر دو کہ جو شخص اس وقت علیحدگی اختیار کر لے گا اس کو امان دی جائے گی اور جو شخص اس حکم سے سر تابی کرے گا وہ حضرموت شاہی میں گرفتار کیا جائے گا اور نہایت بری سزا اس کو دی جائے گی۔ اہل کوفہ کے کان میں جوں ہی یہ آواز پڑی اور انہوں نے اپنے روسا و سرداروں کو یہ کہتے ہوئے دیکھا ایک ایک دو دو پانچ پانچ دس دس علیحدہ ہونے لگے۔ اخیر اخیر یہ نیت چھٹی کہ عورت و مرد سب کے سب گھروں سے نکل پڑے اور وہ اپنے بیٹوں اور چھاتیوں کو بلا لے گئے یہاں تک کہ مسلم بن حذیفہ کے پاس مسجد میں صرف تیس آدمی باقی رہ گئے۔ اس وقت آپ مسجد سے نکل کر ابواب کندہ کی طرف روانہ ہوئے۔ کندہ کے دروازہ تک پہنچے پہنچے یہ تیس نفر بھی علیحدہ ہو گئے۔

ایک اور بیان
صاحب روضۃ الشہداء کے موافق ہانی کی خبر سن کر مسلم نے دار الامارت کا محاصرہ کیا اور قریب

مسلم تنہا رہ گئے۔ اب انہوں نے چاہا کہ ہم کوفہ سے نکل جائیں کہ سعید بن اخف نے اس نیلاد پر منع کیا کہ کوفہ کے تمام راستوں کی محافظت ہو رہی ہے جانا ممکن نہیں ہے۔ اس کے بعد مسلم کو محمد کثیر کے گھر لے آئے۔ ابن زیاد کو خبر معلوم ہوئی اور اس نے محمد کثیر اور ان کے لڑکے کو گرفتار کر لیا لیکن مسلم کو نہ ہلاک محمد کثیر کی قوم نے پھر دار الامارت کا محاصرہ کیا اور اب ابن زیاد نے محمد کثیر کو چھوڑ دیا۔ اور ان کے لڑکے کو خلافت میں رکھ لیا محمد کثیر گھر آئے۔ اب سلیمان بن مرد، مختار بن ابوشبیدہ ثقفی، در قان حازب وغیرہ روسا نے کوفہ جمع ہونے اور صلاح ہوئی کہ ہم لوگ مسلم کو قبائل عرب میں لے جا کر لشکر جمع کریں اور حسین کے پاس جا کر دشمنوں سے جنگ کے لیے آمادہ ہوں۔

لیکن مع کو حاصر ابن طفیل شام سے دس ہزار سواروں کی جمعیت سے ابن زیاد کے پاس آیا۔ مع کو ابن زیاد نے

محمد کثیر کو طلب کیا یہ مع اپنے خداموں کے صلح ہونے اور ان کے قبیلہ کے ہزاروں آدمیوں نے قہر کو گھیر لیا۔ ابن زیاد نے محمد کثیر سے مسلم کو طلب کیا لیکن انہوں نے انکار کیا۔ ابن زیاد نے دوات ان کی پیشانی پر بھیجی ماری جس سے خون جاری ہوا۔ محمد کثیر نے تلوار کھینچی لیکن لوگ لپٹ گئے اور تلوار لے لی۔ مقتل جاسوس تلوار لگاتے قریب کھڑا تھا۔ محمد کثیر نے اس کی تلوار نکال لی اور اسے وہیں ٹھنڈا کر دیا اور حملہ شروع کیا۔ ابن زیاد بھاگ گیا۔ اسلحہ دس آدمی قتل کیے تھے کہ گرفتار ہو گئے۔ محمد کثیر کے لڑکے نے یہ دیکھ کر حملہ کیا، اور کئی کو قتل کیا تھا کہ کسی نے پشت سے نیزہ مارا۔ اور یہ گرفتار کیا۔ ابن زیاد کے حکم سے دونوں کے سران کی قوم کے سامنے پھینک دیے گئے۔ قوم نے اب جنگ بے سود سمجھ کر کھار استہ لیا۔ مختار نے قبیلہ کریم میں سلیمان بن صرد نے بنی زید میں اور قاتنے قاضی شریع کے حملہ میں پناہ لی۔ مسلم مصلوں کی فوجوں سے بچتے ہوئے طومہ کے گھر پہنچے۔

مسلم عطلوعہ کے گھر قول ابن خلدون: "حق تھا بھولتے بھٹکتے بنی کنندہ کی ایک عورت کے مکان پر پہنچے (جس کا نام طومہ تھا۔ اس کا لڑکا بلال لوگوں کے ساتھ سپاہی بن کر گیا تھا) مسلم بن عقیل نے اس کو سلام کر کے پانی طلب کیا۔ طومہ نے پانی پلایا۔ آپ اسی کے دروازہ پر بیٹھ گئے۔ طومہ نے کہا: اے خدا کے بندے کیا تم نے پانی نہیں پیا؟ جواب دیا: ہاں۔ پھر طومہ نے کہا: تم اپنے گھر چلاؤ۔ تین بار اس فقرہ کو اس نے دہرایا۔ آپ نے کچھ جواب نہ دیا۔ تب طومہ بولی: سبحان اللہ میں تم کو گھر جانے کو کہتی ہوں اور تم خاموش بیٹھے ہو۔ اٹھو اپنے گھر چلاؤ۔ مجھے تمہارا یہاں بیٹھنا پسند نہیں ہے۔ آپ نے ایک سرد آہ کھینچ کر ارشاد کیا: اس شہر میں میرا نہ مکان ہے نہ کوئی عزیز قریب ہے۔ کیا تم مجھ کو اپنے گھر میں پناہ دے سکتی ہو؟ اور میرے ساتھ کچھ بھلائی کر سکتی ہو۔ شلید اس کے بعد کبھی میں تم کو اس کا معاملہ دے سکوں۔ طومہ بولی: آپ ہیں کون؟ فرمایا: میں مسلم بن عقیل ہوں۔ مجھے کوفہ والوں نے دھوکا دیا ہے۔ طومہ نے کہا: اچھا آپ میرے مکان میں قسریت لائیے۔"

طومہ لڑکے کے اصرار پر راز بتاتی ہے غرض مسلم بن عقیل کو طومہ نے اپنے مکان کے دوسرے احاطہ میں گھمراہ کھانا لائی۔ لیکن آپ نے تنول نہ کیا۔ اس عرصہ میں اس کا لڑکا آگیا۔ اور طومہ کو بار بار دوسرے احاطہ میں آتے جاتے دیکھ کر سبب دریافت کیا۔ بڑے اصرار سے عہد دیا کہ انہوں نے کچھ نہیں بتائی۔ لیکن آپ نے اپنے احباب کے مسجد میں آیا اور حملہ نہ کر لای کہ سب لوگوں کا حضور دریافت کر دیا گیا کسی پر کوئی الزام باقی نہیں ہے۔ عشا کی نماز مسجد میں آکر پڑھو۔ تھوڑی دیر میں آدمیوں سے مسجد بھر گئی۔ ابن زیاد نے جامعہ کے ساتھ نماز پڑھی اور منبر پر کھڑے ہو کر اس مضمون کا خطبہ دیا کہ ابن عقیل نے تم لوگوں میں اختلاف و فتناء پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ جس کے گھر میں ہم اس کو پائیں گے وہ بری المذمہ ہے اور جو شخص اس کو گرفتار کر لائے گا اس کو ہم انعام دیں گے۔ بعد اس کے حصین بن قیس کو حکم دیا کہ اسی وقت کوفہ کی ناکہ بندی کر لے۔ معج ہوتے ہوتے تمام مکانات کی تلاشی لینا۔ معج ہوتی۔ ابن زیاد نے ایک جلسہ عام منعقد کیا اور بلال (طومہ کے لڑکے) نے بیچ کر

بلال دربار میں آکر اطلاع دیتا ہے

عبدالرحمن بن محمد بن اشعث سے مسلم بن عقیل کے آنے اور مکان میں چھپانے کے ماجرایان کیا۔ عبدالرحمن نے اپنے باپ محمد سے جس وقت وہ ابن زیاد کے پاس دربار میں بیٹھا تھا اور محمد بن اشعث نے ابن زیاد سے بتلایا۔ ابن زیاد نے مسلم بن عقیل کی گرفتاری کے لیے محمد کو معز بن عبداللہ ابن عباس اگلی اور قیس کے ستر آدمیوں کے روانہ کیا۔

مسلم کی جنگ مسلم بن عقیل ان لوگوں کی آواز پر سن کر تلوار کھینچ کر نکل آئے اور نہایت مردانگی سے ان کو گمر کے باہر نکال دیا۔ مگر وہ لوگ حملہ آور ہو کر آئے تھے اور مسلم بن عقیل

دم بھرتیں ان کو نکال دیتے تھے۔ روضۃ الغضا اور احکم کئی کے موافق ابن زیاد نے محمد بن اشعث سے پوچھا کہ تیرے بیٹے نے تم سے کیا بات کی۔ اس پر محمد بن اشعث نے کہا: اللہ تعالیٰ امیر کو خلعت بخشے بڑی خوشخبری کی بات ہے۔ عبید اللہ نے کہا میں ہمیشہ تیری زبان سے خوشخبری کی باتیں سنتا رہتا ہوں۔ اس نے کہا میرا بیٹا کہتا ہے کہ مسلم بن عقیل ایک عورت طوع کے گھر میں پوشیدہ ہے۔ عبید اللہ بہت خوش ہوا اور کہا جیسے بہت بڑا انعام اور خلعت دیا جائے گا۔ اسے پکڑا۔ عمر بن حریث جدوی کو جو اس کا نائب تھا حکم دیا کہ تین سو نامور بہادر فوج میں سے چھٹ کر محمد بن اشعث کے حوالہ کر دے کہ انہیں ہمارے جانے اور مسلم کو گرفتار کر لے۔ محمد تین سو سواروں کو سمجھانے کر جب اس گھر کے قریب پہنچا۔

فوج دیکھ کر مسلم کی آمادگی کی صورت مسلم نے گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز سن کر جان لیا کہ میری گرفتاری کے لیے آتے ہیں۔ اللہ کر اپنی زرہ

پہنی۔ اب وہ لوگ بھی دروازہ پر پہنچے تھے اور گمر کو آگ لگادی تھی کہ اندر آئیں۔ مسلم نے یہ حال دیکھ کر تنگم کیا اور کہا اے نفس مرنے کے لیے مستعد ہو جا۔ آدم کی اولاد کا بھی انجام ہے۔ پھر طوع سے کہا تم کو خدا بخشے گمر کا دروازہ کھول دے اس نے دروازہ کھولا۔ مسلم غضب ناک شیر کی طرح جھپٹ کر گمر سے باہر نکلے اور ایک ہی جملہ میں کئی شخصوں کو مار گرایا۔ لوگوں نے عبید اللہ سے کہا کہ مسلم مقابلہ سے پیش آیا اور کئی شخص مار ڈالے۔ اس نے محمد سے کہا صیحا کہ تم صرف ایک شخص کی گرفتاری کے لیے تین سو سوار جہاز دیے گئے تھے کہ تو اسے پکڑ لے تو نے اسے کیوں جنگ کر لے اور کئی شخصوں کے ہلاک کرنے کا موقع دیا۔ یہ کیسی کمزوری اور عاجزی کی بات ہے۔ مسلم اگرچہ بہادر ہے مگر ایک شخص سے زیادہ نہیں ہے۔ محمد نے جواب میں کہا صیحا کہ کیا تو خیال کرتا ہے کہ مجھے کسی بچے کے مقابلہ پر بھیجا ہے۔ خدا کی قسم وہ ایک ہزار بہادر جوانوں کے ہم پلہ ہے اور اگر ایسے شخص کا کوئی ساتھ دیتا تو دنیا کو ہماری نگاہوں میں تاریک کر دیتا۔ مسلم آسانی سے گرفتار نہیں ہو سکتا۔ کوئی اور تدبیر کرنی چاہیے۔ عبید اللہ نے کہا صیحا کہ اسے پتہ ہے کہ بہ آسانی قبضہ میں آجائے۔

مسلم سے امان کا تذکرہ اور جواب ابن اشعث کے تذکرہ امان پر قبول لہوت آپ نے کہا کہ: ”خدا روں اور غباروں کی امان کیا۔“

قبول ابوالقاسم اسرافانی فرمایا: ”اے خدا در رسول کے دشمنوں کو امان نہیں ہے۔“ قبول روضۃ الغضا: ”مجھے تمہاری امان کی احتیاج نہیں ہے۔ تم کاستوں کی بات پر کیا احتجاج ہے۔ تم مجھ پر اس طرح پتھر پھینک رہے ہو کہ جس طرح کافروں پر پھینکا جاتا ہے۔ کیا نہیں جانتے کہ ہم اہل بیت رسول ہیں۔“ قبول ابن خلدون اور لہوت اشعار پڑھتے تھے جس کا مطلب ہے کہ: میں نے قسم کھائی ہے کہ سوا بہادر کے کسی کو قتل نہ کروں گا۔ اگرچہ موت کو میں نے ایک بری چیز دیکھ کر وہ

جاتا ہوں کہ کسی کو فریب دوں۔ مجھے خوف ہے کہ میں جھٹلایا یا دھوکا دیا جاؤں گا یا ٹھنڈی چیز میں گرم کڑوی چیز ملا دی جائے، آفتاب کی شعاع لوٹادی جائے اور وہ ٹھہر جائے ہر شخص کو ایک دن مرنا ہے۔

محاصرہ اور گرفتاری

لشکر آواز دے رہا تھا کہ تم سے نہ جھوٹ بولیں گے نہ فریب کریں گے لیکن مسلمان نے اس کی کچھ پرواہ نہ کی اور پھر حملہ کیا۔ لشکر نے بھی حملہ کر دیا۔ اس وقت بکیر بن حمران اسدی کو موقع مل گیا کہ وہ نکوار کا دار کرتا۔ اس سے مسلمان کا پانی لب کٹ گیا اور دودھت ٹوٹ گئے لیکن یہ بھی مسلمان کے قریب آچکا تھا۔ انھوں نے بھی اس پر وار کیا اور وہ وہیں ٹھٹھا ہو گیا۔ اب بکیر کے رہتا چمت پر چڑھ گئے اور پھر اور آگ پھینکنے لگے۔ مسلمان بھی جست کر کے قریب پہنچے اور نکوار اپنا کام کرنے لگا۔ اب بعض کے موافق دشمن نے گڑھا کھودا۔ جس وقت مسلمان دشمنوں کو پیچھے ہٹاتے چلے جاتے تھے اس میں گر پڑے اور بعض کے موافق کسی نے پشت پر سے نیزہ مارا کہ آپ فتح کے بل گر پڑے اور دشمنوں نے جوم کر کے پکڑ لیا۔ اسلحہ چھین لیا گیا اور کسی نے علامہ بھی اتار لیا۔ جوش جنگ اور زخم سے پیاس کی شدت تھی۔ آپ نے پانی طلب کیا اس وقت عمر الباہلی نے کہا: ”ظہر آج نہ چٹی مگر دربار“۔ مسلمان نے کہا: ”تق ہے تم پر تو نے نہایت ہی نازیبا بات کہی۔ تجھے قریشی کہنا غلطی ہوگی تو کسی قریشی باپ کی اولاد نہ بگھا جائے گا۔“ عمر الباہلی نے کہا تو کون ہے مسلمان عقلیل نے کہا میں وہ شخص ہوں جس نے اس وقت خدا کو پھیلاتا جب کہ تو فکر تھا۔ اور اس وقت امام کی متابعت کی جس وقت تو گناہ کرتا تھا میں مسلمان عقلیل ہوں۔ اے باہلہ کے بچے تو جہنم کا زیادہ سزاوار ہے کہ تو نے آل رسول کی متابعت پر آل ابوسفیان کو ترجیح دی۔

حضرت مسلمؓ امامؓ کے لیے متاسف تھے اس وقت پھر آپ نے پانی طلب کیا کوئی کوزہ آج لایا لیکن پانی لب اور دانتوں کے خون سے

سرخ ہو گیا اور دودھت بھی اس میں گر گئے۔ پانی نہ پیدا ہو زمین نے کہا ہے کہ اس وقت آپ کے چہرہ پر آثار حزن ظاہر ہوئے ہے دیکھ کر عبداللہ اُکلی نے کہا کہ مصیبت کے وقت رونے سے کیا فائدہ لیکن آپ نے جواب دیا کہ میں اپنے لیے نہیں روتا بلکہ میں حسینؑ کے لیے متاسف ہوں۔ اس کے بعد آپ نے محمد بن اشعث سے کہا کہ تو مجھے امان دہی سے عاجز ہے لیکن میری خواہش ہے کہ تو حسینؑ کو میرے حالات سے مطلع کر دے۔

اب زئی اور یحیٰ بن شیر ابن زیاد کے دربار میں لایا گیا اور بقول ابواخی آپ نے فرمایا: اس شخص پر میرا سلام ہے جو ہدایت پر چلتا ہے۔ موت کے سراپاں سے ڈرتا ہے اور اس سچے اور برتر بادشاہ کی اطاعت کرتا ہے۔ قتیب (بقول ابن خلدون عری ازدی) نے کہا: اے مسلم تم نے امیر کو سلام نہیں کیا۔ مسلم نے جواب دیا کہ: امیر تو صرف میرا آقا میرا مالک میرے آکا کا بیٹا میرا پیارا میری آنکھوں کی ٹھنڈک میرے چچا کا بیٹا امام حسینؑ رضی اللہ عنہ بن علیؑ ابن ابی طالبؑ ہے اور کوئی نہیں ہے۔ میں مسلمان عقلیل ہوں۔ موت سے مجھے کوئی خوف نہیں ہے۔ (اور اللہ تعالیٰ) بقول لہوت فرمایا: دانے جو تم پر چپ رہا وہ میرا حاکم نہیں ہے۔ بقول روضۃ الشہداء جواب دیا کہ اس سلام میں نہ دنیا کا فائدہ ہے نہ عقیقی کا۔ بقول ابن خلدون فرمایا: اگر یہ میرے قتل کا قصد رکھتا ہے تو میرا سلام ہی کیا ہے اور اگر میرے قتل کا ارادہ نہیں ہے تو بہت سلام ہو جائیں گے۔ ابن زیاد بولا میں تم کو ضرور ضرور قتل کروں گا۔ مسلم نے کہا میں بھی ایسا ہی خیال کرتا ہوں۔ اچھا تم مجھے

اجازت دو کہ میں اپنی قوم میں سے کسی کو کچھ وصیت کر دوں۔ ابن زیاد نے اجازت دی۔ آپ نے عمرو بن سعد کی طرف متوجہ ہو کر کہا میری اور تمہاری عزیز داری ہے میں تم سے کچھ پوشیدہ بات کیا چاہتا ہوں۔ عمرو بن سعد نے ابن زیاد کی طرف دیکھ کر ابن زیاد نے کہا جولو غلیہ میں سن لو۔ میں تم کو تمہارے ابن عم کی بات سننے سے نہیں روکتا۔

حضرت مسلم ابن سعد سے وصیت کرتے ہیں میں محمد رسول اللہ کے حقیقی امیر اور حقیقی امیر کے ایک گوشہ

ظان تھا جس سے سات سو درہم قرض لے کر اپنی ضرورتوں میں صرف کیا ہے۔ تم اس کو میری طرف سے ادا کر دینا اور بعد میرے قتل ہونے کے میری نفس کو اجازت لے کر دفن کر دینا اور حسین کے پاس پیغام پہنچا دینا کہ وہ کوفہ میں نہ آئیں۔ عمرو بن سعد نے یہ سب باتیں ابن زیاد سے بتائیں۔ ابن زیاد نے کہا تم اس میں خیانت نہ کرو۔ مال کی بابت تم کو اختیار ہے جو چاہو کرو۔ حسین کی نسبت یہ کہتا ہوں کہ اگر وہ میری طرف آنے کا ارادہ نہ کریں گے تو میں بھی ان کا قصد نہ کروں گا۔ باقی رہا اس کا لاشہ میں اس بارہ میں تمہاری سفارش نہ سنوں گا۔

ابن زیاد اور حسین کی آمد ابو احق، اعظم کئی اور روضۃ الغضا وغیرہ کے موافق حضرت مسلم نے کہا تھا کہ میرا اسلحہ اور گھوڑا بیچ کر قرض ادا کر دینا اور ابو احق کے موافق:

ابن سعد نے کہا: ”زرہ کی فروخت کے نسبت ہم کو اختیار ہے فروخت کریں یا نہ کریں۔ حسین کو یہاں آنے دینا چاہیے تاکہ وہ بھی موت کا ذائقہ چکھے۔“ قبول روضۃ الغضا ابن زیاد نے کہا: ”واما الحسین فلا کرہمہ۔“

حضرت مسلم اور ابن زیاد کی گفتگو اس کے بعد ابن زیاد نے مسلم سے مخاطب ہو کر کہا: تم نے کوفہ میں آکر گردہ بندی کی۔ لوگوں کو ہمارے برخلاف جمع کیا

اور ان میں فتنہ ڈالنے کی کوشش کی۔

مسلم بن حقیل: یہ ہرگز نہیں ہوا لیکن ان شہر والوں نے یہ خیال کیا تھا کہ تمہارے باپ نے ان کے اچھوں کو مار ڈالا ہے۔ خون ریزی کی ہے اور ان کے ساتھ کسریٰ و قیصر کے سے برتاؤ کیے ہیں۔ ہم ان کے بلانے سے ان کے پاس اس غرض سے آئے تھے کہ ان میں مدد و انصاف کریں اور کتب و سنت پر عمل کرنے کی ہدایت کریں۔

ابن زیاد: تو اور یہ کام کیا ان میں مدد و انصاف نہیں کیا گیا تو مدینہ میں شراب پیتا تھا اور اب یہاں انصاف کرنے کو آیا ہے۔

مسلم بن حقیل: میں شراب پیتا تھا۔ واللہ اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ تو مجھوٹا ہے۔ میں ایسا نہیں ہوں جیسا تو کہتا ہے۔

پانے میرے شراب پینے کا وہ شخص متقی ہے جو مسلمانوں کے خون سے اپنے ہاتھوں کو رنگتا ہے۔ اور اللہ کے بندوں کو غضب و عداوت سے قتل کرتا ہے۔ اور اس کو اس نے لہو و لعل کجایا ہے۔

ابن زیاد: مجھے اللہ مارے، اگر میں تجھے اس طرح پر قتل نہ کروں کہ آج تک اسلام میں اس طرح کوئی قتل نہ کیا گیا ہو۔

مسلم: بے شک یہ لیاقت تجویزی میں ہے کہ اسلام میں بدعت و بدعتی و خیانت کا موجد ہو۔

ابن زیاد یہ سن کر مجاہد اٹھا ان کو اور حسین و علی و عقیل (رضی اللہ عنہم) کو سخت دست کہنے لگا۔ مسلم بن عقیل نے کچھ جواب نہ دیا خاموش رہے۔ بعد اس کے ابن زیاد نے حکم دیا کہ بالائے قہر لے جا کر مسلم بن عقیل قتل کیے جائیں اور سر کے ساتھ لاشہ بے گور و کفن پھینک دیا جائے۔۔۔ لوگ آپ کو بالائے قہر لے گئے۔ آپ انتظار کرتے اور سچ پڑھتے ہوئے گئے۔ مقام حدائین کے مقابل شہید کیے گئے۔ شہید کرنے والا بکر بن حران ہے۔ جس پر آپ نے تلوار چلائی حمید اور سر کے ساتھ لاشہ پھینک دیا گیا۔

ضربت اور مسلم کے الفاظ
مرنے وقت مسلم نے مغفرت کی۔
صاحب تاریخ التواریخ کے موافق قاتل کی پہلی ضرب نے کام نہیں دیا تو مسلم نے کہا کہ: یہ غراش کافی نہیں ہے۔ اور ابن زیاد نے سن کہا کہ

ہانی کی شہادت
مسلم بن عقیل کے شہید ہونے کے بعد محمد بن اشعث نے ہانی کی سفارش کی کہ ابن زیاد نے ہانی کو منظور کر کے حکم دیا کہ سر بازار لے جا کر ہانی کی گردن ماری جائے۔ چنانچہ اس کے ایک ترک غلام نے اس کی تعمیل کی۔ (ابن خلدون) اعمش کوئی کے موافق قاتل ہانی کا نام رشید تھا۔
شہادت کے بعد لاشوں سے برتاؤ
قبول ابی اسحاق: پھر ابن زیاد کے لوگوں نے مسلم اور ہانی کے جسموں کو بازاروں میں پھینچنا شروع کیا۔ اس کے بعد ابن زیاد نے ان دونوں کے سر کو کاٹ کر ہانی بن جبیلہ اور زبیر بن ارواح کے ساتھ زبیر کے پاس بھیج دیا۔ قبول اعمش کوئی: بن حکم ابن زیاد ہانی اور مسلم کی لاشیں سولی پر اٹھی لٹکادیں۔

مرثیہ
عبد اللہ ابن زبیر اسدی، فرزدق یا شلمیہا حتی نے یہ اشعار کہے جس کا ترجمہ ہے کہ: اگر تو نہیں جانتا کہ موت کیا چیز ہے تو ہانی اور فرزدق عقیل کی طرف بازاروں میں دیکھ۔ ایسے بہادر کی جانب جس کا منہ تلوار نے توڑا اور دوسرا قتل کر کے کوٹھے سے گرا دیا گیا۔ ان دونوں کو ایک زانی کے بچے نے تکلیف دی۔ اب وہ دونوں ہر راہ گیر کے زہان زد ہو رہے ہیں۔ دیکھتے ہو کہ موت نے بدن کے رنگ کو بدل دیا ہے۔ قیمتی خون خالص راستوں میں بہ رہا ہے۔ وہ جوان ایسا باحیا تھا کہ جیسے جوان عورت شرمیلی ہوتی ہے اور ذودھاری تلوار سے بھی زیادہ کاٹنے والا تھا۔ آیا امن کے ساتھ لوگ اونٹوں پر سوار ہوتے ہیں۔ حالانکہ واقعی قبیلہ مذحج نے اس کے خون کا عوض طلب کیا ہے۔ قبیلہ مراد کے لوگ اس کے ہر طرف پھر رہے ہیں اور ہر ایک ان کے سائل اور مستول کی گردنوں پر ہے۔ اگر تم نے اپنے بھائی کے خون کا عوض نہ لیا تو پھر تم رہنمایاں بن جاؤ جو تھوڑی غری پر راضی ہو جاتی ہیں۔

۳ یا ۸ ذیحجہ ۶۰ شہادت کی تاریخ
صاحب لہوت کے موافق حضرت مسلم ۸ ذیحجہ کو شہید ہوئے۔
صاحب سر الشہادتین کے موافق ۳ ذیحجہ کو شہید ہوئے۔
مسلم بن عقیل کی روانگی کوفہ کی جانب انھوں اور بعض

کہتے ہیں نوبی شب کو ذیقعد سنہ ۱۱ میں یحییٰ قتی۔
در آنجا یکہ وہ پہلے کہ چکا ہے کہ: "مسلم بن حقیق بہ

بقول کامل ابن اثیر کے خروج کی تاریخ

تعلیل ایشادہیل ذی الحجہ سنہ ۱۱ کو کوفہ میں داخل ہوئے۔ "غالبا اس سے خروج مراد ہے۔ جیسا تاریخ کامل ابن اثیر میں ہے۔
اس کے بعد بقول ابواسحاق اسمرائی ابن زیاد نے زید کو لکھا: "تھک رہے خدا کا جس نے
امیر المومنین کا حق دلا یا اور اس کے دشمن کی شردلع کی۔ اے امیر! مسلم بن حقیق،
ہانی بن عروہ کے گھرمیں آیا۔ لوگوں نے دیکھ لیا۔ میں نے ان دونوں کو گرفتار کر لیا۔ یہ ان دونوں کے سر میں جو ہانی بن جبہ
روای اور زبیر بن ارواح یحییٰ کے ہاتھ ارسال ہیں اور یہ دونوں شخص تابع فرماں ہیں۔ جو کچھ آپ پوچھنا چاہیں ان سے دریافت
فرمائیں اور جو چاہیں حکم دیں کیونکہ ان دونوں کو صحیح حالات معلوم ہیں۔"

زید کو اطلاع

زید نے جواب لکھا: "اے امیر! تم نے ویسی ہی کارروائی کی جو میں چاہتا تھا۔ اور تم نے شیر
کی طرح حملہ کیا۔ اب میں نے سنا ہے کہ حسینؑ اپنے اہل و عیال اور قبیلہ سمیت روانہ ہو گیا ہے
اور عراق کی طرف آ رہا ہے۔ تم کو اس کی طرف جانا چاہیے اور جب تک اس کو قتل کر کے اس کا سر اور اس کے رفیقوں
کا سر میری طرف نہ بھیج دو اس وقت تک تم کو تکلیف لگانا اور میری طرح کرنا نہیں چاہیے۔"

زید کا جواب

بقول اعظم کوئی جب ان دونوں شخصوں نے شہیدوں کے سر اور خط زید کے حوالہ کیے تو اس نے خط کا مطالعہ کر کے
حکم دیا کہ "یہ سرد مشق کے دروازہ پر لٹکا دیے جائیں۔" اور خود جواب میں لکھا کہ: "تیرا خط آیا۔ مسلمؑ اور ہانی کے سر
پہنچے۔ میں بہت خوش ہوا۔ تو مجھے بہت ہی عزیز ہے۔ جیسا میں چاہتا تھا تو ویسا ہی نکلا۔ میں تم سے کسی امر کی باز پرس نہیں
کرتا۔ جو کچھ تو نے کیا خوب کیا۔ ہاں یہ بھی سنتا ہوں کہ حسینؑ بن علیؑ کے قتل کر عراق کا ارادہ رکھتا ہے۔ مجھے بہت
ہی احتیاط رکھنی لازم ہے۔ خبرداری کے ساتھ راستوں کو اپنی نگرانی اور حفاظت میں لے لینا چاہیے۔ اور جس شخص کو کوفہ کی
کجے خواہ قتل کر یا قید میں ڈال، مجھے اختیار ہے۔ اور حسینؑ کی جو جو خبریں مجھے معلوم ہوتی رہیں وقتاً فوقتاً مجھے ان سے منسل
اطلاع دیتا رہ۔"

ابواسحاق اسمرائی کے موافق جب ابن زیاد کو زید کا خط ملا تو اس نے
"جلی طور پر مسلم کی زبان سے امام حسینؑ کی طرف یوں خط لکھا:

حسینؑ کے نام جلی خط

"بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ اما بعد اے ابن عم عراق میں ہم کو کامیابی حاصل ہو گئی۔ تمام لوگ مطیع ہیں
جلد آئیے، دیر نہ کیجیے۔ لوگوں کے دل ہمارے ساتھ ہیں اور وہ آپ کی امداد کے لیے چشم براہ
ہیں۔ جلد اٹھیے اور جلد آئیے۔"

پھر ابن زیاد نے خط لکھا اور اہل کوفہ میں سے ایک شخص کو دے کر حکم دیا کہ حسینؑ سے ملو۔ راستہ میں مدینہ میں یا مکہ
میں جہاں ملو یہ خط اس کو دیدو۔ اس نے کہا بسر و چشم خط لکھا اور روانہ ہوا۔ جب مدینہ تک ایک منزل رہ گئی تو اس کو امام
حسینؑ ملے جو اسی روز مدینہ سے روانہ ہوئے تھے۔ تمام عصر کا وقت تھا۔ قاصد نے وہ خط ان کو دیا جس کو امام حسینؑ نے
لے کر پڑھا اور کہا اور نہایت خوش ہوئے۔ پھر باقی تمام لوگوں کو بھی سنایا۔ پھر امام حسینؑ نے تمام لوگوں کو اسی جگہ

۱۵ ذی الحجہ مقام کرنے اور دن کا باقی حصہ اور رات گزارنے کا حکم دیا۔ اس روز ذوالحجہ کی پندرہویں تاریخ

حی۔ ابن زیاد کا قاصد ابن سے رخصت ہو گیا اور جنگوں اور پہاڑوں کو طے کرتا ہوا ابن زیاد کے پاس پہنچا۔ اور اس کو امام حسینؑ کے حالات بتائے کہ وہ خط کو پڑھ کر بہت خوش ہوئے اور عترت ب کوفہ آنے والے ہیں۔ ابن زیاد نے فوراً کھڑے ہو کر حسین بن نمیر کو ایک ہزار سوار دے کر امام حسینؑ کی عمرانی کے لیے بھیجا کہ ان کو کوفہ تک لے آئے۔ تاکہ وہ ہمیں مسلم کی خبر سن کر جاکر نہ جائیں اور قتل سے نہ بچ جائیں۔ حسین یہ حکم لے کر روانہ ہوا اور قادسیہ پہنچا۔

۳۱ یا ۱۸ ذی الحجہ کو حسینؑ کوفہ روانہ ہوئے واقعات نے اپنی ترتیب اس طرح قائم کی

کی شہادت کے روز روانہ ہوئے اور یا ایک آدمہ روز قبل یا ایک آدمہ روز بعد۔ مثلاً صاحب لہوف اور روضۃ الشقا کے موافق سر یا اسطوی کو اور موافق ابن خلدون دوسوی ذی الحجہ سنہ ۶۰ کو روانہ ہوئے۔ صاحب سرا شہادتین کے نزدیک تیسری کو حضرت مسلمؑ شہید ہوئے اور ”جس دن مسلمؑ شہید ہوئے اسی دن سطلے امام حسینؑ علیہ السلام مکہ سے کوفہ کی طرف منگل کا دن“ اور بعضوں نے کہا ہے کہ اسطوی ذی الحجہ کو۔ اعظم کوئی کے موافق ”ترویہ کے وقت و ذی الحجہ کو منگل کے دن مکہ سے نکلے۔“ اور اسی طرح حضرت امام حسینؑ علیہ السلام کے مکہ سے روانگی کے

وجوہات بھی مؤرخین میں اختلاف کی چیز ہیں۔ مثلاً عموماً مؤرخین نے یہ وجہ بتائی ہے کہ حضرت امام حسینؑ علیہ السلام مسلم بن عقیل کا یہ خط پا کر روانہ ہوئے کہ ہمارے ہاتھ پر اٹھارہ ہزار آدمیوں نے بیعت کی ہے۔ آپ جلد تشریف لائیے۔ لیکن حضرت نے کب سفر عراق کا ارادہ کیا۔

سفر عراق کا حکم ارادہ کر لیا۔ اور پرموخت خاص خثینہ کے موافق حضرت امام حسینؑ علیہ السلام حضرت محمد ابن حنفیہ کے جواب میں فرماتے ہیں کہ: ”اے بھائی ڈر تاہوں میں کہ زبید تلخون مکر سے مجھے یہاں قتل کرے اور بسبب میرے قتل کے حرمت خانہ خدا ضائع ہو جائے۔“ لہوف کے نوٹ میں بھی یہی ہے۔

ابن عمر مکہ کے لوگوں کے متعلق اور اعظم کوئی میں جس وقت ابن عباس اور ابن عمر مکہ سے مدینہ کی طرف روانگی کا قصد کرتے ہیں تو آخری مرتبہ حسینؑ کے پاس آکر ابن عمر کہتے ہیں: ”لوگوں نے زبید سے بیعت کر لی ہے اور مکہ والے بھی دولت و زر کی لالچ سے اسی کی طرف جھکیں گے۔ آپ کا ساتھ چھوڑ دیں گے یا شہید کریں گے۔“

حضرت کا جواب کہ دشمن مکہ میں نہ رہنے دیں گے امام حسینؑ نے فرمایا: اے ابن عمر افسوس تو اس بات کا ہے کہ یہ لوگ مجھے گھر میں بھی

بیٹھنے نہ دیں گے۔ مجھ سے اٹھیں گے اور اگر میں ان میں سے نکل کر کسی نامعلوم جگہ چلا جاؤں گا کہ تو بھی ڈھونڈ کر نکالیں گے اور بیعت زبید کے لیے مجبور کریں گے۔ اور اگر انکار کروں گا تو قتل کر دیں گے۔ اے ابا عبد الرحمن خدا سے ڈر اور میرا ساتھ نہ چھوڑ اور امداد سے فتح نہ موز تو میرا مددگار رہ اور بعد نماز دعا نے خیر سے یاد کرتا رہ۔ اگر تو اس وقت مجبور ہے اور

میرے ساتھ نہیں رہ سکتا تو میں تجھے معاف رکھتا ہوں۔۔۔ ان لوگوں کی بیعت اختیار کرنے میں جلدی نہ کرنا۔ اس قدر ضرور توقف کرنا چاہیے کہ تجھے انجام کار کی اطلاع ہو جائے۔۔۔ اب ان حضرت نے ابن عباس کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا:

تین مکہ ہی میں رہوں گا جب تک یہاں کے لوگ میرے دوست رہیں گے اور میری مدد کریں گے۔

حضرت مکہ میں اپنا موقع ظاہر فرماتے ہیں

جب یہ معلوم ہو جانے لگا کہ ان کے ارادے بدل گئے اور میرا ساتھ نہ دیں گے تو میں بھی اس کلمہ کو یاد کروں گا جو ابراہیمؑ تغیر آگ میں ڈالے جانے کے وقت فرماتے تھے کہ: **حسبنا اللہ ونعم الوکیل**۔ اور پھر میں کسی اور جگہ چلا جاؤں گا صاحب البلاء المسین تاریخ ابن جریر طبری سے نقل فرماتے ہیں کہ: ”حضرت نے فرمایا کہ اے مسر زوق اگر میں جانے میں عجلت نہ کروں تو دشمن گرفتار کر کے لے جائیں گے۔“ صاحب وسیلۃ النجات فرماتے ہیں کہ:

”چوں زید پلید مجھے رافضیہ ہوا کہ بزمانہ حج آں حضرت را گرفتہ نزد او بر بند یا بہ قتل آرد حضرت احرام حج را بہ عمرہ بدل نمودہ و اعمال عمرہ بجا آوردہ عمل شد و متوجہ عراق گردید۔“ یعنی: چونکہ زید نے ایک گروہ کو بھیجا تھا کہ حج کے وقت آپ کو پکڑ کر اس کے پاس لے جائیں یا قتل کر دیں۔ حضرت نے حج کو عمرہ میں بدلا اور عمرہ کے اعمال بجالانے کے بعد عمل ہو گئے اور عراق کی طرف روانہ ہوئے۔

صاحب تاریخ التواریخ طبری کی منتخب سے نقل کرتے ہیں کہ زید نے تیس آدمیوں کو ماحیوں کے بھیس میں بھیجا تھا کہ حسینؑ کو گرفتار کر لیں اور اگر گرفتار نہ ہوں تو قتل کر ڈالیں۔

اعظم کوئی کے موافق جس وقت حضرت امام حسینؑ علیہ السلام مکہ سے کوچ فرما چکے ہیں کہ منزل ثعلبیہ پہنچنے کے دوسرے دن صبح کو ”ایک کوئی ابھر رہ از دی نے حسین بن علیؑ کی خدمت میں حاضر ہو کر سلام کیا اور کہا اے فرزند رسولؐ تم کس لیے عرم خدا و رسولؐ سے چلے آئے۔ آپ نے فرمایا اے ابھر رہ بنی امیہ نے ہمارا مال مار لیا۔ ہم لے صبر کیا ہیں سخت دست کہا۔ ہم لے صبر کیا۔ اب قتل کرنا چاہا تو میں وہاں سے نکل آیا۔ اے ابھر رہ خدا کی قسم میں باغیوں کے ہاتھ سے مارا جاؤں گا اور میری ہلاکت کے بعد اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو ذلت و خواری کا لباس پہنائے گا۔ ایک زبردست قوم ان پر مسلط ہوگی جو انھیں ایسا ذلیل و خوار کرے گی جیسا زبردست کمزور کو غراب کرتا ہے۔“

قبول روحۃ الشہدا کسی کے بھانے پر کہ مکہ سے کوئٹہ نہ جائیں۔ فرمایا کہ:

”آج ہذا الزام فحبت ایشان اندیشہ مند و این جازیم اعلوی در گزندم۔“

یعنی: ”وہاں نہ جاؤں تو ان کی فحبت پوری ہو جانے سے ہنسر مند ہوں۔ اور یہاں دشمنوں کی طرف سے خون سے تکلیف میں ہوں۔“



باب ہفتم

واقعات کا نشو و نما

مفسدہ تنقیحات

واقعات کا اس حد تک پہنچنا یہ دو سچ پیدا کر دیتا ہے کہ: ● آیا حضرت امام حسین علیہ السلام کی روش نزاعی تھی دفاعی؟ ● اور حضرت مسلم کا خط کوفہ سے حضرت امام حسین علیہ السلام کے نام اس مضمون کا پہنچا یا نہیں کہ آپ کوفہ تشریف لائے لوگ آپ کی خلافت کے لیے آمادہ ہیں؟۔ میں یہ بھی غلطی سے قائم کرتا ہوں کہ اگر بفرس محل حسین نے زید کی سلطنت کے الٹ دینے کا قصد کیا تو یہ کوشش کب تھی، کبھی تھی اور حضرت نے کامیابی کے لیے کون سے وسائل اختیار کیے؟۔

میں دوسری سچ سے استدراک کرتا ہوں۔

حضرت مسلم کا کوئی خط بنا بر طلب حضرت امام حسین علیہ السلام کے پاس نہیں پہنچا اس کے متعلق میرا تصفیہ ہے کہ حضرت مسلم بن عقیل کو اس کا موقع ہی نہیں ملا کہ وہ حضرت امام حسین علیہ السلام کو اطلاع دیتے اور اگر اطلاع دی بھی تو وہ حضرت تک نہیں پہنچے۔ پس اگر ایسا ہوا کہ حضرت مسلم بن عقیل کی کوئی اطلاع بنا بر طلب حضرت امام حسین علیہ السلام کے پاس نہ پہنچی تو یہ خیال قلمحافظ ہو جانے کا کہ کوفہ میں حصول خلافت کے لیے ایک جماعت کو اپنا مددگار بنا کر حضرت امام حسین علیہ السلام نے مکہ سے کوچ فرمایا۔ اس کے لیے میرے دو جہات یہ ہیں:

حضرت مسلم کے خط کی عبارت۔ زمانہ اور مقام کوٹن ہے وہ مؤرخین جنہوں نے انہوں نے وہ وقت اور جگہ اور عبارت نہیں بتائی ہے جب اور جہاں اور جن قتلوں میں حضرت فاس آل عبا علیہ السلام اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا خط ملا۔ بلکہ رداری میں کہیں مذکرہ کر دیا ہے کہ حضرت کو مسلم کا خط ملا، اور اس وجہ سے وہ کوفہ روانہ ہوئے۔ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ جب نسبتاً غیر مفید واقعات کی اکثر مراعات موجود ہے تو وہ وقت اور جگہ ذکر کے قابل تھی جہاں حضرت کو ایک ایسا خط ملا جس کے بعد کا کوئی اقدام مسلمانوں، تاریخ اسلام اور تاریخ مجاز و عرب و شام میں خصوصیت سے دیکھا جاتا۔ اس لیے کہ ایسی صورت میں حضرت کا روانہ ہونا غور سے دیکھنے کی بات ہوتی کہ دیکھے حسین کا حرکت کرنا ان کے یادداشت کے تحت کے لیے کیا کرتا ہے۔

بڑے مسائل حسین کا کوئی اقدام نہ صرف سیاسی حیثیت سے ایک مفید مسئلہ ہوتا بلکہ حسین کی ذات کا کسی ایسے امر کے لیے آمادہ ہونا یہ امید دیم پیدا کرتا کہ دیکھے حسین کے نانا کا قلم پھر اپنی جگہ پر قائم ہوتا ہے یا اپنی امید اپنی جگہ بے جنبش ثابت ہوتے ہیں۔

وہ لوگ و حضرت کو صلاحیں دیتے ہیں وہ بڑا اس کے
کہ ایسی مجھ باتیں کہیں کہ اہل کوفہ پر اعتبار نہ کرنا

کیا کہیں مسلم کے خط کا اشارہ ملتا ہے

چاہیے۔ اس لیے کہ ان کا سیاق آپ کے بھائی اور پدر بزرگوار کے متعلق امید خیز نہیں ہے۔ یا یہ کہیں کہ اللہ نہیں چاہتا کہ نبوت اور خلافت ایک خاندان میں ہوں۔ کہیں مسلم بن عقیل کے خط کا تذکرہ نہیں ہوتا اور کوئی اس کی تنقید یا تائید نہیں کرتا نہ اس کا تذکرہ کرتا ہے۔ کہا جاسکتا ہے کہ حضرت نے اس خبر کو بصیغہ راز رکھا لیکن اس خبر کا موجود ہونا کبھی مکہ منظرہ میں مسلم کا خط آیا اور اس میں اشارہ ہزار آدمیوں کے بیت کرنے اور بلانے کی خبر تھی اس کی تردید کرنا ہے کہ یہ بصیغہ راز رکھا گیا۔ حالانکہ یہ بجائے خود ایک غور طلب بات ہے کہ ان باتوں کو حضرت امام حسینؑ ظاہر کر سکتے تھے یا نہیں ظاہر فرما سکتے تھے۔ ظاہر ہے کہ مکہ منظرہ میں جہاں سے یزید کا عامل خارج نہ ہوا تھا ایک ایسی خبر کا شائع کر دینا کسی طرح قرین مصلحت نہ تھا کہ یزید کی غداری کے ایک حصہ کے لوگ اس کی حکومت کو الٹ دینے کی فکر میں ہیں اور بے اپناہرگز قرار دینا چاہتے ہیں، وہ مکہ میں موجود ہے اور پھر بھی مائل مکہ کوئی باز پرس جائز نہ سمجھتا یا یہ کہ اپنے دلی نعمت یزید کو اس کی اطلاع نہ دیتا۔ اور پھر سب پر طرہ یہ ہے کہ بلا وجود اس کے کہ ایک ایسے صیغہ راز کی خبر ظاہر ہو جاتی ہے۔ جس سے یزید کو حسینؑ کے روکنے یا کوفہ میں انظام کرنے کا وقت ملے تاہم مؤرخین کے پاس نہ اس خط کی نقل ہے نہ وہ مقام اور وقت معلوم ہے جس وقت کہ مسلم کا یہ مفید خط حسینؑ کے پاس آیا اور نہ کوئی حسینؑ کو اس کی مبارک باد دیتا ہے کہ اہل کوفہ اچھی بڑی جماعت سے آپ کی مدد کے لیے تیار ہیں۔ اگر درمیانِ آفت سے محفوظ کوفہ پہنچ گئے تو کامیابی میں دیر نہیں ہے۔ لوگوں کا رد کو اہل کوفہ کے خطوط کے لحاظ سے تھا اور نہ کہیں یہ تذکرہ ہے کہ کسی نے حضرت سے یہ کہا ہوتا کہ یہ اطلاع جو مسلم نے اشارہ ہزار آدمیوں کے متعلق آپ کے پاس بھیجی ہے یہ تمام یا زیادہ تر آدمی ناقابل اعتبار ہیں۔

مسلماً کے خط کی تمام فطری صورتیں مفقود ہیں

اور اب بھی ہم کو ان کی مدد کا یقین نہیں ہے۔ آپ یقین کرنے کے لیے کچھ اور

وسائل اختیار کیجیے۔ غرض کہ اس یقین کی تمام فطری صورتیں جس سے یہ کہا جاتا کہ مسلم کا خط آیا یا نہیں مفقود ہیں اور کہیں یہ آتا ہے کہ وہ جگہ اور وقت ہی غلط نہیں ہوا جہاں اور جب حضرت کو مسلم کا خط ملا۔

اگر عوام کو نہیں تو کم سے کم ابن عباس اور محمد ابن حنفیہ مطلع ہوتے اور خط کے متعلق گفتگو کرتے

دکھایا اور انہوں نے معنون خط پر مطلع ہو کر اس کے متعلق یہ یہ کہا کچھ نہیں۔ بلکہ جو کچھ باتیں ہوئیں وہ اس تذکرہ اور اس خط کے تعین سے بالکل علیحدہ ہیں۔

مؤرخین میں اہم کوفی نے یہ ایشیا کی ہے کہ حضرت کو مسلم کی شہادت کی خبر مکہ ہی میں دلوانی ہے۔ یہ مؤرخین کے اس عام احترام کے منافی ہے کہ حضرت امام حسینؑ نے مکہ سے اسی دن کوچ کیا جس دن

ناممکن

کوفہ میں حضرت مسلم شہید ہوئے۔ یہ قطعاً ناممکن تھا کہ جس روز حضرت مسلم شہید ہوتے اسی روز حضرت کو مسلم کی شہادت کی خبر معلوم ہو جاتی اور اسی روز روانہ ہو جاتے اور اگر شہادت کے چند روز بعد خبر معلوم ہوتی ہے تو یہ خبر قطعاً غلط ہو جاتی ہے کہ حضرت دس ذی الحجہ تک روانہ نہیں ہو گئے مالا لکہ یہ مسئلہ امر ہے کہ حضرت کی خبر نہیں کر سکے اس کے علاوہ اسے کوئی شخص قبول نہ کرے گا کہ اسی حالت میں جب کہ حضرت کو یہ معلوم ہو چکا تھا کہ حضرت مسلم شہید ہو چکے اور ان کا شہید ہونا اس وجہ سے تھا کہ اہل کوفہ نے ان کی مدد نہ کی تو وہ فوراً ہی کوفہ کی روانگی کا قصد فرماتے۔

جعلی خط بھی قریب مدینہ ملا
ابو احنی اسفرائی نے ایک دوسری صورت پیش کی ہے کہ ابن زیاد نے ایک جعلی خط حضرت کے پاس بھیجا۔ اس سے ہمارے اس سوال پر کوئی اثر نہیں پڑتا کہ حضرت نے حصول خلافت کی کسی امید پر مکہ کے قیام کو ترک کیا، بلکہ یہ جعلی خط حضرت کو مدینہ کے قریب ملا۔ یہی خط اس وقت ملا جس وقت کہ حضرت مکہ کے قیام کو ترک کر چکے تھے۔ کیوں ترک کیا تھا اس کی وجہ بیان کی جاتی ہے۔
گرفتار شدہ خط کے مرسلہ مسلم ہونے کا کوئی ثبوت نہیں ہے

میں مدد دیتا ہے کہ اگر مسلم نے کوئی اطلاع یہی تھی تو وہ حضرت تک نہ پہنچے میں نے یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ ابن زیاد کے ایک خادم مالک بن یزید بن ابی سہل نے مسلم کے قاصد عبداللہ بن یحییٰ کو گرفتار کیا اور وہ خط جس میں یہ اطلاع تھی کہ میں ہزار آدمیوں نے بیعت کی ہے گرفتار ہو گیا۔ مالا لکہ اس خط سے یہ جتنی تصدیق نہیں کیا جاسکتا کہ یہ مسلم نے لکھا تھا۔ اس لیے کہ یہ خط مسلم کی طرف سے حسین کے نام تھا کسی کی طرف سے کسی کے نام خط ہونا اس شخص کی طرف سے خط ہونے کا ثبوت نہیں ہے تا دلیک ثبوت کے دیگر ذرائع سے باقی نہ ہو۔ اور کہیں اس کا ذکر نہیں ہے کہ کسی نے کہا کہ اس خط میں مسلم کے دستخط ہم پہچانتے ہیں۔

اگر ابن زیاد مسلم کی طرف سے کوئی جعلی خط لکھ سکتا تھا کہ حسین ہمارے قبضہ میں آجائیں تو اسی طرح یہ ممکن تھا کہ حسین کا کوئی دوست ایسی غرض سے ایک جعلی خط مسلم کی طرف سے حسین کے نام میں بھیجتا اور یہ اس کا جذبہ شوق بکھا جاتا۔ اس وقت جو کچھ کہا جاسکتا ہے وہ یہ ہے کہ قرینہ ہے کہ خط مسلم نے لکھا ہو۔ جو کچھ بھی ہو اگر مسلم ہی نے یہ خط بھیجا تو یہ اس وقت تھا جب کہ وہ دار بخارا سے ہانی کے گھر منتقل ہو چکے تھے۔ یعنی اپنی شہادت کے صرف ایک آدم دن قبل۔ خط کی عبارت سے یہ بھی کچھ میں آتا ہے کہ حسین کی طلب کے متعلق یہ پہلا خط تھا جو حسین تک نہ پہنچا۔ اگر ہم یہ بھی تسلیم کر لیں کہ مسلم کا خط جو دار بخارا سے روانہ ہوا تھا گرفتار نہیں

دار بخارا سے روانہ شدہ خط حسینؑ کو مکہ میں نہیں مل سکتا تھا
ہوا تاہم یہ خط کوفہ سے ۶ یاء کو روانہ ہوتا ہے۔ اور اس صورت میں کسی اور منزل پر طے تو طے مکہ میں حسین کو نہیں مل سکتا تھا اور اس سے بھی اس کی تردید ہو جاتی ہے کہ حسین نے اس سامان کے مجبور سے پر قیام مکہ نہیں ترک کیا۔

اب میں اس سوال کو حاصلہ اور معلومہ تاریخ کی نظر سے دیکھتا ہوں۔
فصلہ اور معلومہ تاریخ
نورالعین فی مشہد النحسین میں ابو احنی اسفرائی حضرت مسلم کی روانگی کی تاریخ

۱۲ دفعہ مندرجہ بتاتے ہیں۔ اور ابن خلدون کے موافق حضرت مسلم بن حذافہؓ کو کوفہ میں داخل ہو گئے تھے،

اس حساب سے حضرت مسلمؓ مکہ سے کوفہ اٹھا رہے دن میں پہنچے۔ مکہ سے کوفہ اٹھا رہے دن میں پہنچنے کی تصدیق قریب قریب اس حساب سے بھی ہو جاتی

ہے کہ حضرت امام حسینؓ ۹ ذی الحجہ کو مکہ سے روانہ ہوئے اور ۲۲ محرم کو کربلا پہنچے تو اس لحاظ سے قریب ۲۳ دن کے ہوتے ہیں۔ یعنی پانچ دن زیادہ ہیں۔ اس میں چونکہ کربلا کوفہ سے ایک منزل پہلے ہے۔ اس لیے ایک دن کم ہو گیا۔ چار دن یا تو کہیں تمام کیا گیا یا بوجہ اس کے کہ حضرتؓ کے ساتھ ایک پورا قافلہ تھا کہیں کچھ عرصہ ہوا۔

یہ تمام مافیہ جانتے ہیں کہ مکہ سے مدینہ میں قافلہ بارہ یا تیرہ دن میں پہنچتا ہے۔ اگر مسلمؓ کے لیے بارہ دن بھی تجویز کیے جائیں تو گویا مدینہ سے کوفہ کا

راستہ چھ دن میں طے ہوتا ہے۔ اس چھ دن کی مدت کی تصدیق غالباً ابوالحسن اسفرائینی کی اس روایت سے بھی ہوتی ہے کہ ابن زیاد کا جملہ خط ۱۵ ذی الحجہ کو حسینؓ کے پاس قریب مدینہ پہنچا۔ یعنی حضرت مسلمؓ آٹھ ذی الحجہ کو شہید ہوئے۔ اسی روز قاصد روانہ کیا گیا اور چھ دن میں حسینؓ کے ہتھ گیا۔

حضرت امام حسینؓ ۱۶ شعبان کو مکہ میں موجود تھے حضرت امام حسینؓ علیہ السلام جو قحطی شعبان کو مدینہ سے مکہ روانہ ہوئے اور

چونکہ حضرتؓ بھی انتظار کے عالم میں تھے ہم حضرتؓ کے مکہ پہنچنے کے لیے بھی بارہ دن تجویز کرتے ہیں اور اس لحاظ سے حضرتؓ ۱۶ شعبان کو مکہ میں موجود تھے۔

اب علامہ مجلسی کے موافق کوفہ کا پہلا قاصد حضرت امام حسینؓ کے پاس مکہ میں دسویں رمضان کو پہنچا۔ یعنی

حضرتؓ کی مدینہ سے تاریخ روانگی اور مکہ میں کوفہ کا قاصد پہنچنے کے درمیان ایک مہینہ چھ دن کا وقفہ ہے۔ چونکہ مدینہ سے کوفہ خبر پہنچنے تک چھ دن صرف ہوتے ہیں اور اٹھارہ دن میں آدمی کوفہ سے مکہ پہنچتا ہے۔ اس لیے چھ دن کا حساب معلوم ہے۔ اب ایک مہینہ چھ دن میں چھ دن کی تقریق کرنے سے بارہ دن باقی رہتے ہیں۔ یہ بارہ دن غالباً اس طرح صرف ہونے کہ کچھ تو حضرت امام حسینؓ کے مدینہ سے مکہ روانہ ہونے کے ساتھ ہی کوئی مدینہ سے کوفہ روانہ نہیں ہوا۔ اور دو چار دن کا عرصہ ہوا۔ یا مدینہ سے کوفہ آدمی چھ دن سے ایک آدھ دن زیادہ میں پہنچتا ہے، یا بقیہ دن ان دونوں لحاظ کے بعد اہل کوفہ کے فوراً مشورت میں بسر ہوئے۔ اور چونکہ اہل کوفہ نے متواتر تین دفعہ روانہ کیے جن میں کا پہلا روانہ ہو چکنے کے بعد دوسرا اور اتوں کے بعد روانہ ہوا۔

ہم قیاس کرتے ہیں کہ تیسرا بھی دو ہی دن کے بعد روانہ ہوا اور اس طرح تیسرا دفعہ مکہ میں ۱۴ رمضان المبارک کو پہنچا۔

حضرتؓ نے یا کچھ نہ سن دیا یا بہ لطف واپس کیا۔

۳ شوال کو کوفہ واپس

پھر اکیس شوال کو مکہ میں

اس لیے اگر یہ پھر وہ رمضان ہی کو روانہ ہو گیا تو کوفہ میں اٹھارہ دن کے بعد یعنی ۳ شوال کو پہنچا۔ اب لحاظ اس کے کہ اہل کوفہ بہت سرگرم تھے، ان کے روساء کا وفد اسی روز روانہ ہو گیا۔ اور پھر اکیس شوال کو مکہ پہنچ گیا۔ اب اگر یہ اٹھارہ دن میں انکاری جواب سے واپس کیے جائیں تو یہ کوفہ ۱۹ ذی قعدہ کو پہنچیں گے اور اس لیے آخری قاصد کا وقت نہیں رہے گا۔

چوتھے قاصد کے لیے وقت کی کمی اور رعایت

پہنچا، اور دو روز کے فور کے بعد ۱۲ ذی قعدہ کو حضرت نے مسلم کو کوفہ کی طرف روانہ کر دیا، اور یکم ذی الحجہ کو کوفہ پہنچ گئے۔ ہم نے تاریخ اور دنوں کی مدت میں اس لیے رعایت کی ہے کہ یہ کھائیں کہ باوجود ان لحاظ کے بھی یا اور جو کچھ ہم سے چاہا جائے یہ ناممکن ہے کہ پہلا ذی الحجہ (یعنی مسلم کے کوفہ پہنچنے کی تاریخ سے ۱۲ تاریخ یا اسٹوپ تاریخ جس درمیان میں وہ شہید ہونے یا دوسری تاریخ تک جس روز حضرت امام حسینؑ مکہ سے روانہ ہوئے) سے آٹھ ذی الحجہ تک حضرت مسلم کو کوفہ پہنچے ہوں۔ لوگوں کو خبر ہوئی جو نزدیک کے جاسوس نے دمشق خبر بھیجی ہو۔ (واقعات عثمان میں ہم کہہ چکے ہیں کہ مالک اشتر شام سے کوفہ تیرہ دن میں پہنچے تھے) نیز نے ابن زیاد کو بصرہ خبر دی ہو۔ ابن زیاد بصرہ سے کوفہ آیا ہو۔ مسلم کے قحط میں ابتری ہوئی ہو۔ جاسوس دھوڑتا رہا ہو۔ پھر سے مسلم نے ہجرت شروع کی ہو۔ اطمینان ہو گیا ہو کہ لوگ ثابت قدم رہیں گے اور پھر اس کے بعد حسینؑ کو خط روانہ کیا ہو، اور یہ خبر یا کہ حضرت روانہ ہوئے ہوں۔

ممکن کمزوری کا اقرار

جے اس کا اقرار ہے کہ ممکن ہے کہ میرے معلومہ قاصد اور تاریخ کے لحاظ سے لا معلوم قاصد اور مدت کا استنباط غلط ہو۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ ان مقامات کے مقامی اور صوبہ کے نقشہ اور اس کا اسکیل نہ ہونے کی وجہ سے کوئی قیمتی یا عجیب یا کھڑے ہونے کے لیے نہیں ہے۔ اور نہ طریقہ سنسما شرح طے مراحل ہے کہ کس قدر مسافت کس قدر عرصہ میں طے ہوئی ہے۔ لیکن چونکہ عرب آج بھی ویسا ہے جیسا پہلی تاریخ کے وقت تھا۔ خصوصاً اس کا طریقہ سفر، اس لحاظ سے ممکن ہے کہ کسی

مؤرخین کے غلط استنباط کی وجہ

جغرافیہ نویس ماہی اور زائر کا مسند نامہ مفید ہو تا لیکن ایسا مکمل سفر نامہ یا تو موجود نہیں ہے یا میری نگاہ سے نہیں گزرا۔ تاہم اگر کوئی بڑی مضبوط اور قیمتی وجہ میرے حساب کی نہ بھی ہو تاہم مجھے یقین ہے کہ میں موٹی موٹی باتوں میں یقین سے دور نہیں ہوں اور میری اس تصحیح کا جواب اطمینان تک ہو جاتا ہے کہ حضرت مسلمؑ کے کسی خط کی وجہ سے حضرت نے قیام مکہ کو ترک نہیں کیا۔ مؤرخین کا یہ گمان یا مفروضہ اس بنیاد پر ہے کہ چونکہ حضرت مسلمؑ روانہ ہو چکے تھے اور چونکہ حضرت امام حسینؑ بھی کوفہ ہی روانہ ہوئے اس لیے انہوں نے حضرت امام حسینؑ کی روانگی کو حضرت مسلمؑ کی کسی اطلاع کا نتیجہ سمجھ لیا۔ اس طریقہ استنباط پر مجھے بے ساختہ انجیل کی ایسی ہی منطق یاد آ جاتی ہے کہ: ”یہ ایسا ایسا کرے گا۔ صحتی یہ ہیں اس لیے

انہوں نے ایسا کیا ہوگا۔

اب میں اس نتیجہ پر فلسفہ ڈالتا ہوں کہ آیا حضرت امام حسینؑ علیہ السلام کی روش نزامی حق یا دنیوی؟ پہلی تنقیح کے متعلق مولف دیگر مؤرخین کے خیالات پیش کرتا ہے اس کے متعلق خود کچھ عرض کرتے

کے قبل میں سید مرتضیٰ علم الہدیٰ اور علامہ مجلسی علیہ الرحمۃ کے ارشاد کو کار سے نقل کرتا ہوں کہ گین کے خیالات دیکھنا ہیڑ فال آف رومن اسہار سے مسیواریین کے فلسفہ شیعہ سے اور علی بن صلیٰ اربلی کے کشت النثر فی معرفۃ الائمہ سے پیش کرتا ہوں میں اس کے علاوہ اقوال بھی پیش کروں گا اقوال نقل کرنے سے میری غرض محض اطلاقات نقل ہوگی اور بس۔ سید مرتضیٰ علم الہدیٰ رضی اللہ عنہ تنزیہ الانبیاء میں فرماتے ہیں اگر کوئی سوال کرے کہ حضرت امام حسینؑ کو کیا ہذر شرعی داعی ہوا کہ مکہ منکرم سے حضرتؑ نے مع اہل و عیال

علم الہدیٰ کا ارشاد

سفر عراق فرمایا۔ مالا مکہ دشمنان حضرتؑ وہاں مستولی تھے اور حاکم وہاں کانیزید پلید کی طرف سے قابض و محترف تھا اور نزام اردوچی اس کے دست اختیار میں تھا اور حضرتؑ کو فیوں کے مکروہ در سے بسبب اپنے پدر بزرگوار و برادر علی مقدار کے خوب واقف تھے اور کیونکر اس جناب نے خلافت مشورہ احباب علی فرمایا۔ چنانچہ ابن عباس وغیرہ ملحق سفر ہوئے اور حضرتؑ سے اظہار پاکت کرتے تھے اور عبداللہ بن عمر جب حضرتؑ کے وداع کو آئے استودعک من قتیل کبلا یعنی میں تمہیں خدا کو سونپتا ہوں اور جانتا ہوں کہ قتل ہوگے اسی طرح ایک جماعت کثیر نے اس جناب کو مشورہ سفر کا نہ دیا۔ اور جب حضرتؑ نے شہادت شہم بن حقیل کی سنی تھی اشد راہ سے کیوں نہ پھرے اور اس قوم کے مکروہ جملہ پر کیوں متوطن نہ ہوئے اور کیونکر ان کے لیے جائز ہوا کہ باوجود قلت انصار کے اس مجمع کثیر و جم غفیر کے عار بہ پر پیش قدمی کی جس وقت ابن زیاد نے امان کا دھدہ کیا اور بیعت یزید چاہی کس لیے حضرتؑ نے قبول نہ کیا اور کیوں اپنے خون اور اپنے اہل بیت و اصحاب اور اپنے شیعوں کے خون کی ماحکت نہ فرمائی اور کیوں حضرتؑ نے اپنے نفس کو جنگلہ میں ڈالا۔ مالا مکہ ان کے برادر بزرگوار حضرت امام حسنؑ نے بسبب اپنی خوف کے حضرتؑ نے خلافت مملوہ کے سپرد کی تھی پس کس طرح مجمع کیا جائے فعل حضرتؑ اور ان کے برادر ندادار کے باب میں اس جہت سے کہ معمول بہ صحت ہوں؟ جواب: ہم کہتے ہیں کہ معلوم ہے کہ جب امام کو گمان قوی ہوا اپنے غالب ہونے اور اپنے حق کو پہنچنے اور قائم ہونے امور ولایت و خلافت کے تو اس پر اس وقت واجب ہوتا ہے کہ جو امر باعث وصول حق ہو اسے عمل میں لادے اگرچہ وہ امر تعبد و مشقت شدید پر مشتمل ہو۔ لیکن آکا ہمارے امام حسینؑ نے کوفہ کو سفر نہیں کیا مگر یہ ظہور مہد و یحییٰ مظلوم کے اہل کوفہ سے اور یہ اس کے کہ اہل کوفہ نے بہت سے غلطو بطور و رغبت بے حیر و کراہت اس جناب کو کھے اور حرر غلطو میں انہوں نے خود ابتداء کی نہ یہ کہ حضرتؑ کے جواب میں لکھا ہو۔ اور مملوہ کے وقت میں بعد اس صلح کے جو مابین مملوہ و امام حسنؑ واقع ہوئی تھی اکابر و اثرات اہل کوفہ نے اس جناب کو نامہ لکھے تھے لیکن حضرتؑ نے اس وقت قبول اتناس ان کا صلح نہ جانا۔ اور جو جواب باصواب تھا عمل میں لائے۔ جب امام حسنؑ نے وفات پائی تو پھر اہل کوفہ نے نامے لکھے اس وقت حضرتؑ نے ان کی امید برائے کا دھدہ کیا۔ چونکہ امام سلطنت مملوہ بہت مصعب تھے اور احتمال ظہر کا

اس پر نہ تھا۔ لہذا حضرتؑ نے سکوت اختیار فرمایا اور جس وقت مطلوبہ۔۔۔ حاصل ہوا تو پھر اہل کوفہ نے بہت خلط کھچے اور حضرتؑ کے بلانے میں حد سے زیادہ اصرار کیا اور رغبت اپنی حضرتؑ کی تشریف آوری پر اپنے ناموں میں مندرج کی، اور دیکھا حضرتؑ نے کہ والی وحاکم کوفہ جو زبیر کی طرف سے معین ہے نہایت ضعیف اور مغلوب ہے اور اہل کوفہ اس پر نہایت تسلط اور غلبہ رکھتے ہیں۔ اور اس کے کہنے پر اہتتا نہیں کرتے۔ باہر اس کے حضرتؑ کو قلن غالب ہوا کہ اب کوفہ کی طرف جانا واجب ہے پس اس سبب سے حضرتؑ پر لازم ہوا جو کچھ حضرتؑ حل میں لائے اپنے اہل حق میں۔ اور حضرتؑ کو کان نہ تھا کہ اہل کوفہ بلا وجود ایسی عہد و مواثیق کے ضرور دکر کریں گے۔ اور اہل حق حضرتؑ میں سہولت دہری کریں گے اور وہ امور عجیب و غریب کہ تصور میں نہیں آسکتے پیش آئیں گے۔ اس لیے کہ جب حضرتؑ کوفہ میں داخل ہوئے تو اکثر لوگوں سے بیعت لی اور جب ابن زیاد بد نہلا اس شہر میں وارد ہوا اور خبر درودِ مسلم سے مطلع ہوا اور سنا کہ حضرتؑ ہانی بن عروہ مرادی کے گھر میں اترے ہیں جیسا کہ کتب تواریخ میں مذکور ہے پس وہ ثقیف شریک بن اعرور کی حیلات کو کہ وہ بھی ہانی کے مکان میں تھا آیا اور یہ شریک بن اعرور موافق اور شریک رائے حضرتؑ تھا، قل ابن زیاد میں اور حضرتؑ سے اقرار لیا تھا کہ جب ابن زیاد میری حیلات کو آئے تو تم اسے قتل کرنا اور حضرتؑ نے بلا وجود امکان ابن زیاد کو قتل نہ کیا اور بعد اس کے جانے کے حضرتؑ نے اس کا ہذر اس طرح بیان کیا کہ جناب رسالتؐ نے فریب و دکر سے قتل کرنے کو منع کیا ہے۔ پس اگر اس وقت حضرتؑ موافقت شریک سے ابن زیاد کو قتل کر ڈالتے تو قہنہ و فلا زائل ہو جاتا اور حضرتؑ امام حسینؑ بے خوف و خطر کوفہ میں تشریف لاتے اور ہر شخص نصرت و دیاری میں حضرتؑ کے سرگرم ہوتا اور جو لوگ کہ باطن میں قصد نصرت رکھتے تھے اور ظاہر میں مطہرین سے ریم و راہ رکھتے تھے وہ بھی شریک ہو جاتے اور حضرتؑ کے دائرہ بیعت میں داخل ہوتے۔ اور جس وقت ابن زیاد نے ہانی بن عروہ کو بلا کر اپنے پاس قید کیا اس وقت حضرتؑ گردہ کوفہ اپنے ہمراہ لے کر جانب قہر دار الامارت تشریف لے گئے اور اسے غیر اکام اس پر تنگ کیا یہاں تک کہ بسبب خوف و نامردی کے اس شقی نے دروازہ قہر کے بند کر لیے اور ہر طرف سے لوگوں کو اہل کوفہ کے ترغیب دینے اور ڈرانے کو بھیجا اور حضرتؑ کے معتدل اور محبوب کرنے میں کوشش کی۔ اس وقت اکثر اہل کوفہ متفرق ہو گئے۔ اور حضرتؑ کی نصرت سے باز رہے۔ یہاں تک کہ سواچہ شخصوں کے کوئی ان کے ساتھ نہ رہا۔ اور لاچار ہو کر حضرتؑ وہاں سے پھر آئے۔ غرض ان امور کے ذکر سے یہ ہے کہ اسباب فتح و قہر داغ و لارغ تھے لیکن سورہ اتفاق لے اس مقدمہ کو منطکس کر دیا اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ حضرتؑ شہید ہوئے۔ تحقیق کہ سید و آقا ہمارے امام حسین علیہ السلام نے جس وقت اٹھائے راہ میں خبر شہادتِ مسلم بن عقیل بنی سب نے مشورہ دیا کہ پھر چلیے اس وقت حضرتؑ نے مراجعت کا قصد کیا۔ فرزند ان مسلم بن عقیل اٹھ کھڑے ہوئے۔ کہنے لگے تم بھڑا ہم نہ پھریں گے جب تک کہ اپنے پدر بزرگوار کے خون کا عوض نہ لے لیں۔ یا یہ کہ جس طرح حضرتؑ نے ذائقہ شہادت سے اپنے کام و زبان کو شیریں کیا ہم بھی اسی ذائقہ سے اپنی زبان کو آشنا کریں۔ پس اس وقت حضرتؑ نے فرمایا: "لا خیر فی العیش بعد ہولاء۔" یعنی زندگانی دنیا نے فانی میں ہو ایسے عزیزوں کے کچھ لطف و مزہ نہیں۔ بعد اس کے عرب زبیر نے مع لشکر حکم ابن زیاد حضرتؑ کو عدول و مراجعت سے ممانعت شدید کی اور چاہا کہ حضرتؑ کو ابن زیاد کے پاس

لے جائے۔ اور حضرت کو ان کا حکوم گردانے۔ حضرت نے اس شقی کے پاس جانے سے انکار کیا جب حضرت نے دیکھا کہ مراجعت کی کوئی صورت نہیں اور ابن زیاد کے پاس جانا بھی مناسب نہ تھا اس وقت لاچار وہ امام عالی مقام شہر شام محنت انجام کی طرف متوجہ ہوئے اور یزید کے پاس جانے کا قصد کیا اس لیے کہ حضرت جانتے تھے کہ یزید بہ نسبت ابن زیاد نجم سے نرمی کرے گا پس یہ گمان کر کے جانب شہر شام روانہ ہوئے۔ یہاں تک کہ عمر بن سعد بد اخترج لشکر خلافت اثر حضرت سے ملائی ہوا اور نیت یہاں تک پہنچی کہ جیسا کتب سیر و تاریخ میں مذکور ہے۔ پس یہ تو ہم کو نہ کر کیا جائے کہ حضرت نے اپنے ہاتھ سے آپ کو نہ لکھ میں ڈالا در انحالیکہ مقتول ہے کہ حضرت نے عمر سے فرمایا: اسے عمر تو میرے تین سوالوں سے ایک سوال کو قبول کرے

● مجھے رخصت دے کہ میں جس مقام سے آیا ہوں وہاں پھر چلاؤں۔
● یا مجھے یزید کے پاس لے چلے تا میں اپنے امور اسے سپرد کر دوں کہ وہ نجم سے قربت رکھتا ہے۔ پس جس چیز پر اس کی رائے قرار پائے میرے باب میں عمل میں لائے۔

● یا مجھے رخصت دے تاکہ میں سرحد بلاد اسلام سے چلاؤں اور میرا حال قح و ضرر میں مبتلا اور مسلمانوں کے حال کے لیے۔
عمر بن سعد نے یہ ماجرا ابن زیاد کو لکھ بھیجا اس شقی نے قبول نہ کیا اور کہا: جب ہمارے جنگ میں آگئے تو ایسی باتیں کرتے ہیں اور آرزوئے نجات رکھتے ہیں حالانکہ اب ان کو کچھ چارہ نہیں ہے۔ پس جب ان جناب نے اصرار ان اشراک کے اپنے قتل اور ہتک حرمت پر مشاہدہ کیا اور بے دینی ان کی سلسلہ کی جانتا کہ اگر حکم ابن زیاد قبول نہ کروں گا تو بہر حال ذلت ہتک حرمت میری ہوگی۔ باقی ہمہ قتل سے نجات نہ ہوں گا۔ پس بہ جان و دل لڑنا اختیار فرمایا۔ اس وقت حضرت دو خصلت جمیلہ میں متردد تھے۔ ایک یہ کہ اس جہلا میں اعدائے دین پر فتح یاب ہو جائیں۔ دوسرے یہ کہ سلاطین شہادت سے فائز ہوں اور کرامات اخرویہ کو پہنچوں۔ لیکن مخالفت کرنا حضرت کا مشورہ صحابہ سے مانع ابن عباس وغیرہ کے پس سبب یہ ہے کہ قنون بحسب عظمت و آثار قوت و ضعف میں مختلف ہوتے ہیں۔ کبھی ہوتا ہے کہ امر بہ نسبت بعض اشخاص کے بنظر قوت و عظمت و آثار ظہن قوی مقنون ہوتا ہے۔ اور بہ نسبت بعض اشخاص کے ضعیف ہوتا ہے۔ اور شاید ابن عباس عہد و میثاق اور نادمہ و پیام اہل کوفہ پر مطلع نہ ہوتے ہوں۔ اور یہ امر مغلہ ان امور کے ہے کہ حال لوگوں کا اس میں مختلف ہوتا ہے اور تفصیل اس کی احاطہ تحریر میں نہیں آسکتی۔ لیکن مراجعت نہ کرنا حضرت کا بعد شہادت حضرت مسلم۔ پس سابق میں اس سے ہم نے بیان کیا اور ذکر کیا کہ اکثر روایتوں میں وارد ہوا ہے کہ اس جناب نے قصد مراجعت کیا تھا۔ لیکن لوگ مانع ہوئے۔ اور لڑنا جماعت قلیل کا کثیر سے۔ پس ہم نے بیان کیا کہ ضرورت داعی اس کی تھی اور مقتضی شرع و احتیاط کا اس وقت بھی تھا جو حضرت نے کیا اور وعدہ ابن زیاد در باب امام زہدانی تھا اور فیما بین عہد و میثاق ایسا نہ تھا کہ قابل وثوق و اعتماد ہو۔ اور غرض اس کی اظہار ایمان سے سبکی اور ہتک حرمت حضرت منظور تھی۔ بعد اس تذلیل کے آخر کار شہید اور قتل کرنا مذکور تھا اور اگر حقیقت میں اس کی نیت بخیر ہوتی اور ایمان دینے میں صدق و راستی چاہتا اور خیال کسی ایذا رسانی کا نہ ہوتا اور وہ ملتون خود بھی یزید کے نزدیک معذور ہوتا تو البتہ حضرت کو یزید کے پاس بھیج دیتا لیکن اس وقت عداوت روز بدر و احد عداوت رسول

اس کے اور اس کے اصحاب کے سینہ پر کینہ سے ظاہر ہوا اور گمان ہے کہ اس وقت حضرتؑ نے اس احتمال کو تجویز فرمایا ہو کہ جن لوگوں نے حضرتؑ کو غلط سمجھے تھے اور عہدِ دیہان کیسے تھے شاید حضرتؑ کی طرف رجوع کریں۔ اور بسبب مشاہدہ کرنے وقت صبرِ حضرتؑ کے اور قلتِ احوال و انفراد کے حق کی طرف مائل ہوں۔ خواہ بسبب رعایتِ دینِ خواہ بوجہ حمیتِ عرب جیسا کہ بعض اہلِ کوفہ نے لشکرِ عمرِ سعد سے ہدایت پائی اور اس جنب کی خدمت میں حاضر ہو کر سلامتِ شہادت سے فائدہ ہونے اور ان احتمال کی ایسے اوقات میں اکثر توقع ہوا کرتی ہے۔ لیکن وجہِ جمع اور مطابقتِ مابین حضرتؑ اور فضلِ امامِ حسنؑ پس واضح و لاغ ہے۔ اس لیے کہ امامِ حسنؑ نے صلحِ اختیار نہیں فرمائی مگر واسطے رفعِ فتنہ و فساد کے اور بخونِ قتلِ اہلِ بیت و شیعیان و بوجہ عدمِ وثوق و اعتمادِ اصحاب کہ خرد و مکران کا مشاہدہ فرما چکے تھے۔ بخلاف حضرتِ امامِ حسینؑ کے وہ جنب جانتے تھے جن لوگوں نے خط لکھے ہیں اور عہدِ دیہانِ محکم کیسے ہیں میری نصرت سے انکار و چشم پوشی نہ کریں گے اور اصحاب کے وجود سے حضرتؑ پر واجب و لازم ہو گیا تھا کہ اپنے حق کو ادا کرنے دین سے طلب فرمائیں اور خروج کریں۔ اور جب مقدمہ منطکس ہو گیا اور آثار و عظمتِ خرد و فائق اور سورہ اتفاق ظاہر ہونے تو قصدِ مراجعت فرمایا۔ اور چاہا کہ طلبِ حق سے دست بردار ہوں اور امرِ خلافتِ ظاہریِ زید کو سپرد کر دیں۔ اور صلح کر لیں۔ جس طرح ان کے برادرِ بزرگوار نے صلح کی تھی لیکن اس وقت دشمنوں نے نہیں مانا اور اس امر پر راضی نہ ہوئے۔ پس دونوں بزرگوں کا حالِ بعینہ ایک دوسرے سے مطابق اور موافق ہے۔ لیکن چونکہ حضرتِ امامِ حسینؑ نے بعد ظاہر ہونے آثارِ خوف و ضعف کے اور امانتِ لشکرِ خلافت کے صلح چاہی لہذا اس فرقہ گراہ نے صلح قبول نہ کی اور درپے عرض و آبرو کے ہوئے۔ اس وقت حضرتؑ نے بیخود و لاچار ہو کر ان سے لڑنے میں اور ان کے دفع کرنے میں سعی و کوشش فرمائی یہاں تک کہ درجہِ رفیعہ شہادت کو پہنچے اور بہشتِ حشرِ سرشت اور رحمتِ رضوانِ پروردگارِ عالم سے فائدہ ہونے اور یہ سب جو مذکور ہوا اس تامل کرنے والے پر جو اخبار و احادیث سے مطلع ہے واضح و لاغ ہے۔

علامہ مجلسی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں اکثر پیشین ولالت کرتی ہیں اس بات پر کہ ہر ایک ائمہ معصومین میں سے خدا نے عزوجل کی طرف سے احکامِ خاصہ پر مامور تھے

اور وہ احکامِ مجیدہ ہائے آسمانی میں جو کہ رسول پر نازل ہونے تھے مندرج تھے۔ پس ہر ایک ائمہ ظاہرین سے ان احکام پر عمل فرماتے تھے اور مزادار نہیں ہے کہ انہیں اپنے احکام پر قیاس کریں۔ اور جو شخص احوالِ انبیاء مرسلین پر مطلع اور آگاہ ہوا ہے کہ خدا نے اکثر تغیروں کو حق تنہا ہزاروں کفار پر مبعوث فرمایا اور وہ پیغمبران کے بتوں کو اور خداؤں کو برا کہتے تھے اور طرفِ دینِ حق کے دعوت کرتے تھے اور مصائب و مکر دہات دنیا کی پروانہ کرتے تھے اور ضربِ قید و قتل و احرار سے اور مائتہ اس کے دیگر حقوقِ دنیوی سے ذرا خوف و بیم نہ رکھتے تھے تو وہ شخص البتہ جاننا ہے کہ ائمہ معصومین پر مقامِ احترام نہیں ہے اور یہ بھی ہے کہ جہمتِ ائمہ ظاہرین گناہانِ مغیرہ و کبیرہ سے بدلیل و برہان اور بہ نصوص متواترہ قرآنِ مثبت ہو چکی ہے۔ پس کسی طرح جہلِ احترام ان پر نہیں ہے۔ بلکہ قول و فعل ان کا تحت ہے جو کچھ کہیں اور جو کچھ کریں اس کو تسلیم و قبول کرنا واجب و لازم ہے۔ علاوہ یہ کہ اگر کوئی منصفِ خوب غور و تامل کرے یقین کر سکتا ہے کہ حضرتؑ نے جان اپنے جد کے دینِ مبین پر نثار کی اور یہ تزلزل جو ارکانِ دولتِ بنی امیہ میں ظاہر ہوا بعد شہادتِ حضرتؑ کے

واقع ہوا اور کفر و ضلالت ان کا ظہر نہ ہوا مگر بعد اس بات کے حضرت درجہ شہادت سے فخر ہوئے اور اگر حضرت اشتیاء سے مصاحم کر لیتے تو قوت و شوکت ان کی زیادہ ہوتی اور امر ان کا لوگوں پر مشتبہ ہو جاتا اور دین کے نشان پوشیدہ اور آثار ہدایت کے کھنڈ ہو جاتے اور یہ بھی اخبار ساتھ سے واضح ہوا کہ حضرت مدینہ منورہ سے نہیں نکلے مگر خوف قتل سے اسی طرح مکہ معظمہ سے نہیں نکلے مگر بعد غلبہ ظن کے اس بات پر کہ وہ خار و مکار و مکر و دھرم و درپے قتل ٹلے یہاں تک کہ حضرت کو اربابان تمام کرا تاہیں نہ ہوتا تا آنکہ حضرت محل ہوئے اور حج کو عمرہ سے بدل کر مکمل خوف و دہشت وہاں سے نہضت فرمائی۔ خدا جو حضرت پر جان و مال اور ماں باپ اور اولاد میری کہ آپ کو اتمام حج کی جہالت نہ دی اور حالت خوف میں سفر اختیار کیا اور اصرارے عرصہ زمین کو ان پر تنگ کیا اور راہ چارہ مسدود کی اور جانے امن و عمل پہنچا ہوا نہ رکھا۔ یہ تحقیق کہ ہم نے بعض کتب معتبرہ میں دیکھا ہے کہ زید نے عمر بن سعید کو لشکر عظیم کے ساتھ کر کے جانب مکہ معظمہ روانہ کیا اور اس کو سردار جلوچ کیا تھا اور کہا تھا کہ حضرت کو بہر اخفا گرفتار کرے اور اگر ممکن ہو تو حضرت کو بکر و حیلہ قتل کرے اور اسی سال تیس ملتوتوں کو اشرا بنی امیہ میں سے بہر اخفا مایوں کے ساتھ بھیجا تھا کہ جس طرح ممکن ہو حضرت کو قتل کرے۔ جب وہ جناب اس پر مطلع ہوئے تو احرام حج سے محل ہوئے اور حج کو عمرہ متفردہ سے بدل فرمایا اور ہارسنا متخذہ مشغول ہے کہ مہر ابن جحنی نے اس جناب کو سفر سے منع کیا تو حضرت نے ارشاد کیا: واللہ اسے براور اگر میں کھی جانور کے سوراخ میں چھپوں گا تو بھی مجھے ڈھونڈ کر نکالیں گے اور قتل کریں گے۔ ظہر یہ ہے کہ اگر وہ جناب مصاحم و بیعت اختیار کرتے جب بھی وہ ملتون بسبب شدت عداوت قتل حضرت سے دست بردار نہ ہوتے اور ہر صورت مکر و دھرم سے پیش آتے اور خواہش بیعت محض بہانہ تھا اس لیے کہ جانتے تھے کہ حضرت قبول نہ کریں گے مقام غور ہے کہ مردان ملتون نے حاکم مدینہ کو مشورہ دیا تھا کہ حضرت کو قبل تذکرہ بیعت قتل کرے اور ابن زیاد کہتا تھا کہ پہلے حضرت کو ہماری بیعت و اطاعت کی تکلیف دو بعد اس کے جو کچھ ہماری رائے میں ممکن ہو گا عمل میں لائیں گے اور واضح تر یہ فیہ ہے کہ اشتیاء نے پہلے حضرت مسلم کو اعلان دی بعد اس کے قتل کیا لیکن معاویہ اگرچہ بغض و عداوت شدید اہل بیت سے رکھتا تھا لیکن نہایت مدبر و۔۔۔ در فتنہ تھا اور جانتا تھا کہ علانیہ اہل بیت کو قتل کرنا باعث روگردانی خلق اور باعث زوال محبت ہوگا اور لوگ فخر پر غرور کر رہے تھے۔ اس لیے وہ۔۔۔ بظاہر طریقہ صلح و دوستی رکھتا تھا اس سبب سے حضرت امام حسنؑ نے اس سے صلح کی حتیٰ اور امام حسینؑ بھی اس سے متعرض نہ ہوئے۔ اور اسی جہت سے اس نے زید کو نصیحت کی حتیٰ کہ امام حسینؑ سے متعرض نہ ہوتا۔ اس لیے کہ وہ جانتا تھا کہ ان کے متعرض ہونے سے بلا شایہ اس کی۔۔۔ زائل ہونے لگی۔ اور اس کے ملک میں ظل و داغ ہوگا۔

مسٹر گلبن مشرکین و کفار کا ایڑہ قال آت رو من اسہار میں کہتے ہیں: ”وہ (حسین) ہاشم کے سلسلہ خاندان سے تھے اور بلحاظ اس کے کہ وہ نبی اللہ کے نواسہ تھے یہ مقدس شخص ان کی ذات سے وابستہ تھا اور وہ مجاز تھے کہ اپنے دعویٰ کو زید یعنی دمشق کے ظلم کے مقابلہ میں پیش کر سکتے جس کی برائیوں سے وہ قنظر تھے اور جس کے حق کو انھوں نے کبھی تسلیم نہیں کیا تھا۔ کوفہ سے چودہ ہزار مسلمانوں نے ایک فہرست خفیہ طور پر مدینہ بھیجی۔ جس میں ان کی ذات سے وابستگی حتیٰ اور جو اس پر آمادہ تھے کہ فرات کے کنارہ ان کے پہنچنے ہی (ان کی حمایت میں) اپنی تلواریں میچا

لیں گے۔ اپنے کھوار دو ستوں کے مشورہ کے خلاف انھوں نے معصم ارادہ کر لیا کہ وہ اپنی ذات اور اپنے اہل و عیال کے متعلق بے وقوف لوگوں پر اعتبار کرے۔ انھوں نے ریگستان عرب کو بچوں اور عورتوں کے (مرثش) ہمراہی میں طے کیا اور حدود (عراق) میں پہنچ کر وہ اس مقام کی محاصرہ صورت یا تہائی سے بمبارک ہوئے اور وہ لوگوں کے ارتداد یا اپنے خاندان کی تباہی سے متوجہ ہوئے۔ ان کا خوف درست تھا۔ عبید اللہ کوفہ کے گورنر نے ہنوت کے پہلے شراروں کو بچا دیا تھا اور حسین کربلا کے میدان میں پانچ ہزار سواروں میں گھر گئے جنھوں نے دریا اور شہر کے درمیان ان کا سلسلہ آمد و شد متعلق کر دیا۔ وہ اب بھی ریگستان کے ایک قلعہ میں پناہ لے سکتے تھے جس نے قیصر اور خسرو کی طاقتوں کا مقابلہ کیا تھا اور قبیلہ طے کی وفاداری پر اعتماد کر سکتے تھے جو مہلکت کے لیے دس ہزار حکومت کر سکتے تھے دشمن کے سوار سے دوران مشورت میں انھوں نے تین باعزت شرائط میں اپنے کو بخار رہنا تجویز کیا۔ لیکن خلیفہ یا اس کے نائب کے احکام سخت اور قطعی تھے اور حسین کو اطلاع دی گئی کہ یادہ بحیثیت مجرم اور قیدی کے اپنے کو حوالہ کریں اور یا اپنی بغاوت کی شجہ قبول کریں۔

مسیو مار بین مسیو مار بین اپنے رسالہ ”فلسفہ مذہب شیعہ“ میں فرماتے ہیں: بہت بڑی دلیل اس بات پر کہ حسین قتل ہو چکا تھا کہ اگر ہر گز ان کا قہد سلطنت اور ریاست حاصل کرنے کا نہ تھا یہ ہے کہ حسین اپنے اس علم سیاست و تجربہ سے جو انھیں پدر بزرگوار اور برادر عالی قدر کے زمانہ سے نبی امیہ کے ساتھ جنگ و جدل کرنے کے متعلق حاصل تھا خوب جانتے تھے کہ بحالت نہ ٹھہرا ہونے اپنے اسباب کے اور بسبب اس اقتدار و عظمت یزید کے اس کے ساتھ مقابلہ کسی طرح ممکن نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ حسین اپنے پدر بزرگوار کے مقتول ہونے کے بعد اپنے مقتول ہونے کی ہمیشہ پیشین گوئی کیا کرتے تھے اور جس وقت کہ مدینہ سے آپ نے حرکت کی صاف صاف اور بہ آواز بلند کہتے تھے کہ میں مقتول ہونے کے لیے جا رہا ہوں اور اپنے سب ہمراہیوں سے بھی محض اتمام غنیمت کے لیے ہی بیان کرتے تھے تاکہ جو کوئی جاہ و جہول کے عرص و مہج میں ہمراہی چاہتا ہو جدا ہو جانے اور پھر باہت ان کے درد نہاں تھی کہ قتل گاہ کا راستہ میرے سامنے ہے اور یہ بھی ہے کہ حسین کا اگر یہ ارادہ نہ ہوتا یعنی خود دگر اور علم و ارادہ کے ساتھ مقتول ہو جانے پر آمادہ نہ ہوتے تو اس طرح اپنا قتل گوارا نہ کرتے اور لشکر کے جمع کرنے میں ہدر امکان کو شش عمل میں لاتے۔ نہ یہ کہ جو ہمراہ تھے انھیں بھی مخترق و پراگندہ کر دیتے۔ ظاہر ہے کہ وہ محبوبیت کا مرتبہ جو اس زمانہ میں حسین کو مسلمانوں میں حاصل تھا اگر اس کے ساتھ اپنی قوت بڑھاتا چاہتے تو ایک بڑا لشکر فراہم کر سکتے تھے مگر اس صورت میں اگر وہ مقتول بھی ہوتے تو یہی کہا جاتا کہ سلطنت و ہلاشاہی کی خواہش میں مقتول ہونے اور وہ مقلوبیت جس کا نتیجہ عظیم الشان انقلاب تھا حاصل نہ ہوتا کہ اپنے پاس سوائے ان لوگوں کے جن کی جہانی امکان کے باہر تھی کسی کو اپنے ساتھ نہیں رکھا۔ مثل فرزند و برادر اور محبتوں اور نبی امام اور چند مخصوص احباب ہادفا کے تاکہ ان سے فرمایا کہ تم بھی چھوڑ کر جدا ہو جاؤ مگر انھوں نے منظور نہ کیا اور وہ بھی ایسے حضرات تھے کہ مسلمانوں کے نزدیک قدر و اور جلال قدر کے اوصاف رکھتے تھے۔ اور یہ مصائب انھوں نے سلطنت و ہلاشاہی کے لیے برداشت نہیں کیے۔ اور نہ بغیر گجے ہونے اس نہالکہ عظیم میں انھوں نے قدم رکھا ہے۔ جیسا ہمارے بعض مؤرخین نے خیال کر لیا ہے۔ حسین نے اپنی زندگی کے آخری وقت میں اپنے طفل شیر خوار کے باب میں وہ کام کیا کہ زمانہ کے فلسفہ کے حصول کو حیران

دقت پر کہہ دیا۔ گویا اس عمل سے حسینؑ کی غرض یہ تھی کہ تمام اہل عالم واقف ہو جائیں کہ بنی امیہ کی مداخلت بنی ہاشم کے ساتھ کس حد تک تھی اور تصور کر لیں کہ زیدؑ دفاع کے لیے ایسے ظلم و ستم کرنے پر مجبور نہ تھا۔ اس لیے کہ شیر خوار بچہ کا ایسی حالت میں اس وحشت ناک طریقہ سے قتل کر دینا سوائے وحشت اور بیگانہ مداخلت کے جوہر دین اور مذہب و قانون و قاعدہ کے منافی ہے اور کچھ ظاہر نہ کرتا تھا۔۔۔ ان خیالات علیہ کے ساتھ جو حسینؑ کے مد نظر تھے بوجہ اس عمل ملای اور سیاست کے جو ان کے لیے مسلم تھی جب تک مقتول ہوں کوئی کام ایسا نہیں کیا جس سے یہ ظاہر ہو سکے کہ بنی امیہ اس کے دور کرنے میں مجبور ہیں۔ یہاں تک کہ باوجود اس اقتدار کے جو مسلم تھا اور باوجود کامل ہا اثر ہونے کے حسینؑ نے کسی ایک شہر پر بھی بلاد اسلامیہ میں سے قبضہ نہیں کیا اور نہ کسی حکومت پر مملکت زید سے حملہ کیا اور انجام میں قبل اس کے کہ حسینؑ سے کوئی اختلاف یا غیر مطیعانہ حرکت یا شورش و بلبوہ ظاہر ہونے پائے انھیں ایک بیابان بے آب و گیاہ میں معاصرہ کر لیا۔ حسینؑ نے ہرگز نہ کہا تھا کہ میں بادشاہ ہوں گا یا میں بادشاہی کا طالب ہوں مگر بنی امیہ کے اعمال قیصر کا اظہار کیا تھا اور کہا تھا کہ ان کی دین و دوزخ و طرز سلوک باعث انحراف اسلام ہے اور اپنے مقتول ہونے کی خبر دی تھی اور اپنی مظلومیت پر خوش و مسرور تھے اور جب انھیں جھگ میں گھیر لیا تھا اس وقت بھی کہتے تھے کہ اگر مجھے چھوڑ دو تو میں آلاہ ہوں کہ میں اپنے عیال و اطفال کو لے کر سلطنت زید یعنی مملکت اسلامیہ سے باہر چلا جاؤں۔ اسی ایک کھتہ نے جس سے حسینؑ کی سلامت نفس و اطمینان ہے مسلمانوں کے دلوں میں بر خلاف بنی امیہ کے اقتدار و جہ کا اثر کیا۔

جناب خان بہادر مرزا سلطان احمد صاحب رئیس کادریان اپنے قابل قدر و محسب رسالہ ”یادگار حسینؑ“ میں مسٹر ار تھران وائسٹن سی آئی ای کے ترجمہ کے نوٹ میں فرماتے ہیں: (مدینہ سے مکہ جانے کا ذکر کر کے) ”کیا یہ باتیں ایسی ہیں جن سے کوئی شخص یہ نتیجہ نکال سکے کہ نوح و ہالہ حضرت امام حسینؑ نے ملک کی ہوس میں خود بھی جان دی اور اپنے کنبہ کو بھی گواہ کیا۔ ماشاؤ کلہ اگر آپ کے دل میں ملک گیری کی انگلیں تھیں تو آپ کو بار بار یہ کہنے کی کیا ضرورت تھی کہ میں یا تو گوشہ نشینی میں عمر بسر کروں گا اور یا کسی دوسرے ملک کو چلا جاؤں گا میرے واسطے دشمن راستہ چھوڑ دیں اور میرے مقدر میں نہ ہوں۔ کیا جب حضرت امام حسینؑ کعبہ کو گئے یا کعبہ سے چلے تو اس وقت کسی فوج کشی کا سامان کیا گیا۔ کیا منادی کی گئی کہ ہم زید کے مقابلہ کے واسطے جاتے ہیں۔ جانا ایک بادشاہ کے مقابلہ میں اور ساتھ کل بہتر آدمی ہوں۔ دانا اور منصف لوگ اس سامان سے خیال کر سکتے ہیں کہ کیا ملک گیری کے خیالات کا شروع ایسا ہی ہوا کرتا ہے۔ اگر حضرت امام حسینؑ کو جنگ و نیوی کی ضرورت ہوتی تو یقیناً آپ مدینہ اور مکہ کی قوموں میں ایک آسانی سے اثر پیدا کر سکتے اور ممکن نہیں تھا کہ ایک لڑائی کی صورت میں زید کعبہ اللہ پر حملہ آور ہو کر امام کے برخلاف فتح یاب ہوتا۔ امام کا نہایت غربت اور مسکینی سے روانہ ہونا صاف طور پر ثابت کرتا ہے کہ آپ کے پاک دل میں ایسے خیالات کا اثر بھی نہ تھا۔“

اسی کتب میں مسٹر جان لونگ کی پوٹری (نظم) سے جو حضرت امام حسینؑ کے حالات میں لکھی گئی ہے نقل کیا ہے کہ: ”وہ شخص (حسینؑ) دین دار، خدا پرست، خود حق، خلیق اور بے مثل بہادر تھا۔ وہ سلطنت اور حکومت کے واسطے نہیں لڑتا تھا بلکہ خدا پرستی کے جوش میں وہ زید سے اس واسطے بیزار تھا کہ وہ اسلام اور دین احمدی کے خلاف تھا۔“

علی بن عیسیٰ اربلی

وزیر سجد علی بن عیسیٰ اربلی فرماتے ہیں: ”معنی یہاں کہ احادیث سید الشہداء علیہ السلام و شہادت آن حضرت آنچہ در کتب بہ نظر سیدہ مطالب آنہا ظاہر نہ ہو بہ تہدات در

تحصیل حزن و گریہ و زاری بدون این کہ در جمیع کلمات و اسرار کلمات و اقوال ایشان بسط مقلے دهند و شرح حالے کنند و بیانانے حکمت ہائے اعمال و افعال آن حضرت نمایند کہ آیا حکمت و مصلحت چہ بود کہ جناب سید الشہداء روحانہاہ باہمہ اطلاع بہ کثرت انصار و قلت اعداء و باہمہ بصیرت بحالت کفہ و منع یاران و خیر خواہان در مدینہ و مکہ از عزیمت خود صرف نظر نہ نمود و ہر قدر مصلحت در کار احوال و انصار مشاہدہ کی کرد عزم خود را پیش تر رجم و استواری نمود و آشکارا دل بر ہلاک نہیاد باہن حالت اہل و عیال و اطفال را نیز با خود برد و باوجود ظہور آشکار ہلاکت و قطعین داشتن شہادت خود و متعلقان دست بیعت بہ نذیر نہ دلا و چرا مثل جناب امیرالمومنین و امام حسنؑ کہ در عہد خود شاہن ہاد ثمنان دین مواسات و مدد اہل کردند آن حضرت این شیعہ را پیش نہیاد نہ فرمود و بایزید و اتباع زید باہمہ آسگاہی بر قوت ظاہر ایشان و قلت ناصر خود ہمیشہ در حق نمود۔۔۔ ہذا لکہ حکمت عظیم و مصلحت عمدہ در شہادت آن حضرت ثبوت حقیقت دین مسیح و ظہور بطلان دعوی مخالفین و حفظ

بینہ اسلام و ظہوری طریقت حضرت سید امام در آن جزو زمانی و بعد ازاں تا امروز منوط و موقوف بر این ہوا و این حکایت شہادت در واقع نبوت خاصہ را ثابت و بمردم مدلل کردہ اسعد یعنی: پوشیدہ نہ رہے کہ سید الشہداء علیہ السلام اور آپ کی شہادت کے حالات جو کچھ کتب میں نظر آتے ہیں، ان کے مطالب زیادہ تر حزن اور گریہ و زاری کی تہدات میں منحصر تھے بغیر اس کے کہ تمام کلمات اور ان کے کلمات و اقوال کے اسرار کے بارے میں بسط گفتگو اور شرح حال کریں اور آجنگاہ کے اعمال و افعال کی حکمتوں کے بارے میں بیانات فرمائیں کہ اس میں کیا حکمت و مصلحت تھی کہ جناب سید الشہداء دشمنوں کی کثرت اور انصار کی قلت کے کامل علم اور کوفہ کی حالت کی مکمل بصیرت اور دوستوں اور خیر خواہوں کے مدینہ و مکہ میں روکنے کے باوجود اپنے عزم ہائیم سے نہیں ہٹے اور احوال و انصار کے کام میں جتنی بھی کمزوری مشاہدہ کرتے تھے اپنے عزم کو مزید پختہ اور استوار کرتے تھے اور کلم کھادل کو شہادت پر آمادہ کر رکھا تھا اور اس حالت میں بھی اپنے اہل و عیال اور اطفال کو بھی اپنے ساتھ لے گئے اور اپنی بربادی کی شہادت کے یقین کے باوجود زید کی بیعت نہیں کی اور جناب امیرالمومنینؑ اور امام حسنؑ کی طرح کہ انہوں نے اپنے عہد میں دشمنان دین کے ساتھ مواسات اور مدارا کا برتاؤ کیا تھا آپ نے ان کے اس طریقہ کی پیروی کیوں نہیں کی۔ اور زید اور اس کے تابعین کے مقابل باوجود ان کی ظاہر طاقت اور اپنے مددگاروں کی قلت کے ہمیشہ سخت رویہ اپنایا۔ تم جان لو کہ عظیم حکمت اور عمدہ مصلحت آجنگاہ کی شہادت میں دین مسیح کی حقیقت کا ثبوت، مخالفین کے دعویٰ کے بطلان کا ظہور، بینہ اسلام کی حفاظت، حضرت سرور عالم کی طریقت کی نگہداری نہانے کے اس حصہ میں اور اس کے بعد آجنگاہ کی اسی طرز عمل پر منوط و موقوف تھی۔ در حقیقت اس واقعہ شہادت نے نبوت خاصہ کو ثابت کیا ہے اور لوگوں کے لیے مدلل بنا دیا ہے۔

(اس کے بعد مؤلف جناب رسالت مآب کی دعوت، واقعہ غدیر، مناقب کا سعد، واقعہ تحفہ، ارتداد اور منع زکوٰۃ کے واقعات بیان کر کے کہتا ہے کہ اگر امیرالمومنینؑ آمادہ جنگ ہوتے تو اکثر لوگ اسلام سے غلطیہ پھر جاتے۔ حضرت امام حسنؑ نے خلافت ظاہری کو، لوگوں کی بے وفائی و بچ کر ترک کیا۔ امیر شام نے ہوا خا ہان اہل بیت کو ہر قسم کی تکلیفیں دیں۔

اس کے بعد منادی کی منادی کہ کوئی فضائل علی نہ بیان کرے۔ علی کے دوستوں کا نام شہر بردوان سے خارج کیا جاتا۔ ان کا قتل، بصرہ اور کوفہ میں بمقابل دیگر مخالفت شدائد بڑھ گئے اور لڑکوں کو مذمت اہل بیت کی تلقین دی گئی۔ حضرت امام حسن کے بعد خلافت اور تخت ہو گئے اور جب یزید ہلاشاہ ہوا تو اس نے ظاہر شرع اور اسلام کو ترک کیا اور کوئی نام شروع کام ایمانہ تھا جو نہ کیا)

”سید الشہداء انبراگر ہائیزید مصالحت میکرد و در محارکہ او مسامحہ نمود یقیناً بیضہ اسلام مرتفعی شد و مسلمین بالمرہ شہر ناک و حترزلری ملاندند و با این تہاہر یزید ہامور نام شروع مدارے بہ او اسباب خرابی از کان دین ی گردید۔ پس آن حضرت بر حسب طبیعت خدا مصالحت در مصالحت ندید غاصہ این کہ درین بین جمیع از غلص مومنین پیدا شد تا بکشتہ شدن خود و امیری اہل و عیال و تمامی مال و منال در رمنانے خداوند متعال با قدم ثابت الطمینان جو استواری آہنہا بود۔ پس آنجناب ہا بن چین اصحاب لوآنے ضرورت دین را بیفراشت و خواستگاری کند و اسبابے فراہم نہاید کہ بہم مردم معلوم شود کہ لاعلمی آنجناب و اسلاف ظاہر نش و عوالے سلطنت و ریاست بنودہ و برانے مال و منال و حفظ حظ و انفسانیہ محارکہ نمی کند و خلق گردد کہ یزید و اتباع و اسلاف او دشمنی و خصومت با خاندان رسالت داشته و عوی آہنہا عوالے سلطنت و ریاست دنیویہ ہدہ و کشتہ این معنی معلوم نمی شد مگر بشہادت سید الشہداء لہذا آن حضرت خواست کہ عزیمت و خروج خود و ربیعہ یزید را بمسلمین و معظم بلاد اسلام معلوم کند تا ہر کس از رونے فطرت و طبیعت میل موافقت و نفرت دارد بمیل و اعتقاد بہ آنجناب ملحق شود و بر آہنہا کہ مخالفت دارند نجات تمام گردد و تعلق بگویند کہ ما از عزیمت آن حضرت بے خبر بودیم۔ ہا این کہ گفت بیعت بہ آن حضرت در مدینہ شد توقف در مدینہ نہ فرمودہ بکہ روانہ شد چہ ہر گاہ شہادت آن حضرت در مدینہ اتفاق افتادہ بود بہ اغلب ولایات اسلام خبر نمی رسید۔ آن حضرت از مدینہ خارج شد حتی اہل و عیال را سہوا برد تا این شہرت بہ اطراف برد و ہر چہ غیر خواہان منع کردند عزیمت را موقوف نہ فرمود و گفت خداوند خواستہ است مرا قتل و شہید و اہل و عیال مرا اسیر بیند۔ پس از آنکہ آن حضرت بکہ تشریف بردند نظر بر این کہ مردمان آنجا تردد داشتند و از آنجا بہ اطراف و اکناف اخبار میرفت چند ماہ در مکہ توقف فرمودند۔

درین عرصہ از کوفہ نامہائے متعدد و رشوان چندے رسیدند حتی این کہ در یک روز شش صد نامہ بہ آن حضرت رسید و مبالغہ ایشان از حد گزشت و بدین واسطہ در کوفہ عزیمت آن حضرت شہرے کرد و سائر ولایات ہا شہرت افتاد۔ ہا این ہا اکتانہ کردہ ششم بن حقیل را پیش از خود فرستاد تا ہا واسطہ او بر اعلی ولایت کوفہ معلوم گردند کہ آئندہ کیست و مقصود و مرہم چیست و آن فتنیہ ہا کہ بسر ششم آوردند و علی روس الاشہار او را شہید نمودند ہمہ دانستند کہ سید الشہداء ای آید و بیعت یزید نمی کند و قصد یزید کشتن او و استیصال بنی ہاشم و ذریت رسول است۔

بعد از چندے توقف در مکہ کہ موسم حج رسید و ہمہ حجاج از عزیمت آن حضرت مطلع شدند آن حضرت دیگر توقف نہ فرمود حتی آنکہ حج را بہ عمرہ مبدل گردانید و روز ترویہ حرکت فرمود تا ہمہ ملتفت شوند و بداند سبب ہمے آن حضرت روز ترویہ عزیمت فرمودہ است دیگر آنکہ خواست نوے اسب فراہم نماید کہ ہر کس بہ فہد کہ تدرک بیعت یزید و خروج کنندہ ہا و آن حضرت است تا ہمہ معلوم شود کہ جنگ با کیست و مقصود یزید چیست تا بعد از شہادت مردم را

اشتباہ نہاند و بداند کہ مقتول و شہید سید الشہداء بودند خارجی و اسرا و اولاد و عیال او بوده اند نہ عیال خارجی و سراین کہ هنگام معرکہ این ہمہ رجز خوانیہا و فرمودن او من عی فی فقد عی فی و من لم یعرف فی فانا اعرفہ بتفسی و مکرر آمدن بہ کارزار و مکالمہ کردن بآن قوم اشرا و ہم چنین بردن عیال و اطفال بہرہای خود کہ بعد از شہادت دیدن آنہا ہمہ با سہلب تعریف آن حضرت باشد چنانکہ در ہزار کوفہ و شام میان این ہمہ جمعیت و اثر دہام مجھے آنہا را نہ شناختند و یک سراین بود در قتل سران و اطراف بر نیزہ کہ آنہا را ہر کس بہ بیند بشناسد تا امر و مطلب بمعظم ناس مشتبه نہاند و ہم چنین تکلمات مجلس یزید و ظہور عتاب و خطاب او با سر مظہر در حضور مجھے از ملل مختلفہ و یک سراین بود کہ آن حضرت قبل شہادت اہل فاعیریہ را طلبید خود را بآئینہا شناساند و از آنہا زمین خرید و در دفن خود شای و معیت بآئینہا کرد تا بعد از شہادت خبہ نہاند و جائے قبر مظہر نیز معلوم و معین باشد و بتواند آن آئینہ را بخونید چنانچہ متوکل خواست آئینہ قبر را بخونند قہر نشد دیگر آئینہ کہ وضع عزیمت را قسے نمود کہ شخص منعت بے عرض اگر تامل کند در حالات آن حضرت بفہم و بداند کہ مرام و مقصود او امر دنیا بود بلکہ محض ترویج دین و معلوم کردن حقیقت خود و بے پردہ کردن کار ظلم و خلاف معاندین تن بقتل داد و بہ اعتبار و میل خود قدم بہ عرصہ بلا نہاد و تحمل جمیع صدمات شد کہ آنہا آنچہ دشمنی بخواہد و ظلم و سلب حیاتی کنند و حالات باطنی را بروز دادہ بتواند مصدر اعمالے شوند کہ مقتضائے سراز و خمار آنہا بود۔ چنانکہ مرکب شدند بکار ہائے کہ از دیدن و شنیدن آنہا ہر ہمہ جہائیں شتلات و ملعنات ایشان و رخ و آشکارا گردید و این قضیہ بالمآل بر تمامی بنی امیہ گردید کہ بعد از شہادت آن حضرت مسلمانان از ایشان با طبع نظر گشتہ و از اعمال ایشان تیرا و بیزاری جستند و از ہر طرف ہنگامہ برپا شد و مردم نقض بیعت یزید را نمودند بلا خروج کردند و با ابراہیم امیر و مختار ثقفی چہ قدر مردم از ہر طرف ہمراہی نمودند تا این کہ سلطنت بنی امیہ در قلیل مدت منقض شد و سبب جناب امیر کہ سالہا با حکم معاویہ و یزید در مسابہ و منابر مسلمانان رسم و معمول شدہ بود مرتفع گردید۔ و این بار رخ می شد مگر بواسطہ شہادت سید الشہداء نوشہ اند در کہ بلا از اولاد و اصحاب آن حضرت سوائے امام زین العابدین دیگر کسے نہاندہ بود و از بنی امیہ درایں روز تا ہزار طفل در گہوارہ طلا موجود بود و حالا از ایشان اثرے نہاندہ و چندین ہزار سلاط (صرف ہندوستان کی مردم شماری میں کئی لاکھ ہیں۔ مولف) از سلسلہ جلیلہ حسنیہ موجود اند و این تحقیق نمی شد مگر بہ این طریق کہ آفتاب پیش نہاد فرمود بدو این کہ منع امدے را قبول نماید خود و اہل و عیال را دانستہ و فہمیدہ بآن ورطہ بلا انداخت پس این ہمہ ایستادگی و در بیعت یزید از ہر دوا کہ ہر گونہ وسعت در کار بود تا روزے کہ عرصہ بآن حضرت سنگ شد و ہمہ یار و اصحاب او شہید گردید و عیال و اطفاش بے صاحب ماند و ہمہ نظر اسیری شدند و بیچ وقت در بنی سستی در عزیمت او دیدہ نہ شد بر ہمہ سینہ گلن با انصاف و بمعظم ناس و رخ کرد کہ خیال و دعوائے او دعوائے باطل نبودہ است و خود را بر حق میدانست و باقتضائے دینداری و ملاحظہ امر اخروی باین مقامات اقدام نمود چہ اگر قصد او از این ایستادگی با سلطنت و ریاست بود بہ آن عقل کامل کہ داشت لامحالہ در وقتے از اوقات سستی از جانب او مشاہدہ می شد چندانکہ ملات برای جہاد است و حالانکہ ہمہ دیدند و فہمیدند و یقین کردند کہ ہرچہ بلا بر سرش آوردند تا نفس آخر از عزیمت خود تقاضا نہ کرد و فوق الحادہ ایستادگی نمود حتی اذن مرخصی بہ اصحاب خود داد و بیعت را از ایشان برداشت پس ہر کس نکات و دقائق حالات آن حضرت موافق روایت عامہ و خاصہ بدقت احصا نظر کند یقین خواهد کرد کہ کسے کہ دعوی باطل و قصد سلطنت ظاہریہ و خیال

ریاست دنیویہ داشتہ باشد علاقہ ہرگز مرگب این گونہ کار ہائی شود و این اقدامات را کہ از بد و اسیر ہمہ حکایتہ آخر اورا بہ بلاک او قرار دی دلاند بمیل و اختیار اقدام نمی کند پس آن حضرت سبب رادری عزیمت و حرکت نوے و پنج فرام کرد کہ بر ہمہ چنانیوں واضح شد کہ او ایں کار ہا بہ ہوائے نفس و خیال باطل نہ کردہ بلکہ بر حسب تکلیف خدا نے ہوا۔ آن جناب در اہل جز و زمان کہ ظلمت شکوک و شبہات احاطہ بہ اطراف عالم کردہ ہوا بشرق طلیعہ خود آن ظلمت را زائل کرد تا ظلمت حق بہرور آشکار و حق از باطل ممتاز و متمیز شد۔ پس ہر کس در ہر جز و زمان اسباب یلا آوری این خنایا را فرام آورد و نگزارد کہ این و تالیخ از نظر باحو کر دودر حقیقت نصرت دین کردہ۔“

یعنی: سید الشہداءؑ بھی اگر نذیر کے ساتھ مصاحبت کر لیتے اور اس کے مقابلہ سے تساہل کرتے تو یقیناً دین اسلام دنیا سے اٹھ جاتا اور مسلمان یکایک سب کے سب مشتبہ اور مترزل ہو کر رہ جاتے اور نذیر کے حکم کھلا خلاف شریعت انھیں کے باوجود اس کے ساتھ مدارات ارکان دین کی خرابی کا باعث ہو جاتی۔ پس آنجناب نے خدا کی جانب سے اپنے فریبہ کے مطابق مصاحبت میں مصطحت نہ دیکھی خصوصاً یہ کہ اس دوران خالص و مخلص مومنین کی ایک جماعت پیدا ہو گئی کہ رضائے خدا میں ثابت قدمی کے ساتھ خود شہید ہونے، اہل و عیال کے اسیر ہونے اور مال و منال کے بہرہ ہونے کے بارے ان کے قیام پر اطمینان تھا۔ اس لیے آنجناب ان جیسے ساتھیوں کے ساتھ نصرت دین کے جھنڈے کو بلند فرماتے ہیں اور چاہتے ہیں اور اس کے اسباب فرام کرتے ہیں کہ تمام لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ آنجناب اور ان کے اسلاف طہرینؑ کا دعویٰ سلطنت و ریاست کا دعویٰ نہ تھا اور آپ مال و منال اور نفسانی فوائد کے حصول کے لیے معارضہ نہیں کر رہے۔ اور یہ ثابت ہو جائے کہ نذیر اور اس کے اسلاف اور پیروکار خاندان رسالت کے ساتھ دشمنی اور خصومت رکھتے ہیں اور ان کا دعویٰ سلطنت اور حکومت دنیویہ کے لیے ہے۔ اور یہ معنی شہادت سید الشہداء کے بغیر مکشوف و معلوم نہیں ہو سکتا تھا۔ لہذا آنجناب نے چاہا کہ اپنے عزم و غرور اور روایت نذیر سے مسلمانوں اور معظم بلاد اسلام کو آگاہ کر دیں تاکہ ہر شخص جواز روئے فطرت میں موافقت و نفرت رکھتا ہے اپنے میل و اختیار سے آنجناب سے مل جائے اور جو لوگ آنجناب سے مخالفت رکھتے ہیں ان پر فحمت تمام ہو جائے اور یہ نہ کہہ سکیں کہ ہم آنجناب کی عزیمت سے بے خبر تھے۔ اس لیے کہ بیعت کا مطالبہ آنجناب سے مدینہ میں کیا گیا تھا۔ آپ نے مدینہ میں توقف نہ کیا کہ روانہ ہو گئے کیونکہ اگر آپ کی شہادت مدینہ میں ہو جاتی تو اکثر اسلام کے صوبوں میں خبر نہ پہنچتی۔ آنجناب مدینہ سے نکل آئے حتیٰ کہ اہل و عیال کو بھی ہمراہ لیا تاکہ یہ شہرت اطراف میں پھیلے اور خیر خواہان نے جتنا بھی روکا عزیمت موقوف نہیں فرمائی اور فرمایا کہ اللہ نے چاہا ہے کہ میں مقتول و شہید ہو جاؤں اور میرے اہل و عیال کو قیدی نہ دیکھے۔ اس کے بعد کہ آپ مکہ تشریف لے گئے اس بات کے پیش نظر کہ لوگ وہاں آمد و رفت رکھتے تھے اور وہاں سے خبریں اطراف و اکناف میں پہنچ جاتی تھی چند ماہ مکہ میں قیام فرمایا۔

اس عرصہ میں کوفہ سے متعدد خطوط اور کئی قصیدے پہنچے یہاں تک کہ ایک دن میں حضرت کو چھ سو خط موصول ہوئے اور ان کا مبالغہ حد سے بڑھ گیا۔ اس ذریعہ سے حضرت کی عزیمت کی کوفہ میں شہرت ہو گئی اور تمام صوبوں میں شہرت پھیل گئی۔ صرف اس پر اکتفا نہیں کی بلکہ مسلم بن عقیل کو اپنے سے پہلے بھیجا تاکہ ان کے واسطے سے کوفہ کے ہر ادنیٰ و اعلیٰ

کو معلوم ہو جانے کہ آنے والا کون ہے اور مقصد و غرض کیا ہے اور وہ واقعت جو حضرت مسلم پر لانے گئے اور سرعام آپ کو شہید کیا گیا ان سے سب لوگ جان گئے کہ سید الشہداء آرہے ہیں اور وہ زبید کی بیعت نہیں کرتے اور زبید کا قصد ہے کہ آپ کو قتل کر ڈالے اور بنی فاطمہ اور ذریعہ رسول کو جڑ سے اکھاڑ دے۔

لہذا کچھ عرصہ قیام کے بعد مومنج آگیا اور تمام حاجی حضرت کی عزیمت سے مطلع ہو گئے حضرت نے پھر وقت نہ فرمایا حتیٰ کہ حج کو عمرہ میں تبدیل کر دیا اور روز ترویہ سفر کر گئے، تاکہ سب متوجہ ہوں اور جان لیں کہ کئی اہم وجہ سے ہی حضرت نے روز ترویہ عزیمت فرمائی ہے۔ دوسرا یہ کہ آپ نے چاہا کہ ہر شخص کچھ جانے کہ زبید کی بیعت سے انکار کرنے اور اس کے خلاف اختلافی قدم اٹھانے والے آنحضرت ہیں تاکہ سب کے علم میں آجائے کہ جنگ کس کے ساتھ ہے اور مقصد زبید کیا ہے، تاکہ شہادت کے بعد لوگوں کو اشتباہ نہ رہے اور جانتے ہوں کہ مقتول و شہید سید الشہداء تھے نہ کہ خارجی اور قیدی۔ آپ کے اہل و عیال اور اولاد تھے نہ کہ عیال خارجی اور بوقت معرکہ یہ سب رجز خوانیاں اور فریادیں کہ جو بچے جانتے تھے وہ تو جانتا ہی ہے جو نہیں جانتا اسے اپنی پیمان کرداتا ہوں اور بار بار میدان کارزار میں آتا اور اس شرر قوم کے ساتھ مکالمہ کرنا ان سب کا بھی راز تھا اور اسی طرح عیال و اطفال کو اپنے ہمراہ لے جانا کہ آپ کی شہادت کے بعد ان کا دیکھا جانا ہر جگہ حضرت کی شناخت و پیمان کے اسباب ہوں، جیسا کہ بازار کوفہ و شام میں اس سارے بڑے عجم اور عین میں کچھ لوگ ان کو نہیں پیمان سکے تھے اور سر اطہر و انور کانیز سے پہ اٹھانے جانے کا ایک راز یہ بھی تھا کہ جو بھی انہیں دیکھے پیمان جانے تاکہ امر و مطلب زیادہ لوگوں پر مشتتبہ نہ رہے۔ اسی طرح دربار زبید میں تکلمات اور اس کا سرانہ و تحلیف قبول اور مذاہب والوں کے سامنے ہر مظہر سے گستاخی عتاب اور غلبہ کرنا۔ ایک راز یہ تھا کہ آنحضرت نے شہادت سے پہلے غاصبہ لٹی والوں کو بلوایا۔ انہیں اپنی شناخت کر دینی اور ان سے زمین خریدی اور اپنے دفن کے بارے میں انہیں وصیت کی تاکہ شہادت کے بعد شہ نہ رہ جانے اور قبر مظہر کی جگہ بھی معلوم و معین ہو اور ان آثار کو مٹانہ سکیم جیسا کہ متوکل نے چاہا تھا کہ قبر کے نشانات کو مٹا دے مگر قادر نہ ہو سکا۔ دوسرا یہ کہ عزیمت کی وضع اس طرح بنائی کہ بے غرض صاحب انصاف اگر آپ کے حالات میں غور کرے تو کچھ جانے اور جان لے کہ آپ کا مقصد و مرام امر دنیا نہ تھا بلکہ محض دین کی ترویج اور اپنی حقیقت و حقانیت معلوم کروانے اور معاندین کی مخالفت اور کار قلم کو بے پردہ کرنے کے لیے جان دی تھی اور اپنے ارادے اور اختیار سے میدان بلا میں قدم رکھا تھا اور تمام صدموں کو برداشت کیا تھا کہ وہ لوگ جیسے ان کا بی چاہے کر سکیں اور قلم و بے حیائی کر لیں اور اپنے باطنی حالات کے اظہار سے ایسے اعمال کے صلاہ ہونے کا مقام میں کہ جو ان کے اندرونی (خاند و سرائے) کا متعق ہے جیسا کہ وہ ایسے ایسے کاموں کے مرتکب ہونے کہ ان کے دیکھنے اور سننے سے تمام اہل جہان پر ان کی شقاوت اور لعنتی ہونا واضح و آشکار ہو گیا اور آخر کار یہ حالت تمام بنی امیہ کی ہو گئی کہ آنجناب کی شہادت کے بعد مسلمان ان سب سے بالطریق متحضر ہو گئے اور ان کے کاموں سے برائت اور بیزاری کرتے تھے اور ہر طرف ہنگامہ بھا ہو گیا اور لوگوں نے زبید کی بیعت کو توڑ دیا اور اس کے خلاف غروج کیا اور ابراہیم اور مختار فتنی کے ساتھ کس قدر لوگ ہر طرف سے آئے تھے یہاں تک کہ بنی امیہ کی سلطنت قلیل مدت میں ختم ہو گئی اور جناب امیر پر سب جو معاویہ و زبید کے حکم سے سالہا مساجد میں اور

مسلمانوں کے مشہوروں پر رم و معمول بن گیا تھا ختم ہو گیا اور یہ سب کچھ شہادت سید الشہداءؑ کے بغیر ختم نہیں ہو سکتا تھا۔ مؤرخین نے لکھا ہے کہ کربلا میں اولاد و اصحاب امام حسینؑ سے امام زین العابدینؑ کے سوا کوئی باقی نہیں رہ گیا تھا اور بنی امیہ سے اس روز ہزار بچہ شہری گہوارے میں موجود تھا اب ان کا نشان تک نہیں رہا اور کتنے ہزار سادات (صرف ہندوستان کی مردم شماری میں کئی لاکھ ہیں) سلسلہ جلیلہ خستہ سے موجود ہیں اور یہ سب کچھ وجود میں نہیں آ سکتا تھا مگر اس طریق سے ہے آپؑ نے پیش نظر رکھا تھا کسی کے روکنے سے نہ رکے۔ خود کو اور اہل و عیال کو سوچ کر دروڑ طوبلا میں ڈالا پس بیعت زبید کی رد میں آپؑ کی یہ ساری استقامت ابتداء سے کہ بہت گنجائشیں موجود تھیں، آخر امر تک کہ آپؑ پر عرصہ حیات تنگ کر دیا گیا تھا اور آپؑ کے سارے یار و انصار شہید ہو چکے تھے اور عیال و اطفال بے سرپرست رہ گئے تھے اور سب اسیری کے انتظار میں تھے اس سارے عرصے میں کسی وقت بھی آپؑ کی عزیمت میں کمزوری نہیں بکھی گئی۔ اس نے انصاف کی نظر سے دیکھنے والے تمام لوگوں پر اور اکثر ناس پر واضح کر دیا کہ آپؑ کی فکر اور دعویٰ باطل و دعویٰ نہ دعویٰ نہ تھا آپؑ خود کو حق پر جانتے تھے اور دیداری کے تقاضا اور آخرت کے معاملہ کو سامنے رکھ کر آپؑ نے یہ اقدام کیا تھا کیونکہ اگر آپؑ کا قصد اس قیام و استقامت سے سلطنت و ریاست ہوتی اس محل کامل کا حامل ہوتے ہوئے یقیناً کسی نہ کسی وقت اس میں کمزوری مشاہدہ میں آتی، جیسا کہ علوت جاریہ اسی طرح ہے۔ حالانکہ سب سنے دیکھا اور سمجھا اور یقین کر لیا ہے کہ جتنی بھی مصیبت آپؑ کے سر پر آئی آخری سانس تک اپنی عزیمت سے پیچھے نہ ہٹے اور خارق العادہ استقامت دکھائی۔ اپنے ساتھیوں کو اذن رخصت دیا اور ان سے بیعت اٹھالے پس جو کوئی بھی آنحضرتؐ کے حالات کے دقائق و نکات پر حاکمہ و خاصہ کی روایات کے مطابق وقت سے نگاہ ڈالے گا تو یقین کر لے گا کہ جو شخص باطل و دعویٰ اور سلطنت ظاہریہ کا قصد اور ریاست دنیویہ کا خیال رکھتا ہو عاودہ ہرگز اس قسم کے کاموں کا مرتکب نہیں ہوتا۔ اور ان اقدامات کو کہ جو شروع سے ہی تمام لوگ عقلاً اس کے نتیجہ آخر کو اس کی ہلاکت قرار دیتے ہوں اپنے اختیار اور ارادہ سے بیکار نہیں لاتا۔ پس آنحضرتؐ نے اس عزیمت اور حرکت میں اسباب کو اس طرح واضح فرام کیا کہ تمام جہان دالوں پر واضح ہو گیا کہ آپؑ نے ان کاموں کو خواہش نفسانی اور خیال باطل سے نہیں سرانجام دیا بلکہ اللہ کی طرف سے آپؑ کے مکلف تھے اور آنجنابؐ نے اس عرصہ زمان میں کہ جب شکوک و شبہات کی تاریکیاں اطراف عالم کو گھیرے ہوئے تھیں، اپنے نور طلبہ کی چمک سے ان تاریکیوں کو کاٹ کر دیدہ تا کہ ظہر حق زندہ کرنے کے ساتھ ساتھ آنحضرتؐ حق باطل سے جدا اور متحس و غمیز ہو گیا پس جو کوئی بھی جس عرصہ زمان میں بھی ان قضیوں کے یلو آوری کے اسباب فرام کرے اور ان دقائق کو نظر سے محو نہ ہونے دے تو حقیقت میں وہ دین کی نصرت کرتا ہے۔

حضرتؑ کی روش دفاعی تھی مؤلف کے دلائل میں نے اپنی تصحیح کے متعلق اب تک مؤرخین کے موافق اور مخالفت خیالات پیش کیے اب میں خود اس

سوال کا جائزہ لیتا ہوں۔ میرے نزدیک حضرت امام حسینؑ علیہ السلام کی روش ہرگز زامی نہ تھی اس کے لیے میرے وجوہات یہ ہیں: حسینؑ اور زبید کے معاملات کی ابتدا مکہ سے نہ تھی بلکہ مدینہ سے

حضرت امام حسینؑ اور زبید کی مخالفت مکہ

سے شروع نہیں ہوتی بلکہ مدینہ سے مکہ سے حضرت مسلم کو کوفہ روانہ ہوتے دیکھ کر اس نتیجہ پر جست کی جاتی ہے کہ حضرت نے طلب خلافت کے لیے نزاری روش پر پیش قدمی شروع کی اور یہی غلطی کی ابتدا ہے۔ جس میں سلسلہ واقعات کی طرف سے بے خیال ایک نظر استہلاک کی عکاسی ہوتی ہے۔ حالانکہ اگر واقعات کی ابتدا اجماع مدینہ کے مکہ ہی سے ہوتی ہوتی تاہم یہ سوچنے کی کافی جگہ تھی کہ جن اتفاقات میں حضرت نے مسلم بن عقیل کو روانہ کیا ان کے لحاظ سے یہ کہنا کہ حضرت نے نزاری روش اختیار کی انصاف اور فکر کو الٹا لٹکا دیتا ہے۔ مجھے ان مؤرخین سے شکایت لا حاصل ہے جنہوں نے حضرت امام حسین کی رفتار اور ان کے الفاظ کے سلسلہ کو اس طرح پیش نظر رکھا ہے کہ کبھی انہوں نے کچھ ہی کیوں نہ فرمایا ہو لیکن سب سے مکہ سے مسلم کی روانگی کو طلب خلافت کے بچنے کے لیے مدینہ لائیں اور اس کے مقابلہ میں مزید کے سیاق اور رفتار و گھٹار کی ولولت اس وقت تک بھگیں جس وقت سے وہ ابن زیاد کو کوفہ کے انتظام کے لیے روانہ کرتا ہے! یہ نامتصفانہ یکوئی خصائل شناسی اور خاصہ فہمی کے لحاظ سے جس درجہ قابل کشیدگی ہے خصائل کی خوبی اور برائی کے بچنے کا وسیلہ ہونے کے لیے ویسی ہی ناموزوں ہے۔ اخلاق لطافت و نزہت کی گنجی ہے۔ اور گھمایا یہ گیا ہے کہ کاشوں سے کلیاں پھوٹ نکل سکتی ہیں۔ یا حضرت آرا کلیاں ہار نظر ہو سکتی ہیں۔ میں دیکھتا ہوں کہ حسین کی موجود بے گناہی مؤرخین کی عدا یا سہواً کوتاہ نظری سے فریاد کرتی ہے۔ حسین کی اعلیٰ خیالی مزید کے مقابلہ میں مزید کی مصلحت کی شعیبہ بنتی گئی ہے!

ابتدائی مزید کے حکم سے
 کیا یہ حسین تھے جنہوں نے مدینہ میں رہنے پر قناعت نہ کی یا انہوں نے مدینہ میں بیچ کر مسلمان عرب کی فراہمی شروع کی؟ نہیں۔ بلکہ یہ مزید تھا جس نے اپنے حامل کو یہ حکم بھیجا کہ حسین کو یا زندہ گرفتار کر لے اور یا ان کا سر میرے پاس بھیج دے۔ اگر وہ میری بیعت سے انکار کرے۔ نہ یہ حسین تھے جنہوں نے یہ فرمایا ہو کہ حشر ہم میں اور ہمارے دشمنوں میں جنگ ہوا چاہتی ہے اور ایسے خیالات کے اظہار سے وہ اپنے مددگاروں اور دوستوں کو آئندہ جنگ و جدل کے لیے تیار کر رہے ہوں۔ ان میں فوجی جوش یا حکومت اور فتوحات کا حوصلہ پیدا کر رہے ہوں۔ نہیں بلکہ یہ مزید تھا جس نے ایسی خیالات اپنی فوج اور افسروں کے سامنے ظاہر کیے اور ان سے شہسری کا عہد لیا۔

اہل کوفہ کی مدد سے خلافت طلبی کے لیے
مدینہ سے کوفہ جانا آسان تر تھا

وہ مدینہ سے کوفہ روانہ ہو گئے ہوتے بہ نسبت اس کے کہ وہ پہلے مکہ جا کر اس کا انتظار کرتے کہ ہیں مدینہ کی کوئی متعاقب فوج یا خود حامل مکہ کی حکومت مزید کے حکم سے گرفتار کر لے۔ کہیں اس کا تذکرہ نہیں ہے کہ محلوہ کی موت سے اس وقت تک جب تک کہ حضرت پر ولید کا بیعت کے لیے اصرار ہوا یا مدینہ سے مکہ تک اثناء سفر میں یا مکہ کے قیام کے زمانہ میں حضرت نے یہ کبھی ظاہر کیا کہ وہ مکہ کو فوجی مرکز قرار دیا چاہتے ہیں۔ حالانکہ اگر حضرت امام حسین کی یہ غرض ہوتی کہ وہ وطن میں اپنے مددگاروں کے جمع کرنے کی کوشش کرتے یا مکہ میں ایسی ہی روش اختیار کرتے تو ان دونوں

مقامات میں بہ نسبت کوفہ کے تھوڑی ہی تھی، لیکن مدد کی قی امید ہوئی۔ جس میں سے ایک اگر وہ حمام تاجس کی مالکیر شہرت اور شہرت کے وجوہات ان کے جد بزرگوار کی ذات اقدس سے پیدا ہونے والے تھے تو دوسری جگہ اطراف بلاد اسلامیہ سے ان کے نانا کے کلمہ کو جمع ہو رہے تھے کہ اگر کلان معج بچا لادیں۔ حضرت نے نہ صرف اس وقت تک جب تک کہ چوتھی شجبان کو مدینہ سے بلاد وطن ہوئے کوئی ایسی کوشش نہ کی جس سے آپ پر نزامی روش کا حرف رکھا جاتا بلکہ مکہ منظر میں بھی آپ نے جب جب کچھ فرمایا وہ یا تو یہ تھا کہ میں مکہ میں رہوں گا۔ جب تک رہنے دیا جائوں گا۔

خلافت طلبی کا حوصلہ وعدہ قبول کر لیتا یا ایسے وقت جب کہ ابن زبیر مدد کا وعدہ کرتے فرمایا کہ مکہ میں خونریزی جائز نہیں ہے۔ یا فرمایا کہ میں

وہ بیڑ خانہ میں ہوا چاہتا جس سے حرمت خانہ کعبہ ضائع ہو۔ میں ہر عقل سلیم والے کو عقل اور اخلاص کا واسطہ دیتا ہوں کہ کوئی شخص جو کسی مقام کے مشتعل ایسے خیالات رکھتا ہو کیا وہ ایسی جگہ کو اس لیے پسند کرے گا کہ اسے فوجی مرکز قرار دے۔ اور اگر ایسا ہی تھا کہ حضرت نے اسے فوجی مرکز قرار دینے کا ارادہ کیا تھا تو اس کے آثار کہاں ہیں۔ میں اس کے ثبوت میں ایک لفظ کو بھی قبول کر لوں گا اگر تمام اسلامی قواریخ یا ردایات میں سے میرے سامنے پیش کیا جائے کہ حسینؑ نے مسلمانوں کے مجمع کو جو جمع کے لیے جمع ہو رہا تھا اس لفظ سے یا فقرہ سے نبیہ کے خلاف برا بھلا کیا یا اپنی مدد کا استغاثہ کیا۔

خلافت طلبی حاجیوں سے استغاثہ نہ دکر اتی میرے لیے یہ سوچنا محال ہے کہ کوئی شخص جو خلافت حاصل کرنے کی سرود آہیں بھرا کر تادہ ایسے موقع کو

ضائع کر تاجس سے بڑھ کر اس وقت سے آج تک مسلمانوں کے لیے کوئی موقع نہیں ہے۔ جہاں مسلمان اس قدر تعداد اور عہدات کی ہم خیالی سے جمع ہوتے ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ ایسے کسی لفظ کا وجود نہیں ہے۔ وہ لفظ اور موقع ہی پیدا نہیں ہوا۔ اور حج کے مجمع کو بھی جانے دو، جہاں نبی کے نواسہ کا مسلمانوں سے پہنچنے کا استغاثہ بہت کچھ کر سکتا تھا، اور وہ موقع سکتے تھے کہ ہم بھی عہدات بجالا کر ہی کیا کریں گے جب ہم سے وہ فریاد کر رہا ہے جو شرح سکھانے والے کا گوشت خون اور روح ہے۔ اسے دھن گھیرے ہیں۔ اس کی مدد اس وقت کا اہم ترین فرض ہے۔ حج تو ہر سال بھلاتے رہیں گے سب نہ ہی تھوڑے ہی سے متاثر ہوتے اور حسینؑ اسی کو قیمت بچتے کہ کچھ نہیں سے کچھ ہی بہتر ہے۔ ہم اس خیال سے بھی باز آتے ہیں اور پوچھنے کا حق رکھتے ہیں کہ مؤرخین اس کے قائل ہیں کہ حضرت کے مکہ پہنچنے ہی لوگوں کا هجوم ہونے لگا اور لوگ شرف قدم بوسی کے حاصل کرنے کے لیے حاضر ہونے لگے۔ کیا کوئی لفظ کوئی فقرہ یا کوئی غلبہ پیش کیا جاسکتا ہے جس سے حضرت نے اس مجمع کو مخاطب کیا ہو اور ان سے مدد چاہی ہو۔ نہیں ہے۔

کوفہ کے قاصدوں کی واپسی کے معنی جو کچھ ہم نے اب تک کہا اس سے یہ امر بھی صاف ہو گیا کہ کوفہ ہوا کوئی اور مقام اس سے کوئی تحریک

حضرت کی خلافت طلبی کی نہانہ قیام مدینہ میں نہ ہوتی تھی اور اگر ہوتی بھی تھی ہے حضرت روک نہ سکتے تھے، تو خود حضرت نے اسے منظور نہ کیا تھا۔ اور یہ صورت مکہ میں باوجود اہل کوفہ کی تحریک کے قائم رہی کہ یا حضرت نے ان کے قاصدوں کو کوئی جواب نہ دیا۔ غلطو پھینک دیے یا صاف انکار کر دیا۔ مدینہ میں حضرت کے طرز عمل سے جو کچھ واضح ہے وہ یہ ہے کہ :

حضرت متوقفانہ مصلحت اختیار کرتے

حضرت اگر بلا بیعت کے چھوڑ دیے جاتے تو وہ بیعتیت ایک نیوٹرل مسرد کے سکونت گزریں رہتے اور ہرگز

ترک وطن اختیار نہ کرتے۔ انہیں مزید کی حکومت سے نہ موافقت ہوتی اور نہ مخالفت۔ اور ان کی یہ روش ویسی ہی ہوتی جیسے رطلت رٹول کے بعد ایک زمانہ تک جناب امیر کی یا ترک اختیار کے بعد حضرت امام حسن کی تھی۔

اگرچہ حضرت امام حسین علیہ السلام ولید بن عقبہ اور مردان بن حکم کے برتاؤ میں جو ان کے ساتھ متوافق کر رہے تھے لیکن تاہم وہ سمجھتے تھے کہ ولید باوجود مصلحت اور

اپنی جلا وطنی کے معنی

احرام کے اس کے لیے اپنے کو معذور نہیں سمجھتا کہ وہ بیعت لینے کے منتقل مزید تشدد جائز نہ رکھے۔ پھر بھی حضرت نے جلا وطنی منظور کی۔ لیکن لوگوں سے اپنے منتقل تائید کے کسی استیفاء کی کوشش رواگی کے آخری وقت تک نہ کی۔

خطرہ کے وقت اپنی جان بچانے کی کوشش ظرت انسانی میں داخل ہے۔ حضرت نے یہی کیا۔ لیکن کسی ایسے محتام پر فوراً

حفاظت جان و آبرو کی کوشش

پہنچ جانا جو آل ابوسفیان کی حکومت سے علیحدہ ہو سکیں نہ تھا۔ اپنے ہر بزرگوار کا یہ مشکم جانتے تھے کہ:

مکہ میں حیوانی یا انسانی قتل جائز نہیں ہے اور اس لیے موقع کے انتظار کے باوجود حضرت نے یہ تصفیہ فرمایا کہ مکہ روانہ ہوں جہاں یہ امید

مکہ معظمہ جانے کے معنی

ہو سکتی تھی کہ مزید جو مسلمانوں پر حکومت کر رہا تھا شاید مسلمانوں کے خیال سے خانہ کعبہ کی حرمت کو قتل سے ضائع نہ کرے۔ ہم اس پر مطلق زور نہیں دے سکتے کہ حضرت حتماً یہ سمجھتے تھے کہ مکہ پہنچتے ہی ہم محفوظ ہو جائیں گے۔

اس لیے کہ اگر یہاں قتل واجب العمل نہ سمجھا جاتا تو گرفتاری ممکن تھی میرے نزدیک مکہ تشریف لے جانا میسر آ ایک صورت کا دیکھنا تھا۔ میرا یہ خیال اس لیے ہے کہ حضرت نے ابن عباس سے فرمایا کہ میں اس وقت تک مکہ میں قیام کروں

کا جب تک رہنے دیا جائے۔ یعنی حضرت اس امکان سے غافل نہ تھے کہ ہو سکتا ہے کہ میں مکہ رہنے نہ دیا جاؤں۔

عادل مدینہ کی طرح عامل مکہ کے نام بھی مزید کا حکم آسکتا تھا۔ جبکہ ہونی چاہیے تھی۔

دجہ تھی۔ وطن اور اس کا اثر جب اس قابل ثابت نہ ہو سکا کہ حضرت کو جلا وطنی پر میسر نہ کرتا تو مکہ نسبتاً دور تھا اور بمقابلہ مدینہ مکہ پر اثر اور تعلق بھی کم تھا۔ مکہ کسی کا وطن تھا اور جس طرح مدینہ کے عامل کے نام مزید کا ایک خط آسکتا کہ حسین کو

بیعت پر میسر نہ کرو یا ایسا ہی یا اس خط کی ایک نقل عامل مکہ کے پاس بھی آسکتی تھی اور حسین کا موقع یا تو یہاں بھی دیا جاتا جیسا مدینہ میں ہوا یا اس سے بھی زیادہ عذر و شہ جاتا۔ صورت معاملہ اس سے بھی زیادہ مائل بہ سختی تھی اور یہ تجربہ ہو چکا تھا

یا ہوا ہی چاہتا تھا کہ ابن زبیر کی گرفتاری کے لیے ایک فوج آگے جنگ اور کشت و خون ہو تا اور ابن زبیر اس طرح اپنے لیے مزید کی کسی مزید کوشش تک اس موقع کو حاصل کر لیتے کہ مکہ میں جس صورت سے تھے اس سے بہ ذلت خارج نہ

کیے جاسکتے۔ یہ مثال ایسی نہ تھی کہ حسین کی توجہ بغیر گزر جاتی اور اگر اب تک واقع نہ ہوتی ہوتی تو اس کا امکان کہ کوئی فوج باری گرفتاری یا قتل کے لیے آئی ہو ظاہر سے بھی زیادہ ظاہر تھا۔

عمر بن سعید کے سپاہیوں کے ساتھ جنگ نہ کرنے کے معنی میں نہیں جانتا کہ حسین کیا کرتے اگر ان کا موقع بھی

ولیا ہی ہو تا جیسا ابن زبیر کا تھا لیکن میرا تصنیف یہ ہے کہ نہ حسین ان ذرائع کو اپنے لیے پسند کرتے جو ابن زبیر نے پسند کیے ہوں اور نہ مکہ میں جنگ کرتے بلکہ وہ ہر وقت اس خبر کے حوالہ دیتے رہتے کہ اگر ہم کسی فوج کی آمد کی خبر سنیں تو قیام مکہ کو بھی مدینہ کی طرح ترک کر دیں۔ میرا آخری خیال اس روایت سے منبہ ہے کہ عمر بن سعید الاشجق کے سپاہیوں کے روکنے پر حضرت اپنے رہتہ کو نکواریوں سے جنگ کرنے کی اجازت نہیں دیتے۔ بلکہ یا تو کھڑوں سے دور ہٹاتے ہیں یا پسپا ہونے پے جاتے ہیں جس کی دو غرض ہو سکتی ہے ایک تو یہ کہ ہم مشغولہ حدود کے باہر نکل جائیں اور یا اس کا موقع چاہیں کہ جنگ کی نیت نہ آنے اور ہم آگے بڑھ جائیں۔ میرا تصنیف آخر الذکر خیال پر ہے۔

اگر یہ بھی تسلیم کیا جائے کہ عمر بن سعید کا تعلق اس وقت مدینہ میں ہو چکا تھا اور اس نے مدینہ سے حضرت کو امان نامہ لکھا تو اس کا امان نامہ اس لیے قابلِ نظر ہے کہ کسی عامل کے کسی انفرادی فعل کی مرکزی حکومت ہمیشہ ذمہ دار نہیں ہوا کرتی خصوصاً جب کہ کسی عامل کے فعل سے مرکزی حکومت کا حکم محفوظ ہو۔ مزید ولید کو حسین کی گرفتاری یا قتل کا حکم دے چکا تھا اور تساہل کی وجہ سے ولید کو معزول کیا تھا۔ ایسی صورت میں اگر عمر بن سعید کا امان نامہ ولید کے حکم کی لاطی پر مبنی تھا تو اس کا کیا یقین ہے کہ وہ ولید کے حکم کے علم پر بھی اپنے اس امان نامہ پر قائم رہتا اور اگر قائم بھی رہتا تو اس کی ذمہ داری ہے کہ ولید بھی اس کو قبول کر لیتا۔ دراصل اس امان نامہ سے حسین نے کسی شرط کا اپنے کو باندھ نہ کیا ہوتا۔ اس کے علاوہ عمر بن سعید کے خط کو دیکھتے ہی حسین کا قبول کر لینا بغیر شوق کے سیاسی بے احتیاطی ہوتی۔ کون جانتا ہے کہ وہ امان سے حسین کو دھوکا نہیں دیا جا رہا تھا۔

مکہ کا موقع ہرگز قابلِ قبول نہ کرتا کہ وہ اپنی جان کے لیے لوگوں کے اعتقاد میں پسپا ہوتے۔ یا محض پسپا ہوتے، ناگن تھا۔ بلکہ وہ ایسے موقع کے قبل مشغولہ حدود کے باہر نکل جاتے اور وہیں وہ کچھ جوتا جو کر بلا میں ہوا۔ حالانکہ اس کے علاوہ حرمت خانہ کعبہ کی حفاظت بھی ایک چیز تھی۔ جس کے لحاظ سے حضرت شمار ہے تھے کہ: "اگر میں (حدود مکہ سے) ایک ہاشت ہٹ کے شہید ہوں تو مجھے یہ زیادہ محبوب ہے کہ میں مکہ میں مارا جاؤں۔"

عامل مکہ کی اطلاع کے معنی اب میں اس امر پر نظر کرنا چاہتا ہوں کہ مکہ میں حضرت کا کیا موقع تھا۔ ترتیب واقعات میں میں کہہ چکا ہوں کہ جب حضرت مکہ پہنچے اور لوگ

شرف قد مہوسی اور انے جاعت کے لیے حاضر ہونے لگے تو عامل مکہ نے ولید کو ان حالات کی خبر دی میں فرض کرتا ہوں کہ اس کی یہ اطلاع اس بنیاد پر نہ تھی کہ اسے حضرت سے کوئی ویسی ہی صداقت تھی جیسے مروان بن حکم کو اور وہ اس اطلاع سے گویا اس امر کا حکم حاصل کیا چاہتا تھا کہ میں حسین سے استحصال بیعت اور لشکر کی اجازت دی جائے۔ میں اسے بھی فرض کرتا ہوں کہ وہ ولید کے اس حکم سے ناواقف تھا کہ ولید نے عامل مدینہ کو حسین کے متعلق کوئی حکم بھیجا تھا اور

اس حکم سے حسینؑ نے قیام مدینہ کو قیام مکہ سے بدل دیا۔ حالانکہ حضرتؑ کا مکہ آ جانا اس خبر کو پوشیدہ نہیں رکھ سکتا تھا کہ حضرتؑ کو نے اتفاقات میں شریف لانے ہیں۔ میں اس سے بھی چشم پوشی کرتا ہوں کہ واقعات کی غیر رسمی اطلاع پر حامل مکہ نے حسینؑ کے ساتھ کسی برتو کارا راہہ کیا۔ بلکہ محض اطلاع دی۔ کیوں؟ اس لیے کہ وہ مکہ کا حامل تھا اور بیعت اس کے وہ اس کا ذمہ دار تھا کہ اپنے رقبہ اختیار کے واقعات کے لیے آنکھیں کھولے رہتا حسینؑ کی آمد کو اس نے ایک غیر معمولی واقعہ سمجھا جس کی اطلاع دینا ضروری ہوتا۔ اطلاع اپنے ولی نعمت زید کو دینا اس کا نام عمر بن سعید الاشدرق تھا یہ اسی تھا۔ اپنے کو امیدوار سلطنت سمجھتا تھا اور اسی میں قتل کیا گیا۔

یہی تھا کہ جب یہ مدینہ منتقل ہو گیا تو اس وقت حضرتؑ نو اسیر رسولؐ کا فرق مظہر رسولؐ کے منبر پر اسی کے ہاتھوں عالم نے یہ عبرت خیز مقرر دیکھا کہ مسجد نبی کے اسی منبر سے جس پر حسینؑ نبیؐ کی گود اور پشت پر سوار ہو جاتے آج عمر بن سعید الاشدرق اہل مدینہ کو حسینؑ کے شہادت کی اطلاع دیتا اور حسینؑ کا سر اقدس یا اس کے ہاتھ میں ہوتا اور یا منبر کے کسی زینہ پر رکھا ہوتا! (اگر یہ روایات صحیح ہیں کہ حسینؑ کا سر اقدس مدینہ بھیجا گیا)

اور اس کی اطلاع پر جب عہدہ نبی ہاشم یا حاضرین میں کبرام چتا تو یہ کہتا کہ: "ایک روز ہماری عورتیں روتی تھیں آج ہمارے دشمنوں کی عورتیں روتی ہیں۔"

عمر بن سعید کے الفاظ

امان کی کیا ضرورت تھی اگر محفوظ تھے

یہی عمر بن سعید الاشدرق تھا کہ جب حضرتؑ مکہ سے روانہ ہو گئے تو حضرت عبداللہ بن جعفر اس کے پاس آئے اور قبول کمال ابن ابی اس سے خواہش کی کہ: "حسینؑ کو امان دیدہ اور نیکی اور صلہ رحم سے واپس آنے کا سوال کرو۔" اگر حضرتؑ مکہ میں محفوظ تھے اور کوئی خطرہ تھا تو سوال "امان" کی کیا ضرورت تھی؟۔

سواروں کی واپسی کے معنی

عمر بن سعید الاشدرق گرم مزاج نہ تھا بلکہ نہایت خشک مزاج مدبر تھا جو اس ایک مثال سے ظاہر ہے کہ وہ اپنے سواروں کو پہلے تو بھیجتا ہے کہ حسینؑ کو روک دو۔ اور جب دیکھتا ہے کہ حضرتؑ آمادہ نہیں ہیں اور نوبت پیچھے آسکتی ہے تو اپنے سپاہیوں کو واپسی کا حکم دیتا ہے۔ اس لیے کہ زمانہ حج اور مسلمانوں کے گمبج لانے اسے کسی سخت کارروائی سے احتیاط کا خیال دلایا۔ جو واقعات کہ اب تک میں پردہ تھے نکاروں کی جھنکار کے بعد پردہ میں نہ رہ سکتے اور صورت معاملہ ٹھیک تھا کہ بالکل بدل جاتی۔ میں کہتا ہوں کہ وہ خشک مزاج مدبر تھا اور مجھے اس کے آثار اور بھی ملتے ہیں۔ اور میں سوچتا ہوں کہ یہ آثار حضرتؑ کے زمانہ قیام مکہ میں ایک ظہر راز ہیں۔ عمر بن سعید الاشدرق کا موقع یہ تھا کہ حضرتؑ ایک ایسی جگہ سے تشریف لانے تھے جہاں زید کا ایک حکم عام ہو گیا تھا اور اس کی کارروائی سے کسی نہ کسی طرح محفوظ ہو کر حضرتؑ اب مکہ پہنچے تھے۔ بنا بریں اس کا قیاس نا ممکن ہے کہ مکہ میں بھی کوئی ایسی کارروائی اسی طرح کی جاتی کہ جو یا تو ظاہر ہو جاتی اور بے سود ہوتی یا کوئی ایسی شورش ہوتی جو حکومت کے مفید نہ ہوتی۔ یہ مصلحت اس بنا پر بھی ناقابل عمل تھی کہ ابن زبیر یا تو مکہ میں ایک گونہ اقتدار بذور شمشیر حاصل کر چکے تھے اور یا محض تھے آخر الذکر صورت میں بھی یہ نہیں سوچا جاسکتا کہ حسینؑ پر کسی ظہر لشکر دے یا تو حسینؑ کو

اس پر بخور کرتے کہ وہ ابن زبیر سے کسی قسم کی مدد لیتے اور یا ابن زبیر حسین پر کسی لشکر کو اپنے اوپر ایسے ہی لشکر کا مقدمہ بجا کر خود سے حسین کے شریک ہو کر اس دشمن کو مغلوب کرتے جو دونوں کا عام دشمن تھا۔ ہو سکتا ہے کہ حسین کے لیے یہ ناگہانی ہو کہ وہ کسی کی مدد قبول کریں۔ خصوصاً ایسے حوصلہ مند کی جو مدد کا صلہ حصول اختیار قرار دے سکے نہ میں اس وجہ سے متذکرہ صدر خیال ظاہر کر رہا ہوں بلکہ عمر بن سعید الاشدرق کے سیاسی موقع کے لحاظ سے جسے بغیر ایسا سوچے چارہ نہ تھا۔ اس کے علاوہ کوئی قدم اٹھانا سیاسی بے تمیزی ہوئی نہ عمر بن سعید الاشدرق یہ کھیل کھیل سکتا تھا کہ ابن زبیر اور حسین کو آپس میں لڑوا دیتا۔ اس لیے کہ ایک طرف حسین تھے اور ابن زبیر کو قبرہ ہو چکا تھا کہ حسین چلاری کسی کوشش میں دخل نہ دیں گے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ہر صورت میں لوگ بمقابلہ ہمارے حسین کا زیادہ احترام کرتے ہیں۔ اور موقع کی پھر دی بھی جیسی حسین اور ابن زبیر میں ٹھیک تھی نیزہ کے حامل اور ان میں سے کسی میں ٹھیک نہ تھی۔ یہ جواب دینا میرا کام نہیں ہے کہ اگر ابن زبیر کو نیزہ کی رھائیوں کا تقین ہو جاتا تو کس حد تک وہ اس کے خلاف کسی روش سے باز آتے یا نہ آتے۔

خفیہ طور سے قتل یا گرفتاری
ان امور کے لحاظ سے یہ سوچنے کے علاوہ چارہ نہیں ہے کہ یا تو زہر دینے اور یا پوشیدگی سے قتل کرنے کی صلاح ہو رہی تھی اور یا اس قدر خاموشی کو ارا کی گئی تھی کہ نہانہ ختم ہو اور حاجی اپنے گھروں کو واپس جائیں تو اس وقت نسبتاً خورے سے سپاہیوں سے کام چل سکے گا۔ اگر گرفتاری منظور ہو، اور یا نیزہ کی نہی ہوئی فوج بچ جائے گی اور ہم اپنی خواہش کے موافق حسین کے ساتھ رہتا تو کر سکیں گے۔

اب تاریخ نہ صرف اس کوشش کا ذکر کرتی ہے کہ خفیہ قتل یا گرفتاری کی تیاری ہو رہی تھی بلکہ اس کا تذکرہ بھی ہے کہ فوج مکہ سے قریب پہنچی جاتی تھی اور سختی سے حضرت کے قتل و حرکت کی نگرانی ہو رہی تھی اور حضرت کے لیے نہ صرف قیام مکہ بلکہ کہیں اور جانا بھی دشوار ہو گیا تھا۔ اس کے قبل میں ان آثار سے بھی چشم پوشی نہیں کر سکتا جو اگرچہ مطلق ثبوت نہ بھی ہیں تاہم تاہم تاہم ثبوت ضرور ہیں کہ ابن عمر حضرت سے کہتے ہیں کہ: ”لوگوں نے نیزہ سے بیعت کر لی ہے۔ مکہ والے بھی دولت و زر کی لالچ سے اسی کی طرف جھکیں گے آپ کا ساتھ چھوڑ دیں گے یا شہید کر دیں گے۔“ یا تاریخ کامل کے موافق حضرت عبداللہ بن جعفر حضرت کا خفیہ سفر معلوم کر کے کہتے ہیں کہ میں ”آل محمد کی تباہی دیجے رہا ہوں۔“ یا اعظم کوئی کے موافق حضرت عبداللہ بن جعفر حضرت کو لکھتے ہیں کہ: ”میں آپ کے واسطے نیزہ اور بنی امیہ کی اور امیروں کی طرف سے امان حاصل کر اؤں گا۔ پھر اطمینان کے ساتھ حرم محرم میں رہنا۔“ یا حضرت امام حسین علیہ السلام ابن عباس، ابن عمر اور غیر حقیہ سے کہتے ہیں کہ: ”افسوس تو اس بات کا ہے کہ یہ لوگ مجھے گھر میں بیٹھے نہ دیں گے۔ مجھے سے انھیں گے اور اگر میں ان میں سے نکل کر کسی نامعلوم جگہ جاؤں گا تو بھی دھوڑ کاٹیں گے۔ اور بیعت نیزہ کے لیے بخور کر دیں گے اور اگر انکار کروں گا تو قتل کر دیں گے۔“

کہا جاسکتا ہے کہ یہ انظار خطرہ کے گمان سے بڑھ کر نہیں ہیں۔ ہم اس کو تسلیم کر لیتے ہیں اور خدا کے اس بڑے قانون سے چشم پوشی کرتے ہیں کہ خطرہ کے وقت انسان کی قوت حس تنہا ہو جاتی ہے یا بغیر سلسلہ خیال کے بھی دفعہ ہم خطرہ یا غم محسوس کرتے ہیں اور کچھ وقت کے بعد دیکھتے ہیں کہ ہمارا کئی کا وہم توڑی دیر بعد کا واقعہ تھا۔ لیکن یہ وہم یا گمان کی حالت

دیر تک قائم نہیں رہتی بلکہ وہ یقین کی صورت اختیار کرتی ہے جب حضرت فرزدق سے فرماتے ہیں کہ: ”اگر میں جانے میں جلدت نہ کروں تو دشمن گرفتار کر کے لے جائیں گے۔“ یا البہرہ از دی سے کہتے ہیں کہ: ”اب قتل کرنا چاہا تو میں وہاں (حرم خدا و رسول) سے نکل آیا۔“ یا اپنے آخری وقت کسی مصوم بچے کے اس سوال پر: ”پھر میں مدینہ پہنچا دو۔“ فرماتے ہیں کہ اگر کوئے کو آشیانے میں رہنے دیتے تو آرام سے سوتا اور ان واضح خبروں کو تو جانے دو کہ کچھ آدمی حاجیوں کے لباس میں حسینؑ کے شہید کرنے کی فکر میں تھے۔ کوئی عجب نہیں ہے۔ میں اسے بھول نہیں سکتا کہ زید معلویہ کا بیٹا تھا اور نہ یہ سوچ سکتا ہوں کہ زید کو یہ معلوم نہ تھا کہ میرے مدبر باپ نے انہیں کس طرح راستہ سے ہٹا دیا۔ تھیں وہ ظاہر قتل یا گرفتار نہیں کر سکتا تھا اور چمکہ یہ کوششیں مدینہ کے ظاہر حکم کے بعد تھیں میں سوچتا ہوں کہ یا تو مدینہ زید کا خیال ثنوی تھا اور یا یہ عمر بن سعید الاشدق کی صلاح سے تھا۔

اس جگہ میں یہ بھی کہہ دینا چاہتا ہوں کہ حصہ اول میں وہ موقع جب رسولؐ اپنے فرزند ابراہیم اور حسینؑ کی

مؤلف اپنے بعض الفاظ کا ترجمہ کرتا ہے

حیات کا تعفیہ کرتے ہیں اور میں نے اسے ”بولناک خیال“ کہا ہے۔ یا اس موقع پر جب کہ حضرت امام حسینؑ کے احساس خطر کو میں نے وہم یا گمان تسلیم کرنا گوارا کیا ہے۔ یہ حیثیت ”دہم“ ”مگمان“ اور ”خیال“ کے الفاظ کے اس حیثیت کے استعمال کی بخوری سے ہے۔ جس کے بغیر ہم ان الفاظ کا مفہوم نہیں کر سکتے۔ ورنہ میرے نزدیک ان نفوس قدسی میں کسی خیال کا کو نہ تا حیثیتِ عظمت کے قوانین کے موافق الہام تھا یہ اس سے بالاتر تھے کہ ان کے ساتھ وہم، گمان یا خیال کا وہ مصروف جائز رکھا جائے جس طرح ہم آئودہ انسان اپنی حالتوں کے اظہار کے لیے ان الفاظ کو استعمال کرتے ہیں۔

میں یہ کہنے کے قابل نہیں ہوں کہ نفس یا دماغ کا کس حد تک متحرک اس قابل کرتا ہے کہ اس میں اس حرکت کی ابتدا ہو کہ وہ دوسروں کے جذبات کا صحیح احساس کرے یا اپنے خیالات اور جذبات کو دوسرے کے نفس پر نقش کر دے۔ وہ کس طرح حاکم اشیری سے ان ضدوں اور حالتوں کو جذب کرتا ہے اور کونسے طریقوں سے سروش شبی ان کے سامعہ باطنی سے مس ہوتی تھی۔ آیا کسی امر کے متعلق ان کا تعفیہ ایسے ہی کسی قانون کا نشو و نما جس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ایک انسان باوجود بھانے کی تمام کوششوں کے نہیں بھٹتا اور کوئی ہے جو خفیہ سا اشارہ پا کر دیکھتا ہے کہ اس امر کے متعلق تمام پہلو روشن ہو گئے۔ یا صحیح احساس کے لیے کوئی اور مار کوئی گراں گراں طریقہ تھا۔

لیکن تھا۔ ان کی تاریخ بتاتی ہے۔ نہ خواب ان کے لیے خواب تھا نہ خیال ان کے لیے خیال تھا۔ یہ سمجھتے تھے کہ ہمیں خبر ملی اور اسی کے یقین پر اپنے عمل کو مبنی کرتے تھے۔ عالم کی تاریخ پتہ دیتی ہے اور نفس انسانی اس کا انکار نہیں کر سکتا۔ اگرچہ ہم قانون کو نہ سمجھتے ہوں لیکن قانون کا احساس یا وہم و گمان ہم میں ضرور ہے۔ اور اگر ہمیشہ نہیں تو یہ فوراً کبھی کبھی انسان پر چمک جاتا ہے۔ کیا عجب ہے کہ کچھ ایسے نفوس قدسی اور دماغ مظہر ہوں جن پر ایسے عکس کی تکرار ہوتی ہو۔

آخر کیا ضرورت تھی عمر بن سعید الاشدق کو سواروں کے پیچھے اور حضرت سواروں کے پیچھے کے معنی کو بہ جبر مکہ میں دامن لانے کی۔ اگر مکہ کی حکومت حسینؑ کو اپنے جانے اور رہنے میں ایک عقدر انسان مکتی تھی؟ یہ پیش قدمی کبھی ہے کہ اب تک اپنے منصوبوں کو ناقص دیکھ کر جلدی سے سوار بھیجے

کہ انھیں اپنے قبضہ سے نکل نہ جانے دیں۔ اور یاسینؑ کو ان کی خواہش اور نفس کے خلاف زید کی بیعت کرنے پر مجبور کر دیا۔ ان اتفاقات کی موجودگی میں ابن عباس اور ابن عمر مدینہ واپس چلے یا مکہ میں رہنے کی ملاصحت دیتے ہیں۔ میں ان کی رائے کو بڑی محبت اور نیک نیتی کے اور کسی غرض پر

صلاحوں کی حیثیت

محول نہیں کرتا۔ لیکن بغیر یہ کہہ بھی نہیں رہ سکتا کہ یہ بات واقعات سے ناواقف تھے اور یا ان سے چشم پوشی کر رہے تھے۔ کیا یسینؑ مدینہ ہی سے جلا وطن ہو کر نہ آنے تھے۔ بلکہ وہ لوگ اس سے واقف نہ تھے کہ عمر بن زبیرؓ کہتا کہ میں عبداللہ بن زبیرؓ سے ”میں خانہ کعبہ میں لڑوں گا“۔ یا نہ جانتے تھے کہ زیدؓ نے ولید بن عقبہؓ کو ابن زبیرؓ کے مکہ روانہ ہونے کی اطلاع پر لکھا تھا کہ: ”عبداللہ بن زبیرؓ کو اس کے حال پر مجبور و دودھ جہاں کہیں جائے گا بھاری کند اس کے گلوگیر رہے گی“۔ اور یہ تو انھیں ایک آدمہ برس کے بعد دیکھنا تھا جب زیدؓ مسلم بن عقبہؓ کو مدینہ کی تاراجی اور مکہ میں ابن زبیرؓ سے جنگ کے لیے بھیجا اور مسلم بن عقبہؓ اپنے بستر موت پر حسین بن نمیرؓ کو ان نظموں میں وصیت کرتا کہ: ”چوں بیکہ رسی بلید کہ از سرحد و جد واجتلا حرب ابن زبیر قیام نمائی و بلید کہ بر خاطر تو خطور نہ کند کہ ابن خانہ خداست و من چگونہ باہل خانہ مدبرہ کنم۔ وظیفہ آست کہ مہاشی نصب کنی و از ویران شدن خانہ کعبہ پاک نہ داری کہ سخن امیر زہرا است از کعبہ“۔ یعنی: ”تو جب مکہ پہنچے تو ابن زبیرؓ سے لڑائی میں بہت جد و جد سے کام لو اور تیرے دل میں یہ خیال نہ گھسنا چاہیے کہ یہ خدا کا گھر ہے۔ اور میں کس طرح خدا کے گھر والوں سے لڑوں۔ تیرا فریضہ یہ ہے کہ شیعہ نصب کرے اور خانہ کعبہ کے ویران ہونے کی پرواہ نہ کرے۔ کیونکہ امیر کی بات کعبہ سے بڑھ کر ہے“۔

ان حدیث دہک حالات کی موجودگی میں اگر ابن عباس اور ابن عمر کو یہ تصفیہ کرنے کا موقع نہ بھی ہو کہ حسینؑ کے ساتھ درمیانی حالت میں بھی بھی ہو سکتا تھا تو ہم لوگ جو دونوں گزرے ہوئے واقعات سے واقف ہیں اس تصفیہ سے دور نہیں رہ سکتے۔ حسینؑ بیعت نہ کرتے اور ضرور شہید ہوتے۔ جہاں ہوتے۔ لیکن اس وقت یہ ان کے اختیار میں تھا کہ خانہ کعبہ کی حرمت ضائع نہ کرتے اور یہ انھوں نے کیا۔ جو لوگ انھیں حرم میں رکھنا چاہتے تھے وہ بے ہوشی میں اس کے مشتاق تھے کہ حرم کو حسینؑ کے خون سے سرخ دیکھتے۔ جو کچھ ہو جائے کی غیر محفوظ حالت میں کام نہیں ہو سکتا۔ ورنہ حسینؑ عج پر طلب خلافت ہی بھی، کوچہ یا ایک دن کے لیے ترجیح نہ دیتے۔

لیکن ابن عمر اور ابن عباس حسینؑ کی حالت خوف اور زیدؓ کی طرف سے تشدد ہونے ایک سوال کا جواب کے قرائن سے ناواقف نہ تھے۔ بلکہ یہ کہہ رہے تھے کہ زیدؓ سے بیعت کر کے بلا ٹالو۔ اور ابن عمر جانتے تھے اور کہہ رہے تھے کہ: ”اگر تم یہ چاہتے ہو کہ زیدؓ سے بیعت نہ کرو تو تمہیں اس کے لیے ضرور مجبور کر دے گا اور وطن میں اطمینان سے بیٹھنے نہ دیں گے تا وقتیکہ آپ اس کی بیعت اختیار نہ کریں“۔ اگر مؤمنین کے نزدیک ”بہدار“ ہونے کا معیار یہی ہے کہ کوئی شخص اپنی زندگی کے لیے کیسے ہی ذلیل فعل کے آگے سر جھکا دے تو مجھے ”حسینؑ کا جواب ہی کہہ دینا ہو گا اور بس کہ: ”ایسی باتوں پر تفت ہے جب تک آسمان وزمین قائم ہیں“۔ حسینؑ نے اپنے علم و ارادہ سے عزت کی موت کو ذلت کی زندگی پر ترجیح دی۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ اگر عالم میں مجاہداری کے سب ایسے ہی قیام ہوتے تو علوے نفس، ایثار و عنیت اور کسی بڑی وجہ کے لیے قربانی یا شہادت کا شریف ترین مفہوم

اور مثالیں دنیا میں موجود ہوتیں یا نہ ہوتیں اور حجت کہ حسینؑ کے فلسفہ شہادت کی عظمت و شرافت ایسی غلط خیالی یا دور از راہ امتساح کی آماجگاہ۔

غلام میں اپنی اس تیج کا جواب دے چکا کہ: ”آیا حضرت امام حسینؑ علیہ السلام کی روش نزاعی تھی؟ نہ تھی۔ اب میری یہ غرضی تیج شروع ہوتی ہے: ”اگر بغرض عمل حسینؑ نے یزید کی سلطنت کے الٹ دینے کا قصد کیا تو یہ کوشش کب تھی۔ کبھی تھی اور حضرتؑ نے کامیابی کے لیے کونے وسائل اختیار کیے؟“

یہ سوچنا سامنے کی بات ہے کہ ایسے خوف اور لشکر کی حالت میں جس میں حضرتؑ بسر کر رہے تھے کسی انسان کے لیے کیا موقع رہ گیا تھا کہ وہ خاموشی سے اپنے کو دشمن کے حوالہ کر دیتا کہ یا تو وہ کسی تاریک گوشہ میں ناقابل برداشت مصیبتیں گوارا کرتا رہے اور یا قتل کیا جاتا۔ حسینؑ کی غیرت و محبت نے اسے گوارا نہ کیا کہ اپنے کو کھانچا بن کر طرح گرفتار کر لے دے اور دشمن کو اپنی گرفتاری پر محکمہ کرنے دے۔ سیدنا ابن مریمؑ سے یہودیوں یا رومی ان میں سے کسی کو نہ کوئی دیرینہ عداوت تھی اور نہ پیراس کے کہ وہ ان کی مذہبی مداخلت کو غلط درزی سمجھتے تھے اور کوئی عصمت تھی، مگر ظلت اس کے حسینؑ اور ان کے دشمنوں کی مصلحت وہ تھی جو طویل مدت تک پہلے حصہ میں دکھائی گئی۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ ان امور اہل کی ناموجودگی میں حسینؑ کیا کرتے۔ لیکن ان اسبابِ مخالفت کی موجودگی میں حضرتؑ نے اپنے کو ان کے ہاتھوں میں گرفتار دیکھنا پسند نہ کیا۔ حسینؑ کے اسبابِ مدافعت اور دشمن کے سامانِ منازعت کا مقابلہ کرنے کے بعد حسینؑ کی یہ غیرت ایک حکم المثل جرات تھی۔ یعنی تصفیہ کی ابتدا ہی نہایت غیورانہ اور شہلوانہ تھی اور واقعات جس جس طرح صورت اختیار کرتے گئے ان حالتوں میں حسینؑ کے اس ابتدائی پر غیرت تصفیہ میں استقلال اور اصرار کا رتی کرتے جانا ایک ایسی حالت تھی جو تاریخِ عالم میں حسینؑ ہی کے لیے مخصوص تھی۔

حسینؑ اس لیے اب تک گرفتار یا شہید نہیں ہوئے تھے کہ ولید بن عقبہ کے پاس جانے کے وقت مسلح دھندلوں کو ہمراہ لے گئے تھے اور اس کے بعد بھی مدینہ میں رہنے کی جس قدر شہادت ملی اس میں ولید ابن عقبہ خواہی خواہی صورتِ معاملہ کو دیکھ رہا تھا کہ حسینؑ سوالِ بیعت کے متعلق کیا تصفیہ کرتے ہیں۔ بھگے اپنے اس میلان کے ظاہر کرنے میں بھی ہذر نہیں ہے کہ ولید بن عقبہ جس طرح حضرت امام حسینؑ علیہ السلام کے اس موقع کے لحاظ سے جو انصاف مدینہ میں حاصل ہونا چاہیے تھا کسی سختی کی پیش قدمی سے رکنا تھا۔ اسی طرح ممکن ہے کہ وہ رعایت کر رہا ہو، اور اس موقع کا خطر ہو کہ اگر حسینؑ مدینہ سے باہر چلے جائیں تو حدود اختیار سے باہر چل جانے کی وجہ سے میں نواسہ رسول پر سختی کے لیے مجبور نہ ہوں گا۔ مکہ میں پہنچے، اور کئی مہینہ رہے۔ اور کسی کو اس میں ہذر کی گنجائش ہی نہیں ہے کہ نصرتِ شعبان سے بارہ ذیقعدہ تک کوئی لفظ کی انداز اور کوئی حرکت ایسی ظاہر نہ ہوئی جس سے یہ بگھا جاسکتا کہ حسینؑ کسی نزاعی روش کا خیال رکھتے ہیں۔ لیکن یہی زمانہ ان کے لیے موقع کے احساس، تجربہ اور تصفیہ کا تھا۔ اور حسینؑ نے بڑھ کر اپنے موقع کے بگھنے کا نہ دوسرے کو موقع تھا اور نہ ہی تھا۔ وہ اگر اپنے موقع کو سمجھتے تھے تو یہی سمجھتے تھے کہ یزید میرے متعلق اپنے حکم کو بھول نہیں گیا ہے۔ وہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ میرے اثر اور ذات کو دشمن بگھتا ہے اور اس لحاظ سے وہ یہ بھی جانتے تھے کہ مکہ کوئی فوجی چھاونی نہیں ہے بلکہ میرے لیے ایسی کسی سخت کارروائی کے لیے بصرہ یا کوفہ سے فوج منگالنے کی ضرورت ہوگی یا ہو سکتی ہے۔

یہ وقت حکم مدینہ کے انظار کی ایک وجہ تھا اور حضرت کی شہادت کا دور میلانی زمانہ۔

استدعا کا لہجہ اور فطرت انسانی
یہ انتشار تھا کہ اہل کوفہ کی مراسلتوں نے ایک دوسرا لہجہ اختیار کیا اور اگر لہجہ نہ بھی بدلتے تاہم اضطراب کی حالت میں ذریعہ تکلیف کی طرف نگاہ اٹھنا فطرت انسانی میں داخل ہے۔ وہ تکلیف حسیہ تکلیف ہو یا نہ ہو حسین بغیر اس حالت کی موجودگی کے جس میں ان کا ہونا ظاہر بات ہے۔

استغنائے نفس
ریاست و مارت پر مائل ہوتے تو کوئی وجہ نہ تھی کہ وہ ابتدائی میں اہل کوفہ کے قاصدوں اور مراسلتوں کا ویسا ہی جواب نہ دیتے جیسا کوئی شخص دیتا ہے حکومت کی فریگی ہوئی حسین میں حکومت و ریاست کی فریگی کا نہ ہونا صرف ان کی ایسی صیر آسمانوں میں خاموشی سے ظاہر ہے بلکہ ایسے وقت جب کہ مدد کا وعدہ ہو رہا تھا اور غالب سترائے تھے کہ مدد مل سکتی۔ پھر بھی ویسی ہی لاپرواہی پر قائم رہنا حسین کی قوت نفس کا ثبوت ہے۔

حضرت کی آمادگی ایک عہد کے نفاذ کے لیے ہوتی
ملا لکہ اگر محض طلب خلافت کے لیے حضرت اس وقت آمادگی ظاہر بھی کرتے تو وہ اس بات کے لیے آمادہ ہوتے کہ ہم اس عہد نامہ کو نافذ کریں جو حضرت امام حسن اور معاویہ میں ہوا تھا اور جس کے رو سے حسین کو معاویہ کے مرنے کے بعد خلیفہ ہونا چاہیے تھا۔ یہ معاویہ اور زبید کی بد عہدی تھی کہ اس نے حسین کے حقوق کا لحاظ نہ کیا نہ یہ کہ حضرت امام حسین پر کوئی ہذر ہو سکتا کہ تم نے اپنے حق کے طلب کرنے کے لیے کیوں آمادگی ظاہر کی۔

پیشتر کی مثالیں اور ہم آہنگی
ہاں جو اس کے کہ ایسا کرنے میں حسین اپنے حق کے اندر ہوتے لیکن حسین سے یہ امید کرنا کہ وہ خلافت طلبی کے لیے بزور شمشیر کوشش پر آمادہ ہو جائے پیشتر کی مثالوں سے چشم پوشی ہوگی جو حسین کے کسی طرز عمل کے لیے نمونہ تھی۔ یعنی ہادی برحق نے اپنی ریاست روحانی میں لوگوں کے احرام امورات کو اس وقت تک شریک نہ کیا جب تک کہ لوگ ہم آہنگی سے اس امر پر مصر نہ ہوئے کہ ہادی برحق ان کے تمام دینی اور دنیاوی امورات کے ذمہ دار ہوں۔ حبیہ کوئی تنہا مقرر ہی نہ تھا جناب دسی برحق نے باوجود اپنے پامالی حقوق اور باوجود امید و حق اور باوجود اپنی خلیفان کے وعدہ مدد کے اس پر آمادگی ظاہر نہ کی کہ وہ بزور شمشیر حاصل کرتے۔ جب تک کہ لوگوں نے ہم آہنگی سے خلافت کو لا کر ان کے قدموں پر ڈال نہ دیا۔ اور جناب امیر کو اس کی امید ہوئی کہ لوگ اطاعت کریں گے اور مخالفت نہ ہوگی۔ حضرت امام حسن نے اس وقت خلافت کو ترک کیا جب انھیں لوگوں کی اطاعت سے تسلی کو ملاحظہ فرمایا۔ اگرچہ ایسی حالت تھی جو ظاہر قوت مدافعت کا عدم تصور نہ کیا جائے۔

حسین کے لیے اکثر حالتوں کا اجتماع اور خاموشی
حضرت امام حسین باوجود اپنے حقوق اور باوجود اپنے حقوق اور باوجود اہل کوفہ کی استدعا اور باوجود حالت اضطراب کے ان تمام باتوں کو ہاتھ نہ دے رہے اور اگر اس حالت

میں ان کی اس خاموشی کے نیچے حصول خلافت کا خیال پوشیدہ ہوتا بھی تاہم ان کی یہ ادا ان کے تدبیر پر دلالت کرتی۔ جس سے وہ اپنے آغاز کوشش تک اپنے اوپر کمال احتیلا سے کوئی حرف آنے نہیں دیتے تھے کسی کا وہم دوسری چیز ہے۔ حالانکہ ایسا نہ تھا بلکہ واقعتاً، افلاک، انداز اور ان کے نفس کے پر غور مطالعہ سے یہی کچھ میں آتا ہے کہ اگر وہ مانا کے روضہ کی مجاوری سے دور ہٹانے جانے سے متناہت تھے تو مکہ سے جلا وطنی ان کے لیے ویسی ہی پر تاسف تھی۔

ترک مکہ کے وجوہات اب جب کہ متواتر تحریر سے انھیں اس امر کا یقین ہوتا جا رہا تھا کہ انھیں کسی طرح بیعت کی ذلت سے مضر نہ ہوگا اور ضرور قتل کیے جائیں گے تو

دوسری طرف اہل کوفہ کی ہم آہنگی ایک ایسی صورت اختیار کر رہی تھی جو عام صدا بھی جانے اور یہ عام صدا اس کا استیغاثہ کر رہی تھی کہ میں مظالم اور بے دینی سے بچاؤ۔ ان کا یہ فقرہ سچائی کی بوسے خالی نہ تھا کہ: ”اگر آپ نہ آئے تو کل بروز قیامت اللہ تعالیٰ کے حضور میں ہم آپ پر دعویٰ کریں گے اور کہیں گے: الہی! حسینؑ نے ہم پر ظلم کیا تھا کہ ہم پر ظلم ہوتا ہوا دیکھ کر یہ خاموش بیٹھے رہے اور تمام لوگ فریاد کریں گے کہ ہمارے پروردگار حسینؑ سے ہمارا بدلہ دلا۔“ اہل کوفہ نے یحیٰ مقام پر اگلی رکھی تھی۔ اس استیغاثہ کے بعد حسینؑ کا آمادہ ہونا کسی اہل نظر کے نزدیک خود غرضی اور جاہ طلبی کے احساسات سے نہیں ہو سکتا بلکہ مظلوم کی مدد، ہدایت اور ایثار سے۔ حسینؑ کی شجاعت، ہمدردی اور ان کے حقیقی منصب کے لحاظ سے اب مدد کے لیے کوئی حذر نہ رہ گیا تھا۔ اس کے بعد حسینؑ کا کوئی حذر یا ان کے استیغاثہ کی طرف سے لا پرواہی جماعت انسانی کے افسوسناک حالت کی طرف سے لا پرواہی اور غیر شہلاندہ روش بھی جاتی۔ اس لیے کہ یہ گمان کیا جاتا کہ حسینؑ نے ایک کوشش سے اس لیے اصرار کیا کہ اس میں امکان خطرہ تھا۔

اخلاقی اور روحانی شجاعت اب حسینؑ کے لیے کیا چارہ تھا یہ کہ وہ یحیٰ ابن مریم کی طرح اپنے کو دشمن کے رحم اور انصاف کے حوالہ کر دیتے۔ اور اس کے منتظر رہتے کہ

کاشوں کا تاج پہنا کر قسز کیا جاتا اور یا اخلاقی اور روحانی شجاعت کے لیے آمادہ ہوتے۔ اگرچہ سامانوں کی کمی ایک ظاہر بات تھی۔ ابن مریم کو بجز اس کے چارہ نہ تھا۔ کیونکہ ان کے موقع کے وقت ان کا کوئی قابل کاٹو دار کہیں نہ تھا۔ حسینؑ کی حالت اس کے خلاف تھی۔ اور حیوہ حسینؑ کی یہی اخلاقی اور روحانی شجاعت تھی جس نے ان کی شہادت کے بعد فطرت انسانی میں ہمدردی کی کئی کئی لہریں دلا۔ اور ایک ایسا زبردست ہیجان ہوا جو بنی امیہ کی عظیم الشان سلطنت کو الٹ دیتا۔ برخلاف اس کے ابن مریمؑ کے واقعہ نے وہ ظاہری مصلوبیت ہوا اور حیوہ اس سے شہید نہ ہوئے ہوں یا مصلوبیت ذریعہ شہادت ہو جس پر انجیل نے زور دے کر کلام کا موقع دیا ہے۔ کوئی بھائی ہیجان بھی پیدا نہ کیا۔

مکہ اور کوفہ میں شہادت کا فرق اگر حسینؑ اہل کوفہ کے استیغاثہ پر توجہ نہ کرتے تو انھیں مکہ میں یا اس کے بعد کہیں کب مفر تھا۔ تو مکہ میں حسینؑ اس طرح شہید

ہوتے کہ انھوں نے ایک قوم کے استیغاثہ پر توجہ نہ کی ہوتی اور اگر کوفہ میں شہید ہوتے تو ایک قوم کی مشکوریت اور اپنی بلند شخصیت پر عالم کو ابد الابد تک کے لیے گواہ اور ہمدرد بناتے۔ اس کے علاوہ مکہ یا کسی دوسرے مقام میں بجز شہید ہونے کوئی چارہ نہ تھا۔ کوفہ میں کچھ امید بھی تھی۔ کامیابی خلافت اسلامی کی ہیبت بدل دیتی۔ ان تمام صورتوں کے تذکرہ سے

میری غرض یہ تھی کہ حضرت اشرف الشرفہ ایک غیر محفوظ مقام پر دوسرے غیر محفوظ مقام کو ترجیح دینے میں فطری حقوق کی حد میں تھے جو انسان کو اپنے اعزاء، اقرباء، احباب اور خود اپنی جان کے لیے حاصل ہیں۔ ایک مظلوم قوم سے ہمدردی کر رہے تھے اور تیسرے ایک غیر شاہان شخص کی اطاعت کے عہد سے انکار کر کے اخلاقی کمن کو بلند کر رہے تھے۔

طرز عمل پھر بھی حضرت نے کیا کیا۔ مسلم کو اس ہدایت سے روانہ کیا کہ وہ مسجد میں امامت کریں۔ اور شرعی فیصلہ کریں۔ نعمان بن بشیر جو رئیس کوفہ اور زبید کی طرف سے حاکم تھا حاکم رہنے دیا جائے۔ یعنی حسینؑ نے یہ امور اہل شریعت کے اور کسی امر میں دخل دینے کا کوئی حکم نہیں دیا تھا۔ نعمان کے متعلق کسی ایسی ہدایت کا نہ ہوتا جس سے اس کے اختیارات میں دخل ہو۔ یا تو اس وجہ سے تھا کہ یہ امور اہل شریعت کے اور امور اہل انصاف میں دخل کا ارادہ نہ تھا اور معلوم تھا کہ نعمان ہماری طرف مائل ہے یا کم سے کم ہمارا دشمن نہیں ہے اور چونکہ وہ کوئی ہے اس کا اپنی جگہ قائم رکھنا حالت کو حتی الوسع غیر متحرک رکھنے کا۔ جس سے کسی قسم کا اضطراب انگیز پیمانہ نہ ہوگا۔ یہ حالت کھلانے کے لیے کافی ہوتی ہے کہ حضرت کا ارادہ کیا تھا اور اگر حضرت کسی دخل پر آمادہ تھے تو صرف اس قدر کہ ان کی موجودگی روح مذہب کی نگرانی کر سکے اور بس۔ نہ کہ وہ حکومت کی تفصیل میں بھی ارادہ شرکت رکھتے تھے حکومت کی یہ نوعیت ایک شہنشاہانہ شان رکھتی ہے۔ لیکن چونکہ شاہنشاہانہ حقوق کے ادا کرنے کے لیے دنیاوی سلطان نہ تھے اس لیے کوئی ایسی صورت کے معنی پر اخلاقی اور روحانی ہدایت کے دوسرے نہیں ہو سکتے۔

حسینؑ جب یہ صاف دیکھ ہی رہے تھے کہ ہم کس حالت میں ہیں تو کیوں نہ بصرہ کی نبض بھی ٹوٹتے۔ اور یہاں بھی قابل لحاظ امر یہ ہے کہ وہ اپنے خط میں جو مخصوص بات تحریر فرماتے ہیں وہ یہ ہے کہ: ”میں تم کو کتب اللہ و سنت رسول اللہ کی دعوت دیتا ہوں۔ یہ خط اہل بصرہ کو غالباً آخر ماہ رمضان میں ملا ہوگا۔ حسینؑ اپنے ان اظہار میں یا اس کے بعد ایسے ہی استیغاثوں سے اتمام غبت کر رہے تھے جس کی ایک غرض یہ تھی کہ لوگ اس سے ناواقف نہ رہیں کہ اسلام کی کام کون سے ہاتھوں میں ہے۔ اور ذوالقرنی اور اسلامی روح کے مقلدین کے ساتھ کیا برتاؤ ہو رہا ہے۔ اور دوسری غرض یہ تھی کہ لوگ آئندہ کے ظاہر شیعہ سے واقف ہو کر صورت معاملہ سے ناواقفیت کا ہذرہ نہ کر سکیں اور انھیں وقت دار نہایت اور جوش انابت پیدا ہو اور تیسری کوشش جو حسینؑ نے کی وہ ابن عمر یا ابن عباس سے گفتگو کا یہ انداز تھا جس سے وہ لوگ یہ سمجھیں کہ حسینؑ میں اپنی حالت بھار رہے ہیں جس کے معنی گویا مد کا استیغاثہ ہے۔

اس دور دوری اور دور اندیشی کے لحاظ سے جو حضرت خاس آلِ عباس کے ہر انداز سے ظاہر تھی بلکہ کسی ایسے خیال کی ناموجودگی کے کہ ہم کس حال میں ہیں اور صورت معاملہ کیا ہو سکتی ہے حسینؑ کی ذات اقدس میں نواسہ رسولؐ اور فرزند علیؑ و فاطمہؑ کی خصوصیت کا ہونا و نیز معاویہ کے بعد زبید کا مسئلہ نشین خلافت ہونا اس خیال کا محرک ہو سکتا تھا کہ دیکھیں اہل مکہ اور ان کے علاوہ اہل بلاد اسلامی کے وہ افراد جو مکہ میں جمع ہونے ہیں ان پر ہماری ذات کا اثر اس پہلو کے متعلق کیسا ہے کہ خلافت اپنے پہلے مرکز پر چلی جائے۔ یا لوگ پہلے غیر طبعی انقلاب کی روش پر اسب بھی قائم ہیں۔ و نیز یہ کہ مکہ اس وقت دو قسم کے اثر سے متاثر تھا ایک اثر خارجی جو کوفہ کی انجمن کی طرف سے تھا اور دوسرا خود مکہ کا داخلی اثر تھا۔ جہاں زبید کا عامل لوگوں کو ابھرنے نہ دیتا تھا حسینؑ نے ملاحظہ فرمایا کہ غالب قریبہ ہے کہ لوگ جو مصارف کثیر اور رحمتیں اٹھا کر یہاں جا

کرنے آئے ہیں اس وقت پہلے کسی ظہر پر اپنی مشغولیت کی وجہ سے متوجہ نہ ہوں۔ اس سلسلے حضرت نے ترک مکہ کا ارادہ فرمایا اور کسی دوسری جگہ کا قصد کیا۔ جہاں وہ محفوظ ہوں (اس پیرا گراف میں زیادہ تر مؤلف نے نعمت اشرف کے اخبار اکلم کے قاضی ایڈیٹر السید ہبۃ الدین الشہرستانی کا خیال اپنے الفاظ میں ضرب دیا ہے۔ جے موصوف نے مؤلف سے دہدہ گفتگو میں ظاہر کیا۔ مؤلف ان کے الفاظ سے اس قدر موافق ہے جو کچھ اس معنوں کے متعلق اس کے سلسلہ خیال سے ظاہر ہے)

تین راستے اس آخری نتیجے کا لب لباب یہ ہے کہ حسینؑ نے بلاط اس ذکوات حس، روشن ضمیری، عقلی عقل اور صاف نتیجہ دینی کے جو اخصی فطرۃ تعلیم اور تربیت حاصل تھی تصفیہ کیا کہ میں کہیں رہوں لیکن قتل سے بچ نہیں سکتا حسینؑ کے لیے اب تین راہیں تھیں۔ یا وہ نبرد کی بیعت کرتے۔ یا محض قتل ہو جاتے۔ اور یا اس کی کوشش کرتے کہ ہم آئندہ کے صاف نتیجہ کو بدل دیں۔ نتیجہ سے یہاں میری مراد قتل ہے۔ یہ آخری امر ممکن تھا۔ اگر حضرت کو مدد مل سکتی۔

صاف نظری اور اس کی عظمت لیکن جس فتورے وقت میں حسینؑ ملتہ گیر ہوتے جاتے تھے اس کے لحاظ سے دینار اس لحاظ سے کہ لوگ ایک زمانہ سے

اہل بیت رسالت کے اثر سے دور ہوتے جاتے تھے اتنے وقت میں جو حسینؑ کو مل سکتا تھا کسی کامیابی کا قریب نہ تھا اب یہ امر بھی حسینؑ کی نگاہ میں چینی تھا اور یہی حقین تھا جس سے وہ حضرتؑ کچھ ہی کوشش کیوں نہ فرماتے ہوں وہ یہ بھی فرماتے جاتے تھے کہ محزیب میں شہید ہوں گا۔

دو نتائج اور اگر شہید ہونے کو صاف فطرتوں میں نہ بھی فرماتے تھے تو ایسے الفاظ استعمال فرماتے تھے کہ محزیب ایک وعدہ پورا ہونے والا ہے۔ یا مجھے کچھ حکم دیا گیا ہے جو ضرور ہوگا۔ اس وعدہ اور حکم کے اظہار میں حسینؑ کی عظمت کا احساس ہمارے اندازہ کے باہر ہے۔ تو اب حسینؑ اپنے آخر الذکر خیال میں ایک دوسرے نتیجہ کو حتی الوسع ٹال رہے تھے اور انھیں اس دوسرے نتیجہ میں حد سے زیادہ کامیابی ہوئی۔ اگرچہ پہلا نتیجہ اسباب کی کمی سے حاصل نہ ہو سکا ہو۔

عظیم الشان قربانی اس دوسرے نتیجہ کے لیے تھی یہ دوسرا نتیجہ یہ تھا کہ حسینؑ کی شہادت کے بعد جو کچھ نبرد اور اس کے مددگاروں

کو ظہری فتح ہو چکی ہوئی اور حسینؑ کے چند ظہر رقتہ شہید ہو چکے اسے نہ صرف یہ ظہر کرنے کا موقع ملا کہ حسینؑ (معاذ اللہ) اپنی بنیاد میں ناکام رہے بلکہ جو لوگ حسینؑ کی طرف دیکھتے ہوں کہ دیکھیں صورت معاملہ کیا ہوئی ہے وہ بھی شہادت کے بعد کشیدگی کو محسوس اور بے سود کج کر نبرد کی بیعت اور اطاعت پر گر پڑتے اور اس طرح وہ آخری امید اور فتورہ سا مخلصانہ یا شجاعانہ قیام جو اہل بیت اور اسلام کی محبت کے متعلق تھا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے فنا ہو جاتا اور یہ گویا اہل بیت کے علاوہ نظام کی فتح اور اہل بیت اور اسلام کے نظام رومانی کی شکست ہوئی لیکن حسینؑ نے اپنی تمام شکستوں کو اس شکست کے مقابلہ میں بیچ بکھڑا سب کو بھول گئے اور اس آخری شکست کو فتح سے بدل دینے کا محکم ارادہ کر لیا۔ حسینؑ نے عظیم الشان قربانیاں کیں کہ اس عظیم الشان وجہ کی قوت کو کمزور نہ ہونے دیں اور انھیں قربانیوں کی مساوی فطری

حکومت نے ایک ایسا پھیل اور توجہ پیدا کیا جو لوگوں میں حسین کی مدد نہ کر سکنے کی ندامت اور بنی اسیر سے نفرت پیدا کرنے میں کامیاب ہوا۔ جو کچھ مزید اپنی تمام فوج، خزانہ، اثر اور تدبیر سے نہ کر سکا، اسے حسین نے اپنی قربانی، سچائی، استقلال، ایک بڑی وجہ کی حیرت انگیز حمایت اور مظلومیت سے پورا کید ممکن ہے کہ حسین نے جس فطریہ اقدام کا تصفیہ کیا اسے اور سیاسی دماغ بھی طے کر سکتے لیکن حسین نے جو کچھ کیا اس کے لیے حسین ہی چاہیے تھے۔

اس وقت تک میں نے حضرت امام حسین علیہ السلام کی شرح عل کو زیادہ تر اس باب کے نتیجہات تک محدود رکھا، اور کسی مزید نظر کو آخری باب تبصرہ تک ملتوی رکھتا ہوں لیکن

مزید شرح کا التوا

چونکہ مؤرخین نے زیر بحث سوالات کے ضمن میں آگے آنے والے اس واقعہ کا بھی ذکر کیا ہے کہ حضرت نے آنکھ کچھ شراظ پیش کیے جس سے وہ محفوظ ہو جائیں۔ اس لیے میں اسے اسی سلسلہ میں قبول کر لیتا ہوں۔ میرے لیے اس مسئلہ پر فور کی ابتدا میرے عزیز اور مکرم دوست خواجہ غلام محسن صاحب اقبال بی اے کے ان سوالات سے ہوئی کہ :

● حضرت امام حسین کو جس وقت حضرت مسلم کے شہادت کی خبر ملی تو کیوں نہ پلٹے اور کوفہ ہی کیوں روانہ ہوئے جہاں سے

بعض سوالات جو نہایت مفید ہیں

ایسی متوحش خبر ملی تھی؟ ● مرے ملاقات ہونے کے بعد کیوں مراجعت کا قصد کیا جب کوفہ کا قصد کر چکے تھے؟ ● نوی تاریخ یاد سوس کی واپسی کی اجازت کیوں مانگی؟

بے شک حضرت کو حضرت مسلم بن عقیل کے شہادت کی خبر راہ میں ملی ہے حضرت نے بیج باور فرمایا۔ لیکن ”کیوں نہ پلٹے؟“ کے لیے سوال کیا جاسکتا ہے کہ ”کہاں پلٹتے؟“ اگر

کہاں پلٹتے

اس سے مراد مکہ منظرہ یا مدینہ منورہ ہو تو اس کے حالات بیان کیے جا چکے کہ کسی شخص کے لیے جس کا موقع حضرت کا ایسا ہوتا اس کے لیے ناممکن تھا کہ وہ وہاں سے نکل سکتا اور نہ ٹھکرا۔ در آخر ایک حضرت جس طرح بغیر اعلان جلد ان مقامات سے نکلے اس سے ظاہر ہے کہ انھیں مقامات سے نکلنے میں اگر ذرا سی بے احتیاطی ہوئی تو گرفتاری یا قتل سے کوئی شے مانع نہ تھی۔ اب حضرت کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ کہیں اور جاتے۔ اس لیے کہ آگے کے مقامات پر فوجیں پڑی تھیں اور تمام ریگستانی مقامات کو بھی حسین بن نمیر اور مر کے سواروں نے چھان ڈالا تھا اور چھان رہے تھے اور یہ قطعہ بڑھتا ہوا مکہ کی طرف آ رہا تھا اور اگر یہ ممکن بھی ہوتا کہ حضرت اس لشکر سے بچا کر اپنے کو کہیں لے بھی جاتے تو ابن زیاد کا ہاوس جو مکہ منظرہ میں تھا یا مکہ کی مقامی حکومت آگے کے ماحل کو حسین کے قتل و حرکت کی خبر دے رہی تھی، اور چونکہ حضرت تنہا نہ تھے بلکہ سو سو اسو کے قریب عزیز ترین رفقاء سمراہ تھے اس لیے اتنے بڑے قافلہ کا بھی رہنا بھی ایک متلاشی جامعیت سے ممکن نہ تھا۔ اب یہ سوال ہے کہ ”کوفہ ہی کیوں روانہ ہوئے۔“

کوفہ ہی جانے کی وجہ کوفہ ہی روانہ ہونے کی وجہ یہ اس کے کچھ نہ تھی کہ حضرت ایک غیر محفوظ مقام پر دوسرے غیر محفوظ مقام کو ترجیح دے رہے تھے اور حسین کو اپنے موقع کے

کوفہ ہی جانے کی وجہ

احساس کے لحاظ سے اپنے اس اختیار تمیزی کے صرف کا بہترین حق حاصل تھا۔ خصوصاً اس حالت میں کہ کمال ابن ابیہر کے موافق جب مسلم کی شہادت کی خبر ملی اور صلاح ہوئی کہ کہاں جائیں تو بعض اصحاب نے یہ بھی عرض کی کہ ”آپ مثل مسلم

نہیں ہیں، لوگ آپ کی مدد کریں گے۔ اس سے ظاہر ہے کہ اگرچہ حضرت کا موقع اب امید اور اس کے یقین کا نہ تھا۔ لیکن اس کے علاوہ کوئی دوسرا چارہ نہ تھا نہ یہ ممکن تھا کہ حضرت درمیانی مقامات میں سکونت اختیار فرما سکتے۔ اس لیے کہ عرب کے جغرافیائی موقع کے علاوہ جس میں بے آبی کی وجہ سے ہر جگہ قیام ممکن نہیں ہے اور وہیں آب و ہوا بھی جہاں کھانے پینے کی چیزیں دستیاب ہو سکتی ہیں۔ فوجی حیثیت سے بھی حسینؑ کے تھکے ہوئے دور ہوتا کہ وہ اپنے کو ایسے فوجی موقع میں رکھتے جس کے آگے اور پیچھے دشمنوں کی فوجوں یا وفادی علاقہ میں گھر جاتے۔

وجدان یا شعور اب میں خود سے قطع نظر ان حالات کے۔ سوچتا ہوں کہ حضرتؑ کا بنی حقیقی کے ایسے فیصلہ پر کہ یا ہم باپ کا عوض لیں گے یا شہید ہوں گے۔ آگے بڑھنا آیا ایک وجدانی تفسیر تھی یا انسانی شعور کے پاس اس کے علاوہ پیش نظر مسئلہ کا کوئی دوسرا حل نہ تھا۔ میرا ذاتی تفسیر یہ ہے کہ وجدان ہمیشہ اس سخت کا مستوجب نہیں ہے کہ وہ ہمیشہ عقل سے دور بکھا جائے بلکہ اس کے مدارج بھی انسانی تربیت پر موقوف ہیں۔ اور اکثر وجدانی حالت کا تفسیر اس درجہ مفید ہوتا ہے جو کمال عقل بکھا جائے۔ یہ ہمیشہ کابلانہ یا غیر شجاعانہ پیش و پس نہ تھا جس نے دنیا میں بڑے بڑے کام کیے ہیں بلکہ وجدانی حالت بھی ہوئی۔ اب یہ کہ ایک حالت کو اس کی ظاہری وجدانی حالت کے لحاظ سے حیثیت وجدانی حالت بکھلنا اور یہ طے کر لینا کہ اسے انسان کے پیچ و روش خیال اور پیچ و ملکہ تفسیر سے بحث نہ تھی جس سے کوئی ایسی حرکت وجدان پیچ بھی جائے ایک دوسری غلطی ہے۔ بہت ممکن ہے کہ ہم ایک وقت اپنی دور بینی سے ایک حالت کو طے کریں اور اپنے خیال یا تفسیر کا نفاذ اور اظہار ضروری نہ سمجھیں لیکن اس کے بعد ہی موقع کی ایک خاص کیفیت ہم میں ایک وجدانی سنگ پیدا کر دے جو تفسیر کے لحاظ سے دیباہی ہو جو کچھ ہم نے غصے سے غور میں طے کیا تھا لیکن اس وقت ہم میں یہ کیفیت نہ پیدا ہوئی تھی جسے وجدانی حالت کہہ سکیں۔ اس حالت کے پیدا ہونے تک انتظار وہ ہمارا وہ ہو یا بے ارادہ حیثیت وجدان پیچ اور سلیم میں داخل ہے نہ کہ کوئی دار فرائض تفسیر جسے شعور سے کوئی بحث نہ ہو۔ حالانکہ یہ کیفیت بعض حیثیتوں سے نہ صرف تشکیں بلکہ اس سے ہلا تر ذرائع سے بھی جاسکتی ہے۔ ہم اس سے کافی بحث کر چکے کہ حضرتؑ کے لیے کوئی چارہ ہی نہ تھا یزید اس کے کہ جب ایک مقام غیر محفوظ ہو جاتا تو اسے

ایک فرض اور اس کے حیثیات

آئندہ کسی مقام کے تجربہ میں آنے تک ترک کرتے اور علیٰ ہذا القیاس اس حالت کے بین اور سب سے زیادہ واضح ہونے کے بعد بھی حضرتؑ کو کوئی امر اس سے مانع نہ تھا کہ وہ اپنے دیگر فرائض کو اس سلسلہ حالات کی موجودگی کے لحاظ سے ملتوی کر دیتے۔ بلکہ ان حالتوں میں حضرتؑ کا اپنے قبیلہ، ملک، روایات اور خدمات کے لحاظ سے اور خود انتہائی لطافت کا لحاظ کی وجہ سے سب سے پہلے شہم کی خبر شہادت سن کر بنی حقیقی سے صلاح لینا ان کے کمال ہوش، خلق، مروت اور اداانے فرض پر دلالت کرتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر حضرتؑ بنی حقیقی سے پوچھے بغیر کوئی تفسیر کرتے تو بنی حقیقی کو لحاظ اور ادب سے احتکات کی کوئی جرات نہ ہوتی۔ لیکن حسینؑ کی طبیعت شناسی کا یہ موقع کب پیدا ہوتا۔ اس کے علاوہ یہ بھی ہے کہ حضرتؑ بنی حقیقی سے پوچھتے یا نہ پوچھتے لیکن یزید اس تفسیر کے جو کیا گیا اور کوئی تفسیر ممکن نہ تھا پھر بھی اگر بنی حقیقی کا

استزاج نہ لیا جاتا تو اصول معاشرت کی یہ بہترین لطافت ظاہر نہ ہوتی۔ بے شک عربین زبید رہائی سے اور حضرت کاہن
 ہوئیں جس میں حضرت کی ایک تجویز یہ تھی کہ بعض موزین کے
 موافق: ”میں جانے دو جہاں ہمارا بی چاہے۔“ یا ”میں مکہ جانے

عر سے سوال مراجعت کے معنی

دو۔“ یا ”ہم جہاں سے آئے ہیں وہاں چلے جائیں۔“ لیکن عر سے قبول نہ کر سکا اور طے یہ ہوا کہ ”آپ ایسے راستہ سے
 چلیے جو نہ مجاز کی طرف لے جاتا ہو اور نہ کوفہ کی طرف۔“ حضرت کے اس سوال کا موقع یہ تھا کہ پہلے پہل آنحضرت کے کسی دوست
 سے ملاقات ہوتی تھی اور حضرت اس سے یہ سوال کر کے اس امر کی تصدیق کیا چاہتے تھے کہ حیثیت دشمن اس پر راضی ہیں یا
 نہیں کہ ہم ان کی نگرانی اور تصفیہ سے محفوظ رہ سکیں۔ لیکن عر کے انداز اور جواب سے یہ طے کر دیا کہ حضرت مکہ یا کہیں نہیں
 جاسکتے یعنی حضرت مکہ میں یا کہیں آزادی اور بے غمی سے بسر نہیں کر سکتے۔ بلکہ عر کو ابن زیاد کا بیڑا اس کے کوئی دوسرا حکم نہ
 تھا کہ: ”سین کو نہ چھوڑنا یہاں تک کہ میرے پاس لے آئے۔“ اب حضرت کے لیے پھر وہی سوال تھا کہ بیعت کر دو۔ یا
 گرفتار ہو۔ یا جنگ کر دو۔ حضرت یہ سوال پیش کر چکے کہ میں کہیں جانے دو اور اس سے غیر نزامی روش کا ثبوت دیا۔
 لیکن جب دیکھا کہ دشمن اس پر آمادہ نہیں
 عر کے عدم ارادۂ جنگ کو حضرت منظور کرتے ہیں

میں ہیں تو حضرت جنگ کے لیے تیار تھے لیکن عر تیار نہ ہوا۔ اور طے یہ ہوا کہ آپ ایسے راستہ سے چلیے جو نہ موصول بہ
 مجاز ہو اور نہ بہ کوفہ۔ حضرت اے منظور کر کے اس کا ثبوت دیا کہ ہم اس وقت تک جنگ کے لیے آمادہ نہیں ہیں جب
 تک بیڑہ نہ کیے جائیں اور ایسے گھر جائیں کہ نکل نہ سکیں۔ اور جب یہ سامنے تھا کہ ہم گھرنے جاتے ہیں تو حضرت پھر کوفہ
 ہی کے سامنے کیوں نہ گھرتے جہاں برائے نام ہی بھی لیکن امید تھی اور شہید ہونے کی صورت میں ابد اللہ تک کے لیے
 اہل کوفہ میں شرم اور غیرت پیدا کرنا تھا۔ ان کی دودھ غلٹی اور اپنی صلوٰۃ الہی کے علاوہ حمایت و جہ حق کا ثبوت دینا تھا۔
 بیشک حضرت نے ابن سعد سے دوران گفتگو میں یہ شرط بھی پیش کی کہ وہ
 ابن سعد سے گفتگو کے معنی
 واپس جانے دیے جائیں۔ ”واپس کے سوال“ کی نصیحت کے لحاظ سے

عر اور ابن سعد دونوں سے گفتگو کا آنا ایک حیثیت کا تھا۔ صرف درجہ کافرق تھا۔ بلکہ موقع کا منسرق بھی تھا۔ درجہ کافرق
 اس مفہوم میں کہ عربین زبید رہائی اگر تھا تو محض اپنے دستہ کا سپہ سالار تھا۔ اور اگرچہ عر کا منصب اس لحاظ سے کہ اس سے
 بظرا راست ابن زیاد خط و کتابت تھی کسی کے ماتحت نہ تھا لیکن تاہم عر کا موقع عمرو بن سعد کا ایسا نہیں ہو سکتا تھا جو نہ صرف
 کربلا کی تمام موجود افواج کوفہ و شام کا سپہ سالار تھا بلکہ اسے یہ موقع بھی حاصل تھا کہ وہ سعد بن ابی وقاص کا لڑکا تھا اور
 خود اکثر احادیث کا راوی بھی کہا گیا ہے۔ بلکہ اکثر نے تو اسے جہدین میں شمار کیا ہے۔ موقع کافرق یہ تھا کہ اگرچہ حضرت
 کے روک رکھنے اور گرفتار کرانے کے لیے ابن زیاد نے عر کو حکم دیا تھا لیکن اب تک اس نے عر کو جنگ کا کوئی
 مخصوص حکم نہ دیا تھا اور نہ حضرت کو اب تک اطلاعین تھا کہ یزید اور کشت و خون کے ہمارے دشمن کسی اور امر پر
 راضی نہیں ہیں۔ لیکن کربلا میں اب یہ موقع نہ رہا تھا بلکہ متواتر فوجوں کی آمد اور ابن سعد کے نام ایسے ہی سخت احکام لے
 کوئی شبہ نہ رکھا تھا کہ دشمن حضرت سے کیا چاہتے ہیں۔ عر کے انداز سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اسے یہ تک اجازت

نہ تھی کہ حضرت کی اس تجویز کو ابن زیاد تک پہنچا سکتے بر خلاف اس کے عمرو بن سعد اپنے موقع کو ایسا بگھٹاتا تھا کہ وہ اکثر امور کے متعلق سلسلہ مراسلات جاری کر سکتا۔

حضرت کا واپس ہونا ایک عہد ہوتا
 نظر برآں اگر حصر کے زمانہ ملاقات میں بنی شامی کے لیے ایسا سوال تھا تو ایسے موقع پر جب کہ ظہر بیعت یا جنگ کے علاوہ کوئی صورت نہ رہ گئی تھی اور اب حضرت کم سے کم اکیس ہزار اور پچاس ہزار دشمنوں کے سامنے تھے تو اس شرط پر حضرت کا واپس ہونا ایک عہد ہوتا جو حضرت ایک فریق اور نذیر کے وکیل دوسرے فریق میں ہوتا۔ یعنی اس عہد کے بعد از روئے عہد نامہ حضرت اپنے کو کہیں رہنے میں مختار سمجھتے اور حالت خوف جس میں وہ حضرت جٹا تھے بر طرف ہو جاتے اور اس کا لازمی نتیجہ یا اپنے محفوظ رہنے کے عوض میں حضرت کو اپنی طرف سے یہ عہد کرتے کہ وہ حکومت نذیر سے متعرض نہ ہوں گے متعرض ہونے کا خیال تو تنگ آمد ییگ آمد سے پیدا ہوتا ہے۔ جس میں حضرت کے لیے یزید بیعت کے کوئی صورت نہ رہی تھی۔

مصلحت کی یک رنگی
 اور جب بغیر بیعت کے جانے دیے جاتے تو حضرت پھر اپنی اسی فوٹل حالت پر عود کرتے جس میں سوال بیعت کے قبل تھے اور یہ سنت تھی ہے حضرت کے برابر معظم اور پدر بزرگوار نے منظور کیا تھا۔ اور ان کی ہم صر حکومتوں نے اس سے زیادہ ظاہری تشدد و خلاف مصلحت بگاڑا تھا۔ لیکن نذیر اپنے پیشروؤں کی مصلحت سے آگے بڑھا تھا اور اس لیے حسین کا موقع بھی اب وہ نہ تھا جو ان کے برابر مالی مستدار اور پدر بزرگوار کا تھا۔ اور حسین اپنے طرز عمل سے بھارے تھے کہ ہم خاموش رہیں گے مثل اپنے بزرگوں کے اگر ہمارے ساتھ بھی وہی مصلحت برتی جائے گی جو برتی جا چکی ہے۔ یعنی جس طرح انہوں نے بیعت کر کے حکومت کے افعال کا اپنے کو بیرو اور ذمہ دار بننا قبول نہیں کیا اسی طرح ہم نذیر کی بیعت کر کے اس کے افعال کو خلق اللہ کی نگاہ میں اپنی بیعت سے مستند نہیں کر سکتے ظاہر ہے کہ اسی آڑ کا رہنا بھی اگرچہ اس وقت روح اسلامی کی ترقی کا سبب نہیں ہو سکتا تھا لیکن تاہم لوگ ان کے ہم بیعت یا علیحدگی کی داغ بیل سے یہ سوچ سکتے تھے کہ آخر کسی خاص روش میں اہل بیت رسول کا کیا خیال ہے۔ اسلام کی حقیقی روح کی اسی مستدر اس وقت جاتا تھی لیکن حسین کا بیعت کر لینا اس روح کو فنا کر دینا تھا جسے علی اور حسن نے امتحان خیز وقتوں میں قائم رکھا تھا۔ فاطمہ نے حسین کو اس لیے دودھ نہیں پلایا تھا کہ حسین اس وقت روح اسلام کی شہ رگ کاٹ دیتے۔ رسول اللہ نے اس لیے زبان نہیں چوسائی تھی کہ حسین کے دہن اقدس سے نذیر کی بیعت کا اقرار نکلتا۔ جب حکومت نے اپنی مصلحت میں اپنے کو اس حد پر دیکھا کہ وہ بیعت کا آخری تشدد کر سکے جو اب تک نہیں ہوا تھا تو اسلام نے اپنی مشربان گاہ پر حسین کو کمال خستہ پیشانی اور لا پرواہی سے قربان ہونے کے لیے تیار ہایا۔



باب نہم

يَا أَيُّهَا النَّفْسُ الْمَطْمَئِنَّةُ ارْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً فَادْخُلِي فِي عِبْدِي وَأَدْخُلِي جَنَّاتِي (۸۹: ۲۷-۲۸)

(ملکہ سے پوچھتے)

عمر بن عبد الرحمن کی خیر خواہانہ نصیحت

اعظم کوئی کہتا ہے کہ عمر بن عبد الرحمن بن حارث بن ہشام خودی نے حاضر ہو کر کہا اے فرزند رسول میں آپ کو کچھ

نصیحت کرنا چاہتا ہوں اور محض آپ ہی کے فائدہ کے لیے ہے۔ تمام عمر میں ایک لمحہ کے واسطے بھی آپ کی بھلائی کے خیال سے طمعہ نہیں رہا ہوں نہ آپ سے کسی نصیحت کو چھپایا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ میری نصیحت سن لیں اور بالکل خیر خواہی پر محمول کریں۔ اگر آپ کی رائے میں بھی درست ہو تو اس پر عمل فرمائیں۔ امیر المومنین حسینؑ نے کہا: ”تو جس امر میں یہودی اور بھلائی جانتا ہے بیان کر۔“ عمر نے کہا: ”میں نے سنا ہے کہ آپ نے عراق تشریف لے جانے کا ارادہ کر لیا ہے۔ مجھے آپ کے اس ارادہ اور سفر سے اندیشہ ہے۔ کیونکہ:

جس شہر کا قصد ہے وہاں سب امیر اور بڑے مالدار ہیں۔ تمام آدمی مل و زور کے

دلدادہ ہو رہے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ حوام لوگ بھی روپیہ پیسہ کی تمنا میں امیروں کے

شریک مال ہو جائیں۔ اور آپ کے محافظ بن جائیں۔ آپ اپنی جان کا خیال فرمائیں۔ اس ہلاکت کے مجبور سے بچیں۔ اس حرمت والی جگہ پر اطمینان اور فراغت سے قیام رکھیں۔“

امیر المومنین نے فرمایا: ”نہایت ہی اچھی نصیحت ہے اور میں خوب

سمجھتا ہوں کہ محض ازراہ خیر خواہی و شفقت دلی تو نے یہ بات کہی ہے۔

اور اپنی کوئی غرض شامل نہیں کی ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے ایک حکم لگا دیا ہے اور میرے واسطے جو معذور کرنا خاص مقرر کر دیا ہے۔

میں تیری نصیحت مانوں یا نہ مانوں وہ حکم ٹل نہ سکے گا۔ موت ہر ایک برائی اور بھلائی کے ساتھ خلقت کی باگ ڈور اس طرح

بٹھائی رہی ہے کہ اس کے خلاف ہر ایک کوشش بے کار ہے۔“ عسمر سن کر چپ ہو رہا۔ اور واپس چلا گیا۔

کمال ابن اثیر کے موافق فرمایا کہ: ”تو نے نصیحت پوری کی اور یہی بات کہی۔“

اس کے بعد ابن عباس آئے۔ انھوں نے اہل کوفہ

کے گزشتہ حالات بیان کیے۔ ابن زیاد کی موجودگی اور

”تمام لوگوں کو زور و سیم دے کر اپنا طغیان برپا لینے“ کا تذکرہ کیا۔ اس کے جواب میں حضرت نے بعض کے موافق فرمایا:

”میں غور کروں گا۔“ یا ”میں اس سے استغاثہ کروں گا۔“ (اعظم کوئی، روضۃ انتفاہ کمال ابن اثیر، روضۃ الشہداء)

ابن عباس کو جواب اور بعض کے موافق مشہد آن کی کال بھیجی اور یہ آیت نظر پڑی کہ کُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ ۚ وَ إِنَّمَا تُوَفَّقُونَ أُجُورَكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ (۲: ۱۸۵) اس آیت کے ملاحظہ کے بعد حسینؑ نے فرمایا: ”صدق اللہ ورسولہ“ اور بعض کے موافق فرمایا کہ: ”جے عراق میں مارا جاتا کہ میں قتل ہونے سے زیادہ پسند ہے۔“

ابن عباس کی دوبارہ نصیحت اس کے بعد جو کچھ اور مؤرخین نے لکھا ہے اس کے لیے میں ابن خلدون کی عبارت درج کرتا ہوں کہ: ”پھر دوبارہ اگلے دن عبد اللہ بن عباس آئے۔ کھانے لگے: برادر من! مجھے بغیر نصیحت کیے ہوئے صبر نہیں آتا۔ مجھے خوف اس کا ہے کہ اس میں تم ہلاک ہو جاؤ گے۔ تمہارا خاندان تباہ و برباد ہو جانے کا اہل عراق بڑے بے وقار و عہد شکن، مکار ہیں۔ تم ان کے قریب نہ جاؤ۔ اسی شہر میں قیام کرو۔ تم ان کے سردار ہو اور اگر اہل عراق اپنے دعوے میں سچے ہیں تو ان کو لکھ بھجیو کہ تم اپنے گورنر کو نکال دو۔ بعد اس کے تم ان کے شہر میں جاؤ اور اگر تمہارا جی مکہ سے بغیر نکلے ہوئے نہیں ملتا ہے یمن کی طرف چلے جاؤ۔ وہ بہت وسیع سرزمین ہے۔ پہاڑی گھاٹیاں بکثرت ہیں۔ قدرتی محفوظ قلعہ ہیں۔ وہاں سے تم اپنے دعات کو اطراف و جوانب میں بھجواؤ لوگوں سے بیعت لو۔“

دوبارہ حضرت کا جواب آپؑ نے جواب دیا ”میں تو معصم قہد کر چکا۔ اب کسی طرح نہیں رک سکتا۔“ عبد اللہ بن عباس بولے: ”خیر اگر جالتے ہی ہو تو اپنے لڑکوں، عورتوں کو نہ لے جاؤ۔ مجھے اندیشہ ہے کہ دشمن کی طرح تم شہید نہ کیے جاؤ اور تمہارے لڑکے اور عورتیں دھکتی رہیں۔“ آپؑ نے اس کا کچھ جواب نہ دیا۔ بقول روضۃ الصفا فرمایا: ”میری رائے ہے کہ میرے اہل و عیال اس سفر میں میرے ساتھ رہیں۔“ یا جیسا بقول روضۃ الشہد فرمایا: ”ایشان را کجا بگذارم و بکہ سپارم اولی آنکہ با من باشند۔“ یعنی: ”آخر میں کس کے سپرد کروں اور کہاں؟ بہتر ہے کہ میرے ساتھ ہوں۔“

ابن زبیر اور حسینؑ بقول کمال ابن اثیر: اس کے بعد ابن زبیر آئے اور جو مخصوص گفتگو تھی وہ یہ تھی کہ: ”آپؑ مکہ میں اقامت کیجیے اور ہمیں اپنے امر کا دلی کر دیجیے۔“ اور حضرتؑ نے کہا کہ: ”نہیں یہ بھی نہیں چاہتا۔“ اس کے بعد کچھ ”پوشیدہ“ بات ہوئی۔

ابن زبیر وعدہ مدت کرتے ہیں حضرتؑ نے لوگوں سے فرمایا کہ: ”تم لوگ جالتے ہو کہ ابن زبیر نے ہم سے کیا کہا؟“ اور جب لوگوں نے اپنی لاعلمی ظاہر کی تو فرمایا کہ: ابن زبیر کہتا تھا کہ: ”آپؑ اسی مسجد میں اقامت کریں اور ہم لوگوں کو آپؑ کے لیے جمع کریں۔ بخدا اگر میں قتل کیا جاؤں مکہ سے ایک ہاشمت باہر تو یہ میرے لیے اس سے بہتر ہے کہ میں مکہ میں قتل کیا جاؤں۔ اور اگر میں قتل ہوں دو ہاشمت باہر تو زیادہ بہتر ہے اس سے کہ میں ایک ہاشمت پر قتل کیا جاؤں۔ اگر میں سورما میں جو تو یہ لوگ بے کمال لیں گے۔ اپنا مطلب پورا کریں گے اور فخر پر زیادتی کریں گے۔“

حضرت عبداللہ بن جعفر کا خط

نور اسلام

خط کا جواب

عمر بن سعید کاظم

زبد کے اشعار

زید نے لکھے ہیں۔ ان کے جواب میں کلام الہی کی یہ آیت تحریر فرمادی: بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝ وَاِنْ كَذَّبْتُمْ فَقُلْ لِيْ عَمَلٌ وَلَكُمْ عَمَلُكُمْ اَنْتُمْ بَرِيْئُونَ مِمَّا اَعْمَلُ وَاَنَا بَرِيْءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝ (۱۰: ۴۱)

اس کے بعد بقول نور العین ترجمہ خاصائص الحسین اور لہوت، جو میں آخر الذکر سے نقل کرتا ہوں کہ: حضرت امام حسینؑ نے

روانگی کے وقت حضرت کا خطبہ

جب ارادہ سفر کیا تو آپؑ کھڑے ہوئے اور یہ خطبہ ارشاد فرمایا:

”الحمد لله وما شاء الله ولا قوة الا بالله و صلى الله على رسوله۔ آگاہ ہو کہ جس طرح گلوبند ہر وقت جوان عورت کے گلے میں رہتا ہے اسی طرح موت انسان کے ساتھ ہر وقت ہے۔ مجھے کس قدر مشقوں و مشاق کر دیا ہے میرے اسلاف کی طرف اس اشتیاق نے جو مثل اس کے ہے جو یعقوب کو یوسف کی طرف تھا۔ اور میرا جو مقتل مقرر ہوا ہے اس طرف میں جاتا ہوں۔ گویا میں دیچ رہا ہوں کہ اس جنگ کے بیڑے میرے بدن کو کھڑے کھڑے کر رہے ہیں جو درمیان نواہیں دکر بلا کے ہے۔ وہ مجھ سے اپنے خالی معدوں کو بھر رہے ہیں اور اس دن سے گریز نہیں ہے جو لکھا گیا ہے۔ رضائے خدایم اہل بیت کی رضا ہے۔ ہم اس کی بلاؤں پر صبر کرتے ہیں جس کا وہ پورا پورا اجر دے گا۔ صابروں کا اجر دے گا۔ رسول خدا کے گوشت کا ٹکڑا ان سے جدا نہ ہوگا۔ وہ سب کا سب حظیرہ قدس میں جمع ہوگا۔ اس کی وجہ سے چشم رسول خدا روشن ہوگی۔ اور اس کے سبب سے اللہ اپنے وعدہ کو پورا کرے گا۔ جو ہمارے لیے جان شاری کرنا چاہے اور لائے خدا کا تعین رکھتا ہو وہ ہمارے ساتھ پہلے خدا نے چاہا تو میں مع کوچ کروں گا۔“

ابن عمر بوسہ گاہ رسول کو بوسہ دیتے ہیں

اسی زمانہ کے متعلق صاحب خاصائص حسین کہتے ہیں کہ ”عرض کی عبداللہ بن عمر نے کہ یا ابن رسول اللہ کھول دیجئے اس موضع مظہر کو جس مقام پر رسول خدا بوسہ دیتے تھے۔ پس سینہ مبارک کو کھول دیا اور عبداللہ بن عمر نے بوسہ دیا اس مقام مظہر کا اور روئے لگا اور رخصت کیا۔“

ابن عمر بوسہ گاہ رسول کو بوسہ دیتے ہیں

ابن عمر بوسہ گاہ رسول کو بوسہ دیتے ہیں

ابن عمر بوسہ گاہ رسول کو بوسہ دیتے ہیں

ان کے ہمراہوں کو روداگی کوہ سے روکا۔ بحث و تکرار ہوئی۔ آپس میں خیفیت کی مار پیٹ بھی ہو گئی۔ لیکن آپ اور آپ کے ہمراہی نہ رکے۔

سرمہنگ کو بلالیا گیا بقول روضۃ المتقا: عمر بن سعید کے سرمہنگ کے روکنے سے جب صورت معاملہ اس کے قریب پہنچی کہ لڑائی ہو جائے اور یہ حال ابن سعید کو معلوم ہوا تو اس نے اپنے سرمہنگ کو واپس بلالیا۔

کوچ کا وقت اور حضرت محمد ابن حنفیہ صاحب خاص الحسین اور لہوف کے نوٹ میں ہے کہ جس صبح کو حضرت نے کوچ کیا اس کے قبل

شام کو حضرت محمد ابن حنفیہ نے بجھایا تھا اور حضرت نے غور کا وعدہ فرمایا تھا۔ اور جب صبح کو حضرت نے کوچ کیا یہ خبر محمد حنفیہ کو پہنچی وہ فوراً آئے اور اس ناکہ کی مہار پکڑ لی جس پر امام حسینؑ سوار تھے اور کہا: ”اے بھائی! آپ نے میرے کہنے پر غور نہ کیا۔“

حضرت نے فرمایا: ”میں نے خوب غور کر لیا۔“

تب انہوں نے کہا کہ: ”آپ کے جلدی کوچ کرنے کی سبب ہے۔“

حضرت نے فرمایا کہ: ”تمہارے جانے کے بعد رسول خدا خواب میں میرے پاس آئے اور فرمایا کہ اے حسین کوچ کرو۔ کیونکہ خدا نے چاہا ہے کہ تمہیں مقتول دیجئے۔“

تب ابن حنفیہ نے کہا: ”انا لله وانا الیہ راجعون۔“

پھر بچھا کہ: ”آپ اہل بیت کو کیوں ساتھ لیے جاتے ہیں۔“

حضرت نے فرمایا کہ: ”خجور سے جناب رسول خدا نے یہ بھی فرمایا ہے کہ اللہ نے چاہا ہے کہ ان کو مختار دیجئے۔“

جغرافیائی دشواری اب میں اپنی تاریخ میں ایسی جگہ پہنچا ہوں جس کے سلسلہ مقامات کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ایک مؤرخ کسی مقام کا نام پہلے لیتا ہے دوسرا اس کے خلاف اس سے

آخر میں ذکر کرتا ہے۔ نہ میں ان کے جغرافیائی مقامات کی صحت کی ذمہ داری کر سکتا ہوں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ موجودہ ذرائع سے یہ بھی تصدیق نہیں کر سکتا کہ حضرت امام حسینؑ علیہ السلام مکہ سے مدینہ ہو کر کوہ ثعلبہ لے گئے یا مکہ سے سیدھے کوہ ثعلبہ لے گئے۔ مثلاً ابوالحسن اسفہانی کہتے ہیں کہ حضرت کو ابن زیاد کا قاصد قریب مدینہ ملا۔ اور دیگر مؤرخین پر منزلوں کا نام لینے کے یہ تک نہیں جانتے کہ حیدرہ وہیں کہاں۔ حاجی اور زائرین سے بھی اس کا پتا نہیں مل سکا۔ اس لیے کہ وہ لوگ زیادہ تر چہار کی راہ سے جاتے ہیں۔ اتفاق سے مجھے اسید بنہ الدین الشہرستانی صاحب معجۃ العلم فی النجف بالہراق سے گفتگو کا موقع ملا۔ اور میں نے اپنے اس نقشہ کے موقع کو ضائع نہیں کیا۔ ان سے مجھے اس قدر معلوم ہوا کہ حضرت مکہ سے نجر تک غیر معروف راہ سے گئے۔ اور اس کے بعد معروف راستہ سے کوہ پہنچے۔

نقشہ جو دلائلی کارخانوں کے میرے سامنے ہیں ان سے بھی کوئی مطلب نہیں نکلتا۔ اس لیے کہ کسی منزل کا نام ان میں نہیں پایا جاتا۔ جس سے میں سمت روداگی دریافت کر سکتا۔ غالباً میرے بعد کا مؤرخ ایسا خوش نصیب ہوئے عرب حجاز

اور عراق کے نقشے اور گزشتہ جلد سکینہ بہر حال میں مناسب لکھتا ہوں کہ بعض تواریخ سے سلسلہ منازل کو لکھ دوں جس حیثیت سے وہ پائے جاتے ہیں :

مقامات

کمال ابن اثیر	ابن خلدون	اعظم کوفی	روضة الشهداء	بشار	روضة الصفا
نعمیم	نعمیم	عراق کا دیہات	صفاح	ذات عرق	ذات عرق
صفاح	صفاح	خرمییہ	طلحہ رومہ	طلحیہ	صفاح
حاجز	حاجز	طلحیہ	ذات عرق	حاجز	طلحہ رومہ
گلون	طلحیہ	سقوق	زرد	تالاب	زرد
طلحیہ	طلحہ عقبہ	قصرنی مقاتل	سقوق	خرمییہ	زبالہ
زبالہ	شراف	عذیب الجبلات	دریا	زرد	قصرنی مقاتل
طلحہ عقبہ	ذو خشم		قصرنی مقاتل	طلحیہ	حقیق
ذو خشم	عذیب		طلحیہ	زبالہ	سرا
عذیب الجبلات	قصرنی مقاتل		قلقطانیہ	منزل رباد	کر بلا
قصرنی مقاتل	نینوی		کر بلا	ذو خشم	
				عذیب الجبلات	
				قصرنی مقاتل	
				نینوی	

ان ناموں سے حسب ذیل ہائیں نام لکھتے ہیں اور نویں ذوالحجہ سے دوسری محرم تک ہائیں منتریں ہونی چاہئیں۔ ● ذات عراق ● نعمیم ● صفاح ● حاجز ● گلون ● تالاب ● خرمییہ ● طلحہ رومہ ● زرد ● طلحیہ ● زبالہ ● منزل ایاد ● سقوق ● طلحہ عقبہ ● شراف ● ذو خشم ● عذیب الجبلات ● قصرنی مقاتل ● حقیق ● قلقطانیہ ● نینوی ● کر بلا (مؤلف سلسلہ مقامات کا ذمہ دار نہیں ہے)

خیمے برپا کرنے کے وقت ایک مرتبہ سب کو دیکھتے تھے صاحب نورا العین ترجمہ خصائص الحسینؑ لکھتے ہیں کہ درود کر بلا کے قبل تک ”جب خیموں کو نصب کرتے تھے تمام اولاد و برادران و اہل بیٹ کو جمع فرماتے تھے اور ایک قلم سب کو ملاحظہ فرماتے تھے۔“

اس کے بعد جوں ابن خلدون: ”رفعتہ رفعتہ منزل تنعیم میں پہنچے۔ یہاں پر ایک قافلہ
مین کا ایک قافلہ سے ملاقات ہوئی۔ مین سے آ رہا تھاجس کو عمیر بن ایسان دہلی میں نے زید کی طرف

اسباب قیمتی قیمتی ہارچہ جات و زیورات لے کر روانہ کیا تھا۔ آپ نے اس کو گرفتار کر کے اہل قافلہ سے ارشاد کیا کہ
وہ شخص ہمارے ساتھ عراق چلا چاہتا ہو ہم اس کو بچال خوشی اپنے ساتھ رکھیں گے اور اس میں سے اس کو حصہ دیں گے اور جو
شخص ہم سے علیحدہ ہونا پسند کرتا ہو وہ اپنا اس میں سے حصہ لے کر علیحدہ ہو جائے۔ چنانچہ جن لوگوں نے علیحدگی پسند کی ان کو
مٹی قدر مراتب حصہ دے کر رخصت کر دیا۔ اور جنہوں نے ہمراہی منظور کی ان کو بھی حصہ دے کر ہمراہ لے کر آگے بڑھے۔

صاحب لہوت فرماتے ہیں: ”منزل تنعیم میں پہنچے۔ حضرت نے دیکھا کہ ایک قافلہ عمیر بن ریان حمیری عامل مین کی
طرف سے کچھ چیزیں زید کے لیے ہدیہ لیے جاتا ہے۔ حضرت نے وہ ہدیہ خود لے لیا کہ امور مسلمین کے آپ حاکم تھے۔ آپ
نے ساربانوں سے فرمایا کہ جو کوئی ہمارے ساتھ عراق چلنا پسند کرے ہم اس کو پورا کرایہ دیں گے اور اس سے اچھا برتاؤ
کریں گے اور جو نہ جانا چاہے اس کو ہم یہاں تک کا کرایہ دیدیں۔“

حصین بن نمیر کا لشکر ابن خلدون عبد اللہ بن جعفر کے خط کے تذکرے کے بعد لکھتا ہے: ابن زیاد کو آپ
کی روانگی کا حال معلوم ہوا تو اس نے جلوگیری کے خیال سے حصین بن نمیر قحطیہ افراتلی
پولیس کو روانہ کیا۔ اس نے مقام قادسیہ میں پہنچ کر ڈیرے ڈال دیے۔ اور سواروں کو قادسیہ سے خان تک ایک جانب
اور دوسرے جانب قادسیہ سے قطیفانہ و کوہ طلع تک پھیل دیا۔“

مکہ میں ابن زیاد کا جاسوس صاحب روضۃ الشہداء کہتا ہے کہ: ”ابن زیاد جاسوسے بمکہ فرستادہ ہوا کہ
چوں امام حسین بیرون آید و متوجہ کوفہ شود مرا خبر کن دریں وقت کہ

جاسوسے در رسیدہ خبر رسانید کہ شانزدہ روز است کہ امام حسین از مکہ بیرون آمدہ و امروز در قبیلہ بنی سکون است۔“

حضرت ذات عراق میں پہنچے تھے کہ ”بشیر بن غالب سے ملاقات ہوئی جو عراق سے
آ رہا تھا۔ آپ نے اس سے عراق والوں کا حال پوچھا۔ اس نے کہا کہ: ”ان کے

دل آپ کے ساتھ ہیں مگر تلواریں بنی امیہ کے ساتھ ہیں۔“ حضرت نے فرمایا کہ بنی اسد کا بھائی کا کہتا ہے۔ (لہوت)

غلام اعظم کئی اسی شخص سے سوال کرتا ہے کہ: اے فرزند رسول اس آیت

حضرت شریح فرماتے ہیں کے کیا معنی ہیں؟: یَوْمَ نَذَعُوْا عَنْکَ اَنْفُسَکَ اِیْمَا مَیْمَنَہ (۱۷: ۱۷)

آپ نے فرمایا: ”امام دو ہیں۔ ایک سیدھی راہ کی ہدایت کرتا ہے، دوسرا گمراہی کی طرف لے جاتا ہے۔ اور جو گمراہ

اس (گمراہی کے امام) کی پیروی کرتا ہے وہ دوزخی ہے۔“

مفلح تک پہنچے ہوں گے کہ فرزدق شاعر سے ملاقات ہوئی۔ آپ نے اس سے دریافت کیا:

فرزدق شاعر تمہارے پیچھے (یعنی کوفہ والے) جو لوگ ہیں ان کا کیا حال ہے۔ عرض کیا: واللہ آپ نے

واقف کار ہی شخص سے استخسار منسلما ہے۔ اچھا میں عرض کرتا ہوں۔ سنئے: ”لوگوں کے قلوب آپ کے ساتھ

ہیں، اور ان کی تلواریں بنی امیہ کے ساتھ۔ قفس آسمان سے اتر رہی ہے اور اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔“

آپؐ نے فرمایا: ”تو حق کہتا ہے اللہ تعالیٰ ہی کل امور کا مالک ہے وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ اگر حکم الہی ہماری مرضی کے موافق ملے گا تو ہم اس کی نعمتوں کا شکریہ ادا کریں گے، مگر اگر وہ ادا نہ کرے تو ہم صبر کریں گے۔“

کمال ابن اثیر کے موافق فرمایا: ”اگر قتل الہی ہمارے موافق ہوئی تو ہم شکر کریں گے اور اگر ہماری امید میں مائل ہوئی تو اس کے لیے کوئی غرابی نہیں ہے جس کی نیت حق اور قوی اس کا شعلہ ہو۔“

فرزدق کے قول کی شرح

صاحب روضۃ الشہداء نے سنہ رزق کا قول مع شرح کے لکھا ہے کہ:

”اہل کوفہ کا دل آپؐ کے ساتھ ہے اس لیے کہ آپؐ راہ حق پر ہیں اور

نکواریابی امیہ کے ساتھ ہیں، اس لیے کہ مال دنیا ان کے پاس ہے۔“

حضرت کے اشعار

صاحب لہوت اور خصاص الخسین کے موافق حضرتؑ نے اس وقت یہ اشعار انشائیے:

فان ثواب الله اعلى و انبل	فان تكن الدنيا تعد نفيسه
فقله حرص المرو في السقي اجل	و ان كانت الازواق قسما مقدرا
فا بال متروك به المرو يبعث	و ان تكن الاموال للترك جمعاً
فقتل بالسيف في الله افضل	و ان تكن الابدان للموت انشاءت

(اگر دنیا ابھی بھی جائے تو حقیقت میں ثواب اللہ کا اعلیٰ اور اشرف ہے۔ اور اگر روزی انسان کی تقدیر کے موافق ہے تو رزق کی سب سے کم حرص کرنا بہتر ہے۔ اور اگر مال دنیا سب کا سب چھوڑ جانے کے لیے ہے تو کیا حال ہوگا اس متروکہ کا جس کے ساتھ ایسا اجل ہوتا ہے اور اگر جسم موت کے لیے بنائے گئے ہیں تو نکواریابی سے راہ خدا میں مارا جانا افضل ہے)

مسلم کی خبر سن کر حضرتؑ کا ارشاد

انہیں مؤرخین کے موافق حضرتؑ نے مسلم بن عقیل کی خبر سن کر فرمایا: ”فمنهم من قضی نجبہ و منهم من ينتظر“

جو ان پر ہونے والا عہدہ گزر چکا اور اب ہم پر جہاں ہے وہ بھی ضرور ہوگا۔ اہم کوئی کے موافق مسلمؑ کو دھانیں دینے کے بعد یہ بھی فرمایا کہ: ”اس کا جو فرض تھا اس نے پورا کر دیا۔ ذرا کچی نہیں کی۔“

حضرتؑ مسلم کی خبر سن کر اکثر سہرا ہی چلے گئے

صاحب لہوت کے موافق ”منزل زہامہ میں حضرتؑ مسلم کی خبر شہادت حضرتؑ کو معلوم ہوئی

اور جب آپؐ نے اصحاب کو مطلع کیا تو ”گلاچ“ اور طبع والے چل دیے مرنے لگے اور چنے ہوئے اصحاب اور اہل بیت آپؐ کے ساتھ رہ گئے۔“ صاحب روضۃ العفا کے موافق یہ خبر حضرتؑ کو منزل زرد سے روانگی کے بعد ملے اور خبر دہندہ نے کہا کہ: ”ہم جس وقت کوفہ میں تھے کہ مسلمؑ اور ہانی قتل کیے گئے اور میں نے دیکھا کہ لڑکے ان کے ہاتھ پیر کے پیچھے پھرتے ہیں۔“ کمال اور ابن خلدون کے موافق یہ خبر منزل ثعلبیہ میں ملے۔

خبر شہادت اور صلاحیں
آخر اللہ کر مؤرخ کہتا ہے: بعضوں کی رائے ہوئی کہ آپؐ یہیں سے واپس چلے کوفہ میں آپؐ کا کوئی یار و یاور نہیں ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ لوگ بیانے آپؐ کی ضرورت کرنے کے آپؐ کے محفل نہ بن جائیں۔ بنو عقیل بولے واللہ ہم سرزمین کوفہ کو اس وقت تک نہ چھوڑیں گے جب تک مسلم کے خون کا بدلہ نہ لے لیں گے۔ یا جیسا کہ مسلم نے ذائقہ موت چکھا ہے ہم بھی نہ چکھ لیں گے۔ حسین بن علیؑ نے ارشاد کیا تم لوگوں کے بعد ہر زندگی کا کیا طعم ہوگا۔

بنو عقیل کی حالت
ہمراہیوں میں سے چند لوگ کہنے لگے واللہ آپؐ مسلم بن عقیل جیسے نہیں ہیں جو ہی آپؐ کو تنہا میں پیچیں گے سب لوگ آپؐ کے پیچ ہو جائیں گے۔ تاریخ کامل ابن اثیر کے موافق: واپسی کی صلاح اور ہلپ کی خبر شہادت سن کر بنو عقیل ”اچھل پڑے۔“

نتیمہ مسلم اور حسین
صاحب روضۃ الشہداء کے موافق منزل شقوق میں حضرتؑ تنہا ایک جگہ تشریف فرما تھا کہ کوفہ سے ایک شخص آتا ہوا دکھائی دیا۔ اور اس سے مسلم کی خبر معلوم ہوئی۔ ابھی تک کوئی مطلع نہیں ہوا تھا کہ حضرتؑ مسلم کی ایک لڑکی جو حضرتؑ کے ہمراہ تھی اور جو ہر منزل میں حضرتؑ کے پاس حاضر ہوا کرتی تھی حسب معمول قریب آئندہ حضرتؑ نے آج معمول سے زیادہ فوازش فرمائی۔ غور سے اسے دیکھتے تھے اور سر پر ہاتھ پیرتے تھے۔ لڑکی کی فراست نے آج کی غیر معمولی عنایت سے اثر کیا اور پوچھا کہ آج آپؑ مجھ پر ایسی عنایت کر رہے ہیں جو تیسویں پر کی جاتی ہے۔ اب حسینؑ بھی مضطرب کر سکے اور فرمایا بیٹی تم رنج نہ کرو میں تمہارا ہلپ ہوں۔ میری بہن زینب تمہاری ماں ہیں۔ میری لڑکیاں تمہاری بہنیں ہیں اور میرے لڑکے تمہارے بھائی ہیں۔ لڑکی کے رونے سے پیران مسلم کو خبر ہوئی اور عالم گریہ و زاری نے سب کو مطلع کر دیا۔

حضرتؑ کے قاصد کی گرفتاری اور شہادت
روضۃ الشہداء اور روضۃ التفقا کے موافق حضرتؑ نے بطن الرمد سے اور لہوت و ابن خلدون کے

موافق ماجز سے ایک خط اہل کوفہ کو (جس میں اپنی تشریف آوری کا حال لکھا تھا اور ان لوگوں کو مستعد و تیار کیا تھا) قیس بن مصبر صیداوی کے معرفت روانہ کیا۔ قیس جو ہی قادسیہ پہنچے حسین بن نمیر نے گرفتار کر کے ابن زیاد کے پاس کوفہ بھجایا۔ ابن زیاد نے قیس سے کہا کہ تم قہر لمارت پر چڑھ کر۔ حسین بن علیؑ کو گالیاں دو، تمہاری جان بخشی کی جانے گی۔ پس قیس قہر پر گئے۔ حدیث کے بعد کہا: ”اے لوگو! حسینؑ بہترین خلائق فاطمہ بنت رسول اللہ ﷺ کے لڑکے ہیں اور میں ان کا قاصد ہوں وہ اب ماجز سے شلیڈ آگے بڑھ آئے ہوں گے۔ تم ان کی اطاعت کرو۔“ یہ کہہ کر ابن زیاد پر لعن کیا اور زیاد کو سخت دست کہہ کر علی بن ابی طالب کے لیے دھانے مغفرت کہ ابن زیاد نے جھاکر حکم دیدیا کہ اس کو قہر سے بچنے گرا دو۔ گرتے ہی قیس کے ہاتھ پاؤں ٹوٹ گئے۔ دماغ پھٹ گیا۔ انتقال کر گئے۔

صاحب لہوت کے موافق قیس جب قادسیہ پہنچے اور شہر میں داخل ہونا چاہا تو حسین ابن نمیر رفیق بن زیاد نے ان کو راستہ ہی میں روک لیا اور تلاش لینی چاہی۔ تب قیس نے خط نکال کر چلا ڈالا۔ حسین ان کو ابن زیاد کے پاس لے گیا۔ جب وہ اس کے پاس کھڑے کیے گئے تو اس نے قیس سے پوچھا تو کون ہے۔ انھوں نے کہا: میں علی بن ابی طالب اور ان کے فرزند کا

دوست اور شیعہ ہوں۔ اس نے پوچھا تم نے خط کیوں چلاڑا۔ انھوں نے جواب دیا: تاکہ اس کا مضمون ظاہر نہ ہو۔ اس نے پوچھا کہ خط کس کا اور کس کے نام تھا۔ انھوں نے جواب دیا کہ امام حسینؑ کا تھا اور سردار ان کوذ کے نام تھا۔ جن کے نام مجھے معلوم نہیں ہیں۔ اس پر ابن زیاد آگ بھگیا اور تم کھا کر کہا کہ جب تک تو مجھے ان لوگوں کے نام نہ بتائے گا تجھ کو ہرگز نہ چھوڑوں گا۔ جب تک میسر پر جا کر حسینؑ بن علیؑ اور ان کے باپ بھائی پر تبرانہ کرے گا۔

اعظم کوئی کے موافق جس وقت قیس کی خبر سن کر حضرت متاسف تھے اور انا للہ وانا الیہ راجعون فہا رہے تھے آپ کے اصحاب میں سے ایک شخص ہال بن نافع نے عرض کی کہ یا ابن رسول اللہ! تمہارے تانا مہ مصطفیٰ تمام لوگوں کو اپنا دوست نہ بنا سکے۔ بعض آدمی ہمیشہ آپ کے دوست تھے اور کچھ منافق تھے۔ ظاہر میں زبانوں سے دوستی کا دعویٰ کیا کرتے تھے اور کچھ لوگ اپنے دلوں میں صداقت کو پوشیدہ رکھتے تھے۔ یہی آپ کے والد علیؑ مرتضیٰ کی کیفیت تھی۔ کچھ آدمی آپ کے ہوا خواہ اور اور دوست تھے، فرمانبردار اور اعانت سے پیش آتے تھے اور بعض زبانی دعویٰ کیا کرتے تھے۔ اب جو شخص اپنے عہد کو توڑ ڈالے اور آپ کے خلاف ہو جائے وہ اس کا بدلہ دیجی ہی لے گا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو ان سے بے پردہ کر دے۔ آپ مشرق و مغرب جس طرف جانا چاہیں گے ہم خدمت گزاری کے لیے موجود ہیں۔ ہرگز آپ سے جدا نہ ہوں گے اور حکم الہی پر راضی رہیں گے۔ ہمارا دوست وہی شخص ہو گا جو آپ کو عزیز سمجھے گا۔ اور جو شخص آپ کو دشمن کہے گا وہ ہمارا بھی دشمن ہو گا۔ حضورؐ نے اسے دھلے خیر دی۔

تاریخ کامل کے موافق ایسی ہی صورت عبد اللہ بن قحط کے لیے ہوئی۔ قہر سے گرنے کے بعد ان میں کچھ جان بھائی تھی کہ کسی دوسرے شخص نے ذبح کر ڈالا۔ اور لوگوں نے یہ کچھ کہہ دیا کہ ”راحت دیدی“۔

خاصہ انھیں کے موافق عبد الملک بن عمر نے ذبح کیا۔ لوگوں نے ملامت کی تو اس نے جواب دیا کہ میں نے چاہا کہ راحت دے دوں۔ اسی مورخ کے موافق حضرت نے لوگوں کو اس خبر سے مطلع کر دیا اور جس قدر اعراب تھے وہ چلے گئے صرف وہ لوگ ہمراہ رہ گئے جو مکہ سے ہمراہ ہوئے تھے۔ یہ خبر ذہالہ میں ملی تھی۔

کوذ کا خط جو قیس بن مہر کی معرفت روانہ کیا گیا تھا وہ سلیمان بن مرہ، شیب بن خبہ اور عبد اللہ بن دال رحمہم بن شداد اور جماعت مؤمنین کے نام تھا۔ مضمون خط میں نور العین ترجمہ خاصہ انھیں سے نقل کرتا ہوں۔

اہل کوفہ کے نام خط کا مضمون

جانتے ہو تم کہ جناب رسول خداؐ نے فرمایا ہے کہ جو شخص دیکھے بادشاہ جو کہ حلال خدا کو حرام اور حرام کو حلال کرتا ہو اور عہد خدا کو شکستہ کرتا ہو اور مخالفت کرتا ہو سنت کی اور بندگان الہی سے بہ ظلم و عدوان پیش آتا ہو پس جو لوگ ایسے ظالم بادشاہوں سے رشتہ ہیں اور ان کے افعال و اقوال میں انکار نہ کریں تو حق تعالیٰ ان لوگوں کو اس کے شریک کرے گا اس کے افعال میں اور تم لوگ خوب جانتے ہو کہ اس جماعت یعنی بنی امیہ نے روگردانی کی اطاعت خدا سے اور عہدات شیطان اختیار کی ہے اور بالا اعلان فلا کی ملک خدا میں اور بے کار کر دیا خود خدا کو اور مسلمان کامل اپنے واسطے مخصوص کیا اور احکام الہی کو حلال و حرام سے منتخیز کر دیا۔ بہ تحقیق کہ میں زیادہ سزاوار خلافت ہوں تمام خلق سے بہ سبب اس قربت کے جو کہ پیغمبر خدا سے رکھتا ہوں۔ خطوط اور قاصد تمہاری جانب سے میرے پاس آئے تھے۔ اس مضمون کے کہ ہم نے

بیعت کی آپ کی اس امر پر کہ آپ کو نہ چھوڑیں گے اور آپ کی نصرت کریں گے۔ پس اگر اپنی بیعت اور قول پر وفا کرو تو البتہ رشد و ہدایت سے فائدہ ہو گے اور مال تمہارا اور تمہارے عیال کا محل مال میرے اور میرے عیال کے ہو گا اور اگر اقرار پر اپنے نجات نہ رہو گے اور بیعت شکنی کرو گے تب بھی تم سے بعید نہیں ہے کیونکہ میرے پدر بزرگوار اور برادر مال و قار اور پیرم مسلم سے بھی پی کیا تم نے۔ اور مغرور وہ شخص ہے کہ تم پر مغرور ہونے اور اگر ایسا ہی کرو گے اجر اپنا ضائع کیا تم نے اور راہ حق و صواب سے منحرف پھیر لیا تم نے اور اپنا قصاص و ضرر کسیا تم نے اور خدا تم سے بے نیاز ہے۔ والسلام

ابن خلدون کے موافق قریب قریب متذکرہ صدر خط کے الفاظ میں حضرت نے لشکر حر کے سامنے خطبہ دیا۔
اعظم کوئی، روضۃ الشہداء اور لہوت کے موافق حضرت
جب منزل ثعلبیہ میں حضرت خواب دیکھتے ہیں

دیر کے بعد نیم خوابی کے علم سے بے چین اٹھے حضرت کی بے تسداری اور حزن سے اہل بیت متاثر ہوئے۔
حضرت علی اکبر قریب تھے۔ پوچھا: بابا آپ کی بے چینی کی کیا وجہ ہے۔ آپ نے بعض کے نزدیک فرمایا کہ:
میں نے ”ہاتھ“ کو بعض کے نزدیک ایک ”سوار“ کو یہ کہتے سنا کہ: ”اے حسین تم عراق کی طرف جانے کی جلدی کر رہے ہو اور موت تمہارے تعاقب میں جلدی کر رہی ہے کہ بہشت میں نہ جانے۔ اس سے مجھے معلوم ہو گیا کہ موت قریب ہے۔“ حضرت علی اکبر نے پوچھا کہ: ”اے بابا کیا ہم حق پر نہیں ہیں؟“ حضرت نے فرمایا: ”بے شک ہم حق پر ہیں۔ اور حق ہمارے ساتھ ہے۔“ حسین کے فرزند نے کہا کہ: ”اگر ہم حق پر ہیں تو موت سے کیا ڈرتا۔“ (اعظم کوئی) بقول روضۃ الشہداء کہا: ”تو پھر کوئی پرواہ نہیں ہے کہ ہم موت کی طرف جائیں یا موت ہماری طرف آئے۔“ قبول اعظم کوئی یہ سن کر حضرت نے فرمایا: ”اے فرزند تو نے دل خوش کر دیا۔ اللہ تعالیٰ تجھے جزائے خیر عطا کرے۔“ قبول لہوت فرمایا: ”اے فرزند خدا تجھے وہ بہترین جزا دے جو باپ کی طرف سے فرزند کو دی جاتی ہے۔“

کوفہ سے آتا ہوا ایک آدمی
اسی منزل کے متعلق صاحب خاصہ انجمن روایت نقل کرتے ہیں کہ:
عبداللہ بن شلیمان اور منذر بن مشعل کہ دونوں قبیلہ بنی اسد سے تھے روایت کرتے ہیں کہ جب کہ حج سے فارغ ہوئے ہم تو ہم کو کوئی کام نہ تھا اس کے سوا کہ ان حضرت سے ملتی ہوں اور دیکھیں کہ انجام کار کیا ہوتا ہے۔ پس بہت جلد چلے ہم یہاں تک کہ ان حضرت سے ملتی ہوئے۔ ناگاہ دور سے دیکھا ہم نے ایک شخص کو کہ کوفہ کی طرف سے آتا تھا۔ جب کہ نزدیک پہنچا وہ اور امام حسین کو دیکھا اس نے تو راہ اس نے چھوڑ دی اور دوسری راہ کی طرف مائل ہوا۔ پس حضرت نے بھی اسے دیکھ کر توقف فرمایا اور قافلہ کو روک دیا۔ گویا حضرت اس سے کچھ خبر کوفہ کی دریافت فرماتا چاہتے تھے۔ لیکن پھر حضرت نے اعراض فرمایا۔ اور روانہ ہوئے۔ پس ہم دونوں اس شخص کے پاس گئے اور سلام کیا۔ اس نے جواب سلام دیا۔ ہم نے اس سے پوچھا کہ کس قبیلہ سے ہو تم اس نے کہا کہ ہم قبیلہ بنی اسد سے ہیں۔ ہم نے کہا کہ ہم بھی اسدی ہیں۔ تم کون ہو۔ اس نے کہا کہ میں بکر ہوں پھر نکلا۔ پس آپس میں

نسب کو بیان کیا ہم نے۔ پھر کہا ہم نے کہ اہل کوفہ کی خبر بیان کرو۔ اس نے کہا کہ ہاں کوفہ سے نہیں نکلا میں مگر یہ کہ مسلم وہاں قتل ہو چکے ہیں۔ اور رسی ان کے پاؤں میں باندھ کر بازاروں میں کھینچتے تھے۔ پس ہم اس سے رخصت ہوئے اور قافلہ میں حضرت کے داخل ہونے یہاں تک کہ منزل طعلبیہ پر پہنچے اور بہت جلد خدمت میں حضرت کے حاضر ہوئے اور سلام عرض کیا۔ جواب سلام حضرت نے دیا۔

حضرت کا لشکر رازدار تھا پھر عرض کی ہم نے کہ ہمارے پاس ایک خبر ہے اگر حکم ہو تو مخفی عرض کریں۔ ورنہ علانیہ عرض کریں۔ حضرت نے ہماری طرف نظر فرمائی اور پھر اپنے اصحاب کی طرف ملاحظہ فرمایا اور پھر فرمایا کہ: ”نیں ان سے کوئی شے پوشیدہ نہیں کرتا ہوں۔“ ہم نے عرض کیا: ”اس سوار کو جو کوفہ سے آتا تھا اسے آپ نے ملاحظہ فرمایا تھا؟“ فرمایا: ”ہاں! دیکھا تھا میں نے اسے اور اس سے کچھ حال دریافت کرنا چاہا تھا میں نے۔“ ہم نے عرض کی کہ: ”ہم دور سے آپ کے توقف فرمانے سے بچ گئے تھے کہ حضرت کو اس سے کچھ حال دریافت فرماتا ہے۔ اس لیے ہم اس سے مخفی ہوئے۔“ پس حضرت نے نظر فرمائی طرف اولاد عقیل کے اور فرمایا: ”تم کیا کہتے ہو؟“ پس جانا ہم نے کہ حضرت واپس نہ ہوں گے۔

صحرا نشین عربوں سے ملاقات صاحب بھار کے موافق جب حضرت حاجز سے ایک تالاب پر پہنچے اور آگے بڑھے تو چند مسافر نشین عربوں سے ملاقات ہوئی۔ ان سے احوال کوفہ پوچھا گیا اور انہوں نے اپنی لاعلمی ظاہر کرنے کے بعد کہا کہ اس قدر معلوم ہے کہ کسی شخص کو ان راہوں سے آمد و شد نہیں کرتے دیتے۔

عبداللہ بن مطیع کے خیالات مؤرخین نے عبداللہ بن مطیع کو پھر پیش کیا ہے اور بعض کے نزدیک حاجز کے بعد عرب کے چشمے سے بڑے تھے کہ ملاقات ہوئی اور بعض بطن الرمد کے بعد بتاتے ہیں۔ بقول ابن خلدون وہ دریچہ کرکڑا ہو گیا اور کہنے لگا: میرے ماں باپ آپ پر خدا ہوں، آپ کہاں تشریف لیے جاتے ہیں۔ حسین بن علیؑ نے کوفیوں کے خط لکھنے اور اپنی روائی کا مفصل حال بتلایا۔ عبداللہ بن مطیع نے عرض کیا: ”خدا کے واسطے اسے ابن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ کوفہ کا قصد نہ فرمائیے۔ یہ لوگ بڑے بیان شکن و بد مہد ہیں۔ ان میں اسلام کی ہنک، قریش کی آبروریزی (؟) عرب کی عزت جاتی رہے گی۔ واللہ اگر آپ اس چیز کی خواہش کریں گے جو بنی امیہ کے ہاتھ میں ہے (یعنی حکومت و خلافت) تو بے شک وہ لوگ آپ کو شہید کر ڈالیں گے۔ اور پھر آپ کے شہید کرنے کے بعد کسی سے نہ ڈریں گے۔“

زمہیر بن قین اس مؤرخ کے موافق زمہیر بن قین بجلی ہوا تھا ہاں عثمان سے حج کر کے آپ کے ساتھ ہی ساتھ واپس جا رہا تھا۔ ایک منزل و ایک مقام پر قیام نہ کرتا تھا۔ ایک روز آپ نے اس کو بلا بھیجا۔ بہ اکراہ تمام آیا۔ کچھ باتیں ہوئیں۔ لیکن واپس ہو کر اپنی فروغ گاہ پر گیا تو اپنے ہمراہیوں سے خطاب کر کے کہا: ”جس کو میرے ساتھ چلنا ہو چلے میں حسین کے ساتھ جاتا ہوں۔ وہ میرا آخری مہد ہے۔ میں تم لوگوں سے رخصت ہوتا ہوں۔ یہ کہہ کر سیوی کو طلاق دے کر بلا تم اپنے میکا (یعنی ماں باپ کے مکان) چلی جاؤ۔ میں نہیں چاہتا کہ تم قید و گرفتار کی جاؤ۔ اور اپنے ہمراہیوں

سے رخصت ہو کر حسین بن علیؑ کے پاس چلا آیا اور انھیں کے سہل رہا۔ یہاں تک کہ کربلا میں یہ بھی شہید ہوا۔
 روضۃ الشہداء کے موافق: ”امام حسینؑ اور اطلبید زہیر بن قین ابواب نہ نمود زوجہ و گفت
 سبحان اللہ! پسر رسول خدا بطلب تو میفرستد و تعلل مینمائی۔ این سخن ماثراً فائدہ زہیر بدست
 سید جوانان بہشت شرافت و بعد از خطہ بارنگ افروختہ از خیمہ امام حسینؑ بیرون آمدہ فرمود تا خیمہ اور ابر کنند و قریب
 بہ خیمہ امام مظلوم شہید بردہ بزدند۔“ یعنی: ”امام حسینؑ نے اسے بلایا وہ نہ مانا۔ بیوی نے کہا: سبحان اللہ! رسول کا بیٹا تجھے
 بلاتا ہے اور تو یہاں کرتا ہے۔ اس بات کا اثر ہوا۔ زہیر جوانان جنت کے سردار کی خدمت میں دوڑا اور خطہ بدھڑے
 ہونے رنگ کے ساتھ خیمہ حسینؑ سے باہر آیا۔ خیمہ اٹھانے اور امام مظلوم کے خیمہ کے ساتھ لگانے کا اہتمام کیا۔“

خوف کا اندازہ

صاحب لہوف فرماتے ہیں: ”ایک گروہ ذارہ و جیلہ نے روایت کی ہے کہ ہم زہیر بن قین
 کے ہمراہ مکہ سے روانہ ہوئے۔ ہم امام حسینؑ کے ساتھ سفر کرتے تھے ایک بار
 ایسا اتفاق ہوا کہ حضرتؑ ایسے مقام پر اترے کہ ہم کو سوانے حضرتؑ کے ساتھ ہم منزل ہونے کے کوئی چارہ کار نہ ہوا۔ ہم
 کھانا کھا رہے تھے کہ یکایک قاصد امام حسینؑ آیا اور بعد سلام کہا کہ: اے زہیر بن قین! ابا عبد اللہ حسینؑ نے مجھے تم کو
 بلانے کے لیے بھیجا ہے۔ یہ سن کر ہمارے ہاتھوں سے لقمے گر گئے۔ اور ہم ایسے خاموش ہو گئے گویا ہمارے سروں پر
 پرندے بیٹھے ہیں۔ تب زوجہ زہیر جس کا نام دلم بنت عمر تھا کہنے لگی۔۔۔۔۔“

صاحب روضۃ الشہداء ان واقعات کے بعد ایک روایت یہ بھی نقل کرتے ہیں کہ جس وقت زہیر طلاق اور اوائے مہر کے
 خیال میں تھے عورت نے کہا کہ اے صاحب ہمت تو چاہتا ہے کہ حضرت علی مرتضیٰؑ کے فرزندوں کی خدمت کرتے، میں
 بھی چاہتی ہوں کہ دخترانِ فاطمہؑ زہراؑ کی ملازمت میں رہوں۔ اور یہ کہہ کر دونوں با اتفاق حاضر ہوئے۔

عبد اللہ بن حرا بکھفی
 حضرت قمر بنی ہاشم کے قریب خیمہ زن تھے کہ آپؑ نے کچھ دور پر ایک سراپردہ
 ملاحظہ فرمایا۔ اس کے سامنے ایک نسیہ زمین میں گڑا تھا۔ تلوار نکلی تھی اور گھوڑا

بند تھا۔ حضرتؑ نے دریافت فرمایا کہ یہ کس کا سراپردہ ہے۔ جواب دیا گیا کہ یہ ایک کوئی کا ہے جس کا نام عبد اللہ بن حرا
 بکھفی ہے۔ حضرتؑ نے اسی کے قبیلہ کے ایک شخص کو جس کا نام حجاج بن مروقؑ حنفی تھا اس کی طلب میں بھیجا۔ حجاج نے
 عبد اللہ سے کہا کہ اے عبد اللہ اگر تو حسینؑ کے دشمنوں کو ان سے دفع کرے گا تو ثواب عظیم کا متحق ہوگا۔ اور اگر مارا گیا تو
 شہید ہوگا۔ احمم کوئی کے موافق عبد اللہ نے جواب دیا کہ میں اسی لیے کوفہ سے نکل آیا ہوں کہ امام حسینؑ وہاں تشریف
 لائے اور میں نے مدد کرنی چاہی تو نہ کر سکوں گا۔ کیونکہ تمام کوفہ والوں کی عینیں بدل گئی ہیں۔ دنیا کی محبت میں مبتلا ہو کر
 عبد اللہ ابن زیاد کے طرف دار ہو گئے ہیں۔ سلاطین مندی کے ساتھ واپس جا کر میرا سلام پہنچاؤ اور آپؑ کو یہ سب حالات
 سنا دے۔ حجاج نے امیر المومنین کے پاس جا کر جو کچھ دیکھا اور سنا تھا عرض کر دیا۔ امیر المومنین حسینؑ اپنے چہرہ شہ دار اور
 بھائی بند ہمراہ لے کر اس کے پاس گئے۔ عبد اللہ حضرتؑ کو تشریف لاتے دیکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ تعظیم و تکریم سے پیش آیا۔ امام
 حسینؑ کا دست مبارک پکڑ کر صدر جگہ بٹھایا۔ آپؑ نے حمد و ثنائے الہی کے بعد فرمایا: ”اے عبد اللہ تیرے شہر کے
 آدمیوں نے جو سب کے سب نامور اور رکن شہر ہیں، میں خطیبیجینگ کر دھڑے کیے کہ ہم سب آپؑ کے ہوا خواہ

و معلوم دمدگار ہیں۔ آپ ہمارے پاس پہلے آئیے۔ میں نے اس امر کے قبول کرنے میں تامل کیا۔ کسی خط کا جواب نہ دیا تو مکرر خط آئے۔ ناچار میں نے ان لوگوں کے قول و قرار کی وجہ سے حرم خدا سے سفر کیا۔ اور اس طرف آیا۔ اب دیگرگوں مغلطہ دیکھتا ہوں۔ میرے چا زاد بھائی مسلم کی بیعت اٹھارہ ہزار آدمیوں نے کی اور جنگ کے لیے نکلے۔ جب لڑائی شروع ہو گئی تو عین معرکہ میں اس سے علیحدہ ہو گئے۔ اسے تنہا چھوڑ دیا۔ اور پھر زیادہ کے حوالہ کر دیا۔ اس نے بڑی ایذا دہی کے ساتھ شہید کیا۔ اب سنتا ہوں کہ نذیر کی فرمانبرداری کے ساتھ پھر زیادہ کی طرف مائل ہو گئے ہیں۔ اسے عبد اللہ تو خوب جانتا ہے کہ حمزہ جو کچھ نیک و بدی ظہور میں آنے کی اللہ تعالیٰ ویسی ہی جزا دے گا۔ میں چاہتا ہوں کہ تو اس وقت توبہ کر کے تمام گزشتہ گناہوں سے بری ہو جائے۔ ہم رسول خدا محمد مصطفیٰ کے اہل بیت ہیں۔ ہماری امداد کر۔ اور اس معاملہ میں چارہ ساتھ دے۔ جس قدر ہو سکے ہمارے دشمنوں کو ہمارے مقابلہ سے دفع کر۔ عبد اللہ نے کہا: ”اے فرزند رسول اگر کوفہ میں آپ کے کچھ ایسے دوست دمدگار ہوتے جو آپ کا ساتھ دیتے تو میں سب سے پہلے آپ کے واسطے جنگ کرتا۔ مگر آپ کے تمام دوست دمدگار اور شیعہ اعتقاد بدل چکے اور عبید اللہ سے مل گئے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ یہ گھوڑی ٹھٹھہ نام لے لیں۔ خدا کی قسم اس گھوڑی کو میں نے جس جانور کے پیچھے ڈالا ہے اسے جالیا ہے۔ اور جب اس پر سوار ہو کر جاکا ہوں تو کوئی شخص مجھ تک نہیں پہنچ سکا۔ اور یہ تلوار بھی جس پر لکھی ہے صاف اس سے نکل گئی ہے۔ یہ دونوں چیزیں آپ میری طرف سے قبول فرمائیں۔“ آپ نے فرمایا: ”میں تیرے پاس اس گھوڑی اور تلوار کی تلاش سے نہیں آیا ہوں، بلکہ یہ مدعا ہے کہ تو میرا ساتھ دے اور میرے دشمنوں سے لڑے۔ اگر تو اپنی جان کو ہم سے عزیز رکھنا چاہتا ہے تو میں تیرے مال کی بھی ضرورت نہیں ہے۔“ یہ فرما کر آپ اپنے قیام گاہ پر پہلے آئے۔ صاحب روضۃ الشفا کے موافق حضرت منزل حقیقی میں پہنچے تھے کہ بنی عکرہ کا ایک شخص آیا اور اس نے کہا کہ ابن زیاد نے آپ کی تلاش میں لشکروں کو ہر طرف پھیلا دیا ہے اور اس وقت وہ قادسیہ سے عذیب تک آپ کا انتظار کر رہا ہے۔ مصیبت یہ ہے کہ آپ واپس جائیں۔ کم خدا کی آپ نہیں جاتے مگر نیزوں اور تلواروں کی طرف یقین فرمائیے کہ اہل کوفہ کی باتیں قابلِ اعتماد نہیں۔ بلکہ آپ سے جنگ کرنے کے لیے ان لوگوں نے لشکر نذیر سے اتفاق کیا ہے۔ اور آپ کی طرف متوجہ ہوئے ہیں۔ یہ سن کر حضرت نے سر ہلایا کہ: خدا تجھے جزائے خیر دے کہ تو نے شرط ضیعت پوری کر دی۔

حر کا لشکر اس کے بعد مورخ کے موافق منزل سداے آرام منہما کر بڑے تھے کہ حر کے لشکر سے ملاقات ہوئی جو دواب سے اتر کر اس جگہ پہنچا تھا۔ تاریخ کامل کے موافق یہ ملاقات بطن عقبہ کے بعد ہوئی۔ ابن خلدون کے موافق منزل شراف کے بعد حمزہ روضۃ الشہداء کے موافق منزل سراب حمزہ (غالباً سرا، سراب، شراف ایک ہی منزل ہے) صاحب لہوت کے موافق کوفہ دو منزل رہ گیا تھا۔ سیر الانمہ کے موافق کوفہ کے قریب پہنچ گئے تھے۔

دو پہر کا وقت وقت کے متعلق تمام مورخین متفق ہیں کہ آفتاب وسط سما میں پہنچ چکا تھا۔ ملاقات ہونے کی صورت میں اس قدر اختلاف ہے کہ بعض کے موافق حضرت پہلے آ رہے تھے کہ آپ نے دور سے ایک لشکر کو دیکھا کہ وہ اپنے گھوڑوں کے سایہ میں بیٹھا ہے۔ اور جب اس نے حضرت کو رخ رکھا کے آتے دیکھا

جنوں نے یہ خط تحریر کیے ہیں۔ اور عبید اللہ بن زیاد نے بھی حکم دیا ہے کہ آپ کو اس کے پاس لے جائیں۔

حسینؑ کا تبسم اور قصیدہ انگلی
 امیر المومنین حسینؑ نے مسکرا کر کہا: ”تم یہ کام نہیں کر سکتے۔“
 پھر حکم دیا کہ: ”عورتوں کو کھادوں میں سوار کرادو۔ اور سوار ہو کر چلو۔“
 دیکھیں یہ لوگ ہمارا کیا کر سکتے ہیں۔“ لوگوں نے آپ کے حکم کے موافق اہل و عیال اور بچوں کو سوار کر دیا اور چل نکلے۔
 کئی لشکر نے راستہ روکا اور جانے سے مانع آئے۔

حسینؑ تلوار پر ہاتھ ڈالتے ہیں
 اہل بیت کا راستہ روکتے ہی امام حسینؑ نے قبضہ شمشیر پر ہاتھ ڈالا،
 اور کہا: ”اے ہمسرہ یزید! کس لیے تو ان لوگوں کو نہیں جانے دیتا۔“

تیری ماں تیرے سوگ میں بیٹھی ہے۔“ حمر نے جواب دیا: ”یا ابن رسول اللہ! اگر کوئی اور شخص میری ماں کا نام لیتا تو میں تلوار کی
 دھار سے جواب دیتا مگر آپ اور آپ کے ماں باپ کی حرمت بہت بڑی ہے۔ کچھ نہیں کر سکتا۔ لیکن عبید اللہ کے
 پاس ضرور لے چلوں گا۔“ حسینؑ نے کہا: ”نہیں ہرگز نہ جانوں گا اور تیرے ارادہ کی بجائے ذرا پرواہ نہیں۔ تو کیا کر سکتا
 ہے۔“ حمر نے کہا: ”اگر میری اور میرے لشکر کی جانیں بھی اس معاملہ میں جاتی رہیں تو بھی مجھے گوارا ہے۔ میں عبید اللہ

حسینؑ حمر کو تنہا جنگ کے لیے بلاتے ہیں
 کے پاس ضرور لے چلوں گا۔“ امام حسینؑ نے
 کہا: ”اچھا اپنے لشکر سے نکل کر سامنے آ

اور میں بھی اپنے ہمراہیوں سے علیحدہ ہو کر تیرے سامنے آتا ہوں کہ دونوں آپس میں جنگ کرید۔ اگر تو نے مجھے مار ڈالا تو
 تیرے امیر کی اور تیری مراد بر آئے گی اور تو مارا گیا تو خلعت تیرے پیچھے سے آزاد ہو جائے گی۔“

حمر کا حکم اور ذاتی عقیدہ
 حمر نے کہا: ”یا ابا عبد اللہ! مجھے آپ سے جنگ و جدل کرنے کا حکم نہیں دیا
 بلکہ یہ کہہ دیا ہے کہ آپ کے ساتھ سے علیحدہ نہ ہوں۔ یہاں تک کہ آپ کو

عبید اللہ کے پاس پہنچا دوں۔ خدا کی قسم مجھے سخت ناگوار ہے کہ کوئی ایسی بات کہوں یا کوئی ایسی حرکت کروں جو آپ کو نا
 خوش معلوم ہو۔ مگر کہا کروں دوسرے کا مقرر کیا ہوا ہوں۔ اور محکوم میثور ہوتا ہے۔ میں نے اس گردہ سے بیعت کر رکھی
 ہے اور ان کے حکم سے آپ کے پاس پہنچا ہوں اور خوب جانتا ہوں کہ قیامت کے دن تمام خلعت کو آپ ہی کے نانا کی
 شفاعت کی ضرورت پڑے گی۔ میں حیران و پریشان و خوف زدہ ہوں کہ آپ سے لڑنے کی نوبت نہ آئے پھر شفاعت کی
 امید کیا خاک ہو سکتی ہے۔ خدا خواستہ فوج سے کوئی ایسی حرکت سرزد ہوگی جس سے حضرت کے جسم مبارک کو کچھ تکلیف پہنچی
 تو دنیا اور آخرت دونوں جگہ میرے واسطے خرابی موجود ہے۔ اور اگر آپ کو عبید اللہ بن زیاد کے پاس نہ لے جانوں تو میں
 کوفہ میں داخل نہیں ہو سکتا ہاں دنیا وسیع ہے۔ خدا کی پناہ قیامت کے دن آپ کے نانا کی شفاعت سے عروم رہ جانے
 کی نسبت بھی بہتر ہے کہ اور کسی طرف نکل جانوں۔ آپ شارع عام سے نہیں بلکہ کسی اور غیر مشہور راستہ سے کسی سمت
 کو چلے جائیں بلور میں عبید اللہ کو لکھ دوں گا کہ حسینؑ کسی اور طرف چلا گیا ہے۔ نہیں ملے۔ پھر تو مجھے آپ کے نانا کی
 شفاعت کی کچھ امید باقی رہے گی اور اے حسینؑ میں قسم دلاتا ہوں کہ اپنی جان پر دم کرو کوفہ نہ جاؤ۔“

حضرت کا استفسار اور اشعار

آپ نے کہا: ”اے مر کیا تو یہ بات اس لیے کہتا ہے کہ وہ مجھے مار ڈالیں گے؟“۔ مر نے کہا: ”ہاں اے منہ زندر رسول! اس میں ذرا بھی شک و شبہ نہیں ہے۔ آپ سلامتی سے مکہ کو واپس چلے جائیں۔“ ابن خلدون کے موافق مر کا کلام سن کر حضرت نے فرمایا: ”کیا تو فخر کو موت سے ڈراتا ہے؟“ اور اس کے بعد یہ اشعار درو زبان فرمائے:۔

مأ مضی و ما فی الموت عار علی الفقی اذا ما حوی خیدا و جاهد مسلما

(میں تو اپنا قصہ پورا ہی کر لوں گا اور مرنے میں جو اہل کو مار نہیں ہے۔ جب اس نے نیکی کی نیت کر لی اور مسلمان ہو کر جہاد کیا)

و واسی رجالا صالحین بنفسہ و خالف مبشورا و فارق مجرما

(اور اچھے لوگوں سے ہذاہ محبت پیدا کر۔ گردن زندیوں کی مخالفت کی اور باغیوں کا ساتھ چھوڑ دیا)

فلان عشت لم اندم و ان مت لم الم کفی بک ذلا ان تعیش و حرمنا

(اے اگر میں زندہ رہا تو مجھے کچھ غم امت نہ ہوگی اور اگر مر گیا تو میں اپنی طاعت نہ کروں گا۔ تجھے ذلت کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ تو زندہ رہے اور تیری ناک رگڑی جاتی رہے)

کمال ابن اثیر کے موافق مر کے کلام پر حضرت نے فرمایا کہ: ”میں فخر سے وہی کہتا ہوں جو بھائی عوی نے کہا تھا اپنے بن عم سے جب وہ حضرت رسول کا ارادہ کر رہا تھا کہ کہاں جاتا ہے قتل کیا جانے گا تو اس نے جواب دیا کہ: میں جانوں گا اور موت سے کوئی مار نہیں جب کہ نیت خیر اور جہاد ہو۔“۔ مر نے جب یہ سناتو ہٹ گیا۔ غالباً اسی موقع پر جب کہ مر ضد کر رہا تھا زبیر بن عقیل نے حضرت سے عرض کیا کہ اس وقت اجازت جنگ دیجیے کیونکہ اس وقت لڑنا آسان ہے بہ نسبت ان فوجوں کے جو آ رہی ہیں۔ حضرت نے فرمایا کہ: ”تم کچھ کہتے ہو

وقتی تصفیہ

لیکن ہم ابتدا بیگ نہ کریں گے۔“ اس کے بعد یہ تصفیہ ہوا کہ حضرت اپنے راستہ سے تشریف لے چلیں جو نہ موصل پہ جاز ہو اور نہ موصل پہ کوفہ۔ (ابن خلدون)

عذیب الہجانات

رفتہ رفتہ عذیب میں پہنچے جہاں پر نعمان کی لڑکیاں چرا کرتی تھیں۔ کوفہ کے چار آدمی آتے ہوئے دکھائی دیے۔ جو تیراوشیوں پر سوار ناخ بن ہلال کے گھوڑے کے پیچھے تیزی کے ساتھ آ رہے تھے۔

طرماح بن عدی اور سوال رفاقت

اور ان کے ہمراہ ان کا رہبر طرماح بن عدی بھی تھا حسین بن علی کے قریب نہ پہنچنے پانے تھے کہ مر نے بڑھ کر کہا: میں ان کو

گرفتار کر لوں گا۔ یا کوفہ کی طرف لوٹا دوں گا۔ آپ بولے ایسا نہ ہونے پانے گا۔ یہ میرے معین و مددگار ہیں اور میرے قائم مقام ہیں۔ اگر تم نے ان سے کچھ بھی تعرض کیا تو ہمارے اور قتل سے کوئی دقیقہ نہ اٹھ رہے گا۔ مر خاموش ہو رہا۔ حسین بن علی نے ان لوگوں سے دریافت کیا تم ان لوگوں کا کچھ مال بتلاؤ جن (یعنی اہل کوفہ) کو تم چھوڑ آتے ہو۔ ان میں سے کچھ بن عبد اللہ الصمر نے عرض کیا: ”شرعہ کوفہ کی رشوت خواری بڑھ گئی۔ دنیا کی طرح میں پڑے ہوئے

ہیں۔ میں سمجھنا چاہتا ہوں کہ وہ ایک زبان ہو رہے ہیں۔ باقی رہے عوام الناس ان کے مستلوب قہادی طرف مائل ہیں لیکن ان کی تلواریں کل تم پر چینی جائیں گی۔۔۔۔۔۔ اس کے بعد طراح بن ہدی نے کہا:

”آپ کے ہمراہ بہت کم آدمی ہیں اور یہ بڑی دلی ہیں۔
طراح کوہ آجا چلنے کی صلاح دیتے ہیں

اگر آپ یہ چاہتے ہوں کہ کسی محفوظ شہر میں قیام کریں تو آپ ہمارے ساتھ چلیے ہم آپ کو کوہ آجا میں ٹھہرائیں گے جو ہم کو ملوک غسان و تھمان بن منذر اور کل سرخ و سفید کے حملوں سے بچاتا ہے۔ واللہ وہاں پر کسی قسم کی رسوائی و مضرت نہ آئے پائے گی۔ پھر وہاں سے ان لوگوں کی طرف دعاۃ روانہ کرنا جو آباد سلی میں طے والے قہیم ہیں۔ خدا کی قسم دس روز بھی نہ گزرنے پائیں گے کہ بے حد طے کے سوار و پیادہ آکر جمع ہو جائیں گے۔ اس وقت اگر کوئی شخص آپ کے مقابلہ پر آئے گا تو صرف طے کی بیس ہزار تلواریں نیام سے نکل پڑیں گی جو آپ کے رد و دشمنوں سے لڑیں گی۔“

آپ نے فرمایا: ”اللہ تعالیٰ تم کو بہتر جزا دے۔ ہم میں اور ان لوگوں میں کچھ ایسے امور
صلاح کا جواب مائل ہو گئے ہیں کہ جس سے ہم لوٹ چلنے پر قادر نہیں ہیں اور ہم یہ نہیں جانتے کہ
آئندہ ہم میں اور ان میں کیا واقعہ پیش آئے گا۔“

غرض طراح آپ سے رخصت ہو کر اپنے اہل کی طرف روانہ ہوا اور امام حسینؑ پھرتے پھرتے
قصر بنی مقاتل میں پہنچے۔ شام ہو گئی تھی، قیام کر دیا۔ نماز جمع پڑھ کر جھٹ پٹ سوار ہو کر چلنے کا
قصد کیا۔ حرنے پہنچ کر روکنا شروع کیا۔

اسی رد و کد میں نینوی تک پہنچے جہاں پر آپ اتر پڑے اور ایک ساڑنی سوار نے اگر ابن زیاد کا خط مرحو
نینوی دیا جس میں لکھا ہوا تھا: ”میرے اس خط و قاصد کے پہنچنے ہی حسینؑ کو روک کر ایک کھلے ہوئے میدان
میں ٹھہراتا، جہاں نہ پانی ہو اور نہ کوئی محفوظ مقام ہو۔ میں نے اس قاصد کو حکم دیدیا ہے کہ تا قہیل وہ تم سے جدا نہ ہوگا۔“
حرنے خط پڑھ کر حسینؑ بن علیؑ سے مخاطب ہو کر کہا: ”یہ خط امیر کا آیا ہے۔ مجھے ہدایت ہوئی ہے کہ میں آپ کو کھلے
میدان میں ٹھہراؤں اور تا قہیل حکم یہ قاصد مجھ سے علیحدہ نہ ہوگا۔ لہذا آپ نینوی سے اٹھ کر ایسے میدان میں فروکش
ہوں جہاں نہ سایہ ہے نہ پانی ہے۔“ آپ نے ارشاد کیا: ”تم ہم کو اب زیادہ تکلیف نہ دو۔ نینوی ہی میں رہنے دو“ یا
اجازت دو تو فاضلہ یا شقیقہ میں جا کر ہم قیام کریں۔“ حرنے نے: ”میں ایسا نہیں کر سکتا۔ ابن زیاد نے مجھ پر ایک شخص کو
اس امر کی غبریٰ کو مقرر کیا ہے۔“

زہیر بن قین نے عرض کیا: ”واللہ اس کے بعد جو آئے گا وہ اس سے زیادہ سخت
زہیر بن قین کی صلاح ہوگا۔ اسے ابن رسول اللہ (ﷺ) اس وقت اس سے لڑانا آسان ہے
پر نسبت اس کے کہ جو آئندہ آئے والا ہے۔“

آپ بولے: ”ہم جنگ کرنے میں سبقت نہیں کر سکتے۔“
زہیر نے رائے دی: ”آپ اس سترہ میں ہمارے ساتھ
جنگ میں سبقت نہیں چاہتے

و معلوم دمدگار ہیں۔ آپ ہمارے پاس چلے آئیے۔ میں نے اس امر کے قبول کرنے میں تامل کیا۔ کسی خط کا جواب نہ دیا تو مکرر خط آئے۔ ناچار میں نے ان لوگوں کے قول و قرار کی وجہ سے حرم خدا سے سفر کیا۔ اور اس طرف آیا۔ اب دیگر گوں محملہ دیکھتا ہوں۔ میرے چاروں بھائی شہداء کی بیعت اٹھارہ ہزار آدمیوں نے کی اور جنگ کے لیے نکلے۔ جب لڑائی شروع ہو گئی تو عین معرکہ میں اس سے علیحدہ ہو گئے۔ اسے تنہا چھوڑ دیا۔ اور پھر زیادہ کے حوالہ کر دیا۔ اس نے بڑی ایذا دہی کے ساتھ شہید کیا۔ اب سنتا ہوں کہ زبید کی فرمانبرداری کے ساتھ پھر زیادہ کی طرف مائل ہو گئے ہیں۔ اے عبد اللہ تو خوب جانتا ہے کہ تجھ سے جو کچھ نیک و بدی ظہور میں آئے گی اللہ تعالیٰ ویسی ہی جزا دے گا۔ میں چاہتا ہوں کہ تو اس وقت توبہ کر کے تمام گزشتہ گناہوں سے بری ہو جائے۔ ہم رسول خدا محمد مصطفیٰ کے اہل بیت ہیں۔ ہماری امداد کر۔ اور اس محملہ میں چارہ ساتھ دے۔ جس قدر ہو سکے ہمارے دشمنوں کو ہمارے مقابلہ سے دفع کر۔ عبد اللہ نے کہا: ”اے فرزند رسول اگر کوفہ میں آپ کے کچھ ایسے دوست دمدگار ہوتے جو آپ کا ساتھ دیتے تو میں سب سے پہلے آپ کے واسطے جنگ کرتا۔ مگر آپ کے تمام دوست دمدگار اور شیعہ احتمالاً بدل چکے اور غیہ اللہ سے مل گئے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ یہ گھوڑی ٹھٹھہ نام لے لیں۔ خدا کی قسم اس گھوڑی کو میں نے جس جانور کے پیچھے ڈالا ہے اسے جالیسا ہے۔ اور جب اس پر سوار ہو کر بھاگا ہوں تو کوئی شخص مجھ تک نہیں پہنچ سکا۔ اور یہ تلوار بھی جس پر لکھی ہے صاف اس سے نکل گئی ہے۔ یہ دونوں چیزیں آپ میری طرف سے قبول فرمائیں۔“ آپ نے فرمایا: ”میں تیرے پاس اس گھوڑی اور تلوار کی تلاش سے نہیں آیا ہوں، بلکہ یہ مدعا ہے کہ تو میرا ساتھ دے اور میرے دشمنوں سے لڑے۔ اگر تو اپنی جان کو ہم سے عزیز رکھنا چاہتا ہے تو میں تیرے مال کی بھی ضرورت نہیں ہے۔“ یہ فرما کر آپ اپنے قیام گاہ پر چلے آئے۔ صاحب روضۃ القفا کے موافق حضرت منزل عقیق میں پہنچے تھے کہ بنی حکمہ کا ایک شخص آیا اور اس نے کہا کہ ابن زیاد نے آپ کی تلاش میں لشکروں کو ہر طرف بھیل دیا ہے اور اس وقت وہ قادسیہ سے غزیب تک آپ کا انتظار کر رہا ہے۔ مصطیٰ یہ ہے کہ آپ واپس جائیں۔ تم خدا کی آپ نہیں جانتے مگر نیزوں اور تلواروں کی طرف۔ یقین فرمائیے کہ اہل کوفہ کی باتیں قابلِ اعتماد نہیں۔ بلکہ آپ سے جنگ کرنے کے لیے ان لوگوں نے لشکر زبید سے اتفاق کیا ہے۔ اور آپ کی طرف متوجہ ہوئے ہیں۔ یہ سن کر حضرت نے منہ مایا کہ: خدا تجھے جزائے خیر دے کہ تو نے شرط صیحت پوری کر دی۔

حر کا لشکر اس کے بعد مورخ کے موافق منزل سدا سے آرام سدا کر بڑے تھے کہ حر کے لشکر سے ملاقات ہوئی جو دواب سے اتر کر اس جگہ پہنچا تھا۔ تاریخ کامل کے موافق یہ ملاقات بطن عقبہ کے بعد ہوئی۔ ابن خلدون کے موافق منزل شران کے بعد تھی۔ روضۃ الشہداء کے موافق منزل سراب تھی۔ (غالباً سراب، شران ایک ہی منزل ہے) صاحب لہوت کے موافق کوفہ دو منزل رہ گیا تھا۔ سیرالائمہ کے موافق کوفہ کے قریب پہنچ گئے تھے۔

دوہر کا وقت وقت کے متعلق تمام مورخین متفق ہیں کہ آفتاب وسط سما میں پہنچ چکا تھا۔ ملاقات ہونے کی صورت میں اس قدر اختلاف ہے کہ بعض کے موافق حضرت چلے آ رہے تھے کہ آپ نے دور سے ایک لشکر کو دیکھا کہ وہ اپنے گھوڑوں کے سایہ میں بیٹھا ہے۔ اور جب اس نے حضرت کو مع رکھ کے آنے دیکھا

تو گھوڑوں پر سوار ہو گیا اور صفت بلندہ کر قریب پہنچنے کا انتظار کرنے لگا۔ میں اسے کم قرین قیاس سمجھتا ہوں کہ کوئی لشکر ٹھیک دوپہر کے وقت اس طرح کہیں دم لے بلکہ میں اس دوسری روایت کو ترجیح دیتا ہوں جس طرح وہ کامل ابن اثیر اور ابن خلدون میں ہے۔ حضرت تشریف لے جا رہے تھے کہ: دور سے گرد دیکھ کر ہماریوں میں سے کوئی نکبیر کہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ نکبیر کی وجہ دریافت کی جواب دیا کہ گنجان درختوں کا باغ دکھائی دیتا ہے۔ بنی اسد کے دو شخصوں نے کہا اس میدان میں گھنا درخت نہیں ہے۔ حسین بن علی بولے یہ تو سواروں کی گرد ہے۔ پھر ان دونوں بنی اسد سے متوجہ ہو کر ارشاد کیا کہ اس مقام پر کوئی ایسا آباد ماں ہے کہ جس میں ہم پناہ گزین ہوں اور ان لوگوں سے ایک رخ ہو کر ملیں۔

کوہِ ذو خشم ان دونوں نے جواب دیا: سامنے یہ تمہارے پہلو پر ذو خشم ہے۔ اپنے ہاتھیں جانب سے مڑ کر اس کی طرف چلے جاؤ۔ اگر یہ لوگ تم سے پہلے اس طرف چلے جائیں گے تو تمہارا مقصود حاصل ہو جائے گا۔ حسین بن علی یہ سنتے ہی سرعت کے ساتھ ذو خشم کی طرف بھاگے۔ لیکن ذو خشم پر پہنچنے کے پہلے سواروں کی فوج آچکی۔ آپؑ غمہ گئے۔ کامل کے موافق حضرت نے ایسی پناہ کے متعلق دریافت فرمایا، جہاں اس لشکر سے سامنے سے مقابلہ کیا جاسکے۔ ذو خشم کا نام بتا کر کہا گیا کہ اگر آپؑ وہاں اس قوم سے پہلے پہنچیں گے تو وہ ایسی جگہ ہے جیسی آپؑ چاہتے ہیں۔ حضرت نے جلدی کی۔ وہ لوگ بھی ادھر بھاگے لیکن حضرت جلد پہنچے اور اتر پڑے۔ اس وقت چونکہ سخت گرمی کا وقت تھا حضرت نے پانی لانے اور پالنے کا حکم دیا۔

حضرتؑ حر کو طلب کرتے ہیں اس کے بعد قبول اعثم کوئی حضرت نے قاصد کو بھیجا کہ دریافت کرے ان کا سردار کون شخص ہے۔ لوگوں نے کہا: ”حر بن زید ریاہی“۔ امام نے اسے طلب کر کے پوچھا: ”اے حر تو ہماری مدد کے واسطے آیا ہے یا ہم سے جنگ کرنے کے ارادہ سے؟“۔ حر نے کہا: ”مجھے ضیاء اللہ نے آپؑ سے لڑنے کے واسطے بھیجا ہے۔“ حر کا یہ کلام سن کر آپؑ نے فرمایا: لا حول ولا قوۃ الا باللہ العلیٰ العظیم۔

نمازِ ظہر ظہر کی نماز کے وقت امام حسینؑ نے حجاج بن مروق سے کہا: اذان دے کر نماز کے لیے کھڑے ہو جاؤ کہ ہم نماز پڑھ لیں۔ حجاج نے اذان دی اور امام حسینؑ نے حر سے کہا: ”تو اپنی جگہ پر اپنے ہمراہیوں کے ساتھ نماز پڑھے گا یا ہمارے پیچھے کھڑے ہو کر ادا کرے گا؟“۔ حر نے کہا: ”میں تمہارے پیچھے کھڑے ہو کر نماز پڑھوں گا۔“ امام حسینؑ نے دونوں فوجوں کو نماز پڑھانی، اور نماز سے فارغ ہو کر نکوار کا سپہارا لے کر کھڑے ہو گئے اور خطبہ پڑھا۔ حمد و ثناء الہی کے بعد محمد مصطفیٰؐ پر درود بھیجا اور کہا: ”اے لوگو! میں تم سے ہذر کرنے کے لیے کھڑا نہیں ہوا، اور نہ میں نے اس شہر کی طرف اس وقت تک قصد کیا، اور یہاں تک آیا جب تک میرے پاس تم لوگوں کے خطانہ پہنچے۔ اور تم نے میرے بلانے کے لیے درخواستیں نہیں بھیجیں اور تمہارے قاصد جن میں بہت سے نامور اور رکن اشخاص شامل تھے اہل کوفہ کی طرف سے خط لے کر میرے پاس نہ آئے۔ انہوں نے کہا تھا کہ بہت جلدی کوفہ میں پہنچنا چاہیے۔ کیونکہ یہاں کوئی امام موجود نہیں ہے، جو نمازی پڑھائے اور دینی اور دنیوی امور کی اصلاح کرتا رہے۔ اگر تم آجائے گے تو شاید اللہ تعالیٰ ہمارے ابرہہ کا مومن کو درست کر دے۔ اب اگر تم اپنے قول و تم پر

ثابت قدم ہو تو میں آپہ کیا ہوں اور تم پر اعتقاد کرنا چاہیے تو میں تمہارے ساتھ شہر میں داخل ہوں۔ اگر تم اپنے عہد سے چر گئے اور قل و قرار سے شرمندہ ہونے ہو اور میرے آنے کو برا بھانتے ہو تو میں مکہ کو واپس چلا جاؤں۔ حضرت کا یہ کلام سن کر سب کے سب خاموش اور سر جھکانے ہوئے تھے کچھ نہ بولے۔

خاموشی اور ابن زیاد کا دوسرا خط اب حرنے اپنا خیمہ کھڑا کیا اور اس کے اندر جا بیٹھا۔ امام حسین بھی اس کے مقابل بیٹھے اور تمام آدمی بھی اپنے اپنے گھوڑوں کی باگیں پکڑے بیٹھے بیٹھے تھے کہ اتنے میں حرنے کے پاس کوفہ سے اس مضمون کا خط آیا کہ حکم ہذا سے مطلع ہوتے ہی حسین بن علی اور اس کے اصحاب کو نظر بند کر لینا اور خود ان کے ساتھ سے علیحدہ نہ ہونا یہاں تک کہ اسے میرے پاس حاضر کر اور میں نے اس قاصد کو حکم دیا ہے کہ تیرے ساتھ ہے جب تک کہ تو اس حکم کو پوری طرح انجام نہ دے۔ اور میری فرمانبرداری کا حق ادا نہ کرے۔

حر کا میلان حرنے مضمون خط سے مطلع ہو کر اپنے لوگوں کو بلایا اور کہا یہ مردود کم نجت ابن زیاد ہے خط لکھتا ہے کہ حسین بن علی کو گرفتار کر کے حاضر کر اور جہاں تک میں سوچتا ہوں مسیحا دل مجھے ایسے کام یا بات پر آمادہ نہیں ہونے دیتا جس سے امام حسین رنجیدہ ہوں۔ میں اس امر سے سخت پریشان ہوں۔

ابو شعثا اور قاصد حر کا ایک سہراہی ابو شعثا فقیر اللہ کے قاصد کی طرف مخاطب ہو کر بولا: "تیری ماں تیری جدائی میں روئے۔ تو کیسے کام کے لیے یہاں آیا ہے۔" اس نے کہا:

"میں نے اپنے امام کی فداکاری کی اور اپنی بیعت کو پورا کیا ہے۔ اپنے امیر کا حکم پہنچا دیا ہے۔" ابو شعثا نے کہا: "مجھے اپنے سر اور جان کی قسم تو اپنے امام کی فرمانبرداری کے سبب خدا کی درگاہ میں گنہگار ہو گیا تو نے اپنے آپ کو تباہ کر دیا۔ دنیا اور آخرت دونوں غراب کر لیں۔ اور دوزخ کی آگ اپنے واسطے سلگائی۔ تیرے امام کی یہ تعریف ہے جو اللہ تعالیٰ قرآن شریف میں فرماتا ہے: وَجَعَلْنَاهُمْ آيَةً يَدْعُونَ إِلَى التَّوَارِثِ وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ لَا يُنصَرُونَ (۲۸: ۲۱)

عصر کی نماز ابھی یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ نماز عصر کا وقت آگیا امام حسین نے مؤذن سے کہا: اذان دے۔ اور نماز کے لیے کھڑے ہوئے۔ آپنے لشکر کو نماز پڑھائی اور نماز سے فارغ ہو کر محدثہ الہی کے

بعد کہا: اے لوگو! ہم تمہارے پیغمبر محمد مصطفیٰ کے اہل بیت ہیں اور تمہارے شہر میں جو لوگ امام اور والی بنے ہوئے ہیں ہم خلافت اور امامت کے لیے ان سے بہتر ہیں۔ اگر تم ہمارا حق کھو گے اور خدا سے ڈر دے گے تو اللہ تعالیٰ تم سے راضی ہوگا اور اگر میرے آنے کو برا جانو گے اور اپنے خطوط کی تحریروں اور اپنے قاصدوں کی زبانی وعدوں کو پورا نہ کر دے گے تو میں تمہیں کچھ نہیں کہتا اور نہ تمہیں کسی بات کے لیے بخیر کروں گا۔ تم صاف صاف کہہ دو کہ میں مکہ کو واپس چلا جاؤں۔

حر کی خطوط سے لاعلمی اور عرض حرنے نے جو لشکر کا سردار تھا آگے بڑھ کر عرض کی: "اے فرزند رسول! آپنے دو مرتبہ خطوں اور قاصدوں کا ذکر کیا

مگر مجھے خبر نہیں کہ کن لوگوں نے خط لکھا اور کون کون شخص قاصد بن کر حاضر ہوئے تھے۔ امام حسین نے اپنے قلام عقبہ بن سحان کو بلا کر کہا: خطوں کی غرضیاں اٹھا لے۔ عقبہ جا کر غرضیاں اٹھا لیا۔ خط نکال کر زمین پر رکھ دیے اور پیچھے ہٹ بیٹھا۔ فوج کے نامور اشخاص آگے بڑھے لغافوں کو پڑھا۔ حرنے نے یہی دیکھا اور کہا ہم ان شخصوں میں نہیں ہیں

جنہوں نے یہ خط تحریر کیے ہیں۔ اور عبید اللہ بن زیاد نے میں حکم دیا ہے کہ آپ کو اس کے پاس لے جائیں۔

حسینؑ کا تنہم اور قصہ دانگی
امیر المومنین حسینؑ نے مسکرا کر کہا: ”تم یہ کام نہیں کر سکتے۔“
پھر حکم دیا کہ: ”عورتوں کو کجاووں میں سوار کرا دو۔ اور سوار ہو کر چلو۔
دیکھیں یہ لوگ ہمارا کیا کر سکتے ہیں۔“ لوگوں نے آپ کے حکم کے موافق اہل و عیال اور بچوں کو سوار کر دیا، اور چل نکلے۔
کئی لشکر نے راستہ روکا اور جانے سے مانع آئے۔

حسینؑ تلوار پر ہاتھ ڈالتے ہیں
اہل بیت کا راستہ روکتے ہی امام حسینؑ نے قبضہ شمشیر پر ہاتھ ڈالا،
اور کہا: ”اے ہمسرِ یزید! کس لیے تو ان لوگوں کو نہیں جانے دیتا
تیری ماں تیرے سوگ میں بیٹھے۔“ حرنے جواب دیا: ”یا ابن رسول اللہ! اگر کوئی اور شخص میری ماں کا نام لیتا تو میں تلوار کی
دھار سے جواب دیتا۔ مگر آپ اور آپ کے ماں باپ کی حرمت بہت بڑی ہے۔ کچھ نہیں کر سکتا۔ لیکن میں عبید اللہ کے
پاس ضرور لے چلوں گا۔“ حسینؑ نے کہا: ”میں ہرگز نہ جاؤں گا، اور تیرے ارادہ کی مجھے ذرا پرواہ نہیں۔ تو کیا کر سکتا
ہے۔“ حرنے کہا: ”اگر میری اور میرے لشکر کی جائیں بھی اس معاملہ میں جاتی رہیں تو بھی مجھے گوارا ہے۔ میں عبید اللہ

حسینؑ حر کو تنہا جنگ کے لیے بلاتے ہیں
کے پاس ضرور لے چلوں گا۔“ امام حسینؑ نے
کہا: ”اچھا اپنے لشکر سے نکل کر سامنے آ
اور میں بھی اپنے ہمراہیوں سے علیحدہ ہو کر تیرے سامنے آتا ہوں کہ دونوں آپس میں جنگ کر لیں۔ اگر تو نے مجھے مار ڈالا تو
تیرے امیر کی اور تیری مراد بر آئے گی اور تو مارا گیا تو خلقت تیرے بچے سے آزاد ہو جائے گی۔“

حر کا حکم اور ذاتی عقیدہ
حرنے کہا: ”یا ابا عبد اللہ! مجھے آپ سے جنگ و جدل کرنے کا حکم نہیں دیا
بلکہ یہ کہہ دیا ہے کہ آپ کے ساتھ سے علیحدہ نہ ہوں۔ یہاں تک کہ آپ کو
عبید اللہ کے پاس پہنچا دوں۔ خدا کی قسم مجھے سخت ناگوار ہے کہ کوئی ایسی بات کہوں یا کوئی ایسی حرکت کروں جو آپ کو نا
خوش معلوم ہو۔ مگر کہا کروں دوسرے کا مقرر کیا ہوا ہوں۔ اور محکوم مجبور ہوتا ہے۔ میں نے اس گروہ سے بیعت کر رکھی
ہے اور ان کے حکم سے آپ کے پاس پہنچا ہوں اور خوب جانتا ہوں کہ قیامت کے دن تمام خلقت کو آپ ہی کے نانا کی
شفاعت کی ضرورت پڑے گی۔ میں حیران و پریشان و خوف زدہ ہوں کہ آپ سے لڑنے کی نوبت نہ آنے پر شفاعت کی
امید کیا خاک ہو سکتی ہے۔ خدا بخواتمہ فحج سے کوئی ایسی حرکت سرزد ہوگی جس سے حضرت کے جسم مبارک کو کچھ تکلیف پہنچی
تو دنیا اور آخرت دونوں جگہ میرے واسطے خرابی موجود ہے۔ اور اگر آپ کو عبید اللہ بن زیاد کے پاس نہ لے جاؤں تو میں
کوفہ میں داخل نہیں ہو سکتا۔ ہاں دنیا و سیح ہے۔ خدا کی پناہ قیامت کے دن آپ کے نانا کی شفاعت سے عروم رہ جانے
کی نسبت بھی بہتر ہے کہ اور کسی طرف نکل جاؤں۔ آپ شارعِ عالم سے نہیں بلکہ کسی اور غیر مشہور راستہ سے کسی سمت
کو چلے جائیں بلکہ میں عبید اللہ کو لکھ دوں گا کہ حسینؑ کسی اور طرف چلا گیا، مجھے نہیں ملا۔ پھر تو مجھے آپ کے نانا کی
شفاعت کی کچھ امید باقی رہے گی اور اے حسینؑ میں قسم دلاتا ہوں کہ اپنی جان پر رم کرو کوفہ نہ جاؤ۔“

حضرت کا استفسار اور اشعار آپ نے کہا: ”اے مر کیا تو یہ بات اس لیے کہتا ہے کہ وہ مجھے مار ڈالیں گے؟“۔ مر نے کہا: ”ہاں اے منہ زند رسول، اس میں

ذرا بھی شک و شبہ نہیں ہے۔ آپ سلامتی سے مکہ کو واپس چلے جائیں۔“ ابن غلدون کے موافق مر کا کلام سن کر حضرت نے فرمایا: ”کیا تو مجھ کو موت سے ڈراتا ہے؟“ اور اس کے بعد یہ اشعار در زبان فرمائے:
 ماضی و ما فی الموت عار علی الفقی اذا ما نوى خيما و جاهد مسلما

(میں تو اپنا قصہ پورا ہی کرلوں گا اور مرنے میں جواہر کو مار نہیں ہے۔ جب اس نے نیکی کی نیت کر لی اور مسلمان ہو کر مجھ پر ہمدرد کیا)

و واسی رجالا صالحین بنفسہ و خالف مبشورا و فارق مجرما
 (اور اچھے لوگوں سے ہذاہد محبت پیدا کر۔ گردن زندیوں کی مخالفت کی اور ہانیوں کا ساتھ چھوڑ دیا)

فان عشت لم اندم و ان مت لم الم کفی بک ذلا ان تعیش و تروغما

(پس اگر میں زندہ رہا تو مجھے کچھ غم نہ ہوگا اور اگر مر گیا تو میں اپنی سلامت نہ کروں گا۔ تجھے ذلت کے لیے انتہائی کافی ہے کہ تو زندہ رہے اور تیری ناک رگڑی جلتی رہے)

کامل ابن اثیر کے موافق مر کے کلام پر حضرت نے فرمایا کہ: ”میں مجھ سے وہی کہتا ہوں جو بھائی عوسی نے کہا تھا

اپنے بن عم سے جب وہ حضرت رسول کا ارادہ کر رہا تھا کہ کہاں جاتا ہے قتل کیا جانے گا تو اس نے جواب دیا کہ: میں

جانوں گا اور موت سے کوئی مار نہیں جب کہ نیت خیر اور چلاؤ۔“ مر نے جب یہ سناتو ہٹ گیا۔

غالباً اسی موقع پر جب کہ مر ضد کر رہا تھا زبیر بن عقیل نے حضرت سے عرض کیا کہ اس وقت اجازت جنگ دیجیے

کیونکہ اس وقت لڑنا آسان ہے بہ نسبت ان فوجوں کے جو آ رہی ہیں۔ حضرت نے فرمایا کہ: ”تم کچھ کہتے ہو

لیکن ہم استدائیگ نہ کریں گے۔“ اس کے بعد یہ تصفیہ ہوا کہ حضرت اپنے

راستہ سے تشریف لے چلیں جو نہ موصل بہ حجاز ہو اور نہ موصل بہ کوفہ۔ (ابن غلدون)

وقتی تصفیہ

عذیب الہجانات رفتہ رفتہ عذیب میں پہنچے جہاں پر نعمان کی لاشیں چرا کرتی تھیں۔ کوفہ کے چار

آدی آتے ہوئے دکھائی دیے۔ جو تیز اوشنیوں پر سوار ناخ بن ہلال کے گھوڑے کے

پچھے تیزی کے ساتھ آ رہے تھے

طرماح بن عدی اور سوال رفاقت اور ان کے ہمراہ ان کا رہبر طرماح بن عدی بھی تھا حسین بن علی

کے قریب نہ پہنچنے پائے تھے کہ مر نے بڑھ کر کہا: میں ان کو

گرفتار کرلوں گا۔ یا کوفہ کی طرف لوٹا دوں گا۔ آپ بولے ایسا نہ ہونے پائے گا۔ یہ میرے معین و مددگار ہیں اور

میرے قائم مقام ہیں۔ اگر تم نے ان سے کچھ بھی قرض کیا تو ہمارے اور قتلے کوئی دقیقہ نہ اٹھ رہے گا۔ مر خاموش ہو

رہے۔ حسین بن علی نے ان لوگوں سے دریافت کیا تم ان لوگوں کا کچھ مال بتلاؤ جن (یعنی اہل کوفہ) کو تم چھوڑ آئے ہو۔

ان میں سے کچھ بن عبد اللہ الحارثی نے عرض کیا: ”شرطہ کوفہ کی رشوت خواری بڑھ گئی۔ دنیا کی طرح میں پڑے ہوئے

تشریح لے چلیے وہ ایک محفوظ مقام لب دریائے فرات واقع ہے۔ اگر وہ روکے گا تو ہم اس سے لڑیں گے۔ آپؐ نے مقام کا نام دریافت فرمایا۔ عرض کیا: ”کربلا نام ہے۔“ فرمایا: ”یہ زمین کرب و بلا کی ہے۔“ بعض مؤرخین کے موافق حضرتؐ نے اپنے پدر بزرگوار کا خواب بیان فرمایا۔ اور صاحب کنز العمال (از شہادت حسینؑ) کے موافق فرمایا: ”صدق رسول اللہ ﷺ ارض کرب و بلا۔“



jabir.abbas@yahoo.com

باب دہم

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ ۝ وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمُوتَ ۚ بَلْ أَحْيَاءٌ وَلَكِنْ لَا تَشْعُرُونَ ۝ وَلَتَبْلُوَنَّكُمْ بِشَوَاكُم مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنفُسِ وَالتَّمَرُّتِ ۚ وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ ۝ الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُمُ مُصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ ۝ أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ ۝ (۲: ۱۵۳-۱۵۷)

مشہد اعظم

۲ محرم ۱۰۶۱ شہینچ شنبہ
ابن خلدون کے موافق: ”یہ دن پنج شنبہ کا تھا اور محرم ۱۰۶۱
کی دوسری تاریخ تھی۔“ اعظم کئی کے موافق: اب دریائے
فات کے کنارہ اسباب اتارا گیا مجھے کڑے کیے گئے۔

مقام
بھائی اور چچا زاد بھائی ہر ایک اپنے اپنے واسطے غیمہ لگانے لگا حضرت کے غیمہ کے گرد
اسباب اور اعزاء کے مجھے کڑے ہو گئے سب تو اپنے غیمہ میں آرام سے لیٹ رہے اور
امام حسینؑ اپنی تلوار کی مغالی میں مصروف ہوئے۔ غلام ابوذر غفاریؓ آپ
حضرت کا شغل اور اشعار کے پاس حاضر تھا اور حضرت بحالت فکر یہ اشعار پڑھ رہے تھے: ۷

یا دھر ان لك من خليل
من طالب و صاحب قتيل
و كل حي سالك السبيل
د انما الامر الى الجليل
كم لك بالاشراق و الاصيل
ما اقرب الوعد من الرحيل

(اے زمانہ تجھ ایسے دوست پرانے ہے۔ کتنے لوگ اپنے حق کے طلب کرنے والے صبح و شام تجھ میں قتل ہوتے ہیں۔
کیا کوچ کا وعدہ قریب پہنچ گیا ہے۔ کل زندہ راہ پر چل رہے ہیں اور یقیناً سب امر خدا کی طرف ہیں)

حضرت زینبؑ سنتی ہیں
آپؑ کی بیہوش زینبؑ اور ام کلثومؑ نے آواز سن کر کہا: ”اے بھائی! یہ کس کی
آواز ہے جو اپنے قتل کا یقین کیے ہوئے ہے۔ حضرت نے فرمایا: ”اے بہن! یہ

”لوحك القطا لنام“۔ تاریخ کمال کے موافق: یہ اشعار سن کر حضرت زینبؑ نے فرمایا: ”کاش موت آج میری حیات
کو معدوم کر دیتی۔ اے غلیظ گروے یودوں کے اور نشان پھیلوں کے۔“ حضرت نے فرمایا: ”اے بہن! تمہارے علم اور بردباری کو
شیطان نے نہ جانے۔“ حضرت زینبؑ نے فرمایا: ”میرے ماں باپ فرما ہوں کیا آپؑ اپنے نفس کے فدیہ کرنے کا قصد
کر لیا ہے۔“ حضرت کی آنکھ ڈھنڈھا آئی۔ حضرت زینبؑ بے ہوش ہو کر گر پڑیں۔ حسینؑ کڑے ہو گئے اور ہائی چڑھا۔

نزل کے وقت کے الفاظ صاحب نور العین اس وقت کے متعلق لکھتا ہے کہ: جب حضرت نے نزل فرمایا کہتے جاتے تھے کہ: ”یہی ہمارے قافلہ کی فرودگاہ ہے۔ اسی جگہ ہمارے خون بہانے جائیں گے۔ اسی جگہ ہمارے حرم قہر کچے جائیں گے۔ اسی جگہ ہمارے آدمی قتل ہوں گے۔ اسی جگہ ہم معزز لوگ ذلیل ہوں گے۔ واللہ اسی جگہ میری رگیں کٹیں گی اور میری داڑھی خون میں رنگی جائے گی۔ آسمان کے فرشتے میرے نانا اور والد اور ماں سے ماتم پری کریں گے۔ واللہ اسی جگہ کاودہ میرے نانا سے اللہ تعالیٰ نے کیا ہے اور اس کاودہ خلافت نہیں ہوتا۔“

حضرت علی بن الحسینؑ لکھا ہے علی بن الحسینؑ کہتے تھے کہ میرے والد نے جب یہ باتیں کہیں تو میری آنکھوں میں آنسو ڈھنڈا آئے۔ میں تو خاموش رہا مگر میری پھوپھی نے جب یہ باتیں سنیں تو نہایت اندوہ میں اور خائف ہوئیں۔ اور دامن سمیٹ کر ان کے پاس گئیں اور کہا: ”اے میری آنکھوں کے تارے، اے غلیظہ الما منین وعلیہ الباقین، یہ باتیں تم نے ایسی کہی ہیں جیسے موت کا وقت قریب آ گیا ہے۔“

حضرت سچھاتے ہیں اور وصیت فرماتے ہیں اس کے بعد جب عہد راتِ صحت پر عالمِ حزن طاری ہوا تو اعظم کوئی کے موافق: حضرت نے فرمایا: ”اے خواہر صبر کرو اور مرضی الہی پر راضی رہو۔ کیونکہ خدا نے تعالیٰ نے زمین سے لے کر آسمان تک کسی شے کو ہمیشگی کی زندگی عطا نہیں کی نہ کسی کو عطا کرے گا سب فنا ہو جائیں گے۔ صرف ایک ذات پاک خدا کے سوا تمام مخلوقات پاک ہونے والی ہے۔ سب کو اس نے اپنی قدرتِ کاملہ سے پیدا کیا ہے اور سب کو اپنی مرضی اور ارادہ کے موافق نیست و نابود کر دے گا۔ میرے نانا، ماں، باپ، اور بھائی مجھ سے بہتر اور زیادہ عزیز تھے۔ اسی طرح وہ بھی جامِ فنا کی کڑی میں مل گئے۔ تمام دنیا والوں کو حضرت محمد مصطفیٰؐ ہی کی وفات کا خیال اپنی موت پر صبر دلاتا ہے۔“ پھر ارشاد کیا: ”اے بہنو، اے ام کلثوم، اے زینب اور اے فاطمہ! جب مجھے مار ڈالیں تو ہرگز کڑے نہ پھاڑنا، ٹھہ نہ لوچنا، اور ایسے کلمے زبان سے نہ نکالنا جن سے خدا راضی نہیں ہے۔“

عر ابن زیاد کو اطلاعی خط بھیجتا ہے اس مؤرخ کے موافق: عر نے حضرت کے غموں کے برابر اپنا غم لکھا اور عبید اللہ بن زیاد کو خط لکھ کر حسینؑ کے وارد کر بلا ہونے اور قیام کرنے سے مطلع کیا۔

حضرت کے پاس ابن زیاد کا خط عبید اللہ بن زیاد نے امام حسینؑ کو خط لکھا کہ: ”اے حسین! میں نے سنا ہے تم نے کربلا کے مفصل قیام کیا ہے۔ اور آج ہی نذیر کا خط میرے پاس پہنچا ہے اور حکم دیا ہے کہ جب تک آپ کو داخل حق نہ کر دوں نہ بستر پر سوؤں نہ کھانے کا مزاج کھوں۔ یا آپ اس کی فرمانبرداری اختیار کر کے بیعت کریں۔ والسلام

جواب جب یہ خط آپ کے پاس پہنچا پڑا کہ ہاتھ سے ڈال دیا اور کہا: ”وہ قوم ہرگز ظہر نہ پائے گی جو مخلوق کی رضامندی کے لیے خالق کی ناراضی اختیار کرتی ہے۔“ عبید اللہ کے قاصد نے خط کا جواب مانگا۔ آپ نے

نسباً: ”اس کا کچھ جواب نہیں۔ وقد حقت علیہ عذاب العذاب“۔

ابن زیاد کا لوگوں سے مخاطبہ
 فامد جواب لیے بغیر واپس گیا اور جو کچھ دیکھا اور سنا تھا ابن زیاد سے بیان کر دیا۔ وہ زیادہ غضب ناک ہو کر اپنے ملازموں اور دوستوں

سے بولا کہ: ”حسینؑ کو جس طرح ہو سکے قتل ہی کر دینا چاہیے۔ تم میں سے کون اس خدمت کو اپنے ذمہ لیتا ہے۔ اور حسینؑ کو قتل کرتا ہے۔ میں اس کے صلہ میں جو جاگیر اور علاقہ مانگوں گے دوں گا۔ کسی شخص نے اس بات کا کچھ جواب نہ دیا۔ اسی دن عمرو بن سعد (مؤلفہ میری تاریخ میں ان مواقع کا ذکر کیا گیا ہے جہاں جہاں یہ دکھائی دیا ہے) کے نام ایک فرمان جاری کیا اور شہر رے اور اس کا نواح حطا کر کے حکم دیا کہ وہاں جا اور غریبوں کو دور کہ عمرو بن سعد نے فرمان لے کر اس طرف جانا چاہا۔ ابن زیاد نے کہا: ”اے عمر تو نے دیکھا کہ کسی نے حسینؑ سے جنگ کرنے کا ارادہ نہیں کیا۔ بہتر ہے کہ تو اس مہم کو انجام دے۔ اور حسینؑ سے لڑنے کے واسطے جا اور اس طرف سے مجھے مطمئن اور فارغ کر کے پھر شہر رے کی حکومت پر جانا۔“ اس نے کاپ کر کہا: ”اے امیر! اگر تو مجھے حسینؑ بن علی کے مقابلہ پر جانے سے معاف رکھے تو بہت ہی بڑا احسان مانوں گا۔“ ابن زیاد بولا: ”اچھا میں نے معاف کیا۔ مگر یہ فرمان واپس دے کر اپنے گھر میں ہو بیٹھ۔ کیونکہ یہ علاقہ اسی شخص کا حق ہے جو حسینؑ بن علی کا کام تمام کرے گا۔“ عمر نے کہا: ”تو مجھے ایک دن کی مشقت دے کہ اس امر کو اچھی طرح سمجھ لوں۔“

ابن زیاد نے اجازت دی اور عمر نے اپنے گھر آکر دوستوں عزیزوں اور بھائی بندوں سے مشورہ کیا۔ کسی نے اچھا نہ جانا کہ وہ حسینؑ کے قتل کے واسطے جانے سب نے اسے ڈرایا۔ مزہ بن مقیرہ جو اس کی بہن کا بھائی تھا اس کی طرف متوجہ ہو کر بولا: ”ہرگز تو حسینؑ سے لڑنے اور اسے قتل کرنے کا فعل اپنے ذمہ نہ لینا۔ ورنہ تو گناہ عظیم کا مرتکب ہو گا۔ خدا کی قسم اگر دنیا میں تیرے پاس کچھ بھی باقی نہ رہے تو اس سے بہتر ہے کہ تو آخرت میں حسینؑ کا خون اپنی گردن پر لے جانے۔“ عمر سن کر خاموش تھا اور اس کا دل حکومت رے سے باز نہ آتا تھا۔ دوسرے دن بوقت صبح ابن زیاد کے پاس آیا۔ اس نے پوچھا: ”تیری کیا رائے قرار پائی؟“ کہا: ”اے امیر! تو نے پہلے انعام حطا کیا۔ بعد حسینؑ بن علی کا تذکرہ کیا۔ لوگ مجھے مبارک باد دے چکے۔ اگر تو آج فجر سے فرمان واپس لے لے گا تو مجھے نہ امت حاصل ہوگی۔ تو میرا ہانی فنا کر مجھے قتل حسینؑ کے واسطے نہ بھیج۔ اور رے کی حکومت میرے پاس رہنے دے۔ کوفہ میں اور بہت سے نامور سردار، اسماء بن خارجہ و محمد بن اشعث اور کثیر بن شہاب وغیرہ موجود ہیں۔ ان میں سے ہر شخص اس خدمت کو منظور کر کے امیر کے دل کو اس طرف سے مطمئن اور فارغ کر دے گا۔ براہ میرا ہانی مجھے امام حسینؑ کے قتل سے معاف رکھ۔“

دھمکی اور منظوری
 ابن زیاد نے کہا: ”تو میرے سامنے سردار ان کوفہ کا نام لیتا ہے۔ وہ سب میری نظر میں ہیں۔ اگر تو اس فکر سے مجھے مطمئن کر دے گا تو میرے نزدیک تو بہت عزیز ہو گا۔“

ورنہ رے کا فرمان واپس کر کے اپنے گھر جا بیٹھ۔ پھر میں تجھے کسی کام کی تکلیف نہ دوں گا۔“ عمر سن کر چپ ہو رہا اور ابن زیاد نے زیادہ ناراض ہو کر کہا: ”اگر تو نہ جانے گا اور حسینؑ سے جنگ کر کے میرا حکم بجانہ لانے کا تو میں تجھے ابھی قتل کر ادوں گا۔ اور گھر لٹا دوں گا۔ بعد میں کچھ ہی کیوں نہ ہو۔“ عمر نے کہا: ”جب معاملہ کی یہ صورت آ پڑی اور ضرورت

لاحق ہو گئی میں امیر کا حکم بجالاؤں گا۔ پھر زیاد نے اس کی تعریف کی اور انعام و اکرام میں اور بھی ترقی کر کے چار ہزار سوار ہمراہ کر دیے

ابن سعد کے چار ہزار سوار

اور رے کی حکومت برقرار رکھی۔

ابن خلدون کے موافق: سعد ابن ابی وقاص کا بیٹا رات بھر بڑا ہوا سو چار ہزار مسیح کو ذیل کے اشعار پڑھتا ہوا ابن زیاد کے پاس گیا: ۛ

ا احرك ملك الري و الري رغبة
و قتله النار التي ليس دونها
ام ارجع مذموماً بقتل حسين
جباب و ملك ري قررة عين

(کیا میں ملک رے کو چھوڑ دوں اور ملک رے ہی کی بجائے خواہش ہے۔ یا حسین کو قتل کر کے میں مذموم واپس آؤں۔ لیکن ان کے قتل کرنے میں میں دوزخ میں جاؤں گا۔ جس کا کوئی مانع نہیں ہے اور ملک رے کی حکومت میں میرے آنکھوں کی ٹھنڈک ہے) ابو اہق اسفرائی نے یہ چند اشعار اس کے بعد زیادہ لکھے ہیں: ۛ

امید مغفرت کا وقت

الا انما الدنيا لخير معجل
و لكن رب العرش يغفر ذلک
و ما قاتل باع الوجود بدین
و لو كنت فيها اظلم الثقلين

(یاد رکھو دنیا بہت اچھی ہے جو جلد حاصل ہوتی ہے اور اصل مسند تقد کو امداد کے عوض نہیں دیتا۔ ہاں اللہ میرے گناہ کو بخش دے گا۔ گو میں اس کام سے جن دوائس میں سب سے بڑھ کر ظالم بن جاؤں)

ابن خلدون اور کامل ابن اثیر دونوں کے موافق: ابن سعد نے اس وقت قتل حسین کے لیے جانے کا تصفیہ کر دیا جب ابن زیاد نے کہا کہ: ”تیں مشورہ نہیں چاہتا، نہ میں تیرا مطلع ہوں، اور نہ تجھ کو اس امر پر مجبور کرتا ہوں۔ اگر تو نہیں جانا چاہتا تو سند گورزی واپس کر دے۔“

روضۃ الشہداء کے موافق: خلعت، گھوڑا نایع سلمان زری، اور ”پچاس غروار زر“ بھی دیا۔

ابو عننف کے نزدیک جب عمرو بن سعد گھر آیا تو اولاد مہاجرین اور انصار اس کے پاس آئے، اور کہا: اے ابن سعد! تو حسین سے جنگ کرنے جاتا

مہاجرین و انصار کی اولاد

ہے، حالانکہ تیرا باپ سادس الاسلام اور صاحب بیعت رضوان تھا۔

اب قول ابن خلدون: ”عمرو بن سعد نے حکومت رے کی طرح میں پڑ کر امام حسین کے مقابلہ پر جانا منظور کر لیا۔ چنانچہ انھیں چار ہزار فوج کو لے کر اپنے اپنے آپ کے مقابلہ پر جانچا۔“ اعثم کوئی کہتا ہے کہ ابن زیاد نے ”اے سخت تاکید کی کہ ہرگز ہرگز حسین بن علی اور ان کے اصحاب دریائے فرات کے پاس تک نہ آئے پائیں۔ اور ایک گھوٹ پانی نہ پنی سکیں۔“ عمر نے کہا: ”تیں ایسا ہی کروں گا۔“

جس وقت عمرو بن سعد چار ہزار سوار لے کر کربلا میں پہنچا، ہر ایک ہزار سوار لے کر اس کے ساتھ جاملے۔ عمر نے اپنے ایک ہمراہی عمر بن قیس امینی

ہر کے ایک ہزار سوار

کو بلا کر کہا کہ: حسینؑ کے پاس جا کر دریافت کر کہ تمہکے سے جو امن و امان اور حرمت کا مستام ہے کیوں لٹے اور میدان کربلا میں آئے۔ (ابوحنیفہ)

کثیر بن شہابؓ اس نے کہا: اے امیر! افسوس! دنوں میں میرے اور ان کے خلاف کتبت ہوئی رہی ہے اور میں نے ہر قسم سے ان کی دوستی اور محبت کے دعوے کیے تھے۔ وہ پورے نہ ہو سکے اس لیے مجھے آپ کے سامنے ہونے سے شرم آتی ہے۔ عمر نے کہا میں نے تجھے اس خدمت سے معاف کیا۔ پھر ایک شخص عبد اللہ سبئی کو بلا دیا۔ یہ شخص بڑا پہلور تھا۔ حاضر ہوا تو کہا امام حسینؑ کے پاس جا کر پوچھ تم کس لیے مکہ جیسے مقام امن سے نکل کر اس دشت کربلا میں آئے اور یہاں قیام کرنے سے تمہارا کیا مطلب و مدعا ہے۔ سبئی مکتون جو خاندان رسالت کا سخت ترین دشمن تھا۔ بولا اسی طرح ہم یہاں آئے۔

اصحاب نے قاصد کو حضرت تکمیلؑ نہ جانے دیا پھر آنحضرتؐ کے خیمہ کی طرف چلا۔ قریب پہنچا تو ابو ثمامہ صاعدی نے دیکھ کر حضرتؐ سے عرض کیا:

یا ابا عبد اللہ! میری جان آپ پر خدا جو خاندانِ مصطفیٰ کا سب سے بڑا دشمن جو روئے زمین پر موجود ہے اور خلائق میں برترین شخص ہے اس طرف آ رہا ہے۔ آپ یہ سن کر کھڑے ہو گئے اور اس کی طرف نظر کر دیا۔

ابو ثمامہ نے کہا تلوار ہاتھ سے رکھ کر آگے بڑھا۔ اور جہات کہنی جو عرض کر سبئی نے کہا میں اپنی ہوں ایک پیغام لایا ہوں۔ اگر سنو تو بیان کروں مگر تلوار ہاتھ سے علیحدہ نہ کروں گا۔ ابو ثمامہ نے کہا تلوار مجھے دے میں حفاظت سے رکھوں گا۔ اور جب پیغام پہنچا کر تو داہیں جانے کا تہیہ کر دیا۔ اس نے کہا میری تلوار تک کسی کا ہاتھ نہیں ہا سکتا اور نہ میں کسی کو دوں گا۔ ابو ثمامہ نے کہا اسی جگہ ٹھہر کر جو پیغام دینا ہے امام حسینؑ کو سنلو۔ سبئی نے کہا ایسا نہیں ہو سکتا اور ناراض ہو کر داہیں چلا گیا۔ عمرو بن سعدؓ سے کہا مجھے امام حسینؑ کے پاس جانے نہیں دیا کہ پیغام پہنچاتا۔

ابوحنیفہ کے نزدیک عمرو بن سعدؓ نے کثیر بن شہابؓ کو بھیجا تھا۔ اور اسے دیکھ کر زبیر بن عیینہ نے کہا: ”جھگڑا رکھ دے اور داخل ہو۔ اس نے کہا: ”نہیں ایسا نہ کروں گا۔“۔ تو زبیر نے کہا: ”داہیں جا۔ جس طرح آیا ہے۔“۔ کثیر داہیں ہوا اور اپنی سہ کو خبر دی۔

اب عمرو بن سعدؓ نے قرہ بن قیس حلی کو بھیجا۔ جب قرہ آیا امیر المومنین نے اسے دیکھ کر اصحاب سے پوچھا تم اسے پہچانتے ہو۔ یہ کون شخص ہے۔ حبیب بن مظاہر اسدی نے کہا میں جانتا ہوں وہ بنی تمیم میں سے ہے اور اچھے اعتقاد والا ہے۔ میرا خیال تھا کہ وہ بھی اس لشکر کے ساتھ آیا ہو گا۔ انحضرتؐ نے اسے معاف کر دیا۔ اس کے بعد جواب میں حضرتؐ نے وہ واقعات بیان فرمائے جیسا اس کے پہلے فرما چکے تھے۔ مخصوص بات یہ فرمائی کہ آج زمانہ کارنگ و گرگوں دیکھ کر وہ (اہل کوفہ) اپنے قول و قرار سے پھر گئے اور اپنے وعدوں سے شرمندہ ہو کر محزون ہو بیٹھے۔ اب میرا ارادہ ہے کہ مراجعت کر کے مکہ کو چلا جاؤں۔ (ابن خلدون)

قاصد نے عمرو بن سعدؓ سے حضرتؐ کا قول نقل کیا، اور کوئی عجب نہیں ہے کہ عمر بن سعدؓ اس خیال سے اپنی گرانی میں کمی دیکھتا ہو کہ ناسر رسولؐ سے جنگ کی نیت نہ آئے گی۔ اب ابن سعدؓ نے یہ تمام واقعات ابن زبیرؓ کو لکھے۔

عمرو بن سعد کا صلح کا خط اور ابن زیاد کا خیال

ابو عتف کے نزدیک عمرو بن سعد نے دوسرا قاصد بنی غنیمہ میں سے بھیجا تھا جب یہ حضرت کے پاس پہنچا تو دست دہائے مبارک کو بوسہ دیا اور عرض کی کہ یا مولا آپ اس طرف کس طرح تشریف لائے ہیں۔ فرمایا تم نے بلایا تھا کہا خدا ان پر لعنت کرے جنہوں نے آپ کو لکھا تھا آج وہ خواص ابن زیاد ہیں۔ فرمایا جا اور ابن سعد کو اس کی خبر کہہ کیا مولا وہ کون ہے جو بہشت پر دوزخ کو اختیار کرے۔ واللہ میں اب علیحدہ نہ ہوں گا جب تک آپ کے سامنے مارا نہ جاؤں۔ فرمایا خدا تجھے اپنے قریب کرے جس طرح اس نے میں تجھ سے قریب کیا۔

ابن زیاد ابن سعد کا خط پڑھ کر کچھ دیر تک سوچتا رہا اور بلا اس ہمارے بچے میں پڑ کر واپس جانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ یہ چلا ہو گا کہ اس حیلہ سے ہمارے ہاتھ سے بچ کر نکل جائے۔ جواب لکھا: ”اس کی باتوں پر ذرا توجہ نہ کر اس خط کے دیکھتے ہی حسین سے یزید کی بیعت کے لیے کہہ۔ اگر وہ منظور اور قبول کر کے بیعت یزید اختیار کر لے تو مراد بر آئی، ورنہ جس طرح ہو سکے اسے میرے پاس پہنچا۔“

بیعت کے بعد بھی ”پھر“ ہے

کمال ابن اثیر کے موافق ابن سعد کا خط پڑھ کر ابن زیاد نے یہ شعر پڑھا کہ: جب جنگ پھرا مضبوط ہو گیا تو اب چھٹکارا چاہتا ہے۔ مالک یہ نہیں ہو سکتا اور اس کے بعد ابن سعد کو لکھا کہ: بیعت یزید پیش کر۔ اگر منظور کرے تو پھر ہم دیکھیں گے۔ اب قبول اعظم کوئی ابن زیاد نے دوسرے دن جامع مسجد کوفہ میں

ابن زیاد یزید کی تعریف کرتا اور لوگوں کو لانچ دیتا ہے

جا کر لوگوں کو طلب کیا جب سب حاضر ہو گئے منبر پر چڑھ کر حمد و ثناء الہی کے بعد مصلیٰ پر درود بھیجا اور کہا: ”اے لوگو! تم نے اکثر دفعہ آل ابونخیل کو آسا لیا ہے۔ ان کو ظاہر و باطن، سختی اور نرمی ہر حالت میں دیکھ لیا ہے کہ تمہاری دلداری کرتے رہے ہیں۔ یزید کی نیک فتنی، نیک چلتی اور خوش اعتدالی سے اور رعیت کے حق میں اس کے لطف و کرم اور جود و سخا، رحم و انصاف اور حسن سلوک سے بھی تم آگاہ ہو۔ تمام اقسام کے فتنہ و فساد اور بلاؤں کو انتظام سلطنت کے واسطے دور کیا اور ہر طرف راحت و آرام کا دور ہو گیا۔ راستوں کا خطرہ جاتا رہا۔ اپنے زمانہ میں مفسد اور سرکشوں کے قتلے مسمار کر دیے۔ مال و دولت کی کثرت، محاصل کی فراوانی، ہر قسم کی برکتوں کا نزول، تنخواہوں اور وظیفوں کی ترقی، معاش اور رزق کے طریقوں کا دواہی انتظام جو محض اس کے اخلاق حسنہ اور ملامت کریمانہ سے وقوع میں آئے ہیں تم سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ آج اس کا فرمان آیا ہے۔ مجھے حکم ہے کہ تمہارے حال پر زیادہ مہربانی کرو۔ تنخواہوں اور وظیفوں میں ایک دینار کی جگہ سو نو دینار بڑھا کر تمہیں اس کے دشمن حسین بن علی سے لڑنے کے لیے بھیجوں۔ تم ان باتوں کو سن رکھو اور اطاعت و فرمانبرداری سے پیش آؤ۔“

مددگار فوجیں

منبر سے اتر کر حکم دیا کہ فوجوں کو زور مال اور رسد کا سامان عطا کیا جائے کہ وہ جنگ کی تیاریاں کر کے دشت کربلا میں عمرو بن سعد سے جا ملیں۔ حسین بن علی سے لڑنے کے لیے جو نامور شخص آئندہ ہوا وہ شمر بن ابیوسف تھا چار ہزار سوار لے کر عمرو بن سعد سے جا ملا۔ اب اس کے پاس نو ہزار سپاہ ہو گئے۔

زید بن رکاب کئی دو ہزار کی جمعیت لے کر گیدا اس کے پیچھے ہی چلے ایک سردار حسین بن نمیر سکونی چار ہزار آدمی لے کر پہنچا معاصر بن مزنیہ مازنی تین ہزار، ایک اور شخص دو ہزار کی جمعیت سے جا ملا۔ پھر اور سردار یکے بعد دیگرے روانہ ہوئے۔ عمرو بن سعد کی فوج کی تعداد بیس ہزار ہو گئی۔

ثبت ربیع ایک ہزار سوار اب عبید اللہ نے آدمی بیچ کر ثبت ربیع سے کہا بھیجا حسین بن علی سے جنگ کرنے کے لیے مستعد ہو جا۔ وہ سخت ناراض ہوا۔ کوئی بہانہ نہ پایا۔ انجام کار اپنے آپ کو مرض بنایا اور جواب میں کہا بھیجا کہ میں امیر کا فرمانبردار ہوں مگر مجھے صنعت لاحق ہے۔ مہربانی فرما کر مجھے اتنی ٹھٹھ دی جانے کہ عارضہ جاتا رہے۔ جس وقت صحت حاصل ہوگی امیر کے فرمانے کے مطابق جا کر خدمت بجا لاؤں گا۔ عبید اللہ نے لکھا تیری بیماری کا حال مجھے خوب معلوم ہے۔ بیمار نہ بن اور اس گروہ میں شامل نہ ہو جس کی نسبت کلام مجید میں خدا فرماتا ہے: **وَإِذَا لَقُوا الَّذِينَ آمَنُوا قَاتِلُوا آمَنًا طَعًا وَإِذَا خَلَوْا إِلَىٰ شُيُطَانِهِمْ فَلَا وَتَأْتِيكُم مَّعَكُمْ لَا يَأْتِيكُم مِّنْهُمْ عُنُودٌ** (۲: ۱۷) اگر حسین سے لڑنے اور عمرو بن سعد سے جاننے کے ساتھ میری فرمانبرداری مد نظر ہے تو بلا عذر بجلت تمام چل جا۔ یہ پیغام سن کر ثبت کچھ گیا کہ بہانہ کار گرنہ ہو گا۔ اور عبید اللہ میری بناوٹ سے واقف ہو گیا ہے۔ ڈرا نماز عشا کے وقت کہ اس کے چہرہ اور رنگ کو تمیز نہ کر سکے۔ عبید اللہ کے پاس گیدا وہ اسے آنے دیج کر خوش ہوا۔ مرہا کہہ کر اپنے پاس بٹھالیا اور کہا لازم ہے کہ تو آج رات ہی کو سلمان سفر درست کر کے علی الصبح ایک ہزار سواروں کے ساتھ جلد جا اور عمرو بن سعد سے جا مل۔ ثبت نے کہا امیر کا جو حکم ہے اسے بجالاؤں گا۔ دوسرے دن صبح کے وقت ایک ہزار سوار لے کر چلا گیا۔

حبار بن حر کے ایک ہزار (کل بائیس ہزار) عبید اللہ نے ایک ہزار سوار اور فراہم کر کے حجاز بن حر کو ان کا سردار مقرر کیا اور حکم روانگی دے دیا۔ الغرض عمرو بن سعد کی فوج میں بائیس ہزار سوار اور پیدل ہو گئے۔

ابن سعد کے نام خط اب عبید اللہ نے عمرو بن سعد کو خط لکھا کہ: ”حسین سے جنگ کرنے کے لیے اب کوئی بہانہ نہیں رہا۔ فوج کی کمی کی حکایت تھی، سو اب وہ بھی نہیں رہی۔ تیرے پاس بائیس ہزار سوار و پیدل کی جہاز فوج موجود ہے۔ جو ہر طرح سے ساز و سامان اور اسلحہ سے مکمل اور آراستہ ہے۔ اب تیرا انتظام درست ہو گیا لازم ہے کہ تمام حالات سے جو سامان حسین کے ساتھ تھے پیش آئیں مثل جنگ و جدال وغیرہ سب سے مجھے مطلع کرتا رہے۔ ہر روز صبح و شام کے وقت میرے پاس تیرے قاصد پہنچتے رہیں۔ اور تیری تحریریں مشکل حالات و واقعات مجھے ملتی رہیں۔ اس انتظام کو نہایت ضروری اور فرض سمجھنا۔ والسلام“

غرض اس قسم کی اور ضروری تاکیدیں لکھ کر اور متعدد قاصد بھیج کر عمر سعد کے حالات سے مطلع ہوتا، اور اس مہم سے بر صحت و عجلت فارغ ہونے کی تنبیہ کرتا رہا۔

صاحب روضۃ الغضا کہتا ہے کہ: ”اگرچہ ابن زیاد جامعیت کثیر کو حسین سے جنگ کے لیے بھیجتا تھا۔ لیکن اکثر لوگ کردہ کج کر واپس آتے تھے۔

واپس آنے والوں کی سزا

جب ابن زیاد کو معلوم ہوا تو اس نے سعد بن عبدالرحمن کو حکم دیا کہ وہ کوفہ کے محلوں میں گشت کرے اور محفل کر لے والوں میں سے جسے دیکھے میرے پاس بھیج دے سعد نے ایک شاہی کو دیکھا جو ابن سعد کے لشکر سے اپنی میراث لینے کوفہ واپس آیا تھا۔ سعد نے اسے دارالامارت بھیج دیا۔ ابن زیاد نے اس کے قتل کا حکم دیا۔ یہ سیاست دیکھ کر جو لوگ واپس آئے تھے وہ ابن سعد کے پاس چلے گئے۔

اس کے بعد قبولِ روحۃ الشفا: ابن زیاد نے عمرو بن سعد کو لکھا کہ حسینؑ کو نہر فرات سے اس بہانہ سے دور رکھنا کہ بنی ہاشم نے عثمان سے پانی روک لیا تھا۔

اعظم کوئی کے موافق ابن زیاد نے تاکید کی کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ حسینؑ بن علیؑ اور ان کے ہمراہیوں نے کنوئیں کھود کر پانی حاصل کیا ہے۔ اور انھیں کوئی تکلیف اور دقت پیش نہیں آئی ہے۔ اس قاصد کے پہنچنے ہی حسینؑ بن علیؑ اور ان کے دوستوں کو کنوئیں کھودنے سے روک دے۔ اور ایک قطرہ پانی حاصل نہ کرنے دے۔ جس طرح انھوں نے عثمان کو پانی نہیں دیا تو بھی ان کو پانی کا ایک قطرہ دریائے فرات سے نہ پینے دے۔ اس حکم کے پہنچنے ہی اس نے حسینؑ بن علیؑ کے غلات زیادہ سخی اور سختی اختیار کی اور دریائے فرات پر پہرے بٹھادیے کہ ان کی نظر تک پانی پر نہ پڑے۔ پھر اپنے گردہ میں سے عمر بن عجاج الزبیدی کو سوار اور پیدل دے کر کہا کہ تو فرات کے کناروں کی حفاظت کر اور حسینؑ یا کسی ہمراہی کو ہرگز ایک قطرہ نہ لینے دے۔ پھر ایک اور شخص کو بلا کر منادی کراوی کہ اے پیر فاطمہؑ فرزند رسول خداؐ تجھے اس پانی کا ایک قطرہ نصیب نہ ہوگا۔ تا وقتیکہ موت کا زائفہ چکھے گا یا شہید اللہ ابن زیاد کی فساد پر داری نہ کرے گا۔

اور ابواحق اسمرانی کے موافق وہ جو ابن سعد کی مدد کو آئے تھے دریائے فرات اور امام حسینؑ رضی اللہ عنہ کی فرودگاہ کے درمیان جاتے۔ عمرو بن سعد نے حبرین صحر کو بلا کر ایک جھنڈا دیا اور دو ہزار سوار ساتھ کیے اور حکم دیا کہ فلاں راستہ کی حفاظت کر حسینؑ اور اس کے ساتھیوں کو فرات کا پانی پینے سے روکتے رہو اور ابن ربیع کو ایک جھنڈا اور چار ہزار سوار دے کر دوسرے راستہ پر تعینات کیا اور حکم دیا کہ تم اوہر سے حسینؑ اور اس کے ساتھیوں کو پانی پینے سے روکنے۔ یہ دونوں فوجیں اپنے مقام پر آئیں اور امام حسینؑ کو پانی پینے سے روکنے لگیں۔

حضرت کا مخاطبہ جب امام حسینؑ رضی اللہ عنہ نے یہ حال دیکھا تو ان لوگوں کے قریب گئے اور تلوار ٹیک کر کھڑے ہو گئے اور فرمایا اے لوگو تم مجھے جانتے ہو؟ انھوں نے کہا: ہاں۔ فرمایا: میں کون ہوں؟ کہا: تم حسینؑ بن علیؑ مرتضیٰ ہو۔ فرمایا: میرے نانا کون ہیں؟ کہا: محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔ فرمایا: میری ماں کون ہیں؟ کہا: فاطمہؑ زہرا ہیں۔ فرمایا: جب تم کو یہ سب کچھ معلوم ہے تو پھر کیوں کر میرا خون بہانا چاہتے ہو اور کس لیے مجھے پانی سے روکتے ہو۔ حالانکہ میرے والد حوض کوثر کے ساتھی ہوں گے۔ اور قیامت کے روز ان کے ہاتھ میں لوائے حمد ہوگا۔ اور میرے نانا سے مروی ہے کہ حسنؑ و حسینؑ جنتی جوانوں کے سردار ہیں۔ اور انھوں نے فرمایا ہے کہ اے جن و انسان کی جماعت میں تم میں اللہ کی کتاب کو اور اپنے عزیز اور اہل بیت کو چھوڑ چلا ہوں اور واللہ ہم ہی اس حضرت کے عزیز اور اہل بیت ہیں۔

ان لوگوں نے کہا ہم یہ سب جانتے ہیں مگر ہم تم کو پیاس کے ساتھ مارے بغیر نہ چھوڑیں گے۔ امام حسینؑ رضی اللہ عنہ

نے فرمایا میں پناہ مانگتا ہوں اللہ کی جو میرا اور تمہارا پروردگار ہے۔ ہر منکبر شخص سے جو یوم الحساب پر ایمان نہیں رکھتا۔ پھر واپس آئے اور اپنے عیال کے خیمہ میں چلے گئے۔ اس وقت ان کو سخت پیاس لگی ہوئی تھی۔ جب عورتوں نے ان کی یہ حالت دیکھی تو روئے فکیم آپ نے فرمایا خاموش رہو۔ کیونکہ ردنا تمہارے آگے ہے۔ پھر آپ ان کے پاس بیٹھے رہے یہاں تک کہ رات آگئی۔

۷۔ تاریخ اس کے بعد یا اس کے کچھ قبل عمر بن الزبیدی بھی پانچ سو سواروں سے نہر فرات پر منتھین کیا گیا اور یہ لوگ فرات اور امام حسین کے درمیان حائل ہو گئے۔ یہ واقعہ آپ کی شہادت سے تین روز پہلے کا ہے۔ (ابن خلدون)

۸۔ تاریخ حضرت عباسؓ پانی لانے روئے الشہداء، تاریخ کامل، روئے العفّاء، ابن خلدون اور اعظم کوئی سب نے لکھا ہے کہ اس کے بعد (فلاں آشوبی تاریخ کو) حضرت عباسؓ بن علیؓ پانی لانے میں اعظم کوئی کی صراحت کو پسند کرتا ہوں کہ جب حسینؓ اور اصحاب پر تشنگی کا بہت غلبہ ہوا آپ نے اپنے عزیز بھائی عباسؓ بن علیؓ کو بلا کر اور میں سوار اور تیس پیدل دے کر کہا میں تمہیں لے جاؤ اور دریائے فرات سے بھر لو۔ عباسؓ بن علیؓ نے منظور کر لیا اور اس گروہ کو لے کر دریائے فرات کے کنارہ آئے۔ عمر بھر دار قناد پھرا کون شخص پانی لیتا ہے۔ ہلال بن ناخ نے کہا: میں تیرے چچا کا بیٹا پانی پینے آیا ہوں۔ عمر نے کہا پانی لے مجھے گوارا ہو۔ ہلال نے کہا: اے عمر تجھ پر قہر ہے۔ میں کس طرح پانی پی سکتا ہوں جب کہ حسینؓ بن علیؓ اور اس کے فرزند پیاس سے ہلاک ہونے جاتے ہیں۔ عمر نے کہا مجھے یہ حالات معلوم ہیں مگر میرے بس کی بات نہیں ہے۔ میں مقرر کیا ہوا ہوں اور حکوم مجبور ہوتا ہے۔ ہلال نے اپنے دوستوں سے کہا آپ اپنی بھرنو۔ عمر بھی کچھ گیا کہ حسینؓ کے دوست پانی لینے آئے ہیں۔ روکنے کے لیے جنگ سے پیش آیا۔ حسینؓ کے دوستوں میں کچھ لڑنے لگے اور بعض مشکوں کے بھرے میں مصروف ہوئے۔ اور پانی سے سیراب ہو کر بھری ہوئی تھیں لیں اور بیچ سلامت واپس چلے آئے۔ ان میں سے کوئی شخص شہید نہیں ہوا۔ اور عمر کے چند طرفدار مارے گئے۔ امام حسینؓ کے ساتھی ان مشکوں کا پانی پی کر سیراب ہو گئے۔ روئے العفّاء کے موافق پیلوے تھیں بھر رہے تھے اور عباسؓ اپنے سواروں سے ان کی مدد کر رہے تھے۔ یہ اشتعال ابوحنیفہ قریب قریب تمام مؤرخین کے نزدیک حضرت عباسؓ پانی لا سکے۔ ابوحنیفہ کے نزدیک شہید ہونے۔

حضرتؓ نے ابن سعد کو طلب فرمایا ابن خلدون کہتا ہے: بعد اس کے امام حسینؓ نے عمر بن قرقہ بن کعب انصاری کی معرفت عمرو بن سعد کے پاس کہا بھیجا کہ آج شب کو دونوں لشکروں کے درمیان فوج سے ملنا۔ عمرو بن سعد حسب وعدہ آیا۔ دیر تک باتیں ہوئی رہیں۔ پھر دونوں آدمی لوٹ کر اپنے اپنے لشکر میں آئے۔ دوچار بار ملاقات کرنے کے بعد عمرو بن سعد نے غیب اللہ بن زیاد کو لکھا: بعد حمدشا کے واضح ہو کہ اللہ تعالیٰ نے اسٹی فتنہ فرو کر دیا اور اختلاف دفع کر کے سبوں میں اتفاق پیدا کر دیا ہے۔ حسینؓ نے یہ درخواستیں پیش کی ہیں کہ یادہ جہاں سے آئے ہیں واپس کر دیے جائیں دیا جس سرحد کی طرف ہم چاہیں ان کو بھیج دیں دیا ہم ان کو امیر المؤمنین زید کے پاس بھیج دیں تاکہ

شرائط صلح

ان کی یہ بیعت کرید اس میں تمہاری خوشنودی اور امت محمدیہ کی رضامندی ہے۔ ابن زیاد نے خط لکھا: میں اس کو منظور کرتا ہوں۔ یہ خط ایسے شخص کا ہے جو امیر و رعیت کا صلح شفیق ہے۔

شرائط صلح سے انکار
شمر بنی الجوشن نے اٹھ کر کہا: کیا تم اس درخواست کو قبول کر لو گے۔ وہ (حسین) تمہارے ملک میں آگیا ہے تمہارے قبضہ میں ہے۔ واللہ اگر وہ یہاں سے کوچ کر کے چلا گیا اور اس نے تمہارے ہاتھ پر بیعت نہ کی تو وہ تم سے زیادہ قوی و معزز ہو گا اور تم بمقابلہ اس کے ضعیف و ناتواں ہو گے۔ میرے نزدیک مناسب ہے کہ تم اس کو اپنے حکم کے ماتے پر مجبور کرو۔ پس اگر عدول مکی کرنے پر تم اس کو مزاد دو گے تو تم کو اس کا حق حاصل ہے اور اگر رد کر دو گے تو اس کا الزام تم پر آئے گا۔ واللہ مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ حسین و عمرو تمام رات دونوں لشکروں کے درمیان باتیں کرتے رہے ہیں۔

عقوبہ بن سمعان کا قول اور قرین قیاس شرائط
کامل ابن اشیر کے موافق عمرو بن سعد سے حضرت نے جو باتیں کیں وہ یہ تھیں کہ ہم اور تو لشکروں کو چھوڑ کر یزید کے پاس چلیں یا یہ شرطیں پیش کیں کہ میں واپس ہوں۔ یا یزید کے پاس جاؤں۔ اس کی جو رائے ہو۔ یا یہ کہ مسلمانوں کی سرحد پر چلا جاؤں۔

اس مؤرخ و نیز روضۃ الغفانے لکھا ہے کہ عقوبہ بن سمعان کہتا ہے کہ: ”پیوستہ ملازم امام حسین ہودم تا آن زمان کہ شہادت یافت و ہرچہ ی گفتی شنیدم بخدا نگوئد کہ ہرگز بر زبان نہ لاور کہ مرا بگزارد کہ پیش یزید یا شمر سے لا ثغور اسلام روم بلکہ ہمیں قدر پیغام دلا کہ مرا بگزارد تا بکالے ہلا گردم کہ از آغیا آمدہ ام ہا دست از من ہلا دارید تا سرور این جہاں عرض نہ لاور در مہاجرت اوطان و مفارقت روز مجد گزرانم۔“ یعنی: ”میں امام کی شہادت تک ان کے ساتھ لگا ہوا تھا۔ جو کچھ وہ فرماتے تھے میں سن رہا ہوتا تھا۔ آپ نے اپنی زبان سے ہرگز نہیں کہا کہ مجھے چھوڑ دو کہ یزید کے پاس یا کسی سرحد پر چلا جاؤں، بلکہ یہی کہا کہ مجھے چھوڑ دو جہاں سے آیا ہوں چلا جاؤں، یا کشادہ جہاں میں جہاں سرمائے زندگی گزاروں۔“

شب کی ملاقات میں عباسؑ اور علی اکبرؑ حضرت کے ساتھ رہے
اعظم کئی کے موافق امام حسینؑ نے عمرو بن سعد کے

پاس آ دی بیچ کہ پیغام دیا کہ تجھ سے کچھ کہنا ہے۔ رات کے وقت فجر سے ملنا۔ اور میری باتیں سن لینا۔ عمرو ایک سو بیس سوار ہمراہ لے کر اپنے لشکر گاہ سے نکلا۔ امیر المومنین حسینؑ نے اپنے ہمراہی سواروں سے کہا: تم پرے ہٹ کر کھڑے ہو جلاؤ۔ پرے سرک گئے۔ عباسؑ بن علیؑ اور علی اکبرؑ آپ کے ساتھ رہے۔ عمرو نے بھی اپنے ساتھ کے سواروں کو اسی طرح کھجے بنادیا۔ اس کا غلام لائق اور بیاض اس کے پاس ٹھہرے رہے۔ امام حسینؑ نے فرمایا: ”اے عمرو بن سعد تجھ پر افسوس ہے کیا تو اس خدا سے جس کی طرف تمام مخلوق مکرر رجوع کرنے والی ہے نہیں ڈرتا، اور فجر سے جنگ کرنا چاہتا ہے۔ ملائکہ تو جانتا ہے کہ میں کون شخص ہوں۔ تو اس نا واجب اور نامزاکام سے باز آ۔ اور جس کام میں دین اور دنیا کی بھلائی شامل ہے اسے اختیار کر۔ میرے پاس چلا آ۔ اس گمراہی سے نکل۔ اس نکار دنیا نے فجر اور فجر جیسے بہت شخصوں کو

دیکھا ہے۔ اس پر مغرور نہ ہو۔ اور یقین کر کہ نیکی اور سلامتی اسی پر موقوف ہے جو میں تم سے کہہ رہا ہوں۔“

ابن سعد کے عذر کی نوعیت اس نے کہا: یہاں اللہ آپ سے بہت ٹھیک بات کہی ہے۔ لیکن آپ کے پاس چلے آئے ہیں اس بات کا اندیشہ ہے کہ میرے مکان کو برباد کر دیں گے۔

حسینؑ نے کہا: یہاں اللہ یہ کیا ہوس ہے۔ اگر خاندانِ مصطفیٰؐ کی دوستی کے سبب دنیا میں تیرا مکان برباد کیا جائے تو بھی کچھ نقصان کی بات نہیں۔ اس کے عوض بیشعت میں تیرے لیے کئی محل مقرر کیے جائیں گے۔ علاوہ ازیں جب تو میرے ہمراہ رہے گا تو میں تیرے موجودہ گھر سے بھی اچھا گھر بنوا دوں گا۔ عمرو نے کہا: میرے پاس زر خیز و شاداب جاگیر ہے۔ ابن زیاد اسے ضبط کر لے گا۔ اور میری اولاد عروم رہ جائے گی۔ امام حسینؑ نے کہا: اس بات سے بھی مطمئن رہو۔ تمہارے اس کے عوض اس سے بھی زیادہ زر خیز اور سرمبز و شاداب جاگیر و جہ طلال سے مجاز میں عطا کروں گا۔ عروم سن کر خاموش ہو رہا کچھ جواب نہ دیا۔ امیر المومنین حسینؑ یہ حال دیکھ کر واپس چلے آئے۔ اور فرماتے تھے: اللہ تعالیٰ تمہارے پاک کرے اور طاقت میں نہ بخسے۔ میں اللہ تعالیٰ کے فضل سے امید کرتا ہوں تمہارے عراق کے گہیوں کھانے نصیب نہ ہوں گے۔ عمرو نے کہا: ”اے حسینؑ! اگر گہیوں نہ ملیں گے تو اس کے عوض جو ہی کھالوں گا۔“ یہ کہہ کر اپنے لشکر گاہ کو واپس چلا گیا۔ رخصتہ العتفا کے موافق ابتداء کلام حضرتؑ نے کی تھی۔

دشمنوں کے انکارِ صلح پر حضرتؑ اپنے جد بزرگوار کا اصول یاد دلاتے ہیں تاریخ غمیں کے موافق حضرتؑ نے ابن سعد سے مخصوص بات یہ کی کہ: ”تم مجھ سے وہ بات کیوں نہیں قبول کرتے جو رسولِ مشرکوں سے قبول کرتے تھے۔ اور سوال پر کہا کہ جب مشرکین صلح چاہتے تھے تو رسولؐ اسے قبول کر لیتے تھے۔“

ابن سعد کو ابن زیاد کے خلاف انسانیتِ احکام اس گفتگو کی خبر سن کر ابن زیاد نے عمرو بن سعد کو بھول ابنِ خلدون لکھا: میں نے تمہارے عذر کو سنا ہے۔ لیکن میں اس غرض سے نہیں سمجھتا تھا کہ تو اس سے لیت و لعل میں اوقات گزاری کرے اور اس کی سفارش مجھ سے کرے۔ میں تمہارے حکم دیتا ہوں کہ اگر حسینؑ اور اس کے ہمراہی ہمارے حکم کی اطاعت کریں تو صلح نامہ لکھ کر ہمارے پاس ان کو بھیج دو اور اگر انکار کریں تو حملہ کرو۔ یہاں تک کہ ان کو قتل کر کے شلہ کر ڈالو۔ کیونکہ وہ اس کے مستحق ہیں اور بے قتل کے جسمِ دسینہ کو گھوڑوں کے سمنوں سے پہاں کرانا۔ وہ بڑا ظالم، جبار، خود سبر، نافرمان ہے۔ پس اگر تو ہمارے حکم کی تعمیل کرے گا تو تمہارے تاجداروں جیسا صلہ دیا جائے گا اور اگر کچھ بھی سرتابی کرنے کا قصد ہو تو ہم تمہارے معزول کرنے میں اور بجائے تیرے شمر کو لشکر کی سرداری دیتے ہیں۔

حکم کے نفاذ کے لیے دوسرا حکم پھر شمر سے خطاب ہو کر بولا: عمرو بن سعد اگر ہمارے اس حکم کی تعمیل پر مستعد ہو تو فیکہ تم اس کی اطاعت کرنا۔ واللہ معزول اور تم اس پر اور کل لشکر پر امیر ہو۔ ساتھ ہی اس کا سرکٹ کر میرے پاس بھیج دینا۔

حضرت عباسؓ اور ان کے بھائیوں کے لیے امان نامہ

اس خط کے لکھتے وقت اتفاق سے عبداللہ بن ابی علی بن حزام بیٹے ہوئے تھے۔ (ان کی پھوپھی ام البنین بنت حزام امیر المومنین علیؓ کے عقد میں تھیں، جن سے عباسؓ و عبداللہ و جعفر و عثمان پیدا ہوئے تھے) انھوں نے ابن زیاد سے کہا: ہمارے بھائیوں کے لیے امان نامہ لکھ دو۔ چنانچہ ابن زیاد نے لکھ دیا۔ جس کو عبداللہ بن ابی علی نے اپنے ایک غلام کی معرفت پہنچا دیا۔ عباسؓ و عبداللہ وغیرہم پیران امیر المومنینؓ نے کہا:

حضرت عباسؓ امان سے انکار کرتے ہیں

ہم کو تمہاری امان کی ضرورت نہیں ہے۔ ابن سمیہ کی امان سے اللہ تعالیٰ کی امان بہتر ہے۔

ابن غلدون نے قربت میں غلطی کی ہے۔ اگر حضرت ام البنین عبداللہ بن ابی علی کی پھوپھی تھیں تو حضرت عباسؓ وغیرہ ان کے بھائی نہیں ہو سکتے تھے بلکہ پھوپھی زاد بھائی۔ اعمش کوئی ابن ابی علی سے حضرت ام البنین کو مجازاً بہن اور حضرت عباسؓ وغیرہ کو بھانجے کہلاتا ہے۔ نیز اس مورخ کے موافق امیر المومنینؓ نے یہ عقد کوفہ میں کیا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد شمر پھل ابن زیاد کا خط دیکھ کر ابن سعد نے کہا: ”انھوں میں تو یہ بھاتا تھا کہ میری درخواست قبول کر لی گئی اور توسل کرنے کی اجازت ملے کر آیا ہے۔“ شمر بولا: ”یہ تو تمہاری بھوک کی غلطی ہے۔ اب بتلاؤ کیا کر دو گے۔“ جواب دیا: ”بیوراً تعمیل کروں گا۔“ (ابن غلدون)

ابن سعد حضرت کے متعلق

کمال ابن اثیر کے موافق ابن سعد نے شمر سے کہا: ”تو نے بات خراب کی۔ وہ (حسینؓ) بیعت نہ قبول کرے گا۔ اس لیے کہ اس کے باپ کا نفس اس کے پیلوں میں ہے اور وہ کبھی ذلت گوارا نہ کرے گا۔“

حضرت کا دفاعی انتظام

اب بقول صاحب سراشاہدین جب حضرت کو یقین ہوا کہ لوگ لڑیں گے تو آپؐ نے اپنے اصحاب کو حکم دیا کہ ان کے لشکر کے گرد خندق کھودیں۔ اور صرف ایک دروازہ رکھا جائے جس سے نکل کر جنگ کی جائے۔

کمال ابن اثیر کے موافق حضرت نے اصحاب کے خیمہ کا محاصرہ کیا اور حکم دیا کہ خیموں کو ایک دوسرے کے قریب کر دیں۔ دشمنوں سے جنگ کے وقت ایک طرف سے خیموں کے آگے سے مخاطب ہوں کہ خیمے داہنے ہاتھیں اور چپے رہیں۔ ابن غلدون اور گبین نے یہ بھی کہا ہے کہ خیموں کی رسیاں ایک دوسرے سے ملا دو۔

صاحب روضۃ الشہداء ابنی اسد کو آمادہ مدد کرتا ہے

روضۃ الشہداء کے موافق حبیب بن مظاہر اسدیؓ نے حضرت کی خدمت میں عرض کی کہ اس علاقہ میں بنی اسد رہتے ہیں۔ اگر آپؐ کی اجازت ہو تو آپؐ کی مدد کے لیے بلاؤں۔ حضرت نے اجازت دی۔ حبیب گئے اور کہا: اے لوگو! نواسہ رسولؐ کو بائیس ہزار دشمنوں نے گھیرا ہے۔ تم میرے عزیز ہو۔ میں تمہیں نصیحت کرنے آیا ہوں کہ اگر تم شامعت رسولؐ کے متقی ہونا چاہتے ہو تو ان کی مدد کرو۔ ان کی بات سن کر عبداللہ بن ہرکڑا ہو گیا اور کہنے لگا کہ پہلا شخص جو محبت کا دعویٰ اور دعوت قبول کرتا ہے میں ہوں۔ حبیب نے مبارک ہلادی

اور نوے آدمی مسلح ہو کر گھوڑوں پر سوار ہوئے اور چلے اتفاق سے ان میں سے کسی نے ابن سعد کو خبر دی اور اس نے
ارزق شامی کو ایک ہزار سوار کے ساتھ روکنے کو بھیجا۔ فرات کے کنارہ جنگ ہوئی۔ بنی اسد کے کچھ لوگ شہید ہوئے۔
بقیہ اپنے قبیلہ کی طرف واپس گئے۔

ابن زیاد کو معلوم ہوا کہ حسینؑ نے قبائل سے مدد طلب کرنی شروع کی ہے تو اس نے ابن سعد کو لکھا کہ: "اگر تو ابھی
حسینؑ سے جنگ نہ شروع کرے گا تو مستوجب سیاست ہوگا۔" یہ عزم کی نوبت تاریخ تھی۔

اگر حضرتؑ نے مشورہ جنگ اسطویٰ شب کو کیا تو اس کی مخصوص صورت یہ تھی
مشورہ جنگ اور بربر
کہ بربر بن خنیز نے کہا (جو بڑے طاقتور و زاہد مشہور تھے) کہ اے نواسہ رسولؐ

کام نہایت سخت آپ کا ہے۔ اس کے نزدیک بڑا اس کے کوئی چارہ نہیں ہے کہ جاؤں اور ابن سعد کو نصیحت کر دوں۔
شاید اس پر کچھ اثر ہو۔ حضرتؑ نے فرمایا کہ تمہاری موابدہ پر کسی کو کچھ اضافہ کرنا نہیں ہے۔ اجازت پر بربرؑ گئے۔
ابن سعد اپنے خیمہ میں بیٹھا تھا۔ بربرؑ نے اجازت داخل ہوئے اور بغیر سلام نیکیے ایک طرف
بربرؑ اور ابن سعد
بیٹھ گئے۔ ابن سعد کو غصہ آیا۔ اور کہا کہ: "کیا میں مسلمان نہیں ہوں جو تو نے مجھے

سلام نہیں کیا۔" بربرؑ نے کہا جناب رسولؐ نے فرمایا ہے: المسلم من سلم المسلمون من لسانہ و یدہ (مسلمان
وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے مسلمان سلامت رہیں) تو نے اہل بیتؑ پر پانی بند کیا ہے۔ ان پر زبان تیر کی ہے۔ فرزند
رسولؐ سے ارادہ جنگ رکھتا ہے اور ان کی حرمت کے مقابل میں صفت کشی کی ہے۔ (روضۃ الشہداء اعظم کئی وغیرہ)
یہ سن کر ابن سعد دیر تک سر جھکائے رہا۔ اور اس کے بعد کہنے لگا: "اے بربرؑ تم مجھے کہتے ہو مجھے قہقین ہے کہ جو ان سے
لڑے گا اور ان کے حقوق کو غصب کرے گا اس کی جگہ جہنم میں ہے۔ مگر اے بربرؑ زے کا علاقہ بہت وسیع اور زر خیز
ہے۔ مجھ سے وہ نہیں چھوڑا جاتا۔ میرا دل حکومت اور فرمانبرداری کی ہوس سے باز نہیں آتا۔

ابو مخنف کے نزدیک انس بن کاہل گئے تھے اور ان کے سوال پر ابن سعد نے اپنا منہ ایک
ابن سعد کا انداز
طرف پھیر لیا، اور کہا: "خدا کی قسم میں جانتا ہوں کہ ان کا قاتل جہنم میں جائے گا لیکن
لازماً مجھے ابن زیاد کا حکم نافذ کرنا پڑے گا۔"

بربرؑ واپس آئے اور حضرتؑ سے عرض کی کہ: "عمرو بن سعد سخت گمراہی میں مبتلا ہو گیا ہے۔ حکومت کرنے کی
لاج میں آپ کے قتل کو آسان بات سمجھتا ہے۔ میں نے دیکھ لیا کہ وہ اپنے ارادہ سے باز نہ آنے کا اور جو خدمت اس
کے سپرد کی گئی ہے اسے عمل میں لانے کا۔"

دشمن کا طعنہ
صورت معاملہ کی اطلاع پر حضرتؑ نے خیمہ کے گرد کی خندق میں کلاڑی بھروادی اور اس میں آگ
دیدنے کا حکم دیا کہ شب خون نہ مارا جائے۔ آگ روشن دیکھ کر ایک سوار جس کا نام مالک بن
عمرہ یا مالک بن حوزہ تھا خندق کے پاس آکر کھڑا ہوا اور بولا کہ: "اے حسینؑ بن علیؑ تم نے آگ کی طرف بہت جلدی کی۔
اکثر دوزخ میں جانے سے پہلے اس دنیا میں اپنے گرد آگ بٹائی۔ ایک دوسرے نے آواز دی کہ: "اے حسینؑ تمہیں
مہر مٹانے سے کیا قربت ہے۔" تیسرا کہتا تھا کہ: "اے حسینؑ دیکھو دریا نے فرات کس طرح موج مار رہا ہے۔ یہ پانی

تھیں ہرگز نہ ملے گا یہاں تک کہ تم پیاس سے ہلاک ہو جاؤ گے !!!

حسینؑ کی دعا اور اصحاب کی تکبیر مؤرخین جنہوں نے متذکرہ صدر روایتیں لکھی ہیں اس کے ساتھ یہ بھی لکھا ہے کہ پہلے کی گنگو سن کر حضرتؑ نے منہ پایا:

”کذبت یا عدو اللہ۔“ جھوٹ کہا تو نے اے دشمن خدا۔ تو کان کرتا ہے کہ میں دوزخ میں جاؤں گا اور تو بہشت میں جائے گا۔ مسلم بن عویص نے کہا کہ: ”مجھے اجازت دیجیے کہ میں تیرے اسے ہلاک کروں۔ لیکن حضرتؑ نے یہ فرما کر دو کا کہ میں جنگ میں پیش قدمی نہیں کرنا چاہتا۔ یہ کہا اور آسمان کی طرف ہاتھ اٹھائے۔ زبان اقدس پر جاری تھا کہ: ”اللہم احق بالنار۔“ (خداوند اے آگ سے جلدے) اور یہ ہوا کہ اس کے گھوڑے کاسم سوراخ میں چلا گیا اور بھڑکا اور بھڑکنے میں وہ گھوڑے کی بیٹھ سے اس آگ میں گر پڑا، جسے اس نے ذریعہ طعن بنایا تھا اور جل گیا۔

(ابو مخنف اور ابن خلدون نے یہ بھی لکھا ہے کہ: ”مسروق وائل غفیری جو اس کے ساتھ میدان میں آیا تھا یہ دیکھ کر کہتا ہوا لوٹا میں اس قائدان سے نہ لڑوں گا۔ ان کی بددعا میں بہت بڑا اثر ہے) اصحاب حسینؑ نے یہ دیکھ کر تکبیر کہا۔ دوسرے کاکلام سن کر کھل غیرت سے آپؑ نے آسمان کی طرف دیکھا اور عرض کی کہ خداوند اے کہتا ہے کہ تیرے پیغمبر سے میری کوئی قربت نہیں ہے۔ تو اے بھی آج ہی ذلیل کر اور بہت جلد اے اس کہنے کی مزادے۔ اور ایسا ہوا کہ یہ شخص قتلے حاجت کے لیے گیا اور ایک بھجولے اسے ڈنک مارا یہ اپنی نجاست میں لوٹا رہا اور شدید زہر کی تکلیف سے وہیں مر گیا۔

تیسرا بھی گھوڑے سے گرا۔ پیاس کا ظہر ہوا اور ہانی پھٹے پھٹے مر گیا۔

۹۔ محرم ابن سعد کا لشکر حرکت کرتا ہے کامل ابن اثیر کے موافق: نوی تاریخ کو حضرتؑ نماز صبح پڑھا چکے تھے کہ ابن سعد کے لشکر میں حرکت ہوئی

اور وہ آگے بڑھا۔ بعض مؤرخین نے بعد صبح بھی کہا ہے۔ اور چونکہ آج جنگ کی ابتدا تھی اور سپہ سالار لشکر خود فوج کے ساتھ تھا۔ قیاس آسان ہے کہ نہ ماتش اور اظہار شوکت کے لیے قریب قریب تمام فوجیں ترتیب اور انتظام سے بڑھتی جا رہی ہوں گی۔ سواروں اور پیادوں کی گنتی صفیں بڑھ رہی ہوں گی۔ اکیس ہائیس ہزار سوار اور پیادوں کی یہ فوجی آمادگی بچانے خود ایک مہیب منظر ہو گا۔ اور جتنی باجوں کے شور نے ایک عالم پیدا کیا ہو گا۔ یقیناً یہ موقع نہ تھا جب کہ شجاعت کو شام کے لشکر کی آمادگی پر ناز ہوتا۔

بہن کی اطلاع حضرت خیمہ کے آگے تلوار لیے بیٹھے تھے اور نیند کے عالم میں تھے۔ حضرت زینبؑ قریب بیٹھی تھیں کہ ہتھیاروں کی جھنکار سموں کی آواز اور سواروں کے شور سے آپؑ حضرتؑ کو مطلع کیا۔ قبول ابن خلدون: ”عباس بن علیؑ نے عمرو بن سعد کو آتے دیکھ کر کہا: بھائی اٹھو۔ مخالفین آپؑ کے فرمایا: چلو ہم بھی سوار ہو کر چلتے ہیں۔

عباسؑ کی پیشروی عباس بن علیؑ نے کہا: ”میں میں ہی جاؤں گا۔“ امام حسینؑ نے اس رائے کو پسند فرما کر ارشاد کیا: ”بہتر ہے تمہیں جلد درمافست کرو: کیوں آئے ہیں؟“

غرض کیا ہے؟۔ غرض عباسؓ میں آدمیوں کے ساتھ سوار ہو کر قرینہ لے گئے۔ آنے کی وجہ دریافت کی۔ عمرو بن سعد نے لفظ بھلا ابن زیاد کے خط کا مضمون بتا دیا۔ عباسؓ نے کہا: ”شہرہ عجلت نہ کرو۔ ابو عبد اللہ حسینؓ کو اس خبر کی اطلاع کرتا ہوں۔“ یہ کہہ کر عباسؓ لوٹ کر امام حسینؓ کی خدمت میں آئے اور ان کے ہمراہی عمر بن سعد کے مقابلہ پر کھڑے ہونے اللہ جل شانہ کا ذکر کرتے رہے۔

ایک شب کی مہلت حضرت امام حسینؓ نے عباسؓ سے کہا جاؤ ابن سعد سے جا کر کہہ دو کہ ہم کو شب بھر کی مہلت دے کہ ہم استیغفار و دعا کر لیں۔ اپنے رب کی قسم پڑھیں تلاوت کریں۔ صبح کو جو ہونے والا ہوگا ہوگا۔ عباسؓ نے واپس ہو کر ابن سعد سے کہا: اس وقت تو تم لوگ واپس چلے جاؤ صبح تک ہم کو مہلت دو ان شاء اللہ تعالیٰ کل یا تو تمہاری اطاعت کر لیں گے دیا جو مناسب ہوگا کیا جائے گا۔ عمرو بن سعد نے شمر سے استعراج کیا شمر بولا: تم امیر جو چاہو کرو۔ دیا لوگوں سے اس بابت دریافت کرو۔ عمر بن حجاج الزبیدی نے قطع کلام کر کے کہا: بھلا اللہ اگر حسینؓ اہل دلم سے ہوتے اور یہ درخواست پیش کرتے تو بھی تم کو قبول کرنا ضروری تھا۔

قیس کی پیشین گوئی قیس بن اشعث بن قیس بولا: ”منظور کرو۔ لیکن اپنی قسم وہ صبح کو تم سے ضرور لڑیں گے۔“ عمرو بن سعد نے جملہ کر کہا: ”اگر ہمیں یہ یقین ہو جاتا تو بھی ہم یہ وقت ٹال جاتے۔“ اس کے ہمراہی یہ سن کر خاموش ہو رہے۔ اور عمر بن سعد واپس ہو کر اپنے لشکر گاہ میں چلا آیا۔

کابل ابن اشعث کے موافق: حضرت عباسؓ نے دشمن کے مقابلہ پہنچ کر فرمایا کہ جلدی نہ کرو ہم ابی عبد اللہ کے سامنے پیش کریں اور آپؐ حامل ہے اور خدا کو یاد دلاتے ہے۔

اس وقت کی حالت اعظم کوئی کے نزدیک حضرت عباسؓ اپنے بھائیوں کو بھی اپنے ہمراہ لے گئے۔ دشمن کا پیام سن کر حضرت غور میں رہے۔ عباسؓ کھڑے تھے اور اصحاب ان لوگوں سے گفتگو میں مصروف تھے۔ حبیب بن مظاہر اسدی نے کہا: قیامت کے دن جب تم اللہ تعالیٰ کے سامنے جاؤ گے تو بہت بری قوم ہو گے اور پیغمبر کے فرزند اور اہل بیت اور متقی عابد زاہد نیک لوگوں کے قاتلوں میں شمار ہو گے۔ امام حسینؓ پیلا سے بیٹھے ہوئے ان لوگوں سے لڑنے کی تدبیر سوچ رہے تھے۔

ناخ التواریخ اور روضۃ الشہداء کے موافق: اس گفتگو کے بعد اگرچہ جنگ نہ چمچی لیکن عمرو بن سعد کا لشکر وہیں اتر پڑا۔ اور گویا حضرت کا چھوٹا سا لشکر اس وقت سے خصوصیت سے فوجی محاصرہ میں آ گیا۔ اور ابن سعد کے کثیر لشکر کے لیے بیس آکیں خیموں اور سو سو سو آدمیوں کا محصور کر لینا آسان سے بھی زیادہ آسان تھا۔

التوائے جنگ اور محاصرہ غالباً اسی کے بعد امام حسینؓ نے اپنے ہمراہیوں کو جمع کر کے خطبہ دیا۔ جس کا مضمون یہ تھا:

”یہ اللہ تعالیٰ کی محدثا کرتا ہوں اور اس کی تعریف ظاہر و پوشیدہ کرتا ہوں۔ اسے خدا میں تیری تعریف کرتا ہوں کہ تو نے ہمارے جد کو نبوت سے سرفراز فرمایا۔ اور ہم کو گوش و چشم و قلوب (?) عطا کیا۔ اور قرآن کی تعلیم اور دین کی بھدی۔ پس ہم تیرا لشکر یہ ادا کرتے ہیں۔ اما بعد میں اپنے ہمراہیوں سے نہ زیادہ کسی کو بہتر جانتا ہوں اور نہ میرے اہل بیت سے کوئی زیادہ نیک اور نہ ان سے کوئی شخص رشتہ کا زیادہ محاط رکھنے والا ہے۔ پس تم سبوں کو

حضرت کا خطبہ

فلاحی اسی کے بعد امام حسینؓ نے اپنے ہمراہیوں کو جمع کر کے خطبہ دیا۔ جس کا مضمون یہ تھا:

”یہ اللہ تعالیٰ کی محدثا کرتا ہوں اور اس کی تعریف ظاہر و پوشیدہ کرتا ہوں۔ اسے خدا میں تیری تعریف کرتا ہوں کہ تو نے ہمارے جد کو نبوت سے سرفراز فرمایا۔ اور ہم کو گوش و چشم و قلوب (?) عطا کیا۔ اور قرآن کی تعلیم اور دین کی بھدی۔ پس ہم تیرا لشکر یہ ادا کرتے ہیں۔ اما بعد میں اپنے ہمراہیوں سے نہ زیادہ کسی کو بہتر جانتا ہوں اور نہ میرے اہل بیت سے کوئی زیادہ نیک اور نہ ان سے کوئی شخص رشتہ کا زیادہ محاط رکھنے والا ہے۔ پس تم سبوں کو

اور نہ میرے اہل بیت سے کوئی زیادہ نیک اور نہ ان سے کوئی شخص رشتہ کا زیادہ محاط رکھنے والا ہے۔ پس تم سبوں کو

اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے۔ آگاہ ہو جاؤ گے یہ یقین ہو گیا ہے کہ کل یہ اعداد مجھ سے ضرور لڑیں گے۔ میں تم کو خوشی سے اجازت دیتا ہوں جس کا جس طرف جی چاہے چلا جائے۔ میرا کچھ حق اس پر نہیں ہے۔ لیکن مناسب ہے کہ تم میں سے ہر شخص میرے اہل بیت میں سے ایک ایک کو اپنے ہمراہ لے لے۔ تم سب کو اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا کرے گا۔ اور اپنے اپنے شہروں اور ملکوں کی طرف منتشر ہو کر چلے جاؤ۔ شاید اللہ تعالیٰ تم کو اس تکلیف سے بچالے۔ کیونکہ شامی میرے خون کے پیاسے ہیں۔ اگر مجھے پاجائیں گے تو دوسرے کی جستجو نہ کریں گے۔“ (ابن خلدون)

دیگر مؤرخین نے بھی یہی کہا ہے صرف بعض میں کھن کا تھوڑا سا فرق ہے۔ اور کسی نے تھوڑی سی کوئی تہی بات لکھی ہے۔ مثلاً صاحب روضۃ الشہداء کہتا ہے کہ حضرت کرسی ساج پر میدان میں تشریف رکھتے تھے اور فرمایا کہ: میں نے کسی کو اپنے اصحاب سے زیادہ با وفا نہیں پایا (یا فتم) اور اپنے اہل بیت سے زیادہ کسی کو زیادہ رحم اور نیکو کار نہیں دیکھا۔ میں نے تم پر سے اپنے بیعت اضلال اور یہ مہلت میں نے تمہارے لیے طلب کی تھی۔

مہلت کی غرض اعظم کوئی میں اصحاب سے فرماتے ہیں کہ: ”تم نے میرے حق میں ذرا کمی نہیں کی اور میں تمہاری بہتری و بھلائی اسی بات میں بگھتا ہوں کہ جب رات ہو جائے، اے میرے دوستو رفیقو اور خاندان والو بھائی بند اور ملازمو! تم میں سے ہر شخص میرے بھائیوں اور فرزندوں میں سے ایک ایک کا ہاتھ پکڑ کر جس طرف دل چاہے چلا جائے کیونکہ جہاں کہیں جاؤ گے لوگ اچھی طرح پیش آئیں گے کوئی شخص تم سے تعرض نہ کرے گا۔ تم مجھے اس جگہ تنہا چھوڑ جاؤ۔ کیونکہ ان لوگوں کو صرف مجھ سے دشمنی ہے وہ مجھے تنہا پا کر قتل کریں گے۔ اور تم سے کچھ نہ کہیں گے میرے مارے جانے کے بعد تم زندہ رہو گے۔“

شہید اسلام کے قاضی مولف کے موافق: ”حسینؑ نے خطبہ کے بعد شمع گل کر دی کہ جانے والوں کو حجاب نہ ہو۔“ اب شروع ہوا اصحاب اعزا اور خدام کا وہ جواب جو اپنے موقع کے لحاظ سے تاریخ عالم میں عظیم المثل ہے۔ اور جو ایثار نفس، محبت اور قربانی کے لحاظ سے اپنا آپ ہی ظہیر ہے۔ بقول ابن خلدون: ”اس فقرہ کا تمام ہونا تھا کہ سب کے سب چلا اٹھے۔ آپ کے بھائی، اور لڑکوں اور بیٹیوں اور عبداللہ بن جعفر کے لڑکوں نے رو کر کہا: ”ہم ایسا نہیں کر سکتے کہ آپ کے بعد ہم ہاتھی رہ جائیں۔ اللہ تعالیٰ ہم کو یہ دن نہ دکھائے۔“

امام حسینؑ نے منہرایا: ”اے بنی حقیل! بس بس۔ مسلم کی شہادت کافی ہے۔ تم لوگ جاؤ۔ میں نے تم کو خوشی سے اجازت دی۔“

بنی حقیل بولے: ”آپ سے علیحدہ ہو کر ہم لوگوں سے کیا کہیں گے کہ ہم اپنے شیخ اپنے سردار اپنے بہترین چاچے بہترین لڑکے کو دشمنوں کے قبضہ میں چھوڑ آئے اور ان کے ساتھ ایک تیر بھی نہ پھینکا۔ اور نہ ان کے ساتھ تلوار چلائی۔ واللہ ہم یہ نہیں چاہتے کہ وہ کیا کریں گے اور نہ آپ کو تنہا چھوڑ جائیں گے، بلکہ ہم اپنے کو اور اپنے مال کو اور اپنے اہل کو آپ پر فدا کر دیں گے اور آپ کے ساتھ ہو کر لڑیں گے۔ یہاں تک کہ ہم تمہارے ساتھ جہاں تم جاؤ گے جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ اس میں کوئی نہ دکھائے جو تمہارے بعد ہم کو ملے۔“

مسلم بن عوجہ نے کھڑے ہو کر عرض کیا: ”کیا آپ کو تنہا چھوڑ کر ہم چلے جائیں؟ حالانکہ ہم آپ کے حق سے ادا نہیں ہوئے۔ خدا کی قسم ہم آپ کو اس وقت تک نہیں چھوڑ سکتے جب تک آپ کے دشمنوں کے سینوں میں اپنے نیزوں کی نوک نہ چھو لیں گے۔ اپنی تلواروں سے جب تک وہ ہمارے قبضہ میں ہے۔ ان کی گردنوں کو تنہا کھ سے نہ جدا کر لیں گے۔ خدا کی قسم اگر میرے پاس کوئی آلہ حرب نہ ہوتا تو میں آپ کی حمایت میں پتھروں سے سے مار تا یہاں تک کہ میں اپنے آپ کو آپ پر خدا کر دیتا۔“

مسلم بن عوجہ کی اس پر جوش و غبار سے سبوں کے دل بھر آئے اور وہ بھی بلا اتفاق بھی کہنے لگے آپ نے ان لوگوں کو دعائیں دے کر رخصت کیا۔ غیمہ میں تشریف لے گئے۔ شام کا وقت تھا۔ طبیعت بھری ہوئی تھی، دردناک اشعار پڑھنے لگے۔ بعض کے موافق مسلم بن عوجہ نے کہا کہ ہم دشمنان دین اور دشمنان فرزند رسول سے لڑیں گے کہ لوگ دیکھیں کہ نصیبت رسول میں آپ کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ یہ تو ایک دفعہ کا مرتا ہے اور یہاں سے ایسی جگہ جاتا ہے جہاں کی کراحتوں کی نہایت نہیں ہے۔

صاحب لہوت کے موافق سید بن عبد اللہ حتی کھڑے ہوئے اور عرض کی: بخدا یا ابن رسول اللہ ہم آپ کو تنہا نہ چھوڑیں گے یہاں تک کہ خدائے پاک جانے کہ ہم نے ان کے بارہ میں اس اصول وصیت کے ساتھ حفاظت کی جس کو جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم فرما گئے تھے اگر میں اس بات کو جان لوں کہ میں آپ کی مدد میں قتل کیا جاؤں گا اور پھر زندہ کیا جاؤں گا اور پھر مارا جاؤں میری راکھ بھی اڑادی جائے اور اس صورت سے ستر مرتبہ میرے ساتھ مل گیا جائے تو بھی میں آپ سے جدا نہ ہوں گا یہاں تک کہ آپ کے قدموں کے نیچے مرجاؤں اور کیونکر نہ میں ایسا کروں حالانکہ صرف ایک مرتبہ مرنا اور قتل ہونا ہے اور پھر میں ایسی کرامت کو پہنچوں گا جس کی انتہا کبھی نہیں ہے۔

پھر زبیر بن عیینہ کھڑے ہو کر کہنے لگے: یا ابن رسول اللہ بخدا میری خواہش ہے کہ میں ہزار بار مارا جاؤں اور زندہ کیا جاؤں مگر خدائے توانا آپ کو اور آپ کے ان نوجوان بھائیوں اور فرزندوں اور اہل بیت کو قتل و غارت سے بچا دے۔ اس کے بعد سب نے اسی طرح کے کلام کیے اور کہا کہ ہماری جائیں آپ پر خدا ہوں ہم آپ کو اپنے ہاتھوں اور چہروں سے بچا دیں گے۔ پس ہم جب آپ کے حضور میں قتل ہو جاویں گے اس وقت ہم اپنے خدائے برحق کی درگاہ میں اپنا وعدہ وفا کریں گے اور جو ہم پر فرض تھا اس کو ادا کر چکیں گے۔

اسی حالت میں محمد بن بشیر حضری سے کہا گیا کہ تمہارا محمد بن بشیر حضری کے لڑکے کی گرفتاری
فرزند مدد دے پر قید کر لیا گیا ہے۔ اس نے کہا کہ خدا کے حضور میں اس کو ٹوٹا پیش کر تا ہوں اور اپنی جان کو بھی خدا کی نذر کر تا ہوں۔ ہاں مجھے پسند نہ تھا کہ میں رہوں اور وہ قید کر لیا جاوے۔

یہ بات ان کی سید الشہداء نے سنی اور فرمایا کہ خدا تم پر رحمت کرے تم میری بیعت سے آراؤ ہو۔ اپنے فرزند کی رہائی میں کوشش کرو۔ ابن بشیر نے جواب دیا کہ مجھ کو درندے کہا جائیں اگر میں آپ کو چھوڑ دوں۔ سید الشہداء نے فرمایا کہ اپنے فرزند کو یہ چارویں دو کہ اس کے ذریعہ سے

حضرت کی اجازت

اپنے جہان کو رہا کر ليو۔ پھر حضرت نے پانچ چادر يں ان کو دي۔ جن کی قیمت ایک ہزار اشرفی تھی۔
احتم کافی کے موافق : یہ باتیں سن کر جمائیوں اور اہل بیت نے کہا : ”مطالع اللہ ہم اس امر سے ہرگز رضامند نہیں
کہ آپ کے دوست ہمارا ہاتھ پکڑ کر ہر جگہ لیے پھریں۔۔۔۔۔“

شب عاشور

شبِ عاشور
شبِ عاشور یا شہدائے کربلا کی حیات کی آخری رات، زمانہ کے اس کھڑے میں ہے جہے چند آلودگانِ شہادت نے اس لیے مختص کیا تھا کہ اس میں خدا کی عبادت کر رہے محفوظ ہو جانے کے لیے نہیں۔ مذہبوں کے لیے وقت حاصل کرنے کو نہیں۔ لذاتِ دنیوی میں آخری مرتبہ مصروف ہونے کے لیے نہیں۔ عبادت کے لیے عموماً مؤرخین اعظم کوئی کے ہم زمان ہیں کہ: لشکر کے واپس جانے کے بعد امیرالمومنین حسینؑ نے تمام رات اللہ تعالیٰ کی عبادت میں گزاری، رکوع و سجود میں مصروف رہے۔ اور گریہ و زاری کے ساتھ اپنی بخشش اور نجات کی دعا مانگتے تھے۔ اسی طرح آپؐ کے بھائی اور فرزند اور تمام اہل بیت اور دوست رات بھر مصروف عبادت رہے۔ دم بھر کے لیے بھی کوئی نہ سویا۔ سب اپنی مغفرت کے لیے دعائیں مانگتے اور تسبیح و تہلیل میں محو تھے۔ اس شب کو حسینؑ کے فرائض اور اشغال کے تذکرہ میں شاعر غریب کہتا ہے کہ: ۷

گاہ فرمودے پرستاری فرزند طلیل
گاہ شستے ز اشک چشم از گیسوئے قاسم غبار
اس بات کے گھنے کے لیے کہ یہ شب انصار کے لیے افسردہ غور اور مایوسی کی تھی یا وہ صبح اور اس کے ناگوار حوادث
کے لیے بے چین تھے۔ میں لہوت سے یہ روایت پیش کرتا ہوں کہ بریر بن خضیر یمانی اور عبدالرحمن بن عبد ربہ انصاری در
غیمہ پر کھڑے تھے۔ اس وقت بریر یمانی عبدالرحمن انصاری سے مذاق و خوش طبعی کرنے لگے عبدالرحمن نے بریر سے کہا کہ یہ
وقت ایسے اہم باطل کا نہیں ہے۔ بریر نے کہا کہ میری قوم خوب جانتی ہے کہ میں نے کبھی بڑھاپے اور جوانی میں بری بات
نہیں پسند کی نہ اس وقت لیکن میں اس کو حصول بشارت کے لیے کرتا ہوں کہ جس کی طرف میں جاتا ہوں بخدا وہ بشارت یہ
ہے کہ ہم اس قوم سے تلوار لے کر ملیں گے۔ تھوڑی دیر لاس گے اور پھر حوروں سے بظلمت گئے ہوں گے۔

مجمع ہو گئی۔ دنیا کی سب سے مشہور مجمع۔ وہ مجمع جسے ابدالاباد تک آنے والی اور السنت تک گزر جانے والی مجوس پر
فرسے کہ ہم وہ تھے جس نے عالم کا یہ سماویہ حیرت تلاش دیکھا کہ ہزاروں ہزار مطمئن دشمنوں کے مقابلہ میں چند نفوس کو
بحوک اور پیاس لے دل شکستہ نہیں کیا۔ انھیں شب کی عہدات نے سیر نہیں کیا۔ بقول روضۃ الشہداء: ”چوں اسلم مجمع
ظاہر شد امام حسین ہنگ نمد گفت یاران مجمع شدہ و شتم کردہ سنت لدا کردند و فرج را بجماعت گناردند“۔ اور وہ
آخری مرتبہ کربندی کے قبل اپنے امام کے پیچھے نماز پڑھ رہے ہیں۔ وہ باپوس نہیں ہوئے۔ وہ اپنے اعتقاد میں متزلزل نہیں
ہوئے۔ وہ ایک تالاب تھے۔ جنھیں محیط زمین نے ہوا اور موجوں سے مستغنی کر دیا تھا۔ ان کے سکون میں تغیر لانے والی کوئی
قوت پیدا نہ ہوئی تھی۔ وہ ایک پہاڑ تھے جسے تیز اور تند ہوائیں محجور نہیں کرتیں۔ وہ تھے اور عہدات تھی۔ عہدات تھی
اور وہ تھے۔ کاش ابن مریم انھیں دیکھتے۔ کاش موسیٰ بن عمران ان کی زیارت کرتے۔ کاش داؤد ان کا مطالعہ کرتے۔ کاش
رشی گوتم غور کرتے کہ ان کی شائق کا تصور اپنے درجہ میں اس سے کہاں تک مقابل تھا۔ ان کے لیے کوئی خوف نہ تھا۔

ان کے لیے کوئی آرزو آرزو نہ تھی۔ صرف ان کے خاموش چہروں میں آنکھیں قہیں جو ادھر ادھر پرتی قہیں۔ ہر مرام حرکت فرماتے تھے۔ دل میں ایک حرکت تھی کہ ہم کس طرح اپنے امام کی بہتر طریقہ سے حفاظت کر سکیں۔ اس کی فکر نہ تھی کہ ہم نہ رہیں گے۔ غم اس کا تھا کہ ہمارے بعد امام پر کون قربان ہو کر امام پر آئیں نہ آنے دے گا۔

لیکن نماز صبح کے قبل حسینؑ کے آخری خواب کا واقعہ ہے جسے روضۃ العفا اور حسینؑ کا آخری خواب روضۃ الشہداء وغیرہ سے نقل کرتا ہوں کہ: ”حسینؑ کو ذرا سی جھپکی آگئی تھی کہ

پیراٹھ بیٹھے اور فرمایا کہ ابھی میں نے خواب دیکھا ہے کہ بہت سے کتے ٹچہ پر بھونک رہے تھے اور چاہتے تھے کہ کاٹیں۔ ان میں سے ایک ابلی کتا سب سے زیادہ جرات کر رہا تھا۔ ظن غالب ہے کہ میرا قاتل مہر دوس ہو گا۔ اسی وقت میں نے اپنے جد بزرگوار کو دیکھا اور وہ فرما رہے تھے کہ اے فرزند تو شہید آل محمد ہے۔ مگر اعلیٰ عتیں تیرے استقبال کے لیے مستعد ہیں۔ آج میرے پاس اخطار کرنا۔ جلدی کرو اور ناخوش دل نہ ہو۔ اے میرے عزیز اور احباب میری موت قریب ہے اور زندگی کی کوئی امید نہیں ہے۔“

سعد ابن ابی وقاص کا لاکا تعبیر لشکر میں مصروف ہوا۔ اور یقیناً کوئی کثیر لشکر اپنے اسلحہ اور سامان اپنے سپاہیوں اور نظام کے باوجود اپنی ترتیب کے وقت دیا۔ اسلحہ

نہیں ہو سکتا تھا جیسا شام کے حکم کا یہ لشکر شاید ہی کسی لشکر کو اپنی فتح کا ایسا یقین ہو جیسا عمرو بن سعد کے لشکر کو تھا۔ اور شاید کوئی لشکر اپنی فتح کے یقین کے بعد بھی ایسا ذلیل ہوا ہو جیسا یہ لشکر ہوا۔ آخر یہ کون سے مقابل لشکر کے لیے صفیں درست کر رہا تھا۔ مقابل کون تھا۔ کوئی لشکر کہاں تھا۔ جو تیس یا اکیس ہزار سپاہیوں کی گھنی صفوں سے ٹکراتا کہے کوئی اگر کوئی کہہ سکے کہ حسینؑ کے چدر تھا کا شمار لشکر میں ہے۔ خوب کہتے ہیں ابو الفضل بلو شاہ حسینؑ صاحب بی اے اپنے رسالہ حسینؑ ان فطاسی آفت ہشتری میں کہ: ”حسینؑ کے تمام لشکر میں مشکل سے ایک آدمی لڑنے کے قابل تھا۔ ضعیف اور حیران ڈھانچوں کو جن کو شدت عطش اور فطانت سے بغیر ٹھوکر کھانے چلنا دشوار ہو تا اب اپنے عالم نزع میں ان سپاہیوں سے لڑنا تھا جسے شجاعوں پر عرب فکر کر سکتا تھا۔ تاہم حسینؑ ان کی آخری وصیت تھی جو ان کو ہاتھ جوئے جن کا شائبہ بھی ابھی پورا نہ ہوا تھا اور نہ جن کی شادی کی حنا کی سرفی مٹی تھی ان سے ان کی ماؤں اور بہنوں نے شہید ہو جانے کی خواہش کی تھی۔ فاسم کے ایسے بارہ برس کے بچے تھیں گھوڑے پر سوار ہونے کیلئے دوسرے کی مدد کی ضرورت تھی۔ ایک املاوت شہادت کو دیو خصال کا فرد کے مقابلہ میں بچانے کے لیے کھڑے تھے۔“

حسینؑ کے لشکر کا شمش ماہرہ جانباز مجھے اس قدر اور کہہ دینا ہے کہ شام کے انہو کثیر کے مقابل میں حسینؑ کے سپاہیوں کی تعداد

اس وقت پوری ہوتی ہے جس وقت حسینؑ کے لشکر میں حضرت علیؑ صفر کا بھولا بھی رکھ دیا جاتا ہے۔

اور کیا یہ بھی مجھے کہنا ہو گا کہ: ”اور دنیا میں کوئی چھوٹا سا لشکر اس شان سے نہیں کھڑا ہوا جیسے حسینؑ کے یہ چھ بچے، جوان اور بوڑھے رہتا کھڑے تھے۔ ہاں وہ زمین، وقت اور اتفاق پیدا نہیں ہوا۔ جس میں اتنے آدمی اتنے لشکر کے مقابلہ میں باوجود شدید بھوک اور پیاس کی شدنی کے لیے اس طرح تیار اور نظر ہوتے۔“

شاید ہی کسی لشکر کو اپنی شکست اور سپاہی کو اپنے قتل کا ایسا یقین ہو جیسا حسینؑ کے لشکر اور سپاہیوں کو تھا۔ اور شاید ہی کوئی لشکر اس یقین کے بعد اس استقلال اس شان اور شہادت کے شوق میں موت کا ایسا منظر ہو۔ اور ان کی یہ بے خوفی، مصائب پر صبر، استقلال اور جان سے لاپرواہی نہ ہوتی۔ اگر وجہ ایسی عظیم نہ ہوتی، اور شاید باوجود وجہ کے بھی دنیا کا یہ حیرت خیز واقعہ، واقعہ کی صورت میں نہ آتا۔ اگر مرکز ایسا نہ ہوتا جیسے حسینؑ تھے۔

میراجی چاہتا ہے کہ میں اس جگہ مشروا شنگٹن اردیگ کی عبارت درج کر دوں: ”اپنی چھوٹی سی جماعت کو اپنی پاس آلود قسمت کی شرکت کے لیے ایسا مصمّم دیکھ کر حسینؑ ان کی جانوں کو گراں قیمت پر بیچنے کے لیے تیار ہوئے اور انھوں نے ان کی موت کو یادگار قربانی بنانے کی تیاری کی۔۔۔ صبح کو حسینؑ جنگ کے لیے تیار ہوئے۔ ان کی تمام فوج چالیس پیلوے اور تیس سواروں پر مشتمل تھی۔ لیکن ہر ایک میں شہیدانہ جوش تھا۔ حسینؑ اور ان کے مخصوص رفقاء نے فضل کیا۔ تیل لگایا اور اپنے کو محطہ کید کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ: ”تھوڑی دیر میں ہم جنت کی سیاہ چشم حوریوں کے ساتھ ہوں گے۔“ (مؤرخ کا آخری فقرہ مکی مؤرخین کے کمن کا ہم آہنگ ہے)

لشکرِ کعبہ عمر بن عبدالمطلب، میرہ شمر ذی الجوشن، افسر رسالہ عروہ بن قیس، افسر یلکان عمرو بن سعد کا تعبیبہ بحث ربیع، علم دار زید۔ سپہ سالار عمرو بن سعد بن ابی وقاص تعداد لشکر کم سے کم (۲۰۰۰) جنرل کمال بن اثیر ابن سعد نے اہل مدینہ پر عبداللہ بن زبیر اسدی کو مقرر کیا۔ جنرل ابن خلدون ربیعہ دکنہ پر اشعث بن قیس مقرر ہوا۔ حسینؑ کا تعبیبہ لشکر حسینؑ بن علی بن ابی طالب علیہ السلام تعداد لشکر کم سے کم (۷۲) اہل غف کے نزدیک حسینؑ کے افسر میرہ ہلال بن ناخ علی تھے اور ہر ایک کے پاس میں میں مجاہد تھے۔ ہائی حضرت کے ماتحت تھے بچے اور اہل بیت خیمہ میں تھے۔

ان روح فرما وقتوں میں جو حسینؑ اور ان کے ہمراہی پر گزر رہے تھے ظاہر ہے کہ استہزا اور اصحاب حسینؑ کا صفت جنگ درست کرنا بچانے خود ایک مرثیہ تھا لیکن اس سے بڑھ کر رجز اور افتخار کا موقع بھی دوسرا نہ تھا کون تھا جو انھیں داد دیتا لیکن نیکی داد کی نظر نہیں رہتی۔ نیکی اپنا آپ ہی انعام ہے۔ کوئی اندازہ نہیں کر سکتا اس اطمینان اور مسرت کا جو تصفیہ شہادت اور آمادگی کے بعد ان سر تاج شہدائے عالم کو حاصل تھی۔ لیکن میں بھول جاؤں گا اگر یہ کہوں کہ انھیں کسی نے داد نہ دی۔ داد ملی۔ بہترین داد جو مل سکتی تھی۔ ہاں داد کے لیے میری غرض فضائے جنگ کی طرف اشارہ نہیں ہے بلکہ میں خیام حسینؑ کی طرف اشارہ کر رہا ہوں۔ میں اس وقت اہل بیت حسینؑ کو اہل بیت حسینؑ کے نام سے یاد نہیں کر رہا ہوں بلکہ یہ کہہ رہا ہوں کہ یہ خاندان ہے جو سچے شہداء شجاعت و حمیت عرب کا مایہ ناز اور افتخار ہے۔ عرب کی شجاعت میں عورتوں کا بڑا حصہ ہے۔ اب سوچو کہ نہ صرف زنانہ ہی ہاشم بلکہ اکثر مجاہدین کی بیویاں جو خیام حسینؑ میں ہیں وہ دیکھ رہی ہیں کہ ہمارے ورثا اس وقت آمادہ جنگ ہیں۔ کبھی کوئی مجاہد ان سے بہتر دیکھنے والوں کی امید نہیں کر سکتا تھا۔ کبھی دنیا میں کوئی آنکھ اس طرح جنگ دیکھنے کے لیے نہ اٹھی ہوگی اور نہ کبھی دل میں پھر وہ پوری فطری حرکت ہوگی جیسی اس وقت جب کہ یہ بیویاں آفرین کہتی تھیں۔ میرا یہ تصفیہ ہے کہ اس وقت جب کہ یہ یادگار افراد عالم پیش آنے والے واقعات کو

بھول کر جنگی صفت میں کھڑے ہو رہے تھے۔ یہیں بھی اپنے مددگاروں کی اس پر افتخار مشغولیت کے ظاہر میں اپنے دردناک مستقبل کو بھول گئی تھیں۔

اختلافات اس جگہ یہ بھی کہہ دوں کہ آفاقی جنگ اور شہداء کی شہادت کا سلسلہ بھی ہر مؤرخ کے نزدیک یکساں نہیں ہے۔ مثلاً کوئی کہتا ہے کہ لڑائی تیسری چوغی سے شروع ہوئی۔ کسی کے نزدیک دسویں کو شروع ہوئی اور مظلومہ کی جنگ میں اکثر اصحاب حسینؑ شہید ہو گئے۔ کسی کے نزدیک اکثر رشتے حسینؑ کے بعد دیگرے شہید ہوئے۔ کسی کے نزدیک حضرت حبشؑ غالباً انھوں کو شہید ہونے اور حسرت بن یزید کا نمبر بھانپنے پہلے شہید کے آخری کے تشریب تھا۔

بربر کا خطاب اعظم کوئی کہتا ہے: ”جس وقت طرفین کی سفین قائم ہو گئیں بربر بن حصین (خنیزر) ہمدانی نے آگے بڑھ کر عمرو بن سعد سے کہا: کیا تو امیر المومنین حسینؑ سے جنگ کئے گا؟ اس نے جواب دیا: ہاں لڑوں گا۔ اور اس معرکہ میں بہت سے قہرے سر ہوں گے۔ بربر بن حصین نے کہا: تم انھیں واپس کیوں نہیں جالے دیتے کہ مکہ یا مدینہ چلے جائیں۔ اسے کوفہ والو کیا تم نے ہی خطبہ کرا امیر المومنین کو طلب نہیں کیا تھا؟ کیا تم بھول گئے اور اس مضبوط عہد و پیمان کو جن میں خدا کو گواہ کیا تھا توڑ ڈالنا جائز رکھتے ہو۔ پھر آپؐ کی طبیعت میں اس قدر مبالغہ اور تاکید کس لیے تھی؟ تم تو یہ کہتے اور دعویٰ کرتے تھے کہ: جس وقت تم یہاں آ جاؤ گے، ہم سب تمہارا ساتھ دیں گے، اور خدمت گزاری سے پیش آئیں گے۔ تمہارے اقراروں پر مجبورہ کر کے یہاں آئے تو تم ان کے دشمنوں کے دوست بن گئے، اور تلواریں سوخت کر مقابلہ پر آجئے۔ آپؐ کی اولاد پر پانی بند کر دیا۔ آب فزات جس سے عام آدمی فائدہ اٹھاتے ہیں۔ یہودی، مجوسی، ترسا اور جنگی چرند و پرند سب پانی پیتے ہیں۔ اور تم کتوں اور وحشیوں تک کو اس سے نہیں روکتے کیا سبب ہے کہ پیغمبرؐ کی ذریت اور اطفال کو پیسا مارتے۔ ایک ظلمہ پانی نہیں دیتے۔ یہ کون سا مذہب ہے اور قیامت کے دن محمد مصطفیٰؐ کو کیا جواب دو گے۔ اور اس گناہ کا کیا عذر کرو گے؟ مالکم لاسقاکم اللہ یوم القیامۃ فبنس القوم انکم۔ عسکر کے لشکر میں کچھ لوگوں نے آواز دی۔ اے بربر! ہم نہیں سمجھتے کہ تو کیا کہہ رہا ہے۔ بربر نے کہا: ”میں انھیں جس قدر بھاتا ہوں اسی قدر تمہاری گمراہی اور زیادہ ہوتی جاتی ہے اور مجھے تمہارے افعال سے زیادہ عبرت ہوتی ہے۔ اے خدا تو خوب جانتا ہے کہ میں اس قوم سے بیزار ہوں، تو انھیں ہلکا کر اور ان کے ظلموں کی سزا دے۔ ان لوگوں نے تیرے کان پر ہاتھ ڈالا، اور کئی تیرا اس کی طرف چھوڑے۔ بربر واپس چلا آیا۔

زہیر بن قین کی تقریر اور مکالمہ ابن خلدون میں زہیر بن قین کی تقریر ہے کہ: ”اے اہل کوفہ! مسلمانوں پر مسلمانوں کا یہ حق ہے کہ ایک دوسرے کو صیحت کرید۔

اس وقت ہم اور تم بھائی بھائی ہیں۔ اور ایک ہی دین پر ہیں۔ جب تک ہم میں اور تم میں جنگ نہ ہو۔ پس جب کہ بھائے اور تمہارے لڑائی ہو جائے گی تو صیحت اٹھ جائے گی۔ ہم اور تم ایک ہی گروہ میں ہیں۔ ہم کو اور تم کو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی محمد ﷺ کی ذریت میں امتحان اور آزمائش کی غرض سے جٹا کیا ہے۔ ہم تم کو ان کی مدد اور گمراہ بن گمراہ ضیہ اللہ بن زیاد کے ذلیل کرنے کو بلاتے ہیں۔ بے شک تم اس سے سوائے ہدی کے اور کچھ نہ دیکھو گے وہ تمہارے ہاتھوں کو کاٹے گا۔

تم کو مثلہ کئے گا۔ تمہارے معزز اور ممتاز سرداروں محمد بن عدی اور اس کے ہمراہی ہانی بن عروہ جیسے کو قتل کرے گا۔
لشکر کا جواب: کوفیوں نے زہیر کو گلیاں دیں اور ابن زیاد کی صفت و ثنا کر کے کہا: واللہ جب تک ہم تجھ سے اور تیرے دوست (یعنی حسینؑ) اور اس کے ہمراہیوں سے نہ لڑیں گے۔ یا اس کو گرفتار کر کے اپنے امیر عبید اللہ بن زیادہ کے پاس نہ لے جائیں گے۔ اس وقت تک یہاں سے نہ ٹلیں گے۔
 زہیر نے کہا: اے اللہ کے بندو! ابن سمیہ کی نسبت ابن فاطمہ لہداد محبت کا زیادہ مستحق ہے۔ پس اگر تم اس کی مدد نہیں کر سکتے ہو تو اس کو اس کے ابن عم زبید بن معاویہ کے پاس بھیج دو۔ خدا کی قسم بغیر قتل حسینؑ کے بھی زبید تمہاری اطاعت سے راضی ہو جائے گا۔

شر بن ذی الجوشن نے تیر مار کر کہا: ”اللہ تیرا فتنہ بند کرے تو نے ہک ہک کر کے دماغ پریشان کر دیا۔“
 زمیر: اے کینہ بد خصل! تو وحشی جانور ہے۔ میں تجھ سے خطاب نہیں کرتا۔ خدا کی قسم تجھ کو کتب اللہ سے کچھ تعلق نہیں ہے۔ تجھے قیامت کی رسوائی اور عذاب الہی کی بشارت دیتا ہوں۔
 شر: اللہ تعالیٰ تجھے اور تیرے دوست کو محرب شربت مرگ پلانے گا۔

بے مثل اظہار اخلاص

زمیر: کیا تو قسم کو موت سے ڈراتا ہے۔ خدا کی قسم تیرے ساتھ کی حیات ابدی سے حسینؑ کے ساتھ مر جانا بہتر ہے۔

یہ کہہ کر زہیر تھوڑی دیر تک خاموش رہا۔ پھر بلند آواز سے کہا: اللہ کے بندو تم اس کینہ بے دین کے دھوکہ میں نہ آ جاؤ۔ خدا کی قسم اس گروہ کو رسول اللہ ﷺ کی شفاعت نہ نصیب ہوگی جو خون اس کے اہل بیت کا بہانے گا۔ اور اس کے احوان و انصار کو قتل کرے گا۔

حضرتؑ نے واپس بلا لیا
 زمیر کچھ اور بھی کہنے کو تھے کہ حضرت نے واپس بلا لیا۔ (کمال ابن اشیرہ کی بھی یہی عبارت ہے)

بعض مؤرخین مثل کمال ابن اشیرہ، ابن خلدون اور ابی عوف نے حضرتؑ کے خطبہ کے بعد زہیر بن قین کو فہاش کے لیے بھیجا ہے۔ لہذا اور اعظم کوفی نے ان کا پہلے ذکر کیا ہے۔

حضرتؑ کا لشکرِ شام سے مخاطبہ
 بہر حال اس سے کوئی مفید حالت نہیں پیدا ہوئی۔ بقول اعظم کوفی:

امیر المومنین حسینؑ آگے بڑھ کر اس گروہ کے سامنے جا کھڑے ہوئے اور لشکر کو فہرہ پر فلسفہ ڈال دیا۔ عمر کو دیکھا کہ سردار ابن لشکر کے یقین میں کھڑا ہے۔ تھوڑی دیر تک قہقہے سے دیکھا۔ پھر فرمایا: اھم لہ کہ دنیا فانی اور نیست و نابود ہونے والی جگہ ہے۔ سب نیک و بد گزر جاتے ہیں۔ محنت اور راحت کسی شے کو قیام نہیں۔ نیک بخت وہ شخص ہے جو اس دنیا کی نمائش اور بے اصل چیزوں کی طرف میل نہیں کرتا۔ اور بد نصیب وہ ہے جو اس کے فنا ہونے والے بے قیام امور کی خواہش رکھتا اور اس کی وفاداری کے مجرورہ پر قبضی سیتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اس کی نعمتیں ہمیشہ برقرار رہیں گی۔ غرض اسی قسم کی باتیں اپنے دل سے فرما رہے تھے۔ پھر با آواز بلند ان کو نصیحتیں کرنے لگے۔

اور نہایت عمدہ تقریر کی اور نیکو کاری کی تاکید فرمائی۔

عمر بن سعد نے کہا: آپ کا کلام قطع کرو۔ کیونکہ وہ اپنے باپ کا بیٹا ہے اگر اسے بولنے دو گے تو

فصاحت کا اعتراف اور خون

دن اور رات اسی میں گزر جانے گا۔ اور بولنے سے ذرا نہ رکے گا۔

کمال ابن ابیہر کے موافق: جب حضرت سوار ہونے تو مصحف آگے رکھ لیا تھا۔ اور فرمایا: ”خداوند! ہمارا اور ہر سختی جو تجھ پر نازل ہو مجھے تیرا ہی احتمال اور تمہی پر ہمدرد سا ہے۔ جس رنج سے دل ضعیف ہو۔ میں اس میں تیری ہی مدد مانگتا ہوں۔ جس میں حیلہ نہ ہو اور دوستوں سے کام نہ لگے۔ میں صرف تمہی سے کہتا ہوں اور تیرے سوا ہر ایک سے اعراض کرتا ہوں تو دل ہے ہر نعمت کا۔“ (ابن خلدون)

اس کے بعد حضرت کا غلبہ تھا کہ: ”اے لوگو! تم میری بات سنو عجلت نہ کرو۔ تا آنکہ جہاں تک تم پر واجب ہے تم کو کچھ نہ لو۔ اور میں اپنے آنے کا عذر تم سے بیان نہ کروں۔

خطبہ کی تفصیل

پس اگر تم میرے عذر کو قبول کر لو گے اور میری بات کی تصدیق کرو گے اور حق پسندی کرو گے تو تمہاری اس میں سعادت مندی ہے اور تمہارا اس میں کوئی حرج نہ ہوگا۔ اور اگر تم میرے عذر کو نہ قبول کیا چاہتے ہو تو تم لوگ بھیج دو اور اپنے شرکاء کو ایک جا کر دو تاکہ تم پر کوئی امر مشتبه نہ رہے۔ بعد اس کے میرے سامنے آؤ اور بے رورایت دیکھو۔ بے شک میرا دل اللہ ہے جس نے کتب اتاری ہے اور ماسکین کا دل ہے (آپ کی بہن یہ آواز سن کر ردا ٹھیں۔ آپ نے اپنے بھائی عباسؓ اور لڑکے علیؓ کو ان کے چپ کرانے کو بھیجا۔ جب وہ لوگ خاموش ہو گئے تو آپ نے حمد و ثنا کی رشول اللہ ﷺ پر دو در بھیجا۔ بعد ازاں پھر ان کو مخاطب کر کے ارشاد کیا) اما بعد تم لوگ میرا نسب بیان کرو اور دیکھو کہ میں کون ہوں۔ پھر اپنی طبیعتوں (انفسکم) کی طرف رجوع کرو اور اس کو جھڑکو اور غور کرو۔ کیا میرا قتل کرنا اور میری آبروریزی تمہیں روا اور جائز ہے؟ کیا میں تمہارے نبی کا نواسہ نہیں ہوں اور اس کے چچا زاد بھائی اور افضل ترین مومنین باللہ و تصدیق کنندہ رشول اللہ ﷺ کا بیٹا نہیں ہوں؟ کیا حمزہؓ صدیق الشہداء میرے باپ کے چچا نہ تھے۔ کیا جعفرؓ شہید طیارنی البیتہ میرے چچا نہیں ہیں۔ کیا تم کو یہ خبر نہیں چھپی ہے کہ رشول اللہ ﷺ نے میرے اور میرے بھائی کے حق میں فرمایا ہے کہ تم دونوں سردار جو انان جنت ہو۔ اور اہل سنت کے آئینہ کی ٹھنڈک ہو۔ پس جو میں نے تم سے کہا ہے اس کی تصدیق کرو اور پھر بھیج دو۔ بخدا میں نے جھوٹ بھی نہیں بولا۔ جب سے مجھے معلوم ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سے ناراض ہوتا ہے۔ اور اگر تم مجھے جھوٹا جانتے ہو تو تم میں ایسے لوگ موجود ہیں جن سے یہ دریافت کرو گے تو وہ تم کو اس سے آگاہ کریں گے۔ جابر بن عبد اللہ یا ابوسعید یا اسمیل بن سعد اور زید بن ارقم یا انس سے دریافت کرو۔ وہ تم کو بتائیں گے کہ انھوں نے رشول اللہ ﷺ سے یہ سنا ہے۔ کیا تم میں کوئی شخص ایسا نہیں ہے جو تم کو میری خونریزی سے روکے۔ پس اگر تم لوگ میرے کہنے پر مشکوک ہو یا میرے نواسہ رشول ہونے پر شک کرتے ہو تو اللہ مابین مشرق و مغرب میرے سوا تمہارے نبی کا تم میں اور نہ کسی غیر میں کوئی نواسہ نہیں ہے۔ اگر ہو تو بتلاؤ۔ کیا میں نے تم میں سے کسی کو مار ڈالا ہے جس کا غرض تم سے طلب کرتے ہو یا کسی مال کو میں نے ضائع کر دیا ہے جس کا معاملہ مانگتے ہو یا کسی زخم کا

نہید کے لشکریوں میں سے کسی نے اس کا کچھ جواب نہ دیا تو آپ نے شبث بن ربعی، حجار بن امیہ، قیس بن الاشعث، زید بن امرت کو نام بنام پکار کر فرمایا: اَلَمْ تَكْتُبُوا لِي فِي الْقُدُومِ الْيَوْمَ۔ ان لوگوں نے خط کھنے اور بلانے سے انکار کیا۔ آپ نے ارشاد کیا: ﴿يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِذْكُرْهُ قَوْنِي قَدْ عَوْنِي اَنْصُرْتُمُ الْيَوْمَ﴾ من الارض کے بے شک تم نے یہ کیا ہے۔ اے لوگو! تم کو مجھے سے نفرت ہے تو مجھے چھوڑ دو میں کسی محفوظ سرزمین کی طرف چاہاؤں۔

برائی کا خواہاں نہ ہو گا۔ آپ نے جواب دیا: ”کیا تیرا یہ مقصد ہے کہ نبی ہاشم حمزہ سے مسلم بن عقیل کے سوا اوروں کا خون بہا طلب کریں؟ خدا کی قسم میں ذلیل و خوار ہو کر تمہارا پیٹ نہ ہوں گا۔ اور نہ میں غلاموں کی طرح بیخود ہو کر اس کی امارت کا اقرار کروں گا۔ اے اللہ کے بندو میں اپنے اور تمہارے رب سے امن کا خواستگار ہوں اور ہر منکبہ اور اس شخص سے جو آفریت پر ایمان نہیں رکھتا ہے اللہ تعالیٰ سے پناہ مانگتا ہوں۔“ (اس قدر فرمانے کے بعد آپ نے اونٹنی بٹھلا دی اور اتر پڑے)

عمر بن سعد کی کارگزاری عموماً مؤرخین یہ کہتے ہیں کہ جس وقت صف کشی ہوئی عمر سعد نے پہلا تیر حسینؑ کے لشکر کی طرف چلایا اور لوگوں کو اپنی اس حرکت پر گواہ کیا کسی عرب نے

یہ بھی کہا کہ: ”اور پہلا شخص جو جہنم میں جائے گا وہ تو ہوگا۔“

تیروٹ کی بارش اور حضرت کا اپنے اصحاب سے خطاب

سے ایسے تیر چلے کہ گویا بارش ہو رہی تھی۔ سید الشہداء نے اپنے اصحاب سے فرمایا کہ خدا تم پر رحمت کرے تم بھی لڑنے مرنے پر آمادہ ہو جاؤ کہ سوائے اس کے اب کوئی چارہ نہیں ہے کہ یہ تیر ہماری طرف اس قوم کے قاصد ہیں کہ پیام مرگ لاتے ہیں۔ پس وہ اصحاب ایک گھنٹہ تک حملہ کر کے لڑے یہاں تک کہ سید الشہداء کی ایک جماعت قتل ہو گئی۔ اس وقت حضرت سید الشہداء نے اپنے محاسن پر دست اقدس رکھا اور فرمانے لگے کہ سخت غصہ ہوا خدا یہود پر جب کہ انھوں نے خدا کے علیے فرزند قرار دیا۔ اور بہت ہی قہر کیا خدا نے مجھ پر جب کہ انھوں نے سوا اس کے چاند و سورج کی پستش کی اور بے استہتاء غضب کیا خدا نے اس قوم پر جو کہ اپنے نبی کے نواسہ کے قتل پر مستعد و مشتعل ہو گئی۔ بخدا میں وہ بات ہرگز نہ مانوں گا جو وہ لوگ چاہتے ہیں۔ یعنی ذلت نہ گوارا کروں گا۔ یہاں تک کہ اپنے خون کا خضاب علیے ہوئے خدا سے جا کر ملوں۔

بقول ابن خلدون: جس وقت عمر بن سعد نے امام حسینؑ پر حملہ کرنے

عمر بن زید ریاحی اور ابن سعد

خدا تیرا جلا کرے کیا تو حسینؑ سے لڑنے کو جاتا ہے؟ حرنے جواب دیا۔۔۔ واللہ اس کی لڑائی سے یہ آسمان ہے کہ لوگوں کے سرکٹ کٹ کر گریں۔ اور ہاتھ شل ہو جائیں۔ تم مجھے یہ بتاؤ کہ اس نے جو درخواستیں پیش کی تھیں ان میں سے کس کو منظور کیا اور اس کے منظور کرنے میں تمہیں کیا حذر ہے؟ عمر بن سعد نے کہا: خدا کی قسم اگر میرے اختیار میں کچھ ہوتا تو میں اس کو منظور کر لیتا لیکن تمہارا امیر حسینؑ کی کسی درخواست قبول کرنے سے انکار کرتا ہے۔

حرنے کی دماغی کیفیت
 حرنے سن کر آہستہ آہستہ امام حسینؑ کی طرف چلے۔ ایک شخص نے اخص کے قبیلہ سے جس کا نام مہاجر بن اوس تھا چلا کر کہا: واللہ مجھے تمہارا کام مشتبہ معلوم ہوتا ہے۔ تم کو میں نے کسی لڑائی میں اس طرح لرزاں پڑنے ہوئے نہیں دیکھا۔ اگر کوئی شخص اہل کوفہ میں سے یہ فقرہ تمہاری نسبت کہتا تو میں اس سے لڑتا۔ حرنے جواب دیا: میں اپنے کو جنت و دوزخ کے لیے تول رہا ہوں۔ اور حق یہ ہے کہ میں جنت کے مقابلہ میں کسی چیز کو نہیں بچتا۔ چاہے مجھے کوئی مار ڈالے یا جلا ڈالے۔

حسینؑ کے پاس تائب ہو کر آتا ہے
 یہ کہہ کر گھوڑے کو ایک اڑھائی اور دم زدن میں امام حسینؑ کی خدمت میں پہنچ گئے۔ عرض کیا:

”اے ابی رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ تعالیٰ مجھے آپ پر خدا رکھے۔ میں وہی ہوں جس نے تم کو واپس بلانے سے روکا تھا جو تم کو میرے پیر کر اس راہ پر لایا تھا۔ اور جس نے شامت اعمال سے آپ کو اس مقام پر لا کر چھوڑا تھا۔ خدا کی قسم مجھے یہ امید نہ تھی کہ یہ لوگ آپ کے ساتھ یہ برتاؤ کریں گے اور آپ کی ایک بات بھی نہ مانیں گے۔ میں نے یہ رنگ دیکھ کر اپنے جی میں کہا چونکہ بعض باتوں میں ان کی میں اعانت کر چکا ہوں وہ مجھے آپ کی طرف جاتے ہوئے دیکھ کر اپنا مخالف نہ سمجھیں گے۔ پس اگر اب بعض امر میں ان کے خلاف میں کروں کوئی ہرج نہیں ہے۔ واللہ اگر مجھے یہ یقین ہوتا کہ آپ سے وہ نہ لڑیں گے تو میں ہرگز آپ کی خدمت میں حاضر نہ ہوتا۔ میں خدا کی قسم آپ کی خدمت میں جو لغزش مجھ سے ہو چکی ہے اس سے تائب ہو کر آیا ہوں تاکہ آپ کی اعانت کروں یہاں تک کہ آپ کے روبرو میں جان بحق تسلیم کروں۔ کیا آپ کے نزدیک میرا یہ توبہ مقبول ہو گا؟“ آپ نے فرمایا: ہاں۔ اللہ تعالیٰ یہ توبہ قبول فرمائے گا۔ اور تمہاری لغزش سے درگزر کرے گا۔

حرنے کا لشکر سے خطاب
 حرنے یہ سن کر اپنے ہمراہیوں سے مخاطب ہو کر کہا: اے لوگو! تم لوگ حسینؑ کی ان درخواستوں میں سے جو وہ پیش کرتے ہیں کیوں نہیں قبول کرتے۔

اللہ تعالیٰ تم کو دارین میں صبح عنایت کرے گا۔ اور تم کو ان کی لڑائی اور قتل سے نجات دے گا۔ عمر بن سعد بولا میں خدا اس امر کا خواہاں تھا۔ لیکن کیا کروں مجبور ہوں۔ بعد اس کے حرنے لشکریوں کو مخاطب کیا اے اہل کوفہ! بڑے افسوس کی بات ہے کہ تم نے خود ان کو بلایا۔ جب وہ آئے اس غرض سے کہ تم ان کی اعانت کرو اور ان کے ہمراہ ہو کر لڑو تو تم ان کے قتل پر کمر بستہ ہو گئے۔ اس پر طرہ یہ ہے کہ تم نے اس غریب کو اس طرح پر روک رکھا ہے کہ کہیں وہ جا نہیں سکتے۔ بڑے افسوس کا مقام ہے کہ تم نے ان کو قیدیوں کی طرح گرفتار کر لیا ہے۔ کسی طاہر دامن کی طرف جانے نہیں دیتے۔ نہ وہ کوئی فتح حاصل کر سکتے ہیں اور نہ کسی مضرت کے دفع کرنے پر قادر ہیں۔ تم نے ان کو آپ فرات سے بھی روک دیا ہے۔ جس سے یہودی اور نصرانی اور مجوسی سیراب ہوتے ہیں۔ کتے، سور اور کل چرند و پرند اس کو پیچھے ہیں۔ کیا وہ (حسینؑ) اس قابل

بھی نہیں ہیں اور ان کے ہمراہی شدت لشکر سے بے ہوش ہو رہے ہیں۔ تم لوگوں نے اچھا برتنوں (ملائکہ) کے بعد ان کے اہل بیت کے ساتھ کیا۔ اگر تم لوگ اپنے اس فحل سے توبہ نہ کرو گے اور مخالفین کو دریائے فرات سے نہ ہٹاؤ گے تو اس روز جب کہ شدت لشکر سے لوگ بے چین ہوں گے اللہ تعالیٰ تم کو بھی سیراب نہ کرے گا۔ ابن سعد کے لشکریوں نے جواب میں تیر مارا اور مرواہیں آکر جاں نثاران حسینؑ میں کھڑے ہو گئے۔ اس مورخ کے موافق عرصہ جنگ میں سے زیادہ تر میں شریک تھے۔ کبھی تنہا اور کبھی کئی اصحاب کے ساتھ دشمنوں سے جنگ کرتے تھے۔ یہاں تک کہ آخر میں شہید ہوئے۔

حجر بن عمر ابواحق اسفرائینی کہتے ہیں کہ پھر ابن سعد کے لشکر سے ایک سوار نکلا اور کہنے لگا: اے ابوجبر اللہ میں حجر بن عمر ہوں۔ اب میں آپ کے سامنے شہید ہوتا ہوں۔ پھر اس نے ابن سعد کی فوج سے نکل کر اس پر حملہ کر دیا۔ اور لڑتے لڑتے ایک سو بیس سپاہی قتل کیے۔ جس کے بعد وہ خود بھی مارا گیا۔ جب اس کے باپ نے دیکھا تو بڑا خوش ہوا۔ اور بولا شکر ہے اللہ کا جس نے میرے بیٹے کو شہادت کا درجہ عطا کیا۔ پھر وہ امام حسینؑ رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور کہنے لگا: یا حضرت میرا بیٹا آپ کے سامنے شہید ہو گیا ہے اب میں بھی تیار ہوں۔

حسینؑ لاش لائے امام حسینؑ رضی اللہ عنہ نے کہا: ٹھہرو میں اسے لاتا ہوں۔ یہ کہہ کر آپ نے مخالفین پر حملہ کیا۔ اور لڑتے لڑتے اسٹھ سو مخالف قتل کیے۔ اور حجر کو اٹھا لائے اور اس کو خیمہ کے سامنے رکھ دیا۔ مرنے کہا: اب مجھے بھی نکلنے کی اجازت دیجیے۔ امام حسینؑ رضی اللہ عنہ نے اجازت دی، اور کہا خدا تمہارے کام کی قدر کرے۔

صاحب روضۃ الشہداء نے مرقی جو کیفیت لکھی ہے اس سے اس کا عمل طبعی کچھ زیادہ معلوم ہوتا ہے اور وہ یہ کہ مہاجرین اوس یا مہر کے جہانی مصعب بن زید کے متذکرہ سوال و جواب کے بعد ”ننگاہ نعرہ از بکر بر کشید و گفت اے برادر بشارت بلا کہ نفس من بہشت را اختیار کرد۔ پس تازیانہ بر اسپ زد و نزد امام حسینؑ آمد و از مرکب پیادہ شد۔۔۔ امام حسینؑ از بلانے اسپ دست مبارک بر سرور وے لا مالید۔۔۔ اما چون مصعب برادر خرید کہ حرا آخرت را بردنیا گزید و دست و لاوار دامن آل عہازد اسب بر انگیزت و دست در فتراک امام حسینؑ آویخت۔ لشکر عمر سعد گمان بردند کہ بیجگ برادر میرود۔ چون بمیدان رسید گفت اے برادر خضر را من شدی و مرا از ظلمت گمراہی بسر چشمہ آب حیات معرفت رسانیدی من ہم با تو موافقت کردہ از اہل مخالفت بنہار شد م فردا ہر دو گواہ معاملہ یکدگر با شیم و ہام از امام حسینؑ بہر شہادت گیرم۔ حرا برادر خود را نزد یک امام حسینؑ آورد صورت حال را بوقت عرض رسانید امام مظلوم اورا در بر گرفت و بخواخت۔ اسی مورخ کے موافق مہر کے اجازت طلب کرنے پر حضرتؑ نے فرمایا: تو میرا مہمان ہے، صبر کر۔ کوئی دوسرا جائے۔ لیکن مہر حسینؑ کی طرف لذت حیات کے حصول کے لیے نہ آئے تھے کہ ٹھہرتے۔ فوجی عہدہ میں نہاد کی امید نہ تھی جو ادھر بھی لاتی تھی۔ یہ سب تو امیر شام کی طرف سے تھا جہاں ہزار ہزار سواروں کا اقتدار تھا۔ مہر اس لیے حسینؑ کی طرف آیا تھا کہ اسے اپنے پہلے موقع میں جینے سے اس موت میں شرکت زیادہ

دل کش تھی جس کے لیے حسینؑ آمادہ تھے اور عمرو بن سعد کے لشکر میں ہزاروں سواروں کی سپہ سالاری سے یہ زیادہ قابل افتخار تھا کہ حسینؑ کے بھوکے پیادے سپاہیوں کی صف میں ایک لمحہ کھڑا ہو جائے۔ آمادگان شہادت تھیں اپنی موجودہ حیات اپنے ہوش پر بار معلوم ہوتی تھی۔ اپنی حقیقت کا ثبوت اس سے بہتر کیا جا سکتے تھے جو حر کی آمد سے ظہر تھی۔

حر کو اجازت دینے کے وقت حسینؑ کے الفاظ
قبول ابو اسحاق اسفراتی حضرتؑ اجازت دی۔ ”اور کہا خدا تمہارے کام کی قدر کرے۔“

حر کا رجز
حر یہ شعر پڑھتا ہوا نکلا: میں عربوں اور مہان نوازی کے لیے مشہور ہوں۔ تمہاری گردنوں سے نکوار کو لہو پلاؤں گا۔ میں اس شخص کی طرف سے جو تمام اس اونچی سر زمین میں اترنے والوں سے اچھا ہے تم کو ماروں گا۔ اور ہر گز کچھ خوف نہ کروں گا۔

حر صفوان کو قتل کرتے ہیں
روضۃ الشہداء کے موافق ابن سعد نے صفوان بن حظلہ کو جو ایک نہایت مشہور سوار تھا اس ہدایت کے ساتھ بھیجا کہ اسے کھاجا کر لے آئے، اور اگر وہ نہ مانے تو اسے قتل کرے۔ صفوان بڑے غصے سے سامنے آیا۔ حر نے اسے دیکھ کر کہا: صفوان تیری ہنرمندی اور فہم زائی سے عجب ہے کہ تو مزید کے فبق اور ٹاپا کی کوجان کر اور حسینؑ کی پاکیزگی اور پاک زادگی سے واقف ہو کر انکڑہ جنگ ہے۔

صفوان: میں یہ سب جانتا ہوں اور ابن زیاد بھی واقف ہے لیکن مال دولت اور جاہ نرید کے پاس ہے۔ ہم لوگ سپاہی آدمی ہیں۔ ہمیں گھوڑا۔ اسلحہ مرتبہ اور منصب چاہیے۔ قوی طہارت، علم اور فضیلت کیا فائدہ۔ تو حق کو یہاں کر اسے چھپاتا ہے۔

رد و بدل ہوئی۔ حر کا نیزہ صفوان کا سینہ توڑ گیا۔ صفوان کے تین بھائیوں نے یکبارگی حملہ کیا۔ حر نے آگے والے کو زین سے اٹھایا اور پٹکا کہ پھر نہ اٹھلے دوسرے کو نکوار سے قتل کیا۔ تیسرا بھاگا۔ مگر سنان نیزہ نے اسے بھی چن لیا۔ حر کی ہیبت سے اب کسی تہا کو جرات آسانی کا حوصلہ نہ ہوا۔ اور حر نے اب دشمن کی صفوں پر حملہ شروع کیا۔ گری جنگ میں حر کا گھوڑا مارا گیا۔ اور یہ پیدل جنگ کرنے لگا۔

حضرتؑ۔ حر کے لیے گھوڑا بھیجتے ہیں
حسینؑ نے دیکھا اور ایک گھوڑا بھیجا۔ حر نے دیکھ کر کاب کو بوسہ دیا۔ سوار ہوا اور جولان کیا۔ رجز خوانی شروع کی۔

حر تھا اس کا ہاتھ تھا اور نکوار کے لیے دشمن کا انبوہ تھا۔ دشمن کے گردہ کو مخترق کرنے کے اشن میں خیال ہوا کہ ایک مرتبہ حسینؑ کے پاس ہو آئیں لیکن اب تو اس کے کانوں میں یہ صدا آرہی تھی کہ اسے حرمیدان شہادت سے اب کہاں جاتا ہے۔ یہیں سے یہ تصفیہ کی آواز دی کہ: ”یا ابن رسول اللہ آپ کے جد بزرگوار کے پاس جاتا ہوں کوئی پیغام ہے؟“۔ حسینؑ نے گرفتہ آواز سے یہ صاف جواب دیا: ”مظنون رہا ہم بھی تمہارے پیچھے آتے ہیں۔“ ان دونوں صدائوں نے اصحاب میں سے اکثر کے منہ سے کراہ نکال دی۔ اب حر نے اپنے کو سپاہیانہ ہوش نہیں بلکہ شہادت کے جوش اور موت کی جلدی کے لیے دشمنوں پر دے مارا۔ اور ارادہ کی قوت کا تماشا شروع ہوا۔ مرنے والے کے سامنے جلتا آسان

نہیں ہے۔ خصوصاً ایسے سپاہیوں کا جن کی اخلاقی جرأت اپنے انہوہ پر ہو۔

عام حالت

لیکن حرا اپنے ہاتھ ارادہ اور گوشت و خون کی حد سے زیادہ معجزہ نہیں دکھا سکتا تھا۔ انہوہ اور چوم کو بھی کچھ فائدہ حاصل ہے۔ جو تلوار کو سپاہیانہ فہرے نہیں اٹھا سکتے تھے وہ نیزہ مارنے میں دوری کے لحاظ سے کچھ محفوظ تھے اور تیر انداز اس سے بھی زیادہ حقیقتاً دشمن نے تیروں سے ہی جنگ کی۔ اکیلا تیروں کے مینہ کا کہاں تک جواب دے سکے گھوڑا اور سوار دونوں چھلنی ہو کر گرتے تھے اور دشمن خوش ہو لیتا تھا کہ ہم نے نتیجہ حاصل کر لیا۔ اگر کوئی پہلور باوجود تیروں اور بے شمار حروں کے زخم کے گرتے ہوئے گھوڑے سے سنبھلنا چاہتا تھا تو اس کو انہوہ میں اس قدر وقت ملنا بہت دشوار اور پھر سنبھلا بھی تو کہاں تک۔ مگر صرف دل اور ارادہ سے بحث ہے فولاد اور گوشت کا مقابلہ نہیں ہے۔ گوشت تو فولاد کی غذا ہو ہی جائے گا۔ لیکن کہنا یہ ہے کہ نفس انسانی میں قصیم کی یہ قابلیت ہے جو دنیا کے ہر ممکن اقتباس اکہ قتل سے منفر کرے۔ موت کی ہیبت اس کے لیے ہیبت نہیں ہے۔ نزع کی خلیف اس کے لیے شیریں اشتیاق کالائت بخش درد ہے۔

صاحب روضۃ الشفا ابو الموفق خوارزمی کی زبانی کہتا ہے کہ حرا نے چالیس سوار اور پیادوں کے قتل کرنے کے بعد شہادت پائی۔

دشمن کی تعداد جو حرا نے کم کی

ابو احق اسعد اپنی مقتولین کی تعداد پانچ سو سپاہی بتاتا ہے۔

صاحب سوانح عرقہ کے نزدیک حرا اس وقت میدان میں آئے جس وقت حضرت کچھ پاس رفعت شہید ہو چکے تھے۔ ابو عتف کے نزدیک حرا نے ابتدا میں شہید ہونے اور نہ درمیان میں بلکہ جس وقت صرف حضرت قائم ان کے برابر مالی مقدار احمد اور حضرت علی بن الحسین (علی اکبر) باقی تھے۔ اور موئی بن عقیل کے بعد احمد بن محمد الہاشمی شہید ہو چکے تھے کہ حضرت نے اپنی تہائی دیجہ کر بلند آواز سے استیغاثہ فرمایا اور جس وقت حرا کے کان میں حضرت کی صدا پہنچی یہ اپنے چچا ابن قرہ کے پاس آئے اور کہا: اے چچا کیا تم نہیں دیکھتے کہ حسین استیغاثہ کر رہے ہیں اور کوئی ان کی مدد نہیں کرتا۔ ان کے انصار اور اولاد شہید ہو چکی۔ کیا تمہارا ارادہ ہے کہ ان کی طرف چلو کہ ان کے سامنے مارے جائیں۔ دنیا میں آدمی مسافر کی حیثیت رکھتا ہے اور دنیا کی کراہتیں فانی ہونے والی ہیں۔ شاید ہم لوگ شہادت سے بہرہ یاب ہوں اور اہل سعادت میں محسوب ہوں۔ اس نے کہا: ہمیں اس کی کیا حاجت ہے۔ پس حرا نے اسے ترک کیا اور اپنے بیٹے کے پاس آیا اور کہا: اے فرزند کیا تو حسین کو نہیں دیکھتا کہ وہ استیغاثہ کر رہے ہیں اور کوئی ان کی مدد نہیں کرتا۔ اے فرزند چلو ان کی طرف چلیں اور ان کے سامنے جنگ کر پ۔ شاید شہادت سے بہرہ یاب اور اہل سعادت میں محسوب ہوں۔ لڑنے کے لیے کہا: حرا و کرامتہ۔ اس کے بعد یہ دونوں آدمی ابن زیاد کے لشکر سے اس طرح نکلے گویا جنگ کے ارادہ سے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ حسین کے پاس پہنچے۔ پس حرا اپنے گھوڑے سے اترے۔ سر جھکایا اور حضرت کے دست دہانے مبارک کو مس کر کے چچا مار کر رونے لگے۔ پس حضرت نے کہا: یا شیخ اپنے سر کو اٹھا۔ پس اس نے اپنا سر اٹھایا۔ (اس کے بعد گھٹگو حام ہے) پھر حرا نے اپنے فرزند سے حملہ کرنے کو کہا۔ اس نے حملہ کیا۔ یہاں تک کہ ستر سپاہیوں کو قتل کیا۔ اور اس کے بعد شہید ہوا۔ جس وقت باپ نے بیٹے کو شہید دیکھا بہت خوش ہوا۔ اور کہا: خدا کا شکر ہے کہ مجھے میرے مولا

حسین بن امیر المومنین کے سامنے شہادت نصیب ہوئی۔ اب مر ڈے اور عرض کیا کہ مجھے پسہ ہے کہ میں آپ کے سامنے مارا جاؤں۔ پس فرمایا حضرتؑ نے کہ بلا خدا تمہیں اس میں برکت دے۔

اس مورخ کے موافق جب عمر نے ہتیروں کو قتل کیا تو عمر بن سعد نے اپنے سپاہیوں کو آواز دی وہ قتل ہو کر اس پر تیار ہو کر رہے۔ پس ان پر تیرے گئے۔ یہاں تک کہ ان کی جلد سہمی کے ایسی ہو گئی اور گرفتار کر لیے گئے۔ اور ان کا سر کاٹ کر پھینک دیا گیا۔ حسینؑ نے اسے اپنے ہاتھوں پر اٹھالیا۔ چہرہ اور دستوں سے خون پاک کیا اور کہا واللہ تیری ماں نے غلطی نہیں کی تھی کہ تیرا نام عمر کا تھا۔ واللہ تو دنیا میں عمر اور آخرت میں سعید ہے۔ پس ان کے لیے طلب استغفار فرمائی اور اس پر رونے اور یہ اشعار فرمائے:

کیا اچھا عمر تھا عمر بن ریاح جو نیزہ پڑنے کے وقت صبر سے کام لیتا تھا۔ بلاؤں کی گرم بازاری میں جب کہ پہلوں پر سے لیے ہوئے چل رہے ہو۔ عمر بھی خوب آدمی تھا۔ اس نے حسینؑ کو پکارا۔ اور صبح کے وقت اس نے اپنی جان سے سخاوت کر کے کامیاب ہوئے وہ لوگ جنہوں نے حسینؑ کی مدد کی اور ہدایت اور فلاح حاصل کر کے (اس مرثیہ سے شہادت صبح کے وقت ثابت ہوتی ہے)

اس کے بعد عمر کا سر اپنے مقتولین میں رکھ دیا۔ صاحب سر الشہادتین کے موافق قتل معہ اخوہ وابہ و مولاء (اور اس کے ساتھ اس کا بھائی بیٹا اور غلام شہید ہوئے)

روضۃ الشہداء کے موافق عمر کی شہادت کے بعد حضرتؑ دوبارہ دونوں صفوں کے درمیان کھڑے ہوئے اور فرمایا: ”اے اہل کوفہ و شام! میں نے لڑائی کی ابتدا نہیں کی بلکہ تم نے میری طرف تیرے پھینکے۔ میں اب بھی تم سے جنگ کے لیے آمادہ نہیں اور اب تک میرے لشکر سے کوئی مارا نہیں گیا۔ عمر اس کا بھائی بیٹا اور غلام تھا۔ عمر سے آدمی تھے جنہوں نے میری مدد کی۔ میں دوبارہ اتمام غنیمت کرتا ہوں کہ آئندہ تمہیں ہذرہ نہ رہے۔ اے گردہ آؤ اور ان تین باتوں میں سے ایک کو اختیار کرو۔ اول یہ کہ مجھے جانے دو کہ نذیر سے بغیر مقابلہ بحث کرو۔ اگر کچھوں کا کہ وہ حق پر ہے تو اس سے بیعت کروں گا۔ ورنہ وہ جانے گا۔ یہ سن کر کسی نے آواز دی کہ تمہیں نذیر کے پاس نہ جانے دیں گے اس لیے کہ تم شیریں زبان اور تیر بیان شخص ہو۔ تم دل پذیر ہذرات سے اسے ذوق نہ کرو گے اور اس وقت خلاص ہو کر فتنہ مٹا کر دو گے۔ اور دوبارہ ملک میں فتنہ مٹا کر دو گے۔ حضرتؑ نے فرمایا کہ جب یہ نہیں کرتے تو چھوڑ دو کہ میں اپنے نانا کے روضہ کی مہلوری کروں اور اپنی عمر نہاد اور عیادت میں بسر کروں۔ جواب دیا کہ ہم اس پر بھی راضی نہیں ہیں۔ لیکن ہے کہ اجلات عرب تمہارے گرد جمع ہوں اور تم پھر طلب خلافت کرو۔ فرمایا کہ اگر یہ دونوں باتیں تمہیں منظور نہیں تو مجھے اور میرے رفقاء کو پانی دو کہ تمام آدمیوں کو پانی میں حق بشری حاصل ہے۔ جواب دیا کہ پانی کا ذکر نہ کرو کہ اگر تم لوگ بوسیدہ بھی ہو جاؤ تو بغیر بیعت نذیر کے ایک قطرہ فوات کا نہ دیں گے۔ ہمیں تم سے یزید کے کوئی راہ نہیں ہے۔ فرمایا: جب یہ نہیں کرتے تو جنگ کے لیے ایک ایک آدمی نکلو کہ شجاعت اور ہنرمندی ظاہر ہو۔ کہا: ہاں، اے اہل کوفہ! ہم ایسا کریں گے۔

ابن خلدون کے موافق نذیر بن مقل علی بن عیسیٰ جوش مردائی میں اگر لٹکارا تا جو امپان میں آیا اور بریر بن خنیز سے بلا کر کہا: دیکھا اللہ تعالیٰ نے تیرے ساتھ کیا کیا۔ بریر نے جواب دیا:

بریر بن خنیز

واللہ اس نے میرے ساتھ بہت بڑی بھلائی کی ہے اور تیرے ساتھ برائی، نرید بولا تو جھوٹ کہتا ہے۔ اس سے پیشتر تو جھوٹ نہ بولتا تھا خدا کی قسم تو گمراہی میں پڑ گیا۔ ابن خنیر نے کہا: اگر تجھے اپنی بھلائی کا دعویٰ ہے تو آسم اور تو مقابلہ کریں اور اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کریں کہ ہم میں سے جھوٹے اور گمراہ پر اللہ تعالیٰ اپنی پھٹکار بھیجے۔ نرید سے اس کا جواب کچھ نہ بن پڑا۔ تلوار بھیج کر دوڑا۔ فریقین میں کمال تیزی سے دو دو ہاتھ چل گئے۔ نرید بن مفضل نے تلوار چھوڑ کر نیزہ کا دار کیا۔ بریر نے خالی دے کر تلوار چلائی جو خود چھڑ کر سر میں تیر گئی۔ بریر تلوار ٹکالنے میں مصروف تھے کہ رضی بن منذر عہدی نے لپک کر دار کیا۔ ابن خنیر لپٹ پڑے۔ تھوڑی دیر تک زور آزمائی ہوتی رہی۔ بلاآخر ابن خنیر نے رضی کو مار لیا۔ سینہ پر چڑھ کر خنجر ٹکالنے لگے۔ اس اثنا میں کعب بن جابر ازدی نے پتھر کر ابن خنیر کی پشت میں نیزہ مارا ابن خنیر زخم کے صدمہ سے بے تاب ہو کر اٹھ آئے۔ کعب نے نیزہ چھوڑ تلوار کا دار کیا جس سے ابن خنیر شہید ہو گئے اور رضی اپنی قبائلاً تاجوا اللہ کڑا ہوا۔ دایہی کے بعد کعب کی سیوی نے ملامت کرتے ہوئے کہا: قت ہو تجھ پر۔ تو ابن فاطمہ کے خلاف لڑنے کو آیا اور پھر اس پر طرہ یہ ہوا کہ بریر سید القراء کو تو نے شہید کیا جاتیرا رو سیاہ ہوا۔ میں تجھ سے اب ہرگز نہ بولوں گی۔ قبول روضۃ الشہداء حضرت نے بریر کی شہادت پر فرمایا کہ بریر خدا کے بند گن مائین میں سے تھے۔

اعظم کئی اور روضۃ الشہداء کے موافق بریر کے قاتل کا ایک پسر عم فہید بن جابر قتلہ قاتل سے کہنے لگا کہ تو نے بریر کو قتل کیا جو خاص اہل اللہ اور متحابان درگاہ خدا میں سے تھا اس کے علاوہ لوگوں نے بھی ملامت کی۔ قاتل بریر شرم سے لشکر سے چلا گیا اور تھوڑے دنوں میں مر گیا۔ اس کے اشعار بھی ہیں جو اس نے اظہارِ ندامت میں کہے ہیں۔

عبداللہ بن عمر کلبی لشکر شام سے یار ظلم زیاد اور مسلم ظلم عبداللہ کل کر میدان میں آیا۔ مقابلہ کے لیے لٹکار کر لڑنے والے کو طلب کیا۔ امام حسینؑ کی طرف سے عبداللہ بن عمر کلبی

میدان جنگ میں آئے۔ یہ کوفہ سے مع اپنی سیوی کے آپ کی خدمت میں آئے تھے۔ یار و مسلم نے نام و نسب دریافت کیا۔ عبداللہ نے نام بتلایا۔ یار و مسلم بولے ہم تم کو نہیں جانتے۔ ہمارے مقابلہ پر نرید بن قین یا حبیب بن مظاہر بریر بن خنیر جیسے لوگوں کو آنا چاہیے۔ عبداللہ نے ترش رو ہو کر یار کو مخاطب کیا: اے عرایب۔ تیرے مقابلہ پر وہ لوگ آئیں گے؟ تو اس کا بل نہیں ہے کہ تو ان کی تیغ تیرے ہلاک کیا جائے۔ تیری روح و تن کے فیصلہ کے لیے میری تلوار کافی ہے۔ یار یہ سن کر حملہ کی تیغ آگے بڑھا۔ عبداللہ نے دار خالی سے کر تلوار چلائی۔ تھوڑی دیر تک فریقین میں ایک دوسرے پر وار چلا کیے۔ مسلم اپنے ہمراہی کو کمزور دیکھ کر عبداللہ کی طرف جھپٹا۔ عبداللہ نہایت تیزی سے یار کا کام تمام کر کے مسلم کی طرف مڑے۔ مسلم نے دار پر وار کر کے شروع کر دیے۔ عبداللہ روکتے اور حملہ کا بھی جواب دیتے جاتے تھے۔ بلاآخر عبداللہ کے ہاتھ ہاتھ کی انگلیاں کٹ گئیں۔ اور پھر انھوں نے لپک کر ایسا وار کیا کہ مسلم بھی اسی جگہ ٹھنڈا ہو گیا۔ ان کی سیوی ام وہب ایک لکڑی لے کر یہ کہتی ہوئی دوڑی میرے ماں باپ تم پر خدا ہوں رسول اللہ کے نواسوں کے لیے لڑتے لڑتے اپنے کو تصدق کر دو۔ عبداللہ نے میدان جنگ میں آنے سے روکا۔ ام وہب نے جانے سے انکار کر کے کہا: میں تمہارا ساتھ جب تک زندہ ہوں نہ چھوڑوں گی۔ امام حسینؑ نے آواز بلند سے کہا: تم لوگوں نے اہل بیت رسالت کے ساتھ بہت بڑی بھلائی کی اللہ تعالیٰ تم کو جزائے خیر دے گا۔ اے ام وہب تجھ پر اللہ تعالیٰ رحم کرے لوٹ آ۔

عورتوں پر جہاں نہیں ہے۔ ام وہب یہ سن کر واپس آئیں۔

ابن خلدون انتاکہ کرچپ ہو جاتا ہے۔ لیکن روضۃ الشہداء میں قصویٰ تفصیل اور ہے۔ وہ یہ کہ جب یسار اور سلم میدان میں آئے تو بریر اور حبیب نے میدان میں جانا چاہا۔ لیکن حضرت نے انہیں روکا اس وقت عبداللہ بن عمر گلی آگے بڑھے اور عرض کی کہ یا ابن رسول اللہ مجھے اجازت جنگ دیجیے۔ حضرت نے دیکھا کہ ایک گندم گوں دراز بلا قوی ہانڈ، کشادہ سینہ ایک شخص ہے جس کے چہرہ سے شان مبارزت ظاہر ہے۔ حضرت نے فرمایا کہ یہ ان دونوں ظالموں کو قتل کرے گا اور اجازت دی۔ عبداللہ پیادہ ان کی طرف گئے۔ دونوں نے کہا تم کو ہم نہیں پہچانتے۔ تم جہاں اور بریر یا زبیر بن قین کو بھیجو۔ عبداللہ نے کہا کہ اب تم اس قابل ہو گئے ہو کہ سردار ان لشکر اور مبارزان دلاور کو ہلانے کی جرأت کرو۔ تمہارا قتل کرنے والا مثل تمہارے ظالم ہونا چاہیے۔ اگر پیاس نہ ہوئی تو ہم لوگوں کو تم سے جنگ کرنا شرم کی بات تھی۔ یسار نے غصہ میں عبداللہ کو نیزہ مارا۔ عبداللہ نے رد کیا اور تلوار کا دار کیا کہ وہ گھوڑے سے گرا۔ عبداللہ دوڑنے کے اس کا کام تمام کر دی کہ سلم پشت کی طرف آیا۔ اور عبداللہ پر تلوار مارنی چاہی۔ امیر المومنین حسینؑ کے لشکر سے لوگوں نے عبداللہ کو ہوشیار کیا۔ عبداللہ نے آوازوں پر التفات نہ کی اور اپنی تلوار یسار کے سینہ پر رکھ کر زور کیا کہ نوک پشت سے نکل آئی۔ اب سلم کی تلوار سر کے قریب پہنچ گئی تھی۔ عبداللہ نے ہاتھ آگے بڑھا دیا جس سے اٹھکلیا قلم ہو گئیں۔ عبداللہ نے ذرا پرواہ نہ کی اور یسار کے سینہ سے تلوار نکال کر سلم کے پاس پہنچے اور ایک ہی ہاتھ میں اس کا کام تمام کر دیا۔ یہ دیکھ کر ابن زیاد کے ظالموں نے عبداللہ کو گھیر لیا اس پہاڑ نے پیٹیروں کو قتل کیا۔ ہاتھ شہید ہوئے۔

وہب بن عبداللہ کلبی

بریر کے بعد ایک نوخیز نوجوان میدان میں آیا۔ جس کا نام روضۃ العقیق اور روضۃ الشہداء میں وہب بن عبداللہ کلبی ہے۔ ان کی ماں کا نام قربتایا گیا ہے۔ ابن خلدون سے عبداللہ بن عمر گلی کی جنگ لکھی گئی ہے۔ اور اس مورخ نے ان کی زوجہ کا نام ام وہب کہا ہے۔ یہ بھی لکھا ہے کہ عبداللہ مع اپنی بی بی کے کوفہ سے کربلا میں آئے تھے۔ میں سوچتا ہوں کہ وہب اسی شہید کے فرزند تھے جس کا نام عبداللہ بن عمر گلی تھا۔ اور قمر کی کنیت ام وہب تھی۔ پوچھا جاسکتا ہے کہ اگر وہب عبداللہ بن عمر گلی ہی کے فرزند تھے تو کیا ہوا کہ یہ اپنے پہاڑ پر پ کے بعد ہی فوراً میدان میں نہ دکھائی دیے۔ بلکہ بریر نے جنگ کی اور شہادت پائی۔ حضرت نے چھوٹے سے لشکر میں اگر جنگ کے لیے جانے کا اب تک کوئی اصول تھا تو یہ کہ ایک شخص جاتا تو کوئی ہمد دوسرے یہ کہ حضرت سے اجازت لیتا یا اپنی جگہ سے السلام طے کیا یا ابن رسول اللہ کہتا اور میدان کی طرف بڑھ جاتا۔ اس کے علاوہ عرب کیا معنی دنیا نے قدم کا یہ مسلحہ اصول تھا کہ اگر کوئی پہاڑ کسی کو بلاتا تھا تو وہی اس سے جنگ کرتا تھا۔ اگرچہ اس میں درجہ امتیاز کی احتیاج ہو جایا کرتی تھی۔ زبیر بن مقل بریر کو طلب کر چکا تھا۔ اس لیے بریر بڑھ گئے۔ جس طرح حسین بن عمر نے حبیب بن مظہر کو طلب کیا۔ اور انہوں نے بھی لشکر قبول کیا۔ اس کے علاوہ رقتائے حسینؑ میں ہر شخص جس طرح آلودہ شہادت تھا اس سے پیش و پس کا سوال ہی درمیان سے اٹھ گیا تھا۔ جو بڑھ گیا۔ حسینؑ تو اس وقت روکتے جب یہ جانتے کہ روکنے سے صورت واقعہ دوسری ہوگی۔ اگر کوئی ان حضرات میں میوڑ تھا کہ اپنی جگہ نہ چھوڑے تو صرف حضرت کے چھوٹے سے لشکر کے افسران میمد و میسرہ یا حضرت عباسؑ علم دار تھے۔ نظر بریں پیش روی یا پس روی کا خیال زیادہ قوی نہیں ہے۔

تاہم میرے نزدیک بھی کہا جاسکتا ہے کہ ”غالب تشرینہ ہے“ ”تین“ کا لفظ استعمال نہیں کر سکتا۔ بہر حال اس پہلور کا درد انگیز قصہ شہادت یوں شروع ہوتا ہے کہ وہب کی عسروی کو صرف سترو روز ہوئے تھے اور یہ مح اپنی تھی دلہن اور ماں کے خیمہ حسین میں تھے کہ جنگ شروع ہو گئی تھی۔ (روضۃ الشہداء) بریر شہادت پانچکے تھے کہ قزوہب کے پاس گئیں۔ میں روضۃ الشہداء کے بعض خوبصورت الفاظ اور جذبات قرض لیتا ہوں۔ وہ کہتی ہیں: اے فرزند باوجود اس محبت کے جو مجھے تیرے ساتھ ہے۔ میں تجھ سے چاہتی ہوں کہ تو جگر گوشہ مصطفیٰ کی حالت پر غور کر کہ وہ کربلا میں کس طرح بے دکانوں میں گھر گئے ہیں۔ ”میں خواہم کہ مرا از خون خود شربتہ دی تاثیرے کہ از پستان من خورده ای بر تو حلال گردد۔“ میری تمنا ہے کہ حسین پر اپنی جان نثار کر کہ قیامت میں تجھ سے راضی ہوں۔ اے جان ماور جاہ اور اس سرور پر اپنا سفر خا کر اور مردان راہ خدا کی طرح ہوا دھوس کو ترک کر دے۔

روضۃ الغفا کے لفظوں میں وہب نے جواب دیا کہ: افعل یا اماہک ولا اقصر ان شاء اللہ۔ (یعنی اے ماں میں ایسا ہی کروں گا۔ اور خدا نے چاہا تو کئی نہ کروں گا) وہب نے کہا: اے اماں مجھے فرزند رسول پر جان نثار کرنے میں کوئی حذر نہیں ہے۔ لیکن مجھے تھی دلہن کا خیال ہے کہ اس نے اس غربت میں ہم سے مواخت کی اور ابھی اسے کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔ اگر اجازت دو تو اس سے رخصت لے لوں۔ ماں نے کہا: جاپلیکن عورتیں ناقص العقل ہوتی ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ قصیں فریب دے اور توسلوت جاوید سے عودم بوجہائے۔ وہب نے کہا: اے ماں خاطر جمع رکھو حسین کی محبت میں اس طرح کمر نہیں بندھی ہے کہ کوئی اسے فریب سے کھول دے۔ اس کے بعد یہ نوجوان اپنی بی بی کے پاس آیا۔ اور کہا اے بانو نے دسلاز آج حسین دشت کربلا میں گھر گئے ہیں اور غریب دستا ہیں۔ چاہتا ہوں کہ اپنی جان ان پر نثار کر دوں کہ قیامت میں رضائے الہی اور شفاعت رسول سے عودم نہ رہوں۔ بتو خدا کی خوشنودی اور علی مرتضیٰ کی مدد میرے شامل حال رہے۔ یہ سن کر عروس کے دل سے آہ نکل گئی۔ اور کہا: اے میرے عکسار میری ہزار جان حسین پر صدقے ہو کاش عورتوں پر بھی جہاد واجب ہوتا کہ میں بھی اپنی جان فدا کرتی۔ (اس کے بعد دونوں حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عروس نے عرض کی) میری التجا یہ ہے کہ میں یہاں غریب اور بے مددگار ہوں۔ میں خیمہ حرم محترم میں رہنے دی جاؤں کہ میری بصمت محفوظ رہے گی۔ حضرت اور اہل بیت اس عورت کی بات پر چشم پر آب ہو گئے۔ اور جوان نے کہا کہ یا حضرت میں نے اسے آپ کے سپرد کیا۔ حضور اسے عذرات بصمت و طہارت کے حوالہ کر دیں۔ یہ کہہ کر رخصت ہوا۔ مہمان میں پہنچا اور حضرت کی مدح میں شعر کہا: ۛ

امیدی حسینی و نعم الامید لہ لعلہ کالسراج المنیر

شہسواری اور سپہ گری کے فن دکھانے پیتروں سے جنگ کی اور واپس آکر کہا اے ماں مجھ سے راضی ہوئی؟ ماں نے کہا: ہاں تو نے پیتیری پہلوری دکھائی لیکن میں یہ چاہتی ہوں کہ جب تک زندہ ہے لڑائی سے ہاتھ نہ اٹھا وہب نے جواب دیا: اے ماں میں ایسا ہی کروں گا۔ لیکن اگر تو اجازت دے تو عروس کو رخصت کر لوں۔ ماں نے اجازت دی۔ آیا۔ نوازش کی ابھی ہاتھیں کر رہا تھا کہ اہل من مبارز کی صدا آئی۔ اٹھا روانہ ہوا۔ عروس دیکھتی رہ گئی۔ وہب نے ایک بڑے شہسوار کو جس کا نام عجم بن طفیل تھا مارا۔ اب نغمہ میں آگیا۔ اس کی تلوار اپنے جوہر دکھائی رہی۔ یہاں تک کہ ہانڈو بے کار

ہو گئے اور گرا۔ دشمنوں نے سرکٹ کر حضرت کے لشکر کی طرف پھینک دیا۔ "ملارش در جست و سرپر برداشتہ رو بروئے نہلا و گفت احسنت نیکو کردی اے جان ملارش دے حلال زادہ ملارش انہوں رمنائے من ترا حاصل شدہ و بشہدائے راہ خدائے تعالیٰ واصل گشتی"۔ یہ کہہ کر سر کو عروس کی گود میں رکھ دیا۔ عروس نے کوئی بھٹکایا سلاخی خون میں ڈوبی آنکھ میں پتھری آہ کی اور مر گئی۔ یہ بھی روایت ہے کہ جب وہب کا ہاتھ کٹ گیا تو چوب خیر لے کر دوڑی اور شمر نے اپنے غلام کو اشارہ کیا اس نے زوجہ وہب کے سر پر ایک گرز مارا کہ تورا کر گری اور مر گئی۔ یہ بھی روایت ہے کہ ماں وہب کا سر لے کر میدان میں گئی اور قاتل کے سینہ پر اس زور سے پھینکا مارا کہ وہ گرا اور مر گیا حسین نے واپس بلا لیا حیدر نے مقرر کیا کہ بھو اور بیٹے کے غم میں میں نے ایسا کیا

صاحب روضۃ الشہداء کے موافق لشکر دول کی آراستگی کے بعد ابن سعد نے سامہ زبیدی کو میدان میں بھیجا اور یہ بڑے ٹھٹ سے میدان میں آیا۔ اور اپنا نام

ظہیر بن حسان اسدی

و نسب ظاہر کیا۔ اسے دیکھ کر ظہیر بن حسان جو قبیلہ بن اسد کے مشہور شجاع تھے حضرت کے پاس آئے اور عرض کی کہ یہ مشہور بہادر ہے مجھے اجازت دیجیے کہ میں اس سے مقابلہ کروں۔ اجازت ملے گھوڑا اڑاتے ہوئے سامہ کے قریب پہنچے سامہ انہیں دیکھ کر کانپ گیا اور فصیح شروع کی کہ اے بہادر تھے شرم نہیں آتی کہ اپنے اہل و عیال اور مال کو چھوڑ کر حسین کی مدد کو گیا ظہیر نے کہا: اے کینہ تھے شرم نہیں آتی کہ تو نعمت کافی کے لیے حقوت دائمی اختیار کرتا ہے۔ اور اہل بیت پر تلوار کھینچتا ہے۔ سامہ کچھ اور کہنا چاہتا تھا کہ ظہیر نے اس کے منہ پر نیزہ مارا اور وہ کھوپڑی توڑ کر باہر نکل گیا اور سامہ گرا اور اوپر ظہیر عمر سعد کے سامنے گئے اور نعرہ کیا کہ اے اہل عراق جو مجھے جانتا ہے وہ جانتا ہے۔ اور جو نہیں جانتا میں ظہیر بن حسان اسدی ہوں۔ کون آتا ہے کہ بخت آسمانی کی جائے۔ اہل عراق دشام ظہیر کا آوازہ شجاعت سن چکے تھے کوئی نہ ہلا۔ ابن سعد نے لکارا اور اس کی صدا پر ضرب بن کعب بھی جوفن سپہ گری کا بڑا عاشق تھا آگے بڑھا اور ظہیر سے کہنے لگا کہ ایک بہادر تو اپنی نعمت اور قبیلہ سے جدا ہو گیا۔ چل تھے ابن زیاد کے پاس لے چلوں کہ تیری ٹھکیں دور ہوں اور راحت نصیب ہو۔ ظہیر نے کہا: اے مردود ابن زیاد دین میں بدعتیں کرتا ہے میں آل رسول کی خدمت میں ان کی محبت اور معرفت سے بہرہ مند ہوں۔ مجھے دشمنوں سے کوئی اندیشہ نہیں ہے۔ ضرر سوچ رہا تھا کہ ظہیر کو ٹھگوں مشغول کر کے دار کرے۔ ظہیر کچھ گئے اور اب ضرب بھی نیزہ کے زخم سے زمین پر لوٹنے لگا۔ اس کا بھائی صلح بن کعب بھائی کے انتقام کے لیے آیا۔ ظہیر نے اسے بھی نیزہ مارا اور ابن کعب بھائی لیکن گھوڑا بھڑکا۔ رکاب میں الجھا اور گھوڑے کی لاتوں سے تمام ہو گیا۔ اس کا لڑکا کعب بن ضرب میدان میں آیا اور ظہیر کا خون آشام نیزہ ثانی سے گزر کر پشت سے جھانکنے لگا۔ ظہیر نے مقتولین میں سے کسی کے اسلحہ کی طرف توجہ نہ کی۔ اور پیلوں پر حملہ کیا۔ بہتیروں قاتل کرنے کے بعد پھر میدان میں آئے اور مقابل طلب کیا۔ اور تھوڑی دیر میں سائیس سپاہیوں کو قتل کیا۔ ابن سعد نے عمر بن العاص کو غیرت دلائی۔ عمر نے تہادست بدست جنگ سے اعراض کیا۔ لیکن صلاح دی کہ میں تین سو سواروں کو تین جگہ بٹھاتا ہوں اور اس کے مقابل جا کر پسا ہوتا ہوں وہ پہلی کین میں پھنسے گا ورنہ دوسری اور تیسری سے جاہل نہ ہوگا۔ ظہیر ان مکاریوں سے بے خبر میدان میں کھڑے تھے۔ پیاس نے ہونٹ خشک کر دیے تھے اور خاک سے سانس لینا دشوار تھا کہ جو سامنے

گیا لیکن کسی قدر دور کھڑا ہوا۔ ظہیر نے کہا کہ یا ابن الاعجاز آگے بڑھ کہ توڑی کوشش کی جائے۔ میرے کہا میں تجھ سے جنگ کرنے نہیں آیا ہوں بلکہ یہ کہنا ہے کہ باوجود اس شجاعت کے تو ابن زیاد کے پاس کیوں نہیں آتا کہ تجھے مال دنیا سے غنی کر دے گا تو جانتا ہے کہ حسینؑ کے پاس مال، اختیار اور اقتدار نہیں ہے۔ ہمت بلند کا اقتضایہ ہونا چاہیے کہ اہل دولت کے پاس جائے۔ ظہیر نے کہا دولت امام حسینؑ سے طلب کرنی چاہیے کہ وہ ہائے اوج ولایت ہیں۔ میری طوے ہمت مجھے ان کے قریب رکھتی ہے۔ ابن زیاد ناکار ہے اور جن لوگوں نے اختیارات اس کے حوالہ کیے ہیں وہ بھی ایسے ہیں۔ مجھ چپ ہو گیا اور خوف سے آگے نہ بڑھا۔ ظہیر نے باگ لی تھی کہ میرے بیٹے پیری۔ ظہیر کو غیرت آئی کہ دشمن اس طرح قبضہ سے نکل جائے۔ گھوڑے کو ڈانٹا اور پچھے دوڑے گھن کے پاس پہنچ کر حرمیلا یا اور مدد مانگی سوار داہنے ہاتھ سے آگئے اور طعن و ضرب شروع ہو گئی۔ ظہیر نے نیزہ سیدھا کیا اور نہایت بے جگری سے جنگ کرنے لگا۔ یہاں تک کہ پہلی گھن دوسری میں مل گئی اور توڑی دیر میں دوسری تیسری میں شامل ہو گئی۔ اکہ ظہیر تین سو سواروں اور نیزوں سے کھیل رہا تھا۔ شبث ربیع نے ظہیر کے کندھے پر نیزہ مارا کہ زرہ کو توڑ کر انی شانہ میں پڑست ہو گئی۔ ظہیر نے بھی غالباً نیزہ اٹھانے کی قوت نہ دیکھ کر تلوار لی اور لڑنے لگے۔ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے پچاس سواروں کو گرا دیا۔ لیکن ان پر بھی چھوٹے اور بڑے نوے زخم لگے۔ حسینؑ نے دیکھا اور حکم دیا کہ ظہیر کو کھال لافہ سعد ظلم امیر المومنین مع دس رفقاء کے بڑے اور اکثر کو قتل کر کے ظہیر کے لے آئے۔ زرہ کی کڑیوں میں متعقد تیر پڑست تھے اور زخموں سے خون کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ حشر زیادہ سرحالے کھڑے کھڑے۔ کچھ دیر کے بعد ظہیر نے آکھ کھول دیکھا حسینؑ کھڑے ہیں۔ اسی وقت تھی کہ سر اٹھایا اور حسینؑ کے قدموں پر رکھ دیا۔ حسینؑ نے کہا: اے ظہیر کچھ ہو اور جو کچھ دل میں ہے ظاہر کر کہ اس کا کھانا اور تمہاری حق گزاری کروں تم نے خدمت گزاری میں کوئی قصیر نہیں کی اور حق شجاعت ادا کیا۔ لیکن ظہیر میں اب باتوں کی قوت نہ تھی البتہ غم میں اس طرح حرکت تھی کہ جو احتیاط کے عالم کی حرکت کہی جائے۔ یا اس وقت پیاس کے خیال سے اشارہ کر رہے ہوں یا انھیں یہ آخری سکین ملی ہو کہ گویا یہ وہ پانی پی رہے ہیں جو حوض کوثر سے ان کے لیے لایا گیا ہو۔

عمر بن خالد اور ان کے فرزند خالد بن عمر ازدی میدان میں آئے۔ (روضة الشہداء کے موافق وہب بن خالد اور ان کے بعد خالد بن عمر) اور شہید ہوئے۔ ان کے بعد سعید بن حنظلہ تھے جو ایک جنگ دیدہ سپاہی اور لشکر حسینؑ کے ممتاز لوگوں میں تھے میدان میں آئے اور رجز پڑھا: ۷

عمر بن خالد، خالد بن عمر

سعید بن حنظلہ تمیمی

صبرا علی الاسیاف و الاسنة صبرا علیہ لدخول الجنة
میں نے تلواروں اور نیزوں پر دخول جنت کے لیے صبر کیا۔ (بعض اور اشعار کا مطلب) بے شبہ یہ نعمتیں اس شخص کے لیے ہیں جو حصول نجات کا ارادہ کرے۔ اسے نفس راحت کے لیے کوشش اور طلب خیر میں رغبت کر۔

سعید نے خوب جنگ کی اور راحت جاوید کی طرف رطلت کی۔

عمر بن عبد اللہ مذحجی، حماد بن انس، شریح بن عبید

قرآن گاہ پر پہنچے۔ اٹھائے جنگ میں ان کا گھوڑا اگر ابھی سنبھلے نہ تھے کہ دشمنوں نے موقع پا کر نیزوں اور کھواروں سے شہید کر دیا۔

مُسلم بن عوسجہ

اب مُسلم بن عوسجہ اسدی میدان میں تشریف لائے۔ ضعیفی تھی۔ ہاتھ پاؤں قابو میں نہ تھے مگر دل

اختیار میں تھا۔ جنگ کی۔ ابن خلدون کے نزدیک مُسلم بن عوسجہ کی جنگ کا موقع تھا کہ

شاہی فوجیں اپنے اپنے جواہروں کے پیہم ہائے جانے سے سہم سی گئیں۔ ہر شخص ان دونوں ولیوں (عمر بن زید اور نافع بن ہلال)

کے مقابلہ پر جانے سے جی چرا رہا تھا۔ عمر بن حلاج نے چا کر کہا: اے لوگو! تمہارے مقابلہ پر آدمی ہی ہیں۔ یہ کچھ شیر نہیں ہیں

کہ تم کو میدان جنگ میں جاتے ہی پھاڑ ڈالیں گے۔ بڑے انوس کی بات ہے کہ تم لوگ باوجود اس کثرت کھمت ہائے جانے

جو۔ تمہارے حاکمین کی تعداد اس قدر کم ہے کہ اگر تم لوگ ان پر ایک ایک کنکریاں بھی پھینکو تو ان کے مرجانے کو کافی ہو۔

اس سے ظاہر ہے کہ یہ کچھ لوگ بھاگ رہے تھے

یہاں حسینؑ کی مدد کا ارادہ تھا یا علیحدہ ہو رہے تھے

دیکھو ایک ایک لانے کو میدان میں نہ جاتے بلکہ سب کے سب جمرٹ ہاتھ کر جمجومی قوت حملہ کرو۔ عمر بن سعد نے اس

رائے کو پسند کیا۔ اور فراوی فراوی نکل کر لانے کو منع کر دیا۔ امام حسینؑ بولے: اے عمر بن حلاج کیا تو ہمارے غلاف لوگوں کو

اجار تا ہے۔ کیا ہم دین سے باہر ہو گئے ہیں، یا تم؟ خدا کی قسم اگر تمہاری رو میں قبض کر لی جائیں اور اسی حالت میں تم لوگ

مرتے جاتے تو معلوم ہو جائے گا کہ کون شخص دین سے باہر تھا۔ عمر بن حلاج نے جانے جواب دینے کے فرات کی جانب حملہ

کر دیا۔ مُسلم بن عوسجہ سے لڑائی ہوتی رہی۔ آخر الامر یہ زخمی ہو کر گرے اور عمر بن حلاج اپنے لشکر میں لوٹ آیا۔ امام حسینؑ

مُسلم کے پاس تشریف لائے جس وقت وہ دم توڑ رہے تھے۔ فرمایا: اے مُسلم! اللہ تم پر رحم کرے۔ جس کا وقت آ گیا ہے

وہ تو جا رہا ہے اور جو باقی ہے وہ وقت کا انتظار کر رہا ہے۔ تم اندیشہ نہ کرو۔ ہم بھی محترِب تم سے آکر ملا چاہتے ہیں۔

حبيب بن مظہر قریب گئے۔ ارشاد کیا: ”تیں اس زخمی کے جلتی ہونے کی بشارت دیتا ہوں۔“ مُسلم نے یہ سن کر آٹھیں

کھول دیں۔ حبيب بن مظہر بولے: امام حسینؑ تمہارے جلتی ہونے کی بشارت دیتے ہیں۔ مُسلم نے مسکرا کر جواب دیا:

”تیں تم کو تیں کی بشارت دیتا ہوں۔“ حبيب نے مُسلم کا سر اٹھا کر اپنے زانو پر رکھ کر کہا: اے بھائی اگر مجھے یہ معلوم

ہوتا کہ میں تمہارے بعد کچھ دنوں بھی زندہ رہوں گا تو تم سے میں وصیت کی خواہش کرتا۔ لیکن میں یہ یقیناً جانتا ہوں کہ دو ہی

چار ساعت کے بعد میں تم سے آکر ملا چاہتا ہوں۔

مُسلم بن عوسجہ کی آخری وصیت

مُسلم نے کہا: ”تاہم میں تم کو ایسی وصیت کرتا ہوں جس کے

تم سزاوار ہو، اور وہ یہ ہے کہ: تم امام حسینؑ کا ساتھ نہ چھوڑنا،

اور جب تک بقید حیات رہنا ان بد بختوں بے دینوں سے لڑتے رہنا۔“ مُسلم تو اس قدر وصیت کر کے راہی ملک جتا

ہوئے۔۔۔۔۔ (تاریخ کمال کے موافق مسلم نے اشارہ سے حبیب کو دمیت کی)

صاحب روضۃ الشہداء کہتا ہے: ”مسلم کے گھوڑے سے گرنے کے وقت اصحاب عمرو بن سعد نے قل کیا کہ ہم نے مسلم کو مارا۔ شبث بن ربعی نے یہ سن کر قل کرنے والوں کو گالیاں دیں اور کہا کہ: ”تم ایسے شخص کے مارنے کا فکر کر رہے ہو جس نے جنگ آذربائیجان میں مسلمانوں کے ہلنے کے قبل چھ مشرکین کو قتل کیا تھا۔“

صاحب روضۃ الشہداء کہتا ہے کہ مسلم نہ صرف شجاع اور لشکر آرانی میں ماہر تھے بلکہ چند قرآن (غالباً اپنے ہاتھ سے لکھے ہوئے) جناب امیر کی خدمت میں پیش کیے تھے اور جناب امیر نے انھیں ”جہلی“ فرمایا تھا۔

عمر بن قریظہ انصاری نے اجازت جنگ حاصل کی اور بقول صاحب لہوت اس طور سے لڑے کہ جیسے مشتاقین جزائر سے زور شور سے لڑتے ہیں۔ یہاں تک کہ فوج

ابن زیاد سے ایک گروہ کثیر کو قتل کر ڈالا۔ راستبازی اور جہاد کو جمع کر دکھایا۔ کوئی تیر حضرت امام حسینؑ کی طرف ایسا نہ آتا تھا کہ جس کو وہ اپنے ہاتھ سے نہ روکتے تھے۔ کوئی تلوار حضرتؑ کی طرف نہیں آتی تھی جس کو اپنے سینہ پر نہ لیتے تھے۔ کوئی برائی حضرتؑ تک نہ پہنچنے دی۔ یہاں تک کہ سخت زخمی ہوئے۔ تب انھوں نے سید الشہداء کی طرف رخ کیا اور عرض کی: ”یا ابن رسول اللہ! کیا میں نے آپ کا جہد پورا کیا؟“۔ حضرتؑ نے فرمایا کہ: ”ہاں تو ہی مجھ سے پہلے ہشت کو جا رہا ہے۔“ اچھا رسول خدا سے میرا سلام کہنا اور بتا دینا کہ تیرے بعد میں بھی آ رہا ہوں۔ پھر انھوں نے لڑنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ وہ شہید ہوئے۔

ابن خلدون کہتا ہے: ان (عمر بن قریظہ انصاری) کا جہلی عمر بن سعد کے ہمراہ تھا۔ اس نے ہلاؤز بلند کہا: ”یا حسینؑ۔۔۔۔۔ تو نے میرے جہلی کو گمراہ کیا۔ اور اس درجہ اس کو گرویدہ کر لیا تھا کہ وہ مارا گیا۔“ آپ نے جواب دیا: ”اللہ تعالیٰ نے اس کو گمراہ نہیں کیا بلکہ راہ راست کی رہنمائی کی، ہاں تو اللہ گمراہ ہو گیا۔“ عمر بن قریظہ کا جہلی یہ سن کر طیش میں آیا اور یہ کہتا ہوا کہ: ”اللہ تعالیٰ مجھے مارے جو میں تم کو نہ ماروں۔ یا تیرے پاس نہ جاؤں۔“ آگے بڑھنا شروع کیا۔ ہلال مروی نے لپک کر نیزہ چلایا۔ جس سے وہ زخمی ہو کر گرا۔ نافع نے نیزہ چھوڑ کر تلوار چینی لیکن اس کے ہمراہی یورش کر کے اٹھالے گئے۔ طلحہ معالجہ کر کے اچھا ہو گیا۔

عمر بن الحجاج کے دستہ کا حملہ جنگ کی یہ صورت تو تھی ہی کہ ایک ایک سے لڑتا لیکن عمر بن حجاج الزبیدی کی صلاح نے ابن زیاد کو باوجود کثرت سپاہ

جنگی بد جہدی کی ذلت میں مبتلا کیا۔ اور اس نے عمر بن الحجاج کو سپاہیوں کی ایک جماعت سے حملہ کرنے کا حکم دیدیا۔ اس کے حملہ میں مسلم بن عوسجہ کی شہادت بھی تھی۔ اس کے حملہ میں حسینؑ کی طرف سے بھی بزرگ شہید ہوئے۔ ہوں یا کچھ اور زخمی ہوئے۔ عمر بن حجاج مع اپنے سپاہیوں کے موجود ہوا واپس گیا۔ یا معاصرہ اور تے حملہ کا انتظار کر رہا ہو۔

یہاں میں کوئی تنہا حسینؑ کا سپاہی کسی سے جنگ بھی کر رہا ہو۔ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ کس قدر شہر اور ابن نمیر کا حملہ وقفہ کے بعد یا متعلقہ شہر نے حملہ کیا۔ اور ابھی شہر کا حملہ سپاہ ہوا تھا یا نہیں یا

ابھی جنگ کی شدت ہی تھی کہ حسین بن نمیر اور ہانیح سوتیسہ اندازوں سے بڑھا اور اس نے بھی حملہ شروع کر دیا۔

کابل ابن اثیر کے موافق: ”جس وقت ابن علی نے لشکر پھیلایا تو رشتے حسینؑ ”سب گھٹنے ٹیک کر بیٹھ گئے“ اور تیر برسائے

کہ دشمن آگے نہ بڑھ سکا۔“ بقول ابن خلدون: ”حسین بن حمیر قریب پہنچ کر تیر برسائے لاکھ تھوڑی دیر میں آپ کے سواروں کے کل گھوڑے زخمی ہو کر مر گئے۔ اس وقت کل ہمراہی پیادہ ہو کر لڑنے لگے۔ یہاں تک کہ دوپہر ہو گئی۔ لڑائی نہایت تیزی اور سختی سے جاری تھی اور لشکر شام باوجود کثرت کے ان لوگوں کے حملہ کا جواب نہ دے سکتا تھا اور نہ ان کے قریب پہنچ کر حملہ آور ہو سکتا تھا۔ عمر بن سعد نے مجبور ہو کر چند لوگوں کو آپ کے خیموں کی طرف سے حملہ کرنے کو بھیجا۔ آپ کے ہمراہیوں میں سے صرف چار آدمی مخالفین کے روکنے پر مامور ہوئے۔ جو دستہ فوج سواروں یا پیادوں کا لشکر شام سے نکل کر خیمہ کی طرف بڑھتا دکھائی دیتا تھا خیمہ تک پہنچنے کا کیا ذکر ہے راستہ ہی میں ڈھیر ہو جاتا تھا تب عمر بن سعد نے خیموں پر دور سے

اگسٹ بازی
اگ برسائے کا حکم دیا امام حسینؑ نے فرمایا: ”تم لوگ فوج سے لڑتے ہو تو فوج سے بلاؤ۔ خیموں میں عورتوں اور بچوں کے سوا کوئی مرد نہیں ہے۔ وہ غریب نکل کر نہ جھاگ سکیں گی اور نہ ہم خیموں میں آتش زدگی کے باعث تم سے لڑ سکیں گے۔“ عمر بن سعد یہ سن کر خاموش ہو گیا۔ اس کے بعد شمر ذی الجوشن حملہ کر کے امام حسینؑ کے خیمہ تک پہنچ کر کہنے لگا: ”جے دوزخ ہی میں جلتا نصیب ہو اگر میں اس خیمہ کو نہ جلا دوں۔“ عورتیں چلا کر نکل آئیں۔ امام حسینؑ نے ڈانٹ کر کہا: ”اللہ تعالیٰ تجھے جلائے تو میرے خیمہ کو جلائے گا۔ جس میں میرے اہل بیت ہیں؟“ شمر نے اس کا کچھ جواب نہ دیا۔ حمید بن مسلم اور شبث بن ربیع نے بھی اس کو اس فعل شنیع سے روکنا چاہا لیکن بد بختی سے وہ نہیں مانتا تھا۔ برابر خیمہ کی طرف آگ لگانے کی غرض سے بڑھا جاتا تھا۔ زبیر بن عقیل نے دس آدمیوں کو ہمراہ بیان امام سے طعنے کر کے شمر اور اس کے رکاب کی فوج پر حملہ کر دیا۔ ابوہریرہ ضبابی جو اس کے ہمراہیوں میں تھا اور بہت سے سپاہی مارے گئے۔ بلاغی مجبور ہو کر شمر ذی الجوشن کو واپس آنا پڑا۔ چونکہ لشکر شام کی تعداد زیادہ تھی کثرت کی وجہ سے دو چار پہاڑ دس بیس کا مارا جانا محسوس نہ ہوتا تھا۔ اور امام حسینؑ کی طرف بوجہ قلت جماعت ایک دو آدمیوں کے بھی کام آ جانے کا احساس ہو جاتا تھا۔ ان حملوں کے وقت علامہ مجلسی اور کمال کے موافق حضرت کے مرتے تیس اصحاب باقی تھے۔ آخر اللہ کر مآثر کے موافق

ان لوگوں نے ”لشکر کو قہ کی جانب حملہ نہیں کیا۔ مگر یہ کہ اس کو کھول دیا۔“ اسی مؤرخ کے موافق مردہ بن قیس نے جو کوہ کے لشکر کا سردار تھا یہ دیکھا تو اس نے کسی کو عمر سعد کی طرف بھیجا اور کہلوا دیا کہ: ”کیا تو نہیں دیکھتا کہ اس تھوڑے سے لشکر سے تیرا لشکر کس طرح لڑ رہا ہے۔ پیادوں اور تیراندازوں کو اس کی طرف بھیجا۔“

علامہ مجلسی کے موافق: جس وقت دشمن نے آگ لگانے کا ارادہ کیا تو حضرتؑ نے اپنے رہا کو حکم دیا کہ دشمن کو آگ دینے دو۔ اس طرف سے دشمن کی آمد مسدود ہو جانے لگی۔ ایسا ہی ابی مخنف نے کہا ہے کہ جب دوپہر ہو گئی اور ایک طرف سے لڑائی ہو رہی تھی کہ یہ دیکھ کر ابن سعد نے خیمہ جلائے کا حکم دیا۔ پس حضرتؑ نے فرمایا کہ اٹھیں ایسا کرنے دو۔ کیونکہ اس کے بعد وہ ادھر سے تمہاری طرف نہ آ سکیں گے۔ اور ایک ہی طرف سے لڑائی ہوگی۔ پس شمر نے حملہ کیا اور عورتوں

کے خیموں کے قریب پہنچا اور آگ کے لیے آواز دی۔ پس حضرت کے اصحاب نے اس پر حملہ کیا۔ اور اس کو خیمہ سے ہٹا دیا۔ اس کے بعد حضرت نے شمر کو آواز دی۔ ”وائے جو تم پر کیا تیرا ارادہ ہے کہ رسول اللہ کے خیمہ کو جلا دے۔“ اس نے کہا: ہاں۔ پس حضرت نے چہرہ مبارک آسمان کی طرف بلند کر کے شمر کو بد دعا دی۔ اس پر شمر اور غصہ میں آیا۔ اور اس نے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ ان پر سب مل کر حملہ کرو اور ان کے آخری شخص کو فنا کرو۔ اور اس کے بعد یہ لوگ داہنے اور بائیں متفرق ہو کر اصحاب حسینؑ پر تیر مارنے لگے۔ جس سے اکثر اصحاب شہید ہوئے۔ اس وقت ابو ثمامہ اصیداوی بڑے اور عرض کی:

ابو ثمامہ صیداوی اے میرے بولا! ہم لوگ لامحلہ قتل ہوں گے۔ نماز کا وقت آگیا ہے میری آرزو ہے کہ آخری نماز آپ کے ساتھ پڑھ لوں۔ شاید میں اس طرح قتل نہ ہوں۔

اس موضع عظیم میں ہم نے فرائض میں سے ایک فرض ادا کر دیا۔ حضرت نے فرمایا: اذان دے خدا تم پر رحم کرے۔ (بعض کے موافق: حضرت نے آسمان کی طرف دیکھ کر فرمایا کہ: ”تو نے نماز کا ذکر کیا۔ خدا تجھے نماز گزاروں میں قرار دے۔ ہاں یہ اول وقت ہے۔“ پس جس وقت اذان سے منبراغت ہوئی حضرت نے آواز دی: ”اے عسکر! کیا تو نے شرائع اسلام کو جلا دیا۔ کیا تو اس قدر صبر نہ کرے گا کہ نماز پڑھ کر جنگ کی جانے۔“ اس نے قبول نہ کیا۔ اور حسین بن نمیر نے آواز دی: ”اے حسینؑ پڑھو لیکن تمہاری نماز قبول نہ کی جائے گی۔“ حبیب نے اسے جواب دیا۔ ”وائے جو تم پر حسینؑ کی نماز نہ قبول کی جائے گی لیکن تم سے ابن غارہ کی نماز مقبول ہوگی۔ ابن نمیر دونوں لشکروں کے درمیان یہ سن کر غصہ میں آیا۔ میدان میں آیا۔ رجز خوانی کی اور آواز دی کہ اے حبیب! اسطعن و ضرب کے لیے میدان میں نکل آؤ۔ حبیب نے اس کا کلام سن کر حضرت کے قریب گئے اور کہا: یا مولا مجھے امید ہے کہ میں نماز پڑھوں گا۔ اور آپ کے پدر نامدار و جد بزرگوار اور برادر عالی مقدار کو آپ کا سلام پہنچاؤں گا۔ یہ کہہ کر نکل آئے اور رجز پڑھا۔ حسین نے حملہ کیا اور حبیب نے جواب میں وار کیا۔ تلوار حسین کے گھوڑے کے سر پر پڑی اور زخم کی وجہ سے گھوڑے نے حسین کو زمین پر گرا دیا۔ پس اس کے رتھا دوڑے اور اسے اٹھا لیا۔ حبیب نے ایک تہی پر حملہ کیا اور اسے قتل کر ڈالا۔ یہاں تک چستیس آدمی قتل کیے۔ اب دشمنوں نے ان پر ظہر کیا اور انھیں حسینؑ کے سامنے شہید کر ڈالا۔ ابو مخنف کہتا ہے کہ عباس بن علیؑ سلام اللہ علیہ اور حبیب بن مظاہر کی شہادت کے وقت حضرت کے چہرہ پر انگسار کے آثار معلوم ہوئے اور فرمایا کہ حبیب مرد قاتل تھے۔ جو ایک رات میں قرآن ختم کرتے تھے۔

زہیر بن قین پس زہیر بن قین کھڑے ہوئے اور کہا: ”میرے ماں باپ آپ پر خدا ہوں یا ابن رسول اللہ! یہ کیسا انگسار ہے جو میں آپ کے چہرہ پر دیکھ رہا ہوں۔ کیا ہم حق پر نہیں ہیں۔“ منبرا یا: ”واللہ ہمارا علم اعلم علم الیقین ہے۔ ہم اور تم حق اور ہدایت پر ہیں۔“ زہیر نے کہا: ”پھر میں کیا پرواہ ہے ہم جنت اور اس کے نعمات کی طرف جارہے ہیں۔ یا مولا اب میں میدان میں لکھنے کی اجازت دیجیے۔“ آپ نے فرمایا: ”اچھا ہلا۔“

لکھے زہیر اور رجز پڑھا:

انا زہیر و انا ابن قین
اذب بالسيف عن الحسين
اضرکم محامياً عن دینی
اضرکم ضرب غلام زین
و یستقی من اهل الشین
بانیض و صارم المحدثین
و فی ہینی مرحفت السعدین
ابن علی الطاهر المحدثین
و عن الامام الصادق الیقین
الیوم یقضی الدین اهل الدین

پس جنگ کرنے لگے۔ یہاں تک کہ کچاس آدمیوں کو قتل کیا۔ اس کے بعد ڈرے کہ حسینؑ کے ساتھ نماز فوت ہو جانے لگی۔ پس لوٹے اور کہا یا مولا مجھے خوف ہے کہ میری نماز آپ کے ساتھ فوت ہو جائے گی۔ پس حسینؑ کھڑے ہوئے اور اصحاب کے ساتھ نماز ظہر پڑھی۔

ابن خلدون کے موافق حبیب اس طرح شہید ہوئے کہ جب حسین بن نمیر کو اس کے ساتھیوں نے پکالیا تو حبیب حبیب لڑنے لگے۔ بدل بن حریم نامی جنگجو کو قتل کیا۔ ایک دوسرے شخص نے پیچھے سے نیزہ چلایا۔ حبیب جو ہی اس کی طرف متوجہ ہوئے حسینؑ بن نمیر نے تلوار کا دار کر دیا۔ جس سے حبیب تورا کر گر پڑے۔ تمی نے اتر کر سراتار لیا۔ امام حسینؑ کو سخت صدمہ ہوا۔ تنس تنس جانے پر تیار ہوئے۔

حراور زہیر کی جنگ کا طریقہ
حراور زہیر نے بڑھ کر کہا: ”ہم آپ پر سینہ سپر ہو کر خدا ہونے کو موجود ہیں۔ ہمارے ہوتے ہوئے آپ میدان جنگ میں نہ جائیے۔“ امام حسینؑ

یہ سن کر رک گئے اور حراور زہیر نے لشکر شام پر حملہ کر دیا۔ جب ایک شخص ان میں سے لڑنے لڑنے فریق مخالفت میں چھپ جاتا تھا تو دوسرا اس سختی و تیزی سے حملہ کر دیتا کہ اس کو مخالفین کے زخم سے نکال لاتا تھا۔ حراور زہیر دیر تک لڑائی کا عنوان اسی طرح رہا۔ بہت سے آدمیوں کا دم زون میں دارا نسیا ہوا گیا۔ عمر بن سعد نے لشکارا پیلوں نے چاروں طرف سے گھیر کر حراور زہیر کو شہید کیا۔ اور ابوتامہ نے اپنے چچا زاد بھائی کو جوشامی لشکر میں قاتل کر ڈالا۔ بعد اس کے امام حسینؑ مع اپنے ہمراہیوں کے ”مسلوۃ الخوف“ بڑھ کر پھر لڑنے لگے۔

زہیر بن قین کی شہادت
مخالفین چاروں طرف سے تیرہاری کر رہے تھے اور آپکے ہمراہی اپنی اپنی جگہ بازی دکھا رہے تھے۔ زہیر بن قین لڑتے بڑھتے باخیاں پس دہش لشکر شام میں گھسنے پڑے۔ کثیر بن عبد اللہ شعی اور مہاجر بن ادس آگھیں پکا کر دفعہ زہیر پر ٹوٹ پڑے اور ان کو شہید کر ڈالا۔

نماز ظہر کے بعد حضرت کا خطبہ
قیاس کیا جاسکتا ہے کہ پچیس تیس آدمیوں نے ایسا بڑا کام کیا تھا کہ کم سے کم پندرہ سو سوار اور پیلاے اور تیر اندازوں

کے حملہ کو اس حد تک رد کیا تھا کہ کسی طرح نماز پڑھنے کی جھلت ملی۔ لیکن عالم شجاعت کی اس حیرت خیز مثال کے بعد انھیں یہ امید نہ تھی کہ ہم دم لے سکیں گے۔ (ابن خلدون) نہیں لڑائی منقطع نہ ہوتی تھی۔ اور نماز ختم ہوتی اور ادھر حضرت اصحاب کی طرف مخاطب ہوئے اور فرمایا: ”اے میرے اصحاب! جنت لے اپنے دروازے کھول دیے ہیں۔ نہریں بہ رہی ہیں۔ جنت کے میوے تیار ہیں۔ اور اس کے قصور آراستہ ہیں۔ حوری تمہاری نظر ہیں اور یہ رشول خاص اللہ علیہ السلام ہیں۔“

مع ان شہدا کے ہیں جو ان کے اور میرے پدر بزرگوار کے ساتھ شہید تھے۔ تمہاری آمد کے نظر اور مشتاق ہیں۔ اور ایک دوسرے کو بشارت دے رہے ہیں۔ پس دین خدا کی حمایت اور حرم رسول خدا کی حفاظت کرو۔“

مخدرات عصمت کا استیغاثہ اس وقت چھر رات نکل آئیں اور انھوں نے آواز دی کہ ”اے معشر المسلمین اور اے عصبة المؤمنین دین خدا کی مدد کرو اور حرم رسول خدا اپنے امام اور اپنے نبی کی بیٹی کے بیٹے سے دشمنوں کو دفع کرو۔ خدا نے ہماری وجہ سے تمہارا احسان کیا ہے۔ تم ہمارے پدر بزرگوار کے ہمسایہ ہو اور ہمارے دوست ہو۔ دور کرو دشمنوں کو خدا تمہیں برکت دے۔“

اہل بیت کا استیغاثہ سن کر اصحاب کی حالت جس وقت اصحاب نے اہل بیت کا یہ کلام سنا چچ مار کر رونے لگے اور عرض کی: ہمارے نفس آپ کے نفوس پر ہمارا خون آپ کے خون پر اور ہماری رومیں آپ کی ارواح پر خزا ہیں۔ تم خدا کی ہماری حمایت تک کسی کی برائی آپ تک نہ پہنچ سکے گی۔ یہاں تک کہ ہمارے جسم تلواروں اور طائروں کی خوراک ہو جائیں اس وقت ہم آج کے کسب خیر سے فتح یاب ہوں گے۔

سعید بن عبد اللہ حنفی ان لامنی شہاوں میں کوئی سعید بن عبد اللہ الحنفی کا ایسا فائدہ راہ حسینؑ تھا جس نے اپنا فرض بھی قرار دیا تھا کہ اہل بیتؑ کے ہر حسینؑ جانیں۔ اور اپنے سینہ اور جسم کو ان تیر اور نیروں کا نشانہ قرار دے جو حسینؑ کے ارادے سے چلنے لگتے ہوئے انھوں نے دنیا کے حلاوت پر اس وقت تک اپنے عزم و استقلال کی مہر کی جب تک حسینؑ ظہر کی نماز سے فارغ ہوئے۔ اہل سلام پھیرا اہل سعیدؑ میں کھڑے ہونے کی طاقت نہ رہی سلام کیا اور عالم راخت کی طرف رخصت ہو گئے۔

نافع بن ہلال بجلی نافع بن ہلال بجلی کو بھی صاحب روضۃ الشہداءؑ نو ذماد کہتا ہے۔ ان کے ارادہ جنگ کے وقت عروس نے دامن پکڑ لیا۔ اور کہا نہ جلاؤ کہیں ایسا نہ ہو کہ مارے جلاؤ ہلال نے کہا: ”اے نادان فوج سے دور ہو میں کچھ دوسروں سے کم رہوں۔ کیا میرا دعویٰ محبت زہانی ہے۔“ یہ باتیں حسینؑ تک پہنچیں اور آپؑ فرمایا: ”اے بھائی میں نہیں چاہتا کہ جوانی میں تم لوگ جلاؤ فراق ہو۔“ عرض کی: ”آج اگر آپ کو اس بلا میں چھوڑ دوں تو قیمت میں آپ کے بدلہ ملے گا۔“ اصرار کیا رخصت حاصل کی۔ میدان میں آئے اور رجز پڑھا۔

انا الفلام البجلی انا علی دین علی

و دینہ دین النہی

نافع مشہور تیر انداز تھے اور ہر تیر پر اپنا نام کندہ کیا تھا۔ روضۃ الشہداءؑ کے موافق ایک شخص مقابلہ کے لیے آیا اور اس نے کہا: انا علی دین عثمان۔ نافع نے کہا: بل علی دین الش۔

جنگ ہوئی اور نافع نے اپنے مقابل کو مار لیا۔ روضۃ الشہداءؑ کے موافق ان کے ترکش میں اسی تیر تھے۔ اور ان میں سے کوئی خالی نہ گید تیروں کے ختم ہونے پر تلوار لے دلا شجاعت دی اور وہ انعام حاصل کیا جن کا تلواروں کے سایہ کے بعد وعدہ کیا گیا ہے۔ اہل صف کے موافق انھوں نے ستر آدمیوں کو قتل کیا۔ ابن خلدون کہتا ہے: ”یہودین کے سوا

بارہ آدمیوں کو مارا۔ پلاؤ فر لڑتے لڑتے مددہ زخم سے ان کا ہندو ٹوٹ گیا۔ گرفتار کر لیے گئے۔ شرفی الجوش پکڑ کر عمر بن سعد کے پاس لے گیا۔ چہرہ سے خون کے فارے جاری تھے۔ عمر بن سعد دیکھ کر مسکرایا۔ نافع بولے میں نے زخمیوں کے علاوہ تم میں سے بارہ آدمیوں کو قتل کیا ہے۔ اگر میرے ہاند سلامت رہتے تو تم مجھ کو ہر گرفتار نہ کر سکتے۔ شمر نے قتل کی غرض سے نکوار چمکھی۔ نافع نے بے کہا: خدا کی قسم اگر تو مسلمان ہو تا تو مجھ کو یہ شاق ہو تا کہ اللہ تعالیٰ کے رو برو ہمارے خون کے ساتھ جاتا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس نے ہماری موت بدترین ظائق کے ہاتھ پر لکھی ہے۔ شمر یہ سن کر جلا اٹھا اور ایک دار سے نافع کا کام تمام کر دیا۔

عبد اللہ و عبد الرحمن مزی نے شہادت پائی۔ عبد اللہ و عبد الرحمن پیران عروہ

عبد اللہ و عبد الرحمن مزی و عبد اللہ و عبد الرحمن غفاری

غفاری آئے اور شہادت کا حق ادا کیا۔ (روضۃ الشہداء)

مالک بن انس میدان میں گئے اور ابن سعد کو طلب کر کے کہا کہ اگر سعد بن وقاص کو معلوم ہو تا کہ آج مجھ سے یہ حرکت سرزد ہوگی تو وہ اپنے ہاتھ سے تیرے ہاتھ پاؤں کاٹ ڈالتا۔ اور عالم کو تجھ ایسے تنگ و جد سے پاک کر تا۔ عمر سعد نے شرمندہ ہو کر جلدی سے کسی کو مقابلہ کے لیے بھیج دیا۔ مالک نے بھی عالم شہادت میں حصہ لیا۔

عمر بن مطلع ابھی میدان میں میں آئے۔ حسینؑ کی مدح میں شعر پڑھا۔ تیس آدمیوں کو قتل کر لے اور شہدا کے بعد عالم آخرت کی طرف سمنہ کیا۔ قیس بن امیہ راہی ملک چھا ہوئے۔ ابو عتف کے موافق: زید بن مظہر اسدی نے جنگ کی اور پچاس دشمنوں کو قتل کیا۔ ان کے رجز کا ایک مصرع یہ تھا کہ:

یا رب انی للحصین ناصر

دوسرے شعر کا پہلا مصرع یہ تھا:

و ابن الهند تارک و حاجر

علی بن مظہر نے جنگ کی اور شمر کو عالم انصاف کی طرف رخصت کیا۔

طرماح بن عدی طرماح بن عدی کو بھی شہید کرا تا ہے۔ ملائکہ کامل کے موافق حسینؑ سے اٹھائے سمنہ کی ملاقات کے بعد وطن واپس گئے۔ ان کی شہادت ناگین نہ ہوگی، اگر یہ دوبارہ واپس آئے ہوں۔ صاحب روضۃ الشہداء ہاشم بن عتبہ بن ابی وقاص کو بھی لاتا ہے اور سخت جنگ کرا تا ہے۔ میرے نزدیک یہ صفین میں شہید ہو چکے تھے۔

یحییٰ بن کثیر یحییٰ بن کثیر انصاری میدان میں آئے اور رجز پڑھا۔ اس کے بعد ملہ کیا۔ پچاس کے تریب شامیوں کو قتل کیا۔ اور عالم راحت کی طرف رخصت ہوئے۔ (ابن خلدون) سیف بن امیہ بن سرح اور مالک بن عبد بن سرح روتے ہوئے حاضر خدمت ہوئے۔ آپ نے فرمایا: ”تم روتے کیوں ہو۔ مجھے امید ہے کہ معزب تم لوگوں کی

سیف اور مالک

آٹھیں ٹھنڈی ہوں گی۔ سیف و مالک نے عرض کیا: ”ہم اپنے لیے نہیں بلکہ ہم کو اس پر رونا آتا ہے کہ ہم اپنی جان دے کر بھی آپ کو نہیں چا سکتے۔ آپ نے دعائیں دیں اور یہ دونوں جلائی رخصت ہو کر شیر غراں کی طرح میدان جنگ میں ڈکارتے ہوئے جا بیٹھے۔ لشکر شام نے ہر چار طرف سے گھیر کر تھوڑی دیر میں شہید کر ڈالا۔

حظہ بن اسعد الشیبانی بعد اس کے حظہ بن اسعد شیبانی میان صفت سے نکل کر امام حسینؑ کے رد و رد کھڑے ہوئے اور لشکر شام کو مخاطب کر کے بولے۔ ”اے لوگو! مجھے خوف

ہے کہ تم پر یوم احزاب کی طرح عذاب نہ آئے۔ جیسے قوم نوح و عاد و ثمود اور وہ لوگ جو ان کے بعد ہوئے اور اللہ بندوں پر قلم نہیں کیا چاہتا اے لوگو مجھے روز قیامت کا خوف ہے جس دن کہ تم مقابلہ نہ کر سکو گے اللہ کا تم کو اللہ کے سوا کوئی بچانے والا نہیں ہے۔ اور جس شخص کو اللہ گمراہ کرتا ہے اس کا کوئی ہادی نہیں ہے۔ اے لوگو تم حسینؑ کو قتل نہ کرو۔ اللہ تعالیٰ عذاب سے تمہاری پیچ کٹی کر دے گا اور جو شخص اللہ پر انکرا کرے گا وہ عذاب ہوگا۔

لشکر شام میں سے کسی نے اس کا کچھ جواب نہ دیا۔ امام حسینؑ بولے: ”اللہ تعالیٰ تم پر رحم کرے۔ یہ لوگ مستحق عذاب اسی وقت ہو چکے جب کہ میں نے ان کو حق کی طرف بلایا اور یہ لوگ اس کی مخالفت پر اٹھ کھڑے ہوئے اور اب کیوں یہ کلمہ حق پر عمل کریں گے۔ جب کہ تمہارے نیک بھائیوں کو قتل کر چکے ہیں۔“ حظہ یہ سن کر خاموش ہو گئے۔ اور آپ سے رخصت ہو کر رد و پڑھتے ہوئے میدان جنگ میں جا بیٹھے۔ دشمنوں نے ہر طرف سے گھیر کر تیرہاری شروع کر دی۔ بالآخر لڑتے لڑتے شہید ہو گئے۔ صاحب لہوت کے موافق: پھر حظہ سید الشہداء کی طرف پھرے۔ عرض کی: ”یا ابن رسول اللہ کیا میں اپنے رب کی طرف نہ جاؤں اور اپنے بھائیوں سے نہ ملوں۔“ حضرتؑ نے فرمایا: ”ہاں ہاں بہتر ہے خدا کی طرف چلو جو تمہارے لیے دنیا و مافیہا سے بہتر ہے۔ اور اس ملک کو جاؤ جو فنا نہیں ہو سکتا۔“

معلیٰ ابو مخنف معلیٰ کو میدان میں لاتا ہے اور کہتا ہے: ”وکان معروفا بالشجاعة۔“ اور رجز پڑھا:

انا المعلى حافظا لاجلى ديفى على دين احمق و على

قريب पास دشمنوں کے قتل کیے یہاں تک کہ خون کے بکثرت جاری ہونے سے زمین پر گر پڑے۔

ان کے بعد جون، غلام ابوذر غفاری میدان میں آئے۔ رجز پڑھا:

بالسيف صلنا عن بن محمد ارجو بذاك الفوز الموعد

مع الامام و الشفيح احمد

حضرت کا جونؑ سے خطاب اور جونؑ کا جواب ان کے متعلق صاحب لہوت فرماتے ہیں:

”میں تم کو اہانت دیتا ہوں کہ تم سچے جاؤ کیونکہ تم لوگ اپنے آرام کے لیے میرے ساتھ ہوئے تھے پس میری رفاقت میں تم اپنے کو بٹلانے بلانہ کرو۔ جون نے عرض کی: ”یا ابن رسول اللہ! میں آپ کے اچھے وقت کا کلمہ لیس تھا اب برے وقت میں آپ کو میں چھوڑ دوں؟ ہاں بخدا میرے جسم میں بدلو ہے۔ میرا حسب بہت غراب ہے اور میرا رنگ سیاہ ہے۔ پس مجھے جنت میں بھیج دیجیے کہ میرا بدن خوشبودار ہو جائے۔ میں صاحب حسب شریف ہو جاؤں اور میرا منہ

روشن و سفید ہو جاوے۔ بخدا میں آپ سے جدا نہ ہوں گا یہاں تک کہ میرا خون سیاہ آپ کے خون پاک میں مل جاوے۔
پھر جون نے بہ اجازت حملہ کیا اور لڑنا شروع کیا یہاں تک کہ شہید ہوئے۔

ایک نوجوان ابو عثف کہتا ہے: پھر ایک نوجوان میدان میں آیا جو اور جس کی ماں حسینؑ کے ہاتھ پر اسلام لائی تھی۔ جنگ کی چالیں آدی قتل کیے اور دارالسلام کی طرف راہی ہوا۔

جابر بن عروہ غفاری اپنی صورت کا ایک اور عبرت خیز منظر یہ تھا ہے ابو عثف کے الفاظ کی سادگی بہتر ادا کر سکتی ہے کہ: "وبرز بعده جابر بن عروہ الغفاری وکان شیخاً کبیراً

وکان قد شهد مع رسول اللہ یوم بدر وواقعات غیرها وجعل یعصب حاً جبیبہ عن عینہ و الحسین ینظر الیہ ویقول شکر اللہ سعیک یا شیخ"۔ (پھر جابر بن عروہ غفاری نکلے اور وہ بہت بڑے تھے اور انہوں نے رسول اللہ کے ساتھ بدر اور ان کے علاوہ واقعات کو دیکھا تھا۔ انہوں نے اپنی جنوں اپنی آنکھوں سے اٹھائی تھیں۔ حسینؑ نے ان کی طرف دیکھا اور فرمایا: خدا تمہاری سنی کو مشکور کرے یا شیخ) جابر نے رجز کا:۔

قد علمت حقاً بنو غفار و خلدت ثم بنو نزار

ینصروننا لاجل الغنار یا قوم حامو عن بنی الاطہار

الطیبین السادۃ الاخبار صلی علیہم خالق الابوار

عرشہ دار ہاتھوں سے جنگ کی اور ابو عثف کہتا ہے کہ اسی آدی دشمنوں کے لشکر سے کم کر دیے۔

مالک بن داود مالک بن داود میدان میں گئے اور دشمنوں کے ساتھ مددگاروں کو راہی کر دیا۔

عابس و شوزب میدان کر بلا کے واقعات میں عابس بن شیبب الشکاری کی شان جنگ اور گفتگو میں کچھ نیا بن تھا صاحب روضۃ الغنایہ کہتے ہیں کہ عابس نے اپنے غلام (شوزب) سے پوچھا کہ:

"آج میرے ساتھ تیرا کیا مقام ہے۔" غلام نے جواب دیا کہ: "تیری رکاب میں شمشیر زنی کروں گا یہاں تک کہ مارا جاؤں۔" عابس نے کہا کہ: "تجھ سے میرا ایسا ہی گمان تھا اب قدم آگے بڑھا کہ آج وہ دن ہے کہ خدا سے اپنے عمل کی

بڑی مزدوری طلب کریں گے۔ اور آج کے بعد پھر ہم کوئی عمل نہ کریں گے۔" یہ کہہ کر حسینؑ کے پاس گئے اور کہا:

"یا ابا عبد اللہ! میں خدا کی قسم کہتا ہوں کہ روئے زمین پر کوئی شخص آپ سے زیادہ دوست اور عزیز نہیں ہے۔ اگر میں اپنے نفس سے کوئی نفیس تر چیز نہ پاتا تو اسے آپ کی ذائقہ مقدس اور نفس کرم پر فدا کرتا۔ یا ابا عبد اللہ! میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ اپنے پدر بزرگوار کی طرح سالک راہ مستقیم ہیں۔"

رج بن قیم کہتا ہے کہ میں نے لڑائیوں میں عابس کے ہنر دیکھے تھے جب میں نے دور سے اسے لے دیکھا۔ لشکریوں سے کہا کہ تمہاری طرف وہ متوجہ ہوا ہے جو شیر اور ہاتھی پر غالب آتا ہے۔ خبردار کوئی اس کے پاس نہ جائے۔

استے میں عابس پہنچ گئے۔ اور مقابل طلب کیا۔

عابس کے لڑنے کی شان عمر بن سعد نے فوج کو پتھر اور تیر مارنے کا حکم دیا۔ عابس نے جب یہ حالت دیکھی اپنا خود اور زرہ اتار کر پیٹنگ دی اور شام کے لشکر میں ڈوب گئے۔

(رجیم جس سے مابس کی طاقت تھی کہتا ہے) میں نے دیکھا کہ دو سو آدمیوں سے زیادہ کو اگر کہ برابر گھوڑا دوڑا رہا تھا یہاں تک کہ ہر جانب سے گھر گید اور شہید ہوا۔ روضۃ الشہداء کے موافق غلام ان کا مقابلہ پشت تھا۔ ابن خلدون کے موافق شوزب کے ساتھ ہی شہید ہو گئے۔ اس مورخ و نیز ابن اثیر کے موافق مابس کے مقابلہ پر کسی کو جانے کی ہمت نہ ہوئی تھی۔ ابن خلدون کے موافق ”لشکر شام میں سے کسی کی ہمت مقابلہ پر جانے کی نہ پڑی۔ ایک دوسرے کا فتح نکلنے لگا۔ عمر بن سعد نے کہا اے پست ہمتو اگر اس کے مقابلہ پر نہیں جاسکتے ہو تو اس کو چاروں طرف سے تیر و پتھر سے مارو۔ مابس نے لڑائی کا یہ زلزلہ رنگ و بچ کر نکوار کھینچی اور کمال تیزی سے برق کی طرح آگن واحد میں مخالفین پر جا پڑے۔ اور ان کو مار کر ہسپا کر دیا۔ پھر مخالفین نے چاروں طرف سے یورش کر کے گھیر لیا اور تیر و نیزوں سے شہید کر ڈالا۔

ابو الشعشا زید بن ابی زیاد کنڈی اس مورخ کے موافق جبکہ پہلے (۹) آپ کے ہمراہیوں میں سے جو لڑے اور شہید کے گئے وہ ابو الشعشا یعنی زید بن ابی زیاد ہیں۔

وہ عمر بن سعد کے ہمراہیوں میں سے تھے۔ جب ان لوگوں نے امام حسینؑ کی درخواست صلح نامہ منظور کی تو یہ ان سے علیحدہ ہو کر آپ سے آئے۔ حضرت سے اجازت حاصل کر کے جان نثار کی انھوں نے دشمنوں کو ایک سو تیر مارے جن میں سے پانچ نے بھی خلافت کی ہر بار امام حسینؑ فرماتے جاتے تھے: ”اے اللہ اس کے بازوؤں میں قوت عطا فرما اور اس کے ثواب میں جنت عطا کر۔“ (روضۃ الشہداء)

جبل بن مسروق الجعفی اور ایک ترک جبل بن مسروق الجعفی حضرت کے لشکر کے مؤذن لڑے اور شہید ہوئے۔ اس کے بعد ایک ترک غلام جو قاری اور

حافظ تھا حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا اور اجازت جنگ طلب کی۔ حضرت نے فرمایا کہ میں نے تجھے اپنے فرزند زین العابدینؑ کے لیے فرید ا تھا اور انھیں بخش دیا تو ان سے اجازت طلب کر کہ ترک گیا اور اجازت چاہی۔ حضرت علیؑ بن الحسینؑ نے فرمایا کہ میں نے تجھے آزاد کر دیا اس کے بعد تجھے اختیار ہے۔ ترک اب تمام خیموں کے گرد پھرا حق تعالیٰ تعزیر کرانی اور پھر فرزند رسولؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر واقعات بیان کیے اور اب اجازت لے کر میدان کی طرف گیا۔ حضرت امام زین العابدینؑ نے اگرچہ بیمار تھے مگر یہ سن کر کہ ترک میدان میں گیا ہے، خیمہ کے پردے اٹھا دیے۔ دیکھا کہ ترک ہانڈارے چوں گل شکستہ و رخسارے چوں ملہ دو ہفتہ در میان ہر دو صفت بہ ایستاد۔ گاہے بہ عربی رجز میخواند و گاہے بہ لفظ ترکی کلاے بر زبان میراند و ترجمہ بعضے رجز ہائے ابو بکرؓ و ابوالمخارقین است: ۷

اے حسینؑ اے گہر روحانی	لشکر مکرمت سبحانی
منم آن ترک کہ سلطان ہاشم	گر تو ام ہندوے حضرت خونی
چہ شود گر تو بروے خوش خویش	سرخ رونے ابدم گردانی

یادگار جنگ کے بعد پیاس کے قلعہ سے پھر خیمہ کی طرف واپس آیا۔ ”امام زادہ برو آخرین گفت۔ ترک صادق دل دست دہائے امام زین العابدینؑ را بوسہ داد دیگر بارہ از خدات حرمت عصمت بخی طلبید و از سوز مطلق خدمت ایشان بہ ہائے ہائے گریست۔ در اکثر کتب مذکور است کہ آن ترک زخم گراں یافتہ از پائے در آمد و امام حسینؑ

بسرورے رسیدہ اور ابہ خیمہ امام زین العابدین رسانید و لا مرکب فرود آمد و سرش در کند گرفت و رونے بروئے
وے نہاد و امام زین العابدین باوجود مرض بر سرالیں وے ایستاد و غلام دیدہ باز کرد و سر خود در کند شاہ شہید ایں دید و امام زین
العابدین رابر سرالیں خود مشاہدہ فرمودہ بتسم کنن بر پدر و پسر سلام کرد و وجہ دار السلام آورد۔ یعنی: فرزند امام نے
اسے آقرین ہی۔ صادق دل ترک نے امام زین العابدین کے ہاتھوں اور ہاتھوں کو بوسہ دیا اور دوبارہ الہی عرم سے اجازت مانگی
اور ان کی خدمت سے الگ ہونے کی ملن سے ہانے ہانے کر کے روایا۔ اکثر کتابوں میں مذکور ہے کہ وہ ترک بھاری زخم
کھا کر گر پڑا اور امام حسینؑ اس کے سر پر بیٹھے اور اسے اٹھا کر امام زین العابدین کے خیمہ میں پہنچایا۔ سواری سے اترے اور
اس کے سر کو گود میں لے لیا اور اپنا چہرہ اس کے چہرہ پر رکھ دیا۔ امام زین العابدین بیاری کے باوجود اس کے سر ہانے
کھڑے ہو گئے۔ غلام نے آنکھ کھولی اپنے سر کو شہیدوں کے شہنشاہ کی گود میں دیکھا اور امام زین العابدین کو اپنے سر ہانے
مشاہدہ فرمایا۔ مسکراتے ہوئے باپ بیٹے پر سلام کیا اور باغ دار السلام کا رخ کیا۔

سعد بن عبد اللہ الجعفی جنادہ اور عبد اللہ بن جنادہ
حنفیہ سے تھے لڑے اور شہید ہوئے۔
جنادہ حارث انصاری اور عبد اللہ بن جنادہ نے شہدائی فہرست میں اپنا نام لکھوایا۔ بزل انصاری، مرہ بن ابی مرہ غفاری گئے
اور کامیاب ہوئے۔

ابو مخنف ابراہیم بن الحسین (الحسین) سے جنگ کراتا ہے۔ یہ پچاس کے قریب دشمنوں کو
قتل کر کے شہید ہوتے ہیں۔

اصحاب حسینؑ عالم راحت کی طرف رخصت ہو چکے۔ اب ان دھندلوں میں سے کوئی باقی نہ رہا۔ اب صرف بنی ہاشم
باقی رہ گئے۔ کمال ابن اثیر اور اس کی نقل سے ابن خلدون حضرت علی اکبر کو پہلا شہید آل ابی طالب میں قرار دیتا ہے۔ اگرچہ
مجھے شہداء کی ترتیب میں بہت اصرار نہیں ہے لیکن دیگر مؤرخین اور ابو مخنف حضرت علی اکبر کو آخر شہداء میں لاتا ہے اور
میں اسی کو قبول کرتا ہوں۔

عبد اللہ بن مسلم
عام مؤرخین نے یہ سلسلہ اختیار کیا ہے کہ وہ بنی ہاشم میں سے پہلے عبد اللہ بن مسلم بن عقیل کو
میدان میں لگاتے ہیں۔ ابو مخنف کے نزدیک یہ حسینؑ کے پاس جاتے ہیں۔ اور کہتے ہیں:
”یا مولائے میدان میں جانے کی اجازت دیجیے۔“ آپ فرماتے ہیں کہ: ”اے فرزند اپنے اور اپنے اہل کو قتل سے
بچاؤ۔“ عبد اللہ کہتے ہیں کہ: ”اے چچا! میں کس مٹھ سے آپ کو چھوڑ دوں اور کس طرح اپنے بد خستہ منطقتے سے
ملاقات کروں گا۔ واللہ اے میرے سردار یہ ہرگز نہ ہوگا۔ بلکہ میں شہید ہو کر خدا سے ملاقات کروں گا۔“ میدان میں
نکلے اور رجز پڑھا:

نحن بنو ہاشم الکرام نحن ابناء السید المہام
سبط رسول الملک العلام نسل علی فارس الضرعام
اس کے بعد علامہ کید یہاں تک کہ نوے دشمنوں کو دمیر کر دیا۔ اس وقت ایک تیر لکھ اور ”وا ابتا“ کی آواز دی۔

[illegible][illegible]

<http://fb.com/ranajabirabbas>

اس کی جگہ تو کہہ دیا جی ضروری ہے کہ صاحب جمیع الطالب فی الحساب آک الی طالب اور تاریخ التواریخ اور صاحب
جملۃ الخوارزمی ایک روایت کے موافق حسن ثنی (فرزند حضرت امام حسن) اپنے میدان اکرام میں جنگ کے طور حضرت زکی
پڑے تھے کہ اسلام بن خارج بن شیبہ بن خویں طرفہ بن بدر الفزازی اس وقت اس کے قریب پہنچا جب کہ لشکر عمر سعد
خروج کی سرطین کے ساتھ قتل ارادے انہیں یا نگ الی طلحہ بن الملوہ پہنچے تھے کہ حضرت امام حسن علیہ السلام کی
میانجی ہوئی تا کہ حضرت اس وقت ان کے حضور میں حاضر ہوئے۔

لیکن یہاں ہوتا ہے کہ حضرت احمق (حق شناس) کی جنگ ہار کر نہیں کیا ہے اگر کیا ہے تو حکم یہاں نہیں لایا اور کسی
 نے عبداللہ بن مسعود کا بھائی نہیں تھا کہ یہ کیا ہوا کہ غرض میں نے عبداللہ بن مسعود کو حق شناس قرار دیا ہے لیکن یہاں میں نے
 ابراہیم بن مسعود کو حق شناس قرار دیا ہے عبداللہ اور مسعود ایک ہیں لیکن یہاں میں نے ابراہیم کو حق شناس قرار دیا ہے
 جبکہ میں نے حضرت امام حسین علیہ السلام کو حق شناس قرار دیا ہے جبکہ میں نے ابراہیم بن مسعود کو حق شناس قرار دیا ہے
 دیکھ کر یہ بات کہانی ہے اور یہاں میں نے حق شناس قرار دیا ہے کہ اس کے لیے میں نے حق شناس قرار دیا ہے آگے کہ وہی
 اور وہی ضرب لگائی ہے کہ حق شناس

[illegible]

۱۶ برس حق قضیہ میں داخل الیہ وجاہ علی ظہر جوادہ۔۔۔ تم نظر الی القاسم دیکھو علیہ وقت حال یعنی واللہ علی عمک ان تدعوا فلا یجیبک۔۔۔ و بعد ازیں یہ حدیث اخیرہ لاجل ولہ جن القریب ہنترہ سنہ اس سے ظاہر ہے کہ ابراہیمؑ کی مہال میں تشریف لے گئے اور اس قابل تھے کہ

[illegible]

[illegible][illegible]

<http://fb.com/ranajabirabbas>

<http://fb.com/ranaiabirabbas>

اور اس کے کھلیے ہوئے ہونے سے لایا کہ نیکو اور دوسرے اہل ایمان سے بالکل دور رہ کر اپنی ہر بات میں اللہ کے
روایت کو گمان نہ کرے اور کائنات کے چھوٹے و بڑے ہر شے میں اللہ کی قدرت کا اثر دیکھ کر اپنے دل میں اللہ کی
کھلیے ہوئے ہونے سے لایا کہ نیکو اور دوسرے اہل ایمان سے بالکل دور رہ کر اپنی ہر بات میں اللہ کے
روایت کو گمان نہ کرے اور کائنات کے چھوٹے و بڑے ہر شے میں اللہ کی قدرت کا اثر دیکھ کر اپنے دل میں اللہ کی
کھلیے ہوئے ہونے سے لایا کہ نیکو اور دوسرے اہل ایمان سے بالکل دور رہ کر اپنی ہر بات میں اللہ کے
روایت کو گمان نہ کرے اور کائنات کے چھوٹے و بڑے ہر شے میں اللہ کی قدرت کا اثر دیکھ کر اپنے دل میں اللہ کی

<http://fb.com/ranajabirabbas>

اہلِ عفت کے خوب کھانے پینے کا اصرار ہے۔ ایک خوشامی دوستوں کو قتل کیا اور جس وقت زخمی ہو کر گرے فار ہے

تھے کہ: ”یہ میرے باپ علی امیر المومنین علیؑ کی بیوی ہوا کا مکہ نہرا تھا یہ خیرہ کبریٰ ہیں اور فہارمی ہیں کہ اسے فرزند آنے میں جلدی کر ہم تیرے شائق ہیں۔“ حضرت نے دشمنوں پر حملہ کیا اور انہیں شکست دے کر حضرت علیؑ کی کبریٰ کا دل پر پہنچا۔ انہوں نے اس کے چہرہ اور دانتوں سے خون پونچھتے جانتے تھے اور فرماتے تھے: ”اسے فرزند خدا اس پر لعنت کرے جس نے مجھے قتل کیا۔“ عمارہ بن ابی سلمہ بن سلم سے روایت ہے کہ اس نے ایک بی بی کو بچا جو حسینؑ کے غم سے ٹپکھ اور ان کا چہرہ چاند کی طرح تھا اور وہ آہائے رے رہی تھیں کہ اسے فرزند ہے قتل کیسے ہو رہا ہے وہاں کی غم سے اسے اور ہم کسی غریب بی بی کا دل ہم آج کے دن سے پہلے گزر گئے ہوتے۔ حضرت انہیں دیکھ کر پٹے اور انہیں غم میں پھنسا دیا اور دریافت کیا کہ وہ بی بی حضرت امیر المومنینؑ کی صاحبزادی تھیں۔ حضرت ان کے رونے سے روک دیے اور انا للہ وانا الیہ راجعون فرمایا اپنے فرزند کی لاش کو ایک قبر میں لے گئے اور فرمایا: ”اسے فرزند تو فرمایا کہ میں اس سے ہمراہت کروں گا۔“ تیری بھاری رو رہی ہے اور تیرا باپ باقی ہے اور جلد تیری طرف آ رہا ہے۔“

صاحب روضۃ الشہداء یہ روایت لکھتا ہے کہ جب اہل مدینہ کو جناب علیؑ کی اطلاع کا شوق ہوا تھا کہ یا جب ابن حضرت علیؑ کے لیے مبارک کے شائق ہونے لگے تو حضرت علیؑ اکبر کو دیکھتے تھے اور ان کی باتیں سنتے تھے یہی سبب تھا کہ انہیں اس سے لگاؤ تھا کہ حضرت علیؑ اکبر جب میدان میں شریعت لے لے تو آپ کے دو گیسو چہرہ کے آگے اور دو پشت کی طرف دھرتے تھے (شریعت عرب خصوصاً نبیؐ میں یہ رسم تھی)۔

کھنڈ اللہ کے عیالی حضرت نے جناب علیؑ اکبر کو خود کا فرزند اور ”عشق علیؑ عشق حق“ جملہ پیغمبر خیر میداد و خواص ہوش میں حیدر مقدس اثری بود۔“ یعنی: ”آپ کے نہاں اور سے جملہ پیغمبر کے جلال و کبریائی تھی اور بازو کی طاقت حیدر مقدس کی طرح بڑھتی تھی۔“

روضۃ الشہداء کے عیالی عمر بن سعد نے طارق بن شیبہ کو موصل کی لڑائی کے بعد کہ حضرت علیؑ اکبر سے جنگ کے لیے بیرون چلا۔ اور اس نے کہا کہ: میں ڈر تا ہوں کہ فرزند رسولؐ کو قتل کر دیا اور تو اپنے والد کو سب سے بڑھ کر چاہیے گا۔ لیکن حکمت موصل کی آمد نہ پڑی نہ پہنچا اور وہ اپنے دیگر فرزند کے مارا گیا۔

یہ بھی روایت ہے کہ جب آنحضرتؐ علیؑ اکبرؑ کو مدینہ لے گئے، حضرت کا دل ہی میں چلے اور پھرتے جاتے تھے کہ ”یا ابا عبد اللہ کئی کی آواز نہی اس وقت ملے یہ تھی کہ حضرت علیؑ اکبرؑ سخت زخمی ہو چکے تھے اور بے ہوش تھے اپنے کو گھونٹے پر سنبھالنے لگے تھے۔ عیالی چھوڑ دی تھی اور عیالی اس تمام لی تھی کہ گھونٹا خیر کی طرف چلا۔ عیالی دور چلا تھا کہ حضرت علیؑ اکبرؑ پشت بوس سے گر گئے اور گھونٹا میدان کی طرف چلا۔ حضرت عیالی کو غلای دیکھ کر علیؑ اکبرؑ کو تلاش کرنے لگے اور اس کے ساتھ چلے۔ یہاں تک کہ وہ لاش کے پاس آگئے کہ گھونٹا ہو گیا۔ عیالی نے علیؑ اکبرؑ کو پتہ نہ دیا۔

صاحب ابون فرات نے ہیں کہ جب اصحاب خیر الشہداء سے کوئی بات نہ رہا صرف اب اقربا ہی رہ گئے تو جناب علیؑ کی محبت سے لگے وہ ہوش گورے تھے۔ ان سے یہ تو اس زمانہ کی حسینؑ نہ تھا۔ انہوں نے حضرت سے اجازت چاہی کہ عیالی شہداء کے اجازت توڑی مگر حضرت وہاں سے ان کی طرف نہ گئے۔ پھر حضرت نے ایک کھجور لی کر لی اور دو دیے۔ یہ شہداء وہاں پہنچے اور کھڑے ہوئے۔ پھر جب کہ علیؑ اکبرؑ کے منہ پر اپنا کھجور کھلا اور کہا کہ:

[illegible][illegible]

ایک شیر خوار بچہ کی شہادت

اسی طور کے موافق: ”اب حسین بن علیؑ چار رو گئے۔ کوئی ایک شخص بھی پاس نہ رہا۔ صرف ریلٹ برس کا سیتھام عمر نام اور بھائی کا ایک شیر خوار بچہ رہتا ہوا تھا۔ آپؐ گھوڑے پر سوار ہو کر تھک کے خیمہ کے دروازہ پر تعزیت لگائے اور کہا: ”ہمیں بے نتیجے کو میرے پاس لانا کہ اسے دیکھ کر غصہ کر لوں۔“ محمدؐ توں نے اس شیر خوار کو آپؐ کے دست مبارک پر رکھا۔ آپؐ اسے چار کھیرے دیے۔

کہ یاگاہ ایک تیر اس بچے کے سینہ پر لگا اسی وقت جان بحق تسلیم ہو گیا آپ نے کہا: میرے ملازم شیعہ کی دشمنی کی وجہ سے اس قوم کی ساخت پر سخت افوس ہے۔ پھر گھوڑے سے اتر کر گھوڑے سے گڑھا کھودا اور اس بچے کی نعش دفن کر دی۔

عالمی اسلام

آگے زین پر رکھ کر صفوں کے سامنے بٹے گئے۔ اور آواز دی: اے ظالم قوم! اگر

تمہارے خیال میں میں گناہگار ہوں تو اس بچے کے تو کوئی خطا نہیں کی تھی۔ اے ایک گھوڑے پانی پلا دو۔ حسین بن علی کی آواز سنی کہ ان میں سے ایک شخص نے حرکت کی طرف تیز ہوا جو شیر خدا کے گلے کو چھید کا جو حضرت کے بازو میں پوسٹ ہو گیا۔ شیر کے گھائے جی بچے کی زون پر لڑا کر گھمراہ ہوا۔ امیر المومنین دھڑلے کر داکھن آئے اور اس کی ماں کو بچہ کر کہا: اے تیرا بچہ جان کو شہید ہے میرا بچہ ہو گیا اب صلابت تم حسین کے موافق فرمایا: اسے سب اکر تو نے ہم سے بددروک لی ہو تو جو وہ سب بڑھ کر اور ان غلامین سے انتقام لے کر وہ انتقام کے موافق فرمایا: حضرت خنیس سے آپ نے فرمایا کہ اس کو لے لو یہ کہہ کر سید الشہداء کے خون اس کا پلہ میں لیا اور جب چلو خون سے بھر گیا تو آپ نے اس کو آسمان کی طرف اچھالتا دیا اور فرمایا: اے خداوند! میرے دل پر قاتل ہو رہی ہے آسمان سے کیونکہ خدا اس کو بچ رہا ہے۔

ابو بکر اس وقت کہتے ہیں: اس کے بعد آپ فیمہ میں داخل ہوئے اور فرمایا: اے زینب! اے پیاری بہن میرے چہرے پر کھاد اور مراد نہ کریں۔ اللہ وہاں کہ وہاں حضرت نے کہا کہ میں نے اپنے تین دلوں سے پانی نہیں پیا۔ آپ اگر اس کے لیے پانی مانگیں تو شاید لوگ اس میں تخی پر تھیں کھا کھا کر اس کو پانی دے دیں۔ امام حسین رضی اللہ عنہ نے پانی کو گھونٹ لے کر چوڑا کر وہ پیاس کا مارا ان کے ہاتھوں میں ڈال دیا۔ پھر کپاس میں پیر کو لے کر چھین کے منہ میں لے کر کہا تم نے میرے ساتھ پیر کو قاتل کر دیا ہے۔ اس بچے کے سوا کوئی باندہ نہیں رہا۔ اس نے تمہارے تین تین کاٹا۔ یہ پیاس سے بے تاب ہے۔ ہم کو گھونٹیں تو اس کو پانی پینے کو چھوڑا۔ آپ یہ کہہ ہی رہے تھے کہ کبھی بدکار نا بھلا باندی نے ایک زہر پلا تیرا راجہ اس بچے کے گلے میں آکر لگا۔ اور یہ مصوم بچہ وہیں دم توڑ کر رہ گیا۔ درد مند باپ اس کا خون پوچھتا جانتا تھا اور یہ الفاظ سننے سے نکل رہے مانتے اللھم! اللھم! خالق مولاہ القوم! پانی تو ان لوگوں کے سلوک کا گواہ ہے۔ پھر آپ واپس آئے اور بچے کی لاش ام کلثوم کے پاس رکھ دی جس کو انھوں نے سید سے لایا، اور زہر دینے لگیں اور ان کے ساتھ سب کے سب حتیٰ کہ ملائکہ نے مجھ کو مدعو کر دیا۔ ام کلثوم روتے روتے یہ اشعار پڑھتی جاتی تھیں۔

(میر لعل اس پتہ سے غمزدہ سال بچے پر افوس کر رہا ہے جسے دودھ چھوٹنے کے قبل ہی دشمنوں کے تیر نے شہید کر دیا۔ ابھی وہ بچہ ہی تھا کہ اسے خون کی گلی کھادی۔ میرا دل اس پر ہمیشہ افوس کرتا رہے گا۔ اب ظالموں نے اس کے ماں باپ کا دل اس کے غم میں ڈال دیا اور انتقام لینے کے لیے اسے تیر مارا)

ابو عصفیہ کے نزدیک حضرت علی رضی اللہ عنہ کی عمر چھ مہینہ کی تھی۔ آپ یہ چھوٹی سی لاش لیے ہوئے آ رہے تھے اور خون حسین کے پیوہ چہرہ رہا تھا۔ اور فرمایا ہے: تھے:

(اے میرے پیور دگار! مجھے تمہارے چھوڑ دینا لوگوں کے درمیان جو انصاف کے شکر ہیں۔ جنھوں نے ہم کو در ماندہ بنا دیا ہے۔ اور جو اپنے خیال سے زینب کو خوش کر رہے ہیں۔ بقا امیر سے دیکھا شہید ہو گئے ہیں اور حالت

اے کسی میں خون میں تڑپے پڑے ہیں)

(ایک کئی مہر ہے کہ ہمارے ہمارے میں خدائے دہرے)

صاحب رحمۃ اللہ کے مولائی سہیلو نے حضرت کا انتحار سن کر نیند اٹھائی اور مسجد ان کی طرف دوڑے۔ لیکن حالت یہ ہے کہ صفحے سے پاؤں کا پیر ہے اٹھ اور قاضی سے جیم لہڑ رہا ہے۔ حضرت امام حسینؑ نے دیکھا اور فرمایا: "اے منہ زدن و امیں جو کہ تیری قیامت تک ظلم نہ ہوگی۔" اور "من ترومی خود ساختہ مولانا پتہ میگزین و امام پتہ کہ از بد و بد پر بدست من است جو ہی سلام بول فتہ را کن۔" وہ گئے۔ صفحہ کا لہو و جگر اسی دن و جگر احمد و علم قیامت و منہ زدن و پائی علوم کہ غیب سے از انجیل سیف کے رابر آئی و اللہ اعنیہ۔" ایسی صاحب کشف اللہ نے بھی لکھا ہے۔ صاحب "خم صین" بھی اس روایت کو نوٹ کرتے ہیں۔

حضرت اہل بیت کو سلام کرتے ہیں

اور اسے منہ پر تھوکوں پر بیوسلام ہو کہ یہ آخری اجتماع ہے عظیم کٹھنم آٹھویں اور فلانا: اسے بلایا کیا آپ اپنے
کو روکے والہ کہ چلے فلانا کیے تسلیم نہ کروں کہ اب کئی دکان میں ہے جو کٹھنم نے فلانا کو: اسے بلایا
اپنے نائیک کے حرم کی طرف لائے چلے فلانا: جلوس انوس اگر خطا کو چھوڑ دیتے تو وہ آرام کے ہو تار

حضرت مسکینہؑ کے متعلق حضرتؑ کے اشعار

اور انیستیں سے انہیں بھی کر مشغول ہے

سيططيل يعني يا مكينة فتالي
 لا تحرقني فاني يدمعك حسرة
 فاذا قتلت فبعد فابكي الفاني
 فابكي و قولي يا قليلا قد يعني
 فابكي و قولي مديوني بعلما
 قد كنت امل ان اعيش بظله
 احلى الدنيا يا مكينة فاجلا
 اوصيك بالولد الصغير و بعده
 فاذا قتلت فلا تشقى ميزرا
 لكن صدرا يا مكينة في القضا

وہیبتیہ: روح و لیلا: روح (ان کا قتل و اسراف)

حضرت زینب رضی اللہ عنہا کی ہیں

مگر آہ جس وقت امام خود تشریف لے رہے تھے اس وقت مردوں (یعنی امامین علیہ السلام) کے کہنے پر انہیں طاقت نہ تھی اور بستر بیماری پر پڑے تھے۔ اسی وقت سے کہنے لگی جلد نہ تھا جو آپ کو رخصت کرتا تھا اس وقت آپ کی بدن صحت و زہب رضی اللہ عنہا آپ کو رخصت کرنے کے بعد درخیز ہو گئیں اور روز بروز دماغ کھل گیا۔

حضرت کا خطاب

الحاصل کے بعد آپ میدانِ شہریت لائے اور فرمایا: ”وائے ہر تہجد مجھ سے
کیوں لڑ رہے ہو۔ کیا میں نے کسی فریضہ کو ترک کیا ہے۔ یا سنت اور شریعت
میں تغیر کیا ہے؟“ ان لوگوں نے کہا: ”نہیں، ہم اس پہ لڑ رہے ہیں کہ وہیں محمدؐ سے ساتھ تھا جسے والد کا بیٹا
اس کے بچے کے ساتھ جو کچھ ان کے عیال سے ہر گز سے بد رفتاری میں کیا۔“ بعد اس کے ہر جو بھرتی کے عیال سے اور ہر بھرتی کے
والدہ کرکھی کو اپنے رشتہ میں سے ہر خاک و خون بکرو کے درجہ پر آپ نے لکھا: ایک کا نام بدل کر رکھا کہ ”نہی“
فرمایا یہ اپنی اپنی طرف اور اس سے پہلے ان کے درمیان کیا تھا جسے کہتے تھے کہ ”تاکہ“ لیکن تم جو اس میں رہتے تھے اس
میں لیکن تم نہیں سنتے اور نہ کہ تمہارا ایم کہن سلطنت تھی اور یہاں شیخ رشید کا کوئی مددگار نہیں تھا۔ اسی
خبر سے جو محمد اور دشمنوں کو دیکھ کر کہتے تھے کہ تم یہاں اس میں ہو کہ اگر ایسا نہ ہوتا تو تم دونوں تمہیں کہہ دیتے یہ تمہارے اچھے
گے یاں تھا اور تمہاری طرف سے آ رہی ہے اس کے ساتھ ساتھ اللہ والا ہے اور اس کے ساتھ

[illegible]

وبلغه جد كبرى المصطفى
 (١) فلبس الثراء اى و ابي
 فارس الخيل و راي النبيلين
 (٢) فلبس الثراء اى و ابي
 فارس الخيل و راي النبيلين
 (٣) فلبس الثراء اى و ابي
 فارس الخيل و راي النبيلين
 (٤) فلبس الثراء اى و ابي
 فارس الخيل و راي النبيلين
 (٥) فلبس الثراء اى و ابي
 فارس الخيل و راي النبيلين
 (٦) فلبس الثراء اى و ابي
 فارس الخيل و راي النبيلين
 (٧) فلبس الثراء اى و ابي
 فارس الخيل و راي النبيلين
 (٨) فلبس الثراء اى و ابي
 فارس الخيل و راي النبيلين
 (٩) فلبس الثراء اى و ابي
 فارس الخيل و راي النبيلين
 (١٠) فلبس الثراء اى و ابي
 فارس الخيل و راي النبيلين

عروة الدين علي ذو العلي
أظهر الإسلام رفاً لهذا
مع رسول الله يسرى جاهدنا
تولى الأحنام لطفنا ناولا
فأما بن العين و الأذن الذي
و بنا جبريل اضحى فأكزوا
مجزاه الله عنا صلواتنا

سأق الموصى أمام الخافقين
بصنام فتاطع في بشفرتين
قابل الأبطال و المولى طين
رفع الدين فوق العزيرين
أف عن الخلق لما في الخافقين
و أفعأ عنا أجونا كل ذي
خالق العالم مولى المشرين
(أزاد الله له)

● میرے مٹانے کے بعد میرا ایک تمام لوگوں میں خدا کا بڑا گنہگار اور میں خود بزرگزیں دنیا کا فرزند ہوں۔ ● میرے بارہ بزرگوار
آفتاب اور میری بارہ گرانی چاند اور میں ستارہ ہوں۔ اور میں وقر کا فرزند ہوں۔ ● میرے ستارے اور چاند اور میری بارہ
کی طرح نہایت کم کی ماں ہے جو ● عالمہ زہرا میری ماں ہیں اور میرے پردہ گراہی شاہوں کے عروج اور تیز آمد اور چاند
● بدلتا اور چاند کی لڑائیوں میں وہ چاند اور چاند کو شکست دیتے ہوئے ہیں۔ ● میرے شاہی کام میں ہم اور شاہی ہیں۔ ایسے چاند
عروج و چاند کے حامل ہیں۔ ● انھوں نے چشم زدن میں چاند کی یہ حالت کر دی کہ ایک قرینہ انھیں جلد نہیں کر سکتے
● وہ بچپن سے اللہ کی محبت سے کرتے آئے جب کہ قریش بنوں کی پرورش کیا کرتے تھے۔ ● وہ ملک و قضاوت و عہد و نوین
کی پرورش کرتے ہیں اور علی گڑے ہوئے دور تھیں پڑے ہوئے ہیں۔ ● میرے ستارے میری راس کے چرائی ہیں اور میرے
بابا جنگ کے دونوں ملاؤں (۱) کے دن سے مشہور ہیں۔ (۲) حضرت طہری کا ترجمہ اور میرے پردہ
بزرگوار نے ان کے ساتھ دونوں یہ تھیں ہیں وہاں کی و موعظ کے نزدیک نبی و سرا معرہ بیگم جس میں معرہ لال سے
رہا ہے اور مغرب صاف ہے۔ ● علی دین کا مہار اور صاحب عظمت ہیں اور اہل مشرق و مغرب کے ساتھ صاف و ص
کوڑ ہیں۔ ● انھوں نے دشمنوں کی مخالفت کے باوجود اسلام کی اشاعت کی اپنی دود دعاوی الکوار سے۔

● جنہوں نے رسول کے ساتھ جہاد میں سہی کہ بہادریوں کو قتل کیا اور قرض ادا کرنے والے ہیں۔ ● جنہوں نے بتوں کو پست اور سرنگوں بنادیا اور دین کو کس و قمر سے بھی بلند کر دیا۔ ● میں ایسی آنکھ اور کان کا فرزند ہوں جسے مشرق و مغرب کے لوگوں نے مانا ہے۔ ● حیرل کو ہماری وجہ سے فخر حاصل ہوا اور ہمارے ہلپ نے ہماری طرف سے تمام دین ادا کر دیے۔ (مولف کے نزدیک دین یعنی قرض کا مفہوم فرض سے ادا ہوتا ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ اشاعت اسلام اور وہ بڑے بڑے کام جو امیر المومنین نے کیے ان کے بعد ہمارے لیے کوئی اس درجہ کا فرض باقی نہیں ہے۔ اس سے جناب امیر کے کاموں کی وقت قائم کی ہے بمقابلہ ان خدمات دین کے جو ان کے بعد کی جائیں) ● پس اللہ ان کو ہماری طرف سے جزائے خیر دے۔ جو خالق عالم اور مالک دو جہان ہے۔

مقتل ابی عتف میں کچھ اشعار زیادہ ہیں جن کے مخصوص یہ ہیں :

وارث العلم و مولی الثقلین	و ابی الزہراء حقاً و ابی
فانما الزہراء و ابن الازہرین	خصۃ اللہ بفضل و تقی
ما علی الارض مصل غیر ذین	مع رسول اللہ سبحاً کاملاً
و رفاً بصمد فوق المنیرین	حک الامنام مستند حجة
ما جرى بالفلک احد النیرین	فلہ الحمد ملیناً واجب
قد ملکنا شرقاً و المغربین	نحن اصحاب العبا خمستنا
و لنا للبيت کذا و المشعرین	ثم جبریل لنا سادساً
شاعناً یعلو بہ فی الحسین	و کذا الحمد بنا مقتضراً
خالق المخلوق و مولی المشعرین	فجزا اللہ عنا صالحاً
صاحب الحوض مفر الحرمین	عروۃ الدین علی المرتضی
و کذا افعاله فی الخافقین	یفرق الصفا من مہبتہ
حین ساوی ظہرہ فی الرکعتین	و الذی صدق بالخاتم منہ
فقد تسقوا من حوض اللجین	شیعة المختار طیبوا نفساً
حبا تحفه بالحسین	فعلیہ اللہ صلی ربنا

کمال بن اثیر کہتا ہے : جب تین چار آدمی حضرت کے لشکر میں ہلاتے تھے اس وقت حضرت نے ایک ایسا پانچواں پہنا جسے

حضرت آخری لباس پہنتے ہیں

کوئی نہ لوٹے کسی نے کہا کہ ایک جاگلیا پہن لیجئے فرمایا کہ یہ لباس زلت ہے اسے نہ پہنوں گا۔

صاحب لہوت فرماتے ہیں سید الشہداء نے فرمایا کہ میرے لیے ایسا لباس لاؤ کہ جسے کوئی لباس چاک کیا پسند نہ کرے۔ میں اسے اپنے کپڑے کے نیچے پہن لوں تاکہ بعد قتل برہنہ نہ کیا جاؤں۔ تب حضرت کی خدمت میں ایک لنگوٹ یا جاگلیا لائے تو حضرت نے فرمایا کہ نہیں یہ پوشاک ذلیلوں کی ہے۔ پھر

حضرت نے ایک پرائیوٹ لیبس لیا اور اس کو جاباسے چلا کر پہن لیا۔ مگر جب حضرت شہید ہو گئے تو ان لٹکوں نے وہ کپڑا بھی حضرت کے جسم سے اتار لیا۔ اس کے سوا سید الشہداء نے ایک پانچامہ حبرہ کا منگوایا اور اس کو بھی چاک کر کے پہن لیا۔ اس لیے اس کو چلاؤ تھا کہ اس کو کوئی نہ اتارے۔ مگر جب حضرت شہید ہو گئے تو اس کو بحیرن کعب شقی تعین نے اتار لیا۔ صاحب روضۃ الشہداء کے موافق حضرت نے اسلحہ جنگ حضرت شہر بانو سے اسلحہ طلب فرمایا۔ شہر بانو سے طلب کیا۔ لیکن تاریخ کے موافق حضرت

شہر بانو کی رحلت حضرت علی بن الحسین کی ولادت کے بعد ہوئی۔

صاحب بحار طامہ شہر آشوب علیہ الرحمۃ سے نقل فرماتے ہیں کہ اشعیا اہل بیت کو قید کرانے پر حضرت شہر بانو کے جنوں نے اپنے کو فرات میں گرا دیا۔ شاہ عبدالعزیز صاحب سر الشہادتین کے قصیدہ میں فرماتے ہیں کہ حضرت امام حسین علیہ السلام کی ازواج شریفہ میں اس وقت حضرت شہر بانو فی اللہ نہاں اور مادر پسر سوم شیر خوارہ حضرت امام حسین علیہ السلام کے ہمراہ تھیں۔ حضرت جس وقت خود جہلو کے لیے تشریف لائے اس وقت کی حالت شاعر کے ان اشعار سے خوب ادا ہوئی ہے کہ:

ورائے پردہ شہین و کدوک بید
نزد قح کس دیگر از تہد حسین
حسین گریہ کنان در فراق فرزندان
ستاد لشکر بے مد در انتظار حسین

یعنی: بیویوں اور پیار بچے کے سوا حسین کا کوئی نہ رہا۔ حسین بچوں کی جدائی پر رو رہے تھے اور آپ کے انتظار میں

لشکر کھڑا تھا۔

حضرت جنگ کر رہے تھے اور فرماتے تھے "القتل اولی من رکوب العار والعار اولی من دخول النار"۔ (مارا جانا اور کھلب عار سے اور مارا مستوجب نار ہونے سے بہتر ہے) اگرچہ میں یہ جانتا ہوں کہ اکثر مضمون نگار اور واقعہ نویس حضرات نے مسرت جیمس کلارن مؤلف تاریخ حسین کے وہ فقرات جو انھوں نے حضرت امام حسین علیہ السلام کے متعلق لکھے ہیں نوٹ کیے ہیں۔ لیکن چونکہ ایک غیر قوم مؤرخ کے حسن پسندی کا احترام نہ کرنا میرے نزدیک مقصود نہیں ہے۔ اور کتب بھی میرے پاس موجود ہے۔ میں بھی اس موقع کو ضائع نہیں کرتا کہ اس قابل مؤرخ کے پر غور فقرات کو ناظرین کے دلچسپ غور کے حوالہ کروں۔ قابل مؤرخ نے زبان اردو میں جو مہارت اور وقت اظہار حاصل کی ہے اس نے مجھے نہ صرف ترجمہ کی زحمت سے بچایا بلکہ اس سے بڑی بات یہ ہے کہ کوئی شخص ان الفاظ کو دیکھ کر یہ نہ کہے گا کہ ترجمہ میں مناسب لفظوں کے استعمال سے اثر کے درجہ میں زیادتی کی گئی ہے۔ بلکہ یہ الفاظ خود مؤرخ کا آئینہ خیال ہے۔ قابل مؤرخ واقعہ کرنا کو "سردختر تاریخ" کہتا ہے اور لکھتا ہے:

دنیا میں رحم کا نام بہلوری میں مشہور ہے لیکن کئی شخص ایسے گزرے ہیں کہ ان کے سامنے رحم کا نام قابل لینے کے نہیں پائیے۔ چنانچہ اول درجہ میں حسین بن علی کا مرتبہ بہلوری میں ہے۔ کیونکہ میدان کربلا میں ریت پر لکھی اور کربلا میں جس شخص نے ایسا کام کیا ہو اس کے سامنے رحم کا نام وہی شخص لیتا ہے جو تاریخ سے واقف نہیں ہے۔ کس کے قلم کو قدرت ہے کہ حسین کا حال لکھے۔ کس کی زبان میں یہ لطافت و بلاغت ہے کہ ان بعض بزرگوں کی نمبت قدی اور تہود و شجاعت اور میں ہزار سوار و غوار شامیوں کے جواب دینے اور ایک ایک کے ہاک جو جانے کے باب میں مدح

انا ابن علي الطهر من آل هاشم
و جدی رسول الله اکرم خلقه
و فاطمة امی سلاله احمد
و فینا کتاب الله انزل صادقاً
کفائی بمنا مفتوحین حقیر
و نحن سراج الله فی الخلق اظهر
و عی یدعی ذو الجناحین جعفر
و فینا الهدی و الوحی و الخیر یذکر

و نحن امان الله للخلق كلهم
و شيعتنا و الله اكرم شيعه
نقول بمذا للاسام و نخبر
و مغبضنا يوم القيامة يضر

● میں بنی ہاشم میں سے علیؑ طاہر کافر زند ہوں۔ اگر میں فکر کروں تو یہی فکر میرے لیے کافی ہے۔ ● اور میرے ہمدردوں میں جو خلق خدا میں سب سے مکرم ہیں۔ اور ہم خلق میں روشن چراغ ہیں۔ ● اور فاطمہؑ حضرت محمد مصطفیٰؐ کی دختر نیک اختر میری مادر گرامی ہیں۔ میرے چچا حضرت بنی جن کا لقب ذوالجناحین ہے۔ ● اللہ کی پی کی کتاب ہم پر نازل ہوئی اور ہم میں ہدایت دی اور خیر ہے۔ ● ہم تمام خلق کے لیے خدا کی امان ہیں اور ہم اسے تمام خلق سے بھار پکار کر کہتے ہیں۔ ● اور ہمارے شیعہ تمام لوگوں کے رفیق میں زیادہ مکرم ہیں اور ہمارے دشمن روز جزا قصاص اٹھانے والے ہیں۔

دست بدست جنگ
صاحب روضۃ الشہداء اور کشف اللغۃ کہتے ہیں کہ: حضرت جب میدان جنگ میں آئے تو آپؑ نے ایک شرط یہ پیش کی کہ: ”مجھے مدینہ جانے دو۔“

جب اسے دشمنوں نے منظور نہ کیا تو فرمایا کہ: ”مجھے تھوڑا سا پانی دو۔“ جب اسے بھی قبول نہ کیا تو فرمایا کہ: ”تیری شرط یہ ہے کہ مجھ سے ایک ایک کر کے جنگ کرو۔“ ابن سعد نے اسے مان لیا۔ حضرت نے رجز پڑھا اور مقابل طلب کیا۔ اول کس قمیم بن قتبہ کہ از ابطال شام بود چون پلنگ خون آشام آہنگ جنگ ساخت سید الشہداء چون برق خافت بر او تاخت و سرش را با تیغ پرانید۔ پھنک ابطال رجال از دنبال مردے ہاں حضرت رونے در رونے شدند و سخت بکوشیدند و از شربت نختین نوشیدند عدد مقتولین از شہداء آمد۔ ابن سعد دانت کہ در پہن دشت آسمنیش بچسکس را آن توش و توان نیست کہ با سید الشہداء کلاش و کوشش آغلاد و گر کلا بدینگونہ رود تمام لشکر را با تیغ پر از د سپاہیان را با تگ زد و گفت وائے بر شہاد آ یا میدانید کہ با کدام کس قتل ی دہید۔ ابن پسر انزع البلین غالب کل غالب علی بن ابی طالب است۔ ابن پسر کسی است کہ شہدای عرب و دلیان اقوام را یک تن بجائے نگذاشت۔ یعنی: سب سے پہلے قمیم بن قتبہ نے کہ جو شام کے پہلاروں میں سے تھا خون آشام چیتے کی مانند جنگ کے لیے آمادہ ہوا۔ سید الشہداء برق خافت کی طرح اس پر چھپے اور اس کے سر کو تلوار سے اڑا دیا۔ اسی طرح پہلار مردیکے بعد دیگرے حضرت کے سامنے آتے گئے اور سخت کوشش کرتے رہے اور پہلے والے شربت ہی کو چیتے گئے۔ مقتولین کی تعداد شمار سے باہر ہو گئی۔ ابن سعد نے جان لیا کہ دشت کائنات کی وسعت میں کسی میں اتنی طاقت و توانائی نہیں ہے کہ سید الشہداء کے مقابل کد و کلاش کر سکے۔ اور اگر کام اسی طرح چا تو تمام لشکر کو تلوار کے گھاٹ اتار دیں گے۔ سپاہیوں کو آواز دی اور بولا دئے جو تم پر آیا جاتے ہو کہ کس شخصیت سے لڑ رہے ہو۔ یہ انزع البلین غالب علی کل غالب علی بن ابی طالب کا بیٹا ہے۔ یہ اس کا بیٹا ہے کہ جس نے عرب کے پہلاروں اور اقوام کے دلیروں میں سے کسی کو نہیں چھوڑا۔

لشکر کا مجموعی حملہ
حکم دلا کہ لشکر یک مرتبہ حملہ بر آن برند پس لشکر یک بار جنبش آمد و سید الشہداء چون شیر ثیاب دست از جان شستہ و دل بر خدائے بستہ بر میمنہ و میسرہ لشکر حملہ

اٹکند۔ و لشکر پیش رونے آن حضرت چون گوزن از شیر و نگہ از گرگ ی دمیدند۔ و در پہن دشت سر بگاہی پر گزیدند۔ یعنی: اس نے حکم دیا کہ تمام لشکر یک بارگی حملہ کرے۔ پس لشکر یک بارگی حرکت میں آیا۔

اور سید الشہداءؑ نے جان سے ہاتھ دھو کر دل کو اللہ سے لاکر شیریشہ کی طرح لشکر کے میمنہ اور میسرہ پر حملہ کیا اور لشکر آپ کے سامنے اس طرح بھاگنے لگا جیسے ہرن شیر سے اور بکریاں کارپور پھیرے سے بھاگتا ہے۔ اور میدان جنگ کی وسعت میں منتشر ہو گئے۔

تایین وقت ہزار و نہمہ و پینچا کس از کفار با تیغ در گزرا نید۔ اطراف آن حضرت از دشمن حق گشت پس اند کے از قلب حسب گاہ کنار میگرفت و ایستاد۔
یعنی: اس وقت تک آپ نے کفار کے ایک ہزار نو سو پچاس لوگوں کو سپرد تیغ کر دیا تھا۔ آپ کی چاروں اطراف دشمن سے خالی ہو گئیں۔ پس تھوڑی سی دیر کے لیے آپ میدان جنگ کے ایک طرف ہو کر کھڑے ہو گئے۔

دیکر بارہ سر ہنگان سپاہ ہنگ بر لشکر کوفہ زدند و پراگند گان لشکر را جمع و ہنگان را بسر زش میزدند

افسران فوج نے پھر سپاہیوں کو جمع کیا

و بمقامت تحسین دلا ند مرتبہ دیگر سی ہزار تن ہم دست و ہمدستان آہنگ آن یک تن کردند۔ سید الشہداءؑ ہاں زخمی ہائے تیغ و تیر و زحمت لشکر چوں برقی چندہ خود را در میان آن لشکر بیکریاں انگند۔ کس ندانست کہ آن دست و ہزارو چہ مصحت ی کند۔ چہا ہزار کمان خد گہا بزہ بر نہا ند و کمان بر کشا ند۔ سواران حملہا متواتر ساختند و پیلا گان بہ ری اجمار پرداختند و آن حضرت را دائرہ کردار در میان آوردند۔ و صفت از پس صفت زودہ بستند۔ دلتہ واحدہ را کب و راجل بر آن حضرت حملہ کردند۔ سید الشہداءؑ چوں شیر متغضب حملہ بر ایشان آورد و آن گروہ را بزخم تیغ و طعن نسیذہ جناک ی انگند تیغ کس بروے نگزشت کہ حلقہ شیر را گشت و تیغ طرفے رونے نکرد کہ لشکر ہاں پشت نہا ند۔ یعنی: دوبارہ لشکر کے سرداروں نے لشکر کوفہ کو صدادی اور بھرے ہوئے لشکر کو اکٹھا کیا، اور سب کو ڈانٹا اور لڑنے پر ابھارا۔ دوسری مرتبہ تیس ہزار کے لشکر نے ایک ساتھ ہو کر یک بارگی اس یکہ و تہا کا قصد کیا۔ سید الشہداءؑ نے باوجود تیغ و تیر کے زخموں اور پیاس کی شدت کے لپکتی بجلی کی طرح اس بے کراں لشکر کے درمیان اپنے آپ کو ڈالا۔ کوئی نہ کچھ سکا کہ وہ دست و بازو کیا کارنامہ سرانجام دے رہے ہیں۔ چار ہزار تیر چاہے کمان پر چڑھائے گئے اور چلا دیے گئے۔ سواروں نے متواتر حملے کیے اور پیلاے پتھر رسائے لگے، اور انجمن کب کو اپنے دائرے کے درمیان لے کر سطوں کے پیچھے مضیق ہاندہ لیں، اور آنحضرتؐ پر یک بارگی پیدل اور سوار سب حملہ آور ہو گئے۔ اور سید الشہداءؑ نے غضب ناک شیر کی طرح ان پر حملہ کیا اور تلوار اور نیزہ کے زخم لاکر زمین پر گراتے گئے۔ اور کوئی بھی آپ کے سامنے نہ آتا مگر تلوار کا تھکا ہوا ہاتھ اور کسی طرف آپ رخ نہیں کرتے تھے مگر لشکر کی پیٹھ پیر کر بھاگ اٹھتے تھے۔

از شدت عطش جانب فترات رونے نمود۔ ہنگان بر طریق شریعہ آمدند و صفت از پس صفت راست کردند و طریق شریعہ را

گھاٹ کی طرف رخ کیا

بستند۔ اہل اہور اسلی و عمر بن حجاج کہ ہا چہا ہزار مرد کماندار نگہبان شریعہ بودند ہنگ بر سپاہ زدند کہ سید الشہداءؑ را راہ بر شریعہ نہ پید۔ آن حضرت بر ایشان حملہ انگند۔ سطوف را بجاگفت و طریقہ شریعہ را از دشمن پرداخت و اسپ را بغیرات راند۔ دست فترا بر دو کفے آب برگرفت کہ بنوشد۔ یعنی: پیاس کی شدت سے

فات کا رخ کیا سب گھاٹ کے راستے پر آگئے اور صحت میں صحت ہاندہ لیں اور گھاٹ کا راستہ روک لیا اور عمرین جہجہ چار ہزار سپاہیوں کا کماندار اور گھاٹ کا نگہبان تھا اس نے لشکر کو آواز دی کہ سید الشہداء کو گھاٹ کی طرف نہ جانے دیں۔ آنحضرتؐ نے ان پر حملہ کیا مٹوں کو چیرا اور گھاٹ کو دشمن سے چھین لیا اور گھوڑے کو فات میں ڈال دیا۔ ہاتھ نیچے کر کے اور چلو پانی سے بھر لیا کہ پیئیں۔

دہن مبارک پر تیر لگا

دشمن کا عاجزانہ فریب

نگاہ حسین بن نمیر تیرے بجانب آن حضرتؐ کشادہ دل و آن تیر بردہاں مہار کشیں آمد و خون جاری شد۔ در این وقت سواری فسریدا برداشت کہ اے حسینؑ تو آب ی نوشی و لشکر بسرپردہ تو دری رود۔ حضرتؐ سید الشہداء چون این سخن را بشنید آب از کف بریخت و از شریعہ بیرون تاخت و با تیغ سپاہ کوفہ را بپراگندہ و بسرپردہ خویش آمد۔ مکشوف شد کہ گویندہ این خبر مکرے کردہ و قدرے اندیشیدہ یعنی: اچانک حسین بن نمیر نے آنحضرتؐ کی طرف تیر چلایا۔ وہ تیر دہان مبارک پر لگا اور خون بہنے لگا۔ اس وقت ایک سوار زور سے پکارا کہ ”اے حسینؑ تو پانی پیتا ہے، جب کہ لشکر تیرے خیام میں داخل ہو گیا ہے۔“ حضرتؐ سید الشہداء نے جب یہ آواز سنی تو پانی چلو سے پھینک دیا اور گھاٹ سے تیزی کے ساتھ باہر آئے، اور کوار سے لشکر کوفہ کو منتشر کیا، اور اپنے غیموں میں بیٹھے۔ ظاہر ہوا کہ اس خبر دینے والے نے مکر کیا تھا اور قدر کا سوچا تھا۔

اہل بیتؑ کو اسیری کے لائق لباس کی ہدایت

تاجاہ کہ در غور اسیری باشد در پوشیدہ۔ پس ازان حنا بگردانید و آہنگ قتل نمود۔ یعنی: دوبارہ اہل بیتؑ کو الوداع کہی۔ صبر و سکون کی وصیت کی اور فرمایا کہ اسیری کے لئے لباس پہنیں۔ اس کے بعد ہاگ موڑی اور جنگ کا قصد کیا۔ جس وقت حضرتؐ فات کے کنارہ پہنچے آپؐ نے گھوڑے کی ٹام و حیل کر دی اور بھار و نالغ التواریخ کے موافق گھوڑے سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ:

گھوڑے سے خطاب

”تم پیسا ہوں اور تو بھی پیسا ہے۔ بھرا میں نہ پیوں گا جب تک تو نہ پی لے۔“ ابو جحیف کے موافق جب حضرتؐ فات کے کنارہ پہنچے گھوڑا پیسا تھا گھوڑے نے جب پانی کی ٹھنڈک محسوس کی تو اس نے اپنی گردن بڑھائی اور حضرتؐ کو کراہت ہوئی کہ اس پر غصہ کریں۔ آپؐ نے صبر کیا یہاں تک کہ گھوڑے نے پانی پی لیا اور اپنی پیشانی پانی پر رگڑنے لگا۔ اب حضرتؐ پانی پیا چاہتے تھے کہ لوگوں نے آواز دی کہ اے حسینؑ خیمہ کی طرف دوڑو کہ اس میں دشمن داخل ہو گئے ہیں۔ حضرتؐ نے پانی ہاتھ سے پھینک دیا اور خیمہ کے قریب پہنچے تو اسے سالم پایا اور اسے دشمن کا مکر خیال کیا پھر حضرتؐ فات کی طرف چلے اور پھر دشمن مائل ہوئے۔ اس وقت حضرتؐ نے یہ اشعار فرمائے:

اشعار

فان ثواب اللہ اعلیٰ و اجزل
ھلۃ سعی المرء فی الرزق اجل

فان تکت الدنيا تعد نفیسة
و ان تکت الارزاق قسما مقدرا

و ان تكن الاموال للترك جمعاً
و ان تكن الاجساد للموت انشئت
عليك سلام الله يا آل احمد
ارى كل ملعون كفور منافق
لقد غرهم حلم الاله لانه
فما بال متدوك به الموء يعجل
فقتل الفقى بالسيف في الله اجل
فالى اراى عنكم اليوم ارحل
يروم فنانا جمله ثم يامل
كريم حلیم لم يكن قط يعجل

● اگر دنیا ایک نفیس چیز بھی جاتی ہے تو اللہ کا ثواب اس سے اعلیٰ اور زیادہ عمدہ ہے۔ ● اور اگر روزی تقسیم کی جوتی اور
مقرر ہے تو رزق میں آدمی کی تھوڑی کوشش زیادہ اہمی ہے۔ ● اور اگر مال کا جمع کرنا چھوڑ جانے کے لیے ہے تو اس
متروکہ کا کیا مال ہو گا جس سے انسان نے بخل کیا تھا۔ ● اگر جسم موت کے لیے بنائے گئے ہیں تو پہلور کا تلوار سے راہ
خدا میں مارا جانا زیادہ پسندیدہ ہے۔ ● اے آل احمد تم پر سلام ہو کیونکہ میں دیکھتا ہوں کہ میں آج تم سے
رضت ہوں گا۔ ● دیکھیں تمام ملتوں جنہوں نے ناشکری کی ہے اور منافق ہیں کہ اپنے جہل سے مجھے فنا کر کے کیا
پائیں گے۔ ● اللہ کے حکم نے انہیں مغرور کر دیا ہے اللہ جو کریم و طیم ہے اور کبھی جلدی نہیں کرتا۔

ایک حسینؑ کے جسم کے لیے عربوں کی قسمیں
آپؑ نے پھر حملہ کیا اور خلق کثیر کو قتل کیا
تھا کہ شمر عمرو بن سعد کے پاس گیا اور

کہا: اے امیر یہ شخص پلے آفری آدمی کو فنا کر دے گا ابی سعد نے کہا کہ پھر کیا کرنا چاہیے۔ شمر نے کہا کہ: تین دستوں کو
ان پر پھیلادو جو تیروں، نیزوں، تلواروں، آگ اور پتھر سے حملہ کریں۔ یہاں تک کہ زخموں سے میوڑ کر دیں۔۔۔
(جب حضرت زخموں سے چور ہو گئے) چاہا کہ جنگ کریں
تین ساعت تک غش میں رہے
لیکن اب قوت باقی نہ تھی۔۔۔ حضرت دن کی تین ساعت

باقی رہنے تک حالت غشی میں پڑے تھے اور لوگ اس حیرت میں تھے کہ مہلا زندہ ہوں۔

حضرت کے الفاظ
حضرت تین ساعت تک اپنے خون میں پڑے رہے۔ آپؑ کا چہرہ آسمان کی طرف تھا اور فرما
رہے تھے: "صبرا علی قضائک یا رب لا الہ سواک یا غیاث المستغیثین"۔

دشمن بلور کے پیالوں میں پانی چھلکاتے تھے
صاحب "غز حسینؑ" مولانا حسن میاں صاحب
پہلور دی منہ مارتے ہیں کہ: "ظالموں نے

یہاں تک شقوت و سنگ دل کو راہ دیا کہ بلور کے پیالہ میں پانی بھر بھر کر (دور سے) امام حسین علیہ السلام کو دکھاتے تھے
اور حضرت امام مظلوم ان سے اپنے جدا بھائی حضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا واسطہ دے کر وہ پانی مانگتے۔ لیکن کسی کو رحم نہ
آتا اور وہ اشتیاق سے وہ بھرا ہوا بلوری پیالہ ہٹا لیتے تھے۔ اس لیے بزرگان دین اور فقیہین اہل بیت نے جام بلور میں
پانی پینا مکروہ ظائف ادب جانا ہے۔ چنانچہ حضرت عبدالوہاب شعرانی قدس اللہ نفسہ و طیب رملہ نے کتب اليهود و
الموائین میں جہاں آداب مشولہ اہل بیت و بزرگان دین نقل فرماتے ہیں۔ اس دل سوز واقعہ کا بیان ذکر فرمایا ہے کہ۔۔۔ یعنی
اور بلور کے کوزہ میں پانی نہ پینا (جو بزرگوں سے مشول ہے) تو یہ اس لیے کہ: بیعتی نے قتل کیا ہے کہ:

”جب امام حسین علیہ السلام پیادے ہوئے، ان دنوں میں جب کہ دشمنوں میں آپ گھرے ہوئے تھے تو وہ لوگ بلور کے کوزہ میں پانی بھر کر آپ کو دکھاتے تھے اور امام مظلوم ان سے فرماتے تھے کہ (اپنے برگزیدہ رسول) میرے نانا (ساقی کوثر) کے واسطے ہیں ایک گھوٹ پانی پلا دو۔ پس وہ لوگ کوزہ لوٹا لیتے۔ اور امام حسین علیہ السلام کو پانی نہ پلاتے تھے۔“

پس (بزرگوں کے بلوری پیالہ میں پانی پینے کو برا جاننے کی یہی وجہ ہے اور) ایسے اعمال نیتوں پر موقوف ہیں۔

”انما الاعمال بالنیات“

حضرت کے حملہ کے وقت دشمنوں کی حالت

ابن اثیر یہ لکھتے ہوئے کہ لشکر نے داہنے اور بائیں سے حملہ کیا۔ حضرت نے داہنی

طرف حملہ کیا اور وہ لوگ منتشر ہو گئے۔ بائیں طرف حملہ کیا وہ بھی منتشر ہو گئے۔ روایت کرتا ہے کہ: ”ایسا کوئی شخص نہیں دیکھا گیا جس کے بھائی اور بیٹے مارے گئے ہوں اور وہ ایسا جری ہو۔ دشمن اس طرح پھٹ جاتے تھے جس طرح میٹیلے کے حملے سے بکریاں پھٹ جاتی ہیں۔“ یہی مورخ کہتا ہے کہ: ”حضرت ریگی کپڑا پہنے تھے۔ عمامہ باندھے تھے اور دسمہ کا خنجر لگاتے تھے۔ پیدل اس طرح لڑے کہ سوار نہیں لڑ سکتے تیروں کو پکارتے تھے اور لشکر پر سختی کرتے تھے۔“

یہی مورخ کہتا ہے کہ: جب فرات کے کنارہ تیر لاکھ خدا کا لشکر کیا۔ اور بدو عادی کہ: ”خداوند دشمنوں کو قتل اور منتشر کر کہ ان میں کا کوئی باقی نہ رہے۔“ اور جب شمر نے اپنے آدمیوں کے حضرت اور خیمہ کے بیچ میں حائل ہو گیا تو آپ نے فرمایا کہ: ”اگر تمہیں دین و مملکت کا خوف نہیں ہے تو تم لوگ صاحب احساب ہو میرے خیموں سے اپنے جاہلوں اور سرکشوں کو روکو۔ یہ سن کر دشمنوں نے کہا کہ یہ درست ہے اے ابن قاتمہ حضرت جب سنان بن انس، خلی بن زبید اور شمر پر حملہ کرتے تھے تو یہ لوگ پھٹ جاتے تھے۔

صاحب تاریخ التواریخ کہتے ہیں کہ زخمیوں کے علاوہ حضرت نے انیس سو پچاس دشمنوں کو قتل کیا۔ اور لشکر کی ایک سمت خالی ہو گئی۔ اور جب دشمن جھاگتے تھے تو حضرت قلب لشکر سے لاجول ولا قوۃ الا باللہ فرماتے ہوئے کنارہ چلے آتے تھے۔ اس مورخ کے موافق جب حضرت دواع آخری کے لیے خیمہ میں تشریف لے گئے تو آپ نے اہل بیت سے وصیت کی کہ اب نزول بلا کے لیے مستعد ہو جاؤ۔ اور جانو کہ خدا تمہاری محافظت کرے گا تمہیں دشمن کے شر سے نجات ملے گی اور تمہاری طاقت بخیر ہوگی۔ تمہارے دشمن عذاب و بلا میں گرفتار ہوں گے۔ شکوہ نہ کرنا، اور کوئی بات ایسی نہ کہنا جو تمہاری منزلت میں قصاص پیدا کرے۔

ابن خلکان کہتا ہے: پھر شمر ذی الجوشن تقریباً دس آدمیوں کو لے کر امام حسین کے خیمہ کی طرف بڑھلے آپ نے فرات کی طرف سے ٹکران کو روکا۔ اور یہ فرمایا: ”تھو جو تجھ پر اگر تم میں دیداری نہیں ہے اور نہ آخر تک ڈرتے ہو تو شرافت کیوں چھوڑے دیتے ہو۔ اپنے لشکریوں کو روکو اور ہمارے اہل و عیال کو ان کی بے ہودگیوں سے بچاؤ۔“ جب کسی نے اس کا کچھ جواب نہ دیا تو آپ ادر سے نکلا اور کھینچ کر بچھڑے دوسری طرف سے شمر نے اپنے پیادوں کو جس میں عبدالرحمن بن جعفر، قثم بن زبیر جعفی، صلح بن وہب زمزی، سنان بن انس نخعی، خلی بن زبید اموی وغیرہ تھے۔ لٹکرا سمجھوں نے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ لیکن آپ جس طرف رخ کرتے تھے جی چراہر کر لوگ ایک دوسرے کے اوپر تھم کے ہل کرتے پڑتے جھاگ کھڑے ہوتے

تھے۔ اور پھر جرئت بلند کر ہر طرف سے گھیر کر دائیں بائیں آگے پیچھے سے بمبوی قوت حملہ آور ہوتے تھے اس اثنا میں جنگ کا زور شور سن کر خیمہ سے زینب (ان کی بہن) "کاش آسمان زمین پر ٹوٹ پڑتا" کہتی ہوئی نکل آئیں۔ اتفاق سے عمرو بن سعد کا سامنا ہو گیا۔ فرمایا: "کیوں ابن سعد؟ ابو عبد اللہ حسینؑ اس بے کسی سے مائے جانیں اور تم دیکھتے رہو"۔ ابن سعد کا دل اس فقرہ سے بھر آیا۔ آنکھیں پر نم ہو گئیں۔ اشک نہ رک سکے۔ دائیں پرچہ قطرے گر پڑے۔ میوڑ ہو کر زینب کی طرف سے چہرہ پھیر لیا۔ امام حسینؑ کمال سرگرمی سے لڑ رہے تھے شیروں کی طرح سواروں پر چھپتے تھے اور پیادوں کی صفوں کو اپنے پر زور حملوں سے الٹ پلٹ دیتے تھے اور بار بار یہ فرماتے تھے: "کیا تم لوگ میرے ہی قتل کے لیے جمع کئے ہو۔ خدا کی قسم میرے قتل کرنے سے اللہ تعالیٰ سخت ناراض ہو گا۔ مجھے پوری امید ہے کہ میرے قتل سے تم کو سرخروئی حاصل نہ ہوگی۔ اور بے شک اللہ تعالیٰ تم سے میرے خون کا ایسا بدلہ لے گا کہ تم کو اس کی خبر تک نہ ہوگی۔ خدا کی قسم اگر تم لوگ مجھے قتل کر ڈالو گے تو تم میں خونریزی کا دروازہ کھل جائے گا اور تم پر اللہ تعالیٰ اپنا عذاب نازل کرے گا۔ تم لوگ ناحق اپنے ہاتھوں کو میرے خون سے نہ رنگو۔ دیکھو میں بے گناہ ہوں۔ میرا قتل کرنا تم کو روانہ نہیں"۔ کوئی شخص اس کا جواب نہ دیتا تھا اور آپ ان کے حملہ سے اپنے کو بچاتے بچتے میدان جنگ میں داؤ مردانگی لے رہے تھے اور تقریباً کل لشکری آپ کے قتل کرنے سے جی چراتے تھے۔ ہر شخص یہ چاہتا تھا کہ دوسرا شخص آپ کو شہید کرے۔

دشمن اپنے سپاہیوں کو نام اور خاندان کا واسطہ دیتے تھے شمر لشکر کا یہ رنگ دیکھ کر چلا کر بولا: "تمہاری مائیں مر جائیں۔

تم لوگ ایک پیادے کو نہیں مار سکتے ہو۔ قت ہے تمہاری مردانگی پر۔ اگر تم لوگ ایک ایک کنکری پھینکو تو حسینؑ دب کر مر جائیں۔ یہ سلطانہ حرکت کر رہے ہیں، ان میں کچھ دم ہلتی نہیں ہے۔ بڑھو اپنے نام و خاندان کو روانہ کرو"۔ لشکریوں کے دل میں اس پر جوش و خروش سے ناحق کوشی کا ایک تابانہ جوش بھر گیا۔ شمشیر بکھٹ ہو کر پیادوں نے ہر طرف سے حملہ کر دیا اور سواروں نے تیر بڑھانے شروع کیے۔ اسی طرح جنگ جو رہی تھی اب قبول اعظم کوئی ابواخونق نے ایک تیر آپ کی پیشانی پر مارا۔ آپ نے وہ تیر نکال کر پھینک دیا۔ خون سے تمام چہرہ اور ریش مبارک تر ہو گئی۔ جھگوڑوں نے تیر بڑھانے شروع کیے۔

امام کا سوال اور دشمن کا جواب آپ ان کے تیر اپنے سینہ پر کھاتے اور فرماتے تھے کہ:

اے بد بخت امت تو نے اپنے پیغمبر کا ذرا پاس نہ کیا اور اس کی اولاد کو قتل کرنے میں بڑی بے باکی سے کام لیا۔ خدا کی قسم اس ذلت کے عوض مجھے درگاہ الہی سے بہت بڑی عزت کی امید ہے اور یہ یقین جانتا ہوں کہ تم ذلیل و خوار ہو گے اور خدا تم سے میرا بدلہ لے گا۔ حسین بن میر اسکوئی نے نکار کر کہا: اے سپر قاطعہ! کس طریق سے اللہ تیرا بدلہ ہم سے لے گا؟ آپ نے فرمایا کہ: "تم میں دشمنی اور عداوت ڈالے گا۔ اور تم آپس میں ایک دوسرے کو مار مار کر مرنے لے گے۔ اس کے بعد وہ تم پر اپنا عذاب نازل فرمائے گا۔"

زخموں کی بوچھاڑ شمر ذی الجوشن نے کہا: تم کیوں دیر لگا رہے ہو۔ یہ شخص زخموں کی کثرت سے بہت ناتواں ہو گیا ہے۔ اور ایک آدمی سے زیادہ بھی نہیں۔ سب مل کر اس پر حملہ کرو۔ سب چار طرف سے ٹوٹ پڑے اور گھیر کر نیزے اور تلواریں مارتے تھے، ایک تلخون ارشد بن شریک نے آپ کے ہاتھ پر

تکوار ماری اور ایک بد بخت عمر بن ضیفہ نے پشت کی جانب ہو کر دوش مبارک پر تکوار لٹائی اور ایک تیسرے شخص نے جسے سنان بن انس بھی کہتے تھے سینہ پر تیر مارا۔ چوتھے بدکار صلیح بن دہب مرنے لے پہلو پر نیزہ رکھا کیلئے امیر المومنین گھوڑے سے گر پڑے اور زمین پر بیٹھ کر

حضرت اپنا خون چہرہ مبارک پر ملتے ہیں

سینہ سے تیر نکلا۔ خون بہ نکلا۔ دونوں ہاتھ ملا کر زخم کے نیچے رکھتے تھے اور جب لپ بھر جاتی تھی تو اپنے منہ اور ریش مقدس پر ملتے تھے اور فرماتے تھے: ”میں اسی طرح چہرہ پر خون لگانے اور دائرہ کو خون سے رنگین کیجیے جو نے اپنے ناناکے پاس جلاؤں گا۔“ عمرو بن سعد نے آپ کا یہ حال دیکھ کر گھوڑا بڑھایا اور سر مبارک کے قریب پہنچ کر اپنی سپاہ سے کہا: ”گھوڑوں سے اتر کر اس کا کام تمام کر دو اور سر تن سے اتار لو۔“ صحن خوشہ منہاں گھوڑے سے اتر کر آگے بڑھا وہ برس کی بیاری میں جتنا تھا حضرت کے قریب پہنچ کر ریش مبارک پکڑ لی اور چاہا کہ سرق سے جدا کرے۔ امام حسینؑ نے کہا تو وہی مبروس کتا ہے جسے میں نے خواب میں دیکھا تھا۔ صبر نے کہا تو میری نسبت ایسا کہتا ہے۔ تکوار نکال کر گولے مبارک پر رگڑنے لگا اور کہنے لگا: ۷

اشعار انی مخضعت سے

اقتلك اليوم و نفسي تعلم علما یقینا لیس فیہ مزعم
ان ابالك خیر من حکلم بعد النبی المصطفیٰ المعظم
اقتلك اليوم و سوف اندم و ان مشاوی مذاب جہم
افض دملک بالتراب بعضیہ و لا لاولاد النبی ارحم

(آج میں تمہیں قتل کر رہا ہوں۔ اور میرا نفس بغیر کسی شبہ کے یہ یقین جانتا ہے کہ تمہارا باپ کل بولنے والوں میں ممتاز ہے نبی مصطفیٰ کے بعد۔ آج میں تمہیں قتل کر رہا ہوں اور محریب مجھے نہ راست ہوگی اور اس کے بعد مذاب جہم جگتنا پڑے گا۔ تمہارا خون زمین پر گرا رہا ہوں اور اولاد نبی پر دم نہیں کرتا)

ہر چہ تکوار کو خوب زور سے رگڑتا تھا مگر وہ کاٹ نہ کرتی تھی۔ عمر سعد نے غصہ ہو کر ایک شخص خلی بن زبید ابھی تلواروں کو جو جانب راست کھڑا تھا کہا تو جاسین کا کام تمام کر۔ خلی نے گھوڑے سے اتر کر فرزند رسول خدا قراۃ العین علی مرتضیٰ اور راحت جان فاطمہ زہرا کا سر مبارک بدن سے علیحدہ کر دیا۔

اٹھنے کی کوشش

مختلیف زخم کھا کر جب حضرتؑ میں گھوڑے پر بیٹھنے کی طاقت نہ رہی اور حضرتؑ زمین پر تشریف لائے اس وقت جب کہ ہر طرف سے دشمن زخم لگا رہے تھے۔ کمال ابن اثیر کے موافق حضرتؑ کبھی کھڑے ہونے کی کوشش کرتے تھے اور کبھی ٹھٹھنے کے بل کھڑے ہو جاتے تھے۔ یہ بھی عموماً مورخین نے لکھا ہے کہ جس وقت حضرتؑ گھوڑے سے گر پڑے اس وقت ایک کم عمر خوبصورت بچہ حضرتؑ کی طرف دوڑا۔ اگرچہ بیسیوں نے روکنا چاہا مگر نہ رکھا۔

اس وقت کوئی بے رحم نامرد حضرتؑ پر تکوار سے حملہ کیا چاہتا تھا کہ یہ بچہ چلا جائے: ”او جہم نصیب ایک بچہ“ ابن خبیشہ کیا میرے چچا کو قتل کرے گا۔ اور اپنے دونوں ہاتھ حسینؑ پر پھیلا دیے۔ تکوار پٹی اور دونوں

چھوٹی چھوٹی کلاں کٹ کر حسینؑ پر گریں اور اس بے گناہ کا خون اصول خیر پر چڑھایا گیا۔ ابھی چالنے کو میں ابھی طرح نہ لیا تھا کہ ایک تیر کا اور بچہ وہیں ٹھنڈا ہوا گیا۔ بچے نے زخم کھا کر داماء کی صدا بلند کی تھی اور حضرت فارسیؑ تھے کہ اسے فرزند صبر کر اس مصیبت پر جو تھم پر نازل ہوئی ہے۔ بائیں پیلو پر منہ لٹک کر زخم کا زخم لگا تھا جس سے آپؑ داہنی ران کی طرف گرے تھے کہ ساتھ ہی خیمہ سے داغادہ سیدہ و امیبتہ کی صدا بلند ہوئی۔ یہ حضرت زینبؑ خاتون کی صدا تھی جو خیمہ سے اپنے فخرم بھائی کی حالت ملاحظہ فرما رہی تھیں۔

اکثر مؤرخین یہی کہتے ہیں کہ خلی بن زیاد ارادہ قتل سے قریب گیا لیکن ہیبت طاری ہوئی اور ہٹ گیا۔ صاحب کشف اللہ فرماتے ہیں کہ چالیس آدمی حضرتؑ کو گھیرے تھے درہ بن شریک، شمر، حسین بن نمیر، ابوالیوب غنوی، نصر بن غرسہ، صلح بن وہب، شبث بن ربعی، سنن بن انس وغیرہم تھے۔ ”اول کس شبث بن ربعی ہاشمیر کشیدہ پیش تاخت سید الشہداءؑ بجانب اوطارے انگندہ شبث بلزید و شمیر از کفش یستلا و بگریخت۔ سنن بن انس کہ مردے مبروس و کوچ بود از شمتا روبرو نے شبث کرد و گفت چرا از قتل حسینؑ دست ہذا دشی۔ گفت چون چشم بکشود ملاحظہ کرد چشم ہائے رسول خدا را محاسبہ کردم اندام بلزید۔ گفت شمیر بن وہ کہ برائے قتل او من شائستہ تر از تو ام۔ تیغ بگرفت و قصد سید الشہداءؑ کرد۔ چون نزدیک شد رعبے عظیم اورا بگرفت و ترسید چنانکہ شمیر از دست او یستلا و بگریخت۔ شمر اورا سرزنش کرد و گفت چرا ترسندہ مردم کہ شما بودہ اید۔ بچہ کس سزاوار تر از من نیست در قتل او و شمیر بگرفت و بر سینہ سید الشہداءؑ بنشست۔ آن حضرتؑ چشم بکشود و بر اوطار انگندہ۔ شمر گفت من ازاں مردم نیستم کہ از قتل تو باز گردم سید الشہداءؑ فرمود تو کیستی گفت من شمر بن ذی الجوشن۔ گفت مرا می شناسی گفت نیکوی شناسم تو حسینؑ پر مئی و ملارت فاطمہ و جدت محمدؐ است۔ آن حضرتؑ فرمود وائے بر تو ہاں شناس کہ تراست چگونہ مرا می کشی۔ گفت تا نذیر مرا بطا و جائزہ گرای ہدارد۔ پس حضرتؑ رادر وائے در انداخت و ہلا و از دہ ضرب سر مبارک آن حضرتؑ را از قفا برید۔ یعنی: سب سے پہلے شبث بن ربعی نے تلوار چھنی، آگے دوڑا۔ سید الشہداءؑ نے اس کی طرف نگاہ ڈالی۔ شبث کاٹھا اور تلوار اس کے ہاتھ سے گر گئی اور بھاگ گیا۔ سنن بن انس نے جو برس زدہ اور کوچ تھا شمتا سے شبث کی طرف منہ کیا اور کہا: قتل حسینؑ سے کیوں ہاتھ کو روکا۔ اس نے کہا: ”جب آپؑ نے آٹکھ کھولی مجھے دیکھا تو مجھے رشوک کی آنکھیں دکھائی دیں۔ میرا بدن لرز گیا۔“ اس نے کہا تلوار مجھے دے کہ اسے قتل کرنے کے لیے میں تجھ سے زیادہ قابل ہوں۔ تلوار لی اور سید الشہداءؑ کا قصد کیا۔ جب قریب ہوا تو بڑے رعب نے اُسے آگیا اور وہ اس طرح سے ڈر گیا کہ تلوار ہاتھ سے گر گئی اور بھاگ کھڑا ہوا۔ شمر نے اسے ڈانٹا اور کہا: تم لوگ کس قدر ڈر پوک ہو۔ اس کے قتل کا فحش سے زیادہ کوئی سزاوار نہیں ہے۔ اس نے تلوار لی اور سید الشہداءؑ کے سینہ پر بیٹھ گیا۔ آنحضرتؑ نے آٹکھ کھولی اور اس پر نگاہ کی۔ شمر بولا: ”میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں کہ تیرے قتل سے باز آجاؤں۔“ سید الشہداءؑ نے فرمایا: ”تو کون ہے۔“ اس نے کہا: ”میں شمر بن ذی الجوشن ہوں۔“ آپؑ نے فرمایا: ”مجھے پہچانتا ہے۔“ اس نے کہا: ”خوب پہچانتا ہوں۔ تو حسینؑ ہے علیؑ کا بیٹا تیری ماں فاطمہؑ اور نانا محمدؐ ہے۔“ آنحضرتؑ نے فرمایا کہ: ”تجھ پر دانے ہو تو اس طرح پہچانتے کے باوجود کس طرح مجھے قتل کرتا ہے۔“ بولا: ”تاکہ نزدیک مجھے بڑا انعام اور عطیہ دے۔“ پس اس نے حضرتؑ کو منہ کے بل گرایا اور بارہ ضروں کے ساتھ آنحضرتؑ کے

سر مبارک کو پس گردن سے جدا کر دیا۔

اس مورخ نے ابو حنیفہ کا خلاصہ ترجمہ کیا ہے۔ اس میں و نیز ابوالحسن اسفرائینی میں اس قدر زیادہ ہے کہ حضرت نے کہا کہ: ”مجھے میرے نانا کی شفاعت زیادہ محبوب ہے، یا زید کا انعام۔“ اور اس نے کہا کہ: ”مجھے تمہارے باپ اور نانا کی شفاعت سے زید کی ایک دھڑی زیادہ پسند ہے۔“ حضرت نے فرمایا کہ: ”اگر تو مجھے قتل ہی کرے گا تو مجھے تمہارا سا پانی دے۔“ اس نے کہا کہ: ”پانی تو نہ پیو گے لیکن موت ایک ایک گھونٹ پیو گے۔“ اے ابن ابی تراب! کیا تمہارا گمان نہیں ہے کہ تمہارے باپ عرض کوثر سے اپنے دوستوں کو سیراب کریں گے؟ اے اے صبر کرو کہ تمہارے باپ تمہیں پانی پلائیں۔“ آپ نے فرمایا: ”ذرا اپنے غم سے دہان بند ہٹا دے کہ میں تیری صورت دیکھوں۔“ پس اس نے ہٹا دیا اور وہ کورچی (مہروس) تھا۔ بھنگا تھا۔ اس کا دہانا کتے کی طرح تھا اور سور کے ایسے ہال تھے۔ دیکھا تو فرمایا کہ: ”میرے نانا رسولؐ نے کچ فرمایا تھا۔“ شمر نے کہا کہ: ”تمہارے نانا رسولؐ نے کیا کہا تھا؟“ فرمایا: ”میرے باپ علیؑ سے کہا تھا کہ: ”اے علیؑ تمہارے فرزند کو وہ قتل کرے گا جو مہروس اور بھنگا ہو گا۔ اس کا غم کتے کا ایسا اور ہال سور کے مانند ہوں گے۔“ شمر نے کہا کہ: ”تمہارے نانا نے مجھے کتے سے تشبیہ دی ہے۔ میں اس کے عوض میں تمہیں پس پشت سے قتل کروں گا۔“

صاحب روضۃ الشہداء لکھتا ہے کہ امام محمد بن اسماعیل بخاری نے لکھا ہے کہ: ”جس وقت حضرت زمین پر تشریف رکھتے تھے کوئی شخص آیا اور اس نے قتل کا ارادہ کیا۔ حضرت نے اس کی طرف دیکھا اور فرمایا کہ: ”تو میرا قاتل نہیں ہے۔ اور مجھے افسوس ہے کہ تو جھٹلنے مذاب ہو۔“ وہ شخص روتا ہوا اور یہ کہتا ہوا داپس ہوا کہ: ”یا ابن رسولؐ! اس حال میں بھی آپؐ کو ہمارا غم ہے۔“ اب یہ اسی تلوار کو جو اس نے قتل حسینؑ کے لیے چھنی تھی گھماتا ہوا عمرو بن سعد کی طرف دوڑا۔ عمرو بن سعد نے پوچھا کہ: ”کیا تو نے حسینؑ کا کام تمام کر دیا۔“ کہا: ”نہیں، اس لیے آ رہا ہوں کہ تیرا کام تمام کر دوں۔“ یہ کہہ کر حملہ کیا۔ لوگ یقیناً میں آگئے اور اُسے زخمی کرنے لگے۔ اس نے آواز دی کہ: ”یا ابن رسولؐ! مجھے آپؐ کی دوستی میں قتل کر رہے ہیں۔ بروز قیامت مجھے اپنے شہدا میں شمار کیجیے گا۔“ حضرت نے جواب دیا اور تسکین دلائی۔

بعض کے نزدیک جب قاتل حضرت کے قریب پہنچا اور حضرت نے آنکھیں کھولیں دریافت فرمایا کہ: ”کون سا وقت ہے۔“ اور جب معلوم ہوا کہ نماز کا وقت تھا تو حضرت نے اس قدر صبر کرنے کو کہا کہ نماز پڑھ لیں۔ لیکن ابھی سجدہ ختم نہیں ہوا تھا کہ نماز سکھالے والے کے فرزند کا وہ گلاٹ گیا جس سے ابھی نماز کے الفاظ تمام نہ پڑھنے تھے۔ (روضۃ الشہداء)



باب یازدہم

بعد شہادت (اہل بیت کوفہ میں)

لشکر نے تکبیر کہی حضرت کا سر مبارک جسم اقدس سے علیحدہ کرنے کے بعد ایک طویل نیزہ پر بلند کیا گیا اور قبول ابی عتف فکبو العسکری لکھتے ہیں: (اور لشکر نے تین مرتبہ تکبیر کہی)

تکبیر اور اشعار ان محبیدوں کو سن کر کسی نے کہا:

و یکدیون اذ قتلتم و انما قتلو بک التکبیر و التہلیل
(آپ کو قتل کر کے تکبیر کہہ رہے ہیں) آپ کو قتل کر کے انہوں نے محبیر اور تہلیل کو قتل کر ڈالا
(یہ شعر دیکھتے ہوئے شاعر سے منسوب ہے)

مورخین وقتی تغیر فطرت کا ذکر کرتے ہیں عموماً مورخین مثل علامہ جلال الدین سیوطی (تاریخ الخلفاء) ابوالحسن اسفرائینی (نور العین فی مشہد الحسنین) ابی عتف،

روضۃ العتقاد وغیرہ وغیرہ اس کا ذکر کرتے ہیں کہ شہادت حسینؑ کے بعد ایک سخت طوفان آیا جو سرفی مائل تھا اور ہر طرف تاریکی سی چھا گئی اور اکثر لوگوں نے یہ گمان کیا کہ خدا نے اپنا غضب نازل کیا یہ طوفان تھوڑی دیر تک قائم رہا۔ (کامل ابن اثیر، اعظم کوئی) بعض نے اس سے زیادہ تغیرات کا ذکر بھی کیا ہے۔

عمر سعد کو مبارکباد اور مقتول کا بیان ابوالحسن اسفرائینی کہتے ہیں کہ: "جلال بن مانع کہتا ہے کہ میں عمرو بن سعد کے پاس کھڑا تھا کہ استے میں

ایک شخص نے پکار کر کہا: "اے امیر مبارک ہو حسینؑ قتل ہو گیا۔" بخدا میں نے کوئی مقتول اس قدر خون آلودہ نہیں دیکھا پھر بھی اس کے چہرہ کا نور، اس کا جلال اور اس کی ہیبت مجھے اس کے حادثہ قتل پر غور نہیں کرنے دیتی تھی۔ پھر ان کے زخموں کا شمار کیا گیا تو معلوم ہوا کہ تلواروں، نیزوں اور تیروں کے ایک سو بیس زخم کھائے تھے۔

قتل حسینؑ کا شور اور سوید بن مطاع کی دوبارہ شہادت لشکر فوج کی خوشیوں میں شور کر رہا تھا کہ سوید بن مطاع نے جو

رہائے حضرت میں سے تھے جنگ کر کے لوگوں کی دانست میں شہید ہو چکے تھے مگر حقیقت حالت غش میں تھے اور زخموں سے چور تھے۔ قتل الحسین کی آواز سن کر یہ اچھل پڑے۔ ان کے پاس ایک چمڑی تھی۔ اسے لے کر کھڑے ہو گئے۔ ایک ساعت تک جنگ کی اور دوبارہ شہید ہو گئے۔ (کامل ابن اثیر)

حسینؑ کا گھوڑا
 جب گردوغبار فرو ہوا تو لوگوں نے دیکھا کہ امام حسین رضی اللہ عنہ کا گھوڑا ہنہاتا اور مقتولین کی لاشوں کو روندتا ایک ایک مقتول کو دیکھتا پھرتا تھا۔ یہاں تک کہ امام حسین رضی اللہ عنہ کے جسم کے پاس آکر کھڑا ہو گیا تو دیکھا کہ سر نہیں ہے۔ وہ اس جسم کے گرد چکر لگاتے لگا اور اس کے خون میں اپنی پیشانی ملنے لگا۔ جب عمر سعد نے یہ حال دیکھا تو لوگوں کو کہا اے ادھر لڑو لوگوں نے اسے پکڑنا چاہا۔ یہ گھوڑا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھوڑوں میں سے تھا اور یہی ہے کہ اس کا نام میمون تھا۔ جب میمون نے لوگوں کو اپنے پیچھے دیکھا تو اس نے دو لتیاں جھڑاتا اور غم سے کھٹا شروع کیا۔ یہاں تک کہ چھیس سوار مار گرائے اور نو گھوڑے ہلاک کر دیے۔ عمر بن سعد نے پکار کر کہا اس کو جانے دو۔ چھوڑ دو دیکھیں کیا کرتا ہے۔ لوگ پیچھے ہٹ گئے تو میمون پھر جسم کے پاس آیا اور اپنا ماتھا زمین پر ملنے اور لاش کو چومنے لگا۔ اور اس زور سے ہنہاتا تھا کہ تمام جنگل گونج اٹھا۔ پھر مرمر کے خیمہ کی طرف گیا۔ (ابی مخنف، اعثم کوفی، نور الحین) جب مستورات نے اس کی آواز سنی تو زینبؓ نے سکیٹھ سے کہا: پانی آگیا۔ چلو پیئیں۔ مستورات باہر نکلیں تو زین خلی ہلا۔ اور گھوڑے کے ہار بار درناک آواز کے ساتھ ہنہانے سے معلوم ہو گیا کہ امام حسین رضی اللہ عنہ شہید ہو گئے۔ تو پھر سب نے رونا چلانا شروع کیا۔ سکیٹھ نے میمون سے مخاطب ہو کر یہ اشعار پڑھے:

حضرت سکیٹھ کے اشعار

فویلک یا میمون فارجع بسرط واخبر عن السبط الشریف ہدی العلا
 دلتے ہو تجھ پر اے میمون۔ جلدی جا اور سبط شریف اور بلند مرتبہ ہادی کی خبر لا
 و ابن حرکت السبط میمون قل لنا و ابن الذی قد کان للخطب جاملہ
 اے میمون ہمیں بتا کہ تو نے سبط رسول کو کہاں چھوڑا۔ وہ کہاں ہے جو مصیبت برداشت کر رہا تھا
 ا میمون تغدر بالمحسین و ما لنا کفیل للحمل الثقیل تجملہ
 اے میمون تو نے حسینؑ سے بے وفائی کی۔ اب ہمارا کفیل کون ہوگا دراصل ایک ہم میں جاری بوجہ اٹھانے کی قوت نہیں ہے
 ا میمون ضیعت المحسین و جنتنا تحمم فی خیامنا ثم تصہلا
 اے میمون تو نے حسینؑ کو کھو دیا اور اب ہنہاتا اور چپٹی ہوا ہمارے خیمہ کی طرف آیا ہے
 ا میمون القیت المحسین حامہ و بین الاعادی فی دماء تجندلا
 اے میمون تو نے حسینؑ کو موت کا پیلا پلا دیا۔ اور وہ دشمنوں میں خون میں لقمے پڑے ہیں
 ا میمون فارجع لا تقیل خطاہنا فا عدت حرجو و دنا و توملا
 اے میمون واپس جا اور کلام کو طول نہ دے۔ اور اب ہم سے محبت کی امید نہ رکھنا
 اخی من حری من بعد فذلک یا اخی بدافع عنا من یصول من الملا
 اے بھائی تیرے کھو جانے کے بعد اب کون ہے جو حملہ کرنے والے دشمنوں کو ہم سے دور کرے
 اخی من ذراہ حامیا و مناصراً لقد هد هذا الیوم عنزی و عطلا
 اے بھائی اب ہم کے اپنا حامی و مددگار ہمیں گم آج کے دن میرا حزم ٹوٹ گیا اور بے کار ہو گیا

حضرت فاطمہ بنت الحسینؑ کے اشعار

اس کے بعد اس مورخ کے موافق فاطمہ بنت الحسینؑ اور ابوحنیفہ کے موافق سکینہ بنت الحسینؑ نے یہ مرثیہ کہا:

مات الفخار و مات الجود و الكرم
آج فوج و کرم مر گیا اور
غاب الحسين فوالحق لغيبته
غائب الحسین فوالحق لغیبیتہ
سین غائب ہوئے انوس ہے ان کی غیبت پر
سین غائب ہوئے انوس ہے ان کی غیبت پر
یا قوم هل من فداء یا قوم هل عوض
یا قوم کیا فدیہ اور عوض ممکن ہے
تقدیه و الله هذا الناس و الامم
تقدیہ و اللہ ہذا الناس و الامم
و اغبر الارض و الافاق و الحرم
و اغبر زمین، دنیا اور حرم پر غبار چھا گیا
و صار یعلو علينا بعده الظلم
و صار علو پر ہم پر ظلم کا بعد

حضرت ام کلثومؑ کے اشعار

دختر امام کے بعد حضرت ام کلثومؑ نے فرمایا:۔

مصیبتی فوق ان ادلی بأشعاری
میری مصیبتیں اس سے بلند ہیں کہ میرے اشعار انھیں ادا کر سکیں یا میرا علم اور فکر اس کا املہ کرے
و ان یحیط بها علی و افکاری
و ان محیط بہا علی و افکاری

حضرت زینبؑ کے اشعار

حضرت زینبؑ خاتون نے فرمایا:۔

لقد حط فینا من زمان نوائبه
ایک زمانہ سے ہمیں زمانہ کی مصیبتوں نے گھیر لیا ہے اور اس کی کج چلیوں اور ناخوشیوں نے ہم کو متحرق کر دیا ہے
و جار طینا الدهر فی ارض غربه
و جار طینا الدهر فی ارض غربہ
پرندہ میں ہم پر زمانہ نے ظلم کیا اور اس کے بھجہ ہم پر مصیبتیں لیے چلے آتے ہیں
ارادوا انی بالقتل عمدا و خبیة
ارادوا انی بالقتل عمدہ و خبیۃ
انھوں نے دیدہ و دانستہ میرے بھائی کے قتل کا ارادہ کیا اور اس کے بعد جو کچھ چھوڑا وہ بھی غم و مصائب ہیں
حسین لقد امسى قتیلا مجذلا
حسینؑ لقد امس قتیلا مجذلا
آج حسینؑ مقتول ہو کر زمین پر گر پڑا ہے۔ اور اللہ کے دین کی راہیں تاریک ہو گئیں
فلم یبق لی دکن الود بظله
فلم یبق لی دکن الود بظلہ
اب میرے لیے کوئی سہارا نہیں ہے جس کے سایہ میں پناہ لوں۔ کون ہے جو زمانہ کا مقابلہ کرے اور اس پر غالب آئے
(اسرافاتی کے نزدیک کوفہ جانے کے وقت لاش حسینؑ پر یہ مرثیہ کہا)

اہل بیتؑ کی حالت

اہل بیتؑ نے جس وقت یہ تمام اشعار سنے اور گھوڑے کا زین خالی پایا اپنے رخساروں پر ٹھنچے مارے۔ اور وا محمدؐ، وا علیؑ، وا حسناؑ اور

وا حسینہؑ کی آوازیں بلند کیں۔ اور کہا: الیوم مات علی المرتضیٰ الیوم مات فاطمہ الزہراء۔ (آج علی مرتضیٰ

نے رحلت کی اور آج کا طمہ زہرا نے انتقال فرمایا

خیمہ سے واپس ہونے کے بعد گھوڑے کے حرکات

عبداللہ بن قیس کہتا ہے کہ میں نے دیکھا گھوڑا حرم کے پاس سے واپس گیا اور مخالفین پر حملہ آور ہوا۔ یہاں تک کہ جسم شریف کے پاس پہنچا تو اس کے قدموں پر اپنا ماتھا ملنے لگا اور ساتھ ہی ہنہاتا جاتا تھا۔ پھر دریائے فرات پر گیا اور غوطہ لگایا۔ (یہی راوی کہتا ہے کہ صفین میں حسینؑ نے ابوالاعور اعلیٰ سے گھٹ چمین لیا تھا اور امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام نے فرمایا: "ولدی هذا یقتل بکسب بلا عطشاناً" (میرا یہ بیٹا کربلا میں پیسا مارا جائے گا) یہ بھی روایت ہے کہ گھوڑے نے اپنی تھوٹی اور پیشانی اس قدر زمین پر ماری کہ وہیں مر گیا۔ قیاس کیا جاسکتا تھا کہ حسینؑ اور ان کریم النفس رہا کے تمام ہوجانے کے بعد جس قدر لاش کی لوٹ

ساتھ دشمنی کے ذخیرہ کا پورا اندازہ نہ ہو سکتا ابھی حسینؑ کی لاش اقدس سرود بھی نہ ہوئی تھی کہ عمامہ مبارک، درع، پانجامہ، جوتا، چادر، کپڑے، نکوار، زرہ لوٹ لی گئی۔ اور خبریں تو یہاں تک ہیں کہ ایک ذلیل شخص انگوٹھی اتار رہا تھا اور جب اتارنے میں تردد ہوا تو اس نے نکوار کے ایک ٹکڑے سے انگلی کاٹ ڈالی اور پھر قبول ابن خلدون: خیمہ کی لوٹ اور کشت زدگی

بقول اعثم کوفی: اب عمر مستورات کے خیموں کے پاس آکر کھڑا ہوا اور فوج کو حکم دیا کہ گھوڑوں سے اتر کر خیموں میں گھس جاؤ۔ جو شے کم یا زیادہ ہاں سب لوٹ لو۔ لشکر والے خیموں میں گھس گئے اور جو چیز بچی اٹھالی۔

عمر بن الحسنؑ کا بستر بیماری اور شمر

شمر نے علی بن الحسنؑ کے خیمہ میں جا کر دیکھا کہ وہ بستر بیماری پر پڑے ہیں نکوار کھینچ کر چلا کہ اخصیں بھی قتل کر دے۔ حمید بن مسلم نے کہا: سبحان اللہ اس بیمار کے قتل سے تو باز آ۔ یہ تو بیمار ہے۔ شمر نے کہا فبید اللہ بن زیاد کے بھی حکم ہے۔ ابن مسلم نے کہا: تم پر افسوس ہے محمد مصطفیٰؐ کو کیا جواب دے گا۔ آخر تو کیا یہ نہیں جانتا کہ یہ پیغمبر کے اہل بیت ہیں۔ شمر ان باتوں سے شرمندہ ہو کر پلٹ گیا۔ علی بن الحسنؑ کے قتل سے باز آیا۔ پھر حکم دیا کہ رسول خدا کے اہل بیت کے خیموں کو آگ لگا دو۔ لوگوں نے آگ لگا کر خالد بن نبوت کو بہاد کر دیا۔

ابو مخنف کہتا ہے کہ جس وقت عورتیں رد رہی تھیں ابن سعد آیا اور بلند آواز سے پکارا کہ دائے تم پر ان خیموں میں جاؤ۔ جو چیزیں ہوں لے لو۔ اور ان خیموں کو اور جو کچھ اس میں ہو آگ لگا دو۔ ان میں سے کسی نے کہا واپس ہو تم پر اسے ابن سعد کی تیرے لیے حسینؑ ان کے اہل بیت اور اصحاب کا قتل کافی نہیں ہوا کہ ان کے بچوں اور عورتوں کو بھی جلا دینے کا حکم دیتا ہے۔ اور تو چاہتا ہے کہ دنیا سے ان کا نام مٹ جائے۔ اس کے بعد لشکر لوٹ کے لیے داخل ہوا۔

حضرت زینبؑ فرماتی ہیں کہ اس وقت ایک ارزق چشم خیمہ میں داخل ہوا اور خیمہ کی چیزیں لوٹنے لگا۔ اس نے علی بن الحسنؑ کی

طرف دیکھا جو کمال پر بہاری کی حالت میں پڑے تھے اس نے وہ کمال کھینچی اور علی بن الحسین زمین پر آ گئے۔ اب وہ بہاری طرف متوجہ ہوا۔ میری چادر چھین لی۔ پھر میرے کانوں میں اس نے گوشوارہ دیکھا (اور دانتوں سے کاٹ کر نکال لیا) جس سے میرا کان کٹ گیا اور خون بہنے لگا۔ پھر اس نے قاطر کے پاؤں میں کڑے دیکھے تو ان کو کھانے کا اور توڑ کر نکال لیا۔ قاطر بلی: ”تو بہاری چیمیز چھین رہا ہے اور روتا بھی ہے۔“ (ابی عصف) اس نے کہا کہ: ”اے ابی سنیث میں تمہاری نصیبت دیکھ کر روتا ہوں۔“

قبیلہ بکر بن وائل کی ایک عورت
حمید بن مسلم کہتا ہے کہ میں نے قبیلہ بکر بن وائل کی قوم سے ایک عورت کو دیکھا جو اپنے شوہر کے ساتھ لکھڑ عمر بن سعد میں تھی جب اس نے دیکھا کہ فوج ٹوٹ پڑی ہے اور حسین کے خیوں اور عورتوں کو لوٹ رہی ہے تو اس نے ایک تلوار لی۔ پھر حضرت کے خیمہ کا رخ کیا اور پھاری کہ: ”اے آل بکر بن وائل! کسپ تم رسول خدا کی لڑکیوں کے کپڑے لوٹتے ہو۔ خدا سے ڈرو۔“ اس وقت اس کے شوہر نے اس کو پکڑ لیا اور لوٹا لے گیا۔ ابن علقمہ کہتا ہے: بعد اس کے عمر بن سعد کے حکم سے دس سواروں نے آپ کے لاشوں کی پیامالی لاش کو گھوڑوں کے سہلوں سے پھال کیا۔

پیامالی کے بعد لاشوں کی حالت
ابی عصف اور کمال کے موافق ابن سعد نے پکارا کہ کون حسین کی لاش رو دیتا ہے۔ اس پر دس سوار آگے بڑھے اور انھوں نے لاشوں کو پھال کیا یہاں تک کہ پشت اور سینہ چور چور ہو گیا۔ ابن زیاد کے دربار میں ان تلخون سواروں نے اسی مضمون کا رجز پڑھا اور کہنے لگے کہ ہم نے لاش حسین پر گھوڑے دوڑائے اس طرح جیسے چکی گیہوں کو ہستی ہے۔ صاحب لہوت کے موافق ابن زیاد نے ان لوگوں کو تمغوزا سا انعام دلوایا۔

سنان بن انس کے اشعار اور اس کا صلہ
کمال ابن اثیر کے موافق سنان بن انس نے عمر بن سعد کے خیمہ کے پاس کڑے جو کر بلند آواز سے پکارا:

املا دکانی فضة و ذهباً انا قتلت الملك المحجبا
میرے لاشوں کو سونے اور چاندی سے بھر دے کہ میں نے ایک غیور بادشاہ کو قتل کیا ہے
و من صلی القبلتین فی الصبی قتلت خیر الناس اما و ابا
و خیرهم اذ یذکرون النسبا

جس نے لوہے میں دو قبلوں کی طرف نماز پڑھی اور اپنے ماں اور باپ کی طرف سے غیر اناس ہے اور وہ اپنے نسب میں سب سے بہتر ہے۔ ابن سعد نے کہا وہ بخون ہے اے میرے پاس لاف۔ جب وہ آیا تو اسے لکڑیاں ماریں۔ اور کہا: اے ہاکل تو جین اٹھا۔ میں کلام کرتا ہے اگر ابن زیاد سن لے گا تو تیری گردن مارے گا۔ بعض کے نزدیک بکر بن مالک نے یہ اشعار ابن زیاد کے سامنے پڑھے اور ابن زیاد نے غصہ جو کر اس کے قتل کرنے کا حکم دیا۔

قبول الی شفت : وجاء خولی والشمر والسنائی الی ابن سہید
ومعهما راس الحسین یغضون بقتله (خولی، شمر اور سنان

قتل کرنے پر فخر کرنے والے

ابن سہد کے پاس آنے اور یہ سب قتل حسینؑ پر فخر کر رہے تھے

دشمن کی بے غیرتی ناخدا ترسی اور خلافت انسانیت مرکبوں کے لحاظ سے اس روایت کے قبول کرنے میں بھی کوئی تردد نہیں ہے کہ ”شام، نیزہ اور تازیانوں سے الہی بیٹ رسالت کا تمام جسم سیلا ہو رہا تھا۔

ابن خلدون کہتا ہے کہ اس واقعہ میں صرف دو شخص عقبہ بن سعلان
آپ کی بیوی رہب بنت امر، اقیس کلبیہ کے آزاد غلام اور

مردوں میں جو بچ رہے تھے

مرق بن شامہ اندی جابنہ ہوئے۔ علی بن الحسین عمران بن حسین اور حسنؑ الہی بیٹ میں باقی رہے۔

اعظم کوئی کہتا ہے : ”امیر المومنین حسینؑ کو شہید کر کے اور سر مبارک ضیاء اللہ کے پاس روانہ کرنے کے بعد وہ
ملکوں اس شب کو کربلا میں رہے۔ دوسرے دن کوفہ کی طرف پلٹے۔ الہی بیٹ رسول خدا کو ہمراہ لیا۔“

ابن خلدون کہتا ہے : عمر بن سہد نے اپنے ہمراہیوں کو جمع کر کے نماز جنازہ پڑھی اور دفن کر کے راہی کوفہ ہوا۔
دوسرے دن بنو اسد فاضریہ سے آئے اور انھوں نے امام حسینؑ اور ان کے ہمراہیوں کو دفن کیا۔ امام حسینؑ کا سر مبارک مع
آپ کے ہمراہیوں کے خولی بن زبید و حمید بن مسلم اندی کے ہمراہ ابن زیاد کے پاس روانہ کیا گیا۔ رات ہو گئی تھی
قصر لمارت کا دروازہ بند ہو گیا تھا۔ پھر ہو کر خولی سر مبارک لیے ہوئے واپس آیا۔ (قبول کامل : چوٹے میں رکھ دیا۔ اور
لبابی سے کہا کہ ایسی چیز لایا ہوں کہ عمر بھر کے لیے بے پرواہ ہو جائے گا۔ اس کی لبابی نے کہا کہ لوگ سونا اور چاندی
لائے ہیں اور تو حسینؑ کا سر لایا ہے۔ پھر اب میں اور تو ایک جگہ جمع نہ ہوں گے) (معاذ اللہ) یہاں زیاد کی خدمت میں
حاضر ہوا۔ بعضوں کا یہ خیال ہے کہ شمر و قیس بن الاشعث و عمر بن اکھامہ و عروہ بن قیس سر لے کر گئے تھے۔
کشت اللہ میں ہے کہ : ”بعد از دعا گئی عمر سعد اہل قریہ فاضریہ اجساد شہداء دفن کردند۔“

یہی مورخ اس کے قبل کہتا ہے جس کا خلاصہ ہے کہ ابن سہد نے سر مبارک کو پہلے ابن زیاد کے پاس بھیج دیا۔ دیگر
شہداء کے سر کو قوم پر تقسیم کیا کہ وہ ابن زیاد سے جائزہ طلب کریں۔ اور قریب حاصل کریں۔ قبیلہ کنذہ (قیس بن اشعث کنذی)
ہوازن (شمر) بنی تمیم، بنی اسد، بنی مذحج اور کچھ دیگر قبائل پر تقسیم کیے گئے۔ ماضورہ کے بشتیہ دن اور گیارہ سو کی دو پہر تک
اپنے کشتے دفن کیے۔ نماز پڑھی، اور جسد ہائے شہداء کو یوں ہی ترک کر دیا۔ خیمہ میں آگ لادی کہ سیلیں باہر نکل آئیں اور
مقتل کی طرف دوڑ کر شہداء کی لاشیں گود میں اٹھالیں اور زار زار رونا شروع کیا۔ ابن سہد نے حکم دیا کہ سیلیوں کو بے جیر لاشوں
سے دور کرو۔ اس کے بعد انھیں بے مقصد مکشوف الوجہ بے ہودج کے لاشوں پر سوار کیا۔ سجدہ ٹھوکر کے گداز مبارک میں
طوق ڈال دیا۔ اور چونکہ یہودی سے بہت منعیت تھے ان کے دونوں پاؤں کو اوٹ کے پیٹ میں باندھ دیا کہ گرنہ جائیں۔
کامل ابن اثیر کے موافق : حضرت زینبؑ خاتون کے بین پر دوست دشمن سب روتے تھے۔ (ایضاً مشیر الاعمران)
ابو الی اسرانی کے نزدیک جب حضرت زینبؑ نے سنا کہ اب ابن زیاد کی طرف جانا ہو گا تو ابن سہد سے کہا کہ
حسینؑ کا جسم تو دکھلاؤ اور مقتل میں پہنچ کر سیلیوں نے مرثیے کہے۔ اس کے بعد راوی کہتا ہے کہ زینبؑ سر پر ہاتھ رکھ کر

کچھ قسین یا عجمی لڑکیاں دیکھے حسین رضی اللہ عنہ اس غصہ و سریدہ کر بلا میں پڑے ہیں۔ آپ کی سیٹیاں قید ہو گئیں۔۔۔ پھر انہوں نے امام حسینؑ کی چھوٹی بیٹی فاطمہؑ کا ہاتھ پکڑا جو امام رضی اللہ عنہ کو بڑی پیاری تھی۔ اور اس کے چہرہ اور ہاتھوں کو اس کے باپ کے گلے پر لٹا شروع کیا۔ فاطمہ رضی اللہ عنہا رو رو کر کہتی ہیں: ”یہاں ابا! میں بلاتی ہوں تم جواب کیوں نہیں دیتے؟“
راوی کہتا ہے کہ اس کے بعد ابن سعد نے حکم دیا کہ عورتوں کو جبراً لاش سے ہٹا دیا جائے۔ پھر ان کو برہنہ سر اور بے جلب اوٹھوں پر سوار کیا گیا۔ جن پر خلی پالان پڑی تھی۔ اور دشمنوں میں ان کی سواریاں اس طرح جاری تھیں جس طرح رومی کنیزوں کی سواریاں ہوتی ہیں۔

حضرت عباد کی زبانی ایک حالت
ناخ اخواریخ کے موافق حضرت سید منجھو فرماتے ہیں کہ باپ اور اعزا کو شہید اور خون میں لٹھا ہوا اور ماں بہنوں کو اسیر دیکھ کر میرا سینہ ٹگی کرنے لگا اور قریب تھا کہ روح پرواز کر جائے کہ چھوٹی زینبؑ نے دیکھا اور فرمایا کہ اے میرے بزرگوں کے بادگار میں تجھے کس حالت میں دیکھ رہی ہوں۔ کیا تیرا ارادہ ہے کہ دنیا سے گزر جائے۔ حضرت منجھو نے فرمایا اے چھوٹی کیونکر میری یہ حالت نہ ہو کہ میرے سب اعزا مارے گئے اور وہ برہنہ تن اور بے کفن پڑے ہیں۔ فرمایا قسم ہے خدا کی کہ تیرے بزرگوں سے اس کا عہد لیا گیا تھا۔

ابن زیاد اور حضرت کا سر مبارک
ابن زلدون کہتا ہے: ابن زیاد نے دربار عام کیا۔ شہدائے کربلا کے سر طشتوں میں رکھ کر پیش کیے گئے۔ ابن زیاد کے ہاتھ میں ایک بیہ کی چھڑی تھی ہار ہار دندان امام پر ہار رہا تھا۔ زید بن ارقم سے ضبط نہ ہو سکا چلا کر بولے: اے ابن زیاد! اس چھڑی کو ان دانتوں پر نہ مار۔ خدا کی قسم میں نے ہار ہا دیکھا ہے کہ رسول ﷺ کے لہانے مبارک ان دانتوں اور لبوں کو پسہ دیا کرتے تھے۔ ابن زیاد نے کہا: خدا تجھے ہمیشہ زلائے اگر تو بڑا طاقتور العقل نہ ہوتا تو ابھی تیری گردن مارنے کا حکم دیتا۔ زید بن ارقم یہ کہتے ہوئے مجلس سے باہر آئے۔ اے گروہِ عرب تم لوگ سخت ملاق ہو کہ ابن فاطمہؑ کو شہید کر کے ابن مرجمانہ کو لپٹا حاکم بنایا جو اخیراً د مظلما امت کو قتل کر رہا ہے اور شریر فتنہ انگیزوں کو خلعت دیتا ہے۔ افسوس کی بات ہے کہ تم لوگ ذلت و رسوائی پر راضی ہو گئے۔ تعہد ہوا کہ جو اس ذلت و رسوائی پر راضی ہو۔ اس کے دوسرے دن عمر بن سعد اہل بیتؑ امام کو ہا بزنجیر لیے ہوئے آٹھنچا جس میں علی بن الحسینؑ بھی تھے۔

زید بن ارقم کا ابن زیاد سے خطاب
صاحب موافق موقہ زید بن ارقم کے اس خطاب کے بعد اس قدر اور بڑھاتے ہیں کہ انہوں نے کہا کہ اے ابن زیاد میں کچھ اور کہتا ہوں جس سے تیرا غصہ بڑھے گا اور وہ یہ ہے کہ میں نے رسول خدا کو دیکھا کہ حق کو داہنے اور حسینؑ کو بائیں زانو پر بٹھاتے تھے اور اپنے دست مبارک کو دونوں کے سروں پر رکھ کر فرمایا ہے تھے کہ: ”بار الہا میں نے انہیں تجھے اور مومنین صلح کے سپرد کیا۔“ تو اے ابن زیاد دیکھ کہ رسولؐ کی حدیث اور امت تیرے پاس کس طرح ہے (اس کا راوی ابن ابی دینار ہے) اس کے قبل کی سطر میں لکھا ہے کہ: ”روایت کردہ کہ چوں سر حسینؑ خود ابن زیاد آوردند آن را در طشتی نہاد و چہ در دست داشت دندان مبارک او را چپ میزد و بجنب میگردانید و او را در بینی

اودی گفت نیکو رونے مثل این نہ دیدہ ام چہ دندان نیکو دلد انس خود اوسا عمر بودو گر یہ کردو گفت حسین شہید حسین مردم است بر محل اللہ صلی اللہ علیہ وسلم روایت کیا کہ جب سر حسین ابن زیاد کے پاس لایا گیا طشت میں رکھا یا ہاتھ میں چڑی تھی، جسے دندان مبارک پر مارا تا اور ناک مبارک میں گھسنے سے پھراتا اور کہتا تھا اتنا خوبصورت چہرہ نہیں دیکھا کتے خوبصورت دانت ہیں۔ انس موجود تھا وہ رویا اور بلا حسین رسول اللہ کے ساتھ تمام لوگوں سے زیادہ مشابہ تھے۔ (اس کے بعد ابن دینار سے زید بن ارقم کی روایت ہے)

حسین کا سر اہل بیت کے قافلہ کے آگے رکھا گیا
مؤرخین نے لکھا ہے کہ جب اہل بیت کا قافلہ کوفہ پہنچا تو ابن زیاد نے حریت کا سر مبارک بھیج دیا کہ اس قافلہ کے ساتھ لاؤ۔

صاحب کشف اللغۃ کے موافق ابن زیاد نے دس ہزار سپاہیوں کو شہر کی ماحکمت کے لیے مقرر کیا تھا کہ مبادا شیعہ یا علی جوش میں نہ آئیں۔ اور حکم دیا تھا کہ کوئی شخص ہتھیار لے کر نہ نکلے۔ صاحب نور العین کہتے ہیں: مسلم سنا کہتا ہے کہ میں اس روز ابن زیاد کے گھر آگے کا کام کرنے کے لیے بلایا گیا تھا میں اپنے کام میں مشغول تھا کہ اس اثنا میں کوفہ کے ایک جانب سے شور و غوغا سنائی دیا۔ میں نے ایک غلام سے پوچھا: کیا ہے؟ اس نے کہا: ”ایک باغی کاسرا آ رہا ہے“ میں نے پوچھا اس کا نام کیا ہے۔ وہ بولا: ”حسین“۔ میں یہ سنتے ہی اس سے پرے ہٹ گیا اور ہاتھ اور فتح اور ہاتھوں دھو کر حمامہ اور کپڑے پہن کر محل سے نکلا تو میری نگاہ سر پر پڑی اور میں زار و قطار رونے لگا۔ اہل کوفہ کو میں نے دیکھا کہ عید مناتے تھے اور اچھے اچھے لباس زیب تن کیے تھے امام حسین رضی اللہ عنہ کے سر کے قطر تھے اتنے میں ادھوں کی قطاریں شہر میں داخل ہوئیں۔ جن پر امام حسین رضی اللہ عنہ کے حرم سوار تھے۔ زین العابدین ایک اونٹ پر سوار تھے۔ اچھی دھمکڑ پر تھے۔ ان لوگوں کی رائیں خون آلود ہو رہی تھیں۔ جب امام زین العابدین نے اہل کوفہ کو امام حسین رضی اللہ عنہ کے سر کا قطر دیکھا تو بیت رونے لگا۔

راوی کہتا ہے کہ اس وقت کوفہ والے اہل بیت کے بچوں کو روٹیاں دینے لگے تو ام کلثوم رضی اللہ عنہا نے چاکر کہا: اے اہل کوفہ پتھروں کے لائق ہے اس شخص کا سر جو ہم کو مدد دے۔ پھر انھوں نے ان لوگوں کی دی ہوئی روٹیاں لے کر انھیں کی طرف پھینک دیں۔ اس وقت ان کو دیکھ کر لوگ زار و قطار روتے تھے اور شور و شبن سے حشر مہا تھا۔ ام کلثوم نے ان کو دیکھ کر کہا ہماری طرف کوئی نہ دیکھے۔ جو پردہ نشین عورتیں محلات پر سے اس دردناک سین کو دیکھ رہی تھیں وہ اس بات کو سن کر بے تابانہ رونے لگیں۔ ام کلثوم نے کہا اے کچھ تو تمہارے مدد تو ہم کو قتل کرتے ہیں، تم ہمارے حق میں رو رہی ہو۔ واللہ دنیا میں ہم کو اس لیے فتح حاصل نہیں ہوئی کہ آخرت کی فحشیں ہم کو میسر ہوں۔ کم بہت تم لوگ جانتے ہو کہ کن لوگوں کے خون تم نے بہائے ہیں اور کن لوگوں کو تم نے متحج کیا ہے؟

اسیرانِ آلِ محمد
صاحب لہوت فرماتے ہیں: راوی کہتا ہے کہ ایک عورت کو علیہ اپنے کٹھے سے جھانکی اور پوچھا کہ: ”تم کون ہو کیسے قیدی ہو تو ان اسیروں نے جواب دیا کہ: ”ہم قیدی اہل محمد ہیں۔“ اس گھڑی وہ عورت اپنے چہرے سے اتری اور ان بے چاروں کے لیے چاروں پہانچے، روٹیاں اور مٹھوں کو جمع کیے

اور لاکر دیا اس وقت ان اسیروں نے اسے لے کر ہلاک (اینا مشیر الاحزان)

ابلی غنٹ کہتا ہے کہ ابوہریرہ اسدی سے روایت ہے کہ زمانہ قبلِ حسینؑ میں میں کوفہ میں تھا میں نے کوفہ کی عورتوں کو چاک گریبان ہال پریشان دیکھا جن کے رخساروں پر لمبوں کے نشان تھے میں ایک بوڑھے کے پاس گیا اور پوچھا کہ یہ شور وغل اور گریہ و زاری کس بات کی ہے اس نے کہا کہ: ”یہ حسینؑ کے سر کی آمد کی وجہ سے ہے۔“ اتنے میں لشکر اکھنڈ اور اس کے ساتھ کچھ اسرائیلی تھے پس میں نے ایک کنسیز کو دیکھا جو بغیر محل کے اوٹ پر بیٹھی تھی پس میں نے اس سے حال پوچھا اس نے کہا: ”یہ ام کلثومؑ کی بہن ہیں۔“ میں نے ان سے کہا کہ اپنا علاوہ بیان سننا یہ انہوں نے فرمایا کہ: ”تو کون شخص ہے۔“ میں نے کہا میں بسرہ کا ایک آدمی ہوں انہوں نے فرمایا کہ: ”ہم لوگ خیمہ میں تھے کہ گھوڑے کے ہنہانے کی آواز سنی جب ہم باہر نکلے تو دیکھا کہ گھوڑا اٹل ہے۔ اس وقت ہم لوگ رونے لگے اور ہمارے ساتھ اور عورتیں بھی رونے لگیں۔ اس وقت ہم نے کسی کو ایک موشہ پڑھتے سنا لیکن دیکھا نہیں۔“

امام زین العابدینؑ کے اشعار
دیے جن کی زبان خون آلود تھی اور وہ کہہ رہے تھے: ۷۷

تسبیحنا علی الاقطاب طوبیہ کاندنا لم نشید فیکم دینا
تم لوگ ہیں برہنہ پالانوں پر اس طرح لیے جاتے ہو کہ گھبراہٹ میں تمہارے لیے کسی دین کو مستحکم ہی نہیں کیا تھا
دوسرا شعر: تم ہمارے مصائب پر خوشی سے تالیاں بجا رہے ہو۔ دل ہو تم پر کیا رسول اللہ ہمارے بدنہ تھے؟
حضرت ام کلثومؑ نے جس وقت اپنے بھائی کا سر دیکھا تو
گریبان چاک کیا اور سنسایا: ۷۸

ما ذا تقولون اذ قال النبی لکم ما ذا فعلکم و انکم آخر الامم
تم لوگ کیا کہو گے جب نبی تم سے پوچھیں گے کہ تم تو آخر الامم تھے تم نے کیا کیا
بجھتی و باہلی بعد مفتقدی منہم اساری و منہم ضررجا بدم
میرے اہل اور حرمت کے ساتھ بد میرے وہ قہقی بٹانے گئے ہیں اور ان سے خون ٹپک رہا ہے
ما کان هذا جزائی اذ نصحت لکم ان تخلقونی بسوء فی ذوی رحمی
کیا میری نصیحتوں کا یہ بدلہ ہے کہ تم میرے اہل بیتؑ سے اس طرح مخالفت کرو
اس مؤرخ کے موافق بھی جب اہل کوفہ نے یحییٰ کو فرے دینے
چاہے تو حضرت ام کلثومؑ نے چلا کر فرمایا: ”یا اهل الکوفۃ
الصدقة علینا حرام۔“ اے اہل کوفہ صدقہ ہم لوگوں پر حرام ہے۔ اور یہ فرما کر اسے زمین کی طرف پھینک دیا۔

ایک راوی اور اہل بیتؑ کا کوفہ میں داخلہ
سہل شہر زوری کہتا ہے کہ میں اس زمانہ میں مدینہ سے
کوفہ آیا۔ میں نے دیکھا کہ بازار سی سونی پڑی ہیں اور
دکانوں میں قفل دیے ہیں اور لوگ کچھ روپے ہیں اور کچھ ہنس رہے ہیں۔ میں ایک شخص کے پاس گیا اور اس سے کہا کہ

یہ کیا بجا ہے کہ کچھ لوگ روتے ہیں اور کچھ لوگ نہیں ہیں۔ اگر تو پہانتا ہو تو مطلق کر یہ سن کر وہ شخص زور سے رونے لگے اور کہنے لگا: لے شیخ کوئی عید تو نہیں ہے لیکن رونا وہ دود لشکروں کی وجہ سے ہے جس میں ایک فتح یاب ہوا اور دوسرا مقتول ہوا۔ میں نے کہا وہ کون سے دود لشکر تھے۔ اس نے کہا: حسین کا لشکر بہاد اور ابن زیاد کا لشکر فتح یاب ہوا۔ یہ کہہ کر رويا اور اشعار پڑھے۔ اس کے بعد جبل بچنے لگے اور فوجی نشان ظاہر ہونے اور لشکر کوفہ میں داخل ہوا۔ اس وقت بڑا شور و غل ہوا۔ اور حسین کا سر دکھائی دیا۔ جس سے فوراً سطح تھا یہ دیکھ کر غم پر عبرت طاری ہوئی۔ اس کے بعد قیدی دکھائی دیے جن کے بعد علی بن الحسین تھے۔ ان کے بعد حضرت ام کلثوم تھیں۔ اور وہ آواز دے رہی تھیں کہ اسے اہل کوفہ ہماری طرف سے اپنی آنکھیں بند کر لو۔ کیا تمہیں خدا اور ان کے رسول کا خوف نہیں ہے کہ تم رسول اللہ کے حرم کی طرف نگاہ اٹھاؤ۔

صاحب رسالہ ”غیم حسین“ فرماتے ہیں: باطل نے اپنی کتب البیان والتبیین میں ابی اسحاق اور انھوں نے فریخت الاسدی سے روایت کی ہے کہ وہ فرماتے ہیں ہم لوگ کوفہ میں (جب کہ علی بن حسین بن علی (امام زین العابدین) رضی اللہ عنہما کا قاتل کر بلا سے ابن زیاد کے پاس چلا آسکتا تھا) داخل ہوئے۔ میں نے سنا کہ کوفہ کو دیکھا کہ چاک گریبان، مغموم (غم رسیدہ) قاتل کے استقبال کے لیے (کھڑی ہیں) (اور تمام کوئی موجود ہیں) امام زین العابدین علیہ السلام نے جو شدت مرض سے بالکل نحیف اور بہت ہی لاغر ہو رہے تھے بھی آواز سے فرمایا: اهل الكوفة انکم تبکون حلینا فنحن قتلنا غیوکم (ترجمہ) اے اہل کوفہ! تم لوگ ہم کو رو دتے ہو؟ تمہارے سوا کس نے ہم لوگوں کو قتل کیا؟

حضرت زینبؓ کے خطبہ کے متعلق ایک راوی

اور میں نے زینبؓ بنت علی کرم اللہ وجہہ الشریف کو دیکھا اور اللہ میں نے ان سے بڑھ کر کسی پردہ نشین عورت کو ایسا فصیح و بلیغ بولنے والی نہیں دیکھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ امیر المومنین کی زبان ان کے فم میں ہے۔ آپ نے لوگوں کو اشارہ کیا کہ چپ رہو۔ چپ رہو۔ بھائی اللہ کیا ارشاد تھا کہ ہر طرف سکوت طاری ہو گیا۔ گویا سانس تک بند ہو گئی اور اداشوں کے گھٹٹ وغیرہ بیکار ہو گئے۔ آپ نے حمد و نعت کے بعد فرمایا: (علیہم) وہ راوی کہتے ہیں کہ پھر غلط آگے بڑھا اور لوگ حیرت زدہ اور تعجب سے فم پر ہاتھ رکھے تھے اور میں نے ایک بڑے آدمی کو دیکھا کہ حضرت زینبؓ کے قریب ہی کھڑے تھے اور اس قدر روتے تھے کہ ان کی دائری تر ہو گئی تھی۔ پھر انہوں نے حضرت زینبؓ سے یہ کہا: کھولکم خیر الکھول و شبابکم خیر الشبَاب و نسلکم لا یبورو لا یفوزو ابداً۔ غالباً یہ بزرگ زید بن ارقم صحابی رضی اللہ عنہ ہوں گے جو امیر المومنین علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے یارِ ان بانِ اختصاص سے تھے۔ حضرت زینبؓ خاتون کا خطبہ نہ صرف صاحب غم حسینؑ نے نقل فرمایا ہے بلکہ وہ یادگار خطبہ علامہ مجلسی علیہ الرحمۃ، صاحب لہوف، صاحب مشیر الاحزان، اور تاریخ التواریخ نے بھی نقل کیا ہے۔ ابواسحاق نے اختصار کیا ہے۔ اور اس آخر الذکر مؤرخ نے حضرت زینبؓ کے متعلق بشیر اسدی سے روایت کی ہے کہ: میں نے حضرت علی کی بیٹی زینبؓ کو دیکھا وہ بالکل اپنے باپ کے مشابہ تھیں۔ میں نے دیکھا کہ انہوں نے لوگوں کو چپ رہنے کا اشارہ کیا۔ لوگ خاموش ہو گئے تو انہوں نے کہا۔۔۔

لہوت، ہمارے اور نافع التواریخ میں حضرت زینب کے خطبہ کے بعد حضرت فاطمہ مغری، حضرت ام کلثوم اور حضرت

امام زین العابدین علیہ السلام کا خطبہ بھی لکھا ہے۔ صاحب لہوت کی اصل عبارت یہ ہے: "وروی زید بن موسیٰ قال حدثنی ابی عن جدی قال خطبت فاطمة الصغریٰ بعد ان وردت من کربلا۔ اس کا ترجمہ کیا گیا ہے کہ: "زید بن موسیٰ کاظم منسبتے ہیں کہ: "مجھ سے میرے باپ نے اور ان سے میرے دادا نے روایت کی ہے کہ کربلا سے لوٹ کر کے جناب فاطمہؑ مغرانے یہ خطبہ پڑھا۔" بار کا ترجمہ ہے کہ: "حضرت فاطمہؑ مغشریٰ نے بعد مراجعت کربلا سے۔۔۔" "کربلا سے لوٹ کر" یا "بعد مراجعت کربلا سے" یا "بعد ورودت من کربلا" کا مفہوم سمجھنے سے میں اپنے کو قاصر رہا ہوں۔ اگر اس کا مطلب ہے کہ جس وقت کربلا سے کوچ ہو رہا تھا اس وقت سے اس وقت تک جب کہ کوفہ پہنچے تو اس میں ایک دشواری یہ ہوتی ہے کہ حضرت فاطمہؑ مغشریٰ کے خطبہ کا موقع اور مخاطب "اہل کوفہ" معلوم ہوتے ہیں نہ کہ وہ کوئی جو لشکر ان زیلوں کے ساتھ تھے اور اگر اس کا انشا یہ ہے کہ کوفہ کے لوگوں سے کوفہ میں خطبہ تھا تو "بعد ورودت من کربلا" کے سمجھنے اور کہنے کی کوئی ضرورت نہ تھی وہ تو حضرت زینبؑ کے خطبہ کے سلسلہ میں تھا ہی جو کوفہ میں ہوا۔ اس کے لیے ابن غماطیہ رحمہ کا طرز بیان مناسب ہوتا کہ حضرت زینبؑ کے خطبہ کے بعد منسبتے ہیں: "و خطبت فاطمة الصغریٰ فقالت۔۔۔" اس سے بعد ورود کربلا کا ابہام ہائی نہیں رہتا اور کم سے کم ایک شبہ صاف ہوتا ہے۔ بہر حال میں اسے اس عقین کے ساتھ نہیں لکھ رہا ہوں کہ مجھے اس کے موقع اور شخص کا عقین ہے بلکہ اس لیے کہ خطبہ کے واقعات وہ ہیں جو کبھی کسی نے ظہر کیے ہوں اور وہ واقعات قابل انکار نہیں ہیں۔ اس خطبہ کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ یہ سب میں زیادہ طویل ہے۔ دوسری خصوصیت یہ ہے کہ یہ ایک چھوٹی سی صاحبزادی نے کہا ہے۔ جن کے اختلاف نے سن کی بنا پر خطبہ کے مذکورہ واقعات کا کھن اور ترتیب قابل لحاظ ہو سکتا ہے۔ میں اس کو اسی سلسلہ میں اس لیے لکھتا ہوں کہ مجھے اس موقع کے متعلق نہ کہے جانے کا عقین بھی نہ کرنا چاہیے اس استہار اور شبہ کی درمیانی حالت کے لحاظ سے محض شبہ اس کا متفق نہیں ہے کہ میں اسے درج نہ کروں۔ (یہ بھی کہہ دوں کہ تحقیق مؤرخین کے اختلاف میں یوچہ قرات یا بعض الفاظ کے کمی بیشی کے کوئی اختلاف نہیں ہے) یہ خطبات میں لہوت سے لوٹ کرتا ہوں۔ جناب زینبؑ علیا مقام نے فرمایا:

"بہترین مرد خدا نے قادر کے لیے ہے اور بہتر سے بہتر درود و سلام محمد رسول اللہ اور ان کی آل پاک اور بزرگ پر ہے۔ آگاہ ہوا ہے اہل کوفہ اسے اہل غدر و کرباب تم روتے ہو تمہارے آنسو نہ تمہیں۔ تمہارا رونا چلانا بند نہ ہو۔ تمہاری مثال اس عورت کی سی ہے کہ جس نے اپنا سوت کٹ کر اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے ہوں۔ تم اپنے جہدوں میں ایک جملہ بناتے ہو۔ آگاہ ہو کہ تم میں نہیں ہیں مگر ایسے لوگ کہ جو بے ہودہ اور رذیل ہیں۔ تم میں ایسے سینے ہیں کہ جن میں کپٹے مبرے ہوتے ہیں۔ وہ لونڈیوں کی طرح خوشامدی ہیں۔ دشمنوں کے مثل کینہ در ہیں۔ تم کینہ پلہ میں اس سبزی کی صورت ہو کہ جو نہایت پرانے تم اس قبر کی صورت بے فائدہ اور بے حاصل ہو کہ جو چاندی سے آراستہ کی گئی ہے۔ تمہارے نفسوں نے برے اعمال پیش کیے کہ جس کی وجہ سے تم قہر و غضب و مذاہب الہی اور جہنم میں داخل ہونے کے متقی ہونے ہو۔ اب روتے چلاتے ہو۔ بخدا تے تو انات تم بہت رذو اور کم ہنسو گے کہ عار و ننگ و بے شری و عیب امت تم لے حاصل کیے ہیں۔ وہ تم سے ہرگز ہرگز جدا نہیں ہو سکتے۔ پس تم کیونکر نہایت پاسکتے ہو اور کیونکر

ہاں کہہ سکتے ہو کہ تم نے سلاطین خاتم الانبیاء سردار جوانان بہشت، جلاوطنانے ہوکاران، وجائے چاہا اہل غمیت، و ستونِ مجتہد خدا اور اپنے راہ نما کو قتل کر ڈالا ہے۔ براذخیوں نے چلے جو تم رحمت حق سے دور ہو۔ اصل تو یہ ہے کہ تمہاری کوششیں بے جا اور سنی بے فائدہ ہوئی۔ اعمال تمہارے برے ہوئے۔ تم نے اپنی جانوں کو ہلاک کیا۔ تمہارے کمال میں نقصان آیا۔ تمہاری کفایت میں ٹوٹا ہوا۔ تم جنگلے ذلت و خواری و موردِ قہر و غضب الہی ہوئے۔ اسے اہل کفر! تم پر دانے ہو کہ کیا تم نے پیغمبر خدا کا جگر کاٹا ہے۔ کسی اپنی صداقت جناب رسالتِ ملک سے تم نے ظاہر کی ہے۔ جب طرح کا خون تم نے بہایا ہے اور حرمت و آبرو ضائع کی ہے۔ ان کے کیسے پیارے فرزند کو قتل کیا ہے۔ واقعی تم نے بڑے امرِ عظیم کا ارتکاب کیا ہے۔ جب نہیں ہے کہ آسمان چٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے۔ اور زمین چٹ جائے اور پہاڑ ہاش ہاش ہو جائیں۔ بروایت دیگر یہ فرمایا: تم نے ایک بڑی آفت اور ملامتِ عظیم برپا کیا کہ اس سے فتنائے آسمان و زمین تنگ ہو گئی۔ اس امر سے تعجب کرتے ہو کہ آسمان خونِ روبا آگاہ ہو کہ عذابِ آخرت زیادہ رسوا کرنے والا ہے اور اس دن کئی مصیبت و دردگار نہ ہوگا۔ اس شہادتِ چند روزہ پر گھمٹ نہ کرو، مغرور نہ ہو۔ ہاں بالیقہ بدلہ لیا جائے گا اور یہ خونِ پائمال اور ضائع نہ ہوگا۔ عذابِ خدا تمہارے سروں پر ہے۔

راوی کہتا ہے کہ میں نے دیکھا کہ سب لوگ اس دن حیران و مبہوت ہو گئے۔ اپنے ہاتھوں کو منہ پر رکھنے لگے۔ دھتے تھے۔ میں نے (ایک) بوٹے آدمی کو دیکھا کہ جو میرے برابر کھڑا تھا اور ایسا رو رہا تھا کہ اس کی داڑھی آنکھوں سے تر ہو گئی تھی۔ وہ کہتا تھا کہ میرے ماں باپ تم پر خدا ہوں۔ تمہارے بزرگ بہترین بزرگان ہیں۔ جو ان تمہارے بہترین جوانان ہیں۔ عورتیں تمہاری بہترین عورت اور نسل تمہاری بہترین نسل ہے۔ کبھی تمہاری نسل رسوا اور خفیہ نہ ہوگی نہ ذلیل ہوگا۔ حضرت فاطمہؑ صغریٰ نے فرمایا: خدا نے تو ان کے لیے بے حد دہلیاں شکر ہے۔ اور اس قدر سپاس ہے کہ

حضرت فاطمہؑ صغریٰ کا خطبہ اور اثر

جس قدر زمین و عرش کے درمیان چیزیں ہیں۔ خدا کا حکم ادا کرتی ہوں اور اس پر توکل و سوا و تعین و اعتقاد رکھتی ہوں۔ اس کی وحدانیت اور جنابِ رسولِ خدا کی رسالت پر گواہی دیتی ہوں اور اس بات پر گواہی دیتی ہوں کہ ان کی بلا و اہل کو اشیائے امت نے ناحق قتل کر ڈالا۔ اوقات کے کنارے۔ حالانکہ وہ کسی سے بغض و عداوت نہیں رکھتے تھے۔ نہ کسی کا خون بہایا تھا۔ خدا سے پناہ مانگتی ہوں۔ اس بات سے کہ اسے خدا تجھ پر بہتان کیوں۔ اور اس امر کے خلاف جو تو نے عہد دیا۔ علی بن ابی طالب دمی رسولِ خدا کے لیے لیا ہے۔ وہ علی کہ جس کا حق چھین لیا گیا اور بے جرم و گناہ اس کو تیرے گھر میں مسلمانوں کے سامنے قتل کیا۔ جیسا کہ کل ان کے فرزند کو قتل کیا۔ تو نے اس جناب کو وقتِ حیات سے وقتِ ملامت تک پابند اپنی مریضوں کا رکھا حتیٰ کہ ان کے نفسِ نفیس و ذاتِ اقدس کو بہ متاعِ عہدہ اور خصالِ پسندیدہ تو نے اٹھایا اور کسی بات میں گرفت و ملامت کا موقع ان پر نہ ہوا۔ کم سنی میں ان کو ہدایت کی اور جوانی میں پاک و صلتِ فضیلتیں اور عزتیں دیں۔ وہ ہمیشہ خیر خواہی امت میں اور تیرے پیغمبرِ حق کے امور میں سنی اور کوشش کرتے رہے۔ اور آخرت کی طرف رغبت اور دنیا سے نفرت رکھتے تھے۔ اور تیری راہ میں چلا گیا اور تو نے ان کو تمام ظائق سے برگزیدہ کیا اور فوقیت دی۔ وہ راہِ راست کی طرف رہنمائی کرتے رہے اور ہدایت فرماتے رہے۔ اس حالت میں چہاں کافی سے

دارِ ہائی کی طرف کوچ کیا۔ اسے اہل کوفہ اسے اصحاب مکر و حیلہ آگاہ ہو کر (خدا نے) ہم اہل بیت کو تمہارے ہاتھ میں مبتلا کیا اور تمہارا امتحان ہم سے کیا۔ ہماری بلا کو اچھا جانا اور ہم کو اپنے علم و حکمت عطا کی۔ پس ہم قرآنہ علم و فہم اور صندوقِ حکمت الہی اور قبتِ خدا ہیں روئے زمین پر۔ اس نے اپنی کرامت سے ہم کو معزز کیا اور پوجہ اپنے رسول کے تمام خلق پر ہم کو عزت و شرافت بخشی۔ تم نے اپنے پیغمبر کی تکذیب کی۔ ان کو غصہ لایا۔ ہمارے خون و مال کو جائز و حلال جانا۔ گویا ہم اولادِ ترک و کابل تھے۔ کل ہمارے جد کو قتل کیا اور آج تمہاری تلوار سی ہمارے خون سے آلودہ ہیں۔ یہ سب تمہاری برائی عداوت و کینہ کی وجہ سے ہے کہ تم ہمارے قتل سے خوش و فرم ہو۔ خدا کے ساتھ مکر و فریب کرتے ہو حالانکہ وہ مکر کا باطل کرنے والا ہے۔ تم ہمارے قتل سے خوش نہ ہو کہ یہ وہ مصیبتیں اور بلائیں ہیں جو قبل از وقوع واقعہ خدا نے کتب میں لکھی ہیں۔ خدا نے پاک کے نزدیک یہ سہل و آسان ہے۔ (ہمارا شمار ہے کہ) جو چیز جاتی رہے اس پر بخیرہ نہ ہوں اور جو جاہ ملے اس پر خوش نہ ہوں۔ خدا نے پاک کسی مغرور متکبر کو دوست نہیں رکھتا۔ خدا تم کو ہلاک کرے۔ تم عذاب و لعنت خدا کے منتظر رہو۔ گویا تم پر پے در پے غضب خدا اور عذاب شدید آسمان سے نازل ہوا ہے۔ اور تم کو کردارِ زشت کی پاداش نے ہلاک کر دیا ہے۔ بعض کو تم میں سے بعض کے عذاب میں گرفتار کر دیا ہے۔ تمہارے لیے ہمیشہ عذاب و سزا ہے۔ ظالموں پر خدا کی لعنت ہو۔ تمہارا برا بھلا کچھ جانتے ہو کہ کن ہاتھوں سے تم نے ہم کو نیرے مارے اور تم میں کون لوگ ہمارے قتل پر مستعد ہوئے اور کن قدموں سے ہماری لڑائی کو آئے۔ تمہارے دل نہایت ہی سخت و ظلیق ہیں۔ تمہارے دلوں پر مہر کی ہوئی ہے۔ شیطان نے برسے کالوں کو تمہاری نظروں میں رونق دی ہے۔ تمہارے لیے ایسا سامان نہیٹا کر دیا ہے کہ تمہارے دلوں پر پردے ڈال دیے ہیں کہ راہِ راست پر نہیں آتے ہو۔ اسے اہل کوفہ تم رسولِ خدا سے کیسی عداوت رکھتے ہو کہ ان کے بھائی علی بن ابی طالب اور ان کی اولاد سے کہ ذریتِ رسول ہیں تم نے اس کا بدلہ لیا۔ چنانچہ تم میں سے ایک شقی فریہ کہتا ہے کہ: ”ہم نے علی اور اولاد علی کو نیرہ اور شمشیرِ عدی سے قتل کیا اور ان کے حرم کو قتل اسیرانِ ترک کے قید کیا اور کسی کسی لڑائیاں کیں۔“ پس اسے کہنے والے تیرے منہ میں خاک ہو۔ ایسے بزرگوں کے قتل پر تو فر کرتا ہے کہ جن کو خدا نے پاک نے جس و ٹٹاکی سے پاک و صاف کیا ہے۔ چپ ہو جس طرح تیرا باپ چپ رہا۔ ہر شخص کے لیے اس کے افعال کے مطابق اور جو اس نے جمع کیا ہے جزا و سزا ہے۔ تم نے ہمارے فضائل و مناقب پر حسد کیا۔ تمہارے تم پر کہ جو فضیلت خدا نے ہم کو دی ہے اس کو نہیں جانتے۔ یہ قول شاعر: ۛ

فأ ذنبنا ان جاش دھرا بھورنا و بھرك ساج لا یواری الدما مصا

ہمارا کیا قصور ہے کہ ننانہ نے ہمارے دریاؤں کو جوش زن کیا۔ اور تمہارا دریا حرکت نہیں کرتا اور ایک جانور کو چھپا نہیں سکتا۔ یہ خدا کا فضل ہے جس کو چاہتا ہے عطا کرتا ہے۔ وہ صاحبِ فضلِ عظیم ہے۔ جس کو خدا نے نور نہ دیا اس کو نور کہاں سے مل سکتا ہے۔

راوی کہتا ہے کہ شور و فضاں و گریہ و زاری کے ساتھ آواز سی بلند ہوئیں اور ان لوگوں نے کہا کہ بختِ طینین تمہارے لیے پس اسی قدر کافی ہے تم نے ہمارے دلوں کو جلا دیا اور سینوں کو پھٹکا دیا ہمارے پیٹ میں آگ لگادی۔ تب آپ خاموش ہو گئیں۔

راوی کہتا ہے کہ اس روز ام کلثومؓ ہمت علی علیہ السلام نے پس پردہ سے غلبہ پڑھا اور بہ آواز بلند رو کر کہنے لگیں :
اے اہل کفر! برا حال ہو تمہارا کس لیے تم نے حسینؑ کو قتل کیا، اور ان کا مال اسباب لوٹ کر اس کو اپنا ورثہ بنالیا۔
ان کے اہل بیتؑ کو اسیر کیا، ہلاک ہو تمہارے جو تم پر رحمت خدا سے تم دور رہے۔ آیا جانتے ہو تم کس بلا میں گرفتار
ہوئے۔ کیسے کیسے خون تم نے بہا ہے۔ کیسے کیسے بچوں کو تم نے بہہ نہ کیا۔ کیسے کیسے مال لوٹ لیا۔ تم نے اپنے شخص کو
مارا ہے کہ بعد پیغمبر خدا کے تمام عالم سے اشرف و افضل تھا تمہارے دلوں سے رحم جاتا رہا۔ پھر صورت مردان خدا
رستگار ہیں اور پیروان شیطان زیاں کار ہیں۔ پھر آپ نے یہ اشعار پڑھے :۔

قتلتم اخی ظلماً فویلکم خدا سنجون نارا حرمنا يتوق
طاب جو تم پر کہ تم نے میرے بھائی کو قتل کیا جہنم کی بڑبڑی ہوئی آگ تمہارے لیے سزا ہوگی
سفکم دماء حرم الله سفکھا و حرمها القرآن ثم احمد
تم نے ایسا خون پیلا جس کا بہنا خدا قرآن اور رسول اللہؐ نے حرام کیا تھا
و اہل لابی فی حیاتی علی اخی علی خیر بعد المنی یولد

اور میں یقیناً عمر بھر اپنے بھائی کو رونا کروں گا۔ ایسا بھائی جو بعد نبی سب سے بہتر تھا
راوی کہتا ہے کہ تمام حاضرین اس کلام حزن انجام سے گریہ و زاری و شور و ناگ کرنے لگے۔ تمام عورتوں نے ہال
کھول دیے۔ خاک سر پر ڈالی۔ چہرے ناخون سے نچے۔ طمانچے گالوں پر مارے اور مردوں نے اپنی دائرہ می نوحہ ڈالیں۔
روتے چلاتے تھے۔ راوی کہتا ہے کہ اس روز سے زیادہ رونے والیوں اور رونے والے میں نے نہیں دیکھے
اس کے بعد حضرت امام زین العابدینؑ نے ان
حضرت امام زین العابدینؑ کا خطبہ اور اثر

آپ کھڑے ہوئے۔ بعد حمد و ثنائے الہی دعت حضرت رسالت پناہی فرمایا : ”جو کوئی فجر کو جانتا ہے وہ جانتا ہے اور جو
نہیں پہچانتا ہے وہ اب پہچان لے۔ میں علی بن اُسَینؑ ہوں۔ اس کا فرزند ہوں کہ جو راہ خدا میں بے جرم و خطافات کے
کنارہ ذبح کیا گیا۔ میں اس کا فرزند ہوں کہ جس کی عزت و حرمت ضائع کی گئی۔ اس کے اہل حرم کو اور چھوٹے بچوں
تک کو قید کر لیا ہے۔ میں اس کا فرزند ہوں جس کا مال و اسباب لوٹ لیا۔ میں اس کا فرزند ہوں کہ جو صابر و شاکر شہید ہوا۔
اور اس کا فرمیرے لیے کافی ہے۔ اے لوگو! میں تم کو قسم دیتا ہوں خدا نے خالق کی۔ آیا تم جانتے ہو جو کچھ تم نے مکر کیا
میرے پدرِ حلی مقدار کو غلطو لکھے۔ عہد و پیمان کیسے اور آخر کو قتل کر ڈالا۔ ان کی مدد و نصرت نہ کی۔ کس قدر بے اعمال
تم نے اپنے لیے جمع کیسے۔ تم نے بری رائے اختیار کی۔ کن آنکھوں سے تم رسول خداؐ کو دیکھو گے جس وقت وہ حضرت
فرمائیں گے کہ تم نے میری اولاد کو قتل کیا۔ میری ہتک حرمت کی۔ تم میری امت سے نہیں ہو۔“ پس ہر طرف سے
لوگوں کی آوازیں بلند ہوئیں۔ سب روتے تھے اور آپس میں ایک دوسرے سے کہتے تھے کہ ہم سب ہلاک ہوئے۔ ہم
نے غفلت کی۔ (پھر حضرت سبکو نے فرمایا کہ) ”خدا کی رحمت اس پر ہے جو گوش دل سے نصیحت سنے اور قبول کرے۔
در باب خدا و رسول و ذریت رسول میری وصیت یاد رکھے کہ ہم کو رسول خداؐ کے ساتھ اقتدا کرنے کی ہے۔“

(سب نے اتفاق کیا کہ یا ابن رسول اللہ ہم تمہارے عہد کے نگہبان ہیں جو باہم حکم کرو۔ ہم انکار نہیں کرتے تمہارے دشمنوں کے دشمن اور دوست کے دوست اللہ زید سے اس کا مواخذہ کریں گے۔ اور ان ظالموں سے ہزار دنا خوش ہیں جنہوں نے آپ پر ظلم کیا) حضرت نے فرمایا: یہاں یہاں اسے گروہ خدار و مکار تم اپنے نفس کی ہوا دوس میں چسنا چاہتے ہو کہ میرے ساتھ بھی وہی سلوک کرو جو کل میرے باپ کے ساتھ کیا ہے۔ بھرا بھی زخم نہیں بھرا ہے اور حرارت نہیں گئی ہے کل کی بات ہے کہ میرے باپ کو مع اقرہائے باؤ کا قتل کیا ہے۔ مجھے میرے جد و پدر کی موت نہیں بھولے غم و غصہ کی آگ و گری میرے گلے میں ابھی باقی ہے۔ اب میری خواہش تم سے صرف یہ ہے کہ تم ہم کو قتل و ضرر کچھ نہ پہنچاؤ۔

لا غروا فی قتل الحسین فشیخہ قد کان خیرا من حسین و اکراما کچھ جب نہیں ہے اگر حسین قتل ہوئے۔ اس لیے کہ ان کے بزرگ جو ان سے اچھے اور اکرم تھے قتل ہوئے فلا تفرحوا یا اهل الکوفۃ بالذی اصیب حسین کان ذلک اعظما اس اہل کوفہ اس پر خوش نہ ہو کہ تم نے حسین کو بڑی محبت پہنچائی قتیل بشط النہر روحی فداؤہ جزاء الذی ارحاہ نار جہنما ان پر میری جان قربان ہو وہ تو ہر فات کے کندے مارے گئے اور جس نے انہیں قتل کیا اس کی جزا دوزخ کی آگ ہے پھر فرمایا کہ: ”ہم راضی ہیں خدا کی رضا پر ہم تم سے آج فائدہ و نقصان کچھ نہیں چاہتے۔“

سر اقدس دوبارہ دربار میں اعظم کوئی کہتا ہے: جب دوبارہ امام حسینؑ کا سر مقدس ابن زیاد کے سامنے لائے تو وہ بدبخت لعین چہرہ اور بالوں کو اٹھ کر دیکھنے لگا۔ تاہم اس کے محسوس ہاتھوں کو ریشہ ہوا۔ اس نے وہ مقدس سر اپنے زانو پر رکھ لیا اس وقت گلوئے مبارک سے خون کا ایک قطرہ نکل کر زانو پر گرا جو کہلوں سے گزرتا اور ران میں ناسور کرتا ہوا نکل گیا وہ ناسور سخت بدبودار تھا ہر چند جراحوں اور طبیعوں نے علاج کیا کچھ فائدہ نہ ہوا۔ اس لیے وہ شقی ہمیشہ اس ناسور پر مشک رکھتا تھا۔ (ابراہیم بن مالک اشتر نے جس وقت ابن زیاد کو قتل کیا تو بونے مشک سے تصدیق ہوئی کہ مقتول ابن زیاد تھا)

دربار ابن زیاد معلوم ہوتا ہے کہ ابن زیاد نے آج دربار میں کچھ زیادہ آراستگی کی تھی یا کچھ قاعدے آسان کر دیے تھے مثلاً لہوٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل بیت کے داخل دربار ہونے کے وقت ابن زیاد نے لوگوں کو ”اذن عام دیا تھا“۔ صاحب کشف الخفاء کے موافق: ”حضرت زینبؑ ایک گوشہ میں بیٹھ گئیں۔ اور کیزیروں نے ہر طرف سے حضرت کو گھیر لیا۔“ ابواسحاق اسفرائینی اور ابی عصفیہ سے واقعات کا ایک نہایت باموقع نقل ایہ معلوم ہوتا ہے کہ سامنے کھڑے ہوتے ہی حضرت سید مجاہد نے سوال کیا: ”حضرت تم بھی اسی طرح کھڑے کیے جاؤ گے۔ اور تم سے سوال کیا جائے گا لیکن رسول اللہ کو تم کوئی جواب نہ دے سکو گے۔“ ابن زیاد چکا بھڑکا اور اسے یہ پسند نہ آیا حضرت ام کلثومؑ اور ابن زیاد کی گفتگو اسی مورخ کے موافق: ابن زیاد نے پوچھا کہ ان میں اُم کلثوم کون ہے؟ حضرت اُم کلثومؑ نے کوئی جواب نہ دیا۔

ابن زیاد نے دوبارہ سوال کیا۔ پھر خاموش رہیں۔ تیسری مرتبہ اس نے کہا: قسم ہے تمہیں اپنے جد کے حق کی کہ کلام کرو۔ فرمایا: ”کیا چاہتا ہے؟“۔ ابن زیاد نے کہا: ”خدا نے تمہیں اور تمہارے جد کو جھٹلایا اور انہیں رسوا کر کے مجھے ان کی طرف سے مطمئن کیا۔“ فرمایا: ”اے دشمن خدا! خدا قاتل کی تکذیب اور جھوٹے کی تصدیق کرتا ہے۔ اور واللہ تو کذب اور فحش کا حامل ہے جسے جہنم کی بشارت ہو۔“ ابن زیاد نہ سنے گا اور کہا: ”اگر میں جہنم میں جاؤں تو میری مراد برائے۔“ حضرت ام کلثومؓ نے فرمایا: ”تو کم بخت تو نے اہل بیتؑ کے خون سے زمین کو بھلا دیا۔“ ابن زیاد نے کہا: ”اے شجاع کی بیٹی اگر تو عورت نہ بنتی تو میں تیری گردن مارتا۔“ ابی احن کے موافق حضرت نے فرمایا: ”اگر میں شجاع نہ ہوں تو میں اس طرح بے قلب نہ کھڑی ہوں۔“

حضرت زینبؓ اور ابن زیاد کا مکالمہ
ابی عثمت کے موافق حضرت زینبؓ باہال پریشان استین میں اپنے مٹھ کو چھپائے تھیں۔ ابن زیاد دہانے بائیں دیکھ رہا تھا۔ اور سر نیزوں پر گرد تھے۔ ابن زیاد نے حضرت زینبؓ کو دیکھ کر اپنے حاجوں سے پوچھا کہ یہ کون ہے۔ کسی نے کہا کہ یہ زینبؓ حسینؑ کی بہن ہیں۔ ابن زیاد نے کہا: ”اے زینبؓ! حق اپنے جد کے کلام کرو۔“ فرمایا: ”اے دشمن خدا! رسولؐ کیا چاہتا ہے؟“۔ تو نے ٹیکوں اور بدوں میں ہماری ہتک کی۔“ کہا: ”تم نے اپنے اور اپنے بھائی کی شان میں خدا کو کیسا دیکھ دیا۔ تمہارے بھائی نے ارادہ کیا تھا کہ نبرد سے خلافت لے لے۔ ان کی امید ٹوٹ گئی اور میں خدا نے مطمئن کیا۔“ فرمایا: ”وائے جو تجھ پر اگر میرے بھائی نے طلب خلافت کی تو وہ ان کے باپ اور مائا کی میراث تھی۔ لیکن تو اپنے نفس کو جواب کے لیے مستعد رکھ جب کہ خدا قاتل، محمدؐ تیرا قید خانہ ہو گا۔“

حضرت علی بن الحسینؑ اور ابن زیاد
اس وقت حضرت زین العابدینؑ نے حضرت زینبؓ کو چھپ کرایا اور منہ مایا: ”کب تک اد ابن زیاد تو میری پھوپھی کی توکان کرے گا؟“۔ ابن زیاد کو اس پر غصہ آیا۔ اور اس نے اپنے حاجب کو حکم دیا کہ گردن مارو۔ حضرت زینبؓ امام زین العابدینؑ سے لپٹ گئیں۔ حاجب نے چاہا کہ حضرت کو لے جائے۔ اس وقت اہل بیتؑ میں شور مچا اور حضرت زینبؓ نے ابن زیاد سے فرمایا کہ: ”کیا تو چاہتا ہے کہ نسل رسولؐ میں سے کوئی باقی نہ رہے۔ اگر تیرا بھی ارادہ ہو تو مجھے بھی اس کے ساتھ قتل کر ڈال۔“ حاجب کو بلا لیا گیا۔ ابی احن وغیرہ کے موافق حضرت شجاعؓ نے فرمایا: ”تو مجھے قتل کی دھمکی دیتا ہے۔ کیا تو نہیں جانتا کہ قتل ہمارے لیے شہادت اور خدا کی طرف سے درجہ ہے۔“

ابن خلدون بعض پہلو کے متعلق زیادہ صاف ہے۔ وہ کہتا ہے: ابن زیاد نے تین بار زینبؓ (آپ کی بہن) کی طرف اشارہ کر کے دریافت کیا۔ ”یہ کون ہے؟“۔ چوتھی بار کسی نے کہا: ”یہ زینبؓ بنت فاطمہؓ ہیں۔“ ابن زیاد نے مخاطب ہو کر کہا: ”اللہ کا شکر ہے کہ اس نے تم کو رسوا و ذلیل کیا اور جھوٹے کو اس کے کذب کی سزا دی۔“ زینبؓ نے جواب دیا: ”اللہ کا احسان ہے کہ اس نے ہم کو محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ذات مبارک سے سرفراز کیا اور ہمارے بزرگوں کی شان میں آیہ تطہیر نازل فرمائی۔ یہ دنیا چند روزہ ہے۔ یہاں کی ذلت و رسوائی کا کوئی اعتبار نہیں۔ آخرت میں فائق و مہاجر کو اللہ تعالیٰ ذلیل و خوار کرے گا اور ہم کو سرفراز و ممتاز۔“ ابن زیاد بولا: ”کیا خوب تم نے

کیا نہیں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے ابی اجمیؓ کو ذلیل و رسوا کیا ہے۔ کیا تمہارے خاندان والے خوار نہیں ہوئے۔“ زینبؓ یہ سن کر رو پڑی۔ ابن زیاد نے علی بن الحسینؓ کی طرف متوجہ ہو کر نام دریافت کیا۔ جواب دیا: ”علی بن الحسینؓ۔“ ابن زیاد نے متعجب ہو کر کہا: ”کیا اللہ تعالیٰ نے علی بن الحسینؓ کو نہیں مارا ہے۔“ آپؓ یہ سن کر خاموش رہے۔ پھر ابن زیاد نے کہا: ”تم کیوں جواب نہیں دیتے۔“ ارشاد کیا: ”میرا ایک بھائی علی نامی تھا۔ اس کو لوگوں نے شہید کر ڈالا ہے۔“ ابن زیاد ہنس کر بولا: ”اس کو اللہ تعالیٰ نے مار ڈالا ہے۔“ آپؓ خاموش ہو رہے۔ پھر ابن زیاد نے کہا: ”تم کو یہ کیا ہو گیا ہے کہ تم کچھ نہیں بولتے۔“ آپؓ نے فرمایا: اَللّٰهُ يَتَوَقَّى الْاَكْهَسَ حَتّٰى مَوْتِهَا (۲۹: ۲۲) وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ (۳: ۳۵) ابن زیاد نے کہا: واللہ تو بھی انھیں میں کا ہے۔ پھر اپنے ایک مصاحب سے کہا دیکھو شاید یہ بالغ ہو گیا ہے۔ اگر ایسا ہے تو میں ابی اجمیؓ اس سے کچھ لیتا ہوں۔ ابن معاذؓ نے دیکھ کر کہا: ہاں یہ بالغ ہو گیا ہے۔ ابن زیاد بولا: اس کی بھی گردن مار دے۔ آپؓ نے فرمایا: ”میرے بعد کون ان عورتوں کی کفالت کرے گا۔“ زینبؓ رو کر پٹ گئیں اور ابن زیاد سے غلبہ کر کے کہا: ”اے ابن زیاد کیا تیرا ابی اجمیؓ ہماری خورنری سے نہیں بھرا۔ کیا تو ہم میں ایک مرد کو بھی زندہ نہیں دیکھنا چاہتا۔ میں تجھ سے اگر مومن ہے، یہ کہتی ہوں کہ اگر تو اس کو قتل کیا چاہتا ہے تو مجھ کو بھی اس کے ساتھ قتل کر دے۔“ پھر آپؓ نے ارشاد کیا: اے ابن زیاد اگر ان عورتوں میں اور تجھ میں کوئی قرابت ہو تو کسی مرد متقی با خدا کو ان کے ہمراہ کر دینا کہ مسلمانوں کی طرح ان کے ساتھ رہے۔ ابن زیاد قہقہہ دیر تک زینبؓ کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر کچھ سوچ کچھ کر بولا: ”مجھے اپنے رحم پر تعجب آتا ہے۔ واللہ اگر میں اس کو (امام زین العابدینؓ کی طرف اشارہ کر کے) قتل کرتا تو اس کو بھی (زینبؓ کی طرف اشارہ کر کے) قتل کر ڈالتا۔ اس شخص کو عورتوں کے ساتھ رہنے کے لیے چھوڑ دو۔“

ابن خلدونؒ نے جو مونا کمال ابن ابیہ سے قتل کرتا ہے۔ اپنی آخری سطروں میں کمال ابن ابیہ سے کچھ اختلاف کیا ہے۔ شہناش آفرانہ کر مورخؒ نے یہ فقرہ کہ ایسے شخص کو ان (اہل بیت) کے ساتھ حج جو اسلام سے واقف ہو۔ امام کی زہلی کہلویا ہے۔ ایسا ہی ”ختم حسینؓ“ میں ہے۔ اور کسی مورخؒ نے ”قرابت“ کا لفظ استعمال نہیں کیا ہے۔ اور ابن زیاد کے آخری فقرہ کا مفہوم یہ ہے کہ ”رحم سے تعجب ہے کہ یہ عورت اس لڑکے کے ساتھ قتل ہونے کے لیے آمادہ ہے۔“

سر مبارک خولی کی سپردگی میں
اس کے بعد ابن زیاد نے خولی بن زید اجمیؓ کو حکم دیا کہ: ”تو حسینؓ کا سر لے جا۔ اور اس وقت تک اپنے پاس رکھ جب تک تجھ سے طلب نہ کیا جائے۔“

اہل بیتؑ ایک گھر میں
قبول اعظم کئی ابن زیاد نے حکم دیا کہ: ”مجھے اس گروہ کی درد سہری سے پھوٹ
یہاں سے نکال کر اس مکان میں لے جاؤ۔“

مسجد جامع میں ابن زیاد کی تقریر اور عبد اللہ بن عقیف
ابو جعفرؑ کے موافق ابن زیاد نے لوگوں کو مسجد جامع میں طلب کیا۔ خود منبر پر چڑھ گیا اور حضرت علیؓ اور حسینؓ علیہ السلام کی شان میں نامزائے انتظار استعمال کیے۔ اس وقت ایک شخص جس کا نام عبد اللہ بن عقیفؓ اردی تھا اور وہ بہت بوڑھے ہو گئے تھے جس سے ان کے آنکھوں کی بینائی غراب ہو گئی تھی۔

کھڑے ہو گئے یہ صحابی رسول تھے۔ انھوں نے کہا تم پر اور تیرے باپ دادا پر خدا لعنت کرے۔ انھیں مغرب کر کے اور جہنم میں ان کا مسکن قرار دے۔ کیا تیرے لیے قتل حسین کافی نہ تھا کہ تو منبر پر ان کی سب بھی کر رہا ہے۔ میں نے رسول اللہ کو کہتے سنا ہے وہ فرماتے تھے کہ: ”جس نے علی کی سب کی اس نے میری سب کی جس نے میری سب کی اس نے اللہ کی سب کی۔ اور جس نے خدا کو نامزاکا ہوا قیامت تک جہنم میں رہے گا۔“ یہ سن کر ابن زیاد نے ان کی گردن مارنے کا حکم دیا۔ ان کی قوم مانع ہوئی اور انھیں گھر پہنچا آئی۔ جب رات ہوئی تو ابن زیاد نے خلی بن زید ابی کو بلایا اور اس کے ساتھ پانچ سو سوار یکے اور کہا کہ ازدی کی طرف جا اور اس کا سر لے آ۔ پس یہ سب روانہ ہوئے۔ اور ان کے گھر پہنچے۔ ابن حنیف کی ایک چھوٹی لڑکی تھی۔ جب اس نے گھوڑوں کی آواز سنی تو کہا: بلایا دشمنوں نے تم پر چوم کیا ہے۔ ابن حنیف نے کہا: میری تلوار لے آ۔ اور مجھے ایک جگہ بٹھا دے۔ اور ہم سے کبھی جلاؤ کہہ دہئے، ہائیں، آگے، پیچھے دشمن کہاں ہیں۔ لڑکی نے انھیں ایک تنگ جگہ بٹھا دیا اور ابن حنیف حملے کرنے لگے۔ (لڑکی بتاتی جاتی تھی اور کہہ رہی تھی کہ کاش میں مرد ہوتی اور تمہارے سامنے ان ظالموں اور حرمت پاک کے قاتلوں سے لڑتی) اور پچاس آدمیوں کو قتل کیا۔ اور یہ اس وقت اشعار پڑھ رہے تھے جس کے پہلے شعر کا مطلب یہ تھا کہ اگر میری بھارت ہوتی تو میں تمہارے مورد اور مصدر کو تنگ کر دیتا۔ آخر بڑھا جو چوم سے گرفتار ہو گیا اور اسے ابن زیاد کے پاس لے گئے۔ ابن زیاد نے دیکھ کر کہا کہ: ”خدا کا شکر ہے کہ جس نے تیری آنکھوں کو اندھا کر دیا۔“ ابن حنیف نے کہا: ”شکر ہے خدا کا جس نے تیرے قلب کو اندھا کر دیا اور آنکھوں کو کھلا رکھا۔“ ابن زیاد نے کہا: ”خدا مجھے قتل کرے اگر میں تم کو سب سے بری طرح قتل نہ کروں۔“ فضضک عبداللہ بن عقیف۔ (پس بیٹے عبداللہ بن حنیف) اور کہا جس وقت امیر المومنین کے ساتھ صفین میں میری آنکھیں صاف ہوئیں۔ اس وقت میں نے خدا سے دعا کی تھی کہ مجھے شرمناکس کے ہاتھ سے شہادت نصیب کرانے اور میں نہیں جانتا کہ دنیا میں تم سے زیادہ کتنی بد بخت ہے۔ اس کے بعد اشعار پڑھے۔ فی البدیہہ۔ جس کے انیس اشعار ابوحنیف نے قتل کیے ہیں۔ پر جوش اعتقاد ہیں جن میں قوم ازد کو جنگ کے لیے برا بھلا کیا ہے۔ حسین کی تعریف کی ہے انھیں نہا خیر خلق اور ابد تک عالم کا ہادی، صاحب جود و قوتی کہا ہے۔ قوم کی حمد شکنی کی حکایت کی ہے۔ اپنے موجود نہ ہونے اور بے بصری پر حسرت ظہر کی ہے۔ اور اکثر اشعار ”یا لیتنی“ (اے کاش میں ہوتا) سے شروع ہوتے ہیں۔ قوم کو گمراہی سے توبہ کرنے کی نصیحت کی ہے۔ اور شہد پر سلام صحیا ہے۔ جب تک مسابطے اور جب تک ستارے آسمان میں چلیں، یا کوئی ستارہ ٹوٹ کر گرے۔ اس کے بعد وہ گردن جسم سے علیحدہ ہو گئی جو اسول حق کی منادی کر رہی تھی اور انھیں صلیب پر چڑھا دیا۔ ابن خلدون کہتا ہے کہ: ”یہ صبح سے تا وقت عشاء مسجد ہی میں رہتے تھے۔“ اور ”ابن زیاد نے انھیں گرفتار کر کے مسجد میں صلیب پر چڑھا دیا۔“ قبول کامل ابن حنیف کا سر حسین کے سرافس کے ساتھ چرایا گیا اور یہ پہلا سر تھا جو لکڑی پر اٹھایا گیا۔

صاحب لہوت کہتے ہیں کہ ابن زیاد نے حکم دیا کہ جو مکان مسجد اعظم کے پہلو میں ہے اس میں ان سب کو لے جا کر قید کر دو۔ اس وقت حضرت زینبؓ نے کہا کہ: ”ہمارے پاس زنان عرب سے کوئی نہ آوے۔ ہاں مگر لونڈیاں آویں۔ کیونکہ وہ بھی اسیر ہیں اور ہم بھی اسیر ہیں۔“ صاحب لہوت اور ابوالاخی نے کسی کی زبانی یہ اشعار نقل کیے ہیں جو حضرت کے

سرمبارک کی تعمیر کے وقت کسی نے کہا تھے ابوالحق کے نزدیک یہ اشعار زید بن ارقم نے پڑھے :
 راس الحسین ابن النبی محمد للناظرین علی القناتہ یدفع
 صیغہ نبی محمد ﷺ کے فرزند کا سر تماشاویوں کے لیے نیزہ پر بلند کیا گیا ہے
 و المسلمون بمنظر و بسمع لا منکر منهم و لا متفجع
 مسلمان دیکھتے اور سنتے ہیں نہ کسی کو ناگوار گزرتا ہے اور نہ کوئی رونے والا ہے
 کحلت بمنظر العیون عالیہ و اصم شأنک کل اذن تسمع
 تیرے اس منظر نے کوری سرمہ کی طرح آنکھوں میں ڈال دی ہے اور سننے والے کانوں کو بہرہ کر دیا
 ایقظت اجفاناً و کنت لما کبری و امنت عیناً لم تکن تہتجع
 تو نے ان آنکھوں کو جگا دیا جس کا تو آرام تھا اور ان آنکھوں کو سلا دیا جو کہ تیرے فکر قتل میں نہ سوتی تھیں
 ما روضۃ الا تمنت انہا لک حفرة و لحط قیوک مضجع
 کوئی باغ نہیں ہے جسے تیری خواجہ قبر اور گھر بننے کی آرزو نہ ہے

کمال ابن اثیر کے موافق ابن زیاد نے ایک شخص کو عمر بن سعید حاکم مدینہ کے پاس شہادت حسینؑ کی "خوشخبری" دینے کے لیے بھیجا اس سے کسی قریشی سے ملاقات ہوئی اور اس نے خبر پوچھی لیکن اس نے کہا کہ میں امیر کے سامنے خبر بیان کروں گا۔ قاصد عمر بن سعید کے پاس گیا۔ اس نے حال پوچھا اور قاصد نے کہا کہ : "امیر کے لیے قتل حسینؑ کی خوشخبری ہے۔" اس نے کہا کہ مدینہ میں حسینؑ کے قتل کی خبر پکاردے۔

جس وقت بنی ہاشم کی عورتوں نے یہ خبر سنی چچ اطمین اور حضرت عقیل بن ابی طالبؑ کی صاحبزادی اس طرح نکلیں کہ ان کا سر کھٹا ہوا تھا اور مرثیہ پڑھ رہی تھیں۔ جس وقت ابن سعید نے بنی ہاشم کی عورتوں کا رونا سنا تو ہنسا اور کہا : "یہ رونا مثل اس رونے کے ہے جو زمانہ قتل عثمانؓ میں ہوا۔" اس کے بعد وہ منبر (مدینہ اور مسجد رسولؐ کا منبر) پر چڑھا اور لوگوں کو واقعہ کی خبر دی۔ اب حضرت عبداللہ بن جعفر نے اپنے دونوں صاحبزادوں کی خبر شہادت سنی ان کے دوست پڑسہ کے لیے آئے۔ اور ان کے غلام نے کہا کہ : "یہ ہیں حسینؑ کی وجہ سے مائے۔" اس پر حضرت عبداللہ نے غلام کو مارا، اور کہا کہ : "اگر میں بھی ہوتا تو اسے پسند کرتا کہ ان کے ساتھ مارا جاتا۔ بخدا یہ وہ بات تھی کہ مجھے میرے نفس کی محنت پر آمادہ کرتی۔ میرے نفس پر یہ آسان ہے کہ میرے بیٹے حسینؑ کے ساتھ تھے اور انہوں نے موافقت کی۔ اگر میں نہیں تھا تو حسینؑ کے ساتھ میرے بیٹے تھے۔" ابی جعفر نے بھی قریب قریب ایسا ہی لکھا ہے۔ تاریخ التواریخ نے بھی ذکر کیا ہے۔

تاریخ التواریخ کے موافق : شہادت حسینؑ کی خوشی میں کوفہ میں چار مسجدیں بنوائی گئیں جن کے نام
 ① مسجد اشعث، ② مسجد بسریر، ③ مسجد سماک اور ④ مسجد شہید رومی رکھے گئے۔



باب دوازدهم

اہل بیت (دمشق)

اگرچہ یہ ایک ظہر امر ہے کہ ابن زیاد نے یزید بن معاویہ کو حضرت کی شہادت اور اہل بیت کی اسیری کی خبر دی ہوگی۔ لیکن میں اسے قرین قیاس نہیں سمجھتا کہ کوفہ ایسے حدود مقام میں تھی روز ابن زیاد اس کا نظارہ دیکھتا کہ یزید کا کوئی جواب آنے تو اہل بیت کو دمشق کی طرف روانہ کریں۔ ابن زیاد کی دلیل خوشامد یزید اس کے کچھ نہیں چاہ سکتی تھی کہ وہ یزید کو اپنی کارگزاری دکھائے اور چند مجبور اسیروں کو یزید کے پاس جلد سے جلد روانہ کرے کہ وہ خود ہیچ کر اپنا اطمینان کرے۔ اس لیے ابن زیاد نے جو کچھ لکھا ہو وہ خطاً اہل بیت کے ساتھ گیا اور وہ لوگ جو اسیروں کے ساتھ بھیجے گئے تھے ان میں سے کسی کو مزید حالات بتانے کے لیے تجویز کیا تھا۔ میرا سلسلہ بیان اب اور کیا کہے گا یزید اس کے کہ ابن زیاد نے شہدائے کربلا کے سر اپنے اسیروں کے ساتھ دمشق روانہ کیے۔ ان کے ساتھ کچھ فوج بھی تھی۔ اور پھر بقول ابن خلدون: ”عورتیں اوٹھوں پر بغیر حمل کے سوار کرانی گئیں اور لہام زین العابدین کے ہاتھ پاؤں اور گردن میں زنجیر ڈال دی گئی۔ آپ نہ تو، شکاری دھڑی و طوق پہناتے ہوئے کچھ بولے اور نہ اشارہ راہ میں کچھ ان لوگوں سے ہم کلام ہونے۔ یہاں تک کہ شام پہنچ گئے۔“

میرے لیے یہ اندوہناک ہے کہ عموماً مؤرخین نے کوفہ سے دمشق تک کے واقعات نہیں لکھے جو اس صہرت خیز قافلہ کے گزرنے کے زمانہ میں واقع ہوئے۔ اور نہ بعض کتابوں کے بعض واقعات کی بنیاد پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان کا کوفہ سے دمشق تک گزرنے بغیر کسی اتفاق کے تھا۔ پھر بھی قیمت ہے کہ ابی مخنف، ابواسحاق اسفرائینی، روضۃ الشہداء اور غالباً ان لوگوں سے ناخ التواریخ نے کچھ درمیانی حالات کا تذکرہ کیا ہے۔ میں مجبور ہوں کہ ان کی رہنمائی پر آگے بڑھوں۔ ان مقامات میں پیش میں بھی اختلاف ہے بلکہ کئی زیادتی بھی ہے۔ ان منازل میں بھی ہمارے لیے تصفیہ کی وہی دشواری ہے جو حضرت کے سے تشریف آوری کے بعد تھی۔ یہ دشواری کچھ زیادہ اس لیے ہے کہ اس وقت کے منازل کے نام اکثر مؤرخین نے درج کیے ہیں۔ دراصل اہل بیت کے سفر شام کا بہت کم لوگوں نے تذکرہ کیا ہے۔ تو میرا کسی منزل کا لکھنا اس عقین کے ساتھ نہ ہوگا کہ مجھے اس مقام کی جغرافیائی صحت کا وثوق ہے۔ بلکہ اس لیے کہ مجھے ان واقعات سے کچھ کام لینا ہے۔ میں صرف اسی وقت وثوق سے کہہ سکتا جب ان مقامات کی کوئی جغرافیہ، گزیر یا اسمائے دیہات و قریات کے متعلق کوئی کتاب ہوئی۔ یا کسی سیاح کا روزنامہ ان مقامات کا نام بتاتا۔ میرے لیے کبھی یہ کافی معیار نہ تھا کہ کتب معتبرہ یا فلاں راوی تھے۔ یا اس واقعہ کو شرف تو اثر حاصل ہے۔ اور نہ میں اپنی جغرافیہ دانی کو ان تصلوں میں ظاہر کر کے اپنے کو اپنے فرض سے سبکدوش کچھ سکتا ہوں کہ بغداد عراق غم میں ہے اور حلب ایشیائے کوچک کا ایک شہر ہے۔ جب کہ مجھے سلسلہ مقامات، قافلہ، وہاں کے واقعات کو اور واقعات سے یا اس کے بالکس اور واقعات کو ان واقعات سے ربط دینا ہے۔

مقامات

ابی حنفہ	نور العین فی مشہد حسینؑ	منہج التواریخ	روضۃ الشہداء علیہ السلام
قادسیہ	پہلی منزل کا نام نہیں لکھا	نکریٹ	حران
مشرقی جناحہ کی طرف سے	حرالیا	موسل	موسل
چلے نکریٹ کو عبور کیا	ترکیٹ (نکریٹ؟)	قصرین	نصیبین
غٹکی سے اُچی کی طرف آئے	وادئ	شیرزد	ایک اور شہر (نام نہیں)
دیر عسودہ	موسل	قہہ کفر طلب	طلب
صلیبا	کفر نوہ	سیور	محمورہ کوہ (قریب طلب)
واؤی ظلمہ (قیام کیا)	طلب	ما	دیر
ارمینا	قصرین	محس	عسقلان
لینا	شہر لہان	بطلک	دمشق
تخیل	کفر طلب		
موسل	شیراز	اس کتاب سے میرے	
تل ماہر	حامدہ	نوٹ میں صرف وہ	
جبل بنار	محس	شہرہ لکھے ہیں	
نصیبین	خندق الطام	جہاں کئی	
ہین الورود	جوسیہ	واقعہ پیش	
دعوات	بطلک	آیا	
مسندین	مومہ	○	
معرة النعمان	دمشق		
شیراز (شیرزد)			
کفر طلب			
سیور			
حامدہ			
محس			
کنیہ			
بطلک			
مومہ			
دمشق			

ان مؤرخین میں جن کی ہم نے فہرست دی ہے سب سے زیادہ نام ابی حنفہ نے لکھے ہیں۔ اور جہاں تک معلوم ہوتا ہے اس نے اہتمام کیا ہے کہ نہ صرف بڑے بڑے مقامات کے نام دیے ہیں جن میں سے بعض اس وقت بھی فتنوں میں ملتے ہیں بلکہ ان مقامات کو بھی لکھا ہے ہر صر سے یہ قافلہ گزرا۔ یہ کل مقامات لازماً وہ نہیں ہیں جہاں قیام بھی ہوا ہو، بلکہ قیام چند ہی مقامات پر ہوا۔ جس کا ذکر بھی ہے۔ اس کے بعد مؤرخین نے ایسی موٹی بات بھی ذکر کے قابل نہ کی کہ یہ قافلہ کس تاریخ کو دمشق پہنچا۔ اس سے نہ صرف یہ معلوم ہوتا کہ کتنے دن راتہ میں صرف ہوئے، بلکہ متروکوں کی بھی تعداد ایک حد تک معلوم ہو جاتی۔ ہم مناسب مقام پر اس کا تذکرہ کریں گے کہ یہ قافلہ کب کر بلا میں داخل ہوا اور آیا وہ تاریخ صحیح ہے یا نہیں؟ اب ہم واقعات لکھتے ہیں۔

امی حنفہ کے موافق ابن زیاد نے
دمشق کی طرف روانگی اور حضرت ام کلثومؓ کے اشعار

پانچ سو سواروں کو ان کے ساتھ کیا اور حکم دیا کہ سرہانے شہداء اور قیدیوں کے ساتھ دمشق روانہ ہوں اور انہیں تمام شہروں میں تقسیم کریں۔ سہل کہتا ہے کہ جب میں نے یہ دیکھا تو میں نے بھی سفر کا ارادہ کیا۔ تجیز سفر کی اور روانہ ہو گیا۔ جب قادسیہ پہنچے تو حضرت ام کلثومؓ نے فرمایا: ماتت رجالی وافق الدھر ساداتی۔۔۔ ”ہم سے مرد مر گئے اور زمانہ نے ہم سے مرداروں کو فنا کر دیا۔ اور ہم لوگوں کی حسرتیں بڑھ گئیں۔ ان کمینوں کو ہم سے کیا عداوت تھی جب کہ یہ جانتے تھے کہ ہم رسول اللہ کی بیٹیاں ہیں جو ہدایت کے ساتھ آئے تھے دشمنوں نے ہمیں برہنہ پالانوں پر سوار کیا اور ہم ان میں قیمت کی حیثیت سے ہیں۔ یا رسول اللہ! اے نور البریات! دشمنوں نے آپ کے اہل بیت کے ساتھ جو کچھ کیا وہ آپ کے لیے اندوہناک ہے۔ وائے جو تم پر اے دشمنو! تم نے رسول کا کھنڈان کیا جنہوں نے تمہیں منالیت سے ہدایت کی۔“

سرہانے شہداء کے ساتھ شرعی جنازہ کی طرف سے
اہل بیت کا قافلہ اور مقامات پر اس کا اثر

پھر ائی آئے اور یہاں سے دیر عرصہ ہوتے ہوئے صلیتا پہنچے۔ پھر دواوی غلہ آئے اور یہاں قیام کیا۔ پھر دواوی غلہ سے روانہ ہو کر ارمینا کی طرف پہنچے اور روانہ ہوئے یہاں تک کہ لینا کے قریب ہوئے۔ یہ ایک شہر تھا۔ یہاں عورتیں بڑے اور جوان نکل آئے اور حسینؑ کے سر مبارک کو دیکھ کر ان کے جد بزرگوار اور پدر بلندار پر صلوات بھیجتے تھے اور ان کے قاتلوں پر لعنت بھیج رہے تھے۔ اور کہہ رہے تھے کہ: ”اے قاتلین اولاد انبیاء ہمارے شہر سے نکل جاؤ۔“ اس کے بعد کھیل میں آئے اور عامل موصل کو لکھا کہ ہمارے پاس حسینؑ کا سر ہے۔ جس وقت اس نے خط پڑھا شہر کے لوگوں کو اطلاع دی اور آراستہ کیا۔ لوگ ہر طرف سے نکلے اور دلی شہر نے چہ میل آگے جا کر ملاقات کی۔ لیکن بعض لوگوں نے پوچھا کہ کیا خبر ہے۔ ان سے کہا گیا کہ ”ایک خارجی کا سر ہے جس نے عراق میں خروج کیا تھا۔ اور عبید اللہ بن زیاد نے قتل کیا۔ اور اس کا سر زید کے پاس بھیجا ہے۔“ ان میں سے کسی نے کہا کہ اے قوم حسینؑ کا سر ہے اور جب تحقیقات کی تو اوس اور خرزج کے چالیس سوار جمع ہوئے اور طع لیا کہ ہم دشمنوں سے لڑیں گے اور ان سے ایام کا سر لے کر دفن کریں گے۔ اور یہ ہم سے لیے قیامت تک کے فخر کو کافی ہو گا۔ جس وقت دشمنوں نے یہ سنا شہر میں داخل نہ ہوئے اور تل ماعفر کی طرف چلے گئے۔

موصول اور مشہد نقطہ صاحب روحۃ الشہداء کے موافق جب دشمن قریب پہنچے اور حاکم شہر کو اطلاع دی اور عماد الدولہ حاکم شہر نے لوگوں کو بلا کر مسودت حال کی خبر دی اور ان سے

صلاح کی اور یہ بھی کہا کہ ان کا استقبال اور افتخار نامناسب ہے۔ موصی اس سے متفق ہوئے صرف رسید بھیج دی اور کہلوا دیا کہ تمہارا یہاں آنا مصلحت نہیں ہے۔ دشمنان اہل بیت شہر سے ایک فرخ پرتے اور سر مبارک کو ایک پتھر پر رکھ دیا۔ ہر سال روز عاشورہ لوگ یہاں آکر مراسم عزایا کرتے تھے۔ وہ پتھر جس پر خون حسینؑ کا نشان تھا عبد الملک بن مروان کے زمانہ تک رہا۔ اور اس نے وہاں سے ہٹوا دیا۔ لیکن آخر میں وہاں ایک مقبرہ مشہد نقطہ کے نام سے تعمیر ہو گیا۔ پھر ابی عتف کے موافق تل ماعفر سے جیل بخار کی طرف گئے۔ نصیین پہنچے اور وہاں مقام کیا۔ سرہانے مبارک کی تفسیر کی اور حضرت زینبؑ نے اشعار فرمائے۔ پھر اس کے بعد عین الورود کی طرف سے گزرے۔ دعوات کے قریب پہنچے اور اس کے حاکم کو اطلاع دی کہ ہمارے ساتھ حسینؑ کا سر ہے جس وقت عامل نے خط پڑھا بچے بچوانے اور شہر سے باہر جا کر ملاقات کی۔ سر کی تفسیر ہوئی اور باب الریین سے داخل ہو کر سر مبارک کو زوال ظہر سے عصر تک رجبہ میں نصب کیا۔ اہل شہر کچھ روتے تھے اور کچھ ہنستے تھے۔ اور منادی جو رہی تھی کہ یہ خارجی کا سر ہے جس نے زید بن معلیہ پر خردج کیا تھا اس جگہ چل کر سر مبارک نصب ہوا تھا لوگ اپنی حاجات کی دعا میں مانگتے تھے دوسرے دن یہاں سے کوچ ہوا۔ اور حضرت علیؑ بن حسینؑ نے شعر فرمائے۔

پھر مند بن پہنچے۔ جس وقت اہل شہر کو خبر دی گئی ان لوگوں نے اپنے دروازے بند کر لیے۔ قاتلوں پر لعنت کی اور پتھر پھینکے۔ اور کہتے تھے کہ اسے فجار اسے قاتلان اولاد انبیاء ہمارے شہر میں تم داخل نہ ہو سکو گے۔ حضرت اُم کلثومؑ نے اشعار فرمائے۔

اس کے بعد معرۃ النہان میں آئے۔ یہاں ان کا استقبال کیا گیا۔ دروازے کھولے گئے اور کھانے پینے کا سامان ٹھہرایا گیا۔ یہاں دن کا بقیہ حصہ بسر کیا گیا۔ پھر یہاں سے شیراز (ما شیرزو) کی طرف گئے۔ اس جگہ ایک بڑھا رہتا تھا۔ اس نے کہا کہ اسے قوم یہ حسینؑ کا سر ہے۔ یہ سن کر لوگوں نے ماعت کی اور شہر میں داخل ہونے نہ دیا۔ لشکر زید نے یہ دیکھ کر داخلہ مناسب نہ سمجھا اور کفر طلب کی طرف بڑھا۔ یہ ایک چھوٹا سا قلعہ تھا۔ اہل قلعہ نے دروازے بند کر لیے۔ اس وقت خلی ان کی طرف بڑھا اور پوچھا کہ کیا تم ہماری اطاعت میں نہیں ہو۔ ہمیں ہانی پلاؤ۔ ان لوگوں نے کہا کہ واللہ ہم تمہیں ہانی نہ دیں گے۔ اس لیے کہ تم نے حسینؑ اور ان کے اصحاب کو ہانی سے منع کیا۔ یہ سن کر یہاں سے کوچ کیا اور سیور میں آئے۔ سیور میں کچھ لوگ اس صلاح کے موافق تھے کہ سردوں کو ہمارے شہر سے گزر جانے دیا جائے اور کچھ لوگ اس کے مخالف تھے۔ آخر الذکر گر وہ ہلی کی طرف بڑھا اور اسے کاٹ دیا۔ اور مسیح ہو کر لشکر زید کی طرف بڑھے۔ سخت جنگ ہوئی۔ ابن زیاد کے لشکر کے چھ سو آدمی مارے گئے اور اہل سیور کے پانچ شہید ہوئے۔ حضرت اُم کلثومؑ نے شہر کا نام پوچھا اور دعادی کہ یہاں کا ہانی شیریں اور نرغ ستار ہے اور قاتلوں کا ظہر نہ ہو۔

پھر کوچ ہوا اور عتف پہنچے۔ یہاں کے لوگوں نے بھی دروازہ بند کر لیا اور کہلوا دیا کہ تم اس وقت ہمارے شہر میں داخل ہو سکو گے جس وقت ہمارا آخر شخص قتل ہو جائے گا۔ یہ سن کر لشکر زید کوچ کر گیا اور حص پہنچا۔

پھر محسوس کی طرف چلے اور یہاں کے عامل خالد بن شعیب کو لکھا کہ ہمارے ساتھ حسین کا سر ہے۔ خطا کر اس نے شہر میں خبر مشہور کی اور زینت کا حکم دیا۔ لوگوں کو بلایا اور تین میل استقبال کے لیے گید جب یہ لوگ واپس آنے تو اپنی شہر نے پتھر مارنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ چھبیس آدمی مارے گئے اور دروازہ بند کر کے کہا کہ اسے گروہ تو ایمان کے بعد کافر ہو گیا اور ہدایت کے بعد گمراہ ہوا۔ لشکر یہاں سے بڑھا اور ایک قیس کے کنیہ کے پاس ٹھہرے۔ لوگوں نے اس سے بھی ممانعت کی اور ارادہ کیا کہ غلی کو قتل کر کے سرہانے مبارک شہدا کو اس سے چھین لیں۔ جب لشکر کو یہ خبر ملی تو وہاں سے بھی کوچ کیا۔ در آخر خلیفہ وہ سب ماتحت تھے۔

بلبلک آئے۔ (علاقہ کا شہر جہاں ان کے مشہور بت بعل کا مندر تھا) اور حاکم شہر کو اطلاع دی کہ ہمارے ساتھ حسین کا سر ہے۔ اس نے شہر میں خبر دی۔ دفت اور بوق بجانے۔ اور لشکر کے لیے آب و علوٹہ چھینا کیا۔ حضرت ائمہ کثومؑ نے شہر کو بد دعا دی۔

یہاں سے چل کر یہ سب ایک موسم کے پاس آئے۔ حضرت زین العابدینؑ نے اشعار فرمائے۔

هو الزمان فاقا تقى عجائبه عن الكرام و لا تهدى مصائبه

یہ وہ زمانہ ہے کہ اس کی نیرنگیوں شرف سے دور نہیں ہوتیں اور نہ مصیبتیں کم ہوتی ہیں

قلیت شعری الی کم بشارتنا بصرفہ و الی حکم خواربہ

کیا معلوم کہ تک زمانہ ہم سے لڑے گا۔ اور اس کی گردش سے کب تک ہمیں لڑنا پڑے گا

کھرتو برسول اللہ ویکم یا امۃ السوء ما هذا مذاہبہ

دل ہو تم پر تم نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ احسان فراہمی کی اسے بری امت یہ کیسے طریقے ہیں

کہا گیا ہے کہ راہب پر فرق مظہر کا ایسا اثر پڑا کہ وہ اس سے نور ساطع دیکھ رہا تھا اور کچھ آوازیں سن رہا تھا جو

طائفہ کی صدائیں قیاس کی گئیں اور وہ اس سر پر سلام بھیج رہے تھے۔ صبح کو جب روانہ کا شور مچا تو راہب نے اہل

لشکر سے ان کے سردار کانام پوچھا اور غلی بن زید کانام بتایا کیا اس نے پوچھا کہ تمہارے ساتھ کیا ہے۔ لوگوں نے

کہا کہ یہ ایک خارجی کا سر ہے جس نے عراق میں فروج کیا تھا اور اسے عبید اللہ بن زیاد نے قتل کیا۔ راہب نے نام

پوچھا۔ بتایا گیا کہ حسین نام تھا۔ راہب کانام علی بن ابی طالب، اس کانام طاہر الزہراءؑ اور کانام محمد مصطفیٰ تھا۔ راہب نے

کہا: کچھ کہا تھا احبار نے کہ اس شخص کے قتل پر آسمان سے خون برسے گا۔ پھر اس نے کہا کہ آیا یہ ممکن ہے کہ مجھے تم پر

سر تھوڑی دیر کے لیے دیدہ۔ پھر میں تمہیں واپس کر دوں گا۔ غلی نے کہا کہ یہ یزید کے اور کسی کے پاس نہیں کھولا جائے

گا۔ اور اس سے جائزہ لیا جائے گا۔ راہب دس ہزار درہم دینے پر آمادہ ہوا۔ اور یہ لوگ راضی ہو گئے۔ راہب نے فرق

مظہر کھولا۔ رویا اور کہنے لگا کہ: "اے ابا عبد اللہ! اپنے جد بزرگوار کے سامنے میرے کلمہ شہادتین کی گواہی دیجیے گا۔" اور

تھوڑی دیر کے بعد واپس کر دیا۔ اس کے بعد کی روایت ہے کہ جب غلی نے یہ روپیہ تقسیم کرنے کا ارادہ کیا تو دیکھا کہ وہ

سب ٹھیکریاں تھیں اور ان پر و سَعِلَمَ الَّذِیْنَ ظَلَمُوا اَآیَ مَنْقَلَبٍ یَّقْلِبُوْنَ (۲۷: ۲۷) (عزیم ظالموں کو اپنا

انجام معلوم ہو جائے گا) لکھا تھا۔ سہل شہر وزی کہتا ہے کہ میں نے ہاتھ کو کہتے سنا کہ: نہ

۱۰۰ اجرو امہ قتلت حسینا شفاعۃ جدہ یوم الحساب
 کیا وہ گدہ کہ جس نے حسینؑ کو قتل کیا قیامت کے دن ان کے نانا کی شفاعت کی امید کر سکتا ہے
 اس روایت کو اکثر مؤرخین نے مثل ابواسحاق اسفرائینی، ابو یوسف اور صاحب موافق نے بھی نقل کیا ہے۔
 صاحب موافق عقد کے موافق راہب نے نام وغیرہ سن کر کہا: ”تم پر افسوس ہے۔ اگر عیسیٰ کی کوئی اولاد ہوتی تو ہم
 اسے آسمانوں میں بٹھاتے تم کیسے برے آدمی ہو کہ اپنے رسولؐ کے فرزند کو تم نے شہید کیا۔“ اس کے بعد روپیہ دیا اور
 سر کو لے کر غسل دیا۔ خوشبو سے منظر کیا اور گود میں رکھ کر روتا اور دعائیں مانگا رہا۔ پھر مسلمان ہو گیا اور مسلمان
 ہونے کی وجہ یہ تھی کہ اس نے سر منظر سے ایک نور کو آسمان کی طرف ساطع دیکھا مسلمان ہونے کے بعد اس نے دیر کی
 سکونت ترک کی اور اہل بیتؑ کی خدمت میں رہا۔

روضۃ الشہدا اور نور العین میں ان منازل کے واقعات میں یہ زیادہ ہے کہ قسریں میں اہل شہر نے نہ آنے دیا۔ یا
 کہا کہ اگر تم آؤ گے تو تم سے لڑیں گے۔ اور لشکر یزید نہ جاسکا۔
 روضۃ الشہدا کے موافق نصیبین پر بجلی گری اور شہر کے بڑے حصہ کو نقصان پہنچا اس سے لشکر داخل نہ ہوا۔ اور
 ایک مقام پر دو بھائیوں میں جو دروازہ ہانے شہر پر متعین تھے اس بات پر جھگڑا ہوا کہ کس کے دروازہ سے لشکر داخل ہو،
 اور اس خانہ جنگی سے لشکر یزید نے داخل ہونا مناسب نہ لکھا۔

اسی مؤرخ کے موافق جب قافلہ قریب حلب پہنچا تو اس کے قریب ایک پہاڑ تھا جس پر ایک قلعہ تھا اور اس کا نام
 عمورہ تھا یہاں کا کوئل عزیز بن ہارون تھا۔ یہ اور تمام اہل قلعہ یہودی تھے اور حرر بنتے تھے۔ لشکر جب پہاڑ کے نیچے
 ٹھہرا تو شیریں جو اہل بیتؑ کے ساتھ تھی اس نے اپنی ملکہ حضرت شہر بانو کو باحال تباہ دیکھ کر نہایت افسوس کیا اور اس کے
 پاس کچھ چیزیں بچ رہی تھیں اس سے اس نے ارادہ کیا کہ فروخت کر کے کچھ کپڑے خریدے۔ شیریں دروازہ حصار پر آئی۔
 پکارا۔ دروازہ کھولا گیا۔ اہل قلعہ نے حال پوچھا۔ بتایا۔ (یہ بھی لکھا گیا ہے کہ عزیز ایک خواب کی بنا پر مسلمان ہو گیا تھا اور
 اسے اسی عالم میں یہ کل واقعات بتائے گئے تھے) عزیز لشکر کے قریب آیا اور اپنے ساتھ کپڑے لایا۔ موکلوں کو ہزار درہم
 رشوت دی کہ یہ کپڑے اہل بیتؑ رسالت کو دیے جاسکیں۔ اور لشکر کے منظور کرنے پر عزیز خدمت امام سید الساجدین
 میں حاضر ہوا اور یہ چیزیں بعد عزد واصل پیش کیں۔ امام نے قبول فرمائیں اور حضرت شہر بانو نے شیریں سے فرمایا کہ اگر تو
 میری خوشی چاہتی ہے تو عزیز کو اپنے شوہر میں قبول کر اور اس کے بعد شیریں کا عزیز سے عقد کر دیا گیا۔

اسی مؤرخ کے پاس عسقلان کے متعلق یہ قصہ بھی ہے جو میری نظر سے ہمیں اور نہیں گزرا صرف اس واقعہ کے بعض
 کٹڑے بلا تعین شخص اور مقام اور وقت ملتے ہیں لہذا وہ یہ ہے کہ جب یزید کا لشکر عسقلان کے پاس پہنچا تو یعقوب عسقلانی
 نے جو لشکر یزید کے ساتھ کر بلا میں تھا اور یہاں کی حکومت اس سے متعلق تھی شہر کی آرائش کا حکم دیا اور سالن نانے و
 نوش مہینا کیے۔ جس وقت اہل بیتؑ اور سرہانے شہدا گزر رہے تھے ایک سوداگر جس کا نام زریر جو اہل بیتؑ کے
 بازار میں کھڑا تھا۔ یہ حالت دیکھ کر زریر نے کسی سے واقعہ دریافت کیا۔ اور اس نے حسب معمول کہا کہ یہ یزید کے
 مخالفین کا سر ہے جنہوں نے غروج کیا تھا اور یہ عورتیں جو ہود جوں میں ہیں اسی کے اہل بیتؑ ہیں۔ زریر نے پوچھا کہ

یہ جماعت مسلمان تھی یا مشرک۔ جواب ملا کہ مسلمان تو تھی لیکن باغی تھی۔ زیر نے دریافت کیا کہ خروج کی کیا وجہ تھی۔ کہا کہ ان کا سردار کہتا تھا کہ میں امامت کے لیے زید سے سزاوار تر ہوں۔ زیر نے نام و نسب پوچھا اور جب معلوم ہوا تو زمانہ اس کی آسمانوں میں تاریک ہو گیا اور یہ حضرت امام زین العابدین علیہ السلام کے خروج کے قریب گید امام کو دیکھ کر بے ساختہ اس کی آسمانوں سے اُتو نکل پڑے۔ امام نے دریافت فرمایا کہ تو کون ہے۔ اس نے کہا میں یہاں مسافر ہوں۔ پوچھا تمام شہر ہنس رہا ہے تو کیوں رو رہا ہے۔ کہا: اس لیے کہ میں آپ لوگوں کو پہچانتا ہوں۔ کاش میں یہاں نہ ہوتا کہ یہ حال نہ دیکھتا افسوس میں اپنے وطن اور قبیلہ سے دور ہوں، ورنہ کچھ کرتا کہ یادگار رہتا۔ امام نے فرمایا کہ تجھ سے بونے ایک جیتی آئی ہے۔ زیر نے انجاکا کہ مجھ سے کسی امر کے متعلق فرائض کی جانے۔ امام نے فرمایا کہ وہ شخص جو میرے پدر بزرگوار کے فرق مظہر کو اودھنوں کے عازی لے جا رہا ہے اس سے کہو کہ وہ آگے بڑھ جانے کہ لوگ اس کے دیکھنے میں مشغول ہو جائیں گے اور ہماری عورتیں حجاب میں رہیں گی۔ زیر بڑھا اور موکل سر کو پچاس دینار رشوت دے کر آگے آگے چلنے پر راضی کیا۔ اور دوبارہ گزارش کر کے کچھ پڑے پیش کش کیے۔ (یہی روایت سہل شہر دوزی کے متعلق بھی ہے) اس وقت غل و شور مٹانی دیا اور زیر نے دیکھا کہ شمر ایک جماعت کے ساتھ شراب کے نشہ میں مدہوش اچھلتا کودتا چلا آتا ہے۔ زیر کی حمیت اسلام اور غیرت دینی میں جوش آیا اور اس نے اسے روک کر ملامت کی۔ شمر نے اپنے آدمیوں سے کہا کہ اسے مارو۔ سبوں نے حملہ کیا اور اپنے دانت میں مردہ کچھ چھوڑ دیا۔ آدمی رات کو زیر کو ہوش آیا۔ اٹھا۔ کوئی دکھائی نہ دیا۔ چلتے چلتے ایک گورستان میں پہنچا۔ دیکھا کہ ایک جماعت سر دھار بہنے اندوہناک اور منہموم کھڑی ہے۔ زیر نے پوچھا کہ اہل شہر خوشی کر رہے ہیں تم کیوں اس حال میں ہو۔ ان لوگوں نے کہا کہ یہ دشمنوں کی خوشی کا دن ہے اگر تو دشمنوں میں ہے تو چلا جا۔ زیر نے اپنا حال بتایا اور دکھایا۔ یہ لوگ غم و غصہ سے کہہ رہے تھے کہ کاش ہم کربلا میں ہوتے اور دشمنوں سے انتقام لیتے۔ اس کے بعد زیر نے اپنا مال فروخت کر کے گھوڑا اور اسلحہ خریدا اور ایک سو دس آدمیوں کے ساتھ روز جمعہ خروج کیا۔ خطیب کو قتل کر ڈالا اور داروغہ شہر کو گرفتار کر لیا۔ ابی عتف کے موافق جس روز سمرائے شہد اداخل دمشق ہوئے اس روز دود کاہنیں بند تھیں اور لوگ نشہ میں پھر رہے تھے۔ اس وقت ایک شخص زید کے پاس گیا اور کہا کہ اے خلیفہ تیری آنکھیں ٹھنڈی ہوں۔ زید نے پوچھا کس چیز سے۔ کہا حسین کے سر سے۔ زید نے کہا: تیری آنکھیں ٹھنڈی نہ ہوں۔ یہ کہہ کر اس کے جس کا حکم دیا اور ایک سو بیس نشان فوج بھیجے کہ وہ حسین کے سر مبارک کے آگے آئیں۔ اس وقت ان نشان فوج کے ساتھ تکیے کی جارہی تھی کہ کسی نے (افسوس کے تابین میں سے) کہا:

جاؤ برا سگ یا بن بنت محمد مرملا ہدماہ ترمیلا
اے دختر رسول کے فرزند تیرا سر لے کر آئے ہیں جو اپنے خون میں لہڑا ہوا ہے
فکانما بک یا بن بنت محمد قتلوا جماراً حامدین رسولا
اے فرزند بنت رسول تیرے قتل سے گویا طانیہ عمار رسول کو قتل کیا
و یکبوں اذا قتلت و انما قتلوا بک التکبیر و التہلیل

وہ اس پر مغرور ہیں کہ حج کو قتل کیا جا رہا ہے کہ تیرے ساتھ تکبیر اور تہلیل کو قتل کر ڈالا
سہل کہتا ہے کہ لوگ دروازہ خیزران سے داخل ہوئے۔ آگے آگے اٹھایا سر تھے اور قیدی بغیر رقعہ درواتھے۔
حضرت کا سر مبارک شمر کے ہاتھ میں تھا اور وہ کہتا جاتا تھا کہ میں لمبے نیزہ والا ہوں۔ میں نے ابن سید الاصبین کو قتل کیا
ہے اور ان کا سر امیر المومنین کے پاس لے کر آیا ہوں۔

سہل کہتا ہے کہ ایک لڑکی لوٹ پر مٹی تھی اور واعظیہ واجدہ واعلیہ والبتاہ واحسینہ واعقیلہ واعباسہ
وابعدسفرہ (کسی دوری سفر ہے) گنتی تھی۔ پس میں اس کے قریب گیا اور کہا کہ اے سیدہ آپ کا کوئی
حکم ہے۔ لڑکی نے بلند آواز سے کہا کہ کیا تجھے خدا درویش سے حیا نہیں ہے کہ تو رسول کے حرم کی طرف دیکھتا ہے۔ میں
نے کہا کہ واللہ میں تمہاری طرف قابل اعتراض نگاہ سے نہیں دیکھ رہا ہوں۔ کہا تم کون ہو۔ میں نے کہا کہ میں سہل بن
سعدی شہر زدوی ہوں۔ میں تمہارا دوست ہوں۔ اس کے بعد میں علی بن الحسین کے پاس گیا اور عرض کی کہ اے مولا کیا
آپ کی کوئی خواہش ہے۔ فرمایا کہ تیرے پاس کچھ درہم ہیں۔ میں نے کہا ایک ہزار دینار۔ آپ نے فرمایا کہ اس میں کچھ
مائل سر کو دے کہ وہ عورتوں سے کچھ دور ہٹ کر چلے کہ لوگ اس کے دیکھنے میں مشغول ہوں۔ سہل نے ایسا ہی کیا اور
حضرت نے دعا دی۔

اسرائیل اہل بیت اور ایک بوڑھا صاحب لہو فماتے ہیں کہ جب امیر ان پاک و ذریت
رسول خدا در مسجد پر کھڑے تھے ایک مرد پیر ان کے
قریب آیا اور کہنے لگا شکر ہے کہ تم کو خدا نے پاک و تہ کیا اور شہروں کو تمہارے مردوں سے پاک کیا۔ غلیظہ وقت کو
تم پر قابو دیا۔ اس وقت امام زین العابدین نے فرمایا:

زین العابدین: اے مرد پیر تو نے قرآن پڑھا ہے؟

مرد پیر: ہاں پڑھا ہے۔

زین العابدین: تو اس آیت کو جانتا ہے: قُلْ لَا اسْتِغْنٰكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوْذِعُ فِي الْقُرْآنِ (۲۲: ۲۲)

مرد پیر: ہاں اس کو خوب پڑھا ہے۔

زین العابدین: تو اب جان لے کہ قرنی رسول اللہ کے نہیں ہیں۔ اور مرد پیر تو نے سورہ بنی اسرائیل میں یہ آیت پڑھی

ہے: وَاتِّذَا الْقُرْآنِ حَقُّهُ (۱۷: ۱۷)

مرد پیر: ہاں ضرور پڑھی ہے۔

زین العابدین: اے مرد پیر وہ ذی القرنی نہیں ہیں۔ اے مرد پیر تو نے یہ آیت بھی پڑھی ہے: وَاعْلَمُوا اَنَّمَا

غَنِمْتُمْ مِنْ شَيْءٍ قَاتٍ اِنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهُ وَلِلرَّسُولِ وَلِذِي الْقُرْبٰی (۹: ۹)

مرد پیر: ہاں پڑھی ہے۔

زین العابدین: اے مرد پیر وہ ذی القرنی نہیں ہیں۔ اے مرد پیر تو نے یہ آیت بھی پڑھی ہے: اِنَّمَا يُبَيِّنُ اللّٰهُ

لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا (۳۳: ۳۳)

مرد پیر: ہاں بڑی ہے۔
 زین العابدین: اسے مرد پیر ہم وہی اہل بیت ہیں جن کی شان میں خاص کر یہ آیت طہارت اتری ہے۔ پس یہ سن کر وہ مرد پیر نہایت تلام و تحمل ہوا اور چپ ہو گیا۔

ابراہیم بن طلحہ اور امام
 صاحب مانع التواریخ یہ روایت لکھتے ہیں کہ ابراہیم بن طلحہ بن عبد اللہ نے جب سنا کہ قیدی آتے ہیں تو یہ دوڑا اور حضرت یار کر بلا سے پوچھا:
 اے علی بن الحسین کون غالب آیا؟ یہ سن کر حضرت نے جو محل میں اس وقت سر جھکانے تھے سر اٹھایا اور منہمایا:
 ”اگر تو جانتا چاہتا ہے کہ کون غالب ہوا تو نماز کے وقت اذان اور اقامت کہہ۔“

سر مبارک طشت میں
 شمر اس طرح زینید کے سامنے پہنچا کہ حضرت کا سر مبارک نیزہ پر قتلہ زینید نے طشت میں رکھے جانے کا حکم دیا۔ طشت زینید کے قریب رکھا گیا اس وقت وہ لشہ میں قتلہ اہل بیت اور دیگر سرہانے شہدائے گئے اور ایک ایک کا حال بیان کیا جانے لگا۔

زینید کے سامنے معرکہ کر بلا کا طریقہ بیان
 بقول ابن غلدون زجر بن قیس نے کہا: ”امیر المومنین کو فتح و نصرت کی بشارت دینے آیا ہوا۔“

حسین بن علی مع اشارہ نفر اپنے اہل بیت اور ساتھ آدمی اپنے معاونین و انصار کے وارد کوفہ ہوئے۔ ہم لوگ یہ سن کر جلو گیری کے خیال سے ان کی طرف گئے اور یہ امر کہ امیر المومنین کی بیعت کریں یا برسر جنگ آئیں پیش کیا۔ انہوں نے دوسری مشق اختیار کی پس لوگ بھی مستعد بیٹھ ہو گئے۔ چنانچہ آفتاب کے بلند ہوتے ہی ہم لوگوں نے ان کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ پس جب کہ چلتی ہوئی تلواروں اور نوکدار نیزوں نے ان کو اپنے محاصرہ میں لے لیا تو جان بچا کر گڑھوں اور ٹیلوں اور درختوں کی طرف بھاگنے لگے جیسا کہ باز کے خون سے کبوتر بھاگتا ہے۔ واللہ ان کے اس بھاگنے نے ان کو کچھ کام نہ دیا۔ ہماری تیرہ تلواروں نے ان کو فرش زمین پر موت کی نیند سلا دیا۔ ان کی لاشیں بے گور و کفن اسی میدان میں پڑی ہیں۔ جن کے بدنوں پر نہ تو کوئی کپڑا ہے اور نہ اس پر سایہ اگر سایہ ہے تو آفتاب کا ہے اور کپڑا ہے تو ریگ کا۔ یہ بیان کی تیرہ تیرہ ہوائیں ان کو الٹ پلٹ کر کھٹکلا رہی ہیں۔ ان کی زیارت کرنے والے وحشی اور درندے جانور ہیں۔ ان پر دم کرنے والے قرب و جوار کے کتے اور گدے ہیں۔“ اس خبر کے سننے سے زینید کی آنکھیں پر اشک ہو گئیں۔ بولا: میں تم لوگوں سے بغیر قل حسین کے بھی راضی ہو جاتا۔ اللہ تعالیٰ کی لعنت ابن سمیہ پر جو خدا کی قسم اگر میں اس کی جگہ پر ہوتا تو میں حسین سے درگزر کرتا۔ اللہ تعالیٰ حسین پر اپنی رحمت نازل کرے۔ زینید یہ کہہ کر خاموش ہو گیا اور زجر کو کچھ صلہ نہ دیا۔
 زینید کی دورنگی اسی جگہ صاحب صواعق عرقہ کی اس روایت کا نقل کرنا حقیقت فنی میں مدد دے گا کہ:
 ”سبط ابن جوزی وغیرہ اوگفتہ اند کہ مشہور است کہ زینید اہل شام راجع نمودہ خبر کردہ و

سر حسین را در مجلس نہادہ عصا از چپ خیزہ ران کہ در دست داشت دران میگوشت و جمع میان این دو قول (زینید کا ابن سمیہ پر لعنت وغیرہ کرنا) بایں طریق کردہ اند کہ احتمال دارد کہ زینید بحسب ظاہر انکار بر ابن زیاد و ترم بر حسین کردہ و امان در خلوت عمل ثانی از دے صلار شدہ بقریبہ آنگہ مبالغہ تمام در تعظیم و ترفع ابن زیاد کرد حتی آنکہ

دیرا ہندرون خانہ خود کہ زنان می بودند طلب می نمود۔ یعنی: سہل ابن جوزی وغیرہ نے کہا ہے کہ مشہور ہے کہ زبید نے شام والوں کو جمع کر کے خبر سنائی اور سر حسینؑ کو دربار میں رکھا۔ خیزران کی چٹری سے جو اس کے ہاتھ میں تھی اس میں ضرب لگاتا تھا۔ ان دو قلوں میں مہج اس طرح سے کی گئی ہے کہ احتمال ہے زبید نے ظلمہ ابن زیادہ کے کام کو ناپسندیدہ کہا ہو اور حسینؑ کے لیے کلہ رجم کہا ہو۔ لیکن غلوت میں دوسرا کام اس سے ملور ہوا ہو، اور اس کا قرینہ یہ ہے کہ ابن زیاد کی تعظیم اور اس کے درجہ کو بڑھانے میں زبید نے مبالغہ کیا۔ حتیٰ کہ اسے اپنے اندرون خانہ میں جہاں عورتیں تھیں بلوایا۔

جس وقت زبید اپنے اس مکروہ فعل میں جگتا تھا اس کے اکثر اشعار اپنی خفت اور نورالہین وغیرہ میں درج ہیں، جے حسن میاں چلواری نے ”غم حسینؑ“ میں تفسیر روح المعانی، احکام کتب الاشراف، وسیلۃ النجاة اور معراج النجاة سے نقل فرمایا ہے۔ ابی خف میں یہ اشعار مروان کی زبانی اور پھر آگے چل کر زبید کی زبانی اور نورالہین میں بہ اشکاف الفاظ زبید کی زبانی منقول ہیں۔

زبید کے اشعار حرکت اور ابوبرزہ اسلمی

یا حبذا برونک فی البدین و لو نکت الاحمر فی الخدین
ان کا حسن ہاتھوں سے جلوہ گر ہے اور اس کے رخساروں کا رنگ سرخ ہے
شغیت نفسی من دم الحسین اخذت ثاری و قضیت دینی
میرے قلب کو حسینؑ کے خون سے تسکین ملتی تھی میں اپنا بدلہ لیا اور فخر ادا کیا
یا لیت من شاهد فی حنین بیرون فعلی الیوم بالہسین
کاش وہ لوگ جو حنین میں تھے آج حسینؑ کو دیکھتے
زبید یہ اشعار پڑھتا ہوتا تھا اور حسینؑ کے دندان مبارک کو چٹری سے کبیر رہا تھا کہ ابوبرزہ اسلمی صحابی سے نہ دیکھا گیا اور انہوں نے بھی قریب قریب وہ الفاظ کہے جو زبید بن ارت نے ابن زیاد سے کہے تھے زبید نے حکم دیا کہ اسے دھکے دے کر باہر نکال دو۔
اس وقت دیوار قصر ایک کوا چننے لگا معلوم ہوتا ہے کہ زبید نے اس سے
زبید کے اور اشعار

یا غراب البین ما شئت فعل انما تنذب امر قد فعل
اے کوس تیرا جو بی چاہے کہہ جو کچھ ہوتا تھا وہ ہو گیا
لیت اشیائی بہدر شہدوا مصرع الخرج من وقع الاسل
کاش میرے وہ بزرگ جو جنگ بدر میں تھے قریح کا (کریا میں) تیروں سے پھٹا ہوتا دیکھتے۔
فاہلوا و استملوا فرحاً ثم قالوا یا یزید لا تشل
مارے خوشی کے ان کی ہاتھیں کھل جاتیں اور وہ کہتے کہ اے زبید تیرے ہاتھ شل نہ ہوں
قد قتلنا القوم من ساداتهم و عدلنا بہدر فاعتدل

ہم نے ان کی قوم کے بزرگوں کو قتل کیا بدر کا بدلہ لیا اور بدلہ برابر ہو گیا
 لعبت ہاشم بالملک فلا خبر جاء و لا وحی نزل
 ہاشم نے ملک کے ساتھ کھیل کھیلا نہ کوئی خبر آئی حتی نہ وہی نازل ہوئی حتی
 لست من خلف ان لم انتقم من بنی احمد ما کان فعل

میں خدمت سے نہ ہوں اگر بدلہ نہ لوں بنی احمد سے جو کچھ انھوں (احمد) نے کیا تھا
 ان اشعلہ کو نوٹ کرنے کے بعد مولوی حسن میاں صاحب پھلواروی ”محم حسین“ میں منسلک ہیں کہ:
 ”اسی علیہ امام احمد بن حنبل اور ابن جوزی اور دیگر اکابرین محدثین زید مرتد کے ایمان ہی کے قائل نہیں۔“
 اس وقت صاحب لہوت کے موافق: ”روایت ہے“
 دربار زید میں حضرت زینبؓ کا خطبہ

فقرات نوٹ کرتا ہوں: ”اے زید تیرا گمان ہے کہ تو نے زمین و آسمان کو ہم پر تنگ کر دیا۔ ہم ذلیل ہوئے اور تو عزیز
 ہوا۔ اس پر خوش نہ ہو کہ دنیا تیرے لیے درست ہو گئی اور تیرے سب امور ٹھیک ہو گئے اور ملک تیرا ہو گیا صبر کر۔ کیا
 تو ارشاد خدا بھول گیا؟ لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا مُعْجِزِينَ فِي الْأَرْضِ، وَمَا لَهُمْ فِي النَّارِ وَلَا يَنْفُسُ الْمُؤْمِنِينَ
 (۵۷: ۲۴) (اور وہ لوگ یہ نہ سمجھیں جنھوں نے کفر کیا کہ ان کے نفوس کے لیے اچھا ہوا۔ بلکہ ان کا کفر اور گناہ بڑھ گیا
 اور ان کے لیے برا احزاب ہے) ان لوگوں سے کیا امید ہو سکتی ہے جنھوں نے پاکبازوں کا جھگڑا کیا جو جن کا گوشت خون
 شہدائے پلہ ہوں تو اپنے بزرگوں کو بلاتا ہے اور گمان کرتا ہے کہ وہ سن کر آویں گے۔ ارے حزیب تو بھی دہلی جانے کا
 چہاں وہ ہیں۔ اس وقت تو آرزو کرے گا کہ کاش میں لٹ جاتا کہ جو کچھ میں نے کیا نہ کرتا۔ اور جو کچھ کہا نہ کہتا تو مومنین کی
 گردنوں پر مسلما ہوا ہے بہت جلد تجھے معلوم ہو گا کہ ظالموں کے لیے برابر ہے۔ اگرچہ تجھ پر مصیبتیں پڑی ہیں لیکن میں تجھ
 سے کہتی ہوں کہ میں تیری قدر کو ذلیل جانتی ہوں اور تیری شان و شوکت کو خیر سمجھتی ہوں۔ اور تیری سرزنش کو دشوار جانتی
 ہوں۔ تعجب ہے کہ شرک و انجرام دین خدا اگر وہ شیاطین کے ہاتھ سے قتل کیے جائیں۔ خدا نے تعالیٰ بندوں پر ظلم نہیں کرتا۔ خدا
 ہی سے میری شکایت ہے اور اسی پر مجھ دوسا ہے۔ تو مکر کر جو مکر کر سکے اور کوشش کر جو کر سکے۔ بخدا تو ہمارے ذکر کو نہیں
 مٹا سکتا ہماری شرع کو تو مٹا نہیں کر سکتا ہماری درازی مدت کو نہیں پاسکتا اور اس تنگ و حار کو اپنے سے دور نہیں
 کر سکتا حکم ہے خدا کا جس نے نیکی اور بخشش سے ہمارے اول کا خاتمہ اور آخر کا رحمت اور شہادت سے انجام ہوا۔
 یہ سن کر زید نے یہ شعر پڑھا۔

يا صبيحة محمد من صوايح ما اهل الموت على النوايح
 سوگوار عورتوں کا نالہ و فغان اچھا معلوم ہوتا ہے اور نوحہ گری سے ان کی موت آسان ہے
 اس وقت قبول ابی حنیفہ اور کامل بن اشیر: ہمسند بنت عبد اللہ بن عامر بن کریم جو زید کی بی بی تھی اور جسے یہ بہت چاہتا
 تھا چادر اوڑھ کر دربار میں چلی آئی اور حسینؓ کا سر مبارک دیکھ کر چیخ اٹھی اور پوچھا: ”یہ کس کا ہے؟“
 زید نے کہا کہ: ”حسینؓ بن علیؓ بن ابی طالبؓ کا سر ہے۔“ ہند روئی اور کہا: ”اے زید خدا تجھے زلزلے میں علیؓ

واقفہ کے سرزند کا سر تیرے سامنے دیکھ رہی ہوں۔ تو نے جو کچھ کیا اس سے اللہ و رسول کی لعنت کا مستوجب ہوا۔ واللہ اب نہ میں تیری زوجہ اور نہ تو مسیحا شوہر ہے۔“ زید نے کہا: ”تجھے فاطمہ سے کیا کام؟“ ہند نے کہا کہ: ”ان کے باپ، علی اور ان کے فرزند کی بدولت اللہ نے ہماری ہدایت کی اور ہمیں یہ کپڑا پہنایا۔ اے زید تو کس قسم سے اللہ اور اس کے رسول سے ملاقات کرے گا؟“ یہ کہہ کر وہ روتی ہوئی باہر نکل گئی۔

ابی مخنف میں یہ بھی لکھا ہے کہ جس وقت زید خوشی میں تھا اور شراب پی رہا تھا کہ اس اہلوت داخل ہوا۔ (نورالعین کے موافق یہ ایک یہودی تھا اور زید کا طبیب تھا) اس نے زید کے سامنے ایک سر رکھا ہوا دیکھا اور پوچھا کہ: ”یہ کس کا سر ہے؟“ کہا: ”حسین بن فاطمہ بنت غنم کا سر ہے۔“ پوچھا کہ: ”یہ کیوں مستوجب قتل ہوا؟“ زید نے کہا کہ: ”اس لیے کہ اہل عراق نے اسے بلایا کہ اپنا خلیفہ بنائیں۔ اور میرے حامل غیب اللہ بن زیاد نے قتل کیا۔“ اس اہلوت نے کہا کہ: ”اس سے زیادہ متحق خلافت کون تھا اس لیے کہ وہ تمہارے نبی کی دختر کا فرزند تھا۔ جان لے زید کہ محمد میں اور داؤد میں ایک سویا لیس پستیں گزری ہیں۔ لیکن یہود اب تک میری عزت کرتے ہیں۔ میرے قدم کی خاک کو تبرج اٹھاتے ہیں۔ اور تمہارا حال یہ ہے کہ کل تمہارا نبی تمہارے سامنے تھا اور آج تم نے اس کی اولاد کو قتل کر ڈالا۔ تمہارا دین کیا ہے؟“ زید نے کہا کہ: ”اگر رسول نے یہ نہ کہا ہوتا کہ ”جو شخص کسی معہد کو قتل کرے گا میں بروز قیامت اس کا دشمن ہوں گا۔“ تو میں تجھے قتل کر ڈالتا۔“ اہلوت نے کہا کہ: ”اے زید رسول ایک معہد کے لیے قیامت میں تیرے دشمن ہوں گے۔ لیکن کیا اپنی اولاد کے قتل پر تیرے دشمن نہ ہوں گے۔ اس کے بعد وہ سر مبارک سے مخاطب ہو کر کہنے لگا کہ: ”یا ابا عبد اللہ آپ اپنے جد بزرگوار کے سامنے میرے کلمہ شہادتین کے گواہ ہو جائیے گا۔“

یہ سن کر زید نے کہا کہ: ”اب تو اپنے دین سے نکل گیا اور دین اسلام میں داخل ہوا۔ اب میں تیرے خون سے بری ہوں۔“ یہ کہہ کر اس کی گردن مارنے کا حکم دیا۔

ایسی ہی روایت جاثیق نصرانی کی ہے۔ اور ایسی ہی ہم مفہوم روایت ایک کنیزی کی بھی ہے۔ اس کنسینہ نے جاثیق کی طرح بعض مافوق الطورت مناظر دیکھے تھے۔ نورالعین کے موافق زید نے اس کے قتل کا حکم دیا اور ایک عیسائی نے اسے قتل کر ڈالا۔

کامل ابن اثیر کے موافق حضرت کا سر مبارک عورات کی نگاہ کے سامنے نہ تھا۔ جب ان لوگوں نے گردن اٹھا کر دیکھا تو روئیں اور زید کی عورتیں بھی روئیں۔

جس وقت اہل بیت زید کے سامنے کھڑے تھے اور ایک ایک بی بی کا نام لیا جا رہا تھا زید نے کہا: ”ایسا تم کثوم خدا نے تمہارے ساتھ کیا کیا؟“ فرمایا: ”اے ابن طلق تیرے حرم میں پردہ بیٹھے ہیں اور رسول اللہ کے حرم بغیر پردہ کے ہیں۔“ جنہیں ہرنیک و بدیہود و نصاریٰ دیکھ رہے ہیں۔ زید غصہ میں آیا۔ لیکن بعض مصاحبین نے کہا کہ: ”یہ عورتیں ہیں، ان سے مواخذہ نہ کر۔“ اب زید نے حضرت سکینہ کی طرف سر اٹھایا اور کہا کہ اے سکینہ تیرے باپ نے امر خلافت میں مجھ سے نزاع کی اور قطع رحم کیا۔ حضرت سکینہ کا دل بھر آیا اور فرمایا: ”اے زید میرے باپ کے قتل پر خوش نہ ہو۔ وہ بندہ خدا تھا۔ خدا نے اہل طلب کیا اور انہیں قبول فرمایا اور اس وجہ سے اپنے لیے نیک ٹھہرایا۔“

لیکن تو اسے زید خدا کے نزدیک متحقّیٰ عقوبت ہوا۔ اب اپنے نفس کو جواب کے لیے تیار رکھ۔ زید نے کہا: ”چپ رہو اے سکینہ! حسینؑ کا کیا حق تھا؟“ انھوں نے زیہدائی کی اور اللہ نے انھیں عاجز کیا اور مجھے نصرت دی۔“

اس کے بعد ایک واقعہ ہے اکثر مؤرخین نے لکھا ہے جن میں میں ابی عتف کاہل ابن اثیر، نور العین اور ناخ التواریخ کا نام لیتا ہوں۔ اور وہ یہ ہے کہ اس وقت ایک شای کھڑا ہوا اور اس نے کہا کہ: ”اے زید میری خواہش ہے کہ تو اس طرکی کو مجھے دیدے کہ وہ میری خلامہ ہوا۔“ (بعض میں سکینہ، بعض میں فاطمہ مغزی کے متعلق ہے) حضرت سکینہؑ حضرت اُمّ کلثومؑ سے لپٹ گئیں۔ اور فرمایا کہ اے بھوجی کیا آپ نہیں دیکھتی ہیں کہ یہ ملقون کیا کہتا ہے۔ کیا اولاد انبیاء بھی خلاموں کی طرح تقسیم ہو جاتی ہے۔ حضرت اُمّ کلثومؑ یا حضرت زینبؑ نے فرمایا: ”چپ رہ لے ذلیل، بنات انبیاء خلامہ نہیں ہوتیں۔ اس کا نہ تجھے اختیار ہے نہ زید کو۔“ زید نے کہا: ”جھوٹی ہے تو مجھے اختیار ہے۔“ حضرت نے فرمایا: ”ہرگز تیرے اختیار میں نہیں ہے۔ جب تک ہماری ملت سے نکل کر دوسرے دین میں داخل نہ ہو۔“ زید غصہ میں آیا اور کہا: ”تو یہ کہتی ہے۔ تیرا باپ اور بھائی دین سے نکل گیا تھا۔“ حضرت نے فرمایا: ”میرے باپ اور بھائی کے دین سے تیرے باپ دادا لے ہدایت پائی۔“ زید نے کہا: ”جھوٹی ہے تو اے دشمن خدا۔“ حضرت نے فرمایا: ”تو ہوا شاہ ہے۔ اپنی حکومت سے ہم پر جبر کر رہا ہے۔“ یہ سن کر زید شرمایا اور چپ ہو گیا۔ (کاہل)

ابن خلدون، حمدا الفرید سے نقل کرتا ہے کہ: جس وقت قیدیان ابی سیف امام حسینؑ **نعمان بن بشیر اور زید** زید کے رومو پیش کیے گئے نعمان بن بشیر انصاری نے کہا: ”ذرا سوچ کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) ان لوگوں کے ساتھ کیا برتاؤ کرتے تھے اگر وہ اس حالت میں ان لوگوں کو دیکھتے تو کیا کہتے؟“ زید نے کہا: ”تم کچھ کہتے ہو۔ ان لوگوں کو آزاد کر کے رہنے کے لیے خیمہ استادہ کر دو۔“

اس کے بعد زید علی بن الحسینؑ کی طرف مخاطب ہوا۔ اور پوچھا کہ: **زید اور امام زین العابدینؑ** ”یہ کون ہے؟“ لوگوں نے کہا کہ: ”یہ علی بن الحسینؑ ہیں۔“ اس نے کہا: ”لوگ کہتے ہیں کہ علی بن الحسینؑ مائے گئے۔“ لوگوں نے کہا: ”ہاں وہ بڑے تھے اور یہ ان سے چھوٹے ہیں۔“ اب زید نے حضرت علی بن الحسینؑ سے مخاطب ہو کر کہا کہ: ”تیرے باپ نے ارادہ کیا تھا کہ وہ خلیفہ ہو جائے۔ فکر ہے اس خدا کا جس نے مجھے اس پر قدرت دی اور تمہیں ہمارا اسیر کیا۔ اور تمام قریب و بعید آراؤ اور غلام تمہیں دیکھ رہے ہیں اور تمہارا کوئی مددگار اور کفیل نہیں ہے۔“ حضرت امام زین العابدینؑ علیہ السلام نے فرمایا کہ: ”کون ہے جو میرے باپ سے زیادہ خلافت کا متحقّیٰ ہو؟ وہ تمہارے نبی کی دختر کے فرزند تھے۔ اے زید کیا تو نے خداوند تعالیٰ کا کلام نہیں سنا کہ: مَا أَصَابَ مِنْ مُّصِيبَةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي الْفَسِيكَةِ إِلَّا فِي كِتَابٍ مِنْ قَبْلِ أَنْ نَبْرَأَها وَإِنْ ذَلِكُمْ عَلَى اللَّهِ يَسِيرٌ ۝ لَّيْلًا نَّاسُوا عَلَى مَا فَاكَّهُمْ وَلَا تَفْرَحُوا بِمَا آتَاكُمْ ۚ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ ۝ (۲۲-۲۳) (دنیاء میں اور تمہارے نفس کو کوئی مصیبت نہیں پہنچتی مگر یہ کہ قبل از ظہور وہ کتب میں مسطور ہے اور یہ خدا پر آسان ہے تاکہ تم گمراہی پر تمہیں اور عطیات سے خوش نہ ہو اور خداؤ سنگیں مارنے والے کو دوست نہیں رکھتا) یہ سن کر زید غصہ میں آیا اور قاتل کا حکم دیا۔ (ابی عتف) اس وقت حضرت اُمّ کلثومؑ نے اشعار پڑھے جن کا

پہلے یہ سچہ : ۷

انادیک یا جداء یا خید مرسل حبیبک مقتول و نسلک ضائع
میں آپ کو پھرتی ہوں اے نانا اے خید مرسل۔ آپ کا حبیب قتل اور نسل ضائع ہوئی
اس وقت عورتیں حضرت کے گرد آگئیں اور حضرت اُمّ کلثومؓ نے فرمایا کہ: ”اے زید تو نے اہل بیت کا خون
گرایا اور یہ اس بچے کے کوئی نہیں رہا ہے جو عورتوں کا غم ہو۔“

اس وقت کا مجمع حکم قتل کی واپسی کا موجب ہوا
اہل بیت کہتا ہے کہ: اس وقت عورتیں
مرد اور بچے ہڈیوں کی طرح جمع تھے اور
دیجے رہے تھے زید کے دل پر رعب اور خوف طاری ہوا کہ لوگوں کا اہل بیت کی طرف میلان نہ ہو اور قہقہہ نہ کھڑا
ہو جانے اور قتل سے باز رہا۔

زید کا خطیب اور امام
کون تھا جو زید کو اس کے دشمن ہنسی اور استہزاء سے باز رکھتا اب اس نے
قبول ابواسحاق اسمرائی نے اپنا خطیب بلایا جو خوش قرار اور صبح اللہ تو بہت تھا
مگر اس کو خدا کی معرفت کم حاصل تھی۔ زید نے اس کو حکم دیا کہ لوگوں کو جمع کر کے منبر پر چڑھ کر علیؑ اور اس کی اولاد کو
گالیں دے۔ اس نے حکم کی تعمیل کی اور حضرت علیؑ رضی اللہ عنہ اور ان کی اولاد رضوان اللہ علیہم کو بیٹ بھر کر گالیں دیں
اور زید کی تعریف ہی کھول کر کی۔ جب علی بن الحسینؑ نے یہ سنا تو چلا کر کہا: ”اونا معقول خطیب تو نے اپنے رب کو ناراض
کیا اور بندے کو خوش کیا۔“

امام منبر پر جانے کی اجازت چاہتے ہیں
پھر زید کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا: ”جے اجازت
ہو کہ منبر پر چڑھ کر وہ باتیں سنوں جن سے خدا
راضی ہو اور لوگوں کو فائدہ پہنچے۔“ زید نے منظور نہ کیا۔ حاضرین نے کہا: ”اس کو کیوں اجازت نہیں دی جاتی۔“ زید
نے کہا: ”حاضرین میں اس لڑکے کو جانتا ہوں تم نہیں جانتے۔ یہ اہل بیت بڑے چھوٹے سب کے سب ہجرت عملی میں
کمال رکھتے ہیں۔ یہ ابتراب کی نسل ہیں۔ سانپ کا بچہ منہ بولیا ہوتا ہے۔“ لوگوں نے اصرار کیا کہ: ”جے خدا کی قسم
اس لڑکے کو بھی کچھ بیان کرنے دے۔“ زید نے اجازت دی کہ اچھا بیان کرو۔ (بعض مؤرخین کے موافق زید نے کہا:
قتل ولا قتل جبر۔ کہو، لیکن بیان نہ بکنا)

امام منبر پر
علی بن الحسینؑ یہ سن کر منبر پر چڑھے۔ پہلے خدا کی حمد کی پھر رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجا۔
اس کے بعد یوں تقریر شروع کی: ”گو گویا دنیا اور دنیا کی چیزوں سے ڈرو یہ زوال کا گھر ہے۔
اس نے گزشتہ قوموں کو ہلاک کیا۔ حالانکہ وہ مال اور عمروں میں تم سے بڑھ کر تھے مٹی نے ان کے گوشت کو کھا لیا ان
کے لاشات مٹ گئے۔ کیا تم کو ان کے بعد ہمیشہ زندہ رہنے کی آرزو ہے؟ یہ بات محل ہے۔ محل ہے۔ تم کو بھی اسی
راستہ پر سے ان سے جاملنا ہوگا۔ اپنی گزشتہ عمر پر افسوس کر کے آئندہ کے لیے تلافی کی کوشش کرو۔ اور ہتھیار عمر میں نیکی
کالو۔ حقیقت تم کو معلوم ہے کمال کر قبروں میں داخل کیا جائے گا۔ تمہارے اعمال کا حساب لیا جائے گا۔ واللہ بہت سے

گنہگار حسرت سے اپنی انگلیاں کاٹیں گے اور بہت سے اکن بان والے مصائب میں مبتلا ہوں گے مگر اس وقت افسوس و دندامت کچھ کام نہ آئے گی۔ ہر شخص کا عمل اس کے آگے آئے گا۔

”لوگو! جو شخص بچے جاتا ہے وہ جاتا ہے اور جو نہیں جاتا اس کو یاد رکھنا چاہیے کہ میں علی بن الحسین بن علی ہوں۔ میں فاطمہ زہراؑ کا بیٹا ہوں۔ میں خدیجہ کبریٰ کا بیٹا ہوں۔ میں مکہ و مدینہ کا بیٹا ہوں۔ میں اس پیغمبر کا بیٹا ہوں جس نے فشتوں کے ساتھ نماز پڑھی۔ میں اس نبی کا بیٹا ہوں جس کو خدا کا شرب حاصل ہے۔ جو شہادت کبریٰ کئے گا۔ جو وحی کوثر کا مالک ہے۔ جو دلائل و معجزات والا ہے۔ جو صاحب شہر اکن ہے۔ جو صاحب فضاں ہے۔ جو معتام محمود والا ہے۔ جو صاحب کرم و جود ہے۔ جو تاج پیغمبری پہننے والا ہے۔ جو باق کا سوار ہے۔ جو نبی اسماعیل میں انتخاب ہے۔ جو صاحب تائیل ہے۔ میں اس ایام کا بیٹا ہوں جس کو ظلم سے شہید کیا گیا ہے۔ جس کا سر گردن کی طرف سے کاٹا گیا ہے۔ جو یہاں شہید کیا گیا۔ جو کربلا میں شہید کیا گیا۔ جس کا عمامہ اور چادر دشمنوں نے چھین لیے۔ جس کے ماتم میں آسمان کے سترہ شے رد دیے۔ لوگو! اللہ تعالیٰ نے ہم کو ایک اچھی نصیبت میں مبتلا کیا ہے۔ مسم میں ہدایت کا مجنڈا نصب کیا اور ہمارے جانوں میں ہلکت کا جھنڈا لگا دیا۔ اور ہم کو دنیا بھر کے لوگوں پر فضیلت بخشی۔ ہم کو وہ باتیں عطا کیں جو دنیا میں کسی کو میر نہیں ہوتیں۔ ہم میں ہائی خوبیاں ایسی جمع کیں جو مخلوق میں کسی شخص میں جمع نہیں ہوتیں۔ یعنی ● علم، ● شہادت، ● سخاوت، ● خدا کی محبت، ● رسول کی محبت۔“

تقریر کا اثر دور کرنے کے لیے مؤذن بلایا گیا
امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے کہ اس تقریر نے حاضرین پر بھاری گرا دی۔ ہر طرف آہ و بکا شور بلند ہوا۔ زید نے چاہا کہ علی رضی اللہ عنہ کی بات کاٹے۔ اس لیے اس نے مؤذن کو حکم دیا کہ اذان کہو۔ مؤذن نے اذان شروع کی۔ اللہ اکبر (۴ مرتبہ) اشهد ان لا الہ الا اللہ (۲ مرتبہ) پھر اس کے بعد جب کہا: اشهد ان محمدًا رسول اللہ (بقول ابو جعفر اس وقت امام رونے لے) تو علی رضی اللہ عنہ نے مؤذن سے پکار کر کہا: خدا کے لیے ذرا ٹھہرو۔ مؤذن چپ ہو گیا۔ پھر زید سے مخاطب ہو کر کہا: ”بتو تھ میرے نانا ہیں یا تیرے؟“۔ زید نے کہا: ”وہ تیرے نانا ہیں۔“ انھوں نے کہا: ”تو پھر کیوں تو نے ان کی اولاد کو قتل کیا اور کیوں ان کے حرم کو قتل کیا؟“۔ اس بات سے لوگوں پر رقت طاری ہو گئی۔ اور سب رونے لگے اور کہنے لگے: ”یہ واقعہ اسلام کی جاری نصیبت ہے۔“

صاحب روضۃ الشہداء کہتا ہے کہ جس وقت سید الساجدین ”انا ابن“ فرماتے تھے تمام دمشق و شام تھکا تھا اور ایک ہاتھ کہہ معلوم ہوتا تھا۔ (اس کے بعد بقول ابی جعفر زید مل میں چلا گیا اور کہا: ”میں نماز کی ضرورت نہیں ہے۔“) اسی مؤرخ کے نزدیک جب لوگ امام کے خیال بدلنے کے لیے اجزائے قرآن کی پاشانی بعض فقرات سے متاثر ہوئے تو زید ذرا کہ امام کی محبت لوگوں کے قلوب میں پیدا نہ ہو اور فتنہ نہ کھڑا ہو۔ زید نے ان لوگوں سے جنھوں نے امام کے خطبہ کہنے کا اصرار کیا تھا کہا کہ: ”اے منبر پر چڑھا کر تم نے میرے ملک کے زوال کا بار ادا کیا تھا۔“۔ زید نے یہ بھی کیا کہ اجزائے

مشعر آں کو مسجد میں اس غرض سے پاشان کرایا کہ نماز پڑھ کر لوگ اس کے دیکھنے میں مشغول ہوں اور حسینؑ کا ذکر نہ کریں۔
قتل حسینؑ کے متعلق زبید کا تجاہل اور اعلانِ حقیقت
 ابو اسحاق کہتے ہیں: یہ حالت دیکھ کر زبید کو اپنی جان کا خوف ہوا اور کہنے

۵: ”اے لوگو تم یہ مجھے ہو کہ میں نے حسینؑ کو قتل کیا ہے۔ حسین کو جس نے قتل کیا ہو اس پر خدا کی لعنت ہو۔ اس کو عبید اللہ بن زیاد کو زہر بھرنے قتل کیا ہے۔ پھر اس نے حکم دیا کہ جو لوگ حسینؑ کا سر لانے ہیں ان کو حاضر کیا جائے تاکہ ان سے دریافت کیا جائے کہ حسینؑ کو قتل کا واقعہ کس طرح ہوا۔ جب سب لوگ حاضر ہوئے تو ابن ربیع سے زبید نے کہا کہ: ”کیوں بھیج بتا کیا میں نے تم کو حسینؑ کو قتل کے لیے کہا تھا؟“ اس نے کہا: ”ہرگز نہیں۔ خدا کی لعنت ہو اس پر جس نے اس کو قتل کیا ہے۔“ اسی طرح وہ ہر ایک سے سوال کرتا تھا اور سب کے سب بھی جواب دیتے تھے۔ یہاں تک کہ حسین بن نمیر کی نوبت آئی تو اس نے بھی یہی جواب دیا۔ پھر وہ کہنے لگا: ”اگر حکم ہو تو اس کے قاتل کا میچ میچ پتا بتا دوں۔“ زبید نے کہا: ”ہاں بتاؤ۔“ اس نے جان کی امان مانگ کر زبید نے کہا: ”مجھے امان ہے۔“ وہ بولا: ”اے امیر! یہ اس شخص کا کام ہے جس نے جھنڈے نصب کیے، مال فروغ کیا، اور لشکر تیار کیا، اور غلطو بینج کرکھی کو ڈرایا، کسی کو ترغیب دی۔“ زبید نے پوچھا: ”تو پھر یہ کام کس نے کیے؟“ وہ بولا: ”تم نے۔“ زبید یہ سن کر غصہ کا گھوٹ پی کر رہ گیا اور اپنے گم جا کر وہ طشت سامنے رکھا جس میں امام حسینؑ کا سر تھا اور اپنا سر بیٹھا شروع کیا۔ قبول ابی مخنف کہتا تھا کہ: ”مجھے کیا ہوا تھا کہ میں نے حسینؑ کو قتل کیا۔“ یہ روایت روضۃ الشہداء اور ابی مخنف میں بھی ہے۔

۶: **چند اشعار اور زبید**
 انھیں اندوہناک وقتوں میں سے کسی وقت یحییٰ بن حکم نے کچھ اشعار پڑھے جن کا مفہوم یہ تھا کہ: ”زیاد کی اولاد ریگ بیابان سے بڑھ گئی اور رسولؐ کی نسل باقی نہ رہی۔“
 یہ سن کر زبید نے قبول کامل ابن اثیر اس کے سینہ پر ہاتھ مارا اور کہا: ”چپ رہ۔“

۷: **رومی دربان**
 اہل بیتؑ طہارت جس قید خانہ میں تھا اس کے دربان رومی مقرر کیے گئے تھے۔ یہ بھی روایت ہے کہ کسی دن غالباً اس وقت جب کہ ان منہوم کے فترات ادا ہوتے تھے کہ

۸: **نمائش احسان**
 اگر جناب رسالتؐ اہل بیتؑ کو اس حالت میں دیکھتے تو کیا کہتے۔ زبید نے سواہن طلب کیا اور خود سے حضرت امام زین العابدینؑ کا طوق کاٹا، اور وجہ ظہر کی کہ میں نے نہ چاہا کہ سوا میرے اور کسی کا تم پر احسان ہو۔

۹: **منہال اور امام**
 دمشق کے دوران قیام میں کسی روز منہال بن عمر سے حضرت سجادؑ سے ملاقات ہوئی۔ منہال نے پوچھا اس پر امام نے فرمایا: اس کا حال کیا پوچھتا ہے جس کا باپ مقتول، مددگار کم اور حرم اسیر ہوں۔۔۔ عرب عجم پر اس لیے فخر کرتے ہیں کہ خُند رسول اللہؐ ہم میں سے ہیں اور یہی ادا قاریں کا ہے۔ ہم ان کے اہل بیتؑ ہیں لیکن مقتول اور مظلوم ہیں۔۔۔ امام کے فترات سن کر رونے کا شور بلند ہو گیا۔

نرمی اور ماتم پرستی بہت جلد نرید کو یہ طے کرنا پڑا کہ اہل بیٹ کے ساتھ مزید لکھد و لکھن نہیں رہا۔ اب انہیں ایک مکان دیا گیا اور حکم دیا گیا کہ ضروریات کی کل چیزیں ان کے لیے مہیا کی جائیں۔ حکومت کی نرمی دیکھ کر تمام دمشق میں کوئی شہرشی عورت نہ تھی جو سگواروں کی صورت سے اہل بیٹ کے پاس نہ گئی ہو اور اب حسین کی شہادت کے بعد اہل بیٹ کی آنکھوں سے آزاد آنسوؤں کی سیل پہلے دمشق میں پھیلا، غالباً اہل بیٹ ساٹ دن دمشق رہے اور دور ان قیام میں ان کے لیے کوئی دوسرا مشغلہ یا اس کے نہ تھا کہ حسین اور اپنے ممتاز افراد عالم پر آنسو بہاتے۔



jabir.abbas@yahoo.com

باب سیزدہم

اہل بیت (مدینہ)

ساتھ دن کے بعد زید نے رثی کیڑے اور روپیہ منگوایا اور حضرت ائمہ کثومؑ سے کہا کہ: "اے حسینؑ کے عوض میں قبول کرو اور کچھ لو کہ انھوں نے رحلت کی۔" حضرت نے فرمایا کہ: "کس قدر بخت دل ہے تو کہ میرے بھائی کو قتل کر کے مجھے عوض میں مل دیتا ہے۔ حالانکہ یہ ہرگز ممکن نہیں ہے۔" اہل عت کے موافق زید نے ہر ایک کے لحاظ سے کچھ مال لاد کر رثی کیڑے سے منگوانے اور ساتھ کر دیا۔ عتیں درست کی گئیں اور ایک شخص (اہل غدور کے موافق) نعمان بن بشر جو مدین اور ہالیماں شخص تھا) مع کچھ سادوں کے (اہل عت کے موافق پانچ سو) ان کی نگہ بانی اور آرام سے مدینہ پہنچا دینے کے لیے مقرر کیا گیا۔

بعض روایات یہ ظاہر کرتی ہیں کہ زید نے حضرت امام زین العابدینؑ سے تین خواہشیں

امام زین العابدین علیہ السلام کیا طلب فرماتے ہیں

پوری کرنے کا وعدہ کیا۔ حضرت نے پہلی خواہش یہ فرمائی کہ مجھے میرے باپ کا سر دکھا دے۔ دوسرے یہ کہ ہمارا لوٹا ہوا اسباب لو لیں کہ دے۔ تیسرے یہ کہ اگر میرے قتل کا لالہ ہے تو کسی کو مقرر کر کہ ذریعہ رحلت کو وطن پہنچا دے۔ زید نے کہا کہ تم اپنے باپ کا سر مجھے نہ دیکھو گے تمہارے قتل سے میں باز آیا۔ تمہارے ہوا عورات کو کوئی نہ ملے جائے گا۔ اور تمہارا جو اسباب لوٹا گیا ہے اس کے عوض میں الغناحت دوسرا دے سکتا ہوں۔ وہ نہیں مل سکتا۔ حضرت نے فرمایا کہ میں تیرا مال درکار نہیں ہے۔ میں اپنا اسباب اس لیے مانگتا ہوں کہ اس میں میری عداوت کا طعنہ نہ ہو۔ پھر کا ایک چرنا ہے۔ ایک مٹخ ایک گوبند اور ایک کرتا ہے۔ تب زید نے حکم دیا کہ وہ سب اسباب واپس کر دیا گیا۔

راہب کا لحاظ

۲۰ صفحہ کو کر بلا میں

قیام کیا اور ماتمہا کیا۔ لہوت کے موافق نبی ہاشم کے کچھ مرد بھی تھے کہ میں "کئی دن" اسی حالت سے رہے۔ اور وہیں کی عورتیں بھی رونے پٹنے میں شریک رہیں۔

قرب مدینہ قیام اور بشر سے شعور کہنے کی خواہش کی

بشر بن جزم (نعمان بن بشر)

بیان کرتا ہے کہ جب ہم قریب مدینہ پہنچے تو امام زین العابدینؑ نے ایک جگہ قیام فرمایا۔ اسباب سفر اتر دیا۔ خیمہ برپا کیا اور عرم ختم بھی اترے۔ حضرت امام نے خجے سے فرمایا کہ اسے بشیرؑ لے آئیے۔ باپ پر رحمت کرے وہ شاعر تھا تو بھی کچھ شعر کہتا ہے میں نے عرض کی: ”یا ابن رسول اللہ! میں بھی شعر کہتا ہوں۔ تو حضرت نے فرمایا کہ تو مدینہ میں جا اور حضرت ابا عبد اللہ الحسینؑ پر شعر کہہ۔ بشیرؑ کہتا ہے کہ میں گھوڑے پر سوار ہوا اور مہینز کیا یہاں تک کہ میں مدینہ میں پہنچا۔ جب میں مسجد رسولؐ کے قریب آیا تو یہاں دقت و شور و فساد (ترجمہ میں غم کے افلاک کی کثرت نے رفعت صوتی بالبکاء (میں نے رونے کے لیے اپنی صدا بلند کی یا خجے کو بلا لے کر مدینہ میں لے کر آیا ہے) چلا کر یہ اشعار پڑھے:۔

یا اهل بئرب لا مقام لكم هنا قتل الحسين فادمعي حلمات
اسے اہل مدینہ اب یہ شہر تمہارے رہنے کے قابل نہ رہا۔ حسینؑ شہید ہوئے اور میری آنکھوں سے لہو کے آنسو بہتے ہیں
یا اهل بئرب لا مقام مضجع و المراس منه على القنطرة يمداد
کہا میں ان کا جسم خون میں لیتا ہوا ہے اور ان کا سر نیو پر پڑا جاتا ہے
عورات مدینہ استقبال کے لیے جاتی ہیں
میں نے پکار پکار کر کہا کہ اسے اہل مدینہ لے آئیے
الحسینؑ اپنی چوبیسویں بہنوں اور عورتوں کو لے کر

یہاں آئے ہیں اور تمہارے قریب اترے ہیں۔ خجے کو تمہارے پاس اس لیے بھیجا ہے کہ تم سب کو ان حضرت کے مقام سے آگاہ کر دے۔ سن کر کوئی عورت پردہ والی مدینہ میں نہ آئی کہ سر کو لے بالے بھرے خجے کو لے کر چلتی فریاد و فغان گریہ و فغانی گئی۔ چلتی باہر نہ نکل آئی جو میں نے اس دن سے زیادہ رونے والے نہیں دیکھے اور رسول اللہؐ کی وفات کے بعد مسلمانوں پر ایسا دن نہیں گزرا۔ میں نے ایک لڑکی کو امام حسینؑ کے غم میں یہ نوحہ کرتے سنا:۔

حق سیدی جناح نعاہ فادجعا و امرضی نام نعاہ فندجعا
ایک رخصت لے گئے۔ میرے سوار کی غیر سنا کر دروہہ کیا اور اس سنانی نے گئے جگہ پر لگا دیا
فحنی جحا بالدموع واسکنا و جحا بدمع بعد فمکنا معا
اے میری آنکھ روئے میں دریغ نہ کر اور پے در پے آنسو یا
علی من دعا عرش البلیل فزنا و فاصح هذا الجحد و الدین اجلنا
ایسے شخص پر جس کی مصیبت عرش پر پہنچی اور اسے پڑا اب دین بزرگ بے ناک ہو گیا
علی ابنی اللہ و ابنی وصیہ و ان کلنا عنا فاحط النار الشیعا
ایسے شخص پر جو نبی اللہ اور ان کے وصی کا فرزند تھا اگرچہ ہم اس سے بہت دور ہیں
لوگوں کا ہجوم اور امام کی حالت
بشیرؑ کہتا ہے کہ اس کے بعد میں نے بھی گھوڑے کو مہینز کیا قیام
میں نے قریب پہنچ کر دیکھا کہ لڑکوں کا اس قدر ہجوم ہے کہ راہ پھٹا
دشوار ہے۔ آخر میں اپنے گھوڑے سے اترا اور مسلوں کو چھریاں لٹکا کر درخت پر پہنچا۔ حضرت علیؑ یا الحسینؑ غم میں تھے۔

<http://fb.com/ranaiabirabbas>

حلیۃ جدنا لا قبلنا فبالصنات و الاحزان جتنا
 اتے تاتا کے سر پہ چشم نال نہ کر ہم بوج مسرتوں اور اندھ کے ساتھ آ رہے ہیں
 خوینا شک و الاطین جمنا رجعتا لا رجال و لا ہینا
 ہم راج خاندان کے چہرے پہر گئے تھے اب اس مٹی سے آ رہے ہیں کہ نہ ہمارے مرد ہائی ہیں نہ عورتوں
 و کنا فی الخروج علی المطاہا و جتنا خائنین و سہینا
 ہاتھ دھو کر ہم لوگ سواریں پر چڑھے اب بد حال سے خائیں آئے ہیں
 و مولانا المستیق لنا انیساً رجعتا لا حسیق و لا معینا
 اس وقت ہمارے ساتھ حسین چارے ساتھ تھے اب خائیں ہیں نہ حسین ہیں نہ کوئی مددگار
 فلا عیش یدوم لنا نحن و زین المطلق متغون عزینا
 کوئی عزت کی زندگی ہمارے لیے رہائی نہیں ہے زینت الملق بھارت عزت مدفن ہے
 و نحن بنات یسین و ملہ و نحن الباکیات علی ایننا
 ہم یسین اور ملہ کی بیٹیاں ہیں جو اپنے بزرگوں پر رو رہے ہیں
 و نحن الصابرون علی البلیا و نحن الباکیات و لا معینا
 ہم لوگ بلیوں پر صبر کرنے والے ہیں ہم گروں میں اور کوئی صبر نہیں ہے
 و قد متکوا عارمنا و صرنا علی الاقطاب جبراً اجعینا
 انھوں نے ہماری ہمت عرصہ کی اور میں کھلے چروں سے پھاڑوں پر بیٹھا ہوا
 و ذبیح اخرجوا من خلیفنا و فاطمہ و ما احد معینا
 انھوں نے زینب اور فاطمہ کو پردے سے نکال دیا اور کوئی مددگار نہ تھا
 سکینہ تشکی من حرشجو تکلی یا اخی جاروا طینا
 سکینہ سوزش غم کی شہیت کر رہی ہے کہ اے جانی ہم پر ظلم کیا گیا
 و قد طافوا البلاد بنا جمیعاً و بین المخلق جمعا قد رمینا
 انھوں نے ہم سب کو چھوڑ دیا ہر جگہ اور ہم تمام مخلوق میں بھٹک کر گئے
 فہذا قصتی مع شرح حال الا یا مسلمون البکو طینا
 یہ میرا فصل حال ہے اسے مسلمانو! ہم پر رو

— ۴۵۳ —

بشیر صلیہ قبولی نہیں کرتا
 مزید میں کی روز تک ماتم رہا جب رہنا لے دو اگل کا قصد کیا تو اہل بیت
 نے اسے کپڑے اور مال دینا چاہا لیکن اس نے یہ کہہ کر ہاتھ پٹہ کر دیا کہ
 جو کچھ خدمت میں لے کر آ رہا ہوں اس سے میں کی بلکہ قربت جناب رسالت تک کی وجہ سے

امام کے اشعار

صاحب نورالعین نے حضرت امام زین العابدین علیہ السلام کی زبانی روئے رسول پر چند اشعار کہوائے ہیں جو گویا عظیم واقعہ ہے۔ میں اس کے مخصوص اشعار نقل کرتا ہوں۔

الی جدنا نشکو عداۃ قد تحکما و نالو بنا و اللہ کل مناء
ہم اپنے مٹا سے دشمنوں کی حکایت کرتے ہیں جنہوں نے ہم کو تباہ کر کے اپنی تمام آرزوئیں پوری کر لیں
و قد رام قتل یقطع نسلا و ذی عمتی صاحت بغیر عزاء
نیزہ نے میرے قتل کا بھی ارادہ کیا تاکہ ہماری نسل کو قطع کر دے تو میری پھوپھی نے بے صبری سے چیخ ماری
و صلح ہم کل المنصور جمعہم فقل دعواہا من الطلقاء
اور ان کے ساتھ تمام حاضرین بھی چلے آکر نیزہ نے کہا اس کو چھوڑ دو یہ آزاد ہے
خدا یسئل الان کل عروم یسج بأهل البيت سفک دعاء
قلم یں ہو گیا کہ آج ہر عروم کو محل جلتا ہے اور اہل بیت کا خون پہلا مہاج جلتا ہے
انما یستویح الان ال فقہ و یسقی لاهل للبيت کل رداء
اب آں غم کا قتل کرنا مہاج جلتا ہے اور اہل بیت کی ہر چہرہ کو خون آلود کرتا ہے

باب چہارم

شہادتِ حسینؑ کے بعد (متعلق باتیں)

سرمبارک

- کوئی کہتا ہے کہ سرمبارک حضرت فاطمہ زہراؑ کے پاس دفن ہوا۔
- کوئی کہتا ہے کہ یہ قبر امیر المومنین علی بن ابی طالبؑ میں دفن ہوا۔
- کوئی کہتا ہے کہ یہ قبر امیر المومنین علی بن ابی طالبؑ میں دفن ہوا۔
- قبر کے زمانہ میں عثمان بن عفانؓ سے متعلق کیا گیا اور انہوں نے اس کے بعد شہادت میں قہر لے گئے۔
- یہ بھی کہا گیا ہے کہ امیر فضل بن امیر ایوش نے فوق قبر ایک عہدہ رکھا اور اس کے بعد شہادت میں قہر لے گئے۔
- قہر میں اس وقت تک حضرت امام حسینؑ کا روضہ مبارک موجود ہے۔

— — —

غمِ حسینؑ کا نشو و نما

امام زین العابدینؑ اپنی بقیہ حیات تک اس غم سے متاثر رہے۔ حضرت رہا پت بنت امراء افس ایک برس تک چھت کے نیچے نہ بیٹھیں۔ برابر عزون رہتی تھیں۔ یہاں تک کہ اس مدت کے بعد رحلت فرمائی۔ ابو عمارہ شاعر کہتا ہے کہ جس وقت حضرت امام جعفر صادقؑ کے سامنے ذکر حسینؑ ہوتا تھا شام تک کوئی حضرت کو نہ دیکھتا تھا۔

ابلی بیتؑ برابر سوگ میں رہے اور کسی اسبابِ راحت و تزئین پر التفات نہ کیا جب تک ابن زیاد کا سر غنڈہ بن ابوسفیہؑ نے حضرت کے پاس نہ بھیجا۔

حضرت امام جعفر صادقؑ کے حضور میں جعفر بن عقیل، عبداللہ بن غالب، ابو ہارون خصاصیہؑ وغیرہ مرثیہ پڑھتے تھے۔ حضرت اس کا بھی اہتمام فرماتے تھے کہ حرم محترم بھی سنیں اور کھی یہ بھی ہوتا تھا کہ پس پردہ سے یا ابتاہ کی آواز آجاتی تھی۔

حضرت امام رضاؑ کے دربار میں دہل قرائی مرثیہ پڑھتا تھا اور حضرت بھی مثل اپنے پر بزرگوار کے اہتمام فرماتے تھے۔

امیر سیف الملک اور قاضی مومن وغیرہ حضرت کے مرقہ منور کی زیارت کو جایا کرتے تھے۔ (ناخ اتوارخ)

زید مجنون زید مجنون نے جب مصر میں یہ خبر سنی کہ کئی قوبے تائب ہو کر یہاں پہنچے راستہ میں پہاڑوں سے ملاقات ہو گئی۔ اور یہ دونوں بزرگ زیارت کو پہنچے۔ ایک روز شہر میں بڑا جھوم دیکھا اور دیکھا کہ لوگ ایک جنازہ لیے جا رہے ہیں۔ پوچھا کہ کیا متوکل مر گیا؟ کسی نے جواب دیا کہ متوکل کی کنیز ریحانہ مر گئی۔ یہ لوگ بھی قبر کے پاس گئے۔ قبر میں پھول، مشک، ادو، عنبر ڈالا گیا اور لوگوں نے اظہار غم میں کوشش کی۔ یہ دیکھ کر زید کا دل بھر آیا۔ غصہ پر طمانچہ مارتے تھے اور کہتے تھے : اے حسینؑ تم بے مدد گار شہید ہو۔ تمہارے اہل بیٹ قید ہوں اور کوئی تم پر نہ روتے۔ سب غسل و کفن تمہیں دفن کریں اور اس ظلم کے بعد تمہاری قبر کھودی جائے اور زراعت کریں اور تمہارے نور کو بچائیں۔ حالانکہ تم فرزند علیؑ و فاطمہؑ ہو اور ایک کنیز سیاہ کے لیے اس شان و شوکت کا اظہار کیا جائے۔ جوش غم میں اس کے بعد زید اشعار پڑھنے لگے۔ جن کا مفہوم تھا کہ : قبر حسینؑ کو بلائیں غراب ہو اور اولاد زنا کی قسبہ ہو۔

شہادت کس لیے ہوئی
 ایک روز عمران نے حضرت ابو جعفر سے اس طرح کہا کہ حسنؑ اور حسینؑ نے خدا کی اطاعت کی لیکن وہ ہوا جو آپ جانتے ہیں۔ حضرت نے فرمایا: یہ ان کے بلندی مرتبہ کے لیے تھا نہ کہ ملہ گناہ سے، جیسا اور انبیاء کے حال سے ظاہر ہے۔

[illegible]

ایسا ہی واقعہ حضرت موسیٰ بن جعفر کا ہارون سے پیش آیا تھا اور آپ نے متذکرہ حدیث کے علاوہ قتل تھا لہذا
 تدریجاً اپنے باؤں کے ساتھ (۲: ۶۷) حکومت فرمائی اور اس کے بعد کہا کہ ظاہر ہے کہ مہاجر میں یزید علی و دہلوی کے کئی
 خاندان تھے جن کے ساتھ ساتھ ان کے داخل ہوئے۔

شہادت کا ایک نتیجہ

صاحب تاریخ لکھتے ہیں کہ سترہ میں زید کو خبر چلی کہ اہل مدینہ نے اس کی خلافت سے انکار کر کے اس پر فوج کیا ہے۔ زید نے فوراً ایک بڑا لشکر ان کی طرف روانہ کیا اور اہل مدینہ سے جنگ کرنے کا حکم دیا۔ پھر ابن زبیر سے جنگ کرنے کے لیے مکہ چلے گا حکم دیا۔ حسن بیان کرتے ہیں کہ اہل مدینہ میں سے کوئی شخص ایسا نہ تھا جو اس لشکر کے ہاتھ سے ہتھ میں رہا ہو۔ بہت سے صحابی رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین لا رہے دیگر لوگ قتل ہوئے۔ مدینہ شریف غراب کیا گیا اور بد بخت لشکر میں سے ہزار لڑکیوں کا

انکار نکارت کر دیا۔۔۔۔۔ اہل مدینہ کے طمع کرنے کی وجہ پر یعنی کہ یزید نے گناہوں میں بہت ہی زیادتی کی تھی چنانچہ ابن غنیل نے فرمایا کہ ہم نے اس وقت تک یزید کی خلافت سے انکار نہیں کیا کہ ہمیں یقین نہ ہو گیا کہ آسمان سے پتھر برس پڑا ہے۔ غضب ہے لوگ ماؤں بیٹیوں اور بہنوں سے نکاح کر رہے۔ علانیہ شراب پینے اور نماز چھوڑنے لگے۔ وہی کہتے ہیں کہ جب یزید اہل مدینہ کے ساتھ اس بدی سے پیش آیا (وہ شراب تو پینا ہی تھا) لوگ اس سے برا فروختہ ہو گئے۔ اور سب کے سب برا فروختہ ہو گئے۔ اور سب کے سب اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس نے اپنا لشکر اہل مکہ سے جنگ کے لیے بھیجا۔ راستہ میں اس لشکر کا سپہ سالار مر گیا تو ایک اور سپہ سالار بنا دیا گیا۔ آخر مغرب کے وقت اس نے مکہ شریف کا محاصرہ کر دیا۔ ابن زبیر سے جدال و قتال شروع کر دیا اور مفتی سے مارنے لگا یہاں تک کہ اس کے شعلوں سے کعبہ شریف کے پردے اور اس دنہ کی سیٹنگ جل گئی جو حضرت اسماعیل کاغیرہ بنا کر بھیجا گیا تھا اور جو اس زمانہ سے بابا ربیعہ شقیف کعبہ میں رکھی جا رہی تھی۔ اسی شانہ میں خدا نے ماہِ ربیع الاول میں یزید علیہ اللعنہ کو ہلاک کر دیا۔ یہ خبر کہ شریف میں عین حالت جنگ میں تھی۔ ابن زبیر نے فوراً پکار دیا کہ اے اہل شام تمہارا گمراہ کفرہ مر گیا۔ یہ سنتے ہی لشکر اشارہ بھاگ کھڑا ہوا۔ لوگوں نے ان کا تعاقب کیا اور ان کو خوب ذلیل و خوار کیا۔

صاحبِ مدونۃ التقاتل کے موافق مسلم بن عقبہ اہل مدینہ سے اس شرط پر یزید کی بیعت لیتا تھا کہ: ”ہر تفریقہ امیر در اموال و اولاد شما کند شمارا ہمیں نہ ہاشد۔“ یعنی: امیر جو تصرف بھی تمہارے مال و اولاد میں کرتے نہیں اس میں کوئی عیال نہیں ہوگی۔

اور بعض یہ کہتے ہیں کہ وہ اس شرط پر بیعت لیتا تھا کہ تم یزید کے ظلم بن کر نہ ہو گے۔ (ابن ابی الحدید مثلاً) رانسٹ آرمیل سند امیر علی صاحبِ ہاشمہ تاریخ الاسلام میں فرماتے ہیں: ”اس بات (تاریخی مدینہ) سے اسلام کو کئی طرح بڑا نقص پہنچا۔ وہ شہر جس نے رسولِ اللہ ﷺ کو پناہ دی تھی وہ شہر جو آنحضرتؐ کی زندگی اور نبوت سے سرفراز ہوا تھا۔ وہ شہر جو نصیبت کے وقت آنحضرتؐ کے ساتھ رہا۔ اسے کشت و خون اور قتل عام کا آج تک گماں نہ رہا تھا۔ ایسی درشتی نہ تھی کہ مثلاً کو یا تو فرانس کے سپاہیوں کی خداری اور یا سپردانِ لوطہ کی روم پر تاخت و تاراج کی تباہی پہنچتی ہے اور بس۔ جامع مسجد کا طویل بنایا گیا اور مزارِ پی زرو جواہر کی خاطر زمین کے برابر کی گئیں۔ وہی ظلم کی پھر فتح ہوئی اور یورپین مؤرخین کے قول کے مطابق اس کا دوبارہ جنم اسلام کے لیے سخت خوفناک اور تباہی بخش ثبوت ہوا۔ امیرِ دواول نے یہ عوض دیا اس ریم و لطف کا جو فتح اسلام کے وقت ان سے مرئی رکھا گیا تھا۔ مدینہ کے چیدہ چیدہ آدمی یا تو تیغ بے دریغ جوئے یا پانی پلانے کے خاطر دور و دراز ممالک کی طرف بھاگ گئے۔ وہ جو بچے یزید کے ظلم بننے پر بخیر نہ سیکھ گئے۔“



شہادت کا دوسرا نتیجہ ○ یزید کی موت حسینؑ کے انتقام میں
روزِ زندہ رہا۔ ایک روز

شکار کے لیے گیا اور ہرن کے پچھے دور دور گیا۔ جہاں اس کے رہنا تھے۔ بھوک اور پیاس کی حالت میں تھا کہ اسے ایکو اعرابی دکھائی دیا۔ یزید نے اس سے کہا کہ: ”میں یزید بن معاویہ ہوں۔“ اعرابی نے

اچھے گالیاں دیں اور کہات ”واللہ لا قتلک کا قتلہ الحسن بن علیؑ اور المؤمنین“۔ یہ کہہ کر اس پر تلوار چلائی گئی اور بڑا گلاہ نہیہ گرا۔ ہم اس کے پیٹ پر پڑا اور اس کی ہڈیوں کا ٹکڑا کھینچا اور وہیں مر گیا۔ (ابی مخنف)

عبداللہ بن جریر طبری کہتا ہے: ”چوں یزید کا کھنسیر پر دھشت و کوفہ و بصرہ و خراسان و مشرق اور اصفہان پر گشتہ پنداشت کا ملک اتمام شد۔ پس ازاں عبدالرحمن بن زبیر باخلا و مکہ و حیدرہ و سیار ریخ و یدرہ چنانکہ کلاہ حسین رضی اللہ عنہ اور فراموش شد و یزید بیٹھاں شد از کشتن حسین“۔ یعنی: جب یزید حسینؑ کے کام سے فائدہ ہو گیا اور کوفہ، بصرہ، خراسان اور مشرق اس کے لیے صاف ہو گئے تو اس نے خیال کیا کہ اس کی سلطنت مکمل ہو گئی ہے۔ اس کے بعد عبدالرحمن بن زبیر نے عمارہ مکہ اور مدینہ میں بہت طبعیت اٹھائی۔ جیسا کہ اسے امام حسینؑ کا کام بھول گیا تھا اور یزید حسینؑ کے قتل سے پیشانی ہو گیا۔

آگے چلی کر کہتا ہے: ”و عبد اللہ چوں سر امام حسین رضی اللہ عنہ وافر ستاد پنداشت کہ خراسان ہوسے باندہ (یزید) بہ برادرش داد۔۔۔ ازین کلاہ یزید و از کشتن حسین رضی اللہ عنہ پیشانی شد و گھٹ کاٹنے کا حسین رضی اللہ عنہ بچل دشتے تا یزید را بن حاجت بودے۔ یعنی: عبید اللہ نے جب سر امام حسینؑ کو یزید کے پاس بھیجا تو اس کا خیال تھا کہ خراسان اسے چروٹے دیا جائے گا۔ یزید نے اس کے بجائے کوٹے دیا۔ اس کام سے وہ زنجیرہ ہوا اور اہل حسینؑ سے پیشانی ہوا اور کھانکاش میں حسینؑ کے ساتھ اس طرح سلوک رکھتا کہ یزید کو میری ضرورت رہتی۔

صاحب روضۃ الشہداء کہتا ہے: ”راویان معتبر گویند کہ بعد از شہادت حسینؑ بیچ یکت ملا ہوا سرداروں لشکر ابن زیاد و سوار و پیادہ و غلام و مخدوم و خدمتہ آسائش نہ دیدہ و آب خوش دلی نہ خوردند و در اندک وصالے ہر یک سبب چھوٹے دیگر کہ بسبب عبرت عالمیان جو ہلاک شدند“۔ یعنی: معتبر راوی کہتے ہیں کہ شہادت حسینؑ کے بعد لشکر ابن زیاد کے امیروں، سرداروں، سواروں، پیادوں، غلاموں، مخدوموں میں سے کسی نے بھی خطہ آرام نہ پایا اور خوش دلی سے پانی بھی نہ پی سکے۔ خود سے ہی وقت میں ہر ایک عالمیان کے لیے عبرت ناک سزا سے ہلاک ہو گیا۔

جناب حسن میاں صاحب پھلواروی اپنے رسالہ ”غم حسینؑ“ میں فرماتے ہیں: بعد واقعہ کربلا اسلامی دنیا کا کیا رنگ ہو گیا۔ وہ بھی جان لیوا ضروری ہے۔ عموماً اہل اسلام بنی امیہ سے نفور ہو گئے اور اہل عراق ہاتھیں اٹھائی کوفہ پر ہر جگہ نفرین و ملامت ہوتی تھی۔ مگر مگر دار مدینہ میں عموماً لوگوں نے یزید کی بیعت سے انکار کیا اور عبداللہ بن زبیر ہی اس واقعہ کا بڑا اثر پڑا۔۔۔ لوگوں نے ان سے بیعت خلافت شروع کر دی۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے ان کی بیعت نہ کی تھی۔ یزید کو جب یہ خبر معلوم ہوئی تو اس نے خط لکھا کہ تم نے محمد بن زبیر کی بیعت نہ کی اور میری خصوصیت کا خیال کیا۔ ہم آپ کے بہت ممتحن و مشکور ہیں اور آپ کے صلہ رنجی کے حقوق کو بھی بھولنے والے نہیں ہیں۔ اور آپ سے امید ہے کہ لوگوں کو میری طرف متل کریں گے۔ اور ابن زبیر کی طرف سے دلوں کو پھیر دیں گے۔ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے جو اس خط کا جواب دیا اس میں امام مظلوم کی شہادت کا ذکر کیا اور ظاہر کر دیا کہ اس واقعہ کے بعد ممکن نہیں ہے کہ ہم لوگ تیری جانب سے کبھی کوئی امید رکھیں۔۔۔ (سوبرس کے اندر) سلطان عباسی نے ان اشعار بنی امیہ کو پنج وین سے کھود کر پھینک دیا اور ہزار ہا بنی امیہ و بنی مروان و عبدالملک و ولید وغیرہم کی قببریں کھود کر ان کی لاش اور ہڈیاں ٹکٹ بٹکی گئیں۔۔۔

سليمان بن صرد اخراجي

اور کوفہ و عراق میں ان شیعوں کو جنہوں نے امام کو بلایا تھا اور پھر مدد نہ کی تھی اور اور مل گئے تھے، روپوش ہو گئے تھے، سخت ندامت ہوئی۔ کچھ کثیر کر کے

بہت دوتے چٹے اور سلیمان بن صرد غزالی جو مرو ضیعت اور صحابہ رسول خدا ﷺ کے قاتلین تھے اس گروہ کے پیشوا قرار پائے اور یہ بہرے جو گیا کہ اس گناہ کا کوئی کفارہ نہیں ہو سکتا جو اس کے کہ ہم لوگ ان کے قاتلین سے بدلہ لیں اور خود بھی ہلاک ہو جائیں۔ اور آخر پانچ ہزار کی جمعیت کر کے آہ دادیلا کرتے ہوئے یا ناراض اُسین کہتے ہوئے کوفہ سے باہر چلے سرزمین کر بلا گئے اور ان شہیدوں کے غم میں آنسوؤں کے دریا بہا دیے اور ضیعت مبارک سے لپٹ لپٹ کر پانچ روئے اور اپنے گناہوں کی معافی چاہتے تھے تین دن تک بے آب و دانہ وہیں سب کے سب رہے پھر یا ناراض اُسین کانفرہ کرتے ہوئے ملک شام کی طرف بڑھے اور صرد سے شقی ابن زیاد نے فوج نکلی۔ یہ جہاں شام خوب ٹرسے اور راہ خدا میں اپنی جانیں تصدق کیا کیے۔ کچھ لوگ بچ کر آئے اور مختار بن ابوسفیہ قس کی فوج سے جا ملے اور قاتلین اہل بیت کے دوسرے جو سندھ، شمر، تلون، خلی بن زید، حرملہ، عمر بن سعد، ضید اللہ بن اسد، ابیہنی، مالک بن نسر، الکندی، علی بن مالک الطاطری، زید بن مالک، النبی، عمران بن خالد، الحصری، عبدالرحمن بن حنظلہ، عبد اللہ بن قیس، الخولانی، عبدالرحمن بن طلحہ، عبد اللہ بن وہب، الہمدانی، عثمان بن خالد، ابیہنی، ابوالسما بشر بن سمیط، عمر بن حجاج، القبیسی، حکیم بن الفضل، الطائی، عمر بن روح الصدائی سب کے سب بری طرح سے مارے گئے۔ پھر فوج آگے بڑھی اور ابراہیم بن مالک اشتر سپہ سالار تھے مومل کے قریب ابن زیاد بد نہلا بھی فوج جوار لے کر پہنچا اور سخت لڑائی کے بعد وہ شقی بھی مارا گیا اور اس کی فوج بھاگ گئی۔ یا مادی گئی۔ اور اس کا سر کوفہ میں مختار کے پاس آیا اور پھر اور اشقیاء کے سر کے ساتھ مکہ منظم حضرت محمد ابن حنفیہ کے پاس گیا۔ پھر مدینہ منورہ میں بھیجا گیا۔

مذکورہ مدد و واقعات میں سے اکثر ابن طلحہ و ان میں مناسب تفصیل کے ساتھ درج کیا۔ ان سے میری غرض یہ ہے کہ حضرت کے شہید کرنے کے بعد ان کے قاتلوں کے یہ خیال غلط ثابت ہوئے کہ وہ بڑے راحت و آرام سے بسر کریں گے۔ علیہا بن صرد اور ان کے رہتا کا جوش انتقام پر جوش انتقام کے اور کسی نہت سے نہ تھا اور اسی کا پکی ابروہ تھا کہ ہم مملکتان الام کو نیست و نابود کریں۔ چارے پاس کچھ ہی مسلمان کیوں نہ ہو اور خود ہلا کوئی نتیجہ کیوں نہ ہو ابن صرد نے کئی برس کو شش کہ ان کی کوشش اگر پوری کامیاب ہوتی تو ولایت بنی امیہ فوراً نہیں تو ان کی کوششوں کے چند سال کے اندر ہی اپنی قوت و اقتدار سے طغیہ کر دیے جاتے۔ لیکن اگر ابن صرد کے ہاتھ نہ رہا یہ نہیں کر سکے (کامل طور پر) تو ان کی تعریف یہ ہے کہ انہوں نے انتقام کا قنا پہلے چھوٹا اور سولہ ہزار آدمیوں کا کم سے کم تیس ہزار آدمیوں سے لڑنا اور ان میں سے اکثر کو موت سے ہم نوا کر دینا تجویز یافتہ نہ تھی۔ حالانکہ دشمن کے پاس متواتر لڑاؤ پھرتی رہی تھی۔ یہ اس وقت واپس گئے جب انہوں نے دیکھا کہ اب چارے پاس اس قدر آدمی نہیں ہیں جو مقابلہ کر سکیں۔ اور اب لڑے تو گویا حسین کے دوست تمام ہو جائیں گے۔ نہایت عجیب فیصلہ تھا لیکن اگر فیصلہ کی یہ قوت ابتدا ہی سے ہوتی اور انہوں نے اپنے کو نکال دینا میں اس لیے نہ جھونک دیا ہوتا کہ اگر ہم زندہ رہیں گے تو پھر لوگوں کو جمع کر کے اپنا کام جاری رکھیں گے تو غالباً زیادہ کامیابی ہوتی اور ایک فوری تسکین کے مقابلہ میں دیر پا رہ سکتا۔

مختار بن ابوعبیدہ ثقفی

لیکن آگ لگ ہی تھی اور وہ حیرت خیز انسان ان واقعات کو ہی جانتا تھا اور پیشتر سے ایسی ہی کوشش کے لیے موقع درست کر رہا تھا جس کا نام مختار بن ابوعبیدہ ثقفی ہے۔ اور خوش قسمتی سے اسے خلائی اراکہ کا خلائی فرزند اباسیم مل گیا اور جس حد تک کوشش ممکن تھی دشمنان مسیحی کی تلاش اور قتل میں وہ اٹھانہ رکھی گئی یہاں تک کہ کوئی اس بات کا کہنے والا نہ رہا کہ ہم بھی میدان کرنا میں شریک تھے۔

مقتولین سے زیادہ پانی میں ڈوب کر مرے

ابن زیاد اور اباسیم کی جنگ میں ایک حیرت خیز امر یہ تھا کہ رقبے ابن زیاد جس قدر

مارے گئے اس سے زیادہ دراصل ڈوب کر مرے۔

حضرت کی پیشین گوئی

انتقام پورا ہو گیا اس مفہوم میں کہ مسیحی کے قاتل نیست و نابود ہو گئے اور اسلام کے بچے بڑے دشمنوں کا خاتمہ ہو گیا لیکن ان چند سطروں کے لکھنے سے جہاں میری غرض یہ ہے کہ ہر بڑی شہادت کے بعد وراثتی عظیم الشان انقلاب پیدا کیا ہے وہاں حضرت کے ان فراموش واقعات سے نہایت مختصر ترجمہ کرنا ہے کہ بنی امیہ اس طرح تباہ ہوں گے کہ ان میں آپس میں طلاق اور جنگ ہوگی اور بالکل مضبوط قوم ان کو نیست و نابود کر دے گی۔

ابن مرد اور مختار کی کوشش جس میں ایک لاکھ بیس ہزار کے قریب بنی امیہ مارے گئے بنی امیہ کی جہاں کا سنگ بنیاد تھا ابن زبیر کی خدائیں جو کچھ بھی ہوں لیکن ان کی دعوت کا ایک عنصر یہ بھی تھا کہ وہ حضرت خاس آل عبا کا انتقام لے رہے ہیں۔ ان کے رقبہ نے بھی بے انتہائی امیہ کو قتل کیا اور پھر اس کے بعد کثرت سے وہ خدائیں ملنے لگیں کہ کیونکر حصول ثروت و اختیارات کے لیے بنی امیہ آپس میں وہ کل ملکی چالیں کام میں لاتے ہیں جو انھیں اپنے حوصلوں میں مدد دے سکے۔ (ترجمہ ابن عساکر کتاب ثانی طایفہ واقعات شہادت جنت کے بعد سے ان واقعات سے لے کر ہے) جن میں یہ حیرت خیز مثال بھی سامنے آتی ہے کہ حسین بن عمر حضرت امام زین العابدین علیہ السلام سے خلافت قبول کر سکی یہی خبر ملے کہ تا ہے۔ (طبری) یا خود ابن زبیر کو حصول خلافت کے لیے شام چلنے کی ہمارا دیتا ہے۔ ایسے ہواوی رہیں جیسے مروان اور حجاج بن یوسف آج بھی ہمیں ملے دن تک ۶۰ ہزار اور تین ہزار فوجیں لے کر جنگ کرتے ہیں۔ مروان کی فوج اور گورنر مصر کی فوجوں میں جنگ ہوتی ہے۔ مروان بستر خلافت پر مارا جاتا ہے۔ ایران میں شہر ان ابن مرثد اور غوثیم کی لڑائیاں، اوس بن ثعلبہ اور عبداللہ بن خازم کی نیرو آرائیاں اس کی مثالیں ہیں کہ کیونکر بنی امیہ اپنے ہاتھ سے قتل کر رہے تھے اور پھر وہ سخت اور بڑی لڑائیاں شروع ہوتی ہیں جو زبیر بن مہلب اور زبیر بن عبد الملک سے ہوئے تھیں جن میں زبیر اعلان کرتا ہے کہ اہل شام سے جنگ کرنا ترک و دہم کی جنگ سے افضل ہے۔ غیر مسلمین سے جنگ ہو رہی ہے لیکن سورہ بن ابر اور جناب نبطی بھی آپس میں ٹکڑا رہے ہیں۔ عبد الملک بن مروان اور عمر بن سعید الاشقر کی سیاسی رد و بدل اور اشقر کا قتل، عبدالرحمن بن محمد بن اشعث اور حجاج کی خونریز لڑائیوں میں عبدالرحمن بن زبیر بن عبد الملک کو موقع ملتا ہے کہ محمد بن اشعث کی فوج کی امامت کر آئیں اور نہایت یافتہ فوجیں ان کے پاس جمع ہوئیں عبد الملک بن مروان کا

اپنے لڑکے کو اور عبدالعزیز بن مردان کا اپنے لڑکے کو خلیفہ بنانے کی کوشش کرنا۔ عبدالملک بن مروان جو خلیفہ ہو کر تو ان حمید سے کہتا ہے کہ اب میری طاقت قیامت تک تھی۔ وہ حجاج کے ایسے دشمن انسانیت کو اپنے بعد بھی خلق اللہ پر اس لیے قائم رکھنے کی وصیت کرتا ہے کہ اس نے اسے خلافت پر قائم رکھنے کے لیے مشبوں کو ہمال کیلہ اور پھر شلم بن عبدالملک اس طرح اس سے انتقام لیتا ہے کہ حجاج کے دشمن زید بن عجلب کو گورنر بناتا ہے جو حجاج کی اولاد سے انتقام لیتا ہے۔ قتیبہ خلیفہ کو اس لیے دیکھا دیتا ہے کہ اگر تم مجھے خلیفہ نہ کرو گے تو تمہیں معزول کر دوں گا۔ بنی امیہ اپنے سب سے اچھے خلیفہ عمر بن عبدالعزیز کو اس لیے زہر دیتے ہیں کہ وہ ظلم سے منج کر تا تھا۔ ضرر بن سید اور عمر بن قتیبہ بن مسلم کی جنگ جلیہ اور حاتم کی مراد میں اور ایک دوسرے کو ایذا رسانیاں۔ غرض کہ یہ سب ایک طرف ہو رہا تھا۔ اور ابھی سترہ نہ شروع ہوا تھا کہ محمد بن علی بن عبداللہ بن عباس کے دعاۃ کوفہ و خراسان میں پھرنے لگے۔ اور چونکہ یہ دعاۃ نہایت خاموشی سے کام کرتے تھے، اور زیادہ تعداد میں تھے یہ لوگوں کے قلوب کو بنی امیہ میں پھیرنے، آل رسالت اور بنی عباس سے محبت پیدا کرنے میں کامیاب ہوتے جاتے تھے۔ یہاں تک کہ خراسان کے نامی سردار ابو عبد بن حرث بن شریح نے سترہ میں سیاہ کپڑے پہنے لوگوں کو اتباع کتب اللہ و سنت رسول اور بیعت امام رضا کی دعوت دینے لگا۔ اور بنی امیہ کا حقوڑا نقصان نہ کیلہ اور سترہ میں حضرت زید بن علی نے حقوڑے لوگوں کے ساتھ جن طرح بنی امیہ کے کثیر آدمیوں کو قتل کر کے شہادت حاصل کی اس نے ثابت کر دیا کہ سلوات کی شجاعت باوجود خاموشی کے ان سے علیحدہ نہیں ہوتی ہے۔ مجھے یاد آتا ہے کہ غالباً حضرت زید شہید ہی کا یہ فقرہ تھا کہ: ”وہ قوم ذلیل ہوتی ہے جو تلوار کی بازو سے ڈر جاتی ہے۔“ اور اگر میرا ملاحظہ غلطی نہیں کر رہا ہے تو اصول بھی اسب تک مسترداموش نہیں ہوا تھا۔ یہاں تک کہ سترہ میں مختار کے ایسے دو جمعیت فیز شخص سامنے آئے جن کا نام ابو سلمہ (جن کا خطاب وزیر ابی غنم تھا) اور ابو مسلم خراسانی ہے۔ یہ دونوں شخص چاہتے تھے کہ خلافت اہل ابی طالب میں جائے۔ لیکن اباموقت کے قبول نہ کرنے سے یہ بنی عباس ہی کے لیے کوشش کرتے رہے۔ ابو مسلم کو صلاح نے قتل ہی اس لیے کیا کہ وہ اہل ابی طالب کا دوست تھا۔ یہ تھے جنہوں نے بنی امیہ کو ایک بار کے لیے جہاں کر دیا اور پشین گوئی پوری ہوئی۔

میں نے متذکرہ صدر مطرووں میں واقعات کے صرف نام لے دیے ہیں لیکن یہ واقعات یا اور جو کچھ پہلے بیان ہوئے ان کے ساتھ بے انتہائی سہکے قصر فقر کے حوالہ کیے جائیں۔ بار بار بنی امیہ میں اس خیال سے خالی نہیں ہوں کہ ان کے ساتھ کافی نقصان ہو سکے گا۔ مگر میں اسے کتاب کی شکل میں پیش کر دوں۔ اور یہ شہید اعظم صہ سوم ہو۔ لیکن میں اپنی محنت کے لیے قوم کے میاں کا منتظر ہوں گا۔ اگر اس کے لیے عام خواہش مجھ سے کی گئی تو بشرط توافق ابی اس کا تیار ہو جانا میرے لیے نعمت آسان ہو گا اور یہ تہیہ شہادت حسین ہو گا۔



ابی ہاشم علیہ السلام نے کتب حیوان اخبار رضا میں ابومسلمت ہر دی سے روایت کی ہے کہ کوفہ میں ایک جامعہ تھی جسے حسین بن علی قتل نہیں ہوئے۔ خدا نے حظلہ بن سعد شامی کو حضرت کی صورت میں بنادیا اور ان کو حسین ابن مریم کی طرح آسمان پر بلایا اور وہ لوگ اس آیت کو دلیل میں لاتے ہیں کہ ”وَلَنُجْعِلَنَّ اللَّهُ لِلَّذِينَ هُنَّ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ سَبِيلًا“

(۳: ۱۳۲) (حق تعالیٰ کافروں کو مومنوں پر تسلط نہیں دیتا) فرمایا (حیرت علی رضائے) جھوٹ کہتے ہیں۔ غضب نازل ہو ان پر وہ لوگ کافر ہوئے بسبب تکذیب کرنے پیغمبر خدا کے کہ حضور نے قتل حسینؑ کی خبر دی۔ تم بھرا حسینؑ قتل ہوئے اور قتل ہوا وہ شخص جو حسینؑ سے بہتر تھا یعنی علی بن ابی طالب اور مراد حق تعالیٰ اس آیت میں یہ ہے کہ مومنوں پر کفار کی کوئی فحش نہیں ہے اور وہ کیونکر ہو سکتی ہے اس لیے کہ حق تعالیٰ نے قرآن مجید میں خبر دی ہے کہ کافروں نے اکثر پیغمبروں کو ناحق قتل کیا لیکن باوجود قتل کرنے کے فحش پیغمبروں کی ان پر غالب تھی اور حقیقت ظاہر تھی۔

کتاب اکمل الدین و احکام وغیرہ میں محمد بن ابوالہیثم بن اسحاق طائفی سے روایت ہے کہ میں ایک دن شیخ ابوالقاسم حسین بن روح قدس اللہ روحہ کے نائب جناب صاحب الامر علیہ السلام نے حج ایک جماعت کے پیشوا اور علی بن علی قمری بھی ان میں تھا ناگہ ایک شخص ان میں سے اٹھ کر کہنے لگا:

شخص: ”ایک مسئلہ تم سے پوچھتا ہوں۔“

حسین بن روح: ”پوچھا!“

شخص: ”آیا حسینؑ بن علیؑ دل خدا میں؟“

حسین بن روح: ”بے شک۔“

شخص: ”قاتل ابن جناب کا دشمن خدا ہے یا نہیں؟“

حسین بن روح: ”بے شک۔“

شخص: ”آیا جائز ہے کہ حق تعالیٰ اپنے دشمنوں کو اپنے دوست پر مسلط کرے؟“

حسین بن روح: ”اگہ ہو کہ حق تعالیٰ کو نہیں دیکھ سکتے اور سب آدمی کلام خدا کو سب واسطہ نہیں بن سکتے

اور نہیں کچھ سکتے۔ لیکن جناب قدس ان کے لیے ایک رسول ان کی جس اور منف سے بھیجتا ہے کہ حمل ان کے جو اس

لیے کہ اگر رسول ان کی صورت نہ ہو تا اور غیر جس سے ہو تا تو ہر آئینہ یہ اس سے نفرت کرتے اور اس کے کہنے کو قبول

نہ کرتے۔ اور جس وقت ان کی جس سے تھے، کھانا کھاتے تھے اور ہانڈیوں میں پیرہتے تھے تو کہنے لگے تم بھی چل رہے

ہو ہم تمہارے کہنے کو قبول نہ کریں گے، جب تک کوئی ایسی چیز نہ لادے کہ ہم اس فعل سے عاجز ہوں اور ہم اس پر قادر نہ ہوں۔

اور جائیں کہ حق تعالیٰ نے اپنی رسالت اور جلال کے لیے تم کو مخلص کیا ہے اس وقت حق تعالیٰ نے رسولوں سے ایسے

معجزات مقرر فرمائے کہ تمام مخلوقات ان کے بوالہ سے عاجز تھیں۔ بعض پیغمبروں نے الے اور تحوین ائمہ کے لیے طوفان

لائے۔۔۔ جب رسول ایسے معجزے لائے اور ان کی امت بوالہ سے عاجز ہوئی حق تعالیٰ نے اپنے ائمہ پر معجزاتی معجزات

حکمت کلام سے پیغمبروں کو باوجود ان سب معجزات کئی غالب کئی مطلوب کئی مقہور کیا۔ اس واسطے کہ اگر پیغمبروں کے معجزات

معجزات اور خارق عادات کے ہر حال میں غالب اور ظہر ہوتے اور بلا و نصیبت میں احسان نہ کیے جاتے تو ہر آئینہ لوگ

انہیں خدا جانتے لگتے اور خصلت ان کے صبر کی بلا و نصیبت میں لوگوں کو نہ معلوم ہوتی۔ لیکن حق تعالیٰ نے ان امور میں

پیغمبروں کے احوال کو حمل اور دل کے رکھا۔ اس لیے کہ محنت و بلا میں صبر کریں اور طاعت میں ہلکے کریں اور ہر حال میں

فواج اور فروعی کریں۔ مگر اور تجربہ نہ کریں۔ لوگ نہائیں کہ ان کے لیے ایک خدا ہے کہ وہ خالق و مالک سب ہے۔ اس کی

علاوہ کریں اور محنت خدا کی تمام ہو اس شخص پر جو حدود خدا سے ان کے باب میں نکل جاوے اور دعویٰ ان کی خدائی کا کیجے۔ یہ عداوت و مخالفت اور نافرمانی ان کی کرے اور جو پیغام خدا کی طرف سے لائے ہیں اس کا انکار کرے۔ تا آنکہ جو بلاک جو بعد اتمام محنت کے بلاک ہو اور جو نجات پائے نہ دلیل اور بیان حجت پائے۔



حسین کا مرثیہ قریب قریب ان کل زبانوں میں جو مسلمانوں میں مشتعل ہیں حضرت شہید کریم کے مرثیے پائے جاتے ہیں۔ (انگریزی اور بلکہ ہندی میں) کا اور ہر ایک نے اپنے خوش میں اس عبرت عیز واقعہ کو اپنی وسعت نظم اور درجہ جذبات کے موافق نظم کیا ہے۔ اگر شاعری کے ایک معنی اظہار جذبات ہے (عام اسما سے کہ خوبصورتی کا کیسا ہی درجہ کیوں نہ ہو جو پیشہ شاعر کی وسعت نظر اور درجہ معلومات بلکہ اس کی ساخت پر موقوف رہے گا) اور عربی ان کے اہل فہم اپنے جذبات کے لیے ممتاز ہے تو بے عربی شاعری پر پہلا کاٹ کر تاڑے گا۔ عربی شاعری پر سب سے پہلے نظر کرنے کی ایک یہ وجہ بھی ہے کہ حضرت عرب شاعر تھے قاتل عرب تھے جذبات مسلمان تھے زمین و آسمان عرب تھے ان اتفاقات میں عربی ہی اس کے لیے موزوں ہے کہ وہ واقعات اور بیانیات محنت و غم کی مصوری کرے۔

اور کے فضائل سے غالباً اس کی یکجہ بندی ہوتی ہوگی کہ میں عربی زبان کے علاوہ مرثیہ کی فطرت سے نہیں بچ رہا ہوں بلکہ یہ کہہ رہا ہوں کہ جو فطری موانع اس خاص امر میں عربی شاعری کا حاصل تھے وہ دوسری زبان کو حاصل نہ تھے۔ چشم دید گواہ لار سے جو نے زبانی کا فرق تھا جو ہر چیز راوی سے قرض لیتا ہے در نہ فارسی زبان کی خوبصورتی اور حسن ادا بلکہ اکثر اوقات شاعر کے غلبہ کے موافق اظہار وقت میں کمی نہیں ہے۔ پھر بھی عربی شاعری زیادہ تر واقعاتی شاعری ہے۔ اور اس کے مقابلہ میں غالباً فارسی زبان کی شاعری ان حدود میں زیادہ ڈوب گئی ہے عروج کی پست خصوصیات کہیں اس سے میرا مطالبہ نہ سمجھتا چاہیے کہ ان میں فردوسی کا ایسا انداز ہے، سعدی کا ایسا اخلاقی شاعر، عری کا ایسا خوبصورت گو، علی کا ایسا اقربا، ضربہ جیسے دالانہ قلم یا شتم کا شی اور طہمیل کا ایسا کوئی مزید گو نہ تھا۔ نہیں بلکہ فارسی شاعری کی خوب صورتیوں کے ساتھ قافی کا ایسا قادر الکلام بھی پیدا ہوا جس نے بہت کچھ فطری شاعری بھی داخل کر دی۔ ایک لفظ اپنی زبان کے لیے میر کا عربی اردو سے ہے۔ اردو یعنی وہ زبان جس کے الفاظ میں نے دنیا میں پہلے سنے جس میں میری ماں نے مجھے سکھایا۔ جس کے الفاظ پیار سے میرے غم میں دیے گئے جس وقت میں بہتانہ قلم اور میں میں غم سے ہر اس شخص نے بات کی ہے مجھے سے محبت تھی زبان جس نے مجھے بتایا۔ میں جیسا بھی ہوں (موت انسانانی غمالات کے شور و غبار زبان کے درجہ کے اثر کے متعلق یہاں کچھ زیادہ نہیں کہہ رہا ہے) میر، اللہ، سودا، موسیٰ، غالب، انیس، اسحق، میر عشق، اور صبح وغیرہ کی تعلیم جن میں کوئی فلسفی کا ایسا نہیں۔ کوئی نسیم جو کا ایسا نازک ادب، کسی میں مردوں کی ہی سختی اور کسی میں محبت کی اثر عزیز ایک قلم اور کئی ہالی کا سادہ صاف قلم زبان اور اظہار خیال میں دیکھنے کی پہلی چیز یعنی "وقت" کے آثار بھی کم و بیش محسوس نہیں ہیں اور اگر سب نہیں تو بعض نے اپنے الفاظ میں بلند شان پیدا کی ہے۔ لیکن مجھے شاعری کی عام حیثیت سے اس بلکہ مجھے نہیں سمجھتا بلکہ ایک خاص حیثیت یعنی مرثیہ سے۔ اور میرا امیدوار یہ نہ تھا کہ کوئی کہاں تک مبالغہ کر سکتا

بہت بڑے معنی مضمون آخری میں کہاں تک مکمل حاصل کیا ہے۔ ماضیوں کی افراط نے مریضی صدمہ گہری ہے۔ یا رعایت نظمی اور مباحثہ کس حد تک ہے۔ بلکہ پہلی کی ایسی کھری جسے سن کر دل اقرار کرے کہ یہ واقعہ ہے۔ استعارہ اور تشبیہ کی لطیف شان، شعر پرہ کر معلوم ہو کہ یہ شخص نہ صرف واقعات سے واقف ہے بلکہ وہ اس کے غور کا نتیجہ ہے۔ جذبات کا اظہار اس طرح نہیں جس سے معلوم ہو کہ وہ ہماری رقت یازنی سے کھیل رہا ہے۔ اور پھر اس کے بعد سب سے بڑی ضروری چیز خامہ نگاری ہے۔ شاعر اگر محض صدمہ یا افسانہ یا رہا ہی گھر کا اور وہ مصور نہ ہو تو وہ ایک محکمہ ہے جو بغیر فحشہ کے کچھ باتا جاتا ہے جو کچھ بھی بن جاتے۔ ظاہر ہے کہ ایسی محنت بغیر کسی طے شدہ نظام کے کیسی غیر مرتب ہوگی۔ صنعت بغیر شعور اور نظم کے اور نظم بغیر صنعت کے کبھی تعمیر کے اعلیٰ درجہ پر نہیں پہنچ سکتی۔ میرے ان فقرات سے ظاہر ہوگا کہ میں شاعری کے کس درجہ کا متبعی ہوں۔ میں ایک حد تک اپنے زمانہ کے شعرا اور مرثیہ گوئیوں کے کلام سے واقف ہوں اور ان میں ایسے ہیں جو کسی زبان کے لیے قابلِ داد ہوں۔ میں اپنے زمانہ کے شعرا سے امید کروں گا کہ وہ آئندہ کے لیے ایک ترقی خیز نظام اور اصول قائم کریں گے۔ اور اسلام کے نفوسِ قدسیہ کی مدح اور مرثیہ میں متذکرہ صددِ نکات کا لازمی لحاظ کیا جائے گا۔ وقت بچا جائے گا۔ عروج بن گئی کی جسامت اور باقی گھوڑے کی غیر ضروری مصوری میں چھٹی دل چسپی کی امید کی جائے۔ لیکن مجھے اپنی زبان کی مرثیہ گوئی سے ابھی غلاب ہاتی ہے۔ اور میں چاہتا ہوں کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں اس کا اندازہ کیا جائے اور وہ یہ ہے کہ ہمارے ایک قوی مثل میں مجلس کے عنصر میں شاعری کو ایک دخل حاصل ہے۔ اور چونکہ مجلس کو ایک وہ انسٹی ٹیوشن ہونا چاہیے جو قومی حیثیت سے مفید ہو۔ میں اپنے اس جلسہ کی یہ حیثیت کا لحاظ لازمی ہے۔ جو اثر مجلس کا ہماری قوم پر ہے۔ اگر اس میں کسی کا غیر محسوس میلان یا اس قوی عنصر نظم کا لحاظ اندازہ شامل ہے تو قوم کو بازمی اور اصلاح کا حق حاصل ہے۔ ہماری مجلس خراسانی کے واقعات عظیم کے تذکرہ کی جگہ ہے۔ حیثیت کے واقعات میں قوم گری اور خصال سازی کی پوری صلاحیت ہے۔ اس لیے کوئی ترکیب یا نوعیت جو اس میں مدد دیتی ہے وہ ہماری بصیرت کے قابل اور کوئی نوعیت جو اس میں مدد پر پوری نہیں اترتی ہمارے لیے نظر ثانی کی چیز ہے۔ یاد رکھو کہ ہم کسی شاعر کو مجلس میں اس کی شخصی قابلیت کی داد نہیں دیتے جاتے جو مجلس حیثیت کے مقہوم کے خلاف ہے۔ بلکہ اس لیے کہ ہم سمجھیں کہ حیثیت اور واقعات حیثیت کو شاعر کہاں تک کہا اور کچھ سا ہے۔ اور اس کی اس خصوصیت کو کشش کی کامیابی میں اس کی فنی داد ہے۔ ہم ایک نفس عظیم کے خصال سے اثر لینے جاتے ہیں اور ہم ان کی اثرات پر دلوں سے متاثر ہو سکتے ہیں نہ کہ اس کے برخلاف۔ اس کے برخلاف اگر کوئی ہمارے حیثیت کی مجلس کو کسی اور طرح صرف کرنا چاہتا ہے تو وہ نہ صرف ایک شخصی نوعیت تبدیل کر رہا ہے، بلکہ ہمارے قومی فائدہ کو روک رہا ہے۔ اور اس میں ناقص یا غیر متعلق چیزیں شامل کرتا ہے۔

ہمارے مرثیہ کی صورت میں رخصت، اور شادی بیاہ کی امید اور پھر اس کو بھٹ کچھ دینا ہے۔ اور پھر شہادہ کے بعد بین ایک نتیجہ ہے۔ یہ اس لیے ہے کہ رخصت میں عورتوں کی نرم دلی اور ماں کے جوشوں کی بڑی گنجائش ہے۔ اب میں یہ کہتا ہوں کہ میں اس کا محض نہیں ہوں کہ جذبہ غم میں بیان پیدا نہ کیا جائے۔ لیکن جذبہ غم کی ایسی مصوری تو جو زیرِ ذکر خصال کے بھلنے میں غلطی کرتے ہوئے ہیں اسے اس سے بہتر قروں میں نہیں کہا جاسکتا کہ وہ بیسیاں جو عہدِ ازل کے کہا کی باتیں، بیسیاں اور بیسیاں جو کتنی خصال نگاری میں انصاف کی غواہی ہیں۔ جذبہ غم کے بیسیاں کے معنی یہ نہیں ہیں کہ

کوئی شخص بدحواسی سے تجھیں مار کر روئے۔ بلکہ اظہار غم کے موقع اور بے چینی کے وقت صبر بھی سب سے بڑا مشیہ ہے۔ اس شاعری میں جو کچھ ہوا میرے نزدیک قوم پر اس کی خصائل سازی میں بہ نسبت اچھے کے پست تر اثر ہوا۔ اس لیے کہ طبقہ اناس کا مثالیہ زیادہ بلندی کا محتاج تھا اور اس وجہ سے قوم میں بہ نسبت گوارا نری کے بے احتیاط نری پیدا ہوئی۔ یہ عام مفہوم میں عورتوں کا سارو نا کہا جائے نہ ان کا ایسا جیسے کر بلا کی حذر رات تھیں۔

اسکندہ میرے متذکرہ صدر ریادک کے متعلق کسی حیثیت کی غلط فہمی نہ پیدا ہونے کیلئے لکھا ہوں کہ اس میں کسی ایسے خیال کی گنجائش نہیں ہے کہ میں کسی یا کئی مرثیہ گوئیوں کی کوشش کو خفت کے حوالہ کر رہا ہوں یا چونکہ میں نے یزچند کے بہت سے نام نہیں لکھے ہیں اس لیے میرے نزدیک ان کی کوئی قدر نہیں ہے جن کا نام میں نے نہیں لیا۔ یا کسی سے باوجود ان باتوں کے جانے جانے کے اعراض کر رہا ہوں۔ نہیں۔ تمام تعظیم ان کے لیے جنہوں نے کوششیں کیں۔ میری کتب اور میرے نزدیک ایسی اور دیر پے کی ایسی کوئی جگہ نہیں ہے۔ میں کسی شخص سے بحث نہیں کر رہا ہوں بلکہ اصول سے۔ اور ساتھ ہی یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ میں حسین کا سوانح نویس ہوں نہ کہ کسی شاعر کا سوانح نویس، مداح یا نقاد۔ اور اس لیے حسین کی ذات مقدس کے متعلق کسی کوشش کو شخص کی عام حیثیت سے نہیں دیکھ رہا ہوں بلکہ اس کی اس مخصوص حیثیت سے۔ مجھ سے یہ بھی امید نہ کی جائے کہ میں ذکر حسین کی عظمت کو نری اور رعایت سے غیر مثالیان ہاتھوں میں دیکھ کر اعتراف کروں گا۔

خیر تو میں مختصر اشارے کر چکا جو کچھ مجھے کہنا تھا۔ اب میں بعض کے اشعار اور بعض کا مفہوم پیش کرتا ہوں۔ (مؤلف کو یاد آتا ہے کہ نایخ التواریخ میں حضرت کا عربی مرثیہ کافی حد تک جمع کیا گیا ہے۔ مولوی سید محمد ہارون صاحب زنگی پوری نے بھی شہید اسلام میں جمع فرمایا ہے) میں نے اپنے نوٹ میں طوالت کے لحاظ سے اشعار نہیں نوٹ کیے۔ بلکہ صرف ان کا مفہوم۔ اس لیے میں الزام کا مورد نہ قرار دیا ہوں۔ میری غرض یہ ہے اور بس کہ میں مرثیت کا مفہوم لکھوں۔ جو کتابیں میرے پاس ہیں ان میں سے بعض اشعار بھی نوٹ کر دوں گا۔
موقع کے لحاظ سے میں اس کے پہلے اشعار درج کر چکا ہوں۔ وہ حضرت سید الشہداء کے ہوں، اہل بیت طہارت کے ہوں یا شاعر کے جو میری غرض پوری طرح بکھلتے ہیں۔

ابن قتہ

مردت علی ابیات آل محمد قلم اریھا امثالھا یوم حلت
میرا گزر ہوا آل محمد کے گمروں کی طرت تو میں نے اس دن کا ایسا نہیں دیکھا جس دن آیا تھا
فلا یبعد اللہ الدیار و اعلیٰ و ان اصبحنا منہم بزعم تغلت
خدا کسی کو اس کے شہر سے جدا نہ کرے اگرچہ وہ دشمنوں کے چھن میں خلی ہو گئے ہوں
الا ان قتل الطفت من آل ہاشم اذلت رقاب المسلمین فذلت
اگہ ہو کہ کر بلا میں آل ہاشم کے قتل نے مسلمانوں کی گردنوں کو شرم سے نیچا کر دیا

امام زین العابدین (علیہ السلام)

ان الزمان الذي قد كان يضحكنا
 دہ زمانہ جو کبھی ان (مہاجر عزیزوں کے) قرب سے ہم کو خوش کرتا تھا اب ان کے فراق سے ہم کو رونا رہا ہے
 خلعت لفقدہم ایامنا فقدت سودا و کانت ہم بیضا لیالینا
 ان کی جہان سے ہمارے دن سیاہ ہو گئے مالاکھ (ان کی موجودگی میں) ہماری راتیں بھی نورانی تھیں
 فلی تری الدار بعد البعد آنسہ ام حل یعود کما قد کان نادینا
 کیا ان کے فراق کے بعد تو گھر کو آباد پانے کا یا جس طرح پہلے ہم کو ہلانے والا جاتا تھا اس طرح پھر ہلانے کا
 حرفقو۔ بفقادی فی ہوادجکم فقدتہ یوم راحت من اراضینا
 اپنے ہمدردوں میں میرے دل کے ساتھ نری کرو جو اس روز سے گم ہے جب وہ ہماری سرزمین سے کوچ کر گئے
 فوالذی حجت السکبان کعبتہ و من الیہ المطالب الکل ساعینا
 تم ہے اس فاقہ کی جس کے کعبہ کا گرج کرنے کے لیے ہمارے ہیں اور جس کی طرف تمام ساریاں دوڑتی ہیں
 امام صبییری

و بریحائین طیبہا منک الذی اودعنا الزہراء
 (یا رسول اللہ) میں آپ کے آپ کے ریاضتیں کا واسطہ دیتا ہوں جن کی خوشبو آپ کے حق اور جو حضرت فاطمہ زہرا کے سپرد کیے گئے تھے
 کنت تووہما الیک حکما اوت من الخط ققطتہما الیاء
 آپ کو اس طرح اپنے سے لگائے رکھتے تھے جس طرح حوت یاد کا خاکشیدہ اپنے دونوں نفلوں کو پیٹہ میں رکھتا ہے
 من شہیدین لیس ینسینی الطفت مصائبہا و لا کربلاء
 وہ دونوں ایسے شہید ہیں کہ طفت اور کربلا ان دونوں نصیبت زہروں کو بے جھوٹے نہیں دیتے
 ما رعی فیہا دعائک مرو سٹ و قد خان عہدک الرؤسا
 رعلا نے آپ کے ذمہ داریوں کی رعایت نہ کی اور رعیتوں نے بھی آپ کے عہد میں خیانت کی
 ابدلوا الود و الحفیظہ فی القر بی و ابدت ضبابہا النافقاء
 (لوگوں نے) محبت اور حفاظت کو جو آپ کے قربت منزلوں کے لیے چاہیے تھی بدل دیا اور شورا نے اپنے سوسائوں کو ظاہر کر دیا
 و قست منهم قلوب علی من بکت الارض فقدم و السماء
 ان کے قلوب ان لوگوں کے لیے سخت ہو گئے جن کے کھو جانے پر زمین و آسمان رونے
 فابکم ما استطعت ان قلبلا فی عظیم من المصاب بکاء
 پس رو ان لوگوں کو جتنا ہو سکے کیوں کہ بکا ایسی عظیم الشان نصیبت زندہ کے لیے قہور ہے
 کل یوم و کل ارض لکبی منهم کربلاء و عاشوراء
 ہر روز دہر زمین ان کی نصیبت کی وجہ سے میرے لیے کربلا و عاشورا ہے

اَل بَيْتِ النَّبِيِّ اَنْ فَوَادِي لَيْسَ يَسْلُبُهُ عَنْكُمْ التَّاسَامُ
 اے اہل بیت نبی میرے دل کو تمہاری مصیبتیں چھین نہیں لینے دشمن
 اَل بَيْتِ النَّبِيِّ طَبَقُ فَطَابِ الْمَدْحُ لِي فَيْكُمُ وَ طَابَ الرَّثَاءُ
 اے اہل بیت رسول اللہ تم لوگ پاک ہو اس وجہ سے میری مدح اور مرثیہ خوانی بھی پاکیزہ ہے
 اَنَا حَسَانٌ بِمَدْحِكُمْ فَاذَا لَحْتَ عَلَيَّكُمْ فَاَنْتَ الْخَنْسَاءُ
 میں تمہاری مدح میں مثل حسن کے ہوں اور جب تمہارا نام کرتا ہوں تو خسر ہوں (خسر ایک عورت تھی جو لادہ مرثیہ کہنے میں مشہور تھی)
 سَلِّمْتُ النَّاسَ بِالتَّقْوَىٰ وَ سَوَّامُ سَوْدَتِ الْبَيْضَانِ وَ الصَّفْرَاءُ
 تم تقویٰ کی وجہ سے لوگوں کے سوار ہو اور تمہارے سوا لوگوں کی سرداری سونے اور چاندی کی وجہ سے ہے
سیتہ مرتضیٰ علم الہدی

لَمْ جَسُومَ عَلَى الرَّمْضَاءِ مَهْلِكَةً وَ انْقَسَ فِي جَوَارِ اللَّهِ بَقْرَةً
 ان کے جسم خاک پر پڑے ہیں اور ان کی جانوں کی مہلتی خدا اپنے جوار رحمت میں کرتا ہے
 كَانُ قَاصِدَهَا بِالضَّرِّ نَافِعَهَا وَ اِنْ قَاتَلَهَا بِالسَّيْفِ مَحْبِبَهَا
 جو ان کے ضرر کا ارادہ کرتا تھا اس نے ان کو قح پھینکا اور ان کو نکوار سے مارنے والا ان کا جاننے والا تھا
لا اعلم

اِنِّی حَسِیْنَا مَبْلَا کَانَ حَسِیْنَا جَبَلَا
 میں خبر لیا ہوں کہ حسین شہید ہوئے حسین جو پہلے تھے

جعفر بن عقیل
 اگر کوئی مصیبت پر روتا ہے تو اسلام پر رونے کہ اس کے احکام کو اس روز خلع کر دیا جس روز نکوار اور نیروں کو
 امام حسین علیہ السلام کے خون سے سیراب کیا۔
عبد اللہ بن غالب
 حسینؑ کے جسم اقدس کو رد جو کربلا کی خاک گرم پر عریاں پڑا تھا اور جوانی گرد و غبار اس لاش اقدس پر جمع کرتی
 تھیں کہ برہنگی سے محفوظ رہے

دعبل خزاعی
 اے قاتلہ زہرا! اے سیدہ زنان عالم اگر آپ جوتیں اور اپنے پارہ بجز کو ہاں تشنہ فرات پر افتادہ شہیدہ بختیں تو
 ضرور اپنے منہ پر طمانچے مارتیں اور محل پر نالہ کے آنسو خسار پر جاری ہوتے۔
حضرت زینب علیہا السلام

يَا مَلَالَا لِمَا اسْتَقَمَّ حَكْمًا لَا غَالَهُ خُسْفُهُ فَاَبْدَا غُرُوبًا
 اے ہال ای تو تو کھل کو پنہا ہی تھا کہ گہن لگ گیا اور ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا

ایضاً

اگر وہ (بنات رسول) حیر سے بے پردہ ہیں تو اپنے محنت و حیا کی وجہ سے پردہ میں ہیں۔
حضرت ربابؓ

ان الذی کان نوراً يستضاء به بکربلاء قتیل غیور مدفون
 وہ جو نور تھا اور لوگوں کو اس سے نور حاصل ہوتا تھا کربلا میں شہید کیا گیا اور کسی نے دفن بھی نہیں کیا
 سبط النبی جواک الله صالحه عنا و جنبہ خسران الموازین
 اے سبط نبی خدا آپ کو جزائے غیر دے آپ میزان کے نقصان سے بچ گئے
 فقد کنت لی حبلاً صعباً الودیه و کنت تصحبنا بالرحم و الدین
 آپ میرے لیے ایک مضبوط پہلا تھے جس میں پناہ لیتی تھی اور آپ ہمارے ساتھ رحم اور دین سے پیش آتے تھے
 من الملتامی و من للساکین و من یعنی و یا وی الیہ کل مسکین
 اب کون رہا ہے جو تھیں اور قیوں کو پناہ دے اور جس کی طرف مسکین جاویں
 و الله لا ابتغی مھراً بصھرم حق اغیب بین الرمل و الطین
 و اللہ تمہارے گھر کے سوا اب کسی کی یہ نہ ہوں گی جب تک کہ ریگ اور خاک میں دفن نہ ہو جاؤں
لااعلم

ادی قتل طفل من سلالة هاشم نوح له کل النوری نوح مآثمہ
 میں دیکھ چکا ہوں کہ اگر بنی ہاشم میں کوئی بچہ قتل ہوتا تھا تو تمام دنیا اس کے لیے نوح کرنے لگتی تھی
 و کانو غیائاً ثم بادوا جميعهم و قد عظمت تلك الزهراء جہا طمہ
 پھر وہ دن آیا کہ سب کے سب ہلاک ہو گئے مگر وہ فریاد رس تھے اور یہ مسیحیں حضرت فاطمہ زہرا کے لیے بہت بڑی ہو گئیں
عقبہ بن عروۃ الشعبی

مردت علی قبر الحسين بکربلاء ففاض من دموی غزیرہا
 جب کربلا میں حسینؑ کی قبر پر میرا گزر ہوا تو میری آنکھوں سے آنسوؤں کی سیل جاری ہو گئی
 فیا عين ابکی للحسین و عصبہ ا طاف به من جانبہ قبورہا
 اے آنکھ حسینؑ اور ان کے اعزا پر رو جن کی قبریں حسینؑ کے گرد بنی ہیں
 سلامی علی اهل القبور بکربلاء و علی کل من للسلام یزورہا
 ان پر میرا سلام جن کی قبریں کربلا میں بنی ہیں اور انہیں بھی میرا سلام پہنچا جو ان کی زیارت کرتے ہیں
شافعی

میرا دل جلائے آہ ہے۔۔۔ کون ایسا ہے جو حسینؑ تک میرا سلام پہنچا دے۔ اگرچہ اس پیغام رسانی سے لوگوں کے
 نفس و قلوب کراہت کرتے ہیں۔ حسینؑ بے گناہ فتن کیا گیا اور اس کا کردار غوانی رنگ کے پانی (خون) سے رنگین ہوا۔

کیا تعجب ہے کہ رسولِ ہاشمی پر صلوات بھیجی جائے اور ان کی اولاد سے جنگ کی جائے۔

جوہری

روزِ عاشورا اپکار کس قدر افسوس ہے دین پر اسے اکل یسین۔۔۔ آج کے دن فخرِ مضر کے ستارے ذلت و توہین کے ساتھ ٹوٹے۔ آج کے دن اللہ تعالیٰ کا نور روشن ہو گیا اور قنوی کا خون زمین پر بہایا گیا۔۔۔ آج کے روزِ زنی عرب نے بدر و صفین کے کینے نکالے۔

کمیت

ابتدا ظلم کی اہل سیف پر جس نے کی ہے اس کا نتیجہ نذیر نے پورا کیا۔

حضرت ام کلثوم علیہا السلام

ظہرِ دے مسافرانِ عدم اور ہمیں دواع کر لو قبل اس کے کہ ہم سے دور ہو۔۔۔ کشادہ زمین تمہارے بعد نمج پر قید خانہ بن گئی۔ تم پر سلام ہو (اے شہیدانِ کربلا) تمہارا فراق کس قدر سخت ہے۔۔۔ جب آفتاب طلوع کرتا ہے تو اے اہل وطن تم بلا آتے ہو اور جب غروب کرتا ہے تو تمہاری وجہ سے غم تازہ ہو جاتا ہے۔ (شہیدِ اسلام)

فتاویٰ

از غم۔ کد ام غم؟ غمِ سلطانی اولیا
ماش کہ بود؟ فاطمہ جدش کہ؟ شہدائی
کہ؟ حاضرِ عمر۔ پنہاں؟ نے بر ملا
شد لاگلو بیدہ سرش؟ نے نے از قضا
کہ؟ شمر از چہ چشمہ؟ ز سر چشمہ فنا
کارش چہ بود؟ ہدایت و یارش کہ بد؟ خدا
زوللو ہند۔ بلا بر او لعنت خدا
نزد کہ؟ نزد زلاؤ مرچانہ دغا
از گفتہ یزید تحلف نہ کرد؟ لا
نہ او روانہ کرد سپہ سونے کربلا
خلق عزیز فاطمہ؟ نے شمر بے حیا
شرطِ حفاظت چہ بود؟ لوح و بکا
دیگر کہ؟ نہ برادر و دیگر کہ؟ اقربا
سجود کو بد او بہ غم و رنج مبتلا
باعر و احتشام؟ نہ با ذلت و عتا
زینب سکینہ فاطمہ کلثوم بے نوا

بارد چہ؟ خون کہ؟ دیدہ چہ؟ روز و شب۔ چرا؟
نامش چہ بد؟ حسین تزلزل کہ؟ از علی
چوں شد؟ شہید شد۔ بہ کیا؟ دشتِ مادیہ
شب کشتہ شد؟ نے روز۔ چہ ہنگام؟ وقتِ ظہر
سیراب کشتہ شد؟ نہ کس آتش بدلاؤ دلا
مظلوم شد شہید؟ بلکہ جرم داشت؟ نہ
ای ظلم را کہ کرد؟ یزید۔ ای یزید کیست؟
خود کرد ای عمل؟ نہ فرستاد نامہ ای
این زلاؤ زلاؤ مرچانہ بد؟ نعم
ای تباہ کشت حسین را بدست خویش؟
میر سپہ کہ بود؟ عمر سعد او برید؟
بہر چہ؟ بہر آنکہ خود خلق را شفیع
کس کشتہ شد ہم از پسرانش؟ بلے دو تن
دیگر پسر نہ داشت؟ چہا داشت۔ آنکہ بود؟
مائد او بکربلائے پدر؟ نے بشام رفت
تباہ؟ نہ با زبانی حسد۔ نام شاں چہ بود؟

بر تن لباس داشت؟ بلے گرد رہگذر
بیدر بد؟ بلے چہ دوا داشت؟ اٹک چشم
کس بود مہرہش؟ بلے اطفال بلے پدر
از زینت حسرم چہ بجا مانده بود؟ دو چیز
گبر این ستم کند؟ نہ بود و محوس؟ نہ
قاتل یست قاتل این شعر ہا؟ بلے
یعنی: ● بر سالی ہے کیا خون کون؟ آنکھ کیسے؟ دن رات کیوں؟ غم سے کونسا غم؟ سلطان اولیاء کا غم۔
● آپ کا نام کیا تھا؟ حسین۔ کس کا بیٹا؟ علی کا۔ اس کی ماں کون تھی؟ فاطمہ۔ اس کا لانا کون تھا؟ مصطفیٰ
● آپ کو کیا ہوا؟ شہید ہو گئے۔ کہاں؟ عراق کے ماریہ میں۔ کب؟ دسویں محرم کو پوشیدہ؟ نہیں بر سر عام۔
● رات کو مارے گئے؟ نہیں دن کو کس وقت؟ بوقت ظہر۔ ان کا سر گٹے کی طرف سے کاٹا گیا؟ نہیں پس گردن سے۔
● پانی پی کر شہید ہوئے؟ نہیں۔ کسی نے انھیں پانی دیا تھا؟ دیا تھا۔ کس نے؟ شہر نے۔ کس چشمہ سے؟ فنا کے
سر چشمہ سے۔

● مظلوم شہید ہوئے؟ ہاں۔ کوئی جرم تھا؟ نہیں۔ کام آپ کا کیا تھا؟ ہدایت۔ آپ کا مددگار کون تھا؟ خدا۔
● یہ ظلم کس نے کیا؟ مزید لے۔ یہ مزید کون ہے؟ ہند کی اولاد سے ہے۔ اس پر خدا کی لعنت ہو۔
● اس نے یہ عمل خود کیا؟ نہیں، خط بھیجا۔ کس کے پاس؟ ابن مرجانہ مکار کے پاس۔
● ابن زیاد مرجانہ کا بیٹا تھا؟ ہاں۔ مزید کے غم سے اس نے سرتابی نہیں کی؟ نہیں۔
● اس کا بھائی نے اپنے ہاتھ سے حسین کو قتل کیا؟ نہیں۔ کربلا کی طرف فرج روانہ کی تھی۔
● فرج کا سالار کون تھا؟ عمر سعد۔ اس نے فاطمہ کے پیارے بیٹے کاٹھا کاٹا؟ نہیں، شہر بے حیالنے۔
● کس مقصد کے لیے حسین نے شہادت قبول کی؟ اس لیے کہ مخلوق کے شیعہ ہو جائیں۔ آپ کی شفاعت کی شرط کیا
تھی؟ نوحہ اور رونا۔

● ان کے بیٹوں میں سے بھی کوئی قتل ہوئے؟ ہاں، دو فرزد اور کون؟ نوجوالی۔ اور کون؟ قریب رشید دار۔
● اور کوئی بیٹا نہ تھا؟ کیوں نہیں، تھا۔ وہ کون تھا؟ سجاد۔ کہ جو بیاری و غم میں مبتلا تھے۔
● کیا وہ باپ کی کربلا میں رہ گئے؟ نہیں، شام چلے گئے۔ عزت و اعتشام کے ساتھ؟ نہیں، ذلت و سختی کے ساتھ۔
● اکیلے؟ مستوراتِ محرم کے ساتھ۔ ان کے نام کیا تھے؟ زینب، سکینہ، فاطمہ، کلثوم بے نوا۔
● تن پر لباس تھا؟ ہاں، راستے کی دھول۔ سر پر عمامہ تھا؟ ہاں، اشتیاء کا تانہ لپانہ۔
● پیار تھے؟ ہاں۔ دوا کیا تھی؟ آنکھوں کے آنسو۔ دوا کے بعد آپ کی فدا کیا تھی؟ خون دل فدا تھی۔
● کوئی آپ کے ہمراہ بھی تھا؟ ہاں، یتیم بچے۔ اور کون تھا؟ بنار تپ کہ جو آپ سے الگ نہیں ہوتا تھا۔
● محرم کی زینت سے کیا بچا رہا تھا؟ دو چیزیں۔ گردن میں تم کا طوق اور ہاتھوں میں غم کی جھانجی۔

۱ زرتشتی نے یہ تم کیا نہیں۔ یہود نے؟ نہیں۔ مجس نے؟ نہیں۔ ہندو نے؟ نہیں۔ بت پرست نے؟ نہیں۔ اس جٹ سے فریاد ہے۔

۲ یہ شرکے والا قاتل ہے؟ ہاں۔ کیا انگٹسے؟ رحمت۔ کس سے؟ حق سے۔ کب؟ روزِ جزا۔

ملا محتشم کاشی

بلا ایں چہ شورش است کہ در خلق عالم است
گر غواش قیامت دنیا بید نیست
جن و ملک بر آدمیاں نوح میکنند
خورشید آسمان و زمین نور مشرقین
اسے چرخ فانی بچہ پیدا کرد
کام یزید دلاؤ از شکستن حسین
بہر نغے کہ خار درخت شگفت است
حلقے کہ سود لعل لب خود نئی بریں
با دشمنان دیں تھیں کرد آں چہ تو
کشتی شکست خورده طوفان کربلا
در آب ہم منافع کردند کوفیاں
آہ از دمیکہ لشکر اعدا نکرده شرم
کاش آن زمان سراوق گردوں گوں شدے
آل نئی چہ دست قتلیم بہ آوردند
بر خون غم چہ عالمیں را صلا زدند
نوبت بہ اولیاء چہ رسید آسمان طہید
آنگہ سرافق کہ ملک عرش نبود
اہل حرم دریدہ گریاں کشادہ مو
چوں خون حلق تشنه او بر زمین رسید
نزدیک شد کہ خانہ ایماں شود خراب
بلا آں غبار چوں بزار نئی رساند
پر شد ز شور غفلت چوں نوبت خودش
کرد ایں خیال و ہم غلط کار کاں غبار
ہست از ملال گرچہ بری ذات ذوالجلال

بلا ایں چہ نوح و چہ عزاد چہ ماتم است
ایں رختیر عام کہ نامش موم است
گھٹا عزائے اشرف اولاد آدم ست
پروندہ کند رطل خدا حسین
در کیں چہا دریں ستم آباد کرد
بنگر کربہ قتل کہ دل شلا کرد
در باغ دیں چہ با گل و شمشاد کرد
آزردہ اش بہ خنجر پیدا کرد
با شطقی و حیدر و اولاد کرد
در خاک و خون فداہ بمیدان کربلا
غوش داشتند حسرت معانی کربلا
کردند رو نیمہ شعلانی کربلا
ایں خرگہ بلند ستوں بے ستوں شدے
ارکان عرش را بہ تزلزل برآوردند
اول صلا بہ سلسلہ انبیا زدند
زایں نوبت کہ بر سر شیر خدا زدند
کنند از مدینہ و در کربلا زدند
فسریلا بر در حرم کہیا زدند
جوش از زمین بزدہ عرش بریں رسید
از بس شکستہا کہ ہار کاں دیں رسید
گرد از مدینہ بر فلک ہفتمین رسید
از انبیا بہ حضرت روح الامیں رسید
تا دامن جلال چہاں آسمنیں رسید
او در دل ست و بچہ دلے نیست بے ملال

خورشید سر برہنہ بر آمد ز کوہِ سدا
کردند بے عمدی و مہل شتر سدا
روحِ ملائیں ز رونے غی گشتِ فرسدا
شورِ نشور در ہمہ کون و مکانِ فدا
ہر جا کہ بود طائرے از آشیانِ فدا
چوں چشمِ اہل بینک برآں کشکِ فدا
بر پیکرِ شہیتِ امامِ زماں فدا
سرزد چنان کہ آتشِ ازدو در چہاں فدا
رودر مدینہ کرد کہ یا ایہا الرسول
ایں مید دست و پا زدہ در خونِ حسینِ تست
کز خونِ او زمین شدہ جیوں حسینِ تست
شاہِ شہید نا شدہ مدفون حسینِ تست
از موجِ خونِ او شدہ گلگون حسینِ تست
جبریل را ز روحِ کبیرِ عجب شد
رونے زمین ز اشکِ جگر گونِ عجب شد
بر چہ آفریدہ جلنے چین نہ کرد

روزیکہ شد بہ نیرہ سر آں جردگوار
جمعے کہ پاس مہل شاں داشت جیرتیل
با آنکہ سر زد ایں عمل از امتِ رسول
بر حسرتگاہ چوں رہ آں کارواںِ فدا
ہر جا کہ بود آہونے از دشتِ پاکشید
شد دشتے کہ شورِ قیامت بگرد رفت
تا مگاہ چشمِ دخترِ زہرا در آن زماں
بے اختیارِ نعرۂ ہذا حسینِ زد
پس با زبانِ پرگاہِ آن بضعتہ البتول
ایں کشتہ فدا بہ ہاموں حسینِ تست
ایں عتک لب فداۃ ممنوع از فرات
ایں قالبِ طہاں کہ چہیں ملتہ بر زمین
ایں غرقہ محیطِ شہادت کہ رونے دشت
غاموشِ عتشم کہ ز ذکرِ فہم حسینِ
غاموشِ عتشم کہ ازینِ لطمِ گریہِ خیز
تا چرخِ سفلہ بود خطائے چین نہ کرد

یعنی: ● پیر یہ کیا پریشانی سی ہے جو ساری کائنات میں چھائی ہوئی ہے۔ پیر یہ کیسا نوحہ عزا اور کیسا ماتم ہے۔

- ① اگر میں اسے دنیا کی قیامت کہوں تو کچھ غلط نہ ہو گا یہ انقلاب و قیامِ عام کہ جس کا نام عرم ہے۔
- ② جن اور فرشتے آدمیوں پر نوحہ کرتے ہیں گویا اولادِ آدم میں سے سب سے بڑے بزرگ کی عزا ہے۔
- ③ زمین و آسمان کے خورشید اور مشرقین کے نور رسولِ خدا کی گود کے پالے ہوئے حسینؑ
- ④ اے خلک تو غافل ہے کہ تو نے کس پر ظلم کیا ہے دشمنی میں اس ظلمِ نبویؐ آبادیِ عالم میں تو نے کیا کیا کیا ہے۔
- ⑤ یزید کو مقتود قتل حسینؑ سے دیا ہے دیکھ کہ کس کے قتل سے خوش کیا ہے۔
- ⑥ ایک تنکے کے لیے جو بد بختی کے درخت کا کاٹنا ہے تو نے دین کے باغ میں گل و شمشاد کے ساتھ کیا کر دیا ہے۔
- ⑦ وہ گناہ کہ جس پر اپنے لب کے لعل کو خود غرق مالتے تھے اے تو نے ظلم کے خبڑ سے تکلیف و رنج دیا ہے۔
- ⑧ دین کے دشمنوں کے ساتھ بھی وہ کچھ نہیں کیا جاسکتا جو تو نے مصطفیٰؐ و حیدر اور ان کی اولاد کے ساتھ کیا ہے۔
- ⑨ کربلا کے طوکان کی ٹوٹی ہوئی کشتی میدانِ کربلا میں خاک و خون میں پڑی ہوئی ہے۔
- ⑩ کو فیوں نے پانی دینے سے بھی سختی کی۔ انھوں نے کربلا کے مہان کی خوب عزت و حرمت رکھی۔
- ⑪ آہ! اس وقت سے کہ دشمنوں کے لشکر نے بے شرم ہو کر سلطانِ کربلا کے خیمہ کی طرف رخ کیا۔

- ۱۰ کاش ! اس وقت آسمان کا قہر گر گیا ہوتا اور یہ اونچے ستونوں والا بڑا خیمہ بے ستون ہو جاتا۔
- ۱۱ آگ بجی جب ظلم کی حکایت پر ہاتھ رکھیں تو عرش کے ارکان کو ہلا دیں۔
- ۱۲ غم کے دسترخوان پر جب تمام جہان والوں کو بلایا گیا تو سب سے پہلے آوار مسلمانہ انبیاء کو دی گئی۔
- ۱۳ جب اولیاء کی باری آئی تو آسمان کانپ گیا۔ اس نوبت سے جو شیر خدا کے سر پر بھائی گئی۔
- ۱۴ اس وقت وہ سراپردہ کہ فرشتے بھی جس کے حرم نہ تھے اسے مدینہ سے اٹھا کر کر بلا میں جا لگایا۔
- ۱۵ اہل حرم گریں چاک بال کھلے ہوئے اللہ کے حرم کے در پر فریاد کرنے لگے۔
- ۱۶ جب اس کے پیلے گلے کا خون زمین پر پھنکا تو زمین سے عرش کی چوٹی تک اس کا جوش پھنکا۔
- ۱۷ قریب تھا کہ ایمان کا گہری غراب ہو جائے ان خشکیوں سے جو دین کے ارکان کو نہیں۔
- ۱۸ ہوانے جب اس غبار کو مزار نبی پر پھنکایا تو دھول مدینہ سے ساتویں آسمان تک پہنچ گئی۔
- ۱۹ غلغلہ کے شور سے جب بیخ و بکار کی نوبت پر ہو گئی تو یہ دھول انبیاء سے روح الامین تک پہنچی۔
- ۲۰ قوت دہم جو موج میں فطری کرہائی ہے اس نے یہ خیال کیا کہ جہان کے خالق کے دامن تک غبار جا پھنکا ہے۔
- ۲۱ اگرچہ ذات ذوالجلال ملال سے منزہ ہے لیکن وہ دلوں میں ہے اور کوئی دل ملال سے خالی نہیں ہے۔
- ۲۲ جس دن ان بزرگوار کا سر نیزے پہ آگیا خورشید پہاڑ سے سرنگے نکلا۔
- ۲۳ وہ گروہ کہ جن کے عمل کا محاذ جبرائیل رکھتا تھا انھیں بغیر عماری اور محل کے اڈوٹوں پر سوار کرادیا گیا۔
- ۲۴ روح الامین رسول کے منہ کے سامنے شرمسار ہو گیا۔ کیونکہ یہ عمل امت سے سرزد ہوا تھا۔
- ۲۵ جب اس قافلے کا گزر میدان جنگ سے ہوا تو ہر کون و مکان میں قیامت کا شور اٹھا۔
- ۲۶ ہرن جہاں بھی تھا صحرا سے نکل پڑا اور پرندہ جہاں بھی تھا گھونسلے سے گر گیا۔
- ۲۷ اتنی وحشت ہوئی کہ قیامت کا شور ماند پڑ گیا جب اہل بیت کی نگاہ ان مقتولوں پر پڑی۔
- ۲۸ اچانک دختر زہراء کی نظر اس وقت امام زمانہ کے جسم شریف پر پڑی۔
- ۲۹ بے اختیار پکار اٹھیں کہ یہ حسین ہے اور اس طرح سر ہٹا کہ اس سے سارے جہان میں چٹکاریاں گریں۔
- ۳۰ گلہ سے پر زبان کے ساتھ مدینہ کی طرف منہ کر کے بتوں کی اس جگر گوشہ نے کہا اے رسول خدا۔
- ۳۱ یہ میرا میں پڑا ہوا مقتول تیرا حسین ہے۔ یہ خون میں ہاتھ پاؤں مارنے والا نسل تیرا حسین ہے۔
- ۳۲ یہ پیداسافرات سے روکا ہوا کہ جس کے خون سے زمین دریائے حیون بن گئی ہے تیرا حسین ہے۔
- ۳۳ یہ تڑپا لرزتا بدن جس کے موج خون سے رونے مرا گلگون ہو گیا ہے، تیرا حسین ہے۔
- ۳۴ مختشم چپ ہوا کہ غم حسین کے ذکر سے جبرئیل کو روح پیغمبر سے حجاب آگیا ہے۔
- ۳۵ مختشم چپ ہوا کہ اس گریہ پیدا کرنے والی ظلم سے جگر گوں آنسوؤں سے رونے زمین خنطب ہو گیا ہے۔
- ۳۶ جب تک فلک پست تھا ایسی خانہ کی تھی۔ کسی مخلوق پر ایسی جانہ کی تھی۔

مقام قبل

ہیں از شہادت عباس بے برادر شد
سرسے نہ دید کہ زینت وہ سناں گردد
یعنی: ● عباس کی شہادت کے بعد جہانی کے بغیر ہو گئی۔ غریب، بے کس، بے مددگار ہو گئی کہ کوئی جانتے والا نہ رہا۔
● کوئی سر نہ دیکھا تھا کہ نوک نیزہ کی زینت بنتا کوئی جسم نہ دیکھا تھا کہ خاک و خون میں تڑپتا
(حضرت زینب کو طلب فرما کر وصیتیں اور حضرت سکینہؓ کے ساتھ مخصوص لطف کی وجہ)

کہ او از اہل حرم قلم ناکشیدہ تر است
لباس کہنہ از اہل بیت کرد طلب
جواب گفت کہ اے نور دیدہ زہرا
نہ گفتنت کہ خبر دادہ است پیغمبر
کتوں بعد حق ہایدم وفا کردن
چو سر ز پیکرم از تیغ کہیں جدا سازند
ازیں بہ کہنہ لباس ست حاجتم آکتوں
بچامہائے نو ام اہل قلم در سازند
روایت است کہ چون تنگ شد بر او میداں
نہ سید الشہدا بر جدال طاقت داشت
کشید پا ز رکاب آں خلاصہ ایجا
بلند مرتبہ شایہ ز صدر زیں افتاد

ز دختران یتیم ستم نہ دیدہ تر است
سوال کرد ز نقشیش حال آں زیب
سرور سینہ ام اللہ العجا
کہ آب خوردم از آب جدول خیر
بژوہ خبرش جان و سر خا کردن
گل سر سہد نیزہ جہا سازند
کہ چون لباس برآرند از ستم بیروں
دگر بہ سونے کہن جامہا نہ پردازند
فدا از حسرت ذوالجناح و از جلاں
نہ ذوالجناح دگر تلب استقامت داشت
برنگ پر تو خورشید بر زمین افتاد
اگر فط نہ کنم عرش بر زمین افتاد

یعنی: ● کہ وہ تمام اہل حرم سے کم قلم جیلے ہوئے ہے۔ یتیم بچوں سے کم تر ستم دیکھے ہوئے بچی ہے۔

● اہل بیت سے پرانا لباس مانگا تو زینبؓ نے صورت حال معلوم کرنا چاہی۔

● جواب دیا کہ اے نور چشم زہراؓ نجیب اماہوں کی ماں کے سینہ کا سرور۔

● میں نے آپ سے کہا نہیں ہے کہ پیغمبرؐ نے خبر دی ہے کہ خبر کی خبر سے میں نے پانی پینا ہے۔

● اب مجھے دھڑھ حق کو دفا کرنا چاہیہ۔ آپ کی خبر کے مطابق بخوشی سرو جان مجھے قربان کر دینا چاہیہ۔

● جب میرے سر کو میرے جسم سے کینے کی تلوار سے جدا کر دیں گے اور اسے نیزہ جہا کے غلہ ستہ کے سب سے

اوپر والا پھول بنائیں گے۔

● اس وجہ سے مجھے پرانے لباس کی اب ضرورت ہے کیونکہ یہ لوگ میرے بدن سے لباس اتار لیں گے۔

● میرے نئے کپڑوں کو اہل قلم اتار لیں گے تو پھر پرانے لباس کو نہ لیں گے۔

● روایت ہے کہ جب میدان آپ پر تنگ ہو گیا اور ذوالجناح حرکت کرنے اور دوڑنے سے رہ گیا۔

- ۱۔ شہداء کو جنگ کی طاقت نہ رہی اور ذوالجناح بھی استقامت کی تاب کھو بیٹھا۔
- ۲۔ تو اس موجودات کے غلامہ نے رکاب سے ہاتھ کھینچ لیا اور خورشید کے سامنے کی طرح زمین پر گر پڑے۔
- ۳۔ بلند رتبہ بادشاہ زمین کے مدر سے گر گیا۔ اگر غلط نہ کہوں تو عرش زمین پر گر گیا۔



شفیق مکرم خواجہ غلام محمود صاحب بی اے وکیل اقبال

تھا کون جو کربلا میں بہاد ہو گیا کیا کون؟ کون آباد ہوا
 جو پھول بھر گیا وہ کس باغ کا تھا
 فرباد کریں گے ماحی ہوں گے
 سر پیٹ کے آنسوؤں سے ٹھنڈھوئیں گے
 گر کوئی نہ رونے کا زمانہ میں تھیں
 اس وقت بھی اے حسین ہم رونیں گے

مجالس حسینؑ
 اس جگہ میں مناسب خیال کرتا ہوں کہ حضرت کی سوانح عمری کے لحاظ سے مجلس جو حضرت کے سوانح کا ایک جز مسموعی ہے اس کے متعلق بھی کچھ کہا جائے۔ جو کچھ میں اوپر کہہ چکا ہوں اس سے ظاہر ہے کہ نہ صرف حضرات ائمہؑ نے حضرت کے ذکر کا اہتمام فرمایا بلکہ شاعروں کی قدردانی سے وہ زبان خرید لی جو اشاعت مدح میں کام دے اور اس طرح شاعری کی ایسی دل پسند چیز جو ماعرب کے لیے اس بہتر شغل کے لیے کام میں لانی گئی۔ ائمہ کے علاوہ ملوک دیالہ اور بنی فاطمہ نے اس کا اہتمام کیا اور اس وقت سے برابر اس وقت تک مجالس کا سلسلہ کبھی منقطع نہیں ہوا۔ یہاں تک کہ اب یہ صورت ہوئی جو ہم میں آج موجود ہے۔

ہادی النظر میں مجالس کا مفہوم یہ قرار دیا گیا ہے کہ حضرت شہیدؑ کو بلا پر رونایا اس کی غایت ہے۔ اور دلیل کے لیے ائمہ اہل بیتؑ کی حدیثیں پیش کی جاتی ہیں کہ جو شخص رونے حسینؑ پر وہ داخل بہشت ہوگا۔ یا اس نے ختمہ نجار احسان کیا۔ یا جو شخص رونے یا رولانے یا رونے والوں کی سی صورت بنائے وہ داخل بہشت ہوگا۔

میں چاہتا ہوں کہ رونے کی حالت پر میرے ساتھ غور کیا جائے۔ رونا کیا ہے اور کوئی شخص کیوں رونے لگے کیا کوئی بلا اثر لیے رو سکتا ہے۔ یہ سوچنا محال ہے کہ جہاں غم پیدا ہو بغیر اس کے کہ انسان کسی اندوہناک حالت سے اترے اور وہ اثر اس قدر تیز ہو جو اس کی احساس میں ایسی قہر اٹھ پیدا کرے کہ آخر میں یہ دوسری حالت پیدا ہو جائے، جسے رونا کہتے ہیں۔ رونے کے معنی لازماً آنسو بہانا نہیں ہیں بلکہ یہ رونے کی ایک بے اختیارانہ صورت ہے جو کمزوری احتیلا کبی جاسکتی ہے۔ صاحب ارادہ اور صاحب ہوش اور صاحب احتیلا لوگوں کے نزدیک داغ غم کی موجودگی میں، منہج اور حتی الوسع کم اظہار غم اور اثر کی کوشش سب سے بڑا رونا سمجھا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک شخص رو سکتا ہے بغیر اس کے کہ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی یا چہرہ میں کوئی ظاہر تغیر کہا جاسکے۔ یہ رونا بھی دیکھا جاتا ہے اور کچھ خفی تحریریں ایسی ہوتی ہیں جو بغیر ظاہر ہونے نہیں رہتیں۔ منہج کی حالت میں ان تحریروں کی وضاحت سب سے زیادہ اثر خیز ہے۔ اس کے علاوہ باوجود منہج کے غم سے متاثر ہونے کی حالت اگرچہ وہ ہمارے اعضائے ظاہری میں ظاہر نہ ہو وہ اثر ڈالتی ہے جسے قلبی اثر کہیں۔ اور ذوالجناح اس سے بغیر اثر لیے نہیں رہ سکتے یہ ضابط اور صابر لوگوں کا رونا ہے۔

میں یہ نہیں کہتا کہ کوئی سرد آہ یا کوئی کراہ یا صدا کی کوئی قہر تھراہٹ یا آنسو کا کوئی بے چین قطرہ صبر کو اپنے درجہ صبر سے گرا دیتا ہے۔ نہیں بلکہ اس کی اس وقت کی اس کے علاوہ صورت صبر یا عدم صبر کا تصفیہ کرتی ہے اور پھر صابر بھی انسان ہی ہے۔ ممکن ہے کہ اس کا ہوش کثرتِ ہیجان سے ذرا سا چپک جائے اور وہ سیل جے صبر نے روک دیا تھا اس تھوڑے سے وقت میں امٹا آئے جے ہوش کی معادروک دے اور پھر جتنے آنسو تھیں۔ کیونکہ یہ بچاؤ رونا ہے۔ کچھ ہنسی نہیں ہے۔

تو رونا جو ایک حالت ہے جے ضبط اور صبر کا گل جانا اور دل کا پھل جانا کہیں غلٹ انسانی کا ایک ایسا ہی جزو ہے جیسے اور جذبات ہیں۔ اور جماعت انسانی نے رونے کو اظہارِ محبت و لحاظ و ہمدردی کہا ہے۔ اور ان سب کے معنی وہ پیاری چیز ہے جو جماعت انسانی کے کھنچنے اور قریب کرنے کا سب سے بڑا نسخہ ہے۔ جے قلبی وابستگی کہتے ہیں۔ کسی کو حالت اندوہ میں دیکھ کر ہنسو اور صاحبِ غم کے علاوہ دیکھنے والے یعنی جماعت انسانی کا کوئی ٹکڑا ہنسنے والے کے اس فعل کو خلافِ انسانیت ہے رحمانہ تہذیب سے معرا عدم موقع شناسی بے حسی کہے گا اور دفعۃً اس ہنسنے والے کی طرف سے ہر دیکھنے والے کا خیال بدل جائے گا۔

کیا تم نے نہیں دیکھا ہے اور کیا تم نے خود نہیں کیا ہے کہ کسی کی اندوہناک حالت کو عام اس سے کہ تمہیں تعلق ہو یا نہ ہو دیکھ کر تم نے دفعۃً اپنے کو ایسا بنایا ہے جو تمہارا متاثر ہونا کہا جائے۔ ممکن ہے کہ یہ تصنع ہو۔ لیکن دفعۃً تصنع ہی کا خیال آ جاتا بھی اس وجہ سے ہے کہ ہمارے پہلے کے ایک طویل زمانہ اور جماعت انسانی پر غم کے اثر نے عوروش اختیار کی ہے وہ فنا تو ریٹ اور تربیت میں لاعلمیہ حیثیت سے اس طرح ہم میں داخل ہو گئی ہے کہ عام اس سے کہ ہم کو اپنے کسی خاص انداز کا احساس اور ہوش ہو یا نہ ہو ہمارا تمام خاصہ و ایسا ہی بن جاتا ہے جیسا اس موقع کے لیے موزوں ہے۔ یہ حالت پر لحاظ معاشرت کی ایک جزو ہے۔

اب ذرا ان احادیث ائمہ کے وقت اور موقع پر غور کرو۔ تم جانتے ہو کہ یہ وہ موقع تھا جب کہ حکومت اور لڑا مالک کے تمام افراد پر معدودے چند کے اہل نیٹ رسالت کے ساتھ دشمنی کے درجہ میں اس قدر ترقی کر گئے تھے جس کا نتیجہ کر بلا کا سامنے عظیم تھا یعنی دشمنوں کی ایک کوشش جس میں یہ ارادہ کیا گیا کہ اہل رسالت میں کوئی مرد ہائی نہ رہے جس سے نسل تک قائم رہے۔ ایسی حالت میں یہ امید کرنا کہ کوئی ہمدردی کرے اور اس سامنے کی عظمت کو اپنے درجہ پر قائم کرنے اور رکھنے کی کوشش کرے محال تھا۔ لیکن مشیت ایزدی تھی کہ یہ سامنے اپنی پوری عظمت اور شان سے دنیا کو معلوم ہوتا اور فطرت ہیجان غم کو حسین کے نام سے ایسی نسبت دیتی جس قدر کسی گوشت اور خون کے انسان کے لیے نہ ہوتی ہوگی۔ اور یہ ہیجان غم اس طرح نہ پیدا کیا گیا تھا جو کسی حکومت اور اس کے تعلقات کے سایہ میں ہو۔ نہ کوئی ایسی ترکیب اختیار کی گئی تھی جیسی تاریخ یہود میں۔ یہود کے آخری خود مختار بادشاہ ہیرودا اعظم نے اختیار کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ اور وہ یہ ہے کہ اس نے اپنے آخری وقت جو ڈایا کے چند مخصوص خاندانوں کو گرفتار کرایا اور ہیپوڈرم میں زیرِ حراست رکھ کر اپنی بہن سلوم سے وصیت کی کہ جو بھی میں مر جاؤں انہیں قتل کر ڈالتا۔ اور اس سے تمام شہر میں رونا شروع ہو جانے کا اور یہ رونا اس کی موت پر رونا کہا جائے گا۔

اہل رسالت سے دُور تھا کہ وہ ایسے ذرائع اختیار کریں۔ پھر کیا کیا وہی جو ہمدردان حسین جاتے ہیں۔ یہ ایک

نہایت ست رفتار کام تھا۔ اس کے علاوہ چارہ نہ تھا کہا جاسکتا ہے کہ ائمہ کے ان فقرات میں تصنع سے احتیاط نہیں کی گئی ہے اور رونے اور رلانے کے اہتمام کی ایسی کوشش میں فوری لوگوں کا اثر خیز مد تک متاثر ہو جاتا تھا۔

بغرض محل میں اس میں کوئی ایسی قابل اعتراض شان نہیں پاتا جس میں یہ کیا جاسکے کہ اچھی غرض برے ذرائع سے حاصل کی گئی ہے۔ کامیابی تصنع کی حیثیت میں نہیں تھی نہ تصنع کوئی بڑا نتیجہ حاصل کر سکتی ہے جب تک کہ اصلیت اس کی حقیقی بنیاد نہ ہو۔ ان احادیث کا اصول یعنی جوش ہمدردی پیدا کرنا۔ حقیقتاً حسینؑ کے عظیم الشان موقع اور ان کی شہادت کی نوعیت سے تھا اور پھر اس کے بعد ان ائمہ کا منتہی قوت دار جوش تھا جنہوں نے ان فقرات میں ایک اصول کے نشود نما کی کوشش کی۔ اس کے علاوہ اصول کی سادگی اور اسے سامنے کی درد انگیزی سے جو ربط تھا اور پھر اس کے علاوہ رونے رلانے اور رونے والوں کی صورت بنانا جس قدر بے فرق تھا اس نے قلوب کے مائل کرنے میں آسان کامیابی حاصل کی۔ اور پھر موجود لوگوں میں اس شرم کا فطرۃ ہونا کہ نواسۂ رسولؐ شہید ہو جانے لیکن ہم اپنے دنیاوی اغراض یا تساہلی یا کمی ہمت سے مدد نہ کریں۔ اس میں معین ہوا کہ اب اظہار ہمدردی میں کچھ کوشش کی جائے۔ رونے سے زیادہ آسان زیادہ کارگر اور زیادہ باموقع کچھ اور نہ تھا سوچو کہ کون ذریعہ کس غرض کے لیے کام میں لایا گیا ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ یہ وہم قیمتی نہیں ہے کہ اس اصول کے نفاذ اور نشود نما میں یہ غرض پنہاں تھی کہ جب ایک زمانہ کے بعد ہمدردان حسینؑ کی کافی تعداد ہو جانے لگی تو ہم بنی امیہ سے اس شہادت کا انتقام لیں گے اور اب بجائے کسی فوری کوشش کے اثر کے طویل نشود نما سے کام نکلانے کا ارادہ کیا گیا تھا۔ نہیں، بلکہ میں سوچتا ہوں کہ حسینؑ کی شہادت کے بعد بنی امیہ کے خلاف جو پیمانہ نفرت پیدا ہوا تھا اور جس کا یہ اثر تھا کہ خود اموی اور یزید و حکامان حسینؑ بھی اس سے انکار کرنے پر آمادہ ہو گئے تھے۔ حسینؑ کی شہادت کا صحیح انتقام تھا اور اس میں جب ہمدردی کا یہ آسان اصول شامل ہوتے ہوئے ترقی کرتے کرتے اور جزو عادت و خصائل ہوتے ہوئے ایک حد تک پہنچ جاتا۔ یعنی قتل حسینؑ عموماً ایک ملوثون فعل بجا اور عقین کر لیا جاتا اور حسینؑ کی شہادت اور اس کے اصول کی عظمت عام ہو جاتی تو اس کے دوسرے معنی یہ تھے کہ اموی روح عداوت فنا ہو جاتی عام اس سے اموی نسل ضائع ہوتی یا نہ ہوتی۔ اور اس طرح ان انقلابات کی محتاجی نہ ہوتی جو مختار وغیرہ سے ظاہر ہوئی۔ اگرچہ شہادت کے عظیم الشان اثر سے کوئی فوری پیمانہ نہ ہوتا بھی عجب خیز ہوتا۔

اب سوال یہ ہوتا ہے کہ اس اصول سے کیا غرض تھی اور ائمہ کی اس وقت کیا حالت تھی؟ اس اصول سے یہ غرض تھی کہ حسینؑ سے محبت اور ہمدردی پیدا ہو جائے۔ اور جب میں ”حسینؑ“ کا لفظ استعمال کر رہا ہوں تو میں یہ بکھار رہا ہوں کہ وہ تمام حشیش جو اس نام سے متعلق تھیں ان کا مرکز اور جب میں محبت کا لفظ استعمال کر رہا ہوں تو اس کے پورے وسیع منہوم سے میرے خیال کا تعلق ہے۔ حسینؑ کی سب سے بڑی حیثیت ان کی شہادت تھی۔ شہادت اس لیے تھی کہ حسینؑ کا وہ بلند خاصہ جس کی تربیت کے مختلف اثرات تم پہلے پڑے پکے، وہ اسے گوارا نہیں کر سکتا تھا کہ اسلام یعنی مسلمانوں کے دینی اخلاقی ریکی قانونی تمدنی اصول کا رونا اور افسر یزید کا سامنے ہو۔ اور وہ اس طرح ہو کہ میں اپنی ریکی موافقت برہم کر کے ہماری ہستی کو (جو اسلام کا مثالیہ بھی جاتی ہے) اصولاً نیست و نابود کرے۔ اگرچہ ہمارا گوشت یا ہڈیاں اور خون لوگوں کو دکھائی دے۔ اب ائمہ کی مصلحت کے یہ معنی تھے کہ ایسے حسینؑ سے محبت و ہمدردی پیدا کرے یعنی لوگوں کے ارادہ اور خیال کو

ان اصول کی محبت ہے رنگ دے۔ تم سوچ سکتے ہو کہ یہ کوئی آسان کام نہ تھا جب حسینؑ کے خلاف جوشِ عداوت ترقی کرتے کرتے پچاس برس میں ایسا ہوا تھا کہ واقعہ کر بلا ہو سکتا تو ایک جڑ پکڑی ہوئی عداوت کو اکٹھا دینے اور طبعِ انسانی کا خاصہ بدل دینے کے لیے نسبتاً زیادہ وقت اور زیادہ سامان چاہیے تھے۔ سامان کی یہ حالت تھی کہ اور چیزوں کا تو کیا ذکر صدیوں تک ممالکِ اسلامی میں اس سے بڑا کوئی سلطنت کا جرم نہ تھا کہ کوئی اہل بیتِ رسالت سے اظہارِ محبت کرے۔ اس سے تم کچھ سکتے ہو کہ حسینؑ سے محبت و ہمدردی کے اس اصول کے فتوے میں ائمہ کو یہ تک موقع حاصل نہ تھا کہ وہ اس طرح مجلسِ مشفقہ کرتے جیسے مجمعِ ہم کر لیا کرتے ہیں۔ لیکن یہ سوچنا محال ہے کہ ایک قوم میں عموماً محبت و ہمدردی پیدا کرنا کبھی اصول سے پیدا کرنا، ایک انفرادی حیثیت کا اصول تھا۔ بلکہ یہ معاشرت اور اس کی قوت کا سب سے قوی اصول تھا۔ اسلام کو بہ نسبت دیگر ادیان کے اس کی معاشرتی قوت سے امتیاز حاصل ہے۔ وہی معاشرتی اصول اب پھر رتا گیا تھا۔ اسلام کے نام سے نہیں بلکہ اس کے پیچھے مثالیہ یعنی حسینؑ کے نام سے۔ حسینؑ کے نام کی مرکزیت سے۔ یعنی حسینؑ کا اسمِ قدس وہ سختی تھی جس سے انسان کی تخیل، انسان کی معاشرت، انسان کے مذہب اور انسان کے اخلاق میں ایک انقلابِ عظیم پیدا کرنے کا ارادہ کیا گیا تھا۔ محبت اور ہمدردی سے۔ یعنی واقعیت، تربیت، ارادہ اور وابستگی سے۔ یاد دوسرے لفظوں میں ایک قوم بنانے کا سانچہ تھا جس کے افراد سے حسینؑ یاد آئیں۔ حسینؑ ظاہر ہوں اور حسینؑ ابداً ابلا تک اپنی جہانی حیات سے قوی تر حیات میں زندہ رہیں۔ زیادہ سبیل، زیادہ لطیف اور زیادہ واضح ہو کہ

تو میں یہ کہہ رہا ہوں کہ اس اصول کے معنی انفرادی ہمدردی نہیں ہو سکتی اور نہ یہ ممکن تھا کہ کسی خاص ذات سے انفرادی ہمدردی کا مجموعہ ہمیشہ منفرد رہتا۔ بلکہ ایک نوعیت کی چیزیں ضرور ایک جگہ جمع ہوتیں اور وہ دینی اور معاشرتی صورت اختیار کرتیں۔ اس اصول کی ایک سب سے بڑی خوبصورتی یہ تھی کہ راسخِ حیثیت سے افراد بنائے تھے جن میں قوم بننے اور مجموعہ کی صورت اختیار کرنے کی فطری صلاحیت تھی۔ اور اگر اس کی کوشش کی جاتی کہ ہم مجمع اور کافی تعداد سے ہم خیالی چاہیں تو اس کی کامیابی نہایت ظاہر طریقوں کی محتاج ہوتی جن میں سے کوئی ممکن نہ تھی۔ قوم گرا اپنے اصول میں کامیاب ہونے اور مجلسیں اس اصول کی کامیابی کی بہترین دلیل ہیں۔

اب میں پوچھتا ہوں کہ مجلسیں ہونے لگیں اور لوگ دکھائی دینے لگے۔ حسینؑ کے مصائب کا ذکر ہونے لگا تو کیا اصول کی غرض پوری ہو گئی؟ نہیں واللہ۔

یہ تو اصول کے ظاہری آسان نتائج یا ابتدائی مشکلیں تھیں۔ آئندہ کے چند قطرے یا غم کی صورت تمہارا پہلا عہد تھا۔ تمہارا پہلا پیش کش تھا جس کے بغیر تم اصول کے پہلے دروازہ پر نہیں پہنچ سکتے تھے۔ یہ کشتِ صدر تھا اور بس۔ تم نے ہانیان قوم، رہنمایان ملت اور روسائے روحانی کے اقوالِ خصوصاً بڑے اصول کو اس قدر مچھلایا کہ بولیا ہے کہ ان کی غرض یہ تھی اور بس کہ عورتوں کا آکہ تمہارا جزوِ خصل ہو تا اور بس۔ یہ ہماری کاہلی، ہماری غلط فہمی، ہماری بے مغزی ہو گئی کہ ہانیان کا فرض بیچ بولنے تک پورا ہو گیا۔ پودا اگے یا نہ اگے۔ اور اگے تو اسے پانی دیا جائے یا خشک ہو جائے۔ نہ آبیاری کی ضرورت رہی نہ غیر ضروری اور بد نما شاخوں کے تراشنے کی۔

یہ ہمارا صنعتِ تخیل، پیش بینی کی کمی، مفید باتوں سے فائدہ اٹھانے کی کمی صلاحیت تھی جس نے ہمیں اغلاط اور زوال کا

مراون بنادیا۔ نتیجہ کیا ہوا۔ یہ کہ مجلس کا مفہوم تو سوخت ہو گیا اور اب ایک محاسب کے نزدیک اس اعتراض کی گنجائش پیدا ہو گئی کہ یہ اقتصادی فشار کی حالت میں ایک اور بار ہے اور ہمارے مزید غور کی راہ میں اپنی رسمی صورت کا ایک آڑ ہو گئی۔

”میسانہ امید“ جو یہود کے قوی مصلح میں مفید ترین تھی اور جو مؤرخین کے نزدیک قوی تیاری کا ایک ذریعہ ہو سکتی ہے اپنی معاشرتی صورت اور عناصر کے لحاظ سے مجلس کی ایسی معاشرتی قابلیت نہ رکھتی تھی ہمارے پاس نہ صرف میخانہ امید کی طرح اصولاً ”انتظارِ مہدی“ تھا۔ بلکہ مجلس بھی تھی جو اگر ایک نظریہ تو دوسرا عملی ذریعہ سے تعبیر کیا جاسکے ہم کس طرح تیار تھے اسے ہمارے زمانہ کی تاریخ نے دکھا دیا۔ اس طرح دکھایا جس سے سخت تر اور زیادہ نادم کرنے والی کسی قوم کی مثال نہیں ہو سکتی تھی۔ کیا تھی۔ امام مامون کے روضہ مقدس کا واقعہ واقعہ نے ہمیں کیونکر پایا۔ یہ کہ ہم نے چند اشعار موزوں کر لیے جس میں ہم امام صاحب الزماں سے فریاد کرتے تھے۔ لوگوں نے ان نفوس قدسیہ کے وجود کو کائنات اور اسباب کائنات کی نفی کچھ لیا ہے۔ اور اس کے بعد ایک مجلس بڑھ گئی۔ کیا ہوگا اگر بقیہ امکان مقدسہ کی بھی یہی حالت ہو۔ چند ایسی ہی اور۔ مجلسیں بڑھ جائیں گی۔ دوسرے لفظوں میں ہم اس سے ایک قدم آگے نہیں بڑھے تھے جس حالت میں حسین یارین کے مجسمہ نے اپنے کو بے یار و مددگار پایا تھا۔

کیا یہ مجلس جو بڑھ گئی اسلام، اصول، اور اس کے مجسمہ سے تجدید بیعت تھی اور ہم قوی خصال اور قوی تیاری کا طعن لے رہے تھے نہیں۔ اس کا اہتمام کر رہے تھے کہ ایک جگہ جمع ہو کر حقے پہنچا۔ کچھ شیعنی ہانٹ دی اور کچھ ذاکری کے مخصوص انداز دیکھ لیں۔ اس کے بعد؟ اس کے بعد یہ کہ ہمیں امتیاز کا ایک موقع ملا کہیں۔ ذاکر کا حمانہ انداز سے داپہنے ہائیں دیکھے اور لوگ اپنے اثر پر ناز کریں کہ ہم نے کچھ وقت اس مشغلہ میں صرف کر دیا۔ بس؟ بس۔ شاید اس قدر اور کہ کسی اخیار میں چھپو ادیا جائے۔ یا مجلس کا فوٹو لے لیا جائے۔ اس کے بعد۔ اب پھر کہیں گے نیند لگی ہے۔ کیا تم اخص خصال پر امام عصر کی امید کرتے ہو؟ نہیں ایسی امید۔ اصول سے منقطع ہے۔ اصول کی نا فہمی ہے۔ تمہاری ترقی ظہور کی ایک صورت ہوئی۔ کیا تم نے ایسی احادیث نہیں سیں کہ امام عصر کا ظہور اپنے اپنے چالیس آدمیوں کے ہونے پر ہوگا۔ یا امام عصر کے ہمراہ ایسے اور ایسے آدمی ہوں گے اور جماعت کا ربط ضبط اس درجہ پر ہوگا۔ کیا یہ ایک بے معنی فقرہ ہے یا لفظوں کا بے کار مصرف ہے؟ نہیں، بلکہ ہماری قوی ترقی کو ایک لامحدود زمانہ کے حوالہ کیا ہے۔ درست خصال کا ایک معیار اور اصول حوالہ کیا ہے اور مایوسی سے رد کا ہے۔

کیا حسین کی شہادت کی غرض یہ تھی کہ کچھ رونے والے پیدا ہو جائیں اور بس۔ یا پھر ردی کے اس اصول سے ائمہ کی یہ غرض تھی کہ جب ایسا ہوگا تو ہم کو حصول اختیار میں آسانی ہوگی۔ اس سے زیادہ لغو کوئی خیال نہیں ہو سکتا۔ اگر ان انوار مقدسہ میں یہ حوصلہ ہو تا تو ایک اشارہ اور بس بنی امیہ اور بنی عباس کی سلطنتیں ان گھروں کو سونے اور چاندی سے مبرور تھیں۔ اگر ان میں ایسا ہی حوصلہ ہو تا تو پھر یہ طالع ہائش کیوں نہ کرتے۔ طالع ہائش کی کیا ضرورت تھی۔ کیا بنی امیہ کی کامیابی ان کے سامنے نہ تھی کہ انہوں نے مل کر بنی تمیم اور عدی سے اختیار لے لیا۔

یہ نفوس تھیں نہ ملنے اور علیحدگی میں ایک بڑی شریعت جس ایک بڑے بلند ارادے پر کھڑے تھے اور وہ بد اخلاقی سے مس تک نہ ہونے، ہوا تک نہ لگنے دینا تھا۔ اور اپنے اصول سے ایک قوم بنانا تھا جو ایک صاحب خصال، صاحب ارادہ

بلند قوم جو جو حق پر مبنی ہو۔ جس میں دیکھ کر یہ الفاظ طہ کے مطلق میں ایک جہتیں کہ ہماری دنیا ایک مرکز اخلاق کی بنی ہوئی نہیں ہو سکتی۔ جہاں اس قدر وحشت، اس قدر مخالفت، اس قدر خود غرضی، اس قدر ظلم اور ایسی برائیاں ہیں، بلکہ یہ دنیا کو جنت بنا رہے تھے۔ جہاں سے فرد اور جماعت کی ایذا رسانی سے فرد اور جماعت محفوظ ہوتی اور اس خیالی لفظ کی حتمی حکومت ہوتی۔ جسے محنت کہتے ہیں۔ تو ”قوی تیاری“ اور خصائل کی درستی یا ایسی قوم جسے اور جس کے افراد کو دیکھ کر حسین پلا آئیں۔ اس سے میری کیا غرض ہے۔ کیا اس سے میرا ویسا ہی مفہوم ہے جس کا میں اکثر طعنہ دیا جاتا ہے کہ اگر جناب امیر ”غالب علی کل غالب“ تھے تو انھوں نے ایسا اور ایسا کیوں نہ کیا۔ دوسرے لفظوں میں قوی ہونے یا بعض حالتوں پر غلبہ ہونے کے معنی بد فہمی سے یہ کچھ لیے گئے ہیں اگر کوئی شخص جہانی حیثیت سے قوی ہے تو وہ لازماً دوسرے کابات بات پر ٹیٹھا دھایا کرے۔ نہیں بلکہ میں یہ کہہ رہا ہوں کہ اگر ایک قوم جہانی، دماغی، علمی، اقتصادی اور روحانی حیثیت سے بغیر آزار خلق ممتاز ہونا چاہیے تو وہ دین اور دنیا کسی کا بھی گناہ نہیں کر رہی ہے بلکہ وہ عالم کے لیے ایک مثالیہ خیر پیش کر رہی ہے۔ اور ان چیزوں کو آپس میں ایک دوسرے سے جو ربط ہے اگر ان میں سے کسی ایک میں بھی کمی ہے تو پچھانے والی نگاہ کہہ دے گی کہ کس جگہ قوی چول ڈھیل ہے۔

لیکن ان تمام باتوں میں ممتاز ہونا اگرچہ خیال دلاتا ہے کہ ایک قوم اپنے ضروریات زندگی اور روحانی میں بڑی ذی ہوش ہے۔ لیکن آگے میں اکثر مواقع پر کہہ چکا ہوں کہ کچھ ضرور نہیں ہے کہ بڑے عالم کے معنی بڑے صاحب اخلاق حمیدہ یا بڑے واقعہ مذہب کے معنی بڑی مٹی کے ہیں۔ نہ کسی پہلوان کے معنی یہ ہیں کہ وہ دماغی پہلوان بھی ہے۔ نہ اس طرح بڑے ماہر اقتصاد کے معنی یہ ہیں کہ وہ اس کا عامل بھی ہے۔ اور اس میں کوشاں ہے کہ کن شخصیت ذرائع سے قوم کے اہرامات سے اس کی آمدنی اس طرح بڑھائے کہ تجارت اس کی ہم وزنی، رقابت اور تعصبات اسے گھٹنے نہ دیں اور وہ اپنی معاش وغیرہ میں دوسروں کا دست نگر نہ ہو جائے۔ اور اپنے ذرائع معاش میں ترقی کرتا جائے۔ بلکہ میری غرض یہ ہے کہ ان باتوں میں انفرادی یا مجموعی حیثیت کے بعد بھی درستی خصائل ایک چیز باقی رہ جاتی ہے۔ میں اس سے انکار نہیں کرتا ہوں کہ علمی، دماغی اور روحانی ترقی کے معنی یہ ہیں خصائل درست ہوں۔ یا سولے چاہیں۔ مختصر لفظوں میں یہ کہتا ہوں کہ جب آدمی، اپنے حقوق عہد اور حقوق معنوی میں انصاف کر سکتا ہے، جب عدل اس کا جزو ملوث ہو جاتا ہے، جب حق روی اس کی طبیعت میں داخل ہو جاتی اور اعتبار قائم ہو جاتا ہے، جب دنیا اس کے شر سے محفوظ ہو جاتی ہے اور جب اس کے مخالفین پر بھی اس کی عادت اور اس کی ذات کی ہیبت طاری ہوتی ہے اور جب فریب دینے والی چیزیں اس کے سامنے اپنا عجز ظاہر کرتی ہیں۔ مثلاً جو کہ قوم کی کمزوریوں کا ساتھ دینا بھی اصول قومیت ہو لیکن اگر وہ دیکھتا ہے کہ ہم ایسے اصول قومیت کے شریک نہ ہو کر جو اصول انسانیت اور مخلوقات کے مضر ہیں بجائے اپنے سے منسوب جماعت کے عام انسانیت کے لیے نافع ہوں گے تو وہ ایسے کسی کمزور حس سے متاثر نہ ہو کہ ہم اصول قوی کے خلاف کر رہے ہیں۔ قوی ملامت اسے انسانی ملامت کے سامنے مغلوب نہ کر دے۔

حقوق (جس سے فرائض علیحدہ نہیں کرتا) عدل اور حق روی کے ایسے وسیع الفاظ نہ کسی وضاحت کے لیے استعمال کر رہا ہوں اور نہ مجھے اس کا خوف ہے کہ میرے ناظرین کی کافی تعداد اس کے فہم ہونے کی ضمانت کرے گی۔ بلکہ مجھے

یقین ہے کہ وہ اس کی بلندی مفہوم اور خصال پر ان کے اثر سے میرے مفہوم کا اندازہ کریں گے۔
ذرائع علمی کی کتابی صورتیں اگرچہ اس سے عاری نہیں ہیں کہ وہ درستی خصال میں مدد دیں۔ لیکن تڑکے ایسے لیے
لیکچر اور پوسٹل (مچل) کی ایسی فرہ کتابیں اس حیرت انگیز ساحرانہ اثر کے مقابلہ میں کوئی ہستی نہیں رکھتیں، جسے ذاتی مس
کہتے ہیں اور جو زندہ مثال سے حاصل ہوتا ہے۔ مسلمان ناخوش ہیں کہ کفار قریش اہل افراد عالم کو ساحر کہتے تھے۔ میرے
ناجیز خیال میں اس ذات اعلیٰ کے اثرات بھاننے کے لیے اگر فوج سے کوئی مناسب لفظ پوچھے تو سب سے پہلے میری نگاہ
اس لفظ پر پڑے گی، اور میں خوش ہوں گا کہ میں نے وسیع تعریف کی۔ ذات کی حیرت انگیز کشش کا یہ سری تو تھا کہ برا کہتا
ہوا آتا ہے غلام بن کر دعائیں دیتا ہوا جاتا ہے۔ مس اور تمام خاصہ بدل گیا۔ اس کی مثالیں نہ صرف سفیر الہی بلکہ شرع سفیر
الہی اور ہمارے ”شاہزادہ صلح“ کے علاوہ اصول خیر کے سب سے وسیع مفہوم کے شہید اعظم میں پائی جاتی ہیں۔ لیکن اصل
تنازات مقدس نبوی تھی۔ جس نے اپنا سلسلہ جاری رکھا۔ ایک کتب قحی جو پور رہی تھی۔ اور یہ بولے گی، جب تک
آخری سانس دنیا میں چلے گی۔

مختصر صاف اور مشہور لفظوں میں صاحب خصال وہ کہا جاتا ہے جو کاہل ہے۔ جو حقیقت امر کھلت نہیں ہوتا ہے
معاشرت اور انفاق کے امور معروف کا لحاظ ہوتا ہے۔ اور جو دوسروں کی اخلاقی قوت اور خوبیوں کا معترف ہوتا ہے۔ بغیر
ایسی صورتوں کے جس میں ”من ترا حامی بگویم تو مرا حامی بگو“ سے کوئی واسطہ ہو۔ یا بغیر اپنے کسی مخصوص ملکہ اور لحاظ فوائد
کے۔ وہ خوبیوں کو خوبیوں کی وجہ سے پسند کرتا ہے۔ اور جسے ذلیل باتوں کے قبول کرنے سے شرفانہ نفرت ہے۔ ایسے
ہو اور اس وقت تم ایچر خواں ہو گے اس مدرسہ کے جو حسین کا درس دیتا ہے۔ اور تم کہے جاؤ گے کہ فلاں شخص حسین کے
مدرسہ خصال کا شاگرد ہے۔ اور جب اس طرح تمہارے افراد کی تعداد بڑھے گی اور بڑھتی جائے گی تو تم ایک قوم ہو گے جو
منفعت اور خود غرضی پر نہیں بنی ہے بلکہ انسانیت پر بنی ہے۔ جو چارہ پر نہیں بنی ہے روٹی پر نہیں بنی ہے، دھاتوں پر نہیں
بنی ہے۔ اصول خیر پر بنی ہے۔ اور اس بلندی پر جمع ہو کر ایک ہوتی ہے۔ اب میں سوچتا ہوں کہ ”قوی تیاری“ خصال کی
”درستی“ اور ”جسے دیکھ کر حسین یاد آئیں“ میں واضح حد تک بجا ہوا سا۔

خیر۔ تو اچھا ہے اور بہت اچھا ہے کہ کوئی شخص آنسوؤں کے چند قطرے سے وہ بڑا انعام حاصل کر لے جسے جنت
کہتے ہیں۔ ہمارا مسئلہ شفاعت مسیحیوں کے ایسا عجیب خیر نہیں ہے کہ گناہوں کی گھڑی صرف بیٹے خدا کے حوالہ کر دینا ہے
اور بس۔ خود کچھ ہی کیوں نہ کیا جائے۔ نہیں۔ بلکہ ہم پر اور طاعات ویسی ہی فرض ہیں جیسے حسین کا تم کرنا۔ کیونکہ حسین کے
مصائب تو انھیں طاعات کے قائم کرنے کے لیے تھے۔ وہ عظیم الشان ہیروان جسے رونے کی حالت کہتے ہیں۔ ایک مظلوم
کے لیے چند قطرہ اشک آنسوؤں میں نمی اور سرد آہ اور آدمی محسوس کرتا ہے کہ وہ ایک عالم راحت میں ہے۔ اس میں
سکون پیدا ہو گیا۔ وہ ایک بے آزار عالم میں ہے۔ وہ دنیا ہی میں جنت میں تھا۔ اسے جنت کا نمونہ دکھایا گیا تھا۔ فوج سے
پوچھا گیا کہ کیا حسین پر رونا چاہیے اور میں نے کہا کہ جو شخص واقعہ کرطا سے متاثر نہیں ہوتا میرے نزدیک اس کے خاصہ
اخلاقی میں کمی ہے۔

لیکن کیا تم اس پر کفایت کرو گے؟ جس وقت میں یہ سوال کرتا ہوں اس وقت یہ بجا رہا ہوں کہ تمہارا ادا جانے

پیر وی حسینؑ اس شخص سے بلند درجہ پر نہیں ہے جو مسلمان بھی نہیں ہے۔ لیکن چونکہ انسانی فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ کسی انسان کی مصیبت سن کر متاثر ہو جائے۔ اس لیے وہ بھی تمہاری طرح رو دیتا ہے۔ حسینؑ ہی پر کیا موقوف ہے کسی کے مصائب کیوں نہ ہوں۔ وہ ایک گھڑا ہوا قصہ ہی کیوں نہ ہو۔ اب تم گھوگے کہ عام اثر اور مارقائے احساس میں میں حد بندی کر رہا ہوں۔ اور میں یہ بھی کہہ رہا ہوں کہ محض رو دینا کافی نہیں ہے جب تک کہ تم حسینؑ کے شرافت اعمال اور غرض شہادت کے سمجھنے کے قابل نہ ہو۔ میں آنسو کے پیچھے دیکھنا چاہتا ہوں کہ تمہارا درجہ پھر دی اور اثر کیا ہے۔ تم کہتے حق پسند، مستقل مزاج، کریم النفس، رحیم، ہمدرد، سخی اور شجاع ہو۔ تم مصیبتوں کا کس طرح مقابلہ کرتے ہو۔ تم میں غیرت کتنی ہے۔ اب مجھے یہ پوچھنے دو کہ کیا ہم اپنے موجودہ درجہ تعلیم اور خصال سے، شرافت اعمال، شہادت اور حسینؑ کو کچھ کہہ سکتے ہیں۔ نہیں۔ ہزار نہیں۔ حسینؑ کی شہادت کے بعد آج تک ایسے بہت سے نہیں گزرے۔ جس حسینؑ اور ان کے عمل کا کامل احساس ہو۔ میں واقف ہوں کہ ادھر کئی برس کے واقعات میں اخباروں کے اکثر مضامین میں حسینؑ کا نام بلند ہو گیا۔ کیا ہوتا اگر حسینؑ کے خصال طرابلس، مراکش، بلقان اور ایران میں پائے جاتے دیہ لوگ نہ تھے۔ تمہیں حسینؑ یاد آتے۔ یہ حسینؑ کی حیات تھی جس نے اپنا ثبوت دیا۔ اور ہمارے زمانہ کے سب سے بڑے شہید شہید تہذیبہ اسلام کی ذات پر اپنا اثر بھی دکھا دیا۔ کیا ان ممالک میں ایک سو یا ہزار مارے گئے تھے؟ نہیں۔ کیوں؟ بلندی خصال جس نے انسان کے خاصہ اخلاق میں ایک تھوچ پیدا کر دیا۔

تمہیں یاد ہو گا کہ میں نے کہیں کہا ہے کہ ”میں نے ایک مرتبہ نہیں سوچا کہ حسینؑ کو زندہ قومیں بہ نسبت ہمارے بہتر کہہ سکتی ہیں۔“ میرا اس سے کیا مطلب ہے؟ کیا ایسا نہیں ہے کہ مسائل اخلاق، دین اور قومیت کو ایک تعلیم یافتہ اور صاحب خصال انسان بہ نسبت جاہل کے بہتر کہہ سکتا ہے۔ اور کیا زندہ قوموں میں اپنی ان تمام چیزوں کی ترقی اور تحفظ جان سے زیادہ عزیز نہیں ہوتا؟ اور وہ اس دن کے لیے تیار ہوتی رہتی ہیں۔ مال، وقت اور دماغ کی قربانیاں کرتی ہیں کہ اس وقت کو اپنے سے دور رکھیں جب کہ ہم سے ایک زیادہ صاحب ارادہ قوم ہمارے خصال پر قبضہ کر لے اور پھر ہم جانے اپنے کے دوسرے کے ہو جائیں۔ یہاں تک کہ اپنی جانوں کی قربانیوں کو بھی اس کے مقابلہ میں سمجھتے ہیں۔ وہ قوم جیتی ہے جو اپنے مسلمانوں میں زیادہ تیار رہتی ہے۔ ایسی قومیں دوسروں کی ایسی ہی بلندی خصلت کی قدر کیے بغیر نہیں رہ سکتیں۔ کون ہے جو اس کی قدر نہ کرے گا کہ حسینؑ نے کس وقت اور کس سامان سے دین، قوم اور اخلاق کی حفاظت کی۔ نہ بخوری سے بلکہ پر مسرت شوق سے۔

تم میری مسرت کا اندازہ نہیں کر سکتے جب میں نے اپنے کئی انڈر گریجویٹوں اور گریجویٹوں سے جو مشن کے کالجوں میں پڑھتے تھے سنا کہ ان کے دوران تعلیم میں میگیروفیسروں نے ابن عرب کی شہادت کو نبی آدم کے لیے بڑی قربانی ثابت کرنا چاہا، اور انہوں نے شیر خورہ بچہ رسولؐ کی عظیم الشان قربانی کا ذکر کر کے چپ کر دیا۔ اگرچہ انہیں حسینؑ سے اتنی ہی واقفیت تھی جس قدر مجلسوں میں سن کر حاصل ہوتی تھی۔ میرے دیکھنے کے لیے واقعہ نہ تھا۔ بلکہ وہ اثر تھا جو ایک استاد کو اپنے شاگرد پر حاصل ہے۔ خصوصاً جب کہ شاگردوں کو اپنے لیے آخر میں ایسے استادوں کے استاد کی بھی ضرورت تھی۔ اور سلسلہ تعلیم بھی جاری رکھنا ہے۔ لیکن حسینؑ کے ذکر اور نام نے اسی اخلاقی جرأت پیدا کر دی تھی کہ وہ کمزوریوں پر غالب آئے اور

صاف گوئی کی ہمت ہوتی۔ حیرت کہ جس وقت ایک مرتب نظام اور اس کے کارکن کمزوریوں سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے صداقت کہہ رہی تھی کہ تھکے نظام میں اس وقت ہماری حکومت ہے۔ میں نے اپنا کوئی زمانہ حال کا تعلیم یافتہ نہیں پایا مگر یہ کہ اس پر حرکت کارناموں کا وجدانی اثر تھا۔ حسینؑ اس قدر زبانوں پر نہ تھے جس قدر دل میں تھے یا اس قدر بلند نہ تھے جس قدر گہرے تھے۔ یہ حالتیں امید کے اندر ہیں اور کچھ میں آتا ہے کہ علم اور خصلت کا اتنا حسینؑ شای ہے۔

اگر ایسا ہے کہ علم اور خصلت کا اتنا حسینؑ شای ہے جیسا بلاشبہ ہے۔ تو ہمیں اس پر غور کرنا چاہیے کہ سب سے بڑی نیکی وہ ہے جو زیادہ سے زیادہ افراد جماعت کو پہنچائی جاسکے۔ بے شک یہ نیکی ہے کہ کوئی ایسی مجلس قائم کرے جہاں مثالی انسانوں کے خصال بیان ہوں، بے شک یہ ایک حیثیت کی نیکی ہے کہ کچھ لوگوں کا منہ میٹھا کر دیا جائے اور یہ معاشرتی یک جہتی کا ہی ایک ذریعہ ہے۔ لیکن مقتضیات زمانہ اور محل چاہتی ہے کہ یہ اور زیادہ مضبوط بنیاد پر قائم کیا جائے۔ زمانہ اب نظریہ کا فریضہ نہیں ہے عمل کا دلدادہ ہے۔

تو مضبوط بنیاد سے میرا کیا مطلب ہے۔ یہ کہ اگر تم سے کوئی غیر قوم کا شخص پوچھے کہ تم رونے تو خوب لیکن تم نے حسینؑ کے اسم مقدس اور ان کے بلند خصال کے قیام اور نفاذ کے لیے کیا کیا؟ اور ان کے پھولنے کے لیے وقت، مال اور دماغ کی کس قدر قربانی کی؟ حسینؑ کے نام پر تعلیم دو اور حاصل کرو۔ یہاں تک کہ تم میں کوئی ایسا نہ ہو جو کم سے کم اپنے زبان میں حسینؑ کے حالات نہ پڑھ سکے ہر سال کے عزم ختم ہونے پر اس سے خوش نہ ہو جاؤ کہ اس سال خوب گریہ و بکا ہوئی اور خوب شیرینی تقسیم ہوئی، بلکہ یہ بھی دیکھو کہ تم نے حسینؑ کے نام پر کتنے لوگوں کی روٹیوں کا سہارا کیا۔ تم نے کتنے بڑھتی، لوہار، نقش دوز، زردوز، دوکاندار اور کارخانہ دار بنائے۔ تم نے مفتی سیواؤں کا عقد کر کے انھیں مطمئن اور غلط خیالوں سے روکا۔ اور کتنے مٹیوں کے باپ بن کر انھیں دنیا میں غیرت سے زندہ رہنے کا طریقہ بتایا۔ اور اس طرح بیواؤں اور یتیموں کو اس سے بھی محفوظ کیا کہ وہ تمہاری ہو کر بیٹوریوں سے غیر قوموں کے مالی فریب میں جذب نہ ہو جاویں۔ اور تمہاری تعداد کو قائم رکھیں اور ترقی دیدہ خدا کے لیے ذرا غور کرو کہ ہم جس افلاس کی حالت میں ہیں اس میں اگر ہم جاہلیں بھی کہ بڑے بڑے حصوں کی مجلسیں کریں تو نہیں کر سکتے۔ دیکھو وہ لوگ جو باوجود قابلیت رزق کے لیے جان توڑ کوششیں کرتے ہیں، انھیں بھی نہایت ضروری چیزیں نہیں ملتیں۔ کیا تم امید کرتے ہو کہ ہم بغیر جان توڑ کوشش کے اتنا پائیں گے کہ بسر اوقات کے علاوہ تقسیم اور اجرت ذاکری پاسکیں۔ وقت ہے کہ ہماری فراوانی معیشت پر رشوات مذہبی کی حیات موقوف ہے۔ اور چونکہ جہل نے بجائے اصول کے رشوات ہی کو عین مذہب سمجھ لیا ہے، میں کہہ سکتا ہوں کہ ہمارا موجودہ افلاس مذہب کی فنا نہیں تو بے اثری کا ذریعہ ہے۔ قوم کی تعلیمی امداد سے قوی رویہ ضائع نہ ہوگا بلکہ جو حسینؑ کے نام کے مدد میں علم اور ذریعہ معاش حاصل کرے گا، وہ وجہ حسینؑ کا حامی ہوگا نا احسان شناس نہ ہوگا۔ وہ بچے گا دنیا بچے گی کہ اب تک حسینؑ کے نام میں بھلائیاں کرنے کی قابلیت ہے؟ یہ ایک کارخانہ ہوگا جو حسینؑ کے ذکر کو قائم رکھنے کا ایک مستقل سرمایہ ہوتا جائے گا۔ بہت دن تک لوگوں نے حسینؑ کے نام پر برس کیا۔ حسینؑ کا نام تم سے پوچھتا ہے کہ تم نے میرے قیام کے لیے کوئی علمی اور مالی بنیاد قائم کی ہے۔ کیا کسی قوم میں مجلس کا ایسا عالمگیر انجم ہے؟ تمہارے لیے ہوگا۔ رونے کے لیے نہ ہوگا۔ یہ ایک صبر آزمائش کے لیے ہمارا بڑا صبر ہے۔ کیوں نہ مجلس ہی وہ ذریعہ ہو جو نہ صرف

حضرت کی حقیقی ہمدردی ہو، بلکہ وہ اور فائدہ بھی پہنچا سکے جو اس غرض میں مدد دے۔ حسینؑ کی ایسی صبر پسند قوم سے ایسی امید بے جا نہ ہوگی کہ وہ صبر اور اصرار سے اس کامیابی کی کوشش کرے گی۔ مجلس ہے ایک چھوٹا سے قوی جسم ہونا چاہیے۔ دیکھو کہ ہر حیثیت سے اس میں تم کیسے لوگ پاتے ہو پھر بھی اگر تم اسے اپنے بلند اور شاندار روایات کے شایان گجو کہ جیل اور افلاس پر قناعت کر دو تو بھی مجلس حسینؑ کو قائم رکھنا میں کسی مجلس میں نہیں گیا مگر یہ کہ فجر پر جیل، افلاس اور اس کے لازمی آثار دیکھ کر اثر ہوا کہ حضرت کی مجلس کا مفہوم اور اسم گرامی ”هل من ناصرين صرنا“ کا اشتقاق بلند کر رہا ہے۔

اعلیٰ حضرت ملک معظم قیصر ہند اور حکومت ہند کا شہنشاہانہ لطف اور لحاظ

اگرچہ وقت گزرے کئی برس ہوئے لیکن میں اس وقت تک بہر حسینؑ کا پہلا مورخ ہوں گا جس نے اس لحاظ کو فراموش نہیں کیا ہے جو حکومت ہند اور اعلیٰ حضرت ملک معظم قیصر ہند جارج پنجم سے ظاہر ہوا۔ میں اس یلوکار مومق کی طرف اشارہ کر رہا ہوں۔ جب کہ تاریخ ہند میں بہت عرصہ کے بعد اہل ہند کو اس کا مومق ملا تھا کہ ہندوستان کے کسی شہنشاہ کی رسم تاج پوشی دیکھتے۔ یہ شاندار مومق اوائل جنوری ۱۹۱۱ء میں تجویز ہوا تھا۔ پھر عزم کا زائد بھی تھا۔ اس کے علم سے اپنی اسلامی رمایا کے احساس مذہبی کے لحاظ سے شاہانہ لطف نے رسم تاج پوشی کے دن بدل دی اور یہ مبارک رسم اوائل دسمبر ۱۹۱۱ء میں ادا کر دی گئی۔ یہ کوئی بڑی آسان بات نہ تھی، جب کہ بڑے مسلمانوں کے لیے کچھ دن کم کر دیے گئے تھے۔ ہمدردان حسینؑ کے پاس اس بے مثال شاہی تسخیر کا جواب جس نے اپنی عنایت میں جذب کر لیا۔ اس سے بہتر کیا ہے کہ اپنے دل اور زبان سے اس کا شکریہ ادا کریں اور تعلق اور اطاعت میں اور زیادہ بے سہو رنوخ حاصل کریں۔ ہمارے لیے یہ عنایت تاریخی حیثیت کی ہوگی۔ ان ایڈیٹران اخبار کا بھی شکریہ جنہوں نے توجہ دلانے میں سنی یا پیش قدمی کی۔

مولف کا اطمینان اور خواہش

میں خوش ہوں کہ اب میں وہ تمام واقعات اور متعلق باتیں لکھ چکا ہوں کا کہنا میرے نزدیک ضروری تھا۔ اب میں اصحاب، اہل بیت اور حضرت شہید اعظم پر تبصرہ شروع کرتا ہوں اور مجھے امید ہے کہ وہ شایان غور سے پڑھا جائے گا۔



باب پانزدہم

تبصرہ

اصحاب

اصحاب سے میرا مطلب نہ صرف حضرت کے غیر اعزاء ہیں بلکہ اعزاء بھی ہیں

میں اپنے موقع کی دشواری کھ رہا ہوں جب میں ان لوگوں پر نظر کرنے کے لیے کمر باندھ رہا ہوں جو ایسے تھے جن کی حسین مدح کر سکتے۔ ان کی بہترین مدح بھی تھی کہ ان کی لامتناہی خدمات کا حسین اعتراف کرتے۔ یہ ایسے نہ تھے کہ حضرت حسبِ نہم یا حسبِ شہادت کو ان کے متعلق یہ فرما سکتے کہ میں جاکھتا ہوں کہ مرغ کی پانگ کے قبل تم میرا انکار کرو گے نہ ایسے تھے جن کی نسبت کہا جاتا کہ ”برونس تو بھی“ یہ وہ تھے کہ حسین ان کی جانیں حوالہ کر رہے تھے اور یہ پھر اس سے حسین ہی پر قربان ہونے کا عہد کرتے تھے۔ ان کے لیے ممکن تھا کہ یہ دشمن سے مل جاتے اور اس حالت میں اگر انہیں کوئی عہدہ یا مال نہ بھی ملتا تاہم ان کی جانیں اس قیمتی موت سے محفوظ ہو جاتیں۔ لیکن حیات کو دھار دینی اور قوی کے مقابلہ میں محفوظ نہ کرنے کا ارادہ تھا کہ یہ سب کچھ کر رہے تھے۔ موت اپنے کو اس قدر نہیں شگلوں میں انہیں دکھا رہی تھی جس قدر ہیبت اپنے منہ پر اوڑھ سکتی تھی۔ یہ کہہ رہے تھے کہ ہم اپنے شومخات اور ارادہ میں وہ بچے نہیں ہیں جو قہر سے ڈر جائیں۔ یہ موت پر ہنس رہے تھے۔ نہ اس شخص کی طرح جو دنیوی آسائش سے محروم ہو کر طہرانہ مادی عقیدہ سے یہ سوچتا ہے کہ ہم اپنی زندگی ختم کر کے دنیوی تکلیف ختم کر دیں۔ جس کے بعد نہ کوئی راحت ہے نہ کوئی تکلیف۔ کیونکہ خود کشی سے کامل فنا ہے۔ یہ لوگ دنیوی راحت کے لیے اپنی حیات نہ بچتے تھے بلکہ پوری تسلیم و رضا سے ہر حالت کو برداشت کرنا جانتے تھے۔ اور اس برداشت اور اس پر صبر و حکم کو موجبِ قربِ ایزدی سمجھتے تھے۔ ان پر ان کی یہ حیات بار نہ تھی۔ بلکہ اس کی لذتوں سے شمعِ بوسہ تھے۔ غربت سے ہوا یا امارت سے۔ یہ مادی عالم کی راحتیں نہ تھیں جن پر آہ سرد مہر لے کے لیے انہوں نے موت گوارا کی۔ بلکہ اس لیے کہ مادی عالم کی راحتیں انہیں اس لیے اپنا ذوقیت کر رہی تھیں کہ وہ اخلاق کا خون بہائیں اور ”اہرن“ کی حکومت تسلیم کر لیں۔ ان کی شہادت ایسی راحتوں اور ایسی حیات کے خلاف سدائے احتجاج تھی۔ اور ان کی روش کی ایک نہایت بلند شان یہ تھی کہ جس وقت کمزور دل مصائب کے چوم سے اپنے زندگی کا جلد خاتمہ چاہتے یہ اپنی ان حالتوں میں اس لیے حیات کے متمنی تھے کہ ہم حسین کی حفاظت کریں۔ یہ اپنے لیے نہ جیتے تھے بلکہ حسین کے لیے زندہ تھے۔ اور حق یہ ہے کہ انہوں نے اپنی حیات اور موت دونوں کو ایک مثالیہ قرار دیدیا۔ اگر وہ رہے تو اس لیے کہ دیکھو دنیا کے انہو مصائب میں حق رومی اور صبر و حکم سے باز نہیں رکھ سکتے اور اگر انہوں نے جان دی تو اپنی موت میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ایک زبان چھوڑی جو یہ کہتی رہے گی کہ دیکھو کربلا کے مرنے والے

اس لیے مرے ہیں کہ برائیاں انھیں اپنا ماتحت بننا چاہتی تھیں لیکن وہ اپنی حکومت کے ساتھ دنیا سے گئے۔ حکومت اور اختیار نے اپنے نیزوں اور تلواروں سے ان کے جسم پاش پاش کر دیے۔ لیکن تمام ذرائع جو انھیں ان کے بلند ارادے اور خیال سے ہٹا سکتے تھے سچ ثابت ہوئے۔ وہ کوئی ذریعہ ایسا نہ پیدا ہوا تھا جو انھیں مغلوب کر سکتا۔ اب ذرا ہم ان میں سے ہر ایک کی مخصوص حالت کا جائزہ لیں :

ظہر کا پہلا احساس اور جانبازی کی مستعد شان اس وقت ظاہر ہوئی جس وقت حضرت ولید کے دربار میں لے جا رہے تھے۔ اصحاب اور اعزاء دروازہ پر تھے۔ چوکنے تھے۔ اپنے سردار کی مدد پر کان لگاتے تھے۔ مدد کی بلند بھنجناہٹ کانوں میں پہنچی تھی کہ ہاتھ تلواروں کے قبضہ پر پہنچ گئے۔ دوڑے۔ دوڑے یعنی تیس آدمی حکومت کا مقابلہ کرنے کے لیے مستعد ہو گئے۔ نتیجہ جو کچھ ہو۔ حکم بھی ہے۔ امام کی جان اس سے زیادہ عزیز ہے کہ شام کا خیال کیا جائے۔ لیکن تاریخ نے یہ موقع صرف اس لیے پیش کیا تھا کہ ان کی سرفروشی اور اطاعت کے آثار مل جائیں۔ ان کی حقیقی شان اس وقت کے لیے اٹھا رکھی گئی جو آج سے چھٹے مہینہ ظاہر ہونے والی تھی۔ اگرچہ تاریخ میں ان سرفروشوں کے نام نہیں ملتے لیکن محال تھا کہ ان میں مسلم نہ ہوتے، معاشرے نہ ہوتے، یا علی اکبر باپ کے سایہ کے ساتھ نہ رہتے۔

اس وقت یہ تھا چند گھنٹوں کے بعد اس کے لیے تیار ہونا تھا کہ وطن اور اس کی تمام یاد کو دل سے بھلا دیے۔ ملیں۔ کہاں؟ نہیں معلوم۔ کب تک کی جلا وطنی کے لیے؟ نہیں معلوم۔ وطن وہ ہے، جہاں حسین ہیں۔ یاد وہ ہے جو حسین کے سایہ میں ہو۔ حسین کا ایک چہرہ ان تمام مناظر اور ان کی دل چسپیوں کا خلاصہ تھا۔ جو ان کو محلی معلوم ہوتیں۔ کہیں نہیں پایا جاتا کہ اصحاب اور اعز انے ہمراہی میں کوئی تساہلی کی ہو۔ کہیں نہیں معلوم ہوتا کہ یہ اس وقت تیار نہ تھے جس وقت ان کے سردار نے ترک وطن کا ارادہ کیا۔ کہیں کسی پیاری چیز نے انھیں اس طرح نہ ابھلایا۔ جس سے حسین کو دیر ہوئی۔ ادھر سردار اپنے گھوڑے پر دکھائی دیا تھا کہ جانبا جلو میں اور پس پشت دکھائی دے رہے تھے۔ حسین کے گھوڑے کا پہلا قدم اٹھا تھا کہ ان کا گردہ بیک جسم حرکت کر رہا تھا۔

ترک مقام آسان چیز نہیں ہے۔ نہ میں یہ کہہ رہا ہوں کہ اس کی محبت اور وابستگی کے احساسات نہ تھے۔ اور اس لیے۔ اور گراں تھا کہ اہل بیت کی نگاہوں کو وہ سب چیز پیاری تھی جسے مدینہ میں رسول کے نام اور خیال سے نسبت ہو۔ مدینہ چھوڑنا بہت کچھ چھوڑنا تھا۔ اور پھر اس کا نعم البدل کیا تھا؟ دیر ان مقالات جن کے متعلق یہ بھی یقین نہیں کیا جاسکتا تھا کہ وہاں حوائج زندگی معمولی حیثیت سے بھی پائے جاتے ہوں گے۔ جو کچھ ہو۔

یہ مدینہ سے روانگی کا وقت تھا اور شاہراہ سے روانگی کا حکم تھا جس کے متعلق مسلمان عقیدے نے صلاح دی کہ اگر ہم لوگ شاہراہ سے نہ چلیں تو زیادہ مناسب ہوگا۔ اس لیے کہ اگر کوئی فوج تعاقب میں آئے گی تو غالباً شاہراہ سے آئے گی۔ تجربہ نے ظاہر کیا کہ ان کا خوف ایک وہم تھا۔ لیکن اس مکر میں نہ تھے کہ جو صلاح یہ محبت سے دے سکتے اس سے خاموشی اختیار کرتے۔

ہونے والا یہ تھا کہ بنی ہاشم کے باغ کے اس پھول کی پہلی صلاح اس کی پیشین گوئی ہوئی کہ یہ ایک اہم ترین کام کے لیے تجویز ہوتے۔ میری غرض اہل کوفہ کی طرف ان کی روانگی سے ہے۔ اس کی اہمیت اس سے کچھ میں آنے گی کہ

یہ ایسے خوفناک وقت میں تھا جاتے ہیں۔ ایسی طرف جہاں کا تجربہ امید افزانہ تھا اور نہ جس کے تازے وعدوں کا کوئی یقین تھا۔ یقین کرنے جا رہے تھے۔ تجربہ کرنے کی اس عہد و شملت میں اپنی آلودگی ظاہر کرنا حسین اور ان کی وجہ سے ان کی وابستگی ظاہر کرنا ہے اور پھر کام کچھ بہت آسان نہ تھا۔ لوگ تھے جو یہ کہہ رہے تھے کہ ہم ایک حکومت اور اس کے طرز عمل سے خوش نہیں ہیں اور چاہتے ہیں کہ تمہیں اپنا والی امر قرار دیں۔ طبائع کے میلان کو نہ صرف دیکھنا تھا بلکہ میلان کا رخ بھی اپنے موافق بدلنا تھا۔

ہم نہیں جانتے کہ حضرت مسلم کا سن شریف اس وقت کیا تھا۔ لیکن غالباً ہاشمیانے حضرت امام حسین علیہ السلام بنی ہاشم میں یہ سب سے زیادہ سن تھے۔ اور اس لیے کسی اہم کام کے لیے حسین کی جگہ بھی جاسکتے تھے۔ حضرت کے چچا زاد بھائی حضرت مسلم جبلی قوت کے لیے مشہور تھے اور حضرت سے کبھی جدا نہ ہونے تھے۔ روانہ ہونے۔ روتے ہونے اور یہ سن کر کہ امید ہے کہ خدا نہیں اور تمہیں شہادت کا درجہ عطا فرمائے گا! باوجود اس امکان کے کہ اگر دشمن کو بخاری سفارت کی خبر ہوئی تو ہمیں بغیر قتل کیے نہ رہے گا۔ لیکن کام کے شروع کرنے والے معمولی دل گردے کے نہیں ہوا کرتے۔ وہ کچھ کر نہیں سکتے اگر ان میں ہمت اور استقلال نہ ہو۔ ان کے فولادی ارادے پر جان کا خیال کبھی غالب نہیں آتا۔ اور اگر فوری غلبہ حاصل بھی ہو جائے تو وہ پھر اسے قابو میں لے آتے ہیں۔

روانہ ہونے۔ مدینہ آنے کہ مسجد نبی میں نماز پڑھ لیں۔ مدینہ اور اس کی یاد کو ایک مرتبہ تازہ کر لیں۔ روانہ ہونے۔ بیابان کی غیر مانوس شکل اور بے آب و ہوا کی ہلاکت ایک صورت تھی جو اثر کر سکتی اور بری فعل بھی جاتی۔ میں نہیں جانتا کہ ان کی یہ درخواست کہ ”مجھے اس سفر سے معاف رکھیے“ ان کی شکستہ دلی سے تھی یا اس اظہار سے وہ حضرت پر موقع کی دشواری ظاہر کر رہے تھے۔ جس خیال سے کیوں نہ لگتا ہو حسین کے مصمم خط کے سبب وہ شکستہ دلی ہو یا صلت کا مشورہ ہو سب کو نظر انداز کر دیا۔ اور اس سپاہی کی طرح آگے بڑھے جو جانتا ہے کہ قلعہ سے فنا کرنے والے آگاہ راستہ ہی میں تمام کر دیں گے مگر وہ حکم کی عزت اور تعمیل کرتا ہے اور اپنے غور کو شعلہ کر دیتا ہے۔

کوفہ میں داخل ہونے اور کچھ وقت تک انھوں نے حالت دیسی ہی پائی جیسی اہل کوفہ کے خطوط میں تھی۔ ہم نہیں جانتے کہ مسلم کو انسان شناسی میں کہاں تک ملکہ و امتیاز تھی اور انھوں نے کہاں تک کسی یا اکثر کے وعدوں کو احتیاط کی نظر سے دیکھا۔ اس پر اعتبار کے لیے ہمارے پاس کوئی تاریخی اشارہ نہیں ہے۔ دوسری بات یہ تھی کہ ان کے دیکھنے کی چیز یہ نہ تھی کہ حوام الناس کے طبائع کی فطرت میں وقت صرف کرتے بلکہ یہ روسائے کوفہ کے انداز دیکھ رہے ہوں گے اور لوگوں کی آمد بجانے ان کے انھیں روسائے شخص سے ہوگی۔ اس لیے انھیں صرف یہ دیکھنا تھا کہ لوگ یعنی عامہ ناس کہاں تک آ رہے ہیں۔ اور غالباً اسی کو ان کے وعدہ کا معیار قرار دیا ہوگا۔ نہ جو وقت کہ ان کے پاس تھا اس میں اس کی کافی گنجائش تھی کہ وہ انفرادی طبائع کی پوری جانچ کر سکتے جو کچھ انھوں نے کیا ہو گا وہ غالباً یہی تھا کہ جس وقت گردہ گردہ لوگ ان کے پاس آتے تھے یہ حضرت کا خط سنا تے تھے اور لوگوں کے میلان کو ان کے تسلیم یا عدم تسلیم سے سمجھتے تھے۔ اور جی جی اگر یہ سوچنے کی گنجائش بھی ہو کہ اہل کوفہ کے وعدہ فوری قبولیت کے شاہان نہ تھے بلکہ احتیاط چاہتے تھے تو اس سوال کے ساتھ یہ فراموش نہ کرنا ہوگا کہ ذمہ داری روسائے کوفہ کی تھی نہ مسلم کی۔ اور مسلم کی آمد ہی تجربہ کا درجہ رکھتی تھی، حد یقین پر

نہ تھی۔ اس کے علاوہ اس وقت کی کوئی مفقود تھی۔ یعنی اب تک دھرہ کرنے والے حالت خوف میں مبتلا نہ ہوئے تھے کہ اس پر ان کے دھرے کسے جاتے۔ اس لیے یقین یا عدم یقین دونوں پر کوئی اعتبار نہیں کیا جاسکتا تھا۔ جو کچھ بھی ہو، یہ نہیں سوچا جاسکتا کہ کوفہ پہنچنے پر اپنے بے کس جہلی کی مدد کی لوگوں میں آلودگی و بچ کر مسلم خوش نہ ہوئے ہوں گے۔ اور نہ یہ عجب انگیز ہے کہ ان کے حیرانگاہ میں ایک دیکھ بھل ہو گا لیکن یہ صورت دیرپا نہ تھی۔ ابن زیاد کی آمد اور لوگوں کی پاشانی اور خوف نے امید کو مبدل بہ یاس کرنے کی ابتدا کی ہوگی۔ اگر اس اشارہ پر اکتفا کی جائے کہ مسلم نے دار مختار سے ہانی بن عردہ کے گھر پناہ کا ارادہ کیا تو اس کے کوئی معنی میرے نزدیک اور نہیں ہیں کہ مسلم لوگوں کی حالت کو سمجھ گئے اور انھوں نے عامہ ناس کے دھرہ مدد پر شخصی پناہ کو ترجیح دی۔ اب سوال یہ ہوتا ہے کہ کیا مسلم نے اس قتل مرکز کو اپنی حیات کے لیے جوڑ لیا تھا؟ نہیں۔ ان کی جان اب اپنی جان نہ تھی بلکہ اس وجہ کی جس کے لیے یہ بھیجے گئے تھے۔ یہ ہے کہ انسان ایک وقت فوری تصفیہ پر مجبور ہوتا ہے اور اس پر وقتی عمل بھی کرتا ہے۔ لیکن یہ تصفیہ نہ تھی ہوا کرتا ہے اور نہ یہ عمل ناقابل ترمیم ہوتا ہے۔ بلکہ وہ ہمیشہ تجربہ کی حالت سے قابل ترمیم رہا کرتا ہے۔

مسلم کا جبکہ بدلنے کا تصفیہ اس وجہ سے تھا کہ انھوں نے ابن زیاد کی آمد سن کر لوگوں کے خوف سے متاثر ہونے کو سنا تھا اور غالباً اپنے پاس لوگوں کی کئی تعداد بھی ہوگی۔ حالت کے اس احساس کے بعد مضبوط تر موقع کا تجویز نہ کرنا غلطی ہوئی۔ اس لیے کہ اگر لوگوں کی ترک رفاقت مصدق ہو جاتی اور انھوں نے قتل مکان نہ کیا ہو تا تو انھوں نے ایک امکانی کوشش کرنے سے غفلت کی ہوئی۔ دراصل ایک ایسی کوشش کے بعد انھیں اس کا موقع تھا کہ انھوں نے لوگوں کے طبائع کے متعلق جو فوری تصفیہ کی تھا اسے تجربہ پر آزماتے۔ اور لوگوں کی فوری وحشت کو ایک مرکز سے پھر دور کرتے اور انھیں ایک مقصد پر متحد ہونے کا موقع دیتے۔ قتل مکان اور ہانی کے شخص کو اپنی پناہ تجویز کرنے میں مسلم نے غلطی نہ کی تھی جو اس سے ظاہر ہے کہ پھر گشتہ جمع ہونے لگے اور اگر پہلے سے زیادہ نہیں تو پہلے سے کم بھی لوگ جمع نہ ہوئے۔ اب وقت تھا کہ حضرت مسلم خصوصیت سے یہ فرماتے تھے کہ ”تم اپنے اقراروں پر ثابت قدم رہنا بے وفائی نہ کرنا۔“ حضرت مسلم کو ایک نہایت ہی نادر موقع ملا جس وقت ابن زیاد عیلات کے لیے آیا، شریک جتنی تصفیہ یہ تھا کہ ابن زیاد قتل کر دیا جاتا۔ اور اگر ایسا ہو تا تو فوری حیثیت سے ایک سخت اور منظم آدمی درمیان سے اٹھ جاتا اور پھر نتیجہ سوچنا دشوار نہیں ہے کہ لوگ مسلم کی رفاقت میں بے خوفی سے راسخ ہو جاتے اور انھیں اپنے کام کے لیے کافی وقت ملتا۔ اس وقت تک کہ مزید کسی شخص کو صحیح اور انتظام کرتا۔ مزید کو اس وقت بڑے پیمانہ پر انتظام کرنا ہو تا جس وقت مسلم کو قبضہ کیے ہوئے کچھ زمانہ گزر جاتا۔ اور چونکہ مسلم کے پاس کوفہ اور بصرہ کی ایسی دو فوجی چھاونیاں اور مرکز ہوتے اس لیے عراق عرب کا صوبہ کام دے سکتا اور پھر مجاز پر قبضہ کرنا بھی چنداں دشوار نہ ہوتا۔ باوجودی انظر میں صلاح بری نہ تھی۔ خصوصاً ایسی حالت کہ ایک ذرا سی کوشش سے بڑا فائدہ حاصل ہوتا۔

لیکن اس موقع پر سوال یہ بھی نہیں ہے کہ مسلم نے اس موقع پر ابن زیاد کو قتل نہ کرنے میں غلطی کی یا نہیں؟ ایک اصولی بات تھی کہ ایسی حالت میں کہ ابن زیاد عیلات کی غرض سے آیا تھا اس کا قتل کرنا مناسب تھا یا نہیں۔ دوسرے یہ کہ ہانی بن عردہ کے گھر آیا تھا۔ اور اس لیے ہانی اصول مہانداری کے لحاظ سے اس کی پناہ تھی۔ تیسرے مسلم ایک حدیث کی سند

لارہے تھے۔ اس سے ظاہر ہوگا کہ محض قتل کرنا یا نہ کرنا نہ تھا بلکہ وہ بہت سے احساسات کے تابع تھا۔ ایک موقع بین مدبر کے لیے یہ موقع خدا کا بھیجا ہوا اٹھا جاتا۔ یا وہ اس اصول کو مد نظر رکھتا کہ ایسی حالت میں اگر ابن زیاد کو قتل کرنا جائز فعل نہ بھی ہو تاہم اس کے قتل سے آئندہ کے بڑے منافع حاصل ہوتے ہیں۔ مثلاً خلق اللہ اس کے ظلم سے آزاد ہوتی ہے اور نزیہ کے مرکز ظلم کا اثر کم ہوتا ہے اور آئندہ بہتر طریقہ کے نفاذ میں آسانی ہوتی ہے۔ یہاں تھوڑی سی برائی بہت سی بھلائی کا مقدمہ ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ اگر برائی ہو بھی تو صرف موقع کی کمی نہ کہ ابن زیاد کے قتل کی۔ اس لیے کہ ابن زیاد تو گویا ان کے خلاف اعلان جنگ دے چکا تھا اور اس لیے وہ اسے قتل کر کے گویا اپنی حفاظت کا اقدام کرتے۔ تیسرے یہ کہ ابن زیاد کے اعمال کی بنیاد پر اس حدیث کا استعمال اور تعلق صحیح تھا یا نہ تھا یہ دلائل ظاہر یا موقع ہیں اور ہم پر ان کا اثر اس لیے بھی پڑ سکتا ہے کہ ہم ایسے زمانہ میں ہیں جب کہ دنیا کے نزدیک اس پر عمل نہ کرنا احتیلا سے دور ہے۔ یا مختصر نظروں میں یہ فلسفہ سیاست ہے اور ہمیشہ ان حکومتوں کا اصول رہا جنہیں محض وقتی مفاد پر غور سے بحث رہی۔ مثلاً ابن زیاد نے ہانی کو ہلا کر گرفتار اور قتل کیا۔ اور اسے ان احساسات سے کوئی بحث نہ ہوئی کہ ہم نے دھدے کیے ہیں اور اپنے گھر بلیا ہے۔ یا کچھ لوگوں کو درمیان میں ڈالا ہے۔ اسے محض اپنے نقطہ نگاہ ہے ایک دشمن یا سلطنت کے ایک محدود شخص کو ہٹانا تھا اور بس۔

ابن زیاد کا کچھ کرنا شخص کو انفرادی احساسات، قوی، معاشرتی یا اخلاقی سے بری نہیں کر سکتا تھا اور اس لیے ہم اس بلند حوصلگی کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتے جو ایک سخت ترین دشمن کے لیے عمل میں لائی جاسکے۔ اس کے علاوہ جیسا ہم پیشتر کہہ چکے ہیں جہاں تک ہمیں معلوم ہے کہ زیر بحث شعاع مصلحت اسلام کی پسند کے قابل نہ تھا۔ اور اس وقت چونکہ حضرت مسلم حضرت امام حسینؑ علیہ السلام کے دیکھ تھے ان کے نہر فعل کو ہمیں تبعیت حسینؑ سے کہنا ہوگا۔ ہم نہیں جانتے کہ حضرت نے مسلم کی اس مصلحت کو مناسب سمجھا یا اس موقع کی فروگزاشت کو غلطی سمجھا۔ میرا خیال ہے کہ چونکہ حضرت مسلم سے ایک بلند درجہ کا فعل سرزد ہو چکا تھا حضرت اس کے خلاف خیال ظاہر نہ فرما سکتے تھے۔ اگر ان کے نزدیک موقع کے لحاظ سے ابن زیاد کے قتل ہی کے وجوہات ہوتے۔

لیکن نہ ملک غلطی کا وقت آ رہا تھا اور وہ ہانی بن عروہ کا تصفیہ تھا کہ وہ ابن زیاد کے دربار میں جاتے۔ اور بغیر اس کے کہ احتیلا اور پیش بندی کی جاتی۔ یہاں بھی قبیلہ کے قول کی پابندی اور اثر تھا جس سے ہانی متاثر ہوئے۔ ابن زیاد پیشتر ہی سے انتظام کر چکا تھا اور ان لوگوں میں جو ہانی کے لانے کے لیے مقرر ہوئے تھے اشعث کا ایک لڑکا بھی تھا۔ لیکن جبکہ اسلام بن خارجہ اور عمر بن حجاج ابن زیاد کے ارادوں سے ناداقت ہوں۔ لیکن معمولی احتیلا یہ چاہتی تھی کہ مسلم کی آمد سے جو واقعات تھے ابن زیاد کے آنے کی وجوہ تھے اس کی بنا پر مرکز کی احتیلا کی جاتی جس کے بغیر کسی انقلاب کے لیے آسانی ممکن نہ تھی۔ ہو سکتا ہے کہ اسلام اور ابن حجاج کو کسی انقلاب سے زیادہ وابستگی نہ ہو لیکن قربت کی بنیاد پر انہیں ہانی کی حفاظت کا لحاظ تھا جیسا ان کی گرفتاری کے بعد چھڑا لینے کی مستعدی سے ظاہر ہے۔ اور زیادہ افسوس اس کا ہے کہ فطرت کے ماعلوم اسباب نے ہانی کے دل پر اثر کیا۔ قصر تک پہنچتے پہنچتے ان کے دل نے خطرہ کا احساس کیا مگر انہیں متنبہ نہ ہوا۔ اور دوبارہ وہ اپنے بے جانے والوں کے قول سے مطمئن ہو گئے۔

بہت جلد ہائی کو حقیقت امر معلوم ہوئی۔ مقل کا سامنے آنا آئینہ دیکھ لینا تھا۔ ہائی نے بھی بات کہی کہ میں نے مسلم کو خود نہیں بلایا۔ اور اس کے بعد وعدہ کیا کہ میں اب انھیں نکال دوں گا۔ اسی وعدہ میں ان کی مصیبت تھی۔ اور وہ یہ ہے کہ یہ انھوں نے واقعا بھی ارادہ کیا تھا کہ مسلم سے کہیں کہ صورت معاملہ یہ ہے اب آپ اپنی دوسری کوئی پہلا تلاش کیجیے تو یہ خوف سے متاثر ہو کر یا اپنا موقع کمزور دیکھ کر ایک اعلیٰ احساس سے دست بردار ہوتے۔ یعنی جس پہاڑ دی کو انھوں نے حیا اور مہانداری کے لحاظ سے قبول کیا تھا اس سے باز آتے۔ اور یا اس سے انھوں نے یہ ارادہ کیا تھا کہ ہم ابن زیاد کے پاس جس حالت میں ہیں کہ اس کے لوگوں میں گھر سے ہیں۔ باہر جا کر ہم بہت کچھ کر سکیں گے اور پھر ابن زیاد ہم پر قبضہ نہ کر سکے گا۔ واقعات کا ماحول آخر ازلہ کرتوجیہ کا قرینہ ٹھہراتا ہے۔ ہائی جانتے تھے کہ اگر ہم یہاں سے نکل سکے تو ہم اپنے قبیلہ ملازمین اور ان لوگوں میں ہوں گے جو مسلم کی بیعت کر چکے ہیں اور اس وقت ہمارے ذرائع ابن زیاد کے مقابلہ بہت زیادہ ہوں گے۔ ہائی اپنے قول اور مہانداری اور پہاڑ کے احترام پر جس درجہ ثابت قدم تھے اور جو معتمد تصفیہ انھوں نے مسلم بن عمر البہلی سے ظاہر کیا کہ ”میں فرزند رسول کے پیغامبر اور اپنے مہمان کو کبھی دشمن کے حوالہ کرنے کی رسوائی گوارا نہ کروں گا۔“ اس سے ظاہر ہے کہ وہ یزدخ الوقتی کے کچھ نہ چاہتے تھے۔ لیکن ابن زیاد کا سامان بین اس وقت کی ایسی معنید ضمانت سے دست بردار نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ اس پر راضی نہ تھا کہ ہائی جانیں اور زیادہ سے زیادہ مسلم پھر سے اپنی پہاڑ بنالیں۔ بلکہ وہ ہائی کے اس وقت کے مجبورانہ موقع سے یہ فائدہ اٹھانا چاہتا تھا کہ وہ مسلم کو ہمارے حوالہ بھی کر دیں۔ یہ ہائی سے ممکن نہ تھا۔ قتل کی دھمکی دی تھی۔ لیکن یہ بھی ان کے ارادہ میں انحرش پیدا نہ کر سکے۔ اور اب انھوں نے بھی اپنے قبیلہ کی قوت کی دھمکی دی۔ لیکن افسوس کہ ہائی نے موقع سمجھنے میں غلطی کی تھی۔ ابن زیاد نے توہین کی اور اب ہائی نے دوسرے سپاہی کے قبضہ پر ہاتھ ڈالا جس کے معنی یہ ہیں کہ خود کوئی نکوار لے کر بھی نہ گئے تھے۔ اس میں بھی کامیابی کا موقع نہ تھا۔ اسمانے ابن زیاد کے برتاؤ کی مخالفت کی اور اس کے ساتھ بھی سختی کا برتاؤ ہوا۔ اس سب کے معنی یہ تھے کہ رہتائے ہائی کو ابن زیاد کے ارادہ میں شبہ نہ رہتا۔ عمر بن حجاج الزبیدی نے قصر کا محاصرہ کیا۔ لیکن قھوڑے سے نظروں نے اسے ایسا اطمینان دلا دیا کہ وہ واپس بھی ہو گیا۔ کیا صرف لفظ ہی تھے جس سے وہ نہ صرف اس وقت واپس گیا بلکہ اس کے بعد ابن سعد کی گھمکی فوج کا ایک افسر بھی تھا۔

باوجود قربت کے ابن حجاج واپس جو تائیانہ ہوتا۔ مسلم تھے اور ان پر ہائی کا یہ احسان تھا کہ ہائی نے خوف کے وقت میں پہاڑ دی تھی۔ مسلم نے اپنے رہائیں مدد دلانی۔ لوگ جمع ہوئے۔ غریب اور بے ہتھیار لوگ۔ اور امر اس قدر میں اپنا فٹہ چھپا رہے تھے کہ ہم نے حسین کے لیے تم سے بیعت کی ہے۔ انھیں آنے دو۔ ایسے لوگوں سے کامیابی کی امید نہیں کی جاسکتی تھی۔ کیونکہ ان کے فطری مرکز نہ تھے جو عامہ ناس کو سنبھالے رہتے۔ جو کچھ بھی ہو۔ اور جتنے اور جیسے لوگ بھی ساتھ ہوں حملہ کیا گیا اور اگر یہ میج ہے کہ قصر میں اس وقت قھوڑے سے آدی تھے تو حملہ جوش اور قوت کے ساتھ نہ کیا گیا تھا۔ ورنہ قصر پر قبضہ اور ابن زیاد کی گرفتاری مشکل نہ تھی۔ ”شام تک یہی کیفیت رہی۔“ ابتدا کا وقت نہیں معلوم۔ لیکن یہ کیفیت غالباً ظل اور بے سود الفاظ سے زیادہ نہ تھی۔ اور نہ یہ خبر ہے کہ کچھ لوگ مارے بھی گئے یا زخمی ہوئے۔ چند دھمکی کے الفاظ نے اس مجمع کو منتشر کر دیا۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ مجمع نکوار کا مقابلہ نہ کر سکتا تھا۔ اور دیکھو کہ اب مسلم

تہا کھڑے ہیں۔ داپنے ہاتھیں کہیں کوئی مددگار نہیں ہے۔ مسلم واپس جوتے ہیں اور طوحہ پناہ دیتی ہے۔ ان کی دلی کیفیت اس سے معلوم ہوگی کہ طوحہ کا پیش کیا ہوا آب و طعام رغبت نہ دلا سکا۔ داغِ نتیجہ کی ٹھیب ٹھکیں پیش کر رہا تھا اور وہ اس وجہ کو ضائع دیکھ رہے تھے۔ جس کی امید تھی۔ ضائع ایک بے خیال اور بے ارادہ جماعت کے ہاتھوں۔ قبل اس کے کہ اس پر کوئی سختی پڑی ہوئی۔

کہیں پناہ لینا نام لینے اور اس فوری دل غراش حالت کے بعد آئندہ روش طے کرنے کے لیے قتل مسلم غور کر رہے تھے اور ابن زیاد امان کی منادی کر رہا تھا۔ اور اب وہی لوگ اس کے گرد جمع ہو رہے تھے جو اپنے وعدوں میں بہت پیش پیش تھے۔ ابن زیاد لالچ اور دھمکی سے رہا تھا۔ اور ہر شخص اس فکر میں تھا کہ مسلم کو گرفتار کر رکھوں اور روپیہ حاصل کرو۔

ہونے والا یہ تھا کہ ابن زیاد کو مسلم کی خبر بھی اشعث کی اولاد سے ملتی۔ اور وہی اس کام کے لیے روانہ کیا جاتا کہ زندہ یا مردہ گرفتار کرے۔ جمع ہو چکی تھی کہ سموں کی آواز ہتھیاروں کی جھنکار سنائی دی۔ مسلح ہونے اور جنگ کے لیے نکلنے تک غریب بڑھیا کے گھر میں آگ لگا دی جا چکی تھی اور سپاہی اندر داخل ہو چکے تھے۔ ”جنتیم“ اور نفس سے خطاب کہ ”مرنے کے لیے مستعد ہو جا“۔ تلوار کا پھٹکا اور گرنا اور سپاہی دروازہ کے باہر تھے کچھ دیر کوشش جاری رہی۔ سپاہی اپنی تعداد کے فائدے سے داخل ہو جاتے تھے لیکن مسلم کی ہمت اور ارادہ باہر نکال دیتا تھا۔ ابن زیاد کو مسلم کے ”مقابلہ سے پیش آنے کی“ خبر دی گئی۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ دشمن یہ کھڑے تھے کہ مسلم صبر و عجب ہو کر اپنے کو ہمارے حوالہ کر دیں گے۔ لیکن امر شہادت میں حسین کا پیش رو۔ حسین کی شان شہادت کا پیش خیمہ تھا سوچو کہ تمام کوفہ کی مخالفت ہے۔ تہا خود ہیں فتحنگی ہے لیکن کوئی سپاہی نہیں سامنے آتا۔ مگر یہ کہ زمین پر گر کر غلبہ حاصل کرنے سے عجز ظہر کرتا ہے۔ ابن زیاد لکھتا ہے کہ کیوں جنگ کرنے اور کئی شخصوں کو ہلاک کرنے کا موقع دیا۔ غالباً یہی موقع نہ دینے کا خیال تھا کہ گھر میں آگ لگا دی گئی تھی کہ پہلے اس ترکیب سے سفیر حسین ہلاک ہو جائے۔ ٹھیک جواب دیا ابن اشعث نے کہ ”اگر ایسے شخص کا کوئی ساتھ دینے اور مدد کرنے والا ہو تو دنیا کو ہماری آنکھوں میں تاریک کر دیتا“۔ اب ”پناہ“ کا مشہور مکر شروع کیا گیا۔ لیکن اس خود دار ہاشمی نے ورساہی جواب دیا جو حسین کے قائم مقام کو دینا چاہیے تھا۔ جس لفظ کو دشمنوں نے شاندار اظہار کرم کے لیے استعمال کیا تھا اسے نہ صرف مسلم کے جواب کی حقارت بلکہ ان کی خون آلود دشیر کی ایک ضرب نے کاٹ دیا۔ مسلم کی تلوار حقیقی جہاد کا اعلان کرتی ہے۔ جس وقت وہ فرماتے ہیں کہ تم خدا، غار، فاسق، اور خدا و رسول کے دشمن ہو۔ اور اس کے بعد مسلم شہیدانہ جوش شجاعت میں رجز پڑھتے ہیں۔ شیر گرجا ہے اور تلوار کی چمک کے ساتھ یہ آواز سنائی دیتی ہے کہ ”میں نے قسم کھائی ہے کہ سوا بہادر کے کسی کو قتل نہ کروں گا“۔ یہ تو خیر۔ وہ شجاع ہے جو ان کا نام لے اور جو ان کا اسلحہ بردار ہو۔ شجاعت ان کی اسلحہ بردار تھی۔

اس وقت جب کہ یہ اس طرح ٹھہرتے قہنائے قہنائے اور شہادت ان کا آماج تھا۔ عجب نہیں ہے کہ ان کی روشن ضمیری نے ان کے منہ سے یہ فقرہ نکلوا یا کہ: ”مجھے خون ہے کہ میں جھٹلایا یا دھوکا دیا جاؤں گا“۔ تھوڑی ہی دیر میں یا تو یہ ایک گڑھے میں گرے جو دشمن نے انھیں گرانے کے لیے کھودا تھا یا کسی زخمی سپاہی کے خون سے پھسل گئے۔ اور یا کسی نامرد دشمن نے پشت پر سے حملہ کیا۔ دشمنوں کی تعداد کافی سے بھی زیادہ تھی کہ وہ سب اپنا موقع دیکھ کر صبر اڑتے اور شیر کو

سنبھلنے نہ دیتے۔ فوراً اسلحہ بٹا دیا گیا۔ اب شجاعت ثنائی اور تلخ گفتگو سے کوئی چیز باقی نہ تھی۔ لیکن اس وقت بھی مسلم کا جسم گرفتار تھا۔ مسلم کا بلند شخص اور نامعلوم دماغ گرفتار نہ تھا۔ اس وقت بھی زبان کی تلوار مسلم بن عمر البابی پر گری اور اسے اس پر مات کی کہ ”تو نے اکی رٹول کی متابعت پر اکی ابوسفیان کی ترجیح دی۔“

نہ انکار کی ضرورت ہے نہ حیرت کی کہ مسلم کے چہرہ پر آثار حزن ظاہر ہوئے۔ اور اگرچہ عبد اللہ اعلیٰ سے تنہا مسلم سے جنگ میں کوئی آثار شجاعت ظاہر نہ ہوئے لیکن وہ اس وقت طنز کے لیے آمادہ ہو گیا اور بیانے اس کے کہ وہ مسلم کی بیچ حالت کا اندازہ کرتا اس نے وہ کہا جو خود کر سکتا تھا لیکن مسلم کا جواب موجود ہے اور وہ مسلم کے حزن کا ترجمہ ہے کہ: ”میں اپنے لیے نہیں روتا بلکہ میں حسینؑ کے لیے متاسف ہوں۔“

کس کے قلم میں یہ وقت ہے کہ وہ اس فقرہ کے احساسات کا ترجمہ کر سکے۔ کس کے خیالات اس قدر محبت کی لطیف تھر تھراہٹ میں آلودہ ہیں جو اس کا اندازہ کر سکیں اور پھر کس میں اس قدر صبر ہے جو اس فقرہ میں داخل ہو اور اس میں وہ چھپان نہ ہو جسے غم انگیز اثر کہتے ہیں۔ کونسا ایثار پسند دل ہے جو ایک شریف انکس کو مجبور اور آمادہ قتل دیکھ کر اس کی قدر نہ کرے کہ اسے اپنی گردن کی قدر نہیں ہے بلکہ سوچ یہ رہا ہے کہ ہمیں وہ ہماری حالت میں گرفتار نہ ہو جائے جس پر ہم قربان ہو رہے ہیں۔ اس فقرہ اور اس کی تخیل سے احساس محبت کا عمل بازگشت پہلے مسلم ہی پر ہوا۔ اور وہ مخموم نظر آئے۔ وہ بھول گئے کہ ہم گرفتار ہیں۔ ہر طرف پردہ تھا۔ صرف حسینؑ کی صورت اس تاریکی میں سے نکل کر مسلم کو دیکھ رہی تھی اور وہ اس کی ذمہ داری محسوس کر رہے تھے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ حسینؑ اس حالت کو نہ جائیں اور یہاں آکر مصیبت میں چھنس جائیں۔ مسلم کے آن کی قربانی اس سے زیادہ نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ ابن اشعث یا ابن سعد سے کہتے کہ حسینؑ کو مطلع کر دینا۔ کہا اس لیے کہ حسینؑ کے لیے تھا۔

عبد اللہ اعلیٰ کا کردہ اور بے رحم طنز خیز چکا تھا اور مسلم سنبھل چکے تھے کہ وہ ابن زیاد کے سامنے لانے گئے۔ یقیناً اس صورت سے کہ چہرہ خون آلود ہے۔ بہا ہوا خون جم گیا ہے۔ چند نامرد تلواریں کھینچے ہیں اور بن رہے ہیں جس قدر پہلدارانہ شان بنا سکتے ہیں۔ اہل کب بکھے ہوں گے کہ شجاعت خاصہ کا ایک عکس ہے جو شخص کا محتاج نہیں ہے۔ اسے تو نفس ایک زمانہ میں بناتا ہے۔ لیکن شجاعت نے اپنی صورت دکھادی، جس وقت خون آلود چہرہ کی نگاہیں اہل دربار پر پڑیں اور مسلم کا ہر قدم اس طرح اٹھا کہ گویا وہ ابن زیاد کے دربار کی تمام شان کو کھلتا ہوا بڑھ رہا ہے۔ آئے۔ اور جس وقت ان کی نگاہیں اپنے پر اطمینان بستم سے دربار پر سوتیاں برسا رہی ہیں اہل دربار خصوصاً ابن زیاد ایٹھ رہا ہے کہ گرفتار رعب میں نہیں آیا اور نہ جھکا۔ اب وہ سب بل کھاتے ہیں جب وہ خلاف انسانیت اطمینان حاصل نہیں ہوتا جو کسی مجبور کی اظہار مجبوری پر ہوتا۔ گرتے ہیں اور اب وہ سب اپنے کو بچتے ہیں۔ اپنی شان کو بچتے ہیں اور مسلم کی شان کو بچتے ہیں اور سنتے ہیں تو یہ کہ ”اس پر میرا سلام ہے جو ہدایت پر چلتا ہے موت کے سراخام سے ڈرتا ہے اور اس (خدا) کے سچے بادشاہ کی اطاعت کرتا ہے۔“ کیا دنیاوی شان و شوکت، درباریوں کا مجموعہ، لباس، آرائش اور آکات حرب کا کسی کے پاس ہونا اور اس وجہ سے لوگوں کا کسی کی تعظیم کرنا مسلم کے لیے تعظیم کا اصول نہ تھا۔ نہیں بلکہ وہ ”ہدایت“ اور ”خدا کی اطاعت“ کرنے والے کو سلام کرتے ہیں۔ جس سے استنباط یہ ہے کہ ان کے نزدیک انسان اس سے بہت بلند ہے کہ

چیزوں کی تعظیم کرے۔ وہ اس وقت کسی انسان کی تعظیم کر سکتا ہے جس وقت کسی میں خدا کی اطاعت، ہدایت اور موت کے سرانجام سے ڈرنے کا اثر پایا جائے۔ چھوٹے چھوٹے لفظ ہیں جس کی شرح و تفسیر ہو سکتی ہے۔ نمائش کا وظیفہ خوار حاجب خوشدل میں مل چکا ہے کہ ”امیر کو سلام نہیں کیا!“ اور اب مسلم کے معلوم الفاظ معلوم نقشہ کا پتا دیتے ہیں۔ جب وہ کہتے ہیں کہ ”چپ رہ۔ وہ میرا حاکم نہیں ہے“ یا اس کے بعد فرماتے ہیں کہ: ”امیر تو صرف میرے آقا کا بیٹا نہیں ہے۔“ یہ ضرب تھی جس نے زیادہ کے بیٹے کو اپنی جگہ بھلا دی ہوگی۔ اور زمین پر اس کا ہاتھ پھینچ گیا ہوگا اور خوشدلوں کی مضحک صورت تو مصور کے قلم سے باہر ہے۔ ابن زیاد اگر اس سے علاوہ جواب دیتا جو کچھ اس نے دیا تو طبیعت شہسوار اور عمل دماغی پر غور کرنے والوں کے لیے ایک شفق ہو تا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ: ”میں تم کو ضرور قتل کروں گا۔“ ہاں جب اسے ایک گرفتار کی میزبانہ حالت بھی مرحوبیت اور خوشدلانہ تعظیم کی مسرت حاصل نہ کر سکی تو وہ چوندھیا کر اپنے موجودہ اختیارات کی فہرست پر نظر ڈال رہا تھا اور اب تعین کر رہا تھا کہ ہم قتل کر کے خوش ہو سکتے ہیں۔ جسم پر اظہار اختیار اس مجموعہ اجسام کی مدد سے جو حکومت کے کلکروں سے پہلے تھے مسلمانوں سے جوہر فربہ، ظلم اور خلاف انسانیت کا رد وائوں سے حاصل ہوا تھا۔ جو مل سکتا تھا۔ دوسروں کے قبضہ میں جاسکتا تھا۔ لیکن ایک آزاد نفس وہ چیز ہے جس پر دنیا کی سلطنتیں قبضہ کرنے سے عاجز ہیں۔

مسلم اب دینیت کے لیے آمادہ ہوتے ہیں۔ مجمع میں سب سے زیادہ وثوق انھیں ابن سعد پر چاہیے تھا اور یہ اس مجمع کا سب سے زیادہ قابل اعتبار تھا۔ جو ذلیل خوشدل میں دینیت کا احترام نہیں کرتا، بلکہ اسے ابن زیاد سے کہہ دیتا ہے۔ اور بعض کے موافق ضیاء اللہ بن زیاد نہ صرف اسے عہد شکنی پر ملامت کرتا ہے بلکہ یہ پیشین گوئی بھی کرتا ہے کہ حسین سے بھی جوڑنے جانے گا۔ وہ تو ہی ہوگا۔ یہ ابن سعد کی طبیعت کا نمونہ نہ تھا۔ قوم کا چہرہ تھا۔ اور ان دینیتوں میں کوئی ایسی نہ تھی جو سیاسی رنگ میں رنگی جاسکے۔ یہ حضرت امام حسین علیہ السلام کی تعزیت آوری کے اور چونکہ حضرت مسلم اطلاع کی خواہش کر رہے تھے۔ اگر ابن زیاد صلح پسند ہوتا تو اس اطلاع سے اس بنیاد پر خوش ہوتا کہ اس سے آئندہ کا قابل الزام موقع دور ہو جائے گا۔ لیکن انسان کی طبیعت سب سے زیادہ اپنی راز گو ہے۔ وہ اپنے درجہ کو چھپا نہیں سکتی۔

بہر حال اس موقع پر جس میں ایک ہاشمی اپنے آخری وقت اپنے فرائض ادا کر رہا تھا اور اپنے فرض ادا کرنے کی دینیت سے اپنی زبان اور محاسن کا اعتبار قائم کر رہا تھا۔ قائم مقام حکومت اپنی مصلحت بھی ظاہر کر رہا تھا کہ ”زرہ کے فروخت کے متعلق ہمیں اختیار ہے۔“ لیکن یہ تو ایک ذاتی معاملہ تھا۔ بڑے مسئلہ پر بھی ابن زیاد کے جواب سے عکس پڑ رہا تھا کہ ”حسین کو بھی یہاں آنے دینا چاہیے تاکہ وہ بھی موت کا ذائقہ چکھ لے۔“ یہ مصلحت تھی اور دشمنی کا درجہ اس فقرہ سے کھمبہ آنے کا کہ ”حسین کے لیے کوئی کرامت نہیں ہے۔“

ان باتوں کے بعد ابن خالد دن سے میں نے مسلم اور ابن زیاد کا مکالمہ درج کیا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ یہ اموی مورخ کا تذبذب یا حیثیت انھیں لفظوں میں گھٹک ہوئی۔ بہر حال میں اسے فرض کرتا ہوں کہ انھیں لفظوں میں گھٹک ہوئی۔ ابن زیاد مسلم پر گروہ بندی اور نفاق کا الزام لگا رہا تھا اور مسلم کہہ رہے تھے کہ ”شہر والوں نے یہ خیال کیا تھا کہ تمہارے باپ نے ان کے اچھوں کو مار ڈالا۔ خون ریزی کی اور کسری دقیر کے برتنو کیجیے۔ ہم ان کے بلانے سے ان کے پاس اس غرض سے

آئے کہ ان میں مدد و انصاف کریں اور کتب و سنت پر عمل کرنے کی ہدایت کریں۔ ”مسلم کے جواب نے گروہ بندی اور لفاق کو شیشہ کی طرح چور کر دیا۔ گروہ بندی اور لفاق کیسا اور کس میں جب اہل شہر ہی نے بلایا ہے اور بلایا اس لیے ہے کہ ایک ظالمانہ نظام کی جگہ مدد و انصاف قائم کیا جائے اور کسری و قیصر کے برتاؤ کی جگہ کتب و سنت کی ہدایت کی جائے۔ افسوس کہ دربار میں کوئی مسلمان نہ تھا، ورنہ ”مسلم“ کا کہنا کچھ عملی اثر کرتا۔ اس جواب کے بعد ابن زیاد کا موقع یہ ہے کہ بجائے اس کے کہ وہ ”مسلم“ کو ملزم قرار دے خود اپنے اور اپنے نظام کو ملزم دیکھ رہا ہے۔ جس کا جواب اسے ایک قوم کو دینا ہے۔ لیکن اپنی مصلحت اور اپنے نظام کی صحت یا عدم صحت کے جواب میں وہ کیوں الجھتا جب کہ وہ اپنے نظام کو قائم دیکھ رہا تھا اور تلوار اس کی حفاظت کر رہی تھی۔ لیکن کچھ کہنا تھا اور اس کا طبعی کینہ پن اس اصول کے قائم کرنے والے کو نامقبول کرنے کے لیے مسلمانوں کے مجمع میں شراب پینے کا الزام لگادیتا ہے۔ اگر میں اس وقت موجود ہوتا تو یہ سننے کے ساتھ ہی ان لوگوں کی قبروں کی طرف دوڑتا جو زبید کے پہلے حکومت کر چکے تھے یا اعضاء حکومت تھے اور ان کی ہڈیوں کی ٹکڑ ٹکڑا ہٹ سکتا اور نہ حکومت کرنے والوں نے ابن زیاد کے بعد اس کے اس کہنے سے کوئی نصیحت حاصل کی بلکہ طانیہ درباروں کو شراب سے نم کیا، اور مسلمانوں کی بہت سی بد نصیبیوں میں ایک اس بڑے سنی کے باعث ہوئی۔ یہ تو خیر کیا وہ محفوظ رہے جن کے حلق میں شراب پینے کے بعد قوتے پھٹتے تھے؟ لیکن اسے کیا تم تھا کہ اس کے اس فقرہ کے وقت مسلمانوں میں شراب عام ہو چکی تھی اور اس کا ولی نعمت ام المہاجر سے ایسا عقد کر چکا تھا جس میں طلاق نہ تھا۔ اسے تو ایک جواب اور نامقبولیت چاہتی تھی۔

بہر حال ایک فساد کے سامنے میرے متذکرہ صدر ریمارک ”مسلم“ پر سے اس الزام کو رفع نہیں کرتے۔ اور وہ کچھ دلیل چاہ سکتا ہے۔ بہتر اگر حسینؑ کے لیے یہ ممکن تھا کہ وہ ایسے شخص کو اپنا سفیر بنا سکتے تو ان کے لیے یہ بہت آسان تھا کہ وہ زبید کی بیعت بھی کر لیتے۔ اگر ایک یہ گوارا ہوتا تو وہ زبید کے ہاتھ سے جام شراب قبول بھی کر لیتے۔ جب وہ مکہ میں آیا تھا اور اس کی حکومت اور بیعت کی ناجوازی اس کی شراب خواری وغیرہ نہ چاہتے۔ لیکن ابھی تو ”مسلم“ کا جواب ہائی ہے۔ دشمن کا دربار ہے۔ اکیلے ہیں۔ کوئی ان کا گواہ نہیں ہے۔ لیکن ان کا ضمیر اس بڑے گواہ کو موجود دیکھتا ہے جو کسی جگہ غائب نہیں ہے۔ اور فرماتے ہیں کہ: ”اللہ خوب جانتا ہے کہ تو جھوٹا ہے۔“ لہجہ کی قوت اور مصوبانہ سادگی ان کی بے گناہی کی بہترین دلیل ہے۔ کیا اس کے بعد ابن زیاد نے کسی ثبوت کو نکارا۔ اس کے لیے بہت آسان تھا اگر یہ واقعہ ہوتا۔ ایک حکم اور مدینہ سے گواہوں کا اور اقلہ آجاتا۔ اور ابن زیاد ہی کے دربار میں تو یہ گفتگو ہو رہی تھی۔ سب اسی کے خوشامدی بیٹھے تھے۔ اس وقت تو یہ بھی ممکن تھا کہ کوئی شخص جموٹوں محض خوشامدی میں گواہی دیتا کہ ہاں ہم نے ”مسلم“ کو شراب پیتے دیکھا ہے۔ لیکن سہلی اور بے گناہی نے لوگوں کی زبان سی دی تھی۔ لیکن اسے اس کی بھی کیا فکر۔ جواب کی مغالی اسے پھر نظر بازی کھاتی ہے۔ اور اس میں پھر اسے اپنا اختیار دکھائی دیتا ہے اور زبان قتل کا حکم جاری کرتی ہے۔ اور پھر اسے ”مسلم“ کا یہ چیتا ہوا جواب سر شکستہ سانپ کی طرح بل کھاتا ہے کہ: ”بے شک یہ لیاقت بھی میں ہے کہ اسلام میں بدعت و بدعتی خلق و خباثت کا موجد ہو۔ اب وہ برا بھلا کہنا شروع کرتا ہے۔ اس لیے کہ ”مسلم“ اپنے موقع کے غدار نہ تھے اور نہ ان کے ہاتھ میں تلوار تھی۔ اس کے بعد ہی وہ قتل جگہ کی طرف لے جانے جاتے ہیں۔ قاتل کا ہاتھ کانپتا ہے اور ضرب کار کر

نہیں ہوتی۔ لیکن آمادہ شہادت کا نہ دل کانپتا ہے اور نہ زبان میں لکنت ہوتی ہے۔ جب وہ فرماتا ہے کہ: ”یہ غراش کافی نہیں ہے!“۔ کبھی کسی نے موت سے اس طرح مضحکہ نہیں کیا، اور نہ کبھی کسی نے اس طرح اپنے اس قول کا عملی ثبوت دیا کہ ”موت سے مجھے کوئی خوف نہیں ہے“۔ حسینؑ کا سفیر دنیوی زحمت سے سبکدوش ہو گیا اور اس عالم راحت میں پہنچا، جو ایسے بڑے فرض کو اس طرح ادا کرنے کے بعد حاصل ہوتا ہے۔ کوئی کتبہ مسلم کے لوح مزار پر اس سے بہتر نہیں ہو سکتا کہ ”یہاں سفیر حسینؑ دفن ہے جس نے اپنا فرض ادا کیا“۔

لیکن دشمنوں کی خباثت اور وحشیانہ عداوت قتل کے بعد نہ قہمی اور لاش نے کوفہ کے اطراف میں اپنے خون سے جہول چٹکی ٹھیک کہا شاعر نے کہ: ع

خون خالص راستوں میں بہ رہا ہے

میں نہیں جانتا کہ کبھی کسی قوم کے لیے ایسا عبرتناک اعلان ہوا۔ مسلمؑ کی لاش وہ منلوی قہمی جو اہل کوفہ سے کہہ رہی تھی کہ تمہاری نامردی اور بے وفائی کی بیماری لاش گواہ ہے۔ یہ بیماری لاش نہیں ہے جو بازاروں میں چکی جا رہی ہے بلکہ تمہاری عزت ہے جو خاک میں مل گئی۔ لیکن مسلمؑ کی لاش اکیلی نہ تھی بلکہ اس شریعت کی لاش بھی تھی جسے اپنی زبان کا پاس تھا۔ یہ نفس کوفہ کی لاش تھی۔ یعنی اہل کوفہ اپنے فلسفی سردار کی توہین دیکھ رہے تھے اور چپ تھے۔ یحییٰ مثال دی ہے شاعر نے جس کا طعنے موقع کی مصوری کرتا ہے کہ: ”اگر تم نے انتقام نہ لیا تو تمہاری مثال اس فاحشہ کی سی ہے جو تھوڑی غری پر راضی ہو جاتی ہو“۔ یہ صرف شاعری نہ تھی۔ محض جوش انتقام نہ تھا، واقعہ خوانی بھی تھی۔ اپنے سردار کی توہین اور اپنے خالصہ کو ذلیل کر کے اہل کوفہ نے کیا پایا۔ چند لفظ اور چند دھدے جس کے بعد وہ اور برائیوں کے لیے کام میں لگے۔ میرے الفاظ محمد بن کثیر اور ان کے لڑکے کے لیے دی ہیں جو میں نے ہانی کے لیے استعمال کیے تھے۔ اگر ان کے واقعات یحییٰ ہیں۔ بلکہ اس قدر زیادہ کہ ان کے کسی لفظ یا انداز سے خیال کی کوئی قابل حکایت رجعت نہ ظاہر ہوئی اور انہوں نے اکثر دشمنوں کو قتل بھی کیا۔ ایک دوسرا برا قصہ جو مسلمؑ کے اغراض کو پہنچاؤ شریک بن احوار کی ناوقت موت تھی۔ سردار بصرہ جو راستہ میں وہ حرکتیں اختیار کرتا ہے جس سے ابن زیاد کے کوفہ پہنچنے میں دیر ہو۔ اور حضرت کوفہ پہنچ جائیں۔ اس کے بے حد مفید ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ لیکن بے چارے شریک کو کیا خبر تھی کہ حضرت ابی کوفہ سے بہت دور ہیں۔ پھر کوفہ پہنچ کر شریک کا جگر رس دماغ اس موقع کو ڈھونڈ لیتا ہے جو یقینی کامیابی کا ذریعہ ہو سکے۔ شریک کو یقینیت ایک حای دجہ مسلمؑ ہونے کے ان کے فوائد کی صورت تلاش کرنی تھی۔ مصلحت کی حیثیات سے بحث نہ ہونی چاہیے تھی۔ افسوس کہ مواقع نے اس مفید تجویز کو بھی عملی صورت اختیار کرنے نہ دی اور یہ خوش دماغ مدبر، آزادانہ جواز پر حمایت سوچنے والا، مداح علی، اپنی مملکت میں دنیا سے گزر گیا۔ جو اپنے اشعلہ عام نہیں کرتا تھا۔ زمانہ کی دجہ سے۔ لیکن ایسے زمانہ میں مدح علی کرتا تھا۔ ایسے لوگ جو خاموشی سے دین کی حمایت میں سرگرم رہتے ہیں، عام اس سے کہ ان کی کوششیں شہرت پائیں یا نہ پائیں، حیثیت دین و ملت کے ستون ہیں۔ زوال سے محفوظ ہے۔ وہ دین و ملت جس میں ایسے کام کرنے والے پائے جائیں۔

مؤمنین نے ایک دوسری فرد گزاشت یہ کی ہے کہ ان غیر اہل بیت اصحاب کے نام نہیں دیے ہیں جو مدینہ سے ساتھ

چلے یا جو مکہ سے ساتھ ہوئے۔ اس سے یہ گھنا ہوگا کہ جن لوگوں کے نام راستوں سے شریک ہونے۔ کوفہ سے آنے یا عمر بن سعد کے لشکر سے مل جانے کے متعلق ملتے ہیں۔ ان کے علاوہ سب مدینہ سے آنے یا بعض مکہ سے ساتھ ہو گئے۔ میں اب دوسرے وقا شکار قاصد کا ذکر کرتا ہوں جو بصرہ بھیجا گیا تھا جس زمانہ میں ابن زیاد وہاں کا حامل تھا۔ شلیان وجہ حسینؑ کا دوسرا شہید تھا۔ یہ سوچا جاسکتا ہے کہ شلیان پر اظہار راز اور ان لوگوں کا نام بتانے کے لیے کیا کچھ تشدد نہ ہوا ہوگا۔ اور کیا لالچ نہ دی گئی ہوگی۔ لیکن بہادر نامہ بر کے واقعات میں کہیں نہیں ہے کہ اس نے اعتبار کو فروخت کر دیا۔

تیسرا قاصد قیس بن مصہر ہے جس کی آزادانہ حمایت وجہ حسینؑ کی تعریف نہیں کی جاسکتی۔ دیکھو اس سے کہا جاتا ہے کہ تمہاری جان بخشی اس پر موقوف ہے کہ تم حسینؑ کو برا بھلا کہو۔ خاموشی سے بغیر کچھ کہے سنے وقادار قیس میثرب پر چڑھ جاتا ہے اور اسے وہ مقام توجہ مل جاتا ہے جہاں سے وہ حسینؑ کے لیے لوگوں کو دعوت دے سکے۔ اور یہاں سے وہ حسینؑ کا نسب ظاہر کر کے لوگوں کو حضرتؑ کی شرکت کے لیے پکارتا ہے۔ ابن زیاد کو کہتا ہے جس کا وہ متقی تھا اور امیر المؤمنین علیؑ بن ابی طالب کی مدح کرتا ہے۔ یہ مدح اور فحاشی مدح تھی۔ بہت گراں قیمت تھی۔ ظاہر یہ ہوتا ہے کہ ابن زیاد کے اس کہنے پر کہ تم میثرب سب علیؑ و حسینؑ کرو۔ قیس نے کوئی ایسے انداز ظاہر نہ کیے جس سے ابن زیاد کو قیس کے ارادہ کی خبر ہوتی یا شبہ ہوتا کہ وہ ایسا نہ کرے گا۔ ابن زیاد بکھا ہوگا کہ قیس کے لیے جان کی امان سب کچھ ہوگی۔ کبھی ذات تھی علیؑ اور حسینؑ کی کہ بغیر امید انعام ایک شخص اپنی حیات کو موت اور میثرب کو سولی بنا لیتا ہے۔ تمام عقلم اور مدح ایسے وقا شکار کے لیے جو ایک وجہ کی حمایت میں چند الفاظ سے کند موت خرید سکے۔

یہ بہادر اور وفا کے پھول اس طرح کھلا رہے تھے کہ کوئی ان کا ہر رد دیکھنے والا نہ ہوتا۔ لیکن وہ جو حضرتؑ کے ساتھ تھے راستوں کی ہیبت ناک شکلیں دیکھ اور سن رہے ہیں کہ دشمن کی فوجیں ہر طرف سے گھیرتی جاتی ہیں۔ سن رہے ہیں کہ قیس اور مسلم اپنا فرض ادا کر چکے اور کچھ لوگوں پر اس کا یہ اثر بھی دیکھ رہے ہیں کہ وہ ساتھ چھوڑتے جاتے ہیں۔ لیکن جس طرح اغراض دنیاوی کی امید میں ساتھ دینے والے کم ہوتے جاتے ہیں ان رکھائے جاہل باز کا ارادہ رفاقت اور زیادہ دزنی ہوتا جاتا ہے جو جوں جوں ملویت تفرقی جاتی ہے روحانیت ظاہر ہوتی جاتی ہے۔

ایسی حالت میں ہلال بن ہلال بن نافعؑ کی تقریر پر غور کرو جو اس وقت شروع ہوئی جس وقت حضرتؑ قیس کی خبر شہادت سنتے ہیں اور متاست ہیں۔ اور ہلال کی تمام تقریر کا منشاء ایک یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں: ﴿ رسول خدا اور علیؑ مرتضیٰ کے ایسے بزرگوں کے لیے مجی یہ ممکن نہ ہوا کہ وہ سب کو دوست بنا سکتے۔ بیچ مثال سے تسکین تھی۔ ﴿ دوسری بات اپنی رفاقت کا یقین دلاتا ہے۔ ﴿ تیسرے حکم الہی پر راضی رہنے کا ارادہ ظاہر کرتا ہے۔ یہ تین چھوٹی چھوٹی باتیں بہت آسان نہ تھیں۔ ہلال کی طرح موقع بگھنے والے بہت کم تھے۔ اور تھے تو ان میں اتنی جرأت نہ تھی کہ وہ حسینؑ کے ساتھ دلے ہی عہد کرتے جیسے انہوں نے کیے۔ اسے کاش ایسے بہت سے لوگ ہوتے جو اہل بیت سے نزاعی اور دفاعی عہد کر سکتے۔

یہی ہلال بن نافعؑ (بکلی) معمر کہ کربلا کے روز حسینؑ کے لشکر کے آخری سرہ قرار دیے جاتے ہیں۔

میں دیکھتا ہوں کہ بعض مؤرخین نے نافع بن ہلال (مرادی) بھی لکھا ہے اور دونوں کے واقعات عام ہیں۔ غالباً یہ دو آدمی نہ تھے، بلکہ مؤرخین نے کنیت کے پس پیش میں سہو کی ہے۔ اگر ایسا ہے تو ان کے درجہ میں اس ایک اور سخت

امتحان سے اضافہ ہوتا ہے (اگر روضۃ الشہداء کی روایت چمکے) کہ یہ نودائید تھے۔ اور ان کا جوش اور اخلاص بلکہ ان کا تصفیۃ اور اعلان بھی ان کے رجز سے معلوم ہوتا ہے کہ ”تیں علی کے دین پر ہوں جن کا دین بنی اللہ کا دین ہے۔“ انھوں نے تیر اندازی میں بھی کمال حاصل کیا تھا۔ ایک حالت خوف میں بسر کرتے ہوئے شخص کے لیے جسے کھانا پانی بھی کتنی پہر سے نہ ملا ہو ستر آدمیوں کا قتل اور ہتھیروں کا بھرج کرنا چھوٹی بات نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کس جرأت قوت اور ناقابل مقابلہ جوش کے آدمی تھے۔ ان کے لیے سب سے اند دھناک بات یہ تھی کہ موت کے قبل ان کا بازو ٹوٹا، اور ٹوٹا تو دشمنوں کی کثرت ان پر قبضہ کرتی۔ لیکن یہ گرفتار پہلور اپنی جسمانی بیوری میں بھی اپنی سہ کے سامنے فکر کرتا ہے کہ میں نے تمہارے استے آدمیوں کو قتل کیا ہے اور افسوس کہ میرے ہاتھ سالم نہیں ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس کے معنی دشمن کو اور بھڑکانا تھا۔ جس کا نتیجہ قتل میں عجلت تھی۔ بقول ایک مثل کے کہ کچڑ میں پھنسے ہوئے ہاتھی کو مینڈک بھی لات مارتا ہے۔ پہلور ہلال حالت گرفتاری میں شہید کیا گیا۔ اس پر ہلک کر تا ہوا کہ اس کی موت بدترین خلافت کے ہاتھ سے ہوئی۔

دورانی سفر تھا کہ اس صاحب نفس شیردل سے ملاقات ہوئی جس کا نام زبیر بن قین الہی تھا۔ ابن خلدون انھیں خواہ عثمان کہتا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ یہی اثرات تھے جن سے یہ اہتمام کرتے رہے کہ نواسہ رسول کے خیام سے دور دور مقام کرتے رہے۔ اگرچہ یہ ہم سفر تھے۔ یا یہ تھا کہ وہ حسین کے نازک موقع کو بھر رہے تھے اور اس وقت تک ان کا ارادہ اس قدر پختہ نہ ہوا تھا کہ وہ حسین کی رفاقت سے تمام آفات میں بسر کرنے کا تصفیۃ کرتے یا دونوں خیالات علیحدگی کے مرک تھے۔ مجھے اس پر بھی عجب نہیں ہے کہ حضرت کے طلب پر بہ ”اکراہ“ گئے ہوں۔ میں خوش ہوتا اگر ابن خلدون اس کا کچھ خمیر بھی پیش کر سکتا یا روضۃ العفا کے موافق دلم کو غیرت دلانے کی ضرورت ہوئی ”کچھ باتیں“ ہوتی ہیں اور اب جو زبیر واپس ہوتے ہیں تو ”رنگ برافروختہ“ ہے۔ اور کہہ رہے ہیں کہ: ”جس کو میرے ساتھ چلنا ہو پٹے میں حسین کے ساتھ جاتا ہوں۔ یہ میرا آخری عہد ہے۔ اور یہ بھی کرنا تھا کہ اپنی بی بی کو طلاق دیتے۔ طلاق یعنی وہ ضرب جو ایک زمانہ کے شریک رنج و راحت کے تمام سلسلہ احساسات کو کاٹ دیتی ہے۔ نہ اس لیے کہ بی بی سے خلافت مزاج امورات سرزد ہوئے تھے اور اس وجہ سے قوت مبر نے مزید اشتراک سے انکار کیا تھا بلکہ اس لیے کہ وہ اپنے نفس کو دفعۃ اپنے اتفاقات میں دیکھ رہے تھے۔ جس نے تمام علاقہ دنیوی سے فوری علیحدگی پر غور کیا تھا۔ تعجب خیز قوت اور حیرت انگیز تصفیۃ۔ سخت اور ناگہانی چوٹ تھی مگر قدر کے قابل وہ دل تھا جو چوٹ کھانے یا نہ کھانے میں مختار تھا۔ لیکن چوٹ کے سامنے سرٹھادیہ بغیر اس کے کہ دل تھرا تا۔ زوجہ زبیر ہر طرح تعزیت کی مستحق ہے کہ اس نے خاموشی سے اس دل شکن تصفیۃ کو منظور کیا ہوا اس کے بعد اہل بیت رسالت کی رفاقت منظور کی جو اسلام کے سخت دقتوں میں ایسی عورتوں کو بھولنا نا انصافی ہے۔ زبیر نے طلاق کی وجہ بھی بتادی تھی کہ ”میں نہیں چاہتا کہ تم قید و گرفتار کی جاؤ۔“ اس سے ظاہر ہے کہ زبیر کا تصفیۃ ایسا نہ تھا جو فوری جوش میں کر بیٹھے ہوں اور مزید غور یا شگ کچھ کر پھر طبیعت اپنے پہلے رنگ پر آنے لگی ہو۔ نہیں بلکہ انھوں نے رفاقت حسین تمام شگ کو بھج کر اختیار کی تھی۔ انھیں جنگی مواقع کے متعلق بھی جو بصیرت تھی وہ اس سے ظاہر ہوگی کہ ہر سے گرم گفتگو کے وقت زبیر نے صلاح دی کہ شط فرات قریہ کے پاس جس کا نام عقر ہے تعزیت لے چلے چونکہ ادھر سے صرف ایک راہ ہے ہم دشمن کی فوجوں کی آمد سے اچھی طرح اپنی حفاظت کریں گے۔

یہی تھے کہ جس وقت حبیب کی شہادت کے بعد حضرت بہ نفس نفیس میدان میں جانے کے لیے تیار تھے یہ حضرت کو روک رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ: ”ہم آپ پر بیمنہ سپر ہو کر فنا ہونے کو موجود ہیں۔ ہمارے ہوتے ہوئے آپ میدان جنگ میں نہ جائیے۔“ فوج کا ریلہ ہے یہ اور حمل کر لور ہے ہیں۔ ایک نرغہ میں گمراہ تو دوسرے کی نگرانی میں چھاؤں کی تلاش لاتی ہے۔ اور دوسرا فوج کی تاریکی میں چھپا تو دوسرے کی شیر روشنی دکھائی ہے۔ نماز کے بعد انہوں نے شہادت نہ کہ جنگ کا تعین کر لیا۔ اور اب یہ فوج کے ریلہ میں بغیر خیال واپسی گئے۔ کچے کا خیال کرتے۔ دشمن بہت تھے۔ ہر ایک کو جو سامنے آنے سے کانپا میں حملہ کو موقع ملنے لگا۔ مل کر پہلار شیر کو زخمی اور شہید کیا۔

مسلم بن عوجہ وہ بزرگ و حضرت مسلم بن عقیل کے اعتبار کے قابل ٹھہرے۔ اور ان کی نظم امور میں شریک تھے۔ اسلحہ اور لوگ جمع کرتے تھے۔ جنہوں نے لشکر اسلام کے ساتھ اکثر کھارے جنگ کی۔ جنگی انتظام کے ماہر تھے۔ قرآن مجید لکھنے کی مقدس خدمت بھی بجالاتے تھے۔ یہی تھے جن سے مقتل جاسوس سے ملاقات ہوئی اور انہوں نے احتیلا کا کوئی پہلو اٹھانہ رکھا اسے فوراً اپنے راز نہ بتا دیے۔ ہانی کی گرفتاری اور مسلم کے غروج کے وقت یہ قبیلہ مذبح اور بنی اسد پر اصرار مقرر کیے گئے تھے۔ مجھے یقین ہے کہ آخر وقت و حضرت مسلم کے پاس تیس آدمی بھیج گئے تھے ان میں مسلم بن عوجہ بھی ایک ہوں گے۔ اور اگر ایسا ہوا کہ اس کے بعد یہ حضرت مسلم کی وجہ کو لوگوں کے چلے جانے سے منہ بچ کر اسے بے سود بھیج دیں کہ اس وقت کی مہلک شرکت پر اڑے رہیں۔ تو اپنے مستقبل کے لحاظ سے یہ کسی ملامت کے مستوجب نہیں ہو سکتے۔ ہر شخص اس ارادہ کا نہیں بنایا گیا ہے کہ وہ اپنے لفظ سے پیچھے نہ ہٹے۔ اس کے علاوہ معلوم یہ ہوتا ہے کہ جس وقت یہ واپس گئے وہ یہ تعین کر رہے تھے کہ اگرچہ ہم اس وقت جانبازی سے ممتاز نہ ہوں گے لیکن چونکہ حضرت امام حسینؑ علیہ السلام کے لیے ایسے ہی مواقع کا قریب ہے ہم اپنے حوصلہ سرفروشی کو اس کی رفاقت میں پورا کر سکیں گے۔ اسے انہوں نے پورا کیا۔

یہ مسلم بن عوجہ تھے جنہوں نے شب نہم کے یادگار موقع پر حضرت کا ظہر سن کر جو کچھ کہا اس نے دیگر اصحاب کے لذت اغلام میں جھریہ کہ ان کے اس استغناء کی شرح نہیں ہو سکتی کہ: ”کیا آپ کو تنہا چھوڑ کر ہم چلے جائیں؟“ مخالفت اور دشمنوں سے جنگ اس سے بہتر وقت سے نہیں کی جاسکتی کہ: اگر میرے پاس کوئی آگے حرب نہ ہوتا تو میں آپ کی حمایت میں پتھروں سے مارتا۔ یہاں تک کہ میں اپنے آپ کو آپ پر فدا کر دیتا۔ حمایت کے لیے یہ خیال عموماً تھا کہ لوگ دشمنوں کی فیت رسول میں آپ کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ یہ فقرہ تاریخی نقل اور عکس رکھتا ہے۔ جس کی شرح کی اب ضرورت نہیں ہے۔ اور پھر اس کے بعد ان کے شہیدانہ جوش میں طغیانہ کمن شامل ہو جاتا ہے کہ: ”یہاں سے ایسی جگہ جانا ہے جہاں کی کراہتوں کی نہایت نہیں ہے۔“ ان کی شہادت اس سخت وقت واقع ہوئی جس وقت دشمن نے فردا فردا لانے سے عہد شکنی کی اور عمر بن حجاج الزبیری کے دستہ نے مجموعی حملہ کیا۔ چونکہ دشمن واپس گیا اس لیے یہ تعین آسان ہے کہ جو چند آدمی اس حملہ کو روک رہے تھے ان میں کس قدر جوش، ہمت اور بے جھری سے مقابلہ کرنا پڑا ہوگا۔ انہیں یہ افتخار حاصل ہوا کہ حضرت سہیل تشریف لائے اور شہادت کے احتقار کو اپنے الفاظ سے شیریں اور خوشگوار بناتے۔ اور جنتی ہونے کی بشارت دیتے اور یہ بڑا مرثیہ تھا کہ مسلم بن عوجہ یہ سن کر خوشی سے اپنے دواغی وقت

استحسان سے اضافہ ہوتا ہے (اگر روضۃ الشہداء کی روایت میچے) کہ یہ نودائلا تھے۔ اور ان کا جوش اور اخلاص بلکہ ان کا تصفیہ اور اعلان بھی ان کے رجز سے معلوم ہوتا ہے کہ ”میں علیؑ کے دین پر ہوں جن کا دین بنی اللہ کا دین ہے۔“ انھوں نے تیر اندازی میں بھی کمال حاصل کیا تھا۔ ایک حالت خوف میں بسر کرتے ہوئے شخص کے لیے جسے کھانا پانی بھی کتنی پہر سے نہ ملا ہو ستر آدمیوں کا قتل اور بہتیروں کا مجروح کرنا چھوٹی بات نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کس جرأت قوت اور ناقابل مقابلہ جوش کے آدمی تھے۔ ان کے لیے سب سے اندوہناک بات یہ تھی کہ موت کے قبل ان کا بازو ٹوٹا اور ٹوٹا تو دشمنوں کی کثرت ان پر قبضہ کرتی۔ لیکن یہ گرفتار پہلور اپنی جسمانی میٹوری میں بھی اپنی سحر کے سامنے فکر کرتا ہے کہ میں نے تمہارے استے آدمیوں کو قتل کیا ہے اور افسوس کہ میرے ہاتھ سالم نہیں ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس کے معنی دشمن کو اور بڑھانا تھا۔ جس کا نتیجہ قتل میں عجلت تھی۔ قبول ایک مثل کے کہ کچھ میں چھپنے ہوئے ہاتھی کو میٹھ کر بھی لات مارتا ہے۔ پہلور ہلال حالت گرفتاری میں شہید کیا گیا۔ اس پر شکر کرتا ہوا کہ اس کی موت بدترین ظالم کے ہاتھ سے ہوئی۔

دور ان سفر تھا کہ اس صاحب نفس شیر دل سے ملاقات ہوئی جس کا نام زہیر بن قین الہی تھا۔ ابن خلدون انھیں ہوا خواہ عثمان کہتا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ یہی اثرات تھے جن سے یہ اہتمام کرتے رہے کہ نواسہ رسولؐ کے خیام سے دور دور مقام کرتے رہیں۔ اگرچہ یہ ہم سفر تھے۔ یا یہ تھا کہ وہ حسینؑ کے نازک موقع کو بچ رہے تھے اور اس وقت تک ان کا ارادہ اس قدر پختہ نہ ہوا تھا کہ وہ حسینؑ کی رفاقت سے تمام آفات میں بسر کرنے کا تصفیہ کرتے یا دونوں خیالات علیحدگی کے محرک تھے۔ مجھے اس پر بھی عجب نہیں ہے کہ حضرتؑ کے طلب پر بہ ”اکراہ“ گئے ہوں۔ میں خوش ہوتا اگر ابن خلدون اس کا کچھ غمیمہ بھی پیش کر سکتا یا روضۃ الصفا کے موافق دلی کو غیرت دلانے کی ضرورت ہوئی ”کچھ باتیں“ ہوئی ہیں اور اب جو زہیر واپس ہوتے ہیں تو ”رنگ برافروختہ“ ہے۔ اور کہہ رہے ہیں کہ: ”جس کو میرے ساتھ چلنا ہو چلے۔ میں حسینؑ کے ساتھ جاتا ہوں۔ یہ میرا آخری عہد ہے۔ اور یہ بھی کرنا تھا کہ اپنی بی بی کو طلاق دیتے۔ طلاق یعنی وہ ضرب جو ایک زمانہ کے شریک رنج و راحت کے تمام سلسلہ احساسات کو کٹ دیتی ہے۔ نہ اس لیے کہ بی بی سے خلاف مزاج امور ات سرزد ہوتے تھے اور اس وجہ سے قوت صبر نے مزید اشتراک سے انکار کیا تھا۔ بلکہ اس لیے کہ وہ اپنے نفس کو دفعۃً ایسے اتفاقات میں دیکھ رہے تھے۔ جس نے تمام طلاق دنیوی سے فوری علیحدگی پر مجبور کیا تھا۔ تعجب خیز قوت اور حیرت انگیز تصفیہ۔ سخت اور ناگہانی چوٹ تھی مگر قدر کے قابل وہ دل تھا جو چوٹ کھانے یا نہ کھانے میں مختار تھا۔ لیکن چوٹ کے سامنے سر رٹھا دیا۔ بغیر اس کے کہ دل تھرتاتا۔ زوج زہیر ہر طرح تعزیت کی مستحق ہے کہ اس نے خاموشی سے اس دل شکن تصفیہ کو منظور کیا ہوا اس کے بعد اہل بیت رسالت کی رفاقت منظور کی ہو۔ اسلام کے سخت وقتوں میں ایسی عورتوں کو بھولنا نا انصافی ہے۔ زہیر نے طلاق کی وجہ بھی بتادی تھی کہ ”میں نہیں چاہتا کہ تم قید و گرفتار کی جاؤ۔“ اس سے ظاہر ہے کہ زہیر کا تصفیہ ایسا نہ تھا جو فوری جوش میں کر بیٹھے ہوں اور مزید غور یا شائے کچھ کر پھر طبیعت اپنے پہلے رنگ پر آنے لگی ہو۔ نہیں بلکہ انھوں نے رفاقت حسینؑ تمام شایع کو بچ کر اختیار کی تھی۔ انھیں جنگی مواقع کے متعلق بھی جو بصیرت تھی وہ اس سے ظاہر ہوگی کہ حرے گرم گفتگو کے وقت زہیر نے صلاح دی کہ شط فرات کے قریب کے پاس جس کا نام عتقر ہے تشریف لے چلے چونکہ ادھر سے صرف ایک راہ ہے ہم دشمن کی فوجوں کی آمد سے اچھی طرح اپنی حفاظت کریں گے۔

اگر ایسا ہوتا تو ہم پھر کربلا کی قربانی اور لی ایڈس کے کارناموں کو دہراتا ہوا دیکھتے۔ یا مسادروں اور بلوں کی حفاظت میں اکثر فوجوں کو موقع آجاتے ہیں۔ لیکن فوجوں کا فوجوں کو روکنا دوسری چیز ہوتی۔ ان کا یہ دوسرا تصفیہ بھی ویسا ہی قابلِ وقت ہے کہ یہ حرم کے لشکر سے جنگ کرنے کی اجازت طلب کرتے ہیں۔ اس بنیاد پر کہ تھوڑی فوج سے بہ نسبت زیادہ تعداد کے جنگ کرنا آسان ہے اور ایسی ہی پر جگری تھی ان کی کہ خیم حسینؑ پر شمر کے حملہ کے وقت چند آدمیوں سے اسے روک کر اپنی تلوار کا وزن منوالہ۔ یہ زہیری تھے کہ جس وقت حضرتؑ نے اپنی بیعت سے لوگوں کو آزاد فرمایا تو انھوں نے کہا کہ میری خواہش ہے کہ میں ہزار بار مارا جاؤں اور زندہ کیا جاؤں لیکن آپ اور آپ کے اہل بیت قتل و قمارت سے بچ جائیں۔ یہ لوگ تھے جو دین کے بچے سرفروش اور سپر کہے جاتے جو اپنی حیات کی غرض مجسمہ دین پر اس کی قربانی کھتے تھے کبھی کوئی ایثار اس سے بلند تر درجہ کا نہیں ہو سکتا۔

ان باتوں کے علاوہ جو کچھ میں کہہ چکا اب میں ان کی دماغی بزرگی کی طرف توجہ دلاتا ہوں۔ اور یہ وہ موقع ہے جب وہ صفوں کی درستی کے بعد ابنِ سعد کے لشکر کے سامنے تقریر کرتے ہیں۔ ان کی چھوٹی سی تقریر و سیح اصول کا آئینہ ہے۔ اور تمام تقریر کا لہجہ اس طرح کا ہے جیسے کوئی اپنے آخری وقت نہایت ضروری باتوں کو انتہائی صفائی اور بے غرضی سے ادا کرتا ہے۔ موقع نے زہیر کے اس فقرہ میں درد بھر دیا ہے کہ مسلمانوں پر مسلمانوں کا یہ حق ہے کہ ایک دوسرے کو نصیحت کریں۔ گویا میرے کان زہیر کا لہجہ سن رہے ہیں۔ اور میں مقرر کی شرفانہ بلند خیال اور نیک نفسی کی مدح کر رہا ہوں۔ گویا میں دیکھ رہا ہوں کہ ایک شخص جو اس وقت کی حالت کو کچھ رہا ہے۔ اصلاح کے اعلیٰ احساسات سے دین اور انسانیت کے فرض کا اعلان کر رہا ہے۔ وہ دشمن کی کرخت اور سڑی ہوئی دشمنی کو بھول گیا ہے۔ وہ اس کا خیال نہیں کرتا کہ موقع بین دشمن اس وقت اپنے موقع سے فائدہ اٹھانے کو تمام ان چیزوں سے جو دنیا میں اچھی کبھی جاتیں ٹٹے موڑ لے گا۔ وہ اپنے الفاظ کی بلندی مفہوم پر کھڑا ہے جس سے بڑھ کر گوشت اور خون سے بنے ہوئے انسان کو کھڑے ہونے کے لیے بہتر جگہ نہیں ملے۔ آگے بڑھتے ہیں کہ: ”اس وقت تک ہم اور تم بھائی ہیں اور ایک ہی دین پر ہیں جب تک ہم میں اور تم میں جنگ نہ ہو۔“ ذرا سا غور اور اس وقت کا نقشہ کھینچ جائے گا کہ جس وقت دو فوجیں ایک دوسرے سے تلوار سے فیصلہ برآمد ہوئیں۔ ایک شخص سامنے آتا ہے اور جوش کی غفلت کو محبت کے الفاظ سے دور کرتا ہے۔ کبھی صلح شکن حالت کو شخ کی طرف لانے کے لیے اس سے بہتر الفاظ استعمال نہیں ہوتے۔

اور آخر میں ان کے فقرات میں سب سے بلند فقرہ اور الفاظ میں سب سے بلند لفظ استعمال ہوا کہ ”ہیں جب کہ ہمارے اور تمہارے لڑائی ہو جائے گی تو صمت اٹھ جائے گی۔“ میرا ذاتی یقین ہے کہ ہر قوم و ملت کے مرثیہ گو اس سے بڑھ کر قوم کی آئندہ پاشانی کا مرثیہ نہیں کہہ سکتے اور نہ فصحاء اور بلغاتے دہر صمت کی جگہ کوئی دوسرا ایسا خوبصورت اور معنی خیز لفظ استعمال کر سکتے ہیں۔ اسے کاش زہیر کی تقریر کے وہ تمام فقرات جو میں نے اب تک نوٹ کیے کتبہ کی شکل میں درست کر کے اسلام کے ہر فرقہ کے پاس ہوتے۔ قیامت تک ضائع نہ کیے جاتے اور وہ ان اندوہناک مواقع پر خصوصیت سے دیکھے جاتے جو مسلمانوں کی بد نصیبی سے خواہی خواہی پیدا ہو جاتے ہیں شعراء کو اس کی لطافت استعارہ اور مدبرین کو اس کی خوبصورت احتیاط اور الفاظ کے استعمال سے سبق لینا چاہیے۔

یہ باتیں کہنے کے بعد اب زہیر اس خاص امر کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو صورت حال کچی جانے اور کہتے ہیں کہ ہم اور تم اہل رسول سے آسمانے گئے ہیں۔ ان کی مدد کرو اور اس ابن زلیخا کو ذلیل کرو جس سے سوائے بدی کے اور کسی چیز کی امید نہیں کی جاسکتی۔ اور پھر اس کے ہلپ کی مثالیں دیتے ہیں کہ اس نے کیونکر اچھوں کو شہید کر دیا۔

ان کی یہ تمام تقریر جو مناسب اور ترتیب خیال کا بہترین نمونہ ہے۔ نہیں معلوم پوری ختم بھی ہوئی تھی یا نہیں کہ کو فیوں نے وہی کچھ کہا جس کے لیے وہ آئے تھے اور اب بھی زہیر نے اسی مناسبت اور نفس پر قابو کے ساتھ جواب دیا کہ: ”ابن سمنیہ کی نسبت ابن فاطمہ امداد و محبت کا زیادہ مستحق ہے۔“ اور پھر اس کے بعد حضرت کے متعلق چلے جانے دینے کی صلاح جس قدر رخصت کی نیت سے تھی اس سے بدرجہا مفید معنی میں تھی کہ وہ حضرت کو موجودہ موقع سے نکال سکتی۔ زہیر جس اطمینان سے نہایت پختہ باتیں کہہ رہے تھے اور اہل لشکر مخاطب تھے۔ اس وقت شمر کا تیر مارنا اور بے ہودگی سے روکنے کی کوشش کرنا غالباً ان کی تقریر کا اثر نکھاتا ہے۔ گرم گھنگو ہوتی ہے اور اس وقت بھی زہیر سے ان کا تدبر نہیں جاتا جب وہ کہتے ہیں کہ: میں تجھ سے مخاطب نہیں ہوں، بلکہ اہل لشکر سے۔ شمر موت کی دھمکی دیتا ہے اور زہیر اس وقت وہ فقرہ کہتے ہیں کہ جو انبیاء اور صلحاء بلکہ خود مسلمانوں کی تاریخِ اعلا میں بھی بہت سے لوگوں نے نہیں کہا کہ: ”خدا کی قسم تیرے ساتھ کی حیات ابدی سے حسینؑ کے ساتھ مرجانا بہتر ہے“ اور پھر اس کے بعد نصیحت کرتے ہیں۔ یہ تعجب خیز شخص جس کے درجہ شجاعت تدبر، اعلا میں اور خطرہ سے لاپرواہی کے ایسے خود کر بلا میں بہت سے نہ تھے۔ ایک دوسری مثال دیتا ہے جب حبیب قتل ہوتے ہیں۔ حضرت کو غالباً حبیب کی شہادت سے متاثر اور غور میں دیکھ کر حضرت کو مخاطب کرتا ہے۔ مخاطب بھی کرتا ہے اس فقرہ سے کہ: یا ابن رسول اللہ! یہ کیسا انکسار ہے جو میں آپ کے چہرہ پر دیکھ رہا ہوں؟“ خیال کرو۔ انکسار کا لفظ حسینؑ کے لیے استعمال کیا تھا۔ یعنی محرم غیرت کے لیے۔ روحِ حمیت کے لیے۔ میں سوچتا ہوں کہ زہیر نے عمداً تاسع کی جگہ انکسار کا لفظ استعمال کیا جو سخت تر تھا۔ اس لیے کہ زہیر کے نزدیک لفظی کشتگی بہتر تھی بمقابلہ اس کے کہ حسینؑ کا تاسع کچھ دیر قائم رہے۔ نتیجہ یہ تھا کہ حسینؑ اس حالت سے الگ ہوتے اور پہلی شانِ طبیعت پر واپس آتے۔ دوسرے لفظوں میں ایک خیال سے علیحدہ ہو کر اس سوال کا جواب دیتے کہ: ”کیا ہم حق پر نہیں ہیں؟“ ذرا اس کی لطافت پر غور کرو کہ ایک شخص اس پر توجہ دلاتا ہے کہ غم بے حقیقت ہے۔ اگر وہ حق روی سے پیدا ہو۔ حسینؑ کو اس سے بہتر لفظوں میں تسکین نہیں دی جاسکتی تھی۔ خصوصاً جب کہ اس کے فقرہ کے بعد فوراً ہی میدانِ جنگ میں جانے کی اجازت طلب کر کے اپنے خیال کا عملی ترجمہ بھی کرتے ہیں۔ شیر گونجتا ہے۔ رجز پڑھتا ہے۔ کہتا ہے کہ میں حسینؑ کی زورِ خمیر حفاظت کروں گا۔ وہ حسینؑ جو طاہر المجدین ہیں۔ جو امام صادقؑ ہیں۔ ان کی تلوار دشمنوں کے خون سے کھلتی ہے۔ لیکن اس مقدس شغل کے انہماک میں دوسرا فرض یاد آتا ہے۔ اپنے امام کے پاس دوڑے آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یا مولا مجھے خوف ہے کہ آپ کے ساتھ نماز نہ پڑھ سکوں گا۔ یعنی میں اس طرح شہید ہوں گا کہ آخری وقت آپ کے ساتھ نماز نہ پڑھی ہوگی۔ اللہ بے موت سے لاپرواہی اور نماز کا خیال۔ ظاہر ہے کہ اس میں یہ احتجاج اور آرزو چھپی ہوئی تھی کہ حیاتِ آخری وقت نماز کو اس طرح صرف کریں کہ اپنے پیچھے نماز پڑھ لی ہو۔ یہ لوگ تھے جنہیں ایک فرض دوسرے فرض سے غافل نہیں کرتا تھا۔ زہیر میں اگر اور کوئی غفلت نہ ہوتی تو یہ شخص اس وجہ سے زندہ جاوید رہ سکتے تھے کہ انہوں نے ایسے وقت نماز پڑھی۔

یہی تھے کہ جس وقت حبیب کی شہادت کے بعد حضرت بہ نفس نفیس میدان میں جانے کے لیے تیار تھے یہ حضرت کو روک رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ: ”ہم آپ پر سینہ سپر ہو کر فنا ہونے کو موجود ہیں۔ ہمارے ہوتے ہوئے آپ میدان جنگ میں نہ جائیے۔“ فوجوں کا رابطہ ہے یہ اور مرحلہ کر لیا رہے ہیں۔ ایک نغمہ میں گہرا تو دوسرے کی تلوار بیڑ چھانٹ کر نکال لاتی ہے۔ اور دوسرا فوج کی تاریکی میں چھپا تو دوسرے کی شیر روشنی دکھاتی ہے۔ نماز کے بعد انہوں نے شہادت نہ کہ جنگ کا تعین کر لیا۔ اور اب یہ فوجوں کے ریلہ میں بغیر خیال واپسی محسوس گئے۔ کچے کا خیال کرتے۔ دشمن بہت تھے۔ ہر ایک کو جو سامنے آنے سے کانپتا تھا میں حملہ کو موقع تھا کئی نے مل کر پہلور شیر کو زخمی اور شہید کیا۔

مسلم بن عوجہ وہ بزرگ جو حضرت مسلم بن عقیل کے اعتبار کے قابل ٹھہرے۔ اور ان کی نظم امورات میں شریک تھے۔ اسلحہ اور لوگ جمع کرتے تھے۔ جنہوں نے لشکر اسلام کے ساتھ اکثر کار سے جنگ کی۔ جنگی انتظام کے ماہر تھے۔ قرآن مجید لکھنے کی مقدس خدمت بھی بجالاتے تھے۔ یہی تھے جن سے مقتل جاسوس سے ملاقات ہوئی اور انہوں نے اعتیلا کا کوئی پہلو اٹھانہ رکھا اسے فوراً اپنے راز نہ بتادیے۔ ہانی کی گرفتاری اور مسلم کے فروج کے وقت یہ قبیلہ مذبح اور بنی اسد پر اصرار مقرر کیے گئے تھے۔ مجھے یقین ہے کہ آخر وقت جو حضرت مسلم کے پاس تیس آدمی بچ گئے تھے ان میں مسلم بن عوجہ بھی ایک ہوں گے۔ اور اگر ایسا ہوا کہ اس کے بعد یہ حضرت مسلم کی وجہ کو لوگوں کے چلے جانے سے ضائع دیکھ کر اسے بے سود سمجھیں ہوں کہ اس وقت کی ٹھیک شرکت پر اڑے رہیں۔ تو اپنے مستقبل کے لحاظ سے یہ کسی ملامت کے مستوجب نہیں ہو سکتے۔ ہر شخص اس ارادہ کا نہیں بنایا گیا ہے کہ وہ اپنے لفظ سے بچے نہ بیٹے۔ اس کے علاوہ معلوم یہ ہوتا ہے کہ جس وقت یہ واپس گئے وہ یہ تعین کر رہے تھے کہ اگرچہ ہم اس وقت جانبازی سے ممتاز نہ ہوں گے لیکن چونکہ حضرت امام حسین علیہ السلام کے لیے ایسے ہی مواقع کا قریب ہے ہم اپنے حوصلہ سرفروشی کو اس کی رفاقت میں پورا کر سکیں گے۔ اسے انہوں نے پورا کیا۔

یہ مسلم بن عوجہ تھے جنہوں نے شب نہم کے یادگار موقع پر حضرت کا ظہر سن کر جو کچھ کہا اس نے دیگر اصحاب کے لذت اخلاص میں تجدید کی۔ ان کے اس استیقام کی شرح نہیں ہو سکتی کہ: ”کیا آپ کو تنہا چھوڑ کر ہم چلے جائیں؟“ حفاظت اور دشمنوں سے جنگ اس سے بہتر وقت سے نہیں کی جاسکتی کہ: اگر میرے پاس کوئی آکر حرب نہ ہوتا تو میں آپ کی حمایت میں پتھروں سے مارتا۔ یہاں تک کہ میں اپنے آپ کو آپ پر فدا کر دیتا۔ حمایت کے لیے یہ خیال محرک تھا کہ لوگ دیکھیں کہ غیبت رسول میں آپ کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ یہ فقرہ تاریخی نقل اور محسوس رکھتا ہے۔ جس کی شرح کی اب ضرورت نہیں ہے۔ اور پھر اس کے بعد ان کے شہیدانہ جوش میں فلسفیانہ کمن شامل ہو جاتا ہے کہ: ”یہاں سے ایسی جگہ جانا ہے جہاں کی کراہتوں کی نہایت نہیں ہے۔“ ان کی شہادت اس سخت وقت واقع ہوئی جس وقت دشمن نے فرداً فرداً لڑنے سے عہد شکنی کی اور عمر بن عبدالمطلب الزبیدی کے دستہ نے مجموعی حملہ کیا۔ چونکہ دشمن واپس گیا اس لیے یہ تعین آسان ہے کہ جو چند آدمی اس حملہ کو روک رہے تھے انہیں کس قدر جوش، ہمت اور بے جگری سے مقابلہ کرنا پڑا ہوگا۔ انہیں یہ افتخار حاصل ہوا کہ حضرت سہیل شریف لڑتے اور شہادت کے احتضار کو اپنے الفاظ سے شیریں اور خوشگوار بناتے۔ اور جنتی ہونے کی بشارت دیتے اور یہ بڑا مرثیہ تھا کہ مسلم بن عوجہ یہ سن کر خوشی سے اپنے وداعی وقت

اس کی کوشش کرتے کہ آٹھ کھول کر وہ صورت پھر دیکھ لیں جس پر شہباز ہونے اور پھر نزع کی کیفیت میں اس فرض کا یاد رہنا کہ وہ اشارہ سے یا شکستہ لفظوں میں حضرت کی حفاظت کی وصیت کرتے ان کا درجہ محبت وجہ کی پاکیزگی اور عظمت کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ وہ تھے کہ دشمن بھی ان کے قتل سے متاسف تھا۔ ایسے شخص کو امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام یہ فرما کر سکتے تھے کہ ”جہانی“ فرمائیں۔

کوفہ کے لوگوں میں جو حضرت کے ساتھ شہادت سے ممتاز ہونے حبیب بڑا درجہ رکھتے تھے۔ روضہ خوانی کی کتابیں سمجھتی ہیں کہ یہ حضرت کے بچنے کے دوست تھے اور انھیں بھی یہ فرمان حاصل ہوا تھا کہ حضرت نامہ گرامی ارسال فرماتے۔ مضمون خط پر مطلع ہو کر ان کی اور ان کے بیوی کی باتیں غم انگیز ہیں اور پھر جس وقت حبیب کے حکم سے ان کا غلام گھوڑا لیے ہوئے ایک ایسی جگہ کھڑا تھا جو عام رہزور نہ تھا۔ دیر ہونا اور غلام کا کہنا کہ اگر میرا ملک نہ آیا تو میں خود تیری پشت پر سوار ہو کر نصرت حسین کو جاؤں گا۔ جوش و فدا کی نادر روایتیں ہیں۔ حبیب کا افسر میرہ قرار دیا جانا۔ ان کی شہادت پر حضرت کا خصوصیت سے متاسف ہونا اور ان کے متعلق فرمانا کہ مرد قاتل تھے جو ایک رات میں قرآن ختم کرتے تھے۔ ان کے درجہ کو ظاہر کرتا ہے اور کچھ میں آتا ہے کہ حضرت ان سے بخوبی واقف تھے۔

ذرا ان کی غیرت ملاحظہ فرمائیے کہ وقت وہ ہے کہ جب حضرت کی خواہش یہ ہے کہ اگر تھوڑی دیر کے لیے جنگ ملتوی ہو جائے تو فریضہ ظہر ادا کر لیں لیکن ابن نمیر سخت گستاخانہ بات کہتا ہے۔ حبیب سنتے ہیں اور فرماتے ہیں۔ وائے جو تجھ پر حسین کی نماز قبول نہ کی جائے گی۔ لیکن تجھ سے ابن غارہ کی نماز مقبول ہوگی۔

اس تیر فرہ نے ابن نمیر کو دونوں لشکروں میں ذلیل کیا اور اس نے جھلاہٹ میں حبیب کو تہادست بدست جنگ کے لیے بلایا۔ حبیب اس سے بہتر کوئی بات نہ چاہ سکتے تھے کہ ایسی مکار دشمن کے خون کا اپنی تلوار کو مزہ چکھاتے۔ حسین بن نمیر فریب کا سپاہی تھا۔ بہادرانہ جنگ کا آدمی نہ تھا۔ چھپ چھپا کر کسی کو تیر سے زخمی کرنا یا فوج کے انہدہ میں اکاد کا کو زخمی کرنا اور گرا دینا جانتا تھا۔ تلوار چل۔ اور حسین کے گھوڑے کا سر زخمی ہوا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ اپنے کو ایسا داغ بلند کیے ہوئے نہ تھا اور نہ اس قدر قریب تھا کہ حبیب کی تلوار اس کا سر لے سکتی۔ گھوڑے نے زخم کھا کر اسے گرایا۔ اور حبیب اسے اپنی تلوار کے سایہ میں دیکھ کر خوش ہوئے ہوں گے کہ آج سارا فریب موت کے خزانہ میں داخل ہو جائے گا۔ مگر لوگوں نے نرفہ کیا اور اسے بچا لیا۔ اب حبیب جنگ شروع کر چکے تھے۔ ان کی تلوار دشمنوں کو کم کرنے لگی۔ یہاں تک کہ پینتیس آدمی قتل کیے۔ ابی بدیل بن حریم کو قتل کیا تھا کہ کسی نے پشت پر نیزہ مارا۔ اس کی طرف پھرے تھے کہ اب ابن نمیر کو اس کا موقع ملا کہ خود بھی بہادر بن جاتا۔ اور اس کے زخم سے حبیب گرے۔ اور مجمع نے شہید کر ڈالا۔ میں حبیب کے اس فقرہ کی طبی شرح نہیں کر سکتا کہ اب میں آپ کے بزرگوں کے ساتھ نماز پڑھوں گا اور آپ کا سلام پہنچاؤں گا۔ کیا اطمینان تھا کیا خوشی تھی۔ کیسی مستعدی تھی۔ کیا یقین تھا۔ یہ ایسے ہی تھے جن کا حسین کو غم ہوتا۔

ابو ثمامہ صائدی۔ وہ بزرگ جو حضرت مسلم کے خدو ج کے وقت ان کے لشکر کے ایک افسر تھے اور بنی تمیم و دھان پر متعین تھے حضرت مسلم کے آخر وقت ان کے نہ ہونے کے متعلق میرے الفاظ وہی ہیں جو میں نے مسلم بن عوجہ کے تذکرہ کے ضمن میں لکھے ہیں۔ فوجی قاعدہ اور داسب کی انھوں نے منزلت قائم کی کہ قاصد کو اپنے سردار کے پاس مسلح

نہ جانے دیا۔ جس کی حقیقی غرض یہ تھی کہ مکار دشمن حضرت کے ساتھ غفلت میں کوئی فریب نہ کرے۔ خدا کے اس بندہ کا شوق عبادت دیکھو کہ ابھی ابھی جس وقت دشمن کے کئی متواتر حملے ان روح شجاعان عالم نے دفع کیے اور مجمع سے اپنی تلوار کا ادب کرایا ہے۔ دم نہیں لیا۔ خوش نہیں ہوئے۔ دیکھو یہ رہے ہیں کہ نماز کا وقت آیا یا نہیں۔ اور ایک مرتبہ اور حسین کے ساتھ نماز پڑھ لیں۔ بڑھتے ہیں۔ اور کمال بے سستگی سے کہتے ہیں کہ ”اے میرے مولا ہم لوگ ضرور قتل ہوں گے۔“ بس۔ نہ شکوہ ہے۔ نہ خوف ہے۔ کہنا یہ ہے کہ ”نماز کا وقت آگیا ہے۔“ ”اب آرزو یہ ہے کہ آخری نماز آپ کے ساتھ پڑھ لوں۔“ کبھی بے غرض اغلام نے اس سے بہتر خواہش نہ کی تھی۔ اور متانت اور ادب و انکساریہ ہے کہ ”شاید ہیں اس طرح لگانے الہی حاصل ہو کہ اس موضع عظیم میں ہم نے فرائض میں سے ایک فرض ادا کر دیا ہو۔“ فرض کو ان پر نماز تھا۔ ان کا محض یہ فقرہ ان کی کچی سوانح عمری ہے۔

میں سوچتا ہوں کہ سعد بن عبد اللہ حتی کا ذکر ابو ثمامہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہونا چاہیے۔ کیونکہ نماز کے وقت انھیں لوگوں کا خصوصیت کے ساتھ ذکر ہے۔ ان کے متعلق میرے وہی ریمارک ہیں جو میں ان کے اثنائے واقعات میں کر چکا ہوں۔ اتنا اور کہوں گا کہ ان کے طرز عمل میں ایک یہ خصوصیت تھی کہ انھوں نے اپنے سے یہ خوشی بھی دور رکھی کہ وہ جنگ کرتے اور دشمنوں کو قتل کر کے خوش ہوتے۔ انھوں نے اس تبرک اور مقدس حوصلہ سے بھی انکار کیا اور اپنے ہمتی کو حیات ہی میں نیست کج لیا۔ انھوں نے اپنے کو وہ تودہ اور سپر بنالیا جو خود تیر اور تلوار کھاتی ہے لیکن دوسرے کو پھلتی ہے۔ ان کی یہ خود انکاری حدیم المثل ہے۔ میرا قیاس ہے کہ یہ نماز بھی نہ پڑھ سکے اس لیے کہ یہ حفاظت کر رہے تھے کہ حسین نماز پڑھ لیں اور اپنا سینہ اس طرف بڑھا دیتے تھے جس طرف سے کوئی تیر حسین کی طرف آتا تھا۔ یہ اغلام ہوا۔ سینہ اس قابل تھا کہ دنیا کے طالب ہی اس پر بوسہ دے سکتے۔

کوفہ کے مددگاروں میں میں اس پر بصیرت ثابینا کو فراموش نہیں کر سکتا ہوں جس کا نام عبد اللہ بن عقیف تھا۔ ایک تجربہ کار پہلور جس کی آنکھوں کو یہ فرما مل تھا کہ ان میں سے ایک جل میں اور دوسری صفین میں ضائع ہوئی۔ اور پھر اس کے بعد عبادت اور اصطکات سے زندگی بسر کرتے۔ انھیں یہ فریبی حاصل تھا کہ یہ صحابی رسول تھے۔ ایسے صحابی نہیں جو آل رسول کی ہر طرح جھنجھکی کی کوششوں میں شریک ہوں بلکہ وہ جو اپنے بیوروں میں بھی ان کی حمایت اور علوئے شان کے لیے جان دے کر کوشش کریں۔ کوئی نہ تھا جو عبد اللہ بن عقیف سے زیادہ اپنی حیات پر متانت ہوتا کہ وہ اس وقت تک جیتے رہے کہ آل علی و رسول کوفہ میں اور ایک نمک حرام کے سامنے اس ذلت سے کھڑی ہے۔ ابن عقیف کو یقین نہ آتا ہو گا کہ کیا زمانہ ایسا بھی آسکتا ہے؟ لیکن واقعات کا انکار ممکن نہیں ہے وہ کیسے ہی سخت دوش کیوں نہ ہوں۔ بڑھا صحابی اندوہناک تیغ سے ابن زیاد کے مکروہ الفاظ سنتا ہے اور آخر میں بے چین ہو کر چیخا اٹھتا ہے کہ: ”کیا تیرے لیے قتل حسین کافی نہ تھا کہ تو میرے پر ان کی مذمت بھی کر رہا ہے۔“

بنی امیہ کے زمانہ میں آل رسول کی حمایت کرنے والوں کا گوشت اور خون جس قدر ستا تھا اس کے لحاظ سے کوئی حکم قتل نظر کے قابل بھی نہ تھا۔ لیکن چونکہ ابن عقیف صاحب قبیلہ تھے۔ ابن زیاد اپنے حکم میں کامیاب نہیں ہوا۔ لیکن اگر اخلاقی قاتل روشنی سے ڈرتا ہے تو رات کی تاریکی کو اپنے ارادوں کے لیے ایک پردہ بگھتا ہے۔ خصوصاً جب کسی کو اپنے

مفتخانہ ارادوں کے لیے خلی بن زید امی کا ایسا آدمی ملا ہے۔ ایک بڑا حنا مینا اور پانچ سو سواروں کی پورش! معلوم یہ ہوتا ہے کہ ابن عقیف کا کوئی لڑکا نہ تھا ورنہ بجائے لڑکی کے اس کا تذکرہ شجاعت ہو تا یہ چھوٹی سے لڑکی معنا اور اضیلا حنا ابن عقیف کی نور چشم تھی۔ دنیا کے نامرد اس بوڑھے کی ہمت سے سبق لیں اور شہلعلی دہر اس کی مدح میں گیت گائیں۔ جس نے باوجود فطری عیوریں کے اسے گوارا نہ کیا کہ جب تک حیات کا آخری شرارہ بچہ نہیں گیا ہے اس وقت تک ذلت سے دشمن کے قبضہ میں جائے۔ حسینؑ کے وفار پر جان دینے اور علیؑ کا ساتھ دینے والے ایسے ہی ہونے چاہئیں۔

اب کیا میں یہ بھی کہوں کہ ابن عقیف نے کس طرح جنگ کی۔ ہاں کسی بوڑھے اور نابینا نے اپنی حیات اس قدر گراں قیمت پر نہیں بیچی۔ اور ہر وہ شخص جس میں احساس شجاعت ہے ان کی اشعار کی تصدیق اور ان سے ہمدردی کرے گا۔ کہ ”آٹھمیں نہ ہوئیں“ پھر بھی ایک اندھی تلوار نے پچاس اموی سپاہیوں کو بکریوں کی طرح ذبح کر کے ڈال دیا تھا۔ اور سیکڑوں کی پورش سے اس طرح گرفتار ہونے کہ دشمنوں کو روندتے ہوئے اٹھنے کا حوصلہ پورا ہو جاتا۔ دربار اور ابن زہلا کا خبیثانہ طنز کہ خدا نے تجھے اندھا کیا۔ جواب اور اندھا کر دینے والا جواب کہ لیکن خدا نے تیرے دل کو اندھا کر دیا۔ اگرچہ آنکھیں کھلی ہیں۔ حکم قتل، اور گرفتار کی مظہن ہنس، حکم اور اظہار مسرت کہ دعا قبول ہوئی۔ دعایہ تھی کہ آنکھوں کے ضائع ہونے سے اب اگر میدان جنگ میں شہید نہیں ہو سکتے تو دنیا کے سب سے بڑے شرر کے ہاتھوں قتل ہوں۔ بنی امیہ اور ان کے ہوا خواہ بچا انھیں برباد کر کے بھی خوش نہ ہو سکے۔ یاد دوسرے لفظوں میں اپنی امارت، جماعت اور فساد سے بھی ان پر فتنہ پائی۔

میری خواہش نہیں ہے کہ ان کی شاعرانہ حیثیت پر نظر کروں۔ لیکن اس قدر کہوں گا کہ ان کے اشعار کی سلاست جوش اور فصاحت عرب کی بہترین شاعرانہ روایت کے حدود میں ہے۔ وقت یہ ہے کہ ایک شخص کے سر پر تلوار چھنی ہے۔ گردن ہائے عموس کر رہی ہے۔ لیکن زبان حسینؑ کی کرامت، قتل اور ہدایت کی نغمہ بنی کر رہی ہے۔ کبھی شاعری مصوری، موسیقیت اور مرثیت میں ایسی ہم آہنگی پیدا نہ ہوئی تھی۔ میں نہیں جانتا کہ ان کے اشعار اس طرح ختم ہوئے کہ سر گردن پر تھایا آخری شعر گردن سے اگلے خون کے نغمے نے ختم کیا۔

لاش صلیب پر چڑھائی گئی۔ اس لیے کہ یہ حکومت کے نزدیک اظہار ذلت تھا۔ ذلت کا حیرت خیز عکس۔ اے کاش ابن مریم اس لاش کو صلیب پر دیکھتے۔ ان کے سر کا بہترین فزیہ تھا کہ وہ نواسہ رسول کے فرق مظہر کے ساتھ پھرایا گیا۔ عبداللہ بن عبید کللی کوفہ کا وہ پراغلام جومح اپنے بیٹے سیوی اور غالباً بہو کے حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا۔ خاندان سمیت حاضر ہونا زیارت کی خوشی اور شوق کا مظہر ہے۔ زیارت شہادت سے بدلی۔ اور یہ پہلار دابگی کو جان شاری سے بدل دیتا ہے۔ اور تلوار لیے میدان میں کھڑا ہے۔ نہ یہ فکر ہے کہ بی بی یوہ ہوگی۔ اور نہ اس سے رکنا ہے کہ ہمارے بعد ہمارے خاندان پر کیا گزرے گی۔

موقع یہ ہے کہ سالار اور یسار بن زیاد کے دو غلام میدان میں کھڑے ہیں۔ اس طرح کہ ابن زیاد کی شان ظاہر کریں۔ یہ ہالے ہی اس لیے گئے ہیں کہ نوالوں پر قربان کیے جائیں۔ عبداللہ سامنے جاتے ہیں اور دونوں غلام اپنے کو بھول کر حبیب اور بربر کو مقابلہ کے لیے طلب کرتے ہیں۔ سختی سے عبداللہ نے ان کے اظہار شان کو شکستہ کر دیا۔ تواضع اور فروتنی

یہ ہے کہ اپنی طوئے شان ظاہر نہیں کرتے بلکہ اپنے لیے انکساری کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ تو اس قابل نہیں ہے کہ سرداران لشکر تیرے مقابلہ کے لیے آئیں۔ جنگ شروع ہوتی ہے۔ عبداللہ کو مطلق فکر نہیں ہے کہ میرے مقابلہ کے لیے دو ہیں۔ ہاتھ اٹھا تو ارچمگی۔ یار زمین برد کھائی دیا۔ سالم یا سالار مدد کے لیے دوڑا۔ اتنے میں عبداللہ کی تلوار یار کے سینہ کو چاک کر چکی تھی۔ حضرت کے لشکری آواز دیتے ہیں کہ سالم تم پر حملہ کیا چاہتا ہے۔ بچنے کی تو وہ فکر کرتا ہے جینا ہوتا۔ لا پرواہی سے عبداللہ نے تلوار کی ہڈی کی طرف بائیں ہاتھ بڑھا دیا۔ کئی انگلیاں کٹ گئیں۔ پہلے دشمن کو تمام کر چکے تھے۔ وہی خون آلود تلوار پھر چمکی اور سالم شکستہ ہو گیا۔ داد چاہیے تھی۔ دل بڑھانے کی ضرورت تھی۔ سیوی دوڑی۔ یہ نہیں کہا کہ بس کرو حق ادا کر چکے۔ نہیں۔ ”رسول اللہ کے نواسوں کے لیے لڑتے لڑتے اپنے کو تصدق کر دو۔“ اس لیے کہ سیوی بیوہ ہونے کی ذمہ داری لے چکی۔ راضی ہو گئی۔ اور غم سے صبر کر لیا۔ میں مرتے وقت فکر سے آزاد کر دیا۔ ہم خوشی سے مر سکتے ہیں۔ ام وہب دوڑی تھی۔ اور یہ بھی کہا تھا کہ: ”میرے ماں باپ تم پر خدا ہوں“ دل کی حرکت اس دوڑنے کے پہچے تھی۔ خدا ہونے کی حسرت رونے، ہنسی تھی۔ ام وہب کو کیا خبر تھی کہ اس کی حرکت اور انداز میں مدح اور مرثیہ اس طرح مل گیا ہے کہ حد بندی نہیں کی جاسکتی۔ میں نااضافی نہ کروں گا اگر یہ کہوں کہ وہب دیوانوں کی سی ہنسی، ہنس رہی تھی۔ میں اس سے بہتر کسی لفظوں میں مصوری نہیں کر سکتا۔ ”اور تصدق کر دو۔“ کہنے کے وقت اس کے احسانات کی شرح غم سے چمکن نہیں ہے۔ ام وہب بھول نہیں گئی تھی کہ میں اپنے شوہر کو مرنے کے لیے ابھار رہی ہوں۔ کوئی عورت اس نتیجے سے ناواقف نہیں ہے۔ غور کرو کہ ام وہب کا دل ”تصدق کر دو“ کہنے کے وقت کس جگہ تھا۔ عورت تھی۔ رو رہی۔ کوئی جرم نہ کرتی۔ لیکن اس وقت روتی یا روکتی تو کربلا کے شہید کی سیوی نہ کہی جاتی۔

ام وہب کی حرکات نفس کا کوئی شارح یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس کے دل سے محبت کا حس جاتا رہا تھا۔ اس کے لفظوں میں نہیں بلکہ اس کے انداز اور لفظوں کی مجنونانہ سادگی میں اس کی محبت چھپی ہے۔ جس نے غم اور زیادہ شدید کر دیا ہے۔ کوئی لفظ ایسا نہیں ہے جو اس سے قوی تر مرثیت کا دعویٰ کر سکے۔ لیکن یہ اندوہناک منظر ہمیں ختم نہیں ہو گیا تھا۔ شوہر سے یہ تو کہہ چکی تھی کہ اپنے کو تصدق کر دو۔ لیکن اس کے بعد آمادہ شہادت شوہر کی محبت نے موج مارا اور میدان شہادت کی طرف اس کے قدم بھی بڑھ گئے۔ شہیدانہ شان اس کے چہرہ پر آ گئی۔ اور کہا کہ: ”جب تک زندہ ہوں تمہارا ساتھ نہ چھوڑوں گی۔“ نیزوں کا جھگل، تلواروں کی چمک، گھوڑوں اور سپاہیوں کا دستِ جمع اس شیر دل عورت کو مرعوب نہیں کرتا۔ اور نہ ارادہ سے روکتا ہے۔ لیکن حسینؑ کی صدا۔ قانون کا ایک لفظ زمین میں گڑ دیتا ہے کہ ”اے ام وہب عورتوں پر چلا نہیں ہے۔“ حسینؑ کہتے ہیں کہ تم لوگوں نے اہل بیت پر بڑا احسان کیا۔

اگرچہ میں نے ارادہ کیا ہے کہ عورتوں کا ذکر اہل بیت کے تبرہ میں کیا جائے۔ لیکن میرے نزدیک ام وہب کی بہترین داد یہ تھی کہ ان کا غیر فانی ذکر ان کے شوہر کے ساتھ کیا جاتا۔

اگر ام وہب ہی کا نام قمر تھا تو اس اخلاص کی تصویر اور ساتھ ہی فولادی ارادہ کی عورت کو ایک اور بڑا صدمہ اٹھانا تھا۔ بیٹے کی موت کا صدمہ۔ اٹھانا تھا نہتے ہوئے، خوش ہوتے ہوئے، فرزند کو مرنے بیٹھنا تھا۔ یہ صحتیں کرنا تھا کہ دیکھو اپنی حتیٰ دامن کے فریب میں نہ آجانا۔ دشمن نے سرکٹ کر پھینکا۔ ماں کی طرف پھینکا۔ ماں دوڑی۔ بیٹے کا سر اٹھانے دوڑی۔

عرفی کا یہ شعر اس سے زیادہ مناسب موقع کے متعلق استعمال نہیں ہو سکتا کہ :

ہر کہا مژدہ اندوہ نوے بشنودم جتم از درد گراں توشہ و رقصہ رفتم
اور پھر کیسے یہ قوت پائی کہ اپنے پارہ جگر کا خون آلود سر پہو کی گود میں رکھ دیتی۔ اور پھر یہی سراپے دو ہاتھوں سے
اضطیاق اور دشمن کی طرف بھیج مارتی۔ عورت کا ہاتھ اٹھانا اور اس قوت سے کہ کسی دشمن کے سینہ پر پڑتا۔ محبت ہاتھوں میں
تھر تھراہٹ نہ پیدا کرتی۔ ایثار اور قربانی کا عزم قربانی کے بعد بھی ویسا ہی بے لفتش تھا۔ اسے کاش کل مسلمانوں کی ایسی ہی
مائیں ہوتیں۔

دہب اسی طرح مرنے کے لیے تیار ہوئے جس طرح عبداللہ کلی اور ام دہب کے بیٹے کو آمادہ ہونا چاہیے۔ سب
ماؤں نے دہب کے ایسے لڑکے پیدا نہیں کیے۔ یہ ماں کے حکم پر ویسی ہی خوشی سے مرنے جاتا ہے جیسے وہ اور کوئی
دکھپ شغل میں مصروف ہوتا۔ جی چاہتا ہے کہ بیوی سے دواغی باتیں کریں۔ محبت آنکھوں اور لبوں پر امٹ آتی ہے۔ لیکن
اپنی تسکین اور اس وقت کی تسکین سے بھی متنع نہیں ہوتا۔ یا اس میں کمی کرتا ہے۔ اس لیے کہ یہی وقت امتحان کا ہے۔ ماں
کہہ رہی ہے کہ خوش ہو چکے دنیا کی لذتیں ختم ہو چکیں۔ آج اور اسی وقت کی لذت اب یہ ہے کہ اپنے خون میں لوٹو اور ہم
دیکھیں۔ دیکھیں اور یہ کہہ سکیں کہ تم نے میرے دودھ کا حق ادا کیا۔

رجز بھی پڑھنا ہے اور میں اس کے شعر کے لہجہ میں پختہ کارانہ سختی نہیں پاتا بلکہ جھکتی ہوئی نرمی پاتا ہوں۔ یہی حقیقت
اس کے رجز کی شاعری ہے۔ اور اس کی شاعری کا بھلا حسن ہے۔ وہ کہتا ہے کہ حسین میرے امیر ہیں اور کیسے اچھے امیر
ہیں۔ ان کی روشنی چراغ کی سی روشنی ہے۔

میں نہیں جانتا کہ اس وقت بھی یہ اپنی شادی کا کپڑا پہنے تھا یا نہیں۔ شادی میں رنگ کی شوخی اور نمائش مالگیر ہے۔
عرب کا یہ موقع نہ تھا کہ وہ ہر وقت کپڑے دوسرے رکھ سکتا۔ میں سوچتا ہوں کہ یادہ کپڑے زرہ کے نیچے پہنے تھا اور یا
زرہ بھی نہ تھی۔ اور ایسی خلعت پر شہادت کا رنگ چرخہ مبارک ہے وہ کپڑا جو خدا کی راہ میں اپنے خون سے رنگا جائے۔

اب میں اس ایمان دار بہادر کے ذکر کے لیے آمادہ ہوتا ہوں جس کا نام عربین زبیرؓ رہا ہے۔ میں طبیعت کے تغیر
کی مثال ایک حیثیت کی زہیر بن قین کی ذات میں دے چکا ہوں۔ اب میں عرب کے تغیر کی طرف توجہ مائل کرتا ہوں۔ دونوں
کے تغیر میں فرق تھا۔ یہ کہ زہیر بن قین عثمانی تھے کسی شخص کا کسی جماعت سے منسوب کیا جانا اس جماعت کے مخصوص
تاریخی آثار کا اس شخص پر عکس بکھا جاتا ہے۔ مجھے اب حضرت عثمان کی حیات یا مملکت کی تاریخ نہیں لکھنی ہے۔ جس پر میں
حصہ اول میں ہر حیثیت سے بحث کر چکا ہوں۔ نظر بری زہیر کا جماعت عثمانی سے منسوب ہونا ان کے واقعات تاریخی سے
متاثر ہے۔ اس لحاظ سے زہیر بن قین حضرت سے ملاقات کے قبل اگر کشیدہ ہوں تو کچھ بعید نہیں ہے۔ خصوصاً جس سے
جماعت عثمانی کا کوئی فرد کچا ہوا ہو۔ وہ فرزند علیؓ ہو۔ اس سے میرا مطلب یہ ہے کہ وہ ظاہر بظاہر ایک جماعت کے آدمی
تھے۔ لیکن عربین زبیرؓ کسی جماعت سے منسوب نہیں معلوم ہوتے۔ زیادہ سے زیادہ یہ اموی حکومت کے ایک ملازم تھے۔
اس کے معنی یہ نہ تھے کہ وہ بیز دنیاوی امورات کے بنی امیہ کی اس مخصوص روش میں بھی ہم خیال تھے جو اہل بیت رسولؐ
کے ساتھ تھے۔ اگر میں مثال دوں تو کہہ سکتا ہوں کہ عربی امیہ کے دیسے ہی رفیق تھے جیسے مالک اشتر، قحطاع اور اخف

بن قیس یا ہاشم بنی تمیم یا عدی کے شریک تھے۔ پوچھا جاسکتا ہے کہ عرب بن زید کے متعلق یہ کیوں نہیں کہا جاسکتا کہ وہ ہر صورت میں بنی امیہ کے ہم خیال نہ تھے۔ خود عرب کے خیال سے یہ نکتہ صاف ہو جاتا ہے جب وہ حضرت کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنا ہذر پیش کرتے ہیں۔ مذر یہ تھا کہ: ”اے فرزند رسول اگر مجھے گمان ہو تا کہ یہ قوم تیرا انکار کرے گی تو میں اپنے گھر سے باہر نہ نکلتا۔ میرا گمان اس کے خلاف تھا۔ پس میں نے سوچا کہ اگر بعض امور میں ان کی اطاعت کروں تو میں کوئی گناہ نہ کروں گا۔ اب ان کی سرکشی دیکھ کر ان کا گناہ ظاہر ہو گیا اور اب میں تائب ہو کر آپ کے پاس حاضر ہوا ہوں۔“ یہ روضۃ الصفا کے الفاظ ہیں اور میں موقع کی مناسبت سے اسے صحیح باور کرتا ہوں۔ ابن خلدون کے وہ تمام فقرات جو مذر کے جانیں ان میں سے بعض نہ صرف موقع کی مناسبت کے خلاف بلکہ سلسلہ خیال کے لحاظ سے غیر فطری ہیں۔ میں اسے قبول نہیں کرتا۔ اگرچہ سلسلہ واقعات میں لکھ گیا ہوں نہ اس کے تنقید کی ضرورت سمجھتا ہوں خصوصاً جب کہ کامل ابن اثیر جس سے ابن خلدون اکثر نقل کرتا ہے وہی کہتا ہے جو روضۃ الصفا سے لکھا گیا۔

خسیر! تو اس سے صاف ہو گیا کہ بنی امیہ کے بعض امور میں شرکت کے یہ معنی تھے کہ ہم ان کی ملازمت کریں اور ان کے ایسے امور کے شریک رہیں جو منافق ضمیر نہیں ہیں۔ لیکن جس وقت مرکوبہ یقین ہو گیا کہ بنی امیہ کی روش حسین کے ساتھ روادارانہ نہیں بلکہ انتہائی خبیثیت کی نزاعی ہے تو انہوں نے بنی امیہ کی رفاقت ترک کر دی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ اپنی ملازمت کے زمانہ اور خود اس کے قبل اہل بیت رسالت کے دوست تھے۔ لیکن اگر یہ رئیس تھے تو انہیں کوئی شغل اور اگر رئیس نہ تھے تو حصول معیشت کے لیے کچھ کرنا چاہیے تھا۔ اور یہ ملازم تھے اب ایسے موقع پر کہ بنی امیہ کے ملازم تھے ان کا بنی امیہ کے ساتھ رہنا یا حسین کے شریک ہو جانا ایک دشوار تصفیۃ تھا خصوصاً عملی پہلو سے۔

میں ان کے واقعات میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ یہ موجودہ فرض اور دینی فرض کو اپنی اپنی جگہ رکھنے میں انتہائی احتیاط برت رہے تھے۔ اور ان تمام حالتوں میں برابر یہ دیکھتے جاتے تھے کہ بنی امیہ کی غرض کیا ہے۔ میرے نزدیک ان کے لیے غور کی ابتدا اس وقت سے ہوئی جب سے ابن زیاد نے انہیں یہ حکم دیا کہ تم حسین کو کوفہ پہنچاؤ۔ (مجھے افسوس ہے کہ تاریخ میں ان ابتدائی مراحل کا تذکرہ اور تفصیل نہیں ہے) ممکن ہے کہ کوئی یا خود عرب یہ سوچ سکتے ہوں کہ اس سے ابن زیاد اور زید کی نیت اچھی نہ ہو۔ لیکن نیت اچھی نہ ہونے کے معنی یہ نہیں ہو سکتے تھے کہ ابن زیاد اور زید بجز اس کے کسی اور امر پر راضی نہ ہوگا۔ یعنی بجز قتل اور بیعت کے وہ ان کی متوقعانہ حالت یا امن سے کہیں رہنے پر راضی نہ ہوگا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ جس وقت عرب سوچتے ہوں کہ اس معاملہ کا کیا انجام ہو گا تو ان کے نزدیک انتہائی مصلحت اور درگزر میں انتہائی مصلحت کا قرینہ غالب ہو۔ لیکن یہ محض دہم ہوتا یقین نہ کہا جاسکتا۔ خود عرب بن زید کے اقوال سے یہ ظاہر نہیں ہے کہ وہ یہ تصفیۃ کر سکتے تھے کہ بنی امیہ حسین کے ساتھ وہ کچھ کریں گے جسے دیکھ کر وہ حسین کے پاس آنے اور بقول ابی عتف کہا: واللہ یا مولای ما علمت ان الملاعن یبلغون منك هذا الفعّال۔ (قسم خدا کی یا مولا مجھے یہ علم نہ تھا کہ یہ ملعون آپ کے ساتھ ایسا کریں گے) اور یہ ہے کہ کوئی شخص جسے واقعات کربلا کی خبر نہ ہو اگر اس کے سامنے ان واقعات کا تذکرہ کیا جائے تو اس کے فوری یقین نہ کرنے پر عجب نہیں جاسکتا۔ انسان نے بہت ہی کریمہ گناہ کیے ہیں اور کرتا ہے۔ اور غالباً کرے گا۔ لیکن ایسے لوگوں کے ساتھ ایسی بے رحمیاں کسی نے جان بوجھ کر نہیں کیں۔ خصوصاً جب کہ علم

کرنے والے ہر حیثیت سے ہامشائے خباثت ان کے بنائے ہوئے ہوں۔
 تو ایسی صورت میں کہ حرقین کی جرات نہ کرتے تھے صورت معاملہ کو دیکھتے جاتے تھے اور اس وقت تک بنی
 امیہ کے مطیع تھے جب تک ان سے انتہائی ظلم اور عمل کے ظاہر ہونے کا یقین نہ ہو گیا۔ درمیانی زمانہ کو انھوں نے اس
 لیے بنی امیہ کے ساتھ صرف کیا کہ اگر بنی امیہ نے حسینؑ کے ساتھ سختی نہ کی اور طلبی یا محاصرہ سے کوئی نرم غرض ہے تو ہم
 کیوں خواہ مخواہ انگشت نمائیں۔ اور انھیں اپنا دشمن بنائیں اور اسی لیے اپنے ہمدردان میں یہ بھی کہتے ہیں جیسا میں نے ابن
 خلدون سے نقل کیا کہ: ”اگر مجھے یہ یقین ہوتا کہ آپ سے وہ نہ لڑیں گے تو میں ہرگز آپ کی خدمت میں حاضر نہ ہوتا۔“
 یہاں وہ سپاہی اور مدبر دونوں تھے۔ لیکن جس درجہ کے سپاہی تھے اس سے ان کے الفاظ اعتبار کے شکیانہ ہیں۔

اب اگر میں ابتدا سے حسینؑ کے ساتھ ان کی مصلحت پر نظر کروں تو مجھے یہ شخص دنیاوی اور دینی فرض کا مجموعہ، تہذیب
 اور شائستگی کا نمونہ، اعتدال اور برداشت سے شصت معلوم ہوتا ہے۔ یہ سپاہیانہ ادا نے فرض کا نمونہ نہ دھوپ کو دھوپ
 بگھتا ہے اور نہ پیاس اسے روکتی ہے۔ حکم ہے کہ حسینؑ کو تلاش کرو۔ ڈھونڈ رہا ہے۔ ایک قافلہ کے آثار دیکھتا ہے
 دوڑتا ہے۔ اور روکتا ہے۔ گفتگو ہوتی ہے۔ نماز کا وقت آجاتا ہے اور حضرتؑ کے پیچھے نماز پڑھتا ہے۔ اہل کوفہ کے
 خطوط سے لاعلمی ظاہر کرتا ہے کہ یکایک ابن زیاد کا تاکید حکم پہنچتا ہے کہ حسینؑ کو نظر بند کرے۔ پہلا موقع جب کہ عراق
 حکم کی سختی سے منقلب ہوتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ: ”جہاں تک میں سوچتا ہوں میرا دل مجھے اس کام پر آمادہ نہیں ہونے
 دیتا۔“ عراقی ابو عیشا نے کندی پر بھی پڑتا ہے۔ پھر نماز پڑھی جاتی ہے۔ اور حضرتؑ سے کہتا ہے کہ مجھے ابن زیاد نے
 حکم دیا ہے کہ میں آپ کو اس کے پاس لے چلوں۔ اس سوال کا نتیجہ یہ تھا کہ اگر حضرتؑ چلنے پر راضی ہو جاتے تو عراق
 ایک فرض پورا کرتا بغیر اس کے کہ اس نے حسینؑ پر تشدد کیا ہوتا۔ اور چلنے یا نہ چلنے کی ذمہ داری حضرتؑ پر ہوتی۔
 حضرتؑ اس کے جواب میں سوار ہو کر غالباً دوسری سمت اختیار کرتے ہیں اور اب مر روکنے پر آمادہ ہوتا ہے اور صبح
 ارادہ کے ساتھ۔ لیکن عراق کے عزم کے سامنے حسینؑ کا ارادہ تھا۔ مرد دیکھتا ہے کہ ہمارے اصرار کے معنی یہ ہوں گے کہ
 حضرتؑ ہمیں تہا جنگ کے لیے بلاتے ہیں۔ عراق ارادہ ڈھیلا ہوتا ہے یہاں تک کہ تمام شکن جاتی رہتی ہے۔ مغلوب ہو گیا
 عراق اور اب اس نے ایک راز کہہ دیا۔ راز یہ تھا کہ مجھے لڑنے کا حکم نہیں ہے۔ بلکہ حکم یہ ہے کہ آپ کے ساتھ سے
 علیحدہ نہ ہوں۔ یعنی اب تک جو کچھ کر رہا تھا اور اس میں جو کچھ سختی تھی وہ محض دھمکی تھی کہ مرعوب کر کے ابن زیاد تک لے
 چلنے میں آسانی ہو۔

ساتھ ہی ساتھ وہ یہ بھی کہہ دیتا ہے کہ اسے ابن زیاد کے حکم کی اطاعت سے کس قدر کراہت ہے اور اسے کس قدر
 خیال ہے کہ کسی لفظ یا کسی حرکت سے حضرتؑ کو ناخوش نہ کرے۔ اعتقاد؟ ممکن ہے۔ اور اب وہ فوجی اصول پر اعتقاد کو
 غالب کر دیتا ہے۔ اور اس کا نتیجہ بگھتا ہے کہ اس کے معنی یہ ہوں گے کہ میں کوفہ میں داخل نہ ہو سکوں گا۔ تصفیہ یہ کرتا
 ہے کہ جو کچھ بھی ہو حسینؑ سے نہ لڑیں گے۔ اور وسیع دنیا میں کہیں چلے جائیں گے۔ اور اب چونکہ یقین کے اسباب فراہم
 ہوتے جاتے تھے عراقی غلط فہمی کے لہجہ میں صراحہ دیتا ہے کہ: ”اپنی جان پر دم کرو کوفہ نہ جاؤ۔“ پھر بھی عراقی اب تک بنی
 امیہ سے قطع تعلق کا تصفیہ نہ کیا تھا۔

دونوں لشکر روانہ ہوتے ہیں۔ اور صورت معاملہ میں پھر نیا پل پیدا ہو جاتا ہے کہ کوفہ سے پہنچ آدی آتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ (میں ان میں سے ناخ بن ہلال اور طربح کا نام لکھ چکا اس کے بعد ابی عتف پر نظر پڑی اور بقیہ تین آدمیوں کے نام بھی مل گئے۔ یہ تھے عمر السیداوی، سعید بن ابی ذر غفاریؓ اور عبد اللہ المذحجی) مر آگے بڑھتا ہے اور ان لوگوں کو روکتا ہے۔ روکنے کی غرض یہ تھی کہ چونکہ اب تک مر کو اپنی ملازمت کے قائم رکھنے کا خیال تھا۔ اس لیے وہ اس کا اہتمام کر رہا تھا کہ اب تک حکومت کی کوئی خیر خواہی کر سکے اور چونکہ یہ لوگ کوفہ سے آئے تھے عزت سے اپنا فرض سمجھ رہا تھا کہ انھیں حسینؑ کے مددگاروں میں شریک نہ ہونے دے۔ بلکہ یا اپنی مر است میں رکھے اور یا کوفہ لوٹا دے۔

پھر حضرت آگے بڑھتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ: ”کیا تو نے مجھ سے یہ عہد نہیں کیا تھا کہ میرے اصحاب میں سے کسی سے تعرض نہ کرے گا۔ جب تک کہ تیرے پاس ابن زیاد کا کوئی جواب نہ آنے اگر تو اپنے اقرار پر قائم نہیں ہے تو یہ اس کے کہ ہم اور تو جنگ پر آمادہ ہوں اور کیا چارہ ہے۔ عزت رک گیا۔ اور حسینؑ نے ان آنے والوں کا استقبال کیا۔“ یہ دوسرا موقع تھا کہ وہ دلیل سے ہوا لہجہ کی شان اور الفاظ کی قوت سے (جس کے پیچھے انسان کے نفس کا درجہ رہا کرتا ہے) عزت مغلوب ہوا۔ لیکن میں ناظر کو متنبہ کرتا ہوں کہ یہ مغلوبیت عزت کی کوئی وہ حالت نہ تھی جسے بعد اپن کہتے ہیں۔ ہرگز نہیں۔ بلکہ اس میں کئی احساسات شامل تھے۔ یہ کہ جنگ کا حکم نہ تھا۔ یہ کہ اعتقاد مانع مزاحمت تھا۔ یہ کہ ایک قوی نفس سے مقابلہ تھا۔ لیکن باوجود اس حالت کے میں عزت کی تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ تعریف کی بات یہ ہے کہ وہ بیچ تصفیہ کر سکا کہ توقع کیا جائے۔ اتنا ہوش تھا کہ وہ بہت سے متضاد احساسات میں اپنے کو مداحتمال پر رکھے۔ یہ کہ اس میں اپنی زبان کا پاس تھا۔ اور انصاف پسندی ایسے موقع پر بھی اس سے دور نہ ہوتی تھی۔ سوچا جاسکتا ہے کہ اب تک عزت کے طبیعت کی جو حیثیتیں کچھ میں آتی ہیں۔ اس سے ایسے شخص کے لیے یہ کس قدر ناخوشگوار ہوگا کہ وہ ایک غیر صاف حالت میں بسر کر رہا ہے۔ اور وہ ایسے افعال اور انداز میں مبتلا ہوتا ہے جو اسے پسند نہیں ہیں۔ لیکن اب تک وہ ملازم ہے۔ اور پھر ابن زیاد کا خط آتا ہے کہ حسینؑ کو روک دو۔ قطعی حکم، اور قاصد کا ایک فرض یہ بھی تھا کہ وہ دیکھے کہ عزت نے تعمیل کی یا نہیں۔ یہ موقع تھا کہ اب دونوں گروہ کر بلا پہنچ گئے تھے۔ اور کچھ میں یہ آتا ہے کہ چونکہ حضرت اور عزت دونوں نے قیام کیا تھا۔ عزت نے بہ لحاظ اس حکم کے کہ حسینؑ کو پانی سے علیحدہ رکھنا اپنے کوفرات، اور حضرت کے غمیوں کے درمیان قائم کیا۔ اس وقت سے عزت اور حسینؑ سے وہ معاملت ختم ہو گئی جو اب تک اس نوعیت کی تھی کہ عزت ابن زیاد کے احکام کا حامل تھا۔ یہاں پہنچ کر جتنی دیر اور گزری ہو اس کے بعد چونکہ ابن سعد کل افواج کوفہ و شام کا امیر تھا۔ اس لیے اب وہ معاملت کا ذمہ دار تھا۔ اور عزت اس کے ایک ماتحت کی حیثیت سے تھے۔ یہ مہلت عزت کے غور اور صورت معاملہ دیکھ کر آخری تصفیہ کے لیے مفید تھی۔ ہر چیز اس کے سامنے سے گزر رہی تھی۔ نہ احکام اس کے لیے کوئی راز کی چیز تھی اور نہ ابن سعد کے ہمراہیوں کی نیت اور انداز عزت سے پوشیدہ تھے۔ وہ تمام باتیں دیکھتا اور سنتا ہے۔ جو کچھ آج سے دسویں کی صبح تک ہوئی۔ لیکن اب تک کوئی تصفیہ عزت نہ کر سکا۔ یا اس کے کوئی انداز ظاہر نہ ہو سکے۔ ممکن ہے کہ شب دہم کو اس میں اس کے بیٹے جعانی اور غلام وغیرہ میں صورت معاملہ پر کچھ گفتگو ہوئی ہو۔ لیکن یہ نہیں معلوم کہ ہوئی یا نہیں اور ہوئی تو یقیناً کامل احتیاط سے جس میں کسی نے اپنا کوئی میلان ظاہر نہ کیا۔

مجھ ہو گئی۔ اور وہ درد انگیز منظر نگاہوں کے سامنے آیا کہ حسینؑ اور ان کے چند رفقاء ارادہ جنگ سے میدان میں آئے۔ لوگ جن کے چہروں پر جوک اور پیاس نے ان کی فطری رنگت اور شان ہاتی نہ رکھی تھی۔ لیکن تمام رنگ ان کے چہرہ سے اس لیے اڑ گئے تھے کہ اس جلالت خیز رنگ کے لیے جگہ خالی کر پڑے شان شہادت کہیں۔ ان کے چہرہ پر ان کی قلبی نورانیت کا عکس تھا۔ جو یہ کہہ رہا تھا کہ ہم اور ہماری ہنسی یا اگر سنگی دشمن کی شکم سیری اور آسودگی سے مغلوب ہونے والی نہیں ہے۔ نہ ہماری کمی تعداد انہو کے سامنے جھکے گی اور نہ ہمارے قلب کا نور سیاسی اغراض کی تاریکی سے بجھے گا۔ عزت کی شجاعت، کوئی قوم، دنیا کے کسی گوشہ کی جسے شرافت اور شجاعت سے اس ہے ایسے کسی گروہ کو اس حالت میں دیکھ کر جس میں حسینؑ اور ان کے اصحاب تھے غیرت میں آئی اور اس چھوٹی سے صف میں کھڑے ہو جانے کو اپنی حیات کی غرض اور فریاد ہو گئی۔

یہ وقت تھا کہ عزت کی نگاہیں ان لوگوں پر گڑ جاتیں اور اگر اکثری بھی تو درمیانی میدان میں رہتیں۔ کسی چیز پر نہیں بلکہ کھنٹی ہوئی غور میں نہیں معلوم کہ مرد دیکھ رہا ہے۔ بھول گیا ہے کہ ہم دشمن کی صف میں ہیں۔ ہم جنگی صف میں ہیں۔ جسے لڑنا ہے۔ حالت یہ ہے کہ غور نے ایسی محسوس قراہٹ پیدا کی ہے کہ جسم تھر تھرا رہا ہے۔ مہاجرین اس دیکھ رہا ہے۔ چہرہ پر ایک گھنا ہوا بادل ہے۔ جس سے عزت کا چہرہ صاف نہیں دکھائی دیتا۔ چونکتا ہے۔ حرکت، انقلاب ناقابل ضبط جوش اور یہ اپنے چچا سے اب بھی جوش میں سوال کرتا ہے۔ میں کہتا ہوں جوش میں اس لیے کہ اب بھی وہ ظاہر نہیں کرتا کہ میں حسینؑ کی حالت سے متاثر ہوا ہوں۔ بلکہ صرف حالت دکھاتا ہے۔ ضرور نرمی سے۔ اور تصفیہ اور جواب کا ابن قرہ کو ذمہ دار بناتا ہے۔ سوال بھی اس سے کیا ہے جسے ”چچا“ کہتا ہے، ابن قرہ کا جواب کہتا ہے کہ اس کے سر میں دیکھنے کی آنکھیں نہ تھیں۔ وہ بالکل ہی متاثر ہی نہ تھا۔ جواب کے بعد عزت اس سے مڑتا ہے۔ بغیر اس کے کہ اس کے بعد کوئی لفظ کہے۔ اور اب لڑکے کے پاس آتا ہے۔ وہی الفاظ دہراتا ہے۔ جو ابن قرہ سے کہے تھے۔ جس کے معنی یہ تھے کہ انہیں الفاظ کے خیال نے عزت کے دماغ میں اس قدر دخل حاصل کر لیا تھا کہ نہ دوسری طرف توجہ تھی اور نہ لازماً دوسرے الفاظ سے نکل گئے تھے۔ وہ قوت جذب اور پھیلا ہوا اثر جو باپ کے دل کو بیٹے کے نفس پر حاصل ہے امید سے دیکھ رہا ہے کہ میرے انتہام کا اقرار کرتا ہے یا نہیں۔ اقرار نہایت خوبصورت الفاظ اور لہجہ میں: ”حبا و کرامۃ“ کہتا ہے۔ تسکین، جوش محبت۔ لیکن سپاہیانہ منہ، اور تصفیہ۔ بوجہ اتر گیا۔ دونوں کے بے قرار گھوڑے دوڑے۔ لوگ بگھے کہ جنگ کے ارادہ سے جا رہے ہیں۔ ضرور جس نے ان کی حرکت نفس پر غور نہیں کیا تھا اور واقعات سے بے خبر تھا۔ اس نے موقع کے لحاظ سے جوش کو جوش جنگ ہی کہا ہو گا۔ جوش جنگ کا گھنا بھی غلط نہ ہوتا۔ غلطی یہ تھی کہ لوگ یہ سمجھتے تھے کہ وہ حسینؑ سے جنگ کرنے جاتا ہے۔ لیکن میں لوگوں کے ایسا سمجھنے کو بھی غلطی نہیں کہہ سکتا۔ ممکن ہے کہ عزت نے اپنے چہرہ پر وہ انداز اوڑھ لیے ہوں جس کی نمائش یہ ہو کہ وہ حسینؑ کی طرف بقصد جنگ جا رہا ہے۔ کیا وہ ابن زیادہ کی گھنی ہوئی صفوں اور انہو کے لیے سایہ میں تلفوت نہ تھا۔ وہ اپنے کو اس مرحوب کن حلقہ سے باہر کر رہا تھا۔ اور اپنے کو نکلنے کے لیے اس سے بہتر کوئی ترکیب نہ تھی کہ وہ اپنی قتل و حرکت میں حسینؑ کی طرف میلان کو کوئی شبہ نہ پیدا کرتا۔ اگرچہ ابی عصف نے بیٹے سے گفتگو کے بعد یہ نہیں لگایا کہ عزت نے ابن سعد سے بھی گفتگو کی لیکن عزت کی قلبی کیفیت

یہ چاہتی ہے کہ عہد نے اس کے بعد مزید اطمینان کے لیے ابن سعد سے گفتگو کی ہو اور ابن سعد کا تعقیب معلوم کر کے حسین کے پاس جانے کا ارادہ کر لیا ہو یا بیٹے کی گفتگو کے بعد تعقیب کر چکے ہوں اور اس کے بعد ابن سعد کی گفتگو نے ارادہ کے نفاذ میں سرعت پیدا کی ہو۔ مجھے اس میں بھی کوئی عذر نہیں ہے کہ عہد نے ابن سعد سے پہلے گفتگو کی یا اپنے بیٹے سے۔ اگرچہ میرا ذاتی میلان یہ ہے کہ عہد نے پیشتر اپنے بیٹے وغیرہ سے بات کی اور اس کے بعد ابن سعد سے گفتگو کر کے نہ صرف یقین حاصل کیا بلکہ اسے صلاح دے کر بھی حسین کی وکالت کی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ابن سعد سے گفتگو کے بعد اس نے اپنی صفت میں کھڑا ہو جانا بھی مصلحت سمجھا ہو۔ لیکن جو کچھ بھی جواب اسے زمین و آسمان نہیں دکھائی دے رہا تھا غور میں ڈوبا ہوا اور جس طرح وہ مہاجرین اور اس کو جواب دیتا ہے اس سے اس میں کوئی شبہ نہیں رہتا کہ وہ کنوئیں میں بول رہا ہے۔ جواب اور چونکا ہم وقت تھا۔ گھوڑا بڑھا۔ توج میں قوت آئی۔ ہمیز گھوڑے کے سینہ میں جی، چمپک اور بے چین عرب (گھوڑا) حسین کے لشکر کی طرف سنلے بھرے گا۔

عہد میں اس وقت خوف تھا۔ دو خوف۔ ایک یہ کہ وہ محسوس کرتا ہو گا کہ دشمن اس کے دلی ارادہ پر مطلع ہو گئے ہیں۔ پیلوے اور سوار اس کے گرفتار کرنے کو بڑھ رہے ہیں۔ شور انگیز صدائیں ہیں۔ جس کا مفہوم یہ ہے کہ عہد کا محاصرہ کر لو۔ اب کوئی نیزہ لگا۔ اب کوئی تیر گھوڑے کے شکم میں در آیا۔ اور گرا۔ حسین تک پہنچنے میں دشواری ہو گئی۔ سوچتا ہو گا کہ آج میرا گھوڑا اس قدر ست رفتار کیوں ہو گیا ہے۔ ممکن کہ عہد کی گردن اس بے چینی میں پیچھے پھر گئی ہو۔ اور دیکھتا ہو کہ اس کا تعاقب ہو رہا ہے یا نہیں۔ ساتھ ہی ہمیز اور قوت سے گھوڑے کی پسلیوں پر لگی ہو۔ مبارک گھوڑا غزال کی طرح جست کر رہا ہو اور عہد کا وہ دائمی انگار اس میں یہ یاس پیدا کر رہا ہو کہ مبادا حسین سے اپنا عذر بیان کرنے کے قبل ہم گرفتار ہو جائیں۔ کبھی عہد کو اس وقت سے زیادہ اپنی جان عزیز نہ ہوگی۔ روشنی، امید، اور دیکھتا ہے کہ ہم حسین کے قریب ہیں۔ ابن سعد کا لشکر دور ہو گیا۔ وہ گھوڑے سے کودا۔ اب قمر اتانہ تھا۔ قصور داروں کی صورت بنا رہا تھا۔ محسوس یہ کر رہا تھا کہ دریا میں گر کر وہ تیرتا ہوا کنارہ آیا ہے۔ ہاتھ پاؤں پھولے جاتے ہیں۔ دیکھو عہد انابت کی تصویر بنا ہوا ہے۔ حسین کا پالنے مبارک ہاتھ میں آگیا۔ آٹھیں دست اقدس تک پہنچیں۔ ایک نگاہ اور حسین عہد کے استقبال کے لیے تیار تھے۔ اسی شان سے گھوڑے پر بیٹھے رہے۔ دست مبارک مرہم عطوفت بن گیا۔ رسول کی زبان بولی "ارفع راسک یا شیخ"۔ اطمینان کی لمبی سانس۔ "فرغ راسہ"۔ اس کے بعد نہ مصور کی ضرورت ہے نہ کسی مصور کے قلم میں یہ نرمی ہے جو عہد کی اس نگاہ کو کھاسکے جو اس کے بعد حسین کی طرف اٹھی۔

باوجود ان تمام طبی مراحل کے جو تائب ہونے کے لیے غطرہ ہو سکتے ہیں۔ عہد یہ بھی چاہتا ہے کہ رحم، رحمت، اور نقیب مغفرت کے فرزند سے اپنی توبہ کی مقبولیت سن لے۔ سنی، دھو گیا۔ لیکن اس وقت اب وہ اپنے کو ایک سادہ ورق دیچہ رہا ہے۔ چاہتا ہے کہ اس کے بعد کچھ کر لیں۔ اور گزشتہ بے عنوانی کی یاد سے آنکھیں چار کرتے شرماتا ہے۔ راستہ سامنے تھا۔ میدان شہادت پاؤں کے نیچے دکھائی دے رہا تھا۔ اجازت چاہتا ہے۔ یا "قال لولده اجل یا بنی علی القوم الظالمین"۔ (اپنے فرزند سے کہتا ہے بیٹا ظالموں پر حملہ کرو) دیکھتا ہے کہ بیٹا لڑ رہا ہے۔ کیا ایسا ہوتا ہو گا کہ جب فرزند کسی دشمن کو قتل کرتا تھا۔ یا جب اسے کوئی زخم لگتا تھا تو عہد کی نگاہ خوشی سے حسین کی طرف اٹھ جاتی تھی۔ وہ اپنے ہر زخم جگر سے

ہے عنوانی کا جرم ادا کر رہا تھا۔ اور اپنی غلطی کو فرزند کے خون سے دھو رہا تھا۔ مگر نہایت اطمینان سے دیکھتا رہا یہاں تک کہ بیٹا شہید ہو کر گرا۔ فلما رآه ابوه مقتولا فرح بذلك فرحاً شديداً وقال الحمد لله الذي رزقك الشهادة بين يدي مولانا الحسين ابن امير المؤمنين۔ (پس جب باپ نے بیٹے کو مقتول دیکھا تو وہ اس سے بہت خوش ہوا۔ اور کہا: شکر ہے اس خدا کا جس نے تجھے میرے مولا حسینؑ فرزند امیر المؤمنینؑ کے سامنے شہادت نصیب کی)

اجازت مل گئی خود چلا اور ایک نہایت مفید گفتگو کی جو گویا حسینؑ کی حالت اور دشمنوں کے عمل کی ایک مستند تاریخی شہادت ہے۔ گفتگو لشکر سے کی۔ بلانے اور مدد نہ کرنے کی شکایت کے بعد کہتا ہے کہ ”تم نے اس غریب کو اس طرح روک رکھا ہے کہ کہیں وہ جا نہیں سکتے۔ تم نے ان کو قیدیوں کی طرح گرفتار کر لیا ہے۔ کسی مجاہد امن کی طرف نہیں جانے دیتے۔ نہ وہ کوئی فتح حاصل کر سکتے ہیں اور نہ کسی ضررت کے دفع کرنے پر قادر ہیں۔ تم نے ان کو آبِ فرات سے بھی روک دیا ہے۔“ عام جنگی حالت کے متعلق میں مگرؑ کی واقعہ خوانی میں کہہ چکا جو کہنا تھا۔ آخر یہ تھا کہ مگرؑ کا خون آلود سر تھا اور حسینؑ کا ہاتھ اور رمال تھا۔ دانتوں سے خون پونچھ رہے تھے۔ آنکھیں نم تھیں اور فرما رہے تھے: ”نعم المحر۔“ کیا اچھا مگرؑ تھا۔ تعریف ختم ہو چکی۔ اس تعریف کی وسعت لہجہ میں ہے!

مگرؑ کے فرزند اور بھائی کے متعلق میں صرف اس قدر کہوں گا کہ وہ مگرؑ کے فرزند اور بھائی تھے اور مگرؑ کے ایسے شخص سے امید کی جاتی ہے کہ اس کا غلام اس کے اور دین کے ساتھ وفاداری کرتا۔

کوفہ سے طراح اور ناخ بن ہلال مرادی کے ساتھ آنے والوں میں عمر الصیداوی، سعید بن ابی ذر غفاری، اور عبد اللہ المذحی ہیں۔ ناخ بن ہلال مرادی یا ہلال بن ناخ بجلی کا مشروط تذکرہ میں کرچکا۔ اگر یہ ایک شخص نہ تھے تو ناخ بن ہلال مرادی ان لوگوں میں تھے جنہوں نے مشکل وقت میں کوفہ سے زحمت سفر اختیار کی۔ جس کا اور کوئی مشابہت حسینؑ کی مدد کے دوسرے نہ تھا۔ اور انہیں درجہ شہادت نصیب ہوا۔ طراح کے تذکرہ میں مؤرخین کا اختلاف لکھ چکا۔ اگر یہ شریک جنگ نہ بھی تھے تو انہوں نے کوہِ آجا میں لے چلنے اور قبیلہ طے کے سواروں سے مدد کرنے کا وعدہ کر کے اپنا اس وقت کا حق ادا کر دیا۔ طراح نہایت تیز قرار اور حاضر جواب آدمی تھے اور عدی بن حاتم کے ایسے مشہور محبت علیؑ کے فرزند تھے۔

عبد اللہ المذحی یا عمر بن عبد اللہ المذحی کا شہدا میں نام آگیا ہے کوئی تفصیل نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ یہ مددگار ان اہل بیت اس وقت شہید ہوئے ہوں جس وقت دشمنوں نے متواتر حملے کیے تھے۔ اور اس وقت شہادت پانے والوں کی فہرست نہ ہونے کی وجہ سے ان کا علیحدہ ذکر نہیں ہے۔

ظہیر بن حسان اسدی اگر روضۃ الشہداء کی تحقیق صحیح ہے تو ظہیر بن حسان کربلا کے بڑے نامور بہادروں میں تھے۔ ان کا آوازہ شجاعت تھا کہ کوفہ و شام کے سپاہی سامنے آتے کاٹتے تھے غیرت و حمیت کا نمونہ، خوف اور خطرہ سے لاپرواہ کام پورا کرنا چاہیے۔ یہ بہادر تنہا جس طرح لڑا، زفرہ میں اسی طرح باوجود اس رہا کثرت زخم یا گھیرنے والوں کی تعداد بڑھتی گئی۔ لیکن یہ اسدی شجاع اسی اطمینان سے سرگرم جنگ رہا۔ جس طرح پہلے تھا۔ محبت اور وفا کا نمونہ جس سے اور جس کے ہر انداز سے فرزند رسولؐ کی محبت کی خوشبو پھیلی ہے۔ لیکن ان میں محض سپاہیانہ دبدبہ نہ تھا۔ اس قابل بھی تھے جو یہ کہہ سکتے کہ ابن زیاد دین میں بدعتیں کرتا ہے۔ لالچ دی جاتی ہے۔ لیکن یہ بے غرض سپاہی مال نہیں بلکہ علوے نفس کے

قضا کی بنیاد پر اپنے کو حسین کا پیرو دیتا ہے۔ نہایت بلند ہمت کبی تھی۔ یہ تکلیفوں پر ثابت انسان بے شمار زخم کھاتا ہے۔ لیکن کہیں سے عجز اور انگار ظاہر نہیں ہے۔ میں خیال کرتا ہوں کہ اس بے جگر شہید پر غشی طاری ہو چکی تھی اور قریب تھا کہ گھوڑے سے گرے کہ حضرت نے اپنے رتھا کو اسے میدان جنگ سے لانے کی ہدایت کی۔ اب زبان میں پونے کی طاقت نہیں ہے۔ آنکھ کھل سکتی تھی۔ ایک سخت کوشش کی۔ سر حسین کے قدموں پر رک دیا۔ دیکھا آنکھوں میں تنہم کی لطیف لہر اور پہلور نے دنیا کو دواغ کیا۔

عمر بن خالد، خالد بن عمر، ملا بن انس، اور شریح بن عبید، عبداللہ و عبدالرحمن مرنی، عبداللہ و عبدالرحمن غفاری، قیس بن امیہ کو یہ فرما دل ہوا کہ یہ سید الشہداء کے اصحاب کہے جاسکتے اور اپنے امام کے سامنے اپنے کو خون میں لوثا ہوا دکھا دیتے۔ عمر بن مطاع ابھی ان پر جوش لوگوں میں تھے جو رجز پڑھ سکتے اور حسین کی مدح کرتے۔ کم نہ تھا کہ یہ تیس دشمنوں کو قتل کر کے لشکریں حاصل کر سکتے۔

اسی طرح زبید بن مظہر اسدی حسین کے متعلق اپنے احساسات کا اس مصرع سے پتا دے سکتے کہ اے میرے رب میں حسین کا مددگار ہوں۔

علی بن مظہر دشمنوں کے مترسپاہی قتل کر سکے۔ اور آخر یہ اسدی پہلور بھی عالم راحت کی طرف رخصت ہوا۔ سخت طنز کیا مالک بن انس نے جب ابن سعد کو مخاطب کر کے کہا کہ: اگر سعد بن ابی وقاص کو معلوم ہوتا کہ تجھ سے یہ حرکت سرزد ہوگی تو وہ اپنے ہاتھ سے تیرے ہاتھ پاؤں کاٹ ڈالتا۔ یہ تلوار سے زیادہ کاری زخم تھا۔ یہ ممکن نہ تھا کہ ہر شہید کی کوئی ضربت سپہ سالار تک پہنچ سکتی۔ لیکن اس پہلور کی حاضر جوابی نے ایک ضرب چٹی جو کارگر ہوئی۔ اور یہ ناگہن ہے کہ ایسے چھپتے ہوئے فقرہ نے جس سے انکشاف حقیقت بھی ہوتی تھی۔ سپاہیوں کو شرمندہ نہ کیا ہو۔ خود تو مرنے کو گئے ہی تھے۔ یہی بات کہہ کر کیوں نہ مرتے۔

سعید بن حنظلہ قبیلی ایک تجربہ کار سپاہی۔ ان کی شان کے شایان تھا کہ اپنے رجز میں کہتے کہ: ”میں نے تلواروں اور نیزوں پر صبر کیا۔“ وجہ بھی دوسرے مصرع میں ہے کہ ”جنت میں داخل ہوں۔“ موقع یہ تھا کہ میدان جنگ کی اس زینت کو نام و شہرت، انعام اور فتح کا خیال بھی نہ ہوتا۔ یہ سب تو حیات کے دھکوسٹے ہیں۔ میدان کربلا کے جانباز تو اپنے کو مرا ہوا سمجھتے تھے حسین کے پاس کچھ دیر رہنا یا میدان جنگ میں دکھائی دینا حیات کی ایک وقتی معاوضہ تھی۔ اب تو شہادت کا لٹہ تھا۔ ایک حوصلہ تھا کہ کیونکر شہید ہوں۔ زخم کھائیں اور یہ کل ارادے اس لیے ہیں کہ ”نجات“ حاصل ہو۔

عمر بن قرطہ انصاری حسین کے پاس ان کا موجود ہونا اس لیے اور امتحان خیز تھا کہ ان کا ایک بھائی دشمن کے لشکر میں تھا۔ دنیا میں ایسے ہی لوگوں نے اپنی آزادی نفس فیصلہ اور ارادہ کا نشان چھوڑا ہے۔ نہ کہ انھوں نے جو قربت، روپیہ، لالچ اور خوف سے دب گئے ہیں۔ وہ کل تذکرے جو اصحاب کے ہونے یا جواب ہوں، اس سے گھنا محال ہے کہ ان لوگوں میں حضرت سید الشہداء کی محبت اور کاغذ کس درجہ تھا۔ اسی پہلور کو دیکھیے کہ اب زخموں سے چور ہے۔ لیکن یہ پوچھ رہا ہے کہ: ”یا ابن رسول اللہ! کیا میں نے آپ کے عہد کو پورا کیا؟“ عہد کا ان لوگوں نے مرتبہ بڑھایا اور انسان کی زبان کی شرافت ایسے لوگوں سے قائم ہوئی۔ کوئی بیچی بن کثیر کا ایسا مؤرخ شاعر تھا جو اپنے رجز میں کہتا ہے کہ ایک دن

تھا کہ عہد نئی میں انصار کے شعلہ کفار کے خون سے اپنے نیزے رنجھے تھے۔ آج کفار کے خون سے رنگنا چاہیے۔ وہ کفار جنہوں نے حسینؑ کے ساتھ خیانت کی اور یزید کو راضی کیا۔ آج ہم اپنی تلوار کی حد تک ان سے ایسا ہی شعلہ کر رہے ہیں۔ اور یہ فرج اود بہادر ان بخار کے لیے آج فرض واجب ہے۔ یہ لوگ نقیب حقیقت اور سچائی کی کوئی تھے۔

سید بن امیرؑ بن سرح اور مالک بن عبد بن سرح حضرتؑ کے پاس اس طرح آتے ہیں کہ کوئی دیکھنے والا ان کی حالت کو رو نہا۔ اور ان کی یہی حالت ہے جس سے مجھے بحث ہے۔ ایسی ہی ایک حالت بقیہ اصحاب کی لکھی گئی ہے جس وقت نماز ظہر کے بعد اہل بیتؑ رضوان اللہ علیہم اجمعین مخاطب کرتے ہیں اور وہ رو دیتے ہیں۔ اس سے میں اس پر غور کرنا چاہتا ہوں کہ اصحاب حسینؑ کی حالت ان لوگوں کی ایسی نہ تھی جن سے جذبات کا احساس ہوتا تھا۔ اور اس کے بعد انہوں نے موت کا لا پرولنی سے مقابلہ کیا ہو۔ نہیں بلکہ آخر وقت تک ان میں احساسات ویسے ہی تھے جیسے ایک سچا انسان انسان میں ہونا چاہیے۔ اور اس کے بعد بھی وہ اس پر غالب اور حسینؑ کی حفاظت، دین کی مدد، اور موت کے ذوق پر ویسے ہی ثابت قدم تھے۔ جیسے وہ جس پر بے حسی کا پردہ پڑا ہو۔ اور بے شک یہ بڑی حالت حسینؑ اور ان کے رفقاء ہی میں اس درجہ ممتاز تھی۔ اب اگر اس کی شرح چاہتے ہو تو حسینؑ کے سوال اور ان کے جواب پر غور کرو۔ یہ کہتے ہیں کہ: ”ہم اپنے لیے نہیں (روئے) بلکہ ہم کو اس پر رونا آتا ہے کہ ہم اپنی جان دے کر بھی آپ کو نہیں بچا سکتے!“۔ محبت اور اخلاص نے بھی اس سے بہتر الفاظ نہیں بنے تھے۔ نہ کبھی لفظوں نے اندرونی جذبات کی اس شدت سے مصوری کی تھی۔ انہیں اپنے خیالات کا احساس ہے۔ انہیں قربانی کا خیال ہے جو اپنی حیات کو بے قدر کر دیتی ہے۔ وہ دیکھتے ہیں کہ جان دے کر بھی وہ نتیجہ حاصل نہیں کر سکتے جس کی آرزو ہے۔ لیکن پھر مرتے ہیں۔ کیوں؟ اس خوفناک نتیجہ کو ٹال دیں اور ہماری آنکھیں اس موقع کو دیکھنے کے لیے نہ رہیں!۔

معلیٰ کا ایسا شخص جو اپنی شجاعت کے لیے مشہور تمام میدان میں آتا ہے اور اپنے رجز میں نافع بن ہلال کا مضمون کہتا ہے۔ نافع کہتے تھے: ”انا علیٰ دین علی و دینہ دین النقی“۔ اس کہنے کی کوئی وجہ ہونی چاہیے۔ خصوصاً جب کہ شرح بھی کی گئی ہے کہ میں علیؑ کے دین پر ہوں جن کا دین نبیؐ کا دین ہے۔ اس کی شرح اس شخص کے قول سے ہوتی ہے جو ان کے مقابل آتا ہے اور کہتا ہے کہ ”انا علیٰ دین عثمان“ اس سے دو گروہ کے خیالات کی شدت اور تفریق معلوم ہوتی ہے۔ اور چونکہ نافع ہوں یا علیؑ اپنے وقت کے خیالات سے واقف تھے۔ وہ اپنے آخری وقت اپنے عقین کو ظاہر کر کے فرماتے تھے کہ ہم احمد اور علیؑ کے دین پر ہیں۔ یہ فرمنا ہے یہ لوگ اپنے خون سے زندہ کرتے تھے۔ اور سچ ہے کہ ان مرنے والوں ہی نے اسے زندہ رکھا۔ اور اس کا ثبوت دیا کہ اکثر چیزوں کی حیات موت ہی سے ہوتی ہے۔

ایک نو مسلم شوق شہادت میں دوڑا آتا ہے۔ نوجوان، تجربہ نہیں ہے۔ لیکن کہتا ہے کہ مجھے موت کا کوئی خوف نہیں ہے اور شہادت پا کر اس روز جب کہ حالت کرب ہوگی مجھے جنت ملے گی۔ یہ بھی کہتا ہے کہ مجھے اپنے رب پر وثوق ہے۔ اور وہی میرے لیے کافی ہے۔ نئے نئے جوش کا گھنا آسان ہے۔ بچانے کا غم نہ تھا۔ مرنے کا حوصلہ تھا۔ حوصلہ پورا ہوا۔ دشمن نے حسینؑ کی طرف اس سر کو ڈھکا دیا۔ خوش اتفاقی نے شاید یہ چاہا ہو کہ اس سر کو اس کے مولا حسینؑ کے ہاتھ لے لیں۔ ایک مرتبہ پھر مس کر لے۔ مال دوڑتی ہے۔ اور اس سر کو پھر دشمن کی طرف بھینچا دیتی ہے۔ غرض؟

غالباً اس سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ماں یہ نہیں چاہتی ہے کہ میرے بیٹے کا سر میرے پاس یا میری نگاہ کے سامنے رہے اور یہ سامنے رہنا میری کمزوری اور میلان ظاہر کرے۔ راہ خدا میں ٹار ہو چکا۔ اب میں نہیں چاہتا۔ صبر کر چکے۔
حکام بن سعید الشیبانی۔ میدان میں اگر دشمنوں کو مذاب خدا سے ڈراتے ہیں۔ ان کی تقریر کے من سے میرا اثر یہ ہے کہ یہ بے حد نیک نفس اور سیدھے آدمی تھے۔ جس کی کج میں یہ نہیں آیا کرتا کہ دنیا میں ایسے بھی لوگ ہیں جو جان بوجھ کر برائی کر سکتے ہیں۔ لشکر شام ان کی تقریر کا کوئی جواب نہیں دیتا۔ غالباً ان کے سیدھے پن کے ساتھ تمسخر قہر حسینؑ کھاتے ہیں کہ جب یہ ابتدا میں نصیحت پذیر نہ تھے تو اصحاب کو قتل کرنے کے بعد اب کون امید ہے کہ سید میں نہیں جانتا کہ حضرتؑ کو کھانے کی کوئی وجہ ہوئی اور آیا یہ دشمن کے کسی ناپلاطم انداز پر مبنی تھی۔ اس کے بچنے کا کوئی اشارہ نہیں ہے۔ حکام کو بچنے اور ان کی غلبی کیفیت اس سے معلوم ہوگی کہ وہ درود پڑھتے ہوئے میدان کی طرف جا رہے ہیں۔ اس کے معنی ہیں کہ وہ طائف دنیوی سے قطع تعلق کر چکے۔ تمام خیالات کو دماغ سے نکال دیا۔ اور خدا کے ان بندوں کی تعریف سے آخری وقت اپنے زبان اور دل کو پاس لے رہے ہیں۔ شہادت۔

محمد بن بشیر انحضری

وہ وفادار جو سستا ہے کہ میرا بیٹا گرفتار ہو گیا ہے۔ حضرت زفریہ عطا فرماتے ہیں اور اجازت دیتے ہیں۔ لیکن یہ نمونہ اخلاص کہتا ہے کہ مجھے درندے کھا جائیں اگر میں اس وقت آپ کو چھوڑ کر چلا جاؤں۔

مالک بن داؤد جناہ

مالک بن داؤد جناہ اور ان کا فرزند عبداللہ بن جناہ، ابراہیم بن الحسین نے شجاعت ثنائی اور وفاداری کا حق ادا کیا۔ سعید بن عبداللہ الجعفی (مؤلف یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ اور سعید بن عبداللہ الجعفی ایک ہی بزرگ تھے اور یہ صرف کاتب کی غلطی ہے) کا آلودہ شہادت ہونا کوئی عجب کی بات نہ تھی۔ جب کہ یہ حضرت محمدؐ ابن حنفیہ کے ملاری اعز میں تھے۔ برزل انصاری اور مرہ غفاری نے بھی دین کا حق ادا کیا۔

روضة الشهداء جس ترک کی شہادت کو اس خوبصورتی سے بیان کرتا ہے وہ حیثیت وفاداری، اطاعت اور حق ملک کی لا جواب مثال ہوگی۔ یہ ظاہر نہیں ہو سکتا تھا اگر حضرت اور امام زین العابدین علیہ السلام کا برتاؤ اس کے ساتھ پدرانہ نہ ہوتا۔ اور یہ اس خاندان کے اس برتاؤ کا مظاہر کہ جو انسان بلکہ حیوانوں تک کے ساتھ بائز رکھتے تھے ذرا حیرت کا بل نہیں ہے۔ اور پھر ترک کی شہادت بعد دیکھو حسینؑ اس کی لاش پر گئے، لٹے، سر زانو پر رکھا اور قلم پر قلم ترک کی آنکھ کھولنے اور مونچک درمیان بقیع قلم

جہان بن مسروق الجعفی :

جہان بن مسروق الجعفی حضرت کے مؤذن تھے اور واقعات کربلا میں ان کی بھی خصوصیت تھی۔ وقت یہ ہے کہ قرآن کے

لشکر اور حضرت کے اصحاب میں تصفیہ نہ کھانے کی گرائی ہے۔ ہر شخص دماغی بے مینی میں مبتلا ہے۔ نماز کا وقت آتا ہے اور علاج کی بانگ اذان عصر کے وقت بلند ہوتی ہے۔ دھوپ ہے، ریگستان ہے۔ اتفاق سے بچے کھانے لوگ ہیں۔ انتظار ہے۔ لیکن ان سب پر اذان کی صدا پھیل رہی ہے۔ اور تھوڑی دیر کے لیے دماغ کے تمام اضطراب خیز خیالات کو دور کر رہی ہے۔ یہ وقتی سمیت اس وقت ان کی وجہ سے پیدا ہوتی۔ لیکن اتفاقات نے یہ بھی چاہا تھا کہ انہیں اس سے بدرجہا سخت وقت اللہ کا نام بلند کرنا ہو۔ اس وقت جب کہ کسی مؤذن کو فرما حاصل نہ ہوا ہو گا۔ ظہر عاشور، علاج اذان نے لے لیے ہیں۔ یہ ان کی آخری اذان تھی۔ حسینؑ کے بعد کونسا ایسا نفس مطمئن تھا جس کا کربلا میں اذان دینے والا مؤذن ہو سکتا۔ بہتر ہے کہ وہ گلا کٹوا دیا جائے جس سے اذان دی جاتی تھی۔ اس کے قبل کہ سید العابدین دنیا میں نہ رہے۔

ابو الشعشاہ زبید الکندری

وہ تغیر جو عمر بن زبید ریاضی میں ہوا اسی کا ایک کس ابو الشعشاہ تھا۔ یہ یقین ہو گیا کہ لشکر شام نواسہ رسولؐ کے ساتھ انسانیت کا برتاؤ نہیں کرنا چاہتا۔ اپنی امیدوں کو طلاق دیا۔ موت اور شہادت کی طرف آئے۔ معمولی درجہ کے تیر انداز نہ تھے کہ نو تیروں میں سے کسی نے خطا نہ کی۔ اور ان کے تیروں کو امتیاز یہ تھا کہ ہر تیر کے ساتھ حسینؑ کی دعا تھی اور دھلے مغفرت فرما رہے تھے۔ راحت ابدی نصیب ہوتی۔

عابس اور شوذب

اگر میں ان کی سب سے بڑی اور سب سے بڑی تعریف کروں تو کہوں گا کہ ان میں مالک اشتر کی جھنک تھی۔ سپاہی، بے پیچ، سیدھا، صاف، جو کچھ کہتا ہے وہ مدبرانہ ہو یا نہ ہو لیکن اس پر سپاہیانہ غصہ کی مہر ہے۔ اور یہی اس بات کی جو کبھی تھی جو بہترین سفارش ہے۔ مثال: سیدے حسینؑ کے پاس جاتے ہیں اور اپنا قطعی تصفیہ ظاہر کرتے ہیں کہ ”روئے زمین پر کوئی شخص آپ سے زیادہ عزیز نہیں ہے۔“ اس کے بعد نذر بہترین تحفہ جو ایک سپاہی پیش کر سکتا ہے۔ ”اگر میں اپنے نفس سے کوئی نفیس تر چیز پاتا تو اسے آپ کی ذات مقدس اور نفس مکرم پر فدا کرتا۔“ اس کے بعد کے فقرہ کی مغالی ہزاروں مدح اور قصیدہ برکتی ہے کہ ”میں گواہی دیتا ہوں آپ اپنے پدر بزرگوار کی طرح سالک راہ مستقیم ہیں۔“ کوئی کہے گا کہ حضرتؑ کے نفس مکرم، ذات اقدس اور روش کے متعلق ریمارک میں یہ اپنی حد سے آگے بڑھ رہے تھے۔ پھر کون کہہ سکتا اگر ایسے لوگ کچھ نہ کہتے۔ محاذ کے بے معنی گونجے پن سے یہ صاف گونی بدرجہا شیریں تھی۔ بیکار لفظی نہ تھی وہ حقیقت تھی جو ایک سادہ مزاج سپاہی بکھا تھا۔ آدرندہ تھی۔ تیار نہ ہوا تھا۔ اس کا تمام غصہ بخود ہوا کہ کچھ کہتا اور بلو جو کو کشش کے بھی نہ اس کے علاوہ اور نہ اس سے بہتر کچھ کہہ سکتا تھا۔ یہ لفظ تھے جو اس کے منہ میں بھر آئے تھے اور ان کی آمد میں عابسؑ نے پس و پیش کی اڑنہ کی تھی۔

اس کے قبل وہ کچھ دیکھنے کے بعد جو ان کی شہادت کے قبل گزر چکا تھا اس پہلور کی سیدھی گردن مڑتی ہے اور نرم متانت سے شوذب سے سوال کرتا ہے۔ سوال جس میں حکم کی سختی نہیں ہے صرف سوال ہے جس میں عظام کا تصفیہ و رلافت

کیا ہے۔ سوال ہی میں یہ بکھار رہا ہے کہ میں میدان شہادت کی طرف جا رہا ہوں، میرے بعد تو اپنی آزادی کو سوچ رہا ہے۔ یا میرے ارادہ کا رقیق ہے۔ شوذب، وکدار شوذب وہی جواب دیتا ہے جو ایک وکدار کو دینا چاہیے۔ جوش ہے اور عابٹ شائد ارادہ دیتا ہے کہ ”تمہ سے میرا ایسا گان تھا“۔ کبھی کسی غلام کو اپنے آقا کے ہم مرتبہ ہونے کا اس سے بہتر موقع نہ ملا تھا۔ جب کہ آقا اور غلام دونوں مجسمہ اصول خیر کے غلام تھے۔ پھر جب تعینہ ہو چکا تھا تو اب قدم بڑھنا رہ گیا تھا۔ ایک عمل محتاج کی ”بڑی مزدوری“ کی آقا اور غلام دونوں جو کس کر رہے تھے، بڑھے۔ رنج بن حیم و بچہ رہا تھا۔ دیکھا کہ عابٹ آ رہا ہے اور اس کے آنے کی تصدیق یہ تھی کہ اس کے راستہ میں آنے والے شمع کی طرح نکلے جاتے تھے اور لاشیں بتا رہی تھیں کہ ادھر سے عابٹ گیا ہے۔ رنج غل بھا دیتا ہے اور امیر شام کا انہو مصلحت بھی بگھتا ہے کہ کوئی تنہا اپنی جان سے سخاوت نہ کرے۔ اور اس کے بعد عابٹ کا نفس وہ عمل کرتا ہے جو نہ صرف تاریخ عالم میں معدوم ہے بلکہ تاریخ اسلام میں بھی اس کی ایک ہی مثال ہے۔ (عباس بن عبدہ، احد میں) اور وہ یہ کہ عابٹ اپنی زرہ اور خود اتار کر پھینک دیتے ہیں اور غلام معمولی کپڑے پہنے ہوئے انہو لشکر میں گھس جاتے ہیں۔ عباس بن عبدہ کی غرض جس قدر ان کے ایسے ہی فعل سے ظاہر ہو سکتی، وہ ان کا شوق شہادت تھا اور یہ عابٹ میں بھی تھا۔ لیکن کر بلا کا موقع ایک بے مثال موقع تھا۔ یہاں ابتداء ہی سے چند سپاہی تھے۔ بہتر اور اکتیس ہزار اور ان یادگار بہتر کا ایک اس کا اہتمام نہیں کرتا کہ ہم اپنی کافی اور غیر معمولی حفاظت کریں بلکہ اسباب حفاظت کو بھی دور پھینک رہا تھا۔ دور نہیں پھینک رہا تھا ان چیزوں سے امیر شام کے سپاہیوں کی سپاہیانہ غیرت اور شجاعت پر وہ ضرب لگا رہا تھا جس کے روکنے کیلئے کوئی سپر نہیں ہو سکتی۔ کبھی کسی سپاہی نے اپنے مقابل کو اس ذلت و دھارت سے نہیں دیکھا جیسا کر بلا کے بہتر سپاہیوں نے اکتیس ہزار سپاہیوں کو دیکھا۔ جو ان سے لڑنا تنگ سمجھتے تھے۔ ان کی ذلیل کوششوں کو دیکھنا گوارا کریں؟ نہیں اپنے کو جلد تمام کر دیں۔ قیاس آسان ہے کہ عابٹ کے ایسے دل، ایسے ارادہ، ایسی شان، ایسے بشوہ اور ایسی ضرب کا کون مقابلہ کر رہا ہو گا۔ تیر، پندرہ، انہو، اور اس کا نام سادی وزن، جو جو کچھ بھی ہو۔ دشمن جن چیزوں کو اپنی کامیابی کا ذریعہ سمجھتا تھا اس کے لیے عابٹ نے اپنے کو تیار دکھایا۔ نہ ہم زرہ پہنے رہیں گے نہ سر پھانیں گے، تم اس قابل نہیں ہو کہ تھلہ ضرب کے لیے کوئی حفاظت کی جائے۔ پہلور شوذب پشت کا نگہ بان ہے۔ کہاں تک زخم نہ کھاتا، گرا، شہید ہوا، شیر دل عابٹ ایک مرتبہ انہو کو سپا کر دیتا ہے۔ پرورش پرورش ہو رہی ہے۔ زخم لگتے جاتے ہیں۔ کہاں تک۔ وہ وقت آ گیا جس کی جلدی کر رہے تھے۔ وہاں پہنچے جہاں ذلیل دنیا کی کسی ذلیل مصلحت کا تماشا نہ دیکھیں گے۔

دارالاسلام۔ دارالایمان

جوش غالب جان

کوئی حبشی عیسائی جو اسلامی فتوحات میں گرفتار ہوا، اور مسلمان ہوا، اور وہ بھی ابوذر کا غلام۔ اور پھر اپنے آقا کے بعد حسین کی پناہ لیتا۔ شہداء کا جوش دیکھ رہا ہے۔ شہادت کا سلسلہ ہے جس میں ہسکی نہیں ہے۔ اجماع نے کی ضرورت نہیں

ہے۔ ہر شخص خود دوڑ رہا ہے۔ جز اور انگاری سے حسینؑ کے سامنے آتا ہے۔ یقین نہیں آ رہا ہے کہ میں بھی ایسا خوش نصیب ہو سکتا ہوں کہ فرزند رسولؐ پر شاد ہو سکوں۔ کہتے جو کچھ جوتی کہتے۔ لیکن ان کا انگار اور اس کی سلاوی سچائی کہہ رہی تھی کہ اب وہ بڑے حسب و نسب کے شریفوں کے فرزند۔ ذرا ان کے اس فقرہ کے جوش، محبت اور غلوں کا اندازہ کر دو کہ ”میں آپ سے جدا نہ ہوں گا یہاں تک کہ میرا سیاہ خون آپ کے خون پاک میں مل جائے۔“ اسلام ہی کو یہ فرما حاصل ہے کہ وہ اپنا ایک ایسا آزاد غلام بنا سکتا۔ میدان میں ”پدرم سلطان بود“ کا جزم نہیں پڑھتے۔ فریہ ہے کہ ہم آج تلوار سے فرزند رسولؐ کی حمایت کریں گے اور ہم بھی اپنے امام اور شاہ روز جزا کی وساطت سے وعدہ کی جوتی کا سبیل کی امید کر سکتے ہیں۔ اس کے بعد حسینؑ ہیں اور جوتی کی لاش ہے۔

بربر ہدائی

قبیلہ ہمدان نے امیر المومنینؑ اور حضرت امام حسن علیہ السلام کے ساتھ جو عملی اظہار غلامی و فاکیا تھا اس کی بنیاد پر اس قبیلہ کے کسی شخص کا حضرت امام حسین علیہ السلام کی مدد کرنا حیرت خیز نہ تھا۔ بربرؑ کوئی ”مہملہ فرد نہ تھے۔ بلکہ مشہور عابد اور قادی تھے۔ لیکن ان کا اس سے بلند تر درجہ ظاہر نہ ہوتا۔ اگر ان کی لاش پر حضرت کا یہ فقرہ موجود نہ ہوتا کہ ”بربرؑ خدا کے بند گن ماحین میں سے تھے۔“ صلح کے لفظ میں بربرؑ کی تاریخ مختصر ہے۔

لیکن بربرؑ کے واقعات انھیں ذی جوش، جزرس اور موقع شناس بھی کھلاتے ہیں۔ جسے کوئی مخصوص حالت اپنے ساتھ لے نہیں جاتی بلکہ جس میں اتنی قوت ہے کہ وہ اپنے کو اپنی جگہ قائم رکھے۔ مثلاً جس روز مشورہ جنگ ہوتا ہے بربرؑ موقع کی دشواری ظاہر کرتے ہیں اور ان کے نزدیک اس دشواری سے نکلنے کی صرف ایک راہ معلوم ہوتی ہے اور وہ یہ ہے کہ ابن سعد کو باز رکھیں۔ یقیناً اس کے علاوہ کوئی دوسری راہ نہ تھی۔ اس کے بعد ان کے انداز میں ان کی تدبیر، تدبیر میں ان کی عقل اور عقل میں موقع کی نفس شناسی تھی اور وہ یہ ہے کہ ابن سعد کے سامنے جاتے ہیں لیکن اسے سلام نہیں کرتے۔ بربرؑ کوئی غیر مشہور آدمی نہ تھے جنہیں ابن سعد نہ جانتا ہوتا۔ خصوصاً جب کہ یہ اس کے پاس گئے تھے اگر وہ نہ بھی جانتا ہوتا تو اسے جانتے والوں نے اطلاع دی ہوتی۔ اس بنیاد پر یہ قیاس نہیں ہو سکتا تھا کہ بربرؑ اس اسلامی اور رسمی فرض سے مطلع نہ ہوتے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ ابن سعد، سعد بن ابی وقاص کا لڑکا اور اس وقت امیر شام کے لشکر کا سپہ سالار ہے۔ یہ بھی گمان نہیں ہو سکتا کہ ابن سعد کو بربرؑ نہ جانتے ہوں۔ پھر بربرؑ کے سلام نہ کرنے میں کوئی غرض پوشیدہ ہوگی اور کچھ اثر ڈالنا چاہتے ہوں گے۔ غرض تھی جس کے ظاہر کرنے میں ابن سعد کے سوال نے پیش قدمی کی کہ: ”کیا میں مسلمان نہیں ہوں جو تو نے مجھے سلام نہیں کیا۔“ یہی کہلوانا ان کی غرض تھی۔ اور اسی میں ان کے ترکیب کی کارگری اور بدلت تھی۔ اس م دق کی خود مصوری کر لو کہ کوئی شخص کیونکر یہ فقرہ کہہ سکتا تھا اور کونسا موقع ہوگا کہ کوئی شخص عدا ایک ذبیہ کو ایک شخص کے لیے متروک کچھ گا۔ اور اب بربرؑ کے چہرہ اور لہجہ کا خیال کرو جس وقت وہ کہہ رہے ہوں گے کہ ”مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان محفوظ ہیں۔“ اسے کاش کسی زمانہ میں کسی مسلمان کا گھر اس کتبہ سے خالی نہ ہوتا۔ اسے کاش ہر مسلمان کا کان اس سے آشنا ہوتا۔ اسے کاش ہمارے اور ہمارے بعد کے واعظین، مقررین، مؤلفین اور

معاہدہ نکار اور مسلمان افروا سے ہر وقت اپنی آسکھوں کے سامنے رکھتے۔ جس خوبی سے بریڑ نے ایک بات کے سننے کے لیے ابن سعد کو تیار کیا تھا اس سے بہتر کوئی ترکیب ممکن نہ تھی۔ وہ بات حدیث رسول تھی۔ اور بات بھی ایسی اور اس موقع پر جب کہ ایک شخص اس کے گھر کے تباہ کرنے پر آمادہ ہے جس کی بدولت ابن سعد کا گوشت پوست اور موقع بٹا ہے۔ اور یہ بے مثل حدیث بھی اسی کے گھر کی بتائی ہوئی ہے۔

اثر ۹۔ ”ابن سعد دیر تک سر جھکائے رہا“ وہ محسوس کر رہا ہے کہ کس قوت نے اس کی گردن اور دل کو مرد و کر زمین کی طرف جھکا دیا ہے۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ اس کے دماغ پر ایک کندہ ضرب لگی ہے۔ بدحواس ہو گیا ہے۔ اور اس کے منہ کے الفاظ بھر گئے ہیں۔ دیر میں اس نے اپنے کو متحیر کیا۔ بالکل غریب تھا کہ ابن سعد بریڑ کے ہر لفظ کی تصدیق کرتا۔ موقع کے لحاظ سے انسانی نفس دوسرا عمل نہیں کر سکتا تھا۔ یہ ہو سکتا تھا کہ اقرار نہ کرتا لیکن اس وقت دوسری مکارانہ تصنع ہوئی جس سے نفس اور زبان کی حرکت میں مطابقت نہ کہی جاتی۔ تصدیق کے بعد ابن سعد کے اختیار میں تھا کہ اپنے ارادہ سے باز آتا۔ اور پھر اسے یہ بھی اختیار تھا کہ باز نہ آتا۔ اس نے دوسری صورت کو پسند کیا۔ اس لیے کہ اس کا ”دل حکومت اور فرماں روائی کی محسوس سے باز نہیں آتا تھا“۔

کھڑے ہو گئے بریڑ یہ ان کی نفس شناسی اور موقع فہمی تھی۔ بے کار باتیں اور بے سود کوششوں کا کوئی نتیجہ نہ تھا۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ ایک آدمی گمراہی پر مصر ہے اور اس کا ہٹنا اب محال ہے۔ اب انسان کے پاس اس موقع میں جس میں بریڑ تھے کوئی ترکیب نہ رہ گئی تھی۔ بریڑ بھی اگر کسی دنیاوی سلطنت کے وکیل ہوتے تو وہ بھی کسی شہر یا صوبہ کی حکومت دے سکتے اور اب ابن سعد کا منہ بند ہو جاتا۔ بریڑ حضرت کے پاس آئے اور شبہ نہیں بلکہ یقین کے ساتھ ابن سعد کی گمراہی کی اطلاع دی۔

لیکن بریڑ اپنی ایسی ہی کوشش سے جس سے انہوں نے قریب قریب ابن سعد کو بدل دیا تھا، باز نہیں آنے اور انہوں نے عاشور کی صفت کشی کے بعد بھی ایک کوشش کی۔ یہاں بھی میرے خیال میں تدبیر کا ایک ٹکڑا تھا۔ اور وہ یہ کہ پہلے بریڑ ابن سعد سے سوال کرتے ہیں کہ ”کیا تو امیر المومنین حسین سے جنگ کرے گا؟“۔ ابن سعد جواب میں ”ہاں“ کہتا ہے اور اسے سب لوگ سنتے ہیں۔ بریڑ حسین کے لیے داہنی کا سوال کر کے اب عامہ ناس کی طرف مخاطب ہو جاتے ہیں۔ اور وہ کچھ کہتے ہیں جسے انہوں نے اور اکثر لوگوں نے کہا تھا۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ یا تو ابن زیاد کا خوف اور یا ابن سعد کی تعلیم اور اکثر دشمنان اہل بیت کی دیکھ بھال تھی کہ کسی نے ان کے خطاب کا کچھ جواب نہ دیا اور دیا تو غیر معقول تھا۔

بریڑ میدان میں اس طرح گئے کہ زبیر بن معقل نے انہیں مکالمہ کے لیے بلایا اور گفتگو کی۔ تصفیہ اس پر ہوا کہ میاں کیا جائے۔ ایک دوسرے کو بددعا دے اور اللہ سچے کوچ اور جھوٹے کو شکست دے اور اس کے بعد جنگ شروع ہو گئی۔ زبیر کی کوشش نے بریڑ کا ہال بھی بیگانہ کیا۔ لیکن بریڑ نے وار کیا تو زبیر کا فوادی خود چاک ہو گیا۔ اور بریر کی تلوار کو بریر کا سر اس قدر پسند آیا کہ اس پر مضبوط بیٹھ گئی۔ ان کی یہ ضرب بتائی ہے کہ بریڑ صرف زاہد خشک اور عابد گوشہ نشین نہ تھے بلکہ مسلمان تھے جو ایک وقت منہزن، فرد کاسب اور صاحب اہل و عیال ہے۔ دوسرے وقت عابد ہے اور تیسرے وقت سپاہی ہے اور میدان جنگ میں حصول شہادت ہی کو اپنا فرض سمجھتا ہے۔ یہ صرف معمولی قوت کی ضرب

نہ تھی بلکہ اس سے مشائی ظاہر ہے۔ ابھی دشمن کے سرے تلوار کھینچ رہی تھی کہ ایک دوسرے نامرد دشمن ابن منذر نے اپنی شجاعت نمائی کا موقع پایا، اور برتر بر دار کیا۔ برتر نے تلوار زبرد کے سر میں چھوڑی اور ابن منذر کا ٹیٹوالید زور آسانی سے لے لگی، اور ہمارے جلد نے ابن منذر کو بھی زمین پر لٹا دیا۔ کمرے خیر کمال رہے تھے کہ ایک نامرد کعب بن جابر پشت پر پہنچا اور نیزہ مارا۔ یہ زخم کاری تھا۔ جواب دینے آئے تھے کہ اب کعب نے تلوار کا دار کیا اور برتر اس کے پاؤں اور چہرے کے متواتر زخموں سے شہید ہو گئے۔ ان کا قدس اور اس کی شہرت اس سے ظاہر ہے کہ قاتل کو اس کی سیوی نے ملامت کی اور آئندہ کے لیے اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ (کیا اچھے خاتمہ کی عورت تھی؟) اور خود قاتل نے ندامت میں شعر کہا اور ہلاک ہوا۔ ایک تنہا برتر میں ان کے مختصر واقعات سے ان خویوں کی قوی جھلک پائی جاتی ہے، جو ایک زندگی چاہیے والی قوم اور فرد میں ہونی چاہیے۔ یح غور، پاکیزگی نفس، حمیت اور ہمت۔

جابر بن عروہ قتاری

حسینؑ کس حالت میں تھے اور کبھی ذات تھی کہ ان پر گہوارہ کے بچے اور قبر میں پاؤں لٹکانے ہوئے بڑے قربانی کے لیے تیار ہوتے۔ صرف بڑھی عمر کا ششہ اپنے سامنے کر لو اور تم سب کچھ جانو گے۔ اگر جابر نے واقعہ بدر میں شرکت کی تھی تو اسے انٹھ برس ہوئے تھے اور اگر یہ قیاس کیا جائے کہ وہ بیس برس کے تھے جس وقت شریک ہوئے تو بھی وہ آج اسی برس سے کم نہ تھے۔ ایک ضعیف جس میں کوشش نہیں ہے، رنگ میں حیات نہیں ہے، خون نہیں، جوش نہیں ہے، کھڑے ہونے کی قوت نہیں ہے، اسٹھوں میں شوخیت سے مردنی چھائی ہے، کمر یا خم ہو گئی ہے یا مائل ہو گئی ہے۔ جس کی یہ میٹورانہ عمر اس کی عزت اور کھانا کے لیے کافی ہے۔ وہ کمر باندھ رہا ہے۔ نیزہ اور تلوار کھانے جا رہا ہے۔ احضار کا رخصتہ اٹھا کر تاجو کا کہ وہ نیزہ یا تلوار تمام سکے۔ لیکن اگر وہ اتنے بڑے تھے کہ اسٹھوں سے دیکھنے کے لیے پٹلیں اوپر اٹھا لیتے تو وہ میرے نزدیک سو برس کے قریب تھے۔ کب میدان جنگ نے وہ اندوہناک منظر دیکھا ہو گا جس وقت یہ بڑھا مہلہ دشمن کے سامنے کھڑا ہو گیا ہو گا۔ لیکن اگر یہ یا اس کا چوتھائی بھی میچ ہے کہ جابر نے اسی آدمیوں کو قتل کیا تو کچھ میں آسا ہے کہ بچے ہوئے چراغ کی روشنی آخری مرتبہ تیر ہو گئی تھی۔ روح جوش اور ہمت نے کبھی اس سے قوی تر آخری کوشش نہیں کی۔ میں باوجود کوشش کے بھی آسانی سے یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ بڑھا مہلہ اپنے خون میں لوٹا۔ اگر ایسے لوگوں کی کوشش بھی کسی قوم کے لیے مثال نہ ہو تو جدوجہد کی تاریخ ایک سلاہ ورق ہے۔

سوید بن مطاع

صاحب لہوت کے موافق ”بڑے شریعت اور نمازی۔ انھوں نے شیرانہ حملہ کیا اور خوب ہی لڑے۔ خوب ٹکلیوں پر صبر کیا۔“ ایسا لڑے جس کی مثال نہیں دی جاسکتی۔ وقت وہ ہے کہ ہزاروں آدمی کا ٹھانہ نعرے بلند کر رہے ہیں۔ اللہ اکبر کہہ رہے ہیں۔ قتل انھیں کا ظل ہے۔ اور یہ شور سوید کو جگاتا ہے۔ یہ زخمی اور ایسے زخمی تھے کہ دوست اور دشمن سب انھیں مردہ سمجھتے تھے۔ لاش اٹھتی ہے۔ حیات عود کرتی ہے۔ اب خود سوچو کہ یہ کیا سنتے ہیں۔ کیا اثر ہوتا ہے۔ کیونکر تلوار

ڈھونڈتے ہیں اور کس طرح لڑتے ہیں۔ ہم نہیں جانتے کہ اتنے وقت میں یہ حسینؑ کی لاش مظہر اور فریقہ مقدسہ کی طرح دیکھ سکتے تھے یا نہیں۔ رونے کے لیے ہاتھ رکھتا یا نہیں۔ یا مرنے کے بعد ان کی آنکھوں میں نمی دکھائی دی تھی۔ مطالعہ سید کی قریب المرگ حالت نے نہ خاصہ میں تغیر کیا تھا نہ روح کی قوت میں نسبتاً کمزوری پیدا کی تھی بلکہ اور خالص قوت کی چمک تھی۔ ختم ہو گیا ان اصحاب کا تذکرہ جس طرح پیش نگاہ رکھنے کا بچے فوجہ ممکن ہے کہ ان کے علاوہ کچھ اور ہوں اور میری نظر لپک گئی ہو۔ یا میری کئی وقت نے مزید شخص نہ کیا ہو۔ لیکن میں مطمئن ہوں اس پر جس قدر میں کہہ سکا۔ یہ اپنے وعدے پورے کر چکے۔ انہوں نے اپنی حیات تک اہل نبیؐ تک کوئی آغوش نہ آنے دی۔ پھر تھے جنہوں نے اپنے دلوں کو اپنی زہرہ اور استینوں پر پہن لیا تھا اور اپنی جان دینے کے لیے گرتے تھے۔ ان کا فرح تھا کہ یہ حسینؑ کے اصحاب ہوتے۔ اور ان کے جانکاه مصائب میں شرکت کرتے لیکن کسی سردار کا فرح تھا کہ اس کے ایسے رفقاء ہوتے۔ انہوں نے حسینؑ کا نام بلند کرنے اور ان کی وجہ کو قوت دینے میں اس طرح مدد دی جس طرح ممکن تھی۔ یہ حسینؑ کی طرح زندہ جاوید ہوتے۔ کون ہے حسینؑ کا نام لینے والا جو ان کا ذکر نہ کرے اور کون ہے حسینؑ کا زائر جو ان کی خاک قبر کو آنکھوں سے لٹکا اپنی عزت نہ کھے۔ کربلا کسی ایک یا چند قبروں کا نام نہیں ہے۔ بلکہ تمام شہداء کی ایک قبر ہے جس کی لوح مزار سید الشہداءؑ کی قبر مظہر ہے۔ چند اعزاز کا اور تذکرہ اور یہ باب تمام ہے۔

ایک ایک شائع کٹ گئی لیکن بڑی حفاظت کرتی رہی۔ آج اب کوئی نہ تھا جو بنی ہاشم سے کہتا کہ ہم اپنی زندگی تک تمہیں میدان میں نہ جانے دیں گے۔ کسے حق تھا کہ وہ بنی ہاشم میں سفیر حسینؑ کے فرزند کے پہلے جام شہادت نوش کرنے کے لیے آگے بڑھتا تاریخ نے بھی حرکت محفوظ رکھی ہے جہاں لکھا ہے کہ بنو عقیل دایہ کی صلاح اور مسلم کی شہادت سے کر ”اچھل پڑے“ اس کے معنی صلاح پر حیرت ہے۔ اس کے معنی فرزند ان مسلم کی کم عمری ہے۔ اس کے معنی ناگہانی چوٹ ہے۔ اس کے معنی ان کا جوش ہے۔ اچھل پڑنا جس کا عنوان تھا اس کا نفس مطمئن یہ تھا کہ ”واللہ ہم سرزمین کوہ کو اس وقت تک نہ چھوڑیں گے جب تک مسلم کے خون کا بدلہ نہ لیں گے۔ یا جیسے مسلم نے ذائقہ موت چکھا ہے ہم بھی نہ چھ لیں گے۔“ امید کے باہر جو تاگر بنو عقیل اس کے علاوہ کچھ کہتے بنو عقیل کو عقیل کی حاضر جوابی میں کافی حصہ ملا تھا۔ اور نہ جو کچھ انہوں نے کہا۔ اس میں کسی شبہ کی گنجائش تھی۔ سوچا نہیں جاسکتا کہ عموماً بنو ہاشم اور خصوصاً بنو عقیل سے زیادہ کوئی بے چین ہو گا کہ جلد لڑائی شروع ہو اور ہم مسلم کا بدلہ لیں۔ ان کی اندوہناک شہادت کا وقت گزرا یہاں تک کہ دنیا کا وہ یادگار وقت آیا کہ یہ چھوٹی سی مقدس اور خالص جماعت اپنے امام سے یہ سنتے کہ تم لوگ جانہ دشمنوں کو میری فکر ہے۔ تم سے کوئی تعرض نہ ہو گا۔ اور یہ سنتے ہی وہ جذبات بزرگ اٹھتے جو سینہ میں دبے تھے کہنے کو سب کہہ رہے تھے لیکن غالباً بنو عقیل کی صدا اس ہم آہنگی میں اس قدر ممتاز تھی کہ حضرت انہیں کی طرف مخاطب ہوئے اور پھر بنو عقیل کو کہتے سنا کہ: ”آپ سے علیحدہ ہو کر ہم لوگوں سے کیا کہیں گے؟“۔ لفظ اس استہقام کی شرح نہیں کر سکتے اور جی یہ ہے کہ میرے پاس اس سادی، بچی اور گہری حیرت کے کھلانے کے لیے مناسب لفظ ہی نہیں ہے۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ دل کڑھ گیا ہے۔ لہذا آتا ہے اور روٹی پیچ ہے جس سے جواب دیا گیا ہے۔ یہ ایک تنہا جذبہ محبت نہ تھا۔ محض جوش انتقام نہ تھا۔ حسینؑ کے شہس کی عظمت نہ تھی، بلکہ مجتہد تھا جس میں ایک لہر اپنے غلوص کی حفاظت کی تھی جو طے جانے کی صلاح

سے متروک ہو سکتا وہ کہہ رہے تھے کہ ہمارے گرد و پیش کے موت خیز سامانوں نے ہمیں جوش رقابت میں کمزور نہیں کر دیا ہے کہ اس صلاح پر عمل کریں۔ نہ مجھے اس کے بعد ان کے اور فقرات کی شرح کرنی ہے، جو ان کی شرافت ان کی غیرت اور ان کی حمیت کی تاریخ ہے۔ صرف یہ پھر یاد دلانا ہے کہ: ”اللہ تعالیٰ اس میٹھ کو نہ دکھائے جو آپ کے بعد ہم کو ملے۔“ وہ وقت آگیا جس کے یہ منتظر تھے۔ بازار شہادت گرم ہوا اور اجازت خواہی کے وقت اوپر اٹھے ہوئے شوق کی تکرار تھی۔ حسینؑ نے بھانجا کو مرنے کی اجازت دے دی۔ عبد اللہ بن مسلم چلے۔ اب انھیں فکر نہ تھی کہ کوئی روتا ہوگا۔ یہ خوش خوش میدان کی طرف جا رہے تھے اور رجز پڑھ رہے تھے۔ ان کا رجز ایسے افتخار کا اظہار نہ تھا جو ان میں نہ تھا۔ بلکہ عین واقعہ تھا کہ ان کے بنی ہاشم، فرزندان رسولؐ اور شیر خدا کی نسل میں ہونے سے انکار تھا۔ لڑے جس طرح بنی ہاشم کو لڑنا چاہیے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ کتنے زخم کھائے لیکن موت کی ظاہر وجہ ایک نیزہ اور دور کے تیر کے زخم سے ہوئی۔ ایک کلی جو ابھی کھلی تھی۔ نہ تھی۔ فلاں سے کھل گئی۔ حسینؑ اس نوخیز کی خون آلود لاش پر پہنچے جس کے گرم خون سے ابھی بھل لک رہی تھی۔ ”دارالامان“ کی تسکین دی۔

جعفرؑ، عبد اللہؑ، موسیٰؑ اور عبد الرحمنؑ بن عقیلؑ۔ ان کی شہادت میرے زیادہ تر متذکرہ صدر ریمارک کے ذیل میں ہے۔ ان میں سے ہر ایک اس طرح لڑا کہ دشمن کی کثیر تعداد کو قتل کیا۔ ہر ایک رجز پڑھتا تھا اور میدان جنگ میں دشمنوں کی حیات سے کھیلا تھا۔ یہ کہتے تھے اور ثبوت دیتے تھے کہ اے دشمنو! تمہیں تلوار اور نیزوں سے ماریں گے۔ اور اہلی بیتؑ اور امام انس و جان کی حفاظت کریں گے۔ شام کے لشکر میں بجلیاں چلیں، اور ہر ایک نے اپنے نامقابلہ جوش، بے جگری اور ہمت کا ثبوت دیا۔ مثال دی کہ ہم اپنی خاموشی اور بے تعلقی میں بھی اپنے تمام احساسات کو قائم رکھتے ہیں۔

(اولاد عقیل کی یحیٰ تعداد کی تلاش میں میں عمدۃ الطالبؒ فی انسب آل ابی طالبؑ کو ملتا ہوں۔ اور اس میں مولفؒ کہتا ہے کہ عقیلؑ کے بعد یزیدؒ بن محمد بن عقیلؑ کے کوئی نہ تھا۔ مسلم بن عقیلؑ کو فہ میں شہید ہوئے اور ان کا سلسلہ متعرض ہو گیا۔ اس کے بعد محمد بن عقیلؑ کا سلسلہ دیتا ہے جس میں کوئی حضرتؑ کے ساتھ شہید نہیں ہوا۔ اور نہ حضرتؑ مسلم بن عقیلؑ کی کسی اولاد کا تذکرہ کرتا ہے۔ ان سطروں کے لکھنے کے وقت مولفؒ کے پاس انسب میں کوئی اور کتاب نہیں ہے۔ جس سے مزید تفتیش کی جاتی۔ اس صورت میں اپنے اس سلسلہ بیان کو جو میں نے اوپر لکھا ہے غالب اور قوی قرآن کی وجہ سے قبول کرتا ہوں۔ یزیدؒ اس شبہ کے کہ جو نام لکھے گئے ہیں ممکن ہے کہ نام اور کنیت دونوں معلوم نہ ہونے کی وجہ سے مؤرخین نے نام اور کنیت کے ایک ہی شخص کو علیحدہ لکھا ہو۔ حالانکہ شخص ایک ہی ہو) پوچھا جاسکتا ہے کہ کیا حضرتؑ کے صرف ایک صاحبزادے میدانِ کربلا میں شہید ہوئے اور میرا جواب غالباً اثبات میں ہوگا۔ اور اس سے سوال ہوگا کہ آیا حضرتؑ کے فرزندوں کے متعلق اس روایت کی کیا نوعیت ہے کہ وہ کوفہ میں بعد شہادت حضرتؑ مسلم شہید کیے گئے یا صاحبِ بکار کے موافق بعد واقعہ کربلا حضرتؑ کے دو صاحبزادے گرفتار ہوئے اور ایک برس قید رہے۔ خود صاحبِ بکار نے اس کا تصفیہ نہیں کیا ہے کہ وہ پسرانِ حضرتؑ تھے بلکہ انھیں پسرانِ حضرت جعفر طیارؑ بھی کہا ہے۔ اب یہ امر ہے کہ آیا حضرتؑ کے صاحبزادے حضرتؑ کے ساتھ کوفہ گئے اور وہ حضرتؑ کے بعد شہید ہوئے۔ نہ صرف اس کا معتبر تذکرہ نہیں ہے بلکہ ایک متعرض کے نزدیک بہت سی قابلِ اعتراض باتیں ہیں۔ مثلاً

- ایسی حالت میں جس میں حضرت مسلمؓ روانہ کوفہ ہوئے تھے یہ بہت کم قرینہ ہے کہ انہوں نے دو چھوٹے بچوں کو اپنے ہمراہ رکھا ہو۔
- موضع منیق سے اگرچہ مصائب سفر اور ناپائیدار آب کا خطر آتا ہے لیکن کہیں بچوں کا تذکرہ نہیں ہے۔ اگر ساتھ ہوتے تو یقیناً ایسی حالت میں واپس کر دیے جاتے۔
- پسرانِ مسلمؓ کا نہ صرف حضرت مسلمؓ کی روادگی کے وقت کوئی تذکرہ نہیں ہے بلکہ دارِ عقاد، دارِ ہائی، طوص یا کہیں حضرت مسلمؓ کی حیات میں کوئی تذکرہ نہیں ہے۔
- حضرت مسلمؓ کی شہادت سن کر اگرچہ جو عقیل متاثر ہوتے ہیں لیکن کہیں کوئی پسرانِ مسلمؓ کو نہ دریافت کرتا ہے نہ ان کی کوئی خبر ہے۔ حضرت سے بھی اگرچہ یہ روایت ہے کہ حضرت مسلمؓ کی صاحبزادی پر اظہارِ نوازش فرماتے ہیں لیکن بچوں کا کہیں تذکرہ نہیں کرتے۔
- حضرت مسلمؓ اگرچہ اپنی شہادت کے وقت دستیں فرماتے ہیں لیکن کہیں اس کا تذکرہ نہیں کرتے کہ میرے بچوں کی حفاظت کرنا یا انہیں حسینؑ کے پاس پہنچا دینا۔

ہو سکتا ہے کہ کچھ اور سلسلہ واقعات جو جس سے پسرانِ مسلمؓ کی شہادت ثابت ہو۔

اب میں اولادِ حضرت جعفر طیارؓ کے تذکرہ پر پہنچتا ہوں۔ صاحبِ عمدة الطالب پھر ایک طیمرہ سی ہفت کہتا ہے کہ حضرت جعفر طیارؓ کے دو لڑکے ”عون و محمد فقطلا مع عمہما الحسنین علیہ السلام یوم الطف“۔ یہ ابنِ خلدون، کامل ابن اثیر، روضۃ الصفاء، نور العین اور کشف الثمہ وغیرہ کے منافی ہے جن مؤرخین کے نزدیک عون و محمد پسرانِ عبداللہ بن جعفر تھے نہ پسرانِ جعفر طیارؓ۔ اور میں یہاں بھی ان آخر الذکر مؤرخین کے قول کو قبول کرتا ہوں۔

محمد بن عبداللہ جعفر اور عون بن عبداللہ جعفر

مجھے صرف اس قدر کہنا ہے اور بس کہ یہ حضرت جعفر طیارؓ کے پوتے تھے اور غالباً میں اس سے ان کی تمام اخلاقی اور شہادۂ توریث اور خاصہ کو کھجادیتا ہوں۔ میں حضرت جعفر اور حضرت عبداللہ بن جعفر کے مفید تذکرے کر چکا ہوں۔ اتنا اور کہہ دوں کہ کربلا کے ان نوغیر شہیدوں کی ملامت گراہی حضرت زینبؓ خاتونِ قصیم۔ ان کی عمر کے متعلق میری کوئی ذاتی تحقیق نہیں ہے۔ لیکن غالباً ان کی عمر بھی حضرت علی اکبرؓ کی مشہور عمر اور یا کم و بیش حضرت امام زین العابدینؓ علیہ السلام کی عمر ہوگی۔ غالباً تیس برس کا اوسط آسانی سے قبول کیا جاسکتا ہو۔ صاحبِ کشف الثمہ کے موافق محمد بن عبداللہ نے دس دھن قتل کیے۔ ”خویشین رادر میان احد الکند“ اور عون بن عبداللہ بن جعفر نے تین سوار اور آٹھ پیادے قتل کیے۔ ابو نعیم جیسا میں پہلے کہہ چکا، ان کے مقتولین کی تعداد اسی بتاتا ہے۔ جو کچھ بھی ہوان کی ذات میں نسباً وہ سب تھا جو عرب کے نزدیک بہترین فخر کے قابل تھا۔ اور ان کی خصوصیات جن سے وہ متاثر تھے وہ قصص جن سے اہل عالم کی بہترین پسند اعراف نہیں کر سکتی۔ سوچو کہ لوگ ان کے رجز اور ان کی موجودگی سے سوچ رہے ہوں گے کہ جعفر طیارؓ کے پوتے میدان میں آئے ہیں۔ نتیجہ نہ ہی لیکن لوگ سوچ سکتے تھے کہ اسلام کے کس پہلار کے پوتے ہیں اور حضرت جعفرؓ تو ایسے زمانہ میں نہ تھے

جب کہ سیاسی و صلوں کا زور شور اور حسد و عداوت کی لہری کسی خاص کنارے سے لگرائی ہوں۔ کم سے کم حضرت جعفر کی ذات وہ نہ تھی جس سے کوئی ایسی لہر لگرائی۔ لیکن کیا یہ علیؑ کے نواسے نہ تھے؟ اور کیا یہ حسینؑ کے لیے اس وقت نہ لڑ رہے تھے۔ ہون کہہ رہے تھے:۔

اقامت داخل الجنة موالیا لاجد و السنة

لڑ رہے تھے کہ جنت میں داخل ہوں اور حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ اور سنت کا حق ادا کریں۔ اسی لیے آئے تھے۔ راستہ میں ملے تھے۔ شاید باپ نے بھیجا ہو۔ شاید ماں کی محبت پہنچ گئی ہو لیکن کسی صورت میں ان سے حضرت کا موقع پوشیدہ نہیں رہ سکتا تھا۔ خصوصاً ایسے شخص سے جن سے حامل نے خط و کتابت کی ہو اور وہ جسے معاویہ حسینؑ کا رقیب بنانے کے لیے کوششیں کر رہا تھا۔ اس سے میری غرض یہ ہے کہ یہ لوگ سردار قبیلہ کی قسمت کی شرکت کے خیال سے خالی نہ تھے اور تمام ان مشکلوں کے لیے تیار تھے جو اس فرض کے ادا کرنے میں پیش آئیں۔ ان کی ابتداء اگر پوشیدہ بھی ہو تو انتہا نے ان کی غرض ظاہر کر دی۔ اس وقت جس وقت یہ اس بہترین خلعت کو پہن کر کربلا کی سرزمین پر سونے۔ ایسی نیند جس سے بھر نہ چو سکے۔

میں اس کے پیشتر حضرت عبداللہ بن جعفر کے صبر آسا مواقع کے متعلق کہہ چکا ہوں جو کچھ میرا شکستہ قلم کہہ سکتا تھا لیکن حقیقت میٹوں کی شہادت سے ان کا ایسا امتحان ہوا جس کا دشمن کی سیاسی نمائشوں اور فریبوں سے امتحان کا مقابلہ نہیں کیا جاسکتا۔ یہ ایک چوٹ تھی جو سید محی دل و دماغ پر لگی تھی۔ اس وقت جب کہ ادھر ہو گئے تھے امتحان ہوا لیکن حضرت عبداللہ بن جعفر نے بڑھتے ہوئے صبر اور برداشت سے اس کا مقابلہ کیا اور جس طرح مقابلہ کیا اس میں کسی تصنع کی گنجائش نہ تھی۔ کیونکہ وقت نہ ملتا تھا کہ سنبھلتے اور سنبھل کر کچھ کہتے۔ نہیں، خبر سنی، چوٹ کھائی، غلام نے خوشلد کی۔ خوشلد پر طیش آیا۔ اور ساتھ ہی منہ سے نکلا کہ: اگر میں ہوتا تو دوست رکھتا کہ ان کے ساتھ مارا جاتا۔ یہ وہ بات ہے جو فوج سے میرے نفس کی سلامت کرا سکتی۔ اگر میں نہیں تھا تو میرے بیٹے حسینؑ کے ساتھ تھے۔ ان فقرات کے قبل کی حالت ابی مخنف کے الفاظ میں خوب ادا ہوئی ہے کہ: "فجذبہ عبداللہ بن جعفر و ضربہ بصلہ ثم قال یا بن اللخنأ تقول بالحسین مثل هذا الكلام"۔ یہ تھے حضرت عبداللہ بن جعفر۔ ان کا ایسا ہونا ان کے خاندان کے لحاظ سے عجب خیز نہ تھا لیکن سوچو کہ یہ اپنے خاندان کے قوی تر روشنی کے مہر و ماہ (جناب رسالت مآب اور امیر المومنین) سے علیحدہ کر کے افراد عالم میں کیسے روشن جسم تھے۔ اسلام ایسے خاصوں پر فخر کرتا ہے۔ اسلام ہی نے انھیں ایسا بنایا تھا۔

عبداللہ بن حسنؑ

اسلام کے شاہزادہ صلح کا فرزند۔ اگرچہ میرا قوی میلان یہ ہے کہ انھیں کا نام احمد بن حسنؑ تھا۔ لیکن میں اس جگہ عبداللہ بن حسنؑ پر نظر کرتا ہوں جس حیثیت سے اعظم کوئی اور روضۃ الشہداء وغیرہا سے اس نام کے واقعات لکھے گئے۔ میدان جنگ میں چاند نکل آیا۔ خوب صورت ہاشمی مبارکباد گھوڑے پر بلند تھا جس میں حسنؑ کی شیرینی اور وقار اور علیؑ کی شجاعت تھی۔ جوانی نہیں شباب کی بے مینی اور جوش۔ جنگ کا پہلا حوصلہ۔ چہرہ پر فطری مسکندگی نہیں بلکہ گزشتہ اندوہناک دنوں کے

آٹار۔ ترم خیز حریر یا۔ حتمیں دیکھ کر خیال ہو کہ ابھی یہ اس قابل نہ تھے کہ زمانہ ان کے چاند سے چہرہ پر اپنے فشار کا نقش کرتا۔ لیکن وہ میدان میں تھے۔ سخت مستقل، تندہ اور آلودہ جنگ۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ ہم نو عمری میں بھی وہ تمام صفات اپنے میں لیے ہیں جن کے لیے بنی ہاشم مشہور ہیں۔ نا تجربہ کار ساری نگاہیں بدلیں ان میں دشمنوں کے قتل کا کھس آیا۔ چاند اور کالے بادلوں کی جنگ شروع ہوئی۔

کچھ حسدیت نہیں ہے اگر اس ہاشمی نورس سے یہ رم اور ایثار ظاہر ہوا ہو کہ اپنے گھسہ کے ایک خادم (فیروز دان) کو زخمی دیکھ کر گھوڑے پر سوار کر لیا اور خود پیدل چلے گئے۔ (اگر وہ شہید کی واقعہ نگاری صحیح ہے) اور اسے پہلوروں کی موت مرنے ہوئے دیکھ کر آسمانیں ڈبڈبایا کرتے ہیں۔ عبداللہ بن حسن کی مطلق جنگ باعواس اور پھر قیامت ساتھ ہی قلیل ضرب دشمنوں کو بہت دنوں یاد رہی ہوگی۔ کچھ دیر کی جنگ میں کتنے تیر، نکلوار اور نیزوں کے زخم لگے ہوں گے اور کس طرح مصاحت خون آلود ہوتی جاتی ہوگی اور پھر سرخی گہری ہوتی جاتی ہوگی۔ لیکن تازے زخموں سے خون کی نہ کتنی ہی دہیز کیوں نہ ہوتی جاتی ہو۔ مغرور دماغ اور شجاع دل ابھی آخری حرکت تک اس سے انکار کرتا رہا کہ وہ صحت سے مغلوب ہوتا۔ ضرب کی آخری قوت بھی دشمن پر صرف کی گئی۔ یہاں تک کہ بے رم موت نے اپنا اثر شروع کیا۔ حسیں کے منہ زندگی لاش آ رہی ہے۔ اس نے حسیں کی نگاہوں میں کوئے واقعت کو زندہ کر دیا ہوگا۔ اور خیالات کا کس قدر مجموعی سلسلہ ہو گا جس سے حسیں محسوس کر رہے ہوں گے کہ ہم رو رہے ہیں۔ وہ لہریں دماغ پر اپنا اثر کر رہی ہوں گی۔ جن سے بڑھ کر کوئی ضرب تکلیف دہ نہیں ہے۔

احمد بن حسن

یہ عبداللہ بن حسن تھے یا نہ تھے، میرے تمام ریمارک وہی ہیں جو میں کر چکا ہوں۔ اتنا ہے کہ حسیں کے استیغاثہ کے وقت یہ خیمہ میں تھے۔ چپاکی آواز سن کر دوڑے آئے۔ ”لیک لیک“ کہتے ہوئے کہہ رہے تھے کہ ہم موجود ہیں۔ حکم دیجیے۔ اور حسیں فرار ہے تھے حملہ کرو۔ اور اپنے جد کے حرم سے دشمنوں کو دُور کر دو۔ رجز پڑھتے ہوئے حملہ کیا۔ اسی دشمنوں کو قتل کر کے اس طرح دایم ہوئے کہ پیاس سے آسمانیں جنس گئی تھیں۔ پانی مانگتے ہیں۔ اس لیے کہ ”خدا درویش کے دشمنوں سے جنگ کی قوت آجائے“۔ حمایت و جرح کا بڑا جوش تھا۔ لیکن ان کے قلب کی قوت زیادہ تر اس سے ظاہر ہے کہ وہ چچا سے جواب سنتے ہیں کہ: ”ذرا صبر کرو یہاں تک کہ اپنے نانا رسول اللہ سے مل جاؤ۔ وہ تمہیں پانی پلائیں گے جس کے بعد تم پیاسے نہ ہو گے“۔ ساتھ ہی پلٹ پڑے۔ ہمت پست نہ ہوئی۔ پھر رجز خوانی کی قوت آگئی اور ایک مرتبہ پچاس اور پھر ساٹھ دشمن قتل کیے۔ ممکن ہے کہ تعداد مقتولین میں راوی نے مبالغہ کیا ہو۔ نہ اس وقت نہ اس کے پہلے اور نہ بعد میں۔ میں تعداد پر مصر ہوں۔ بلکہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ اپنی اس حالت میں کس طرح لڑتے تھے۔ اس سولہ برس کے بچے نے جس صبر و اطمینان سے زخم کھائے اور جس تسلیم و رضا سے موت کی طرف سبقت کی وہ اپنے گھر کے روایات کی تصدیق تھی۔ یہاں تک کہ حسیں کا یہ نونہال بھی بے رم موت کی گود میں سو گیا۔

حسن شہ

قالا حضرت امام حسن علیہ السلام کے سب سے بڑے فرزند، شہید کربلا کے دلداد جنگ کی اور سب نے کہا کہ شہید ہو گئے۔ لیکن دشمنوں نے جس وقت شہداء کے سر کاٹنے چاہے یہ زندہ ہائے گئے۔ علاج کیا گیا اور اچھے ہو گئے۔ اگر ایسا ہے اور ان کی نہانی اس واقعہ عظیم کی روایتیں محفوظ ہوتی تو وہ واقعت کربلا کے کھنے میں مصیبت ہوتیں۔

قاسم بن حسن

ایک چودہ برس کا خوبصورت بچہ۔ ابھی زرہ پہننے کے قابل نہیں ہیں۔ غالباً گھوڑے پر بھی نہیں ہیں۔ فلین پہنے ہیں۔ اور ایک کرتہ ہے اور تیروں تلواروں اور نیزوں میں جانا ہے۔ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ اب تک انھیں یہ تجربہ نہ ہو سکا تھا کہ زخموں اور انسانی جسم میں کیا تعلق ہے۔ کیونکر خوبصورت جسم قیمہ ہو سکتا ہے اور پھر کیا صورت ہوتی ہے۔ تجربہ تھا۔ ہو چکا تھا۔ چند گھنٹوں میں۔ لیکن چچا کو اس حالت میں دیکھ کر حکم چاہتے اور حکم ملتا ہے۔ دوڑتے ہیں گویا میدان میں چوگان کھیلنے چلے ہیں۔ انھیں سے کسی وقت حضرت پوچھتے ہیں کہ: ”موت کیسی معلوم ہوتی ہے“۔ اور یہ غلط امید (ایک بچہ کے لحاظ سے) جواب ملتا ہے کہ: ”شہد سے زیادہ شہیں“۔

کوئی قوم و مذہب جس کا کوئی اتنا بڑا بچہ قربانی کو اس خوشی سے قبول کرے جیسے کے قابل تھی۔ چاہے کہ انھیں کی وجہ سے زندہ رہے۔ ابھی تو قاسم اس قابل نہ تھے کہ تلوار اٹھاتے۔ لیکن زمانہ نے مجبور کیا تھا۔ ایک بڑی وجہ نے مر جانے کا وہ ذوق پیدا کیا تھا جو قاسم کی آنکھوں سے ظاہر ہے۔ اور جب تلوار اٹھائی تو تلوار کو فریاد کیا کہ ہم قاسم کے ہاتھ میں ہیں۔ قاسم کے اس فقرہ میں نہ صرت باوجود کم سنی کے حضرت قاسم کا شخص ہے بلکہ وہ تمام اسباب ہیں جن میں حضرت قاسم کے خصائل کا نشوونما ہوا تھا۔ بلکہ پورا تھا۔ ایک دوسری بات یہ تھی کہ حضرت نے رخصت کے وقت قاسم کا گریبان پاک کر دیا تھا۔ چاند سا سینہ کھلا ہوا تھا اور دشمنوں کے خوفناک حربے دیکھ رہے تھے۔ کیا قاسم کی یہ صورت اور اس طرح میدان میں جانا اس قابل نہ تھا کہ انسانیت اور شجاعت رحم کا خیال کرتی۔ رحم؟ اور پھر یہ کیسے کہ میں آتا کہ انسان ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ وہ ایسے ظلم بھی کر سکے۔ اور تمام احساسات شرافت اور انسانیت سے منہ پھیر لے۔ قاسم کو دیکھ لو۔ یہ چھوٹا سا جسم ایک لختہ خون ہو رہا ہے۔ آخری وقت ہے اور قاسم اڑیاں رگڑ رہے ہیں۔ موت سے آخری جنگ ہے۔ لاش سرد ہوا چاہتی ہے۔ حسینؑ سر ہانے ہیں اور یہ اند دھناک منظر دیکھ رہے ہیں۔ کیا لاش تک پہنچنے میں سواروں کی آمد و رفت سے قاسم کی لاش پامال ہو گئی تھی۔ پشت پر کیوں لاش گئی۔ کیا ایک پشمارہ بنایا تھا۔ عبرت خیز بغل گیری۔ دیہی جسم بے رخصت کے وقت گرم دیکھا تھا۔ اس وقت سرد اور نم پارہے تھے اور اس کی سرخ نمی حسینؑ کے جسم اور کپڑوں پر منتقل ہو گئی تھی۔ حضرت امام حسنؑ کی بولاد میں اب کوئی تلوار اٹھانے کے قابل نہ رہا۔ شہید ہونے کے قابل نہیں۔ تلوار اٹھانے کے قابل۔

عبداللہ بن علی، جعفر بن علی، عثمان بن علی، محمد بن علی، ابوبکر بن علی

یہ فرزند تھے اس کے جس نے دنیا کو شریفانہ شہادت کا اصول سکھایا۔ جو شہادت کا باپ تھا۔ یہ لوگ نوجوان تھے۔ میں سے چھ برس تک کے۔ میدان میں گئے۔ حسینؑ کے علمدار نے انہیں یاد دلایا کہ وقت آگیا۔ انتظار کا وقت گنا۔ پے درپے میدان میں جانے لگے۔ اور ایک سلسلہ تھا کہ عباسؑ اور حسینؑ نے جماعتوں کو یکے بعد دیگرے لڑتے اور گرتے دیکھا۔ علیؑ کے پھول خون کے چھینٹوں سے میدان جنگ میں کھلے۔ علیؑ کے فرزندوں کے لیے اس سے کوئی بڑا حوصلہ نہ تھا۔ خصوصاً جب کہ فرزند رسولؐ پر قربان ہونا سرفروشی کی غرض ہو۔ علیؑ کا نام، علیؑ کا جسم، علیؑ کا خیال، علیؑ کا شخص اس لیے قائم ہوا تھا کہ وہ ہادی عالم اور ان کے اصول کے لیے غفلت نمانوں میں۔ اپنے کو قربان کیا کرتا۔ میدان کر بلا میں ان کے یہ فرزند شہید نہ ہوئے تھے بلکہ ان کا نام زندہ ہوا تھا۔ علیؑ نے اپنے کو یاد دلایا تھا۔ یاد دلانے کا سامان چھوڑتے گئے تھے اور یہ سامان ایک ذخیرہ ہے جو قیامت تک فروغ نہ ہوگا۔ اس روز ختم ہو گا جس روز اسلام اور اس کی ضرورت ختم ہوگی۔

عباسؑ بن علی

حسینؑ کے لشکر کے علمدار بچوں کے ساتھ وہ ذات جو اس طرح دنیا میں آئی کہ شجاع باپ میں ایک شجاع فرزند کا حوصلہ تھا۔ اس کے علاوہ میں نہیں جانتا کہ حکیم الاسلام کو اور کونسی وجہ داعی ہوئی کہ وہ ایک شجاع فرزند کی خواہش کرتے۔ یقیناً ان جناب کی شہادت پر دور نگاہ میں کچھ کام اور بڑھتی ہوئی ضرورتیں ہوں گی جس سے ایسے نفوس کی موجودگی لازم ہوگی۔ اس سے یہ نہ بھنا چاہیے کہ حضرتؑ کو اپنے اور فرزندوں کی شہادت کے متعلق شبہ تھا۔ حاشا۔ زمانہ آیا کہ حضرت محمد بن حنفیہؑ نے اپنے کو اپنے شجاع باپ کا شاہیان فرزند ثابت کیا۔ جناب امیرؑ نے انہیں کوئی پر سختی سے کسا۔ اور حسینؑ اپنی فطری خواہش اور میلان سے شریک جنگ ہونے اور اس نادر سپاہی کا اعتراف حاصل کیا جس کا نام مالک اشر تھا۔ لیکن غالباً حسینؑ ہی کی ذات میں جناب امیرؑ کی خواہش کامل ہے۔ نواسہ رسولؐ، رسولؑ کی یادگار۔ جناب امیرؑ کا وہ بے مثال لحاظ جو سرور کائنات کے متعلق تھا وہ نہیں چاہتا کہ ان کی کوئی لسانی ان کی نگاہ کے نیچے یا خیال کے سامنے (وہ کوئی زمانہ ہو) مورد ہلاکت ہو۔ خصوصاً جب کہ رسولؑ کی کوئی لسانی حسینؑ کی ایسی جو جن سے رسولؑ اور اسلام کا مستقبل وابستہ ہو۔

عباسؑ پروری سلسلہ سے عید منات تک پہنچتے تھے۔ اس کے علاوہ ان کی ذات کو یہ روایتی خصوصیت حاصل تھی کہ میرے وجود پر میرے باپ کی اس خواہش کا کس ہے کہ یہ منہ زند شجاع ہو۔ کیوں؟ شاید عباسؑ جانتے ہوں۔ لیکن سپاہی اکثر، مصلح کی کچھ نہیں دوڑتا۔ (قبول میر حبش کے کہ "ممن مرد ککاش نیستم اگر بے یک ضرب ہارہ نہ کم دست مرا بربند") اس کا نتیجہ یہ تھا کہ عباسؑ اپنے ہوش کے زمانہ سے شہادانہ تربیت کے تابع تھے اور ان کا تشو و فسا اس خیال کے سایہ میں ہو رہا تھا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ عباسؑ کے اندازہ حرکات، لہجہ اور قیام پر اس کا اثر پڑا تھا۔ لیکن یہ نہ بھولنا کہ علیؑ کا دم و کرم مخلوقات کا لحاظ اور خدا کا خوف ان میں کم تھا۔ نہیں کوئی اسلام کا سپاہی نہ کہا جائے گا جس میں شہادت کے ساتھ شرافت اعمال نہ ہوگی۔ حیۃ شہادت شرافت اعمال کا ایک بہترین حصہ ہے۔ اس میں

حضرت امام جعفر الصادقؑ کے ایسے بزرگ کا یہ قول بھی ختم کر لو کہ حضرت عباسؓ بہت ہی صاحب بصیرت اور پختہ ایمان تھے۔ بصیرت اور ایمان کا کسی میں ہونا اور وہ بھی ایک عقد جس حکیم اور فلسفی کی زبان سے ایک سند ہے جس کے مقابلہ میں زیادہ وزنی شہادت طلب نہیں کی جاسکتی۔ ابواسحاق اسفہانی نے ایک نہایت ہی عمدہ کلام محفوظ کر رکھا ہے جو مجھے حضرت عباسؓ کی مصوری میں مدد دے گا کہ حضرت ماردان مدین سے فرماتے ہیں کہ: ”میں اپنی شرافت، عظمت، دینداری، نفس کشی، دشمن شناسی، شجاعت، مقابلہ آرائی، تیغ زنی، جفاکشی اور شکر و توکل میں مشہور ہوں۔“

ان باتوں کے ساتھ بلند بالا اور قوی سبیل تھے۔ عباسؓ کا ذکر یہیں تمام نہیں ہو گیا بنی ہاشم بالعموم خوش شکل اور خوش لہجہ ہوتے تھے اور جن میں ایک قوت جذبہ کا درشہ تھا۔ ان میں عباسؓ اس قدر ممتاز تھے کہ ”قمر بنی ہاشم“ کہے جاسکتے۔ صاحب عہدہ الطالب کے نزدیک حضرت کی عمر چونتیس برس کی تھی۔ اور اعظم کوئی کے موافق امیر المومنینؑ نے حضرت ام البنینؑ سے کوفہ میں عقد کیا۔ اس لحاظ سے حضرت کی عمر قریب ۲۵ برس کے تھی۔ اس لیے یہ صفت بھی میں آتا ہے کہ ابھی جوانی کے دن بھی پورے نہ ہونے تھے۔

انتا کہنے کے بعد اب مجھے دکھانی دیتا ہے کہ حضرت عباسؓ اپنے بھائی کی آواز سن کر ان لوگوں میں سب کے آگے تھے۔ حصین حضرت ولید کے دروازہ پر بٹھا گئے تھے۔ تلوار لیے ہوئے۔ اس ناقابل تیغ عزم کے ساتھ جس کے مقابلہ کی جرات اس میں ہو جسے اتفاقات نے عباسؓ کا ایسا بنایا ہو۔ کون تھا جو ایسا ہوتا۔ میں یہ بھی دیکھ رہا ہوں کہ اہل بیت کا قافلہ مدینہ سے کوچ کر رہا ہے اور اس وقت یا تمام راستہ میں عباسؓ کیا کر رہے ہیں۔ ہر وقت ہوشیار، مستعد، خطرہ پر ٹوٹ پڑنے کے لیے بے چین۔ حر سے گرم کلام اور عباسؓ حسینؑ کے سامنے آنے جاتے ہیں اور گویا پوچھتے ہیں کہ کیا عباسؓ موجود نہیں ہے؟۔ آپ حکم کیوں نہیں دیتے پھر دیکھیے کہ کر کیا ہوتا ہے۔ حسینؑ عباسؓ کی گرمیاں دیکھتے ہیں پیار سے مسکراتے ہیں اور آنکھوں میں کہتے ہیں کہ ابھی صبر کرو۔

یہاں تک کہ وہ مشہور دن آگیا جس کا ہانگ بھی اگر قوموں میں ہو تا تو انھوں نے اس کے یلغار رکھنے کے لیے اہتمام کی طرح اہتمام کیا ہوتا۔ آٹھویں تاریخ پانی لانے کا حکم ہوا ہے۔ اور عباسؓ کے پہلا پرچاس اس عزم کے ساتھ روانہ ہوتے ہیں کہ ہزار ہا دشمن سے گھلاٹ چھین لیں گے۔ تیس پیادے اور تیس سوار مشکوں سے سجا جا رہے ہیں۔ پیادے پیادوں کے وکیل اور سقا فرات کو دیکھتے ہیں اور دشمن کی مداخلت ہوتی ہے۔

اس چھوٹے سے لشکر میں حکم کی صدا بلند ہوتی ہے کہ: ”پانی مبرلو۔“ بجلی دوڑی، تلواریں برسیں، راستہ صاف ہوا۔ اور خشک مٹیوں بے صبری سے پانی پینے لگیں۔ یہ سوچنا ممکن ہے کہ عمر بن حجاج الزبیدی چپکا قند دیکھ رہا تھا۔ جب کہ بزور خمیر پانی لینے پر بات آئی تھی۔ صرف یہ ہو سکتا ہے کہ تمام لشکر جو محافظات تھا وہ دفعہ تیار نہ ہو گیا ہو۔ عباسؓ اور ان کے سوار کیا کر رہے ہیں۔ رجز پڑھ رہے ہیں۔ اپنے سواروں کے ساتھ مستعد ہیں۔ کسی اہل رسیدہ نے حرکت کی اور اس پر ٹوٹ پڑے۔ عباسؓ کو بھی اتنی مہلت ملی کہ اب داہنے ہاتھ میں بجائے تلوار کے پانی ہوتا۔ کیا اب اس پانی کی وقعت بڑھ گئی تھی؟ کسی دریا کی عزت تھی کہ اس پر قبضہ کیا جاتا اور ایسے فاتح سیراب ہوتے۔ نہیں۔ صرف چلو میں لے لیا تھا۔ قبضہ دکھانا منظور ہو۔ اس کے بعد ہی فرماتے ہیں: ”والله لا ذقت الماء وسیدی الحسین عطشان۔“

واللہ نہ پیوں گا میرے سید حسین پیاسے ہیں۔ دوسرے انداز میں میں پیوں اور حسین پیاسے ہوں؟ دم دی الماء۔ بس پانی پینک دیا۔ گھاٹ سے نکل آئے۔ اور مشک عہاٹ کے کاندھے پر تھی۔

احسن اسے بہادر پچاس! تجھ سے چلو۔ لیکن تمہاری منانت اور بلندیٰ فر طلب نہ تھی۔ دوڑو۔ دوڑو۔ کوئی پیاسا بچہ گرنے جانے۔ جلاؤ۔ ان کا بھولا بھٹم تمہاری بہترین داد ہے۔ ان کی سیرابی تمہارا بہترین صلہ ہے۔ حسین کی ”مقبرضانہ نگاہ“ تمہاری نگاہ تمہاری خیر مقدم کی نظر ہے۔ میں محمد حسین کی ”مقبرضانہ نگاہ“ کہہ رہا ہوں۔ یہی مندرات تھی۔ حسین تمہیں شام کا لشکر تھا اور گھاٹ چھینا تھا۔ آج دیکھنا تھا کہ جو کچھ میں نے کیا تھا وہ عہاٹ نے کیا۔ داد اس کی دینی تھی کہ میرے ماتحت دس ہزار سوار تھے اور مزید ملک کی امید تھی۔ میں اور میرے سپاہی تمہارے اور تمہارے سپاہیوں کی طرح پیاسے نہ تھے۔

نویں تاریخ پھر عہاٹ کے متعلق ایک نہایت شاندار فرض متعلق ہو گیا تھا۔ جب عمر سعد کا لشکر حملہ کی نیت سے بڑھ رہا تھا۔ عہاٹ حضرت کو نہیں جانے دیتے بلکہ خود جاتے ہیں۔ اور ہزاروں سپاہیوں کے موج خیز دریا کے سامنے ہیں۔ سواروں سے کھڑے ہو کر فرماتے ہیں: غمرو، عجلت نہ کرو۔ ابو عبد اللہ حسینؑ کو اس خبر کی اطلاع کرتا ہوں۔ کوئی شبہ نہیں کہ عہاٹ کی ذات تھی جس نے اس طوفان کی قوت میں سکون پیدا کر دیا۔ اور درمیانی وقت کا یہ مصروف تھا کہ ”خاک کو یاد دلاتے رہے۔“

اندوہناک واقعات میں غم کی زیادتی ہوتی جا رہی تھی۔ دیکھ رہے تھے کہ بے مثل رختہ ایک ایک کر کے تمام ہو گئے۔ اور اب بڑے بھائیوں کے کوئی نہیں ہے۔ عہاٹ کی نگاہ بھائیوں کی طرف اٹھتی ہے۔ جس میں استغاثہ محنت اور غم سب کچھ ہے۔ زبان یہ کہتی ہے کہ ”بہادروں کی طرح ابن سعد کے لشکر کی طرف بڑھو اور لشکریوں کے چہرہ اور سینوں کو زخموں سے بھر دو۔“ اس لیے کہ ”مخالفین خدا و رسول ہمارے قتل پر تل گئے ہیں۔“ دیکھا کہ ایک ایک جلتی خون میں نہایا۔ عہاٹ اپنی شہادت کے لیے رستہ بنا رہے تھے۔ جانتے تھے کہ حسینؑ نہیں جانے نہ دیں گے۔ جب تک کوئی تلوار اٹھانے والا رہے گا حسینؑ کے نشان فوج میں حرکت ہوئی۔ اس کے ساتھ حسینؑ کے دل میں حرکت ہوئی۔ عہاٹ کو کتنا وہ شہادت دیکھ کر حسینؑ آمادہ ہونے لگے ہوں گے۔ اور اگر یہ یحییٰ ہے کہ حضرت علیؑ اکبر حضرت عہاٹ کے قبل شہید ہوئے تو حضرت عہاٹ اور حضرت امام حسینؑ علیہ السلام گویا ساتھ ساتھ مصروف جہاد ہوئے۔ اور شہادت میں بہت کم وقفہ تھا۔ اس صورت میں بھی عہاٹ نے تعظیم پر جاں شہری کو مقدم رکھا۔ حسینؑ کے ”آگے آگے تھے۔“

معلوم ہوتا ہے کہ جب حضرت عہاٹ کو اجازت جہاد ملی تھی تو حضرت نے مرجانے ہونے پھولوں کو دیکھ کر مناسب سمجھا کہ ایک مشک بھی ساتھ رکھ لیں۔ حضرت دوبارہ فرات پہنچے ہوں یا نہ پہنچے ہوں۔ یہ علیؑ ہی کے فرزند کی بہت تھی کہ وہ تنہا گھاٹ پر قبضہ کا خیال کرتے۔ اور نہ رحم و انصاف نے اس سے کوئی بہتر مثال دی ہے۔ اس کے بعد میں جو کچھ کہوں گا وہ طبعاً وہی ہو گا جو میں حضرت جعفر طیار کے متعلق کہہ چکا ہوں۔ جس وقت یہ شیر عکار کھیل رہا تھا دشمن میں پشت سے وار کرنے کی فکر میں تھا۔ عہاٹ کس کا خیال کرتے۔ وار چل گیا اور عہاٹ کا فرش ہاتھ زمین پر پڑنے لگا۔ ہو سکتا ہے کہ عہاٹ پر مایوسی کی ایک خفیت سی لہر آگئی ہو، خصوصاً اس لیے کہ وہ ہاتھ کٹ گیا جس سے اس سب کی

باب شانزدہم

(اہل بیت علیہم السلام)

اس جگہ اہل بیت کی سرفرازی سے میری مراد نہ صرف خدماتِ صحت و طہارت ہیں بلکہ وہ بیابان بھی ہیں جن کا واقعہ کرنا سے کئی قتل ہے۔

اہل بیت کا تذکرہ ایک ایسا قصہ غم ہے جیسا سانحہ شاید ہی کسی شریف خاندان پر ہوا ہو۔ ایک مسلسل داستانِ اندوہ ہے جس میں ہمیں خوشی کی جھلکی نہیں ہے۔ اور نہ کسی قلم کے تہنیتوں میں یہ درد ہے کہ ان بہت سے دل نگاروں کے ماتم کا چہرہ اتار سکے لیکن ان اندوہناک حقائق میں خصال کی ایسی بلند شان دکھائی دیتی ہے جس سے غم سے متاثر دل بے ساختہ مدح کے لیے جھنجھکتا ہے۔ ان کی پہلی مصیبت اس سے کم نہیں ہے کہ اپنے افسرانِ خاندان کے قتل یا زہر کی بیعت پر آمادہ رہو۔ قتلِ اندوہناک تھا لیکن اس سے زیادہ افسوس ناک ہو گا اگر ہم اپنی بلندی سے ایسا گریں گے کہ زہر کی بیعت پر آمادہ رہیں۔ ان دو مصیبتوں نے بلا و فتنی کی درمیانی اور قسری مصیبت گوارا کی۔ وطن اور اس کی یاد بھلا دی گئی۔ بے مذر صبر سے اس پر آمادہ ہو گئے کہ اپنے لئے رسول کے ساتھ ملیں۔ روانگی کے وقت کا یہ حال اس فقرہ میں ہے کہ ”روانگی کے وقت اہل بیت رسالت سے زیادہ رنج و غم میں نہ تھا۔“

اس طرح مکہ پہنچے لیکن مکہ میں بھی کسی کے چہرہ پر بیاضی نہ تھی۔ دن گزرتے جاتے تھے اور دنوں کے گزرنے کے ساتھ آنے والی مصیبتیں دور نہ ہوتی تھیں، بلکہ سولے دلی بات قریب ہوتی جاتی تھی۔ یہاں تک کہ دو جگہ بھی ترک کی گئی جہاں سے قتل کا علاج کر دیا گیا تھا۔ ترک اس لیے کی گئی کہ اگرچہ اب بھی علاج کسی کے لیے یہاں قتل جائز نہ رکھا جائے لیکن ہم کسی قاتل کا چہرہ ہوا خنزیر، ٹکڑوں کی چمک اور نیروں کا جہنم دیکھ رہے ہیں۔ اندوہناک ہو گا وہ وقت جس وقت اہل بیت اپنے کو مکہ منظر سے بھی علیحدہ ہوتے دیکھتے ہوں گے وہ محسوس کرتے ہوں گے کہ ہم ایک پتہ سے نکل رہے ہیں۔ کیا کرتے جب سامن ہی مذبح یا قید خانہ بنا چاہتا تھا اور پھر بس نہ تھا۔

روانگی اور ساتھ ہی دیکھتے ہیں کہ سوار ہمارے تعاقب میں ہیں۔ کیوں؟ اس لیے کہ امیر مکہ زہر کا حامل نہیں چاہتا کہ ہم جائیداد کیا اس لیے کہ وہ ہمیں اپنی پتہ میں رکھنا چاہتا ہے اور ہمارے چلے جانے سے ہماری سلامتی کا اسے خوف ہے۔ ایسی صورت میں غمناک قوت کا ترجمہ یہ ہو گا کہ ہم بزرگِ شمشیر تم سے اظہارِ محبت کرتے ہیں۔ ہم دھماکا رہے ہیں اور تم اب بھی اسے محبت نہیں سمجھتے۔ گرم صدائیں، ٹکڑوں اور نیروں کا چمکانا طبقہ نوان کا دل پسند شغل اور نظارہ نہیں ہے۔ عورتوں کی عموماً ذہنی اور جسمانی کمزوری، نرمی، لطیف اور رعایت کی منتی ہے۔ لیکن عورت احساسِ شہادت اور دوا دینے کی بہترین قابلیت رکھتی ہے۔ شجاع بناتے ہیں اسے ظرت نے صبر دیا ہے۔ اب اس کے بعد دیکھو کہ امیر مکہ کے نیروں اور ٹکڑوں کا اپنے ہمراہیوں اور نامور اعزاء کے کوڑوں سے منہ پھیرتے ہوئے دیکھ کر عرب کے بہترین شاہوں کی یہ بہترین

یادگار طبیعت کی کس کیفیت میں ہوں گی۔

پھر روانگی، غیر مانوس راستوں سے۔ کوئی زحمت تھی چونہ ہوگی اور کیسی متوحش خبر یہ ہو سکتی ہیں جو ان تک نہ پہنچی ہوں گی۔ لیکن یہ تو اپنے سردار کے ساتھ شریک راحت و رنج ہونے گئے تھے۔ حکایت کے لیے نہ گئے تھے۔ یہاں تک کہ وہم اور خوف سے گزر کر اب عملی غم کی پہلی کاری ضرب لگتی ہے۔ حضرت مسلم کی شہادت کی خبر سنائی دیتی ہے۔ مکہ میں سواروں کا گھیرنا اگر محض اظہار اختیار ہی سمجھا جائے تو بھی ایک وجہ یہ تھی کہ اب تک متوحش خبروں کا درجہ بہت سخت نہ تھا جو ہر روز کے سفر سے بڑھتا جاتا تھا اور مزید کے خیالات اس کے اضطرابات سے معلوم ہوتے جاتے تھے۔ مسلم کی شہادت ایسی خبر نہ تھی جو اب مستقبل کو پوشیدہ رکھ سکتی۔ لیکن اب بھی کہا جاسکتا تھا کہ شاید ہمارا موقع ان سے کچھ مختلف ہو۔ یہاں تک کہ سوار دکھائی دیے۔ ہر کے ایک ہزار سوار، اور اس بڑے جسم نے ہیبت ناک جنگی طریقہ سے تعاقب کیا۔ اس وقت ویسے ہی جنگی اصول سے محفوظ مقام کا یہاں پشت لیا جانا اہل بیت کو حقیقت حال بتا رہا تھا۔ کیا وہ سوچ رہے تھے کہ وہ وقت آگیا جس کا خوف تھا بلاشبہ آگیا تھا۔ لیکن حسینؑ کے لیے نہیں۔ جن کے استقلال، زبان اور عقل نے پھر وقت ٹال دیا۔ یہاں تک کہ قتل دکھائی دیا۔ فات اور اس کی نرم لہری صوحت سفر کے بعد بھی معلوم ہوں گی۔ بچے لب ساحل کھیلنے کے لیے ٹرپ گئے ہوں گے۔ کون ہلکا تھا کہ فات کا یہ عظیم غیر چہرہ اہل بیت کو خون رلانے کا۔ اسی وقت ہر کوہم تھا کہ وہ اس آوارہ وطن قافلہ کو لب ساحل نہ اترے دے۔ بقی سے دور رکھے۔ اس لیے نہ سلمان آسائش ملیں اور نہ کوئی مدد مل سکے۔ دشمنوں نے حضرتؑ کو اس جگہ گھیرنے میں بھی مصیحت طوطی رکھی تھی کہ اگر آبادی کے قریب نواسے رسولؐ نے قیام کیا تو بہت محکم ہے کہ لوگ ان کے استغاثہ مدد پر تیار ہو جائیں اور امیدی برآں آجائیں ہو جائے۔ بنی ہاشم کے چھوٹے ریگستان اور جنگل میں جمع کیے گئے اس لیے کہ ان کی ہلاکت دیکھنے والا کوئی نہ ہو۔

یہ موقع ہے کہ حضرت زینبؑ علیا مقام بھائی کی صدا سنتے نہیں اور صورت اقدس دیکھتے ہیں۔ اشرار تھے جو موجودہ موقع سے منتقل تھے۔ زمانہ کی رنج روی کی واقعہ خوانی تھی۔ کوئی مخاطب نہ تھا۔ یہ نفس عظیم خود سوچ رہا تھا۔ کوئی ہوتا تو شاید حسینؑ قطعاً خاموش ہوتے۔ دیکھا بہن آ رہی ہے۔ اور حضرت زینبؑ بغیر رکے ہوئے فرماتی ہیں کہ اے غلیظہ المائین اور حمیۃ الباقین یہ باتیں ایسی ہیں جیسے موت کا وقت قریب آگیا ہے۔ یا کیا آپ نے اپنے نفس کے فدیہ کرنے کا قصد کر لیا ہے؟ پیار کے الفاظ تھے، محبت کا لہجہ تھا۔ لیکن احترام سے اعراض نہ تھا۔ اور محبت و احترام کے ساتھ اس خوبصورت فقرہ اور الفاظ میں گزشتہ اور موجودہ تاریخ کا خلاصہ تھا۔ اشرار سن کر حضرت زینبؑ میں جیواں ہوتا اور تمام آنے والے واقعات کو کھیلنا ان کی ذکاوت کی مثال ہے۔ ہر طرف کی پائس انگیز صورتوں اور دشمنوں کی عداوت کی خبروں میں بہن کے محبت آمیز الفاظ اور لہجہ نے اثر کیا۔ حسینؑ کی انھیں ڈبڈبا آئندہ ساتھ ہی حضرتؑ لے اہل بیت کو بے صبری نہ کرتے گے متعلق جو ہدائیں فرماتیں اس پر عمل کرنا انھیں خواتین کا کام تھا۔ بلکہ صبر کے ساتھ انھوں نے اس ہوش، خودداری اور جرأت سے کام لیا جس نے ان کی حقیقت اور عظمت لوگوں پر مشکفت کردی اور وجہ حسینؑ کو مدد ملے۔ مثالوں پر توجہ دلانے کا وقت آگے آئے گا۔ اس دور میان میں دلیع، طوعہ اور ابن حنیف کی چھوٹی سی لڑکی کے متعلق ایک ایک نقطہ کہہ لوں۔ یہ تصنیف نہیں کیا جاسکتا کہ اگر دلیع نے زہیر بن قین سے نہ کہا ہوتا کہ ”سبحان اللہ منہ زند رسولؐ تمھیں طلب

فرما رہا ہے اور تم تساہلی کر رہے ہو۔ تو زہیر کیا تعفیہ کرتے لیکن یہ کہا جاسکتا ہے کہ زہیر کے آئندہ کارنامے دلم کے اس سوال سے متاثر تھے غیرت دلائی تھی۔ اظہار حیرت کیا تھا۔ اعتقاد کی قوت ظاہر کی تھی۔ کہا جاسکتا ہے کہ دلم کو شیخ کا علم نہ تھا۔ اگر ایسا ہی ہو تو کہیں اس کا شوق نہیں ہے کہ دلم نے زہیر کے تعفیہ شدہ اکت کے بعد ان سے ایک لفظ بھی کہا ہو جو انہیں روکنا کہا جائے۔ نہیں بلکہ کمال صبر سے اس پر راضی ہو گئیں کہ وہ ایک زمانہ کے رفیق سے ترک تعلق کریں۔ بڑی قربانی تھی۔ یہ اور اس کے علاوہ مثالیں یہ بھی بھائی ہیں کہ جس وقت مرد مختلف حیثیت کے سیاسی اثرات سے متاثر تھے عورتیں خاندان رسالت کی دوستی میں عموماً راسخ تھیں۔ اس کی مثالیں آگے بھی آئیں گی۔ میں خصوصیت سے دکھاؤں یا نہ دکھاؤں۔

طوبہ نے خاندان رسالت کے ساتھ جس بے غرض محبت کا اظہار کیا وہ بے حد اثر خیز ہے۔ ابن حنیف کی چھوٹی سی لڑکی کی جراثیم اس سے ظاہر ہے کہ وہ مسلمانوں کی پورش اور آگاہی عرب کی تہذیب چمک اور صدائے متاثر نہیں ہوتی بلکہ کمال ہوشیاری اور بے غمی سے دشمنوں کا موقع اس صحت سے بتا رہی تھی کہ بڑے ناپسندیدہ مہاجر نے بہت سے دشمن اشاروں پر قتل کیے مہارک ہے وہ کم عمر صاحبزادی جس سے ایسے مفات ظاہر ہوئے ہوں اور اس نے خدا اور رسول کے دشمنوں کے قتل کرنے میں ایسی مفید مدد دی ہو۔

میں قاتل بریر اور خلی بن یزید آج کی سیویں کا مقرب ہوں کہ انہوں نے اپنے ملتون شہروں کو ان کے گنہگاروں پر ملامت کی اور ایسے گناہگاروں کی ترک رفاقت کا عہدہ کیا اور میں اسی طرح ہمسندہ کا دماغ ہوں کہ اس نے یزید کی بد اعمالیوں کو نہایت قوت سے ظاہر کرنے کی جرأت کی جب وہ شہادت حسین سے متاثر ہو کر دربار میں نکل آئی اور یزید کو ملامت کی۔

کر بلا کا قیام کسی طرح امن کا نہ تھا بلکہ یوں کہا جاسکتا ہے کہ یہاں کی سکونت کسی وقت سکون کی حالت نہ تھی۔ فہمیں بے در بے آرہی تھیں، جن کی غرض مخفی نہ تھی۔ میں نہیں جانتا کہ دوران قیام کر بلا میں جس قدر لوگ حضرت کے پاس آئے ان کی تعداد کس قدر تھی لیکن مثال تھی۔ مثلاً حضرت اور چند اور شاید اس سے اہل بیت کو کچھ تسکین ہوتی ہو۔ لیکن مدد کا درجہ جو کئی حد پر مبنی تھا امید خیز نہ ہو سکتا تھا۔ یہاں تک کہ اب دشمن نے اپنی فوجی زیادتی پر قناعت نہ کی بلکہ اس ملتون فوجی اصول پر بھی کاربند ہونے کا ارادہ کیا کہ اس چھوٹے سے گروہ تک پانی نہ پہنچ سکے۔ بات بھی جاسکتی ہے کہ ان سیویں کو جو بچوں کے داشت کی ذمہ دار تھیں مصوموں کی پانی کے لیے مند اور بے قراری سے کسی روح فساد کھلیت ہوتی ہوگی۔ بچے جنہیں یہ بھایا نہیں جاسکتا کہ کوئی چیز کیوں نہیں مل سکتی۔ مکر وہ دنیا۔ چیزوں۔ خدا کی چیزوں پر اقبال قبضہ سے فخر کرتی ہے۔ اور دوسرے انسان کو ستانے، مطلوب کرنے یا ذلیل کرنے کے کام میں لاتی ہے۔ اور دوسروں کی ضرورت پر اس کا کیسا ہی درجہ کیوں نہ ہو بے حیث ظلم سے دیکھتی رہتی ہے۔ یہ تھا۔ چیزوں۔ قبضہ اور معاملات کا مکر وہ اصول جس کے خلاف ہمارے ہادیوں نے اپنے عمل سے کمال مثالیں دیں۔ انہوں نے خلق اللہ کی ضرورت کے مقابلہ میں کسی چیز پر قبضہ کو مکر وہ سمجھا اور یہ سمجھا کہ ہم عارضی طور پر کسی چیز پر قابض تھے کہ ضرورت کے وقت کسی انسان کے حوالہ کر دیں۔ یہ مثالیں دنیا کے ہادیوں میں نہ ملیں گی۔ کیونکہ ان میں کے اکثر دوسروں کی کٹائی پر بسر کرتے تھے۔ اب ہو جو کہ اہل بیت کے بچے

تو درکنار بڑے بھی نہیں سوچ سکتے تھے کہ کوئی انسان ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ وہ پانی کی ایسی چیز میں انسان کے حق بھری سے اعراض کرے۔ پانی ہی کو ظلم کا ذریعہ قرار دے۔

مثال پیش کر رہی ہے کہ مملوہ نے آج کے پہلے ہی اس ظلم کو جائز رکھا تھا اور جناب امیر نے اسے اس پر ملامت کی تھی۔ اور فرمایا تھا کہ: ”لشکر کے ساتھ بڑے بچے اور ضعیف بھی ساتھ ہیں پانی کے متعلق کوئی روک نہ ہونی چاہیے۔“ لیکن سنا کون تھا جب تک تلوار نہ کھائی۔ امیر المومنین نے قبضہ کیا اور ہاؤس کے کہ انتقام میں عام لوگوں کے نزدیک پانی روکنے کا حق پیدا ہو گیا تھا لیکن امیر المومنین نے تو اس لیے قبضہ کیا تھا کہ مخلوق کو ان کا حق دلائیں نہ اس لیے کہ حکومت کا قبضہ کر لے۔ اور خود سے منادی کرانی کہ: ”پانی حلال ہے ہر شخص لے سکتا ہے۔“

اور اگرچہ حضرت عباسؓ اپنی بے مثال شجاعت سے پانی لائے مگر وہ کب تک کے لیے کافی ہو سکتا تھا۔ اگرچہ یہ تسلیم کیا جائے کہ صرف پیلو سے بھیجیں لے گئے تھے تو تیس مہینے تھیں اور اگر یہ بھی قیاس کیا جائے کہ سواروں نے بھی پانی کے لیے مہینے رکھی تھیں تو پچاس تھیں۔ حالانکہ اتنے سے قافلہ کے پاس اٹنی مہینے ہونا کبھی قدر غیر معمولی ہو گا۔ اور پھر اتنی مشکلوں کے رکھنے میں وقت آنے کی۔ جب عرب کے سفر اور ناپائی آب کا خیال کیا جائے جس میں ہر شخص کے پاس ایک مشک رہنا ضروری ہے۔ بہر حال زیادہ سے زیادہ پچاس مہینے بھری گئیں۔ اب سوچو کہ سو کے قریب مرد مہمے ان کے مملوہ عورتیں تھیں جن کی تعداد معلوم نہیں۔ بچے تھے۔ ہارم ہارم کے جانور تھے۔ غالباً کم سے کم بیس اوٹ، اور پچاس گھوڑے۔ یہ پچاس مہینے اگر بے انتہا کفایت سے صرف کی گئی ہوں تو اتنے جانداروں میں ایک وقت کے لیے مشکل سے کام آسکتی ہیں۔ اس میں اگر یہ خیال کیا جائے کہ عباسؓ کے سواروں نے اپنے گھوڑوں کو پانی پلانے دیا تھا تو وقتی ضرورت کچھ کم ہو جاتی ہے اور اگر یہ بھی خیال کیا جائے کہ کچھ پانی بچوں کی ضرورت کے لیے روک رکھا گیا تھا تاہم اس کے آثار ہیں کہ نوس کے آخری حصہ میں پانی نہ تھا اور دوسو کو تو تین تارہ تھا۔

میں اجتہاد نہیں کر سکتا کہ یہ واقعہ بحیثیت روایت کے کہاں تک پہنچا ہے کہ حسینؓ کی لادلی بیٹی پیاس سے بے چین ہو کر حضرت زینبؓ کے پاس جاتی ہے کہ پانی مانگے لیکن وہاں دیکھتی ہے کہ دودھ پیتا بچہ بھلی کی طرح ٹرپ رہا ہے اور پھوٹی ناپائی آب کی حکایت کر رہی ہیں۔ اور یہ حالت دیکھ کر حضرت سکینہؓ اپنی پیاس کی حکایت بھول جاتی ہیں۔ لیکن یہ کہہ سکتا ہوں کہ بحیثیت واقعہ کے یہ واقعہ ہے۔ یہ حالتیں تھیں۔ پاس اور تاریکی ہر طرف دکھائی دے رہی تھی کہ دفعہ حضرت زینبؓ ہوں یا اُمّ کلثومؓ شور سنتی ہیں۔ شور جو فوج کے بڑھنے کا ایسا ہے سوں کا کڑا کا۔ ہتھیاروں کی جھنکار۔ پیادوں سے دھلی ہوئی زمین، فوجی احکام کی سخت صدائیں۔ یہ منظر حضرت سے دور نہ تھیں۔ بلکہ حضرت قریب ہی تھے۔ آرام میں تھے قیاس انسان ہے کہ ہاؤس انتہائی اعتیاد کے بھی ہوشیار کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ اضطراب تھا۔ اس وقت سے زیادہ مضطرب کرنے والی تھیں۔ لیکن نہ تھی۔ تمام خوف و اضطراب سامنے موجود ہو گئے تھے جن کا خلاصہ بھائی کی شہادت اور اپنی تباہی تھی۔

پھر وقت ٹل گیا۔ اس امید کے ساتھ نہیں کہ کل بھی شاید ٹل جائے۔ نہیں۔ بلکہ یقین کے ساتھ کہ کل تصفیہ ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ یہیں جن کے شوہر گریبا میں موجود ہیں۔ اپنا رٹ لیا اور اپنے شوہروں کو اپنی آنکھوں کے سامنے

حمیت کر رہے تھے جیسی وجہ کے لیے کبھی کوئی انسان لڑا ہو۔ لیکن عہاٹ کا ہوش انہیں ہلایا ہاتھ دکھا دیتا ہے۔ اور لب دشمن کش مچلی اس ہاتھ میں چبکتی ہے۔ ساتھ ہی ہاتھ کٹنے کا مہر نہیں ہے بلکہ کہہ یہ رس ہے ہیں کہ: ”اگرچہ میرا داہنا ہاتھ کٹ گیا پھر بھی میں دین کی حمیت کے لیے چلا کروں گا“ پھر لڑنے لگے اور اب دشمن کے لیے پیشتر سے آسان تھا کہ دوسرے ہاتھ پر بھی دار کرتا۔ ضرب چل گئی۔ اور دوسرا ہاتھ بھی کٹ گیا اور ساتھ ہی عہاٹ کا نا مغلوب نفس کہنے لگا: ”اے نفس کفار سے نہ ڈر تجھے غفار کی رحمت کی بشارت ہو“۔ کبھی اس وقت سے زیادہ عہاٹ اپنے باپ کے بیٹے ظاہر نہیں ہونے تھے۔ باپ اگر قاتل ضرب کھا کر ”فزت بدوب الکعبۃ“ فرما سکتا تھا تو عہاٹ کے فقرہ سے قتلے الٹی اور رحمت ایزدی کے اے اطمینان، محبت اور رضا کا ثمرہ پیدا تھا۔ دونوں قوی بازوؤں سے خون کی چادر بھری۔ لیکن عہاٹ کا چہرہ ویسا ہی غیر متحرک اور شاندار تقم کامرکز ہے۔ نکالیں ہیں جو دشمن کو اب بھی ویسی ہی حارث سے دیکھ رہی تھی۔ کہا یہ گیا ہے کہ مشک کو اب تک کانڈ سے پر محفوظ رکھا تھا۔ اور اب بھی عہاٹ موزے کی نوک سے دشمنوں کو دور کر رہے تھے اور خیمہ کی طرف بڑھ رہے تھے۔ غالباً مشک کہہ رہی تھی کہ میں خیمہ تک پہنچا کر سونا۔ اس وقت کی کوشش کی داد کون تھا جو دیتا ہو سید الصابری کے۔ لیکن اس وقت بھی میرا یہی کہنے کو بی چاہتا ہے کہ کاش حضرت ام البنین دیکھتیں۔ دیکھتیں اور احسن کہتیں۔ فرمائیں کہ شاہاش اے فرزند تولے علی کے حوصلہ کو اس وقت پورا کیا۔ علی کے لفظ چاہیے تھے جو اس وقت عہاٹ کے چہلو کی مصوری اور مدح کرتے۔ عہاٹ نے اسلام کے علم داری کی شان قائم رکھی۔ اس کی جلالت خیز روایات کو قائم رکھا۔ حضرت جعفر طیار کو حق تھا کہ اپنے اس بھوکے پیاسے بھتیجے کو دیکھتے۔ اس کے ہوش، حواس، صبر، استقلال اور حمیت دین کے جوش پر وجد کرتے۔ نہیں۔ ان کے ہونے ہاتھوں کو چوم لیتے جو زمین پر گرے۔ تڑپے اور سرود ہونے تھے۔ نہیں۔ حضرت جعفر طیار حوصلہ کرتے کہ شجاعان عالم میری طرح عہاٹ کی رکاب چوم لیتے اور اس نوک موزہ کی مدح میں سپاہیانہ سادگی سے شعر کہتے۔

قیاس آسان ہے کہ شیر کو بخور دیجے کر دشمن کی نامردانہ شجاعت میں کس قدر زیادتی ہوتی ہوگی۔ مجھے یہ روایت مام کردہ سے ملتی ہے کہ عہاٹ کا بہت سا گوشت دشمنوں کی نوک نیزہ پر آگیا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ خیال یا شاعری ہو۔ لیکن یہ اندوہناک شاعری واقعہ سے دور نہیں ہے۔ خصوصاً اس شخص کے لیے جسے ذاتی یا تاریخی تجربہ ہے کہ ایک نامرد انسان یا قوم اپنے موقع پر کیا کچھ کرتی ہیں۔ جو کچھ بھی دشمن کا کردہ مشغلہ جس شدت سے بھی جاری رہتا۔ ستون شجاعت اس طرح بے جنبش ہے۔ اور اگر اسے کسی سمت حرکت ہے تو حسین کے خیمہ کی طرف۔ ذرا خیال کرو کہ بے شمار حریفوں نے عہاٹ کے خوبصورت جسم کی کیا مالت کی ہوگی۔ عہاٹ ایک بختہ خون تھے۔ زرہ کی کڑیاں ساہی کی جلد بن گئی تھیں۔ لیکن اب بھی لگتا ہے جی کہ خیمہ تک پہنچ جائیں۔ کوئی منظر اس سے بڑھ کر شجاعت خیز اور اندوہناک تلاش نہیں کیا جاسکتا خصوصاً جب کہ عہاٹ کی اس کوشش کے پیچھے ایک ماہوسانہ غرض تھی۔ پیاسوں کی سیرابی۔

اس طرح کچھ دیر عالم کا یہ عبرت خیز تماشہ قائم رہا۔ عہاٹ اپنا خون آلود جوازہ لیے جارہے تھے کہ مشک تیروں سے چھدی۔ سر پر گر پڑا۔ اور عہاٹ کے مقدس خون کے ساتھ یہ پانی بہ گیا۔ جس کی قیمت کا اندازہ ممکن نہیں ہے۔ اس وقت عہاٹ نے جہان کو آخری سلام کیا: ”یا ابا عبد اللہ علیک مفی السلام“ فرمایا۔ راونہا میں حق جہاد ادا کر چکے تھے۔

اب ساحل فرات کو ابلا بلا تک کے لیے اپنی آرام گاہ قرار دیا۔ سو گئے عباس۔
کیا خوب کہا ہے شاعر نے جس کی آمد سلوکی اور یگ واقعہ خوانی نے اس کے اشعار کو بے مثل قرار دیدیا ہے کہ :

احق الناس ان یبکی علیہ فقی ابی الحسین بکربلاء
اخوة و ابن والده علی ابو الفضل المصنح بالدعاء
و من واساہ لا یشیہ شیء و جادلہ علی عطش بماء

فکے ہے۔ کون اس جوان سے رونے والے کا زیادہ متقی ہے جس پر حسینؑ کربلا میں رونے۔ وہ جوان حسینؑ کا بھائی اور ان کے
پدر گرامی علی بن ابی طالبؑ کا فرزند تھا۔ کون فرزند؟ ابو الفضل۔ جو خون میں لیترا ہوا تھا اس جوان نے مٹی خم
خواری کی اس کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ اور وہ پیاس میں پانی کے لیے خوب لڑا۔

علی اکبرؑ

بعض کا خیال ہے کہ علی اکبرؑ حضرت امام زین العابدینؑ تھے اور وہ حضرت امام حسینؑ علیہ السلام کے سب سے
بڑے فرزند تھے۔ حضرت علی اکبرؑ علیہ السلام تھے اور سب سے چھوٹے حضرت علیؑ اصغر تھے۔ حضرت علی اکبرؑ کی ابھی
عمری کیا تھی کہ ان کی بڑی تاریخ ہوئی۔ لیکن ان کا ایک فقرہ جو ہمارے لیے محفوظ ہے وہ ایک مثل ہے جو تاریخی میں
راستہ دکھا رہی ہے اور اسی میں علی اکبرؑ کی ہر حیثیت کی تاریخ ہے۔ مزیں گزری ہیں۔ صوبہات سفر ہیں۔ وطن کی راحتوں
کے بعد ہر قدم پر متوحش اور اندوہناک خبریں اور سالان ہیں۔ تسلیم میں پہنچے ہیں۔ باپ کو نیند آگئی ہے۔ علی اکبرؑ قریب
ہیں۔ عجب نہیں ہے کہ عالم خواب میں باپ کے چہرہ کا مطالعہ کر رہے ہوں کہ حضرت سیدار ہوتے ہیں۔ علی اکبرؑ نے ہنستے
ہوئے مطیعانہ چہرہ سے باپ کی طرف دیکھا ہو گا۔ گویا پوچھتے ہیں کہ کوئی حکم ہے۔ دیکھتے یہ ہیں کہ باپ کے بشرہ میں بے
درستی ہے۔ اثر اور فکری حرکت سے مخاطب ہو کر وجہ پوچھتے ہیں۔ حضرت وجہ بتا دیتے ہیں۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ حضرت کو
علی اکبرؑ پر اس قدر اعتبار تھا کہ وہ انھیں کسی ہی خبر اور حالت کے قابل قوی سمجھتے۔ خبر اس کے علاوہ کیا تھی کہ کوئی کہہ رہا
تھا کہ : ”تم عراق کی طرف جانے کی جلدی کر رہے ہو اور موت تمہارے تعاقب میں جلدی کر رہی ہے۔“ اب نفس کی
نیاری، تربیت، تعلیم، توریث، فضا، مصائب پر مسرورانہ قلب کا اظہار ہوتا ہے۔ علی اکبرؑ یہاں جواب یا تسکین دینے
کے چھوٹے ایک سوال کرتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ”بایا کیا ہم حق پر نہیں ہیں؟“۔ کبھی کوئی کند سوال اس سے زیادہ اپنا
شارح نہیں تھا اور نہ ایسا معنی خیز تھا جس کے جلو میں اپنا اعتبار، اپنی روش کی پسندیدگی اور کیسے ہی مستقبل کے لیے تسلیم و
رضا کا خوشی سے خیر مقدم ہے۔ حسینؑ میں اس استنبہام سے ایک لطیف حرکت علی اکبرؑ کے چشمہ پر نظر، اور اقرار
اب علی اکبرؑ سامنے آتے ہیں۔ پھر علی اکبرؑ ہیں جو کہہ رہے ہیں کہ : ”پھر کوئی پرواہ نہیں ہے کہ ہم موت کی طرف
جائیں یا موت ہماری طرف آئے۔“

لکنت نہیں ہے، جنبش نہیں ہے، پس و پیش نہیں ہے۔ ایک تیر ہے جو اپنی آماج کی طرف جا رہا ہے۔ لیکن خیال

رہے کہ یہ علی اکبر کا سائیٹا ہے جو باپ سے اپنی آلودہ مرگ اور خبیثانے قہا ہونے کی خوشی ظہر کر رہا ہے۔ ہم انگیز غری شاعری، طرزِ کلام جس نے مرکز بدل دیا۔ حسین کا ذلی اثر غم نہ بٹا۔ علی اکبر نے اسے اپنا کر لیا۔ اس سے بڑھ کر حسین کو کسی اور طرح تسکین نہ دی جاسکتی تھی اور نہ حسین اپنی اس داد سے زیادہ کسی لفظ میں نہ کسی اور طرح رو سکتے تھے کہ:

”اے مسر زند تو نے دل خوش کر دیا۔“

میں سوچتا ہوں کہ یہ بہت ممکن ہے کہ بنی ہاشم میں حضرت علی اکبر پہلے شہید ہوں، مرنا ہی تھا۔ پہلے باپ بچے کیا۔ علی اکبر کا بیشتر جانا نہ صرف اس کا مظہر ہوتا کہ وہ اصحاب کے بچے نہیں ہیں۔ بلکہ ان کی شہادت کو اور آسان کر دیتا۔ اطمینان دلا دیتا۔ حسین کے گھر کا چراغ بجو رہا ہے۔ لیکن گج کہا ہے شاعر نے کہ:

اگر بر شہادت کر بستہ چست خوشم زانکہ قربانی راہ تست
اور اجازت بھی عجب طرح ملی ہے۔ حسین نے علی اکبر کی طرف دیکھا ہے اور آنکھیں میچ کر لیں۔ اجازت مل گئی۔ دیکھا کہ علی اکبر سیرے ہونے ہیں۔ دلولہ ہے۔ شوقِ شہادت ہے۔ رکیں گے نہیں۔ آنکھ میچ کر لی۔ جلد کیا قدرت نے علی اکبر کو اس لیے شبیہ بنایا تھا کہ میدانِ جنگ میں ایک جیٹا پیدا کر دے۔

عمر بن سعد نے تو رسالتِ مآب کو دیکھا تھا۔ کتنے ہوں گے جنہوں نے دیکھا ہوگا۔ پھر وہ کیا سوچ رہے ہوں گے کہ جناب رسالتِ مآب اپنے فرزند حسین کی سفارش کرنے آئے ہیں۔ اس کی بے گناہی کی وکالت کر رہے ہیں اور اس کے لیے شمشیر بکت ہیں۔

آمار ہیں کہ لشکر میں علی اکبر سے جنگ کرنے کے متعلق بد دل پیدا ہو گئی تھی بلکہ انہیں اپنی طرف کر لینے کی کوشش کی تھی۔ اور اس کے بھی آمار ہیں کہ ابن سعد سپاہیوں پر وہی جادو چلاتا ہے جو ابن زیاد نے اس پر کیا تھا۔ اب مجھے اور کیا کہنا ہے یز اس کے کہ علی اکبر اس طرح دشمنوں کی طرف دوڑ رہے تھے کہ گویا اس موت کے مشتاق تھے جو دشمنوں کے حروں میں تھی۔ خبر یہ ہیں کہ علی کا پوتا مشہور اور پادگار جنگ کے بعد ایک مرتبہ باپ کے پاس میدانِ جنگ سے واپس آیا۔ جو سکتا ہے کہ بے چین شہاب اور اس کی انگلیوں نے کہا ہو کہ اس کارنامے کے بعد باپ کی نگاہ حاصل کر دے۔ مگر سوال اب تھا اس لیے کہ جنگ کی قوت آہانے، بشارتِ شہادت اور پلٹ پڑے شیر گونج رہا ہے اور کہہ رہا ہے کہ: ”فرزندِ زنا کا حضرت پر ظلم نہیں کر سکتا۔“ دشمن کے انہوہ میں مین سے سر پر گزرتا۔ نیزہ کی اٹی سینہ توڑ گئی۔ ہاتھ رکھا تھا کہ بے شمار حربے چل گئے۔ حسین کو معلوم ہوا کہ علی اکبر لاپتہ ہے۔ حضرت کی طرح لاش لائے۔ چہرہ اور دانتوں سے خون پونچھ رہے ہیں۔

علی اصغر

اب میں حسین کے آخری سپاہی کی شہادت بیان کرنے کے لیے اپنے کو تیار کر رہا ہوں۔ لیکن تیار نہیں ہوتا۔ اپنے کو کھیچتا ہوں لیکن منتقل ہو رہا ہوں۔ ایک مجاہد جو حیرت خیز سواری پر گیدا اور حیرت خیز حربے سے لڑا۔ گھوڑے پر سوار نہیں ہو سکتا۔ پاؤں پاؤں نہیں چل سکتا۔ گھنٹیوں نہیں چل سکتا۔ سواری باپ کا ہاتھ یا آنکھوں سے ہے۔ اور حربہ وہ سوکھی زبان

ہے جو ورق گل سے باہر نکلتی ہے نہان جس پر بہت دیر سے پانی یا دودھ کی نمی نہیں پہنچی ہے۔ اس کے بعد کیا ہوا۔ اس کے بھانے کچے لیے جانے اس کے کہ میں ایک مصوم بچے کی صورت دکھلاؤں، حسین کے کپڑوں کی سرخی دکھاتا ہوں۔ ”ودمہ یصری علی صدر الحسین“۔ (اور اس کا فلان حسین کے سینہ پر جاری تھا) تم نے حضرت ہاجرہ کی جلاوطنی میں سنا ہوا کہ جب ان کے مشک کا پانی تمام ہو گیا اور اسٹیکل پیاس سے بے تاب ہوئے تو حضرت ہاجرہ اسٹیکل کو ایک درخت کے شاخ پر بٹھا کر خود ایک تیر کے رقبہ میں بیٹھ گئیں۔ اس لیے کہ اپنے بچے کا پیاس سے مرنا نہ دیکھیں ذرا سوچ ان بیسیوں کا حال جو اب اپنے بونے ہوئے بھلے کو خاموش اور خون آلود دیکھ رہی ہیں۔ دنیا کے مشہور مرثیوں میں بیت المقدس کی تباہی کے متعلق حضرت جریر کا نوحہ نہایت مشہور ہے۔ میرا خیال ہے کہ کوئی نوحہ اس درد انگیز نوحہ سے نہیں بڑھ سکتا جو حضرت علی امیر کی لاش دیکھ کر کہا گیا تھا:۔

یا لہف قلبي علی الصغیر الظانی فطمته السهام قبل القطام

غرغرة بدمہ و نحو طفل لہف قلبي علیہ فی کل عام

(اس پیاسے بچے کے لیے میرا قلب اندھونہا کہ ہے جس کا دودھ تیرے دودھ چھوٹنے کے زمانہ کے قبل چڑھا دیا۔ ابھی تو وہ بچے تھا لیکن اسے خون کی گلی کرادی۔ میرا قلب ہمیشہ اس پر مصمت رہے گا۔)

ختم ہو گیا ان چند افراد عالم کا ذکر جن کے حیرت خیز کارنامے، جان ہیں ان تمام غویوں کی جو کسی نام سے جامعہ انسانی میں پکاری گئی ہوں۔ یہ وہ تھے جن کے متعلق علامہ ابن ابی الحدید ایک چشم دید گواہ کی روایت بیان کرتے ہیں کہ: ”ہم نے ان لوگوں سے مسئلہ کیا ہے جن کے ہاتھ حملہ کرنے والے شیر کی طرح قبضوں پر تھے وہ داسنے ہائیں پہلوروں کو کھل ڈالتے تھے اور اپنے کو موت کے لوہے پر گرلاتے تھے وہ نہ امان قبول کرتے تھے اور نہ انھیں مال کی طرف رغبت تھی۔ کوئی چیز ان کے اور موت کے درمیان یا ملک پر غالب آنے میں حائل نہ تھی۔ اگر ہم نے کچھ بھی تامل کیا ہوتا تو یقیناً تم لکڑ کا لکڑ ختم ہو جاتا۔“ (سوانح قرۃ)

یہ لوگ حضرت کے پیرو تھے۔ ان کی شہادت سے ایک بڑے خطہ زمین کے مثالی خصال کا بیج خلائق کر دیا گیا جن سے ہر طرح کی غویوں کا نشو و نما ہوتا رہتا۔ لیکن یہ سرفروشان راوذا جب یہ بکھگئے کہ ہماری فتاہی میں دین کی حیات ہے تو انھوں نے موت سے زیادہ کسی شے کو دل پسند نہ کیا۔ کچھ کہا ہے شاعر نے کہ کوئی خطہ زمین اور باغ نہیں ہے جسے ہماری قبر بننے کی آرزو نہ ہو۔ ان قبروں پر سلام جو حسین کی قبر کو گھیرے ہیں۔ کربلا کے سونے والوں کو سلام جب تک نیم سر کی ہلکی سے ہلکی موج دنیا میں چلے۔



اور پھر فرماتی ہیں: قسم ہے خدا کی تیرے بزرگوں سے اس کا عہد لیا گیا تھا۔ یہ قسمیں حضرت زینبہ جو ایک زمانہ کانینانہ اور ولینانہ عل نفس اور عزم قربانی یاد دلارہی تھیں۔ اور امکان کے ہو چکنے کے بعد صابر تھیں کہ ہم عہد پورا کر سکے۔ بڑا عہد اور بڑے عہد کرنے والے۔

میں اس موقع پر آگے نہیں بڑھ سکتا جب تک مانتھم کے اس موقع کے یادگار بند کی داد نہ دے لوں۔

ناگہ چشمِ دخترِ زہراءِ دریاں زماں

ان کے بے مثل اشعار غیر کافی ہو گئے اور عام مقبولیت اس کی مدح ہے۔ اس سے بچ کر مصوری، اس سے مناسب تر الفاظ، اس سے لطیف تر کمن اور آمد محال ہے۔ اس لیے کہ اتفاقات نے ان کے اشعار میں واقعات کی روح کو اس طرح نافذ کر دیا ہے کہ اب اس کے بعد کسی کی تعریف یہ ہوگی کہ اس نے اچھی یا بری فعل کی ہے۔

اب دیکھو کہ یہ لٹا ہوا قافلہ امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام کی دار السلطنت میں ہے۔ جہاں حضرت زینب اور اُمّ کلثوم شاہزادیاں تھیں۔ اور کوفہ کا دارالامارت اس کا متعلق رہتا تھا کہ ان کی خاک کفش سے میری عزت ہو۔ وہی جگہ جہاں سے زیادہ کی تقرری منظور کی گئی تھی اور اس پر عنایت ہوئی تھیں۔ ممکن ہے کہ سب برس میں ایک ہی نسل پیدا ہو گئی ہو لیکن یہ ممکن نہیں ہے کہ ہزاروں کی تعداد میں لوگ ایسے نہ ہوں جنہیں یہ باتیں یاد نہ ہوں۔ اور اگر بھول بھی گئے ہوں تو کیا حضرت مسلم بن عقیل نے ہزاروں کو یہ یاد نہیں دلا دیا تھا کہ فرزند امیر المومنین اس حالت میں ہے کہ تمہاری مدد اسے آج کے دن سے بچا لیتی۔

کوفہ کا ایسا مقام جو اس کے بعد بھی برابر ایک صوبہ کا دار السلطنت رہا، آبادی کے لحاظ سے ممتاز تھا، اور اب اسی میں یہ منظر دکھائی دے رہا ہے کہ ہزار ہا ہزار آدمی ان راستوں پر کھڑے ہیں جہاں سے دخترانِ رسول کا لٹا ہوا قافلہ گزرنے والا ہے۔ کڑکیاں، چھتیں، بالا خانے صبرے ہیں۔ دس ہزار سوار اس لیے منتظر ہیں کہ اہل بیت کے لیے ذرا سی کوئی جنش دکھائی دے اور تلوار اپنا کام کرنے لگے۔ اہل بیت اس ذلت سے کوفہ میں نہیں گزر رہے تھے۔ دین، قومیت، محبت، غیرت، اور شرافت کی توہین ہو رہی تھی۔ اور مسلمان دیکھ رہے تھے۔ اس سے کچھ میں آئے گا کہ لوگ کس حالت پر پہنچ گئے تھے اور کیسے تغیرات عظیم ہوئے تھے کہ یہ کچھ آنکھوں کے سامنے سے گزرتا اور کسی میں کوئی حس نہ ہوتا۔ اس ملتون خاموشی میں کوئی بوڑھا صحابی اپنے ہی کو مخاطب کر کے اشعار میں روتا کہ فرزندِ رسول کا سر نیزہ پر بلند کیا گیا ہے۔ مسلمان دیکھتے اور سنتے ہیں لیکن نہ کسی کو ناگوار گزرتا ہے نہ کوئی رونے والا ہے۔ لیکن اگر رونا ہے سب کچھ ہے تو روئے والے تو اس وقت بھی تھے۔ عورتیں تھیں جو رو رہی تھیں اور اکثر تماشائی تھے جن پر اثر تھا اور انھیں اشک آلود تھیں۔ آسنو ہی اگر قوی ذلت کو دھولے کالنے ہوں اور کسی کو غیرت دار اور قوی قوم بنا سکیں تو ہر خشیت سے عورتیں دنیا پر حکومت کرتی ہوتیں۔

اب میں اس موقع پر پہنچا ہوں جہاں سے اس کا پوری طرح اندازہ ہو سکتا ہے کہ نرم دلہ، لطیف انہوی خاتین کس طرح صبر اور اپنے وقت نفس سے بچ کر حکومت کر رہی ہیں۔ رو کر نہیں۔ اپنے اوپر اختیار سے، ضبط سے، اپنے حق پر احترام اور خاصہ کی بلندی سے۔

کیا غرض تھی ابن زیاد کی کہ وہ اہل بیت کو اسکانی ذلت سے سروہا برہنہ، بے ہودج، و محل کے اوٹوں پر لائے جانے کا حکم دیتا، یزاس کے کہ وہ یزید کی فتح اور حسین کی شکست کی نمائش کرتا اور یہ دکھاتا کہ ہم نے اپنے دشمنوں کو کس قدر ذلیل کیا۔ لیکن یہ خود خدا دشمنان انسانیت نہیں جانتے تھے کہ نمائش ظلم اکثر وہ قبر ہوتی ہے جس میں ظلم دفن ہو جایا کرتے ہیں۔ اور کیسے ہی مظلوم کے متعلق انسان کی طبیعت ہمدردی اپنے کو ہاڑ نہیں رکھتی نہ کہ جب مظلوم اہل بیت رسالت ہوں۔ اور انھوں نے اس کا اہتمام کیا ہو کہ ہم اپنے کو اس وقتی ذلت سے متاثر نہ دکھائیں بلکہ ان لوگوں کو جو ہماری ذلت کے دیکھنے کے لیے آئے ہیں اپنی اصلی شان دکھائیں۔ بلاشبہ جس انبوه مصائب میں اہل بیت رسالت مبتلا تھے اس میں کوئی ایسی کوشش ایک نہایت سخت کوشش تھی۔ جس کے لیے ہر انسان تیار نہیں کیا گیا ہے۔ لیکن وہ تیار تھے جو یہ کہہ رہے تھے کہ ہمارے بزرگوں سے آج کے مصائب کا عہد لیا گیا ہے۔ وہ تیار تھے جنھوں نے حسین سے سنا تھا کہ میں اس ذلت میں خدا سے امید عزت و کرامت ہے۔ وہ تیار تھے جنھیں حسین نے آخر وقت تک کہا تھا کہ دیکھو کسی طرح ایسے افعال اور انداز اختیار نہ کرنا جس سے ہماری منزلت میں نقص پیدا ہو۔

اب دیکھو کہ جس وقت تماشائی اسیروں کے شکستہ چہرے فرہادی صورتیں اور مستفیضانہ لہجہ کی امید کرتے ہوں گے، وہ دیکھتے ہیں کہ ایک اوٹ پر سے ایک ہاتھ اٹھا جس کا بیچ سے اشارہ ہے کہ چپ رہو۔ چہرہ پر نگاہ جاتی ہے اور وہ دیکھتے ہیں کہ ایک بے جنبش، غیر متاثر، ناشکستہ صورت سامنے ہے۔ جس کی بلندی بشرہ، نگاہ کا حجم، اور لہجہ کی صاف قوت خاموشی چاہ رہی ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی دفعہ صدائیں ڈوبتی جاتی ہیں۔ حیرت اور استعجاب لوگوں کو مخاطب کرتا جاتا ہے اور دفعہ کوفہ کا وہ ٹکڑا جو حضرت زینب کی نگاہ کے نیچے قحطی نموشاں بن جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اوٹ کے گلوں کے گھٹنوں کی صدا بھی نہیں سنائی دیتی۔ کوئی اتفاق تھا کہ ایسے موقع پر دفعہ ایسی خاموشی چھا گئی۔ نہیں بلکہ حضرت زینب علیا مقام کا ارادہ اور اس کے پیچھے ان کے عظیم الشان نفس کی قوت تھی، جس نے حتی تصنیہ کیا تھا کہ ہم کچھ کہیں گے۔ یہ ارادہ ایک بجلی تھی جو دوڑ گئی تھا اور لوگ سحر معلوم ہوتے تھے۔ ممکن نہ تھا کہ لوگ متوجہ نہ ہوتے۔ علی کی بیٹی کا نفس بیچ پر چھا گیا تھا۔

اس خاموشی میں حضرت زینب کی صدا بلند ہوتی ہے۔ ایک ایک لفظ اپنی مدد سماعت پر چٹ مار رہا ہے۔ اور سننے والے اس طرح سن رہے ہیں کہ اب گویا انھیں اور کسی بات کا ہوش ہی نہیں ہے۔ سن وہ باتیں رہے ہیں جس کے لیے وہ تیار نہ تھے۔ اس طرح جس کی امید نہ تھی۔ وہ سمجھتے تھے کہ بیورو قیدی یزاس کے کہ اپنی حالت زار سے ہمارے رحم و کرم کا استغاثہ کریں اور کیا کہیں گے نہ جاننے والے جو سمجھتے ہوں گے کہ ان قیدیوں کو دین سے کوئی غرض نہیں ہے۔ انھیں زمین و آسمان نہ دکھائی دیتا ہو گا۔ بہر صورت اہل کوفہ کو یہ امید نہ ہوگی کہ حسین کی شہادت کے بعد آل رسالت کے اسرا ایک انگلی سے سرہانے شہد کی طرف اشارہ کریں گے اور ہم سے کہیں گے کہ دیکھو تمہاری بے وفائی اور نامردی سے یہ ہوا۔

میں حضرت زینب سے خدا کی حمد اور ہادی برحق کی نعت سنتا ہے۔ اور اس کے بعد اپنے کو مخاطب دیکھتا ہے کہ: ”اے اہل کوفہ! اے اہل خدر و کمر۔ اب تم روتے ہو۔ تمہاری مثال اس عورت کی سی ہے جس نے اپنا سوت کلاٹ کر اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے ہوں۔ تم اپنے عہدوں میں ایک حیلہ بناتے ہو۔“ زینب خاتون اپنی اندوہناک

حالت نہیں دکھائی ہیں بلکہ اہل کوفہ یہ دیکھ رہے ہیں کہ وہ نہیں دکھائی ہیں کہ تم کیسے ہو۔ اہل کوفہ کی خصلت ان کی آنکھوں کے سامنے پیش کر دی گئی تھی اور نکیل عورتوں کے گل سے دی گئی تھی۔ اثر گھوا کر تمہاری تخیل مدد کرے۔ ایک مجبور قانون ملامت کر رہی ہے۔ میں صاف دیکھ رہا ہوں کہ اہل کوفہ پر ایک بجلی تھی جو گری تھی وہ چوندھیا گئے تھے اور ان کی وہ آنکھیں جو قیدیوں کا تماشا دیکھنے کے لیے اٹھی تھیں زمین میں گر گئی تھیں۔ ان کی گردنیں موم کی بن گئی تھیں۔ اور وہ سیدھی نہ ہو سکتی تھیں۔

وہ سنتے ہیں: ”آگاہ ہو کہ تم میں نہیں ہیں مگر ایسے لوگ جو بے ہودہ اور رذیل ہیں۔ تم میں ایسے سینہ ہیں جن میں کینے بھرے ہیں (اور) وہ لونڈیوں کی طرح خوشامدی ہیں۔ تم کمینہ پن میں اس سبزی کی صورت ہو کہ جو خواست پر آگاہ ہو۔ تم اس قبر کی صورت بے فائدہ ہو جو چاندی سے آراستہ کی گئی ہو۔“

سلاست، فصاحت، بلاغت، اور مغز تو جانے دو، تشبیہ کی تیزی سے بھی الگ ہو جاؤ۔ بلکہ ان فقرات کو وہ اختیارے گھو جو ایک قوم کے نفس کو چیر کر دنیا کو دکھائی ہیں۔ اہل کوفہ اپنے کو دیکھ رہے ہیں اور یہ کوڑے انھیں ہوش میں لاتے ہیں کہ ہم ایسے ہیں۔ اہل کوفہ یا سپاہیوں کی نسل اگر تلوار سے زخمی ہوتی تو خوش ہوتے کہ ہم نے پہلاری سے زخم کھائے۔ یہ وہ زخم تھے جسے اپنی شجاعت نمائی کے لیے دکھانہ سکتے تھے اور جو کبھی مندمل نہ ہو سکتے تھے۔ وہ ہر وقت تازے تھے جس وقت انھیں خیال آتا۔

وہ سنتے ہیں کہ: ”تم نے بڑے اعمال پیش کیے۔ جس کی وجہ سے تم قہر الہی کے متحق ہونے۔ اب روتے چلاتے ہو۔ بھڑانے توانا بہت رو اور کم ہنسو گے (اس لیے کہ) مار و ننگ عیب امت تم نے حاصل کیے ہیں۔ وہ تم سے ہرگز ہرگز جدا نہیں ہو سکتے۔“ لہجہ کی قوت، نفس شناسی کا درجہ الفاظ کی شان اور آمد بکھاری ہے کہ حضرت زینب علیا مقام فرما رہی ہیں۔ بلاشبہ حضرت زینب کو یہ کہنے اور کہنے کا حق تھا کہ کس میں امت کی غیباں اور کس میں برائیاں اور بے شرمیاں آگئی ہیں۔ اور اب وجہ بکھائی ہیں کہ: ”تم نے یلو گھر رشول، سردار جوانان بہشت، ملجا و ملائے ٹیکو کاران، جانے پناہ اہل مصیبت، ستون نجات خدا، اور اپنے راہ نما کو قتل کر ڈالا ہے۔“ اہل کوفہ اپنے کو دیکھ چکے تھے اب سنتے ہیں کہ حسینؑ کیسے اور کون تھے۔ کبھی اس سے لطیف تر سلسلہ اختیار نہیں کیا جاسکتا تھا اور نہ اس سے مناسب تر الفاظ میں دو متضاد صورتیں دکھائی جاسکتی تھیں۔ کیا کر رہا ہو گا وہ مجمع جو سن رہا تھا اور کہہ رہا تھا کہ خارجی کا سر آتا ہے اور اب وہ قہر نہیں سن رہا ہے جس کے انکار کی نہ صرف اس مجمع بلکہ زینب کی تمام سلطنت اور عالم کے تمام اہل قلم کو قدرت نہیں ہے۔ اس لیے کہ یہ عین واقعہ ہی تھا جو بیان کیا جا رہا تھا۔ اگر کبھی بات میں کوئی قدرت ہے تو میں کہوں گا کہ اس وقت اس مجمع پر زینب اس کے اسلمہ برداروں اور مصلحت کی حکومت نہ تھی بلکہ حضرت شہیدؑ کے بلا کے نفس عظیم کی حکومت تھی جو اس وقت حضرت زینبؑ کے دہن اقدس سے اپنے کو ظاہر کر رہا تھا۔ کب کسی اور کے لب و زبان کو یہ حق تھا کہ وہ حسینؑ کی مدح کر سکتا مگر یہ کہ وہ حقیقی معنوں میں حسینؑ کی ”ہمیشہ“ کالب و زبان ہوتا۔

مخاطب لوگ سنتے ہیں کہ: ”تم نے پیغمبر خدا کا جگر کاٹا ہے اور جناب رسالت مآبؐ سے کیسی عداوت ظاہر کی ہے!“۔ ”تم نے ایک بڑی آفت اور مادۂ عظیم بپا کیا کہ اس سے فتنائے آسمان و زمین تنگ ہو گئی۔“ یہ فقرہ تھا

جوانی شرح کا انکار کرتا ہے۔ جس کی بلاغت اپنی دوا یہ چاہتی ہے کہ وہی اسی طرح رہنے دیا جائے۔ قیاس نہیں کیا جاسکتا کہ اہل کوفہ کا علوم نفس کس طرح اس فقرہ کو سن رہا ہو گا کہ: ”چند روزہ شہادت پر مغرور نہ ہو۔ یہ خون پامال اور ضائع نہ ہو گا۔ خدا سبب خدا تمہاری تکین میں ہے!“۔ یہ فقرہ تھا جو ان کی آنکھ زندگی تاریک کر رہا تھا۔ ان کی بے ہوشانہ خوشی اور تسلی کو موت کا کرب بنا رہا تھا اور بگھارہا تھا کہ خدا کے لیے وقت کا ضائع ہونا وقت کا ضائع ہونا نہیں ہے۔ وہ اس نیلہ پیشین گوئی سے روز جزا کو سامنے دیکھ رہے ہوں گے اور سوچ رہے ہوں گے کہ خدا کا اہتمام ہمیں بھول نہیں گیا ہے۔

میرا آخری فقرہ اور بس کہ یہ ہمارے اندازے کے باہر ہے کہ حضرت زینب خاتون کی تقریر کا کیا اثر ہوا ہو گا اگر تاریخی اشارہ کی ضرورت ہو تو وہ موجود ہے کہ ایک بوڑھا پاس کھڑا ہے۔ نا تجربہ کار دل نہیں ہے۔ عمر کے اکثر مدارج طے کر چکا ہے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ اس کی سفید داڑھی ایک آبشار بن گئی ہے۔ جس سے آنسو ٹپک رہے ہیں۔ اور کہ یہ رہا ہے کہ: ”جوان تمہارے بہترین جوانان، عورتیں تمہاری بہترین عورات اور نسل تمہاری بہترین نسل ہے۔ کبھی تمہاری نسل رسوا اور ذلیل نہ ہوگی۔“ اس سے مجمع پر استہلا کا موقع ہے۔ لیکن میں جو کچھ کہہ رہا ہوں، وہ ایک نگاہ میں اس قدر باتوں کی روح کا مجموعہ کھ لینا ہے جہاں استہلا جواب دیتا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ یہ تقریر حضرت زینب کی قہم جس میں ان کے مقدس بزرگوں کی روح قہم خود اپنی صورت پر ان تمام حریرات کے علاوہ ناقابل مقابلہ قہم کے آثار تھے۔ انہیں دور رکھنے کی کوشش تھی۔ ایک مجمع تھا جسے ان منظمہ کی اس وقت اس حالت میں دکھائی دینے سے ایک نسبت تھی۔ ان حالتوں میں حضرت کی تقریر تھی۔ تقریر کہتی ہے کہ وہ کس طرح ادا ہو سکتی تھی اور کس لہجہ میں۔ پھی لہجہ تھا جس کی بجلی ہماری تصریح کے باہر ہے۔ لیکن یہ کہنا ہے کہ باوجود تمام صبر کے یہ اک درد رسیدہ کا جوش بھی تھا۔ یہ مجموعہ ہے جس کا کسی لفظ یا کسی فقرہ میں دکھانا میرے قلم کی وسعت سے باہر ہے۔ چاہے یہ کہ میں کبھی اس موقع سے زیادہ اپنے عزیزان کا معر نہیں ہوا۔ اس لیے کہ یہ قلم اور لفظوں کا کام ہی نہیں ہے بلکہ ایک وقت میں نہایت سرح ملاحظہ، تیر خلیل، قیادہ شناس نگاہ کا کام ہے۔ جیسی تیر خلیل، سرح ملاحظہ اور قیادہ شناس نگاہ کم انسانوں کو دی گئی ہے۔ ایسا دیکھنے والا بھی بڑا اس کے کہ ایک کیفیت محسوس کرے اس جگہ کھو جانے کا جب وہ اسے قلم کے حوالہ کرنا چاہے گا۔ مختصر لفظوں میں کبھی کسی ایسے اندوہناک موقع پر کسی ایسے امیر نے اپنی جلالت شان کا ایسا اظہار اور اثر نہیں کیا تھا۔ انسان کی زبان تو تاج کے نیچے اور تخت شاهی پر غرادی ہوئی تقریر کے ادا کرنے میں تھرتاتی ہے۔ یہ تو ایک مظلومہ تھی جس کا لگا ملتا فواد میں تھا۔ بازو حرکت نہ کر سکتے۔ ایک بے کلاہ اوٹ تھا اور زبان تھی جس پر آہ بھی بے احتیاطی سے نہ آسکتی تھی۔ کون اس موقع پر ایسا کچھ کہہ سکتا تھا مگر یہ کہ وہ نقیب الہی اور خلیفہ ربانی کی بیٹی ہوتی۔ کسے حق تھا کہ وہ حضرت زینب کی تقریر کی دوا دیتا ہو حضرت امام زین العابدین علیہ السلام کے کہ: ”آپ عالمہ غیر متعلمہ ہیں!“۔

کچھ عجب نہیں ہے کہ اس کے بعد لوگ ”حیران اور بھوکے“ ہو گئے ہوں اور اب انہیں یہ منظر قلم حلقہ دوسری صورت میں دکھائی دیتا ہو۔ یہ اور اس کے مثل تقریریں تھیں جن میں مقررین نے اس منظر کو جسے ان کے دشمنوں نے ذلت کا ذریعہ بنایا تھا اپنی عزت اور ہمدردی کا آکہ بتالیا۔ اپنے شخص، اپنی مخالفت اور اپنے نفس اور خیالات کی بلندی سے،

کھڑے کھڑے دیکھنے پر مستعد ہو جائیں۔ جن کی اولاد یہ ہیں۔ وہ اپنے مہر مادری کی جگہ فرزندوں کی شہادت کے لیے آمادہ ہو جائیں۔ ان عذر رات میں دین کے وقار کے محفوظ کرنے کا کس درجہ لحاظ تھا کہ نہ کسی نے کوئی شکوہ کیا اور نہ شکایت کا کوئی لفظ زبان سے نکالا۔ بلکہ اس کے علاوہ سوچا نہیں جاسکتا کہ ایسے بڑے عالم اندوہ میں بھی ان خواتین کو اپنے فرزندوں اور شوہروں کے کارناموں پر فخر تھا کہ انہوں نے اس طرح ادا آنے فرض میں شہادت اختیار کی۔ ظاہر ہے کہ جن کی شجاعت اور وقاحت تسکین حتیٰ ان کی موت کس قدر دل شکن ہوگی۔

سیپاہیں ہیں جو اپنے رنڈا پے پر بے اولادی کو ضم کر رہی ہیں اور حسرت و افسوس ظاہر کرتی ہیں کہ عورتوں پر جہلا واجب نہیں ہے۔ آٹا رہیں کہ سیپاہیں جن کی اولاد یہ نہیں ہی وہ متاسف ہیں کہ آج ہمارے پاس کوئی تحفہ نہیں ہے جسے ہم حسین قربان کرتے۔

لیکن جس بی بی کو خلافت امید چوٹ لگی وہ مادر حضرت علی اصغر تھیں۔ نہیں کسی انسان کی تخیل ایسی بے رحم نہیں ہے جو سوچے کہ اتنا بڑا بچہ تیر کا نشانہ بنایا جاسکتا ہے۔ لیکن اللہ رے صبر احتیاط اور دل کہ کہیں یہ نہیں لکھا ہے کہ ان پر کوئی بے مہنی طاری ہوئی۔ بلکہ یہ کہ حسین سے حضرت آتم کلثومؑ نے لاش لے لی۔ اور سیدہ سے لکلاہ ماں نے غالباً ایک مرتبہ حسین کی طرف دیکھا اور اسے گھٹیں پیچ کر لیں۔

اضطراب کا کیا ذکر بینیاں تھیں جن کے آنکھوں کے سامنے عبد اللہ بن مسلمہ عوف و محمدہ قاسم و امجد اور علی اکبر کے ایسے ناشگفتہ بھول بھواروں اور نیروں میں جا رہے تھے۔ اور وہ اس سے خوش تھیں کہ وہ اپنی جانوں کو حضرت امام حسینؑ علیہ السلام کے لیے قربان کر رہے ہیں۔

توجہ کے قابل ہے کہ اب کوئی نہیں ہے۔ اور قافلہ سالار اہل بیتؑ اسلحہ جنگ طلب فرما رہا ہے۔ حضرت شہر ہاتھ ہوں یا کوئی بی بی ہوں اسلحہ جنگ دیتی ہیں۔ بے قراری نہیں ہے۔ شکایت نہیں ہے۔ تسلیم و رضا ہے۔ صفت حضرت آتم کلثومؑ دیکھتی ہیں اور پوچھتی ہیں: ”اے بھائی! کیا آپ اپنے آپ کو موت کے حوالے کر چکے؟“۔ بس میں اس وقت اسے ممکن نہیں سمجھتا کہ کسی بی بی یا حضرت آتم کلثومؑ ہی نے فرمایا ہو کہ: ”اپنے مائے کے حرم کی طرف لوٹ چلو“۔ یہ نہیں سوچا جاسکتا کہ اس وقت تک جس قدر واقعات گزر چکے تھے ان سے اہل بیتؑ ناواقف تھے کہ وہ ایسا سوال کر سکتے۔ میرے نزدیک محاصرہ کے قبل ایسا کوئی امر قابل خیال ہو سکتا تھا۔ مجھے اس میں عذر نہ ہوگا۔ اگر یہ سوال حضرت سکیئہؑ نے کسی وقت کیا ہو۔ اس کے بعد کس طرح اہل بیتؑ نے وہ کپڑا حسینؑ کو دیا ہوگا جو اس امکان کے لحاظ سے زیب جسم کیا جا رہا ہے کہ اس کی بوسیدگی دشمن کو مائل نہ کرے۔ اور لاش برتنی سے محفوظ رہے۔ یہ بھی ایک نیا منظر تھا کہ کسی شہید راہ خدا کے اہل بیتؑ یہ دیکھیں کہ ایک کپڑا ہے جو جا بجا سے پاک کیا جا رہا ہے۔ بے شک جناب امیر کامیدان میں عذر دہش موقع پر جلتے وقت ایک خاص سر بند استعمال کرتا۔ حضرت فاطمہؑ زہرا علیہا السلام کے لیے باعث اضطراب ہوتا ہوگا۔ لیکن وہ اس کا یقین نہ تھا کہ جناب امیرؑ ضرور شہید ہی ہوں گے۔ امکان تھا۔ لیکن یہاں حسینؑ کپڑا پہن رہے ہیں جو موقع ہی نہیں ظاہر کرتا بلکہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ شہادت کے بعد لاش سے کپڑے بھی لیے جائیں گے۔

کب کسی چھوٹی سی لڑکی نے یہ منظر اندوہ دیکھا ہے کہ باپ مرنے جا رہا ہے۔ بچہ، لاڈلی لڑکی، چند سال کی، اس

حال میں ہے کہ آنسو باپ کے چہرہ کو صاف دیکھنے نہیں دیتے۔ باپ سینہ سے لٹاتا ہے۔ پیاد کرتا ہے۔ استین سے آنسو پونچھتا ہے۔ لیکن نہ بیٹی کہتی ہے کہ مرے نہ جاؤ، نہ باپ اپنے بچے کی اس امتحان خیز حالت سے اپنے ارادہ کو کمزور ہاتا ہے۔ بلکہ دھتکتیں فرماتا ہے۔ صبر و احسان کی یاد دلاتا ہے کہ ہم لوگ اپنے باپ دادا، اور جمالی کے نقش قدم پر چلنے والے ہیں۔ یہ ہونا ممکن تھا کہ جس وقت حضرت رخصت کر چکے ہوں اور اب مقتل کی طرف روانگی کا قصد ہو گھوڑے کو چلنے کا حکم دیا ہو۔ اور گھوڑا جنبش نہ کرتا ہو۔ کیوں۔ سکینہ سموں سے لپٹی ہیں اور جب باپ دیکھتا ہے تو ہاتھ پیلا کر کہتی ہیں کہ ایک مرتبہ پھر سینہ سے لٹا کر پیار کر لو۔ حسین اترتے ہیں اور دنیا کی اس آخری راحت کو قبول کرتے ہیں۔

اور کیا یہ برداشت کے قابل تھا کہ حسین کو رخصت کرنے کے لیے کوئی مرد نہیں ہے کہ رکاب تمام کر سوار کرے۔ علی کی بیٹی یہ رسم ادا کرتی ہے۔ شجاعان عالم اس بی بی کے قدم کی خاک اپنی آنکھوں میں لٹائیں اور فر کریں۔ شہدائے عالم دیکھیں اور وجد کریں کہ کوئی بے مددگار بی بی جو اس کے بعد اپنے لیے دنیا کی یہ مصیبتیں ٹھینا دیجے رہی ہے اس فرض کو کس طرح ادا کرتی ہے۔

حسین کا رخصت ہونا اس کا مقدمہ تھا کہ اہل بیت اسیری کے لیے تیار ہوتے۔ ایسے ایسے غم اٹھانے کے بعد بھی راحت کی امید نہ تھی۔ بلکہ جانتے تھے کہ اب ان کے بعد دشمنوں کی عداوت اور شیطنیت کا روکنے والا کوئی نہیں ہے۔ وقت ہو گا جب حضرت کی تنہا تلوار صفوں کو الٹ کر پیچھے کر دیتی ہوگی اور غل و شور ہوتا ہوگا۔ مگر اہل بیت اس شور کو بجائے اپنے انتہائے فکر کے دھڑکتے ہوئے دل سے سنتے ہوں گے اور سمجھتے ہوں گے کہ ہماری آخری چہا معدوم ہو گئی۔ جذبات غم و خوشی کا اپنے اپنے موقع پر پیدا ہونا صین تقاضائے فطرت ہے۔ لیکن تعزیت یا عدم تعزیت یہ ہے کہ کئی شخص کس طرح ان پر غالب آتا ہے۔ اور ان جذبات کو اپنے قبضہ میں رکھتا ہے۔ اس وقت دیکھو کہ حضرت اب قریب ہے کہ گھوڑے کی پیٹ پر قائم نہ رہ سکیں۔ دشمنوں کا مشغلہ جاری ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ حضرت زینب فور سے دیجے رہی ہیں۔ فور جس میں آج سے زیادہ کبھی اس قدر صبر، شہادت پر اس قدر رضامندی، حکم خدا کی اطاعت، غیرت پر قیام نہیں پایا۔ اور یاد رکھو کہ یہ سب کچھ ایک بی بی سے ظاہر تھا۔

عورتیں تو نرم دل، کمزور اور مغلوب ہو جانے والی ہیں غم سے۔ لیکن یہ سب مظہر اندوہ علی کی بیٹی کی نگاہ کے سامنے تھا اور جے حسین نے وصیت کی تھی کہ دیکھو تمہاری بے صبری منزلت کو نقصان نہ پہنچائے اور دشمن شامت کرے۔ اب حضرت زینب کا ارادہ تھا۔ ارادہ جو اگرچہ فی نفسہ عورت کا ارادہ تھا مگر اب فلاں اس کی سختی اور پہاڑ اس کے وزن کو نہیں ہچک سکتا تھا۔ اس وقت فرض پھی ہے کہ ہم دیکھیں اور صبر کریں۔ میں کسی امکان کی تشریح نہیں کر رہا ہوں بلکہ صین واقعہ لکھ رہا ہوں۔ واقعہ کہ ابن سعد حضرت کو زخمی دیکھ کر نامرد سپاہیوں کو لٹکا رہا ہے کہ نواسہ رسول جلد تمام کر دیا جائے۔ حضرت زینب اس کی طرف دیکھتی ہیں اور فرماتی ہیں: ”کیوں ابن سعد ابو عبد اللہ حسین اس بے کسی سے مارے جائیں اور تو دیکھتا رہے۔“ یہ حضرت زینب ہیں۔

کیا یہ استغاثہ مدد تھا؟ نہیں استغاثہ اور مدد کا وقت تو جاتا رہا تھا۔ یہ ملامت تھی۔ ملامت جو عرب کے شجاع اور شریف ترین خاندان کی ایک بی بی نے ایک عرب کو کی تھی۔ یہ حسین کا وقار یاد دلانا تھا۔ اور اسے یاد دلانا تھا کہ تو

دنیا کا سب سے بڑا گناہ کر چکا کہ تو نے اس مرکز خیر کو قتل ہوتے دیکھا بلاشبہ یہ نرم لہجہ میں کہا گیا تھا۔ اور اسی میں مرثیہ تھا جس نے ابن سعد کو حسینؑ کو شہید کرنے کے جوش اور فوج کی خوشی میں رلا دیا۔ لیکن زینبؑ علیہا مقام مظراندہ اور ابن سعد کی غالت دیکھنے کے لیے پھر اسی طرح بے جنبش کھڑی تھیں۔ ہزار ہا سپاہی خوشی کے نعرے بلند کر رہے ہیں۔ سنیں گے۔ حسینؑ کا فرق مظہر نیر سے پر بلند ہے اور تازہ خون ٹپک رہا ہے۔ دیکھیں گے اگر حسینؑ نے شیر قاطر سے پرورش پائی تھی تو زینبؑ و ائمہ کثومؑ بھی اسی سے پل تھیں۔ حسینؑ اگر شہید ہونے کو تھے تو یہ بیسیاں دکھانے والی تھیں کہ جو کچھ بھی جو ہم اپنے خاندان کی انتہائے بلندی حاصل کے دکھانے کے لیے کہلا میں حسینؑ کے ساتھ آئے ہیں۔ حسینؑ کی لاش پامال ہوگی۔ لیکن ہم انہی بے صبری سے اپنے اور حسینؑ کے دکھار کو پامال نہ ہونے دیں گے۔ تعریف کی گئی ہے کہ: ”کان حسینؑ جبلاً“۔ میں حیران ہوں کہ نرم دل بیسیوں کے اس صبر و استقلال کی کن فطرتوں میں تعریف کروں۔

ذرا ٹھہر جاؤں اور مکہ بن وائل کی اس عورت کو داد دے لوں ہے یہ غیرت آئی کہ بے غیرت سپاہیوں کو چند بے کس عورتوں کے لوٹنے کے لیے جاتا دیکھ کر نکل آئی۔ انتقام برد کیا اور تلوار لیے تھی۔ افسوس اب کوئی مرد نہ تھا جس میں اہل بیتؑ کی مدد کا جوش پیدا ہوتا۔

اب اس کے بغیر بگے کیا کہنا ہے؟ اس کے کہ کچھ چیزیں (اسباب) جو اہل بیتؑ کے خیمہ میں تھیں دشمنوں نے لوٹ لیں۔ یہی معرکہ کہلا کی روح ہے۔ ذرا گھو کہ حسینؑ کے جسم مظہر پر وہ پرانا اور چاک شدہ کپڑا بھی نہیں ہے جو اعتیاداً پہنا گیا۔ اسی میں قوم کی تاریخ ہے کہ وہ کسی تھی۔ کیونکر ایسی ہو گئی اور کب سے ایسی ہوئی تھی۔ چیزیں جن کی لاش میں لشکر آیا تھا۔ جس کے لیے ابن سعد اور ابن زیاد اپنے مکروہ مظالم ایلا کر رہا تھا۔ چیزیں جس پر قابض رہنے کے لیے زید حسینؑ کو اپنے راستہ سے ہٹا دینا چاہتا تھا۔ چیزیں جس نے زید کے پہلے ایسے اسباب پیدا کیے کہ آج کے عبرت خیز مظہر بنتی ہوئے۔ حسینؑ کی برہنہ اور خون آلود لاش دیکھ لو اور گھو کہ کیا ہوا تھا۔ میں کوئی برہنہ لاش نہیں دکھا رہا ہوں۔ میں کوئی خون آلود لاش نہیں دکھا رہا ہوں۔ میں ایک برہنہ لاش دکھا رہا ہوں جو خون آلود ہے۔ یا ایک خون آلود لاش دکھا رہا ہوں جو برہنہ ہے۔

کیا اسلام اور رسولؐ نے چیزوں کی محبت سکھائی تھی۔ اور اس طرح؟ نہیں۔ تو کچھ روح اسلام میں بھی تغیر ہوا تھا۔ اہل بیتؑ کے لیے تاریخی خیام اس لیے زیادہ اندوہناک نہ تھی کہ ان کے اسباب پر دشمن قابض ہو گئے تھے۔ کچھ چیزیں غارت ہو گئیں۔ نہیں۔ بلکہ اکثر چیزوں کا تباہ ہونا اس لیے اندوہناک ہوا کہ ان سے اکثر نفوس کی یاد وابستہ ہوگی۔ چیزوں کا دیکھنا شخص کو یاد دلاتا ہوگا۔ نظر بریں یہ چیزیں نہیں غارت ہوئیں بلکہ سلسلہ یاد غارت ہوا اور یہی عزیز تھا مثلاً جہاں اہل بیتؑ کے خیام تھا وہاں اب خیمہ نہیں ہے۔ بلکہ راکھ کا ڈھیر ہے۔ یا بٹے ہوئے خیموں کے کچھ ٹکڑے ہوا کے ساتھ زمین میں لوٹ رہے ہیں۔ کون کہہ سکتا ہے کہ ان خیموں سے حسن فتنی، علی مرتضیٰ اور محمد مصطفیٰ ﷺ کی اکثر وقت کی تاریخ وابستہ نہ تھی۔ گھر کے لوگ جانتے تھے کہ کس وقت وہ کہاں تھے۔ انہوں نے کسی خاص فرد سے کونسا مخصوص اظہار عنایت کیا تھا یا کسی جگہ سے کوئی خوشگوار حالت تازی ہوئی تھی۔ یہ سب بھی نہ سہی یہ ضرور تھا کہ حسینؑ اپنے دوران سفر میں خیموں میں کس کس طرح دکھائی دیے تھے۔ اور اپنے آخری وقتوں میں کسی خاص جگہ کیا کر رہے تھے۔

اور اہل بیت کا ہر ایک جگہ کیا موقع تھا۔ ان چیزوں کا غارت ہونا اس تاریخ کا ضائع ہونا تھا جو ان چیزوں پر لکھی تھی۔ اور اس طرح ان بزرگواروں کے ضائع ہونے کے بعد یاد دلانے والی چیزوں کا ضائع ہونا غم ہالانے غم تھا۔ کس کا تصور اس قدر قوی اور وسیع ہے جو اس وقت کی حالت لکھ سکے جس وقت اہل بیت حضرت کے گھوڑے کو خلی زین دیکھتے ہیں۔ زین پر سوار نہیں ہے۔ اور خون آلود ہے۔ اس وقت کے مذکورہ اشعار اپنی آپ ہی شرح ہیں۔ عین واقعات ہیں۔ اور مبارکوں کے رونے کا نمونہ ہیں۔ نوحہ میں ایک دھار ہے۔ جس کے پیچھے عزم اور استقلال کی دیواریں ہیں۔ اور پھر کس کی تحلیل اس قدر ہمدردی و غور ہے جو اس وقت کا نقشہ کھینچ سکے جس وقت دشمنوں کو اس کی جرأت ہوئی کہ اہل بیت کی چادریں اور زیورات چھین لیں۔ وقت کی بہترین مصوری اس واقعہ میں ہے کہ ایک ذلیل کسی بی بی (حضرت زینب یا حضرت فاطمہ صغریٰ) کا زیور لے رہا ہے اور رو رہا ہے۔ پوچھا جاتا ہے اور وہ کہتا ہے کہ ”میں تمہاری نصیبت پر رو رہا ہوں۔“ پھر پوچھا جاتا ہے کہ: ”تو کیوں تو زیور لیتا ہے؟“ اور وہ کہتا ہے کہ: ”اس لیے کہ اگر ہم نہ لیں گے تو کوئی دوسرا لے لے گا!“۔

اور دشمنوں کا یہ برتاؤ اس ہمدردی و محکم کی اولاد کے ساتھ ہے جو انبار پر دشمن کے تلے اور لوگوں کی ملک میں تساہل پر ملامت کرتا تھا اور تنہا درد کرنے پر آمادہ تھا اور فرماتا تھا: ”مجھے ان حملہ آوروں کے ظلم و جور کی یہاں تک خبر پہنچی ہے کہ ان میں سے ایک شخص کسی مسلمہ یا ذمیہ عورت کے گھر میں داخل ہوا۔ اس کی پازیب، اس کے کڑے، اس کا گلوبند، اس کے گوشوارے۔ یہ سب زیورات نہایت بے رحمی سے چھین لیے۔ وہ عورت اس مرد کو نہ روک سکی مگر یہاں برابر وہ مدائے گریہ بلند کر رہی تھی اور قبیلہ والوں کو بلارہی تھی۔ اب اگر کوئی مسلمان اس سانحہ و تلاشِ ہرافوس کرتے کرتے مرجانے تو اسے ملامت نہیں کی جاسکتی بلکہ وہ اسی مرگ کا سزاوار ہے۔“ اچھا برتاؤ کیا گیا اس کی اولاد کے ساتھ جو نہ صرف مسلمہ بلکہ ذمیہ کی حفاظت کا ایسا لحاظ فرماتا تھا۔

میرا خیال ہے کہ اہل بیت پر سب سے سخت اور اندوہناک رات روز شہادت کی پہلی رات تھی۔ ایک رات قبل سب تھے اب کوئی نہیں ہے۔ اسباب ضرورت تھا۔ اب اس کا نام بھی نہیں ہے۔ یہ بھی نہیں معلوم کہ اب کیا ہو گا۔ یہ معلوم ہے کہ ہم گرفتار ہیں۔ اور ابن زیاد اور شام تک جائیں گے۔ اور یہ پوچھنے والا کہاں تھا کہ کئے دن سے کھانا یا پانی تمہارے لبوں تک نہیں پہنچا ہے۔ محال ہے کہ کوئی انسان اس سے زیادہ عالم اندوہ کا خیال کر سکے کبھی کسی شریف خاندان پر اس سے زیادہ طویل رات نہیں گزری۔

صبح ہوئی۔ اہل بیت دیکھ رہے ہیں کہ دشمن اپنے کشتوں کو دفن اور سامان سفر کر رہے ہیں۔ اہل بیت کسی طرح شہداء کی لاشوں پر پہنچے ہیں۔ دوست دشمن سب رو رہے ہیں۔ حضرت سکینہؓ آخری مرتبہ ہاپ کے سینہ سے لپٹ گئی ہیں۔ اور سر کو حسینؑ کے گلوئے مبارک پر رگڑ رہی ہیں۔ لیکن دشمن اس پر بھی راضی نہ تھے کہ اہل بیت کو یہ اندوہناک تسکین بھی کچھ دیر حاصل ہو۔ لاشوں سے پھیر ملانے گئے۔ قافلہ روانہ ہوتا ہے اور اب بیار کر بلا کی نگاہ مقتل پر جمی ہوئی ہے۔ سب کچھ نگاہ کے سامنے ہے اور آپ میں ایک تغیر عظیم پیدا ہوتا ہے۔ حضرت زینبؓ کی نگاہ بیدار کر بلا کے چہرہ پر جم جاتی ہے۔ اور فرماتی ہیں: ”اے میرے بزرگوں کی یادگار میں تجھے کس حالت میں دیکھ رہی ہوں۔ کیا تیرا ارادہ ہے کہ دنیا سے گزر جائے؟“۔

اور یہ نذیر کے خلاف بلکہ بنی امیہ کے خلاف پیمان اور تباہی کا سنگ بنیاد ہوا۔

اب میں جن قہرروں یا حالتوں پر نظر کروں گا وہ متاثر ہوگا میرے ان خیالات سے جو میں حضرت زینبؓ خاتون کی قہر کے ضمن میں ظاہر کر چکا اور اب میں اس کے بعد نہایت مخصوص فقرات اور پیش کروں گا حضرت فاطمہؓ مغزیؓ بھی عمر سے شروع فرماتی ہیں۔ جناب رسالت مآبؐ کی رسالت کی ”گواہی“ دیتی ہیں۔ اور فرماتی ہیں کہ ان کی اولاد کو ”اشتباہ“ است“ نے ”ناحق“ قتل کیا۔ ”مالانکہ وہ کسی سے بغض و عداوت نہ رکھتے تھے۔“ یہ فرض جناب فاطمہؓ مغزیؓ سے متعلق کیا گیا تھا کہ وہ جناب امیر علیؓ السلام کے فضائل لوگوں کو یاد دلادیں۔ اسی کوفہ میں جہاں ایک زمانہ گزر گیا تھا کہ کوئی اموی حاکم نہیں آتا تھا مگر یہ کہ اپنے حاکمانہ فرائض میں سب علیؓ کو ایک اہم ترین فرض سمجھتا تھا۔

فرماتی ہیں کہ: ”اے اہل کوفہ! خدا نے تمہارے امتحان ہم سے کیا۔“ اس فقرہ میں ایک زمانہ کی تاریخ تھی کہ قوم کی کیا حالت تھی۔ کس طرح اہل بیتؑ حفاظت دین اور حقوق قومیت کے لیے کھڑے ہوئے اور اس قوم نے کیا مصلوہ دیا۔ اس احسان کا جس کے لیے اہل بیتؑ رسالت نے ہمت کی تھی۔ اہل کوفہ امتحان میں پورے نہ اترے، بلکہ نا احسان شناسی کہ اور جب ان کی نا احسان شناسی سے حفاظت دین و قومیت میں اہل بیتؑ مبتلائے مصیبت ہوئے تو اہل بیت کی یہ کوشش اور تسلیم و رضا خدا کے نزدیک بہتر تھی اور اس نے ”ہماری ہلاک کو اچھا جانا“ ”ہم کو علم و حکمت عطا کی۔“ اپنی کرامت سے ہم کو معزز کیا“ اور بوجہ اپنے رسولؐ کے تمام خلق پر ہم کو عزت و شرافت بخش“۔ کس میں اتنی جرأت تھی کہ وہ ان اصول اور واقعات کے خلاف کچھ کہہ سکتا۔ اب فرماتی ہیں: ”تم نے اپنے پیغمبر کی تکذیب کی (اس لیے کہ) ہمارے خون و مال کو ہمارے حلال جانا۔۔۔ یہ سب تمہاری پرانی عداوت و کینہ کی وجہ سے ہے۔“

”تم ہمارے قتل و قمارت سے خوش نہ ہو کہ یہ وہ مصیبتیں اور بلائیں ہیں جو قبل از وقوع واقعہ خدا نے کتب میں لکھی ہیں۔“ یہ فقرہ صراحت میں نے اس جگہ لکھا ہے۔ اور وہ اس وجہ سے کہ بعض بیاناں دے اے جاہل اندھوں کے فریب دینے کے لیے استعمال کرتے ہیں یا کر سکتے ہیں۔ کون کہے کہ تمہاری ہمہ دانی کا یہ محکم کلڑا اس آگ پر جلا دینے کے قابل ہے جس سے تم خدا کی اکثر نعمات کو رسوا خاک کر دینے کو قرین عقل سمجھتے ہو۔ جانے اس کے کہ اس نعمت سے اپنے ہی ایسے مخلوق کو قلع پھلانہ ایسے دماغ سختوں کو بھولنا نہ ہو گا کہ پانی کے چند قطرے ان کے آئینہ پرش کو فنا کر دے سکتے ہیں۔ نہ عامہ مسلمین ایسے اولیٰ نے توجہ والے اسٹیل پرستوں کے فریب سے آپس میں لڑ کر انھیں خوش کر دیں گے۔ وہ کہتے ہیں کہ جب یہ لگایا ہوا تھا کہ ایسا ہو تو پھر اس ہانے والے، تذکرے اور واقعہ کے اہتمام تلاذگی کی کیا ضرورت ہے۔ حسینؑ بغیر شہید ہونے نہ رہ سکتے تھے۔ اور یزیدؑ بغیر شہید کیے نہ رہ سکتا تھا۔ پھر اس میں حسینؑ کی تعریف اور یزیدؑ کی مذمت کی کیا ضرورت ہے؟ بیاناں دھوکے اور جاہل اندھوں کو جانا چاہیے کہ عالم کی توحید خدا کو عالم جاتی ہے۔ ان تمام واقعات کا جو ہر چکے، جو ہر ہے ہیں یا جو ہوں گے۔ علم الہی ارادہ الہی نہیں ہے۔ اور یہ مٹی سے بات ہے کہ میں کسی چیز کا علم ہو سکتا ہے لیکن کچھ ضرور نہیں ہے کہ اس چیز سے ہمارا ارادہ بھی وابستہ ہو۔ اور ہم نے اپنا ارادہ اس طرح جاری بھی کیا ہو کہ دوسرے کی قوت فاعلیٰ ہم نے ضائع کر دی ہو۔ کیا مقررین کے پاس خدا کے اس پروانہ کی قوت ہے جو اس نے یزیدؑ کے پاس بھیجا تھا کہ تم حسینؑ کو شہید کر دو۔ اور ایسا ایسا ہمارے علم میں گزر چکا ہے۔ جس کی ہم تمہیں اطلاع دیتے ہیں۔ اور مطلع

حکم خدا نذیر اس حکم کو عبور نہیں کرتا ہے۔ اور تعمیل کیلئے نہ کرے کہ اس کے قرآنہ کار وسیع اثر اڑ کر سپاہیوں کے ہاتھوں میں چلا رہا ہے۔ اسلحہ خانہ کی تلواریں قاتلیں حسین کی مکروں سے لٹی جا رہی ہیں۔ اس کے گھوڑے اصطبلوں سے کھل کر ان کے پاس آتے ہیں۔ بیٹے پر سوار کر کے کربلا کی طرف دوڑتے ہیں۔ تلواریں نیام سے ہاتھوں میں آئی جاتی ہیں۔ اور ہاتھ خود بخود حسین پر چلنے لگتے ہیں۔ اور اعضاء زخمی کرتے ہیں۔ سپاہی اس کے خلاف چاہتا ہے لیکن کچھ نہیں کر سکتا۔ نذیر کا ارادہ اور حملہ صلیح ہو گئی ہے۔ اور وہ بڑا اس کے کچھ سوچ ہی نہیں سکتا کہ حسین کو شہید کرے۔ حسین چاہتے ہیں کہ نذیر کی بیعت کر لیں۔ لیکن ان کا ہاتھ بیعت کے لیے حرکت ہی نہیں کرتا۔ اور نہ زبان بڑا انکار کے کوئی لفظ نکال سکتی ہے اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ حسین شہید ہوتے ہیں۔

مختصر یہ کہ ایسا مقرر کار خانہ عالم کو درہم و درہم دکھانے کا بھی وعدہ کرتا ہے۔ شاید مقرر کا ادارہ مدخل اس کی آنکھوں کے سامنے کوئی ایسا تماشا دکھاتا ہو لیکن عالم اور اس کے اسباب اور فہم حسین کی شہادت کے قبل جیسا تھا شہادت کے وقت ویسا ہی تھا اور شہادت کے بعد ویسا ہی رہا۔

خدا کے علم نے انسان کے قائل مختار حیثیت کو ضائع نہیں کیا تھا۔ نذیر کو اختیار تھا کہ وہ اپنے ارادہ سے وہ اسباب پیدا کرے جو قتل حسین پر مقرر ہوں اور حسین کو اختیار تھا کہ وہ انکار سے اپنی قتل گاہ تک جائید اور اس کے بالکل نذیر کو یہ بھی اختیار تھا کہ وہ اپنے وہم کو اپنے قبضہ میں رکھتا جیسا کہ شہادت اس نے نصیب ہی سے ہی تاسف ظاہر کیا۔ اور حسین کو بھی یہ اختیار تھا کہ وہ بیعت نذیر کر لیتے۔ اور واقعہ کربلا کا دنیا میں وجود نہ ہوتا۔ انفرادی آزادی ارادہ کی بھی مثالیں ہیں کہ جس وقت لشکر نذیر حسین کے قتل پر آمادہ تھا اور ابوالشعشاد وغیرہ اپنے لشکر سے الگ ہو جاسکتے تھے اور اسی طرح جس وقت حضرت امام حسین کے رہائے تھے اور اپنی قتل گاہ کی طرف جا رہے تھے وہ لوگ جو امید فتح سے ساتھ تھے ساتھ چھوڑتے جاتے تھے۔

اس کے بعد بڑا اس کے کہ کسی پر ”سوم“ یا بھنگ کا اثر ہو اور کوئی ایسے لغو اعتراض سے کسی مسلمان کا وقت ضائع نہ کرے گا۔

بلاشبہ حسین اور نذیر کو اپنے احوال کے شائع معلوم تھے۔ نذیر جانتا تھا کہ ہم اپنی مصلحت میں کہہ رہے ہیں۔ اور حسین جانتے تھے کہ ہمارا انکار بیعت ہمیں کہہ رہے ہیں۔ لیکن نذیر نے اپنے ارادہ اور اختیار سے عالم کے ہر بہتر سے بہتر احساس کو کربلا میں قتل کر دیا۔ اور حسین نے اپنے علم ارادہ اور اختیار سے اپنی گردن کٹا کر دنیا کے بہتر سے بہتر احساسات کو ابد الابد کے لیے زندہ کر دیا۔

حسین تھے جن کا تجربہ سیاسی، قوم شناسی، انسان شناسی، روشن ضمیری ان سے کہہ رہی تھی کہ تمہارا بیعت کر لینا دین کی شہ رگ کاٹ دے گا۔ حسین نے اس شہ رگ کے پالنے کے لیے اپنی گردن آگے بڑھائی۔ اور جب دیکھا کہ ایسے اسباب پیدا ہو گئے ہیں تو کمال تسلیم و رضا سے یہ تصفیہ کیا کہ مشیت ایزدی یہ ہے کہ ہم ان اتفاقات میں یہ کہہ کر یہ خدا کی حکایت نہ تھی۔ امتحان سے اعراض نہ تھا۔ نہایتا ہونا اور اہتمام کرنا تھا۔ آج ہے۔ دنیا میں حسین کا یہ عمل نفس کیسے ہر شخص کے کج میں آسکتا ہے۔ حسین اور حسین کے پیرو اور ان کے بعد ان کے سلسلہ روش کے قائم رکھنے والے بھی کرتے تھے۔

وہ اس کے قاتل نہ تھے کہ خدا انسان کو اس کے افعال میں مجبور کر کے اپنے قائم کردہ نظام کا بطلان کرتا ہے۔ بلکہ وہ اس بلند درجہ پر تھے کہ جب وہ کسی ایسے اتفاقات میں اپنے کو پاتے تھے جو مصائب پر گنتی ہوتا تھا تو وہ خدا سے عطا کیے صبر و استقلال کی دعا کرتے تھے۔ اور امتحان کو شہیدانہ محبت خدا سے ”مشیت“ کے لفظ میں غرق کر دیتے تھے۔ اور ”خدا کی کتاب میں لکھا“ ہونے سے بڑا اپنے اظہار تسکین کے اور کچھ نہ کہتے تھے جس کی غرض یہ تھی کہ یہ علم خدا میں تھا نہ یہ کہ کسی کاغذ اور چمڑے کی بندھی ہوئی جلد میں۔ کافی۔

خیر ہماری فزادوی نے اس کے قبل فرمایا ہے کہ: ”تم ہمارے قتل و غارت سے خوش نہ ہو۔“ اور اس کے بعد فرمایا ہے کہ ہماری عادت یہ ہے کہ: ”جو چیز جاری ہے اس پر رنجیدہ نہ ہوں اور جو کچھ حاصل ہو اس پر خوش نہ ہوں۔“ اس سے جہاں اپنی بے جنبش صبر اور صبر سے شجاعت بھائی ہے دشمنوں کو اس بڑے جانتے والے کے غضب سے ڈرایا ہے۔ جس کی آنکھ سے انسان کا کوئی عمل مخفی نہیں ہے۔ اور وہ ہر ایک کے افعال کی پاداش عطا کرتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ چونکہ جناب فاطمہ مغربیہ یہ فرما رہی تھیں کہ یہ امور اعلیٰ علم الہی میں تھے اس کے اقرار سے اپنے علم اور روشن ضمیری کی امکانی مستعدی ظاہر کی تھی۔ یہ نہ تھا کہ دشمنوں کی ایذا رسانی نے انھیں عدم مستعد پایا ہو، اور اس سے ان میں کوئی ایسا اضطراب پیدا ہوا جو مظلومیت نفس کوئی جائزے اور اس سے دشمنوں کو خوش ہونے کا موقع ہو۔

اس کے بعد عجیب پر ہیبت فقرہ تھا کہ: ”عذاب و لعنت خدا کے ظہور ہو۔ گویا تم پر پے در پے غضب خدا اور عذاب شدید آسمان سے نازل ہوا ہے۔ اور تم کو کردار زشت کی پاداش نے ہلاک کر دیا ہے اور تم میں سے بعض کو بعض کے عذاب میں گرفتار کر دیا ہے۔“ زمانہ جلتا ہے کہ اگرچہ یہ الفاظ اس وقت ممکن ہے کہ ایک یتیمہ کی فریاد سے زیادہ نہ بگے گئے ہوں۔ مگر چند برس بعد کا یہ ایک واقعہ تھا۔

آخر میں یہ بھی فرمایا ہے کہ: ”ہر شخص کے لیے اس کے افعال کے مطابق سزا دیا جائے۔“ اور نتیجہ یہ ہوا کہ: ”گریہ و زاری کی صدائیں بلند ہوئیں، اور لوگوں نے کہا کہ: بخت طعین تمہارے لیے بس اسی قدر کافی ہے۔“

حضرت زینب علیا مقام اور حضرت فاطمہ مغربیہ انتہائی وقار اور صبر سے ایسے کلمات ارشاد فرمائی تھیں جو بہت سے امور پر حاوی تھے۔ لوگ متوجہ ہو چکے تھے۔ غم لوگوں کے دلوں میں بھر گیا تھا۔

تھیں کی ضرورت تھی کہ بیان نہ چمک جاتا۔ ضرورت تھی کہ آنسو لوگوں کے دلوں سے رہی بھی رکھوٹ بھی دھو دیتے۔ یہ کام غالباً حضرت اُمّ کلثوم علیہا السلام کے سپرد کیا گیا تھا۔ آپ کی تقریر کی ابتدا بلند آہ یا غم انگیز صدا تھی۔ اگر فوج سے پوچھا جائے تو حضرت اُمّ کلثوم کی یہی تقریر تھی۔ اگرچہ اس کے بعد بھی آپ نے کچھ فرمایا جس میں کوئی تمہید نہ تھی بلکہ اپنے برابر عالی مقام کے اندوہناک واقعات بیان کیے۔ لیکن یہ صرف اظہار غم کی شرح تھی۔ اور بس۔ فرمایا ہے کہ تم نے میرے بھائی کو قتل کیا اور ایسا خون بہایا جسے قرآن اور رسولؐ نے حرام کیا تھا۔ (وای لا یبکی فی حیاتی علی اخی، علی خیر بعد النبی۔۔۔) اب عمر میرا اپنے بھائی کو روؤں گی۔ وہ بھائی جو نبی کے بعد سب سے بہتر تھا۔ اس غم انگیز نوحہ کو اس فقرہ سے گھبو کہ: ”تمام حاضرین اس کلام سے شور و ناگ کرنے لگے۔ عورتوں نے بال کھول دیے، خاک سر پر ڈالی۔“

چہرے ناخون سے نوچے ٹمٹمے کالوں پر مارے اور مردوں نے اپنی دھڑکی نوچی اور اس روز سے زیادہ رونے والی اور رونے والیاں نہیں دکھائی دیے۔

حضرت امام زین العابدین علیہ السلام کے متعلق مجھے صرف یہ کہنا ہے کہ ان جناب کا خطبہ زیادہ تر اپنا تعارف تھا۔ ہاں ایک ہادی خلق کے بعد دوسرے ہادی کو اس کی ضرورت تھی کہ وہ ایسے بڑے مجمع سے یہ کہہ دیتا کہ سلسلہ ہدایت متقطع نہیں ہو گیا ہے۔ لازماً موقع یہ تھا کہ ہر چیز ختم آؤد ہوئی۔ ذرا سوچئے کہ ایک خیف دناواں ہے۔ بیار ہے۔ جسے بیٹھا بھی مشکل ہے۔ اس پر بھی دشمنوں نے یہ اہتمام کیا ہے کہ گلے میں لوسے کا طوق پہنادی اور ہاتھوں کو اوٹ کے پیٹ میں باندھ دی جس کا اثر یہ ہے کہ اس بیمار کی رانیں تختہ خون ہو رہی ہیں۔ امام کی تقریر بھی تھی اور بس کہ ”میں علی بن اسین ہوں۔“ مجھے دیکھ لو کہ میں کس حالت میں ہوں اور کیوں۔ میں اس کا فرزند ہوں جو راہ خدا میں فاسق کفارہ ذبح کیا گیا۔ جو صابر و شاکر شہید ہوا اور اس کا فر میرے لیے کافی ہے۔ بڑا فرقا اور یہی حقیقی فرقہ امام اپنے کو اپنے صابر باپ کی صفات کا فرزند کہہ رہے تھے۔ محض حضرت امام زین العابدین کا اپنی طرف لوگوں کو مخاطب کر لینا ہزار مرثیوں سے زیادہ اثر خیز تھا۔ لوگ ایک دوسرے سے کہہ رہے تھے کہ ہم ہلاک ہوئے اور ہم نے غفلت کی۔ توحیت کافی حد تک ہو چکی تھی اور اس کی بھی ضرورت تھی کہ رحمتہ اللعالمین کا یہ جانشین بشر بھی ہو تاکہ امام فرماتے ہیں خدا کی رحمت اس پر ہے جو گوش دل سے نصیحت سنے اور قبول کرے۔ رحمت کے لفظ کا یاد دلانا اس وقت سے زیادہ کمی کم مفید ہوا ہوگا۔ لوگ سننے کے لیے مستعد ہونے اور اکثر توجہ کرنے لگے اور یہاں تک بڑھے کہ انہوں نے مزید سے اہتمام کا وعدہ کیا۔ یہ وعدے غیر فطری نہ تھے اس پر قیام یا عدم قیام سے بحث نہیں ہے۔ لیکن امام ان وعدوں سے روکتے ہیں۔ انہیں اپنے پدر بزرگوار کے ساتھ کے وعدے یاد دلاتے ہیں اور اپنے لیے فرماتے ہیں کہ میری خواہش تم سے صرف یہ ہے کہ تم ہم کو قطع و ضرر کچھ نہ پہنچاؤ۔“

یہ بھی توجہ کے قابل ہے کہ اہل کوفہ ان مخلوقوں کے طرف غریبہ پینکتے ہیں اور حضرت ائمہ کلثوم فرماتی ہیں کہ: ”اے اہل کوفہ صدقہ ہم پر حرام ہے۔“ یا اپنے دیکھنے والوں سے ارشاد بلکہ حکم فرماتی ہیں کہ: ”بند کرو اپنی آنکھوں کو کیا تمہیں خدا و رسول سے شرم نہیں آتی کہ تم اہل بیت کو بحالت عریانی دیکھتے ہو!“

ان تقریروں کے بعد کوئی عجب نہیں ہے کہ کوفہ کے خیالات اس سے بالکل بدل گئے ہوں۔ جیسے اس حسرت خیز واقعہ کی آمد کے پہلے تھے۔ خبریں ایک زبان سے دوسری زبان تک پہنچی ہوں گی کہ یہ اسیران آگیاں تھیں اور ان کے ساتھ کرپا میں کیا ظلم کیے گئے ہیں۔ یہ محال ہے کہ خوف زدہ دوستوں میں ان خبروں سے کرب نہ پیدا ہوا ہو۔ ساتھ ہی ایسے لوگ بھی معدوم نہ ہونے ہوں گے جنہیں خاندان رسالت سے قسمانہ عداوت تھی۔ لیکن متوقفین کی ہمدردی قرینہ ہے کہ اہل بیت کی مخلوق سے ان کی طرف مائل ہوتی ہو۔

وہ جوش خیز موقع آیا کہ اہل بیت ابن زیاد کے سامنے ہوتے۔ آج اذن عام تھا۔ اہل بیت کی یہ حالت تھی کہ کنیز یا انہیں گھیرے تھیں اور خاموش ایک گوشہ میں بیٹھے تھے۔ غالباً رسمی گفتگو شروع ہونے کے قبل کی خاموش ابھی نہ ٹوٹی تھی کہ حضرت سید الساجدین نے گفتگو میں پیش قدمی کا تعفیہ کیا کہنا یہ تھا کہ معریب تم بھی اسی طرح کھڑے کیے جاؤ گے اور تم سے سوال کیا جائے گا۔ لیکن تم رسول اللہ کو کوئی جواب نہ دے سکو گے۔ ظاہر ہے کہ اس پیش قدمی کی غرض

یہ تھی کہ ابن زیاد کی تقریر اور کسی اثر ڈالنے کے قبل۔ مسلمانوں سے یہ کہہ دی کہ ہم کون ہیں اور کس حالت میں ہیں۔ بلاشبہ اس سے حاضرین میں اپنے موافق حالت پیدا کرنے کی کوشش تھی جس کا اثر اس سے کچھ میں آنے لگا کہ ابن زیاد ”چپ ہو گیا اور اسے یہ پسند نہ آیا“۔

آخر ابن زیاد نے حضرت اُمّ کلثوم کو پوچھا اور کسی نے جواب نہ دیا۔ دوسری مرتبہ پوچھا اور پھر کسی نے جواب نہ دیا۔ تیسری مرتبہ اس نے قسم دی اور جواب یہ دیا گیا کہ: ”مات زید؟“ (کیا چاہتا ہے؟) قیاس کرو کہ اس نام عوب بلکہ مظہر عمارت جواب نے ابن زیاد کی پیشانی کو پسینہ سے نہلا دیا ہوگا۔ لوگ اپنی نشستوں سے اٹھ گئے ہوں گے اور ایک گرفتار کی جرات نے حیرت میں غرق کر دیا ہوگا۔ اور اب ابن زیاد کہتا ہے کہ خدا نے تمہیں اور تمہارے جد کو جھٹلایا۔ کذب و کذب جدم۔ اور انہیں رسوا کر کے مجھے ان کی طرف سے مطمئن کر دیا۔ کیا ابن زیاد اس فقرہ کے اظہار سے کوئی سیاسی راز کہہ دے رہا تھا؟ اور کیا یہ اس وقت تک غم سے نہ نکلا تھا جب تک حوصلہ مندوں اور دشمنوں نے اپنے کو پوری طرح کامیاب نہ دیکھ لیا۔ اور کیا وہ تمام کوششیں جن کا ہم نے کبھی ذکر کیا اور جو شہادت حسینؑ یعنی اہل بیت رسالت کے فنا کر دینے کے قریب قریب پہنچ گئیں۔ اس کے پچھے حقیقت میں بھی راز تھا کہ جب ہم کامیاب ہو لیں گے تو کہہ سکیں گے کہ تم جھٹلائے گئے۔ اور خدا کا نام لے کر پھر ایک پردہ رکھیں گے۔ اور اب بھی مسلمانوں کی نگاہ میں پوری دشمن اسلام کی حیثیت سے نہ دکھائی دیں گے۔ اور کیا بھی یہ سیاسی بے تمیزی نہ ہوتی اگر دشمن اپنے کو فتح یاب اور اکل رسول کو اپنا اسیر نہ دیکھتا۔ اور اگر ابن زیاد اپنی اس فقرہ میں محض جوش کی وجہ سے مد کے آگے بڑھ گیا تھا اور حکومت کے ایک جزو سے زیادہ نہ تھا۔ تو کیا زید یعنی سر حکومت کے مشہور اشعار خصوصاً یہ شعر کہ:

لعبت حاشم بالملك فلا خبر جاء ولا وحى نزل

اس سیاسی بے تمیزی کو دہرا کر کیا صلحت کی تصدیق نہیں کر رہا تھا اور اب اس کے ظاہر کرنے ہی کو اپنی کامیابی نہیں سمجھ رہا تھا۔ یہ ایک موقع ہے جس کے متعلق بجائے اس کے کہ میں اثبات یابی میں کچھ ہوں بہتر ہوگا کہ ناظر خود تفتیہ کرے۔ اور اگر مجمع کی حالت کا اندازہ کرنا چاہتے ہو تو اس پر غور کرو کہ ابن زیاد تین مرتبہ پوچھتا ہے لیکن حاضرین کو یہ کہنے کی جرات نہیں ہوتی کہ نواسہ رسولؐ کی ہمشیر کون ہے۔

مجھے تو یہ کہنا ہے کہ وقت محض یہ نہ تھا کہ اہل بیتؑ اپنی ذاتی موقع اور دجاہت کو معرض ذلت میں دیکھتے۔ بلکہ دیکھتے کہ ہمارے اس موقع کو دشمن دین کی توہین اور تکذیب کے لیے کام میں لا رہا ہے۔ اب وقت نہ تھا کہ اہل بیتؑ اپنے چہرہ پر کسی شکستگی کو رہنے دیتے۔ بلکہ ہلچل بے خور و خوابی اور ہلچل غم اور لازمی خافت کے دیچہ رہے تھے کہ آج موقع ہے کہ ہم اپنے اور اپنے اصول کا وقار قائم کریں۔ اور توفیق الہی سے اپنے انداز، اپنے دل، اپنے لہجہ اور اپنی صدا میں اتنی قوت پیدا کریں کہ سب ہمارے جواب کو سن لیں اور ہمیں دیکھ لیں کہ آیا ہم میں کسی مغلوبیت یا انکسار کے آثار ہیں۔ جس سے کہا جاسکے کہ ہماری شکست ہوئی کہ شکست ہماری تکذیب کا ذریعہ قرار دیا جاسکے۔ جواب سوچا نہیں گیا۔ در نہیں ہوئی۔ پس دیش نہیں ہوا۔ ادھر ابن زیاد کے الفاظ تمام ہونے لگے تھے کہ جواب ہر ایک نے سن لیا سنا کہ: ”اے دشمن خدا۔ خدا فائق کی تکذیب اور جھوٹے کی فضیحت کرتا ہے اور واللہ تو کذب و فجور کا عامل ہے“۔ وہ جو اپنے دشمنانہ فعل کو

خدا کے حوالہ کر رہا تھا اپنی خوشدلیدیں اور خلق اللہ کے سامنے ”ذمّٰن خدا“ کہہ دیا گید اصول بتا دیا گیا ہے کہ اصل خیر (خداوند تعالیٰ) ”فاق کی تکذیب اور جھوٹے کی فضیحت کرتا ہے“۔ صلاقیں اور مالان خیر کی تکذیب یا فضیحت نہیں کرتا۔ نیکیوں اور بھوں کی تودہ تکذیب اور فضیحت کرتے ہیں جنہوں نے اپنے دلوں پر خدا کی حکومت سے انکار کیا ہے۔ قریر کی روح تمام ہو چکی لیکن اس کے اثر کی شرح ابن زیاد کے اس فقرہ میں ہے کہ: ”اے شجاع کی بیٹی اگر تو عورت نہ ہوتی تو میں گردن مارتا“۔ مجھے تمام فقرہ سے بحث نہیں ہے۔ مجھے شجاعت کے خیال کے درمیان میں آجانے سے غرض ہے۔ ظرۃ شوکت اور قوت نمائی اگر محض اظہار قوت و شوکت کے لیے ہو خصوصاً مجبوروں اور عورتوں پر انسان میں ایک کیفیت پیدا کرتی ہے جسے نفرت کہیں۔ اور ظرۃ ایک عورت کی حق گوئی اور حق گوئی کی جرأت انسان میں ایک حالت پیدا کرتی ہے جسے پسندیدگی کہیں۔ اس سے بکھا جاسکتا ہے کہ ابن زید کی بے احتیلا خود نمائی اور حضرت اُمّ کلثومؓ کی بے سائنہ جرأت نے دربار میں کیا اثر کیا ہو گا۔ عام لوگوں پر اثر کا کیا ذکر خود دارفتہ ضمیر ابن زیاد شجاعت کا معترف ہوتا ہے۔ شاید بعض کے نزدیک ہماری خردادی کے لہجہ اور انداز کے لیے اشارہ ضروری ہو۔ دانشمندان اردو بنگ ”مغرورانہ“ کہتے ہیں۔ غرور کا لفظ زیادہ سخت اور نیم مصور ہے۔ میں ”شریفانہ غرور“ کہوں گا۔

اس جگہ یہ بھی کہہ دوں کہ بعض مؤرخین نے حضرت اُمّ کلثومؓ اور حضرت زینب علیہا السلام کے مکالمے الگ الگ لکھے ہیں۔ اور بعض نے یہ مکالمہ صرف زینب خاتونؓ سے منسوب کیا ہے۔ جو کچھ بھی ہو اگر یہ تقریریں دو ہی تھیں تو اصولاً اس میں کچھ زیادہ علیحدگی نہ تھی۔ بلکہ وہ تفصیل ہی بھی جائے۔ احتیاطاً میں دوسرے مکالمہ کو اس حد تک دیکھتا ہوں جہاں تک اس میں تے پن کا لمس ہے۔

ابن زیاد حضرت زینبؓ سے بھی گفتگو چمیزنے کی خواہش کرتا ہے اور حضرت زینبؓ شروع اس جواب سے فرماتی ہیں کہ: ”اے ذمّٰن خدا اور رسول کیا چاہتا ہے۔ تو نے نیکیوں اور بدوں میں ہماری چٹک کی“۔ ابن زیاد اس سے باز نہیں آتا کہ وہ ابھی اپنے کو ظلم کا ذمہ دار سن چکا ہے بلکہ پھر وہی پرانا مکمل کھیلتا ہے کہ خدا نے نام کو اپنے مظالم کی آرزو دار ہے۔ اور کہے کہ ”تمہارے بھائی نے ارادہ کیا تھا کہ زید سے خلافت لے لیں۔ ان کی امید ٹوٹ گئی۔ اور خدا نے ہمیں مطمئن کر دیا اس کو تو زمانہ نے بتا دیا کہ بنی امیہ قتل حسینؑ کے بعد کہاں تک مطمئن ہوئے۔ لیکن اگر اطمینان کوئی چیز ہے تو اس کی لہر کو حضرت زینبؓ کے اس فقرہ میں دیکھو کہ: ”وائے جو تم پر۔ اگر میرے بھائی نے طلب خلافت کی تودہ ان کے ہاپ اور نانا کی میراث تھی۔ لیکن تو اپنے نفس کو جواب کے لیے مستعد رکھ“۔

غالباً گفتگو کا انداز سخت ہوتا جا رہا تھا کہ حضرت یار کر بلانے دخل دیا اور اس جھڑپ کو منسلب کیا جس نے اپنے اختیار کے زعم میں عرب کی اس جا گرفتہ علات سے بھی اعراض کیا تھا کہ وہ عورتوں اور تم رسیدہ عورتوں کے زعم پر اور ملک نہ چمڑ کے مخاطبہ اس سے کم کسی فقرہ سے نہ تھا کہ: ”کب تک او ابن زیاد تو میری چھوٹی کی توہین کرے گا“۔ ابن زیاد قتل کا حکم دیتا ہے۔ اگرچہ اس حکم کا نتیجہ سامنے ہے کہ اہل بیتؑ کے ساتھ حضرت امام زین العابدینؑ کے بعد کوئی نگران مرد نہیں رہتا اور گویا نسل منقطع ہو جاتی ہے۔ لیکن اس کے بعد بھی کوئی استغناء نہیں کرتا بلکہ حضرت زینبؓ اگر کچھ فرماتی ہیں تو یہ کہ اگر تیرا ارادہ قتل ہی کا ہے تو مجھے بھی قتل کر ڈال۔ شاید ابن زیاد کو اپنے دشمنانہ حکم اور اس کے

اثر کی تحصیل سے کوئی لطف آیا ہو مگر خدا نے ارادہ کیا تھا کہ اہل بیت کے نفس کی بلندی اپنے درجہ سے نہ گرے۔ یہاں کر بلا ابن زیاد کے قہر کے تمام ہونے کے ساتھ ہی نہایت عداوت سے فہاتے ہیں کہ: ”تو مجھے قتل کی دھمکی دیتا ہے کیا تو نہیں جانتا کہ قتل ہمارے لیے شہادت اور خدا کی طرف سے ایک درجہ ہے!“

یہ حکم واپس لیا گیا۔ کیا ابن زیاد میں دفعۃً رم پیدا ہو گیا تھا؟ رحم اور ابن زیاد میں خصوصاً ایسے زمانہ میں جب کہ کسی حکم کا واپس لینا حکومت کی کمزوری بھی جاتی تھی۔ بلکہ اس کے بعد غالباً لوگوں کی حالت تھی جسے دیکھ کر ابن زیاد اس میں متروک تھا کہ وہ یا اپنا حکم واپس لے کر تھوڑی سی کمزوری ظاہر کرے اور یا فوری انقلاب اور لوگوں کی مخالفت کا مقابلہ کرے۔ ابن زیاد نے حکم قتل واپس لیا۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ لوگوں کے احساسات اس قدر ظاہر تھے کہ جس سے وہ ڈر گیا۔ ایسی ہی ظاہر مثال آگے آنے گی۔

اس کے بعد ہی عبد اللہ بن حنفیہ وغیرہ کے فقرات اور اشعار اثر اور تلخ ظاہر کریں گے کہ کیا ہوتا جا رہا تھا یہ کہا جانے لگا تھا کہ فرزند رسول کے قتل سے گویا رسول اللہ کو علی الاعلان شہید کر دیا۔

میں نے منازل کے نام اس لیے نہیں لکھے ہیں کہ ان مقامات کی جغرافیہ لکھوں بلکہ ان کے لکھنے سے میری غرض صرف اس قدر تھی کہ یہ کجا جاسکے کہ اکثر مقامات پر اہل بیت کے موافق پیمان ہوا۔ اور باوجود اس کے کہ یہ مقامات اموی حکومت کے اثر میں تھے لیکن اکثر مقامات پر زید کی فوج کو دم تک نہ لینے دیا گیا۔ اور یہ امر واضح ہوگا کہ اہل بیت کی توہین کی مصلحت غلط تھی۔ بلکہ وہ بنی امیہ کے لیے قہر تیار کر رہے تھے۔ اور آل رسول کی ہمدردی کا اعلان کر رہے تھے۔

قافہ دمشق پہنچا۔ دمشق جو کم سے کم تین ہزار برس سے مشہور ہے۔ جس نے یہودی قوم کے بہت سے تماشے دیکھے۔ جہاں اکثر حکومتوں کے نشان لہرائے۔ اور جو معاویہ بن ابی سفیان کا ایک زمانہ سے مرکز حکومت تھا۔ جہاں یہود اور عیسائیوں کی بڑی آبادی تھی اور چونکہ اب وہ مرکز حکومت تھا ظاہر ہے کہ اس وقت دینا کے مشہور مقامات کے لوگ یہاں بہت سی حیثیتوں سے جمع ہوں گے۔ اس جگہ اور ان مختلف النسل اور مذہب قوموں میں اہل بیت رسالت کو گزرتا تھا۔ گزرتا تھا طوق و زنجیر کے پوچھ سے دبے ہوئے لیکن دانشمندانہ اردینگ یعنی غیر قوم مؤرخ بھی کہتا ہے کہ علی بن الحسین کے گلے میں زنجیر تھی لیکن وہ اپنے کوشاں سے لے گئے۔

شہر کی دو کانیں بند تھیں اور لوگ شراب کے نشہ میں تھے۔ زید کے دربار میں اس قدر لوگ تھے کہ مڑیوں سے تشبیہ دی جا رہی تھی۔ دروازہ خیزران، غالباً دمشق میں داخل ہونے کا پہلا دروازہ تھا اور باب الساعات جہاں اہل بیت کا قافہ تین ساعت کھڑا تھا۔ دربار سے قریب تھا اور یہاں اس لیے ٹھہرایا گیا تھا کہ جب زید اجازت دے لے تو داخل کیے جائیں۔ حکومت کی نمائش کا صرف اس قدر اشارہ ہے کہ ایک سو بیس نشان فوج کھلے تھے۔ اگر یہ قیاس کیا جائے کہ ہر نشان کسی فوجی دستہ کے ساتھ تھا ایک بڑی فوج کا موجود ہونا ممکن ہو گا۔ ورنہ کم سے کم وہ پانچ سو سوار ہوں گے جو ابن زیاد نے قافہ کے ساتھ کیے تھے۔

اضحیٰ وقتوں میں سے کوئی وقت تھا کہ حضرت زینبؓ سہرا تیں کہ اگرچہ ہم بہ جبر بے پردہ ہیں، لیکن اپنی حفت و حیا سے پردہ میں ہیں۔ اور یا سہل کے ایسے کسی شخص سے خواہش کی جاتی کہ وہ مجمع اور تماشاہائیں کا رخ بدل دے۔

اس وقت کے متعلق اشعار

جاؤ براسک یا ابن بنت محمد

یا جب کہ کسی نادانہ بڑے نے حضرت امام زین العابدین علیہ السلام کو مخاطب کیا اور ان حضرت کا جواب غالباً دور کے دمشق کے کچھ حصہ کو حقیقت امر سے مطلع کرتا جاتا ہوگا اگرچہ دمشق بنی امیہ یعنی دشمنان رسول اور آل رسول کا ایک زمانہ سے مرکز تھاجس سے یہاں اہل بیت رسالت کے پھر ردوں کی کافی مہمت کی امید نہیں کی جاسکتی تھی۔ لیکن پھر بھی یہ عمل تھا کہ یہاں کچھ لوگ نہ ہوتے۔ بلکہ آثار تو اس کے بھی ہیں کہ کچھ باقی عورتیں بھی تھیں۔ جو کچھ بھی جو داخلہ دمشق سے داخلہ دربار نزیہ تک یومئذ کہ صدر امور ات کے اہل بیت نے کوئی تقرر نہیں کیا اور نہ پھر حضرت امام زین العابدین کے اور کسی نے اپنا تعارف کرایا۔ یہ جیسا آئندہ ظاہر ہوگا دربار نزیہ کے لیے اٹھا رکھا گیا تھا۔

بے کار ہے یہ کہنا کہ نزیہ نے اپنے دربار کی نمائش کے لیے کیا کچھ کیا ہوگا۔ اور ہونے والا یہ تھا کہ جس وقت نزیہ شراب کے نشہ میں سرمبارک کو چھڑی سے چھیڑتا کوئی ابوبرزہؓ اسی کا ایسا بے خوف صحابی بھی موجود ہوتا اور وہ حج اٹھتا کہ : ”اے نزیہ جس سر کے ساتھ تو یہ بے ادبی کر رہا ہے میں نے اسی کو بار بار دیکھا ہے کہ رسول چومتے تھے۔“ غالباً اہل بیت رسالت کی موافقت میں یہ پہلی صدا تھی جو سخت کے قریب بلند ہوئی۔ اور بلند کرنے والا بھی ایک بڑھا صحابی تھا۔ اور نزیہ نے اپنے حکومت کے زعم میں اس بڑے صحابی کو دھکے دے کر ٹکوا دیا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ کچھ لوگوں نے یہ دیکھا کہ نزیہ نے کسی پر سختی کی نہ جانتے والے جان گئے ہوں گے کہ یہ بڑھا کون ہے اور کیوں وہ اس حتاب شامی کا متعلق ہوا ہے۔ اور اس حالت نے بھی لوگوں کی واقعیت میں مدد دی ہوگی اور یقیناً دربار سے نکل کر بھی ابوبرزہ کی زبان خاموش نہ ہوئی ہوگی۔ بلکہ اب انھیں اظہار خیال و دم کا کافی موقع ملا ہوگا۔ پے در پے ایسے اتفاقات ہوتے جا رہے تھے۔ اور ہرونی لوگوں کا کیا ذکر خود زوجہ نزیہ محل سے باہر نکل پڑی۔ سرمبارک سامنے رکھا تھا۔ ہند نے دیکھا اور چیخ کر رو دی۔ پوچھا اور نزیہ نے کہا کہ یہ حسین بن علی بن ابی طالب کا سر ہے۔ اور وہ کہتی ہے کہ یہ فرزند فاطمہ کا سر تیرے سامنے ہے تو خدا اور رسول کی لعنت کا متعلق ہوا۔ اب نہ میں تیری بی بی ہوں اور نہ تو میرا شوہر ہے۔ اور نزیہ پوچھتا ہے تجھے فاطمہ سے کیا کام۔ اور وہ کہتی ہے کہ فاطمہ زہرا کے پدر بزرگوار، علی اور ان کے فرزندوں سے ہماری ہدایت ہوئی اور ان کی بدولت یہ لباس (حکومت) حاصل ہوا۔ ویل ہو تجھ پر تو کس غم سے خدا اور رسول کو دیکھے گا۔

میرے خیال میں یہ واقعہ اہل دربار کو قوت کے ساتھ صورت حال بگھاڑا تھا۔ لیکن اتفاق بھی نہ تھا۔ بلکہ ہونے والا یہ تھا کہ قاتل بھی صلہ کی امید میں جو دینگیں مارتا اس سے مقتول کی حقیقت آشکار ہو گئی کہ وہ خیر الناس اور سید اہل عربین ہے اور نزیہ کہتا کہ جب تو جانتا تھا کہ وہ خیر الناس ہیں تو تو نے کیوں قتل کیا۔ اب تو خدا سے آگ اور لکڑی کا جائزہ طلب کر یہ کہہ کر اسے تلوار کی پشت سے مارا اور اسے باہر ٹکوا دیا۔ صرف یہی نہ تھا بلکہ غیر قوم کے لوگ یہود مثل راس اہمالوت اور بائیس صرانی بھی نزیہ کو اس کی حرکت پر نادم کرتے۔ کوئی مسلمان مثل یحییٰ بن حکم شعر کہتا اور نزیہ اسے چپ رہنے کے لیے ڈانٹتا۔ یا نعمان بن بشیر کہتا کہ رسول انھیں اس حالت میں دیکھ کر کیا کہتے۔

وقت آیا کہ نزیہ دماغی آس کے عالم میں اپنے اشعلہ پڑھتا۔ اور حضرت زینب کے بولنے کا وقت آتا۔

سمہاتیں: ”تیرا گناہ ہے کہ تو نے زمین و آسمان کو ہم پر تنگ کر دیا۔ ہم ذلیل ہوئے اور تو عزیز ہوا؟ اس پر خوش نہ ہو کہ دنیا تیرے لیے درست ہو گئی۔ تیرے سب امور ٹھیک ہو گئے اور ملک تیرا ہو گیا۔ صبر کر۔ کیا تو ارشاد خداوندی کو بھول گیا کہ وہ جنہوں نے انکار حقیقت کیا یہ نہ سمجھیں کہ ان کے نفس کے لیے اچھا ہوا بلکہ اس کا منہ بڑھ گیا اور اس کے لیے بڑا عذاب ہے۔

ان فقرات میں حضرت زینبؓ زبید کے دماغی انکاس کی شرح کر رہی تھیں۔ یا جیسا لوگ سوچ سکتے تھے۔ لیکن حضرت زینبؓ کے انداز کلام میں جیسی بنیاد ملامت یعنی اور وزن تھا وہ یقیناً ایک ملوم نفس اور اس کے شرکاء کو سخت پریشان میں مبتلا کر سکتا تھا۔ حضرت نے نہ صرف اپنے فقرات بلکہ مشہر آن عید کی آیت سے اپنے خیالات کو پورا کیا تھا۔ اس کے بعد حضرت زینبؓ زبید کے گھر کی تاریخ بیان کرتی ہیں کہ اس نے خاندان رسالت کے ساتھ کیا کیا یہ نہایت ہی وقت دار اور تیز نظروں میں تھی۔ جس کے سننے کے بعد زبیدؓ کو خیر لوگ بھی اپنی بے ہوشی سے چونک سکتے تھے۔ فرماتی ہیں: ”کیا امید ہو سکتی ہے ان لوگوں سے جنہوں نے پاکبازوں کا جگر کھایا ہو۔ جن کا گوشت خون شہداء سے پلا ہو۔“ یقیناً کسی کو جو انسانی جسم میں جو اس سے سخت تر کوئی بات اس کو خوبصورتی سے نہیں کہی جاسکتی تھی۔ خصوصاً جب کہ یہ شاعری نہ تھی بلکہ عین واقعہ تھا۔ قیاس ممکن ہے کہ ایسے انسانی دردندوں کے متعلق دوسرے انسانوں میں کونسا خیال دوڑ گیا ہو گا۔ اگرچہ بچوں کے خوف سے اپنے گلے یا انداز سے کسی نے نفرت نہ ظاہر کی ہو۔

فرماتی ہیں: ”تو اپنے بزرگوں کو بلاتا ہے اور گناہ کرتا ہے کہ وہ سن کر آنہیں گے۔ اے بہتر بہت تو بھی وہیں جانے لگا۔ جہاں وہ ہیں۔ اس وقت تو آرزو کرے گا کہ کاش میں لٹ جاتا۔ کوٹکا ہوتا کہ جو کچھ میں نے کیا نہ کرتا۔ اور جو کچھ کہا نہ کہتا۔“ مجھے امید ہے کہ کبھی زبیدؓ نے موت کی ایسی ظاہر حقیقت کو اس مغالی سے نہ سنا ہو گا۔ اور سنا بھی تو اس وقت جب کہ وہ رشیم، سونے اور جواہرات پر ناز کر رہا تھا۔ کیا اسے معلوم ہوا ہو گا کہ عزرائیل کا ہاتھ اس کی گردن تک پہنچ گیا ہے۔ فرماتی ہیں: ”تو مومنین کی گردن پر مسلط ہوا ہے۔ بہت جلد تجھے معلوم ہو گا کہ ظالموں کے لیے برابر ہے۔“

اس فقرہ میں حضرت زینبؓ نہیں۔ حقوق عہدہ کے نقاب۔ اور مخلوقات الہی کے خدائی رہنماؤں کی یادگار بول رہی تھی۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ زبیدؓ کے زوال حکومت کے لیے اس سے کاری تر ضرب لگائی جاسکتی تھی۔ زبیدؓ جانتا تھا کہ وہ کیسا ہے۔ اس کے دست و بازو جانتے تھے کہ وہ کیسا ہے۔ لوگ جانتے تھے کہ وہ کیسا اور کیونکر خلیفہ المسلمین بنا ہے۔ سب کچھ تھا لیکن یہ کہنا۔ لوگوں کے منہ پر کہنا۔ حقیقی اصول حکومت ظاہر کرنے والوں کی اس روح، زبان، گوشت و خون اور خصال کی زبانی اٹھا رکھا گیا تھا۔ اس کی سیاسی لطافت اس میں ہے کہ یہ نہیں کہا گیا ہے کہ زبیدؓ جیسا ہے اسے کیوں لوگوں نے خلیفہ تسلیم کر لیا ہے۔ یا کیسے لوگوں نے اسے حاکم بنانے میں مدد کی ہے بلکہ ”مومنین“ کا لفظ استعمال کرتی ہیں۔ میرے خیال میں کبھی مسلمانوں کو اس سے بہتر اور قوی تر مجبوز سے ہوش میں لانا ممکن نہ تھا۔ بلکہ میں تو یہ کہہ رہا ہوں کہ حقیقت یہ فقرات بھی منجملہ دیگر اسباب کے وہ سبب ہوئے جو نہ صرف زبیدؓ کے خلاف تباہ کن انقلاب کھڑا کر دیتا بلکہ بنی امیہ کے خلاف وہ نفرت انسانی قلوب میں ساری کر دیتا جو کسی آلہ سے پھیلی نہ جاسکتی۔ مجھے اس سے بحث نہیں ہے کہ زینبؓ خاتون کے ان فقرات کی روشنی موجودہ موقع کے علاوہ کیا کچھ نہ دکھائی تھی۔ فرماتی ہیں: ایک تم رسیدہ خاتون کہتی ہے:

”اگرچہ مجھ پر مصیبتیں پڑی ہیں۔ لیکن میں تجھ سے کہتی ہوں کہ میں تیری قدر کو ذلیل جانتی ہوں اور تیری شان و شوکت کو حقیر سمجھتی ہوں۔ تعجب ہے کہ شہر فاد اور مردان خدا گودہ شیاطین کے ہاتھ سے قتل کیے جائیں (لیکن) خدا بندوں پر ظلم نہیں کرتا۔ خدای سے میری شخصیت ہے اور اسی پر مجھ سا ہے۔ تو مکر کر جو کر سکے اور کوشش کر جو کر سکے۔ پھر تو ہمارے ذکر کو نہیں مٹا سکتا۔ ہماری شہر کو خلیع نہیں کر سکتا۔ ہماری درازی مدت کو نہیں پاسکتا اور اس سنگ و عار کو اپنے سے دور نہیں کر سکتا۔“

ان فقرات کی بلاغت اور بلندی اس سے بلند ہے کہ وہ شارح کے قلم کی زد کے اندر آسکے۔ اس لیے کہ اس میں ایک منظم اپنے صبر، اپنے یقین، اپنی خود داری، اور اپنے افتخار کو اس خوبی سے بیان فرما رہی ہے جن حالتوں میں ان احساسات کا ہونا مدح کا محتاج نہیں ہے۔ یہ ایک عزیز مردہ، ختم رسیدہ اور آفات میں مبتلا مظلومہ ہے جو ظالموں سے کہہ رہی ہے کہ تم ہم سے اپنی قدر نہیں کر سکتے اور نہ اپنی شان و شوکت کا ہم پر اثر ڈال سکتے ہو۔ اب تک جس قدر مصائب برداشت کیے ہیں ان کے علاوہ بھی ابھی صبر اور برداشت کی ہمت ہے اور وہ فرماتی ہیں کہ جس قدر مکر اور کوشش کر سکے کہ اور پھر اس کے بعد اپنی عظمت اور وقار کا یقین دیکھو۔ اپنے جا گرفتہ اثر کا اعتبار دیکھو کہ فرماتی ہیں کہ تو ہمارے ذکر کو مٹا نہیں سکتا اور نہ ہماری شہر کو خلیع کر سکتا ہے۔ یزید ایک بادشاہ ہے جس کے ماتحت وہ تمام مسلمان اور اختیار ہیں جو ایک بادشاہ کے متعلق ہو سکتا ہے لیکن بادشاہ قلوب اور حاکم روحانی کی روح اس وقت اپنا دائمی اقتدار ظاہر کرتی ہے کہ: ”تو ہماری درازی مدت کو نہیں بچھ سکتا۔“ مٹ گیا یزید۔ اس کے بعد کے اس کے پہلے کے لیکن اہل بیت کا ذکر انسانی روحانیت کا آج بھی دیہائی دستور الحل ہے جیسا پہلے تھا اور رہے گا۔ جب تک انسان میں مذہبی احساس رہے گا یزید دیوانہ نہ تھا جو اس کا انکار کر سکتا اور میٹور تھا کہ باوجود اپنے تمام مسلمانوں کے اہل بیت کے اس کا مقابلہ نہ کر سکتا جو زمانہ اور انسانی دماغ میں منظر ہو گیا تھا۔ وہ دیکھیں جو دیکھنا چاہتے ہیں کہ آیا یزید ان پر اپنی قوت کا اثر ڈال سکا یا نہیں۔ وہ سوچتا تھا کہ جب ہم اہل بیت کو مٹا دیں گے اور انھیں ذلیل کریں گے تو وہ میٹور اور مرحوب ہو کر ہمارے مطیع ہو جائیں گے۔ اور لوگ بھیں گے کہ یزید غالب آیا۔ لیکن کونسا ایسا وہ مجبوظ انھوں اس دربار یزید میں تھا جو ان میٹور عہد رات کے ایسے عالی، قوت دار، صاف اور جوش خیز کلام سنتا اور کہتا کہ یزید کی فتح ہوئی۔ نہیں بلکہ ان لوگوں نے بہت سی قربانیوں کے بعد یہ وقت پایا کہ یزید کے تخت کے سامنے اپنی حکومت قائم کرتے۔

میرا ارادہ نہیں ہے کہ میں اب کسی اور مکالمہ یا تقریر کی شرح کروں۔ اس لیے کہ متذکرہ صدر تقریر خلاصہ ہے ان تمام کاجس پر کوئی بحث ہوئی ہو۔ اس جگہ میں اپنے میں یہ کہنے کی خواہش بھی پاتا ہوں کہ ممکن ہے کہ کسی وقت کوئی کہے کہ یہ تقریر حضرت زینب یا حضرت ام کلثوم کی نہ تھی۔ میں نہ صرف اس اثر سے جو مجھ پر ہے بلکہ موقع، انداز، لہجہ، مناسبت، اور حضرت زینب کے خصائل بلند کے لحاظ سے اس یقین کے ساتھ اس تقریر کو حضرت زینب کی تقریر سمجھتا ہوں گویا میں دربار یزید میں موجود تھا اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا اور اپنے کانوں سے سن رہا تھا۔ اس تقریر کی لہجہ گری انکار کرتی ہے کہ یہ اس موقع کے کسی اور وقت ادا ہوئی ہو۔

دانشگن اردبیل کی اس جگہ صبح واقعہ بتی شاید پر لطف ہو کہ: ”یزید نے حضرت زینب سے گفتگو میں

حضرت علی اور حضرت امام حسینؑ کی تخفیف منزلت کی اور اس شجاعی بی کادل پیر اس کے لبوں پر آگیا اور انھوں نے ایسی شریفانہ طنز اور مناسب ملامت سے جواب دیا کہ مزید شرمناک چپ ہو گیا۔

غالباً یہ بھی واقعہ تھا کہ کوئی شای زید سے کہتا کہ مجھے یہ لڑکی دے دے۔ اس پر اہل بیتؑ نے جس سختی سے مخالفت کی اس کا اثر تھا کہ جس نے محفوظ رکھا اس فقرہ کو سن کر کوئی ناواقف نہ رہ سکتا تھا کہ: ”چپ رہ او ذلیل بنات انبیاءِ خدامہ نہیں ہوتیں۔“ زید اپنے اختیار کے جوش میں کچھ آگے بڑھا تھا کہ کہا گیا کہ تو اس وقت تک یہ نہیں کر سکتا ”جب تک بیماری ملت سے نکل کر دوسرے دین میں داخل نہ ہو۔“ کیا کسی کو اس میں شبہ تھا کہ زید مسلمان نہیں ہے۔ کوئی شبہ نہ تھا۔ لیکن اس فقرہ کے بعد زید مسلمانوں میں ظاہر ظاہر مخالفت کے لیے مصر کھاتا اور اس کا موقع نہایت نازک ہو جاتا۔ میں سوچتا ہوں کہ یہ فقرہ مسلمانوں کے سامنے مسلمانوں کے سامنے ہی کے لیے کہا گیا تھا۔ گھٹگوخت ہو چکی تھی کہ اس فقرہ نے اسے پھر خاموش کر دیا کہ ”تو ہوا شاہ ہے اپنی حکومت سے ہم پر حیر کرنا ہے۔“ اور اس اندوہناک موقع کو بھی اہل بیت کے شریفانہ استقلال نے اپنے سے دور رکھا۔

اور اب وہ موقع آیا کہ زید امام زین العابدین علیہ السلام سے گھٹگو میں کامیاب نہ ہو کر اپنے خوش ہونے کی یہ صورت نکالتا کہ اس یادگار رسولؐ کے قتل کا حکم دیتا۔ کونسا حکم بڑھ سکتا تھا ان بے کس پیسوں کی اس دقت کی حالت سے جب کہ وہ اس بیمار اور نحیف کے گرد آگئیں۔ اور پچالے کی کوشش کہ پیسوں کی حالت اور حضرت ام کلثومؑ علیہا السلام کے اس شعر نے جو اثر پیدا کیا اس نے تیسری مرتبہ نسل امامت کو منقطع ہونے سے بچالیا کہ:

انادیک یا جداء یا خیر مرسل حبیبک مقتول و نسلک ضائع
یہ مواقع تھے جس نے بے شمار حاضرین پر اثر کیا اور اب زید کو لوگوں کے خیال بدلنے کے لیے کوششیں کرنی پڑیں۔ صبح مقرر میسر ہو گیا جس نے زید کی تعریفیں شروع کیں اور بنی امیہ کے پرانے وظیفہ سے حاضرین کی علوی طبیعت سے کھیلنا چاہا۔ اب دقت تھا کہ موجودہ امام بغیر کچھ بولے نہ رہتے۔ وہی قافلہ سالار اہل بیتؑ جو طوق وزنجیر پہننے کے دقت کچھ نہیں بولتا۔ سیکڑوں میل متزیلے طے ہوتی ہیں لیکن ناشکستہ خاموشی ہے۔ وہ میسر پر ایک صبح بے ہودہ گو کی تقریر سن کر فرماتا ہے کہ تو نے ایک بندہ کو تو خوش کیا لیکن خدا کو ناراض کیا۔ اور اب امام زید سے اجازت چاہتے ہیں کہ وہ کچھ فرمائیں۔ جس سے خدا خوش ہو۔ اجازت طلبی کے معنی یہ تھے کہ دین کی زبان رسن بستہ تھی۔ دین کے پاؤں اور گلے میں طوق وزنجیر پڑی تھی۔ لیکن اس حالت میں بھی اس کی قوت ظاہر ہے کہ زید میسر پر جانے کی اجازت نہیں دیتا۔ لوگ اصرار کرتے ہیں اور یہ اصرار اس قدر بڑھ جاتا ہے کہ زید کو اجازت دیے بغیر چارہ نہیں ہوتا۔ اور اب امام میسر پر دکھائی دیتے ہیں۔ اپنے تخت پر۔

خدا اور ہلاوتی برحق پر درود سے تقریر شروع کی۔ محمدؐ خدا اور رسولؐ کی تعریف شایان زبان کے حوالہ تھی۔ اسی میں اس کا اثر تھا۔ زین العابدینؑ اور سید الساجدینؑ نے خدا کا نام لیا تھا۔ اور رسولؐ کے فرزند نے اپنے جد بزرگوار پر درود بھیجا تھا۔ سوچو کہ سلسلہ خیال نے لوگوں کی نگاہ میں کتنا زمانہ روشن کر دیا ہوگا۔ اور وہ امام کو موجودہ موقع میں دیکھ کر کیا کچھ رہے ہوں گے۔ کیا اس میں کسی کو شبہ ہے کہ وہ بڑا مجمع جو اس وقت تھا کس خاموشی سے سن رہا ہوگا۔ سانس منقطع ہوگی۔ ہر شخص

اپنی جگہ گڑ گیا ہو گا اور خاموشی بول رہی ہوگی۔ جس میں امام کی نعت لیکن خلق اللہ کو حقیقت امر بھانسنے کے جوش سے قوت پائی ہوئی صدا بلند ہو رہی تھی۔ لوگوں نے اپنی توجہ امام کے حوالہ کر دی تھی۔ امام کا نفس غلظت اس مجمع پر حاوی تھا اور سینے والے روشنی اپنے گرد محیط دیکھ رہے تھے۔

امام کی تقریر کا دوسرا درجہ دنیا کی اس عظیم الشان مسئلہ کی یاد دہانی تھی۔ جسے موت اور حیات کہتے ہیں۔ جس کی بنیاد بغیر نہ فلسفہ ہوتا، نہ مذہب ہوتا، نہ اخلاق ہوتا اور نہ انسان پر کوئی اثر ہوتا۔ کس طرح حیات اور کس طرح مراد اسی کا دستور العمل مذہب ہے۔ اسی کے لیے اخلاق کی ضرورت ہے۔ اسی کو ہر مصلح بنی آدم نے اپنے درجہ کے موافق بکھایا۔ امام موت کی ہی ظاہر لیکن موثر حقیقت کا ذکر کرتے ہیں۔ یعنی انسانی حیات کا لابدی انجام دکھاتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ ”اپنی گزشتہ عمر پر افسوس کر کے آئندہ کی تکالیف کی کوشش کرو۔ اور بقیہ عمر میں نیکی کا لو۔“ اس میں وہ سب کچھ تھا جس سے قوم کو جوش میں لاتے اور ان تمام باتوں کی طرف اشارہ کرتے جن کی غفلت قوم کی دنیا اور عاقبت غراب کرتی ہے اور اسی سے وہ تمام باتیں یاد دل رہے تھے جن پر عمل اور جن کے جوش سے انسان اور قومیں اپنی دنیا و آخرت درست کرتی ہیں۔ پھر اسے اس مجمع سے کیا مخصوص نسبت تھی؟ یہی اس تمہید کی خوبصورتی تھی۔ کیا وہ مرکز سامنے نہ تھا جس نے دنیا کا برا پہلو اختیار کیا اور دنیا کے اس پہلو کو بری طرح اختیار کر کے انسانیت اور ہر اس روش پر جو اچھی طرح زندگی بسر کرنا کہا جائے ظلم کیا۔ اس نے چند مادی چیزوں کے حصول کے لیے دنیا کے ہر شریفانہ احساسات اور امورات معروف کو چیزوں سے کھل دیا اور تمام امورات منکر کو نہ صرف فروغ دیا بلکہ انھیں حارشی اختیارات سے فروغ دیا۔ کیا مختصر لفظوں میں مزید نے اس سارے نظام کو جو انسان کے تجربہ تاریخی اخلاقی یا الہامی سے بہتر کہا گیا تھا۔ فلاسفے ٹکڑے ٹکڑے نہیں کر دیا۔ واضح فکلوں اور مثالوں میں کیا یہ مزید اور اس کے مددگار نہ تھے۔ جو چند خون آلود سراور چند غمخوار عورتوں کو دیکھ کر غیر شریفانہ اظہار میں مبتلا ہیں۔ اور یہ چند خون آلود سراور یہ چند غمخوار بیسیلیں وہ ہیں جن سے وہ تمام روشیں ظاہر ہوئی تھیں۔ جو انسان کے نزدیک بہتر طریقہ سے جینے اور بہتر طریقہ سے مرنے کی مافوق العادت مثالیں تھیں۔ واضح تر فکلوں میں امام اپنی انگشت مبارک سے حاضرین کو شہدا کے گلوں نے مبارک دکھا رہے تھے اور فرما رہے تھے کہ دیکھو تم نے دنیا میں اس طرح زندگی بسر کی ہے کہ چند چیزوں کے لیے ایسے گلے کاٹے ہیں۔ حالانکہ تمہاری چیزیں بھی معرض خطر میں نہ تھیں۔

تقریر کا تیسرا ٹکڑا اپنا اور اپنی حالت کا تعارف اور اس کی شرح تھی۔ وہ فرما رہے تھے کہ ہم کس کے فرزند ہیں۔ یہ تو ظاہر ہے کہ وہ حسین، حضرت فاطمہ زہرا، حضرت خدیجہ کبریٰ اور ہادی عالم کے فرزند تھے۔ لیکن اس کے معنی کیا تھے کہ میں مکہ و مدنی یا مروہ و صفا کا بیٹا ہوں۔ کیا یہ چیزیں شعار اللہ میں داخل نہ تھیں۔ کیا یہ چیزیں بہترین مذہبی روایات میں منکوت نہ تھیں۔ کیا اس سے ایک زمانہ سے مسلمانوں کے فرض رسومات وابستہ نہ تھے۔ اور کیا یہ رسول اللہ کی تصدیق کردہ نہ تھے۔ اور کیا انھیں کا خاندان اس کا محافظ نہ تھا۔ اب ان چیزوں کا اپنے کو بیٹا کہنا ایک طویل زمانہ کی تاریخ، احکام، خدمات، معاشقت، رسومات مذہبی، قلبی تعلق اور میلان کی یاد دہانی تھی۔ ایسی بلیغ فصاحت اور ساتھ ہی ایسی واضح طریقہ سے اثر کرنے والی کسی اور لفظ سے ظاہر نہیں کی جاسکتی تھی۔

اب بھی استہکارے تھے لیکن اس کے بعد غالباً امام کی آنکھ یہ دیکھ چکی تھی کہ لوگوں کی توجہ اور قلب

کس درجہ پر ہیں۔ غالباً یہاں چھلکنے کی حد پر آ گیا تھا۔ دل بھر آئے تھے۔ بلکوں نے آنسوؤں کو روکنے سے عجز ظاہر کر دیا کہ امام کی مختار صدا کانوں میں جاتی ہے کہ: ”میں اس امام کا بیٹا ہوں جو ظلم سے شہید کیا گیا۔ جس کا سر گردن کی طرف سے کاٹا گیا۔ جو یہاں شہید کیا گیا۔ جو کربلا میں شہید کیا گیا۔ جس کا عمامہ اور چادر دشمنوں نے پھین لیے۔“

بارہ صدیوں کے زمانہ اور مقامی فاصلہ نے میرے حس کو اس قدر کمزور نہیں کر دیا ہے کہ میں ان آہوں کراہوں پیچ اور پچھلیوں کو نہ سن سکوں جن کی لہروں نے اس وقت دمشق کو زیر و زبر کر دیا تھا۔ یہ چھین عالم اسیری میں مل گئیں۔ اور ان کی تھراپٹ یا جھنجھٹاٹ معدوم نہیں ہوئی۔ کچھ تھا اور وہ کچھ یہ تھا کہ تمام دمشق اس وقت ایک عراخانہ تھا لوگ تھے جو رو رہے تھے۔ بہت سے اس منتقدی غم سے متاثر ہوئے تھے۔ اگرچہ ان کے کانوں میں امام کی آواز نہ پہنچی تھی۔ بہت سے حیران تھے اور نہ جانتے تھے کہ ایک مظلوم کی روح اور ایک مظلوم کی زبان نے دمشق پر کیا کر دیا ہے۔ ہاں دمشق نے ایک منظر اندہ اس کے قبل دیکھا تھا۔ جب کہ شرفائے یہود گرفتار کر کے لے جائے جاتے اور یا ستر برس کی غلامی کے بعد واپس ہوتے اور خوشی کا رونا روتے۔ لیکن کبھی دمشق یا اس کے علاوہ کسی شہر نے ایسی مجلس عزا نہیں دیکھی تھی۔ کیونکہ زمانہ نے کبھی ایسے اتفاقات فراہم نہیں کیے تھے۔

تمہارا کوئی کہے گا کہ متذکرہ صدر سطر پر میرے عالم تخیل کا نتیجہ ہیں۔ تخیل کے معنی اگر خیال کی اسٹک سے حقیقت پائی ہے تو مجھے اس کا فخر ہو گا لیکن اگر اس کے معنی خلاف واقعہ شاعری ہے تو میں مزید کی بے مہنی اور مصلحت کی ایلاسی دکھا دوں گا۔ اور بس میں جواب دے چکا دیکھو کہ مزید کی مصلحت یہ ہے کہ وہ آگ کو آگ سے بجھاتا چاہتا ہے یعنی فرزند رسول کا اثر زائل کرنے کے لیے وہ رسول کے احکام کی مدد لے رہا ہے۔ یعنی وقتی توجہ حاصل کرنے کے لیے وہ اذان دلا رہا ہے۔ اور اس طرح یا تو لوگوں کا خیال بدل رہا ہے اور یا توجہ کو متعلق کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن امام منبر پر تھے اور اچھی انھوں نے اتر آنے کا تفسیر نہیں کیا تھا۔ اور اس طرح موقع کو اپنا کر لیا کہ گویا مزید نے امام کو یہ موقع ملنے کے لیے یہ تدبیر کی تھی۔ مؤذن اشہد ان محمد رسول اللہ کہتا ہے اور اب امام اپنی خاموشی توڑتے ہیں اور تمام قوت سے مؤذن کو مخاطب کر کے خدا کا واسطہ دیتے ہیں کہ وہ ٹھہر جائے۔ رکا مؤذن۔ اور اب امام پوچھتے ہیں کہ ”اے مزید بتا کہ محمد جن کا نام اذان میں لیا جا رہا ہے وہ تیرے نانا ہیں یا میرے۔“ کیسے مزید نہ کہتا کہ یہ تمہارے نانا ہیں۔ سوچو کہ مزید نے کس بشرہ سے جواب دیا ہو گا اور اب امام کہتے ہیں کہ: ”جب تو جانتا تھا تو پھر کیوں تو نے ان کی اولاد کو قتل اور ان کے حرم کو قید کیا۔“ اور نتیجہ یہ تھا کہ لوگ رو رہے تھے۔ اور کہہ رہے تھے کہ: ”یہ واقعہ اسلام کے لیے ایک بھاری مصیبت ہے۔“ اور دیکھو کہ مزید لوگوں یعنی امام کا ظہر سننے والوں سے کہہ رہا ہے کہ ”تم نے میرے ملک کے زوال کا ارادہ کیا تھا۔“ اور یہ کہتا ہوا عمل میں بھاگا جا رہا ہے۔ نماز پڑھنے یا پڑھانے کے لیے بھی موجود نہیں ہے۔ بلکہ اجزائے قرآن پاشان کرتا ہے کہ لوگ اس کے چننے میں مشغول ہوں۔ جماعت کھڑی کرتا ہے کہ لوگ نماز میں مشغول ہو جائیں۔ اس کے بعد سوچو کہ کون فتح یاب ہوا۔ اور اب بھی کسی اشارہ کی ضرورت ہو تو دیکھو کہ مزید عمل میں ہے۔ امام کا سر مبارک رکھا ہے۔ مزید جھکا ہے اپنے غم پر ہاتھ رکھے ہے اگر ٹمٹمے نہ بھی مار رہا ہو اور کہہ رہا ہے کہ ”مجھے کیا ہوا تھا کہ میں نے حسین کو قتل کیا۔“ اور اشارہ کی ضرورت ہو تو دیکھو کہ اہل بیت کے قید خانہ کا کوئی محافظ اس وقت کا ایسا بھی مسلمان نہیں ہے۔

رومی ہی تھے۔ اور میں نے تو یہ بھی سنا ہے (میری ذاتی تحقیق نہیں ہے) کہ یزید نے رومی سپاہی بھی حضرت سے لڑنے کے لیے بھیجے تھے۔

ان باتوں کے بعد جو کچھ ہو چکی تھیں کسی طرح یزید کے لیے ممکن نہ تھا کہ وہ اہل بیت پر کسی مزید تشدد کو جائز نہ سمجھتا۔ پھر اس نے غالباً ایک آخری کوشش کی کہ اپنے کو قتل حسین کے الزام سے بری کر کے معاملہ کسی دوسرے کے سر چھوپے۔ اور اس لیے اس نے ان تمام لوگوں کو بلایا جو مملکتان حسین کہے گئے تھے۔ لیکن ان میں سے کسی نے یہ کہہ دیا کہ قاتل حسین وہ ہے جس نے جھڑے نصب کیے۔ مال دیا، ترغیب دی، دھمکایا اور لالچ دی۔ اب یزید کے لیے کیا چارہ تھا؟ اس کے وہ اہل بیت کے ساتھ اظہار نرمی کرتا۔ اور اس طرح لوگوں کے خیال کی شدت کو روکنا نہ بتایا کہ یزید نے بہت دیر کی تھی اور جو کچھ وہ کر چکا تھا اس نے جس انقلاب کا بیج بودیا تھا وہ ضائع ہو جانے والا نہ تھا۔

کہا گیا ہے اور میں اسے یقیناً یاد کرتا ہوں کہ اہل بیت رسالت میں سفر کو کر بلائے مٹی میں پھینک گئے تھے۔ اس کا حساب یہ ہے کہ عمرو بن سعد گیارہ عرم کو کر بلا سے چلا۔ بارہ کو اہل بیت کوفہ میں تھے اور کوفہ کی جو حالت تھی اس کے لحاظ سے کسی طرح یہ قرین مصلحت نہ تھا کہ ابن زیاد اسیران آل محمد کو کوفہ میں مقیم رکھتا۔ اس بنیاد پر غالباً تیرہ کو قافلہ دمشق کی طرف چلا اور تیرہ دن میں دمشق پہنچا۔ یعنی چھبیس کو دمشق میں موجود تھا۔ اس کے بعد روائتیں ہیں کہ اہل بیت چھ دن دمشق میں رہے۔ یعنی تیسری سفر کو دمشق سے کر بلا کی طرف روانہ ہوئے۔ اس طرح وہ کر بلا میں سترہ تاریخ کو پہنچ جاتے ہیں۔ تین دن جو بچتے ہیں یا تو ان میں کا کوئی حصہ کہیں زیادہ صرف ہوا یا کوفہ اور دمشق میں ایک ایک دن زیادہ قیام کیا گیا۔

اہل بیت نے کر بلا میں پہنچ کر جو کچھ دیکھا یہ ایک تیسری صورت تھی۔ کبھی انہوں نے اپنے عزیز ترین رہتا کو موجود اور اپنا محفل دیکھا تھا۔ کبھی انہیں خاک و خون الود اور خاموش دیکھا۔ آج قبروں کے نشان دیکھتے ہیں۔ ان کے اس وقت کے عالم کا قیاس ممکن نہیں ہے۔

اس سے کچھ کم مدینہ کا داخلہ نہ ہوگا۔ بشیر کا بھی جانا اسی غرض سے تھا کہ اہل مدینہ کے درجہ احساس کا اندازہ کیا جاتا۔ جو کچھ ہوا ایسا نہیں ہے کہ اس پر حیرت کی جائے۔ مجمع کو دیکھ کر امام نے جو خطبہ فرمایا وہ تسلیم و رضا اور اپنے درجہ اثر کے اور کسی بات کا مظہر نہیں ہے۔ جو کچھ ہو چکا تھا اس کا اندازہ امام کے اس فقرہ سے زیادہ کسی لفظ یا عبارت سے نہیں ہو سکتا کہ ”اگر رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے قتل کا حکم دیا ہوتا تو لوگ اس سے زیادہ نہ کر سکتے جو کچھ کیا گیا۔“

اجلا گھروں نے اپنے رہنے والوں اور رہنے والوں نے اپنے اجلا گھروں کو دیکھا۔ گھروں نے وہ محل باتیں یاد دلادی جن سے ان کی آہوی کی زینت تھی۔ وہ گھر جو کبھی آرام دے سکتے تھے اب ان کے بعد جن کی قبریں کر بلا میں بنی تھیں وہ یہ غم بن گئے تھے۔ صرف یہ دیکھ لو کہ اہل بیت مسند رسول کے دروازہ اور قبر مظہر سے فریاد کر رہے ہیں اور لپٹ رہے ہیں۔ یزان خاموش چیزوں کے اور کوئی نہ تھا جن سے یہ اپنا درد دل کہتے اور نہ کسی میں اتنا صبر تھا کہ ان کا قصہ اندوہ اس طرح سن سکتا۔ داؤد کے ایسے مستند شجاع نے اپنے عرم کو ایسا نہ بنایا تھا جن کی اسیری نے ان کے افتخار کی کوئی پاد قاتم رکھی ہوئی۔ لیکن خاتم النبیین کی ان یادگاروں نے اپنے کو بیوروں میں ایسا دکھایا جیسا کوئی قوت و اختیار میں اپنے کو نہیں دکھا سکتا۔ انہوں نے غیرت و شرافت کا مرتبہ بلند کر دیا۔ ان کی مختصر تعریف یہ ہے کہ یہ حسین کے پس ماندہ تھے۔ جنہیں حسین

اپنی مصلحت کا ذمہ دار بناتے اور جن پر اعتبار کر سکتے۔ کچھ انہوں نے وجہ حسین کو پورا کر دکھایا۔ بلکہ اس کی مخفی حقیقت کو روشن کر دیا۔ ان کا مرتبہ لوگوں کو پہچان دیا۔ اور یہ دکھایا کہ میں حسینؑ نے ایسا بنایا ہے، جیسے ہم ہیں۔ ہم نہیں ہیں مگر یہ کہ حسینؑ کے خصال ہم سے روشن ہیں۔ تم پر سلام ہو اے آل محمد ہر اس شخص کا جسے انسانی نفس کی بلندی اور شرافت کی قدر ہے۔ تم سے ہر شریف ہمدردی کرے گا وہ کسی قوم کا کیوں نہ ہو۔ شرافت تم پر ناز کرے گی۔ جب تک دنیا میں اس لفظ کا وجود رہے گا۔ اسلام بخودش وقتوں میں اپنے بیٹے اور بیٹیوں کو تمہیں دکھائے گا اور بس جس کی درازی مدت کو تم نے ابد سے پیوست کر دیا

○

باب ہفت دہم

(حسین)

اس باب کے شروع کرنے کے ارادہ کے ساتھ مجھے خیال ہوتا ہے کہ میں ناظر سے یہ سفارش کروں کہ وہ جتنے اولے کا باب ہے ہنرمند لکھنے پر بڑھ لے جس میں میں نے حسینؑ کے توصفات کا رجحان سے متاثر کیا ہے۔ پیش نظر باب اس کا سلسلہ ہے۔

یاد دہانی کے لیے اس قدر کہنا مناسب ہوگا کہ اس وقت تک حضرت امام حسین علیہ السلام جن اتفاقات میں بسر کر رہے تھے اور ایک زمانہ تک جن نفوس قدسیہ کے سایہ میں حسینؑ کی شخصیت کی تعلیم ہوئی تھی اس نے یہ کہنے کی جگہ نہیں چھوڑی کہ ہجرت مدینہ کے بعد سے جو واقعات پیش آئے ان کے متعلق حضرتؑ کو تجربہ نہ تھا یا مماثل واقعات ان کے اثر و دشمنوں کی مصلحت، درجہ عداوت اور ان کے طبع سے حسینؑ واقف نہ تھے۔ بلکہ اتفاقات زمانہ نے حضرتؑ کی چھ برس چار مہینہ کی عمر میں جس قدر انواع کے واقعات پیش کیے تھے اور انہیں حضرتؑ کی ذات سے جیسا تعلق قائم ایسے انسان ہیں جنہیں اتنی مختلف قسموں کے واقعات سے سابقہ پڑا ہو۔ اور اب حضرتؑ اس حالت تک پہنچ گئے تھے کہ ان کے افعال تقلیدی حیثیت سے بڑھ کر عین خاصہ کا اظہار سمجھے جاتے۔

اس زمانہ تک نہ صرف حضرتؑ کا شخص، خاصہ، صفات اور روایات، کافی حد تک شہرت پذیر ہو چکے تھے بلکہ اتفاقات ابتداء ہی سے اس کا اہتمام کیا تھا کہ حسینؑ کے عدم تعارف کی کسی کوتاہی نہ ہو سکتی۔ وہ کسی حیثیت کا تعارف کیوں نہ ہوتا۔ صفاتی ہو یا شخصی۔ کون جانے کہ ابتداء ہی سے حسینؑ کے تعارف کی مشیت الہی کا اقتضایہ تھا کہ ان کی عظیم الشان شہادت کے بعد ایک بڑے حصہ ملک کی بڑی جماعت اس طرح ان کے افعال اور نتائج کو سننے کہ واقعات کے سننے کے ساتھ ہی ان کا رونے مبارک آنکھوں کے سامنے آجائے اور کہے کہ ہیں ہیں جس کے تم نے حالات سنے ہیں۔

کون تھا جس نے رسولؐ کو دیکھا تھا اور حسینؑ اس کی آنکھوں سے پوشیدہ ہوتے۔ کیا بازاروں، محلوں اور فوجی مواقع نے حسینؑ کو رسولؐ کا آدیزہ دوش نہ دیکھا تھا۔ کیا جماعتوں، مسجد، اور نماز نے حسینؑ کو رسولؐ کا جزد جسم نہ دیکھا تھا۔ کیا غیر قوموں نے اس کا طعنہ نہ دیا تھا کہ آپؐ لڑکوں سے جس طرح محبت کرتے ہیں وہ ہماری عادت سے زیادہ ہے۔ کیا مہالہ میں نہ تھے اور کیا حسینؑ ایسے موقع پر رسولؐ کے دست اقدس، پہلو اور آنکھوں میں نہ تھے جس وقت رسولؐ یہ فرماتے تھے تعارف کے لیے فرماتے تھے کہ یہ حسینؑ مجھ سے ہے اور میں اس سے ہوں۔ یا یہ سردار جوانان بہشت ہے۔ یا میرا ریکان ہے۔ اس کی محبت کرو۔ کیا یہ حسینؑ نہ تھے جنہیں رسولؐ دست مبارک سے تمام کر بلند کرتے تھے۔ اپنی زبان دکھاتے تھے۔ اور حسینؑ اس کی سرخی دیکھ کر خوش ہوتے تھے۔ بلکہ زبان چوستے تھے۔ اور کیا ان لوگوں نے حسینؑ کو

رسول کے سینہ اقدس پر نہ دیکھا تھا جو لوگ ہادی برحق کے عالم ار حلال میں عیادت کے لیے آئے ہوں۔ اور وہیں نہ سنی ہوں۔ بے شک دیکھا اور سنا تھا۔ اور بے شک حجۃ الوداع کے موقع پر اک لاکھ سے زیادہ بدوی اور شہریوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اپنے کانوں سے سنا تھا۔ اور اس طرح ان کی شہرت نہ صرف مشہور بلکہ غیر معروف دروں، مواضع اور ریگستانوں میں جوتی تھی۔ اور مدینہ اور مکہ کا پچھانا تمام حجاز کا پچھانا تھا۔

بے شک رسول کے بعد ایسے مواقع پیدا ہوئے جس سے ان کی منزلت اور شہرت اپنے فطری موقع سے دور افتادہ بھی جاتی۔ لیکن کیا عدالت اور انصار کے حملوں نے انہیں نہ دیکھا تھا اور پھر کیا اس کے بعد میثربے یہ نہ سنا تھا کہ تو ہمارا ہے۔ اور کیا یہ حسین ہی نہ تھے جسے شہناو پچھاتی۔ اگرچہ کسریٰ کی بیٹی نے شاہزادہ کوئین کو کبھی دیکھا نہ تھا۔ لیکن ایک بلاشاہ کی بیٹی شرافت اور جلال سے واقف تھی۔ اب وہ ایک ایسی شرافت اور جلال سے متوجہ رہی تھی جس کا طبع بننا امیری میں شاہی سے زیادہ خوش آید تھا۔

صرف یہی نہ تھا بلکہ موقع یہ بھی آنے والا تھا کہ کوفہ حسین کو فرزند امیر المومنین کی حیثیت سے پہچاند اور پھر وہیں ہوتیں جو حسین کو اپنا افسردہ نکھیں اور وہیں جوتی جو اپنے مقابلہ میں حسین کو دکھیں کہ وہ بہادر سپاہیوں کے سر پر ہیں۔ اور پھر کئی مرتبہ حسین نے پیدل جاکے تھے۔ اور ان کے خصال کی حقایق شہرت جس حیثیت کی تھی وہ ان کے پہنچانے میں کافی سے زیادہ معین تھی۔ اور اگر اب بھی کسی کو حسین سے عدم تعارف کی شکایت ہو تو کیا یہ نہ تھا کہ جس وقت اہل مدینہ نے ولید بن عقبہ کے نام زید کا حکم اور حسین کا انکار اور جلا وطنی سنی تھی اس وقت بھی حسین پوشیدہ رہ سکتے تھے۔ پھر مدینہ سے مکہ اور مکہ سے کربلا کے سلسلہ مخالفت نے کوئی آباد یا غیر آباد مقام چھوڑا تھا جہاں حسین کا نام نغی رہ سکتا۔ یہ بھی کیا یہ نہ تھا کہ حضرت نے کوفہ و شام کے لشکروں کے سامنے کئی مرتبہ کئی تاریخوں میں اپنا تعارف کر لیا۔ اور پھر کیا یہ نہ تھا کہ حضرت کے سر مبارک نے کربلا سے دمشق تک ہر ایک کو پہنچا دیا کہ ہم کون ہیں۔ عبرت خیز ہے کہ حسین کی جلا وطنی زندگی ہی تک محدود نہ تھی بلکہ انہیں شہادت کے بعد بھی سیکڑوں میل چلنا تھا۔

آیا یہ شہرت بے سود تھی؟ اس سے میں دو مائیں بھگتا چاہتا ہوں۔ ایک حیات کی اور ایک بعد شہادت۔ حسین کی حیات کا تعارف مدینہ سے کربلا تک کچھ بگڑا تھا۔ اس طرح جس سے قوی تر زبان اور قوی تر الفاظ میں بھگتا انسان کے امکان سے باہر تھا۔ اور وہ یہ کہ لوگ دیکھتے ہیں کہ نواسہ رسول اپنے جد نثار کے عرم اور عرم خدا میں نہیں رہ سکتا۔ اس لیے کہ نہیں رہنے دیا جاتا۔ لوگ وجہ جانتے ہیں اور خاموش ہیں۔ کیا اس کے بعد بھی قوم کے احساس عزت و شرافت، ملت اور مذہب کی مخلوجیت کی کوئی اور مثال تلاش کرنے کی ضرورت ہے۔ دوسرے نقطوں میں وہ اس پر راضی تھے کہ ملت و مذہب کا زید کا ایسا بھی عنانگیر ہو سکتا ہے اور باوجود اس کے کہ ہمارے ہر حیثیت کے محسن کے اصول، اہل بیت اور دارنہن محافل پر کچھ ہی کیوں نہ کیا جائے لیکن اس ظالمانہ دست برد پر بھی ہمیں کسی حق اور چشم کشائی کی ضرورت نہیں ہے۔ سوچا جاسکتا ہے کہ قوم اب ایک لاش تھی جس پر اس قدر مٹی ڈالی جاسکتی تھی جس قدر مٹی دینے والے چاہیں۔ قیاس ممکن نہیں ہے کہ کسریٰ اور قیس نے اپنی مفتوح قوموں کو اس حد تک کچلا ہو کہ ان کی زبان سے لفظ گر گئے ہوں۔ ان کی آنکھوں کی بینائی جاتی رہی ہو۔ اور ان کے کانوں نے سماعت کو طلاق دیا ہو۔ ان کے دل اس حالت میں پہنچ گئے ہوں جس کے بعد

حرکت کا سکون اور موت ہے۔ اور یہ وہ قوم تھی جسے سکھایا گیا تھا اور ہر شخص سیکھ گیا تھا کہ ہم پر کسٹری وقیر کے برتاؤ نہیں ہو سکتے۔ ان میں کا ہر شخص جزو حکومت اور صلاح دینے کا مہاز کھاتا تھا اور اسے بخاطر راست اپنے دلیان امر سے اپنے دکہ درد کہنے اور رفع مصیبت کا انتہائی کرنے کا حق تھا۔

حسینؑ کے تعارف کا دوسرا اثر یہ تھا کہ وہ اپنی کل مردم شناسی، اور موقع شناسی سے جو اعلیٰ قوم کے متعلق حاصل تھی اور ان حالتوں کے علم کی بنیاد پر جس میں قوم کے بسر کرنے کا اعلیٰ ایک زمانہ سے تجربہ تھا انہوں نے اپنی شہادت میں دیکر کہ یعنی اپنے مصائب کو بھانپنے اس کے کہ فوراً شہادت سے منقطع کر دیں یہ گوارا کیا کہ ہم اپنے مصائب کے سلسلہ کو طویل کر دیں جس کا درجہ اور زمانہ ہمیں اس میں مدد دے کہ ہم مخلوقات خدا کے ایک کافی حصہ کو نہ صرف اپنے غیر بلکہ اپنی روش بگاڑ کھینچنے میں مدد دیں۔ حسینؑ اس میں کامیاب ہوئے۔ کوئی شخص جس میں حسینؑ کا ایسا استقلال ہو تا اور وہ یہ روش اختیار کرنا کامیاب ہو تا۔ اس لیے کہ حسینؑ نے مظالم پر صبر اور اچھی روش پر اصرار کا جو طریقہ اختیار کیا تھا وہ یہ اس کے کہ انسان کے دل کی حرکت کو اپنے موافق کر لیتا اور کوئی نتیجہ نہ پیدا کر سکتا تھا اور چونکہ یہ صبر و استقلال غیر معمولی حالتوں میں ایسا غیر معمولی تھا جس کی مثال انسانی نفس کی تاریخ میں مفقود ہے۔ اس لیے اس نے اثر بھی دیا ہی عظیم الشان کید خدا نے ایک ہی حسینؑ پیدا کیا تھا۔ قیامت دنیا میں مرنے والی اسلامی طاقت کو نہ مرنے دینے کے لیے کوئی صلاح ہی نہ رہ گیا تھا۔ بڑا اس کے کہ وہ جس میں رسولؐ کے استقلال، رسولؐ کا جوش ہدایت، اور رسولؐ کی صفات کا ورثہ تھا اس آبادی کی جرأت کرتا کہ ہم اپنی عبرت خیز شہادت اور ناقابل برداشت مصائب سے لوگوں کی توجہ کو اپنی طرف مائل کر لیں گے۔ مائل اس لیے نہیں کریں گے کہ ہم خلافت رسولؐ کے مالک ہو کر کسٹری وقیر کے سے برتاؤ کریں بلکہ اس لیے کہ اپنے کو فنا کر کے رسولؐ کی حقیقی حکومت یعنی احساس مذہب کو زندہ کر دیں۔ جس کے معنی خدا شناسی، خدا کا خوف، اور اس معروف کی پیروی فکر سے اعراض، انسانی ہمدردی، انصاف، رحم اور حقوق عباد کا بھلا ہے۔

اسے بھی جانے دو کہ حضرتؑ کوئی نراری روش اختیار نہیں کی اور وہ اس پر بیور کیجئے تھے کہ دفاع کے لیے کچھ راستے تلاش کرتے اور فرض کرو کہ جب لوگوں نے سنا کہ حسینؑ شہید کیجئے تو شہادت کی وجہ یہ تھی کہ چونکہ حسینؑ نے یزید سے خلافت لینے کا ابرادہ کیا تھا، یزید اپنے کو اپنے موقع پر قائم رکھنے کے لیے بیور تھا کہ جنگ کرتا اور اس جنگ میں ایک طرف کو شکست بخوئی اور وہ طرف حسینؑ تھے۔ اب اس کے بعد میں پوچھتا ہوں کہ کیا تمام جاز، عراق، عرب، شام، مصر اور ایران یہ سوچ سکتا تھا کہ حسینؑ نے اس لیے حکومت پر قبضہ کرنے کا ابرادہ کیا تھا کہ وہ یزید کی طرح یا یزید سے سخت تر قبضہ کے ساتھ حکومت کرتے۔ اور وہ یزید کی طرح منہیات میں مشغول کیجئے؟ ہر شخص جسے اس خاندان کی طرز حکومت، طریقہ، روش، خصائل، اور معاملات کا علم ہے وہ بڑا اس کے کچھ نہیں کہہ سکتا کہ لوگوں کے نزدیک یہ سوچنا محال تھا کہ وہ اپنے آپ اس طرح حکومت کرتے کہ ہمیں کھجوں میں کسے رہتے۔ ہمارا منظر کھاتے رہتے اور ہم وہ ذرائع ہوتے جسے حکومت اپنی ضروریات کے لیے کام میں لاتی رہتی۔ جس طرح اس کے اعراض اور اس کے مدبرین کے مصلح کے نزدیک مفید ہو تا۔ مشیت ایزدی کا مقتضایہ تھا کہ کسی ہی کم وقت کے لیے کیوں نہ ہو لیکن لوگ ہادی برحق، صالح عرب اور حسن فطی کے طرز حکومت اور خلق اللہ کے ساتھ برتاؤ کو دیکھ چکے ہوتے۔ اور جانتے بغیر ہالے نہ رہ سکتے کہ انہوں نے کبھی اپنے لیے کچھ نہیں کیا۔

اپنے لیے جو کی بھوسی لگی ہوئی روٹی بھی نہ رکھی وہ اسباب آرائش، زینت و لطف کیا رکھتے جس میں سے کسی غریب چند غریبوں یا ایک جماعت انسانی کے خوں کی بو آتی ہو۔

توحسینؑ کی شہادت کی غرض کسی کے نزدیک دنیا طلبی کے مفہوم میں حصول خلافت ہو یا نہ ہو، ان کے اور ان کے خاندان کے متعلق ہر حیثیت کا تجربہ اس سے اٹکا کر رہا تھا کہ ان کا طرز حکومت ایک ایسے ہلاشاہ کا طرز عمل کھاجاتا جو خدا اور مخلوقات کسی کو اپنے اٹھال کا جوابدہ نہیں بھتا۔ بلکہ اس کا تجربہ تھا کہ ہم مسوی رعایت، عدل، حق روی اور حفظ حقوق کی جتنی امید کر سکتے ہیں تو پھر وہ جو حسینؑ سے لڑے آئے تھے وہ اس غرض سے نہ آئے تھے کہ ہم ایک آنے والی مصیبت کو دور رکھنے کے لیے اپنے تمام قوائے ذہنی و جسمانی اور تمام اسباب ظاہری سے مدافعت کریں۔ تو کیا یہ تھا کہ وہ لوگ جو حسینؑ سے لڑ رہے تھے وہ اپنے فوائد کے حفظ کے لیے اس کے کوشش تھے کہ حسینؑ کو دور میاں سے ہٹا دیں؟ بلاشبہ کیوں؟ اس لیے کہ ہم ایسی حکومت کرنا چاہتے ہیں جو ان کی مثالیہ حکومت اور ہر اس شخص کے نزدیک جو طریقہ حکومت کی کوئی منصفانہ صورت پیش کرے قطعی ٹھیک ہو۔ ہم وہ چاہیں اور کریں۔ جیسے ہمارے درجہ عقل و اطلاق تخیل اور روایات قوی سے مناسبت ہو جس کی شرح زمانہ نے کی کہ ہم علمہ ناس کو باہلی اور بے تعلق رکھیں، ان کی زبانیں سی دیں۔ انہیں اپنے طرز عمل کی طرف نگاہ اٹھانے کا متقن نہ بھیں۔ بلکہ بدترین قسم کی غلامی میں مبتلا رکھیں۔ اور ان تمام باتوں کو جنہیں زمانہ دراز کے تجربہ نے کسی حیثیت سے اچھا سمجھا ہو ہمارے نزدیک کوئی بیور اتھلیج کی چیز نہ ہو بلکہ ہم ان تمام باتوں میں بھی کسی کے جواب دہ نہ ہوں جسے عالم کے تجربہ نے برا سمجھا ہو۔ حسینؑ کو اس لیے اٹھلا دیں کہ وہ نہ صرف وہ مرکز بنیں جو ایک بہترین مثالیہ حکومت یا دولا تاسے۔ بلکہ ان کی ذات وہ نہاں ہے جو خاموشی میں بھی ہماری روش کے خلاف مدائے احتجاج بلند کرتی ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ حسینؑ کے خلاف کوششیں کرنے والی جماعت، جماعت حکومت تھی جس نے خلق اللہ کے جسم کو زمین پر لٹا دیا تھا اور اپنے ناخون اس طرح اس کے جسم میں چھو دیے تھے کہ اس جسم کو حرکت کی جرأت اسی وقت ہو سکتی تھی جب وہ اس پر آمادہ ہو جائے کہ ہماری حرکت ناخونوں کے فشار کو اور تیز کر دے۔

ان مالتوں کا بیج احساس تھا جس نے حسینؑ کے خاصہ بلند میں اموی حکومت سے انتہائی نفرت کے ساتھ خلق اللہ کے ساتھ ایک ناقابل بیان جوش پھر دی پیدا کیا اور وہ اس پر آمادہ ہوئے کہ اگر دبے ہوئے مخلوقات میں یہ جرأت نہیں ہے کہ کچھ کہہ لیں اور کر سکیں تو ہم میں یہ جرأت ہے کہ ہم اموی ناخونوں کے فشار کا مقابلہ کریں اور اسے اس حد تک برداشت کریں کہ ظلم کا ذخیرہ ختم ہو جائے لیکن ہمارے صبر اور برداشت کا ذخیرہ و سرمایہ ناقابل انتہام ثابت ہو۔ یہ مدینہ طیبہ میں بھی ممکن تھا۔ لیکن اگر حسینؑ نے اسے مدینہ ہی میں گوارا کیا ہو تا تو وہ اعلان جو ان کی مسلسل جلاد طغی سے ہوا نہ ہوتا اور لانا وہ جوش پھر دی نہ پیدا ہوتا۔ حسینؑ پر اعتراض ہوتا کہ انہوں نے باوجود اس صورت کے کہ انہیں اپنے بچانے اور چلے جانے کا اختیار تھا۔ نہ کہ سے بچنے کی کوشش نہ کی اور پھر اگر حسینؑ کی شہادت کے بعد مدینہ طیبہ کا دی حال ہوتا جو مسلم بن عقبہ کے ہاتھوں ہوا، تو کہا جاتا کہ حسینؑ نے اس آنے والی مصیبت کا خیال نہ کیا تھا۔ نتیجہ ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی مدینہ سے فوراً چلے جانے کی کہ ہم ان ممالک کو جو ہمارے جد بزرگوار کے یا دولا نے والی ہیں انہیں دشمنوں کے کسی دستبرد

کے حوالہ نہ کر لیا۔ اور اگرچہ اس امر خاص کے متعلق حسینؑ کا کوئی خیال تاریخ میں موجود نہیں ہے لیکن مثال واقعہ نے قوی استدلال کی جگہ چھوڑی ہے جو کچھ ان حضرتؑ نے مکہ منظمہ سے روانگی کی وجہ میں اختلاف کیا۔

ایک خود غرض اور بے رحم بلکہ قابل ستائش احسانات کو اپنے فائدہ کے لیے کھل ڈالنے والا مدبریہ کر سکتا کہ وہ مدینہ طیبہ یا مکہ منظمہ ہی میں اپنے لیے کچھ کرتا۔ اس لیے کہ وہ اپنی حیات کے لیے لوگوں کے احسانات میں پناہ لیتا اور مختلف مقامات کے تقدس اور ان کی یاد کو اپنی سپرد قرار دیتا لیکن حسینؑ نے یہ نہیں کیا۔ اس لیے کہ یہ سرتاج شجاعان عالم یزید خدا کی پناہ کے اور کسی پر مجرد سوا کو اپنی غیرت کے منافی سمجھتا تھا اور ان چیزوں کا احترام جیسا تھا وہ یزید اس کے اور کوئی فیصلہ نہ کر سکتا تھا کہ اسے قائم رکھو۔ اگرچہ اپنی ذاتی بے عرقی دشمنوں کے ہاتھوں ہو جائے۔ چاہے اگر حسینؑ روح مقدس نبوی اور کعبہ اللہ کے قیام احترام کا ایسا لطیف لحاظ نہ فرماتے تو کون تھا جو حسینؑ کے بعد ان روح احسانات اسلامی کو اپنے لحاظ کا شایان قرار دیتا۔ اس کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ حسینؑ ان مقامات قبر کہ کو اپنی حفاظت کے کام میں اس لیے بھی نہ لائے کہ جب ان مقامات کی بے عرقی ہوگی تو لوگوں میں بے عرقی کرنے والوں کے خلاف ایک پیمانہ ہوگا جو ہمارے مفید ہوگا۔ اصول سیاست میں یہ امر مفقود نہیں ہے۔ لیکن میں حسینؑ کی اصول سیاست کا ذکر کر رہا ہوں۔ ایک خطر جو پاکیزگی، بلند حوصلگی، اور قربانی سے کھینچا گیا ہے۔

غور طلب ہے یہ امر کہ جو کچھ اہل مدینہ، اہل کوفہ اور ابن زبیر نے چند دنوں کے بعد کیا اگر وہ حسینؑ کی پیروی سے کرتے تو اس کا کیا نتیجہ ہوتا؟ بلاشبہ یہ نہایت آسانی سے کہا جاسکتا ہے کہ ہر زمانہ میں فوجی فتح و شکست صرف تعداد میں نہ تھی بلکہ اس کا ایک نہایت زبردست عنصر انہوں کا دماغ اور شجاعت تھی۔ اب اگر مدینہ یعنی مرکز مسلمین میں حسینؑ کو مسلمانوں کی تعداد کی مدد ملتی، اور عبد اللہ بن غیل ان کے لڑکوں، عبد اللہ بن مطیع، مصلح بن سنان، ابھی اور فضل بن عباس کے علاوہ کربلا کے بہتر شجاعوں کی بھی تعداد ہوتی تو فوجی جسم ایک فلاحی دیوار ہوتی جو پیچھے کی طرف ہل نہ سکتی۔ لیکن جس میں آگے بڑھنے اور کچلنے کی پوری قابلیت ہوتی اور اسلام کا وہ روز بد نہ آتا جو آیا۔ لیکن کچھ تو یہ ہے کہ مسلمانوں کے مخلوق جسم میں صرف شہادت حسینؑ ہی کی وجہ سے ذرا سی حرکت پیدا ہوئی تھی۔ یہ حسینؑ کی مثال تھی در نہ بہت ممکن تھا کہ اگر حسینؑ لے یہ نہ کیا ہوتا تو اہل مدینہ یا کسی کو کان ہلانے کا بھی خیال نہ ہوتا۔ اور اپنے ظلمانہ طرز عمل میں ایک ذلت اور بڑھاپہ دیتے۔

خیر تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ حسینؑ کی شہرت کئی طرح کی تھی۔ ذاتی اور مفائد ذاتی سے میرا مطلب یہ ہے کہ لوگ نہ صرف حضرتؑ کے برگزیدہ انہی تعلقات سے واقف تھے بلکہ ایک کثیر جماعت انسانی بھی روشناس تھی۔ اسی طرح تعارف مفائد سے لوگ اسی طرح واقف تھے کہ حضرتؑ کون سے نفوس قبر کہ کی یاد گار ہیں۔ بلکہ خود حضرتؑ کو انہی مفائد کے مظہر ہیں۔ اس کا اثر کھناد شوار نہیں ہے۔ جس کی مثالیں میں حصہ اول میں کافی حد تک دے چکا۔ لیکن مثال کی خصلت گراؤ کی یاد دہانی مفید ہوگی کہ یہ ایک مرتبہ نہیں ہوا کہ لوگوں نے دیکھا کہ حضرتؑ کس درجہ طہیم ہیں۔ بطم اس وقت جب کہ آپ کو سزا دینے اور گستاخوں کی سخت باز پرس کرنے کا پورا اختیار تھا۔ لیکن حضرتؑ نے یہ دکھایا کہ ہم نہ صرف بڑے نفس شناس ہیں بلکہ انسانی کمزوریوں کو کس درجہ صوفی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور اس کا نتیجہ یہ تھا کہ حضرتؑ کی وسیع دور بینی ایسے گستاخ یا بے خیالوں سے جو متقی سزا تھے ایسی عنایت کا برتاؤ کرتی تھی کہ دفعۃً ان کا غصہ بدل جاتا تھا اور اس وقت

اعلیٰ نہ صرف حضرت کف عظیم سے تالیف حسی ہوتی بلکہ ان کی کجی میں یہ آتا تھا کہ ایسی حالتوں میں ایسا دم و کرم بھی دکھایا جاسکتا ہے۔ ساتھ ہی اس دم و کرم علو اور جلم کے لوگ اس کے قضا کس میں ایک سخت جوش حضرت میں پاتے تھے اور وہ جوش اس وقت ظاہر ہوتا تھا جس وقت کوئی شخص کوئی اصول فطری کرتا تھا۔ جوش سے اس جگہ میرا مطلب یہ ہے کہ جب حضرت سمجھتے تھے کہ کوئی کسی اصول فطری کا مرتکب ہے اور حضرت کا جواب نہ دیتا اسے اپنی گمراہی پر مصر رکھے گا تو حضرت کسی ہی صورت میں اس کے مناسب پہلو کے واضح کرنے سے اپنے کو باز نہ رکھتے تھے۔ اس کے لیے عبداللہ ابن عمرو بن حاص کا مکالمہ یا معاویہ کی تقریر و الامام مویج اور لوگوں کا دریافت کرنا اور حضرت کا حقیقت حال سے لوگوں کو واقف کر دینا معاویہ سے مکالمہ اور بے خوف صاف گوئی، زمانہ حج میں خطبہ اور ایک ہزار کے قریب آدمیوں کو آئینہ کی آنے والی گمراہیوں سے مطلع کر دینا ایسی مثالیں ہیں جس سے واضح ہوا کہ اگرچہ یہ مواقع ایسے تھے کہ صاحب اختیار گروہ اسے اپنے اظہار و اس کے لیے ایک وسیلہ سمجھتا لیکن اس باز پرس کے خوف نے بھی حضرت کو خاموش نہیں کیا۔ اس لیے کہ اس وقت کی خاموشی ان کے حقیقی منصب کی نشانی ہوتی۔ اور ہلکا جو اس کے کہ آپ کی ذات اقدس سے لوگوں کی امید اور خیال وابستہ ہو سکتا کہ وہ اپنے گمراہی کے اصول کے کھلانے کے ذمہ دار ہیں لیکن پھر بھی حضرت ہدایت کے مواقع کو ضائع کر کے اپنے منصب کا اظہار اور اپنے ہدایت گزار کے اصول کی روح کو فنا کے حوالہ کر دیتے۔

اس کے ساتھ ساتھ حضرت کی ذات اقدس ایک ایسے لطیف ایسے شیریں اور ایسے دلکش عزم و اعتدال کی مظہر تھی جس سے الفاظ، انداز اور حرکت پر غور کرنے والے کے لیے یزدہد کے اور کوئی حالت پسندیدگی کے قابل نہیں رہتی۔ ایک مدبر جس کے سامنے کوئی مسئلہ نہیں آتا مگر یہ کہ اس کی روش نکلے اس کے سارے جسم میں پیر جاتی ہے۔ ایک فلاح جو نا قابل فطری فیصلہ کرتا ہے اور کمزوری کو روشن کر دیتا ہے۔ ایک سیاسی رہنما جو تاریک اور محسوس حالتوں میں محفوظ طریقہ تلاش کر لیتا ہے۔ ایک مصلح قوم جس کی آنکھ نہیں جھپکتی اور قوم کا وسیع جسم کسی حیثیت سے داغدار نہیں ہوتا مگر یہ کہ اس کی نگاہ خور اس دلفریب کو پیچ لیتی ہے اور اس پر تختہ کرنے کے لیے ایک طریقہ اختیار کرتی ہے۔ بلکہ ایک طریقہ اختیار کرتی ہے جو مجموعی حیثیت سے مفید ہو۔ ایک شہید جو خدا پر اس لیے ناز کرتا ہے کہ اس نے ایسے موقع پر اسی کو اس کا موقع دیا کہ وہ اس کی حکومت کا نقیب ہو تا۔ اور ہلکا جو اس کے کہ انسان بناتوں کرتا اور اسے رلو سے ہٹانے کے لیے دنیا کی ہر ممکن مصیبت سے خوف دلاتا۔ لیکن وہ کہلوا دیتا کہ ہم اسی لے بنائے گئے ہیں کہ آج یہ دکھائی کہ کمزور انسان کس قدر قوی بھی ہے۔

یہ باتیں میں محض تازگی کے لیے کہہ رہا تھا۔ ورنہ میں یہ سب کہہ چکا ہوں اور مثالیں دے چکا اس وقت اسے اس لیے کہہ رہا ہوں کہ یہ کہنے میں مدد دوں کہ اس کا کوئی اثر مخلوقات پر تھا یا نہیں۔ بلاشبہ تھا اگر حسینؑ کے خصال رفیع کا اثر نہ ہوتا تو کیا ضرورت تھی کہ معاویہ کے اس قرار کے بعد کہ حسینؑ نے حجر سے بیعت کی ہے۔ لوگ حیرت زدہ ہوتے اور اس وقت تک لوگ اس کا یقین نہ کر سکتے جب تک دوبند حضرت سے دریافت اور تصدیق کر کے اپنی تسکین نہ کر لیتے۔ حضرت نے کیا کھلایا اور یقین دلایا۔ یہ کہ حضرت نے نہ صرف فریب کو کھول دیا اور بتایا کہ ہماری ذات ایسا ہونا ممکن نہ تھا بلکہ اپنے خصال کی مستند قوت سے لوگوں پر یہ اثر کیا کہ معاویہ نے جس مفید اثر کا اہتمام کیا تھا اس سے بدرجہا زیادہ برا اثر ہوا۔

یعنی حسینؑ کی ذات اقدس وہ رہنا جو شاہی قوت کے مقابلہ میں لوگوں کے قلوب کو اپنی طرف مچھلی سے نہ صرف حاصل ہو سکتی بلکہ غلط روی سے ہار رکھنے کا ذریعہ ہوتی۔ یہ حسینؑ ہی کے صفات اور خصائل کی شہرت تھی کہ میں بن سحر بن عبادہ، حمر بن صدی اور شعیب بن غنہ کے ایسے لوگوں کی نگاہیں حضرت امام حسینؑ علیہ السلام کی طرف بہر صلاح اٹھ سکتیں۔ یہ تھے حسینؑ جن کے لیے وقت آیا کہ زیدؑ یعنی مجتومہ قبلہؑ حسینؑ یعنی مجتومہ حسن سے اپنی اطاعت کا طلب گار ہوتا۔ اس طلب کے ساتھ ممکن نہ تھا کہ لوگوں کی نگاہ سے حضرتؑ کے خصائل کی طول یا فراموش ہو گئی ہوتی۔ عام اس سے کہ کسی میں حضرتؑ کی حمایت کی جرأت ہوتی یا نہ ہوتی۔ وقت آیا کہ حضرتؑ نہ صرف اپنی گزشتہ کی حمید اور تصدیق کرتے بلکہ اس کا کمال دکھا دیتے۔

حاکم مدینہ کے پاس زید کا قلعی حکم پہنچا۔ ولید کا تردد اور مردان یعنی اپنے رقیب اور دشمن سے صلاح لینے کی ضرورت مسئلہ کی اہمیت پر عکس ڈالتی ہے۔ یعنی ولید اس حکم کو ایسا نہیں سمجھتا جو اگرچہ اس کے حاکم کا حکم ہے۔ لیکن وہ بلا تردد نافذ کیا جاسکے اس کی دوجہ ہو سکتی تھیں یا دونوں تھیں۔ اول یہ کہ ولید مصلحت کی اس شدت کو غلط مصلحت سمجھتا تھا۔ ثانی یہ کہ وہ اس مصلحت کو فاسد رسول کے خلاف نافذ نہ کر سکتا تھا۔ ثانی یہ کہ چونکہ یہ حکم فاسد رسول کے خلاف تھا فاسد رسول کے موقع اور اثر کے مقابلہ میں یہ حکم بلا تردد نافذ نہ ہو سکتا تھا۔ مردان آتا ہے اور کہتا ہے کہ ”حسینؑ ہرگز زید کی بیعت اختیار نہ کریں گے۔ خدا کی قسم اگر میں تیری جگہ ہوتا تو حسینؑ سے کچھ بھی نہ کہتا، انہیں قتل ہی کر ڈالتا۔“ یا کہتا ہے کہ: ”اے ابی تراب ہمیشہ کی پھاری دشمن ہے۔“ کہتا ہے کہ: ”اگر تو نے جلدی نہ کی اور حسینؑ تیرے ہاتھ نہ آنے تو زید کی طرف سے تیری حرمت اور مرتبہ کو نقصان پہنچے گا۔“ یہ فقرات کسی کے چند الفاظ نہ تھے۔ بلکہ یہ ایک زمانہ کی تاریخ تھی۔ اس میں ایک قوم کی روش بول رہی تھی۔ اس کا شامیہ عزت و محنت بول رہا تھا۔ اور حسینؑ اور ان کے خاندان کا طرز عمل کو میں آتا تھا۔ حسینؑ کی طلبی کے لیے آدی جاتا ہے۔ حسینؑ یا مسجد میں ہی یا درودہ رسولؐ پر بیٹھ کر دشمن کے فاسد کے انداز میں بے وقت طلبی کی وجہ سمجھتے ہیں۔ وقت بھی رات کا ہے۔ حسینؑ کو معاذ خیال ہوتا ہے کہ معاویہ مر گیا۔ اور یہی صین واقعہ تھا۔ ابھی اہتمام ردائی نہ کیا تھا کہ دوسرا قاعدہ پہنچتا ہے۔ اور طلبی کی شدت سے حسینؑ سمجھتے ہیں کہ پہلی مرتبہ فوراً میرے نہ بچ جانے سے ولید کو شاید خیال ہوا ہو کہ میں نہ جلاؤں گا اور اب وقت سے فرماتے ہیں کہ کوئی آنے یا نہ آنے میں آؤں گا۔ دوبارہ بھی قاعدہ کے ساتھ حسینؑ کو نہ دیکھ کر مردان کہتا ہے کہ وہ نہ آئیں گے۔ صرف ٹال دیا ہے۔ اور اب ولید کہتا ہے کہ حسینؑ بے وفائیں ہیں، جو کہتے ہیں اسے پورا کرتے ہیں۔

اتفاق یہ تھا کہ جس وقت قاعدہ پہنچتا حسینؑ اس وقت تنہا نہ ہوتے بلکہ ابن زبیر بھی موجود ہوتے اور اس وقت حسینؑ کی یہ گفتگو موجود ہوتی کہ معاویہ سے کیا عہد تھا۔ اور اگر اس نے زید کو غلیظ بنایا ہے تو اہم واقعہ ہوا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ عہد بلکہ اس لیے بھی کہ: ”زید شہابی مجوٹا اور غلیظ فساد کرنے والا ہے۔ ہم رسول خدا کے اہل بیتؑ ہیں، ہم سے ایسی بات (بیعت زید) وقوع میں نہیں آسکتی۔“ زمانہ مستقبل نے جانا کہ حسینؑ نے جو کچھ اس وقت کہا وہ ایک تصفیہ تھا جس میں کسی وقت گنجائش ترمیم نہ ہوتی۔

حضرتؑ کا اہتمام ردائی نہ صرف حضرتؑ کے تجربہ بلکہ دور اندیشی پر بھی دلالت کرتا ہے۔ اور ایسے موقع پر ولید سے

گنگو کا طرزِ حضرت کے اطہیان کا مظہر ہے۔ مردان ایٹھتا ہے، اور انتہائے اقام کی صلاح دیتا ہے۔ حسینؑ کی نگاہِ طہی ہے۔ آواز بلند ہوتی ہے اور مردان کی گردن اٹھا دینے والی تلوار اس کی نیام ہی میں دفن رہ جاتی ہے۔ حسینؑ دارالامارت سے باہر تقریب لے آئے۔ اگرچہ حضرت کی احتیلا اور استحکال نے برے وقت کو سامنے سے دور کر دیا لیکن صورت حال ایسی نہ تھی جو یہ نہ کہتی کہ مسئلہ کس حد تک آگیا ہے۔

اس کے بعد حضرت نے مدینہ سے روانگی ہی کا تصفیہ کیا۔ اولاً اس خیال سے کہ ہم اہل مدینہ کو اپنی مدد کے لیے بلا کر انہیں آنکھ کی زحمت میں جٹانہ کر دے۔ ثانیاً اہل مدینہ اس قدر غیر سپاہی اور اس قدر اثرات سے مخم ہو گئے تھے کہ ان سے کسی مدد کی امید نہ تھی۔

اور اگر ان سے ایسی امید مدد ہو بھی جو مقامی ضرورت کے لیے کافی ہو تاہم ان کا درجہ مدد نیک کی بڑی فوجوں کے مقابلہ میں ناقص تھا۔ (ہم مدینہ کے حرم رسول ہونے کی حیثیت سے بحث کر چکے ہیں)

یہ باتیں تھیں جو حسینؑ کے اپنے قوم پر حرمِ مدبر کے سوچنے کی قید اور ان سے ایسی امید کی جاتی تھی۔ لیکن کچھ اہل مدینہ پر بھی حسینؑ کا حق تھا اور اہل مدینہ کو بھی سوچنا چاہیے تھا۔ افسوسناک چاہیے تھا کہ ہمارا موقع اور ہماری کم سے کم دو پشتوں کا گوشت و پوست حسینؑ کے گھر کی بدولت ہلا ہے۔ ہمارا احترام حسینؑ کی بدولت اور اس روضہ مقدس کی بدولت ہے جس کی محواری حسینؑ کو شاہی سے زیادہ پسند تھی۔ یہ مدینہ تھا جسے رسولِ اہل مکہ کی تالیفِ قلب کے لیے مکہ یا اپنے پہلے وطن سے بدل سکتے تھے۔ لیکن اہل مدینہ کے لیے اس روز سے زیادہ غم کا کوئی دن نہ تھا جس روز انہیں وہم ہوا کہ رسولِ ترکِ مدینہ کریں گے۔ رسول کی نوازش نے بھادیا کہ مدنی وہم غلط تھا اور ہادی کے یہ لفظ ہمیشہ کے لیے ان کی تسکین کے باعث تھے کہ اگر تمام دنیا ایک طرف جاسے تو میں ادمر جاؤں گا بدرجہ اسے انصار تم جانو یا مؤلفہ القلوب کو سونا چاندی اور ٹکڑی لے جانے دو، میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔ اور یہ سن کر اہل مدینہ خوشی سے رو رہے تھے۔ حسینؑ کے ہر حالی مقدار لے اہل مدینہ کو ایک منضبط اور عادلانہ حکومت عطا کی۔ پھر انہ توجہ مبذول رکھی اور ان کے حالات و اطوار درست کیے۔ آج حسینؑ ہیں جو دیچ رہے ہیں کہ جس کے دادا کو میرے گھر لے حکم دیا تھا کہ جو اونٹن ان کے گھر میں داخل ہو گا اسے پتہ دی جائے گی۔ وہ اس پر آمادہ ہے کہ اگر میں اس کی بیعت نہ کروں تو قتل کیا جاؤں۔ آج حسینؑ کسی زندہ کے پاس نہیں جاتے۔ کچھ قبروں کی طرف جاتے ہیں۔ کوئی انسان نہیں ہے جس سے امت کی حمایت کرتے۔ ہزاروں کی خاموشی حسینؑ کو اپنی فضا میں موجود دیکھتی ہے۔ خاموش، افسردہ اور بے چین۔ کیوں ان خاموش قبروں کے پاس آئے اور کسی مجمعِ انصار کو مخاطب نہ کیا؟ اس لیے کہ حسینؑ کی غیرت اس سے بلند تر تھی کہ کسی انسان کو اپنی افسردگی دیکھنے دیتی۔ کوئی انسان نہ تھا جو حسینؑ کو تسکین دیتا اور حسینؑ اپنا دکھ اسے سناسکتے۔ تانا کی قبر تھی جس پر جھکے تھے یا جسے سینہ بھر کر لپٹ گئے تھے بے حس قبر آسمانوں سے نرم ہو رہی تھی اور کہہ رہے تھے: "تانا جس حسینؑ کے لیے آپ نے دمیں کی تھیں" ضائع اور عود ہو گیا۔

سو گئے حسین۔ داغی بے معنی کو ذرا سا سکون مل گیا۔ اس لیے کہ نیند کے عالم میں یا اپنے بیچ تصفیہ کا مکس دیکھتے۔ یا ارواحِ مقدسہ کا قلبی اتصال ہو تا۔ یا روشن ضمیری ہوتی۔ جو زمانہ مستقبل دکھا دیتی۔ چونکہ اب حسینؑ دوسرے تھے۔

ظنی تصفیہ ہو چکا اب اہتمام کر رہے تھے عقل کی طرف جانے کا اہتمام ایک تصفیہ ہے کوئی بدل نہیں سکتا تھا لوگ آتے ہیں صلا میں بہت کچھ دیتے ہیں زیادہ تر ناہانہ، جن کی فکر نہ وقت، موقع اور نہ سلسلہ اتفاقات پر چلتی ہے کہتے ہیں جو کچھ تمہ میں آتا ہے۔ لیکن چونکہ وہ نیک نیتی کی جانے، حضرت حکمران ادا کرتے ہیں اور فہم الفاظ میں جواب دیتے ہیں کہ مجھے کچھ حکم ہے جو ضرور پورا ہو گا وہ مل نہیں سکتا کیا تھا وہ حکم حکم نہ تھا ایک تو تھی ایک روشنی تھی جو اکثر نفوس مقدسہ پر چمکی تھی کہ اگر ایسا ہو تو کیا ہو گا اور تصفیہ تھا کہ یہ ہو گا کہ اس وقت کا ماحول اپنے کو قربان کرے گا اور ہم اس پر راضی ہیں کہ وہ قربان ہو۔ یہ رضا اور یہ تصفیہ چونکہ حسینؑ کے آباء طاہرین کا تھا اور چونکہ یہی روشنی حسینؑ پر چمکی تھی، اس وقت کا ماحول حسینؑ کے لیے گزشتہ کی تصدیق تھی ایک حکم حاجس سے حسینؑ اعراض نہیں کر سکتے تھے ان کی دُور بین نگاہ مسلمانوں کو دیکھ رہی تھی۔ دیکھتی تھی کہ یہ کس حد پر پہنچی ہوں گے اور اس صحیح نتیجہ شناسی نے انہیں بکھار دیا کہ وہ وقت آ گیا جس کے لیے ہماری جد بزرگوار، پدر عالی مقدار اور ماور گرامی تیار ہوئی تھیں۔ اب یہ حسینؑ کے لیے کوئی حکم کی بات نہ تھی۔ فخر کی تھی۔ خوشی کی تھی کہ ہم یہی وہ ہیں جو حکم خدا کو اپنے منتقل پورا کریں گے۔ مسیحیں حسینؑ کو اس سے ہٹاؤں۔

لیکن مداخلت رومی اور الہام لے تو حسینؑ کو ایک عالم میں تیجہ دکھانا تھا تیجہ کی تفصیل مادی عالم سے منتقل تھی۔ انہیں روش وہ اختیار کرنی تھی جسے عالم اسباب کو جواب دینا تھا اور وہ یہ تھا کہ حسینؑ دی راستہ اختیار کرتے ہیں کہ ہم نے اپنی مخالفت کے لیے کوئی طریقہ اور شرط مصامت اٹھانہ رکھی اور یہ اس سچے مدبر کی طرح کیا۔ جو نہ صرف چھائی بلکہ تیزی فہم اور قائم بہ اعتدال عقل، صحیح احساس سے ایک ایک قدم اٹھاتا ہے اور تیجہ یہ ہوا کہ کوئی نہ تھا جو یہ کہہ سکتا کہ حسینؑ نے غلط جگہ غلطی کی۔

لیکن حسینؑ کو مدینہ سے نکلتا تھا مدینہ جس کا ہر سنگریزہ حسینؑ کو کھنٹی سیار سے دیکھتا تھا اور عظیم کرنا تھا۔ دیکھو اسے حسینؑ وہ تھا اگر گھر ہے۔ تم جانتے ہو کہ اس نے تمہارے لیے راحت کے کیسے کیسے وقت ٹھہرا کیسے تھے وہاں تمہارا گہوارہ تھا اور تمہاری ماور گرامی لوریاں دیتی تھیں۔ وہاں تم نے اپنے پدر بزرگوار کو ڈنکی لوریاں اور نانا کو تھمار داری کرتے دیکھا تھا وہاں تم اور حسنؑ کھیلے تھے۔ اس جگہ تم تھے کہ رسولؐ غلا جنگ کے رخ کی خوش خبری دینے آئے تھے یا سنا تھا کہ خدا کے دین میں لوگ غول کے غول داخل ہو رہے ہیں۔ وہ تمہارا اکلہ ہے۔ یہاں تم کھیلے تھے اور رسولؐ تم سے کھیلے اور پیار کرتے ہوئے بڑھ جاتے تھے وہ علقہ بنی جذعان ہے جہاں تم کھو گئے تھے اور لوگ تمہیں لینے آئے تھے۔ وہ حدیقہ بنی غار ہے اور تمہیں رسولؐ مع امیر المومنین کے لینے گئے تھے۔ اور وہ مسجد رسولؐ ہے جس کے منبر پر تم نانا کو دیکھتے تھے اور تم اس پر سے بلند کیے گئے تھے۔ اور لوگ دیکھتے تھے تم نے اپنے گھر میں غلا غلا جگہ ان کو انجری مرتبہ دیکھا تھا جو تمہیں دنیا میں سب سے زیادہ عزیز تھے اور وہ جگہ ہے جہاں رسولؐ کی رحلت کے بعد انتشار اور مہلکی کے عالم میں تم بیٹھے تھے تم نہ جانتے تھے کہ کیا سوچیں لیکن تم غور میں کھوئے ہوئے تھے وہاں تم بھوک میں سو گئے تھے اور وہ جگہ ہے جہاں تمہاری خوشی کی گڑیاں صورت پذیر ہوئی تھیں۔

یہ اور بہت کچھ چیزیں، مقلات اور سلسلہ خیال تھے جو حسینؑ کے دماغ میں اس سرعت سے آ اور جارہے تھے جس کے وقت کا اندازہ ممکن نہیں ہے۔ آنکھیں تھیں جو ان چیزوں پر گڑ گئی تھیں۔ موقع کہتا تھا کہ بڑھو بڑھو۔ لیکن دابگی

کہتی تھی کہ تم آخری مرتبہ انہیں دیکھ رہی ہو۔ اس طرح دداع کر لو کہ پھر دیکھنے کی آرزو نہ رہے۔

یہاں تک کہ حضرت مہدی مصر سے خلافت نکلے تھے اگرچہ والی مصر سے عہد ہوا تھا اکیلے نہ تھے۔ کوئی چھوٹی سی جماعت نہ تھی۔ چھ لاکھ آدمی تھے جو حضرت یسٹ کے وقت سے اس وقت تک بڑے تھے۔ قوم کو ایسی جگہ کی بشارت دیتے ہوئے نکلے تھے کہ ہم قصیدہ دودہ اور شہد کے ملک کی طرف لے چل رہے ہیں۔ جہاں تم آزاد رہو گے۔ مصر کی ایسی غلامی میں مبتلا نہ ہو گے۔ پھر بھی خلافت تھی۔ خوف اس لیے نہ تھا کہ ریسس ٹائی سے اور ان سے کوئی صداوت تھی۔ یا قوم کے قتل اور غارت یا بے عزتی کا اندیشہ تھا۔ نہیں بلکہ اہل مصر اور فراعنہ کچھ زمانہ سے بنی اسرائیل کو اپنا نظام سمجھتے تھے اور ان سے بیکار کا کام لیتے تھے۔ ان کا چلا جانا منعت کے خدشہ کا چلا جانا تھا۔ جو حقوڑے خرقے سے بڑے کام دیتے تھے۔ زیادہ سے زیادہ اقتصادی تعلق۔ حضرت رسول کی پھرت عہد و شہد تھی لیکن ان کی پھرت کے وقت مکہ میں کوئی عظیم حکومت نہ تھی جس کا سلسلہ ہر جگہ گھوم رہا تھا۔ اور اگرچہ قریش دشمن تھے لیکن وہ بھی حضرت کے قبیلہ سے دور رہے تھے۔ قبیلہ کا اثر اب تک زائل نہ ہوا تھا۔ اس کے علاوہ ان کی دشمنی صرف ذات مقدس نبوی تک محدود تھی۔ قریش کو حضرت کے متعلقین سے بحث نہ تھی۔ کیا اس کے بعد کہا جاسکتا ہے کہ مانا کی پھرت جن اتفاقات میں ہوئی تھی، نواسہ کی پھرت اپنے موقع کے لحاظ سے سخت تر تھی۔ ہادی برحق کا مکہ کے بعد مدینہ میں پر لطف استقبال ہوا اور امنیت و سکون حاصل ہوا۔ حسین کی پھرت سے امنیت و سکون کے لحاظ خارج تھے۔ صرف وقت ملتا تھا۔

دوسری بات یہ ہے کہ حضرت کی روانگی کے وقت اعزاء، احباب، مسلمان بار برداری، ان کے مسلمان آب و خورش کے اہتمام کے لیے کچھ روپیہ کی ضرورت ہوئی چاہیے تھی۔ خصوصاً ایسی حالت میں کہ فوراً روانہ ہو جانا تھا۔ اہل بیت اس کے لیے مشہور نہ تھے کہ وہ بڑی دولت ہر وقت جمع رکھتے۔ پھر بھی حضرت نے جیسا فوری انتظام کیا اور جس طرح کر بلا تک ضروریات کی کمی کا مسئلہ پیش نہ ہوا اس سے ظاہر ہے کہ حضرت نے کیا انتظام بہت حقوڑے وقت میں کر لیا تھا۔ یہ بھی ظاہر نہیں ہے کہ تاریخی خیام کے وقت دشمنوں کو ذرا نقد کس قدر حاصل ہوا۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ حضرت کے پاس ایک ہزار اشرفی نہ تھی۔ درنہ محمد بن بشیر حضری کے لڑکے کے زعفریہ کے لیے اس قیمت کی چار سو عطا نہ فرماتے۔

اس سب سے غرض یہ ہے کہ اگرچہ وطن اور اس کی ان تمام یادگار چیزوں سے ترک تعلق کرنا تھا جن سے حسین کو قلبی وابستگی تھی اسی وقت اہل بیت کو بھی ساتھ رکھنا تھا۔ اس لیے کہ ایسا نہ ہو کہ ہم تنہا اپنی جان بچا کر چلے جائیں اور دشمن ہماری حیات میں ہمارے پس ماندوں سے اپنا جوش انتقام پورا کرے۔ یہ حسین نے باوجود صلاح کے بھی نہیں مانا۔ اس لیے کہ یہ حسین کی ذمہ دارانہ غیرت کے خلاف تھا۔ صلاح دینے والے دشمن کا درجہ صداوت اور وحشت نہ سمجھتے تھے اور نہ کسی نے یہ کہا یا اطمینان دلایا کہ ہم آپ کی ناموجودگی میں ہر طرح ان کی حفاظت کریں گے۔ ایسی صورت میں حسین انہیں بھی اپنے ساتھ کیوں نہ رکھتے۔ خصوصاً جب کہ ہونے والا یہ تھا کہ وجہ حسین کو ان سے بڑی مدد ملتی۔ کم سے کم یہ لوگ اس وقت تک محفوظ تھے جب تک حسین دنیا میں رہتے۔ اور یہ ہوا۔ اس وقت تک ہوا جب تک حسین کی آخری مقدس سانس ان کے سینہ مبارک سے نکلے۔

حضرت کا موقع یہ تھا کہ ایک مشکل کے پانے کے لیے اگر اسباب پر نظر ڈالتے تھے تو دوسری ویسی ہی مشکلات

سامنے آئی تھیں اور حضرت جس طرح ان کا انتخاب فرماتے تھے وہ ان کی سرعت تصفیہ بلکہ صحت تصفیہ کی دلیل ہے اور ان تمام انتخاب میں اصول یہ ہوتا تھا کہ کہیں سے ہم اپنی بلندی نفس کے خلاف کوئی امر نہ کریں، اگرچہ مصائب کا وزن بڑھ جائے۔

اب اس جگہ مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے کہ میں ان مکالمات کی شرح، جرح یا تحقیر کروں جو اس وقت حضرت محمد ابن حنفیہ، ابن عباس یا ابن عمر سے ہوئے۔ میں اس میں محمد ابن حنفیہ کے مکالمہ سے صرف ایک فقرہ یاد دلاتا ہوں کہ:

”اگر دنیا میں میرا ایک دوست بھی نہ ہوگا اور کسی جگہ بھی امن و امان نہ ہاؤں گا تب بھی زبید کی بیعت نہ کروں گا۔“ یا اپنے وصیت نامہ میں تحریر فرمایا تھا کہ: ”میں کسی ظلم یا فساد یا خواہش دوری حق کے اندیشہ کے سبب سے مدینہ سے باہر نہیں جاتا ہوں بلکہ محض امت محمدی کی دورستی کے واسطے جاتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ نیکی کی ہدایت اور بدی کی ممانعت کے شرائط لوگوں پر ظاہر کروں۔“ ابن عباس سے حکایت کرتے ہیں کہ ہم تربت رسول کی زیارت نہیں کرنے دیے جاتے اور ایسے ڈرانے لگتے ہیں کہ کہیں نہیں رہ سکتے ابن عمر سے فرماتے ہیں: ”میں ہرگز زبید کی بیعت نہ کروں گا بلکہ اپنے مٹا رسول خدا کی سنت اور ہاپ علی مرتضیٰ کی خصلت پر چلوں گا۔“ یہ فقرات ہیں جن میں حسینؑ نے اپنی آئندہ روش ظاہر فرمائی اور یہ ایک ایک لفظ صحیح ثابت ہوئی۔ حضرت نے اسے بھی ظاہر فرمادیا اگرچہ مخصوص مواقع پر کہ میرا خاتمہ قتل سے ہوگا اور اگرچہ اہل مدینہ نے رحلت رسول کے بعد سے اہل بیت رسالت کی رفاقت کا کوئی عملی ثبوت نہ دیا بلکہ احسان کے موقعوں پر سود اور سہل انکار پائے گئے۔ لیکن اب وہ موقع تھا جو اس کے پیشتر کسی نہ آیا تھا یعنی اگرچہ جناب بعیر نے وقتی صلاح کی بنا پر کوفہ کو مستقر خلافت قرار دیا جس سے اہل مدینہ کا درجہ خلوص ظاہر ہے تاہم کوئی ایسا موقع نہ آیا تھا جیسے شعبان کی تیسری یا چوتھی تاریخ کو جس میں آل رسالت کا ایک ایک بچہ مدینہ کو چھوڑ رہا تھا خوف بالقرور۔ لیکن انتہائے شجاعت کے خطرات میں بھی ملتوث۔ یعنی قتل، گرفتاری، اور توہین۔ پھر بھی اہل مدینہ میں ان کے موافق کوئی حرکت نہ ہوئی۔ مدنی مسائل کے اس تغیر کامل پچاس برس گزشتہ کی تاریخ میں ہے۔ تاہم یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ایسا موقع اہل مدینہ کے تاسع کانہ تھا جب وہ دیچ رہے تھے کہ ہادی کا ہر حیثیت کا قائم مقام آج کل میں مدینہ ترک کر رہا ہے۔

بہ فرض حال چند رونے والے ہوں۔ کیا ایسا ممکن تھا کہ ایسے عہد و شوق حسینؑ اپنی عزت، اپنی جان، اور اپنے حرم کی حفاظت کو چند رونے والوں کے سپرد کرتے۔ نہ اس وقت اور نہ اس کے بعد کبھی جماعت اسلامی میں حسینؑ کے مسائل کی ترقی محض رونے سے ممکن ہے۔ یہ حضرت کا اثر اس وقت اور اس وقت کے بعد تھا کہ عبد اللہ بن مظعون کہہ رہا تھا کہ: ”آپ سید عرب ہیں اگر آپ ہلاک ہوں گے تو ہم بعد آپ کے غلام ہو جائیں گے۔“

غیر تو جو کچھ بھی ہوتا اور احسانات کی کیسی ہی قربانی کیوں نہ ہوتی لیکن حسینؑ سے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ ایک ایسے اصول کی قلابہ منظور کر لیتے جسے انسانیت، اخلاق اور مذہب نے کبھی پسندیدگی سے نہیں دیکھا۔ نکلے وطن سے اس طرح کہ ان حضرت کی نگاہوں میں موت کا دریا مشرق سے مغرب اور مغرب سے مشرق تک لہریں مار رہا تھا لوگ آتے ہیں اور سلامیں دیتے ہیں۔ حضرت انہیں کہنے دیتے ہیں جو وہ کہنا چاہتے ہیں۔ ملاحظہ فرماتے ہیں کہ ان کی صلاح میں موقع کے پہلوؤں کا احساس نہیں ہے۔ ان کی صلاح کا شکر یہ ادا کرتے ہیں اور کند جواب دے دیا کرتے ہیں جس سے کچھ بچانہ جاسکے۔ آج جو ظاہر ہائیں نہ دیچ رہا ہو، اسے صلح پر مطلع کر کے اپنے کو اور مصیبتوں میں مبتلا کرنا ہے۔ اس طرح

یہ سفر جو مشہرہ سے قحطام ہوا یعنی وہ تمام لوگ جو سفر کر رہے ہوں، دیکھتے تھے کہ فرزند رسولؐ ایک نہیں بلکہ ان تمام لوگوں کے ساتھ جو جزو خاندان اور متعلقین ہیں مکہ جا رہا ہے۔ اور اگر مدینہ سے روانگی کے وقت فرمایا تھا کہ خدا قالموں سے نجات دے تو اس وقت مکہ کی پہاڑیاں دیکھ کر فرما رہے تھے کہ خداوند امتزل مقصود تک پہنچا دے۔

مکہ کا سامنے آنا اس کی گزشتہ یاد کا سامنے آ جانا تھا خیال میں ایک نرم لہر کا شامل ہو جانا تھا کہ یہاں بنائی اور حیوانی قتل جائز نہیں ہے۔ ایک گونہ امید خیز سکون تھا کہ ہم نے جس جائے پناہ کا ارادہ کیا تھا وہاں پہنچ گئے۔ لوگ بھی استقبال کو آئے۔ مہذن اذان دینے لگے۔ لوگ نمازوں میں شریک ہونے لگے۔ اور گویا بادیِ انحر میں رشتے حضرتؐ کو مکہ کی حتی سکونت سے ایک گونہ مطابقت ہونے لگی۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ اہل مکہ میں کبھی کی مقدس پلا تازہ ہو گئی۔ اور انھیں کبھی کبھی خیال آتا ہو گا کہ رسولؐ کا یہ نبی سلسلہ ہدایت کبھی ہمارے ساتھ شکستہ نہیں ہوا تھا۔

لیکن یہ بھولنا نہ ہو گا کہ ان زبیر کا بھائی کس طرح عین خانہ کعبہ میں لانے کے متعلق حاکم مدینہ سے دستگیر مار چکا تھا۔ اور بھائی سے مکہ میں لڑکر اپنا حوصلہ پورا کر چکا تھا یا کچھ ہی دن کے بعد کیا چاہتا تھا۔ اور نہ امکان سے دوری تھی۔ میرا ذاتی اثر یہ ہے کہ مکہ کی آمد سے اور پھر یہاں کے فرد تک کبھی حضرتؐ مطمئن نہ تھے بلکہ آنکھ کے امکانات سے برابر حالت خوف میں بسر کر رہے تھے۔ اس پر میں باب ہفتم (واقعات کا نقشہ) میں نظر کر چکا ہوں۔ ان اتفاقات میں اور اس شہرت سے کہ حضرتؐ نے زبیر بن عوفیہ کی بیعت نہیں اختیار کی اہل کوفہ نے حضرتؐ کو مدعو کیا۔ یہ شہرت اس قدر تیز رفتار تھی کہ اس زمانہ میں کہ حضرتؐ مدینہ سے مکہ تشریف لے جاتے مدینہ سے کوفہ پہنچ گئی۔ اور ادھر مکہ میں سکونت اختیار کیے ہوئے دو ہفتہ گزرا تھا کہ اہل کوفہ کا قاصد آگیا قیاس نہیں کیا جاسکتا کہ اگر حضرتؐ کے علاوہ کوئی ذات منکر بیعت زبیر ہوئی تو وہ ایک بڑی جماعت میں یہ چھان پیدا کر سکتی کہ لوگ اسے اس طرح طلب کرتے اس لیے کہ کسی دوسری ذات میں وہ باتیں نہ ہوتیں جن کی بنیاد پر طلب کر رہے تھے۔ حضرتؐ نے بلو جو اس کے کہ بیعت زبیر کا اکراہ حضرتؐ اور اہل کوفہ میں عام تھا ان کی دعوت قبول نہ کی۔ اس لیے کہ حضرتؐ کو اہل کوفہ کا گزشتہ درجہ استقامت جو کچھ معلوم تھا وہ امید خیز نہ تھا۔ اس لیے بھی کہ حضرتؐ دیکھ رہے تھے کہ اگر ہم مکہ میں رہنے دیے جائیں تو ہمیں یہ زیادہ پسند ہے کہ ہم اپنی مدد کے لیے کسی جماعت کی طرف امید سے دیکھیں۔ اور اتفاقات کی رفتار یہ تھی کہ جس وقت وجوہات خوف میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا اہل کوفہ کے اصرار میں بھی شدت ہوتی جاتی تھی۔ ان کی استدعا لے ہدایت یابی کے لیے استغاثہ کیا تھا۔

حضرتؐ یا کسی کے لیے ایسے وقت کوئی راستہ نہ رہ گیا تھا۔ یز اس کے کہ وہ کہیں اور چلا جاتا۔ لیکن کہیں اور کہاں جاتا۔ کیا کسی حکومت اور وسیع حکومت سے متوافق ہو کر کہیں چلا جاتا آسان ہے۔ خصوصاً ایسی حالت میں کہ دوسری کوئی حکومت قریب نہ ہو جس کی سرحد کو عبور کر جانا آسان ہو اور وہ دوسری حکومت اس اصول کی بھی حامل ہو کہ وہ پناہ گزینوں کو قبول کرے۔ اس لیے حضرتؐ کے واسطے یہی راستہ تھا کہ وہ تہجدِ مسلم بن حقیل کو دریافت حال کے لیے روانہ کرتے کہ اہل کوفہ اپنی ہم آہنگی میں کہاں تک راسخ اور صلاح ہیں۔ اور اہل کوفہ کو بھی اس کی اطلاع دے دی کہ مسلم "کوفہ کی مسجد میں تمہاری امامت کرانے لگا۔ اور شرعی فیصلہ کیا کرے گا۔ نفعان میرے آئے تک تم میں احکام جاری کرے گا۔" اس کے معنی یہ ہیں کہ حضرتؐ نے اپنے سفیر کو یز اس کے کچھ ہدایت نہ کی تھی کہ وہ امور امت اسلامی

میں داخل نہ دے بلکہ اللہ کے امورات شرعی کا محافظ ہو۔
 اتفاقات نے یہ چاہا تھا کہ حضرت نے مسلم بن حذیل کو زید کی سلطنت کے الٹ دینے ہی کے لیے کیوں نہ بھیجا ہو لیکن ان کے جواب کا انتظار نہ کر سکیں اور اس وقت تک حرم خدا پر غور ہوں۔ جس وقت بے شمار امت احکام حج بجالا رہے ہوں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ سیاسی غرض ہو یا ہدایت کوئی ایسی فوری نہ ہو سکتی تھی کہ حج سکھانے والے کافر زید جو فرائض کا نمونہ تھا اپنے ذاتی فرض کو دوسرے دن بغیر ادا کیے ہوئے چلا جاتا تا وقتیکہ اسے اپنے کو فوری ٹھیکہ سے بچانا اور حرم خدا کی اپنے قتل سے حفاظت متصور نہ ہوتی۔ یہ حسینؑ ہی کا کام تھا اور انہیں کی ذات عظیم ختمی جو اپنی ذات اور حج کے معنی یا حرم خدا سے یہ کام نکالنا نہ چاہا کہ وہ زید کے خلاف ایک ذریعہ ہوتا۔ چلے گئے۔ اس لیے کہ اپنے کو بچانا تھا لیکن کسی جگہ کسی مجمع سے اپنے لیے استغاثہ نہ کیا۔ خود کچھ لو اگر کچھ سکو اسے ہم روک نہیں سکتے۔ دیکھو اگر آگھیں ہوں اور سنا اگر کان ہوں۔ اور اس طرح چلے جانے سے اس کا بھی تصفیہ ہو گیا کہ کہیں یا کوئی ہی کی طرف حضرت کا روانہ ہونا یقین خلافت سے نہ تھا۔

یہ وقت تھا کہ عامل مکہ دیکھتا کہ ہماری حکومت کا حضور ہمارے قبضہ سے نکلا جا رہا ہے۔ ایک سرہنگ مع سپاہیوں کے بھیجا جاتا ہے اور حسینؑ کی دین پرور ذات کھل شہادت سے تلواروں سے روکنے کا حکم نہیں دیتا بلکہ دشمنوں کی پگٹی ہوتی تلواروں اور بلند تیروں کے مقابلہ میں کوڑوں سے روکنے کا حکم دیتی ہے۔ حضرت کے اصحاب کے لیے یہ ایک تفریح تھی۔ آملگی جنگ نہ تھی۔ ہاں۔ موقع یہ ہے کہ یاسینؑ کی شہادت کی تعریف کرو کہ فلاح کا مقابلہ کوڑوں سے کیا یا دوزیٹی کی کہ وہ جانتے تھے کہ ذرا سا روک دو اور عامل مکہ میں مقابلہ کا موقع دیکھ کر یہ جرات نہ ہوگی کہ وہ زمانہ حج میں اپنے حکم پر اصرار کرے۔

پھر لوگ آتے ہیں اور صلاحیں دیتے ہیں اور حضرت دے ہی جواب دیتے ہیں جیسے پیشتر دے چکے تھے۔ یا کچھ نہیں فرماتے۔ اور زیادہ صبر پر فرما دیتے ہیں کہ خدا نے چاہا ہے کہ مجھے مقتول دیکھے اور خدا نے چاہا ہے کہ اہل حرم کو مختار دیکھے۔ یہ بڑے لفظ ہیں جن میں ابام الشہداء نے نتیجہ بتایا تھا۔ جو آج سے ایک مہینہ بعد کا واقعہ تھا کسی کی محض روشن ضمیری پیشین گوئی نہیں کر سکتی تا وقتیکہ اس میں ان اتفاقات پر تسلیم و رضا کا عزم قوی نہ ہوتا۔ حسینؑ نے نہ چاہا اور نہ وہ چاہ سکتے تھے کہ ان کا عزم ان کی صاف بینی نتائج سے تخلع کرتا۔ یہی مجموعہ حسینؑ کا آئینہ ہے۔ حضرت موسیٰ کو یقین دلایا گیا تھا کہ تم دودھ اور شہد کاملک دیکھو گے لیکن ان کے عزم کا بعض مواقع پر تھپل اس کا سبب ہوا کہ دودھ ٹال دیا جاتا۔ جنگ آگیا داؤد باوجود دافعت اور جنگ و انتقام کے اس پر بے صبر ہو گئے کہ عداوت ان کے حرم کو لے گئے۔ ابن مریم موت سامنے دیکھ کر کہہ سکے کہ کیا تو مجھے بھول گیا یا اس کے دفعیہ کے خواہاں ہوئے۔ لیکن حسینؑ نے موت بھی۔ اتفاقات دیکھے اور اس کا ایسا یقین ہوا کہ جو بدلہ نہ جاسکتا تھا۔ اتفاقات تھے جن کا نتیجہ ان کی صاف نگاہ اور روشن ضمیری کے سامنے دو اور دو چار کی طرح واضح تھا۔ لیکن اس نتیجہ نے غزل کیا معنی انہیں بھادیا کہ ایسے موقع کا جمع ہو جانا چاہتا ہے کہ دینی، قوی، انسانی اور اخلاقی روح کی عظمت قائم کی جائے۔ اور یہ جہانی فتنے مگن ہو گا۔ جس کے آثار ہیں۔ اب حسینؑ کا ہر قدم اس طرح اٹھ رہا تھا جس طرح کسی صاحب خصال اور دودھ و فانا انسان کا قدم اٹھانے دودھ کے لیے اٹھتا ہے اور اس کی کٹی مسرت ہوتی ہے وہ کچھ رہے تھے کہ وہ ایک دودھ کو پورا کر رہے ہیں۔ دودھ جو ہر انسان میں دو نوعیت کیا گیا ہے کہ وہ حدود الہی کو قائم رکھے۔ لیکن ہر انسان میں امتحان کے وقت اس پر قائم رہنے کی جرات نہیں ہے چہ جائے کہ اس امتحان میں جس میں

حسینؑ تھے ایسے وعدہ کا بھنا اور وعدہ پر قائم رہنے کی قوت اور اس کے شکنج بھنا حسینؑ سے کہلوارا تھا کہ خدا نے چاہا ہے کہ مجھے قاتل دیکھے۔ اور اس کے بعد دشمنوں کی طبیعت شناسی کہلوار ہی تھی کہ اور خدا نے یہ بھی چاہا ہے کہ میرے اہل بیت کو اسیر دیکھے۔ کون انسان ہے جو اس عظمت نفس کا پورا اندازہ کر سکے یہ اخلاقی اعتبار کی جان تھے۔ اعتبار کا ان سے اعتبار ہوا۔

اب تم مجھو گے اس حالت کو جو مکہ کی روانگی سے درود کر بلا تک حسینؑ میں پائی گئی اور تم حیرت زدہ تھے کہ خبریں ہیں۔ متوحش لیکن حسینؑ ہیں جن کے لیے گویا خوف پیدا ہی نہیں کیا گیا تھا۔ کیا ایسا ہی تھا۔ نہیں۔ حسینؑ نہایت ہی بیجا احواس اور ذکی احواس انسان تھے۔ ان میں تمام انسانی قوتیں تھیں بلکہ لطیف تر حالت میں۔ وہ جو معمولی انسان کی کبھی نہیں آتا وہ ان کی روحانی قوت تھی۔ انسان ان پر کمزور احساسات کا اثر نہ دیکھ کر حیرت زدہ ہوا کرتا ہے۔ ان کے لیے وقت تھے کہ چہرہ مبارک پر مصائب کا کس دکھائی دے جاتا جیسا حضرت علیؑ اکبرؑ زبیر بن عقیلؑ اور حضرت زینبؑ قاتلون نے ملاحظہ فرمایا۔ یہ سب تھا لیکن یہ سب گزرتی جاتی باتیں تھیں۔ حسینؑ وہ تھے جو ان باتوں کے بعد جواب سے ظاہر ہیں نہ صرف جواب بلکہ عمل گجو اگر کچھ سکو کہ جنوٹ اپنے فرزند کے قول کو سن کر کہ: ”اگر ہم حق ہو ہیں تو موت سے کیا خوف ہے۔ اور ہم موت کی طرف ہائیں یا موت ہماری طرف آئے۔“ فرماتے ہیں کہ: ”اے فرزند تو نے دل خوش کر دیا۔“ یہ لفظ نہیں ہیں بلکہ ان سے کچھ خوشی ظاہر ہے۔ اور یہ بھی فرمایا ہے کہ: ”خدا تجھے وہ بہترین جزائے جو ہاپ کی طرف سے فرزند کو دی جاتی ہے۔“ یہ بیٹے کے آدگی شہادت کی خوشی ہے اور اس کی داد دی ہے۔ فطری رنج غلطی پسندیدگی نے دھو دھال۔ یا اسی طرح حضرت زینبؑ موثر اشعار سے متاثر ہوتی ہیں۔ تو ہادی عالم اور امام الامۃ کی رحلت کے تذکرے اور مثال سے تسکین دیتے ہیں۔ اور یہ بھی کہہ کر کہ ”تمہارے صبر کو کیا ہوا ہے۔“ غیرت کو چھو کر آئندہ کا استقلال بتایا تھا۔ حسینؑ نے جو کچھ فروق سے فرمایا وہ نہ صرف حسینؑ کو بھاتا ہے، بلکہ وہ انسان کے لیے ایک دستور العمل بھی ہے کہ: ”اگر حکم الہی ہماری مرضی کے موافق ملدور ہوا تو ہم اس کی نعمتوں کا حکم کرے اور اگر اس کے مخالف ہو تو ہم اس کی مخالفت سے متعلق ایک حیثیت یہ تھی کہ ”اگر انسان کا جسم موت ہی کے لیے بنا ہے تو کھوار سے مارا جانا ہی بہتر ہے۔“ کوئی حیرت نہیں اس لیے کہ اس کا فرزند یہ فرما رہا تھا جس کا قل تھا کہ: ”مجھے میدان جنگ میں مارا جانا فراش پر مرنے سے بدرجہا پسند ہے۔“ یا ”جنت تلواروں کے سایہ میں ہے۔“ موت سے اس درجہ لاروانی ظاہر ہونا کچھ بھاتا ہے۔ اور وہ اصول کی وقعت ہے۔ طبیعت کا ایک درجہ ہے۔ درجہ جس میں حیات اپنے کو بے سود سمجھنے لگتی ہے اور موت ہی کو اپنی حیات کی غرض سمجھتی ہے۔ خیالات کی ایسی قوت اور عمل کی آدگی طبعی نشوونما کوئی فوری اتفاق نہیں ہے۔ بلکہ ایک زمانہ کی مختلف حیثیتوں کے عمل کا نتیجہ ہے۔

راستہ میں شہادتِ مسلم کے ایسے اندوہناک حادثہ کی خبر ملتی ہے اور فوراً زبان پر جاری ہوتا ہے کہ جو کچھ (ان پر) جانے والا تھا ہوا۔ اور جو کچھ (ہم پر) جانے والا ہے ہو گا۔ ساتھ ہی مسلم کے متعلق فرماتے ہیں کہ مسلم نے اپنا فرض پورا کیا اور پھر مسلم کے بچوں پر نوازش فرماتے ہیں اور مسلم کے پس ماندوں سے صلاح لیتے ہیں۔ یہ کوئی اتفاق نہ تھا بلکہ یہ تمام باتیں ایک دوسرے کے حقوق و فرائض میں داخل تھیں جن میں ہر ایک کے لیے جداگانہ ارادہ کی ضرورت تھی۔

دوران سفر کے لقب خیز واقعات میں زمیں پر قین اور عر کا پنا کر لینا بڑے واقعات تھے۔ ظاہر ظاہر یہ دونوں آدمی دو طرح کے اثر میں تھے۔ دونوں جانتے تھے کہ حسین کس حالت میں ہیں۔ دونوں جانتے تھے کہ ہم ان کے شریک نہ ہو کر مصائب سے دور اور دنیاوی راحت میں ہیں۔ اور اس لیے حسین کے پاس جانا غلطی امید خیز نہیں ہے بلکہ مصائب سامنے دکھائی دے رہے ہیں۔ پھر کیا تھا کہ یہ اپنی مطمئن حالت کو چھوڑ کر ایک نہ صرف تھی بلکہ غیر مطمئن حالت کی طرف آئے۔ اور جس طرح، جس وقت اور جس صورت سے آئے وہ معلوم ہے۔ ایک کارنگ برافروختہ ہے، چہرہ پر شہادت کارنگ چڑھ گیا ہے۔ دوسرا پائے مبارک چوم رہا ہے۔ اس قلب مہینت کے پہلے حسین ہیں۔ جن کا شخص آدمی کو بدل دیتا ہے۔ مس اور دوسرا جو گید و من تھا و قادر غلام بن گید یقیناً دونوں کی یہ حالت نہ ہوتی اگر ان کے ذاتی احساسات اور حواس سرد ہوتے۔ اور یا اس حالت میں حسین کی فویں کے بچنے کے قابل نہ ہوتے۔ اب تم گھوگے کہ کیوں یہ متاثر ہوئے اور کیوں عبد اللہ بن حرا بھی متاثر نہ ہوا۔ اگرچہ وہ ابتداء سے دشمن نہ تھا اور نہ آخر میں اس لیے کہ اس کی دماغی حرکت ابتداء ہی سے یہ رنگ اختیار کئی تھی جو بے دلی، بلکہ حالت خوف اور موت سے حائلہ کی عدم جہت کی جانب سے وہ اپنی اس حالت کے اندازہ ہی سے نکلا تھا کہ دور رہے۔ اور یہ حالت اس قدر اس کا جزو شخص ہو گئی تھی کہ کوئی فوری اثر اسے اس حالت سے نکال نہ سکتا تھا۔ اس لیے کہ طبیعت اثر کے قبول کرنے سے انکار کر رہی تھی۔ اور کیسا ہی عمدہ کام ہو لیکن اس کے کرنے کے قابل ارادہ پیدا نہ ہو رہا تھا۔ مختصر قتلوں میں خیال کے قابل الزام ہونے سے بحث نہ تھی ارادہ کا ضعف قابل نظر تھا۔

ایک موقع ہے کہ دفعہ حر کے ایک ہزار سوار دکھائی دیے ہیں۔ ریگستان ہے۔ کوئی جاننے پہنچنے نہیں ہے۔ لیکن ناپائیدار کیا بیانی شے کامریشہ ہمیشہ مفید نہیں ہوا کرتا۔ اور نہ بے سود موشگافی ہر وقت مفید ہے۔ بلکہ حالتوں کے موافق تجویز اکثر بہترین حل ہوا کرتا ہے۔ خطرہ کے احساس کے ساتھ ہی حضرت کی نظریاتی انتظام پر پڑتی ہے۔ خصوصاً ایسی حالت میں جب کہ اپنے رہائش کی تہا و متعلقہ بہت کم ہے۔ ایسے موقع پر ہر ذی ہوش سپہ سالار چاہے گا کہ وہ ہر طرف سے گھرنے جانے۔ اگر نکل نہ جانا چاہتا ہو یا نکل نہ سکتا ہو۔ حضرت کچھ بچے تھے کہ اس وقت نکل جانا ممکن نہیں ہے۔ ضرورت اس کی تھی کہ کوئی محافظ پشت جبکہ ہو۔ معلوم ہوا کہ ایسی جگہ دو ختم ہے۔ سرعت تفتیش اس لحاظ سے کوشش کی گئی کہ دشمن کے پہنچنے کے قبل اس پر قبضہ کیا جائے۔ قبضہ کیا اور دشمن نے دیکھا کہ چند آدمی حملے اور قبائلی پہنچنے لگے ہیں۔ مطمئن ہوا اس، متظر جن کے ہاتھوں کا سیان قبضہ شمشیر کی طرف ہے۔

حضرت سے گفتگو ہوتی ہے۔ اس وقت اس کے پہلے یا اس کے بعد جب ہوئی ہو تو یہ کہنا چاہوں کہ ہر موقع پر کوئی شخص نظر نہیں کر سکتا مگر یہ کہ تفتیش کرے گا کہ اس میں سلیم الطبع، خشک دماغی، اتفاق کی قوت و دلیل کی غریب اور لہجہ کی راستی نمایاں ہے۔ حسین کی باتوں کا انکار معقول جواب سے نہیں کیا گیا بلکہ اس لیے کہ زبید اور یروان زبید کی مصلحت یہ تھی کہ وہ ہمیشہ ان کی مخالفت کریں۔ اور یہ تو حسین تھے جن کے قدم میں رسول کی زبان تھی اور تھیں امیر المومنین یا غلیب لائمی نے تقرر کرنا سکھایا تھا۔ بیسیں تھیں جنہوں نے درباروں میں ابن زیاد اور زبید کو اس طرح خاموش کیا کہ اس کی ساری حکومت جواب نہ لاسکی۔

عرسے گفتگو میں ایک موقع آتا ہے جس میں عرض کرتا ہے کہ میں ابن زیاد کا حکم ہے کہ آپ کو اس کے پاس لے جائیں۔ حضرت ”مسکرا کر فرماتے ہیں کہ: تم یہ کام نہیں کر سکتے۔“ مسکراتا ایک اپنے سے دس گنا لنگر کے مقابلہ میں سب سے پہلے سالار کے اظہار شدت پر ہے۔ کس درجہ حسینؑ کو اپنے اوپر اختیار تھا کہ کسی قوت خدی کیا اور وہ تھا۔ اور کس قدر مطمئن تھے کہ انداز کی غلطی میں کوئی فرق نہیں آتا۔ عرہ پر روکتا ہے۔ اور حسینؑ کے متبعم چہرہ پر ذرا سی گری کی چمک آ جاتی ہے اس لیے کہ ہاتھ قبضہ شمشیر پر جا رہا تھا سکون میں فرق نہیں ہے۔ فرما رہے ہیں کہ: ”آج جنگ کریں۔ تصفیہ ہو جائے۔ قطعی تصفیہ۔ عرہ کی شدت تمام ہو گئی۔ وہ اس موقع کے لیے تیار نہ تھا۔ نرمی اور صلاح۔ اور اب حضرت اسی حرارت اللہ سکون میں اشعار فرماتے ہیں کہ: ”تو مجھے موت سے ڈراتا ہے! جو فرود کو مرنے سے حار نہیں ہے۔ خصوصاً جب کہ اس نے نیکی کی نصیحت کی۔ اور مطمئن کی طرح مہلکہ کیلچہ لوگوں سے محبت کی اور باغیوں کا ساتھ چھوڑا۔ پس اگر میں اس کے بعد زندہ رہا تو مجھے کچھ ندامت نہ ہوگی۔ (میں نے تو اپنی خوشی اور ارادہ سے اسے گوارا کیا تھا) تجھے اتنا کافی ہے کہ ذلیل و دروہا ہو کر عمر بسر کرے گا۔“

ان لاثانی اشعار میں حسینؑ نے عزت کی موت اور حیات اور ذلت کی موت اور حیات کی جیسی مصوری کی ہے۔ اس کی ان سے امید کی جاتی تھی۔ اور یاد رہے کہ یہ اشعار اس وقت کے تھے جس وقت طبیعت اس موقع پر ہے کہ ہاتھ قبضہ شمشیر پر ہاسکے۔

اس وقت بھی یہ قابل ملاحظہ ہے کہ حضرت زبیر بن عین کو ابتدائے جنگ کی اجازت نہیں دیتے۔ جنگ شروع نہ کرنے کی ایک غرض یہ تھی کہ حضرت خود سے ابتدا نہیں کرنا چاہتے تھے۔ بس ۹۔ اس سے دو اور مفید نتیجہ پیدا ہو سکتا تھا۔ ایک یہ کہ ممکن تھا کہ اس وقت جنگ نہ کرنا آگے چل کر کوئی ایسی صورت پیدا کرنا جو مفید نہ ہو جاتی۔ اور وہ مسلح یا لہو تھی، جس کا امکان اس وقت کی جنگ سے سوخت ہو جاتا۔ اسے حضرت نے قائم رکھا۔ قائم رکھا عرہ کو قطعی تصفیہ کے بلانے کے بعد۔ یعنی اس طرح نہیں کہ اپنے کو مغلوب کر کے۔ اس کے بعد بھی طریقہ وغیرہ کی آمد اور عرہ کے ٹوکنے پر دوبارہ اسے اس سختی سے رد کیا اس لیے کہ اصول کا مسئلہ پیش ہو جاتا تھا۔

غریب میں پناہ کر طراح کی صلاح پر کہ آپ کوہ آجا میں چلیے میں فاصلہ کی فاطمی کی وجہ سے کوئی قابل تسکین فیصلہ نہیں کر سکتا ظہر معلوم ہوتا ہے آجا اور کوفہ میں امید مشترک ہو گئی تھی۔ آجا دور اور کوفہ نزدیک تھا۔ اہل کوفہ کے قلوب کی تیاری کا ایک گونہ سلمان ہو چکا تھا۔ آجا کے متعلق شخصی وعدہ کی ابتدا تھی۔ دوسرے یہ کہ عرہ کوفہ کی طرف جانے میں روک نہ رہا تھا۔ آجا کی طرف جانے میں مل ہو تا اور چونکہ اس سے ایک حیثیت کا تصفیہ ہو چکا تھا اس وقت آجا کی طرف کوئی پیش قدمی ایک نیا اقام ہوتا۔ جو ممکن نہ تھا۔

اس حین میں حسینؑ کو بچنے اور حضرتؑ اپنے پدر بزرگوار کا غلبہ اور اپنے ہمد علی مقدار کا قول نقل فرمایا۔ یہ بھی کہا کہ اس جگہ ہمارے خون بہانے جائیں گے۔ اور اسی جگہ ہمارے عرم قید کیے جائیں گے۔ ہر سنگ غلی عرہ کا ظہر سلمان تھے جو حضرتؑ سے یہ کہلا رہے تھے۔ کون جانتا ہے کہ جس وقت یہ اسباب حضرتؑ کو اپنا قتل دکھا رہے تھے اسی وقت سلسلہ خیال نے یہ فوٹو گوار یاد تازی کر دی تھی کہ ایک دن میں اپنے پدر بزرگوار کے سایہ میں کھڑے تھے۔ اور

اس نفس عظیم کی قربت محسوس کر رہے تھے اور وہ نفس مذکی آنے والے واقعات کے متعلق صبر کی ہدایت فرما رہا تھا۔ کربلا میں نیچے کھڑے جانے لگے تھکے ہوئے اپنے اپنے غیوموں میں گئے حسینؑ کو آرام کہاں۔ خیمہ کے سامنے نکوار صاف کر رہے ہیں۔ خیالات میں ڈوبے ہوئے۔ سرخ اور بے شمار خیال۔ چند اشعار درد زبان ہیں۔ ان سے اور ہستیا تکلیف دہ خیالات دور رکھے جاتے ہیں کہ دفعۃً بہن سامنے آئی ہے۔ اس کی محبت لذت درد پیدا کر دیتی ہے۔

کربلا میں قیام ہوا تھا کہ ابن زیاد کا بیعت یا قتل والا خط آیا اور آپؑ نے اسے زمین پر ڈال دیا اور فرمایا کہ ایسے لوگوں کے لیے عذاب ہی ہے۔ عمر سعد آیا۔ اس نے دریافت حال کیا اور حضرتؑ نے صاف فرمایا کہ اگر تم لوگ بلانے سے پھر گئے ہو تو میں واپس چلا جاؤں۔ اولاً اس لیے کہ اہل کوفہ نے اپنے ہم سنگی کو جھٹلایا۔ دوم اس لیے کہ یہ ابن سعد ہی ابن زیاد اور زید کے سپہ سالار سے عہد ہوا تھا۔ لیکن ابن سعد کے خط پر ابن زیاد نے اس کا جواب دیا اس سے ظاہر ہے کہ دشمنان اکابر رسالت محض بیعت پر اکتفا نہیں کرنا چاہتے تھے۔ بلکہ ان کی خواہش تھی کہ پہلے بیعت لوگوں کو دکھائے اور پھر اس کے بعد گزشتہ مردم بیعت کی باز پرس کر کے تمام کردوجس سے غفلت کو ہاتھ میں لائیں اور اہل بیتؑ رسالت کے اثر سے بے خوف اور مطمئن ہو جائیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ اموی اپنی اس مصلحت پر اسی لیے تھے کہ ان سے کسی درمیانی راہ کا طے کرنا ممکن نہ تھا اور وہ حکومت پر بھی اپنی مصلحت کا ساتھ دینے کے لیے یہ جبر کر رہے تھے کہ حسینؑ سے جنگ نہ کرنے والوں کو دھمکاتے۔ مثال کے لیے مذر ڈھونڈتے اور چند کو قتل کر کے خوف پیدا کر دیتے کہ آئندہ کوئی تمہاری یا انکار نہ کرے۔ اسی طرح فرات سے منع کرنے کی کوشش اور اہم کہتا ہے کہ انھوں نے انسانیت کے ادنیٰ ترین احساسات کو دور کر دیا تھا۔ اسی طرح بچوں کا قتل اور عورتوں کے ساتھ بے رحمانہ برتاؤ کہتا ہے کہ یہ خوفناک درد سے محض انسانی جیس میں تھے اور انھوں نے ہر خوبی کو جو انھیں بتائی گئی تھی دنیا سے محاور برتاؤ سے خارج کر ڈالنا چاہا تھا۔ ایسے درد سے وحشی اور خبیثوں کے لیے اس کی ضرورت تھی کہ وہ دنیا سے نیست و نابود کر دیے جاتے۔ اس لیے کہ ان کی یہ خصلتیں آنے والی قوموں اور انسانوں میں اثر نہ کرتیں۔ شیعوں کا مزہ کہ اسے حسینؑ کے ظلم، جلی جاتی، صبر اور بلندی اعمال نے فنا کر دیا۔ اور بنی امیہ کے خلاف ان کی بے رمیوں نے ایک حام بھیان پیدا کر دیا۔ ان کی خوش کر لے والی چیز یہ ان کی موت کا ذریعہ بن گئیں۔

اس کے بعد بھی باوجود اس کے کہ حضرتؑ سے بنی امیہ مٹتی نہ تھے لیکن آپؑ نے کئی مرتبہ اپنے کو پہچایا اور کیا کہنا چاہیے تھا جو نہ کہا۔ بنی امیہ اور ان کے رشتہ درندوں سے بدتر ہوا کرتے لیکن یہ کوئی وجہ نہ تھی کہ قتیب الہی کا فرزند انھیں وہ باتیں یاد نہ دلا دیتا جس پر توجہ انھیں بہت سے فحشک شائع سے دور رکھتی۔ حسینؑ مخلوقات کے لیے اپنا فرض ادا کر رہے تھے۔ اور جس طرح حسینؑ کج رہے تھے کہ کوئی حالت ہمارے پیش نظر ہے۔ اسی طرح وہ صاف ملاحظہ فرما رہے تھے کہ بنی امیہ کے لیے بھی کیا ہونے والا ہے۔ اور فرمادیتے ہیں کہ تم آپس کے اختلاف سے ہلاک ہو گے اور ایک قوم تمہیں ہلاک کرے گی۔ اس پیشین گوئی میں حسینؑ کی روشن ضمیری، قوم کے عروج و زوال کے سمجھنے کا ملکہ، خصال سمجھنے اور پختہ تصنیف کرنے کی استعداد تھی۔ بلکہ قوم گری کی بنیاد بھی تھی۔ وہ آج ہی سے اس کا بیج بڑھ رہے تھے کہ بنی امیہ کے تباہ کرنے والی زبردست قوم قوی اعتبار سے نوعیت پذیر ہو۔ بنی امیہ اس وقت اس کا احساس نہیں کر رہے تھے۔

کیونکہ حسینؑ تھا اور زنجی کڑے تھے۔ چدر تھا۔ اپنے خون میں نہانے پڑے تھے۔ اور یزید کے ریزہ خوار تک قرنی سے یہ بھر رہے تھے کہ ہم نے حسینؑ کو تمام کیا اور ہم کامیاب ہوئے۔ انھیں قتل حسینؑ کے شایع ہو میں نہ آرہے تھے۔ کیونکہ اس وقت تک انھیں شایع کھنے کے سلمان دکھائی نہ دے رہے تھے یہاں تک کہ وقت آیا جس کا پہلا دور یہ تھا کہ فاطمہؑ حسینؑ سوراخوں میں چھپتے اور نکالے جاتے۔ اپنی جان کے لیے نامردوں کی طرح گڑگڑاتے اور موت ہلکتی کہ تم ہی تھے جس نے رحم کو اپنی لغت سے خارج کر دیا تھا۔ جس کا دوسرا دور بنی امیہ کی آپس کی تباہ کن لڑائیاں تھیں اور جس کا تیسرا دور یہ تھا کہ کتوں کو بے گوشت ہڈیاں چھانی پڑتیں۔

ان وقتوں میں جس کا ہر وقت اپنی حیثیت سے نیا تھا حضرتؑ کو حضرت عباسؑ کی کارگزاری سے جیسے تسکین ہوتی، اس کی مقدار کا کھانا انسان کی تاریخ میں ممکن نہیں ہے۔ کبھی کسی تھا یا چند نے اس طرح دشمن کے انہو کثیر سے کوئی چیز لو کر چھین لی تھی۔ کب کوئی لشکر فوجی ضرورت سے بڑھ کر ذاتی عداوت اور انتقام کے جھوٹے الزام کو درمیان میں لا کر ہائی ہو کتا تھا۔ اور کب کسی لشکر کے ساتھ اس قدر پیسے تھے جنہیں ہائی پلا کر کوئی خوش ہوتا۔ اور دیکھتا کہ مرجھانے ہوئے پھول تازے ہو رہے ہیں اور کب کسی نے یہ دردناک منظر دیکھا تھا کہ پیسے بچے بنوڑ خمیر حاصل کیا ہوا ہائی ڈکڑا کارہی رہے ہیں۔ عباسؑ کے بیور اور جنگ نے حسینؑ کو کیا کچھ یاد نہ دلا دیا ہو گا۔ اور پھر حسینؑ کی آنکھ بھی اشک کو آلود ہو گئی ہو گی۔ مصالحت کے متعلق جو کچھ شرائط پیش ہوئے وہ وہی تھی جو عقبہ بن سحان کہتا ہے کہ مجھے مکہ یا مدینہ جانے دیا اگر یہ منظور نہ ہو تو نہیں جانے دو۔ اور جب اسے بھی دشمنوں نے منظور نہ کیا تو فرمایا کہ تم فجر سے وہ بات کیوں نہیں منظور کرتے جو رسولؐ مشرکوں سے منظور کر لیتے تھے وہ بات صلح تھی۔ مجھے اس میں کوئی اعتراض نہیں ہے۔ اگر حضرتؑ نے اسے دشمن کی منظوری یا عدم منظوری کے پہلے پیش کیا۔ لیکن یہ باتیں بھی دشمن کے نزدیک قبول کرنے کے قابل نہ تھیں اس لیے کہ وہ یہ بکھڑا تھا کہ حسینؑ اب ”ہمارے جنگل میں ہیں“۔

کوئی شخص اس پر حیرت کر سکتا ہے کہ حضرتؑ جن اسباب میں محیط تھے ان کے لحاظ سے یہ ممکن نہ تھا کہ کوئی شخص محفوظ رہ سکتا۔ پھر حضرتؑ نے دسویں تاریخ سے کچھ پہلے اس کا اہتمام کیوں کیا کہ خندق کھدواتے اور اس میں لکڑیاں بھر داتے۔ امکاناً آخری وقت تک ناامیدی نہ دکھانے کے لیے یہ بڑا سبق دینے کے لیے کہ ہم قبل از مرگ داویلا سے اس مفید وقت میں اپنے فرائض مطلق نہ کر دیں جس میں ہم ایسی مصیبت میں مبتلا ہوئے ہوں جس کا نتیجہ موت ہو۔ اور جس وقت تک جیسے وہ کل کام جنہیں عقل اور تجربہ ممکن سمجھتا ہو کرتے جائیں۔ عام اس سے کہ کچھ ہی نتیجہ کیوں نہ ہو۔ کیونکہ کسی نتیجہ کا قبل وقوع یقین محال ہے۔ اس لیے ایسے قبل وقوع یقین سے پاس کیوں پیدا کی جائے اور یہ بھی یگانہ کہ کسی چیز کے قوی قرائن ہوں لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ کمزور سمت کے لیے احتیاط نہ کی جائے۔ یا غفلت کی جائے۔ دوسرے لفظوں میں یہ ایک کوشش تھی جس سے حسینؑ اپنی حیات، اپنے خیال اور اپنی روش میں آخر وقت تک غنڈا رہنا چاہتے تھے۔ نہ چاہتے تھے کہ ہم دشمن کے ہاتھ میں گرفتار اور بیور ہو کر کوئی عمل کریں۔ اور اس وقت تک تو خیر جنگ شروع نہ ہوتی تھی۔ وہ وقت بھی آیا کہ اب ان بندگان خدا کی حیات چند ساعت سے زیادہ دنیا میں باقی نہیں ہے اور دشمن آگ لگانے کا ارادہ کرتا ہے۔ ہوش و حاضر دماغی دیکھو حسینؑ کی کہ اصحابؑ دشمن کو روکنے کا ارادہ کرتے ہیں لیکن حسینؑ روکتے ہیں کہ

بے سود کوشش نہ کرو۔ تم جس نتیجہ کے لیے کوشش کرنا چاہتے ہو وہ اسی سے حاصل ہو جائے گا کہ دشمن اپنا ارادہ پورا کر لے۔ یعنی اس صلب چاہتے تھے کہ دشمن کو روکیں اور دشمن آگ لگاتا چاہتا تھا۔ دشمن نے پشت کے خیوں میں اگر آگ لگائی تو وہ خود آگے نہ بڑھ سکتا تھا اور اس طرح پشت حملہ سے محفوظ ہو جاتی تھی۔ بغیر اس کے کہ اس صلب روکتے۔

میں خیال کرتا ہوں کہ جس وقت نوی تاریخ دشمن نے حملہ کا ارادہ کیا وہ دنیا میں حضرتؑ کے حیات کی آخری فینہ تھی۔ بہن یا بھائی نے اگرچہ نرمی سے جگایا۔ لیکن جگنا خوف سے متاثر ہو کر تھا۔ حسینؑ اور انکار یہ دو متضاد چیزیں تھیں۔ حسینؑ یا تو بھائی کو بھیجتے ہیں اور کہتے ہیں کہ چلو ہم بھی آئے۔ اور یا عہدوں کی سفارت کے نتیجہ کا اظہار کرتے ہیں۔ لیکن معنوں سفارت بھائی نے خود ایک غور کی چیز ہے۔ اور وہ یہ کہ جاگنے کے بعد ہی جو کچھ سنتے ہیں اس کے بعد یہ فرماتا کہ ایک شب کی شہادت طلب کرو۔ کھاتا ہے کہ حضرت خواب میں ہوا جاگئے میں اس خبر کے قطرے اور پانی کہنے والے تھے۔ اور اگر یہ منظور نہ بھی کیا جاتا تو غالباً حضرتؑ وقتی حیات کو ابد الابد کی حیات سے بدلنے کے لیے اسی اطمینان سے مستعد ہو جاتے۔ جیسے کل مستعد ہوتے۔ یہ سب جانتے ہیں کہ حضرتؑ نے یہ شہادت کیوں طلب کی تھی۔ اس لیے کہ حضرتؑ کو شب بیداری اور عہدات الہی بہت محبوب تھی۔ ایسی محبوب کہ لیم دشمنوں سے ایک رات کی شہادت اس لیے طلب کرتے کہ اس رات کو عہدات کے ارادہ سے طلب اور مخصوص کی ہوئی عہدات کی رات قرار دے دیں۔ یہاں نہایت عظیم وجہ کے لیے۔ جس کی عظمت کا چارے گناہگار دلوں میں سمجھا جا رہا ہے۔ اس لیے کہ وہ اس طرح جانے الہی کے احساس سے اور قریب ہو جائیں اور اس طرح قرب ازدی کے خیال کو اپنے میں برہیں کہ طاق دنیوی کی گرفت سے اس پر غالب نہ ہو۔ یہ نور قہاجس کو اوڑھے ہوئے شہدائے کربلاؑ کو دشمن کے مقابلہ میں کھڑے تھے۔ اس طرح کہ حسینؑ ان کے سپہ سالار ہوں۔ اور یہ نور قہاجس کی موجودگی میں کسی خم، ٹکڑ اور انکار کی تحریر چہرے پر ظاہر نہ ہو سکتی تھی۔

حضرتؑ نے اس کا بھی اہتمام فرمایا کہ جب یہ دیکھ لیتے کہ دشمن کسی سٹو اپتی پر راضی نہیں ہے۔ اور اس کی کئی غرضیں اس کے نہیں ہے کہ ہمیں قتل کرے تو اپنے رہنے والی نفس سے فرمایا کہ تم لوگ بڑے جلدیوں کو صرف جو سے غرض ہے۔ یہ تعفیہ تھا حضرتؑ کا جس کی مثالیں بھی ہیں کہ دشمن اکثر کے لیے پروانہ مٹانے لگے تھے اور اس سے پتہ چلنے کے لیے کیا ہوتا کہ جب مدافعت کرنے والے کم رہ جاتے تو انھیں اپنے نئونانہ ارادہ کے فائدہ میں اور آسانی ہوتی۔ بھے یہ کہنا نہیں ہے کہ اگر کوئی دوسرا انسان حسینؑ کی جگہ ہوتا تو وہ کیا کرتا۔ لیکن یہ کہنا ہے کہ حسینؑ ہی کے نفس میں یہ قوت تھی کہ وہ اس موقع پر بھی اپنے نقطہ لحاظ سے نہیں بلکہ دوسروں کے نقطہ لحاظ سے ان کی حالت پر غور کرتا اور اپنے مصائب میں ان کی کئی مصائب کی سبیل نکالتا۔ اگرچہ تنہائی اپنے لیے کسی ہی حدود کیوں نہ ہوئی۔ لیکن کیسے ممکن تھا کہ وہ صلب جنھیں حضرتؑ باوجود فدا کیے تھے۔ وہ اعتبار کے ساتھ ہی کرتے۔ یہ بھی ایک ذریعہ تھا جو اس وقت حضرتؑ کو خوش کرتا اور حضرتؑ تصفیہ فرماتے کہ دشمنوں کو آسانی سے اپنے اوپر قابض نہ ہونے دیں۔

راج ہو گئی۔ آج وہ وقت آگیا ہے کہ حسینؑ کے رہائے کے ساتھ ہونے تھے۔ وہ وقت آگیا جس کے لیے حسینؑ نے انکار بیعت فرمایا تھا اور ایک زمانہ سے جس کے لیے تیار ہونے تھے۔ وہ وقت آگیا جس کے لیے نور اور الہام سے دھونے ہوئے دلوں نے خبر دی تھی۔ ابتدائے مراحل طے ہو چکے تھے اب صرف بشارت شہادت کا

پورا کر دیتا تھا۔ دھڑکھڑکھٹے تھے۔ اچانک دھڑکھڑکھٹے دیکھنے والے کے لیے یہ منظر کیسا ہی منظر انداز دکھائی دے گا۔
 ہوتا جس میں چند بھوکے پیاسے، وطن آوارہ، بچے، جوان، اور بوڑھے اس طرح غیبتا نے قہا ہوتے لیکن کونسا بے حس انسان
 ہے جو ایک آنکھ سے شام کی تاریک گھٹی اور لمبی منوں کو دیکھتا اور پھر ان چند بوڑھے، جوان، اور بچوں کو دیکھتا کہ وہ کسی
 اطمینان سے مرنے کے لیے کھڑے ہیں اور وہ حیرت منقلب نہ ہو جاتا۔ یہ چھوٹی سی صفت اس لیے نہیں کھڑی ہے کہ وہ نیک
 سے اس کا ملک چھین لینا چاہتی ہے۔ نہ اس لیے کھڑی ہے کہ اس نے ملک اور قوم کے مسلمہ اصول کے خلاف کچھ کیا
 ہے۔ نہ اس لیے کہ اس نے انسانیت پر ظلم کیا ہے۔ یادین کے ساتھ کوئی خیانت کی ہے۔ یہ سب تو انہوں نے کیا ہے جو
 فرات کے قریب کی لمبی منوں میں ہیں۔ یہ چند اس لیے کھڑے ہیں کہ حسین کو بچائیں۔ حسین یعنی اصول خیر کی جان۔ بولتی ہوئی
 تصویر، عملی شکل، انسانیت اور اس کی فوہوں کا بہترین نمونہ۔ دین اور اس کے فلسفہ کی روح اور اس سب کی تاریخ جو کبھی
 ابھی محمد قوی یلادداشت کا دفتر اور عرب کی شرافت کا مرکز اور حسین اس لیے کھڑے تھے کہ اصول خیر آج ہماری قربانی
 چاہتا ہے۔ تسلیم۔ یہ دکھانے کے لیے کہ ہم کیونکر جیتے ہیں۔ اب دکھا رہے ہیں کہ ہم کیونکر مارتے ہیں۔ دیر تک معرکہ کارزار
 گرم رہا۔ چند آدمیوں نے ظہر تک ہزاروں کے ریلوں کو روکا۔ دھن ہلا جو اپنی کٹھنک دھڑوں سے ہٹ گیا۔ یہ اپنے
 فرائض سے نہ ہٹے۔ ہر بات کو وقت سے کید کون مرنے گیا جسے حسین نے مہنتے ہوئے چہرہ سے رخصت نہ کیا اور کون مرا
 جس کے احتیاط کو حسین نے بشارت کو غلوار نہ کیا اور پسندیدہ الفاظ سے اس کی کار گزراری کا احترام نہ فرمایا۔ غزاں کہہ
 رہی تھی کہ ہم چھوٹوں کا ایک ایک ورق خشک کر دیں گے۔ حسین فرما رہے تھے کہ ہماری بہار بھی ہے کہ تمام ورق خشک
 ہو جائیں۔ موت کہہ رہی تھی کہ ہم ایک ایک لونہال کو چن لیں گے اور حسین فرما رہے تھے کہ تو ہی ان کی حیات ہے۔
 اولاد مسلمہ حقیقہ، حضرت نکواردوں سے کھڑے کھڑے ہوئی دیکھ حسین کے ہارہ بھر زمین پر لوٹے۔ دیکھ علی اکبر کا ایسا چلند
 افق خون میں چمپ گیا۔ لیکن یہ حسین ہی تو تھے جنہوں نے فرمایا تھا کہ تھوڑی دیر میں تم حوض کوثر سے اس طرح سیلاب
 ہو گے کہ پھر پیاس نہ لگے گی۔ علی اکبر کی جنگ کے وقت یقیناً حسین کی ایک نظر علی اکبر پر پڑی تھی اور دوسری مرتبہ، سستی ہوئی
 آسمان کی طرف اٹھتی تھی۔ آج حسین اپنے بھر کا کھڑا اپنے مرکز محبت کے سامنے تھمے لانے تھے اور یہ عزیز پیش کش قبول
 ہوا تھا۔ علی اکبر کے سینہ کی لوک سنان سے حسین نے اُت نہیں کیا۔ دل خوشی سے چیخ اٹھا کہ ہم بڑا امتحان دے چکے۔ عالم
 اس سے کہ صدا بلند ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو۔ کیونکہ حسین چہرہ پر سرخی دوزخ تھی۔ سناں دریا پر ایک ہلکی موج دکھائی دی۔ مہا کی
 نرم حرکت سے تلاطم نہیں، سستی ہوئی لہر جواشی اور پھر ڈوب گئی۔ دریا پھر ویسا ہی ساکن تھا۔ لاش لائے۔ دیکھ کچھ دیر دیکھ
 اس نگاہ کی حال شرح نہ کر دو کہ لو کہ حسین بیٹے کو آخری مرتبہ دیکھ رہے ہیں۔

حسین عہد کی جنگ بھی دیکھ چکے۔ یہ دیکھا کہ کربلا کے موجود بھائیوں میں آخری بھائی بھی نگاہ سے اوجھل ہو گیا۔
 عہد کی شہادت حسین کے لشکر کی فوجی حیات کا خاتمہ تھا۔ یہی معنی تھے اس کے کہ اب میری کڑوٹ گئی۔ اب حسین
 نے ارادہ کیا کہ اہل حرم کو آخری مرتبہ دیکھ اور سلام کر لیں۔ اور اس کے بعد شہادت کے لیے آگاہ ہوں۔

ذرا سوچو رشی گوتم سنیاں کا ارادہ کرنے کے بعد بی بی اور بچے کو آخری مرتبہ چپکے سے سوتے ہوئے دیکھتا ہے اور
 جگانے کی ہمت نہیں کرتا۔ غالباً اس لیے کہ ان کی باتیں اور عالم ہوش میرا ارادہ خن نہ کر دے۔ لیکن حسین مرنے کا

ارادہ کر کے اہل بیت کی شکستہ صورت دیکھتے جاتے ہیں اور نہ صرف اپنا ارادہ شکستہ نہیں جھلنے دیتے بلکہ اہل بیت کو بھی آئینہ کی تسلیم و رضا کا سبق دیتے ہیں۔ میں اس سے بہتر کوئی مثال اس کی نہیں دے سکتا کہ دوسرے مذاہب کے ترک دنیا اور اسلام کی باوجود معاشرت ترک دنیا بھی تھی۔ یقیناً اسلام کا مل فطری اور زیادہ شجاع اور صابرانہ ہے۔ بیسیاں ہیں۔ بچے ہیں جن کے خشک لب کچھ کہیں یا نہ کہیں اس کے معنی ہی یہ تھے کہ ہمیں کس پر چھوٹے جاتے ہو اور حسین فرماتے ہیں کہ میں تمہیں خدا کے سپرد کرتا ہوں جو سب سے اچھا وکیل ہے۔ اس کے معنی یہ تھے کہ میں جانتا ہوں کہ تم کس حالت میں ہو۔ آئینہ کیا حالت ہوگی۔ تم میرے آخری وقت کی تسکین ہو۔ لیکن تمہیں ہمارے اس ارادہ پر راضی ہونا ہو گا کہ ہم سرکٹا نہیں اور تم دیکھو اور آئینہ کے مصائب برداشت کرو۔

اور اسی وقت حسین کا سب سے بڑا امتحان لیا گیا۔ اور وہ یہ تھا کہ ایک پیاس سے ٹڑپتے ہوئے بچے کو گود میں لیا جس نے صدام کو اپنے بچنے سے ظہر کیا تھا کہ ہم ہوش میں آگئے ہیں۔ ہمیں پیار کر لو۔ سوکھے ہوشوں نے سوکھے ہوئے ہوشوں کو پیار کیا۔ یہ حسین کی آخری راحت تھی۔ یہ اور ظالم انسانیت کے لیے انسان سے آخری استفادہ بھی تھا کہ اس بچے کو دشمنوں کی طرف لے جاتے اور دکھاتے کہ آخر یہ بے گناہ شیر خوار کیوں تمہارا مورد انتقام ہو رہا ہے۔ تیرا اور لاش حسین کے ہاتھ پر منتقل تھی۔ خون اڑا تھا اور چہرہ اور ہونٹ خون سے غم ہو گیا تھا۔ سیراب ہو گئے تھے لیکن لاش اسی طرح حسین کے ہاتھ پر تھی۔ ہاں قوی انسان بڑے بڑے بوجھ اٹھا سکتا ہے لیکن اس چھوٹی سی لاش کا بوجھ اٹھانے رہنا سخت مشکل تھا۔ اور دیکھو حسین اس خوبصورت لاش کو اور بلند کرتے ہیں۔ آسمان کی طرف اٹھتی ہیں اور فرماتے ہیں کہ خداوند! تیرا حسین اب بھی صابر ہے یا خداوند! اس مصیبت پر اپنے حسین کو صبر عطا فرما۔ اور پھر حسین اس خون افشان گلے کے نیچے چلو لگا دیتے ہیں اور چلتے ہوئے خون کو اتنی دیر تک دیکھتے ہیں جتنی دیر تک چلو مبرے چلو میں کافی مقدار خون آنے آسمان کی طرف اچھال دیا۔ کیوں؟ کس لیے یہ اہتمام تھا کہ یہ پروردگار دیکھتے چلنے ہی کیوں نہ دیا۔ آسمان پر اسے اچھالنے کی کیا ضرورت تھی۔ یہی حسین تھے جو ایک معصوم کے خون کو اصول خیر پر چڑھا رہے تھے۔ کبھی انسان نے خدا سے ایسا ناز نہیں کیا۔ اور نہ کبھی کسی اصول کے لیے اس سے بڑھ کر قربانی کی تھی۔ اور اس طرح غم سے پوچھو کہ حسین کی سب سے بڑی عکلیت تھی۔ اور میں کہوں گا کہ ان کی سب سے بڑی مصیبت ان کے نا شکستہ ہوش کی وجہ سے تھی۔ جس کی ذکارت آخری سانس تک کم نہیں ہوئی۔ اور اسی طرح حسین کی مصیبت یہ نہ تھی کہ چند رہا اور اعزاء شہید ہوئے۔ نہیں بلکہ ایک سلسلہ تھا جو حسین کی شہادت کے بعد بھی نہ ٹوٹا۔ اس لیے کہ شہید ہوتے وقت یہ یقین تھا کہ اہل بیت اسیر ہوں گے اور باوجود اس کے صبر اور استقلال تھا۔ یہی سب سے بڑی تعریف بھی تھی۔

کیا حضرت سکینہؓ سے حسینؓ کا رخصت ہونا کوئی بڑی چھوٹی سی بات تھی؟ اس لیے نہیں کہ کوئی باپ اپنی چھوٹی اور بھولی بھولی لڑکی سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو رہا ہے۔ نہیں میں اس کے غم کے پہلو کی طرف اشارہ نہیں کرتا ہوں لیکن اگر کوئی چاہے تو کیا اس کے لیے اس سے بڑا مرثیہ چاہیے کہ اگرچہ یہ فرما رہے ہیں کہ سکینہؓ جلدی آ کہ تجھے مرنے والے کی طرح وداع کر لوں۔ اور اس میں سب سے مرثیہ یہ ہے کہ ”دیکھ اے خیر انسان جب تک میرے جسم میں روح ہے اس وقت اپنے آنسو سے میرے قلب کو نہ بلانا۔“ یہ حسینؓ کا اپنی چھوٹی سی لڑکی سے استفادہ تھا۔ اپنے لیے تھا۔

زمانہ نے اس چھوٹی لڑکی کا بھی بڑے صبر سے امتحان لیا کہ ہلپ کو مرتے دیکھے اور نہ روئے بلکہ میں اس لیے اس کا ذکر کر رہا ہوں کہ ہلپ آخری نگاہ سے دیکھ رہا ہے۔ اور سر پر دست شفقت پھیرتا جاتا ہے اور فرماتا ہے کہ: ”میں اک تئیموں، اور پڑوسیوں کے حق میں تجھے و منیت کرتا ہوں۔ اے سکینہؑ خنائے الہی پر مہربانہ یاد رکھو کہ ہم اہل صبر و احسان ہیں اور اپنے ہلپ نانا اور بھائی کے اسوۂ حسنہ پر چلنے والے ہیں۔“

حسینؑ کے اس وقت میدان میں جانے کی آمادگی کے لیے اس سے بہتر کوئی اور داؤنہ تھی کہ علیؑ کی بیٹی رکاب حمام کراخیں سوار کرتی اور میدان میں بھیجتی۔

حضرت ریاض کے لفظوں میں: —

ہجر میں دارغ تھے عباسؑ و اکبرؑ کے مگر پھر بھی تنہم خیز اطمینان سے تیری رجز خوانی اور رجزی کے متعلق مجھے کہنا ہے کہ اس کی مخصوص شان یہ تھی کہ اس کا بڑا حصہ جناب امیرؑ کی مدح میں تھا۔ کیا یہ اس لیے تھا کہ جناب امیرؑ کے پدربزرگوار تھے۔ نہیں اصل غرض اشعار کے مفہوم میں ہے۔ اور اس روش میں ہے جو نبی امیرؑ نے اس ذات اقدس کے متعلق اختیار کی تھی۔ دکھایا ہے کہ انھوں نے بدر حسینؑ میں کیا کید وہ ابن مہم غلط تھے۔ انھوں نے دین اور جناب رسالتؐ کی کیسے کیسے وقتوں میں مدد کی اور وہ کیسے تھے۔ خوبصورتی اور حقیقت دیکھو اس اظہار خیال کی کہ انھوں نے بتوں کی یہ حالت کر دی کہ سب قریش انھیں سجدہ نہیں کرتے یا انھوں نے اسلام کی حمایت کی اگرچہ دشمنوں کو یہ اچھا نہ معلوم ہوتا تھا۔ اور انھوں نے دین کو کس و قمر سے بلند کر دیا۔ میدان کر بلا کے نادر امور اور شاعری کی تاریخ میں حسینؑ کا قصیدہ ایک حیرت خیز چیز ہے۔ کون کہتا مگر وہ جس میں حسن اشعار اور حقیقت شناسی کا حسینؑ کی طرح احساس ہوتا۔ اچھی بات کی ثابت کے لیے حسینؑ کا سا جوش ہوتا۔ حسینؑ کی ایسی حاضر دماغی اور حسن اظہار ہوتا۔ اور کسے حق تھا کہ وہ اس حیرت خیز قدرت الہی کی حسینؑ کے علاوہ مدح کرتا۔ اس قصیدہ کے پہلے حسینؑ کے الفاظ اور ان میں حسینؑ کا شکار لہجہ اور لہجہ کا طوکانہ اور نیاں طرز ادا ہے۔

اس کے بعد مجھے کیا اور کہنا ہے۔ یز اس کے کہ حسینؑ نے جنگ بھی کی۔ جنگ کے معنی یہ ہیں کہ حسینؑ نے یہ ارادہ فرمایا کہ جب تک ہم یا ہمارا کوئی رفیق تلوار اٹھا سکے اس وقت تک دشمن ہم پر قابض نہ ہو، جس کے معنی یہ ہیں کہ اپنی حیات اور دفعیہ کے اسباب کی ممکن موجودگی تک ہم حفاظت کی کوشش سے باز نہ رہیں۔ کہنے میں چھوٹی سی بات ہے۔ ذرا خیال کرو کہ اس وقت آدمیوں کے جنگل میں میرٹ ایک حسینؑ ایک طرف ہیں اور دوسری طرف ہزار دشمن ہیں لیکن حسینؑ کی تلوار اس طرح بلند ہے جس کی ہیبت کا دشمن ادب کر رہا ہے۔ اور اس تنہا پر بھی تیز، پتھر اور آگ چھینک رہا ہے۔ وقت تھا کہ امیر المومنین کے لیے لافق الاعلیٰ لا سیف الا ذوالفقار کہا جاتا۔ اس لیے کہ اس وقت سوائے علیؑ کے ہاتھ اور ذوالفقار کے کوئی دوسرا ہاتھ اور تلوار اسلام کے وقار کے تحفظ کے لیے بلند نہ تھی۔ آج وقت تھا کہ امیر المومنین ہی اپنے فرزند کو داد دیتے کہ تیرا ہاتھ اور تلوار سخت تر وقت میں بلند ہے۔ تمام بیانات کا ایک ہی آہنگ ہے کہ اس روح شجاعت کا حملہ مضیق لپیٹ دیتا تھا اور دشمن گرتے پڑتے ایک دوسرے پر بھاگتے تھے۔ یہ حسینؑ کے نفس عظیم کی ہیبت اور ان کے ارادہ کی قوت تھی۔ جس کا کوئی آنکھ اور دل مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ دشمن بھی حقیر تھا۔

دیکھنے والے انگشت بدنداں تھے اور کہہ رہے تھے کہ تم نے حسینؑ سے زیادہ کوئی پہلوور دیکھا ہے جس کا گھراس کے سامنے تباہ ہو گیا اور وہ اس طرح لڑ رہا ہے کہ گویا اس پر غم کے پہاڑی نہ ٹوٹے تھے۔ گویا یہ حسینؑ ہی دوسرے تھے۔ وقت آیا تھا کہ دشمن اپنے سپاہیوں کو نام اور خاندان کی رسوائی کے تذکرہ سے ابھارتا۔ یا کہتا کہ ان کے ہاتھ سے مارا جاتا افتخار ہے اور حسینؑ کا گھوڑا جس وقت دور تک دشمن کا تعاقب کر کے میدان صاف کر دیتا ہے تو حسینؑ ہاگ روک لیتے ہیں اور فرماتے ہیں لا حول ولا قوۃ الا باللہ دیکھتے ہیں کہ ہم تنہا ہیں۔ ہر طرف میدان صاف ہے۔ رجز پڑھتے ہیں۔ اپنے خون آلود رختا کی لاشیں دیکھ کر انھیں لازوال الفاظ میں مخاطب فرماتے ہیں یا خیمہ میں جو آتے ہو۔ زخموں کا شمار اس سے کرو کہ بیٹا ہاپ کو نہیں پہچانتا۔ جس وقت حضرت سید شہلا کو دواغ کرنے جاتے ہیں۔ میرے نزدیک یہ کوشش عبث ہے کہ حضرت کے جسم اطہر پر کس قدر زخم لگے تھے۔ ایک زخم دوسرے کی صورت قائم نہ رکھتا تھا۔ اور پھر پامالی نے تمام جسم مبارک لختہ خون بنا دیا تھا۔ حسینؑ نے یہ بھی دکھا دیا کہ ہم کیونکر فرات تک پہنچ سکتے ہیں۔ دشمن کا عز تھا کہ اس نے بہانہ کیا۔ بہانہ نے حسینؑ کی غیرت ظاہر کی۔ ہم تاریخ کے خاموش لفظوں سے حسینؑ کو بکھر رہے ہیں لوگ تھے جن کے سامنے یہ شاندار تصویر ہر صورت سے کھڑی تھی۔

لاچکے حسینؑ دور کے سہ پہلو تیرے نے رونے مبارک رقمی کیا۔ پہلو بر بھی کاری زخم لگا اور نیزے کے کئی شدید زخم کھائے۔ حقیقت یہ کہ بے شمار حروں کے دار کسی وقت نہ رُکے تھے۔ دشمن کوشش کرتا جاتا وہ قریب ہوتا یا نہ ہوتا یہ بھی دیکھنے کی بات ہے کہ جس وقت حضرت بے حد مدح ہو گئے تھے گھیرنے والے معمولی سپاہی نہ تھے بلکہ افران لشکر تھے جو گرد تھے اس لیے ادنیٰ سپاہی کسی بڑے انعام کی امید نہ کر سکتا۔ یہ سرداران لشکر تھے۔ حصین انعام کی لالچ اس شدید گناہ کے لیے قریب لاری تھی۔ پھر بھی جب حضرت کسی طرف کا ارادہ ظاہر فرماتے تھے سب بھاگتے تھے اور کوئی نامرد دشمن انہو میں وار کرتا جاتا تھا۔ ستون الہی جنبش میں آیا۔ زین خلی ہو گیا۔ مگر جسم اقدس زمین پر نہیں ہے۔ بلکہ ان بے شمار تیروں پر ہے۔ جو جسم اقدس پر لگے تھے۔ پھر حسینؑ نے اپنے کو سنبھالا۔ کسی دشمن کو قریب دیکھ کر کھٹکے کے بل کھڑے ہوتے ہیں اور اس کے بھاگنے کے ساتھ پھر بیٹھ جاتے ہیں۔ دور کے زخم لگتے جاتے ہیں۔ اس وقت ایک جھوٹا مساجد دوڑتا ہوا آیا۔ آیا یہ دیکھ کر کہ کوئی دشمن چپا کے فرق مظہر پر وار کیا چاہتا ہے۔ دو جھوٹے جھوٹے ہاتھ آگے کر دیے۔ بے رحم دشمن کی تلوار چلی اور بچے کا خون حسینؑ پر چڑھ گیا۔ اب اتنی قوت بھی نہ تھی کہ دست دھا حرکت کر سکتے۔ لیکن زبان حرکت میں تھی۔ آہستہ آہستہ فرما رہے تھے: صبرا علی قضائک یا رب لا الہ سواک یا غیاث المستغیثین (اے فریادوں کے مددگار سوا تیرے کوئی خدا نہیں ہے۔ تیرے حکم پر صبر کرتا ہوں۔) پھر حسینؑ تھے اور اسی اللہ کی حکومت کو مستند اور اپنے خون سے قائم کرنے کے لیے حسینؑ آج وعدہ وفا کر رہے تھے۔ وہ خون بہ گیا جو شیر سیدۃ النساء سے بنا تھا۔ خدا کے سجدہ میں بہا۔ پھر حسینؑ کا آخری شغل تھا۔ اور خدا کا بزرگ نام حسینؑ کی زبان اقدس پر آخری لفظ تھا۔ اور حسینؑ کی چشم مبارک کی آخری حرکت یہ تھی کہ خیمہ کی طرف اٹھ گئی تھی۔ غیرت حسینؑ دشمن فتح کی خوشی میں شادمانے بجا رہا تھا یا قاتلانہ قعر سے بلند کر رہا تھا۔ لیکن ان دشمنان انسانیت کو کیا خبر تھی کہ تمہارے قبل و بوق کی صدا چند لمحوں میں ڈوب جائے گی اور حسینؑ کے ماتی باجوں پر ابد آباد تک ان کے غم کا بار رہے گا۔ قاتلانہ صدا میں ڈوب جائیں گی لیکن حسینؑ کے غم کی صدا

انسانی جماعتوں سے بلند ہوتی جائے گی۔ ہر پچھلیں گی۔ یہاں تک کہ فنا اور عالم بھری اس کی تھراہٹ سے مبر جانے کا اور یہ تھراہٹ کبھی ساکن نہ ہوگی بلکہ ہر زمانہ اسے محسوس کر رہا ہوگا اور زمانہ کا تازہ خم اسے چھیڑتا جائے گا۔ کوئی حسین کا نام لے گا اور معلوم ہوگا کہ دشت و در فنا اور ملا سے جواب مل رہا ہے۔ خاموش اسباب غلٹ جواب دیں گے کہ ہم نے حسین کا نام سنا ہے۔ حسین کا خم جزو زمان ہو گیا۔

حسین ان کی چھوٹی سی خالص جماعت اور ان کے دشمنوں کے متعلق تاریخ عالم اور دنیا کی قومیں اپنا فیصلہ دے چکیں۔ لیکن یہ فیصلہ تو ہماری عمومی تائید ہے ہم اپنے تصفیہ کے لیے غیر قوموں کے محتاج نہیں ہیں۔ اگرچہ مشکور ہوں۔ ہمیں تو حسین کے افعال کو سبق آموزی کی حیثیت سے دیکھنا ہے۔ جس کے رم سے دشمن اور جانور فیضیاب ہوتے ہیں جو جوش میں جوش سے کام لیتا ہے۔ جس کا احوال طبیعت کبھی ضائع نہیں ہوتا اور جو اصول کے سامنے کسی چیز کی وقعت نہیں کرتا۔ بلکہ سب کچھ قربانیاں کر دیتا ہے۔ حسین کی شہادت اسباب عروج و زوال اسلام کا غلامہ ہے۔ عروج حسین بنا سکتا ہے۔ زوال ایسے لوگ نہیں کر سکتا ہے جو اپنے بہترین فرد کو ضائع کر دیں۔

آج دنیا کا مشغل سے کوئی گوشہ ہے جہاں حسین کے نام سے کوئی واقف نہ ہو اور جوش و ہزدردی نہ پیدا ہوتی ہو۔ مظلوم کی قبر اگرچہ ایک زمانہ کے سیاسی تشدد کے تابع رہی۔ باوجود اس کے کہ لاش اور سر میں تفرقہ رہا لیکن اس مظلوم کا نام اس ریگستانی تنہائی سے جے کر لیا کہتے ہیں بلند ہوا۔ وہاں وہاں ایک نشان قبر اور روضہ بن گیا جہاں کسی نے نام لیا اور ہمدردوں کی جماعت اس طرح اپنے وقت، اپنی توجہ اور اپنے مال کو ان کے تذکرے کے لیے صرف کرنے لگی۔ گویا اس کی طبیعت پسند کے لیے اس سے خوشگوار فرض کوئی دوسرا نہ تھا۔ کیا ہوا اگر حسین کی قبر مظہر کے لیے مختلف روایتیں ملے۔ کیا ہوا اگر سر اور لاش کے یکجا دفن ہونے کے متعلق بیانات مختلف ہیں۔ کیا ہوا اگر کوئی متوکل پھر یہاں سے یا ایسے اتفاقات ہوں کہ ہم کو حسین کی قبر مظہر کا نشان نہ ملے۔ حسین کی قبر تو اس بلند اور مخصوص زمین میں ہے جس سے بڑھ کر دفن تلاش کرنا بے سود ہے۔ اور وہ جگہ شرافت پسند انسانوں کا دل ہے۔

حسین کا نام اس وقت بھی فر سے لیا جائے گا جس وقت تک ایک انسان بھی رہے گا۔ اور استقلال و حق رومی کا نام لیا جائے گا۔

اولوالعزم ہلاشاہ اور شہنشاہوں کا نہ کوئی نام لیتا ہے اور نہ کوئی ان کا زائر ہے لیکن مظلوم حسین کی زیارت کرنے والوں کے سیلاب کی تعداد بارہ صدیوں سے برابر تہی پذیر ہے۔ اور یہ سیلاب ذرائع آمد و رفت کے ساتھ بڑھتا جائے گا۔ انسانوں کی جماعتیں اس نشان کو دیکھنے جائیں گی جہاں شرافت، شجاعت، انسانی ہمدردی، اصول کی حفاظت اور خدا کی ناقابل مقابلہ اطاعت اور اعتبار کی روح دفن ہے۔ جائیں گے ادب سے کھڑے ہوں گے خاموشی سے غور کریں گے اور روح مظہر کا سایہ فگن کس حاصل کریں گے۔ ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے اٹھ پلوں پھر جائیں گے اور کہیں گے کہ اس طرح بھی انسان اور قومیں زندہ ہو سکتی ہیں جس طرح حسین ہوئے۔ ان کی مدد اس لیے نہ ہوگی کہ یہ دنیاوی عیش و نعمت کے گہوارے میں تھے بلکہ اس لیے کہ یہ مصیبت اور امتحانوں میں عظیم الشان تھے۔ حسین کی شہادت انفرادی اور قومی حیات کا مقدمہ ہے۔ حسین اس لیے شہید ہوئے کہ شرافت اور انسانیت کا مرتبہ بلند کریں۔

یہ ذات ہے کہ جس طرح مسلمانوں میں حب وطن، حب قوم، حب ملت، حب دین، ترقی کرتی جانے لگی اس طرح حسینؑ کی محبت بھی بڑھتی جانے لگی۔ جہل نہ حسینؑ کو بھلائے گا نہ ان کا نام بلند کرے گا۔ بلکہ روشنی کی علامت اس جسم روشن کے دیکھنے میں مدد دے گی۔

حسینؑ نے اپنی شہادت سے یہ بھادیا کہ ان کی خاندانہ میں ہر زمانہ میں اسلام کی آخری امید ہے۔ حسینؑ کی شہادت دین کی تازہ حیات کی بنیاد تھی۔ دین کی ان صورتوں یا بھول ہوئی صفات کو جن کے پھلنے کا ذریعہ مفقود ہو گیا تھا۔ حسینؑ نے اپنے حیرت خیز عمل سے پھنسا دیا۔ دین کی ناقابل سہو شرح کردی جس کے اصول غور اور مطالعہ میں وہ گری اور بیان خیزی حاصل نہ ہوتی جو ان مثالوں سے ہوتی جو حسینؑ نے دی۔ ہو سکتا ہے کہ مسلمان ثقافت حقیقتوں کے احتکاظ اور اثرات سے اپنا اسلامی مزاج بھول جائیں۔ یا وہ کسی روش اور اسلامی روش میں فیصلہ نہ کر سکیں۔ اور اسی لیے حسینؑ کی ذات و اقدس وہ بلند روشنی ہوگی جو بھولے ہوؤں کو راستہ بتا دے گی۔ حسینؑ مردہ ہڈیوں کے عرقیل ہند۔ سلام ہو تم پر اے حسینؑ۔ تمہاری حیات کے تصور ایک شکستہ قلم کا سلام۔ ایک ناچیز سوانح نویس کا سلام

جس کی حیرت اس کے ہوش پر غالب آتی جاتی ہے۔ اور وہ مدہوشی میں کہہ رہا ہے

کہ تمہاری حیات یہ صاف نہ بھلائی تھی! تم کیوں پیدا کیے گئے تھے۔

تمہاری شہادت بھلائی ہے کہ تم کیوں پیدا کیے گئے تھے۔

حسینؑ نہ بھلے اگر اسلام نہ ہوتا نہ شکستہ

لغات اسلام نہ ہوتی

اگر حسینؑ نہ

ہوتے

○

ریاض

۲۲ مرم ہفتہ ۱۰ بجے دن ۱۳۳۳ھ۔ ۱۲ نومبر ۱۹۱۴ء

غلامی اشاعت اول: جہم میں بہاری ساکن عظیم مجسمہ شہر ہندس (مجلدات)